ہماری ویب ای بُک

محمد احمد ترازی

M. AHMED TARAZI

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

E-BOOK SERVICES

Collection of Published Articles
By "M. Ahmed Tarazi"
at Hamariweb.com

سانحہ گوجرہ۔۔۔۔۔اسلام اور پاکستان کے خلاف ایک سازش

تحمل،.برداشت، رواداری، صبر اور ایک دوسرے کے مذہب اور مذہبی تعلیمات کے احترام کا جذبہ جب ختم ہوجائے تو حادثات اور سانحات کا جنم لینا ایک لازمی امر ہے، گزشتہ دنوں گوجرہ میں پیش آنے والا سانحہ جس میں قرآن پاک کی بے حرمتی کے خلاف احتجاجی جلوس کے دوران مشتعل ہجوم نے دو گرجا گھروں سمیت عیسائیوں کی پوری بستی کو آگ لگانے کی کوشش کی اور اس ہنگامہ آرائی میں آٹھ افراد زندہ جل کر اپنی زندگی کی بازی ہار گئے، جبکہ چالیس سے زائد گھروں کو جلنے کی وجہ سے نقصان پہنچا اور دو طرفہ فائرنگ کے تبادلے میں میں ایک ڈی ایس پی سمیت ٹی ایم اے اور 20 افراد زخمی ہوئے، اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

30 جولائی کو ٹوبہ ٹیک سنگھ کی تحصیل گوجرہ میں پیش آنے والے اس گھناؤنے واقعے نے پورے ملک میں تشویش کی ایک لہر پیدا کردی ہے، یہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں اقلیتوں کو پڑوسی ملک بھارت کے مقابلے میں ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھا گیا اور وہ بھارت کے مقابلے میں پاکستان میں زیادہ آزاد، آسودہ حال اور خوشحال ہیں، لیکن حالیہ واقعہ سے جس طرح اس چنگاری کو شعلہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے، وہ واقعتاً تشویشناک ہے۔

اس واقعے کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وزیراعظم پاکستان نے پنجاب کے وزیراعلیٰ سے رابطہ کرکے حالات معلوم کیے اور وزیر داخلہ نے اس موقع پر گوجرہ کے عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کریں، اس واقعے پر غفلت .برتنے پر ایک ڈی ایس پی سمیت کئی پولیس افسران کو معطل کیا جا چکا ہے، اس وقت صورتحال یہ ہے کہ علاقہ میں سخت کشیدگی.برقرار ہے اور رینجرز و پولیس کے دستے شہر میں گشت کررہے ہیں۔

جبکہ حکومت پنجاب کی خصوصی ہدایات کی روشنی میں گوجرہ میں ہونیوالے ناخوشگوار سانحہ میں آٹھ افراد کی ہلاکت، کئی افراد کے زخمی ہونے اور درجنوں مکانات کوآگ لگا کر تباہ کرنے سمیت دہشت گردی پھیلانے کے جرم میں پولیس تھانہ سٹی گوجرہ نے ڈی سی او ڈی پی او اور 17 دیگر نامزد افراد سمیت 800 نامعلوم ملزمان کے خلاف انسداد دہشت گردی ایکٹ سمیت سنگین نوعیت کی کئی دیگر دفعات کے تحت مقدمہ درج کر لیا ہے جبکہ وزیر اعلیٰ پنجاب کی درخواست پر چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ نے ایک انکوائری کمیشن بھی تشکیل دے دیا ہے جس نے اپنی تحقیقات کاآغاز کر دیا ہے۔

یوں توانتظامی غفلت کا مظاہرہ ہمارے قانون نافذ کرنے والے اداروں کا خاصہ

ہے، لیکن سانحہ گوجرہ اس اعتبار سے اپنی نوعیت کا منفرد واقعہ ہے کہ اس میں انتظامیہ کی جانب سے غفلت اور لاپرواہی کی انتہا کر دی گئی ہے۔ مصدقہ اطلاعات کے مطابق یہ جھگڑا ایک شادی کیلئے ہونے والی تقریب میں قرآن مجید کی بے حرمتی سے شروع ہوا، جس پر مقامی مسلمانوں نے اعتراض کیا، لیکن یہ اعتراض ایک بلوے میں کس طرح تبدیل ہوا اور اس کہانی کے کرداروں میں ایک کالعدم تنظیم کے شر پسند عناصر کیسے داخل ہوئے، یقینی طور پر اس بات کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کی ضرورت ہے۔

زیادتی جس فریق کی جانب سے بھی کی گئی، تب بھی جھگڑا اس حد تک بڑھ جانے کی امید نہ تھی اگر اگلے روز شدت پسندوں کی ایک جماعت اسلام کی ٹھیکیدار بن کر وہاں نہ پہنچتی اور چالیس سے زائد گھروں کو آگ نہ لگائی جاتی، تو کبھی بھی اس قسم کے حالات جنم نہیں لیتے۔ گوجرہ میں رونما ہونے والے افسوسناک واقعات کا پس منظر دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مقامی انتظامیہ اگر ابتداء ہی میں اس معاملے کو کنٹرول کر لیتی اور قرآن پاک کی بے حرمتی کرنے والے افراد کے خلاف ایف آئی آر درج کر کے کارروائی کا آغاز کرتی تو آج یہ صورتحال ہرگز پیدا نہ ہوتی۔

بعد کے واقعات سے ایک بات اور بھی بہت واضح ہو کر سامنے آئی ہے کہ بنیادی

غلطی مقامی انتظامیہ کی ہے اور یہ سوالات جواب طلب ہیں کہ جس وقت مشتعل مظاہرین لبستی کی طرف بڑھ رہے تھے، اس وقت پولیس اور قانون نافذ کرنے والے ادارے کہاں تھے، جس وقت قرآن کی بے حرمتی کا واقعہ رونما ہوا تھا اور مقامی لوگوں نے متعلقہ افراد کو پکڑ کر انتظامیہ کے حوالے کرتے ہوئے ان کے خلاف ایف آئی کار کاٹنے اور انہیں گرفتار کرنے کا مطالبہ کیا تھا، اس وقت انتظامیہ نے اس مذموم کاروائی میں ملوث افراد کے خلاف کاروائی کیوں نہیں کی۔

درحقیقت یہی وہ اصل عوامل ہیں، جنکی وجہ سے حالات اس نہج پر پہنچے ہیں اور جس کی وجہ سے پاکستان دشمنوں کو اس واقعے سے نہ صرف پاکستان اور اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک موقع ہاتھ آگیا ہے بلکہ اقلیتوں کے ساتھ سلوک کے حوالے سے پاکستان کے سابقہ شفاف ریکارڈ بھی خراب کرنے کوشش کی گئی ہے۔

یہاں یہ امر بھی توجہ طلب ہے کہ گزشتہ کچھ عرصے سے پاکستان میں تسلسل کے ساتھ قرآن پاک کی بے حرمتی اور توہین رسالت جیسے مذموم واقعات وقتاً فوقتاً رونما ہوتے رہے ہیں، جن پر مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا برانگختہ ہونا ایک فطری عمل ہے، عام مشاہدہ یہ ہے کہ ایسے عناصر کے خلاف بروقت کارروائی نہیں ہوپاتی اور اگر کبھی کوئی کارروائی ہو بھی جائے تو مسلمانوں کی دل آزاری

کے مرتکب یہ عناصر ضمانت پر رہا ہو جاتے ہیں، جس کی وجہ سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں اور جب وہ ایسے لوگوں کو جن پر توہین رسالت اور قرآن پاک کی بے حرمتی کے الزامات ہوتے ہیں، سر عام آزادانہ گھومتے پھرتے دیکھتے ہیں تو وہ لوگ قانون کو ہاتھ میں لے لیتے ہیں، جس کی وجہ سے سانحہ گوجرہ جیسے افسوسناک واقعات جنم لیتے ہیں۔

ان حالات میں ضرورت اس امر کی ہے کہ جب عوام قانون ہاتھ میں لینے سے گریز اور اپنے جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے اہانت قرآن اور توہین رسالت کے ملزمان کو انتظامیہ کے حوالے کرتے ہیں تو انتظامیہ کو بھی ایسے افراد کو رعایتیں اور تحفظ دینے کے بجائے ان کے خلاف قانون کے مطابق قرار واقعی سزا دلوانے کا انتظام کرنا چاہیے تاکہ لوگوں کا خود قانون کو ہاتھ میں لینے کا کوئی جواز باقی نہیں رہے۔

پاکستان کا کردار ہمیشہ اقلیتی آزادی کے حوالے سے پوری دنیا میں سراہا جاتا رہا ہے، لیکن آج اس سانحے کی وجہ سے ایک سوال بن گیا ہے، پاکستان میں مسلمان اور اقلیتیں ہمیشہ شیر وشکر رہی ہیں، دوسری طرف حکومت اور معاشرے سے بھی غیر مسلموں کو کبھی شکایت نہیں رہی، پاکستان کی باسٹھ سالہ تاریخ میں آج تک کوئی اس حوالے سے ہماری جانب انگلی نہ اٹھا سکا تھا کہ کبھی ہم

نے اقلیتوں کے امور پر کوئی غفلت برتی ہو اور کبھی بھی یہ ثابت نہیں کیا جا سکا کہ پاکستان میں کسی نان مسلم کو مذہب کے نام پر کوئی گزند پہنچی ہو یا ان کے حقوق غصب کیے گئے ہوں۔

پاکستان ہمیشہ سے اقلیتوں کے حقوق کا ضامن رہا ہے اور اس طرح کے واقعات پاکستان میں کبھی سننے کو نہیں ملے۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ ملک پہلے ہی اندرونی طور پر دہشتگردی کا شکار ہے، اس قسم کے مذہبی منافرت پر مبنی واقعات جلتی پر تیل کا کام کریں گے، موجودہ وقت میں قومی یکجہتی کی بے حد ضرورت ہے، کیونکہ لسانی اور مذہبی اور قومی عصبیت مضبوط سے مضبوط قوموں کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔

آج دنیا میں پاکستان کو دہشت گرد ملک قرار دلانے کی کوششیں ہو رہی ہیں اس میں اگر پاکستان سے مخاصمت رکھنے والے لوگ سرفہرست ہیں تو کچھ اپنے بھی ان کے ساتھ ملے ہوئے ہیں، پاکستان کو بدنام کرنے کا ان کو محض ایک بہانہ چاہیے، ایسے میں پاکستانیوں کے اندر اتحاد و یگانگت کی اشد ضرورت ہے، نہ کہ گوجرہ جیسے واقعات رونما ہوں، اس نوعیت کے واقعات کا اس لئے بھی سدباب ضروری ہے کہ پاکستان اور مسلمانوں کے درپے دشمن قوتیں اس سے فائدہ اٹھاتی ہیں اور ایسے واقعات کو ہمارے خلاف منفی پراپیگنڈہ کے طور پر استعمال کرتی

ہیں۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان نے اقلیتوں کو ہمیشہ بھرپور مذہبی، معاشرتی، ثقافتی آزادی دی اور کبھی بھی اقلیتوں کے حقوق پر کوئی آنچ نہیں آنے دی، لیکن گوجرہ کے سانحے نے دنیا میں پاکستان کی ساکھ کو شدید نقصان پہنچایا ہے، ان حالات میں آئی جی پنجاب کا یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ سانحہ گوجرہ میں غیر ملکی ہاتھ ملوث ہے، جہاں یہ غیر ملکی ہاتھ بلوچستان، وزیرستان، باجوڑ، سوات اور مالاکنڈ میں آگ لگانے کا موجب بنا ہوا ہے، وہیں اب گوجرہ جیسے واقعات کو جنم دے کر وطن عزیز کو غیر مستحکم کر کے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

یہاں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ کوئی بھی بیرونی طاقت اس وقت تک کسی ملک کو نقصان نہیں پہنچا سکتی جب تک اندر سے ہی اس کا ساتھ دینے والے لوگ موجود نہ ہوں، اس سانحے میں بھی بیرونی ہاتھ کے ساتھ ساتھ اندرونی طاقتیں بھی برسرپیکار ہیں، جن پر توجہ دینے اور انہیں بے نقاب کرنے کی شدید ضرورت ہے، پاکستان کی باسٹھ سالہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ پاکستان میں اقلیتوں کو بلاامتیاز معاشی، سیاسی اور مذہبی آزادی حاصل رہی ہے اور پاکستانی معاشرہ میں عوامی رویے بھی اس بات کے مظہر ہیں کہ یہاں کے مسلمان کسی بھی اقلیت کے

بارے میں کوئی مذہبی پرخاش نہیں رکھتے۔

شاید انہی قابل رشک روایات کو داغدار کرنے کیلئے پاکستان میں گزشتہ کچھ عرصہ سے مذہبی، علاقائی اور لسانی منافرت کو ہوا دینے والے واقعات رونما ہورہے ہیں، چنانچہ اب یہ صوبائی اور وفاقی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ سانحہ گوجرہ کے پرتشدد واقعات کی غیر جانب دارانہ تحقیقات اور اصل حقائق عوام کے سامنے پیش کرے اور جن فتنہ پرور لوگوں نے قرآن پاک کی بے حرمتی کی ہے اور اس کے بعد ملک دشمن شر پسندوں کی ایماء جو پرتشدد واقعات رونما ہوئے انہیں بے نقاب کرکے اصل ملزمان کو کیفر کردار تک پہنچا کر قرار واقعی سزا دے تاکہ مستقبل میں ایسے سانحات سے بچا جاسکے۔

پاکستان کے 62 ویں یوم آزادی پر خصوصی تحریر

صبح آزادی کا قرض ابھی باقی ہے
ابھی تک نا مکمل ہے مگر تعبیر آزادی

امرتسر کی تنگ و تاریک گلی میں موہن سنگھ نے محتاط نظروں سے اپنے چاروں طرف دیکھا کہ کہیں کوئی ہندو یا کوئی سکھ اُسے ایک مسلمان راہگیر کے ساتھ دیکھ نہ لے، اپنے گرد و پیش سے مطمئین ہونے کے بعد اُس نے کہا اچھا ہوا تم مجھے مل گئے، یہ میرے پاس تمہارے لئے ایک امانت ہے، پھر اُس نے اپنی جیب سے سلے ہوئے کپڑے کا رومال نکالا اور اُس کی گرہیں کھول کر اندر سے ایک چھوٹا سا تعویز نکالا اور مسلمان راہگیر کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ " آج میرا بوجھ ہلکا ہوگیا، آج موہن سنگھ سرخرو ہوگیا" تعویز لینے والے مسلمان راہگیر نے موہن سنگھ سے پوچھا یہ تعویز کس کا ہے اور تمہیں کہاں سے ملا۔

یہ سوال سن کر موہن سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آگئے ،اُس نے بتایا کہ چند دن پہلے جب مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا، ہندوؤں اور سکھوں کے جتھے مسلمان محلوں پر حملہ آور تھے، وہ بوڑھے جوانوں اور بچوں کو قتل کر رہے تھے، مکانوں کو آگ لگا رہے تھے اور عورتوں کی بے حرمتی کر رہے تھے، ایسے میں ایک

رات میں ایک چوک سے گزر رہا تھا کہ وہاں چند ہندو غنڈے نشے میں بدمست بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے مجھے روکا اور مجھ سے پوچھا کہاں جارہے ہو میں نے انہیں بتایا کہ میں گھر جارہا ہوں، انہوں نے مجھے کہا آؤ تمہیں سورگ (جنت) کی سیر کراتے ہیں، میں اُن کا اشارہ سمجھ گیا کہ شاید کوئی مظلوم مسلمان لڑکی اُن کے ہاتھ چڑھ گئی ہے۔
انہوں نے مجھے کہا جاؤ تم بھی موج کرلو اور ساتھ والی کوٹھری کا دروازہ کھول دیا، میں نے دیئے کی روشنی میں دیکھا کہ چارپائی پر ایک سترہ سالہ نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی، جس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور بال یوں بکھرے ہوئے تھے جیسے زبردستی نوچے کھسوٹے گئے تھے، لیکن اُس کی آنکھوں میں شیرنی کی سی چمک تھی، مجھے دیکھتے ہی اُس نے کہا "خبردار میرے قریب مت آنا" میں نے کہا بہن میں تجھے کچھ نہیں کہوں گا، بہن کا لفظ سن کر اسے کچھ تسلی ہوئی، اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کا نام نام رقیہ ہے اور اِن غنڈوں نے میرے باپ، بھائی اور خاندان کو قتل کردیا ہے اور مجھے اٹھا کر یہاں لے آئے ہیں۔
لیکن انہیں علم نہیں کہ ایک مسلمان عورت اپنی عزت کی حفاظت کیسے کرتی ہے، اُس نے اپنے گلے سے ایک تعویز اتارا اور میرے قریب آکر مجھے دیتے ہوئے کہا یہ میری امانت ہے اسے کسی مسلمان کو دے دینا اور اِس دوران اُس نے چھپٹ کر

میرے گلے میں لٹکی ہوئی کرپان کو زور سے اپنے سینے میں اتار لیا، خون کا فوارہ اُس کے سینے سے ابل پڑا اور تھوڑی دیر وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہو گئی، دیئے کی دھیمی روشنی میں اُس کے چہرے پر ایک ایسا سکوت اور نور تھا جس سے میں خوفزدہ ہوگیا اور تعویز جیب میں ڈال کر بھاگ نکلا، اُس دن سے میں کسی مسلمان کو ڈھونڈ رہا ہوں تاکہ یہ امانت میں اُس کے سپرد کرسکوں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک مسلمان عورت اتنی بہادری سے اپنی عزت کی حفاظت کیلئے کس طرح جان دے سکتی ہے"۔

میرے دوستوں یہ کوئی کہانی یا داستان نہیں بلکہ تحریک پاکستان کے دوران پیش آنے والا ایک ایسا حقیقی واقعہ ہے جو پاکستان کے مشہور ادیب جناب اے حمید کے ساتھ پیش آیا تھا، ایسے ہزاروں لاکھوں لٹے پٹے قافلوں، جلتے ہوئے گھروں، کٹے پھٹے لاشوں اور مٹی میں ملتی آبروؤں بھرے واقعات تحریک پاکستان کے دوران برصغیر کے بچے، بوڑھے، جوانوں اور خواتین نے اپنے خون سے تاریخ کے صفحات پر لکھ کر وطن عزیز پاکستان کی بنیاد رکھی۔

آج جب ہم اپنے بزرگوں سے جو اِن واقعات کے چشم دید گواہ اور راوی ہیں سوال کرتے ہیں کہ آپ نے یہ قربانیاں کس لیے دی تھیں تو وہ ہمیں فوراً ہی جواب دیتے ہیں اُس پاکستان کیلئے جس کا مقصد "پاکستان کا مطلب کیا لاالہ الااللہ"

قانون ریاست کیا ہوگا محمد رسول اللہ " تھا، یہ کوئی جذباتی بات یا نعرہ نہیں بلکہ وہ ،
ٹھوس اور زندہ حقیقت ہے جسے بتدریج ایک منظم طریقے سے بھلایا جارہا ہے اور ہم
بھولتے جارہے ہیں۔

یہی وہ اصل حقیقت، عزم اور منزل کے حصول کے ساتھ ایک ایسا وعدہ تھا جو ہم نے
اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کیا تھا،اور اسی وعدے پر
مسلمانان برصغیر نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرکے قیام پاکستان کی تاریخ ساز
جدوجہد کی تھی، اس خواب کو تعبیر بخشنے کیلئے ہمارے قائدین نے قربانیاں دیں، تحریکیں
چلائیں، گھربار زمین و جائیدادیں چھوڑی اور عوام کیلئے پاکستان کا جواز فراہم کیا، جس کی
وجہ سے لاکھوں مسلمانوں نے آگ و خون کے دریا عبور کئے، ماؤں نے معصوم بچوں کو
نیزوں کی انیوں پر اچھلتے دیکھا، عورتوں نے اپنے سہاگ اجڑتے دیکھے اور گھربار، عزیز و
اقارب اور اپنے پیاروں کے نام ونشان چھوڑ کر پاکستان کیلئے عازم سفر ہوئے اور
ہجرت کی۔

تاریخ گواہ ہے کہ غلامی کی لعنت حساس افراد اور زندہ قوموں کیلئے ہمیشہ ذہنی اذیت،
روحانی بے چینی اور قلبی درد و کرب کا باعث بنتی ہے حقیقت یہ ہے کہ احساس غلامی اور
محرومیت نے ہمیشہ محکوم اور غیور انسانوں اور غیرت مند

قوموں کے لہو کو گرم رکھا اور نتیجتاً حکمران قوموں کی ظاہری شفقت و مہربانی اور آئین پسندی کے باوجود محکوم قوموں نے غلامی کی زنجیروں کو توڑ ڈالا۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ غلامی کی زنجیریں ٹوٹنے کا عمل کبھی خاموش نہیں ہوتا، غلامی کی زنجیروں پر موت کے رقص ہوتے ہیں،آزادی کے متوالے سولیوں پر چڑھتے ہیں، سروں کے نذرانے پیش کئے جاتے ہیں، جانوں کی قربانی دی جاتی ہے اور شہداء کے بہتے ہوئے خون سے دریا سرخ ہو جاتے ہیں، گاؤں دیہات لٹتے ہیں، شہر جلائے جاتے ہیں لیکن آزادی کے متوالے آگ و خون کے دریاؤں سے گزر کر آزادی کی منزل تک پہنچ ہی جاتے ہیں۔

ان آگ و خون کے دریاؤں سے گزرنے کا احساس اور تجربہ برصغیر کے مسلمانوں سے زیادہ کسی اور قوم کو نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ غلامی کا طوق گلے سے اتارنے کیلئے ہمیشہ سینہ سپر رہے، انہوں نے ہندو قوم کی طرح عزت و آزادی کے سودے نہیں کئے، پلاسی کے میدان سے لے کر سرنگا پٹم کی سرزمین تک، 1857ء کی جنگ آزادی سے لے کر تحریک خلافت، تحریک ہجرت اور تحریک عدم تعاون تک، جلیانوالہ باغ کے المیہ سے لے کر واقعہ کانپور مچھلی بازار، سانحہ مسجد شہید گنج اور حادثہ قصہ خوانی بازار تک، ایسے تمام مواقع پر مسلمانانِ ہند جرات و

بہادری کے ساتھ بڑھ چڑھ کر مردانگی کا مظاہرہ کرتے رہے اور اپنے خون سے آزادی کے چراغ روشن کرتے دکھائی دیئے۔

مسلمانان برصغیر کی جدوجہدِ آزادی بلاشبہ انتہائی کٹھن اور صبر آزما کام تھی اور مسلمانوں کو کئی محاذوں پر برسرپیکار رہنا پڑا، ایک طرف انگریز کی غلامی سے نجات کا مرحلہ درپیش تھا تو دوسری طرف ہندو بنیے کے متوقع رام راج کے برسراقتدار آنے کے خطرات لاحق تھے، انگریزوں اور ہندوؤں دونوں کی غلامی کے طوق انہیں اپنی گرفت میں لینے کیلئے بے چین تھے، کیونکہ دونوں ہی مسلمانوں کے ازلی دشمن تھے، انگریزوں کے ذہن سے صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کبھی محو نہیں ہو سکی اسی طرح ہندو برصغیر کے میدانوں میں سلطان محمود غزنوی، سلطان محمد غوری، ظہیر الدین محمد بابر، احمد شاہ ابدالی جیسے مایہ ناز سورماؤں اور جری جرنیلوں کے ہاتھوں اپنی ذلت آمیز شکستوں کے واقعات نہیں بھولے تھے۔

یہی وجہ تھی جب آزادی کی گھڑیاں قریب آئیں تو دونوں قوموں نے اپنے سینوں میں چھپائی ہوئی برسوں کی دشمنی، نفرت اور بغض کا برملا اظہار کیا، انگریز نے حالات و واقعات سے مجبور ہو کر مسلمانان برصغیر کا مطالبہ تو منظور کرلیا لیکن پاکستان کے وجود کو گہری اور خطرناک ضربیں لگانے سے باز نہیں آئے

پاکستان میں شامل ہونے والے دو بڑے صوبے بنگال اور پنجاب کو تقسیم کر دیا گیا، باؤنڈری کمیشن سے تمام بے اصولیاں کرائیں گئیں، الغرض پاکستان کو لولا لنگڑا بنانے کیلئے انہوں نے تمام ممکنہ کوششیں روا رکھیں۔

دوسری طرف ہندوؤں اور سکھوں نے بھی اگرچہ پاکستان کے قیام پر بظاہر رضا مندی ظاہر کر دی تھی لیکن اندرونی طور پر وہ پاکستان کے وجود کو چند ساعتوں یا چند مہینوں سے زیادہ دیکھنے کے متحمل نہیں تھے، وہ برصغیر کے مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتے تھے اور خاص کر انہوں نے بھارت میں شامل ہونے والے علاقوں کے مسلمانوں پر لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا، مسلمانوں کے محلے قصبے، شہر اور دیہات لوٹے انہیں آگ لگائی، ہزاروں لاکھوں بے گناہ بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کو تہہ تیغ کیا، نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کو اغوا کیا، نوا کھلی سے لے کر لاہور تک، کشمیر سے لے کر راس کماری تک غریب مسلمانوں پر ایک قیامت گزر گئی، پورا مسلم ہندوستان جل رہا تھا، بہار سے لے کر مشرقی پنجاب تک آگ لگی ہوئی تھی، لیکن انگریزوں کا "نیرو" لارڈ ماونٹ بیٹن اور ہندوؤں کا" نیرو" مہاراجہ پٹیالہ جو پنجاب کا رنجیت سنگھ بننا چاہتا تھا چین سے بیٹھے بانسری بجا رہے تھے، مسلمانوں کی دنیا لٹتی رہی اور مسلمانوں کے ازلی دشمن 14 اگست 1947ء کی صبح آزادی تک بانسری بجاتے رہے۔

چودہ اگست 1947ء کو دنیا کے نقشے پر ایک آزاد اسلامی جمہوری مملکت پاکستان کی شکل میں ابھری، جس کے قیام کیلئے مسلمانان ہند نے بابائے قوم قائدِ اعظم محمد علی جناح رحمتہ اللہ علیہ کی قیادت میں ایک طویل اور صبر آزما جنگ لڑی، یہ وہ سیاسی اور جمہوری حقوق کی بازیابی کی جنگ تھی جس کیلئے مسلمانانِ ہند نے قید و بند کی صعوبتیں تو ایک طرف ہزاروں ماؤں نے اپنے جگر گوشوں کی شہادت سے، ہزاروں بہنوں نے اپنی عزتوں اور عفتوں کے نذرانے دے کر اور ہزاروں معصوموں نے بوڑھوں نے اپنی جانوں کی بازی ہار کر ظالم و متعصب انگریزوں اور ہندوؤں سے اپنے پاک وطن کی آزادی حاصل کی۔

یہ حصول پاکستان کی طویل جدوجہد پر مبنی تاریخی واقعات زندہ اور باغیرت قوم کی تاریخ ہیں جو آج ہمارے لئے قابل رشک اور قابل زکر ہیں، یہ اُن نیک جذبوں اور پاکیزہ آرزوؤں کی تاریخ ہے جس کی قوت اثر سے ہندوستان کی تین سو سالہ شب ظلمت کا سینہ چیر کر آزادی کا سورج طلوع ہوا مگر اِن پاکیزہ فولادی جذبوں کی تاریخ کا آخری باب گیارہ ستمبر 1948ء کو بانی پاکستان حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناح کی وفات کے ساتھ ہی ختم اور مکمل ہوگیا اور اُس کے بعد جس تاریخ کا آغاز ہوا اُس کے صفحات پر کارناموں کی جگہ المیے رقم ہوئے۔

بابائے قوم اور شہید ملت لیاقت علی خان کی وفات کے بعد سے تا حال ہماری قومی تاریخ المیوں در المیوں کی تاریخ ہے جس کے صفحات کا ایک سرا مقبوضہ کشمیر کی لہو رنگ وادی، سری نگر کے خوں آلود پہاڑوں سے لے کر ڈھاکہ اور چٹاگانگ کی خون آلود گلیوں تک پھیلا ہوا ہے تو دوسرا صوبہ بلوچستان و سرحد کے کوہساروں سے لے کر کراچی کی سڑکوں تک سسکتی ہوئی مظلوم انسانیت اور بے بسی و لاچارگی کی تاریخ بیان کرتا ہے۔ اِن المیوں نے ہمیں ایک متحد و منظم قوم سے چھوٹے چھوٹے انسانی گروہوں اور بکھرے ہوئے بھیڑوں کے ریوڑ میں تبدیل کر دیا۔

انگریزوں اور ہندو بنیے سے لڑ کر پاکستان حاصل کرنے والی قوم جغرافیائی، لسانی اور نسلی تضادات میں الجھ کر بکھر گئی۔ اقتدار مافیا نے کبھی جمہوریت، کبھی اسلام، اور کبھی غریب پروری کے لبادوں میں روپ بدل بدل کر جمہوریت کی دھجیاں اڑائیں۔ اسلام کے ساتھ کھلا مذاق کیا اور سیاست کا وہ کھیل کھیلا جس کے احوال دیکھ کر شاید گورستانوں کے گل فروش بھی شرمندہ ہوتے ہوں۔ سیاستدانوں کی باہمی چپقلش، سیاسی مفادات کی کالی آندھی نے تحریک پاکستان کے مقاصد کے ساتھ ساتھ قرار داد مقاصد کو بھی نہ صرف دھندلا کر رکھ دیا بلکہ بانیان پاکستان اور تحریک پاکستان کے گمنام شہیدوں کی ارواح کو بھی زخم لگائے جنھوں نے اپنا سب کچھ اس مملکت عظیم کے قیام کیلئے قربان کیا

تھا۔

قوم گزشتہ 62 برس سے اپنی ناکام تمناؤں اور حسرتوں کے لاشے اٹھائے امید بر آس رہی جبکہ حکمرانوں نے ہر مرتبہ وطن عزیز پاکستان کے جواز کی توہین کی اور قیام پاکستان کے بنیادی مقصد کو فراموش کردیا، قوم سے ہر مرتبہ وعدہ خلافی کی گئی، حکمرانوں نے پاکستان کو اپنے باپ کہ جاگیر سمجھ کر اس بری طرح لوٹا کہ آج پوری قوم کاسہ گدائی لئے ورلڈ بینک، آئی ایم ایف جیسے اسلام اور پاکستان دشمن اداروں کے سامنے کھڑی ہے جو اپنی مرضی سے ہمارا بجٹ بنواتے ہیں ہم پر ٹیکس لگواتے ہیں۔

بخدا یہ صریحاً توہین ہے اُن جذبوں کی جو قیام پاکستان کیلئے دی جانے والی قربانیوں کے پیچھے کارفرما تھے، یہ توہین ہے اُس خون کی جو پاکستان کیلئے شہداکے بدن سے بہا، یہ توہین ہے اُس نظریے کی جس کی بنیاد پر تحریک پاکستان چلائی گئی اور یہ توہین ہے اُس تارخ کی جس کی پیشانی پر اسلام کی 12 سو سالہ حکمرانی کا تاج سجا رہا اور جس نے دنیا کو رہنے، سہنے اور جینے کے ڈھنگ اور قرینے سکھائے۔

آج اسی قوم کی تباہی و بربادی پر باطل ہنس رہا ہے، قوم بانیان پاکستان کی

قربانیوں اور مقاصد کو بھول کر مفادات میں الجھ گئی ہے ہر کوئی کہیں بھی ہو اپنی
مفاداتی جنگ سے باہر نہیں آرہا ہے، اس وقت قوم جس دور آشوب سے گزر رہی ہے
وہ انتہائی خطرناک اور بھیانک منظر کی عکاسی کر رہا ہے، نادان حکمرانوں نے "سب سے
پہلے پاکستان" کا نعرہ لگایا جس کے خطرناک نتائج آج برآمد ہو رہے ہیں، ہونا تو یہ
چاہیے تھا کہ وہ" سب سے پہلے اسلام " یعنی نظریہ پاکستان کا نعرہ بلند کرکے عالم اسلام
اور صیہونی طاقتوں سے غیر جانبدارانہ باہمی مفاہمت اور بین الاقوامی تعاون کے ذریعے
اپنے تشخص اور قومی حیثیت کو برقرار رکھتے لیکن وہ براہ راست یہودیوں اور صیہونیوں
کی جارحیت کے علمبردار بن کر عالم اسلام کی نظروں میں گر گئے۔
وہ جنگ جو امریکہ کل تک افغانستان اور عراق میں لڑرہا تھا آج کمال مہارت سے اس
نے وہ جنگ پاکستان کے اندر شروع کرا رکھی ہے جس سے ہمارا اسلامی تشخص اور مقام
ہی متاثر نہیں ہو رہا بلکہ اس کا براہ راست اثر ہماری آزادی اور خود مختاری پر بھی پڑ رہا ہے
اور دشمن چاروں طرف سے منہ کھولے ہمیں نگلنے کیلئے تیار کھڑا ہے لہٰذا اس نازک
وقت میں ہمیں اسلام کی درخشاں تاریخ کی روشنی میں اپنے گھوڑے ہر لمحے تیار رکھنے
چاہیں۔
حقیقت یہ ہے کہ دشمن نے پاکستان کو کبھی معاف نہیں کیا اُس کا تو مقصد ہی

یہی تھا کہ پاکستان چند ماہ میں ختم ہو جائے لیکن وہ بابائے قوم قائدِ اعظم محمد علی جناح کے اِس قول اور حقیقت کو بھول گیا کہ "پاکستان خدا کی مرضی ہے اور یہ مرضی پوری ہو کر رہے گی پاکستان قیامت تک زندہ رہے گا۔" قائدِ اعظم کی اس بات کا ثبوت ہر سال لوٹ کر آنے والا ہمارا یوم آزادی ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ دشمن خواہ کچھ بھی کرلے مشیعت ایزدی یہ ہے کہ پاکستان ٹوٹنے کیلئے نہیں بلکہ دنیا کے نقشے پر قائم رہنے کیلئے بنا ہے۔

انشاء اللہ پاکستان قیامت تک زندہ وآباد اور قائم و دائم رہے گا، دشمن کی کوئی چال کوئی حربہ پاک سرزمین کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا، ہم کل بھی آزاد تھے، آج بھی آزاد ہیں اور اپنے رب کی عطا سے کل بھی آزاد رہیں گے، آج ہم اس پاک سرزمین کے مرغزاروں، ریگزاروں، اور آباد قصبوں اور شہروں میں اپنی آزاد فضاؤں کے ساتھ محو رقص ہیں، یہاں کی سرسبز و شاداب وادیاں ہمیں زندگی کے جبر سے بے خبر کئے ہوئے ہیں، جبکہ اس کے دامن میں جاری دریا اور اس کی تہوں میں چھپے خزانے ہماری توانائیوں کے جواب میں اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے کیلئے تیار ہیں، یہاں کے پہاڑوں کی بلندیاں اور سمندر کی وسعتیں ہماری ہمتوں کی آزمائش کیلئے محو انتظار ہیں، قدرت کی اَن گنت عطیات اس خطہ ارضی کے دامن میں پوشیدہ ہیں۔

لیکن افسوس کہ ہماری تمام توانائیاں سہل انگاری کی نظر ہو گئیں، ہماری خوابیدہ صلاحیتیں کسی معجزہ کے ظہور کا انتظار کر رہی ہیں، اب وقت آگیا ہے کہ ہم سہل انگاری کے فریب اور معجزوں کے انتظار کے سحر سے باہر نکلیں اور سوچیں کہ وہ کون سے دشمن ہیں جنہوں نے ہمیں 62 برس تک قیام کے پاکستان کی اصل منزل سے دور رکھا ہوا ہے، پاکستان ہمارے پاس اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امانت ہے، یہ امانت ہے اُن شہداء کی جنہوں نے اس کی بنیادیں اپنے گرم لہو سے اٹھائیں، یہ امانت ہے ہماری آئندہ نسلوں کی جنہیں کل اس کا پاسبان بننا ہے۔

یاد رکھیں کہ پاکستان ایک حقیقت ہے یہ عطیہ خداوندی ہے اس نعمت سے فیضیابی کیلئے ہمیں اپنے آپ کو پورے خلوص اور عزم صمیم کے ساتھ تیار کرنا ہوگا جس طرح ہمارے آباء واجداد نے اپنی انتھک محنت اور کامل جذبہ ایمان سے اسلام کے پیغام حق کو جزیرہ ہائے عرب کے ریگزاروں سے نکال کر دنیائے عالم کے گوشہ گوشہ تک پہنچایا تھا، آج ہمیں اُسی جذبہ اور ایمان کے ساتھ رخت سفر باندھنا ہوگا انشاءاللہ، اللہ تعالٰی کی طرف سے فتح و نصرت کے دروازے کھلتے جائیں گے اور گردوں سے آج بھی فرشتوں کا نزول قطار اندر قطار ہونا شروع ہو جائے گا، آیئے ہم سب مل کر اپنے بزرگوں کی اِس امانت کی حفاظت کریں، پاکستان کی نامکمل عمارت کی تعمیر کریں، اور اُس تصور پاکستان کی تکمیل کریں جس کی

تخریب ہمارے دشمنوں کا مقصد و مدعا ہے، آج تکمیل پاکستان کیلئے ہمیں وہی جذبے، وہی ولولے اور وہی قربانیاں دینا ہونگی جس کا نظارہ تشکیل پاکستان کے وقت ہمارے آباؤاجداد نے پیش کیا تھا، آیئے اِس قافلے کے ہم رکاب بن کر تکمیل پاکستان کی جد وجہد کا عملی حصہ بنیئے کیونکہ جسم و جاں پر صبح آزادی کا قرض ابھی باقی ہے۔

لہو برسا، بہے آنسو، لٹے رہرو، کٹے رشتے
ابھی تک نامکمل ہے مگر تعبیر آزادی

قافلہ راہ حق میں جس کا نام لکھا گیا

قافلہ راہ حق میں جس کا نام لکھا گیا

شہید کی جو موت ہے۔۔۔۔۔

تازہ ترین اطلاعات کے مطابق مالا کنڈ سے نقل مکانی کرنے والے متاثرین کی اپنے گھروں کو واپسی شروع ہو چکی ہے، اس سے قبل چارسدہ، مردان، صوابی، نوشہرہ اور نواحی علاقوں کے کیمپوں میں مقیم متاثرین بونیر اور سوات کے مختلف علاقوں میں اپنے گھروں کو روانہ ہو چکے ہیں، بھاری تعداد میں متاثرین کی واپسی کے بعد مینگورہ میں بھی زندگی کی رونقیں بحال ہو رہی ہیں اور اب بیشتر بازاروں میں گہما گہمی نظر آنے لگی ہے، مختلف نوعیت کے کاروبار سے وابستہ افراد پھر سے اپنے کاروبار میں مصروف دکھائی دینے لگے ہیں۔

دوسری طرف اسکولوں میں مقیم پناہ گزینوں کی اپنے علاقوں کی طرف روانگی بھی شروع ہو چکی ہے اور اگلے مرحلے میں رشتہ داروں کے ہاں یا کرائے کے مکانات میں رہائش پذیر متاثرین کی واپسی ہو گئی، مندرجہ بالا صورتحال سے ظاہر ہوتا

ہے کہ عسکریت پسندوں کے خلاف آپریشن سے متعلق معاملات درست سمت میں آگے
بڑھ رہے ہیں جو کہ ایک خوش آئند بات ہے، لیکن اس سارے معاملے میں ایک پہلو
دکھ کا بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس آپریشن کے دوران ہماری مسلح افواج کے ان متعدد
اعلیٰ افسروں اور جوانوں کی شہادت ہے۔

جنھوں نے اس نیک مقصد کیلئے اپنی جانیں قربان کرکے قوم کو ان دہشت گردوں سے
بچانے میں کلیدی کردار ادا کیا، جنھوں نے عوام کی زندگی ہی اجیرن نہیں بنائی تھی بلکہ وہ
اس قدر طاقتور اور خود سر بھی ہوگئے تھے کہ حکومت کو بلیک میل کرتے اور معاہدوں کو
کاغذ کے ٹکڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔

ظاہر ہے ان حالات میں حکومت کے پاس ایک ہی راستہ بچا تھا کہ یہ علاقے یا تو ملک
دشمن عسکریت پسندوں کے حوالے کردیتی یا پھر ان کے خلاف بھرپور فوجی کاروائی
کرتی، چنانچہ ان حالات میں آپریشن ایک ناگزیر عمل تھا، جو پاک آرمی نے اپنے
جوانوں کی شہادت اور عوام کی مدد سے ممکن بنایا، سوات اور بونیر میں آپریشن کی
کامیابی کے بعد امید ہو چلی ہے کہ وہ علاقے بھی جلد عسکریت پسندوں سے خالی کرالیے
جائیں گے جہاں عسکریت پسند جا چھپے ہیں اور ان علاقوں کے مکین بھی جلد ہی اپنے
گھروں کو لوٹ سکیں گے۔

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ کل تک جو علاقے شورش زدہ اور دہشت گردوں کے کنٹرول میں تھے، آج پرامن اور عسکریت پسندوں سے مکمل طور پر صاف ہو چکے ہیں، ان علاقوں سے دہشت گردوں اور عسکریت پسندوں کا خاتمہ، امن و امان کی بہتری، حکومتی رٹ کا قیام اور متاثرین مالاکنڈ، بونیر اور سوات کی اپنے گھروں کو واپسی کا کریڈٹ بلاشبہ پاکستان کی مسلح افواج کو جاتا ہے۔

جس کی بروقت، بھرپور اور منظم کاروائی کے نتیجے میں شورش زدہ علاقوں سے عسکریت پسندوں کا خاتمہ ممکن ہوا، اور حکومتی رٹ بحال ہوئی، کل تک یہی علاقے دہشت گردوں اور عسکریت پسندوں کا مضبوط گڑھ قرار دیئے جاتے تھے اور عسکریت پسندوں کے نام نہاد اسلام کے نام پر قتل و غارت گری اور لوٹ مار کے سلسلے نے ہزاروں افراد کو نقل مکانی پر مجبور اور ریاست کے اندر ریاست کے قیام نے حکومتی رٹ کو بھی چیلنج کیا ہوا تھا۔

لیکن پاکستان آرمی نے ان علاقوں کو عسکریت پسندوں سے خالی کرا کر جو کامیابی حاصل کی ہے، وہ بلاشبہ عسکریت پسندوں کے خلاف پاک فوج کی بہترین حکمت عملی اور اعلیٰ مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے، جس کو پاک فوج کے افسروں اور جوانوں نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرکے ممکن بنایا، تب کہیں جا کر نقل مکانی کرنے والوں کی اپنے گھروں کو واپسی ممکن ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ ملک دشمن دہشت گردوں اور عسکریت پسندوں کے خلاف اس آپریشن میں پاک فوج کے بہت سے اعلیٰ افسروں اور سپاہیوں نے جام شہادت نوش کیا، جن کا تذکرہ وقتاً فوقتاً قومی اخبارات و میڈیا میں آتا رہا ہے، وطن عزیز کی حفاظت میں اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرنے والے ان مجاہدین کی طویل فہرست میں سپاہی ملک آصف نواز شہید جو ہمارے عزیز دوست ملک زاہد اعوان کے کزن تھے، کا نام بھی شامل ہے، جو سوات میں عسکریت پسندوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔

ملک آصف نواز 1982 میں صوبیدار میجر (ر) ملک نواز کے گھر پیدا ہوئے، ان کا تعلق ضلع تحصیل ایبٹ آباد کے ایک گاوں "کاکوٹ" سے تھا، والد، چچا اور دیگر خاندان کے افراد کا تعلق فوج سے ہونے کی وجہ سے انہیں بھی بچپن ہی سے فوج میں جانے کا شوق تھا، ملک آصف نواز شہید سات بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔

انہوں نے دینی تعلیم گاوں کے مدرسے میں حاصل کی اور میٹرک کرنے کے بعد 2000ء میں پاکستان آرمی جوائن کی، شہادت کے وقت وہ ایس ایس جی یونٹ ون کمال کمپنی)" میں بطور سپاہی خدمات انجام دے رہے تھے، وہ 11 اور 12 مئی کی درمیانی شب اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ تحریک طالبان سوات کے سربراہ فضل

اللہ اور اس کے ساتھیوں کا پیچھا کرتے ہوئے اپنے 23 ساتھیوں کے ساتھ شہید ہو گئے۔

وطن کی مٹی سے محبت کرنے والے ملک آصف نواز ایک بہادر اور نڈر سپاہی تھے۔ شہادت کی رات وہ نہایت ہی بے جگری سے دشمن سے برسرپیکار تھے اور اپنے کمپنی کمانڈر کے ساتھ بھاگتے ہوئے عسکریت پسندوں کا پیچھا کر رہے تھے۔ ایک موقع پر جب عسکریت پسندوں کی جوابی گولی سے ان کا کمپنی کمانڈر زخمی ہو گیا تو ملک آصف نواز نے فوراً ہی اپنے زخمی کمپنی کمانڈر کو اپنے کاندھوں پر اٹھایا اور دشوار گزار راستوں سے ہوتے ہوئے کیمپ پہنچے۔

کمپنی کمانڈر کو بحفاظت کیمپ پہنچا کر جب وہ دوبارہ عسکریت پسندوں کے پیچھے روانہ ہونے لگے تو ساتھیوں نے ان کو بہت منع کیا لیکن اس وقت ملک آصف نواز پر عسکریت پسندوں کو کچل دینے کا جنون سوار تھا۔ اس معرکے میں ان کے ہاتھوں چھ عسکریت پسند بھی مارے گئے اور وہ خود بھی اپنے 23 ساتھیوں کے ساتھ جام شہادت نوش کر گئے۔ ان کے سینے پر دو اور ماتھے پر ایک گولی لگی تھی۔

شہید ملک آصف نواز بہت رحم دل، ہر دلعزیز اور دوست نواز شخصیت تھے۔ وہ ایک صالح اور دیندار اور عبادت گزار نوجوان تھے۔ وہ اپنے دوستوں میں بے انتہا

مقبول تھے، دو سال قبل ہی ان کی شادی ہوئی تھی اور کچھ عرصہ بعد ان کے یہاں بچے کی ولادت متوقع ہے، اپنی شہادت سے چھ دن قبل رخصت ہوتے وقت، انھوں نے اپنی بیوی، والدہ اور دیگر عزیز و اقارب سے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہوسکتا ہے یہ میری آخری ملاقات ہو، آپ لوگ میری تمام غلطیاں اور خطائیں معاف کردینا میں چاہتا ہوں کہ میرا ہونے والا بیٹا بھی اپنے باپ دادا اور دیگر رشتہ داروں کی طرح فوج میں جائے اور دفاع وطن کا فریضہ سرانجام دے۔

شہید کے والد ملک نواز اور شہید کی والدہ کو اپنے بیٹے کی شہادت پر بہت فخر ہے، ان کا کہنا ہے کہ وطن عزیز کے دفاع کیلئے ہمارے بیٹے نے بہادروں کی طرح سینے پر گولیاں کھا کر ہمارا سر فخر سے بلند کردیا ہے اور اس شہادت نے ہمیں بھی شہداء کے والدین کی ہم رکابی کا شرف بخشا ہے۔

ہم شہید کے والدین کے جذبات کی قدر کرتے ہیں اور ان تمام عظیم والدین اور بالخصوص ماؤں کو مبارکباد پیش کرتے ہیں جن کے جگر گوشوں کی قربانیاں پاکستان کی سالمیت، تحفظ، بقاء اور آزادی کی ضامن ہیں، یہی لوگ ملک و قوم کے ماتھے کا جھومر اور درخشندہ ستارے ہیں، شاعر نے کیا خوب کہا ہے

شہید کی موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کی مسلح افواج صرف سرحدوں پر دشمن سے ملک کی حفاظت ہی نہیں کرتی بلکہ ملک کے اندر بھی پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کی محافظ اور پاکستانی عوام کی جان و مال اور عزت وآبرو کی حفاظت بھی کرتی ہے، ہم ملک آصف نواز شہید سمیت دفاع وطن کیلئے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرنے والے تمام شہداء کی عظمت کو سلام کرتے ہیں اور انہیں دل کی گہرائیوں سے خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

پھر ایک جواں نے گواہی دے کر، فسانہ عشق مومناں میں
جو سرخ سا رنگ بھر دیا ہے، زمیں کو سیراب کر دیا ہے
شہید آصف تیرے لہو سے افق پہ لالی سے ی چھا گئی ہے
مایوس، ڈرے، خوفزدہ چہروں پہ اک مسکراہٹ سی آ گئی ہے

امریکی سرپرستی میں بھارت کا علاقائی بالادستی کا خواب

بھارت امریکہ دفاعی معاہدہ .... بھارت کے جارحانہ عزائم اور پاکستان دشمنی کا مظہر ہے

گزشتہ دنوں بھارت نے اپنی پہلی ایٹمی آبدوز "آئی این ایس اریہانت" سمندر میں اتار دی جو کہ جوہری میزائلوں سے لیس اور 80 میگا واٹ کے جوہری ری ایکٹر سے چلتی ہے اور سمندر کی گہرائیوں سے اپنے حدف پر نشانہ لینے کی جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ ہے، اس آبدوز کی خوبی یہ ہے کہ سمندر کی اوپری سطح سے زیر سمندر جانے کی تیز رفتار صلاحیت رکھتی ہے، بھارت کی یہ ایٹمی آبدوز دو برس تک سمندر میں مختلف تجرباتی مراحل سے گزرے گی اور 2011ء میں اسے باضابطہ طور پر بھارتی بحریہ میں شامل کیا جائے گا۔

اطلاعات کے مطابق اسی طرح کی دو اور جوہری آبدوزیں بھارت 2015ء تک تیار کرنے کا منصوبہ رکھتا ہے، یہ آبدوز جوہری میزائل سے حملہ اور جوابی حملہ کرنے والی روسی آبدوز" چارلی -1" کی ساخت پر بنائی گئی ہے، اس کی چوڑائی 11 میٹر، لمبائی 110 میٹر اور وزن 6 ہزار ٹن ہے جبکہ اس کی رفتار پچپن کلو میٹر فی گھنٹہ ہے، اس آبدوز سے سو میٹر کی گہرائی سے میزائل فائر کیے جا

سکتے ہیں۔

اریہنت پانی کے نیچے سو سے زیادہ دنوں تک رہ سکتی ہے اور اسے پیغام رسانی کے لیے بھی پانی کی اوپری سطح پر بھی نہیں آنا پڑے گا، اس آبدوز کے سمندر میں اترنے سے بھارت امریکہ، برطانیہ، فرانس، چین اور روس کے بعد دنیا کا چھٹا ملک بن گیا ہے جس کے پاس جوہری توانائی کی ٹیکنالوجی سے چلنے والی ایٹمی آبدوز ہیں۔

واضح رہے کہ یہ جوہری آبدوز ایک ایسے وقت میں بھارتی بحریہ کے حوالے کی گئی ہے جب کارگل جنگ کو دس سال کا عرصہ مکمل ہوگیا ہے، ایک روسی خبر رساں ادارے کے مطابق بھارتی بحریہ 10 سالہ لیز پر آبدوز آئی این ایس چکرہ بھی 65 کروڑ امریکی ڈالرز کے خفیہ معاہدے کے تحت حاصل کرنے جارہی ہے، خاموشی سے طے پانے والے بھارت روس معاہدہ کے تحت رواں سال دسمبر تک فراہم کی جائیگی جواِس وقت بحر الکاہل میں تجرباتی و آزمائشی مرحلے سے گزر رہی ہے۔

پاک بحریہ کے ایک ریٹائرڈ آفیسر کے مطابق بھارتی بحریہ کے پاس موجود جوہری آبدوزیں جو کہ دو سے تین ماہ تک پانی میں رہنے اور روایتی ہتھیاروں کیساتھ ساتھ ایٹمی ہتھیاروں کی صلاحیت کی حامل ہے، پر نصب ایٹمی وار ہیڈز سے

پاکستان کیلئے بحر ہند سے مزید دباؤ بڑھے گا اور بھارتی بحریہ کو متحرک سمندری پلیٹ فارم کے ذریعے گوادر اور صوبہ سندھ کے اندرونی شہروں تک میزائل داغنے کی صلاحیت حاصل ہو جائیگی۔

ایٹمی آبدوز کے سمندر میں اتارے جانے کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے بھارتی وزیر اعظم ڈاکٹر من موہن سنگھ نے کہا کہ بھارت کسی ملک کیخلاف جارحانہ عزائم نہیں رکھتا اور نہ ہی وہ کسی کیلئے خطرے کا باعث ہے، من موہن سنگھ کا یہ بھی کہنا تھا کہ بھارت اپنے دفاع کو مضبوط بنانے کے لئے ہر ممکن اقدامات کرے گا، انہوں نے کہا کہ سمندر کسی بھی ملک کی سلامتی کے لئے اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور بھارت اس ضمن میں اپنی دفاعی صلاحیتوں کو از سر نو مرتب کر رہا ہے۔

ایک طرف بھارت روز بروز اپنی دفاعی صلاحیتوں میں اضافہ کررہا ہے تو دوسری جانب حقیقت یہ ہے کہ خود کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت اور سیکولر ریاست کہنے والی ہندو اسٹیٹ بھارت، منہ میں رام رام اور بغل میں چھری لیے پڑوسی ممالک بالخصوص پاکستان کو عدم استحکام کا شکار کرنے کی کوشش میں بھی مبتلا ہے، گو کہ بھارت سفارتکاری کے محاذ پر ہمیشہ سے خطے میں امن اور استحکام کی بات کرتا ہے لیکن دوسری جانب اپنے دفاع کے حوالے سے اتنا حساس واقع ہوا ہے

کہ اس نے اپنے سالانہ جنگی بجٹ کی مد میں 34 فیصد اضافہ کر دیا ہے جبکہ ایٹمی
ہتھیاروں کیلئے مختص رقم میں اضافہ اس کے علاوہ ہے۔
دفاعی بجٹ میں مجوزہ اضافہ بلاشبہ بھارت کے گھناؤنے عزائم کی نشاندہی کرتا ہے،
بھارت دنیا کا ایک ایسا ملک ہے جس کے غریب عوام زندگی کی بنیادی سہولیات سے بھی
محروم ہیں، اس کے باوجود بھارت عوام کی فلاح و بہبود اور اس کے معیار زندگی کو بلند
کرنے کیلئے کوئی اقدامات کرنے کے بجائے بھارتی حکومت اپنے بجٹ کا ایک بہت بڑا
حصہ دفاع اور اسلحہ کی خریداری اور ایٹمی توانائی کے حصول پر خرچ کر رہی ہے، بھارت کا
یہ اقدام اس کے جنگی جنون اور خطے کو عدم استحکام سے دوچار کرنے کے مترادف ہے۔
گزشتہ دنوں بھارت نے اپنے بجٹ میں سرحدوں سے دراندازی روکنے کیلئے بارڈر پر
باڑ لگانے اور دیگر سیکیورٹی انتظامات کی مد میں اپنے جنگی بجٹ میں 34 فیصد اضافہ
کیا، بھارت دراصل دفاعی بجٹ میں اضافے کی آڑ میں اضافہ کردہ رقوم پڑوسی ممالک
میں مختلف تخریبی کارروائیوں کے ذریعے انتشار پیدا کرنے کیلئے استعمال کرتا ہے، گزشتہ
سال بھارت کا دفاعی بجٹ دس کھرب 56 ارب روپے تھا، جس میں آئندہ مالی سال
کے دوران تین کھرب 69 ارب روپے تیس کروڑ سے زائد کا اضافہ کیا گیا ہے، جبکہ
ایٹمی ہتھیاروں کیلئے مختص رقم میں 55 فیصد اضافہ

الگ ہوا ہے۔

جبکہ اس کے مقابلے میں پاکستان کا مالی سال 2009-10ء کیلئے دفاعی بجٹ 343 ارب روپے ہے، اس لحاظ سے بھارت کا دفاعی بجٹ پاکستان کے مقابلے میں 7 گنا زیادہ ہے، اگر پاک بھارت دفاعی بجٹ کا موازنہ پاکستان کے دفاعی بجٹ سے کیا جائے تو پاکستان کے دفاعی بجٹ میں کبھی بھی اس رفتار سے اضافہ نہیں ہوا جس رفتار سے بھارت کے دفاعی بجٹ میں اضافہ ہوتا ہے، اس لحاظ سے بھارت کی جانب سے اس کے دفاعی بجٹ میں اندھا دھند اضافہ اس کے گھناؤنے عزائم کی نشاندہی کرتا ہے۔

یہاں یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ افغانستان میں قائم کردہ بھارتی سفارتخانے پاکستان کے اندر دہشت گردی اور تخریبی کارروائیوں میں براہ راست ملوث ہیں اور بھارت دیگر پاکستان دشمن طاقتوں کے ساتھ مل کر "خاکم بدہن "پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی سازش پر عمل پیرا ہے، دوسری طرف بھارت نے اپنی جنگی صلاحیت میں اضافے کیلئے امریکہ سے ایک دفاعی معاہدہ بھی کیا ہے۔

امریکی وزیر خارجہ کے دورہ بھارت کے موقع پر ہونے والے اس دفاعی معاہدے کے تحت امریکہ بھارت کی فوج کو جدید امریکی اسلحہ سے لیس کرنے کیلئے جدید ترین

ٹیکنالوجی، ہتھیار اور ایٹمی پرزے، 126 لڑاکا طیارے، سیٹلائٹ اور دو ایٹمی ری ایکٹر بھی فراہم کرے گا۔ اس دفاعی معاہدے کا ذکر کرتے ہوئے امریکی وزیر خارجہ نے کہا تھا کہ بھارت امریکہ کا مضبوط ترین دفاعی حلیف ہے اور دونوں ملک باہمی اقدامات پر عملدرآمد یقینی بنائیں گے۔ دفاعی تجزیہ نگاروں کے اندازوں کے مطابق امریکی کمپنیاں بھارت کو دس ارب کی دفاعی اشیاء بھی برآمد کرسکیں گی۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ دورہ بھارت کے دوران ہیلری کلنٹن نے ایک طرف تو نائن الیون کے ملزموں کی پاکستان میں موجودگی کا بیان دیکر نئی امریکی حکمت عملی اور مخاصمانہ عزائم کو ظاہر کیا تو دوسری طرف بھارت کو جدید ترین امریکی اسلحہ فراہم کرنے کے معاہدے پر دستخط کرکے امریکہ نے عملاً بھارت کو خطے کی بالادست فوجی قوت بنانے کے اس منصوبے کی ابتداء کی ہے، جس کی داغ بیل کلنٹن اور بش کے دور میں ڈالی گئی تھی اور جس کا مقصد پاکستان کی صورت میں موجود راستے کی اہم ترین رکاوٹ کو دور کر کے بھارت کو چین کے مدمقابل کھڑا کرنا، اسے سلامتی کونسل کا رکن بنانا اور خطے میں امریکی مفادات کی نگہبانی کا فرض سونپنا ہے۔

اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ چین کی بڑھتی ہوئی اقتصادی و فوجی طاقت سے امریکہ و

یورپ دونوں ہی پریشان ہیں اور وہ اس کے گھیراؤ کیلئے بھارت کی مدد چاہتے ہیں، جبکہ پس پردہ بھارت کے اپنے مکروہ عزائم ہیں جس کے تحت وہ امریکہ و یورپ کے سامنے چین کا ہوا کھڑا کرکے خود علاقے کا چوہدری بننے کیلئے کوشاں ہے، کل تک اس نے اس مقصد کیلئے روس کو بے وقوف بنایا تھا اور آج وہ امریکہ کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کر رہا ہے، دراصل بھارت کی اصل تکلیف پاکستان ہے جس نے ایٹمی صلاحیت اور میزائل ٹیکنالوجی میں خود کفالت حاصل کرکے بھارت کے جارحانہ اور توسیع پسندانہ عزائم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کھڑی کردی ہے۔

دوسری طرف امریکہ اپنے اسلام دشمن کروسیڈی ایجنڈے کی تکمیل کیلئے بھارت کے موقف اور تعاون کو خوشدلی سے قبول کر رہا ہے، گزشتہ دنوں ہونے والے بھارت امریکہ دفاعی معاہدے کو اگرچہ بھارت چین کے حوالے سے پیشرفت قرار دیکر فوجی تعاون کے اصل مقاصد اور ممکنہ نتائج پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بھارت کبھی بھی چین کیخلاف جارحیت کی جرات نہیں کر سکتا، کیونکہ دنیا جانتی ہے کہ چین ایک طاقتور مگر پرامن ملک ہے اور اس کے اپنے کوئی جارحانہ عزائم نہیں ہیں، اسکے باوجود بھارت کی آنکھوں میں اگر کوئی پڑوسی ملک کھٹکتا ہے تو وہ صرف پاکستان ہے۔

گویا دفاعی اعتبار سے بھارت کا کوئی بھی قدم پاکستان کیلئے خطرے سے خالی نہیں ہے،
حقیقت یہ ہے کہ بھارت ہمارا ایسا کھلا دشمن ہے جس کے جارحانہ اور توسیع پسندانہ
عزائم کے خلاف ہمیں ہمہ وقت ہوشیار اور ہمیشہ تیار رہنے کی ضرورت ہے، اس تناظر
میں درحقیقت یہ معاہدہ سو فیصدی پاکستان کیخلاف، بھارت کے جارحانہ عزائم کا عکاس
اور خطے میں امریکہ کی پاکستان مخالف حکمت عملی کا بھی مظہر ہے، جس کا احساس ہمارے
حکمرانوں اور فوجی قیادت کیلئے ضروری ہے۔

یہ درست ہے کہ امریکہ اور بھارت کی سٹرٹیجک پارٹنرشپ کو پاکستانی حکمرانوں نے
ہمیشہ نظرانداز کیا ہے اور اپنے عوام کو یہ کہہ کر گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ امریکہ
پاکستان کا قابلِ اعتماد دوست ہے، البتہ وہ بھارت سے بھی خوشگوار تعلقات برقرار رکھنا
چاہتا ہے، لیکن بش دور میں امریکہ کی طرف سے بھارت کیساتھ سول ایٹمی تعاون کا
معاہدہ اور اوباما کے دور میں ممبئی حملوں کے ملزموں کے حوالے سے پاکستان پر بے جا
دباؤ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ امریکہ دراصل پاکستان کا کبھی بھی
دوست نہیں رہا، وہ پاکستان کا نہیں بلکہ بھارت کا دوست ہے اور اس نے ہمیشہ پاکستان کو
اپنے مقاصد کیلئے استعمال کیا ہے۔

لیکن اس کھلی حقیقت کے باوجود آج بھی ہمارے حکمرانوں کو بھارت سے کوئی خطرہ

نظر نہیں آتا، جبکہ دہشت گری کے خلاف جنگ میں پاکستان کو اپنا فرنٹ لائن اتحادی کہنے والا امریکہ اپنے مفادات کیلئے دوستی کا دم پاکستان سے بھرتا ہے، مگر درپردہ اور ظاہراً وہ بھارت سے محبت کی پینگیں بڑھاتا رہا ہے، جس کا اظہار اس کے بھارت کے ساتھ حالیہ دفاعی معاہدے سے بھی ہو رہا ہے۔

درحقیقت یہ امریکہ کا وہ کھلا تضاد اور دوہرا معیار ہے جس پر ہمارے ارباب اقتدار کو ہوش کے ناخن لینے کی ضرورت ہے، ہمارے بار بار احتجاج کے باوجود امریکہ نے پاکستانی حدود میں ڈرون حملوں کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے اور ہمارے مطالبے کے باوجود امریکہ ڈرون طیاروں کی ٹیکنالوجی کی منتقلی پر آمادہ نہیں، اس صورتحال میں کہ پاکستان نے امریکی خوشنودی کیلئے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکی مفادات کیلئے اپنی سالمیت تک داؤ پہ لگا دی ہے اور معیشت کو تباہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس جنگ کے نتیجے میں اب تک 40 ارب ڈالر سے زائد کا نقصان بھی اٹھا چکا، جبکہ ڈرون حملوں اور فوجی آپریشن کے نتیجے میں ہمارے ہزاروں بے گناہ شہری اور جوان بھی اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر چکے ہیں۔

مگر اس قدر بڑے پیمانے پر جانی اور مالی نقصان اٹھانے کے بعد بھی امریکی نوازشات کا جھکاؤ ہمارے ازلی دشمن بھارت کی طرف ہے جو کہ ہماری حکومت کیلئے

یہ لمحہ فکریہ ہے۔ رہ گئی امریکی دوستی کی بات تو یہ حقیقت ہے کہ امریکہ کی دوستی کبھی آڑے وقت میں پاکستان کے کام نہیں آئی ہے۔ گزشتہ ساٹھ سالہ امریکی طرز عمل اس بات کا عملی گواہ ہے کہ ہر مشکل وقت میں امریکہ نے پاکستان کو سوائے دھوکے دینے کے اور کچھ نہیں دیا۔

اس وقت پاکستان بے شمار اندرونی اور بیرونی مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ ایک طرف اقتدار کی کشمکش جاری ہے تو دوسری جانب مہنگائی، بے روزگاری، پانی و بجلی کا بحران اور اداروں کی توڑ پھوڑ کے باعث سیاست، معیشت اور انتظامی ڈھانچے سمیت معاشرے کا کوئی شعبہ بھی مستحکم نظر نہیں آتا۔ ہم بے شمار گمبھیر مسائل سے نمٹنے میں بری طرح الجھے ہوئے ہیں، ادھر ہمارا دشمن بھارت ہمیں ہر محاذ پر نیچا دکھانے اور بیرونی طاقتوں کی مدد سے خطے میں اپنی بالادستی قائم کرنے میں لگا ہوا ہے۔ اس وقت اس کی توجہ کا مرکز توانائی ہے جس کے حصول کی خاطر جہاں وہ ہمیں آبی ذخائر سے محروم کر کے ڈیم بنانے اور بجلی پیدا کرنے میں مصروف ہے وہیں وہ ایٹمی توانائی کے حصول اور اس کے استعمال سے بھی غافل نہیں ہے۔

بھارت نے ایٹمی آبدوز تیار کر کے خطے میں ایٹمی اسلحے کی نئی دوڑ شروع کی ہے جس میں پاکستان کا شامل ہونا ایک لازمی امر ہے۔ بحرہ ہند میں بھارت کی

ایٹمی آبدوز کے آنے کے بعد یہ کیسے ممکن ہے کہ پاکستان اپنے دفاع سے غافل رہے،
چنانچہ ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے امریکہ کا موجودہ رویہ اس کے مستقبل کے عزائم
اور منصوبہ بندی کو واضح اور اس بات کا متقاضی ہے کہ اپنے دشمن اول بھارت کے
قریبی دوست اور خیر خواہ امریکہ کے ایسے اقدامات کو نظرانداز کرنے کا مطلب اپنی
سلامتی، خود مختاری، آزادی، سالمیت اور بقاء کو جان بوجھ کر خطرے میں ڈالنا ہے۔
لہٰذا اپنی دفاعی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہوئے امریکہ کے اس غیر دوستانہ بلکہ پاکستان دشمنی
پر مبنی اقدام کو کسی طور برداشت نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ یہ بات امریکی انتظامیہ بھی
اچھی طرح جانتی ہے کہ بھارت کی ایٹمی صلاحیت اور جنگی تیاریاں صرف پاکستان کے
خلاف ہیں، اس کے باوجود پاکستان کو نظرانداز کرکے بھارت کو طاقتور بنانے کی امریکی
پالیسی واضح طور پر پاکستان دشمنی کے مترادف ہے۔

اس صورتحال میں ہماری حکومت کو بھی اپنے یکطرفہ تعاون سے ہاتھ اٹھاتے ہوئے اپنی
پالیسی پر نظرثانی کی ضرورت ہے، ہم اپنے ارباب اقتدار سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ
دھوکہ باز امریکہ پر تکیہ کرنے اور معیشت سنبھالنے کے لیے غیروں کے سامنے کشکول
گدائی پھیلانے کے بجائے اپنے زور بازو پر بھروسہ کرے، یاد

رہے کہ پاکستان کی سلامتی، آزادی، خودمختاری، استحکام اور عزت و وقار کے ساتھ ہی قومی سلامتی یکجہتی ، عزت و وقار اور آن بان شان وابستہ ہے۔

جیسی عوام ویسے حکمران

عوام ..... حکمرانوں کے افعال و اعمال کا عکس ہوتے ہیں

عام طور پر مشہور ہے کہ جیسی عوام ہوتی ہیں ویسے حکمران مسلط کر دیئے جاتے ہیں، عوام اگر اچھے، نیک، ایماندار اور صاحب کردار ہوں، تو حکمران بھی نیک، ایماندار اور صاحب کردار ہوتے ہیں، عوام اگر بد عنوان، نافرمان اور بد کردار ہوں، تو انہیں حکمران بھی ایسے ہی ملتے ہیں، گویا حکمران عوام کے افعال و اعمال کا عکس ہوتے ہیں، عوام اچھے تو حکمران اچھے، عوام خراب تو حکمران بھی خراب، ممکن ہے یہ اصول و قاعدہ سو فیصد صحیح اور درست ہو، لیکن ہم جاننا چاہتے ہیں کہ کیا طاقت، ظلم اور جبر کے دور حکومت میں بھی یہی اصول و قاعدہ صادق آتا ہے اور کیا ظلم و جبر کے بوجھ تلے دبے عوام جو کہ اپنے حکمرانوں سے شدید غصے، نفرت اور بیزاری کے جذبات رکھتے ہیں اور انہیں کسی طور بھی دل سے پسند نہیں کرتے ہوں، وہ بھی اس زمرے میں آتے ہیں، اب اس بات کا بہتر فیصلہ تو اہل علم و دانش ہی کریں گے اور وہی بتا سکتے ہیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی عوام کی مرضی، خواہشات اور امنگوں کے خلاف حکمران ان پر کیوں مسلط ہو جاتے ہیں، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ "جیسے عوام ویسے حکمران" کے بجائے

جیسے حکمران ویسے عوام" کا کلیہ بھی ہونا چاہیے اور ہمارا ماننا ہے کہ "عوام حکمرانوں کے افعال و اعمال کا عکس ہوتے ہیں۔" آیئے آج ذرا معمول سے ہٹ کر اس پہلو پر غور کرنے کیلئے تاریخ کے اوراق پلٹتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دور خلافت ہے، مسجد نبوی میں دربار خلافت لگا ہوا ہے جس میں خلیفۃ المسلمین سیدنا عمر فاروق اور داماد رسول سیدنا علی المرتضیٰ دیگر صحابہ کرام کے ساتھ وہاں موجود ہیں، اتنے میں مصر کے محاذ سے لشکر اسلام کے سپہ سالار کا قاصد مال غنیمت کے ساتھ ایک رقعہ امیر المومنین کی خدمت میں لے کر حاضر ہوتا ہے اور مال غنیمت کے ساتھ رقعہ امیر المومنین کی خدمت میں پیش کرتا ہے،

سیدنا عمر فاروق قاصد سے خط لے کر پڑھنا شروع کرتے ہیں، جس میں اسلامی لشکر کے سپہ سالار نے اپنے سپاہیوں کو ہدیہ تہنیت پیش کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "امیر المومنین۔۔۔۔ الحمد للہ میرے سپاہی اتنے دیانتدار، ذمہ دار، فرض شناس اور خداترس ہیں کہ دوران جنگ اگر کسی مجاہد کو معمولی سی سوئی بھی ہاتھ لگی تو وہ بھی اس نے میرے پاس جمع کرائی ہے اور اگر کسی مجاہد کو اشرفیوں کی تھیلی یا سونے کی ڈلی بھی ملی تو وہ بھی اس نے اپنے پاس رکھنے کے بجائے مجھ تک پہنچائی ہے۔"

سیدنا عمر فاروق جیسے جیسے خط پڑھتے جاتے آپ کی آنکھوں سے آنسو چھلکتے جاتے، یہاں تک کہ چہرہ مبارک آنسوؤں سے تر ہو جاتا ہے، سیدنا علی المرتضی یہ صورتحال دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ محاذ جنگ سے شاید کوئی بری خبر آئی ہے جس نے امیر المومنین کو پریشان اور دکھی کر دیا ہے، آپ بے چینی اور اضطراب کے عالم میں امیر المومنین سیدنا عمر فاروق سے دریافت فرماتے ہیں ،یا امیر المومنین ۔۔۔۔
خیریت تو ہے آپ کیوں رو رہے ہیں، سیدنا عمر فاروق حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی فکر مندی دیکھ کر فرماتے ہیں، "اے میرے بھائی یہ خوشی کے آنسو ہیں" یہ کہہ کر آپ وہ خط حضرت علی کو دے دیتے ہیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ ساری صورتحال جاننے کے بعد علم وحکمت پر مبنی وہ ایمان افروز تبصرہ ارشاد فرماتے ہیں جو رہتی دنیا تک ایک ایماندار اور صاحب کردار حکمران اور اس کی انتظامیہ کی پہچان اور شناخت قرار پاتا ہے۔
سیدنا علی فرماتے ہیں، امیر المومنین۔۔۔۔ "یہ اسلامی فوج کے سپاہیوں کی دیانت اور امانت نہیں بلکہ آپ کے عدل و کردار کا کمال ہے، اگر آپ فرض شناس، امین، عادل اور خدا ترس نہ ہوتے تو آپ کے سپاہی کبھی بھی ان اوصاف کا مظاہرہ نہ کرتے اور سپاہیوں میں یہ وصف کبھی پیدا نہ ہوتا۔" باب العلم سیدنا علی المرتضی کا علم و حکمت بھرا یہ تبصرہ کہ " جب تک اعلیٰ سطحی

حکومتی و سیاسی قیادت ان اوصاف کی حامل نہ ہو، رعایا اور دیگر ارکان ریاست کبھی بھی ذمہ دار اور فرض شناس نہیں ہو سکتے" سربراہ مملکت اور ارکان ریاست کے حوالے سے جامع اور مکمل ہے، آج ہمیں اس اصول و قاعدے کی روشنی میں ہمیں اپنا کوئی حکمران اور اس کے معاونین کی انتظامی ٹیم پوری اترتی دکھائی نہیں دیتی ہے۔

عربی کا مقولہ ہے کہ "الناس علیٰ دین ملوکھم" کہ لوگ اپنے حکمرانوں کے دین پر (پیرو کار) ہوتے ہیں، یعنی جیسا حکمران ہوتا ہے، ویسی ہی اس کی رعایا ہوتی ہے، مثال کے طور پر حجاج بن یوسف کا دور قتل و غارت گری اور فتنہ کا دور تھا، اس دور میں کتنے ہی لوگ جیلوں میں ٹھونسے گئے، لاتعداد قتل کئے گئے، تاریخ بتاتی ہے کہ اس دور میں لوگ صبح اٹھ کر اس قسم کی گفتگو کیا کرتے تھے "کل کس کو قتل کیا گیا، کون سولی پر چڑھایا گیا اور کس کو کوڑے مارے گئے۔" اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کو عمارتیں بنوانے اور کارخانے لگوانے کا شوق تھا، لوگ اس دور میں ایک دوسرے سے عمارتیں بنانے، کارخانے لگانے، نہریں کھودنے اور شجر کاری کے بارے میں باتیں کرتے تھے، اس کے بعد سلیمان بن عبدالملک کا دور آیا، وہ کھانے پینے کا شوقین تھا، گانے بجانے سے دل لبھاتا تھا، اس دور میں لوگ انواع و اقسام کے کھانوں کی بات کرتے، مغنیات اور لونڈیوں کا ذکر ہوتا اور محفل و مجالیس میں شادی بیاہ کی

تقریبات اور رقص و سرور کا تذکرہ رہتا تھا، جب حضرت عمر بن عبدالعزیز کا دور آیا تو لوگ اس دور میں ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ تم نے کتنا قرآن پاک حفظ کیا ہے، رات میں کتنے نوافل پڑھے ہیں، اس ماہ میں کتنے روزے رکھے ہیں اور فلاں نے اتنا قرآن حفظ کرلیا ہے اور فلاں کا کب ختم ہونے والا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ پہاڑوں پر پگھلنے والی برف کا پانی نیچے ڈھلوان پر ندی نالوں سے ہوتا ہوا میدانوں اور کھیتوں کو سیراب کرتا ہے، بالکل اسی طرح تاریخ کے مندرجہ بالا واقعات ہمیں بتاتے ہیں کہ عوام میں قناعت، دیانت، امانت، کفایت اور فرض شناسی کے احساسات حکمرانوں سے رعایا میں منتقل ہوتے ہیں، کیونکہ ہمیشہ اصلاح احوال اور تبدیلی کی ترتیب ہمیشہ اوپر سے نیچے کی طرف آتی ہے، مگر اس اصول و قاعدے کے برعکس ہمارے یہاں ہمیشہ حکمران عوام سے تبدیلی اور متذکرہ اوصاف کے متقاضی نظر آتے ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ عوام حکمرانوں کے پیروکار ہوتے ہیں، حکمران جو رنگ اختیار کرتے ہیں، عوام خود کو اسی رنگ میں رنگتے چلے جاتے ہیں، حکمران جو ڈھنگ اپناتے ہیں عوام بھی اسے اپنا لیتے ہیں، حکمرانوں کا جو مزاج ہوتا ہے، عوام کا بھی وہی مزاج بن جاتا ہے، حکمران اگر نڈر، بہادر اور جرات مند ہوں تو عوام بھی بے خوف اور بے باک ہوتے ہیں، حکمران اگر بزدل، ڈرپوک اور کم ہمت ہوں تو عوام بھی مصلحت کیش اور عافیت کوش بن جاتے ہیں۔

نپولین نے درست کہا تھا کہ "اگر بکریوں کے ریوڑ کی قیادت شیر کو دی جائے تو بکریاں بھی شیر کی طرح لڑتی ہیں لیکن اگر شیروں کے لشکر کی قیادت بکریوں کے ہاتھ آجائے تو شیر بھی میمنے بن جاتے ہیں" حکمران اگر اصول پسند اور قانون و ضابطے کے پابند ہوتے ہیں تو عوام بھی قانون و ضابطے کا احترام کرتے ہیں، حکمران اگر سادگی کو اپنا شعار بناتے ہیں تو عوام بھی اپنا طرز زندگی سادہ اور آسان کر لیتے ہیں، حکمران اگر شاہ خرچ ہوں تو عوام بھی اسراف پر آجاتے ہیں، حکمران اگر مسائل کے حل میں سنجیدہ ہوں تو عوام کے مزاج میں بھی سکون اور ٹھہراؤ آجاتا ہے اور اگر حکمران تصنع، بناوٹ اور نمائش پسندی کے دلدادہ ہوں تو عوام ان سے پہلے عیش و آسائش پر فریفتہ دکھائی دیتے ہیں۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک کے حکمرانوں کا ہمیشہ سے یہ طرز عمل رہا کہ وہ شاہانہ کروفر کو قومی مفاد پر ترجیح دیتے ہوئے اس طرح اقتدار سے لطف اندوز ہوتے ہیں کہ ان میں بات بات پر پروٹوکول کا احساس نمایاں ہوتا ہے، کپڑوں سے لے کر رہائش اور سواری تک ہر انداز میں نزاکت، امارت، شان و شوکت اور جلالت کا رنگ جھلکتا ہے، مجموعی قومی پیداوار کس حال میں ہے، بیرونی قرضوں کا کیا عالم ہے، بجٹ کا خسارہ کتنا ہے، قومی ترقی کی رفتار کیسی ہے، یہ ساری بنیادی چیزیں ان کے اپنے دور حکمرانی میں بے معنی ہوتی ہیں، ان کے سر میں

تو بس ایک ہی خبط سمایا رہتا ہے کہ وہ دنیا کو ایک صاحب جبروت اور شان و شوکت کے حامل حکمران نظر آئیں۔ اپنے اسی رنگ ڈھنگ اور انا پروری کو برقرار رکھنے کیلئے وہ عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ لادتے ہیں اور بیرونی مالیاتی اداروں سے قرض لے کر قوم و ملک کو سود اور غلامی کے دلدل میں دھکیل دیتے ہیں۔ ان کی ساری کوشش اور توجہ اس امر پر مرتکز رہتی ہے کہ ان کا دور اقتدار بغیر کسی مزاحمت اور چیلنج کے باآسانی مکمل ہو جائے، چنانچہ اس مقصد کیلئے وہ اپنے سارے ذہنی اور ریاستی وسائل جوڑ توڑ میں کھپاتے ہیں، سرکاری وسائل و خزانہ لٹاتے ہیں، مخالفین پر جھوٹے مقدمات بنواتے ہیں، تائید و حمایت کے حصول کیلئے ملازمتوں کا نیلام گھر سجاتے ہیں، پلاٹ اور پرمٹوں کی دکانیں کھلتی ہیں، کوٹوں کی منڈی لگتی ہے اور کمیشن کی رشوتیں چلتی ہیں تاکہ اقتدار کی مدت پوری ہو جائے۔

دراصل یہ سارے شاخسانے قیادت کے قحط اور قائدانہ بصیرت کے فقدان کے ہیں، ورنہ ایک حقیقی قیادت کبھی بھی نام و نمود اور دولت کی چمک دمک کی محتاج نہیں ہوتی، ہمیں ہر عہد کے اہل دانش اس امر پر متفق نظر آتے ہیں کہ اہل قیادت کیلئے قابلیت، اہلیت، حکمت اور بصیرت کا ہونا لازمی ہے، ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ تاریخ میں وہ حکمران کبھی بھی نیک نام نہیں رہے جنہوں نے فرعون کی فرعونیت، قارون کی دولت اور ہامان کی منافقت کی راہ کو اپنایا اور

اسے اپنا ورثہ قرار دیا، جبکہ اس کے برخلاف وہ لوگ تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں، جنہوں نے اصول، قاعدے اور قانون کے ساتھ حکمت، بصیرت اور اخلاص کے ساتھ حکومت کی اور عوام کے سکون و آرام اور بنیادی حقوق کا خیال رکھا۔

آج اگر پوری قوم میں کرپشن اور لوٹ مار کے جراثیم سرایت کر چکے ہیں، کام چوری قوم کی عادت ثانیہ بن چکی ہے، ڈسپلن کو توڑنا ایک مشغلہ اور قانون شکنی ایک روایت کی شکل اختیار کر گئی ہے، اپنے دائرہ کار اور اختیارات سے تجاوز روز مرہ کا معمول اور عدم برداشت اور تشدد ایک فیشن کا روپ دھار چکا ہے، قوم میں ان ساری خرابیوں کی تخلیق اور پرورش کسی اور نے نہیں کی ہے بلکہ ہمارے خیال میں ان قومی بیماریوں اور خرابیوں کا اصل سبب ہماری قیادت کی نااہلی ہے اور اس کا ثبوت خود قیادت کا اپنا وہ طرز عمل ہے جس میں وہ اپنے قول و کردار اور عمل کو بہتر بنانے اور خود اخلاقی و سیاسی اصولوں پر کاربند رہنے اور دوبارہ برسر اقتدار آنے کیلئے وسائل جمع کرنے کے بجائے، سارا زور اس بات پر صرف کرتے ہیں کہ اپنے سیاسی مخالفین اور اختلاف رائے رکھنے والوں کو کیسے پیچھے دھکیلا جائے اور سیاسی داؤ پیچ کے ذریعے کیسے انہیں نیچا دکھایا جائے، وہ اس مقصد کیلئے نت نئے اسکینڈل گھڑتے ہیں، الزامات تراشے جاتے ہیں اور وہ وہ بہتان کھڑے کئے جاتے ہیں جس کے ذریعے مخالفین کا راستہ روکا جاتا ہے اور مشکلات پیدا کی جاتی ہیں۔

یہ ہمارا وہ سیاسی کلچر ہے جس کی فصل آج پوری قوم کاٹ رہی ہے، نہ دستور ہے، نہ منشور، نہ کوئی قومی و ملی نصب العین ہے، نہ مسائل اور قومی بحران سے نکلنے کا کوئی عملی منصوبہ اور لائحہ عمل ہے، حال یہ ہے کہ ہماری سیاسی قیادت اپنی تمام ذہانت، قابلیت، صلاحیت اور قومی دولت محض اس بات پر خرچ کرتی ہے کہ اس کی حکومت کو دوام ملے خواہ اس دوام کے عیوض اسے مارشل لاء سے مفاہمت ہی کیوں نہ کرنا پڑے، بیوروکریسی کا سہارا ہی کیوں نہ لینا پڑے، رات کی تاریکی میں اپنے مخالفین سے معاہدہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے اور بیرونی قوتوں کی مدد ہی کیوں نہ لینا پڑے، عوام سے کئے گئے وعدے اور عہد ٹوٹتے ہیں تو ٹوٹ جائیں، لوگوں کی امنگیں، خواہشات اور امیدیں دم توڑتی ہیں تو توڑ جائیں، خود ان کا اپنا سیاسی کیریئر اور سیاسی زندگی بے ثمر ہوتی ہے تو ہو جائے، جماعتی شناخت مٹتی ہے تو مٹ جائے اور محنت جد وجہد اور قربانیاں ضائع ہوتی ہیں تو ہو جائیں، کچھ بھی ہو انہیں تو بس اقتدار چاہیے ۔

قوم کا ایک ایک فرد آج اس بات کا گواہ ہے کہ اقتدار میں آنے کے بعد ہمارے ہر حکمران نے اپنے پیش نظر صرف ایک بات رکھی کہ عوام کو اصل حقائق سے دور رکھ کر ان کی آنکھوں میں دھول کیسے جھونکی جا سکتی ہے اور انہیں بے وقوف کیسے بنایا جا سکتا ہے، ظاہر اس طرز عمل اور طرز فکر کی روشنی میں قوم میں محنت

دیانت، قناعت، ایمانداری اور فرض شناسی کے جذبات کیونکر پیدا ہو سکتے تھے،آج
ہمارے موجودہ قومی بحران اخلاقی پستی، معاشی پسماندگی، سیاسی بد نظمی اور معاشرتی
مسائل کا اصل سبب جرات مند، مخلص، صاحب فکر و نظر اور اعتماد کی دولت سے مزین
قیادت کا فقدان ہے۔ کسی مفکر نے سچ کہا ہے کہ "قوموں اور ملکوں کی موت کبھی بھی
وسائل کی کمی کے سبب نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی ان کی تباہی اور غرقابی طوفانوں اور
سیلابوں سے ہوتی ہے بلکہ نااہل، خوشامد پسند،بزدل، کم فہم، کوتاہ نظر اور مفاد عاجلہ
کی رسیا قیادت قوموں کی لٹیا ڈبوتی ہے۔"

بھٹکتی قوم دم توڑتی امیدیں اور جواز و تاویلات کا نہ ختم ہونے والا خزانہ

پاکستان دنیا کی تاریخ میں وہ واحد ملک ہے جو خالصتاً جمہوری عمل کے نتیجے میں وجود میں آیا، مگر افسوس کہ وہی پاکستان اپنے قیام کے بعد سب سے زیادہ غیر جمہوری صدموں سے دوچار رہا، باسٹھ برس گزرنے کے بعد بھی پاکستان میں جمہوریت اور جمہوری ادارے ایک سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں، قیام پاکستان سے لے کر آج تک ملک کا آدھے سے زیادہ عرصہ فوجی آمریت کی نذر ہو چکا ہے جبکہ بقیہ رہ جانے والے عرصے میں جمہوریت کے نام پر جمہوری بادشاہ ملک پر مسلط رہے ہیں اور اِس تمام عرصے کے دوران جمہوریت اور جمہوری عمل کا فقدان ہماری تاریخ کا سب سے بڑا المیہ بنا رہا، اگر ہم دنیا کے دیگر جمہوری ممالک کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت باآسانی منکشف ہو جاتی ہے کہ وہاں تمام سیاسی خرابیوں اور باہمی اختلافات کے باوجود کوئی اور دوسرا ادارہ اصلاح احوال کیلئے جمہوری عمل میں مداخلت نہیں کرتا، لیکن اِس کے برخلاف پاکستان میں ہر پانچ دس سال کے بعد جمہوریت کی بحالی کے نام پر ایک اصلاحی طاقت اٹھتی ہے اور ایک طویل عرصے کیلئے حقیقی جمہوریت اُس کے قدموں میں ڈھیر ہو جاتی ہے، یوں ملک ایک بار پھر آمریت کے سیاہ سائے کی لپیٹ میں آجاتا ہے اور اِس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پچھلی خرابیاں دور ہونے کے بجائے کئی نئی پیچیدگیاں اور گمبھیر مسائل جنم لے لیتے ہیں۔

بد قسمتی سے ہمارے ملک میں گزشتہ باسٹھ برس سے یہی سلسلہ چلا آ رہا ہے، ہر بار
جمہوریت ایک سوالیہ نشان بن جاتی ہے، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جب پاکستان جمہوری
عمل اور ووٹ کی طاقت کے ذریعے قائم ہوگیا تھا تو اُسی وقت ہی یہ عہد بھی کرلیا جاتا
کہ جو عمل قیام پاکستان کا باعث بنا ہے وہی جمہوری عمل پاکستان کی بقا، استحکام اور
سلامتی کا ذریعہ بھی بنے گا، اگر اِس فکر و فلسفہ کو اپنا کر تمام تر خدشات، موہوم حادثات
اور ممکنہ مشکلات کے باوجود یہ عمل جاری رکھا جاتا تو آج ملک میں یہ صورتحال پیدا
نہیں ہوتی اور ملک جمہوریت کی پٹڑی پر کبھی کا گامزن ہوچکا ہوتا، لیکن افسوس کہ ایسا
نہیں ہوا ہر بار ایک نئے معمار نے جمہوری عمارت کی نئی سنگ بنیاد رکھی، ابھی نئی
عمارت مکمل بھی نہیں ہوپاتی کہ ایک اور نیا معمار اصلاح احوال کی تحریک لئے آجاتا
ہے اور پرانی عمارت اور اُس کی بنیاد کو ڈھا کر نئے سرے سے ایک بار پھر ایک اور نئی
عمارت کی سنگ بنیاد رکھتا ہے، یہ سلسلہ 16 اپریل 1953 کو خواجہ ناظم الدین کی
حکومت کی برطرفی سے شروع ہوا اور آج تک جاری ہے، ملک غلام محمد سے لے کر
جنرل پرویز مشرف تک ہر نئے معمار نے ملک میں جموریت کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد
رکھا، لیکن آج تک کسی کی کوئی بھی جمہوری عمارت مکمل نہیں ہو سکی، یہاں یہ امر بھی
واضح رہے کہ جمہوری عمل کا ہمیشہ یہ اصول اور تقاضہ ہوتا ہے کہ کوئی بھی ایسا شخص یا
گروہ حکومت نہیں کرسکتا

جسے عوام کی تائید و حمایت حاصل نہ ہو اگر یہ اصول ابتداء ہی میں ہمارے ملک کے حکمرانوں کیلئے لازم کردیا جاتا تو آج ملک کی حالت کچھ اور ہوتی۔

لیکن ایسا نہیں ہوا ہر آنے والے حکمران نے ابتداً قوم میں نئی امیدیں جگائیں، نت نئے خواب دکھائے، کسی نے عوامی حاکمیت کا نعرہ لگایا، تو کسی نے عوام کی دہلیز پر انصاف پہنچانے کا دعویٰ کیا، کوئی کشکول توڑنے کی بات کرتا رہا، تو کوئی زرعی انقلاب کا مژدہ سناتا رہا، کوئی قانون کی حکمرانی کا شور مچاتا رہا، تو کوئی اسلامی نظام کے نفاذ کا نعرہ لگاتا رہا، کوئی قرضوں سے چھٹکارا اور غربت مٹاؤ کا پروگرام دیتا رہا، اور کوئی روٹی کپڑا اور مکان کے خواب دکھاتا رہا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جونہی یہ لوگ ایوان اقتدار میں پہنچتے ہیں اِن کا لب و لہجہ بدل جاتا ہے، دعوؤں اور وعدوں کی جگہ مجبوریوں اور رکاوٹوں کی لمبی فہرست عوام کے سامنے آنا شروع ہوجاتی ہے اور اقتدار حاصل کرنے سے پہلے کے تمام وعدے اور دعوے بین الاقوامی حالات کے عذر، عالمی دباؤ، خزانے کے خالی ہونے، وسائل کی کمی، پچھلی حکومتوں کی ناقص کارکردگی اور حکومت کرنے کیلئے مزید مہلت کے مطالبے میں ڈھلتے نظر آنے لگتے ہیں، وہ مسائل جن کو حصول اقتدار سے قبل چٹکی بجاتے ہی حل کرنے کے دعوے ہوتے ہیں اب اُن کو حل نہ کرنے کا استدلال الہٰ دین کے چراغ کے محاورے پر آکر ختم ہوجاتا ہے۔

گزشتہ باسٹھ برس سے یہی کچھ ہوتا رہا ہے، ہر نئی آمریت نے عوام سے وعدہ کیا کہ وہ عوام کے منتخب نمائندوں کا حق حکومت تسلیم کرتے ہیں، اسی طرح سیاسی حکمرانوں نے جمہوری روایات کو فروغ دینے اور پختہ کرنے کا عزم کیا لیکن اس کے باوجود عوام ابھی تک دوراہے پر حیران و مضطرب کھڑے ایک اچھی حکومت اور مستحکم جمہوری نظام کو تلاش کر رہے ہیں اور دائروں در دائروں کا سفر ابھی تک جاری ہے، یہ حقیقت ہے کہ ستائیس دسمبر 2007 کو بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد اٹھارہ فروری 2008 کے الیکشن میں پاکستان پیپلز پارٹی ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت بن کر ابھری، قوم نے پیپلز پارٹی کو ملک کو درپیش گمبھیر مسائل حل کرنے اور قوم کی کشتی کو گرداب سے نکالنے کیلئے جرات مندانہ اقدامات کرنے کا سنہری موقع فراہم کیا ہے گویا قسمت نے پاکستان پیپلز پارٹی اور جناب آصف علی زرداری کو حقیقی جمہوری عمارت کی سنگ بنیاد رکھنے اور جمہوری عمارت کو مکمل کرنے کا ایک نادر موقع دیا اور یوں ملک میں جمہوریت کے قیام کی تکمیل کے ساتھ ساتھ تمام حکومتی و ملکی معاملات غیر سیاسی سیٹ اپ سے نکل کر مکمل طور پر نو منتخب حکومت کے ہاتھوں میں آگئے ہیں۔

لیکن صرف پندرہ ماہ میں تبدیلی کے تمام خواب قوم کی پلکوں سے پھسل کر زمین پر آگرے، یوں لگتا ہے کہ صرف چہرے بدلے ہیں اور کچھ بھی نہیں بدلا، شاید

یہی وجہ ہے کہ اب مسلم لیگ (ن) کے قائد میاں نواز شریف بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ "موجودہ جمہوریت اور سابقہ آمریت میں کوئی فرق نہیں ہے، نواز شریف کا کہنا ہے کہ پرویز مشرف کے جانے کے باوجود حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی،
سترھویں ترمیم (جس کے خاتمے کا قوم سے وعدہ کرتے ہوئے جناب آصف علی زرداری نے کہا تھا کہ پیپلز پارٹی کا آئندہ آنے والا صدر یہ اختیارات خود پارلیمنٹ کو واپس کرکے ایک نئی مثال قائم کرے گا، لیکن ڈیڑھ سال بعد سوائے ایک کمیٹی کے قیام کے کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی) بدستور اپنی جگہ موجود ہے، غربت، بھوک افلاس، مہنگائی اور بے روزگاری نے عوام کی حالت پہلے سے بھی بدتر کر دی ہے، سرحد اور بلوچستان کے قبائلی علاقوں میں آگ و خون کا کھیل جاری ہے، ڈرون حملے پہلے سے زیادہ بڑھ گئے ہیں، حکومت اور حکومتی رٹ ناپید ہے، پارلیمنٹ کمزور ہے اور سب زیادہ ستم ظریفی یہ ہے کہ آمریت کے خلاف جدوجہد کی بات کرنے والی عوامی جماعت کی حکومت آمریت کی باقیات کو اپنے سینے سے لگائے بیٹھی ہے۔
ان حالات میں یہ کہنا قطعاً غلط نہ ہوگا کہ کبھی نہ رکنے والا کاروان جمہوریت پٹڑی پر چڑھنے سے پہلے ہی اتر گیا اور پلک جھپکتے ہی مسائل کو حل کر دینے کے دعوے، پاکستان کو خوشحال و ترقی پسند معاشرہ بنانے اور غربت کے خاتمے کے وعدے کسی دیوانے کا خواب بن کر رہ گئے، حقیقت یہ ہے کہ سال بھر

پہلے 80 فیصد پاکستانی اپنی آمدنی کا40 فیصد کھانے پینے اور روز مرہ کی اشیاء پر خرچ کرتے تھے لیکن آج وہ اپنی آمدنی کا تقریباً 70 فیصد حصہ جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے پر خرچ کررہے ہیں، سال بھر پہلے دس ہزار روپے تک آمدنی والے گھرانوں میں اگر بڑوں کو نہیں تو بچوں کو ضرور تین وقت کا کھانا مل جاتا تھا، لیکن آج شہروں میں ہزاروں بچے اسکول کے بعد کچھ نہ کچھ کام کرتے ہیں، شہر میں دو وقت کے کھانے کیلئے بھیک مانگنے والے ہمیشہ سے موجود ہیں، لیکن پچھلے ایک برس سے پیشہ ور بھکاریوں کے علاوہ صاف ستھرے کپڑے پہنے نوجوان لڑکے، لڑکیاں، بوڑھے اور خاندان ٹریفک سگنلز، مصروف شاہراہوں، اور کاروباری مراکز میں بڑی تعداد میں ہاتھ پھیلائے بھکاری بنے گھومتے نظر آتے ہیں، بھوک، غربت و افلاس نے جسم فروشی کو آسان کاروبار بنا دیا ہے۔

گزشتہ حکومت یہ کہہ کر قوم کا دل بہلاتی تھی کہ آپ سب کی فی کس آمدنی 650 ڈالر تک پہنچ چکی ہے، زرمبادلہ کے ذخائر 16 ارب ڈالر سے تجاوز کر گئے ہیں، آئی ایم ایف اور عالمی بینک کو ہم نے ہمیشہ کیلئے خیر آباد کہہ دیا ہے، غربت کی شرح 35 فیصد سے کم ہو کر 24 فیصد رہ گئی ہے، بس کچھ ہی دنوں کی بات ہے کہ ملک کا ہر مرد و زن اس ترقی کے فوائد اپنے کچے گھروں کی چھتوں سے ٹپکتے ہوئے دیکھے گا، ہمیں پریشان ہونے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، ہر حکومت کے پاس عوام کو بہلانے اور وعدوں کے لولی پاپ دینے کیلئے کچھ نہ کچھ

تو ہوتا ہی ہے اگر پچھلی حکومت کے پاس عوام کیلئے خوبصورت سہانے خواب تھے تو موجودہ حکومت کے پاس جواز وتاویلات کا نہ ختم ہونے والا خزانہ ہے، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ پلک جھپکتے ہی برسوں پر محیط خرابیاں اور تمام مسائل حل ہوجائیں، حکومت کے پاس کوئی جادوئی چھڑی تو ہے نہیں، کوئی الہ دین کا چراغ تو نہیں ہے جو رگڑا اور مسائل کے حل کیلئے جن حاضر ہوگیا، اب آپ ہی سوچیے کہ پانی، بجلی کے مسائل حل ہونے میں وقت تو لگے گا، اگر پہاڑوں پر برف نہیں پڑے گی تو پانی اور بجلی کا بحران تو پیدا ہونا ہی ہے، یہ تو قدرت کے کام ہیں ہم دخل اندازی کیسے کر سکتے ہیں، صرف دعا ہی کی جاسکتی ہے، دعا کیجئے، مہنگائی دو دنوں میں تو کم یا ختم نہیں ہوجائے گی، امن و امان کے بگڑے ہوئے نو سالہ حالات ایک دن میں ٹھیک نہیں ہو سکتے اور سب سے بڑی بات یہ کہ عوامی فلاح و بہبود اور مسائل کے حل کیلئے قومی خزانے میں پیسہ نہیں ہے، لہذا یہ طے شدہ بات ہے کہ ہمیں انتظار کرنا پڑے گا، پیسے کے آنے کا انتظار، وقت کے صحیح ہونے کا انتظار اور مہنگائی، غربت، بھوک و افلاس کے ختم ہونے کا انتظار، ایک ایسا انتظار جس میں مسائل و آلام ختم ہوں یا نہ ہوں غریب ضرور ختم ہوجائیں۔

گزشتہ دس عشروں سے یہی کچھ ہورہا ہے، وعدوں کے سبز باغ اور بیانات کے لولی پاپ سے قوم کو بہلایا اور پھسلایا جارہا ہے، ہر بار عوام کی جائز و معصوم

خواہشات کو دباؤ اور مجبوریوں کے پتھر تلے بے دردی سے کچلا جاتا ہے اور ہر بار مایوسی اور ناامیدی ہی ملتی ہے۔ بھٹو صاحب کا روٹی، کپڑا اور مکان کا خواب، ضیاء الحق کا شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پانی پلانے والے اسلامی نظام کی بات، محترمہ بے نظیر بھٹو کے جمہوریت کے وعدے، نواز شریف کا صنعتی ترقی کا شور و غوغا، عوام کو مکے دکھا دکھا کر ڈرانے اور دھمکانے والے ڈکٹیٹر پرویز مشرف کی مادر پدر آزاد روشن خیالی سے ٹھنڈے، میٹھے اور دھیمے لہجے میں بات کرنے والے جناب صدر مملکت اصف علی زرداری صاحب کے افہام و تفہیم بھرے مفاہمتی دور تک عوام کی تقدیر اور نصیب کے دامن کسی فقیر کے کاسہ گدائی کی طرح خالی کے خالی ہی رہے۔

طبقاتی کشمکش اور اونچ نیچ کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوگی کہ لوگ بھوک، غربت اور افلاس کے ہاتھوں مجبور ہو کر محض ایک پیالہ چائے کی عدم دستیابی پر خودکشیاں کر رہے ہیں، اپنے جسمانی اعضاء بیچ رہے ہیں، جگر کے ٹکڑوں کی بولیاں لگ رہی ہیں، لیکن فرانس، جرمنی، برطانیہ، تھائی لینڈ، سنگاپور اور ترکی سے طبقہ اشرافیہ کے کتوں کے کھانے کیلئے اوسطاً ہر ماہ ڈھائی سے تین کڑور روپے کی خوراک درآمد کی جارہی ہے، کتنی حیرت، دکھ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ جس ملک میں چھ ہزار روپے ماہوار کی آمدنی کے حصول کیلئے عوام ملوں اور فیکٹریوں کے باہر لمبی لمبی لائن لگائے کھڑے ہوں، اُس ملک میں لوگ ایک

کتے پر ماہانہ بیس سے چالیس ہزار روپے خرچ کرتے ہیں، ایک طرف حکومت معاشی حالات کے دگرگوں ہونے کا رونا روتی ہے تو دوسری طرف نوے سے زائد وزراء اور مشیروں کی فوج ظفر موج کے رنگ ڈھنگ اور انداز و اطوار کے کیا کہنے، لگتا ہی نہیں کہ اِن کا تعلق کسی غریب ملک سے ہے، خزانہ خالی ہے، لیکن گورنرز کیلئے پچاس کڑور کا ہیلی کاپٹر اور وزراء و مشیروں کیلئے قیمتی گاڑیاں درآمد کی جارہی ہیں، ارکان اسمبلی کے صوابدی فنڈ (جو غریب عوام سے زیادہ خود ان کے کام آتے ہیں) ڈبل کئے جارہے ہیں، ملکی معاملات چلانے کیلئے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سمیت دیگر مالیاتی اداروں سے قرض در قرض کی بھیک مانگی جارہی ہے، لیکن اربوں روپوں کا قومی خزانہ ہڑپ کر جانے والوں کے نام ظاہر کرنے، کروڑوں اربوں روپوں کی سرکاری زمینوں کی بندر بانٹ کرنے والوں کو پکڑنے اور اُن کے احتساب کے حوالے سے کوئی پیش رفت نہیں، حال یہ ہے کہ بچے کھچے قومی اداروں کو اونے پونے بیچنے کی تیاری کی جارہی ہو، ایک طرف صدر صاحب ایوان صدر کی قیمتی کراکری پیک کروا کر رکھ رہے ہیں تو دوسری جانب ہمارے وزیر اعظم صاحب بیرونی دوروں پر قوم کا پیسہ پانی کی طرح بہا رہے ہیں۔ عجیب منظر ہے حکمرانوں کا قول اُن کے فعل سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا، کہہ کچھ رہے ہیں اور کر کچھ اور رہے ہیں، بدعنوانی، کرپشن اور لوٹ مار کا زہر پوری قوم کے رگ و پے میں سرائیت کرچکا ہے، ظلم، زیادتی، اقرباء پروری اور

ناانصافی کا نہ رکنے والا ایک طوفان ہے۔ بھلا خود ہی سوچیے ایسے حالات میں تبدیلی کیونکر آسکتی ہے اور کیسے عوام کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ سچ کہا حبیب جالب ۔

وہی حالات ہیں فقیروں کے

دن پھرے ہیں، فقط وزیروں کے

ہماری قوم کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ قوم ہر دو چار سال بعد تبدیلی کے عمل سے گزرتی ہے ، پی ڈی ایم، پی این اے، یو ڈی ایف، ایم آر ڈی، ملی یکجہتی کونسل، اسلامک فرنٹ، اسلامی جمہوری اتحاد، متحدہ شریعت محاذ، تحریک نظام مصطفیٰ، تحریک تحفظ ختم نبوت، تحریک ناموس رسالت، تحریک ناموس صحابہ سے لے کر یحییٰ خان کی آمد، پاکستان میں مارشل لاء حکومت کے زیر سایہ جماعت اسلامی اور مسلم لیگ کی وزارتیں، جنرل ضیاء الحق کی کابینہ میں مرد مومن مرد حق کا نعرہ لگانے والی جماعت اسلامی کی شمولیت، اصغر خان، معراج محمد خان، عمران خان اور نواز شریف جیسے لوگوں کو قومی ہیروز کے روپ میں پیش کرنے سے لے کر جنرل پرویز مشرف اور صدر آصف علی زرداری کی آمد تک، امید اور حسرت و یاس کی ایک نہ ختم ہونے والی کہانی ہے، ہر بار عوام سمجھتے ہیں کہ تبدیلی آ گئی ہے یا آنے والی ہے، لیکن وہ اِس تبدیلی اور اُس کے ثمرات کو کبھی

محسوس نہیں کرپاتے، یہ تبدیلی کبھی اُن کی زندگی کا تجربہ نہیں بنتی، اُن کے آنگن میں خوشیوں کے پھول نہیں کھلاتی، اُن کے پژمردہ چہروں پر مسکراہٹ نہیں لاتی اور دلوں کی دھڑکنوں کو تیز نہیں کرتی، گزشتہ 62 سال سے وہ انتظار کی طویل قطار میں کھڑے ہیں اور اس وقت تک کھڑے رہیں گے جب تک کہ سوچ، فکر، نظر اور عمل کے زاویئے نہیں بدل جاتے۔

یاد رہے کہ قوم موسیٰ نے اپنی غلامانہ ذہنیت کے سبب رب تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دینے سے انکار کیا تھا، جس کی سزا اُنہیں یہ ملی کہ وہ اُس وقت تک وادی تیہ میں بھٹکتی رہی جب تک کہ غلامانہ ذہنیت کے لوگ مرکھپ نہیں گئے اور جذبہ حریت و آزادی سے آشنا ایک نئی نسل تیار نہیں ہو گئی، پاکستانی قوم بھی گزشتہ باسٹھ برس سے سیاست کی وادی تیہ میں بھٹک رہی، اِس باسٹھ سالہ بے مقصد و رائیگاں سفر کا حاصل ناکامیوں اور محرومیوں کے سرابوں کے سواء اور کچھ نہیں ہے، نشان منزل کیا تھی، منزل کیا ہے؟ ہر آنے والے دن کے ساتھ یہ تصورات دھندلاتے جارہے ہیں، پوری قوم ایک بند گلی میں کھڑی ہے، اُسے راستہ نہیں مل رہا، ہمارا یقین کہتا ہے کہ یہ راستہ اُس وقت تک نہیں ملے گا جب تک کہ پوری قوم اجتماعی طور اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہو کر معافی نہیں مانگتی، توبہ نہیں کرتی اور اس راستے پر چلنے کا تعین اور وعدہ نہیں کرلیتی جس کا انتخاب ہمارے اسلاف نے

حصول پاکستان کی تحریک میں کیا تھا اور جو بنائے پاکستان قرار پائی تھی۔

ہمارا اصول یہ ہے کہ ہمارا کوئی اصول نہیں

عام طور پر ہر معاشرے میں دو طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں، ایک وہ جن کی زندگی اصول، قاعدوں اور ضابطوں کے گرد گھومتی ہے اور دوسرے وہ جن کی زندگی میں اصول قاعدوں اور ضابطوں کی کوئی حیثیت و اہمیت نہیں ہوتی، بااصول لوگ بااصول زندگی گزارتے ہیں، وہ کبھی بھی بے اصولی، دھوکہ دہی اور منافقت سے سمجھوتہ نہیں کرتے، ہمیشہ ظالم و جابر اور کفر طاغوت کے خلاف کلمہ حق بلند کرتے ہیں، وقت انہیں اہل عزیمت کے نام سے یاد کرتا ہے، تاریخ اُن کے اوراق زندگی محفوظ رکھتی ہے تاکہ آنے والے زمانے اور نسلیں اُن کی روشن بااصول اور قابل تقلید زندگی کو مشعل راہ بنائیں، اسی طرح بے اصول لوگ بھی تاریخ کا حصہ بنتے ہیں، تاریخ اُن کی بے اصولی، ابن الوقتی اور موقعہ شناسی کو نشان عبرت اور ننگ دیں ننگ وطن کے طور پر محفوظ رکھتی ہے۔

جہاں ایک کو عزت، مرتبہ اور مقام ملتا ہے وہیں دوسرے کو ذلت، ملامت اور لعنت نصیب ہوتی ہے، جہاں ایک اچھائی، اصول پسندی اور بہادری کی علامت قرار پاتا ہے، وہیں دوسرا، جھوٹ، فریب اور منافقت کی نشانی کے طور پر یاد رکھا جاتا ہے، یوں تو دنیا میں بطور عادت سچ بولنے والے بہت لوگ ہوتے ہیں لیکن

جان و مال کی آزمائش کے وقت کلمہ حق کہنے والے اس قدر قلیل تعداد میں ہوتے ہیں
کہ ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ درحقیقت حق کے راستے پر گامزن انسان کا حقیقی
امتحان ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی، جائیداد، اولاد اور آبرو کی پرواہ نہ کرتے ہوئے
ایک ظالم و جابر حکمران کے سامنے کس قدر ثابت قدمی کے ساتھ کلمہ حق زبان پر لاتا
ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شدید خطرات میں سر پر لٹکتی تیغ بے نیام کے نیچے حق بلند کرنے
والے لوگ ہی عالم انسانیت کے ہیرو قرار پاتے ہیں۔ مرحلہ دار و رسن کے سامنے بڑے
بڑے بہادروں اور حوصلہ مندوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ گردن کے نزدیک پھانسی
کا پھندا دیکھ کر رستموں اور سہرابوں کے پاؤں ڈگمگانے لگتے ہیں۔ کیونکہ یہ امتحان
جسمانی قوت کا نہیں، ایمانی طاقت کا ہوتا ہے اور یہ ایمانی طاقت و جرات دنیا میں بہت
ہی کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ ہماری تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ جس
میں لوگوں کو دین میں محنت اور ایمان میں ترقی کا درس مقرر دینے والے عالم، واعظ
اور ناصح، قاہر اور جابر سلطان کی ایک نگاہ غضب آلود کی تاب نہ لاسکے اور اپنی بے
ہمتی کا جواز تخلیق کرنے کیلئے اُس ظالم حکمران کے حق میں تاویلیں تلاش کرتے رہے،
فتوے دیتے رہے اور مصلحت اور تقیہ کو دین کا ایک لازمی جزو قرار دیتے رہے۔
تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ شراب و شباب کی لذت آفریں مسرتوں میں ڈوبے

رہنے والے بادشاہوں اور آمروں کو "عالم پناہ، ظلِ سبحانی، محافظ دین وملت، مرد مومن، مرد آہن، نقیب کلمہ حق اور محافظ وطن و جمہوریت وغیرہ کے القاب عطا کرنے والے بھی بعض اوقات قاضی وقت، مفتی یا فقیہہ اور صاحب جبہ ودستار ہی تھے،
حضرت شیخ سعدی اپنی مشہور زمانہ کتاب "گلستان" میں ایک بہت ہی خوبصورت حکایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ایک بادشاہ نے اپنے درباریوں سے کسی مسئلے پر رائے طلب کی، چنانچہ ہر شخص نے پوری ایمانداری سے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا، سب کی رائے سننے کے بعد بادشاہ نے بھی اُس مسئلے پر اپنی رائے دی، جس پر وزیر نے فوراً ہی بادشاہ کی رائے کی تائید کرتے ہوئے اُسے درست قرار دے دیا، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ بادشاہ کی رائے کی اصابت مشکوک ہے، دربار برخاست ہونے کے بعد لوگوں نے وزیر سے پوچھا کہ یہ جاننے کے باوجود کہ بادشاہ کی رائے غلط ہے، تم نے بادشاہ کی رائے کی حمایت کیوں کی، وزیر نے درباریوں کو جواز پیش کرتے ہوئے کہا کہ "جو لوگ بادشاہ سے اختلاف کرتے ہیں، وہ اپنے ہی خون میں ہاتھ دھوتے ہیں" گویا مطلب یہ تھا کہ اگر بادشاہ دن کو رات کہے تو عقلمند آدمی کو چاہیے کہ وہ فوراً بادشاہ کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہے کہ "حضور والا دیکھیں آسمان پر چاند بھی نکلا ہوا ہے اور ستاروں بھری کہکشاں بھی موجود ہے، یہ مصلحت کوشی اور حکمرانوں کی چاپلوسی اور کاسہ لیسی کی وہ بیماری تھی جس میں ہمیشہ ہی اہل ہوس واقتدار مبتلا نظر آئے۔

اسلام میں مصلحت اندیشی اور کتمان حق کا مرض کب شروع ہوا اور اہلیان جبہ و دستار میں اس مرض میں کب گرفتار ہوئے، اس بحث و مباحثہ میں جائے بغیر اتنا بتانا ضروری ہے کہ مسلمانوں میں تقیہ اور مصلحت گزینی کا رواج عربوں کے اہل ایران کے ساتھ میل جول اور اختلاط کا نتیجہ تھا، جس کے اثرات سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے ہی میں نظر آنے شروع ہو گئے تھے، غلبہ اسلام کے باوجود ایرانیوں کا واضح جھکاؤ اپنے بادشاہ کی طرف ہی رہا، جبکہ اہل عرب اطاعت امیر میں غلو کے قائل نہیں تھے، حکمران پرستی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک حکمران کو تو اپنی عوام پر تمام حقوق حاصل ہو گئے، لیکن رعیت کے پاس صرف حکمرانوں کے فرائض کی تابعداری کرنے کے سوا کوئی کام باقی نہیں بچا، چنانچہ جھوٹ، دغا اور خوشامد کے کلچر نے معاشرے میں رواج کا درجہ حاصل کر کے ملت اسلامیہ میں ابن الوقت اور بے اصول لوگوں کو پروان چڑھایا اور ایک ایسے نئے طبقے کی بنیاد پڑی، جس نے اپنا اصول ہی یہ بنا لیا کہ "ہمارا اصول یہ ہے کہ ہمارا کوئی اصول نہیں"۔

چنانچہ اسلام کی ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ میں یہ لوگ کتمان حق کے سنگین جرم کے مرتکب ہوتے رہے اور یہ لوگ رعیت کی آزادی اظہار اور آزادی فکر کو کچل کر ملت کی اخلاقی تخریب بھی کرتے رہے، قابل شرم بات یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر

حضرات نے اپنے انفرادی سیاسی خیالات کی تصدیق اور مادی آسائشوں کے حصول کیلئے ہمیشہ قرآن و حدیث کی تعبیر کا سہارا لیا، عہد بنو امیہ سے آغاز ہونے والی اس روایت نے برصغیر پاک و ہند میں شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر اور بہادر شاہ ظفر تک اور پھر انگریز سرکار سے لے کر پاکستان کی تاحال تاریخ میں ایسے بے شمار لوگ موجود ہیں جنھوں نے درہم و دینار کے لالچ میں جبہ و دستار کا سودا کیا، یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہر دور میں حکمرانوں کے ظلم و جبر اور مرضی و منشا کی تائید و حمایت میں قرآن و حدیث کو بطور تو تاویل استعمال کیا اور حق کے معاملات کو گدلانے کیلئے گمراہ کن فتوے دے کر مسلمانوں کو آمروں کی ذہنی اور فکری غلامی کی راہ پر لے جانے کی ناپاک کوشش کی اور آج بھی یہ کوشش دین اور مذہبی سیاست کے نام پر زور و شور سے جاری ہے، ویسے تو لالچ ،مفاد پرستی اور دنیاوی عزت و تکریم کیلئے پروان چڑھنے والا یہ رویہ ہمیں اپنے معاشرے میں عام نظر آتا ہے، لیکن ایک عام آدمی کے مقابلے میں طبقہ خواص اور سیاستدان اس مرض میں زیادہ مبتلا نظر آتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ ہر معاشرے میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کی زندگی میں اصول قاعدے اور ضابطوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا، وقت اور حالات کا بہاؤ یا اُن کی اپنی طبیعت کا میلان اور مادی لالچ و فوائد کا حصول انہیں جدھر چاہتا ہے، باآسانی بہا کر لے جاتا ہے، باالفاظ دیگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ

جدھر انہیں اپنا فائدہ نظر آتا ہے، وہ اُسی طرف کے ہو جاتے ہیں، زندگی میں اصول، قاعدوں اور ضابطوں سے محروم ہونے کی یہ بیماری عوام الناس سے زیادہ ملک کی اعلیٰ انتظامیہ، بیوروکریسی، سیاستدانوں اور بالخصوص مذہبی لبادوں میں ملبوس ان مذہبی لیڈروں میں زیادہ پائی جاتی ہے، جن کے لب صبح و شام اسلام اور اسلامی نظام کے نفاذ کی بات کرتے نہیں تھکتے، اِن کی تمام سیاسی بصیرت، معاملہ فہمی اور دور اندیشی صرف اور صرف ذاتی فائدے اور ابن الوقتی پر مبنی ہوتی ہے، انہیں ان باتوں سے قطعی غرض نہیں ہوتی کہ دینی اور مذہبی سیاست کے اسرار رموز کیا ہیں اور اصول و قاعدے کن تقاضوں اور قربانیوں کے متقاضی ہیں، ان تمام باتوں سے قطع نظر وہ حزب اختلاف میں رہ کر اقتدار کی سیاست کے گر جانتے ہیں، پارٹیاں بدلتے ہیں اور ہمیشہ اقتدار کے مزے لوٹتے ہیں، ہر حکومتی کولیشن کا حصہ ہو کر ہمیشہ حکومتی کارکردگی کو تنقید کا بھی نشانہ بناتے ہیں اور درپردہ حکومت اور حکومتی اقدامات کی تائید و حمایت جاری رکھ کر گھاٹے کا سودا بھی نہیں کرتے، سیاسی حوالوں سے ہمیشہ ان کی گفتگو تحفظات اور ملک و قوم کو لاحق خدشات کے گرد گھومتی نظر آتی ہے، لیکن درحقیقت یہ تمام تحفظات اور خدشات اپنے ذاتی مفادات کے دائروں کے گرد گھوم رہے ہوتے ہیں، ہر دور میں اقتدار کے مزے لوٹنا اور مراعات یافتہ عہدوں کا حصول ان کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے، یہ کوچہ سیاست کے یہ وہ مسافر ہوتے ہیں جن کا قول و فعل، کردار و عمل اور شخصیت ہمیشہ ہی متنازعہ اور ابن الوقتی کی

مظہر ہوتی ہے۔

درحقیقت یہ لوگ سیاستدانوں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جو ہار کر بھی جیت جانے کا ہنر جانتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے جبہ و دستار کی آڑ میں ذاتی مفاد و منفعت کو اپنا مطمع نظر بنالیا اور ایک سچے اصول پسند مسلم رہنماء کے اسلامی تشخص کو شدید نقصان پہنچایا، قول و عمل کے اسی تضاد نے عوام کو ان سے نہ صرف دور کردیا بلکہ مذہبی لیڈروں اور نام نہاد مذہبی جماعتوں پر سے ان کا اعتماد و بھروسہ بھی اٹھ گیا ہے اور آج قوم کسی طور بھی ان نام نہاد مذہبی و سیاسی رہنماؤں پر بھروسہ کرنے کو تیار نہیں جو ہر حاکم وقت کا ساتھ دینے کو اپنے ایمان کا حصہ سمجھتے ہیں، حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ معاشرے میں علماء نمک ہیں، نمک سے ہر چیز خوش ذائقہ ہوتی ہے، لیکن جب نمک ہی بدمزہ ہوجائے تو کون سی چیز درست رہ سکتی ہے۔"آج ہمارے تمام معاشی، معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی مسائل اور قومی تنزلی کا اصل سبب ہی یہ ہے کہ ہمارے حکمران، سیاستدان اور مذہبی رہنماء اچھے نہیں، اگر یہ درست ہوتے تو ملک و قوم کے تمام معاملات اور مسائل بھی درست ہوتے، سچ فرمایا ہے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ "میری امت کے دو آدمی " حکام اور علماء" ٹھیک رہے تو امت بھی ٹھیک رہے گی۔"

"ہم بھی کیا لوگ ہیں۔۔۔جو فریب نظر کو آسودہ چشمی سے تعبیر کرتے ہیں"

"ہم بھی کیا لوگ ہیں....جو سلگتی ہواؤں سے خوشبو.... گھٹاؤں سے .... مہکتی ہوئی
چاندنی مانگتے ہیں.... سر دشت بیٹھے ....ازل سے، دہکتی ہوئی ریت سے .... شبنمی
ساعتوں کی نمو چاہتے ہیں.....خلاؤں کی بے نام سی وسعتوں میں بھٹکتے....ہر اک
سانس کی ضرب سے .... ریزہ ریزہ بکھرتے .... فصیل انا سے....اتھاہ پستیوں میں
لڑھکتے چلے جارہے ہیں.... مگر پھر بھی خوش ہیں کہ ہم کو....لہکتے گلابوں .... مہکتی
ہوئی نرگسوں کی تمنا یہاں لائی ہے....ہم بھی کیا لوگ ہیں....جو فریب نظر کو
بھی ....آسودہ چشمی سے تعبیر کرتے .... سرابوں سے .... صدیوں کی تشنہ لبی کو
بجھانے پہ ایمان رکھتے ہیں"

مندرجہ بالا نظم محترم گلزار آفاقی کی اس تحریر نے یاد دلادی کہ "ایک بار پھر خوش فہم، ظاہر پرست، کوتاہ عقل اور تنخواہ دار نام نہاد دانشوروں نے سیاہ فام بارک اوباما کے سیاہ باطن سے اسلام کی خوشبو کشید کرنے کا پرانا دھندہ شروع کردیا، بالکل اسی طرح جس طرح ماضی میں اس شخص کے نام میں شامل "حسین" کی عرفیت کے باعث کچھ خوش گمان لوگ اس فریب میں مبتلا ہوگئے تھے کہ امریکہ کے قصر ابیض میں بندہ سیاہ نہیں، بلکہ اسلام داخل ہونے جارہا ہے،

ماضی کی اسی خوش فہمی اور خود فریبی کے ڈسے یہ عناصر آج ایک بار پھر اس شخص کی زبان سے السلام علیکم اور چند قرآنی آیات کے حوالے سن کر اس سیاہ فام متعصب " عیسائی پر فریفتہ اور واری ہو رہے ہیں
تعریف و توصیف کے ڈونگرے برسا رہے ہیں اور افغانستان و عراق پر برستے آتش و آہن کے ڈھیر میں امید و آس کے خوش فہم بہانے تلاش کر رہے ہیں، لیکن وہ بھول رہے ہیں کہ اس طرح کی دروغ گوئی، ڈرامہ بازی اور منافقت تو منافقین ہر دور میں کرتے رہے ہیں، اب رہ گئی یہ بات کہ اوباما کے آباؤ اجداد کا تعلق اسلام سے ہے اور وہ اپنے بچپن کے دن ایک اسلامی ملک انڈونیشیا کے گلی کوچوں میں گزار چکے ہیں، ہماری نظر میں اوباما کی یہ نسبت اور یہ حوالے کسی طور بھی اس بات پر دلالت نہیں کرتے کہ وہ اسلام اور عالم اسلام کے سچے خیر خواہ، ہمدرد اور دوست ہیں، کیونکہ اگر نسبت اور حوالے معیار امتیاز ہوتے تو آج "عمرو بن ہشام "ابو جہل نہ ہوتا اور یہ اصول اور قاعدہ " تخلیق نہ پاتا کہ " یہود و نصاری کبھی بھی تمہارے دوست نہیں ہو سکتے۔
ممکن ہے کہ تجزیہ نگاروں کی یہ رائے درست ہو کہ بارک اوباما اپنے پیش رو امریکی صدور سے قدرے مختلف سوچ کے حامل ہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ بھی درست ہو کہ اوباما ،امریکہ کے مسلم دنیا سے تعلقات کو بہتر بنانے میں سنجیدہ ہوں

لیکن کیا اس حقیقت سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ اب تک امریکہ نے مسلم امہ اور دنیا کے ساتھ جو کچھ کیا ہے، کیا اس کے زخم اوباما کی چکنی چپڑی باتوں اور لچھے دار منافقانہ تقریروں سے مندمل ہو سکتے ہیں، یقیناً اس مقام پر جمہوریت، آزادی اور انسانی اقدار کے خلاف اکیسویں صدی کی پہلی عالمی جنگ شروع کرنے والے امریکہ اور اس کے حواریوں کو شاید ماضی کے حوالے زیادہ اچھے نہ لگیں، لیکن ان حوالوں کے آئینے میں بے سر و ساماں مجاہدین کے ہاتھوں ہارتی ہوئی دنیا کی واحد سپرپاور کا اصل چہرہ آج بھی نظر آتا ہے۔

حافظے کی کمزوری کے باوجود دنیا آج بھی نہیں بھولی کہ وہی انڈونیشیا جس کے گلی کوچوں میں گزارنے والے بچپن کی یادوں کا ذکر کرکے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کرنے کا ناٹک کرنے والے اوباما کے ملک امریکہ نے صدر سوئیکارنو سے نجات حاصل کرنے کیلئے کم و بیش پانچ لاکھ بے گناہ انڈونیشیوں کو قتل کروایا، اپنے پروردہ ایجنٹ شاہ ایران کے تحفظ کیلئے ایران میں لاکھوں انسانوں کو مروانے سے لے کر الجزائر کی منتخب حکومت کا تختہ الٹ کر اپنے چہیتوں کو اقتدار پر بیٹھانے، صومالیہ، کمبوڈیا اور لاوس کے در و دیوار کو خون سے رنگنے، سوڈان کی میڈیکل فیکٹری پر حملہ اور صدر عمرالبشیر کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کرنے، صابرہ و شتیلہ کیمپوں میں ابلیسی رقص

کا مظاہرہ کرنے والے اسرائیل کی سرپرستی کرنے، عراق کی تباہی و بربادی اور لاکھوں بچوں کو دودھ خوراک اور ادویات سے محروم کرنے اور بلکنے پر مجبور کرنے، افغانستان کے گلی کوچوں کو خون سے نہلانے، لیبیا کے صدر کی اقامت گاہ پر میزائل حملہ کرکے اس کی بچی کی جان لینے اور ہیروشیما اور ناگاساکی کی انسانیت سوز تاریخ رقم کرنے والا کوئی اور نہیں خود امریکہ ہی ہے۔

کیا آج یہ حقیقت نظرانداز کی جاسکتی ہے کہ امریکی سرپرستی، چشم پوشی اور مسلمانوں کے قتل عام پر معنی خیز خاموشی کی وجہ سے اسرائیل نے غزہ کو اور بھارت نے کشمیر کو آتش کدہ بنا رکھا ہے، لیکن ان میں سے کوئی بھی جرم، جرم اور واردات دہشت گردی کے زمرے میں نہیں آتی، کیونکہ ان سب کے پیچھے خود امریکہ بہادر کارفرما ہے اور امریکی لغت میں دہشت گردی کے معنی و مفہوم ہی کچھ اور ہیں اور کیوں نہ ہوں کہ طاقت کی دنیا کا یہی اصول اور قاعدہ ہوتا ہے کہ رعونت اور خون آشام طاقتیں الفاظ کے معنی و مفہوم بدل دیتی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ امریکہ نے آج جس چیز کو دہشت گردی کا نام دے رکھا ہے اس کی اصل حقیقت کچھ اور ہے لیکن وہ خود جس آزادی، جمہوریت اور انسانیت کا علمبردار ہے آج اس کے خونی نقوش ساری دنیا کے در و دیوار پر ثبت فرعونی ظلم و بربریت کا عملی نمونہ پیش کررہے ہیں، یہ ہے دنیا میں انصاف، امن اور عافیت اور مساوات کے حصول کیلئے امریکہ کے نئے، نرالے اور منفرد اصول، واہ

امریکہ، واہ۔۔۔۔

مصر میں بارک اوباما نے اپنے خطاب میں بین السطور یہ تاثر بھی دینے کی کوشش کی کہ نائن الیون کے واقعات کے بعد امریکہ اور مسلم دنیا کے درمیان دوریاں اور غلط فہمیاں پیدا ہوئیں، جنہیں دور کرنے کیلئے وہ کوشش کر رہے ہیں، دراصل اوباما کا خطاب الفاظ کی جادوگری تھا، سچ تو یہ ہے کہ اوبامہ کے تمام دلائل بودے، بیہودہ اور تضاد بیانی پر مبنی تھے، قصر ابیض کے سیاہ فام مکین نے دھوکہ دہی اور فراڈ سے دن کو رات ثابت کرنے کی کوشش کی اور کمال مہارت سے سچ کو جھوٹ کے پردوں میں چھپانے کی ناکام اداکاری کی مگر حقیقت یہ ہے کہ جھوٹ اس ننگے بدن کی مانند ہوتا ہے جس کی عریانی ہمیشہ اصل حقیقت کو بے نقاب کئے رہتی ہے۔

آج اوباما دعوی کرتے ہیں کہ وہ مسلم امہ کے ساتھ حالت جنگ میں نہیں ہیں، لیکن اس دعوی کے برعکس امریکہ نے عراق اور افغانستان پر قیامت سوز جنگی اسلحے سے اپنی داداگیری جما رکھی ہے، اسرائیلی یہودی بھیڑیوں کے روپ میں روزانہ معصوم فلسطینی بچوں، عورتوں اور بے گناہ فلسطینوں کا خون پیتے ہیں، اسرائیل کے اسلحہ خانے جوہری و جراثیمی ہتھیاروں سے بھرے ہوئے ہیں، مگر امریکہ کو مشرق وسطی کے اس خونی آدم خور ملک کے جوہری و کیمیائی ہتھیاروں

پر کوئی اعتراض نہیں، شمالی کوریا کا حالیہ ایٹمی دھماکہ امریکہ و مغرب کے لئے نہ تو
باعث تشویش ہے اور نہ ہی کرہ ارض کی قیادت کا خود ساختہ دعویٰ کرنے والوں کو شمالی
کورین بموں اور میزائلوں سے امن کے لئے کوئی خطرہ نظر آتا ہے، لیکن تہران کے
نامکمل جوہری توانائی کے منصوبوں نے امریکہ و اسرائیل کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں،
سوال یہ ہے کہ آخر امریکہ کی یہ تضاد بھری دوہری پالیسی کن امور کی نشان دہی کرتی
ہے۔

امریکی صدر نے اپنے دورہ مصر کے دوران مسلمانوں کے دل میں اپنے اور امریکہ کے
لیے نرم گوشہ پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی، لیکن ان پالیسیوں کا کیا کیا جائے جو
امریکہ نے عملی طور پر اپنا رکھی ہیں، اوباما نے اپنے پورے خطاب میں تنازع کشمیر کو
بڑی خوبصورتی سے گول کر دیا، جس کی بظاہر وجہ یہی نظر آتی ہے کہ وہ بھارت کی
ناراضگی کا خطرہ مول نہ لیتے ہوئے ایسا کر رہے ہیں، حالانکہ اپنی صدارتی انتخابی مہم کے
دوران انہوں نے واضح طور پر یہ عندیہ دیا تھا کہ وہ مسئلہ کشمیر کو ترجیحی بنیادوں پر حل
کرینگے اور صدارت کا حلف لینے کے بعد بھی انہوں نے تنازعہ کشمیر کے حل کا عندیہ دیا
تھا، تاہم اقتدار میں آنے کے بعد اوباما مصلحتوں کا شکار نظر آئے، ہمارا ماننا ہے کہ مسئلہ
کشمیر اور فلسطین کو حل کیے بغیر اوبامہ کا مسلم دنیا سے تعلقات کی بحالی یا نئے سرے سے
استوار کرنے کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں

ہو سکتا، اوباما کے خطاب سے کئی تضاد بیانی آشکارا ہوئیں، ایک طرف وہ مسلم برادری کی حمایت کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ اسرائیل کو مظلوم ظاہر کرتے ہوئے فلسطینوں کو تشدد روکنے کا کہہ کر دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتے ہیں، انہیں کشمیر یاد ہے اور نہ ہی فلسطین، نہ ہی وہ مظالم یاد ہیں جو یہودیوں نے فلسطینیوں پر روا رکھے ہوئے ہیں، کیا اوباما کے مظلوم کہہ دینے سے مسلم دنیا اسرائیل کو مظلوم مان سکتی ہے۔

ہماری نظر میں اس وقت دنیا میں دو ہی بڑے تنازعے ہیں جن کو حل کیے بغیر دنیا میں امن کا قیام ممکن نہیں، پہلا تنازع کشمیر اور دوسرا فلسطینی ریاست کے قیام میں اسرائیلی ہٹ دھرمی و رکاوٹ، کشمیریوں پر لاکھوں کی تعداد میں تعینات بھارتی فوج مظالم ڈھارہی ہے جبکہ نہتے فلسطینی مسلسل یہودیوں کی جارحیت کا شکار ہو رہے ہیں، اسرائیل غیر اعلانیہ ایٹمی قوت بن چکا ہے مگر اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا، بیان بازی کی حد تک ہر امریکی صدر ان تنازعات کے حل پر زور دیتا ہے مگر جب عملی اقدامات کرنے کی بات آتی ہے تو وہاں اسے بھارت اور اسرائیل کا خوف دامن گیر ہو جاتا ہے، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اسرائیل اور بھارت امریکی ایما پر پوری دنیا میں جارحیت کا پرچار کر رہے ہیں۔

آج اوباما جھوٹے ٹسوے بہا کر سانحہ نائن الیون میں تین ہزار امریکیوں کی ہلاکت کا رونا تو روتے ہیں لیکن وہ عراق و افغانستان میں استعماریت کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے بیس لاکھ سے زائد مسلمانوں کا زکر کرنا بھی مناسب نہیں سمجھتے۔ اوباما کا یہ کہنا کہ ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کی ہلاکت کا آئینہ دار ہے سو فیصد درست، مگر کوئی ہمیں یہ تو بتائے کہ اسرائیل امریکہ اور اتحادی قصابوں کے ہاتھوں شہید ہونے والے مسلمانوں کا خون ناحق کس کے کھاتے میں ڈالا جائے گا، مقام حیرت ہے کہ تباہی و بربادی پھیلانے والا امریکہ آج دنیا کو دہشت گردی کی بجائے امن و سلامتی کا گہوارہ بنانا چاہتا ہے، مگر یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ ظلم اور امن دونوں ایک ساتھ چلیں۔

آج بھی دنیا کے ستر فیصد لوگ امریکہ کو ظالم، دہشت اور جبر طاغوت کا علمبردار اور بانی سمجھتے ہیں، ان کا یہ خیال کہ امریکہ نے دنیا میں اپنی طاقت کے بل بوتے پر اپنی حاکمیت قائم کرنے کیلئے جو رویہ اپنایا ہوا ہے وہی دراصل فساد اور دہشت گردی کی اصل جڑ اور بنیاد ہے، امریکی صدر کی یہ بات بھی کسی جھوٹ اور مکر وفریب سے کم نہیں کہ جس دن افغانستان اور پاکستان میں دہشت گردی ختم ہو گئی وہ اسی روز امریکی فوجیوں کو واپس بلالیں گے، یوں لگتا ہے کہ بوکھلاہٹ میں اوباما نے ایک ہی سانس میں کئی راگ الاپ دیئے کہ وہ مسلم امہ کے ساتھ نئے اور مساویانہ تعلقات کی تجدید کرنا چاہتے ہیں اور

ایسی دوستی چاہتے ہیں جس میں بداعتمادی کا عنصر شامل نہ ہو، مگر وائٹ ہاوس کے سیاہ فام صدر نے اس کیلئے کسی ٹھوس اور عملی اقدام کا اعلان نہیں کیا، درحقیقت اوباما کا خطاب صرف خوشنما لفظوں کا ہیر پھیر تھا اور اس کی یہ تقریر اس خوبصورت فلم کی مانند تھی جس کی کہانی زمینی حقائق و سچائی سے بے نیاز لغویات، فریب اور دھوکہ دہی کے مناظر پر مشتمل ہے۔

محترم قارئین آپ کو یاد ہوگا کہ امریکی انتخابات کے موقع پر ہم نے لکھا تھا کہ جارج بش کے جانے اور بارک اوباما کے آنے سے مسلم دنیا کے حالات میں کوئی فرق نہیں آئے ہوگا اور نہ ہی امریکہ کی بنیادی پالیسی تبدیل ہوگی، آج یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آچکی ہے کہ امریکی صدر بارک اوباما صدر بش کی "وار آن ٹیرر" جو اسلام اور عالم اسلام کے خلاف تہذیبِ مغرب کی جنگ ہے اور جسے مغربی مفکرین سیاست چوتھی عالمی جنگ قرار دے رہے ہیں بدستور جاری رکھے ہوئے ہیں، فرق صرف اتنا ہوا ہے کہ اب ڈک چینی اور ڈونلڈ رمز فیلڈ کے بجائے جو بائیڈن، بزرنسکی اور ان کے ہم خیال یہودی حکمت کار امریکی پالیسی بنا رہے ہیں ، بارک اوباما کسی طور بھی پاکستان اور عالم اسلام کیلئے اپنے پیشروں سے مختلف ثابت نہیں ہوئے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ سابق صدر جارج بش سے زیادہ خطرناک عزائم کے مالک اور اسلام دشمن ہیں، لہٰذا نام نہاد دانشوروں کا یہ کہنا اور سمجھنا کہ بارک اوباما تبدیلی کے خواہاں اور عالم اسلام کے

ہمدرد و دوست ہیں محض خود فریبی اور خام خیالی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔
چونکہ خوش فہمی اور خوش گمانی ہمیشہ سے ہمارا خاصہ رہی ہے، جس کی وجہ سے ہم نے ہمیشہ یہ بات تو یاد رکھی کہ " دوست کا دوست، دوست اور دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے "لیکن ہم اصل بات کہ " دشمن کا دوست دشمن ہوتا ہے " بھول گئے۔ ہم اس بات پر تو بہت خوش ہیں کہ پاکستان بارک اوباما کیلئے اجنبی نہیں، ان کی والدہ پاکستان میں کام کرتی رہی ہیں اور وہ ایک مسلمان کا عیسائی بیٹا ہے، اس لحاظ سے شاید وہ ہمارے لئے کوئی نرم گوشہ رکھتا ہو، لیکن ہم سب سے اہم بات جو بھول رہے ہیں وہ یہ ہے کہ امریکہ امریکہ ہے اور امریکی، امریکی ہوتے ہیں، وہ کبھی بھی ہمارے دوست تھے ،نہ ہیں اور نہ، ہی ہونگے، امریکہ ہمارا ازلی دشمن اور عالم اسلام کی واحد ایٹمی قوت کی تباہی و بربادی چاہتا ہے، بارک اوباما اسی پاکستان دشمن امریکہ کا ایک وفادار شہری اور دنیا میں صلیبی اور صہیونی مفادات کا نیا محافظ ہے، جس کے نزدیک ان مفادات کے حصول اور دنیا پر امریکی برتری کیلئے دوسروں کی آزادی کو کچلنا اور ان کے وسائل پر قبضہ کرنا کسی طور بھی نا جائز نہیں ہے۔
لہذا ایک ایسا شخص جس کی ذمہ داری ہی دنیا میں صلیبی اور صہیونی مفادات کا تحفظ اور نگرانی ہو وہ کیونکر پاکستان اور عالم اسلام کا ہمدرد اور دوست

ہوسکتا ہے، چنانچہ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ " اسلام میں سور نجس اور حرام ہے، خواہ
اس کا رنگ سابق امریکی صدر" بش "کی طرح سفید ہو یا موجودہ امریکی صدر" بارک
اوباما" کی طرح سیاہ "لہذا حقیقت حال کو سمجھنے کیلئے خوش گمانیوں اور خود فریبی کے
دائرے سے باہر نکل کر یہ حقیقت لازمی اپنے پیش نظر رکھنا ہوگی کہ سور تو سور ہوتا
ہے، قد کاٹھ اور رنگ و نسل اس کے جائز اور حلال ہونے پر دلالت نہیں کرتے، ان
حقائق کے باوجود بھی اگر ہمارے ارباب اقتدار اور کاسہ لیس اہل فکر دانش کو اوباما سے
خیر، وفا اور ہمدردی کی امید ہے تو اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ "ہم بھی کیا لوگ
ہیں، جو فریب نظر کو بھی، آسودہ چشمی سے تعبیر کرتے اور سرابوں سے، صدیوں کی
" تشنہ لبی کو بجھانے پہ ایمان رکھتے ہیں، ہم بھی کیا لوگ ہیں۔

کاش پاکستان میں بھی ایسا ہوتا

وہ میرا بہت اچھا دوست تھا، ہم اکثر گھنٹوں بیٹھ کر قومی اور بین الاقوامی امور پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ سنجیدگی اور متانت سے لبریز مدلل اور تحمل آمیز انداز گفتگو ہمیشہ ہی سے اُس کا خاصہ رہا، لیکن آج بیرونی خطرات اور سنگین اندورنی حالات میں گھرے پاکستان کی مقروض معیشت، اُس پر حکومتی اراکین کی عیاشیاں، سرکاری خریداری میں کرپشن اور کمیشن پر وزیر اعظم کی موجودگی میں وفاقی وزراء کے ایک دوسرے پر لوٹ مار کے الزامات، سرکاری زمینوں پر قبضے اور انتہائی قیمتی اراضی کوڑیوں کی مول فروخت، آئین، قانون، عدلیہ اور پارلیمنٹ کی بے توقیری اور دیگر معاشرتی برائیوں کے تذکرے نے جیسے اُس کے ضبط کے سارے بندھن توڑ دیئے، اُس نے طنزیہ لہجے میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا، تمہیں معلوم ہے۔۔۔۔ جنوبی کوریا کے سابق ہر دلعزیز صدر روہمو ہیون جو 2003ء سے 2008ء تک عہدہ صدارت پر فائز رہے، نے پہاڑ سے چھلانگ لگا کر خود کشی کیوں کی؟ اُس نے کرکٹ کے چھکے کی طرح سوال میری جانب اچھال دیا اور گہری نظروں سے میرا جائزہ لینے لگا۔اِس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، وہ خود ہی جواب دیتے ہوئے کہنے لگا، کیونکہ وہ رشوت کے الزامات کا بوجھ برداشت نہ کرسکا، رشوت کے الزامات۔۔۔۔ میں نے اُس کی بات دہرائی، ہاں۔۔۔۔ رشوت کے الزامات۔۔۔۔ اُسے ملینز ڈالرز

کی بدعنوانی کے مقدمے میں رشوت ستانی کے الزام کے تحت انکوائری کا سامنا تھا اور کورین حکام اُس کے خلاف جوتوں کی کمپنی کے ایک دولت مند تاجر کی جانب سے اُس کی بیوی کو ایک ملین اور بھتیجی کو پانچ ملین ڈالرز دیئے جانے کے علاوہ ٹیکس چھپانے کے ایک معاملے کی بھی چھان بین کر رہے تھے۔

سابق صدر روہمو ہیون اِن الزامات کا سامنا نہ کرسکا اور اُس نے گھر کے قریب واقع پہاڑ سے ایک گہری کھائی میں چھلانگ کر خودکشی کرلی، اُس نے سوالیہ انداز میں مجھ سے پوچھا، کیا پاکستان میں کبھی ایسا ہوا کہ کسی شخص نے دورانِ تفتیش یا عدالت سے مجرم ٹھہرائے جانے کے بعد اپنے جرم کا کفارہ اِس طرح ادا کیا ہو؟ یا اُس نے اپنے ضمیر کی خلش اِس طرح دور کی ہو؟۔۔۔۔ مجھے معلوم ہے تمہارا جواب نفی میں ہوگا۔۔۔۔ کیا پاکستان میں کبھی ایسا ہوا کہ کوئی وزیر کوئی مشیر، کوئی اعلیٰ سرکاری عہدیدار سرکاری فنڈ کے غلط استعمال اور اپنے اختیارات سے تجاوز کے الزام میں خود ہی مستعفی ہوا ہو؟۔۔۔۔ یا اُسے کسی تادیبی کاروائی کا سامنا کرنا پڑا ہو؟۔۔۔۔ نہیں ناں۔۔۔۔ لیکن ابھی حال میں برطانیہ کے وزیر انصاف شاہد ملک فنڈز کے غلط استعمال کے الزامات عائد ہونے کے بعد مستعفی ہوئے اور برطانوی وزیر اعظم گورڈن براؤن نے اُن کے خلاف تحقیقات کا حکم بھی دیا اور تمہیں معلوم ہے کہ اِس انکشاف سے قبل برطانوی وزیر اعظم گورڈن براون حکمران لیبر پارٹی کے ایک رکن سابق

وزیر ایلیٹ مورلے کی رکنیت اِس وجہ سے معطل کر چکے تھے کہ مورلے پر الزام تھا کہ اُس نے پارلیمانی اخراجات کے زمرے میں سولہ ہزار پاونڈ اُس قرضے کے لیے رقم وصول کئے جو وہ پہلے ہی ادا کر چکا تھا۔

یہ کہہ کر اُس نے گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا اور پھر بولا، کیا پاکستان میں ایسا ہوتا ہے؟ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔۔۔۔ خاموشی کا وقفہ طویل ہوتا دیکھ کر میں نے اُس سے پوچھا کیسا ہوتا ہے۔۔۔۔؟ اُس نے ایک گہری سانس لی اور پھر گویا ہوا، جیسا چند برس قبل اٹلی کے شہر میلان میں ہوا تھا۔۔۔۔ میلان میں کیا ہوا تھا؟ میں نے متجس انداز میں اُس سے پوچھا، اُس نے خلا میں گھورتے ہوئے اپنی یادداشت کو جمع کیا اور بولا۔۔۔۔ یہ کوئی پانچ برس قبل کی بات ہے، اٹلی کے شہر میلان میں ہسپتال کی ایک عمارت گر گئی، تحقیقات پر معلوم ہوا کی عمارت کی تعمیر میں ناقص میٹریل استعمال ہوا تھا اور جس کمپنی نے یہ عمارت تعمیر کی تھی اُس کی شہرت بھی اچھی نہیں تھی، اُس نے ماضی میں جتنی بھی عمارتیں بنائیں، اُن میں تعمیراتی نقص پائے گئے، اِس صورتحال میں سوال یہ پیدا ہوا کہ پھر اِس بدنام فرم کو ٹھیکہ کس نے دیا، تحقیقات میں انکشاف ہوا کہ ٹاون میئر اِس ٹھیکے میں ملوث ہیں، چنانچہ مقدمہ مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوا، مجسٹریٹ نے میئر کو طلب کیا، سماعت ہوئی جرم ثابت ہو گیا اور مجسٹریٹ نے فیصلے کی تاریخ مقرر کر دی، اس سے پہلے کہ

مجسٹریٹ اپنا فیصلہ سناتا، میئر نے اپنا اثرو رسوخ استعمال کرکے فیصلے سے پہلے ہی مجسٹریٹ کے تبادلے کے احکامات جاری کروا دیئے، جس کی وجہ سے مجسٹریٹ کو چارج چھوڑنا پڑا، عوام کو جب اِس صورتحال کی خبر ہوئی تو وہ سڑکوں پر آ گئے اور پورا میلان شہر جام ہوگیا، عوام کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ مجسٹریٹ کو واپس لایا جائے۔

میلان کے عوام کا خیال تھا کہ جو مجسٹریٹ میئر کو عدالت میں بلا سکتا ہے وہ یقیناً ایک نڈر، بے باک اور ایماندار جج ہے اور میلان شہر کو ایسا افسر کھونا نہیں چاہیے، آنے والے دنوں میں عوامی احتجاج اِس قدر شدید ہوگیا کہ حکومت کو عوامی مطالبہ کے آگے اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا، مجسٹریٹ نے دوبارہ عدالت کا چارج سنبھالا، میئر کا کیس سنا اور انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے میئر کو سزا سنا دی، اب تم مجھے بتاؤ کیا پاکستان میں ایسا ہوتا ہے؟۔۔۔۔ کیا انصاف پسند بااصول ججوں کو کسی دباؤ کے بغیر آزادانہ فیصلے کرنے کا اختیار ہے؟۔۔۔۔ کیا ارباب اختیار عدالتی فیصلوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہیں کرتے؟۔۔۔۔ کیا ہماری عدالت کو یہ اختیار ہے کہ وہ کسی بھی بڑے صاحب اختیار شخص کو عدالت میں ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کرسکے، اُس سے سوال و جواب کرسکے، اسے قانون کے مطابق مجرم قرار دے سکے؟۔۔۔۔ اور کیا اس عمل کے بعد کوئی جج اپنے عہدے پر فائز رہ سکتا ہے؟۔۔۔۔

کیا پاکستان میں ایسا ہوتا ہے جیسا سویڈن کے بادشاہ کے ساتھ ہوا، میں نے چونک کے اس کی طرف دیکھا لیکن اس نے اپنی بات جاری رکھی وہ کہہ رہا تھا کہ "ایک مرتبہ سویڈن کے شاہ اپنے چند سالہ پوتے کے ہمراہ لانگ ڈرائیو پر نکلا، راستے میں پوتے نے دادا کی گود میں بیٹھنے کی خواہش کی، جس پر دادا نے اُسے اپنی گود میں بیٹھا لیا، بادشاہ کی یہ حرکت ایک ٹریفک سارجنٹ دیکھ رہا تھا اُس نے بادشاہ کی گاڑی رکوائی اور پوتے کو بادشاہ کی گود سے اٹھا کر پچھلی سیٹ پر بیٹھاتے ہوئے ادب سے سر جھکا کر بادشاہ کو مخاطب کیا "ہز ایکسی لینسی، قانون توڑنا مجرموں کا کام ہوتا ہے، بادشاہوں اور حکرانوں کا نہیں " اور شاہ کا چالان کاٹ کر اُن کے ہاتھ میں پکڑا دیا، تم بتاؤ کیا پاکستان میں ایسا ہوتا ہے؟ کیا ہمارے کسی ٹریفک سارجنٹ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ قانون کی خلاف ورزی پر وہ کسی وزیر، کسی مشیر، کسی اعلیٰ حکومتی عہدیدار یا کسی صدر اور کسی وزیر اعظم کی گاڑی روک سکے، انہیں قانون کے احترام کا درس دے سکے اور ان کا چالان کر سکے؟۔۔۔۔ نہیں ناں۔۔۔۔ اُس نے میرے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

کیا پاکستان میں ایسا ہوتا ہے جیسا ایران میں ہوا۔۔۔۔ تمہیں معلوم ہے کیا ہوا تھا؟ اس نے میری طرف دیکھا اور بولا، موسیٰ حسین ایران کا ایک تاجر

تھا جو اکثر کاروبار کے سلسلے میں دبئی کے راستے نیویارک جاتا رہتا تھا، ایک بار نیویارک کے ہوائی اڈے پر امریکی سیکورٹی ایجنسی کے لوگوں نے اس کے ساتھ نہایت ہتک آمیز سلوک کیا، اُس کو برہنہ کرکے جامہ تلاشی لی گئی، پوچھ گچھ کے نام پر کئی گھنٹے زیر حراست رکھ کر سخت ناروا سلوک کیا گیا، بلڈ پریشر اور شوگر کے مریض ہونے کی وجہ سے اُس کی طبیعت خراب ہوگئی اور اسے چار دن ہسپتال میں گزارنے پڑے، ایران واپسی پر اُس نے اپنے ساتھ شرمناک امریکی سلوک کی روداد مقامی اخبارات میں اس مطالبے کے ساتھ شائع کرادی کہ "اگر امریکی ادارے امریکہ میں ایرانیوں کی تلاشی لے سکتے ہیں اور اگر امریکہ میں ایرانیوں کے فنگر پرنٹس لازمی ہیں تو ایران میں ایسا کیوں نہیں ہوسکتا"، موسیٰ حسین کا مطالبہ اخبارات سے نکل کر پارلیمنٹ پہنچ گیا اور بالآخر بحث و مباحثہ کے بعد انیس نومبر 2006ء کو ایک قانون کہ "2007ء سے ایران کی حدود میں داخل ہونے والے تمام امریکی شہریوں کے فنگر پرنٹس لئے جائیں گے" کی شکل اختیار کرگیا، گو کہ ایرانی پارلیمنٹ اِس قانون کو منظور کرچکی تھی لیکن ایرانی صدر محمود احمدی نژاد کے اس پر کچھ تحفظات تھے، ان کا خیال تھا کہ ایران کے اختلافات امریکی حکومت سے ہیں امریکی عوام سے نہیں، اس قانون سے مسافروں اور سیاحوں کو تکلیف ہوگی، جس سے ایران اور امریکہ کے سفارتی تعلقات خراب ہوجائیں گے، اُن کا خیال تھا کہ اس قانون سے امریکی مہمانوں کے میزبانوں کو بھی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا اس لئے اس قانون

سے پرہیز کیا جائے۔

چنانچہ انہوں نے اس قانون کے خلاف گارڈین کونسل (جو کہ ایرانی دستور کے مطابق چھ سیاسی لیڈر اور چھ عدالتی ارکان پر مشتمل ایک ایسا ادارہ ہے جو کسی بھی قانون کو ویٹو کرسکتا ہے) میں اپیل کردی، گارڈین کونسل کے ارکان نے صدر کی اپیل کا جائزہ لیا اور اتفاق رائے سے صدر کی درخواست مسترد کرتے ہوئے کہا کہ "امریکہ میں ایرانیوں سمیت دنیا بھر کے مسلمانوں کو روز شرمندگی ہوتی ہے، اگر امریکی اس شرمندگی کا تھوڑا سا حصہ لے لیں تو قیامت نہیں آجائے گی، چونکہ ایرانی پارلیمنٹ قانون پاس کرچکی ہے، لہٰذا کوئی امریکی شہری اب اِس سے مستثنیٰ نہیں ہوگا" میں تم سے پھر وہی پوچھوں گا کہ کیا پاکستان میں ایسا ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے؟۔۔۔۔ کیا ہماری پارلیمنٹ ایسی ہے کہ کوئی بل، کوئی قرارداد، کوئی قانون پاس کردے تو صدر مملکت سمیت تمام حکومتی عہدیدار اُس کا احترام کریں، اُس پر نہ صرف خود بلکہ تمام انتظامی محکموں کو بھی عمل درآمد کا حکم دیں۔۔۔۔ نہیں، ایسا نہیں ہے، ہماری پارلیمنٹ آزاد ہے نہ سپریم ہے، نہ ہی وہ خود کوئی فیصلہ کرسکتی ہے اور نہ ہی کبھی اُس کے کئے گئے؟ فیصلوں پر حکومت وقت نے خوشدلی سے عمل کیا۔

بدقسمتی سے آج تک ایسا نہیں ہوا۔۔۔۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا، میں نے

خاموشی سے اُس کے چہرے کا جائزہ لیا، جس پر کرب، اذیت، مایوسی، محرومی اور حسرت ویاس کے سائے بکھرے تھے، اُس نے ایک بار پھر چبھتی ہوئی نگاہیں میرے چہرے پر گاڑتے ہوئے سوال کیا، کیا پاکستان میں ایسا ہوتا جیسا عالم اسلام کے دشمن اسرائیل میں ہوتا ہے، کہ جہاں ایک یہودی خاتون سے جنسی زیادتی کی شکایت پر پولیس اسرائیلی صدر موشے کاتساو کے دفتر پر ریڈ کرتی ہے، تفتیش کیلئے صدر کے کاغذات اور کمپیوٹر کو اپنے قبضے میں لے لیتی ہے، صدر پر الزامات کا جائزہ لینے کیلئے اعلیٰ سطح پر تحقیقات کا آغاز ہوتا ہے، اس دوران، سات ستمبر 2006ء کو صدر موشے کاتساو کو نئے الیکشن کمشنر سے ایوان صدر میں حلف لینا تھا لیکن چونکہ اُس دن تفتیش تھی اور اسرائیلی قانون کے مطابق کوئی زیر تفتیش ملزم پولیس کی اجازت کے بغیر تفتیش سے غیر حاضر نہیں ہوسکتا، پولیس کے مطابق جب تک یہ تفتیش جاری رہے گی اُس وقت تک صدر موشے کاتساو کی تمام سرکاری مصروفیات معطل رہیں گی اور وہ پولیس کی اجازت کے بغیر کسی جگہ نہ جاسکتے ہیں اور نہ ہی کسی تقریب میں شرکت کر سکتے ہیں، لہٰذا صدر تقریب حلف برداری میں شرکت سے معذور تھے، انہوں نے پولیس چیف سے تقریب میں شرکت کی اجازت چاہی لیکن پولیس چیف نے اجازت دینے سے انکار کردیا۔

چنانچہ صدر نے پارلیمنٹ سے معذرت طلب کی اور اسرائیلی تاریخ میں پہلی بار حلف برداری کی یہ تقریب ایوان صدر کے بجائے پارلیمنٹ میں منعقد ہوئی اور

الیکشن کمشنر سے صدر کے بجائے پارلیمنٹ نے حلف لیا، تمہیں معلوم ہے۔۔۔۔اُس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا، اُس دن پولیس نے اسرائیل صدر موشے کاتساو سے نو گھنٹے تفتیش کی اور پولیس کی یہ تفتیش صبح دس بجے سے شام سات بجے تک جاری رہی، کیا پاکستان میں ایسا ہوتا ہے کہ پولیس کسی برسر اقتدار صدر کے خلاف مقدمہ درج کر سکتی ہے؟۔۔۔۔ گورنر، وزیر اعلیٰ ہاوس، ایوان صدر اور وزیر اعظم ہاؤس میں تفتیش کیلئے داخل ہو سکتی ہے؟۔۔۔۔ وہ گورنر، وزیر اعلیٰ، صدر اور وزیر اعظم کے کاغذات اور کمپیوٹرز تفتیش کیلئے اپنے قبضے میں لے سکتی ہے؟۔۔۔۔ کیا وہ ملک کے صدر یا دیگر اعلیٰ سرکاری عہدیداروں سے نو نو گھنٹے تفتیش کر سکتی ہے؟۔۔۔۔ کیا دوران تفتیش ہمارا صدر اور دیگر عہدیدار سرکاری تقریب میں شرکت کیلئے پولیس چیف کی اجازت کے محتاج ہیں اور کیا ہماری پولیس کو یہ اختیار ہے کہ وہ اگر چاہے تو صدر یا کسی بھی زیر تفتیش سرکاری افسر کو اجازت دینے سے انکار کر دے؟۔۔۔۔ یقیناً اس بار بھی تمہارا جواب نفی میں ہوگا، کیونکہ حقیقت یہی ہے، میرے دوست۔۔۔۔ میں تمہیں دنیا کے غیر اسلامی ملکوں سے ایسی بے شمار مثالیں دے سکتا ہوں، لیکن تم مجھے اپنے دیس کی شاید ہی کوئی ایک مثال دے پاؤ۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دنیا میں صرف وہی قومیں قائم و دائم رہتی ہیں جو اپنی آزادی کا تحفظ کرنا جانتی ہیں اور ایمان و یقین کے ساتھ دنیا میں سر

اٹھا کر جیتی ہیں، اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، کیا تم جانتے ہو پاکستان میں ایسا کیوں نہیں ہوتا۔۔۔۔ اس لئے کہ ہم نے اپنی قومی غیرت، اپنی آزادی اور اپنی خود مختاری غیروں کے ہاتھوں گروی رکھ دی ہے، اُس کا سودا کردیا ہے اوراپنی سالمیت اور خود مختاری پر سودے باری کرنے والوں کو دنیا جوتے کی نوک پر رکھتی ہے، آج ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے حکمران امریکہ کے کاسہ لیس اور غلام ہیں کا اختیار نہیں رکھتے، تم خود "Baggers are not choosers" اور غلام اور بھکاری ہی بتاؤ۔۔۔۔ وہ قوم۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ وہ حکمران۔۔۔۔ جو محض چند ڈالروں کے عوض اپنے ضمیر، اپنی انا، اپنی قومی و ملی اقدار کا سودا کردیں اور اپنی عزت نفس کو غیروں کے ہاتھوں گروی رکھ دیں، کیا وہ ایسا کر سکتے ہیں؟ اُس نے جواب طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔۔۔۔ لیکن میرے پاس سوائے نفی میں سر ہلانے کے۔۔۔۔ کوئی جواب نہیں تھا، اُس لمحے بس دل و دماغ میں ایک ہی سوال گردش کرکے روح کو کچوکے لگا رہا تھا کہ۔۔۔۔ کاش پاکستان میں بھی ایسا ہوتا، کاش۔۔۔۔ پاکستان میں بھی ایسا ہوتا۔۔۔۔!

ایک ہی راستہ

جمہوریت یا آمریت دوستی

پاکستان مسلم لیگ (ن) کے قائد میاں محمد نواز شریف نے ایک بار پھر اس مطالبے کا اعادہ کیا ہے کہ سابق صدر پرویز مشرف کے خلاف آئین توڑنے کا مقدمہ چلایا جائے۔ دبئی میں ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ عدالتی فیصلے پر عملدرآمد نہ کرنا ملک دشمنی ہے۔ مشرف کیخلاف کارروائی کیلئے اتفاق رائے پیدا کرنا ان کا دفاع کرنے کے برابر ہے۔ میاں محمد نواز شریف نے کہا کہ 62 برسوں میں ملک پر 33 سال آمریت کا راج رہا، ہر آمر نے ہمیشہ عدلیہ کو نشانہ بنایا، حکومت آج آمریت کی نشانیاں ختم کرنے کی طرف توجہ دینے کے بجائے ان کو تقویت دی جارہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ 31 جولائی2009 کا دن ہماری تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ جب ایک ڈکٹیٹر کے اقدام کو آئین اور قانون کیخلاف قرار دیا گیا، اگر سپریم کورٹ کے اس فیصلے کی روح کے مطابق عمل کیا گیا تو آمریت کا دروازہ ملک میں ہمیشہ کیلئے بند ہو جائے گا۔ نواز شریف کا کہنا تھا کہ عدالتی فیصلے کے باوجود اگر حکومت حرکت میں نہیں آتی اور آئین کا دوبارہ گلا گھونٹنے والے ڈکٹیٹر کو کٹہرے میں نہیں لاتی تو یہ آئین اور جمہوریت سے دشمنی اور آمریت سے دوستی ہوگی۔

گزشتہ دنوں قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف چوہدری نثار علی خان نے بھی اسی مطالبے کو دہراتے ہوئے کہا تھا کہ ان کی جماعت مشرف کے خلاف غداری کا مقدمہ چلانے کے لئے تحریک لائے گی، جس پر وزیر اعظم سید یوسف رضا گیلانی نے پارلیمنٹ کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اس حوالے سے ایک متفقہ قرارداد سامنے لائے، یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہمارے ملک میں اگر کوئی غریب آدمی کسی معمولی جرم کا مرتکب ہو تو اس کیلئے تو قانون فوراً حرکت میں آجاتا ہے لیکن ایک ایسا ڈکیٹیٹر جو آئین توڑ کر اس ملک اور عوام کے مقدر کو اندھیروں میں دھکیل دیتا ہے اسے مکمل پروٹوکول کے ساتھ رخصت کیا جاتا ہے اور اسے قرار واقعی سزا دینے میں حکومت متفقہ قرار داد لانے کا مطالبہ کرتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ 18 فروری کے انتخابات نے ایک ایسی پارلیمنٹ کو جنم دیا تھا، جس کے حوالے سے عوام کو امید تھی کہ منتخب نمائندے وہ فیصلے صادر کریں گے، جو ملک کے استحکام اور عوام کی امنگوں کے ترجمان ہوں گے، لیکن بدقسمتی سے حکمران جماعت اپنے اتحادیوں سمیت اب تک پارلیمنٹ کو خود مختار بنانے میں اس وجہ سے کامیاب نہیں ہوسکی کہ آئین میں وہ سابقہ آمرانہ ترامیم اب تک موجود ہیں جن کے سوتے ایوان صدر سے پھوٹتے ہیں اور جن کے سہارے ایک ڈکیٹیٹر نے آئین کا حلیہ بگاڑ کر ملک کے آئین کو ایوان صدر کے زیر نگیں کردیا تھا۔

اس وقت پارلیمنٹ میں حکمران جماعت سمیت تمام سیاسی جماعتیں اس بات پر متفق ہیں کہ 17 ویں ترمیم اور اٹھاون ٹو بی کا خاتمے کے بغیر جمہوریت کی گاڑی کو آگے بڑھانا ممکن نہیں ہے، لیکن اس حقیقت کے ادراک کے باوجود پونے دو سال گزرنے کے بعد بھی ان آمرانہ ترامیم کا موجود ہونا ایک ایسا سربستہ راز ہے جس کے کھلنے کے امکانات دور دور تک نظر نہیں آرہے، جبکہ حکمران جماعت میں وزیراعظم سمیت تمام مقتدر شخصیات بارہا اس عزم کا اظہار کرچکی ہیں کہ جلد ہی ان ترامیم کا خاتمہ کردیا جائے گا، لیکن افسوس کہ جلد از جلد ان ترامیم کے خاتمے کیلئے ٹھوس لائحہ عمل مرتب کرنے کے بجائے کمیٹیوں کے قیام کے ذریعے اس اہم کام کو لٹکایا جارہا ہے، جس کی وجہ سے اب عوام بھی موجودہ حکومت کو گزشتہ حکومت کا تسلسل قرار دینے پر مجبور ہوتے جارہے ہیں۔

دوسری طرف پارلیمنٹ کا ہر فیصلے کے لیے بظاہر ایوان صدر کی طرف دیکھنا، جن شکوک وشبہات کو جنم دے رہا ہے وہ نہ صرف پارلیمنٹ کے لیے بلکہ ایوان صدر کے لیے بھی کوئی مستحسن عمل نہیں ہے، گزشتہ دنوں حکمران جماعت کی سیکرٹری اطلاعات کا ٹی وی مذاکرے میں یہ بیان بھی جمہوریت پسند حلقوں کیلئے خاصہ حیران کن تھا کہ ہماری جماعت ایوان وزیراعظم اور ایوان صدر میں اختیارات کا توازن چاہتی ہے، چنانچہ ان حالات میں حکومت کو چاہیے کہ وہ ان ترامیم کے

جلد خاتمے کے لیے مثبت اور ٹھوس منصوبہ بندی کرے کیونکہ پارلیمنٹ میں ان آمرانہ
ترامیم کے حمایت میں ایک بھی سیاسی جماعت نظر نہیں آتی۔
اس لیے یہ کہنا کہ شاید اکثریت دستیاب نہیں ہوگی، ایک بے معنی سی بات ہو کر رہ
جاتی ہے، صرف دو بڑی سیاسی جماعتیں پاکستان پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) ہی اگر
ان ترامیم کا خاتمہ کرنے کا تہیہ کرلے تو جمہوریت کے مستقبل کو مستحکم کرنے والی ان
ترامیم کو ختم ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔
یہاں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ اعلیٰ عدلیہ کے فیصلے نے نظریہ ضرورت کو ہمیشہ
کیلئے دفن کرتے ہوئے عدلیہ کے اجلے دامن پر لگے داغوں کو مٹانے میں اہم کردار ادا
کیا ہے اور آج پاکستان کو 60 سالوں کی صبر آزما آزمائش کے بعد ایسی عدلیہ میسر آئی
ہے جس کی بدولت پاکستان دنیا کے سامنے اپنا سر فخر سے بلند کر سکتا ہے، بلاشبہ ہماری
اعلیٰ عدلیہ نے جو اصولی مؤقف اپنایا ہے وہ قانون اور انصاف کے تقاضوں کے عین
مطابق ہے، کیونکہ انصاف کا تقاضا یہ کہتا ہے کہ انصاف کی بروقت فراہمی کو یقینی بنایا
جائے اور انصاف ایسا ہو جو نظر بھی آئے۔
،اعلیٰ عدلیہ نے فیصلوں کے معیار پر سمجھوتہ نہ کرنے کا جو عزم ظاہر کیا ہے

معزز عدلیہ نے اس کام کا آغاز اپنی خود احتسابی سے کیا ہے، 76 پی سی او ججوں کو فارغ کرنا اور ماتحت عدالتوں کے کرپشن میں ملوث ججوں کے خلاف تادیبی کارروائی کا آغاز اس کا بات کا منہ بولتا ثبوت ہے، اس تاریخ ساز فیصلے کے بعد مشرف کے گرد گھیرا مزید تنگ ہوتا جارہا ہے، جبکہ لندن میں اس پر انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور دیگر جرائم جن میں 12 مئی، اکبر بگٹی کا قتل اور سانحہ لال مسجد شامل ہیں اور پاکستانیوں کو ڈالروں کے عوض امریکہ کے سپرد کرکے انہیں عقوبت خانوں میں پہنچانے اور عافیہ صدیقی جیسے بے شمار بے گناہوں کو امریکی استعمار کے حوالے کرنے جیسے جرائم کی طویل فہرست ہے،۔برطانوی عدالتوں میں کیس چلانے کی تیاریاں جاری ہیں، جبکہ حکومت کی طرف سے بھی مشرف کے خلاف آرٹیکل 6 اور 244 کے تحت مقدمہ چلانے کی باتیں سامنے آرہی ہیں۔

دوسری طرف اٹارنی جنرل لطیف کھوسہ کا بھی کہنا ہے کہ پارلیمنٹ کی سادہ اکثریتی قرارداد سے سابق صدر پرویز مشرف پر مقدمہ چلایا جاسکتا ہے، درحقیقت اس وقت صرف پرویز مشرف کے ٹرائل کا کیس ہی نہیں پارلیمنٹ کے ذمہ سپریم کورٹ نے ایسے آرڈیننس بھی لگائے ہیں جن پر پارلیمنٹ کو 120 روز میں فیصلہ کرنا ہے یہ تمام 37 آرڈیننس سابق آمرانہ دور کی سیاہ نشانیاں ہیں، حالیہ تاریخی فیصلے کی گونج ابھی تک سنائی دے رہی ہے جس میں سابق آمر مشرف کے 3 نومبر کے

اقدامات کو غیر آئینی قرار دیدیا گیا تھا۔

اب جبکہ عدلیہ کی تاریخ میں پہلی بار سپریم کورٹ نے ایک یادگار تاریخی اور متوازن فیصلہ سنایا اور سپریم کورٹ کے 14 رکنی بینچ نے جنرل پرویز مشرف کے ان اقدامات کو غیر آئینی قرار دیتے ہوئے عوام کی منتخب پارلیمنٹ کو امتحان میں ڈال دیا ہے، سے ثابت ہوتا ہے کہ مشرف نے آئین کی پامالی کے مرتکب ہوئے ہیں، ایسے میں ایک آئین توڑنے والے شخص کو 12 رکنی سیکیورٹی فوجی ٹیم کی فراہمی نہ صرف فوجی قواعد وضوابط کے خلاف ورزی ہے بلکہ قومی خزانے پر بھی بوجھ ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت قواعد وضوابط کی پاسداری کرتے ہوئے سابق آمر کو دیا گیا پروٹوکول فی الفور واپس لے۔

یہ حقیقت ہے کہ 1973 کا آئین جو قوم کے منتخب نمائندوں نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے تیار کیا تھا، اس آئین میں ترمیم اور اضافے کا اختیار صرف منتخب پارلیمنٹ کو ہے، یہ آئین پارلیمنٹ کے پاس قوم کی ایک مقدس امانت ہے، ایک ایسا شخص جس نے اکتوبر 1999 میں اور پھر 3 نومبر 2007 کو دو دفعہ اس مقدس امانت میں 12 خیانت کی ہو، قوم کے منتخب نمائندوں کی امانت کو دو دفعہ پیروں تلے روندھا ہو، دو دفعہ آئین کی بے حرمتی کی ہو۔

سوال یہ ہے کہ ایسے مجرم کو سزا کون دے گا، جناب وزیر اعظم کے بقول اب پارلیمنٹ اپنا کردار ادا کرے گی، کیا واقعی پاکستان کی پارلیمنٹ میں اتنی غیور ہے کہ وہ 17 کروڑ عوام کی امانت میں خیانت کرنے والے شخص کو انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کر سکے گی، سکندر مرزا، ایوب خان، یحییٰ خان اور جنرل ضیاء الحق تو گزر چکے ہیں لیکن 12 اکتوبر 1999 کا مجرم ابھی زندہ ہے، اگر آج اس کو سزا نہ ملی تو پھر آئندہ کیسے کسی طالع آزما کا راستہ روکا جا سکے گا، عوام حکومتی اقدامات کے منتظر ہیں، آج جب ایک طویل آمریت کے بعد اس ملک کی لاچار عوام نے اپنے ووٹ کی طاقت سے اپنے منتخب نمائندوں کو پارلیمنٹ میں پہنچا دیا ہے، تو یہ سوال بڑے زور و شور سے اٹھ رہا ہے کہ کیا پارلیمنٹ بااختیار اور آزادانہ فیصلے کرنے کی مجاز ہے ؟اور کیا ہماری جمہوری حکومت ان سنگین جرائم پر سابق آمر کا احتساب کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے ؟

وزیر اعظم نے " متفقہ " قرار داد کی " بیخ " لگا کر ویسے ہی اس کام کو ناممکنات کی جانب دھکیل دیا ہے کیونکہ مسلم لیگ (ق) اور ایم کیو ایم مشرف کے خلاف کسی کارروائی کا حصہ نہ بننے کا اعلان کر چکی ہیں، جس کی وجہ سے مشرف کیخلاف کاروائی بظاہر مشکل نظر آرہی ہے، لیکن اگر عوام سے رائے لی جائے تو عوام کی ایک بڑی اکثریت مشرف کو کٹہرے میں لانے کی حامی ہے، لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس حوالے سے ساری جمہوری قوتیں سابق آمر کو کڑے احتساب سے گزارنے کی

تگ و دو کریں تاکہ آئندہ کوئی ڈکٹیٹر اس قسم کی حرکت کرنے سے پہلے باز رہے۔
بد قسمتی سے پاکستان میں بنیادی مسئلہ ہی یہ رہا ہے کہ جب کوئی بڑا قانون کو توڑتا ہے تو اسے معاف کر دیا جاتا ہے لیکن جب کوئی عام آدمی قانون توڑتا ہے تو اسے سزا دی جاتی ہے، جنرل پرویز مشرف ایک قومی مجرم ہے، لیکن حیرت کی بات ہے کہ حکومت ایک آمر کو اسکے گناہوں کی سزا دینے سے گریز کر رہی ہے، اور ہمارے حکمران آئین کے آرٹیکل نمبر 6 پر بھی عمل کرنے کو تیار نظر نہیں آتے، جبکہ اس کے برخلاف آمروں کو جب بھی موقع ملا انہوں نے مقبول لیڈروں کو ملک بدر کرنے، پھانسی دینے اور شہید کرنے سے گریز نہیں کیا، پیپلز پارٹی ایک جمہوری، نظریاتی اور ایک انقلابی جماعت ہے جس نے اس قوم کو پہلا متفقہ آئین دیا، پیپلز پارٹی کے لیڈروں کا فرض ہے کہ وہ آئین کا دفاع کریں اور اس پر عملدرآمد کو یقینی بنائیں۔
عدلیہ کی آزادی اور آئین کی بالادستی اس بات کی متقاضی ہے کہ عدلیہ کے فیصلے کو اسکے منطقی انجام تک پہنچایا جائے، کیونکہ یہ کارروائی سپریم کورٹ کے فیصلے کی روشنی میں جنرل پرویز مشرف کے خلاف ہے، فیصلہ حکومت نے نہیں بلکہ عدالت نے دینا ہے پھر بھی حکومت پس و پیش کا شکار ہے، جس کی وجہ وہ شخص ہے جس نے پاکستان اور اس کے عوام کو تباہی و بربادی کے کنارے تک

پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، آزادانہ سابق صدر کے مکمل پروٹوکول کے ساتھ
باہر ملکوں میں گھوم کر ہماری بے چارگی اور بے بسی کا مذاق اڑا رہا ہے۔
جبکہ عوام کی تائید و حمایت سے منتخب پارلیمنٹ ابھی تک اس بحث میں پھنسی ہوئی ہے
کہ اس کا ٹرائل کیا جاسکتا ہے یا نہیں، اس حالات میں میاں نواز شریف اور چوہدری نثار
علی خان کا یہ کہنا بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ اگر پارلیمنٹ یہ کام نہ کر سکی تو پھر کوئی
اور کرے گا، مارشل لاء آتے رہیں گے اور عوام یونہی ذلیل و خوار ہوتے رہیں گے،
آج اگر پارلیمنٹ کو یہ زعم ہے کہ وہ ربر سٹیمپ نہیں بلکہ ایک سپریم ادارہ ہے تو مشرف
کے بارے میں فوری فیصلہ کرے ورنہ اس کے سپریم اور بالادست ہونے کے تمام
دعوے ہواؤں میں بکھر جائیں گے اور موجودہ پارلیمنٹ بھی ماضی کا حصہ بن جائے گی۔
اس وقت عوام کی نظریں اپنے منتخب نمائندوں پر لگی ہوئی ہیں کہ وہ کب انہیں
اندھیروں اور تباہی کے راستے پر ڈالنے اور امریکی خوشنودی کی خاطر ملک کو دہشتگردی
کی نام نہاد جنگ میں جھونکنے والے آمر پرویز مشرف کا محاسبہ کرتے ہیں، عوام کے تیور
بتا رہے ہیں کہ وہ قومی مجرم کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے بے چینی سے
انتظار کر رہے ہیں، اس صورتحال میں کہ جبکہ

اعلیٰ عدلیہ اس کے جاری کردہ آرڈیننسوں کو قبول کرنے یا نہ کرنے پر ٹائم فریم دے چکی ہے اور وقت کو متعین کرتے ہی الٹی گنتی شروع ہو جاتی ہے، اب عوام کی امنگوں پر پورا اترنے کے علاوہ پارلیمنٹ کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں۔
حالات بتارہے ہیں کہ پرویز مشرف کیلئے پاکستان اور برطانیہ دونوں ممالک میں برا وقت شروع ہوچکا ہے، اس بار اگر ہماری پارلیمنٹ ایک طالع آزما کو انجام سے دوچار کرنے میں کامیاب ہو گئی تو پھر آمریت کا باب ہمیشہ کیلئے بند ہو جائے گا، ورنہ چوہدری شجاعت کے بقول مارشل لاء کے لیے ایک جیپ اور دو ٹرکوں کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن اگر جمہوری ادارے ٹھان لیں تو پھر آمریت کا راستہ ہمیشہ کے لیے روکا جاسکتا ہے، اگر اٹلی اور برطانیہ کے آمروں کو قبروں سے نکال کر نشان عبرت بنایا جاسکتا ہے، تو پھر پاکستان میں کیا امر مانع ہے کہ ایک آمر اور قومی مجرم کو نشان عبرت نہ بنایا جاسکے ؟

چنانچہ موجودہ حالات میں ضرورت اس امر کی ہے کہ حکمران جماعت شہیدوں کے مشن کو آگے بڑھانے کے ساتھ ساتھ آمروں کے احتساب میں بھی سنجیدگی اختیار کرے، اور ان عناصر کے خلاف بھی سخت کاروائی کرے جو آمریت کی باقیات اور جمہوریت کیلئے سنگین خطرہ ہیں، یاد رکھئے آج ملک میں جمہوریت کا استحکام اور جمہوری

اداروں کی مضبوطی اور مستقبل میں جمہوری اداروں کو طالع آزماؤں کی مہم جوئی سے
بچانے کیلئے عزم، حوصلہ اور جرات مندی کی شدید ضرورت ہے۔ اس وقت پاکستان کی
موجودہ پارلیمنٹ عوام کی عدالت میں کھڑی ہے عوام اسکی جانب دیکھ رہے ہیں کہ وہ
جمہوریت اور آمریت دوستی میں سے کس راستے کا انتخاب کرتی ہے۔

امریکہ ناقابل اعتبار اور بے وفا دوست ہے

کہہ مکرنیوں کی داستان۔۔۔۔پاک امریکہ دوستی

آج کے دور میں دوستی، وفا اور بے وفائی کے معنی و مفہوم کو کسی لغت کے سہارے کے بغیر پاکستان کے حوالے سے امریکی کردار کو سامنے رکھ کر باآسانی نہ صرف سمجھا جاسکتا ہے بلکہ اور اس حوالے سے امریکی کردار و عمل کو اس کی عملی تفسیر اور مثال کے طور پر پیش بھی کیا جاسکتا ہے، گو کہ امریکہ نے پاکستان کے حوالے سے ہمیشہ اپنے دوست ہونے کا دم بھرا اور ہمارے حکمران بھی امریکی دوستی کے دعوؤں میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے رہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ امریکہ اور پاکستان دوستی کے تانے بانے ہمیشہ ہی امریکی ترجیحات اور مفادات کے گرد گھومتے رہے، جب امریکہ کا مطلب اور مفاد ہوا، اس نے پاکستان کو اپنی دھونس، دھاندلی، بدمعاشی اور دوستی کا جھانسہ دے کر استعمال کیا اور جب اس کا کام نکل گیا، امریکہ نے کسی طوطا چشم کی طرح پاکستان کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں، لیکن آئینہ کی طرح اس شفاف اور واضح حقیقت کے باوجود ہمارے حکمران قومی مفادات اور ترجیحات کو پس پشت ڈال کر ہمیشہ ہی امریکی کاسہ لیسی میں آگے آگے رہے اور انھوں نے اپنے آپ کو امریکی دوست باالفاظ

دیگر امریکی غلام ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں چھوڑا، جس کا نتیجہ تباہی و بربادی کی صورت میں آج ہمارے سامنے موجود ہے۔

ایک معروف سیاسی تجزیہ نگار کے مطابق پاک امریکہ تعلقات کے موجودہ دور کا آغاز انیس سو پچاس میں پاکستانی وزیر اعظم لیاقت علی خان کے دورہ امریکہ سے ہوا، جو مارچ دو ہزار میں سابق صدر ہنری کلنٹن کے دورہ بھارت پر ختم ہوا، امریکہ نے ابتدائی چار سال انیس سو پچاس سے انیس سو چوون تک پوری کوشش کی کہ وہ پاکستان، بھارت اور افغانستان کے حوالے سے یکساں پالیسی اختیار کرے، اس دوران امریکہ نے یہ بھی کوشش کی کہ یہ تینوں ممالک مل کر دوسری جنگ عظیم کے بعد بدلے ہوئے حالات میں امریکہ کا ساتھ دیں، امریکہ کی بے پناہ خواہش اور کوشش تھی کہ اشتراکی دنیا کے گرد جو حصار امریکہ بنانا چاہتا ہے بھارت اس میں امریکہ کا ساتھ دے، لیکن پنڈت نہرو نے کسی صورت بھی اس نظام کا حصہ بننے کیلئے آمادگی ظاہر نہیں کی بلکہ اس نے انڈونیشیا اور چین کے ساتھ مل کر غیر جانب دار تحریک کو مضبوط کرنے کی کوشش کی جو کہ خطے میں امریکی پالیسی کے خلاف تھی۔

اس کے برخلاف پاکستان اپنی حکمت عملی کے تحت جنوبی ایشیاء سے زیادہ اپنے آپ کو وسطی ایشیاء اور شرط اوسط کا حصہ سمجھتا تھا اور انہی ممالک کے درمیان

اپنے مستقبل کا کردار دیکھ رہا تھا، چنانچہ ان حالات میں انیس سو چوون میں پاکستان
امریکہ کے دفاعی معاہدوں سیٹو اور سینٹو، بغداد پیکٹ کا رکن اور سرد جنگ میں امریکہ کا
سب سے قریبی حلیف بن گیا، جس کی وجہ سے امریکی جمہوریت کو جنرل ایوب خان کی
آمریت میں کوئی خرابی نظر نہیں آئی، لیکن انیس سو باسٹھ میں امریکہ پھر بھارت کی
طرف لوٹ گیا، اس نے چین سے نام نہاد مقابلے کیلئے بھارت کی دو ڈویژن فوج کو
جدید جنگی ٹیکنالوجی سے لیس کیا اور بھارت کو نیوکلیر ٹیکنالوجی سے نوازا اور پاکستان کو
زبردستی کشمیر سے دستبردار کرانے کی کوشش کی، پھر انیس سو پینسٹھ میں بھارت نے
تین سالہ امریکی فوجی اور معاشی امداد سے حاصل ہونے والی قوت کے زعم میں
پاکستان پر رات کے اندھیرے میں حملہ کیا تو امریکہ نے اپنے حلیف پاکستان کا ساتھ
دینے کے بجائے پاکستان کی فوجی امداد روک لی، جبکہ بھارت کی فوجی سپلائی کا انحصار
روس پر تھا۔

امریکی وزیر خارجہ کسنجر اور صدر نکسن کیلئے چین تک کیلئے رسائی کی خدمات انجام دینے
والے پاکستان سے امریکہ نے ایک بار پھر انیس اکہتر کے نازک لمحات میں جب
بھارت نے دہشت گردی اور مکتی باہنی کی کھلی تائید کی اور پھر نومبر انیس سو اکہتر میں
مشرقی پاکستان پر فوج کشی کی، اسی طرح بے وفائی کی جس طرح انیس سو پینسٹھ میں کی
تھی، یہ امریکی طرز عمل دراصل اس امریکی

پالیسی جو امریکی دستاویزات کے مطابق "گو کہ پاکستان سے ہماری دوستی اور معاہدات ہیں مگر ہمارے مفادات کا تقاضہ ہے کہ ہم بھارت کو پاکستان پر ترجیح دیں" کا عملی عکاس تھا، پاک امریکہ تعلقات کا سب سے خطرناک اور امریکہ مخالف دور اس وقت شروع ہوا جب امریکہ نے ہماری تمام تر قربانیوں اور خدمات کو پس پشت ڈالتے ہوئے نیوکلیئر پالیسی کے سلسلے میں کھلی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے اس وقت کے سربراہ مملکت ذوالفقار علی بھٹو کو "عبرتناک مثال Horrible Example" بنانے کی نہ صرف دھمکی دی بلکہ امریکی صدر جمی کارٹر نے معاشی پابندیوں کا نشانہ بنانے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا، یہ تو افغانستان پر روس کا حملہ اور اشتراکیت کے خلاف افغان مجاہدین اور پاکستان کا ڈٹ جانا تھا جس کی وجہ سے امریکہ کو ایک بار پھر پاکستان کی دوستی کی ضرورت محسوس ہوئی، لیکن جیسے ہی افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کے امکانات پیدا ہوئے امریکہ نے پاکستان سے اگلی ضرورت سانحہ نائن الیون تک ایک بار پھر اپنی نظریں پھیر لیں۔

حقیقت یہ ہے کہ امریکہ نے اس پورے دور میں پاکستان کے ساتھ ہی نہیں بلکہ تیسری دنیا اور عالم اسلام کے ساتھ دوستی کا رشتہ قائم کیا وہ خالص امریکی مفادات کی بنیاد پر تھا، گو کہ اس پورے عرصے میں آزاد دنیا، جمہوریت، جمہوری حقوق اور بنیادی انسانی حقوق کا تذکرہ رہا اور نظریاتی، اخلاقی

اصولوں اور عالمی اقدار کی بات بڑے بلند بانگ انداز میں کی گئی لیکن فی الحقیقت امریکی پالیسی کا ایک ہی مرکزی اصول یعنی امریکہ کا اپنا مفاد تھا۔ لہذا ان تاریخی حقائق کو سامنے رکھنے سے یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ امریکہ کی دوستی نہایت نا قابل اعتماد اور نا قابل بھروسہ ہے اور کام نکل جانے کے بعد اپنے دوستوں سے آنکھیں پھیر لینا امریکہ کا معمول ہے۔ خود امریکی پالیسی ساز اس میکاولیانہ سیاست کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "یہی ان کی حقیقی پالیسی ہے اگر اسے دوسرے نہیں سمجھتے تو یہ ان کی کور چشمی ہے، امریکہ کا دوغلا پن نہیں۔"

پاک امریکہ تعلقات کی پچاس سالہ داستان انہی کہہ مکرنیوں کی داستان ہے اور اس اصول کا منہ بولتا ثبوت ہے جسے امریکی جمہوریت کے بانی جارج واشنگٹن نے بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ایک چھوٹی اور کمزور ریاست کا ایک بڑی اور طاقتور ریاست سے تعلق اول الذکر کیلئے آخر الذکر کا لاحقہ ہونا لازمی کر دیتا ہے۔ کسی قوم کا غیر متعلق لوگوں سے ہمدردی کی توقع رکھنا حماقت ہے۔ وہ اس حوالے سے اگر کچھ حاصل کرے تو اسے اپنی آزادی کے ایک حصے سے اس کی قیمت ادا کرنا ہوتی ہے۔" امریکی بابائے آزادی کے اس قول کی روشنی میں آج ہم امریکی تعلق اور دوستی کی وہ قیمت ادا کر رہے ہیں جو ہم نے کبھی سوچی بھی نہیں تھی۔ ظاہر ایسی حالت میں امریکہ کی دوستی کا لازمی نتیجہ سیاسی، معاشی

اور خود عسکری میدان میں محتاجی کی شکل میں ہی نکلنا تھا، معاشی میدان میں ہم بیرونی قرضوں کے جال میں پھنستے چلے گئے، آج یہ عالم ہے کہ قرضوں کی غلامی نے ہماری آزادی کو پابند سلاسل کردیا ہے اور ہماری پوری معیشت ملک کی حقیقی ضروریات اور قوم کی ترجیحات کے بجائے بیرونی ساہوکاروں کے چشم ابرو کے اشارے کی تعمیل پر لگی ہوئی ہے۔

دیکھا جائے تو بحیثیت مجموعی یہ دوستی ہمیں ہر میدان میں مہنگی پڑی ہے، آج امریکی ذمہ دار کہتے ہیں کہ امریکہ نے دوبار پاکستان سے بے وفائی کی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ نے ہر بار پاکستان سے بے وفائی کی، امریکی وزیر دفاع رابرٹ گیٹس کا کہنا ہے کہ نوے کی دہائی میں جنوبی ایشیا میں امریکی توجہ کم ہونے کی وجہ سے پاکستانیوں کا امریکہ سے اعتماد کم ہوا، بہت جلد پاکستانیوں کا امریکہ پر اعتماد قائم ہوجائے گا اور امریکہ پاکستان کا قابل بھروسہ شراکت دار رہے گا، رابرٹ گیٹس کا بیان سابقہ امریکی طرز عمل، رویے اور تاریخی حقائق کے یکسر خلاف ہے، حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی عوام بخوبی سمجھتے ہیں کہ امریکہ کے قول وفعل میں کھلا تضاد ہے وہ دوستی کا دم تو پاکستان کا بھرتا ہے اور پاکستان کو اپنا فرنٹ لائن اتحادی بھی قرار دیتا ہے مگر اس کی نوازشات اور عنایتوں کا رخ پاکستان کے بجائے اس کے دیرینہ دشمن بھارت کی طرف ہے، جبکہ پاکستان امریکہ کی خوشنودی کیلئے قبائلی علاقوں میں آپریشن

جاری رکھ کر اپنے عسکری جوانوں کی قربانی دے رہا ہے، لیکن اتنی بھاری جانی و مالی قربانیوں کا صلہ یہ ہے کہ باوجود حکومت اور پاکستانی عوام کے شدید احتجاج کے امریکہ نے ڈرون حملوں کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے، جب تک امریکہ وہ پاکستانی جن کو سابق صدر مشرف نے ڈالروں کے عوض فروخت کردیا تھا ان کا حساب نہیں دیتا، ڈرون حملے بند نہیں کرتا اور بھارت نوازی کی پالیسی ترک نہیں کرتا تب تک امریکہ پر پاکستان اور پاکستانی عوام کا اعتماد کسی طور بھی بحال نہیں ہو سکتا۔

اس وقت صورحال یہ ہے کہ امریکہ اپنی افغانستان میں ہاری جانے والی جنگ پاکستان کے گلے ڈالنے کے درپے ہے اور پاکستان کے آرمی چیف سے اپنے تعلقات کا حوالہ دیکر اپنا دباؤ بڑھانا چاہتا ہے، اس پس منظر میں یہ نقشہ نئی دوستیوں اور پرانے تعلقات پر نظرثانی کا متقاضی ہے کیونکہ بین الاقوامی تعلقات کے ماہرین کے مطابق "عملی سیاست میں کوئی دوستی مستقل نہیں ہوتی، مستقل چیز تو صرف مفاد کا حصول ہوتا ہے اور مفادات کی شکل اور نوعیت صحرا کی ریت کی حرکت کی طرح بدلتی رہتی ہے اسی روشنی میں دوستوں اور مخالفین کی درجہ بندی ہوتی ہے" ہمیں امریکہ کی نئی ترجیحات اور نئی راہوں کو سمجھنے اور ان کی روشنی میں اپنے مقاصد اور مفادات کے تحفظ کی فکر کرنی چاہیے، موجودہ حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ اس وقت ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار

نہیں کہ پوری دیانت، حقیقت پسندی اور ملک وملت سے وفاداری کے ساتھ امریکہ
سے اپنے تعلقات، ماضی، حال اور مستقبل کا از سر نو جائزہ لیں، خوابوں اور تمناؤں کی
دنیا سے باہر نکلیں اور نئے حالات کی روشنی میں روشن زمینی حقائق کے مطابق اپنے
نظریاتی، سیاسی، معاشی اور قومی مفادات کے تحفظ اور حصول کیلئے جان دار، واضح اور
دیرپا حکمت عملی وضع کریں اور دوستوں میں "سب سے قریبی دوست" فرینڈ آف دی
فرینڈ اور" سب سے قریبی ساتھی" موسٹ الائیڈ الائے کی دوستی اور قربت کی حقیقت
کو سمجھیں، ہوا کے بدلتے ہوئے رخ کو پہچانیں، خوش فہمیوں کی بھول بھلیوں اور مجہول
ومبہم خوابوں کی دنیا سے باہر نکلیں، اپنی پالیسی اور اہداف کا تعین کریں اور مومنانہ
بصیرت کہ "مومن کبھی ایک سوراخ سے بار بار نہیں ڈسا جاتا" کو سامنے رکھتے ہوئے
اس کے حصول کیلئے سرگرم عمل ہوجائیں، کیونکہ امریکہ سے دوستی کے پچاس سالہ دور کا
بے لاگ جائزہ اور امریکہ کی نئی ترجیحات اور دوستی کے نئے سفر کی روشنی میں اپنے
مقام اور اپنے اہداف کا تعین ہی ہماری اولین ذمہ داری اور ضرورت ہے اور اسی پر
ہماری آزادی، سلامتی اور باعزت قومی زندگی کا دارومدار ہے۔

افسوس کہ اندھے بھی ہیں اور سو بھی رہے ہیں

انسانی تاریخ میں کچھ دن ایسے بھی ہوتے ہیں جو تاریخ کے ماتھے کا جھومر اور قوم کیلئے عزت و وقار کی علامت ہوتے ہیں، مسلمانان برصغیر کی تاریخ میں چودہ اگست ایک یادگار، ولولہ انگیز اور روح پرور دن ہے، ایک ایسا دن، جس دن برصغیر کے مسلمانوں کی جدو جہد آزادی کو نقطہ عروج حاصل ہوا، ان کے جذبوں اور آرزوؤں کی تکمیل ہوئی، چودہ اگست 1947ء کا دن 1957ء کی جنگ آزادی سے لے کر جولائی 1947ء تک کہ ماہ و سال میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل دن ہے، اس دن برصغیر کے مسلمانوں کو دو سو سالہ غلامی کے بعد آزادی کا سورج دیکھنا نصیب ہوا، ہر سال لوٹ کے آنے والے اس دن کا طلوع ہوتا ہوا سورج اس بات کی علامت ہے کہ قدرت کو ابھی پاکستان کا وجود اور استحکام اور بقاء مطلوب ہے اور پاکستان دنیا کے نقشے پر ہمیشہ قائم رہنے کیلئے بنا ہے، پاکستانی قوم ہر سال اس دن کو جشن آزادی کے طور پر مناتی ہے، گلی، کوچے، محلے بازار اور شہر سجائے جاتے ہیں، ہر طرف جشن آزادی کے چرچے ہوتے ہیں، پورے ملک کی فضا ملی نغموں، قومی ترانوں اور آزادی کے گیتوں سے گونج رہی ہوتی ہے اور یہ گیت "ہمارا پرچم ..... یہ پیارا پرچم ..... اس پرچم کے سائے تلے ہم ایک ہیں .... ہم ایک ہیں اور عیاں ہیں خون شہیداں کی عظمتوں کے نقوش ..... زبان لالہ و گل پر ہے داستان وطن ..... کانوں میں رس گھول

رہے ہوتے ہیں، الغرض، صبح سے رات گئے تک تمام شعبہ ہائے زندگی کے لوگ اس
دن کی عظمت کیلئے نغمہ سرا اور رطب اللسان رہتے ہیں اور ہر سال لوٹ کے آنے والا یہ
دن قوم کیلئے آزادی اور خوشی کا پیغام لے کر آتا ہے، چاروں اطراف گرمی، جوش،
جذبوں اور رنگوں کی دھنک بکھرتی ہے، لیکن وہ چودہ اگست جو ہماری قومی تاریخ کا اہم
باب اور تحریک آزادی کا سنگ میل ہے ہنوز نامکمل اور تشنہ تکمیل رہتا ہے۔

ہم یہ بات جذباتی ہو کر نہیں لکھ رہے بلکہ اس کی بنیاد وہ حقیقت ہے، جسے ہم بھول بیٹھے
ہیں اور بتدریج بھولتے جارہے ہیں، وہ حقیقت اور اس کا ادراک کیا ہے؟ ہر سال جشن
آزادی کے موقع پر یہ سوال بڑی شدت سے اٹھایا جاتا ہے، اہل فکر و نظر اس حوالے
سے تاریخ کے اوراق پلٹتے ہیں لفظوں کے موتی بکھیرتے ہیں، ماضی سے نسبت اور
حوالے تلاش کرتے ہیں اور قوم کو قیام پاکستان کا مقصد بتاتے ہیں، وہ یاد دلاتے ہیں کہ
قیام پاکستان ایک عزم تھا.....ایک منزل تھی .....اور ایک وعدہ تھا، جو ہم نے اللہ
اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کیا تھا "پاکستان کا مطلب
کیا.....لاالہ الااللہ" اور اسی وعدے پر لاکھوں مسلمانوں نے اپنی جانیں ہتھیلیوں پر
رکھ کر آزادی کی تاریخ رقم کی، اس خواب کو تعبیر بخشنے کیلئے ہمارے قائدین نے
قربانیاں دیں، تحریکیں چلائیں، گھربار چھوڑے، کاروبار ختم کئے اور عوام الناس کے
دلوں

میں پاکستان بنانے کا جواز فراہم کیا، جس کیلئے لاکھوں مسلمانوں نے اپنی جانوں پر کھیل کر اور اپنے پیاروں کے بے گور و کفن لاشے چھوڑ کر آگ و خون کے دریا عبور کئے اور یہاں آنے میں کامیاب ہوئے، یہ سب کچھ کیا تھا؟ جواز ہی تھا تو اتنی قربانیاں دی گئیں، لیکن یہ سارا مقصد، فہم و ادراک اور جوش و جذبہ چودہ اگست کے ڈوبتے سورج کے ساتھ ایک بار پھر ایک سال کیلئے تاریک اندھیروں میں ڈوب جاتا ہے۔

دوستو..... تخلیق پاکستان صرف ایک جذباتی عمل نہیں تھا بلکہ یہ ٹھوس عوامل کا حامل تھا، ایک قوم کی شناخت اور پہچان کا حامل تھا، اس عظیم اسلامی ریاست کی جڑیں مدینہ منورہ کی اس ریاست سے ملتی ہیں، جس کی بنیاد پیغمبر انقلاب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رکھی تھی، دینی اعتبار سے تحریک آزادی ہمارے عقیدے کا حصہ ہے، اس لحاظ سے چودہ اگست ایک اہم دینی فریضے سے سبکدوشی کا دن ہے، لیکن ہر بار جشن آزادی منانے کے باوجود ہم ابھی تک اپنی اس منزل سے کوسوں دور ہیں، جس کیلئے مسلمانان برصغیر نے قربانیاں دیں اور جس کی نشاندہی کرتے ہوئے بابائے قوم نے فرمایا تھا کہ "پاکستان اسلامی اقدار کی تجربہ گاہ بننے والا ہے۔" لیکن پاکستان اسلامی اقدار کی تجربہ گاہ بننے کے بجائے چوروں، ڈاکوؤں اور لٹیروں کی آماجگاہ بن گیا، ہم نے تو نعرہ لگایا تھا کہ ہم قرآن و سنت پر مبنی نظام سے ایک نیا جہان

اٹھائیں گے۔ لیکن ہم نے طاغوتی نظام کی آبیاری کی۔ ایک مسلمان کیلئے دین اسلام، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت سے بڑا جواز اور کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد اس جواز کی توہین اور وعدہ خلافی کی گئی اور اس عزم کو فراموش کردیا گیا۔ سول اور فوجی حکمرانوں نے اس مملکت کو اپنی ذاتی جاگیر سمجھ کر دونوں ہاتھوں سے لوٹا اور ایک غیرت مند حریت پسند، آزاد قوم کو اغیار کا منگتا بنا دیا۔

بدقسمتی سے آج تک ہم یہ طے نہ کرسکے کہ ملک کا نظام کون سا ہوگا۔ کبھی پارلیمانی طرز حکومت اور کبھی صدارتی نظام کا نعرہ لگایا گیا تو کبھی بنیادی جمہوریت اور سوشلزم کی باتیں کی گئیں، کبھی فیڈریشن تو کبھی کنفیڈریشن کے مطالبے ہوئے، حالانکہ صاف سی بات تھی کہ پاکستان کی اساس اسلام اور پاکستان کی بقاء وسالمیت، استحکام اور ترقی اسلامی نظام حیات کے ساتھ منسلک ہے۔ لیکن اس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے کہ وطن عزیز کے باشندوں نے انگریز سے تو نجات حاصل کرلی، لیکن وہ سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور بیوروکریسی کے شکنجے میں پھنس گئے۔ باسٹھ سال گزرنے کے بعد بھی قوم اپنے پرائے کی تمیز نہیں کرسکی۔ قوم نے ہر بار انہی صیادوں کو معالج سمجھا جنہوں نے اسے دوا کے بجائے زہر کے پیالے پلائے۔ آج کرپشن، لوٹ مار، ملاوٹ، دھوکہ دہی، خود غرضی اور رشوت ستانی کا زہر پوری قوم کے رگ وپے میں

سرایت کرچکا ہے اور قوم نفس پرستی اور خود غرضی کے گڑھے میں اوندھے منہ گرتی چلی جارہی ہے، یہ ناتمام سا خاکہ ہے ہماری باسٹھ سالہ قومی تاریخ کا، تحریک پاکستان میں بہنے والا خون، لٹی ہوئی عزتیں، تار تار عصمتیں اور کٹے پھٹے لاشے آج قوم کے باسٹھ سالہ حافظے سے قیام پاکستان کا جواز مانگ رہے ہیں، 14 اگست کا دن اس بات کی علامت تھا کہ اب استعمار، بیورو کریسی، جاگیرداری اور دھونس و دھاندلی کا نہیں بلکہ انصاف و قانون کا راج ہوگا اور دنیا میں پاکستان سیاسی، اخلاقی اور اسلامی اصولوں کا گہوارہ ہوگا، لیکن ایسا نہیں ہوا، ہم نے اس نعمت عظمیٰ کی ذرہ برابر قدر نہیں کی اور اسلاف کی عظیم الشان قربانیوں کو فراموشی کے گہرے غاروں میں دھکیل دیا، اس کے باوجود آج پوری قوم باسٹھواں جشن آزادی منارہی ہے، اقبال اور قائد اعظم کے خوابوں کی تعبیر اور لاکھوں مسلمانوں کی آرزوؤں اور امنگوں سے محروم ..... نامکمل اور تشنہ تکمیل جشن آزادی...... کیا ایسے جشن آزادی کی خوشیاں منائی جاسکتی ہیں..... اور کیا ایسے جشن آزادی کی مبارکباد دی جاسکتی ہے۔۔۔۔

بے عقل بھی ہم لوگ ہیں غفلت بھی ہے طاری
افسوس کہ اندھے بھی ہیں اور سو بھی رہے ہیں

قائداعظم کبھی بھی سیکولر اور ہندو مسلم اتحاد کے حامی نہیں تھے

حقیقت کا یہی کمال ہوتا ہے کہ حقیقت مانی نہیں جاتی، بلکہ وہ خود اپنے آپ کو منوا ہی لیتی ہے، اس کی تازہ مثال بی جے پی کے اکہتر سالہ سابق رہنما اور سابق بھارتی وزیر خارجہ جسونت سنگھ کی کتاب "جناح، بھارت، تقسیم، آزادی" ہے، جس میں سابق وزیر خارجہ جسونت سنگھ نے بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی ذات کے حوالے سے تعریفی کلمات، اُن کے کردار کی بلندی اور اُن کی راہ میں روڑے اٹکانے والے ہندو کانگریسی رہنماؤں مہاتما گاندھی اور جواہر لعل نہرو کی عیارانہ پالیسیوں کو طشت از بام کرتے ہوئے قائداعظم محمد علی جناح کی سحر انگیز شخصیت کا اعتراف کیا ہے اور گاندھی اور جواہر لال نہرو کو برصغیر کی تقسیم کا ذمہ دار قرار دیا ہے، یہ وہ اعتراف حقیقت ہے جو نہ چاہتے ہوئے بھی بالآخر ہندو بنیئے کی زبان پر آ ہی گیا اور انہیں اس آزادی رائے کی قیمت پارٹی رکنیت سے معطلی اور زبردست مخالفت کی صورت میں ادا کرنی پڑی، جسونت سنگھ نے بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کو سیکولر اور ہندو مسلم اتحاد کا حامی قرار دے کر پاکستان کی نظریاتی اساس اور جواز پر نہ صرف سوال کھڑا کردیا ہے بلکہ قائداعظم کی ذات کو بھی متنازعہ بنانے انہیں غیر متوازن، غیر واضح اور الجھی ہوئی شخصیت کے روپ میں پیش کرنے اور گاندھی اور جواہر لال نہرو

کو برصغیر کی تقسیم کا ذمہ دار قرار دے کر تاریخ کو مسخ کرنے کا جو کارنامہ انجام دیا ہے
اس پر تو بی جے پی کو خوش ہونا چاہیے تھا لیکن حیرت ہے بی جے پی کی سیاسی نا سمجھی پر،
ہماری نظر میں جسونت سنگھ نے تاریخ کو مسخ کرنے کا جو جرم عظیم کیا ہے اس کی سزا
انہیں اس سے کہیں زیادہ اور سخت ملنا چاہیے تھی، جسونت سنگھ کے اسی جرم نے ہمیں
حقیقت حال کو واضح کرنے اور تاریخی ریکارڈ کو درستگی پر مجبور کر دیا، چنانچہ زیر نظر
مضمون میں ہم کیا قائداعظم سیکولر اور ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے؟ کا مختصراً جائزہ لینے
سے پہلے یہ بتاتے چلیں کہ جسونت سنگھ پہلے بھارتی فرد نہیں ہیں جنھوں نے قائداعظم
محمد علی جناح کو سیکولر قرار دیا ہو، ان سے قبل ان ہی کی پارٹی کے شری لال کرشن
ایڈوانی بھی 2005ء میں دورہ پاکستان کے موقع پر قائداعظم کو ایک سیکولر رہنما قرار
دے کر متعصب ہندوؤں کی طوفانی مخالفت کا سامنا کر چکے ہیں، یہاں یہ بات بھی یقیناً اہل
علم کی نظر میں ہوگی کہ بھارت کے بزرگ قانون اور سیاستداں اور مہاراشٹر کے سابق
ایڈوکیٹ جنرل ایچ ایم سیروائی نے اپنے کتاب Partition of India,Legend &
Reality جس کا اردو ترجمہ ممتاز محقق ڈاکٹر صفدر محمود نے "تقسیم ہند افسانہ اور
حقیقت" کے نام سے کیا ہے، میں کانگریسی لیڈر گاندھی، نہرو اور پٹیل کی غلطیوں اور
حماقتوں کا جائزہ اور گاندھی کی عیاری اور نہرو کی ہوشیاری کو بے نقاب کرتے ہوئے
کانگریس کے خبث باطن، تنگ نظری، تعصب اور اصل عزائم پر روشنی ڈالی اور انہیں
تقسیم ہند کا

ذمہ دار قرار دیا، ایچ ایم سیر وائی نے بھی اپنی کتاب میں یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قائد اعظم محمد علی جناح تقسیم ہند کے مخالف تھے لیکن کانگریس کی غلطیوں نے پاکستان بنا دیا، لیکن جسونت سنگھ اس لحاظ سے دونوں افراد سے قدرے منفرد ثابت ہوئے وہ ایڈوانی اور سیر وانی سے بھی ایک قدم اور آگے بڑھ کر قائد اعظم کو سیکولر رہنما کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم اتحاد کا حامی قرار دینے کی جسارت کر بیٹھے، یہ درست ہے کہ ابتداء میں قائد اعظم نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز ہندو مسلم اتحاد کے پیامبر کے طور پر کیا، لیکن بہت جلد ہی انھوں نے ہندوؤں کے ناپاک عزائم کو بھانپ لیا اور جب 1928ء میں نہرو رپورٹ جس میں کانگریس کی نہرو کمیٹی نے مسلم لیگ کی جانب سے تجویز کی جانے والی مناسب ترمیمات اور لکھنو پیکٹ کے تحت جن اصولوں پر اتفاق رائے کیا گیا تھا کو ماننے سے انکار کر دیا تو قائد اعظم کانگریس کے رویہ سے بالکل مایوس ہو کر کہہ گزرے کہ "آج سے ہمارے اور ہندوؤں کے راستے الگ الگ ہیں۔" ایک بار جب کسی نے قائد اعظم سے سوال کیا کہ انہیں پہلی بار پاکستان کا خیال کب آیا؟ تو قائد اعظم نے فرمایا تھا کہ 1930ء میں۔

قارئین محترم یہ قائد اعظم کا کوئی سیاسی بیان نہیں تھا بلکہ یہ اُن کے دل کی آواز تھی، اُن کے شعور کا فیصلہ تھا اور اُن کی فہم و فراست اور دور بین نگاہ اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ ہندو اور مسلمان دو علیحدہ علیحدہ قومیں

ہیں جو کبھی بھی ایک ساتھ نہیں رہ سکتے، یہی وجہ تھی جو 1930ء سے انہوں نے تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا اور یہی وہ سال ہے جب علامہ اقبال نے الٰہ آباد میں تصور پاکستان پیش کیا تھا، پھر 1937ء کے انتخابات کا تجربہ اور اس کے بعد 1940ء کی قرار داد لاہور اس امر کی شاہد ہے کہ قائد اعظم اس بات کے قائل ہو چکے تھے کہ مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کیلئے ایک علیحدہ وطن کا قیام ضروری ہے، اس مقام پر سینکڑوں تاریخی مثالیں دے کر یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ ایچ ایم سیر وانی، ایل کے ایڈوانی، جسونت سنگھ اور ان کی سوچ سے متفق وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ قائد اعظم تقسیم ہند کے مخالف تھے اور کانگریس کی غلطی نے پاکستان بنا دیا، سراسر لغو، جھوٹ اور تاریخی حقیقت کو مسخ کرنے کے مترادف ہے، کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان قائد اعظم کی کرشمہ ساز قیادت، مسلمانوں کی بے پناہ قربانیوں اور مسلم لیگ کی جدوجہد کا ثمر تھا، جسے خود کانگریس اور انگریز حکومت نے آخری چارہ کار کے طور پر قبول کیا تھا، ورنہ ماؤنٹ بیٹن تو حکومت برطانیہ سے جو تحریری ہدایت نامہ لے کر آیا تھا اس کے تحت وہ ہندوستان کو متحد رکھنے کا پابند تھا۔

قائد اعظم محمد علی جناح کو سیکولر اور تقسیم ہند کا مخالف ثابت کرنے کی کوشش گذشتہ کئی عشروں سے جاری ہیں، یہ بحث اب وطن عزیز پاکستان میں بھی نام

نہاد مفکروں اور دانشوروں کے منہ سے تواتر کے ساتھ سنی جا رہی ہے کہ قائد اعظم ایک سیکولر اور لادین رہنما تھے اور قیام پاکستان کا مقصد اسلامی ریاست نہیں بلکہ ایک سیکولر ریاست کا قیام تھا اور قائد اعظم پاکستان میں سیکولر نظام قائم کرنا چاہتے تھے، دانشوروں کا حلقہ یہ ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے کہ قائد اعظم پاکستان کے سیاسی ڈھانچے کو اسلام سے بالکل پاک اور صاف رکھنا چاہتے تھے، ان کے نزدیک قیام پاکستان کا مقصد ایک سیکولر جمہوری ریاست کا قیام تھا، اپنے اس دعوے کی دلیل میں ان دانشور وں کو قائد اعظم محمد علی جناح کی پوری زندگی سے صرف 11 اگست 1947ء کو دستور ساز اسمبلی سے خطاب سے چند جملے جو کہ کسی سیکولر نظام کی بنیاد رکھنے کیلئے نہیں بلکہ اقلیتوں کو احساس تحفظ دلانے کیلئے تھے " اگر ہم اس جذبے کے ساتھ کام کریں تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اکثریت اور اقلیت مسلمان اور ہندو کے درمیان پیچیدگیاں ختم ہو جائیں گی ..... آپ آزاد ہیں، مندر میں پوجا کریں، یا مسجد میں عبادت کریں، آپ کا کسی مذہب، ذات، یا عقیدے سے تعلق ہو اس سے حکومت کو سروکار نہیں" ملتے ہیں، جو سیاق و سباق سے ہٹ کر اپنے من پسند معنی و مفہوم کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی کہ قائد اعظم سیکولر نظام کے حامی تھے، جبکہ خود قائد اعظم محمد علی جناح نے 25 اکتوبر 1947ء کو رائٹر کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ "میں دستور ساز اسمبلی کی افتتاحی تقریر میں یہ واضح کر چکا ہوں کہ اقلیتوں سے پاکستان کے

شہریوں جیسا سلوک کیا جائیگا اور ان کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو دوسروں کو حاصل ہوں، پاکستان غیر مسلم اقلیتوں کو احساس تحفظ اور اعتماد پیدا کرنے کیلئے سب کچھ کرے گا۔" حیرت ہے کہ ہمارے دانشور حضرات 11 اگست والی تقریر کی تشریح و توضیح پر تو بہت زور دیتے ہیں لیکن قائدِ اعظم کی 25 اکتوبر والی تقریر کا ذکر نہیں کرتے، جس میں خود قائدِ اعظم نے 11 اگست کی تقریر کے حوالے سے اپنے مدعا کی وضاحت کی تھی،

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان اسلام کی بنیاد پر معرض وجود میں آیا تھا اور یہی پاکستان کے مطالبے کا طاقت ور ترین محرک تھا، جس کے سبب برصغیر کے مسلمانوں نے بے پناہ قربانیاں دیں، صعوبتیں برداشت کیں اور آگ و خون کے دریا عبور کرکے پاکستان پہنچے، پاک و ہند کے مسلمانوں کا اجتماعی شعور اس بات کا عکاس ہے کہ ان کے ذہنوں میں یہ احساس پوری طرح جاگزیں ہوچکا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں اور اسلام کی صحیح معنوں میں بقاء کیلئے ایک مسلمان ریاست کا قیام بے حد ضروری ہے، دراصل یہ احساس ہندوستان میں مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ کے تجربات کا نچوڑ تھا اور خود قائدِ اعظم نے بھی اپنی تقریروں میں یہ بات بار بار کہی تھی ۔

کسی بھی شخصیت کے نظریات اور تصورات کو سمجھنے کیلئے اس کی ذاتی زندگی میں جھانکنا اور اس کی عوامی زندگی کا مطالعہ کرنا بہت ضروری ہوتا ہے، محض کسی شخص کے ظاہری حال، حلیے اور وضع قطع کو دیکھ کر اس کی شخصیت کا اندازہ نہیں

لگایا جاسکتا، وہ جناح جو بظاہر انگریزی بولتا، مغربی لباس پہنتا اور مغربی طور طریقوں پر عمل کرتا تھا، اس جناح کے باطن میں جھانکیئے تو آپ کو اصل محمد علی جناح کا سراغ ملے گا، جو ظاہری جناح سے یکسر مختلف ہے، جو کہتا ہے کہ "مسلمانوں۔۔۔۔۔ میں نے دنیا کو بہت دیکھا، دولت، شہرت اور عیش و عشرت کے بہت لطف اٹھائے۔۔۔۔اب میری زندگی کی واحد تمنا یہ ہے کہ میں مسلمانوں کو آزاد اور سربلند دیکھوں، میں چاہتا ہوں کہ جب مروں تو یہ یقین اور اطمینان لے کر مروں کہ میرا ضمیر اور خدا گواہی دے رہا ہو کہ جناح نے اسلام سے خیانت اور غداری نہیں کی۔۔۔۔ میں آپ کی داد اور شہادت کا طلب گار نہیں ہوں، میں چاہتا ہوں کہ مرتے وقت میرا اپنا دل، ایمان اور ضمیر گواہی دے کہ جناح تم نے مدافعت اسلام کا حق ادا کردیا، جناح تم نے مسلمانوں کی حمایت کا فرض بجا لایا، میرا خدا کہے کہ بے شک تم مسلمان پیدا ہوئے اور کفر کی طاقتوں کے غلبے میں علم اسلام کو سربلند رکھتے ہوئے مسلمان مرے۔" (روزنامہ انقلاب 22 اکتوبر 1939ئ)

یوم حساب، خدا کے حضور سرخروئی، مسلمانوں اور اسلام کی سربلندی کا علم بلند کرتے ہوئے مرنے کی آرزو اور رضائے الٰہی کی تمنا صرف اور صرف وہ شخص کر سکتا ہے جو سرتاپا سچا اور پکا مسلمان ہو اور جس کا باطن خوف خدا کے نور سے منور ہو، اب سوال یہ ہے کیا ایسا شخص پاکستان کو سیکولر ریاست بنانا چاہے گا، تو

یقیناً جواب یہی ملے گا کہ ہر گز نہیں، قائداعظم کی نظر میں پاکستان کا خطہ زمین اس لئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں اسلامی تہذیب و تمدن، ثقافت اور اسلامی اصولوں کی تجربہ گاہ بنایا جاسکے۔31 جنوری 1948ء کو اسلامیہ کالج پشاور میں خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا "اسلام ہماری زندگی اور ہمارے وجود کا بنیادی سرچشمہ ہے، ہم نے پاکستان کا مطالبہ زمین کا ایک ٹکڑا حاصل کرنے کیلئے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں۔" 25 جنوری 1948ء کو کراچی میں عید میلادالنبی کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ "کون کہتا ہے کہ پاکستان کے آئین کی اساس شریعت پر نہیں ہوگی، جو لوگ ایسا کہتے ہیں وہ مفسد ہیں، ہماری زندگی میں آج بھی اسلامی اصولوں پر اسی طرح عمل ہوتا ہے، جس طرح تیرہ سو سال پہلے ہوتا تھا" 21 مارچ 1948ء کو آپ نے ارشاد فرمایا "میری آرزو ہے کہ پاکستان صحیح معنوں میں ایک ایسی مملکت بن جائے کہ ایک بار پھر دنیا کے سامنے فاروق اعظم کے سنہری دور کی تصویر عملی طور پر کھنچ جائے، خدا میری اس آرزو کو پورا فرما۔" اسی طرح آپ نے 1946ء میں مسلم اسٹوڈنٹس کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ "مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ پاکستان کا طرز حکومت متعین کرنے والا کون ہوگا، میرے نزدیک مسلمانوں کے طرز حکومت کا فیصلہ آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے قرآن مجید نے کردیا تھا۔" طوالت کے خوف سے ہزاروں مثالوں میں سے ہم نے یہاں چند مثالوں پر ہی اکتفا کیا ہے، جس سے واضح

ہو جاتا ہے کہ قائد اعظم ایک سچے مسلمان اور پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے ذریعے ایک مثالی ریاست بنانے کے خواہاں تھے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ قائد اعظم سیکولر رہنما تھے پاکستان کی اسلامی نظریاتی اساس اور جواز پاکستان کی نفی ہے، کیونکہ اگر قائد اعظم پاکستان کو ایک سیکولر ریاست ہی بنانا چاہتے تھے تو پھر ایک الگ وطن کے مطالبے کی ضرورت ہی نہیں تھی، حقیقت یہ ہے کہ اگر مسلم لیگ یا قائد اعظم یہ اعلان کر دیتے کہ پاکستان ایک سیکولر ریاست ہوگی تو برصغیر کا ایک بھی مسلمان مسلم لیگ کا ساتھ نہ دیتا اور نہ ہی آج قائد اعظم، قائد اعظم ہوتے۔ ہمارے نزدیک قائد اعظم کو سیکولر اور ہندو مسلم اتحاد کا حامی کہنا اس صدی کا سب سے بڑا گمراہ کن جھوٹ اور قائد کی بے داغ شخصیت کو داغدار کرنے کے مترادف ہے، حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا قیام ایک اسلامی ریاست کیلئے عمل میں آیا تھا، سیکولر ریاست بننے کیلئے نہیں، مسلمانان برصغیر کے عظیم قائد کی ذات کے حوالے سے جسونت سنگھ جیسے دانشوروں کی رائے ہماری دانست میں کم علمی اور بے عقلی کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کے پیچھے دیدہ و دانستہ پاکستان کو اس کی اسلامی نظریاتی اساس سے ہٹانے اور دو قومی نظریئے کو ختم کرنے کی منظم سازش اور اس منصوبے کا حصہ ہے جسے وقتاً فوقتاً ہندو اور نام نہاد مسلمان لبرل دانشور اچھال کر مسلمانوں کی پاکستان سے نظریاتی وابستگی کو کمزور کرنا چاہتے ہیں، یہ جسونت سنگھ کا اعتراف حقیت نہیں بلکہ قائد کی شخصیت پر الزام اور بہتان طرازی ہے اور اس نقطہ نظر سے

اتفاق کا مطلب بانی پاکستان پر منافقت، عدم اخلاص اور بددیانتی کا الزام لگانا ہے جس کا
کوئی محب وطن تصور بھی نہیں کر سکتا، یہ قائد اعظم پر سنگین الزام اور بہتان ہے اور قائد
اعظم کے کردار کو گہنانے کی سازش اور ان کے شاہکار اسلامی پورٹریٹ کو مسخ کرنے
اور انہیں غیر متوازن، غیر واضح اور الجھی ہوئی شخصیت کے روپ میں پیش کرنے کی
کوشش ہے اور یہ ثابت کرنا ہے قائد اعظم اور کانگریسی قیادت کے مابین کوئی نظریاتی
اختلاف نہیں تھا بلکہ وہ محض اپنے اپنے اقتدار کیلئے الگ الگ ریاست قائم کرنے کیلئے
کوشاں تھے، چنانچہ یہ کہنا کہ پاکستان بنا تو مسلمانوں کیلئے تھا مگر اسلام کی اس میں کوئی
گنجائش نہیں اول درجے کی منافقت اور قائد اعظم کے ساتھ صریحاً ظلم و زیادتی ہے۔
زمانہ گواہ ہے کہ قائد اعظم ایک سچے کھرے، بااصول اور باوقار انسان تھے،ایک
جسونت سنگھ ہی کیا ان کے بدترین دشمن بھی ان کے کردار کی عظمت کے معترف ہیں،
قائد اعظم محمد علی جناح کا شمار عالم اسلام کی ان برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا ہے، جن کے
کارنامے اپنی انفرادیت اور تنوع کے باعث دنیا بھر میں رشک کی نگاہ سے دیکھے جاتے
ہیں، قائد اعظم صرف ایک سیاستدان ہی نہیں بلکہ ایک بااصول کراماتی شخصیت کے
مالک بھی تھے، تحریک پاکستان اور وجود پاکستان میں قائد اعظم محمد علی جناح کی ذات
ایک روح کا درجہ رکھتی

ہے، یہی وجہ ہے کہ پاکستان مخالف قوتیں پہلے دن سے آج تک قائد اعظم کی ذات پر مختلف حوالوں سے کیچڑ اچھال کر پہلے تحریک پاکستان اور بعد میں وجود پاکستان کو کمزور کرنے کی ناپاک کوششیں کرتی رہی ہیں، لیکن یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح ایک سچے راسخ العقیدہ مسلمان تھے، اعتقادی نقطہ نظر سے قائد اعظم کی ذات "پختہ مسلمان" ہی ہے، ان کا دل اسلام کی عظمت سے مالا مال تھا اور ان کا دل و دماغ ایک مسلمان ہونے کے فخر سے معمور تھا اور ان میں مصور پاکستان علامہ اقبال کے "مرد مومن" کی تمام خصوصیات موجود تھیں، ان کا کردار بے داغ اور شخصیت بے عیب تھی، وہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے ایسے عظیم قائد تھے، جنھوں نے ہمیشہ اسلامی تعلیمات کو اپنے پیش نظر رکھا، ان کے خطبات اور تمام زندگی کے واقعات اس امر پر گواہ ہیں، یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ شخصیت جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے پناہ عشق کرتی ہو جس کے عشق رسالت مآب کا یہ عالم ہو کہ وہ لنکزان میں محض اسلئے داخلہ لے کہ اس کے دروازے پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسم گرامی لکھا ہوا تھا، ایسا شخص کسی طور بھی نہ تو سیکولر ہو سکتا ہے اور نہ ہی ہندو مسلم اتحاد کا حامی ہو سکتا ہے۔

دوستو آؤ۔۔۔۔لوح جبیں تازہ کریں

نیکیوں کا موسم بہار......رمضان

نیکیوں کے موسم بہار رمضان کا مہینہ شروع ہو چکا ہے، عشرہ رحمت کے آغاز کے ساتھ رحمتوں کے دروازے کھل گئے ہیں اور انعام واکرام اور تجلیات کی بارشیں شروع ہو گئیں، اس ماہ مبارکہ کی شان یہ ہے کہ جب یہ مہینہ آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کرکے سرکش شیاطین کو قید کردیا جاتا ہے، یکم رمضان کی پہلی رات کو ایک فرشتہ اعلان کرتا ہے کہ "اے خیر کے طالب....آگے بڑھ اور نیکیوں سے اپنا دامن بھرلے، اور اے شر کے چاہنے والے....گناہوں سے باز آجا، رمضان کا ادب کر، اللہ تعالیٰ ہر رمضان کی رات میں لوگوں کو جہنم سے آزاد کرتا ہے۔"

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مشکوٰۃ شریف میں مروی ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شعبان المعظم کے آخری ایام میں خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "اے لوگوں، تم پر ایک بہت بڑی عظمت و برکت والا مہینہ سایہ فگن ہونے والا ہے اور یہ وہ مہینہ ہے جس کی ایک رات ہزار مہینوں سے افضل و بہتر ہے، اللہ تعالیٰ نے اس مہینے میں تم پر روزے فرض کیے ہیں، اگر کوئی

شخص اس مہینے میں کوئی ایک نیک کام اپنے دل کی خوشی سے خود کرے، وہ ایسا ہوگا جیسے رمضان کے سوا دوسرے مہینوں میں فرض ادا کیا ہو اور جو اس مہینے میں فرض ادا کرے وہ ایسا ہوگا، جیسے رمضان کے سوا دوسرے مہینوں میں ستر فرض ادا کیے ہوں، یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے اور یہ مہینہ معاشرے کے غریب اور حاجت مندوں کے ساتھ مالی تعاون، ہمدردی کا مہینہ ہے۔"

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

"پانچ وقت کی نمازیں اور ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان سے دوسرے رمضان تک کی عبادات کے درمیانی مدت کے (صغیرہ) گناہوں کو مٹا دینے والی ہیں۔"

ان احادیث مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان المبارک میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بخشش اور مغفرت کی بارش ہوتی ہے، جس میں ایمان والوں کو گناہوں کی غلاظت سے پاک و صاف ہونے کا ایک سنہری موقع عطا کیا جاتا ہے،ح ضور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ "وہ شخص رحمت الٰہی سے دور ہو، جس کی زندگی میں رمضان کا مہینہ آئے اور وہ اپنی بخشش نہ کرا سکے۔"

ماہ رمضان کے فیوض و برکات اور رحمتوں کو حاصل کرنے کیلئے اہل ایمان کو اس

مہینے میں جن خصوصی اعمال کا حکم دیا گیا ہے، ان میں روزہ سر فہرست ہے اور اسے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اللہ کریم ارشاد فرماتا ہے کہ "روزے دار کی منہ کی بو مجھے مشک و عنبر سے بھی زیادہ اچھی لگتی ہے اور یہ کہ مومن میرے لیے روزہ رکھتا ہے، میں اس کی جزا دوں گا۔"

حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں "اللہ تعالی ہر افطار کے وقت لوگوں کو (جہنم سے) آزاد فرماتا ہے اور یہ رمضان کی ہر رات میں ہوتا ہے اور روزے دار کی افطار کے وقت کی دعا رد نہیں ہوتی۔"

عزیز دوستو، رمضان کا مہینہ ہر لحاظ سے خیر و برکت والا ہے، اس مہینے کے نیک اعمال کے ثواب میں دوسرے مہینوں کی نسبت ستر گنا زیادہ برکت ہے، یہ ہماری کس قدر خوش قسمتی ہے کہ رب کائنات نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں ایک بار پھر رمضان المبارک کا مہینہ دیکھنے اور اس کی بے شمار رحمتیں، برکتیں اور نیکیاں سمیٹنے کا موقع دیا ہے، تاکہ ہم رب تعالی اور اس کے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوشنودی اور قرب حاصل کر سکیں، رب کائنات نے ہم گناہ گاروں کیلئے اس ماہ میں فضائل و برکات، نیکیوں اور رحمتوں کا بے حد و بے حساب اہتمام کیا ہے، اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم اللہ تعالی اور اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوشنودی اور دولت ایمان کے حصول کیلئے کس

،قدر نیکیاں سمیٹتے ہیں

یہاں یہ بات واضح رہے کہ رمضان المبارک کا مقصد یہ نہیں ہے کہ سحری کے وقت پیٹ بھر لیا جائے اور افطار کے وقت خوب ڈٹ کر افطاری کی جائے، ماہ رمضان کا اصل مقصد تقویٰ و پرہیزگاری کے ساتھ یہ ہے کہ اس ماہ مبارکہ میں امت مسلمہ اپنے روز مرہ کے معمولات میں ایسی تبدیلیاں لائے جو اس کی زندگی اور معاشرے کا نقشہ ہی بدل ڈالے۔

قرب خداوندی کے حصول کیلئے ذکر و اذکار میں مشغول رہنا، درود پاک کی کثرت کرنا، نمازوں کی پابندی کرنا، خدا کی راہ میں صدقہ و خیرات کرنا، غریبوں، یتیموں اور مسکینوں کی مدد کرنا اور انہیں عید کی مسرتوں میں شامل کرنا، دلوں سے بغض، نفرت اور عناد کو باہر نکالنا، اور مکمل طور پر اسلامی تعلیمات کے دائرے میں آنا، یہ ساری تربیت رمضان المبارک میں ہوتی ہے، اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ان کاموں کو اپنی زندگی کا معمول بنائیں کیونکہ یہی ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد ہے، محض ماہ صیام کے روزے رکھ کر پورے مہینے بھوکا پیاسا رہنا اللہ کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے، کیونکہ وہ ہمیں نیک اور پرہیزگار مسلمان دیکھنا چاہتا ہے۔

بلاشبہ اس مہینے کی برکت و عظمت عظیم ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ اس ماہ کی رحمتیں ہر اس شخص کے حصے میں آجائیں جو اس ماہ کو پالے۔ اس کی مثال ایسے ہی کہ جب بارش ہوتی ہے تو بارش کا پانی مختلف ندی، نالوں اور تالابوں سے گزرتا ہے اور یہ ندی، نالے، تالاب، چٹانیں اور زمین کے ٹکڑے اپنی اپنی وسعت و گہرائی کے مطابق اس پانی سے فیضیاب ہوتے ہیں، جبکہ بارش سب پر یکساں برستی ہے۔ یہی حال انسانی فطرت اور نصیب کا ہوتا ہے۔ رمضان کے بے پناہ خزانوں میں ہمیں کیا ملتا ہے؟ یہ ہمارے وسعت قلب اور ایمان پر منحصر ہے۔ دل کی کھیتی نرم اور اگر ایمان کی کھاد سے زرخیر ہوگی، تو فصل بھی اچھی اور توانا ہوگی۔ لیکن اگر دل پتھر کی طرح سخت، بنجر اور چٹیل میدان ہوگا تو روزے، نماز، تراویح اور رحمت و برکت کا سیراب کرنے والا تمام پانی بہہ جائے گا اور کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

اسلیئے ایسا نہ ہو کہ رمضان کا پورا مہینہ گزر جائے، رحمتوں اور برکتوں کے ڈول کے ڈول انڈیلے جاتے رہیں اور ہم اتنے بدنصیب ہوں کہ ہمارے کاسے خشک اور دامن خالی رہ جائیں، لہذا دوستوں.... اس رحمت بھری ساعتوں کے گنوانے، محرومی سے بچنے اور اپنے حصے کی رحمتیں لوٹنے کیلیئے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس تنبیہہ کو سامنے رکھ کر کمر کس لیجئے کہ "کتنے روزہ دار ہیں جن کو اپنے روزوں سے بھوک و پیاس کے سوا کچھ نہیں ملتا اور

کتنے راتوں کو نماز پڑھنے والے ہیں جن کو اپنی نمازوں سے رات کی جگائی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔"

یاد رکھیئے یہ مہینہ دلوں کی مردہ اور بنجر زمین کو زندہ وآباد رکھنے کا ہے۔ رمضان المبارک منزل نہیں بلکہ حصول منزل کا ذریعہ ہے اور ایک مسلمان کی منزل تو یہ ہے کہ وہ اپنا ظاہر اور باطن ایسا بنالے کہ اللہ اور اس کے رسول کی نظر میں جچ جائے اور اس کا مالک اس سے راضی ہو جائے۔ کیونکہ جو اللہ اور اس کے رسول کی نظر میں مذموم ہو اہل دنیا کا محبوب ہونا اسے کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ یاد رکھیئے کہ حقیقی راحت یہ نہیں کہ آپ کو دنیاوی آسائش اور چین وآرام میسر ہو بلکہ حقیقی راحت یہ ہے کہ رضائے الٰہی کے حصول کی کوشش کی جائے جو اپنا احتساب و محاسبہ اور جہد وجہد و سعی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

کون کہہ سکتا ہے رمضان کا یہ مہینہ ہمیں دوبارہ دیکھنے کو نصیب ہو۔ لہذا ان لمحات کو غنیمت جانتے ہوئے اس موقع کو ضائع مت ہونے دیجئے۔ اگر قسمت نے ہمیں ایک مہینہ اللہ اور اس کے رسول کی رضا کے مطابق گزارنے کی توفیق مرحمت فرمادی ہے تو اس کا شکر ادا کیجئے اور کوشش کیجئے کہ بقیہ گیارہ مہینے ہی نہیں باقی ماندہ تمام زندگی بھی اسی مقصد اور رضا کے حصول میں گزر جائے اور رمضان کا آیا ہوا رنگ ہماری ساری زندگی اور پورے معاشرے پر محیط ہو جائے۔

سرکشی نے کر دیئے ہیں دھندلے نقوش زندگی
آؤ سجدے میں گریں اور لوح جبیں تازہ کریں

منافع خور تاجر، بے بس حکومت، ہوش ربا مہنگائی اور مظلوم عوام

ماہ رمضان المبارک رحمتوں، برکتوں اور نعمتوں کی برسات کا مہینہ ہے، اس ماہ مبارک میں اللہ رب العزت کی رحمتوں، مغفرتوں اور جہنم سے نجات کے دروازے کھل جاتے ہیں، انوار و تجلیات کی بارشیں ہوتی ہیں، رحمتوں کے خزانے لٹائے جاتے ہیں اور خوش نصیب اہل ایمان اپنی اپنی جھولیاں بھرتے ہیں، سیرت طیبہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رمضان المبارک سے قبل صحابہ اکرام کو جمع فرما کر استقبال رمضان کے متعلق خطبہ دیتے تھے اور انہیں اس ماہ مبارکہ کی عظمت، فضیلت اور اہمیت بتاتے ہوئے آپس میں صلہ رحمی، محبت و مروت اور ایک دوسرے کے ساتھ رحمدلی کا برتاؤ کرنے کا درس دیتے تھے، جس پر صحابہ کرام دل و جان سے عمل کرتے تھے، لیکن اس کے برخلاف آج کا مسلمان ماہ رمضان المبارک میں ایک دوسرے کے ساتھ صلہ رحمی، محبت اور رحمدلی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے لوٹ کھسوٹ اور ناجائز منافع خوری کو اپنے لئے جائز سمجھ بیٹھا ہے، حال یہ ہے کہ کپڑے اور جوتوں کے تاجر سے لے کر بیکری مالکان، کریانہ سٹور والے، درزی حضرات، سبزی فروٹ فروش غرض کہ سب کے سب اس ماہ مبارکہ میں بے رحم قصائی بن کر مہنگائی کی چھری سے قوم کی کھال اتارنے اور ان کی جیبیں خالی کرنے کیلئے بے تاب ہیں۔

گو کہ تجارت پیشہ نبوی ہے اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تجارت کی اور اسے پسند فرمایا، لیکن جو تجارت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام نے کی اس کی بنیاد دیانت، امانت اور ایمانداری پر تھی، اس میں کسی قسم کی دھوکہ دہی، منافع خوری، جعلسازی یا ذخیرہ اندوزی کی کوئی گنجائش نہیں تھی، لیکن اس کے برعکس آج کے تاجر ہر اس برائی میں مبتلا ہیں، جن سے اسلام نے سختی سے منع فرمایا ہے، آج یہ حال ہے کہ ہمارے تاجروں نے جھوٹ، دھوکہ، منافع خوری، ذخیرہ اندوزی اور جعلسازی کو اپنا وطیرہ بنالیا ہے اور حج، عمرہ، نماز، روزے اور تسبیح کے دانے پھیرنے کے ساتھ ساتھ ایک کے دو، دو کے چار اور چار کے آٹھ کرنے میں مصروف ہیں۔

یوں تو ماہ رمضان لمبارک کی آمد سے قبل ہی قیمتوں میں 35 سے 40 فیصد اضافہ ہوچکا تھا لیکن رمضان میں ہونے والی ہوش ربا مہنگائی نے تو غریب عوام کی کمر ہی توڑ کر رکھ دی ہے، روزمرہ ضروریات کی عام اشیاء جس خاص انداز میں فروخت کی جارہی ہیں اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ماہ مبارکہ فقط ذخیرہ اندوزوں اور ناجائز منافع خور تاجروں کیلئے آسمان سے اترا ہے، غریب روزہ دار جس طرح ان روزمرہ اشیاء کیلئے پریشان ہورہے ہیں، اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہے، اس ماہ مبارک میں غریب سے غریب مسلمان کی بھی یہ خواہش ہوتی

ہے کہ وہ کچھ بہتر خوراک کے ساتھ سحری کھائے اور افطاری کرے، لیکن آج اشیاء خوردنی اور اشیاء ضروریات کی جو قیمتیں ہیں اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ غریب عوام کو پیٹ پر پتھر باندھ کر سحر و افطار کرنے، روزے رکھنے اور عید منانا ہو گی۔

پاکستان میں ہر سال رمضان المبارک کے موقع پر ناجائز منافع خوروں اور ذخیرہ اندوزوں کی ملک کے سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کی ملی بھگت اور اعلیٰ انتظامی حلقوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کے نتیجے میں ایک سازش کے تحت اشیائے خوردنی کی قیمتوں میں اضافہ کرکے ایک مصنوعی بحران پیدا کیا جاتا ہے اور اس بحران کو جنم دینے والی قوتوں تو اس بحران کے نتیجے میں اربوں روپے کما لیتی ہیں لیکن غریب عوام کو اس مقام پر لا کر کھڑا کر دیا جاتا ہے، جہاں ان کے پاس دو ہی راستے بچتے ہیں ایک یا تو وہ ان اشیاء کو ترس کر وقت گزاریں، دوسرے یا پھر مخصوص مافیا کی طرف سے پیدا کردہ بحران کے نتیجے میں مہنگی اشیاء خرید کر گزر بسر کریں، پاکستان میں یہ بحران ہر سال پیدا ہوتا ہے اور حکومت کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے، لیکن حکومت اور مختلف علاقوں کی انتظامیہ بے بس ہو کر یا اپنا حصہ وصول کرکے خاموش تماشائی بنے رہتی ہے، ہر سال حکومت رمضان میں عوام کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں پہنچانے کا دعویٰ کرتی ہے لیکن ان دعوؤں اور بیانات کے باوجود غریب عوام گراں فروشوں کے ہاتھوں لٹتے رہتے ہیں

اور حکمران اور انتظامیہ ائیر کنڈیشنڈ دفاتر اور گھروں میں بیٹھ کر لوٹ کھسوٹ سے ملنے والے حصے سے مزے لوٹ رہے ہوتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اس رمضان المبارک سے قبل مہنگائی کی خوفناک لہر کے بدنما اثرات نے حکومت کی نا صرف گڈ گورننس کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے بلکہ اس نے دنیا کے سامنے ہمارے اخلاقی دیوالیہ پن کو بھی عریاں کر دیا ہے کہ مسلمان تاجر اور حکمران کلے کی دولت سے سرفراز تو ضرور ہیں لیکن دیانت اور ایمانداری کی صفات سے محروم ہیں، خود احتسابی کے اس مہینے سے قبل مہنگائی کا عفریت جس طرح بے قابو ہو کر بوتل سے باہر نکل آیا ہے اور سوات و بونیر میں حکومتی رٹ قائم کرنے والے غریب پروری کے دعویدار حکمران منافع خوروں اور ذخیرہ اندوزوں کے سامنے جس طرح بے بس دکھائی دیتے ہیں، اس سے لگتا ہے کہ مہنگائی کا طوفان شاید حکومت اور تاجروں کی کسی مفاہمت کا نتیجہ ہے، یا پھر حکومت امریکہ کی طرح منافع خوروں کے ڈرون حملوں کے سامنے بے بس ہے۔

پاکستان دنیا کا وہ ملک ہے جہاں سب سے زیادہ محنت کش طبقہ آباد ہے، اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں 7 کروڑ 90 لاکھ 75 ہزار لوگ محنت مزدوری کرتے ہیں جبکہ غربت میں ہمارا 43 واں نمبر ہے، ایک حالیہ سروے رپورٹ کے مطابق پاکستان میں غربت کی شرح 40 فیصد سے زائد ہے، 7 کروڑ سے زائد لوگ غربت کا

شکار ہیں جبکہ ہمارا شمار دنیا کے ان ممالک میں بھی ہوتا ہے جن میں مہنگائی اپنی آخری حدوں کو چھو رہی ہے، پاکستان میں مہنگائی کی شرح 21 فیصد ہے، اشیائے ضروریہ کی قیمتوں میں 30 فیصد اور ٹیکسوں میں 10 فیصد اضافہ ہو چکا ہے، جبکہ دوسری طرف صاحبان اقتدار شاہ خرچیوں میں مصروف عمل ہیں، حالیہ بجٹ میں ایوان صدر کے اخراجات میں ڈیڑھ کروڑ روپے کا اضافہ کیا گیا ہے،اسی طرح وزیراعظم ہاؤس، قومی اسمبلی کے اجلاسوں اور کابینہ کی مراعات میں بے تحاشہ اضافہ کیا گیا، اگر اس ساری صورت حال کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو ہم تاریخ کے انتہائی نازک دور سے گزر رہے ہیں اور غربت، بیروزگاری، معاشی بحران، دہشت گردی اور باہمی انتشار کا شکار ہیں، قومی، علاقائی اور لسانی عصبیت نے ہمیں ٹکڑوں میں بکھیر دیا ہے، جس کی وجہ سے پورا ملک آتش فشاں کے دھانے پر کھڑا ہے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ کیا طبقاتی نظام، تعلیم، جہالت یا بیرونی غلامی، جمہوریت کا قتل اور آمریت کی پرورش یا اقتدار کی پوجا پاٹ نے ہمیں اندھے چوراہے پر لا کھڑا کیا ہے یا پھر حکمرانوں کی بے حسی، خود غرضی اور اقتدار پرستی ہمیں اس مقام تک لائی ہے؟

ہمارے خیال میں شاید یہ سب کچھ اس وجہ سے ہو رہا ہے کہ عوام اپنے ووٹوں سے ان نمائندوں کو منتخب کرتے ہیں جو اقتدار کے ایوانوں میں پہنچ کر عوام سے کیے گئے وعدوں کو بھول جاتے ہیں اور اپنے

ذاتی مسائل اور مفاد کی دیکھ بھال اور حفاظت میں مصروف ہو جاتے ہیں، نتیجتاً حکمران طبقہ تو عیش و عشرت کی زندگیاں گزارتا ہے لیکن غریب عوام یوٹیلٹی اسٹورز پر گرم چلچلاتی دھوپ میں لمبی لمبی قطاریں لگائے گھنٹوں آٹے، دالوں، گھی، شکر اور دوسری ضروریات زندگی کے حصول کیلئے عذاب میں مبتلا رہتے ہیں یا پھر فاقہ کشی انہیں خود کشی کرنے یا اپنے جسم کے اعضاء اور جگر کے ٹکڑے بیچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

اس وقت حال یہ ہے کہ ملک میں مجموعی طور پر چھ کروڑ 70 لاکھ افراد غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں، پانچ کروڑ اسی لاکھ افراد کو پینے کا صاف پانی میسر نہیں، چار کروڑ نوے لاکھ افراد صرف ایک کمرے کے گھر میں رہائش پذیر ہیں، ہر آنے والے دن کے ساتھ غربت میں اضافہ ہو رہا ہے، گزشتہ سال پاکستان میں 24 فیصد آبادی غربت کی نچلی سطح پر زندگی گزارنے پر مجبور تھی جبکہ غربت کی شرح بڑھ کر 28 فیصد ہو گئی ہے، وطن عزیز کی 73 فیصد آبادی روزانہ 2 ڈالر سے کم کماتی ہے، عوام کو آنسو بہاتے، پیٹ پر پتھر باندھتے اور جسم پر چیتھڑے لپیٹے 62 سال گزر گئے ہیں، ہر آنے والے حکمران نے عوام کو سبز باغ دکھائے، کسی نے روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرے لگایا تو کوئی قرض اتارو ملک سنوارو کی نعرے لگاتا رہا اور کوئی خوشحال پاکستان کا فریب دے کر عوام کو بے وقوف بناتا رہا، لیکن بیچارے عوام کے مسائل جوں کے توں ہی رہے،

واضح رہے کہ فورڈ سپورٹ پروگرام کا نام بے نظیر انکم سپورٹ رکھ دینے سے غربت کا خاتمہ نہیں ہو سکتا ہے اور نہ ہی طبقاتی نظام کو دفن کیے بغیر ملک کے عوام خوشحال ہو سکتے ہیں۔

یہ کتنی حیرت کی بات ہے کہ جس ملک کی اکثریت جہالت، بیماری، بے روزگاری اور غربت کا شکار ہو، وہاں کے وزراء سولہ سولہ کروڑ کی گاڑیاں یوں میں گھومیں، جس ملک کے لوگ روٹی پانی کے لیے اپنے گردے فروخت کر رہے ہوں، اس ملک کے صدر ہاؤس کے باغات کی دیکھ بھال کے لیے لاکھوں روپیہ خرچ کیئے جائیں، غربت، بھوک اور افلاس کے ہاتھوں مجبور ہو کر جس ملک کے عوام اپنے جگر کے ٹکڑوں کو سربازار نیلام کریں، اس ملک کے پی ایم ہاؤس کا خرچہ 54 کروڑ سے تجاوز کر جائے، جس ملک میں غربت اور بھوک سے تنگ آ کر لوگ اپنی اولادیں کو اپنے ہی ہاتھوں ذبح کر رہے ہوں، اس ملک کے حاکموں کے جہازوں کی آرائش پر 58 کروڑ روپے خرچ کیے جائیں، جس ملک کی رعایا آلودہ پانی پینے کی وجہ سے موت کو گلے لگا رہی ہو، اس ملک کے وزیراعظم غیر ملکی دوروں پر 17 کروڑ 60 لاکھ روپے کی خطیر رقم خرچ کر دیں، جس ملک کے 31 فیصد اسکولوں میں بجلی، پانی اور چھتیں نہ ہوں، اس ملک کے ارباب اختیار کی اولادیں سرکاری خرچ پر امریکا اور انگلستان میں تعلیم حاصل کریں۔

ہم ارباب اقتدار سے گزارش کریں گے کہ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں، جب غریب و مجبور عوام یہ دیکھتی ہے کہ اس تو سونے کیلئے فٹ پاتھ اور سر چھپانے کیلئے چھت بھی میسر نہیں ہے جبکہ حکمرانوں کے عالی شان بنگلوں کے پھول بوٹوں کی دیکھ بھال کے لیے بجٹ میں 74 لاکھ روپے خرچ کئے جائیں، جب ایک غریب کا بچہ یہ دیکھتا ہے کہ میرے گھر میں پینے کے لیے پانی، کھانے کے لیے روٹی اور بیماری کے لیے دوا نہیں اور حکمران عوامی ٹیکس سے حاصل ہونے والی کروڑوں کی رقم سے بیرون ملک علاج کے نام پر عیاشیاں کررہے ہیں، تو ان کے سینوں میں حکمرانوں کے خلاف ایک ایسا لاوا پکنا شروع ہوجاتا ہے، جو بعد ازاں خونیں انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے، یہ درست ہے کہ مہنگائی کے ڈرون حملے روکنے کے لیے حکومتی جمع خرچ اور اُن تمام سرکاری دعوؤں کی قلعی کھل چکی ہے کہ اگر منافع خور اور ذخیرہ اندوزوں نے اپنی روش نہ بدلی تو حکومت ان عناصر کے ساتھ سختی سے نپٹے گی، حقیقت یہ ہے کہ بے لگام مہنگائی اور اس کے کرداروں کو قانون کے دائرے میں لانے اور رمضان المبارک میں عوام کو آسانی فراہم کرنے میں حکمرانوں کی بے بسی جمہوریت کے دعویداروں کیلئے نہ صرف ایک سوالیہ نشان ہے بلکہ عوام یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ حکمران عوامی مشکلات و پریشانیوں سے بے نیاز، کسی چوک پر نصب وہ بے فیض مجسمے ہیں، جن کے کان سماعت اور آنکھ بصارت سے محروم ہیں۔

پاکستان نئی امریکہ کالونی-----

پاکستان پر بڑھتا ہوا امریکی تسلط اور قومی سلامتی کے تقاضے

اندیشے، وسوسے اور وہ واہمے جس کا اظہار ہمارے دانشور، صحافی، سیاستدان اور سابقہ فوجی اہلکار گزشتہ کافی عرصے سے بڑی شدت کے ساتھ کر رہے تھے، بالآخر آہستہ آہستہ حقیقت کا روپ دھار رہے ہیں اور پاکستان میں بڑھتی ہوئی امریکی سرگرمیاں قومی سلامتی کیلئے تشویش اور تحفظات کے دائرے سے نکل کر نہ صرف اب حقیقت کی خطرناک حدوں کو چھو رہی ہیں بلکہ ہر آنے والے دن کے ساتھ محب وطن حلقوں میں یہ تاثر بھی پختہ ہوتا جارہا ہے کہ امریکہ پاکستان پر آہستہ آہستہ اپنی گرفت مضبوط کر رہا ہے، پاکستان جیسے زخم خوردہ ملک کیلئے امریکہ کے ماضی پر نظر رکھنا، اُس کے حال کا باریک بینی سے جائزہ لینا اور مستقبل کے عزائم کا فہم و ادراک رکھنا انتہائی ضروری ہے، لیکن کمزور ہونے کے خوف، امریکی جارحیت کے ڈر، بھیک کیلئے پھیلے ہوئے کشکول اور حکمرانوں کے ذاتی مفاد نے آج پاکستان کو اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں سوچ، سمجھ اور قومی مفادات کے تحفظ کے سارے تقاضے امریکی پالیسیوں اور مفادات کے تحفظ میں مصروف عمل ہیں، حال ہے کہ سادہ لوح عوام کو دھوکہ اور فریب دینے کیلئے وہ

تمام اقدامات جن سے پاکستان کے مفادات پر شدید ضرب پڑتی ہے "قومی مفاد" کے ملمع میں لپیٹ کر قوم کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں اور ببانگ دہل یہ کہا جاتا ہے کہ قوم کے وسیع تر مفاد میں حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے اور پھر ان فیصلوں کے حق میں جو جواز اور تاویلیں تراشیں جاتی ہیں وہ خود ہی ساری حقیقت حال کو واضح کر رہی ہوتی ہیں،
اس کی عملی مثال کراچی، پشاور اور اسلام آباد میں بدنام زمانہ امریکی دہشت گرد تنظیم بلیک واٹر جو "زی ورلڈ وائیڈ" کے نام سے چھپ کر کام کر رہی ہے، کی موجودگی، اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے کی سولہ ایکڑ پر قلعہ نما توسیع اور میرینز کی تعداد میں اضافے کی وہ خبریں ہیں جو اوپر بیان کئے گئے پس منظر کا وہ پیش منظر پیش کر رہی ہیں جس کا اظہار یہ حلقے مسلسل کرتے رہے ہیں۔
دہشت گردی کیخلاف جنگ کے نام پر امریکہ نے افغانستان اور عراق کے مسلمانوں کیخلاف جو کروسیڈ کا سلسلہ شروع کیا تھا، اب اس کا دائرہ پاکستان کے اہم اور حساس علاقوں تک وسیع ہو چکا ہے، اس نام نہاد جنگ میں شمولیت کے بعد وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی کے بقول پاکستان 36 ارب ڈالر کا نقصان اٹھا چکا ہے جبکہ امریکہ سے اب تک پاکستان کو بمشکل دس ارب ڈالر کی بھیک ملی ہے اور اگلے پانچ سال کے دوران مزید ساڑھے سات ارب ڈالر کی خیرات ملنے کی امید ہے، لیکن اس بھیک نما امداد کا چکمہ دے کر فنڈز خرچ کرنے کے نظام کی نگرانی اور

ممکنہ نتائج کے نام پر امریکہ نے اسلام آباد میں اپنی خفیہ ایجنسیوں، فوج اور دیگر خفیہ اداروں کا وسیع و عریض نیٹ ورک قائم کرلیا ہے، گزشتہ روز پاکستان میں امریکی سفیر این پیٹرسن نے یہ اعتراف بھی کیا کہ امریکہ اسلام آباد میں 200 مکان کرائے پر لے چکا ہے اور وہ سفارت خانے میں توسیع کرکے میرینز کی تعداد میں اضافہ کررہا ہے،
اگرچہ امریکی سفیر نے انکی تعداد کم بتائی ہے، مگر دفتر خارجہ کے ترجمان عبدالباسط پہلے ہی ان میرینز کی تعداد ایک ہزار ظاہر کرچکے ہیں، اس کے علاوہ بدنام زمانہ امریکی دہشت گرد تنظیم بلیک واٹر کے اہلکاروں کی کراچی، پشاور اور اسلام آباد جیسے اہم شہروں میں موجودگی کی اطلاعات بھی منظر عام پر آچکی ہیں، جس کے سربراہ پر عراق میں قتل اور عصمت دری کے کئی مقدمات چل رہے ہیں اور اب یہ تجربہ پاکستان میں دوہرایا جارہا ہے، لیکن اس کا سب سے خطرناک ترین پہلو یہ ہے کہ "بلیک واٹر" کے ہرکارے ویزوں کے تکلف کے بغیر چارٹرڈ طیاروں میں پاکستان آتے ہیں اور ان کی آمدورفت کا کوئی ریکارڈ پاکستانی انتظامیہ کے پاس نہیں ہے۔
یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ یہ پراجیکٹ امریکی خفیہ ایجنسی سی آئی اے کے زیر نگرانی کام کررہا ہے، جس کا مقصد بظاہر القاعدہ اور طالبان کے اہم لیڈروں تک رسائی اور انہیں قتل کرنا ہے لیکن درحقیقت پس پردہ پاکستان کے ایٹمی اثاثوں پر نظر رکھنا، چین اور ایران کے گرد گھیرا تنگ کرنا ہے

بد قسمتی سے یہ سب کچھ دہشت گردی کیخلاف نام نہاد جنگ کے نام پر ہو رہا ہے، جس
کی وجہ سے نہ صرف پاکستان کی خود مختاری ختم ہو کر رہ گئی ہے بلکہ امریکی، پاکستانی اور
بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں ان اطلاعات کے شائع ہونے کے بعد کہ سی آئی اے نے
پاکستان کے پہاڑی علاقوں میں امریکہ کے مخالفین کو قتل کرانے کے لئے "بلیک واٹر"
نامی بدنام زمانہ تنظیم کی خدمات حاصل کرلی ہیں، پاکستان کے سیاسی، سماجی، مذہبی اور
صحافتی حلقوں میں شدید تشویش بھی ظاہر کی جا رہی ہے، جبکہ پاکستان میں دہشت گردی
کے واقعات میں بھارت اور اسرائیل کے ملوث ہونے اور دہشت گردوں سے بھارتی
اور امریکی اسلحہ برآمد ہونے کے بعد پہلے سے سکیورٹی کو لاحق خطرات میں اضافہ ہو رہا
ہے، بلیک واٹر تنظیم نے عراق اور افغانستان میں جو قتل عام کیا ہے، اسے امریکی ذرائع
ابلاغ نمایاں انداز میں سامنے لا چکے ہیں، اس تنظیم سے عراق میں جاسوسی اور مخالفین
کو قتل کرانے کا جو کام سی آئی اے نے کرایا ہے، اس پر امریکہ کے اندر بھی تنقید ہو رہی
ہے، سینٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی کے چیئرمین جان کیری بلیک واٹر کے بارے میں
تفصیلات طلب کر چکے ہیں، جبکہ سینٹ ارکان کی طرف سے سی آئی اے کو مطعون کیا
جارہا ہے کہ امریکی پرائیویٹ کمپنی کو بدستور جاسوسی کے ٹھیکے دینے کے مقاصد کیا ہیں،
قارئین کو یاد ہوگا کہ پاکستان میں بلیک واٹر کا نام اسلام آباد میں میریٹ دھماکے کے
وقت سامنے آیا تھا اور اس وقت بعض اخبارات و جرائد نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ اس
دھماکے میں "بلیک واٹر" کے

اہلکار مارے گئے، تاہم اب جبکہ اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے کو بلاجواز توسیع
کی جارہی ہے اور ایک ہزار میرینز کے تعیناتی کی اطلاعات گشت کر رہی ہیں، بلیک واٹر کی
اسلام آباد میں موجودگی اور قبائلی علاقوں میں کارروائیوں کے انکشاف سے عوام میں
تشویش اور قومی سلامتی کو درپیش خطرات اور پاکستان میں بڑھتی ہوئی امریکی دخل
اندازی کی وجہ سے عوام میں امریکہ نفرت جذبات اور اشتعال یں اضافہ بھی ہو رہا
ہے۔

امریکی سفارتخانے کی توسیع کے حوالے سے میڈیا میں جو کچھ بیان کیا جارہا ہے وہ سب
درست ہے یا غلط، اس سے قطع نظر حقائق یہ بتاتے ہیں کہ جو کچھ زبان خلق کہہ رہی
ہے وہ صحیح اور سو فیصد درست ہے۔ افغانستان میں موجود امریکی افواج کی کارگزاری اور
پھر پاکستان پر نظر رکھنے کی امریکی پالیسی کے ساتھ ساتھ چین کو لگام ڈالنے کی امریکی
خواہش کے پس پشت جو عوامل کارفرما ہیں، امریکی سفارتخانے کی توسیع اس کا پہلا قدم
ہے، پاکستان کی یہ بدقسمتی رہی ہے کہ اسے کبھی ٹالبوٹ کبھی رچرڈ باؤچر تو کبھی ہالبروک
سے واسطہ پڑتا رہا، یہ تھرڈ کلاس امریکی اہلکار جس شاہانہ طریقے سے پاکستان آتے رہے
اور جس طرح ہمارے فوجی اور عوامی حکمران ان کے سامنے " لائن حاضر" ہوتے رہے،
اس سے ان کی غلامانہ ذہنیت صاف عیاں ہے، یہاں یہ بات بھی کسی سے ڈھکی چھپی
نہیں کہ امریکہ کو صرف اپنے مفادات سے دلچسپی ہے، نا اس کی کسی سے دوستی رہی ہے
اور

نا ہی اسے کسی سے دوستی عزیز ہے، بلکہ وہ اپنے مفادات کیلئے ہمیشہ ہمارے حکمرانوں کو استعمال کرتا رہا ہے، عجب طرفہ تماشا ہے کہ کل تک جس دہشت گردی کا منبع اسے افغانستان اور عراق میں نظر آتا تھا اب اسے اس دہشت گردی کے سارے سوتے پاکستان سے پھوٹتے نظر آرہے ہیں، جس کی وجہ سے اسے بلیک واٹر کی مدد، میرینز کی تعداد میں اضافے اور اسلام آباد میں فوجی چھاؤنی کی ضرورت پیش آرہی ہے، لیکن ہمارے حکمران اس حوالے سے بالکل خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں اور عوام کو اس توسیع، بلیک واٹر کی موجودگی اور بڑھتی ہوئی امریکی سرگرمیوں کے بارے حقائق بتانے سے گریزاں ہیں، مگر عوام امریکی غلامی کی اس صورتحال سے اتنے متنفر ہوچکے ہیں کہ وہ موجودہ حکومت کو پرویز مشرف کی پالیسیوں کا تسلسل اور صرف چہروں کی تبدیلی سمجھتے ہیں۔

پاکستان میں پہلے ہی ڈرون حملوں اور دیگر اقدامات کی وجہ سے امریکہ کیخلاف نفرت کے جذبات شدید ہیں، جس کا اعتراف خود امریکی سفیر کے علاوہ رچرڈ ہالبروک اور مائیک مولن بھی کرچکے ہیں، اس لئے اتنی بڑی تعداد میں امریکیوں کی وفاقی دارالحکومت میں موجودگی بذات خود نہ صرف سیکورٹی مسائل کا باعث بنی رہے گی، بلکہ اس سے عام شہریوں کو بھی خطرات لاحق رہیں گے، اس کا تازہ ثبوت وفاقی دارالحکومت اسلام آباد کے سیکٹر جی نائن میں 4 امریکی میرینز جو کہ خطرناک اسلحے سے لیس اور سفارت خانے کی تبدیل شدہ نمبر پلیٹ

والی گاڑی پر سوار تھے کی ایک افغان باشندے کے ساتھ ناروا سلوک پر پاکستانی حکام کے ہاتھوں گرفتاری اور امریکی سفارت خانے کی مداخلت پر رہائی ہے۔ اُس امریکی متکبرانہ اور توہین آمیز رویے کی وجہ سے جس کا اعتراف مائیک مولن نے اپنے مضمون میں کیا، عالم اسلام میں نفرت اور اشتعال موجود ہے، لیکن پاکستان میں یہ سب سے زیادہ ہے، اس لئے امریکہ۔برطانیہ کی طرف سے پاکستان کو دہشت گردی کیخلاف جنگ کی صلاحیت۔بڑھانے اور مزید کردار ادا کرنے کی ہلہ شیری کسی بھی لحاظ سے اطمینان بخش نہیں، بلکہ یہ پاکستان کو مسلسل حالت جنگ میں رکھ کر سیاسی، معاشی اور اقتصادی عدم استحکام کا شکار کرنے اور پاک فوج کو اپنے ہی عوام کیخلاف الجھائے رکھنے کی سازش ہے، امریکہ نے اب تک پاکستان سے جو کام لیا ہے، اس کے عیوض ناروا شرائط کے ساتھ آئی، ایم ایف کے قرضوں میں اضافے، قومی سطح پر ہیجان اور خلفشار اور سلامتی کے مسائل کے سوا کچھ نہیں ملا اور اگر کچھ ملا بھی ہے تو اسے اپنے ہی مسلمان بھائیوں کیخلاف کارروائیوں سے مشروط کردیا گیا، یہ حقیقت بھی ناقابل تردید ہے کہ سوات کی طرح قبائلی علاقوں میں حالات کی خرابی میں امریکی، بھارتی، اسرائیلی خفیہ ایجنسیوں کا کردار ہے، تاکہ پاک فوج مسلسل پھنسی رہے اور شیطانی اتحاد ثلاثہ ہمارے ایٹمی پروگرام، اسلامی تشخص اور قومی سلامتی کیخلاف اپنی سازشوں کو یکسوئی سے پروان چڑھا سکے۔

گزشتہ چند ماہ کے دوران پاکستان میں امریکی سینٹ ڈیپارٹمنٹ اور پینٹگان کے عہدیداروں کی آمد و رفت میں جو اضافہ دیکھنے کو ملا ہے، اسے قومی حلقے پاکستان کے اندرونی معاملات میں کھلی مداخلت کے ساتھ کسی نئی سازش کا پیش خیمہ اور افغانستان اور پاکستان کے بارے میں نئی امریکی اسٹریٹجی نتیجہ قرار دے رہے ہیں، دوسری طرف اوبامہ حکومت کی طرف سے افغانستان میں بیس ہزار سے زائد نئے فوجیوں کی پاک افغان سرحد پر تعیناتی اور آپریشن میں توسیع کے بعد پاکستان میں طالبان جنگجوؤں کے منتقل ہونے کا خدشہ بھی بڑھ گیا ہے، لیکن تمام تر پاکستانی تحفظات اور اندیشوں کے باوجود امریکہ اپنے مفادات کیلئے پاکستان پر مسلسل دباؤ ڈال رہا ہے کہ پاکستانی فوج سوات طرز کا آپریشن وزیرستان میں بھی کرے، ظاہر ہے کہ یہ صورتحال پاک فوج کی قیادت کو ہرگز قبول نہیں اور وہ امریکی عہدیداروں کو باور کرانے میں مصروف ہے کہ وہ پاک افغان سرحد پر نئے امریکی فوجیوں کی تعیناتی سے پیدا شدہ صورتحال کی بہتری، افغانستان کا مسئلہ طاقت کے بجائے مذاکرات سے حل کرنے، ڈرون حملے بند کرنے، وزیرستان میں فوجی آپریشن پر اصرار نہ کرنے اور اسلام آباد کے سفارت خانے کو سفارت خانہ رہنے دینے کے اقدامات کرے، حقیقت یہ ہے کہ امریکہ کا ایجنڈا اب کسی سے مخفی نہیں رہا، وہ اسلام، مسلمانوں اور پاکستان کے دشمنوں بھارت اور اسرائیل کا حقیقی دوست اور خیر خواہ ہے اور یہ تینوں ممالک اپنے دیگر اتحادیوں کے ساتھ مل کر اس پاکستان مخالف ایجنڈے پر عمل پیرا ہیں

جس کا مقصد پاکستان کو ایک نئی امریکہ کالونی میں تبدیل کرنا ہے، لہذا دہشت گردی کی نام نہاد جنگ کی اس دلدل سے نکلنے کی کوشش ضروری ہے، جس پر 36 ارب ڈالر اپنے پلے سے خرچ کرکے ہم نے سوائے ذلت و رسوائی، عدم استحکام، سلامتی کیلئے خطرات کی فصل کاشت کرنے کے اور کچھ نہیں پایا، چنانچہ عقل مندی اور قومی مفاد کا تقاضہ یہ ہے کہ امریکہ پر یہ باور کرادیا جائے کہ اب ہم مزید اس کارزیاں کو جاری نہیں رکھ سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ امریکہ کی نظریں ایک طرف پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں پر مرکوز ہیں تو دوسری طرف وہ اپنے مفادات کیلئے قبائلی علاقوں سے بلوچستان تک جو خوفناک کھیل کھیل رہا ہے، اس سے پاکستان کی سلامتی کو شدید خطرات لاحق ہیں، یہاں یہ بات، بھی انتہائی حیرت ناک ہے کہ جن امریکیوں کو ناپسندیدہ قرار دے کرپاکستان سے نکالا گیا تھا، ان کو دوبارہ ویزا دے کرپاکستان بھیج دیاگیا، ایسے ہی ایک شخص نکولس شمیڈل کو جو بظاہر صحافی تھا مگر اس کی سرگرمیاں مشکوک تھیں پاکستان سے نکالا گیا تو اگلے ہی ہفتہ امریکہ میں پاکستانی سفیر حسین حقانی نے اس کو ویزا دے کر پھر واپس پاکستان بھجوا دیا، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ شخص مشکوک سرگرمیوں میں ملوث نہیں تھا تو اسے نکالا کیوں گیا اور اگر وہ جاسوسی میں ملوث تھا تو حسین حقانی نے اس پر خصوصی نظر کرم کیوں فرمائی؟ تمام محب وطن حلقوں کے واضح خدشات اور تحفظات

کے باوجود پاکستانی وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی کا یہ کہنا کہ اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے کی توسیع پر مجھے کوئی پریشانی نہیں، نہ صرف باعث حیرت واستعجاب بلکہ قومی مفادات پر ذاتی مفاد کو ترجیح دینے کے مترادف ہے، حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی سترہ کروڑ عوام کو امریکی سرگرمیوں اور مستقبل کے حوالے سے خوفناک سازشوں پر شدید پریشانی لاحق ہے، امریکہ جن مقاصد کو لے کر آگے بڑھ رہا ہے، اس سے اب ہمارے عوام اچھی طرح واقف ہوچکے ہیں، لیکن امریکہ کے خطے میں واضح خطرناک عزائم اور سازشوں کے طشت ازبام ہونے کے بعد ہمارے سیاستدانوں اور حکمرانوں کی بے حسی دیکھ کر قوم سراپا احتجاج اور سوالی ہے کہ کب تک ہمارے حکمران اور سیاستدان امریکہ کے آگے جی حضوری کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ملک و قوم کے مستقبل کو غلامی کے اندھیروں کے حوالے کرتے رہیں گے، وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ ارباب اقتدار پاکستانی سرزمین کو امریکی سازشوں کی مزید آماجگاہ بننے سے بچانے کیلئے پاکستانی عوام، سیاسی و مذہبی حلقوں اور پاک فوج کی قیادت کے تحفظات کی روشنی میں فوری اقدامات کریں، کیونکہ قوم گزشتہ 62 سالوں سے جاری امریکہ کی پاکستان کے سیاسی، داخلی، عسکری، معاشی اور سماجی شعبوں میں اس مداخلت کا خاتمہ چاہتی ہے جو پاکستان کے وجود، سالمیت، تحفظ استحکام اور بقاء کیلئے ناگزیر ہے۔

سات ستمبر یوم تحفظ ختم نبوت کے حوالے سے خصوصی تحریر

عقیدہ ختم نبوت اسلام کی اساس اور وہ بنیاد ہے جس پر دین اسلام کی پوری عمارت کھڑی ہے، یہی وہ عقیدہ ہے جو جسد اسلام کی روح ہے، یہی وجہ ہے کہ اس عقیدہ کی اہمیت اور نزاکت کے پیش نظر مسلمان ہر دور میں تحفظ ختم نبوت کیلئے بڑے حساس اور چوکس رہے ہیں، تاریخ اسلام شاہد ہے کہ جب بھی کسی کمینہ خصلت نے قصر نبوت پر ڈاکہ زنی کی ناپاک جسارت کی، غیور مسلمانوں کی تلواریں اللہ کا انتقام بن کر اس کی طرف لپکیں اور اس جہنم واصل کر دیا، مسلمانوں کی تاریخ اس عقیدے کے تحفظ کیلئے قربانیاں دینے والوں سے بھری ہوئی ہے، ختم نبوت اتنا اہم مسئلہ ہے کہ قرآن مجید میں سو سے زائد مقامات پر اس کا واضح الفاظ میں ذکر موجود ہے جبکہ خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کم و بیش دو سے زائد احادیث مبارکہ میں اس امر کی وضاحت مختلف پیرائے میں کی کہ پوری امت ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم نبوت کے مسئلہ پر یکسو اور متحد ہو گئی اور یہ پوری امت کا متفقہ عقیدہ قرار پایا۔

حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ سے لے کر آج تک ہر دور میں دنیا کے حریص اور طالع آزماؤں نے جھوٹ، فریب، مکر و دجل اور شعبدے

باریوں سے قصر نبوت میں نقب لگانے کی جسارت کی، مگر امت مسلمہ اس جعلسازی کا مقابلہ کرنے کیلئے ہمیشہ مستعد رہی، مسیلمہ کذاب، طلیحہ بن خویلد، اسود عنسی سے لے کر مرزا قادیانی تک امت مسلمہ نے ہر دور میں ان نقب زنوں کا کامیاب تعاقب کیا، 1901ء میں جب سے مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے خود ساختہ نبی ہونے کا اعلان کیا، تو علماء و مشائخ نے اس فتنے کے سدباب اور ہر میدان میں قادیانیت کا محاسبہ جاری رکھا۔

بیسویں صدی کا آغاز امت مسلمہ کیلئے جن بدترین حالات میں ہو ا، اس کا آج تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس تاریک دور میں اللہ ربّ العزت نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے امت کو ایسے افراد سے نوازا جنھوں نے کفر و طاغوت اور ظلم و استحصالی نظام کے خلاف ہر محاذ پر چومکھی لڑائی لڑی، اُن نفوس قدسیہ میں حضرت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کو ایک ممتاز اور منفرد مقام حاصل ہے، علامہ شاہ احمد نورانی کی زندگی اسلام کے عملی نفاذ، دینی قوتوں اور جمہوری اداروں کی فروغ وبقا، پاکستان کے استحکام و سالمیت، مسلم وحدت کی مسلسل جدوجہد، احیائے اسلام اور کفر کے خلاف عالم اسلام کی بیداری سے عبارت ہے۔

یکم اپریل 1926ء میں مبلغ اسلام سفیر پاکستان حضرت علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی رحمتہ اللہ علیہ کے گھر پیدا ہونے والے اس فرزند ارجمند نے زندگی بھر

اپنے ایمان، ضمیر اور نسبی تقاضوں کو سامنے رکھ کر احقاق حق اور ابطالِ باطل شمع روشن رکھی۔ علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کی زندگی کا واحد مشن ملک خداداد پاکستان میں نظام مصطفیٰ کا نفاذ اور مقام مصطفیٰ کا تحفظ تھا۔ جناب شاکر حسین خان ریسرچ اسکالر علوم اسلامی جامعہ کراچی اپنے تحقیقی مقالے میں لکھتے ہیں کہ

قیام پاکستان کے بعد علماء و مشائخ نے 1953ء میں قادیانیوں کے خلاف تحریک چلائی" لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکی، اس کے باوجود علمائے حق نئ حکمت عملی سے اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے سرانجام دیتے رہے اور ہر محاذ پر قادیانیوں کے سامنے سینہ سپر رہے، وہ علماء جنہوں نے حق کی آواز کو تحریک ختم نبوت 1953ء کی ناکامی کے بعد دوبارہ بلند کیا، ان میں روشن وتابندہ نام مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی کا ہے، جنہوں نے عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کیلئے بھرپور طریقے سے عملی جدوجہد جاری رکھی، قادیانیوں کے خلاف تحریک چلائی اور ان کی ہر موڑ پر مخالفت کرتے رہے، مولانا کو قادیانیوں کی مخالفت کرنا ورثے میں ملی تھی، ان کے والد مولانا شاہ عبد العلیم صدیقی قادیانیوں کے اہم مخالفین میں سے تھے، انہوں نے افریقہ، یورپ، سیلون، انڈونیشیا، ملائیشیا، برما، اور عرب ریاستوں میں قادیانیت کے خلاف مہم چلائی اور ان کے رد میں انگریزی زبان میں "The Mirror" نامی کتاب لکھی۔۔۔۔انہوں نے ایک کتاب

اردو میں بھی تحریر کی، جس کا نام "مرزائی حقیقت کا اظہار" ہے، اس کتاب کا ملائیشیا کی زبان میں ترجمہ شائع ہوا تو وہاں قادیانیوں کے خلاف زبردست تحریک چلی، جس کے بعد ملائیشیا میں قادیانیوں کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا، چنانچہ مولانا نورانی نے اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے قادیانیوں کی مخالفت کی اور ہمیشہ ان کے آگے آہنی چٹان کی مانند کھڑے رہے۔" بحوالہ ماہنامہ پیام حرم کراچی، نومبر 2005ء ص 23

علامہ نورانی 1971 میں پہلی بار جمعیت علماء پاکستان کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، 15اپریل 1972ء کو قومی اسمبلی کا سہ روزہ افتتاحی اجلاس شروع ہوا تو علامہ نورانی نے اجلاس کے پہلے ہی روز جمعیت علماء پاکستان کے پارلیمانی قائد کی حیثیت سے عبوری آئین کے حوالے سے عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کو اپنا موضوع گفتگو بنایا، یہ پاکستان کی تاریخ میں قومی اسمبلی کے فلور پر عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ میں بلند ہونے والی سب سے پہلی آواز تھی، قومی اسمبلی میں اپنے اولین خطاب میں علامہ نورانی نے آئین کے اندر مسلمان کی تعریف شامل کرنے کا پرزور مطالبہ کیا اور کہا کہ " جو لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آخری نبی نہیں مانتے ہم ان کو مسلمان ہی نہیں سمجھتے۔"

آپ کے اس مطالبے کا مقصد پاکستان کے اس اعلیٰ ترین انتظامی عہدوں پر عقیدہ ختم نبوت کے مخالف قادیانیوں اور غیر مسلموں کے فائز ہونے کے امکانات کا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خاتمہ تھا، دراصل علامہ نورانی کا آئین میں مسلمان کی تعریف شامل کرنے کا مطالبہ قادیانیوں کو کافر اور غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی تحریک کا نقطہ آغاز اور 1974ء کی تحریک ختم نبوت کی بنیادی اساس تھا، اس اجلاس میں مولانا نورانی نے مسلمان کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ "مسلمان وہ ہے کہ جو کتاب وسنت اور ضروریات دین پر یقین رکھتا ہو اور قرآن کو ان تشریحات کے مطابق مانتا ہو جو سلف صالحین نے کی ہیں، نیز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آخری نبی تسلیم کرتا ہو، اگر اسلامی آئین میں مسلمان کی یہ تعریف شامل نہ کی گئی تو ہم ایسے آئین کو اسلامی آئین نہیں کہیں گے" بحوالہ مولانا شاہ احمد نورانی ایک عالم ایک سیاستداں، ص 102-103 چنانچہ 17 اپریل 1972ء کو جمعیت علماء پاکستان اور متحدہ اپوزیشن کی جانب سے مسلمان کی جامع تعریف کو پہلی بار اسمبلی میں پیش کی گئی، جسے بعد میں 1973ء کے آئین میں شامل کرلیا گیا، علامہ نورانی کی کوششوں کی بدولت مسلمان کی تعریف پاکستان کے آئین کا حصہ بن چکی تھی، دراصل آئین میں اس تعریف کی شمولیت نے قادیانیوں کو ایک ایسی غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا تھا، جس کا مستقبل میں صرف اعلان ہونا ہی باقی رہ گیا تھا، اس تعریف کی شمولیت سے

قادیانیوں کو بھی یہ یقین ہو چلا تھا کہ وہ ایک غیر اعلانیہ غیر مسلم اقلیت قرار پا چکے ہیں
علامہ شاہ احمد نورانی پاکستان کی پارلیمانی اور آئینی تاریخ میں پہلے سیاستدان تھے،،
جنھوں نے سب سے پہلے آئین میں مسلمان کی تعریف شامل کرنے کا مطالبہ کیا اور
آپ نے آئین سازی کیلئے قائم کمیٹی میں سب سے پہلی ترمیم مسلمان کی تعریف اور
اسلام کو ریاست کا سرکاری مذہب قرار دینے سے متعلق پیش کی۔
مولانا نورانی کو منکرین ختم نبوت قادیانیوں اور قادیانیت سے شدید نفرت تھی اور اسی
نفرت نے انہیں زندگی بھر قادیانیت کے خلاف مصروف جہاد رکھا، قیام پاکستان کے بعد
اُمت مسلمہ کو امید تھی کہ ایک اسلامی نظریاتی ملک ہونے کی وجہ سے حکومت وقت
عوام کے مذہبی جذبات واحساسات کا خیال کرتے ہوئے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت
قرار دے گی، لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا اور وقت کے ساتھ ساتھ قادیانیوں کی
سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا، یہاں تک قادیانیوں کی اسلام
اور ملک دشمن سرگرمیوں کی وجہ سے اُمت مسلمہ کی نفرت نے 1953ء کی تحریک ختم
نبوت کو جنم دیا، جسے حکومت نے طاقت کے بل پر وقتی طور پر دبالیا، لیکن قادیانی
ذریت سے یہ نفرت اُمت مسلمہ کے دلوں میں سلگتی رہی، علامہ نورانی جو کہ نوجوانی
میں تحریک ختم نبوت 1953ء میں جید اکابر علماء کے ساتھ " علماء بورڈ کے ممبر اور
مجلس عمل تحفظ ختم

نبوت سندھ کے جنرل سیکرٹیری“کی حیثیت سے مرکزی کردار ادا کر چکے تھے۔
اس تحریک کی ناکامی کے اسباب و عوامل سے پوری طرح واقف تھے، چنانچہ آپ نے تحفظ ختم نبوت اور عظمت مصطفیٰ کو مملکت کا قانون بنانے اور آئینی تحفظ دینے کیلئے کام کرنا شروع کردیا، اس سفر کی کامیاب ابتداء آئین میں مسلمان کی تعریف کی شمولیت، ریاست کا سرکاری مذہب اسلام، دیگر اسلامی دفعات کو آئینی تحفظ دینے کے علاوہ عائلی قوانین کی تنسیخ، تینوں مسلح افواج کے سربراہوں کیلئے مسلمان ہونے کی شرط، فتنہ ارتداد کو روکنے کی ضمانت حاصل کرنے اور پاکستان کے دستور کو دو قومی نظریے سے ہم آہنگ کرنے کی کوششوں سے ہوچکی تھی اور آپ اپنے اہداف پر نظر رکھے ہوئے مرحلہ وار اس منزل کی جانب رواں دواں تھے۔
علامہ نورانی 29 اپریل 1973ء کو آزاد کشمیر اسمبلی میں میجر (ریٹائرڈ) محمد ایوب کی متفقہ طور پر منظور کی جانے والی قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی قرار داد سے بھی اچھی طرح واقف تھے اور محسوس کر رہے تھے کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی قرار داد پاکستان کی نیشنل اسمبلی کو بھی منظور کرکے پاکستان کے مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرنی چاہیے، واضح رہے کہ میجر (ریٹائرڈ) محمد ایوب کی قرار داد کا اصل محرک اور

اس کی بنیاد 17 اپریل 1972ء کو پاکستان کی قومی اسمبلی میں پیش کردہ مسلمان کی وہ متفقہ تعریف تھی جسے علامہ نورانی اور آپکے رفقاء نے تیار کیا تھا، آزاد کشمیر اسمبلی نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر ایک نئی تاریخ ہی رقم نہیں کی بلکہ پاکستان کی نیشنل اسمبلی کے اراکین کیلئے بھی آئندہ کا لائحہ عمل متعین کر دیا تھا۔

مرزائی آئین میں مسلمان کی تعریف کی شمولیت سے پہلے ہی سخت پریشان تھے کہ آزاد کشمیر اسمبلی میں قادیانیوں کے خلاف قرارداد کی منظوری نے ان کے تمام خدشات کو یقین میں بدل دیا اور انہیں محسوس ہونے لگا کہ عنقریب اب پاکستان کی قومی اسمبلی میں موجود علماء ان کے مستقبل کے بارے میں قرار داد پیش کر کے ان کیلئے رہے سہے راستے بھی بند کر دیں گے اس صورتحال نے مرزا ناصر کو اس قدر سیخ پا کر دیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف ہذیان بکنے لگا، اتفاق سے اسی دوران سانحہ ربوہ پیش آگیا، جس نے قادیانیوں کے خلاف عوامی نفرت کو مزید گہرا کر دیا، بعد میں یہی سانحہ تحریک ختم نبوت 1974ء کی اصل بنیاد بنا، علامہ شاہ احمد نورانی جو کہ تمام حالات کا نہایت ہی باریک بینی سے جائزہ لے رہے تھے، نے محسوس کیا کہ اب قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوانے کیلئے آئینی اور قانونی جنگ لڑنا انتہائی ضروری ہوگیا ہے، چنانچہ 30، جون 1974ء کو آپ نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کیلئے تاریخ ساز

قرارداد قومی اسمبلی میں پیش کی، جسے ایوان نے متفقہ طور پر منظور کرلیا۔
اس حوالے سے رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین مفتی منیب الرحمٰن لکھتے ہیں کہ "علماء اُس سے پہلے بھی موجود تھے۔۔۔۔ مگر یہ سعادت ماضی میں کسی کے حصے میں بھی نہیں آئی، تاریخ پاکستان میں پہلی بار ایک مرد حق، پیکر صدق و صفا، کوہ استقامت اور حاصل جرات و شجاعت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی اسمبلی میں پہنچے اور فتنہ انکار ختم نبوت یعنی قادیانیت کو کفر و ارتداد قرار دینے کی بابت قرار داد قومی اسمبلی میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی، تاریخ اسلام میں ریاست و مملکت کی سطح پر فتنہ انکار ختم نبوت کو کفر و ارتداد قرار دینے اور ان کے خلاف علم جہاد بلند کرنے کا اعزاز جانشین رسول خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوااور ان کے بعد یہ اعزاز انہی کی اولاد امجاد میں علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کو نصیب ہوا۔" بحوالہ ماہنامہ کاروان قمر کراچی نومبر دسمبر 2004ء ص 20
قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی جو کہ پورے ایوان پر مشتمل تھی نے دو ماہ میں قادیانی مسئلے پر غور خوض کیلئے 28 اجلاس اور 96 نشستیں منعقد کیں، اس دوران قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی کے روبرو قادیانی گروہ کے سرخیل مرزا ناصر، لاہوری گروپ کے امیر صدرالدین اور انجمن اشاعت اسلام لاہور کے عبدالمنان

اور مسعود بیگ پر ان کے عقائد و نظریات، ملک دشمنی اور یہودی و سامراجی گٹھ جوڑ کے حوالے سے جرح ہوئی، علامہ نورانی فرماتے ہیں کہ "مسلسل گیارہ روز تک مرزا ناصر پر جرح ہوتی رہی اور سوال اور جوابی سوال کیا جاتا رہا، مرزا کو صفائی پیش کرتے کرتے پسینہ چھوٹ جاتا اور آخر تنگ آ کر کہہ دیتا کہ بس اب میں تھک گیا ہوں، اسے گمان نہیں تھا کہ اس طرح عدالتی کٹھہرے میں بٹھا کر اس پر جرح کی جائے گی۔۔۔۔ وہ اپنا عقیدہ خود اراکین اسمبلی کے سامنے بیان کر گیا اور اس بات کا اعلان کر گیا کہ مرزا غلام احمد قادیانی حضور صلی للہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد مسیح موعود اور امتی نبی ہے، جن اراکین اسمبلی کو قادیانیوں کے متعلق حقائق معلوم نہیں تھے، انہیں بھی معلوم ہوگیا اور انہیں اس بات کا یقین ہوگیا کہ مولانا نورانی جنھیں اقلیت قرار دلوانے کی سعی کر رہے ہیں وہ لوگ واقعی کافر، مرتد اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔" بحوالہ ماہنامہ ضیائے حرم ختم نبوت نمبر 1974ء

قادیانی مسئلے پر فیصلہ کرنے کیلئے قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی نے قادیانی مسئلہ کو جانچنے اور پرکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں چھوڑا، کمیٹی کی کارکردگی اور اس کی کاروائیوں پر حزب اختلاف کے لیڈروں نے بھی پورے اطمینان کا اظہار کیا، اس طویل جمہوری و پارلیمانی کاروائی کے بعد قومی اسمبلی نے پورے تدبر سے کام لیتے ہوئے 7، ستمبر 1974 ء کو وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو

کی موجودگی میں آئین کی وہ واحد ترمیم منظور کی جس کی مخالفت میں ایک بھی ووٹ نہیں ڈالا گیا اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا تاریخ ساز فیصلہ کرتے ہوئے کہا کہ "جو شخص خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی للہ علیہ وآلہ وسلم کی حتمی اور غیر مشروط ختم نبوت میں یقین نہیں رکھتا یا نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، کسی بھی لفظ یا بیان کے ذریعے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ایک ایسے دعویدار کو نبی تسلیم کرتا ہے، یا کہ مذہبی مصلح جانتا ہے، وہ آئین یا قانون کی رو سے مسلمان نہیں ہے۔"

یوں جہاں علامہ شاہ احمد نورانی کی پیش کردہ قرارداد کی منظوری نے ختم نبوت کے ہر منکر کو خارج اسلام قرار دے دیا، وہاں اس قرارداد کی منظوری نے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے عہد حکومت کو ایک منفرد اعزاز سے مشرف کردیا۔ 1973ء کا آئین ملک کا پہلا آئین تھا، جس میں پاکستان کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان، مملکت کا مذہب اسلام، جس کی حفاظت کی ذمہ دار مملکت، مسلمان کی تعریف کی شمولیت اور قرآن و سنّت کے منافی کوئی قانون نہ بنانے کی شقوں کی وجہ سے 1956ء، 1962ء کے آئین سے قدرے ممتاز تھا، لیکن قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے والی آئینی ترمیم نے اس آئین کو دنیا کے تمام اور بالخصوص اسلامی ممالک کے دستاتیر میں ایک منفرد اور انوکھا اعزاز بخشا، وہ اعزاز یہ تھا کہ اس آئینی ترمیم کے ذریعے اسلام کے ایک بنیادی عقیدے عقیدہ

ختم نبوت جس پر اسلام کی بنیاد قائم ہے اور جس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں علمائے کرام قرآن و سنّت کی رو سے اس کے غیر مسلم ہونے کا اعلان کرتے تھے کو آئینی اور قانونی تحفظ دے کر اسے مملکت پاکستان کا ایک ایسا قانون بنا دیا گیا تھا جس کی رُو سے عقیدہ ختم نبوت پر یقین نہ رکھنے والا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی اور شخص کی نبوت کو ماننے والا کافر و مرتد، خارج اسلام اور غیر مسلم اقلیت قرار پایا۔

اس لحاظ سے 1973ء کا دستور دنیا کے تمام دساتیر میں منفرد حیثیت اور ممتاز مقام رکھتا ہے، علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی برصغیر پاک و ہند میں تحریک ختم نبوت کے قائدِ آخر ہیں، آپ کے ہاتھوں پاکستان کی قومی اسمبلی کے ذریعے اس نوے سالہ فتنے کا اختتام ہوا اور تحریک ختم نبوت اپنے منطقی انجام تک پہنچی، جناب شاکر حسین خان ریسرچ اسکالر علام اسلامی جامعہ کراچی لکھتے ہیں کہ " بے شک علامہ شاہ احمد نورانی عصر حاضر میں عاشقان مصطفٰی کے سردار ہیں، آپ نے مقام مصطفٰی کے تحفظ کیلئے بے پناہ خدمات سرانجام دیں، آپ اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے، اللہ تعالیٰ جس سے کام لینا چاہے لے لیتا ہے،اور عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کیلئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو چنا آپ نے جو کارنامہ سرانجام دیا وہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم تھا،جس کی بدولت آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔" بحوالہ ماہنامہ پیام حرم نومبر 2006ص

عروس البلاد کراچی میں ماہ رمضان کے شب و روز

عروس البلاد کراچی پاکستان کا سب سے بڑا اور ایسا شہر ہے جس میں رمضان المبارک شروع ہوتے ہی زندگی کے تمام معمولات بدل جاتے ہیں اور ہر طرف ایک ایسا رنگ نظر آنے لگتا ہے جس میں اسلامی تہذیب و ثقافت اور روایات کی جھلک نمایاں ہوتی ہے، ماہِ رمضان اس شہر کا سارا ماحول ہی بدل دیتا ہے، مساجد اور عبادت گاہیں نمازیوں سے بھر جاتی ہیں، شہر میں موجود شادی ہالوں میں تین روزہ اور پانچ روزہ نماز تراویح کا اہتمام کیا جاتا ہے، رمضان کے آخری عشرے میں تمام بڑی بڑی مساجد بالخصوص نیو میمن مسجد بولٹن مارکیٹ، رحمانیہ مسجد طارق روڈ اور مسجد طوبیٰ ڈیفنس وغیرہ میں محافل شبینہ منعقد کی جاتی ہیں، اسی طرح کراچی کے مشہور پارک " جہانگیر پارک" میں بھی تین روزہ تاریخی "نورانی شبینہ" جو پچیس تا ستائیس رمضان تک جاری رہتا ہے، کا انتظام کیا جاتا ہے، اس محفل شبینہ کی خاص بات یہ ہے کہ جب تک حضرت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی رحمتہ اللہ علیہ حیات تھے، وہ اس محفل شبینہ کا پچیس رمضان کو پہلا پارہ پڑھ کر باقاعدہ آغاز فرماتے اور ستائیس رمضان کو آخری پارہ سنا کر اس پر وقار محفل شبینہ کا اختتام فرماتے تھے، یہ روایت آج بھی قائم ہے، بس حضرت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کی جگہ اُن کے فرزند صاحبزادہ شاہ انس نورانی صدیقی نے لے لی

ہے۔

رمضان میں شہر بھر میں کھانے پینے کی دوکانیں اور ہوٹل احترامِ رمضان میں افطار تک بند ہو جاتے ہیں، مسجدوں میں خوب رونق رہتی ہے، جو خاص طور پر رمضان کی طاق راتوں میں روح پرور اور دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، کچھ لوگ جو سارا سال نمازِ جمعہ کے علاوہ مسجد میں نظر نہیں آتے اس بابرکت مہینے میں پانچ وقت کی نماز باجماعت ادا کرتے نظر آتے ہیں، کم عمر بچے بھی بہت ذوق و شوق سے مساجد کا رخ کرتے ہیں، یوں تو خواتین (جنہیں گھر میں نماز ادا کرنے کا حکم ہے) پر مسجد میں باجماعت نماز تراویح کی ادائیگی ضروری نہیں، لیکن گزشتہ کچھ سالوں سے شہر کی کچھ مخصوص مساجد میں خواتین کے لیے بھی علیحدہ نماز تراویح کا انتظام کیا جاتا ہے، اس کے علاوہ گھریلوں خواتین اپنے اپنے گھروں میں ماہ رمضان المبارک کے دوران تلاوت قرآن مجید، نوافل اور رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کا اہتمام بھی کرتی ہیں، دوران رمضان بعض گھروں میں نماز تراویح کے بعد ذکر واذکار کی محفلیں بھی سجائی جاتی ہیں، مساجد اور امام بارگاہوں میں افطاری کا بندوبست دیگر شہروں کی طرح کراچی کی بھی وہ روایت اور ایسی شناخت ہے جو مسلمانوں کی مساجد اور عبادت گاہوں کو اوروں سے ممتاز اور جدا کرتی ہے۔

مخیّر اور اہل ثروت حضرات اور فلاحی تنظیموں کی جانب سے شہر میں جگہ جگہ غریب روزہ داروں کیلئے سحری و افطاری اور کھانے کا اہتمام کیا جاتا ہے، بس اسٹاپوں پر مسافروں کی سہولت کیلئے افطاری کے اسٹال لگائے جاتے ہیں، دوسرے عشرے کے شروع ہوتے ہی چاند رات تک شہر کی مارکیٹس رات دیر گئے تک کھلی رہتی ہیں، جن میں افطار کے بعد رات دیر تک خریداروں کا ہجوم نظر آتا ہے، شہر میں جگہ جگہ بچت بازار لگائے جاتے ہیں، جن پر ہر قسم کی اشیاء مارکیٹ سے قدرے کم ریٹ پر دستیاب ہوتی ہیں اور افطار کے بعد بازاروں میں رات دیر تک خریداروں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔

کراچی میں افطار کے بعد کھانے پینے کے شوقین لوگ برنس روڈ، ایم اے جناح روڈ، سی ویو، بوٹ بیسن، سیون اسٹار چورنگی اور چٹخارے دار کھانوں کے ریستورانوں اور فورڈ اسٹریٹوں کا رخ کرتے ہیں، جوں جوں عید الفطر قریب آنے لگتی ہے، ان بازاروں کی رونقیں اور بھی دوبالا ہو جاتی ہیں، یہ بازار تقریباً ساری رات ہی کھلے رہتے ہیں، خاص طور پر ریسٹورنٹ تو صبح سحری تک کھلے رہتے ہیں تاکہ کسی کو بھی سحری میں تکلیف نہ ہو، بازاروں میں نت نئے خوانچہ فروش دیکھنے کو ملتے ہیں جو ٹھیلوں اور خوانچوں پر سموسے، پکوڑے، دہی بڑے، جلیبیاں اور انواع و اقسام کی چاٹ فروخت کر رہے ہوتے ہیں، مارکیٹ میں ہر قسم کا پھل دستیاب ہوتا ہے، جو مہنگائی اور ناجائز منافع خوری کے رجحان کی وجہ سے ایک

غریب اور عام آدمی کی پہنچ سے بہت دور ہوتا ہے، بد قسمتی سے انتظامیہ کی ملی بھگت کی وجہ سے پچھلے کچھ برسوں سے رمضان میں ناجائز منافع خوری کا رجحان بہت بڑھ گیا ہے، جو کہ اس ماہ مبارک میں انتہائی قابل افسوس اور بحثییت مسلمان باعث شرم بات ہے۔

یوں تو رمضان کے مبارک دنوں میں ہمیں بلاوجہ بازار جانا سخت ناپسند ہے، ایک تو اس کی وجہ روزے کی حالت میں طبیعت کا ست ہونا اور دوسرے رمضان کے دنوں میں بازاروں میں جیب کتروں اور اوباش قسم کے لوگوں کی موجودگی ہے، جو بلاوجہ خواتین کو تنگ کرتے ہیں اور شریف لوگوں کی جیبیں کاٹتے ہیں، اسی وجہ سے ہماری ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ رمضان کے ابتدائی دنوں میں ہی عید کی تیاری کرلی جائی اور تمام ضروری اشیاء پہلے سے خرید کر رمضان کے درمیان اور آخر میں مارکیٹ جانے کی کوفت سے بچا جائے، اس حوالے سے ہمارا دوست ساجد بھی ہمارا ہم خیال ہے، لیکن کیا کریں کہ ہم دونوں بھی دیگر لوگوں کی طرح اپنی اپنی اللہ رکھیوں (بیویوں) سے مجبور ہیں، جو کسی نہ کسی بہانے رمضان کے آخری دنوں تک خریداری جاری رکھنے کے بہانے ڈھونڈ ہی لیتی ہیں اور ہمیں ان کی وجہ سے بادل ناخواستہ بار بار بازار جاناپڑتا ہے۔

ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن میں کھلے میدانوں اور چھتوں پر رمضان کا چاند

دیکھنے کیلئے اہل محلہ جمع ہوا کرتے تھے اور جب کوئی چاند دیکھ لیتا تھا تو انگلی کے اشارے سے دوسروں کو دکھانے کی کوشش کرتا تھا۔ لوگ چاند دیکھ کر چاند دیکھنے کی دعا پڑھتے اور ایک دوسرے کو رمضان کی مبارکباد دیا کرتے تھے۔ محلے کی مساجد سے چاند کا اعلان کیا جاتا تھا اور سائرن بجائے جاتے تھے۔ گو کہ چاند کے اعلان اور سحر و افطار کے شروع اور ختم ہونے پر سائرن آج بھی بجائے جاتے ہیں، لیکن میدانوں اور چھتوں پر جمع ہو کر چاند دیکھنے اور ایک دوسرے کو گلے مل کر رمضان کی مبارکباد دینے کا رواج اب تقریباً متروک ہی ہوگیا ہے اور خود چاند دیکھنے کے بجائے اُس کی جگہ ٹی وی پر چاند کا اعلان سن کر موبائل میسجز کے ذریعے ایک دوسرے کو مبارکباد دینا اب عام سی بات بن گئی ہے۔

گو کہ رفتار زمانہ نے بہت سی انسانی عادتوں، رویوں اور چیزوں کو تبدیل کر دیا ہے لیکن بازاروں سے افطاری منگوانے کے بجائے خواتین کا خود گھروں میں افطاری تیار کرنے کا رواج آج بھی موجود ہے اور ہماری گھریلو خواتین شربت، ملک شیک، فروٹ چاٹ، کھٹے میٹھے دہی بڑے، آلو پالک کے پکوڑے، مختلف قسم کے سموسے بازار سے منگوانے کے بجائے گھر ہی پر تیار کرنا ضروری خیال کرتی ہیں۔ عموماً گھروں میں نمازِ عصر کے بعد افطاری بننا شروع ہو جاتی ہے۔ جس میں بچوں اور بڑوں سب کی پسند کا خیال رکھا جاتا ہے۔ رشتے داروں، ہمسایوں، محلے

کے غریب گھروں اور مساجد میں افطاری اور خاص کھانوں کو بھیجنے کا رواج آج بھی زندہ ہے۔ آج کے دور میں افطاری کے وقت ایک دستر خوان پر ایک ساتھ سب کا روزہ کھولنا کسی انعام اور نعمت باری سے کم نہیں ہے۔ ہوش ربا مہنگائی کی وجہ سے سفید پوش طبقے کی جانب سے افطار پارٹیوں کا سلسلہ کم ضرور ہوگیا، مگر ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ بچوں کو روزہ رکھوا کر روزہ کشائی کے دعوت نامے تقسیم کرنا اور افطاری کی بڑی بڑی تقریبات منعقد کرنا اور اہل ثروت کی جانب سے شہر کے اعلیٰ ہوٹلوں میں افطار ڈنر بوفے) دینا شہر کی نئی فروغ پاتی روایات میں سے ہیں۔)

پاکستان کے دیگر شہروں کی طرح ماہ رمضان المبارک میں کراچی شہر پر بھی پیشہ ور بھکاریوں اور گداگروں کی یلغار ہوتی ہے جن سے بازاروں اور سڑکوں پر جان چھڑانا آسان کام نہیں ہے۔ اسی طرح دن بھر گھر کے دروازے پر کسی نا کسی حاجت مند کا موجود ہونا بھی علامت رمضان ہے۔ رمضان المبارک کے دنوں میں سحری کے اوقات میں محلے کی مساجد سے خوبصورت لحن دار آوازوں میں نعتوں کا پڑھنا اور بار بار سحری کے اختتامی وقت کا بتانا ایک معمول ہے۔ حالانکہ پہلے سحری میں جگانے والے آتے تھے جو اعلانات اور ڈھول بجا کر لوگوں کو اٹھانے کا فریضہ سرانجام دیتے تھے۔ لیکن اب رمضان کے ابتدائی دنوں میں یہ لوگ دور دور تک نظر نہیں آتے۔ ہاں جہاں آخری عشرہ آتا ہے یہ لوگ نذرانے کے حصول کیلئے یوں

نکل آتے ہیں جیسے پوری تندہی سے انہوں نے لوگوں کا سحری میں اٹھانے کا کام کو سرانجام دیا ہو۔ رمضان میں عموماً ہر روزہ دار کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ جلدی سو جائے تاکہ صبح سحری میں اٹھنے میں مشکل نہ ہو۔ لیکن کراچی کی پر رونق اور دیر تک جاگتی زندگی میں یہ کام اتنا آسان نہیں۔

ایک زمانہ تھا جب رمضان کے آخری عشرے میں مساجد میں اعتکاف میں بیٹھنے کیلئے ایک آدمی بھی نہیں ملتا تھا اور اس فرض کفایہ کی ادائیگی کیلئے بزرگوں کو اعتکاف میں بیٹھنا پڑتا تھا، لیکن گزشتہ دس پندرہ سالوں سے نوجوانوں میں اعتکاف میں بیٹھنے کا رجحان بہت زیادہ بڑھ گیا ہے اور اب مساجد میں ایک نہیں بلکہ کثیر تعداد میں نوجوان جن کی تعداد دو اور تین ہندسوں سے بھی زائد ہو سکتی ہے، اعتکاف میں بیٹھتے ہیں، جو کہ ایک بہت ہی اچھی علامت ہے۔ دیگر خواتین کی طرح ہماری والدہ اور بہنیں بھی اعتکاف میں بیٹھتی ہیں، جو انتیس یا تیس رمضان کی مغرب اور چاند نکل آنے کے اعلان تک جاری رہتا ہے، چاند رات کو خواتین اور نوجوان لڑکیوں کا چوڑیاں پہننا، مہندی لگوانا اور سجنا، سنورنا اور صبح عید کی تیاریاں کرنا بھی اس رات کے خاص خاصے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اکیسویں صدی کا جدید کراچی آج بھی پاکستان کا ایک ایسا شہر ہے جو اپنی تہذیب و ثقافت، اساس اور روایات کا امین اور ان سے اپنا رشتہ قائم رکھتے ہوئے ہے، پاکستان کے دیگر شہروں کی طرح کراچی کے

مسلمان بھی بڑے خلوص اور جوش و جذبہ کے ساتھ رمضان المبارک کے روزے رکھتے
ہیں، نماز تراویح اور دیگر عبادات کا اہتمام کرتے اور عید مناتے ہیں اور وہ پوری
کوشش کرتے ہیں کہ اس ماہ مبارکہ میں اللہ رب العزت کی نازل کردہ انوار و تجلیات
اور اس کی رحمتوں و برکتوں مستفید ہوں اور رمضان کی فیض بھری ساعتوں سے اپنے
اپنے دامن بھرلیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ کریم اس ماہ مبارکہ میں تمام مسلمانوں کی
عبادات کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور بروز حشر اپنے پیارے حبیب حضرت محمد
مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر عنایت اور شفاعت سے بہرہ مند فرمائے۔ آمین

کہیں طے پا چکا ہے شہر کا مسمار رہنا

بدامنی، دہشت گردی، قتل اور غارت گری کی آکاس بیل قومی زندگی کی نرم و نازک شاخوں سے زندگی کا رس چوس کر تباہی و بربادی کی پت جھڑ پیدا کر رہی ہے، یوں لگتا ہے کہ خوف و دہشت اور بے یقینی کے ماحول میں زندگی گزارنا اب قوم کا مقدر بن چکا ہے، انجانے خوف، دل کو ڈرا دینے والے وسوسے اور قلب و روح کو دہلا دینے والے ڈر نے زندگی کا آرام و سکون چھین لیا ہے، کچھ پتہ نہیں کہ کب کون سے حادثے اور سانحے سے واسطہ پڑ جائے، اور کب کون سی روح فرساء خبر سننے کو مل جائے،
حادثات ہیں کہ سر اٹھائے کھڑے ہیں، صفحہ قرطاس پر وقت تباہی و بربادی کی داستان لکھ رہا کہ مالاکنڈ، دیر، بونیر، بیگورہ، شانگلہ، باجوڑ تباہی و بربادی کی کہانی سنا رہے ہیں تو سوات سے دیر اور بونیر سے صوابی تک عذاب دربدری اور بے گھری کے نوحے بکھرے پڑے ہیں۔
عجب حال ہے کہیں بم دھماکے، تو کہیں خود کش حملے، کہیں دہشت گردوں کی جانب سے جلسے، جلوس اور عبادت گاہوں پر حملے، تو کہیں قانون نافذ کرنے والے اداروں اور سیکورٹی فورسز کے ٹھکانوں پر حملے، اب ہماری روز مرہ زندگی کا معمول بن چکے ہیں، دہشت گردی کے خوں آشام عفریت نے ملک و قوم کی دیوار کو

اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے، گاؤں ہو شہر، قریہ ہو یا بستی، صوبہ ہو یا مرکز۔ اب کوئی جگہ ایسی نہیں، جو اِن ناگہانی حادثات سے بچی ہوئی ہو، سارے کا سارا ملک کرچی کرچی، زخم زخم ہے اور بے گناہ انسانوں کے لہو نے پورے ملک کو آفت زدہ بنادیا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ شاید پاکستان دنیا کا وہ واحد ملک ہے جہاں حجام اور قصاب تو ناغہ کر سکتے ہیں لیکن بم دھماکوں، بمباروں، خود کش حملوں اور ڈرون حملوں کا کوئی ناغہ نہیں تو قطعی غلط نہ ہوگا، ادھر ڈرون حملہ تو ادھر خود کش دھماکہ، کہیں بمباری تو کہیں فائرنگ کا تبادلہ، اخبارات ہوں یا ٹی وی، خبر نامہ سے زیادہ وحشت نامے کا منظر پیش کرتے ہیں۔

لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ قومی زندگی کے اس خوفناک منظر نامے میں ہمارے حکمران اور حکومتی ذمہ دار ہیں کہ ایک ہی راگ الاپ رہے ہوتے ہیں ''ہم دھماکے کی شدید مذمت کرتے ہیں، حکومت نے شر پسند عناصر کے ساتھ آہنی ہاتھ سے نمٹنے کا فیصلہ کرلیا ہے، دہشت گردی میں بیرونی ہاتھ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، حکومت نے سیکورٹی کیلئے فول پروف اقدامات کیے ہیں، مٹھی بھر دہشت گردوں کے ہاتھوں قوم کو یرغمال نہیں بننے دیا جائے گا، آخری دہشت گرد کے خاتمے تک جنگ جاری رہے گی اور یہ کہ اس قسم کی کاروائیاں دہشت گردی کے خلاف جنگ لڑنے کے ہمارے عزم پر اثرانداز نہیں ہوسکتیں، وغیرہ وغیرہ'' روز بیانات کی پٹاری میں سے عملی اقدامات سے محروم ایک نیا اور تازہ بیان سامنے

آجاتا ہے اور بے یقینی اور مایوسی کی پت جھڑ کو کچھ اور بڑھا دیتا ہے، اب تو یہ حال ہوگیا ہے کہ امید اور آس کے سارے شجر اپنے پتوں سے محروم ہوتے جارہے ہیں اور خزاں رسیدہ درختوں کی ننگی شاخیں دہشت گردی کے سورج کی زہر آلود کرنوں کو نہیں روک پارہی۔

جس کی وجہ سے قومی وجود کے مسام سلگ رہے ہیں، جسم جل رہے ہیں، لیکن دہشت گردی کا دائرہ ہے کہ پھیلتا ہی چلا جارہا ہے، وطن عزیز کا ہر شخص سہا اور دبکا ہوا ہے، کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ کیا ہورہا ہے اور کیا ہونے والا ہے، کون اِن واقعات کا ذمہ دار ہے، وہ کون سی پس پردہ قوتیں ہیں جو اِن واقعات کو بڑھاوا دے رہی ہیں، دہشت گرد کون ہیں، کہاں سے آتے ہیں اور وہ کون سی سلیمانی ٹوپی ہے جسے پہن کر وہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر غائب ہوجاتے ہیں۔

مقام حیرت ہے کہ ملک میں دہشت گردی کا یہ سلسلہ ایک طویل عرصے سے جاری ہے مگر آج تک ہمارے کسی انٹیلی جنس ادارے نے اِس حوالے سے کوئی خاص کارکردگی نہیں دکھائی، بس ہر واقعہ کے بعد وہی رٹا رٹایا بیان سامنے آجاتا ہے کہ دہشت گرد کا سر مل گیا ہے یا اس کی ٹانگیں مل گئیں ہیں، تفتیش کیلئے خصوصی کمیٹیاں بنتی ہیں، کمیشن قائم کیے جاتے ہیں، خصوصی فورس تشکیل دی جاتی ہے

اور انسداد دہشت گردی کے سیل بنائے جاتے ہیں، مگر اُس کے بعد کیا پیش رفت ہوئی۔ قوم آج تک اس حوالے سے ہونے والی تمام تحقیقات سے لاعلم ہے، یوں لگتا ہے کہ ملک میں ایسا کوئی ادارہ اور قانون نہیں جو مملکت کی جڑیں کھوکھلے کرنے والے اِس کینسر کی روک تھام کرے اور اسے عضو معطل کی طرح کاٹ کر باہر نکال پھینکے، امن وامان کی غارت گری کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ جانے کب تک جاری رہے گا، کوئی نہیں جانتا، اب تو قوم اس لگے بندھے فارمولے ''بھیانک وارادات، رسمی بیانات، مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے اعلانات اور پھر گہری نیند کے ایک طویل وقفہ جو دوسری واردات سے پہلے نہیں ٹوٹ پاتا'' کی تقریباً عادی ہوچکی ہے۔

آج وطن عزیز میں امن وامان کی اس گھمبیر صورتحال سے ہر محب وطن پاکستانی شدید فکر اور اضطراب میں مبتلا ہے، آئے روز کے خود کش دھماکوں نے وہ غیر یقینی صورت حال پیدا کردی ہے کہ کسی شخص کی زندگی محفوظ نہیں رہی اور یوں لگتا ہے کہ پورے ملک میں خود کش حملہ آوروں کی فصل بڑھتی چلی جارہی ہے، جس کے سامنے حکومت کے تمام قانون نافذ کرنے والے ادارے بے بس ولاچار نظر آتے ہیں، ایک ایسے وقت میں جبکہ دہشت گردوں کے حملوں میں تیزی آگئی ہے۔

امریکی کمانڈر جنرل پیٹریاس کے ایک سابق مشیر ڈیوڈ کیلون پیش گوئی کر رہے ہیں کہ پاکستان میں جاری مزاحمت کے نتیجے میں پاکستان چھ مہینے میں ٹوٹ جائے گا" جس " تسلسل اور منظم پلاننگ کے ساتھ ملک میں بے چینی اور مایوسی پھیلائی جارہی ہے، اس سے صاف نظر آرہا ہے کہ پاکستان دشمن طاغوتی طاقتیں پاکستان کا مستقبل کیا دیکھنا چاہتی ہیں۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ یہ سب کچھ 11/9 کی اُسی آسیبی رات میں طے پایا تھا جس میں عوام کو مکے دکھانے والے ایک فوجی آمر نے اپنے اقتدار کو طول دینے کیلئے امریکی رعونت کے سامنے سر تسلیم خم کرکے افغانستان پر لشکر کشی کیلئے اپنا کاندھا پیش کیا تھا، یہی وہ قیامت کی گھڑی تھی جس نے ہمارے مقدر میں ذلت و رسوائی اور تباہی و بربادی لکھ دی، وقت نے ثابت کردیا کہ ترقی و خوشحالی کیلئے دکھائے گئے سارے خواب جھوٹے تھے، امریکی عنایات و نوازشات کے سارے دعوے غلط تھے۔

آج یہ حال ہے کہ امریکی خوشامد، چاپلوسی اور کاسہ لیسی میں فرنٹ لائن اسٹیٹ کا کردار ادا کرنے اور امریکی جارحیت کی رضاکارانہ وکالت کے باوجود ہم کسی بند گلی میں کھڑے ہیں اور ہماری آواز گنبد کی دیواروں سے ٹکرا کر گونج رہی

ہے، چنانچہ اس خطرناک صورتحال میں ضرورت اس امر کی ہے کہ ڈالروں کی امداد سے بہلنے، امریکی دوستی کے بیانات سے خوش ہونے اور بارک اوباما، رچڑد ہالبروک، جنرل پیٹریاس سے ہاتھ ملانے کو اپنی خوش بختی سمجھنے والوں کو یہ جان لینا چاہیے کہ کی تگ و دو میں بدامنی اور دہشت گردی کی تیز Batter more اور Do more دھوپ اب ہمارے گھروں کے آنگنوں میں اتر چکی ہے۔

جس کی حدت سے ملک و قوم کا حساس وجود جھلسا جارہا ہے اور ان حالات میں عوام میں نہ صرف حکومتی کارکردگی پر عدم اطمینان بلکہ خود جمہوری عمل سے مایوسی میں اضافہ ہورہا ہے، کچھ لوگ مایوس ہوکر تشدد اور خونی انقلاب کا راستہ اختیار کررہے ہیں تو کچھ بددل ہوکر مایوس ہو بیٹھے ہیں، حالانکہ کہ یہ وقت قومی احتساب، نئی سوچ و بچار، مملکت کو درپیش خطرات کے صحیح ادراک، اصلاح احوال کیلئے درست حکمت عملی اور قوم کو متحد، منظم اور متحرک کرنے کا ہے۔

یہ ملک اللہ تعالٰی کا ایک عظیم عطیہ ہے جس کی حفاظت ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے، جبکہ دوسری طرف سامراجی قوتوں کا اصل ہدف پاکستان کا اسلامی تشخص اور اِس کی نیوکلیئر صلاحیت ہے، یہ راز اب ڈھکا چھپا نہیں کہ امریکہ اور اُس کے حواری بھارت اور اسرائیل اس علاقے کے سیاسی نقشے کو تبدیل کرنے کے

مذموم منصوبے پر عمل پیرا ہیں، یہ وقت صرف قیادت کا ہی نہیں پوری قوم کیلئے امتحان کا وقت ہے۔

اس وقت ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ بحیثیت قوم، پاکستان کو درپیش خطرات اور چیلنج سے نبرد آزما ہونے کیلئے کمربستہ ہوجائیں، قومی زندگی کے اس نازک موڑ پر ہمارے ارباب اختیار یقیناً اس حقیقت سے آگاہ ہونگے کہ کمزور سے کمزور قومیں بھی اپنے اندر کچھ نہ کچھ دفاعی صلاحیت رکھتی ہیں اور بے بس و مجبور لوگ بھی زندگی میں کسی نہ کسی موڑ پر پورے اعتماد اور بھروسے کے ساتھ ظالم و جابر قوت کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہوجاتے ہیں اور کہہ گزرتے ہیں کہ ''بس اب بہت ہوگیا، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوسکتا'' چنانچہ غیرت و حمیت، عزت نفس اور آزادی و خودداری کا تقاضہ اب اِس بات کا متقاضی ہے کہ ہمارے ارباب اقتدار وطن عزیز کی سالمیت بقاء اور استحکام اور ملک و قوم کو مزید تباہی و بربادی سے بچانے کی خاطر وار آن ٹیرر کی پالیسی پر نظرثانی کریں اور امریکہ کی مزید کاسہ لیسی سے گریز کرتے ہوئے ایک زندہ و باوقار قوم کی طرح اپنے فیصلے خود کرنے کا حوصلہ اپنائیں، کیونکہ اب ہماری بربادیوں کے مشورے سرگوشیوں سے نکل کر کھلے اعلانات تک آچکے ہیں۔

مقدر ہوچکا ہے بے درو دیوار رہنا

کہیں طے پا چکا ہے شہر کا مسمار رہنا

اس سے پہلے کہ مہلت ختم ہو جائے ــــــــــــــــــ

حضرت مجاہد رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پرانے زمانے میں ایک بادشاہ تھا جو بہت نرم مزاج، عدل پسند اور اپنی رعایا کے ساتھ بہت حسن سلوک کرتا تھا، بادشاہ کا دور حکومت بہت ہی مثالی تھا، ملک میں ہر طرف امن و امان اور خوشحالی کا دور دورہ تھا، ایک دن بادشاہ کے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ بھیس بدل کر اپنی رعایا کے حال احوال کا جائزہ لیا جائے، چنانچہ اُس نے بھیس بدلا اور رعایا کا جائزہ لینے نکل گیا۔
راستے میں ایک مقام پر اُسے ایک آدمی ملا جس کے پاس ایک گائے تھی، بادشاہ نے اُس آدمی سے اُس کی خیریت دریافت کی اور گائے کے بارے میں معلوم کیا، آدمی نے بادشاہ کو بتایا کہ رحم دل اور عادل بادشاہ کی وجہ سے ہم پر اللہ کا بڑا کرم ہے، سب کچھ ٹھیک ہے اور یہ جو گائے آپ دیکھ رہے ہیں اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ 30 گائیں کے برابر دودھ دیتی ہے۔
بادشاہ جو کہ ایک عام آدمی کے بھیس میں تھا یہ سن کر بہت حیران ہوا، اور اس نے دل میں سوچا کہ اگر یہ گائے مجھے مل جائے تو کتنا اچھا ہو، کیوں نہ میں

اِس آدمی سے یہ گائے چھین لوں، چنانچہ بادشاہ نے اُس آدمی سے گائے ہتھیانے کا ارادہ کیا اور آگے روانہ ہوگیا، کچھ عرصے کے بعد بادشاہ نے ایک بار پھر بھیس بدلا اور گھومتا ہوا اُسی جگہ پر پہنچا جہاں اُس کی ملاقات پچھلی مرتبہ گائے کے مالک سے ہوئی تھی، اُس نے دیکھا کہ گائے کا مالک کچھ پریشان ہے، بادشاہ نے گائے کے مالک سے اُس کا حال احوال دریافت کیا اور گائے کے متعلق سوال کیا، گائے کے مالک نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور افسردہ لہجے میں کہا، اے اجنبی میں تجھے کیا بتاؤں، بادشاہ جو کہ عام آدمی کے بھیس میں تھا اُس نے ہمدردانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے گائے کے مالک سے کہا آخر میں بھی تو سنو ایسا کیا معاملہ ہوا۔

گائے کے مالک نے کہا بھائی میری یہ جو گائے آپ دیکھ رہے ہیں کچھ عرصہ پہلے تک یہ 30 گائیں کے برابر دودھ دیتی تھی لیکن اب یہ بمشکل ایک گائے کے برابر دودھ دیتی ہے، بادشاہ نے اُس سے کہا کیا تم نے اپنی گائے کو کسی اور چراگاہ میں چرانا شروع کردیا ہے، آدمی نے جواب دیا نہیں بلکہ میں تو اپنی گائے کو اُسی جگہ چراتا ہوں جہاں پہلے چراتا تھا، بادشاہ نے پوچھا پھر اس کے دودھ کی کمی کی کیا وجہ ہوسکتی ہے، گائے کے مالک نے جواب دیا ہمدرد اجنبی مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہمارے بادشاہ سلامت کی نیت میں فتور آگیا ہے اور اُس نے اپنی رعایا پر ظلم کرنے کا ارداہ کرلیا ہے، بادشاہ نے کہا، اے شخص تو یہ

کیا کہہ رہا ہے سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارا بادشاہ کتنا عادل اور نیک اور اپنی
رعایا کا خیال رکھنے والا ہے۔
اُسے تیری کیا خبر اور اُس نے تیرے ساتھ کون سا ظلم کر دیا ہے؟ گائے کے مالک نے
کہا میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میری گائے کے دودھ کی کمی اصل وجہ بادشاہ کی نیت
میں فتور اور اُس کے ظلم کرنے کا ارادہ ہے، بادشاہ نے اُس آدمی سے پوچھا تو اتنا یقین
سے کیسے کہہ سکتا ہے، گائے کے مالک نے جواب دیا، اے اجنبی بزرگ کہتے ہیں جب
حکمران اپنی رعایا پر ظلم و ستم کا ارادہ کرتے ہیں تو مال و اسباب اور چیزوں میں خیر و
برکت اٹھالی جاتی ہے۔
اس لئے میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میری گائے کے دودھ کی کمی کی
اصل وجہ بادشاہ کے رویئے کی تبدیلی ہے، بادشاہ نے گائے کے مالک کی دلیل سن کر
محسوس کیا کہ واقعی گائے کا مالک سچ کہہ رہا ہے اُس نے دل میں سوچا کہ ابھی تو میں
صرف اِس آدمی سے اُس کی گائے چھیننے کا ارادہ کیا تھا، گائے چھینی نہیں تھی تو اللہ تعالی
نے میری بدنیتی کے سبب گائے کے دودھ کی برکت چھین لی اگر خدانخواستہ میں اِس
آدمی سے گائے چھیننے کا ظلم کر بیٹھتا تو نہ جانے کیا حال ہوتا۔

وہ خاموشی سے محل واپس لوٹا اور اللہ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوکر رو رو کر سچے دل سے معافی مانگی، توبہ کی اور عہد کیا کہ آئندہ کبھی بھی اپنی رعایا پر ظلم و ستم کرنے اور اُن سے اُن کا حق چھیننے کا خیال بھی دل میں نہیں لائے گا، حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ ادھر بادشاہ نے سچے دل سے توبہ کی ادھر اللہ نے گائے کے دودھ میں پہلے کی طرح خیر و برکت پیدا فرما دی۔

یہ بات درست ہے کہ حضرت مجاہد کا بیان کردہ مندرجہ بالا واقعہ ایک حکایت ایک کہانی ہے لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حکمرانوں کی اچھائیوں اور نیکیوں کے ثمرات پورے ملک و قوم کی معیشت پر نمایاں ہوتے ہیں اور اُن کی بداعمالیوں اور ظلم و زیادتی کا تاوان پوری قوم ادا کرتی ہے، اِس بات کی تائید حضرت مالک بن دینار رحمتہ اللہ علیہ کے بیان کئے ہوئے اِس واقعہ سے ہوتی ہے آپ فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمر بن العزیز رحمتہ اللہ علیہ خلیفہ ہوئے تو پہاڑوں کی چوٹیوں پر موجود چرواہے کہنے لگے کون نیک شخص لوگوں کا خلیفہ بنا ہے، اُن سے پوچھا گیا کہ تمہیں اِس بات کا علم کیسے ہوا؟، انہوں نے کہا جب کوئی نیک شخص خلیفہ بنتا ہے تو شیر اور بھیڑیئے بکریوں کا شکار کرنے سے رک جاتے ہیں، حضرت موسیٰ ابن اعینی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ خلافت میں ''کرمان'' کے علاقے میں بکریاں چراتے تھے اور جنگلی جانور اور بھیڑیے ایک ہی جگہ میں چرتے تھے، ایک

رات اچانک ایک بھیڑیا ایک بکری پر حملہ آور ہوا تو ہم نے کہا ضرور کسی نیک آدمی کا انتقال ہوا ہے۔

حضرت حماد کہتے ہیں کہ مجھ سے حضرت موسیٰ ابن اعینی یا کسی اور نے بیان کیا کہ انہوں نے حساب لگایا تو اُسی رات حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تھا، حضرت قتادہ رضی اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا آپ آسمان میں ہیں اور ہم زمین میں ہیں آپ کی رضا اور ناراضگی کی علامت کیا ہے؟، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، میرا تمہارے اوپر نیک لوگوں کو بادشاہ بنانا میرے راضی ہونے کی علامت ہے اور برے لوگوں کو بادشاہ بنانا میرے ناراض ہونے کی علامت ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ”جب تم میں سے اچھے لوگ تمہارے امیر ہوں تمہارے مال دار سخی ہونگے اور تمہارے معاملات آپس میں مشورے سے طے ہوتے ہوں تو اُس وقت زمین کے اوپر کا حصہ تمہارے لیے اُس کے اندورنی حصے سے بہتر ہے اور جب تم میں سے برے لوگ تمہارے امیر ہوں تو تمہارے مال دار بخیل ہونگے اور تمہارے معاملات عورتوں کے ہاتھ میں ہوں تو اُس وقت زمین کا اندورنی حصہ تمہارے لیے اوپر کے حصے سے بہتر ہے“حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ کے پاس

مہاجرین کے دس افراد بیٹھے ہوئے تھے میں اُن میں سے دسواں آدمی تھا۔
آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے چہرہ انور کے ساتھ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا ''جس قوم میں بے حیائی عام ہوجائے اور لوگ اُس کا کھلم کھلا ارتکاب کرنے لگیں تو وہ قوم مختلف امراض و تکالیف اور طاعون میں مبتلا کردی جاتی ہے جو امراض اُن سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں میں موجود نہ تھے اور جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے وہ قحط سالی، مشقت و شدت اور بادشاہ (حاکم وقت) کے ظلم میں مبتلا کردی جاتی ہے اور جو قوم اپنے مال کی زکوۃ ادا نہیں کرتی وہ باران رحمت سے محروم کردی جاتی ہے۔
اگر جانور نہ ہوتے تو اُن پر بارش ہی نہ برستی اور جو قوم عہد شکنی کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اُن پر اُن کے غیر سے دشمن مسلط کردیتے ہیں، جو اُن کے مال و متاع پر قابض ہوجاتے ہیں، اور جب لوگوں کے حکمران اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام و قوانین کے مطابق عمل نہیں کرتے اور قرآن مجید کے احکامات کو اہمیت نہیں دیتے تو اللہ تعالیٰ اُن کو آپس کے عذاب میں مبتلا کردیتے ہیں'' ایک اور روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ '' جس قوم میں قتل و غارت عام ہوجاتی ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو قتل کرنے لگیں تو اللہ تعالیٰ اُن پر اُن کے دشمن مسلط کردیتے

ہیں۔۔۔۔ اور جو قوم امر بالمعروف (کافریضہ) ترک کردیتی ہے اس کے اعمال کو بلندی نہیں ملتی اور ان کی دعائیں قبول نہیں ہوتی''

واقعی حق فرمایا رسول برحق نے مندرجہ بالا حالات کے تناظر میں آج ہماری دعائیں کیسے قبول ہو سکتی ہیں، ہمارے حالات کیسے بہتر ہو سکتے ہیں اور حکمرانوں کے ظلم و ستم اور جابرانہ تسلط سے ہمیں کیسے نجات مل سکتی ہے، یہ درست ہے کہ ہماری موجودہ پستی، سیاسی تنزلی، معاشی و معاشرتی ابتری اور دنیا میں ذلت و رسوائی کا سب سے اہم اور بنیادی سبب ہمارے دینی و ملی فکر سے عاری ناعاقبت اندیش حکمران ہیں لیکن اِس کے ساتھ ساتھ ہم کسی طور بھی اِن حالات سے اپنے آپ کو بری الزمہ قرار نہیں دے سکتے، بلکہ درحقیقت دیکھا جائے تو (جیسے عوام ویسے حکمران کی مصداق) حکمرانوں سے زیادہ ہمیں اپنا قصور نظر آتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نیک اور اچھے اور ملک و قوم سے محبت رکھنے والے لوگوں کو چھوڑ کر چوروں، لیٹروں، ڈاکوؤں اور ظالم و جابروں کو اپنا حکمران منتخب کرتے ہیں، بار بار آزمائے ہوئے لوگوں کو آزماتے ہیں اور ایک ہی سوراخ سے ڈسے جاتے ہیں، بے راہ روی، بے حیائی اور عریانی و فحاشی کو فیشن کا روپ دیتے ہیں، جھوٹ، فریب مکر و دجل کا راستہ اپناتے ہیں، ناپ تول میں ڈنڈی

مارتے ہیں، زکوۃ کی ادائیگی سے صرف نظر کرتے ہیں، ناداروں، مسکینوں اور مظلوموں کے حقوق غصب کرتے ہیں۔

احکام خداوندی کی صریحاً کھلے عام خلاف ورزی کرتے ہیں، اور سزا و جزا کے ڈر و خوف سے بے نیاز کمال ڈھٹائی سے بار بار اللہ اور اس کے رسول سے عہد شکنی کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آج دنیا بھر میں اُمت مسلمہ بری طرح پٹ رہی ہے، ذلت و رسوائی مقدر ہمارا بنی ہوئی ہے، اُمت کے بکھرے ہوئے ریوڑ کو ہر لمحہ اور ہر ہر قدم پر خونخوار بھیڑیوں کا سامنا ہے۔

دنیا بھر کے مسلمان اغیار کی سازشوں کا شکار ہیں، اپنے شاندار ماضی سے اکتاہٹ، ناامیدی، شکست خوردگی، اور احساس کمتری جیسے مہلک امراض نے اُمت کو پست ہمت، کاہل، عیش پرست اور علم و عمل کی دنیا میں ناکارہ بنا دیا ہے، ہمارے حکمران محض لیلیٰ اقتدار کے مجنوں بنے یہود و نصاریٰ کی غلامی کے جال میں جکڑے ہوئے ہیں، اور اُمت مسلمہ اور بالخصوص پوری پاکستانی قوم کا المیہ یہ ہے کہ ہم اسراف کا شکار ہیں، مسلمانوں کے دشمنوں یہود نصاریٰ سے ڈرتے ہیں اُن کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔

اللہ پر توکل اور خود پر بھروسہ اختیار کرنے کے بجائے غیروں سے ہمدردی اور

مدد کی بھیک مانگتے ہیں، اللہ کی مخلوق پر رحم و در گزر نہیں کرتے، کمزور و بے بس بھی ہمارے قہر و غضب اور ظلم و ستم سے محفوظ نہیں، جھوٹ، وعدہ خلافی، بداخلاقی، بد زبانی ہمارا روز مرہ کا معمول بن گئی ہے، خیرات و صدقات دینا تو درکنار کھانے سے بھی گریز نہیں کرتے ہیں، اپنے گناہوں پر اللہ سے توبہ استغفار طلب کرکے ربّ کی بارگاہ میں سجدہ ریز نہیں ہوتے، افسوس کہ ہم اپنی زندگی میں اِن تمام حقائق سے واقف لیکن یکسر غافل لوگ ہیں، ہمارے کان، ہماری آنکھیں، ہمارے ہاتھ، ہمارے پاؤں اور ہمارے دل و دماغ سب ہماری نفسانی خواہشات کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں۔

ہم اپنے ہاتھوں سے اپنی تباہی کا گڑھا کھود رہے ہیں، اور اپنی موجودہ بد بختی کے ہم خود ہی ذمہ دار ہیں، قرآن کہتا ہے ”اور کاش (ان) ظالموں کو تم اُس وقت دیکھو جب یہ اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونگے، جو کمزور سمجھے جاتے تھے وہ بڑے لوگوں سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرو مومن ہوجاتے، بڑے لوگ کمزوروں سے کہیں گے کہ بھلا ہم نے تم کو ہدایت سے جب وہ تمہارے پاس آچکی تھی روکا تھا، نہیں بلکہ تم خود مجرم تھے“ (السبا31

میرے دوستوں ذرا اُس دن کو یاد کرو جب حق کا منادی پکار پکار کر کہے گا کہاں (34 ہیں وہ لوگ جو کہتے تھے ہم بہت سا مال و اولاد رکھتے ہیں ہم کو عذاب نہیں ہوگا، کہاں ہیں۔

وہ متکبر جنھوں نے اللہ کی عظمت و کبریائی کے سامنے خود کو بڑا سمجھنے کی جسارت کی، کہاں ہیں وہ مجرم جنھوں نے بے گناہوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے، جنھوں نے سازش کرکے بھائی بھائی کو لڑا دیا، جنھوں نے ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب، کو ماننے والوں سے ایک دوسرے کے گلے کٹوائے، جنھوں نے بے گناہ معصوموں کی جان لی، کہاں ہیں وہ بے حس، تنگ دین وملت جنھوں نے روئے زمین کو نفرت اور آتش و آہن سے بھر دیا، کہاں ہیں وہ جنھوں نے ہمارے قول صداقت کو جھوٹ اور افتراء قرار دیا، کہاں ہیں وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہمارے سامنے پیش نہیں ہونگے، یقیناً ضرور ہوں گے اور آج انہیں اپنے کرتوتوں کی لازمی سزا ملے گی۔

آج ہمارے پیارے وطن کو انہی مجرموں، خائنوں، بدکرداروں، ظالموں، جابروں اور قاتلوں کا سامنا ہے، دشمن ہماری سرحدوں پر ہماری تباہی و بربادی کا سامان لئے تیار کھڑا ہے اور حکمران اُس کا مقابلہ کرنے کے بجائے اپنی ہی وحدت ملی اور قوت و طاقت کا شیرازہ بکھیرنے میں مصروف ہیں، قوم گزشتہ 62 برس سے اِن کے ہاتھوں یرغمال بنی ہوئی ہے، بھوک و پیاس، غربت و بے روزگاری، ظلم و زیادتی اور استحصالی نظام نے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔

بے گناہ اور معصوم ظلم و ستم اور تشدد کا نشانہ بن رہے ہیں، اور ظالم و جابروں کو ظلم و ستم کرنے کیلئے کھلی ڈھیل ملی ہوئی ہے، سوال یہ ہے کہ کیا یہ مجرم اللہ کی گرفت سے بچ پائیں، بھاگ پائیں گے، بے شک وہ رسی دراز کرتا ہے تاکہ ہر ظالم اپنے ظلم کا پیمانہ خوب اچھی طرح بھرلے، اپنے نامہ اعمال کی سیاہی مزید بڑھالے اور اپنی ہوس اقتدار کو پورا کرنے کیلئے جس کو چاہے روند ڈالے، جس کو چاہے مٹا ڈالے، مہلت کا ملنے والا یہ وقفہ انسان کو خود فریبی میں مبتلا رکھتا ہے۔

وہ سمجھتا ہے ابھی اُس کے پاس بہت وقت ہے اور اُسے کوئی روکنے والا نہیں، لیکن خدائے لم یزل کی طرف سے ملی ہوئی مہلت بالآخر ختم ہو ہی جاتی ہے اور بغاوت ونافرمانی کی دراز رسی گلے کا پھندہ بن کر ظلم و جبر اور گناہوں کا سلسلہ منقطع کرکے بڑے بڑے ناموروں کو بے نام ونشاں بنا دیتی ہے، ہمیشہ اقتدار کی کرسی پر متمکن رہنے کے خواہشمندوں اور اُن کے قتدار کو دوام بخشنے والوں غور کرو، اس سے قبل کہ وہ وقت آئے جب مہلت ختم ہوجائے اور توبہ کے تمام دروازے بند ہو جائیں، رب تعالیٰ کی بارگاہ میں سچے دل سے توبہ کرنے کیلئے سجدہ ریز ہو جاؤ۔

مصطفیٰ کریم کے صدقے میں اپنی تمام بداعمالیوں اور کوتاہیوں سے معافی کے

طلب گار بنو، بے شک وہی معاف کرنے والا اور ذلت کے اندھیروں سے نکال کر عزت
و عظمت کے اجالوں کا راستہ دکھانے والا ہے۔

عوامی خواہشات کے ادراک سے محروم حکمران

پاکستان کی 61 سالہ تاریخ میں بحران در بحران کی ایک نہ ختم ہونے والی کہانی ہے، کبھی آئینی بحران، کبھی سیاسی بحران، کبھی معاشی بحران، کبھی معاشرتی بحران، کبھی اخلاقی بحران اور کبھی جمہوری بحران، ایک بحران سے دوسرے بحران تک ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ ہے۔

یہ ہماری عجیب بدقسمتی ہے کہ ایک بحران ختم نہیں ہوپاتا کہ دوسرا بحران سر اٹھائے کھڑا ہوتا ہے، ابھی ایک بحران کے اثرات زائل نہیں ہوپاتے کہ دوسرا بحران اپنی تمام تر تباہ کاریوں کے ساتھ ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہوتا ہے اور بحرانوں کے زہریلے سانپ اور خونخوار اژدہے پھنکارتے ہوئے قومی یکجہتی اور ملکی سالمیت کو تباہ کرنے کیلئے موجود ہوتے ہیں، قیام پاکستان کے بعد بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح کی آنکھیں بند ہوتے ہی بحرانوں کا ایسا سیلاب آیا کہ سات سال تک پاکستان سرزمین بے آئین رہی اور حکمران ملک کو کوئی متفقہ آئین نہ دے سکے.

ملک میں ایک عبوری آئین نافذ کیا گیا جو 1956ء میں مستقل آئین قرار پایا،

مگر 1958ء میں ایک فوجی آمر جنرل ایوب خان نے ملک میں مارشل لاء لگا کر اس آئین کو بھی اٹھا کر پھینک دیا، ایوب خان کے اس اقدام کی وجہ سے پاکستان میں جاگیر داری نظام کمزور ہونے کے بجائے مزید طاقتور ہوگیا، فوجی اسٹیبلشمنٹ، سول بیورو کریسی، سرمایہ داروں اور جاگیر داروں کے گٹھ جوڑ نے قیام پاکستان کے بنیادی نظریے، آزادی کی تاریخی جدو جہد اور ملک و قوم کے مستقبل کو اغوا کرلیا.

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ پڑوسی ملک کے مقابلے میں ایک چھوٹی فوج رکھنے والے ملک پاکستان کے فوجی سربراہوں نے اقتدار پر قبضے اور کنٹرول کے حوالے سے اپنے آپ کو دنیا کے منظم ترین لوگ ثابت کیا، فوجی سول بیورو کریسی اور جاگیر دارانہ و سرمایہ دارانہ گٹھ جوڑ نے بہت جلد ملک و قوم کو اپنے خونی پنجوں میں دبوچ لیا، جس کی وجہ سے انہیں اپنے خلاف بغاوت اور سرکشی کا خطرہ نہیں رہا اور یوں قیام پاکستان کے اُس بنیادی نظریے اور اساس کی نفی ہوگئی جو بنائے پاکستان اور استحکام پاکستان کی بنیاد قرار دی گئی تھی، حکمرانوں کی ہوس اقتدار نے نظریے کی بنیاد پر قائم ہونے دنیا کی واحد ریاست کو اپنی اصل شناخت سے ہی محروم کرکے پاکستان کو بحرانوں کی سرزمین بنا دیا اور آئے دن جنم لینے والے نت نئے مسائل پاکستان کو مسائلستان بناتے گئے.

المیہ یہ ہوا کہ گزشتہ 61 سال سے قومی مفاد سے قطع نظر ملک حکمرانوں کے ذاتی مفادات اور خواہشات کی بھینٹ چڑھتا رہا، ہر آنے والے نے ملک و قوم کی بہتری کے بجائے اپنے اقتدار کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی تگ دو کی، ملک غلام محمد، میجر جنرل سکندر مرزا، فیلڈ مارشل ایوب خان، جنرل آغا محمد یحییٰ خان، ذوالفقار علی بھٹو، جنرل محمد ضیاء الحق، میاں نواز شریف، جنرل پرویز مشرف تک ہماری قومی تاریخ ایسی شرمناک مثالوں سے بھری پڑی ہے، مسند اقتدار پر فائز ہونے کے بعد، اپنے عرصہ اقتدار کو دوام دینے کیلئے زیادہ سے زیادہ طاقت کا حصول اور اس مقصد کیلئے اپنے مخالفین کے خلاف بے بہا طاقت کا استعمال ہمارے حکمرانوں کا ہمیشہ ہی شیوہ رہا ہے .
لیکن حکمرانوں کے اس شوق اقتدار نے نہ صرف انکے اقتدار کے سنگھاسن کو ہلا کر رکھ دیا بلکہ ملک کو دولخت اور قومی یکجہتی کو پارہ پارہ کرکے رکھ دیا، ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ " اِس کی سب سے بڑی بنیادی وجہ جمہوری اصولوں سے روگردانی، آئینی اور قانونی تقاضوں سے انحراف اور اتفاق رائے کے بغیر قومی معاملات میں فرد واحد کی مرضی و منشاء کا عمل دخل ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ فرد واحد خواہ کتنا ہی مخلص، محب وطن، صاحب بصیرت اور دانا و بینا ہی کیوں نہ ہو، کبھی بھی آئین اور دستوری اداروں کا نعم البدل نہیں ہوسکتا .

ہماری 61 سالہ تاریخ میں ہر طالع آزماء نے آئین کو ملبوس سمجھ کر اپنے قد و قامت کے مطابق غیر آئینی اقدامات کے بل پر اپنے تئیں ملک و قوم کے مفاد میں دور رس اصلاحات کا بیڑہ اٹھایا، لیکن جہاں اُس کی ذات کا بنیادی پتھر سرکا، اُس کا اپنا تعمیر کردہ بلند و بالا سیاسی محل اور تحفظ دینے والے وزراء و مشیروں کی مضبوط دیواریں ریت کے گارے کی طرح زمین پر آگریں اور پلک جھپکتے ہی تمام انقلابات کے دروازے، اصلاحات کی کھڑکیاں، آئینی ترامیم کے دریچے اور ڈیمو کریسی کی محرابیں ملبے کا ڈھیر بن گئیں، درحقیقت یہی وہ دیرینہ بیماری ہے جو پچھلے 61 سالوں سے اقتدار کے سنگھاسن پر بیٹھنے والے ہر حکمران کے رگ و پے میں سرایت کرجاتی ہے اور اس وقت بھی یہی دیرینہ بیماری ہمارے حکمرانوں کے دلوں کے دروازے پر دستک دے رہی ہے .

انہیں یہ یقین دلارہی ہے کہ ''پاکستان بچانے ''کے نعرے کی وجہ سے ملک کی تقدیر سنبھالنے کا فریضہ قدرت نے انہیں سونپ دیا ہے اور اب صاف ستھری جمہوریت، اقتصادی انقلاب، ترقی و خوشحالی کے تمام راستے اور عوامی فلاح و بہبود کے تمام چشمے صرف انہی کی ذات سے پھوٹیں گے، ملک و قوم کا مستقبل اور قوم کی ترقی و خوشحالی کی ضمانت اور بقاء اب اُن کے عہدہ صدارت سے مشروط ہے، یہی وہ خام خیالی اور خود فریبی ہے'' جس نے ہمارے موجودہ حکمرانوں کو ایک ایسے دھوکے اور سراب میں مبتلا کیا ہوا ہے جس سے باہر نکلنے کے بعد ان کے

.پاس سوائے کف افسوس ملنے کے اور کچھ نہ ہوگا
آج یہ حال ہے کہ مشکلات کی دلدل دن بدن گہری سے گہری اور مسائل کا دائرہ مکڑی
کے جالے کی طرح پھیلتا جارہا ہے۔ بہتری کیلئے اختیار کی گئی تمام کوششیں اور حکمت
عملیاں ناکام ہوتی دکھائی دے رہی ہیں اور وہ جمہوری ماحول جو 9 برس کے عرصے پر
محیط طویل عرصہ کے انتظار کے بعد حاصل ہوا ایک بار پھر مجبوریوں کے فیصلوں اور
مصلحت کی آلودگی میں لتھڑا ہوا قومی جذبات اور عوامی امنگوں کا خون کرتا دکھائی دے
رہا ہے،آج مفاہمتی دعوؤں اور سب کو ساتھ لے کر چلنے کے وعدوں پر ضد وانا کا عنصر
غالب آچکا ہے اور حالات اس حد تک پوائنٹ آف نو ریٹرن پر پہنچ چکے ہیں کہ حکومت
کی اپنی بقاء اور سلامتی بھی خطرے میں نظر آرہی ہے اور جمہوری بساط لپیٹنے کے وسوسے
واندیشے یقین کے پیکر میں ڈھلتے دکھائی دے رہے ہیں،۔برطانوی اخبار ٹائمز کا کہنا ہے کہ
پاکستان میں فوج اس وقت آگے آتی ہے جب سیاستدان بے تحاشا مسائل پیدا کرکے ملکی
استحکام کو خطرے میں ڈال دیتے ہیں
اگرچہ پرویز مشرف کے 9 سالہ دور کے بعد پاکستانی فوج سیاسی معاملات میں مداخلت
ناپسند کرتی ہے اور درپردہ وہ مفاہمت کو ممکن بنانے کی کوشش بھی کررہی ہے لیکن
طاقت کے ذریعے وکلاء تحریک کو دبانے اور لانگ مارچ کو کچلنے

کی کوشش کے رد عمل میں برآمد ہونے منظر نامہ فوجی مداخلت کی راہ ہموار کرتا دکھائی رہا ہے، آج پاکستان کا مستقبل ایک بار پھر ناقابل بیان اندیشوں اور خطروں کی زد میں ہے، پارلیمنٹ اپنی بالاستی اور آئین اپنی اصل شکل میں بحالی کا منتظر ہے اور پرویز مشرف کے 3 نومبر 2007ء کے غیر آئینی اقدامات، معزول چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کی بحالی اور عدلیہ کی آزادی سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے اور تمام آئینی و قانونی ضابطے و قاعدے صرف ایک فرد واحد کے گرد گھوم رہے ہیں، وہی ذہنی پستی اور سیاسی پسماندگی کا دور ایک بار پھر شروع ہوچکا ہے جو ہمیشہ حکمرانوں کا طرہ امتیاز رہا ہے، سیاسی تجزیہ نگاروں کے مطابق وزیر اعظم نے گیند صدر کے کورٹ میں ڈال دی ہے جس کے بعد حالات کی بہتری یا خرابی کی ذمہ داری صدر آصف علی زرداری کے رویے پر منحصر ہے، تیزی سے بدلتی ہوئی صورتحال اور بیرونی طاقتوں کی مداخلت میں تشکیل پانے والے نئے منظر نامے میں قوم کی نظریں ایوان صدر کی طرف لگی ہوئی ہیں کہ وہاں سے کیا برآمد ہوتا ہے .

لیکن حالات و واقعات کا تقاضہ یہ کہہ رہا ہے فوری طور قوم میں پھیلی ہوئی مایوسی کو ختم کیا جائے اور ان تمام وعدوں اور معاہدوں کو پورا کیا جائے جو صدر آصف علی زرداری اور پیپلز پارٹی نے مسلم لیگ ن کے ساتھ مل کر اقتدار میں آتے وقت قوم سے کئے تھے، نوبت نج چکی ہے اور وقت ریت کی طرح ہاتھ سے

پھسلتا جارہا ہے، فیصلہ کن لمحات کا آغاز ہوچکا ہے اور ہر گزرتی ہوئی ساعت کے ساتھ
..بڑے اور بنیادی فیصلوں کی ناگزیریت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے
ہم نہیں سمجھتے کہ وطن عزیز میں شاید ہی کوئی ایسا فرد ہو جو موجودہ حکومت کے خاتمے کا
خواہشمند ہو، پوری قوم سمیت تمام سیاسی جماعتیں موجودہ سیاسی اور جمہوری نظام کو چلتا
دیکھنا چاہتی ہیں، لہذا حالات کا تقاضہ یہ کہہ رہا ہے کہ جمہوریت کو بہترین انتقام قرار
دینے والے ذاتی مفادات کی خاطر جمہوریت سے انتقام نہ لیں اور ضد، انا اور سیاسی
مفادات کے دائرے سے باہر نکلیں، کیونکہ وقت ان سے ملک و قوم کی بہتری کیلئے بالغ
نظری اور دانشمندانہ فیصلے کا متقاضی ہے۔

حالات مجھے اِس بات کی اجازت نہیں دیتے

عید کے حوالے سے خصوصی تحریر

یوں تو دنیا میں قومی، ملی اور دینی تقریبات کو منانے کا سلسلہ زمانہ قدیم سے جاری ہے اور دنیا کی ہر قوم کسی نہ کسی انداز اور رنگ میں ان تقریبات کا اہتمام کرتی ہے، جشن مناتی ہے، خوشیوں کے شادیانے بجاتی ہے، لیکن ان کا جشن اور یوم عید عیش و عشرت اور نفسانی خواہشات کے تابع اور شہوانی لذتوں پر مشتمل ہوتا ہے، جبکہ اسلام کا تصور عید نرالی ہی شان کا حامل ہے اور اِس کے منانے کے انداز و اطوار دیگر قوموں کے طور طریقوں سے بالکل مختلف، جدا اور الگ ہیں، ایک مسلمان کی عید احکام الٰہیہ کے ماتحت اور اس کی خوشیاں رضائے الٰہی کے تابع ہوتی ہیں، اس کا ہر فعل اپنے ربّ کی خوشنودی کیلئے ہوتا ہے اور اس کا جشن طرب روحانیت کی تکمیل اور سعادت دارین کے حصول کیلئے ہوتا ہے، دین فطرت ہونے کی وجہ سے اسلام نے غم اور خوشی کو منانے کے طور، طریقے مقرر کرتے ہوئے ان تمام غیر فطری رسوم و رواج کے پردوں کو بھی چاک کیا ہے جسے امتداد زمانہ اور انسان کی لاعلمی اور جہالت نے عید (یعنی خوشی) کے رخ روشن پر ڈالا تھا۔

اسلام اپنے ماننے والوں کو خوشی کے موقع پر عید منانے کی اجازت دیتا ہے اور بتاتا ہے
کہ ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد اپنے خالق و مالک کی اطاعت و عبادت ہے، وہ یاد دلاتا
ہے کہ ایک مسلمان خواہ راحت میں ہو یا مصیبت میں اسے کسی بھی حال میں اپنے
خالق سے رشتہ نہیں توڑنا چاہیے، ہر حال میں اپنے رب کی اطاعت و بندگی کا راستہ
اختیار کرنا چاہیے، کیونکہ وہی کبریائی کا حق دار اور حاکمیت و الوہیت کا مستحق اور حمد و ثنا
کا ثنا سزاوار ہے، اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ عید منانا اور جشن و طرب کے ایام مقرر کرنا
فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے، تم عید مناؤ، خوشی و مسرت، فرح و سرور کا
اظہار کرو، مگر جشن و نشاط میں اپنی ہستی کو فراموش مت کرو، اپنے حقوق و فرائض سے
غافل نہ ہو جاؤ اور اپنے خالق کو مت بھول جاؤ، اسلیئے کہ ایک مسلمان مومنِ صادق کی
سچی خوشی اور حقیقی نشاط کا راز اِس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ اپنا تن من دھن سب کچھ
اپنے آقا و مولا کے سپرد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ " میری نماز، میری عبادات، میرا جینا،
میرا مرنا اس رب العلمین کیلیئے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں۔"

آج ایک بار پھر اسی پیغام کو لے کر عید کا دن ہمارے درمیان موجود ہے، لیکن اِس
خوشی و انسباط کے موقع پر عید مناتے اور عید کی مبارکباد دیتے ہوئے میں سوچ رہا
ہوں کہ اپنے اہل وطن اور دنیا بھر کے ان مسلمانوں کو جو کفر طاغوت

کے ظلم و جبر کا شکار ہیں، جو بے سرو سامانی کے عالم میں بے گھر در کھلے میدانوں میں پڑے ہوئے ہیں، بھوک، پیاس، تن عریانی اور غم واندوہ جن کا مقدر ہے، اس عید کے موقع پر میں انہیں کون سا تحفہ پیش کروں، خوشی کی کون سی کہانی سناؤں، ان کی قلبی و روحانی آسودگی کیلیے کون سا سامان پیدا کروں، جس سے ان کے بجھے ہوئے خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر جائے، زخم مندمل ہوجائیں اور قلب و روح میں اطمینان و طمانیت کا احساس پیدا ہوجائے۔ لیکن میری بے بسی، کمزوری اور بے سرو سامانی خود میری راہ میں حائل مجھے کچھ بھی کرنے نہیں دیتی، دوستون معاف کیجئے گا، جب میں اُن کیلیے کچھ نہیں کرسکتا تو آپ کی خوشیوں میں بھی شریک نہیں ہوسکتا، حالات مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتے، میں آپ کو عید کی مبارکباد نہیں دے سکتا، عید مبارک نہیں کہہ سکتا۔

اِس لئے کہ عراق، افغانستان اور کشمیر سے لے کر فلسطین تک پوری امت مسلمہ لہو رنگ اور بالخصوص ارض وطن پاکستان کی سرزمین اپنے ہی سپوتوں کے خون سے رنگین ہے، ملک کے دو صوبوں میں آگ لگی ہوئی ہے، ایک صوبہ نفرتوں کی آگ میں جل کر ہم سے دور ہوئے جارہا ہے تو دوسرا اغیار کی سازشوں کا شکار آمادہ شورش ہے، ملک میں ہر طرف غم اور سوگ کی سی کیفیت ہے، ہم جدھر کان لگائیں اپنے ہی مسلمان بھائیوں کی آہ و بقاء، خوفناک چیخیں اور سسکیاں سنائی دیتی ہیں، جس سمت نظر اٹھائیں مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں، بے گورو

کفن لاشے اور کٹے پھٹے جسم پڑے ہیں، اجڑی ہوئی بستیاں اور جلتے ہوئے گھر ہماری دینی غیرت و حمیت پر نوحہ کناں ہیں۔

یہی حال پورے عالم اسلام کا ہے، کشمیر، فلسطین، بوسنیا، چیچینا، جیسے ممالک میں اسلام کا نام ونشان مٹانے کیلئے سروں کی فصل کٹ رہی ہے، افسوس تو اِس بات کا ہے کہ ہم اپنے دشمن کو ازل سے پہچانتے ہوئے بھی اس کی گود میں پناہ ڈھونڈ رہے ہیں، اس کے دامن میں سایہ عافیت تلاش کر رہے ہیں، وہ ہر بار ایک ہاتھ سے ہماری پشت میں خنجر گھونپتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے ہمارے منہ میں خیرات کا نوالہ ڈالتا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ یہی ہمارا آقائے نعمت ہے، گویا ہم عزت و وقار کی دولت سے تو محروم تھے ہی اب عقل و شعور سے بھی عاری ہوتے جا رہے ہیں، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر اور مراکش سے مغربی ایشیاء اور مشرق بعید تک پھیلی ہوئی ہر نعمت سے مالا مال اللہ کی پسندیدہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نام لیوا امت اِس درجہ ذلیل و خوار کیوں ہے، غور کیا جائے تو دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے کہیں زیادہ اپنوں کی حماقتیں نظر آتی ہیں، پاکستان ہی کو لیجئے اللہ تعالی نے ہمیں جغرافیائی اور مالی وسائل کے اعتبار سے بہترین خطہ زمین دیا، لیکن ہم نے اسے غیروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا، آخری امت ہونے کے وصف کے ساتھ ہمیں اللہ تعالی کے آخری اور مکمل دین، قرآنی دستور اور سب سے بڑھ کر حضور اکرم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ حسنہ کی صورت میں گھر سے لے کر ایوان اقتدار تک ہر شعبہ حیات میں بہترین راہنمائی میسر تھی لیکن ہم نے شرف و کرامت کی اِن ساری نسبتوں کو اپنے لئے توہین سمجھا۔

اسلام نے ہمیں محبت و دوستی کا جو معیار دیا تھا، ہم نے اس کے برعکس کفار و مشرکین سے محبت کی پینگیں بڑھائیں اور اپنوں سے بیگانے ہوگئے، یوں ہم نے دینی شناخت، نظریاتی تشخص، ثقافتی معیار اور علمی برتری کو خود ہی فراموش کردیا، لہذا قدرت نے ہمیں عظمت و رفعت کی کہکشاؤں سے اٹھا کر ذلت کی پستیوں میں دے مارا، آج پاکستان اپنے درماندہ کارواں کو لے کر اکیسویں صدی میں رینگ رہا ہے، بے پناہ قدرتی وسائل سے مالا مال اِس ملک کو گھر کے چراغوں سے ہی آگ لگ گئی، اِس کے محافظ بد قسمتی سے تسلسل کے ساتھ اِس ملک کا خون چوستے رہے، اِس کے نظام سیاست و معیشت کی نہ کوئی سمت متعین ہوئی اور نہ ہی کوئی فکر و فلسفہ اور پالیسی، پورے کا پورا نظام اشخاص اور ان کے ذاتی مفادات کے گرد گھومتا رہا ہے، جو الیکشن میں کامیاب ہوگیا، وہ نقب لگانے میں بھی کامیاب ہوگیا اور اس نے موقع غنیمت جانتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے ملک لوٹنے کے علاوہ کسی اور تعمیری کام کی طرف توجہ دینے کی ضرورت پر وقت ضائع نہیں کیا۔

سامراجی آقاؤں سے لئے گئے نظام سیاست نے ہمارے سیاستداں کو یہ تحفظ بھی فراہم کیا کہ وہ بیرونی قوتوں کے کارندے بن جاتے ہیں، خدا نا خواستہ ان پر ملک میں کوئی کڑا وقت آ بھی جائے تو امریکہ، فرانس اور دوسرے یورپی ممالک میں پناگاہیں ان کی منتظر ہوتی ہیں، جہاں وہ بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ اپنے کتوں اور گھوڑوں سمیت منتقل ہو کر ملک بدری کے مزے لیتے ہیں، الغرض وہ ملک کے اندر رہیں یا ملک بدر ہوں، ان کے آرام و سکون اور عیش و عشرت کیلئے ہر نعمت دامن پھیلائے کھڑی رہتی ہے، لیکن غریب و محکوم عوام کہاں جائیں وہ تو زندگی کا بوجھ اٹھا کر دو قدم بھی چلنے کے قابل نہیں رہے اور اب تو ان کو اپنی ساری توانائیاں سانسوں کی ڈوری قائم رکھنے کیلئے صرف کرنا پڑتی ہیں، عجیب حال ہے عوام جس قدر بدامنی، مہنگائی، بے روزگاری اور بدعنوانی کے ہاتھوں نیم جاں ہیں، یہ مراعات یافتہ طبقہ اسی قدر خوش باش اور توانا دکھائی دیتا ہے، عوام کا خون نچوڑ کر اپنے مفادات کے عالیشان محل تعمیر کرنے والے قوم کے وسائل کو اپنے لئے شیر مادر سمجھتے ہیں۔

اِن تمام تلخ حقیقتوں کے باوجود سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان لیڈروں کو بار بار ملک و قوم کی تقدیر کے ساتھ کھیلنے کے موقعہ کون دیتا ہے، کیا ہمارا دیا گیا ووٹ انہیں ایوان اقتدار تک پہنچانے کا باعث نہیں بنتا، ایک دو بار نہیں قوم اپنے ساتھ پچھلے 62 سالوں سے یہ مذاق خود کر رہی ہے، بات طبقاتی

اونچ نیچ اور اقتصادی تفاوت تک محدود رہتی تو کسی حد تک قابل برداشت ہوتی، لیکن اب تو بات اِس حد تک آگے بڑھ چکی ہے کہ ہماری سلامتی و بقاء بھی خطرے میں نظر آرہی ہے، دشمن ہماری تاک میں ہے، وہ ہمیں تباہ و برباد کرنے پر تلا ہوا ہے، ملک کے دو صوبے آگ و خون کی لپیٹ میں ہیں، لاکھوں افراد اپنے گھروں سے دور کھلے میدانوں میں بے یارو مددگار بے سرو سامانی کے عالم میں پڑے ہوئے ہیں غربت، بھوک، بے روزگاری اور مہنگائی کی حالت یہ ہے کہ غریب اپنے معصوم بچوں کے گلوں میں برائے فروخت کے بورڈ آویزاں کرنے پر مجبور ہیں، روپے پیسے کی حرص میں بچوں اور خواتین کی اسمگلنگ تو رہی ایک طرف ان کے گردے اور دیگر اعضاء بیچے جارہے ہیں، بدامنی اور انارکی کی حالت یہ ہے کہ لوگ گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھتے ہوئے سو بار سوچتے ہیں، اندرونی اور بیرونی دباؤ کی وجہ سے حکومت کے ستون ڈگمگا رہے ہیں اور ہر آنے والے دن کے ساتھ خطرات بڑھتے جارہے ہیں۔

یہی حال دنیا بھر میں مسلمانوں کا ہے جو ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے ہیں، اسلامی تہذیب و ثقافت کی دھجیاں اڑائی جارہی ہیں، قوانین الٰہیہ کے ساتھ مذاق ہو رہا ہے، لیکن ہمارے سیاسی رہنماؤں نے قوم کو سوئے حرم متوجہ کے بجائے امریکہ کو اپنا قبلہ و کعبہ بنالیا ہے، اب آپ ہی بتایئے کہ ان حالات میں کیسے خوشی منائی جاسکتی ہے، کیسے ، کسی کو عید کی مبارکباد دی جاسکتی ہے

یقیناً یہ بہت مشکل کام ہے، رسم دنیا نبھانے کیلئے دل کے زخموں کو دباتے ہوئے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجائے جب میں احباب سے ملتا ہوں، تو دل کی گہرائیوں سے اٹھتی ہوئی درد کی شدید لہر مجھے میرے اپنوں کے درد سے لا تعلق اور بیگانہ نہیں رہنے دیتی، مجھے خوش ہونے والوں کی خوشیوں میں شریک نہیں ہونے دیتی، مجھے عید مبارک نہیں کہنے دیتی۔

دوستوں۔۔۔۔۔۔آج عید کا دن ہمارے لیے دعوت فکر و عمل لے کر آیا ہے اور ہم سے ہمارے دائرہ کار اور اختیار کے مطابق اس احساس ذمہ داری کا متقاضی ہے، جس سے ہم بحیثیت مسلمان کسی طور بھی بری الذمہ نہیں، عید کے یہ لمحے اپنے پس منظر اور پیش منظر میں ایثار و قربانی کا پیغام رکھتے ہیں اور تقاضہ کرتے ہیں کہ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماننے والے۔۔۔۔۔غلاموں۔۔۔۔۔جاگو۔۔۔۔۔اٹھو۔۔۔۔۔اپنی صفوں کو درست کرو اور ایمان اور تقویٰ کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر دین کی دشمن قوتوں باطل کے خلاف ڈٹ جانے کیلئے تیار ہو جاؤ، کیونکہ یہی رمز مسلمانی اور امت کے درد کا اصل درماں ہے۔

جناب صدر اگر آپ تاریخ میں اَمر ہونا چاہتے ہیں تو۔۔۔

اُس کا قد چھوٹا اور سر گنجا تھا، جب وہ کرسی پر بیٹھتا تھا تو اُس کے پاؤں زمین تک نہیں پہنچتے تھے، وہ کبھی بھی اپنی سج دھج اور لباس کی طرف دھیان نہیں دیتا تھا، عموماً اس کی پتلون ضرورت سے زیادہ لمبی ہوتی تھی، وہ ایک آنکھ سے بھینگا تھا اور اس کی ناک اوپر کی طرف اٹھی ہوئی تھی، اس نے تمام عمر ریشمی ہیٹ یا فراک کوٹ نہیں پہنا، اس نے قانون کی تعلیم حاصل کی، وہ دنیا کی چار زبانوں انگریزی، جرمنی، فرانسیسی اور روسی پر عبور رکھتا تھا، اسے موسیقی، شاعری اور مذہب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اس نے اپنی جلاوطنی کا زمانہ سائبیریا میں ایک خانماں برباد انسان کی طرح گزارا، اس دوران اُس نے غریب کسانوں جنہیں سوائے کسی تہوار کے سارا سال گوشت کھانے کو نہیں ملتا تھا، کی حالت زار کو بہت قریب سے دیکھا، 1891ء کے قحط میں لاکھوں غریب کسانوں کو بھوک، پیاس مفلسی اور غربت سے مرتے دیکھ کر اس نے ان کی حالت سدھارنے کا فیصلہ کیا اور ایک انقلابی لیڈر بن گیا۔

اس نے پورے پچیس برس ملکوں ملکوں پھرنے میں گزارے، وہ جس ملک بھی جاتا اسے وہاں سے نکال باہر کیا جاتا، یوں اس نے اپنی زندگی کے پچیس سال جرمنی،

آسٹریا، فرانس، سوئٹزرلینڈ، پولینڈ اور برطانیہ میں ملک بدری میں گزارے، گرفتاری سے بچنے کیلئے اس نے کبھی مزدور، کبھی کسان، کبھی ملاح کے روپ دھارے، دوران سفر وہ ہمیشہ ایک صندوق اپنے ساتھ رکھتا تھا جس کے خفیہ پیندے میں وہ اپنی ضروری دستاویزات چھپا کر رکھتا تھا، اس نے جیل میں اپنی انقلابی کتاب لکھنا شروع کی، پکڑے جانے کے خوف سے اس نے سیاہی کے بجائے دودھ کو بطور سیاہی استعمال کیا، جسے پڑھنے کیلئے تحریر کو گرم پانی میں ڈبویا جاتا تو حروف نمایاں ہو کر دکھائی دینے لگتے تھے، یہی طریقہ اس نے اپنے شاگردوں کو بھی اپنانے کی ہدایت کی، نومبر 1917ء میں یہ انقلابی لیڈر اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر روس کا ڈکٹیٹر" لینن " بن کر ابھرا، اس نے سب سے پہلا حکم تمام جاگیریں، جائیدادیں کو سرکاری تحویل میں لینے کا جاری کیا، جن دنوں روس میں قحط پڑا تو لینن اپنی چائے میں چینی نہیں ڈالا کرتا تھا، اُس کا کہنا تھا کہ کیونکہ عام لوگوں کو چینی میسر نہیں ہے، اسلیئے میں شکر کا استعمال نہیں کرسکتا۔

گو کہ وہ روس کا حاکم اعلیٰ تھا لیکن اُس کی زندگی سامان تعیش سے دور تھی، اس نے اپنی سہولت کیلئے سیکرٹری بھی نہیں رکھے تھے، وہ اپنے تمام خطوط کے جواب خود دیتا تھا، وہ روزانہ اٹھارہ سے بیس گھنٹے کام کرتا اور جب کام سے تھک جاتا تو نرم و نازک گدوں پر آرام کرنے کے بجائے دفتر کی ٹیبل پر ہی سو

جاتا۔برسوں اس کا یہی معمول رہا، شدید محنت اور کام کی زیادتی کی وجہ سے پانچ سال
میں اس کے دماغ کی شریانیں سخت ہو گئیں اور پھر فالج کے حملے نے اسے بولنے کی
صلاحیت سے محروم کردیا، جس کی بحالی کیلئے اسے ایک بار پھر نوزائیدہ بچوں کی طرح
بولنا سیکھنا پڑا، فالج کی وجہ سے اس کا دایاں ہاتھ بھی بیکار ہوگیا، لیکن اس نے ہمت نہیں
ہاری اور بائیں ہاتھ سے لکھنے کی مشق جاری رکھی، وہ پورے دو سال بہادری سے موت
سے لڑتا رہا، اس دوران وہ بار بار ایک ہی جملہ دہراتا تھا" بھی مجھے بہت کام کرنا ہے،
"ابھی مجھے بہت کام کرنا ہے۔
آج روس میں شاید ہی کوئی گھر، کوئی کارخانہ، کوئی دفتر، کوئی کلب اور کوئی ہال آپ کو
ایسا نظر آئے جس میں لینن کی تصویر آویزاں نہ ہو، آج روس کا ہر فرد خواہ اس کا تعلق
کسی بھی پیشے سے ہو اپنے آپ کو لینن کا شیدائی اور پیروکار گردانتا ہے، حال یہ ہے کہ
بیکر اپنے کیکوں پر، قالین بنانے والا اپنے قالین پر اور باغبان پودوں کی مدد سے اپنے
باغوں میں لینن کی شبیہہ بناتے ہیں، غرض کہ ہر روسی لینن کی پوجا کرتا ہے اور
پورے روس میں یہ بات مشہور ہے کہ جب کسی کسان یا مزدور کو کوئی مشکل پیش آتی
ہے تو لینن اپنی قبر سے اٹھ کر اس کی مدد کرنے کو آجاتا ہے، لینن کو دنیا سے گزرے کم
و بیش نصف صدی ہو رہی ہے لیکن آج بھی اس کی حنوط شدہ لاش کو دیکھنے روزانہ
ہزاروں

افراد لینن ہال آتے ہیں اس کی حنوط شدہ لاش پر پھول چڑھا کر اسے خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

دنیا میں ایسے بے شمار لوگ گزرے ہیں جنھوں نے اپنی عوام کیلئے انقلابی تحریکیں چلائیں، جلاوطنی کی زندگی گزاری، گرفتاری سے بچنے کیلئے سوانگ بھرے، اقتدار حاصل ہونے کے بعد بھی خود اپنے ہاتھ سے کام کرنا پسند کیا، سادہ اور عوامی زندگی گزاری اور اپنے اجلے دامن پر کبھی بد دیانتی اور بے ایمانی کے داغ نہیں لگنے دیئے، لیکن نہ تو تاریخ کے صفحات نے انہیں یاد رکھا اور نہ ہی قوم نے ان کی یاد میں میموریل ہال بنائے، نا ان کی تصویریں اپنے گھروں، دفتروں، کارخانوں اور ہالوں میں سجائیں، نا کسی بیکری والے، کسی قالین بنانے والے اور کسی باغبان نے ان کی شبیہہ کیکوں، قالینوں اور باغیچوں میں بنانے کی کوشش کی، نا ہی وہ قوم کے مسیحا شمار ہوئے اور نہ ہی لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ مشکل وقت میں ان کی روحیں لوگوں کی مدد کو آتی ہیں۔

یہ درست ہے کہ قوم کی یاداشت اور تاریخ بڑی ظالم اور سنگدل ہوتی ہے،اسے اپنے حکمرانوں کے ذاتی اوصاف، اخلاق و کردار اور ایمانداری سے کوئی غرض و غایت نہیں ہوتی، اسلیئے کہ یہ تو عام انسانوں کی وہ خوبیاں ہیں جو اگر اتفاق سے کسی اعلیٰ عہدے پر پہنچ جائیں تو ان کا ردعمل بھی شاید ایسا ہی ہو ،

حقیقت یہ ہے کہ قوم کی یادداشت اور تاریخ اگر کچھ یاد رکھتی ہے تو وہ بڑے لوگوں کی قوم کیلئے دی گئی قربانیاں اور کارنامے ہیں، آج دنیا میں کتنے لوگ جانتے ہیں کہ چیئرمین ماوزے تنگ سائیکل پر دفتر جاتا تھا، دو کمرے کے مکان میں رہتا تھا، دو سلائس سے لنچ کرتا تھا، اس کے پاس کپڑوں کے صرف دو جوڑے اور جوتوں کی ایک جوڑی تھی، اس نے بتیس برس تک ایک ہی کوٹ پہنے رکھا جو آج بھی چین کے میوزیم میں قومی یادگار کے طور پر محفوظ ہے، آج یہ باتیں کون جانتا ہے؟ لیکن ایک افیمی قوم کو نئی زندگی دینے اور عوامی جمہوریہ چین کے بانی کی حیثیت سے ماوزے تنگ کو ساری دنیا جانتی ہے۔

امام خمینی نے عام سادہ اور درویشانہ زندگی گزاری، شاہ ایران کے خلاف آواز بلند کرنے کے جرم میں عرصہ دراز تک وہ جلا وطن رہے آج بھی قم میں ان کا کچا گھر موجود ہے، بہت کم لوگ یہ باتیں جانتے ہیں لیکن ایران کے اسلامی انقلاب کے بانی کی حیثیت سے کون ہے، جو امام خمینی کو نہیں جانتا، محمد علی جناح ایک چمڑے کے تاجر کے بیٹے تھے، انہوں نے قانون کی تعلیم حاصل کی، سیاست میں داخل ہوئے تو منحنی اور دھان پان سے وجود رکھنے والے جناح نے اپنی سچائی، اصول پسندی اور بلند کرداری سے ہلچل مچا دی، انگریزی زبان بولنے والے محمد علی جناح انگریزی سے نابلد قوم کے قائد اعظم تھے، جب گورنر جنرل بنے تو ایک روپیہ تنخواہ لی، ہمیشہ اپنے اخراجات قومی خزانے سے ادا کرنے کے بجائے اپنی

جیب سے ادا کیئے، اسٹاف کو بھی اپنی ذاتی جیب سے تنخواہیں دیں، ذاتی اکاونٹ سے تین روپے کے موزے اسلیئے نہیں خریدے کہ ایک غریب نوزائیدہ ملک اور بھوکی ننگی قوم کے سربراہ کو یہ عیاشی زیب نہیں دیتی تھی۔
آج بہت ہی کم لوگ ہونگے جو قائداعظم محمد علی جناح کے ان ذاتی اوصاف سے واقفیت رکھتے ہوں گے، لیکن مسلمانان برصغیر کی جدوجہد کو انتہائے کمال تک پہنچا کر دنیا کے نقشے پر ایک نئی اسلامی مملکت "پاکستان" کے وجود کے خالق کی حیثیت سے قائداعظم محمد علی جناح کو کون ہے جو نہیں جانتا، آج اگر روسی لینن کو اپنا نجات دہندہ، چینی ماوزے تنگ کو اپنا مسیحا، ایرانی خمینی کو اسلامی ایران کا بانی اور پاکستانی قائداعظم محمد علی جناح کو مسلمانان برصغیر انگریز اور ہندوؤں کی غلامی سے نکال کر ایک علیحدہ تشخص اور شناخت دلانے والے خطہ زمین پاکستان کا خالق اور معمار سمجھتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ وہ عظیم لوگ ہیں جنھوں نے ظلم و جبر کے نظام سے بغاوت کی، مظلوم کے حق کیلئے صف آراء ہوئے، ایک قوم، ایک ملت کی تعمیر کی، اس کی آنکھوں میں امن و انصاف اور آتشی کے خواب جگائے، انہیں عزت دی، انصاف دلایا اور طبقاتی اونچ نیچ کا خاتمہ کیا، ایک نیا نظام دیا، اپنی ساری زندگی اپنی عوام اور اپنے ملک کی فلاح و بہبود اور بہتری کیلئے وقف کردی اور اس وقت تک اپنے آپ کو ان سہولتوں، مراعات اور عیش و عشرت کا حقدار نہیں سمجھا جب کہ قوم کو وہ

سہولتیں اور مراعات حاصل نہ ہو گئیں۔

یہی وہ بنیادی وجوہات ہیں جس کی وجہ سے لینن آج بھی ہر روسی، ماوزے تنگ ہر چینی، امام خمینی ہر ایرانی اور قائد اعظم محمد علی جناح ہر پاکستانی کے دل میں زندہ ہے اور وہ انہیں اپنا مسیحا اور نجات دہندہ سمجھتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ حکمران جو عوام کی مجبوریوں اور پریشانیوں کا فہم و ادراک رکھتے ہیں اور انہیں حل کرنے کیلئے عملی جدوجہد کرتے ہیں، خود قربانیاں دیتے ہیں، عوام انہیں ہمیشہ یاد رکھتے ہیں، لیکن وہ حکمران جن کے قوم و فعل میں تضاد ہوتا ہے اور جو اپنے عیش و عشرت کے علاوہ عوامی مسائل اور ان کے حل سے کوئی سروکار نہیں رکھتے، تاریخ انہیں بہت جلد بھلا دیتی ہے۔

جناب صدر آپ اگر چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کو مدتوں یاد رکھیں، آپکی تصویریں اپنے گھروں میں لگائیں، آپ کیلئے یادگاری تقریبات منعقد کریں، یادگاری ٹکٹ چھاپیں، چوکوں اور چوراہوں پر آپ کی یادگاریں بنائیں، لوگ آپ کی خدمات پر آپ کو خراج عقیدت پیش کریں لڈیاں بجا کر سلوٹ کریں، تو آپ کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا اور اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآں ہونا ہوگا، جناب صدر گستاخی معاف لیکن یہ کہہ کر کہ آٹے، چینی اور توانائی کے مسائل کا حل میرا کام نہیں، آپ کسی طور بھی اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآں اور بری الذمہ نہیں

ہو سکتے، کیونکہ بحیثیت پارٹی کے شریک چیئرمین، صدر مملکت اور ملک کے چیف ایگزیکٹو عوام کے مسائل کا حل اور ان کیلئے بنیادی سہولیات کی فراہمی آپ کی ہی ذمہ داری ہے اور "روٹی، کپڑا اور مکان" اسی وعدے پر آپ برسر اقتدار آئے تھے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ آپ ملک و قوم کی تقدیر اور نظام بدلنے کے داعی تھے، آج وقت اور قسمت نے آپ کو یہ سنہری موقع دیا ہے تو خدارا اسے ضائع مت کیجئے، جناب صدر اگر آپ تارخ میں زندہ و جاوید اور اَمر رہنا چاہتے ہیں تو اپنے فرائض منصبی کو پہچانیے، قوم کے اعتماد اور بھروسے کو مت توڑیئے اور قوم کو مزید مایوس مت کیجئے، یاد رکھئے اپنی قوم کو مایوس کرنے والے اور ان کے یقین، اعتماد اور بھروسے کو توڑنے والے نہ تو کبھی تارخ کے صفحات میں جگہ پاتے اور نہ ہی قوم انہیں یاد رکھتی ہے، ان کی حیثیت اُن لوگوں کی سی ہوتی ہے جنھیں ایک اتفاق ایک حادثہ ایوان اقتدار میں پہنچاتا ہے تو دوسرا اتفاق ایوان اقتدار سے اٹھا کر تارخ کے کوڑے دان میں پھینک دیتا ہے۔

سب مشرف کی باقیات اور وراثت کے امین ہیں

بلور مفتیان کرام کی خدمت میں

وطن عزیز میں ایک سے زائد عیدوں کا منانا کوئی نئی بات نہیں ہے، گزشتہ کچھ عرصے سے ملک میں ہر سال دو دو اور بسا اوقات تین روز تک عید منانے کے افسوس ناک واقعات ہمیں ملتے ہیں، جنھیں اسلام دشمن قوتوں نے دنیا بھر میں پاکستان کی جگ ہنسائی کے ساتھ قومی وحدت ملی اور اتحاد و یگانگت کے آئینہ دار عیدین جیسے مذہبی تہواروں کو انتشار اور افتراق کا سبب بنا کر مسلکی اور علاقائی تعصبات کو ہوا دینے کیلئے استعمال کیا، ان واقعات کی وجہ سے سیکولر اور دین سے بیزار عناصر کو اہل مذہب بالخصوص علماء کرام پر طعنہ زنی اور کیچڑ اچھالنے کا بھی موقع ملا، حالانکہ پاکستان کے مسلمانوں کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ عیدین کے اجتماعات قومی وحدت کے مظہر اور مسلمانوں کی عظمت کے آئینہ دار ہوں، ماضی میں عید کے موقع پر مختلف علاقوں میں الگ الگ عیدیں منانے کی وجہ سے جو اختلافات سامنے آئے تھے انہیں مد نظر رکھتے ہوئے حکومت نے تمام مکاتب فکر کے علماء کرام اور ارکان پارلیمنٹ کے مشورے کے بعد "مرکزی رویت ہلال کمیٹی" قائم کی تھی، جس میں نہ صرف تمام مکاتب فکر کے علماء کرام کو نمائندگی دی گئی تھی بلکہ جدید تعلیم یافتہ افراد اور ماہرین

فلکیات کو بھی اس کمیٹی کا حصہ بنایا گیا تھا۔
اس کمیٹی کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ ملک میں رویت ہلال کے حوالے سے اختلاف رائے کو ختم کیا جائے تاکہ پوری قوم ایک ہی دن عید منا سکے۔ گو کہ اس کمیٹی کی تشکیل کے بعد بہت کم مواقع پر اختلاف رائے سامنے آیا، لیکن گزشتہ چند سالوں سے صوبہ سرحد میں ماضی میں ایم ایم اے اور موجودہ اے این پی کی حکومت نے سیاسی وجوہات اور بعض علماء کرام مسلکی اختلافات کی بناء پر مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے وجود کو تسلیم کرنے اور اس کی طرف سے چاند نظر آنے کے اعلان کو پورے ملک کیلئے واجب عمل قرار دینے پر تیار نہیں ہیں، جس کی وجہ سے گزشتہ چند سالوں سے صوبہ سرحد کے کچھ لوگ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے علیحدہ عید مناتے رہے ہیں لیکن اس سال تو حکومت سرحد نے غیر سرکاری رویت ہلال کمیٹی کے فیصلے کے مطابق پورے صوبے میں اتوار کے روز عیدالفطر منانے کا فیصلہ کر کے عملاً باقی تین صوبوں اور صوبہ سرحد کے بعض اضلاع سے الگ عید منانے کی روایت کا آغاز کر دیا ہے اور رویت ہلال کی شہادتوں کے بجائے سعودی عرب کی طرف سے اعلان عید کو پورے پاکستان بلکہ پوری دنیا کیلئے قابل تقلید قرار دے کر ملک میں ایک نئی لایعنی اور غیر ضروری بحث کا دوراہ کھول کر قوم کو شدید ذہنی اذیت میں مبتلا کر دیا ہے۔

یہ درست ہے کہ پوری پاکستانی قوم کی یہ خواہش ہے کہ عید ایک ہی روز منائی جائے
لیکن اس مقصد کیلئے دینی اور شرعی تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھنا بھی بہت ضروری ہے،
محض کسی مخصوص علاقے یا گروپ کی خوشنودی کیلئے مسلمانوں کو روزے جیسی عظیم
نعمت سے محروم کردینا سراسر گناہ ہے جبکہ رویت ہلال کے ضمن میں سعودی عرب کی
پیروی کرنا اس لئے بھی ممکن نہیں کہ ایک تو پاکستان اور سعودی عرب کا مطلع بالکل
مختلف ہے، دوسرے دونوں ممالک میں تین گھنٹے کا فرق ہے، جس وقت سعودی عرب
میں افطار اور نماز مغرب کا وقت ہوتا ہے اس وقت پاکستان میں نماز تراویح پڑھی جا
چکی ہوتی ہے، مقام حیرت یہ ہے کہ کیا بلور برادران کو اس حقیقت کا ادراک نہیں؟ اگر
بالفرض سعودی عرب میں شام کے وقت چاند دکھائی بھی دے جائے تو عین اسی وقت
وہ پاکستان میں کیسے دکھائی دے سکتا ہے، جہاں اس وقت رات کے دس یا گیارہ بج رہے
ہوتے ہیں؟ جغرافیائی لحاظ سے پاکستان کی جغرافیائی پوزیشن سعودی عرب سے بالکل
مختلف ہے، اتنے واضح اور وسیع جغرافیائی فرق کی بنا پر ہر ہجری ماہ کا یکم کا چاند سعودی
عرب میں پہلے دکھائی دیتا ہے اور پاکستان میں اگلے روز نظر آتا ہے، جبکہ شرعی حکم یہ
ہے کہ جہاں چاند نظر آجائے اور ثقہ شرعی شہادتیں مل جائیں تو وہاں عید منالینی
چاہیے، جبکہ نئے ابھرتے ہوئے مفتیان کرام بلور برادران کی نرالی منطق کے مطابق اگر
پوری دنیا میں سعودی عرب کے ساتھ عید منانے کی رسم ڈالی جائے تو امریکہ اور
یورپ کے کئی ممالک میں نماز عید عشاء کی نماز کے ساتھ ادا

کرنا پڑے گی جو کہ کسی طور بھی ممکن نہیں۔
عالم اسلام سے اتحاد اور یک جہتی کی خواہش اور اس کی کوشش بہت اچھی بات ہے مگر ملک کی ایک ایسی سیکولر جماعت جو کہ ہمیشہ روس کے سرخ سوشلزم کی علمبردار رہی ہو، جس کے افکار و نظریات اور منشور کا سرچشمہ ماسکو رہا ہو اور جس کے بانی خان عبدالغفار خان المعروف باچا خاں نے اپنی سرزمین کے بجائے جلال آباد میں دفن ہونا پسند کیا ہو، کے سرکردہ رہنماؤں کے دلوں میں اچانک مکہ، مدینہ اور عالم اسلام کی محبت کے سیلاب کو دیکھ کر قوم حیران ہے، اس سارے قضیئے میں اس جماعت کے دو نوزائیدہ مفتیان کرام علامہ مفتی غلام احمد بلور اور حضرت مولانا مفتی بشیر احمد بلور سب سے زیادہ پیش پیش اور بضد تھے کہ عید الفطر سعودی عرب کے ساتھ ادا کی جائے گی، دونوں بلور مفتیان کرام کا مؤقف تھا کہ ہمیں عالم اسلام کے ساتھ چلنا چاہیے، ان کی اس ضد اور فتوے کا اثر یہ ہوا کہ سرکاری طور پر سرحد کے بعض مقامات پر اٹھائیس روزوں کے بعد عید منائی گئی، اس طرح عالم اسلام کی مذہبی اور شرعی تقاضوں سے کھلا انحراف کرتے ہوئے عالم اسلام کے داعیوں نے خود ہی ملک کے اندر عید جیسے مقدس تہوار کو تقسیم کر دیا۔
یہ کس قدر افسوسناک بات ہے کہ ملک میں پہلی بار نماز عید اور رویت ہلال کے

خالص شرعی معاملے میں صوبائی تعصب کو بھی ہوا دینے کی کوشش گئی، جو انتہائی قابل مذمت اور افسوس ناک امر ہے۔ بلور برادران کے رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین مفتی منیب الرحمٰن کو پنجاب کا چیئرمین قرار دینے، پشتونوں کی گواہی تسلیم نہ کرنے اور مرکزی کمیٹی کے اعلان کے مطابق عید منانے والوں کو قادیانیوں کے ساتھی قرار دینے کے عمل نے پورے ملک میں قومی اتحاد اور یکجہتی پر جو ضرب لگائی ہے وہ انتہائی شرمناک عمل ہے، اس مرحلے پر یوں اچانک بلور برادران کا اس قسم کا طرز عمل جہاں کئی اشکالات اور سوالات کو جنم دے رہا ہے وہیں کسی ایسے خفیہ ہاتھ کی بھی نشاندہی کا اشارہ کر رہا ہے جس کا اصل ہدف رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین مفتی منیب الرحمٰن کی ذات ہے، اس کا ثبوت ان کا چیئرمینی سے ہٹائے جانے کا مطالبہ اور ان پر آمرانہ فیصلے مسلط کرنے کا الزام ہے، یہ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی جس کے فیصلوں پر سرحد کی اکثریت سمیت پورے پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے لوگ اعتماد کرتے ہوں اور جس میں مختلف الخیال مکتبہ فکر کے جید علماء شامل ہوں کے ہوتے ہوئے مفتی منیب الرحمٰن صاحب تن تنہا فیصلے کریں اور کمیٹی کے ارکان خاموش تماشائی بنے رہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ادارے قومی اور ملی ملکیت ہوتے ہیں اور جب ادارے قائم ہو جاتے ہیں اور وہ مملکت کے متعین کردہ اصول و قاعدے اور آئین کے مطابق کام

کر رہے ہوں تو ان کے فیصلوں سے انحراف کا مطلب انتشار، فساد اور بغاوت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، رہی بات مشرف کی باقیات ہونے کی، تو یہ بات تو تمام احباب اچھی طرح جانتے ہیں کہ سربراہ مملکت آتے جاتے رہتے ہیں، اگر پرویز مشرف کے مفتی منیب الرحمٰن کو رویت ہلال کمیٹی کا چیئرمین نامزد کردینے سے انہیں مشرف کی باقیات تصور کرنے کا اصول و قاعدہ مان لیا جائے تو پھر سارے کا سارا موجودہ نظام اور خود الزام کنندہ بھی مشرف کی باقیات اور وراثت کے امین قرار پاتے ہیں، اس مقام پر مفتی منیب الرحمٰن کی جانب سے اٹھایا گیا یہ سوال بہت اہمیت کا حامل ہے کہ صوبہ سرحد کے گورنر اویس غنی بھی پرویز مشرف کے مقرر کردہ ہیں، آرمی چیف اشفاق کیانی کو بھی آرمی چیف انھوں نے ہی بنایا تھا، چیف جسٹس آف سپریم کورٹ کا معاملہ بھی ایسا ہے تو کیا یہ سب مشرف کی باقیات ہیں تو ان کے فیصلے اور سربراہی ماننے سے انکار کردیا جائے؟ لہذا مفتی صاحب کا یہ کہنا درست ہے کہ قومی اداروں کی اپنی اپنی حرمت ہوتی ہے اور ان کے فیصلے ماننا ضروری ہوتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ " رویت کا فیصلہ کسی پنجابی، پٹھان، سندھی یا بلوچی کی خواہش کے مطابق نہیں بلکہ اسلامی اصولوں اور تقاضوں کے مطابق کیا جاتا ہے اور شہادتوں کو سامنے رکھتے ہوئے جس میں سائنسی اداروں کی معاونت بھی حاصل ہوتی ہے کے بعد اکثریتی طور پر فیصلے کیے جاتے ہیں۔"

چنانچہ اس تناظر میں سرحد حکومت کا فیصلہ آئینی، قانونی اور شرعی اصولوں کے سراسر منافی اور اللہ کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے، حقیقت یہ ہے کہ رویت ہلال کمیٹی جس میں تمام مکتبہ فکر کے جید علماء کرام شامل ہیں اور جو مضبوط اور ثقہ شرعی شہادتوں کی بناء پر رویت کا فیصلہ کرتی ہے کے فیصلوں کی پابندی ہونی چاہیے، عید گزر چکی ہے اس لئے اب مرکزی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ سرحد حکومت سے باز پرس کرے اور اس سے پوچھے کہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے ہوتے ہوئے، غیر سرکاری کمیٹی کے غیر شرعی فیصلے کی بنیاد پر اسے دینی معاملات میں مداخلت کا حق کس نے دیا ہے، صوبہ سرحد کے بیشتر اضلاع ہری پور، ایبٹ آباد، مانسہرہ سمیت پورے ہزارہ ڈویژن، ڈیرہ اسماعیل خان اس کے قبائلی علاقے، سوات، دیر، بونیر، شانگلہ، چترال، پارہ چنار میں روزہ رکھنا اور ان علاقوں کے عوام کی جانب سے اے این پی حکومت کے فیصلے کو مسترد کیا جانا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ صوبہ سرحد کے اکثریتی عوام بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ حکومت غیر ضروری طور پر دینی معاملات میں مداخلت کر رہی ہے اس لئے انہوں نے مرکزی رویت ہلال کمیٹی کا فیصلہ تسلیم کرتے ہوئے پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے عوام کے ساتھ ایک ہی روز عید منائی، اس عوامی فیصلے کے بعد اب سرحد حکومت اور اس کے مفتیان کرام بلور برادران کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں اور انہیں آئندہ کے لئے دینی معاملات میں مداخلت سے پرہیز کرنا چاہیے، سرحد حکومت کے اکابرین کو چاہیے کہ وہ اللہ سے توبہ کریں اور اپنے طرز عمل سے

رجوع کریں۔

یہ درست ہے کہ مفتی منیب الرحمٰن صاحب ایک صاحب کردار، سلجھے ہوئے اور غیر متعصب عالم دین ہیں اور ان کی شخصیت تمام مکتبہ فکر میں احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے، اس طرح صرف ان کی کردار کشی کرنا اور صرف انہی کو مورد الزام قرار دینا کسی طور بھی قابل تعریف عمل نہیں ہے، جبکہ کسی شرعی مسئلے پر اختلاف رائے کی صورت میں اصول، قاعدے اور ضابطے کا تقاضہ یہ ہے کہ مذہبی تعصبات اور قومی، لسانی اور علاقائی بدگمانی کا پرچم لہرانے کے بجائے اہل علم علماء اسے دلائل شائستہ بحث و مباحثہ اور مکالمے کے ذریعے طے کریں نا کہ بلور برادران جیسے غیر عالم جو کہ خود کہتے ہوں کہ ہم کوئی مفتی اور عالم نہیں ہیں اس طرح ایک شرعی مسئلے پر اپنی رائے اور قیاس آرائیوں سے انتشار اور بدگمانی پیدا کریں، یہ بات دینی، دنیاوی اور اخلاقی رویئے کے بھی خلاف ہے، یاد رہے کہ قومی زندگی میں اس طرح کے رویئے نفاق پیدا کرتے ہیں جس سے قومی یکجہتی پارہ پارہ ہو جاتی ہے، قوم بکھر جاتی ہے اور ملک نت نئے مسائل سے دوچار ہو جاتے ہیں، اگر ہمیں پاکستان کی سلامتی اور بقا عزیز ہے تو ہمیں اس قسم کی شرانگیزی سے گریز کرنا ہوگا، آج پاکستان کی بقاء، استحکام اور سالمیت کے لئے ہمیں اپنے رویوں پر نظر ثانی کرنا ہوگی اور مذہبی منافرت اور نفاق سے بچنا ہوگا کیونکہ قومی اتحاد اور ملی یکجہتی کو برقرار رکھنے کا

اول و آخر راستہ یہی ہے کہ ہم قومی، ملی، علاقائی اور مسلکی تعصبات اور نفاق میں پڑے بغیر اتحاد اور اتفاق کا دامن تھام کر مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے فیصلے کے تحت ایک ہی دن عید منائیں۔

غلامی کی نئی دستاویز....... کیری لوگر بل

شرمناک اور مکروہ شرائط کے ساتھ جڑی امریکی بھیک

بغلیں بجائی جارہی ہیں، ڈینگیں ماری جارہی ہیں، مقتدر حلقے مارے خوشی کے بھنگڑا ڈال رہے ہیں، اپنی کامیابی و کامرانی کے راگ الاپ رہے ہیں، امریکی سینٹ سے کیری لوگر بل کے تحت پاکستان کیلئے منظور ہونے والی ڈیڑھ ارب ڈالر کی سالانہ امداد پر ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے ہیں، پاکستان میں متعین امریکی سفیر اور واشنگٹن میں موجود پاکستانی سفیر کی کارکردگی کو اس کامیابی سے جوڑ رہے ہیں اور حکومت کیری لوگر بل کی امریکی سینٹ سے منظوری کو اپنا سب سے بڑا کارنامہ اور اسے صدر آصف علی زرداری کے دورہ امریکہ کی کامیابی کا ثمر قرار دے رہی ہے، حکومت کی طرف سے یہ دعویٰ بھی کیا جارہا ہے کہ کیری لوگر بل میں بھارت نے اپنے دوست ارکان کانگریس کے ساتھ مل کر پاکستان کے خلاف جو ناروا شرائط شامل کرائی تھیں وہ ہم نے زبردست سفارت کاری سے ختم کرادی ہیں اور اب یہ بل پاکستان میں اقتصادی امداد کا بہترین بل ہے جس سے ترقی اور خوشحالی کے دروازے کھلیں گے اور بیرونی سرمایہ کاری میں بے تحاشہ اضافہ ہوگا۔

درحقیقت خوش فہمی، خودفریبی اور خودفراموشی کی وہ نادر و نایاب مثال ہے، جس میں پاکستان کی آزادی خود مختاری سالمیت اور قومی وقار کے منافی شرمناک شرائط کے ساتھ ملنے والی امداد یا قرضے پر اس قدر خوشی کے اظہار نے پوری قوم سمیت ساری دنیا کو متعجب و حیران کیا ہوا ہے، جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ کیری لوگر بل کے تحت پانچ سال تک ڈیڑھ ارب ڈالر کی سالانہ امریکی امداد کے بدلے پاکستانی قوم کو کیا کچھ دینا ہوگا اور اپنا کیا کیا گروی رکھنا ہوگا؟ اس حوالے سے ہر روز نت نئے انکشافات اور چشم کشا حقائق ہمارے سامنے آرہے ہیں، گو کہ ہمارے حکمران اس معمولی امداد کو اپنی بہت بڑی کامیابی باور کرانے کی مہم میں مصروف ہیں، مگر حقیقتاً امداد کی شکل میں ملنے والے بھیک کے یہ چند ٹکے ہمیں ہماری آزادی، خود مختاری اور بقاء کے مکمل خاتمے کی قیمت پر عطا کئے جارہے ہیں، لیکن افسوس کہ اس روشن، تلخ اور واضح حقیقت جس سے ایک عام آدمی بھی اچھی طرح واقف ہے، کو سمجھنے سے ہمارے خوش فہم حکمران قاصر اور عاری نظر آتے ہیں جبکہ محب وطن حلقے اور سیاسی فہم و فراست اور بصیرت رکھنے والے دانشور اس امداد کے ممکنہ مضمرات اور وطن عزیز کو پہنچنے والے نقصانات پر نوحہ کناں ہیں۔

دوسری طرف ملکی و غیر ملکی میڈیا اس امداد کے حوالے سے ہوش ربا انکشافات

سامنے لارہا ہے اور اس امر پر تعجب اور حیرت کا اظہار کر رہا ہے کہ "پاکستانی سفارت کار، حکومت اور حکومتی ذمہ داران اِن چونکا دینے والی شرمناک شرائط کا جائزہ کیوں نہیں لے رہے اور سنجیدگی کے ساتھ اس کی اہمیت اور سنگینی کو کیوں محسوس نہیں کر رہے، جو حال ہی میں امریکی سینٹ کی جانب سے منظور کئے جانے والے کیری لوگر بل کا حصہ ہیں، تعجب خیز بات یہ ہے کہ حکومتی ذمہ داران یہ بتانے کیلئے بھی تیار نہیں ہیں کہ جس وقت یہ شرائط عائد کی جارہی تھیں اس وقت تمام پاکستانی اسٹیک ہولڈر آرمی انٹیلیجنس ایجنسیوں اور سیاسی قیادت کو اعتماد میں لیا گیا تھا یا نہیں، گو کہ یہ حقیقت وقت کے ساتھ جلد ہی سامنے آجائے گی، لیکن یہاں ایک بات طے تو ہے کہ ان مکروہ شرائط کے پورے ہونے اور امریکی وزیر خارجہ کی جانب سے جاری سرٹیفیکٹ کے بعد ہی پاکستان کو امداد کی قسط ادا کی جائے گی۔

کیری لوگر بل سے جڑی ان شرمناک شرائط کی پہلی قسط" ایٹمی ہتھیاروں کے غیر قانونی نیٹ ورکس کے خلاف کارروائی میں پاکستان امریکہ کے ساتھ تعاون اور ایسے نیٹ ورک سے وابستہ کسی بھی پاکستانی تک امریکہ کو رسائی فراہم کرنیکا پابند ہوگا، پاکستان کی حکومت کسی ایسے عنصر یا گروہ کی حمایت نہیں کریگی جو امریکہ وافغانستان میں اتحادی افواج کے علاوہ پڑوسی ممالک پر حملوں میں ملوث رہ چکے ہیں، پاکستان القاعدہ و طالبان یا ان سے منسلک دہشت گرد گروپوں

مثلاً لشکر طیبہ اور جیش محمد کو پڑوسی ملکوں پر حملوں کیلئے اپنی سرزمین استعمال نہیں کرنے دیگا اور پاک فوج، انٹیلی جنس ایجنسی سے وابستہ، ایسے افراد اور عناصر کی حمایت نہیں کی جائیگی جو دہشت گردوں کی براہ راست یا بالواسطہ امداد میں ملوث ہوں گے، اس کے علاوہ فاٹا اور ملک کے مختلف حصوں بشمول کوئٹہ اور مریدکے میں قائم دہشت گرد کیمپ کا خاتمہ۔" کی صورت میں ہمارے سامنے آچکی ہیں، قومی خودمختاری اور بقاء کے حوالے سے فکرمند ہر محب وطن پاکستانی کیلئے یہ تو وہ حیران کن شرائط ہیں جن کا تعلق اس معاہدے کے اُس تحریری حصے سے ہے جو کہ سامنے آچکا ہے لیکن اس معاہدے کی پس پردہ طے ہونے والی وہ خفیہ ضمانتیں اور شرائط جو حکومتی ذمہ داران نے نام نہاد سٹیک ہولڈرز" کو فراہم کی ہیں، شاید جلد منظر عام پر نہ آسکیں، لیکن یہاں ایک بات" طے ہے کہ اس امداد کے ملمع میں لپٹی ہوئی خوشنما بھیک کیلئے طے شدہ شرائط کا الجھاؤ آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہو گیا ہے۔

گو کہ اس وقت کیری لوگر بل کی پانچ بنیادی دفعات اور درجن بھر شقیں منظر عام پر لائی گئی ہیں جب کہ عوامی اضطراب کے پیش نظر اس کے اس امداد کے بہت سے مطالبات کو تاحال پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، سیاسی و دفاعی تجزیہ نگاروں کے مطابق ان شرائط میں ایک بڑی، اہم اور غیر تحریر شدہ خفیہ شرط امریکی سفارتخانے کی بلا مشروط توسیع اور اس توسیعی مرکز میں جاسوسی کا ایک

ایسے نیٹ ورک تشکیل ہے، جس کے تحت کیری لوگر بل میں بیان کی جانے والی دفعہ
سے پاکستان کی تینوں افواج اور حساس اداروں، عدالتی اور عالمی امور اس نیٹ ورک
میں مداخلت نہیں کریں گی، سب سے زیادہ تشویش ناک بات یہ ہے کہ پاک فوج
سمیت دیگر حساس اداروں کی اسلام آباد میں رہ کر مانیٹرنگ کرنا، بنیادی مسئلہ ہوگا، یہ
بات بھی سامنے آئی ہے کہ سفارتخانے کے اس توسیعی پروگرام میں پاکستان کے تمام
حساس مقامات کی مانیٹرنگ اور ان کا کنٹرول سسٹم موجود ہوگا، امریکہ کا یہ مرکز پورے
ایشیاء میں محفوظ ترین اور مضبوط ترین مرکز ہوگا، گو کہ کیری لوگر بل میں بعض ایسی
شقیں بھی شامل ہیں جو بظاہر بہت معمولی نظر آتی ہیں، لیکن دراصل ان سے براہ
راست پاکستان اور اس کے عوام متاثر ہوں گے مثلاً پاکستان القاعدہ اور طالبان اور اس
سے منسلک پڑوسی ملک کے لئے اپنی سرزمین استعمال نہیں ہونے دے گا۔
یہاں پڑوسی ملک سے مراد بھارت کے سوا کوئی اور نہیں ہے، جو ہمارا ازلی دشمن ہے
اس کے خلاف ممبئی دھماکوں کے بعد یہ سمجھنا کہ وہ ہم پر الزام تراشی اور پروپیگنڈے کو
ہوا دینا بند کر دے گا، احمقانہ سی بات لگتی ہے، امریکہ سے تعاون کی شرط میں ایک بڑی
خوفناک شرط، کسی بھی شہری تک رسائی ہے اس میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے لے کر
ہر خاص و عام افراد شامل ہیں، سابق آمرانہ دور میں نام نہاد ایٹمی پھیلاؤ نیٹ ورکس
کا ڈھنڈورا پیٹ کر جس طرح محسن

پاکستان کی کردار کشی کی گئی موجودہ جمہوری حکومت اس سے بھی دو ہاتھ آگے جا رہی ہے، اسی طرح اس بل میں یہ بھی شرط رکھی گئی ہے کہ فاٹا قبائلی علاقوں کے علاوہ کوئٹہ اور مریدکے، میں بھی تربیتی مراکز کے خلاف آپریشن کیا جائے گا، یعنی اب امریکہ امداد کے بدلے جہاں چاہے گا دہشتگردی کے شبہے میں پاکستانی عوام کو پاکستانی فوج سے مروائے گا یا خود ان پر حملہ کرے گا، یہاں اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ افغانستان میں امریکہ کو شکست کا سامنا ہے، افغان عوام اور طالبان قیادت اپنے ملک کی آزادی کیلئے جو کچھ کر رہی ہے وہ پاکستان یا اس کے کسی ادارے کے تعاون سے نہیں بلکہ اپنی مدد آپ کے تحت ہو رہا ہے لیکن پاکستان کی جذبہ جہاد سے سرشار فوج، قومی مفادات اور سلامتی کا تحفظ کرنے والی خفیہ ایجنسیوں کے گرد گھیرا تنگ کرنے کیلئے یہ ناروا شرط رکھی گئی ہے۔

تاکہ امریکہ جب چاہے شرائط کی خلاف ورزی کا الزام لگا کر ان اداروں کے خلاف منفی پروپیگنڈے اور اقدامات کا محاذ کھول کے دوسری طرف ان شرائط پر عملدرآمد کیلئے اسلام آباد میں جو انفراسٹرکچر مسز رابن رافیل کی قیادت میں کھڑا کیا جا رہا ہے اس پر قوم اپنے جذبات کا اظہار پہلے ہی کر چکی ہے اگر حکومت نے ان شرائط کو قبول کرتے ہوئے ہر چھ ماہ بعد امریکی وزیر خارجہ کی طرف سے شرمناک اور قومی غیرت و حمیت کے منافی سرٹیفکیٹ حاصل کرنے پر آمادگی

ظاہر کردی تو قوم اسے کسی قیمت پر قبول نہیں کریگی اور اس کا احساس حکومت کو پہلی قسط وصول کرنے سے پہلے ہی ہو جائیگا۔ درحقیقت یہ پاکستان کی پارلیمنٹ، حکومت، قوم، عدلیہ، خفیہ ایجنسیوں اور دیگر قومی اداروں پر بالواسطہ کنٹرول کی وہ پالیسی ہے جو ایک آزاد، خودمختار نیوکلیر اسلامی ریاست کو اپاہج اور مفلوج بنا سکتی ہے۔

چنانچہ ان حالات کے تناظر میں سب سے اہم سوال جو پوری پاکستانی قوم کے سامنے سر اٹھائے کھڑا ہے وہ یہ ہے کہ امریکہ سے ہمارے وہ کون سے مفادات وابستہ ہیں، جس کی وجہ سے ہم ایک زرخرید غلام اور لونڈی کی طرح امریکہ کو اپنی عزت کا جنازہ نکالنے کا مسلسل اجازت نامہ دیئے جارہے ہیں؟ حیرت کی بات ہے کہ دنیا کے بہترین وسائل اور صلاحیت رکھنے کے باوجود امریکی غلامی کی ایسی شرمناک نظیر ہمیں ماضی قریب میں بھی نہیں ملتی، سب سے زیادہ حیران کن امر یہ ہے کہ ہمارا کوئی مفاد امریکہ سے وابستہ نہیں ہے، نہ ہی ہماری جغرافیائی سرحدیں امریکہ سے ملتی ہیں اور نہ ہی پاکستان کی باسٹھ سالہ تاریخ میں امریکہ نے کسی مشکل وقت میں پاکستان کا ساتھ دیا اور مدد کی ہے اور اس نے کبھی پاکستان کے دکھ درد میں شریک ہونے کی کوشش کی ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ امداد کے نام پر ڈالروں کی بھیک کی بھوک ہمارے حکمرانوں کو امریکہ کے سامنے جھکنے اور گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرتی ہے؟

کون ہے جو نہیں جانتا کہ آج تک حکمرانوں نے جتنے بھی قرضے حاصل کئے اس کے ثمرات کبھی بھی عوام تک نہیں پہنچے اور نہ ہی اس سے کبھی عوام کو کوئی فائدہ حاصل ہوا، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ امداد اور قرضے جو حکمران اپنی سہولت اور اچھا وقت گزارنے کیلئے حاصل کرتے ہیں اس کے نتائج اور سود سمیت قیمت حکمرانوں کو نہیں بلکہ قوم اور آنے والی نسلوں کو ادا کرنی پڑتی ہے، کیری لوگر بل کے ذریعے امریکہ پاکستان سے جو شرائط منوانا چاہتا ہے وہ کسی طور پر بھی پاکستانی عوام کے لئے قابل قبول نہیں ہوں گی، ان شرائط کو تسلیم کرنے کا مطلب پاکستان کو امریکی کالونی بنانا اور محض ڈیڑھ ارب ڈالر سالانہ کے عوض پاکستان کی سلامتی، خود مختاری، آزادی اور وقار کو امریکہ کی جھولی میں ڈال دینا ہے جو کسی طور بھی عقلمندانہ اقدام نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ کیری لوگر بل کی منظوری پاکستان کے خلاف ایک ایسی سازش ہے جس کا مقصد انتہائی حقیر معاوضے کے بدلے پاکستان کے جوہری پروگرام، ایٹمی و عسکری صلاحیت اور قدرتی وسائل پر قبضہ کرنا ہے، موجودہ حکومت جس کی اپنی کارکردگی پہلی ہی ایک سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے اگر ان شرمناک شرائط کو تسلیم کرتی ہے تو اسے بہت جلد اپنی حیثیت اور عوامی جذبات کی حدت کا اندازہ ہو جائے گا۔

لہذا ہمارے حکمرانوں کو چاہیے کہ وہ نوشتہ دیوار پڑھیں اور اپنا قبلہ درست

کرلیں اور قرضوں پر انحصار کے بجائے اپنے وسائل پر بھروسہ کرتے ہوئے ایسی امداد جس کے حصول سے ہمیں اپنی آزادی اور خود مختاری گروی رکھنا پڑے انکار کردیں، موجودہ حالات میں ضرورت اس امر کی ہے کہ کیری لوگر بل کا اصل مسودہ اور اس کی تمام پس پردہ شرائط کو عوام کے سامنے لایا جائے اور اسے پارلیمنٹ میں منظوری کے ساتھ عوام سے بھی منظور کرایا جائے، کیونکہ امریکی سینٹ سے منظور شدہ مسودہ سامنے آنے کے بعدامداد کیلئے جن شرمناک شرائط کا انکشاف ہوا ہے وہ پوری قوم کیلئے غم وغصے، شرمندگی اور پشیمانی کا باعث ہے حقیقت یہ ہے کہ ان توہین آمیز شرائط کو پورا کرنا نہ تو کسی ریاستی ادارے کیلئے ممکن ہے، نہ پاکستان کی غیور عوام اسے کسی طور پر قبول کرسکتے ہیں اور نہ وہ حکومت وقت کو اس بات کا اختیار دے سکتے ہیں کہ وہ محض چند ڈالروں کی بھیک کے حصول کیلئے پاکستان کی سلامتی کو غیروں کے ہاتھوں گروی رکھ کر قوم کو غلامی کی دلدل میں دھکیل دیں، کیونکہ تاریخ گواہ ہے کہ ہمیشہ غلامی کی دستاویز پر دستخط ایک یا دو افراد ہی کرتے ہیں، لیکن غلامی پوری قوم اور آنے والی نسلوں کو بھگتنی پڑتی ہے، کیری لوگر بل بھی پاکستان اور پاکستانی قوم کیلئے غلامی کی ایک ایسی دستاویز ہے جس کی شرمناک شرائط کے تحت ملنے والی امداد پاکستان کی سالمیت، استحکام اور بقاء کیلئے نہ صرف خطرہ بلکہ اس پر عمل درآمد کا مطلب صریحاً خودکشی کے مترادف ہے۔

مہد سے لحد تک تحفظ ناموس رسالت اور احیائے اسلام کی جدوجہد

علامہ شاہ احمد نورانی کی چھٹی برسی کے حوالے سے خصوصی تحریر

علامہ شاہ احمد نورانی پاکستان میں اصولی سیاست کے علمبردار تھے، آپ نے کبھی بھی اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کیا اور نہ ہی کبھی بھی چور دروازے سے اقتدار میں آنے کی کوشش نہیں کی، یہی وجہ ہے کہ آپ کے شدید ترین مخالف بھی آپ کا نام عزت و احترام سے لیتے ہیں، تحریک پاکستان ہو یا تحریک ختم نبوت تحریک نظام مصطفیٰ ہو یا تحریک بحالی جمہوریت یا آئینی و پارلیمانی بالادستی کی تحریک علامہ شاہ احمد نورانی جدو جہد کے کسی مرحلے میں کبھی پیچھے نہیں رہے، جب بھی قوم کو ضرورت ہوئی آپ کو ہمیشہ صف اول میں موجود پایا، آپ نے کبھی کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا، کئی بار اصولوں کی خاطر اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالا لیکن پیچھے ہٹنا گوراہ نہیں کیا، زندگی بھر علامہ شاہ احمد نورانی کے پیش نظر ہمیشہ عالم اسلام کا مجموعی مفاد ملک میں نظام مصطفیٰ کا نفاذ مقام مصطفیٰ کا تحفظ اور وطن عزیز پاکستان کا استحکام و سالمیت رہی، اس مقصد کے حصول کیلئے آپ نے مختلف مکاتب فکر کے علماء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا، لیکن اس اتحاد کے باوجود آپ نے کبھی بھی اپنے

عقائد و نظریات کا سودا نہیں کیا، آپ فرماتے تھے دیگر مکتبہ فکر سے "ہمارے اشتراک عمل کی وجہ لادینی عناصر، پاکستان کے بدترین دشمنوں بھارت امریکہ، برطانیہ اور صہیونی و یہودی اور پاکستان کے اندرونی دشمن قادیانیوں کے خلاف دینی قوتوں کا ایک مشترکہ پلیٹ فارم تھا، جب ہم متحد ہوئے اور ہم نے دباؤ ڈالا تو مضبوط ترین وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو بھی ہماری بات ماننا پڑی" (انٹرویو سنڈے میگزین روز نامہ جنگ 3 مارچ2002)

علامہ شاہ احمد نورانی ایک سچے عاشق رسول اور صحیح العقیدہ مسلمان تھے، آپ کی ذات اور عظمت و کردار کا اعتراف آپ کے بڑے بڑے مخالفین عقائد و نظریات کا ہزارہا اختلاف رکھنے کے باوجود کرتے تھے اور آپ کو قائد ملت اسلامیہ قرار دے کر آپ کی قیادت کو اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے تھے، ممتاز اہل تشیع رہنما جناب علی غضنفر کراروی علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کو حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ قرار دیتے جبکہ جماعت اسلامی کے سابق امیر قاضی حسین احمد کہتے ہیں کہ "علامہ شاہ احمد نورانی ایک سچے عاشق رسول تھے، آپ کا ہر فعل و عمل سنت رسول کے مطابق ہوتا تھا، آپ اپنے وقت کے سب سے بڑے اور سب سے سچے عاشق رسول تھے" ایک سچے عاشق رسول کی زندگی کا ہر پل اور ہر لمحہ اپنے محبوب کی اتباع اور پیروی میں گزرتا ہے، اسی وجہ سے علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کی زندگی کا زیادہ تر حصہ پاکستان اور بالخصوص

دنیا بھر میں احیاء اسلام اور تحفظ ناموس رسالت کی جدوجہد سے عبارت ہے، آپ مملکت پاکستان میں نظام مصطفیٰ کے نفاذ کے داعی تھے اور آخری دم تک آپ اسلام کی سربلندی اور مقام مصطفیٰ کے تحفظ کی کوششوں میں مصروف عمل رہے۔

یہ حقیقت ہے کہ علامہ شاہ احمد نورانی نے 1977ء میں بھٹو حکومت کی الیکشن میں دھاندلی کے خلاف اٹھنے والی عوامی تحریک کو اپنے حسن تدبر اور فہم و فراست سے تحریک نظام مصطفیٰ میں تبدیل کردیا، تحریک نظام مصطفیٰ، تحریک پاکستان کے بعد پاکستان کی سب سے بڑی اور کامیاب ترین تحریک تھی، یہ تحریک پاکستان کو اپنی حقیقی منزل نفاذ نظام مصطفیٰ تک پہنچانے ہی والی تھی کہ جنرل ضیاء الحق نے بیرونی طاقتوں کے اشارے پر اقتدار پر قبضہ کرکے پاکستان کو اس عظیم تحریک کے ثمرات سے محروم کردیا، 1977ء کے مارشل لاء کے دوان جب جنرل ضیاء الحق نے ملک کا آئین معطل کیا تو اسلامی دفعات کی معطلی کی وجہ سے قادیانیوں نے اپنی سرگرمیوں میں اضافہ کردیا، اس صورتحال میں علامہ شاہ احمد نورانی نے آئین میں اسلامی دفعات کی معطلی پر شدید احتجاج کیا اور فوجی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ فوری طور پر قادیانیوں کی سرگرمیوں کا نوٹس لے اور آئین کی تمام اسلامی دفعات کو فوری طور پر بحال کرے چنانچہ آپ کے بھرپور احتجاج پر حکومت کو آئین کی اسلامی دفعات کو بحال کرنا پڑیں اور امتناع قادیانیت آرڈیننس بھی جاری کرنا پڑا۔

سابق وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے جب سیشن کورٹ سے سزائے موت پانے والے دو عیسائی شاتم رسول کی سزا پر دکھ کا اظہار کیا اور انہیں رہا کرا کر رات و رات ملک سے باہر بھیج دیا تو علامہ شاہ احمد نورانی نے ان کے اس اقدام کو ملک دشمنی قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ " دو عیسائی گستاخان رسول کو عزت و احترام سے بری کروا کر تحفے تحائف دے کر بیرون ملک بھیج کر محترمہ بے نظیر نے پاکستان میں گستاخی رسول کا راستہ کھول دیا ہے، محترمہ نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گستاخوں کو چھوٹ دے دی ہے لیکن اللہ تعالی اپنے محبوب کی عزت و حرمت اور بزرگی کے معاملے میں بہت غیرت مند ہے، گستاخان رسول کو تحفظ دینے والی حکومت برقرار نہیں رہ سکتی، میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ یہ حکومت بہت جلد ختم ہو کر رہے گی" (انجمن نوجوانان اسلام کے ملتان کنونشن سے خطاب) علامہ شاہ احمد نورانی کا یہ ارشاد اس وقت سچ ثابت ہوگیا جب محترمہ کی اپنی جماعت سے منتخب ہونے والے صدر مملکت فاروق احمد خان لغاری نے آئین کی دفعہ اٹھاون ٹو بی کا سہارا لے کر اپنی ہی جماعت کی حکومت کو برطرف کرکے ایوان سے باہر پھینک دیا، 1995ء میں جب بے نظیر حکومت نے اپنے یہودی و سامراجی آقاؤں کی ایماء پر قانون توہین رسالت میں ترمیم کرنا چاہی تو علامہ شاہ احمد نورانی کی اپیل پر حکومت کے اس اقدام کے خلاف 27 مئی 1995ء کو ملک گیر پہیہ جام ہڑتال ہوئی، اس تاریخی ہڑتال نے ملک

میں تحریک نظام مصطفیٰ کی یاد تازہ کر دی اور حکومت کو اپنے بڑھتے ہوئے قدم روکنا پڑے، اس موقع پر آپ نے تمام علماء اور آئمہ مساجد کے نام ایک خط بھی جاری کیا جس میں آپ نے اُن کو اُن کے فرائض منصبی یاد دلائے۔

علامہ شاہ احمد نورانی کی ہی کوششوں کی بدولت نواز شریف دور میں گستاخ رسول کی سزائے موت کا قانون قومی اسمبلی سے منظور ہوا، پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے انگلینڈ کے لارڈ پادری نے جب قانون توہین رسالت کی سزائے موت کو معطل کرنے کا مطالبہ کیا تو علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی نے فرمایا کہ " تقریباً پانچ چھ سال کی جدوجہد کے بعد 1990ء کی پارلیمنٹ سے پاس ہوا ہے اور اس قانون کی رو سے کوئی بھی شخص خواہ وہ مسلمان ہو یا عیسائی اس کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو اگر اس نے کسی بھی نبی کی بے حرمتی کی تو اس کیلئے سزائے موت ہے، مجھے اس بیان پر بڑی حیرت ہے کہ ایک عیسائی ایسا مطالبہ کر رہا ہے بلکہ اس کو تو خوش ہونا چاہیے کہ ایک مسلمان ملک میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عزت و حرمت کو اس طرح تحفظ دیا گیا ہے کہ عیسائی بھی اتنا تحفظ نہیں کر سکے، اس قانون سے جہاں حضور پر نور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرتبہ کا تحفظ کیا گیا ہے وہاں دیگر انبیاء و مرسلین کی عزت و حرمت کا تحفظ بھی کیا گیا ہے، اگر اس قانون کو ختم کیا گیا یا اس کی سزا میں کمی کی گئی تو اس سے گستاخان رسول کو شان رسالت میں گستاخی کا موقع مل جائے گا، وہ اچھی

طرح جانتے ہیں کہ مسلمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں گستاخی نہیں کرتے ہیں، دراصل وہ اس قانون کی منسوخی کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کا جواز پیدا کرنا چاہتے ہیں، ہم مسلمان آرچ بشپ کے اس مطالبے کی مذمت کرتے ہیں اگر حکومت عیسائیوں کے ہاتھ میں کھیلی اور اس قانون میں کسی قسم کی ترمیم کی تو خود مسلمان دین اور مذہب کے مطابق اس سزا کو نافذ کردیں گے۔ (ماہنامہ پیام حرم، اپریل 2006)

12 اکتوبر 1999ء کو جب جنرل پرویز مشرف نے ملک کی باگ دوڑ سنبھالی تو انہوں نے پاکستان کے آئین کو معطل کردیا اور اپنا ایک آئینی پی سی او آرڈر جاری کیا، جس میں اسلامی دفعات شامل نہیں تھیں، علامہ شاہ احمد نورانی نے اس موقع پر بھی حکومت سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا اور فوجی آمروں کے خلاف اپنی جمہوری جدوجہد کی تاریخ برقرار رکھی، آپ نے شدید احتجاج کرتے ہوئے آئین کی مکمل بحالی، ایل ایف او کی غیر آئینی حیثیت اور وردی کی مخالفت میں اپنی آواز کو کبھی نیچے نہیں ہونے دیا، آپ نے تمام مذہبی اور سیاسی جماعتوں سے رابطہ کرکے انہیں اس کے سنگین نتائج سے آگاہ کیا، آپ نے تحریک فدایان ختم نبوت کے پلیٹ فارم سے ہر ضلع میں کانفرنس کرنے کا اعلان کیا، آپ نے فرمایا کہ دینی جماعتیں، محب وطن عوام اور عاشقان رسول ناموس مصطفیٰ پر حکومت سے کوئی سمجھوتہ نہیں کرینگے، تل ابیب قادیانیوں کا ہیڈ کوارٹر ہے، جس کا

ناقابل تردید ثبوت میں قومی اسمبلی میں 1974ء میں پیش کرچکا ہوں، جس کا کوئی جواب اس وقت مرزا ناصر بھی نہیں دے سکا تھا، قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا فیصلہ ایوان بالا اور زیریں نے متفقہ طور پر طویل بحث کے بعد دیا تھا، اب کسی کو کوئی اختیار نہیں کہ وہ اس میں کوئی تبدیلی کرسکے" آپ نے تحفظ ناموس رسالت کیلئے 19 مئی 2000ء کو ملک گیر ہڑتال کا اعلان کیا جو انتہائی کامیاب رہی اور پورے ملک میں فدایان ختم نبوت نے اس ہڑتال میں حصہ لے کر حکومت کے اس اقدام کے خلاف اپنا احتجاج ریکارڈ کرایا، اسی سلسلے میں آپ نے 27 مئی 2000 کو نشتر پارک کراچی میں ختم نبوت کانفرنس منعقد کرنے کا اعلان کیا اور اہل وطن کے نام ایک کھلا خط بھی جاری کیا، جس میں آپ نے اہل وطن کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا "فدایان ختم نبوت دستور کسی ملک کی اساس ہوتا ہے، یہ قومی یکجہتی ملکی سالمیت ملی وحدت اور جغرافیائی و نظریاتی سرحدوں کے تحفظ کی ضمانت ہوتا ہے، یہ کسی قوم کی یکجہتی و سالمیت کی مقدس دستاویز ہوتی ہے، یہ پوری قوم کا میثاق اور پیمان وفا ہوتا ہے، پاکستان کی دستوری تاریخ نہایت تلخ ہے۔۔۔۔۔۔۔1973ء میں جمہوری طریقہ پر منتخب اسمبلی نے ایک جامع متفقہ پارلیمانی جمہوریت پر مشتمل دستور دیا، اس منزل کو پانے میں قوم آدھے سے زیادہ ملک گنوا چکی تھی،

اس دستور پر قوم کے تمام منتخب ارکان پارلیمنٹ کے تائیدی و توثیقی دستخط

ثبت تھے اور آج تک تمام تر دستوری تعطل دستور سے انحراف اور عارضی طور پر دستور کو ایک جانب رکھ دینے کے افسوس ناک اقدامات کے باوجود آج بھی ملک کی وحدت، بقا، سلامتی اور بحیثیت ایک قوم اور ملک مل جل کر رہنے کی واحد آئینی و قانونی اساس یہی دستور ہے، خدانخواستہ اسے چھیڑا گیا اس کے حقیقی ڈھانچے کو بدل کر رکھ دیا گیا، اس میں من مانی ترامیم کرکے اس کی روح کو مسخ کر دیا گیا، اس دینی ملی قومی اور ملکی اساس کو پامال کر دیا گیا، تو پھر خاکم بدہن شاید ہم ملکی وحدت و سالمیت اور قومی یکجہتی کا آخری موقع بھی گنوا بیٹھیں گے، الہذا ہم متنبہ کرنا اپنا دینی و ملی فریضہ سمجھتے ہیں کہ آئین کی مسلمہ اسلامی، دفعات کو معطل رکھنے کے بجائے ہمہ وقت نافذ العمل اور ناقابل تنسیخ قرار دے کر پی سی او کا لازمی حصہ بنایا جائے، ابھی تک ہم ناصح و مشفق کا رول ادا کر رہے ہیں ہم نے نرم سے نرم الفاظ میں حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنی آواز اہل اقتدار تک پہنچانے کی کوشش کی ہے، تاکہ مسلح افواج کا احترام بحیثیت ادارہ قائم رہے، ان کا وقار مجروح نہ ہو، آگے چل کر آپ نے حکومت کو متنبہ کیا کہ وہ ہوش کے ناخن لے اور شمع رسالت کے پروانوں کا تقابل حریصان اقتدار اور محرومین اقتدار سے ساتھ نہ کرے، وہ داد عیش پانے کیلئے جیتے ہیں اور یہ خاتم النبیین رحمتہ اللعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ناموس پر مرمٹنے کی خواہش میں زندہ ہیں، ہم نہیں چاہتے کہ عوام اور افواج آمنے سامنے ہوں، بلکہ ہماری تمنا ہے کہ ختم نبوت اور

ناموس رسالت کے تحفظ اور وطن کی بقاء و سالمیت اور دفاع کیلئے عوام اپنی مسلح افواج کے شانہ بشانہ کھڑے ہوں، ہم چیف ایگزیکٹو سے یہ بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ غیر ملکی امداد سے پنپنے والی اور اپنے بیرونی آقاؤں کے مفادات کا پرچار کرنے والی این جی اوز پر اعتماد کرنے اور ان کو اپنا سیاسی اتالیق بنانے کے بجائے ان حساس دینی، ملی اور قومی مسائل میں رہنمائی حاصل کرنے اور پورے ملک کو فکری انتشار میں مبتلا کرنے اور مسلح افواج کی نظریاتی کمٹمنٹ کو موضوع بحث بنانے کے بجائے محب وطن جماعتوں سے رابطہ کریں، اور ان کا مؤقف سنیں۔"

27 مئی 2000ء کو نشتر پارک کراچی میں آپ کی اپیل پر فدایان ختم نبوت کا عظیم الشان جلسہ عام ہوا، علامہ شاہ احمد نورانی نے اس جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا، "جنرل پرویز مشرف کے ہاتھوں دستور کی معطلی کے بعد قادیانی اپنے آپ کو مسلمان ہونے کا پروپیگنڈہ کرکے ہمارے زخموں پر نمک پاشی کررہے ہیں، ہم عقیدہ ختم نبوت کیلئے سر کٹا سکتے ہیں، لیکن کوئی سمجھوتہ نہیں کرسکتے۔ جس طرح فوج اپنا جعلی سربراہ برداشت نہیں کرسکتی اسی طرح مسلمان قوم جعلی نبی کبھی برداشت نہیں کرسکتی۔" چنانچہ حکومت نے مذہبی امور کے وزیر عبدالمالک کانسی کو آپ کے پاس بھیجا، آپ نے اس ملاقات میں وزیر موصوف پر واضح فرمادیا کہ ناموس رسالت کا قانون زمین سے نہیں بلکہ آسمان سے

اتارا گیا اس میں کوئی تبدیلی برداشت نہیں کی جائے گی، چنانچہ حکومت نے حالات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے ایک آرڈیننس جسے پی سی او کا حصہ بنایا گیا جاری کیا، اس آرڈیننس میں آئین کی تمام اسلامی دفعات کو شامل کرلیا گیا، اس طرح علامہ شاہ احمد نورانی نے ایک مرتبہ پھر حکومت کو مجبور کردیا کہ وہ ان اسلامی آئینی دفعات کو کبھی بھی معطل اور تبدیل نہیں کرسکتی جن کا تعلق اسلام کے بنیادی عقائد سے ہے۔" اپریل 2001ء میں علامہ شاہ احمد نورانی نے جنرل پرویز مشرف سے ایک ملاقات میں پاکستان ٹی وی سے پیش کئے جانے والے کلچر پر شدید تنقید کی اور انہیں کہا کہ پاکستان ٹی وی ثقافت کے نام پر کثافت پھیلا رہا ہے، آپ نے اس ملاقات میں جنرل پرویز مشرف کو قادیانیوں کے بارے میں حقائق سے آگاہ کرتے ہوئے انہیں پاک فوج سے نکالنے مطالبہ کیا، آپ نے جنرل صاحب سے کہا کہ " قادیانی اسلام اور پاکستان کے کھلے دشمن ہیں، جہاد کے منکر ہیں، ایسے منکرین جہاد کی پاک فوج میں موجودگی اسلامی نقطہ نظر سے جائز نہیں، کیونکہ پاک فوج کا نعرہ جہاد فی سبیل اللہ کرنا ہے، اسلیے پاک فوج کو قادیانیوں کے وجود سے پاک کیا جائے۔" (انٹرویو حامد میر روزنامہ اوصاف اسلام آباد 7 اپریل 2001) 3 مارچ 2003ء کو حمید نظامی ہال نوائے وقت لاہور میں لیکچر دیتے ہوئے علامہ شاہ احمد نورانی نے فرمایا کہ "1973ء کا دستور متفقہ دستور ہے، اس میں پہلی

مرتبہ ملک کا سرکاری مذہب اسلام قرار دیا گیا، یعنی حکومت کہے گی کہ وہ مسلمان ہے،
اس طرح اگر اسلام پر کوئی مشکل آئے گی تو اسلام کا دفاع کرنا بھی حکومت کی ذمہ داری
ہوگی، مگر نہایت افسوس کی بات ہے کہ آج دستور پر عمل نہیں ہو رہا ہے، تاہم ہمیں
جدوجہد کرنی چاہیے کہ مستقبل میں آئین پر عمل درآمد ہو، آپ نے کہا کہ 1973ء کا
آئین مولویوں نے سوشلسٹوں سے بنوایا، انھوں نے کہا کہ امریکی کانگریس کے نہ جانے
پیٹ میں کیا درد ہوا ہے کہ اس نے قادیانیوں کو مسلمان قرار دینے کا مطالبہ کیا ہے،
حالانکہ اگر قادیانی توبہ کرکے اسلام قبول کرلیں تو ہمارے دروازے کھلے ہیں، قادیانی
کوئی دستوری نہیں ایک مذہبی مسئلہ ہے اور مسلم اُمہ نے سو سال کی جدوجہد کے بعد ان
کو غیر مسلم قرار دلوایا ہے، امریکی کانگریس کو کیا حق ہے کہ وہ پاکستان سے مطالبہ
کرے کہ تحفظ ناموس رسالت کے قوانین میں ترمیم کی جائے، قادیانیوں کو مسلمان
قرار دیا جائے۔۔۔۔ امریکی دراصل ہمارا معاشرہ اور ہماری قومیت بدلنا چاہتے ہیں،
لیکن جس ملک کا بچہ بچہ غازی علم دین شہید بننے کیلئے تیار ہو، وہاں ایسا کرنا ناممکنات
میں سے ہے، انھوں نے کہا کہ حکومت جو ترامیم تیار کررہی ہے، وہ غلط ہیں اور کسی
"فرد واحد کو آئین میں ترمیم کا حق نہیں دیا جاسکتا۔
عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد سے لے کر 11، دسمبر 2003ء کو اپنے وصال تک

علامہ شاہ احمد نورانی کی زندگی نظام مصطفیٰ کے نفاذ اور مقام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تحفظ کی جدوجہد میں مصروف رہی، آپ کی دینی ومذہبی اور قومی و بین الاقوامی خدمات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کیلئے کئی کتابیں درکار ہیں، ہم یہاں صرف ممتاز صحافی جناب نادر شاہ عادل کا ایک مختصر تبصرہ درج کررہے ہیں "ان کی جمہوریت اور اسلام سے روحانی اور لازوال کمٹمنٹ کا آخری منظر اور دستاویزی ثبوت یہ تھا کہ موت ان کے در دل پر دستک دے رہی تھی اور مولانا جمہوریت کی بحالی اور اسلام کی بقاء کی جنگ لڑ رہے تھے اور وہ بھی تاج و تخت و حکومت و دربار سے، مولانا نورانی اپنی زندگی اور اصولی جدوجہد سے ہمیں یہ پیغام دے گئے کہ

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغ آخر شب

ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے"

علامہ شاہ احمد نورانی نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ کی رضا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوشنودی اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود، عالم اسلام کی یکجہتی اور کفار پر اسلام کے غلبہ و سربلندی کیلئے گزارا، جناب شاکر حسین خان (ریسرچ اسکالر علوم اسلامی جامعہ کراچی) لکھتے ہیں کہ " بے شک علامہ شاہ احمد نورانی عصر حاضر میں عاشقان مصطفیٰ کے سردار ہیں، آپ

نے مقام مصطفیٰ کے تحفظ کیلئے بے پناہ خدمات سرانجام دیں، آپ اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے، اللہ تعالیٰ جس سے کام لینا چاہے لے لیتا ہے اور عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کیلئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو چنا آپ نے جو کارنامہ سرانجام دیا وہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم تھا، جس کی بدولت آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔" گو کہ آج علامہ نورانی کی ذات ہم میں نہیں لیکن اس عاشق رسول کی کی یاد اس بات کا ثبوت ہے کہ جسم فانی ہے اور فنا ہو جانے والی چیزوں سے خوفزدہ ہونے والے خود بھی فنا ہو جاتے ہیں، بقائے دوام صرف ان ہی کے حصے میں آتی ہے جن کی زندگی کا مقصد غلبہ دین احیائے اسلام اور اللہ اور اس کے رسول کی رضا و خوشنودی کا حصول ہوتا ہے۔

سامراجی ذہن، برہمنی سوچ اور بھارت کا مکارانہ ہندو کردار

بھارت سے دوستی کی خواہش ..... دل کے بہلاوے یا خام خیالی

کہتے ہیں کہ دوستی کا ہاتھ اگر دوستی کے جذبے کے تحت بڑھایا جائے اور اخلاص و نیک نیتی کے ساتھ تھاما جائے تو یہ کوشش درمیان کے فاصلوں کو کم کرنے، پرانی رنجشیں دور کرنے اور دلوں کی دوریاں مٹانے کا ذریعہ بن سکتی ہے لیکن اس کیلئے ضروری ہے کہ دوستی کی یہ کوشش دونوں فریقوں کی جانب سے یکساں اور برابری کی بنیاد پر ہو جبکہ اس کے برخلاف اگر یہی کوشش ایک فریق کو کمزور سمجھ کر اسے دھوکہ اور فریب دینے اور نقصان پہنچانے کیلئے استعمال کی جائے تو کبھی بھی باہمی اعتماد و بھروسے کی فضا پیدا نہیں ہوسکتی اور نہ ہی دوستی اور محبت کا جذبہ پروان چڑھ سکتا ہے پاک بھارت تعلقات اور دوستی کے حوالے سے بھارت کے مقابلے میں پاکستان کا کردار ہمیشہ مثبت تعمیری اور مصالحانہ رہا اور پاکستان نے ہمیشہ ایک پر امن پڑوسی ہونے کا کردار ادا کیا لیکن اس کے برخلاف بھارت نے ہمیشہ پاکستان کے خلاف جارحانہ رویہ اختیار کیا پاکستان کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کیں اور پاکستان کے نرم و مصالحانہ رویئے کو کمزوری سے تعبیر کیا حقیقت یہ ہے کہ بھارت نہ تو کبھی پاکستان کا

دوست تھا اور نہ ہی ہوگا اور بھارت سے اچھے تعلقات اور دوستی کی خواہش دل کے بہلاوے اور خام خیالی کے سوا اور کچھ نہیں۔

بھارت کی اس تمام تر پاکستان دشمن کوششوں کے باوجود بھی پاکستان کی ہمیشہ یہ کوشش اور خواہش رہی کہ بھارت کے ساتھ ایک اچھے ہمسایہ ملک جیسے تعلقات رکھے جائیں لیکن طاقت اور رعونت کے زعم میں مبتلا بھارت نے کبھی پاکستان کے جذبہ خیر سگالی کو کوئی اہمیت نہیں دی ہمیشہ پاکستان کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو جھٹکا اور اگر کبھی مصافحے کی نوبت بھی آئی تو بھارتی وزیر اعظم کے بوجھل دل اور سپاٹ چہرے کے ساتھ بڑھا ہوا ہاتھ وہ پوری کہانی بیان کرگیا جو صدیوں پر محیط ہے اور جنوبی ایشیاء کی سرزمین اس کہانی کے سارے کرداروں اور سارے منظروں سے اچھی طرح واقف ہے دراصل یہی وہ بنیادی سبب ہے جس کی وجہ سے پاک بھارت تعلقات میں بہتری کی تمام تر کوششیں نقش برآب ثابت ہوئیں لیکن اس تلخ حقیقت کے باوجود بھی ہر دور میں ہمارے حکمران بھارت سے بہتر تعلقات کے خواہاں رہے اور یہ یک طرفہ کوششیں آج بھی جاری ہیں۔

جبکہ دوسری طرف بھارت پاکستان کے گرد گھیرا تنگ کرنے اور اپنے جارحانہ عزائم کی تکمیل میں تیزی سے مصروف ہے اور ہر آنے والے دن کے ساتھ بھارت کے جنگی جنون میں اضافہ ہورہا ہے گزشتہ دنوں پاکستانی سرحد کے قریب اپنے تمام

مگ 29 لڑاکا طیاروں کی تعیناتی کا فیصلہ اور اس کی حالیہ جنگی تیاریاں اور اقدامات اس کا عملی ثبوت ہیں تازہ ترین اطلاعات کے مطابق بھارت کے دو سکواڈرن لڑاکا طیارے اودھم پور ائیر بیس پہنچ چکے ہیں جبکہ تیسرا اسکواڈرن گجرات سے اودھم پور روانہ ہو چکا ہے اودھم پور ائیر بیس کے افسر کمانڈنگ ائیر کموڈور ایس ایچ اروڑہ کے بقول اس فیصلے کا مقصد بھارتی فضائیہ کو مغربی سرحدوں پر ہمہ وقت تیاری کی حالت میں رکھنا ہے تاکہ کسی بھی حملے کی صورت میں اس کا فوری جواب دیا جاسکے دوسری جانب بھارت نے روسی کمپنی کے ساتھ 60 مگ 29 طیاروں کو اپ گریڈ کرنے کا معاہدہ بھی کیا ہے جبکہ فضا میں ایندھن بھرنے والے دو اواکس تین طیارے چھ سی 130 طیارے 80 ہیلی کاپٹر اور جدید ریڈار بھی بھارتی فضائیہ میں شامل کئے جا رہے ہیں۔

پاکستان کے خلاف بھارتی جارحانہ عزائم تو افغانستان میں پاکستانی سرحد پر موجود بھارتی سفارت خانوں اور بلوچستان اور قبائلی علاقوں میں اس کے پیسہ و تربیت یافتہ افراد کی تخریبی کارروائیوں سے بھی عیاں ہیں جبکہ ممبئی حملوں کے حوالے سے دنیا بھر میں پاکستان کے خلاف شر انگیز منفی پراپیگنڈہ بھی اس کا منہ بولتا ثبوت ہے اور بھارت اس وقت تک پاکستان سے مذاکرات پر آمادہ نہیں جب تک پاکستان اس کی شرائط مان کر حافظ سعید اور ان کے ساتھیوں کے خلاف کارروائی نہیں کرتا بھارتی حکمران اپنے جنگی جنون اور جنگجویانہ عزائم

کی تکمیل کیلئے اسلحہ کے ڈھیر لگا رہے ہیں امریکہ اور روس دونوں سے اسلحہ کی خریداری
کے علاوہ اندرون ملک اسلحہ کے کارخانے دھڑا دھڑ فوجی ساز و سامان تیار کر رہے ہیں
جبکہ امریکہ سے سول نیوکلیر تعاون معاہدے کے بعد بھارتی سائنس دانوں نے نئے ایٹمی
تجربات کی راہ ہموار کرنے کیلئے یہ شوشہ بھی چھوڑا ہے کہ 1998ء میں کئے گئے ایٹمی
تجربات کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوئے اور این پی ٹی پر دستخطوں کیلئے سلامتی کونسل کی
حالیہ قرارداد کو ماننے سے انکار بھی بھارت کے جارحانہ عزائم کی چغلی کھاتا ہے۔
جبکہ یہ حقیقت بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ بھارت نے کبھی بھی پاکستان کو
ایک آزاد اور خود مختار ملک کے طور پر تسلیم نہیں کیا اور اس نے ہمیشہ پاکستان سے تقسیم
ہند کا بدلہ لینے کی کوشش کی اس مقصد کیلئے اس نے پاکستان کو کمزور اور غیر مستحکم کرنے
کی سازشوں میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اس بین حقیقت کے بعد بھی کیا بھارت سے یہ توقع
کی جا سکتی ہے کہ وہ برابری کی بنیاد پر دو طرفہ خوشگوار تعلقات کے قیام و استحکام کی خاطر
ہمارے ساتھ مذاکرات کی میز پر بیٹھ کر کشمیر سمیت تمام بنیادی تنازعات پر ہم سے
بات چیت پر آمادہ ہوگا جبکہ وہ آج بھی کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ قرار دیتا ہے اور اکی
تان اسی بات پر ٹوٹتی ہے کہ جب تک پاکستان کی جانب سے کشمیر میں دراندازی بند
نہیں ہوتی وہ پاکستان کے ساتھ کسی قسم کے مذاکرات نہیں کر سکتا

خود بھارتی وزیر خارجہ ایس ایم کرشنا بھی یہ بات کہہ چکے ہیں کہ ہم پاکستان کے ساتھ جامع مذاکرات کی بحالی کی ضمانت نہیں دے سکتے انکے بقول مذاکرات کی بحالی سے قبل پاکستان ممبئی حملوں کے ملزمان کو انصاف کے کٹہرے میں لائے، سوال یہ ہے کہ کیا اس پاکستان دشمن بھارتی رویے کی موجودگی میں خطے میں پائیدار قیام امن کی خاطر بھارت کے ساتھ مذاکرات کی میز پر بیٹھا جا سکتا ہے اور کیا بھارت خود ہمارے ساتھ بے لوث مذاکرات پر آمادہ ہو سکتا ہے؟ جبکہ وہ تو ہمیں غیر مستحکم کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اور ماضی کی طرح آج بھی وہ باقی ماندہ پاکستان کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی ہنود و یہود و نصاریٰ کی مذموم منصوبہ بندی پر عمل پیرا ہے۔

اس صورتحال میں جبکہ بھارت موجودہ فضاء کو ہماری سالمیت کیخلاف اپنی مذموم سازشوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کیلئے نادر موقع خیال کر رہا ہے، امریکہ کس خوش فہمی کے تحت پاکستان بھارت دو طرفہ مذاکرات کی بحالی کیلئے اپنا کردار بروئے کار لانے کی خواہش کا اظہار کر رہا ہے جبکہ بھارت خود ہمارے ساتھ مذاکرات کی میز پر بیٹھنے کو تیار نہیں امریکہ نے تو بھارت کو ہمارا دوست ملک قرار دلانے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی اور یہی کوشش ہمارے موجودہ حکمرانوں کی بھی ہے، حقیقت یہ ہے کہ امریکہ کی اس منافقانہ پالیسی کی وجہ سے ہی خطے میں طاقت کا توازن خراب ہوا ہے اور بھارت کو ساٹھ سال کے

بعد امریکہ کا پٹھو بن کر علاقے میں اپنی تھانیداری قائم کرنے اور اپنے توسیع پسندانہ
عزائم کو مزید وسعت دینے کا موقع ملا ہے آج امریکی آشیرباد جدید ایٹمی اسلحہ اور فوجی
تعاون کی بنیاد پر بھارت ہمیں ہڑپ کرنے کی دیرینہ خواہش کو عملی جامہ پہنانے میں
مصروف ہے اور اپنے تربیت یافتہ دہشت گردوں کے ذریعے دہشت گردی کا ملبہ ہم پر
ڈال کر اقوام عالم میں ہمارا تشخص ایک دہشت گرد ملک کے طور پر قائم کرنا چاہتا ہے۔
یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ بھارت ممبئی دھماکوں کے بعد متعدد مرتبہ پاکستان
کے خلاف سرجیکل سٹرائیکس کے ارادے بھی ظاہر کر چکا ہے اور ایک موقع پر بھارتی
وزیر دفاع پاکستان کو سبق سکھانے کی دھمکی بھی دے چکے ہیں، جبکہ گزشتہ روز سیالکوٹ
بارڈر پر بھارتی فوج کی جانب سے پاکستانی فوج پر گولہ باری بھی کی گئی ہے، ایک طرف
جہاں بھارت اپنے جنگی سازوسامان میں اضافہ کر رہا ہے تو دوسری جانب وہ پاکستانی
دریاؤں پر 62 ڈیموں کی تعمیر کا آغاز کرکے آبی دہشت گردی کا مرتکب اور ہماری سونا
اگلنے والی زرخیز دھرتی کو بنجر بنانے اور بے آب وگیاہ چٹیل میدانوں میں تبدیل
کرکے ہمیں بھوکا پیاسا مارنے کی منصوبہ بندی بھی کر چکا ہے، اس بات کے شواہد موجود
ہیں کہ بھارت پاکستان میں قومی نسلی اور لسانی فسادات اور مذہبی منافرت کو بھی ہوا
دے رہا ہے، گزشتہ دنوں یہ اطلاعات بھی منظر عام پر آچکی ہیں کہ بھارت نے

پاکستان کو توانائی اور آبپاشی کے شعبے میں مفلوج اور پاکستانی کی سرسبز و شاداب زرخیز زمین کو بنجر ریگستان میں تبدیل کرنے کیلئے کالاباغ ڈیم کی تعمیر رکوانے کی غرض سے 8 ارب ڈالر کی خطیر رقم بھی خرچ کی ہے۔
بھارت کے یہ تمام پاکستان دشمن اقدامات دراصل ہماری دفاعی صلاحیتوں کو چیلنج اور کھلا اعلان جنگ ہیں، حیرت کی بات ہے کہ یہ بھارتی اقدام عین اس وقت سامنے آیا ہے جب امریکہ خطے میں مستقل قیام امن کی خاطر پاکستان اور بھارت کے مابین جامع مذاکرات کی بحالی کیلئے پاکستانی قوم کو بار بار یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا ہے کہ بھارت پاکستان کا دشمن نہیں، دوست ملک ہے، ایک طرف امریکہ بھارت کو پاکستان کا دوست ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے تو دوسری طرف وہ پاک بھارت سرحدوں پر تعینات پاک افواج کو وہاں سے ہٹوا کر قبائلی علاقوں میں عسکریت پسندوں کے خلاف استعمال کرکے بھارت کو پاکستان کے خلاف واک اوور کا ایڈوانٹیج دینے کیلئے بھی کوشاں ہے، امریکہ کی یہ کوشش اور خواہش دراصل بھارت دوستی اور پاکستانی دشمنی کی واضح مظہر ہے۔
اب جبکہ بھارت نے ہماری سرحد کے قریب مگ 29 لڑاکا طیارے تعینات کرکے واضح طور پر یہ عندیہ دے دیا ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف حتمی جنگی تیاریوں میں مصروف ہے اور چند روز قبل پاک بھارت سرحد پر بھارتی افواج کی جانب سے

پاکستانی چوکی پر فائرنگ اور جھڑپ کے بعد پاکستان کو کسی خوش فہمی کا شکار نہیں رہنا چاہئے، بھارت کی جانب سے ان اشتعال انگیز کاروائیوں کو جارحیت کے ارتکاب کا اعلان سمجھ کر ہمیں امریکہ کو باور کرادینا چاہئے کہ وہ ہمیں بھارت کو دوست سمجھنے کا درس نہ دے، بلکہ ہماری حکومتی سیاسی اور عسکری قیادتوں کو اس مکار دشمن کی ممکنہ جارحیت کا جواب دینے اور اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ توڑنے کی مکمل منصوبہ بندی کرنی چاہئے، کیونکہ ہمارا دشمن اپنی بد خصلتی کے باعث ہماری سالمیت کے خلاف اپنے مکروہ عزائم کو عملی جامہ پہنانے پر تلا بیٹھا ہے، جس طرح ایک کسان کسی جنگلی سانڈ کو اپنی ہری بھری فیصلیں اور کھیتی اجاڑنے کا موقع نہیں دیتا بالکل اسی طرح ہم کسی طور بھی بھارت کو یہ موقع فراہم نہیں کرسکتے کہ وہ اسرائیل امریکہ اور برطانیہ وغیرہ کے ساتھ مل کر ہمارے خلاف سازشوں کے جال بنے۔

یاد رکھیئے کہ بچھو کا کام اور اس کی سرشت ہی ڈنگ مارنا ہے اور بھارت وہ بچھو ہے جس نے جب بھی موقع ملا ہے ہمیں ڈنگ مارا اور نقصان پہنچانے کی کوشش کی، لہٰذا ایسے زہریلے بچھو کو اپنا دوست اور ہمدرد سمجھنا کوتاہ نظری خود فریبی اور خام خیالی ہے حقیقت حال کا تقاضہ یہ ہے کہ سیاسی مصلحت آمیزی کے خول سے باہر نکلا جائے بھارتی دوستی کی آڑ میں پاکستان کے استحکام اور سالمیت کو نقصان پہنچانے کی سازشوں کو سمجھا جائے اور اس کے تدارک کیلئے

منظم حکمت عملی اختیار کی جائے یاد رکھیئے بھارت کے حضور پیشکشوں معاہدوں رعایتوں
مصافحوں معانقوں ملاقاتوں اور مداراتوں کے نذرانے چڑھانے سے کچھ حاصل نہیں
ہوگا بلکہ اس کے سامراجی ذہن برہمنی سوچ اور ہندو مکارانہ کردار کو نکیل ڈالنے کیلئے
طاقتور توانا پر عزم اور دو ٹوک جرات مندانہ موقف اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

وہی حالات ہیں فقیروں کے

غربت، بھوک اور مہنگائی کے ہاتھوں بدحال عوام..... پھر بھی ہے خوشحال پاکستان۔

ہمارے ایک دانشور دوست کا خیال ہے کہ موجودہ زمانہ انسان اور خدا، انسان اور کائنات اور انسان سے انسان کے قدیم ترین رشتوں کو توڑنے کا زمانہ ہے، اُن کا خیال ہے کہ مغربی فکر و فلسفہ اور جدید سائنس نے اُن تمام انسانی رشتوں کو بری طرح توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے جو زمانہ قدیم سے لے کر آج تک انسانی زندگی کی معنویت کا تعین کرتے رہے اور جس کے بغیر انسانی زندگی کا تصور کرنا امر محال رہا ہے، دور جدید میں انسانی رشتوں کی عزت، حرمت، بے قدری اور بے توقیری کو دیکھتے ہوئے اپنے دانشور دوست کی بات سے سو فیصدی متفق ہونے کے باوجود ہمارا خیال یہ ہے کہ دور جدید نے صرف ان رشتوں کو ہی توڑ پھوڑ کر نہیں رکھ دیا بلکہ اِن کے معنی و مفہوم بھی بدل دیئے ہیں، آج انسانی تعلقات اور معیارات کے پیمانے بدل گئے ہیں کل تک انسان کی تمام تر جدوجہد اور سرگرمیوں کا مرکز اُس کے قریبی رشتے، دوست احباب، عزیز و اقارب ہوا کرتے تھے لیکن آج کے جدید سائنسی دور میں انسان کی تمام تر جدوجہد اور سرگرمیوں کا مرکز انسان کی انسان سے محبت اور نفسیاتی و جذباتی وابستگی کے

بجائے معاشی تگ و دو نے لے لی ہے اور اب انسانی رشتوں اور تعلقات کا پیمانہ بہتر معاشی آسودگی اور اعلیٰ اسٹیٹس کے گرد گھومتا ہے۔

گویا معاشی آسودگی کے حصول نے انسانی زندگی کے اُس نظام کو جو محبت، رواداری اور اپنائیت کے جذبوں اور ایک دوسرے کے احساسات کے گرد گھومتا تھا کو بری طرح مسخ کردیا، اور آج یہ حال ہوگیا کہ اگر آپ معاشی طور پر مستحکم اور آسودہ ہیں تو آپ کے گرد دوست احباب اور رشتے داروں کا ہجوم عام سی بات ہے لیکن اگر آپ کی مالی حالت اور معاشی پوزیشن اچھی نہیں تو دوست احباب تو کجا سگے رشتے دار بھی آپ کو پہچاننے سے انکار کردیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں اپنی قومی زندگی میں معاشرتی بے حسی اور سنگدلی کے یہ خوفناک مناظر جگہ جگہ بکھرے نظر آتے ہیں، کہیں بھوک، افلاس اور تنگدستی ہاتھوں مجبور باپ شفقت پدری کو مار کر اپنے تین ماہ کے بچے کو پانچ ہزار روپے میں بیچ دیتا ہے تو کہیں زرینہ جیسی ماں اپنی ماں کا گلا گھونٹ کر اپنے پانچ جگر کے ٹکڑوں کو بیچنے کیلئے بازار میں لے آتی ہے، کہیں بشریٰ اپنے دو معصوم بچوں کے ساتھ ٹرین کے نیچے آکر غربت، بھوک اور تنگدستی کے ہاتھوں تنگ آکر زندگی کی بازی ہار دیتی ہے، کہیں یاسمین اپنے تین بیٹیوں 12 سالہ فائزہ، 9 سالہ ایشا، 7 سالہ جمیلہ اور 10 سالہ بیٹے عدنان کو، گل تاج بی بی اپنی دو بیٹوں 8 سالہ عرفان اور 5 سالہ عثمان کو اور رخسانہ اپنے دو بچوں 5 سالہ وردہ اور

سالہ نمرہ کو غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کراچی کے ایدھی ہوم میں جمع کرانے پہنچ 6 جاتی ہیں اور کہیں رضوان نامی غریب باپ سوکھے کی بیماری کا شکار اپنی پانچ سالہ بچی انعم کو کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیتا ہے۔

غربت، بھوک اور تنگدستی کے ہاتھوں مجبور ہو کر ملتان کی رہائشی خاتون زرینہ کا برائے فروخت کا بورڈ لگا کر کمہارانوالہ چوک پر اپنے چار بچوں کو فروخت کرنے کیلئے کھڑا کر دینا ہو یا لاہور میں سیون اپ اسٹاپ پر اپنے دو بچوں سمیت خودکشی کرنے والی بشریٰ بی بی کی دردناک موت ہو یا کراچی کی رہائشی یاسمین، گل تاج بی بی اور رخسانہ کا اپنے 8 بچوں کو ایدھی ہوم کے حوالے کرنا ہو، یا رضوان کا اپنی بچی کو کوڑے کے ڈھیر پر پھیکنا ہو، اہل وطن کیلئے یہ سب خبریں ہرگز نئی نہیں ہیں، روزانہ نامعلوم کتنے لوگ مفلسی اور بھوک سے تنگ آ کر اپنے اعضاء بیچے، کتنی مائیں اپنے جگر کے ٹکڑوں کو فروخت کرنے پر مجبور ہیں، اور کتنی بشرائیں ہیں جو پانچ سالہ زبیر اور تین سالہ معصوم صائمہ کے ساتھ بھوک اور افلاس کے ہاتھوں تنگ آ کر زندگی کی بازی ہار رہی ہیں، کتنے رضوان اور کتنی یاسمین، گل تاج اور رخسانہ بی بی ہیں جو اپنے جگر کے ٹکڑوں کو ایدھی ہوم میں جمع کرانے یا کوڑے کے ڈھیر پر پھینکنے پر مجبور ہیں۔

لیکن ارباب اقتدار اصل وجہ جاننے کے باوجود بھی اِس قسم کے واقعات کی روک تھام، اُس کے تدارک اور کوئی مستقل حل تلاش کرنے سے معذور ہیں۔ روزمرہ زندگی میں پے درپے پیش آنے والے اِس قسم کے واقعات اور حالات کا جائزہ لینے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے جس طرح زرینہ کا اپنے بچوں کو فروخت کرنے کا اعلان ہمارے معاشرے میں کوئی پہلا اعلان نہیں تھا۔ بالکل اُسی طرح بشریٰ بی بی کی اپنے معصوم بچوں سمیت المناک موت، رضوان کا اپنی بچی کو پھینکنا اور یاسمین، گل تاج بی بی اور رخسانہ کا اپنے بچوں کو ایدھی ہوم کے حوالے کرنا ہمارے گلے سڑے معاشرے کا کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے بلکہ اس طرح کے واقعات تو اب ہماری روز مرہ زندگی کا معمول بن چکے ہیں۔

اِس وقت صورتحال یہ ہے کہ ملک میں غربت کی شرح ستر فیصد سے تجاوز کرچکی ہے اور پانچ کروڑ سے زائد افراد غربت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ بیروزگاری میں 8 % سالانہ کے حساب سے اضافہ ہورہا ہے۔ مجموعی شہری آبادی کا پانچواں حصہ غریبی کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے، ہر سال ملک میں 50 لاکھ بیروزگاروں کا اضافہ ہورہا ہے۔ ملک کی 70% آبادی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار کر جسم وجاں کے رشتے کو باقی رکھتے ہوئے زندگی گزارنے کی کوشش کررہی ہے۔ پاکستان کے کل آباد رقبے کی 55 فیصد کچی آبادیاں زندگی کی بنیادی سہولیات سے محروم ہیں۔ ملک کی 60 فیصد آبادی کو پینے کا صاف پانی اور دیگر بنیادی سہولتیں میسر نہیں

ہیں، ملک کی نصف سے زائد آبادی ناخواندگی کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی ہے، غربت و افلاس اس حد تک قحط کی صورت اختیار کر گئی ہے کہ غریب عوام کیلئے دو وقت کی روٹی کا حصول ناممکن ہوگیا ہے، لوگ بے روزگاری کے ہاتھوں مجبور ہو کر خود کشی کر رہے ہیں۔

غربت و محرومی کی یہ داستان بڑی طویل ہے لیکن ان تلخ حقائق کے باوجود اِس غریب ملک کے حکمرانوں کے اللّے تللّے اور شاہ خرچیوں کا یہ عالم ہے کہ ملک کے صرف ایک صوبے کا وزیر اعلیٰ سیکریٹریٹ 17.5 کنال پر محیط ہے، جس کی تزئین و آرائش اور تعمیر نو پر سابقہ حکومت نے اربوں روپے خرچ کیے گئے، اس دور میں ایوان صدر کے انتظام اور رکھ رکھاؤ کے اخراجات 29 کروڑ اور ایوان صدر کے باغات کی دیکھ بھال کا بجٹ 70 لاکھ روپے سالانہ تھے، اسی طرح سابقہ دور میں وزیر اعظم ہاؤس کا سالانہ خرچ 53 کروڑ 87 لاکھ روپے تھا، وزراء کی فوج ظفر موج کیلئے کیبنٹ ڈویژن کے بجٹ میں 14 کروڑ روپے اور خفیہ فنڈ کی مد میں 40 لاکھ روپے رکھے جاتے ہیں، حکمرانوں کے بیرونی سفر بھی اس غریب ملک کے محدود وسائل کے بدترین استعمال کی شرمناک مثال ہیں، سابقہ دور میں ایک ایک سفر میں پانچ پانچ دس دس نہیں 60،60 شرکاء سفر کا باقاعدہ اہتمام کیا جاتا رہا، اور کوئی مہینہ ایسا نہیں گزرا جب صدر یا وزیر اعظم نے کسی بیرونی ملک کا رخت سفر نہ باندھا ہو، قومی خزانے پر اِن دوروں سے پڑنے والے مالی بوجھ

کا اندازہ صرف صدر، وزیر اعظم اور اُن کے ہمراہ جانے والے افراد کی مد میں کئی ارب روپے سے زیادہ لگایا گیا، جبکہ صدر، وزیر اعظم، وزرائے کرام، ارکان پارلیمنٹ اور اعلیٰ سرکاری حکام کے سالانہ دوروں پر مجموعی اخراجات کا تخمینہ 4 ارب روپے سے زیادہ بیان کیا جاتا ہے۔

بد قسمتی سے جو حال کل تھا وہی منظر آج بھی ہے، کردار ضرور بدل گئے لیکن منظر نہیں بدلا، جس ملک کے عام شہری کو سائیکل، موٹر سائیکل یا اچھی ٹرانسپورٹ میسر نہیں اس ملک کے حکمرانوں کیلئے قیمتی ہوائی جہاز اور لگژری کاریں، جیپیں اور مرسڈیز بینز گاڑیاں منگوائی جائیں، زندہ معاشروں اور قوموں میں مضبوط قانون اور بلند اخلاقی سطح کے ہوتے ہوئے کبھی بھی کسی بھی حکمران کو اِس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ چیف منسٹر ہاؤس، ایوان صدر، اور ایوان وزیر اعظم کی دیکھ بھال، مہمانوں کی تواضع اور دیگر لوازمات اور وزراء و مشیروں کی فوج ظفر موج کے ساتھ بیرون ملک دوروں پر ملک و قوم کی خطیر رقم خرچ کریں اور مراعات و آسائش کے حصول کیلئے اپنی مرضی و منشا کا قانون بنائیں، عوام کے خادم اور غلام ہونے کے بجائے عوام کو اپنا خادم اور غلام سمجھیں، اور اُن کی طرز زندگی مفلوک الحال عوام کے برعکس عیش و عشرت، خود غرضی اور ذاتی نمود و نمائش کی آئینہ دار ہو، قوم نے دیکھا کہ حکمرانوں کے ایوانوں کی دیواریں بلند تر ہوتی گئیں لیکن غربت و افلاس کی

ماری عوام کو پیٹ بھر روٹی، پینے کا صاف پانی اور دیگر بنیادی سہولتیں تک میسر نہیں ہوئیں۔

جبکہ ہر دور میں ارباب اقتدار کے دستر خوان انواع اقسام کے کھانوں اور مرغِ مسلم سے سجے رہے، غریب کو کفن کیلئے کپڑا نصیب نہیں تھا لیکن حکمرانوں کو خیر مقدمی بینر کیلئے ہمیشہ ریشمی کپڑوں کے تھانوں کے تھان دستیاب رہے،اِس وقت ایک عام آدمی بھوک، افلاس اور مہنگائی کے جس خوفناک صحرا میں کھڑا ہے اُس کی ایسی کوئی دیوار نہیں جس سے وہ سر ٹکرا ٹکرا کر مرجائے، جس قبر نما گھر میں وہ رہتا ہے اس میں پاؤں پھیلانے کی صورت میں گھر کا حدود اربعہ ختم ہوجاتا ہے، روز بروز بڑھتی ہوئی مہنگائی کے اِس دور میں عام آدمی کو اپنے خانگی اور معاشی مسائل سے نبرد آزماء ہونے کیلئے کم ازکم 25 ہزار روپے ماہانہ درکار ہیں، جبکہ حکومت کم از کم تنخواہ چھ ہزار روپے مقرر کرکے سمجھتی ہے کہ اس نے ہر عام آدمی کے تمام مسائل حل کردیئے ہیں۔

اِس بات میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں کہ اِس نظام زر کے ناخداؤں اور ملک کے فرمانرواؤں کا ایک ایک ڈرائنگ روم اور اُس میں سجے ہوئے نوادرات اور نمائشی ظروف اس ملک کے ہزاروں عام آدمی کے مکانات سمیت مجموعی اثاثے سے کہیں زیادہ قیمتی ہیں، جناب صدر محترم اور محترم وزیر اعظم صاحب گستاخی معاف ایسے میں

لوگوں کو صرف وعدوں سے بہلانا، تقریروں سے جھوٹی تسلی دینا اور صبر کی تلقین کے ذریعے اپنا ہم خیال بنا لینا ممکن نہیں رہا ہے، عوام اب باشعور ہو چکے ہیں اور اپنے ارد گرد کے حالات پر نظر رکھتے ہیں، آج ہر آدمی اپنے شکم کی آگ بجھانے اور زندگی کی ڈور کا سرا تھامے رکھنے کی تگ و دو میں بری طرح مصروف ہے، اِس وقت مہنگائی، غربت، بے روزگاری، اور بھوک و افلاس نے عوام کو زندہ درگور کر دیا ہے جس کا زندہ ثبوت غربت اور مہنگائی کے ہاتھوں مجبور ہو کر ماؤں کا اپنے بچوں کا بیچنا، معصوم بچوں سمیت خود کشی کرنا یا ایدھی ہوم کے حوالے کرنا بھی ہے۔

معاشرے میں غربت و مہنگائی اور فاقہ کشی کے ہاتھوں موت جیسے سانحات کا جنم لینا سابقہ حکومت کی اُس آٹھ سالہ خوشحال ٹریکل ڈاؤن پالیسی کا اعادہ ہے جس کے ثمرات کا نتیجہ کراچی تا خیبر تک بچوں کی خرید و فروخت، موت، کچرا خانوں پر پھینکنے اور یتم خانوں کے حوالے کرنے کی شکل میں بکھرا ہوا ہے، گو کہ موجودہ حالات میں کچھ مخیّر حضرات اور مختلف سیاسی تنظیموں کی جانب سے ان خاندانوں کی امداد کا اعلان یقیناً ایک اچھا قدم ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا غربت و افلاس کی ماری ہر ماں کو اپنے لختِ جگر بیچ کر، موت کی وادی سے گزار کر، کوڑے کے ڈھیر پر پھینک کر یا خیراتی اداروں میں داخل کرا کے اربابِ اقتدار کی توجہ حاصل کرنا ہو گی؟

جناب صدر محترم اور وزیر اعظم صاحب یہ سارے واقعات آپ کی حکومت کیلئے ایک تازیانہ عبرت ہیں اور آپ کو فی الفور اِس کے اسباب و محرکات کے تدارک اور سابقہ حکومت کی غریب کُش پالیسیوں کو جاری رکھنے پر نظر ثانی کی دعوت دے کر لایعنی دعوؤں کے بجائے زمینی اور معروضی حقائق پر توجہ دینے کا تقاضا کر رہے ہیں، موجودہ حالات میں عوام یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ جب تک حکمران آمد و خرچ میں توازن پیدا نہیں کرتے، مجموعی قومی وسائل کی روشنی میں کاروبار حکومت ترتیب نہیں دیتے اور وسائل و مسائل کے فرق کو مٹا کر ایک ایسا اعتدال پسند معاشرہ تشکیل نہیں دیتے، جس میں حکمرانوں کی آسائشوں سے زیادہ عوام کی خواہشات کا احترام اور عکس نمایاں ہو، اُس وقت تک کوئی بھی سیاسی جماعت اور حکومت ملک سے غربت اور بھوک و افلاس کا خاتمہ کر کے سترہ کروڑ عوام کی تقدیر نہیں بدل سکتی۔

آؤ پھر سے غلام بن جائیں

شرمناک ذلت آمیز شرائط کے ساتھ تاریخی دستاویز۔۔۔۔

کیری لوگر بل، وضاحتی بیان کا ناٹک ..... کھلا دھوکہ اور مذاق

ایک دانشور دوست کا خیال ہے کہ "جب حکمرانوں کو حالات و واقعات اور مستقبل میں لاحق اندیشوں، خدشات اور خطرات کو اپنے حقیقی خدوخال کے بجائے، اپنی تن آسانی، عیش و عشرت اور خواہشات کے سانچے میں ڈھال کر دیکھنے کا مرض لاحق ہوجائے تو ملک و قوم کے مستقبل پر منڈلاتے چیختے چلاتے اور چنگاڑتے خطرات بھی اپنا وجود کھو بیٹھتے ہیں، ایسی حالت میں فہم و ادراک اور احساس زیاں کے تمام دروازے بند ہوجاتے ہیں، نہ تو آنے والے موسموں کا سراغ ملتا ہے، نہ ہی خزاں رتوں کی پہچان باقی رہتی ہے اور نہ ہی خنک و خشک ہوائیں بہار موسموں کی خوشبو اور نرمی و لطافت کا احساس باقی رہنے دیتی ہیں اور جب یہ مرض شدت اختیار کرجائے تو بہار و خزاں کی تمیز اور دھوپ و چاندنی کا فرق بھی جاتا رہتا ہے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم، ارادوں کو کمزور، اعصاب کو شل اور عزائم کو مضمحل کردینے والی یہی بیماری اس وقت ہمارے حکمرانوں کے دل و دماغ میں گھر کرچکی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قوموں کے معاملات کی صورت گری کرنے والے رہبر و رہنما اور حکمران بھی جب حالات و واقعات کا درست تجزیہ نہ کر سکیں اور ان کی نگاہ بصیرت صحیح تناظر میں جائزہ لینے کے بجائے دل میں چھپی آرزوں، امنگوں اور تمناؤں کے دریچے کھول بیٹھے یا دستر خوانی قبیلے کے خوشہ چینوں اور فکر اغیار کے اسیر غلاموں کی بصارت و بصیرت پر بھروسہ کرنے لگیں تو اچھی بھلی باوقار اور غیرت مند قوم بھی مصائب و آلام اور آزمائش و ابتلاء کا شکار ہو جاتی ہے اور راستے اور منزل کے واضح تعین کا زاد راہ اور زاد سفر رکھنے والے قافلے بھی خود فریبی اور خوش فہمی کی غلام گردشوں میں بھٹک جاتے ہیں۔

نائن الیون کے بعد پتھر کے زمانے میں جانے کے خوف سے خود سپردگی اور غلامی کے اندھے اور تاریک راستوں پر شروع ہونے والا سفر آج بھی پورے زور و شور سے جاری ہے اور ہمارا قافلہ فہم و ادراک سے محروم اور بے شعوری کی انہی غلام گردشوں میں بھٹک رہا ہے، وہی بساط ہے وہی بازیگر ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ ہمارے اقتدار کی بساط پر مہرے بدل گئے ہیں، اس وقت صورتحال یہ ہے کہ شرمناک اور ذلت آمیز شرائط پر مبنی غلامی کی نئی دستاویز "کیری لوگر بل" پر عوام، میڈیا اور مسلح افواج کے شدید تحفظات اور اعتراضات کے باوجود امریکی صدر بارک اوباما کے دستخط ہو چکے ہیں اور اب وہ ایک قانون بن چکا ہے۔

گو کہ متنازعہ اور توہین آمیز شرائط پر مبنی بل کی منظوری کے خلاف ملک میں اٹھنے والے احتجاجی طوفان اور فوج کے شدید تحفظات نے امریکہ کو دفاعی پوزیشن پر دھکیل دیا تھا اور خود پاکستانی حکومت نے بھی بل کے خلاف ممکنہ رد عمل سے بچنے کیلئے اپنے وزیر خارجہ کو امریکہ دوڑایا تھا، لیکن بل کے محرک امریکی سینیٹر جان کیری اور ایوان نمائندگان کی امور خارجہ کمیٹی کے سربراہ ہاورڈ برمین نے بل میں کسی تبدیلی سے صاف انکار کرتے ہوئے ایک ایسا وضاحتی بیان جاری کیا، جس کی اپنی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے، رہ گئی اخلاقی حیثیت تو وہ بھی مکمل طور پر امریکی صوابدید اور اُس کی اُس نیک نیتی پر منحصر ہے جس کے معنی دور جدید کی امریکی لغت میں کچھ اور ہی ہیں۔

یہ بالکل ایسا ہی جیسے آپ کسی کو گولی مارتے ہوئے کہیں کہ ہم آپ کو بڑی نیک نیتی کے ساتھ گولی مار رہے ہیں، کیونکہ ہمارا ارادہ آپ کو مارنے یا نقصان پہنچانے کا قطعاً نہیں ہے اور نہ ہی ہم یہ گولی آپ کو آپ کی اجازت سے مار رہے ہیں، کیونکہ گولی مارنے کا فیصلہ، وقت اور نشانے کی جگہ کا انتخاب اور اختیار ہمارا ہے آپ کا نہیں، ہم جب چاہیں گے، جہاں چاہیں گے اور جیسے چاہیں گے آپ کو مارنے اور نقصان پہنچانے کے ارادے کے بغیر پوری نیک نیتی کے ساتھ گولی ماریں گے، درحقیقت یہ اس امریکی وضاحت کا مطلب ہے جو اب کیری لوگر بل

کے ساتھ منظور کر دی گئی ہے اور جسے ہمارے وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی "تاریخی دستاویز" سے تعبیر کر رہے ہیں، جبکہ اراکین کانگریس کے وضاحتی بیانات پر مشتمل اس قسم کی متعدد غیر اہم مگر بقول شاہ صاحب "تاریخی دستاویز" پہلے ہی امریکی کانگریس کے بے عمل ریکارڈ کا حصہ ہیں۔

گو کہ امریکی سینٹ اور کانگریس کے مشترکہ وضاحتی بیان میں یہ یقین دلانے اور دھوکہ دینے کی پوری کوشش کی ہے کہ کیری لوگر بل سے پاکستان کی خودمختاری پر کوئی حرف نہیں آئے گا، بل میں پاک فوج کے اندرونی معاملات پر یا ترقیوں پر اثرانداز ہونے کی کوئی شرط شامل نہیں ہے، بل کی شرائط پاکستان پر عائد نہیں ہوتیں، یہ تمام شرائط امریکی انتظامیہ کیلئے ہیں، پاکستان کیری لوگر بل کے اندر درج شقیں ماننے کا پابند نہیں، بل میں ایسی کوئی شرط نہیں کہ امریکہ حکومت پاکستان یا پاکستانی فوج کے کاموں یا اندرونی معاملات میں کوئی مداخلت کرے، بل کا مقصد صرف پاکستان کی جمہوری حکومت اور جمہوری اداروں کو مضبوط کرنا ہے، امریکہ پاکستان کی آزادی، جمہوریت اور خودمختاری کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور پاکستان کیساتھ دیرینہ دوستانہ تعلقات کا خواہاں ہے۔

لیکن اس وضاحتی بیان میں اس متنازعہ شق جس میں پاکستانی مسلح افواج کی

ترقیوں اور فوجی منصوبہ بندی پر سویلین کنٹرول پر زور دیا گیا تھا، کو شاطرانہ مہارت کے ساتھ نظرانداز کرتے ہوئے یہ کہہ کر دھوکہ دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ امریکہ پاکستان کے داخلی معاملات، بشمول فوجی افسروں کی ترقی اور پاک فوج کے داخلی آپریشن کے معاملات میں کوئی رول ادا کرنے کا ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتا ہے اور نہ ہی اس بل میں کہا گیا ہے، جبکہ وضاحتی بیان میں جوہری پھیلاؤ میں ملوث کسی بھی پاکستانی سے پوچھ گچھ یا اس تک رسائی کی شق کو پاکستان اور امریکہ کی طرف سے جوہری پھیلاؤ کی روک تھام میں جاری جدوجہد اور باہمی تعاون کی ایک نئی شق سے بدل دیا گیا ہے،
اگرچہ وضاحتی بیان میں یہ بھی نہیں کہا گیا ہے کہ سول انتظامیہ اور پارلیمنٹ کو فوج کے حوالے سے کنٹرول حاصل ہوگا اور فوج سول انتظامیہ میں مداخلت نہیں کرے گی اور یہ کہ پاکستان کیری لوگر بل کے اندر درج شقوں کا کتنا پابند ہے اور کتنا نہیں، اس کی حقیقت ہم اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔
اگرچہ پاکستانی فوجی قیادت اور سیاسی اور عوامی حلقوں نے کیری لوگر بل کی جن شرائط پر اعتراض کیا تھا کو تبدیل نہیں کیا گیا ہے اور نہ ہی امریکی قاعدے اور قانون کے مطابق اس میں فوری طور پر کوئی تبدیلی ممکن تھی، چنانچہ امریکی انتظامیہ نے شاہ محمود قریشی صاحب کو بل کی نیک نیتی کے بارے میں سینیٹ اور ایوان نمائندگان کا ایک مشترکہ وضاحتی بیان کا تحفہ تھما کر

اسلام آباد روانہ کردیا ہے، ہوسکتا ہے کہ ہماری حکومت اور اس کے اتحادیوں کے نزدیک یہ وضاحتی بیان پاکستانی عوام، میڈیا اور مسلح افواج کے تمام اندیشوں، خدشات اور ملک و قوم کے مستقبل پر منڈلاتے خطرات کو دور کرنے کا یقینی اور کارگر نسخہ ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ امریکہ کیری لوگر بل کے ذریعے پاکستان کے جوہری صلاحیت اور ایٹمی اثاثوں پر مکمل کنٹرول حاصل کرنا چاہتا ہے، جبکہ دوسری طرف ہمارے حکمران اپنی آزادی اور خود مختاری کی قیمت پر بھی یہ امداد حاصل کرنے کیلئے بے تاب ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ جب پوری قوم نے کیری لوگر بل کی ذلت آمیز شرائط کو قبول کرنے سے انکار کردیا تو ایک وضاحتی بیان کا ناٹک رچایا گیا یہ بیان اس بل کی تیاری میں شامل جان کیری کے اس اعلان کے ساتھ جاری کیا گیا کہ کانگریس بل منظور کرچکی ہے لہٰذا بل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی لیکن اس کے باوجود ہمارے وزیر خارجہ اس وضاحتی بیان کو پاکستان کی شاندار کامیابی قرار دے رہے ہیں اور اسے ایک تاریخی دستاویز گردانتے ہوئے قانون اور کیری لوگر بل کا حصہ سمجھ رہے ہیں، ان کا دعویٰ ہے کہ اس وضاحتی بیان کے بعد کیری لوگر بل سے پاکستان کی خود مختاری کے بارے میں لاحق اندیشے ختم ہوگئے ہیں اور ثابت ہوگیا ہے کہ حکومت پاکستان کی خود مختاری پر کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں ہے۔

مقام حیرت ہے کہ عوام، میڈیا اور فوج کے شدید احتجاج کے بعد کل تک جس کیری لوگر بل کے بارے میں حکومت اور پارلیمنٹ کا اس بات پر اتفاق تھا کہ یہ بل پاکستان کے اندورنی معاملات میں مداخلت کے مترادف ہے، آج اس بل کے متن میں ایک شوشے کی تبدیلی کے بغیر محض ایک ایسے وضاحتی بیان جس کی اپنی کوئی قانونی اور اخلاقی حیثیت نہیں، سے کیسے صورتحال تبدیل ہو سکتی ہے، جب تک کہ اس بل کے متن میں کوئی تبدیلی نہیں لائی جائے اور قابل اعتراض شقوں کو حذف نہ کیا جائے، اس وقت تک یہ دعویٰ کیسے درست ثابت ہوسکتا ہے کہ ہماری قومی خود مختاری اور سالمیت پر کوئی آنچ نہیں آئے گی، چنانچہ ایسی صورت میں اس وضاحتی بیان کو ایک کھلے فریب کے سوااور کیا نام دیا جاسکتا ہے۔

یہ خوش فہمی اور خود فریبی نہیں تو اور کیا ہے کہ پاکستان کے ہی نہیں خود امریکی مبصرین بھی کیری لوگر بل کے سلسلے میں وضاحتی بیان کو ایک رسمی کاروائی سمجھتے ہیں، جس کے تحت قابل اعتراض شرائط کو ختم کرنے کے بجائے یہ کہہ کر برقرار رکھا گیا ہے کہ ان کی صحیح تشریح نہیں ہو سکی، جبکہ خود امریکی نمائندوں کے مطابق کانگریس کے وضاحتی بیان کا مقصد بل کی درست تعبیر و تشریح اور اس پر اس کی روح کے مطابق عمل درآمد ہے، دراصل یہی وہ عوامل ہیں جس کی وجہ سے مسلم لیگ (ن) اس بل کو مسترد کرچکی ہے، آفتاب شیرپاؤ

سمیت خود حکومت کے کئی اتحادی اپنے تحفظات کو اظہار کر رہے ہیں اور خود پاکستانی قوم کسی طور بھی اس فریب کو حقیقت تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔

لیکن اس کے باوجود حکومت امریکی وضاحت کے میٹھے ملمع میں لپٹی کیری لوگر بل کی ذلت آمیز شرائط کو قبول کرنے کا فیصلہ کرچکی ہے، حکومت کا یہ سمجھنا کہ اس وضاحتی بیان سے پاکستان مخالف قابل اعتراض شرائط کو غیر مؤثر بنا دیا گیا ہے اور یہ کہ اس وضاحتی بیان کو کیری لوگر بل کا حصہ اور قانون کا درجہ حاصل ہوچکا ہے، خوش فہمی اور خود فریبی نہیں تو اور کیا ہے، یوں لگتا ہے کہ فہم وادراک اور احساس زیاں کے سارے دروازے بند ہوچکے ہیں، کمزور ارادوں، شل اعصاب اور مضمحل عزائم نے دل و دماغ مقفل کردیئے ہیں، فکری بانجھ پن کی یہی وہ بیماری ہے جس کا شکار آج ہماری قیادت نظر آتی ہے، درحقیقت یہی وہ عذاب ہے جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ" جب اللہ کسی قوم پر عذاب نازل کرتا ہے تو اس کا تدبر چھین لیتا ہے۔" اور جب فہم وتدبر اور فکر شعور چھن جائے تو پھر قوموں کے مقدر میں محکومی اور غلامی لکھ دی جاتی ہے۔

آؤ پھر سے غلام بن جائیں۔۔۔۔۔ ریاست انکل سام بن جائیں

تھام کر دامنِ اوباما کو۔۔۔۔۔غلامِ عالی مقام بن جائیں

امریکی امداد" تحفہ " نہیں ہے

امریکی وضاحت کی ایک اور نئی وضاحت ذلتوں اور رسوائیوں کی داستان
کیا جادو تھا جو سر چڑھ کر بول رہا تھا، وزیر محترم کا چہرہ جوش خطابت سے تمتما رہا تھا،
سینیٹر جان کیری اور ہاورڈ.برمن کے دستخطوں سے جاری ایک سیاسی بیان کے وہ وہ نقطے
بیان ہو رہے تھے اور وہ وہ توضیحات پیش کی جارہی تھیں کہ جو خود امریکیوں کے بھی
وہم و گمان میں نہ ہوں گی، حکومتی ارکان عش عش کر رہے تھے، خوشی میں سر دھن
رہے تھے اور بے تابانہ انداز میں ڈیسکیں بجارہے تھے، جبکہ محترم وزیر خارجہ شاہ
محمود قریشی صاحب کیری لوگر بل پر بحث سمیٹتے ہوئے وضاحتی بیان کی کاپی لہرا لہرا کر
ارکین اسمبلی کو بتارہے تھے کہ ہم نے امریکہ کو بتا دیا ہے کہ وہ اپنے طور طریقے بدلے
کیونکہ آج پاکستان ایک جمہوری ملک ہے اور ہم سب پارلیمنٹ کو جوابدہ ہیں، کیری
لوگر بل پر خدشات دور ہوگئے ہیں، امریکہ پاکستان کے معاملات میں مداخلت نہیں
کرے گا، موصوف فرمارہے تھے کہ امریکہ نے کیری لوگر بل میں عائد شرائط کے
بارے میں خدشات دور کرتے ہوئے پاکستان کے معاملات میں مداخلت نہ کرنے کا
یقین دلایا ہے۔

وزیر موصوف نے وضاحتی بیان کی کاپی لہراتے ہوئے کہا، یہ وضاحتی بیان کیری لوگر بل کے ساتھ منسلک ہے، جو اب قانون بن چکا ہے، اس میں واضح طور پر لکھا ہے کہ امریکہ پاکستان میں فوجی اور سویلین آپریشن کی مائیکرو مینجمنٹ نہیں کرے گا اور اس بل سے پاکستان کی خود مختاری، سلامتی اور جوہری پروگرام پر کوئی حرف نہیں آئے گا، اس قانون کے عوض ہم نے پاکستان کی خود مختاری اور سلامتی پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا، ان کے بقول کیری لوگر بل میں پاکستانی حکومت پر کوئی شرائط عائد نہیں کی گئیں، بلکہ اس قانون کے تحت پاکستان کو دی جانے والی امداد کے بارے میں امریکی حکومت، امریکی کانگریس کے روبرو جوابدہ ہوگی جبکہ یہ امداد سکولوں، صحت، سڑکوں، جیسے ترقیاتی کاموں کے انفراسٹرکچر اور غربت کے خاتمہ کیلئے بروئے کار لائی جائیگی جو پاکستان کے کسی مخصوص علاقے میں نہیں بلکہ پورے ملک میں استعمال ہو گی، وزیر خارجہ کے لبوں سے نکلتے ہوئے تند تیز الفاظوں کے تھپیڑے اور منہ زور طوفانی لہروں کے آگے ساکت وجامد، بے بس اور مبہوت تماشائی بنی اپوزیشن اُس وقت جاگی جب ڈپٹی اسپیکر نے اسمبلی اجلاس غیر معینہ مدت کیلئے ملتوی کرنے کا اعلان کیا، یہی حال سینٹ کا تھا، پوری قوم دانتوں میں انگلی دابے حیران وپریشان کھڑی سوچ رہی تھی کہ کہاں ہے اُس کی Supermacy اور Sovereignty امنگوں کی ترجمان، وہ پارلیمنٹ، جس کی دعوے کئے جاتے ہیں اور جس نے قومی جذبات کی

ترجمانی کرتے ہوئے لوگربل پر حتمی فیصلہ دینا تھا، مگر نہ تو کوئی قرار داد پیش ہوئی اور نہ ہی کوئی رائے شماری کرائی گئی بلکہ وزیر موصوف کی تقریر سے سرشار اپوزیشن شیم شیم اور کیری لوگربل نا منظور، نامنظور کے نعرے لگاتی سر جھکائے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئی۔

حقیقت یہی ہے اور صدیوں کا تجربہ اور دانشوری بھی کہتی ہے کہ ہے فکرِ اغیار کے اسیر اور بیرونی امداد کی آکسیجن کے سہارے زندہ رہنے والے کاسہ لیسوں کے رنگ ڈھنگ اور انداز ایسے ہی ہوتے ہیں، جب خوئے غلامی انسان کے رگ و پے میں سرایت کر جائے اور بیرونی امداد کا نشہ انسان کے دل و دماغ پر چھا جائے تو تائید و حمایت کا جادو سر چڑھ کر ہی بولتا ہے، قومی غیرت و حمیت، سلامتی و خود مختاری کے لٹنے کا احساس زیاں جاتا رہتا ہے، نہ ماتھے پر ندامت کا پسینہ ہوتا ہے اور نہ ہی چہرے پر شرمندگی کے آثار نظر آتے ہیں، بلکہ کمال ڈھٹائی سے قوم کی آنکھوں میں دھول جھونکنے اور دھوکہ دینے کیلئے غلامی کی دستاویز کو ترقی و خوشحالی کا منبع قرار دیتے ہوئے تعریف و توصیف کے ڈونگرے برسائے جاتے ہیں، وہ وہ معنی و مطلب کشید کئے جاتے ہیں کہ خود اس دستاویز کے خالق حیران و ششدر رہ جاتے ہیں اور ایوان نمائندگان و سینیٹ کی امور خارجہ کمیٹیوں کے ترجمان مسزلن وائل اور فریڈ جونز امریکی وضاحت کی ایک اور نئی وضاحت جاری کرتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ "کیری لوگربل

اپنی تمام تر متن، شقوں اور شرائط کے ساتھ مسلمہ امریکی قانون کا درجہ رکھتا ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے، وضاحتی بیان محض تشریح ہے جسے قانون کا حصہ نہیں سمجھنا چاہیے۔"

یہی وہ بات ہے جو امریکی نمائندگان پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ کانگریس کے وضاحتی بیان کا مقصد بل کی درست تعبیر و تشریح اور اُس پر اُس کی روح کے مطابق عمل درآمد ہے، جبکہ امریکی مبصرین کے نزدیک بھی کیری لوگر بل کے سلسلے میں وضاحتی بیان ایک ایسی رسمی کاروائی ہے جس کے تحت قابل اعتراض شرائط کو ختم کرنے کے بجائے یہ کہہ کر برقرار رکھا گیا ہے کہ ان کی صحیح تشریح نہیں ہو سکی، لیکن امریکی وضاحت کی وضاحت کے بعد بھی وزیر خارجہ کا کیری لوگر بل کو تاریخی دستاویز اور پاکستان کی ترقی و خوشحالی کیلئے ضروری قرار دینا حیرت ناک بات ہے، یہی وہ خوش فہمی اور خود فریبی کی اسیری ہے جس میں مبتلا ہمارے ارباب اقتدار اپنی قوم کو آرزوؤں اور تمناؤں کے کبھی نہ ختم ہونے والے سرابوں میں دھکیل کر امریکی غلامی کی راہ ہموار کر رہے ہیں۔

جبکہ کیری لوگر بل کے ساتھ شامل کیے گئے وضاحتی بیان کی وضاحت سے یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آگئی ہے کہ اس بل میں عائد شرائط کے اثرات ختم یا کم نہیں ہوئے، خود امریکی خارجہ امور کمیٹی کے بقول متذکرہ وضاحتی بیان کیری

لوگر قانون کا حصہ نہیں ہے، جبکہ ہمارے سینئر سرکاری عہدیداران، قانونی و آئینی ماہرین، سابق سفارت کاروں اور میڈیا کی جانب سے بھی اسی رائے کا اظہار کر کیا جارہا ہے کہ وضاحتی بیان کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے اور نہ ہی متذکرہ وضاحتی نوٹ سے کیری لوگر بل کے تحت کی جانے والی قانون سازی متاثر ہو گی، اس لئے یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ محض اس وضاحتی بیان کی بنیاد پر جس میں پاکستان پر عائد کی جانے والی شرائط کو چھیڑا تک نہیں گیا اور جس میں صرف امریکہ پاکستان سٹریٹجک پارٹنر شپ کو مستحکم بنانے کا رسمی اعلان کیا گیا ہے، جبکہ یہ پارٹنر شپ بھی امریکہ کے اپنے مفاد میں ہے، وزیر خارجہ کس بنیاد پر یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ کیری لوگر بل کے ذریعہ پاکستان کی آزادی اور خود مختاری پر کوئی زد نہیں پڑیگی۔

اصل بات یہ ہے کہ کاسہ گدائی لے کر خود ہی اپنی عزت پامال کرنے والے اگر دوسروں سے عزت و احترام کی توقع کریں تو یہ ایک مضحکہ خیز بات ہوگی، آج کی دنیا میں طاقتور ممالک کسی کمزور ملک کی مدد و معاونت صرف اور صرف اپنے مقاصد اور مفادات کیلئے کرتے ہیں، کیری لوگر بل کی آڑ میں امریکہ کے بھی اپنے مفادات ہیں، جس کا اظہار ایوان نمائندگان کی جنوبی ایشیاء سے متعلق ایک ذیلی کمیٹی کے چیئرمین گیری ایکرمین کے اُس بیان سے ہوتا ہے جس میں ان کا کہنا ہے کہ " اسلام آباد کو دی جانے والی مجوزہ امداد " تحفہ " نہیں، ایک خاص

"معاملے پر اشتراک عمل ہے جس کے مطلوبہ نتائج کا حصول یقینی بنانا ضروری ہے۔
یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جذباتی تقریریں اور الفاظ کی جادوگری نہ تو حقیقت حال کو چھپا سکتی ہے اور نہ حقائق کے رخ روشن پر پردہ نہیں ڈال سکتی، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ قومی اسمبلی میں جوش خطابت کے جوہر دکھانے کے بجائے وزیر خارجہ قوم کے ذہنوں میں اٹھنے والے ان سوالوں کے جواب دیتے کہ کیا کیری لوگر بل کی شرائط میں کوئی تبدیلی ہوئی یا نہیں؟ کیا اب امداد کیلئے پاکستان کو امریکی صدر اور اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ سے نیک چلنی کے سرٹیفیکٹ کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اور کیا یہ وضاحتی بیان کانگریس کے منظور کردہ بل کی شرائط کو منسوخ کرتا ہے اور بل پر حاوی ہے یا نہیں؟ تو زیادہ بہتر ہوتا، لیکن اصل حقائق کو سامنے لانے اور اس پر گفتگو کرنے کے بجائے وزیر خارجہ نے قومی اسمبلی کے روبرو اپنی جذباتی تقریر میں ارکان اسمبلی کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ متذکرہ بل میں امریکہ نے پاکستان کو سٹریٹجک پارٹنر تسلیم کیا ہے، اسکی ماتحت کی حیثیت ہرگز نہیں۔
انہوں نے جذبات ابھارنے کیلئے یہ اعلان بھی کیا کہ ہمارا اقتدار رہے نہ رہے اور حکومت رہے نہ رہے، ہم پاکستان کے سٹریٹجک اثاثوں پر کوئی سمجھوتہ نہیں

کریں گے۔ جبکہ کیری لوگر بل میں موجود شرائط پر بالخصوص ملک کے عسکری حلقوں کی جانب سے جن تحفظات کا اظہار کیا گیا ہے، اس کے مطابق متذکرہ شرائط تسلیم کرنے کی صورت میں ملک کے سٹریٹجک اثاثوں پر ہی زد پڑیگی، وزیر خزانہ شوکت ترین نے بھی جن کی وزارت کے ذریعے کیری لوگر بل کے تحت ملنے والی امداد بروئے کار لائی جانی ہے، اپنے تحفظات میں اسی امر کی نشاندہی کی ہے کہ اس امداد کے عوض پاکستان کو خود کو دہشت گرد ریاست تسلیم کرنا پڑیگا اور اس صورت میں امریکہ کسی بھی وقت پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کو دہشت گردوں کے ہاتھوں غیر محفوظ قرار دے کر ان کی حفاظت کی آڑ میں ان پر قبضہ جما سکتا ہے اور ہمیں جوہری صلاحیتوں سے محروم کر سکتا ہے، ملک کی آزادی اور خود مختاری پر اس سے بڑی زد اور کیا ہوگی، جبکہ امریکی امداد کی مانیٹرنگ کے نام پر پاکستان میں تعینات امریکی انسپکٹر جنرل ہمارے ایٹمی اثاثوں تک رسائی کا کوئی موقع بھی کیوں ہاتھ سے جانے دیں گے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ اس وقت کیری لوگر بل میں وہ تمام شرائط اور شقیں بدستور اپنی جگہ جوں کی توں موجود ہیں جن پر ملک کی عسکری قیادت اور خود حکومتی حلقے اپنے تحفظات کا اظہار کر چکے ہیں، خود وزیر خارجہ کے ایک اہم حکومتی ساتھی وفاقی وزیر خزانہ شوکت ترین بھی اس بل کی بعض شقوں پر اپنے تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے نشاندہی کر چکے ہیں کہ اس بل کی ایک شق کے تحت پاکستان کو

تسلیم کرنا ہوگا کہ وہ ایک دہشت گرد ریاست ہے جبکہ اس بل کی بنیاد پر پاکستان کو دی جانے والی امریکی امداد کی مانیٹرنگ کیلئے امریکی انسپکٹر جنرل پاکستان میں تعینات کیا جائیگا، لیکن اس کے باوجود وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی کا یہ کہنا ہے کہ یہ بل ہماری آزادی اور خود مختاری کو تسلیم کرتا ہے، قوم آنکھوں میں دھول جھونکنے اور دھوکہ دینے کے مترادف ہے۔

سچی بات ہے کہ ذلتوں اور رسوائیوں کا جو سفر نائن الیون کے بعد سے شروع ہوا تھا، کیری لوگر بل اُسی سفر کا صرف ایک حصہ ہے، امریکہ اور اس کے حواری پاکستان کی عزت، غیرت اور سلامتی پر مسلسل حملے کررہے ہیں اور تشویشناک بات یہ ہے کہ پاکستان کی سلامتی پر ہونے والے اِن حملوں میں پاکستانی خزانے سے بڑی بڑی تنخواہیں اور مراعات لینے والے لوگ برابر کے شریک نظر آتے ہیں، کیا یہ حیرت ناک بات نہیں ہے کہ پاکستان میں ہر ذی شعور فرد کیری لوگر بل کی مخالفت کررہا ہے، لیکن اس کے باوجود حکومت اسے ہر حال میں قبول کرنے کو تیار ہے، حالات کا تقاضہ ہے کہ ڈیڑھ ارب ڈالر سالانہ کی امریکی بھیک کیلئے پاپڑ بیلنے اور کیری لوگر بل کی شرمناک شرائط پر عمل کرنے کے بجائے ارباب اقتدار ملکی و قومی مفادات کو ترجیح دیتے ہوئے اپنے وسائل پر بھروسہ کرتے کیونکہ یہی ہمارے قومی مفاد اور قومی غیرت کا تقاضہ تھا۔

آزاد میڈیا اور عدلیہ ہی قوم کی آخری اُمید ہے

آزادی صحافت پر ممکنہ امریکی حملہ......ایک لمحہ فکریہ

سیانے سچ کہتے ہیں کہ "کھسیانی بلی کھمبا ہی نوچتی ہے" امریکی مہارانی ہیلری کلنٹن کا پاکستانی میڈیا کے بارے میں دیا گیا بیان دراصل اِسی ہذیانی کیفیت کا آئینہ دار ہے، جس میں محترمہ نے پاکستانی میڈیا کے حوالے سے اپنے نادر و نایاب فرمودات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ " پاکستانی میڈیا میں امریکہ کے خلاف جو منفی پروپیگنڈہ چل رہا ہے، اُس کا بھرپور اور جارحانہ جواب دیا جائے گا اور اِس مقصد کے لئے ایک خصوصی ٹیم پاکستان بھیجی جارہی ہے، محترمہ کا کہنا تھا کہ امریکہ نے کئی مہینوں تک پاکستانی حکومت کے ساتھ مل کر کیری لوگر بل تیار کیا جسے پاک امریکہ تعلقات میں اہم سنگ میل سمجھا جارہا تھا، لیکن میڈیا میں اِس پر منفی ردعمل سے ہم تشویش کا شکار ہوگئے ہیں، انہوں نے کہا کہ ہم پاکستانی میڈیا پر آنے والی تمام خبروں کا جائزہ لے رہے ہیں، جو مکمل طور پر غلط ہیں اور ان خبروں کا مؤثر جواب دینے کی ضرورت تھی جو ہم نے نہیں دیا، اب ہم بہت تیزی سے ان خبروں کا جواب دیں گے، ہم کسی غلط خبر اور اٹھائے گئے سوال پر خاموش نہیں رہیں گے، انہوں نے کہا

کہ یہ انتہائی افسوسناک ہے کہ امریکہ کے بارے میں بداعتمادی بڑھ رہی ہے ہم نے کیری لوگربل پر رد عمل دیکھا ہےاور ہم اس پروپیگنڈہ کا مقابلہ کریں گے، امریکی وزیر خارجہ کی جانب سے پاکستانی میڈیاکے لئے اس کھلی دھمکی کی وجہ یہ ہے کہ پاکستانی میڈیا امریکہ کے اصل ناپاک عزائم کو بڑی دلیری سے بے نقاب کر رہاہے اور چاک و چوبند، چوکس اور محب وطن میڈیا کی وجہ سے امریکہ کے اہداف متاثر ہو رہے ہیں اِس لئے اس کے لہجے میں جارحانہ پن نمایاں نظر آ رہا ہے۔

دوسری طرف امریکی وزیر خارجہ کے اس بیان پر ملک بھر کی صحافتی تنظیموں نے سخت رد عمل کا اظہار اور اسے سختی سے رد کرتے ہوئے اس عزم کا اعادہ کیا کہ پاکستانی میڈیا امریکہ کی ہر قسم کی جارحیت کا بھرپور مقابلہ کرے گا، قارئین محترم آپ کو یاد ہوگا کہ چند سال قبل تک پاکستان میں اتنا چاک وچوبند اور بیدار الیکٹرانک میڈیا نہیں تھا، جس کی وجہ سے عوام کو حالات سے صحیح آگاہی نہیں ہوتی تھی اور حکمران وقت بھی عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکتے تھے، حکومتی اثر و رسوخ اور پابندیوں کی وجہ سے عوام کے سامنے اصل حقائق کو مسخ اور زہر ہلاہل کو قند بنا کر پیش کیے جانے کی وجہ سے وطن عزیز کے معصوم اور سادہ لوح عوام دھوکے میں آجایا کرتے تھے جس کی وجہ سے امریکہ کی پاکستان میں اکثر سرگرمیوں کا عوام کو پتہ ہی نہیں چلتا تھا، لیکن

الیکٹرانک میڈیا کے آجانے کے بعد، اب منظر نامہ بدل چکا ہے، آج پاکستانی میڈیا کو جو آزادی حاصل ہے اس کے پیچھے میڈیا کی طویل جدوجہد اور قربانیاں ہیں، میڈیا کی اس آزادی کیلئے صحافیوں نے کوڑے کھائے اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، تب جا کر میڈیا کو یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے، لہٰذا دیکھنا یہ ہے کہ ایسی صورت میں سخت محنت، جدوجہد اور قربانیوں کے بعد حاصل ہونے والی آزادی صحافت پر قدغن کیا پاکستانی میڈیا آسانی سے برداشت کرلے گا، اس سوال کا جواب تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ لیکن حکومت کی طرف سے میڈیا پر عائد بعض پابندیوں اور امریکی وزیر خارجہ کے دھمکی آمیز بیان کے تناظر میں یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ پاکستانی میڈیا پر کڑا وقت آنے والا ہے، حقیقت یہ ہے کہ حکمران تو پہلے ہی میڈیا کے آزادنہ کردار، بے لاگ تبصروں اور حقائق پر مبنی رپورٹوں سے خائف اور شاکی ہیں اور ان کی یہی کوشش رہی کہ میڈیا کی آزادی کو سلب کیا جائے، اس مقصد کیلئے ہر حکومت نے میڈیا پر قدغنیں لگانے کی کوشش کی، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے میڈیا نے آئین و جمہوریت کی بحالی اور مشرف آمریت کے خاتمہ میں جاندار اور فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے، گزشتہ چند سالوں میں متعدد مرتبہ ایسے مواقع بھی آئے کہ میڈیا نے قومی سلامتی، جمہوری اداروں کے استحکام اور عوامی مسائل کے حل کے لئے حکومت اور پارلیمنٹ سے آگے بڑھ کر اپنی ذمہ

داریاں پوری کیں، یہ ہمارا بہادر میڈیا ہی تھا جس نے عدالتی بحران میں وکلا سیاسی جماعتوں اور سول سوسائٹی کو لیڈ کیا اور جس کے نتیجہ کے طور پر پرویز مشرف کو وردی اتارنے کے ساتھ ساتھ ایوان صدر سے بھی رخصت ہونا پڑا، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آج ہمیں بیدار و چوکس میڈیا کی بدولت جہاں پل پل کی خبر مل رہی ہے وہیں امریکی امدادوں اور عنایتوں کے پس پردہ خوفناک ارادے و عزائم بھی ہمارے سامنے آرہے ہیں۔

مختلف ٹی وی چینلز پر میزبان، دانشور اور آئینی و قانونی ماہرین جہاں امریکی سازشوں کو طشت ازبام کر رہے ہیں، وہیں حقیقت حال بھی آشکارا کر رہے ہیں، پاک فوج کے پر وقار ادارے کی ساکھ کا معاملہ ہو، یا آمر وقت کی چیرہ دستیاں یا پھر امریکہ کی منفی پالیسیاں، یہ میڈیا ہی تھا جس نے ہمیشہ حق کا ساتھ دیا، کیونکہ اس نے قلم کی حرمت اور کیمرے کی آنکھ سے عوام کو درست معلومات پہنچانے کی ذمہ داری لے رکھی ہے اور میڈیا سے یہ ذمہ داری کوئی سپرپاور نہیں چھین سکتی، یہی وہ بنیادی وجہ تھی کہ جب کیری لوگر بل کی متنازعہ شقوں کی بات چلی تو پاکستانی عوام کو دھوکہ دینے کے لئے ایک تشریحی ڈرافٹ ساتھ لگا دیا گیا اور کہا گیا کہ ہم نے پاکستانی عوام اور فوج کے تحفظات کا ازالہ کر دیا ہے، اگر صرف سرکاری ٹی وی چینل والا دور ہوتا تو شاید عوام مطمئن ہو جاتے کہ امریکہ نے بڑی فیاضی سے کام لیتے ہوئے تمام شکایات اور

تحفظات کا ازالہ کر دیا ہے، ہر کڑے وقت میں سرکار کی خدمت کرنے والے دستر خوانی قبیلے کے ماہرین امریکہ کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے کہ امریکہ نے پاکستان اور اس کے عوام کے ساتھ دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔

بلند و بانگ تبصرے کیے جاتے کہ امریکہ نے نہ صرف اربوں ڈالرز امداد منظور کی بلکہ عوام اور فوج کی جانب سے اٹھائے جانے والے اعتراضات کو بھی دور کر دیا، پاک امریکہ تعلقات ایک نئے عہد میں داخل ہونے جیسے عنوانات کی سرخیاں جمائی جاتیں اور ممکن تھا کہ عوام کو میٹھے مشروب میں شرمناک اور ذلت آمیز شرائط سے لبریز کیری لوگر بل کا زہریلا مشروب پلا دیا جاتا اور انہیں خبر بھی نہ ہوتی، لیکن اس کے برعکس ہوا یہ کہ محب وطن پاکستانی میڈیا نے وضاحتی اور تشریحی ڈرافٹ کی نہ صرف دھجیاں اڑا کر رکھ دیں بلکہ قانونی اور آئینی ماہرین کی زبان سے یہ بھی کہلوا دیا کہ اس ڈرافٹ کی کوئی قانونی حیثیت نہیں، کیری لوگر بل میں جو شراط لگائی گئی ہیں انہیں ہر حال میں پورا کرنا پڑے گا، جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ہمارے حکمران کیری لوگر بل کی شرمناک شرائط کے تحت امریکی امداد لینے کا تہیہ کر چکے، لیکن میڈیا اب بھی جذبہ حب الوطنی کے تحت اس کے خلاف ڈٹا ہوا ہے اور عوام بھی اس بل کو کسی طور قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہیں، یہ ایسی صورتحال ہے جس سے امریکہ کو اس سے پہلے کبھی واسطہ نہیں پڑا اور یہی چیز امریکی حکومت اور وزیر خارجہ کو مشتعل کر

رہی ہے۔ لہذا ان عوامل کی روشنی میں امریکی وزیر خارجہ کی طرف سے پاکستانی میڈیا کو جو دھمکی دی گئی ہے اس کے اثرات بہت جلد سامنے آنا شروع ہو جائیں گے۔ امریکی حکومت اپنی اس دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کیا راستہ اختیار کرے گی اس حوالے سے کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔

لیکن دلچسپ امر یہ ہے کہ امریکی حکومت کی طرح پاکستانی حکومت بھی میڈیا سے سخت شاکی ہے، خصوصاً الیکٹرانک چینل اس کے لئے درد سر بنے ہوئے ہیں، کیری لوگر بل پر مباحث کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ، این آر او کی تند و تیز بحث، حکومتی ارکان کے کرپشن کی دیومالائی کی کہانیاں، سرکاری خزانے پر عیش و عشرت اور عیاشیوں کی داستانیں، ملک میں لاء اینڈ آرڈر کی خطرناک صورتحال اور ان پر پل پل خبریں دیتے ہوئے نیوز چینل حکومت کو مکمل پریشان کیے ہوئے ہیں، اب جبکہ امریکہ کی پریشانی بھی کھل کر سامنے آ گئی ہے تو میڈیا کے لئے خطرے کی گھنٹی بج اٹھی ہے، موجودہ حالات میں امریکی وزیر خارجہ کی جانب سے میڈیا کو نشانہ بنانے کا اظہار اس امر کی دلیل ہے کہ امریکہ اپنے مفادات کیلئے کچھ بھی کر سکتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حالات میں پاکستانی میڈیا اس لوہے کے چنے کی مانند ہے جسے چبانے کی امریکی خواہش خود امریکہ کو مہنگی پڑے گی اور پاکستانی عوام کو جو شعور میڈیا نے دیا ہے میڈیا پر پابندیوں کی صورت میں عوام اس شعور سے کسی طور دست بردار ہونے کو تیار نہیں

ہونگے۔

حقیقت یہ ہے امریکی وزیر خارجہ نے پاکستانی میڈیا کے بارے میں جو کچھ کہا وہ آزادی اظہار رائے کے بین الاقوامی قوانین کے صریحاً کے خلاف اور منافی ہے، سب سے زیادہ توجہ طلب اور خطرناک بات یہ ہے کہ امریکی وزیر خارجہ نے ایک آزاد اور خود مختار ملک کے آزاد میڈیا سے نمٹنے کی بات کی ہے، کل کو آزاد عدلیہ امریکیوں کے عزائم کی راہ میں رکاوٹ بنی تو یقینی طور پر امریکی اس کی راہ میں بھی رکاوٹ بننے کی کوشش کریں گے، لہٰذا موجودہ حالات میں ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستانی میڈیا کے ذمہ داران ان دھمکیوں کا سنجیدگی سے نوٹس لے کر اس معاملے کو عالمی صحافتی تنظیموں کے ساتھ مل کر نہ صرف بین الاقوامی فورم پر اٹھائیں بلکہ ملک کے تمام نیوز چینل و اخبارات پوری دلیری کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں کیونکہ اس وقت ہمارے سیاستدان مصلحتوں کا شکار اور امریکہ سے ڈرے ہوئے ہیں اور کمزور حکومت اپنی مجبوریوں کی وجہ سے امریکیوں کو آنکھیں دکھانے کے قابل نہیں ہے، رہ گئے عوام تو انہیں دال روٹی، بجلی اور گیس جیسے بنیادی مسائل میں الجھا دیا گیا ہے، ایسے حالات میں آزاد میڈیا اور عدلیہ ہی اس قوم کی آخری اُمید ہیں، اگر یہ اُمید بھی ختم ہو گئی تو پاکستان کو امریکی کالونی بننے سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔

اِک اور بحران پس بحران نظر آتا ہے

پھر ایک اور ڈرامائی پسپائی۔۔۔۔۔

اور وقت نے ایک بار پھر بھرپور جوڑ توڑ، لین دین، بیس بیس کروڑ کے بھاؤتاؤ اور قائمہ کمیٹی میں عددی برتری کے حصول کیلئے ہزاروں پاپڑ بیلنے کے باوجود این آر او پر ایک اور شرمناک ڈرامائی پسپائی حکومت کے مقدر میں لکھ دی، یوں این آر او کے کالے قانون کی بنیاد پر لوٹ مار اور کرپشن کو جائز قرار اور تحفظ دینے والے آئینی عمارت کھڑی کرنے کی کوشش اپنے قیام سے پہلے ہی زمین بوس ہوگی، حیرت انگیز طور پر حکومت کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچنے اور حکومت کی فتح و کامرانی کو ذلت و رسوائی میں بدلنے والے کوئی اور نہیں اس کے اپنے اتحادی ثابت ہوئے، یعنی جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے کی مصداق، حکومت کی اتحادی متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین نے کالا قانون قرار دیتے ہوئے دوٹوک لہجے میں نہ صرف قومی اسمبلی میں این آر او کی مخالفت کا اعلان کیا بلکہ صدر زرداری اور ان کی کابینہ کو بالواسطہ طور پر قربانی دینے کا بھی مشورہ دے ڈالا، ظاہر ہے متحدہ قومی موومنٹ کے اس واضح مؤقف کے بعد حکومت کی شکست یقینی اور پسپائی لازمی امر

تھا، چنانچہ پہلے وزیر آعظم نے قومی اسمبلی میں سب کو ساتھ لے کر چلنے کا عندیہ دے کراس ہزیمت کو ٹالنے کی کوشش کی اور رات گئے ایوان صدر کے ترجمان نے این آر او کو قومی اسمبلی میں پیش نہ کرنے اور اتحادیوں کو ساتھ لے کر چلنے کے اعلان سے اپنی جان چھڑائی۔

ہوسکتا ہے کہ ایم کیو ایم کی اس ڈرامائی پیش رفت کے پس پردہ مقاصد کچھ اور ہوں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایم کیو ایم کی جانب سے این آر او کی مخالفت عوامی رائے عامہ کے عین مطابق تھی، چنانچہ قومی مصالحتی آرڈیننس یا این آر او کے معاملہ پر حکمران پیپلزپارٹی کا پلٹا کھانا لازمی تھا، کیونکہ پیر کے روز دن بھر کی گرما گرمی اور جوڑ توڑ کی کوششوں کے بعد بھی پیپلزپارٹی کو اپنے اتحادیوں کی طرف سے شدید مخالفت کا سامنا تھا اور رات تک صورتحال واضح ہو گئی تھی کہ اس آرڈیننس کو پارلیمنٹ سے منظور کرانے کے لیے مطلوبہ ووٹ نہیں مل سکیں گے جس سے حکومت کو شدید خفت کا سامنا کرنا پڑے گا، چنانچہ حکومت نے اسے پارلیمنٹ میں پیش نہ کرنے میں ہی عافیت جانی، گو کہ حکومت نے اپنی اس پسپائی کو سب کو ساتھ لے کر چلنے کے ملمع میں لپیٹنے کی کوشش کی ہے لیکن دیکھا جائے تو این آر او کو پارلیمنٹ میں پیش کرنے سے فرار بھی حکومت کا اعتراف شکست ہی ہے، سیاسی مبصرین کے خیال میں حکومت کو ایک نئے سیاسی بحران کا احساس ہوگیا تھا جس سے بچنے کے

لیے این آر او کو پارلیمنٹ میں پیش کرنے کا فیصلہ واپس لے لیا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ این آر او کروڑوں اور اربوں روپے کی کرپشن، فوجداری نوعیت کے قبیح جرائم اور سیاستدانوں کے علاوہ بیورو کریٹس اور طبقہ اشرافیہ کے دیگر افراد کی بے ضابطگیوں کو معاف کرنے اور انہیں مزید لوٹ مار کی اجازت دینے کا ایسا سرٹیفکیٹ ہے، جس کی کسی بھی قانون پسند اور مہذب معاشرے میں مثال نہیں ملتی، یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ این آر او کے امتیازی قانون کا فائدہ محض ایک مخصوص گروہ کو پہنچا اور ایک مخصوص مدت کے درمیان قائم کئے گئے مقدمات واپس ہوئے، جن پر ریاست نے اربوں روپے کے اخراجات قومی خزانے سے کئے این آر او کو پارلیمنٹ کا قانونی تحفظ ملنے کی صورت میں آئندہ کوئی سیاستدان اور بیورو کریٹ قابل مؤاخذہ نہیں رہے گا، خواہ وہ بدترین بدعنوانی، بے ضابطگی حتیٰ کہ فوجداری جرائم کا مرتکب ہی کیوں نہ ہو، اس بنا پر تمام محب وطن حلقوں کی طرف سے یہ مطالبہ کیا جاتا رہا ہے کہ ایک آمر کے امتیازی قانون پر کم از کم پارلیمنٹ مہر تصدیق ثبت نہ کرے تاکہ غیر جمہوری قوتیں عوام کو یہ باور نہ کرا سکیں کہ اس ملک میں قانون اور ضابطوں کا اطلاق صرف عام عوام پر ہوتا ہے، طاقتور طبقات کو بدعنوانی، بے ضابطگی اور لاقانونیت کی کھلی چھٹی ہے اور پارلیمنٹ کا کام مخصوص طبقات کے مفادات کا تحفظ اور نگہبانی رہ گیا ہے اس طرح سے وہ آئین بھی مذاق بن کر رہ جائیگا جس

میں ہر شہری کو بلاامتیاز و تفریق زندگی گزارنے اور قومی وسائل سے مستفید ہونے کا حق حاصل ہے۔

واضح رہے کہ قومی مصالحت اور مفاہمت کے خوبصورت نام سے سابق فوجی حکمران جنرل پرویز مشرف نے جو بدنام زمانہ آرڈیننس جاری کیا اس کا مقصد پیپلز پارٹی کی قیادت کو مراعات دیکر اپنے اقتدار کو طول دینا اور دنیا پر یہ ثابت کرنا تھا کہ بے نظیر بھٹو، آصف علی زرداری اور دیگر سیاستدان بدعنوان ہیں اور اپنی بدعنوانی پر پردہ ڈالنے کیلئے ایک فوجی آمر سے ڈیل پر مجبور ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ وطن واپسی پر بے نظیر بھٹو نے حالات کو بھانپ کر مجبوری کی اس ڈیل سے جو امریکہ کی مرضی اور ضمانت کے ساتھ مکمل ہوئی تھی چھٹکارا پانے کی کوشش کی اور بعض حلقوں کی رائے کے مطابق اپنی موت کو گلے لگایا، توقع یہ تھی کہ فروری کے عام انتخابات کے نتائج کے مطابق جب پیپلز پارٹی مسلم لیگ (ن) اور دیگر سیاسی و جمہوری قوتوں کے تعاون سے اقتدار میں آ گئی تو اولین فرصت میں اس بدنام زمانہ آرڈیننس کو بالائے طاق رکھ کر عوام کو یہ باور کرائے گی کہ اس ملک میں کسی آمر کی مسلط کردہ امتیازی خواہش اور اپنے اقتدار کے تحفظ کیلئے کی جانے والی ڈیلز کیلئے کوئی گنجائش نہیں۔

مگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا اور دو سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود نہ تو

حکمرانوں نے اپنے خلاف چلنے والے مقدمات کے سلسلے میں آزاد عدلیہ کا سامنا کیا ہے، نہ 17 ویں ترمیم ختم کرکے پارلیمنٹ کی بالادستی کا اہتمام کیا ہے اور نہ ہی پرویز مشرف دور کی امریکہ نواز پالیسیوں کو ترک کرکے آزاد خارجہ پالیسی کی تشکیل کا آغاز کیا، بلکہ حکومت نے اُلٹا بین الاقوامی مالیاتی اداروں سے قرض در قرض اور شرمناک شرائط سے لبریز کیری لوگر بل قبول کرکے قوم اور مقتدر طبقات میں نئے اختلافات پیدا کر دیئے ہیں وہ موجودہ جمہوری نظام کیلئے کسی خطرہ سے کم نہیں، چنانچہ ان حالات میں جناب آصف علی زرداری کا یہ شکوہ کہ عوام کو حقائق سے ہٹانے کے لیے سیاست کو ان کے گرد گھمایا جارہا ہے، این آر او پر قانونی ماہرین سے مشاورت کی جائے گی اور متحدہ کے تحفظات بیٹھ کر دور کیے جاسکتے ہیں، انتہائی حیرت کی بات ہے کہ ایوان صدر اور حکمران پیپلزپارٹی نے اب تک این آر او پر قانونی ماہرین سے مشاورت ہی نہیں کیا! یہ بات کسی طور سمجھ میں آنے والی نہیں ہے، جہاں تک سیاست کو ان کے یا پیپلزپارٹی کے گرد گھمانے کی بات ہے تو اس میں تعجب کیسا؟ سیاست ہمیشہ حکمرانوں کے افعال و اعمال کے گرد ہی گھومتی ہے، جہاں تک متحدہ کے تحفظات کی بات ہے تو یہ تحفظات کیا ہیں، اس کی وضاحت ہونی چاہیے تھی، رہی دور کرنے کی بات، تو پیر کی شب تک متحدہ کے تحفظات کو دور نہیں کیا جاسکا تھا، ورنہ حکومت این آر او پر پسپائی اختیار نہ کرتی۔

حقیقت یہ ہے کہ معاملہ ابھی ختم نہیں ہوا، وزیر اعظم گیلانی نے اسمبلی سے خطاب میں کہا ہے کہ ہم اور ہمارے اتحادی اب بھی این آر او کا جائزہ لے رہے ہیں، یعنی اگر کامیابی کا یقین ہو جائے تو یہ آرڈیننس پارلیمنٹ میں پیش ہو سکتا ہے جب کہ صدر زرداری نے اشارہ دیا ہے کہ این آر او کو 28 نومبر تک پارلیمنٹ میں پیش کرنا لازمی نہیں، لیکن گھیرا تنگ ہوتا جا رہا ہے اور صدر زرداری کی رخصتی کی افواہیں تیز ہو گئی ہیں، فی الوقت سوال یہ ہے کہ عدالت عظمیٰ کی ہدایت پر این آر او پارلیمنٹ میں پیش نہ کیا گیا تو اس کا مستقبل کیا ہوگا؟ کیا یہ ختم ہو جائے گا اور اگر ایسا ہوا تو اس سے فیض یاب ہونے والوں کا کیا ہوگا؟ جناب زرداری کو بطور صدر کب تک اور کس قسم کا استثنیٰ حاصل رہے گا؟ یا اس کی جگہ کرپشن اور لوٹ مار کو تحفظ دینے والا کوئی اور قانون لایا جائیگا؟ ایسے بہت سے سوالات ہیں جو اٹھنے شروع ہو گئے ہیں اور ایک اور بحران پس بحران صاف نظر آ رہا ہے۔

بظاہر حکومت نے اپنے حلیفوں کی طرف سے ہاتھ کھڑے کرنے کے بعد این آر او کو پارلیمنٹ میں پیش نہ کرنے کا دانشمندانہ فیصلہ کیا ہے لیکن اب محض وقت گزاری سے کام نہیں چلے گا موجودہ جمہوری نظام کی بقا و استحکام کا دار و مدار حکومت کے ایسے فیصلوں پر ہے جو کسی ایک شخص، گروہ یا جماعت کے ذاتی و گروہی مفادات سے بالاتر ہو کر محض قومی اور اجتماعی مفاد میں کئے جائیں۔

این آر او کے مسئلہ پر جو سیاسی ارتعاش پیدا ہوا ہے اس سے عہدہ.برآ ہونے کی واحد صورت یہی ہے کہ موجودہ حکمران جناب الطاف حسین کی صائب تجویز کے مطابق عدلیہ کا سامنا کریں، اگر وہ بے قصور ہیں تو یوسف رضا گیلانی کی طرح عدالتوں سے.بری ہوں، 17 ویں ترمیم ختم کرکے پارلیمنٹ کو وہ اختیارات واپس کریں جو غاصب فوجی آمر نے زبردستی حاصل کئے تھے اور ملک میں حقیقی مصالحت اور مفاہمت کی فضا پیدا کریں، بصورت دیگر مائنس ون، مائنس تھری، مڈ ٹرم الیکشن، قومی حکومت اور بنگلہ دیش ماڈل کی افواہیں گشت کرتی رہیں گی اور موجودہ نظام ہمیشہ عدم استحکام سے دوچار رہیگا۔

بھارت کا مکروہ چہرہ بے نقاب کیا جائے

بھارت کی چانکیائی سیاست اور حکومتی ذمہ داریاں

بھارتی سیاست میں "جس کی لاٹھی اُس کی بھینس"۔ "آپ کا ہمسایہ ہمیشہ آپ کا دشمن ہوتا ہے، جبکہ ہمسائے کا ہمسایہ آپ کا دوست ہوتا ہے"۔ "دشمن کی طرف محبت و دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ، جب وہ قریب آئے تو اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دو، پھر اس کے ساتھ مل کر بچاؤ، بچاؤ کی آواز نکالو اور جب دشمن مر جائے تو اس کی لاش پر بین کرو"۔ "اپنی کمزوری اور اپنی ناکامی کو کبھی تسلیم نہ کرو، ہمیشہ اپنی شکست کا الزام دوسروں پر تھوپ دو"۔ "اپنا اندورنی اتحاد قائم رکھنے کیلئے ہمیشہ کسی نہ کسی بیرونی طاقت سے جنگ چھیڑے رکھو۔ "پہلی ہندوٗ سلطنت کی بنیاد رکھنے والے چندر گپت موریہ کے وزیر چانکیہ کے وہ پانچ اصول ہیں، جن کو بھارت کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے بھارت کی قومی پالیسی کا حصہ بنایا اور آج 62 سال گزرنے کے بعد بھی بھارت کی قومی پالیسی انہی چانکیائی اصولوں کے گرد گھوم رہی ہے، آج بھارت جس کی لاٹھی اُس کی بھینس کے اصول پر گامزن ہے، وہ اپنے ہمسایوں پاکستان اور چین کو اپنا دشمن اور ایران افغانستان اور روس کو اپنا دوست سمجھتا ہے، اسی رویہ کی وجہ سے

نیپال، سکم، بھوٹان، سری لنکا، مالدیپ، میانمار حتیٰ کہ چین جیسے پڑوسی ملک بھی بھارت کے توسیع پسندانہ عزائم اور ہمسایوں پر دباؤ اور دھمکیوں کے ہتھکنڈوں کا سامنا کر رہے ہیں۔

بھارت کبھی بھی اپنی اور اپنے سیکورٹی اداروں کی ناکامی تسلیم کرنے کے بجائے ہر چھوٹے بڑے واقعہ کی ذمہ داری پاکستان پر ڈال دیتا ہے، وہ اپنے اندورنی اتحاد کو قائم رکھنے کیلئے گزشتہ کئی عشروں سے کشمیر اور آسام میں جنگی کاروائیوں میں مصروف ہے اور گزشتہ 62 سالوں سے بھارت مذاکرات کی آڑ میں پاکستان میں دہشت گردی کو فروغ اور ناراض عناصر کے ذریعے بلوچستان اور پاکستان کے دیگر علاقوں میں علیحدگی پسند تحریکوں کی پشت پناہی کرکے ہماری پیٹھ میں چھرا گھونپ رہا ہے، بھارت کی یہ پاکستان دشمن پالیسیاں تسلسل کے ساتھ جاری ہیں اور اب تو بلوچستان اور وزیرستان میں بھارتی مداخلت کے ثبوت قومی سلامتی کی پارلیمانی کمیٹی کے سامنے پیش بھی کئے جاچکے ہیں، جس پر کمیٹی نے حکومت کو سفارش کی ہے کہ یہ ثبوت بھارت کے علاوہ امریکہ کے حوالے کیے جائیں اور یہ معاملہ عالمی برادری میں اٹھایا جائے۔

یہ درست ہے کہ بھارت پاکستان میں تخریبی کاروائیوں میں پوری طرح ملوث ہے، جس کا ثبوت گزشتہ دنوں جنوبی وزیرستان میں جاری آپریشن راہ نجات کے دوران

.برآمد ہونے والا وہ بھارتی اسلحہ اور لٹریچر ہے ، جسے پاک فوج نے اپنے قبضے میں لے کر وزارتِ خارجہ کو بھجوادیا ہے، یہ حقیقت تو سوات، مالاکنڈ کے آپریشن راہ راست کے دوران بھی منظر عام پر آچکی ہے کہ بھارت افغانستان میں قائم کئے گئے اپنے قونصل خانوں کے ذریعہ دہشت گردوں کو تربیت اور اسلحہ دے کر دہشت گردی کیلئے پاکستان بھجوارہا ہے، مگر ہمارے حکمرانوں نے نامعلوم وجوہات کی بنیاد پر اس معاملہ میں خاموشی اختیار کئے رکھی اور پاکستان کے مختلف علاقوں میں دہشت گردی کے واقعات میں بھارت کے ملوث ہونے کے ثبوت ملنے کے باوجود کھلم کھلا بھارت کا نام لینے سے گریز کیا، جبکہ بھارت نے ممبئی حملوں کا ڈرامہ رچا کر فوری طور پر اس کا ملبہ پاکستان پر ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور اسی کی بنیاد پر بھارت آج بھی ہمیں دہشت گرد ریاست قرار دلانے کی سازشوں میں مصروف ہے۔

دوسری طرف سفارتی ذرائع بھی اس بات کی تصدیق کر چکے ہیں کہ کیری لوگر بل میں پاکستان سے خود کو دہشت گرد ریاست تسلیم کرانے کی شرط بھارتی لابنگ کا ہی شاخسانہ ہے، اب جبکہ وزیر داخلہ رحمان ملک بلوچستان میں بھارتی مداخلت کے ثبوت ملنے کا اظہار کرنے پر مجبور ہوئے ہیں مگر لاہور، پشاور، اسلام آباد اور راولپنڈی میں دہشت گردی کے واقعات میں شواہد موجود ہونے کے باوجود بھارت کے ملوث ہونے کا اظہار کرنے میں احتیاط سے کام لیا جارہا ہے، اگر

ہمارے حکمرانوں کی جانب سے بھی بھارت جیسا جارحانہ رویہ اختیار کیا جاتا اور پاکستان میں دہشت گردی کی وارداتوں میں بھارت کے ملوث ہونے کے ثبوت بروقت دنیا کے سامنے پیش کرکے پاکستان کی سالمیت کے خلاف بھارت کے مکروہ عزائم کو بے نقاب کر دیا گیا ہوتا تو آج صورتحال قدرے مختلف ہوتی اور امریکی وزیر خارجہ ہلیری کلنٹن بھارت کے دفاع میں یہ کہتے ہوئے یقیناً سوچتی کہ ہمیں بلوچستان میں بھارتی مداخلت کے کوئی ثبوت نہیں ملے۔

اس وقت حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ وطن عزیز میں کی گئی دہشت گردانہ سرگرمیوں میں بھارت کے ملوث ہونے کے شواہد پارلیمنٹ کی قومی سلامتی کی کمیٹی کے سامنے پیش کئے جانے اور کمیٹی کی طرف سے ان ثبوتوں کو بین الاقوامی فورموں اور خود بھارتی حکام کے سامنے پیش کرنے کی سفارش پر عمل درآمد میں مزید تاخیر کی اب کوئی گنجائش اور ضرورت نہیں ہے، یہ درست ہے کہ ہم اپنا پڑوس تبدیل نہیں کر سکتے، لیکن اپنے ہمسایہ ملک سے اچھے تعلقات رکھنے کی خواہش کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ ماضی میں پاکستان کی بقا و سلامتی کے خلاف کئے گئے سنگین اقدامات، کشمیر سمیت تمام دیرینہ تنازعات کے حل پر بھارت کی ہٹ دھرمی اور اس وقت بھی مختلف سطحوں پر جاری سازشوں کو نظرانداز کر دیا جائے اور ہم بھارتی وزیر اعظم سے اظہار محبت میں نئی دہلی کو ماضی، حال اور مستقبل میں وطن عزیز کے لئے کوئی خطرہ نہ ہونے کا سرٹیفکیٹ دیدیں، اس لئے

ضرورت اس امر کی ہے کہ قومی معاملات سے تعلق رکھنے والے حقائق کو پوری طرح ملحوظ رکھا جائے۔

جہاں تک سرحد اور بلوچستان کی دہشت گردی میں بھارت کے ملوث ہونے کا تعلق ہے، اس کے لئے قیام پاکستان کے وقت بھارتی لیڈروں کی طرف سے پاکستان کے چھ یا آٹھ مہینے سے زیادہ نہ چلنے کی پیش گوئیاں، پاکستان سے الحاق کرنے والی ریاستوں حیدرآباد دکن، جوناگڑھ، ماناودر، منگرول پر حملے اور قبضے، مسلم اکثریت والے علاقے جموں و کشمیر کے پاکستان سے الحاق کو روکنے کے لئے وہاں بھارتی فوجیں اتارنے، اقوام متحدہ میں کشمیریوں کو استصواب رائے کے ذریعے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے وعدے سے انحراف کرکے نو لاکھ فوجیوں کے ذریعے ظلم و ستم کا بازار گرم کرنے، بھارت میں مسلمانوں کا قتل عام کرکے نوزائیدہ مملکت پر لاکھوں مہاجرین کا بوجھ لادنے اور پاکستان پر کئی جنگیں مسلط کرنے کے واقعات بھارت کی مخصوص ہندو ذہنیت کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں اور پھر جس انداز سے ملک کے مشرقی بازو کو پہلے مکتی باہنی کی دہشت گردیوں کی پشت پناہی اور پھر ننگی جارحیت کے ذریعے علیحدہ کیا گیا، اس کے بعد بھارت پر کسی بھی معاملے میں آنکھیں بند کرکے اعتماد کرنے کا کوئی جواز نہیں رہا ہے۔

چنانچہ اس منظر نامے میں افغانستان میں پاکستانی سرحد کے قریب قائم کئے گئے متعدد بھارتی قونصل خانوں کے مقاصد بالکل واضح ہیں، یہ حقیقت ہے کہ قیام پاکستان کے وقت سے ہمارے سرحدی علاقوں میں گڑبڑ کی کئی ایسی کوششیں کی گئیں جن میں بھارت کا ہاتھ نمایاں تھا، توجہ طلب امر یہ ہے کہ افغانستان پر غیر ملکی فوجوں کے قبضے کے بعد بھارتی خفیہ ایجنسی را، اسرائیلی ایجنسی موساد، روسی ادارے کے جی بی اور افغان خفیہ ادارے خاد کا گٹھ جوڑ نہ تو کسی سے ڈھکا چھپا ہے اور نہ ہی ان سب اداروں کا تعاون واشتراک افغانستان پر قابض امریکہ اور اس کے اداروں کے تعاون کے بغیر ممکن ہے، لیکن بدقسمتی سے اس حقیقت سے آگاہی کے باوجود ہمارے حکمران گومگو کی کیفیت کا شکار اور عالمی برادری کو خطے کے اصل حقائق سے درست طور پر آگاہ کرنے سے قاصر ہیں۔
حیران کن امر یہ ہے کہ حکومت پر وہ کون سا پراسرار دباؤ ہے جس نے اب تک اسے فاٹا میں ملنے والے غیر ملکی اسلحے، دواؤں اور بعض مرنے والوں کی واضح شناخت سے دنیا کو آگاہ کرنے سے روکے رکھا تھا، حقیقت یہ ہے کہ حکومت نے بلوچستان میں بھارتی مداخلت کے شواہد پیش کرنے میں غیر معمولی تاخیر سے کام لیا ہے، لیکن اب جبکہ پارلیمانی کمیٹی برائے قومی سلامتی کے اجلاس میں بلوچستان اور وزیرستان میں بھارتی مداخلت کے ثبوت پیش کئے جانے کے بعد توقع کی جاتی ہے کہ کمیٹی کی سفارش کے بموجب مذکورہ شواہد امریکہ، بھارت اور عالمی برادری

کے سامنے جلد پیش کر دیئے جائیں گے اور اس ضمن میں دنیا کو تمام ہمسایہ ممالک کے ساتھ بھارت کے معاندانہ طرز عمل اور بھارت میں چلنے والی سیکڑوں علیحدگی کی تحریکوں سے دنیا کی توجہ ہٹانے کے لئے پڑوسیوں پر الزام تراشیوں، داخلی مسائل کی سنگینی اور الیکشن کے انعقاد کے وقت پاکستانی سرحدوں پر فوجیں جمع کرنے اور خود اپنے ملک میں سرکاری سرپرستی میں سمجھوتہ ایکسپریس کی بہیمانہ آتشزدگی اور گجرات واحمد آباد کے انسانیت سوز مسلم قتل عام سمیت ہزاروں مسلم کش فسادات کرانے کے حربوں کی طرف مبذول کرانا بھی ضروری ہے۔

تاکہ دنیا کے سامنے بھارت کا حقیقی چہرہ سامنے آسکے، ہمارا ماننا ہے کہ اس وقت حکومت کیلئے مصلحت سے کام لینا قومی مفادات کے سراسر منافی ہوگا، کیونکہ ملکی اور قومی سلامتی بہرصورت ہماری حکومتی اور عسکری قیادتوں کی اولین ترجیح اور ذمہ داری ہوتی ہے جو اس وقت امریکی بھارتی اور اسرائیلی شیطانی عزائم کی وجہ سے سخت خطرے میں نظر آرہی ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ پاکستان عالمی برادری کو بتادے کہ جو ممالک دہشت گردی کے خلاف جنگ کے چیمپئین بنے ہوئے ہیں ان کا اصل کردار کیا ہے، لہٰذا وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ سکیورٹی فورسز کی جانب سے وزارت خارجہ کو جو ثبوت اور شواہد فراہم کئے گئے ہیں ان کی بنیاد پر اقوام عالم کے سامنے بھارت کی منافقت

آمیز چانکیائی کو بے نقاب کر کے اس کا اصل مکروہ چہرہ نہ صرف سامنے لایا جائے بلکہ بھارتی سرپرست امریکی انتظامیہ پر بھی یہ واضح کر دیا جائے کہ جس دشمن کو وہ ہمیں اپنا دوست سمجھنے کا مشورہ دے رہے ہیں وہی تو ہمارا اصل، بدترین اور ازلی دشمن ہے جو ہماری سالمیت، بقاء اور استحکام کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ضائع نہیں جانے دے رہا۔

امریکہ کی دیرینہ آرزو۔۔۔پاکستان کے جوہری اثاثوں پر قبضہ

ایٹمی اثاثوں کے تحفظ کے نام پر امریکی پروپیگنڈا اور مکروہ عزائم

پاکستان اپنے جوہری اثاثوں کی حفاظت کرنا جانتا ہے۔۔۔۔

یہ کوئی پہلا موقع نہیں اور نہ ہی ایسا پہلی بار ہوا ہے، اس سے قبل بھی امریکی خفیہ ایجنسیاں، عہدیدار اور میڈیا اس قسم کے بے بنیاد شوشے چھوڑتے رہے ہیں اور پاکستان کے ایٹمی پروگرام اور اثاثوں کے خلاف منفی پروپیگنڈہ کرتے رہے ہیں، گزشتہ دنوں امریکی جریدے "نیویارکر" کی حالیہ رپورٹ بھی دراصل اسی سلسلے کی ایک کڑی اور اس کے تانے بانے اس امریکی مذموم مقاصد کی نشاندہی کررہے ہیں، جس کا مقصد پاکستان کے ایٹمی پروگرام اور اثاثوں پر امریکی کنٹرول کی دیرینہ آرزو کی تکمیل ہے، نیویارکر کی یہ متنازعہ رپورٹ جسے امریکی صحافی سیمور ہرش نے تیار کیا ہے، میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ امریکہ پاک فوج کے ساتھ پاکستان کے جوہری اثاثوں کے تحفظ سے متعلق حساس معاہدوں پر بات چیت کررہا ہے، ان معاہدوں کے تحت امریکہ کا خصوصی تربیت یافتہ یونٹ بحران کی صورت میں پاکستان کے نیوکلیئر اثاثوں کا اضافی تحفظ کر

سکے گا۔

جوائنٹ چیف اسٹاف کمیٹی کے چیئرمین جنرل طارق مجید نے امریکی جریدے کے مضمون کو مسترد کرتے ہوئے اسے لغو اور شرانگیز قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ پاکستان کے جوہری اثاثوں کی حفاظت کیلئے انتہائی مؤثر نظام موجود ہے اور ہمارے جوہری اثاثوں تک رسائی کے بارے میں حساس معلومات غیر ملکی فرد، ریاست یا ادارے کو دینے یا تبادلے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، جبکہ پاک فوج کے ترجمان میجر جنرل اطہر عباس کا کہنا ہے کہ ایٹمی ہتھیار بنانے والے اس کی حفاظت کرنا بھی جانتے ہیں، دفتر خارجہ نے بھی جوہری اثاثوں کی حفاظت کیلئے کسی غیر ملکی مدد کی ضرورت کے خیال کو سختی سے مسترد کرتے ہوئے رپورٹ کو بے بنیاد اور من گھڑت قرار دیا ہے، خیال رہے کہ اس سے قبل اسلام آباد میں امریکی سفیر این پیٹرسن واضح طور پر یہ کہہ چکی ہیں کہ امریکہ پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں پر قبضے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نیویارکر میں شائع ہونے والی حالیہ رپورٹ امریکہ کے انہی مخصوص مقاصد کیلئے تیار اور شائع کی گئی ہے جس کا اظہار سابق امریکی وزیر خارجہ کنڈولیزا رائس کانگریس کمیٹی کے سامنے ان الفاظ میں کرچکی ہیں کہ " ہم نے بحرانی صورت میں پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کا کنٹرول حاصل کرنے

کیلئے ایک ہنگامی منصوبہ بنا رکھا ہے " اسی وجہ سے اہم امریکی عہدیداروں کی طرف سے مسلسل یہ پروپیگنڈا کیا جاتا رہا ہے کہ انتہا پسند پاکستان کے ایٹمی اثاثوں پر قبضہ کر سکتے ہیں یا پاکستان کے ایٹمی اثاثے غیر محفوظ ہیں۔

حقیقت حال یہ ہے کہ پاکستان کے جوہری پروگرام کے بارے میں امریکی پروپیگنڈا دراصل بھارتی لابی کی مسلسل کوششوں کا نتیجہ تھا کیونکہ ہنود و یہود کسی طور یہ بات برداشت کرنے کو تیار نہیں کہ کسی مسلمان ملک کے پاس جوہری صلاحیت موجود ہو. یہی وجہ ہے کہ امریکا اور اس کے حواریوں نے آج تک پاکستان کی ایٹمی قوت کو تسلیم نہیں کیا اور پہلے ہی دن سے آج تک پاکستان پر طرح طرح سے دباؤ ڈالا جا رہا ہے اور امریکا مختلف حیلوں و بہانوں سے پاکستان کی ایٹمی صلاحیت اور طاقت کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔

حالات و قرائن سے اندازہ ہو رہا ہے کہ اس وقت امریکی جریدے نیویارکر نے پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کے حوالے سے جو رپورٹ شائع کی ہے وہ بے مقصد نہیں ہے، گو کہ پاکستان کی طرف سے اس رپورٹ کی سختی سے تردید کی گئی ہے لیکن اس رپورٹ میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ کسی طور نظر انداز کرنے کے لائق نہیں بلکہ اس کو بین السطور پڑھنے، سمجھنے اور غور کرنے کی اشد ضرورت ہے، خیال رہے کہ مذکورہ رپورٹ امریکا کے مشہور صحافی سیمور ہرش کی تیار کردہ ہے جس کے رابطے

پاکستان کی اہم شخصیات سے ہیں، امریکی صحافی سیمور ہرش امریکہ کے ان چند صحافیوں میں سے ہیں جو خاص مواقع پر اسلام آباد آکر نہ صرف اعلیٰ حکومتی عہدیداروں سے ملاقاتیں کرتے ہیں بلکہ دنیا میں ان کی پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے حوالے سے رپورٹوں کو خاص توجہ کی نظر سے دیکھا اور پڑھا جاتا ہے۔

واضح رہے کہ سیمور ہرش یہودی لابی سے قریبی تعلق کی بناء پر پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے بارے میں ایک خاص نقطہ نظر رکھتے ہیں، گوکہ اس رپورٹ کا بیشتر حصہ تو اخباری اصطلاح میں "ٹیبل اسٹوری" معلوم ہوتا ہے، مگر اس تحریر کو مکروہ سازش اور پاکستان مخالف گمراہ کن پروپیگنڈے کا حصہ قرار دیا جاسکتا ہے اور یہ کسی ایسی سازش کی کڑی معلوم ہوتی ہے جس کا بنیادی مقصد چند عناصر کی پشت پناہی سے دنیا میں پاکستان کے تشخص کو داغدار کرنا اور ایٹمی اثاثوں کی حفاظت کے نام پر کہوٹہ یا دیگر حساس مقامات پر امریکی کنٹرول کیلئے راہ ہموار کرکے پاکستان کو ایٹمی سطح پر مفلوج کرنا اور بھارت کیلئے ترم چارہ بنانا ہے۔

تاہم اس رپورٹ کا سب سے خطرناک ترین پہلو یہ انکشاف ہے کہ "گزشتہ گرمیوں میں ایک جھوٹی خبر یہ ملی کہ پاکستان کے 80 سے 100 تک کے ایٹم بموں میں سے ایک غائب ہے جس پر دبئی میں موجود ایف بی آئی، سی آئی اے، پینٹاگون اور انرجی

ڈیپارٹمنٹ کی ایکشن ٹیم پاکستان پر حملے کے لیے تیار ہو گئی، تاہم چار گھنٹے بعد جب یہ خبر غلط ثابت ہوئی تو ٹیم کو روانگی سے روک دیا گیا۔ اس خبر کا سب سے تشویشناک پہلو یہ ہے کہ اگر اور کچھ دیر تک اس افواہ کی تردید نہ ہوتی تو پھر کیا ہوتا۔ یہاں قابل توجہ اور سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ ایسی ہی کسی اور افواہ کی بنیاد پر پاکستان کی ایٹمی تنصیبات پر یلغار ہو سکتی ہے۔ یہ افواہ خود امریکی ذرائع بھی اڑا سکتے ہیں اور امریکا اس پر فوری عمل کر سکتا ہے۔

کیونکہ دبئی میں تربیت یافتہ ایکشن ٹیم کی موجودگی ظاہر کر رہی ہے کہ امریکا اس مقصد کے لئے تلا بیٹھا ہے۔ نیویارکر کی اس رپورٹ میں یہ انکشاف بھی کیا گیا ہے کہ جنرل کیانی اور امریکی ایڈمرل مائیکل مولن میں ذاتی دوستی ہے اور روزانہ کی بنیاد پر باہم رابطے ہیں، چنانچہ امریکا اور پاکستانی فوج میں یہ مذاکرات ہو رہے ہیں کہ ایٹمی تنصیبات اور اسلحہ کو کوئی خطرہ درپیش ہو تو ماہرین پر مشتمل امریکی ٹیم کو حرکت میں آنے کی اجازت ہوگی اور امریکی دستے جوہری ہتھیار اپنے قبضے میں لے سکتے ہیں۔ رپورٹ میں یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ جوائنٹ اسپیشل آپریشنز کمان نے پاکستانی ایٹمی اسلحہ کی منتقلی کے لیے بھی منصوبہ بندی کر لی ہے۔ پاک فوج کو خصوصی فنڈز دیے جائیں گے اور پاکستان نے ہتھیاروں کے مقامات اور کمانڈ اینڈ کنٹرول سسٹم کے بارے میں

معلومات فراہم کردی ہیں۔

دراصل سیمورہرش کی رپورٹ امریکہ کی اس دیرینہ خواہش کی عکاسی کرتی ہے جس کا اظہار ہم مضمون کے ابتداء میں کرچکے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں موجودہ حالات امریکی جنگ کے پیدا کردہ ہیں، افغانستان پر امریکی حملے کے بعد ہی خطے میں دہشت گردی اور انتہا پسندی بڑھی ہے، ان حالات میں پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو اگر کوئی حقیقی خطرہ ہے تو وہ بھارت، اسرائیل اور امریکہ سے ہے، کیونکہ امریکی ایجنٹ پاکستان کے مختلف شہروں بالخصوص اسلام آباد میں سرگرم عمل ہیں اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی رہائش گاہ اور کہوٹہ کے قریب بلیک واٹر اور دیگر امریکی اہلکاروں کی موجودگی کا انکشاف ہوچکا ہے، اس بناء پر سیمور ہرش کی رپورٹ کو سنجیدگی سے لینے کی ضرورت ہے۔

پاکستان کا ایٹمی پروگرام اپنے اعلیٰ انتظامات کی وجہ سے محفوظ ہے اور اس پر انتہا پسندوں کے قبضے کا کوئی امکان نہیں، لیکن امریکہ کی طرف سے اس خطرے کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا مقصد واضح ہے کہ وہ عالمی سطح پر تشویش پیدا کرکے اس پر خود کنٹرول کرنا چاہتا اور اس قسم کی پورٹوں کے ذریعے اپنی حکمت عملی چھپانا چاہتا ہو، یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ پاکستان کا جوہری پروگرام کا کنٹرول اور کمان سسٹم دنیا کے کسی بھی ایٹمی ملک سے زیادہ

جدید اور بہتر ہے اور یہی وجہ ہے کہ دشمن کی کوئی بھی شرارت آج تک کامیاب نہیں ہو سکی لیکن امریکہ دوستی کے پردے میں جس دشمنی کا خواہاں ہے، اس سے بچنے کی تدابیر ہمیں ہر سطح پر کرنی چاہئیں۔

اور حکومتی ذمہ داران کو ان رپورٹوں کی واضح تردید کرنے کے ساتھ قوم کو یہ یقین دہانی بھی کرانی چاہئے کہ پہلے کی طرح ہمارے ایٹمی اثاثوں کی حفاظت جذبہ جہاد سے سرشار پاک فوج اپنے کنٹرول اینڈ کمان سسٹم کے تحت کر رہی ہے، یہ پروگرام ہم نے اپنی صلاحیت، محنت اور وسائل سے شیلف میں سجانے کیلئے نہیں بلکہ بوقت ضرورت استعمال کرنے کیلئے تیار کیا ہے، الہذا دنیا اس ضمن میں اپنی غلط فہمی کو دور کر لے، ہم نہ صرف اپنے جوہری پروگرام کی حفاظت کرنا جانتے ہیں بلکہ اس کی طرف اٹھنے والی ٹیڑھی آنکھ اور بڑھنے والے ناپاک ہاتھ کو روکنا اور دشمن کو منہ توڑ جواب دینا بھی جانتے ہیں۔

اُلوؤں کی وجہ سے

نحوست اُلوؤں میں نہیں ظلم اور بے انصافی میں ہوتی ہے۔۔۔۔
تبدیلی بیانات اور خواہشات سے نہیں عملی اقدامات سے آتی۔۔۔۔
کہتے ہیں کہ طوطے کا ایک جوڑا دن بھر کی مسافت کے بعد رات گزارنے کیلئے ایک ویران گاؤں میں رکا، گاؤں کی ویرانی دیکھ کر طوطی نے طوطے سے پوچھا "کس قدر ویران گاؤں ہے، ہر طرف خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا ہے، تمہارے خیال میں یہ گاؤں کس وجہ سے اجڑا ہوگا....؟" طوطے نے کچھ دیر سوچا اور طوطی کی طرف دیکھ کر بولا "میرا خیال ہے اُلوؤں کی وجہ سے" جس وقت طوطا طوطی کو گاؤں اجڑنے کی وجہ بتا رہا تھا، عین اس وقت ایک الّو بھی وہاں سے گزر رہا تھا، اس نے طوطے کی بات سنی اور وہاں رک کر ان سے مخاطب ہو کر بولا، تم لوگ اس گاؤں میں مسافر لگتے ہو، لمبے سفر کی وجہ سے تھکے ہوئے بھی ہو، میرا گھر قریب ہے، اس ویران گاؤں میں رات گزارنے سے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آج رات تم لوگ میرے مہمان بن جاؤ، میرے ساتھ ڈنر کرو، آرام سے رات بسر کرو اور صبح اپنی اگلی منزل پر روانہ ہو جانا، تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔

اُلو کی محبت بھری دعوت سے طوطے کا جوڑا انکار نہ کرسکا اور انہوں نے اُلو کی دعوت قبول کرلی۔ دونوں اُلو کے ساتھ اس کے گھر پہنچے۔ اُلو نے دونوں کی بہت شاندار اور پر تکلف دعوت کی، تینوں نے اکھٹے کھانا کھایا اور آرام دہ بستر پر رات گزاری۔ صبح جب انہوں نے اپنے میزبان اُلو کی مہمان نوازی پر شکریہ ادا کرکے رخصت ہونے کی اجازت چاہی، تو اُلو نے مسکرا کر طوطے کی طرف دیکھا اور بولا "میری طرف سے اجازت ہے آپ جاسکتے ہیں، لیکن طوطی نہیں جائے گی"طوطے نے حیرت سے پوچھا "کیوں"اُلو بولا "اسلیے کہ یہ طوطی میری بیوی ہے "طوطا چلایا" یہ کیسے ہوسکتا ہے"تم اُلو ہو اور ہم طوطے ہیں ،ایک طوطی اُلو کی بیوی کیسے ہوسکتی ہے؟"اُلو نے اطمینان سے جواب دیا "تم مانو یا نہ مانو لیکن یہ طوطی میری بیوی ہے اور میں اپنی بیوی کو تمہارے ساتھ جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

دونوں میں جب بحث و تکرار زیادہ بڑھی تو اُلو نے طوطے کے سامنے ایک تجویز پیش کرتے ہوئے کہا "ایسا کرتے ہیں ہم تینوں کورٹ چلتے ہیں اور اپنا مقدمہ قاضی کے سامنے پیش کرتے ہیں، قاضی جو فیصلہ کرے وہ ہمیں قبول ہوگا"اُلو کی تجویز پر طوطا اور طوطی مان گئے اور تینوں قاضی کی عدالت میں پیش ہوئے۔ طوطے نے قاضی کی عدالت میں اپنا مقدمہ دائر کیا اور طوطی کو اپنی بیوی قرار دیا۔ قاضی نے اُلو کی طرف دیکھا، اُلو بیان دینے کیلیے آگے بڑھا، اس نے حلف

اٹھایا"میں جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا، سچ کے سوا اور کچھ نہیں کہوں گا"اس کے بعد اس نے قاضی کے روبرو طوطی کو اپنی بیوی قرار دینے کیلئے دلائل دینے شروع کئے، اُلو کے جواب میں طوطے نے اپنے جوابی دلائل دیئے لیکن بد قسمتی سے اُلو کے دلائل طوطے کے دلائل سے زیادہ مضبوط اور قوی تھے، چنانچہ قاضی نے دلائل کی روشنی میں اُلو کے حق میں فیصلہ دے کر عدالت برخاست کردی، طوطا اس بے انصافی پر روتا رہا، چلاتا رہا، انصاف کی دہائی دیتا رہا، مگر اس کی بات سننے والا کوئی نہ تھا۔

ناکام و نامراد جب طوطا اکیلا جانے لگا تو اُلو نے اسے آواز دی، "بھائی اکیلے کہاں جاتے ہو اپنی بیوی کو تو ساتھ لیتے جاؤ"طوطے نے حیرانی سے اُلو کی طرف دیکھا اور بولا "اب کیوں میرے زخموں پر نمک چھڑکتے ہو، یہ اب میری بیوی کہاں ہے، عدالت نے تو اسے تمہاری بیوی قرار دے دیا ہے" اُلو نے طوطے کی بات سن کر زوردار قہقہہ لگایا اور بولا، میرے بھائی یہ سب ڈرامہ تھا، میں تمہیں عدالت اس لیے لایا تھا کہ میں تمہیں اُس گاؤں کے اجڑنے کی اصل وجہ بتا سکوں، جس ملک میں انصاف نہیں ہوگا اور جس ملک کے قاضی بے ایمان اور عدالتیں بے انصاف ہونگی، وہ ملک ویران ہوجائے گا، اگر تم اپنے معاشرے، اپنے گاؤں اور اپنے ملک کو اجڑنے اور برباد ہونے سے بچانا چاہتا ہے تو ملک میں کبھی بے انصافی نہ ہونے دینا ہے، یاد رکھو میرے بھائی معاشرے، گاؤں اور ملک

اُلوؤں کی نحوست کی وجہ سے نہیں اجڑتے، بلکہ بے انصافی کی وجہ سے اجڑ جاتے ہیں،
"نحوست اُلوؤں میں نہیں ہوتی، نحوست ظلم اور بے انصافی میں ہوتی ہے۔
ایک معروف ٹی وی اینکر کی بیان کی ہوئی اس حکایت میں اُلو کی بات کتنی درست ہے کتنی غلط، اس سے قطع نظر، یہ حقیقت ہے کہ کسی معاشرے کے مہذب ہونے کیلئے ضروری ہے کہ وہاں عدلیہ آزاد ہو اور قانون کی حکمرانی ہو، جن معاشروں میں قانون کی حکمرانی نہیں ہوتی اور انصاف عوام کی پہنچ سے دور ہوتا ہے، وہ معاشرے یقین اور اعتماد کی دولت سے محروم ہو جاتے ہیں اور ہر آن یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کسی بھی وقت، کوئی بھی ہاتھ کسی کی دستار یا گریبان تک پہنچ سکتا ہے، جس ملک میں انصاف نہیں ہوتا، وہاں ایسا جنگل کا قانون ہوتا ہے جس میں جرائم پیشہ افراد اور لاقانونیت کا راج ہوتا ہے، درندوں کی حکمرانی ہوتی ہے اور معاشرہ خونخوار بھیڑیوں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے، یہ انصاف ہی ہوتا ہے جو ایک عام اور کمزور شہری کو بااثر، مضبوط اور طاقتور لوگوں کے ظلم و ستم سے محفوظ رکھتا ہے، انہیں یقین، اعتماد اور تحفظ کی دولت فراہم کرتا ہے۔
آج وطن عزیز پاکستان اپنی تاریخ کے بدترین بحران سے گزر رہا ہے، ہر طرف ظلم

وزیادتی اور لاقانونیت کو دور دورہ ہے، آٹے، گھی، چینی، بجلی اور پانی کا بحران ہے، ایک بحران ختم نہیں ہوتا کہ دوسرے بحران کا عفریت سر اٹھائے کھڑا ہوتا ہے، لوگ بھوک غربت اور افلاس کی چکی میں پس رہے ہیں، جبکہ ارباب اقتدار دونوں ہاتھوں سے اپنی جیبیں بھرنے میں مصروف ہیں، اب تو حکومتی ارکان، وزرااور حکمرانوں کی لوٹ مار کی کہانیاں تواتر کے ساتھ قومی اور بین الاقوامی اخبارات اور میڈیا کی زینت بن رہی ہیں، حال یہ ہے کہ لوٹ مار اور کرپشن نے پاکستان کو دنیا کے کرپٹ ترین ممالک میں سر فہرست کر دیا ہے۔

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ ہر فرد بے یقینی کی صلیب پر لٹک رہا ہے، حالات کی کوکھ سے جنم لینے والی مایوسی کی وجہ سے قومی زندگی سے سکون، ٹھہراؤ اور اطمینان کے عناصر ختم ہوتے جارہے ہیں، سماجی اور معاشرتی ناانصافیوں کے ساتھ ساتھ سیاسی و آئینی حوالے بھی قومی اعتماد کو پستیوں کی اتھاہ گہرائیوں کی طرف لے جارہے ہیں، ہماری قومی اقدار وروایات، قناعت پسندی، سادگی، قربانی، ایک دوسرے کی مدد، دلجوئی، حلال روزی کی طلب، حرام روزی سے اجتناب، صبر واستقلال، بے غرضی، اخوت و محبت، انسانوں کی عزت واحترام، وعدے کی پاسداری، امانت میں دیانت، اور دوسروں کیلئے راستہ چھوڑ دینے کا جذبہ معاشرے سے غائب ہوتا جارہا ہے۔

ہمارا معاشرے جو کبھی انسانی تہذیب و تمدن، اخلاقی اقدار، دکھ سکھ کی ساجھے داری، اور محبتوں کے پھیلاؤ کا امین اور مرکز ہوا کرتا تھا، آج بدلتے ہوئے سماجی رویے اِسے تیزی سے اُس اخلاقی پستی اور معاشرتی انحطاط کی جانب لئے جا رہے ہیں، صاف دکھائی دے رہا ہے کہ ہمارا معاشرہ تمام تہذیبی، قومی، سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی سنگ میلوں کو بے دردی سے روندتا ہوا ذہنی بغاوت کی راہ پر گامزن ہوچکا ہے اور غصہ، نفرت، جرم و بغاوت کی آکاس بیل اُسے تیزی سے اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے، جس کا انجام سوائے تباہی و بربادی کے اور کچھ نہیں، یاد رکھیے جب معاشروں میں عدل و انصاف عنقا ہوجائے تو درندوں کی افزائش ہوتی ہے اور مجرم اور جرائم پیشہ افراد سڑکوں پر دندناتے پھرتے ہیں۔

ایسی صورت میں خوف و دہشت اور وحشتوں کا در و بام تک آ پہنچنا ایک معمولی بات بن جاتی ہے، چنانچہ ان حالات میں میاں نواز شریف صاحب کے رشوت، منافقت اور بے انصافی سے پاک اور شفاف پاکستان کی بنیاد رکھنے والے بیانات اور وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کی کرپشن سے پاک معاشرے کی خواہش ایک بے معنی اور لایعنی بات کے سوا اور کچھ نہیں، کیونکہ تبدیلی بیانات اور خواہشات سے نہیں بلکہ عملی اقدامات سے آتی ہے، اس وقت ناانصافیوں کے گھنے دلدلی جنگل سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے، ظلم و زیادتی کا خاتمہ اور عدل و انصاف کا قیام،

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں "معاشرہ کفر کے ساتھ تو زندہ رہ سکتا ہے، ظلم و زیادتی کے ساتھ نہیں" قارئین محترم ..... اُلو نے واقعی سچ کہا تھا، نحوست اُلوؤں میں نہیں، نحوست ظلم، زیادتی اور بے انصافی میں ہوتی ہے، جو معاشرے، قوم اور ملکوں کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔

عید الضحیٰ کا پس منظر اور پیش منظر قربانی کا پیغام دیتا ہے

دنیا میں قومی، ملی اور دینی تقریبات کو منانے کا سلسلہ زمانہ قدیم سے جاری ہے اور دنیا کی ہر قوم کسی نہ کسی انداز اور رنگ میں ان تقریبات کا اہتمام کرتی ہے۔ جشن مناتی ہے، خوشیوں کے شادیانے بجاتی ہے۔ لیکن اُن کا جشن اور یوم عید عیش و عشرت اور نفسانی خواہشات کے تابع اور شہوانی لذتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جبکہ اسلام کا تصور عید نرالی ہی شان کا حامل ہے اور اِس کے منانے کے انداز و اطوار دیگر قوموں کے طور طریقوں سے بالکل مختلف، جدا اور الگ ہیں۔ ایک مسلمان کی عید احکام الٰہیہ کے ماتحت اور اُس کی خوشیاں رضائے الٰہی کے تابع ہوتی ہیں۔ اُس کا ہر فعل اپنے ربّ کی خوشنودی کیلئے ہوتا ہے اور اُس کا جشن طرب روحانیت کی تکمیل اور سعادت دارین کے حصول کیلئے ہوتا ہے۔ ایک مسلمان مومنِ صادق کی سچی خوشی اور حقیقی نشاط کا راز اِس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ اپنا تن من دھن سب کچھ اپنے آقا و مولا کے سپرد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ " میری نماز، میری عبادات، میرا جینا، میرا مرنا اُس رب العلمین کیلئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں " یہ حقیقت ہے کہ اسلام دین فطرت ہے۔ اُس نے غم اور خوشی کو منانے کے طریقے مقرر کرتے ہوئے اُن تمام غیر فطری رسوم و رواج کے پردوں کو بھی چاک کیا ہے جسے امتداد زمانہ اور انسان کی لاعلمی اور جہالت نے عید (یعنی

خوشی) کے رخ روشن پر ڈالا تھا، اسلام اپنے ماننے والوں کو خوشی کے موقع پر عید منانے کی اجازت دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد اپنے خالق و مالک کی اطاعت و عبادت ہے، وہ یاد دلاتا ہے کہ ایک مسلمان خواہ راحت میں ہو یا مصیبت میں اُسے کسی بھی حال میں اپنے خالق سے رشتہ نہیں توڑنا چاہیے، ہر حال میں اپنے ربّ کی اطاعت و بندگی کا راستہ اختیار کرنا چاہیے، کیونکہ وہی کبریائی کا حق دار اور حاکمیت و الوہیت کا مستحق ہے اور حمد و ثنا کا ثنا سزا وار ہے، اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ عید منانا اور جشن و طرب کے ایام مقرر کرنا فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہے، تم عید مناؤ، خوشی و مسرت ،فرح و سرور کا اظہار کرو، مگر جشن ونشاط میں اپنی ہستی کو فراموش مت کرو، اپنے حقوق و فرائض سے غافل نہ ہوجاؤ اور اپنے خالق کو مت بھول جاؤ۔

آج ایک بار پھر اسی پیغام کو لے کر عید کا دن ہمارے درمیان موجود ہے، لیکن اِس خوشی و انسباط کے موقع پر سوچ رہا ہوں کہ اپنے اہل وطن کو کون سا تحفہ پیش کروں، خوشی کی کون سی کہانی سناؤ، قلبی و روحانی آسودگی کا کون سا سامان پیدا کروں کہ بجھے ہوئے خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر جائے، زخم مندمل ہوجائیں اور قلب و روح میں اطمینان و طمانیت کا احساس پیدا ہوجائے لیکن شاید آج میں ایسا نہ کرپاؤں، اِس لئے کہ عراق، افغانستان، کشمیر سے لے فلسطین تک پوری اُمت مسلمہ لہو رنگ ہے، بالخصوص ارض وطن پاکستان کی سرزمین

اپنے ہی سپوتوں کے خون سے رنگین ہے، ملک کے دو صوبوں میں نفرت اور بغاوت آگ لگی ہوئی ہے، ہر طرف غم اور سوگ کی کیفیت ہے، ہم جدھر کان لگائیں اپنے ہی مسلمان بھائیوں کی آہ و بقا، خوفناک چیخیں اور سسکیاں سنائی دیتی ہیں، جس سمت نظر اٹھائیں مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں، بے گور و کفن لاشے اور کٹے پھٹے جسم پڑے ہیں، اجڑی ہوئی بستیاں اور جلتے ہوئے گھر ہماری دینی غیرت و حمیت پر نوحہ کناں ہیں، یہی حال پورے عالم اسلام کا ہے، کشمیر، فلسطین، بوسنیا، چیچینا، جیسے ممالک میں اسلام کا نام و نشان مٹانے کیلئے سروں کی فصل کٹ رہی ہے، افسوس تو اِس بات کا ہے کہ ہم اپنے دشمن کو ازل سے پہچانتے ہوئے بھی اُس کی گود میں پناہ ڈھونڈ رہے ہیں، ہر بار وہ ایک ہاتھ سے ہماری پشت میں خنجر گھونپتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے ہمارے منہ میں خیرات کا نوالہ ڈالتا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ یہی ہمارا آقائے نعمت ہے، گویا ہم عزت و وقار کی دولت سے تو محروم تھے ہی اب عقل و شعور سے بھی عاری ہوتے جارہے ہیں، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر اور مراکش سے مغربی ایشیاء اور مشرق بعید تک پھیلی ہوئی ہر نعمت سے مالا مال اللہ تعالیٰ کی یہ پسندیدہ اُمت اِس درجہ ذلیل و خوار کیوں ہے، غور کیا جائے تو دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے کہیں زیادہ اپنوں کی حماقتیں نظر آتی ہیں، پاکستان ہی کو لیجئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں جغرافیائی اور مالی وسائل کے اعتبار سے بہترین خطہ زمین دیا، لیکن ہم نے اسے غیروں کے رحم و کرم پر چھوڑ

دیا، آخری اُمت ہونے کے وصف کے ساتھ ہمیں اللہ تعالی کے آخری اور مکمل دین، قرآنی دستور اور سب سے بڑھ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اسوہ حسنہ کی صورت میں گھر سے لے کر ایوان اقتدار تک ہر شعبہ حیات میں بہترین راہنمائی میسر تھی لیکن ہم نے شرف و کرامت کی اِن ساری نسبتوں کو اپنے لئے توہین سمجھا، اسلام نے ہمیں محبت و دوستی کا جو معیار دیا تھا، ہم نے اُس کے برعکس کفار و مشرکین سے محبت کی پینگیں بڑھائیں اور اپنوں سے بیگانے ہوگئے، یوں ہم نے دینی شناخت، نظریاتی تشخص، ثقافتی معیار اور علمی برتری کو خود ہی فراموش کر دیا، لہذا قدرت نے ہمیں عظمت و رفعت کی کہکشاؤں سے اٹھا کر ذلت کی پستیوں میں دے مارا۔

آج پاکستان اپنے درماندہ کارواں کو لے کر اکیسویں صدی میں رینگ رہا ہے، بے پناہ قدرتی وسائل سے مالا مال اِس ملک کو گھر کے چراغوں سے ہی آگ لگ گئی، اِس کے محافظ بد قسمتی سے تسلسل کے ساتھ اِس ملک کا خون چوستے رہے، اِس کے نظام سیاست و معیشت کی نہ کوئی سمت متعین ہوئی اور نہ ہی کوئی فکر و فلسفہ اور پالیسی، پورے کا پورا نظام ذاتی مفادات کے گرد گھومتا رہا ہے، جو الیکشن میں کامیاب ہوگیا، وہ نقب لگانے میں بھی کامیاب ہوگیا اور اُس نے موقع غنیمت جانتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے ملک لوٹنے کے علاوہ کسی اور تعمیری کام کی طرف توجہ دینے جیسی ضرورت پر وقت ضائع نہیں کیا، سامراجی آقاؤں سے

لئے گئے نظام سیاست نے ہمارے سیاستداں کو یہ تحفظ بھی فراہم کیا کہ وہ ہر آنے والی قوت کے کارندے بن جاتے ہیں، خدانا خواستہ اُن پر ملک میں کوئی کڑا وقت آ بھی جائے تو امریکہ، فرانس اور دوسرے یورپی ممالک میں پناگاہیں اُن کی منتظر ہوتی ہیں جہاں وہ بڑے سکون کے ساتھ اپنے کتوں اور گھوڑوں سمیت منتقل ہو کر ملک بدری کے مزے لیتے ہیں، الغرض وہ ملک کے اندر رہیں یا ملک بدر ہوں، اُن کے آرام و سکون اور عیش و عشرت کیلئے ہر نعمت دامن پھیلائے کھڑی رہتی ہے، لیکن غریب و محکوم عوام کہاں جائیں وہ تو زندگی کا بوجھ اٹھا کر دو قدم بھی چلنے کے قابل نہیں رہے ہیں اور اب تو اُن کو اپنی ساری توانائیاں سانسوں کی ڈوری قائم رکھنے کیلئے صرف کرنا پڑتی ہیں، عجیب حال ہے عوام جس قدر بدامنی، مہنگائی، بے روزگاری اور بدعنوانی کے ہاتھوں نیم جاں ہیں، یہ مراعات یافتہ طبقہ اُسی قدر خوش باش اور توانا دکھائی دیتا ہے، عوام کا خون نچوڑ کر اپنے مفادات کے عالیشان محل تعمیر کرنے والے قوم کے وسائل کو اپنے لئے شیر مادر سمجھتے ہیں، اِن تمام تلخ حقیقتوں کے باوجود سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اِن لیڈروں کو بار بار ملک و قوم کی تقدیر کے ساتھ کھیلنے کے موقعہ کون دیتا ہے، کیا ہمارا ووٹ انہیں ایوان اقتدار تک پہنچانے کا باعث نہیں بنتا، ایک دو بار نہیں قوم اپنے ساتھ پچھلے 62 سالوں سے یہ مذاق خود کر رہی ہے، بات طبقاتی اونچ نیچ اور اقتصادی تفاوت تک محدود رہتی تو کسی حد تک قابل برداشت ہوتی لیکن اب تو بات اِس حد تک آگے بڑھ چکی ہے کہ

ہماری بقاء و سلامتی بھی خطرے میں پڑی ہوئی ہے، دشمن ہماری طاق میں ہے، وہ ہمیں تباہ و برباد کرنے پر تلا ہوا ہے، ملک کے دو صوبے آگ و خون کی لپیٹ میں ہیں، لاکھوں افراد اپنے گھروں سے دور کھلے میدانوں میں بے یارو مددگار بے سرو سامانی کے عالم میں پڑے ہوئے ہیں، غربت و بھوک اور بے روزگاری کی یہ حالت ہے کہ غریب اپنے معصوم بچوں کے دامن میں برائے فروخت کے بورڈ آویزاں کرنے پر مجبور ہیں، روپے پیسے کی حرص میں بچوں اور خواتین کی اسمگلنگ تو رہی ایک طرف اُن کے گردے اور دیگر اعضاء بیچے جارہے ہیں، بدامنی اور انارکی کی حالت یہ ہے کہ لوگ گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھتے ہوئے سو بار سوچتے ہیں، اندرونی اور بیرونی دباؤ کی وجہ سے حکومت کے ستون ڈگمارہے ہیں، ہر آنے والے دن کے ساتھ خطرات بڑھتے جارہے ہیں، یہی حال دنیا بھر میں مسلمانوں کا ہے جو ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے ہیں، اسلامی تہذیب و ثقافت کی دھجیاں اڑائی جارہی ہیں، قوانین الٰہیہ کے ساتھ مذاق ہو رہا ہے، لیکن ہمارے سیاسی رہنماؤں نے قوم کو سوئے حرم متوجہ کے بجائے امریکہ کو اپنا قبلہ و کعبہ بنالیا ہے۔

اس تناظر میں آج عید کا دن ہمیں دعوت فکر و عمل دے رہا ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے پیکر تسلیم و رضا بن کر اعلائے کلمۃ اللہ کیلئے جو قربانی دی تھی اُس سلسلے کو جاری رکھا جائے اور تمام دینوی حرص و لالچ، جاہ و منصب

اور دولت و ثروت کے بتوں کو مثل خلیل توڑ دیا جائے۔ آج پاکستان اور دین اسلام کو اسی طرح کی قربانی درکار ہے۔ ہمیں اپنے دائرہ کار اور اختیار کے مطابق اپنی اپنی ذمہ داریاں ادا کرنا ہونگی اور بحیثیت مسلمان اِس ذمہ داری سے ہم کسی طور بھی بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ آج پھر صنم کدہ جہاں میں غیرت ابراہیمی کی ضرورت ہے۔ باطل سامراج کی شکل میں ہزاروں نمرود وقت حق کے متوالوں کو للکار رہے ہیں اور پوچھ رہے ہیں کہ کون ہے جو عشق کی راہ میں جان و مال کی قربانی پیش کرنے کیلئے آتش نمرود میں بے خطر کودنے کو تیار ہے۔ عید قرباں کے یہ لمحے اپنے پس منظر اور پیش منظر میں اُسی قربانی کا پیغام رکھتے ہیں۔ جس کی ابتداء سیدنا اسماعیل اور انتہا سیدنا امام حسین علیہ السلام نے کی۔ آج عرفات کے رہگزاروں سے لے کر میدانِ کربلا ذروں تک سے یہ آواز مسلسل آرہی ہے کہ چاہے تمہارے سامنے آتش نمرود کے آلاؤ آئیں ...یا... یزیدی فوج کے لشکر.... نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماننے والے ....غلاموں.... جاگو.... اٹھو.... اور ایمان اور تقویٰ کے ہتھیاروں سے لیس ہوکر دین کی دشمن قوتوں کو للکارو۔ اپنے ذاتی مفادات کی قربانی دیتے ہوئے قافلہ حق میں داخل ہوکر باطل کے سامنے ڈٹ جانے کیلئے تیار ہوجاؤ کیونکہ یہی رمز مسلمانی اور اُمت کے درد کا اصل درماں ہے۔

عوام کبھی جھوٹ نہیں بولتے

برطانیہ کی تاریخ میں یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا، پچھلی تین سو سالہ تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی اسپیکر کو اپنے عہدے سے استعفٰی دینا پڑا ہو، لیکن 21 جون 2009ء کو برطانوی پارلیمانی تاریخ کی تین سو سالہ روایت اس وقت ٹوٹ گئی جب مائیکل مارٹن کو پارلیمنٹ پر عوام کے اعتماد کو متزلزل ہونے سے بچانے کے لئے اسپیکر کے عہدے سے استعفٰی دینا پڑا، مائیکل مارٹن پچھلے تیس سالوں سے برطانوی پارلیمنٹ کا اسپیکر چلا آرہا تھا، حیران نہ ہویئے کیونکہ برطانیہ دنیا کا وہ ملک ہے جہاں اسپیکر تا زندگی اپنے عہدے پر فائز رہتا ہے، وہ اپنے حلقہ انتخاب سے بلامقابلہ منتخب ہوتا ہے اور کوئی سیاسی جماعت اس کے مقابلے میں اپنا امیدوار کھڑا نہیں کرتی، کیونکہ یہ اس عہدے کے غیر جانبدار ہونے کا ایک ثبوت ہے۔
قارئین محترم اسپیکر کا جرم کیا تھا جس نے اس کی تیس سالہ دیانت، ایمانداری اور غیر جانبداری پر پانی پھیر دیا، کیا مائیکل مارٹن لوٹ مار، کرپشن اور ناجائز ذرائع سے مال و دولت بنانے میں ملوث تھا، یا کسی بدکرداری نے اس کے دامن کو داغدار کردیا تھا، درحقیقت ایسا کچھ بھی نہیں تھا، مائیکل مارٹن

کے استعفیٰ کی وجہ لوٹ مار، کرپشن یا بد کرداری نہیں بلکہ وہ پارلیمانی اسکینڈل ہے جسے برطانوی وزیراعظم گورڈن براؤن نے پچھلی دو صدیوں کا سب سے بڑا پارلیمانی اسکنڈل قرار دیا ہے اور جس میں برطانوی اراکین پارلیمنٹ پر الزام ہے کہ انہوں نے ٹیکس دہندگان کے خون پسینے کی کمائی کا غلط استعمال کیا ہے، گو کہ اسپیکر مائیکل مارٹن خود اس جرم میں ملوث نہیں تھا لیکن اسے اراکین پارلیمنٹ کے ٹیکس دہندگان کے خون پسینے کی کمائی کے غلط استعمال اور اس غفلت کا ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا تھا، چنانچہ مائیکل مارٹن نے تحریک عدم اعتماد سے بچنے کے لئے اپنے اس عہدے سے مستعفی ہوجانا بہتر سمجھا جس پر وہ گزشتہ تیس سال سے فائز تھا اور یوں اسے دوسرے ارکان پارلیمنٹ کی غلطیوں کی سزا بھگتنا پڑی۔

یہاں یہ امر پیش نظر رہے کہ برطانوی اراکین پارلیمنٹ کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے رکن پارلیمنٹ کی حیثیت سے حاصل مراعات کا غلط استعمال کیا، ان پر الزام تھا کہ انہوں نے اپنے گھروں کی صفائی ستھرائی اور باغبانی کی مد میں ضرورت سے زائد اخراجات کئے ہیں، جبکہ برطانیہ میں رکن پارلیمنٹ کے لئے گرین بک میں اس طرح کے الاؤنس اور اخراجات کے حوالے سے کوئی حد مقرر نہیں ہے، جس کی وجہ سے صفائی ستھرائی اور باغبانی کی مد میں زیادہ رقم وصول کرکے اراکین کسی ملکی قانون کی خلاف ورزی کے مرتکب نہیں ہوئے تھے، لیکن ایک ایسے

ملک میں جہاں اخلاقی قدریں ہی آئین کا درجہ رکھتی ہیں، انہیں اس قدر زبردست عوامی ردعمل کا سامنا کرنا پڑا کہ احساس ندامت میں نہ صرف وزراء نے اپنے استعفے دے دیئے بلکہ ایک سو سے زائد اراکین اسمبلی بھی آئندہ الیکشن نہ لڑنے کا اعلان کرچکے ہیں۔

یہ دنیا کی وہ پارلیمنٹ ہے جس نے اخلاقی روایات کو مقدم جانتے ہوئے کسی قانون اور کسی آئینی ترمیم کا سہارا لینے کی بجائے اپنی اصلاح کرنے کی کوشش کی، جبکہ یہ کوئی اتنا بڑا مالیاتی اسکینڈل بھی نہیں تھا کہ جس میں اربوں، کھربوں کا فراڈ کیا گیا ہو، مگر پھر بھی برطانوی وزیراعظم گورڈن براؤن نے زائد اخراجات کے اسکینڈل کے سامنے آتے ہی ایک آزاد آڈیٹر کا تقرر کیا، جس کی سفارشات پر طے ہوا کہ وہ تمام اراکین پارلیمنٹ جنھوں نے اپنے گھروں کی صفائی کی مد میں دو ہزار پاؤنڈ سالانہ اور باغبانی کی مد میں ایک ہزار پاؤنڈ سالانہ سے زائد کے اخراجات کیے ہیں، وہ یہ تمام اضافی رقم واپس قومی خزانے میں جمع کروائیں گے۔

چنانچہ ان سفارشات کا شکار قائد حزب اختلاف ڈیوڈ کیمرون، بچوں کی نگہداشت کے وزیر ای ڈی بالز اور خود وزیراعظم گورڈن براؤن بھی ہوئے اور انہیں بالترتیب دو سو انیس پاؤنڈ، تیرہ پاؤنڈ اور بارہ ہزار چار سو پندرہ پاؤنڈ

کی رقوم قومی خزانے میں واپس جمع کرانی پڑی، قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ بات یہاں پر ختم نہیں ہوئی بلکہ ایک آزاد پارلیمانی اسٹینڈرڈ اتھارٹی کے تحت جو کمیٹی قائم کی گئی اس کی سفارشات کو جس کے مطابق" آئندہ کوئی رکن پارلیمنٹ اپنے گھروں کے لئے صفائی، باغبانی اور تزئین و آرائش کے اخراجات کو کلیم ہی نہیں کرسکے گا"کو برطانیہ کی تینوں بڑی جماعتوں کے سربراہان گورڈن براؤن، ٹوری پارٹی کے ڈیوڈ کیمرون اور لبرل ڈیموکریٹس کے نک لیگ نے خوشدلی قبول کیا۔

قارئین محترم یہ تھا وہ پارلیمانی اسکینڈل، جس میں کوئی اربوں اور کھربوں ڈالر کا معاملہ نہیں تھا، بلکہ ایک ملین پاؤنڈ سے بھی کم کے کلیم شدہ اخراجات کا سوال تھا، لیکن اسے بھی باعث شرم و ندامت سمجھا گیا، یہ ہے جدید دنیا کا وہ مہذب ملک جہاں اصلاح احوال کی سنجیدہ کوششیں کی جاتی ہیں، جہاں قیادت ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی قانون اور چور راستوں کا سہارا لینے کی کوشش نہیں کرتی بلکہ اخلاقی ذمہ داری کو افضل سمجھتے ہوئے اس کے سامنے سرتسلیم خم کر دیتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کسی مہذب ملک کی قومی زندگی میں وقوع پذیر ہونے والے حالات اور ایسے ہی واقعات جہاں تاریخ توڑتے ہیں وہیں وہ نئی تاریخ رقم کرتے اور ایک

روشن مستقبل کی بنیاد بھی رکھتے ہیں، دنیا میں قوموں کی آبرو دستور کی پاسداری سے ہوتی ہے اور ریاستوں کی قوت کا سرچشمہ عوام ہوتے ہیں، جب آئینی جمہوریت کا شیرازہ بکھر جائے اور نظام مملکت کسی شخص کی افتاد طبع اور خواہش نفس کا غلام بن جائے تو نہ ملک آبرومند ہوتے اور نہ ہی قومیں دنیا میں سربلند ہوتی ہیں۔

آج برطانیہ سمیت دنیا کی بہت سے ممالک یہ راز جان چکے ہیں کہ حکومتیں عدل و انصاف اور عوامی تائید وحمایت کے بغیر نہ تو کامیاب ہو سکتی ہیں اور نہ ہی قائم رہ سکتی ہیں، لیکن افسوس ہم اسلامی تعلیمات، ثقافت اور روایات کے امین ان سنہری اصولوں سے کوسوں دور ہیں، ہمارے یہاں ایسا نہیں ہوتا، اخلاقی قدریں کیا ہوتی ہیں، مذہبی اقدار کیا ہیں، آئین قانون اور منصب کے تقاضے کیا کہتے ہیں، ہمارے ارباب اقتدار کا اس سے کوئی سروکار نہیں، ہمارا تو حال یہ ہے، این آر او کے تحت فائدہ اٹھانے والے افراد جن میں سیاستدانوں، اعلیٰ سول و فوجی حکام اور حکمران جماعت کے علاوہ 8041 اس کے اتحادیوں سمیت مختلف سیاسی جماعتوں کے ارکان شامل ہیں، ایک سعید مہدی کے سوا کوئی دوسرا کوئی فرد ہی نہیں ہے، جس نے اپنے ضمیر کے بوجھ یا اپنی مذہبی، اخلاقی اور آئینی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پسند کیا ہو۔

یہاں تو حال یہ ہے کہ ہمارے وزراء عدالتوں میں اپنے اوپر لگے ہوئے الزامات کا سامنا
کرنے کے بجائے اپنے خلاف الزامات کو بے بنیاد قرار دے کر کمال ڈھٹائی سے کہتے ہیں
کہ" ہم پر الزامات ہی تو ہیں، کونسا ثابت ہو گئے، استعفےٰ نہیں دے سکتے، وغیرہ غیرہ"
جبکہ دوسری طرف صدر مملکت کی ذات کو آئینی تحفظ حاصل ہے، لیکن صدر کی ذات کو
یہ تحفظ اور حکومتی ارکان کا انکار بے معنی اور انہیں اس وقت تک الزامات سے بری
الذمہ قرار نہیں دے سکتا، جب تک کہ وہ اپنے آپ کو احتساب کیلئے کسی عدالت کے
روبرو پیش نہ کریں، کوئی لاکھ کہتا رہے کہ اس پر عائد الزامات بدنیتی پر مبنی تھے، لیکن
حقیقت یہ ہے کہ عوام کی رائے اور تاثر اس سے مختلف ہے، این آر او زدہ افراد اس
حقیقت سے آنکھیں چرا رہے ہیں کہ وہ عوام کا اعتماد کھو چکے ہیں، وہ اس حقیقت کو بھی
نظر انداز کر رہے ہیں کہ حکمرانوں کی اصل طاقت ملک کے عام شہری اور عوام ہوتے
ہیں، اگر خلق خدا حکومت اور اپنے حکمرانوں سے مطمئین ہے تو وہ حکومت مضبوط بھی
ہے اور کامیاب بھی، لیکن اگر عام شہری اور ملک کے عوام حکمرانوں سے مطمئین نہیں تو
دنیا کی کوئی طاقت اسے اپنی آئینی مدت پوری ہونے کی ضمانت نہیں دے سکتی۔
دنیا میں وہی حکومتیں کامیاب اور اپنی مدت پوری کرتی ہیں، جسے عوام پسند

کرتے ہیں اور کامیاب قرار دیتے ہیں، عوامی تائید و حمایت سے محروم، ذاتی اغراض و مقاصد اور شخصی تحفظ اور مفاد پر مبنی حکومت زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتیں، ارسطو نے سکندر اعظم سے کہا تھا" بادشاہ کے سارے وزیر جھوٹ بول سکتے ہیں، بادشاہ کے سارے مشیر اور خادم بھی جھوٹے ہو سکتے ہیں، حتیٰ کہ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب بادشاہ خود اپنے ساتھ جھوٹ بولنے لگتا ہے، لیکن عوام کبھی جھوٹ نہیں بولتے، وہ بادشاہ کے ہر اچھے اقدام کی تعریف اور اس کی غلطی پر افسوس کرتے ہیں۔"آج پاکستان کے عوام جو کچھ کہہ رہے، وہ نوشتہ دیوار ہے، اگر ہمارے حکمران اب بھی نہ سنبھلے تو عوام کے فیصلے کا وقت، وقت سے پہلے آ سکتا ہے، موجودہ حکومت کی بقاء، قیام اور مضبوطی کیلئے عوامی اعتماد اور بھروسے کی ضرورت ہے، جو معاشرے میں انصاف کو یقینی بنانے، کرپشن، لوٹ مار اور بدعنوانی کے انسداد اور اس کے مرتکب ہر فرد کو قانون کی گرفت میں لانے اور بے لاگ احتساب کے ایک ایسے آزاد، خود مختار اور شفاف ادارے کے قیام کا متقاضی ہے جو بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے حکومتی عہدیدار، بااثر افراد اور اداروں کے خلاف کارروائی کرنے کا مکمل اختیار رکھتا ہو اور جس کی کریڈیبلیٹی عوام کے نزدیک مشکوک نہ ہو۔

حضرت عمر بن العزیز سے ایک علاقے کے حاکم نے اپنے شہر کی ویرانی کی شکایت کی اور امیرالمومنین سے اس شہر کو آباد کرنے کیلئے مالی امداد کیلئے لکھا،

عمر بن عبدالعزیز نے حاکم کو جواب میں لکھا "جب تم میرا خط پڑھو تو اپنے شہر کو عدل و انصاف کے ذریعے سے محفوظ کردو اور شہر کے راستوں سے ظلم وزیادتی دور کردو، کیونکہ ظلم وزیادتی اور بے انصافی ہی شہر کی ویرانی کا اصل سبب ہے۔" درست یہی ہے کہ جس طرح "ملک لشکر کے بغیر، لشکر مال کے بغیر، مال شہروں کے بغیر، شہر عوام کے بغیر اور عوام انصاف کے بغیر نہیں۔" بالکل اسی طرح جوابدہی اور احتسابی عمل سے مبرا کوئی حکومتی رکن اور حاکم نہیں ہو سکتا۔

حکومت مضبوط اور جمہوریت کیلئے کوئی خطرہ نہیں

خوش فہمی کے سنہری خواب اور خود فریبی کے رنگین سپنے۔۔۔۔

خوش فہمی کے سنہری خواب اور خود فریبی کے رنگین سپنے انسان کو فہم و ادراک کی صلاحیت سے محروم اور اس کی سوچنے، سمجھنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت کو ماؤف کردیتے ہیں، اس مرض میں مبتلا شخص کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اسے نظر آنے والے منظر کی حقیقت کیا ہے، پیش منظر اتنا حسین، خوبصورت اور دلکش ہوتا ہے کہ پس منظر میں پوشیدہ چیختے چلاتے اور چنگھاڑتے طوفان اور جنم لینے والے خوفناک حادثے اس کی نظروں سے اوجھل اور پوشیدہ رہتے ہیں، اسے تو بس سب کچھ اچھا، صحیح اور درست معلوم ہوتا ہے، نگاہوں کے سامنے سے خوش فہمی اور خود فریبی کا پردہ ہٹتے ہٹتے اتنی دیر ہوچکی ہوتی ہے کہ سوائے کف افسوس ملنے کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

بدقسمتی سے ہمارے ارباب اقتدار آج اسی بیماری میں مبتلا نظر آتے ہیں، خوش فہمی اور خود فریبی انہیں سمجھارہی ہے کہ سب کچھ ٹھیک اور اچھا ہے" حالات کنٹرول میں ہیں، ہم درست اور صحیح سمت میں گامزن ہیں، صدر کے ساتھ بہترین

ورکنگ ریلیشن اور اعتماد کا رشتہ قائم ہے اور اختلافات کی خبریں بے بنیاد ہیں، ہر تین ماہ بعد حکومت کے خاتمے کی باتیں محض اسپیڈ بریکر ہیں جن کا مقصد ہماری ہمت کو کم کرنا ہے، پونے دوسال گزر چکے ہیں، حکومت مضبوط ہے اور جمہوریت کو کوئی خطرہ نہیں، صدر کو خوامخواہ تنقید کا نشانہ بنایا جارہا ہے، نہ ہی صدر جانے والے ہیں اور نہ ہی کوئی بڑی تبدیلی آنے والی ہے، ہم کسی سے ڈرنے والے نہیں، ہم نے ہر دور میں "اسٹیبلشمنٹ اور حکومت مخالف قوتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے اور آج بھی کر رہے ہیں۔

ارباب اقتدار کے یہ بیانات دراصل اسی کیفیت کے عکاس ہیں جس کا اظہار ہم اوپر کر چکے ہیں، درحقیقت یہ بیانات اندورن خانہ "ہیں کواکب کچھ اور نظر آتے ہیں کچھ اور" کی چغلی کھاتے ہیں، جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ٹھیک کو کبھی ٹھیک کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی، کیونکہ ٹھیک اور صحیح وہی ہوتا ہے جسے عوام اور خلق خدا درست سمجھتی ہے، اگر مملکت کی عوام حکومتی اقدامات اور کارکردگی سے مطمئین ہیں تو حکومت کامیاب اور مضبوط ہے، لیکن اگر عوام مطمئین نہیں تو آپ کا یہ کہنا کہ حکومت مضبوط اور جمہوریت کو کوئی خطرہ نہیں سوائے خود فریبی اور خوش فہمی کے اور کچھ نہیں، آج مملکت کے عوام اپنے ارباب اختیار کی پالیسیوں اور طریقہ کار سے کتنے مطمئین ہیں اسے کسی اظہار کی ضرورت نہیں، صرف یہ کہہ دینے سے کہ ایک چینل اور اخباری گروپ حکومت

گرانے کی سازش کر رہا ہے، حقائق کو جھٹلایا اور بدلا نہیں جاسکتا ہے۔

اس وقت حالات کے تیزی سے بدلتے ہوئے منظر نامے طرح طرح کے سوالات اور شکوک و شبہات کو جنم دے رہے ہیں، اب تو بین الاقوامی میڈیا بھی حکومتی پالیسی اور کارکردگی پر حرف اٹھا رہا ہے اور اسے غیر تسلی بخش قرار دے کر نئی نئی کہانیاں سنا رہا ہے، ایک اخباری رپورٹ کے دعوٰی کے مطابق زرداری حکومت خاتمے کے قریب پہنچ چکی ہے اور امریکا صدر زرداری کی اقتدار پر کمزور ہوتی ہوئی گرفت پر انتہائی پریشان ہے، مشہور امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ زرداری کی سیاسی کمزوریاں پاک، امریکی تعلقات کے لئے اضافی خطرہ ہیں، اوباما انتظامیہ کو خدشہ ہے کہ زرداری کی پوزیشن کمزوری کی طرف گامزن رہے گی اور اگر وہ اپنا عہدہ بچانے میں کامیاب ہو بھی گئے تو صرف علامتی صدر بن کر رہ جائیں گے، کیونکہ فوج انہیں پسند نہیں کرتی جبکہ اپوزیشن اور اپنے وزیر اعظم کی طرف سے بھی انہیں چیلنجز درپیش ہیں، این آر او کا قانون بھی اٹھائیس نومبر کو ختم ہوچکا ہے اور صدر کو بدعنوانی کے الزامات کا بھی سامنا ہے، اس کے ساتھ انہیں منتخب حکومت کی برطرفی اور اعلیٰ فوجی قیادت کی تقرری کے اختیارات سے محرومی کا چیلنج بھی درپیش ہے۔

واشنگٹن پوسٹ نے صدر کی جانب سے نیشنل کمانڈ کونسل کی سربراہی وزیراعظم کے

سپرد کئے جانے کو ایک بڑا واقعہ قرار دیتے ہوئے اسے صدر زرداری کی کمزوری سے تعبیر کیا، نیویارک ٹائمز نے بھی اپنی رپورٹ میں تقریباً ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صدر آصف علی زرداری کی کمزوری نے افغانستان میں درپیش مسائل کو مزید پیچیدہ کر دیا ہے، صدر زرداری اس وقت اتنے کمزور ہیں کہ ان کی حکومت ختم ہوتی نظر آ رہی ہے، صدر کا نیشنل کمانڈ اتھارٹی کی سربراہی وزیر اعظم کے سپرد کرنے کا اقدام بظاہر مواخذے یا عدالتی کارروائی سے بچنے یا کم از کم صدر کے عہدے پر فائز رہنے کی کوشش نظر آتا ہے، ایک امریکی عہدیدار کا کہنا ہے کہ سب کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور حقیقی خدشات موجود ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ کچھ عرصہ سے بالخصوص صدر آصف علی زرداری کی ذات کے حوالے سے جو افواہیں گردش کر رہی ہیں اور متعدد "مائنس" فارمولوں کے تذکرے زبانِ زد عام ہیں اس سے اس تاثر کو تقویت ملتی ہے کہ زیر گردش مجوزہ فارمولوں کے حوالے سے دال میں کچھ کالا ضرور ہے، آج قومی اور بین الاقوامی میڈیا کے خدشات، ملک میں گردش کرتی ہوئی افواہیں اور غیر یقینی سیاسی صورتحال کی بنیادی وجہ حکومت کی قومی مسائل، انتخابی ایجنڈے اور آئین و قانون پر عمل درآمد سے گریز اور صرف نظر ہے، گزشتہ پونے دو سال کے دوران موجودہ حکومت نے جمہوری نظام کو پروان چڑھانے، قومی ایجنڈے کو آگے بڑھانے

اور جمہوری قوتوں کے تعاون سے اداروں کو مضبوط بنانے کی کوئی شعوری کوشش نہیں کی اور نہ ہی معزول ججز کی بحالی، میثاق جمہوریت، پارلیمانی بالادستی، لوڈشیڈنگ سے نجات کے وعدے، پرویز مشرف کے ٹرائیل، کیری لوگر بل اور اب این آر او، ان میں سے کسی ایک بھی مسئلے کو حقیقی اسپرٹ کے ساتھ حل کرنے کی جانب قدم بڑھایا بلکہ وقتاً فوقتاً ایسے ایشوز جو قومی، سیاسی اور جمہوری نظام کیلئے ہی نہیں بلکہ ملک اور قوم کے مجموعی مفادات سے بھی متصادم تھے، میں الجھ کر اپنے آپ کو بھی کمزور کیا۔
یوں 17 ویں ترمیم کے خاتمہ میں ٹال مٹول، ججز کی بحالی سے اجتناب، این آر او کے تحت مراعات یافتہ افراد کے تحفظ اور پرویز مشرف دور کی امریکہ نواز پالیسیوں کو جاری رکھنے اور کرپشن و بے ضابطگی جیسے سنگین واقعات کو سنجیدگی سے نہ لینے کی وجہ سے صرف پونے دو سال کے عرصہ میں مائنس ون، تھری، فائیو اور آل جیسے فارمولے منظر عام پر آئے اور کیری لوگر بل کی قبولیت کے علاوہ این آر او کی منظوری پر اصرار اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے موجودہ سسٹم کے چل چلاؤ کی باتیں ہونے لگیں، حالانکہ اگر حکومت چاہتی اور سنجیدگی سے کوشش کرتی تو یہ مسائل ابتدائی مراحل میں حل کرکے مضبوط سیاسی و جمہوری نظام کی بنیاد رکھی جا سکتی تھی، جس کے بعد حکومت یکسوئی سے مہنگائی، بے روزگاری، کرپشن، لوڈشیڈنگ، دہشت گردی اور دیگر عوامی مسائل پر قابو پا سکتی تھی، لیکن

ایسا نہیں ہوا۔

اٹھارہ فروری 2008ء کے انتخابات میں عوام نے جرنیلی آمریت اور اسکے تمام ساتھیوں کو مسترد کرکے نئی حکومت کے ساتھ جو توقعات وابستہ کی تھیں، وہ نہ صرف پوری نہیں ہوسکیں بلکہ انکے معاشی، اقتصادی حالات بھی مزید دگرگوں ہوگئے، آج امن وامان کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہے، لوگوں کیلئے آٹا، چینی اور روزی روزگار کا مسئلہ بھی سنگین ہوگیا ہے، غربت اور پسماندگی پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی ہے، بیروزگاری، بھوک اور افلاس کے ہاتھوں تنگ آکر لوگ خودکشیاں کررہے یا اپنے جگر کے ٹکڑوں کو فروخت کررہے ہیں، گڈ گورننس کی یہ حالت ہے کہ کہیں بھی حکومت اور حکومتی رٹ نظر ہی نہیں آتی، گویا موجودہ جمہوری نظام میں عوام کیلئے سکھ کا سانس لینا بھی دشوار ہوچکا ہے، اگر قومی مسائل پر ڈیڑھ سال سے جاری خوشنما بیانات، کبھی نہ پورے ہونے والے وعدوں اور لایعنی دعوؤں سے مسائل حل ہونے ہوتے تو آج یہ صورتحال نہیں ہوتی۔

چنانچہ اس غیر یقینی حالات میں اگر عوامی اضطراب کی بنیاد پر افواہوں کی صورت میں زیر گردش منفی مثبت فارمولوں میں صدر زرداری کو اپنی پارٹی کی حکومت کیخلاف کسی سازش کی بو محسوس ہو رہی ہے تو انہیں قربانیاں دینے کا دعویٰ کرنے کے بجائے، سنجیدگی سے جائزہ لینا چاہئے کہ انکی پارٹی کے اقتدار

کیخلاف عوامی اضطراب کی نوبت کیوں آئی ہے اور اس میں انکے اپنے ساتھیوں اور پالیسیوں کا کتنا کردار اور عمل دخل ہے۔ بلاشبہ سسٹم کو بچانے کی ذمہ داری جمہوریت کا درد رکھنے والی تمام سیاسی جماعتوں پر عائد ہوتی ہے جس کیلئے وہ یکسو بھی ہیں مگر اس سسٹم کو قومی امنگوں کا ترجمان اور عوام کے دکھوں کے مداوا کا باعث بھی تو ہونا چاہئے، اگر تمام سہولتیں اور مراعات اقتدار کے ایوانوں میں نظر آئیں اور حکمرانوں کو اقتدار کے ایوانوں میں لانے والے عوام بھوکے مریں، دربدر کی ٹھوکریں کھائیں اور ملک کی آزادی و خودمختاری بھی خطرے میں پڑی ہو تو عوام کی ترجمانی کے دعویدار سیاسی قائدین چاہیں بھی تو خود کو اس صورتحال سے الگ نہیں کر سکتے۔

اس لئے حکمرانوں کی اپنی پالیسیوں کا پیدا کردہ موجودہ عوامی اضطراب اگر بقول صدر زرداری پیپلزپارٹی کی حکومت اور سسٹم کیخلاف سازش ہے تو انہیں خود فیصلہ کرلینا چاہئے کہ اس کی اولین ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے، انہیں الزام تراشی کے بجائے اصلاح احوال کی کوششیں اور اپنی پارٹی کی حکومت کو گڈ گورننس کی مثال بنانا چاہئے، کیونکہ اپنے طرز حکمرانی میں موجود تمام خامیوں کو دور کرکے ہی جمہوری نظام کے استحکام کو یقینی بنایا جاسکتا ہے، بصورت دیگر انہیں پتے ٹوٹنے کی آوازیں اور ہوا کی کسی سرسراہٹ سے بھی اپنے اور اپنی پارٹی کے اقتدار کیلئے خطرات محسوس ہوتے رہیں گے، حقیقت یہ ہے کہ

موجودہ جمہوری نظام کو غیر مستحکم کرنے کا کام کسی اخباری گروپ یا چینل نے نہیں بلکہ موجودہ حکمرانوں نے خود انجام دیا ہے۔ اگر اخباری گروپ، میڈیا یا چینلز حکومت بنا اور گرا سکتے ہیں تو ماننا پڑے گا کہ پرویز مشرف کی وردی کا اترنا، اقتدار سے جانا، 18 فروری کے الیکشن کا ہونا، پیپلز پارٹی کی حکومت کا بننا اور ججز بحالی سمیت تمام معاملات اس ہی کے مرہون منت ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ ٹرخالوجی اور لٹکالوجی کلچر اپنانا، عہد شکنی اور بار بار وعدوں سے انحراف، عوام کے بنیادی مسائل سے صرف نظر، کیری لوگر بل اور این آر او پر قوم کو اندھیرے میں رکھنے کی کوششیں اور قومی مفادات کو لاحق سنگین خطرات جیسے مسائل میڈیا کے پیدا کردہ نہیں، بلکہ حکمرانوں کے اپنے پیدا کردہ ہیں، میڈیا تو وسیع تر قومی اور عوامی مفاد میں ان حقائق کو منظر عام پر لایا ہے، الہذا عقل و دانش کا تقاضہ یہ کہتا ہے کہ آئینہ توڑنے کے بجائے اپنا چہرہ سنوارنے کی کوشش کی جائے، حکمران خوش فہمی اور خود فریبی کے خول سے باہر نکلیں، حقائق کا ادراک کریں اور اپنے دستر خوانی مشیروں کے بجائے حکمرانوں کی اصل قوت اور طاقت عوام سے پوچھیں کہ کیا وہ حکومت اور حکمرانوں سے مطمئین ہیں، اگر ہیں تو سمجھ لیجئے کہ حالات کنٹرول میں ہیں، ملک درست سمت میں گامزن ہے، صدر اور وزیر اعظم میں اختلافات کی خبریں بے بنیاد ہیں، کوئی بڑی تبدیلی نہیں آنے والی ہے اور واقعی حکومت کامیاب مضبوط

اور جمہوریت کیلئے کوئی خطرہ نہیں۔۔۔۔

علامہ شاہ احمد نورانی، سقوط ڈھاکہ اور قادیانی سازشیں

ہماری سیاہ تاریخ کا ایک روشن کردار

انیس سو ستر کے الیکشن کے نتائج کے نتیجے میں عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں 169 نشتوں میں سے 167 نشستیں حاصل کیں جو تمام کی تمام مشرقی پاکستان کی تھیں، شیخ مجیب الرحمٰن کا مغربی پاکستان میں کوئی ووٹ نہیں تھا، جبکہ دوسری طرف مغربی پاکستان کی 144 نشتوں میں سے پیپلز پارٹی 86 نشستیں حاصل کرکے مغربی پاکستان کی ایک بڑی پارٹی بن گئی تھی، جس طرح عوامی لیگ کا مغربی پاکستان میں کوئی ووٹ نہیں تھا، بالکل اسی طرح پیپلز پارٹی کا مشرقی پاکستان میں کوئی ووٹ کوئی سیٹ نہیں تھی، قومی اسمبلی کے 313 نشتوں کے ایوان میں عوامی لیگ 167 نشتوں کے ساتھ اکثریتی پارٹی بن کر سامنے آئی تھی، یہ منظر خطرے کی نشاندہی کررہا تھا، اکثریتی پارٹی ہونے کی وجہ سے اصولی طور پر اقتدار شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ کو منتقل کیا جانا چاہیے تھا، لیکن یحیٰی خاں اقتدار مجیب الرحمٰن کو منتقل کرنا نہیں چاہتے تھے، وہ جان بوجھ کر اقتدار کی منتقلی میں تاخیر کرکے رہے تھے، جس کی وجہ سے مشرقی پاکستان کے حالات جو پہلے ہی حکمرانوں کی متعصبانہ پالیسیوں کی وجہ سے اچھے

نہیں تھے مزید خراب ہو رہے تھے اور ہر آنے والے دن کے ساتھ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان سیاسی اختلافات کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی جارہی تھی۔

یہ صورتحال ملک کی سالمیت، وحدت اور قومی یکجہتی کیلئے خطرناک تھی، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اقتدار پرست حکمران اپنے غیر ملکی آقاؤں کے اشارے پر اقتدار کی منتقلی میں تاخیری حربے استعمال کرکے مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا جواز پیدا کر رہے تھے، جبکہ حضرت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی ایم، ایم، احمد کی غلط منصوبہ بندی کی وجہ سے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے خطرے کی نشاندہی پہلے ہی کرتے ہوئے کہہ چکے تھے کہ " ایم، ایم احمد کی تعصّبانہ اقتصادی پالیسیوں کی وجہ سے ملک ٹوٹ جائے گا، لہٰذا ایم، ایم احمد کو فوری طور پر حکومت سے علیحدہ کیا جائے" آپ نے یہ انکشاف بھی کیا تھا کہ نئی دہلی اور تل ابیب میں پاکستان توڑنے کیلئے ایک خوفناک سازش تیار کی گئی ہے اور ایم، ایم احمد سامراجیوں کی طرف سے پوری سرگرمی سے اس میں ملوث ہیں، ایم،ایم، احمد (جو کہ مرزا غلام احمد قادیانی کا پوتا تھا) نے اس سازش میں مرکزی کردار ادا کیا، اس نے حکومت پاکستان کے فنانس سیکرٹری، مالی مشیر، اور منصوبہ بندی کمیشن کے ڈپٹی چیرٔمین کی حیثیت سے مشرقی پاکستان کو مصیبت زدگان کی سرکاری امداد سے بھی محروم رکھا، اس نے بنگالیوں کو معاشی بدحالی اور مہنگائی کے ہاتھوں اتنا بے بس کردیا کہ انہیں

پاکستان سے علیحدگی میں اپنے مسائل کا حل نظر آنے لگا، دراصل قادیانی مشرقی پاکستان کو پاکستان سے علیحدہ کروانا چاہتے تھے، کیونکہ جب تک مشرقی پاکستان پاکستان سے علیحدہ نہیں ہوتا، قادیانیوں کیلئے پاکستان میں اقتدار کا سوال خارج از امکان تھا۔
جب کہ دوسری طرف مشرقی پاکستان کی عوام کی اکثریت اور شیخ مجیب الرحمٰن ان کے مذموم عزائم اور حرکات کو بھانپ چکے تھے، دسمبر 1970ء کے جنوری 1971ء کے دوران صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے انتخابات کے بعد محب وطن سرکردہ مذہبی و سیاسی رہنماؤں نے پاکستانی سیاست میں قادیانی اور صہیونی دخل اندازی کی بھرپور مذمت کی، جمعیت علمائے پاکستان کے پارلیمانی لیڈر علامہ مولانا شاہ احمد نورانی اس میں پیش پیش تھے، آپ نے پاکستان کے خلاف قادیانی سازشوں کی مذمت کرتے ہوئے یہ الزام بھی عائد کیا کہ وہ (قادیانی) صدر پاکستان کے مشیر اقتصادیات ایم،ایم احمد کے زریعے اسرائیل سے رقومات حاصل کرتے رہے ہیں، 5فروری 1971ء کو روزنامہ جسارت کراچی آپ کے بیان کو نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ " مولانا نورانی نے کہا کہ اشتراکی، یہودی، فری میسن اور قادیانی پاکستان کی سالمیت اور استحکام کے خلاف سازشیں کررہے ہیں، پاکستان کے اصل دشمنوں کو بے نقاب کرنے پر وہ اتھاہ گہرائیوں سے شکریئے کے مستحق ہیں، یہ کوئی راز کی بات نہیں ہے کہ پاکستان کی سیاست میں ایک خفیہ یہودی

تنظیم تحریک فری میسنری کے تعاون سے قادیانی گھناؤنا کردار ادا کر رہے ہیں،فری میسنوں نے ایک بین الاقوامی نظام ترتیب دیا ہے، تاکہ دولت اکھٹی کی جاسکے، انھوں نے بڑے بڑے کاروباری اشخاص، بڑی کاروباری کمپنیوں کے ڈائریکٹروں، مختلف پیشہ ورانہ گروہوں کے سرکردہ لوگوں اور اعلیٰ سطح کے افسران کو مختلف لالچ دے کر اپنے زیر اثر کرلیا ہے، انھوں نے قادیانیوں کے ساتھ ان کے اسرائیلی مشن کے زریعے مضبوط تعلقات قائم کرلیے ہیں، دراصل فری میسنوں نے اپنے خفیہ ہتھکنڈوں سے پاکستان میں ایک متوازی حکومت قائم کرلی ہے، (1970ء کے) عمومی انتخابات کے دوران قادیانیوں کے اشتراک کے ساتھ انتخابی نتائج پر اثر انداز ہونے کا مکروہ کھیل کھیلا گیا ہے۔

بیس مارچ 1971ء کو آرام باغ کراچی کے جلسہ عام میں علامہ شاہ احمد نورانی نے اعلان کیا کہ "اس ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی سازش تیار ہوچکی ہے، مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنے کی تیاریاں ہورہی ہیں، اور ایم.ایم احمد قادیانی باقاعدہ یہ کہتا ہے کہ مشرقی پاکستان ہمارے لیے بوجھ ہے، اس کا علیحدہ ہونا ہی ہماری ترقی کا ذریعہ ہوگا ورنہ ہم اسی طرح تباہ ہوجائیں گے" (ماہنامہ تنظیم اہلسنّت ،اگست 1972ء بحوالہ قادیانیت کا سیاسی تجزیہ ص 985) روزنامہ مشرق لاہور نے 25 مارچ 1971 کی اشاعت میں لکھا کہ " مولانا شاہ احمد نورانی نے فرمایا عوام ملک کے اتحاد اور سالمیت کی خاطر مزید قربانیاں دینے کیلئے

تیار رہیں اور ملک کو تقسیم کرنے کی تمام سازشوں کو ناکام بنادیں، انہوں نے بتایا کہ مشرقی پاکستان کے اخبارات صدر کے اقتصادی مشیر ایم ایم احمد کی ڈھاکہ میں موجودگی پر نقطہ چینی کر رہے ہیں، انہوں نے کہا کہ مسٹر احمد اقتصادی ماہر ہیں سیاسی امور کے ماہر نہیں، اس کے باوجود مذاکرات میں صدر کے مشیر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں" (بحوالہ تحریک ختم نبوت 1974ء جلد اول ص 686

علامہ شاہ احمد نورانی کو حالات کی سنگینی کا شدید احساس تھا اور آپ جمہوری فیصلے کی روشنی میں اقتدار فوری طور پر مجیب الرحمٰن اور عوامی لیگ کے حوالے کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے، اپوزیشن کی دیگر جماعتیں جن میں ممتاز دولتانہ کی کونسل مسلم لیگ، قیوم لیگ اور نیپ بھی آپ کے اس مطالبے کی تائید کر رہی تھیں، اس مشکل صورتحال میں علامہ شاہ احمد نورانی نے جمعیت علمائے پاکستان کے پارلیمانی لیڈر ہونے کی حیثیت سے ملک کو اقتدار پرستوں کی بھینٹ چڑھنے سے بچانے کیلئے سیاستدانوں سے گفت و شنید کا سلسلہ شروع کیا، آپ 30 جنوری 1971ء کو اپنے رفقاء پروفیسر شاہ فرید الحق اور ظہور الحسن بھوپالی کے ساتھ شیخ مجیب الرحمٰن سے تبادلہ خیالات کیلئے ڈھاکہ تشریف لے گئے، اس وقت تک مجیب الرحمٰن کے پاس علیحدگی کا کوئی تصور نہیں تھا اور وہ اسمبلی کا اجلاس بلانے اور اقتدار کو اکثریتی پارٹی کو منتقل کرنے کا خواہاں تھا، ظہور

الحسن بھوپالی شہید کے مطابق "مولانا شاہ احمد نورانی اور پروفیسر شاہ فرید الحق کے ساتھ مجھے شیخ مجیب الرحمٰن سے ڈھاکہ میں ملاقات کا موقع ملا" اس ملاقات میں جو سیاسی اور دستوری معاملات زیر بحث آئے انہیں کسی اور وقت کے تذکرے کیلئے چھوڑ کر صرف اُس گفتگو کا حوالہ دے رہا ہوں جو خالصتاً مرزائیوں کے بارے میں ہوئی۔ "اس موقع پر مولانا شاہ احمد نورانی نے شیخ مجیب سے فرمایا کہ ہماری جانب سے ایک اہم مطالبہ یہ بھی ہوگا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے اور انہیں کلیدی عہدوں سے ہٹایا جائے، اس پر آپ کا کیا طرز عمل ہے، مجیب نے جواب دیا، "دیکھئے قادیانیوں کا فتنہ آپ کے علاقے ہی کا پروردہ ہے، ہمارے یہاں ڈھاکہ میں انھوں نے ایک مشن قائم کیا تھا جسے مسلمانوں کے دباؤ اور مظاہرہ کے باعث وہ خود ہی ختم کرنے پر مجبور ہوگئے، ہم نے اس فتنہ کو کہیں بھی سر اٹھانے نہیں دیا، آپ دیکھئے ایم، ایم احمد ڈھاکہ میں مارا مارا پھر رہا ہے، یہاں اس کا کوئی کام نہیں، کوئی مقصد نہیں، میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مشرقی پاکستان میں یہ (قادیانی) جانور نہیں ملتا۔" (تحریک ختم نبوت اور مولانا شاہ احمد نورانی، ظہور الحسن بھوپالی ص 10-11

مجیب الرحمٰن اور دیگر سیاسی رہنماؤں سے ملاقات کے بعد علامہ شاہ احمد نورانی نے اپنے رفقا علامہ عبدالمصطفیٰ ازہری، علامہ محمد حسن حقانی اور

ظہور الحسن بھوپالی کے ہمراہ 28۔ فروری 1971ء کو ایوان صدر کراچی میں جنرل یحییٰ خاں سے ملاقات کی، یہ آپ کی یحییٰ خاں سے پہلی ملاقات تھی۔" آپ نے انگریزی میں یحییٰ خاں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا، جناب صدر کیا آپ کو معلوم ہے کہ قادیانی مسلمانوں سے علیحدہ حیثیت رکھتے ہیں اور ان کا مشن اسرائیل میں کام کر رہا ہے، جب کہ پاکستان اور اسرائیل کے درمیان سفارتی تعلقات نہیں ہیں، قادیانی جب چاہیں جینوا کے راستے اسرائیل چلے جاتے ہیں اور پاکستان میں یہودی سرمائے کے زریعے ملکی سالمیت کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ مولانا نے یہ سوال بھی کیا جناب صدر کیا آپ کو علم ہے کہ ربوہ دراصل پاکستان کے اندر ایک آزاد ریاست کی طرح ہے، اس کی اپنی عدالتیں اور نیم فوجی تنظیم الفرقان فورس ہے،؟ یحییٰ خاں نے مولانا کے دونوں سوالات پر لاعلمی کا اظہار کیا، علامہ شاہ احمد نورانی نے یحییٰ خاں سے یہ بھی کہا کہ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ مشرقی پاکستان کے لوگ ایم۔ایم احمد سے نفرت کرتے ہیں، اگر انہیں ایم۔ایم احمد مل جائے تو اسے جلا کر اس کی خاک خلیج بنگال میں ڈال دیں، لیکن پھر بھی آپ ایم۔ایم احمد کو اپنے ساتھ مشرقی پاکستان لے جا رہے ہیں، اس کے اچھے اثرات مرتب نہیں ہوں گے، اس کے جواب میں یحییٰ خاں نے کہا کہ مجیب بھی یہی کہتا ہے، مولانا نے جب دیکھا کہ یحییٰ خاں مسئلہ کی سنگینی کو سمجھ ہی نہیں پا رہا تو وہ یہ کہہ کر خاموش ہوگئے، کہ صدر صاحب یہ ملک بڑی قربانیوں سے حاصل کیا گیا ہے، اسے اس آسانی سے ضائع

نہ کیجیے۔" (تحریک ختم نبوت اور مولانا شاہ احمد نورانی، ظہور الحسن بھوپالی ص 12-13
آپ نے یحییٰ خاں کو حالات کی سنگینی کا احساس دلاتے ہوئے فوری اسمبلی کا اجلاس بلانے
اور اقتدار عوامی نمائندوں کو منتقل کرنے کا مطالبہ کیا، جبکہ یحییٰ خاں کسی طور بھی اس پر
آمادہ نہیں تھا، اس ملاقات میں آپ کی مدلل گفتگو اور دلائل کا یحییٰ خاں کے پاس کوئی
جواب نہیں تھا، وہ کسی طرح بھی حالات کی سنگینی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا اور اس
نے یکم مارچ کو اپنی نشری تقریر میں 3 مارچ کو ڈھاکہ میں بلایا گیا قومی اسمبلی کا اجلاس
ملتوی کر دیا، علامہ شاہ احمد نورانی نے مشرقی پاکستان کے بدترین حالات اور قادیانیوں
کی پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی سازشوں سے قوم کو آگاہ کرنے کیلئے 19 مارچ
1971ء کو آرام باغ کراچی میں جلسہ عام سے خطاب کیا، "جلسہ عام سے خطاب
کرتے ہوئے آپ نے فرمایا، انگریزی استعمار کی پیداوار مرزا غلام احمد قادیانی کے
پیروکاروں نے پاکستان کے وجود کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا تہیہ کر لیا ہے، اور میں پوری
ذمہ داری کے ساتھ یہ اعلان کر رہا ہوں کہ قادیانیوں نے پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے
کرنے کا جو پروگرام ترتیب دیا ہے، اس کا پہلا مرحلہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی ہے۔
برسر اقتدار ٹولہ اور مغربی پاکستان کی اکثریتی جماعت ان کی آلہ کار بن گئی ہے، اور اب
مشرقی پاکستان کی علیحدگی

کی سازش کا آخری راؤنڈ شروع ہونے والا ہے، مشرقی پاکستان میں فوجی کاروائی کی جائے گی اور بھارت مداخلت کرے گا، اس سلسلے میں ایم،ایم احمد اور سورن سنگھ کے درمیان حال ہی میں نیویارک میں ملاقات ہوئی ہے،ایم ،ایم احمد نے گزشتہ ہفتہ کراچی میں باتھ آئی لینڈ کے ایک بنگلے میں ملک کی بعض اہم شخصیات سے ملاقات کرکے انہیں اس بات پر قائل کیا ہے، کہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان پر ایک بوجھ ہے اور اس کا آمدنی میں حصہ محض 9 فیصد ہے، قادیانیوں کا اس ضمن میں بھارت اور اسرائیل سے رابطہ ہے،" (تحریک ختم نبوت اور مولانا شاہ احمد نورانی ، ظہور الحسن بھوپالی ص 14-15

علامہ شاہ احمد نورانی قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہوتے ہی ڈھاکہ روانہ ہوگئےاور آپ نے 23 مارچ 1971ء ڈھاکہ میں قیام کیا، اس دوران آپ نے شیخ مجیب الرحمٰن سے کئی ملاقاتیں کیں اور اس بحران کا مثبت حل نکالنے کی کوششیں جاری رکھیں، ان ہی ایام میں سردار شوکت حیات، ممتاز دولتانہ، اور ولی خان بھی ڈھاکہ پہنچ چکے تھے، ڈھاکہ میں قیام کے دوران علامہ شاہ احمد نورانی کو یحییٰ خاں نے ڈھاکہ کے ایوان صدر میں ملاقات کیلئے بلایا، اس وقت وہ مے نوشی میں مصروف تھا، آپ نے اسے مے نوشی پر ڈانٹتے ہوئے کہا کہ ملک شدید قسم کے سیاسی بحران سے گزر رہا ہے اور آپ مے نوشی فرمارہے ہیں، آپ نے جام ومینا کی موجودگی میں صدر سے بات کرنے سے انکار کردیا، اس ملاقات میں آپ نے یحییٰ

خاں کو مجیب الرحمٰن سے مذاکرات کرنے اور اسے فوری اقتدار منتقل کرنے کا مطالبہ کیا اور اسے متنبہ کیا کہ اس میں تاخیر اور تساہل کی صورت میں ملک ٹوٹ جائے گا، لیکن یحییٰ خاں کسی بھی قسم کی مفاہمت پر آمادہ نہیں تھے اور ایوان صدر میں کھیلے جانے والے کھیل سے واضح ہو رہا تھا کہ پر امن اقتدار انتقال ممکن نہیں رہا ہے، حکمرانوں نے پرامن مذاکرات کا راستہ اپنانے کے بجائے بندوق کا سہارا لینے کا فیصلہ کرلیا تھا، جس کے جواب میں اہل بنگال کی جوابی نفرت اور رد عمل کا اظہار فطری تھا، چنانچہ 23 مارچ کو علامہ شاہ احمد نورانی جو ملک کے استحکام اور سالمیت کی جدوجہد میں مصروف تھے ڈھاکہ سے واپس آگئے، 25 مارچ 1971ء بعد ملک میں موجود سیاسی گھٹن کے باوجود علامہ شاہ احمد نورانی ارباب حل و عقدتک قادیانیوں کے بارے میں قوم کا مؤقف پیش کرتے رہے۔

سات اپریل 1971ء کو آپ نے یحییٰ خاں کے نام کھلا خط لکھا، جس میں مشرقی پاکستان میں کی جانے والی ناعاقبت اندیشی کا زکر کرتے ہوئے قادیانیوں اور خصوصاً ایم ایم احمد کی وطن دشمن سرگرمیوں کا بھی زکر کیا گیا تھا،" اکتوبر 1971ء میں علامہ شاہ، احمد نورانی نے ایک پریس کانفرنس کے زریعے ملک کے مسائل حل کرنے کیلئے ایک پانچ نکاتی فارمولا پیش کیا، جس کو ملک گیر پزیرائی حاصل ہوئی، آپ کے ان پانچ نکات میں قادیانی مسئلہ سرفہرست تھا۔

علامہ شاہ احمد نورانی نے کبھی بھی اس مسئلے کو پاکستان کی سالمیت سے الگ تصور نہیں کیا، بلکہ اس مسئلے کا حل پاکستان کی استحکام و سالمیت و اساس کیلئے لازمی سمجھا، آپ کے پیش کردہ وہ پانچ نکات مندرجہ زیل ہیں۔

☆اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کیا جائے۔

☆مشرقی پاکستان کے مسئلے کا سیاسی حل تلاش کیا جائے۔

☆قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔

☆قادیانیوں کو کلیدی عہدوں سے ہٹایا جائے۔

☆1954ء کے دستوری مسودہ کو دستور کی بنیاد کے طور پر اختیار کیا جائے'' ۔

(تحریک ختم نبوت اور مولانا شاہ احمد نورانی، ظہور الحسن بھوپالی ص 15)

جمعیت علمائے پاکستان کے قائد علامہ شاہ احمد نورانی پاکستان کے وہ واحد مذہبی اور سیاسی رہنما تھے، جنھوں نے قادیانیوں اور مرزائیوں کی نقاب کشائی اور محاسبے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا، آپ نے ہمیشہ اُن کی وطن دشمن سرگرمیوں پر قدغن لگانے کا مطالبہ کیا، لیکن افسوس کہ علامہ شاہ احمد نورانی کے بار بار انتباہ کے باوجود ارباب اقتدار کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی اور وہ قادیانیوں کی ایماء پر دیدہ و دانستہ ملک دشمن سرگرمیوں میں مصروف رہے، حتیٰ کہ علامہ شاہ احمد نورانی کے اندیشے درست نکلے اور دنیا نے دیکھ لیا کہ 25 مارچ 1971ء کو ہونے والی فوجی کاروائی بالآخر مشرقی پاکستان

کی علیحدگی پر مختتم ہوئی، 16 دسمبر 1971ء کا سورج مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا اعلان
لے کر طلوع ہوا اور مشرقی پاکستان ہم سے جدا ہو کر بنگلہ دیش بن گیا، پاکستان کی کم و
بیش 93,000 ترانوے ہزار فوج کو یحییٰ خاں کے غلط اقدام کے نتیجے میں المناک
حالات میں ہتھیار ڈالنے پڑے اور مشرقی پاکستان میں مسلمانوں نے جس طرح ایک
دوسرے کا خون بہایا وہ ایک دردناک داستان ہے۔
مولانا شاہ احمد نورانی فوجی حکمرانوں کو ہمیشہ ان خطرات اور المیے سے آگاہ کرتے رہے
جن کا پوری قوم کو سامنا کرنا پڑا، ان کا یہ واضح اور دو ٹوک مؤقف تھا کہ اقتدار بلا
تاخیر اکثریتی پارٹی کو منتقل کر دیا جائے اور باقی تمام معاملات قومی اسمبلی کے اندر طے
ہونے چاہئیں، یہ مولانا شاہ احمد نورانی ہی تھے جنہوں نے دیگر قومی رہنماؤں کے سامنے
جنرل یحییٰ خاں کو کھری کھری سنائیں تھیں، لیکن جنرل یحییٰ اقتدار اور شراب کے نشے
میں اس قدر مست تھا کہ اس نے آپ کے حقائق پر مبنی تجزیے اور صحیح مشورے پر کوئی
توجہ نہیں دی اور طاقت کا غلط استعمال کر کے نہ اپنے اقتدار کو بچا سکا اور نہ ہی پاکستان کی
جغرافیائی حدود کی حفاظت کر سکا۔
علامہ شاہ احمد نورانی کیلئے مشرقی پاکستان کا سانحہ سب سے زیادہ تکلیف و دکھ کا باعث تھا،
آپ قادیانیوں کو سانحہ مشرقی پاکستان کا سو فیصدی ذمہ دار

قرار دیتے تھے، آپ کے بقول "پاکستان کے بجٹ کی تیاری اور اقتصادی حوالے سے جو بھی پلاننگ ہوتی اسکا چیئرمین ہمیشہ ایم۔ایم احمد ہوتا، جو جان بوجھ کر مشرقی پاکستان کو نظر انداز کرتا، تاکہ وہاں کے لوگوں میں مغربی پاکستان کے حوالے سے شکایات پیدا ہوں اور ان کے درمیان دوریاں بڑھیں، اس سلسلے میں ایم۔ایم قادیانی کا کردار بہت ہی گھناؤنا ہے

مجھے ڈھاکہ جانے کے بعد مزید اندازہ ہوا مشرقی پاکستان میں قادیانی واقعی بڑا گھناؤنا'' کردار ادا کر رہے ہیں اور ڈھاکہ کا ہر سمجھدار شخص ایم۔ایم احمد کی شکایت کرتا نظر آتا ہے، مشرقی پاکستان میں جب 1970ء میں سیلاب آیا تو دنیا بھر کے ممالک سے ان کی مدد کیلئے امداد آئی، لیکن بد قسمتی سے اس امداد کی تقسیم کا کام ایم۔ایم احمد قادیانی کے سپرد کیا گیا، جس سے وہاں کے لوگ شدید نفرت کرتے تھے، انہیں اس بات پر سخت افسوس تھا کہ اس شخص کو امداد کی تقسیم کا کام سونپا گیا ہے جو ہمیشہ ان کے ساتھ ناانصافی کرتا ہے، جہاں تک اقتصادیات کا تعلق ہے ایم۔ایم احمد نے پوری منصوبہ بندی سے مرزائیت کو مضبوط کیا، بالکل اسی طرح جس طرح امریکہ میں یہودیوں نے اپنے آپ کو مضبوط کیا ہے، اور یہودی امریکہ میں اس قدر اثر انداز ہیں کہ تمام بینکوں، انشورنش کمپنیوں اور بڑے بڑے کارخانوں، غرضیکہ ہر بڑے سرمایہ کاری کے اڈے پر ان کا قبضہ ہے، یہی وجہ ہے کہ امریکہ کی سینٹ اور صدر ان کی حمایت کے بغیر منتخب نہیں ہو سکتے، یہی طریقہ مرزا ایم۔ایم احمد نے اختیار

کیا اور وہی پوزیشن حاصل کرنے کی کوشش کی، انہوں نے اور چوہدری ظفر اللہ قادیانی نے یہاں آکر باقاعدہ مرزائیوں کو لائسنسوں سے نوازا، قادیانیوں کو کارخانوں اور تمام اہم انڈسٹریز کے پرمٹ دیئے گئے، تاکہ مرزائی اقتصادی طور پر مضبوط ہو جائیں، ظفر اللہ قادیانی کی حمایت سے قادیانیوں کا بڑا گروہ حکومت میں داخل ہو گیا اور اقلیت میں ہونے کے باوجود ان کی وہی پوزیشن ہو گئی جو امریکہ میں یہودیوں کی ہے۔" (انٹرویو علامہ شاہ احمد نورانی ترجمان اہلسنت کراچی مارچ 1973ئ

سانحہ مشرقی پاکستان کے عوامل اور وجوہات اور مستقبل کے لائحہ عمل پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے فرمایا" دسمبر 1971ء کی جنگ کو ہرگز فیصلہ کن نہیں قرار دیا جاسکتا، برصغیر کی اسلامی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے جب کہ وقتی طور پر ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا، لیکن اس وقت غیور اور باضمیر مسلمان حکمرانوں نے بالآخر اپنی شکست کو مستقل فتح میں بدل ڈالا، محمد غوری کی جدوجہد اس سلسلے کی ایک روشن مثال کی حیثیت رکھتی ہے، موجودہ صورتحال اپنوں کی غداری اور بے وقوفی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے، ہماری چودہ سو سالہ روایات کا تقاضہ ہے کہ ہم اسے ایک عارضی سانحہ سمجھیں اور تلافی مافات کیلئے بھرپور جدوجہد کا آغاز کردیں، مجھے تعجب ہوتا ہے اس جنگ کو فیصلہ کن قرار دے کر گھٹنے ٹیک دینے والے لوگ وہ ہیں جو ہزار سال تک لڑنے کا اعلان کرتے تھے۔

میں کہتا ہوں ہزار سال نہیں پانچ سو سال نہیں ایک سو سال اپنی جدوجہد جاری رکھو،
بزدلی اور بے غیرتی کا راستہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔" (انٹرویو مولانا شاہ احمد نورانی
اردو ڈائجسٹ جولائی 1972ء
ممتاز مسلم لیگی رہنما چودھری ظہور الٰہی کہتے ہیں کہ "سابق صدر یحییٰ خاں نے مولانا شاہ
احمد نورانی سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ جب مشرقی پاکستان کے لیڈروں سے
مذاکرات کے دوران مغربی پاکستان کے تمام لیڈر خاموش رہتے تھے تو شاہ احمد نورانی
واحد آدمی تھا جو میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھ سے بات کرتا تھا اور جس نے
کہا تھا کہ تم کسی کو غدار قرار دینے والے کون ہوتے ہو، عوام کے نمائندوں کو اقتدار
منتقل کردو، اس کے بعد سیاسی معاملات کو حل کرنا ہمارا کام ہوگا" (روزنامہ مشرق لاہور
جولائی 1977ء نورانی میاں کی تبلیغی مصروفیات ص 38 26

یہ مینار ہمارے نیزے اور گنبد ہماری ڈھال ہیں

چونکہ " میری پارٹی نے اسلام کے خلاف مہم چلا رکھی ہے اس لیے میں اپنی پارٹی چھوڑ رہا ہوں، میناروں پر پابندی کے مطالبہ نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ میں تیس سال سے ایک ایسی پارٹی سے کیسے وابستہ رہا جو مسلمانوں کے حوالے سے متعصبانہ رویہ رکھتی ہے، سوئٹزر لینڈ حکومت کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ مسلمانوں کو اپنے شعائر پر عمل کرنے سے روکے، آج ضرورت تو اس بات کی تھی کہ سوئٹزر لینڈ میں زیادہ سے زیادہ مساجد ہوں، لیکن اس کے برخلاف سوئٹزر لینڈ میں میناروں پر پابندی اسلام کے خلاف تعصب اور مسلمانوں کا گھیراؤ کرنے کے مترادف ہے، آج میں اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ اسلام میں مجھے اُن تمام سوالات کا جواب مل گیا جو بائبل میں نہیں مل سکا۔" اسلام کی حقانیت کے مظہر یہ الفاظ سوئٹزر لینڈ میں مساجد کے میناروں پر پابندی کا مطالبہ کرنے والی سیاسی جماعت سوئس پیپلز پارٹی سے وابستہ رہنے والے ڈینئل اسٹریچ کے ہیں، جو کچھ عرصہ قبل تک ایک پکے عیسائی کی طرح باقاعدگی سے بائبل کا مطالعہ کرتے اور پابندی سے چرچ جاتے تھے، لیکن اب وہ قرآن پڑھتے ہیں اور نماز کیلئے پانچ وقت مسجد میں جاتے ہیں۔ گو کہ ڈینئل اسٹریچ دو سال سال قبل ہی اسلام قبول کر چکے تھے، مگر انہوں نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان نہیں کیا تھا، لیکن اپنی جماعت کے اس متعصبانہ فیصلے اور

اقدام نے انہیں اتنی ایمانی جرات عطا کی کہ وہ نہ صرف اپنی پارٹی چھوڑنے پر مجبور ہوگئے بلکہ انھوں نے اپنے مسلمان ہونے کا اقرار بھی کرلیا، پارٹی کی رکنیت سے احتجاجاً استعفیٰ دینے والے ڈینئل اسٹریچ تیس سال تک سوئٹزرلینڈ میں مساجد کے میناروں پر پابندی کا مطالبہ کرنے والی سیاسی جماعت سوئس پیپلز پارٹی سے وابستہ رہے ہیں اور آج کل وہ سول کنزرویٹو ڈیموکریٹک پارٹی کے نام سے نئی سیاسی جماعت بنانے کی تیاری بھی کر رہے ہیں، واضح رہے کہ ڈینئل اسٹریچ ایک سیاستدان ہونے کے علاوہ سوئس فوج میں انسٹرکٹر بھی ہیں، ان کے مسلمان ہونے کے اعلان کی وجہ سے سوئٹزرلینڈ میں بعض حلقے اس بات پر تشویش کا اظہار کر رہے ہیں کہ ایک نومسلم کا فوج میں انسٹرکٹر کے طور پر کام کرنا خطرناک ہو سکتا ہے، وہ امریکی فوجی اڈے فورٹ ہڈ میں میجر ندال کی فائرنگ کا حوالہ دیتے ہیں، سوئس فوج میں ڈینئل اسٹریچ کا بطور انسٹرکٹر کام کرنا سیکورٹی رسک قرار دیا جا رہا ہے تاہم فوج کے ترجمان نے اس کو بے ہودہ الزام قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ سوئس فوج مذہبی تعصب سے پاک ہے۔

گزشتہ دنوں میناروں کی تعمیر پر پابندی کیلئے سوئٹزرلینڈ میں ہونے والے حالیہ ریفرنڈم کے خلاف مسلمان ممالک، تنظیمیں اور دنیا بھر کے حقوق انسانی کے ادارے جہاں اس امتیازی قانون کے خلاف آواز بلند کر رہے ہیں، وہیں اس ہنگامے میں ہمیں ڈینئل اسٹریچ کے مسلمان ہونے کی روح پرور اور ایمان افروز خبر بھی سننے کو ملی، سوئٹزرلینڈ میں ہونے والے ریفرنڈم میں کل چھبیس حلقوں سے ملنے والے نتائج کے مطابق 57.5

فی صد ووٹروں نے میناروں کی تعمیر پر پابندی کے حق میں ووٹ دیا ہے جبکہ صرف چار حلقوں میں ووٹروں نے پابندی کی تجویز مسترد کی ہے،29 نومبر 2009 کو سوئٹزرلینڈ میں اس بات پر ووٹ ڈالے گئے کہ مینار تعمیر کرنے پر کیوں نہ پابندی لگا دی جائے، ووٹ ڈالنے کی وجہ یہ تھی کہ عوامی رائے جاننے کے ادارے نے 113540 سے بھی زیادہ ووٹ دہندگان کے دستخط جمع کرکے 8 جولائی 2008 کو پارلیمینٹ میں پہنچائے تھے، ان دستخط کنندہ کا مطالبہ تھا کہ سوئٹزرلینڈ میں مینار کے تعمیر پر پابندی لگائی جائے، سوئٹزرلینڈ کی کئی بنیاد پرست تنظیموں کا خیال ہے کہ مینار مسلمانوں کی مذہبی یا سیاسی طاقت کی نشانی ہیں جبکہ اسلامی تنظیموں کا کہنا ہے کہ مینار صرف مسلمانوں کی عبادت گاہوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ریفرنڈم کی حامی قوم پرست سوئیس پیپلز پارٹی مسجد کے مینار کو سیاسی طاقت کی علامت قرار دیتی ہے اور اس کا کہنا ہے کہ ریفرنڈم کا مقصد سوئٹزرلینڈ کو مزید "اسلامی رنگ میں رنگے جانے سے بچانا ہے" دوسری طرف سوئیس حکومت کہنا ہے کہ اس نے ووٹنگ کے نتائج کو تسلیم کرلیا ہے اور اب سوئٹزرلینڈ میں نئی مسجدوں کے ساتھ مینار تعمیر کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی، تاہم حکومت کا کہنا ہے کہ ملک میں مسلمانوں کو انفرادی یا اجتماعی طور پر بدستور عبادت کرنے کا حق حاصل رہے گا، کئی قوم پرست لوگوں کا کہنا ہے کہ انہیں سوئٹزرلینڈ میں مسجدوں کی تعمیر پر کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن انہیں میناروں پر اعتراض ہے، اس لیے کہ انتہا پسند عناصر مسجد کے مینار کو ایک سیاسی

علامت کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور یہ بات سوئٹزر لینڈ کے آئین کے خلاف ہے،
ان کا یہ بھی استدلال ہے کہ اسلام میں مینار تعمیر کرنا لازمی نہیں ہے۔
لیکن یہ بات کسی طور بھی درست نہیں، جناب مختار مسعود اپنی مشہور زمانہ کتاب "آواز دوست" میں لکھتے ہیں کہ "مسجد بنو امیہ (دمشق میں) کا شمالی مینار آج سے پورے تیرہ سو دو سال قبل بنا تھا، یہ ہمارے میناروں کا امام ہے، اس کے پیچھے لا تعداد مینار دست بستہ کھڑے ہیں۔" قارئین محترم یہ وہ دور تھا جب یورپ جہالت کی تاریکی ڈوبا ہوا تھا اور اس کی گلیاں گندگی اور کیچڑ میں لتھڑی ہوئی تھیں، یہ صحیح ہے کہ اسلام کی سب سے پہلی مسجد "مسجد قبا" ایک خیمے کی طرز پر بنائی گئی تھی اور اس میں کوئی مینار نہیں تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام کے ابتدائی دور میں مساجد بہت سادہ ہوتی تھیں، اسلیے اس میں مینار یا گنبد کا بنایا جانا ضروری خیال نہیں کیا جاتا تھا، مگر وقت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے طرز تعمیر میں جدت آتی گئی اور انہوں نے اپنی ضرورت اور علاقے کی ثقافت کے مطابق مساجد تعمیر کیں، یوں مساجد میں مہنگے کام، بلند و بالا مینار اور خوبصورت گنبد بننا شروع ہوئے، مساجد میں گنبدوں اور میناروں کی تعمیر کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کی عبادت گاہوں کی شان و شوکت ظاہر ہوں، مسجد دور سے نظر آئے اور میناروں پر چڑھ کر اذان دی جائے تو اذان کی آواز دور دراز علاقوں تک پھیل جائے۔

اسی طرح گنبد سے مسجد کے خطیب کی تقریر اور نماز کی آواز ایک گونج اور خوبصورتی کے ساتھ پوری مسجد میں پھیلتی اور نمازیوں کو صاف سنائی دیتی تھی۔ اسلامی فن تعمیر کی ترقی کے ساتھ مساجد کی تزئین و آرائش کے لئے قرآنی آیات کا مختلف خوبصورت طریقوں سے استعمال بھی کیا گیا اور مساجد کے دور و دیوار پر مختلف جیومیٹرک ڈیزائن بھی بنائے گئے۔ اسی وجہ سے مینار اور گنبد مسجد کی بنیادی پہچان، علامت اور نشان بن گئے اور مساجد کا لازمی حصہ قرار پائے۔ آج مسلمانوں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ مساجد کے مینار کلیساؤں کے میناروں کو دیکھ کر بنائے گئے مگر اس الزام میں کوئی صداقت نہیں کیونکہ عرب تعمیرات میں پہلے سے ہی مینار بنتے تھے۔ خصوصاً دور تک دیکھنے کیلئے دفاعی قلعوں کے ساتھ بنائے گئے مینار قابل ذکر ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ اس وقت سوئٹزرلینڈ میں چار لاکھ مسلمان آباد ہیں اور ان کی دو سو مساجد ہیں، جن میں صرف چار مساجد میں مینار ہیں۔ مسلمان ملک کی آبادی کا چار فیصد ہیں، زیادہ تر لوگ ترکی اور بلقان سے یہاں آکر آباد ہوئے ہیں۔ ملک کی کل آبادی ستتر لاکھ نفوس پر مشتمل ہے اور اسلام عیسائیت کے بعد اس ملک کا دوسرا بڑا مذہب ہے۔ گو کہ حکومت اور پارلیمنٹ کے اراکین اس پابندی کو واضح طور پر مسترد کرتے رہے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ ایسا کچھ نہ صرف قومی اثاثے کے منافی ہے بلکہ آئینی قوانین کی بھی خلاف ورزی ہے اور ساتھ ہی یہ بین الاقوامی انسانی حقوق کے قانون کے بھی منافی ہے۔ حکومت کا خیال ہے کہ یہ مسلمانوں کے مذہبی نشان کے ساتھ ایک امتیازی

سلوک ہوگا، کیونکہ اور دوسرے مذاہب بھی اپنی عبادت گاہ ایک خاص مذہبی عمارت کے طور پر تعمیر کرتے ہیں۔" جبکہ سوئٹزر لینڈ کی وزیر انصاف ایولائین وِڈنر شمپ کا کہنا ہے کہ ریفرنڈم کے نتائج سے بنیاد پرست مسلمانوں کے بارے" وسیع پیمانے پر خوف" کی عکّاسی ہوتی ہے، ان کا کہنا ہے کہ میناروں پر پابندی عائد کرنے سے انتہا پسند روّیوں کو تبدیل کرنے میں کوئی مدد نہیں ملے گی۔

ادھر اقوام متحدہ کی انسانی حقوق تنظیم نے سوئٹزرلینڈ کے فیصلے کی سخت مذمت کرتے ہوئے اسے متعصبانہ اور بین الاقوامی قانونی ذمہ داری کے خلاف بتایا ہے، اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کی کمیشن کی سربراہ نے سوئٹزرلینڈ میں مساجد کے میناروں کی تعمیرات میں پابندی کی شدید مذمت کرتے ہوئے اسے سخت امتیازی فیصلہ قرار دیا ہے، سیکرٹری جنرل کی نائب ترجمان نے انسانی حقوق کی ہائی کمشنر کے بیان کے حوالے سے بتایا کہ سوئٹزر لینڈ میں مساجد کے میناروں کی تعمیر پر لگائی جانیوالی پابندی کو جو ریفرنڈم میں اکثریتی ووٹ کے نتیجے میں عمل میں آئی ہے، انتہائی امتیازی، سوئس سماج کو تقسیم کرنے والا اور بدقسمت فیصلہ کہا ہے، انہوں نے کہا کہ اس فیصلے سے سوئٹزر لینڈ بین الاقوامی انسانی حقوق کی ذمہ داریوں سے روگردانی کا مرتکب ہوگا، ہائی کمشنر نے سوئٹزر لینڈ میں مساجد پر پابندی کے فیصلے کو عدم برداشت اور نسل پرستی پر مبنی سیاست کا وہ تسلسل قرار دیا جس کے تحت اس سے قبل غیر ملکیوں، تارکین وطن اور سیاسی پناہ حاصل کرنے والوں کے خلاف پوسٹر چسپاں کیے جاتے رہے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ مجھے اس کی مذمت کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے کہ سوئٹزر لینڈ سمیت کئی ممالک میں غلط طور پر مسلمانوں سے خوف کے ہیجان پر مبنی سیاسی مہموں نے ایسے فیصلوں کو جنم دیا ہے، اگرچہ سوئٹزر لینڈ کی حکومت نے ریفرنڈم کی حمایت نہیں کی تھی لیکن ایک مخصوص مذہب سے تعلق رکھنے والی علامات کی یعنی مسلمانوں کی مساجد کے میناروں پر پابندی کا فیصلہ واضح طور پر امتیازی سلوک ظاہر کرتا ہے، دوسری طرف فرانس کے وزیر خارجہ نے انسانی حقوق کی مسلم تنظیموں اور سوئیس حکومت کا ساتھ دیتے ہوئے سوئٹزر لینڈ میں اس ریفرنڈم کی مذمت کی ہے،.برنارڈ کوچنر نے اس ووٹنگ کو عدم رواداری کا ایک اظہار قرار دیا ہے، جنیوا میں ایک ممتاز بین المذاہب مسلم تنظیم باہمی مفاہمت کی مسلم کونسل" کے سربراہ نے کہا ہے کہ انہیں ریفرنڈم کے نتائج پر " حیرت اور افسوس ہے، انہوں نے کہا ہے کہ انہیں توقع ہے کہ مسلمان اس پابندی کے خلاف انسانی حقوق کی یورپی عدالت میں اپیل دائر کریں گے۔

سوئٹزر لینڈ حکومت کی جانب سے مساجد کے میناروں پر پابندی ایک نہایت افسوس ناک قدم ہے، حکومت کے اس فیصلے سے یورپ سمیت دنیا بھر کے مسلمانوں میں شدید بے چینی پیدا کر دی ہے، اس فیصلے سے نہ صرف مذاہب کے درمیان فاصلے پیدا ہوں گے بلکہ غیر مسلموں میں اسلامی اقداروں سے نفرت کا اظہار بھی بڑھے گا، سوئٹزر لینڈ حکومت کے اس اقدام سے نہ صرف یورپ بھر میں مذہبی ہم آہنگی کو شدید نقصان پہنچے گا بلکہ اس قسم کے متعصبانہ

فیصلے تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ کا باعث بھی بنیں گے۔ مساجد کے مینار اسلام کا سمبل ہیں، ان کی تعمیر پر پابندی اسلام کے خلاف کھلا اعلان جنگ اور عالمی سازشوں کا ایک حصہ ہے،جب تک مسلمانوں نے عزت سے جینا اور مرنا نہیں سیکھا اس وقت مسلمانوں کے خلاف اس قسم کی سازشیں ہوتی رہیں گی، حقیقت یہ ہے کہ یورپ سمیت دنیا بھر میں مساجد دشمنان اسلام کی آنکھوں میں کھٹکتی ہیں، کیونکہ مسجد اسلام کا مرکز ہے اور یہاں سے پانچ وقت "اللہ اکبر" کی آواز بلند ہوتی ہے، یورپ میں نماز جمعہ اور رمضان المبارک میں مساجد نمازیوں سے بھری ہوتی ہیں، وہاں کے تعلیمی اداروں سے سینکڑوں مسلمان بچیاں روزانہ سکارف پہنے نکلتی ہیں، جبکہ مسلم نوجوان داڑھیاں رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کے تھنک ٹینک سر پکڑ کر بیٹھے سوچتے ہیں کہ اسلام کو پھیلنے سے کیسے روکا جائے۔

یہی وہ صورتحال ہے جس سے خوفزدہ لوگوں نے سوئٹزر لینڈ میں "مینار" پر پابندی کے لئے نام نہاد ریفرنڈم کروایا، جو مغرب کی اسلامی دنیاکے حوالے سے دوغلی پالیسی کا آئینہ دار ہے، سوال یہ ہے کہ اگر مینار انہیں مشکل میں ڈالتے ہیں تو پھر چرچ پر لگی صلیبیں انہیں کیوں مشکل میں نہیں ڈالتیں، اصل بات یہ ہے کہ مینار نہیں، بلکہ اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت اور تیزی سے پھیلنے کی صلاحیت نے انہیں خوفزدہ اور پریشان کیا ہوا ہے، یہی وہ عوامل ہیں، جس کی وجہ سے فرانس برقعہ پر پابندی لگا چکا ہے اور بہت سے مغربی ممالک میں مسلمانوں کے ساتھ متعصبانہ رویہ اختیار کیا جاتا ہے، دراصل یہ

ان کے دل کی وہ نفرت ہے جو آج مساجد کے میناروں سے جلن کی صورت میں عیاں ہو رہی ہے، آج سوئٹزر لینڈ میں مسجد کے میناروں پر پابندی کے اعلان سے واضح ہو گیا ہے کہ یورپ اور پورا عالم کفر مسلمانوں کے خلاف متحد اور صف آراء ہے، آج اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مینار، گنبد اور محراب و منبر شعائر اسلامی کا حصہ ہیں۔

سوئٹزر لینڈ نے میناروں کی تعمیر پر پابندی لگا کر دنیا بھر کے مسلمانوں کے جذبات توہین کی ہے اور انہیں مجروح کیا ہے لیکن اس کے باوجود عالم اسلام ابھی تک مہر بلب خاموش تماشائی بنا ہوا ہے، لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ مساجد کے میناروں، اسکارف اور داڑھی پر پابندی لگانے والے ممالک کے خلاف اسلامی ممالک باہم یک آواز ہو کر صدائے احتجاج بلند کریں، کیونکہ مسئلہ دینی حمیت اور شعائر اسلامی کی توہین کا ہے۔

مساجد کے مینار ہماری مذہبی شناخت، تہذیبی علامت اور ہماری مساجد کا علامتی سمبل ہیں، ترکی کے مشہور شاعر ضیاء گوکلپ نے اپنی مشہور نظم میں کہا تھا کہ "مسجدیں ہماری پناہ گاہیں ہیں، اُن کے مینار ہمارے نیزے ہیں، اُن کے گنبد ہماری ڈھال ہیں اور اہل ایمان ہمارے سپاہی ہیں۔" اور اہل ایمان اسلام کے سپاہی اپنی پناہ گاہوں، اپنی خانقاہوں، اپنے نیزوں اور اپنی ڈھالوں پر نہ تو کسی قسم کی کوئی پابندی برداشت کر سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے اِن ہتھیاروں سے دست بردار ہو سکتے ہیں۔

سقوط ڈھاکہ .... مقصد تخلیق سے انحراف کی سزا

میجر خلیل احمد مرزا لکھتے ہیں کہ "شام سات بجے کے قریب یونٹ کی طرف سے حکم ملا کہ تمام کمپنیاں پیچھے آ جائیں، لڑائی ختم ہو گئی ہے، جنرل نیازی نے ہتھیار ڈالنا منظور کرلیا ہے، پنجاب رجمنٹ کے کمپنی کمانڈر اور میں نے مل کر فیصلہ کیا کہ اپنے ہتھیار دشمن کے حوالے نہیں کریں گے، چنانچہ ہم نے اپنی رائفلیں اور ایمونیشن ایک بوری میں لپیٹ کر ایک بڑے درخت کے نیچے گڑھا کھود کر دبا دیا، اُس وقت میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے ....آہ.... ہمیں یہ ذلت بھی دیکھنا تھی، دل و دماغ میں ایک طوفان سا اٹھ رہا تھا کہ یہ کیا ہوگیا....ہماری آئندہ نسلیں ہمارے متعلق کیا خیال کریں گی، پاکستان کا ایک حصہ دشمن نے ہم سے علیحدہ کردیا ....تاریخ میں ہندوستان کی کامیابی اور ہماری ناکامی کا ذکر ہوگا۔"

سولہ دسمبر 1971ء کو آج 38برس ہونے کو آئے ہیں لیکن محب وطن پاکستانیوں کے دلوں میں میجر خلیل احمد مرزا کی طرح سقوط ڈھاکہ کے زخم آج بھی تازہ ہیں، سانحہ مشرقی پاکستان ہماری قومی زندگی کا ایک ایسا المیہ ہے جسے 38سال گزرنے کے بعد بھی پاکستان کے غیور اور باشعور عوام اپنے ذہنوں سے بھلا نہیں پائے، اُن کے سینوں میں اپنے مشرقی بازو کی علیحدگی کا غم ایک لاوے کی طرح

دہک رہا ہے۔16 دسمبر 1971ء کا دن اپنے پیچھے ایک ایسی لمبی داستان رکھتا ہے، جس میں اپنوں اور بیگانوں کی سالوں کی پلاننگ اور وہ سازشیں پوشیدہ ہیں، جنھوں نے مشرقی پاکستان کے مسلمانوں میں تعصب، محرومی اور احساس کمتری کو اِس حد تک پروان چڑھایا کہ اِس کے نتائج سقوط ڈھاکہ پر منتج ہوئے۔

گو کہ اِس المیے کے کئی تکلیف دہ پہلو ہیں، لیکن دو پہلو سب سے زیادہ کربناک تھے، ایک تو یہ کہ ہمیں ہندوٴ بنیے کے ہاتھوں ایک ایسی فوجی شکست (جس میں ہماری 90ہزار فوج کو ہتھیار ڈالنا پڑے) کا سامنا کرنا پڑا جس کی مثال دوسری جنگ عظیم کے بعد نہیں ملتی اور دوسرے پاکستان کی نصف سے زیادہ آبادی والا حصہ ہم سے علیحدہ ہوگیا، یوں پاکستان اپنے قیام کے 24 سال بعد دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا،تاریخ اسلام میں ایسا پہلی مرتبہ نہیں ہوا تھا کہ ایک سلطنت ٹوٹ کر دو علیحدہ علیحدہ مملکتوں میں تقسیم ہوئی ہو۔

لیکن وطن عزیز پاکستان کی دو حصوں میں تقسیم اس لئے ناقابل فہم اور تکلیف دہ امر تھی کہ یہ سرزمین دنیا میں ریاست مدینہ کے بعد اسلام کے نام پر وجود میں آنے والی پہلی سرزمین تھی جو مسلمانان برصغیر کی طویل صبر آزما کٹھن جدوجہد اور بے پناہ قربانیوں کے بعد حاصل کی گئی تھی اور جس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی، قیام پاکستان کی کہانی ایک ایسی لہو لہو دستاویز ہے جس

کا ہر صفحہ غیرت مند بوڑھوں، حریت پسند نوجوانوں، معصوم بچوں اور عفت مآب ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کے خون سے رنگین ہے۔گنگا، جمنا، گھومتی، گھاگرا، نربدا، ستلج، بیاس، راوی، چناب سے لے کر جہلم تک وہ کون سا دریا تھا جو مسلمانوں کے خون سے لہو رنگ نہیں تھا، ہر طرف آگ تھی، شور تھا، آہ بکا اور چیخ و پکار تھی۔

چشم فلک آج بھی گواہ ہے کہ کس طرح لاکھوں مسلمان چھوٹے۔بڑے ڈیروں میں حفاظت اور سلامتی کے خاطر سکڑے سمٹے بیٹھے تھے، یا پر آشوب راستوں پر خاک و خون میں لتھڑے ہوئے اپنی نئی منزل پاکستان کی جانب اُس وقت بھی گامزن تھے، جب ہندوٗ اور سکھ بلوائی پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ "جو مانگے کا پاکستان، اُس کو ملے گا قبرستان" لیکن پھر بھی یہ قافلہ آگ و خون کے دریا عبور کرکے 14 اگست 1947ء کو قائدا عظم محمد علی جناح کی ولولہ انگیز قیادت میں اپنی منزل مراد پاکستان تک پہنچا۔

تخلیق پاکستان کو ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے اپنے مخصوص نظریے سے دیکھا، مسلمانوں کے نزدیک پاکستان کا قیام ایک عظیم کامیابی کی حیثیت رکھتا تھا جبکہ اِس موقعہ پر ہندوؤں کا ردعمل ذلت و شکست اور توہین و اہانت کے احساسات سے مملو تھا، ہندوؤں کی یہی کوشش تھی کہ ہندوستان تقسیم نہ ہو اور

سارے خطے پر اُن کی حکمرانی ہو، مسلمانوں کے دل احساس تشکر اور طمانیت کے جذبوں سے سرشار تھے کہ اُن کی جدوجہد بارآور ثابت ہوئی مگر ہندو تاریخ کے اِس فیصلے کو کسی طور بھی قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے، وہ اِس نقصان کا ازالہ کرنے کا تہیہ کر چکے تھے۔

چونکہ پاکستان جغرافیائی لحاظ سے ایک وحدت نہیں تھا، یہ دنیا کا واحد منفرد ملک تھا جس کے دونوں بازوؤں کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ تھا، درمیان میں دشمن کا علاقہ واقع تھا اور سوائے مذہب اور مشترکہ جدوجہد آزادی کے دونوں کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں تھی، صرف ایک دین اسلام ہی تھا جو دونوں بازوؤں کو ایک وحدت، ایک لڑی اور ایک زنجیر میں باندھ سکتا تھا اور پاکستانی قوم کو یک جہتی و استحکام دے سکتا تھا، دشمن اچھی طرح جانتا تھا کہ جب تک یہ تعلق یہ رشتہ مضبوط ہے پاکستان توانا و مضبوط اور متحد و مستحکم رہے گا، جہاں یہ رشتہ کمزور ہوا پاکستان کمزور ہو جائے گا۔

چنانچہ پاکستان دشمنوں نے قیام پاکستان کے بعد سے مشرقی پاکستان میں نسلی، لسانی اور صوبائی و علاقائی نفرت و عصبیت کو پروان چڑھانا شروع کر دیا، رہی سہی کسر ہمارے حکمرانوں کی ناعاقبت اندیش پالیسیوں نے پوری کر دی، بقول زیڈ اے سلہری "اُن حکمرانوں) کی پالیسیوں نے ملک کو افسوسناک طور پر تقسیم)

کردیا" جس کا منطقی نتیجہ متحدہ پاکستان کے خاتمے کی شکل میں ہمارے سامنے آیا۔
یہ حقیقت ہے کہ جو قوم اپنی تاریخ کو فراموش کردیتی ہے، اُس کا جغرافیہ اُسے فراموش کردیا ہے "زندہ قومیں اپنے ماضی اور حال پر تنقید کرکے مستقبل کو روشن کو کرتی ہیں، کسی قوم کے ذہنی طور پر بالغ ہونے کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو اپنے ماضی اور حال کو تنقید کا موضوع بنائے اور اگر خود میں کوئی خامی نظر آئے تو اُس کی ذمہ داری دوسرے افراد یا کسی دوسری قوم پر ڈالنے کے بجائے یہ معلوم کرنے کوشش کرے کہ اِس شکست و ریخت میں خود اِس کا اور اِس کی قوم کے دیگر افراد کا کیا کردار ہے۔
زندہ قومیں اِس قسم کے تجزیئے اور تنقید سے اہم نتائج اخذ کرتی ہے اور ماضی و حال کی خامیوں اور غلطیوں سے آگاہ ہو کر اپنے مستقبل کیلئے صحیح راستے تلاش کرتی ہیں اور کوشش کرتی ہیں کہ اگر تاریخی عوامل نے انہیں شکست و زوال کی منزل پر کھڑا کر بھی دیا ہے تو وہ مزید تباہی کا راستہ اختیار نہ کیا جائے بلکہ قومی سلامتی و بقاء کی نئی راہیں تلاش کی جائیں، تاریخ گواہ ہے کہ سمجھدار قومیں اپنی ناکامیوں کو حرز جان نہیں بناتیں بلکہ اُن کے اسباب و علل کو ہمیشہ سامنے رکھتی ہیں اور اُن سے سبق سیکھتے رہنے کا داعیہ اُن

میں کبھی بھی ختم نہیں ہوتا۔

یہی ایک زندہ اور توانا قوم کی شناخت و علامت ہے،آج 38 برس گزر جانے کے بعد اِس بحث سے قطع نظر کہ ہم نے اپنی ناکامی کے اسباب سے کتنا سبق سیکھا ہے، کتنا نہیں، ہم اِس حقیقت کبریٰ کے اصولی و عملی تقاضوں کو ہرگز ہرگز فراموش نہیں کر سکتے کہ پاکستان اسلام کے نام پر اور اسلام کی خاطر حاصل کیا گیا تھا، یہ مملکت خداداد خالصتاً جمہوری جدوجہد کے بعد اِس مقصد کیلئے حاصل کی گئی تھی کہ یہاں مسلمان دین اسلام کے عملی تقاضوں کی روشنی میں اپنی زندگی بسر کریں گے اور اقتصادی ومعاشی ترقی و خوشحالی کی منزلیں طے کریں گے۔

یہی وہ واضح اور بنیادی فرق تھا جس کی اساس تاریخ، جغرافیے اور معدنی وسائل کی تقسیم پر نہیں بلکہ دو قومی نظریئے کے منفرد نظریاتی تشخص پر رکھی گئی تھی، جسے ہمارے ارباب اختیار آج پھولوں کے ہاروں سے مٹانے کی یک طرفہ سعی ناکام کر رہے ہیں، جبکہ قائداعظم محمد علی جناح نے 1948ء میں اسلامیہ کالج پشاور کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے قیام پاکستان کے اصل محرک کو واضح کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کیلئے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے، جہاں

"ہم اسلام کے اصولوں کو نافذ کر سکیں۔

مقصد واضح تھا تحریک پاکستان کے رہنماؤں اور مفکروں کے ذہن و فکر میں کوئی الجھن نہ تھی، ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کے دل و دماغ میں کوئی ابہام نہیں تھا، لیکن آج 62 برسوں کے بعد بھی ہم پاکستان کو اسلامی نظام کی تجربہ گاہ اور قرآن و سنت کی روشن تعلیمات کی آماجگاہ نہیں بناسکے، منطقی نتیجہ سقوط ڈھاکہ کے دلدوز سانحے کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے، ہماری اسی کمزوری کا فائدہ آج دشمن ایک بار پھر اٹھانا چاہتا ہے، وہ بلوچستان، سرحد اور آزاد قبائلی علاقوں میں قومی، لسانی اور علاقائی عصبیت کو فروغ دے کر پاکستان کی وحدت اور سالمیت کو نقصان پہنچانے کے درپے ہے، اور وہ بلوچستان میں وہی کھیل کھیل رہا ہے جو بنگلہ دیش بننے کا محرک بنا تھا۔

اِس وقت ملک کی مجموعی صورتحال یہ ہے کہ ہم نوع بہ نوع مسائل میں گھرے ہوئے ہیں، نائین الیون کے بعد امریکہ کا ساتھ دینے کے باعث قوم مایوس، شکستہ دلی اور مردنی کا شکار ہے، ایٹمی طاقت اور بہترین جغرافیائی محل وقوع رکھتے ہوئے بھی ہمارا حال یہ ہے کہ ہمارے اناج پر زندہ رہنے والا افغانستان جیسا ملک ہم پر دراندازی کے الزامات لگاتا اور ہم پر حملے کی دھمکیاں دیتا ہے، ملک امریکی کالونی بنا ہوا ہے، امریکی اعمال حکمرانوں کیلئے احکامات و

ہدایت نامے لیے دندناتے پھر رہے ہیں، بھارت ہمیں آنکھیں دکھا رہا ہے، کھلے عام ہماری سرحدوں کی خلاف ورزی کی جارہی ہے، امریکہ، اسرائیل اور برطانوی سرپرستی میں بھارتی قیادت کے جارحانہ بیانات، اس کی جنگی تیاریاں، اس کے خطرناک عزائم کی نشاندہی کررہے ہیں۔

لیکن ہمارے حکمراں ہیں کہ "ملک کا دفاع مضبوط ہاتھوں میں ہے، بیرونی جارحیت کا منہ توڑ جواب دیا جائے گا۔" جیسے زبانی بیانات کے گولے داغ رہے ہیں، ہمارے دینی مدارس، ہماری دینی تنظیمیں، ہماری دینی شخصیات اور ہمارا دینی تشخص ہر سنگ اور تیر دشنام کا نشانہ بنا ہوا ہے، مغربی تہذیب و اقدار کو سرکاری سرپرستی دی جارہی ہے اور استعماری دباؤ پر مدارس، رفاعی اور فلاحی اداروں پر پابندی لگائی جارہی ہے۔

پاکستان کا یہ منظر نامہ کسی طور پر بھی خوش آئند نہیں ہے اور آج وہ پاکستان گہری دھند میں لپٹتا جارہا ہے، جس کے خدوخال 62 سال پہلے قربانیوں کی لازوال تاریخ رقم کرنے والوں کی آنکھوں کو لو دے رہے تھے، اہل ایمان مایوس نہیں ہیں، پاکستان پر اللہ کریم کا خصوصی فضل و کرم تھا اور ہے، انشاء اللہ یہ ہمیشہ قائم و دائم رہے گا، صرف ضرورت اِس امر کی ہے کہ ہمارے رہنما، ہمارے قائدین، ہمارے پالیسی ساز اور ہمارے حکمران اِس حقیقت کا

احساس کرلیں کہ اسلام کے نام پر قائم ہونے والی ریاست کو اپنی سلامتی و بقاء اور استحکام کیلئے اسلامی نظام کی کارفرمائی درکار ہے۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کا ادراک ارضِ پاک کیلئے اپنا سب کچھ قربان کرنے والے مجاہدوں اور مسلمانان برصغیر کی تمناؤں کے چراغ کو روشن رکھ کر موجودہ پاکستان کو مزید تقسیم سے بچاسکتا ہے، ہمیشہ قائم و دائم رکھ سکتا ہے اور دشمنانِ دین وملت کے مذموم عزائم سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

خدا کرے کہ میری ارض پاک پہ اترے وہ فصل گل جسے اندیشہ زوال نہ ہو

عدالت عظمیٰ کا تاریخ ساز فیصلہ۔۔۔۔

عوامی امنگوں کا آئینہ دار اور اک نئے پاکستان کا مظہر

سولہ دسمبر سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے ہماری ذلت و رسوائی کی تاریخ کا ایک تاریک دن ہے، گزشتہ 38برس سے قوم اِس دن کو اپنی شکست و ریخت کی تلخ یادوں کے حوالے سے یاد رکھے ہوئے ہے اور وہ اُن وجوہات کی متلاشی ہے جو قیام پاکستان کے صرف 21برس بعد ہی پاکستان کے دولخت ہونے کا سبب بنیں، لیکن آج یہ دن پاکستان کی تاریخ میں اِس حوالے سے بے انتہا تاریخی اہمیت کا حامل ہوگیا کہ اِس دن پاکستان کی سب سے بڑی عدالت عظمیٰ سپریم کورٹ آف پاکستان کی جانب سے دیئے گئے تاریخ ساز فیصلے نے ایک ایسی روشن صبح کی نوید پیدا کردی جس کی اُجلی، شفاف اور چمکدار روشنی میں ایک نئے اور کرپشن سے پاک پاکستان کا ظہور ہوگا، آس و اُمید کے نئے چراغ جلیں گے اور دکھوں کی ماری قوم کو اُس اعتماد اور یقین کی روشنی ملے گی کہ ابھی ہمارے اسلاف کی جدوجہد اور قربانیوں کے ثمر مدینہ ثانی پاکستان پر اللہ اور اُس کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحمتوں کا سایہ موجود ہے اور وہ ہم سے ابھی مایوس نہیں ہوئے، یوں پاکستان کی تاریخ میں یہ دن یوم سقوط ڈھاکہ کے

ساتھ قومی دولت لوٹنے والے چوروں ڈاکوؤں اور لیٹروں کو تحفظ دینے والے سیاہ قانون این آر او کے خلاف " انصاف کی جیت " کے حوالے سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اِس دن وطن عزیز کے 17 رجال عظیم نے تاریخ ساز فیصلہ دے کر نہ صرف اپنے منصب انصاف کی لاج رکھی ہے بلکہ عدلیہ کے صاف اور اُجلے دامن پر لگے نظریہ ضرورت کے بدنما داغ کو دھو کر طاقت کے بجائے قانون کی حکمرانی کی راہ بھی ہموار کی ہے اور امیر کیلئے الگ اور غریب کیلئے الگ قانون کے چور دروازے بند کرنے کے روشن امکانات پیدا کر دئے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ پاکستان کی عدلیہ کا یہ تاریخ ساز فیصلہ، عوام کا انصاف کی فراہمی کے اداروں پر اعتماد کی بحالی کے ساتھ، اُن میں نئی امنگوں اور جذبوں کے ابھار اور ایک نئے مضبوط، خوشحال اور پراُمن پاکستان کی تخلیق کی بنیاد بنے گا، یہ درست ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ عدالت عظمیٰ نے حکومت یا ارباب اختیار کی مرضی و منشایا نظریہ ضرورت کے تحت فیصلہ نہیں دیا بلکہ کسی بھی عہدے اور شخصیت کی پرواہ کیئے بغیر انصاف کا بول بالا کیا ہے اور ملک و قوم کی دولت لوٹنے اور چوری کرنے والوں کی استثنائی حیثیت کو سوالیہ نشان بنا کر مستقبل میں عام چوروں، لیٹروں اور ڈاکوؤں کے برابر انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کی نئی راہ عمل بھی متعین کی ہے، آج اِس بات سے کوئی انکار نہیں

کر سکتا کہ عدالت عظمٰی کو 9 مارچ 2007ء سے 16 مارچ 2009ء تک وکلاء، عوام، سول سوسائٹی اور میڈیا کے ساتھ نہایت ہی مشکل، صبر آزماء اور کٹھن سفر سے گزرنا پڑا، تب جاکر کہیں آزاد عدلیہ کی یہ منزل نصیب ہوئی اور مستقبل میں آئین و قانون کی حکمرانی کے آثار پیدا ہوئے۔

سپریم کورٹ کے اس تاریخ ساز فیصلے کے اثرات و عوامل کا جائزہ لینے سے پہلے اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ سابقہ دور آمریت میں 12 اکتوبر 1999 ء سے پہلے احتساب بیورو کی جانب سے عوامی اور سرکاری عہدے رکھنے والوں کے خلاف عدالتوں میں زیرِ التواء مقدمات کے خاتمے کے لیے جنرل پرویز مشرف نے 5 اکتوبر 2007ء کو قومی مصالحتی آرڈیننس یا این آر او جاری کیا تھا، لیکن دو دن بعد ہی 8 اکتوبر کو پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی رکن، ممتاز سیاستدان اور سابق وزیر خزانہ ڈاکٹر مبشر حسن اور سینئر بیوروکریٹ روئیداد خان نے اسے آئین سے متصادم قرار دینے کیلئے سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا تھا لیکن 8 اکتوبر 2007ء سے 16 مارچ 2009ء کو معزول عدلیہ کی بحالی تک، متعدد تاریخی واقعات ظہور پزیر ہوئے، جن میں بے نظیر بھٹو پر مقدمات کی واپسی، 18 اکتوبر 2007 ء کو بے نظیر بھٹو کی وطن واپسی اور قاتلانہ حملہ، 3 نومبر 2007ء کو ایمر جنسی کا نفاذ اور چیف جسٹس افتخار چوہدری سمیت عدلیہ کی معزولی، عبدالحمید ڈوگر کو سپریم کورٹ کا نیا چیف جسٹس مقرر کیا

جانا، 27 دسمبر 2007ء کو بے نظیر بھٹو کی شہادت، 18 فروری 2008ء کے عام انتخابات، وفاق سمیت چاروں صوبوں میں پیپلز پارٹی کی مخلوط حکومت کا قیام، 28 فروری 2008ء کو ڈوگر کورٹ کی طرف سے قومی مصالحتی آرڈیننس کے خلاف حکم امتناعی کی واپسی اور بحالی، 4 مارچ 2008ء کو سندھ ہائی کورٹ کی طرف سے آصف علی زرداری کے خلاف مختلف ممالک میں دائر احتساب ریفرنسز کے خاتمے کا حکم، 18 اگست 2008ء کو پرویز مشرف کا استعفیٰ، 6 ستمبر 2008ء کو آصف علی زرداری کا صدر منتخب ہونا اور 16 مارچ 2009ء تک بار بار وعدوں کے باوجود معزول چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری اور معزول عدلیہ کو بحال نہ کرنا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سولہ مارچ 2009ء کو چیف جسٹس کی بحالی کے بعد دیگر معاملات کے علاوہ ایک سوال جو سب سے زیادہ عوام کے ذہنوں میں گردش کر رہا وہ یہ تھا کہ کیا جسٹس افتخار محمد چودھری این آر او پر نوٹس لیں گے۔ لیکن 31 جولائی 2009ء کو حالات میں اس وقت تبدیلی آئی جب سپریم کورٹ آف پاکستان نے 3 نومبر 2007ء کے بعد اعلیٰ عدالتوں میں تعینات ہونے والے پی سی او ججز اور سندھ ہائی کورٹ کے دو ججوں کی برطرفی کے حوالے سے آئینی درخواستوں پر فیصلہ سناتے ہوئے 3 نومبر کو لگائی گئی ایمرجنسی کو ماورائے آئین قرار دیا اور موجودہ حکومت کو سابق صدر پرویز مشرف کی طرف سے ایمرجنسی اور اس سے پہلے جاری کئے گئے 37

آرڈیننس کو چار ماہ کے اندر پارلیمنٹ سے منظور کرانے کا حکم دیا، جس کے بعد حکومت نے اس متنازع آرڈیننس کو قانونی تحفظ دینے کے لیے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں بحث کے لیے پیش کیا، لیکن مسلم لیگ ن کی شدید مخالفت اور حکومت کی اتحادی جماعت متحدہ قومی موومنٹ کی جانب سے عدم تعاون کے ساتھ صدر اور اُن کے ساتھیوں کو جمہوریت کے لیے قربانی دینے کے مشورے سے جب حکومت کی ناکامی یقینی نظر آنے لگی تو حکومت کو اسے پارلیمنٹ میں پیش نہ کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ 28 نومبر کو سپریم کورٹ کی طرف سے دی گئی مدت ختم ہونے کے بعد اس متنازعہ آرڈیننس کی قانونی حیثیت بھی ختم ہو گئی، چنانچہ یکم دسمبر کو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری نے این آر او کے خلاف درخواستوں کی سماعت کے لیے ایک فل بینچ تشکیل دے دیا، جس نے 16 دسمبر 2009ء کو این آر او کے بارے میں دائر درخواستوں کا مختصر فیصلہ سناتے ہوئے اسے آئین سے متصادم اور این آر او کے تحت ختم کیے گئے تمام مقدمات پہلی پوزیشن پر بحال کر دیئے، یوں عدالتی معاون جسٹس ریٹائرڈ اللہ نواز خان کے بقول "چوروں کی حکومت، چوروں کے ذریعے اور چوروں کے لیے" بنایا گیا امتیازی سپریم کورٹ نے کالعدم قرار دے دیا۔

اس مقدمے کی سماعت کے دوران حکومت نے اپنی سابقہ بدانتظامی کی روایات کو ایک بار پھر برقرار رکھا، دوران سماعت حکومتی وکلاء کی مایوس کن کارکردگی

کا اندازہ اِس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اُن کے پاس این آر او کی وجہ سے معاف ہونے والے مقدمات اور بیرون ملک عدالتوں دائر کیسوں کے بارے میں مکمل معلومات تک نہیں تھی، یہ وکلاء اس قدر بو کھلائے ہوئے اور منتشر الذہن تھے کہ معزز جج صاحبان کو بار بار یہ کہنا پڑا کہ آپ جس صدر کا دفاع کر رہے ہیں، اس سے انہیں کوئی فائدہ نہیں بلکہ الٹا نقصان ہو سکتا ہے۔ عدالت بار باران سے پوچھتی رہی کہ سوئس مقدمات کس طرح اور کس کے حکم پر واپس لئے گئے، مگر تمام سرکاری وکلاء کوئی واضح جواب نہ دے سکے، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یا تو انہیں اس بات کا علم ہی نہ ہو یا وہ جان بوجھ کر چھپا رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ سپریم کورٹ میں این آر او کے خلاف درخواستوں کی سماعت کے دوران ہر موقع پر صدر زرداری کیلئے مشکلات بڑھتی گئیں، گو کہ اس سے قبل ان پر لگائے گئے الزامات کو بہت سے لوگ مسترد کرتے رہے مگر دوران سماعت ان پر قائم مقدمات اور بیرون ملک بنک اکاؤنٹس میں موجود رقوم کا جو ریکارڈ اور تفصیلات عدالت میں پیش کی گئیں، اس نے صدر کی غیر متنازعہ حیثیت اور سیاسی ساکھ کو شدید نقصان پہنچایا، اسی طرح وفاق کی طرف سے بیرسٹر کمال اظفر کو عدالتی جنگ میں اتارنے کا فیصلہ بھی حکومتی بدحواسی کا مظہر اور ساکھ کیلئے نقصان دہ ثابت ہوا، گو کہ اس تعیناتی کا مقصد عدالت کو صدر آصف زرداری کے خلاف فیصلہ دینے سے روکنا تھا مگر وہ سوائے عدالت عظمٰی کو ناراض کرنے کے، کوئی کام نہ کرسکے، سماعت کے دوران قومی احتساب بیورو کی کارکردگی بھی اس وقت کھل

کر سامنے آگئی جب بہت سے معاملات پر عدالت نے نیب کے چیئرمین کو وارننگ دی اور ان سمیت کئی ذمہ داران کو ہٹانے کی ہدایت جاری کی۔ اسی طرح این آر او کے خلاف درخواستوں کی سماعت کے دوران صدر کا یہ بیان کہ جمہوریت کا عدالتی قتل نہیں ہونا چاہئے، عدالت کے نوٹس کا سبب بنا۔شاید صدر کے بیان کا مقصد عدالت کو یہ پیغام دینا تھا اگر وہ عدالتی فیصلے کی وجہ سے نااہل قرار دیئے جاتے ہیں تو یہ جمہوریت کا عدالتی قتل ہوگا۔ لیکن دوران سماعت چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری نے واضح کردیا کہ عدلیہ ایوان صدر کا احترام کرتی ہے۔ اسے اِس سے کوئی غرض نہیں کہ وہاں کون بیٹھا ہوا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ روز اول سے ہی حکومت کا کیس بڑا کمزور اور مؤقف بڑا حیران کن تھا کہ این آر او تو ایک غیر آئینی قانون ہے مگر اس کی وجہ سے لئے گئے فوائد درست اور صحیح ہیں۔ این آر او پاکستان کی تاریخ کا وہ منفرد اور بدنصیب سیاہ قانون تھا جس کے دفاع اور صفائی کیلئے خود اس سے فائدہ اٹھانے والے بھی عدالت میں پیش نہیں ہوئے۔ بلکہ حیرت کی بات یہ ہے کہ انہوں نے خود عدالت سے اسے غیر آئینی اور غیر قانونی قرار دینے کی استدعا کی۔

اس لحاظ سے موجودہ حالات میں این آر او کے خلاف عدالت عظمٰی کا فیصلہ ایک تاریخ ساز فیصلہ اور ایسا سنگ میل ہے جس کو جتنا بھی سراہا جائے اتنا ہی کم ہے۔ سپریم کورٹ کے اس فیصلے سے پاکستان پر دور رس اثرات مرتب ہونگے۔ آج

عدالت عظمیٰ کی جانب سے این آر او کو آئین سے متصادم اور کالعدم قرار دیے جانے سے عدل انصاف سرخرو ہوگیا اور اس سے نہ صرف عوام کے سر فخر سے بلند ہوگئے بلکہ دنیا بھر میں پاکستان کے وقار میں بھی اضافہ ہوا، اس تاریخ ساز فیصلے سے ملک میں کرپشن اور لوٹ کھسوٹ کی سیاست کا خاتمے اور بد عنوان افراد کی حوصلہ شکنی کا دور شروع ہوگا، جمہوریت کی فتح اور آئین کی بالادستی قائم ہوگئی، ملک میں کرپشن اور لوٹ مار کرکے غیر قانونی تحفظ کے تمام دروازے بند ہوجائیں گے جس سے قومی مجرموں کو قرار واقعی سزا ملنے کی امید پیدا ہوگی، یقیناً سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ ملک کے 17 کروڑ عوام کے دل کی آواز، عدلیہ بحالی کی جدوجہد میں دی گئی قربانیوں کا ثمر اور پوری قوم کیلئے فتح وکامرانی اور صبح نو کی نوید ثابت ہوگا، آج عدالت عظمیٰ کے فیصلے نے جہاں یہ ثابت کردیا ہے کہ قانون امیر و غریب اور ادنیٰ واعلیٰ سب کیلئے برابر ہوگا، وہیں اس فیصلے سے این آر او سے مستفید ہونے والے وزراء اور بالخصوص صدر زرداری کے مستقبل پر بھی کئی سوالات کھڑے کردیئے ہیں اور اس فیصلے نے اُن کے اپنے عہدوں پر موجود رہنے کا اخلاقی جواز ختم کردیا ہے،اب دیکھنا یہ ہے کہ اس اخلاقی جواز کے آگے کون کون سر تسلیم خم کرتا ہے، گو کہ اس کے امکانات بہت ہی کم ہیں لیکن وہ دن دور نہیں جب حکومتی کرپشن اور لوٹ مار کو بے نقاب کرتا میڈیا اور آئین و قانون کی حرمت اور تقدس کا تحفظ کرتی ہوئی عدلیہ کے فیصلوں سے بیدار ہوتی ملک کی رائے عامہ ایک مؤثر

عوامی تحریک میں ڈھل کر یہ مطالبہ کرتی نظر آئے کہ کرپٹ اور بدعنوان افراد کی اب
ہمارے سسٹم میں کوئی جگہ اور گنجائش نہیں ہے اور اگر مجرم خود ہتھیار نہیں ڈالیں گے تو
آئین و قانون کے رکھوالے اور ملک کے محب وطن عوام اُن کے ہاتھوں سے جرائم کے
تمام ہتھیار چھین لیں گے۔

اک نیا باب کہ دیتا ہے یہ آواز ہمیں
آؤ سفاک اندھیروں کی چٹانیں توڑیں

شہیدِ راہ وفا دختر مشرق بے نظیر بھٹو کی

محترمہ بے نظیر بھٹو کی دوسری برسی کے موقع پر خصوصی تحریر
شہیدِ راہ وفا دختر مشرق بے نظیر بھٹو کی ... بے نظیر زندگی بے نظیر شہادت
آج دختر مشرق شہید جمہوریت محترمہ بے نظیر بھٹو کو اپنی قوم سے جدا ہوئے دو سال بیت گئے، اس موقع پر ہمیں 27 دسمبر 2007ء کو راولپنڈی کے تاریخی لیاقت باغ میں محترمہ بے نظیر بھٹو کی تقریر کے وہ الفاظ یاد آرہے ہیں، جس میں محترمہ جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں "آپ کا اور میرا ملک خطرے میں ہے، سوہنی دھرتی مجھے پکار رہی ہے، ہم دہشت گردوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالیں گے، قبائلی علاقوں میں پاکستان کا پرچم ہمیشہ لہراتا رہے گا، پاکستان کیلئے میرے والد کو شہید کردیا گیا..... میرے دو جوان بھائی مار دیئے گئے، شوہر کو طویل عرصے تک جیل میں رکھا گیا، مجھے پارٹی کی قیادت کے ساتھ ختم کرنے کی کوشش کی گئی، میری ماں کو سڑکوں پر لاٹھیاں ماری گئیں، مجھے جیل میں رکھا گیا، لیکن ہم موت سے نہیں ڈرتے، ہم عوام کی طاقت سے انتہا پسندوں کو شکست دیں گے۔"

راولپنڈی کے جلسہ عام میں محترمہ بے نظیر بھٹو دراصل اپنے اُس عہد کی تجدید اور اُس وعدے کا اعادہ کر رہی تھیں جو انہوں نے اپنی 24 ویں سالگرہ پر جیل میں آخری ملاقات کے موقع پر اپنے والد قائد عوام شہید ذوالفقار علی بھٹو سے کیا تھا، جس کا اظہار محترمہ اپنی کتاب دختر مشرق میں کرتے ہوئے لکھتی ہیں "میں آکسفورڈ اور اپنے متعدد دوستوں سے الوداع پر رنجیدہ تھی.... لیکن میں پاکستان میں نئے منتظر امکانات کے سلسلے میں بھی بہت پر جوش تھی، میرے والد بھی میری آمد کے اتنا ہی منتظر تھے جتنا میں گھر واپس جانے کیلئے بے تاب تھی، انہوں نے مجھے خط میں لکھا تھا "میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں پاکستان میں تمہاری ذہنی ہم آہنگی کیلئے اپنی بھرپور کوشش کرونگا، تاکہ تمہارا مستقبل جلد ہی خوشگوار ہو جائے، اِس کے بعد تمہیں اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہونا ہے، البتہ میرے مزاج کے طنزیہ تیروں کو تمہیں برداشت کرنا ہوگا۔
بد قسمتی سے میں اب اِس عمر میں اپنے مزاج کو تبدیل نہیں کر سکتا، اگرچہ میں اپنی پہلوٹی بیٹی کیلئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں، مشکل یہ ہے کہ تم زود رنج مزاج رکھتی ہو اور تمہاری آنکھوں سے فوراً ہی ٹپ ٹپ آنسو گرنا شروع ہو جاتے ہیں، جیسے میری اپنی آنکھوں سے بھی، اِس کی وجہ یہ ہے کہ ہم دونوں ایک ہی گوشت پوست کے بنے ہوئے ہیں، آؤ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کا معاہدہ کرلیں، تم

ایک متحرک طبیعت کی مالک ہو، ایک متحرک انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ صحرا کو حدت کے بغیر اور پہاڑوں کو برف کے بغیر دیکھنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا، تم اپنی دھوپ کی چمک اور اپنی قوس و قزح اپنی باطنی اقدار اور اخلاقیات میں تلاش کروگی اور یہیں تمہیں کاملیت کا حصول ممکن ہوگا، ہم دونوں قابل تعریف کامیابیوں کیلئے مشترکہ طور پر جدوجہد کریں گے، کیا تم شرط لگاتی ہو کہ ہم اِس میں سرخرو ہوجائیں گے۔"

یہ عجیب اتفاق ہے کہ زندگی میں قابل تعریف کامیابیوں کے حصول اور اِس میں سرخروئی کیلئے اپنی بیٹی محترمہ بے نظیر بھٹو سے شرط لگانے والا عظیم باپ ذوالفقار علی بھٹو دونوں ہی اپنی اپنی جگہ نہ صرف کامیاب و کامران ہوئے بلکہ دونوں پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اَمر بھی ہوگئے، بھٹو خاندان سندھ کی سیاست میں ایک قدیم خاندان ہے جو ہمیشہ سے سندھ کی سیاست میں متحرک اور فعال رہا ہے اور جس نے نہ صرف سندھ بلکہ پاکستان کی سیاست میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں ہیں، اِس خاندان کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اِس کے سپوت کئی بار پاکستان کے اعلیٰ ترین منصب وزارت عظمیٰ پر فائز ہوئے۔

ذوالفقار علی بھٹو کے والد سر شاہنواز بھٹو 1934ء میں ممبئی کابینہ میں

وزیر بلدیات بننے سے لے کر ریاست جوناگڑھ کی وزارت عظمیٰ تک مختلف منصب پر فائز رہے۔ اُن کے بیٹے ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی سیاست کا آغاز ایوب خان کے دور میں کیا اور بالآخر وہ پاکستان کے وزیر اعظم بنے۔ آمر وقت کے ہاتھوں شہید ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد اُن کی پیاری بیٹی "پنکی" محترمہ بے نظیر بھٹو پاکستان کی سیاسی بساط پر ایک قدآور شخصیت کے روپ میں نمودار ہوئیں اور انھوں نے اپنے والد کے مشن کو اپنی زندگی کے آخری لمحے تک آگے بڑھایا۔ ذوالفقار علی بھٹو اپنی بیٹی کی صلاحیتوں سے پوری طرح واقف تھے۔ اسی وجہ سے انھوں نے 1977ء میں عدالت میں اپنی آئینی پیٹشن داخل کرتے وقت جنرل محمد ضیاء الحق کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "پاکستان کے کسی بھی حلقے سے میری بیٹی بے نظیر کے مقابلے میں الیکشن لڑ کر دیکھ لو۔ میں لکھ کر دے سکتا ہوں کہ وہ صرف تمہیں شکست دے گی بلکہ تمہاری ضمانت بھی ضبط کرا دے گی۔ آؤ اور میرے اِس چیلنج کو قبول کرو۔ تم ایک مومن ہو اور میں ایک مجرم۔ پھر مجرم کی بیٹی سے کیوں ڈرتے ہو۔"

لیکن جنرل ضیاء الحق سے لے کر جنرل پرویز مشرف تک کسی آمر وقت کو یہ جرات نہیں ہوئی کہ وہ بھٹو کے اس چیلنج کو قبول کرکے محترمہ بے نظیر بھٹو کے مقابلے میں الیکشن لڑتا۔ بھٹو کو اپنے بیٹوں سے زیادہ اپنی بیٹی پر اعتماد تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اُن کی بیٹی بلند حوصلہ، نڈر اور بہادر ہے

اور کبھی ہمت نہیں ہارتی ہے، اسی وجہ سے انہوں نے اپنے بیٹوں کے مقابلے میں اپنی بیٹی کو اپنا سیاسی وارث بنانے کا فیصلہ کیا، ذوالفقار علی بھٹو نے بے نظیر کے نام اپنے آخری خط میں اِس بات کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا تھا "تمہاری صلاحیت اور ذہانت تمہیں اعلیٰ ترین مقام تک پہنچائے گی، لیکن ہم ایک ایسے معاشرے میں زندگی بسر کررہے ہیں، جہاں ذہانت اور صلاحیت ایک نقص شمار ہوتی ہے اور دم گھونٹنے والی معمولی قسم کی ذہانت ایک اثاثہ شمار کی جاتی ہے، تمہارے والد (بھٹو) قائد اعظم اور شاید.... ! حسین شہید سہروردی کے سوااِس ملک میں حکومت شعبدہ بازوں اور کپتانوں نے کی ہے، شایداِس صورتحال میں تبدیلی پیدا ہو جائے، اگر حالات تبدیل نہیں ہوتے تو پھر تبدیل کرنے کیلئے کچھ نہیں بچے گا، یا اقتدار عوام کو حاصل ہوگا یا پھر ہر شے تباہ و برباد ہوجائے گی۔"

واقعی بھٹو کے اندیشے درست ثابت ہوئے کہ ہر چیز تباہ و برباد ہو گئی، معمولی ذہانت نے اُس وقت اعلیٰ ذہانت پر قبضہ کرلیا، جب 4اپریل 1979ء کو ایک فوجی آمر نے اپنی اَنا کی تسکین کی خاطر "پنکی "کے باپ قائد عوام، فخر ایشیا اور ایک ہارے ہوئے ملک کو نئی زندگی دینے والے دنیا کے عظیم لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کی زندگی پر شب خون مار کر اُن کی زندگی کا خاتمہ کردیا، بظاہر بھٹو مرگیا، شہید ہوگیا، لیکن اِس شہادت نے اُسے آمر حکمرانوں کے سامنے عزم ،

حوصلے، استقامت اور بے مثال قربانی کی روشن علامت اور عملی جدوجہد کا استعارہ بنا دیا، باپ سے کئے گئے عہد اور وعدے نے نوجوان بیٹی کو عزم و ہمت اور جدو جہد کی دولت عطا کی، چنانچہ اپنے لیے سفارت کاری کا میدان چننے کی خواہشمند "پنکی" اب اپنے باپ کی سیاسی جانشین بن کر اپنے عہد کو پورا کرنے کا فیصلہ کرچکی تھی، بے رحم وقت نے اُسے کارزار سیاست کے کانٹوں بھرے میدان میں لا کھڑا کیا تھا اور تقدیر بھی اُس نازک سی لڑکی کی آنکھوں کو مستقبل کے رنگین سنہرے خوابوں کے بجائے آنسوؤں سے بھرنے کا فیصلہ کرچکی تھی۔

اُس کی خوبصورت آنکھیں کبھی باپ کی پھانسی کے صدمے پر، کبھی جواں سال بھائی کی دیار غیر میں پراسرار موت پر، کبھی دوسرے بھائی کی کراچی کی سڑک پر قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ہاتھوں اندوہناک ہلاکت پر، کبھی صدموں سے نڈھال زندہ درگور ماں کی بے بسی پر، کبھی شوہر کی اسیری پر اور کبھی اپنے پیاروں اور اپنی مٹی کی خوشبو سے دور جلاوطنی پر بھیگتی رہیں، پھر بھی وہ اپنے باپ کے مشن کو پورا کرنے کیلئے زندگی کی آخری سانسوں تک مصائب و آلام سے نبرد آزمارہی، اُس نے اپنے والد کی پھانسی کے بعد ایک طویل عرصہ قید و بند کی صعوبتوں میں گزارا، فوجی آمر جنرل ضیاء الحق کے خلاف جدوجہد کی علامت بن کر ابھرنے والی یہ نازک سی لڑکی ہر دور میں آمریت کو للکارتی رہی، اپنے

عظیم باپ ذوالفقار علی بھٹو کے مشن کو ہمیشہ جاری رکھنے کا عہد کرنے والی لاڈلی اور پیاری بیٹی " پنکی " کو وقت نے سیاست کی بساط پر نڈر بہادر محب وطن، ہمیشہ فوجی آمریت سے برسرپیکار، جمہوریت کی علمبرادر، وفاقِ پاکستان کی علامت اور چاروں صوبوں کی زنجیر کا اعزاز بخشا، اب وہ میدان سیاست کی "بی بی" اور ملک کی مقبول ترین عوامی لیڈر اور پاکستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کی قائد تھی، انہیں مسلم دنیا کی پہلی خاتون اور پاکستان کی دو مرتبہ وزیر اعظم منتخب ہونے کا اعزاز بھی ملا۔

انیس سوستتر تک بے نظیر کی زندگی آسودگی میں گزری، اس کے بعد مشکلات اور دشواریوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا جو ان کی ناگہانی شہادت پر منتج ہوا، جنرل ضیاء الحق نے بھٹو کا تختہ الٹا تو اُس کے بعد بے نظیر بھٹو کی زندگی میں کئی چیزیں الٹ پلٹ ہو گئیں، 24 سالہ لڑکی کے نازک کاندھوں پر فوجی آمروں نے اپنے بھاری بوٹوں کا وزن رکھ دیا، 3 اپریل 1979ء کی صبح بھٹو سے بے نظیر کی آخری ملاقات ہوئی، اِس ملاقات میں بیٹی نے اپنے باپ کے سامنے اُن کے مشن کو جاری رکھنے کا عہد کیا، سلاخوں کے پیچھے قید بے بس مگر غیر متزلزل ارادوں کے مالک باپ نے اپنی بیٹی میں ایک ایسی نئی انقلابی عورت کو جنم لیتے ہوئے دیکھا تھا جس میں اُس کے مرنے کے بعد بھی اُس کی انقلابی فکر اور روح کو زندہ رہنا تھا، شاید اسی وجہ سے اُسے موت کو گلے لگانے کیلئے

پھانسی کے پھندے کو قبول کرنا مشکل نہیں رہا۔ 21 جون 1953ء کو کراچی میں پیدا ہونے والی بے نظیر بھٹو نے ریڈ کلف کالج اور ہارڈورڈ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی، انہوں نے لیڈی مارگریٹ ہال آکسفورڈ سے سیاسیات، اقتصادیات اور فلسفے کی ڈگری حاصل کی اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے بین الاقوامی قانون اور ڈپلومیسی کا کورس مکمل کیا۔

وہ پہلی ایشیائی خاتون تھیں جو آکسفورڈ یونین کی صدر منتخب ہوئیں، انہوں نے کئی کتابیں بھی لکھیں، وہ 1988ء میں پہلی بار اور 1993ء میں دوسری بار پاکستان کی وزیر اعظم بنیں، بدقسمتی سے دونوں دفعہ اُن کی حکومت بدعنوانی اور کرپشن کے الزامات کے تحت برطرف کی گئی، پاکستان اور اسلامی دنیا کی پہلی اور ملک کی دوبار وزیر اعظم منتخب ہونے والی بے نظیر بھٹو کی زندگی حوادث زمانہ سے بھری پڑی ہے، اگر اُن کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو کب کا شکستہ دل ہو کر سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلیتا لیکن انہوں نے اپنی سیاسی بصیرت، فہم وفراست اور مدبرانہ قیادت سے اِس بات کو سچ کر دکھایا کہ اُن کے والد شہید ذوالفقار علی بھٹو کی نگاہ انتخاب کبھی غلط نہیں ہو سکتی، بے نظیر بھٹو نے سیاست کے میدان میں بہت سے دھچکے اور صدمے برداشت کئے، انہوں نے اپنی آنکھوں سے والد کی پھانسی دیکھی، ضیاء دور میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، دو مرتبہ جلاوطنی کا عذاب سہا، شادی سے قبل اپنے بھائی

شاہنواز بھٹو کو پُراسرار حالت میں موت کی سیاہ وادی میں اترے دیکھا، سیاست کے میدان میں اپنی ماں کو زخمی حالت میں پھٹے ہوئے سر کے ساتھ خون آلود دیکھا۔ دوران اقتدار جوان بھائی میر مرتضٰی بھٹو کے لاشے کو کندھا دیا، شوہر کو سات برس حوالہ زنداں کیا، اُن کا پورا خاندان بکھر گیا، مگر اِس کے باوجود اُن کی زندگی جہد مسلسل سے عبارت ہے، اُن کا وجود پاکستان کیلئے ایک ایسی زنجیر ثابت ہوا جس نے چاروں صوبوں کو باہمی طور پر ایک دوسرے سے باندھے رکھا، 18 اکتوبر 2007ء کو جب وہ آٹھ سالہ جلا وطنی ختم کرکے پاکستان واپس لوٹیں تو اُن کے جلوس پر خود کش حملہ کیا گیا جس میں وہ بال بال بچ گئیں لیکن اُن کی پارٹی کے ڈیڑھ سو سے زائد ارکان لقمہ اجل بن گئے، اِس خوفناک حادثے کے بعد بار بار کہا گیا کہ وہ اپنی سرگرمیاں محدود کردیں، لیکن انہوں نے نہایت ہی دلیری اور بہادری سے بحالی جمہوریت کی جدوجہد زندگی کی آخری سانسوں تک جاری رکھی، بھٹو کی پھانسی کے بعد بے نظیر بھٹو نے اپنے باپ کے متعین کردہ اصولوں کی روشنی میں اپنی سیاست کا آغاز کیا، یہاں سے بے نظیر کی فہم و فراست کا اصل امتحاں شروع ہوا اور وقت نے بے نظیر کی فہم و فراست پر مہر تصدیق ثبت کردی۔

پاکستان کی سیاسی تاریخ گواہ ہے کہ جناب بھٹو کا یہ انتخاب بالکل صحیح ثابت ہوا اور اُن کی بیٹی پاکستان کی ایک بڑی سیاسی لیڈر ہی نہیں بنی، بلکہ اُن کو بین الاقوامی سطح پر ایک عالمی سیاسی لیڈر اور مدبر کی حیثیت سے بھی پہچانا جانے لگا، جبکہ عالمی امور پر ان کی گہری نظر کا ایک زمانہ قائل رہا، وہ سیاست میں جلد بازی کی کبھی بھی قائل نہیں رہیں، جنرل مشرف سے قومی مفاہمت پر جن لوگوں نے سب سے زیادہ شور مچایا، اِس مفاہمت کا فائدہ بھی انہی لوگوں نے اٹھایا، بے نظیر بھٹو کی اس مفاہمت کی پالیسی کی وجہ سے انتخابات کی راہیں ہموار ہوئیں، بے نظیر بھٹو کے والد شہید ذوالفقار علی بھٹو ہارے ہوئے پاکستان کے تشخص، عزت وقار اور اعتماد کی بحالی چاہتے تھے، وہ دنیا میں پاکستان اور پاکستانی قوم کے سر اٹھا کر جینے کے خواہاں تھے اور اس مقصد کیلئے وہ پاکستان کو دفاعی لحاظ سے ایٹمی طاقت بنا کر ناقابل تسخیر بنانا چاہتے تھے، اُن کا مشن پاکستان کو دنیا میں عالم اسلام کی پہلی ایٹمی وقت بنانا تھا اور وہ اِسی جرم کی پاداش میں تختہ دار پر چڑھائے گئے۔

اپنے والد کی طرح بے نظیر بھٹو کا بھی یہی مشن تھا، انہوں نے پاکستان کو میزائل ٹیکنالوجی کا تحفہ دلوا کر والد کے مشن کو جاری رکھا، وہ کسی طور بھی اپنے والد کے مشن سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھیں، اپنے والد سے کئے گئے عہد اور اُن کے مشن کو پورا کرنے کی جدوجہد میں مصروف بے نظیر بھٹو

کو وقت نے اُس وقت "بے نظیر "اور ہمیشہ کیلئے اَمر بنا دیا، جب وہ لیاقت باغ راولپنڈی
میں ایک انتخابی جلسے سے خطاب میں اِس عزم کا اعادہ کرکے واپس جارہی تھیں
کہ "چاہے جان چلی جائے ملک کو بچائیں گے۔" جمہوری اداروں کے استحکام، پاکستان کی
بقا، عوام کی حکمرانی اور چاروں صوبوں کو ایک لڑی، ایک زنجیر میں پروئے رکھنے کی
جدوجہد میں مصروف بے نظیر بھٹو 27دسمبر 2007ء کو لیاقت باغ راولپنڈی میں
دہشت گردوں کے ہاتھوں زندگی کی بازی ہار گئیں، 27دسمبر 2007ء پاکستان کی سیاسی
تاریخ میں وہ المناک دن ہے جس دن لوگوں کے دلوں میں ملکی بقاء اور سلطانی جمہور
کی لگن ابھارنے اور چاروں صوبوں میں محبت و یگانگت کے ترانے گانے والی آواز ہمیشہ
کیلئے خاموش ہوگئی، گڑھی خدا بخش میں بے نظیر بھٹو کا خاکی وجود ہی نہیں جمہوریت کیلئے
طویل سیاسی جدوجہد سے عبارت ایک سیاسی عہد بھی دفن ہوگیا۔
اِس میں کوئی شک نہیں کہ بے نظیر بھٹو موجودہ سیاسی قائدین میں اِس لحاظ سے ممتاز
حیثیت رکھتی تھیں اور اُن کی زندگی اور اُن کا وجود وفاق کی سلامتی اور استحکام کی علامت
تھا، وہ ساری زندگی عوامی اور جمہوریت کی بحالی کی خاطر سرگرم عمل رہی، اُن کی اِن
خدمات کا اعتراف بعد از مرگ اقوام متحدہ نے انہیں اعزاز سے نواز کر کیا، بلاشبہ اُن کی
شہادت ایک عظیم قومی سانحہ ہے اور اُن کی شہادت سے پیدا ہونے والے خلاء کے پُر
ہونے کے آثار دور دور تک

نظر نہیں آتے۔ آج محترمہ بے نظیر بھٹو کو ہم سے جدا ہوئے ہوئے دو سال گزر گئے ہیں لیکن پوری قوم ان کی یاد میں سوگوار ہے

قبائے صبر کئے تار تار بیٹھے ہیں
یہ کس کی یاد میں سب سوگوار بیٹھے ہیں
تمام شہر ہے خاموش، بند ہیں بازار
اداس تیرے عقیدت گزار بیٹھے ہیں
جنہیں گماں تھا کہ دے تجھ کو موت، شاید مات
وہ جیت کے بھی بازی کو ہار بیٹھے ہیں

بھٹو خاندان کی سیاسی تاریخ خون سے رنگین ہے، پاکستان کی ترقی، بقا اور استحکام و سالمیت کیلئے اِس خاندان نے جتنی قربانیاں دی ہیں،۔برصغیر کی تاریخ میں اُس کی نظیر نہیں ملتی۔آج بھی چاروں طرف بھٹو کا طلسم پھیلا ہوا ہے ....اور آج بھی بھٹو زندہ ہے، بھٹو کی طرح آمریت کے پروردہ اور جمہوریت دشمن عناصر نے 27 دسمبر 2007ء کے دن بے نظیر بھٹو کو شہید کرکے اُن کے جسمانی وجود سے چھٹکارا تو حاصل کرلیا گیا، لیکن اُن کی مقبولیت، ہر دل عزیزی اور کرشماتی شخصیت کو دفن نہیں کیا جاسکا، بے نظیر واقعی بے نظیر تھیں، انہیں معلوم تھا کہ انہیں قتل کردیا جائے گا، لیکن اِس کے باوجود

وہ اپنے مشن سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھیں، دنیا میں یہ آن بان یہ شان ہر
کسی کے مقدر میں نہیں آتی، سچ کی قربان گاہ پر بہنے والا بے نظیر کا لہو رنگ لا کر رہے گا
اور قاتلوں کے سیاہ چہروں پر ثبوت کا اَن مٹ نقش بن کر اعلان کرے گا۔"
ظالمو.... تمہاری بزدلی تمہاری موت ہے.... اور.... میری دلیری میری زندگی
ہے.... جو اَمر ہے.... میں مر کر بھی آج زندہ ہوں....اور.... ہمیشہ زندہ رہوں
گی....لوگوں کے دل و دماغ میں .... مجھے کوئی نہیں مٹا سکتا.... کیونکہ میں بے نظیر
ہوں....جس کی کوئی نظیر نہیں ....اور نظیر ہمیشہ زندہ رہتی ہے"۔

کربلاِ وقت میں اب بھی جنگ جاری ہے

قرآن مجید کی سورہ بقرہ میں ارشاد ہے "اور ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے، کچھ ڈر اور بھوک سے اور کچھ مالوں، جانوں اور پھلوں کی کمی سے اور خوشخبری سناؤان صبر کرنے والوں کو کہ جب اُن پر کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہ ہم اللہ ہی کا مال ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن پر اُن کے رب کی دُرود اور رحمت ہے اور یہی لوگ راہ ہدایت پر ہیں" (آیت ۱۵۷۔۱۵۵)۔

دین اسلام میں ہر صاحب ایمان اور مومن ہونے کے دعویدار کی آزمائش اور امتحان اُس کی حیثیت و شان اور مرتبہ و مقام کے مطابق لیا جانا ضروری ہے، کیونکہ یہی تقاضہ فطرت اور قانون الہیٰ ہے، دین اسلام کے اس نصاب امتحان میں خوف وپریشانی، بھوک وپیاس، مال وجان کا نقصان اور بچوں کا لیا جانا شامل ہے، دراصل اس امتحان کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ کون اپنے دعویٰ ایمانی میں سچا ہے اور کون جھوٹا، جو شخص اس میدان امتحان میں اخلاص و محبت کے ساتھ ثابت قدمی اور صبر و رضا کا مظاہرہ کرتا ہے وہ کامیاب قرار پاتا ہے اور جو اس امتحان سے جی چراتا ہے وہ اپنے جھوٹے ہونے کے ساتھ ساتھ دنیا اور آخرت میں بھلائی اور خیر سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔

دنیا میں جہاں حق و باطل کے امتیاز اور اللہ کے دوستوں اور دشمنوں کی پہچان کیلئے ہمیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلاموں اور محبّوں کی والولہ العزمی اور اسلام دشمن شیطانوں کی درندگی کی مثالیں ہر دور میں ملتی ہیں، وہاں چراغ مصطفوی کے مقابلے میں شرار بولہبی بھڑکانے کا سلسلہ بھی نیا نہیں ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال ظاہری کے بعد یہودیوں اور نصرانیوں نے مسلمانوں کی متحد و منظم قوت کو منتشر کرنے کیلئے ہر وہ حربہ آزمایا، جس کے زریعے وہ مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرکے ان کا شیرازہ بکھیر سکتے تھے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت تک وہ اپنے مذموم عزائم میں کامیاب نہ ہوسکے، لیکن حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں سبائیوں نے اپنی ریشہ دوانیاں تیز کردیں اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دور میں خوارج نے فرقہ واریت اور اہل بیت رسول سے دشمنی کا بیج بو کر اُمت مسلمہ میں اس فتنے کا آغاز کیا، اُس کے بعد سے جو کچھ بھی ہوا وہ آج بھی تاریخ کے صفحات میں موجود ہے۔

اسلام کی تاریخ گواہ ہے کہ ہر دور میں ہمیشہ باطل کے سامنے اہل حق ہی صف آرا ہوئے ہیں، دنیا کی کوئی طاقت نہ تو ان کو خرید سکی اور نہ ہی ان کے پائے استقامت میں لغزش پیدا کرکے انہیں حق کے اظہار سے باز رکھ سکی، یہی

وہ اہل ایمان تھے جنہوں نے دین اسلام کی خاطر کبھی بھی کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کیا اور کفر و طاغوت اور ظلم و ناانصافی کے خلاف حق کے غلبے اور آبیاری کی جنگ لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کرکے ہمیشہ کیلئے تاریخ کے صفحات میں امر ہوگئے، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں جس کا مفہوم ہے کہ "جب دین کا سیاسی نظام بگڑ جائے تو مسلمانوں پر ایسے حکمران ہونگے جو غلط رخ پر سوسائٹی کو لے جائیں گے، اگر اُن کی بات مانی جائے تو لوگ گمراہ ہوجائیں اور اگر اُن کی بات کوئی نہ مانے تو وہ اسے قتل کردیں گے۔" اس پر لوگوں نے پوچھا "ایسے حالات میں آپ کیا ہدایت دیتے ہیں؟" تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تمہیں وہی کچھ اُس زمانے میں کرنا ہوگا جو عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے ساتھیوں نے کیا وہ آروں سے چیرے گئے، سولیوں پر لٹکائے گئے، لیکن انہوں نے باطل کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے۔ اللہ کی اطاعت میں مرجانا اس زندگی سے بہتر ہے جو اللہ کی نافرمانی میں بسر ہو"۔ (طبرانی)

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے کہ "تم میں سے جو کوئی ایسے حاکم کو دیکھے جو شریعت و سنت کو بدلنے والا ہو، تو دیکھنے والا اپنے قول و عمل سے اس کو نہ بدلے تو اللہ تعالیٰ کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اس شخص کو بھی اس حاکم کے ساتھ دوزخ میں ڈال دے" 61 ہجری میں جب شریعت محمدی کو بدلنے کیلئے حاکم وقت نے

جبر و استبداد سے کام لیتے ہوئے گلشن اسلام کو تاراج کرنا چاہا اور شریعت وسنت کو مسخ کرنے کی کوشش کی تو اسلام کے تحفظ کیلئے فرزند رسول سیدنا امام حسین علیہ السلام میدان عمل میں نکلے، آپ اُس وقت اپنے علم و فضل اور مرتبہ و مقام کے لحاظ سے عالم اسلام کی سب سے بزرگ ترین شخصیت تھے۔

آپ کے پیش نظر اپنے نانا جان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات اور سیرت طیبہ تھی رخصت و عزیمت کی دونوں راہیں آپکے سامنے تھیں، راہِ عزیمت کا تقاضہ تھا کہ جابر وظالم اور فاسق و فاجر حکمراں کے فسق و فجور کے خلاف صدائے حق بلند کرکے ثابت قدمی سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جان دے دی جائے جبکہ رخصت کہتی تھی کہ خاموش رہ کر اپنی جان بچالی جائے۔ یہ اصول شریعت بھی آپ کے پیش نظر تھا کہ جب فاسق و فاجر امامت صغریٰ کا اہل نہیں ہوسکتا تو پھر وہ امامت کبریٰ یعنی ملک و قوم کی امامت کا کیسے اہل ہوسکتا ہے، آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ ایسے فاسق و فاجر اور ظالم و جابر حکمران کے خلاف خروج لازمی ہے۔ جس کا فسق و فجور اپنی ذات تک محدود نہ رہے بلکہ اس کی جرات اتنی بڑھ جائے کہ وہ حدود شرع کو معطل کرکے بے حیائی اور نافرمانی کو فروغ دینے لگے اور حلال و حرام کی تمیز ختم بھی کردے۔

آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ اِس وقت سب کی نگاہوں کا مرکز آپ کی ذات ہے، آج

اگر رخصت پر عمل کیا گیا تو اسلام کا اپنی اصل شکل و صورت پر باقی رہنا ہی مشکل نہیں ہوگا بلکہ آپ کے اس طرز عمل سے قیامت تک کیلئے ہر فاسق و فاجر اور ظالم و جابر حکمران کی بیعت بھی جائز ہو جائے گی اور لوگ آپ کے اس عمل سے جواز تلاش کرکے کہیں گے کہ جب نواسہ رسول نے اپنی جان بچانے کیلئے رخصت پر عمل کیا تو ہم اور آپ تو معمولی حیثیت کے لوگ ہیں ہم کیوں نہ اس پر عمل کریں، لہٰذا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے فرض منصبی اور نصبی تقاضوں کو سامنے رکھ کر عزیمت کا راستہ اختیار کیا اور جبر و استبداد اور ظلم و استحصال کے خلاف باطل کی بے پناہ طاقت و قوت کے باجود اپنے 72 رفقاکے ساتھ میدان جہاد میں آئے اور جواں مردی اور جوش ایمانی سے باطل کا ایسا مقابلہ کیا کہ تاریخ آج بھی اُس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ میدان کربلا میں امام عالی مقام اور آپکے رفقا نے جام شہادت نوش کرکے حق و صداقت کا ایسا پرچم لہرایا جسے آج تک باطل طاقتیں سرنگوں نہ کرسکیں، دیکھنے والوں نے دیکھا کہ امام حسین اور آپکے ساتھی شہید ہوگئے لیکن اس شہادت کے باوجود آج بھی ان کا نام زندہ ہے اور قیامت تک زندہ رہے گا، امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنی شہادت سے یہ ثابت کردیا کہ دین اسلام کی سربلندی اور بقا کی خاطر دشمن کی عددی طاقت اور بے پناہ وسائل سے مسلمان نہ تو مرعوب ہوتے ہیں اور نہ ہی قربانی دینے سے دریغ کرتے ہیں، آپ کی شہادت نے قیامت تک آنے

والے ہر یزید اور فاسق و فاجر حکمران کیلئے کامیابی راہیں مسدود کر کے دشت کربلا میں ایثار و قربانی کی ایسی مثال قائم کردی جس سے ہر دور میں روشن انقلابی تحریکیں اسلامی اصولوں اور انسانی آفاقیت کو سہارا دیتی رہیں گی۔

جب بھی ظلم ہوگا حسینیت حریت اور کفر و طاغوت کے خلاف عملی جد و جہد کی علامت بن کر اُمت مسلمہ کے دلوں کو گرماتی رہی گی، اُمت مسلمہ ہر سال ماہ محرم میں شہدائے کربلا کا غم اور ان کی یاد نالہ و ماتم،آہ و بقا، رسم علم و تعزیہ کے ساتھ مختلف انداز و اطوار سے مناتی ہے، سوال یہ ہے کہ کیا امام عالی مقام نے اپنی اور اپنے جانثار ساتھیوں کی قربانی دے کرامت مسلمہ کو یہ سبق دینا چاہا تھا کہ وہ اس قربانی کے عیوض چند دن کا سوگ منا کر اہل بیت رسول کے ساتھ عقیدت و محبت کا اظہار کیا کرے، یا یہ کہ آپ نے میدان کربلا میں دریائے فرات کے کنارے اپنی جان دے کر قربانی، شہادت، جہاد اور باطل سے پنجہ آزمائی کی تاریخ اس لیئے تیار کی تھی کہ نوجوانان اسلام اپنے سردار کے نقش قدم پر چل کر حق کیلئے ہمیشہ سینہ سپر رہیں اور جیتے جی کبھی بھی باطل کو اپنے ناپاک مقاصد اور عزائم میں کامیاب نہ ہونے دیں۔

داستان کربلا صرف سننے سنانے کیلئے نہیں ہے اور نہ ہی کسی طور بھی ہم یاد حسین کی محفلیں سجا لینے سے یا نیاز و فاتحہ کرلینے سے اس کا حق ادا کر سکتے

ہیں، شہیدان کربلاکے نقش قدم کے حصول کیلئے داستان کربلا کا تقاضہ یہ ہے کہ اسلام اور ملت اسلامیہ کی زندگی، بقا اور کامیابی کا انحصار کفر وطاغوت کے مقابلے میں اٹھنے، لڑنے اور جان دے دینے میں ہے، آج لہو رنگ عالم اسلام اور بالخصوص پاکستان کفر و طاغوت کے پنچہ استبداد میں بری طرح جکڑا ہوا ہے، دین سے دوری اور بداعمالی کے سبب شرق سے غرب تک اُمت مسلمہ بے بسی اور بے کسی کی تصویر بنی ہوئی ہے، یہود و نصاریٰ کے ایجنٹ عالم اسلام اور وطن عزیز کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں، اس خطرناک کھیل میں اغیار کی سازشوں کے ساتھ ساتھ اپنوں کی نادانی بھی شامل ہے۔ ان حالات میں شہادت امام حسین کی یاد مناتے وقت اس عہد کی تجدید بھی ضروری ہے کہ عالم اسلام اور مسلمانان پاکستان امام عالی مقام اور آپکے 72 نفوس قدسیہ نے میدان کربلا میں ظلم و جبر اور لادینی طاقتوں کے خلاف حق و صداقت کی جس جنگ کا آغاز کیا تھا، اس جنگ کو ہمیشہ جاری رکھیں گے، یاد رکھیے وقت کی بساط پر ظلم و جبر اور کفر و طاغوت کے خلاف اُمت مسلمہ کی جنگ کل بھی جاری تھی اور آج بھی جاری ہے۔

کربلا نہیں لیکن حق و صداقت کی
کل بھی جنگ جاری تھی اب بھی جنگ جاری ہے

یوم عاشور پر سانحہ کراچی ..... آگ کا کھیل اور خون کی ہولی

سانحہ کراچی ..... ہماری اقتصادی شہہ رگ پر ضرب کاری

دس محرم الحرام کو شہداء کربلا کی یاد میں یومِ عاشور پر کراچی میں ملک دشمن دہشت گردوں نے ایک بار پھر کربلا برپا کردی، یوں عوامی توقعات اور حوصلہ افزا امیدوں پر پانی پھیرتے ہوئے دہشت گردوں نے عاشورہ محرم کے مقدس و محترم دن کے موقع پر کراچی میں عزاداروں کے مرکزی جلوس پر خودکش حملے میں 43 افراد کو ہلاک اور 250 سے زائد کو زخمی کر دیا، دھماکے بعد نامعلوم افراد نے ایم اے جناح روڈ پر واقع لائٹ ہاؤس کے تاریخی لنڈا بازار، ادویات کی ہول سیل مارکیٹ، پیپر مارکیٹ، کوئٹہ مارکیٹ، فیروز مارکیٹ، بانو مارکیٹ، پلاسٹک مارکیٹ، الیکٹرونکٹ مارکیٹ اور موتن داس مارکیٹ سمیت پچیس سے زائد مارکیٹوں کو نذر آتش کیا، جن میں کئی پرانی مارکیٹیں منہدم ہو گئی ہیں، شرپسندوں نے میٹھادر تھانے میں قائم ٹریفک پولیس چوکیاں اور بلدیہ عظمٰی کی تاریخی عمارت سمیت 80 سے زائد گاڑیوں اور متعدد دکانوں، نجی و سرکاری املاک، 2 پٹرول پمپ اور 4 بینک بھی نذرِ آتش کر دیئے گئے، دھماکہ اس قدر شدید تھا کہ آواز میلوں دور تک سنی گئی اور انسانی اعضاء سڑکوں کے ارد گرد موجود عمارتوں سے

چپک گئے جبکہ اطراف کی عمارتوں اور دکانوں کو بھی شدید نقصان پہنچا، دھماکے کے بعد فضا میں دھوئیں کے بادل چھا گئے اور بھگدڑ مچ گئی، دھماکے بعد شہر کے مختلف علاقوں میں ہنگامے پھوٹ پڑے اور فائرنگ کی گئی، بعض اطلاعات کے مطابق ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔

ایک اخباری اطلاع کے مطابق نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے مثال قربانی کی یاد میں منائے جانے والے اس دن کے موقع پر اس المناک سانحہ نے عزاداروں کی شہادت پر بڑی تعداد میں مشتعل افراد نے متعدد مین مارکیٹوں، تجارتی و کاروباری اداروں اور 2500 سے زائد دکانوں کو نذرِ آتش کر دیا جس کی وجہ سے ان کے اندر پڑا ہوا سارا سامان جل کر خاکستر ہو گیا جس کی مالیت اربوں روپے سے زائد تھی، اس تخریب کاری کی وجہ سے جلنے والی دکانوں کے مالکان کی اکثریت نہ صرف زبردست مالی نقصان سے دوچار ہوئی بلکہ وہ زندگی بھر کی جمع پونجی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی، شر پسندوں کی جانب سے لگائی گئی آگ رات گئے تک بجھائی نہ جا سکی اور دوسرے دن بھی کئی عمارتوں سے دھواں اٹھتا دکھائی دے رہا تھا، شر پسندوں کی جانب سے لگائی جانے والی آگ سے تاجروں اور دیگر شہریوں کا اربوں روپے کا نقصان ہوا، اس ہنگامہ آرائی کے دوران جو رات گئے تک جاری رہی، موصولہ اطلاعات کے مطابق پولیس اور رینجرز غائب تھی، جبکہ ہنگامہ آرائی سے قبل میڈیا کے نمائندوں کو بھی تشدد کا

نشانہ بنایا گیا تاکہ واردات کرنیوالے کیمرے کی آنکھ سے محفوظ رہیں۔
ذرائع کے مطابق نامعلوم افراد نے یہ ہنگامہ آرائی انتہائی منظم اور جس مشینی انداز میں سرانجام دی، اس کے بعد یہ سوچا جانا فطری امر ہے کہ بم دھماکہ اور اس کے بعد کی ساری کاروائی ایک طے شدہ منصوبے کا حصہ تھی، جس منظم طریقے سے ملک کی سب سے بڑی ہول سیل مارکیٹوں کو جلایا گیا اور درجنوں گاڑیوں کو نذر آتش کیا گیا وہ ایک لمحہ فکریہ ہے، حیرتناک بات یہ ہے کہ بم دھماکہ کے فوری بعد خود کش حملہ قرار دے کر اپنی بچت کا جواز تراشنے والے قانون کے رکھوالے اس تمام وقت کیوں خاموش تماشائی بنے رہے اور کس چیز نے انہیں اس وحشیانہ عمل کے مرتکبین کے ہاتھ روکنے اور کوئی کاروائی نہ کرنے سے روکے رکھا، جب مسلح شرپسند سڑکوں پر دندناتے بے قصور تاجروں کے سرمایہ زندگی کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر رہے تھے، سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں حکومت اور انتظامیہ کس کام کی جو بم دھماکوں پر قابو پانا تو کجا، دن دھاڑے شہریوں کی املاک اور مین بازاروں کو پہنچنے والے نقصان سے نہ بچاسکے، خود کش حملے کے بعد جس تیزی سے ایم اے جناح روڈ کی مارکیٹوں کو آگ لگائی گئی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عوام کا نہیں بلکہ کسی منظم گروہ کی سازش اور دہشتگردی کا شاخسانہ ہے، اس تمام ہنگامہ آرائی میں سب سے زیادہ نقصان بولٹن مارکیٹ میں ہوا جہاں ہزاروں دکانیں نذر آتش کی گئیں اور وہاں لگنے والی آگ

پر نو گھنٹے بعد قابو پایا جا سکا، اسی طرح میڈیسن مارکیٹ، پیپر مارکیٹ، لنڈا بازار، چھیپا مارکیٹ، فیروز مارکیٹ اور نور چیمبرز کی کثیر المنزلہ عمارتیں بھی آتش زنی کی بھینٹ چڑھیں۔

اس المناک سانحہ نے کراچی میں قیامت صغریٰ کا منظر پیدا کر دیا، ہر طرف لاشیں اور انسانی اعضا بکھرے پڑے تھے، سکیورٹی حکام کے مطابق بم دھماکے میں 16 کلو گرام بارود استعمال کیا گیا، اس سانحہ کا ایک خاص پہلو رینجرز اہلکار عبدالرزاق کی جرات و بہادری تھا جس نے خودکش حملہ آور کو پکڑنے کی کوشش میں اپنی جان دے کر شرکاء جلوس کو بہت بڑی تباہی اور جانی نقصان سے بچایا، حکومت نے شہید رینجرز اہلکار عبدالرزاق کے لئے تمغہ شجاعت کے علاوہ لواحقین کے لئے 5 لاکھ روپے انعام کا بھی اعلان کیا ہے، لیکن اس سانحے کے بعد جو کچھ ہوا وہ کسی قیامت سے کم نہیں تھا، خاص طور پر اُن لوگوں پر تو قیامت گزر گئی جو چند لمحوں میں کروڑ پتی سے فقیر ہو گئے، کراچی چیمبر کے صدر کے بقول دینے والے ہاتھ مانگنے والے ہاتھ بن گئے، اس سانحہ کے بعد بولٹن مارکیٹ اور اس سے ملحقہ مارکیٹوں کے تاجروں کا کہنا ہے کہ ان کا تیں ارب روپے کا نقصان ہوا ہے، انھوں نے حکومت سے معاوضے اور منہدم دکانوں کی دوبارہ تعمیر کا مطالبہ بھی کیا ہے۔

شہر کے مرکزی علاقے کی ایک تاجر تنظیم اولڈ سٹی ٹریڈرس ایسوسی ایشن کے چیئرمین جمیل چیمہ کا کہنا ہے کہ اگر آگ پر بروقت قابو پالیا جاتا تو دو سو دکانوں میں لگی آگ دو ہزار دکانوں تک نہیں پہنچ پاتی، اُن کا کہنا ہے کہ ابتدائی دو گھنٹوں تک فائر بریگیڈ کی صرف دو گاڑیاں پہنچ سکی تھیں جن کے پاس آگ کو بجھانے کے لیے کوئی کیمیکل وغیرہ نہیں تھا اور ان کے پانی کی وجہ سے آگ مزید بڑھ رہی تھی، تاہم کراچی کے سٹی ناظم نے ان الزامات کو مسترد کر دیا ہے، گو کہ حکومت نے نقصان کے ازالہ کا وعدہ کیا ہے اور حکومت نے ایف آئی اے کے ڈائریکٹر کی قیادت میں اس آتش زنی کی تحقیقات کے لیے ایک تحقیقاتی ٹیم بھی قائم کر دی ہے، لیکن بنیادی سوال یہ ہے کہ اس تخریب کاری کا ارتکاب کس نے کیا؟ کیا یہ مشتعل افراد کا خوفناک ردعمل تھا یا منظم شرپسندوں نے جلتی پر تیل چھڑکا، جو دھماکے کے فوراً بعد ہی گاڑیوں کو آگ لگانے، صحافیوں، کیمرہ مینوں اور پولیس اہلکاروں پر حملے شروع ہو گئے تھے، متاثرہ دکانداروں اور عینی شاہدین کے مطابق پولیس اور رینجرز کے سامنے دکانیں جلائی جا رہی تھیں لیکن وہ بے بس کھڑے تھے، یہ شرپسند کون تھے، کہاں سے آئے، اس کا تعین بہت ضروری ہے۔
جہاں تک دہشت گردی اور عسکریت پسندی کا تعلق ہے بلاشبہ اس نے ملک کے ایک بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے لیکن روشنیوں کا شہر کراچی اور

پاکستان کا سب سے بڑا صنعتی مرکز اب تک ایسے المناک واقعات سے بڑی حد تک محفوظ تھا، لیکن ایک انتہائی مقدس تہوار کے موقع پر جس میں ہزاروں افراد نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عقیدت و محبت کا مظاہرہ کرنے کے لئے شریک ہوتے ہیں اس قسم کا المناک سانحہ نہ صرف بدترین دہشت گردی کی ایک مثال ہے بلکہ اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ دہشت گردوں کا نیٹ ورک تیزی کے ساتھ پھیلتا جارہا ہے اور وہ قومی اتحاد و یکجہتی کو پارہ پارہ کرکے فرقہ واریت، فروعی اختلافات، نسلی، لسانی اور صوبائی عصبیت کی آگ بھڑکا کر وطن عزیز کی سلامتی کو نقصان پہنچانے پر تلے ہوئے ہیں، درحقیقت کراچی میں اپنی نوعیت کے اس پہلے المناک سانحہ سے دہشت گردوں کے جو عزائم کھل کر سامنے آئے انہیں بہتر طور پر سمجھنے اور انہیں ناکام بنانے کے لئے ضروری ہے کہ معاشرے کے تمام طبقے بالخصوص مذہبی و سیاسی جماعتیں اور تمام مکاتبِ فکر کے لوگ وسیع تر قومی و ملکی مفادات کے پیش نظر پوری طرح حرکت میں آئیں اور ہر قسم کے فروعی اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وطن عزیز کی سلامتی، آزادی، خودمختاری اور شہریوں کے جان و مال کے تحفظ کو اولین ترجیح قرار دے کر دہشت گردی کی اس لہر پر قابو پانے کے لئے بلاتاخیر نتیجہ خیز اور بارآور اقدامات کریں۔

لیکن یہ اسی وقت ہی ممکن ہے جب معاشرے کا ہر طبقہ دہشت گردوں کے ان عزائم

کا گہرا ادراک کرتے ہوئے ان کے عزائم و مقاصد کو بھی پیش نظر رکھے اور انہیں ناکام بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے۔اس کے ساتھ ساتھ حکمرانوں کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے نہ صرف عوام اور تمام طبقوں کو تیار کریں اور قیمتی انسانی جانوں کے ضیاع کے پس پردہ عوامل کا ادراک کرتے ہوئے ملک میں سیاسی استحکام اور جمہوریت کی جانب مثبت پیش رفت کے لئے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں تاکہ انتخابی منشور اور میثاق جمہوریت میں عوام سے کئے گئے وعدے پورے کئے جاسکیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ دہشت گردوں کے اپنے مقاصد ہیں جو ہمارے مکار دشمن کے عزائم کی تکمیل کیلئے اسکی ایجنسی سے تربیت اور مالی کمک کے ساتھ وطن عزیز میں اپنی مذموم کارروائیوں میں مصروف ہے۔

ہماری قومی یکجہتی و سالمیت کیخلاف دشمن اپنی سازشوں میں کامیاب ہوتا نظر آرہا ہے مگر اپنی لوٹ مار کے تحفظ کی فکر میں مبتلا ہمارے حکمران اس نازک صورتحال سے عہدہ برآء ہونے میں کسی سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کر رہے، سیاسی تجزیہ کاروں کے مطابق خدانخواستہ اگر ایسا ہے تو پھر شدت پسندوں کی یہ حکمت عملی بہت خطرناک ہو سکتی ہے کیونکہ کراچی ملک کی اقتصادی شہ رگ ہے اور دہشتگردی کی آگ سے بری طرح جھلسے ہوئے پاکستان کیلئے آخری امید کی کرن بھی، کون نہیں جانتا کہ کراچی شہر کی سیاسی بساط لسانی بنیادوں پر کھڑی ہے، ایسے

میں اگر شدت پسند یا غیر ریاستی عناصر اپنے مفادات کو بالائے طاق رکھ کر اس شہر کو بھی دہشتگردی کی آگ میں جھونکنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو اسکے سدباب کے لیے مقامی اور قومی سیاسی قیادت کو بھی اپنے گروہی مفادات کو پس پشت ڈالنا ہوگا۔
اس وقت وطن عزیز کو سابقہ اور موجودہ حکمرانوں کی عاقبت نااندیشی کے باعث جس سنگین دہشت گردی کا سامنا ہے اور جس طرح ہمارے شاطر دشمن کو ہماری اندرونی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا رہا ہے، الہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس پر فوری توجہ ضروری ہے، مگر صد افسوس دشمن کے مفادات پر مبنی پرائی آگ میں کودنے کے شوق میں مبتلا ہمارے حکمران اس جنگ کو اپنی جنگ قرار دیکر آخری دہشت گرد کے مارے جانے تک آپریشن جاری رکھنے کے اعلانات کا اعادہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں، حیرت کی بات ہے کہ جب حالات و واقعات بھی گواہی دے رہے ہیں اور حکومتی ایجنسیوں کی رپورٹوں کا لبِ لباب بھی یہی ہے کہ حالیہ دہشتگردی اور ہنگامہ آرائی ہماری سالمیت کیخلاف ایک سوچی سمجھی سازش ہے تو ہمارے ارباب اختیار دشمن کے مفادات کی جنگ سے خود کو وابستہ رکھنا کیوں ضروری سمجھ رہے ہیں جبکہ اس کے ردعمل میں سینکڑوں بے گناہ معصوم انسانوں کی قیمتی جانیں ہی ضائع نہیں ہوئیں، سرکاری اور نجی املاک تباہ ہونے اور قومی معیشت کا بھٹہ بیٹھنے سے بھی اب تک ملک کو اربوں کھربوں روپے کا ناقابل

تلافی نقصان ہو چکا ہے۔

یہ درست ہے کہ دہشت گردوں نے جو ذہن، فکر اور سوچ تشکیل دی ہے اسے مکمل طور پر ختم کرنا فوری طور پر ایک مشکل کام ہے لیکن اس کے بغیر ملکی و قومی سلامتی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی، درحقیقت یہ ہمارے اندرونی محاذ کو انتشار اور افتراق کا شکار بنانے کی منظم سازش ہے جس کے تحفظ، سلامتی اور بقاء حکومت کی اوّلین ذمہ داری ہے، جو محض نیک خواہشات، توقعات، تمنائیں، دعائیں اور امیدوں سے نہیں بلکہ عملی اقدامات سے ہی پوری ہو سکتی ہے، چنانچہ اس تناظر میں سانحہ کراچی حکمرانوں کیلئے ہوش کے ناخن لینے کیلئے کافی ہونا چاہئے، اگر دشمن ہماری سالمیت کیخلاف صف آراء ہے اور ہماری کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے پر تلا بیٹھا ہے تو ملکی و قومی سلامتی کا ہر تقاضہ پورا کرنا ہمارے حکمرانوں کی ذمہ داری بنتی ہے، اب یہ فیصلہ کرنا ارباب اختیار کا کام ہے کہ وہ اسکے اہل ہیں یا نہیں، چنانچہ ملک کے موجودہ حالات حکومتی، سیاسی، عسکری حلقوں کیلئے لمحہ فکریہ ہیں، انہیں ملک کو بچانے اور اسکی سالمیت کیخلاف دشمن کے گھناؤنے عزائم کو ناکام بنانے کیلئے محض زبانی بیانات کی نہیں بلکہ اُس ٹھوس، جامع منصوبہ بندی اور عملی اقدامات کرنے کی ضرورت ہے جو وطن عزیز کو عدم استحکام، معاشی ابتری اور دشمن کے ناپاک منصوبے کی تکمیل سے بچا سکے۔

اتحادِ ملت کے علمبردار ایک دور اندیش مدبّر و رہنما

"اُن کی ذات و شخصیت قومی یکجہتی کی روح اور عملی تصویر تھی"

"مولانا نورانی کی زندگی ایک کھلی کتاب کی مانند تھی جس کے ہر ورق پر ایک سرگرمی عمل، تحریک، سچائی و بے باکی روز روشن کی طرح عیاں تھی، وہ رواں سیاسی نظام میں ایک نادر الوجود مثال تھے، انہوں نے ہر قدم خوب سوچ سمجھ کر اٹھایا اور پھر جو بھی فیصلہ کیا اس پر کامل حق الیقین کے ساتھ ڈٹ گئے۔ علامہ مشرقی کے بقول "دنیا کی مکر کی تاریخ میں سیاست صرف اپنے نقطہ نظر سے کامیاب حکومت کا نام ہے، سیاست کے سب چالباز اپنے حریف کی چال کو کم و بیش صاف طور پر دیکھتے ہیں، لیکن کیونکہ سب چور ہوتے ہیں اور سب کا مقصد بے بس اور بے خبر رعیت کا کامیاب شکار کرنا ہوتا ہے، اسلیئے ہر چور اپنے حریف کی چال کو روایتی احترام کی نظر سے دیکھتا ہے اور سیاست کے تمام کھیل کو سر مکتوم بنا دینا اپنی سیاسی شرافت سمجھتا ہے، اس نقطہ نظر سے راعی کی رعایا کے خلاف ہمیشہ ایک سازش رہی ہے، جس کا پورا انکشاف اسلیے نہیں ہوسکا کہ راعیوں کی ٹولی دنیا میں ایک مستقل گروہ رہا ہے، جس کی سیاسی شرافت اور آداب جماعت اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ چوروں کی منڈلی کے راز فری میسنوں

کی طرح فاش کرکے رکھ دے۔" مقام صد شکر ہے کہ تاریخ پاکستان میں قائداعظم محمد علی جناح کے بعد مولانا شاہ احمد نورانی کی صورت میں ایک ایسی سرگرم عمل اور تحریکی شخصیت کارزار سیاست میں سرگرم عمل رہی، جس نے اوّل الذّکر کی طرح بااصول، شفاف اور جرات مندانہ طرز سیاست کو فروغ دیا اور جنھوں نے رعایا کے خلاف ہونے والی ہر سازش کو کھلے بندوں بے نقاب کیا۔"

یہ اقتباس اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے منظور ہونے والے "ایم فل" کے اُس مقالے کا ہے جو ایک نوجوان اسکالر مظہر حسین نے ڈاکٹر شاہد حسن رضوی کی زیر نگرانی مکمل کیا اور جسے حال ہی میں انوار رضا جوہر آباد، زیور طباعت سے آراستہ کرکے "پاکستان کے سیاسی اتحادوں میں مولانا نورانی کا کردار (قومی اتحاد سے متحدہ مجلس عمل تک)" کے عنوان سے منظر عام پر لایا ہے۔ کسی کتاب پر تبصرے سے قبل صاحب کتاب کا تعارف، ہوسکتا ہے اصول، قواعد اور عام روایات سے ہٹ کر ہو، لیکن اس مقام پر کتاب سے پہلے صاحب مقالہ کا تعارف ہمارے نزدیک اسلئے بے انتہا اہمیت کا حامل ہے کہ صاحب مقالہ تاریخ میں "پاکستان کی مذہبی سیاست میں جمعیت علماء پاکستان کا کردار 1972ء سے 2003ء تک" کے عنوان سے اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور سے پی ایچ ڈی کی تیاری کررہے ہیں، 3 جنوری 1976ء کو ضلع ساہیوال کے غیر معروف قصبے "کمیر" کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہونے والے مظہر حسین نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک اسکول کے مدرس کی

حیثیت سے کیا، وہ اس وقت گورنمنٹ ڈگری کالج فار بوائز منڈی بہاؤالدین میں شعبہ
تاریخ کے لیکچرار کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔
تینتیس سالہ نوجوان مظہر حسین کو حصول علم سے بے انتہا محبت ہے، جس کا ثبوت اس
شعبہ تعلیم میں M.A، کم عمری میں اردو، اقبالیات، تاریخ اور مطالعہ پاکستان میں
کی ڈگری ہے وہ حال ہی M.Phil اور تاریخ میں M.S.C، کمپیوٹر سائنس میں M.Ed،
میں ایم بی اے کے امتحان سے فارغ ہوئے ہیں اور ڈاکٹر شاہد حسن رضوی کی زیر نگرانی
پی ایچ ڈی کی تیاری کر رہے ہیں، مظہر حسین کو کتب بینی کے ساتھ افسانہ نویسی اور تنقید
نگاری کا بھی شوق ہے اور موصوف کے متعدد افسانے اور ڈھائی سو سے زیادہ کتابوں پر
تنقیدی تبصرے مختلف ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔
جناب مظہر حسین نے زیر نظر مقالے میں "پاکستان کے سیاسی اتحادوں میں مولانا شاہ
احمد نورانی کا کردار" کو موضوع بحث بنایا ہے، حقیقت یہ ہے کہ مولانا نورانی نے اپنے
پارلیمانی دور سیاست میں متعدد سیاسی اتحادوں کی بنیاد رکھی اور اُن میں اہم مرکزی
کردار ادا کیا، مولانا کی ہمہ پہلو زندگی کا بنیادی مقصد مقام مصطفیٰ کا تحفظ اور نظام مصطفیٰ کا
نفاذ تھا، جس کیلئے مولانا نے اپنی ساری زندگی وقف کردی، نوجوان مقالہ نگار نے مولانا
شاہ احمد نورانی کی

زندگی کے اِسی پہلو کو زیر گفتگو لاتے ہوئے پاکستان کے سیاسی اتحادوں کی تشکیل میں مولانا کے عظیم الشان کردار کو سامنے لانے کی بہترین کوشش کی ہے، فاضل محقق کا یہ مقالہ سات ابواب" مولانا شاہ احمد نورانی ...حیات وخدمات کا اجمالی جائزہ، پاکستان قومی اتحاد اور مولانا شاہ احمد نورانی، تحریک پاکستان ایم آر ڈی اور مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا شاہ احمد نورانی اور تحریک بحالی جمہوریت، مولانا نورانی اور پاکستان عوامی اتحاد، مولانا شاہ احمد نورانی اور اسلامی جمہوری محاذ، مولانا شاہ احمد نورانی اور ملی یکجہتی کونسل سے متحدہ مجلس عمل تک، اور مولانا نورانی کا انداز سیاست ایک تحقیقی و تنقیدی جائزہ "پر مشتمل ہے۔

یہ وہ موضوعات ہیں جن پر فاضل محقق کی سیر حاصل گفتگو نے مولانا شاہ احمد نورانی کے ایک غیر متنازعہ اور عظیم مدبر رہنما ہونے کا کردار اجاگر کیا ہے، یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ مولانا شاہ احمد نورانی نے اِن سیاسی اتحادوں کی تشکیل کے دوران کبھی اپنے عقیدے اور اُصولوں پر سمجھوتہ نہیں کیا اور وہ ہمیشہ اپنے عقیدے پر سختی سے کاربند رہے، انھوں نے کبھی بھی سیاست کو انفرادی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں بنایا، اُن کی نمایاں خوبیوں میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ کبھی سیاسی اختلاف کو ذاتی اختلاف میں تبدیل نہیں کرتے تھے، اپنی انہی خوبیوں کی بدولت وہ تمام مکاتب فکر میں

ایک روشن خیال اور غیر متنازعہ شخصیت کا درجہ رکھتے تھے اور یہی وہ بنیادی خصوصیات اور وجوہات تھیں جن کی بناء پر دیوبندی، اہل حدیث، اثناء عشری اور دیگر مکاتب فکر نے انہیں اپنا قائد و رہنما تسلیم کیا، مولانا نورانی نے اِن سیاسی اتحادوں میں ایک دور اندیش مدبر رہنما کا کردار ادا کیا، انہوں نے ہمیشہ اپنی خداداد صلاحیتوں اور فہم و فراست کی بدولت مختلف الخیال جماعتوں اور سیاست دانوں کو ایک پلیٹ فارم پر متحد رکھا، اور مولانا کی زیر قیادت اِن سیاسی اتحادوں نے اسلامی اقدار اور بحالی جمہوریت کی تحریکوں میں نمایاں کردار ادا کیا۔

قومی اور اجتماعی مسائل پر اُن کی سوچ ہمیشہ مثبت رہی، یہ اُن کی بردباری اور معاملہ فہمی کا ہی نتیجہ تھا کہ متحدہ مجلس عمل نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار حکومتی اور بیرونی طاقتوں کو ہلا کر رکھ دیا اور ملکی تاریخ میں پہلی بار حکمرانوں کو مذہبی جماعتوں کے وجود اور طاقت کا احساس دلایا، مولانا نورانی بازار سیاست کے بہت بڑے رمز شناس تھے، انہوں نے ہمیشہ لسانیت، قومیت، فرقہ واریت، تشدد اور لاشوں کی سیاست کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا، درحقیقت وہ حقیقی معنوں میں اسٹیبلیشمنٹ مخالف عالم دین اور مذہبی و سیاسی رہنما تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا نورانی متحرک، فعال اور ملک و قوم کا درد رکھنے والی ایک ایسی شخصیت تھے جنھوں نے اپنی ساری زندگی پاکستان کے اوّلین مقصد لاالہ الااللہ کے نعرے کو عملی صورت دینے میں وقف کردی، انھوں نے اِس نعرے کو اپنی سیاست کے نکتہ ارتکاز کے طور پر اپنایا اور اسے دیگر سیاسی جماعتوں سے اتحاد کے وقت ہم خیالی کی بنیاد بنایا، مولانا نے ہر سیاسی اتحاد کی بنیاد بحالی جمہوریت اور نفاذ نظام مصطفیٰ کی جدوجہد پر رکھی، آپ نے اپنی ذہانت اور تدبر سے پاکستان میں اتحاد ملت کے نعرے کو عملی شکل دی، آپ کے تحرک پر بنائے گئے تمام اتحادوں کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اتحاد ملت کے علمبردار تھے بلکہ اِن اتحادوں کی وجہ تخلیق اور روح رواں بھی تھے ،ہماری اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ آپ نے جس اتحاد کو خیر آباد کہا وہ اتحاد آپ اپنی موت مرگیا، حقیقت یہی ہے کہ پاکستان میں فرقہ واریت کے سدباب کیلئے مولانا شاہ احمد نورانی کا کردار ناقابل فراموش تھا اور اُن کی ذات و شخصیت قومی یکجہتی کی روح اور عملی تصویر تھی۔

مولانا شاہ احمد نورانی کو اپنی تمام سیاسی جدوجہد کے دوران متعدد مرتبہ حکومتی جبرو استبداد کا نشانہ بھی بنناپڑا اور اپنے کئی دیرینہ رفیقوں کی قربانی بھی دیناپڑی، لیکن پارلیمانی محاذوں پر پے در پے شکستوں سے دوچار ہونے کے باوجود آپ نے کبھی غیر ،جمہوری روایات کا حصہ بننا پسند نہیں کیا

انہوں نے ملکی و مذہبی سیاست میں حصول اقتدار کے بغیر سیاست کی ایک نئی اور منفرد روش متعارف کروائی اور علماء و مشائخ کو مساجد و خانقاہوں سے نکل کر میدان سیاست میں فریضہ حق ادا کرنے کی ترغیب دی، اصول پسندی، دستوریت، قربانی ذات کے ساتھ اُن کے انداز سیاست کا چوتھا ستون حق گوئی و بے باکی تھا جس نے آخر وقت تک ہر ظالم و جابر کے سامنے انہیں صف آرا رکھا۔

درحقیقت نوجوان محقق مظہر حسین کا یہ مقالہ مولانا شاہ احمد نورانی کی سیاسی و مذہبی خدمات اور قائدِ اعظم محمد علی جناح کے بعد پاکستانی سیاست میں بلندی کردار کا ایک ناقابل فراموش تاریخی باب ہے۔ فاضل محقق قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں اِس اہم موضوع پر تحقیق کرکے مولانا کی ہمہ جہت شخصیت کے ایک پہلو کو سامنے لانے کی کامیاب کوشش کی ہے، اِس کے ساتھ مقالے کے ناشر ملک محبوب الرسول قادری بھی مبارکباد کے مستحق ہیں، جن کی کوششیں اور کاوشیں ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل اِس ضخیم مقالے کو کتابی شکل میں سامنے لانے کا سبب بنی، خوبصورت جلد سے مزین آفسٹ پیپر پر یہ مقالہ " انوار رضا جوہر آباد" کے زیر انتظام سامنے لایا گیا ہے، جو کہ ہر لحاظ سے قابل ستائش اور قابل مطالعہ ہے۔ یہ مقالہ 27اے، شیخ ہندی اسٹریٹ، دربار مارکیٹ لاہور سے یا مندرجہ ذیل ای میل پر رابطہ کرکے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

سالِ نو کا پہلا تحفہ ...... بجلی بم

جمہوری حکومت کا ایک اور عوام کش فیصلہ

عموماً دنیا میں یہ اصول رائج ہے کہ قیمت صرف اسی چیز کی بڑھائی جاتی ہے جس کی خصوصیات بہتر و اعلیٰ ہوں، کوالٹی معیاری ہو، مارکیٹ میں وہ چیز باآسانی دستیاب اور ایک عام صارف کیلئے فائدہ مند ہو، مگر اس اصول کے برخلاف ہمارے ملک میں تو الٹی ہی گنگا بہہ رہی ہے، چیز کی کوالٹی خراب ہو، مارکیٹ سے نایاب ہو، لوگ حصول کیلئے مارے مارے پھر رہے ہوں تو سمجھ لیجئے کہ دام بڑھ گئے ہیں، دالیں، چاول، چینی، گھی، تیل، آٹا غرضیکہ انسانی ضرورت کی وہ کونسی اشیاء ہیں جو وافر مقدار میں سستے داموں باآسانی مارکیٹ میں دستیاب ہیں، یہی حال گیس اور بجلی کا ہے، اکثر علاقوں میں گیس کی لوڈ شیڈنگ ہے اور کئی کئی گھنٹوں کیلئے بجلی غائب ہے، جبکہ بجلی کے نظام کا یہ حال ہے کہ ذرا سی تیز ہوا چلے تو تاروں کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، آندھی آئے تو بجلی غائب اور بارش ہو تو بجلی ناپید، گرمیوں میں تو لوڈ شیڈنگ تھی ہی، لیکن سرد موسم میں بھی آٹھ آٹھ گھنٹوں کی لوڈ شیڈنگ اب تو معمول کی بات بن گئی ہے، اس صورتحال میں ان گنت لوگ ذہنی مریض بن کر رہ گئے ہیں، لیکن اس سب کے باوجود طرفہ تماشہ دیکھئے کہ ایک طرف عوام لوڈ شیڈنگ کا عذاب بھگت رہے ہیں

تو دوسری طرف بجلی کے نرخوں میں نہ رکنے والا اضافہ ایک ایسا ظلم ہے جس کی پاکستانی تاریخ میں نظیر ملنا مشکل ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ ایک طرف عوام کو دینے کے لئے حکومت کے پاس بجلی نہیں ہے جبکہ دوسری طرف بجلی کی قیمتوں میں ہوش ربا اضافہ کرکے ان کی زندگی اجیرن بنائی جارہی ہے، حالت یہ ہوچکی ہے کہ 2008ء میں جو لوگ ایک ہزار روپیہ بجلی کا بل ادا کر رہے تھے، وہی لوگ آج ڈبل بل ادا کر رہے ہیں، ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اس عرصہ میں کروڑوں لوگوں کی آمدنی میں ایک پائی کا بھی اضافہ نہیں ہوا، ایک بجلی کے بلوں پر ہی کیا موقوف صرف ایک سال کے عرصہ میں اشیائے ضروریہ کی قیمتوں میں اس قدر خوفناک اضافہ ہوچکا ہے کہ پہلے لوگوں کے صرف ہاتھ کانپتے تھے اب ان کی ٹانگیں بھی لرزنا شروع ہوگئی ہیں، اس کے باوجود مہنگائی، ذخیرہ اندوزی، امن وامان کی بگڑتی ہوئی صورتحال اور بحرانوں کی بھنور میں جکڑے عوام کیلئے حکومت کی جانب سے بجلی کی قیمتوں کے اضافے کا بم گرادیا گیا، حیرت اس بات پر ہے کہ یہ سب کچھ ایک ایسی جمہوری دور حکومت میں ہو رہا ہے جس کا بنیادی نعرہ روٹی، کپڑا اور مکان کی فراہمی تھا، لیکن حالات یہ ہیں کہ عوام کے منہ سے روٹی، تن سے کپڑا اور سر سے مکان کا سایہ بھی چھنتا جارہا ہے، غریب عوام غربت، بھوک، مہنگائی اور بے روزگاری جیسے بحرانوں کے گرداب میں اس قدر بری طرح پھنس چکے ہیں کہ عوام کی تمام خوشیاں

اور امیدیں دم توڑتی نظر آرہی ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ حکومت نے پہلے ہی آئی ایم ایف سے کیے گئے معاہدے کے تحت یکم جنوری 2010 ء سے عوام پر "بجلی بم" گرانے کی تیاری کرلی تھی، ظلم تو یہ ہے کہ 12 فیصد اضافے کی زد میں وہ لوگ بھی آئے جو غربت کی سطح سے بھی بہت نیچے زندگی گزار رہے ہیں، آپ کو یاد ہوگا کہ موجودہ حکومت نے دو سال قبل الیکشن مہم کے دوران عوام سے وعدہ کیا تھا کہ وہ برسر اقتدار آکر عوام کو کمر توڑ مہنگائی سے نجات دلائے گی، جبکہ 2009ء میں حکومت نے ایک وعدہ آئی ایم ایف سے بھی کیا تھا کہ بجلی کی قیمتوں میں بتدریج ہوشربا اضافہ کرکے عوام کی کمر توڑ کر رکھ دے گی، حقیقت حال یہ ہے کہ عوام سے کیا گیا وعدہ تو ایفا نہ کیا گیا لیکن آئی ایم ایف سے کیا گیا ہر وعدہ پورا کیا جارہا ہے، جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ قرض کی اگلی قسط کی وصولی کیلئے حکومت آئی ایم ایف کی دست نگر اور مجبور ہے، جبکہ عوام کی کمر اس لئے توڑی جارہی ہے کہ وہ بے بس، کمزور اور مجبور ہے گویا اس ملک میں کمزور ہونا ایک ایسا جرم بن گیا ہے جس کی سزا "مرے کو مارے شاہ مدار" ہے، یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ ایک طرف حکومت عوام سے اپنے لئے حمایت مانگ رہی ہے اور یہ تقاضا کر رہی ہے کہ موجودہ حکومت کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں لیکن دوسری جانب وہ عوام کو دیوار سے لگا رہی ہے۔

یہ درست کہ جمہوریت پاکستان کے لئے نا گزیر ہے یہ بھی درست کہ عوام آمرانہ دور کے غلط فیصلوں کی سزا بھگت رہے ہیں لیکن یہ جمہوریت کا کیسا عجب نمونہ ہے کہ جس میں عوام کی زندگی اجیرن ہوتی جارہی ہے، ایک طرف صدر محترم یہ کہتے نہیں تھکتے کہ جمہوریت بہترین انتقام ہے اور وہ بی بی کی شہادت کا انتقام نظام بدل کرلیں گے لیکن دوسری طرف بجز اس کے اب تک کوئی تبدیلی نہیں آئی کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ عوام پر مہنگائی کے بم گرائے جارہے ہیں، اگر حکومت کا یہی وطیرہ رہا تو وہ اس بات کا یقین کرلے کہ عوام میں پائی جانے والی بے چینی غیر جمہوری قوتوں کا راستہ ہموار کرے گی اور اگر ایسا ہوا تو اس کی تمام تر ذمہ داری موجودہ حکومت کے عوام کش فیصلوں پر عائد ہوگی، حکومت کے اس قسم کے اقدامات کے نتیجے میں غریب عوام کیلئے جو حالات پیدا ہورہے ہیں اس سے تو یوں لگتا ہے کہ حکومت جانتے بوجھتے اس سے صرف نظر کررہی ہے، جبکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت ان عوام دشمن اداروں کے فیصلوں اور عوام کی مشکلات کو دیکھتے ہوئے ہنگامی بنیادوں پر ایسے اقدامات کرے جس سے عوام مایوسیوں کی دلدل سے نکل کر امیدوں کے راستے پر گامزن ہوسکیں۔

یہاں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ پہلے ہی صرف پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافے سے عوام مہنگائی کے بوجھ تلے بری طرح دب چکے ہیں، اس کے باوجود

بجلی کی قیمتوں میں حالیہ اضافے سے مہنگائی کا ایک ایسا طوفان آئے گا جس سے حکومت کیلئے بھی حالات پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا، موجودہ حالات میں مہنگائی کے اس طوفان اور مختلف اداروں کی اجارہ داری سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ عوام کا کوئی پرسان حال نہیں، صرف جاگیرداروں، سرمایہ داروں، سیاستدانوں، حکمرانوں اور لوٹ مار کرنے والوں کیلئے ہی تمام سہولیات میسر ہو سکتی ہیں، غریب عوام اس وقت اپنے آپ کو بالکل تنہا اور بے سہارا محسوس کر رہے ہیں اور مایوسیوں کی انتہا تک پہنچ چکے ہیں، چنانچہ ان حالات میں عوام یہ سوال کرنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ حکومت کہاں ہے اور حکومت کی وہ رٹ کہاں ہے جس کے تحت عوام کو تحفظ اور سہولیات میسر آتی ہیں، کیا عوام کے ان سوالوں کا جواب اور مشکلات کا تدارک حکمرانوں اور سیاستدانوں کے پاس ہے؟ کیا عوام کے نام پر سیاست کرنے والوں کی یہ ذمہ داری نہیں بنتی کہ وہ عوام کے سوالوں کا جواب دیں اور ان کی مشکلات کے خاتمے کیلئے عملی اقدامات کریں، لیکن یہ تو جب ہی ممکن ہے جب حکمران اور سیاست دان اپنے قلعہ نما محلات سے باہر نکل کر دیہی علاقوں اور شہروں کی غریب بستیوں میں جا کر حالات معلوم کریں تو انہیں اندازہ ہو گا کہ عوام کی اکثریت کن مصائب اور مشکلات میں زندگی بسر کر رہی ہے۔

آج یہی وہ عوامل ہیں جس کی وجہ سے مہنگائی، بے روزگاری اور غربت کے مارے

افراد خودکشیوں اور جرائم کی طرف مائل ہو رہے ہیں، لوگوں کے کاروبار اور وسائل ختم ہوتے جارہے ہیں اور مسائل بڑھتے جارہے ہیں، جبکہ دوسری طرف حکمران صرف آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی خوشنودی اور ان کی شرائط پوری کرنے کے چکر میں عوام کو زندہ درگور کرنے پر تلے ہوئے ہیں، سوال یہ ہے کہ یہ حالات کب تک رہیں گے اور عوام کب تک اچھے وقت کی آس میں بھوک، افلاس، بے روزگاری اور بدامنی برداشت کرتے رہیں گے، آخر کبھی تو انکے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہوگا، اس وقت جو حالات پیدا ہوں گے، کیا حکمرانوں اور سیاستدانوں کو اس کا کچھ ادراک ہے کہ نہیں؟ ان حالات میں غربت، بھوک اور بے روزگاری کے ہاتھوں ستائے ہوئے عوام کیلئے وہ دور کب آئے گا جب عوام کو حقیقی معنوں میں خوشیاں نصیب ہوں گی۔

آج 62 برس گزرنے کے بعد بھی قومی منظر نامہ یہ ہے کہ ہر آنے والی حکومت نے غریب عوام کے معیار زندگی میں تبدیلی لانے کیلئے عملی اقدامات کرنے کے بجائے، صرف بلند بانگ دعوؤں، جھوٹے وعدوں اور کھوکھلے نعروں کی آڑ میں اُن سے معمولی ریلیف بھی چھیننے کے سوا، اور کچھ نہیں کیا، آج حالت یہ ہے کہ مہنگائی اور بے روزگاری کے زخموں سے چور، سسکتے، بلکتے اور چیختے چلاتے عوام کی آہ و بکا نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہو رہی ہے، جبکہ دوسری طرف ہمارے حکمران مسلسل وہ اقدامات کر رہے ہیں جس سے عوام کی مشکلات میں بے

پناہ اضافہ ہی ہو رہا ہے، کیا ہمارے حکمرانوں، سیاستدانوں اور پالیسی ساز اداروں کو ادراک نہیں کہ پاکستان کے عوام کس قدر مشکل حالات میں زندگی کی دوڑ سے ناطہ جوڑے ہوئے ہیں، بے روزگاری، مہنگائی اور امن وامان کی ناقص صورتحال نے غربت میں اس قدر اضافہ کر دیا ہے کہ کم آمدنی والا طبقہ مایوسیوں کی انتہاؤں تک پہنچ چکا ہے اور اپنے بچوں کی بھوک مٹانے کیلئے ہزار ہا کوششوں کے باوجود بھی ناکام ہوتا نظر آرہا ہے۔

درحقیقت یہی وہ عوامل ہیں جس کی وجہ سے مایوس افراد کا دھیان جرائم اور خودکشیوں کی طرف جاتا ہے، دولت اور وسائل کی ناجائز تقسیم نے ہمارے ملک میں افراتفری، انتشار اور نفرتوں بھرے جس ماحول کو جنم دیا ہے اس سے نکلنے میں ہمارے حکمران، سیاستدان اور قومی پالیسی ساز ادارے بری طرح ناکام ہو چکے ہیں اور ان کی حالیہ کارکردگی سے یہ ثابت ہوتا نظر آرہا ہے کہ ارباب اقتدار غربت مٹانے کی بجائے ملک سے غریب مٹا رہے ہیں، اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ عوام کی مشکلات کا ادراک کرتے ہوئے حکومت ایسے انقلابی اقدامات اور ٹھوس پالیسیاں اختیار کرے جس سے عوام کی مشکلات میں کمی واقع ہو اور عوام کیلئے روٹی، کپڑا اور مکان کا حصول آسان ہو۔

نفرتوں کی فصل پر امن کی آشا۔۔۔

امن کی آشا..... نا سمجھ دیوانوں کا خواب

گزشتہ دنوں پاکستان اور بھارت سے تعلق رکھنے والے دو بڑے میڈیا گروپس نے پاکستان اور بھارت میں "امن کی آشا" کے عنوان سے سروے کرائے، اس سروے رپورٹ کے مطابق 72 فیصد پاکستانیوں اور 66 فیصد بھارتیوں نے پرامن تعلقات کے حق میں رائے دی، اس سروے رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ بھارت میں مردوں، عورتوں، بچوں اور بڑوں سمیت سب کی رائے ایک سی ہے، جبکہ پاکستان میں خواتین کی نسبت مرد امن کے زیادہ حق میں ہیں، قابل غور بات یہ ہے کہ "امن کی آشا" پراجیکٹ کے تحت کیے گئے سروے کے دوران 64 فیصد پاکستانیوں کی رائے یہ تھی کہ "ذہن میں بھارت کا نام آتے ہی کشمیر کا خیال آتا ہے"، یوں تو امن کی آشا کا مطلب امن کی خواہش یا امن کی امید ہے، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ خیال برا نہیں، لیکن سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اس سروے میں شامل کتنے لوگ ایسے ہیں جن کو اس بات کا علم ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان نزاعی معاملات کی اصل اور بنیادی نوعیت کیا ہے؟ یہاں یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ اس سروے رپورٹ کے منظر عام پر آنے سے صرف ایک دن پہلے پاکستان سمیت دنیا

بھر کے اخبارات میں بھارتی آرمی چیف جنرل دیپک کپور کی وہ تقریر بھی شائع ہوئی، جو دہلی میں ایک سیمینار میں کی گئی تھی، اس سیمینار میں جنرل دیپک کپور نے واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ بھارت، پاکستان اور چین کے ساتھ بیک وقت جنگ کرنے بلکہ جیتنے کے امکانات پر کام کر رہا ہے اور اس حوالے سے بنیادی ہوم ورک تیار کر لیا گیا ہے، دیپک کپور کا کہنا تھا کہ اس حوالے سے فوج کو اسپیشل ٹریننگ بھی دی جا رہی ہے۔
امر واقعہ یہ ہے کہ بھارتی فوج نے پاکستان اور چین کے ساتھ بیک وقت جنگ کی تیاری شروع کر دی ہے اور نئی جنگی اور جارحانہ ڈاکٹرائن پر شملہ کے آرمی ٹریننگ کمانڈ سینٹر میں کام بھی جاری ہے، جس کا مقصد روایتی اور غیر روایتی صورتحال میں جنگی حکمت عملی اور تیاریاں ہیں، بھارتی میڈیا رپورٹ کے مطابق بھارتی فوجی حکام کا کہنا ہے کہ موجودہ ڈاکٹرائن کے سست آغاز اور بھارتی فوج کی جنگی پوزیشن میں تاخیر سے آنے کی وجہ سے پاکستان کو اپنا دفاع مضبوط بنانے اور بین الاقوامی برادری کو مداخلت کا موقع مل گیا ہے، بھارتی آرمی چیف جنرل دیپک کپور نے سیمینار کے دوران یہ بھی بتایا کہ بھارت ملکی ساختہ وار اور ڈاکٹرائن میں موجود خامیاں دور کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے اور اب بھارتی فوج فوری جنگ کیلئے تیار ہے، سیمینار میں جنرل دیپک کپور نے دعویٰ کیا کہ پاکستان اور چین کے ساتھ لڑنے کیلئے بھارتی افواج کو شملہ میں جنرل

اے ایس لامبا کی سربراہی میں تربیت دی جاچکی ہے۔ بھارت سمجھتا ہے کہ پاکستان اور چین کے ساتھ لڑنے کیلئے تیار ہے اور دشمن کی سرزمین پر 96 گھنٹوں میں قبضہ کیا جاسکتا ہے۔

بھارتی آرمی چیف نے جس نئی جنگی ڈاکٹرائن کے پانچ حصوں کی نشاندہی کی ہے اس کے مطابق ملک کی چاروں سرحدوں پر جارحانہ حملہ کی صلاحیت حاصل کرنے کیلئے بھارت نے 2001ء میں جنوب مغربی آرمی کمانڈ قائم کی اور اب وہ چین کے ساتھ جنوبی سیکٹر میں جنگ کی تیاریوں کیلئے اقدامات کے ساتھ مغربی اور شمال مشرقی محاذوں پر بھی مقابلے کی صلاحیت پر کام کررہا ہے۔ بھارتی آرمی چیف کے مطابق جنگی ڈاکٹرائن کا دوسرا اہم حصہ فوج کو روایتی جنگ سے نمٹنے کے لئے تیار کرنا ہے، جس میں بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کا استعمال اور سائبر دہشت گردی سے نمٹنا بھی شامل ہے، اس نئی ڈاکٹرائن کا تیسرا نقطہ خلیج فارس سے آبنائے ملاکہ تک دفاعی صلاحیت اختیار کرنا ہوگا، چوتھا نقطہ بری، بحری، جنگی آپریشن میں آزادی حاصل ہوگی، جبکہ جنگی حکمت عملی کا پانچواں نقطہ جدید ٹیکنالوجی کا حصول ہے، جس میں فضائی آپریشن، نگرانی، انفارمیشن اور الیکٹرانک وار ہیڈز کی صلاحتیں شامل ہیں، بھارت کی اِن جنگی حکمت عملیوں اور تیاریوں کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ بہت جلدی میں ہے اور پاکستان و چین کے خلاف فتح حاصل کرنا چاہتا

ہے۔
لیکن شاید وہ یہ بات بھول رہا ہے کہ جنگیں صرف اسلحے کے زور پر لڑی اور جیتی نہیں جاسکتیں، جنگ جیتنے کیلئے اُس جوش، جذبے اور ولولے کی ضرورت ہوتی ہے جس کا اظہار کرتے ہوئے جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین جنرل طارق مجید نے کہا کہ بھارتی فوج کے سربراہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ بھارتی افواج کیا کر سکتی ہے اور پاکستان کی مسلح افواج کیا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے انہوں نے کہا کہ چین کی بات تو چھوڑیں، جنرل دیپک کپور اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ بھارتی مسلح افواج کتنے پانی میں ہے اور ان کی مسلح افواج عسکری اعتبار سے کیا کر سکتی ہے، جنرل طارق مجید کی یہ بات دراصل پوری قوم کی آواز ہے کہ بھارتی چیف کو علم ہے کہ پاک فوج کیا کر سکتی ہے، جنرل طارق مجید کے اس بیان سے ہر کوئی یہ سمجھ سکتا ہے کہ پاک فوج دشمن کے مقابلے کے لئے ہر قسم کے اسلحے اور جذبہ ایمانی سے لیس اور ہمہ وقت اپنے ملک و قوم کے دفاع کے لئے جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کیلئے تیار ہے واضح رہے کہ اس سے قبل چیف آف آرمی سٹاف جنرل اشفاق پرویز کیانی اور اب جنرل طارق مجید کا دشمن کیلئے منہ توڑ بیان قوم کے دلوں کی آرزو اور دشمن کیلئے مؤثر پیغام کا درجہ رکھتا ہے۔

در حقیقت بھارت روز اول سے ہی پاکستان کے وجود کے خلاف اور اکھنڈ بھارت کے منصوبے کو مکمل کرنے کیلئے کوشاں ہے، اب چونکہ بھارت کو اس حوالے سے امریکہ کی مدد اور سرپرستی بھی حاصل ہے، اسی تناظر میں امریکہ نے بھارت کے ساتھ سول ایٹمی معاہدہ کیا اور افغانستان میں امریکہ نے بھارت کو وہ کردار دیا ہے جس کا کسی بھی طرح کوئی جواز نہیں بنتا تھا، یوں بھارت نے افغانستان کی سرزمین کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان کے خلاف ہر سطح پر سازشوں کا وہ جال بچھا دیا ہے کہ آج پورا ملک دہشت گردی اور بدامنی کی لپیٹ میں ہے، بھارت ایک طرف جہاں کشمیریوں پر ظلم و ستم ڈھا رہا ہے تو دوسری طرف امریکی آشیر باد سے وہ ہمارے خلاف افغانستان کی سرزمین استعمال کرتے ہوئے پاکستان کے قبائلی علاقوں اور بلوچستان میں حالات خراب کرانے اور پاکستان مخالف جذبات پیدا کرنے کیلئے اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر رہا ہے، شاید اپنی انہی سازشوں کی وجہ سے بھارت یہ سمجھتا ہے کہ پاکستان اس کے لئے تر نوالہ ثابت ہوگا، لیکن پاکستان کے ساتھ جنگوں میں اس کا جو حشر ہوا ہے اس کے باوجود بھی اگر بھارت یہ سمجھتا ہے کہ پاکستان کا مقابلہ کرنا آسان ہوگا تو یہ اس کی خام خیالی اور اس کی پیٹھ ٹھونک کر جنگی تیاریاں کرانے والی طاقتوں کی لاعلمی ہے کہ پاکستان نہ تو افغانستان ہے اور نہ ہی عراق۔ وہ یہ بھول رہے ہیں کہ ملک پہ اگر کوئی مشکل گھڑی آن پڑی تو پاک فوج کی تو بہادری اور جاں فروشی کی زندہ تاریخ اپنی جگہ پاکستان کی سترہ کروڑ عوام بھی ملکی

سلامتی اور دفاع کیلئے اپنی جانوں کا نذرانہ دینے کے لئے تیار ہے۔

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ایک طرف بھارت میں اس فوجی ڈاکٹرائن پر کام ہو رہا ہے تو دوسری جانب دونوں ممالک کے مشہور میڈیا گروپ امن کی آشا کرتے ہوئے "عوام" سے یہ جاننے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کتنے فیصد پاکستانی اور بھارتی دونوں ملکوں کے مابین امن وسکون چاہتے ہیں، یہاں یہ سوال اپنی جگہ الگ جواب طلب ہے کہ دونوں ملکوں کی پالیسیوں پر اس کے عوام کس حد تک اثر انداز ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں، جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ 62 سال سے مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج کشمیری باشندوں کے ساتھ جو ظلم کر رہی ہے، بھارتی عوام کا اکثریتی حلقہ اسے پسند نہیں کرتا، لیکن بھارت کے پالیسی سازوں نے آج تک اپنے عوام کی اس رائے کو کتنا وزن دیا ہے؟اسی طرح پاکستانی عوام کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ بھارت کے ظلم استبداد سے مظلوم کشمیری مسلمانوں کو نجات دلائی جائے، چاہے وہ بزور شمشیر ہی کیوں نہ ہو، لیکن پاکستان حکومت نے عوام کی اس خواہش کا کس حد تک احترام کیا؟ یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں، آج حال یہ ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی سیکولر اسٹیٹ ہونے کے دعویدار بھارت میں مسلمانوں اور اقلیتوں کے ساتھ نہ صرف امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے بلکہ ان کے بنیادی حقوق بھی پامال کئے جاتے ہیں۔

ایک ایسا ملک جہاں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی سرپرستی میں تاریخی بابری مسجد شہید کرکے وہاں شری رام کی پوجاپاٹ کی اجازت دی جاتی ہو، جہاں گجرات سمیت ملک بھر میں مسلم کش فسادات میں ہزاروں مسلمانوں کا قتل عام ہوتا ہو، جہاں سابق وزیر خارجہ جسونت سنگھ کی قائداعظم کی معمولی سی تعریف پر وہاں کا نام نہاد روشن خیال، ترقی یافتہ معاشرہ بھڑک اٹھے، جہاں ایڈیٹر انڈین ڈیفنس ریویو بھارت بما مستحکم پاکستان انڈیا کے مفاد Stable Pakistan is not in Indian Interest میں نہیں جیسے مضمون لکھ رہے ہوں، جہاں مقبوضہ کشمیر میں ساڑھے سات لاکھ بھارتی فوج نہتے کشمیریوں پر ظلم وستم ڈھائے اور جہاں حکومت پوری ریاست جموں وکشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ قرار دے کر اپنے جنگی جنون اور توسیع پسندانہ عزائم کا برملا اظہار کرے، وہاں چند لوگوں کی خواہش اور امن کی آشا کیا معنی رکھتی ہے، کیا بھارت کے ان اقدامات سے اس کی روشن خیالی اور بھارت میں مسلمان ودیگر اقلیتوں سے متعلق ذہنی رویہ کی عکاسی نہیں ہوتی ہے۔

اس رویئے کی موجودگی میں امن کی خواہش کس طرح نتیجہ خیز ثابت ہوسکتی ہے اور کیا صرف امن کی آشا سے پاک بھارت میں جنگ نہ کرنے، تخفیف اسلحہ، آزاد تجارت، سارک کرنسی جیسے معاہدات کی توقع کی جاسکتی ہے؟ یہاں حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ امن کو بروئے کار لانا عوام کا نہیں، دونوں ملکوں کے حکمرانوں

کا کام ہے اور امن گولی سے نہیں، بندوقیں پھینک دینے سے قائم ہوتا ہے، جبکہ کشمیر میں
ساڑھے سات لاکھ بھارتی فوج نے ہنوز کشمیریوں پر اپنی بندوقیں تانی ہوئی ہیں، چنانچہ
ان حالات میں امن کا ہر راستہ کشمیر سے ہو کر جاتا ہے اسی لئے پاکستانی سب سے پہلے یہ
جاننے کے خواہش مند ہیں کہ کتنے فیصد بھارتی مسئلہ کشمیر کا کشمیری عوام کی خواہشات کے
مطابق فوری اور آبرومندانہ حل چاہتے ہیں؟ جبکہ مسئلہ کشمیر کا جنرل اسمبلی کی
قراردادوں کو ماننے کے باوجود حل نہ ہونا، سیاچن اور سرکریک کے تنازعات کا طے نہ
ہونا نیز سندھ طاس کے معاہدے کی خلاف ورزی سے نئے آبی مسائل کا پیدا ہونا اس
بات کی کھلی دلیل ہے کہ صرف خواہشوں سے یہ مسائل حل ہونے والے نہیں۔
حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ کشمیر کے ہوتے ہوئے امن کے لئے کی جانے والی ہر کوشش کبھی
بھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتی، امن کی آشا کے نام سے جو پروگرام بنایا گیا ہے وہ
دراصل اسی ایجنڈے کی ایک تبدیل شدہ شکل ہے جو پاکستان اور بھارت کی بعض این
جی اوز نے مرتب کیا تھا اور ماضی قریب میں ہمیں متحرک بھی نظر آیا تھا اور مسئلہ کشمیر
کے حل کے بغیر اس ایجنڈے کو امریکہ اور مغربی طاقتوں کی حمایت حاصل تھی، آج اسی
ایجنڈے کے مطابق بعض پاکستانی این جی اوز کے نمائندوں شہیدوں کی سرزمین کشمیر میں
ڈھول کی تھاپ پر رقص کر رہے ہیں، پاکستانی پاپ گلوکار سرینگر میں شہیدوں کے
لواحقین کے زخموں پر یہ کہہ کر

نمک چھڑک رہے ہیں کہ وہ حزب المجاہدین کے سپریم کمانڈر سید صلاح الدین کو میوزیکل جہاد کی دعوت دیتے ہیں اور آج اسی ایجنڈے کے تحت عاصمہ جہانگیر کی جواں سال بیٹی دورہ سرینگر کے دوران اس بات پر افسوس کا اظہار کرتی ہے وہ وہاں رقص نہ کرسکی۔

آج کوئی بھی ذی شعور اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ خطہ میں مستقل قیام امن کی خاطر پرامن بقائے باہمی کے اصول کی بنیاد پر پاکستان اور بھارت میں پڑوسی ممالک والے دوستانہ مراسم قائم ہونے چاہئیں مگر ان دونوں ممالک کے مابین کشیدگی کی بنیاد کے خاتمے اور تمام بنیادی تنازعات طے کئے بغیر نہ تو ایک دوسرے کی آزادی، خود مختاری اور احترام کے تمام تقاضے پورے ہوتے ہیں اور نہ ہی "امن کی آشا" کو حقیقت کی شکل میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ اگر دلوں میں کدورتیں بھری ہوں تو محض چہرے پر مسکراہٹیں سجا کر ایک دوسرے کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھانا سوائے منافقت کے اور کچھ نہیں، الہذا سب سے پہلے تو ضرورت اس امر کی ہے کہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق کشمیری عوام کو حق رائے دہی دیا جائے۔ کیونکہ کشمیر ہی وہ واحد تنازعہ ہے جس پر بھارت اپنے اکھنڈ بھارت کے فلسفہ توسیع کے تحت پاکستان پر تین جنگیں مسلط کرچکا ہے، ہمارے وطن عزیز کے ایک بڑے حصے کو ہم سے جدا کرچکا ہے اور باقی ماندہ پاکستان کی جڑیں کاٹ کر اسے کمزور بنانے کی سازشوں میں مصروف اور ہڑپ کرنے کی خواہش

رکھتا ہے۔

اس مقصد کیلئے ہی وہ کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ بنائے رکھنا چاہتا ہے تاکہ ہماری شہ رگ پر اپنا خونیں پنجہ مضبوط بنا کر پاکستان آنے والے دریاؤں کا پانی روک کر ہماری زرخیز و شاداب زمینوں کو بے آب وگیاہ صحرا میں تبدیل کر سکے۔ ہمارا سوال ہے کہ آج جس ثقافت کی بنیاد پر یہ دونوں میڈیا گروپس امن کی آشا کی تحریک چلا رہے ہیں، کیا وہ اس حقیقت کو بھول گئے کہ انہی دو ایشوز کی وجہ سے دو قومی نظریے کے تحت تقسیم ہند کی بنیاد رکھی گئی تھی اور پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا، کیونکہ مذہبی تعصب کی بڑائی میں مبتلا ہندو بنیاء ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود کسی طور بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں تھا، لہذا امن کی خواہش کرنے والوں کو یہ حقیقت بھی اپنے پیش نظر رکھنی چاہئے کہ متعصب ہندو بنیئے کی وہ سوچ اور ذہنیت آج بھی قائم ہے، یاد رہے کہ خوبصورت الفاظوں کے استعمال سے حقائق اور تاریخ نہیں بدلتی، یہ درست ہے کہ اس خطے کے عوام کئی دہائیوں سے امن و سکون چاہتے ہیں، لیکن ایسا تب تک ناممکن ہے جب تک بھارتی حکومت اپنا ذہنی رویہ تبدیل نہیں کرتی، چنانچہ ان عوامل کو سامنے رکھتے ہوئے کیا ضروری نہیں کہ پہلے حقیقتوں کو تسلیم کرکے بنیادی تنازعات کو حل کیا جائے اور بنیادی مسائل کے حل بغیر صرف سرحدیں مٹانے کی خواہش کو امن کی آشا کی تحریک کی بنیاد نہ بنایا جائے، کیونکہ

نفرتوں کی فصل برقرار رکھ کر امن کے بیج بونا اور ان سے میٹھے پھل کی توقع رکھنا کسی ناسمجھ دیوانے کا ہی خواب ہو سکتا ہے۔

تمغے اور اعزازات ملک و قوم کی امانت ہوتے ہیں

تمغے اور اعزازات ملک و قوم کی امانت ہوتے ہیں یہ نوازشِ بے جا نہیں

باہر اعوان، سومنات کا مندر اور ستارہ امتیاز۔۔۔۔

تاریخ کا یہ منظر 1857ء کی جنگ آزادی سے تعلق رکھتا ہے جب خاندان مغلیہ کے آخری چشم و چراغ بہادر شاہ ظفر کی حکومت عملاً ختم ہو چکی تھی اور مسلمانوں کا آخری حکمران لال قلعہ دلی میں علامت کے طور پر زندہ تھا۔برطانوی فوج نے قلعہ پر قبضے کیلئے جو فوج ترتیب دی تھی، اس میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جن کے نام و نصب مسلمانوں جیسے تھے، مگر ذہنی طور پر وہ انگریز کے ایسے غلام تھے جو وہ کچھ کر سکتے تھے جس کا ہم اور آپ تصور بھی نہیں کر سکتے، اسی وفادار فوج کی ایک رجمنٹ فرنٹیئر فورس نے جب لال قلعہ دلی پر حملہ کیا تو قلعے کے محافظوں نے حملے سے بچنے کیلئے دروازہ بند کرنا چاہا، لیکن دروازہ مکمل طور پر بند ہونے سے پہلے ہی فرنٹیئر فورس کے ایک سپاہی نے دروازے کے بیچ میں اپنا سر دے دیا، مغل سپاہیوں نے دروازہ بند کرنا چاہا، فرنٹیئر فورس کے سپاہی کی گردن نیلی ہو گئی لیکن قلعہ کا دروازہ بند نہ ہو سکا، یوں

برطانوی افواج قلعے میں داخل ہو گئی اور بہادر شاہ ظفر کی حکومت کا ہی نہیں برصغیر پر مسلمانوں کی حکومت کا چراغ بھی ہمیشہ کیلئے گل ہوگیا۔ لال قلعہ دہلی کی فتح کے بعد فرنٹیئر فورس کے سپاہی کے اس کارنامے پر حکومت برطانیہ نے اس رجمنٹ کو اپنے سب سے بڑے فوجی اعزاز وکٹوریہ کراس سے نوازا۔ آج بھی یہ رجمنٹ اپنے وفادار سپاہی کی یاد منانے کیلئے تہوار کے دن اپنی گردن پر نیلی پٹی باندھتی ہے۔

یوں تو دنیا کی ہر حکومت کا یہ قاعدہ اور قانون ہے کہ وہ اپنے ملک کے اہم، باصلاحیت، قابل فخر اور وفادار افراد کو مختلف قسم کے سول اور فوجی اعزازات سے نوازتی ہے اور انہیں اپنا قومی ہیرو قرار دیتی ہے۔ دنیا کی دیگر حکومتوں کی طرح پاکستانی حکومت بھی اپنے ملک کے باصلاحیت، قابل فخر اور وفادار سویلین اور فوجی افراد کو ہر سال اعزازات سے نوازتی ہے، یہ اعزازات نشان حیدر، نشان پاکستان، نشان شجاعت، نشان امتیاز، نشان قائد اعظم، ہلال پاکستان، ہلال جرات، ہلال شجاعت، ہلال امتیاز، ہلال قائد اعظم، ہلال خدمت، ستارہ پاکستان، ستارہ شجاعت، ستارہ امتیاز، ستارہ قائد اعظم، ستارہ جرات، ستارہ بسالت، تمغہ پاکستان، تمغہ جرات، تمغہ شجاعت، تمغہ امتیاز، تمغہ قائد اعظم، تمغہ بسالت وغیرہ کے نام سے جانے جاتے ہیں، ان اعزازات میں ستارہ امتیاز پاکستان میں سول اور عسکری شخصیات کو عطاء کیا جانے والا تیسرا بڑا

اعزاز ہے، اِس کا ترجمہ ستارہ فضیلت بھی کیا جاتا ہے، یہ ایک ایسا اعزاز ہے جو حکومتِ پاکستان عسکری اور سِول شخصیات کو عطاء کرتی ہے، اِس اعزاز کا اعلان سال میں ایک دفعہ یومِ آزادی کے موقع پر کیا جاتا ہے اور یومِ پاکستان کے موقع پر صدرِ پاکستان اس اعزاز سے منتخب افراد کو نوازتے ہیں، عسکری حوالے سے یہ اعلیٰ ترین اعزاز بریگیڈیر یا میجر جنرل کے رتبہ پر فائز ان فوجی افسران کو عطاء کیا جاتا ہے، جنھوں نے نمایاں خدمات سرانجام دی ہوں، جبکہ سول شخصیات کو یہ اعزاز ان کی اَدب، فنونِ لطیفہ، کھیل، طب یا سائنس کے میدان میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں دیا جاتا ہے۔

گذشتہ دنوں حکومت پاکستان نے وزیر قانون ڈاکٹر بابر اعوان کو یہ اعزاز دینے کا اعلان کیا، جناب بابر اعوان کو یہ اعزاز اَدب، فنونِ لطیفہ، کھیل، طب یا سائنس کے کس میدان میں نمایاں خدمت پر دیا گیا ہے یہ تو حکومت ہی بہتر جانتی ہے، لیکن حکومت کا یہ اعلان تمام اہل وطن سمیت خود حکومتی ارکان اور جماعتی وابستگان کیلئے بھی باعث حیرت واستعجاب تھا، شاید اسی وجہ سے پیپلزپارٹی کے سینئر رہنما اور سینٹرل ایگزیکیٹو کمیٹی کے رکن (جو کہ اب معطل ہیں) ڈاکٹر اسرار شاہ یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ "بابر اعوان نے سومنات کا مندر فتح کیا ہے جو انہیں یہ اعزاز دیا جارہا ہے۔" ڈاکٹر اسرار شاہ نے ڈاکٹر بابر اعوان کی نامزدگی پر اعتراض کرتے ہوئے وزیر اعظم یوسف رضا

گیلانی کو ایک خط بھی لکھا ہے، صدر زرداری کے نام بھیجی گئی اس خط کی کاپی میں ڈاکٹر اسرار شاہ نے یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ بابر اعوان پہلے ہی حارث اسٹیل ملز کیس میں ساڑھے تین کروڑ روپے کی کرپشن کے الزامات کی زد میں ہیں، ان کا کوئی اور کرپشن اسکینڈل سامنے آیا تو کیا حکومت ان کو ڈپٹی پرائم منسٹر بنا دے گی، ڈاکٹر اسرار شاہ نے وزیر اعظم کے نام خط میں افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ حکومت نے ایسے شخص کو وزیر قانون بنایا ہے جو نیپ کو مطلوب اور حارث اسٹیل ملز کیس میں ساڑھے تین کروڑ روپے کی کرپشن میں ملوث ہے۔

ڈاکٹر اسرار شاہ پاکستان پیپلز پارٹی کے ابتدائی سینئر ترین کارکنوں میں شمار ہوتے ہیں، پارٹی کیلئے ان کی بے شمار قربانیاں ہیں، آپ کو یاد ہوگا کہ 17 جولائی 2007ء کو عدلیہ بحالی تحریک کے دوران اسلام آباد بار ایسوسی ایشن کی طرف معزول چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کو ایک استقبالیہ دیا گیا تھا، اسی روز پیپلز پارٹی کے کیمپ پر ہونے والے بم دھماکے میں کئی کارکن جاں بحق ہوئے تھے، اس بم دھماکے میں ڈاکٹر اسرار شاہ بھی اپنی دونوں ٹانگوں سے محروم ہوگئے تھے، بعد میں انہیں این اے 43 سے پارٹی ٹکٹ دیا گیا اور انہوں نے بڑی جانفشانی سے وہیل چیئر پر اپنی انتخابی مہم چلائی لیکن کامیاب نہ ہوسکے، ڈاکٹر اسرار شاہ پارٹی میٹنگز میں نہایت بے باکی سے بولنے والے فرد

ہیں، ان کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے اکثر و بیشتر خطوط کے ذریعے پارٹی قیادت کو حقائق سے آگاہ کرنے کی کوشش کی، ہمیشہ پارٹی کی غلط پالیسیوں پر تنقید کی اور میٹنگز میں غلطیوں کی نشاندہی کرتے رہے، لیکن آج اسرار شاہ کو وفاداریوں اور قربانیوں کا یہ صلہ ملا ہے کہ حق بات کہنے پر سنیٹرل ایگزیکیٹو کمیٹی کی رکنیت سے معطل کئے جا چکے ہیں اور اس معطلی کو اُن کے بچے پارٹی کیلئے ان کی قربانیوں کا تحفہ قرار دیتے ہیں۔

حق گوئی، وفاداری، اخلاص اور مخلصی سے مزین ڈاکٹر اسرار شاہ کی زندگی کے یہ وہ پہلو ہیں جو ان کی ساری زندگی پر محیط ہیں جبکہ اُن کے مقابلے میں ڈاکٹر بابر اعوان موجودہ رائج الوقت سیاسی کھیل کے ایک ایسے ماہر کھلاڑی ہیں، جو سیاست کے اسرار و رموز، اتار چڑھاؤ اور باریکیوں کو سمجھتے ہیں اور اپنے رہنما کے دیئے گئے ٹارگٹ کو حاصل کرنے میں مہارت رکھتے ہیں، ان کی انہی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے حکومت نے انہیں وزیر قانون بنانا پسند کیا اور شاید اسی مہارت کو دیکھتے ہوئے صدر آصف علی زرداری نے بابر اعوان کو تمغہ امتیاز سے نوازا ہے، صدر آصف علی زرداری نے یہ فیصلہ یقیناً ان کی کارکردگی کی بنیاد پر کیا ہوگا، بابر اعوان کی وہ خدمات کیا ہیں جن کے طفیل انہیں یہ اعزاز بخشا گیا؟ یہ تو حکومت ہی بہتر جانتی ہے، لیکن ایک بات طے ہے کہ آج کی سیاست میں کوئی بات حرف آخر نہیں ہوتی، ہماری سیاست ایک ایسا عمل ہے جس

میں نہ کوئی دائمی دشمن ہوتا ہے اور نہ دائمی دوست، درحقیقت سیاست یا اقتدار میوزیکل چیئر کا کھیل ہے، جو شخص اس میدان میں اترنے کے بعد عقل سے فیصلے کرتا ہے وہی اس کھیل میں کامیاب ہوتا ہے، گویا سیاست عقل کا وہ کھیل ہے جس کا راستہ دل سے نہیں، دماغ سے ہو کر گزرتا ہے، اس میں دل اور جذبات کا کوئی عمل دخل نہیں، جس نے سیاست میں عقل سے کام لیا وہ جیت گیا، سیاست کے اسی اصول اور پھر وقت کی ایک لہر نے بابر اعوان کو سیاست کے اس ساحل پر اتار دیا جہاں سے کامیابی زیادہ دور نہیں تھی، جبکہ ڈاکٹر اسرار شاہ کی وفاداری، اخلاص و مروت اور قربانیوں پر ابن الوقتی اور چاپلوسی اس قدر غالب آ گئی کہ حق و انصاف کے روشن دیئے بھی بجھ گئے، جس کی وجہ سے وہ حق گوئی اور سچائی کا علم لئے تنہا کھڑے رہ گئے۔

حیرت کی بات ہے کہ وفاقی وزیر قانون جو کہ پارٹی کے شریک چیئرمین کے منظور نظر بھی ہیں کی حیثیت پارٹی کے جیالے کارکنوں کے نزدیک انتہائی متنازعہ ہے، جب حکومت نے بابر اعوان کو ستارہ امتیاز دینے کا اعلان کیا تو اس فیصلے کے خلاف ڈاکٹر اسرار شاہ نے وزیراعظم کے نام ایک خط میں اپنے تحفظات کا اظہار کیا، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ بابر اعوان کو ستارہ امتیاز دیئے جانے کے خلاف ان کے تحفظات پارٹی کی سینٹرل مجلس عاملہ کے رکن ہونے کی حیثیت سے پارٹی کی مرکزی مجلس عاملہ میں زیر بحث لائے جاتے کیونکہ دنیا بھر کی،

جمہوری پارٹیاں، پارٹی ارکان کو اختلاف رائے کا نہ صرف حق دیتی ہیں بلکہ اختلاف رائے کے حوالے سے ان کے مؤقف اور رائے کا احترام کرتے ہوئے اختلافی امور کو خاص طور پر پارٹی کی جنرل کونسل یا مجلس عاملہ میں زیر بحث لاتی ہیں اور اکثریت رائے سے کسی نتیجے پر پہنچ کر پارٹی میں جمہوری اقدار کا تحفظ کرتی ہیں۔ لیکن ڈاکٹر اسرار شاہ کے معاملے میں ایسا نہیں ہوا۔ حکمران جماعت کے اعلیٰ منصبوں پر فائز ہائی کمان نے پارٹی روایات کے برخلاف آمرانہ روش اختیار کرتے ہوئے اپنے ایک دیرینہ کارکن کی سینٹرل ایگزیکیٹو کمیٹی کی رکنیت معطل کر کے پارٹی منشور اور دستور کی ہی خلاف ورزی نہیں کی بلکہ آئین میں دی گئی انسانی حقوق کی دفعات کو روند ڈالا۔ ہمارا ماننا ہے کہ حکومتی مصلحتیں اور مجبوریاں اپنی جگہ لیکن ہر دل میں سچائی ایک دیا ضرور روشن رہتا ہے، جو تقاضہ کرتا ہے کہ سچ بولا جائے اور حق وانصاف کا ساتھ دیا جائے، ہم سمجھتے ہیں کہ تمغے اور اعزازات نوازش بے جا نہیں بلکہ ملک و قوم کی امانت ہوتے ہیں، جس کی تقسیم میں کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس امانت کو اپنی افتاد طبع، اپنی خواہشات، ذاتی پسند و ناپسند اور شخصی معاملات کے تابع کر دے، یاد رکھئے کہ یہ اعزازات پاکستان کے اُن عظیم سپوتوں اور قومی ہیروز کیلئے ہیں جو ملک و قوم کی فلاح و بہبود، بہتری اور استحکام کیلئے کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں، گستاخی معاف یہ قومی امانت حکومت اور صدر کے خیر خواہوں اور وفاداروں کیلئے نہیں۔

پاکستان میں اسلامی بینکاری کا بڑھتا ہوا رجحان

دور جدید میں بینکنگ کا مطلب سود پر قرض کا لین دین اور کاروباری ذرائع کو فروغ دینا ہے، جبکہ اسلام سود کی بنیاد پر قرض کے لین دین کی بالکل نفی اور ممانعت کرتا ہے، لیکن رہن رکھ کر قرض کا لین دین اور مضاربۃ و شرکۃ کے بنیادوں پر کاروبار کو فروغ دینا اور ارباب مال و ارباب ہنر دونوں کو باہمی اشتراک سے ترقی کرنے کے مواقع ضرور فراہم کرتا ہے۔ اگر ان اسلامی تعلیمات اور اصولوں کی بنیاد پر سرمایہ کاری کے طریقے اختیار کئے جائیں تو اسے "اسلامی بینکنگ" کہا جاسکتا ہے۔ لیکن چونکہ مروجہ بینکنگ نظام کا لازمی جز سودی لین دین پر ہے، جبکہ اسلامی بینکنگ میں کلی طور پر اس سے اجتناب لازم ہے۔ جبکہ پاکستان میں عام مسلمانوں اور تاجروں کی خاطر خواہ تعداد کی یہ خواہش رہی کہ وہ سودی تجارت اور بینکاری سے نجات حاصل کرکے اسلامی اصولوں پر تجارت کریں۔ امریکا اور یورپ میں حالیہ اقتصادی بحران، مالیاتی اداروں کی بڑے پیمانے پر تباہی، پھر دبئی میں سودی بینکوں کا دیوالیہ ہونا، اتنے بڑے واقعات ہیں کہ جنہیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان واقعات نے سودی معیشت و بینکاری کے "بلبلے پن" کو آشکار کردیا ہے۔ اس لئے دنیا بھر کے مسلمانوں میں اسلامی بینکنگ کی جانب رجوع کا رجحان تیزی سے فروغ پا رہا ہے۔ پاکستان میں اسلامی بینکاری نظام کو

متعارف ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے جبکہ اس سے پہلے کا بینکنگ سسٹم کئی صدیوں سے موجود ہے اور اپنی ایک ایڈوانس سطح پر پہنچ چکا ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلامی بینکاری بھی بہت تیزی سے اپنا سفر طے کر رہی ہے اور ہر آنے والے دن کے ساتھ پاکستان میں اسلامی بینکاری کا مارکیٹ شیئر بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ 2009ء کی دوسری سہ ماہی میں اسلامی بینکوں کی افزائش 12.4 فیصد رہی جو کمرشل بینکوں کی اس مدت میں ہونے والی افزائش سے کہیں زیادہ ہے۔ پاکستان میں اسلامی بینکوں کے مجموعی اثاثہ جات 313 ارب روپے ہیں۔ اسلامی بینکنگ کی تیز رفتار پیش رفت کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ پیش گوئی کی جا سکتی ہے کہ 2012ء تک اسلامی بینکوں کا مارکیٹ شیئر 12 فیصد تک پہنچ جائے گا۔

اس صورتحال میں ملک کے تاجروں، صنعت کاروں اور عوام الناس کا یہ فرض ہے کہ وہ غیر سودی بینکاری کی حوصلہ افزائی کریں، کیونکہ سود اللہ اور اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھلی جنگ ہے۔ اس جنگ میں سود خوروں اور سودی کاروبار کرنے والوں کی ناکامی یقینی ہے۔ ملک سودی معیشت سے جتنا جلد چھٹکارا حاصل کرے یہ اس کی سالمیت اور استحکام کے لئے اتنا ہی مفید ہے۔ اس وقت پاکستان میں اسلامی بینکنگ میں 15 فیصد اضافہ کی شرح برقرار ہے۔ دنیا بھر کے 51 اسلامی ممالک میں 500 سے زائد اسلامی بینک اور مالیاتی ادارے اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں جس سے کروڑوں لوگ مستفید ہو رہے ہیں، ان

اداروں سے استفادہ کرنے والوں میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی شامل ہیں جو آج غیر سودی بینکاری کو زیادہ محفوظ تصور کرتے ہیں، اگرچہ اس وقت اسلامی مالیاتی اداروں کے اثاثے عالمی بینکنگ اور مالیاتی اداروں کی کل مارکیٹ کا صرف ایک فیصد ہیں، لیکن آئندہ ایک عشرے میں توقع کی جارہی ہے کہ یہ بڑھ کر 8 سے 10 فیصد ہو جائیں گے۔ پاکستان میں اس وقت 6 اسلامی بینک کام کررہے ہیں جن کی ملک بھر میں 560 شاخیں ہیں، جبکہ 12 روایتی بینکوں کی اسلامی بینکنگ شاخیں بھی موجود ہیں، اسلامی بینکنگ کا ملک کے مجموعی بینکنگ اثاثوں میں حصہ 5 فیصد کے لگ بھگ ہے اور اسلامی بینکوں کا 35 ارب روپے کا تمسکاتی پروگرام ملک کی تاریخ کا سب سے بڑا غیر سودی قرض منصوبہ ہے، جس سے حکومت پاکستان استفادہ کر سکتی ہے۔

اسلامی بینکنگ دیگر اقسام کی بینکنگ سے کس طرح مختلف ہے اس کا اندازہ اس مثال سے ہوتا ہے کہ اسلامی بینک کمپنیوں کو فلوٹنگ انٹرسٹ ریٹ پر قرضے دیتے ہیں، فلوٹنگ ریٹ کا انحصار کمپنی کی شرح نمو پر ہوتا ہے، چنانچہ بینک کا نفع کمپنی کے منافع کی ایک خاص شرح کی صورت میں ملتا ہے، جب قرض کی اصل رقم واپس کر دی جائے تو نفع میں شراکت کا یہ معاہدہ ختم ہو جاتا ہے، اس نظام کی ایک اور مثال کاروبار میں سرمایہ کاری ہے، کاروبار کرنے والا افرادی قوت فراہم کرتا ہے جبکہ بنک اس میں سرمایہ لگاتا ہے، اس طرح نفع اور نقصان

دونوں میں شرکت ہو جاتی ہے۔ سرمائے اور مزدور کے درمیان اس طرح کا شراکتی انتظام اسلام کے اس اصول کی نشاندہی کرتا ہے کہ کاروبار میں کسی ناکامی کا سارا بوجھ صرف قرض دار کو ہی نہ اٹھانا پڑے۔ دوسری طرف اس سے آمدن بھی متوازن طور پر تقسیم ہو جاتی ہے اور معیشت پر قرض دینے والے کے تسلط کا بھی سدِّباب ہو جاتا ہے۔ رہن کے معاملے میں بھی بینک اسلامی اصول پر عمل کرتے ہیں، اس نظام میں بینک کوئی چیز خریدنے کے لئے رقم فراہم نہیں کرتا بلکہ مطلوبہ شئے خود خرید لیتا ہے اور پھر اپنا منافع رکھ کر وہ چیز صارف کو دوبارہ فروخت کر دیتا ہے۔ بینک صارف کو اس شے کی قیمت قسطوں میں ادا کرنے کی سہولت بھی دیتا ہے اور تاخیر سے ادائیگی کی صورت میں کوئی اضافی رقم یا جرمانہ بھی ادا نہیں کرنا پڑتا۔ اس تیسری مثال میں نادہندگی سے بچنے کے لئے فریقین کے درمیان سخت شرائط رکھی جاتی ہیں۔

آج اسلامی بینکنگ اور اسلامی سرمایہ کاری کا ہر طرف بہت شور ہے۔ اسلامی دنیا میں بینکاری کے اس رجحان کو دیکھتے ہوئے مغرب میں بھی حکومتی سطح پر اس نظام کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ اسلامک بینکنگ کا نظام اس وقت پاکستان سمیت کئی اسلامی ممالک میں رائج ہے گو کہ مغربی ممالک میں یہ تصور ابھی اتنا عام نہیں ہے۔ لیکن اب امریکہ میں بھی اسلامی بینکنگ اور مسلم فنانسنگ نظام متعارف کروانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یوں اس کے فوائد اب صرف اسلامی ممالک

تک محدود نہیں رہے ہیں بلکہ دنیا بھر میں تسلیم کئے جا رہے ہیں، اس سال برطانیہ سود سے پاک "سکوک" اسلامی بانڈ جاری کرے گا، ان بانڈز کی قدر سٹرلنگ پاؤنڈ میں مقرر کی گئی ہے تاکہ برطانیہ میں رہنے والے مسلمان اور دیگر ایسے لوگ جو سٹرلنگ پاؤنڈ میں کاروبار کرنے کے خواہشمند ہیں، اس موقع سے فائدہ اٹھا سکیں، مزید براں یورپ میں یورپی اسلامی سرمایہ کار بینک اور برطانوی اسلامی بینک جیسے کئی بڑے اسلامی مالیاتی ادارے ابھر کر سامنے آ رہے ہیں، تھائی لینڈ اور سنگاپور بھی انہی خطوط پر آگے بڑھ رہے ہیں اور ایشیاء میں ہانگ کانگ اور سنگاپور سب سے پرکشش اسلامی فنانس مارکیٹ کی شکل اختیار کر رہے ہیں۔

اس وقت برطانیہ کی کئی یونیورسٹیوں میں اسلامی بینکنگ سے متعلق ماسٹر ڈگری پروگرام اس وجہ سے شروع کئے گئے ہیں کہ اُن کی بینکوں سے ایک بڑی رقم نکل کر مسلمان ممالک کی اسلامی بینکوں میں نہ چلی جائے، چنانچہ وہ اس سرمائے کو اپنی بینکوں میں محفوظ رکھنے کے لئے اپنے یہاں اسلامی بینکاری نظام کو فروغ دے رہے ہیں، اس قسم کے ماسٹر ڈگری پروگرام کی پاکستان میں بھی ضرورت تھی، وفاقی وزارت تعلیم کے زیر نگرانی چلنے والے شیخ زاید اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی میں معمول کی تدریسی سرگرمیوں کے علاوہ گزشتہ چند برسوں سے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اسلامی بینکاری میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ اور ماسٹرز کی

ایوننگ کلاسز کامیابی سے جاری ہیں، اس وقت اسلامی بینکوں کو تربیت یافتہ اسلامی بینکاروں کی شدید ضرورت ہے اور انہیں معیاری تعلیم وتربیت کے حامل افراد درکار ہیں، اس سلسلے میں جہاں جامعہ کراچی اپنے اِس سینٹر کے ذریعہ یہ ضرورت پوری کرنے میں اپنا مثبت کردار ادا کر رہی ہے، وہیں اس سے ادارے کے تعلیمی شعبے سے وابستہ شرعی امور کے معاون اور شریعہ ایڈوائزر تربیت یافتہ بینکاروں کی تیاری میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں تاکہ پاکستان کے اسلامی بینکنگ کو اسلامی اسکالرز اور اقتصادی ماہرین کی شرعی ماہرین کی زیر Products مشاورت ہی حاصل نہ ہو بلکہ بینکنگ سروسز اور نگرانی اسلام کے دائرے کے اندر رہ کر صارفین کی بآسانی پہنچ میں بھی ہو۔

آج اسلامی فنانس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس نے دنیا پر ثابت کیا ہے کہ اسلام ایک پرسکون اور مساوات پر مبنی دین ہے، یہی وجہ ہے کہ آج اسلامی بینکنگ صرف مسلمانوں تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں موجود اسلامی مالیات اور بینکنگ کی مشترکہ اقدار نے اسے غیر مسلموں کے لئے بھی قابلِ قبول بنا دیا ہے، اسلامی فنانس نے مساوات کے اصول کو اہمیت دے کر نفع و نقصان میں قرض دار اور قرض خواہ کی برابر شراکت کے ذریعے سرمایہ کاری کے عام مواقع فراہم کئے ہیں، اس طرح کے اصولوں کی بنیاد پر کام کرنا اقتصادی نظریات اور جمہوری اصولوں کے ساتھ پوری طرح مطابقت رکھتا ہے ،یعنی" لوگوں کے ذریعے لوگوں کے

لئے معیشت۔" اور یہی وہ اصول ہیں جن پر عمل کرکے اسلامی ممالک اپنی اقتصادی تنہائی
دور کر سکتے ہیں۔

عدلیہ حکومت تصادم

نظام اور شخصیات میں سے کسی ایک کا انتخاب

اٹھائیس جنوری کو قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف چوہدری نثار علی خان کی تقریر کے جواب میں وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کا خطاب دراصل " نا کرنے کے بہانے ہزار" کا عملی نمونہ پیش کر رہا تھا، وزیر اعظم صاحب نہایت ہی معصومیت اور کمال سادگی سے فرما رہے تھے کہ صدر کو استثنیٰ آئین اور قانون کے تحت حاصل ہے میں اسے ختم نہیں کر سکتا، آئین کے آرٹیکل 248 کی تشریح کرکے مجھے بتایا جائے کہ وہ کیا کہتا ہے، اگر کسی کو اعتراض ہے کہ صدر کو آرٹیکل 248 کے تحت استثنیٰ حاصل نہیں ہے تو وہ عدالت میں جائے اور مقدمہ دائر کرے کہ صدر کو استثنیٰ حاصل نہیں ہے اور وہ اس کے خلاف سپریم کورٹ سے فیصلہ لے آئے، جو چیزیں تشریح طلب ہیں سپریم کورٹ ان کی تشریح کر دے، اس حوالے سے عدالت جو وضاحت کرے گی اس پر عمل کریں گے، ہم نے یہ کبھی نہیں کہا کہ ہم سپریم کورٹ کے فیصلے پر عملدرآمد نہیں کریں گے، ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ سابق اٹارنی جنرل میری جماعت سے ہیں نہ حزب اختلاف سے، انہوں نے سپریم کورٹ کے فیصلے کے خلاف نظرثانی کی اپیل کی ہے جب تک اٹارنی جنرل کی نظرثانی کورٹ میں ہے میں کیسے کاروائی کر سکتا ہوں؟ انہوں نے چیف جسٹس کے بیان کہ "

اداروں میں تصادم نہیں ہونے دیں گے" کو خوش آئند قرار دے کر خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ ہم ان کے "ڈومین" میں مداخلت نہیں کر سکتے، ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ڈومین میں بھی کوئی مداخلت نہ کرے، ہر ادارہ اپنی اپنی حدود میں کام کرے، انہوں نے کہا کہ آٹھ ہزار 34 کیسیز میں سے صرف صدر کے کیسز کی بات کیوں کی جاتی ہے؟ ہر کوئی چاہتا ہے کہ میں صدر سے کہوں کہ وہ ہٹ جائیں، صدر کو ان کے عہدے سے فارغ کر دیا جائے تو یہ ان کے لئے سپریم کورٹ کے فیصلے پر عملدرآمد ہو گا، آج ہر طرف ایک ہی بات کی جا رہی ہے کہ سپریم کورٹ کے فیصلوں پر عملدرآمد کیا جائے، یہ سوال تو تب پیدا ہونا چاہئے تھا کہ اگر میں کہتا کہ ہم سپریم کورٹ کے فیصلوں پر عملدرآمد نہیں کریں گے، لیکن عدالت کے فیصلے کے بعض نکات وضاحت طلب ہیں جب ان کی وضاحت آ جائے گی تو ان پر عملدرآمد کیا جائے گا۔

یہ ہے وزیر آعظم کا وہ خطاب جو "نا کرنے کے بہانے ہزار" کا عملی مصداق اور اس بات کی کھلی وضاحت کر رہا تھا کہ وہ این آر او کے خلاف عدالت عالیہ کے فیصلے پر عمل درآمد نہ کرنے کے کھلے بہانے اور جواز تراش رہے ہیں، آپ کو یاد ہو گا کہ اس سے قبل بھی وزیر اعظم ملتان کے جلسہ عام میں اس عزم کا اظہار کر چکے ہیں کہ اداروں میں تصادم نہیں ہونے دیں گے، اس کے علاوہ وزیر اعظم کئی موقعوں پر اس بات کی یقین دہانیاں بھی کرا چکے ہیں کہ سپریم کورٹ کے

فیصلے پر عمل کیا جائے گا، اسی طرح وزیراعظم صاحب کم و بیش سات ہزار سے زائد بار فرما چکے ہیں کہ حکومت نے 17 ویں ترمیم ختم کرنے کا تہیہ کرلیا ہے، ان کے اس بیان کی ٹیپ پچھلے دو برسوں سے ہر تیسرے چوتھے روز مسلسل چل رہی ہے لیکن 17 ویں ترمیم جو کی توں وہیں کی وہیں موجود ہے جہاں دو سال پہلے تھی، وزیراعظم بار بار کہتے ہیں کہ جمہوریت کو کوئی خطرہ نہیں لیکن ان کے ہر ایسے بیان کے فوراً بعد صدر پاکستان کا بیان آجاتا ہے کہ جمہوریت کے خلاف سازشیں ہورہی ہیں، یوں لگتا ہے کہ حکومت نے صرف بیانات اور ٹال مٹول سے مسائل کو الجھانے اور ٹہلانے کا طریقہ اختیار کیا ہوا ہے، اس وقت حکومتی لیت و لعل سے جو معاملات سامنے آرہے ہیں وہ عدلیہ حکومت تصادم کے حوالے سے اک نئے بحران کو جنم دے رہے ہیں، جناب یوسف رضا گیلانی کی آرزو اور خواہش اپنی جگہ کہ اداروں میں تصادم نہیں ہونے دیں گے لیکن اس وقت انتظامیہ اور عدلیہ میں اختلافات کا واضح منظر جو پوری قوم دیکھ رہی ہے وہ دو سال قبل والی تصادم کی کیفیت کو جنم دیتا دکھائی دے رہا ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ آئینی طور پر ججوں کے تقرر کیلئے صدر لازمی طور پر چیف جسٹس سے مشورہ کرنے کا پابند ہے اور اس مشورے کے بغیر کوئی جج مقرر نہیں کیا جاسکتا، اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ چیف جسٹس کی رائے کو نظرانداز یا بائی پاس نہیں کیا جاسکتا، مگر حالت یہ ہے کہ لاہور ہائی کورٹ کے 60 ججوں

کی نشستوں پر صرف 20 جج کام کر رہے ہیں اور 40 ججوں کی نشستیں خالی پڑی ہیں انہیں پر کرنے کے لیے ہائی کورٹ کے چیف جسٹس خواجہ محمد شریف نے 29 ججوں کے نام کئی ہفتے پہلے بھجوائے تھے مگر جمہوری ملک کے ایک گورنر نے یہ نام اپنی میز سے آگے نہیں بڑھنے دیئے، اس وجہ سے کہ گورنر اور صدر ان ناموں کی بجائے اپنی مرضی کے جج لانا چاہتے ہیں، چونکہ آئین کے تحت چیف جسٹس کے بھیجے ہوئے نام مسترد کرنا حکمرانوں کے بس کی بات نہیں تھی، لہٰذا یہ راستہ نکالا گیا کہ چیف جسٹس خواجہ شریف کو ہائی کورٹ سے تبدیل کرکے سپریم کورٹ بھیج دیا جائے اور ہائی کورٹ میں نئے چیف جسٹس سے نئے نام منگوا لیے جائیں، دوسری طرف صدر کی جانب سے چیف جسٹس آف پاکستان کی سفارشات صدر کے اس مؤقف کہ " 1996ء کے سپریم کورٹ کے فیصلے کے مطابق پہلے چیف جسٹس ہائی کورٹ کو سپریم کورٹ میں لانا چاہیے "واپس بھجوا کر کھلی محاذ آرائی کا پیغام دیا گیا، ان سب کے باوجود پھر بھی وزیر اعظم صاحب فرما رہے ہیں کہ اداروں میں تصادم نہیں ہونے دیا جائے گا، حقیقت یہ ہے کہ چیف جسٹس کی سفارشات مسترد کرنے کا صدارتی مؤقف بلا جواز ہے کیونکہ آئین میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے، اگر ہوتی تو 1996ء کے اس فیصلے کے بعد جب جسٹس خلیل الرحمان رمدے، جسٹس اعجاز احمد چودھری، جسٹس فقیر محمد کھوکھر اور دوسرے صوبوں کے ان ججوں کو جو وہاں چیف جسٹس نہیں تھے کو ان ہائی کورٹوں کے چیف جسٹسوں پر ترجیح دے کر سپریم کورٹ لایا گیا، تو ایسے مواقع پر حکومت نے 1996ء کے فیصلے کی پیروی کیوں

نہیں کی؟ کیوں چیف جسٹس کی سفارشات من و عن منظور کرلیں، صاف ظاہر ہے کہ اصل مسئلہ اصول اور فیصلے کا نہیں بلکہ نیت کا ہے، جب نیت و ارادہ ہی آمادہ تصادم ہو تو پھر کیا، کیا جاسکتا ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ اس وقت آئین کی دفعہ 260 کی روشنی میں اعلیٰ عدلیہ کے سابق ججوں اور ملک کے نامور آئینی اور قانونی ماہرین کی یہ مصدقہ رائے بھی سامنے آچکی ہے کہ سپریم کورٹ کے ججوں اور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کے تقرر کیلئے چیف جسٹس پاکستان کی سفارشات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا اور حکومت ان سفارشات کی روشنی میں ہی تقرر عمل میں لانے کی پابند ہے، کیونکہ ججز کیس کے فیصلہ پر بہر صورت آئین کو فوقیت حاصل ہے، اگر چیف جسٹس اپنے آئینی اختیار کی بناء پر سپریم کورٹ کے ججوں کے تقرر کیلئے صدر مملکت کو سفارشات بھجواتے ہیں تو کیا ان پر عملدرآمد سے انکار کر کے آئین کی خلاف ورزی کی جائے گی، سینئر قانون دان عبدالحفیظ پیرزادہ نے یقیناً اسی تناظر میں حکمرانوں کو باور کرایا ہے کہ آئین کی دفعہ 190 کے تحت چیف جسٹس پاکستان اپنے احکام پر عملدرآمد کیلئے ملک کی مسلح افواج کی خدمات حاصل کر سکتے ہیں، مگر اس تلخ حقیقت سے آگاہی کے باوجود عدلیہ کے احترام کی دعویدار حکومت چیف جسٹس پاکستان کی سفارشات پر نہ صرف عملدرآمد کرنے سے گریزاں ہے بلکہ اس سلسلہ میں چیف جسٹس پاکستان کی سفارشات انہیں واپس بھجوا کر عدلیہ کے ساتھ جان

بوجھ کر محاذ آرائی کا راستہ اختیار کر رہی ہے اور وہ دیدہ و دانستہ عدلیہ کے ساتھ ٹکراؤ کا راستہ اختیار کرکے جمہوری نظام کو خود ہی پٹری سے اتارنے کی کوششوں میں مصروف ہیں، خود حکومتی حلقوں کے قریبی ذرائع سے ملنے والی اطلاعات اس خیال کو حقیقت کا روپ دے رہی ہیں کہ ایوان صدر اور اس کے قریبی مشیر اس کوشش میں مصروف ہیں کہ کسی طرح فوج مداخلت کرکے انہیں ایوان اقتدار سے باہر نکال دے تاکہ وہ سیاسی طور پر مظلوم بن کر عوام سے اپنی گرتی ہوئی ساکھ بحال کرا سکیں، جبکہ دوسری طرف اس تناظر میں چیف جسٹس بجا طور پر حکومتی ریاستی اتھارٹی کو باور کرا رہے ہیں کہ اچھی گورننس کیلئے قانون کی حکمرانی پر عمل کرنا انتہائی ضروری ہے اور آئین و قانون کی بالادستی کے سوا کوئی دوسرا نظریہ تسلیم نہیں کیا جائے گا، خواہ اس کی کتنی ہی بھاری قیمت کیوں نہ ادا کرنا پڑے،اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک کے عوام نے مشرف کی جرنیلی آمریت کی پیدا کردہ لاقانونیت کے خاتمہ اور قانون و آئین کی حکمرانی اور انصاف کی عملداری کیلئے ہی 18 فروری کے انتخابات میں موجودہ حکمرانوں کو سلطانی جمہور کا مینڈیٹ تھا، اسلئے عوام اب بجا طور پر اپنے حکمرانوں سے توقع رکھتے ہیں کہ معاشرے میں سرائیت کر جانے والے کرپشن کلچر کا قانون و انصاف کی عملداری کے ذریعہ خاتمہ کیا جائے، عام آدمی کو بھی انصاف کے یکساں مواقع حاصل ہوں اور تمام آئینی ریاستی ادارے اپنی آئینی حدود میں رہ کر اپنے فرائض انجام دیں، اگر آج آزاد عدلیہ کو وکلاء اور سول

سوسائٹی کی سرکردگی میں عوام کی تحریک کے ذریعہ ملک میں قانون و آئین کی حکمرانی کو یقینی بنانے کا مینڈیٹ ملا ہے اور یہ اس کے آئینی فرائض میں بھی شامل ہے تو عدلیہ کی جانب سے ان فرائض کی بجاآوری میں کسی کو جزبز ہونے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ عوامی مینڈیٹ کا احترام کرتے ہوئے قانون و آئین کی حکمرانی کو مستحکم بنانے کی کوشش کرنی چاہئے، جبکہ اس سے سسٹم کی بقاء و استحکام کی بھی ضمانت مل سکتی ہے مگر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے حکمرانوں نے ماضی کے تلخ تجربات سے ابھی تک کوئی سبق نہیں سیکھا۔

بظاہر صدر آصف علی زرداری نے چیف جسٹس کی دو سفارشات کو مسترد کرکے اپنا آئینی حق تو استعمال کرلیا، مگر ایک ایسی جنگ بھی چھیڑ دی ہے جس میں ہر صورت انہیں پسپائی ہوگی، وہ غالباً یہ بھول گئے کہ اسی آئین کے تحت اگر چیف جسٹس نے نظرثانی کے بعد جسٹس ثاقب نثار کی سپریم کورٹ میں تقرری کی سفارش دوبارہ کردی تو پھر صدر اس نظرثانی شدہ سفارش کو قبول کرنے پر مجبور ہوں گے، اس صورت میں ان کی کیا وقعت رہ جائے گی، ایک بار پھر وہی داستان دہرائی جائے گی یعنی کہ عدلیہ کی مانگ بھی پوری ہو جائے گی اور صدر زرداری کو کریڈٹ کی بجائے ملامت ملے گی، کتنا ہی اچھا ہوتا اگر یہ معاملہ کاغذی محاذ آرائی کی بجائے افہام تفہیم سے طے کرلیا جاتا، یقیناً اب چیف جسٹس کی جانب سے مزید استدلال کے ساتھ صدر کو دوبارہ سفارشات بھجوائی جائیں گی جنہیں

صدر مملکت کی جانب سے مسترد کئے جانے کی صورت میں چیف جسٹس کے آئینی احکام پر عملدرآمد کے پابند ریاستی ادارے خاموش نہیں رہیں گے اور ملک میں قانون و آئین کی حکمرانی کیلئے اپنا کردار بروئے کار لائیں گے۔ اگر اس صورت میں سسٹم کو کوئی نقصان پہنچتا ہے تو عدلیہ کے ساتھ محاذ آرائی کی راہ اختیار کرنے والی حکومت پر ہی اس کی ذمہ داری عائد ہوگی، پھر اس ایکشن کو جان بوجھ کر دہرانے کی کیا ضرورت ہے جو پہلے بھی جمہوریت کی بساط لپیٹے جانے پر منتج ہو چکا ہے۔
لہذا وزیراعظم صاحب یاد رکھیں کہ ایسے ہی حالات فوج کے لیے سازگار ہوتے ہیں جب عوام سول حکمرانوں سے تنگ آ جائیں، گورننس کا بیڑا غرق ہوچکا ہو، میرٹ کا قتل عام اور عدم تحفظ ہو، جمہوریت کے پردے میں شخصی آمریت پروان چڑھ رہی ہو اور عوام بنیادی سہولتوں اور اشیاء ضرورت کیلئے ترس رہے ہوں، ایسی صورت میں صرف یہ کہہ دینے سے کام نہیں چلتا کہ اداروں میں تصادم نہیں ہونے دیں گے اور تمام ادارے آئین کے مطابق چلائے جائیں گے۔ بنیادی سوال یہ بھی ہے کہ عدالت عالیہ کی طرف سے حکومت میں موجود کئی افراد مشکوک ٹھہرائے جا چکے ہیں، یہ ٹھیک ہے کہ ملزم اور مجرم میں فرق ہوتا ہے لیکن جب تک کوئی ملزم عدالت سے بے گناہی کی سند نہ حاصل کرلے، مشکوک ہی رہے گا، حقیقت حال یہ ہے کہ اب تو آئینی و قانونی ماہرین یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ پاکستان کا

صدر سزا یافتہ ہے اور وہ اس منصب کا اہل نہیں، اس صورتحال میں اب دو ہی راستے ہیں کہ شخصیات کو بچایا جائے یا نظام کو، اگر حکومت نظام کو بچانے کے راستے کا انتخاب کرتی ہے تو اسے چاہیے کہ فیصلے پر اس کی روح کے مطابق عمل کرکے ایک نئی تاریخ رقم کرے، لیکن اگر اس کے برعکس شخصیات کو بچانے کا عمل شروع ہوتا ہے تو اس سے نہ صرف حکومت کا نقصان ہوگا بلکہ پورا سیاسی نظام اور ڈھانچہ بھی تباہ ہوجائے گا اور غیر جمہوری قوتوں کو موقع ملے گا کہ وہ جمہوریت کے خلاف سازشیں کریں، آج جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سپریم کورٹ کے فیصلے سے حکومت کو خطرہ ہے وہ دراصل اس نظام کی بساط لپیٹ کر اپنے پس پردہ مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں، بہ نظر غائر دیکھا جائے تو سپریم کورٹ کے فیصلے سے حکومت کو کوئی خطرہ نہیں کیونکہ سپریم کورٹ کا فیصلہ حکومت کے خلاف نہیں بلکہ ان لوگوں کے خلاف ہے جنھوں نے ملکی دولت لوٹی اور قومی خزانے کو نقصان پہنچایا ہے، ہمارا ماننا ہے کہ پیپلزپارٹی ایک عوامی جماعت ہے اور ایک عوامی جماعت ہونے کے ناطے اسے ملکی دولت لوٹنے والوں کا دفاع کرنے کے بجائے سپریم کورٹ کے فیصلے پر عمل کرکے کرپشن کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کردینے چاہیں۔

آج اگر چیف جسٹس ایک ایسے معاشرے کے قیام کی جدوجہد کررہے ہیں جہاں پر ہر ایک کیلئے انصاف ہو، تو اس میں غلط کیا ہے، قوم گزشتہ باسٹھ سالوں سے ایک

ایسے ہی معاشرے کے متمنی ہیں جو انصاف فراہم کرنے والا ہو، 62 برسوں سے عوام اسی معاشرے کیلئے قربانیاں دیتے آئے ہیں لیکن عوام کی تمام کوششیں، قربانیاں، امیدیں اور خواہشیں نقش برآب ثابت ہوئیں، ہمیشہ چہرے بدلتے رہے لیکن نظام وہی رہا، جس میں کسی غریب و بے سہارا کے بجائے صرف سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور وڈیروں کو تو تحفظ حاصل تھا، اسی ناانصافی کے نتیجے میں باسٹھ برس گزرنے کے بعد تمام تر وسائل ہونے کے باوجود ہم بحیثیت قوم ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہوسکے، دولت کی ناجائز تقسیم اور اس کا چند ہاتھوں میں سمٹ جانا اور مصلحتوں میں لپٹے انصاف کی فراہمی سے ہمارے معاشرے کو افراتفری، انتشار اور انارکی کے سوا کچھ نہیں ملا، ماضی میں اگر عدالتوں نے انصاف فراہم بھی کیا تو وہ انصاف مصلحتوں اور نظریہ ضرورت کی چادروں میں لپٹا ہوا حکمرانوں کی مرضی و منشا کا پابند تھا، لیکن آج اگر عدلیہ تمام تر دباؤ سے آزاد غیر جانب دار اور بے لاگ انصاف کیلئے اپنا کردار ادا کر رہی ہے تو حکومت کیوں اس کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرکے محاذ آرائی کی طرف لے جانے کی کوشش کررہی ہے، شاید وہ یہ بات بھول رہی ہے کہ یہ 90ء کی دہائی والے حالات نہیں ہیں کہ انصاف و قانون کی عملداری کیلئے چیف جسٹس کے جاری کردہ احکام روبہ عمل نہ آسکیں اس لئے عدلیہ کے ساتھ ٹکراؤ کا راستہ اختیار کرنا اب حکمرانوں کو بہت مہنگا پڑے گا، جبکہ قانون و آئین کی حکمرانی اور انصاف کی عملداری کیلئے عوام بھی عدلیہ کی پشت پر کھڑے ہیں، وہ ملک میں قانون و

آئین کی حکمرانی کیلئے کاربند اور کرپشن کے خاتمہ کیلئے پرعزم عدلیہ کے ساتھ حکومتی ریاستی محاذ آرائی کو کسی صورت قبول نہیں کریں گے۔

اسلئے ضرورت اس امر کی ہے کہ پیپلزپارٹی سمیت تمام سیاسی جماعتیں سپریم کورٹ کے فیصلے کو تسلیم کریں کیونکہ اس میں ملک و قوم کا فائدہ ہے، یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ این آر او کے حوالے سے سپریم کورٹ کے فیصلے پر عملدرآمد سے شخصیات کے لئے تو خطرہ ہے لیکن موجودہ نظام کیلئے نہیں، اب یہ سیاسی قوتوں کا کام ہے کہ وہ اس نازک مرحلے پر شخصیات کو مقدم رکھتی ہیں یا ملک و قوم اور نظام کو اہمیت دیتی ہیں،

آج وقت نے حکومت اور تمام سیاسی قوتوں کو تاریخ کے ایک ایسے موڑ پر لاکھڑا کیا ہے کہ جہاں ان کی سیاسی فہم وفراست اور دور بینی کا امتحان مقصود ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ اس امتحان میں حکومت اور سیاسی قوتیں نظام بچاکر کامیاب و سرخرو ہوتی ہیں یا شخصیات بچاکر علامہ عنایت اللہ مشرقی کے اس قول بلیغ کہ "دنیا کی مکر کی تاریخ میں سیاست صرف اپنے نقطہ نظر سے کامیاب حکومت کا نام ہے، سیاست کے سب چالباز اپنے حریف کی چال کو کم وبیش صاف طور پر دیکھتے ہیں، لیکن کیونکہ سب چور ہوتے ہیں اور سب کا مقصد بے بس اور بے خبر رعیت کا کامیاب شکار کرنا ہوتا ہے، اسلئے ہر چور اپنے حریف کی چال کو روایتی احترام کی نظر سے دیکھتا ہے اور سیاست کے تمام کھیل کو سر مکتوم بنا دینا اپنی سیاسی شرافت سمجھتا ہے،

اس نقطہ نظر سے راعی کی رعایا کے خلاف ہمیشہ ایک سازش رہی ہے، جس کا پورا
انکشاف اسلئے نہیں ہو سکا کہ راعیوں کی ٹولی دنیا میں ایک مستقل گروہ رہا ہے، جس کی
سیاسی شرافت اور آداب جماعت اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ چوروں کی منڈلی کے
راز فری میسنوں کی طرح فاش کر کے رکھ دے" کی تائید و حمایت کرتی ہیں۔

سلسلہ اہلِ جنوں باقی ہے۔۔۔

نور احمد میرٹھی........ تاریخ کا ایک باب مستقبل کا ایک حوالہ

ہم جناب نور احمد میرٹھی صاحب کو جان کر بھی نہیں جانتے تھے، یقیناً آپ ہماری اس بات پر حیران ہورہے ہوں گے، لیکن حقیقت یہی ہے، اگر جناب ندیم صدیقی صاحب (ڈپٹی ایڈیٹر روزنامہ انقلاب ممبئی) نیٹ پر ہماری توجہ اُن کی جانب مبذول نہ کراتے تو شاید یہ راز ہم پر نہ کھلتا کہ جنھیں ہم بچپن سے کسی اور حیثیت سے جانتے تھے، وہی دراصل دنیائے ادب کی عظیم شخصیت نور احمد میرٹھی ہیں، ہوا کچھ یوں کہ جب ندیم صدیقی صاحب سے ہماری کتاب " تحریک تحفظ ختم نبوت سیدنا صدیق اکبرتا علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی "کے حوالے سے رابطہ محبت کے درجے میں داخل ہوا تو نیٹ پر باتوں باتوں میں ایک دن انھوں نے ہمیں کراچی کے علاقے کورنگی زمان ٹاؤن (جو کہ ہمارے گھر سے تقریباً تین چار کلومیٹر کے فاصلے پر ہے) میں رہائش پزیر اپنے دوست جناب نور احمد میرٹھی صاحب کا فون نمبر دے کر اُن کی خیریت سے آگاہی اور سلام پہنچانے کی استدعا کی، چنانچہ ہم نے ندیم صدیقی صاحب کی معرفت جناب نور احمد میرٹھی صاحب کو فون کرکے اُن کی خیریت معلوم کی اور انہیں ندیم صدیقی صاحب کا سلام پہنچایا،

یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلتا رہا، آخر ایک دن جناب نور احمد میرٹھی صاحب نے فرمایا، احمد صاحب آپ اکثر فون کرکے خیریت معلوم کرتے ہیں، کسی دن تشریف لاکر شرف ملاقات بخشیں، چنانچہ ہم ایک دن اپنے ایک دوست کے ہمراہ جناب نور احمد میرٹھی صاحب کے آشیانے پر پہنچے، چہرہ شناسا سا لگا، بات چیت اور مکمل تعارف میں یہ عقدہ کھلا کہ موصوف ہمارے علاقے میں جاوید کلینک (جس کے سامنے ہم بچپن میں کھیلا کرتے تھے) پر ڈاکٹر جاوید کی معاونت کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں، گزشتہ سات ماہ سے صاحب فراش اور ریڑھ کی ہڈی میں ٹی بی کی وجہ سے بستر پر ہونے کے باوجود وہ ہمارے ساتھ نہایت ہی محبت اور خنداں پیشانی سے پیش آئے اور اپنی دس بیش قیمت کتابیں خوبصورت تاثرات کے ساتھ ہمیں پیش کیں، یہ نور احمد میرٹھی صاحب سے بحیثیت نور احمد میرٹھی ہماری پہلی ملاقات تھی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی سچ کہتے ہیں کہ "نور احمد میرٹھی صاحب دل انسان ہیں، خلوص و محبت کا پیکر ہیں، دھن کے پورے، کام کے پکے.... علم و ادب اُن کا اوڑھنا بچھونا، دن رات اِسی کام میں لگے رہتے ہیں اور گزشتہ پندرہ بیس سال کے عرصے میں کئی کتابیں مرتب کرکے شائع کرچکے ہیں جو سب کی سب اپنے موضوع پر اچھوتی اور اُن کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔" نور احمد میرٹھی ادارہ فکر نو کراچی کے بانی، بزم اتحاد ادب، بزم شعر و سخن، ادارہ فوق الادب سے

وابستہ اور آرٹس کونسل کراچی کے رکن ہیں، بیماری کی حالت میں بھی وہ تصنیف و تالیف کے کام میں تندہی سے مصروف ہیں، اِس وقت 1991ء سے 2010ء تک چھپنے والے شعری مجموعوں کا دو جلدوں اور نعتیہ کلام کا ایک جلد پر "انتخاب" کے عنوان سے کام جاری ہے، اس کے علاوہ وہ "گلستان عقیدت" کے نام سے غیر مسلموں کی منقبتی شاعری، "تذکرہ شعرائے طنز و مزاح"، "شعرائے طنز و مزاح کی نعتیہ شاعری" اور "تذکرہ شاعرات پاکستان" پر بھی کام کر رہے ہیں۔

میرٹھ کی سرزمین ہمیشہ سے باکمال لوگوں کا گہوارہ رہی ہے جہاں علم و دانش کے کئی شگوفے پھوٹ کر قدآور درخت بنے، فکر و فہم اور علم و دانش کے اِن گلوں نے مہک کر برصغیر کی فضا کو معطر اور دیدہ و دل کو منور کیا، اِسی گدازپارہ صفت مٹی سے نور احمد میرٹھی کا وجود بھی نمو پایا، نور احمد میرٹھی کے والد سید محمد احمد کا تعلق دہلی اور والدہ کا میرٹھ سے تھا، نور احمد میرٹھی نے 17 جنوری 1948ء کو دہلی میں آنکھ کھولی اور اپنے نانا سید نور الٰہی کے زیر سایہ میرٹھ میں پرورش پائی، فیض عام انٹر کالج میرٹھ سے تعلیم حاصل کی، موصوف کے نانا کا حلقہ احباب وسیع اور ماحول خالص مشرقی تھا، اسی لیے علم و تہذیب کی چھاؤں جو سونے کو کندن بنا دے، میں اُن کا فکر و شعور پروان چڑھا، وہ اپنے نانا سے بہت متاثر اور عملی ادبی کام میں اشرف علی زبیری کے ممنون ہیں، جنوری 1962ء میں وہ پاکستان منتقل ہوئے اور سماجی، ادبی اور صحافتی

زندگی کا آغاز کیا۔ برصغیر پاک و ہند میں غیر مسلموں کی حمدیہ، نعتیہ اور رثائی شاعری کے حوالے سے تحقیقی کام کرنے نور احمد میرٹھی پہلے آدمی ہیں، اُن کی ادبی خدمات کو مشاہیر اور دانشور طبقہ نے سراہا اور وہ آج دنیائے علم و ادب کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں، اُن کی ادبی خدمات پر انہیں قائدِ اعظم ادبی ایوارڈ اور پاکستان نعت اکیڈمی کا سلور جوبلی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔

نور احمد میرٹھی کی دور رس متلاشی نگاہیں ہمیشہ عجیب عجیب نکتے تلاش کرکے اپنی بو قلمی کے نادر شاہکار تراشتی ہیں اور جدید و منفرد انداز اُن کے محور فکر پر رقصاں ہے، جس کا عملی اظہار ان کی وہ تصنیفات ہیں جو موجودہ اور آنے والی نسلوں کیلئے سرمایہ افتخار ہیں، حقیقت یہ ہے کہ نور احمد میرٹھی ایک مکمل سوچ، مجسم فکر، سراپا خلوص اور بے پایاں محبت کی وہ شبنم ہیں جو ذہنوں کو طمانیت اور زندگی کو حرارت بخشتی ہے، جن لوگوں نے علم و ادب کو مقصد حیات بناکر مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی نظم "پن چکی" کی طرح دُھن اور لگن سے کام کیا، اُن میں نور احمد میرٹھی کا نام نمایاں و ممتاز ہے، اُن کی اب تک درجن بھر چھوٹی بڑی کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں، جن میں "اذکار و افکار، نورِ سخن، گلبانگ وحدت، بوستان عقیدت، انتخاب، اشاریہ، صاحب سراری کی تخلیقات، تذکرہ شعرائے میرٹھ، مشاہیر میرٹھ، شخصیات میرٹھ اور بہر زماں بہر زباں جیسی

نادر ونایات اور اچھوتی کتابیں شامل ہیں، اس کے علاوہ مہر وماہ، فراز خودی، جام طہور، چشم شوق، تاریخ رفتگاں، پانی پہ نقوش، ہوا چراغ آئینہ، خواب سے بیداری تک، دکھ موسم اور خواب، اعتبار کا موسم اور کتابوں پر تاریخی قطعات بھی آپ کی مرتبہ کتب میں شامل ہیں، جناب نور احمد میرٹھی کی تمام کتابیں بین الاقوامی ادبی معیار کے مطابق چھاپی گئی ہیں۔

گزشتہ 25 سال سے وہ اسی کام میں لگے ہوئے ہیں کہ میرٹھ کے لوگوں نے علم وادب اور زندگی کے مختلف شعبوں میں علمی و تخلیقی سطح پر جو خدمات انجام دی ہیں، انہیں بصورت تذکرہ یکجا و مرتب کرکے دنیا کے سامنے پیش کریں، میرٹھ سے تعلق رکھنے والی قومی و ملی تاریخ کی اِن عظیم شخصیات کے ذکر کے بغیر ہماری تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی، ان سب شخصیات کو سمیٹ کر تذکرے کی صورت میں یکجا کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا، ان کاموں کیلئے ادارے بنائے جاتے ہیں، جہاں بہت سے لوگ مل کر کام کرتے ہیں اور پھر کوئی نتیجہ برآمد ہوتا ہے، لیکن نور احمد میرٹھی نے یہ کام تن تنہا کرکے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جس پر نہ صرف نور احمد میرٹھی بلکہ ہم سب بجا طور پر فخر کرسکتے ہیں، ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں کہ "بہر زمان بہر زبان کو ملا کر اُن کا یہ کام "تذکرہ شعرائے میرٹھ"، "مشاہیر میرٹھ، شخصیات میرٹھ" اتنا اہم ہوجاتا ہے کہ کسی بھی "یونیورسٹی کو انہیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دینی چاہیے۔

نوراحمد میرٹھی کی ادبی تخلیقات

گلبانگ وحدت "پانچ سو پچیس کلر صفحات پر مشتمل اس کتاب میں نوراحمد میرٹھی نے غیر مسلم شعراء کے حمدیہ کلام کو موضوع گفتگو بنانے کے ساتھ ساتھ ایک تخصیص اور تحدید کے دائرے میں سمو دیا ہے، اس کتاب میں نوراحمد میرٹھی نے غیر مسلم شعراء میں حمدیہ رجحان اور ان کی تخلیقات کو تلاش کرکے ایک اچھوتا، مشکل اور منفرد کام سرانجام دیا ہے،اس مجموعے کی فہرست شعراء اور فہرست ماخذ اس حد تک مبسوط ہے کہ فاضل مرتب کی جستجواور تلاش و مستعدی پر رشک آتا ہے، گلبانگ وحدت اردو شاعری میں غیر مسلموں کی حمد کو یکجا صورت میں مرتب کرنے کی ایک عمدہ کوشش ہے، 211 غیر مسلم شعراء انتخاب کو دیکھ کراس حیران کن امر کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ غیر مسلم شعراء کی حمدیہ و نعتیہ شاعری کا لب و لہجہ، لفظیات کی ترتیب اور احترام و عقیدت مسلمانوں کے اظہار و بیان سے مختلف اور کم درجہ کا نہیں۔

بہر زماں بہر زباں" اپنے نام کے اعتبار سے حیات و کائنات کی تمام ترافقی اور عمودی وسعتوں کا احاطہ کرتی ہوئی ایک ایسی نادر و نایاب ضخیم کتاب جس میں 391 غیر مسلم شعراء جن میں ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی، بدھ اور دوسرے

مذہبی عقائد کے ماننے والے لوگ شامل ہیں،کا چودہ مختلف زبانوں پر مشتمل کلام بمعہ حالات 263 کتب و رسائل کی مدد سے 1008 صفحات پر ترتیب دیا گیا ہے، یہ اتنا ضخیم اور جامع تذکرہ ہے کہ ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد کہتے ہیں کہ " اب آئندہ سو سال تک اس موضوع پر کام کرنے کی ضرورت نہیں" ڈاکٹر فرمان فتح پوری کہتے ہیں کہ " کسی نے حضور پاک کی سیرت طیبہ کو سپرد قلم کرکے مرتبہ جاودانی حاصل کرلیا ہے اور کسی نے نعت گو شعراء کے تذکرہ و انتخاب کی ترتیب و تدوین سے اپنے لئے ایک ابدی نشان بنالیا ہے، نور احمد میرٹھی نے یہ بھی کیا ہے لیکن اس سے آگے بڑھ کر انھوں نے بہر زماں بہر زباں کے زیر عنوان ایک ایسا عظیم کارنامہ انجام دیدیا ہے جو اردو میں آپ اپنا جواب اور آپ اپنی مثال ہے، نور احمد میرٹھی اپنی خوبی قسمت پر جس قدر ناز کریں کم ہے۔" اردو ادب میں غیر مسلم شعراء کے حوالے سے اب تک ایسا تذکرہ شائع نہیں ہوا عمدہ لہجہ اور نوع بہ نوع اسلوب میں کہی گئی اتنی بہت سی نعتوں تک رسائی حاصل کرنے میں نور احمد میرٹھی نے کس قدر محنت شاقہ ،انتظار، صبر واصرار اور جدوجہد کی ہے اس کا صحیح اندازہ تو وہی لگا سکتا ہے جو خود اہل قلم ہو، حقیقت یہ ہے کہ 336 غیر مسلم مدحت نگاران رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام اور حالات کو جمع کرنا ایک عظیم مگر محیر العقل کام ہے جس پر انہیں کسی بھی یونیورسٹی سے باآسانی P.hd کی ڈگری مل سکتی ہے، درحقیقت " بہر زماں بہر زباں " نور احمد میرٹھی کی وہ عظیم کتاب ہے جسے بین الاقوامی پذیرائی ملی۔

نور سخن ” .برصغیر پاک و ہند میں ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت و عقیدت کا نعتیہ اظہار جہاں مسلمانوں نے کیا، وہاں ہندو شعراء بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے، لیکن کچھ عرصہ قبل تک لاعلمی کی وجہ سے اُن کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے، جناب نور احمد میرٹھی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے 154 ہندو شعراء کا کلام جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کا اعجاز پایا، کو نور سخن میں جمع کرکے ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے، یوں اپنے موضوع اور ترتیب کے اعتبار سے یہ غیر مسلموں کی کہی ہوئی نعتوں پر مشتمل ایک ایسا حسین مجموعہ ہے، جو تسکین روح، طمانیت قلب اور ایمان کو جِلا بخشتا ہے۔

بوستان عقیدت ” بابائے اردو مولوی عبدالحق فرماتے ہیں ”مسلمانوں کی المیہ شاعری امام حسین کی شہادت ہے ”بوستان عقیدت غیر مسلموں کی حمدیہ و نعتیہ شاعری کے بعد رثائی شاعری کا مجموعہ ہے، جسے نور احمد میرٹھی صاحب نے بڑی جانفشانی سے مرتب کرکے قدماکے دور سے لے کر عصر حاضر تک 120 غیر مسلم شعراء کی مرثیہ گوئی کو صفحات کے مجموعے میں یکجا کردیا ہے، اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے704 کہ اردو شاعری میں ہندوؤں کی مرثیہ نگاری کی تاریخ بہت ہی قدیم ہے، ہندو مرثیہ نگاروں نے اردو شاعری کی ادبی قدروں اور

روایتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے مرثیہ کو مثنوی، قصیدے، مربع اور مسدس کی شکلوں میں لکھا اور حضرت امام حسین کی شہادت پر غیر مسلموں کے قلم سے نکلنے والی سیاہی نے صفحہ قرطاس پر سرخ رنگ بکھیرے۔

تذکرہ شعرائے میرٹھ" 602 شعراء کے حالات اور مستند کوائف پر 992 صفحات پر مشتمل اس ضخیم کتاب میں متعدد ایسے شعراء کا ذکر شامل ہے جو ہماری تاریخ کا ناگزیر حصہ ہیں،ان میں مصطفیٰ خان شیفتہ، قلق میرٹھی، مولانا اسمٰعیل میرٹھی، مرزا رحیم بیگ، احسان دانش، سلیم احمد،اقبال عظیم، مظفر وارثی، فہمیدہ ریاض، حزیں میرٹھی، عالمتاب تشنہ وغیرہ شامل ہیں،درحقیقت ان سب شخصیات کو سمیٹ کر تذکرے کی صورت میں مرتب کرنا آسان کام نہیں۔

مشاہیر میرٹھ" 224 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں اُن 59 مشاہیر کا تذکرہ شامل ہے جنھوں نے علم و ادب دنیا اور مذہب و سماجیات کے شعبوں میں غیر معمولی خدمات انجام دیں، یہ وہ مشاہیر ہیں جن کے نام آج بھی زندہ ہیں اور آنے والے زمانے میں بھی زندہ رہیں گے۔ان مشاہیر میں ڈاکٹر سر ضیاالدین احمد، بابائے اردو مولوی عبدالحق، شاہ عبدالعلیم صدیقی،آغا ناصر ،انتظار حسین وغیرہ شامل ہیں،تذکرہ شعرائے میرٹھ کی طرح مشاہیر میرٹھ میں بھی جو معلومات و کوائف دیئے گئے ہیں وہ مستند ماخذوں سے حاصل کرکے سلیقے سے ترتیب دیئے گئے

ہیں، یہی احتیاط نور احمد میرٹھی کا مزاج اور اُن کی کتابوں کی ہر سطر سے جھلکتی ہے۔

شخصیات میرٹھ"اِس کتاب میں 130 شخصیات کا ذکر شامل ہے جنھوں نے شعر و شاعری اور علم و ادب کے علاوہ زندگی و سماج کے دوسروں شعبوں میں غیر معمولی خدمات انجام دیں،اِن میں متعدد ایسی شخصیات ہیں جو قومی و ملی سطح پر،برصغیرپاک و ہند کی تاریخ کا حصہ ہیں، جن میں مولانا نذیر احمد خجندی،نواب جمشید احمد خان، حکیم احمد شجاع،وغیرہ شامل ہیں، یہ کتاب 340 صفحات پر مشتمل ہے۔

اشاریہ" تذکرہ شعرائے میرٹھ، مشاہیر میرٹھ اور شخصیات میرٹھ"کے اشاریئے جو کہ رجال،اماکن، کتب اور ادارے وغیرہ کی سہولت کو مد نظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے ایک ایک قاموس کی حیثیت رکھتا ہے، 234 صفحات پر سائینٹیفک انداز پر ترتیب دی گئی یہ کتاب مصنف کے پختہ علمی و تحقیقی ذوق کی عکاسی کرتی ہے۔

انتخاب" 1981ء سے 1990ء کے درمیانی عرصے میں،برصغیرپاک و ہند میں منظر عام پر آنے والے 252 شعری مجموعوں کا انتخاب ہے، جس میں سن اشاعت کے ساتھ شعری مجموعوں کی ترتیب بہ اعتبار حروف تہجی رکھی گئی ہے،بقول ڈاکٹر ساجد امجد " یہ "شعراء کا نہیں مجموعہ ہائے کلام کا انتخاب ہے۔

اذکار و افکار" کراچی کے اُن شعراء کے تذکرے پر مشتمل ایک ایسی کتاب جو لانڈھی کورنگی میں رہتے ہیں،اِن میں بعض ایسے اساتذہ بھی شامل ہیں جو دنیائے ادب میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور ایسے نوجوان شعراء بھی شامل ہیں جن کا تخلیقی مستقبل روشن ہے۔

صابر براری کی تخلیقات" یہ مشہور شاعر و ادیب جناب صابر براری کی ادبی تخلیقات پر ترتیب دی گئی ایک کتاب ہے۔ مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ مہر وماہ،فراز خودی، جام طہور، چشم شوق،تاریخ رفتگاں،پانی پہ نقوش اور کتابوں پر تاریخی قطعات بھی موصوف کی مرتبہ کتب میں شامل ہیں، واضح رہے کہ جناب نور احمد میرٹھی کی ساری کتابیں بین الاقوامی ادبی معیار کے مطابق ہیں۔

نور احمد امیرٹھی کی علمی و ادبی خدمات اہل علم کی نظر میں

علامہ شاہ احمد نورانی فرماتے ہیں "وہ کام جو مختلف حضرات مل کر کرتے وہ انہوں نے تنہا کر دکھایا۔" ڈاکٹر فرمان فتحپوری کہتے ہیں "نور احمد میرٹھی کی نگاہ جستجو اور اشہب خیال نے بے بحر ظلمات میں غواضی کا فریضہ ادا کیا، اُن موتیوں کو تہہ آب سے باہر نکلا اور نئی آب وتاب کے ساتھ منظر عام پر

لے آئے کہ عاشقانِ رسول کے دیدہ ودل منور ہوگئے۔" ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کہتے
ہیں" جناب نور احمد میرٹھی نے انتخاب اور ترتیب وتدوین کے فن کی تمام نزاکتوں کو
خوب سمجھا اور بڑے سلیقے سے اپنے ادبی کاموں میں اِن کا اظہار کیا، یہ تذکرے اپنے
حسن ترتیب اور حسن صورت کی بناء پر ہماری ادبی تاریخ میں یاد رکھے جائیں گے۔" محترم
ضیاء الحق قاسمی کہتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ اُن کی خدمت کو شرف قبولیت بخشے۔" جناب زیڈ
اے نظامی کہتے ہیں کہ "قدرت نے نور احمد میرٹھی کو اِس خدمت کیلئے منتخب کرلیا، اُن
کی تگ و دو اِس امر کی عکاسی کرتی ہے کہ وہ پورے انہاک اور خداداد صلاحیتوں کے
ساتھ محو سفر ہیں، مجھے امید ہے کہ اُن کی یہ کاوشیں تاریخ ادب کا حصہ بنیں
گی۔" مشفق خواجہ کہتے ہیں" آپ نے موضوع کا حق ادا ہی نہیں کیا بلکہ کام کرنے والوں
کیلئے ایک مثال قائم کردی کہ کام کس طرح کرنا چاہیے، آپ نے جس اعلیٰ معیار کا کام
انجام دیا ہے اُس پر حیرت ہوتی ہے۔" پروفیسر معین الدین عقیل کہتے ہیں کہ "ہمارا
ادب اُن کے اِن کارناموں کو کبھی فراموش اور نظر انداز نہیں کرسکے گا۔" ڈاکٹر عبدالنعیم
عزیزی بریلی کہتے ہیں" جناب نور احمد میرٹھی نے تن تنہا وہ اہم اور عظیم کارنامہ انجام
دیا ہے جس کیلئے ادارے کی ضرورت تھی۔" پروفیسر عاصی کرنالی کہتے ہیں کہ "حقیقت
یہ ہے کہ یہ ایک حیرت آفریں اعجاز ہے جس کا اظہار آپ سے ہوا۔" ڈاکٹر ابوسلمان
شاہجہاں پوری کہتے ہیں کہ "آپ نے بہت بڑی ادبی خدمت انجام دی ہے اور آپ کے
حسن ذوق کی کارفرمائی

ترجمہ و انتخاب دونوں ہی بے مثل و لاجواب ہے۔" جناب حکیم محمد سعید مرحوم لکھتے ہیں کہ "محنت اور لگن سے قطع نظر نعتیہ کلام کے انتخاب میں بھی اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ صرف ایسا کلام منتخب کیا جائے جس میں جذبہ کی صداقت اور نئی خوبی کا پہلو ضرور ہو۔" خالد علیگ کہتے ہیں کہ "نور احمد میرٹھی کا دم غنیمت ہے کہ اُن کا سلسلہ اہل جنوں باقی ہے۔" شاہ مصباح الدین شکیل کہتے ہیں "کاش کچھ یونیورسٹیاں ایسی ہوتیں جو اعلیٰ تحقیقی کتابوں پر اعتراف خدمت کے طور پر از خود ڈاکٹریٹ عطا کرتیں، اگر ایسا ہوتا تو جناب نور احمد میرٹھی کی کتاب اس کی مستحق ٹھہرتی۔" سید اختر الاسلام میرٹھ سے لکھتے ہیں کہ "ناسپاسی ہوگی کہ اگر نور احمد میرٹھی کے ضمن میں یہ نہ کہا جائے کہ وہ ہر دم متحرک اور سیماب پا شخصیت ہیں۔" محترم مسعود احمد برکاتی کہتے ہیں کہ "نور احمد میرٹھی کی محنت شاقہ کی داد دینی پڑتی ہے۔" ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کہتے ہیں "زعشق مصطفےٰ دل ریش دارم... رفاقت باخدائے خویش دارم..." آپ کو یہ رفاقت حاصل ہو۔

اہل علم و دانش سے ایک سوال "کیا احسان کا بدلہ احسان نہیں

یقیناً احسان کا بدلہ احسان ہے، جناب نور احمد میرٹھی گزشتہ سات ماہ سے ریڑھ کی ہڈی میں ٹی بی ہونے کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور اور بے روزگار

ہیں، محنت، ایمانداری اور خود داری ہمیشہ اُن کی زندگی کا خاصہ اور وجہ شناخت رہی ہے،آج بھی وہ اپنے رب پر توکّل کے ساتھ بہادری سے حالات سے نبرد آزما اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھے ہوئے ہیں اور کسی بھی قسم کی ایسی مدد کے طلبگار نہیں، جو اُن کی طبیعت، مزاج اور زندگی بھر کے اثاثے" خود داری" کے خلاف ہو، ہاں البتہ وہ اہلِ علم و دانش اور صاحبانِ محبت سے اتنا ضرور چاہتے ہیں کہ انکی ادبی تصنیفات خرید کر پڑھی جائیں، قارئین محترم یہ مضمون بھی اسی جذبے کے تحت لکھا گیا ہے، قرآن کہتا ہے کہ اے ایمان والو... نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو"آگے بڑھیئے اور نور احمد میرٹھی (فون نمبر00923232202815) کی علمی ادبی اور تاریخ کتب خرید کر اُن کی مدد و معاونت میں حصہ دار بنیئے۔

کہو کچھ، کرو کچھ ۔۔۔ بھارتی وزیر اعظم کا چانکیائی راگ

پاک بھارت مذاکرات کا نیا راگ، نیا ڈرامہ
نشستند، گفتند و برخاستند = بے معنی، بے نتیجہ اور بے مقصد مذاکرات

جھوٹ، مکر وفریب، منافقت، دھوکہ دہی، دغا اور چالبازی پر مبنی چانکیائی سیاست کا بانی، چانکیہ ٹیکسلا کا رہنے والا ایک انتہائی شاطر و چالاک برہمن شخص تھا. اُس کی انہی خوبیوں کو دیکھ کر چندرگپت موریہ نے اسے اپنا وزیر اعظم بنایا اور چانکیہ نے اپنی چالاکی اور عیاری سے چندرگپت موریہ کی چھوٹی سی حکومت کو پورے ہندوستان میں پھیلا کر برصغیر میں پہلی ہندو سلطنت کی بنیاد رکھی، چانکیہ نے ساڑھے تین سو سال قبل مسیح ہندوستان کے بادشاہوں کو حکومت کرنے کے اسرار رموز سکھانے کیلئے ایک کتاب "ارتھ شاستر" بھی لکھی، منافقت، مکروفریب اور دغابازی کے اصولوں پر مبنی یہ کتاب صدیاں گزرنے کے بعد آج بھی بھارتی سیاست کا مزکر و محور ہے اور بھارت کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے لے کر موجودہ وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ تک ہر بھارتی حکمران ہمیں چانکیائی سیاست پر پوری طرح عمل پیرا نظر آتا ہے۔

چانکیہ کی کتاب ارتھ شاستر کا ایک اصول ہے کہ "دشمن کو کبھی اعتماد میں نہ آنے دو، کہو کچھ، کرو کچھ، جب دباؤ آئے، تو وعدہ کرلو، جب دباؤ ہٹے، تو مکر جاؤ۔" چانکیہ کا یہ گُر بھارت کی سیاسی اور خارجہ پالیسی کی اصل بنیاد ہے، قیام پاکستان سے لے کر آج تک ایسے بے شمار مواقع آئے جب بھارت کے بڑے بڑے لیڈروں نے پاکستان کے ساتھ مسائل کے حل کے اعلانات اور وعدے کئے، لیکن بعد میں اپنی کمٹمنٹ سے پھر گئے۔
آپ کو یاد ہوگا 1999ء میں بھارتی وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی نے لاہور میں مینار پاکستان پر کھڑے ہو کر پاکستان کی تاریخی حقیقت کو تسلیم کیا اور وعدہ کیا تھا کہ انڈیا کشمیر سمیت تمام مسائل گفت و شنید سے حل کرے گا، لیکن جونہی وہ پاکستان سے امرتسر پہنچے، چانکیائی سیاست نے اپنا اثر دکھایا اور وہ دنیا کو یہ کہتے نظر آئے کہ "کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے۔" درحقیقت یہی بھارت کی اصل پالیسی ہے، وہ جو اعلان کرتا ہے، اُس سے بھاگ جاتا ہے، وہ جو وعدہ کرتا ہے، اُس سے مکر جاتا ہے اور وہ جو معاہدے کرتا ہے، اُسے خود ہی توڑ دیتا ہے، 62 سالہ تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات بھارت کی دوغلی پالیسی کے آئینہ دار ہیں جو بھارتی ہٹ دھرمی کے باعث نشستند، گفتند و برخاستند سے کبھی آگے نہ بڑھ سکے۔
گذشتہ دنوں پندرہ ماہ کے تعطل کے بعد بھارتی خواہش پر سیکرٹری خارجہ کی سطح پر ہونے والے مذاکرات میں ناکامی کے بعد ایک مرتبہ پھر بھارتی وزیر اعظم

منموہن سنگھ نے مذاکرات کا راگ الاپا، اپنے سرکاری دورہ سعودی عرب کے دوران ریاض میں ایک سعودی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ پاکستان کے ساتھ دہشت گردی سمیت تمام تنازعات اور مسائل پر بات چیت ہوگی، انہوں نے کہا کہ وہ مذاکرات ہی کو پاکستان بھارت تنازعات کے حل کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور اس بارے میں ان کے مؤقف میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، دوسری جانب بھارتی وزیر مملکت برائے امور خارجہ ششی تھرور نے ریاض میں اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ پاک بھارت تعلقات بہتر بنانے میں سعودی عرب رابطے کا کردار ادا کرسکتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ سعودی عرب کو بھارتی مسائل کا احساس ہے، یہاں یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ گذشتہ دنوں سیکرٹری خارجہ مذاکرات کے موقع پر بھارتی وزیراعظم منموہن سنگھ نے برملا کہا تھا کہ اگر پاکستان دہشت گردی کے علاوہ کسی اور موضوع پر مذاکرات کا ارادہ رکھتا ہے تو اسکے وفد کو بھارت آنے سے روک دیا جائے۔

عجب طرفہ تماشہ ہے کہ ممبئی حملوں کو بہانہ بنا کر بھارت نے نئی دہلی میں جاری دوطرفہ مذاکرات کی بساط بھی خود ہی لپیٹی پھر گزشتہ ماہ کے دوسرے ہفتے میں خود ہی پاکستان کو خارجہ سیکرٹریوں کی سطح پر دوبارہ مذاکرات کی دعوت دی، ان مذاکرات کیلئے شیڈول بھی خود ہی تیار کیا اور جب مذاکرات کیلئے سیکرٹری خارجہ سلمان بشیر کی زیر قیادت پاکستان کا وفد نئی دہلی پہنچا تو

بھارت جامع مذاکرات کے لفظ سے ہی بدک گیا اور ان مذاکرات کو محض بات چیت کا نام دے کر ممبئی سے پونا تک کی مبینہ دہشت گردی کا ملبہ نہ صرف پاکستان کے سر ڈالنے کی کوشش کی بلکہ کشمیر اور پانی جیسے اہم بنیادی تنازعات پر بات کرنا بھی گوارہ نہ کیا، لیکن آج بھارتی وزیراعظم سعودی عرب پہنچ کر پاک بھارت تنازعات کے حل کیلئے پھر دوطرفہ مذاکرات کا راگ الاپ رہے ہیں، جسے بھارت کی منافقانہ روش کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا، واضح رہے کہ گذشتہ دنوں بھارتی وزیر خارجہ ایس ایم کرشنا نے پاکستان کے سیکرٹری خارجہ سلمان بشیر سے ملاقات کے دوران باور کرایا تھا کہ پاکستان اور بھارت کے مابین فوری طور پر جامع مذاکرات نہیں ہو سکتے، لیکن ابھی بھارتی ذمہ داران کے بیانات کی سیاہی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ ایک بار پھر بھارتی وزیراعظم پاکستان کے ساتھ تمام تنازعات پر مذاکرات کی بات کر رہے ہیں۔

جبکہ گذشتہ ماہ ہونے والے مذاکرات کے حوالے سے یہ حقیقت اب کھل کر سامنے آچکی ہے کہ بھارت نے امریکی دباؤ پر پاکستان کو خارجہ سیکرٹریوں کی سطح پر مذاکرات کی دعوت دی تھی، جسے افغانستان میں بھارت کے خصوصی کردار کی ضرورت ہے، دراصل امریکا بھارت کے ذریعے پاکستان کو مذاکرات میں الجھا کر بھارت کے معاندانہ عزائم سے غافل رکھنا چاہتا ہے، دوسری طرف بھارت کا خارجہ سیکرٹریوں کی سطح پر مذاکرات کی دعوت کا مقصد امریکہ کو یہ تاثر دینا تھا کہ وہ

پاکستان کے ساتھ تنازعات کے حل کیلئے مذاکرات کی میز پر بیٹھنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مذاکرات کا دروازہ ہمیشہ بھارت کی جانب سے ہی بند کیا جاتا رہا،آج اگر وہ مذاکرات کی بات کرتا ہے تو صرف دہشت گردی کے معاملہ میں ہمیں ڈکٹیشن دینے کیلئے کرتا ہے، حالانکہ پاکستان اور بھارت کے مابین کشمیر اور بھارت کی آبی دہشت گردی اصل تنازعہ ہے، جبکہ سیاچن، سر کریک جیسے کئی اہم مسائل بھی موجود ہیں، جن کے حل کے بغیر نہ تو علاقائی اور عالمی امن کی ضمانت دی جا سکتی ہے اور نہ ہی پاکستان اور بھارت کے مابین خوشگوار دوستانہ تعلقات قائم ہو سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بھارت پاکستان کو مذاکرات کی پیشکش کے باوجود متنازعہ امور ومسائل پر بات کرنے کو تیار نہیں، جبکہ پاکستان اور بھارت کے درمیان 62 برسوں میں 131 بے نتیجہ مذاکراتی دور کی تاریخ اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ بھارتی قیادت کو خطے میں امن کے قیام سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، بھارت کے اسی طرز عمل کی وجہ سے پاکستان اور بھارت کے درمیان مذاکرات کی تاریخ پر نظر رکھنے والے تجزیہ نگار اور سیاسی مبصرین کے نزدیک مذاکرات کے نتیجہ خیز ہونے کی کوئی امید نہیں، آج بھارت کا کوئی پڑوسی ملک ایسا نہیں ہے جس سے اس کا تنازع نہ ہو، دنیا کی مضبوط اقتصادی قوت چین سے لے کر خطے کے انتہائی کمزور ملک بھوٹان اور نیپال تک سب کے تعلقات بھارت کے ساتھ کشیدہ ہی رہے

ہیں،اب رہی سہی کسر بھارت کے علاقائی طاقت بننے کے جنون نے پوری کردی ہے جس کی وجہ سے پورے جنوبی ایشیا کا امن و سکون خطرے میں دکھائی دے رہا ہے۔

اس تناظر میں پاکستان اور بھارت کے درمیان جامع مذاکرات کے آغاز اور اس کی کامیابی کا دار و مدار صرف اور صرف بھارتی رویئے پر منحصر ہے،جب تک بھارت کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ قرار دیتا رہے گا اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کی روشنی میں کشمیری عوام کو استصواب رائے کا حق دینے پر آمادہ نہیں ہوگا،اس وقت تک کی مذاکرات کی ہر پیش کش مکر و دجل پر مبنی اور اخلاص سے عاری ہوگی،گذشتہ دنوں بھارت نے امریکہ کو یہ یقین دلانے کیلئے کہ ہم تو پاکستان کے ساتھ تمام معاملات پر مذاکرات کیلئے تیار ہیں، اس نے خارجہ سیکرٹریوں کی سطح پر مذاکرات کا ڈرامہ رچا کر خود ہی اُسے سبوتاژ کیا اور اب وہ ہمارے۔برادر اسلامی ملک سعودی عرب کو یہ چکمہ دینے کی کوشش کر رہا ہے کہ ہم دہشت گردی سمیت پاکستان کے ساتھ تمام مسائل پر مذاکرات کیلئے تیار ہیں، سوال یہ ہے کہ کیا بھارت ایسی شاطرانہ چالوں سے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتا ہے جبکہ عالمی۔برادری بالخصوص مسلم ممالک اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ پاکستان اس وقت امریکہ،اسرائیل اور بھارت کی دہکائی ہوئی دہشت گردی کی آگ میں جل رہا ہے،ان ممالک کی ایماء پر تربیت یافتہ دہشت گرد افغانستان کے راستے پاکستان میں داخل ہو کر دہشت گردی کی گھناؤنی وارداتیں کرتے ہیں اور

جس کی بنیاد پر یہ ممالک ہم پر دہشت گردی فروغ دینے کا الزام لگاتے ہیں۔
ایک طرف بھارت جہاں پاکستان کے خلاف تخریبی سرگرمیوں میں مصروف ہے وہیں دوسری طرف اس نے ہمیں بھوکا پیاسا مارنے کیلئے ہمارے خلاف آبی دہشت گردی بھی شروع کررکھی ہے، کبھی وہ دریائے چناب کا پانی بند کردیتا ہے تو کبھی دریائے جہلم کا پانی روک کر ہماری زرخیز دھرتی کو ریگستان میں تبدیل کرنے کی مذموم سازشوں میں مصروف نظر آتا ہے، بھارت کی ان سازشوں کے نتیجہ میں ہمارے کھیتوں کو سیراب کرنے والی تمام نہریں اور نالے خشک ہو چکے ہیں،آج پاکستان کی سلامتی اور استحکام کو سب سے بڑا خطرہ پانی کی کمی کی صورت میں لاحق ہے، دراصل بھارت آبی دہشت گردی کے ذریعے پاکستان کو بنجر بنا دینا چاہتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ مکار ہندو بنیے سے پاکستان کا وجود کبھی برداشت نہیں ہوا اور اس نے اپنی مکروہ سازشوں کے ذریعے پاکستان کو نقصان پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی،امر واقعہ یہ ہے کہ ایک طرف بھارت ہماری سالمیت کو نقصان پہنچانے کی سازشوں میں مصروف ہے تو دوسری طرف وہ اپنی جنگی تیاریوں میں بدستور اضافہ بھی کررہا ہے، جس کا بین ثبوت بھارت کے دفاعی بجٹ میں حالیہ 24 فیصد اضافہ ہے، جس نے اسے پوری دنیا میں فوجی اخراجات کا چوتھا بڑا بجٹ بنادیا ہے، چنانچہ ان حقائق کی موجودگی میں بھارت امریکہ، سعودی عرب یا کسی اور ملک کو پاک بھارت تنازعات کو حل کرانے کیلئے بطور ثالث کیسے قائل

کر سکتا ہے۔

لہذا ان عوامل کی روشنی میں ضرورت اس امر کی ہے کہ بھارت کشمیر سمیت پاکستان کے ساتھ تمام تنازعات کے حل کیلئے نیک نیتی کے ساتھ برداشت اور اخلاص کا راستہ اختیار کرے، لیکن جب تک وہ کشمیر پر بزور طاقت اپنا تسلط جمائے رکھنے کی پالیسی اور کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ قرار دینے کی ضد پر قائم رہے گا،اس وقت تک نہ تو خطے میں امن کی آشا پوری ہو سکتی ہے اور نہ ہی علاقائی امن کی ضمانت فراہم کی جا سکتی ہے، چنانچہ آج اگر بھارت پاکستان کے ساتھ دوطرفہ تعلقات بہتر بنانا چاہتا ہے اور علاقائی و عالمی امن کا خواہاں ہے تو اسے اپنی ضداور ہٹ دھرمی ترک کرکے اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق کشمیر میں استصواب رائے اور کشمیریوں کو حق خودارادیت دینے اور آبی دہشت گردی سمیت تمام متنازعہ مسائل کو حل کرنے اور کھلے دل کے ساتھ پاکستان کے وجود کو تسلیم کرنا ہوگا اور یہ تب تک ممکن نہیں،جب تک کہ بھارت مکروفریب، منافقت، دغا اور چالبازی پر مبنی چانکیائی سیاست کے دائرے سے باہر نہیں نکلتا،جس کے فی الحال دور دور تک کوئی آثار نظر نہیں آتے۔لہذا موجودہ حالات میں بھارتی وزیراعظم کا سعودی عرب کو ثالث بناکر پاکستان کے ساتھ مذاکرات کا نیا راگ،دنیا کو دھوکہ دینے کی ایک نئی کوشش اور ماضی کی طرح بے معنی،بے نتیجہ اور بے مقصد مذاکرات کاڈرامہ رچانے کی سعی کے سوااور کچھ

نہیں۔

بے چارگی کی صلیب پر لٹکی خلقِ خدا اور گا، گی، گے کا راگ

حکمران کب تک گا، گی اور گے کے راگ الاپتے رہیں گے

ابھی ہم وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کے خوش کن بیان "مشکلات کے دو سال گزر گئے، آئندہ تین برسوں میں عوام کو ریلیف دیں گے۔" کی لذت اور چاشنی سے پوری طرح لطف اندوز بھی نہ ہونے پائے تھے کہ اخبار کی دوسری سرخی "بجلی کے نرخوں میں ایک روپیہ دو پیسے فی یونٹ کا اضافہ کر دیا گیا۔" نے ہمیں اپنی جانب متوجہ کر لیا، ستم ظریفی دیکھئے کہ دونوں خبریں ایک ہی روز قومی اخبارات کے فرنٹ پیج کی زینت بنی، ایک طرف وزیر اعظم کی جانب سے عوام کیلئے ریلیف کا وعدہ، تو دوسری طرف بجلی کے نرخوں میں مزید اضافہ، درحقیقت وزیر اعظم کے عوام کو ریلیف دینے کے مؤثر عزم کا حقیقی اور عملی اظہار کر رہا تھا، یوں وزیر اعظم نے اپنی حکومت کی دو سالہ کارکردگی کو عوام کی نظروں میں لانے کیلئے جس مہم کا آغاز ریڈیو پر خطاب کے ذریعے کیا تھا، وہ ابھی چوبیس گھنٹے بھی پرانی نہیں ہونے پائی تھی کہ بجلی کے نرخوں میں اضافے کی خبر نے عوام سے براہ راست رابطے اور اعتماد سازی کی مہم کے مستقبل اور حکومت کی جانب سے عوامی ریلیف کے وعدوں کی اصل حقیقت کو آشکارا کر دیا۔

ایسا پہلی بار تو نہیں ہوا، نہ ہی موجودہ حکومت پاکستان کی تاریخ کی کوئی پہلی حکومت ہے جس نے ایسا پہلی بار کیا ہو، ریکارڈ گواہ ہے کہ ہر حکومت نے عوام کے مسائل حل کرنے کے وعدے کئے، انہیں روٹی کپڑا اور مکان فراہم کرنے کے دعوئے کئے، مہنگائی ختم کرنے کی نویدیں سنائیں، نئے ذرائع روزگار پیدا کرنے کے منصوبے بنائے اور غربت کے خاتمے کے سبز باغ دکھائے، لیکن ہماری 62 سالہ تاریخ گواہ ہے کہ عوام کو "گا"، "گی" اور "گے" سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوا، ہر حکومت انہی راگوں کے ذریعے سادہ لوح عوام کو بے وقوف بناتی رہی اور لوگوں کے جذبات و خواہشات سے کھیلتی رہی، ہمیشہ حکومتی ذمہ داران نے کہا کچھ اور کرا کچھ، چنانچہ موجودہ حکومت نے بھی یہی کام کیا، آپ کو یاد ہوگا کہ وزیر اعظم نے اپنی پہلی تقریر میں وعدہ کیا تھا کہ وہ کنکریٹ لسٹ کا خاتمہ کریں گے، بے روزگاری کے خاتمے کیلئے ایمپلائمنٹ کمیشن بنائیں گے، مدرسہ ویلفیئر اتھارٹی قائم کریں گے، طلبہ یونین سے پابندی اٹھائیں گے، بلوچستان میں کشیدگی کے خاتمے کیلئے کمیشن بنائیں گے، قبائلی علاقوں کیلئے خصوصی پیکج دیں گے، مفاہمتی کمیشن بنائیں گے، بائیس سو میگاواٹ کے نئے یونٹ لگائیں گے، ایک کروڑ انرجی سیور تقسیم کریں گے، چھوٹے ڈیم بنائیں گے، وزراء سولہ سی سی کی گاڑیاں استعمال کریں گے، کابینہ کا سائز چھوٹا کرکے قومی خزانے پر بوجھ کم کریں گے، فصلوں کی انشورنس اسکیم شروع کریں گے، کسانوں کو

کم نرخ پر بیج فراہم کریں گے۔

لیکن ماسوائے چند ایک کے ان میں سے کتنے ہی وعدے ایسے ہیں جو آج بھی ہواؤں میں معلق ہیں، نہ بے روزگاری کا خاتمہ ہوسکا، نہ ہی بلوچستان میں کشیدگی کم ہوئی، نہ بجلی کی پیداوار کیلئے نئے یونٹس لگائے گئے، نہ ہی لوڈ شیڈنگ کا خاتمہ ہوسکا، نہ انرجی سیور کی تقسیم کئے جاسکے، نہ ہی وزراء نے سولہ سو سی سی کی گاڑیاں استعمال کیں، نہ چھوٹی کابینہ بنی، نہ ہی ڈیم بنائے جاسکے، نہ فصلوں کی انشورنس اسکیم شروع کی گئی، نہ ہی کسانوں کو کم قیمت پر بیج فراہم کئے جاسکے اور نہ ہی مہنگائی ختم ہوسکی، حال یہ ہے کہ آج مہنگائی آسمان کو چھورہی ہے، کئی کئی گھنٹوں کی لوڈ شیڈنگ جاری ہے، بے روزگاری کی شرح میں خطرناک حد تک اضافہ ہوچکا ہے، ہزاروں کارخانے بند پڑے ہیں، پورا ملک دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے، سرمایہ کاری رک چکی ہے اور گلی گلی حکومتی رٹ چیلنج ہورہی ہے، لیکن اس کے باوجود بھی حکومت گا، گی، گے کے راگ الاپ کر عوام کو بے وقوف بنانے کی کوشش کررہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ جمہوری حکومت کو اقتدار میں آئے دو سال کا عرصہ گزر چکا ہے، عوام کو توقع تھی کہ موجودہ حکومت خود انحصاری کی پالیسیاں اپنائے گی اور ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرکے لوگوں کی زندگیوں میں آسانیاں

پیدا کرنے کیلئے ٹھوس اقدامات کرے گی، مگر بدقسمتی سے یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا، اس وقت پاکستان میں بڑھتی ہوئی غربت اور مہنگائی کا مسئلہ ایک خوفناک عفریت کی شکل اختیار کر چکا ہے، محکمہ شماریات کے اعداد و شمار کے مطابق موجودہ حکومت کے دور میں اشیاء خورد و نوش کی قیمتوں میں 250 سے 300 فیصد تک اضافہ ہوا ہے، جبکہ غیر سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پاکستان کے پندرہ کروڑ انسان مفلوک الحالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، جبکہ حکومت جامع معاشی منصوبہ بندی وضع کرنے کے حوالے سے مکمل طور پر ناکام نظر آتی ہیں، جس کے باعث معاشرے کے اندر معاشی طوائف الملوکی پھیل چکی ہے، پورے ملک میں اشیائے صرف کی قیمتوں کو کنٹرول کرنے کا نظام ناپید ہے، پڑھے لکھے بے روزگار نوجوانوں کی اکثریت نامعلوم اندھی منزل کی طرف گامزن ہے، جبکہ دوسری طرف ایوان اقتدار میں عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے والے نمائندے عوام کی بات کرتے ہیں، حکومت بھی عوامی ریلیف کا دعویٰ کرتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آمریت کے خاتمے کے بعد عوامی منشا کے مظہر ایوان میں آج تک عوام کے حقیقی اور بنیادی مسائل کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی ہے، بلکہ اگر یہاں یہ کہا جائے تو قطعاً بے جا نہ ہوگا کہ ہمارا ایوان نمائندگان محض ایک دکھاوے کا ایک ایسا فورم بن چکا ہے جہاں پاکستانی سماج کی استحصالی قوتیں ہر دم عوام سے ایک نئے دھوکے اور دکھاوے کو دوام بخشنے کے لئے الفاظوں کے گورکھ دھندے سے کھیلتی ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ گزشتہ دو سالوں میں مہنگائی تین سو فیصد تک بڑھی، جبکہ ان دو سالوں میں کئی عدالتی و سیاسی بحران بھی آئے اور حکومتی پسپائیوں کے تمام سابقہ ریکارڈ ٹوٹ گئے،اس دوران حکومت نے تمام عرصہ بحران پیدا کرنے اور پھر اس کے خاتمے کی مشق جاری رکھی اور عوام کے مسائل کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا، جس کی وجہ سے اب معیشت ایک ایسے مقام پر جاکھڑی ہوئی ہے کہ عام آدمی کا جینا دوبھر ہوگیا ہے، سترہ کروڑ عوام بھوک غربت مہنگائی اور بے روزگاری کی چکی میں پس رہے ہیں، مگر عوامی نمائندے اس حوالے سے عملی اقدامات کرنے کے بجائے سینٹ اور قومی اسمبلی میں بحثیں اور تقریریں کر رہے ہیں، طرفہ تماشہ دیکھئے کہ عوام کے ووٹ سے منتخب ہونے والے سیاستدان اچھی طرح جانتے ہیں کہ لوگ بھوک سے بلک رہے ہیں، مہنگائی نے عام آدمی کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے، لیکن وہ صدائے احتجاج بلند نہیں کرتے، عوامی حقوق کی لڑائی نہیں لڑتے، اُن کیلئے سڑکوں پر نہیں آتے، بھوک ہڑتال نہیں کرتے، نہ جانے کتنے غریب اور مفلوک الحال لوگ بھوک سے ایڑیاں رگڑ رہے ہیں، مگر یہ رہبران قوم، نام نہاد رہنما اور خود ساختہ مسیحاؤں کو اپنے مفادات کے تحفظ سوا کسی کی فکر نہیں، یہ تو صرف منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے قومی اسمبلی اور سینٹ میں غربت، بھوک اور مہنگائی پر بحثیں کرتے ہیں۔

پاکستانی عوام مسلسل 62 سالوں سے سیاست دانوں کی شعبدہ بازیاں دیکھتی چلی آرہی ہے، 18فروری کے الیکشن کے بعد قوم کو پیپلز پارٹی سے امید تھی کہ ایک عوامی جماعت ہونے کے ناطے وہ ان کی پریشانیوں اور دکھوں کا مداوا کرے گی، مگر ہر آنے والے دن کے ساتھ یہ امیدیں بھی معدوم ہوتی جارہی ہیں، بے روزگاری، مہنگائی، بجلی، سوئی گیس کے بحران نے عوام کو ہلکان کرکے رکھ دیا ہے، گو کہ وزیراعظم سید یوسف رضا گیلانی عوام کو زندگی کی بنیادی سہولتیں فراہم کرنے کی وقتاً فوقتاً یقین دہانی کراتے رہے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ دور دور تک اس کی کوئی عملی تصویر نظر نہیں آتی، جبکہ دوسری طرف حکمران طبقہ کی شاہ خرچیاں دن بدن بڑھتی جارہی ہیں، عوام نے آمریت کے خلاف، جمہوریت کی بحالی کیلئے قربانیاں اس لئے دی تھیں کہ ان کی زندگیوں میں آسانیاں پیدا ہونگی، مہنگائی، بے روزگاری اور غربت سے نجات ملے گی، جان و مال کا تحفظ حاصل ہوگا، لیکن جمہوری حکومت کے دور میں سب کچھ اس کے برعکس ہو رہا ہے، ایک طرف دہشت گردی اور غیر ملکی مداخلت کا عفریت عوام کو نگل رہا ہے تو دوسری طرف مہنگائی اور بے روزگاری کا طوفان عوام سے جینے کی امنگیں چھین رہا ہے، مہنگائی کی ستائی ہوئی بے حال عوام خودکشیاں کرنے پر مجبور ہے، جبکہ پر تعیش رہائش گاہوں، بڑے بڑے بنگلوں اور سرکاری خرچ پر زندگی کی ہر سہولت سے لطف اندوز ہونے والے ارباب اقتدار جن کی اپنی اولادیں یورپ اور امریکہ کے مہنگے ترین تعلیمی اداروں میں پڑھ رہی ہیں، عوام کو

مزید قربانی، صبر اور برداشت کی تلقین کر رہے ہیں۔

گزشتہ دنوں وزیراعظم سے جب یہ سوال کیا گیا کہ ملک کا مسئلہ نمبر ایک کیا ہے، تو انہوں نے فرمایا لا اینڈ آرڈر، دہشت گردی اور لاقانونیت ختم ہو جائے گی تو مہنگائی بھی کم ہو جائے گی، یہ کتنی عجیب بات ہے کہ حکومت نے جن جیالوں کو نوکریوں پر بحال کیا، انہیں کئی سالوں کے واجبات بھی ادا کئے، اس وقت تو ان سے یہ نہیں کہا گیا کہ جب دہشت گردی ختم ہوگی تب تمہیں نوکریوں پر بحال کیا جائے گا، نہ ہی حکومت نے اپنے وزیروں اور مشیروں کی تعداد گھٹائی گئی، نہ ہی اپنے بیرونی دورے کم کیے، دو سال کے دوران حکومت کے کسی عمل سے ایسا نہیں لگا کہ وہ اپنے اخراجات کم کرکے قومی خزانے کو بچانا چاہتی ہے، نہ ہی سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں اضافہ کرتے وقت یہ عذر پیش کیا گیا کہ دہشت گردی ختم ہوگی تو تنخواہیں بڑھائی جائیں گی، آج بھی صدر، وزیر اعظم، وزیروں، مشیروں اور بیوروکریٹوں کے تو وہی ٹھاٹ باٹ ہیں، قوم کو پینے کیلئے گندا پانی بھی دستیاب نہیں، لیکن یہ خود باہر سے منگوائے ہوئے منرل واٹر سے اپنی پیاس بجھا رہے ہیں، آج ایک غریب آدمی کو سرکاری ہسپتال سے معمولی دوا بھی نہیں ملتی لیکن ایم این اے، سینٹر، وزیروں اور مشیروں کو بیرون ملک علاج کرانے کی سہولت میسر ہے۔

چنانچہ ان عوامل کی روشنی میں ہم وزیر اعظم سے سوال کرتے ہیں کہ دہشت گردی کی وجہ سے جو مہنگائی بڑھی طبقہ اشرافیہ کے کتنے لوگ اس کی زد میں آئے اور کتنوں کی طرز زندگی میں تبدیلی واقع ہوئی؟ کتنے لوگوں نے اپنے بچوں کو مہنگے اسکولوں سے ہٹا کر عام اسکولوں میں داخل کرا دیا، کتنے لوگوں نے لگژری گاڑیوں کا استعمال چھوڑ کر پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر شروع کر دیا اور کتنے لوگوں نے ون ڈش پر گزارہ کرنا شروع کر دیا، آج محترم وزیر اعظم مہنگائی کے خاتمے کو دہشت گردی کے خاتمے سے مشروط کر رہے ہیں، گویا اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ اگر دہشت گردی مزید کچھ سال چلتی رہی تو مہنگائی بھی بڑھتی رہے گی، اس اعتبار سے اگلے دو تین سالوں میں مزید دو تین سو فیصد تک اضافہ ہوگا، جس کی وجہ سے پیدا ہونے والے حالات کی تصویر بتا رہی کہ لوگ

بھوک و افلاس اور بے روزگاری کے ہاتھوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مریں گے یا پھر حالات انہیں کسی خونی انقلاب کے راستے پر لے جائیں، ایسی صورت میں نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری اور عوام کا سیلابی ریلا خس و خاشاک کی طرح سب کچھ بہا کر لے جائے گا، لہٰذا موجودہ حکومت جو کہ روٹی، کپڑا اور مکان کی فراہمی کے نعرے پر وجود میں آئی ہے کی بنیادی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اپنے نعرے کو حقیقی رنگ دینے کیلئے عوام دشمن فیصلوں سے اجتناب کرتے ہوئے غریب عوام کو ریلیف فراہم کرنے کے بروقت انقلابی اقدامات کرے اور ایسی پالیسیاں وضع کرے جس سے مہنگائی کی پسی ہوئی عوام سکھ کا سانس لے سکے اور اس کے احساس محرومی

کا خاتمہ ہو سکے۔

ہماری ارباب اقتدار سے گزارش ہے کہ وہ اپنی پارٹی کے بانی شہید ذوالفقار علی بھٹو کے اس قول کا ضرور مطالعہ کریں جو انہوں نے 1974ء میں شہداد کوٹ جیسے ایک پسماندہ قصبے میں حکومت کی جانب سے مل لگانے کی اُس سرکاری فائل پر لکھا تھا جس کے فیزیبلٹی رپورٹ پر ڈپٹی سیکرٹری، جوائنٹ سیکرٹری، ایڈیشنل سیکرٹری اور سیکرٹری سمیت تمام بیوروکریٹس نے زمینی حقائق پر توجہ دینے کی گزارش کرتے ہوئے اس منصوبے کو غیر مناسب قرار دیا تھا، لیکن بھٹو صاحب کا کہنا تھا کہ "سیاست کی سب سے بڑی گراؤنڈ ریالٹی عوام ہوتے ہیں، یہ مل شہداد کوٹ کے عوام کی ضرورت ہے اور میں نے شہداد کوٹ کی عوام سے اس مل کا وعدہ کیا ہے، اگر میں ایک عوامی لیڈر ہوں تو مجھے اس ڈیمانڈ کو تسلیم کرنا چاہیے اور اس وعدے سے بھاگنا نہیں چاہیے۔" اس کے بعد بھٹو صاحب اُس فائل پر موجود تمام کمنٹس کو رد کرتے ہوئے ولیم شیکسپیئر کا ایک قول "میرا اصلی فخر میرا وعدہ ہے، میرے وعدوں نے مجھے ایک ساکھ دی ہے اور یہ ساکھ ہی میرا خزانہ ہے۔" لکھ کر حکم دیا کہ یہ مل ہر صورت میں لگنی چاہیے۔

قارئین محترم حقیقت یہی ہے کہ دنیا کے تمام بڑے اور عظیم سیاسی لیڈروں کا فخر، شناخت، ساکھ اور خزانہ اُن کے وہ وعدے ہوتے ہیں جو وہ اپنے عوام سے

پورے کرتے ہیں اور جس کی وجہ عوام انہیں اپنے دلوں میں ہمیشہ کیلئے امر کر لیتے ہیں،
محترم وزیر اعظم اور جناب صدر مملکت ابھی بھی وقت ہے آپ اگر عوام کے دلوں میں
زندہ رہنا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کو ہمیشہ یاد رکھیں تو عوام سے کئے گئے
اپنے وعدوں کو پاس کریں، یاد رکھیں جو حکمران اپنے وعدوں کا پاس نہیں کرتے عوام
انہیں حرف غلط کی طرح صفحہ وقت سے مٹا دیتے ہیں۔

عزت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں۔۔۔۔

شرمناک امریکی اسکرینیگ نظام اور غیرت ملیّ کے تقاضے

وہ ایک بہت ہی ظالم و جابر اور سفاک قبائلی سردار تھا، اُس کے سپاہی انتہائی دلیر اور بہادر تھے، ایک مرتبہ اُس نے سلطنت مغلیہ کے مرکز دہلی پر حملہ کیا، جس میں اُس کے ہاتھ بہت سا مال غنیمت آیا اور کئی مغل شہزادے اور شہزادیاں بھی قید ہوئیں، مال غنیمت اور مغل شہزادے، شہزادیوں کے ہاتھ آنے کی خوشی میں اُس نے ایک محفل طرب کا انتظام کیا اور قیدی مغل شہزادیوں کو اِس محفل میں رقص کرنے کا حکم دیا، جان بچانے کیلئے خوف زدہ شہزادیوں نے جب اُس کے سامنے ناچنا شروع کیا تو اُس نے اپنا خنجر نیام سے نکال کر سامنے رکھدیا اور خود اِس طرح آنکھیں بند کرلیں جیسے اُسے نیند آگئی ہے اور وہ سو رہا ہو، محفل طرب چلتی رہی اور مغل شہزادیاں رقص کرتی رہیں، جب کافی دیر گزر گئی تو اس نے آنکھیں کھولیں اور مغل شہزادیوں سے مخاطب ہو کر بولا، میں سویا نہیں تھا بلکہ میں نے جان بوجھ کر اسلئے آنکھیں بند کی تھیں کہ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ مغلیہ خاندان میں کتنی غیرت و حمیت باقی رہ گئی ہے؟ اگر تم میں ذرا سی بھی غیرت ہوتی تو ناچتے ہوئے سامنے پڑا ہوا میرا خنجر

اٹھاتی اور مجھ پر حملہ کر دیتی، مگر افسوس کہ تم نے یہ دیکھ کر بھی کہ میں تمہاری طرف سے بے خبر آنکھیں بند کئے سو رہا ہوں، اسی طرح ناچتی رہیں، اِس صورتحال کو دیکھ کر میں اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ بالکل صحیح اور درست ہے کیونکہ جو لوگ اپنی غیرت و حمیت کو چھوڑ دیتے ہیں وقت انہیں اِسی طرح ذلیل و رسوا کرتا ہے اور اُن کے ساتھ یہی سب کچھ ہوتا ہے۔اِس کے بعد اُس نے کہا "حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے "قبائلی سردار غلام قادر روہیلہ کا یہ فقرہ اُس کے ساتھ آج بھی تاریخ میں زندہ اور ہمارے موجودہ حالات کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔

قارئین محترم دنیا میں زندہ رہنے کے دو ہی طریقے ہیں، ایک عزت و قار اور قومی غیرت و حمیت کے ساتھ سر اٹھا کر زندہ رہا جائے، دوسرے اپنی غیرت و حمیت کا سودا کرکے ذلت و رسوائی کا راستہ اختیار کیا جائے، جو لوگ دنیاوی مفادات کی خاطر اپنی غیرت و حمیت اور قومی مفادات کا سودا کر لیتے ہیں، تاریخ گواہ ہے کہ ذلت و رسوائی اُن کا مقدر ٹھہرتی ہے لیکن جن کی غیرت و حمیت زندہ ہوتی ہے وقت اُن کی قسمت میں عزت و وقار اور سرخروئی لکھتا ہے، ہمارے نزدیک فاٹا سے تعلق رکھنے والا نو رکنی پارلیمانی وفد اِس لحاظ سے قابل عزت اور لائق احترام ہے کہ اُس نے شرمناک امریکی اسکیننگ نظام کو مسترد کرکے جس طرح قومی غیرت کا ثبوت دیا ہے وہ لائق تحسین ہے، اِس وفد نے

سینیٹر عباس آفریدی کی قیادت میں امریکہ کے جان ایف کینڈی ایئرپورٹ پر اسکیننگ کرانے سے انکار اور احتجاجاً دورہ منسوخ کرکے جس حمیت کا اظہار کیا، اُس نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ آج بھی ہماری قومی غیرت و حمیت زندہ ہے۔ آج اُن کے اِس عمل نے جہاں ایک طرف امریکہ کو واضح پیغام دیا ہے کہ وہ ایک آزاد اور خود مختار ملک کے باوقار شہری ہیں، وہیں دوسری طرف پاکستانی حکمرانوں کو بھی یہ باور کرادیا ہے کہ قومی غیرت و حمیت سے بڑھ کر کوئی چیز اہم نہیں، آج فاٹا کے پارلیمانی اراکین نے اپنے عمل سے نہ صرف قومی غیرت کا عملی ثبوت پیش کیا ہے بلکہ اُن کا یہ طرز عمل تمام حکمرانوں اور سیاستدانوں کیلئے بھی مشعل راہ ہے اور اس بات کا متقاضی ہے کہ آئندہ ہمارے دیگر اراکین پارلیمنٹ، وزراء اور حکمران طبقہ اِس شرمناک امریکی اسکیننگ نظام کو مسترد کرکے قومی غیرت کا ثبوت دیں گے۔

خدا کرے کہ کاش ایسا ہی ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی بہت ہی کم امید ہے کیونکہ آج بھی ہمارے ملک میں ایک ایسا بااثر طبقہ موجود ہے جو اس قسم کی غیرت کا مظاہرہ کرنے والوں کو بے وقوف، جاہل اور قدامت پسند خیال کرتا ہے، اُن پر تنقید کرتا ہے اور طنز کے نشتر برساتا ہے، درحقیقت یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے امریکہ کو اپنا اَن داتا بنا رکھا ہے، یہ لوگ قوم کو یہ کہہ کر ڈرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر ہم نے امریکہ کے سامنے قومی غیرت ملیؔ

واسلامی کا مظاہرہ کیا تو تباہی و بربادی ہمارا مقدر ہوگی، امریکہ ہمیں تورا بورا بنا دے گا، وہ ہماری امداد بند کر دے گا، ہم بھوکے مرجائیں گے۔ لیکن اگر اُن سے یہ سوال کیا جائے کہ خود سپردگی اور بے غیرتی کا مظاہرہ کس قدر کیا جائے اور کس حد تک امریکی کاسہ لیسی میں اُس کے آگے جھکا اور بچھا جائے تو اس سوال کا اُن کے پاس نہیں ہوتا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید اُن کے نزدیک اِس کی کوئی حد متعین نہیں ہے۔

ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ امریکہ وہ ملک ہے جہاں باڈی اسکریننگ کے نئے سلسلہ کے آغاز سے پہلے بھی پاکستان سے جانے والے انتہائی معزز افراد کے کپڑے اور جوتے تک اتروا لیے جاتے تھے مگر اُن کی پیشانی پر بل تک نہ آتا تھا، امریکی ایئرپورٹ پر توہین اور ذلت کی اِس سے بڑی شرمناک مثال اور کیا ہوگی کہ جنرل پرویز کے ترجمان اور حاضر سروس میجر جنرل راشد قریشی تک کے جوتے اور کپڑے اتروا لیے گئے لیکن مجال ہے جو کسی نے امریکی طریقہ کار پر ناراضگی اور احتجاج کیا ہو، اسی طرح پاکستان کے نامور قانون داں شریف الدین پیرزادہ کی تو ٹوپی تک اتروا کر دیکھا گیا کہ اس کے نیچے کچھ ہے تو نہیں، یہ تو اُس وقت کی بات ہے جب امریکی ائیرپورٹس پر اِس قسم کی اسکرینیگ مشینیں نہیں لگائی گئیں تھیں جن میں انسان مکمل طور پر برہنہ نظر آئے، لیکن اب تو امریکی ہوائی اڈوں پر ایسی اسکریننگ مشینیں لگا دی گئی ہیں جن میں

انسان برہنہ نظر آتا ہے۔اس عمل میں عورت اور مرد کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔
بد قسمتی سے جہاں ہمیں ماضی میں اِس قسم کی شرمناک مثالیں ملتی ہیں وہیں آج ہمیں غیرت و حمیت کی ایسی بھی نادر الوجود مثالیں دستیاب ہیں جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آج بھی ہمارے معاشرے میں ایسے افراد موجود ہیں جن کا طرز عمل "عزت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں" کا عملی مظاہرہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایسی ہی ایک مثال گزشتہ دنوں دو پاکستانی نژاد مسلمان خواتین نے قائم کی، جنھوں نے پاکستان آنے کے لیے امریکی ہوائی اڈے پر اسکریننگ کرانے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ انہوں نے ٹکٹ ضائع ہونے کی پرواکیے بغیر واپس جانا مناسب سمجھا اور بتا دیا کہ دنیا میں عزت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوتی ہے۔
چنانچہ اس تناظر میں قابل مبارکباد ہیں فاٹا کے وہ ارکان پارلیمنٹ اور وہ خواتین جنھوں نے ثابت کردیا کہ آج بھی پاکستانیوں کی غیرت ملی زندہ ہے، ہم اُس خوددار پارلیمانی وفد اور اُن خواتین کو قدرو منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جنھوں نے امریکی سکیورٹی نظام پر لعنت ڈالتے ہوئے پاکستان واپس آکر اُن لوگوں کیلئے خودداری اور غیرت مندی کی نادر مثال قائم کی ہے جنھوں نے امریکی صدر کے ایک ٹیلی فون کال پر ساری آن، بان، شان، اپنی شناخت، ساکھ، قومی وقار اور غیرت ملی کو امریکی قدموں میں نچھاور کردیا تھا، یہ زندہ مثال ہے اُن لوگوں کیلئے جو رچرڈ ہالبروک اور جیمز جون جیسے امریکی کلرکوں

کے استقبال کیلئے سرخ قالین بچھاتے ہیں، انہیں جھک جھک کر سلام کرتے ہیں، اُن کے جوتے اٹھاتے ہیں، جی حضوری کرتے ہیں اور غلاموں کی طرح اُن کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں، ان جیسے لوگوں کیلئے فاٹا کے پارلیمانی وفد کا یہ عمل نہ صرف قومی غیرت و حمیت کا عملی ثبوت ہے بلکہ ارباب اقتدار سمیت تمام سیاستدانوں کیلئے مشعل راہ اور اس بات کا متقاضی ہے کہ ہمارے وزراء، اراکین پارلیمنٹ اور ارباب اقتدار اِس شرمناک امریکی اسکیننگ نظام کو مسترد کرکے قومی غیرت کا ثبوت دیں گے، لہٰذا ہمارا حکومت سے مطالبہ ہے کہ وہ جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے پاکستانی وفد کے ساتھ اِس شرمناک امریکی طرز عمل پر امریکہ سے سخت احتجاج کرے اور اُس پر یہ بات واضح کردے کہ اگر اُس نے پاکستان کو تلاشی کے اِس شرمناک اور تضحیک آمیز نظام سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا تو پھر پاکستان بھی امریکی شہریوں کے ساتھ پاکستانی ایئرپورٹس پر ایسا ہی طریقہ اختیار کرے گا۔

ذوالفقار علی بھٹو.... تاریخ پاکستان کا ایک زندہ اور لازوال کردار

ایٹمی پاکستان کے بانی، قائدِ عوام فخر ایشیاء ذوالفقار علی بھٹو کی برسی کے موقع پر
خصوصی تحریر

یہ اپریل 1945ء کی بات ہے جب تحریک پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی ولولہ
انگیز قیادت میں اپنے بام عروج پر تھی اور مسلمانان ہند کے "لے کر رہیں گے
پاکستان بٹ کر رہے گا ہندوستان" کے نعروں سے پورا برصغیر گونج رہا تھا، بچے،
بوڑھے، جوان سب کا ایک ہی مطالبہ تھا ایک آزاد و خود مختار سرزمین کا حصول، جس
میں وہ اپنی زندگی اپنی معاشرتی روایات اور مذہبی اقدار کے مطابق بسر کرسکیں، گویا
حصول پاکستان مسلمانان برصغیر کا خواب ہی نہیں انکی جدوجہد کی حقیقی منزل بھی تھا،
اُس زمانے میں ایک طالبعلم نے اپنے محبوب لیڈر قائداعظم محمد علی جناح کو ایک خط
لکھا، جس میں اُس نے لکھا"ڈیئر سر...... صوبہ سرحد میں جو سیاسی صورتحال پیدا
ہوئی ہے، اُس نے مجھے اتنا جذباتی اور برانگیختہ کردیا ہے کہ میں اپنے قائد کو اِس کے
متعلق لکھنے کی جراٴت کررہا ہوں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج مسلمانوں کو یہ محسوس
کرلینا چاہیے کہ ہندو،بنیئے ہمارے ساتھ کبھی مخلص و متحد نہیں ہوسکتے، وہ ہمارے
قرآن اور ہمارے پیغمبر کے شدید ترین دشمن ہیں، یہ بھی اچھی طرح جان

لینا چاہیئے کہ آپ ہی ہمارے قائد اور رہنما ہیں، جناب آپ نے ہمیں ایک پلیٹ فارم اور ایک جھنڈے تلے اکٹھا کیا ہے اور ہر مسلمان کا یہی نعرہ ہے کہ "پاکستان کی طرف بڑھو، ہماری قسمت پاکستان ہے" ہماری منزل و مقصد پاکستان ہے، ہمیں آپ کی ذات میں ایک قابل رہنما مل گیا ہے، اب ہمیں کوئی بھی منزل مقصود کی طرف جانے سے نہیں روک سکتا، میں حیران ہوں کہ شیخ محمد عبداللہ اور اُن جیسے ڈاکٹر خان صاحب وغیرہ اپنے آپ کو مسلمان کیسے کہتے ہیں جب کہ انہوں نے کانگریس کی پالیسیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں، میرا دل ڈوبنے لگتا ہے جب میں مسلم لیگ کے خلاف اُن کی بیہودہ تقریریں پڑھتا ہوں، کیا وہ اتنے ہی بے خبر ہیں یا اُن کی حبّ الوطنی کا یہی تقاضہ ہے؟ ہزاروں لاکھوں عبداللہ بھی مل کر ہم کو یقین نہیں دلا سکتے کہ ہم غلطی پر ہیں، اپنا ایڑی چوٹی کا زور لگا کر بھی وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے، کیونکہ انہیں یہ احساس ہی نہیں ہے کہ ہم آپ سے کس قدر متاثر ہیں اور ہمیں آپ پر کتنا فخر ہے، ایک طالبعلم کی حیثیت سے میں ابھی اِس قابل تو نہیں ہوں کہ مادر وطن قائم کرنے کیلئے (آپ کی) کوئی مدد کر سکوں، لیکن ایک وقت ایسا آئے گا، جب میں پاکستان کیلئے اپنی جان قربان کروں گا۔"

بیس اپریل 1945ء کو سولہ سال کی عمر میں قائداعظم محمد علی جناح کو خط لکھنے والے نوجوان طالبعلم ذوالفقار علی بھٹو تھے، کس کو معلوم تھا اتنی کم

عمری میں قائد اعظم محمد علی جناح کو خط لکھ کر اپنی وفاداری اور ملک کیلئے جان دینے کے عزم کا اظہار کرنے والا طالبعلم ایک دن پاکستان کا وزیر اعظم بنے گا اور 4 اپریل 1979ء کو ایک فوجی آمر جنرل ضیاء الحق کے ہاتھوں جام شہادت نوش کرکے اپنے دور طالبعلمی کے عہد پر ایفا کی مہر ثبت کرے گا. قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو 5 جنوری 1928ء کو لاڑکانہ میں سر شاہنواز بھٹو کی دوسری بیوی خورشید بیگم کے یہاں پیدا ہوئے، جو ایک معمولی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، جاگیردارانہ پس منظر کی وجہ سے خاندان میں خورشید بیگم کو وہ عزت واحترام حاصل نہیں تھا، جس کی وہ مستحق تھیں، یہ خاندانی تفاوت ذہین وفطین بچے ذوالفقار علی بھٹو کے قلب وذہن پر گہرا انقلابی اثر مرتسم کر گیا،ایک انٹرویو میں خود بھٹو صاحب اِس بات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "میری والدہ ایک معمولی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، انہوں نے مجھے غریبوں اور مفلسوں کی تکلیفوں سے آگاہی دی،اِس کے علاوہ جب میں والد صاحب کے ساتھ دورے پر جاتا تو غریبوں کی حالت زار دیکھ کر آبدیدہ ہو جاتا، بمبئی اور سندھ کے اندرونی حصوں کی معاشی حالات میں غیر معمولی فرق تھا،اِس فرق نے افلاس کے نقوش میرے ذہن پر اور بھی گہرے کر دیئے" چنانچہ بھٹو بچپن ہی سے طبقاتی اونچ نیچ، معاشرتی ناہمواریوں اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف ہو گئے۔

وہ اپنی آخری کتاب "اگر مجھے قتل کر دیا گیا" میں اپنے بچپن کا واقعہ بیان

کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " 1935ء میں جب میری عمر سات سال تھی، میرے والد اُس وقت بمبئی کی حکومت میں وزیر تھے ایک دن بمبئی کے گورنر لارڈ برابورن نے میرے والد کو تینوں بیٹوں کے ہمراہ چائے کی دعوت پر بلایا، جب میرے بڑے بھائی امداد علی جن کی عمر 21 سال تھی کا تعارف ہوچکا تو گورنر نے بھائی کے بارے میں کہا کتنا خوبصورت اور جوان آدمی ہے، امداد علی نے ایک تربیت یافتہ ارسٹو کریٹ ہوتے ہوئے جواب دیا "میں اپنے آپ کو بہت مسرور اور مغرور سمجھتا ہوں کیونکہ میری تعریف ہمارے خوبصورت گورنر نے کی ہے، جب میری باری آئی تو میں نے باریک آواز میں کہا "ہز ایکسی لینسی گورنر اس لئے خوبصورت ہیں کیونکہ وہ ہمارے خوبصورت ملک کے خون پر پلتے ہیں، لارڈ برابورن میرے اِس جواب پر ششدر رہ گیا ایک لمحے تک وہ حیرت زدہ میری طرف دیکھتا رہا اور پھر میرے والد سے کہنے لگا "شاہنواز اِس میں تمہیں ایک شاعر اور انقلابی ملا ہے۔" بھٹو صاحب لکھتے ہیں "یہی سب کچھ ہے جو میں اِن سارے برسوں میں رہا ہوں، ایک شاعر اور ایک انقلابی اور جب تک میرے جسم میں سے آخری سانس نہیں نکل جاتی ہیں یہی رہوں گا۔"

ذوالفقار علی بھٹو کا شمار بیسویں صدی میں جنوبی ایشیاء کے عظیم انقلابی رہنماؤں میں ہوتا ہے، وہ ایک ایسے رہنما تھے جو نا صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر کے کروڑوں عوام میں بے حد مقبول تھے اور دنیا بھر بالخصوص مسلم دنیا کے

سربراہ مملکت اُنہیں خاص محبت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ قائدِ عوام ذوالفقار علی بھٹو بے انتہا ذہانت، اعلیٰ سیاسی بصیرت، لاجواب تدبر اور دوطرفہ تعلقات کے امور کے ماہر تھے، وہ ابتدا ہی سے ایشیائی امور میں مغرب کی مداخلت کے کٹرے مخالفوں میں سے ایک تھے، بھٹو "سامراج" کے خاتمے، اقتصادی آزادی اور خود کفالت کے حامی اور زندگی بھر اس موقف کے زبردست داعی رہے کہ کسی ملک کے اندرونی معاملے میں مداخلت نہ کی جائے، بھٹو کہتے تھے "نوآبادیاتی دور ختم ہورہا ہے، اب ایشیاء اور افریقہ میں نئی طاقتیں ابھر چکی ہیں، ایشیائی قیادت کے سامنے بنیادی مسئلہ اُن کی خود مختاری کے چیلنج کا ہے، مغرب میں ایشیائی قیادت کو جس دن برابری اور مساوات کی بنیاد پر تسلیم کرلیا گیا اُس دن عالمی امن کے تقاضے پورے ہوجائیں گے" اپنی اسی انقلابی فکر کی وجہ سے وہ زندگی بھر سامراجی حلقوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے رہے، 1963ء میں وائٹ ہاؤس میں امریکی صدر جان کینڈی کی پاکستانی وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات میں امریکی صدر بھٹو کی ذہانت اور وسعت علمی سے اِس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے بھٹو سے کہا کہ "اگر آپ امریکن ہوتے تو میری کابینہ میں وزیر ہوتے" جناب بھٹو نے برجستہ جواب دیا "مسٹر پریذیڈنٹ محتاط رہیں اگر میں امریکن ہوتا تو آپ کی جگہ ہوتا۔"

پاکستان کے نوجوان وزیر خارجہ کی بلاکی ذہانت، خود اعتمادی اور بے باکی نے

امریکی صدر کو ہلا کر رکھ دیا اور اسی دن سے بھٹو کے باغیانہ خیالات کی وجہ سے امریکن خفیہ ایجنسیوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ایک دن یہ شخص امریکہ کیلئے درد سر بنے گا، چنانچہ انہوں نے بھٹو کے نام کے گرد سرخ دائرہ لگا دیا، قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو کو 1957ء میں 29 سال کی عمر میں پہلی بار اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کے سب سے کم عمر رکن ہونے کا اعزاز ملا، بھٹو کی خداداد ذہانت اور قابلیت کو دیکھتے ہوئے اسکندر مرزا نے انہیں اپنی کابینہ میں بطور وزیر شامل کیا،28 اکتوبر 1958ء کو جنرل ایوب خان نے بھٹو کو اپنی حکومت میں وزیر معدنیات مقرر کیا اور 23 جنوری 1963ء کو وزیر خارجہ محمد علی بوگرہ کے انتقال کے بعد جناب بھٹو کو وزارت خارجہ کا قلم دان سپرد کیا گیا، یہ پاکستان کی آزاد خارجہ پالیسی کا نکتہ آغاز تھا، بھٹو صاحب کے دور میں پاکستان کی خارجہ پالیسی جن خطوط پر استوار ہوئی اور جس ماہرانہ انداز سے بھٹو نے اسے آگے بڑھاتے رہے، وہ مغربی طاقتیں بالخصوص امریکہ کیلئے درد سر تھا۔

چھ ستمبر 1965 کو رات کے اندھیرے میں جب بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو اُس وقت ذوالفقار علی بھٹو نے بین الاقوامی محاذ پر پاکستان کی جنگ لڑی اور چین، انڈونیشیا، سعودی عرب، ایران، ترکی، عراق، مصر، اردن، الجزائر، شام، سوڈان، یمن، مراکش، لیبیا، کویت کی حکومتوں کو پاکستان کی اخلاقی اور مالی

امداد پر رضامند کیا، ذوالفقار علی بھٹو نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں پاکستان کا
مقدمہ لڑتے ہوئے تاریخی تقریر کی، جس کے ایک ایک لفظ سے زندگی حرارت اور
جذبوں کی سچائی عیاں تھی، جناب بھٹو نے اقوام عالم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "ہم
ہزار سال تک جنگ لڑیں گے" اُن کا یہ جملہ پاکستان کے عوام کے دلوں کی دھڑکن اور
جذبوں کا امین تھا، اقوام متحدہ میں بھٹو کی تقریر نے قوم کے حوصلوں کو بلند کردیا، مگر
افسوس کہ جنگ کے میدانوں میں جیتی ہوئی باری جنرل ایوب خان نے تاشقند میں
مزاکرات کی میز پر ہار دی، 16 جون 1966ء کو بھٹو صاحب نے وزارت سے استعفیٰ
دے دیا اور 30 نومبر 1967ء کو پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھ کر ملک میں عوامی
جدوجہد کا آغاز کیا، ذوالفقار علی بھٹو نے سقوط ڈھاکہ کے بعد 20 دسمبر 1971ء باقی
ماندہ پاکستان کی باگ دوڑ سبنھالی۔

وہ پاکستان کی پہلی شخصیت تھے جس کی سوچ اور فکر کے منفرد، انقلابی اور تخلیقی انداز نے
ایشیائی سیاست میں انقلاب آفریں تبدیلیاں پیدا کیں، افریشائی اتحاد، پاک بھارت
تعلقات اور پاک چین دوستی کے متعلق بھٹو صاحب کا انداز فکر و عمل عالمی سامراج کے
مقاصد کیلئے زہر قاتل ثابت ہوا، جس کی وجہ سے اُسے جنوب مشرقی ایشیاء میں اپنی
پالیسیوں کے تسلسل میں ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا، اِسی وجہ سے بھٹو صاحب کو کئی بار
خریدنے کی بھی کوشش کی

گئی۔ایک بار امریکی صدر جانسن نے انہیں کہا تھا کہ "ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ، تمہیں جتنی دولت چاہیے، وہ دنیا کے جس حصے میں چاہو گے مل جائے گی"اِس موقع پر بھٹو نے قومی غیرت اور جذبہ حب الوطنی سے لبریز جواب دیتے ہوئے امریکی صدر جانسن کو کہا تھا کہ "ہم غیرت مند قوم ہیں کوئی بکاؤ مال نہیں ہیں" لالچ، دھونس، دھاندلی اور دھمکیوں کے باوجود بھٹو نے پاکستان کی سالمیت، استحکام، ترقی اور عوام کی خدمت کا پُر خار راستہ منتخب کیا،اُن کے دور حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ 7 ستمبر 1974ء کو قومی اسمبلی و سینٹ سے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینا اور 10 اپریل 1973ء کو متفقہ آئین کی منظوری تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو ایٹمی پاکستان کے اولین معمار و بانی اور اسلام کی نشاط ثانیہ کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کو دفاعی، سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے مضبوط دیکھنا چاہتے تھے، مشہور نقاد و دانشور جناب حسن نثار ذوالفقار علی بھٹو کے مختصر دور کے کارناموں کو یوں بیان کرتے ہیں"چند سالہ دور اقتدار میں لاتعداد محاذوں پر لڑنے والا بھٹو، کراچی میں ایٹمی بجلی گھر بنانے والا بھٹو،90ہزار جنگی قیدی اور پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ ہندوستان سے چھڑانے والا بھٹو،اسلامی سربراہی کانفرنس کا انعقاد اور اوپن یونیورسٹیاں ایجاد کرنے والا بھٹو،چواین لائی،اور سوئیکارنو سے لے کر بریئنڈر سل تک کا فیورٹ بھٹو،آئین سے لے کر شاہراہ

قراقرم تک کا معمار بھٹو، پورٹ قاسم کی تعمیر، چشمہ بیراج سے لے کر فرانس اور کینیڈا
کے ساتھ دو ایٹمی معاہدے کرنے والا بھٹو، وزارت مذہبی امور بنانے سے لے کر 17
لاکھ ایکڑ زمین بے زمین ہاریوں میں بانٹنے والا بھٹو، غریب عوام کو شریک اقتدار کرنے
والا بھٹو، کشمیر کو آزاد کرانے کیلئے ہزار سال تک لڑنے والا بھٹو اور عالم اسلام کو نیم
"وفاق کی زنجیر میں باندھنے کی سعی کرنے والا بھٹو۔

پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کی سعی کرنا ذوالفقار علی بھٹو کا سب سے بڑا جرم تھا، جو
امریکہ کی نظر میں نا قابل معافی جرم تھا،امریکہ نہیں چاہتا تھا کہ پاکستان ایٹمی ٹیکنالوجی
حاصل کرے اور مسلم ممالک کو متحد و منظم کرے چنانچہ امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر
نے بھٹو کو دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ "اگر تم نے ایٹمی پروگرام ترک نہیں کیا اور اس
منصوبے سے باز نہیں آئے تو تمہارا انجام عبرت ناک ہوگا"اس دھمکی کو سن کر جناب
بھٹو نے نہایت بہادری سے جرات مندانہ جواب دیتے ہوئے کہا تھا "مسٹر ہنری کسنجر یہ
پاکستانی قوم کا حق ہے اور پاکستانی قوم اپنے حق سے دستبرار نہیں ہو سکتی، میں یہ پسند
کروں گا کہ چند جرنیل میری لاش کو سڑکوں پر کھینچتے پھریں، لیکن قوم سے غداری کرکے
میں تاریخ کا مجرم نہیں بنوں گا" بھٹو اپنے اسی ناکردہ جرم کی پاداش میں امریکی ایماء پر
ایک فوجی آمر کے ہاتھوں 4اپریل 1979ء کو تختہ دار

پر لٹکا دیئے گئے۔

بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو سے اپنی آخری ملاقات میں بھٹو نے مسکراتے ہوئے کہا تھا کہ "میں اپنے اجداد کی زمینوں کی طرف واپس جا رہا ہوں، تاکہ اِس سرزمین کا اِس کی خوشبو اور اِس کی فضا کا حصہ بن جاؤں، خلق خدا میرے بارے میں گیت گائے گی، میں اُن کی کہانیوں کا جاوداں حصہ بن جاؤں گا۔" آج قائدِ عوام، فخرِ ایشیاء ذوالفقار علی بھٹو کو ہم سے جدا ہوئے 31 برس گزر چکے ہیں، لیکن قوم کے دل و دماغ اُن کی یادوں سے آج بھی معطر اور تروتازہ ہیں، وہ تاریخ پاکستان کا ایک ایسا زندہ و لازوال کردار ہیں، جس کے عزم و حوصلے، جرات و بہادری، بے مثال تدبر اور فہم و فراست سقوط پاکستان کے بعد باقی ماندہ پاکستان کی تشکیل نو کا باعث بنی۔

جس قوم کے حکمران سو رہے ہوں۔۔۔

کہتے ہیں کہ ایک بادشاہ کے دربار میں ایک فریادی فریاد لے کر حاضر ہوا، اور اس نے بادشاہ سے روتے ہوئے عرض کی، حضور والا.... میں لٹ گیا.... میں برباد ہوگیا.... میں تباہ ہوگیا.... بادشاہ نے اُس سے پوچھا.... کیا ہوا؟، فریادی نے عرض کی جناب والا.... میرے گھر میں چوری ہوگئی ہے اور چور میری زندگی بھر کی تمام جمع پونجی لوٹ کر لے گئے ہیں.... بادشاہ نے فریادی کی بات سن کر غصے سے کہا.... جب چور یہ کام کر رہے تھے، تم کیا کر رہے تھے؟ فریادی نے عرض کی، حضور والا.... اُس وقت میں سو رہا تھا، فریادی کا جواب سن کر بادشاہ کے غصے میں مزید اضافہ ہوگیا اور اُس نے چیختے ہوئے کہا.... تم کیوں سو رہے تھے؟ حیرت میں گم فریادی نے عرض کی، جناب والا.... میں معافی چاہتا ہوں .... مجھ سے غلطی ہوگئی .... میرا گمان تھا کہ آپ جاگ رہے ہیں۔

آج یہ حکایت ہمارے حالات کی بہترین عکاسی کرتی ہے، عوام چیخ رہے ہیں، چلا رہے ہیں، دہائی دے رہے ہیں لیکن اُن کی آواز ایوان اقتدار کی بلند و بالا فیصلوں سے ٹکرا کر واپس آجاتی ہے، کوئی سننے والا نہیں، دیکھنے والا نہیں، محسوس کرنے والا نہیں ہے، ایوان اقتدار کے مکین بے حس تماشائی بنے ہوئے ہیں،

انہوں نے وعدوں کے رنگا رنگ غباروں، دعوؤں کی ست رنگی پتنگوں اور خلاف حقیقت بیانات کی پھلجھڑیوں سے مکر و فریب کا ایک سرکس لگا رکھا ہے، جبکہ دستر خوانی قبیلے کے افراد کا کہنا ہے کہ ترقی و خوشحالی نقرئی پازیبیں پہنے ملک کے گلی کوچوں میں رقص کر رہی ہے، شلیکن حقیقت حال یہ ہے کہ بے چارگی کی صلیب پر لٹکی خلق خدا اپنے روز وشب کا شمار تک بھول گئی ہے اور پاکستان کے 17 کروڑ عوام کو ایک بھی ایسا دل نواز منظر دکھائی نہیں دے رہا جسے وہ اپنے زخموں کا مرہم بنا سکے اور جو اُن کے دکھوں کا مداوا بن سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس قوم کے حاکم جاگ رہے ہوتے ہیں، وہاں کسی تقریر، کسی بیان، کسی اشتہار کی ضرورت نہیں ہوتی، کبھی حاکم وقت کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ ہمیں عوام کے مسائل کا اندازہ ہے، ہم جلد ہی عوام کو ریلیف دیں گے، نہ ہی انہیں یہ کہنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ ہم نے تمہارے لئے یہ کیا ہے یا ہم تمہیں بہترین مستقبل دینے کی کوشش کر رہے ہیں، ہم ظلم و زیادتی، دہشت گردی اور غربت کا خاتمہ کر دیں گے، ہماری پالیسیاں عوام کے دلوں کی دھڑکن ہیں، لوگوں کی اکثریت ہمارے ساتھ ہے جو اگلے پانچ برسوں کیلئے ہمیں حکمران دیکھنا چاہتی ہے، کیونکہ جہاں عوام کی اکثریت حکمرانوں کے ساتھ ہوتی ہے، وہاں ان کی زبانیں نہیں چہرے بولتے ہیں، اُن کی آنکھیں روشن اور ہنستی ہیں، زبانیں خوشی و مسرت کے گیت گاتی ہیں اور جسم جھومتے ہیں ، لہراتے ہیں

لیکن جس قوم کے حاکم سو رہے ہوں، وہاں لوگوں کو ایک لمبی چپ لگ جاتی ہے اور ایک طویل خاموشی چہروں پر چھا جاتی ہے، جس سے حکمران یہ سمجھتے ہیں کہ ملک میں آرام ہے، چین ہے، سکون ہے، امن ہے، جبکہ یہ آرام و سکون اور بظاہر دکھائی دینے والا چین اُس غبارے کی مانند ہوتا ہے جس میں ہوا بھری جارہی ہوتی ہے تو ہوا بھرنے والے کو اندازہ نہیں ہوتا کہ غبارہ مزید کتنا اور پھولے گا اور کب اُس کے پھولنے کی حد ختم ہوجائے گی، وہ تو بس اُسے لمبا اور بڑا کرنے کے شوق میں مزید پھونکیں مارتا اور ہوا بھرتا جاتا ہے، اور جب غبارے کی برداشت کی حد ختم ہوجاتی تو وہ اچانک پھٹتا ہے، اُس وقت اس کا نشانہ کوئی اور نہیں بنتا بلکہ ہوا بھرنے والے کا منہ ہوتا ہے، کمال کی بات یہ ہے کہ اس سارے عمل کے دوران نہ تو غبارہ فریاد کرتا ہے، نہ ہی وہ ہوا کے بوجھ سے بلبلاتا اور چیختا ہے، بس ایکدم دھماکے سے پھٹ جاتا ہے، گذشتہ دنوں پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں ہونے والی ہنگامہ آرائی اِس کی عملی مثال ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کی موجودہ حکومت نے غریب عوام کو روٹی کپڑا اور مکان دینے کا جو نعرہ لگایا تھا وہ اب ایک مذاق کے سوا اور کچھ نہیں لگتا، حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں اگر کسی پارٹی نے سب سے زیادہ عرصے حکومت کی ہے تو وہ پاکستان پیپلز پارٹی ہی ہے، اگر پیپلز پارٹی دور

حکومت کے تمام ادوار کو شامل کر کے دیکھا جائے تو ایک چیز جو مشترک نظر آئے گی، وہ عوام کو محض نعروں کے ذریعے بہلانے اور ٹرخانے کی پالیسی ہے، لیکن موجودہ پیپلز پارٹی کی حکومت پچھلی حکومتوں سے اس لحاظ سے قدرے ممتاز رہی کہ اُس نے عوام کو محض نعروں کے ذریعے بہلانے اور پھسلانے کے ساتھ اہم قومی معاملات پر لٹکانے کی بھی پالیسی اپنائی اور تمام عرصہ بحران پیدا کرنے اور پھر اسے حل کرنے میں گزار دیا، اگرچہ وزیر اعظم نے ریڈیو پر اپنے گذشتہ خطاب میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ ہم نے دو سال میں قوم سے جو وعدے کیے انہیں پورا کیا، مہنگائی، دہشت گردی، غربت و بیروزگاری کے خاتمے کیلئے ترجیحی اقدامات اٹھائے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ معروضی حقائق کا زاویہ کچھ اور ہی کہہ رہا ہے، ججز بحال ہوئے مگر کس طرح بحال ہوئے یہ پوری قوم جانتی ہے، ججوں کی تقرری کا معاملہ بھی عدالتی فیصلوں کے تحت حکومت کو تسلیم کرنا پڑا، گلگت بلتستان کی خود مختاری، آغاز حقوق بلوچستان پیکج، صوبہ سرحد کیلئے نیٹ ہائیڈل منافع کے واجبات اور NFC ایوارڈ کا اجراء، اُس وقت تک حکومت کی اہم کامیابیاں شمار نہیں ہوسکتی جب تک کہ یہ اقدامات نتائج اور اثرات کے اعتبار پوری طرح اپنی افادیت ظاہر نہیں کرتے۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ موجودہ حکومت کے برسر اقتدار آنے کے بعد سے عوامی مسائل ومشکلات کم اور حل ہونے کے بجائے مزید بڑھی ہیں، ڈالر قیمت

بڑھنے سے لے کر آٹا چینی گھی و دیگر اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں اتنا اضافہ ہوا ہے
کہ مہنگائی و غربت کم ہونے کے بجائے خوفناک حد تک بڑھ چکی ہے، دوسری طرف
توانائی کی قلت اور بجلی کے بحران کی وجہ سے صنعتیں بند ہو رہی ہیں جس کی وجہ سے
بیروزگاری میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے، رہی سہی کسر بدعنوان انتظامیہ اور بیورو
کریسی نے پوری کردی ہے، روز ایک نیا انکشاف عوام کے سامنے آتا ہے، یہ درست ہے
کہ پاکستان کی مختلف حکومتی ادوار میں ملک کی حقیقی معاشی ضروریات کی طرف سے
شدید غفلت برتی گئی، بجلی، پانی اور گیس کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو بری طرح
نظرانداز کیا گیا، ہر حکومت کی توجہ وقتی ضروریات، محدود فوائد اپنی حکومت کا استحکام،
برسراقتدار طبقے اور اشرافیہ کے مفادات کا تحفظ اور حکمرانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ
آمرانہ اختیارات کے حصول کی طرف رہی اور وہ آئین میں سرنگیں لگانے اور تسلسل
اقتدار کی راہیں تراشتے رہے۔

بدقسمتی سے یہی وطیرہ موجودہ حکومت نے بھی اپنایا ہوا ہے، آج انہی غفلتوں،
کوتاہیوں اور عدم توجہ کا نتیجہ ہے کہ پاکستان میں بجلی، پانی اور گیس کا بحران شدت
اختیار کرگیا ہے، واضح رہے کہ بجلی پانی اور گیس کی حیثیت ملکی معیشت اور تجارت کے
لیے جسم میں دوڑتے ہوئے خون کی مانند ہے، جس طرح خون کے بغیر جسم کی نقل
وحرکت اور مختلف اعضاء کی کارکردگی ممکن نہیں، اسی طرح

بجلی، پانی اور گیس کے بغیر ملکی معیشت کا پہیہ نہیں چل سکتا، حال یہ ہے کہ بجلی، گیس کی
لوڈشیڈنگ کا سلسلہ ملک میں بدستور جاری ہے جبکہ دوسری جانب پانی کی شدید قلت
سے شہری پریشان ہیں، ملک کی 40 فیصد سے زیادہ آبادی غربت، بھوک اور افلاس کی
چکی میں پس رہی ہے، اس کے باوجود حکومت یکم اپریل سے بجلی کے نرخوں میں 6.5
فیصد، پیٹرولیم کی نرخوں میں مزید اضافے اور آئی ایم ایف کے دباؤ پر تمام اشیاء پر 16
فیصد ویلیو ایڈیڈ ٹیکس لگانے کی تیاری کررہی ہے، اگر یہی صورتحال رہی تو بجلی، پیٹرولیم
اور گیس کے نرخوں میں مزید اضافے سے ڈیڑھ کروڑ سے زائد لوگ غربت کی لکیر سے
نیچے آجائیں گے جبکہ ویلیو ایڈیڈ ٹیکس کے نفاذ سے مہنگائی کے طوفان کے خلاف عوامی رد
عمل کا سامنے آنا ایک فطری عمل ہوگا، لیکن اس کے باوجود ہمارے ارباب اقتدار چین
کی بانسری بجاتے ہوئے سابقہ حکمرانوں کی پالیسیوں پر گامزن ہیں، جو عوام کے بنیادی
مسائل حل کرنے پر توجہ دینے کے بجائے صرف اس بات پر خوشی کے شادیانے بجاتے
تھے کہ ملک میں موبائل فون استعمال کرنے والوں کی تعداد 2 کروڑ تک جا پہنچی ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ اب تو ہمارے پاس گنوانے کے لئے بھی کچھ نہیں بچا، معیشت تباہی کے
دھانے پر پہنچ چکی ہے، زراعت کی تباہی کیلئے بھارت پہلے ہی منصوبوں پر عمل پیرا ہے، ہر
روز کسی نہ کسی شہر میں لوگ اپنے پیاروں کی

لاشیں اٹھاتے ہیں، ہر طرف لوٹ مار، افراتفری اور بدامنی کا دور دورہ ہے، ان
حالات میں ملک کی محب وطن عوام کا اور کتنا تیل نکالا جائے گا، کب تک عوام بے چارگی
کی صلیب پر لٹکی رہے گی، کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ ہم اپنے مستقبل کو محفوظ
بنانے اور عوام کے غموں اور دکھوں کا مداوا کرنے کی فکر کریں؟ جناب وزیر اعظم
صاحب پلوں کے نیچے سے اس حد تک پانی گزر چکا ہے کہ اب محض بلند بانگ کھوکھلے
دعوؤں اور خلاف حقیقت بیانات سے عوامی مسائل حل ہونے والے نہیں، لہذا قوم کو
سبز باغ دکھانے اور خوبصورت الفاظوں کے گورکھ دھندے میں الجھانے کے بجائے
وقت کے تقاضوں کو سمجھئے، خیال رہے کہ حالات و واقعات اور آنے والے طوفان کا
تقاضہ آپ سے عملی اقدامات کا متقاضی ہے۔

سارا قصور اِس نظام کا ہے۔۔۔۔۔

یہ جعل ساز، دھوکے باز فراڈیے قومی مجرم ہیں۔۔۔۔۔
سوال: آپ نے اسلامیات میں ایم اے کیا ہے، عدالت کو بتائیں کہ قرآن پاک میں کتنی آیات ہیں؟ جواب: معلوم نہیں، سوال: قرآن کی کل کتنی سورتیں ہیں؟ جواب: خاموشی، سوال: آپ نے مدرسے سے کتنے سال کا کورس کیا ہے؟ جواب: دو دو سال کے چار کورس کئے ہیں، سوال: یہ کل کتنے سال ہوئے؟ جواب: معلوم نہیں، سوال: قرآن کے پندرہ پاروں کے نام بتائیں؟ جواب: معلوم نہیں، سوال: اچھا پندرہ پارے چھوڑیں پانچ پاروں کانام ... یا چلیں صرف پانچ سورتوں کا نام ہی بتا دیں؟ جواب: معلوم نہیں، سوال: قرآن کی پہلی سورت کونسی ہے؟ جواب: الحمد، سوال: دوسری سورت کونسی ہے؟ جواب: آل عمران ہے، سوال: آپ نے اسلامیات میں ایم اے کیا ہے، آپ نے قران پاک کی کونسی تفسیر پڑھی ہے؟ جواب: حضرت یوسف علیہ السلام کی تفسیر، سوال: آپ کے نصاب میں کون کون سے مضامین شامل تھے؟ جواب: معلوم نہیں، سوال: چار دونی کتنے ہوتے ہیں؟ جواب: معلوم نہیں۔
نعوذباللہ من ذالک، یہ مکالمے کسی مزاحیہ ڈرامے کے نہیں اور نہ ہی یہ منظر

کسی سنسنی خیز فلم کا ہے، بلکہ یہ منظر 25 مارچ 2010ء کو پاکستان کی عدالت عظمیٰ سپریم کورٹ میں اُس وقت پیش آیا، جب مظفر گڑھ سے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہونے والے رکن قومی اسمبلی جمشید دستی (جو سینٹ کی قائمہ کمیٹی برائے کھیل کے چیرمین بھی تھے) سے عدالت عظمیٰ کے معزز ججز نے اُن کی اہلیت کے حوالے سے سوالات کئے اور جس کے بعد چیف جسٹس صاحب یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ "اپنے دین کے بارے میں آپ کی معلومات کا یہ حال ہے اور آپ کہتے ہیں کہ آٹھ سال کا دینی کورس کر رکھا ہے.... آپ کو تو سیدھے جیل بھیجا جانا چاہیے"اِس صورتحال کے بعد جسٹس افتخار محمد چوہدری کی قیادت میں سپریم کورٹ کا بنچ اِس نتیجے پہنچا کہ جمشید دستی نے الیکشن کمیشن میں جعلی ڈگری پیش کی تھی، اِس لیے وہ قومی اسمبلی کی رکنیت کے لیے نااہل ہیں۔

قارئین محترم یہ وہی جمشید دستی ہیں جنھوں نے سری لنکا میں پاکستان کرکٹ ٹیم کی شکست کے بعد ٹیم پر یہ الزام لگایا تھا کہ ٹیم نے سٹہ کھیلا ہے، اِسی الزام کی بنا پر ٹیم کے کپتان یونس خان اور کوچ انتخاب عالم کو سینیٹ کے سامنے پیش ہو کر صفائی دینا پڑی تھی اور توہین آمیز رویئے سے دل برداشتہ ہو کر یونس خان نے کپتانی سے دست بردار ہونے کا فیصلہ کیا تھا، یہ درست ہے کہ موجودہ حکومت کے دور میں جمشید دستی نے کھیلوں کی قائمہ کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے بہت نام کمایا، اُن کی کرکٹ بورڈ کے چیئرمین اعجاز بٹ

سے رسہ کشی اکثر اخبارات کی زینت بھی بنتی رہی ہے، یہاں تک کہ ایک موقع پر تنگ آ کر اعجاز بٹ کو یہ کہنا پڑا تھا کہ جمشید دستی پاکستانی کرکٹ کو تباہ کرنے کے درپے ہیں، دوسری طرف جمشید دستی اعجاز بٹ کے خلاف یہ بیان دیتے ہوئے پائے گئے کہ اگر میرے پاس اختیار ہوتا تو اعجاز بٹ جیل میں ہوتے، تاہم وہ اعجاز بٹ کو تو جیل نہ بھیج سکے، مگر گزشتہ دنوں وہ خود جیل جاتے جاتے بچے، درحقیقت اُن کی قسمت اچھی تھی کہ عدالت نے اُن کے صرف استعفے ہی پر اکتفا کیا، وگرنہ اُن کے خلاف دھوکہ دہی اور جعل سازی کا مقدمہ بھی قائم کیا جا سکتا تھا۔

کہتے ہیں کہ حقیقی زندگی افسانے سے زیادہ ہنگامہ آمیز اور سنسنی خیز ہوتی ہے، کب کیا ہو جائے کسی کو پتہ نہیں ہوتا، ہم میں سے کسی کو بھی یہ گمان نہیں تھا کہ جمشید دستی جیسا منہ زور، زبان دراز اور بدتمیز رکن اسمبلی اِس طرح عدالت عظمٰی کے سامنے اخلاقی اور ذہنی پستی کا مظاہرہ کرے گا، گھگھیائے گا اور اپنی تمام تیزی، طراری اور لن ترانی بھول جائے گا، امر واقعہ یہ ہے کہ فاضل عدالت کے روبرو جو ریکارڈ پیش کیا گیا، اُس کے مطابق جمشید دستی نے شہادۃ العالمیہ کی جعلی ڈگری حاصل کر رکھی تھی، جبکہ نذیر جٹ ایم این اے نے سرگودھا سے میٹرک کے امتحان میں فیل ہونے اور تنظیم المدارس آزاد کشمیر سے بی اے کی جعلی ڈگری حاصل کی تھی، پی پی 63 ق لیگ کے محمد اجمل آصف کا بھی

یہی معاملہ ہے۔ اِن تین افراد کے علاوہ اسلامیہ یونیورسٹی کے ڈپٹی کنٹرولر امتحانات نے عدالت میں بتایا کہ پی پی پی 259 مظفر گڑھ کے ایم پی اے اللہ وسایا عرف چنوں خاں نے میٹرک اور ایف اے کے امتحانات دیئے بغیر ہی بی اے کی ڈگری حاصل کر رکھی ہے۔

جبکہ مولانا فضل الرحمان کے بھائی مولانا عطا الرحمان کے خلاف جعلی اسناد پیش کرنے کا کیس بھی زیر سماعت آنے والا ہے، یہ اُن ارکان اسمبلی کی اہلیت کا حال ہے جن کی ذمہ داری قانون سازی ہے، طرفہ تماشا دیکھئے کہ مسلم لیگ ق سے تعلق رکھنے والے نذیر جٹ نے میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے کمال ڈھٹائی سے کہا کہ انہوں نے استعفیٰ جعلی ڈگری پر گرفت کے خوف سے نہیں، بلکہ مسلم لیگ ن میں شامل ہو کر ضمنی انتخابات میں حصہ لینے کے لیے دیا ہے، اِس پر مستزاد یہ کہ حکومت اٹھارویں ترمیم کے ذریعے صرف ناخواندہ ہی نہیں بلکہ سنگین جعل سازی اور بے ضابطگیوں ملوث اِن افراد پر مشتمل ایک ایسا پارلیمانی کمیشن بنانے جارہی ہے جو ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججوں کی تقرریاں کیا کرے گا۔

جمشید دستی کی عدالت عظمیٰ میں یہ ڈرامائی پرفارمنس کوئی نئی بات نہیں ہے، وطنِ عزیز میں اِس قسم کے واقعات اکثر و بیشتر پیش آتے رہے ہیں، ایسا ہی

ایک واقعہ نوے کی دہائی میں اُس وقت سامنے آیا جب ضلع بٹگرام سے تعلق رکھنے والے صوبہ سرحد کے رکن اسمبلی یوسف خان ترند (جو 1990ء سے 1993ء تک وزیر تعلیم رہے) نے اپنے خلاف عدالت میں بدعنوانی کے ایک مقدمے میں یہ اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا، میں توان پڑھ ہوں، مجھے کیا معلوم کہ میرے افسر مجھ سے کن کاغذوں پر دستخط کروا کرلے جاتے ہیں، ہماری سماعتوں میں ابھی تک محترمہ کے وہ الفاظ "اذان بج رہی ہے" گونج رہے ہیں، جو انہوں نے اسمبلی فلور پر اذان کی آواز سن کر کہے تھے، اِسی طرح پرویز مشرف کے دور میں دو برس تک وفاقی وزیر مواصلات اور چار برس تک وفاقی وزیر تعلیم کے منصب پر فائز رہنے والے ریٹائرڈ جنرل جاوید اشرف قاضی قرآن پاک کے چالیس پارے بتایا کرتے تھے، اسی طرح موجودہ وزیر قانون کی کی ڈگری بھی میڈیا میں موضوع گفتگو رہتی ہے جو کہ ایک ایسی یونیورسٹی سے Ph.d جاری کی گئی، جس کو اِس بات کا اختیار ہی نہیں تھا، حال ہی میں مسلم ن کی رکن صوبائی اسمبلی کو چوری کے کریڈیٹ کارڈ پر خریداری کرنے کی وجہ سے اپنی نشست سے ہاتھ دھونا پڑا، اِسی طرح مسلم لیگ ن کے ایک رکن قومی اسمبلی کو اپنی جگہ ایک رشتہ دار کے امتحان دینے کی وجہ سے استعفیٰ دینا پڑا تھا۔

اِس تناظر میں ہمارا سوال یہ ہے کہ اگر ایک اَن پڑھ اور انگوٹھا چھاپ شخص، وزارت کے مزے لوٹ سکتا ہے، الفاظ کی ادائیگی میں بے احتیاطی کا مظاہرہ کرنے

والی محترمہ دو مرتبہ وزرات عظمیٰ پر فائز ہو سکتی ہیں، قرآن پاک کے چالیس پارے کی متنازعہ ڈگری رکھنے والا Ph.d گنوانے والا وفاقی وزارتوں کے مزے لوٹ سکتا ہے اور وزیر قانون رہ سکتا ہے، تو جمشید دستی کا کیا قصور، کسی نے پڑھی ہو یا نہ پڑھی مگر یہ تو جمشید دستی کا کمال ہے کہ اُس نے تو حضرت یوسف علیہ السلام کی تفسیر پڑھ رکھی ہے، ہمارا ماننا ہے کہ اِس سارے قضیئے میں قصور اُس نظام کا ہے جس کے ذریعے اِس قسم کے نااہل، دھوکے باز اور فراڈیے قسم کے لوگ منتخب ہو کر ایوانوں تک پہنچتے ہیں اور یہ نظام اِن جھوٹے، دغا بازوں اور فراڈیوں کو تحفظ اور پناہ کی بیساکھیاں فراہم کرتا ہے، قصور ہے تو اُن جماعتوں کا ہے۔

جنھوں نے جانتے بوجھتے جمشید دستی، نذیر جٹ، محمد اجمل آصف اور اللہ وسایا عرف چنوں خاں جیسے لوگوں کو جن کا مدارس یا درس نظامی کے کورس سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں اور جنھوں نے مدارس کی جعلی ڈگریاں حاصل کر رکھی ہیں، اپنی پارٹی کے ٹکٹ جاری کیے، قصور ہے تو اُس قومی اسمبلی کا ہے کہ جس نے دو برس تک جعلی ڈگریوں والے جھوٹے فراڈیوں کو اپنی آغوش میں جگہ دی اور وہ جعلی ڈگریوں کی بنیاد پر اُس مقدس ایوان کے رکن رہے کہ جسے پاکستان میں سپریم ہونے کا دعویٰ ہے، کیا یہ ظلم نہیں کہ دو سال تک یہ لوگ نہ صرف ملک میں ہونے والی قانون سازی میں شریک رہے بلکہ قومی خزانے سے ہر ماہ لاکھوں

روپے بھی وصول کرتے رہے، ایم این اے کے اسٹیٹس سے خوب مزے اور فائدے اٹھاتے رہے اور انجوائے کرتے رہے؟ کیا دو سال تک جعلی ڈگریوں کی بنیاد پر پوری قوم کی توہین اور مذاق اڑانے والے یہ لوگ سخت ترین سزاؤں کے مستحق نہیں تھے؟

یقیناً تھے مگر بالعموم عدالتوں کی یہ روایت ہے کہ اُس کے سامنے جس قانونی یا آئینی مسئلے پر کوئی کیس پیش کیا جاتا ہے، وہ اُسی مسئلے پر فیصلہ دے دیتی ہیں، جن تین ارکان نے استعفے دیئے ہیں اُن کی اسمبلیوں کی رکنیت کی اہلیت کو چیلنج کیا گیا تھا، فاضل عدالت نے اُس کا فیصلہ سنا کر انہیں نااہل قرار دے دیا، مگر اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اِن لوگوں کا جرم نہایت سنگین ہے جس کی ابھی انہیں قرار واقعی سزا ملنا باقی ہے، یہ مجرم ہیں جعل سازی کے، عوام کو دھوکا دینے کے، غیر آئینی اور غیر قانونی طور پر اسمبلیوں کے حلف اٹھانے کے، ارکان کے طور پر بھاری تنخواہیں وصول کرنے اور دھوکہ دہی کے ذریعے قوم کے فنڈز اور وسائل استعمال کرنے کے۔

یہ سارے وہ سنگین الزامات ہیں، جس کے مرتکب لوگ قومی مجرم قرار پاتے ہیں، اِس لحاظ سے اُن کے استعفے کوئی سزا نہیں، ہمارا مطالبہ ہے کہ اِن لوگوں سے اسمبلیوں کی رکنیت کے دوران حاصل کی جانے والی بھاری تنخواہوں اور مراعات کی پائی پائی وصول کی جائے، اِن کے خلاف جعل سازی اور مختلف اداروں، عوام

اور عدلیہ کو دھوکہ دینے کے سنگین جرم میں مقدمات چلائے جائیں اور انہیں کڑی سے کڑی سزا دے کر نشان عبرت بنایا جائے۔ مگر افسوس اور صد افسوس کہ ایسا نہیں ہوگا، کیونکہ ہمارا موجودہ نظام اِس بات کی اجازت نہیں دیتا، اگر ایسا ہوتا تو یہ افراد کمال ڈھٹائی اور بے شرمی سے عدالت سے اپنی بدکرداری کا نتیجہ سن کر باہر آتے ہی نئی جماعت میں شمولیت اور نئے سرے سے اسمبلیوں کے ضمنی انتخابات میں حصہ لینے کے اعلانات نہ کر رہے ہوتے، دراصل یہ ہمارے کرپٹ نظام کی عطا کردہ وہ جراتیں ہیں جس کی وجہ سے سب سے زیادہ کرپشن کرنے والا سب سے زیادہ معزز اور بااختیار قرار پاتا ہے، یہی وہ معیار ہے جس نے ایسے لوگوں کو جواب دہی، احتساب اور محاسبے کے خوف سے آزاد کیا ہوا ہے۔

بد قسمتی سے پاکستان کی سیاست کا یہ اخلاقی بحران اِس حد تک بڑھ چکا ہے کہ اِس کا ایک مظہر یہ چند ارکان اسمبلی ہی نہیں، نہ جانے مزید ایسے اور کتنے ارکان ہوں گے جن کی تعلیمی اسناد جعلی ہونگی، ہماری دانست میں جعلی اسناد پر رکن اسمبلی بننے کا مطلب فریب اور دھوکے کی بنیاد پر اپنی سیاسی زندگی کی تعمیر کے ساتھ، قوم کے ساتھ دھوکا دہی اور کھلا فریب ہے، گو کہ عدالت عظمیٰ نے ایسے افراد کو استعفیٰ دینے کا اختیار دے کر رعایت دی ہے، لیکن اصل سوال قومی وجود کی بقاء کا ہے جس کی بنیاد دیانت، سچائی اور ایمانداری کے اصولوں پر قائم ہے، لہٰذا اِس لحاظ سے ہونا تو یہ چاہیے کہ قوم کے

قائدین کو جو مقننہ کے ارکان بننے جارہے ہیں اخلاقی طور پر صاحب کردار ہوتے۔
لیکن افسوس کہ ایسا نہیں، اور ہو بھی نہیں سکتا، کیونکہ جس ملک میں لوٹ مار، رشوت اور مالی بدعنوانی جیسے سنگین جرائم کو ریاستی سرپرستی اور تحفظ حاصل ہو، جہاں طاقتور اور بااثر طبقہ جواب دہی اور احتساب کے خوف سے آزاد ہو، وہاں قوم کو اخلاقی پستی اور ذلت میں گرنے سے کوئی نہیں روک سکتا، جناب من، دیکھا جائے تو اب یہ مسئلہ محض انفرادی نہیں رہا، اِس صورتحال نے ہمارے پورے نظام، قومی اداروں اور سیاسی جماعتوں کے طریقہ انتخاب کی اِس حقیقت کو آشکارا کر دیا ہے کہ اُن کے پاس ایسا کوئی نظام موجود نہیں ہے جس کے ذریعے پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے امیدواروں کی اہلیت، دیانت اور اخلاقی معیار کا امتحان لیا جاسکے اور ایک صالح، بے لوث، صاحب کردار اور ایماندار سچی قیادت سامنے لائی جاسکے۔

کب راج کرے گی خلقِ خدا۔۔۔۔

مبارکبادوں کا شور تھم چکا ہے، طبلے کی تھاپ پر ناچنے والوں کے پیر رک چکے ہیں، مٹھائیاں کھانے اور کھلانے کا سلسلہ بھی اب ختم ہوچکا ہے، محترم صدر آصف علی زرداری پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے ایک ایسے موقعہ پر خطاب بھی فرما چکے ہیں جب 1973ء کا آئین بحال کرنے کیلئے اٹھارویں ترمیم حتمی مسودے کی شکل میں پارلیمنٹ میں پیش ہوچکی ہے، بلاشبہ یہ پیپلزپارٹی کی موجودہ حکومت کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اُس نے وسیع تر مشاورت اور اتفاق رائے کے بعد اٹھارویں ترمیم کے ذریعے 1973ء کے آئین کو بحال کرنے کی کوشش کی اور جمہوریت کی مضبوطی کی جانب قدم بڑھایا، لیکن اِس شاندار کوشش اور کارنامے کے باوجود ایک تلخ اور جیتی جاگتی حقیقت ابھی بھی موجود ہے وہ یہ کہ یہ ترمیم عوام کے دکھوں، پریشانیوں، احساس محرومی اور مسائل کا حل نہیں ہے، اِس حقیقت کا ادراک خود اِس مسودے پر دستخط کرنے والے ارکان سمیت دیگر پارلیمانی جماعتوں کے ارکان کو بھی ہے کہ اٹھارویں آئینی ترامیم کا مسودہ موجودہ عوامی مسائل، احساس محرومی اور عوام پر گرانی کا بوجھ کم کرنے میں کسی طور بھی مددگار ثابت نہیں ہوسکے گا، اِن ارکان اسمبلی کا یہ بھی خیال ہے کہ حکومت کو غربت کے خاتمے کے لئے تعلیم اور صحت کی سہولیات کی فراہمی سمیت بنیادی نوعیت کے مسائل حل کرنے

اور گڈ گورننس پر فوری اور بھرپور توجہ دینی ہوگی، جس کے سردست ہمیں کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

دوسری طرف پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے اپنے خطاب میں جناب صدر کا کہنا تھا کہ" شہیدوں کا بدلہ نظام بدل کرلیں گے، ہم ملک کو نیا پاکستان بنائیں گے، اٹھارہویں ترمیم کے بعد بہت کچھ کرنا باقی ہے، ہم نے دو سالوں میں جمہوریت کو مضبوط کر دیا ہے، مجھے فخر ہے کہ بے نظیر بھٹو کے فلسفے کو آگے بڑھایا ہے، بے نظیر کے خواب میں ہر پاکستانی خوشحال ہے، انہوں نے کہا کہ میں نے نظام بدلنے کی قسم کھائی ہے، میں عوام کی خدمت کرنے کا عہد کرتا ہوں اور میرے قدم کوئی ڈگمگا نہیں سکتا۔"اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ ایک طرف جہاں پیپلزپارٹی کی موجودہ حکومت نے آغاز حقوق بلوچستان، گلگت بلتستان کے آئینی حقوق، این ایف سی ایوارڈ کی متفقہ منظوری اور اب اٹھارہویں ترمیم کے ذریعے آمروں کی گندگیوں کو صاف کرنے جیسے تاریخی کام کیے ہیں، وہیں دوسری طرف یہ تلخ حقیقت بھی منہ کھولے کھڑی ہے کہ موجودہ حکومت کے برسراقتدار آنے کے بعد سے عوام مہنگائی، غربت اور بے روزگاری کے ہاتھوں اِس قدر لاغر اور کمزور ہوچکے ہیں کہ اب اُن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا چاہتا ہے۔

محترم صدر صاحب، عوام آپ کے جذبات کی دل سے قدر کرتے ہیں، آپ کا کہنا کہ "نظام بدلیں گے اور پاکستان کو نیا پاکستان بنائیں گے"، لائق صد تحسین ہے، لیکن گستاخی معاف، نظام بدلنے کے لئے عملی اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے اوراِس کی ابتدا سب سے پہلے اپنی ذات سے کرنا ہوتی ہے، اہل علم کا خیال ہے کہ نظام بدلنے کیلئے پہلے خود کو بدلنا بہت ضروری ہے، لہٰذااِس کی ابتداء آپ کو پہلے اپنی ذات اور اپنے ارکان حکومت سے کرنی ہوگی، آپ ذوالفقار علی بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے فلسفے اور فکر و سوچ کے وارث اور آگے بڑھانے کے دعویدار ہیں، اُن کا فکر و فلسفہ تو یہی تھا کہ عوام کی محرومیاں دور ہوں، عوام خوشحال ہو، ملک ترقی کرے اور خلق خدا راج کرے، اسلیئے جہاں آپ نے جمہوری اداروں کو طاقتور بنانے کی جدوجہد کی ہے، وہاں آپ کو عوام کی محرومیاں دور کرنے کے لئے بھی انقلابی اقدامات کرنا ہونگے، کیونکہ عوام کو ایسی جمہوریت سے کوئی فائدہ نہیں، جس سے ایک عام آدمی کی زندگی مشکل سے مشکل تر ہوجائے اور وہ دو وقت کی روٹی کیلئے ترسے۔

اس وقت ایک عام آدمی کا سب سے بڑا مسئلہ روٹی، کپڑا اور مکان ہے، اسے اِس سے کوئی غرض نہیں کہ ایوان صدر کا مکین کون ہے اور وزیراعظم ہاؤس میں کون متمکن ہے، اٹھارہویں ترمیم میں کیا خوشخبریاں ہیں اور سترہویں ترمیم میں آمر کی کیا خرافات شامل تھیں، اسے اِس سے بھی کوئی غرض نہیں کہ جمہوریت کے

فیوض و برکات کیا ہیں اور آمریت کی ہولناکیاں کیا ہیں، جناب صدر، ایک عام آدمی کو تو صرف اِس بات سے غرض ہے کہ اُسے دو وقت کی روٹی، بچوں کی تعلیم اور اسکی ضروریات کے لئے مواقع میسر ہیں کے نہیں؟ اگر یہ مواقع جمہوریت دے رہی ہے تو وہ جمہوریت زندہ باد کے نعرے لگائے گا اور اگر یہ سہولت اسے آمریت میں ملے گی تو وہ آمریت کے گن گائے گا، یوں تو دنیا میں بنیادی طور پر جمہوریت کے معنی "عوام کی حکومت عوام کے لئے " سمجھے جاتے ہیں، لیکن بد قسمتی سے ہمارے ملک میں ایسا نہیں ہے، یہاں تو صورتحال اِس کے بالکل برعکس ہے، ہماری حکومت جو کہ ایک جمہوری اور عوامی حکومت کہلاتی ہے کے دور میں عوام دو وقت کی روٹی کے لئے ترس رہے ہیں، اشیا خوردونوش کی قیمتیں اِس قدر بڑھ چکی ہیں کہ کم آمدنی والے طبقے کے لئے دو وقت کی روٹی تو درکنار، ایک وقت کی روٹی بھی آسانی سے میسر نہیں، مہنگائی کا عفریت ہے کہ مسلسل انسانوں کو نگل رہا ہے۔

حال یہ ہے کہ گزشتہ دنوں چیچہ وطنی میں میاں بیوی جن کی شادی کو صرف چھ ماہ ہی ہوئے تھے، نے تنگ دستی اور غربت سے دلبرداشتہ ہو کر ٹرین کے نیچے آکر خودکشی کر لی اور چند لمحوں میں دونوں میاں بیوی کو موت نے اپنی آغوش میں لے کر دنیا کی وحشتوں اور دکھوں سے آزاد کردیا، اِسی طرح گلشن اقبال کراچی کے رہائشی عاصم جو کہ ہمدرد یونیورسٹی سے ایم بی اے کی ڈگری رکھتا تھا، نے

چار سالہ طویل بے روزگاری سے تنگ آ کر گلے میں پھندا ڈال کر اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا، غربت، بے روزگاری اور افلاس کے ہاتھوں تنگ آ کر اپنی زندگیوں کے خاتمہ کرنے کے واقعات اب ہماری روز مرہ زندگی کا معمول بن چکے ہیں، امر واقعہ یہ ہے کہ ہر دور میں پیپلز پارٹی نے عوام کو روٹی، کپڑا اور مکان کے سبز خواب دکھائے، لیکن یہ خواب کبھی پورا نہ ہوسکا اور اب تو یہ حالت ہے کہ لوگ کپڑے کی بات کرتے ہیں نہ مکان کی، بلکہ اپنے حکمرانوں سے فقیروں کی طرح ایک ہی سوال کرتے ہیں کہ خدارا ہمیں اور ہمارے بچوں کو ایک وقت کی روٹی سے محروم نہ کرو، لیکن سماعت اور بصارت سے محروم گونگے، بہرے اور اندھے حکمران اِس سوال کا جواب کبھی بجلی، کبھی گیس، کبھی پیٹرولیم اور کبھی روز مرہ کی اشیائے ضرورت کی قیمتیں بڑھا کر دیتے ہیں، حال یہ ہے کہ خیبر سے کراچی تک کے عوام حکمرانوں کا نام لے لے کر دہائیاں دے رہے ہیں، انہیں مدد کے لئے پکار رہے ہیں لیکن اُن کی پکار حکمرانوں کے محلوں کی اونچی دیواروں سے ٹکرا کر صدا بہ صحرا ثابت ہو رہی ہے۔

ستم ظریفی دیکھئے کہ اِس معاملے پر حکومت، اپوزیشن اور پارلیمنٹ سب خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے، محترمہ بے نظیر بھٹو کے ذکر پر آنسو بہانے والے ارکان اسمبلی کی آنکھوں میں اُن نادار مردوں، عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کی حالت کا تصور کرکے نمی تک نہیں آتی جن کو ایک وقت روٹی بھی میسر نہیں، انہیں

سڑکوں، گلیوں اور بازاروں میں دست سوال دراز کرتے مرد و زن اور بچے نظر نہیں آتے۔ انہیں گندگی کے ڈھیر اور کچرا گھروں سے گلا سڑا کھانا اٹھا کر شکم سیری کرنے والے بھوکے نظر نہیں آتے۔ انہیں ہسپتالوں میں اپنے بیماروں کی دوا کی فہرست تھامے ڈاکٹروں کی منت سماجت کرتے اور مدد مانگتے غریب و نادار لوگ نظر نہیں آتے۔ انہیں کدال، بیلچہ اور پھاوڑا اٹھائے سارا سارا دن مزدوری کی تلاش میں بھٹک کر شام کو خالی ہاتھ گھر جانے والے مزدور نظر نہیں آتے۔ کیا یہ سب لوگ اِس ریاست کی اولاد نہیں ہیں، کیا یہ ریاست اِن بھوکے ننگے اور ناداروں کی ماں نہیں ..... ! یہ کیسی ماں ہے جو روز اپنے ہی بچوں کو زہر کھا کر، ٹرین کے نیچے آ کر، عمارتوں سے چھلانگ لگا کر، نہروں اور دریاؤں میں ڈوب کر اپنی زندگی کا خاتمہ کرتے دیکھ رہی ہے، لیکن ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتی، جس طرف نظر ڈالیئے غربت، بھوک اور افلاس کا راج ہے، جس نے لوگوں سے جینے کی امنگ تک چھین لی ہے، یہ کیسی اندھیر نگری ہے، جس میں عوام کا کوئی پرسان حال ہی نہیں، اُن کا کوئی وارث نہیں، جبکہ مملکت کا دستور بھی اس بات کی ضمانت فراہم کرتا ہے کہ ریاست ہر شہری کو بنیادی حقوق کی فراہمی سمیت تعلیم، روزگار اور اُس کی جان و مال کی محافظ ہوگی اور ہر شہری کو بنیادی حقوق فراہم کرے گی، لیکن موجودہ صورتحال میں یہ ساری باتیں فرضی اور کاغذی معلوم ہوتی ہیں، اصل حقیقت یہ ہے کہ ہمارا دستور صرف طبقہ اشرافیہ کو تحفظ فراہم کرنے اور انہیں پناہ دینے کیلئے رہ گیا ہے۔

ایسا کب تک ہوتا رہے گا، 63 سال ہو گئے، عوام کو خواب دیکھتے، آس لگاتے اور امید کے دیئے جلاتے ہوئے، اب تو اٹھارویں ترمیم بھی آچکی ہے، جو چند دنوں میں منظور ہو کر آئین کا حصہ بن جائے گی، اِس کی اہمیت اور افادیت میں کوئی کلام نہیں، بہت اچھا ہوا، مبارک ہو کہ وزیراعظم بااختیار ہونے جارہے ہیں، مبارک ہو کہ نواز شریف کیلئے تیسری بار وزیراعظم بننے کے دروازے کھل رہے ہیں، مبارک ہو کہ وفاقی کابینہ کے ارکان کی تعداد گھٹ جائے گی اور قومی خزانے سے وزیروں اور مشیروں کی فوج ظفر موج کے اخراجات کا وزن کچھ کم ہوجائے گا، بہت کچھ بدل رہا ہے اور شاید بہت کچھ بدل جائے، تبدیل ہوجائے، لیکن اگر نہیں بدلے گا اور نہیں تبدیل ہوگا، تو وہ ہوگا عوام کا مقدر، جو کبھی نہیں بدلے گا، نہیں نکلے گا تو ان کے دکھوں، پریشانیوں، احساس محرومی اور مسائل کا حل نہیں نکلے گا، خلق خدا اِسی طرح روتی، بلکتی اور سسکتی رہے گی، چنانچہ اِس تناظر میں ہمارا ارباب اقتدار سے بہت ہی سادہ سا سوال ہے، کہ کب اس ملک کی عوام کو غربت، مہنگائی اور بے روزگاری سے نجات ملے گی .....؟، کب اِس ملک میں ترقی و خوشحالی کا سنہری دور آئے گا.....؟، کب اِس ملک کی غریب عوام کو امن و امان، تحفظ اور چین نصیب ہوگا.....؟، کب اِس ملک کی عوام کی جان آئی ایم ایف، ورلڈ بینک جیسے خون چوسنے والے اداروں سے چھوٹے گی .....؟، کب بھٹو اور بے نظیر کے خواب کے مطابق ہر پاکستانی خوشحال

. . . . . ہوگا..... ؟اور کب وہ دن آئے گا، جب اس ملک پر خلق خدا راج کرے گی

تاریکیوں کا راج مگر پھر وہی لولی پاپ۔۔۔

راجہ صاحب کا اور اِک اور وعدہ۔۔۔۔۔

گزشتہ دنوں ایک مرتبہ پھر وفاقی وزیر پانی و بجلی راجہ پرویز اشرف نے عوام کو جھوٹے لولی پاپ سے بہلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ "توانائی کے موجودہ بحران پر قابو پانے کیلئے صدر اور وزیراعظم کی ہدایات پر ہنگامی بنیادوں پر اقدامات کئے جارہے ہیں اور آئندہ چند ہفتوں میں بحران میں کمی واقع ہوگی، لہٰذا عوام، تاجر، صنعتکار اور سیاستدان صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے قومی مسئلہ کو سیاست کی نذر کرنے کی بجائے حکومت سے تعاون کریں، اُن کا دعویٰ تھا کہ آئندہ ڈیڑھ ماہ کے اندر ایک ہزار میگاواٹ بجلی آئی پی پیز اور رینٹل پاور کے ذریعہ سسٹم میں شامل ہو جائے گی۔" گزشتہ دو سال سے محترم وفاقی وزیر مسلسل اِس قسم کے بیانات کہ "گزشتہ سال کی نسبت اِس سال موسم گرما میں شہریوں کو بجلی کے بحران کا سامنا نہیں کرنا پڑیگا، ملک میں بجلی کا بحران جلد دور ہوجائے گا، عوام کو سستی بجلی فراہم کی جائے گی، ملک میں سستی بجلی کے حصول کے وسیع ذخائر موجود ہیں، تھرکول پروجیکٹس کی بدولت 65 فیصد بجلی سستی ہونے سے مثبت نتائج سامنے آئیں گے، بجلی کا بحران دور کرنے کے لئے پیپکو 11 سو میگاواٹ کا جنریشن پلانٹ لگائے گی، جس سے نیشنل گریڈ

میں بجلی آنے سے عوام کو ریلیف ملے گا، 31 دسمبر 2009ء تک بجلی کا بحران ختم ہوجائے گا، جلد ہی عوام کو لوڈ شیڈنگ سے نجات مل جائے گی اور یہ کہ بجلی کے بحران اور پانی کے مسئلے کو میڈیا نے بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔" کے لولی پاپس سے ملک کی عوام کو بہلانے اور بے وقوف بنانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

لیکن ہر آنے والے دن کے ساتھ بجلی کے بحران میں کمی آنے کے بجائے مزید شدت ہی آئی اور اِس بحران نے پورے ملک کو مفلوج کرکے رکھ دیا ہے، اس وقت حال یہ ہے کہ بڑھتی ہوئی گرمی کے ساتھ بجلی کا بحران بھی شدید سے شدید تر ہوگیا ہے، جس کی وجہ سے عوام کا غیض و غضب اب اِس حد تک بڑھ چکا ہے کہ ملک کے کئی شہروں میں عوام سڑکوں پر نکل آئے ہیں، اعداد و شمار کے مطابق اِس وقت ملک میں بجلی کا شارٹ فال 5800 میگاواٹ تک پہنچ گیا ہے جبکہ بجلی کی غیر اعلانیہ لوڈشیڈنگ نے شہریوں کی زندگی اجیرن بنا دی ہے، 24 گھنٹوں میں 16 اور 18 گھنٹوں کی لوڈشیڈنگ ایک عذاب بن چکی ہے، ایک طرف شہری گرمی میں جھلس رہے ہیں تو دوسری طرف پینے کے پانی کے لئے بھی ترس رہے ہیں، لوڈشیڈنگ کی وجہ سے صنعتیں بند ہیں، لاکھوں لوگ بے روزگار ہوچکے ہیں اور ملک کے چھوٹے بڑے شہروں میں بجلی کی لوڈشیڈنگ کے خلاف احتجاج کا سلسلہ شروع ہوچکا ہے، پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان ہر جگہ لوگ بجلی کیلئے سراپا احتجاج ہیں، ہڑتالیں ہورہی ہیں، جلوس نکالے جارہے ہیں، توڑ پھوڑ اور جلاؤ گھیراؤ جاری ہے، بعض مقامات پر

پولیس اور مظاہرین میں جھڑپیں بھی ہوئی ہیں، بجلی نہ ہونے کی وجہ سے کارخانے بند ہیں، کاروبار ٹھپ ہیں، جس کی وجہ سے معاشی صورتحال بھی ابتر ہوچکی ہے۔

بدقسمتی سے یہ سب کچھ ہماری اپنی حکومتوں کی غفلت اور لاپروائی کا نتیجہ ہے، اگر حکومتی سطح پر بروقت اور درست فیصلے کئے جاتے تو آج اِس صورتحال سے بچا جاسکتا تھا، ستم ظریفی دیکھئے کہ چین نے توانائی کا بحران حل کرنے کے لئے ہمیں مدد کی پیشکش کی، لیکن ہم اِس سے کوئی فائدہ نہ اٹھاسکے، اسی طرح ایران بھی ہمیں فوری طور پر ایک ہزار میگاواٹ بجلی فراہم کرنے کیلئے تیار ہے، مگر حکومت پاکستان کی طرف سے اب تک اِس سلسلے میں کسی پیش رفت یا کسی گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کیا گیا، خود پاکستان کے اندر پانی کے چھوٹے چھوٹے منصوبے بنائے جاسکتے ہیں، جن سے مقامی سطح پر نہ صرف بجلی کی ضرورت پوری کی جاسکتی ہے بلکہ ترقی و خوشحالی کے دروازے بھی کھولے جاسکتے تھے، مگر اس مقصد کیلئے جس منصوبہ بندی کی ضرورت ہے اُس پر غور کیلئے ہمارے پالیسی ساز تیار نہیں، نتیجہ یہ کہ پانی کے وسائل بھی ضائع ہو رہے ہیں اور بجلی کی قلت بھی دور نہیں ہوپارہی، چند ماہ پیشتر بڑی شدت کے ساتھ رینٹل پاور ہاؤسز کے حصول کی باتیں ہوئیں، مگر مس مینجمنٹ کے باعث لاکھوں ڈالر ضائع ہوگئے اور یہ بھی طے نہیں ہوسکا کہ کرائے کے یہ بجلی گھر کہاں لگائے جائینگے، سب سے

زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ حکومتی ایوانوں میں عوامی مسائل حل کرنے کے لئے کسی قسم کی کوئی سنجیدہ کوششیں ہوتی نظر نہیں آتیں اور حکومت کی عوامی مسائل سے عدم دلچسپی کے رویئے سے جہاں عوامی مسائل بڑھ رہے ہیں وہیں عوام میں احساس محرومی بھی اب اپنی آخری حدوں کو چھو رہا ہے، لیکن اِس کے باوجود حکومت اور سیاسی حلقے اٹھارویں ترمیم کی خوشیاں منانے اور ایک دوسرے کو مبارک بادیں دینے میں مصروف ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا چند ماہ پیشتر حکومت نے غریب عوام کے پیسے سے لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے کے اشتہارات اخبارات میں چھاپے اور چھپوائے۔ اِن اشتہارات میں دعویٰ کیا گیا کہ "دسمبر 2009 تک لوڈ شیڈنگ کا خاتمہ کر دیا جائے گا یا پھر اس پر بڑی حد تک قابو پا لیا جائے گا۔18 جولائی 2009 کو ایک اشتہار وزارت پانی و بجلی، حکومت پاکستان کی جانب سے قومی اخبارات میں شائع ہوا، جس میں کہا گیا کہ "نئے پاور پراجیکٹس، خوشحالی کی روشن راہیں، انشاء اللہ بجلی کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے ہنگامی بنیادوں پر مختلف نئے پاور پراجیکٹس کی تکمیل سے دسمبر 2009 تک مزید ساڑھے 3ہزار میگا واٹ بجلی حاصل ہو گی، ہمارا عزم، روشن پاکستان، پاکستان میں توانائی کے شعبے کی نئی جہت، پاکستان الیکٹرک پاور کمپنی" ہم صرف حکومت سے اتنا پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ نئے پاور پراجیکٹس کہاں گئے.... ؟وہ خوشحالی کی روشن راہیں کہاں گم ہو گئیں....؟وہ

دسمبر 2009 تک ملنے والی ساڑھے 3 ہزار میگا واٹ بجلی کونسی زمین نگل گئی....؟آپ کے دعوئِ عزم اور اُس کے تحت روشن پاکستان آج کیوں اندھیروں میں ڈوبا ہوا ہے....؟اور کیوں پاکستان میں توانائی کے شعبے کی نئی جہت نظر نہیں آ رہی....؟، ہم روشن پاکستان کے خواب دیکھانے والوں کو صرف اتنا بتانا چاہتے ہیں کہ جس روشن پاکستان کی وہ بات کرتے ہیں، آج اُس کی عوام اٹھارہ اٹھارہ گھنٹوں کی لوڈ شیڈنگ کا عذاب برداشت کر رہی ہے۔

یہ درست ہے کہ پاکستان صنعتی وزرعی محاذوں پر طویل عرصہ سے بحرانوں کا شکار ہے، ایک بحران ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا جنم لے لیتا ہے اور قوم کو مایوسی، ناامیدی اور مستقبل کے خدشات سے دوچار کر دیتا ہے، اس وقت سب سے بڑا بحران توانائی کا ہے، جس نے ملکی معیشت کا پہیہ جام کرکے رکھ دیا ہے،آبادی میں اضافے اور شہروں کے پھیلاؤ کا تقاضا تھا کہ زرعی اور صنعتی ترقی کی رفتار بھی اِسی تناسب سے تیز کی جاتی، مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہوا اور نہ ہی حکومت کی طرف سے اِس جانب کوئی سرگرمی دکھائی گئی، بلکہ موجودہ حکومت نے بھی سابقہ حکومتوں کی طرح دعوؤں اور وعدوں کے لولی پاپ سے وقت گزارنے کی کوشش کی، اس تناظر میں ہمارا سوال یہ ہے کہ آخر کب تک ہمارے حکمران عوام کے بنیادی مسائل سے چشم پوشی کرتے رہیں گے اور کب تک زبانی جمع خرچ سے عوام کو بے وقوف بنانے کی کوشش کریں گے، حقیقت یہ ہے کہ موجودہ

حکومت نے دو برس مسائل پیدا کرنے اور پھر اسے حل کرنے میں ضائع کر دیئے اور
اب جبکہ عوام کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا ہے، ہمارے حکمرانوں اور سیاستدانوں نے عوام
کے بنیادی مسائل کی طرف توجہ نہ دی تو کوئی بعید نہیں کہ یہاں کے حالات بھی
کرغزستان کی طرح کسی خونی انقلاب کی طرف نہ لے جائیں، کیونکہ عوام اِن بحرانوں
سے اِس قدر عاجز آچکے ہیں کہ اب انہیں سوائے احتجاج کے کوئی اور راستہ دکھائی نہیں
دے رہا، لہذا آج ضرورت اِس امر کی ہے کہ نہ صرف بجلی کی قلت کے بحران بلکہ
مہنگائی، غربت، بے روزگاری جیسے سنگین مسائل سے ملک کی غریب عوام کو نجات
دلانے کے لئے حکومت سنجیدگی سے عملی اقدامات کا راستہ اختیار کرے، ایسا نہ ہو کہ اِس
حوالے سے مزید چشم پوشی عوام کے غیض و غضب اور غم و غصے کے طوفان کو ایسا راستہ
اختیار کرنے پر مجبور کر دے جسے روکنا پھر کسی کے بس کی بات نہ ہو۔

دس ملین ڈالرز میں کھودا پہاڑ اور نکلا۔۔۔

بے نظیر قتل کیس اور اقوام متحدہ کی تحقیقاتی رپورٹ

بالاآخر سابق وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کے قتل کی تحقیقات کے حوالے سے اقوام متحدہ کمیشن کی رپورٹ اردو کے مشہور محاورے "کھودا پہاڑ نکلا چوہا" یا" وہی ڈھاک کے تین پات" کی مصداق نکلی، دس ملین ڈالرز (تقریباً 86 کروڑ پاکستانی روپے) کی ادائیگی اور نو ماہ کے انتظار کے بعد اقوام متحدہ کی جانب سے 65 صفحات پر مشتمل ایک ایسی رپورٹ کا اجراء جس کی خاص خاص باتوں سے ایک عام پاکستانی بھی بخوبی آگاہ ہے، کو صدر اور حکومت کی جانب سے اپنی توقعات کے عین مطابق قرار دینا انتہائی اہم اور حیرت ناک ہے، اہم اِس لئے کہ اِس رپورٹ سے صدر صاحب اور اُن کے خاندان کی بریت کا اظہار ہوتا ہے اور حیرت ناک اِس لئے کہ پاکستانی قوم کی خون پسینے کی کمائی کو عوام دوستی کے نعرے لگانے والی حکومت نے ایک ایسے کار لاحاصل میں پھونک ڈالا، جس کا نتیجہ سوائے صفر کے اور کچھ نہیں اور دو سال میں لاکھوں ڈالر کے اخراجات کے بعد قوم کو صرف یہ بتایا گیا کہ" پاکستانی پولیس نالائق ہے، سیکورٹی کا نظام ناقص تھا، قتل میں طالبان، القاعدہ اور پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے کردار کا

جائزہ لیا جانا چاہیے۔ بے نظیر کی موت میں گاڑی کے لیور لگنے یا بیت اللہ محسود کے ملوث ہونے کے حکومتی دعوے سے قبل از وقت ہیں۔ جس دور حکومت میں بے نظیر بھٹو کا قتل ہوا تھا اُس دور کے حکمران اِس قتل کے ذمہ دار ہیں۔ بم دھماکے کے بعد مناسب تحقیقات نہیں کی گئیں، جائے حادثہ سے ہزاروں شواہد مل سکتے تھے لیکن صرف 23 شواہد اکھٹے کیے گئے۔ حادثہ کے بعد علاقہ کی دھلائی اور پوسٹ مارٹم نہ کرانا تحقیقات پر اثرانداز ہوا۔ بینظیر بھٹو کے قتل کے بعد پولیس اہلکاروں کی جانب سے درست اقدامات کرنے میں ناکامی جان بوجھ کر تھی۔ رحمان ملک جو کہ نجی طور پر بے نظیر بھٹو کی سکیورٹی کے ذمہ دار تھے، اِس سانحہ کے فوراً بعد گاڑی سمیت غائب ہو گئے۔ ایسے کوئی شواہد نہیں ملے کہ صدر آصف زرداری یا اُن کے خاندان کا کوئی فرد اِس واقعے میں ملوث ہو سکتا ہے اور موجودہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچائے۔"

دلچسپ بات یہ ہے کہ چلی کے سفیر ہیرالڈو منوز کی قیادت میں قائم تین رکنی کمیٹی نے جن لوگوں سے ملاقات کی اور جن افراد سے تفتیش کی ہے اُن سب نے ہی تقریباً وہ تمام باتیں دہرادیں جو وہ کمیشن کے پاکستان آنے سے قبل میڈیا کے سامنے آچکی تھیں۔

پاکستانی قوم اپنی ایک محبوب لیڈر سے محرومی اور اُس کی موت کی تحقیقات پر ایک کروڑ ڈالر ضائع کرنے کے بعد جس نتیجے کو ہاتھ میں لیے کھڑی ہے اُس میں ایسی کون سی انہونی بات ہے جو قوم کو پہلے سے معلوم

نہیں تھی، ہاں اقوام متحدہ کے ذریعے اِس تحقیقات سے دنیا کے سامنے یہ ضرور آگیا کہ پاکستان ایک ایسا غیر محفوظ ملک ہے، جہاں سیکورٹی کے انتظامات ناقص، پولیس کرپٹ اور نااہل ہے اور اسٹیبلشمنٹ اتنی طاقتور ہے کہ وہ کچھ بھی کر سکتی ہے، اب رہی یہ بات کہ بے نظیر کے قتل کی ذمہ دار پرویز مشرف حکومت ہے، تو اصول و قاعدہ یہی کہتا ہے کہ وہی حکومت اور حاکم وقت مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے جس کے دور حکومت میں سانحہ وقوع پذیر ہوتا ہے، لہٰذا اِس لحاظ سے رپورٹ میں پرویز مشرف اور اُس کی حکومت کو ذمہ دار ٹھہرانا بھی کوئی نئی بات نہیں، یہی وہ معلوم اہم نقاط ہیں جن کی طرف اقوام متحدہ کے کمیشن نے توجہ دلائی ہے اور جس کیلئے ہماری حکومت نے قوم کے کروڑوں ڈالر ضائع کر دیئے، جبکہ عوام، میڈیا اور حکومتی ذمہ داران یہ نتائج کو بہت اچھی طرح جانتے تھے، لیکن خدا معلوم وہ کیا وجوہات تھیں کہ حکومت نے اِس واقعہ کی کرمنل انکوائری کرانے کے بجائے اقوام متحدہ کا دروازہ کھٹکھٹانے میں بہتری جانی اور جس کی وجہ سے بات گھوم پھر کر وہیں آکھڑی ہوئی "کہ بے نظیر کے قتل کی تحقیقات حکومت وقت کی ذمہ داری ہے۔" اسطرح ایک کروڑ ڈالر خرچ کرکے آج ہماری قوم وہیں آکھڑی ہوئی جہاں 27 دسمبر 2007 کو تھی۔

درحقیقت بے نظیر بھٹو قتل کیس کی اقوام متحدہ کی رپورٹ نے اُن بے شمار پاکستانیوں کو شدید مایوس کیا ہے جو یہ توقع لگائے بیٹھے تھے کہ یہ

الاقوامی ادارہ کسی بڑی سازش کو بے نقاب کرے گا، البتہ بعض حلقوں کا یہ کہنا ہے کہ رپورٹ میں اُس پولیس افسر کی نشاندہی کردی گئی ہے جسے شامل تفتیش کرکے قاتلوں تک پہنچا جاسکتا ہے اور بے نظیر قتل کیس کا کھرا تلاش کیا جاسکتا ہے، بعض سیاسی مبصرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگرچہ اقوام متحدہ نے اپنی رپورٹ میں بے نظیر کے قاتلوں اور منصوبہ سازوں کی براہ راست نشاندہی نہیں کی ہے، لیکن ایسے اشارے ضرور دیئے ہیں جواِس معاملے میں اُس وقت کی فوجی قیادت کے کردار کو مشکوک کرتے ہیں، بعض تجزیہ نگار کہتے ہیں کہ نہ صرف اُس پولیس افسر کو شامل تفتیش کرنا ضروری ہے جس پر حقائق کو چھپانے کا الزام عائد کیا گیا ہے بلکہ رپورٹ میں واضح نشاندہی کے بعد اُس پولیس افسر کی زندگی کے حفاظت بھی ضروری ہوگئی ہے، کیونکہ بے نظیر بھٹو کی سکیورٹی میں شامل ایک اہم شخص خالد شہنشاہ پہلے ہی پراسرار حالات میں ہلاک کیا جاچکا ہے۔
مشہور دفاعی تجزیہ نگار بریگیڈیر (ر) فاروق حمید کے مطابق " اب آصف علی زرداری پر یہ دباؤ بڑھ جائے گا کہ وہ اُن قاتلوں کا نام بتائیں جن کے بارے میں انھوں نے 30 دسمبر 2007 کو گڑھی خدا بخش میں بے نظیر بھٹو کی سوئم کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں کہا تھا کہ وہ بے نظیر کے قاتلوں کو جانتے ہیں۔"اِس موقع پر انھوں نے مسلم لیگ ق کیلئے قاتل لیگ کی

اصطلاح بھی استعمال کی، اُن کی اِس تقریر سے عام خیال یہی پیدا ہوا تھا کہ پیپلز پارٹی آنے والے وقت میں مسلم لیگ ق اور اُس کے سرپرست اعلیٰ پرویز مشرف سے بے نظیر بھٹو کے خون ناحق کا حساب لے گی، لیکن چشم فلک نے یہ حیرت ناک منظر بھی دیکھا کہ پیپلز پارٹی ہی کی حکومت کے دور میں پرویز مشرف (جنھیں آج بے نظیر بھٹو کے قتل کا ذمہ دار قرار دیا جارہا ہے) کو بے نظیر کی زندگی کے تحفظ میں ناکامی کے باوجود انتہائی عزت واحترام اور مکمل پروٹوکول کے ساتھ گارڈ آف آنر کے سائے میں رخصت کیا گیا، ایک آمر وقت کے ساتھ اِس حسن سلوک پر عوامی حلقے اور خود پیپلز پارٹی کے وابستگان آج بھی ششدر اور انگشت بدنداں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی رائے عامہ نے اقوام متحدہ کمیشن رپورٹ کو اِس وجہ سے بری طرح مسترد کردیا ہے کہ اِس میں کوئی نئی بات نہیں، تاہم پیپلز پارٹی کے شریک چیئر مین اور صدر مملکت جناب آصف علی زرداری اِس بات پر خوش ہیں کہ اقوام متحدہ کی رپورٹ انہیں اور پیپلز پارٹی کو بے گناہ قرار دیتی ہے، جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ بے نظیر کی شہادت پر کسی نے بھی پیپلز پارٹی کی جانب انگلی نہیں اٹھائی کیوں کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی ذات خود پیپلز پارٹی تھی اور اُن کی ذات سے پارٹی کے ہر جیالے سمیت وطن عزیز کا ہر محب وطن فرد محبت اور عقیدت رکھتا تھا، تاہم کچھ انگلیاں خود آصف زرداری اور بے نظیر بھٹو کی

حفاظت پر مامور رحمان ملک کی طرف ضرور اٹھی تھیں، جس کی وجہ اپنی لیڈر کی حفاظت کیلئے خاطر خواہ انتظامات کا نہ کرنا اور حادثے کے وقت وہاں سے غائب ہو جانا تھا، یہی وہ وجوہات ہیں جس کی وجہ سے رحمان ملک ایک عرصے سے عوامی تنقید کا نشانہ بنتے چلے آئے ہیں اور اسی وجہ سے کمیشن نے جہاں پرویز مشرف حکومت کو بے نظیر کی شہادت کا ذمہ دار قرار دیا، وہیں اُس ٹیم کو بھی مشکوک قرار دیا جو پیپلز پارٹی کی طرف سے محترمہ کی حفاظت پر مامور تھی۔

گو کہ اقوام متحدہ کے نام نہاد تلاش حقیقت کمیشن نے ہر چند کہ کسی حقیقت کا انکشاف نہیں کیا، لیکن جناب زرداری صاحب کیلئے مندرجہ بالا پہلو کے ساتھ یہ بات بھی خاص توجہ طلب ہے کہ حکومت کی طرف سے حفاظتی اقدامات کی ذمہ داری اُس وقت کے سیکرٹری داخلہ کمال شاہ کی تھی جبکہ پیپلز پارٹی کی طرف سے جناب رحمان ملک کی، لیکن کیا اسے اتفاق سمجھا جائے گا کہ پیپلز پارٹی نے حکومت سنبھالتے ہی کمال شاہ کی مدت ملازمت میں دو سال کی توسیع کردی، جبکہ رحمان ملک آج وفاقی وزیر داخلہ ہیں، اقوام متحدہ کی رپورٹ میں تو اِس پر بھی شبہ کا اظہار کیا گیا ہے کہ بی بی کے آگے چلنے والی سیاہ مرسیڈیز حملہ ہوتے ہی غائب ہو گئی، جس میں جناب رحمان ملک، بابر اعوان اور فرحت اللہ بابر سوار تھے۔ آج یہ تینوں حضرات اہم حکومتی مناصب پر فائز ہیں، آج پیپلز پارٹی کے ذمہ داران نے اِس بات پر اطمینان کا اظہار کر رہے ہیں کہ رپورٹ میں آصف

زرداری اور بی بی کے خاندان کے کسی فرد کو حادثہ کا ذمہ دار قرار نہیں دیا گیا، لیکن یہ بات توجہ طلب ہے کہ جب ایک اخباری نمائندے نے نیویارک میں کمیشن کے چیئر مین مسٹر ہیرالڈو سے اِس حوالے سے سوال کیا تو انھوں نے کہا کہ ہم نے آصف زرداری سمیت کسی کو باعزت بری کیا، نہ کسی پر فرد جرم عائد کی، کیوں کہ یہ کمیشن کے دائرہ اختیار میں نہیں تھا، ہیرالڈو مونیز کا کہنا تھا کہ آصف زرداری کے بارے میں افواہیں بہت سنی ہیں، لیکن کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا۔

اب جبکہ بلی تھیلے سے باہر آچکی ہے اور کروڑوں روپے کے اخراجات سے اقوام متحدہ کی تحقیقاتی رپورٹ جو اِس وقت قوم کے سامنے ہے، میں کوئی نئی بات اور نیا انکشاف نہیں بلکہ وہی باتیں دہرائی گئی ہیں جو پہلے سے میڈیا میں گردش کرتی رہی ہیں، لیکن حیرت انگیز طور پر رپورٹ میں اُن اہم باتوں مثلاً یہ کہ "یہ ہولناک واقعہ 27 دسمبر 2007ء کو پیش آیا، اُس وقت سے لے کر آج، دو سال ساڑھے تین ماہ تک صدر مملکت آصف زرداری یا اُن کے کسی عزیز نے قتل کے اتنے بڑے واقعہ کی ایف آئی آر کیوں درج نہیں کرائی.....؟ رپورٹ میں اِس بات کی نشاندہی بھی نہیں کی گئی کہ بے نظیر بھٹو ہجوم کے درمیان گاڑی میں آرام سے بیٹھی ہوئی تھیں، انہیں کس بات نے مجبور کیا کہ وہ گاڑی کی چھت سے سر نکال کر باہر کی طرف دیکھیں.....؟ رپورٹ میں اِس بات کا ذکر ہی نہیں کیا گیا اِس

سانحہ کے بعد بے نظیر کو ہسپتال لے جانے والی گاڑی کے پہیے کس طرح اچانک پنکچر ہوگئے تھے.....؟ رپورٹ میں اِس بات کا بھی جائزہ بھی نہیں لیا گیا کہ بے نظیر بھٹو کی اِس المناک شہادت سے کس کس کو کیا کیا فائدہ حاصل ہوا.....؟ رپورٹ میں بعض اعلیٰ شخصیات پر رکاوٹ ڈالنے کا الزام تو لگایا گیا، لیکن اِس کے باوجود اُن کے نام صیغہ راز میں کیوں رکھے گئے....؟ اس کے ساتھ یہ بات بھی قابل توجہ تھی کہ پیپلز پارٹی نے اپنے دور حکومت میں بریگیڈیر (ر) جاوید اقبال چیمہ، سابق سیکرٹری خارجہ سید کمال شاہ اور سابق سی سی پی او راولپنڈی سعود عزیز سمیت رپورٹ میں مذکور ہر مشکوک شخص کو مراعات سے نوازا.....؟ "پر یا تو توجہ ہی نہیں دی گئی یا پھر انہیں جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا جو محترمہ کی شہادت کے بعد سے مسلسل سوالیہ نشان بنی ہوئی ہیں، بے نظیر بھٹو کے قتل سے جڑی یہ وہ پراسرار کڑیاں ہیں جن کے حوالے چہ مگوئیاں آج بھی زبان زد عام ہیں اور اُس وقت تک جاری رہیں گی جب تک کہ اصل حقائق سامنے نہیں آجاتے۔

بہرحال حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ رپورٹ بے معنی اوراِس کے معین مفہوم کی بنیاد پہلے سے زیر گردش معلومات کا ذخیرہ ہے، حسب توقع اقوام متحدہ کی کمیشن کی جاری کردہ رپورٹ سے بے نظیر کے قتل کے حقیقی محرکات اوراِس کے ذمہ داروں کا تعین کرنے میں کوئی مدد نہیں مل سکی ہے، اِس رپورٹ نے اِس کے

علاوہ کسی اہم بات کی طرف اشارہ نہیں کیا کہ سابق صدر جنرل (ر) پرویز مشرف کی حکومت بے نظیر بھٹو کی حفاظت کی ذمہ داری میں ناکام رہی اور حکومت کے پاس بے نظیر بھٹو کی زندگی کو لاحق خطرات کے پیش نظر کوئی مناسب حفاظتی منصوبہ نہیں تھا، اسی کے ساتھ کمیشن نے راولپنڈی پولیس کی جانب سے کی جانے والی تحقیقات پر بھی عدم اطمینان کا اظہار کے ساتھ بے نظیر بھٹو کے حفاظتی انتظام کے سلسلے میں پیپلزپارٹی کے سیکورٹی انچارج کے انتظامات کو بھی ناکافی قرار دیا ہے،اِس لحاظ سے اقوام متحدہ کی رپورٹ سے کم از کم ایک بات توثابت ہو گئی کہ پاکستانی پولیس تفتیشی اداروں اور انٹیلی جنس ایجنسیوں نے جان بوجھ کر غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا اور بے نظیر بھٹو کے قتل کے حقیقی محرکات اور اُس کے حقیقی ذمہ داروں پر پردہ ڈالا، یہ انکشاف اہل پاکستان کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے، ہاں اقوام متحدہ کمیشن کی رپورٹ میں موجودہ حکمرانوں کے لیے صرف ایک ہی بات منفی ہے اور وہ یہ کہ موجودہ حکومت نے بے نظیر بھٹو کے قتل کی حقیقی تحقیقات نہیں کیں، بے نظیر بھٹو بے خون کے نتیجے میں،برسراقتدار آنے والی حکومت نے بے نظیر بھٹو کے حقیقی قاتلوں تک پہنچنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟اگر صرف اِس سوال کا جواب ہی تلاش کر لیا جائے تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے، جبکہ خود صدر آصف زرداری یہ کہتے ہیں کہ وہ قاتلوں سے بخوبی واقف ہیں، لیکن اس کے باوجود انہوں نے تمام ذمہ داری اقوام متحدہ کے کمیشن پر ڈال دی، جو یہ بھی نہیں بتاسکا کہ اِس قتل کے اصل محرکات اور

اسباب کیا تھے۔
اِس کی وجہ یہ ہے کہ کمیشن کا کام صرف تحقیقات اور حالات کے تعین تک محدود تھا اور مجرموں کی تلاش اُس کی ذمہ داری نہیں تھی، لیکن اِس کے باوجود اگر حالات اور ادارے سامنے آ گئے ہیں تو یہ موجودہ حکومت کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ تحقیقات کا دائرہ آگے بڑھائے اور ذمہ دار افراد کی نشاندہی کرے، تاکہ اِس بات کا تعین کیا جاسکے کہ جن اداروں کا نام لیا گیا اُن کے کون کون سے افراد غفلت اور غیر ذمہ داری کے مرتکب ہوئے ہیں، کس کے حکم پر ایسا کیا گیا اور وہ کون ہے جو اِس راہ میں رکاوٹ بنا؟ اِس المناک سانحہ کے حوالے سے مکمل تحقیقات اور اِس میں ملوث افراد کو قانون کی گرفت میں لانا اسلئے بھی ضروری ہے کہ ماضی میں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان، حسین شہید سہروردی اور جنرل ضیاء الحق سمیت اعلیٰ فوجی حکام کی شہادت کے پس پردہ عوامل اور اصل وجوہات کو آج تک قوم کے سامنے نہیں لایا جاسکا، اسلئے بے نظیر بھٹو کی شہادت کے باب میں بھی یہی خدشہ تھا کہ شائد قوم کو اسباب اور افراد کا علم نہیں ہوسکے گا، لیکن اِس رپورٹ کے اجراء کے بعد عوام یہ توقع رکھنے میں حق بجانب ہیں کہ موجودہ حکومت جلد از جلد ایسا مؤثر، ٹھوس اور نتیجہ خیز لائحہ عمل اختیار کرے گی جس سے محترمہ کے اصل قاتلوں کی نشاندہی ہوسکے گی اور انہیں قانون کے کٹھمرے میں لاکر نمونہ عبرت بنایا جاسکے گا، لیکن

اگر اب بھی حکومت نے ایسا نہیں کیا تو بی بی سی کے مطابق "اقوام متحدہ نے اِس رپورٹ کا گز میدان میں رکھ دیا ہے، اب دو ہی راستے ہیں یا تو حکومت اِس گز سے بارودی سرنگوں سے اٹا میدان ناپ لے یا پھر گردن نپوانے کیلئے تیار رہے۔

ایامِ اسیری کی شاہکار تصنیف

اعتقاداتِ اسلامیہ کی عملی غمّاز و نقیب" فلسفہ عباداتِ اسلامی"

فلسفہ عباداتِ اسلامی تحریکِ پاکستان کے عظیم مجاہد، مسلم لیگ کے رہنما اور جمعیت علمائے پاکستان کے صدر فاتح سرحد حضرت علامہ عبدالحامد بدایونی کی وہ معرکتہ العراء تصنیف ہے جو آپ نے تحریک تحفظ ختم نبوت 1953ء کے دوران جیل میں لکھی، کتاب کے مقدمے میں مولانا خود تحریر فرماتے ہیں کہ "یہ تالیف کسی بنگلہ، کوٹھی، تفریح گاہ میں مرتب نہیں ہوئی بلکہ ایک ایسی جگہ اِس کا سلسلہ شروع ہو کر انجام کو پہنچا، جو شہر میں واقع ہوتے ہوئے بھی اہلیان شہر بلکہ شہری دنیا سے دور ہے، نہ بچے ہیں نہ اہل و عیال، حتیٰ کہ قلم و دوات کاغذ کی بھی نگرانی ہوتی ہے، لکھنے والا جو لکھتا ہے، اُسے بھی جانچا جاتا ہے، یعنی ہم اور ہمارے رفقاء میں حضرت مولانا ابوالحسنات صاحب قادری اور دیگر علماء، کارکنان بسلسلہ تحریک ختم نبوت اور تحفظ ناموس رسالت جیلوں میں محصور ہیں اور وہ بھی ایسے خانہ بدوش کی زندگی کہ کبھی کراچی ہیں، تو کبھی حیدرآباد و سکھر، لاہور میں بدلے جاتے ہیں......خدا کا شکر ہے کہ ہمیں تیسری بار یہ سعادت ناموس مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دین اسلام کو

"ارتداد و کفر سے بچانے کے سلسلے میں حاصل ہوئی۔
حضرت علامہ عبدالحامد بدایونی ایسے مجاہد ملت ہیں، جن کی خدمات تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، تحریک فلسطین اور تحریک پاکستان سے لے کر قیام پاکستان اور استحکام پاکستان تک پھیلی ہوئی ہیں، 1918 میں مسلم لیگ سے وابستہ ہونے کے بعد سے لے کر قیام پاکستان تک مسلم لیگ کا کوئی اجتماع ایسا دکھائی نہیں دیتا، جس میں آپ نے شرکت اور تقریر نہ کی ہو، 1940 میں لاہور میں قرارداد پاکستان کی منظوری کے حق میں آپ کی ولولہ انگیز تقریر آج بھی تاریخ کا حصہ ہے، آپ نے اپریل 1944 میں بنارس سنی کانفرنس میں شرکت کی اور آل انڈیا سنی کانفرنس کے سیکرٹری نشرو اشاعت منتخب ہوئے، آپ اُس تیرہ رکنی کمیٹی کے بھی ممبر رہے جس کی ذمہ داری اسلامی حکومت کیلئے لائحہ عمل تیار کرنا تھی، آپ نے 1946ء کے انتخابات میں کامیابی کیلئے گرانقدر خدمات انجام دیں، سرحد میں مسلم لیگ کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے پر قائد اعظم محمد علی جناح نے آپ کو " فاتح سرحد" کے خطاب سے نوازا، الغرض مولانا عبدالحامد بدایونی کی زندگی تحریک پاکستان اور جدوجہد آزادی کا ایک روشن باب ہے۔
علامہ عبدالحامد بدایونی ایک بیدار مغز سیاستدان، صاحب علم و فکر عالم دین، باعمل شیخ طریقت اور ایک سچے عاشق رسول تھے، آپ کی زندگی کا مقصد عقیدہ ختم

نبوت کا دفاع اور مقام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تحفظ تھا، علمائے کرام میں آپ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ آپ نے سب سے پہلے 30 جولائی 1944ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے سالانہ اجلاس لاہور میں مرزائیوں کو مسلم لیگ کی رکنیت سے خارج کرنے کی قرارداد پیش کی، آپ نے تحریک تحفظ ختم نبوت 1953 میں نمایاں کردار ادا کیا اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، حضرت مولانا ایک شعلہ بیاں مقرر، بہترین نعت گو شاعر اور صاحب طرز ادیب بھی تھے، آپ نے کئی کتابیں جن میں "نظام عمل"، "بالشویزم اور اسلام"، "مرقع کانگریس"، "خطبہ صدارت پاکستان کانفرنس 1941 بمقام لدھیانہ"، "تاثرات روس"، "ممالک عربیہ اور ایران کا سفر نامہ"، "ہندو حکمرانی کا ہولناک تجربہ"، "اسلام کا معاشی نظام اور سوشلزم کی مالی تقسیم" وغیرہ شامل ہیں، بھی لکھیں، جبکہ "فلسفہ عبادات اسلامی" تحریک تحفظ ختم نبوت 1953 کے دوران جیل میں تخلیق پانے والی آپ کی شاہکار کتاب ہے۔

فلسفہ عبادات اسلامی مشقِ بندگی اور خدا کے سامنے خشوع و خضوع کا نام ہے، خیال رہے کہ عبادت ہمیں اِس بات کی یاد دہانی کرواتی ہے کہ ہر چیز کا خالق ربّ کریم کی ذات ہے، ہم اللہ کی عبادت کرتے ہیں، کیونکہ وہی معبود حقیقی اور لائق عبادت ہے، جو تمام صفاتِ کمالیہ کا جامع ہو، ہر وصف اُس کی صفت ہو کر اپنے کمال کو پہنچ کر اکمل ہو، نہ کوئی اُس کی ذات میں شریک ہو اور نہ

صفات میں، وہ ہر عیب سے پاک ہو، اُسی معبود حقیقی کی غایت درجہ تعظیم بجالانے کو
عبادت کہا جاتا ہے، دین اسلام نے ہمیں جس معبود حقیقی کی عبادت بجالانے کا تصور دیا
وہ حضور سید عالم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اِس فرمان سے بخوبی واضح
ہے کہ " تم اللہ عزوجل کی عبادت اِس طرح کرو کہ اُس کو دیکھ رہے ہو اور اگر (یہ
تصور نہیں کرسکتے کہ) تم اُس کو نہیں دیکھ رہے ہو، (تو یہ تصور کرو کہ) وہ تو تمہیں دیکھ
رہا ہے۔" اِسی تصور پر تمام عبادات، اُس کی تحسین اُس میں رغبت اور اُس کی قبولیت کا
دارومدار ہے۔

عبادت انسان کی بندگی کا اظہار، خالق کے قرب کا ذریعہ اور رضائے الٰہی کا سامان
ہے، حقیقت یہ ہے کہ عبد اور معبود کے درمیان تعلق کا ذریعہ، روحانی سکون، جسمانی
ورزش اور انسان کی روحانی و جسمانی تندرستی کی باقاعدہ مشق کا نام عبادات ہے، " فلسفہ
عبادات اسلامی "عبد اور معبود کے درمیان تعلق کی انہی پوشیدہ حکمتوں کے اظہار پر
مشتمل ہے جو نہایت ہی سادہ آسان اور عام فہم انداز میں فلسفہ عبادات، لباس و ستر،
جہت و تکبیر، نماز وجماعت، اوقات کار کی حکمتیں، مساجد کی اہمیت، مذہب و سیاست،
شہری آزادی، خدمت خلق، حقوق العباد، فلسفہ زکوۃ و حج اور قربانی اور علماء و مشائخ
سمیت عاملین و ملازمین کے فرائض منصبی سمجھاتی ہے۔

پروفیسر شعبہ عربی پنجاب یونیورسٹی ڈاکٹر سید محمد قمر علی کے بقول مولانا کی یہ کتاب "اسلامی عبادات، اسلامی معاشرے اور اعتقادات اسلامیہ کی عملی غماز و نقیب ہے اور وضاحت کرتی ہے کہ اِن کی عقلی وجوہ اور عملی فوائد کیا ہیں، بشری طبیعتیں اِسے کیسے قبول کرتی ہیں، معاشرے پر اِس کے اجتماعی اثرات کیسے مرتب ہوں گے اور ایک ریاست و مملکت کیسے ایک اسلامی فلاحی ریاست کی شکل اختیار کرے گی، فلسفہ عبادات اسلامی میں جذب و ایمان کی روشنی کہاں سے ملے گی، وہ وجود روشن بشکل عملی اُسوہ کون ہے، دنیا کی انفرادی و اجتماعی قیادت کی دائمی ضروریات کیا ہیں، کس نے کیا کیا، کون ناکام رہا اور کون کامیاب ہوا، اِن تمام سوالات کے جوابات" فلسفہ عبادات اسلامی" ہمیں فراہم کرتی ہے۔"

اِس نادر و نایاب اور تاریخی کتاب کی برسوں بعد دوبارہ اشاعت ممتاز دینی و سماجی شخصیت جناب ظہور الدین امرتسری صاحب کی کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہے، ظہورا لدین امرتسری صاحب کی زندگی تحریک پاکستان کے دوران سواد اعظم اہلسنّت سے تعلق رکھنے والے علماء و مشائخ کی شاندار خدمات کو نوجوان نسل کے سامنے لانے میں گزر گئی، اِس مقصد کیلئے انھوں نے اپنی بینک کی نوکری کو بھی خیر آباد کہا، اور اپنی عمر عزیز تاریخ پاکستان کے اُن گمنام گوشوں اور

کرداروں کو سامنے لانے میں گزار دی، جنھیں اپنوں کی بے اعتنائی اور اغیار کی سازشوں نے ماضی کے دھندلکوں میں دھکیل دیا تھا۔

وہ دنیاوی لالچ اور مالی منفعت سے بے نیاز اِس مقصد کے حصول کیلئے پوری تندہی کے ساتھ "ادارہ پاکستان شناسی" کے پلیٹ فارم سے تحریک پاکستان کے حوالے سے فکری کجیوں اور لاعلمی کے ڈالے گئے گہرے و دبیز پردے اٹھانے میں مصروف ہیں، یہ کہنا قطعاً غلط نہ ہوگا کہ تاریخ پاکستان کے وہ گوشے اور کردار جو آج تک مورخ کی نظر سے اوجھل رہے یا جنھیں جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا، اُن تاریخی حقائق کو بے نقاب کرنے اور سامنے لانے کا سہرا جناب ظہور الدین امرتسری صاحب کے سر جاتا ہے، موصوف اِس قبل" خطبات آل انڈیا سنی کانفرنس، سوانح پروفیسر مولوی حاکم علی، کانگریسی مسلمانوں اور حقائق قرآن، مولانا عبدالحامد بدایونی کی ملی و سیاسی خدمات، اکابر تحریک پاکستان، ابوالکلام آزاد کی تاریخی شکست، علامہ شاہ احمد نورانی کی دینی و معاشرتی خدمات، النور، البلاغ، چودھویں صدی کے مجدد، خطبات آل انڈیا سنی کانفرنس، الرشاد، تحریک پاکستان میں مولانا عبدالحامد بدایونی کا کردار، اعلیٰ حضرت بریلوی کی سیاسی بصیرت، تحریک پاکستان کی ایک اہم دستاویز (1940) وغیرہ جیسی معرکتہ العراء کتابیں چھاپ چکے ہیں، جو آج بھی مسافرانِ تاریخ کو روشن اُجالوں کی طرف رہنمائی کرتی دکھائی دیتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ زندہ قومیں کبھی بھی اپنے محسنوں کو فراموش نہیں کرتیں اور اُن کے سیرت و کردار اور جدوجہد کو آنے والی نسلوں کے دل و دماغ میں راسخ کرتی ہیں، یہی وہ بنیادی مقصد ہے، جس نے پیرانہ سالی میں بھی ظہور الدین امرتسری کو بستی بستی، قریہ قریہ مصروف سفر کیا ہوا ہے، امرتسری صاحب کی خواہش ہے کہ نوجوان نسل اپنے اسلاف کے فکرو کردار اور عمل سے واقف ہو اور اُس پر فخر کرتے ہوئے اُسے اپنی زندگی کا نصب العین بنائے، مادیت، تعصب اور تنگ نظری کے اندھیروں میں " فلسفہ عبادات اسلامی " بھی ظہور الدین امرتسری کے جلائے ہوئے علم کے چراغوں میں سے ایک روشن چراغ ہے، ڈاکٹر سید محمد قمر علی (پروفیسر شعبہ عربی پنجاب یونیورسٹی)کے خوبصورت ابتدائیہ اور خود ظہورالدین امرتسری کے تحقیقی تعارف نے کتاب کے حسن میں چار چاند لگا دیئے ہیں، یہ کتاب ادارہ پاکستان شناسی (فون نمبر
کے زیر انتظام چھاپی گئی ہے، آفسٹ پیپر پر شاندار مجلد رنگین (03224005952 ٹائٹل سے مزین یہ کتاب ہر صاحب علم اور تعلیمی و علمی لائبریری کی ملکیت ہونا چاہیے۔

بلوچستان میں فکر و شعور اور علم و دانش کا خون۔۔۔۔

حکمران کب تک صحرائی ریت میں سر چھپائیں گے۔۔۔۔
تعلیم کا شعبہ ہر معاشرے میں بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور دنیا کا ہر معاشرہ اِس شعبے میں ترقی کو ترجیح دیتا ہے اور تعلیمی نظام کو بہترین بنانے کی کوشش کرتا ہے. اِس کی اصل وجہ یہ ہے کہ تعلیم انسان کے کردار میں ایسی نمایاں تبدیلیاں لاتی ہے، جس کا اثر براہ راست پورے معاشرے پر پڑتا ہے، واضح رہے کہ علم ایک ایسا اعزاز ہے جس نے ابتدائے آفرینش ہی سے انسانیت کو معزز اور قابل صد احترام بنایا ہے، علم ایک ایسا زیور ہے، جو انسانیت کو سجا سنوار کر حسن کائنات بناتا ہے، تہذیب و تمدن، آداب معاشرت اور طرز معیشت کے ایسے انداز سکھاتا ہے جس سے انسانیت کو معراج حاصل ہوتی ہے اور معاشرہ امن و سکون کا گہوارہ بن جاتا ہے، علم کا سیکھنا اور اِس کے حصول میں سرگرم عمل رہنا اسلامی تعلیمات کا بھی ایک اہم جز ہے، کیونکہ علم کے بغیر انسان خود فراموشی کے ساتھ خدا فراموشی کا بھی مرتکب ہوتا ہے اور اپنے مقصد تخلیق کی معرفت سے محروم رہتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ علم تہذیب و تمدن اور معاشرے کی تعمیر و ترقی کا ضامن ہے، اِسی لیے اسلامی تعلیمات میں جہاں

حصول علم کیلئے بے شمار ترغیبی مضامین ملتے ہیں، وہیں اہل علم و دانش، استاد اور ماہر تعلیم کی عزت و احترام اور توقیر کی بھی مثالیں ملتی ہیں، گو کہ ایک استاد اور معلم کا احترام ہر معاشرے میں کیا جاتا ہے کیونکہ وہ نسلوں کو علم و آگہی کی روشنی دیتا ہے، لیکن اسلام ایک استاد کو روحانی باپ کا درجہ دے کر ایسا منفرد مقام عطا کرتا ہے، جس کی مثال شاید ہی آج کے کسی جدید تعلیم یافتہ معاشرے میں ملتی ہو۔

بلوچستان میں کافی عرصے سے اہل علم و دانش اور اساتذہ کی ٹارگٹ کلنگ کا سلسلہ جاری ہے، خود گورنر بلوچستان بارہا یہ اعتراف کر چکے ہیں کہ صوبے میں امن کہیں نظر نہیں آتا، سب سے زیادہ تشویشناک بات صوبہ بلوچستان میں شعبہ تعلیم سے وابستہ افراد کی ٹارگٹ کلنگ ہے، اب تک ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر فضل باری، بلوچستان یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر صفدر کیانی، پروفیسر خورشید اختر انصاری، وزیر تعلیم شفیق احمد سمیت شعبہ تعلیم سے وابستہ 25 سے زائد بے گناہ افراد اِس ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بن چکے ہیں، جن کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ دوسرے صوبے سے آ کر بلوچستان کے نوجوانوں میں علم و حکمت کی سوغات بانٹ رہے تھے، گزشتہ دنوں بلوچستان یونیورسٹی کے شعبہ ابلاغ عامہ کی پروفیسر ناظمہ طالب کا بہیمانہ قتل بھی اِسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے، ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بننے والی مشہور افسانہ نگار، شاعرہ اور ادیبہ پروفیسر

ناظمہ طالب نے 1987ء میں بطور لیکچرار بلوچستان یونیورسٹی سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا، انہوں نے بلوچستان یونیورسٹی میں ماس کمیونی کیشن ڈیپارٹمنٹ کے قیام میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا، جس کی وجہ سے اُن کا شمار اِس شعبے کے بانی ارکان میں ہوتا تھا، چند روز قبل انہیں دہشت گردوں نے یونیورسٹی سے گھر جاتے ہوئے راستے میں ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بنایا، اطلاعات کے مطابق اُن کے قتل کی ذمہ داری بلوچ لبریشن آرمی نے قبول کر لی ہے۔

اِس وقت صورتحال یہ ہے کہ بلوچستان میں دہشت گردوں کی جانب سے اساتذہ کو ٹارگٹ کلنگ اور نشانہ بنانے کے پے در پے واقعات اور خاتون پروفیسر کے قتل کے بعد کوئٹہ میں واقع بلوچستان یونیورسٹی کے 100 سے زائد اساتذہ نے ہائر ایجوکیشن کمیشن کو تبادلے کیلئے درخواستیں دے دی ہیں، جبکہ بلوچستان یونیورسٹی کے کئی اساتذہ نے اسلام آباد، پنجاب اور کراچی کی جامعات میں باقاعدہ تدریس بھی شروع کر دی ہے، واضح رہے کہ بلوچستان یونیورسٹی میں 500 کے قریب اساتذہ ہیں، جن میں 280 کے کا تعلق پنجاب، سندھ اور کراچی سے ہے مگر وہ برسوں سے کوئٹہ میں مقیم ہیں، ہائر ایجوکیشن کمیشن کے ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر سہیل نقوی کا کہنا ہے کہ بلوچستان یونیورسٹی کے اساتذہ کی جانب سے درخواستیں موصول ہو رہی ہیں جن میں انہوں نے اپنی پوسٹنگ بلوچستان سے باہر کرنے کی درخواست دی ہے، اگر یہی حال رہا تو بلوچستان کے اعلیٰ تعلیمی ادارے

اساتذہ سے خالی ہو جائینگے۔

یوں تو پاکستان کے مختلف شہروں میں سیاسی کارکنوں کے ساتھ ساتھ اب اساتذہ کو بھی ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بنایا جارہا ہے، بالخصوص کوئٹہ، لاہور اور کراچی میں اِس طرح کی وارداتیں رونما ہورہی ہیں، جس پر طلباء اور اساتذہ اور محب وطن حلقے سراپا احتجاج بنے ہوئے ہیں، بلوچستان میں دہشت گردی، بدامنی، سیاسی حقوق کے حصول کیلئے، عسکری اور نظریاتی مزاحمت کے نتیجے میں انارکی اور ٹارگٹ کلنگ کی سے جو بدترین صورتحال پیدا ہوئی ہے، اسے جامعہ بلوچستان کی ایک درمند، انسان دوست اور خلیق معلّمہ پروفیسر ناظمہ طالب کے وحشیانہ قتل کے پس منظر میں ایک دردانگیز سانحہ اور ناقابل بیان المیہ ہی کہا جاسکتا ہے، جس سے اُن بلوچ سیاسی قوتوں کو جو وسائل کے جائز اور معقولیت پر مبنی مطالبات کیلئے پرامن جدوجہد کررہے ہیں، شدید اور ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔

بلوچستان میں ٹارگٹ کلنگ اب شعلہ جوالہ بن چکی ہے، جسے بجھانے کی فوری ضرورت ہے، دیکھا جائے تو مظلومیت اور محکومیت پورے ملک کی غریب عوام کی مشترکہ میراث ہے، اسلیئے مسلح جدوجہد میں مصروف عناصر کو ہمارا دردمندانہ مشورہ ہے کہ ٹارگٹ کلنگ اور بدامنی مسئلے کا حل نہیں ہے، حقوق کے حصول

کیلئے سیاسی جدوجہد کے آئینی و جمہوری راستے تلاش کرنے چاہیے جو ہمیشہ کھلے رہتے ہیں، یاد رکھیں کہ معصوم اور بے گناہ انسانوں کو قتل کرنے سے کوئی تحریک اور عوامی جدوجہد کبھی بھی مقامی، قومی اور بین الاقوامی ہمدردی کی مستحق نہیں ٹھہرتی، یہ بات بلوچستان میں تمام متحارب قوتوں کو یاد رکھنی چاہیے۔اِس وقت بلوچستان صوبائی اور مرکزی حکومت کی انتہائی توجہ کا طالب ہے۔ اسلئے کہ وہاں بیرونی اور اندرونی وطن دشمن عناصر کی پوری کوشش ہے کہ بلوچستان کو محض بلوچوں کا مرکز بنا دیا جائے اور ایسے حالات پیدا کردیئے جائیں کہ وہاں دوسرے صوبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ نہ تو رہ سکیں اور نہ ہی ملازمت کرسکیں، جبکہ پاکستان ایک ایسی وحدت ہے جس میں ہر پاکستانی جس صوبے میں چاہے جائے، رہے اور وہاں ملازمت کرسکتا ہے، خیال رہے کہ صوبوں کی تقسیم کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ جتنے صوبے اتنے پاکستان، مگر حکمرانوں کی ناعاقبت اندیشی اور حالات و واقعات سے یوں لگتا ہے کہ ملک دشمن قوتیں بلوچستان کو ایک ایسا صوبہ بنایا چاہتی ہیں جہاں کسی اور صوبے کے باشندے نہ تو قیام کرسکیں اور نہ ہی ملازمت، لیکن اگر یہی حال رہا تو وہ وقت دور نہیں جب ہر صوبے کا رہنے والا اپنے صوبے میں کسی اور صوبے کے فرد کا وجود برداشت کرنے پر تیار نہیں ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ اساتذہ اور اہل علم و دانش قوموں کے بہترین مستقبل کے معمار

اور ضامن ہوتے ہیں، اِن کا یوں کھلے عام قتل، علم و حکمت اور فکر و شعور کا قتل اور ملک و قوم کے مستقبل کو جہالت اور ذلت و گمراہی کے اندھیروں میں دھکیلنے کی منظم سازش کا حصہ ہے، بلوچستان میں علم کے چراغوں کو بجھانے کا جو عمل علم دشمن قوتوں نے شروع کیا ہے، وہ ہم سب کیلئے لمحہ فکریہ ہے، آج اگر یہ عمل نہیں رکا تو یاد رکھیں کہ مستقبل میں اہل نظر انسان دوست، جمہوریت پسند اور بلوچستان کی آئندہ نسلیں جامعہ بلوچستان کے در و دیوار سے لپٹ کر روئیں گی، یہ امر معنی خیز ہے کہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت صرف اُن لوگوں کو قتل کیا جارہا ہے جو مقامی نہیں ہیں، دوسرے لفظوں میں تمام آباد کاروں کیلئے عدم تحفظ کی صورتحال پیدا کی جارہی ہے، یہ صورتحال صوبے کی ترقی و خوشحالی کے ساتھ ملک و قوم کیلئے بھی شدید نقصان دہ ہے، پروفیسر، ڈاکٹر اور انجینئر جو اِس صوبے کے عوام کی برسہا برس سے خدمت کررہے ہیں، کا صوبے کی تعمیر و ترقی میں نمایاں کردار ہے، اِن کی ہلاکتوں کا واضح مقصد صوبے کی ترقی کے خلاف ایک منظم اور گھناؤنی سازش ہے، جو عناصر بھی اِن مذموم کاروائیوں میں ملوث ہیں وہ کسی صورت بھی صوبے کی عوام کے دوست نہیں ہیں اور انہیں کسی طور بھی بلوچوں اور پختونوں کا ہمدرد قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اس وقت بلوچستان اپنی تاریخ کے انتہائی نازک ترین دور سے گزر رہا ہے، حکومت

کی جانب سے ساحلی علاقے گوادر سے لے کر تمپ، تربت، مند، خضدار، ڈیرہ بگٹی، سبی، کوہلو، خاران، مستونگ اور صوبے کے دار لحکومت کوئٹہ تک، دہشت گردی کے سدباب میں زمینی حقائق سے جڑے ہوئے انتظامی فیصلوں کی شدید کمی محسوس ہوتی ہے، اِسی وجہ سے مستقبل قریب میں شورش اور دہشت گردی کے بنیادی تدارک اور عوام کی جائز شکایات اور سیاسی قوتوں سے مکالمے اور دو طرفہ بات چیت کا کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا، حکومت کی طرف سے محض وقت گزاری اور صوبے کے سیاسی، سماجی اور زمینی حقائق سے اغماض برتنے کی جو بھاری قیمت اِس بدنصیب صوبے کی دکھی عوام اور قوم کو ادا کرنا پڑ رہی ہے، کیا وہ ہمارے ارباب اقتدار کی آنکھیں کھولنے کیلئے کافی نہیں ہے؟، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ امن و امان کے قیام کو اولین ترجیح دی جاتی اور عوام کے تمام طبقات بالخصوص آبادکاروں میں احساس تحفظ پیدا کیا جاتا، لیکن بلوچستان آج بھی بے معنی بیان بازی، الزام تراشی اور نیم دلانہ سرکاری کوششوں اور بدامنی کے اعصاب شکن اثرات و مضمرات کی لپیٹ میں ہے، لہٰذا ہم حکمرانوں سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ نوشتہ دیوار پڑھیں اور بلوچستان کی صحرائی ریت کے اندر سر چھپا کر حالات کو بہتر بنانے کے خواب دیکھنے کے بجائے، دیرپا مؤثر اور ایسے عملی اقدامات کریں، جس سے صوبے کی عوام کا احساس محرومی دور ہو سکے اور وہ بھی قومی دھارے میں شامل ہو کر ایک قوم ایک وحدت کا حصہ بن سکیں۔

استحقاق سے استثناء اور بریّت تک۔۔۔

سوئس کیسیز پر عمل درآمد اور حکومتی گرپائی

لو جناب۔۔۔۔۔ بالآخر وفاقی سیکرٹری قانون جسٹس (ر) عاقل مرزا نے بھی اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا، گو کہ انہوں نے اپنی خرابیِ صحت کو وجہ استعفیٰ بتایا ہے، تاہم ذرائع کہتے ہیں وزارت قانون سے اُن کے اختلافات چل رہے تھے اور انہیں این آر او کے فیصلے پر عملدرآمد کے حوالے سے حکومتی مؤقف سے اختلاف تھا، جس کے باعث انہوں نے سپریم کورٹ کے موڈ کو دیکھتے ہوئے شرمندگی سے بچنے کیلئے استعفیٰ دینا مناسب سمجھا، واضح رہے کہ جسٹس (ر) عاقل مرزا دوسرے سیکریٹری قانون ہیں، جنھوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دیا ہے، انہیں 23 دسمبر 2009ء کو وفاقی سیکریٹری قانون تعینات کیا گیا تھا، اُن سے قبل جسٹس (ر) ریاض کیانی بھی اپنے سے عہدے ہٹائے جا چکے ہیں، جبکہ این آر او پر فیصلہ آنے کے بعد حکومت سے اختلافات کے باعث سابق اٹارنی جنرل انور منصور خان (جنھوں نے وزیر قانون بابر اعوان کو سپریم کورٹ کے فیصلے پر عمل درآمد میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا تھا) اور وزارت قانون کے جوائنٹ سیکرٹری اکبر خان اچکزئی بھی اپنے عہدوں سے مستعفی ہو چکے ہیں، اِس طرح موجودہ حکومت کے

دور اقتدار میں اب تک 2 وفاقی سیکرٹری برائے قانون اور 3 اٹارنی جنرل اپنے عہدوں سے مستعفی ہو چکے ہیں، جبکہ این آر او سے متعلق سپریم کورٹ کے فیصلے کے روشنی میں چیئرمین نیب نوید احسن اور پراسیکیوٹر جنرل ڈاکٹر دانشور ملک کو بھی ان کے عہدوں سے ہٹا دیا گیا تھا۔

جمعرات کے روز نئے اٹارنی جنرل مولوی انوار الحق نے مستعفی ہونے والے سیکریٹری قانون عاقل مرزا کی جانب این آر او پر عمل درآمد کے حوالے سے حکومتی مؤقف پیش کرتے ہوئے عدالت عظمٰی کو بتایا تھا کہ این آر او پر عدالتی فیصلہ آنے کے بعد سوئس مقدمات دوبارہ شروع کرنے کے حوالے سے حکومت نے سوئس حکام کو خط نہیں لکھا، عدالت میں پیش کیے گئے اِس تحریری جواب میں کہا گیا تھا کہ چونکہ آصف علی زرداری کے خلاف مقدمات ختم ہو چکے ہیں، لہٰذا اِن مقدمات کو دوبارہ شروع کرنے کے لیے خط وکتابت کا کوئی جواز نہیں ہے، سپریم کورٹ نے اِس بیان پر قومی احتساب بیورو کے چیئرمین اور سبکدوش ہونے والے سیکرٹری قانون عاقل مرزا کو 13 مئی کو عدالت میں طلب کیا تھا، لیکن وفاقی سیکرٹری قانون نے اِس سے قبل ہی استعفٰی دے کر ثابت کر دیا کہ وہ سپریم کورٹ کے سامنے بدعنوانوں کا زیادہ دیر دفاع کرنے کے قابل نہیں تھے۔

قارئین محترم آپ کو یاد ہوگا کہ 16 دسمبر 2009ء کو سپریم کورٹ نے این آر او

کے متنازعہ قانون کے خاتمے اور اس قانون کے تحت تمام مقدمات کی بحالی کا حکم دیتے ہوئے حکومت کو یہ ہدایت بھی کی تھی کہ وہ سوئس عدالت میں مقدمات کی بحالی کے لیے دوبارہ خط لکھے۔ عدالت عظمیٰ نے سابق اٹارنی جنرل جسٹس (ر) ملک قیوم کو بھی سخت سرزنش کرتے ہوئے اُن کے خلاف کاروائی کی ہدایت کی تھی، جنھوں نے سوئس عدالتوں میں آصف زرداری کے خلاف بدعنوانی کے مقدمات ختم کرنے کے لیے خط لکھا تھا، لیکن حکومت کی جانب سے بار بار یقین دہانیوں کے باوجود عدالت عظمیٰ کے فیصلوں پر ابھی تک عملدرآمد نہیں ہوسکا، لہٰذا فیصلے پر عملدرآمد کی نگرانی کرنے کے لئے عدالت عظمیٰ نے جسٹس ناصر الملک کی سربراہی میں چار رکنی لارجر بنچ تشکیل دے رکھا ہے، یہاں یہ اَمر بھی قابل توجہ ہے کہ نیب دستاویزات کے مطابق آصف زرداری کے خلاف بیرون ملک ڈیڑھ ارب ڈالر کے اثاثوں اور پاکستان میں 22 ارب روپے کی بدعنوانی کے مقدمات قائم تھے، جو این آر او کے تحت ختم کردیے گئے تھے، واضح رہے کہ جس وقت یہ مقدمات قائم ہوئے تھے آصف زرداری اُس وقت صدر نہیں تھے، لیکن جب سپریم کورٹ نے این آر او کو غیر قانونی قرار دیا تھا، آصف زرداری صدر مملکت کے منصب پر فائز ہوچکے تھے، اِس لحاظ سے صدر کے استثنٰی کا سوال اپنی جگہ بہت اہمیت کا حامل ہے، جبکہ صدر مملکت آصف زرداری کے خلاف بدعنوانیوں کے مقدمات کی بحالی کے سلسلے میں حکومت کا مسلسل یہ مؤقف تھا کہ صدر کو عدالت میں پیشی اور مقدمہ چلائے جانے سے استثنٰی حاصل ہے، لیکن اب حکومت نے واضح طور پر یہ مؤقف

اختیار کرلیا ہے کہ سوئس عدالتوں میں آصف زرداری کے خلاف ختم شدہ مقدمات کو دوبارہ کھولے جانے کیلئے کسی قسم کی خط وکتاب کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن گزشتہ جمعرات کے روز اٹارنی جنرل نے جس انداز سے سابق سیکریٹری قانون کا تحریری بیان عدالت میں پیش کیا، اُس کے بعد اداروں کے تصادم اور توہین عدالت کی کاروائی کے امکانات بھی پیدا ہوگئے ہیں اور یہ سوال مزید ابھر کر سامنے آگیا ہے کہ صدر آصف زرداری کو استثنٰی حاصل ہے کہ نہیں۔

حقیقت حال یہ ہے کہ ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کے فیصلے پر عملدرآمد میں تاخیری حربے اختیار کرنے اور بعد ازاں عدالتی حکم کو ماننے سے انکار کرکے حکومت ایک ایسے راستے پر چل پڑی ہے جس کا اختتام اندھی کھائی پر ہوتا ہے۔ پاکستان کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ جب کسی حکومت نے سپریم کورٹ سے تصادم کی راہ اختیار کی تو انجام کار وہ حکومت ہی ختم ہوگئی۔ اِس تناظر میں دیکھا جائے تو موجودہ حکومت نے صحرا کی تپتی ہوئی ریت پر چلنے اور جانتے بوجھتے انگاروں سے کھیلنا شروع کر دیا ہے۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ صدر آصف علی زرداری جن مشیروں کے رحم و کرم پر ہیں انہوں نے ہی صدر کو عدلیہ کے ساتھ تصادم کی راہ دکھائی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ مشیر اپنے آپ کو شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں یا پھر کسی ایسی قوت کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں جو صدر زرداری کو ایوان صدر سے باہر دیکھنا

چاہتی ہے۔

دنیا بھر کے مہذب معاشروں کا اصول و قاعدہ یہ ہے کہ جب بھی کسی حکومتی ذمہ دار پر کوئی الزام لگتا ہے، اِس سے قطع نظر کہ وہ الزام سچا ہے یا جھوٹا، اُس شخص کیلئے لازم ہوتا ہے کہ اگر وہ بے گناہ ہے تو خود کو اُس ملک اور معاشرے میں رائج طریقہ کار کے مطابق بے گناہ ثابت کرے، محترم صدر آصف علی زرداری کے ساتھ بھی کچھ اِسی قسم کا معاملہ ہے، سوئس اکاؤنٹس میں اُن کے نام سے منسوب رقم کے حوالے سے پوری قوم اور عدلیہ یہ جاننا چاہتی ہے کہ وہ کس طریقے سے حاصل کی گئی یا کمائی گئی ہے تو اُس کو عدالت اور قوم کے سامنے لانے میں کیا حرج ہے، لیکن جب صدر اور اُن کے رفقاء سوئس کیسز کو نہ کھولنے اور صدارتی استثناء کی بات کرتے ہیں تو ہر کس و ناکس کے ذہن میں یہ شک گزرتا ہے کہ شائد وہ دولت ناجائز ذرائع سے حاصل کی گئی ہے، اگر ایسا نہیں ہے تو صدر صاحب یہ بات عدالت کے روبرو کیوں ثابت نہیں کر دیتے کہ سوئس اکاؤنٹ میں موجود رقم اُن کی جائز کمائی سے حاصل کی گئی ہے، لیکن اگر اس کے برخلاف سوئس کیسز کے حوالے سے حکومت اور صدر کی گریزپائی یونہی چلتی رہی تو سوئس اکاؤنٹس کے بارے میں لوگ یہی گمان کریں گے کہ اُن میں رکھی گئی رقم کرپشن اور ناجائز ذرائع سے حاصل کی گئی ہے۔

اس موقع پر سابق اٹارنی جنرل انور منصور خان کی جانب سے اٹھایا گیا یہ سوال بہت اہمیت کا حامل ہے کہ "اگر سوئٹزر لینڈ کے اٹارنی جنرل یہ کہہ رہے ہیں کہ صدر آصف علی زرداری کو بین الاقوامی قوانین کے مطابق تحفظ حاصل ہے پھر بھی حکومت پاکستان کی جانب سے خط نہ لکھنے کی وجہ سمجھ سے بالاتر ہے۔" سابق اٹارنی جنرل کا یہ بھی کہنا ہے کہ کوئی بھی شخص قانون سے بالاتر نہیں ہے، ملک کے ادارے تب تک مضبوط نہیں ہوں گے جب تک تمام ادارے اپنے اپنے دائرہ کار میں رہ کر کام نہ کریں، عدالتی فیصلے پر عملدرآمد نہ کرنا نہ صرف توہین عدالت بلکہ عدالتی معاملات میں مداخلت بھی ہے، اگر سپریم کورٹ کے فیصلے پر عمل درآمد نہ کیا گیا تو عدالت خود عمل کرائے گی، جس سے شدید تصادم ہوگا، جبکہ سپریم کورٹ سے جھگڑا کرنے والا کبھی نہیں جیتا ہے، یہ درست ہے کہ پاکستانی آئین صدر پاکستان کو یہ استثنٰی دیتا ہے، لیکن ہماری اسلامی روایات اور تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں جب حاکم وقت پر کوئی الزام لگا تو وہ مدعا علیہ کے طور پر مدعی کے ساتھ عدالت کے روبرو پیش ہوئے، اس عمل سے نہ تو اُن کا استحقاق مجروح ہوا، نہ ہی انہوں کسی استثناء کا تقاضہ کیا اور نہ ہی یہ گوارا کیا کہ منصب قضاء پر موجود قاضی الزامات سے باعزت بریت تک عزت و احترام سے پیش آئے اور اُن کی حمایت، ہمدردی اور طرفداری کا مظاہرہ کرے۔

اُمر واقعہ یہ ہے کہ اِس وقت عدلیہ جو عوامی تحریک کے نتیجے میں آزاد ہوئی ہے، اس بدقسمت قوم کی آخری اُمید اور سہارا ہے اور وہ عوامی و قومی مفادات اور ملکی سلامتی کے مسائل پر مسلسل نوٹس لے رہی ہے، دوسری طرف مہنگائی، بیروزگاری، بدامنی اور دہشت گردی کے ساتھ کرپشن اور حکومت کی بدترین طرزِ حکمرانی نے قومی بحران کی شدت میں اضافہ کردیا ہے، ان حالات میں وفاقی حکومت آئین و قانون اور اصول و قواعد سے مسلسل انحراف کے باوجود نوشتہ دیوار کو پڑھنے کے بجائے چند افراد کے مفادات کے تحفظ کیلئے سیاسی نظام کو خطرے میں ڈال رہی ہے، اِس صورتحال میں جمہوریت کی بقاء اور پارلیمنٹ کی بالادستی کا سیاسی نعرہ بھی کچھ کام آتا دکھائی نہیں دے رہا، گو کہ صدر یا وزیراعظم اور پیپلزپارٹی کی حکومت کے ترجمان مسلسل یہ دعویٰ کررہے ہیں کہ وہ عدالت عظمیٰ میں اپنا قانونی مؤقف پیش کررہے ہیں اور عدلیہ سے ٹکراؤ کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے، لیکن حکومت اور حکومتی ذمہ داران کا طرز عمل اِن کے بیانات کی تصدیق نہیں کررہاہے، حال یہ ہے کہ اب تو خود پیپلزپارٹی کے داخلی حلقوں میں بھی تنقید شروع ہوچکی ہے اور بغاوت کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں، اس کے باوجود عارضی طاقت و حکومت اور پس پردہ قوتوں کی پشت پناہی کے گھمنڈ میں مبتلا ارباب اقتدار کو اصل زمینی حقیقت سمجھ نہیں آرہی ہے اور وہ سیاسی حقیقت پسندی تحت فیصلے کرنے کے بجائے جان بوجھ کر محاذ آرائی کا ایسا راستہ اختیار کررہے ہیں، جس کا انجام سوائے تباہی اور بربادی کے اور کچھ

نہیں۔۔۔۔

پاکستان امریکی خونی تصنیف کا نیا باب

اپنی سلامتی تحفظ اور بقاء کی جنگ تنہا ہی لڑنا ہوگی۔۔۔۔۔

"دہشت گردی کے خلاف جنگ کا آغاز القاعدہ سے ہوتا ہے، لیکن یہ وہاں پر ختم نہیں ہوجائے گی، یہ اُس وقت تک ختم نہیں ہوگی جب تک دنیا کا ہر دہشت گرد گروپ تلاش نہیں کر لیا جاتا، اُسے غیر مؤثر نہیں کردیا جاتا اور اُسے شکست سے دوچار نہیں کردیا جاتا، یہ لوگ بیسویں صدی کے خونخوار نظریے کے وارث ہیں، ہمارے رد عمل میں فوری انتقام اور منفرد حملوں سے کہیں زیادہ دوسری کاروائیاں شامل ہیں، یہ ایک طویل مہم ہے جو پہلے کسی نے نہیں دیکھی.....دنیا کے ہر گوشے میں موجود ہر ملک کو فیصلہ کرنا ہوگا، یا وہ ہمارا ساتھی ہے یا پھر دہشت گردوں کا.....طالبان دہشت گردوں کو ہمارے حوالے کردیں یا پھر اُنہی کے مقدر سے ہمکنار ہونے کیلئے تیار ہوجائیں۔"

نائن الیون کے بعد سابق امریکی شہنشاہ معظم جلالۃ الملک جارج ڈبلیو بش کی دلائل و استدلال سے عاری، مگر اشتعال و رعونت سے بھرپور یہ وہ تقریر ہے، جس نے اکیسویں صدی میں لامحدود عسکری قوت کے بل بوتے پر دنیا میں امریکی مظالم

کا ایک نیا دیباچہ روم کیا، سچ ہے رعونت اور طاقت کا گھمنڈ جب اپنی انتہاؤں پر پہنچ جاتا ہے تو خون آشام بھیڑیئے اور فرعونی طاقتیں الفاظ کے معنی و مفہوم بدل کر نئی اصطلاحیں تراشتی ہیں، نئی ڈکشنری ایجاد کرتی ہیں اور طاقت، دھونس، بدمعاشی کی بنیاد پر اُسے کمزور و غریب ممالک پر لاگو کرتی ہیں، آج امریکہ نے جس چیز کو دہشت گردی کا نام دے رکھا ہے، ساری دنیا جانتی ہے کہ اُس کے اصل اور پس پردہ مقاصد کچھ اور ہی ہیں اور آج امریکہ دنیا میں جس آزادی، جمہوریت اور انسانیت اور انسانی حقوق کے تحفظ کی علمبرداری کا دعویدار ہے، اُس کے خون آمیز تجریدی نقوش سے ساری دنیا کے در و دیوار رنگین ہیں۔

آج بھی سابق صدر بش کی نفرت اور زہر میں بجھی تقریر کے دیباچے کو موجودہ امریکی انتظامیہ ایک باب کی شکل دے کر دنیا میں اپنی بے مہار سپرپاور ہونے کی "کتاب" لکھ رہی ہے، نائن الیون کے بعد سے افغانستان، عراق اور پاکستان کے قبائلی علاقوں میں امریکی مظالم سے بھرے اِس تصنیف کے مسلسل نئے نئے باب لکھے جا رہے ہیں اور ہر آنے والے دن کے ساتھ انسانی خون سے لبریز اِس خونی تصنیف کے صفحات میں اضافہ ہو رہا ہے، یہ اضافہ اُس وقت تک جاری رہے گا، جب تک کہ سابق صدر بش کے ایجاد کردہ بیسویں صدی کے خونخوار نظریئے کے وارث دہشت گرد گروپ تلاش کرکے ختم نہیں کر دیئے جاتے، گزشتہ دنوں ٹائم اسکوائر کے

واقعہ میں ملوث امریکی شہری فیصل شہزاد کے حوالے سے پاکستان کے خلاف موجودہ
امریکی شہنشاہ معظم اوباما (جن کے بارے میں ہماری خوش فہم اور فریب زدہ قیادت
کو بہت امید تھی) کی چیلی اور دست راست ہلیری کلنٹن کی جانب سے دیا گیا
بیان "مستقبل میں ٹائمز سکوائر جیسے واقعہ میں پاکستان سے تعلق پایا گیا تو اُسے اِس کے
سنگین نتائج بھگتنا ہوں گے" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی اور امریکی ارادوں کی ترجمانی کے
ساتھ پاکستان کے خلاف امریکہ کے اصلی روپ اور مزموم عزائم کی عکاسی کررہا
ہے،امریکی وزیر خارجہ کا کہنا تھا کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان ڈرائیونگ
سیٹ پر ہے اور اِسے مزید اقدامات کرنا ہوں گے، اپنی دھمکی کو مزید آگے بڑھاتے
ہوئے موصوفہ نے یہ الزام بھی لگایا کہ پاکستانی حکومت میں ایسے لوگ موجود ہیں جو
جانتے ہیں کہ اسامہ بن لادن اور ملا عمر کہاں ہیں، دوسری طرف امریکی اٹارنی جنرل
نے ٹائمز اسکوائر سازش میں پاکستانی طالبان کو ملوث قرار دیتے ہوئے شمالی وزیرستان
میں بھی آپریشن کا مطالبہ کیا ہے۔
قارئین محترم جہاں تک ٹائم سکوائر والے واقعے کا تعلق ہے تو یہ بات واضح ہے کہ یہ
ڈرامہ صرف پاکستان کے خلاف دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی ایک سازش ہے،
اَمر واقعہ یہ ہے کہ امریکہ جیسے ملک (جہاں اسلحہ تو بہت دور کی بات ہے) میں ایک
چاقو اور چھری کی فروخت کا بھی ریکارڈ رکھا جاتا ہو، وہاں

اِس قسم کے دھماکہ خیز مواد تک فیصل شہزاد کی رسائی کیسے ممکن ہوئی اور یہ کیسے ممکن ہوا کہ فیصل شہزاد نے پنسلوانیا ریاست کے ایک قصبے سے بم میں استعمال ہونے والے کیمیکل کی آٹھ بوتلیں خریدیں، اگر ایسا تھا تو اُس وقت اُس پر ہاتھ کیوں نہیں ڈالا گیا اور کیوں اسے یہ موقع فراہم کیا گیا کہ وہ کار کو دھماکے کیلئے تیار کرکے نیویارک کے ٹائمز اسکوائر میں چھوڑ کر چلا جائے۔ اگر فیصل شہزاد کی ڈرامائی گرفتاری سے لے کر فرد جرم عائد کرنے اور اقرار جرم کرنے تک کے تمام حالات واقعات پر گہری نظر ڈالی جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ ڈرامہ بش عہد کی واپسی اور پاکستان کو ڈو مور پر آمادہ کرنے کا نیا امریکی حربہ ہے۔

اِس سارے ڈرامے کا حیران کن پہلو یہ ہے کہ بالفرض محال اگر ٹائم اسکوائر کا واقعہ حقیقت سے تعلق بھی رکھتا ہے تو اسے صرف فیصل شہزاد کا ذاتی فعل ہی قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ وہ امریکی شہریت رکھتا ہے اور ایک امریکی شہری ہونے کے ناطے اُس کے جرم کی تمام تر ذمہ داری امریکہ پر ہی عائد ہوتی ہے، پاکستان پر نہیں، لیکن اِس حقیقت کے باوجود امریکی وزیر خارجہ پاکستان کو دھمکیاں دے رہی ہے، اِس سارے قضیئے میں امریکی دھمکیوں سے یہ بات اور بھی زیادہ واضح ہو کر سامنے آ رہی ہے کہ ٹائم سکوائر والا واقعہ امریکہ کا اپنا تیار کردہ ڈرامہ ہے، جس کا مقصد پاکستان کو بلیک میل کرکے اپنے مفادات

حاصل کرنا ہیں، دراصل امریکہ چاہتا ہے کہ قبائلی علاقوں اور افغان سرحدوں سے لے کر پنجاب اور پورے پاکستان میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کا دائرہ وسیع کیا جائے تاکہ اس بہانے سے اسے پاکستان میں مکمل مداخلت اور ایٹمی اثاثوں تک رسائی کا موقع حاصل ہوسکے، مگر جب تک ایک بھی پاکستانی زندہ ہے، یہ امریکی عزائم کبھی بھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔

آج ماضی کے حکمرانوں کی غلطیوں اور موجودہ حکمرانوں کی کمزوری وڈھیل کا فائدہ اٹھا کر امریکہ اپنے اتحادیوں کے ساتھ بدو کے اونٹ کی مانند پورے کا پورا پاکستان میں داخل ہونا چاہتے ہیں، دوسری طرف حکمرانوں کی غلطیوں اور ناعاقبت اندیشی کے سبب ہم امریکی جال میں پھنستے جارہے ہیں، حال یہ ہوگیا ہے کہ امریکہ کے مطالبات مانتے مانتے آج ہم تباہی کے دہانے تک پہنچ چکے ہیں، یہ انتہائی افسوسناک بلکہ تشویشناک صورتحال ہے کہ پرویز مشرف دور میں دہشت گردی کے خاتمہ کے نام پر پاکستان نے امریکی مفادات کی جنگ میں فرنٹ لائن اتحادی بن کر خود کو بدترین دہشت گردی اور خودکش حملوں کا نشانہ بنوایا، ہزاروں بے گناہ انسانوں کی جانیں ضائع ہوئیں، ملکی معیشت کو 40 ارب ڈالر سے زائد کا نقصان پہنچا، لیکن اس کے باوجود آج امریکہ اپنے فرنٹ لائن اتحادی کے خلاف ایک خود ساختہ معمولی واقعہ کو بنیاد بنا کر بدترین دشمنوں جیسا رویہ اختیار کئے ہوئے ہے، اِن حالات میں ہمارا ارباب اقتدار سے سوال یہ ہے

کہ امریکی ڈو مور کا سلسلہ کب تک چلتا رہے گا؟ اور کب تک ہمارے حکمران عقل و خرد سے عاری قومی مفادات کے منافی فیصلے کرتے رہیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ امریکہ اب اپنے اصل عزائم کے ساتھ کھل کر سامنے آچکا ہے، وہ ہر حال میں پاکستان کو غیر مستحکم کرنا چاہتا ہے، اُس نے فیصل شہزاد کا تعلق پاکستانی طالبان کے ساتھ جوڑ کر اِس سارے معاملے کو ایک نیا رنگ دینے کی کوشش کی ہے، اِس کے حوالے سے جو باتیں منظر عام پر آرہی ہیں، اُن کی روشنی میں تو ٹائم سکوائر کا نام نہاد واقعہ ممبئی حملوں کی طرح ہی خانہ ساز نظر آتا ہے، جس کا مقصد پاکستان پر ملبہ ڈالنے کے سوا اور کچھ نہیں، اسلیئے موجودہ امریکی رویئے سے یہ بات بھی واضح ہو رہی ہے کہ فیصل شہزاد کے معاملے کو پاکستان پر دباؤ ڈالنے کے لئے استعمال کیا جارہا ہے، اِس وجہ سے فیصل شہزاد کا معاملہ حقیقت سے زیادہ ڈرامہ لگتا ہے۔

دراصل امریکہ اور اُس کے حواری نہیں چاہتے کہ پاکستان میں امن و سکون ہو اور پاکستانی فوج اپنے اصل دشمن اور اہداف کی جانب متوجہ ہو، امریکی حکمت عملی یہی ہے کہ پاکستانی فوج کو اندرونی محاذوں پر الجھا کر رکھا جائے تاکہ وہ بیرونی محاذوں پر توجہ نہ دے سکے، چنانچہ جونہی وہ کسی علاقے کے آپریشن سے فارغ ہوتی ہے، اُسے ایک نئے علاقے میں آپریشن کے امریکی مطالبے کا سامنا

کرنا پڑتا ہے، سوات کے بعد جنوبی وزیرستان اور اب شمالی وزیرستان اور عین ممکن ہے کہ عنقریب جنوبی پنجاب کی بھی باری آجائے۔ امریکہ چاہتا ہے کہ اب آگ وخون کی بارش کا کھیل قبائلی علاقوں اور پاک افغان سرحدوں سے نکل کر پنجاب میں داخل ہو جائے۔

ایک طرف جہاں امریکہ اور بھارت ایک منظم سازش کے تحت پاکستان کے خلاف گھیرا تنگ کرنے کیلئے ڈرامے رچا رہے ہیں، وہیں سب زیادہ تشویش ناک بات یہ ہے کہ ہمارے حکمران امریکی احکامات اور ہدایات کی بجاآوری میں مسلسل سر تسلیم خم کرتے نظر آرہے ہیں، ماضی کے حکمرانوں کی ہوس اقتدار اور موجودہ حکمرانوں کے ذاتی مفادات نے امریکہ کو اتنی ڈھیل دے دی کہ اب وہ پاکستان کو کمزور کرکے اپنی کالونی بنانے کی سازشوں میں مصروف ہے، اِن حالات میں ضروری ہوگیا کہ امریکی کمبل سے جان چھڑالی جائے، فرنٹ لائن اتحادی کا کردار ترک کیا جائے اور ایک ایٹمی قوت کے حامل، آزاد و خودمختار ملک ہونے کی حیثیت سے امریکہ پر واضح کردیا جائے کہ اب ہم تیرے مزید ناز نخرے اور نادر شاہی احکامات برداشت نہیں کریں گے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ امریکی وزیر خارجہ اور دیگر آفیشل کے بیانات پاکستان کے اندرونی معاملات میں کھلی مداخلت اور واضح دھمکی کے

مترادف ہیں، جس پر محض رسمی رد عمل کا اظہار کافی نہیں، ہماری حکومتی اور عسکری قیادت کو دو ٹوک الفاظ میں امریکہ کو باور کرانا ہوگا کہ وہ ہمیں اپنے لئے نرم چارہ نہ سمجھے، اگر اس نے ہماری سالمیت اور خود مختاری پر وار کرنے کی کوشش کی تو اسے لوہے کے چنے چبانا ہوں گے، جبکہ یہی وقت خود کو امریکی مفادات کی جنگ سے باہر نکالنے اور امریکہ پر یہ بات واضح کر دینے کا ہے کہ اب امریکی خواہشات کی خاطر پاکستان کے امن و سکون، قومی سلامتی اور استحکام کو داؤ پر نہیں لگایا جا سکتا۔

اِس نازک وقت میں ہمارے حکمرانوں کو کسی مجبوری اور پس و پیش سے کام نہیں لینا چاہئے، کیونکہ اِس وقت امریکی وزیر خارجہ کے بیان کے بعد پاکستان دشمنی کے معاملہ میں امریکہ اور بھارت میں کوئی فرق محسوس نہیں ہو رہا، آپ کو یاد ہوگا کہ بھارت کی جانب سے بھی اسی طرح ممبئی حملوں کے خود ساختہ ڈرامہ کا ملبہ پاکستان پر ڈالنے کی سازش کی گئی تھی اور نئی دہلی میں بھارتی وزیر داخلہ چدمبرم کے پہلو میں بیٹھ کر امریکی وزیر داخلہ رچرڈ گیٹس نے بھی بھارتی زبان میں ہمیں یہی باور کرایا تھا کہ اگر اب بھارت میں ممبئی حملوں جیسا کوئی دوسرا واقعہ ہوا، تو بھارت خاموش نہیں بیٹھے گا اور اُس کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑے گا، بالکل اُسی طرح اور اُسی لب و لہجے میں امریکی وزیر خارجہ نے بھی ٹائمز اسکوائر کے نام نہاد واقعہ کو بنیاد بنا کر پاکستان

کو باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اگر اب امریکہ میں ایسا کوئی واقعہ ہوا، تو پاکستان کو
اِس کے سنگین نتائج بھگتنا ہوں گے۔
زہر آلود رعونت میں ڈوبا اور اپنے حکم کا سکہ جمانے کیلئے بے تاب سابق صدر بش کا
لب و لہجہ گوری میم کی آواز میں آج پھر ہماری سماعتوں سے ٹکرا رہا ہے، نام نہاد
مہذب دنیا کی طاغوتی طاقت امریکہ کے نیو ورلڈ آرڈر کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے، لمحہ
فکریہ ہے خود فریبی اور خوش گمانیوں کے سراب میں مبتلا ہمارے حکمرانوں کیلئے....
کیونکہ کچھ بھی نہیں بدلا..... وہی رعونت، نفرت، بغض و عناد..... وہی الزامات در
الزامات کے تیر دشنام جو ہر سو بکھیرے ہوئے، ہمیں اِس حقیقت سے آگاہ کر رہے ہیں
کہ ہم زمانے بھر کیلئے خواہ کتنی ہی جنگیں کیوں نہ لڑتے رہیں، اُن کے حلیف اور فرنٹ
لائن اتحادی کا کردار کیوں نہ ادا کرتے رہیں، لیکن ہمیں اپنی بقاء، سلامتی، تحفظ و استحکام
اور عزت و وقار کی جنگ تن تنہا ہی لڑنا ہوگی۔

جو کبھی ہماری میراث، اساس اور شناخت تھا

کسی ملک اور معاشرے کی بقاء اخلاقی روایات کی پاسداری میں مضمر ہے

اخلاق کیا ہے اور اخلاقی قدریں کیا ہوتی ہیں، معاشرتی زندگی میں اِس کیا اہمیت و حیثیت ہوتی ہے، چند دنوں سے میڈیا میں یہی گفتگو موضوع بحث ہے۔دانشورانِ قوم، ہمارے رہبرانِ قوم اور حکومتی ذمہ داران کو اخلاق، اخلاقی قدریں اور اپنی اسلامی روایات و اساس یاد دلانے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن افسوس کہ یہ ساری بحث و مباحثہ آئین و قانون کی دفعات کے سامنے آکر دم توڑ دیتی ہے، کیونکہ آئین و قانون کی دفعات حکمرانوں پر اخلاقی روایات اور قدروں کے اطلاق کا تقاضہ نہیں کرتیں۔

ویسے بھی ہمارے یہاں رواج بن گیا ہے کہ اگر آئین و قانون کی دفعہ اجازت دیتی ہے تو پھر کسی اخلاقی ضابطے اور روایت پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں ہے،ارباب اقتدار سمیت معاشرے کا یہ مزاج، معاشرے کو تیزی سے معاشرتی انحطاط کی طرف لے جارہا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے معاشرے سے ایک دوسرے کا احساس، ہمدردی، لحاظ و مروت، رواداری، جذبہ قربانی اور خود احتسابی جیسی اعلیٰ

اخلاقی روایات کا مظاہرہ ناپید ہوتا جارہا ہے، ویسے بھی یہ اخلاقی قدریں اور روایات اُن معاشروں میں لاگو ہوتی ہیں، جہاں ضمیر زندہ ہوتے ہیں، جہاں آئین و قانونی اجازت کے باوجود اخلاقی قدریں راہ کی دیوار بن کر ایک فرد اور بالخصوص حکمرانوں کو خود احتسابی کیلئے پیش کرنے پر تیار کرتی ہیں، امریکہ، برطانیہ اور یورپ کے بہت سے ممالک میں آج بھی ہمیں اِس کی نظیریں ملتی ہیں۔

لیکن اگر نہیں ملتی تو ہمارے ملک اور ہمارے معاشرے میں نہیں ملتی، المیہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں کسی میں اتنی جرات نہیں کہ وہ آگے بڑھ کر خود کو احتساب کیلئے پیش کر کے ایسی کوئی مثال قائم کرے، پھر ایسی صورتحال میں ہم کیوں اپنے رہبرانِ قوم سے اخلاقی تقاضے پورے کرنے کی توقع رکھتے ہیں، کیوں چاہتے ہیں کہ وہ اعلیٰ اخلاق کا نمونہ پیش کریں، تعفن زدہ سڑے ہوئے معاشروں میں ایسا ہی ہوتا ہے، اب اگر ایک ایسے معاشرے میں صدر مملکت رحمان ملک کی سزا معاف کردیتے ہیں تو کیا برا کرتے ہیں، اخلاقی قدریں اجازت دیں یا نہ دیں، آئین و قانون تو اجازت دیتا ہے، لہٰذا ایسی صورت میں حکمرانوں کو اخلاقی ضابطے اور قدریں یاد دلانے کا کیا فائدہ، ہماری نظر میں یہ کار عبث کے سوا اور کچھ نہیں۔

کیونکہ پاکستان کا آئین و قانون صدر مملکت کو آئین کی دفعہ 45 کے تحت یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ کسی کی بھی سزا معاف کر سکتے ہیں، آئین کی یہ دفعہ انہیں یہ اختیار دیتی ہے کہ وہ کسی عدالت، ٹربیونل یا دیگر مجاز اتھارٹی کی جانب سے دی گئی سزا کو معاف، ملتوی، مؤخر،اُس میں تخفیف اور اُسے معطل یا تبدیل کر سکتے ہیں، البتہ سپریم کورٹ جو آئین کی تشریح کی مجاز اتھارٹی ہے، ایسے کسی کیس میں صدر کی جانب سے استعمال ہونے والے اِس اختیار کا جائزہ لے سکتی ہے کہ یہ اختیار کسی بدنیتی کے تحت تو استعمال نہیں کیا گیا، اب یہ عدالت عظمیٰ کو دیکھنا ہے کہ صدر مملکت نے یہ اختیار سزا کے حتمی مرحلے کی تکمیل پر استعمال کیا ہے یا اُس سے قبل اور یہ کہ کیا رحمان ملک کے پاس ہائیکورٹ کے فیصلے کیخلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کرنے کا موقع موجود تھا یا نہیں ؟اِس کے ساتھ ہی یہ سوالات بھی اپنی جگہ وضاحت طلب ہیں کہ صدر کی جانب سے سزاؤں کی معافی کی صورت میں کیا رحمان ملک کی حیثیت ایک سزا یافتہ مجرم کی نہیں رہی، کیا اُن کو اُن تمام قانونی پابندیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا جس کا عموماً ایک مجرم کو ہوتا ہے اور کیا ایسی صورت میں وہ ایوان بالا کے رکن رہنے کے اہل رہیں گے ؟

بہر حال اِن سارے سوالات کے جوابات تو آنے والے وقت ہی بہتر دے گا، لیکن یہاں ایک بات تو طے ہے کہ صدر نے جو کچھ کیا، انہیں اُس کا اختیار حاصل تھا ،

سزا کی معافی کی سمری پیش کرنا وزیر اعظم گیلانی کے دائرہ کار میں تھی، عدلیہ کے فیصلے کو چند گھنٹوں کے اندر اندر مسترد کر دینے میں بھی بظاہر کسی آئینی شق کی خلاف ورزی نہیں ہوتی اور لاہور ہائیکورٹ سے سزا اور سندھ ہائیکورٹ سے ضمانت کی گنجائش بھی ہمارا قانون فراہم کرتا ہے، لیکن اگر کوئی مسئلہ ہے تو وہ اخلاقی روایات کا ہے، پامالی ہوئی ہے تو وہ اُن اخلاقی اصولوں اور قدروں کی ہوئی ہے جو کبھی ہماری میراث، اساس، شناخت اور خاصہ تھیں۔

یہ حقیقت اظہر الشمس ہے کہ اخلاقیات انسانی معاشروں کو استوار رکھنے والا بنیادی ستون ہے، انسانی معاشرے کی پوری عمارت، اخلاقیات کے بنیادی ستون پر ہی استوار ہوتی ہے، آپ کتنا ہی جامع دستور کیوں نہ بنالیں، کتنی ہی عمدہ قانون سازی کیوں نہ کرلیں، کتنے ہی خوبصورت قاعدے، ضابطے اور اصول کیوں نہ وضع کرلیں اور کتنا ہی بے لاگ نظام عدل وانصاف کیوں نہ تشکیل دے لیں، لیکن اگر اُس کے تانے بانوں میں سے اخلاقیات کا بنیادی عنصر نکال دیا جائے تو معاشرہ دور جدید کے سارے عمرانی تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے باوجود ایک ایسے تاریک جنگل کی مانند ہوتا ہے، جس میں درندوں کا راج اور فرعونی طاقتوں کی حکمرانی ہوتی ہے۔

بدقسمتی سے آج ہمارا معاشرہ بھی درندہ راج کا عملی نمونہ پیش کر رہا ہے، آج ہمارے قومی ادارے داخلی انتشار، فساد اور لوٹ مار کا منظر پیش کر کے قومی تعمیر کو تقویت دینے کے بجائے قوم کے زوال کا سبب بن رہے ہیں، اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ سب اللہ کی نعمتوں کی سلبی کی ہی ایک صورت ہے، اَمر واقعہ یہ ہے کہ اعمال کا سارا دارومدار نیتوں پر ہوتا ہے، نیت میں اگر قومی اداروں کے حقیقی فروغ اور اللہ کی رضا مندی پوری طرح شامل نہ ہو اور مقصدِاِن اداروں کی سربراہی کی آڑ میں اپنی اوراپنی منظور نظر شخصیتوں کو پناہ و تحفظ دینا اور دنیاوی اغراض ومقاصد ہوں توظاہر ہےاِس مقصد کا منطقی نتیجہ یہی نکلے گا کہ ذاتی کاروبار فروغ پائے گا، زمین، پلاٹ اور جائیداد و پرمٹ میں اضافہ ہوگا، جاہ حب حال کے سارے مواقع ملیں گے، مگر یہ سب کچھ قومی اداروں کی تباہی و بربادی کی قیمت پر ہوگا، یاد رہے کہ جب قومی ادارے تباہی و بربادی کا شکار ہوتے ہیں تو قوم کے مؤثر افراد کی انفرادی خوشحالی بھی زیادہ دیر قائم تک نہیں رہ سکتی اور وہ بھی قوم کے اجتماعی زوال کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔

چنانچہ اِن حالات میں سوال یہ ہے کہ ہمارے قومی، ملی اداروں کے سربراہ اداروں کو اخلاص نیت، بے غرضی اور ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر اصول و قواعد کے مطابق چلانے پر کیوں تیار نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب فرد اور افراد

ایک بار نفسی خرابیوں اور اخلاقی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو قدرت کے ایک ایسے شکنجے میں پھنس جاتے ہیں جس سے نکلنے کی ساری راہیں بند ہو جاتی ہیں، یہ دراصل قدرت کا سب سے بڑا عذاب ہے، اس لیے کہ قومی ملی اداروں میں قوم کی اجتماعی قوت شامل ہوتی ہے۔ باالفاظ دیگر قوم نام ہی اجتماعی اداروں کے بقاء واستحکام کا ہے۔ کسی قوم کیلئے اِس سے بڑا المیہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کے سربراہ اور ذمہ داران اخلاقی بیماریوں میں گرفتار ہو کر اپنے اصل مرتبے و مقام اور ذمہ داریوں کو بھول جائیں۔

یہ حقیقت آج کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ ہم قومی اور اخلاقی زوال کی ساری حدود تجاوز کر چکے ہیں، معیشت، معاشرت اور سیاست کے ماحول میں اخلاقی خرابیوں نے ہمیں اسفل السافلین میں پھینک دیا ہے، آج ہمارے ملک میں جو حالات چل رہے ہیں اُس میں ہر طرف اقرباء پروری، رشوت، لوٹ مار اور کرپشن کا بازار گرم ہے، ان ناسوروں نے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے، اوپر سے ہمارے ارباب اقتدار کا طرز عمل، الامان والحفیظ۔ لوگ حرام کھانے کو منہ کھولے بیٹھے ہیں، دوڑ لگی ہوئی ہے کہ جتنا روپیہ سمیٹا جا سکتا ہے سمیٹ لو، خواہ اس کیلئے کتنا ہی جھوٹ، فریب اور دھوکہ کیوں نہ کرنا پڑے، کر گزرو، اَمر واقعہ یہ ہے کہ بد سے بدتر حکمرانوں نے بھی پاکستانی معاشرے کی اخلاقی قدروں کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا موجودہ حکومت کے دور میں

پہنچا ہے۔

آج ہمارے معاشرے میں جو فساد پھیلا ہوا ہے وہ دراصل اسی ذہنیت اور طرز فکر کا شاخسانہ ہے، جب تک ہم اور ہمارے حکمران اپنی سوچ نہیں بدلیں گے ہماری حالت نہیں بدلے گی، تاریخ عالم اِس بات کی شاہد ہے جن قوموں نے اپنے مضبوط اخلاق اور اعلیٰ سیرت و کردار کا مظاہرہ کیا، وہ دوسری قوموں کے مقابلے میں ہمیشہ سربلند اور غالب رہیں اور جن قوموں نے کمزور اخلاق اور گھٹیا سیرت و کردار کا نمونہ پیش کیا، وہ دنیا میں ذلیل و خوار اور محکوم ہو کر صفحہ ہستی سے مٹ گئیں، حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی ملک اور معاشرے کی بقاء و تحفظ اخلاقی روایات کی پاسداری میں مضمر ہے، جس قوم اور معاشرے کے لوگ اخلاقیات سے عاری ہو جاتے ہیں، وہ معاشرہ اور ملک کھوکھلا اور دیوالیہ ہو جاتا ہے، پھر اسے تاریخ کا قصہ پارینہ بننے سے مادی طاقتیں بھی نہیں روک سکتیں، عصر حاضر میں مختلف ممالک جو مادی اور نیوکلیائی اعتبار سے خود کو خواہ جتنا بھی مضبوط کیوں نہ سمجھتے ہوں، مگر اُن کی اندرونی حالت حد درجہ ناگفتہ بہ ہے، کی صورت حال اور مثال ہمارے سامنے موجود ہے، لہذا اس تناظر میں اخلاقیات ہی آئینی و قانونی اختیار کو تہذیب و شائستگی عطا کرتا ہے، حکمرانوں کی ضد، انا اور خودسری کو لگام دے کر انہیں آئین، قانون اور ضابطے کا پابند بناتا ہے اور بے اصولی کی تلوار سے اخلاقی روایات پر چرکے لگانے سے روک کر صاحب

اقتدار کو تہذیب واخلاق کے دائرے میں رکھتا اور اختیار کو شتر بے مہار نہیں ہونے

دیتا۔

یوم تکبیر تحفظ نظریہ پاکستان اور تکمیل دفاع پاکستان کی تاریخ کا دن

ایٹمی پاکستان، عالم اسلام کا احساس تفاخر.... سامراجی خطرات کی زد میں

حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی زندگی میں بعض لمحات اتنے منفرد، اہم اور تاریخی ہوتے ہیں کہ اُن لمحوں کی اہمیت اور حیثیت کا مقابلہ کئی صدیاں بھی مل کر نہیں کر سکتیں، یہ منفرد و قیمتی لمحات دراصل تاریخ کا وہ حساس موڑ ہوتے ہیں، جہاں کوئی قوم اپنے لیے عزت و وقار اور غرور و تمکنت یا ذلت و رسوائی اور غلامی و محکومی میں سے کسی ایک کا ایک راستے کا انتخاب کرتی ہے،.بزدل، ڈرپوک، ابن الوقت اور غلام ذہنیت کے لوگ اِن تاریخ ساز لمحات کی قدر و قیمت نہیں جانتے اور نہ ہی اُن کے دل و دماغ کسی چیلنج کو قبول کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں، نتیجتاً ایسی اقوام شاہراہ حیات پر دوسری اقوام سے پیچھے رہ جاتی ہیں اور پھر اِن اقوام کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے، جب یہ قومیں ماضی کی گرد میں کھو کر قصہ پارینہ بن کر تاریخ کی بوسیدہ کتابوں کا حصہ بن جاتی ہیں، لیکن اِس کے برعکس جرات مند اور بہادر لوگ تاریخ کے ان نازک لمحات میں ہوش مندی اور دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے ایسے تاریخی فیصلے کرتے ہیں، جو قومی زندگی کی بقاء، سلامتی و استحکام اور تحفظ کیلئے لازم و

ملزوم ہوتے ہیں۔

چودہ اگست 1947ء کی یوم آزادی کے بعد 28 مئی 1998ء کا دن اور سہ پہر 3:20 منٹ کا وقت پاکستان کی تاریخ کا وہ تاریخ ساز لمحہ ہے، جس کے احساس تفاخر نے پوری قوم اور عالم اسلام کے مسلمانوں کا سر غرور و سر فخر اور خوشی و استنباط سے بلند کر دیا، مئی" یوم تکبیر" پاکستان کی تاریخ کا وہ دن ہے، جس دن پاکستان نے بلوچستان کے 28 مقام" چاغی" کے پہاڑی سلسلے "راس کوہ"زیر زمین پانچ ایٹمی دھماکے کر کے عالم اسلام کی پہلی اور دنیا کی ساتویں ایٹمی قوت ہونے کا اعزاز حاصل کیا اور 11 مئی 1998 کو پوکھران میں 3 اور 13 مئی کو 2 ایٹمی دھماکوں کے بھارتی ایٹمی ایڈونچر کا دندان شکن جواب دے کر جنوب مشرقی ایشیاء میں ہندو بنیئے کے توسیع پسندانہ عزائم اور خطے میں جوہری بالادستی کے بھارتی منصوبے کو بھی خاک میں ملا دیا، اِس تاریخ ساز موقع پر اُس وقت کے وزیر اعظم میاں نواز شریف (جو تاریخ ساز کامیابی پر خوشی سے بار بار اللہ کا شکر یہ ادا کر رہے) نے عوامی جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے قوم سے اپنے خطاب میں کہا کہ " الحمد للہ ہم نے گزشتہ دنوں کے بھارتی ایٹمی دھماکوں کا حساب 6 کامیاب ایٹمی دھماکوں سے چکا دیا ہے اب ہم پر کوئی دشمن شب خون مارنے کی جرات نہیں کرسکے گا،کامیاب ایٹمی دھماکوں سے پاکستان کو دنیا کی ساتویں اور عالم اسلام کی پہلی ایٹمی قوت بننے کا اعزاز حاصل ہوگیا اور

ایٹمی تجربات نے ملت اسلامیہ پر پانچ صدیوں سے طاری جمود توڑ کر اُس کو خواب خرگوش سے بیدار کر دیا، انہوں نے کہا کہ پاکستان کا ایٹم بم ملت اسلامیہ کی نہ صرف بلکہ اُس کے اتحاد کی علامت بھی ہے جو عہد رفتہ کی عظمت کو واپس لانے کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔"

یہ ایک نا قابل تردید حقیقت ہے کہ 1947ء سے ہی پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد بھارت پاکستان کا دشمن بن گیا اور وہ ہر قیمت پر پاکستان کو ختم کرنے کے درپے رہا، دراصل یہود و ہنود یہ قطعاً نہیں چاہتے کہ دنیا کے نقشے پر واقع ایک چھوٹا سا اسلامی ملک پاکستان دنیا میں عزت و وقار کے ساتھ زندہ رہے اور عالم اسلام کی قیادت کا فریضہ انجام دے، چنانچہ وہ ہمیشہ ہی مختلف حیلوں اور بہانوں سے پاکستان کے خلاف سازشوں میں مصروف رہے، بھارت کا ایٹمی پروگرام امریکہ، روس اور دیگر ایٹمی طاقتوں سے جوہری معاہدے، جدید لڑاکا طیاروں اور، فوجی سازو سامان کا حصول اور اسلحہ کے انبار، سب اسی سلسلے کی کڑی ہیں، 1960ء کے عشرے میں جب یہ خبریں آنی شروع ہوئیں کہ بھارت بڑی تیزی سے جوہری تجربات کی سمت بڑھ رہا ہے،اُس وقت کی ہماری سیاسی قیادت جوہری اسلحہ کے میدان میں قدم رکھنے کے حوالے سے مخمصے کا شکار تھی لیکن اُس وقت بھی ایوب کابینہ کے نوجوان وزیر ذوالفقار علی بھٹو کی دور اندیش نگاہوں سے بھارت کا ایٹمی پروگرام اور مستقبل کے جارحانہ عزائم پوشیدہ نہیں تھے، بھٹو

بھارت کو مستقبل کی نیوکلیئر طاقت کے روپ میں دیکھ کر پاکستان کیلئے خطرہ محسوس کر رہے تھے اور اُن کی خواہش تھی کہ طاقت کے توازن کو برابر کرنے کیلئے پاکستان کو بھی اپنا جوہری پروگرام شروع کرنا چاہیے۔

یہ بات بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ اس مقصد کیلئے انہوں نے کابینہ میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ پاکستان کو جوہری اسلحہ کی تیاری کا پروگرام شروع کرنا چاہئے، لیکن ایوب خان اور اُن کے امریکہ نواز وزیر خزانہ محمد شعیب اور دیگر وزیروں نے بھٹو کی اِس تجویز یکسر مسترد کرتے ہوئے جوہری صلاحیت کے عدم حصول کا فیصلہ کیا،1963ء میں جب صدر ایوب خان فرانس کے دورے پر گئے تو وہاں فرانسیسی صدر چارلس ڈی گال نے پاکستان میں جوہری ری پراسسنگ پلانٹ کی تعمیر کی پیش کش کی لیکن ایوب خان نے فرانس کی یہ پیشکش اُس وقت کے چیف آف آرمی اسٹاف جنرل یحیٰی خان، سائنسی مشیر ڈاکٹر عبدالسلام (قادیانی) اور منصوبہ بندی کمیشن کے نائب چیئرمین مرزا مظفر احمد قادیانی المعروف ایم ایم احمد (جو کہ کسی طور بھی پاکستان کو ایک مسلم ایٹمی طاقت کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتے تھے) کے مشورے پر ٹھکرا دی، لیکن یہ قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو ہی تھے جنھوں نے 1971ء میں پاکستان کے دولخت ہونے کے بعد باقی ماندہ پاکستان کا اقتدار سنبھالا اور پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کے لئے 1973ء میں جوہری صلاحیت کے حصول کا باقاعدہ پروگرام شروع کیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کا عزم تھا کہ "ہم گھاس کھالیں گے لیکن ایٹم بم ضرور بنائیں گے" یہ ذوالفقار علی بھٹو ہی کا کارنامہ تھا کہ جہاں ایک طرف انہوں نے فرانسیسی حکومت کو جوہری ری پراسسنگ پلانٹ کی تعمیر کی پرانی پیشکش کی تجدید پر آمادہ کیا، وہیں انہوں نے پاکستان کے جوہری پروگرام کو درست سمت میں گامزن کرنے کیلئے جوہری توانائی کمیشن کے سربراہ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ سائنسی مشیر ڈاکٹر عبدالسلام (قادیانی) کو بھی برطرف کر دیا اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان جو کہ اُس وقت ہالینڈ میں مقیم تھے کو پاکستان بلوا کر پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کی ذمہ داریاں سونپیں، بھٹو جس تیزی سے پاکستان کا جوہری پروگرام بڑھا رہے تھے وہ امریکہ اور صہیونی لابی کے نزدیک کسی طور بھی قابل قبول اور قابل معافی جرم نہ تھا، چنانچہ 1976ء میں امریکی وزیر خارجہ ہنری کیسنجر نے پاکستان کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو دھمکی دی کہ اگر تم نے ایٹمی ری پراسسنگ اور ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کے منصوبہ پر کام جاری رکھا تو ہم تمہیں مثال عبرت بنا دیں گے۔

لیکن قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو نے کیسنجر کی اس دھمکی کے باوجود پاکستان کا ایٹمی پروگرام جاری رکھا کیونکہ بھٹو کے نزدیک اُن کی جان سے زیادہ ملک و قوم کی سلامتی اور بقاء زیادہ اہمیت کی حامل تھی جو پہلے ہی بھارتی ایٹمی

پروگرام کی وجہ سے شدید خطرے میں تھی، دوسری طرف بھٹو صاحب کے حکم پر عالمی شہرت یافتہ مایہ ناز ایٹمی سائنسدان اور پاکستان کی ایٹمی ٹیکنالوجی کے بانی و معمار ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے انتہائی نامساعد حالات میں پاکستان کے جوہری پروگرام کا آغاز کیا، مشکل ترین حالات میں جوہری پروگرام کی تشکیل، تعمیر اور تکمیل کی یہ داستان بھی اللہ تعالیٰ اور اُس کے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے بے پایاں فضل و کرم کا ثمر ہے، ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی زیر نگرانی 1976ء میں پاکستان کے سائنس دانوں نے کہوٹہ لیبارٹری میں یورنیم کی افزودگی کا کام شروع کیا اور 1982ء تک پاکستانی سائنسدان 90% افزودگی کی صلاحیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے اور بالآخر وہ دن بھی آیا جب قومی و ملی جذبوں سے سرشار ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور اُن کی پوری ٹیم کی اپنی انتھک محنت نے 28 مئی 1998ء کو بھارت کے پانچ ایٹمی دھماکوں کے جواب میں چھ کامیاب ایٹمی دھماکے کرکے نہ صرف وطن عزیز کو ناقابل تسخیر قلعہ بنا دیا بلکہ قوم اور مسلح افواج کے مورال کو بھی آسمان کی بلندیوں پر لے گئے اور پوری قوم کے اعصاب سے ہندو بنیے کے خوف کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم کردیا، ڈاکٹر عبدالقدیر اور اُن کی ٹیم کے اِس عظیم کارنامے کی بدولت آج 28 مئی 1998ء کا دن پاکستان کی تاریخ میں "تحفظ نظریہ پاکستان اور تکمیل دفاع پاکستان کی تاریخ کا دن" اور" یوم تکبیر "کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

آج پاکستان کا جوہری پروگرام اور ایٹم بم جو کہ پورے عالم اسلام کا جوہری پروگرام اور ایٹم بم ہے کے خلاف بھارت، اسرائیل، امریکہ اور اس کے حواری سازشوں میں میں مصروف ہیں اور وہ پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کے گرد گھیرا تنگ کر رہے ہیں، ان کی خواہش ہے کہ کسی طرح پاکستان کو جوہری صلاحیت سے محروم کردیا جائے، آئے دن کوئی نہ کوئی فتنہ ساماں کہانی مغربی پریس کی زینت بنتی رہتی ہے، بے سروپا شوشے اڑائے جاتے ہیں کہ پاکستان ایک غیر ذمہ دار ملک ہے اور اس کے ایٹمی اثاثے کسی بھی وقت القاعدہ اور دوسرے انتہا پسند عناصر کے ہاتھ لگ سکتے ہیں، سب سے زیادہ ستم ظریفی کی بات ہے کہ جو ممالک پاکستان کے ایٹم بم پر "اسلامی بم" کی پھبتی کستے ہیں، اِن کے نزدیک امریکہ۔برطانیہ اور فرانس کے ایٹم بم "عیسائی بم" نہیں ہیں، چین اور روس کے بم "کمیونسٹ بم" نہیں ہیں، بھارت کا ایٹم بم "ہندو بم "نہیں ہے اور نہ ہی اسرائیل کا ایٹم بم "یہودی بم" ہے۔

اس کھلے تضاد اور دو عملی کی اصل وجہ یہ ہے کہ پاکستان کی ایٹمی صلاحیت روزِ اول سے بھارت جیسے دشمنوں اور امریکہ جیسے نام نہاد دوستوں کیلئے سوہان روح بنی رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ گزشتہ تیس سال کے دوران پاکستان بار بار امریکی پابندیوں اور مخالفانہ پروپیگنڈے کا شکار ہوا، حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کو دہشت گردوں کی نرسری اور ناکام ریاست قرار دینے کے امریکی

بیانات بھی اسی سلسلے کی کڑی تھے تاکہ انتہا پسندوں کے قبضے کا شور مچا کر پاکستان کے ایٹمی
ہتھیاروں پر کنٹرول حاصل کیا جاسکے۔ ماضی میں ڈاکٹر عبدالقدیر کے خلاف الزام تراشی
بھی اسی حکمت عملی کا نتیجہ تھی اور اسلام آباد پر طالبان کی چڑھائی کا شور بھی اسی لئے
مچایا گیا، دنیا کو یہ بھی تاثر دیا گیا کہ طالبان کی نظریں ہمارے ایٹمی اثاثوں پر ہے، جبکہ
حال ہی میں امریکی حکومت نے ایک خصوصی فورس کی تشکیل اور پاک افغان سرحد پر
اُس کی تعیناتی بھی صرف اس مقصد کیلئے کی ہے کہ وقت ضرورت پاکستان کے ایٹمی
ہتھیاروں کا کنٹرول حاصل کیا جاسکے، امریکہ اپنے علاقائی مفادات، اسلام مخالف عالمی
ایجنڈے اور بھارت و اسرائیل کیلئے خطرہ تصور کرتے ہوئے پاکستان اور ایران سمیت
کسی بھی اسلامی ریاست کو ایٹمی صلاحیت کا حامل دیکھنا نہیں چاہتا۔
اس لئے وہ مختلف حیلوں بہانوں سے ہمارے ایٹمی پروگرام کو کیپ یا ختم کرنے کے
درپے ہے، لہٰذا اس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے، جبکہ دوسری طرف پاکستان کے
ایٹمی پروگرام کے خلاف امریکی پراپیگنڈے سے متاثر بعض نام نہاد دانشوروں نے ایک
بار پھر یہ راگ الاپنا شروع کردیا ہے کہ پاکستان کو 1998ء میں ایٹمی تجربات کی
ضرورت نہیں تھی، امریکی مرعوبیت اور بھارت نوازی پر مبنی سوچ کے حامل یہ افراد
بھول رہے ہیں کہ اگر خدانخواستہ پاکستان ایٹمی قوت نہ

ہوتا تو ممبئی دھماکوں کے بعد بھارت پاکستان پر حملہ کرنے میں ایک دن کی تاخیر نہ کرتا، حقیقت یہ ہے کہ ہمارا میزائل اورایٹمی پروگرام جو قومی افتخار اور ملکی بقاء کی علامت بھی ہے، ہی پاکستان کے دفاع استحکام اور سلامتی کا ضامن اور دشمن کے ناپاک و مذموم عزائم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، جس کی حفاظت اتحاد و یگانگت اور قومی یکجہتی سے ہی ممکن ہے۔

نیا جال لائے پرانے شکاری

متحدہ مجلس عمل پھر میدان میں

یوں تو پاکستان کے سیاسی و صحافتی حلقوں میں یہ تاثر عام پایا جاتا ہے کہ دینی و سیاسی جماعتوں کا جب بھی کوئی اتحاد وجود میں آتا ہے تو اُس کے پیچھے اسٹیبلشمنٹ یا ایجنسیوں کی طاقت کارفرما ہوتی ہے، جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح اِن اتحادوں کی صورت میں ملک کی بڑی سیاسی جماعتوں کی کامیابی کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کی جائے، متحدہ مجلس عمل کے بارے میں یہی تاثر عام ہے، یہ بات کتنی صحیح ہے اور کتنی غلط، اِس کا اندازہ آپ کو مضمون کے اگلے حصے میں ہوجائے گا، یہ حقیقت ہے کہ وطن عزیز میں مختلف ادوار میں "پاکستان قومی اتحاد، تحریک بحالی جمہوریت، پاکستان عوامی اتحاد، اسلامی جمہوری محاذ اور اسلامک فرنٹ وغیرہ کے نام سے دینی و سیاسی جماعتوں کے کئی اتحاد قائم ہوئے، لیکن اِن سب میں متحدہ مجلس عمل کو علامہ شاہ احمد نورانی کی دوراندیش اور صاحب کردار کی قیادت کے سبب سب سے زیادہ کامیاب اتحاد سمجھا جاتا ہے۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ علامہ شاہ احمد نورانی جولائی 2000ء میں اِس قسم کے اتحاد کی جانب توجہ دلاچکے تھے، آپ ہی کے تحرک پر جولائی 2001ء میں

ملک کی چھ بڑی جماعتوں جس میں علامہ شاہ احمد نورانی کی جمعیت علماء پاکستان، قاضی حسین احمد کی جماعت اسلامی، مولانا فضل الرحمٰن کی جمعیت علماء اسلام (ف)، ساجد نقوی کی تحریک جعفریہ، پروفیسر ساجد میر کی جمعیت اہلحدیث اور مولانا سمیع الحق کی جمعیت علماء اسلام نے ایک نئے سیاسی و مذہبی اتحاد "متحدہ مجلس عمل" کے قیام کی منظوری دی، جسے 19 مارچ 2002ء کو باقاعدہ انتخابی فرنٹ میں تبدیل کرنے کا اعلان کردیا گیا، دینی جماعتوں کے اِس اتحاد نے علامہ شاہ احمد نورانی کی قیادت میں صدارتی ریفرنڈم کو مسترد کرتے ہوئے عام انتخابات کو یقینی بنانے کیلئے تحریک کا آغاز کردیا، ابتداء میں اِس سیاسی و مذہبی اتحاد کے قیام کا مقصد ملک میں فرقہ وارنہ ہم آہنگی کیلئے اسلامی نظام کے قیام اور لادینی عناصر کی یلغار کا مقابلہ کرنا تھا۔

لیکن ملک میں عام انتخابات کے پیش نظر اتحاد میں شامل تمام جماعتوں نے فیصلہ کیا کہ انتخابات کے حوالے سے مشترکہ حکمت عملی اختیار کی جائے گی، متحدہ مجلس عمل کے سربراہ علامہ شاہ احمد نورانی کا خیال تھا کہ نائن الیون کے بعد افغانستان پر حملے کے بعد امریکہ نے وہاں جو تباہی مچائی تھی اُس نے پاکستانی عوام کی سوچ کو دینی جماعتوں کے قریب کردیا تھا، جس کی وجہ سے آئندہ انتخابات میں عوام کسی ایسی جماعت کو ووٹ نہیں دیں گے جس نے اِس مسئلہ پر حکومت کی تائید کی ہوگی، لہٰذا مجلس عمل کی ملک گیر کامیابی یقینی

ہے،چنانچہ علامہ شاہ احمد نورانی کی حکمت عملی کے سبب 10 اکتوبر 2002ء کو ملکی
تاریخ میں پہلی بار دینی جماعتوں کے اِس اتحاد متحدہ مجلس عمل کو عوام الناس نے
پزیرائی بخشی، انتخابات میں غیر معمولی کامیابی کی وجہ سے وہ ملک کی دوسری بڑی سیاسی
قوت بن کر ابھری، جس نے بہت سے سیاسی پنڈتوں کو حیران و پریشان کردیا، یہ 2002
ءکے الیکشن میں کامیابی کا ہی نتیجہ تھا کہ متحدہ مجلس عمل نے صوبہ سرحد موجودہ
خیبر پختونخواہ میں حکومت قائم کی، بلوچستان میں ق لیگ کے ساتھ مل کر مخلوط حکومت
بنائی اور قومی اسمبلی میں مولانا فضل الرحمٰن کو قائد حزب اختلاف کا کردار و مقام ملا۔
ابتداء میں متحدہ مجلس عمل میں شامل جماعتوں نے بڑی سرگرمی کا ثبوت دیا اور ایسے
تمام خدشات کو دور کردیا کہ یہ اتحاد بیرونی طاقتوں یا ملکی اسٹیبلشمنٹ اورایجنسیوں کی
سرپرستی میں بنایا گیا ہے،اِس کی بنیادی وجہ متحدہ مجلس عمل کے مرکزی قائد علامہ شاہ
احمد نورانی کا اصولی اور بے لچک موقف تھا جو علامہ شاہ احمد نورانی کی وفات تک قائم
رہا، یہ متحدہ مجلس عمل کے قائد علامہ شاہ احمد نورانی کی سیاسی بلوغت کا ہی نتیجہ تھا کہ
متحدہ مجلس عمل نے الیکشن کے بعد پاکستان کی خارجہ پالیسی، ایل ایف او، صدر کی
وردی، آئین کے تحفظ، آئین کی غیر متنازعہ شقوں کو برقرار رکھنے اور پارلیمنٹ کی
بالادستی پر اصولی موقف اپنایا،اِس حوالے سے 27 مئی 2003ء کو ایم ایم اے کی

سپریم کونسل کے اجلاس میں صدر کی وردی اتارنے کیلئے دو سال کی چھوٹ دینے پر گرما گرم بحث ہوئی، اجلاس میں متحدہ مجلس عمل کے سیکرٹری جنرل مولانا فضل الرحمٰن نے اپنے ساتھیوں کو اِس اَمر پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ صدر کیلئے آرمی چیف کا عہدہ محدود مدت کیلئے رکھنے کی درخواست کو قبول کرلیا جائے۔

دراصل مولانا فضل الرحمٰن پرویز مشرف کی وردی کے معاملے پر اسلئے غور چاہتے تھے کہ انہیں خدشہ تھا کہ ایل ایف او کے مسئلہ پر محاذ آرائی سے نظام کو لاحق خطرات سرحد اور بلوچستان میں ایم ایم اے کی صوبائی حکومتوں کے خاتمے کا سبب بن سکتے تھے، جبکہ متحدہ مجلس عمل کے قائد علامہ شاہ احمد نورانی پرویز مشرف کو کسی طور بھی وردی میں صدر دیکھنا نہیں چاہتے تھے، اُن کا اصولی موقف تھا کہ اگر صدر نے وردی نہ اتاری تو مشرقی پاکستان جیسا سانحہ رونماء ہوسکتا ہے، متحدہ مجلس عمل کے قائد علامہ شاہ احمد نورانی کے اِس اصولی موقف نے حکومت کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں، حکومت کی کوشش تھی کہ کسی طرح ایم ایم اے کی قیادت کو قائل کرلیا جائے، لیکن ایم ایم اے کی مرکزی قیادت وردی کے مسئلے پر کوئی لچک دکھانے کو تیار نہ تھی، اِس دوران ایم ایم اے اور حکومت مذاکرات کے دروازے کئی دفعہ کھلے اور بند ہوئے، دراصل حکومت روزِ اوّل سے ہی ایم ایم اے کے ساتھ "مذاکرات، مذاکرات" کا چوہے بلی کا کھیل کھیل رہی تھی، اُدھر مولانا فضل الرحمٰن اور جماعت اسلامی کے ڈیڑھ صوبے کی

حکومت کے لالچ نے ایم ایم اے کو بری طرح پھنسا دیا تھا،اُس کیلئے یہ حکمرانی نہ تو اگلی جانے والی تھی اور نہ نگلی جانے والی۔

دوسری طرف جنرل پرویز مشرف سے معاہدہ بھی ایم ایم اے کی سیاسی حیثیت کیلئے نقصان دہ تھا،اِس صورت میں نہ تو اُس کی صوبائی حکومتیں بچتیں اور نہ عوامی طاقت اُس کے ساتھ ہوتی، گویا ایم ایم اے کا اصولوں پر سودا اُس کی سیاسی موت کے مترادف تھا،یہی وجہ تھی جو ایم ایم اے کے قائد علامہ شاہ احمد نورانی نے حکومتی پیش کردہ آئینی پیکج کو مسترد کرتے ہوئے عوامی رابطہ مہم شروع کرنے کا فیصلہ کیا،انھوں ایم ایم اے کے اصولی مطالبات کی منظوری کیلئے حکومت کو 17 دسمبر 2003ء کی ڈیڈ لائن دیتے ہوئے 18 دسمبر سے احتجاجی تحریک چلانے کا بھی اعلان کیا، لیکن بدقسمتی سے 18 دسمبر 2003ء کو احتجاجی تحریک بلکہ اُس کے بعد کسی بھی احتجاجی تحریک کی نوبت نہ آسکی، کیونکہ اِس دوران 11 دسمبر 2003ء کو ایم ایم اے کو اپنے قائد علامہ شاہ احمد نورانی کی ناگہانی موت کے عظیم سانحے سے دوچار ہونا پڑا، جس نے ایم ایم اے کی ایسی کمر توڑ کر رکھدی، جس کے بعد تاریخ پاکستان نے وہ موڑ لیا کہ ایم ایم اے بطور سیاسی جماعت اور تحریک اپنے مقاصد سے دور ہٹتی چلی گئی۔

یہ بات بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ علامہ شاہ احمد نورانی اُس روز بارہ بجے

پارلیمنٹ ہاؤس کی کمیٹی روم میں اہم پریس کانفرنس کرنے والے تھے، جو ہو سکتا تھا کہ متحدہ مجلس عمل کے مستقبل اور کردار پر دور رس اثرات مرتب کرتی، یہ بات بھی درست ہے کہ اُن دنوں علامہ شاہ احمد نورانی سترھویں آئینی ترمیم کی منظوری کے حوالے سے شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھے، مولانا فضل الرحمن اور قاضی حسین احمد اِس ترمیم کی منظوری اور صدر کی وردی کے حق میں تھے،اُن کے اندورن خانہ حکومت سے معاملات بھی طے کرچکے تھے، وہ علامہ شاہ احمد نورانی کو اپنی راہ کی رکاوٹ سمجھتے تھے اورعلامہ شاہ احمد نورانی یہ بات جانتے تھے (تفصیل کیلئے دیکھئے علامہ شاہ احمد نورانی کے پرسنل سیکرٹری حسنات احمد قادری جو کہ آخری وقت میں علامہ کے ساتھ تھے،کا وہ انٹرویو جو ماہنامہ "افق" کراچی فروری 2010ء کے شمارے میں شائع ہوچکا ہے) ساتھیوں کے حکومت سے اندورن خانہ معاملات اور مجلس عمل کے اصولی موقف سے انحراف کا دباؤ علامہ شاہ احمد نورانی جیسے بااصول اور صاحب کردار سیاستدان کیلئے جان لیوا دل کے دورے کا سبب بنا،علامہ شاہ احمد نورانی کی وفات کے بعد ایم ایم اے ایسی گری کہ پھر کبھی سنبھل نہ سکی، کیونکہ علامہ نورانی ایم ایم اے کیلئے نہ صرف اتحاد کی علامت تھے،بلکہ اُن کے نہ جھکنے اور نہ بکنے والے کردار،اصولی موقف اور حق گوئی و بے باکی نے ایم ایم اے کو حکومت کے ساتھ کسی بھی شرمناک معاہدے سے محفوظ رکھا ہوا تھا۔

مولانا کے انتقال کے بعد متحدہ مجلس عمل قاضی حسین احمد کی سربراہی میں اِس دعوے کے ساتھ میدان میں اتری کہ وہ مولانا شاہ احمد نورانی کے مشن کو جاری رکھے گی، مگر افسوس کہ اُن کا یہ مشن اُن کے انتقال کے بعد محض چند دنوں تک ہی جاری رہ سکا، ابھی علامہ شاہ احمد نورانی کا کفن بھی میلا نہیں ہوا کہ متحدہ مجلس عمل نے 19دسمبر 2003ء کو حکومت کے ساتھ اپنے تمام معاملات اِس قدر جلدی میں طے کئے جس سے اِس خیال کو مزید تقویت ملی کہ علامہ شاہ احمد نورانی اِس معاہدے کی راہ کا آخری کانٹا تھے، جس کے نکل جانے سے فریقین کو حد درجہ اطمینان ہوا تھااور28دسمبر 2003ء کو متحدہ مجلس عمل کے تعاون سے آئین میں 17ویں ترمیم کا شرمناک بل منظور ہوگیا، یہ وہی مجلس عمل تھی جو علامہ شاہ احمد نورانی کی زندگی میں ایل ایف او پر کسی سمجھوتے کی روادار نہ تھی لیکن علامہ شاہ احمد نورانی کے بعد شریک جماعتوں کے سیاسی مفادات کی وجہ سے جھاگ کی طرح بیٹھ گئی، مجلس عمل کا یہ یوٹرن حکومت کے ہاتھ مضبوط کرنے اور 2004ء کے سال کو پرویز مشرف کیلئے کامیابیوں کی نوید بنا کر لایا، حقیقت یہ تھی کہ جب تک علامہ نورانی مجلس عمل کے سربراہ رہے، حکومت مطلوبہ مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہی، کیونکہ وہ حصول اقتدار کے بغیر سیاست کی نئی اور منفرد طرز کے بانی تھے اور اُن کی سیاسی ترجیحات میں حصول اقتدار آخری نمبر پر آتا تھا، علامہ شاہ احمد نورانی کے بعد ایم ایم اے نے اصولوں پر سودے بازی کرکے جمہوریت کو نقصان پہنچانے اور ایم ایم اے کو ایک

آمر کی زرخرید لونڈی بنا کر اپنے سیاسی کردار اور مقام جو نقصان پہنچایا اُس کی تلافی شاید اب ممکن نہیں ہے۔

علامہ شاہ احمد نورانی کے انتقال کے بعد مجلس عمل کے قائدین کی طرف سے ہوس اقتدار میں پے در پے سمجھوتوں اور مجلس عمل کی صوبائی حکومت کے دعوؤں کے باوجود عوامی فلاح کے اسلامی تصور سے کوسوں میل کی دوری نے مجلس عمل کی افادیت کیساتھ اُس کے وجود کو بہت جلد سوالیہ نشان بنا ڈالا، رہی سہی کسر مولانا فضل الرحمٰن کے دن رات بدلتے طرز عمل نے پوری کردی، جنھوں نے اپنے مفادات کی خاطر جنرل مشرف کے اقتدار کو دوام بخشنے، سترھویں ترمیم کو قوم پر مسلط کرنے، وردی سمیت اُسے دوبارہ اقتدار میں لانے، صوبے میں بلاشرکت غیرے جبکہ وفاق میں حصہ بقدرجُسہ کے اصول کے تحت ابن الوقتی اور کاسہ لیسی کا گھناؤنا کھیل کھیلا ہے، یہ حقیقت ہے کہ مولانا فضل الرحمٰن نے ماضی میں ایم ایم اے کے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں، ایک کالم نگار کے مطابق متحدہ مجلس عمل جب بنی تھی تو اُس وقت مختلف اہل قلم نے ایم ایم اے کے لئے متنوع نام تجویز کئے تھے۔

تاہم 2002ء کے انتخابات اور 2003ء میں مولانا نورانی کی وفات کے بعد ایم ایم اے بالخصوص جمعیت علمائے اسلام کے مولانا فضل الرحمٰن کا جو کردار رہا ہے اور

انہوں نے پرویز مشرف کے ساتھ مل کر جو ایڈونچر کئے، اسکی بنیاد پر ایم ایم اے کو صحافتی حلقوں نے "مک مکاؤ ایجنسی، میل ملاپ ایسوسی ایشن، مرچ مصالحہ ایسوسی ایشن، میاں مٹھو ایسوسی ایشن، مس منیجمنٹ اتھارٹی، مِن مِن ایجنسی اور مکھی مار اتھارٹی وغیرہ جیسے نام دیئے اور آج وہی کالم نگار ایم ایم کو ملا ملٹری ایڈونچر بھی قرار دے رہے ہیں، آج مولانا فضل الرحمٰن ایک بار پھر متحدہ مجلس عمل کو فعال کرنے کیلئے سرگرم ہیں، اِس حوالے سے اسلام آباد میں مولانا فضل الرحمٰن کی رہائش گاہ پر دینی وسیاسی جماعتوں کے اتحاد، متحدہ مجلس عمل کی شریک جماعتوں کا غیر رسمی سربراہی اجلاس بھی منعقد ہو چکا ہے، جس میں متحدہ مجلس عمل کے مردہ گھوڑے کو تین سال کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر اتفاق رائے کے ساتھ طے پایا ہے کہ اِس سلسلے میں روابط جاری رکھے جائیں گے، تاکہ امریکی ڈرون حملوں کو بند کرانے کے لئے علمائے دین و مفتیان شرع متین کا مشترکہ پلیٹ فارم موثر کردار ادا کرسکے۔

قارئین محترم آج ایک بار پھر متحدہ مجلس عمل کو دوبارہ فعال کرنے کے حوالے سے یہ کہا جارہا ہے کہ موجودہ حالات میں اِسے ازسر نو زندہ کرنا اسلیئے ضروری ہے کہ امریکی ڈرون حملوں کی بھرپور مخالفت کی جائے، جبکہ یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ نائن الیون کے بعد جب اِس اتحاد کو پہلی مرتبہ معرض وجود میں لایا گیا تھا تو اُس وقت بھی بڑے زور وشور کے ساتھ یہ دعویٰ کیا

گیا تھا کہ اتحاد افغانستان اور پاکستان کے قبائلی علاقوں میں امریکی یلغار کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑا ہو گا اور امریکہ کی اتحادی مشرف حکومت کے لئے جینا حرام کر دے گا، مگر تمام تر دعووں کے باوجود یہ اتحاد قبائلی علاقوں اور ملک کے دوسرے حصوں میں امریکی فوج اور سی آئی اے کی کاروائیوں کے آگے بند باندھنے کے بجائے الٹا سترہویں آئینی ترمیم کو منظور کروا کر امریکی جنگ میں ہراول دستے کا کردار ادا کرنے والی مشرف آمریت کا دست و بازو ضرور ثابت ہوا، جس کی بعد میں قاضی حسین احمد کو قوم سے معافی مانگنی پڑی، لیکن اِس کے باوجود محترم مولانا فضل الرحمٰن اپنی کسی حرکت پر ذرا بھی ٹس سے مس نہ ہوئے اور آج ایک بار پھر وہ مجلس عمل کی اجڑی ہوئی مانگ میں نیا سندور بھرنے کے خواہشمند ہیں۔

ہمیں مولانا کی اِس خواہش کا احترام ہے، مگر ذہن میں ابھرتے ہوئے چند سوالات ہنوز جواب طلب ہیں، آخر مولانا کو تین سال کے بعد اب مجلس عمل کے احیاء کی ضرورت کیوں محسوس ہو رہی ہے؟ وہ کیا مقاصد ہیں جنھیں مولانا حکومتی حلیف اور شریک اقتدار ہونے کے باوجود مجلس عمل کو فعال کر کے حاصل کرنا چاہتے؟ اگر کسی طور یہ اتحاد دوبارہ فعال ہو بھی گیا تو کیا علامہ شاہ احمد نورانی جیسی اصولی، قدآور اور متفقہ قیادت کے بغیر کامیاب ہو سکتا ہے؟ اور کیا مجلس عمل کی سابقہ مایوس کن کارکردگی کو دیکھتے ہوئے عوام ایک بار پھر اسے سند

قبولیت عطا کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے؟ ہماری ناقص رائے میں مولانا فضل الرحمٰن متحدہ مجلس عمل کو متحرک کرکے محض اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل چاہتے ہیں، بعض آگاہ ذرائع یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ یہ اتحاد زرداری حکومت کو دباؤ میں رکھنے کیلئے دوبارہ منظم ہو رہا ہے، کچھ اندرونی حلقوں کا خیال ہے کہ مولانا کے ڈیزل پرمٹ اور ٹھیکے بری طرح متاثر ہو رہے ہیں، اسلئے مولانا فضل الرحمٰن زرداری حکومت سے سودے بازی کے لئے ایم ایم اے کو فعال کر رہے ہیں، تاکہ یہ اتحاد وقت ضرورت اُن کے کام آسکے، البتہ ایم ایم اے کے احیاء میں ڈیرہ اسماعیل خان کی وسیع و عریض زمینوں کا کہیں کوئی ذکر نہیں، جو مشرف حکومت نے دوبارہ صدارتی انتخاب میں حمایت کرنے پر مولانا فضل الرحمٰن کو دی تھیں کیونکہ اب وہ قانونی طور پر مولانا فضل الرحمٰن کے عزیز واقارب کے نام ہو چکی ہیں۔

خیبر پختونخواہ اور بلوچستان میں دوبارہ حصول اقتدار کا خواب ہو یا مذہبی ووٹ کے ذریعے بلدیاتی انتخابات میں کامیابی کی خواہش، حقیقت بہر حال کچھ بھی ہو مولانا فضل الرحمٰن مستقبل میں انتخابی کامیابی کیلئے مجلس عمل کی فیوض و برکات سے ایک بار پھر فیضیاب ہونا چاہتے ہیں اور آنے والے سیٹ اپ میں اپنی جگہ پکی کرنا چاہتے ہیں، اُن کا گمان ہے کہ مذہبی جماعتوں کے ووٹ بنک کو ایک جگہ جمع کرکے وہ مجلس عمل کی سابقہ تاریخی کامیابی کو دہرانے میں کامیاب و

کامران رہیں گے، یہ درست ہے کہ کاروبار حکومت چلانے کیلئے دین کی رہنمائی ہی اوّل و آخر ہے، مگر ہم جس بنیاد پر اِس اقدام کے خلاف ہیں اُس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جب آپ ماضی میں دین اسلام کی روشنی میں سیاسی، سماجی اور معاشی نظام کا کوئی عملی خاکہ عوام کے سامنے پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں، تو پھر دوبارہ مذہب کے نام پر کی جانے والی اِس مہم جوئی کا مقصد اِس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ آپ ایک بار پھر اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کیلئے مذہب کو بطور ہتھیار استعمال کرکے مذہب پسندوں کو بیوقوف بنانا چاہ رہے ہیں۔

چنانچہ سیاسی کامیابیوں کیلئے مذہب کو بطور ہتھیار استعمال کرنے کی جو منصوبہ بندی مولانا کے زیر غور ہے ہمیں اُس پر شدید اعتراض ہے، ہمارا ماننا ہی نہیں پختہ یقین ہے کہ متحدہ مجلس عمل کی 2002 ء میں تاریخی کامیابی کی روشنی نے ابھی تک مولانا کی آنکھیں خیرہ کر رکھی ہیں اور مستقبل میں انتخابی کامیابی کا تصور انہیں ایک بار پھر سہانے خواب دکھا رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ مولانا فضل الرحمٰن کے سر میں ایک ہی سودا سمایا ہوا ہے کہ کسی طرح دوبارہ خیبر پختونخواہ کو تسخیر کیا جائے۔ لیکن کیا اِس حقیقت سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ متحدہ مجلس عمل کی 2002ء میں کامیابی اُس وقت کے معروضی حالات کے ساتھ مجلس عمل کے سربراہ علامہ شاہ احمد نورانی کی قائدانہ بصیرت اور طے شدہ حکمت عملی کی مرہون منت تھی جو کہ آج مفقود ہے، چنانچہ علامہ شاہ احمد

نورانی کے بغیر مجلس عمل کے اجراء اور 2002 ء کی طرح کامیابی کا خواب کس طرح شرمندہ تعبیر ہو سکتا۔

لہذا مجلس عمل کی سابقہ کارکردگی دیکھتے ہوئے ہمیں یہ کہنے میں کوئی قطعاً کوئی عار نہیں کہ مجلس عمل کا وجود شاید کچھ مذہبی جماعتوں کے مفادات کی تکمیل کیلئے ایک بار پھر وقت کی ضرورت ہو، مگر پاکستانی عوام اور بالخصوص عوام اہلسنّت کا اِس اتحاد سے کوئی لینا دینا نہیں ہے، ویسے بھی جن مذہبی جماعتوں نے ملی یکجہتی کونسل اور بعد ازاں متحدہ مجلس عمل کی تشکیل کی تھی،اُن کے درمیان نفاذ اسلام کے حوالے سے اِس قدر مختلف تصورات پائے جاتے ہیں کہ اُن سب کا سیاسی، سماجی اور معاشی نظام میں تبدیلی کے لئے کسی ایک ایجنڈے پر اتفاق کر لینا بعید از قیاس ہے،اگرچہ مجلس عمل کی دو بڑی جماعتوں جمعیت علمائے اسلام اور جماعت اسلامی میں نظریاتی تفاوت نہیں ہے، مگر اب علامہ شاہ احمد نورانی (جنھوں نے ملی یکجہتی کونسل اور متحدہ مجلس عمل میں شامل ہونے کے باوجود بھی اپنے مذہبی تشخص اور شناخت پر کبھی کوئی آنچ نہیں آنے دی) جیسی قد آور، بے داغ اور صاحب کردار قیادت کے بغیر داخلی انتشار کا شکار جمعیت علماءپاکستان کا اِس اتحاد میں دوبارہ شامل ہونا جمعیت علماءپاکستان کے مذہبی اور مسلکی تشخص اور رہے سہے بقیہ وجود کیلئے خطرناک ہے اوراس اتحاد سے جمعیت علماءپاکستان کو بجائے فائدے کے نقصان کا زیادہ

اندیشہ ہے، یہاں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ جو تحریک ایک دفعہ مرجاتی ہے اُسے کبھی بھی دوبارہ زندہ نہیں کیا جاسکتا اور ایسی صورت میں جبکہ اُس کے موئد اور موئسس بھی نہ رہے ہوں۔

آج اِس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اپنی سابقہ کارگزاری کے سبب متحدہ مجلس عمل عوام میں اپنی ساکھ اور وقار کھو چکی ہے اور مولانا فضل الرحمٰن کے مسلسل حکومت میں شامل رہنے کی وجہ سے عوام اُن پر کسی طور اعتماد کرنے کو تیار نہیں ہیں، چنانچہ اِن حالات میں متحدہ مجلس عمل کے پلیٹ فارم کے ذریعے اپنے وجود، اپنی شناخت اور اپنی حیثیت کی قربانی کے بعد حصول اقتدار کی کوشش کس قدر کامیابی سے ہمکنار ہوسکتی ہے یہ ہم سے زیادہ جمعیت علماءپاکستان کے قائدین کیلئے سوچنا ضروری ہے، ساتھ ہی تمام دینی جماعتوں بالخصوص جمعیت علماءپاکستان کے قائدین کو یہ حقیقت اپنے پیش نظر رکھتے ہوئے اِس خوش فہمی سے باہر نکلنا ہوگا کہ عوام انہیں ایک بار پھر آزمانے جیسی غلطی کا دوبارہ ارتکاب کریں گے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اگر جمعیت علماءپاکستان ایم ایم اے کا حصہ بننا چاہتی ہے تو اس کیلئے دو ہی راستے ہیں، ایک جمعیت علماءپاکستان علامہ شاہ احمد نورانی کی طرح اپنے اصولی موقف کو قائم رہتے ہوئے اتحاد کا حصہ بنے اور اپنے دامن کو پلاٹ، پرمٹ اور سودے بازی جیسی آلائشوں سے بچاتے ہوئے اپنا موثر کردار ادا کرے، موجودہ حالات میں

اس کے امکان بہت ہی کم ہیں۔
دوسرا یہ کہ جمعیت بھی باقی دیگر جماعتوں کی طرح اپنے اصولی موقف سے ہٹ کر وقتی مفادات اور فائدے سمیٹے اور وہی کام کرے جو مولانا فضل الرحمٰن اور قاضی حسین احمد نے کرتے ہیں، لیکن خیال رہے کہ یہ طرز عمل جمعیت علماء پاکستان کی سیاسی خود کشی کے مترادف ہوگا، لہٰذا اِن عوامل، ماضی کے تلخ تجربات اور مولانا فضل الرحمٰن و قاضی حسین احمد کی ہر قیمت پر حصول اقتدار کی سیاست کے تناظر میں آنے والے حالات کومد نظر رکھتے ہوئے ہمارا جمعیت علماء پاکستان کی مرکزی قیادت کو مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ جمعیت کواِن ابن الوقت افراد کی بیساکھی بننے سے بچائیں، ہمارے خیال میں متحدہ مجلس عمل میں دوبارہ شامل ہونے سے کہیں بہتر ہے کہ جمعیت علماء پاکستان، جمعیت کے دیگر دھڑوں اور سنی تنظیموں کو باہم متحد و منظم کرنے کی کوشش کے ساتھ تحریک انصاف جیسی امریکہ مخالف سیاسی جماعتوں سے کسی نئے سیاسی اتحاد کے امکانات پر غور کرے، کیونکہ اِسی میں جمعیت کے نظریاتی تشخص، تنظیمی بقاء اوراپنے ماضی جیسے بے داغ کردار کی ادائیگی کا راز مضمر ہے۔

محبت شرط اوّل ہے۔۔۔۔

ایمان نام ہی محبت رسول کا ہے

دنیا میں ہر انسان کو اپنی عزت و ناموس بڑی عزیز ہوتی ہے اور وہ اپنی عزت بچانے کیلئے مال و دولت تو درکنار جان کی بھی پرواہ نہیں کرتا، لوگ تو اُن آبرو کا تحفظ بھی اپنی ذمہ داری گردانتے ہیں جن سے اُن کا نسبی تعلق ہو یا جن سے اُنھوں نے رشتہ محبت و عقیدت استوار کرلیا ہو، یہ بھی حقیقت ہے کہ محب اپنے محبوب کی شان میں ذرا سی بھی گستاخی برداشت نہیں کرسکتا اور پھر اُس کو یہ علم ہو کہ اُسے جو عزت ملی ہے وہ اُس ذات کی وجہ سے ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے اور وہ ہستی دنیا و عقبیٰ میں کبھی اُس کی عزت پر آنچ نہیں آنے دے گی تو ایسی ہستی کے تحفظ و ناموس کی خاطر وہ کیوں نہ کٹ مرے، کیونکہ روح و قالب کا رشتہ توڑ کر ایسی ہستی سے رشتہ جوڑ لینا ہی انسانیت کی معراج ہے، جس طرح ہم اپنے پیاروں کی شان میں کوئی گستاخی برداشت نہیں کرسکتے، بالکل اُسی طرح اللہ جل شانہٗ بھی اپنے حبیب مکرم، رسول معظم، امام الانبیاء اور خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں توہین و تضحیک نہیں برداشت کرسکتا اور اِس جرم کے ارتکاب کرنے والے کو دردناک عذاب کی وعید سناتا ہے، ارشاد ہوتا ہے "جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ایذا

دیتے ہیں اُن کیلئے دردناک عذاب ہے" (التوبہ 61:9)۔ایک اور مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اذیت دینا اللہ کو اذیت دینا قرار دیتا ہے اور ایسے شخص کو عذاب اُٹھانا کیلئے تیار رہنے کا حکم دیتا ہے۔ ذخیرہ قرآن و حدیث میں اِس حوالے سے متعدد آیات احادیث موجود ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان نام ہی محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے اور حبُ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بغیر ایمان کی تکمیل ناممکن ہے۔ بلکہ مسلمان ہونے کیلئے شرط اوّلین محبت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ بخاری کی روایت ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا"تم میں سے اُس وقت تک کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اُس کو اُس کے والد، اُس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔" حضورِ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اِس ارشاد مبارک سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مسلمان کے ایمان کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ اُس کے دل میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت اتنی زیادہ ہو کہ اُس کی موجودگی میں اُس کو اپنے تمام حقیقی رشتے بھی ہیچ نظر آئیں۔ مسلمان کی اِسی کیفیت کو ایک حدیث شریف میں ایمان کی معراج بتایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بار حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا،یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم مجھے اپنی اولاد اور والدین کے بعد سب سے زیادہ آپ سے محبت ہے، حضور نے ارشاد فرمایا کہ ابھی نہیں ...یعنی ابھی آپ کا ایمان مکمل نہیں ہوا ... کچھ دیر کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اب مجھے اپنی اولاد اور اپنے والدین سے بھی زیادہ آپ سے محبت ہو گئی ہے، آپ نے فرمایا" ہاں اب ٹھیک ہے...یعنی اب تمہارا ایمان مکمل ہو گیا ہے... اِس حدیث کے ذیل میں علماء کرام فرماتے ہیں کہ مسلمان کے ایمانِ کامل کا تقاضا یہ ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس سے اتنی محبت ہو جائے کہ اُس کی موجودگی میں دنیا کے تمام رشتے اور تمام چیزیں معمولی نظر آئیں، یعنی اپنے والدین، اولاد اور مال و دولت سے بڑھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت ہر مسلمان کے ایمان کا حصہ ہے۔

تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں بھی بعض ایسے شیاطین پیدا ہوئے، جنھوں نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی کا ارتکاب کیا، ایسے اشخاص کی سرکوبی کے لئے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو روانہ فرمایا اور حضرات صحابہ کرام نے ایسے اشخاص کو واصل جہنم کرکے دربارِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جنت کا پروانہ حاصل کیا،اِن واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام میں نبی اکرم صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس میں دریدہ دہنی،سب وشتم اور گستاخانہ کلمات کا
زبان سے نکالنا کتنا ناقابل معافی جرم ہے، تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی کسی بدبخت نے
یہ مذموم حرکت کرنے کی کوشش کی تو ایسے شخص کو نشانِ عبرت کانشان بنادیا گیا،اِس
لیے کہ یہ مسئلہ مسلمانوں کے دین ومذہب اور ایمان کی بقاء کا ہے،تاریخ میں اِن
عاشقان رسول کے اسمائے گرامی آج بھی زندہ وروشن ہیں جنھوں نے ایسے شیاطین کو
اُن کے منطقی انجام تک پہنچایا۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا ایک مسلمان سب کچھ برداشت کر سکتا ہے لیکن شانِ رسالت
مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں گستاخی اُس کیلئے ناقابل برداشت ہے،توہین رسالت
کے حوالے سے پاکستان سمیت کئی اسلامی ممالک میں قانون موجود ہے اور مسلمانوں کی
حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کے حوالے سے غیر مسلم دنیا کو بھی مکمل آگاہی
ہے، لیکن اسکے باوجود وقفے وقفے سے کچھ لوگوں نے آزادی اظہار کے نام پر حضور اکرم
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی کو اپنا وطیرہ بنالیا ہے، لیکن ایسی
آزادی اظہار رائے جس سے دنیا کے ڈیڑھ ارب سے زائد مسلمانوں کے بنیادی انسانی
حقوق متاثر ہوتے ہوں،اِس کی اجازت نہ تو کوئی مذہب دیتا ہے اور نہ ہی کسی ملک کا
دستور، ہم سمجھتے ہیں کہ جن ملکوں سے توہین آمیز خاکوں کی اشاعت کی روایت شروع
ہوئی،اُن ملکوں کی حکومتیں اِس میں برابر کی شریک ہیں، جو اپنے کسی بھی شہری کو اِس
بات کی

اجازت نہیں دیتیں کہ وہ ہولوکاسٹ پر کچھ لکھے، اُس کا انکار کرے یا مذاق اڑائے، یہ وہ حکومتیں ہیں جو دنیا بھر میں انسانی حقوق کی چیمپئن بنی ہوئی ہیں۔

لیکن اُن کا طرزِ عمل یہ ہے کہ اگر ایک راہبہ پورا جسم ڈھانپے اور سکارف پہنے تو اُس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا، مگر اگر مسلمان خواتین حجاب پہنیں تو اُن پر پابندی عائد کی جاتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ایک باقاعدہ منظم منصوبہ بندی کے تحت مسلمانوں کے مذہبی شعائر کو نشانہ بنایا جارہا ہے، کبھی فرانس میں برقع پر پابندی عائد کی جاتی ہے تو کبھی جاپان میں ملازمین کا داڑھی جرم قرار پاتا ہے، کبھی بلجیئم میں برقع پر پابندی کے خلاف مسلمانوں کو احتجاج کے حق سے بھی محروم کردیا جاتا ہے تو کبھی سوئٹزر لینڈ میں مسجدوں کے میناروں کی تعمیر پر پابندی لگادی جاتی ہے، آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟ یہ سارے اقدامات کیا اِس بات کا ثبوت فراہم نہیں کرتے کہ ڈنمارک ہو یا ہالینڈ ہو، جاپان ہو بلجئیم ہو یا امریکہ، تمام عالم کفر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک متفقہ پالیسی کے تحت بھرپور سازشوں میں مصروف ہیں۔

ذرا انصاف کا دامن پکڑ کر فیصلہ کیجئے کہ اگر پاکستان میں حکومت عیسائیوں یا ہندوؤں کے کسی مذہبی شعائر پر پابندی عائد کردیتی تو کیا امریکہ سمیت

یورپی ممالک اسے ہضم کر پائیں گے، یقیناً نہیں بلکہ امریکہ اور برطانیہ کی حکومتوں کے
رد عمل سے بھی پہلے پاکستان میں امریکی پٹاری کے لبرل فاشٹ اور حقوق حیوانات کی
عالمی چیمپئین این جی اوز پورے ملک کو سر پر اٹھالیں گی، کیونکہ اُن کو ہر غلطی، ہر
قصور، ہر جرم صرف اور صرف مسلمانوں کا ہی نظر آتا ہے، آج اگر فرانس میں برقع پر
پابندی عائد کر دی جاتی ہے تو یہ حکومت فرانس کا حق بنتا ہے، اگر بلجئیم برقع پر پابندی
عائد کرتا ہے تو یہ لوگ حکومت بلجئیم کو اس کا حق دیتے ہیں، لیکن اگر پاکستان میں
گستاخان رسول کے خلاف توہین رسالت ایکٹ لاگو کیا جاتا ہے تو سارے عالم کفر کے پیٹ
میں مروڑ اٹھنا شروع ہو جاتی ہے اور یہ لوگ توہین رسالت کے قانون کو ختم کروانے
کیلئے مصروف عمل ہو جاتے ہیں، حالانکہ توہین رسالت کا قانون بھی دنیا کے ایک آزاد
اور خود مختار ملک کی حکومت نے اپنی مذہبی اصولوں اور تقاضوں کے مطابق بنایا ہے۔
آج توہین رسالت کے مزموم فعل کے مکمل خاتمے کیلئے ہر اسلامی ملک کی طرف سے
انفرادی سے زیادہ اجتماعی کوششوں کی ضرورت ہے، لیکن سب سے زیادہ افسوس ناک
پہلو یہ ہے کہ اسلامی دنیا کی قیادت کی جانب سے کسی قسم کی مذمت یا رد عمل سامنے
نہیں آتا، جس کی وجہ سے اِن گستاخان رسول کی جراتیں بڑھ جاتی ہیں، جو حدیثِ بالا کی
رُو سے اُن کے ایمان اور ایمانی غیرت پر سوالیہ نشان ہے، آج

دنیا میں ریاست کی مخالفت کو سنگین بغاوت اور غداری جیسا جرم قرار دیا گیا ہے،اِسی وجہ سے دنیا کے تمام ملکوں میں خواہ وہ سیکولر ہوں یا غیر سیکولر جرم بغاوت کا قانون موجود ہے، جس کی سزا، سزائے موت مقرر ہے، جو لوگ بھی اِس جرم میں ملوث ہوتے ہیں، انہیں گولیوں سے اڑا دیا جاتا ہے یا پھر تختہ دار پر کھینچا جاتا ہے اور جن ممالک میں اِس جرم کی سزا، عمر قید ہے، وہاں ایسے ملزموں کو عقوبت خانوں میں تڑپ تڑپ کر مرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے، مگر اِس قانون کے خلاف آج تک کسی نے لب کشائی نہیں کی، تو کیا پھر وہ ذات مبارکہ جس کی وجہ سے یہ دنیا معرض وجود میں آئی، جن کا نام نامی ہی اِس دنیا کے قیام اور بقاء کی ضمانت ہے، اُن کی عزت اور ناموس پر حملہ کرنے والوں کے خلاف قانون توہین رسالت، قابل اعتراض قانون ہے۔؟

ہماری رائے میں قانون توہین رسالت پر اعتراض دراصل دین و مذہب بلکہ خود اپنی عقل و دانش اور فہم و فراست سے یکسر انکار ہے، لہٰذا یہود و نصاریٰ کو یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ مسلمان اپنے آپ کو گالی دینے والے کو تو سو بار معاف کر سکتے ہیں، لیکن اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی کا ارتکاب کرنے والے کو ایک لحظہ بھی برداشت اور معاف نہیں کر سکتے، کیونکہ یہی اُن کے ایمان کا حصہ اور رمز ایمانی ہے، لیکن آج عالم اسلام کی کمزوری کی وجہ سے یہود و نصاریٰ کو اتنی جرات حاصل ہو گئی ہے کہ وہ مسلما

نوں کی اساسِ ایمان پر ڈاکہ ڈالنے لگے ہیں اور کھلے عام اپنے خبثِ باطن کا اظہار کرتے ہوئے کبھی مسلمانوں کے دین و مذہب کا مذاق اڑاتے ہیں، کبھی قرآن و سنت کو نشانہ تنقید بناتے ہیں اور کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو .... نعوذباللہ .... تختہ مشق بناتے ہیں، پھراس فعلِ قبیح کو آزادی صحافت کی آڑ میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ایسے شرمناک اور مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے والے اقدامات کا مقصد مسلمانوں کو ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت و عقیدت سے دور کرنا ہے، لیکن اِس قسم کے اقدامات سے کبھی بھی روح محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں کے بدن سے نہیں نکالی جاسکتی ہے،ہاں یہ ضرور ہے کہ اِس طرز عمل سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں اور انکے دل کٹ کر رہ جاتے ہیں، چند سال قبل ڈنمارک، سویڈن اور ناروے میں کچھ جرائد نے توہین آمیز خانے شائع کیے تو عالم اسلام سراپا احتجاج بن گیا، مسلمانوں کی طرف سے شاتمانِ رسول کو سزا دینے اور جرائد بند کرنے کے مطالبات کیے گئے، لیکن اِس پر کسی نے کان نہ دھرے،تاہم ایک لعین کارٹونسٹ کو اسکے ایک ہم وطن نے انجام تک پہنچا دیا اور ایک گھر میں لگی آگ میں جل کر جہنم واصل ہوگیا، لیکن مغرب نے عالم اسلام کے جذبات کو مجروح کرنے والی اِس شرمناک حرکت کا کوئی نوٹس نہ لیا۔

اگر حکومتی سطح پر مذکورہ جرائد بند کرا دیئے جاتے، گستاخانہ خاکے بنانے والوں اور انہیں
شائع کرنے والے شیطانوں کو سزا دلا دی جاتی اور مسلم اُمہ کی طرف سے اِس کا بھرپور
جواب دیا جاتا تو آج فیس بک انتظامیہ کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس
میں گستاخی کی جرات نہ ہوتی۔اِن حالات میں محب وطن پاکستانیوں اور مخلص مسلمانوں
کو کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے یہ آج کا سب سے بڑا اہم اور سلگتا ہوا سوال ہے، ہم
سمجھتے ہیں اِن حالات میں کوئی بھی جذباتی قدم اٹھانے کی بجائے انتہائی غور و فکر اور
تدبر کے ساتھ کافروں اور منافقوں کی چالوں کا انہی کے انداز میں منہ توڑ جواب دینا
چاہیے اور پاکستان سمیت دنیا بھر کے مسلمانوں کو اِس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ کافر
و منافق مسلمانوں کو اُن کے رسول رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دور کرنا چاہتے
ہیں، جس میں وہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتے ۔

اقتصادی سروے اور شرمناک معاشی حقائق

"اکنامک سروے آف پاکستان "کیا قوم کے دکھوں کا مداوا کرسکے گا۔۔۔

خوبصورت الفاظ اور حقائق کے منافی گوشوروں کا گورکھ دھندہ

گزشتہ دنوں ملک کی اقتصادی صورت حال کا سالانہ جائزہ جاری کیا گیا جسے عرف عام میں "اکنامک سروے آف پاکستان" کہا جاتا ہے، حکومت ہر سال بجٹ سے پہلے عمدہ آفسٹ پیپر پر رنگین تصاویر اور خوبصورت گوشواروں کے ساتھ اعلیٰ سرورق سے مزین ایک ایسی دستاویز شائع کرتی ہے جو بعد ازاں حکومتی کباڑخانوں کی نذر ہوجاتی ہے، گوکہ بنیادی طور پر اِس "اکنامک سروے آف پاکستان" کا مقصد ملک کی معاشی صورتحال کا جائزہ لینا ہوتا ہے، لیکن یہ بہت سے ایسے متعلقہ معاملات کا بھی اجمالی جائزہ لیتی ہے جو ملکی اقتصادیات پر اثر انداز ہوتے ہیں، حکومت کے تازہ ترین معاشی جائزے میں نام نہاد "وار آن ٹیرر" کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے، رپورٹ کے اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ نائن الیون سے اپریل 2010 تک نو برس کے دوران پاکستان میں دہشت گردی کی 8141 وارداتیں ہوئیں، جن میں عام شہریوں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکاروں سمیت 8875 افراد لقمہ اجل بنے،20675 افراد زخمی اور ایک بڑی تعداد معذور ہوئی، رپورٹ

میں اِن نو سالوں کے درمیان ملکی معیشت پر پڑنے والے منفی اثرات کا تخمینہ 43 ارب ڈالر لگایا گیا ہے، جو کہ ایک محتاط اندازے کے مطابق پاکستانی کرنسی میں 3655 ارب روپے کی رقم بنتی ہے۔
یہ جائزہ رپورٹ بتاتی ہے کہ امن وامان کی اِس بدحالی کے باعث معیشت کی نشو ونما تعمیر وترقی کے منصوبوں اور سرمایہ کاری پر بھی مضر اثرات مرتب ہوئے ہیں، ہزاروں لوگ زندگیوں اور اپنے گھروں سے ہی نہیں وسائل روزگار سے بھی محروم ہوگئے ہیں، یہ اکنامک سروے رپورٹ اُن متاثرہ شعبوں کی بھی واضح نشاندہی کرتے ہوئے بتاتی ہے کی شرح نمو، بیرونی سرمایہ کاری، برآمدات، روپے کی GDP کہ مجموعی قومی پیداوار قدر اور ترقیاتی بجٹ میں کمی ہوئی، بے روزگاری اور مہنگائی میں اضافہ ہوا اور سرمایہ بیرون ملک منتقل ہوا، اس سروے میں مزید انکشاف کیا گیا ہے کہ جولائی 2007ء سے اب تک سیکورٹی اور سول ریلیف کے کاموں پر 4 ارب ڈالر خرچ ہوئے جو مجموعی قومی پیداوار کا 2.4 فی صد اور ہمارے پورے سال کے تعلیمی اخراجات کے برابر ہے،
سروے مزید بتاتی ہے کہ امریکی جنگ میں حصہ داری کی وجہ سے کم وبیش تیس لاکھ افراد بے گھر ہوئے، جن کی بحالی اور آبادکاری کے لئے گزشتہ برس 60 کروڑ ڈالر مختص کرنا پڑے، رپورٹ میں کئی دیگر شعبوں پر مرتب ہونے والے منفی اثرات کی تفصیل بتانے کے بعد کہا گیا ہے کہ یہ مستقل نوعیت کے ایسے نقصانات ہیں جن کا ازالہ کئی

برسوں میں بھی نہ ہوسکے۔

خیال رہے کہ اس اقتصادی جائزے سے چند دن قبل اسٹیٹ بینک بھی زرعی اور مالیاتی صورتِ حال پر ایک مفصل رپورٹ جاری کرچکا ہے۔ اسٹیٹ بینک کی رپورٹ اور سالانہ اقتصادی جائزے دونوں پاکستانی معیشت کی تباہی کی تصدیق کررہے ہیں۔ اب تو ماہرین معیشت بھی وزارتِ خزانہ کے منتظمین کے پیش کردہ اعداد و شمار، اندازوں اور تخمینوں کو گمراہ کن قرار دے رہے ہیں۔ اعداد و شمار کے گورکھ دھندوں اور حکومت کے نام نہاد معاشی ماہرین کے تجزیوں اور دعوؤں کے برعکس ایک عام شہری روزانہ اپنا چولہا گرم رکھنے اور روزمرہ کی ضروریات پوری کرنے کی کشمکش میں لگا ہوا ہے۔ ایک عام شہری کے لیے ملک کے اقتصادی بحران کی شدت کیلئے کسی جائزے اور اعداد و شمار کے تجزیے کی ضرورت نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حالات کی خرابی اب اس انتہا تک پہنچ گئی ہے کہ اس کا بیان کرنا کسی بھی رپورٹ میں ممکن نہیں رہا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ موجودہ حکومت کو برسرِاقتدار آئے ہوئے 28 ماہ گزر چکے ہیں۔ یہ بات روزِ اوّل سے واضح تھی کہ نئی منتخب حکومت کے سامنے سب سے بڑا چیلنج اقتصادی بحران ہے۔ حالات میں تبدیلی کی امید پر عوام، سیاسی جماعتیں، ذرائع ابلاغ اور تجزیہ نگار موجودہ حکومت کو وقت اور مہلت دینے کو تیار تھی، لیکن اٹھائیس ماہ میں معاشی ابتری، مہنگائی اور بے روزگاری کے طوفان میں جس قدر تیزی سے اضافہ ہوا ہے اس سے

حالات اس نہج پر پہنچ چکے ہیں کہ اب سرکاری اور حکومتی رپورٹوں میں بھی اس بات کا اعتراف کیا جارہا ہے کہ مہنگائی، بے روزگاری میں اضافہ اور غیر ملکی سرمایہ کاری میں کمی ہوئی ہے، اس کے باوجود حکومت کے معاشی منتظمین کا دعویٰ ہے کہ معیشت بحالی کی جانب گامزن ہے اور مشکل فیصلوں کے ثمرات آنے شروع ہوگئے ہیں، لیکن اقتصادی جائزے جو حقیقت بیان کررہے ہیں اس کے مطابق ملکی اور غیر ملکی قرضوں کا حجم 8 ہزار ارب روپے سے تجاوز کرگیا ہے، جس کی وجہ سے حکومت کا سارا زور ٹیکسوں کی 160 شکل میں عوام کی رگوں سے خون نچوڑنے پر منحصر ہے، یہی وجہ ہے کہ موجودہ بجٹ کو عوام دوست بجٹ کے بجائے "آئی ایم ایف دوست" بجٹ قرار دیا جارہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے عوام کو موجودہ خطرناک ترین صورت حال تک پہنچانے اور آئی ایم ایف کے سخت ترین شکنجے میں جکڑنے کے لئے پیپلزپارٹی کی حکومت نے بنیادی کردار ادا کیا ہے، ہمارے معاشی پالیسی سازوں اور حکومت نے جان بوجھ کر ملک کو آئی ایم ایف کی سخت ترین شرائط پر قرض حاصل کرکے ملک و قوم کو گروی رکھ دیا ہے، ایک طرف جہاں حکومت سخت معاشی حالات کا بہانہ بنا کر ویٹ جیسے ظالمانہ ٹیکس کو نافذ کرنے کی کوشش کررہی ہے اور ٹیکس کے دائرے کو وسیع کرنے کے نام پر عوام پر بوجھ بڑھا رہی ہے، وہیں دوسری طرف مراعات یافتہ طبقات کے لئے تمام رعایتیں موجود ہیں، ایک تحقیقی رپورٹ کے مطابق 48

فیصد سے زائد آبادی اپنی بنیادی غذائی ضروریات پوری نہیں کر سکتی جب کہ حکمران طبقے کی بھرپور عیاشیاں جاری ہیں، کرپشن اور بدعنوانی کی داستانیں بھی اس کی تصدیق کر رہی ہیں، اس کے باوجود معاشی منتظمین اعداد و شمار کے حوالے سے یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ پاکستان میں ٹیکسوں کا تناسب سب سے کم ہے، یہ درست ہے کہ پاکستان کی حقیقی معیشت کبھی کمزور نہیں تھی، اس معیشت کو درآمد شدہ ماہرین معیشت، رشوت خور، بدعنوانی سیاست دانوں اور افسر شاہی کے گٹھ جوڑ نے تباہ کیا ہے، سوال یہ ہے کہ کیا اس صورت حال کی ذمہ دار حکومت نہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض معاملات میں حکومت کی ناکامی نوشتہ دیوار ہے، مثال کے طور پر ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کی رپورٹ کو اگر پچاس فی صد غلط قرار دیا جائے تو بھی حکومتی سطح پر ہونے والی کرپشن کا معاشی تباہی میں سب سے بڑا کردار ہے، اس پر مستزاد یہ کہ حکومت کوئی واضح معاشی حکمت عملی اپنانے میں بھی پوری طرح ناکام رہی ہے، سرکاری اخراجات اور وسائل میں توازن پیدا کرنا حکومت کا کام ہے، لیکن اس کی بھی کوئی منصوبہ بندی کہیں دکھائی نہیں دیتی، معاشی منصوبہ بندی کی عدم موجودگی کا ایک اظہار اس سے بھی ہوتا ہے کہ پٹرول کی قیمت ایک روپیہ فی لیٹر بڑھتی ہے تو ہر شے کی قیمت میں فوراً اضافہ ہو جاتا ہے، لیکن جب پٹرول کی قیمت چھ روپے فی لیٹر کم ہوتی ہے تو کسی ایک شے کی قیمت میں کوئی کمی نہیں آتی، یہ انتظامی ناکامی کے ساتھ معاشی منصوبہ بندی کے نہ ہونے کی بین دلیل ہے، لیکن اس کے باوجود

موجودہ حکومت کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ عوام کی نمائندہ اور ان کی خیر خواہ ہے، چنانچہ ایسی اقتصادی صورتحال میں بہتری کی توقع کرنا کار عبث ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس اقتصادی سروے میں جو اعداد و شمار جاری کئے گئے ہیں وہ اتنے ہولناک ہیں کہ اُس نے پہلے سے مایوس اور پریشان عوام کو اور بھی زیادہ فکر مند کر دیا ہے، حکومت کی طرف سے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق جو جائزہ رپورٹیں پیش کی جاتی ہیں، ایک ذمہ دار حکومت کی طرف سے اُن کا بنیادی مقصد عوام کو حقائق سے آگاہ کرنا اور اِس اَمر کی یقین دہانی کرانا ہوتا ہے کہ آئندہ اِن کے منفی پہلوؤں کا تدارک کیا جائے گا اور مؤثر اور نتیجہ خیز اقدامات سے اِن کا ازالہ کرکے عوام کی مشکلات کو دور کیا جائے گا لیکن موجودہ اقتصادی سروے میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ اِس وقت معروضی صورتحال اور زمینی حقائق یہ ہیں کہ توانائی کے بحران کے سبب صرف پنجاب میں 30 ہزار کے لگ بھگ صنعتی ادارے بند ہونے سے لاکھوں افراد بے روزگاری کا شکار ہو گئے ہیں، بجلی اور گیس کی قیمتوں میں اضافے سے جہاں گھریلو صارفین کے لئے مشکلات پیدا ہوئیں ہیں، وہاں مصنوعات کی پیداواری لاگت بڑھنے سے قیمتوں میں اضافے کے باعث مہنگائی میں بھی اضافہ ہوا، لیکن اِس کے باوجود نہ تو حکومتی اخراجات میں کمی کی گئی ہے اور نہ ہی کارکردگی کو بہتر بنانے اور مالی کنٹرول کو مؤثر بنانے کے لئے کوئی قدم اٹھایا گیا، جس سے یہ خدشات جنم

لے رہے ہیں کہ آئندہ سال بھی معیشت کی بحالی اور حالات کی بہتری کا کوئی واضح امکان نظر نہیں آتا، اوپر سے حکومتی سروے میں اصلاح احوال کے لئے مؤثر اقدامات کا فقدان اِس خدشے کو مزید تقویت دیتا ہے کہ معاملات حکومت کے کنٹرول سے باہر ہوتے جا رہے ہیں، مشیر خزانہ کی طرف سے حکومت کی ناقص کارکردگی کا اعتراف اپنی جگہ لیکن اُن کی طرف سے بجلی کے نرخوں میں مزید اضافہ اور ویلیو ایڈڈ ٹیکس کے نفاذ کا عندیہ گرانی کے طوفان میں گھرے ہوئے عوام کی کمر توڑ کر اُن کی قوت خرید کو بالکل ختم کر دے گا، اِس پر افسوسناک اَمر یہ ہے کہ ہمارے حکمرانوں نے یہ سوچنے کی زحمت ہی گوارہ نہیں کی کہ عوام جنھوں نے انہیں ایوانِ اقتدار تک پہنچایا ہے، اُن کے منہ سے نوالہ چھین لینے، انہیں بے روزگاری کی بھٹی میں جھونکنے اور زندگی کی بنیادی سہولتوں اور مراعات سے محروم کرنے کا اُن کے پاس کیا جواز ہے اور وہ عوام کو کس جرم کی سزا دینے پر تلے ہوئے ہیں، سروے میں جن خامیوں کی نشاندہی کی گئی ہے حکومتی پالیسی کے حوالے سے بجٹ میں اُن کے ازالے کا بھی کوئی امکان نظر نہیں آتا، دوسری طرف اسٹیٹ بینک قوم کو یہ خوش خبری دے رہا ہے کہ اِس سال مہنگائی اور بڑھے گی۔

قارئین محترم یہ ساری تفصیل خود اُس حکومت کی مرتب کردہ ہے جو امریکی جنگ کی سواری پہ سوار فتح کا نشان بنائے سابقہ حکمرانوں کی طرح اپنی قوم کو یہ

باور کرا رہی ہے کہ یہی حکمت عملی ملک اور قوم کے وسیع تر مفاد میں ہے، درحقیقت اکنامک سروے آف پاکستان کی رپورٹ نے صرف اُن مادی نقصانات کا مختصر سا جائزہ پیش کیا ہے جو امریکی مفادات کی جنگ میں اُس کا دست و بازو بن جانے سے ہمارا مقدر بنے، بدقسمتی سے ابھی تک ایسے اصول، قاعدے، ضابطے اور فارمولے ایجاد نہیں ہوئے، جو قلب و ذہن، شعور فکر اور انسانی احساس کی کھنڈر ہو جانے والی بستیوں کا جائزہ لے سکیں، ایک زندہ و جاوید، حریت پسند قوم کی کرب و اذیت کا صحیح تخمینہ لگا سکیں اور قومی آزار مسلسل کو کسی گوشوارے کی شکل میں ڈھال سکیں، نہ ہی ابھی تک ایسا کوئی آلہ ایجاد ہوا ہے جو گراف بنا کر وحشت ناک ڈرون حملوں کا نوالہ بن جانے والوں کے ورثا کے شب و روز کا کوئی گوشوارہ بنا سکے اور قومی غیرت و حمیت کے لٹ جانے والے خزانے کی نقشہ گری کر سکے۔ ہماری خیال میں دیکھا جائے تو یہ حکومتی اکنامک سروے ان سب کے منہ پر ایک زناٹے دار طمانچہ ہے جو امریکی مفادات کی جنگ کا ہر اول دستہ بننے کو پاکستان کی ترقی و خوشحالی کا باب اوّل خیال کرتے ہیں۔

ایسی جمہوریت پر لعنت ہے-----

صاحب مجھے معلوم ہے کہ آپ بہت مصروف آدمی ہیں اور آپ کا وقت بہت قیمتی ہے مگر میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا. بس ایک چھوٹی سی کہانی سنانا چاہتا ہوں، شاید میری کہانی کسی اکبر علی، کسی ایمن کسی نادیہ، کسی بینش، کسی مزمل بی بی اور کسی شیخ اسماعیل کی جان بچاسکے۔ میں نے نگاہ اٹھا کر اُس کی طرف دیکھا، وہ چالیس پینتالیس سال کی درمیانی عمر کا شخص تھا، اُس کی آنکھوں میں زندگی سے لڑنے کا عزم اور چہرے پر حالات سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ نمایاں تھا، اِس سے قبل کہ میں اُس سے معذرت چاہتا اور اُسے اپنی کہانی سنانے سے منع کرتا اُس نے بھی میری اجازت کی ضرورت محسوس کئے بغیر ہی اپنی کہانی سنانی شروع کر دی، وہ کہہ رہا تھا، "جناب میں نے انٹرمیڈیٹ کیا ہوا ہے، ایک نجی کمپنی میں اچھی بھلی نوکری چل رہی تھی، بچے بھی درمیانے درجے کے اسکول میں پڑھ رہے، سفید پوشی سے زندگی گزر رہی تھی، بد قسمتی سے ایک دن کمپنی منیجر سے کسی بات پر تکرار سے بات بڑھ گئی، اُس نے مالک سے شکایت کر دی، جس نے دس بارہ سال کی محنت، ایمانداری اور ملازمت کا خیال کئے بغیر مجھے فوراً ہی جاب سے نکال دیا، یہ دھچکا میرے لیے اِس قدر شدید تھا کہ میری پوری زندگی ہی بدل گئی۔

دوسری ملازمت حاصل کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں، کئی مہینے گزر گئے، اِس دوران گھر میں موجود تمام جمع پونجی ختم ہو گئی، حتیٰ کہ بیوی کے چھوٹے موٹے زیور بھی بک گئے، نوبت فاقوں تک آ گئی، محلے کے دکانداروں نے ادھار دینا بند کر دیا، دوست رشتے دار ادھار دے دے کر تنگ آ گئے، حال یہ ہوگیا کہ انہوں نے فون اٹھانے چھوڑ دیئے، اگر کسی سے ملنے جاتا تو اندر سے کہلوا دیا جاتا کہ موجود نہیں ہیں، ایک روز جب بیوی بچے تین وقت کے فاقے سے تھے، دل میں خیال آیا کہ اِس ذلت بھری زندگی سے تو مر جانا ہی بہتر ہے، مگر میرے پاس تو مرنے کیلئے بھی زہر خریدنے کے پیسے نہیں تھے، اچانک یاد آیا کہ کچھ عرصہ قبل چوہے مار زہریلی دوا کی گولیاں خریدی تھی، کیوں نہ اسے استعمال کیا جائے، اِس خیال کے آتے ہی خاموشی سے دوا کا پیکٹ ڈھونڈا، پیس کر باریک سفوف بنایا، کچن سے پرانا گڑ نکالا اور اُس میں گھول کر زہریلا شربت تیار کیا اور شربت کا جگ لے کر میں نے بیوی بچوں کو ایک کمرے میں جمع کیا۔

بیوی حیران تھی کہ گھر میں کھانے کو روٹی نہیں ہے، شربت کیسے بنا لیا، میں نے اُس کی آنکھوں میں موجود سوال کو محسوس کرتے ہوئے کہا، نیک بخت میرے پاس ایک بہت اچھی خبر ہے جلد ہی ہماری مشکل کے دن ختم ہونے والے ہیں، جب تم لوگ یہ شربت پی لوگے تو میں تمہیں وہ خوشخبری سناؤں گا، وہ سب خوش ہوگئے، میں نے ایک گلاس میں شربت انڈیلا اور اپنی بڑی بیٹی کو پینے کیلئے دینے لگا،

اِس سے قبل کہ میری بیٹی اُس گلاس کو تھامتی، یکایک میرے سب سے چھوٹے بیٹے جس کا چہرہ فرط مسرت سے چمک رہا تھا، نے جھپٹ کر میرے ہاتھ سے گلاس لے لیا، کہنے لگا بابا جانی.... پہلے میں پیوں گا، تاکہ خوشخبری بھی سب سے پہلے میں سن سکوں، جبکہ میری بیٹی بھی بضد تھی کہ بڑے ہونے کی وجہ سے شربت پہلے اُسے ملنا چاہیے، اپنے بچوں کی ایکدوسرے پر سبقت لے جاتے دیکھ کر میرے ذہن میں خیال آیا کہ میرے بچے مجھ پر کتنا اعتماد کرتے ہیں، وہ بھاگ بھاگ کر میرے ہاتھ سے زہر کا بھرا گلاس لے رہے ہیں، انہیں یقین ہے کہ اُن کا باپ اُن کو نقصان نہیں پہنچا سکتا، بس جناب اُس ایک لمحے نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔

میں نے گلاس اپنے بیٹے کے ہاتھ سے چھین لیا اور تمام زہریلا شربت صحن کے ایک کچے گوشے میں انڈیل دیا اور طے کرلیا کہ آج سے میں اپنے بیوی بچوں کیلئے ہر کام کروں گا، چاہے وہ کیسا ہی کیوں نہ ہو، چنانچہ دوسرے دن سے میں نے کباڑیے کا کام شروع کردیا اور گلی گلی، محلے محلے گھوم کر پرانی اشیاء ردی بوتلیں، جوتے وغیرہ جمع کرنے شروع کردیئے، جس سے مجھے اتنی آمدنی ہونے لگی کہ میرے گھر کا چولہا جلنے لگا، شروع میں مجھے کام کا سلیقہ نہیں تھا، لیکن جوں جوں کام کا طریقہ آتا گیا، میری آمدنی بھی بڑھتی گئی، اللہ نے میرے کاروبار میں برکت دی، اب میں خود ایک بڑا کباڑی ہوں اور میرے پاس کئی پھیری والے ملازم ہیں، میرے گھر کے حالات بھی بدل چکے ہیں، بچے پرائیوٹ اسکول میں

زیر تعلیم ہیں، اللہ کے فضل و کرم سے میری زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے، میں اکثر
سوچتا ہوں کہ اُس روز ایک لمحے کیلئے اگر شفقت پدری غالب نہ آتی اور میں اپنے ہاتھ
سے محنت مزدوری کرنے کو عار نہ سمجھتا تو آج لاہور کے رکشہ ڈرائیور اکبر علی، کراچی
کی بدنصیب ماں بیٹیوں، شاہدرہ کے بے روزگار نوجوان اور ڈی جی خان کے محنت کش
شیخ اسماعیل کی طرح میری کہانی بھی اخبارات اور ٹی وی چینلز کی زینت بنی ہوتی۔
جناب آپ اخبارات میں لکھتے ہیں، میں نے آپ کو اپنی کہانی اِسلئے سنائی ہے کہ آپ
میرا یہ پیغام اپنے قارئین تک پہنچا دیں کہ غربت سے زیادہ مایوسی انسان کو شکست
خوردہ بناتی ہے، اُمید کا دامن کبھی بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے اور کبھی اللہ کی ذات
سے مایوس نہیں ہونا چاہیے، انسان کا کام ہے محنت کرنا، محنت میں ہی عظمت ہے، کوئی
بھی کام برا نہیں ہوتا اور ایک انسان کو ہر کام کیلئے تیار رہنا چاہیے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا،
سلام کیا اور مجھے جھنجھوڑنے والی کہانی سنا کر چلا گیا۔
قارئین محترم حقیقت یہی ہے کہ جب آس اُمید اور یقین کا راستہ کھو جائے تو مایوسی اور
نااُمیدی انسان کو ایسے تاریک گھنے جنگل میں لے جاتی ہے، جہاں موت کی آغوش ہی
اُس کو آخری پناہ گاہ محسوس ہوتی ہے، دنیا بھر کے نفسیاتی

ماہرین اِس بات پر متفق ہیں کہ آدمی خودکشی اُس وقت کرتا ہے جب اُس کے سامنے زندگی گزارنے کے عمل کو پہاڑ جیسا مشکل بنادیا جائے اور کوئی اُس کا ساتھ دینے کو تیار نہ ہو، جبکہ اُس کے سامنے لوگ آسانی اور تیز رفتاری سے یہ پہاڑ سر کر رہے ہوں، ایک عام آدمی کا آخری سہارا حکومت ہوتی ہے، لیکن اگر وہ بھی ذخیرہ اندوزوں اور منافع خوروں کا ساتھ دے اور اپنی جیبیں بھرے تو مایوسی اور بھی شدید ہوجاتی ہے، اِس مایوسی کے عالم میں خودکشی کا دوسرا محرک زندگی کی وہ چمک دمک بن جاتی ہے جو حکمرانوں سرمایہ داروں اور طبقہ اشرافیہ میں نظر آتی ہے، غربت بھوک اور افلاس کے ستائے ہوئے لوگ جب اِس جانب دیکھتے ہیں تو نہ اُن کا یقین حکمرانوں پر قائم رہتا ہے اور نہ اللہ کی ذات پر۔

یہی وہ بے یقینی ہے، جو انہیں موت کو گلے لگانے میں مدد دیتی ہے، پاکستان میں اِس وقت غربت، بھوک اور بے روزگاری کا وحشیانہ رقص جاری ہے، گھر گھر، گلی گلی، محلے محلے غربت، بھوک اور افلاس کے عفریت نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں اور یہ عفریت کمزوروں کو اسلیئے نگل رہا ہے کہ حکمرانوں نے اپنی ظالمانہ اور عوام کش پالیسیوں کا سحر پھونک رکھا ہے، اُن کے پاس عوام کو دینے کے لئے کچھ بھی نہیں، دوسری طرف مہنگائی نے لوگوں کو پاگل کر دیا ہے اور جب انہیں کہیں کوئی جائے پناہ نہیں ملتی وہ موت کی آغوش میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔

خود کشی کے یہ واقعات پاکستان کے ہولناک سماجی اور نفسیاتی منظر نامے کی عکاسی کر رہے ہیں، گو کہ غربت پاکستان میں ہمیشہ رہی ہے، لیکن گزشتہ چند عشروں سے ایسی صورتحال پیدا ہوئی ہے کہ لوگ دنیا کی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے آخرت کی مصیبت اور عذاب کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

ہمارا ماننا ہے کہ عوام کی دنیا و آخرت کی بربادی کے ذمہ دار پاکستان کے حکمراں ہیں، جنھوں نے اللہ کی رحمتوں سے مالا مال ملک کو بدترین حال تک پہنچا دیا ہے، اگر حکمرانوں کی پر تعیش زندگی، بدعنوانی اور رشوت خوری کے ذریعے جمع کیے گئے کروڑوں اور اربوں روپے کی داستانوں پر نظر ڈالی جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کی تباہی کے اصل ذمہ دار کون ہیں، یہ صورتحال پاکستان میں سیاسی انقلاب، سماجی اصلاح اور جمہوریت کے اُن دعویداروں کے منہ پر بھی طمانچہ ہے جو اب بھی بیرونی اشاروں پر غریب عوام پر ٹیکسوں کا مزید بوجھ لادنے کے منصوبے بنا رہے ہیں، انھیں اِس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ ملک کے غریب عوام کس کرب و اذیت میں مبتلا ہیں، اگر یہی حال رہا تو وہ دن دور نہیں جب لوگ ایک دوسرے کے منہ سے روٹی کے نوالے چھیننے لگیں گے۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ پاکستان میں ہر گزرتے دن کے ساتھ زندہ رہنا مشکل سے

مشکل تر ہوتا جارہا ہے، جس کا نتیجہ خود کشی کے بڑھتے ہوئے واقعات کی صورت میں سامنے آرہا ہے اور اس رجحان میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے، حال یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں مایوسی، عدم اعتماد، غربت، خاندانی نظام کی ٹوٹ پھوٹ، بے روزگاری اور احساسِ محرومی بڑھتا جارہا ہے، ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کی رپورٹ کے مطابق دنیا میں خود کشی کی سب سے زیادہ شرح ایشیاء میں ہے، جو پوری دنیا کے مقابلے میں ساٹھ فیصد ہے، ایک غیر سرکاری رپورٹ کے مطابق پاکستان میں ہر سال چھ سے آٹھ ہزار افراد خود کشی کر رہے ہیں، جن میں سے پچاس فیصد سے زائد واقعات تو مختلف وجوہات کی بنا پر رپورٹ بھی نہیں ہوتے، صرف دارالحکومت اسلام آباد میں پانچ برس کے دوران 99 خود کشی اور اقدام خود کشی کے واقعات رونما ہوئے۔ آغا خان ہسپتال کی ایک تحقیقی رپورٹ کے مطابق خود کشی کے 90 فیصد واقعات کا تعلق ڈپریشن سے ہوسکتا ہے۔

یونیورسٹی کے شعبہ نفسیات کے سربراہ پروفیسر ڈاکٹر مراد موسیٰ خان کا کہنا ہے کہ ملک کی 34 فیصد آبادی عام اعصابی امراض میں مبتلا ہے، جس میں زیادہ تر افراد تیس سال سے کم عمر ہیں، رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ بڑھتی ہوئی سماجی و معاشی مشکلات نے صورت حال کی سنگینی میں مزید اضافہ کردیا ہے، جبکہ اِن مسائل پر قابو پانے میں حکومت کی ناکامی لوگوں میں مایوسی کو بڑھاتی ہے، جو بالآخر ڈپریشن میں تبدیل ہوجاتی ہے، ڈاکٹر مراد کا کہنا ہے کہ مایوسی

خودکشی کے عوامل میں سے ایک ہے، کیونکہ انسان جتنا ذہنی دباؤ کا شکار ہوتا ہے، اُس میں مایوسی اور ناامیدی اتنی ہی بڑھ جاتی ہے۔ خودکشی کے خلاف کام کرنے والی ایک عالمی تنظیم انٹرنیشنل ایسوسی ایشن فار سوسائیڈ پری وینشن (آئی اے ایس پی) کا کہنا ہے کہ دنیا بھر میں ہر سال دس لاکھ سے زیادہ لوگ خودکشی کرتے ہیں اور اِن کی تعداد جنگوں، دہشت گردی کے واقعات اور قتل کے نتیجے میں ہلاک ہونے والوں سے کہیں زیادہ ہے۔

اِس وقت پاکستان میں روزانہ اوسطاً سات افراد خودکشی کر رہے ہیں، سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 2008ء میں دو ہزار پانچ سو اٹھائیس افراد نے خودکشی کی جن میں ایک ہزار سات سو پچیس مرد اور آٹھ سو تین خواتین شامل ہیں، جنوری 2000ء تا دسمبر 2009ء کے دوران پاکستان بھر سے خودکشی کے 31349 واقعات رپورٹ ہوئے، جس کی زیادہ تر وجہ انصاف کی عدم فراہمی یا پھر معاشی بدحالی ہے، حقیقت یہ ہے کہ خودکشیوں کی بنیادی وجہ معاشی بدحالی کے ساتھ مغرب کی نقالی اور اپنی تہذیب و تمدن اور اپنے دین سے دور ہو کر مغرب کی جدیدیت اور مادیت کا شکار ہونا بھی ہے، جس نے فرد اور ہمارے معاشرے میں اضطراب اور بے سکونی کی کیفیت پیدا کر دی ہے اور ہمارے ملک میں مغربی معاشرے کی طرح ذہنی و اعصابی امراض پیدا ہو گئے ہیں، جس کا منطقی نتیجہ خودکشی کے بڑھتے ہوئے رجحان کی صورت میں سامنے آرہا ہے، ماہرین نفسیات کے مطابق مسائل میں گھرے

ہوئے انسان کو جب اُمید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی تو وہ موت کو تمام مسائل کا حل سمجھتا ہے۔

پاکستان میں غربت اور بیروزگاری کی شرح میں جس تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے، اُس نے ایک غریب آدمی کی کمر توڑ کر رکھدی ہے۔اِس وقت پاکستان کی تقریباً 60 فیصد سے زیادہ آبادی خط غربت سے نیچے زندگی بسر کر رہی ہے، حالات میں بہتری کی امید اُن کے لیے ماند پڑتی جا رہی ہے، مایوسی بڑھ رہی ہے اور وہ نوجوان جو ملک و قوم کا سرمایہ ہیں وہ اپنی زندگیاں ختم کر رہے ہیں۔پاکستان میں بڑھتی ہوئی غربت، مہنگائی، ناانصافی لوگوں کیلئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکی ہے اور پاکستان کے سماجی، اقتصادی اور صحت سے متعلق بڑھتے ہوئے مسائل اور بیروزگاری اور غربت کی ابتر صورت حال نے لوگوں کو حرام موت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی سماج بھی اب مغربی سماج کی طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا ہے، ایسے میں خودکشی اور مایوسی کے اِس رجحان کو روکنے کے لیے حکومت سے اُمید رکھنا کار عبث ہے، کیونکہ حکمراں تو ریس کے شوقین، گولف کے دلدادہ اور عالیشان محلوں کے رہنے والے ہیں، عوام کو پینے کا صاف پانی اور دو وقت کی روٹی میسر ہو یا نہ ہو لیکن اُن کے گھوڑوں کیلئے تو میوے بادام حاضر

ہیں، ایسے میں قوم کو اپنی تقدیر اور اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنا ہوگا اور اِن ظلموں سے
نجات کے لیے عملی قدم اٹھانا ہوگا، ورنہ ایک وقت آئے گا کہ پوری قوم یا تو اجتماعی
خودکشی پر خود مجبور جائے گی یا پھر زبردستی مجبور کردی جائے گی، ہم سمجھتے ہیں کہ
کروڑوں لوگوں کو مہنگائی، بھوک اور بے روزگاری کی مار دے کر حکمران ملک کو اُس
خونی انقلاب کی طرف دھکیل رہے ہیں جو سب کچھ تلپٹ کرکے رکھ دے گا، پنجاب کے
وزیر اعلیٰ اِس انقلاب سے متعدد مرتبہ خبردار کرچکے ہیں، اب تو حکومتی جماعت کے
رکن سنیٹر رضا ربانی نے بھی کہنے پر مجبور ہوگئے ہیں کہ گلیوں سے اٹھنے والا انقلاب
حکمران طبقے کو بہالے جائے گا، درست فرمایا فخر پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے کہ "
جس ملک میں عوام فاقوں سے مر رہے ہوں، وہاں جمہوریت کے بھنگڑے ڈالے
جائیں، تو ایسی جمہوریت پر لعنت ہے۔"

شعب ابی طالب سے غزہ تک۔۔۔۔

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر اپنی کتاب " پیغمبر اعظم و آخر" میں لکھتے ہیں کہ "مسلمانوں کی ہجرت ثانی کے بعد قریش اور بھی تلملائے اور اپنی چیرہ دستیوں میں بہت دور نکل گئے، لیکن نہ تو وہ انقلاب پسند مسلمانوں کو اسلام سے منحرف کرسکے اور نہ ہی اُن کی تحریک انقلاب کو دبا سکے، یہ درست ہے کہ تحریک جب تک حرکی رہتی ہے جمود اور تعطل کا شکار نہیں ہوتی، وہ زندہ و توانا رہتی اور آگے بڑھتی رہتی ہے، اگرچہ اُس کی رفتار سست ہی کیوں نہ ہو، تحریک اسلام کے قائد چونکہ پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے، اسلیئے قریش نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز کو دبانے اور خاندان بنی ہاشم کی حمایت سے محروم کرنے کیلئے ایک سفاکانہ منصوبہ ترتیب دیا، اِس منصوبے کا مقصد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے خانوادے بنوہاشم کو شہر بدر اور محصور کرکے اُن کا معاشرتی مقاطعہ کرنا تھا، چنانچہ ایک معاہدہ طے پایا، جسے منصور بن عکرمہ نے لکھا اور اُسے خانہ کعبہ کی دیوار پر لٹکا دیا، اِس معاہدے میں بنوہاشم میں سے صرف ابولہب عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب شریک تھا، اِس معاہدے کی بڑی بڑی شقیں یہ تھیں، "اگر بنو ہاشم (حضرت) محمد (مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قتل (نعوذ باللہ) کیلئے ہمارے حوالے نہ کریں تو اُن کا مکمل معاشرتی مقاطعہ کیا

جائے، اُن کے ساتھ رشتے ناطے اور شادی بیاہ کے تعلقات منقطع کر لئے جائیں، اُن سے خرید و فروخت اور لین دین ہر گز نہ کیا جائے، انہیں کھانے پینے کی چیزیں مہیا نہ ہونے دی جائیں، انہیں گلی بازاروں میں گھومنے پھرنے نہ دیا جائے، وغیرہ وغیرہ"

چنانچہ داعی انقلاب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ آپ کے خانوادہ بھی، بجز ابو لہب بن عبدالمطلب کے ایک کٹھن، صبر آزما بلکہ شکیب رُبا آزمائش زندگی میں مبتلا ہوگیا، تحریک اسلام کیلئے یہ ایک انتہائی نازک وقت تھا، بنو ہاشم شہر چھوڑنے اور پہاڑ کی گھاٹی میں، جسے شعب ابی طالب (جو دراصل شعب بنی ہاشم ہے) کہتے ہیں سکونت پذیر ہونے پر مجبور ہوگئے، اگرچہ انہوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا لیکن وہ اِس اعتبار سے تحریک اسلام کے معاونین و مددگار ضرور تھے کہ انہوں نے محض پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاطر تین برس تک، جس کا ایک ایک دن اُن کیلئے کسی قیامت سے کم نہیں تھا، انہوں نے شہر بدری، محصوری اور معاشرتی مقاطعہ کے صدمات اٹھائے اور مصائب جھیلے، لیکن اُن کے پائے عزم و ثبات میں کسی لمحے بھی لغزش نہ آئی، وہ شہر جس کی بنو ہاشم زینت تھے، جس میں اُن کی عظمت کے جھنڈے گڑے تھے، جس کے معاملات میں اُن کی آواز وزن رکھتی تھی، اُس شہر میں اُن کو قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی، وہ لوگ جن کے وہ سادات تھے، جو اُن کے مشوروں کے

متمنی رہتے تھے اور اُن کی دوستی کو سرمایہ افتخار سمجھتے تھے، بیگانہ ہی نہیں اب دشمن بھی بن چکے تھے، بنو ہاشم کا جرم یہ تھا کہ وہ پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت سے دست بردار نہیں ہوتے تھے اور اِس جرم کی پاداش میں اُن پر عرصہ حیات تنگ کردیا گیا، انہیں بھوکا رہنا پڑا، درختوں کے پتے، چھالیں کھانی پڑیں اور اپنی بے بسی و بے کسی پر دشمنوں کو قہقہے لگاتے اور آوازے کستے بھی دیکھنا پڑا، انہوں نے مسلسل تین برس تک سب کچھ دیکھا، سنا اور سہا، لیکن داعی انقلاب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قریش کے حوالے نہیں کیا، بنو ہاشم اِس شکیب رُبا تجربے سے گزرے اور کامیاب رہے۔

یہ حقیقت ہے کہ انقلاب کی راہیں بڑی کٹھن، دشوار گزار اور ہمت شکن ہوتی ہیں اور انہیں عزم وایمان صبر واستقلال اور تدبر و حکمت سے گزارنا پڑتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اِن مراحل سے گزرے، معاشرتی مقاطعے کے شکیب رُبا تجربے میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رویہ بطریق سایہ خداوندی و رحمت تھا، اِس کے برعکس قریش کا طرز عمل ظالمانہ تھا، لہذا اِس کا فطری رد عمل مظلوموں کے حق میں ہوا اور وہ دن آگیا، جب قریش کے ہی افراد نے ابو جہل وغیرہ کی مخالفت کے باوجود اپنے ہاتھوں سے معاشرتی مقاطعے کا عہد نامہ چاک کردیا۔" بالکل اسی طرح آج کا غزہ جو دور جدید کی شعب ابی طالب ہے کی چار سال بعد اسرائیلی ظلم و بربت اور محاصرے سے نجات کے دن جلد آنے والے

ہیں اور ترکی کی جانب سے اہل غزہ کی امداد کیلئے روانہ کیے گئے چھ بحری جہازوں پر مشتمل فریڈم فلوٹیلا (قافلہ آزادی) پر وحشیانہ حملے میں بیس امدادی کارکنوں کی ہلاکت نے اسرائیلی وحشت و درندگی کو بے نقاب کرکے عالمی ضمیر کو جگانے میں جو کردار ادا کیا ہے اُس کے بعد وہ دن دور نہیں جب دنیا اسرائیل کی جانب سے عائد غزہ پر پابندیوں کے حکم نامے کو خاک میں ملا دے گی۔

قارئین محترم یہ وہی غزہ ہے جو پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جد امجد حضرت عبدالمطلب کے والد جناب ہاشم بن عبد مناف کی جائے آرام گاہ ہے اور اُن کی قبر آج بھی غزہ کے محلے "الدرج" میں موجود ہے، جس کے پڑوس میں ایک شان دار تاریخی مسجد" مسجد سید ہاشم "واقع ہے، غزہ کو اسی حوالے سے غزہ ہاشم کہہ کر بھی پکارا جاتا ہے، مصر کی وادی سینا سے منسلک اور بحر متوسط کے ساحل پر پھیلی ہوئی 40 کلومیٹر لمبی اور 10 کلومیٹر چوڑی غزہ کی پٹی میں 15 لاکھ فلسطینی مسلمان بستے ہیں، 1948ء میں سرزمین فلسطین پر قبضہ کرکے جب صہیونی ریاست قائم کرنے کا اعلان کیا گیا تو غزہ کی پٹی مصر کے زیر انتظام آ گئی جو 19 سال تک رہی، 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ کے نتیجے میں دیگر وسیع علاقوں کے ساتھ ساتھ غزہ پر بھی صہیونی افواج نے قبضہ کرلیا اور غزہ ہاشم پر ابتلاء کا ایک نیا دور شروع ہوگیا، 1948ء کے بعد دیگر فلسطینی علاقوں سے

بھی مہاجرین کی بڑی تعداد غزہ منتقل ہو گئی تھی، آٹھ مہاجر خیمہ بستیاں وجود میں آئیں، یہودیوں نے بھی یہاں اپنی 25 جدید بستیاں تعمیر کیں اور غزہ کی یہ مختصر سی پٹی دنیا کی سب سے بڑی گنجان انسانی آبادی بن گئی، یہ مفلوک الحال آبادی سسک سسک کر جی رہی تھی کہ وہاں جہاد و مزاحمت سے آشنا ایک نئی نسل نے جنم لیا۔

شیخ احمد یاسین، ڈاکٹر عبدالعزیز الرنتیسی اور انجینیر یحیٰی شہید جیسے راہ نماؤں نے اِس نسل کی تربیت کا بیڑا اٹھایا، اسلامی یونی ورسٹی غزہ جیسے شان دار تعلیمی ادارے قائم کیے اور بالآخر 1987ء میں اسلامی تحریک مزاحمت "حماس "وجود میں آ گئی، ابتداء میں پتھروں اور غلیلوں سے ٹینکوں کا مقابلہ کیا گیا، معصوم بچوں نے کنکریوں سے دیو قامت ٹینکوں اور جدید ترین ہتھیاروں کا مقابلہ کیا، ابابیل صفت بچے گھروں سے نکلتے ہوئے باوضو ہو کر مساجد میں نوافل ادا کرتے اور صہیونی درندوں کا مقابلہ کرنے کے لیے نکل آتے، بظاہر صہیونی اسلحے کے انباروں اور بے وسیلہ بچوں کا کوئی تقابل نہیں تھا، لیکن دنیا نے دیکھا کہ ہزاروں شہدا، زخمیوں اور قیدیوں کا نذرانہ دینے کے بعد بالآخر بے وسیلہ تحریک انتفاضہ ہی کامیاب ہوئی اور 1967ء سے غزہ پر قابض صہیونی افواج 2005ء میں انخلا پر مجبور ہو گئی۔

جبکہ صہیونی اور امریکی منصوبہ یہ تھا کہ اسرائیلی انخلا کے بعد غزہ اور مغربی کنارے میں فلسطینی آپس ہی میں لڑتے لڑتے ختم ہوجائیں۔ صہیونی استعمار کے ساتھ مذاکرات و مصالحت کرنے والی الفتح تحریک جو خود کو فلسطینی عوام کا اکلوتا نمائندہ قرار دیتی رہی ہے، وہی 1993ء کے بعد سے لے کر غزہ اور مغربی کنارے میں قائم فلسطینی اتھارٹی کے سیاہ و سفید کی مالک تھی۔ صہیونی اور امریکی منصوبہ ساز اس اتھارٹی کے ذریعے فلسطینی مجاہدین کو فلسطینی "حکمرانوں" کے ہاتھوں نیست و نابود کروانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کیلئے اربوں ڈالر کی امداد کا اعلان کیا گیا، مزید امداد کے لیے شرط یہ رکھی گئی کہ دہشت گردوں، یعنی مجاہدین کا قلع قمع کرو۔ یہ منصوبہ اور سازش شاید کامیاب ہوجاتی، لیکن جنوری 2006ء میں وہاں کا پورا نقشہ ہی بدل گیا۔ انتخابات ہوئے اور حماس نے پہلی بار انتخابات میں شرکت کا فیصلہ کیا، گو کہ امریکہ، اسرائیل اور فلسطینی اتھارٹی نے لاکھ دھمکیاں دیں کہ اگر حماس کو منتخب کیا گیا تو امداد بند کردی جائے گی۔ لیکن فلسطینی عوام نے بھاری اکثریت سے حماس ہی کو اپنا نمائندہ منتخب قرار دیا۔ حماس کی اس کامیابی سے اسرائیل اور اس کی پسندیدہ فلسطینی اتھارٹی مخمصے کا شکار ہوگئی کہ حماس کو حاصل دو تہائی اکثریت تسلیم کرے یا سب کچھ لپیٹ کر واپس 1993ء سے پہلے کی پوزیشن پر واپس چلی جائے۔ بہر حال طویل لیت و لعل کے بعد صدر محمود عباس کو پارلیمنٹ کا اجلاس بلانے، منتخب ارکان اسمبلی اور ارکان حکومت سے حلف لینے کی ہدایات دی

گئیں اور وزیراعظم اسماعیل ھانیہ اور ان کے ساتھیوں نے کام کرنا شروع کردیا، گو
بظاہر ایک منتخب حکومت اور پارلیمنٹ وجود میں آ گئی اور صہیونی انخلا کے بعد غزہ سے
اسرائیلی قبضہ ختم ہوگیا تھا، لیکن عملًا پورا علاقہ نہ صرف صہیونی گھیرے میں تھا، بلکہ غزہ
کے اندر بھی اسرائیلی افواج کی نمائندگی کرنے والے دندناتے پھرتے تھے، امریکہ اور
اسرائیل نے منتخب حکومت کو ایک دن بھی سکھ کا سانس نہیں لینے دیا اور حماس کی
حکومت آتے ہی تمام بیرونی امداد یکسر بند کردی گئی، اسرائیلی انتظامیہ نے تعاون کے
بجائے عداوت کے نئے مورچے کھول لیے، حماس نے چیلنج قبول کیا اور کہا کہ امداد بند
ہے تو بند رہے ہم اپنا جہاں خود پیدا کریں گے، پورے عالم اسلام کے عوام نے ان کے
لیے مالی امداد جمع کرنا شروع کی، ایک خطیر رقم جمع ہو گئی، بعض حکومتوں نے بھی
دست تعاون بڑھایا، جس سے دنیا کو خطرہ لاحق ہوگیا کہ حماس حکومت کامیاب ہو جائے
گی، چنانچہ مسلمان ملکوں کے بینکوں پر پابندی عائد کردی گئی کہ کوئی بینک فلسطینی حکومت
کے اکاؤنٹ میں ایک پیسہ بھی منتقل نہیں کرے گا، جس کی وجہ سے کئی بینکوں نے منتخب
فلسطینی حکومت کے لیے جمع شدہ رقوم ضبط کرنے کا اعلان کردیا۔

لیکن حماس نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور ذمہ داران حکومت خود مالی اعانت لے کر غزہ
جانے لگے، واضح رہے کہ غزہ کو باقی دنیا اور خود فلسطین کے دیگر

مقبوضہ علاقوں سے ملانے والے راستوں کی تعداد سات ہے، ان میں سے چھ تو براہ راست اسرائیلی انتظام میں ہیں جو غزہ کو مقبوضہ فلسطینی علاقوں سے ملاتے ہیں جبکہ ایک راستہ "رفح گیٹ" غزہ کو مصر سے ملاتا ہے، تقریباً ڈیڑھ برس کا عرصہ یونہی گزرا، عالمی امداد بند، تمام بری راستے جزوی طور پر بند، صہیونی فوجی کاروائیوں کا وسیع پیمانے پر دوبارہ آغاز اور سب سے بڑھ کر یہ کہ الفتح تنظیم اور صدارتی افواج کے ذریعے حماس کے ساتھ باقاعدہ مڈبھیڑ کا اہتمام، آئے روز ذمہ داران قتل، مجاہدین گرفتار صہیونی دشمن کے ہاتھوں نہیں بلکہ اپنے ہی بھائی بندوں کے ذریعے، اس دوران کئی مصالحتی کوششیں ہوئیں، حماس اور الفتح کے درمیان خانہ کعبہ میں ایک تفصیلی معاہدہ بھی طے پایا، لیکن ابھی اس معاہدے کی سیاہی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ صدارتی افواج اور الفتح کے مسلح عناصر کے ذریعے منتخب حکومت اور حماس کے خلاف جارحانہ کاروائیاں پھر شروع ہوگئیں، اغوا، قتل اور جلاؤ گھیراؤ کی یہ کاروائیاں عروج پر پہنچیں تو 14 جون 2007ء کو حماس کے جوانوں نے غزہ سے صدارتی کیمپ کے تمام دفاتر خالی کروالیے، چند گھنٹوں کے اندر اندر غزہ میں صرف حماس ہی کی عوامی و عسکری قوت باقی رہ گئی، اس کے باوجود حماس نے اعلان کیا کہ یہ صرف ایک عارضی اور انتظامی کاروائی ہے، ہم معاہدہ مکہ کی اصل روح کے ساتھ اپنے تمام فلسطینی بھائیوں سے اشتراک عمل چاہتے ہیں، لیکن 14 جون کے واقعات کو بنیاد بنا کر غزہ کو مکمل گھیرے میں لے لیا گیا، آج اس محاصرے کو چار

سال ہو رہے ہیں، غزہ جانے کے تمام راستے مکمل طور پہ بند ہیں، کوئی گاڑی، کوئی سواری اور کوئی شخص غزہ آ سکتا ہے، نہ وہاں سے جاسکتا ہے، اس مکمل بندش کی وجہ سے غزہ میں زندگی معطل ہو کر رہ گئی، ایندھن، پانی، ادویات، سامان خورد نوش فلسطینی مقبوضہ علاقوں سے آتا تھا، وہ بند ہوگیا، غزہ سے کچھ سامان تجارت خصوصاً فرنیچر ملبوسات اور زیتون کی مصنوعات باہر جاتی تھیں وہ بھی بند ہیں، غزہ سے لاکھوں افراد روزانہ محنت مزدوری کے لیے مقبوضہ فلسطینی علاقوں میں جاتے تھے، ان کے جانے آنے پر پابندی ہے، غرض کہ اس وقت غزہ چاروں طرف سے سیل بند اور مقفل ہے، چالیس کلومیٹر طویل اور دس کلومیٹر عریض پٹی بستے والی پندرہ لاکھ کی آبادی کیلئے جینے کا ہر سامان حرام قرار دے دیاگیاہے، 27 دسمبر 2008ء کو اسرائیل نے ان پر 24 روزہ مہیب جنگ مسلط کی، سفید فاسفورس بم سمیت، جلا کر بھسم کر دینے والا ہر نوع کا بارود ان پر برسایا گیا۔

لیکن انہیں ان کے مؤقف سے دست بردار نہیں کرایا جاسکا، اہل غزہ نے امریکا و یورپ کی مکمل سرپرستی اور اکثر پڑوسی عرب ملکوں کی خیانت و معاونت سے حملہ آور ہونے والے صہیونی دشمن کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا، گو کہ غزہ کا حصار اور ناکہ بندی جنگ سے پہلے بھی جاری تھی لیکن 24 روزہ تباہ کن جنگ کے بعد محاصرہ شدید تر کر دیا گیا، ایسے میں اہل غزہ کے سامنے زیر زمین

راستوں کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا، تین اطراف میں تو "اہلِ ایمان کے بدترین دشمن" یہودیوں کا گھیرا ہے، چوتھی جانب مصر کی وادیِ سینا ہے، غزہ اور مصر کے درمیان 10 کلومیٹر کی سرحد، اونچی اونچی باڑیں لگا کر بند کر دی گئی ہے، اس صوتحال میں فلسطینی اور مصری رفح کے شہریوں نے لمبی لمبی سرنگیں کھود کر 15 لاکھ انسانوں کے جسم و جان کا رشتہ بحال رکھنے کی کوششیں شروع کر دیں، عالمی طاغوت اور اس کے پالتو حکمرانوں کو یہ بات سب سے زیادہ دکھ دینے لگی، چنانچہ امریکی صدر بش نے جاتے جاتے اسرائیلی اور ملت فروش مصری حکمرانوں کے ساتھ مل کر ایک منصوبہ تیار کیا، جو شاید انسانی تاریخ کا انوکھا تعمیراتی منصوبہ تھا جس کے تحت 10 کلومیٹر لمبی اور 20 سے 30 میٹر گہری ایک فولادی دیوار زمین کے اندر تعمیر کی جا رہی ہے، یعنی تقریباً 5 یا 6 منزلہ عمارت کی بلندی جتنی گہری دیوار، بحالی مہاجرین کے لیے قائم کردہ اقوامِ متحدہ کے ادارے انروا (UNRWA) کی مصر میں نمائندہ کیرین ابوزید نے اس فولادی دیوار کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "یہ انتہائی مضبوط فولاد ہے جسے خصوصی طور پر امریکا میں تیار کیا گیا ہے، اس پر مختلف دھماکا خیز مواد چلا کر اس کی مضبوطی کا تجربہ بھی کیا جا چکا ہے۔" یعنی اس میں نقب لگانا یا بم دھماکے سے اس میں سوراخ کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں، پھر مزید حفاظتی اقدامات کرتے ہوئے اس زیر زمین پوری آہنی فصیل کو برقی رَو سے جوڑ دیا گیا ہے، ساتھ ہی مزید ایسے آلات لگا دیے گئے ہیں کہ کہیں سے اگر اس میں شگاف ڈالا جائے تو

فوراً اس کا سراغ لگایا جاسکے۔ اس فولادی دیوار کے علاوہ فلسطینی علاقے کی جانب ایک خطرناک آبی دیوار قائم کی جارہی ہے۔ یہ بھی اپنی نوعیت کا ایک اور ناقابلِ یقین اور ہلاکت خیز منصوبہ ہے۔ اس منصوبے کے مطابق بحر متوسط سے ایک زمین دوز موٹا پائپ فولادی دیوار کے ساتھ ساتھ بچھایا جارہا ہے۔ اس پائپ سے ہر 30 سے 40 میٹر کے فاصلے پر تقریباً 35 میٹر گہرا، چھے انچ موٹا پائپ زمین میں اتارا جارہا ہے۔ ان عمودی پائپوں میں لاتعداد سوراخ کیے گئے ہیں۔ طاقت ور پمپس کے ذریعے جب سمندر سے بڑے افقی پائپ اور وہاں سے گہرے عمودی پائپوں میں پانی چھوڑا جائے گا تو پورا علاقہ دلدل کی صورت اختیار کرجائے گا اور وہاں کسی کے لیے سرنگیں کھودنا ممکن نہ رہے گا۔

ستم ظریفی دیکھئے کہ عالمی اقتصادی بحران اور دنیا میں بڑھتی ہوئی غربت کا رونا رونے والوں کے پاس، مفلوک الحال، بھوکے اور محصور فلسطینیوں کو سرنگیں کھودنے سے روکنے کے لیے شیطانی ذہنیت ہی نہیں اربوں ڈالر کا وافر خزانہ بھی موجود ہے۔ چونکہ فیصلہ امریکی اور اسرائیلی دباؤ پر ہوا ہے۔ اس لیے مصر اسے قومی مصلحت قرار دیتے ہوئے تیزی سے پایہ تکمیل تک پہنچا رہا ہے۔ اس بارے میں سب سے زیادہ تکلیف دہ مؤقف مصر کی جامعہ ازہر کا ہے جس کے درباری مفتیوں نے فولادی اور آبی دیوار کو جائز قرار دیا ہے کہ یہی حکم آقا تھا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ جب سے اسرائیل نے غزہ میں تباہی و بربادی کا مکروہ کھیل

کھیلا ہے، تب سے اُس نے غزہ پر متعدد پابندیاں عائد کر رکھی ہیں، حتیٰ کہ باہر سے کھانے پینے کے سامان کی بھی ایک حد مقرر ہے اور اس سے زیادہ سامان غزہ میں نہیں لے جایا جاسکتا، غزہ میں تعمیر نو کے لئے تعمیراتی سامان کی اشد ضرورت ہے، لیکن اسرائیل نے اس طرح کے سامان پر بھی پابندی عائد کر رکھی ہے، غزہ کی مسلمان آبادی ایک محصور شہر کا منظر پیش کر رہی ہے اور وہاں کا ہر دن اذیت ناک ہے۔

قارئین محترم غزہ میں زندگی کی آخری رمق بچانے کی خاطر کھودی گئی سرنگیں بند ہو رہی ہیں لیکن اس کے باوجود اہلِ غزہ کو یقین ہے کہ اللہ اُن کے لیے کوئی دوسرا راستہ کھول دے گا، ان کا یہ یقین عنقریب حقیقت میں بدلنے والا ہے، کیونکہ ترکی اور دنیا کے کچھ اہل جرات افراد نے کمر ہمت کس لی اور طے کرلیا ہے کہ وہ اہل غزہ کو اسرائیل کے ظلم و بربریت سے نجات دلا کر ہی رہیں گے، چنانچہ یہ لوگ اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر عازم غزہ ہوئے، یہ وہ لوگ تھے جنہیں اسرائیلی خطرے کا بالکل درست اندازہ تھا، یہ وہ لوگ تھے جنہیں پہلے سے معلوم تھا کہ اسرائیل درندگی کے کس مقام تک جاسکتا ہے، لیکن اس کے باوجود اُن سے اپنے بے بس بھائیوں اور بہنوں کی مظلومیت دیکھی نہیں گئی اور یہ لوگ بحری جہازوں کے قافلے فریڈم فلوٹیلا (جس پر پاکستان، آسٹریلیا، ،آذربائیجان، اٹلی، انڈونیشیا، آئرلینڈ، الجیریا، امریکا، بلغاریہ، بوسنیا

بحرین، بیلجئم، جرمنی، جنوبی افریقہ، ہالینڈ، برطانیہ، یونان، اردن، کویت، لبنان،
ماریطانیہ، ملائیشیا، مصر، مقدونیہ، مراکش، ناروے، نیوزی لینڈ، شام، سربیا، اومان،
چیک ری پبلک، فرانس، کوسووا، کینیڈا، سویڈن، ترکی اور یمن کے سات سو سے زائد
شہری سوار تھے) فلسطینیوں کے لیے دس ہزار ٹن امدادی سامان لے کر غزہ روانہ
ہوئے، گو کہ ان کی یہ کوشش اسرائیلی جارحیت کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو سکی، لیکن
ان کے اس اقدام نے دنیا کے سامنے امریکا کی اولاد سرائیل کا مکروہ چہرہ اور ننگی جارحیت
ضرور آشکارہ کر دی۔

اب یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ اسرائیل نے امریکہ کی شہ اور اسکی
سرپرستی میں اسرائیلی ریاست عربوں کے قلب میں قائم کر کے فلسطینی عوام کا عرصہ
حیات تنگ کر رکھا ہے جس کا مقصد فلسطینی عوام کی جدوجہد آزادی کے آگے بند باندھ
کر فلسطین کی آزاد ریاست کو دنیا کے نقشے پر نمودار ہونے سے روکنا ہے، امریکی شہ پر
اسرائیل کی جانب سے غزہ کے بے بس اور محصور شہریوں کی امداد کیلئے جانے والے
قافلے پر دھاوا بولنا، درحقیقت اُن امریکی عزائم کو بے نقاب کرنے کے مترادف ہے جو
پوری مسلم امہ کو صفحہ ہستی سے مٹانے کیلئے اسکے دل میں موجود ہیں، اس صورتحال میں
کیا اسلامی ممالک کی تنظیم او آئی سی اور اسلامی کانفرنس کی ذمہ داری نہیں بنتی کہ وہ
امریکہ بھارت، اسرائیل کے ہاتھ روکنے کیلئے متحرک کردار ادا کرے اور اپنی روایتی
غفلت کا

لبادہ اتار پھینکے، اسرائیلی بحریہ کی جانب سے غزہ کے شہریوں کو امداد سے محروم کرنے کی خاطر پورے امدادی قافلہ کی لوٹ مار اور قتل عام ایسا واقعہ ہے جس کی صرف مذمت پر اکتفا کرنا ہی کافی نہیں، یہ حقیقت سب جانتے ہیں کہ دنیا میں دہشت گردی کا آغاز اسرائیل ہی کی وجہ سے ہوا۔بڑی طاقتوں کی پشت پناہی کی وجہ سے اسرائیل نے فلسطینیوں کے حقوق کو ہمیشہ نہایت بے دردی سے پامال کیا اور کبھی کسی قاعدے قانون کی پروا نہیں کی، جہازوں کا اغوا اور خود کش حملے اسرائیلی ظلم و بربریت ہی کا نتیجہ ہیں، امریکا اور اس کی اتحادی بڑی طاقتوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس قسم کے اندوہناک واقعات فلسطینیوں پر اسرائیلی مظالم ہی کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئے، بین الاقوامی سمندر میں جارحیت کا تازہ ترین واقعہ اسرائیلی بربریت اور درندگی کا کھلا ثبوت ہے۔

ہمارے خیال میں یہی مناسب وقت ہے کہ خطہ میں ایک الگ اسلامی بلاک تشکیل دے کر طاغوتی طاقتوں کا راستہ روکا جائے، اس وقت اتفاق سے ترکی اور ایران بھی اس اتحاد کے خواہاں ہیں، دیکھا جائے تو اسرائیل کے تازہ ترین حملے کا اصل شکار تو ترکی بنا ہے، ہم سے زیادہ صاحب ایمان ترکی والے نکلے، اس خطرے کے باوجود کہ اسرائیل فوجی کاروائی کرے گا، غزہ کے محصور فلسطینی باشندوں کی امداد کے لیے بحری جہازوں میں خوراک اور دوائیں بھر کر بھیج دیں، ساتھ ہی

سینکڑوں امدادی کارکن بھی روانہ کئے اور استنبول کی بندرگاہ پر لاکھوں ترک باشندوں نے اس قافلے کو الوداع کہا، اس کے باوجود کہ مسلم ممالک میں ترکی وہ واحد ملک ہے جس کے اسرائیل کے ساتھ بہت قریبی تعلقات تھے اور ترکی ہی مسلم دنیا کا وہ پہلا مسلم ملک ہے جس نے 1948ء میں اسرائیل کو تسلیم کرکے اس کے ساتھ سفارتی تعلقات استوار کیے تھے، لیکن 2008ء کی غزہ کی تباہ کن جنگ اور ظالمانہ محاصرہ کے بعد ترکی کے اسرائیل سے تعلقات پر کشیدگی کے بادل چھا گئے ہیں، ترکی کے وزیر اعظم رجب طیب اردگان نے 2009 ء میں ڈاووس میں ورلڈ اکنامک فورم میں غزہ پر اسرائیل کے حملہ اور مظالم کی سخت مذمت کی تھی، اب غزہ کے عوام کے لیے ترکی کے امدادی بحری بیڑہ پر اسرائیل کے حملہ کے بعد ترکی نے اسرائیل سے اپنا سفیر واپس بلا لیا ہے اور سلامتی کونسل کے ہنگامی اجلاس میں اسرائیل کے اس حملہ کو دہشت گردی قرار دیا ہے، ترکی کے اس اقدام کے بعد یورپی یونین نے بھی اسرائیل کے حملہ کی سخت مذمت کی ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ غزہ کا محاصرہ ختم کیا جائے۔

اسی دباؤ کی وجہ سے فلسطینی انتظامیہ کے صدر محمود عباس نے اسرائیل کے اس حملہ کو قتل عام قرار دیا ہے اور اب اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے جس طرح اسرائیلی حملہ کی مذمت کی ہے اور آزادانہ تحقیقات کا مطالبہ کیا ہے اس نے اسرائیل کی شکست پر تصدیق کی مہر ثبت کردی ہے، دوسری طرف ترک وزیر اعظم نے

قونیہ" شہر میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ " بیت المقدس کا"
مستقبل استنبول اور غزہ کا انقرہ سے وابستہ ہے، ترکی کے لیے جہاں استنبول اور انقرہ کا
دفاع ضروری ہے، وہیں غزہ اور بیت المقدس کا بھی ضروری ہے، انہوں نے عہد کیا کہ
وہ فلسطینی عوام کے حقوق کی حمایت سے پیچھے نہیں ہٹیں گے چاہیں انہیں اس سلسلے میں
پوری دنیا کی طرف سے تنہائی کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے، انہوں نے حماس کو
فلسطینیوں کی نمائندہ، مزاحمتی اور وطن کی دفاع میں سرگرم تنظیم قرار دیتے ہوئے کہا
کہ حماس کو دہشت گرد قرار دینے والوں کے اپنے دامن بے گناہوں کے خون سے
لتھڑے ہوئے ہیں" قارئین محترم یہ وہی ترکی ہے جس کی فوج ملک کی سیکولر پہچان کی
نگہبان سمجھی جاتی ہے اور اس نے ملک میں اسلامی طرز زندگی کو بدلنے میں اہم ترین
کردار ادا کیا، لیکن حالیہ سالوں میں سیکولر ترکی نے ایک نئی انگڑائی لینی شروع کی ہے اور
اب یورپی یونین میں شرکت کے لیے بھیک مانگتا ترکی ایک نئے روپ میں سامنے آنا
شروع ہو گیا ہے، وزیر اعظم طیب اردگان اور صدر عبداللہ گل کی اسلام پسند پارٹی ترکی
کی سیاست پر حاوی نظر آتی ہے، فوج کی جانب سے تشویش کے باوجود عوام میں اسلامی
تشخص مقبولیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔
یہی وجہ ہے کہ اب عالمی منظر نامے میں اس کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے، اس صورحال
میں ہم دعا کرتے ہیں کہ ترکی اسلام دشمنوں کو پیغام دینے کا سلسلہ

جاری رکھے اور خلافت عثمانیہ کے دور میں اسلام کا یہ مرکز ایک پھر اسلامی قوت کا گڑھ
بن کر ابھرے، آج اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ترکی نے غزہ کے 15 لاکھ
فلسطینی مسلمان جو شعب ابی طالب میں محصور بنو ہاشم کی طرح روٹی، پانی اور دیگر
بنیادی ضروریات کیلئے ترس رہے ہیں، کیلئے زہیر بن اُمیہ (جنہوں نے بیت اللہ کا طواف
کرتے ہوئے عہد کیا تھا کہ ہم تو انواع و اقسام کے کھانے کھائیں، طرح طرح کے کپڑے
پہنیں اور بنو ہاشم ہلاک ہوتے رہیں، اُن سے ہر طرح کی خرید و فروخت بند رہے،
نہیں .... خدا کی قسم ..... نہیں، میں تب تک چین سے نہیں بیٹھوں گا، جب تک کہ
بنو ہاشم سے بائیکاٹ کی ظالمانہ دستاویز پھاڑ نہیں دی جاتی) کا کردار ادا کرکے اہل غزہ
کیلئے اسرائیلی ظلم و بربریت سے نجات کی نئی راہیں متعین کردی ہیں۔

شہید پاکستان ڈاکٹر سرفراز نعیمی صاحب کو ہم سے بچھڑے ایک سال کا عرصہ گزر گیا ہے، 16 فروری 1948ء کو سہارن پور میں پیدا ہونے والے ڈاکٹر سرفراز نعیمی" جامعہ نعیمیہ "گڑھی شاہو لاہور کے بانی مفتی محمد حسین نعیمی (جنہوں نے 1950 جامع نعیمیہ کی بنیاد رکھی) کے صاحبزادے تھے، آپ نے ابتدائی تعلیم لاہور میں حاصل کی، ڈاکٹر صاحب نے ایم،اے، ایل ایل بی اور پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی، ڈاکٹر سرفراز نعیمی رویت ہلال کمیٹی کے اور اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن بھی رہ چکے ہیں، انہوں نے جامعہ نعیمیہ کو کمپیوٹر جیسی جدید تعلیم سے آراستہ کیا، وہ ایک متحرک مذہبی رہنما تھے، انہوں نے تحریک تحفظ ختم نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تحریک نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بھرپور حصہ لیا اور کئی بار جیل گئے، ڈاکٹر صاحب تحفظ ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلسوں میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے، چار سال قبل انہوں نے تحفظ ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پلیٹ فارم سے امریکہ کے خلاف ایک بہت بڑی ریلی نکالی، جس پر انکے خلاف انسداد دہشتگردی کی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا، لیکن وہ باعزت بری ہوگئے، ڈاکٹر سرفراز نعیمی ہمیشہ دین کی خدمت کو ترجیح دیتے تھے، انہوں نے حکومت کی طرف سے کبھی کوئی عہدہ قبول نہیں کیا۔

ڈاکٹر سرفراز نعیمی نے 10 جون 2009ء کو ایوان اقبال لاہور میں پاکستان بچاؤ کنونشن سے اپنے آخری خطاب میں فرمایا تھا کہ "علماء نے پاکستان بنایا تھا اور اب مل کر اسے بچائیں گے اور ضمن میں وہ کسی قربانی سے دریغ نہیں کرینگے۔" آپ کی شہادت آپ کے ارشاد کی آئینہ دار ہے۔ 12 جون 2009ء کو جمعہ کے روز جامعہ نعیمیہ میں ایک خود کش حملے میں شہید ہونے والے ڈاکٹر سرفراز نعیمی کا شمار ملک کے اعتدال پسند سوچ رکھنے والے مذہبی رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر سرفراز نعیمی بے باک اور نڈر شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے خود کش حملوں کے حرام ہونے کا نہ صرف فتوٰی دیا بلکہ وہ پاکستان میں انتہا پسندی کے بھی سخت مخالف تھے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ پاکستان کو انتہا پسندی سے بچانا پوری قوم کا اولین فریضہ ہے، جسے ادا کرنے کے لئے کسی بھی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ انہوں نے سوات اور مالاکنڈ کے فوجی آپریشن کی کھل کر حمایت کی اور ملک میں جاری شدت پسندی کی لہر کے خلاف متحرک رہے۔ ڈاکٹر سرفراز نعیمی نے توہین آمیز خاکوں کی اشاعت کے فتنہ کا قلع قمع کرنے کے لئے 22 دینی جماعتوں پر مشتمل ایک پلیٹ فارم "تحفظ ناموس رسالت محاذ" بھی تشکیل دیا۔

ڈاکٹر سرفراز نعیمی بے لوث اور انتہائی سادہ شخصیت کے مالک تھے۔ آپ ایک سچے

عاشق رسول تھے اور آپ نے اپنی ساری زندگی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے گزار دی۔ ڈاکٹر سرفراز نعیمی وہ بزرگ شخصیت تھے جن کے رگ وپے میں وطن عزیز کی محبت اور قوم کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ حق گوئی و بے باکی آپ کا طرہ امتیاز اور ہر دور میں باطل کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے رہنا آپ کا خاصہ تھا۔ درحقیقت ایمان، حق گوئی اور عقیدہ کامل پر ڈٹ کر رہنے اور "بلغوا عنی ولوایة" پر عمل پیرا ہونے والے مجاہد شہید پاکستان ڈاکٹر سرفراز نعیمی ایک ایسے زندہ و جاوید کردار کا نام ہے جس کی زندگی نمود و نمائش، تصنع و بناوٹ اور دنیاداری سے پاک تھی۔ ایک بڑے دارالعلوم کے ناظم اعلیٰ، مفتی اور صدر مدرس کے باوجود عاجزی وانکساری اور سادہ لوحی آپ کی شخصیت کے نمایاں وصف تھے۔ ڈاکٹر سرفراز نعیمی ریڈیو، ٹی وی کے مقرر اور سرکاری و دینی حلقوں میں نمایاں پہچان رکھنے کے باوجود نہ عالموں جیسا رعب و دبدبہ رکھتے تھے اور نہ ہی دانشوروں جیسی تکلف و نزاکت، معاملہ فہمی، دور اندیشی اور تمام مذاہب و مسالک کے ساتھ رواداری آپ کی پہچان اور وجہ شناخت تھی۔ بلاشبہ آپ ایک ایسے مذہبی سکالر تھے، جن کو قرآن اور حدیث پر مکمل عبور حاصل تھا، آپ اتحاد بین المسلمین کے داعی اور فرقہ واریت کے سخت مخالف تھے۔ یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ ڈاکٹر صاحب دین کی سربلندی اور وطن عزیز کے استحکام کے لئے جہاد کرتے ہوئے شہادت کی عظمیٰ کی نعمت سے سرفراز ہوئے۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ مفتی محمد حسین نعیمی کے لائق اور قابل فخر فرزند کی زندگی کا اک اک لمحہ اسلام اور پاکستان کیلئے وقف تھا، جرات و استقامت کے پیکر ڈاکٹر سرفراز نعیمی شہید نے درس وتدریس کے ساتھ لکھنے پڑھنے پر بھی توجہ دی، آپ نے باقاعدگی سے 1996ء سے 1998کے دوران "نشان راہ" کے عنوان سے روزنامہ جنگ میں کالم لکھے، آپ کی انہی بکھری ہوئی تحریروں کو جمع کرکے "نشان راہ"کے عنوان سے آپ کی زندگی میں شائع کیا گیا، زیر نظر کتاب "نشان راہ دوم" آپ کے انہی کالموں کا مجموعہ ہے جو کہ آپ کی شہادت کے بعد شائع ہوئی ہے، ڈاکٹر صاحب نے اپنے اِن مضامین میں قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اصلاح کار کا آغاز سب سے پہلے اپنی ذات سے کرنا چاہیے، آپ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم معاشرے میں اپنے اپنے کردار کی اصلاح کرنا شروع کردیں اور اپنے افعال و اعمال کو بہتر بنالیں تو معاشرے کے بہت سے مسائل از خود حل ہوسکتے ہیں۔

اس حوالے آپ اپنے ایک مضمون "قربانی مانگنے والے" میں لکھتے ہیں کہ " ہمارے معاشرے میں عجیب طرح کی روایت قائم ہوتی چلی جارہی ہے، ہر ایک بغیر امتیاز، تفریق اور تحریر کے دوسروں سے قربانی دینے کی درخواست کرتا نظر آتا ہے،.بڑے خلوص سے، درد دل سے، شعور کی اتھاہ گہرائیوں سے، ملک کے نام پر، وطن کے نام

پر، قوم کے نام پر، بگڑی ہوئی معیشت کے نام پر، دشمن طاقتوں کے حوالے سے، عالمی تناظر میں قربانی دینے کی اپیلیں ہو رہی ہیں، بھکاریوں کی مانند ہاتھ پھیلا پھیلا کر، ساہلانہ، ملتجانہ اور عاجزانہ انداز میں قربانی دینے کیلئے آمادہ کیا جا رہا ہے۔" آگے چل کر ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں "آقائے دوجہاں حضور ختمی مرتبت، رحمت دو عالم، نور مجسم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ ہمیں یہی سبق سکھا رہی ہے کہ جہاد کے موقع پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بطون مبارک پر اگر پتھر بندھا ہوا تھا تو آقائے دوجہاں کے بطن مبارک پر اس سے کہیں زیادہ پتھر بندھے ہوئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت مبارکہ یہی تعلیم دے رہی ہے کہ قربانی طلب کرنے سے پہلے قربانی پیش کی جائے، ماضی کی عظیم المرتبت ہستیوں کے عظیم کارناموں کو بھول جانے والے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ قوم کے قائدین اگر آج قربانی طلب کرنے سے پہلے قربانی دینے کی سنت پر عمل پیرا ہوں تو قوم آج بھی اپنے قائدین کو دل وجان سے زیادہ چاہتی ہے۔"

ڈاکٹر سرفراز نعیمی اپنے ایک اور مضمون " ایٹمی دھماکہ ہی مستقل علاج ہے" میں ارباب اقتدار کی بزدلی اور ابن الوقتی کو نمایاں کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "قوموں کی زندگی کی باگ دوڑ جب مصلحت کوش، مصلحت اندیش اور مصلحت بین حکمرانوں، وزیروں، مشیروں اور مصاحبوں کے ہاتھ میں آجاتی ہے تو پھر وہ

اقتدار کی "لیلیٰ" کے فراق کا تصور کرتے ہی مصلحتوں کے نام پر حقائق کا مقابلہ کرنے کے بجائے مستقبل کی نادیدہ حالات کا معروضی انداز میں اس "درد سوزی" سے نقشہ کھینچتے ہوئے تصویر کشی کرتے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید مستقبل کی باگ دوڑ کی تمام لگامیں انہوں نے اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی ہیں اور مستقبل کی ترقی کی راہیں اُن کے سامنے مؤدبانہ انداز میں ہاتھ باندھے موجود ہیں اور صرف ان کے چشم نازنین کے اشاروں کی منتظر ہیں، عقل وخرد، بصیرت وبصارت کا واسطہ دیتے ہوئے، فہم وفراست کا ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے احتیاط واحتراز کا نعرہ لگاتے ہوئے اور عالمی تناظرات کے دامن میں چھپ کر وطن کے تحفظ کی قسم کھانے والوں کو انہی تیروں سے چھلنی کرنے لگتے ہیں جو تیر اصل میں دشمن کے ہاتھوں میں ہونے چاہئیں۔"

ڈاکٹر سرفراز نعیمی کے یہ معرکۃ الآراء مضامین علمی اور ادبی ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی سادہ اور عام فہم انداز رکھتے ہیں اور آپ کے مضامین میں دور حاضر کے عصری تقاضوں کے ساتھ ساتھ وقت کی ضرورت اور افادیت بھی جھلکتی ہے، ڈاکٹر صاحب کا طرز اسلوب سادہ اور ایسا دل نشیں ہے کہ قاری اِس کے سحر سے نکل نہیں پاتا، آپ کی تحریر دور جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ اور اہل مغرب کے افکار ناپختہ کی قلعی کھولتی ہے اور مغربی علوم وفنون سے مرغوب مسلمانوں کو اسلام کی روشنی سے دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے کا قرینہ عطا کرتی ہے، آپ

کا طرز تحریر ناصحانہ ہی نہیں انتہائی مشفقانہ بھی ہے، ڈاکٹر صاحب کے یہ کالم روز مرہ کے
دینی معاملات، معاشرتی اور سماجی رویوں کے عکاس اور مقصدیت، لطافت اور جاذبیت
سے لبریز ہیں، زیر نظر کتاب میں آپ کے 43 کالموں کا جناب محمد ضیاء الحق نقشبندی
صاحب نے انتخاب پیش کیا ہے اور اسے ادارہ" نعیم المصنّفین" جامعہ نعیمیہ گڑھی شاہو
لاہور، فون نمبر 92426293289 نے شائع کیا ہے، بقول پیرزادہ اقبال احمد فاروقی
صاحب "ضیاء الحق نقشبندی نے بکھرے ہوئے پتوں کو اکٹھا کرکے پھولوں کے گلدستے بنا کر
قارئین کی محفل مطالعہ کو سجادیا ہے،انہوں نے ذروں کو سمیٹ کر آفتاب بنادیا ہے،
قطروں کو اکٹھا کرکے دریا بہا دیئے ہیں۔"برادرم محمد ضیاء الحق نقشبندی کی یہ گرانقدر
کاوش قابل مبارکباد اور لائق مطالعہ ہے۔

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

بالآخر مخدوم امین فہیم اور رحمان ملک کے بعد وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے بھی مولانا فضل الرحمٰن کی وزراء کالونی میں واقع اُس سرکاری رہائش گاہ (جو حکومت کی جانب سے وزیر کا درجہ اور مراعات دینے کے باعث دی گئی ہے) کی یاترا کر ہی لی، دو گھنٹے سے زائد جاری رہنے والی اِس ملاقات میں وزیر اعظم نے مولانا محمد خان شیرانی کو اسلامی نظریاتی کونسل کا چیئرمین بنانے سمیت دیگر مطالبات پورے کرنے کی یقین دہانی کرا کر آخر کار مولانا کو منا ہی لیا، واضح رہے کہ مولانا فضل الرحمٰن اس سے قبل یہ کہہ چکے تھے کہ اگر مطالبات تسلیم نہ کئے گئے تو وہ حکومت سے علیحدہ ہو جائیں گے، اسی وجہ سے گزشتہ دنوں انہوں نے حکومت پر دباؤ بڑھانے کیلئے مجلس عمل کو فعال کرنے کا عندیہ دیکر غیر فعال مجلس عمل کے رہنماؤں کی پر تکلف دعوت کا بھی اہتمام کیا تھا، تاہم لاہور کے اجلاس میں جمعیت علمائے پاکستان اور جماعت اسلامی کے رہنماؤں نے مجلس عمل کی فعالی سے پہلے اُن سے حکومت سے علیحدہ ہونے کا مطالبہ کیا تو وہ یہ کہہ کر دامن بچا گئے کہ پہلے مجلس عمل کو بحال کیا جائے پھر وہ حکومت چھوڑنے کا سوچیں گے، باخبر ذرائع کے مطابق مولانا فضل الرحمٰن کے ایم ایم

کے اجلاس بلانے اور رہنماؤں کے ساتھ رابطہ رکھنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ ایک طرف حکومت کو مستقل دباؤ میں رکھا جائے تو دوسری طرف اگر وسط مدتی الیکشن کی کوئی صورت پیدا ہو تو حکومتی گاڑی چھوڑ کر ایم ایم اے کا پرچم اٹھا لیا جائے، موجودہ صورتحال میں غیر فعال مجلس عمل کا اجلاس بلا کر مولانا اپنی حکمت عملی میں بظاہر کامیاب نظر آتے ہیں اور وہ وزیر اعظم جنھوں نے کابینہ کے بجٹ اجلاس سے جے یو آئی کے وزراء کے بائیکاٹ کے موقع پر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے اُن سے استعفےٰ دے کر جانے کا مطالبہ کیا تھا، 26 جون کو خود مولانا کو منانے کیلئے اُن کی سرکاری رہائش گاہ پہنچ گئے، اِس ملاقات کے بعد مولانا فضل الرحمٰن کا کہنا تھا کہ وہ حکومت کے ساتھ تعاون جاری رکھیں گے، انھوں نے کہا کہ جمہوریت میں اختلافات چلتے رہتے ہیں، ہم نظام بچانے کیلئے حکومت میں شامل ہیں، لیکن دوسرے ہی روز لاڑکانہ میں مولانا نے لوگوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ انہیں عہدوں اور وزارتوں کا کوئی لالچ نہیں، انھوں نے کہا "ہم وزارتوں اور عہدوں کے لالچی نہیں بلکہ نظریاتی ترجیحات کیلئے حکومت میں کا حصہ ہیں، اگر وہ پیش رفت (یعنی مطالبات منظور) کریں گے تو خود کو اتحادی تصور کرینگے ورنہ نہیں......"

قارئین محترم ایسا پہلی بار تو نہیں ہوا ہے، مولانا فضل الرحمٰن تو ہر حکومت میں اسی وجہ سے شامل رہتے ہیں کہ اُن کے پیش نظر جمہوری نظام کی بقاء اور

نظریاتی ترجیحات ہوتی ہیں، اب وہ نظریاتی ترجیحات مالی منفعت، جاہ و منصب اور ذاتی مراعات کے گرد گھومتی ہوں یا جمہوری نظام کسی فوجی آمریت کی کوکھ سے جنم لیتا ہو، مولانا ہمیشہ اپنی نظریاتی ترجیحات کیلئے اُس جمہوری نظام کو بچانے کی تگ و دو ضرور کرتے ہیں، ہاں یہ الگ بات ہے کہ اُس جمہوری نظام کو بچاتے بچاتے مولانا کو کچھ نہ کچھ فائدے، مراعات اور مفادات حاصل ہوجاتے ہیں، دراصل مولانا فضل الرحمٰن کارزار سیاست کے ایک ایسے شہسوار ہیں، جنھوں نے اپنے اسی انداز سیاست سے ملک کے سادہ لوح عوام کے ساتھ ساتھ دیندار طبقے کو بھی حیران و ششدر کر رکھا ہے، اُن کی اعلیٰ ترین سیاسی بصیرت کا اِس سے بڑا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ عوام تو عوام خود ماہر سیاستدان بھی اُن کی اِس طرز سیاست پر حیران اور یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ مولانا کی سیاست کے رنگ ڈھنگ اتنے انوکھے، نرالے اور عقل و خرد میں نہ آنے والے کیوں ہیں؟ مولانا فضل الرحمٰن، مفتی محمود کے ایسے ہونہار اور لائق فرزند ہیں جنھوں نے سیاست میں آنے کے بعد سب سے پہلا کام ہی یہ کیا کہ دنیا کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا اور اُن کا مطمع نظر صرف اور صرف اقتدار، وزارتیں اور شاہانہ ٹھاٹ باٹ کے مزے لوٹنا ہی رہ گیا ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مولانا فضل الرحمٰن پرویز مشرف کے دور میں بھی "اصولی سیاست" کر رہے تھے اور آج بھی اصولی سیاست کر رہے ہیں، یہ

الگ بات کہ آپ اور ہم جیسے چھوٹے دماغ کے لوگ اُن کی اِس مشہور و معروف اصولی سیاست کو شاید ہی کبھی سمجھ سکیں۔ قربان جایئے مولانا کی اِس اصولی سیاست پر کہ قاضی حسین احمد جیسا زیرک سیاستدان بھی اُن کے دامِ تزویر سے خود کو نہ بچا سکا اور سترہویں ترمیم پر صاد کر بیٹھا، لیکن جب اگلے سال پرویز مشرف نے استعفیٰ دینے سے انکار کر دیا تو قاضی حسین احمد بھونچکا رہ گئے۔ یقیناً پرویز مشرف کے اس طرز عمل پر مولانا فضل الرحمٰن کو کوئی حیرت نہیں ہوئی ہوگی اور نہ ہی انہیں غصہ آیا ہوگا کیونکہ اُن کی اور پرویز مشرف کی اصولی سیاست میں بڑی مماثلت پائی جاتی تھی۔ اِس کا ثبوت یہ ہے کہ جب پارلیمنٹ کے ذریعے دوسری بار صدر منتخب ہونے کا مرحلہ آیا تو مولانا فضل الرحمٰن نے سرحد حکومت کو برقرار رکھ کر صدر کے انتخابی کالج کو مکمل رکھا اور قاضی حسین احمد سمیت مسلم لیگ (ن) لکیر ہی پیٹتے رہ گئے۔ گستاخی معاف آپ مولانا کے انداز سیاست سے تو اختلاف کر سکتے ہیں، لیکن اُن کی شاطرانہ صلاحیتوں سے انکار نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابن الوقتی اُن کی شناخت اور حکمرانوں کی کاسہ لیسی اُن کی پہچان ہے۔ ہمیشہ اُن کا ہاتھ سیاست کی نبض پر رہتا ہے اور خراب سے خراب حالات میں وہ بھی اپنے لئے کوئی نہ کوئی دلیل، گنجائش اور راستہ نکال ہی لیتے ہیں۔ انہیں دلائل کے ساتھ بات کرنے اور اپنے مدمقابل کو لاجواب کرنے کا فن خوب آتا ہے اور اُن کی انہی خوبیوں کی وجہ سے آج اُن کا "اصولی موٴقف" اردو میں ایک مشہور ضرب المثل بن چکا ہے۔

ہمیں حیرت ہے کہ مصالحتی اور مفاہمتی سیاست کے خوگر مولانا فضل الرحمٰن نے اُس وقت کوئی مصالحتی کردار کیوں ادا نہیں کیا، جب جامعہ حفصہ کی معصوم بچیوں کو گھیرے میں لے کر فاسفورس بموں کے ذریعے کوئلہ بنانے کی منصوبہ بندی ہو رہی تھی، اگر وہ اپنے ساتھ علمائے کرام کو لے کر جامعہ حفصہ کے سامنے کھڑے ہو جاتے اور صرف اتنا کہہ دیتے کہ پہلے ہمیں گولی مارو اس کے بعد ہماری لاشوں سے گزر کر جامعہ حفصہ کی بچیوں پر گولی چلاؤ تو یقین جانئے کہ جنرل مشرف بے بس ہو جاتا اور پاکستان کی تاریخ کا اتنا بڑا سانحہ رونما نہ ہوتا، وزیرستان سے لے کر باجوڑ تک اور باجوڑ سے لیکر سوات تک بے گناہ سنی العقیدہ شہریوں پر نام نہاد اسلام پرستوں نے ظلم کے پہاڑ توڑے، لیکن مولانا نے کسی لانگ مارچ کی کال نہیں دی، کیونکہ وہ لانگ مارچوں پر نہیں مصالحت اور مفاہمت کی سیاست پر یقین رکھتے ہیں، طرفہ تماشا تو دیکھئے کہ پاکستانی عوام ہی نہیں کشمیری عوام بھی مولانا کی مصالحتی اور مفاہمتی پالیسی کے خوف سے تھر تھر کانپتے ہیں، جن دنوں یہ خبریں اڑ رہی تھیں کہ مولانا کو کشمیر کمیٹی کا چیئرمین بنایا جارہا ہے، اُن دنوں ہم نے پاکستان میں موجود کشمیری مہاجرین کے چہروں پر ہوائیاں اڑتی دیکھیں، سال گزشتہ جب اسرائیل نے غزہ کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی، لیکن مولانا نے اسرائیلی ظلم و بربریت کے خلاف بھی کوئی بھی مؤثر آواز بلند نہیں کی، حالانکہ وہ چاہتے

تو اپنے مکتبہ فکر کے لوگوں کو سڑکوں پر لاسکتے تھے۔
آپ کو یاد ہو گا کہ مولانا فضل الرحمٰن چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کی بحالی کے بھی زبردست مخالف تھے، لیکن جب افتخار محمد چوہدری صاحب بحال ہو گئے تو انہوں نے آگے بڑھ کر انہیں بحالی کی مبارکباد دی، کیا پاکستان میں اِس سے بڑھ کر اصولی سیاست کا مظاہرہ کوئی اور کرسکتا ہے؟ آپ نے دیکھا ہو گا کہ قومی معاملات میں بات کرتے ہوئے مولانا کے چہرے پر اکثر سنجیدگی چھائی رہتی ہے، اگر بیچ میں کہیں ہنستے ہیں تو اُن کی اس ہنسی پر قربان جانے کو جی چاہتا ہے، ایک مرتبہ اُن سے ایک منہ پھٹ صحافی نے پوچھ لیا، مولانا وعدہ خلافی پر قرآن و حدیث کیا کہتے ہیں تو مولانا نے سوال کا جواب دینے سے ہی انکار کر دیا، صحافی نے تو یہ سوچ کر سوال پوچھا کہ مولانا سیاسی شخصیت کے ساتھ ساتھ ایک عالم دین بھی ہیں لیکن اُس بے چارے کو کیا معلوم کہ مولانا جب سیاسی مفاہمتی مشن کو لے کر نکلے ہوئے ہوں تو وہ دین کے حوالے سے پوچھے گئے سوالوں کا جواب نہیں دیتے، یہ بھی سچ ہے کہ مولانا فضل الرحمٰن کو حکومتی کشتی میں سوار ہونے کا طویل اور کامیاب تجربہ ہے، وہ آصف زرداری حکومت کی کشتی میں یہ کہہ کر سوار ہوئے تھے "ناخدا جس کا کوئی نہ ہو، اس کا خدا ہوتا ہے" لیکن آج کل انہوں نے زیرِ لب کہنا شروع کر دیا ہے کہ "نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم" یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ مولانا فضل الرحمٰن

اور اسفندیار ولی صوبہ سرحد کی سیاست میں ایک دوسرے کے سخت ناقد اور حریف رہے ہیں، لیکن بھلا ہو سیاسی مفاہمت کا کہ دونوں صاحبان نے بیک وقت آصف زرداری کا پیغام رساں بن کر شریف۔برادران سے ملاقاتیں کرنے کی ذمہ داری قبول کی، دراصل مولانا فضل الرحمٰن اور اسفندیار ولی کی مفاہمت اور مصالحت آصف زرداری کی کشتی کو ڈوبنے سے بچانے کی کوشش تھی، کیوں کہ اُس کشتی میں وہ خود دونوں بھی سوار تھے۔"ہائے رے اقتدار کی مجبوریاں" کیا کیا کراتی ہیں۔
مولانا فضل الرحمٰن کی اسی انداز سیاست کو "ترجمان الحدیث" یوں بیان کرتا ہے کہ مولانا کے بیشتر سیاسی معاملات اسلام اور مسلمانوں کے لئے شرمندگی اور ندامت کا" باعث بنے ہیں، وہ ہر حکومت کو بلیک میل کر کے مفادات حاصل کرتے ہیں اور افسوسناک پہلو یہ ہے کہ یہ سب کچھ اسلام کے نام پر ہوتا ہے، مولانا کی طرف سے حکومت کو ستمبر تک نفاذ اسلام کی ڈیڈ لائن دینا اور پھر اسے واپس لینے کے حوالے سے جریدہ لکھتا ہے کہ مولانا کا اسلام وہ والا نہیں ہے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے بلکہ جس اسلام کی وہ بات کرتے ہیں وہ انہیں اچھی طرح مل گیا ہے، دراصل مولانا امریکہ کی طرف سے ملنے والی امداد میں اپنا حصہ بٹورنے کے لئے یہ ناٹک کر رہے تھے،زرداری کے ملک میں واپس آنے کے بعد ایک ہی ملاقات میں سارے معاملات طے ہو گئے تو مولانا بھی مطمئین ہو گئے اور نفاذ اسلام کا مطالبہ واپس لے لیا، البتہ امریکہ کی طرف سے کڑی شرائط

کے باعث مولانا فضل الرحمٰن سمیت امریکہ کے ہاتھوں ملک اور قوم کو فروخت کرنے والے ایک دوسرے کا منہ تک رہے ہیں۔ (شذرہ" مولانا "کا اسلام ....زندہ باد"
(ماہنامہ "ترجمان الحدیث" اکتوبر ۲۰۰۹ء فیصل آباد

درحقیقت مولانا فضل الرحمٰن پاکستان کی سیاست کا انتہائی اہم کردار ہیں، ان کے سیاسی بیانات بھی بہت دلچسپ اور ذومعنی ہوتے ہیں، مثلاً کچھ عرصہ قبل انہوں نے فرمایا تھا کہ میں صدر آصف علی زرداری کا ساتھی ہوں اور اس پر مجھے کوئی شرمندگی نہیں ہے، مولانا فضل الرحمٰن کے اس بیان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آخر صدر آصف علی زرداری کے کسی سیاسی حلیف کو یہ وضاحت کرنے کی ضرورت ہی پیش کیوں آئی کہ انہیں صدر آصف زرداری کا ساتھی ہونے پر کوئی شرمندگی نہیں، اس کا ایک مطلب تو یہ سمجھ آتا ہے کہ جناب آصف زرداری کی سیاست کے کئی پہلو قابل اعتراض ہیں، لیکن میں اُن کے ساتھ کھڑا ہونے پر شرمندہ نہیں ہوں، مولانا فضل الرحمٰن جنرل پرویز مشرف کے دور میں قائد حزب اختلاف تھے، پرویز مشرف کو جب آئین میں 17 ویں ترمیم کی ضرورت پیش آئی اور فوجی آمروں کا من پسند اختیار پرویز مشرف نے حاصل کرنا چاہا تو اُس وقت مولانا فضل الرحمٰن کندھے سے کندھا ملا کر فوجی ڈکٹیٹر کے ساتھ آرٹیکل 58 ٹو (بی) کو دوبارہ آئین میں شامل کرانے کیلئے کھڑے تھے، واضح رہے کہ ایک اور فوجی آمر جنرل ضیاء الحق نے پہلی دفعہ آرٹیکل 58 ٹو (بی) متعارف کروائی تھی،

اس آرٹیکل کی تلوار سے ایک بار خود جنرل ضیاء الحق دو مرتبہ غلام اسحاق خاں اور ایک دفعہ فاروق لغاری نے اپنے اپنے دور میں پارلیمنٹ کو قتل کیا، جسے مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی نے مل کر دو تہائی اکثریت سے ختم کر دیا تھا، لیکن پرویز مشرف کے دور میں فوجی صدر کو دوبارہ پارلیمنٹ توڑنے کا اختیار مولانا فضل الرحمٰن جیسے سیاست دانوں کے تعاون سے ایک مرتبہ پھر فراہم کر دیا گیا، یہ کردار اس دور کی پارلیمنٹ کے ارکان کیلئے یقیناً باعث شرمندگی تھا کہ وہ خود پارلیمنٹ کو توڑنے کا اختیار ایک فوجی آمر کو سونپ رہے ہیں، لیکن اس دور میں بھی اور بعد میں بھی کسی مرحلہ پر مولانا فضل الرحمٰن نے ایک فوجی ڈکٹیٹر کو قوم کی منتخب پارلیمنٹ توڑنے کے لئے آئینی ترمیم کیلئے مطلوبہ دو تہائی اکثریت کا تعاون فراہم کرنے پر کبھی شرمندگی کا اظہار نہیں کیا، حالانکہ اس دور میں اپوزیشن کے اس کردار سے دنیا بھر میں پاکستان کی بہت بدنامی ہوئی تھی، لوگ حیران تھے کہ پاکستان کی پارلیمنٹ میں یہ کس طرح کے ارکان ہیں جو خود ایک فوجی آمر کو پارلیمنٹ کے ڈیتھ وارنٹ جاری کرنے کا اختیار سونپ رہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ جنرل پرویز مشرف کو پارلیمنٹ توڑنے کا آمرانہ اختیار حاصل کرنے میں کبھی کامیابی نہ ہوتی اگر مولانا فضل الرحمٰن اُن کا ساتھ نہ دیتے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ مولانا فضل الرحمٰن وطن عزیز کے ایک ایسے سیاست دان ہیں

جن کے بارے میں آپ کبھی بھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کس کے ساتھ ہیں اور کس کے خلاف، کبھی وہ طالبان کے دکھ میں روتے ہیں، تو کبھی پاکستان کے، کبھی طالبان کے نعرے مارتے ہیں تو کبھی گو طالبان گو چلاتے ہیں، کبھی طالبان کے خیالات پر تف کرتے نظر آتے ہیں تو کبھی ان کی پذیرائی میں طالبان سے زیادہ طالبان کے وفادار نظر آتے ہیں، اُن کا کمال یہ ہے کہ وہ حکومت میں رہ کر اپوزیشن میں ہوتے ہیں اور کبھی اپوزیشن بینچوں پر بیٹھ کر وزارت کے مزے لوٹتے ہیں، اپنے اس فن میں طاق ہونے کی وجہ سے آج وہ اپنی ذات میں ایک انجمن بن گئے ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ مولانا فضل الرحمن ایک ایسے چکری سیاست دان ہیں جو دوسروں کو چکر دے کر اپنا مقصد حاصل کرلیتے ہیں، انہوں نے جنرل مشرف کیساتھ آٹھ سالہ دور میں اقتدار اور حزب اختلاف دونوں کے مزے ایک ساتھ لینے کا نیا ریکارڈ قائم کیا ہے، عام زندگی میں تو ایسے شخص کو دوغلا، بے ضمیر اور دھوکے باز کہا جاتا ہے جو دشمنوں اور دوستوں دونوں سے اس طرح بے وقوف بنا کر رکھے کہ ہر کوئی سمجھے کہ وہ ان کا ساتھ دے رہا ہے، لیکن آج کی سیاسی زندگی میں ایسے شخص کو سیاست کا کامیاب کھلاڑی کہتے ہیں، ایم ایم اے میں یہ کریڈٹ اکیلے مولانا فضل الرحمن کو ہی جاتا ہے جنھوں نے ایل ایف او کو آئین کا حصہ بنانے کیلئے ایم ایم اے کو جنرل مشرف کی مدد کیلئے راضی کیا اور اس کے بدلے سرحد کی پوری حکومت، بلوچستان کی آدھی اور قائد حزب اختلاف کی کرسی حاصل کی، یہ انہی کا اعجاز ہے کہ اے پی ڈی ایم کے استعفوں کے

باوجود سرحد اسمبلی نہیں ٹوٹی اور پرویز مشرف دوبارہ صدر منتخب ہوگئے، کمال ہے کہ ایک طرف مفتی محمود ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا ساتھ دیتے ہیں تو دوسری طرف اُن کے بیٹے مولانا فضل الرحمان جنرل مشرف کی آمریت کو مضبوط بنیاد فراہم کرتے ہیں، اگر ایک طرف مفتی محمود جنرل ضیا کی آمریت کو جائز سمجھتے ہیں تو دوسری طرف مولانا فضل الرحمان سابقہ فوجی آمر پرویز مشرف اور موجودہ سیکولر حکمران آصف زرداری کا ساتھ دیتے ہیں، پاکستان سیاست کا المیہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی سیکولر جماعت برسر اقتدار آتی ہے وہ اِن نام نہاد مذہبی سیاستدانوں کو ضرور اپنے ساتھ ملاتی ہے، جس طرح جنرل مشرف کے دور کے درباری مولوی آج موجودہ حکومت کی جھولی میں بیٹھے ہوئے اُس کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں، بالکل اسی طرح کوئی بعید نہیں کہ کل یہ کسی اور کے ہاتھ مضبوط کرتے نظر آئیں گے۔ سابق وفاقی وزیر شیر افگن نیازی درست کہتے ہیں کہ مولانا فضل الرحمٰن اقتدار کی خاطر اپنے نظریات تبدیل کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے، اُن کا کہنا ہے کہ مولانا فضل الرحمٰن کی جماعت نے کبھی کھل کر کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کی حمایت نہیں کی، لیکن وہ کشمیر کمیٹی کے چیئرمین بن کر بیرونی دوروں کے مزے لوٹنا چاہتے ہیں، وہ ہمیشہ وقت کے دھارے میں بہتے ہیں اور وہ وقت کے مخالف کبھی نہیں رہے۔

قارئین محترم آج ایک بار پھر مولانا فضل الرحمان کارزار سیاست میں دلچسپ

کھیل کھیل رہے ہیں، ایک جانب وہ اپنی اتحادی حکومت کے ساتھ آنکھ مچولی کرتے ہیں تو دوسری طرف مذہبی سیاسی جماعتوں کے غیر فعال اتحاد متحدہ مجلس عمل کے رہنماؤں کے ساتھ اجلاس منعقد کرکے اپنی سودے بازی کی صلاحیت میں اضافہ کررہے ہیں، ان کے وزراء ٹیلی وژن چینلز پر حکومت کے بجائے حزب اختلاف کا حصہ نظر آتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ حکومت میں شامل ہیں اور سرکاری جاہ و حشمت ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہیں، کل تک وہ پرویز مشرف کے ہمراہ لیلائے اقتدار سے لطف اندوز ہوتے تھے آج صدر آصف زرداری کے ہم رکاب ہیں، وہ امریکا کے سخت ناقد ہیں لیکن امریکا کی حامی حکومت کے ساتھ شریک اقتدار بھی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ مولانا فضل الرحمان ایک ایسے سودے باز سیاستدان ہیں جو حالات کو اپنے حق میں تبدیل کرنے کے فن جانتے ہیں، وہ سیاسی بساط پر ایک ماہر کھلاڑی کی طرح اپنے مخالفین کو زیر کرنے یا سرکار سے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے کی خاطر مختلف چالیں چلتے رہتے ہیں، اکثر اوقات کسی بھی ایشو پر دو ٹوک مؤقف اختیار کرنے کے بجائے ابہام پیدا کرنے کو ترجیح دیتے ہیں تاکہ وہ کسی مشکل سے دوچار نہ ہوں، پاکستان کے اندر جاری دہشت گردی کی کاروائیوں میں ملوث 96 فیصد سے زائد افراد کا تعلق انہیں کے مکتب فکر سے ہے، لیکن اس کے باوجود انہیں ایک متوازن مزاج سیاستدان کے طور پر متعارف کرایا جاتا ہے اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ مولانا صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں میں پائے جانے والی شدت پسندی کے سامنے بندھ باندھنے کی

صلاحیت رکھتے ہیں، لیکن یہ حقیقت آشکارہ ہو چکی ہے کہ وہ طالبان اور اُن کے حامی حلقوں میں کوئی غیر معمولی اثر و رسوخ نہیں رکھتے ہیں بلکہ انہیں اپنی جان بچانے کے لالے پڑے ہوئے ہیں، جب ریاستی اداروں نے انہیں مجبور کیا کہ وہ خودکش حملوں کے خلاف علما سے فتویٰ جاری کرائیں تو اُن کے ایما پر جامعہ اشرفیہ لاہور میں دو دن تک دیوبندی مکتبہ فکر کے 150 کے لگ بھگ علما کرام کے سامنے ملک اور دیوبند کو درپیش چیلنجز کا جائزہ پیش کرتے ہوئے استدعا کی گئی کہ وہ اجتماعی طور پر خودکش حملوں کے خلاف فتویٰ جاری کریں، لیکن طالبان کے حامی جوشیلے علماء نے مولانا فضل الرحمان کی ایک نہ چلنے دی اور خودکش حملوں کی مذمت کرنے اور انہیں حرام قرار دینے کے بجائے امریکا کے خلاف پہلے سے منظور شدہ قراردادوں کے انبار میں مزید ایک اور قرارداد جس میں کہا گیا کہ "پاکستان کے موجودہ حالات میں نفاذ شریعت اور ملک کو غیر ملکی تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے پر امن جدوجہد ہی بہترین حکمت عملی ہے اور مسلح جدوجہد شرعی اعتبار سے غلط ہونے کے علاوہ مقاصد کے لیے بھی سخت مضر ہے، اگر کوئی شخص اخلاص کے ساتھ اسے دین کا تقاضہ سمجھتا ہے تو یہ اجتماع اس بات پر اتفاق کرتا ہے کہ ایسے حضرات کو حالات کے تقاضوں اور ضرورتوں سے آگاہ کرکے مثبت کردار کی ادائیگی پر آمادہ کرنے کے لیے ناصحانہ اور خیر خواہانہ روش اختیار کی جائے" کا اضافہ کر دیا۔

امر واقعہ یہ ہے کہ خود مولانا فضل الرحمان بھی صرف امریکا کے خلاف بیان بازی پر اکتفا کرنا چاہتے تھے اور اس سے بڑھ کر وہ کسی سرگرمی کے حق میں نہیں ہیں تاہم شدت پسندوں کا دباؤ کم کرنے کے لیے مولانا کبھی حکومت سے باہر نکلنے کی دھمکیاں دیتے ہیں تو کبھی ایم ایم اے کی بحالی کی کوششوں میں سرگرم پائے جاتے ہیں، ہماری رائے میں وہ حکومت سے الگ ہونے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، کیونکہ ایسا کرنے سے انہیں دستیاب حفاظتی چھتری اور سرکاری پروٹوکول برقرار نہیں رہتا ہے، جس کے بناء اب اُن کی زندگی بے کیف ہوجاتی ہے، وہ تمام سیاسی راستے کھلے رکھنا چاہتے ہیں تاکہ بوقت ضرورت کسی بھی طرف جاسکیں، عجیب بات ہے کہ آج وہ ایم ایم اے (جس کے توڑنے میں ان کا سب سے بڑا حصہ ہے) کو بحال بھی کرنا چاہتے ہیں اور لیلیٰ اقتدار کی غلام گردش سے نکلنا بھی نہیں چاہتے ہیں، ایک ہی سانس میں دو مختلف چاہتیں، حیرت کی بات ہے، دراصل ایم ایم اے کی بحالی کی آڑ میں وہ پیپلزپارٹی پر دباؤ ڈال کر اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں، جب وہ دیکھتے ہیں کہ پی پی پی اُن کے مطالبات تسلیم نہیں کررہی تو وہ فوراً ایم ایم اے کی بحالی کی کہانی شروع کردیتے ہیں، آج ایک بار پھر انہوں نے مجلس عمل کی فعالیت کی آڑ میں جمعیت علمائے پاکستان، جماعت اسلامی، جمعیت اہلحدیث و دیگر مذہبی جماعتوں کو بطور چارہ استعمال کرکے حکومت سے اسلامی نظریاتی کونسل کی چیئرمین شپ اور باخبر ذرائع کے مطابق بلوچستان کی گورنری جیسے مطالبات منوا کر اپنے مقاصد میں

کامیابی حاصل کر لی ہے، یہی اُن کا طریقہ واردات ہے، اگر حکومت ان کے مطالبات
پورے کر دیتی ہے تو وہ جمہوری نظام کی بقاء اور نظریاتی ترجیحات کیلئے حکومت میں
شامل رہیں گے، بصورت دیگر ان کے پیٹ میں پھر مجلس عمل کی بحالی کا درد اٹھنے لگے
گا، معلوم نہیں مولانا فضل الرحمٰن خود کو دھوکہ دے رہیں، یا دینی جماعتوں اور اُن کے
قائدین کو یا پھر قوم کو، ہو سکتا ہے کہ دینی جماعتیں اور اُن کے قائدین شاید مولانا سے
نیکی اور خیر کی کوئی توقع رکھتے ہوں، لیکن پاکستان کے عوام اب یہ بات اچھی طرح
جانتے ہیں کہ مولانا فضل الرحمٰن کی ڈوریں کہیں اور سے ہلائی جاتی ہیں اور وہ ہمیشہ
بادشاہ گروں کی خواہشات پر ہی متحرک ہوتے ہیں۔

اب کے داتا کا بھی دربار لہو رنگ ہوا۔۔۔۔

کس نے کاٹی ہیں یہاں آکے سروں کی فصلیں

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے سلسلہ تصوف سے تعلق رکھنے والے شیخ ابوالفضل نے جب دیکھا کہ اُن کے شاگرد حسین زنجانی نے اپنی روحانی تعلیم وتربیت مکمل کرلی ہے اور مقام مطلوب پالیا ہے تو ایک دن اپنے ہونہار شاگرد کو بلایا، اُسے خرقہ خلافت عطا کیا اور حکم دیا،اے حسین.....آج میں تمہیں خدائے بزرگ و برتر کے حوالے کررہا ہوں، یہاں سے دیار ہند چلے جاؤ جو شرک وبت پرستی کا گڑھ بنا ہوا ہے، وہاں توحید الٰہی کا چراغ روشن کرو،اِس راہ میں تمہیں شدید مشکلات اور کڑے مصائب کا سامنا کرناپڑے گا، ایسی ہر آزمائش میں صرف اپنے اللہ کو یاد کرنا، اُسی سے مدد مانگنا، وہ یقیناً تمہاری مشکل کشائی کرے گا۔“ اپنے پیرو مرشد کا حکم پاکر سید حسین زنجانی نے اپنے دونوں بھائی سید یعقوب زنجانی اور سید موسیٰ زنجانی کو ساتھ لیا اور سبزوار، نیشاپور، ہرات، غزنی، جلال آباد اور پشاور سے ہوتے ہوئے لاہور پہنچے، اُسے اپنا مسکن بنالیا، یوں لاہور کا جنوبی علاقہ جو آج ”شاہ عالمی“ کے نام سے مشہور ہے،اِس روحانی چراغ کا پہلا طاق بنا اور شرک وبت پرستی کے اندھیروں

میں اسلام کی نورپاشی کا عمل شروع ہوگیا، سید حسین زنجانی اکیس سال تک شرک و بت پرستی کی تاریکیوں میں نور توحید کا چراغ جلاتے رہے۔

دوسری طرف اس دوران ہجویر کے سید عثمان کے ہاں پیدا ہونے والے سید علی ہجویری ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد شیخ حسین زنجانی کے پیرومرشد شیخ ابوالفضل کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، شیخ کی نگاہ باطن نے دیکھ لیا کہ ہجویر سے آنے والے نوجوان کی پیشانی روشن ہے، انھوں نے نوجوان سید علی ہجویری کی روحانی تعلیم وتربیت شروع کردی، کچھ عرصے بعد ایک روز شیخ ابوالفضل نے اپنے ہونہار شاگرد کو بلایا اور شفیق لہجے میں کہا، علی.... میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے قلب میں اب مضبوطی اور استقامت آگئی ہے اور تم کامیابی کے ساتھ اُس خارزار بستی کا سفر کرسکتے ہو، سید علی ہجویری نے سرجھکائے ہوئے مؤدب لہجے میں جواب دیا، شیخ.... یہ سب اللہ کا کرم ہے اور آپ کی دعاؤں کا فیضان ہے، شیخ نے کہا، یقیناً اللہ نے تمہیں ثمربار کردیا ہے، اب اِس کا پھل دوسروں میں بانٹنے کا وقت آگیا ہے، تم رخت سفر باندھو اور لاہور چلے جاؤ، وہاں پیاس کی شدت سے بھٹکتی خلق خدا تمہاری راہ دیکھ رہی ہے، اپنے مرشد کامل سے دوری اور فرقت کے تصور سے سید علی ہجویری کی آنکھیں بھرآئیں، ادب سے عرض کی، شیخ.... وہاں تو آپ کے مرید کامل قطب الاقطاب سید شیخ حسین زنجانی پہلے ہی موجود ہیں، اُن کی موجودگی میں میری ذات سے لوگوں کو

کیا فیض حاصل ہوگا؟ شیخ نے یہ سن کر پر جلال لہجے میں پوچھا، علی.... میں اِسے حجت سمجھوں یا انکار؟ علی ہجویری شیخ کی مرضی جان گئے، عرض کی نہیں شیخ.... مجال انکار کہاں، فقط فرقت کے احساس سے آزردہ ہوں، شیخ نے کہا، میری خدمت بجا لانا چاہتے ہو تو بلا تاخیر لاہور پہنچو۔

چنانچہ مرشد کے حکم کے مطابق سید علی ہجویری نے رخت سفر باندھا اور پا پیادہ سفر کر کے دو ماہ کے عرصے میں غزنی سے لاہور پہنچے، صعوبتوں سے پر کٹھن سفر میں ایک ہی سوال سارے راستے چبھتا رہا کہ قطب الاقطاب سید شیخ حسین زنجانی کی موجودگی میں میرا چراغ کہاں جلے گا، جس روز آپ لاہور میں پہنچے تو شام ہو چکی تھی، چنانچہ آپ نے شہر کے باہر ہی شب بسر کی، صبح شہر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک بہت بڑا جنازہ آرہا ہے، جس کے ساتھ ہزاروں لوگ آہ وزاری کر رہے ہیں، آپ بھی ہجوم سے جا ملے اور زار و قطار روتے ہوئے ایک شخص سے پوچھا، یہ کس کا جنازہ ہے، وہ بولا ... حضرت شیخ حسین زنجانی انتقال فرما گئے ہیں، یہ سننا تھا کہ سید علی ہجویری کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، اپنے مرشد کامل شیخ ابوالفضل کی مصلحت کو نہ سمجھنے اور لاہور آنے میں عذر تراشنے کے احساس نے درد کی شدت کو اور بھی بڑھا دیا، آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے، لاہور کے لوگ حیران تھے کہ یہ اجنبی نوجوان کون ہے جو اِس قدر گریہ کر رہا ہے، یہ حکمت خداوندی تھی کہ جس دن ایک چراغ گل ہوا، اُسی دن لاہور کے

طاق میں ایک نیا چراغ روشن ہوگیا، غزنی کے جواں سال درویش نے سب سے پہلے ایک مسجد کا سنگ بنیاد رکھا، مغل شہزادہ داراشکوہ نے اپنی مشہور کتاب "سفینۃ الاولیا" میں لکھا کہ لاہور کے علماء کو سخت اعتراض ہوا کہ قبلہ کی سمت درست نہیں، علی ہجویری نے ان کا اعتراض سنی ان سنی کردیا، مسجد تیار ہوگئی تو نوجوان درویش نے علماء کو دعوت دی، نماز پڑھائی، علماء نے کہا، ہمیں اب بھی شک ہے کہ سمت قبلہ درست نہیں ہے، حضرت علی ہجویری نے مسجد کے میناروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا... آپ حضرات ملاحظہ توفرمائیں، علماء نے نگاہیں اٹھائیں تو دیکھا کہ عین سامنے خانہ خدا موجود ہے، حضرت علی ہجویری کا چراغ تین عشروں سے زائد تک لاہور کی فضاؤں کو جگمگاتا رہا، لاکھوں انسان سید علی ہجویری کے فیضان سے مشرف بہ اسلام ہوئے، غزنی کے یہ درویش سید علی ہجویری داتا گنج بخش کے نام سے معروف ہوئے اور 1072ء میں دنیائے فانی سے رخصت ہوئے، لیکن صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی یہ درگاہ بلا تفریق مذہب وملت ہر ایک کے لیے روحانی فیوض وبرکات اور آسودگی کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

آج حضرت داتا گنج بخش کو ساری دنیا میں تصوف اور صوفیانہ تعلیمات کے سبب جانا جاتا ہے، حضرت سید ابوالحسن علی بن عثمان ہجویری المعروف داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ نسب حضرت علی مرتضٰی کرم اللہ وجھہ سے ملتا ہے، عوام آپ کو گنج بخش (خزانے بخشنے والا) اور داتا صاحب کہتے ہیں، دریائے

راوی کے کنارے واقع لاہور شہر جو صوبہ پنجاب کی راجدھانی اور پاکستان کا دوسرا بڑا شہر ہونے کے ساتھ ساتھ پاکستان کا ثقافتی، تعلیمی اور تاریخی مرکز ہے، اسے پاکستان کا دل بھی کہتے ہیں، شاہی قلعہ، شالامار باغ، بادشاہی مسجد، مقبرہ جہانگیر اور مقبرہ نور جہاں مغل دور کی یادگار ہیں، سکھ اور برطانوی دور کی تاریخی عمارتیں بھی اسی شہر میں موجود ہیں، لیکن جنوبی ایشیاء کی روحانی دنیا میں داتا کے دربار کی وجہ سے یہ شہر سب سے زیادہ مشہور اور داتا کی نگری کہلاتا ہے، لاہور کا داتا دربار مرجعِ خلائق ہے، جہاں روزانہ ہزاروں لوگ اکتساب فیض کیلئے آتے ہیں، داتا صاحب کے مزار پر حاضری دیتے ہیں، یہاں چوبیس گھنٹے لنگر چلتا اور درود و سلام، حمد و نعت خوانی کے نذرانے پیش کئے جاتے ہیں، کبھی کسی نے یہ خیال بھی نہیں کیا ہوگا کہ جو دربار مرجع خلائق ہے اور جہاں سے لوگوں کو روحانی سکون ملتا ہے، اُسی دربار میں ایک دن ایسا بھی آئے گا جب دہشت گرد خون کی ہولی کھیلیں گے، کوئی پاکستانی اِس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی دہشت گرد قوت امن و آشتی اور روحانی تجلیات کے اِس مرکز کو بھی نشانہ بنا سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ داتا گنج بخش، حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی، حضرت شاہ رکن عالم ملتانی، بابا فرید الدین، بابا بلھے شاہ وہ بزرگ ہیں، جن کی ساری زندگی کا فکر و فلسفہ اخوت و محبت، امن اور بھائی چارے پر محیط ہے، اِن

بزرگوں کی ساری زندگی لوگوں کو تشدد سے دور رکھنے اور امن کی طرف لانے میں صرف ہوئی اور ان کے مزارات صدیوں سے قائم ہیں، یہ وہ عرصہ ہے جس میں کبھی سکھوں نے لاہور کو تاراج کیا، تو کبھی وقت کی کوئی اور قوت پنجاب پر حملہ آور ہوئی، لیکن کیا مجال ہے کہ کسی بھی غیر مسلم قوت نے اِن صوفی بزرگوں کے مزاروں کو ذرا سی بھی گزند پہنچائی ہو، حیرت کی بات ہے کہ وہ مزارات جن کو سکھوں اور ہندوؤ ں نے بھی ادب اور احترام کی نظر سے دیکھا، آج اُن بزرگوں کے مزارات بھی دہشت گردی سے محفوظ نہیں رہے ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ لاہور میں داتا دربار پر خودکش حملہ جس میں 44افراد شہید اور سینکڑوں زخمی ہوئے، پاکستان میں کسی مزار پر پہلا حملہ نہیں ہے، اس سے بھی قبل اسلام آباد کے قریب بری امام کے مزار پر خودکش حملے میں بیس افراد ہلاک ہوچکے ہیں، 5مارچ2009ء میں صوبہ خیبر پختونخواہ کے دارالحکومت پشاور کے مضافات میں واقع پشتو کے مشہور صوفی شاعر رحمان بابا کے مزار کے ستونوں کے ساتھ دھماکہ خیز مواد رکھ کر تباہ کر دیا گیا، 6 مارچ2009ء کو نوشہرہ میں واقع بہادر بابا کے مزار کو نامعلوم افراد نے بموں سے نقصان پہنچایا، 11 مئی 2009ء کو خیبر ایجنسی کے لنڈی کوتل میں مقبول پشتو شاعر امیر حمزہ خان شنواری کے مزار کی بیرونی دیوار کو دھماکہ خیز مواد سے اڑا دیا گیا، مارچ2008ء کو پشاور سے ملحق قبائلی علاقے خیبر ایجنسی میں سرگرم لشکر اسلام

نے صوبائی دارالحکومت کے قریب شیخان کے علاقے میں چار سو سال پرانا ابو سید بابا کا مزار تباہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔31 جولائی 2007ء کو قبائلی علاقے مہمند ایجنسی میں برطانوی سامراج کے خلاف لڑنے والے حریت پسند مجاہد حاجی صاحب تورنگزئی کے مزار پر قبضہ کرلیا۔ 18 دسمبر سال 2007ء کو عبدالشکور ملنگ بابا کے مزار کو دھماکے سے نقصان پہنچایا گیا۔ شدت پسندوں کا ہدف گذشتہ کئی برسوں میں محض صوفیاء کرام کے مزارات ہی نہیں رہے بلکہ کئی گدی نشینوں نے بھی اِن دہشت گردوں کے ہاتھوں اپنی جان گنوائی۔ تکفیری سوچ اور خارجی نظریات نے اِن شدت پسندوں کو سماجی مقبولیت رکھنے والے گدی نشینوں کا بھی دشمن بنا دیا ہے۔ خیبر ایجنسی میں منگل باغ کے لشکر اسلام نے 2008ء میں پیر سیف الرحمان کو شدید جھڑپوں کے بعد علاقہ بدر کر دیا تھا۔ اُن کے علاقے سوات کے گدی نشین پیر سمیع اللہ کو دسمبر میں شدت پسندوں کے خلاف لشکر کشی کے بعد ایک جھڑپ میں ہلاک کر دیا گیا۔ اُن کی لاش کو بھی بعد میں قبر سے نکال کر مینگورہ کے ایک چوراہے پر لٹکا دیا گیا اور نامعلوم مقام پر دفن کر دیا گیا۔ ضلع جھل مگسی میں فتح پور کے مقام پر ایک مزار پر حملے میں تیس سے زائد افراد ہلاک ہوئے، جس کی ذمہ داری صوبائی پولیس سربراہ نے کالعدم سپاہ صحابہ پر ڈالی اور اُس کے چند مبینہ اراکین کو گرفتار بھی کیا۔

لیکن گذشتہ آٹھ سو سالہ تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ دہشت گردوں نے

داتا دربار میں بھی خون کی ہولی کھیلی، روحانی سکون کی تلاش میں پریشان حال، نیک اور بے گناہ انسانوں کو قتل کرکے نہ صرف مزار کا تقدس مجروح کیا بلکہ پوری دنیا میں پاکستان کو بھی بدنام کیا، دہشت گردوں کے اِس اقدام کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے، لیکن معاملات صرف مذمت سے نہیں، عملی اقدامات سے ہی درست ہو سکتے ہیں، آج دہشت گردوں کی بڑھتی ہوئی جرات کے سبب حضرت معین الدین اجمیری کے "ناقصاں را پیر کامل، کاملاں را رہنما" اور مرد قلندر اقبال "سید ہجویری مخدوم امم" کے مزار مبارک کا احاطہ خون سے لت پت ہے، کاروباری مراکز، مسلموں اور غیر مسلموں کی عبادت گاہیں اور سرکاری عمارتیں پہلے ہی غیر محفوظ تھیں اب مادی و سماجی مسائل سے گھبرا کر روحانی سکون کی تلاش میں سرگرداں عامتہ المسلمین کی اِن پناہ گاہ کو جہاں دل اور شکم دونوں کی غذا دستیاب ہے قتل گاہ میں تبدیل کردیا گیا ہے، بت کدہ ہند میں شرک و بدعات کی تاریکی کو اسلام کی روشنی سے بدلنے والے حضرت معین الدین چشتی اجمیری رحمتہ اللہ علیہ کے روحانی پیرو مرشد حضرت سید علی ہجویری کے مزار پر حملہ ہمارے نزدیک اسلام کی اُس روحانی اقدار پر حملہ ہے جو برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی آبیاری کا سبب بنی۔

داتا دربار پر حملہ اولیائے کرام سے محبت رکھنے والوں کی روح کو زخمی، دل کو چھلنی اور اعصاب کو شل کردینے والا ایسا واقعہ ہے جس کے بعد پاکستان میں

غم وغصے کی لہر کا دوڑنا ایک فطری امر ہے۔ لوگ حکومت کی ناکامیوں کے خلاف مشتعل ہو اٹھے ہیں اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد نے اِس موقع پر حکومت کو سخت تنقید کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ رویت ہلال کمیٹی کے مرکزی چیئرمین اور سنی رہبر کونسل کے سربراہ مفتی منیب الرحمٰن نے اس سانحہ پر اپنے رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ "یہ سانحہ ایک ایسے وقت میں پیش آیا جبکہ مزارات سے تعلق رکھنے والے گیلانی، قریشی، مخدوم، کاظمی اور شاہ ان مزارات کی نسبت کی برکت سے اعلیٰ اقتدار پر فائز ہیں، ان سب کے عہد اقتدار میں پاکستان کے سب سے بڑے مزار کی حرمت کی پامالی ایک المیہ اور لمحہ فکریہ ہے اور ان سب کیلئے باعث شرم ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ حکومت کی ترجیحات بالکل مختلف ہیں اسے صرف اقتدار سے غرض ہے، عوام کی جان و مال کی کوئی پرواہ نہیں ہے، کچھ عوامی نمائندوں کا کہنا ہے کہ اب تک کسی بھی حملہ آور کو قرار واقعی سزا نہیں ملی جسکی وجہ سے حملہ آوروں کے حوصلے بڑھ گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ داتا دربار پر حملے کے بعد اب پاکستان میں کوئی جگہ محفوظ بھی نہیں رہی ہے، مدرسہ، خانقاہ، مزار، تاریخی مقامات اور یہاں تک کہ مسجدیں بھی دہشت گردوں کے نشانے پر ہیں، ایک ایسا ملک جہاں صرف مسلمان بستے ہوں، وہاں ایسی مقدس جگہیں بھی اگر محفوظ نہیں تو اِس سے بڑھ کر حیرت اور

افسوس کا اور کیا مقام ہو سکتا، کیا اب بھی یہ کہنے کو باقی ہے کہ دہشت گردوں کا کوئی
مذہب ہے، خود کو مسلمان کہلانے والے یہ دہشت گرد کس طرح کا اسلام پھیلانا چاہتے
ہیں اور کس طرح کا معاشرہ وجود میں لانا چاہتے ہیں، یہ سب جانتے ہیں، سوال یہ ہے
کہ کیا اب بھی ہماری حکومت اور اس کے ذمہ دار افراد ایسے دہشت گردوں کی پشت
پناہی کرتے رہیں گے، جنھوں نے ملک کی سلامتی، استحکام اور بقاء کو داؤپر لگا دیا ہے اور
جن کی وجہ سے پوری دنیا میں اسلام کے نام لیوا شرمسار ہیں۔
حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر اِس نوعیت کا واقعہ اگرچہ باقی اِس طرح کے تمام واقعات
کی طرح ہی قابل افسوس اور قابل مذمت ہے، لیکن ہر شخص یہ سوال پوچھ رہا ہے کہ
ایک ایسی مقدس درگاہ جس کے مکین نے برصغیر میں اسلام پھیلایا، کو کس حکم یا
اشارے پر نشانہ بنایا گیا، وہ کون سا ذہن ہو سکتا ہے جو اللہ کے اِن پیارے بندوں کے
خلاف نبرد آزما ہے، اِس دھماکے کا مقصد بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ یہاں خود کش دھماکہ
کرانے والے دراصل کسی ایسے مکتبہ فکر کا ذہن رکھتے ہیں جو بزرگان دین کی درگاہوں
کے خلاف ہے، اگر ہم غور کریں تو ہمارے معاشرے میں ایسے مکتبہ فکر کے لوگ موجود
ہیں، جو یہ سوچ رکھتے ہیں کہ درباروں سے لگاؤ اچھا نہیں، یہی وہ فکر ذہن اور سوچ ہے
جو بارود کے زور پر ناپختہ ذہنوں کو خود کش حملوں کی تربیت دے کر پاکستان میں

انار کی پھیلا رہی ہے اور اپنے خارجی خیالات و فکر پر مبنی اسلام کو دوسروں پر ٹھونسنا چاہتی ہے، جبکہ پاکستان کی اکثریت اسلام کی پیروکار اور بزرگان دین سے عقیدت و محبت رکھتی ہے۔

لیکن افسوس کہ اِس ملک میں ایک خاص نکتہ نظر کے مذہبی رجعت پسند اکثریت کی مذہبی سوچ پر اپنی دقیانوسی خارجی سوچ کو طاقت کے زور پر مسلط کرنا چاہتے ہیں، جس کی وجہ سے سانحہ داتا دربار کے بعد اِن رجعت پسند مذہبی عناصر اور دہشت گردوں کی پشت پناہی کرنے والوں کے خلاف شدید رد عمل سامنے آرہا ہے، جو اِن سے نفرت، برات اور بیزاری کا کھلا اظہار ہے، لہٰذا اِن حالات میں بزرگان دین سے عقیدت رکھنے والے ہر مسلمان کو صبر و تحمل سے کام لینے کی ضرورت ہے، کیونکہ ہمارا دشمن ہماری صفوں میں دراڑیں ڈال کر اپنے مکروہ عزائم کی تکمیل کیلئے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کر کے تخریب کاری کے راستے پر لیجانا چاہتا ہے، عقلمندی، جذبہ حب الوطنی اور بزرگان دین سے محبت کا تقاضہ یہ ہے کہ صبر واستقامت سے کام لے کر اپنے اتحاد، یکجہتی کی قوت سے دشمن کے تمام تر مذموم عزائم کو ناکام بنا دیا جائے۔

خوب کہا عرشی ملک نے کہ .... "اب کے داتا کا بھی دربار لہو رنگ ہوا.... یہ وہ دربار کہ جو امن کا گہوارہ تھا.... یہ وہ دربار جو الفت کا رواں دھارا

تھا.... جو غریبوں کو امیروں کو بہت پیارا تھا.... جہاں مذہب کو نہ مسلک کو تھا پر کھا جاتا.... نہ حسب کو، نہ نسب کو، جہاں دیکھا جاتا.... کوئی دیوان، جہاں، خاص نہ تھا، عام نہ تھا.... نام والا نہ تھا کوئی، کوئی بے نام نہ تھا.... جوق در جوق چلی آتی تھی خلقت ساری.... آس و امید کا، خوراک کا لنگر جاری.... بھوک مٹ جاتی دل و پیٹ کی باری باری.... کتنی صدیوں سے تھا روشن، یہ محبت کا چراغ.... زرد موسم میں بھی سرسبز رہا، عشق کا باغ.... دہریے بھی یہاں پاتے تھے عقیدت کا سراغ.... کس نے کاٹی ہیں یہاں آ کے سروں کی فصلیں.... کون انساں کی مٹانے پہ تلا ہے نسلیں.... باڑ نفرت کی سرِ راہ اگانے والوں.... خانقاہوں پہ جلے دیپ بجھانے والوں.... بو میں بارود کی جنت کو کمانے والوں.... خود کشی کر کے بڑا جشن منانے والوں.... تم کہ کرتے ہو، عقیدوں کی بنا پر حملہ.... اب کے تو تم نے کیا، بادِ صبا پر حملہ.... مردِ درویش کے پیغامِ بقاء پر حملہ.... ایک صوفی کی محبت کی صدا پر حملہ.... یہ تو حملہ ہے عقیدت پہ، وفا پر حملہ.... آس و امید پہ اور حرفِ دعا پر حملہ.... دلِ مظلوم کی ہاں آہِ رسا پر حملہ.... مار پائیں نہیں جس شخص کو صدیاں عرشی.... کس لئے کرتے ہو اس مردِ خدا پر حملہ...."

پاک چین ایٹمی معاہدے پر بھارتی اور امریکی مروڑ

گزشتہ دنوں پاکستان نے بھارت کے اُس مطالبے کو مسترد کر دیا، جس میں یہ کہا گیا تھا کہ پاکستان چین کے ساتھ نیوکلیئر معاہدے کی وضاحت کرے، پاکستان نے پاک چین سول نیوکلیئر ٹیکنالوجی تعاون کے بارے میں بھارت اور امریکی تحفظات کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان اور چین کے مابین یہ تعاون بین الاقوامی قوانین کے مطابق ہے جس پر کسی کو تحفظات نہیں ہونے چاہئیں، دوسری طرف چین نے بھی امریکہ اور بھارت کے اعتراضات کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اِن ملکوں کے پاس پاکستان کے ساتھ سول جوہری معاہدے میں رکاوٹ ڈالنے کا کوئی جواز موجود نہیں، کیونکہ پاک چین معاہدہ عالمی توانائی ایجنسی کے قوانین کے مطابق ہے، چین نے اعلان کیا ہے کہ وہ امریکہ اور بھارت کے تحفظات کے باوجود پاکستان کے صوبہ پنجاب میں 650 میگاواٹ نیوکلیئر پاور پلانٹ تعمیر کریگا، اِس سلسلہ میں چین کی جانب سے گزشتہ روز نیوزی لینڈ میں نیوکلیئر سپلائرز گروپ کے اجلاس میں باقاعدہ طور پر آگاہ بھی کر دیا گیا اور مؤقف اختیار کیا گیا کہ امریکہ خود بھارت سے اِس نوعیت کا ایٹمی معاہدہ کر چکا ہے، اِس لئے وہ چین پر دباؤ نہیں ڈال سکتا، ایک بھارتی اخبار کے مطابق چین کی آرمڈ کنٹرول اینڈ ڈس آرمامنٹ ایسوسی ایشن کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل زی وی کوانگ نے

واضح طور پر اعلان کیا ہے کہ چین پاکستان کو سول نیوکلیئر پاور پلانٹ کے سلسلہ میں تعاون فراہم کریگا اور دو ایٹمی ری ایکٹروں کی تعمیر کیلئے پاکستان کی مالی معاونت بھی کی جائیگی۔

حقیقت یہ ہے کہ عوامی جمہوریہ چین پاکستان کا بہترین ہمسایہ ہی نہیں، ایسا قابل اعتماد دوست ہے جو آزمائش کے ہر مرحلے میں دوستی کے معیار پر پورا اترا ہے، اُس نے پاکستان کیلئے جو کہا، وہ کرکے بھی دکھایا، اِسی وجہ سے پاک چین دوستی کے ہمالیہ سے بلند اور شہد سے میٹھا ہونے کی جو مثالیں دی جاتی ہیں، وہ غلط نہیں، چین نے ہر فیلڈ میں ہمیشہ پاکستان کے ساتھ بے لوث تعاون کیا ہے، یہ الگ بات ہے کہ ہمارے حکمرانوں نے اپنی مصلحتوں اور مجبوریوں کے تحت چین کے بے لوث تعاون کے باوجود ہمیشہ امریکہ کی کاسہ لیسی کی، حالانکہ امریکہ نے دوستی کا معیار مقرر کرتے وقت دفاعی تعاون، مشترکہ جنگی مشقیں، ایٹمی ٹیکنالوجی کا تبادلے اور تجارتی تعاون میں ہمیشہ پاکستان پر بھارت کو ترجیح دی، جو شروع دن سے پاکستان کی سلامتی کے درپے اور مشرقی کی علیحدگی سے لے کر بلوچستان اور آزاد قبائلی علاقوں میں خانہ جنگی تک پاکستان کی آزادی و خودمختاری کیخلاف مسلسل سازشوں میں مصروف ہے۔

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ بھارت خطے میں تھانیداری کے جنون میں مبتلا

ہے، اُس کے توسیع پسندانہ عزائم آج کھل کر دنیا کے سامنے آچکے ہیں، اِس تناظر میں اگر پاکستان اپنے دفاع کو مضبوط بنانے کے لئے کوئی قدم اٹھاتا ہے تو بھارت شور مچاتا ہے کہ پاکستان کو روکا جائے، اسی وجہ سے اب بھارت کو یہ بات ہضم نہیں ہو رہی ہے کہ پاک چین سول ایٹمی معاہدہ کیوں ہوا، جبکہ خود بھارت امریکہ،،برطانیہ، روس، فرانس اور اسرائیل سمیت متعدد ممالک کیساتھ دفاعی اور ایٹمی تعاون کے اب تک 130 معاہدے کر چکا ہے، اِس وقت اسکی دفاعی صلاحیت اور جنگی ساز وسامان میں پاکستان کے مقابلے میں چارگنا اضافہ ہو چکا ہے، جس کی بنیاد پر وہ ہمیں محض دھمکیاں ہی نہیں دیتا، بلکہ ہماری سالمیت کیخلاف مسلسل سازشوں میں بھی مصروف ہے، جبکہ دہشت گردی کے خاتمہ کے نام پر ہماری سرزمین کے اندر حملہ آور ہونے کے حوالے سے اُس کے عزائم کا اظہار بھی بارہا ہو چکا ہے، لیکن اس کے باوجود آج تک امریکہ نے بھارت کے جنگی جنون، تخریبی سرگرمیوں اور توسیع پسندانہ عزائم کا نہ تو کوئی نوٹس لیا اور نہ ہی کبھی تشویش کا اظہار کیا، دوسری طرف پاکستان چین دفاعی تعاون کے معاہدوں پر امریکہ اور بھارت کے پیٹ میں بیک وقت مروڑ اٹھ رہے ہیں اور امریکہ کی جانب سے باور کرایا جا رہا ہے کہ وہ خطہ میں امن و اماں کے حوالے سے پاکستان چین سٹرٹیجک تعاون کے معاہدوں کا سنجیدگی کیساتھ جائزہ لے رہا ہے۔

پاکستان کے بارے میں مغرب کے دوہرے معیار کا اندازہ اِس امر سے بھی بخوبی

لگایا جا سکتا ہے کہ ایٹمی عدم پھیلاؤ کے جس معاہدے پر دستخط کرنا اور عملدرآمد کرنا خود امریکہ نے کبھی ضروری نہیں سمجھا اور بھارت اور اسرائیل کو بھی اس معاہدے کی روح کے منافی ایٹمی سرگرمیوں کی کھلی چھوٹ دی، پاکستان چین ایٹمی تعاون معاہدے کے بعد امریکہ، برطانیہ، بھارت اور یورپی یونین کو بڑی شدت سے احساس ہونے لگا کہ پاکستان چین ایٹمی تعاون کا معاہدہ آئی اے ای اے کے قوانین کے مطابق ہونا چاہئے۔
گزشتہ دنوں برطانوی وزیر خارجہ ولیم ہیگ نے بھی اسلام آباد میں صدر زرداری اور اپنے ہم منصب وزیر خارجہ پاکستان شاہ محمود قریشی سے ملاقات کے دوران پاکستان کو یہی باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ چین سے ایٹمی تعاون کے بارے میں پاکستان عالمی قوانین کی پاسداری کرے، جبکہ دو سال قبل جب امریکہ نے بھارت کو اپنا فطری اتحادی قرار دے کر اُس کے ساتھ ایٹمی تعاون کا معاہدہ کیا تھا۔
اُس وقت پاکستان چین معاہدے کے مخالفین کو یہ یاد نہیں آیا کہ یہ معاہدہ ایٹمی عدم پھیلاؤ کے عالمی قوانین سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں، اُس وقت نہ کسی نے بھارت پر دباؤ ڈالا اور نہ ہی امریکہ پر زور دیا کہ وہ اِس معاہدے سے اجتناب کرے، کہ اِس سے خطہ میں طاقت کا توازن مزید خراب ہو سکتا ہے اور عالمی امن کو مزید خطرہ لاحق ہو سکتے ہیں، اَمر واقعہ یہ ہے کہ امریکہ ہمارے دشمن اوّل بھارت کو علاقائی تھانیدار بنانے کیلئے اُسے جدید ایٹمی

ٹیکنالوجی سمیت تمام دفاعی حربی سامان سے لیس کر رہا ہے، یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ امریکہ اِس معاہدے کی بنیاد پر اب تک بھارت کو جدید ایٹمی ہتھیاروں اور ٹیکنالوجی سے لیس کر چکا ہے، جبکہ بھارت نے امریکہ سے ہی سے نہیں، فرانس، برطانیہ، کینیڈا اور اسرائیل تک سے ہر قسم کا ایٹمی تعاون حاصل کیا ہے، جس کی بنیاد پر وہ نہ صرف ہم سے چار گنا زیادہ دفاعی صلاحیت رکھتا ہے بلکہ طاقت کے نشہ میں چور ہو کر وہ اب چین کو بھی آنکھیں دکھا رہا ہے۔

اِس صورتحال میں سوال یہ ہے کہ جب بھارت کھلم کھلا اپنے جارحانہ عزائم کا اظہار کر رہا ہو تو پھر اپنے دفاع کیلئے چین اور پاکستان کو ایک دوسرے کے ساتھ ایٹمی تعاون کرنے کا کیوں حق نہیں پہنچتا، چین بلاشبہ پہلے بھی ہر فیلڈ میں ہمارے ساتھ بے لوث تعاون کرتا رہا ہے اور کسی بھی مشکل وقت میں اُس نے کبھی ہمیں تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیا، اسی بنیاد پر پاک چین دوستی کی دنیا میں مثال پیش کی جاتی ہے جو ہمالیہ سے بھی بلند اور شہد سے بھی میٹھی ہے، آج امریکہ بھارت اسرائیل گٹھ جوڑ کے باعث خطہ میں بگڑتے ہوئے طاقت کے توازن نے اپنی اپنی سلامتی کے نقطہ نظر کے تحت پاکستان اور چین کو ایک دوسرے کے مزید قریب کر دیا ہے، یقیناً اسی تناظر میں پاکستان اور چین کے مابین ایٹمی تعاون کا ایسا ہی معاہدہ روبہ عمل ہوا، جیسا امریکہ اور

بھارت نے ایک دوسرے کے ساتھ معاہدہ کیا ہے۔ اگر مغربی دنیا اور یورپی یونین امریکہ بھارت معاہدے کو نظرانداز کرتے ہوئے اِسی نوعیت کے پاک چین معاہدے پر .برافروختہ ہو رہی ہے تو اِس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آئی اے ای اے، این پی ٹی اور سی ٹی بی ٹی جیسے ایٹمی عدم پھیلاؤ کے عالمی معاہدے کس کے گرد شکنجہ کسنے کیلئے تیار کئے گئے ہیں۔

اگر یہ عالمی قوانین وضع کرنے والے ہی خود کو اِن کا پابند نہیں سمجھتے تو پھر پاکستان اور چین کو اِن قوانین کی پابندی پر کیسے مجبور کیا جا سکتا ہے۔ اِس لئے چین نے نیوکلیئر سپلائرز گروپ کی میٹنگ میں پاکستان چین ایٹمی معاہدہ کے تحت پاکستان میں نیوکلیئر پاور پلانٹ تعمیر کرنے کا اعلان کرکے انتہائی جرات، بہادری اور دانشمندی کا مظاہرہ کیا ہے، جس کے بعد پاکستان کو بھی ایسی ہی جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے امریکی مفادات کی اُس جنگ سے جس نے پاکستان کو سوائے تباہی و بربادی کے اور کچھ نہیں دیا، اپنا دامن چھڑا کر کھل کر چین کے ساتھ ہو جانا چاہئے اور امریکہ اور مغرب کی جانب دیکھنے کے بجائے چین سے اپنے تعلق اور دوستی کو مضبوط کرنا چاہیے کیونکہ یہی پاکستان کے بہترین مفاد میں ہے۔

امریکہ نے گزشتہ آٹھ سال میں ہمارے ساتھ جو رویہ اختیار کیا اُس کے بعد

ہمارے حکمرانوں کو کم از کم یہ بات ضرور سمجھ لینی چاہئے کہ امریکہ کو دوست سمجھنا، اُس پر بھروسہ واعتبار کرنا اور اُس سے خیر کی توقع رکھنا، محض خام خیالی کے سوا اور کچھ نہیں ہے، لہٰذا ایسی حالت میں جبکہ ہماری سلامتی کیخلاف امریکہ بھارت اسرائیل پر مشتمل شیطانی اتحاد ثلاثہ کے توسیع پسندانہ عزائم کسی سے ڈھکے چھپے نہیں، ہمیں امریکہ کا فرنٹ لائن اتحادی بنے رہنے کی ضرورت نہیں، حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا مستقبل چین کے ساتھ جڑا ہوا ہے، آج ایک بار پھر چین نے ایٹمی تعاون کے حوالے سے امریکی دباؤ کو مسترد کرکے پاکستان کے ساتھ دوستی اور تعاون کی ایک نئی تاریخ رقم کرتے ہوئے اپنے گرانقدر تعاون کا ایسا تحفہ پیش کیا ہے جو اِس خطے کی ہی نہیں، عالمی امن کی بھی ضمانت ہے اور جس کی مدد سے نہ صرف امریکہ جیسی سپرپاور کا زعم بھی توڑا جا سکتا ہے بلکہ طاقت کے نشے میں بدمست ہاتھی بھارت کا نشہ بھی ہرن کیا جا سکتا ہے۔

جعل ساز اور قانون ساز ادارے، یہ ہے میرا پاکستان۔۔۔

مسلم لیگ (ن) کے رکن پنجاب اسمبلی طارق محمود باجوہ نے میٹرک سے پانچ سال پہلے ایم اے کرنے کا جو کارنامہ سرانجام دیا ہے، اُس نے تو ہمیں حیرت زدہ ہی کر دیا، کمال ہے بھئی ....یقین نہیں آرہا.... ویسے تو جعلی ڈگریوں کے پنڈورا بکس سے روز نئی نئی کہانیاں سامنے آرہی تھیں، لیکن ایسا محیر العقل کارنامہ کہ 2007 میں میٹرک پاس کرنے والے طارق محمود باجوہ نے 2002 میں ایم اے کرلیا، ہمارے وہم و گمان سے باہر ہے، حیران ہونے کی بات تو ہے، لیکن بھائی یہ پاکستان ہے، یہاں ہونی کب انہونی میں بدل جائے اور انہونی کب ہونی میں بدل جائے، کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا ہے، کچھ بھی ہوسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جعلی ڈگریوں کے معاملے نے ہمارے پورے تعلیمی نظام کو ہی مشتبہ بنا دیا ہے، روزانہ بڑے بڑے لیڈروں، ڈاکٹروں، وکیلوں اور اسی طرح کے دوسرے لوگوں کے نام اِس حوالے سے منظر عام پر آرہے ہیں، جس سے مستقبل کی نسل پر اِس جعلسازی کے جو منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں وہ آگے چل کر بہت تباہ کن ہوں گے، کیا اِس سوال کا جواب کسی کے پاس ہے کہ اِس سے دنیا میں پاکستانی معاشرے کے بارے میں جو تاثر پیدا ہو رہا ہے اور عالمی سطح پر ہماری جو

تصویر ابھر کر سامنے آ رہی ہے، اُسے ہم کس طرح ٹھیک کریں گے اور اِس کے نقصانات کی تلافی کیسے ہوگی؟

یہ درست ہے کہ تعلیمی ادارے سرکاری ہوں یا پرائیویٹ، زیادہ پیسے لے کر جعلی ڈگریاں جاری کرتے ہیں اور انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں، لیکن سب زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ جن لوگوں پر اِس صورتحال کی اصلاح کا فریضہ عائد ہوتا ہے وہ خود جعلی ڈگریوں سے اپنا کام چلا رہے ہیں اور وہ اِس کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو دبانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے تعلیم کے چیئرمین عابد شیر علی کے بقول یہ لوگ اِس مسئلہ کے حل کے لئے ہونے والے سارے عمل کو سبوتاژ کرنا چاہتے ہیں اور ایسے لوگوں کا تعلق تمام پارٹیوں سے ہے۔ اَمر واقعہ یہ ہے کہ جعلی ڈگری کے حوالے سے ذرائع ابلاغ میں شروع ہونے والی بحث نے مجموعی طور پر ارکان اسمبلی کی اخلاقی ساکھ کو بری طرح مجروح کیا ہے۔ گزشتہ دنوں پنجاب اسمبلی کا مجموعی طرز عمل اِس اَمر کا عکاس ہے کہ عوامی غیر مقبولیت کی آنچ نے انہیں تکلیف دینی شروع کر دی۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ کے خلاف اصل شکایت پاکستان پیپلزپارٹی کی قیادت کو تھی جو آزاد عدلیہ اور آزاد ذرائع ابلاغ کو جمہوریت کے خلاف سازش

قرار دے رہی تھی اور خود مسلم لیگ (ن) آزاد عدلیہ اور ذرائع ابلاغ کی آزادی کی حمایت کر رہی تھی، لیکن پیپلز پارٹی نے ذرائع ابلاغ سے شاکی ہونے کے باوجود میڈیا کے خلاف محاذ نہیں کھولا، یہ کام کیا بھی تو مسلم لیگ (ن) نے۔اِس طرح پنجاب اسمبلی نے قانون ساز اداروں میں اُن "جعلسازوں" کی موجودگی کی حمایت کی، جن پر خود اپنی اخلاقی ساکھ برقرار رکھنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

دنیا میں تعلیم یافتہ، مہذب اور آزاد معاشروں میں یہ روایت ہوتی ہے کہ وہاں پر ہر اُس عمل کے خلاف احتجاج کیا جاتا ہے جو معاشرے، قوم اور ملک کیلئے بدنامی کا سبب ہوں، بالخصوص جمہوری معاشروں میں اِس قسم کے اقدامات کو گناہ کبیرہ تصور کیا جاتا ہے جس میں جمہوریت کے نام پر حکمران یا سیاستدان ایسے اقدامات اٹھائیں جس سے جمہوریت کا سر شرم سے جھک جائے، 9 جولائی کو پنجاب اسمبلی میں میڈیا کے خلاف قرارداد ایک ایسے موقع پر پاس کی گئی جب ملک بھر میں سیاستدانوں کی جعلی ڈگریوں کا شور برپا ہے، آئے دن کسی نہ کسی معزز رکن قومی یا صوبائی اسمبلی کی شرافت سے پردہ اٹھ جاتا ہے اور سربازار رسوائی اُس کا مقدر بن جاتی ہے، قابل افسوس بات یہ ہے کہ جمہوریت کی مالا جپنے والے حکمران اور اُن کے ساتھی اراکین اپنے خلاف شائع مواد پر اِس قدر سیخ پا ہوگئے کہ آئینہ دکھانے پر انہیں اتنا غصہ آتا ہے کہ اپنا چہرہ صاف کرنے

کی بجائے آئینے کو توڑنے کیلئے سنگ باری پر اتر آتے ہیں، جسے چوری اور پھر سینہ زوری کہتے ہیں۔

درحقیقت ہمارے سیاستدان اِس محاورے کے مصداق بن چکے ہیں اور بجائے اِس کے کہ اُن کی طرف سے ندامت اور شرمندگی کا اظہار سامنے آتا، ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی پر مبنی رویہ سامنے آرہا ہے جو ملک کے لئے کسی طور بھی نیک شگون نہیں ہے، چونکہ اِن لوگوں کا تعلق بااثر خاندانوں سے ہے اور انہیں پاکستان کی رولنگ کلاس سمجھا جاتا ہے اِس لئے یہ خود کو ہر قسم کے احتساب سے مبرا سمجھتے ہیں اور اِس حوالے سے اُن میں شدید غم و غصہ پایا جاتا ہے کہ اُن کی ڈگریوں کو کیوں چیک کرایا جارہا ہے، صورتحال یہ ہوچکی ہے کہ جس کی چوری پکڑی جاتی ہے وہ بجائے نادم اور شرمسار ہونے کے عدلیہ اور صحافیوں پر تنقید کرنے لگتا ہے اور سارے معاملے کو ایک سازش قرار دے ڈالتا ہے۔

یہی وہ رویہ ہے جس کی نشاندہی کرتے ہوئے پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "تم سے پہلے والی امتیں اِس لئے تباہ ہوئیں کہ جب اُن کا کوئی معزز فرد جرم کرتا تھا تو اُس کے جرم سے صرف نظر کرلیا جاتا تھا اور جب کوئی معمولی آدمی جرم کرتا تھا تو اُسے سزا دی جاتی تھی۔" درحقیقت من حیث القوم ہم اخلاقی تباہی کے اُس مقام پر پہنچ چکے ہیں جس کے آگے کنواں

اور پیچھے گہری کھائی ہے، غضب خدا کا، ہماری اخلاقی باختگی کا یہ مقام بھی آنا تھا کہ ہم یہ خبر سن رہے ہیں کہ ہائر ایجوکیشن کمیشن نے قومی و صوبائی اسمبلیوں اور سینٹ کے ارکان کی ڈگریوں کو باضابطہ جعلی قرار دے دیا ہے، ابھی مزید ڈگریوں کی تصدیق کا 23 عمل جاری ہے جس کے بعد خدشہ ہے کہ ایسی ڈگریوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ سکتی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ وہ نقشہ بن چکا ہے جس کی طرف اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اشارہ فرمایا تھا، درحقیقت ہم ایک بڑی تباہی کی طرف بڑھ رہے ہیں اور جس انارکی کی جانب اہل علم اشارہ کر رہے تھے وہ وقوع پذیر ہو چکی ہے، بات صرف اتنی سی ہے کہ اِسے دیکھنے کے لئے دیدہ بینا چاہیے، اِس وقت نیچے سے لے کر اوپر تک ہر شخص من مانی کر رہا ہے، ہر طرف ہاہاکار مچی ہوئی ہے، اِس صوت حال پر جب میڈیا چیخ و پکار کرتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی حدود سے تجاوز کر رہا ہے، عدالتیں فعالیت کا مظاہرہ کرتی ہیں تو اُن کے بارے میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی حدود سے تجاوز کر رہی ہیں، جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ جج، جرنیل اور جرنلسٹس تو اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داریوں کی ادائیگی میں مصروف ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ سیاستدان بھی اپنی اُن ذمہ داریوں کو ادائیگی پر توجہ دیں جو قوم نے انہیں ووٹ دے کر سونپی ہے۔

قارئین محترم ہمارا ماننا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہمارے سیاستدانوں کے اپنے کرموں کا پھل ہے، یہ وہ کھلواڑ ہے جو وہ اپنے ملک کے ساتھ گزشتہ 63 برسوں سے کر رہے ہیں اور جسے اب کوئی بھی دیکھنا پسند نہیں کرتا، یہ سارا منظر نامہ اب اِس حد تک نا قابل برداشت ہوچکا ہے کہ ایک عام آدمی بھی اِس سے شدید کوفت اور بیزاری محسوس کر رہا ہے، واضح رہے کہ یہی میڈیا اُس وقت سیاستدانوں کو بہت بھلا لگتا تھا جب وہ مشرف حکومت کو آڑے ہاتھوں لے رہا تھا، اب چونکہ یہ لوگ خود حکومت میں ہیں اور جعلی ڈگریوں سمیت کئی طرح کے سکینڈل سامنے آرہے ہیں، اِس لئے جو لوگ اِس سے متاثر ہو رہے ہیں، اُن کی خواہش ہے کہ میڈیا ایسے معاملات کو نہ اچھالے۔

سچائی یہ ہے کہ لوگ اپنے کردار پر غور نہیں کرتے، جن لوگوں کے خلاف ثابت ہو جاتا ہے کہ انہوں نے جعلی ڈگریاں بنوا کر الیکشن لڑا وہ اِس پر اظہار ندامت کرنے کے بجائے ڈھٹائی سے اپنے اِس عمل کا دفاع کرتے ہیں، کچھ کو عدلیہ سے شکایت ہے تو کچھ کو میڈیا سے، لیکن کوئی بھی اپنے گریبان میں جھانکنے کو تیار نہیں ہے، بالعموم پورے معاشرے کا چلن یہی ہے، لوگ اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہی نہیں، ندامت کا اظہار تو بہت دور کی بات ہے، حالیہ مہینوں میں سیاستدانوں کے حوالے سے کیسے کیسے راز افشا نہیں ہوئے، بڑے بڑے نیک نام لوگوں کے سکینڈل سامنے آئے لیکن بجائے یہ تسلیم کرنے کے کہ اُن سے غلطی

سرزد ہوئی، وہ یا تو عدلیہ کو برا بھلا کہتے ہیں یا پھر صحافیوں پر دشنام طرازی شروع کر دیتے ہیں، اِس تناظر میں سب سے زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے گریبان میں جھانکنے اور خود احتسابی کی ضرورت نہیں محسوس کرتے، یہی وہ بنیادی عوامل ہیں جو آج ہمارے اخلاقی زوال اور معاشرتی انحطاط کی وجہ بنے ہوئے ہیں۔

ابھی بھی وقت ہے۔۔۔۔

نفرت، بغاوت اور احساس محرومی کی آگ میں جلتا ہوا پاکستان کا سب سے بڑا اور کل رقبے کے 48 فیصد پر محیط، ملک کی صرف 4 فیصد آبادی والا صوبہ بلوچستان اِس وقت آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہے اور ہر آنے والے دن کے ساتھ قومی وحدت سے دوری کی گہری ہوتی ہوئی خلیج بلوچستان کو ہم دور لئے جا رہی ہے۔ گزشتہ دنوں بلوچستان نیشنل پارٹی کے مرکزی سیکریٹری جنرل اور سابق سینیٹر حبیب جالب بلوچ کے قتل نے بلوچستان کو ہی نہیں، پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اِس المیے کے منصوبہ ساز یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ اُن کا ہدف ایک فرد نہیں بلکہ پاکستان کی سالمیت اور یکجہتی ہے، حبیب جالب بلوچ کے قتل سے چار روز قبل نیشنل پارٹی کے سینئر رہنما مولا بخش دشتی کی شہادت کے سوگ میں ڈوبے ہوئے بلوچوں سمیت ملک بھر کے صاحبان دل پر یہ خبر بجلی بن کر گری اور بلوچستان کے مختلف علاقوں کے سمیت کراچی اور دوسرے مقامات پر نظر آنے والا احتجاجی ردعمل، جلاؤ گھیراؤ، توڑ پھوڑ، پتھراؤ، شاہراہوں کی بندش، تعلیمی اداروں میں سوگ، تجارتی مراکز میں ہڑتال اور اشتعال کے مظاہرے دکھ کی اُس کیفیت کے مظہر ہیں جس سے بلوچ عوام اور اُن سے محبت کرنے والے آج دوسرے پاکستانی دوچار ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ جب بھی بلوچستان میں حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، وہاں کوئی نہ کوئی ایسا دل ہلا دینے والا واقعہ رونما ہو جاتا ہے جس سے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کا عمل ضائع ہو کر رہ جاتا ہے۔ گزشتہ چھ عشروں سے جاری آپریشنوں اور مقامی روایات سے انحراف کے اثرات صوبے کے لوگوں کے اپنے ہی وسائل سے محرومی کے احساس کے ساتھ مل کر شدید تر ہوتے رہے ہیں۔ نواب اکبر بگٹی کی شہادت کا زخم ایسا کاری ہے جس کے اندمال کے لئے بہت کچھ کرنے کی ضرورت تھی۔ پچھلے برس تین رہنماؤں غلام محمد بلوچ، شیر محمد بلوچ اور لالہ منیر کے تربت میں قتل کے واقعے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ گو کہ پیپلز پارٹی کے شریک چیئرمین جناب آصف علی زرداری نے 18 فروری 2008ء کے انتخابات کے بعد صوبے کے عوام سے وفاق کی طرف سے ماضی میں کی گئی زیادتیوں کی جو معافی مانگی، اُس کا قوم پرست کہلانے والے حلقوں کی طرف سے مثبت جواب آیا تھا، مگر بعد میں ٹارگٹ کلنگ سمیت جو واقعات رونما ہوتے رہے، اُن سے حالات مزید بگاڑ کی طرف جاتے نظر آ رہے ہیں۔ مغربی ممالک کے تھنک ٹینکس بعض منصوبوں اور وزیر داخلہ رحمٰن ملک کی جانب سے بعض غیر ملکی طاقتوں کے ایجنڈے کے تذکروں کے باوجود اِس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ صوبے میں ٹارگٹ کلنگ کا ایک ایسا سلسلہ جاری ہے جس سے اساتذہ، ڈاکٹر، رینجرز، سرکاری اہلکار، آباد کار اور مقامی محنت کشوں سمیت کوئی بھی محفوظ نہیں ہے، جبکہ عوامی مقبولیت کے حامل سیاستدانوں کا قتل صوبے کے موجودہ حالات کے ایک خاص سمت کی طرف لے

جائے جانے کا اشارہ بھی کرتا ہے۔

اس حوالے سے 18 اکتوبر 2009ء کو دی نیوز کراچی کی اشاعت میں دل ہلا دینے والی رپورٹ قابل توجہ ہے، جس کے مطابق بلوچ اسٹوڈنٹ آرگنائزیشن پاکستان سے آزادی کی تحریک شروع کر چکی ہے، مذکورہ تحریک کی خاص بات یہ ہے کہ اِس میں خواتین بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہیں، رپورٹ کے مطابق خواتین میں پاکستان کی قومی سلامتی سے متعلق ادارے کے خلاف مردوں سے بھی زیادہ شدید جذبات پائے جاتے ہیں، جبکہ بلوچ نوجوانوں میں پنجابیوں اور اردو بولنے والوں کے خلاف جذبات عروج پر ہیں، یہی وجہ ہے کہ آپ کو کراچی سے کوئٹہ جانے والی شاہراہ اور مستونگ اور قلات کی درو دیوار پر جگہ جگہ پاکستان مخالف نعرے لکھے نظر آئیں گے، حال یہ ہے کہ بلوچستان میں قومی ترانہ پڑھنے، پاکستانی پرچم لہرانے پر دھمکیوں کے باعث پابندی ہے، مطالعہ پاکستان کے نصاب سے نکالنے کے مطالبے ہو رہے ہیں، کوئٹہ میں گوادر، خضدار اور حب نیز چمن اور قلات سے لیکر نصیر آباد، اوستہ محمد تک آتش و آہن کا دور دورہ ہے۔

آج سینئر بلوچ رہنما دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر بلوچستان میں ریفرنڈم کرایا جائے تو 90 فیصد لوگ پاکستان سے علیحدگی کے حق میں رائے دیں گے، دی نیوز میں شائع ہونے والی رپورٹ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ اب تک بلوچستان سے 50 ہزار

غیر بلوچی خاندان نقل مکانی کر چکے ہیں اور 22 ہزار سے زائد سرکاری ملازمین نے بلوچستان سے باہر ٹرانسفر کی درخواستیں دے چکے ہیں، بلوچستان یونیورسٹی کے متعدد اساتذہ اپنا ٹرانسفر کرا چکے ہیں، جبکہ 120 اساتذہ کی ایسی ہی درخواستیں احکامات کی منتظر ہیں۔اِس صورت حال کی وجہ سے بلوچستان کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں اساتذہ کی شدید قلت پیدا ہو گئی ہے اور بہت سے ادارے بند ہو گئے ہیں، رپورٹ کے مطابق بلوچوں میں غیر بلوچوں پر بداعتمادی اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ عام لوگوں کو بھی شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور انہیں پنجابی اسٹیبلشمنٹ کا حصہ تصور کیا جاتا ہے۔

اِن حالات میں معتدل آوازیں غیر موثر اور غیر متعلق ہوتی جا رہی ہیں، بہت سے بلوچ رہنما سمجھتے ہیں کہ مسئلے کا زیادہ سے زیادہ حل صوبائی خودمختاری ہے، گو کہ اس رپورٹ کو مبالغہ آمیز کہا جا رہا ہے، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ یہ رپورٹ ملک کی وحدت و سلامتی کے حوالے سے بین الاقوامی قوتوں کے خطرناک عزائم کی نشاندہی کر رہی ہے، حقیقت یہ ہے کہ بلوچستان بین الاقوامی توجہ کا اس لئے مرکز ہے کہ بلوچستان میں معدنی دولت کی فراوانی ہے اور اِس کی زمین میں پوشیدہ خزانوں کے ساتھ ساتھ یورینیم جیسے معدنی دولت بھی موجود ہیں، بلوچستان کی زمین کے نیچے بہنے والے سیال سونے کی صرف ایک ذیلی پیداوار وہ گیس ہے جس پر وطن عزیز کے بیشتر کارخانوں کا انحصار ہے اور جس کی بدولت

ہماری بستیوں کے گھروں میں چولہے جل رہے ہیں، بلوچستان میں چین کی مدد سے تیار کردہ گوادر پورٹ کو ملکی معیشت میں انتہائی اہمیت حاصل ہے، جبکہ اِس کی جغرافیائی اہمیت کے پیش نظر پاکستان دشمن طاقتوں پر خوف اور سراسیمگی کی کیفیت طاری ہے۔

گوادر پورٹ نے بحیرہ عرب کے تین ساحلوں کو اپنے قریب کردیا ہے،اِس کی اسی اہمیت کے پیش نظر عالمی سطح پر امریکی ایماء پر اِس طرح کی منصوبہ بندی کی جارہی ہے کہ بلوچستان کو پاکستان سے الگ کرکے اسے عملی اعتبار سے امریکا کی بالادستی میں دے دیا جائے،دراصل بلوچستان کو پاکستان سے کاٹ کر امریکی تحویل میں دینااُس عظیم عالمی سیاسی کھیل کا حصہ ہے جسے گلوبلائزیشن (Globalization) کے ماہر اور متعدد کتابوں کے مصنف پیپ سکوبار Escobar Pep نے تفصیل کے ساتھ طشت ازبام کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ بلوچستان کو جغرافیائی لحاظ سے وسط ایشیاء میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے اور اسی وجہ سے امریکہ و بھارت کا اصل نشانہ بلوچستان ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ بلوچستان عالمی سازش کے نرغے میں گھرا ہوا ہے،معدنی دولت سے مالا مال اِس خطے میں جب سے پاکستان اور چین نے مل کر دلچسپی لینی شروع کی ہے،تب سے یہاں کے حالات بہت خراب ہیں، بعض عالمی سازشی قوتیں نہیں چاہتیں

کہ گوادر اور بلوچستان کے دیگر میگا پراجیکٹس میں چین کوئی سرگرم کردار ادا کرے۔اس لئے وہاں ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے ہیں جن سے نہ صرف بلوچوں کا غم و غصہ بڑھ رہا ہے بلکہ میگا پراجیکٹس بھی بہت بری طرح متاثر ہو رہے ہیں، یہ اس قدر نازک معاملہ ہے کہ حکومت پاکستان کو اسے پہلی ترجیح کے طور پر لینا چاہیے، کیونکہ بلوچستان کے ساتھ پاکستان کا مستقبل جڑا ہوا ہے۔اس صوبے کے معدنی وسائل پاکستان کو ایشین ٹائیگر بنا سکتے ہیں لیکن حکمرانوں کو پاکستان کو ایشین ٹائیگر بنانے سے کوئی دلچسپی نہیں،اُن کی ساری توجہ یا تو آئی ایم ایف سے قرضے حاصل کرنے یا آئی ایم ایف کی شرائط پورا کرنے پر پر مرکوز رہتی ہے،پاکستان کو خود کفالت کی منزل سے کیسے ہمکنار کرنا ہے یہ ہمارے حکمرانوں کا مقصد نہیں۔

یہاں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ بلوچستان کا مسئلہ آئینی اور سیاسی ہے جسے طاقت کے زور پر حل کرنے کا سابق آمر پرویز مشرف کا طریقہ کار درست تھا نہ ماضی کے حکمرانوں کی فوج کشی کا، صدر آصف علی زرداری نے تو بھٹو دور میں ہونے والی فوج کشی پر بلوچ عوام سے معافی طلب کی ہے،تاہم ساٹھ برس میں لگائے جانے والے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے عملی اقدامات بشمول مجوزہ آئینی پیکیج،لاپتہ افراد کی تلاش، سیاسی قیدیوں کی رہائی، صوبائی خود مختاری، قومی وسائل، سرکاری ملازمتوں اور فورسز میں بلوچستان کی نمائندگی کا

تناسب بڑھانے کا معاملہ تاخیر کا شکار ہے۔
ایسے وقت میں جب بلوچستان کے زخموں پر مرہم رکھنے اور صوبہ سرحد میں اٹھنے والی شورشوں کی آگ بجھانے کے لئے تمام طبقوں، حلقوں اور قوتوں کے مل جل کر کام کرنے کی ضرورت بہت بڑھ چکی ہے، ذمہ دار حلقے اندرونی محاذ آرائی پر اپنی توانائیاں صرف کرنے اور سیاسی بیان بازی کے علاوہ کچھ نہیں کر رہے، ایک طرف وزیرستان میں حالات پہلے ہی مخدوش ہیں، دوسری طرف بلوچستان میں احتجاج کی ایک شدید لہر دیکھنے میں آرہی ہے، امریکا اپنی عالمی جنگ کے حوالے سے سرحد اور بلوچستان کے حالات سے فائدہ اٹھانے کے لیے سرگرم ہے، جبکہ بلوچستان سے ہمدردی رکھنے والے آئینی موشگافیوں میں الجھ کر بلوچوں کو ایک ایسی بند گلی کی طرف دھکیلنے میں مصروف ہیں جہاں سے واپسی ممکن نہ ہو۔
اس تناظر میں حبیب جالب بلوچ جیسی دلیل کی قوت سے اپنے مؤقف کی پیروی کرنے والی شخصیات کے اٹھ جانے سے اُن انتہا پسندوں اور علیحدگی پسند عناصر کو تقویت ملنے کا امکانات اور بھی بڑھ جاتے ہیں، جن کی راہ میں علم و آگہی کی بصیرت رکھنے والے اعتدال پسند رہنما دیوار بنے رہتے ہیں، حبیب جالب کی شہادت کو وفاقی و صوبائی حکومتوں اور قومی سیاسی جماعتوں کو خطرے کی گھنٹی سمجھنا چاہئے، مجرموں کی گرفتاری کی ہدایات، لوگوں کو صبر کی تلقین اور جعلی

گرفتاریوں کا سہارا لیکر اِس قربانی کو ضائع کرنا قوم کو نا قابل تلافی نقصان کی طرف لے جاسکتا ہے، مرکز اور بلوچستان کی حکومتوں کو فوری طور پر اِس سانحے کے ممکنہ اثرات کا اس طرح جائزہ ہوگا جس سے قوم کو محسوس ہو کہ ہماری وفاقی و صوبائی حکومتیں اور سیاسی و مذہبی جماعتیں لوگوں میں پائی جانے والی تشویش اور اُس کے اسباب کا ادراک اور حل رکھتی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ حبیب جالب بلوچ کی شہادت سے بلوچستان کی حقیقی قوم پرست سیاست کا ایک اور باب بند ہوا ہے، نواب اکبر بگٹی جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ بلوچ رہنما کے بعد ایک اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نڈر بلوچ رہنما کا قتل بھی اُسی ٹارگٹ کلنگ کا شاخسانہ ہے جس کا سلسلہ ایک عرصے سے بلوچستان میں جاری ہے۔

بلوچستان نیشنل پارٹی کے بانی عطاء اللہ مینگل کی بات قابل توجہ ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ " ہمارے لوگوں کو ایک ایک کرکے مارا جارہا ہے وہ اپنی طرف سے سب کو دھکا دے کر اُس مقام پر لیجانا چاہ رہے ہیں جہاں سے واپسی ناممکن ہو، مگر ہمارے پاؤں اُس طرف نہیں اٹھ رہے، لیکن اِن قدموں کو ہم کب تک روکیں گے ؟ عطاء اللہ مینگل نے ایک اور بات اور کہی جو بہت معنی خیز ہے،اُن کا کہنا تھا کہ ملک جب تک باہر کی دنیا نہ چاہے نہیں ٹوٹتے اور نہ بنتے ہیں ۔" قارئین محترم عطاء اللہ مینگل ہوں یا دیگر بلوچ عمائدین بلا شبہ وہ زخم خوردہ اور غمزدہ ہیں،اِس مرحلے پر جہاں اُن کو اعتماد میں لینا بہت

ضروری ہے وہیں اُن کی باتیں ارباب اقتدار کو دعوت غور و فکر بھی دے رہی ہیں۔
ہمیں یہ بات کہنے میں کوئی عار نہیں کہ حبیب جالب بلوچ کی شہادت نے بلوچستان کے منظر نامے کو یکسر تبدیل کردیا ہے اور نیشنل پارٹی کے رہنما سابق ضلعی ناظم مولا بخش دشتی اور بلوچستان نیشنل پارٹی کے مرکزی سیکریٹری جنرل حبیب جالب بلوچ کا قتل بلوچستان کی نازک اور سنگین صورتحال کی عکاسی کررہا ہے، سابق فوجی آمر جنرل (ر) پرویز مشرف نے بلوچستان کے رہنما، سابق وزیراعلیٰ، گورنر اور وفاقی وزیر اکبر بگٹی کو میزائل حملوں کے ذریعے قتل کرکے بلوچستان میں جو آگ لگائی تھی وہ پھیل کر آتش فشاں کا روپ دھار چکی ہے، دوسری طرف حکومتی رٹ کے نام پر ارباب اقتدار بلوچوں کو ایسے راستے پر دھکیلنے کی کوشش کررہے ہیں، جہاں سے اُن کی واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔
ابھی بھی وقت ہے کہ عطاء اللہ مینگل، نواب خیر بخش مری، جنرل عبدالقادر بلوچ، محمود خان اچکزئی جیسے بلوچ رہنما جو پاکستانی آئین و قانون کے اندر رہتے ہوئے حقوق کے حصول کی کوششوں پر یقین رکھتے ہیں کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ڈائیلاگ کا آغاز کیا جائے اور بااختیار افراد اور ادارے تساہل و سست روی کی روش ترک کرکے بلوچستان کے مسئلے پر "وعدے نہیں عمل" کی حکمت عملی اختیار کرکے دشمن کے عزائم کو ناکام بنانے کیلئے سیاسی بنیادوں پر

بلوچستان کے مسئلے کا حل تلاش کریں۔یاد رکھیں کہ حالات و واقعات کی رفتار تیز ہے اور عمل کی مہلت بہت ہی کم ہے۔آنے والے دنوں میں بلوچستان کا سیاسی منظر نامہ کیا ہوگا یہ حکومت اور سیاسی جماعتوں کے رویوں پر منحصر ہے۔ہمارا ماننا ہے کہ پارلیمانی سیاست کی حامی قوتوں کا اشتراک عمل ہی ناراض بلوچ قوم پرستوں سے مذاکرات کی مضبوط بنیاد بن سکتا ہے اور قومی وحدت کو متحد رکھ سکتا ہے۔

قومی مفاد اور پاک افغان تجارتی معاہدہ

پاک افغان ٹریڈ ایگریمنٹ خدشات اور مضمرات

چانکیائی سیاست کے اصول "کہو کچھ کرو کچھ" کا عملی اطلاق اگر دیکھنا ہو تو ہماری موجودہ حکومت کا طرز عمل اِس کی بہترین مثال ہے، جمہوریت، آئینی اقدار، قانون کی حکمرانی اور پارلیمنٹ کی بالادستی کی دعویدار حکومت نے برسر اقتدار آنے کے بعد سے لے کر اب تک یہی کچھ کیا ہے، یعنی کہا کچھ ہے اور کرا کچھ ہے،اور جہاں پھنس گئے، فوراً اپنے سابقہ بیان سے مکر گئے، چند دن پہلے تک حکومتی ذمہ داران بڑی شدت کے ساتھ یہ دعویٰ کر رہے تھے کہ پاکستان کے راستے بھارت کو تجارتی راہداری نہیں دی جائے گی، کیونکہ یہ پاکستان کے مفاد میں نہیں ہے، لیکن سب نے دیکھا کہ وفاقی وزیر تجارت مخدوم امین فہیم عوامی دباؤ پر اپنے سابقہ بیان "بھارتی سامان واہگہ باڈر سے افغان ٹرکوں میں افغانستان جائے گا" سے مکرتے اور یہ کہتے پائے گئے کہ "بھارتی سامان افغانستان لے جانے کی اجازت نہیں ہوگی بلکہ افغانستان سے سامان واہگہ کے راستے بھارت جائے گا۔"

ابھی مخدوم امین فہیم کے دونوں بیانات کی سیاہی بھی خشک نہیں ہونے پائی تھی کہ وزارت تجارت کی جانب سے ایک اور بیان جاری کیا گیا جس میں کہا گیا کہ "پاک افغان ٹرانزٹ ٹریڈ معاہدے پر میڈیا میں خبریں بے بنیاد ہیں، ابھی پاک افغان ٹرانزٹ ٹریڈ معاہدے پر دستخط نہیں ہوئے، پہلے تمام قانونی تقاضے پورے کئے جانے کے بعد دستخط کئے جائیں گے اور افغان ٹرکوں کے لیے روٹ کا تعین بھی بعد میں کیا جائے، بیان میں یہ وضاحت بھی کی گئی کہ واہگہ بارڈر کے ذریعے افغانستان کو بھارتی برآمدات کی اجازت نہیں دی جائے گی۔" لیکن بیانات کے گورکھ دھندے میں الجھا ذہن ابھی بھی وزیر اعظم ہاؤس کے اُس منظر نامے کو سمجھنے سے قاصر ہے جس میں مخدوم امین فہیم اور افغان وزیر تجارت انوارالحق واحدی وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کی موجودگی اور امریکی وزیر خارجہ کی سرپرستی میں اِس معاہدے پر دستخط کرتے نظر آتے ہیں۔

بہر حال حقیقت کیا ہے بہت جلد سامنے آجائے گی مگر ایک بات تو طے ہے کہ امریکی وزیر خارجہ کا دورہ پاکستان شروع ہوتے ہی بھارت کا وہ دیرینہ خواب پورا ہو گیا جس کیلئے وہ گزشتہ 45 سال سے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، بھارت کی عرصہ دراز سے خواہش تھی کہ اُسے واہگہ اور تورخم کے راستے اپنی برآمدات افغانستان اور اُس سے آگے وسطی ایشیائی ممالک تک پہنچانے کی اجازت دی جائے، مگر چونکہ اِس اجازت کے نتیجے میں نہ صرف پاکستان کے تجارتی مفادات متاثر

ہوتے بلکہ پاکستان کی سلامتی کو بھی خطرات لاحق ہو سکتے ہیں، اِس لئے ماضی کی ہر حکومت نے اِس اجازت سے اجتناب برتا، لیکن 18 جولائی 2010ء کو امریکی دباؤ کے تحت بھارت نے وہ سب کچھ حاصل کرلیا جس کا خواب وہ طویل عرصہ سے دیکھ رہا تھا، یوں پاکستان اور افغانستان کے مابین اتوار کو ایک وسیع البنیاد مفاہمتی دستاویز پر دستخط ہوئے، جسکی رو سے بھارت کو واہگہ کے راستے افغانستان کیلئے برآمدات کی بالواسطہ اجازت مل گئی ہے اور اُسے افغانستان تک اپنے سامان کی نقل وحمل کیلئے پاکستان کے فضائی اور سمندری راستے استعمال کرنے کا حق بھی دے دیا گیا ہے، جس کا اصل فائدہ امریکہ کے گٹھ جوڑ سے بھارت اور افغانستان اٹھائے گا۔

باخبر حلقوں کے مطابق مفاہمتی دستاویز جسے بہت جلد قانونی تقاضے پورے کرنے کے بعد باقاعدہ معاہدے کی شکل دے دی جائے گی کے تحت افغانستان کا برآمدی سامان لے جانے والے ٹرکوں کو واہگہ اور پاکستانی بندرگاہوں تک طے شدہ روٹس کے ذریعے جانے کی اجازت ہوگی، معاہدہ کی رو سے پاکستان نے افغانستان کو اپنی سمندری حدود کے علاوہ فضائی حدود حتیٰ کہ زمینی راستے سے بھی بھارتی برآمدات منگوانے کی اجازت دے دی ہے، خود وفاقی وزیر تجارت امین فہیم نے دستاویز پر دستخط کے بعد بتایا کہ افغان تجارتی سامان کو کراچی سے لے کر افغانستان کی سرحد تک ترسیل کیلئے راہداری دی جائے گی جبکہ لاہور کے قریب

واہگہ بارڈر سے تجارتی سامان کو افغان ٹرکوں پر لاد کر افغانستان بھیجا جاسکے گا۔
افغانستان کا برآمدی سامان جس میں زیادہ تر خشک اور تازہ پھل شامل ہیں پہلے ہی پاکستانی شاہراہوں سے گزر کر واہگہ کے راستے بھارت جا رہا ہے۔
اِس تناظر میں وہاں سے کوئی نئی اشیاء کی تجارت کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں، البتہ اِس سے سمگلنگ میں غیر معمولی اضافے کا امکان ہے، جس سے پاکستان کی معیشت کو نقصان پہنچے گا۔ افغان ٹرانسپورٹ گاڑیاں واپسی میں پاکستانی مصنوعات اور اشیاء افغانستان لے جائینگی، جس سے پاکستانی ٹرانسپورٹروں اور کنٹینر مالکان کو بھی نقصان پہنچے گا۔ اسی وجہ سے عوامی اور تجارتی حلقوں نے نئے پاک افغان ٹریڈ ایگریمنٹ پر شدید ردعمل کا اظہار کیا ہے اور اِسے پاکستان کے قومی مفادات کے منافی قرار دیا ہے۔ اِن حلقوں کا خیال ہے کہ امریکی وزیر خارجہ کے دورہ پاکستان کا بنیادی مقصد ہی اِس معاہدے کیلئے پاکستان پر دباؤ ڈالنا تھا اور یہ معاہدہ امریکی دباؤ کا نتیجہ ہے جس سے افغانستان کو بہت کچھ ملے گا جبکہ پاکستان کو اِس سے سراسر نقصان ہوگا۔
کچھ حلقوں کا یہ بھی خیال ہے کہ پاکستان نے بھارت کو تجارتی راہ داری دے کر

اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے، حکومت نے یہ معاہدہ کرکے پاکستان کے مفادات کا سودا کر دیا اور پاکستان کو بیچ دیا ہے، مسلم لیگ (ق) کی رکن قومی اسمبلی ماروی میمن کا کہنا ہے کہ حکومت نے ایک مرتبہ پھر وعدہ خلافی کی ہے کیونکہ حکومت نے اِس معاہدے سے متعلق پارلیمنٹ کو اعتماد میں لینے کا وعدہ کیا تھا، مگر ایسا نہیں کیا گیا، انہوں نے کہا کہ امریکی دباؤ کے تحت بھارت کو افغانستان تک رسائی دی جا رہی ہے اِس مسئلہ پر پارلیمنٹ کی بالا دستی مجروح ہوئی ہے، اِن حلقوں کی رائے کے مطابق اب اِس بات میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہ گیا کہ بھارت افغانستان کی سرزمین کو پاکستان کے خلاف تخریب کاری کیلئے استعمال کر رہا ہے تاکہ اِسے غیر مستحکم کیا جائے اور پاکستان اور افغانستان کے مابین ہونے والے تجارتی معاہدے سے بھارت کو اپنے عزائم کی تکمیل میں مدد ملے گی۔

بہر حال اِس معاہدے کے کیا نتائج نکلیں گے اور اِس سے اصل فائدہ کس کو ہوگا، بہت جلد سامنے آجائے گا تاہم اِس موقع پر امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن اور اوباما کے خصوصی ایلچی رچرڈ ہالبروک کی اسلام آباد میں موجودگی بے حد معنی خیز ہے جس سے عوامی و تجارتی حلقوں کا یہ سمجھنا غلط نہیں کہ مذکورہ معاہدہ امریکا کے دباؤ پر ہوا ہے، اِس معاہدے کے دو نہیں تین فریق ہیں یعنی بھارت بھی اِس کا حصہ دار ہے اور یہ کوئی راز نہیں کہ افغانستان پوری طرح

امریکی قبضہ میں ہے اور بھارت امریکہ دوستی عروج پر ہے، چنانچہ دیکھا جائے تو اصل فریق امریکہ ہی ہے، جس طرح سے بات اچانک آگے بڑھی ہے، اُس سے یہ سمجھنا غلط نہ ہوگا کہ اگلے مرحلہ میں زمینی حدود بھی بھارت کے لیے کھول دی جائیں گی، امریکہ کی یہی خواہش ہے اور پاکستانی حکمران امریکی خواہشات کو حرز جان بنانے میں تامل نہیں کرتے، امکان یہی ہے کہ ناٹو کے کنٹینروں کی طرح افغانستان کے ٹرکوں کی بھی تلاشی نہیں لی جائے گی، افغانستان پر قابض ناٹو کی صلیبی افواج کو افغان مجاہدین سے لڑنے کی قوت فراہم آنے کے لیے پاکستان نے اپنے تمام دروازے کھول رکھے ہیں اور ناٹو کے کنٹینروں کی تلاشی ممنوع ہے، چنانچہ کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ ان کنٹینروں کے ذریعہ کیا کچھ افغانستان جاتا رہا ہے اور جارہا ہے۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ افغانستان میں بھارت امریکی تعاون سے مسلسل اپنی موجودگی بڑھا رہاہے اور اُس کے فوجی بھی وہاں موجود ہیں، پاکستان کی سرحدوں کے ساتھ ساتھ بھارت نے اپنے سفارتی مشن قائم کر رکھے ہیں، پاکستانی حکام بار بار یہ کہتے رہے ہیں کہ بھارت افغانستان کی سرزمین کو پاکستان کے خلاف استعمال کر رہاہے، بلوچستان کی شورش کو ہوا دینے میں بھارت ملوث ہے، پاکستان کے اِس دعوے کے جواب میں بھارتی وزیر خارجہ ایس ایم کرشنا اسلام آباد میں یہ کہہ گئے ہیں کہ پاکستان اِس کا ثبوت پیش کرے، یہ بات بھی درست

ہے کہ بلوچستان سے غائب ہوجانے والے بہت سے شر پسند بھارت کی پناہ میں ہیں یا افغانستان میں بیٹھے بھارت کی شہ پر پاکستان کے خلاف کام کر رہے ہیں، اِن میں سے بہت سے ایسے بھی ہیں جن کے بارے میں یہ شور مچایا گیا ہے کہ اُن کو ایجنسیوں نے اٹھا لیا ہے۔ بھارتی وزیر خارجہ ایس ایم کرشنا ایک بلوچ علیحدگی پسند لیڈر براہمداغ بگٹی کے بارے میں یہ کہہ چکے ہیں کہ اگر وہ پاکستانی ہے تو اُس کا بھارتی پاسپورٹ منسوخ کردیا جائے گا، قربان جایئے بھارتی وزیر خارجہ کی اِس سادگی پر، اُن کو یہی نہیں معلوم کہ وہ پاکستانی ہے یا بھارتی؟ جبکہ بھارتی پاسپورٹ جاری کرنے کا مطلب تو یہی ہے کہ بھارت نے اسے اپنا شہری بنا رکھا ہے، ایسے نجانے اور کتنے ہوں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان بھارت کے "بِل" سے کئی بار ڈسا جا چکا ہے لیکن ہمارے حکمران ہر بار اُس "بِل" میں ہاتھ ڈال دیتے ہیں، یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ بھارت پاکستان کو کوئی سہولت فراہم کرنے پر تیار نہیں، اُس نے کشمیر پر نہ صرف یہ کہ ناجائز اور ظالمانہ قبضہ کر رکھا ہے بلکہ گزشتہ 62 سال سے کشمیریوں کا قتل عام بھی کر رہا ہے، اِن حالات میں امن کی آشا کا پرچار کرنے والوں کے سوا کسی کو بھی بھارت سے خیر کی توقع نہیں لیکن اِس کے باوجود پاکستان اُس کے لیے اپنے دروازے کھول رہا ہے اور آغوش وا کر رہا ہے، اِس تجارتی معاہدے کے تحت ایک سوال یہ بھی جنم لیتا ہے کہ بھارت، افغانستان

کو کیا برآمد کرے گا؟ جبکہ افغانستان کے لیے پاکستان سے گزر کر جو سامان جاتا ہے
اُس کا بیشتر حصہ پاکستان ہی کو اسمگل کردیا جاتا ہے، تجارت کے نام پر ایسا سامان
افغانستان بھیجا جاتا ہے جس کی وہاں کوئی ضرورت نہیں، چنانچہ یا تو وہ سامان واپس
آجاتا ہے یا پھر افغانستان جاتا ہی نہیں اور پاکستانی مارکیٹوں میں پہنچ جاتا ہے۔
اِس معاہدے کی ایک شق یہ بھی ہے کہ پاکستان بھی افغانستان کے راستے اپنا مال وسط
ایشیائی ریاستوں تک پہنچاسکے گا۔اِس میں یقیناً پاکستان کا فائدہ ہے لیکن یہ اسی صورت
میں ممکن ہے جب پاکستان اپنا سامان محفوظ طریقے سے افغانستان سے گزار سکے، سوال
یہ ہے کہ کیا افغانستان کے موجودہ حالات میں پاکستان اپنا سامان افغانستان سے گزار
کر وسط ایشیا تک پہنچاسکے گا؟ اور کیا اپنی آزادی کی جنگ لڑنے والے مجاہدین پاکستان کو
صلیبی افواج کا نمائندہ سمجھتے ہوئے تجارتی کارواں پر حملے نہیں کریں گی۔؟
جبکہ حال یہ ہے کہ خود پاکستان کے اندر ناٹو کنٹینرز پر حملے ہو رہے ہیں اور افغانستان
میں امریکی و صلیبی کارواں محفوظ نہیں ہیں،اِس صورتحال میں اندازہ یہی ہے کہ پاکستان
کو فائدہ پہنچے یا نہ پہنچے، بھارت کو پورا پورا فائدہ پہنچایا گیا ہے اور نئے اے ٹی کے تحت
تاریخ میں پہلی بار بھارت کو

پاکستان کی طرف سے افغانستان کے ساتھ تجارت کے لئے سمندری اور فضائی راستے
سے دو طرفہ تجارت کی اجازت دے کر امریکہ کی طرف سے یہ پیغام ہمارے حکام اور
عوامی حکومت کو دیا گیا ہے کہ امریکہ پاکستان میں بھارتی مفادات کی نگرانی کرتا ہے اور
ایسا اُس نے اِس معاہدہ کی دستاویز کی تیاری اور اِس پر دستخطوں کے مرحلوں سے ثابت
بھی کر دیا ہے۔

اِس وقت ملک پہلے ہی دہشت گردی کی آگ میں جل رہا ہے، ساری دنیا جانتی ہے کہ
اِس میں زیادہ تر بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کے تربیت یافتہ دہشت گردوں کا عمل دخل
ہے، جنہیں بھارت پہلے افغانستان بھجواتا تھا، جہاں انہیں بھارت کے مختلف قونصل
خانوں میں تربیت، اسلحہ، بارود اور نقدی فراہم کی جاتی اور پھر انہیں افغانستان کی سرحد
سے ہماری سرزمین میں داخل کر دیا جاتا، حکومت اور خفیہ ایجنسیوں کے پاس "را" کے
تربیت یافتہ اِن دہشت گردوں کی بلوچستان، سرحد اور پنجاب میں مذموم کاروائیوں کے
ثبوت بھی موجود ہیں، اِس صورتحال میں ٹرانزٹ ٹریڈ معاہدے کے تحت بھارتی اشیاء
کو پاکستان کے راستے افغانستان بھجوانے کی سہولت ملے گی تو اسکی آڑ میں بھارتی اسلحہ،
گولہ بارود اور اسکے تربیت یافتہ دہشت گردوں کو بھی اِن اشیاء کے ساتھ براہ راست
پاکستان میں داخل ہونے کی موقع مل جائے گا، اِس طرح یہ معاہدہ جہاں ہماری معیشت
و تجارت کیلئے نقصان دہ ثابت ہوگا وہیں اِس معاہدے کی آڑ میں بھارت کو ہماری
سالمیت

پر کاری ضرب لگانے کا بھی کھلم کھلا موقع ملے گا۔

جبکہ پہلے ہی ماضی کے حکمرانوں کی ہوس اقتدار میں اپنائے گئے اقدامات سے ایک طرف افغانستان میں ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ ہماری محفوظ سرحدیں غیر محفوظ ہوچکی ہیں، اِن حالات میں باوقار اور محب وطن قوموں کا شیوہ یہ نہیں ہوتا کہ جو دشمن اُن کی شہ رگ پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہو اور جس کی سازشوں سے قومی وجود زخموں سے چور چور ہو اُس دشمن کو ایسی سہولیات فراہم کی جائیں کہ جن سے اُس کی معیشت مضبوط ہو اور وہ اپنے مذموم مقاصد کو پایہ تکمیل تک باآسانی پہنچاسکے، یہاں یہ اَمر بھی قابل توجہ ہے کہ بظاہراِس معاہدے میں بھارت کی نمائندگی نہیں مگر یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ امریکی وزیر خارجہ بھارت کے مفادات کا تحفظ کرنے کیلئے کھڑی تھیں، اِس معاہدے کی اندرونی کہانی کیلئے صرف وہی منظر نامہ ہی کافی ہے جس کا زکر پہلے کیا جاچکا ہے۔

سوال یہ ہے کہ امریکی دباؤ میں ہمارے حکمرانوں کو اور کون کون سی حدیں پار کرنا رہ گئی ہیں، ایک ایسا معاملہ جس میں قوم کے ہر فرد کے جذبات شامل ہیں اور جس سے پاکستان کا مستقبل وابستہ ہے کواِس طرح صرف نظر کرنا کسی طور بھی قومی غیرت و مفاد میں نہیں ہے، پوری قوم کیلئے یہ صورتحال انتہائی

تشویشناک ہے کہ منتخب پارلیمنٹ کی موجودگی میں ملک و قوم کی سالمیت سے متعلق اتنے
اہم اور نازک معاملات پر بالا ہی بالا فیصلے کرلیے جائیں اور افغانستان کے ساتھ
راہداری معاہدے کی آڑ میں بھارت کو کھل کر کھیلنے کا موقع فراہم کر دیا جائے۔ لہذا
اِس نازک صورتحال میں ضرورت اِس اَمر کی ہے کہ اِس معاہدے کو پارلیمنٹ میں
بحث کیلئے لایا جائے۔ مشترکہ اجلاس میں اُس پر تمام جماعتوں کے منتخب ارکان پارلیمنٹ
سے سیر حاصل بحث کرائی جائے اور تمام غیر ملکی دباؤ کو مسترد کرتے ہوئے بھارت
کی شمولیت کے ہر پہلو کا جائزہ لے کر ملکی اور قومی مفادات کی روشنی میں ایسا فیصلہ کیا
جائے جس سے پاکستان کی عزت، وقار، سالمیت اور استحکام میں اضافہ ہو۔

بش اور بلیئر جنگی جرائم کے عالمی مجرم۔۔۔۔

کیا چلکاٹ انکوائری بیس لاکھ مسلمانوں کے قاتلوں کو سزا دلواسکے گی۔۔۔۔۔
کہتے ہیں جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، مگر دنیا نے دیکھا کہ جھوٹ پاؤں کے بغیر
زقندیں بھرتا، منزلیں مارتا ہر سو اپنی طاقت غرور اور رعونت کا پھریرا لہراتا ہوا دوڑتا
رہااور سچ اپنی تمام تر سچائی کے باوجود بھی کٹی پتنگ کی مانند ہوا میں ڈولتا رہا، مگر آج
جھوٹ کی پٹاری کھل رہی ہے، دنیا کی آنکھوں سے مکر، فریب، جھوٹ اور عیاری کی
بندھی پٹیاں اتر رہی ہیں،افغانستان و عراق پر جنگ کے حوالے سے سابق امریکی و
برطانوی سربراہوں کے منافقانہ عزائم و گٹھ جوڑ پر مبنی پردے ہولے ہولے سرک رہے
ہیں اور طلوع ہونے والی سچائی ایک نئی تاریخ رقم کرنے جارہی ہے،ایک ایسی تاریخ
جسے برطانیہ کو عراق کے خلاف جنگ کی تباہ کن آگ میں دھکیلنے والے سابق
وزیراعظم ٹونی بلیئر نے برطانوی عوام سے فریب اور دھوکہ دہی کے دبیز پردے میں
چھپانا چاہامگر وہ عراق کی جنگ کے بارے میں چلکاٹ انکوائری میں برطانیہ کی خفیہ
ایجنسی ایم آئی فائیو کی سابقہ سربراہ لیڈی الیزا مننگھم بلر اور جنگ کے دوران اقوام
متحدہ میں برطانوی وفد کے سیکریٹری کارنے راس کی شہادتوں سے روز روشن کی طرح
عیاں ہو گئی ہے، واضح رہے کہ لیڈی الیزا مینگھم بلر 2002ء سے 2007ء تک ایم
آئی

فائیو کی سربراہ تھیں، اُنہی کے دور میں عراق کی جنگ شروع ہوئی تھی، چلکاٹ انکوائری کے سامنے اِن کی شہادت کے دو اہم نکات سامنے آئے ہیں، اوّل عراق کے خلاف جنگ کا جواز پیش کرنے کے لئے انٹیلی جنس کو نہایت بددیانتی سے استعمال کیا گیا، دوسرے یہ کہ اُن کے ادارے ایم آئی فائیو نے خبردار کیا تھا کہ عراق کے خلاف جنگ کے نتیجہ میں القاعدہ کا خطرہ بڑھے گا، اور ایسا ہی ہوا، ایم آئی فائیو کی سابقہ سربراہ نے ٹونی بلیئر کا یہ استدلال یکسر مسترد کر دیا کہ صدام حسین کے پاس وسیع پیمانہ پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار موجود تھے اور اسے دہشت گردوں کے ہاتھ میں جانے سے روکنے کے لئے کاروائی ضروری تھی، چلکاٹ انکوائری کمیشن کے سامنے لیڈی مینئنگھم بلر نے یہ انکشاف بھی کیا کہ 2002ء میں عراق میں وسیع پیمانہ پر تباہی کے اسلحہ کے بارے میں بلیئر حکومت نے جو دستاویز تیار کی تھی ایم آئی فائیو نے اُس میں شامل ہونے سے صاف انکار کر دیا تھا، انہوں نے کمیشن کو یہ بھی بتایا کہ جنگ شروع ہونے سے چھ ماہ پہلے انہوں نے وزارت داخلہ کے سیکریٹری جان گیف کے نام ایک خط میں صاف صاف لکھا تھا کہ برطانیہ کو صدام حسین سے کسی کاروائی کا کوئی خطرہ نہیں۔
ایم آئی فائیو کی سابقہ سربراہ لیڈی مینئنگھم بلر کا کہنا تھا کہ انہوں نے بلیئر حکومت کو خبردار کیا تھا کہ عراق کے خلاف جنگ کے نہایت خطرناک نتائج برآمد ہوں گے اور یہی ہوا، اُن کا کہنا تھا کہ صدام حسین کا تختہ الٹے جانے

کے نتیجہ میں پہلی بار القاعدہ کو عراق میں قدم جمانے کا موقع ملا اور در حقیقت خود ہم نے اسامہ بن لادن کو اُن کا عراقی جہاد پیش کر دیا۔ لیڈی مینگھم بلر نے چلکاٹ انکوائری کو بتایا کہ 2002ء کے اوائل میں اُن کے ادارے نے یہ تجزیہ پیش کیا تھا کہ صدام حسین کے خلاف فوجی کاروائی کی صورت میں برطانیہ میں صدام حسین کے ایجنٹوں سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا البتہ اِس کے دور رس سیاسی مضمرات ہوں گے۔ دوسرے نکتے کے حوالے سے اُن کا کہنا تھا کہ 2003ء میں عراق کے خلاف جنگ کے بعد سے برطانیہ میں دہشت گردی کا خطرہ بڑھ گیا کیونکہ برطانیہ میں مسلمانوں کی نئی نسل کے ایک حصہ میں شدت پسندی میں زبردست اضافہ ہوا جو عراق اور افغانستان کے خلاف جنگ کو اسلام کے خلاف جنگ تصور کرتے ہیں۔ لیڈی مینگھم بلر کا یہ بھی کہنا تھا کہ افغانستان اور عراق کی جنگوں کے نتیجہ میں برطانیہ میں سیکوریٹی سروسز پر زبردست دباؤ بڑھا ہے اور اِس کی وجہ سے ایم آئی فائیو کا بجٹ دوگنا کرنا پڑا۔ افغانستان اور عراق کی جنگ کے دوران اقوام متحدہ میں برطانوی وفد کے سیکریٹری کارنے راس نے انکوائری کے سامنے اپنے بیان میں کہا کہ عراق سے خطرے کے سلسلہ میں مبالغہ سے کام لیا گیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ اقوام متحدہ میں برطانیہ اور امریکہ کے نمائندوں کا یہ تجزیہ تھا کہ عراق کے وسیع پیمانہ پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں سے کوئی بڑا خطرہ لاحق نہیں تھا۔ کارنے راس نے چلکاٹ کمیشن پر زور دیتے ہوئے مطالبہ کیا کہ اِس انکوائری کا مقصد محض سابقہ اقدامات کے نتائج

سے سبق سیکھنا نہیں ہونا چاہئے بلکہ احتساب کا عمل بھی اِس کا اہم حصہ ہونا چاہئے اور
جنگ کا فیصلہ کرنے والی سیاسی قیادت کے خلاف قانونی کاروائی ہونی چاہیے۔
واضح رہے کہ گزشتہ برس ٹونی بلئیر کو سزا دینے کے عوامی مطالبے پر سابق وزیراعظم
گورڈن براون نے ایک سابق سول سرونٹ Jone Chilcot کی سربراہی میں ایک
پانچ رکنی تحقیقاتی انکوائری ٹیم تشکیل دی تھی، جسے Chilcot Inquiry کا نام دیا
گیا،اِس کمیشن کے اراکین نے 15 جون 2009ء کو باقاعدہ سرکاری سطح پر عراق جنگ
کے بارے میں برطانوی کردار کی تفتیش اور یہ انکوائری شروع کی کہ کیا عراق جنگ
میں برطانوی فوج کی شمولیت کا حکومتی فیصلہ غلط تھا یا درست۔؟ اس ٹیم کا کام جولائی
2001ء سے جولائی 2009ء کے درمیانی عرصے میں برطانوی حکومت کے فیصلوں کا
تجزیہ کرنا اور 2003ء میں عراق میں برطانوی مداخلت کی وجوہات جاننا ہے اور عراق
جنگ کے وقت برطانوی وزیر دفاع جیف ہون سمیت کئی دیگر اعلیٰ سیاست دان تفتیشی
کمیشن کے لئے گواہوں کی حیثیت رکھتے ہیں، جان چلکاٹ کے مطابق ان کی سربراہی میں
تفتیشی ٹیم عراق میں برطانوی کردار کی اصل وجوہات کا پتہ لگائے گی، جان چلکاٹ کئی
مرتبہ اِس بات کی یقین دہانی کرواچکے ہیں کہ تفتیشی عمل مکمل طور پر
غیر جانبدار، شفاف اور صاف ہوگا۔" چلکاٹ کے بقول انہیں اِس بات کا بخوبی اندازہ"
ہے کہ برطانوی عوام اِس تفتیش

سے کیا توقعات وابستہ کئے ہوئے ہیں۔

قارئین محترم آپ کو یاد ہوگا کہ 2003ء میں امریکہ ،برطانیہ اور اُس کے اتحادیوں نے عراق پر حملہ کردیا تھا، جس کا مقصد سابق صدر صدام حسین کی حکومت کا تختہ الٹنے کے علاوہ وہاں مبینہ طور پر موجود "وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں" کا سراغ لگانا بھی بتایا گیا تھا،اِس کاروائی میں عراقی صدر صدام کا تختہ الٹ دیا گیا، بعد میں انہیں گرفتار کرکے پھانسی دے دی گئی، عراق کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی، لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا گیا لیکن وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کا آج تک کوئی سراغ نہیں ملا، سابق برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر نے اس وقت کے امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کا بھرپور ساتھ دیتے ہوئے اپنے ملک کے پینتالیس ہزار سے زائد فوجی عراق روانہ کئے اور ایک اندازے کے مطابق عراق جنگ پر ساڑھے آٹھ ارب پاؤنڈ کی خطیر رقم پھونک ڈالی، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ جنگ غیر مقبول ہوتی گئی اور امریکہ کی طرح اِس کے سب سے بڑے اتحادی ملک برطانیہ میں بھی عوام کی اکثریت اِس جنگ کی مخالفت کرتی رہی، یہاں تک کہ برطانیہ میں لیبر پارٹی کے بعض حامی بھی عراق جنگ کی مخالفت کرتے نظر آئے اور عراق پر حملے کے بعد سابق وزیر اعظم ٹونی بلیر کو امریکہ کے سابق صدر بش کے ساتھ ملکر بغداد و کابل پر قبضہ کرنے اور پھر برطانوی فوجیوں کی پے درپے ہلاکتوں پر عوامی غیض و غضب

کا سامنا بھی کرنا پڑا، گو کہ ابتدا میں یورپی باشندوں کا احتجاج کمزور تھا کیونکہ صہیونیت
کے سرمائے کی چھاوں تلے صف بستہ مغربی میڈیا نے زہریلے پروپگنڈے کا سہارا لیکر
القاعدہ اور طالبان کے خلاف جھوٹی استعجاب خیز کہانیوں کی بھرمار سے مغربی لوگوں کے
دلوں پر خوف کے سائے مسلط کر رکھے تھے۔لیکن جوں جوں عراق و افغان جنگ کے
حقائق منکشف ہونے لگے۔برطانوی عوام نے جنگ اور بلیر کے خلاف احتجاجوں اور
ریلیوں کے ریکارڈ قائم کرڈالے اور برطانوی عوام کا غم و غصہ ٹونی بلیر کی 10 ڈاوننگ
سٹریٹ سے بید خلی کا سبب بنا،اِس وقت برطانیہ میں ہزاروں باضمیر انسان ٹونی بلیر کو
انصاف کے کٹھمرے میں لانے اور لاکھوں لوگوں کو ہلاک کرنے کے جرم میں سنگین
سزائیں دلوانے کے لئے صف آراء ہو چکے ہیں،لندن کے سماجی و سیاسی رہنما جارج مون
نے ٹونی بلیر کو جنگی ملزم قرار دلوانے کیلئے انٹرنیٹ پر عطیات جمع کرنے کی مہم شروع
کر رکھی ہے،اُن کا کہنا ہے کہ معصوم عراقیوں کے قتل انبوہ کو فراموش نہیں کیا
جاسکتا،اُنھوں نے اقوام عالم اور برطانوی حکومت سے اپیل کی کہ ٹونی بلیئر کے دوروں
پر پابندی عائد کی جائے اور ٹونی بلیئر کو جنگی ملزم نامزد کرکے عالمی عدالت انصاف کے
حوالے کیا جائے تاکہ انصاف کے تقاضے کے پورے ہوں اور اِس جنگ میں ٹونی بلیر کے
علاوہ جتنے لوگ بھی ملوث ہیں انہیں سزا ملنی چاہیے اور ملزموں کے گلے میں نیور
مبرگ ٹریبونل کی طرز پر مقدمے کا شکنجہ کسا جانا چاہیے۔

گو کہ سابق وزیر اعظم بلیئر اور گورڈن براؤن کے حکومتی وزرا اور مشیر کہتے رہے ہیں کہ عراق جنگ قانونی تھی لیکن برطانوی میڈیا میں یہ سوال آج بھی گردش کر رہا ہے کہ عراق جنگ قانونی تھی یا نہیں۔؟اِس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لئے سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس لارڈ سٹین کی سربراہی میں ڈچ انکوائری کمیٹی تشکیل دی گئی تھی جس نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ جنگ کو بین الاقوامی قوانین کی رو سے جواز حاصل نہیں تھا اور عراق کے متعلق پاس کی جانیوالی UNOکی قرارداد غیر قانونی تھی، واضح رہے کہ نیویارک ٹائمز نے دو سال پہلے یہ خبر شائع کی تھی کہ برطانوی حکومت خود اِس نقطے سے آگاہ تھی کہ عراق جنگ جائز نہیں، مارچ 2003ء میں برطانوی وزارت خارجہ کی جانب سے جاری کردہ ایک پریس ریلیز میں بھی کہا گیا تھا کہ عراق میں ابھی تک کوئی جواز نہیں مل سکا جس کی بنیادوں پر اُسے نشانہ بنایا جائے، یہ بھی درست ہے کہ وزارت خارجہ کی لیگل ایڈوائزر رالی زبیتھ لم شرسٹ نے محض اِس وجہ سے استعفیٰ دے دیا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر وزیر اعظم کو باور کرواتی رہیں کہ عراق پر حملہ جارحیت و وحشت ہوگا جب تک UNO دوسری نئی قرارداد پاس نہ کرے،اِسی طرح جب اسلام دشمن بش اور ٹونی بلیئر نے اقوام متحدہ سے منظوری لئے بغیر ہی 19 مارچ 2003ء کو عراق پر حملہ کیا تو کلیئر شارٹ جو برطانیہ کے وزیر برائے عالمی ترقی تھے، نے بطور احتجاج بلیئر کابینہ سے استعفیٰ دے دیا تھا،انہوں

نے ایک پبلک انکوائری میں بتایا تھا کہ "ٹونی بلیئر کا یہ دعویٰ کہ صدام حسین کا عالمی دہشت گردی سے کوئی تعلق تھا، یکسر جھوٹ تھا۔" کلیئر شارٹ نے ٹونی بلیئر کے اِس دعوے کو بھی احمقانہ قرار دیا تھا کہ "11 ستمبر کے حملوں کے نتیجے میں صدام حسین کے خلاف کاروائی کی ضرورت شدید تر ہو گئی تھی۔" اُن کا کہنا تھا کہ بلیئر نے برطانیہ کو گمراہ، عراق کو زیادہ خطرناک، غیر مستحکم اور شرق اوسط میں القاعدہ کی موجودگی کو فروغ دیا۔" کلیئر شارٹ نے برطانوی حکومت کے قبل از جنگ اُن دعوؤں کی بھی شدید مذمت کی کہ صدام حسین وسیع تباہی کے ہتھیار تیار کر رہا تھا، اُن کے بقول اُس کے پاس ایٹم بم بنانے کے وسائل نہیں تھے، اُن کا یہ بھی کہنا تھا کہ "برطانوی حکومت کے چیف لیگل ایڈوائزر اٹارنی جنرل پیٹر گولڈ سمتھ نے حکومت کو یہ عندیہ دے کر گمراہ کیا تھا کہ عراق پر حملہ عالمی قانون کی خلاف ورزی نہیں، انھوں نے کہا کہ حملے کی منصوبہ بندی میں بعد از حملہ منصوبہ بندی شامل ہی نہیں تھی اور یوں عراق کو ابتری سے دوچار ریاست بنا کر چھوڑا گیا۔"

آج عراق جنگ کے حوالے سے اِس قسم کے متعدد اعترافات بھی سامنے آ چکے ہیں کہ عراق پر امریکی اور برطانوی لشکر کشی ناجائز تھی، خود اِس خونی جنگ کے سرخیل سابق امریکی صدر جارج بش یہ اعتراف کر چکے ہیں کہ عراق پر حملہ غلط انٹیلجنس معلومات کی بنیاد پر کیا گیا، اقوام متحدہ کے سابق سکریٹری جنرل کوفی عنان

بھی عراق پر امریکی حملے کو غلط اور غیر قانونی قرار دے چکے ہیں، بین الاقوامی ایٹمی ایجنسی کے سابق سربراہ محمد البرادعی اقوام متحدہ میں اپنی آخری تقریر میں کہہ چکے ہیں کہ "عراق پر امریکی لشکر کشی غلط اور بے بنیاد اطلاعات اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل کی اجازت کے بغیر کی گئی، انھوں نے کہا کہ عراق میں ایٹمی ہتھیاروں کا کوئی وجود نہیں تھا،اسی طرح عراق پر حملے کی حمایت کے ہالینڈ حکومت کے فیصلے پر کی جانے والی ایک انکوائری میں کہا گیا کہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق یہ حملہ جائز نہیں تھا،اس رپورٹ میں وزراپر من پسند انٹیلی جنس رپورٹوں کے استعمال کا الزام بھی لگایا گیا، عراق کے سابق امریکی حکمران پال بریمر جو عراق پر امریکی قبضے کے بعد 13 ماہ تک فوجی حکمران رہے کا کہنا تھا کہ 2003ء میں امریکی سربراہی میں عراق پر انجام پانے والا فوجی حملہ غلط تھا کیونکہ وہ غلط بنیادوں اور مفروضوں پر استوار تھا،کینیڈا کے وزیراعظم اسٹیفن ہارپر کا کہنا ہے کہ عراق پر امریکی حملہ بہت بڑی غلطی تھی،انھوں نے کہا کہ عراق پر انسانی تباہی پھیلانے والے ہتھیار رکھنے کا الزام غلط ثابت ہو چکا ہے،ان اعترافات کے بعد آج یہ حقیقت پوری طرح آشکارہ ہو چکی ہے کہ عراق پر حملے سے پہلے وہاں کوئی مہلک ہتھیار نہیں تھا،اسی وجہ سے اقوام متحدہ کے معائنہ کار ھینس بلکس نے اپنی کتاب" ڈس آرمنگ عراق" میں اِس بارے میں بڑی تفصیل سے لکھا،وہ لکھتے ہیں کہ صدر بش کا یہ کہنا کہ عراق پر حملہ انٹیلیجنس کی غلطی سے ہوا ہرگز

درست نہیں ہے، عراق کے خلاف امریکی جارحیت کے سراسر بے جواز ہونے کا اعتراف کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ بش کو اقراری مجرم قرار دے کر اِس اعتراف کے منطقی تقاضوں کی تکمیل کے لیے پیش رفت عدل کا تقاضا ہے۔

اسی طرح سان فرانسسکو کرانیکل نے اپنے 14 دسمبر 2009ء کے اداریے میں عراق پر حملے کو انٹیلیجنس کی غلطی قرار دینے کے بش کے بیان پر کڑی گرفت کرتے ہوئے لکھا کہ صدر کی جانب سے عذر لنگ کی بنیاد پر جنگ کی ذمہ داری سے خود کو الگ کرنے کی" کوشش صاف طور پر اشتعال انگیز ہے، بش اور اُن کے نائب صدر ڈک چینی بہت سے لوگوں کی بھیڑ میں محض دو افراد نہیں تھے جنھیں صدام حسین کے مہلک ہتھیاروں سے پریشانی تھی، یہ وہ لوگ تھے جو عراق کے بارے میں جنون کی آگ کو اُس وقت ہوا دے رہے تھے جب اہم ترین حلیفوں میں سے کئی صدام حسین کے ہتھیاروں اور جنگی صلاحیت کے حوالے سے امریکی دعوؤں پر برملا شکوک و شبہات کا اظہار کر رہے تھے، بش انتظامیہ اُس وقت خطرے کی گھنٹیاں بجا رہی تھی جس کی ایک مثال کنڈولیزا رائس کا 2003ء کا وہ بیان ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ہم مکمل یقین حاصل کرنے کے لیے ہم دھواں اگلتی بندوق کے کھمبیوں کی فصل بن جانے کا انتظار نہیں کر سکتے، جبکہ اقوام متحدہ کے معائنہ کار عراق سے خالی ہاتھ لوٹ رہے تھے،ان واقعاتی حقائق کی موجودگی میں صدر بش کا یہ کہنا کہ عراق کی جنگ غلط انٹلی جنس معلومات کا نتیجہ تھی جس پر انہیں افسوس ہے، دنیا

کومزید دھوکا دینے کی ایک ناکام کوشش کے سوا کچھ نہیں اور اُن کی یہ معذرت افغانستان اور عراق میں اُن کی جارحیت کے سبب بے گناہ لوگوں کے قتل عام کے جرم کو ہلکا نہیں کر سکتی. مشہور یہودی دانشور نوم چومسکی عراق پر بش و بلیئر کے ظالمانہ حملے کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "2003ء میں عراق پر امریکی قیادت میں حملہ کئی ایک باطل بہانوں اور جھوٹوں کی بنیاد پر کیا گیا جو ایک بڑا جرم تھا لیکن حملے کے کئی ناقدین بشمول اوباما نے اسے صرف غلطی یا اسٹریٹیجک بلنڈر ہی شمار کیا. یہ اسٹریٹیجک بلنڈر نہیں واقعی ایک بڑا جرم تھا."

قارئین محترم آج عراق پر حملے یعنی بڑے جرم کو سات سال ہو چکے ہیں. دنیا کو پرامن بنانے اور دہشت گردی ختم کرنے کے نام پر شروع کی گئی کروسیڈی جنگ جس کی ابتداء 2001ء میں افغانستان کی پرامن طالبان حکومت پر حملہ کے ساتھ کی گئی. 2003ء میں اگلا قدم اٹھاتے ہوئے عراق پر مسلط کی گئی. اِن جنگوں نے صرف دو ملکوں افغانستان و عراق ہی کو نہیں دنیا بھر کو جن حالات سے دوچار کر دیا ہے. شاید اُس کا کسی نے تصور بھی نہیں کیا گیا تھا. حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بہت سے ممالک اِن دونوں جنگوں میں امریکی حملے کو غلط اور اِس سلسلے میں اُس کی جاری کردہ پالیسیوں کو ہدف تنقید بنانے کے باوجود ابھی بھی تعاون و شراکت جاری رکھے ہوئے ہیں. جبکہ اِن جنگوں نے دونوں ممالک میں لوہے اور

بارود کی وہ آگ بھڑکائی ہے جس نے لاکھوں زندگیاں جلا کر بھسم کر دی ہیں، شہروں کے شہر تباہ و برباد کر دیئے ہیں، ہنستے کھیلتے علاقے ویران و سنسان اور ہر جگہ خوف و وحشت کے ڈیرے آباد ہو گئے، حقیقت یہ ہے کہ امریکہ اور برطانیہ کے یارانے کے نتیجے میں دو اسلامی ممالک پر جو تباہی و بربادی نازل کی گئی وہ واشنگٹن اور لندن کے یہودی نواز صلیبیوں کا وہ مکروہ گٹھ جوڑ تھا، جس نے صدام حسین کے عراق میں تباہ کن ایٹمی اور کیمیائی ہتھیاروں کی تیاری اور القاعدہ سے تعلقات کے ایسے ایسے جھوٹے افسانے تراشے کہ ابلیس بھی شرما گیا اور نائن الیون کا وہ واقعہ جو اسکی بنیاد بنا نے ایک ایسی صورتحال کو جنم دیا جس کا بنیادی مقصد پرانے جغرافیوں اور ملکوں کی سرحدوں کو تبدیل اور دنیا کو دھوکہ دے کر سینٹرل ایشیاء کے معدنی وسائل پر قبضہ اور کنٹرول کرنا تھا، دراصل یہی وہ عوامل تھے جس کے حصول کے لئے افغانستان اور عراق پر جنگ مسلط کی گئی اور اسامہ بن لادن کا نام افغانستان پر جبکہ اعراقی تیل پر قبضے کے لئے ایٹمی ہتھیاروں کا شور جنگ مسلط کرنے کے جواز کے طور پر استعمال کیا گیا، حالانکہ جیسے افغانستان پر جنگ مسلط کرنے کا جواز جھوٹ تھا ویسے ہی عراق پر جنگ کرنے کا جواز بھی جھوٹ اور فریب پر مبنی تھا، لیکن چونکہ امریکہ اور برطانیہ اِس جھوٹ پر متفق تھے اس لئے باقی دنیا کے بچے جمورے اِن کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے اور یہی وہ تلخ ترین سچائی اور حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

یہاں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ عراق پر حملے کے وقت سابق امریکی صدر بش اور برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر کے علاوہ جن دوسرے یورپی صلیبی لیڈروں نے اندھا دھند بش کی حمایت کی اُن میں ڈنمارک کے سابق وزیراعظم آندرس فوغ راس موسن جو اچھی طرح جانتا تھا کہ امریکی جواز بہت بودا اور فریب کارانہ ہے) اور اٹلی کے) وزیراعظم برلسکونی اور اسپین کے وزیراعظم آزنر (جنہوں نے اپنے عوام کی رائے کے خلاف جنگ باز بش کی حمایت کو ترجیح دی) بھی شامل تھے، یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے بش اور ٹونی بلیئر کے ساتھ مل کر افغانستان اور عراق کو تباہی و بربادی سے ہمکنار کیا اور لاکھوں بے گناہ انسانوں کے خون سے اپنی صلیبی ہوس کی پیاس بجھائی، آج اِن جنگوں کے دوران برطانوی فوجیوں پر عراقی مزاحمت کاروں کو حراستی مراکزاور تفتیشی کیمپوں میں شدید جسمانی اذیتیں پہنچانے کے سنگین الزامات عائد کئے جارہے ہیں، دوسری طرف عراق جنگ میں مارے جانے والے فوجیوں کے اہل خانہ اور قریبی رشتہ داروں کے علاوہ اپوزیشن سیاست دان کافی عرصے سے اِس جنگ کی تحقیقات کا مطالبہ کرتے چلے آرہے تھے، اِن میں سے بیشتر کا یہ کہنا تھا کہ انٹیلی جینس معلومات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا اور عراق میں برطانوی مداخلت کے لئے غلط طریقے سے راہ ہموار کی گئی، بعض سیاسی مبصرین اور تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ عراق جنگ کی انکوائری کا حتمی نتیجہ برطانوی حکومت کے لئے شرمندگی کا باعث ہوسکتا"

ہے۔" خیال رہے کہ عراق جنگ کے حوالے سے اِس سے پہلے بھی دو سرکاری انکوائریز
کرائی جاچکی ہیں، جان چلکاٹ انکوائری کمیشن تیسری تفتیشی ٹیم ہے، جو عراق میں
برطانوی مداخلت کے اسباب و وجوہات کا جائزہ لے کراُن ذمہ داران کا تعین کرنے
جارہی ہے جو دنیا کے دو اسلامی ممالک کی تباہی و بربادی اور بیس لاکھ مظلوم مسلمانوں
کے قاتل ہیں۔

کیا چلکاٹ انکوائری کمیشن بش اور ٹونی بلیئر کو جنگی جرائم کا مرتکب قرار دے کر سزا دلوا
سکے گا۔؟اِس سوال کا صحیح جواب تو آنے والا وقت ہی دے گا لیکن چلکاٹ انکوائری کے
دوران سامنے آنے والی شہادتوں اور مندرجہ بالا نا قابل تردید حقائق کے بعد اب اِس
بات میں کسی قسم کا کوئی شک وشبہ نہیں رہا کہ ٹونی بلیئر نے نہ صرف دروغ گوئی
کرتے ہوئے جارج بش کا ساتھ دے کر دنیا کو تباہ کن جنگ کی آگ میں دھکیلا بلکہ اُس
نے برطانوی عوام جو عراق کے خلاف جنگ کے کھلم کھلا مخالف تھے سے فراڈ اور دھوکہ
دہی بھی کی ہے،اِسی وجہ سے برطانوی عوام عراق جنگ میں ڈیڑھ سو برطانوی فوجیوں
کی ہلاکت کے ساتھ لاکھوں افغانی اور عراقی شہریوں کے خون کا بھی اُسے ذمہ دار قرار
دے رہے ہیں،آج برطانیہ کے بعض حلقوں میں یہ مطالبہ بھی زور پکڑتا جارہا ہے کہ
ٹونی بلیئر کے خلاف جنگی جرائم کے الزام میں بین الاقوامی عدالت انصاف میں مقدمہ
چلایا جائے،اِس مقصد کیلئے وکلا کی تنظیم لیگل ایکشن اگینسٹ وار پہلے ہی ہیگ میں

انٹر نیشنل کرمنل کورٹ کے سامنے یہ درخواست پیش کرچکی ہے کہ ٹونی بلیئر سابق وزیر خارجہ جیک اسٹرا اور سابق وزیر دفاع ہون کے خلاف جنگی جرائم کے الزام میں مقدمات چلائے جائیں۔ اِس تناظر میں اب برطانیہ میں بھی ٹونی بلیئر کے سرپر جنگی جرائم کے مقدمہ کی تلوار لٹک رہی ہے اور یہ پیش منظر واضح کررہاہے کہ اب وہ دن دور نہیں جب دنیا جنگی جرائم کے عالمی مجرموں اور انسانیت کے قاتل بش اور بلیئر سمیت اُن تمام قصابوں کو عالمی عدالت انصاف کے کٹہرے میں کھڑا دیکھے گی جن کے ہاتھ میں لاکھ بے گناہوں انسانوں کے خون سے رنگین ہیں۔

نائن الیون بہانہ افغانستان ٹھکانہ، پاکستان نشانہ۔۔۔

سابق ڈی جی آئی ایس آئی لیفٹننٹ جنرل (ر) حمید گل واضح نظریاتی سوچ رکھنے والے مدبر، مفکر اور عسکری دانشور ہیں، قومی اور ملکی مسائل پر اُن کے افکار و خیالات بصیرت افروز اور چشم کشا ہوتے ہیں، اسلام اور پاکستان سے والہانہ محبت کی وجہ سے جنرل حمید گل کو قدامت پسند اور بنیاد پرست کے طور پر جانا جاتا ہے، اسی وجہ سے اُن کا کردار پاکستان اور اسلام دشمنوں کی نظروں میں ہمیشہ کھٹکتا رہا ہے، افغان جنگ کے حوالے سے وکی لیکس پر 92 ہزار سے زائد خفیہ دستاویزات جو کہ 2004ء سے 2009ء پر محیط ہیں کے افشاء ہونے کی وجہ سے آج کل 74 سالہ جنرل حمید گل ایک بار پھر الزامات کی زد میں ہیں، اُن پر عائد کیے گئے الزامات میں حکمت یار اور جلال الدین حقانی نیٹ ورکس کی دوبارہ بحالی کی کوششیں، جنوری 2009ء میں القاعدہ کے رہنما الکنی کی ڈرون حملے میں ہلاکت کا انتقام لینے کی منصوبہ بندی کیلئے وانا کا دورہ، اور طالبان کو پاکستان کی بجائے افغانستان پر توجہ مرکوز کرنے کا مشورہ دینا شامل ہے، وکی لیکس کی جانب سے جاری ہونے والی ”خفیہ افغان وار ڈائری“ میں آئی ایس آئی کے سابق سربراہ لیفٹننٹ جنرل (ر) حمید گل پر طالبان کی مدد کا الزام بھی عائد کیا گیا ہے۔

واضح رہے کہ جیولین اسانجے کی قائم کردہ جرمن ویب سائٹ وکی لیکس معلومات تک رسائی کی آزادی کے لئے کام کرتی ہے اور اِس حوالے سے مختلف ویڈیوز و معلومات ویب سائٹ پر نشر کرتی ہے،وکی لیکس کی جانب سے "افغان وار ڈائری" کے نام سے 92 ہزار سے زائد رپورٹس پر مشتمل خفیہ دستاویزات اتوار 25 جولائی کو آن لائن جاری کی گئیں،ویب سائٹ کے مطابق افغانستان میں یہ رپورٹس مختلف فوجیوں اور انٹیلی جنس افسران کی جانب سے تحریر کی گئیں ہیں جو افغانستان میں تعینات امریکی فوج کے خطرناک فوجی آپریشنز سے متعلق ہیں، ویب سائٹ کے مطابق اِن رپورٹس میں خفیہ معلومات کے علاوہ سیاسی شخصیات کے ساتھ ہونے والی ملاقاتوں کی تفصیلات بھی موجود ہیں،امریکہ اور برطانیہ کے دو بڑے اخبارات کے مطابق انٹرنیٹ پر خفیہ معلومات جاری کرنے والے ویب سائٹس وکی لیکس افغانستان میں امریکی فوج کی 92 ہزار سے زائد خفیہ معلومات منظرِ عام پر لائی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ امریکی فوج کی تاریخ میں پہلی بار اتنی بڑی تعداد میں خفیہ معلومات منظر عام پر آئی ہیں، امریکہ نے اِن خفیہ معلومات کو منظر عام پر لانے کی مذمت کرتے ہوئے اِسے ایک غیر ذمہ دارانہ فعل قرار دیا، جبکہ پاکستان نے اِن بے بنیاد رپورٹوں پر سخت ناگواری کا اظہار کرتے اپنے باقاعدہ ردِ عمل میں انھیں غلط، گمراہ کن اور زمینی حقائق کے منافی قرار دیا ہے، وزارت

خارجہ کی طرف سے جاری ہونے والے ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ پاکستانی عوام اور
اُس کی سکیورٹی فورسز بشمول آئی ایس آئی نے انتہا پسندی و دہشت گردی کے خلاف لڑائی
میں بہت زیادہ قربانیاں دی ہیں، جن کا بین الاقوامی برادری خصوصاً امریکہ نے
اعتراف بھی کیا ہے اور اِس طرح کی رپورٹوں سے دہشت گردی کے خلاف پاکستان کے
مثبت کردار کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

اِن خفیہ دستاویزات میں پاکستان انٹیلی جنس اداروں کو بطور خاص ہدف بنایا گیا ہے اور
اُن کی کردار کشی کرتے ہوئے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ پاکستان امریکہ کا
حلیف ہوتے ہوئے طالبان کی مدد کر رہا ہے، منظر عام پر آئی دستاویزات کے مطابق
افغانستان سے باہر پاکستان کی خفیہ ایجنسی طالبان کے سب سے بہترین ساتھی ہے
اور افغانستان میں افغان سکیورٹی فورسز، امریکنوں اور اُن کے حمائتیوں کے خلاف
جنگ پاکستان ہی سے لڑی جا رہی ہے، جرمن ویب سائٹ دستاویزات کے حوالے سے
لکھتی ہے کہ طالبان کے لیے پاکستان محفوظ پناہ گاہ ہے، نئے رنگروٹ پاکستان سے
افغانستان میں داخل ہوتے ہیں، جن میں عرب، چیچن، ازبک اور یورپی مسلمان شامل
ہیں اور جنگجوؤں کے اجلاس میں آئی ایس آئی کے ارکان شریک اور خاص احکامات بھی
جاری کرتے ہیں۔

وکی لیکس کے مطابق ''اِن احکامات میں افغان صدر حامد کرزئی کو ہلاک کرنے کی

کوشش بھی شامل ہے" خیال رہے کہ افشا شدہ دستاویزات میں امریکہ کی ان خفیہ فوجی کاروائیوں کی تفصیلات بھی شامل ہیں جو باغیوں اور دہشت گردوں کے اہم اہداف کے خلاف کی گئیں،اِن میں سے کچھ کاروائیاں افغان شہریوں کی ہلاکتوں کا باعث بھی بنی ہیں،لندن کے روزنامے "دی گارڈین" کے مطابق فوجی تاریخ کے سب سے بڑے خفیہ دستاویزات کے ظاہر ہونے سے نیٹو افواج کے ہاتھوں افغان شہریوں کی ہلاکت کے ایسے کئی واقعات سامنے آئے ہیں جواِس سے قبل کبھی منظر عام پر نہیں آئے،اخبار کے مطابق اِن خفیہ دستاویزات سے پاکستان اور ایران کی جانب سے افغانستان میں جاری عسکریت پسندی کو فروغ دینے سے متعلق نیٹو کے شکوک کا بھی پتہ چلا ہے،اِن دستاویزات میں نیٹو کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے معصوم شہریوں کی آف دی ریکارڈ تفصیلات بھی سامنے آئی ہیں۔

اِس کے علاوہ افغان مزاحمت کاروں کے خلاف اسپیشل فورسز کے ماورائے قانون خفیہ آپریشنز کی تفصیلات بھی دستاویزات میں موجود ہیں،یہ دستاویزات ظاہر کرتی ہیں کہ افغان سیکورٹی حکام طالبان حملوں کے آگے بے بس ہیں،حالیہ افغان جنگ کے زمینی حقائق بتاتے ہیں کہ جنگ میں طالبان کا پلڑا بھاری ہے اور نیٹو کی اتحادی افواج کو ہزیمتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے،اِس صورتحال کی حقیقت اُن 92 ہزار سے زائد خفیہ رپورٹوں سے ظاہر ہوتی ہے،جس میں اِس حقیقت کا اعتراف بھی کیا گیا کہ افغانستان کی جنگ میں امریکہ 3 کھرب ڈالر کے مصارف کر

چکا ہے، مگراِس کے باوجود طالبان 2001ء سے کہیں زیادہ مضبوط، منظم اور فعال ہیں، خیال کیا جارہا ہے کہ یہ خفیہ دستاویزات ایک فوجی تجزیہ کار "براڈلے مانگ" کی جانب سے فراہم کی گئی ہیں جسے 26 مئی کو فوجی قوانین کی خلاف ورزی الزام میں بغداد سے گرفتار کیا گیا تھا،اِس اہلکار نے ایک امریکی فوجی ہیلی کاپٹر سے متعلق متنازعہ ویڈیو بھی فراہم کی تھی۔

قارئین محترم امریکیوں کی کسی بھی خفیہ رپورٹ کے افشا ہونے کا ہر گز یہ مطلب نہیں ہے کہ اِن رپورٹوں میں جو کچھ درج ہے وہ بالکل درست ہے،امریکی انٹیلی جنس غلط رپورٹیں مرتب کرنے کے حوالے سے خاصی بدنام ہے،ماضی میں ایسی ہی جھوٹی اور جعلی خفیہ رپورٹیں جن میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ عراق کے پاس موجود کیمیائی ہتھیار عالمی امن کے لئے خطرہ ہیں، کو بنیاد بنا کر امریکہ نے عراق پر چڑھائی کی تھی،مگر جب عراق کا چپہ چپہ چھان مارنے کے باوجود وہاں کوئی کیمیائی ہتھیار نہیں ملے تو امریکیوں اور اُس کے اتحادیوں کو سخت شرمندگی اور ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا تھا،اَمر واقعہ یہ ہے کہ امریکی انٹیلی جنس ایجنسیاں خفیہ رپورٹوں کے حوالے سے مفروضوں پر کام کرتی ہیں اور سنی سنائی باتوں کو بھی خفیہ رپورٹوں کا حصہ بنا دیتی ہیں، سوال یہ ہے کہ اگر امریکی انٹیلی جنس ایجنسیوں کو اِس بات کا علم تھا کہ پاک فوج اور پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں نے دوہرا معیار اپنایا ہوا ہے تو پھر امریکہ اور

پاک فوج کے درمیان کثیر الجہت تعاون کیونکر ممکن ہوا۔؟
اگر واقعی ایسا ہوتا تو امریکیوں نے آٹھ سالوں تک جنرل پرویز مشرف کو کیسے برداشت کیا اور ریٹائرمنٹ کے بعد بھی اُن کی سرپرستی کیوں کی گئی؟ سچائی یہ ہے کہ پاکستانی فورسز کی پے درپے کاروائیاں نے طالبان اور القاعدہ کی کمر توڑ کر رکھ دی اور جس کے جواب میں طالبان اور القاعدہ نے پاکستانی افواج اور سول سوسائٹی پر متعدد حملے کئے، جن میں بہت سے پاکستانی فوجی اور لاتعداد شہری شہید ہو چکے ہیں، لیکن پھر بھی اگر پاک فوج اور طالبان کے درمیان خفیہ روابط ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طالبان بار بار پاک فوج پر حملہ آور کیوں ہوتے ہیں اور سول سوسائٹی کو نشانہ کیوں بناتے ہیں۔؟ گو کہ امریکہ اِس افشا کو معمول کی کاروائی قرار دے رہا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ بیشتر باتوں کا زور پاکستان اور پاک فوج کے ادارے آئی ایس آئی کی طرف کرنا اور افغان جنگ میں پاکستان سے لڑے جانے کے الزامات ظاہر کرنا یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ یہ سارا ڈرامہ پاکستان اور پاک آرمی کو دباؤ میں لانے کی ایک کوشش ہے۔
اَمر واقعہ یہ ہے کہ نو سال تک افغانستان میں ایک بے مقصد جنگ نے امریکیوں کے اعصاب شل کر دیئے ہیں، وہ افغانستان میں بری طرح ناکام ہو چکے ہیں اور اب

انہیں کوئی ایسا سر چاہیے جس پر وہ اپنی ناکامیوں کی ٹوپی رکھ سکیں اور اپنی شکست و شرمندگی کا ملبہ ڈال کر یہ کہہ سکیں کہ اِس وجہ سے انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے، حقیقت یہ ہے کہ آئی ایس آئی پاک فوج کا ایک ایسا ذیلی ادارہ ہے جو وطن عزیز کے خلاف ہونے والی سازشوں کو قبل از وقت بے نقاب کرکے ملک کا بالواسطہ طور پر تحفظ کرتا ہے،آئی ایس آئی نے پاکستان کے تحفظ کی خاطر ہمیشہ کلیدی کردار ادا کیا ہے،استحکام پاکستان اِس ادارے کی سب سے اہم ذمہ داری ہے،یہ امریکہ ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے علم میں ہے کہ آئی ایس آئی نے دہشت گردی اور طالبان کے خاتمہ کے لئے کلیدی کردار ادا کیا ہے اور دہشت گردی کے خلاف لڑی جانے والی جنگ میں نہ صرف آئی ایس آئی اور پاک فوج بلکہ پورے پاکستان نے امریکہ کا ساتھ دیتے ہوئے بے شمار قربانیاں دی ہیں لیکن اسکے باوجود بھی امریکی عہدیداروں،حکومت اور میڈیا کی طرف سے بار بار آئی ایس آئی پر الزامات کی بوچھاڑ آئی ایس آئی کو بدنام کرنے کی سازش اور مستقبل قریب میں امریکی جارحیت افغان سرحدوں سے نکل کر قرب و جوار کا رخ کرنے کی کوشش کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔

ہمارا سوال یہ ہے کہ آئی ایس آئی پر سنگ زنی کرنے والوں سے کوئی یہ تو پوچھے کہ درجنوں حکمرانوں کو قتل کرنے،بیسیوں حکومتوں کا تختہ الٹنے اور دنیا بھر میں جگہ جگہ بغاوت و فسادات کی آگ لگانے والی سی آئی اے کے بارے

اُن کا کیا خیال ہے، چنانچہ اِس مشکل صورتحال میں پاکستان کیلئے قابل غور نکتہ یہ ہے کہ پاکستان مدافعانہ حکمت عملی ترک کرکے جارحانہ حکمت عملی اپناتے ہوئے امریکہ پر واضح کردے کہ اگراُس نے پاکستان اور پاکستانی اداروں پر الزام تراشی کا سلسلہ بند نہیں کیا اور اپنی موجودہ روش نہ بدلی تو پاکستان دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ کے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہیں کرے گا، ہم سمجھتے ہیں کہ اب وقت آگیا ہے کہ دنیا کو بتانا ہوگا کہ افغانستان میں شدید نوعیت کے جنگی جرائم کی بدولت افغانوں کی اکثریت امریکی اور اتحادی افواج کے خلاف ہوچکی ہے، جبکہ دوسری طرف اخلاقی اعتبار سے برتری کے حامل طالبان کیلئے افغان عوام میں نرم گوشہ موجود ہے، جس کی وجہ سے مقامی لوگ طالبان کو پناہ بھی دیتے ہیں اور اُن کی مدد بھی کرتے ہیں۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ اب موسم بدل رہا ہے،آج نو سال گزرنے کے بعد بھی 37 ممالک سے آئی ہوئی دنیاکے جدید ترین مہلک ہتھیاروں سے لیس اتحادی فوج بھاری پگڑیوں، گھنی داڑھیوں اور لمبے عباؤں والے مٹھی بھر طالبان سے خوفزدہ ہے اور امریکی سپہ سالاری میں کابل و قندھار کے گلی کوچوں میں ذلیل ورسوا ہو رہی ہے، کل تک اگر ہمارے ارباب اقتدار کے نزدیک امریکہ سے والہانہ دوستی اور اُس کے تمام مطالبات کے سامنے سرنگوں ہونا تقاضائے حکمت اور دانشمندی تھا، تو آج دنیا کی سفاک ترین سپرپاور سے اپنے آپ کو بچانا اور پاکستان کے

مفادات کی نگہبانی کرنا انتہائی ناگزیر اور اہم ذمہ داری قرار پاتا ہے، کیونکہ شہنشاہ عالم پناہ پاکستان کی ایٹمی صلاحیت کی تباہی و بربادی کے خواہشمند ہیں، امریکہ پاکستان کی تقدیر سے کھیل رہا ہے، وہ افغانستان میں متوقع شکست سے خوفزدہ ہے اور پاکستان کو قربانی کا بکرا بنا کر اپنی شکست کا سارا ملبہ پاکستان پر ڈالنا چاہتا ہے،اس تناظر میں جنرل حمید گل کا یہ کہنا کہ "نائن الیون بہانہ تھا، افغانستان ٹھکانہ ہے اور پاکستان نشانہ ہے۔" امریکہ کی پاکستان دشمن حکمت عملی اور ناپاک مذموم مقاصد کو واضح کرتے ہوئے حکمرانوں کو دعوت فکر و عمل دے رہا ہے۔

ثبوت حاضر ہیں

اسلامی عقائد میں " عقیدہ ختم نبوت " کو بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل ہے، یہ عقیدہ دین اسلام کی اساس ہے جس پر مکمل ایمان رکھے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا، قرآن مجید کی 100 کے قریب آیات اور 200 سے زائد احادیث مبارکہ سے ثابت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی اور رسول ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی قسم کا کوئی نیا نبی نہیں، آج تک پوری اُمت مسلمہ کا اِس بات پر اجماع رہا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ساتھ ہی نبوت و رسالت کا دروازہ ہمیشہ کیلئے بند ہو گیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نئے نبی کے آنے کی ضرورت باقی نہیں رہی، الہٰذا اب اگر کوئی شخص کسی بھی معنوں میں دعوے نبوت کرتا ہے تو وہ بالاتفاق اُمت کافر و مرتد، کذّاب و دجّال اور دائرہ اسلام سے خارج قرار پاتا ہے۔

یوں تو دنیا میں عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک سینکڑوں بدبخت لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کر کے دنیا و آخرت میں اپنی ذلت و رسوائی کا سامان پیدا کیا، لیکن بیسویں صدی میں فرنگی سرپرستی میں قادیان کے ایک ضمیر فروش مرزا غلام احمد قادیانی نے جس نبوتِ کاذبہ کا دعویٰ کیا، اُس نے اسلام

کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔برصغیر میں مرزا کی نجمی نبوت کا مقصد انگریزی اقتدار کی مضبوطی کیلئے مسلمانوں کی فکری وحدت کو پارہ پارہ کرنا اور جذبہ جہاد کا خاتمہ تھا، مرزا کی ساری زندگی انگریز کی حاشیہ برداری میں گزری۔

اُس نے اپنی زندگی کا اِک اِک لمحہ حکومت برطانیہ کی مدح سرائی اور جاسوسی میں صرف کیا، انگریز کا دور حکومت اُس کے نزدیک "سایہ رحمت اور ایسے امن و استحکام کا باعث تھا، جو اُسے مکہ و مدینہ میں بھی نہیں مل سکتا۔"ایسی صورت میں مرزا کے متبعین ذریت) یہ کب گوارہ کرتی کہ انگریز اِس سرزمین سے چلے جائیں، چنانچہ مرزا کی) جماعت نے برصغیر میں انگریز کے قیام کو طول دینے کیلئے اُسے ہر ممکن مدد و معاونت فراہم کی، حقیقت یہ ہے کہ قصر نبوت میں نقب لگانے کی کوشش کرنے والے مرزا کی ذریت نے "اکھنڈ بھارت "کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کیلئے تحریک پاکستان کی ہی مخالفت نہیں کی بلکہ انہوں نے قیام پاکستان کے بعد پاکستان کے وجود کو نقصان پہنچانے کیلئے بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قادیانیت کے خلاف تحریک تحفظ ختم نبوت کی رہبری و قیادت میں علماء و مشائخ اہلسنّت ہمیشہ پیش پیش رہے، جن میں " براہین احمدیہ

کی اشاعت کے ساتھ ہی تعاقب فتنہ قادیانیت کا سب سے پہلے آغاز کرنے والے علامہ ”غلام دستگیر ہاشمی قصوری سے لے کر پیر سیدنا مہر علی شاہ صاحب، اعلیٰ حضرت امام احمد رضاخاں فاضل بریلوی، حجۃ الاسلام علامہ حامد رضاخان، امیر ملت پیر جماعت علی شاہ صاحب، مبلغ اسلام علامہ عبدالعلیم صدیقی، قائد تحریک ختم نبوت 1953ء علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری، مجاہد ملت حضرت علامہ عبدالستار خان نیازی، غازی تحریک ختم نبوت 1953ء سید خلیل احمد قادری اور علامہ عبدالمصطفیٰ الازہری رحمھم اللہ تعالیٰ اجمعین تک ہزاروں علماء و مشائخ اہلسنّت شامل ہیں۔

لیکن عصر حاضر میں جس کے نام پر قادر مطلق نے تحریک ارتداد قادیانیت کا سہرا مقدر فرمایا وہ شخصیت حضرت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی رحمتہ اللہ علیہ کی ہے، تاریخ اسلام میں ریاست و مملکت کی سطح پر فتنہ انکار ختم نبوت کو کفر وارتداد قرار دینے اور اُس کے خلاف سب سے پہلے علم جہاد بلند کرنے کا اعزاز جانشین رسول خلیفہ اوّل سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا اور اُن کے بعد یہ اعزاز اُنہی کی اولاد امجاد میں علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کو نصیب ہوا۔

علامہ شاہ احمد نورانی نے 30 جون 1974ء کو قومی اسمبلی میں قادیانیت کے خلاف

قرار داد پیش کرنے سے لے کر اُس کی منظوری تک نہایت ہی محنت و جانفشانی سے کام کیا،اِس دوران آپ نے قومی اسمبلی کے اجلاسوں میں باقاعدگی سے شرکت کے ساتھ اراکین اسمبلی کو اعتماد میں لینے،انہیں مسئلہ ختم نبوت کی اہمیت و حیثیت سے روشناس کرانے،رات گئے تک اٹارنی جنرل کے ساتھ قادیانیوں سے پوچھے جانے والے سوالات کی تیاری کے ساتھ،مرزا ناصر اور صدرالدین لاہوری کے محضر نامے کے جواب میں 75 سوالات پر مشتمل سوالنامہ کی تیاری میں بھی بھرپور حصہ لیا،آپ نے قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی اور رہبر کمیٹی کے رکن ہونے کے باوجود عوامی رائے عامہ ہموار کرنے کیلئے ملک بھر کے طوفانی دوروں میں چالیس ہزار میل کا سفر طے کیا اور ڈیڑھ سو سے زائد شہروں،قصبوں اور دیہاتوں عوامی جلسوں سے خطاب کرکے مسلمانوں کو قادیانیوں گمراہ کن عقائد،فتنہ پردازیوں اور شرانگیزیوں سے آگاہ کیا۔

پاکستان کی تاریخ میں اسمبلی فلور پر عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کیلئے سب سے پہلے مسلمان کی تعریف کو آئین کا حصہ بنانے کا مطالبہ کرنے والے علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کی پیش کردہ قرار کے نتیجے میں 7 ستمبر 1974ء کو ملک کی منتخب پارلیمنٹ نے متفقہ طور پر قادیانیوں کو اُن کے کفریہ عقائد کی بناء پر غیر مسلم اقلیت قرار دیا اور یوں نوے سالہ فتنہ اپنے انجام کو پہنچا،لیکن اِس کے باوجود آج بھی قادیانی خود کو مسلمان اور مسلمانوں کو غیر مسلم کہتے

ہیں، قادیانی عقائد و تعلیمات اتنی روح فرسا ہیں کہ انہیں پڑھ کر کلیجہ پھٹنے کو آتا ہے،دل ٹکڑے ہوتا ہے،روح میں زہر آلود نشتر چبھتے ہیں اور دماغ مفلوج ہوتا محسوس ہوتا ہے۔

زیر نظر کتاب "ثبوت حاضر ہیں !" (جو کہ 1072 صفحات پر مشتمل اور علم و عرفان پبلیشرز،اردو بازار لاہور کے زیر انتظام شائع کی گئی ہے) معروف سکالر محمد متین خالد نے تمام مکاتیب فکر کے جید علماء کرام اور نامور اہل علم و دانش کی سرپرستی میں 15 سال کی شبانہ روز انتھک محنت کے بعد مکمل کی ہے،یہ عالم اسلام کی اپنی نوعیت کی منفرد اور شاہکار کتاب ہے جس میں قادیانیوں کی اسلام کے خلاف ہرزہ سرائیوں، مضحکہ خیزیوں اور کفریہ عقائد و عزائم کو مستند عکسی و دستاویزی شہادتوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

یہ کتاب قادیانیوں کے متعلق نادر معلومات، حیرت انگیز اکتشفات، ہوش ربا انکشافات، سنسنی خیز واقعات، ناقابل تردید حقائق اور مذموم سرگرمیوں کے خفیہ گوشے لیے ہوئے ہے،اِس کتاب میں تمام قادیانی کتب اور اخبارات و رسائل کے 50 ہزار سے زائد صفحات کھنگالنے کے بعد قادیانیوں کے مذموم عقائد و عزائم کے عکسی ثبوت یکجا کردیے گئے ہیں، جن کی موجودگی میں قادیانیوں کی طرف سے کسی قسم کا انکار،تاویل یا بہانہ ناممکن ہے،آج قادیانیت کی اصل حقیقت کو سمجھنے

کے لیے اِس سے بہتر کتاب کوئی نہیں۔

قادیانی جماعت کے سربراہ نے قادیانیوں پر اِس کتاب کے مطالعہ پر پابندی لگا رکھی ہے، ورنہ یہ کتاب اپنی تحقیق کے لحاظ سے ایک ایسا سرچشمہ ہے جس سے قادیانی سیراب ہو کر مشرف با اسلام ہو سکتے ہیں، خوبصورت ٹائٹل سے مجلد جلد اور عمدہ پیپر پر طبع اِس کتاب میں جہاں پیر کرم شاہ الازہری، جناب مجید نظامی، لیفٹیننٹ جنرل حمید گل، پروفیسر محمد سلیم، پروفیسر منور احمد ملک، ڈاکٹر محمود احمد غازی، پروفیسر رفیع الدین ہاشمی جیسے اہل دانش کے علمی و تحقیقی تبصرے شامل کئے گئے ہیں، وہیں اِس کتاب میں کچھ ایسے تبصرے بھی شامل ہیں جو دین کے دعویداروں کے متعصبانہ اور غیر مورخانہ طرز عمل کے عکاس، صریحاً دروغ گوئی پر مبنی، اصل تاریخی حقائق کے خلاف اور قابل گرفت ہونے کی وجہ سے کتاب کی علمی حیثیت و مقام کو متاثر کر رہے ہیں اور اصل تاریخی حقیقت کو سامنے لانے کے متقاضی ہیں۔

اِس تناظر میں آج ضرورت اس اَمر کی ہے فتنہ ارتداد قادیانیت کی تحاریک میں شامل تمام مکتبہ فکر کے علماء و مشائخ کا تذکرہ اُن کے کردار و عمل کے مطابق درجہ بدرجہ کیا جائے، ہم امید کرتے ہیں کہ جہاں محترم محمد متین خالد نے قادیانیت کے خلاف نا قابل تردید شواہد کو اکٹھا کر کے ایک کا عظیم کارنامہ

انجام دیا ہے وہیں وہ مستقبل قریب میں ہماری گزارشات پر توجہ دیتے ہوئے صحیح تاریخ کو قوم کے سامنے لانے کا اہم فریضہ بھی سرانجام دیں گے۔

زیر نظر کتاب اِس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اِس کا مطالعہ علما، خطباء، وکلاء، اساتذہ اور طلبہ کو فتنہ قادیانیت کے خلاف مضبوط دلائل اور ٹھوس معلومات کا ذخیرہ فراہم کرتا ہے، اِس کتاب کو قادیانیت کے خلاف ہر عدالتی مقدمہ، بحث اور مناظرہ میں مستند حوالے کی حیثیت سے پیش کیا جاسکتا ہے، ایسی کتاب وقت کی ضرورت تھی، جسے جناب محمد متین خالد صاحب نے بروقت پورا کیا ہے، اِس کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر نہ صرف ہر مسلمان کے لیے اِس کا مطالعہ ناگزیر ہے بلکہ اس کا ہر گھر اور لائبریری میں بھی موجود ہونا بہت ضروری ہے، ہم اِس اہم کوشش وکاوش پر جناب محمد متین خالد کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے دعاگو ہے کہ "اللہ کرے زور قلم اور بھی زیادہ"۔

ابھی تک نامکمل ہے مگر تعبیر آزادی

"امرتسر کی تنگ وتاریک گلی میں موہن سنگھ نے محتاط نظروں سے اپنے چاروں طرف دیکھا کہ کہیں کوئی ہندو یا کوئی سکھ اُسے ایک مسلمان راگیر کے ساتھ دیکھ نہ لے، اپنے گرد و پیش سے مطمئن ہونے کے بعد اُس نے کہا اچھا ہوا تم مجھے مل گئے، یہ میرے پاس تمہارے لئے ایک امانت ہے، پھر اُس نے اپنی جیب سے سلے ہوئے کپڑے کا رومال نکالا اور اُس کی گرہیں کھول کر اندر سے ایک چھوٹا سا تعویز نکالا اور مسلمان راگیر کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ" آج میرا بوجھ ہلکا ہوگیا، آج موہن سنگھ سرخرو ہوگیا" تعویز لینے والے مسلمان راگیر نے موہن سنگھ سے پوچھا یہ تعویز کس کا ہے اور تمہیں کہاں سے ملا، سوال سن کر موہن سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اُس نے بتایا کہ چند دن پہلے جب مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا، ہندوؤں اور سکھوں کے جتھے مسلمان محلوں پر حملہ آور تھے، وہ بوڑھے جوانوں اور بچوں کو قتل کر رہے تھے، مکانوں کو آگ لگا رہے تھے اور عورتوں کی بے حرمتی کر رہے تھے۔

ایسے میں ایک رات میں ایک چوک سے گزر رہا تھا کہ وہاں چند ہندو غنڈے نشے میں بدمست بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے مجھے روکا اور مجھ سے پوچھا کہاں جا رہے

ہو میں نے انہیں بتایا کہ میں گھر جا رہا ہوں،انھوں نے مجھے کہا آؤ تمہیں سورگ کی سیر کراتے ہیں، میں اُن کا اشارہ سمجھ گیا کہ شاید کوئی مظلوم مسلمان لڑکی اُن کے ہاتھ چڑھ گئی ہے،انھوں نے مجھے کہا جاؤ تم بھی موج کرلو اور ساتھ والی کوٹھری کا دروازہ کھول دیا، میں نے دیئے کی روشنی میں دیکھا کہ چارپائی پر ایک سترہ سالہ نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی، جس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور بال یوں بکھرے ہوئے تھے جیسے زبردستی نوچے کھسوٹے گئے تھے، لیکن اُس کی آنکھوں میں شیرنی کی سی چمک تھی، مجھے دیکھتے ہی اُس نے کہا "خبردار میرے قریب مت آنا"میں نے کہا بہن میں تجھے کچھ نہیں کہوں گا، بہن کا لفظ سن کر اسے کچھ تسلی ہوئی،اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کا نام رقیہ ہے اور اِن غنڈوں نے میرے باپ، بھائی اور خاندان کو قتل کردیا ہے اور مجھے اٹھا کر یہاں لے آئے ہیں۔

لیکن انہیں علم نہیں کہ ایک مسلمان عورت اپنی عزت کی حفاظت کیسے کرتی ہے،اُس نے اپنے گلے سے ایک تعویز اتارا اور میرے قریب آکر مجھے دیتے ہوئے کہا یہ میری امانت ہے اسے کسی مسلمان کو دے دینا اور اِس دوران اُس نے چھپٹ کر میرے گلے میں لٹکی ہوئی کرپان کو زور سے اپنے سینے میں اتار لیا،خون کا فوارہ اُس کے سینے سے ابل پڑا اور تھوڑی دیر وہ تڑپ کر ٹھنڈی ہوگئی ،دیئے کی دھیمی روشنی میں اُس کے چہرے پر ایک ایسا سکوت اور نور تھا، میں خوفزدہ

ہو گیا اور تعویز جیب میں ڈال کر بھاگ نکلا ۔اُس دن سے میں کسی مسلمان کو ڈھونڈ رہا ہوں تاکہ یہ امانت میں اُس کے سپرد کرسکوں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک مسلمان عورت اتنی بہادری سے اپنی عزت کی حفاظت کیلئے کس طرح جان دے سکتی ہے"۔

دوستوں یہ کوئی کہانی یا داستان نہیں بلکہ تحریک پاکستان کے دوران پیش آنے والا ایک ایسا حقیقی واقعہ ہے جو پاکستان کے مشہور ادیب اے حمید کے ساتھ پیش آیا تھا،ایسے ہزاروں لاکھوں لٹے پٹے قافلوں، جلتے ہوئے گھروں، کٹے پھٹے لاشوں اور مٹی میں ملتی آبروؤں بھرے واقعات تحریک پاکستان کے دوران ،برصغیر کے بچے، بوڑھے، جوانوں اور خواتین نے اپنے خون سے تاریخ کے صفحات پر لکھ کر وطن عزیز پاکستان کی بنیاد رکھی ،آج جب ہم اپنے بزرگوں سے جو اِن واقعات کے چشم دید گواہ اور راوی ہیں سوال کرتے ہیں کہ آپ نے یہ قربانیاں کس لیے دی تھیں تو وہ فوراً جواب دیتے ہیں اُس پاکستان کیلئے جس کا مقصد "پاکستان کا مطلب کیا لاالہ الااللہ، قانون ریاست کیا ہوگا" محمد رسول اللہ" تھا۔

یہ کوئی جذباتی بات یا نعرہ نہیں بلکہ وہ ٹھوس حقیقت ہے جسے بتدریج منظم طریقے سے بھلایا جارہا ہے اور ہم بھولتے جارہے ہیں،یہی وہ اصل حقیقت، عزم اور منزل کے حصول کے ساتھ ایک ایسا وعدہ تھا جو ہم نے اللہ اور اُس کے رسول

صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا تھا،اور اسی وعدے پر مسلمانان برصغیر نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرکے قیام پاکستان کی تاریخ ساز جدوجہد کی تھی،اس خواب کو تعبیر بخشنے کیلئے ہمارے قائدین نے قربانیاں دیں، تحریکیں چلائیں، گھربار زمین و جائیداد چھوڑی اور عوام کیلئے پاکستان کا جواز فراہم کیا، جس کی وجہ سے لاکھوں مسلمانوں نے آگ و خون کے دریا عبور کئے، ماؤں نے معصوم بچوں کو نیزوں کی انیوں پر اچھلتے دیکھا، عورتوں نے اپنے سہاگ اجڑتے دیکھے اور گھربار، عزیز و اقارب اور اپنے پیاروں کے نام ونشان چھوڑ کر پاکستان کیلئے عازم سفر ہوئے ہجرت کی۔

تاریخ گواہ ہے کہ غلامی کی لعنت حساس افراد اور زندہ قوموں کیلئے ہمیشہ ذہنی اذیت، روحانی بے چینی اور قلبی درد و کرب کا باعث بنتی ہے حقیقت یہ ہے کہ احساس غلامی اور محرومیت نے ہمیشہ محکوم اور غیور انسانوں اور غیور قوموں کے لہو کو گرم رکھا اور نتیجتاً حکمران قوموں کی ظاہری شفقت و مہربانی اور آئین پسندی کے باوجود محکوم قوموں نے غلامی کی زنجیروں کو توڑ ڈالا، یہ بھی حقیقت ہے کہ غلامی کی زنجیریں ٹوٹنے کا عمل کبھی خاموش نہیں ہوتا، غلامی کی زنجیروں پر موت کے رقص ہوتے ہیں، آزادی کے متوالے سولیوں پر چڑھتے ہیں، سروں کے نذرانے پیش کئے جاتے ہیں، جانوں کی قربانی دی جاتی ہے، اور شہداء کے بہتے ہوئے خون سے دریا سرخ ہو جاتے ہیں، گاؤں دیہات لٹتے ہیں، شہر جلائے جاتے ہیں

لیکن آزادی کے متوالے آگ و خون کے دریاؤں سے گزر کر آزادی کی منزل تک پہنچ ہی جاتے ہیں،آگ و خون کے دریاؤں سے گزرنے کا احساس اور تجربہ برصغیر کے مسلمانوں سے زیادہ کسی اور قوم کو نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ غلامی کا طوق گلے سے اتارنے کیلئے ہمیشہ سینہ سپر رہے،انہوں نے ہندو قوم کی طرح عزت و آزادی کے سودے نہیں کئے۔ پلاسی کے میدان سے لے کر سرنگا پٹم کی سرزمین تک،1857ء کی جنگ آزادی سے لے کر تحریک خلافت، تحریک ہجرت اور تحریک عدم تعاون تک،جلیانوالہ باغ کے المیہ سے لے کر واقعہ کانپور مچھلی بازار،سانحہ مسجد شہید گنج اور حادثہ قصہ خوانی بازار تک ایسے تمام مواقع پر مسلمانانِ ہند جرات و بہادری کے ساتھ بڑھ چڑھ کر مردانگی کا مظاہرہ کرتے رہے اور اپنے خون سے آزادی کے چراغ روشن کرتے دکھائی دیئے۔

مسلمانان برصغیر کی جدوجہدِ آزادی بلاشبہ انتہائی کٹھن اور صبر آزما کام تھی انہیں کئی محاذوں پر برسرپیکار رہنا پڑا،ایک طرف انگریز کی غلامی سے نجات کا مرحلہ درپیش تھا تو دوسری طرف ہندو بنیے کے متوقع رام راج کے برسراقتدار آنے کے خطرات لاحق تھے، انگریزوں اور ہندوؤں دونوں کی غلامی کے طوق انہیں اپنی گرفت میں لینے کیلئے بے چین تھے، کیونکہ دونوں ہی مسلمانوں کے ازلی دشمن تھے،انگریزوں کے ذہن سے صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کبھی محو نہیں ہو سکی اسی طرح ہندو برصغیر کے میدانوں میں

سلطان محمود غزنوی، سلطان محمد غوری، ظہیر الدین محمد بابر، احمد شاہ ابدالی جیسے مایہ ناز سورماؤں اور جری جرنیلوں کے ہاتھوں اپنی ذلت آمیز شکستوں کے واقعات نہیں بھولے تھے، یہی وجہ تھی جب آزادی کی گھڑیاں قریب آئیں تو دونوں قوموں نے اپنے سینوں میں چھپائی ہوئی برسوں کی دشمنی، نفرت اور بغض کا برملا اظہار کیا، انگریز نے حالات و واقعات سے مجبور ہو کر مسلمانان برصغیر کا مطالبہ تو منظور کر لیا۔
لیکن پاکستان کے وجود کو گہری اور خطرناک ضربیں لگانے سے باز نہیں آئے، پاکستان میں شامل ہونے والے دو بڑے صوبے بنگال اور پنجاب کو تقسیم کر دیا گیا، باؤنڈری کمیشن سے تمام بے اصولیاں کرائیں گئیں، الغرض پاکستان کو لولا لنگڑا بنانے کیلئے انہوں نے تمام ممکنہ کوششیں روا رکھیں، دوسری طرف ہندوؤں اور سکھوں نے بھی اگرچہ پاکستان کے قیام پر بظاہر رضامندی ظاہر کر دی تھی لیکن اندرونی طور پر وہ پاکستان کے وجود کو چند ساعتوں یا چند مہینوں زیادہ دیکھنے کے متحمل نہیں تھے، وہ برصغیر کے مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتے تھے اور خاص کر انہوں نے بھارت میں شامل ہونے والے علاقوں کے مسلمانوں پر لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا، مسلمانوں کے محلے قصبے، شہر اور دیہات لوٹے انہیں آگ لگائی، ہزاروں لاکھوں بے گناہ بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کو تہہ تیغ کیا، نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کو اغوا

کیا، نواکھلی سے لے کر لاہور تک کشمیر سے لے کر راس کماری تک غریب مسلمانوں پر ایک قیامت گزر گئی، پورا مسلم ہندوستان جل رہا تھا، بہار سے لے کر مشرقی پنجاب تک آگ لگی ہوئی تھی، لیکن انگریزوں کا "نیرو" لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور ہندوؤں کا" نیرو" مہاراجہ پٹیالہ جو پنجاب کا رنجیت سنگھ بننا چاہتا تھا چین سے بیٹھے بانسری بجارہے تھے، مسلمانوں کی دنیا لٹتی رہی اور مسلمانوں کے ازلی دشمن 14 اگست 1947ء کی صبح آزادی تک بانسری بجاتے رہے۔

چودہ اگست 1947ء کو دنیا کے نقشے پر ایک آزاد اسلامی جمہوری مملکت پاکستان بن کر ابھری، جس کے قیام کیلئے مسلمانان ہند نے بابائے قوم قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں ایک طویل جنگ لڑی، یہ وہ سیاسی اور جمہوری حقوق کی بازیابی کی جنگ تھی جس کیلئے مسلمانانِ ہند نے قید و بند کی صعوبتیں تو ایک طرف ہزاروں ماؤں نے اپنے جگر گوشوں کی شہادت سے، ہزاروں بہنوں نے اپنی عزتوں اور عفتوں کے نذرانے دے کر اور ہزاروں معصوموں نے بوڑھوں نے اپنی جانوں کی بازی ہار کر ظالم و متعصب انگریزوں اور ہندوؤں سے اپنے پاک وطن کی آزادی حاصل کی، یہ حصول پاکستان کی طویل جدو جہد پر مبنی تاریخی واقعات زندہ اور باغیرت قوم کی تاریخ ہیں جو آج ہمارے لئے قابل رشک اور قابل زکر ہیں، یہ اُن نیک جذبوں اور پاکیزہ آرزوؤں کی تاریخ ہے جس کی قوت اور اثر سے ہندوستان کی تین سو سالہ شب ظلمت کا سینہ چیر کر آزادی کا سورج طلوع ہوا مگر اِن

پاکیزہ فولادی جذبوں کی تاریخ کا آخری باب 11 ستمبر 1948ء کو بانی پاکستان حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناح کی وفات کے ساتھ ہی ختم اور مکمل ہو گیا۔

اور اُس کے بعد جس تاریخ کا آغاز ہوا اُس کے صفحات پر کارناموں کی جگہ ایسے رقم ہوئے، بابائے قوم اور شہید ملت لیاقت علی خان کی وفات کے بعد سے تا حال ہماری قومی تاریخ المیوں در المیوں کی تاریخ جس کے صفحات کا ایک سرا مقبوضہ کشمیر کی لہو رنگ وادی، سری نگر کے خوں آلود پہاڑوں سے لے کر ڈھاکہ اور چٹاگانگ کی خون آلود گلیوں تک پھیلا ہوا ہے تو دوسرا صوبہ بلوچستان و سرحد کے کوہساروں سے لے کر کراچی کی سڑکوں تک سسکتی ہوئی مظلوم انسانیت اور بے بسی و لاچارگی کی تاریخ بیان کرتا ہے۔ان المیوں نے ہمیں ایک متحد و منظم قوم سے چھوٹے چھوٹے انسانی گروہوں اور بکھرے ہوئے بھیڑوں کے ریوڑ میں تبدیل کر دیا۔انگریزوں اور ہندو بنیے سے لڑ کر پاکستان حاصل کرنے والی قوم جغرافیائی، لسانی اور نسلی تضادات میں الجھ کر بکھر گئی۔اقتدار مافیا نے کبھی جمہوریت، کبھی اسلام،اور کبھی غریب پروری کے لبادوں میں روپ بدل بدل کر جمہوریت کی دھجیاں اڑائیں،اسلام کے ساتھ کھلا مذاق کیا اور سیاست کا وہ کھیل کھیلا جس کے احوال دیکھ کر شاید گورستانوں کے گل فروش بھی شرمندہ ہوتے ہوں، سیاستدانوں کی باہمی چپقلش، سیاسی مفادات کی کالی آندھی نے تحریک پاکستان کے مقاصد کے ساتھ قرار داد مقاصد کو بھی نہ صرف دھندلا کر رکھ دیا

بلکہ بانیان پاکستان اور تحریک پاکستان کے گمنام شہیدوں کی ارواح کو بھی زخم لگائے جنھوں نے اپنا سب کچھ اس مملکت عظیم کے قیام کیلئے قربان کیا تھا۔

قوم گذشتہ 63 برس سے اپنی ناکام تمناؤں اور حسرتوں کے لاشے اٹھائے امید بر آس رہی جبکہ حکمرانوں نے ہر مرتبہ وطن عزیز پاکستان کے جواز کی توہین کی اور قیام پاکستان کے بنیادی مقصد کو فراموش کردیا، ہر مرتبہ وعدہ خلافی کی گئی، حکمرانوں نے پاکستان کو اپنے باپ کہ جاگیر سمجھ کر اس بری طرح لوٹا کہ آج پوری قوم کاسہ گدائی لئے ورلڈ بینک، آئی ایم ایف جیسے اسلام اور پاکستان دشمن اداروں کے سامنے کھڑی ہے جو اپنی مرضی سے ہمارا بجٹ بنواتے ہیں ہم پر ٹیکس لگواتے ہیں، بخدا یہ سریحاً توہین ہے اُن جذبوں کی جو قیام پاکستان کیلئے دی جانے والی قربانیوں کے پیچھے کارفرما تھے، یہ توہین ہے اُس خون کی جو پاکستان کیلئے شہداکے بدن سے بہا، یہ توہین ہے اُس نظریئے کی جس کی بنیاد پر تحریک پاکستان چلائی گئی، اور یہ توہین ہے اُس تاریخ کی جس کی پیشانی پر اسلام کی 12 سو سالہ حکمرانی کا تاج سجا رہا اور جس نے دنیا کو رہنے، سہنے اور جینے کے ڈھنگ اور قرینے سکھائے۔

آج اسی قوم کی تباہی و بربادی پر باطل ہنس رہا ہے، قوم بانیان پاکستان کی

قربانیوں اور مقاصد کو بھول کر مفادات میں الجھ گئی ہے ہر کوئی کہیں بھی ہو اپنی
مفاداتی جنگ سے باہر نہیں آرہا ہے۔اس وقت قوم جس دور آشوب سے گزر رہی ہے
وہ انتہائی خطرناک اور بھیانک منظر کی عکاسی کر رہا ہے۔نادان حکمرانوں نے "سب سے
پہلے پاکستان" کا نعرہ لگایا جس کے خطرناک نتائج آج برآمد ہو رہے ہیں، ہونا تو یہ
چاہیے تھا کہ وہ " سب سے پہلے اسلام " یعنی نظریہ پاکستان کا نعرہ بلند کرکے عالم اسلام
اور صہیونی طاقتوں سے غیر جانبدارانہ باہمی مفاہمت اور بین الاقوامی تعاون کے ذریعے
اپنے تشخص اور قومی حیثیت کو برقرار رکھتے براہ راست یہودیوں اور صہیونیوں کی
جارحیت کے علمبردار بن گئے اور عالم اسلام کی نظروں میں گر گئے وہ جنگ جو امریکہ
کل تک افغانستان اور عراق میں لڑرہا تھا آج کمال مہارت سے اُس نے وہ جنگ
پاکستان کے اندر شروع کرا رکھی ہے جس سے ہمارا اسلامی تشخص اور مقام ہی متاثر
نہیں ہو رہا بلکہ اس کا براہ راست اثر ہماری آزادی اور خود مختاری پر پڑ رہا ہے اور دشمن
چاروں طرف سے منہ کھولے ہمیں نگلنے کیلئے تیار کھڑا ہے۔ لہٰذا اس نازک وقت میں
ہمیں اسلام کی درخشاں تاریخ کی روشنی میں اپنے گھوڑے ہر لمحے تیار رکھنے
چاہیے، دشمن نے پاکستان کو کبھی معاف نہیں کیا اُس کا تو مقصد ہی یہی تھا کہ پاکستان چند
ماہ میں ختم ہو جائے لیکن وہ بابائے قوم قائد اعظم محمد علی جناح کے اِس قول اور حقیقت
کو بھول گیا کہ "پاکستان خدا کی مرضی ہے اور یہ مرضی پوری ہو کر رہے گی پاکستان
قیامت تک زندہ رہے گا"۔

انشاءاللہ پاکستان قیامت تک زندہ وآباد اور قائم و دائم رہے گا، دشمن کی کوئی چال کوئی حربہ پاک سرزمین کو نقصان نہیں پہنچاسکے گا، ہم کل بھی آزاد تھے، آج بھی آزاد ہیں اور اپنے رب کی عطا سے کل بھی آزاد ہونگے، آج ہم اس پاک سرزمین کے مرغزاروں، ریگزاروں، اور آباد قصبوں اور شہروں میں اپنی آزاد فضاوں کے ساتھ محو رقص ہیں، یہاں کی سرسبز و شاداب وادیاں ہمیں زندگی کے جبر سے بے خبر کئے ہوئے ہیں، جبکہ اس کے دامن میں جاری دریا اور اس کی تہوں میں چھپے خزانے ہماری توانائیوں کے جواب میں اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے کیلئے تیار ہیں، یہاں کے پہاڑوں کی بلندیاں اور سمندر کی وسعتیں ہماری ہمتوں کی آزمائش کیلئے محو انتظار ہیں، قدرت کی اَن گنت عطیات اس خطہ ارضی کے دامن میں پوشیدہ ہیں، لیکن افسوس کہ ہماری تمام توانائیاں سہل انگاری کی نظر ہوگئیں، ہماری خوابیدہ صلاحتیں کسی معجزہ کے ظہور کا انتظار کررہی ہیں، اب وقت آگیا ہے کہ ہم سہل انگاری کے فریب اور معجزوں کے انتظار کے سحر سے باہر نکلیں اور سوچیں کہ وہ کون سے دشمن ہیں جنھوں نے ہمیں 63برس تک قیام کے پاکستان کی اصل منزل سے دور رکھا ہوا ہے، پاکستان ہمارے پاس اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت ہے۔

یہ امانت ہے اُن شہداء کی جنھوں نے اس کی بنیادیں اپنے گرم لہو سے

اٹھائیں، یہ امانت ہے ہماری آئندہ نسلوں کی جنہیں کل اس کا پاسبان بننا ہے، یاد رکھیں کہ پاکستان ایک حقیقت ہے یہ عطیہ خداوندی ہے اس نعمت سے فیضیابی کیلئے ہمیں اپنے آپ کو پورے خلوص اور عزم صمیم کے ساتھ تیار کرنا ہوگا جس طرح ہمارے آباء و اجداد نے اپنی انتھک محنت اور کامل جذبہ ایمان سے اسلام کے پیغام حق کو جزیرہ ہائے عرب کے ریگزاروں سے نکال کر دنیائے عالم کے گوشہ گوشہ تک پہنچایا تھا، آج ہمیں اُسی جذبہ اور ایمان کے ساتھ رخت سفر باندھنا ہوگا انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ کی طرف سے فتح و نصرت کے دروازے کھلتے جائیں گے اور گردوں سے آج بھی فرشتوں کا نزول قطار اندر قطار ہونا شروع ہوجائے گا، آیئے ہم سب مل کر اپنے بزرگوں کی اِس امانت کی حفاظت کریں، پاکستان کی نامکمل عمارت کی تعمیر کریں، اور اُس تصور پاکستان کی تکمیل کریں جس کی تخریب ہمارے دشمنوں کا مقصد و مدعا ہے، آج تکمیل پاکستان کیلئے ہمیں وہی جذبے، وہی ولولے اور وہی قربانیاں دینا ہونگی جس کا نظارہ تشکیل پاکستان کے وقت ہمارے آباؤ اجداد نے پیش کیا تھا، آیئے تکمیل پاکستان کی جد وجہد کا عملی حصہ بن کر جسم و جاں پر صبح آزادی کا قرض چکایئے۔

لہو برسا ہے آنسو لٹے رہبر و کٹے رشتے
ابھی تک نامکمل ہے مگر تعبیر آزادی

فقہ حنفی کا ایک عظیم ورثہ

"امام اعظم" کے لقب سے یاد کیے جانے والے حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ شہرت قرآن مجید اور حدیث مبارکہ کی روشنی میں اجتہاد اور استنباط مسائل کی وجہ سے ہے، احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اکٹھا اور تدوین دینے والے امام ابو حنیفہ فقہ حنفی کے بانی سمجھے جاتے ہیں اور آپ کے ماننے والے دنیا میں حنفی کہلاتے ہیں، آپ کا اصل نام نعمان بن ثابت بن زوطا اور کنیت ابو حنیفہ تھی، اسلامی فقہ میں حضرت امام اعظم ابو حنیفہ کا مقام بہت بلند ہے، 80 ہجری بمطابق 699ء میں کوفہ میں پیدا ہونے والے امام ابو حنیفہ نے بیس سال کی عمر میں اعلیٰ علوم کی تحصیل کی ابتداء کی، آپ نہایت ذہین اور قوی حافظہ کے مالک تھے، آپ کا زہد و تقویٰ فہم و فراست اور حکمت و دانائی بہت مشہور تھی، علم الادب، علم الانساب اور علم الکلام کے حصول کے بعد علم فقہ کیلئے امام حماد کے حلقہ درس سے فیض یاب ہوئے، آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کی براہ راست زیارت کی اور اُن سے علم حدیث حاصل کیا، آپ اِس اعتبار سے منفرد ہیں کہ آپ تابعی ہیں، آپ کے علاوہ امام مالک سمیت ائمہ حدیث اور ائمہ فقہ میں کوئی امام بھی تابعی نہیں، آپ نے اپنی عمر مبارک میں 7 ہزار مرتبہ ختم قرآن کیا، چالیس 40 سال تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کی، رات کے دو نفلوں میں پورا قرآن حکیم ختم

کرنے والے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃاللہ علیہ دن کو علم پھیلاتے اور رات کو عبادت کرتے،آپ کی حیات مبارکہ کے لاتعداد گوشے ہیں،ائمہ حدیث آپ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک طرف آپ علم کے سمندر تو دوسری طرف زہد و تقویٰ اور طہارت کے پہاڑ ہیں،آپ نے 150 ہجری میں وفات پائی۔

امام اعظم نے فقہ حنفیہّ کی صورت میں اسلام کی قانونی و دستوری جامعیت کی لاجواب شہادت مہیا کی اور آپ نے جو مسائل مدون کیے اُن کی تعداد بارہ لاکھ ستر ہزار سے زائد ہے،امام ابو حنیفہ اور اُن کے شاگردوں امام قاضی ابو یوسف اور امام محمد بن الحسن الشیبانی نے حنفی فقہ کی باضابطہ تدوین کی،آج دنیا میں فقہ حنفی کے پیروکاروں کی تعداد سب سے زیادہ ہے،آپ کے اجتہادی مسائل تقریباً بارہ سو سال سے تمام اسلامی ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں،واضح رہے کہ عباسی خلفاء کے عہد میں سرکاری فقہ حنفی تھی، عثمانی ترک بھی حنفی تھے اور بخارا، خراسان اور بغداد اِن کے خاص مرکز تھے، حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی عظیم اسلامی سلطنتوں میں آپ ہی کے مسائل متخرجہ، قانون سلطنت تھے اور آج بھی اسلامی دنیا کا بیشتر حصہ آپ ہی کے فقہی مذہب کا پیرو کار ہے۔

یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ تمام ائمہ کرام و محدثین عظام عقائد و اصول میں متفق ہیں،البتہ اِن کے مابین فروعی مسائل کا اختلاف اجتہاد کی

بنیاد پر ہے، ہر امام کے پاس اپنے مسلک کی تائید و موافقت میں دلائل موجود ہیں، جس کی وجہ سے ائمہ اربعہ کے تمام متبعین ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں، لیکن بعض حلقوں کی جانب سے فقہ حنفی پر اعتراض کیا جاتا رہا ہے کہ فقہ حنفی کی بنیاد صرف رائے اور قیاس پر ہے، جبکہ بعض معترضین نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کوئی صحیح حدیث نہیں ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ قرآن مجید اور حدیث مبارکہ کی روشنی میں قیاس اور رائے سے کام لے کر اجتہاد اور استنباط مسائل کرتے ہیں، جسے وہ خود بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "میں سب سے پہلے کسی مسئلے کا حکم کتاب اللہ سے اخذ کرتا ہوں، پھر اگر وہاں وہ مسئلہ نہ پاؤں تو سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے لے لیتا ہوں، جب وہاں بھی نہ پاؤں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے اقوال میں سے کسی کا قول مان لیتا ہوں اور اُن کا قول چھوڑ کر دوسروں کا قول نہیں لیتا اور جب معاملہ ابراہیم شعبی، ابن سیرین اور عطاء پر آجائے تو یہ لوگ بھی مجتہد تھے اور اس وقت میں بھی ان لوگوں کی طرح اجتہاد کرتا ہوں۔"

لیکن اِس کے باوجود سراج اُلامہ سیدنا نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ "انہوں نے بعض مسائل میں احادیث مبارکہ کے خلاف رائے دی۔" زیر نظر کتاب" دینی مسائل قرآن و سنت کے دلائل کی روشنی میں" دراصل انہی الزامات کا خوبصورت علمی جواب ہے، ارضِ فلسطین سے تعلق رکھنے والے کتاب کے

مصنف امام ابو محمد علی بن زکریا المنبجی ساتویں صدی ہجری کے ایک ممتاز عالم دین
ہیں،اِس کتاب میں مصنف نے دلائل و براہین سے یہ ثابت کیا ہے کہ امام اعظم کے
نزدیک قرآن و حدیث کے خلاف رائے دینے کا تصور بھی نہیں تھا، وہ روایت کو
درایت کی کسوٹی پر جانچتے تھے اور جو روایت قرآن و حدیث سے متصادم اور درایت
کے خلاف ہوتی اُس میں تامل فرماتے تھے، صاحب مصنف نے کتاب کے ہر باب میں
قرآنی آیات، احادیث رسول اور اجماع و قیاس کی ترتیب کے ساتھ مذکورہ باب سے
متعلق ائمہ فقہ کی آراء کا ذکر کرتے ہوئے پورے فقہی مبحث کو مدلل و منصوص انداز
میں پیش کیا ہے،اِس کتاب میں مصنف نے علماء کرام کے مابین اختلافی مسائل کو فقہی
ابواب کی صورت میں مرتب کیا ہے، اُنھوں نے پہلے اہل علم کے اقوال بصورت
اعتراضات بیان کیے ہیں، پھر اُن کا علمی مناقشہ و تجزیہ کیا ہے اور اُس کے بعد جس قول کا
راجح سمجھا، اُسے ترجیح دی اور ادلہ و براہین سے اپنے اقوال کی تائید کی ہے، یوں صاحب
مصنف نے ہمارے لیے ایک منفرد و یکتا علمی کتاب تیار کی ہے جو بلاشبہ فقہ حنفی میں ایک
عظیم ورثہ کی حیثیت رکھتی ہے۔
عصر حاضر کے بحث و تحقیق کے تناظر میں اِس کتاب کی افادیت اور بھی اِس لیے بڑھ گئی
ہے کہ سعودی عرب کے ایک فاضل اسکالر ڈاکٹر محمد فضل عبدالعزیز المراد نے پانچ
مختلف قلمی نسخوں (جو کہ ترکی، مکہ مکرمہ اور مصر کی مختلف

لائبریوں میں محفوظ ہیں) کی مدد سے، اِس کتاب کی تحقیق و تخریج کرکے جامعہ الازہر مصر سے جولائی 1976ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے، فاضل محقق نے بلاشبہ زبردست علمی کاکام کیا ہے، انہوں نے اِس کتاب کے جملہ نصوص اور اقوال و آراء کے اصل مصادر اور مراجع کو تحقیقی انداز میں مندرج کیا گیا ہے، جس سے علماء وباحثین کیلئے اصل کتب کی طرف مراجعت میں آسانی پیدا ہو گئی ہے، کتاب کا اردو ترجمہ ایک مستند عالم دین اور فاضل علوم اسلامیہ جناب ظہیرالدین بھٹی نے کیا ہے، جو اِس سے قبل متعدد عربی کتب کا ترجمہ کر چکے ہیں، موصوف ملک اور بیرون ملک اہم علمی مناصب پر فائز رہ چکے ہیں اور ایک کہنہ مشق مترجم ہونے کے ساتھ استاد اور مدرس علوم اسلامیہ بھی ہیں اور علوم عصریہ پر بھی عبور رکھتے ہیں، یہ کتاب جو کہ شریعت اسلامی اور بالخصوص فقہ حنفی کے منصوص تفہیم کیلئے مصدر کی حیثیت رکھتی ہے کا اردو ترجمہ علماء طلباء اور فقہ اسلامی سے دلچسپی رکھنے والے افراد کیلئے کتاب سے کماحقہ استفادہ کو مزید سہل بنانے میں مددگار ثابت ہوگا، متن اور اردو ترجمہ کے موازنہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مترجم نے مضامین اور اُن کے مفاہیم کے مابین ربط اور توازن کو ترجمہ میں برقرار رکھا ہے۔

کتاب ھذا کی جلد اوّل کا اردو ترجمہ " دینی مسائل قرآن و سنّت کے دلائل کی روشنی میں " کے نام سے پہلی بار پیش کیا جارہا ہے، جو کہ شیخ زائد اسلامک

سینٹر کراچی کے ڈائریکٹر پروفیسر ڈاکٹر نور احمد شاہتاز کی مساعی جلیلہ کا نتیجہ ہے، موصوف نے اس کتاب کو بیرون ملک ایک مطالعاتی دورے کے دوران دیکھا، پسند کیا اور افادہ عام کیلئے ترجمہ کی ضرورت محسوس کی، پروفیسر ڈاکٹر نور احمد شاہتاز صاحب کے بقول "یہ کتاب ایک ریسرچ ورک ہونے کے ساتھ ساتھ فقہ اسلامی کے جدید مصادر و مراجع میں ایک اہم مرجع" اللباب فی الجمع بین السنۃ والکتاب" کا اردو ترجمہ ہے۔"ترجمہ کا اہتمام جامعہ کراچی کے زیر انتظام شیخ زائد اسلامک سینٹر کراچی نے کیا ہے، یہ اِس سینٹر کی جانب سے شائع ہونے والا پہلا تحقیقی کام ہے، چار سو تہتر صفحات کی اِس کتاب کی اشاعت سینٹر کے تحقیقی پروگراموں کے حوالے سے ایک اچھی پیش رفت ہے، ہم اِس گراں قدر کوشش اور کاوش پر شیخ زاید اسلامک سینٹر کے ڈائریکٹر جناب پروفیسر ڈاکٹر نور احمد شاہتاز اور بالخصوص کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب پیرزادہ قاسم صاحب جنھوں نے اِس کتاب کی اشاعت کی اجازت عطا فرمائی، کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ کریم اِس کتاب کے مصنف، محقق، مترجم اور دیگر معاونین کو اجر عظیم عطا فرمائے اور اِس کتاب کو باعث نفع خلائق بنائے۔آمین

سیلاب، سیاست اور بے بس عوام۔۔۔۔

ملک بھر میں سیلاب کی تباہ کاریاں جاری ہیں، ہر طرف تباہی و بربادی کی داستانیں بکھری ہوئی ہے۔اِس وقت ملک کے بہت سے شہر، قصبے اور دیہات زیر آب آچکے ہیں، رابطہ پل اور سڑکیں تباہ ہوچکی ہیں، ہزاروں گھر بہہ چکے ہیں، سینکڑوں کی تعداد میں قیمتی جانور اور کھڑی فصلیں تباہ ہوچکی ہیں، کاروبار اجڑ گئے ہیں، لاکھوں متاثرین کھلے آسمان تلے بے یارو مددگار پڑے ہیں،اکثر متاثرہ علاقوں میں قحط کی سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے اور سیلاب سے ہلاک ہونے والی انسانی جانوں کی تعداد ہزاروں میں پہنچ چکی ہے،میڈیا پر دکھائے جانے والے ڈوبتے بہتے خوفناک مناظر ہر دل کو دہلا رہے ہیں، کہیں معصوم بچوں کو سینوں سے لگائے مائیں مایوس آنکھوں سے اپنے گھروں کو ڈوبتے دیکھ رہی ہیں تو کہیں لوگ اپنے پیاروں کو سیلاب کی لہروں میں سوکھے پتوں کی مانند بہتے دیکھ کر بے بسی سے ہاتھ مل رہے،آہ و بکا کررہے ہیں، وہ لوگ جو کل تک امن و آشتی کے ساتھ اپنے گھروں اور خاندانوں کے درمیان زندگی بسر کررہے تھے آج حسرت ویاس اور بے بسی کی تصویر بنے امداد کے منتظر ہیں، حقیقت یہ ہے کہ سیلاب زدہ علاقوں کے متاثرین آج جس مشکل میں گرفتار ہیں،انہیں لفظوں کی شکل دینا بہت ہی مشکل اور کٹھن کام ہے،ایک محتاط اندازے کے مطابق حالیہ سیلاب اور بارش سے پورے ملک میں ڈیڑھ کروڑ سے

زائد آبادی متاثر ہوئی ہے، بے گھر ہونے والوں کی تعداد کے بارے میں حکومت درست اندازہ لگانے میں ناکام ہے جبکہ کاروبار، باغات، کھیتوں، سڑکوں، پلوں، تعلیمی اداروں، بجلی اور مواصلات کے دیگر ذرائع کو پہنچنے والا نقصان اِس کے علاوہ ہے۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ اس وقت پاکستان کو موجودہ تاریخ کے ایسے بدترین سیلاب کا سامنا ہے جسے اقوام متحدہ نے حالیہ سونامیوں سے بھی زیادہ تباہ کن قرار دیا ہے،اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق سیلاب سے متاثرین کی تعداد بحر ہند کی 2004 کی سونامی، 2005 کے کشمیر کے تباہ کن زلزلے اور 2010 کے ہیٹی میں آنے والے زلزلے کے سارے متاثرین سے بہت زیادہ ہے، اندازہ یہ ہے کہ اس سیلابی آفت سے ڈیڑھ کروڑ لوگ سے زائد متاثر ہوئے ہیں، جن کی بحالی کیلئے اربوں ڈالرز درکار ہوں گے،اس سیلاب میں اب تک ڈھائی ہزار سے زائد افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں،اس کے علاوہ مویشیوں کی ہلاکت، گھروں، پلوں اور سڑکوں کی تباہی کا اندازہ لگانا فی الحال بہت مشکل ہے،کپاس، چاول،گنا، سبزیوں اور پھلوں کی فصلیں تباہ و برباد ہو گئی ہیں، ایک ایسے ملک،جس میں پہلے ہی تقریباً 8 کروڑ لوگ خوراک کی کمی کا شکار تھے،خوراک کی مزید کمی واقع ہو گئی ہے۔

لیکن اِس المناک صورتحال میں جہاں ایک طرف قوم پاکستان کی تاریخ کی بدترین قدرتی آفت میں مبتلا بے یارو مددگار کھلے آسمان تلے بیٹھے امداد کے منتظر ہے وہیں دوسری طرف افسوسناک طرز عمل یہ ہے کہ ہمارے قومی قائدین ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کیلئے سیاسی بیان بازی میں مصروف اور حکمران بیرونی دوروں پر کمربستہ ہیں، یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اس بڑی آزمائش اور مشکل میں سیاسی جماعتوں کا کردار قومی تقاضوں کی نفی کر رہا ہے اور عوامی نمائندگی اور حقوق کی علمبردار یہ سیاسی جماعتیں نمبر گیم میں اس بری طرح الجھی ہوئی ہیں کہ ان کے پاس عوام کی دادرسی اور دل جوئی کے لیے وقت ہی نہیں ہے، قومی قائدین کے اِن رویوں کی وجہ سے ابھی تک وہ قومی جوش و جذبہ سامنے نہیں آسکا جس نے 8اکتوبر 2005ء کے زلزلے میں پوری قوم کو متحد و یک جان کردیا تھا اور لوگ اپنے مصیبت زدہ بہن بھائیوں کی مدد کیلئے ہر قربانی دینے کو تیار تھے،اِس شرمناک صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے امدادی ادارے کے سربراہ میجر جنرل ندیم کا کہنا ہے کہ حالیہ سیلاب کی تباہی 2005ء کے زلزلے سے کئی گنا زیادہ ہے، لیکن اِس کے باوجود نہ تو قوم میں وہ جذبہ بیدار ہوا ہے اور نہ ہی ہمارے قائدین اپنی سیاسی سرگرمیوں اور وابستگیوں سے بالاتر ہوکر سیلاب زدگان کی مدد کیلئے آگے بڑھ رہے ہیں۔

یہ درست ہے کہ سیلاب، زلزلے، طوفان، بارشیں اور قدرتی آفات قوموں کیلئے امتحان

ہوتی ہیں لیکن اِن امتحانوں میں وہی قومیں، معاشرے اور ملک کامیاب ہوتے ہیں جن کے اندر اتحاد، یکجہتی اور اپنے لوگوں کا درد موجود ہوتا ہے۔ اگر قوم کے اندر جذبہ انسانیت، اتحاد و یکجہتی اور قوم کے قائدین اپنے مفادات سے بالاتر ہو کر آگے بڑھنے کا جذبہ ہو تو بڑے سے بڑے امتحان میں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن ہماری بدقسمتی یہ کہ ہمارے قائدین اپنے سیاسی مفادات کے دائروں سے باہر نہیں نکلتے۔ اسی وجہ سے آج اِس طوفان بلاخیز میں ہمارے قومی قائدین سیاسی بیانات، بیرونی دوروں اور فضائی جائزوں سے نکل کر عملی طور پر ابھی تک سیلاب زدگان کے دکھوں اور مشکلات کا مداوا کرتے نظر نہیں آرہے، وہ تو صرف سیاسی بیانات اور لایعنی دعوؤں کے ذریعے اپنے سیاسی قد کاٹھ میں اضافہ کرنے کے خواہشمند ہیں، حال یہ ہے کہ حکمرانوں کا حکمرانوں سے مناظرہ چل رہا ہے اور اُن کے حواری اپنے رویوں سے ایک دوسرے کے خلاف باقاعدہ مورچہ زن ہیں، اس صورتِ حال کا اثر ہر طرف نظر آ رہا ہے، وفاق میں پیپلز پارٹی ہے اور پنجاب میں مسلم لیگ ن کی حکمرانی ہے، تختِ لاہور کی لڑائی میں ان دونوں اتحادیوں کو قطعی فکر نہیں کہ یہ وقت کیا ہے، قوم کس ابتلاء اور آزمائش سے گزر رہی ہے اور ہمیں اِس سے کیسے نبرد آزما ہونا چاہیے۔

انہیں فکر یہ ہے کہ ایک دوسرے کے خلاف پوائنٹ کس طرح سکور کیے جائیں، پیپلز پارٹی کی مہم جوئی پر مامور وفاقی وزراء کہہ رہے ہیں کہ تختِ لاہور سارے

وسائل لاہور پر صرف کر رہا ہے۔ لندن کی جائیدادیں بیچ کر پنجاب کے سیلاب زدگان کی مدد کیوں نہیں کرتا، کوئی برطانیہ کے دوروں کا حساب رکھ رہا ہے تو کہیں برطانیہ جانے کا معاملہ زیر بحث ہے، ق لیگ کہہ رہی ہے کہ خادم اعلیٰ فوٹو سیشن کرا رہے ہیں، خادمِ اعلیٰ فرما رہے ہیں کہ ق لیگ کے دور کے ناقص کاموں کی وجہ سے تباہی کا حجم بڑھ گیا ہے اور پل اور سڑکیں سیلابی ریلوں کا سامنا نہیں کر سکے، جن وفاقی وزیروں کا میاں برادران سے مطالبہ ہے کہ لندن کی جائیدادیں فروخت کرکے سرمایہ سیلاب زدگان پر خرچ کریں، اُن سے ہماری گزارش ہے کہ وہ سوئٹزرلینڈ اور لندن کے بینکوں میں پڑے قوم کے کروڑوں ڈالر واپس پاکستان منتقل کرادیں، قوم اُن کی احسان مند ہوگی، اصل معاملہ یہ ہے کہ ہمارا شمار اُن قوموں میں ہوتا ہے جن کے سیاسی رہنماء لاشوں پر بھی سیاست چمکاتے ہیں اور مصیبت کی گھڑی میں بھی صرف سیاسی مفادات حاصل کرنے سے نہیں چوکتے۔

قارئین محترم اِس تناظر میں آج ضرورت اِس امر کی ہے کہ تمام حکومتی عہدیداروں، امدادی ٹیموں، سماجی اور تاجر تنظیموں سمیت ہر عام آدمی کو متحد و منظم ہو کر سیلاب سے متاثرہ افراد کی بحالی اور انہیں ایک نئی زندگی شروع کرنے میں مدد دینے کیلئے ہنگامی بنیادوں پر کام کرنا ہوگا، لیکن یہ کام اُس وقت تک پایہ تکمیل تک نہیں پہنچایا جاسکتا جب تک حکومت اور عوام ملکر اِس

کام کو سرانجام نہ دیں،اِس وقت مملکت خداداد انتہائی نازک دور سے گزر رہی ہے،یہ وقت سیاست کرنے اور ایک دوسرے پر الزام تراشی کا نہیں ہے، ملک کی اقتصادی حالت جو پہلے ہی دہشت گردی کی وجہ سے تباہ حال ہے،آنے والے سیلاب نے مزید تباہ کرکے رکھ دی ہے،ایسی نازک حالت میں صرف ایمان اتحاد اور تنظیم ہی ہمیں اعتماد و یقین کا راستہ دکھا کر ہمت استقامت اور ثابت قدمی کی دولت فراہم کر سکتا ہے،آیئے اپنے قومی جوش وجذبے کو بیدار کریں، کیونکہ لاکھوں سیلاب زدگان کو ہماری مدد اور ہمدردی کی ضرورت ہے،ہزاروں بھوکے،پیاسے اور بے یارومددگار لوگ ہماری مدد کے منتظر ہیں،اِس نازک وقت میں ہمیں اپنے تمام تر اختلافات کو بھلا کر اور اپنے ذاتی و سیاسی مفادات کو بالائے طاق رکھ کر آگے بڑھ کر اپنے مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنا ہوگی، اُن کے دکھوں کا مداوا کرنا ہوگا اور زخموں پر مرہم رکھنا ہوگا،یاد رکھیں اگراِس قیامت خیز گھڑی میں ہم نے کوئی کمزوری دکھائی تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی اور ہم کبھی بھی قدرت کی گرفت و عذاب سے بچ نہیں سکیں گے۔

خاتم الانبیاء کے خاتم الخلفاء سیدنا علی المرتضی رضی اللہ عنہ

جنگ خیبر کا موقع ہے، لشکر اسلام نے قلعے کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا ہے، مرحب کا پایہ تخت خیبر کا قلعہ فتح کرنا آسان کام نہ تھا،اس قلعہ کو سر کرنے کے لیے پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ کو جھنڈا عنایت فرمایا اور دوسرے دن حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کو، لیکن فاتح خیبر ہونا تو کسی اور کے لیے مقدر ہو چکا تھا اس لیے قلعہ فتح نہ ہوا،جب اس مہم میں بہت زیادہ دیر ہوئی تو ایک دن پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کل میں جھنڈا ایک ایسے شخص کو دوں گا کہ جس کے ہاتھ پر اللہ تعالی فتح عطا فرمائیگا وہ شخص اللہ و رسول کو دوست رکھتا ہے اور اللہ و رسول اس کو دوست رکھتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خوشخبری کو سن کر صحابہ کرام نے وہ رات بڑی بیقراری میں کاٹی،ہر صحابی کی یہ تمنا تھی کہ اے کاش! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل صبح اسے جھنڈا عنایت فرمائیں تو اس بات کی سند ہو جائے کہ ہم اللہ و رسول کو محبوب رکھتے ہیں اور اللہ و رسول ہمیں چاہتے ہیں اور اس نعمت عظمیٰ و سعادت کبریٰ سے بھی سرفراز ہو جاتے کہ فاتح خیبر جاتے۔

دراصل وہ صحابی تھے ان کا عقیدہ تھا کہ اللہ کے محبوب دانائے خفایا وغیوب جناب احمد مجتبٰے محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے وہ کل ہو کر رہے گا، اس میں ذرہ برابر فرق نہیں ہو سکتا، جب صبح ہوئی تو تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین امیدیں لئے ہوئے بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور ادب کے ساتھ دیکھنے لگے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آج کس کو سرفراز فرماتے ہیں، سب کی ارمان بھری نگاہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لب مبارک کی جنبش پر قربان ہو رہی تھیں کہ پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، این علی بن ابی طالب، یعنی علی بن ابی طالب کہاں ہیں؟

لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! وہ آشوب چشم میں بتلا ہیں ان کی آنکھیں دکھتی ہیں آپ نے فرمایا کوئی جا کر ان کو بلا لائے، جب حضرت علی رضی اللہ عنہ لائے گئے تو رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آنکھوں پر لعاب دہن لگایا جس سے وہ بالکل ٹھیک ہو گئیں، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جھنڈا عنایت فرمایا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا میں ان لوگوں سے اس وقت تک لڑوں جب تک کہ وہ ہماری طرح مسلمان نہ ہو جائیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم ان کو اسلام کی طرف بلاؤ اور پھر بتلاؤ کہ اسلام قبول کرنے کے بعد ان پر کیا حقوق ہیں، خدا قسم اگر تمہاری کوشش سے ایک شخص کو بھی ہدایت مل گئی تو وہ تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بھی بہتر ہوگا، (بخاری، مسلم

لیکن اسلام قبول کرنے یا صلح کرنے کی بجائے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مقابلہ
کرنے کے لئے مرحب رجز پڑھتا ہوا قلعہ سے باہر نکلا، وہ بڑے گھمنڈ سے آیا تھا لیکن
شیر خدا علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ نے اس زور سے تلوار ماری کہ اس کے سر کو کاٹتی ہوئی
دانتوں تک پہنچ گئی اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا، اس کے بعد آپ نے فتح کا اعلان فرما
دیا، حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس روز آپ نے خیبر کا
دروازہ اپنی پیٹھ پر اٹھا لیا تھا اور اس پر مسلمانوں نے چڑھ کر قلعہ کو فتح کر لیا، اس کے
بعد آپ نے وہ دروزہ پھینک دیا، جب لوگوں نے اسے گھسیٹ کر دوسری جگہ ڈالنا چاہا تو
(چالیس آدمیوں سے کم اسے اٹھا نہ سکے، (تاریخ الخلفاء صفحہ 114
ابن عساکر نے ابو رافع سے روایت کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ خیبر
میں قلعہ کا پھاٹک ہاتھ میں لے کر اس کو ڈھال بنالیا وہ پھاٹک ان کے ہاتھ میں برابر
رہا اور وہ لڑتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالٰی نے ان کے ہاتھوں خیبر کو فتح فرمایا، اسکے
بعد پھاٹک کو آپ نے پھینک دیا، لڑائی سے فارغ ہونے کے بعد ہمارے ساتھ کئی
(آدمیوں نے مل کر اسے پلٹنا چاہا مگر وہ نہیں پلٹا، (تاریخ الخلفاء صفحہ 114

دوستو یہ ہیں پروردہ رسول، اقلیم ولایت کے شہنشاہ، عبادت و ریاضت میں مسلمانوں کے پیشوا، میدان کارزار کے تاجدار، معرکہ خیبر کے شہسوار، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غم خوار، خلفاءِ ثلاثہ کے خیر خواہ، تمام صحابہ کے محبوب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محب صادق جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کا مژدہ سنایا، جن سے بغض رکھنا کفر، جن سے محبت رکھنا ایمان، خاتون جنت کے شوہر، جنت کے جوانوں کے سردار، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ عم زاد، جن کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ناز برادری کریں، جن کو تہجد پڑھوانے کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم راتوں کو جگانے آئیں، جو اگر روٹھ جائیں تو سرکار صلی اللہ علیہ وسلم منانے آئیں، اور اسی عالم میں بوتراب کا لقب پائیں، جس سے وہ ناراض ہو جائیں، وہ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کا معتوب، اور جس سے وہ راضی ہو جائیں وہ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کا محبوب ہو، یہ وہ ہیں جن کی محبت میں جینا عبادت اور مرنا شہادت ہے یہ ہیں خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم الخلفاء سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ۔

حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کی ذات وہ ذات گرامی ہے جو بہت سے کمال و خوبیوں کی جامع ہے کہ آپ شیر خدا بھی ہیں اور داماد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم بھی، حیدر کرار بھی ہیں اور صاحب ذوالفقار بھی، حضرت

فاطمہ زاہرہ کے شوہر نامدار بھی اور حسنین کریمین کے والد بزرگوار بھی، صاحب سخاوت بھی اور صاحب شجاعت بھی، عبادت و ریاضت والے بھی اور فصاحت و بلاغت والے بھی، علم والے بھی اور حلم والے بھی، فاتح خیبر بھی اور میدان خطابت کے شہسوار بھی، غرضیکہ آپ بہت سے کمال و خوبیوں کے جامع ہیں اور ہر ایک میں ممتاز ویگانہ روزگار ہیں اسی لئے دنیا آپ کو مظہر العجائب والغرائب سے یاد کرتی ہے اور قیامت تک اسطرح یاد کرتی رہے گی۔

سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مناقب وفضائل بے شمار ہیں جتنی زیادہ حدیثیں آپ کی تعریف وتوصیف اور فضیلت میں منقول ہیں اتنی صحابہ میں سے کسی کے حق میں منقول نہیں ہیں، حضرت علی کی مناقب میں سے جو صحیح احادیث منقول ہیں اُن کے بارے میں امام احمد اور امام نسائی وغیرہ نے کہا ہے کہ ان کی تعداد ان احادیث سے کہیں زیادہ ہے جو دوسرے صحابہ کے حق میں منقول ہیں، علامہ جلال الدین سیوطی نے اس کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ متاخر ہیں اور ان کے زمانہ میں نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے درمیان اختلاف ونزاع کی خراب صورت حال پیدا ہو گئی تھی بلکہ خود سیدنا علی کی مخالفت کرنے والوں کا ایک بہت بڑا طبقہ پیدا ہوگیا تھا جنھوں نے ان کے خلاف جنگیں بھی لڑیں اور ان کی خلافت سے انحراف بھی کیا، لہذا علماء اور محدثین نے مقام علی کی حفاظتی اور مخالفین علی کی تردید وتغلیط کی خاطر

منقبت علی سے متعلق احادیث کو چن چن کر جمع بھی کیا، اور ان احادیث کو پھیلانے میں بہت سرگرم جد وجہد بھی کی، ورنہ جہاں تک خلفاء ثلاثہ کے مناقب کا تعلق ہے تو وہ حقیقت میں حضرت علی کے مناقب سے بھی زیادہ ہیں۔

آپ کا نام نامی "علی بن ابی طالب ،بن عبد المطلب، بن ہاشم بن عبد مناف ہے" اور کنیت "ابوالحسنین و ابو تراب ہے،طالب کے صاجبزادے ہیں یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی ہیں،آپ کی والدہ محترمہ کا اسم گرامی فاطمہ بنت اسد ہاشمی ہے اور وہ پہلی ہاشمی خاتون ہیں جنہوں نے اسلام قبول کیا اور ہجرت فرمائی۔ (تاریخ الخلفاء ص 113)

لوگ آپ کو حیدر بھی کہتے ہیں، حیدر دراصل حضرت علی کے نانا اسد کا نام تھا،جب آپ پیدا ہوئے تو اس وقت آپ کی والدہ فاطمہ بنت اسد نے آپ کا نام اپنے باپ کے نام پر ''حیدر'' رکھا پھر بعد میں ابو طالب نے اپنی طرف سے بیٹے کا نام ''علی'' رکھا اور جیسا کہ ایک روایت میں آیا ہے حضرت علی فرمایا کرتے تھے ، خود میرے نزدیک ابوتراب" سے زیادہ پسندیدہ کوئی نام نہیں ہے،آپ 30 عام الفیل میں پیدا ہوئے" اور اعلان نبوت سے پہلے ہی مولائے کل سید الرسل جناب احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش میں آئے کہ جب قریش قحط میں مبتلا ہوئے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طالب پر

عیال کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو لے لیا تھا،اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سائے میں آپ نے پرورش پائی اور انہی کی گود میں ہوش سنبھالا،آنکھ کھولتے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جمال جہاں آرا دیکھا،انہی کی باتیں سنیں اور انہی کی عادتیں سیکھیں،اس لئے بتوں کی نجاست سے آپکا دامن کبھی آلودہ نہ ہوا اور آپ نے کبھی بت پرستی نہ کی ، اسی لئے کرم اللہ وجہہ الکریم آپ کا لقب ہوا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نو عمر لوگوں میں سب سے پہلے اسلام سے مشرف ہوئے،تاریخ الخلفاء میں ہے کہ جب آپ ایمان لائے اس وقت آپ کی عمر مبارک دس سال تھی بلکہ بعض لوگوں کے قول کے مطابق نو سال اور بعض کہتے ہیں کہ آٹھ سال اور کچھ لوگ اس سے بھی کم بتاتے ہیں،امام اہلسنّت اعلیٰ حضرت احمد رضا محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ تنزیہ المکانتہ الحیدریہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ بوقت اسلام آپ کی عمر آٹھ دس سال تھی،آپ کے اسلام قبول کرنے کی تفصیل محمد بن اسحاق نے اس طرح بیان کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کو رات میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا،جب لوگ نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ لوگ یہ کیا کر رہے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ایسا دین ہے جس کو اس نے

اپنے لئے منتخب کیا ہے اور اسی کی تبلیغ و اشاعت کے لئے اپنے رسول کو بھیجا ہے، لہذا میں تم کو بھی ایسے معبود کی طرف بلاتا ہوں جو اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور میں تم کو اسی کی عبادت کا حکم دیتا ہوں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے کہا کہ جب تک میں اپنے باپ ابو طالب سے دریافت نہ کرلوں اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا، چونکہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو راز کا فاش ہونا منظور نہ تھا اس لئے آپ نے فرمایا اے علی! اگر تم اسلام نہیں لاتے ہو تو ابھی اس معاملہ کو پوشیدہ رکھو کسی پر ظاہر نہ کرو، حضرت علی رضی اللہ عنہ اگرچہ اس وقت رات میں ایمان نہیں لائے مگر اللہ تعالٰی نے آپ کے دل میں ایمان کو راسخ کر دیا تھا دوسرے روز صبح ہوتے ہی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کی پیش کی ہوئی ساری باتوں کو قبول کر لیا اسلام لے آئے۔

پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اللہ تعالٰی کے حکم کے مطابق مکہ معظّمہ سے ہجرت کا ارادہ فرمایا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو بلا کر فرمایا کہ مجھے اللہ تعالٰی کی طرف سے ہجرت کا حکم ہو چکا ہے لہذا میں آج مدینہ روانہ ہو جاؤں گا تم میرے بستر پر میری سبز رنگ کی چادر اوڑھ کر سو رہو تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی قریش کی ساری امانتیں جو میرے پاس رکھی ہوئی ہیں انکے مالکوں کو دے کر تم بھی مدینہ چلے آنا، یہ موقع بڑا ہی خوفناک اور

نہایت خطرہ کا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو معلوم تھا کہ کفار قریش سونے کی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کر چکے ہیں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بستر پر سونے سے منع فرما دیا ہے، آج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر قتل گاہ ہے، لیکن اللہ کے محبوب دانائے خفایا و غیوب جناب احمد مجتبےٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے کہ "تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی قریش کی امانتیں دے کر تم بھی مدینہ چلے آنا".

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو پورا یقین تھا کہ دشمن مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکیں گے میں زندہ رہوں گا اور مدینہ ضرور پہنچوں گا، لہٰذا پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر جو آج بظاہر کانٹوں کا بچھونا تھا وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے پھولوں کی سیج بن گیا، اس لئے کہ ان کا عقیدہ تھا کہ سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکل سکتا ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے خلاف نہیں ہو سکتا، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رات بھر آرام سے سویا صبح اٹھکر لوگوں کی امانتیں ان کے مالکوں کو سونپنا شروع کیں اور کسی سے نہیں چھپا اسی طرح مکہ میں تین دن رہا پھر امانتوں کے ادا کرنے کے بعد میں بھی مدینہ کی طرف چل پڑا، راستہ میں بھی کسی نے مجھ سے کوئی تعارض نہ کیا یہاں تک کہ میں قبا میں پہنچا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی بہت سی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ آپ پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد اور چچازاد بھائی ہونے کے ساتھ "عقد مواخاۃ" میں بھی آپ کے بھائی ہیں جیسا کہ ترمذی شریف میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مدینہ طیبہ میں اخوت یعنی بھائی چارہ قائم کیا دو دو صحابہ کو بھائی بھائی بنایا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ روتے ہوئے بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ نے سارے صحابہ کے درمیان اخوت قائم کی،ایک صحابی کو دوسرے صحابی کا بھائی بنایا مگر مجھ کو کسی کا بھائی نہ بنایا میں یوں ہی رہ گیا، تو پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "انت اخی فی الدنیا والاٰخرۃ"یعنی تم دنیا اور آخرت (دونوں میں میرے بھائی ہو۔ (مشکوۃ شریف 564

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شجاعت اور بہادری شہرہ آفاق ہے، عرب و عجم میں آپ کی قوت بازو کے سکے بیٹھے ہوئے ہیں آپ کے رعب و دبدبہ سے آج بھی بڑے بڑے پہلوانوں کے دل کانپ جاتے ہیں،جنگ تبوک کے موقع پر سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو مدینہ طیبہ پر اپنا نائب مقرر فرمادیا تھا اس لئے اس میں حاضر نہ ہو سکے باقی تمام غزوات و جہاد میں شریک ہو کر بڑی جانبازی کے

ساتھ کفار کا مقابلہ کیا اور بڑے بڑے بہادروں کو اپنی تلوار سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

جنگ بدر میں جب حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے اسود بن عبد الاسد مخزومی کو کاٹ کر جہنم میں پہنچایا تو اس کے بعد کافروں کے لشکر کا سردار عتبہ بن ربیعہ اپنے بھائی شیبہ بن ربیعہ اور اپنے بیٹے ولید بن عتبہ کو ساتھ لے کر میدان میں نکلا اور چلّا کر کہا کہ اے محمد ! (صلی اللہ علیہ وسلم) ، اشراف قریش میں سے ہمارے جوڑ کے آدمی بھیجئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا، اے بنی ہاشم ! اٹھو اور حق کی حمایت میں لڑو جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی کو بھیجا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کو سن کر حضرت حمزہ، حضرت علی اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہم دشمن کی طرف بڑھے، لشکر کے سردار عتبہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے مقابل ہوا اور ذلت کے ساتھ مارا گیا، ولید جسے اپنی بہادری پر بہت بڑا ناز تھا وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلہ کے لئے مست ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا آگے بڑھا اور ڈینگیں مارتا ہوا آپ پر حملہ کیا مگر شیر خدا علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ الکریم نے تھوڑی ہی دیر میں اسے مار گرایا اور ذوالفقار حیدری نے اس کے گھمنڈ کو خاک و خون میں ملا دیا، اس کے بعد آپ نے دیکھا کہ عتبہ کے بھائی شیبہ نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو زخمی کر دیا ہے تو آپ نے چھوٹ کر اس پر حملہ کیا

اور اسے بھی جہنم پہنچا دیا۔

جنگ احد میں جب کہ مسلمان آگے اور پیچھے سے کفار کے بیچ میں آ گئے جس کے سبب بہت سے لوگ شہید ہوئے تو اس وقت پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم بھی کافروں کے گھیرے میں آ گئے اور انھوں نے اعلان کر دیا کہ اے مسلمانوں! تمہارے نبی قتل کر دیئے اس اعلان کو سن کر مسلمان بہت پریشان ہو گئے یہاں تک کہ اِدھر اُدھر ہو گئے بلکہ ان میں سے بہت لوگ بھاگ بھی گئے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم فرماتے ہیں کہ جب کافروں نے مسلمانوں کو آگے پیچھے سے گھیر لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری نگاہ سے اوجھل ہو گئے تو پہلے میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زندوں میں تلاش کیا مگر نہیں پایا پھر شہیدوں میں تلاش کیا وہاں بھی نہیں پایا تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ ایسا ہر گز نہیں ہو سکتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میدان جنگ سے بھاگ جائیں لہذا اللہ تعالی نے اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمان پر اٹھا لیا، اس لئے اب بہتر یہی ہے کہ میں بھی تلوار لیکر کافروں میں گھس جاؤں یہاں تک کہ لڑتے لڑتے شہید ہو جاؤں۔

فرماتے ہیں کہ میں نے تلوار لیکر ایسا سخت حملہ کیا کہ کفار بیچ میں سے ہٹتے گئے اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیا تو مجھے بے

انتہا خوشی ہوئی اور میں نے یقین کیا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعہ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت فرمائی، میں دوڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر کھڑا ہوا کفار گروہ در گروہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرنے کے لئے آنے لگے، آپ نے فرمایا علی ان کو روکو، تو میں نے تنہا سب کا مقابلہ کیا اور ان کے منہ پھیر دیئے اور کئی ایک کو قتل بھی کیا، اس کے بعد پھر ایک گروہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرنے کی نیت سے بڑھا آپ نے پھر میری طرف اشارہ فرمایا تو میں نے پھر اس گروہ کا اکیلے مقابلہ کیا، اس کے بعد حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے میری بہادری اور مدد کی تعریف کی تو آپ نے فرمایا انہ منی وانا منہ، یعنی" بیشک علی مجھ سے ہیں اور میں علی سے ہوں،" مطلب یہ ہے کہ علی کو مجھ سے کمال قرب حاصل ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کو سن کر حضرت جبرائیل نے عرض کیا وانا منکما، یعنی" میں تم دونوں سے ہوں،" سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ پا کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا شہید ہو جانے کی نیت سے کافروں کے جتھے میں تنہا گھس جانا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرنے والے گروہ در گروہ سے اکیلے مقابلہ کرنا آپ کی بے مثال بہادری اور انتہائی دلیری کی خبر دیتا ہے ساتھ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے عشق اور سچی محبت کا بھی پتہ دیتا ہے۔

حضرت کعب بن مالک انصاری سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جنگ خندق کے روز عَمرو بن عبدِ ود (جو ایک ہزار سوار کے برابر مانا جاتا تھا) ایک جھنڈا لئے ہوئے نکلا تا کہ وہ میدان جنگ کو دیکھے، جب وہ اور اس کے ساتھ سوار ایک مقام پر کھڑے ہوئے تو اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے عَمرو! تو قریش سے اللہ کی قسم دے کر کہا کرتا تھا کہ جب کبھی مجھ کو کوئی شخص دو اچھے کاموں کی طرف بلاتا ہے تو میں اس میں سے ایک کو ضرور اختیار کرتا ہوں، اس نے کہا ہاں میں نے ایسا کہا تھا اور اب بھی کہتا ہوں، آپ نے فرمایا کہ میں تجھے اللہ و رسول (جل جلالہ، صلی اللہ علیہ والہ واصحابہ وسلم) اور اسلام کی طرف بلاتا ہوں، عَمرو نے کہا مجھے ان میں سے کسی کی حاجت نہیں، حضرت علی نے فرمایا تو اب میں تجھ کو مقابلہ کی دعوت دیتا ہوں اور اسلام کی طرف بلاتا ہوں، عَمرو نے کہا اے میرے بھائی کے بیٹے کس لئے مقابلہ کی دعوت دیتا ہے خدا کی قسم میں تجھ کو قتل کرنا پسند نہیں کرتا، حضرت علی نے فرمایا یہ میدان میں پتہ چلے گا دونوں میدان میں آ گئے اور تھوڑی دیر مقابلہ ہونے کے بعد شیر خدا نے اسے موت کے گھاٹ اتار کر جہنم میں پہنچا دیا، شیر خدا کی اس بہادری اور شجاعت کو دیکھ کر میدان جنگ کا ایک ایک ذرہ زبان حال سے پکار اٹھا۔

شاہ مرداں شیر یزداں قوتِ پروردگار

لا فتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی فضیلت میں اتنی حدیثیں وارد ہیں بلکہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جتنی حدیثیں آپ کی فضیلت میں ہیں کسی اور صحابی کی فضیلت میں اتنی حدیثیں نہیں ہیں، بخاری اور مسلم میں حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ غزوہ تبوک کے موقع پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ طیبہ میں رہنے کا حکم فرمایا اور اپنے ساتھ نہ لیا تو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ! آپ مجھے یہاں عورتوں اور بچوں پر اپنا خلیفہ بنا کر چھوڑے جاتے ہیں، تو سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کیا تم اس بات پر راضی نہیں کہ میں تمہیں اس طرح چھوڑے جاتا ہوں کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت ہارون علیہ السلام کو چھوڑ گئے، البتہ فرق صرف اتنا ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، مطلب یہ ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر جانے کے وقت چالیس دن کے لئے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو بنی اسرائیل پر اپنا خلیفہ بنایا تھا اسی طرح جنگ تبوک کی روانگی کے وقت میں تم کو اپنا خلیفہ اور نائب بنا کر جا رہا ہوں، لہذا جو مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نزدیک حضرت ہارون علیہ السلام کا تھا وہی مرتبہ ہماری بارگاہ میں تمہارا ہے، اس لئے اے علی ! تمہیں خوش ہونا ،چاہیے، تو ایسا ہی ہوا کہ اس خوشخبری سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تسلی ہو گئی

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علی سے منافق محبت نہیں کرتا اور مومن علی سے بغض و عداوت نہیں رکھتا۔ (ترمذی)

سبحان اللہ ! حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کیا ہی بلند و بالا شان ہے کہ سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے محبت نہ کرنے کو منافق ہونے کی علامت ٹھہرایا اور آپ سے بغض و عداوت رکھنے کو مومن نہ ہونے کا معیار قرار دیا، یعنی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت نہ کرے وہ منافق ہے اور جو ان سے بغض و عداوت رکھے وہ مومن نہیں۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (جس نے علی کو برا بھلا کہا تو تحقیق اس نے مجھ کو برا بھلا کہا۔" (مشکوۃ"

طبرانی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اور ترمذی و حاکم حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: انا مدینۃ العلم و علی بابھا، یعنی میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں، علامہ جلال الدین

سیوطی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو حدیث حسن قرار دیتے ہیں (تاریخ الخلفاء صفحہ 116)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے علی سے محبت کی تو اس نے مجھ سے محبت کی، جس نے علی سے دشمنی کی اس نے مجھ سے دشمنی کی اور جس نے مجھ سے دشمنی کی اس نے اللہ سے دشمنی کی۔ (تاریخ الخلفاء بحوالہ طبرانی)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا اور فرمایا کہ تمہاری حالت حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسی ہے کہ یہودیوں نے ان سے یہاں تک دشمنی کی کہ ان کی والدہ حضرت مریم (رضی اللہ عنہا) پر تہمت لگائی اور نصاریٰ نے ان سے محبت کی تو اس قدر حد سے بڑھ گئے کہ ان کو اللہ یا اللہ کا بیٹا کہہ دیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تو کان کھول کر سن لو، میرے بارے میں بھی دو گروہ ہلاک ہوں گے۔ ایک میری محبت میں حد سے تجاوز کرے گا اور میری ذات سے ایسی باتوں کو منسوب کرے گا جو مجھ میں نہیں ہیں اور دوسرا اگر وہ اس قدر بغض و عداوت رکھے گا کہ مجھ پر بہتان لگائے گا۔ (تاریخ الخلفاء

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم علم کے اعتبار سے بھی علمائے صحابہ میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں، پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سے حدیث آپ سے مروی ہیں،آپ کے فتوے اور فیصلے اسلامی علوم کے انمول جواہرپارے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہم نے جب بھی آپ سے کسی مسئلہ کو دریافت کیا تو ہمیشہ درست ہی جواب پایا، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہاکے سامنے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ علی سے زیادہ مسائل شرعیہ کا جاننے والا کوئی نہیں ہے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مدینہ طیبہ میں علم فرائض اور مقدمات کے فیصلہ کرنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ علم رکھنے والا کوئی دوسرا نہیں تھا اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سوائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کوئی یہ کہنے والا نہیں تھا کہ جو کچھ پوچھنا ہو مجھ سے پوچھ لو۔ (تاریخ الخلفاء

حضرت علی مرتضی کرم اللہ وجہہ الکریم نے 17 رمضان المبارک 40 ھ کو علی الصبح بیدار ہو کر اپنے بڑے صاحبزادے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ سے فرمایا آج رات خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! آپ کی امت نے میرے ساتھ کجروی اختیار کی ہے اور سخت نزاع برپا کر دیا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم

ظالموں کے لئے دعا کرو، تو میں نے اس طرح دعا کی کہ یا اللہ العالمین ! تو مجھے ان
لوگوں سے بہتر لوگوں میں پہنچا دے اور میری جگہ ان لوگوں پر ایسا شخص مسلط کر دے
جو برا ہو، ابھی آپ یہ بیان ہی فرمارہے تھے کہ مؤذن نے آواز دی الصلاۃ
الصلاۃ، حضرت علی رضی اللہ عنہ نماز پڑھانے کے لئے گھر سے چلے، راستے میں لوگوں کو
نماز کے لئے آواز دے دے کر آپ جگاتے جاتے تھے کہ اتنے میں ابن ملجم آپ کے
سامنے آگیا اور اس نے اچانک آپ پر تلوار کا بھرپور وار کیا وار اتنا سخت تھا کہ آپ کی
پیشانی کنپٹی تک کٹ گئی اور تلوار دماغ پر جا کر ٹھہری، شمشیر لگتے ہی آپ نے
فرمایا : فزت برب الکعبۃ، یعنی رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا، آپ کے زخمی ہوتے
ہی چاروں طرف سے لوگ دوڑ پڑے اور قاتل کو پکڑ لیا۔ (تاریخ الخلفاء)
حضرت عقبہ بن ابی صہبا کہتے ہیں کہ جب بد بخت ابن ملجم نے آپ پر تلوار کا وار کیا یعنی
آپ زخمی ہو گئے تو امام حسن رضی اللہ عنہ روتے ہوئے آپ کی خدمت میں
آئے، آپ نے ان کو تسلی دی اور فرمایا بیٹے ! میری چار باتوں کے ساتھ چار باتیں یاد
رکھنا، حضرت امام حسن نے عرض کیا وہ کیا ہیں فرمایئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے
ارشاد فرمایا، اول سب سے بڑی تونگری عقل کی توانائی ہے، دوسرے بیوقوفی سے زیادہ
کوئی مفلسی اور تنگدستی نہیں، تیسرے غرور و گھمنڈ سب سے سخت وحشت ہے، چوتھے
سب سے عظیم خلق کرم ہے، حضرت امام حسن رضی اللہ

عنہ نے عرض کیا کہ دوسری چار باتیں بھی بیان فرمائیں، آپ نے ارشاد فرمایا کہ
اول) احمق کی محبت سے بچو،اس لئے کہ نفع پہنچانے کا ارادہ کرتا ہے لیکن نقصان پہنچ)
جاتا ہے، (دوسرے) جھوٹے سے پرہیز کرو،اس لئے کہ وہ دور کو نزدیک اور نزدیک
کو دور کر دیتا ہے، (تیسرے) بخیل سے دور رہو،اس لئے کہ وہ تم سے ان چیزوں کو
پھرا دے گا جنکی تم کو حاجت ہے، (چوتھے) فاجر سے کنارہ کش رہو،اس لئے کہ وہ تمہیں
(تھوڑی سی چیز کے بدلے میں فروخت کر ڈالے گا، (تاریخ الخلفاء
حضرت علی رضی اللہ عنہ سخت زخمی ہونے کے باوجود جمعہ و ہفتہ تک بقید حیات رہے
لیکن اتوار کی رات میں آپ کی روح بارگاہ قدس میں پرواز کر گئی اور یہ بھی روایت
ہے کہ 19 رمضان المبارک جمعہ کی شب میں آپ زخمی ہوئے اور 21 رمضان المبارک
،شب اتوار 40 ہجری میں آپ کی وفات ہوئی،انا للہ وانا الیہ راجعون
چار برس آٹھ ماہ نو دن آپ نے امور خلافت کو انجام دیا اور ترسٹھ سال کی عمر میں
آپ کا وصال ہوا، حضرت امام حسن، حضرت امام حسین اور حضرت عبد اللہ بن جعفر
رضی اللہ عنہم نے آپ کو غسل دیا اور آپ کی نماز جنازہ حضرت امام حسن رضی اللہ
،عنہ نے پڑھائی

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بہت سے اقوال ہیں جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں ان
میں سے چند نظر قارئین،
علم مال سے بہتر ہے، علم تیری حفاظت کرتا ہے اور تو مال کی، علم حاکم ہے اور مال
محکوم، مال خرچ کرنے سے گھٹتا ہے اور علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے، عالم وہی شخص
ہے جو علم پر عمل بھی کرے اور اپنے عمل کو علم کے مطابق بنائے، حلال کی خواہش اسی
شخص میں پیدا ہوتی ہے جو حرام کمائی چھوڑنے کی مکمل کوشش کرتا ہے، تقدیر بہت گہرا
سمندر ہے اس میں غوطہ نہ لگا، خوش اخلاقی بہترین دوست ہے اور ادب بہترین میراث
ہے، جاہلوں کی دوستی سے بچو کہ بہت سے عقلمندوں کو انہوں نے تباہ کر دیا ہے،
اپنا راز کسی پر ظاہر نہ کرو کہ ہر خیر خواہ کے لئے کوئی خیر خواہ ہوتا ہے، انصاف کرنے
والے کو چاہئے کہ جو اپنے لئے پسند کرے وہی دوسروں کے لئے بھی پسند کرے،
اس مضمون کی تیاری میں تاریخ الخلفاء، مقالات سعیدی، خطبات صحابہ کرام اور نیٹ پر
موجود مواد سے مدد لی گئی ہے

یوم بدر غلبہ دین حق اور ابطال باطل کا دن

قانون فطرت ہے کہ جس چیز کو جتنا دبایا جاتا ہے وہ اتنا ہی ابھر کر سامنے آتی ہے، یعنی عمل جتنا شدید ہوتا ہے، رد عمل بھی اتنا ہی شدید واقع ہوتا ہے، یہ ایک بھی طے شدہ اصول ہے کہ ہر عمل اپنے اندر چند اسباب و محرکات رکھتا ہے، جو اپنے ظاہری اور خفیہ پہلوؤں پر محیط ہوتے ہیں، جنگ ہی کو لیجئے اِس کے کچھ اسباب فوری نوعیت کے ہوتے ہیں اور کچھ کا دورانیہ ایک طویل عرصے پر محیط ہوتا ہے، فوری وجہ تو صرف بہانہ بنتی ہے، لیکن اُس کے پس پردہ بہت سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں، غزوہ بدر بھی کسی فوری اور اضطراری سوچ کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ حق و باطل کے اِس معرکے کی وجوہات پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت سے ہجرت مدینہ تک اَن گنت واقعات کے دامن میں پھیلی ہوئی ہیں، اگرچہ چند ایک واقعات کو اِس معرکہ کی فوری وجوہات میں شمار کیا جاسکتا ہے لیکن درحقیقت یہ تصادم تو اُسی روز ناگزیر ہوگیا تھا، جس دن پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم نے کفر و شرک کے طاغوتی ماحول میں اعلائے کلمتہ الحق کا پرچم بلند کیا تھا، جس روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین مکہ کو پتھر کے جھوٹے خداؤں کی پرستش ترک کرکے خداوحدہ لاشریک کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہونے کی دعوت دی تھی، فاران کی چوٹیوں سے آفتاب ہدایت کے طلوع ہونے کے ساتھ ہی کفر کے

اندھیروں نے اپنی بقاء کی جنگ کیلئے صف بندی کا آغاز کر دیا تھا،اسلام اور پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سازشوں اور شرانگیزیوں کا سلسلہ اصل میں غزوہ بدر کا دیباچہ تھا، ہجرت مدینہ کے بعد جب مسلمان منظم ہونے سے اُن کی مظلومیت کا دور ختم ہو چکا تھا، چنانچہ کفار مکہ کو یہ خدشہ کہ "اگر مسلمان ایک منظم قوت بن کر ابھرے تو صرف اُن کا باطل اقتدار ہی نہیں بلکہ اُن کا صدیوں کا قائم باطل نظام بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔" حقیقت میں تبدیل ہونے لگا تھا۔

وہ جس قوت کو کمزور اور ختم کرنا چاہتے تھے، وہ قوت مدینہ منورہ میں بڑی تیزی سے عوامی پذیرائی حاصل کر رہی تھی، کفار مکہ نے مسلمانوں کو مٹانے کیلئے ظلم وستم کے پہاڑ توڑے، قدم قدم پر جبر و تشدد کا نشانہ بنایا، اُن پر زمین کی وسعتیں تنگ کر دی گئیں، لیکن مسافرانِ راہ حق جادہ حق پر رواں دواں ہی رہے، نہ انکے ارادے متزلزل ہوئے اور نہ ہی اُن کے پائے استقلال میں لغزش آئی، زباں پر احد احد کا نغمہ ہی گونجتا رہا، ہجرتِ مدینہ کے بعد تو کفار کی اسلام دشمنی، نفرت اور انتقام کی خواہشیں تمام حدوں سے تجاوز کر گئی، کفر کے علمبرداروں کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اپنے صدیوں سے قائم باطل نظام کو بچانے کیلئے کچھ بھی کر گزریں گے اور اِس دشمنی میں وہ تمام اصول وضابطوں کو روند کر درندگی کی آخری حدوں کو بھی پھلانگنے سے گریز نہیں کریں گے۔

اِدھر پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے باطل ارادوں سے پوری طرح واقف تھے،آپ نے مہاجرین اور انصارِ مدینہ کو جمع فرمایا اور ان سے ارشاد فرمایا کہ "ایک طرف تجارتی قافلہ ہے اور دوسری طرف کفار کا لشکر،اللہ کا وعدہ ہے کہ اِن دونوں میں سے کوئی ایک تمہیں مل جائے "حضرت مقدار بن عمرو رضی اللہ عنہ اٹھ کر کہتے ہیں یا رسول اللہ جدھر آپ کا ربّ آپ کو حکم دے رہا ہے، اُس طرف چلیے، ہم آپ کے ساتھ ہیں، بخدا ہم آپ کو وہ جواب نہ دیں گے جو بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کو دیا تھا کہ آپ اور آپ کا رب جائیں اور اُن سے جنگ کریں ہم تو یہاں بیٹھے ہیں،.... اُس ذات پاک کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے اگر آپ ہمیں برک الغماد تک بھی لے چلیں تو ہم آپ کے ساتھ ہیں اور آپ کی معیت میں دشمن کے ساتھ جنگ کرتے جائیں گے۔"انصار میں سے حضرت سعد بن معاز رضی اللہ عنہ نے نعرہ حق بلند کرتے ہوئے کہا"یا رسول اللہ اگر آپ ہمیں سمندر میں گرنے کا حکم دیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ سمندر میں چھلانگ لگا دیں گے اور ہم میں سے ایک بھی شخص پیچھے نہ رہے گا۔"

اب وقت آگیا تھا کہ کفار مکہ کی بڑھتی ہوئی خود سری، سرکشی اور رعونت کا جواب بے نیام شمشیروں سے دیا جائے اور اُن کے جنگی جنون کو میدان جہاد میں

ہی ٹھنڈا کیا جائے، چنانچہ خود پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم سمیت تمام صحابہ کرام اعلائے کلمتہ الحق کی بلندی اور باطل کی سرکوبی کیلئے اذن جہاد کے منتظر تھے، پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم اِس اَمر سے بخوبی آگاہ تھے کہ راہ انقلاب میں سربکف چلنے والے قافلے ہتھیلیوں پر اپنے سروں کے چراغ جلا کر ہی منزل انقلاب سے ہمکنار ہوتے ہیں، خلعت شہادت زیب تن کئے بغیر نہ تو کلمہ حق کی بلندی کا فریضہ سرانجام دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی باطل استحصالی قوتوں کے مکمل خاتمے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

ابتدائے آدم سے لے کر موجودہ دور تک یہی قانون فطرت رہا ہے کہ زندہ قومیں اپنے نظریاتی تشخص کے تحفظ اور اپنی جغرافیائی سرحدوں کی بقاء کا عہد نامہ اپنے خون سے تحریر کرتی ہیں، دنیا میں تبدیلی لانے کیلئے انقلابی قوتیں معجزوں کا انتظار نہیں کرتیں، بلکہ معجزے اور تائید ایزدی ہر لمحے اُن کی مدد و نصرت کیلئے موجود ہوتی ہیں، صرف باطل کی آنکھوں میں آنکھوں ڈال کر منشائے ایزدی پر عمل کرنا ہوتا ہے، پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نئی حکمت عملی کے تحت باطل پر کاری ضرب لگانے کیلئے فیصلہ کن مرحلے کے منتظر تھے کہ رب تعالیٰ کی طرف سے حکم ملتا ہے، "اجازت دی گئی اُن لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے صرف اِس قصور پر کہ وہ

کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔" (سورہ الحج 40-39

سترہ رمضان المبارک دو ہجری کی پر نور ساعتوں میں مجاہدین اسلام اپنے عظیم قائد امام المجاہدین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں توحید کا پرچم لہراتے ہوئے میدان بدر میں صف آراء ہوتے ہیں، جہاں حق باطل کا پہلا معرکہ گرم ہونے والا ہے، جہاں اِس عقدہ کی گرہ کشائی ہونے والی ہے کہ جینے کا حق کس کو حاصل ہے اور موت کس کا مقدر ہے، جہاں اِس دعوئے کی تصدیق ہونے والی ہے کہ فداکاری کے میدان میں کون کون جانوں کا نذرانہ پیش کرتا ہے اور کون موت سے ہم آغوش ہونے سے جی چراتا ہے اور جہاں اِس حقیقت کا بھی انکشاف ہونے والا ہے کہ باطل کو زیروزبر کرنے والے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر نثار ہونے والے جریدہ عالم پر اپنا نقش دوام کس طرح ثبت کرتے ہیں، بدر کی فضا الجہاد الجہاد کے نعروں سے معمور ہے، چشم فلک حیران و ششدر، جاں نثاران مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمتماتے ہوئے چہروں اور چمکتی ہوئی آنکھوں میں اسلام کا روشن مستقبل دیکھ رہی ہے، داستان حریت کا ایک نیا باب رقم ہو رہا ہے اور بے سروسامانی کے عالم میں دنیا وآخرت میں سرخروئی کا سامان فراہم کیا جا رہا ہے، آج بدر کا میدان جنگ اُن کے دعوائے ایمان کا پہلا مظہر ہے۔

تاریخ عالم یہ منظر حیرت سے دیکھ رہی ہے کہ ایک طرف کفار مکہ کا ایک ہزار کا لشکر
جرار تو دوسری طرف تین سو تیرہ فداکار دوجہاں، رسول انس و جاں صلی اللہ علیہ وسلم
کی معیت میں باطل سے نبرد آزما ہونے کیلئے نشہ شہادت سے سرشار، ایک طرف
ہتھیاروں کی فراوانی دوسری طرف تن عریانی، ایک طرف سامان حرب پر
بھروسہ، دوسری جانب رب کریم پر تکیہ، آج اُن کی سخت آزمائش اور امتحان کا وقت
ہے کیونکہ سامان حرب اور افرادی قوت سے قطع نظر اُن کے مقابلے پر اُن کے قریبی
اعزاء واقرباء ہیں، باپ کے مقابلے پر بیٹا، بھائی کے مقابلے پر بھائی، مگر اسلام کی عظمت و
سربلندی اور خدا اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت آج تمام رشتوں سے
بالاتر ہے، بدر کا میدان بتا رہا ہے کہ کمند اسلام سے رشتہ جوڑنے والوں کو سب غیر
اسلامی رشتے توڑنے پڑتے ہیں، اسلام کی راہ میں اگر خونی رشتے بھی حائل ہوں تو اُن
کے حلقوم پر چھری چلانا پڑتی ہے، باپ کو بیٹے سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے، بھائی بھائی کا
گلا کاٹتا ہے۔

ہوئی حائل نہ راہ حق میں ندی شیر مادر کی
کہ بڑھ کر کاٹ لی گردن برادر نے برادر کی

مجاہدین اسلام تاریخ میں اپنے رخ کو متعین کرنے کیلئے بے قرار ہیں، انھوں نے تمام
دنیاوی عیش و عشرت اور لذتوں سے منہ موڑ لیا ہے اور اب وہ خدا اور اُس

رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ جوڑ کر دونوں جہاں میں کامیابی سے ہمکنار ہونا چاہتے ہیں، پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم رب کریم کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہیں، ردائے مبارک بار بار شانوں سے سرک جاتی ہے، فضائے بدر لب مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکلی ہوئی دعا سے معمور ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں "اے اللہ تو اپنا وعدہ پورا فرما، خدایا یہ سامان غرور کے ساتھ آئے ہوئے قریش تیرے رسول کو جھوٹا ثابت کرنا چاہتے ہیں، اے خدا اگر آج یہ مٹھی بھر جماعت ہلاک ہو گئی تو قیامت تک روئے زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔" بارگاہ لم یزلی میں گریہ وزاری کی یہ کیفیت دیکھ کر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ عرض کرتے ہیں، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ اللہ کے سچے رسول ہیں، اللہ ضرور اپنا وعدہ پورا فرمائے گا اور فتح مسلمانوں کو نصیب ہوگی۔

نماز فجر کے بعد پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم جاں نثاران مصطفیٰ کی صف بندی فرماتے ہیں، آپ صفوں کو آراستہ کرتے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ سرداران قریش کی موت کی پیشین گوئی کرتے جاتے ہیں، ارشاد مبارک ہو رہا ہوتا ہے، ابو جہل یہاں مارا جائے گا، عتبہ یہاں قتل ہوگا، اُمیہ یہاں خاک نشین ہوگا، دنیا دیکھتی ہے کہ جنگ کے خاتمے کے بعد سرداران قریش ٹھیک اُن ہی مقامات پر ڈھیر تھے جن کی پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم نے نشاندہی فرمائی تھی، قلت

تائید لایزدی سے کثرت پر غالب آتی ہے، باطل شکست کھا کر الٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہوتا ہے اور غازیان اسلام کو فتح مبین حاصل ہوتی ہے، معرکہ بدر اسلام کیلئے نقطہ عروج ثابت ہوتا ہے اور اِس معرکے کے مذہبی اور ملکی حالات پر دور رس نتائج مرتب ہوتے ہیں، دیکھا جائے تو بعثت نبوی کے بعد حقیقتاً یہ اسلام کی ترویج و اشاعت اور سربلندی کی جانب پہلا قدم تھا، جس نے کفر کی قوت کو ختم اور اُن کے باطل زعم کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا تھا، نصرت خداوندی نے مٹھی بھر مسلمانوں کو فتح و نصرت سے سرفراز فرمایا اور مجاہدین اسلام نے ثابت کردیا کہ راہ حق میں اعداد و شماراور عددی برتری کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

اِس غزوے کے بعد مسلمان ایک قوت قاہرہ بن کر ابھرے اور گردش ایام کے پسے ہوئے آزادی وحریت کے گیت گاتے اٹھے اور ابر کرم بن کر دنیا پر سایہ فگن ہوگئے،اِس غزوے نے مسلمانوں کی بہادری و جرات کی دھاک سارے عرب پر بیٹھا دی، اِس معرکے نے ایک نئی تہذیب کو جنم دیا، بتان شعوب کی گردن کاٹی گئی، غرور، حسب و نسب کو خاک میں ملادیا گیا اور اِس غزوے کے بعد نصف صدی کے اندر اندر مسلمانوں نے ساری دنیا کا نقشہ بدل کر رکھدیا، اونٹوں اور بکریوں کے چرواہے اور صحراؤں کے بدوں نے پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں قیصر و کسریٰ کی قباؤں کو چاک کر ڈالا اور انھوں نے ثابت کردیا کہ دنیا کے بڑے سے بڑی طاقت انہیں جادہ حق سے ہٹا نہیں سکتی، کیونکہ وہ فتح

وشکست سے بے نیاز ہو کر صرف رضائے الٰہی کے حصول کیلئے لڑتے ہیں۔
یوم بدر غلبہ دین حق اور ابطال باطل کا دن ہے،اس دن کفر کے مقدر میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ذلت آمیز شکست لکھ دی گئی اور اِس دن مطلع انسانیت پر ایک ایسی روشن صبح طلوع ہوئی جس سے کفر کے ایوانوں پر قیامت تک کیلئے لرزہ طاری ہوگیا، معرکہ بدر اسلام سے تجدید عہد وفا کا دن ہے، یہ دن اِس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ رزم حق و باطل میں میدان جنگ میں نکلنا اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ملانا نہایت ضروری ہے، صحابہ کرام جہاد کی تمنا میں جیتے تھے اور شہادت کے آرزو مند رہا کرتے تھے،اُن کے پیش نظر ہمیشہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہوا کرتا تھا"جس (شخص کے) دل میں جہاد کی آرزو نہیں وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔""میری اُمت میں جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔"آج اُمت مسلمہ ذلت و رسوائی اور محکومی وغلامی کے گڑھے میں گری ہوئی ہے، جس کی اصل وجہ اپنے ماضی سے قطع تعلق اور دوری ہے،اُمت مسلمہ کو دوبارہ بام ثریا تک پہنچانے کیلئے اور وقت کی یزیدی قوتوں کے خاتمے کیلئے فضائے بدر کا پیدا کیا جانا بہت ضروری ہے،آج ایک بار پھر ہمیں اُسوہ مجاہدین بدر کو حرز جاں بنا کر غلبہ دین حق کیلئے میدان جہاد کی جانب چلنے کی تیاری کرنا ہوگی کیونکہ یہی اسلام کے روشن مستقبل اور وقت کی ابوجہلی قوتوں کے خاتمے کا واحد راستہ ہے۔

مردہ ضمیر تماش بین اور انسانی کھال پہنے وحشی درندے۔۔۔۔

جب معاشرہ بے حس، قانون خاموش اور قوم تماشائی بن جائے۔۔۔۔
گزشتہ کئی دنوں سے ذہن ماؤف اور خیالات منتشر ہیں، دل و دماغ میں سناٹا طاری ہے، لفظ، الفاظ کی شکل اختیار کرنے اور صفحہ قرطاس پر بکھرنے سے گریزاں ہیں، سوچ کی وادیوں میں ویرانی چھائی ہوئی ہے، تخیل کے درخت کو مایوسی کی آکاس بیل نے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے اور خیالات کے بہتے دریا سوکھے ہوئے ہیں، طبعیت کے اضمحلال نے ذہنی سکون ویکسوئی غائب کردی ہے، جونہی قلم پکڑتے ہیں، آنکھوں کے سامنے وہی درندگی، شقاوت، حیوانیت، سنگدلی اور سفاکی سے لبریز وحشت وبربریت آمیز منظر گھوم جاتے ہیں، جس میں انسانی کھال پہنے وحشی درندے دو نوجوانوں کو لرزہ خیز سفاکی اور وحشیانہ انداز میں ڈنڈوں سے مار مار کر موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں۔
اُن کی نعشوں کی بے حرمتی کر رہے ہیں، کھمبے پر الٹا لٹکا رہے ہیں، ٹریکٹر ٹرالی پر سارے شہر میں گھما رہے ہیں اور برف کی بے جان سلوں کی مانند زمین پر پھینک رہے ہیں، یہ سب کچھ دن کی روشنی میں شہر اقبال و فیض میں ایک رواں

دواں سڑک کے بیچوں بیچ ہو رہا ہے، خوفِ خدا اور جوابدہی و گرفت کے احساس سے بے نیاز قبیلہ قاتلاں سے تعلق رکھنے والے بے حس افراد کا انبوہ کثیر دل لہو اور رونگٹے کھڑے کر دینے والے اِس خونی منظر کو دیکھتا ہے، لطف اندوز ہوتا ہے اور چپ چاپ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتا ہے۔

حیرت ہے کہ کسی کے دل میں خوفِ خدا کا احساس پیدا نہیں ہوا، کسی کے سینے میں درد نے انگڑائی نہیں لی، کسی ایک نے بھی آگے بڑھ کر ظالموں کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش نہیں کی، وردیوں میں ملبوس، سروں پر ٹوپیاں سجائے، سینے اور شولڈروں پر بیج لگائے اور ہاتھوں میں ہتھیار پکڑے سرکاری اہلکاروں سمیت، بچے، بوڑھے، جوان اور ادھیڑ عمر باریش افراد پر مشتمل مردہ ضمیر تماش بینوں کا ہجوم لہو میں لت پت، دو تڑپتے اور بے بس نوجوانوں کو ایک کے بعد ایک خونی درندوں کی بہیمانہ درندگی و تشدد کا خاموشی سے نشانہ بنتے دیکھتا رہا۔

اِس واقعہ کو کئی دن گزر گئے، لیکن طبعیت پر مرتب ہونے والے اثرات آج تک کم نہ ہوسکے، بارہا چاہا کہ بھول جائیں مگر ہر بار یہ واقعہ اپنی پوری سنگینی کے ساتھ سامنے آکھڑا ہوا، وہی رونگٹے کھڑے کر دینے اور دہلا دینے والے مناظر چار سو نظر آتے ہیں، آج کئی دن گزرنے کے بعد بھی ہم اِس موضوع پر لکھتے ہوئے خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہے ہیں، چاہتے ہیں کہ اپنے دکھ، تکلیف

اور کربناک احساس میں آپ کو بھی شریک کریں، لیکن ہماری بے بسی یہ ہے کہ الفاظ ہمارا ساتھ نہیں دے رہے، لغت میں ہمیں کوئی لفظ ایسا نہیں مل رہا جو اِس دکھ کا بوجھ اٹھا سکے۔

اِس اندوہناک واقعے کی مکمل وضاحت واحاطہ کرسکے اوراِس فعل قبیح کی سنگینی کو سند و جواز فراہم کرسکے۔ یا الٰہی کیا کریں.... الفاظ وضاحت سے عاری ہیں .... لغت معنی و مفہوم فراہم کرنے سے عاجز و مجبور ہے.... شقاوت، درندگی، حیوانیت، اور سفاکی جیسے الفاظ بھی اِس فعل کی سنگینی کے سامنے ہمیں حقیر اور بونے لگتے ہیں.... اور ہم جو لفظ بھی چنتے ہیں وہ بے مائیگی، بے بسی اور شرمندگی کی تصویر بن جاتا ہے۔

ایک اسلامی معاشرہ تو بہت دور کی بات ہے، کسی نام نہاد انسانی معاشرے میں بھی اِس انداز کی انسان کشی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، جس طرح سیالکوٹ پولیس کی موجودگی میں انیس سالہ حافظ مغیث اور پندرہ سالہ محمد منیب کے ساتھ ہوا، ہم اِس ظلم و بربریت کی تفصیلات میں جانا نہیں چاہتے کہ یقیناً آپ اِس سے بخوبی واقف ہیں، لیکن اتنا ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ لوگوں کا یوں قانون ہاتھ میں لے لینا کسی مہذب معاشرے کیلئے ڈوب مرنے کا مقام ہے اور قانون کے محافظوں کا تماشہ دیکھتے رہنا سب سے بڑا جرم عظیم ہے۔

اِس درندگی کی ویڈیو فلم اگر ٹی وی چینلوں سے جاری نہ ہوتی اور عدالت عظمیٰ از خود نوٹس لے کر حکومت پنجاب اور پولیس کو کارروائی کا حکم نہ دیتی تو شاید اِس واقعے کے ذمہ داروں کے خلاف مقدمات بھی درج نہ ہوتے۔ سوال یہ ہے کہ ہر بار عدالت عظمیٰ کو ہی نوٹس کیوں لینا پڑتا ہے اور اُسے ہی کیوں اپنی دردمندی اور دل سوزی کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ حکومت اور حکومتی ادارے کیا کرتے اور کہاں سوئے رہتے ہیں۔؟
یہ حقیقت ہے کہ ایک معاشرہ اپنے یہاں بسنے والے افراد کے ربط وضبط، میل جول اور باہمی تعلقات کی بنیاد پر پروان چڑھتا ہے۔ تحمل، برداشت، رواداری کی اقدار افراد میں بہترین تعلقات کار کی پرورش کرتی ہیں۔ جن معاشروں میں حقیقی جمہوریت کا کلچر موجود ہو وہاں جمہور کی قوت مثبت مقاصد کیلئے روبہ عمل آتی ہے اور ایسے معاشرے کا کوئی فرد، افراد یا گروہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ لیکن جن معاشروں میں فکر و عمل کے تضاد کا چلن عام ہو۔ جہاں گُن تو اعلیٰ اقدار کے گائے جائیں، جہاں دعوے تو قانون و انصاف کی حکمرانی کے کئے جائیں۔
مگر عملی طور پر معاملہ اِس کے برعکس ہو۔ جہاں ایک محدود بااثر اقلیت ملکی

وسائل کی لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہو اور غریب عوام کی اکثریت ایک وقت کی روٹی کو ترس رہی ہو، جہاں مایوسیوں کے ڈیرے ہوں اور خودکشیوں کا راج ہو، اُن معاشروں کے افراد کو ذہنی انتشار اور فکری انارکی پرتشدد راستوں کی طرف لے جاتی ہے، جس کی وجہ سے کسی بھی ہنگامی و ہیجانی کیفیت میں قانون کو ہاتھ میں لے لینا ایک معمول بن جاتا ہے۔

مگر اِس تناظر میں ظلم و بربریت، وحشت و درندگی، اور لاقانونیت کو بے لگام نہیں چھوڑا جاسکتا اور نہ ہی اِسے سند جواز عطا کی جاسکتی ہے، یوں تو معاشرتی اور سماجی ارتقاء کی تاریخ اچھے بُرے، نیک و بد اور ظالم و مظلوم کے مابین کشمکش اور تضاد سے بھری پڑی ہے، مگر معاشرے میں نیکی، بھلائی، امن و سلامتی اور خیر خواہی کی اقدار کی علمبردار قوتیں ہمیشہ سرگرم عمل رہتی ہیں۔

اور انہی قوتوں کے فیضان سے بدترین حالات میں بھی معاشرے کی اکثریت بھلائی اور بہتری کی فضا کو قائم رکھتی ہے جس کی وجہ سے قانون کے احترام کیلئے مثبت دباؤ کی کیفیت برقرار رہتی ہے اور بدقماش عناصر کے گرد گھیرا تنگ رہتا ہے، لیکن اِس کے باوجود جب کسی مقام پر لاقانونیت، ظلم و بربریت اور سفاکی کا مظاہرہ دیکھنے میں آتا ہے تو اُس کی بڑی وجہ انتظامی شعبوں کی مجرمانہ

غفلت ہوتی ہے۔ سانحہ سیالکوٹ بھی انتظامی اداروں کی اِسی مجرمانہ غفلت کا شاخسانہ ہے۔

ہمارا ماننا ہے کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کی سرپرستی اور لاقانونیت کے راج نے ہجوم کو ایسا وحشی درندہ بنا دیا ہے جو محض ایک اشارے پر کسی تحقیق و تفتیش کے بغیر دو بے گناہ نوجوانوں کو ڈنڈوں، لاٹھیوں اور پھاوڑوں سے مار مار کر ہلاک کر دیتا ہے، قارئین محترم یہ ایک ایسا کربناک سانحہ ہے جس میں مجرموں کے ساتھ عوام اور پولیس بھی شامل ہے، منیب اور مغیث کو بے رحمی سے قتل کرنے والوں کا ایک جرم تو بہت واضح ہے کہ انہوں نے قانون اپنے ہاتھ میں لیا۔

مگر پولیس کا جرم یہ ہے کہ اس نے اپنے فرائض سے غفلت برتتے ہوئے اپنی موجودگی میں دونوں نوجوانوں کو وحشیانہ درندگی کا نشانہ بننے دیا، جو کہ قابل تعزیر اور ہماری نظر میں ناقابل معافی جرم ہے، رہے وہ تماشائی جو اِس سفاکانہ منظر کو دیکھ کر خاموش تماشائی بنے رہے اور اِس مکروہ واردات سے لطف اٹھاتے رہے، قاتل نہیں تو شامل قتل اور قتل عمد کے مرتکب ضرور ہیں اور ہماری رائے میں اُن پر بھی اعانت مجرمانہ کا مقدمہ درج ہونا چاہیے اور انہیں بھی قرار واقعی سزا ملنا چاہیے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ سانحہ سیالکوٹ نے بڑے بڑوں لوگوں کی زبانیں گنگ اور سوچ کے دھارے منجمد کر دیئے ہیں، شقاوت، سفاکی اور سنگدلی جیسے تمام الفاظ اِس کے سامنے ہیچ قرار پاتے ہیں، ہماری نظر میں اِس واقعے کی اصل ملزم پولیس اور سب سے بڑھ کر خود ریاست ہے، جب ریاست خود مجرم بن جائے تو وہ مجرموں کے خلاف کاروائی کیسے ہو سکتی ہے، سانحہ سیالکوٹ جس انداز میں سرعام پیش آیا ہے، وہ اِس بات کی علامت ہے کہ اِس علاقے کی پولیس اور جرائم پیشہ طبقات کو کسی کے احتساب کا کوئی خوف نہیں ہے۔

زبانی کلامی قانون کے نفاذ کے دعوے تو بہت کئے جاتے ہیں، لیکن اصل معاملہ یہ ہے کہ اِن دعوؤں کی سب سے زیادہ خلاف ورزی خود حکومت اور اُس کے قانون نافذ کرنے والے ادارے کرتے ہیں، بد قسمتی سے پاکستان میں ایسی کوئی قوت موجود نہیں جو پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی لاقانونیت کا احتساب کر سکے۔
اگر یہی حال رہا تو پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی لاقانونیت ملک کو انتشار اور انارکی کی طرف لے جائے گی اور یہ معاشرہ، معاشرہ نہیں بلکہ ایسے جنگل میں تبدیل ہو جائیگا، جس میں حیوانوں کی حکمرانی اور درندوں

کا راج ہوگا، یاد رکھیں، جب معاشرہ بے حس ہو جاتا ہے، قانون خاموش ہو جاتا ہے اور
قوم مہر بہ لب تماشائی بن جاتی ہے تو ایسے معاشروں کے مقدر میں ذلت و رسوائی
انحطاط اور تنزلی لکھ دی جاتی ہے اور ایسی حالت میں اُس معاشرے پر عذاب الٰہی کا
نازل ہونا تعجب خیز نہیں ہوتا۔

ہمیں ایسی امداد نہیں چاہیے۔۔۔۔

حکمرانوں نے قوم کو بھکاری بنا دیا۔۔۔۔۔

بھکاری تو بھکاری ہوتا ہے،اُس کا کام ہر ایک کے سامنے کاسہ گدائی پھیلانا اور صدا لگانا ہے "دے جا سخیا۔۔۔۔دے جا۔۔۔۔اللہ کے نام پر۔۔۔۔اللہ تیری مراد پوری کرے۔" بھکاری ہر ایک کے سامنے اپنا کشکول پھیلاتا ہے اور دن بھر اپنے کشکول میں گرنے والی چونیاں، اٹھنیاں جمع کرتا ہے،جس طرح بھکاری کو اِس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ دینے والا کون ہے،اُس کا نام و نسب کیا ہے، کہاں سے آیا ہے اور کیا کرتا ہے، بالکل اُسی طرح ہمارے ارباب اقتدار کو بھی اِس بات سے کوئی مطلب نہیں کہ امداد کون دے رہا، کس لیے دے رہا ہے اور کتنی دے رہا ہے،انہیں اگر کوئی غرض ہے تو اِس بات سے کہ امداد ملنی چاہیے، کہیں سے بھی ملے، چاہے وہ ہمارا ازلی دشمن بھارت ہی کیوں نہ دے، حکمرانوں کے اِسی انداز فکر نے حکومت کو سیلاب زدگان کیلئے 50 لاکھ ڈالر کی بھارتی امداد کو قبول کرنے کی راہ دکھائی، ہمیں بھارتی امداد قبول کرتا دیکھ کر اسرائیل کی بھی ہمت بڑھی اور اُس نے بھی ہمارے پھیلے ہوئے کاسہ گدائی میں خیرات ڈالنے کی پیش کش کر ڈالی، کیا اب ہمارے حکمرانوں کیلئے ایک دشمن ملک کی امدادی پیشکش قبول کرنے کے بعد دوسرے دشمن ملک کی امدادی پیشکش

کو قبول نہ کرنے کا کوئی اخلاقی جواز رہتا ہے۔؟ ہمارے خیال میں نہیں۔
لیکن ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا بھارت کی پچاس لاکھ ڈالر کی امداد ہمارے اُن زخموں پر مرہم رکھ سکتی ہے جو بھارت نے ہمیں گذشتہ 64برسوں میں پہنچائے ہیں،کیا یہ پچاس لاکھ ڈالر کی معمولی امداد پاکستان کو دولخت کرنے کی گھناؤنی سازش، مقبوضہ کشمیر پر غاصبانہ تسلط اور وہاں جاری تحریک حریت کو کچلنے کیلئے ظلم و جبر کے ہتھکنڈوں کا استعمال، بلوچستان میں بغاوت وانارکی کو ہوا دینے،سندھ طاس معاہدے کی خلاف ورزی اور پاکستان کی جانب آنیوالے دریاؤں پر 62 سے زائد ڈیم تعمیر کرکے ہمارے پانی کو روکنا اور ہمیں قحط سالی سے دوچار کرنے کی پلاننگ کرنا اور باقی ماندہ پاکستان کو توڑنے جیسے گناہ عظیم اور جرائم سیاہ کا مداوا بن سکتے ہیں،ہرگز ہرگز نہیں.....ہماری طرح ہر محب وطن پاکستانی کا یہی جواب ہوگا،یہاں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ سونامی، قطرینہ اور 2005ء میں پاکستان میں آنیوالے زلزلے سے بھی زیادہ تباہ کن موجودہ صدی کا سب سے بڑا اور خوفناک جو سیلاب آیا ہے اور جس کی تباہ کاریاں اِس وقت بھی جاری ہیں،بھارت کی جانب سے دریائے چناب، جہلم اور سندھ میں اور بھارتی ایماء پر دریائے کابل میں زیادہ پانی چھوڑنے کے ہی کا نتیجہ ہے۔

ایک طرف بھارت ہمارا پانی روک کر ہماری سرسبز وشاداب زمینوں کو بنجر بنانے کا انتظام کرتا ہے، تو دوسری جانب وہ اپنا زائد پانی چھوڑ کر ہماری تباہی و بربادی کا نظارہ کرتا ہے۔اِس صورتحال میں وہ ہمارا ہمدرد، خیر خواہ اور دوست کیسے ہو سکتا ہے ....!

اِس تناظر میں بجائے اِس کہ اپنے شاطر اور مکار دشمن کی امداد کی پیشکش قبول کی جاتی، حکومت کو چاہیے تھا کہ بھارت کا وہ مکروہ چہرہ عالمی برادری کے سامنے لاتی، جو منہ میں رام رام، بغل میں چھری کے فلسفے کی بنیاد پر دنیا کو دھوکہ دینے اور ہماری سالمیت پر وار کرنے کی مذموم منصوبہ بندی کو عملی جامہ پہنا رہا ہے۔اِس وقت ضرورت تو اِس امر کی تھی کہ ہمیں ڈبونے کے حالیہ بھارتی جرم کے ساتھ اُس کے ماضی کے تمام جرائم سے بھی پردہ اٹھایا جاتا، چہ جائیکہ قومی غیرت و حمیت کے منافی بھارت کی حقیر سی امداد قبول کی جاتی۔

لیکن ہماری حکومت نے عوامی رائے عامہ کے برخلاف امریکی دباؤ پر بھارت کی پچاس لاکھ ڈالر کی امداد قبول کرنے کا نہ صرف فیصلہ کیا بلکہ ستم ظریفی دیکھئے کہ ہمارے غیرت مند وزیر خارجہ نے بھارت کے امداد دینے کے فیصلے کو خوش آئند، جذبہ خیر سگالی کا مظہر اور ایک نئے دور کا آغاز قرار دینے کے ساتھ اُسے پاکستانی عوام کی جانب سے سراہا جانا بھی قرار دے ڈالا، اُن کے اِس بیان کو بھارتی ذرائع ابلاغ نے یہ کہہ کر" بھارتی امداد کو حقارت سے

ٹھکرانے والے پاکستان کو امریکی اشارے پر قبول کرنی پڑی " نہ صرف پاکستان کو تضحیک کا نشانہ بنایا بلکہ اُس پر مختلف پیرائے میں توہین آمیز تبصرے بھی کئے، بدقسمتی سے یہ سب کچھ ایک ایسے وقت میں ہوا جب مقبوضہ جموں کشمیر میں غاصبانہ بھارتی تسلط کے خلاف کشمیری مسلمانوں کی تحریک ایک بار پھر اپنے عروج پر ہے اور بھارت کشمیری عوام کی تحریک آزادی کو دبانے کیلئے تمام تر ریاستی حربے،طاقت اور انسانیت سوز مظالم روا رکھے ہوئے ہے، تحریک آزادی کشمیر کا یہ نازک اور اہم ترین موڑ پوری دنیا کے مسلمانوں اور بالخصوص وطن عزیز پاکستان کے اصحاب فکر ودانش اور ارباب اقتدار کی خصوصی دلچسپی اور عملی تعاون کا محتاج ہے،کیونکہ اہل کشمیر جغرافیائی نہیں بلکہ وہی دینی و نظریاتی جنگ لڑ رہے ہیں جو جہاد کی صورت میں ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے،لیکن افسوس اور صد افسوس، حکمرانوں کی مبہم اور بزدلانہ پالیسیوں نے مسئلہ کشمیر کو مشکل اور پیچیدہ بنادیا ہے، قیام پاکستان سے اب تک تمام سابقہ حکومتوں کی طرح موجودہ حکومت نے بھی کشمیریوں کی قسمت سے کھیلنے کے شرمناک عمل کو جاری رکھااور بھارت کے ساتھ یک طرفہ محبت کی پینگیں بڑھائیں، بھارتی امداد قبول کرنے کا موجودہ فیصلہ بھی اسی کیفیت کا مظہر ہے۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ابتداء میں مقتدر حلقوں اور وزارت خارجہ کے بعض حکام نے بھارتی امداد قبول کرنے کے معاملے پر تحفظات کا اظہار کیا تھا،جس کے

باعث حکومت نے بھارتی امداد کے بارے میں خاموشی اختیار کرلی تھی، دراصل بھارتی امداد کی مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ بھارت کی طرف سے محض 50 لاکھ ڈالر کی پیشکش کی گئی تھی، جس سے امدادی کاروائیوں میں کوئی خاص بہتری نہیں آتی، دوسرے اِن حلقوں کا خیال تھا کہ بھارت اِس امداد کے بہانے پاکستان پر اخلاقی برتری حاصل کرنا چاہتا تھا، جس کی وجہ سے حکومت پاکستان نے بھارت کی جانب سے امداد کی پیشکش پر فوری ردعمل کا اظہار نہیں کیا، لیکن جب بارک اوباما انتظامیہ کی طرف سے پاکستان کو یہ باور کرایا گیا کہ وہ بھارت کی امداد قبول کرلے اور اسے سیاسی مسئلہ نہ بنائے، تو ہماری تابعدار حکومت کے فرمانبردار وزیر خارجہ نے 24 گھنٹوں کے اندر اندر بھارتی امداد کے اسٹریجک اور دور رس اثرات کو نظر انداز کرتے ہوئے اُسے قبول کرنے کا حیرت انگیز اعلان کردیا، حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک طرف حکومت بڑی شدت کے ساتھ یہ دعویٰ کرتی ہے کہ ہم امریکی ڈکٹیشن قبول کرتے ہیں، نہ اُس پر عمل کرتے ہیں، مگر دوسری جانب امریکی انتظامیہ کی جانب سے ہلکے سے اشارے پر بھارتی امداد قبول کرلی جاتی ہے اور ہمارے محترم وزیر خارجہ امریکہ میں بیٹھ کر سر تسلیم خم کرتے ہوئے نہ صرف بھارتی امداد کی پیشکش قبول کرنے کا اعلان کرتے ہیں بلکہ توہین و تضحیک کے لبادے میں لپٹی ہوئی اِس پیشکش کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔

بدقسمتی سے ہمارے ارباب اقتدار کا یہی وہ شرمناک طرزِ عمل ہے جس نے اُس قوم کو
جس کے اکابرین نے برطانوی اور ہندو سامراج سے آزادی چھین کر مملکت خداداد
پاکستان حاصل کیا تھا، دنیا کے بازار میں بھکاریوں اور منگتوں کی قوم بنا دیا ہے، غیر ملکی
آقاؤں کے تابع فرمان بددیانت اور کرپٹ حکمرانوں نے اپنی ہوس اقتدار اور عیش و
عشرت کیلئے اتحاد، تنظیم، ایمان کو حرز جان بنا کر پاکستان حاصل کرنے والوں کی
اولادوں کو بدامنی، انتشار اور ذلت و رسوائی کے اندھیرے غاروں میں دھکیل دیا
ہے، یہ درست ہے کہ اِس وقت ہم مصیبت کے مارے ہیں، سیلاب نے ہماری کمر توڑ کر
رکھدی ہے لیکن اِس کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ ہم اپنے اُس دشمن کی امداد بھی قبول
کرلیں جس نے اپنے دریاؤں کے بند کھول کر ہمارے ملک کو سیلاب کی تباہ کاریوں سے
دوچار کیا اور جس نے کبھی بھی ہمیں نقصان پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں
کیا، ہوسکتا ہے کہ حکومت کی اپنی مصلحتیں اور مجبوریاں ہوں لیکن ہمارا ماننا ہے کہ
پاکستان کے غیور عوام بھارت کی اِس امدادی پیشکش کو نہ تو پسند کر سکتے ہیں اور نہ ہی
سراسکتے ہیں اور نہ ہی کسی طور بھی وہ اپنے دشمن کی جانب سے دھوکہ، فریب اور
منافقت کے زہر میں بجھی ہوئی امداد کو قبول کرنے کیلئے تیار ہیں۔

یہ درست ہے کہ آج ملک و قوم مصیبت اور مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں، مگر اِس
کے باوجود قوم میں ابھی بھی اتنی ہمت، طاقت اور حوصلہ موجود ہے کہ وہ دشمن کی

بھیک قبول کئے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہے۔ لہٰذا اِس صورتحال میں بھارتی امداد کو ایک نئے دور کا آغاز قرار دینا بڑا معنی خیز معلوم ہوتا ہے کیونکہ ایسا آغاز ماضی میں سینکڑوں بار بھارت کی بدنیتی اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے پیشکشوں، معاہدوں، مصافحوں، معانقوں، ملاقاتوں اور مداراتوں کی نظر ہوچکا ہے۔ اِس تناظر میں زیادہ بہتر تو یہ تھا کہ قومی غیرت و حمیت کے منافی بھارتی امداد کی پیشکش کو قبول کرنے اور اِس معمولی امداد کی سپاس گزاری کرنے کے بجائے پاکستان عالمی برادری پر دباؤ ڈالتا کہ وہ بھارت سے کشمیر سمیت تمام متنازعہ اُمور طے کرائے، مگر افسوس جب عوام کی تمناؤں اور جذبوں کی ترجمانی کرنے والی آوازیں گنگ اور ڈرو مصلحت کا شکار ہوجائیں، جب ارباب اقتدار کی زبانیں زمینی حقائق کو جھٹلائیں اور رنگا رنگ تاویلیں پیش کریں تو اقتدار کے ایوانوں میں ہونے والے فیصلے قومی مفاد اور امنگوں کے خلاف ہی ہوا کرتے ہیں، بدقسمتی سے آج یہ سب کچھ اُس سیاسی جماعت کے دور حکومت میں ہورہا ہے جس کے بانی اور قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو نے کہا تھا "ہمیں ایسی امداد نہیں چاہیے جو ہمیں قومی مفادات سے بے خبر بنادے۔" یاد رہے کہ ملک و قوم کی عزت و آبرو بھارتی امداد سے کہیں زیادہ قیمتی اور مقدم ہے، جسے دشمن کے چند ٹکوں کی خاطر قربان نہیں کیا جاسکتا۔

تحفظ عقیدہ ختم نبوت، اکابرین اہلسنّت کا کردار اور ہماری ذمہ داریاں

عقیدہ ختم نبوت اسلام کا وہ بنیادی اور مرکزی عقیدہ ہے جس میں معمولی سا شبہ بھی کفر ہے،امام اعظم امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ "جو شخص کسی جھوٹے مدعی نبوت (نبوت کا دعویٰ کرنے والا) سے دلیل طلب کرے وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔" کیونکہ دلیل طلب کرکے اُس نے اجرائے نبوت کے امکان کا عقیدہ رکھا اور یہی کفر ہے، عقیدہ ختم نبوت اسلام کی بنیادوں اساس ہے جس پر مکمل ایمان رکھے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا،قرآن مجید کی 100 کے قریب آیات اور 200 سے زائد احادیث مبارکہ سے ثابت ہے کہ حضور نبی کریم اللہ تعالی کے آخری نبی اور رسول ہیں،آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی قسم کا کوئی نیا نبی نہیں، تمام صحابہ کرام،تابعین عظام، تبع تابعین، ائمہ مجتہدین اور چودہ صدیوں کے
مفسرین، محدثین، متکلمین، علماء اور صوفیاء سمیت پوری اُمت مسلمہ کا اِس بات پر اجماع رہاہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ساتھ ہی نبوت و رسالت کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بند ہوگیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نئے نبی کے آنے کی ضرورت باقی نہیں رہی، لہٰذا اب اگر کوئی شخص کسی بھی معنوں میں دعوے نبوت کرتا ہے تو وہ بالاتفاق اُمت کافر و مرتد، کذاب و دجّال اور دائرہ اسلام سے خارج قرار پاتا ہے۔

خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سلسلہ نبوت کی آخری کڑی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص کو اِس منصب پر فائز نہیں کیا جائے گا، قرآن مجید میں ہے "ماکان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین" (الاحزاب 40) "محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں کسی کے باپ نہیں، بلکہ اللہ کے رسول اور آخری نبی ہیں۔" تمام ائمہ ومفسرین کا اِس بات پر اتفاق ہے کہ یہاں "خاتم النبیین" کے معنی ہیں کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں" آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو "منصب نبوت" پر فائز نہیں کیا جائے گا۔
جس طرح قرآن کریم کی نصوص قطعیہ سے عقیدہ ختم نبوت ثابت ہے، بالکل اسی طرح یہ عقیدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث متواترہ سے بھی ثابت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں" میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں۔" (ابوداؤد جلد2، ص:228) " مجھے تمام مخلوق کی طرف مبعوث کیا گیا اور مجھ پر نبیوں کا سلسلہ ختم کردیا گیا۔" (مشکوٰۃ،512) "رسالت ونبوت ختم ہوچکی ہے پس میرے بعد نہ کوئی رسول ہے اور نہ نبی۔" (ترمذی، جلد2، ص51) " میں آخری نبی ہوں اور تم آخری امت ہو۔" (ابن ماجہ:297

اِن ارشاداتِ نبوی میں اِس اَمر کی تصریح فرمادی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی اور رسول ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت آخری امت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ آخری قبلہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ کتاب آخری آسمانی کتاب ہے، یہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ کے ساتھ منصب ختم نبوت کے اختصاص کے تقاضے ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے پورے کر دیے، چنانچہ قرآن مجید کو "ذکر للعالمین" اور بیت اللہ شریف کو "ھدی للعالمین" کا اعزاز بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے صدقے میں ملا، ترجمان القرآن حضرت عبداللہ ابن عباس" تفسیر ابن عباس" میں فرماتے ہیں، "ختم اللہ بہ النبیین قبلہ فلایکون نبی بعدہ "خاتم" کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کریم نے سلسلہ انبیاء حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر ختم فرما دیا ہے، پس آپ کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا۔" علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃاللہ علیہ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "خصائص کبریٰ" میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت قرار دیا ہے، امام اہلسنّت الشاہ احمد رضا فاضل بریلوی رحمتہ اللہ علیہ کے مطابق "حضور پر نور خاتم النبیین سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم یعنی بعثت میں آخر جمیع انبیاء و مرسلین بلاتاویل و بلاتخصیص ہونا ضروریات دین سے ہے، جو اِس کا منکر ہو یا اِس میں ادنٰی شک و شبہ کو بھی راہ دے، کافر مرتد ملعون ہے۔" (فتاویٰ رضویہ جلد 6 ۔ص 57)

چنانچہ اِن تصریحات، تشریحات اور دلائل واقوال سے یہ بات ثابت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں اور آپ کے بعد قیامت تک نبوت و رسالت کا سلسلہ بند ہوچکا ہے،اِس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو شخص بھی نبوت و رسالت کا دعویٰ کرے اور پھر اس دعوے کے بارے میں کتنی ہی تاویلیں کیوں نہ کرے،اپنی نبوت کو ظلّی،بروزی، تشریعی، غیر تشریعی،یالغوی ثابت کرنے کیلئے لاکھ جتن کرے، لیکن اسے کافر، مرتد اور زندیق ہی قرار دیا جائے گا،چنانچہ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو اِس منصب پر فائز نہیں کیا جائے گا،آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے انبیاء علیہم السلام تشریف لائے،اُن میں سے ہر نبی نے اپنے بعد آنے والے نبی کی بشارت دی اور گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کی،آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی تصدیق توفرمائی مگر کسی نئے آنے والے نبی کی بشارت نہیں دی۔

بلکہ فرمایا" قیامت اُس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ 30 کے قریب دجال اور کذاب پیدا نہ ہوں، جن میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کرے گا کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔"ایک اور ارشاد مبارک ہے کہ" قریب ہے کہ میری امت میں 30 جھوٹے پیدا ہوں،ہر ایک یہی کہے گا کہ میں نبی ہوں، حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں، میرے

بعد کوئی نبی نہیں۔"اِن ارشادات میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مدعیان نبوت" کے لئے دجال اور کذاب کا لفظ استعمال فرمایا، جس کا معنی ہے کہ" وہ لوگ شدید دھوکے باز اور بہت زیادہ جھوٹ بولنے والے ہوں گے، اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے مسلمانوں کو اپنے دامن فریب میں پھنسائیں گے۔" لہذا اُمت کو خبردار کر دیا گیا کہ وہ ایسے عیار و مکار جھوٹے مدعیان نبوت اور اُن کے ماننے والوں سے دور رہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اِس پیشنگوئی کے مطابق عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک سینکڑوں کذاب اور دجال مدعیان نبوت پیدا ہوئے، جن کا حشر تاریخ اسلام سے واقفیت رکھنے والے خوب جانتے ہیں۔

لیکن بیسویں صدی میں فرنگی سرپرستی میں قادیان کے ایک ضمیر فروش مرزائے قادیانی نے جس نبوتِ کاذبہ کا دعویٰ کیا، اُس کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا تھا کہ جو بھی شخص مرزا کی نبوت پر ایمان نہ لائے وہ کافر قرار دیا جائے، چنانچہ قادیانیوں نے بھی یہی کیا، انہوں نے اُن تمام مسلمانوں کو اپنی تحریر و تقریر میں اعلانیہ کافر قرار دیا، جنھوں نے مرزا قادیانی کو نبی نہیں مانا، قادیانیوں کا مسلمانوں سے اختلاف صرف مرزا کی نبوت کے معاملے میں ہی نہیں تھا، بلکہ خود قادیانیوں نے اپنا خدا، اپنا اسلام، اپنا قرآن، اپنی نماز، اپنا روزہ، غرض کہ اپنی ہر چیز مسلمانوں سے الگ قرار دی، جس کا منطقی نتیجہ

ظاہر ہے کہ اُن کے غیر مسلم اقلیت ہونے کی شکل میں نکلا، مرزا قادیانی نے اسلام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔برصغیر میں مرزا کی جھوٹی نبوت کا مقصد انگریزی اقتدار کی مضبوطی کیلئے مسلمانوں کی فکری وحدت کو پارہ پارہ کرنا اور جذبہ جہاد کا خاتمہ تھا۔

مرزا کی ساری زندگی انگریز کی حاشیہ برداری میں گزری، اُس نے اپنی زندگی کا اِک اِک لمحہ حکومت برطانیہ کی مدح سرائی اور جاسوسی میں صرف کیا، انگریز کا دور حکومت مرزا کے نزدیک "سایہ رحمت اور ایسے امن واستحکام کا باعث تھا، جو اُسے مکہ ومدینہ میں بھی نہیں مل سکتا۔" ایسی صورت میں مرزا کے متبعین یہ کب گوارہ کرتے کہ انگریز اِس سرزمین سے چلے جائیں، چنانچہ مرزا کی جماعت نے برصغیر میں انگریز کے قیام کو طول دینے کیلئے اُسے ہر ممکن مدد ومعاونت فراہم کی، حقیقت یہ ہے کہ قصر نبوت میں نقب لگانے کی کوشش کرنے والے مرزا کی ذریت نے "اکھنڈ بھارت" کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کیلئے تحریک پاکستان کی ہی مخالفت نہیں کی بلکہ انہوں نے قیام پاکستان کے بعد بھارت واسرائیلی گٹھ جوڑ سے عالمی سطح پر پاکستان کے خلاف سازشیں کرکے وجود پاکستان کو نقصان پہنچانے میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

یہاں یہ تاریخی حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ قادیانیت کے خلاف تحریک تحفظ ختم

نبوت کی رہبری و قیادت میں علماء و مشائخ اہلسنّت ہمیشہ پیش پیش رہے، علمائے اہلسنّت و جماعت کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ سب سے پہلے مومنانہ فراست سے کام لیتے ہوئے مرزا کے کفر و نفاق اور اُس کے مزموم عقائد کا پردہ چاک کرکے اُس کا اُس وقت زبردست ردّ کیا، جس وقت کچھ لوگ مرزائے قادیانی کو" مرد صالح "اور اُس کی کتاب" براہین احمدیہ" کو صدی کا شاہکار قرار دے رہے تھے، عین اُسی وقت علمائے حق اہلسنّت و جماعت کے نمائندے عارف کامل "علامہ غلام دستگیر قصوری رحمتہ اللہ علیہ" مرزا قادیانی کی کتاب "براہین احمدیہ" میں کئے گئے مرزا کے دعوؤں کا بطلان اپنی کتاب رجم الشیاطین براغلوطات البراہین" میں پیش کرکے اُس کے کفر و گمراہی کا پردہ چاک" کیا،علامہ غلام دستگیر قصوری رحمتہ اللہ علیہ برصغیر کے سب سے پہلے عالم دین تھے جنھوں نے مرزا کی کتاب" براہین احمدیہ" کے ابتدائی حصے پڑھ کر اُس کے کفر گمراہی کو بھانپ لیا تھا اور انھوں نے بروقت اِس فتنے کا ردّ کرکے برصغیر کے مسلمانوں کو مرزا کے ناپاک عزائم سے آگاہ کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ تعاقب فتنہ قادیانیت کے سب سے پہلے سرخیل علامہ غلام دستگیر ہاشمی قصوری سے لے کر پیر سیدنا مہر علی شاہ صاحب،اعلیٰ حضرت امام احمد رضاخاں فاضل بریلوی، حجتہ الاسلام علامہ حامد رضاخان،امیر ملت پیر جماعت علی شاہ صاحب، مبلغ اسلام علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی،پروفیسر محمد الیاس

برنی، قاضی فضل احمد لدھیانوی، تاج العلماء مولانا مفتی عمر نعیمی، مفتی مظفر احمد دہلوی، قائد تحریک ختم نبوت 1953ء علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری، مجاہد ملت حضرت علامہ عبدالستار خان نیازی، غازی تحریک ختم نبوت 1953ء سید خلیل احمد قادری، حضرت شیخ الاسلام خواجہ قمرالدین سیالوی، مفتی ظفر علی نعمانی، صوفی محمد ایاز خان نیازی اورعلامہ عبدالمصطفیٰ الازہری رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین تک ہزاروں علماء و مشائخ اہلسنّت شامل ہیں، لیکن عصر حاضر میں جس کے نام پر قادر مطلق نے تحریک ارتداد قادیانیت کا سہرا مقدر فرمایا وہ شخصیت حضرت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی رحمتہ اللہ علیہ کی ہے۔تاریخ اسلام میں ریاست و مملکت کی سطح پر فتنہ انکار ختم نبوت کو کفرو ارتداد قرار دینے اور اُس کے خلاف سب سے پہلے علم جہاد بلند کرنے کا اعزاز جانشین رسول خلیفہ اوّل سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا اور اُن کے بعد یہ اعزاز اُنھی کی اولاد امجاد میں علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کو نصیب ہوا۔

علامہ شاہ احمد نورانی نے 30 جون 1974ء کو قومی اسمبلی میں قادیانیت کے خلاف قرار داد پیش کرنے سے لے کر اُس کی منظوری تک نہایت ہی محنت و جانفشانی سے کام کیا،اِس دوران آپ نے قومی اسمبلی کے اجلاسوں میں باقاعدگی سے شرکت کے ساتھ،اراکین اسمبلی کو اعتماد میں لینے،انہیں مسئلہ ختم نبوت کی اہمیت و

حیثیت سے روشناس کرانے، رات گئے تک اٹارنی جنرل یحیٰی بختیار کے ساتھ قادیانیوں سے پوچھے جانے والے سوالات کی تیاری کے ساتھ مرزا ناصر اور صدرالدین لاہوری کے محضر نامے کے جواب میں 75 سوالات پر مشتمل سوالنامہ کی تیاری میں بھی بھرپور حصہ لیا، آپ نے قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی اور رہبر کمیٹی کے رکن ہونے کے باوجود عوامی رائے عامہ ہموار کرنے کیلئے ملک بھر کے طوفانی دوروں میں چالیس ہزار میل کا سفر طے کیا اور ڈیڑھ سو سے زائد شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں عوامی جلسوں سے خطاب کرکے مسلمانوں کو قادیانیوں کے گمراہ کن عقائد، فتنہ پردازیوں اور شرانگیزیوں سے آگاہ کیا، پاکستان کی تاریخ میں اسمبلی فلور پر عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کیلئے سب سے پہلے مسلمان کی تعریف کو آئین کا حصہ بنانے کا مطالبہ کرنے والے علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کی پیش کردہ قرار کے نتیجے میں 7 ستمبر 1974ء کو ملک کی منتخب پارلیمنٹ نے متفقہ طور پر قادیانیوں کو اُن کے کفریہ عقائد کی بناء پر غیر مسلم اقلیت قرار دیا اور یوں نوے سالہ فتنہ اپنے منطقی انجام کو پہنچا۔

علماء اسلام کی گرفت اور پارلیمنٹ کے متفقہ فیصلے کے بعد قادیانی جماعت نے اپنے لٹریچر کو چھپانے کی منظم کوشش کی اور اپنے اسلام دشمن عقائد پر تقیہ کا پردہ ڈال کر اہل اسلام میں نقب زنی کا عمل جاری رکھا، ایسے میں ضرورت اس

اُمر کی تھی کہ قادیانیت کے کفر وارتداد کو مستند شہادتوں کے ساتھ عوام کے سامنے لایا جائے اور شہادتیں بھی ایسی کہ ناقابل تردید ہوں، لیکن مجبوری یہ تھی کہ قادیانی لٹریچر تک عوام تو کجا خواص کی بھی رسائی آسان نہیں تھی اور اگر خوش قسمتی سے قادیانی کتب ورسائل دستیاب ہو بھی جائیں تو قادیانی اپنے لٹریچر کے ہر نئے ایڈیشن میں تحریف کا فریضہ باقاعدگی سے سرانجام دیتے رہتے ہیں، پھر دور جدید میں عوام کے پاس وقت کی بڑی قلت ہے کہ مرزائی لٹریچر کی ورق گردانی کرکے اُس میں سے حقائق تلاش
کریں، جہاں تک قادیانی لٹریچر کے مطالعہ کا ہمیں اتفاق ہوا، ہمیں اِن میں اجراء نبوت و وفات مسیح کی کج بحثیوں، جھوٹے الہامات، نہ پوری ہونے والی پیشین گوئیوں، علماء و مشائخ کے خلاف دشنام طرازیوں، سیدنا مسیح علیہ السلام پر توہین آمیز تبرّے، پادری عبداللہ آتھم سے ہونے والے مناظرے اور محمدی بیگم کی مناکحت کی جھوٹی تاویلات کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آتا۔
علم و حکمت ہو بھی تو کیونکر، کہ خداجب ایمان لیتا ہے تو عقل و حکمت چھین لیتا ہے مرزا کے ساتھ بھی یہی ہوا، آج مرزا اور اُس کے متبعین دین و دنیا دونوں میں ذلیل و خوار اور راندہ درگاہ ہیں، مرزا کے رنگ برنگے ماضی، اُس کے جھوٹے
دعوؤں، تحریروں، جھوٹی وحی والہامات اور پیشین گوئیوں کا تجزیہ ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ وہ ایک باخبر کذاب تھا اور وہ سب

کچھ جانتے ہوئے بھی دھوکہ دے رہا تھا، اُس نے خدا کے نام اور جعلی نبوت کو سامراجی مقاصد کی تکمیل میں استعمال کیا اور اُس کے اِس تمام کاروبار کا مقصد ذاتی عظمت اور مذہب کے نام پر دولت و شہرت اکٹھی کرنا تھا، قادیانیوں کی انجیل "تذکرہ" میں وہ لغویات اور احمقانہ پن ہے جو کسی اہم شخص کی سوانح عمری اور تاریخ میں ہرگز نہیں ملتا، مرزا قادیانی کی جھوٹی وحی عربی، اردو، فارسی، انگریزی، عبرانی، ہندی اور پنجابی زبان میں ہے،زبان گھٹیا، مبہم، عامیانہ، گندی اور غلط ہے، حقیقت میں اُس کا بڑا حصہ لغو اور بے معنی فقرات پر مشتمل ہے،جس کے کوئی واضح معانی نہیں ہیں، پھر بھی قادیانی ذریت اُس کے بیانات کی مختلف تاویلات پیش کرکے مرزا کی جھوٹی نبوت ثابت کرنے اور امت مسلمہ کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔

چنانچہ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ قادیانیوں کی اسلام دشمن سرگرمیوں اور ان کے اسلام کی خلاف ہرزہ سرائیوں، مضحکہ خیزیوں اور کفریہ عقائد و عزائم کا بھرپور محاصرہ کیا جائے اور ان کیلئے راہ فرار کے تمام دروازے بند کر دیئے جائیں اور قادیانیت کی حقیقی گھناؤنی تصویر اور اسلام دشمن شرمناک کردار لوگوں کے سامنے رکھا جائے،آج اس کام کیلئے ہم سب کو اپنا بھرپور، فعال اور متحرک کردار ادا کرنا ہوگا،دعا ہے کہ اللہ کریم فتنہ قادیانیت کی سرکوبی اور بیخ کنی کیلئے ہمیں بھی اپنے اسلاف کی طرح سرفروشانہ کردار ادا کرنے کی

توفیق عطا فرمائے۔ آمین بجرمۃ خاتم النبیین سید المرسلین وعلی وآلہ واصحابہ اجمعین

علامہ شاہ احمد نورانی اور تحریک تحفظ ختم نبوت

عقیدہ ختم نبوت اسلام کی اساس اور وہ بنیاد ہے جس پر دین اسلام کی پوری عمارت کھڑی ہے، یہی وہ عقیدہ ہے جو جسد اسلام کی روح ہے، قرآن مجید کی سو کے قریب آیات مبارکہ سے ثابت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالٰی کے آخری نبی اور رسول ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی قسم کا کوئی نیا نبی نہیں، خود رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے کم و بیش دو سے زائد احادیث مبارکہ میں اس اَمر کی وضاحت مختلف پیرائے میں فرمائی کہ پوری اُمت ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم نبوت کے مسئلہ پر یکسو اور متحد ہو گئی اور یہ پوری امت کا متفقہ عقیدہ قرار پایا، حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ سے لے کر آج تک ہر دور میں دنیا کے حریص اور طالع آزماؤں نے جھوٹ، فریب، مکر و دجل اور شعبدے بازیوں سے قصر نبوت میں نقب لگانے کی کوشش کی، مگر امت مسلمہ اس جعلسازی کا مقابلہ کرنے کیلئے ہمیشہ مستعد و منظم رہی، مسیلمہ کذاب، طلیحہ بن خویلد، اُسود عنسی سے لے کر مرزا قادیانی تک امت مسلمہ نے ہر دور میں ان نقب زنوں کا کامیاب تعاقب کیا، 1901ء میں جب سے مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے خود ساختہ نبی ہونے کا اعلان کیا، تو علماء و مشائخ اُمت نے اس فتنے کے سدباب کیلئے ہر میدان میں قادیانیت کا محاسبہ جاری رکھا۔

بیسویں صدی کا آغاز امت مسلمہ کیلئے جن بدترین حالات میں ہوا،اس کا آج تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ل یکن اس تاریک دور میں اللہ ربّ العزّت نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے اُمت کو ایسے افراد سے نوازا جنھوں نے کفر و طاغوت اور ظلم و استحصالی نظام کے خلاف ہر محاذ پر چو مکھی لڑائی لڑی،اِن نفوس قدسیہ میں حضرت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کو ایک ممتاز اور منفرد مقام حاصل ہے،علامہ شاہ احمد نورانی کی زندگی اسلام کے عملی نفاذ،دینی قوتوں اور جمہوری اداروں کی فروغ وبقاء،پاکستان کے استحکام و سالمیت، مسلم وحدت کی مسلسل جدوجہد،احیائے اسلام اور کفر کے خلاف عالم اسلام کی بیداری سے عبارت ہے،یکم اپریل 1926ء میں مبلغ اسلام سفیرپاکستان حضرت علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی رحمتہ اللہ علیہ کے گھرپیدا ہونے والے اِس فرزند ارجمند نے زندگی بھر اپنے ایمان، ضمیراور نسبی تقاضوں کو سامنے رکھ کر احقاق حق اور ابطالِ باطل شمع روشن رکھی،علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کی زندگی کا واحد مشن ملک خداداد پاکستان میں نظام مصطفیٰ کا نفاذ اور مقام مصطفیٰ کا تحفظ تھا،جناب شاکر حسین خان ریسرچ اسکالر علوم اسلامی جامعہ کراچی اپنے تحقیقی مقالے میں لکھتے ہیں "قیام پاکستان کے بعد علماء و مشائخ نے 1953ء میں قادیانیوں کے خلاف تحریک چلائی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکی،اس کے باوجود علمائے حق نئی حکمت عملی سے اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے سرانجام دیتے رہے اور ہر محاذپر

قادیانیوں کے سامنے سینہ سپر رہے، وہ علماء جنہوں نے حق کی آواز کو تحریک ختم نبوت 1953ء کی ناکامی کے بعد دوبارہ بلند کیا، اُن میں روشن وتابندہ نام مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی کا ہے، جنہوں نے عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کیلئے بھرپور طریقے سے عملی جدوجہد جاری رکھی، قادیانیوں کے خلاف تحریک چلائی اور اُن کی ہر موڑ پر مخالفت کرتے رہے.... مولانا نورانی نے اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے قادیانیوں کی مخالفت کی اور ہمیشہ اُن کے آگے آہنی چٹان کی مانند کھڑے رہے۔“بحوالہ ماہنامہ پیام حرم کراچی، نومبر 2005ء ص23

علامہ نورانی 1971 میں پہلی بار جمعیت علماءپاکستان کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، 15اپریل 1972ء کو قومی اسمبلی کا سہ روزہ افتتاحی اجلاس شروع ہوا تو علامہ نورانی نے اجلاس کے پہلے ہی روز جمعیت علماءپاکستان کے پارلیمانی قائد کی حیثیت سے عبوری آئین کے حوالے سے عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کو اپنا موضوع گفتگو بنایا، یہ پاکستان کی تاریخ میں قومی اسمبلی کے فلور پر عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ میں بلند ہونے والی سب سے پہلی آواز تھی، علامہ شاہ احمد نورانی پاکستان کی پارلیمانی اور آئینی تاریخ میں پہلے سیاستدان تھے، جنہوں نے سب سے پہلے آئین میں مسلمان کی تعریف شامل کرنے کا مطالبہ کیا اور آئین سازی کیلئے قائم کمیٹی میں سب سے پہلی ترمیم مسلمان کی تعریف اور

اسلام کو ریاست کا سرکاری مذہب قرار دینے سے متعلق پیش کی، قومی اسمبلی میں اپنے اوّلین خطاب میں علامہ نورانی نے آئین کے اندر مسلمان کی تعریف شامل کرنے کا پرزور مطالبہ کیااور کہا کہ " جو لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی نہیں مانتے ہم ان کو مسلمان ہی نہیں سمجھتے۔" آپ کے اس مطالبے کا مقصد پاکستان کے اس اعلیٰ ترین انتظامی عہدوں پر عقیدہ ختم نبوت کے مخالف قادیانیوں اور غیر مسلموں کے فائز ہونے کے امکانات کا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خاتمہ تھا، دراصل علامہ نورانی کا آئین میں مسلمان کی تعریف شامل کرنے کا مطالبہ قادیانیوں کو کافراور غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی تحریک کا نقطہ آغاز اور 1974ء کی تحریک ختم نبوت کی بنیادی اساس تھا۔

چنانچہ 17اپریل 1972ء کو جمعیت علماءپاکستان اور متحدہ اپوزیشن کی جانب سے مسلمان کی جامع تعریف کو پہلی بار اسمبلی میں پیش کی گئی، جسے بعد میں 1973ء کے آئین میں شامل کرلیا گیا، علامہ نورانی کی کوششوں کی بدولت مسلمان کی تعریف پاکستان کے آئین کا حصہ بن چکی تھی اور آئین میں اس تعریف کی شمولیت نے قادیانیوں کو ایک ایسی غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا تھا، جس کا مستقبل میں صرف اعلان ہونا ہی باقی رہ گیا تھا، اس تعریف کی شمولیت سے قادیانیوں کو بھی یقین ہو چلا تھا کہ وہ ایک غیر اعلانیہ غیر مسلم اقلیت قرار پاچکے ہیں، مولانا نورانی کو منکرین ختم نبوت قادیانیوں اور قادیانیت

سے شدید نفرت تھی اور اسی نفرت نے انہیں زندگی بھر قادیانیت کے خلاف مصروف جہاد رکھا،علامہ نورانی جو کہ نوجوانی میں تحریک ختم نبوت 1953ء میں جید اکابر علماء کے ساتھ "علماء بورڈ کے ممبر اور مجلس عمل تحفظ ختم نبوت سندھ کے جنرل سیکرٹیری" کی حیثیت سے مرکزی کردار ادا کرچکے تھے،اس تحریک کی ناکامی کے اسباب و عوامل سے پوری طرح واقف تھے،چنانچہ آپ نے تحفظ ختم نبوت اور عظمت مصطفیٰ کو مملکت کا قانون بنانے اور آئینی تحفظ دینے کیلئے کام کرنا شروع کردیا،اس سفر کی کامیاب ابتداء آئین میں مسلمان کی تعریف کی شمولیت،ریاست کا سرکاری مذہب اسلام،دیگر اسلامی دفعات کو آئینی تحفظ دینے کے علاوہ عائلی قوانین کی تنسیخ،تینوں مسلح افواج کے سربراہوں کیلئے مسلمان ہونے کی شرط، فتنہ ارتداد کو روکنے کی ضمانت حاصل کرنے اور پاکستان کے دستور کو دو قومی نظریے سے ہم آہنگ کرنے کی کوششوں سے ہوچکی تھی اور آپ اپنے اہداف پر نظر رکھے ہوئے مرحلہ وار اس منزل کی جانب رواں دواں تھے۔

آپ 29اپریل 1973ء کو آزاد کشمیر اسمبلی میں میجر (ریٹائرڈ) محمد ایوب کی متفقہ طور پر منظور کی جانے والی قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی قرار داد سے بھی اچھی طرح واقف تھے اور محسوس کررہے تھے کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی قرار داد پاکستان کی نیشنل اسمبلی کو بھی منظور کرکے پاکستان کے مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرنی چاہیے،واضح رہے

کہ میجر (ریٹائرڈ) محمد ایوب کی قرار داد کا اصل محرک اور اس کی بنیاد 17 اپریل 1972ء کو پاکستان کی قومی اسمبلی میں پیش کردہ مسلمان کی وہ متفقہ تعریف تھی جسے علامہ نورانی اور آپکے رفقاء نے تیار کیا تھا،آزاد کشمیر اسمبلی نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر ایک نئی تاریخ ہی رقم نہیں کی بلکہ پاکستان کی نیشنل اسمبلی کے اراکین کیلئے بھی آئندہ کا لائحہ عمل متعین کردیا تھا، مرزائی آئین میں مسلمان کی تعریف کی شمولیت سے پہلے ہی سخت پریشان تھے کہ آزاد کشمیر اسمبلی میں قادیانیوں کے خلاف قرارداد کی منظوری نے اُن کے تمام خدشات کو یقین میں بدل دیااور انہیں محسوس ہونے لگا کہ عنقریب اب پاکستان کی قومی اسمبلی میں موجود علماء اُن کے مستقبل کے بارے میں قرار داد پیش کرکے اُن کیلئے رہے سہے راستے بھی بند کردیں گے، اس صورتحال نے مرزا ناصر کو اس قدر سیخ پا کردیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف ہذیان بکنے لگا، اتفاق سے اسی دوران سانحہ ربوہ پیش آگیا، جس نے قادیانیوں کے خلاف عوامی نفرت کو مزید گہرا کردیا اور جو تحریک ختم نبوت 1974ء کی اصل بنیاد بنا، علامہ شاہ احمد نورانی جو کہ تمام حالات کا نہایت ہی باریک بینی سے جائزہ لے رہے تھے، نے محسوس کیا کہ اب قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوانے کیلئے آئینی اور قانونی جنگ لڑنا انتہائی ضروری ہوگیا ہے، چنانچہ 30، جون 1974ء کو آپ نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کیلئے تاریخ ساز قرارداد قومی اسمبلی میں پیش کی، جسے نے ایوان بحث کیلئے متفقہ طور پر منظور

کرلیا۔

آپ نے قومی اسمبلی میں قادیانیت کے خلاف قرار داد پیش کرنے سے لے کر اُس کی منظوری تک نہایت ہی محنت و جانفشانی سے کام کیا،اس دوران آپ نے قومی اسمبلی کے اجلاسوں میں باقاعدگی سے شرکت کے ساتھ،اراکین اسمبلی کو اعتماد میں لینے،انہیں مسئلہ ختم نبوت کی اہمیت و حیثیت سے روشناس کرانے،رات گئے تک اٹارنی جنرل یحیٰی بختیار کے ساتھ قادیانیوں سے پوچھے جانے والے سوالات کی تیاری کے ساتھ،مرزا ناصر اور صدرالدین لاہوری کے محضر نامے کے جواب میں 75 سوالات پر مشتمل سوالنامہ کی تیاری میں بھی بھرپور حصہ لیا،آپ نے قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی اور رہبر کمیٹی کے رکن ہونے کے باوجود عوامی رائے عامہ ہموار کرنے کیلئے ملک بھر کے طوفانی دوروں میں چالیس ہزار میل کا سفر طے کیا اور ڈیڑھ سو سے زائد شہروں،قصبوں اور دیہاتوں میں عوامی جلسوں سے خطاب کرکے مسلمانوں کو قادیانیوں کے گمراہ کن عقائد،فتنہ پردازیوں اور شرانگیزیوں سے آگاہ کیا،رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین مفتی منیب الرحمٰن فرماتے ہیں کہ "علماء اِس سے پہلے بھی موجود تھے......مگر یہ سعادت ماضی میں کسی کے حصے میں بھی نہیں آئی،تاریخ پاکستان میں پہلی بار ایک مرد حق،پیکر صدق و صفا،کوہ استقامت اور حاصل جرات و شجاعت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی اسمبلی میں پہنچے اور فتنہ انکار ختم نبوت یعنی قادیانیت کو

کفر وارتداد قرار دینے کی بابت قرار داد قومی اسمبلی میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی،تاریخ اسلام میں ریاست و مملکت کی سطح پر فتنہ انکار ختم نبوت کو کفروارتداد قرار دینے اور ان کے خلاف علم جہاد بلند کرنے کا اعزاز جانشین رسول خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوااور ان کے بعد یہ اعزاز انہی کی اولاد امجاد میں علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کو نصیب ہوا۔" "بحوالہ ماہنامہ کاروان قمر کراچی امام "نورانی نمبر نومبر دسمبر 2004ء ص 20

قادیانی مسئلے پر غور خوص کیلئے قومی اسمبلی کی پورے ایوان پر مشتمل خصوصی کمیٹی نے دو ماہ میں 28 اجلاس اور 96 نشستیں منعقد کیے،اس دوران قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی کے روبرو قادیانی گروکے سرخیل مرزا ناصر،لاہوری گروپ کے امیر صدرالدین اورانجمن اشاعت اسلام لاہور کے عبدالمنان اور مسعود بیگ پر ان کے عقائد و نظریات،ملک دشمنی اور یہودی و سامراجی گٹھ جوڑکے حوالے سے جرح ہوئی،علامہ نورانی فرماتے ہیں کہ "مسلسل گیارہ روزتک مرزا ناصر پر جرح ہوتی رہی،اور سوال اور جوابی سوال کیے جاتے رہے، مرزا کو صفائی پیش کرتے کرتے پسینہ چھوٹ جاتا اورآخر تنگ آ کر کہہ دیتا کہ بس اب میں تھک گیا ہوں،اسے گمان نہیں تھا کہ اس طرح عدالتی کٹھرے میں بٹھاکراس پر جرح کی جائے گی.....وہ اپنا عقیدہ خود اراکین اسمبلی کے سامنے بیان کرگیا اوراس

بات کا اعلان کر گیا کہ مرزا (غلام احمد قادیانی) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسیح موعود اور امتی نبی ہے، جن اراکین اسمبلی کو قادیانیوں کے متعلق حقائق معلوم نہیں تھے، انہیں بھی معلوم ہوگیا اور انہیں اس بات کا یقین ہوگیا کہ مولانا نورانی جنہیں اقلیت قرار دلوانے کی سعی کر رہے ہیں وہ لوگ واقعی کافر، مرتد اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔" "بحوالہ ماہنامہ ضیائے حرم ختم نبوت نمبر 1974ء" قادیانی مسئلے پر فیصلہ کرنے کیلئے قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی نے قادیانی مسئلہ کو جانچنے اور پرکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور طویل جمہوری و پارلیمانی کاروائی کے بعد قومی اسمبلی نے پورے تدبر سے کام لیتے ہوئے 7، ستمبر 1974ء کو وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی موجودگی میں آئین کی وہ واحد ترمیم منظور کی جس کی مخالفت میں ایک بھی ووٹ نہیں ڈالا گیا، یوں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا تاریخ ساز فیصلہ کرتے ہوئے پاکستان کے دونوں ایوانوں نے مرزا قادیانی اور اُس کی ذریت کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا، اس طرح علامہ شاہ احمد نورانی اور تمام مسالک کے علماء و مشائخ کی مشترکہ کوششوں سے نوے سالہ فتنے کے اختتام ہوا اور قادیانیوں کے خلاف تحریک اپنے منطقی انجام تک پہنچی۔

آزادی کشمیر ابھی نہیں تو کبھی نہیں-----

تحریک آزادی کشمیر تاریخ کے فیصلہ کن موڑ پر

چیئرمین ماوزے تنگ نے کہا تھا "جنگیں دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک انقلابی اور دوسری انقلاب دشمن، انقلابی جنگوں کا مقصد دراصل مزید جنگوں کا دروازہ بند کرنا ہوتا ہے، جبکہ انقلاب دشمن جنگیں مزید جنگوں کا راستہ ہموار کرتی ہیں، ہماری جنگ انقلابی ہے، ہم امن کی خاطر جنگ لڑ رہے ہیں، فتح آخر کار ہماری ہوگی۔" جب ارادے مصمم، عزم جواں، حوصلے بلند اور قوم کا بچہ بچہ جذبہ قربانی سے آشنا ہو تو تحریکوں کو کامیابی کی منزل سے زیادہ دیر دور نہیں رکھا جاسکتا، آج مقبوضہ جموں و کشمیر میں بھارتی غاصبانہ کے خلاف 11 جون 2010 سے شروع ہونے والی تحریک آزادی کی نئی لہر چوتھے فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوچکی ہے اور ہر آنے والے دن کے ساتھ اِس کی شدت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے، جبکہ بھارت نے اس تحریک کو کچلنے کیلئے پہلے سے موجود سات لاکھ فوج کی مدد کیلئے مزید 60 ہزار فوج مقبوضہ کشمیر بھیج دی ہے، آزادی کے حق میں بڑھتے ہوئے عوامی احتجاج، مظاہروں اور فوج کے درمیان خونریز جھڑپوں کے بعد سری نگر میں کرفیو لگا دیا گیا ہے، عوامی اجتماعات اور جلسے جلوسوں پر پابندی

عائد ہے، حریت کانفرنس سمیت کئی رہنماؤں کو گرفتار کرکے نظر بند کر دیا گیا ہے،
ذرائع ابلاغ پر بھارتی حکومت کے شدید دباؤ کی وجہ سے تحریک کے بارے میں بہت کم
خبریں مقبوضہ ریاست سے باہر پہنچ رہی ہیں مگر ذمہ دار اور غیر جانبدار ذرائع
صورتحال کے متعلق لائن آف کنٹرول کے اِس پار جو اطلاعات پہنچا رہے ہیں، اُن کے
مطابق ریاست کے مختلف مقامات پر مظاہرین اور احتجاجی جلوسوں پر بھارتی فوج کی
وحشیانہ فائرنگ سے اب تک سینکڑوں کشمیری شہید ہو چکے ہیں، کرفیو کے باوجود مقبوضہ
کشمیر کے نہتے عوام تین ماہ سے مسلسل بھارتی فوج اور سیکورٹی فورسز کی فائرنگ کا مقابلہ
احتجاجی مظاہروں اور پتھروں سے کرکے دنیا کو یہ باور کرا رہے ہیں کہ وہ بھارت کے
ساتھ رہنے کو تیار نہیں۔
آج کشمیریوں کی عظیم الشان تحریک نے جہاں ایک طرف ساری دنیا کو اپنی جانب متوجہ
کر لیا ہے، وہیں بھارتی حکمرانوں کو بھی ہلا کر رکھ دیا ہے، دنیا نے دیکھا کہ کس طرح نئی
دہلی میں بھارتی وزیر اعظم اعتراف شکست کرتے ہوئے بڑی بے بسی کے ساتھ کانپتے
ہوئے ہونٹوں سے کہہ رہے تھے کہ کشمیری عورتوں، بچوں اور نوجوانوں کے مظاہروں
نے انہیں ہلا کر رکھ دیا ہے، وزیر اعظم کے اِس بیان سے یہ بات روز روشن کی طرح
عیاں ہو چکی کہ کشمیر کی تحریک آزادی ایک ایسے فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی جس
میں بچے، بوڑھے، جوان حتیٰ کہ

خواتین بھی بندوق اور گولی کے خوف سے بے نیاز ہو کر گولیوں اور سنگینوں کے سائے
میں سینہ تان کر کھڑے ہیں، گزشتہ دنوں بھارتی وزیراعظم من موہن سنگھ کی
صدارت میں منعقد ہونے والی کل جماعتی کانفرنس نے فیصلہ کیا ہے کہ مقبوضہ کشمیر کی
سیاسی اور غیر سیاسی قیادت سے مذاکرات کے لیے وزیر داخلہ پی چدم برم کی سربراہی
میں ایک وفد مقبوضہ کشمیر کا دورہ کرے گا، بھارتی وزیراعظم نے اپنی رہائش گاہ پر بھارت
کی تمام سیاسی جماعتوں پر مشتمل کانفرنس طلب کی تھی تاکہ مقبوضہ کشمیر کی صورتحال کا
جائزہ لے کر عوامی بے چینی، احتجاج اور تشدد کے خاتمے کے لیے تجاویز تیار کرے،
ذرائع ابلاغ کی رپورٹوں کے مطابق یہ کانفرنس بے نتیجہ ختم ہو گئی ہے، سات گھنٹے تک
جاری رہنے والی یہ کانفرنس سیاسی رہنماؤں پر مشتمل وفد کی تشکیل کے علاوہ کوئی فیصلہ
نہیں کر سکی جو مقبوضہ کشمیر میں حقائق کو معلوم کرنے کی کوشش کرے گا، بھارتی
وزیراعظم من موہن سنگھ کی جانب سے مقبوضہ کشمیر کی صورتحال کے بارے میں کل
جماعتی کانفرنس کا طلب کیا جانا اِس بات کی علامت ہے کہ بھارتی حکومت مقبوضہ کشمیر
میں موجودہ احتجاجی لہر سے ہل کر رہ گئی ہے، حالانکہ جنرل پرویز مشرف اور موجودہ
پاکستانی حکومت کی کمزور اور معذرت خواہانہ پالیسی نے بھارت کو یہ اعتماد بخشا کہ وہ
مقبوضہ کشمیر کی آزادی کی تحریک کو کچل کر رکھ دے گا، لیکن اِس دفعہ کشمیر میں تحریک
نے جو رخ اختیار کیا ہے اُس کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بھارت اور عالمی دنیا کو
نوشتہ دیوار پڑھ کر اب یہ

فیصلہ کرنا ہوگا کہ کشمیر کے آتش فشاں کو سرد کرنے کے لئے کشمیریوں کو آزادی دینی ہے یا طاقت کے زور پر اس تحریک آزادی کو کچل کر عالمی امن کو خطرے سے دوچار کرنا ہے، موجودہ تحریک کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اگر اِس تحریک کو کشمیری قائدین بھارت کی کسی شاطرانہ چال کا شکار ہو کر ختم بھی کرنا چاہیں تو یہ ممکن نہیں، کیونکہ تحریک کا مکمل کنٹرول اُن نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے، جو اب آزادی سے کم کسی بات کے لئے راضی نہیں۔

یہاں یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ کشمیر کی موجودہ تحریک پچھلی تمام تحاریک سے اِس لحاظ سے منفرد ہے کہ اِس کی قیادت کشمیر کا نوجوان طبقہ کر رہا ہے، جن کے جوش جنوں کا یہ عالم ہے کہ کشمیر بھر میں رمضان المبارک کے دوران بھی یہ تحریک پوری قوت سے چلتی رہی اور نوجوان طبقے نے اِس کے زور کو کم نہیں ہونے دیا، عید الفطر کے دوران بھی کشمیری حالت جنگ میں رہے اور عید کے تیسرے روز انہوں نے بھارتی فورسز کو زچ کرکے رکھ دیا، قارئین محترم کشمیر کی موجودہ تحریک ایک ایسے وقت میں شروع ہوئی ہے، جب پچھلی نسل حوصلہ ہار چکی ہے، اَن گنت نامور کمانڈرز شہید ہو چکے ہیں اور وادی میں مجاہدین کی تعداد بہت ہی کم رہ گئی ہے، ایسے وقت میں کشمیر کا نوجوان یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اگر اُس نے وقت ضائع کیے بغیر اِس تحریک کو دوبارہ نہ اٹھایا تو اُن کی قوم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھارتی غلامی میں چلی جائے گی، چنانچہ اِس صورتحال

میں انہوں نے اِس خلاء کو پورا کرنے کا فیصلہ کیا اور انتہائی مختصر وقت میں یہ نوجوان تحریک کو ایک ایسے مقام تک لے آئے ہیں جسے فیصلہ کن مرحلہ کہا جائے تو قطعاً غلط نہ ہوگا. آج نہ صرف یہ کہ پوری دنیا مقبوضہ کشمیر کی طرف متوجہ ہو رہی ہے بلکہ کشمیر کے ہر طبقے کے اندر یہ احساس فزوں تر ہو رہا ہے کہ اگر اُس نے یہ موقع ضائع کر دیا تو پھر شائد آزادی کی صبح کبھی طلوع نہ ہو سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ کشمیری عوام اب اُس فیصلہ کن معرکے کا تہیہ کر چکے ہیں جس کے ذریعے قوموں کو غلامی کی زنجیروں سے آزادی نصیب ہوتی ہے، کشمیری نوجوان اب ماضی کے تمام مظالم اور شہداء کی قربانیوں کا قرض چکانے کے لئے ایک ہو چکے ہیں کشمیریوں عوام کے اجتماعی شعور نے یہ فیصلہ دے دیا ہے کہ آزادی "ابھی نہیں تو کبھی نہیں" یہی وجہ ہے کہ ساری کشمیری قوم بھارت کے جابرانہ تسلط کے خلاف آزادی حق میں اٹھ کھڑی ہوئی ہے، مقبوضہ کشمیر میں پچھلے چار ماہ سے جاری جدوجہد آزادی کی نئی لہر روز.بروز طاقت پکڑ رہی ہے اور اب بھارت کیلئے اِسے نظر انداز کرنا آسان نہیں رہا، یوں تو مقبوضہ کشمیر میں گزشتہ چھ عشروں میں کئی تحریکیں چلی، لیکن حالیہ تحریک کے بارے میں اب خود بھارت کی صاحب الرائے اور دانشور حضرات کا کہنا ہے کہ موجودہ تحریک وہ نہیں کہ جسے بھارت طاقت کے زور پر دبایا جاسکے یا موجودہ تحریک سے آسانی سے جان چھڑائی

جاسکے۔اِس بات کا اظہار بھارت کے معروف اخبار ہندوستان ٹائمز کی اُس سروے رپورٹ سے بھی ہوتا ہے جس کے مطابق 72 فیصد کشمیریوں نے بھارت کے ساتھ رہنے کو مسترد کردیا ہے۔ بھارت میں باضمیر اہل دانش اور حقوق انسانی کی تنظیمیں بھی اب اِس بات کو تسلیم کر رہی ہیں کہ کشمیر کی موجودہ تحریک میں گزشتہ 20 سال میں پہلی مرتبہ اتنی شدت دیکھنے میں آرہی ہے اور تحریک کی شدت نے بھارت کی رائے عامہ کو بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور کردیا ہے کہ مقبوضہ کشمیر کے عوام بھارت کی حکومت سے شدید ناراض ہیں۔ دنیاکے سامنے یہ منظر نامہ عیاں بھی ہے کہ ایک محدود جغرافیے میں 7 لاکھ بھارتی فوجی تعینات ہیں جسے ایک ظالمانہ اور سیاہ قانون کے تحت یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی بھی شخص پر گولی چلا سکتی ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج کی جانب سے انسانی حقوق کی خلاف ورزی پر اب بھارت میں بھی آواز اٹھنے لگی ہے۔ نہتے مظاہرین کی ہلاکت کے بعد بھارتی حکومت اسے سرحد پار دراندازی یا دہشت گردی قرار نہیں دے سکتی، یہی وجہ کہ بھارت نواز کشمیری جماعتیں بھی اِس قانون کی منسوخی کا مطالبہ کررہی ہیں، کل جماعتی کانفرنس میں بھی اِس قانون کی منسوخی کا معاملہ زیر بحث آیا لیکن بھارتی قیادت نے مجموعی طور پر اتفاق کیا ہے کہ اِس ظلم ودرندگی کو جاری رکھا جائے گا۔ بھارتی وزیراعظم من موہن سنگھ نے تشدد کے خاتمے کی شرط پر مذاکرات کی بات کی ہے، لیکن یہ وہی پرانی رٹی رٹائی بات ہے جس کی بنیاد پر بھارت نے گزشتہ 63 سال سے مسئلہ کشمیر کو پس پشت ڈال رکھا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کشمیریوں کی موجودہ تحریک مزاحمت نے پوری دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا ہے اور کشمیری نوجوانوں نے "بھارتیوں، کشمیر چھوڑ دو" کی جو تحریک شروع کی وہ اِس وقت تاریخ کی ایسی غیر معمولی تحریک میں تبدیل ہو گئی ہے، جس نے ثابت کر دیا ہے آج کے دور میں کسی قوم کو بزور شمشیر زیر نہیں کیا جا سکتا، یہاں یہ اَمر قابل ذکر ہے کہ بھارت اِس سے قبل یہ بات تسلیم کرنے کے لیے ہی تیار نہیں تھا کہ کشمیر کی تحریک آزادی مقامی تحریک ہے اور کشمیر ایک متنازعہ خطہ زمین ہے، یہی وجہ ہے کہ بھارت کی حکومت اور قیادت ماضی میں مسلسل یہ دعویٰ کرتی رہی کہ مقبوضہ کشمیر میں پاکستان سے مداخلت ہوتی ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک مقامی تحریک ہے اور اِس مرحلے پر مقبوضہ کشمیر کے نوجوانوں اور عوام نے حیرت انگیز اور غیر معمولی مزاحمت کا مظاہرہ کرکے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اب یہ تحریک کسی طور بھی اپنے منطقی انجام تک پہنچے بغیر نہیں رکے گی، اِس وقت کشمیری جس اتحاد و یک جہتی کا مظاہرہ کر رہے ہیں اُس کو دیکھتے ہوئے پاکستان کو بھی اپنے سرد مہری والے رویئے اور جنرل پرویز مشرف کی اپنائی گئی پالیسیوں میں ایسی تبدیلی لانے کی ضرورت ہے جس سے کشمیر کے اندر پاکستان کے حوالے سے پھیلائی گئی مایوسیوں کا خاتمہ ہو اور کشمیری اپنے آپ کو تنہا محسوس نہ کریں، اِس حوالے سے حکومت پاکستان کو چاہیے کہ کشمیر کے مقدمے کو عالمی سطح پر اجاگر کرنے کے لئے ایک مضبوط اور

منظم پالیسی اپنائے اور عالمی برادری کی توجہ کشمیر میں بھارتی مظالم کی طرف دلاتے ہوئے بھارت کا اصل چہرہ دنیا کے لائے۔

یوں بھی پاکستان میں اِس وقت ذوالفقار علی بھٹو کی جماعت کی حکومت ہے، جنھوں نے اقوام متحدہ میں کہا تھا کہ "ہم کشمیر کے لئے ہزار سال تک جنگ لڑیں گے۔" آج ذوالفقار علی بھٹو کے نظریاتی وارث ہونے کے دعویدار حکومت پر لازم ہے کہ وہ کشمیریوں کی اخلاقی اور سفارتی مدد کے ساتھ آزادی کشمیر کیلئے مضبوط حکمت عملی اپنا کر ماضی کی اُن پالیسیوں کا یکسر خاتمہ کرے جس کے نتیجے میں بھارت نے کشمیر پر اپنا ظالمانہ تسلط قائم کر رکھا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان مسئلہ کشمیر کا ایک اہم فریق ہے اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق اِس مسئلے کے حتمی حل میں اِس کا کردار بنیادی اہمیت کا حامل ہے، وہ کشمیری عوام کو حق خودارادیت دلانے کی کمٹمنٹ کر چکا ہے جسے وہ کسی قیمت پر فراموش نہیں کر سکتا، چنانچہ تحریک آزادی کشمیر کے اِس اہم موقع پر بھارت کی ریاستی دہشت گردی پر اقوام متحدہ، انسانی حقوق کی تنظیموں اور بالخصوص حکومت پاکستان کی خاموشی تشویشناک ہے، جبکہ مسئلہ کشمیر پاکستان کی خارجہ پالیسی کا کلیدی نکتہ ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ کشمیریوں کی تحریک آزادی کی منزل اب زیادہ دور نہیں، لہٰذا پاکستان کے حکمران اور عوام کیلئے کشمیریوں کی اخلاقی، سفارتی اور ہر سطح پر مدد کے لئے تیار ہونا

لازمی اَمر ہے تاکہ " کشمیر بنے گا پاکستان " کے نعرے کو سچ ثابت کرنے کے لئے کشمیریوں کے ہاتھ مضبوط ہوں اور 63 سال سے جاری تحریک آزادی کشمیر اپنے منطقی انجام تک پہنچ سکے۔

فرد جرم عائد ہو چکی ہے۔۔۔۔۔۔

ڈاکٹر عافیہ جیت گئی۔۔۔۔۔۔

حقوق انسانی کے علمبردار،آزاد عدلیہ کے دعویدار اور دنیا میں انصاف،امن اور عافیت کا پرچم لہرانے والے امریکہ کا اصل چہرہ بالآخر سامنے آ ہی گیا اور وہی ہوا جس کی توقع کی جارہی تھی،امریکی عدالت نے ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو مجرم قرار دے کر اُس پر لگائے گئے سارے الزامات ثابت کر دیئے،اِس حقیقت سے قطع نظر کہ رائفل پر اُس کی انگلیوں کے نشانات نہ تھے،نہ ہی رائفل سے کوئی گولی چلی،نہ ہی اس کا خول برآمد ہوا،نہ کمرے کی کسی دیوار یا فرش پر کسی فائر کا کوئی نشان ملا اور نہ ہی کسی امریکی فوجی کا جسم گولی سے زخمی ہوا،اِس کے باوجود کہ استغاثہ کے گواہوں کے بیانات تضادات کا مجموعہ تھے اور وکلاء صفائی نے استغاثہ کی ساری کہانی جھوٹ کا پلندہ اور ایک تراشیدہ افسانہ ثابت کردی تھی، لیکن اِس سب کے باوجود تمام جرائم ثابت ہوگئے اور ڈاکٹر عافیہ صدیقی استغاثہ کے پیش کردہ مقدمے کی ساتوں دفعات میں مجرم پائی گئی، کیوں نہ پائی جاتی، بارہ ارکان پر مشتمل متعصب صہیونی جیوری کے نزدیک اُس کے مجرم ہونے کیلئے یہی جرم کیا کم تھا کہ اس کا نام عافیہ ہے، وہ مسلمان ہے اور سب سے مستزاد یہ کہ وہ ایک پاکستانی ہے، یہ وہ "جرائم" ہیں جس

کے سبب اسے کبھی بھی بے گناہ قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔

آفرین ہے ڈاکٹر عافیہ پر کہ مین ہٹن میں امریکی وفاقی عدالت کے جج رچرڈ برمن سے 86 سال قید کی سزا سننے کے بعد بھی وہ انتہائی پر سکون اور مطمئن تھی، اُس کے چہرے پر کوئی حزن و ملال نہیں تھا، بلکہ سزا سننے کے بعد اُس کا کہنا تھا کہ " سزا نے ثابت کردیا کہ امریکی عدالتوں میں انصاف نہیں ہوتا، یہ فیصلہ امریکہ کے زوال کی نشانی بنے گا، میں نے اپنا مقدمہ اللہ کی عدالت میں پیش کردیا ہے، دنیا بھر کے مسلمانوں کو صبر و تحمل کی تلقین کرتے ہوئے ڈاکٹر عافیہ کا کہنا تھا کہ اُن کی سزا کے خلاف کوئی خون خرابا نہ کیا جائے، خدا نے انہیں کسی نیک مقصد کیلئے چنا ہے۔" حقیقت یہ ہے کہ آج چھ برس تک امریکی قید و بند اور مختلف جیلوں میں ظلم و تشدد برداشت کرنے اور ڈیڑھ برس تک عدالتی کاروائی کا سامنا کرنے والی ڈاکٹر عافیہ صدیقی ثابت قدمی اور استقامت کا مظاہرہ کرکے جیت گئی اور دنیا بھر میں امن، انصاف اور حقوق انسانی کا ڈھنڈورا پیٹنے والا امریکہ اور امریکی عدالت کا کفر ہار گیا، آج جہاں ڈاکٹر عافیہ صدیقی جیسی مظلوم اور بہادر خاتون، پاکستانی قوم کے گناہوں اور غفلتوں کا کفارہ بنی، وہاں اُس نے امریکہ اور امریکی تہذیب و انصاف کا گھناؤنا چہرہ بھی بے نقاب کردیا۔

ایک من گھڑت، بودے اور انتہائی کمزور کیس میں امریکی عدالت نے جس طرح ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو 86 برس کی قید کی سزا سنائی اُس نے جہاں انسانی حقوق بالخصوص خواتین کے حقوق کے چیمپئن ہونے کی امریکی دعویداری اور انسانی حقوق کے تحفظ کے دعوؤں کی قلعی کھول دی ہے اور دنیا کے سامنے امریکہ کے "انصاف پسند" چہرے کو سامنے لاکر ہمارے حکمرانوں کی منافقانہ پالیسیوں کو بھی بے نقاب کردیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ جن مبینہ جرائم میں ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو موت سے بھی زیادہ سخت سزا دی گئی ہے، اگر اُن جرائم کا سرزد ہونا ثابت بھی ہو جائے تو بھی اِس جرم میں ملوث کسی مجرم کو ایسی سخت سزا نہیں دی جاسکتی، جبکہ ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے بارے میں تو خود متعلقہ امریکی عدالت دوران سماعت یہ ریمارکس دے چکی تھی کہ ڈاکٹر عافیہ صدیقی نے جو جرم کیا وہ کسی منصوبہ بندی کے تحت نہیں ہوا، مگر اِس اعتراف کے باوجود امریکی عدالت نے ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو 86 برس کی سزائے قید دے کر جس سفاکیت اور بہیمیت کا مظاہرہ کیا ہے، وہ صاف عیاں ہے، اگر ڈاکٹر عافیہ کا جرم تسلیم کر بھی لیا جائے تو بھی سزا جرم سے زیادہ ہولناک ہے، امریکی عدالت کے اِس فیصلے کا مقصد اِس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں میں خوف و دہشت پیدا کی جائے اور عافیہ کی سزا کو دنیا کے تمام مسلمانوں کے لئے وارننگ بنا دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ امریکیوں کی جمہوریت، امریکیوں کی قانون پسندی، امریکیوں کے

بنیادی حقوق، امریکیوں کا عدل وانصاف، امریکیوں کی انسان دوستی، سب کچھ امریکیوں کے لئے ہے، مسلمانوں کیلئے اُن کے اصول و قاعدے، ضابطے اور جانچنے کے پیمانے مختلف ہیں،اسلام کا نام لینے والوں اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھنے والے کے لئے ان کا قانون جدا ہے، پاکستان اور پاکستانیوں کیلئے ان کے ضابطہ قانون وانصاف الگ ہیں،اُن کے اپنے پالتو کتوں اور بلیوں کو کانٹا بھی چبھ جائے تو قانون بے قرار ہوجاتا ہے،انصاف انگڑائیاں لینے لگتا ہے اور انسانوں سے زیادہ جانوروں کے تحفظ کے رکھوالے جاگ اٹھتے ہیں، لیکن مسلم ممالک کے باسیوں کو یہ لوگ اپنے پالتو کتے اور بلیوں سے بھی حقیر سمجھتے ہیں،اسی وجہ سے یہ صیہونی درندے عراق اور افغانستان میں لاکھوں انسانوں کا لہو پی کر بھی اسلیئے پیاسے ہیں کہ امریکی قانون وانصاف کی منڈی میں اُن کی جانوں کی کوئی قیمت نہیں۔

یہ سب ہماری اجتماعی بے حسی اور حکمرانوں کی کاسہ لیسی کا نتیجہ ہے،اِس جرم بے حسی میں ہم سب برابر کے شریک ہیں، جہاں اِس شرمناک مجرمانہ بے حسی کی فرد جرم قوم پر عائد ہوتی ہے، وہیں وہ حکمران بھی اس فرد جرم سے بری الذمہ نہیں، جنھوں نے قوم کی بیٹوں اور بیٹیوں کو ڈالروں کے عیوض بیچا اور غیروں کے حوالے کیا، جنھوں نے امریکی غلامی اور چاکری کا تاج اپنے سر پر برقرار رکھنے کیلئے اِن بے گناہوں کا دفاع نہیں جان بوجھ کر چشم پوشی کی،ہم یہ،

بات کسی طور بھی ماننے کیلئے تیار نہیں کہ حکومت پاکستان پورے خلوص، سنجیدگی، عزم اور استقامت سے عافیہ کی واپسی کو ایک اہم ایشو کے طور پر لیتی اور امریکہ کو باور کراتی کہ نام نہاد جنگ دہشت گردی میں تعاون، ڈاکٹر عافیہ کے اِیشو سے جڑا ہے تو یہ کبھی نہ ہوتا۔امریکی عدالت کبھی بھی ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو اتنی سنگین سزا نہیں سنا سکتی تھی۔اگر اُسے ذرا سا بھی یقین ہوتا کہ پاکستانی قوم کی ایک بیٹی کو سزا دینے سے پاکستان اور پاکستانی قوم آسمان سر پر اٹھالے گی یا پاکستان کے حکمران دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ پر لعنت بھیج کر اس سے کنارہ کش ہونے کا اعلان کر دیں گے۔ امریکی عدالت اور حکومت اچھی طرح جانتی ہے کہ ڈالروں کے عیوض بکے ہوئے حکمرانوں کی بیرونی ٹکڑوں پر پلنے والی قوم دو چار دن نعرے لگائے گی، امریکہ کو گالیاں دے کر دل کی بھڑاس نکالے گی اور پھر سب بھول جائے گی۔ امریکیوں نے ہماری اجتماعی نفسیات کو سمجھ لیا ہے، وہ ہمارے حکمرانوں کے کردار، چال چلن اور دام سے بھی واقف ہیں، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو قوم لال مسجد اور جامعہ حفصہ کی مظلوم بچیوں کو تحفظ نہ کر سکی اور انہیں یاد نہ رکھ سکی، وہ ڈاکٹر عافیہ کو بھلا کتنے دن یاد رکھ سکے گی۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر عافیہ کی سزا کے حوالے سے ہمارے ارباب اقتدار نے جس بے اعتنائی، لاپروائی اور بے حسی کا مظاہرہ کیا ہے، وہ نا قابل معافی

جرم ہے۔ ڈاکٹر عافیہ کی والدہ کے بقول جہاں ہمارے حکمرانوں نے اپنی عاقبت خراب کی ہے، وہاں امریکی معاشرے نے ڈاکٹر عافیہ کو یہ سزا دیکر اپنا مستقبل بھی برباد کرلیا ہے۔ فرد جرم عائد ہوچکی ہے۔ اپنے بہن بھائیوں کو فروخت کرنے کی، ظلم پر خاموشی کی، غفلت و لاپروائی کی اور بے حسی کی۔ قضا و قدر کے پہرے داروں نے ہمارے نامہ اعمال میں اِس جرم کی ایف۔آئی۔آر درج کرلی ہے۔ عنقریب مقدمہ اُس عدالت پیش ہونے والا ہے۔ جس کا دستور نرالا ہے۔ قاعدے قانون جدا ہیں۔ جہاں مظلوم و بے گناہ کو کسی جیوری، کسی استغاثہ اور کسی وکیل صفائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔

غریبِ شہر تو فاقوں سے مر گیا حاکم۔۔۔۔

مرے کو مارے شاہ مدار۔۔۔۔۔۔

دوسرے عباسی خلیفہ اُبو جعفر منصور کے دربار میں خلیفہ سمیت تمام درباری.بڑے انہماک سے اُس کی گفتگو سن رہے تھے اور راوی مختلف ممالک کے سفر کے دوران پیش آنے والے حالات و واقعات بیان کر رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا،اَے امیر المومنین..... میں اکثر کام کے سلسلے میں مختلف ممالک کے دورے پر جایا کرتا تھا، ایسے ہی ایک سفر کے دوران جب میں ملک چین پہنچا اور بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ دربار میں افسردگی کا عالم ہے، چین کا بادشاہ بہت غمگین ہے اور زاروقطار رُو رہا ہے، جبکہ اہل دربار بادشاہ کو صبر وسکون کا مشورہ دے رہے ہیں، میں نے صورتحال جاننے کیلئے دربار میں موجود ایک آدمی سے معلوم کیا کہ آخر معاملہ کیا ہے، بادشاہ سلامت کیوں رُو رہے ہیں ؟اُس نے بتایا کہ بادشاہ سلامت کی قوت سماعت چلی گئی ہے اور وہ بہرے ہو چکے ہیں، ابھی درباری کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ اچانک بادشاہ نے رُونا بند کر دیا اور اپنے درباریوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا،اَے میرے مصاحبوں..... میں اسلئے نہیں رُو رہا کہ میرے اوپر مصیبت آن پڑی ہے اور میں سماعت سے محروم ہوگیا ہوں، بلکہ میں اسلئے رو رہا ہوں کہ جب کوئی مظلوم

انصاف کیلئے میرا دروازہ کھٹکھٹائے گا تو میں اُس کی فریاد نہیں سن سکوں گا، لیکن کوئی بات نہیں میں ابھی صرف سننے کی صلاحیت سے محروم ہوا ہوں، میری بصارت تو ابھی باقی ہے اور میری آنکھیں ابھی دیکھ رہی ہیں، پھر اُس نے اپنے وزیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، جاؤ اور جا کر ساری سلطنت میں یہ اعلان کردو کہ آج کے بعد میری مملکت میں سوائے مظلوم کے کوئی اور فرد لال رنگ کے کپڑے نہیں پہنے گا، صرف وہی شخص لال رنگ کے کپڑے پہنے گا جو مظلوم اور فریادی ہوگا تاکہ میں اُسے دیکھ کر پہچان سکوں اور اُس کی داد رسی کرسکوں۔" راوی نے عباسی خلیفہ اُبو جعفر منصور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، اے امیر المومنین ..... اُس دن کے بعد سے جب تک بادشاہ زندہ رہا، چین میں صرف وہی لوگ لال رنگ کے کپڑے پہنتے تھے جو مظلوم ہوتے تھے اور بادشاہ انہیں اِس رنگ کے لباس میں دیکھ کر فوراً اُن کی داد رسی کے احکامات جاری کرتا تھا۔"

قارئین محترم، تاریخ کی کتابوں میں موجود یہ کہانی ایک ایسے درد مند حکمران کی ہے جسے اپنی رعایا کے دکھ درد، تکلیف اور پریشانی کا احساس تھا، جسے اِس بات نے بے چین کیا ہوا تھا کہ قوت سماعت سے محرومی کی وجہ سے وہ مظلوموں کی فریاد نہیں سن سکے گا، اُن کی داد رسی نہیں کرسکے گا، ایک وہ حکمران تھے جو اپنی رعایا کو آرام سکون پہنچانے کیلئے بے چین رہا کرتے تھے، اُن کے مسائل کے حل کیلئے نئے نئے طریقے اور راستے ڈھونڈا کرتے تھے اور ایک یہ حکمران

ہیں جو سننے، دیکھنے، سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود اِن صلاحیتوں سے محروم ہیں، جن کانوں تک کسی مظلوم، کسی مسکین، کسی ضرورت مند فریادی کی آہ و بکا نہیں پہنچ پاتی، جن کی آنکھیں نادار اور مفلوک الحال لوگوں کو دیکھنے سے قاصر ہیں اور جن کے فہم و اداک ظلم و جبر کی چکی میں پسے ہوئے عوام کے مسائل اور اُن کے حل سے محروم ہیں، جو اپنے عیش و آرام کی خاطر مظلوم و مفلوک الحال عوام کے مصائب و آلام میں اضافے کیلئے نت نئے طریقے اور بہانے ڈھونڈ کر رعایا پر ظلم و ستم ڈھانے میں مصروف ہیں اور سیلاب کی تباہ کاری اور مہنگائی کے سونامی سے بدحال عوام پر 80 ارب روپے کے نئے ٹیکسز کا بوجھ لادنے کی تیاری کر رہے ہیں،اِن کو اِس بات کی فکر نہیں کہ عوام پر کیا بیت رہی ہے اور وہ کس حال میں زندگی گزار رہے ہیں، مقام حیرت ہے کہ وہ حکومت جو اپنے آپ کو عوام کا ہمدرد اور خیر خواہ کہتی ہے، جس نے روٹی، کپڑا اور مکان کی فراہمی کا نعرہ لگا کر اقتدار حاصل کیا، اُسی نے آج غریبوں کے منہ کا نوالہ بھی چھین لیا، اُن کے تن پر کپڑے نہیں رہنے دیے اور مکان کی فراہمی کی تو نوبت ہی نہیں آئی، رہی سہی کسر سیلاب نے پوری کر دی کہ مکان، دکان تو کیا بستیوں کی بستیاں بہہ گئیں، فصلیں تباہ و برباد ہو گئیں اور لوگ اپنی زندگی بھر کی جمع پونجی سے محروم ہوگئے،اِس طوفان بلا خیز کے بعد جو بچ رہے ہیں وہ اب مہنگائی کے نئے سیلاب میں ڈوبنے والے ہیں۔

پہلے ہی ملک میں متوسط اور تنخواہ دار طبقہ مہنگائی سے پریشان ہے، ستم ظریفی دیکھئے کہ اب اِسی تنخواہ دار طبقے پر 80 ارب روپے کے (10% فلڈ، 8% سے 15% اربن اور ویلیو ایڈیڈ کی شکل میں) نئے ٹیکس نافذ کرنے اور طاقتور سرمایہ دار اور جاگیردار 15% طبقوں کو اِن ٹیکسوں سے بچانے کی تیاری کی جارہی ہے۔ تنخواہ دار اور متوسط طبقے پر مزید نئے ٹیکس عائد کرنے کا واضح مطلب یہ ہے کہ حکمرانوں نے تہیہ کرلیا ہے کہ اِس ملک سے غریبوں کا صفایا کردیا جائے اور انہیں جینے کے حق سے محروم کردیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ مہنگائی جب بھی بڑھتی ہے تو اِس کا سب سے زیادہ اثر مزدور اور تنخواہ دار طبقے پر پڑتا ہے، جبکہ سرمایہ دار اشیاء کی قیمتیں بڑھا کر اور مختلف طریقوں سے ٹیکس بچا کر کامیاب ہوجاتے ہیں، بدقسمتی سے آج تک کوئی حکومت ایسی نہیں آئی جو اِن بااثر طبقات سے ٹیکس وصولی کرسکے، یہ سلسلہ آخر کب تک چلتا رہے گا۔ اب تو غریب کی ہمت بھی جواب دے چکی ہے اور حکومت کے خلاف عوام کے ذہنوں میں شدید نفرت پائی جاتی ہے جبکہ معاشی ناانصافی، مالیاتی ناہمواریاں اور امیر و غریب کا بڑھتا ہوا فرق معاشرے میں بے چینی پیدا کررہا ہے، جوں جوں یہ فرق بڑھتا جارہا ہے طبقاتی تقسیم اور خلیج بھی گہری ہوتی جارہی ہے، بھوک، غربت، افلاس اور بیروزگاری بڑھنے کے ساتھ جرائم میں بھی اضافہ ہورہا ہے، غربت، بھوک، افلاس اور بیروزگاری سے تنگ آکر خودکشی کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے، چند ماہ قبل ایک غریب اور مقروض رکشہ ڈرائیور نے مالی

پریشانیوں اور اشیائے ضروریہ کی قیمتوں میں بے تحاشہ اضافے سے تنگ آکر اپنے بچوں سمیت خود کشی کرلی۔اِس سے قبل ایک عورت غربت سے تنگ آکر اپنے بچوں سمیت ٹرین تلے کٹ کر مر گئی۔ میرپور خاص میں تین دن کے فاقوں سے مجبور ٹی بی کی بیمار ماں کا 13 سالہ بچہ دو کلو آٹا چوری کرتا ہوا پکڑا گیا۔

میڈیا رپورٹ کے مطابق پاکستان میں ہر ماہ سینکڑوں لوگ خود کشی کر رہے ہیں، یہ اعداد و شمار انتہائی ہولناک اور دہلا دینے والے ہیں، خود کشیوں کے ریکارڈ اضافے کی یہ خبر کوئی افواہ یا سازش نہیں بلکہ یہ اعداد و شمار پاکستان اور عالمی سطح پر تسلیم کیے جانے والی انسانی حقوق نے اکھٹے کئے ہیں، جس کے مطابق جنوری سے ماہ ستمبر کی 15 تاریخ تک ایک ہزار 640 پاکستانیوں نے خودکشیاں کیں، جن میں ایک ہزار 161 مرد اور خواتین شامل ہیں، جولائی کے ماہ میں خود کشیوں کی شرح سب سے زائد رہی اور 479 پاکستانیوں نے حالات سے تنگ آکر اپنی جانیں گنوائیں، جنوری سے ستمبر تک 264 افراد نے خود کشی کی کوشش کی جن میں 423 مرد اور 226 خواتین شامل ہیں 649 یہ اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ پاکستان میں عوام خاص کر غریبوں کے حالات کس، حد تک بدتر ہوچکے ہیں، یہ بات انتہائی تشویشناک، فکر انگیز اور غور طلب ہے کہ گزشتہ ماہ جس میں رمضان المبارک اور عید الفطر تھی، خواتین سمیت روزانہ 15 پاکستانیوں نے خودکشیاں کیں، آخر پاکستانی اپنے ہی ہاتھوں اپنی زندگیوں کے چراغ گل کیوں کر رہے ہیں؟

اِس بات کو جاننے کے لئے کسی راکٹ سائنس کا علم ہونا ضروری نہیں بلکہ عام سوچ رکھنے والا فرد بھی یہ جان سکتا ہے کہ پاکستانی خودکشیاں کیوں کر رہے ہیں، سیدھی سی بات ہے کہ گزشتہ تین سالوں کے دوران مہنگائی نے پاکستان کی تاریخ کے تمام ریکارڈ ٹوٹ گئے ہیں، بے روزگاری کا ایک سیل رواں ہے جو رکنے کا نام نہیں لے رہا ہے، روزمرہ کی ضروریات پوری کرنے کے لئے غریبوں کے پاس نہ مال ہے اور نہ اسباب، موجودہ حکومت کے اقتدار کے دوران مہنگائی کی خراب ترین صورتحال کے باعث خودکشیوں کے حوالے سے یہ پاکستان کے لئے بدترین سال ہے، انسانی حقوق کے سابق وزیر اقبال حیدر کا کہنا ہے کہ " رواں سال خودکشیوں کے رجحان میں خطرناک اضافے پر انہیں قطعی حیرت نہیں ہے، کیونکہ جس بڑے پیانے پر لوگوں میں بے بسی کا احساس پایا جاتا ہے، اسے میں بیان نہیں کرسکتا، اِس پر طرہ یہ کہ مہنگائی آسمان کی حدوں کو پار کر رہی ہے، ایسے میں پاکستانیوں کے لئے مرنا زیادہ آسان ہوگیا ہے، انہوں نے اِس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ ماہانہ 20 ہزار روپے بھی کمانے والا آخر کس طرح اپنی زندگی گزار رہا ہے، انہوں نے حکومتی ترجیحات پر شدید اعتراض کیا، کیونکہ وہ بنیادی ضروریات پر ٹیکس لگارہی ہے، اُن کا کہنا تھا کہ ملک کے اعلیٰ ترین عہدے سے لے کر نیچے تک سب کے سب چور ہیں، سب مل کر اداروں کو لوٹ رہے ہیں۔"

بین الاقوامی پروگرام برائے خوراک کے چیئرمین وولف گینگ کے مطابق پاکستان میں مہنگائی، گرانی اور بڑھتی ہوئی بیروزگاری کے سبب لوگوں کی قوت خریداِس حد تک کم ہو گئی ہے کہ لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد دو وقت کی روٹی خریدنے کے قابل بھی نہیں رہی ہے، سوئس ایجنسی برائے تعاون وترقی کی رپورٹ کے مطابق پاکستان کی 48.6 فیصد آبادی خوراک کی شدید قلت کا شکار ہے، غربت میں اضافے کی ایک وجہ دہشت گردی کے خلاف جنگ ہے جس پر سالانہ 969 ارب روپے خرچ ہوتے ہیں، پاکستان کے بجٹ کا 22 فیصد دفاع اور 28 فیصد قرضوں کی ادائیگی پر خرچ ہوجاتا ہے، جبکہ حکومت کے غیر ترقیاتی اخراجات اور شاہانہ مسرفات بھی بہت زیادہ ہیں، جس کی وجہ سے ترقیاتی بجٹ کے لیے کم رقم ہی بچتی ہے، ایک جانب یہ کیفیت ہے تو دوسری جانب امیر خاندانوں کے کتوں کی خوراک کی درآمد پر سالانہ 2 کروڑ روپے سے زائد کی رقم خرچ کی جاتی ہے، اِن کتوں کے ماہانہ اخراجات 40 ہزار روپے سے زائد ہیں، اِس سے بڑا المیہ اور کیا ہوگا کہ جس ملک کی 50 فیصد آبادی خوراک کی قلت کا شکار ہو اور جس ملک کا ایک طبقہ کتوں کی پرورش پر سالانہ 5 لاکھ روپے خرچ کردے، خود وزیر خزانہ نے مہنگائی کی بنیادی وجہ زیادہ حکومتی اخراجات کو قرار دیتے ہوئے اور مراعات یافتہ طبقات کی جانب سے ٹیکس ادائیگی میں لیت ولعل پر تاسف کا اظہار کیا ہے، انہوں نے اعتراف کیا کہ گزشتہ 3 برسوں کے دوران مہنگائی میں 44 فیصد اضافہ ہوا، جبکہ حقیقت اِس کے برعکس ہے، موجودہ حکومت کے دور حکومت میں مہنگائی نے اپنے

تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دیئے ہیں، غیر ملکی قرضوں کا بوجھ 55 ارب ڈالر سے تجاوز کرچکا ہے، جبکہ اِن تین برسوں کے دوران 50 ارب 85 کروڑ 40 لاکھ کے قرضے معاف کیے گئے ہیں، ملکی معیشت کے حوالے سے وزیر خزانہ کا بیان ریکارڈ پر موجود ہے کہ دو مہینوں کے بعد تنخواہوں کیلئے رقم نہیں ہوگی، ایک طرف یہ حال ہے کہ خزانہ خالی ہے، دوسری طرف وہ نظام حکومت جو صرف بیس وزراء سے چلایا جاسکتا ہے، وہاں وزیروں، مشیروں اور پارلیمانی سیکرٹریوں کی فوج ظفر موج سرکاری خزانے پر عیش کر رہی ہے اور حکومت کے اللے تللوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہو رہی، دوسری طرف عوام کی حالت یہ ہے کہ وہ دو وقت کی روٹی کیلئے ترس رہی ہے، اِس کے باوجود بھی یہ دعوے کیے جارہے ہیں کہ عوام کی خدمت کی جارہی ہے، جبکہ عوام گزشتہ دور حکومت سے بھی بدتر حالات میں زندگی کرنے پر مجبور ہیں، لیکن حکومتی حلقوں میں چین کی بانسری بجائی جارہی ہے اور "ایسا کرینگے، ویسا کرینگے" کے لولی پوپ سے عوام کو بہلانے کی کوشش کی جارہی ہے، اصل معاملہ یہ ہے کہ حکومت کو عوامی مسائل کے حل سے زیادہ این آر او کیسز اور اٹھارویں ترمیم سے دلچسپی ہے۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ اسٹیٹ بینک کی مانیٹری پالیسی کے اعلان فلڈ اور ویلیو ایڈیڈ ٹیکس نافذ کرنے اور امریکہ کی طرف سے اُمرا پر ٹیکس لگانے کے مطالبہ کے بعد جو صورتحال نظر آرہی ہے، اُس کو دیکھتے ہوئے یہ بات یقین سے کہی

جا سکتی ہے کہ اگر ملک کی گرتی ہوئی معیشت کو سہارا دینے کیلئے بروقت اقدامات نہیں کیے گئے، تو مہنگائی کا طوفان تو آئے گا ہی آئے گا لیکن اِس مہنگائی کے بعد عوامی سطح پر نفرت کا جو طوفان سامنے آئے گا اُسے روکنا کسی کے بس کی بات نہیں ہوگی، موجودہ حکومت سے عوام کی توقعات اِس لئے زیادہ تھیں کہ یہ ایک ایسی جماعت کی حکومت ہے جس کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ عوامی اور غریبوں کی جماعت ہے اور جس کا نعرہ ہی روٹی، کپڑا اور مکان ہے، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ موجودہ حکومت نے اپنے نعرے کو سچ ثابت کرنے کیلئے جس قسم کے اقدامات کرنے تھے وہ نہیں کیے اور ایسے حالات پیدا ہوچکے ہیں کہ عوام تو پہلے ہی چیخ رہے تھے، اب عالمی سطح پر بھی پاکستان کی گرتی ہوئی معیشت، بدانتظامی اور کرپشن کی روک تھام میں ناکامی پر تشویش بھی پائی جاتی ہے، اِن حالات میں ضرورت اِس اَمر کی ہے کہ حکومت ہنگامی بنیادوں پر سیاسی جماعتوں اور ماہر معاشیات کا اجلاس بلاکر ایسی دور رس پالیسیاں مرتب کرے، جس سے ہوشربا مہنگائی پر قابو پایا جاسکے اور غریب عوام کو باآسانی دو وقت کی روٹی میسر آسکے، اگر اب بھی حکومت نے عوام کی حالت زار کا تدارک نہ کیا اور مہنگائی کے سیلاب پر قابو نہ پایا تو وہ دن دور نہیں جب یہ سیلاب حکومت کو خس خاشاک کی طرح بہا کرلے جائے گا۔

تبدیلی بیانات اور تقریروں سے نہیں عملی اقدامات سے آتی ہے

جناب وزیر اعظم صاحب تبدیلی بیانات اور تقریروں سے نہیں عملی اقدامات سے آتی ہے۔۔۔۔

کہتے ہیں کہ طوطے کا ایک جوڑا دن بھر کی مسافت کے بعد رات گزارنے کیلئے ایک ویران گاؤں میں رکا، گاؤں کی ویرانی دیکھ کر طوطی نے طوطے سے پوچھا "کس قدر ویران گاؤں ہے، ہر طرف خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا ہے، تمہارے خیال میں یہ گاؤں کسی وجہ سے اجڑا ہوگا۔۔۔؟ "طوطے نے کچھ دیر سوچا اور طوطی کی طرف دیکھ کر بولا "میرا خیال ہے اُلوؤں کی وجہ سے "جس وقت طوطا طوطی کو گاؤں اجڑنے کی وجہ بتا رہا تھا، عین اس وقت ایک الّو بھی وہاں سے گزر رہا تھا، اس نے طوطے کی بات سنی اور وہاں رک کر ان سے مخاطب ہو کر بولا، تم لوگ اس گاؤں میں مسافر لگتے ہو، لمبے سفر کی وجہ سے تھکے ہوئے بھی ہو، میرا گھر قریب ہے، اس ویران گاؤں میں رات گزارنے سے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آج رات تم لوگ میرے مہمان بن جاؤ، میرے ساتھ ڈنر کرو، آرام سے رات بسر کرو اور صبح اپنی اگلی منزل پر روانہ ہو جانا، تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔

اُلو کی محبت بھری دعوت سے طوطے کا جوڑا انکار نہ کر سکا اور انہوں نے اُلو

کی دعوت قبول کرلی، دونوں اُلو کے ساتھ اس کے گھر پہنچے، اُلو نے دونوں کی بہت شاندار اور پر تکلف دعوت کی، تینوں نے اکھٹے کھانا کھایا اور آرام دہ بستر پر رات گزاری، صبح جب انہوں نے اپنے میزبان اُلو کی مہمان نوازی پر شکریہ ادا کرکے رخصت ہونے کی اجازت چاہی، تو اُلو نے مسکرا کر طوطے کی طرف دیکھا اور بولا "میری طرف سے اجازت ہے آپ جا سکتے ہیں، لیکن طوطی نہیں جائے گی"طوطے نے حیرت سے پوچھا "کیوں"اُلو بولا "اسلیئے کہ یہ طوطی میری بیوی ہے "طوطا چلایا "یہ کیسے ہو سکتا ہے "تم اُلو ہو اور ہم طوطے ہیں ،ایک طوطی اُلو کی بیوی کیسے ہو سکتی ہے؟"اُلو نے اطمینان سے جواب دیا"تم مانو یا نہ مانو لیکن یہ طوطی میری بیوی ہے اور میں اپنی بیوی کو تمہارے ساتھ جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

دونوں میں جب بحث و تکرار زیادہ بڑھی تو اُلو نے طوطے کے سامنے ایک تجویز پیش کرتے ہوئے کہا"ایسا کرتے ہیں ہم تینوں کورٹ چلتے ہیں اور اپنا مقدمہ قاضی کے سامنے پیش کرتے ہیں، قاضی جو فیصلہ کرے وہ ہمیں قبول ہوگا"اُلو کی تجویز پر طوطا اور طوطی مان گئے اور تینوں قاضی کی عدالت میں پیش ہوئے ،طوطے نے قاضی کی عدالت میں اپنا مقدمہ دائر کیا اور طوطی کو اپنی بیوی قرار دیا، قاضی نے اُلو کی طرف دیکھا ،اُلو بیان دینے کیلیئے آگے بڑھا ،اس نے حلف اٹھایا"میں جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا سچ کے سوا اور کچھ نہیں،

کہوں گا" اس کے بعد اس نے قاضی کے روبرو طوطی کو اپنی بیوی قرار دینے کیلئے دلائل دینے شروع کئے۔ اُلو کے جواب میں طوطے نے اپنے جوابی دلائل دیئے لیکن بد قسمتی سے اُلو کے دلائل طوطے کے دلائل سے زیادہ مضبوط اور قوی تھے، چنانچہ قاضی نے دلائل کی روشنی میں اُلو کے حق میں فیصلہ دے کر عدالت برخاست کردی، طوطا اس بے انصافی پر روتا رہا، چلاتا رہا، انصاف کی دہائی دیتا رہا، مگر اس کی بات سننے والا کوئی نہ تھا۔

ناکام و نامراد جب طوطا اکیلا جانے لگا تو اُلو نے اسے آواز دی، "بھائی اکیلئے کہاں جاتے ہو اپنی بیوی کو تو ساتھ لیتے جاؤ" طوطے نے حیرانی سے اُلو کی طرف دیکھا اور بولا "اب کیوں میرے زخموں پر نمک چھڑکتے ہو، یہ اب میری بیوی کہاں ہے، عدالت نے تو اسے تمہاری بیوی قرار دے دیا ہے" اُلو نے طوطے کی بات سن کر زوردار قہقہہ لگایا اور بولا، میرے بھائی یہ سب ڈرامہ تھا، میں تمہیں عدالت اس لیئے لایا تھا کہ میں تمہیں اُس گاؤں کے اجڑنے کی اصل وجہ بتاسکوں، جس ملک میں انصاف نہیں ہوگا اور جس ملک کے قاضی بے ایمان اور عدالتیں بے انصاف ہونگی، وہ ملک ویران ہو جائے گا، اگر تم اپنے معاشرے، اپنے گاؤں اور اپنے ملک کو اجڑنے اور برباد ہونے سے بچانا چاہتا ہے تو ملک میں کبھی بے انصافی نہ ہونے دینا ہے، یاد رکھو میرے بھائی معاشرے گاؤں اور ملک اُلوؤں کی نحوست کی وجہ سے نہیں اجڑتے، بلکہ بے انصافی کی وجہ سے، اجڑ جاتے

”ہیں، نحوست اُلوؤں میں نہیں ہوتی، نحوست ظلم اور بے انصافی میں ہوتی ہے۔

ایک معروف ٹی وی اینکر کی بیان کی ہوئی اس حکایت میں اُلو کی بات کتنی درست ہے کتنی غلط، اس سے قطع نظر، یہ حقیقت ہے کہ کسی معاشرے کے مہذب ہونے کیلئے ضروری ہے کہ وہاں عدلیہ آزاد ہو اور قانون کی حکمرانی ہو۔ جن معاشروں میں قانون کی حکمرانی نہیں ہوتی اور انصاف عوام کی پہنچ سے دور ہوتا ہے، وہ معاشرے یقین اور اعتماد کی دولت سے محروم ہوجاتے ہیں اور ہر آن یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کسی بھی وقت، کوئی بھی ہاتھ کسی کی دستار یا گریبان تک پہنچ سکتا ہے۔ جس ملک میں انصاف نہیں ہوتا، وہاں ایسا جنگل کا قانون ہوتا ہے جس میں جرائم پیشہ افراد اور لاقانونیت کا راج ہوتا ہے، درندوں کی حکمرانی ہوتی ہے اور معاشرہ خونخوار بھیڑیوں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے، یہ انصاف ہی ہوتا ہے جو ایک عام اور کمزور شہری کو بااثر، مضبوط اور طاقتور لوگوں کے ظلم و ستم سے محفوظ رکھتا ہے، انہیں یقین، اعتماد اور تحفظ کی دولت فراہم کرتا ہے۔

آج وطن عزیز پاکستان اپنی تاریخ کے بدترین بحران سے گزر رہا ہے، ہر طرف ظلم و زیادتی اور لاقانونیت کو دور دورہ ہے، آٹے، گھی، چینی، بجلی اور پانی کا بحران ہے، ایک بحران ختم نہیں ہوتا کہ دوسرے بحران کا عفریت سر اٹھائے کھڑا

ہوتا ہے۔لوگ بھوک غربت اور افلاس کی چکی میں پس رہے ہیں، جبکہ ارباب اقتدار دونوں ہاتھوں سے اپنی جیبیں بھرنے میں مصروف ہیں،اب تو حکومتی ارکان ،وزرا اور حکمرانوں کی لوٹ مار کی کہانیاں تواتر کے ساتھ قومی اور بین الاقوامی اخبارات اور میڈیا کی زینت بن رہی ہیں، حال یہ ہے کہ لوٹ مار اور کرپشن نے پاکستان کو دنیا کے کرپٹ ترین ممالک میں سرفہرست کردیا ہے۔

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ ہر فرد بے یقینی کی صلیب پر لٹک رہا ہے،حالات کی کوکھ سے جنم لینے والی مایوسی کی وجہ سے قومی زندگی سے سکون، ٹھہراؤ اور اطمینان کے عناصر ختم ہوتے جارہے ہیں، سماجی اور معاشرتی ناانصافیوں کے ساتھ ساتھ سیاسی و آئینی حوالے بھی قومی اعتماد کو پستیوں کی اتھاہ گہرائیوں کی طرف لے جارہے ہیں،ہماری قومی اقدار وروایات، قناعت پسندی، سادگی، قربانی، ایکدوسرے کی مدد ، دلجوئی،حلال روزی کی طلب، حرام روزی سے اجتناب، صبر واستقلال ،بے غرضی، اخوت و محبت،انسانوں کی عزت واحترام،وعدے کی پاسداری،امانت میں دیانت،اور دوسروں کیلئے راستہ چھوڑ دینے کا جذبہ معاشرے سے غائب ہوتا جارہا ہے۔

ہمارا معاشرے جو کبھی انسانی تہذیب وتمدن ،اخلاقی اقدار،دکھ سکھ کی ساجھے داری،اور محبتوں کے پھیلاؤ کا امین اور مرکز ہوا کرتا تھا،آج بدلتے ہوئے

سماجی رویئے اِسے تیزی سے اُس اخلاقی پستی اور معاشرتی انحطاط کی جانب لئے جارہے ہیں، صاف دکھائی دے رہا ہے کہ ہمارا معاشرہ تمام تہذیبی، قومی، سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی سنگ میلوں کو بے دردی سے روندتا ہوا ذہنی بغاوت کی راہ پر گامزن ہوچکا ہے اور غصہ، نفرت، جرم و بغاوت کی آکاس بیل اُسے تیزی سے اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے، جس کا انجام سوائے تباہی و بربادی کے اور کچھ نہیں ،یاد رکھیئے جب معاشروں میں عدل و انصاف عنقا ہوجائے تو درندوں کی افزائش ہوتی ہے اور مجرم اور جرائم پیشہ افراد سڑکوں پر دندناتے پھرتے ہیں۔

ایسی صورت میں خوف و وحشت اور وحشتوں کا در و بام تک آ پہنچنا ایک معمولی بات بن جاتی ہے،چنانچہ ان حالات میں میاں نواز شریف صاحب کے رشوت ، منافقت اور بے انصافی سے پاک اور شفاف پاکستان کی بنیاد رکھنے والے بیانات اور وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کی کرپشن سے پاک معاشرے کی خواہش ایک بے معنی اور لایعنی بات کے سوا اور کچھ نہیں، کیونکہ تبدیلی بیانات اور خواہشات سے نہیں بلکہ عملی اقدامات سے آتی ہے،اس وقت ناانصافیوں کے گھنے دلدلی جنگل سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے، ظلم و زیادتی کا خاتمہ اور عدل و انصاف کا قیام ،حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں معاشرہ کفر کے ساتھ تو زندہ رہ سکتا ہے، ظلم وزیادتی کے ساتھ نہیں" قارئین محترم ..... اُلو نے واقعی سچ کہا تھا، نحوست اُلوؤں میں نہیں، نحوست ظلم،زیادتی اور بے انصافی میں ہوتی ہے

جو معاشرے، قوم اور ملکوں کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔

رہن رکھا ہوا ملک اور قرضوں میں جکڑی قوم

آج ہم آپ کو بچپن میں سنی ہوئی ایک کہانی سناتے ہیں، ایک غریب لکڑہارا روزانہ روزی کی تلاش میں جنگل جایا کرتا تھا، جنگل کے راستے میں ایک بہت بڑا کوہستانی پتھر پڑتا تھا جس کو عبور کرنا اُس کیلیئے بہت مشکل ہوتا تھا،ایک دن حسب معمول وہ روزی کی تلاش میں جنگل جارہا تھا کہ راستے میں اُس نے دیکھا کہ ایک چڑیا زخمی حالت میں پڑی ہے، لکڑہارے کو چڑیا کی حالت پر رحم آگیا،اُس نے چڑیا کو اٹھایا اور اُس کی مرہم پٹی کی اور جیسے ہی اُسے آرام دہ محفوظ جگہ پر چھوڑا،چڑیا یکایک ایک خوبصورت پری میں تبدیل ہوگئی اور اُس نے لکڑہارے کی رحمدلی سے متاثر ہوکر اُسے تین انڈے دیتے ہوئے کہا،جب تم اپنی کوئی خواہش پوری کرنا چاہو تو ایک انڈا توڑ دینا، یہ کہہ کر پری غائب ہوگئی، لکڑہارا بہت خوش ہوا اور خوشی خوشی واپس گھر کی جانب روانہ ہوا، راستے میں جب وہ اُس کوہستانی پتھر کے پاس پہنچا تو جوش مسرت میں اُس نے پتھر کو ایک زوردار لات رسید کی،تاکہ وہ راستے سے ہٹ جائے، پتھر کیا ہٹتا،بیوقوف اپنی ہی ٹانگ تڑوا بیٹھا،اِس افراتفری میں ایک انڈا بھی اُس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا، یوں اب اُس کے پاس دو انڈے رہ گئے،اُس نے سوچا کہ ایک انڈا توڑ دوں تاکہ ٹانگ واپس مل جائے، یہ سوچ کر اُس نے ایک انڈا توڑ دیا،ٹانگ تو واپس آگئی، مگر اُس کے ساتھ

کئی اور ٹانگیں بھی نکل آئیں، یہ دیکھ کر وہ اور بھی پریشان ہوا کہ یہ کیا ہوگیا، آخرکار اُس نے تیسرا انڈا بھی اِس خواہش کا اظہار کرکے توڑ دیا کہ میری اصل ٹانگ واپس مل جائے، چنانچہ اُس کو اصل ٹانگ تو واپس مل گئی، مگر تینوں انڈے ٹانگ توڑنے اور جوڑنے میں ختم ہوگئے اور کوہستانی پتھر بدستور اپنی جگہ پر موجود رہا۔

بدقسمتی سے یہی حال ہمارے ملک اور ارباب اقتدار کا ہے، ایک قرض اتارنے کیلئے دوسرا قرض لیتے ہیں، مگر پچھلا قرض ادا نہیں ہوپاتا اور ملک و قوم پر ایک اور نئے قرضے کا بوجھ بڑھ جاتا ہے، یوں ہر آنے والے دن کے ساتھ ملک پر بیرونی قرضوں کے حجم میں کمی کے بجائے تیزی سے اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے، اب ایک بار پھر حکومت نے غیر ملکی قرضے اتارنے کے لئے آئی ایم ایف سے نیا قرض لینے پر غور شروع کردیا ہے، ایک نجی ٹی وی کی رپورٹ کے مطابق وزارت خزانہ اِس حوالے سے ایک سمری تیار کررہی ہے جس میں آئی ایم ایف سے نیا قرضہ لینے کے لئے سفارشات تیار کی جارہی ہیں تاکہ نئے قرضے کے ذریعے آئندہ مالی سال میں غیر ملکی قرضوں کی ادائیگی کی جاسکے، اطلاعات کے مطابق اِن نئے قرضے کا ابتدائی حجم 7.5 ارب ڈالر ہوگا، اِس وقت پے در پے قرض کی وجہ سے ہمارے ملک میں ہر پیدا ہونے والا بچہ 28 ہزار روپے کا مقروض ہے، اگر یہی حال رہا تو اگلے بیس سالوں میں ہر پیدا ہونے والا بچہ اڑھائی لاکھ روپے کا مقروض ہوگا اور

اگر قرض کی رقم رہن رکھے جانے والے سامان سے بڑھ گئی تو اِس صورت میں کیا ہو سکتا ہے اِسے سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔
در حقیقت ہماری حکومت کی حالت اُس چوہدری کی سی ہے جو اپنے مزارعوں کے نام پر اپنے سے بڑے چوہدری سے قرض لیتا ہے اور اُس قرض کا ایک بڑا حصہ خود ہڑپ کر جاتا ہے، کچھ عرصہ کے بعد اپنی سرداری کی پگڑی اپنے بیٹے کے سر پر رکھ کر مزارعوں کے معاملات اُسے سونپ کر خود حقہ سنبھال لیتا ہے۔اِس طرح اِن چوہدریوں کی جائیدادیں بڑھتی رہتی ہیں،اُن کی گاڑیاں، بنگلوں اور بنک بیلنس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، جبکہ قرض دینے والے بڑا چوہدری (عالمی ساہوکار ادارے) قرض کی وصولی کیلئے مقروض مزارعوں (عوام) کی تکہ بوٹی کرنا شروع کر دیتا ہے اور یوں عوامی استحصال کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چلتا رہتا ہے، جس طرح چوہدری کا قرض اُس کے بیٹے نہیں بلکہ غریب مزارعوں نے ادا کرنا ہوتا ہے، بالکل اُسی طرح پاکستانی حکمرانوں کے لیے ہوئے قرضے حکمرانوں یا اُن کی اولادوں نے نہیں بلکہ عوام نے بمعہ سود ادا کرنے ہوتے ہیں،اسلئے انہیں اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔
اِس وقت پاکستان پر مجموعی قرضہ 56 ارب ڈالر کے لگ بھگ ہے،اگر حکومت نے آئی ایم ایف سے مزید نیا قرضہ حاصل کیا تو یہ حجم اور بھی بڑھ جائے گا،جس کی

ادائیگی نہ تو صدر صاحب نے کرنی ہے اور نہ ہی وزیر اعظم اور اُن کے بچوں نے، بلکہ اِن قرضوں کی ادائیگی پاکستان کے غریب اور مفلوک الحال عوام نے کرنی ہے، چاہے اِس کیلئے انہیں اپنا گوشت اور اپنی ہڈیاں ہی کیوں نہ بیچنی پڑیں، یہ عام مشاہدہ ہے کہ ایک غیرت مند شخص جب بحالت مجبوری کسی سے قرض مانگتا ہے تو شرمندگی کے احساس سے اُس کی نظریں جھکی ہوتی ہیں، زبان لڑکھڑا رہی ہوتی ہے، ٹانگیں ڈگمگا رہی ہوتی ہیں، ہاتھ کپکپا رہے ہوتے ہیں، یہ سوچ کر اُس کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں کہ وہ یہ قرض کیسے ادا کرے گا، جبکہ اِس کے برخلاف حکومت کے ارباب اختیار جب ریاست اور اُس کے عوام کے نام پر قرضے حاصل کرتے ہیں تو اُن کے چہرے مسرت و انبساط سے تمتما رہے ہوتے ہیں، باچھیں قرض حاصل کرنے کی فتح مندی سے کھلی ہوتی ہیں، اپنی آزادی اور خود مختاری رہن رکھتے اور غلامی کی دستاویز پر دستخط کرتے وقت اُن کا قلم نہ تو لرزتا ہے، نہ ہی ٹانگیں کپکپاتی ہیں، کیونکہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرض اُنھوں نے اور اُن کی نسلوں نے نہیں بلکہ ملک کی سترہ کروڑ غریب عوام نے ادا کرنا ہے۔ اس تناظر میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ روٹی، کپڑا اور مکان کی فراہمی کی دعویدار عوامی حکومت بیرونی قرضوں پر انحصار کے بجائے کفایت شعاری اور سادگی کی مثال قائم کرتے ہوئے عوام کو بنیادی سہولیات فراہم کرتی اور جن

لوگوں نے قومی خزانے کو لوٹا اور نقصان پہنچایا، انہیں نشان عبرت بناتی، مگر افسوس اِس حکومت نے بھی اپنے پیش رو کی طرح اپنی تمام تر توجہ نئے قرضوں کے حصول اور غریب عوام کو ٹیکسوں اور مہنگائی کے بوجھ تلے دبانے پر مرکوز کی ہوئی ہے، اِس سے بڑی ستم ظریفی اور کیا ہوگی کہ اِس ملک کا ایک غریب آدمی بجلی اور گیس کے بلوں سے لے کر تنخواہ کی وصولی، کھانے پینے کی اشیاء حتیٰ کہ ٹول ٹیکس سے لے کر نہ جانے کتنے قسم کے ٹیکس ادا کرتا ہے، جبکہ پاکستان کا مراعات یافتہ طبقہ عوام کہلوانے کے باوجود ٹیکس ادا نہیں کرتا، حال یہ ہے کہ صرف جمہوری حکومت کے ڈھائی سالہ دور اقتدار میں مہنگائی نے اپنے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دیئے اور غیر ملکی قرضوں کا بوجھ 56 ارب ڈالر تک پہنچ گیا، جس میں آئی ایم ایف، عالمی بینک اور اے ڈی بی کا مجموعی قرضہ 31 ارب لاکھ 20 ہزار ڈالر اور اِن کا سود 3 ارب 63 کروڑ 70 لاکھ ڈالر ہے، سب سے زیادہ 16 افسوس ناک بات یہ ہے کہ اِن غیر ملکی قرضوں پر سالانہ 160 ارب روپے سود کی مد میں ادا کیے جارہے ہیں، یہ تو ملک کے معاشی میزانیہ کا نقشہ اور کھلا منظر ہے، جبکہ حکومت نے اِس عرصے میں 50 ارب 85 کروڑ 40 لاکھ کے قرضے الگ معاف کیے ہیں

۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ حکومت ماضی کی حکوتوں کی روش کو ترک کرکے قومی خزانے کو لوٹنے والوں کا احتساب کرکے رقم واپس لاتی، مہنگائی میں کمی کرتی

اور ملکی وسائل سے استفادہ کرکے معیشت کو ترقی دیتی، مگر بدقسمتی سے سب کچھ الٹ ہو رہا ہے، ملکی معیشت کی حالت یہ ہے کہ وزیر خزانہ کا بیان ریکارڈ پر موجود ہے کہ دو مہینوں کے بعد تنخواہوں کی ادائیگی کیلئے رقم نہیں ہوگی، جبکہ مہنگائی کی وجہ سے بنیادی اشیاء کی قیمتیں عام آدمی کی قوت خرید سے بہت دور نکل چکی ہیں، لیکن اِس کے باوجود حکومتی حلقوں میں چین کی بانسری بجائی جارہی ہے اور حکومت کو سوائے این آر او کیسز اور اٹھارویں ترمیم کے علاوہ کچھ نظر ہی نہیں آرہا، ادھر عوام کی حالت یہ ہے کہ دو وقت کی روٹی کیلئے ترس رہی ہے، جبکہ اگلے چند ماہ میں ملک کی اقتصادی صورتحال، معاشرتی بحران اور عوامی درعمل کیا منظر نامہ ترتیب دینے جارہا ہے اِس کا تصور ہی محب وطن سیاسی و معاشی ماہرین کو دہلانے کیلئے کافی ہے، ہمارا ماننا ہے کہ ابھی بھی وقت ہے، ملکی معیشت سنبھالنے کیلئے اگر حکومت اخلاص کے ساتھ کام کرے اور بلا تخصیص گذشتہ برسوں میں معاف کرایے گئے قرضے، لوٹی ہوئی دولت، نادہندہ بااثر افراد سے ٹیکس اور یوٹیلٹی بلز کی مد میں واجب الادا رقم وصول کرلے، تو صرف اِن وصولیوں سے ہی پاکستان کو غیر ملکی قرضوں سے باآسانی نجات مل سکتی ہے، اس ساتھ اگر ہمارے حکمران اور سیاستدان بیرون ممالک بینکوں میں پڑے اپنے اربوں ڈالر زپاکستان لے آئیں تو یقین جانئے ہمیں کسی کے آگے کشکول گدائی پھیلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

لہذا ہمارا ارباب اقتدار سے مطالبہ ہے کہ وہ معاشی اور اقتصادی بحران پر قابو پانے کیلئے کفایت شعاری اپنائیں، اپنے شاہانہ اخراجات سمیت وزراء اور مشیروں کی فوج ظفر موج میں کمی کریں اور فوری طور پر غیر ملکی مفادات کی جنگ سے کنارہ کشی اختیار کرکے ملکی سلامتی، وحدت اور یکجہتی پر توجہ مرتکز کریں، ہماری ناقص رائے میں یہی وہ چند اہم اقدامات ہیں جن پر عمل کرکے حکومت نہ صرف معاشی اور اقتصادی طور پر مستحکم ہوسکتی ہے بلکہ بیرونی قرضوں سے نجات بھی حاصل کرسکتی ہے، آج اِس بات کو سمجھانے کیلئے کسی حکمت و دانائی کی ضرورت نہیں کہ رہن رکھا ہوا ملک اور قرضوں میں جکڑی قوم کبھی بھی آزاد اور خود مختار نہیں ہوتے۔

شہر سے ناگہانی موت کا سایہ نہیں جاتا۔۔۔

جواں لاشے، تھکے کاندھے، لرزتے قدم ہیں میرے

لاشے گر رہے ہیں، شہر کے در و دیوار، سڑکیں اور گلیاں بے گناہ انسانوں کے خون سے لہو رنگ ہیں، نوحے، بین اور آہ و بکا کا شور ہے، اشکوں کا سیل رواں ہے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتا،لوگ اپنے پیاروں کی جدائی پر سینہ کوبی کر رہے ہیں، لیکن ہائے رے بے بسی.... اور.... مجبوری.... کہ وزیر داخلہ سندھ فرمارہے ہیں کہ "وہ بے بس ہیں اوراِس خونریزی کو روکنا بہت مشکل ہے"موصوف اعتراف کرتے ہیں کہ " کراچی میں ہونے والی قتل و غارت گری کے ہم سب ذمہ دار ہیں"کسی نے خوب کہا ہے کہ "ہمیں خبر ہے مجرموں کے سب ٹھکانوں کی.... شریک جرم نہ ہوتے تو مخبری کرتے" دنیاکے مہذب ملکوں کا دستور ہے کہ جب انہیں ایسی کسی صورتحال کا سامنا کرناپڑااور وہاں جب کوئی وزیر کھل کر اپنی بے بسی کا اظہار کر دیتا ہے تواِس ناکامی کے اظہار کے ساتھ وہ اپنا استعفیٰ بھی پیش کر دیتا ہے،لیکن جناب نہ تو ہم مہذب ملک ہیں اور نہ ہی ہمارے کسی ذمہ دار فرد کواپنی محکمانہ

ذمہ داری کا احساس ہے، اخلاقی ذمہ داری تو بہت دور کی بات ہے، ہمارے یہاں تو دور دور تک ایسی کوئی مثال نظر نہیں آتی، بلکہ پاکستانی جمہوریت کے بہت سے کمالات میں سے ایک کمال یہ بھی ہے کہ چاہے کوئی محکمہ ناکامی کی آخری حدوں کو چھونے لگے اور اُس محکمے کی ناکام کارکردگی کی وجہ سے آدھی سے زیادہ قوم ذہنی مریض بھی بن جائے، تب بھی اُس محکمے کا ذمہ دار وزیر نہ تو اِس ناکامی کی ذمہ داری قبول کرتا ہے اور نہ ہی از خود استعفیٰ دیتا ہے، بلکہ جمہوریت کے اِس شرمناک حسن کو مزید چار چاند ہمارے اربابِ اقتدار اپنے اِس طرزِ عمل سے لگا دیتے ہیں کہ وہ ایسے کسی محکمے کے سربراہ سے نہ تو استعفیٰ طلب کرتے ہیں اور نہ ہی نااہلی پر اُس کو برطرف کرتے ہیں۔

پاکستان کی معاشی شہ رگ شہر کراچی ایک عرصے سے خانہ جنگی کا شکار ہے، بے گناہ شہریوں کی سربریدہ لاشیں، زخموں سے تڑپتے لوگ، جلتی ہوئی املاک، روتی سسکتی انسانیت اور نااہل و بے شرم انتظامیہ آج بیرونی دنیا میں اِس شہر کی " علامتی شناخت " بن چکی ہے، وہ شہر جو کبھی رنگوں، روشنیوں اور محبتوں کا امین اور علامت ہوتا تھا، ناعاقبت اندیش حکمرانوں کی بے حسی اور مفاداتی سیاست کا شکار ہے، آناً فاناً موت کا سایہ روشن و زندہ شہر کو مفلوج، شہر خموشاں اور مقتل گاہ میں تبدیل کر دیتا ہے، چوبیس گھنٹوں میں 38 افراد اور چار دنوں میں 86 افراد موت کی نیند سلا دیئے جاتے ہیں، منوں مٹی تلے قبروں میں اتار دیئے

جاتے ہیں، لیکن صدر اور وزیر اعظم صرف نوٹس لیتے ہیں، تحقیقات کا حکم دیا جاتا ہے، اتحادی جماعتیں ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہراتی ہیں، حکومت سے علیحدگی کی دھمکیاں دیتی ہیں، یوم سوگ منایا جاتا ہے، جو مزید کئی بے گناہ انسانوں کی جانیں لے لیتا ہے، جب صورتحال کنٹرول سے باہر ہو جاتی تو وفاقی وزیر داخلہ کراچی کا رخ کرتے ہیں، حکومت بچانے کیلئے اپنے اتحادیوں کو مناتے ہیں، یقین دہانیاں کراتے ہیں، آہنی ہاتھ سے نمٹنے کی باتیں ہوتی ہیں، فول پروف سیکورٹی کے بلند وبانگ دعوئے کئے جاتے ہیں، صوبائی وزیر داخلہ مجرموں کو الٹا لٹکانے کی دھمکیاں دیتے ہیں، شرپسندوں کو دیکھتے ہی گولی مارنے کے احکامات جاری ہوتے ہیں، سڑکوں اور چوراہوں پر رینجرز کے جوان کسی بے اختیار اسٹیچو کی طرح تعینات کر دیئے جاتے ہیں، کمیٹیاں بنتی ہیں، انکوائریاں ہوتی ہیں، ہر حادثے اور سانحے کے بعد ایک جیسے بیانات 24 گھنٹوں اور پھر 48 گھنٹوں کی ڈیڈ لائن، قوم کو صبر کی تلقین، ورثا سے اظہار ہمدردی، معاوضے کا اعلان اور اُس کے بعد کوئی اور حادثہ، پہلے والے حادثے پر ملبہ ڈال دیتا ہے اور وہی رٹا رٹایا بیان تھوڑے سے الفاظ کے ہیر پھیر کے ساتھ دوبارہ سامنے آجاتا ہے۔

لیکن قاتل بدستور دندناتے پھرتے ہیں، یاالٰہی .... یہ کیسا قانون ہے .... یہ کیسی انتظامیہ ہے .... یہ کیسی جمہوریت ہے .... اور یہ کیسی حکومت ہے، جو ہر مرتبہ ایک بیان سے دوسرے بیان تک تیس، چالیس اور پچاس سے زائد بے گناہ

انسانوں کے خون کا خراج لیتی ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتی، بلکہ الٹا اِس ناکام جمہوری نظام کی خوبیاں گنواتی ہے، مصالحتی پالیسی کے گن گاتی ہے اور مفاہمت کی پالیسی پر ناز کرتی ہے، لیکن قتل و غارت گری کو نہیں روکتی، بے انسانوں کے قاتلوں گرفتار نہیں کرتی، انہیں کیفر کردار تک نہیں پہنچاتی، آخر یہ سب کیا ہے؟ ریاست کی بے بسی، بے حسی یا جان بوجھ کر خاموشی اور چشم پوشی؟ سوال یہ ہے کہ یہ والیان ریاست آخر کس کام کے ہیں؟ کیا انہیں ہر سانحے کے بعد دعائے مغفرت پڑھنے کے لئے اقتدار دیا گیا تھا؟ انھوں نے اب تک عوام کے تحفظ کے لئے کیا کیا ہے؟ یہ سانپوں کو اُن کے بلوں سے باہر نکالنے کے لئے اپنے آہنی ہاتھ اِن بلوں میں کیوں نہیں ڈالتے، اِن کے پاس پولیس ہے، رینجرز ہے، فوج ہے لیکن اِس کے باوجود یہ اتنے بے بس اور کمزور ہیں کہ چند دہشت گردوں نے انہیں انگلیوں پر نچایا ہوا ہے اور یہ سوائے خالی خولی بیانات دینے کے اور کچھ بھی نہیں کرپاتے، دنیا جہاں کی انٹیلی جنس اِن کے پاس ہوتی ہے، گرفتاریوں کے نام پر سینکڑوں لوگوں کو پکڑا جاتا ہے، جن کی مدد سے اُن لوگوں کا سراغ لگایا جاتا ہے جو دہشت گردی کی وارداتیں کر رہے یا کرا رہے ہیں، اِن لوگوں سے کیا کچھ اگلوایا جاتا ہے اِس بارے میں عوام کو کچھ نہیں بتایا جاتا، خدارا.... کوئی تو ذمہ داری قبول کرے، کوئی وفاقی وزیر داخلہ، کوئی صوبائی وزیر داخلہ، آئی جی، ڈی آئی جی، ایس ایس پی، سیکرٹری داخلہ، خدا کیلئے.... کوئی تو کہے کہ ہاں یہ میری ذمہ داری تھی جو میں پوری

نہیں کر سکا۔۔۔ہاں میں مجرم ہوں ۔۔۔۔ سزا دینی ہے تو مجھے سزا دو۔۔۔۔ ورنہ یہ پڑا ہے میرا استعفیٰ قبول کرو۔

مگر افسوس ایسا نہیں ہوتا، کسی میں اتنی اخلاقی جرات نہیں کہ ذمہ داری قبول کرے، یہ کیسے لوگ ہیں کہ اپنی جان کے لئے تو محافظوں کے انبار لگا رکھے ہیں لیکن عوام کی حفاظت میں یہ بری طرح سے ناکام ہیں،افسوس کہ نہ شرمندگی کا اظہار کرتے ہیں،نہ اِس بات کا اعتراف کہ ہاں عوام کو تحفظ دینا ہماری ذمہ داری ہے جو ہم پوری نہ کر سکے،نہ با عزت طریقے سے استعفیٰ دے کر گھر جاتے ہیں اور نہ اِن کے بڑے اِن سے استعفیٰ طلب کرتے ہیں،نہ انہیں سترہ کروڑ عوام کا کوئی ڈر ہے،نہ ہی آخرت کی گرفت اور خدا کی پکڑ کا خوف، قوم لاشوں پہ لاشیں اٹھا رہی ہے اور یہ بن ٹھن کے قیمتی سوٹ پہن کر محافظوں کے جھرمٹ میں ائیر کنڈیشنڈ بلٹ پروف گاڑیوں میں گھوم رہے ہیں، کوئی ہے انہیں پوچھنے والا کہ جب تم اپنی ذمہ داریاں ادا نہیں کر سکتے،جب سترہ کروڑ عوام کے جان و مال کا تحفظ نہیں کر سکتے تو اقتدار کے ساتھ کیوں چمٹے ہوئے ہو،اقتدار کا بوجھ تو وہ اٹھائے جو عوام کو جان و مال کا تحفظ دے سکیں،جو خود بھوکے رہیں، عوام کو کھلائیں،جو خود جاگیں، راتوں کو چوکیداری کریں اورچوری،ڈکیتی ، قتل کی وارداتوں کی ذمہ داری قبول کریں اور اپنی عوام کو آرام و سکون نیند کو سلائیں،شاید یہ ہماری شامت اعمال کا نتیجہ ہے جو ہمیں دردمندی،احساس اور

قوم کی فکر و فاقہ سے عاری و بے نیاز چوکیدار ملے ہیں،اے قوم کے چوکیداروں ڈرو اُس وقت سے جب خدا کا قانون "ہم ظالموں کو ظالموں سے ختم کرواتے ہیں تاکہ دنیا سکھ کا سانس لے" (القرآن) حرکت میں آجائے اور پھر تمہیں کوئی بچانے والا نہ ملے،ڈرو ربّ ذوالجلال کی گرفت سے،جب تم سے تمہاری رعیت کی ذمہ داریوں کے بارے میں سوال ہوگا،مہلت عمل کم ہے....اۓ میرے خدا....اب تو کرم فرما دے....اب تو معاف کردے کہ.... لہو کے رنگ سے رنگین ہیں دیوار و در میرے.... شہر سے ناگہانی موت کا سایہ نہیں جاتا....جواں لاشے، تھکے کاندھے،لرزتے قدم ہیں میرے....الٰہی، کرم فرما،بوجھ اب یہ اٹھایا نہیں جاتا۔

کرپشن وہ دیمک ہے

دو سال قبل پاکستان دنیا کے کرپٹ ترین ممالک کی فہرست میں 47 ویں نمبر سے ترقی کرکے 42 واں نمبر پر تھا، مگر ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کی حالیہ رپورٹ کے مطابق اِس ترقی کی رفتار میں تیزی سے اضافہ ہوا اور پاکستان نے 8 درجے ترقی کرکے 42 ویں نمبر سے 34 واں نمبر حاصل کرلیا ہے، ترقی معکوس کا عمل تیزی سے جاری ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ اِس ترقی معکوس پر اپنے ارباب اقتدار سے دکھ، غم اور افسوس کا اظہار کروں، یا انہیں مبارکباد دوں، کہ دونوں ہی صورتوں میں کچھ بدلنے والا نہیں لگتا۔ پاکستان میں شماریات کے تمام اعشاریے اِس اَمر پر دلالت کررہے ہیں کہ ملک کی معیشت تیزی سے روبہ زوال ہے، عوام کی بھاری اکثریت زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم ہے، بڑھتی ہوئی مہنگائی نے عام آدمی کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے، انڈسٹری بند ہورہی اور بے روزگاری میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے، ایسے میں ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کی تازہ رپورٹ گزشتہ ایک سال کے دوران ملک میں بدعنوانی میں غیر معمولی اضافے کی بھی واضح نشاندہی کررہی ہے، پہلے اِس فہرست میں ہمارا 42 واں نمبر تھا، اب 34 واں ہوگیا ہے، گویا صرف ایک سال میں کرپشن اتنی ہوئی ہے کہ ہم مزید آٹھ کرپٹ ممالک پر بازی لے گئے، یہ ہے ہماری

ترقی معکوس کا شاندار مظاہرہ....... پاکستان دو سال پہلے دنیا کا 47 واں کرپٹ ترین ملک تھا،جب 5 درجے گر کر یہ 42 ویں نمبر پر آیا تھا تو اُسی وقت ہمارے اربابِ اختیار کو اصلاح احوال کی تدابیر اختیار کرکے کرپشن کی روک تھام اور اِس درجہ بندی میں بہتری لانے کا احساس ہونا چاہیے تھا، مگر افسوس عملاً ایسا نہیں ہوا اور ملک بدعنوانی میں مزید 8 درجے آگے جاکر اُس بنگلہ دیش کو بھی بہت پیچھے چھوڑ گیا ہے جو کسی وقت اِس دوڑ میں سرفہرست ہوا کرتا تھا، قابل توجہ بات یہ ہے کہ ٹرانسپیرنسی انٹر نیشنل کی جانب سے پاکستان کی نئی درجہ بندی وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کے اُس بیان کے صرف دو روز بعد سامنے آئی جس میں انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ پاکستان میں کوئی کرپشن نہیں۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ ٹرانسپیرنسی انٹر نیشنل مختلف ممالک میں کرپشن جانچنے کیلئے دنیا میں سب سے زیادہ قابل اعتبار ادارہ اور اُس کے انڈیکس یا اعشاریے درست ترین پیمانہ تسلیم کئے جاتے ہیں، جن ممالک کی حکومتیں اپنے معاملات ٹھیک کرنا چاہتی ہیں، وہ اِس سے فائدہ اٹھاتی ہیں اور عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کیلئے یہ پروپیگنڈہ نہیں کرتیں کہ اِس طرح کے جائزے اُن کے مخالفین تیار کرا کر چھپواتے اور نشر کراتے ہیں، ٹرانسپیرنسی انٹر نیشنل کی فہرست میں آٹھ درجے نیچے آنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ پچھلے ایک سال کے دوران پاکستان میں کرپشن بڑھی ہے،ٹرانسپیرنسی انٹر نیشنل پاکستان کے

چیئرمین عادل گیلانی کا کہنا ہے کہ پچھلے سال ملک میں تین سو ارب روپے کی کرپشن ہوئی جس کا نہ تو قومی احتساب بیورو نے نوٹس لیا، نہ حکومت نے اِس معاملے میں کوئی خاص دلچسپی کا مظاہرہ کیا، تنظیم کے دعوے کے مطابق سب سے زیادہ کرپشن کرائے کے بجلی گھروں میں ہوئی، جبکہ ای او بی آئی، این ایچ اے پیپکو، او جی ڈی سی ایل میں بھی مالی بے ضابطگیاں ہوئیں، سرکاری اداروں میں اتنی بڑی بدعنوانی اور خورد برد سے جان بوجھ کر صرف نظر کرنا سمجھ سے بالاتر ہے۔
ہمیں تو ٹرانسپیرنسی پاکستان کی یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے کہ حکومت کرپشن روکنا ہی نہیں چاہتی اور نہ اُس کے پاس کرپشن کو کنٹرول کرنے کیلئے مضبوط سیاسی عزم ہے، اگر حکومت سنجیدگی سے کرپشن کی لعنت کو ختم کرنا چاہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ادارے قومی وسائل کے بے جا اسراف اور خورد برد کو نہ روکیں، حیرت ناک اَمر یہ ہے کہ بعض اداروں میں ہونیوالی لوٹ مار کا نوٹس عدلیہ کو لیناپڑا جبکہ یہ کام خود حکومت کو کرنا چاہیے تھا، رینٹل پاور پلانٹس سے بجلی حاصل کرنے کے بارے میں یہ تشویشناک انکشاف بھی سامنے آیا کہ 23 ارب روپے ادا کرنے کے باوجود صرف 62 میگاواٹ بجلی حاصل کی جا سکی، حکومت کی اسی بدانتظامی اور اللے تللوں کی وجہ سے ملک پر قرضوں کا بوجھ چند سال میں 46 بلین سے بڑھ کر 53.3 بلین ڈالر ہوگیا ہے، یہ سارا بوجھ غریب عوام کے کندھوں پر ہے جن کی

کمر روز بروز جھکتی جا رہی ہے، جو پیسہ عوام کو زندگی کی سہولتیں فراہم کرنے اور ملک کی تعمیر و ترقی پر خرچ ہونا چاہئے تھا وہ بدعنوان لوگوں کی جیبوں میں جا رہا ہے۔
کرپشن ہمارے معاشرے کا ایک ایسا ناسور بن گیا ہے، جس کی جڑیں اتنی پھیل گئی ہیں کہ سارا معاشرہ اِس کا شکار بن کر رہ گیا ہے۔اِس ناسور کی شاخوں نے جہاں دیکھو منافقت، جھوٹ، ملاوٹ، لوٹ مار، قتل و غارت، بے حیائی، چور بازاری، بے حمیتی اور رشوت کی منڈیاں کھول دی ہیں، مکاری وعیاری کے دریا بہہ رہے ہیں، ہوس، لالچ، نااہلی اور حکمرانی کی خواہش اقتدار نے غیروں کی غلامی میں جکڑ رکھا ہے۔الغرض کرپشن کے ناسور کی جڑیں ہر شعبہ زندگی میں پھیل چکی ہیں اور پورے ملک کو اِس نے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے، ہمارے ارباب اقتدار اچھائی کا نعرہ لگا کر برائی کرتے ہیں، ایمانداری کا طبل بجا کر پوری قوم کو غربت و محرومی کی دھن پر نچاتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک ماں جو پیار اور ممتا کا خوگر ہوتی ہے اپنے ہی بچوں کے قتل اور ایک باپ جو شفقت اور محبت کی علامت ہوتا ہے، اپنے ہی بچوں کو زہر دینے کا سبب بن جاتا ہے، محرومی، غربت، مہنگائی اور حکمرانوں کے تراشیدہ عذابوں نے زندگی کو ارزاں اور موت کو عام کر دیا، ہمارے لیڈر بے غیرتی کی چادر اوڑھ کر کشکول بکف یہود و نصاریٰ کے دروازوں پر کھڑے ہیں، دشمن ہمیں بناتا اور بگاڑتا ہے اور ہمارے

حکمران کٹ پتلیوں کی طرح اُس کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔

جب میڈیا اور ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل جیسے ادارے حکمرانوں کی توجہ اِس صورتحال کی جانب مبذول کراتے ہیں تو وہی رٹا رٹایا سبق دہرا دیا جاتا ہے کہ عوام صبر کریں،سب ٹھیک ہوجائے گا، یہ کتنی ستم ظریفی کی بات ہے کہ صاحبان اقتدار کسی اقتصادی جائزے کو ماننے کیلئے تیار نہیں ہیں،اُن کے خیال میں تو ہر طرف چین ہی چین،انصاف ہی انصاف ہے،ہر ادارہ ایماندانہ اور شفاف طریقے سے کام کر رہا ہے، کہیں کوئی کرپشن، بدانتظامی،اوراقرباء پروری نہیں ہورہی، وہ کسی طور بھی اِس حقیقت کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں کہ ملک میں کچھ غلط بھی ہو رہا ہے،بس اُن کا اصرار ہے کہ حکومتی کارکردگی، کرپشن،نااہلی اور بدانتظامی کے متعلق رپورٹیں حکومت کو بدنام کرنے کیلئے ہیں،اِس طرزِ فکر کو دھوکہ اور خود فریبی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے،ہمارے خیال میں معیشت کی تباہی اور کرپشن کی ذمہ داری حکومت کی پالیسیوں پر عائد ہوتی ہے، خود مرکزی بینک کی رپورٹ معیشت کی تباہی کے اسباب کی طرف اشارہ کررہی ہے،جس کے مطابق تین برسوں میں سرکاری قرضے دگنے ہوگئے ہیں اور حکومتی قرضوں اور واجبات کی رقم 102 کھرب تک پہنچ گئی ہے،حکومت اِن تین برسوں میں اپنے طے کردہ اصلاحاتی اقدامات پر بھی عمل نہیں کرسکی،جس میں سب سے بڑا مسئلہ بجلی کا بحران اور صنعتوں کی بندش کی وجہ سے بیروزگاری اور مہنگائی میں بڑھتا

ہوا اضافہ ہے، سابق وزیر خزانہ ماہر معاشیات ڈاکٹر حفیظ پاشا نے بیروزگاری اور مہنگائی میں اضافے کی پیش گوئی کرتے ہوئے کہا تھا کہ مستقبل میں حکومت کی معاشی ٹیم کا اصل امتحان اُس وقت ہوگا جب آئی ایم ایف کو قرض کی واپسی کا سلسلہ شروع ہوگا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل نے کرپشن سے متعلق جو رپورٹ پیش کی ہے وہ اپنی جگہ درست ہے، ضروری ہے کہ ہمارے پالیسی ساز جتنی جلد اِس گرداب سے نکلیں گے اتنا ہی قوم اور ملک کے حق میں بہتر ہوگا،حکومت کو غیر جانبداری اور دیانتداری کے مظاہرے کے ساتھ پاکستان سے کرپشن کلچر کے خاتمے کے لئے مشنری جذبہ کے ساتھ کام کرنا ہوگا،ہر مجرم خواہ اُس کا تعلق کسی بھی طبقے یا پارٹی سے کیوں نہ ہو انصاف کے کٹہرے میں لانا ہوگا اور کرپشن کو بے نقاب کرنے کے ساتھ ساتھ مجرموں کو کیفر کردار تک بھی پہنچانے کا فریضہ سرانجام دینا ہوگا، ہمارے خیال میں پاکستان کا اولین مسئلہ کرپشن کا خاتمہ ہے اور یہ خاتمہ صرف اُسی صورت میں ممکن ہے جب میڈیا، عوام اور عدلیہ کے ساتھ ارباب اختیار بھی سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا کردار ادا کریں اور ملک و قوم کی دولت لوٹنے والے ہر کرپٹ کو سرعام سزا دے کر نشان عبرت بنائیں۔

خیال رہے کہ پیپلز پارٹی کو عوام نے بہتر مستقبل کی امید پر حکمرانی کا مینڈیٹ دیا ہے، جس پر پورا اتر کر ہی وہ قوم کے سامنے سرخرو ہو سکتی ہے۔ ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کی رپورٹ نے درست کہا ہے کہ "کرپشن سے صرف نظر کرنا قبول نہیں، کیونکہ اِس کے اثرات دنیا بھر میں غرباء کو برداشت کرنا پڑتے ہیں۔" اِس تناظر ہمیں موجودہ قوانین کے سختی سے نفاذ کی ضرورت ہے۔ ہمارا ماننا ہے کہ پاکستان میں کرپشن کے خاتمے کیلئے بلاامتیاز قانون کے نفاذ، میرٹ پر تعیناتیوں اور انصاف تک آسان رسائی بہت ضروری ہے۔ حکومت کو اِن اصولوں پر کسی صورت بھی سمجھوتہ نہیں کرنا چاہیے، چاہے اِس کے لئے کتنی ہی قیمت کیوں نہ ادا کرنا پڑے۔ یاد رکھئے کرپشن وہ دیمک ہے جو ملک و قوم کی بنیادوں کو ہی کھوکھلا نہیں کرتی بلکہ دنیا میں عزت و وقار سے جینے کا حق بھی چھین لیتی ہے۔

ہم سب منافق ہیں۔۔۔۔

دونوں ہی عوام کے مجرم ہیں۔۔۔۔۔

ابھی وزیراعظم کے اُس بیان کہ "حکومت نے اپنی آدھی مدت پوری کرلی ہے،اب حکومت عوامی مسائل کے حل اور مہنگائی کے خاتمے پر توجہ دے گی"کی صدائے بازگشت بھی ختم نہیں ہونے پائی تھی کہ حکومت نے ایک ہی دن میں بجلی کی قیمتوں میں 2 فیصد اضافے کے ساتھ پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں بھی خوفناک حدتک اضافہ کر دیا،یوں عوام پر دو دھاری تلوار چلائی گئی ہے،ایک طرف بجلی کے نرخ بڑھائے گئے تو دوسری طرف پٹرولیم مصنوعات کے نرخوں میں اضافے کے اعلان کے ساتھ ہی ملک میں مہنگائی کا نیا طوفان بھی برپا کردیا گیا،جس کے بعد

چینی، دودھ، دالوں، سبزیوں، پھلوں، گوشت، مرغی اور خشک میوہ جات سمیت کم و بیش تمام اشیائے خوردنی اور روزمرہ استعمال کی اشیاء کی قیمتوں میں بھی بے تحاشا اضافہ ہو گیا،حکومت کے اِن اقدامات سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے سارے خسارے بجلی، پٹرول، مٹی کے تیل اور ڈیزل سے پورے کرنا چاہتی ہے اور عوام کو ایک ایسی سطح پر پہنچا دینا چاہتی ہے جہاں اُن کا شمار زندوں میں ہوسکے نہ مردوں میں۔

حقیقت یہ ہے کہ عوامی حکومت کے ڈھائی سالہ دور اقتدار میں اشیاء خورد و نوش غریب طبقے کی قوت خرید سے باہر ہو چکی ہیں، مہنگائی نے ماضی کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے ہیں،اِس دوران ذخیرہ اندوزوں، گراں فروشوں اور منافع خوروں نے اپنی تجوریاں بھرنے کیلئے بحران در بحران پیدا کیے اور عوام کو جی بھر کے لوٹا، روٹی کپڑا اور مکان کے نعرے پر وجود میں آنے والی حکومت نے عملاً عوام کے منہ سے روٹی کا نوالہ بھی چھین لیا،حال یہ ہے کہ اِس وقت ہر شخص شدید ذہنی کرب و اذیت میں مبتلا ہے کہ وہ کیسے اپنے خاندان کی کفالت کا بندوبست کرے، مہنگائی اور بے روزگاری نے عوام سے جینے کی امنگیں چھین لی ہیں، لوگوں کی قوت خرید ختم ہوتی جارہی ہے اور عوام حالات کا مقابلہ کرتے کرتے تھک چکے ہیں،سب سے زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ عوام کیلئے "روٹی کپڑا اور مکان" کا نعرہ لگانے والے حکمرانوں نے اُنکے ہاتھ میں موجود نوالہ چھیننے، تن کے کپڑے نوچنے اور مکان کی سہولت کو ان کیلئے ڈراؤنا خواب بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، مزدور اور تنخواہ دار طبقہ تو پہلے ہی اقتصادی اور معاشی بدحالی کا شکار تھا، حکومت کے اِس اقدام کے بعد اب سفید پوشی کا بھرم قائم رکھنے کی کوشش میں مصروف مڈل کلاس طبقہ بھی غربت کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جائے گا،ایسی حالت میں ظاہر ہے لوگ اپنے مسائل سے عاجز آکر یا تو انفرادی اور اجتماعی خودکشیوں اور خود سوزیوں کا راستہ اختیار کرینگے یا پھر تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق اُس انقلاب کی راہ پر چل نکلیں گے جس کے آنے کی خبر دے

کر حکمران طبقات ایک دوسرے کو ڈراتے نظر آتے ہیں۔
اُمر واقعہ یہ ہے کہ موجودہ حکومت اپنی کارکردگی کے اعتبار سے پاکستان کی تاریخ کی انوکھی حکومت ہے جسے عوام کے ساتھ ذرا بھر ہمدردی نہیں اور اُس نے اپنے عوام کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھا ہے جیسا دشمنوں کے ساتھ کیا جاتا ہے،آپ کو یاد ہوگا کہ صدر زرداری نے برسر اقتدار آتے وقت کہا تھا کہ وہ نظام بدل کر محترمہ بے نظیر بھٹو کے قتل کا بدلہ لیں گے،ایسا لگتا ہے کہ وہ اسی قول کو عملی جامہ پہنا رہے ہیں اور پاکستان میں ایسا نظام لانا چاہتے ہیں جس میں غریب فاقوں کے ہاتھوں مرنے اور مڈل کلاس طبقہ ایڑیاں رگڑنے پر مجبور ہو جائے، یہ ہماری بدقسمتی رہی کہ جو بھی برسر اقتدار آیا اُسے صرف یہی فکر لاحق رہی کہ کس طرح اپنے اقتدار کو طول دیا جائے، حکمرانوں نے اقتدار کی لالچ میں عالمی اداروں کے مفادات کا تحفظ تو کیا،لیکن عوام کی سہولت کیلئے کوئی منصوبہ ترتیب نہیں دیا،ہر حکومت نے عوام کیلئے آسانیوں کی بجائے مشکلات میں اضافہ کیا،صرف وقت گزاری کیلئے عوام کو سبز باغ دکھائے، موجودہ حکومت نے بھی ماضی کی حکومتوں کی عوام کش پالیسیاں اپنائیں،حکومتی اخراجات اور اپنے اللوں تللوں میں کمی کرکے عوام کو ریلیف پہنچانے کے بجائے غیر ضروری کاموں پر اربوں روپے ضائع کیے،ایک طرف عوام دو وقت کی روٹی کو ترس رہے ہیں تو دوسری طرف حکومت غیر ملکی دوروں اور وزراء کی فوج ظفر موج کم

کرنے کی بجائے آئی ایم ایف کے احکامات کی بجاآوری کیلئے عوام پر کبھی بجلی بم، کبھی چینی بم، کبھی گیس بم اور کبھی پیٹرول بم گرا کر قربانیاں مانگ رہی ہے، جبکہ وزیر اعظم اور حکومتی وزراء جھوٹے دعوے کر رہے کہ حکومت عوام دوست پالیسیاں بنا رہی ہے، کیا یہی عوام دوست پالیسیاں ہیں کہ روزمرہ کی اشیائے ضرورت بھی ایک عام آدمی کی پہنچ سے باہر ہو جائیں۔

ملک کے غریب عوام تو پہلے ہی حکومت کی مالی بدانتظامی، بے تحاشا سرکاری اخراجات اور کرپشن کے باعث معاشی بدحالی اور روز بروز بڑھتی ہوئی مہنگائی کے بوجھ تلے بری طرح دبے ہوئے تھے، ایسے میں پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں حالیہ اضافے کی وجہ سے اب کھانے پینے کی عام اشیاء بھی اُن کی پہنچ سے دور کر دی گئی ہیں، ستم بالائے ستم یہ کہ پٹرولیم کی مصنوعات کی قیمتوں میں اضافہ ایک ایسے وقت میں ہو رہا ہے جب ہمارے پڑوس میں بجلی اور پٹرولیم مصنوعات کی قیمتیں کم کی جا رہی ہیں، دیکھا جائے تو عوام کے ساتھ حکومت کا یہ سلوک انتہائی بے رحمانہ ہے، وہ گڈ گورننس کے ذریعے مالی بدحالی پر قابو پانے کی بجائے پہلے سے بری طرح پسے ہوئے غریبوں کو نچوڑ کر اپنے بڑھے ہوئے اخراجات پورے کرنے پر تلی ہوئی ہے، یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے کہ حکومت ملک کے قدرتی وسائل بروئے کار لانے اور صنعتوں کو فروغ دینے کے بجائے توانائی کی قیمتیں بڑھا دیتی ہے، جس سے معیشت کا کمزور پہیہ چلنے کی بجائے رک جاتا

ہے، یہ ایسی صورتحال ہے جسے کسی حال میں بھی قابل قبول قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اِس سے ملک کی اقتصادی بدحالی میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے جس سے عوام کا جینا محال ہوگیا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ عوام کو اِس حال تک پہنچانے میں صرف حکومت ہی نہیں اپوزیشن بھی برابر کی شریک ہے، یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے جمہوریت کے نام پر عوام سے ووٹ لیے، مسائل حل کرنے اور معاشی حالت بہتر بنانے کے سبز باغ دکھائے، لیکن جب پارلیمنٹ میں پہنچ گئے تو کند چھری سے عوام کی کھال اتارنے میں مصروف ہوگئے، ہماری نظر میں وہ سب لوگ اِس جرم میں برابر کے شریک ہیں، جنھوں نے" بنام جمہوریت" عوام کو لوٹا اور" مفاہمت اور استحکام جمہوریت "کی آڑ میں انہیں تباہ کرنے کے منصوبے بنائے، یہ وہ لوگ ہیں جو عوام کے خیر خواہ بنتے ہیں، پریس کانفرنسوں اور ٹی وی مباحثوں میں عوام، عوام کی رٹ لگاتے ہیں، لیکن عوام کے حقوق کے لئے کھڑے نہیں ہوتے، حکومت پر دباؤ نہیں ڈالتے کہ وہ عوام دشمن اقدامات سے گریز کرے، دراصل اِن لوگوں کے درمیان مفادات کی گہری ساجھے داری ہے،اِن کو پتہ ہے کہ اگر یہ سسٹم نہ رہا توسب سے زیادہ اِن کا ہی نقصان ہوگا،اسی لیے یہ لوگ سسٹم کو بچانے کی بات کرتے ہیں، یہ مشاہدہ تو عام ہے کہ جب انہیں ذاتی یا پارٹی کے حوالے سے کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو حکومت سے الگ ہونے کی دھمکی دیتے ہیں، پارلیمنٹ سے واک آؤٹ کرتے ہیں اور

عوام کو سڑکوں پر لانے کا عندیہ بھی دیتے ہیں، لیکن جب اِن کے مطالبات مان لیے جاتے ہیں تو پھر سے اپنے حال میں مست ہو جاتے ہیں اور عوام کو بھول جاتے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے عوامی حقوق کے لئے آج تک سنجیدگی سے کوئی آواز ہی نہیں اٹھائی، اسلیے کہ ِان کا تعلق غریب اور مفلوک الحال عوامی طبقے سے نہیں بلکہ اُس مراعات یافتہ طبقے سے ہے جسے اِس مہنگائی کے دور میں بھی وہ تمام آرام و آسائشیں میسر ہیں جو ایک عام آدمی کی پہنچ سے کوسوں دور ہیں، اسی وجہ سے یہ لوگ چپ چاپ عوام کی اجتماعی خودکشیوں، مفلسی، بھوک اور بے روزگاری کے ہاتھوں بربادی کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔

اِن حالات میں ہمارا عوام سے سوال یہ ہے کہ وہ کیوں اپنے حق کیلئے آواز بلند نہیں کرتے، جبکہ اللہ نے انسان تو انسان حشرات الارض میں بھی یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ خطرہ محسوس کرتے ہی اپنی حفاظت کیلئے متحرک ہوجاتے ہیں، جوابی حملہ کرتے ہیں اور کاٹ لیتے ہیں، چیونٹی جیسی معمولی مخلوق بھی اپنے ہدف تک پہنچنے کے لئے اُس وقت تک جدوجہد کرتی ہے جب تک اُس ہدف کو حاصل نہیں کرلیتی، دنیا کے ہر ملک کا باسی خود پر ہونے والے ظلم و زیادتی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے، زیادتیوں کے خلاف سڑکوں پر نکل آتا ہے، حکومتوں کا ناطقہ بند کر دیتا ہے، لیکن خدا جانے یہ پاکستانی عوام کس مٹی کی بنی ہوئی ہے، اِن پر جتنی مرضی چاہے زیادتیاں کرتے جاؤ، یہ چپ چاپ ظلم پہ ظلم سہتے

جاتے ہیں، مگر صدائے احتجاج بلند نہیں کرتے، حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے، پوری دنیا میں پاکستان وہ واحد ملک ہے جس کے عوام کے چہروں سے حالات کی سختیوں کا عکس تو جھلکتا ہے لیکن اپنے حقوق کے حصول کی خاطر سڑکوں پر نہیں آتے، منافقت کی اِس سے بڑی علامت اور کیا ہوگی کہ ظلم و جور پر خاموشی اختیار کر کے ظالم کی حوصلہ افزائی کی جائے، قتیل شفائی نے سچ کہا تھا

قتیل اُس شخص سا منافق نہیں کوئی

جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا

خدارا جاگئے.... رب کے دیئے ہوئے عقل و شعور کے باوجود ہم نے جو منافقانہ طرز عمل اختیار کیا ہوا ہے، کہیں اُسی کی وجہ سے آج ہم اِن ہوس پرست اقتدار پرستوں کے ہاتھوں ذلیل و رسوا تو نہیں ہو رہے ہیں، سوچیئے .... ہوش میں آیئے .... اور یاد رکھئے کہ اللہ نے ہمیں اپنے حق کے لئے لڑنے کی ترغیب دینے کے ساتھ یہ بھی بتا دیا ہے کہ جب تک ہم اپنے حق کے لئے خود نہیں لڑیں گے، اُس وقت تک وہ بھی ہماری مدد کو نہیں آئے گا، وہ وقت کب آئے گا.... جب ہم ایک ہی سوراخ سے بار بار ڈسوانا بند کریں گے.... وہ وقت کب آئے گا.... جب ہم اِن مفاد پرست آزمائے ہوئے لوگوں کو پوری قوت سے مسترد کر کے حصولِ حق کا راستہ اختیار کریں گے، کیا اب بھی خواب غفلت سے بیدار ہونے اور اپنی آنے والی نسلوں کو تباہی سے بچانے کا وقت نہیں آیا۔

؟___

شخصیاتِ اسلام" کا حسین انتخاب

تاریخِ اسلام میں بے شمار شخصیات نے اپنے علم و فضل، تقویٰ و طہارت اور ریاضت و مجاہدہ کی بنیاد پر اعلیٰ مرتبہ و مقام حاصل کیا،اِن عظیم شخصیات کے سیرت و کردار اور افعال و اعمال ہمیشہ ہی ملت اسلامیہ کیلئے مشعل راہ بنے رہے،جب تک اُمت مسلمہ نے اِن شخصیات کے سیرت و کردار سے رہبری و رہنمائی حاصل کی،کامیابی و کامرانی، عزت و وقار اُمت کا مقدر رہی،زیر نظر کتاب "شخصیات اسلام" بھی ایسے ہی اکابرین ملت کے تذکروں پر مشتمل ہے، جسے مشہور و معروف محقق و ادیب جناب صلاح الدین سعید ی ڈائریکٹر تاریخ اسلام فاونڈیشن لاہور نے ترتیب دیا ہے، موصوف اِس سے قبل مختلف موضوعات پر دو درجن سے زائد کتب تصنیف کرچکے ہیں۔

یہ کتاب دراصل مختلف اوقات میں لکھے گئے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف رسائل وجرائد میں اشاعت پزیر ہوتے رہے،اِن مضامین میں صلاح الدین سعیدی نے اُن شخصیات کے سیرت و کردار کو اجاگر کیا ہے، جنھوں نے رشد و ہدایت کے چراغ روشن کئے اور اپنے اپنے ادوار میں انسانیت کیلئے راہ عمل متعین کرکے قرطاسِ وقت پر انمٹ نقوش چھوڑے،اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ صاحب کتاب نے زیادہ تر اُن شخصیات پر قلم اٹھایا ہے، جو عرصہ دراز سے گوشہ گمنامی میں تھیں اور جن

کے بارے میں ہماری نوجوان نسل تقریباً لاعلم ہے۔

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے، پہلا باب "رہنمائی" کے خوبصورت عنوان سے مزین ہے، یہ باب اُمہات المومنین، رسول اللہ کی شاہزادیوں، حضرت امیر معاویہ، سیدنا عمر بن عبدالعزیز، حضرت رابعہ بصری، داود طائی، سیدنا غوث اعظم، شیخ فریدالدین عطار غیاث الدین ایوبی، حضرت نظام الدین اولیاء اور حضرت خواجہ گیسو دراز کے تذکروں پر مشتمل ہے،اِس باب میں بیبیاں پاک دامن کے حوالے سے ایک خاص تحقیقی مضمون بھی شامل ہے جو اِن کی اصل تاریخی حقیقت کو واضح کرتا ہے۔

دوسرا باب "اجتماعی تذکرے" کے عنوان سے ہے ،اِس باب میں صدیقی بزرگان کے ساتھ ،لاہور کے مفتی خاندان کی پانچ سو سالہ علمی سرگزشت اور سرھند سے علی پور تک کے عنوان سے علمی و تحقیقی مضامین شامل ہیں، تیسرا باب "برصغیر کی شخصیات" کے تذکروں پر مشتمل ہے، جس میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے کلام میں صنعت تضاد، علامہ اقبال اور نظریہ ختم نبوت، مرزائیت مشاہیر اسلام کی نظر میں ،برصغیر کے عظیم صحافی مولانا فقیر محمد جہلمی، مولانا محمد صالح، مولانا رکن الدین الوری، خلیفہ اعلیحضرت مولانا محمود جان پشاوری اور سید احمد ابوالبرکات، سید خلیل احمد کاظمی، سید احمد سعید کاظمی، صاحبزادہ افتخار

الحسن، علامہ ارشد القادری، مفتی جلال الدین امجدی، مفتی احمد یار خان نعیمی، مولانا غلام قادر اشرفی، خاندانِ قائد ملت اسلامیہ علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی، مفتی محمد حسین نعیمی اور مولانا الٰہی بخش ضیائی پر معلوماتی مضامین شامل ہیں، کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس باب میں ماہر رضویات پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد اور حکیم اہلسنت حکیم محمد موسیٰ امرتسری کا ذکر بھی شامل ہوتا۔

چوتھا باب "عصر حاضر کی شخصیات" کے عنوان سے ہے،اِس باب میں اُن شخصیات کا تذکرہ شامل کیا گیا ہے جو بقید حیات ہیں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دے رہی ہیں،اِن میں مشہور و معروف عالم و ادیب پیرزادہ اقبال احمد فاروقی، مشہور نعت گو شاعر سعید بدر، کنزالایمان سوسائٹی کے صدر اور مدیر ماہنامہ کنزالایمان محمد نعیم طاہر رضوی اور مفکر اسلام ڈاکٹر اشرف آصف جلالی شامل ہیں،اس باب میں مفسر قرآن اور شارح حدیث مسلم و بخاری علامہ غلام رسول سعیدی، مشہور اسکالر محمد عالم مختار حق اور ماہر نیازیات و مشہور محقق محمد صادق قصوری صاحب جیسے اکابرین ملت کی تذکروں کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے،اُمید ہے صاحب کتاب اِس طرف خصوصی توجہ فرمائیں گے۔

پانچواں اور آخری باب "انٹرویوز" پر مبنی ہے، جس میں عاشق رسول محمد پناہ ٹوانائی، مناظر اہلسنّت پروفیسر سعید احمد اسد اور خدمت گزار صدرالافاضل محمد افضل اشرفی ایڈوکیٹ کے انٹرویوز شامل ہیں،اس طرح 256 آفسٹ صفحات اور عمدہ ٹائٹل سے مزین یہ کتاب اُن مشاہیر اسلام کے تذکروں پر مشتمل ہے، جنھوں نے اپنے اپنے ادوار میں اسلام کی ترویج واشاعت اور دین حق کی آبیاری کیلئے نمایاں خدمات انجام دیں یا دے رہے ہیں،اِس اعتبار سے یہ کتاب ایک منفرد مقام رکھتی ہے کہ صاحب کتاب نے گزری ہوئی شخصیات کے ساتھ اُن شخصیات کا بھی ذکر شامل کتاب کیا ہے جو بقید حیات ہیں،اِس انتخاب پر جناب صلاح الدین سعیدی تحسین کے مستحق ہیں،انشاء اللہ یہ کتاب نوجوان نسل کیلئے اپنے اکابر و مشاہیر سے مضبوط تعلق و رشتہ کی ایک مضبوط بنیاد ثابت ہوگی، علم و حکمت کے موتیوں کے متلاشی اور اہل ذوق حضرات کیلئے لائق مطالعہ یہ کتاب "پرانا کاہنہ ڈاکخانہ کاہنہ نو، ضلع لاہور موبائل03008090476 سے حاصل کی جاسکتی ہے۔"

مہنگائی میں گہنائی ہوئی عید کی خوشیاں۔۔۔

عید الفطر اور عید الاضحیٰ رب تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کیلئے خاص تحفہ اور انعام ہیں، لیکن گزشتہ کئی سالوں سے یہ تہوار پاکستان کے غریب عوام کیلئے خوشی و مسرت کے بجائے دکھ اور اذیت کا پیغام لے کر آرہے ہیں، منافع خور تاجر اور عوام دشمن قوتیں اِن تہواروں کے آنے سے قبل ہی اشیائے ضرورت اور خوردونوش کی مصنوعی قلت پیدا کرکے قیمتوں میں ہوشربا اضافہ کردیتی ہیں اور پاکستان کے غریب عوام جو پہلے ہی بجلی، گیس اور پٹرول کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے بدحال ہیں،پر مزید مہنگائی کا بوجھ لاد دیا جاتا ہے۔

چند دنوں میں عید الاضحیٰ آنے والی ہے،اس موقع پر آلو، پیاز، ٹماٹر، مرچ، ادرک، لہسن وغیرہ ہر گھر کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن ہمیشہ کی طرح اِس بار بھی ذخیرہ اندوز مافیا نے اِن چیزوں کا مصنوعی بحران پیدا کردیا ہے،حال یہ ہے کہ آلو35 روپے، پیاز 60 سے 80روپے، ٹماٹر50 سے 80روپے، مرچ120روپے سے 150روپے اور ادرک و لہسن جیسی معمولی اشیاء جو ہر کھانے کی بنیادی ضرورت ہوتی ہیں 200 سے زائد روپے کلو بک رہی ہیں،اِس حالت میں ایک غریب اور دیہاڑی دار آدمی جس کی ایک دن کی آمدنی دو، تین سو روپے روزانہ بنتی ہے، کس طرح اپنے

بیوی بچوں کی کفالت اور ہانڈی روٹی کا انتظام کرتا ہے، تصور بھی محال ہے، چہ جائیکہ قربانی یعنی سنت ابراہیمی کی ادائیگی کرے، جبکہ مہنگائی، غربت، بے روزگاری اور افلاس کے ہاتھوں روز اُس کی اپنی قربانی ہوتی ہو۔

عموماً سنت ابراہیمی کی پیروی میں دنیا بھر کے مسلمان عید الاضحیٰ کے موقع پر گائے، بکرے، بیل، اونٹ اور دنبے کی قربانی کرتے ہیں، اِس مقصد کیلیے دنیا بھر میں مویشی منڈیاں قائم کی جاتی ہیں جہاں قربانی کے جانور فروخت کے لئے لائے جاتے ہیں، کراچی میں بھی سپر ہاوے پر 8 سو ایکڑ رقبے پر محیط ایشیاء کی سب سے بڑی مویشی منڈی قائم ہے، جس میں ملک بھر سے لائے جانے والے خوبصورت اور صحت مند جانوروں کو دیکھنے کے لیے شہریوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہوتی ہے، رات کے وقت بھی منڈی میں میلے کا سماں دکھائی دیتا ہے۔

کراچی میں سپر ہاوے کے علاوہ ملیر، بھینس کالونی، بہادر آباد، برنس روڈ، حسن اسکوائر، لیاقت آباد مارکیٹ، بابر مارکیٹ لانڈھی، کورنگی جے ایریا، قائدآباد، گلشن حدید میں بھی مویشی منڈیاں قائم ہوچکی ہیں، جبکہ کئی فلاحی اداروں اور سرکاری اداروں کی جانب سے پارکوں میں بھی مویشیوں کی خرید وفروخت کا سلسلہ جاری ہے، تاہم گزشتہ سال کی نسبت قیمتیں دگنی ہونے کے باعث کاروباری سرگرمیوں میں تیزی دکھائی نہیں دے رہی، بیوپاری خریداروں کے منتظر

ہیں مگر منڈیوں میں خریدار کم دیکھنے والوں کا ہجوم زیادہ ہے۔
اِس صورتحال کی بنیادی وجہ قربانی کے جانوروں کی قیمت میں 100 سے 150 فیصد تک اضافہ ہے، جو ایک عام آدمی کی قوت خرید سے باہر ہے۔اِس وقت ایک اچھے اور صحت مند بکرے کی قیمت 20 ہزار سے ایک لاکھ روپے تک ہے، وہ دنبہ جو گزشتہ سال پانچ، چھ ہزار روپے کا مل جاتا تھااِس سال اُس کی قیمت میں 25 سے 30 فیصد اضافہ نوٹ کیا گیا، یہی حال بڑے جانوروں کی قیمت کا ہے، معمولی سے معمولی اوسط درجے کی گائے بھی پچاس ہزار سے کم میں نہیں مل رہی ہے۔
جبکہ منڈی میں قائم وی آئی پی بلاک میں قیمتی اور نایاب بکروں کی قیمت 50 ہزار سے لاکھ اور گائے، بیل بچھڑوں کی قیمتیں ڈیڑھ لاکھ سے 30 لاکھ روپے تک ہیں، یہ 3 قیمتیں ایک غریب آدمی کے ہوش اڑا دینے کیلئے کافی ہیں کیونکہ محدود آمدنی والے لوگوں کی قوت خرید زیادہ سے زیادہ 20 سے 25ہزار روپے تک نظر آتی ہے۔اسی وجہ سے گزشتہ برسوں کے مقابلے میں اِس سال لوگوں میں قربانی کا رجحان 30 سے 40 فیصد تک کم نظر آرہا ہے، سچ تو یہ ہے کہ گرانی سے بے حال لوگ جانوروں کی آسمان سے باتیں کرتی قیمتوں کے سامنے بے بس ہیں اور مہنگائی نے عیدالاضحیٰ کے خوشیوں بھرے تہوار کو گہنا دیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شدید مہنگائی کے باعث اس سال اجتماعی قربانی میں اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے، تاہم یہ اجتماعی قربانی بھی فی حصہ 8000 سے 9000ہزار روپے میں پڑ رہی ہے، جبکہ کراچی کے ہر ٹاؤن میں مختلف سیاسی، مذہبی، سماجی تنظیموں کے ساتھ ساتھ مدارس میں اجتماعی قربانی کافی کس حصہ کم از کم 5500 سے 6500رکھا گیا ہے،
حکومت کی ناقص پالیسی نے جہاں پہلے ہی عوام کو مہنگائی کے بوجھ تلے دبا دیا ہے، وہیں عید کے موقع پر انفرادی قربانی سے بھی محروم کرکے شہریوں کو عید کا خصوصی تحفہ دیا ہے، لیکن یہ تحفہ بھی برداشت کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔
قارئین محترم ،یوں تو قربانی کا موسم ہر سال آتا ہے اور بارگاہ لم یزدی سے یہی حکم لاتا ہے کہ اپنی سب سے قیمتی چیز اُس کی راہ میں قربان کرو، صاحب استطاعت مسلمان اِس حکم کی پیروی میں خوبصورت سے خوبصورت اور تندرست سے تندرست جانور اللہ کی راہ میں قربان کرتے ہیں، رضائے الٰہی کے حصول کیلئے قربانی دیتے ہیں، لیکن ہمارے حکمران اپنے بیرونی آقاؤں کی خوشنودی کیلئے سال میں کئی کئی بار عوام جیسی قیمتی متاع کی قربانی دیتے ہیں، آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور عالمی ساہوکار اداروں کی قربان گاہ پر غریب عوام کو بھینٹ چڑھاتے ہیں۔

چنانچہ اِس بار بھی عوام کی قربانی دینے کی تیاریاں کرلی گئی ہیں، مہنگائی کے سیلاب میں ڈوبتے ابھرتے لوگوں پر ریفارمڈ جی ایس ٹی اور فلڈ ٹیکس عائد کیا جارہا ہے۔بقول شاعر
"وہی ذبح بھی کرے ہے، وہی لے ثواب الٹا۔"
اب تو ایسے لوگ بھی حکمرانوں کی تیز چھریوں کی زد میں ہیں جن کے جسم پر صرف کھال رہ گئی ہے اور اِن کی ہڈیوں پر چمڑا اِس طرح منڈھا ہوا ہے، جیسے طبلے پر کھال، طبلہ پر تھاپ پڑتی ہے تو بج اٹھتا ہے، بھوک، مہنگائی اور بے روزگاری کی تھاپ اِن کھال منڈھے بے حال جسموں پر مسلسل پڑ رہی ہے، حکومت کے معاشی جادوگروں اور اقتصادی ماہرین کی انگلیاں تھرک رہی ہیں، مگر کھال منڈے طبلوں میں اب اتنی سکت بھی نہیں کہ کوئی صدائے احتجاج بلند ہو، سر بکھریں اور آواز نکلے، سیانے کہتے ہیں کہ قربانی کے جانوروں کو سوتے میں چھریاں دکھائی دیتی ہیں، مگر عوام کا یہ حال ہے کہ انہیں تو جاگتے میں بھی چھریاں نظر آرہی ہیں، خدا معلوم غریب عوام کا انجام کیا ہوگا۔

بے یقینی کے موسموں میں ایقان کی چٹھیاں

اردو زبان میں خطوط نویسی کا دامن بہت وسیع ہے اور خطوط نویسی کی روایت اتنی توانا ہے کہ بذات خود ایک صنف ادب کی حیثیت اختیار کر چکی ہے، جس کی سب سے بڑی مثال مرزا غالب کے خطوط ہیں، مولانا ابو الکلام آزاد بھی مکتوب نگاری میں ایک طرز خاص کے موجد ہیں، مولانا کے خطوط کے مکاتیب ابولکلام آزاد، نقش آزاد، تبرکات آزاد اور کاروانِ خیال کے نام سے شائع ہو چکے ہیں، لیکن سب سے زیادہ شہرت "غبار خاطر" کے حصے میں آئی، مکتوب نگاری دراصل اردو ادب کی قدیم صنف ہے مگر یہ ادبی شان اور مقام و مرتبہ کی حامل کب ہوتی ہے، ڈاکٹر سید عبداللہ کا خیال ہے کہ "خطوط نگاری خود ادب نہیں مگر جب اِس کو خاص ماحول، خاص مزاج، خاص استعداد ایک خاص گھڑی اور خاص ساعت میسر آجائے تو یہ ادب بن سکتی ہے۔" بابائے اردو مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ " خط دلی خیالات و جذبات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا صحیفہ ہے۔"

اِس بات کا عملی ثبوت مجاہد ملت مولانا عبدالستار خان نیازی کا وہ خط ہے جو آپ نے 4 اگست 1941ء کو بابائے قوم قائدا عظم محمد علی جناح کے نام لکھا تھا، مجاہد ملت لکھتے ہیں "جناب قائدا عظم ! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر

آپ ملت کے جسم پر سے اِن لاعلاج ناسوروں کو ایک مرتبہ دور کردیں گے تو نیا خون سامنے آئے گا اور معاملات ایک نیا رخ اختیار کریں گے اور اِس طرح ہمارے خواب پورے ہونگے۔پرانی مشینوں سے نئے ماڈلز برآمد نہیں ہو سکتے اور نہ ہی پرانی وضع قطع کے اشخاص سے نئے رجحانات کو پورا کرنے کی اُمید کی جاسکتی ہے۔نئے حالات نئی حکمت عملی کے متقاضی ہیں، بیشک ماضی سے اچانک رشتہ ختم نہیں کیا جاسکتا، لیکن ہر قیمت پر سفر آگے کی طرف ہونا چاہیے نہ کہ پیچھے کی طرف۔ہم بہت خوش ہیں کہ ہم نے آپ کی ذات میں ایک ایسا رہنما پالیا ہے جو اِس قوم کے نوجوانوں کی جبلّی خواہشات کو نہ صرف بخوبی سمجھتا ہے بلکہ غداروں سے نپٹنے کی جرات بھی رکھتا ہے۔"

یکم اکتوبر 1915ء کو عیسیٰ خیل میانوالی کے ممتاز نیازی خاندان میں پیدا ہونے والے مجاہد ملت تحریک پاکستان کے نامور اور بے باک رہنما تھے۔آپ مفکر اسلام علامہ اقبال کی صحبت سے فیضیاب اور قائدِ اعظم محمد علی جناح کے سچے جانثار سپاہی تھے۔آپ نے قیام پاکستان کیلئے بستی بستی،قریہ قریہ اور کوچہ کوچہ پاکستان کا پیغام پہنچانے کیلئے دن رات محنت کی اور قیام پاکستان کے بعد اپنی زندگی نفاذ نظام مصطفیٰ کیلئے وقف کردی، قائدِ اعظم نے آپ کے بارے میں فرمایا تھا کہ "جس قوم کے پاس عبدالستار نیازی جیسے پیکران یقین و صداقت اور صاحبان عزم و ہمت ہوں،اُس کے پاکستان کو کون روک سکتا ہے۔" پیغمبر انقلاب

حضور سید عالم کا ارشاد مبارک ہے کہ "بہترین جہاد جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق بلند کرنا ہے۔" ضیغم اسلام مجاہد ملت مولانا عبدالستار خان نیازی کا شمار اُنہی اللہ والوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے اپنی تمام عمر جابر حکمرانوں اور اسلام دشمن طاقتوں سے معرکہ آرائی میں گزاری، ہر دور کی آمری قوتوں کو للکارا، کبھی کلمہ حق کہنے سے گریز نہیں کیا، ہمیشہ اصول پرستی کا مظاہرہ کیا اور ساری زندگی سیاسی شعبدہ بازیوں، منافقت اور ریا کاری سے دور اِس شعر کی مصداق گزاری۔

جیتا ہوں نگہبانی اسلام کی خاطر

فاق ہیں میری تلخ نوائی سے گلہ مند

حقیقت یہ ہے کہ مسلم اسٹوڈینس فیڈریشن کے قیام سے لے کر 1940ء میں قرار داد پاکستان کی منظوری تک، تشکیل پاکستان سے لے قرار داد مقاصد کی جہد وجہد تک، 1953ء کی تحریک ختم نبوت کے مرحلہ دار ورسن سے لے کر ایوبی آمریت تک، یحییٰ خان کے دور سیاہ سے لے کر بھٹو کی جمہوری آمریت تک، 1977ء کی تحریک نظام مصطفیٰ کی قید وبند سے لے کر ضیاءالحق کے مارشل لاء اور 2 مئی 2001ء کو اپنی وفات تک ہر ہر قدم پر مجاہد ملت کی داستان عزم و ہمت بکھری ہوئی ہے۔

زیر نظر کتاب "مکاتیب مجاہد ملت" اسی مرد خود آگاہ کے اُن چھیاسی خطوط پر

مبنی ہے جو آپ نے 1941ء سے 1992ء تک بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح، شہید ملت لیاقت علی خان، راجہ صاحب آف محمود آباد، خواجہ ناظم الدین، میاں محمود علی قصوری، مولانا کوثر نیازی، مولانا مودودی، حکیم محمد موسیٰ امرتسری، جنرل ضیاء الحق، میاں نواز شریف، سید شہاب دہلوی، مجید نظامی، عبدالقادر حسن، ارشاد احمد احمد حقانی، نذیر ناجی، ظہور الحسن بھوپالی، جسٹس ذکی الدین پال، اقبال احمد فاروقی، بشریٰ رحمان، ظہور الدین امرتسری، میجر امیر اللہ خان نیازی، معراج خالد، ملک محمد اکبر ساقی، معاصر سیاستدانوں، دانشوروں اور دوستوں کو لکھے۔ نصف صدی کے طویل عرصے پر محیط یہ خطوط اُس دور کے سیاسی، ثقافتی، تہذیبی، علمی، معاشرتی، اقتصادی اور دینی و ملی مسائل کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ مجاہد ملت کے لکھے ہوئے یہ خطوط بتاتے ہیں کہ تحریک پاکستان کے دوران پنجاب میں مسلم لیگ کن صبر آزما مراحل سے گزری اور کن کن تلخ حوادث و حادثات سے دوچار ہوئی۔اِن خطوط میں اُن پردہ نشینوں کے بھی نام ملتے ہیں جنھوں نے سالہا سال تک پردہ نگاری کے پیچھے وہ کچھ کیا جس کی سزا آج ہم من حیث القوم بھگت رہے ہیں۔ مجاہد ملت کے خطوط کی اہمیت کا ایک اور پہلو اپنے عہد کی تاریخی، سیاسی اور معاشرتی تصویر کشی ہے۔اُنھوں نے اِن تحریروں میں اپنے زمانہ کی معاشرت اور سیاست کی طرف واضح اشارے کئے ہیں۔ خصوصاً تحریک پاکستان کے دوران لکھے گئے اُن کے خطوط تحریک کے دوران پیش آنے والے حالات و واقعات اور سیاسی اتار چڑھاؤ کے چشم دید

گواہ اور زندہ تاریخ ہیں۔

اِن مکاتیب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تنہا اور مجرد زندگی گزارنے والے مجاہد ملت کا پہلا اور آخری عشق پاکستان اور پاکستان میں نفاذ نظام مصطفیٰ سے تھا، یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنا دل اور جان پاکستان اور نفاذ اسلام کیلئے وقف کردی اور اُن راہوں کا سفر اختیار کیا جن پر قدم قدم پر جھوٹ، ریاکاری اور منافقت کے کانٹے بچھے ہوئے ہیں، محترمہ بشریٰ رحمان نے بہت خوبصورت بات لکھی کہ آپ زندگی بھر" بے یقینی کے موسموں میں ایقان کی چٹھیاں تقسیم کرتے رہے اور ادراک کی بلند فصیلوں کے اُس طرف بیٹھنے والوں کیلئے نقیب بنے رہے۔"

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ مجاہد ملت کی شخصیت ایک انفرادیت کی مالک تھی، وہ گھسے پٹے راستے پر چلنے والے مسافر نہیں تھے، وہ اپنی طبیعت کے اعتبار سے انقلابی راہرو بھی تھے اور میر کارواں بھی، انہوں نے سادگی، سلاست، بے تکلفی و بے ساختگی، گنجلک اور مغلق انداز بیان کی بجائے سادا مدعا نگاری کے محاسن اپنائے جو مکاتیب مجاہد ملت میں نمایاں نظر آتے ہیں، اُن کے مکاتیب اُن کی بلند اور قدآور شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں، مجاہد ملت کے طرز تحریر میں، انوکھے پن کے ساتھ، عالمانہ سنجیدگی اور دور اندیش

مسلم رہنماء کی بصیرت موجود ہے، جسے سامنے رکھ کر ہم باآسانی مجاہد ملت کی زندگی، فکر و سوچ اور کردار و عمل کا مکمل خاکہ تیار کر سکتے ہیں، مجاہد ملت کا اسلوب ایک شمشیر بے نیام ہے، جس میں قوس و قزاح کے رنگوں کے ساتھ مومنانہ شان اور اللہ کی برہان جھلکتی ہے اور اُن کی ہمہ گیر انقلابی شخصیت کو ظاہر کرتی ہے، مکاتیب کا مطالعہ اِس بات کو واضح کرتا ہے کہ مجاہد ملت کی ذہانت بہت تیزی سے ہر شخص یا ہر چیز کا مضحک پہلو دیکھ لیتی ہے" مکاتیب مجاہد ملت " کا اسلوب اردو میں نامعلوم مدت تک زندہ رہے گا، درحقیقت مکاتیب مجاہد ملت" کی دلکشی کا اصل راز اُس کی طرز تحریر میں ہے، تخلیق نثر کا یہ شہکار صدیوں تک مسافران عزیمت کو فکری و نظریاتی اساس کی دولت عطا کرتا اور خراج تحسین وصول کرتا رہے گا۔

دیکھا جائے تو" مکاتیب مجاہد ملت" میں شامل خطوط کثیر المقاصد ہیں جنھیں "ماہر نیازیات و محقق" جناب محمد صادق قصوری نے بڑی عقیدت اور جانفشانی سے اِس طرح ترتیب دیا ہے کہ یہ اپنے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتے نظر آتے ہیں، کتاب کے آخر میں شامل "تشریحات و تصریحات" اور" تذکرہ رجالِ مکاتیب مجاہد ملت" کے باب اُن شخصیات، تنظیموں اور اداروں کے بارے میں اہم معلومات پر مبنی ہیں جو مجاہد ملت کے مخاطبین رہے،اس کارنامے پر محترم محمد صادق قصوری صاحب بانی و ناظم اعلیٰ مجاہد ملت فاؤنڈیشن برج کلاں ضلع قصور لائق

صد تحسین ہیں، جنھوں نے اپنی شبانہ روز کاوشوں سے اِس کتاب کو از سر نو ترتیب دیا اور حضرت مجاہد ملت مولانا عبدالستار خان نیازی کی حیات و خدمات کے سلسلے میں " مکاتیب مجاہد ملت " جلد اوّل کا گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ جناب صادق قصوری صاحب 5 فروری 1943ء کو پیدا ہوئے۔ انٹر تک تعلیم حاصل کی۔ 1963ء میں محکمہ زراعت سے وابستہ ہوئے اور 2003ء میں بحیثیت زراعت انسپکٹر محکمہ سے ریٹائر ہوئے۔ آپ نے اپنا سب سے پہلا مضمون 1961ء میں لکھا، اُس دن سے آج تک کاغذ اور قلم سے رشتہ برقرار ہے۔ موصوف " مکاتیب مجاہد ملت " سے قبل "اکابر تحریک پاکستان، تحریک پاکستان میں علماء و مشائخ کا کردار، کاروان تحریک پاکستان، نذر مجاہد ملت، مجاہد ملت بحضور حکیم الامت، مناقب مجاہد ملت، مجاہد ملت مشاہیر کی نظر میں، مجاہد ملت کا روحانی مقام، مجاہد ملت بحضور رسالت مآب، مجاہد ملت خطوط کے آئینے میں، مولانا عبدالستار نیازی، مولانا عبدالستار نیازی مجاہد ختم نبوت، غازی ختم نبوت، ارمغان مجاہد ملت، مجاہد ملت حیات، خدمات تعلیمات، نگارشات مجاہد ملت، خطبات مجاہد ملت، تحریک مشائخ نقشبند، رباعیات خواجہ نقشبند، حضرت امیر ملت اور اُن کے خلفاء، مکاتیب امیر ملت، تذکرہ شعرائے جماعتیہ" وغیرہ جیسی چالیس سے زائد اہم معلوماتی اور تاریخی کتابیں ترتیب دے چکے ہیں۔

محترم صادق قصوری صاحب کی ذات عوام اہلسنّت کے لیے سرمایہ افتخار ہے جو

اپنے اکابرین کی حیات وکارناموں کو نوجوان نسل کے سامنے لانے کا مؤجب ہے،انہوں نے مکاتیب مجاہد ملت کو ترتیب دے کر اِس کتاب کو مفید عام ہی نہیں بنایا بلکہ فن خطوط نویسی میں ایک مثبت اور اہم تاریخی دستاویز کا اضافہ بھی کیا ہے اور علم وادب اور تاریخ کی ایسی شاہراہ پر اپنا راہوار قلم دوڑایا ہے، جس کی آج کے حالات میں شدید ضرورت تھی، ہم اُن کے اِن جواں جذبوں کو سلام کرتے ہیں جو اہلسنّت کے علمی احیاء کے لئے ستائش ومالی منعفت سے بے نیاز پیرانہ سالی میں شہری سہولتوں سے دور قصور کے دور افتادہ مضافات "برج کلاں" میں بیٹھے سرگرم عمل ہیں، ہماری دعا ہے اللہ کریم اُن کے علم، عمر اور زرق میں برکتیں عطا فرمائے (آمین بجرمۃ سیّد المرسلین)

علامہ نیاز فتح پوری نے لکھا تھا"مشاہیر اہل علم وقلم کے خطوط کی جمع وترتیب کو دور حاضر میں کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی جارہی، حالانکہ یہ خطوط ایک سرمایہ سے کم نہیں،اہل علم وفکر، صاحب دانش کے قلم سے نکلے الفاظ، پندونصائح، حالات کے بہتے دھارے پر اُن کے تبصرے، نقد وجرح اہم نکات کی نشاندہی اور فکری رہنمائی مہیا کرتے ہیں۔" زیر نظر کتاب "مکاتیب مجاہد ملت " کی جمع وترتیب اِسی سوچ کی عکاس ہے، محمد صادق قصوری کی اِس کاوش سے متروک عمل کا اجراء ہوا ہے اور اُمید ہے کہ ایسے صاحبان جن کے پاس مجاہد ملت کی بیش قیمت تحریروں سے مرصع خطوط گرد میں دبے ہیں وہ انہیں فراہم کر

کے جلد دوم کی زینت بنا کر افادہ عام کی نیک سعی میں اپنا حصہ ڈالیں گے۔کتاب چالیس
روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر مجاہد ملت فاؤنڈیشن۔ برج کلاں ضلع قصور پوسٹ کوڈ
55051۔ فون نمبر 03064469496 سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

قانون توہین رسالت پر نیا حملہ ..... اصل عزائم کیا ہیں

اِس کہانی کا آغاز نینسی جے پال سے ہوتا ہے، جو 16 اگست 2002ء سے 5 نومبر 2004ء تک پاکستان میں امریکہ کی سفیر رہی ہیں، بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ انہیں پاکستان میں تعینات کرتے وقت کچھ خصوصی حدف دیئے گئے تھے، جن میں ایک پاکستان کے نصاب تعلیم میں تبدیلی، دوسرا حدود آرڈی نینس کا خاتمہ یا ترمیم، تیسرا قانون توہین رسالت کو ختم کرنا یا تبدیل کرنا، اور چوتھا امتناع قادینت آرڈیننس کی منسوخی، چنانچہ نینسی جے پال نے ذمہ داریاں سنبھالتے ہی صدر، وزیر اعظم اور دیگر اہم شخصیات سے پہلے خفیہ اور بعد ازاں اعلانیہ ملاقاتیں شروع کردیں، اُس وقت بعض باخبر اور محب وطن دانشورانِ ملاقاتوں کو خطرے کا الارم قرار دے رہے تھے، دور اندیشوں نے بھانپ لیا تھا کہ اندر ہی اندر کچھ کھچڑی پک رہی ہے، لیکن کچھ ہی عرصے بعد جب امریکی استعمار کے ایجنڈے پر باقاعدہ کام شروع ہوا تو پوری تصویر نکھر کر سامنے آگئی، سب سے پہلے امریکی ایجنڈے کے مطابق "نصابِ تعلیم میں تبدیلی" پر کام شروع ہوا اور 2003ء سے پاکستان کے نصابِ تعلیم میں تبدیلیوں کا آغاز ہوا جو 2004ء میں اختتام پذیر ہوا، ابتدائی طور پر امریکہ نے پاکستان کے نظام تعلیم کی تبدیلی کیلئے پاکستان کو 3 ارب 90 کروڑ روپے دیئے، یہ بات بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ 5 فروری 2005ء کو سابق صدر بش نے فخریہ انداز میں کہا تھا کہ

پاکستان کا نصابِ تعلیم میرے کہنے پر تبدیل کیا گیا۔" جس کے بعد سابق آمر"
پرویز مشرف نے "انڈیا ٹوڈے" کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ "بھارت اور
پاکستان کا نصابِ تعلیم مشترکہ ہونا چاہئے۔" مئی 2004ء کو قومی اسمبلی سے خطاب
کرتے ہوئے اُس وقت کی وزیر تعلیم زبیدہ جلال کا یہ بیان بھی ریکارڈ پر موجود ہے جس
میں انہوں نے کہا تھا کہ "بیالوجی کی کتاب میں قرآنی آیات کا کیا کام ہے؟" اور اگر
مقدس مضامین کے سامنے کتے کی تصویر آ گئی ہے تو اِس میں کیا مضائقہ ہے۔؟ اِس کے
بعد حکومت نے نصاب سے سیرت رسول، غزوات، جہاد کی آیات، شہادت کا
فلسفہ، صحابہ کرام کے واقعات، مسلم فاتحین کے حالات و واقعات، اُمہات المومنین کے
تذکرے اور ہر ایسی بات نکال دی جس کو پڑھ کر ایک طالبعلم نظریاتی مسلمان، سچا
پاکستانی اور اسلام کا مجاہد بن سکتا تھا۔

نصاب تعلیم میں تبدیلی کے بعد دوسرا اہم ایجنڈا "حدود آرڈیننس" میں تبدیلی تھا،تاکہ
پاکستان کے اسلامی کلچر کو یہود و نصاریٰ کے مادر پدر آزاد معاشرے میں تبدیل کیا
جاسکے، یہ لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر اِس ملک میں حدود آرڈیننس باقی اور موثر
رہا تو زناکاری اور بدکاری کا جنازہ نکل جائے گا، واضح رہے کہ جس معاشرہ میں زناکاری و
بدکاری نہیں ہوتی، وہ کثرتِ اموات، کثرت امراض، معاشی تنگ دستی اور جنگ وجدل
سے بچ کر ترقی کی راہ پر گامزن ہو جاتے ہیں، جو انہیں کسی طور بھی گوارہ نہیں تھا، چنانچہ
پاکستانی

معاشرہ اور مسلمانوں کو غلاظت کی اِس دلدل میں دھکیلنے کے لئے سب سے پہلے حدود آرڈیننس کے خلاف اربوں ڈالر کے مصارف سے "کچھ سوچئے" کے عنوان سے ایک میڈیا مہم چلائی گئی اور حدود آرڈیننس کے خاتمے کیلئے فی ممبر پچیس پچیس کروڑ روپے خرچ کیے گئے، تاکہ ملک میں فحاشی وعریانی کیلئے راہ ہموار ہوسکے۔ پوری قوم کو ذہنی طور پر حدود آرڈیننس کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا گیا، زنا بالجبر اور زنا بالرضا کی غلیظ ابحاث اٹھائی گئیں اور کھلے عام بحث و مباحثے ہوئے، ٹی وی چینلز پر اِس نازک اور شرم وحیا والے مسئلے پر بے ہودہ گفتگو کی گئی، جس میں حدود ختم کرنے پر زور دیا گیا، دلائل کے طور پر زانی عورتوں کو مظلوم اور کوڑے مارنے اور حد جاری کرنے کو ظلم قرار دیا گیا اور وہ حدود آرڈیننس جو زنا کے سدباب کی ایک ادنی سی کوشش تھی، اُس کو ظلم و تشدد سے تعبیر کرایا گیا، یوں حدود آرڈیننس کو کالعدم قرار دینے کیلئے 2005ء میں شروع ہونے والا کام 2006ء میں اِس کے متبادل حقوق نسواں بل لانے اور زنا کاری کو تحفظ فراہم کرنے کا سبب بنا، صرف یہی نہیں ہوا بلکہ ایسے جوڑے جو بدکاری و زناکاری کے مرتکب تھے، انہیں تحفظ فراہم کرنے کے لئے بیرون ملک شہریت دے کر اِس گھناؤنے جرم اور مجرمین کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی، جس کے بعد ملک میں عریانی، فحاشی اور بے حیائی کے دور غلیظ کا آغاز ہوا۔

اِس کے بعد اِن اسلام دشمن قوتوں کا اگلا ہدف قانون توہین رسالت اور امتناع

قادیانیت آرڈیننس تھا، منصوبے کے مطابق یہ کام 2007ء میں شروع ہونا تھا اور 2008ء تک ختم ہونا تھا، مگر 9 مارچ 2007ء سے سابق آمر پرویز مشرف حکومت کی الٹی گنتی شروع ہو گئی، جس کی وجہ سے یہ کام کچھ عرصے کیلئے رک گیا، لیکن اب یہ کام امریکہ ہماری موجودہ حکومت سے لینا چاہتا ہے، حکومت اِس کی حامی بھر چکی ہے، صدر زرداری لندن میں اِس کی یقین دہانی بھی کروا چکے ہیں اور دل و جان سے عمل کرنے کیلئے مچل رہے ہیں، ہدف یہ ہے کہ 2009ء سے 2012ء تک تین سالوں کے دوران اِس تیسرے اور اہم ترین قانون توہین رسالت کو ختم یا غیر موثر کروایا جائے، جس پر کام کا آغاز گوجرہ، سمبڑیال اور ڈسکہ سانحات، دیوبندی، بریلویوں میں اختلافات کو ہوا دے کر اور بعض لیڈروں کے بیانات سے ہو چکا ہے، ننکانہ کے نواحی علاقے اٹانوالی سے تعلق رکھنے والی 45 سالہ عیسائی خاتون آسیہ کا معاملہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے، جسے تعزیرات پاکستان کی دفعہ 295 سی کے تحت 8 نومبر 2010ء کو توہین رسالت کے جرم میں مقامی عدالت نے سزائے موت سنائی ہے، جس کے بعد بار پھر یہ قانون اِن قوتوں کے نشانے پر ہے اور نام نہاد حقوق انسانی کے تنظیموں، بیرونی سرمائے پر پلنے والی این جی اوز، پوپ بینیڈیکٹ اور یہودی و صہیونی ممالک کی جانب سے اِس قانون کے خلاف بلا جواز واویلا اور منسوخی کا مطالبہ سامنے آرہا ہے۔

گزشتہ دنوں صدر آصف علی زرداری نے بھی اِس قانون پر عملدرآمد کے طریقہ کار

میں اصلاحات کیلئے وفاقی وزیر اقلیتی امور شہباز بھٹی (جو کہ اقلیتی حقوق کے چمپئن اور
اپنی کمیونٹی کا بھرپور دفاع کرتے ہیں اور جو اِس قانون کو ظالمانہ قرار دے چکے ہیں) کی
سربراہی میں کمیٹی بنانے کا حکم دیتے ہوئے کہا ہے کہ وہ اصلاحاتی طریقہ کار کی سفارش
کیلئے دانشوروں اور ماہرین کی کمیٹی کیلئے نام تجویز کریں، تاکہ ذاتی اور سیاسی وجوہات پر
توہین رسالت قانون کے غلط استعمال کو موثر طور پر روکا جاسکے۔ صدر کا کہنا تھا کہ اِس
قانون کے غلط استعمال کے بڑھتے ہوئے واقعات کو روکنے کے لئے حکومت
انتظامی، طریقہ جاتی اور قانونی اقدامات سمیت تمام تر مناسب اقدامات اٹھائے گی۔"
دوسری طرف پے درپے واقعات کے بعد زمین قدرے ہموار ہوچکی ہے، مگر یہ حکومت
کے لئے اتنا آسان کام نہیں، گو کہ بازی گروں کے پاس حیلوں اور بہانوں کی کمی
نہیں، ایک بہانہ جس کا بہت زیادہ امکان ہے، وہ یہ ہے کہ نظرثانی (ریویو) کے نام پر
اِس قانون کو غیر معینہ مدت کے لئے سرد خانے میں ڈال کر عدالتوں کو اِس قانون کے
تحت سزائیں دینے سے روک دیا جائے اور یہ دلیل دی جائے کہ ہم ناموس رسالت
کے قانون کو بدلنے کا سوچ بھی نہیں سکتے، فقط اِس کے غلط استعمال کو روکنے کے لئے
قانون پر از سر نو نظرثانی کررہے ہیں، یہ دراصل اُسی گہری مکروہ سازش کے تانے
بانے ہیں، جس کی منادی نیویارک اور تجدید لندن سے ہوئی اور جس کا ایجنڈا لے کر
سابق امریکی سفیر نینسی جے پال پاکستان آئی تھی۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ قانون توہین رسالت کے ذاتی، سیاسی اور غلط استعمال کا معاملہ ایک
الگ انتظامی اور قانونی مسئلہ ہے، جس کا اِس قانون کی منسوخی کے مطالبے سے کوئی تعلق
اور ربط نہیں، جہاں تک اِس قانون کے اقلیتوں کے خلاف استعمال کا معاملہ ہے تو یہ بات
بالکل غلط ہے، پچھلے بیس سالوں کے دوران توہین رسالت اور توہین قرآن کے الزام
میں 700 سے زائد مقدمات درج ہوئے، جن میں نصف سے زیادہ مقدمات
مسلمانوں نے مسلمانوں کے خلاف درج کرائے، لہٰذا یہ دعویٰ بالکل ہی غلط ہے کہ 295
سی کا نشانہ صرف غیر مسلم اقلیت ہی بنتی ہے، اب رہ گئی بات اِس قانون کی منسوخی کی، تو
یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی بے گناہ فرد کو تعزیرات پاکستان کی دفعہ 302 کے تحت
قتل کے مقدمے میں ملوث کردیا جائے اور پھر اِس دفعہ کی منسوخی کی بات کی
جائے، آج تک کسی جانب سے کبھی یہ مطالبہ سامنے نہیں آیا کہ دفعہ 302،304 اور
307 کالا قانون ہیں، انہیں فی الفور ختم کیا جائے اور ملک بھر میں اِن دفعات کے تحت
سزا یافتہ افراد کو صدر صاحب معافی دے کر یورپ، امریکہ اور جرمنی روانہ
کردیں، حقیقت یہ ہے کہ قانون توہین رسالت میں کوئی خامی نہیں ہے، جہاں یہ قانون
توہین رسالت کے مرتکب افراد کیلئے سزا کا تعین کرتا ہے، وہیں توہین رسالت کا جھوٹا
الزام لگانے والوں کیلئے بھی قانون میں سخت سزا کی دفعہ موجود ہے، اگر شہباز بھٹی اور
سلمان تاثیر اپنی دانست میں آسیہ کو بے گناہ سمجھتے ہیں تو اُن کے کیلئے آسیہ کی سزا کے
خلاف ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ کا دروازہ کھلا ہوا

ہے، وہ اِس سزا کے خلاف اعلیٰ عدالتوں سے رجوع کرتے، کیونکہ ماضی میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جن میں ہائیکورٹ نے توہین رسالت کے ملزمان کو الزام ثابت نہ ہونے پر رہا کیا ہے۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ شہباز بھٹی اور سلمان تاثیر کے اقدامات کا اصل مقصد توہین رسالت کی مرتکب آسیہ کو بچا کر بے گناہ ثابت کرنا یا عادی مقدمہ بازوں کی حوصلہ شکنی کرنا نہیں، بلکہ 295 سی میں ترمیم یا منسوخ کرانا ہے، یہ دراصل آسیہ کے نام پر ایک ایسے قانون کو بدلنے کی کوشش کی ہے، جو ملک کی نوے فیصد اکثریت کے جذبات و احساسات کا مظہر اور کسی ملزم کو عوامی غیظ و غضب سے بچانے کا ضامن ہے، جس پر مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کا اتفاق موجود ہے اور جو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں سے متفقہ طور پر منظور شدہ ہے، لہٰذا ایسے قانون کو کالا قانون قرار دینا اور اسے یکسر ختم کرنے کے اعلانات کرنا صرف عدالتی فیصلے کی ہی تذلیل نہیں بلکہ عامۃ المسلمین کے جذبات کی توہین اور مسلمانوں کے بدن سے روح محمد صلی اللہ علیہ وسلم نکال کر متاع دین و ایمان سے محروم کرنے کا سوچا سمجھا شرمناک منصوبہ ہے، جس سے ملک میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھے گی، اب رہ گئی بات عیسائی خاتون آسیہ کی سزا کی، تو یہ بات پر ریکارڈ پر موجود ہے کہ دوران تفتیش اُس نے ایس پی انویسٹی گیشن شیخوپورہ محمد امین شاہ بخاری اور مسیحی برادری کے اہم افراد

کی موجودگی میں اعتراف جرم کرتے ہوئے کہا تھا کہ اُس سے غلطی ہو گئی ہے، لہذا اُسے معاف کردیا جائے، جس کے بعد ایڈیشنل سیشن جج ننکانہ صاحب نوید اقبال نے گواہوں کے بیانات اور واقعاتی شہادتوں کو سامنے رکھتے ہوئے قانون کے مطابق کو آسیہ کو سزائے موت اور ایک لاکھ روپے جرمانے کی سزا سنائی تھی۔

قارئین محترم،اصل معاملہ یہ ہے کہ یہ قانون ایسے موذیوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، جو اپنے بیرونی آقاؤں کے اشاروں پر مقدس شخصیات خصوصاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی کرتے ہیں، بلاشبہ قانون توہین رسالت حضرات انبیاء کرام اور مقدس شخصیات کے خلاف بھونکنے والی ایسی زبانوں کو روکنے بلکہ انہیں لگام دینے کا موثر ہتھیار ہے، لہذا اِس قانون کو غیر موثر بنانے کی خاطر جان بوجھ کر ایسے موذیوں کو دریدہ دہنی پر آمادہ کیا جاتا ہے، جو اسلام، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی مقدس شخصیات کے خلاف جان بوجھ کر دریدہ دہنی کے مرتکب ہوتے ہیں، گزشتہ حالات اِس بات کے گواہ ہیں کہ اِس قسم کے واقعات میں اِن عناصر نے باقاعدہ طے شدہ منصوبے کے تحت اِس کو فساد کی شکل دی اور قتل وغارت اور جلاؤ گھراؤ کے ذریعے جنگ وجدل کا بازار گرم کیا، دنگا فساد برپا کرنے کے لئے جانبین پر حملے کرائے اور توہین رسالت کے مرتکب موذیوں اور گستاخوں کی صفوں میں گھس کر مسلمانوں کو اور مسلمانوں کی صفوں میں گھس کر اِن موذیوں کو مارا، زخمی

اور قتل کیا، بلکہ ہر دو جانب سے فائرنگ کا ڈھونگ رچا کر مسلمانوں کو ظالم اور اعدائے اسلام کو مظلوم باور کراتے ہوئے اِس کو قانون توہین رسالت کو غلط استعمال کے کھاتے میں ڈالا، اور اپنے زر خرید غلاموں کے ذریعے پر زور مطالبے اور بیان دلوائے گئے کہ چونکہ یہ سب کچھ قانون توہین رسالت کے غلط استعمال کی وجہ سے ہوا ہے، لہٰذا قانون توہین رسالت کو ختم ہونا چاہیے، دیکھا جائے تو یہ سب کچھ اُسی منظم سازش اور مہم کا حصہ ہے جس میں طے کیا جاچکا ہے کہ قانون توہین رسالت اور امتناع قادیانیت آرڈیننس ہر حال میں ختم ہونا چاہیے، چنانچہ پاکستان بھر میں جہاں جہاں عیسائی مسلم اور قادیانی مسلم فسادات کی خبریں آتی ہیں، اُس کے پیچھے دراصل یہی عنصر کارفرما ہوتا ہے۔

لہٰذا اگر خدانخواستہ قانون توہین رسالت منسوخ یا تبدیل ہوگیا تو اِس کے بعد ان اسلام دشمن قوتوں کا اصل اور نہایت ہی خطرناک حدف 7 ستمبر 1974ء کو متفقہ طور پر منظور ہونے والی وہ آئینی ترمیم ہوگی، جسے قائد ملت اسلامیہ علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کے تحرک پر پاکستان کی قومی اسمبلی اور سینٹ نے منظور کرکے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا تھا، قارئین محترم ،اوپر بیان کئے گئے حالات وواقعات، آثار وقرائن اور ملکی وبین الاقوامی لادین لابیوں، افراد، جماعتوں اور اسلام دشمن این جی اوز کے بیانات اور مطالبات سے اس اَمر کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایک باقاعدہ اور

منظم منصوبہ تشکیل دیا جاچکا ہے، جس کے تحت پاکستان اور بیرون پاکستان کے نام نہاد سیکولر زعماء بیرونی سرمائے اور اشاروں پر پاکستان کی اسلامی نظریاتی شناخت کے خلاف اِس گھناؤنے مشن میں مصروف ہیں، جس میں بطور خاص پنجاب کے گورنر سلمان تاثیر، وزیر اقلیتی امور شہباز بھٹی اور ایک خود جلاوطن لیڈر سر فہرست ہیں۔

اِس ساری صورت حال کا تکلیف دہ اور اذیت ناک پہلو یہ ہے کہ جس قوم نے انگریزی دور سے اب تک دین و مذہب اور نفاذ اسلام کے لئے اپنا تن، من اور دھن قربان کرنے کو اپنے لئے سرمایہ اعزاز و افتخار سمجھا، اعدائے اسلام، باغیانِ ملت اور موذیانِ رسول کے خلاف ہر محاذ پر چومکھی لڑائی لڑی اور جس نے لاکھوں
جانوں، عزتوں، عصمتوں اور املاک کی قربانی دے کر محض اِس لئے یہ خطہ زمین حاصل کیا کہ اِس میں نفاذ اسلام ہوگا اور وہ آزادی سے شعائر اسلامی کے مطابق اپنی زندگی بسر کر سکیں، مگر افسوس ! صد افسوس ! کہ آج وہ قوم خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے، دوسری طرف پاکستان کے دین دار طبقات اور اسمبلی میں موجود نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت و وابستگی کے دعویدار، نہ صرف گومگو کا شکار ہیں، بلکہ اِس قدر حساس مسئلے اور دین و مذہب کے بنیادی اور اساسی معاملات پر زد پڑنے کے باوجود بھی بے حس و حرکت دکھائی دے رہے ہیں، بظاہر ایسا لگتا ہے کہ وہ اِس کو ذرہ بھر کوئی اہمیت دینے یا اِس پر

کسی قسم کی ناگواری کا اظہار کرنے کے روادار نہیں ہیں، سوال یہ ہے کہ عاشقانِ رسول اور محبانِ دین ومذہب ہونے کے دعویدار کب جاگیں گے؟ کیا یہ اُس وقت کا انتظار کر رہے ہیں جب پانی سر سے گزر جائے گا اور جب سارا کھیل ختم ہو جائے گا؟ تب یہ خواب غفلت سے جاگیں گے، سڑکوں پر نکلیں گے، احتجاج کریں گے، جلسے جلوس نکالیں گے اور پھر آہستہ آہستہ حالات معمول پر آجائیں گے۔

بالکل اُسی طرح جس طرح نصابِ تعلیم میں تبدیلی اور حدود آرڈیننس کے خاتمے کے وقت ہوا تھا، لہٰذا اگر پاکستان کے غیور مسلمان چاہتے ہیں کہ توہین رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کا قانون اور امتناع قادیانیت آرڈیننس موجود رہے تو پھر اُنہیں ابھی سے پاکستان کی سالمیت، اُس کی دینی، ملی اور مذہبی شناخت کے خاتمے کے اِس بھیانک منصوبے کو ناکام بنانے کیلئے باہمی مل کر حکمرانوں اور امریکی ایجنٹوں کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بننا ہوگا اور اِس کام کیلئے تمام مکاتب فکر کے علمائے کرام وپاسبان ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا اپنا کردار ادا کرنا ہوگا، وگرنہ اِسی طرح صدر کو حاصل معافی کے مخصوص اختیار کے تحت توہین رسالت کے مجرموں کو معاف کرکے بیرون ملک بھیجنے کا سلسلہ جاری رہے گا، یاد رہے کہ جہاں توہین رسالت سے فساد پھیلتا ہے، وہیں قانون توہین رسالت پر صحیح عملدرآمد سے فساد کے تمام راستے مسدود بھی ہوتے ہیں، لہٰذا قانون توہین رسالت کو بدلنے اور ملک کے اکثریتی طبقے کے مذہبی

جذبات سے کھیلنے کے بجائے حکومت کا فرض ہے کہ وہ قوم کے جذبات و احساسات کی پاسداری کرتے ہوئے اُن کی ایمان و عقیدے کے مطابق قانون سازی، عدل و انصاف کے تقاضوں کی تکمیل اور ملکی آئین و قوانین کا بھرپور دفاع کرے، کہ یہی علامت محبت رسول اور تقاضہ ایمان ہے۔

وکی لیکس کے حمام میں۔۔۔۔

وکی لیکس پر ڈھائی لاکھ خفیہ دستاویزات کے منظر عام پر آنے کے بعد کہنے والوں نے کہا
کہ وکی لیکس کے ہاتھوں امریکی حکومت کی خفیہ دستاویزات کی اشاعت سفارت کاری کا
نائن الیون ہے، کسی نے کہا کہ یہ مسلمان ممالک کو آپس میں لڑانے کی سی آئی اے
اور یہودیوں کی سازش ہے، کسی نے کہا کہ وکی لیکس نے پاکستانی
حکمرانوں، سیاستدانوں اور مذہبی جماعتوں کے سربراہوں کو ننگا کرکے بے نقاب
کر دیا، تو کسی نے اسے جھوٹ کا پلندہ قرار دیا، اب یہ جھوٹ کا پلندہ ہے یا یہودیوں
اور سی آئی اے کی سازش یا پھر سفارت کاری کا نائن الیون، حقیقت کیا ہے جلد آشکارہ
ہو ہی جائے گی، رہی بات پاکستانی حکمرانوں، سیاستدانوں اور مذہبی جماعتوں کے
سربراہوں کو ننگا کرکے بے نقاب کرنے کی تو ہمیں اِس بات سے قطعاً اتفاق نہیں،
کیونکہ ننگا اور بے نقاب تو اُسے کیا جاتا ہے جس نے کپڑے پہنے ہوں اور جن کے قول و
فعل اور کردار و عمل سے قوم واقف نہ ہو، جبکہ ہمارے حکمرانوں، سیاستدانوں اور
مذہبی جماعتوں کے قائدین کا کردار و عمل اور قول و فعل کسی سے پوشیدہ نہیں ہے،
کرسی اقتدار تک پہنچنے کیلئے یہ کیسے کیسے جتن کرتے ہیں، کیا کیا حربے استعمال کرتے ہیں
اور کیسی کیسی اوچھی حرکتیں کرتے ہیں، وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں، سیاسی جوڑ
توڑ، وعدہ خلافیاں، بار

بار اپنے بیانات سے مکرنا اور قوم کو دھوکہ دینا اِن کا وطیرہ اور امتیازی وصف ہے، لہٰذا یہ کہنا کہ وکی لیکس نے سب کو ننگا اور بے نقاب کردیا، درست نہیں، کیونکہ ننگوں کو کوئی اور کیا ننگا کرسکتا ہے، ہاں رومان پسند طبیعتوں کو ممکن ہے اِن انکشافات سے کچھ حیرت ضرور ہوئی ہو، مگر حقیقت یہ ہے کہ سب باتیں اہل نظر کیلئے نئی نہیں ہیں، اصل معاملہ یہ ہے کہ ہماری قیادت، سیاستدان اور مذہبی وفوجی قیادت وکی لیکس کے حمام میں اصل لباسِ فطرت میں نظر آتے ہیں، سب کے سب امریکی غلامی کے بازار میں ایک لائن میں کھڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور امریکی حضور میں، سب کی جی "حضوری ایک جیسی دکھائی دیتی ہے۔"

دیکھا جائے تو وکی لیکس نے امریکہ کا منافقانہ باطن اور اصل چہرہ ہی دنیا کے سامنے ہی ظاہر نہیں کیا، بلکہ ہمارے سیاسی ومذہبی کرداروں کی منافقت اور دوغلاپن بھی پوری طرح عیاں کردیا ہے، اِس موقع پر لاہور ہائیکورٹ کے جسٹس عظمت سعید کے تبصرہ بہت ہی اہم اور ہر محب وطن پاکستانی کے دل کی آواز ہیں، جسٹس عظمت سعید نے پاکستان میں وکی لیکس کے خلاف پابندی لگانے کی درخواست ناقابل سماعت قرار دے کر خارج کرتے ہوئے فرمایا کہ" چند افراد کے کپڑے اترنے سے پوری قوم کو فائدہ ہوگا، سب کو سچ کو سامنا کرنا چاہیے، پابندی لگوا کر عوام کو کیوں اندھیرے میں رکھنا چاہتے ہیں۔" دراصل اصل

معاملہ ہی ہمارے حکمرانوں، سیاستدانوں اور مذہبی قائدین کی وکی لیکس کے آئینے میں ظاہر ہونے والی وہ شرمناک کریہہ تصویر ہے، جس کا ہر کردار آج اپنے ساتھیوں اور قوم سے شرمندگی کے باعث آنکھیں چرانے کے ساتھ وضاحتیں در وضاحتیں اور طرح طرح کی تاویلیں پیش کر رہا ہے، ایک طرف امریکی وزیر خارجہ ہلیری کلنٹن صدر زرداری کو فون کرکے رپورٹ کے باعث پاکستانی لیڈروں کو ہونیوالی شرمندگی پر افسوس کا اظہار کر رہی ہیں اور یہ یقین دلا رہی ہیں کہ مستقبل میں ایسی رپورٹس کے افشا نہ ہونے کو یقینی بنایا جائے گا، تو دوسری طرف پاکستانی لیڈرز کو امریکی سفیر بھی ملاقاتیں کرکے حوصلہ دے رہے ہیں، واضح رہے کہ امریکہ کی طرف نے وکی لیکس رپورٹس کی تردید نہیں کی گئی، بلکہ انکے افشا ہونے پر معذرت کی گئی ہے، یہ طرز عمل اِس بات کا عکاس ہے کہ یہ رپورٹس درست اور مبنی بر حقائق ہیں، جہاں وکی لیکس رپورٹ بعض اہم شخصیات کی بدنامی کا باعث بنی ہیں، وہیں اِس میں کچھ ایسے پہلو بھی سامنے آئے ہیں، جنہیں کسی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، مثال کے طور پر امریکی ایلچی رچرڈ ہالبروک کا بھارتی سیکرٹری خارجہ کو ایک بریفنگ کے دوران یہ کہنا کہ امریکہ افغانستان میں بھارتی منصوبوں کا حامی ہے، امریکہ کی منافقانہ پالیسی کا عکاس اور پاکستان کیلئے لمحہ فکریہ ہے۔

وہیں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ بھارت نے بلوچ علیحدگی پسندوں کی تربیت

کیلئے 9 تربیتی کیمپ قائم کر رکھے ہیں، جس کیلئے روس اور متحدہ عرب امارات مدد کر رہے ہیں، پاکستان کے حوالے سے یہ انکشافات بہت ہی اہم ہیں، وکی لیکس پر موجود تقریباً ڈھائی لاکھ خفیہ امریکی دستاویزات میں 4800 دستاویزات صرف پاکستان سے متعلق ہیں، یہ وہ مراسلات ہیں جو امریکی سفارت کار اپنی ملاقاتوں، سرگرمیوں اور رونما ہونے والے واقعات کے بارے میں اپنی حکومت کو ارسال کرتے رہتے ہیں، ان رپورٹس میں صدر زرداری، وزیراعظم گیلانی، میاں نواز شریف، جنرل کیانی، جنرل شجاع پاشا، چوہدری شجاعت حسین، مولانا فضل الرحمٰن اور دیگر بہت سے سیاسی اور غیر سیاسی کرداروں کے بارے میں انکشافات کئے گئے ہیں، ملکی مفادات کے حوالے سے دیکھا جائے تو جنرل کیانی اور نواز شریف کے سوا ہر چھوٹا بڑا کردار "اِن دی لائن آف فائر" ہے، سب سے زیادہ ملبہ صدر پاکستان پر گرا ہے، جن کی ذات کو وکی لیکس کے مطابق شاہ عبداللہ نے پاکستان کی ترقی میں رکاوٹ قرار دیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ جب سر ہی گلا سڑا ہو تو اثر سارے جسم پر پڑتا ہے، ولی عہد ابو ظہبی نے زرداری کو بدعنوان اور نواز شریف کو خطرناک قرار دیا، برطانیہ نے امریکہ کو بتایا کہ زرداری فہم و فراست سے عاری ہیں، زرداری صاحب کے بارے میں رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ انکی پارٹی کو اقتدار ملا تو شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ وہ امریکہ کی وجہ سے اقتدار میں آئے، امریکہ کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے، اسی رپورٹ میں رحمان ملک کے حوالے سے ڈی جی آئی ایس آئی جنرل پاشا کو سازشی

قرار دیا گیا،ایک تازہ ترین انکشاف کے مطابق سابق امریکی سفیر این ڈبلیو پیٹرسن نے
جنوری 2008ء میں مسلم لیگ (ن) کے سربراہ میاں نواز شریف سے ملاقات کے
دوران چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چودھری کی بحالی کی مخالفت کی تھی،امریکی
سفیر کا موقف تھا کہ کچھ معزول جج بحال ہو سکتے ہیں لیکن چیف جسٹس بحال نہیں ہو سکتے
۔

وکی لیکس کی طرف سے جاریکردہ خفیہ دستاویزات کی تفصیلات میں یہ دعویٰ بھی کیا گیا
ہے کہ آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی نے ملک میں سیاسی بحران حل کرنے کیلئے
صدر آصف زرداری کو عہدے سے ہٹانے اور جلاوطن کرنے پر غور کیا تھا،اس سلسلہ
میں سابق امریکی سفیر این ڈبلیو پیٹرسن کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ جنرل کیانی صدر
زرداری کو جتنا ناپسند کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ انہیں نواز شریف کے بارے میں
بداعتمادی ہے،ان خفیہ دستاویزات کے مطابق معزول ججوں کی بحالی کیلئے میاں
نواز شریف کی تحریک کے دوران جنرل کیانی نے امریکی سفیر سے مسلسل چار ملاقاتیں
کیں اور اشارہ دیا کہ اگر صورتحال مزید خراب ہوئی تو انہیں مجبوراً صدر زرداری کو
مستعفی ہونے پر قائل کرنا پڑیگا،انہوں نے صدر زرداری کی جگہ اے این پی کے سربراہ
اسفندیار ولی کو صدر کے منصب پر فائز کرنے اور سید یوسف رضا گیلانی کو بطور
وزیراعظم برقرار رکھنے کا عندیہ بھی دیا تھا،جبکہ جے یو آئی کے سربراہ مولانا فضل
الرحمٰن نے نومبر 2007ء میں

امریکی سفیر کو اپنے عشائیہ میں مدعو کرکے اُن پر زور دیا تھا کہ امریکہ انہیں وزیراعظم بننے کیلئے مدد دے۔ وکی لیکس کے انکشافات کے مطابق پاکستانی فوج نے کمانڈ الیون کور کے لیفٹیننٹ جنرل مسعود اسلم کی درخواست پر امریکی خصوصی فورسز کی تعیناتی کی منظوری دی تھی جبکہ 2008ء میں وزیر داخلہ رحمان ملک نے ایک اجلاس میں باجوڑ آپریشن کی تکمیل تک ڈرون حملے روکنے کی تجویز پیش کی، جس پر وزیراعظم گیلانی نے اٹل انداز میں جواب دیا کہ "یہ حملے جاری رہتے ہیں تو بھی مجھے کوئی پرواہ نہیں، ہم قومی اسمبلی میں احتجاج کرینگے اور پھر اسے نظرانداز کردینگے۔ ہمارے وزیراعظم امریکی سفیر سے کہتے ہیں کہ ہم اس کے خلاف اپنی پارلیمنٹ سے نمائشی قرارداد پاس کروا کر خاموش ہوجائیں گے اور آپ لوگ کرتے رہیں جو کرنا ہے۔ ہمارے صدر مملکت سی آئی اے کے ایک معمولی اہلکار کو ڈرون حملوں پر شاباش دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ Collateral Damage کی ہمیں کوئی پروا نہیں۔ حکومتی حکام کے یہ رسمی ردعمل وکی لیکس کے انکشافات کی تصدیق کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، جبکہ خود امریکی حکام بھی یہی دعویٰ کرتے ہیں کہ ڈرون حملے پاکستانی سرزمین سے حکومت پاکستان کی منظوری سے ہورہے ہیں۔ ہاں پاکستان سے متعلق ایک حوصلہ افزا رپورٹ یہ ہے کہ پاکستان نے 2007ء میں جوہری ایندھن میں کمی اور افزودہ یورینیم امریکا کو دینے اور 2009ء میں امریکا کو ایٹمی تنصیبات کے معائنے کی اجازت دینے سے انکار کردیا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو، ضیاالحق، بے نظیر بھٹو، نواز شریف حتیٰ کہ پرویز مشرف

بھی امریکی خواہشات کے برخلاف پاکستان کے ایٹمی اور میزائل پروگرام پر کسی سمجھوتے کے لیے تیار نہیں ہوئے، وکی لیکس کے مطابق ان تنصیبات کے معائنے کی اجازت تو آصف زرداری صاحب نے بھی نہیں دی، یقیناً یہ بات قوم کیلئے اطمینان کا باعث ہے۔

وکی لیکس کے انکشافات میں جس طرح پاکستان کے ایٹمی پروگرام اور مبینہ دہشت گردی کے خاتمہ کی جنگ میں امریکی ڈرون حملوں کی اجازت سمیت ہمارے حکمرانوں کی تابعداری کو فوکس کیا گیا ہے اور ہماری عزت مآب سیاسی حکومتی شخصیات کی حرص و ہوس کو بے نقاب کیا گیا ہے، اُس پر پوری قوم سخت تشویش میں مبتلا ہے، قوم کو بجا طور پر یہ فکر لاحق ہے کہ اپنے اقتدار کے تحفظ یا اپنے اقتدار کی خاطر اکی نمائندہ سیاسی شخصیات امریکی تابعداری کی جس انتہا تک پہنچتی رہی ہیں، اُن سے ملکی اور قومی مفادات کے تحفظ کی کیسے توقع کی جاسکتی ہے، کیا ایک غیرت مند، آزاد، خودمختار اور ایٹمی قوت کے حامل پاکستان کی قیادت کیلئے یہ ڈوب مرنے کا مقام نہیں۔؟ وکی لیکس میں پاکستان سے متعلق جو حقائق سامنے آئے ہیں، ان میں پاکستان سے متعلق کوئی نئی بات نہیں، پاکستانی سیاست و سکیورٹی سے دلچسپی رکھنے والے ہر فرد کو علم تھا کہ موجودہ سیاسی سیٹ اپ کی بساط امریکہ نے بچھائی تھی، یہ حقیقت سب اہل صحافت و سیاست پر عیاں تھی کہ آصف علی زرداری ملکی اسٹیبلشمنٹ کو اچھے لگتے ہیں اور

نہ اسے میاں نواز شریف عزیز ہیں، یہ راز بھی اب کوئی راز نہیں ہے کہ آصف علی
زرداری اور میاں نواز شریف یکساں طور پر عسکری قیادت کے بارے میں شاکی
ہیں، کون نہیں جانتا کہ سابق صدر پرویز مشرف نے عسکری قیادت کی ضمانت کے بعد
صدارت سے استعفیٰ دیا اور اسی ضمانت کے تحت ان کو بحفاظت باہر جانے دیا گیا، ہر
ایک کے لئے قابل قبول بن جانے کی مولانا فضل الرحمٰن کی آرزو اور نئے مسلم لیگ
ق) بننے کے لئے اے این پی کی خواہش کس سے مخفی تھی؟ کس باخبر پاکستانی کو خبر نہ)
تھی پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے سرخیل اپنے ہر بڑے قدم کے لئے واشنگٹن کی آشیرباد
ضروری سمجھتے ہیں اور یہ کہ پاکستانی سیاستدانوں کی اکثریت اپنے گندے کپڑے امریکی
سفارتخانے میں جاکر دھوتے رہتے ہیں؟ موجودہ سیاسی بساط اور زرداری صاحب کا
اقتدار امریکی کوششوں کی مرہون منت ہے یا پھر یہ کہ سعودی بادشاہ ، پاکستانی
صدر سے ناراض اور باقی دنیا کے حکمران مایوس ہیں، وکی لیکس کی ان رپورٹس کے
عیاں ہونے سے وہ باتیں جو مختلف سفارتخانوں میں، اخبارات اور ٹی وی چینلز کے دفاتر
اور مخصوص ڈرائنگ روموں میں کی جاتی تھیں اب اخبارات کے صفحات، ٹی وی ٹاک
شوز اور گلی کوچوں تک نکل آئیں ہیں، محب وطن حلقے اور کالم نویس عرصے سے دہائی
دے رہے ہیں کہ امریکہ پاکستان کے ساتھ منافقت سے کام لے رہا ہے، وہ ایک عرصے
سے متنبہ کررہے ہیں کہ منافقت فرد کرے یا قوم ، وقتی فائدہ تو ہوتا ہے لیکن انجام
بھیانک اور عبرتناک سزا کی صورت میں ہی سامنے آتا ہے، آج وکی لیکس کے انکشافات
نے یہ

ثابت کردیا کہ پاک امریکہ تعلقات جھوٹ، منافقت اور دوغلے پن پر مبنی ہیں جو نصف صدی پر محیط ہیں۔

دیکھا جائے تو وکی لیکس کے یہ انکشافات بلاشبہ ہمارے لئے اذیت، نقصان اور شرمناک ذلت کا باعث ہیں،ان انکشافات سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ افغان مسئلہ پر امریکہ کا ساتھ دینے اور افغانستان سے پاکستان میں داخل ہونے والے دہشت گردوں اور تخریب کاروں کے علاوہ ڈرون حملوں میں سینکڑوں،ہزاروں بے گناہ پاکستانیوں کی ہلاکت اور وزیرستان، سوات، مالاکنڈ اور بعض دوسرے علاقوں میں آپریشن کے دوران سینکڑوں فوجی افسران اور اہلکاروں کی ہلاکت کے باوجود امریکی قیادت ہم سے مخلص نہیں ،اِن حالات میں پاکستانی عوام پاکستانی حکمرانوں اور سیاستدانوں کے کردار سے نہ صرف مطمئن نہیں بلکہ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ یہ سیاستدان جن کے ہاتھ میں قوم کی باگ ڈور ہے، قوم کا بیڑا پار لگاسکیں گے بھی یا نہیں؟ دوسری جانب پاک امریکہ تعلقات کی تاریخ ظاہر کرتی ہے کہ امریکہ پاکستان کا دلی طور پر خیر خواہ نہیں،اسے صرف اور صرف اپنے مفادات عزیز ہیں اور اس کے لئے وہ ہمارے بدترین دشمن سے بھی ہاتھ ملا سکتا ہے، لیکن اس تلخ حقیقت سے آشنا ہونے کے باوجود ہمارے سیاستدانوں کی اکثریت آج بھی امریکہ کے سامنے سجدہ ریز ہے،اگر ہم نے ان زمینی حقائق کا ادراک کرنے،اپنے مفادات کا تحفظ کرنے،اپنی آزادی، سلامتی اور خود مختاری کو

یقینی بنانے کے لئے بلاتاخیر کوئی مثبت قدم نہ اٹھایا اور نام نہاد دوستوں کے چہروں کو پہچاننے میں سستی کی، تو وہ دن دور نہیں جب تباہی و بربادی ہمارا مقدر ہوگی، الہذا آج ضرورت اس اَمر کی ہے کہ ماضی کی کوتاہیوں کا ازالہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو بچانے کی فکر کی جائے اور ماضی کے تلخ تجربات کی روشنی میں حالات و واقعات کا جائزہ لے کر یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ امریکہ کی طرف سے پاکستان کے ساتھ دوستی کے دعوؤں کی حقیقت کیا ہے؟اور کون ہمارا دوست ہے اور کون ہمارا دشمن؟ صرف اس طرح پاکستان کے 17 کروڑ عوام ماضی کی غلطیوں اور کوتاہیوں کا ازالہ کرکے اپنی آزادی سلامتی اور خود مختاری کا تحفظ کر سکتے ہیں،امر واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کی سیاست کا جوہڑ امریکی صیہونی استعمار نے اس حد تک آلودہ کر دیا ہے کہ اب پاکستانی قوم کی قسمت کے فیصلے واشنگٹن، نیویارک یا پھر اسلام آباد کے امریکی سفارت خانے میں کئے جاتے ہیں، یہ ایوان صدر، ایوان وزیر اعظم، پارلیمنٹ، سینٹ اور ان میں بسنے والی مخلوق بظاہر تو بڑی طرم خان بنی نظر آتی ہے، درحقیقت یہ وہ روبوٹ ہیں جو صرف امریکی فیصلوں کے سامنے ہاں میں سرہلانے والے ہیں اور جن کے کنٹرول بٹن امریکیوں کے ہاتھوں میں ہیں، سچی بات یہ ہے کہ سیاسی و مذہبی اور عسکری قیادت کے بارے میں وکی لیکس نے جو انکشافات کیے ہیں انہیں پڑھ کر ہم سمیت ہر درد مند دل رکھنے والے پاکستانی کا سر شرم سے جھک گیا ہے، پرویز مشرف سے ذلتوں اور رسوائیوں کا شروع ہونے والا سفر نہ صرف آج بھی جاری ہے بلکہ ہماری موجودہ

قیادت نے تو پستیوں کی اِن کھائیوں کو مزید گہرا کر دیا ہے،ان حالات میں آخر پاکستان
کے عوام اعتماد کریں تو کریں کس پر۔؟

قائداعظم محمد علی جناح، میرے قائد

قائد اعظم کے یوم پیدائش کے حوالے سے خصوصی تحریر

"جس روز قائد اعظم نے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کیا، میں اُس روز کراچی میں تھا۔افتتاحی تقریب کے بعد اُن کی واپسی سے کچھ پہلے میں وائی۔ایم ۔اے بلڈنگ کے پیچھے جاکر ایوان صدر کے بڑے گیٹ کے سامنے کھڑا ہوگیا۔اُس جگہ بھیڑ نہیں تھی، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میرے قریب ایک شخص بھی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد دور سے قائد اعظم کی کھلی گاڑی آتی دکھائی دی۔آہستہ آہستہ یہ گاڑی عین میرے سامنے آگئی، میں نے اپنے قائد کو جی بھر کے دیکھا۔ سفید شیروانی اور اپنی مخصوص ٹوپی پہنے وہ بالکل سیدھے بیٹھے تھے۔اُن کے ساتھ اُن کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح تھیں۔

گاڑی ابھی صدر دروازے کی طرف مڑنے ہی والی تھی کہ قائد اعظم نے آہستہ سے اپنی گردن بائیں طرف گھمائی اور اُن کی نظریں سیدھی میرے چہرے پر پڑیں، بے ساختگی میں میرا داہنا ہاتھ ماتھے کی طرف اٹھا....اور....پھر....اور ....پھر....وہ وہیں جم کر رہ گیا....یااللہ....! میرے ہاتھ کے ساتھ ہی

میرے قائد کا ہاتھ بھی ماتھے کی طرف اٹھا، میرے قائد نے میرے سلام کا جواب دیا.... میرے قائد نے ایک واحد ہاتھ کا سلام قبول کیا.... میرے قائد نے ایک گمنام شخص کا سلام قبول کیا.... میرا قائد اسلامی روایات کا پابند ہے .... میرا قائد مکمل مسلمان ہے۔"

قائد اعظم محمد علی جناح کے بارے سید اشفاق نقوی کے یہ جذبات مسلمانان برصغیر کی دلی کیفیت کے آئینہ دار ہیں، رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں کہ "قائد اعظم کے ساتھ سب سے بڑی بے انصافی یہ ہوتی چلی آرہی ہے کہ اُن پر لکھنے والوں میں سے کسی نے بھی آپ کو مومنانہ صفات، مذہبی جذبات، دینی تاثرات، اسلامی رجحانات کے آئینہ میں پیش نہیں کیا، جیسے دین و مذہب سے آپ کا کوئی واسطہ ہی نہ ہو، حالانکہ آپ کا ہر ارشاد، ہر بیان، ہر تقریر اسلام کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوتی تھی، گو آپ منافقین کی طرح اسلام،اسلام کی رٹ نہیں لگاتے تھے، بلکہ اٹھتے بیٹھتے اسلام ہی کو اپنے مخصوص رنگ اور عصری تقاضوں کے مطابق پیش کرتے تھے، اگر آپ کی ہر تقریر اور ارشاد کا دیانت دارانہ جائزہ لیا جائے تو وہ اسلام کی کسوٹی پر پورا اترے گا۔"

آج قائد اعظم محمد جناح کے یوم پیدائش کے موقع پر ہم ان کی زندگی کے وہ چند واقعات آپ کے سامنے پیش کررہے ہیں جو قائد کی زندگی کے دینی، مذہبی اور

اسلامی پہلوؤں کو بھرپور طریقے سے اجاگر کرتے ہیں، اگرچہ قائد اعظم بظاہر معنوی اعتبار سے مذہبی رہنما نہیں تھے لیکن یہ واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ بر صغیر کے مسلمانوں کو ایک آزاد وطن کی منزل سے روشناس کرنے والے قائد کا خدا، رسول اور اپنے دین و مذہب پر کتنا کامل یقین تھا اور وہ کتنے پختہ اصولوں کے مالک تھے، شاید اسی وجہ سے جناب مجید نظامی نے کہا کہ "اُن کی شخصیت کا خمیر سنہرے اصولوں کی روشن مٹی سے اٹھا تھا اور ان کی پوری زندگی ایک زندہ کرامت تھی۔"

خواجہ اشرف احمد بیان کرتے ہیں کہ "3 مارچ 1941ء کو لاہور ریلوے اسٹیشن کے سامنے آسٹریلیا مسجد میں نماز عصر ادا کرنا تھی، جب قائد تشریف لائے تو مرزا عبدالحمید تقریر کر رہے تھے، مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، قائد موٹر کار سے برآمد ہوئے تو انہوں نے اچکن، چوڑی دار پاجامہ اور بٹلر شوز پہن رکھے تھے، اُن کی آمد پر لوگوں میں ہلچل پیدا ہوئی، لیکن وہ فوراً سنبھل گئے کہ قائد اعظم نظم و ضبط کے انسان تھے، وہ مسجد کے بغلی دروازے میں داخل ہوئے، اگلی صف تک راستہ بن گیا، لیکن قائد نے یہ کہتے ہوئے اگلی صف میں جانے سے انکار کر دیا "میں آخر میں آیا ہوں اسلئے یہیں بیٹھوں گا" سیاست میں آگے جانے والا خانہ خدا میں سب سے پیچھے بیٹھا، نماز سے فارغ ہونے کے پر قائد نے جو کام فوراً کیا وہ یہ کہ اپنے جوتے اٹھا لیے، ہر کسی کی خواہش تھی کہ وہ قائد کے

جوتے اٹھانے کی سعادت حاصل کرے، لیکن ہر کسی کی حسرت ہی رہی، لوگ بعد میں اُن کے ہاتھ سے جوتے چھیننے کی کوشش ہی کرتے رہے، لیکن قائد کی گرفت آہنی تھی، وہ ہجوم میں اپنی ریشمی جرابوں سمیت کوئی تیس قدم بغیر جوتوں کے چلے اور اصرار اور کوشش کے باوجود کسی شخص کو اپنا جوتا نہیں پکڑایا۔

جناب مختار زمن کہتے ہیں کہ " میرے والد آگرہ میں جج تھے،انہوں نے بتایا کہ ایک دفعہ قائداعظم کسی کیس کے سلسلے میں آگرہ تشریف لائے،اس موقع پر مسلم لیگ نے جلسہ کرنا چاہا، لیکن قائداعظم نے اس میں شرکت سے انکار کردیا اور کہا، میں اپنے موکل کی طرف سے پیش ہونے آیا ہوں، جس کی وہ فیس ادا کرچکا ہے، میں خیانت کیسے کروں،آپ جلسہ کرنا چاہتے ہیں تو بعد میں بلالیں ، میں اپنے خرچ پر آؤنگا۔ "نواب صدیق علی خان کہتے ہیں کہ "جارج ششم شاہ انگلستان کے زمانے میں ہندوستان کیلئے مزید اصلاحات کے سلسلے میں قائداعظم لندن تشریف لے گئے،مذاکرات جاری تھے کہ قصر بکنگھم سے ظہرانے کی دعوت موصول ہوئی،اُس زمانے میں قصر بکنگھم کی دعوت ایک اعزاز ہی نہیں بلکہ یادگار موقع ہوتا تھا لیکن قائداعظم نے یہ کہہ کر اس دعوت میں شرکت کرنے سے معذرت کرلی کہ "آجکل رمضان المبارک کا مقدس مہینہ ہے اور اس میں مسلمان روزے رکھتے ہیں۔"

تحریک پاکستان کے آخری مرحلے میں قائداعظم نے مسلم عوام سے چاندی کی گولیوں کی اپیل کی،اس پر عام مسلمان مردوں ہی نے نہیں عورتوں نے بھی لبیک کہا اور اپنا زیور تک لیگ فنڈ میں دینا شروع کردیا، لیکن قائداعظم نے اس چندے کو قبول نہیں کیا،ایک روز بیگم شائستہ اکرام اللہ نے قائداعظم سے پوچھا، سر یہ مسلمان خانہ دار عورتیں اتنے شوق سے اپنے ہاتھوں کے کنگن اور بالیاں اتار اتار کر مسلم لیگ کو دیتی ہیں اور آپ انہیں قبول نہیں کرتے، واپس کردیتے ہیں، عجیب سا لگتا ہے،کیا یہ ایک قابل قدر جذبے کی توہین نہیں ہے، قائداعظم نے کہا نہیں یہ بات نہیں، کوئی اور لیڈر ہو تو شاید اسے اپنی بڑی کامیابی سمجھے، لیکن میں سیاست میں جذباتیت کو پسند نہیں کرتا،ان خواتین کو چاہیے کہ وہ زیورات کا عطیہ کرنے سے پہلے اپنے اپنے شوہروں سے پوچھیں،اُن سے اجازت لیں اور پھر دیں۔"

دہلی مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا جلسہ امپیریل ہوٹل میں ہورہا تھا،خاکساروں نے گڑبڑ کی،سارا ہنگامہ قائداعظم کے خلاف تھا،لیکن سارے ہنگامے میں جو شخص سب سے پرسکون رہا،وہ خود قائداعظم تھے،جب میٹنگ انتشار کا شکار ہوکر ختم ہوگئی تو وہ بڑے اطمینان سے تنہا باہر جانے لگے،یہ دیکھ کر پیر آف مانکی شریف نے آپ سے کہا،آپ اس طرح باہر نہ جایئے ، کہیں آپ کو کچھ نہ ہوجائے،ہم آپ کے ساتھ چلتے ہیں، قائد اعظم نے کہا نہیں،اس کی ضرورت نہیں اور آسمان کی طرف

انگلی اٹھاتے ہوئے کہا، کیا وہ (خدا) وہاں نہیں ؟۔
اسی طرح 1946ء میں جب قائد اعظم شملہ تشریف لے گئے تو بعض لیگی کارکنوں نے
محسوس کیا کہ قائد اعظم کیلئے خصوصی حفاظتی اقدامات کی ضرورت ہے،ایک کارکن نے
آپ سے کہا جناب ہمیں معلوم ہے کہ دشمن آپ کی جان کے درپے ہیں،اسلیئے اجازت
دیجئے کہ ضروری حفاظتی اقدامات کئے جائیں، جس پر قائد اعظم نے فرمایا مجھے اللہ کی
ذات پر بھروسہ ہے،خدا ہی سب سے بڑا محافظ اور چارہ ساز ہے،آپ فکر مند نہ ہوں۔
اپریل 1945ء میں قائد اعظم خان آف قلات کی دعوت پر بلوچستان تشریف لے گئے
اس موقع پر خان آف قلات نے ان سے بچوں کے ایک اسکول کے معائنہ کی درخواست
کی، قائد اعظم ننھے منے بچوں سے مل کر بہت خوش ہوئے اور اُن سے گھل مل گئے،
قائد اعظم نے ایک بچے سے خان آف قلات کی جانب اشارہ کرکے پوچھا یہ کون
ہیں،بچے نے جواب دیا یہ ہمارے بادشاہ ہیں، قائد اعظم نے بچے سے پوچھا،میں کون
ہوں، بچہ بولا،آپ ہمارے بادشاہ کے مہمان ہیں، قائد نے پھر بچے سے پوچھا، تم کون
ہو، بچہ بولا، میں بلوچ ہوں، قائد اعظم نے خان آف قلات سے کہا،اب آپ ان کو پہلا
سبق یہ پڑھایئے کہ میں مسلمان ہوں اور بچوں سے مخاطب ہوکر ارشاد
فرمایا، بچوں.... ! تم پہلے مسلمان ہو، پھر بلوچ یا کچھ اور ہو۔

پاکستان کے سابق ائیر فورس کے فضائی جنرل جناب یحییٰ بختیار نے ایک موقع پر جب قائداعظم کوئٹہ میں قیام پذیر تھے، ان کی کچھ ایسی تصویریں دکھائیں جو انہوں نے کھینچی تھیں، قائداعظم نے اُن سے اپنی مزید تصویریں کھینچنے کی فرمائش کی، یحییٰ بختیار نے عذر پیش کیا، لیکن قائداعظم نے اُن کا عذر مسترد کر دیا، دوسرے دن جناب یحییٰ بختیار اپنا کیمرہ اور فلیش لے کر قائداعظم کی رہائش گاہ پہنچے، اُس وقت قائداعظم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر مشتمل ایک کتاب جس کا ٹائیٹل "الحدیث" تھا مطالعہ فرما رہے تھے، یحییٰ بختیار چاہتے تھے کہ وہ قائداعظم کی تصویر ایسے زاویہ سے لیں کہ کتاب کا ٹائیٹل بھی فوکس میں آسکے، لیکن قائداعظم نے تصویر کھنچوانے سے پہلے کتاب علیحدہ رکھدی اور یحییٰ بختیار سے فرمایا "میں ایک مقدس کتاب کو اس قسم کی پبلسٹی کا موضوع بنانا پسند نہیں کرتا۔"

قائداعظم کے معالج ٹی بی اسپیشلسٹ ڈاکٹر ریاض علی شاہ لکھتے ہیں کہ "ایک بار دوا کے اثرات دیکھنے کیلئے ہم ان کے پاس بیٹھے تھے، میں نے دیکھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں، لیکن ہم نے اُن کو بات چیت سے منع کر رکھا تھا، اسلیئے الفاظ لبوں پر آ کر رک جاتے تھے، اسی ذہنی کشمکش سے نجات دلانے کیلئے ہم نے خود انہیں بولنے کی دعوت دی، تو وہ بولے، "تم جانتے ہو، جب مجھے یہ احساس ہوتا

ہے کہ پاکستان بن چکا ہے تو میری روح کو کس قدر اطمینان ہوتا ہے، یہ مشکل کام تھا
اور میں اکیلا اسے کبھی نہیں کرسکتا تھا، میرا ایمان ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کا روحانی فیض ہے کہ پاکستان وجود میں آیا،اب یہ پاکستانیوں کا فرض ہے کہ وہ
اسے خلافت راشدہ کا نمونہ بنائیں،تاکہ خدا اپنا وعدہ پورا کرے اور مسلمانوں کو زمین کی
بادشاہت دے، پاکستان میں سب کچھ ہے،اس کی پہاڑیوں ،ریگستانوں اور میدانوں میں
نباتات بھی ہیں اور معدنیات بھی،انہیں تسخیر کرنا پاکستانی قوم کا فرض ہے، قومیں نیک
نیتی، دیانت داری،اچھے اعمال اور نظم و ضبط سے بنتی ہیں اور اخلاقی
برائیوں، منافقت،زر پرستی اور خود پسندی سے تباہ ہوجاتی ہیں۔"

یہ کس کی یاد میں سب سوگوار بیٹھے ہیں

محترمہ بے نظیر بھٹو کی تیسری برسی کے موقع پر خصوصی تحریر
آج دختر مشرق شہید جمہوریت محترمہ بے نظیر بھٹو کو اپنی قوم سے جدا ہوئے تین سال بیت گئے، اس موقع پر ہمیں 27 دسمبر 2007ء کو راولپنڈی کے تاریخی لیاقت باغ میں محترمہ بے نظیر بھٹو کی تقریر کے وہ الفاظ یاد آرہے ہیں، جس میں محترمہ جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں "آپ کا اور میرا ملک خطرے میں ہے، سوہنی دھرتی مجھے پکار رہی ہے، ہم دہشت گردوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالیں گے، قبائلی علاقوں میں پاکستان کا پرچم ہمیشہ لہراتا رہے گا، پاکستان کیلئے میرے والد کو شہید کر دیا گیا..... میرے دو جوان بھائی مار دیئے گئے، شوہر کو طویل عرصے تک جیل میں رکھا گیا، مجھے پارٹی کی قیادت کے ساتھ ختم کرنے کی کوشش کی گئی، میری ماں کو سڑکوں پر لاٹھیاں ماری گئیں، مجھے جیل میں رکھا گیا، لیکن ہم موت سے نہیں ڈرتے، ہم عوام کی طاقت سے انتہا پسندوں کو شکست دیں گے۔"
راولپنڈی کے جلسہ عام میں محترمہ بے نظیر بھٹو دراصل اپنے اُس عہد کی تجدید

اور اُس وعدے کا اعادہ کر رہی تھیں جو انہوں نے اپنی 24 ویں سالگرہ پر اور جیل میں آخری ملاقات کے موقع پر اپنے والد قائد عوام شہید ذوالفقار علی بھٹو سے کیا تھا، جس کا اظہار محترمہ اپنی کتاب دختر مشرق میں کرتے ہوئے لکھتی ہیں "میں آکسفورڈ اور اپنے متعدد دوستوں سے الوداع پر رنجیدہ تھی.... لیکن میں پاکستان میں نئے منتظر امکانات کے سلسلے میں بھی بہت پر جوش تھی، میرے والد بھی میری آمد کے اتنا ہی منتظر تھے جتنا میں گھر واپس جانے کیلئے بے تاب تھی، انہوں نے مجھے خط میں لکھا تھا "میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں پاکستان میں تمہاری ذہنی ہم آہنگی کیلئے اپنی بھرپور کوشش کرونگا، تاکہ تمہارا مستقبل جلد ہی خوشگوار ہو جائے، اِس کے بعد تمہیں اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہونا ہے، البتہ میرے مزاج کے طنزیہ تیروں کو تمہیں برداشت کرنا ہوگا، بدقسمتی سے میں اب اِس عمر میں اپنے مزاج کو تبدیل نہیں کرسکتا، اگرچہ میں اپنی پہلوٹی بیٹی کیلئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں، مشکل یہ ہے کہ تم زود رنج مزاج رکھتی ہو، اور تمہاری آنکھوں سے فوراً ہی ٹپ ٹپ آنسو گرنا شروع ہو جاتے ہیں، جیسے میری اپنی آنکھوں سے بھی، اِس کی وجہ یہ ہے کہ ہم دونوں ایک ہی گوشت پوست کے بنے ہوئے ہیں، آؤ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کا معاہدہ کرلیں، تم ایک متحرک طبیعت کی مالک ہو، ایک متحرک انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ صحرا کو حدت کے بغیر اور پہاڑوں کو برف کے بغیر دیکھنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا، تم اپنی دھوپ کی چمک اور اپنی قوس وقزح اپنی باطنی اقدار

اور اخلاقیات میں تلاش کرو گی، اور یہیں تمہیں کاملیت کا حصول ممکن ہوگا، ہم دونوں قابل تعریف کامیابیوں کیلئے مشترکہ طور پر جدوجہد کریں گے، کیا تم شرط لگاتی ہو کہ ہم اِس میں سرخرو ہو جائیں گے۔"

یہ عجیب اتفاق ہے کہ زندگی میں قابل تعریف کامیابیوں کے حصول اور اِس میں سرخروئی کیلئے اپنی بیٹی محترمہ بے نظیر بھٹو سے شرط لگانے والا عظیم باپ ذوالفقار علی بھٹو دونوں ہی اپنی اپنی جگہ نہ صرف کامیاب و کامران ہوئے بلکہ دونوں پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اَمر بھی ہو گئے، بھٹو خاندان سندھ کی سیاست میں ایک قدیم خاندان ہے جو ہمیشہ سے سندھ کی سیاست میں متحرک اور فعال رہا ہے اور جس نے نہ صرف سندھ بلکہ پاکستان کی سیاست میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں ہیں، اِس خاندان کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اِس کے سپوت کئی بار پاکستان کے اعلیٰ ترین منصب وزارت عظمیٰ پر فائز ہوئے، ذوالفقار علی بھٹو کے والد سر شاہنواز بھٹو 1934ء میں ممبئی کابینہ میں وزیر بلدیات بننے سے لے کر ریاست جوناگڑھ کی وزارت عظمیٰ تک مختلف منصب پر فائز رہے، اُن کے بیٹے ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی سیاست کا آغاز ایوب خان کے دور میں کیا اور بالآخر وہ پاکستان کے وزیر اعظم بنے، آمر وقت کے ہاتھوں شہید ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد اُن کی پیاری بیٹی "پنکی" محترمہ بے نظیر بھٹو پاکستان کی سیاسی بساط پر ایک قدآور شخصیت کے

روپ میں نمودار ہوئیں اور انہوں نے اپنے والد کے مشن کو اپنی زندگی کے آخری لمحے تک آگے بڑھایا۔

ذوالفقار علی بھٹو اپنی بیٹی کی صلاحیتوں سے پوری طرح واقف تھے،اسی وجہ سے انہوں نے 1977ء میں عدالت میں اپنی آئینی پیٹشن داخل کرتے وقت جنرل محمد ضیاء الحق کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "پاکستان کے کسی بھی حلقے سے میری بیٹی بے نظیر کے مقابلے میں الیکشن لڑ کر دیکھ لو، میں لکھ کر دے سکتا ہوں کہ وہ صرف تمہیں شکست دے گی بلکہ تمہاری ضمانت بھی ضبط کرا دے گی،آؤ اور میرے اِس چیلنج کو قبول کرو، تم ایک مومن ہو اور میں ایک مجرم ،پھر مجرم کی بیٹی سے کیوں ڈرتے ہو"لیکن جنرل ضیاء الحق سے لے کر جنرل پرویز مشرف تک کسی آمر وقت کو یہ جرات نہیں ہوئی کہ وہ بھٹو کے اس چیلنج کو قبول کرکے محترمہ بے نظیر بھٹو کے مقابلے میں الیکشن لڑتا، بھٹو کو اپنے بیٹوں سے زیادہ اپنی بیٹی پر اعتماد تھا،وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اُن کی بیٹی بلند حوصلہ ،نڈر اور بہادر ہے اور کبھی ہمت نہیں ہارتی ہے،اسی وجہ سے انہوں نے اپنے بیٹوں کے مقابلے میں اپنی بیٹی کو اپنا سیاسی وارث بنانے کا فیصلہ کیا،جب 4اپریل 1979ء کو ایک فوجی آمر نے اپنی اَنا کی تسکین کی خاطر "پنکی "کے باپ قائد عوام، فخر ایشیاء اور ایک ہارے ہوئے ملک کو نئی زندگی دینے والے دنیا کے عظیم لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کی زندگی پر شب خون مار کر اُن کی زندگی کا

خاتمہ کر دیا، بظاہر بھٹو مر گیا، شہید ہو گیا، لیکن اِس شہادت نے اُسے آمر حکمرانوں کے سامنے عزم، حوصلے، استقامت اور بے مثال قربانی کی روشن علامت اور عملی جدوجہد کا استعارہ بنا دیا۔

باپ سے کئے گئے عہد اور وعدے نے نوجوان بیٹی کو عزم و ہمت اور جدوجہد کی دولت عطا کی، چنانچہ اپنے لیے سفارت کاری کا میدان چننے کی خواہشمند "پنکی" اب اپنے باپ کی سیاسی جانشین بن کر اپنے عہد کو پورا کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی، بے رحم وقت نے اُسے کارزار سیاست کے کانٹوں بھرے میدان میں لا کھڑا کیا تھا اور تقدیر بھی اُس نازک سی لڑکی کی آنکھوں کو مستقبل کے رنگین سنہرے خوابوں کے بجائے آنسوؤں سے بھرنے کا فیصلہ کر چکی تھی، اُس کی خوبصورت آنکھیں کبھی باپ کی پھانسی کے صدمے پر، کبھی جواں سال بھائی کی دیارِ غیر میں پراسرار موت پر، کبھی دوسرے بھائی کی کراچی کی سڑک پر قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ہاتھوں اندوہناک ہلاکت پر، کبھی صدموں سے نڈھال زندہ درگور ماں کی بے بسی پر، کبھی شوہر کی اسیری پر، اور کبھی اپنے پیاروں اور اپنی مٹی کی خوشبو سے دور جلاوطنی پر بھیگتی رہیں، پھر بھی وہ اپنے باپ کے مشن کو پورا کرنے کیلئے زندگی کی آخری سانسوں تک مصائب و آلام سے نبرد آزما رہی، اُس نے اپنے والد کی پھانسی کے بعد ایک طویل عرصہ قید و بند کی صعوبتوں میں گزارا، فوجی آمر جنرل ضیاء الحق کے خلاف جدوجہد کی علامت بن کر ابھرنے

والی یہ نازک سی لڑکی ہر دور میں آمریت کو للکارتی رہی،اپنے عظیم باپ ذوالفقار علی بھٹو کے مشن کو ہمیشہ جاری رکھنے کا عہد کرنے والی لاڈلی اور پیاری بیٹی" پنکی" کو وقت نے سیاست کی بساط پر نڈر بہادر محب وطن، ہمیشہ فوجی آمریت سے برسرپیکار، جمہوریت کی علمبرادر، وفاق پاکستان کی علامت اور چاروں صوبوں کی زنجیر کا اعزاز بخشا،اب وہ میدان سیاست کی "بی بی"اور ملک کی مقبول ترین عوامی لیڈر اور پاکستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کی قائد تھی،انہیں مسلم دنیا کی پہلی خاتون اور پاکستان کی دو مرتبہ وزیر اعظم منتخب ہونے کا اعزاز بھی ملا۔

انیس سو ستتر تک بے نظیر کی زندگی آسودگی میں گزری،اس کے بعد مشکلات اور دشواریوں کا ایک لامتناعی سلسلہ شروع ہوا، جو ان کی ناگہانی شہادت پر منتج ہوا، جنرل ضیاء الحق نے بھٹو کا تختہ الٹا تو اُس کے بعد بے نظیر بھٹو کی زندگی میں کئی چیزیں الٹ پلٹ ہوگئیں، 24 سالہ لڑکی کے نازک کاندھوں پر فوجی آمروں نے اپنے بھاری بوٹوں کا وزن رکھ دیا، 3اپریل 1979ء کی صبح بھٹو سے بے نظیر کی آخری ملاقات ہوئی،اس ملاقات میں بیٹی نے اپنے باپ کے سامنے اُن کے مشن کو جاری رکھنے کا عہد کیا، سلاخوں کے پیچھے قید بے بس مگر غیر متزلزل ارادوں کے مالک باپ نے اپنی بیٹی میں ایک ایسی نئی انقلابی عورت کو جنم لیتے ہوئے دیکھا تھا جس میں اُس کے مرنے کے بعد بھی اُس کی انقلابی فکر

اور روح کو زندہ رہنا تھا، شاید اسی وجہ سے اُسے موت کو گلے لگانے کیلئے پھانسی کے پھندے کو قبول کرنا مشکل نہیں رہا۔21 جون 1953ء کو کراچی میں پیدا ہونے والی بے نظیر بھٹو نے ریڈ کلف کالج اور ہارڈورڈ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی،انہوں نے لیڈی مارگریٹ ہال آکسفورڈ سے سیاسیات، اقتصادیات اور فلسفے کی ڈگری حاصل کی اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے بین الاقوامی قانون اور ڈپلومیسی کا کورس مکمل کیا، وہ پہلی ایشیائی خاتون تھیں جو آکسفورڈ یونین کی صدر منتخب ہوئیں،انہوں نے کئی کتابیں بھی لکھیں،وہ 1988ء میں پہلی بار اور 1993ء میں دوسری بار پاکستان کی وزیر اعظم بنیں۔

بد قسمتی سے دونوں دفعہ اُن کی حکومت بد عنوانی اور کرپشن کے الزامات کے تحت برطرف کی گئی، پاکستان اور اسلامی دنیا کی پہلی اور ملک کی دوبار وزیر اعظم منتخب ہونے والی بے نظیر بھٹو کی زندگی حوادث زمانہ سے بھری پڑی ہے،اگر اُن کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو کب کا شکستہ دل ہو کر سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلیتا لیکن انہوں نے اپنی سیاسی بصیرت، فہم وفراست،اور مدبرانہ قیادت سے اِس بات کو سچ کر دکھایا کہ اُن کے والد شہید ذوالفقار علی بھٹو کی نگاہ انتخاب کبھی غلط نہیں ہوسکتی۔بے نظیر بھٹو نے سیاست کے میدان میں بہت سے دھچکے اور صدمے برداشت کئے،انہوں نے اپنی آنکھوں سے والد کی پھانسی دیکھی،ضیاء دور میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں،دو مرتبہ جلاوطنی کا

عذاب سہا، شادی سے قبل اپنے بھائی شاہنواز بھٹو کو پُراسرار حالت میں موت کی سیاہ وادی میں اترے دیکھا، سیاست کے میدان میں اپنی ماں کو زخمی حالت میں پھٹے ہوئے سر کے ساتھ خون آلود دیکھا، دوران اقتدار جوان بھائی میر مرتضٰی بھٹو کے لاشے کو کندھا دیا، شوہر کو سات برس حوالہ زنداں کیا، اُن کا پورا خاندان بکھر گیا، مگر اِس کے باوجود اُن کی زندگی جہد مسلسل سے عبارت ہے، اُن کا وجود پاکستان کیلئے ایک ایسی زنجیر ثابت ہوا جس نے چاروں صوبوں کو باہمی طور پر ایکدوسرے سے باندھے رکھا۔
اٹھارہ اکتوبر 2007ء کو جب وہ آٹھ سالہ جلاوطنی ختم کرکے پاکستان واپس لوٹیں تو اُن کے جلوس پر خودکش حملہ کیا گیا جس میں وہ بال بال بچ گئیں لیکن اُن کی پارٹی کے ڈیڑھ سو سے زائد ارکان لقمہ اجل بن گئے، اِس خوفناک حادثے کے بعد بار بار کہا گیا کہ وہ اپنی سرگرمیاں محدود کردیں، لیکن انہوں نے نہایت ہی دلیری اور بہادری سے بحالی جمہوریت کی جدوجہد زندگی کی آخری سانسوں تک جاری رکھی، بھٹو کی پھانسی کے بعد بے نظیر بھٹو نے اپنے باپ کے متعین کردہ اصولوں کی روشنی میں اپنی سیاست کا آغاز کیا، یہاں سے بے نظیر کی فہم وفراست کا اصل امتحان شروع ہوا اور وقت نے بے نظیر کی فہم وفراست پر مہر تصدیق ثبت کردی، پاکستان کی سیاسی تاریخ گواہ ہے کہ جناب بھٹو کا یہ انتخاب بالکل صحیح ثابت ہوا اور اُن کی بیٹی پاکستان کی ایک بڑی سیاسی لیڈر

ہی نہیں بنی، بلکہ اُن کو بین الاقوامی سطح پر ایک عالمی سیاسی لیڈر اور مدبر کی حیثیت سے بھی پہچانا جانے لگا، جبکہ عالمی امور پر ان کی گہری نظر کا ایک زمانہ قائل رہا، وہ سیاست میں جلد بازی کی کبھی بھی قائل نہیں رہیں، جنرل مشرف سے قومی مفاہمت پر جن لوگوں نے سب سے زیادہ شور مچایا، اِس مفاہمت کا فائدہ بھی انہی لوگوں نے اٹھایا، بے نظیر بھٹو کی اس مفاہمت کی پالیسی کی وجہ سے انتخابات کی راہیں ہموار ہوئیں، نواز شریف کو وطن واپس آنا نصیب ہوا اور فوجی آمر جنرل مشرف وردی اتارنے پر مجبور ہوئے، بے نظیر بھٹو کے والد شہید ذوالفقار علی بھٹو ہارے ہوئے پاکستان کے تشخص، عزت و وقار، اور اعتماد کی بحالی چاہتے تھے، وہ دنیا میں پاکستان اور پاکستانی قوم کے سر اٹھا کر جینے کے خواہاں تھے اور اس مقصد کیلئے وہ پاکستان کو دفاعی لحاظ سے ایٹمی طاقت بنا کر ناقابل تسخیر بنانا چاہتے تھے، اُن کا مشن پاکستان کو دنیا میں عالم اسلام کی پہلی ایٹمی وقت بنانا تھا اور وہ اِسی جرم کی پاداش میں تختہ دار پر چڑھائے گئے، اپنے والد کی طرح بے نظیر بھٹو کا بھی یہی مشن تھا۔

انہوں نے پاکستان کو میزائل ٹیکنالوجی کا تحفہ دلوا کر والد کے مشن کو جاری رکھا، وہ کسی طور بھی اپنے والد کے مشن سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھیں، اپنے والد سے کئے گئے عہد اور اُن کے مشن کو پورا کرنے کی جدوجہد میں مصروف بے نظیر بھٹو کو وقت نے اُس وقت "بے نظیر" اور ہمیشہ کیلئے اَمر بنا

دیا،جب وہ لیاقت باغ راولپنڈی میں ایک انتخابی جلسے سے خطاب میں اِس عزم کا اعادہ کرکے واپس جارہی تھیں کہ "چاہے جان چلی جائے ملک کو بچائیں گے" جمہوری اداروں کے استحکام،پاکستان کی بقا، عوام کی حکمرانی، اور چاروں صوبوں کو ایک لڑی،ایک زنجیر میں پروئے رکھنے کی جدوجہد میں مصروف بے نظیر بھٹو 27دسمبر 2007ء کو لیاقت باغ راولپنڈی میں دہشت گردوں کے ہاتھوں زندگی کی بازی ہار گئیں،27دسمبر 2007ء پاکستان کی سیاسی تاریخ میں وہ المناک دن ہے جس دن لوگوں کے دلوں میں ملکی بقاء اور سلطانی جمہور کی لگن ابھارنے اور چاروں صوبوں میں محبت ویگانگت کے ترانے گانے والی آواز ہمیشہ کیلئے خاموش ہوگئی،گڑھی خدا بخش میں بے نظیر بھٹو کا خاکی وجود ہی نہیں جمہوریت کیلئے طویل سیاسی جدوجہد سے عبارت ایک سیاسی عہد بھی دفن ہوگیا،اس میں کوئی شک نہیں کہ بے نظیر بھٹو موجودہ سیاسی قائدین میں اِس لحاظ سے ممتاز حیثیت رکھتی تھیں اور اُن کی زندگی اور اُن کا وجود وفاق کی سلامتی اور استحکام کی علامت تھا،وہ ساری زندگی عوامی اور جمہوریت کی بحالی کی خاطر سرگرم عمل رہی،اُن کی اِن خدمات کا اعتراف بعد از مرگ اقوام متحدہ نے انہیں اعزاز سے نواز کر کیا،بلاشبہ اُن کی شہادت ایک عظیم قومی سانحہ ہے اور اُن کی شہادت سے پیدا ہونے والے خلاء کے پُر ہونے کے آثار دور دور تک نظر نہیں آتے،آج محترمہ بے نظیر بھٹو کو ہم سے جدا ہوئے ہوئے تین سال گزر گئے ہیں لیکن پوری قوم ان کی یاد میں سوگوار ہے۔

قبائے صبر کئے تار تار بیٹھے ہیں
یہ کس کی یاد میں سب سوگوار بیٹھے ہیں

بھٹو خاندان کی سیاسی تاریخ خون سے رنگین ہے، پاکستان کی ترقی، بقاء اور استحکام و سالمیت کیلئے اِس خاندان نے جتنی قربانیاں دی ہیں، برصغیر کی تاریخ میں اُس کی نظیر نہیں ملتی، آج بھی چاروں طرف بھٹو کا طلسم پھیلا ہوا ہے ....اور آج بھی بھٹو زندہ ہے، بھٹو کی طرح آمریت کے پروردہ اور جمہوریت دشمن عناصر نے 27 دسمبر 2007ء کے دن بے نظیر بھٹو کو شہید کرکے اُن کے جسمانی وجود سے چھٹکارا تو حاصل کر لیا گیا، لیکن اُن کی مقبولیت، ہر دل عزیزی اور کرشماتی شخصیت کو دفن نہیں کیا جاسکا، بے نظیر واقعی بے نظیر تھیں، انہیں معلوم تھا کہ انہیں قتل کردیا جائے گا، لیکن اِس کے باوجود وہ اپنے مشن سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھیں، دنیا میں یہ آن بان یہ شان ہر کسی کے مقدر میں نہیں آتی، سچ کی قربان گاہ پر بہنے والا بے نظیر کا لہو رنگ لا کر رہے گا اور قاتلوں کے سیاہ چہروں پر ثبوت کا اَن مٹ نقش بن کر اعلان کرے گا،"
ظالموں.... تمہاری بزدلی تمہاری موت ہے.... اور.... میری دلیری میری زندگی ہے.... جو اَمر ہے.... میں مر کر بھی آج زندہ ہوں....اور.... ہمیشہ زندہ رہوں گی....لوگوں کے دل و دماغ میں ....مجھے

کوئی نہیں مٹا سکتا.... کیونکہ میں بے نظیر ہوں.... جس کی کوئی نظیر نہیں ....اور نظیر ہمیشہ زندہ رہتی ہے"۔

پہلے خود بعد میں عوام-----

اِس وقت پاکستان کے ایوان بالا سینٹ، قومی اور چاروں صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کی تعداد 1170 ہے، یہ وہ ارکان سینٹ، قومی و صوبائی اسمبلی ہیں جن کی اکثریت کا تعلق پاکستان کے سرمایہ دار، جاگیردار اور زمیندار طبقے سے ہے، لیکن ملک کے کھاتے پیتے طبقے سے تعلق رکھنے والے اِن افراد کی اکثریت کسی قسم کا کوئی ٹیکس ادا نہیں کرتی، 2008ء کے الیکشن کیلئے الیکشن کمیشن آف پاکستان میں ارکان پارلیمنٹ کی جانب سے جمع کرائی گئی دستاویزات کے مطابق موجودہ قومی اسمبلی، سینٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے 463 ارکان جن کی تعداد 61 فیصد بنتی ہے ٹیکس جمع کرانے کے دعویدار ہیں، لیکن صرف 109 یعنی 9 فیصد ارکان کی جانب سے معمولی یعنی ایک لاکھ یا اِس سے زائد ٹیکس جمع کرایا گیا، جبکہ 707 ارکان ایسے ہیں جنھوں نے اپنے حلف ناموں میں اِس بات کی تصدیق ہے کہ وہ کوئی ٹیکس جمع نہیں کراتے،اِن ٹیکس نادہندگان کی سب سے بڑی تعداد بلوچستان اسمبلی میں 78 فیصد، خیبر پختونخواہ اسمبلی میں 77 فیصد، سندھ اسمبلی میں 74 فیصد، پنجاب اسمبلی میں 57 فیصد، قومی اسمبلی میں 53 فیصد اور سینٹ میں 48 فیصد ہے، واضح رہے کہ قومی اسمبلی کا ایوان جو ہر سال فنانس بل منظور کرکے ٹیکسوں میں کمی بیشی کرتا ہے کے 342 ارکان قومی اسمبلی میں سے 181 ارکان ایسے ہیں جو کوئی ٹیکس ادا نہیں

کرتے، جبکہ 161 ارکان کا دعویٰ ہے کہ وہ ٹیکس ادا کرتے ہیں لیکن ریکارڈ کہتا ہے کہ صرف 43 ارکان قومی اسمبلی ایسے ہیں جو ایک لاکھ یا اِس سے زائد ٹیکس ادا کرتے ہیں، جو کہ اُن کی آمدنی کے حساب سے کوئی بڑی رقم نہیں کیونکہ اِس سے زیادہ ٹیکس تو ایک عام تنخواہ دار آدمی ادا کر رہا ہے، یہ بات بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ ملکی تاریخ کی بھاری بھرکم کابینہ جس کے ایک وزیر کا سالانہ خرچہ 16 کروڑ اور کل کابینہ کا سالانہ خرچ ارب 36 کروڑ بنتا ہے، رکھنے والے وزیر اعظم سید یوسف رضا گیلانی سمیت کابینہ 15 کے 25 ارکان ایسے ہیں جو قومی خزانے کو ٹیکس کی مد میں کوئی پیسہ ادا نہیں کرتے۔

قارئین محترم یہ اِس ملک کے اُن ارکان قومی، صوبائی اور ممبران سینٹ کی مجموعی صورتحال ہے جن کا تعلق ملک کے غریب اور مفلوک الحال خاندانوں سے نہیں ہے، نہ ہی یہ وہ لوگ ہیں جنھیں بھوک، غربت، مہنگائی اور بے روزگاری کا سامنا ہے، بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کا طرز زندگی ملک کی مجموعی آبادی سے ہزار ہا درجے
بہتر، آسودہ، پرسکون اور عیش و عشرت پر مبنی ہے، انہیں زندگی گزارنے کیلئے کسی قسم کا کوئی فکر و فاقہ نہیں، یہ لوگ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ دودھ، تیل، گھی، اور سبزی جیسی بنیادی اشیاء ضرورت مارکیٹ میں کس بھاؤ بک رہی ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو صرف الیکشن جیتنے کیلئے لاکھوں روپے کے اخراجات کرتے ہیں اور الیکشن جیتنے کے بعد کڑوں روپے بناتے ہیں، بھاری بھاری تنخواہیں

وصول کرتے ہیں، سرکاری مراعات استعمال کرتے ہیں اور قومی خزانے پر عیش کرتے ہیں، ستم ظریفی دیکھئے کہ ہر حکومت کا حصہ بنے والے یہ لوگ قومی خزانے کو کچھ دینے کی بجائے عوام کا خون نچوڑ نچوڑ کر اپنے عشرت کدے سجاتے ہیں، لیکن ٹیکس کی مد میں کوئی پیسہ جمع نہیں کرتے، جبکہ اِن کے مقابلے میں ملک کا غریب اور متوسط طبقہ جو تن ڈھانپنے، سر چھپانے اور پیٹ بھرنے کی تگ ودو میں بڑی طرح جکڑا ہوا ہے، مختلف مدوں میں اِن طبقہ اشرافیہ سے کہیں زیادہ ٹیکس ادا کرتا ہے۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ دنیا بھر میں حکومتیں امیروں پر زیادہ سے زیادہ ٹیکس لگاتی ہیں تاکہ اُس آمدنی کو محروم طبقات کی فلاح و بہبود پر خرچ کیا جاسکے، مگر وطن عزیز میں بڑی سفاکی کے ساتھ غریبوں کے منہ کا نوالہ چھین کر وسائل پر قابض اشرافیہ کے عیش و آسائشوں میں اضافہ کیا جاتا ہے اور وہ بھی ایک ایسی حکومت کے دور میں جو معاشرے کے پسماندہ طبقے کو روٹی، کپڑا اور مکان دینے کے وعدوں کے ساتھ اقتدار میں آئی ہے، لیکن یوں لگتا ہے کہ حکومت نے عوام سے روٹی، کپڑا اور مکان چھیننے کا عزم کیا ہوا ہے،اِس وقت عوام کی حالت یہ ہے کہ وہ پہلے ہی بجلی، گیس، پٹرولیم مصنوعات اور اشیاء خوردونوش کی قیمتوں میں بے پناہ اضافے کے بھاری بھرکم بوجھ کو اٹھانے سے قاصر آچکی ہے،لوگ غربت بھوک، بے روزگاری اور مہنگائی سے مجبور ہو کر خودکشیاں کررہے

ہیں، مگر اقتدار کے سنگھاسن پر بیٹھے ہوئے گونگے، بہرے اور اندھے ارباب اقتدار خود ٹیکس دینے کے بجائے عوام کی زندگی کو مشکل سے مشکل دشوار تر بناتے جارہے ہیں، نئی حکومت کے آنے سے قوم صورتحال میں بہتری کیلئے انقلابی اقدامات کی توقع کر رہی تھی، مگر افسوس کہ انہیں سوائے مایوسی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوا، کیونکہ حکمرانوں کی ساری توجہ عوامی مسائل کے حل کے بجائے اپنے آقا امریکہ بہادر کی خوشنودی حاصل کرنے پر ہے، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ حکومت عوام کو مشکلات سے چھٹکارا دلانے کیلئے کوئی عملی اقدامات کرتی، لیکن افسوس کہ سب کچھ الٹا ہی ہو رہا ہے، مہنگائی، بے روزگاری اور غربت کے ستائے ہوئے عوام پر نت نئے ٹیکسوں کا بم گرایا جارہا ہے، وزیر اعظم کی عوامی مسائل سے بے نیازی کا عالم یہ ہے کہ وہ کئی بار اپنی آئینی میعاد کا ذکر کرتے ہوئے یہ اصرار کرچکے ہیں کہ پانچ سال سے پہلے کسی حساب کتاب کی بات نہ کی جائے، اِن حالات میں عوام کی بڑی تعداد یہ سوچنے میں حق بجانب ہے کہ حکمرانوں کا تصور جمہوریت اُن کی خواہشات اور امنگوں کے برعکس ہے، جو کہ حکمرانوں کیلئے ایک لمحہ فکریہ ہے۔

یہ درست ہے کہ حکومت چلانے کیلئے ٹیکس کا حصول لازمی اَمر ہے، ٹیکس ضرور لگنے چاہئیں، لیکن اِس کے لئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ قوم کو اِس قابل بنایا جائے کہ وہ ٹیکس ادا کرسکے، دنیا کے ہر ملک میں اُمور مملکت چلانے کیلئے

عوام سے ٹیکس وصول کئے جاتے ہیں،اگر کوئی حکومت عوام سے ٹیکس وصول کرتی ہے تو
اُس کے وہ عوض سہولیات بھی فراہم کرتی ہے، سوال یہ ہے کہ پاکستانی عوام کو حکومت
نے کون سی سہولیات دی ہیں، جبکہ عوام تو دو وقت کی روٹی کے لئے ترس رہی
ہے، تعلیم کے دروازے غریب آدمی کے لئے بند ہیں، صحت کی سہولیات ناپید ہیں،امن
وامان کی صورتحال سب کے سامنے ہے،اِس کے باوجود ہماری حکومت عوام کا خون نچوڑ
کر نظام حکومت چلانا چاہتی ہے،اُسے احساس ہی نہیں کہ وہ عوام جو بجلی اور گیس کے بل
ادا کرنے سے قاصر ہے اور اشیاء ضرورت کے حصول میں ناکامی پر خودکشیوں پہ مائل
ہے،مزید ٹیکس کہاں سے ادا کرے گی،ہمارا سوال یہ ہے کہ وہ حکمران جو عوام پر ٹیکس
عائد کرتے ہیں اور جن کی جائیدادیں پاکستان سے لے کر بیرون ملک تک پھیلی ہوئی
ہیں، کیا وہ خود ٹیکس ادا کرتے ہیں،اوّل تو ادا ہی نہیں کرتے اگر کرتے بھی ہیں تو
اربوں، کھربوں کی جائیداد اور اثاثوں پر ہزاروں کا معمولی ٹیکس دیا جاتا ہے،لہٰذا اس
صورتحال میں ٹیکس وصولی کی ابتداء جاگیرداروں، سرمایہ
داروں، حکمرانوں، سیاستدانوں، بیوروکریٹوں، جرنیلوں اور اُس امراء طبقے سے ہونی
چاہیے جس نے اُس ملک کے تمام تر وسائل پر قبضہ کیا ہوا ہے۔
پاکستان کی معاشی حالت کو دیکھتے ہوئے ہر محب وطن پاکستانی یہ سمجھتا ہے کہ ٹیکس نیٹ کا
دائرہ بڑھایا جائے، لیکن اِس کا یہ مطلب ہرگز یہ نہیں کہ

جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور کھربوں کی جائیداد اور اثاثے رکھنے والوں کو تحفظ دے کر صرف غریب عوام، سرکاری ملازمین اور چھوٹے کاروباری طبقے پر ٹیکس کا عذاب نازل کر دیا جائے، یہ تو وہ طبقہ ہے جس سے پہلے ہی ٹیکس وصول کیا جارہا ہے، کیا سرمایہ داروں، جاگیرداروں، سیاستدانوں اور حکمرانوں پر اس ملک کو کوئی حق نہیں؟ آئی ایم ایف، عالمی بنک اور امداد دینے والے ممالک چاہتے ہیں کہ پاکستان میں ٹیکس نیٹ بڑھانے کیلئے سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور بڑے بڑے مگرمچھوں کو ٹیکس رینج میں لایا جائے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اِس کے باوجود حکومت سرمایہ
داروں، جاگیرداروں اور بڑے بڑے مگرمچھوں کو تحفظ دے کر صرف غریب عوام کو زندہ درگور کرنے پر تلی ہوئی ہے، یہ اِس ملک کے غریب قوم کی بدقسمتی ہی ہے کہ اہل اقتدار کی اکثریت قانون اور ضابطوں کو ردی کی ٹوکری میں پھینک کر اپنے صوابدیدی اختیارات کے مزے لیتی ہے اور قوم کے ٹیکسوں سے جمع ہونے والا پیسہ جو کہ قوم کی امانت ہے کو بے دردی سے لٹانا شروع کر دیتی ہے۔

ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں ہر سال ایک ہزار ارب روپے کرپشن کی نذر ہو جاتے ہیں، اعلیٰ ترین سطح کی شخصیتوں اور اُن کے متعلقین پر غبن اور کرپشن کے الزامات لگتے ہیں، اسکینڈل سامنے آتے ہیں، لیکن کوئی اپنا جرم تسلیم نہیں کرتا، بلکہ بیچ بچاؤ کی صورت نکال کر معاملے کو ٹھنڈا کر دیا جاتا ہے، یہی وجہ

ہے کہ موجودہ دور میں ملک میں کرپشن کلچر کو بے تحاشا فروغ ملا ہے، جس کی وجہ سے ملکی معیشت ڈوب رہی ہے اور عام آدمی کی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی ہے، وہ ادارے جو کل تک ملکی خزانے میں اربوں روپے کا منافع جمع کراتے تھے، خسارے کی وجہ سے آج تباہی کے دہانے پر پہنچ چکے ہیں، ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل سمیت کئی ملکی اور غیر ملکی اداروں کا کہنا ہے کہ اگر ملکی خزانے میں ہونے والے غبن اور انتظامی کرپشن کو روکا جائے تو ملک کی معیشت اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکتی ہے، جبکہ معاشی ماہرین کا خیال ہے کہ مختلف طریقوں سے خورد برد اور چوری کئے جانے والے 10 ارب روپے کے ٹیکسوں کی وصولی یقینی بنانے کیلئے قابل عمل تدابیر اختیار کی جائیں تو عوام پر کوئی نیا بوجھ ڈالے بغیر قومی ضروریات کے لئے وافر سرمایہ مہیا ہو سکتا ہے۔

چنانچہ اِن حالات میں پہلے ہی محصولات کے بوجھ تلے دبے ہوئے چند لاکھ ملازمت پیشہ اور رضاکارانہ ٹیکس ادا کرنے والے افراد پر دباؤ بڑھانے یا غریب اور متوسط طبقے کو بالواسطہ ٹیکسوں کے ذریعے نچوڑنے سے مسائل حل نہیں ہوں گے، اِس کے لئے وہ بڑے لوگ جنھوں نے خود کو ہر قسم کے ٹیکسوں اور یوٹیلیٹی بلوں کی ادائیگی سے مبرا قرار دے رکھا، اور جو عوام کے خون پسینے سے حاصل ہونے والے محصولات شیر مادر سمجھ کر ہضم کرنے اور بیرون ملک منتقل کرنے میں مصروف ہیں، کو بھی ٹیکس کے دائرے میں لانا ہوگا، لہٰذا آج ضرورت اِس

اَمر کی ہے کہ حکومت چھوٹے کاروباری، سرکاری ملازمین اور عوام جو پہلے ہی ٹیکس ادا کر رہے ہیں، پر مزید ٹیکسوں کا بوجھ عائد کرنے کی بجائے اُن مراعات یافتہ طبقات سے ٹیکس وصول کرنا شروع کرے جو اربوں، کھربوں کی جائیدادوں، اثاثوں اور زمینوں کے مالک ہونے کے باوجود ٹیکس نہیں دیتے۔ دوسری طرف ملکی معیشت اور اقتصادی حالت سنبھالنے کیلئے اِن طبقات کو بھی اپنا حصہ ڈالنا ہوگا۔ کہ یہی اچھے حکمرانوں کا فرض اوّل، ملک و قوم سے محبت کی علامت، موجودہ معاشی مسائل کا بہترین حل اور دین اسلام کا پہلا تقاضہ ہے۔

اسلام کا نظامِ بلا سود بینکاری

اسلامی بینکاری و تکافل سے وابستہ افراد کیلئے ایک مفید تحفہ
ایک وقت تھا جب دنیا میں سود کے بغیر بینکاری نظام کا تصور بھی محال تھا کیونکہ سود بینکاری نظام کا جزو لاینفک اور اِس کی لازمی بنیاد قرار دیا جاتا تھا، لیکن اب یہ مفروضہ غلط ثابت ہو چکا ہے۔اِس وقت دنیا میں ایک ایسے متبادل نظام کا کامیاب تجربہ ہو رہا ہے، جس میں سود اور اِس کی قبیل کا کوئی عنصر موجود نہیں ہے۔اِس نظام کو بلا سود یا اسلامی بینکاری نظام کہا جاتا ہے، ستر کی دہائی میں شروع ہونے والا یہ نظام مسلسل ترقی کر رہا ہے اور اِس کی مقبولیت کسی ایک علاقے یا مذہب تک محدود نہیں اور نہ ہی اسے صرف مسلم ممالک اختیار کر رہے ہیں، بلکہ اب غیر مسلم ممالک میں بھی اسلامی بینکاری اداروں کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے اور اِس نظام کے حوالے سے متعلقہ قوانین بھی بنائے جا رہے ہیں۔

نوخیز اور تیزی سے ترقی کرتے ہوئے کسی بھی نظام کی طرح "اسلامی بینکاری نظام" کے بھی کچھ مخصوص تقاضے ہیں، جس میں سب سے بنیادی بات اِس نئے نظام کی

منفرد اصلاحات اور عملی معاملات میں اِس کے اصولوں کی تطبیق کو سمجھنا ہے، دنیا بھر میں جہاں اسلامی بینک تیزی سے قائم ہورہے ہیں، وہاں اِس حوالے سے نظریاتی اور عملی تربیت کا بھی اہتمام کیا جارہا ہے، جو کہ بہت ضروری ہے، تربیتی اداروں کے قیام کے ساتھ ساتھ ضروری تربیتی مواد کی بھی اپنی اہمیت اور حیثیت ہوتی ہے، جس میں خاصی کمی محسوس ہورہی ہے خصوصاً اردو زبان میں ایسا مواد نہ ہونے کے برابر ہے۔

اِس حوالے سے ایک عرصے سے اِس بات کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ اردو میں کوئی ایسی مستند کتاب ہو، جس میں بیوع کے مختلف ابواب اور اِن ابواب کے مسائل کو قرآن و سنت کے دلائل کی روشنی میں جدید مثالوں کے ساتھ واضح کیا گیا ہو، زیر نظر کتاب "سرمایہ کاری کے شرعی اصول" نے دراصل اسی کمی کو پورا کرنے کی ایک کامیاب سعی ہے، جسے نوجوان محقق داؤد اسلامک بینک کے سینئر شریعہ کوآرڈینیٹر اور داؤد فیملی تکافل میں شریعت ایڈوائزر مفتی سید صابر حسین صاحب نے مرتب کیا ہے، مفتی سید صابر حسین کی یہ کاوش اگرچہ اِس سلسلے کی پہلی کڑی نہیں ہے، لیکن اِس میں ایک قابل قدر اضافہ ضرور ہے، مفتی صاحب نے جتنی کم عمری میں یہ علمی کارنامہ سرانجام دیا ہے، وہ یقیناً لائق تحسین ہے اور اپنی گوناگوں مصروفیات، جن میں اسلامی بینک اور تکافل کمپنی میں فل ٹائم خدمات، دارالعلوم امجدیہ میں تدریس اور دارالافتاء کی

مصروفیات، تعلیمی اداروں میں تدریس، زونل رویت ہلال کمیٹی کے اجلاسوں میں شرکت، درس قرآن کی محافل اور مختلف ٹی وی چینلز پر دینی پروگرامز اور مسجد کی خطابت جیسے فرائض کی بجاآوری کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف سے وابستہ ہونا یقیناً فضل ربی اور اُن کے والدین اساتذہ اور بالخصوص مفتی اعظم پاکستان حضرت علامہ مفتی منیب الرحمٰن کی خصوصی تربیت کا نتیجہ ہے۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ اسلامی نظام مالیات اور معاشیات کی بنیادیں فقہ اسلامی کی متعلقہ شاخوں سے نکلتی ہیں،اِس لئے یہ ایک نہایت اہم اَمر ہے کہ اسلامی مالیات اور بینکاری کے تمام تر متعلقین، بشمول ملازمین، ماہرین اور طالب علم فقہ المعاملات کا معتدبہ علم رکھتے ہوں، لیکن زمینی حقائق یہ ہیں کہ بالعموم اسلامی بینکاری کے متعلقین فقہ میں مناسب حد تک عبور نہیں رکھتے اور نہ اسلامی بینکاری کی تعلیم دینے والے ادارے اِس کمی کو پورا کرپارہے ہیں، جس کے نتیجے میں اسلامی بینکاری اور مالیات کے عملی معاملات میں خامیاں سامنے آرہی ہیں،اِس سلسلے میں ایک کمی یہ بھی نظر آتی ہے کہ لوگ اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق کسی بھی شے کو اسلامی یا غیر اسلامی قرار دینا شروع کردیتے ہیں، بجائے اِس کے کہ وہ شریعت مطہرہ کے ماخذ اور فقہ اسلامی کی تعلیمات سے رجوع کریں، ہماری ناقص رائے میں اِس کتاب کا مطالعہ اسلامی بینکاری اور اسلامی مالیاتی نظام کے تمام متعلقین اور اُن ناقدین کیلئے

نہایت ہی فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے، جو فقہ کی بنیادوں میں جائے بغیر محض عقلی بنیادوں پر حلال و حرام کے فیصلے صادر کرتے ہیں۔

درحقیقت اِس کتاب نے اسلامی بینکاری اور مالیاتی نظام کے حوالے سے پائے جانے والے جمود کو توڑنے کے ساتھ علمائے دین میں مذاہب اربعہ سے مفاد عامہ کی خاطر رجوع اور اجتہاد کے فلسفے کو دوبارہ زندہ کیا ہے،اِس اعتبار سے مختلف مکاتب فکر کے علماء کا سامنے آنا اور تحریر و تقریر کے ذریعے حق بات لوگوں تک پہنچانا اور اِس کے ساتھ ساتھ اِس نظام میں موجود فکری، فقہی اور عملی خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کرنا نہایت ہی اہم عمل ہے،اِس لحاظ سے یہ کتاب جس میں "اسلامی ذرائع تمویل، مختلف فقہ اکیڈمی کی _OIC، معاملات سے متعلق قرآن و حدیث کے ساتھ مجلۃ الاحکام قراردادوں، فتاویٰ عالمگیری، ہدایہ، قاضی خان، اور فتاویٰ رضویہ جیسی موقر تصنیفات سے استفادہ کرتے ہوئے نہایت جامع اور مختصر انداز میں اسلامی بینکاری سے متعلق شرعی احکام بیان کئے گئے ہیں" وقت کی اہم ضرورت ہی نہیں بلکہ اس میدان میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ کہنا قطعاً غلط نہ ہوگا کہ مفتی سید صابر حسین کی تصنیف کردہ کتاب "سرمایہ کاری کے شرعی اصول" اسلامی مالیاتی فقہ اور بینکاری نظام کے متعلق

معلومات کا ایک بیش قیمت خزانہ ہے۔اِس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ یہ بہت عام فہم، سہل اور اسلامی بینکاری کی ضرورت کے عین مطابق ہے، جس میں مفتی صاحب نے نہایت ہی جامع انداز میں مشکل اور ثقیل عربی فقہی اصلاحات کی آسان تعریف و تشریح کے ذریعے اسلامی بینکاری کے نووارد طلبہ، مربیین اور ٹرینرز کیلئے بہت آسانی پیدا کردی ہے، درحقیقت یہ کتاب اِس موضوع پر نہ صرف مصنف کی بھرپور تحقیق اور تجربے کی عکاسی کرتی ہے بلکہ اردو زبان میں شائع ہونے کے باعث اسلامی فقہ اور بینکاری نظام سے وابستہ ہر طبقے کیلئے عام فہم اور مفید بھی ہے۔اردو زبان میں اشاعت کا سب سے بڑا فائدہ اسلامی بینکاری سے وابستگی کے خواہش مند اُن طلبہ اور طالبات کو ہوگا،جو بطور کیریئر اس پیشے کو اپنانا چاہتے ہیں، 352 صفحات کی یہ کتاب، الرّضا پبلیکیشنز، فون نمبر 03002760012 سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

بوٹیاں نوچتے گدھ اور زخم زخم عوام۔۔۔۔

مہنگائی کی ماری قوم کیلئے سال نو کا پہلا تحفہ۔۔۔۔

"ہمارے سامنے ایک زخمی گدھا کھڑا تھا، گدھے کی پیٹھ پر ایک گدھ بیٹھا تھا اور گدھ کی گردن گدھے کی پیٹھ کے سوراخ میں گم تھی پیٹھ پر صرف گدھ کے پر اور پاؤں دکھائی دے رہے تھے، گدھا تکلیف سے چیخ رہا تھا، لیکن گدھ اُس کو اندر سے کاٹ کاٹ کر کھا رہا تھا، تھوڑی دیر بعد گدھ نے اپنی چونچ سوراخ سے باہر نکالی تو وہ گردن تک گدھے کے لہو میں لتھڑا ہوئی تھی۔"

اردو کے مشہور ادیب مستنصر حسین تارڑ کی تحریر کا یہ خوفناک منظر آج بھی پنجاب اور سندھ کے بعض گاؤں اور دیہاتوں میں موجود اُس روایت کی عکاسی کرتا ہے، جس میں گاؤں کے لوگ زخمی، معذور اور ناکارہ گدھے اور خچر جو کام کاج کے قابل نہیں رہتے، گاؤں کے باہر ایک ایسے احاطے میں چھوڑ دیتے ہیں، جو اُن کی آخری آرام گاہ ہوتی ہے، اُس احاطے کی دیواروں اور درختوں پر چیلیں اور گدھ بیٹھے ہوتے ہیں، یہ گدھ اور چیلیں اُس زخمی اور معذور گدھے کا گھیراؤ کر لیتے ہیں اور اُس کی پیٹھ پر سوار ہو کر اپنی تیز اور نوکیلی چونچ سے گدھے کی

پیٹھ میں سوراخ کرتے ہیں اور زندہ گدھے کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھانا شروع کر دیتے ہیں۔

بعینہٖ ہمارے حکمران بھی اپنی عوام کے ساتھ یہی سلوک کر رہے ہیں، وہ بھوک، غربت، مہنگائی اور بے روزگاری کے ہاتھوں پریشان چیختے چلاتے اور زندگی کی بقاء کی جنگ لڑتے عوام کو نت نئے ٹیکس، بجلی، گیس اور پیٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافے کی تیز اور نوکیلی چونچ سے کاٹ کاٹ کر کھا رہے ہیں، لیکن اپنے عیش و عشرت میں کوئی کمی نہیں لا رہے، حال یہ ہے کہ معیشت تباہ ہو چکی ہے، خزانہ خالی ہے اور ملک گردن تک قرضوں میں جکڑا ہوا ہے، لیکن عوامی حکومت کے وزیر اعظم سیکرٹریٹ کیلئے مختص اخراجات 19 کروڑ 88 لاکھ روپے سے تجاوز کر کے 42 کروڑ 93 لاکھ تک پہنچ چکے ہیں اور عوام کے ٹیکسوں سے حاصل کی جانے والی آمدنی سے 15 کروڑ روپے صرف ایک باغ کی تعمیر پر خرچ کئے جا چکے ہیں، صرف تین کروڑ 78 لاکھ روپے وزیر اعظم کے قافلے کے ساتھ چلنے والی گاڑیوں کی مد خرچ کیے گئے، جبکہ وزیر اعظم صاحب اپنی دو ہزار آٹھ اور نو کی تنخواہ کی مد میں مختص سات لاکھ 59 ہزار روپے سے 13 لاکھ 17 ہزار روپے زائد وصول کر چکے ہیں، یہی حال بھاری بھر کم اراکین کابینہ کا ہے، جس کے ایک وزیر کا سالانہ خرچہ 16 کروڑ اور کل کابینہ کا سالانہ خرچ 15 ارب 36 کروڑ بنتا ہے، اس کے باوجود وزیر اعظم صاحب کمال سادگی سے فرماتے ہیں کہ "حکومت پٹرول پر مزید

سبسڈی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔" جبکہ وفاقی وزیر اطلاعات سارا بوجھ اوگرا پر ڈال کر وزیر اعظم کو تازہ اضافے سے بری الذمہ قرار دینے اور حکومت کو عوامی رد عمل سے بچانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔

حیرت کی بات ہے کہ عوامی دکھوں کا مداوا بننے کی دعویدار حکومت نے مہنگائی کے بوجھ تلے سسکتے ہوئے عوام کو یکم جنوری سے پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافہ کرکے سال نو کا پہلا تحفہ دیا ہے، تازہ اضافے کے حوالے سے اقتصادی ماہرین کا کہنا ہے کہ جب حکومت کی غلط مالیاتی پالیسیوں کی وجہ سے اُس پر دباؤ بڑھتا ہے تو وہ اوگرا کو پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافے کا اشارہ دے دیتی ہے کیونکہ اِس اضافے سے حکومت کو کم وبیش 25 روپے فی لیٹر کے حساب سے مختلف ٹیکسوں کی صورت میں یقینی آمدنی ہوتی ہے، اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ 2010ء کے دوران وزیروں، مشیروں اور اعلیٰ بیوروکریسی کے شاہانہ اخراجات پورے کرنے کیلئے پٹرولیم مصنوعات اور گیس پر بھاری ٹیکسوں کے ذریعے غریب عوام سے 350 ارب روپے کی خطیر رقم نچوڑی گئی، یہ کسی ایک شعبے میں ٹیکسوں کی مد میں وصول کی جانے والی سب سے بڑی رقم ہے، خیال رہے کہ حکومت نے گزشتہ سال 6 مرتبہ پیٹرولیم مصنوعات میں قیمتوں میں 14.56 روپے کا ہوشربا اضافہ کیا، حکومت کے نزدیک عوام سے فوری رقوم کی وصولی کیلئے سب سے آسان طریقہ پٹرول، گیس اور بجلی کی قیمتوں اور ٹیکس کی شرح میں اضافہ ہے، جس

کے تحت موجودہ اور سابقہ حکمران عوام کا خون نچوڑتے رہے ہیں۔
افسوسناک بات یہ ہے کہ ہمارے حکمرانوں کو اِس بات کی کوئی پرواہ نہیں وہ اقتصادی اور معاشی مسائل کے حل کے لئے نہ تو کوئی ٹھوس منصوبہ بندی کرسکے اور نہ ہی پیداواری عمل اور روزگار کے مواقع میں اضافہ کرکے غربت و افلاس اور بے روزگاری کے بڑھتے ہوئے گراف پر قابو پاسکے، بلکہ وہ پہلے سے موجودہ پیداواری عمل کو بھی برقرار رکھنے میں کامیاب نہیں ہوسکے، اِس وقت گیس و بجلی کے بحران سے ہزاروں صنعتی ادارے بند اور لاکھوں افراد بے روزگاری کا شکار ہوچکے ہیں، قیمتوں میں اضافے سے برآمدات میں ہونے والی کمی نے تجارتی خسارے میں خوفناک حد تک اضافہ کردیا ہے، عالمی مارکیٹ میں دوسرے ملکوں کی مصنوعات کا مقابلہ نہ کرسکنے کی وجہ سے کئی منڈیاں پاکستان کے ہاتھ سے نکل گئی ہیں، ماہرین کے مطابق حکومت کے پاس سرے سے کوئی پروگرام اور کوئی قابل عمل منصوبہ ہی نہیں، جب اُس پر دباؤ بڑھتا ہے تو اُسے پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافے کا صرف یہی ایک فارمولا قابل عمل دکھائی دیتا ہے۔
ستم ظریفی دیکھئے کہ اِس طریقہ کار پر عمل کرتے وقت حکومت قیمتوں میں اضافے کے خلاف عوامی ردعمل کا بھی کوئی نوٹس نہیں لیتی، اگر عوام واویلا کرتے ہیں تو انہیں حوصلہ دینے کی بجائے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے، جبکہ اچھی

اور عوام کے دکھ درد کا خیال رکھنے والی حکومتیں عوامی رد عمل پر سنجیدگی سے توجہ دیتی ہیں، لیکن ہمارے یہاں حکومت ایسے اقدامات کی براہ راست ذمہ داری بھی قبول نہیں کرتی بلکہ سارا بوجھ اپنے ماتحت کام کرنے والوں اداروں پر ڈال دیتی ہے، جس کی تازہ مثال وفاقی وزیر اطلاعات کا مندرجہ بالا بیان ہے، جبکہ دنیا بھر کے مہذب ممالک کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہاں ٹیکسوں کا زیادہ بوجھ صاحب ثروت اور مالدار طبقے پر ڈالا جاتا ہے اور اُن سے حاصل ہونے والے محصولات کو متوسط اور نچلے طبقے پر خرچ کیا جاتا ہے تاکہ اُن کی قوت خرید برقرار رہے اور وہ خط غربت سے نیچے نہ چلے جائیں، لیکن وطن عزیز پاکستان کے حکمرانوں کا حال یہ ہے کہ وہ عوام کے خون پسینے کی کمائی سے جبراً لئے جانے والے بالواسطہ اور بلاواسطہ ٹیکسوں سے ایسی شاہانہ زندگی بسر کر رہے ہیں جس کا کسی بھی مہذب جمہوری تو کیا غیر جمہوری ملک کا حکمران اور عوامی نمائندہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔

یہ بھی عام مشاہدہ ہے کہ اگر جمہوری معاشرے میں حکومتیں عوامی مفاد کے کیلئے کام نہ کرپائیں اور عوامی مفادات سے لاپروائی اُن کا طرہ امتیاز اور وتیرہ بن جائے تو پھر انہیں صرف اپوزیشن جماعتوں کا سخت رد عمل ہی راہ راست پر لا سکتا ہے، لیکن بدقسمتی سے ہمارے یہاں ایسا بھی نہیں ہوتا، اپوزیشن جماعتوں کا احتجاج بھی اُن کے اپنے مفادات کے حصول اور تحریک التواء تک ہی محدود

رہتا ہے، کیونکہ عوامی مفادات کا تحفظ اُن کے ایجنڈے کا حصہ نہیں۔اِس تناظر میں ہمیں
اپوزیشن کے علاوہ بعض حکومتی اتحادی جماعتوں کا موجودہ رد عمل زبانی جمع خرچ سے
زیادہ دکھائی نہیں دیتا۔ایسا لگتا ہے کہ ہماری اپوزیشن جماعتیں بھی عوامی حقوق اور
مفادات کے تحفظ کے حوالے سے گویا بے حس ہو چکی ہے۔انہیں اِس امر کا احساس ہی
نہیں کہ ملک کے کروڑوں غریب موت کے کنارے تک پہنچ چکے ہیں، چنانچہ اپوزیشن
رہنماؤں کے بیانات حکومت پر زبانی تنقید اور صرف یہ کہہ کر مطمئن ہو جانا کہ ہم ظلم کا
ساتھ نہیں دیں گے، صورتحال کا ازالہ کر سکتے ہیں نہ ہی حکومت کو اپنا فیصلہ واپس لینے پر
مجبور کر سکتے ہیں، لہٰذا مہنگائی کے ہاتھوں جاں بہ لب عوام کے پاس اِس سوا کوئی چارہ
نہیں رہتا کہ وہ یا تو جرم کا راستہ اختیار کریں یا خود کشی کر کے اپنے آپ کو ہی ختم کر لیں
۔

امر واقعہ یہ ہے کہ جمہوری حکومت کے تین سالہ دور اقتدار نے عوام کو سوائے
مایوسیوں، بھوک اور دکھوں کے کچھ نہیں دیا۔اب تو غریب لوگ جمہوری حکومت کو
بد دعائیں دیتے ہیں، جس نے اُن کی زندگیوں اجیرن بنا کر رکھدی ہے ہیں، پہلے ہی کیا
عوام پر یوٹیلٹی بلوں کی مد میں کم بوجھ تھا کہ اوپر سے ہر ماہ بلوں میں اضافے کے علاوہ
کھانے پینے کی ضروری اشیاء میں اضافہ کیا جا رہا ہے، حکومت اپنے الّلے تلّلے، عیاشیوں
اور بے جا بیرونی ممالک کے دورے کم کرنے کی بجائے

مہنگائی کا سارا بوجھ عوام پر لادھ رہی ہے، غربت، بے روزگاری اور مہنگائی کے ہاتھوں تنگ آکر لوگ خودکشیاں کرنے پر مجبور ہیں،اپنے جگر کے ٹکڑے بیچنے پر مجبور ہیں،اِس وقت صورتحال یہ ہے کہ ملک کے دو،بڑے صوبوں پنجاب اور خیبر پختونخواہ میں بجلی اور گیس کے بحران کی وجہ سے سینکڑوں صنعتیں بند ہیں،لاکھوں مزدور بے روزگاری کا شکار ہیں،اُن کے گھروں کے چولہے ٹھنڈے ہو گئے ہیں لیکن حکمرانوں کواِس کی کوئی فکر نہیں،وہ اقتدار کے ایوانوں میں ایسے فیصلے کررہے ہیں جس نے ایک عام آدمی کا زندہ رہنا مشکل کردیا ہے حکومت نے پٹرول،ڈیزل اور مٹی کے تیل کی قیمتوں میں جو غیر معمولی اضافہ کیا ہے،اِس کے اثرات ضروریات زندگی کے نرخوں میں اضافے کی شکل میں پہلے ہی ظاہر ہونا شروع ہوگئے ہیں،ہماری نظر میں پٹرولیم مصنوعات کے نرخوں میں اضافہ حکومت کا ایک ایسا فیصلہ ہے،جس سے طوفانی مہنگائی کا ایک نیا ریلہ ہی نہیں آئے گا بلکہ ٹرانسپورٹ کے پہلے سے ناقابل برداشت کرایوں میں مزید اضافے سے شہری زندگی ساکت وجامد ہو کر بھی رہ جائے گی۔

یہ درست ہے کہ موجودہ حکومت نے اٹھارویں اور انیسویں ترمیم پاس کراکے آئین کو بحال کیا ہے،این ایف سی ایوارڈ،آغاز حقوق بلوچستان پیکیج جیسے اقدامات سے اختلافات کا کسی حد تک خاتمہ ہوا،لیکن ہمارا سوال یہ ہے کہ جس اٹھارویں اور انیسویں ترمیم کو وزیر اعظم عوام کیلئے نئے سال کا تحفہ قرار دے رہے

ہیں، کیا اِس سے عوام کی بھوک مٹ جائے گی، کیا غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر لوگ اپنے گردے نہیں بیچیں گے، کیا بے روزگاری کا خاتمہ ہو جائے گا اور کیا عوام کے تمام مسائل حل ہو جائیں، اگر اِن تمام سوالوں کا ہاں میں ہے تو واقعی وزیر اعظم صاحب یہ قوم کیلئے سب سے بڑا اور قیمتی تحفہ ہے،اس کامیابی پر ہم آپ کو مبارکباد پیش کرتے ہیں، لیکن اگر ایسا نہیں اور یقیناً نہیں، تو آپ اِن ترمیمات کو ملک کی عوام کیلئے سال کا تحفہ قرار دے کر اُن کے زخموں پر نمک پاشی نہ کریں، جناب صدر اور محترم وزیر اعظم صاحب، عوام یہ سوال کر رہے ہیں کہ آپ تو روٹی، کپڑا اور مکان کے نعروں کی گونج میں اقتدار کے ایوانوں میں داخل ہوئے تھے، آج اُس نعرے کا کیا بنا، کیا آپ پاکستان کے کروڑوں غریبوں کیلئے بھی کوئی تحفہ دیں گے یا یہی سناتے رہیں گے کہ عوام انتظار کریں، ہمیں پانچ سال پورے کرنے دیں، ہم عوام کو ریلیف دیں گے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ جمہوری حکومت اور سیاستدانوں کو 63 برسوں کی غلطیوں سے سبق سیکھنے اور آمروں کے میرے "عزیز ہم وطنو" کی آواز کے ساتھ اقتدار پر قابض ہونے کی وجوہات کا تدارک کرکے حقیقی معنوں میں اپنی اصلاح اور ملک و قوم کی خدمت کرنے کا بہترین موقع ملا ہے، اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے تو صاف نظر آرہا ہے کہ عوام جمہوری حکومتوں سے نالاں ہو کر غیر جمہوری قوتوں کی جانب دیکھیں گی، جس کی تمام تر ذمہ داری موجودہ حکومت اور

سیاستدانوں پر ہی عائد ہوگی، کیونکہ عوام نے تو انہیں جمہوری طریقے سے منتخب کیا تھا لیکن یہ خود نہ تو جمہوریت کی حفاظت کر سکتے ہیں اور نہ عوامی حقوق کی، لہذا آج ضرورت اِس اَمر کی ہے کہ ملک کی اپوزیشن اور تمام سیاسی پارٹیاں حکومت کے باقی رہنے یا جمہوری طریقے سے چلے جانے کی فکر کرنے کی بجائے ملک اور قوم کے مفادات کو مقدم رکھیں جبکہ حکومت کو چاہیے کہ وہ عوام کے بنیادی مسائل کا ادراک کرتے ہوئے اُس کے ممکنہ حل کی طرف بھرپور توجہ دے، کیونکہ اِسی میں جمہوریت کی بقاء اور استحکام کا راز مضمر ہے۔

غیرت مسلم زندہ ہے۔۔۔۔

چار جنوری 2011ء کی سہ پہر گورنر پنجاب سلمان تاثیر کو اسلام آباد کی کوہسار مارکیٹ کے قریب اُس وقت ایلیٹ فورس کے ایک گارڈ ملک ممتاز حسین قادری نے قتل کر دیا،جب وہ ایک ریستوران سے کھانا کھا کر اپنی گاڑی میں سوار ہو رہے تھے،میڈیا رپورٹ کے مطابق ایلیٹ فورس کے اہلکار نے گورنر پنجاب کو 27 گولیاں ماریں،پھر اپنی گن زمین پر رکھ کر خود کو گرفتاری کیلئے پیش کر دیا،گورنر پنجاب کو قتل کرنے والے گارڈ ملک ممتاز حسین قادری کا کہنا تھا کہ "سلمان تاثیر نے توہین رسالت کے قانون کو" کالا قانون" کہا تھا،وہ توہین رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتکب ہوئے،اُن کی گستاخ رسول آسیہ مسیح کے ساتھ ہمدردی اور پھانسی سے بچانے کی کوشش پر مجھے شدید رنج پہنچا تھا،اِس لئے میں نے گورنر کے قتل کا منصوبہ بنایا،مجھے اپنے کئے پر کوئی ندامت نہیں،گارڈ ملک ممتاز حسین قادری کا یہ بھی کہنا تھا کہ اُس کا کسی تنظیم سے کوئی تعلق نہیں،اُس نے غلامی رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ خون کیا ہے کہ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اپنی غلامی میں قبول کرلیں۔" موقع پر موجود ایک عینی شاہد کے مطابق ملک ممتاز حسین قادری نے سلمان تاثیر کو مارنے کے بعد "اللہ اکبر" کا نعرہ لگایا اور گن زمین پر رکھتے ہوئے کہا کہ "یہ شخص گستاخ رسول تھا،اِسی لئے واجب القتل تھا،گستاخ

رسول کی یہی سزا ہے، موقع پر موجود سب لوگ دیکھ لیں کہ میں نے گورنر کے علاوہ کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔"

سب جانتے ہیں کہ گورنر پنجاب سلمان تاثیر نے 20 نومبر 2010ء کو توہین رسالت کی مرتکب آسیہ مسیح سے شیخوپورہ ڈسٹرکٹ جیل میں ملاقات کی تھی اور آسیہ مسیح کے ہمراہ پریس کانفرنس کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ بے گناہ ہے اور وہ صدر سے آسیہ مسیح کی سزا معاف کرنے کی سفارش کرینگے، جبکہ آسیہ مسیح کو توہین رسالت کے جرم میں ننکانہ صاحب کی مقامی عدالت سزائے موت سنا چکی ہے، سلمان تاثیر کی جانب سے یہ کہنے کے بعد کہ وہ صدر زرداری سے آسیہ مسیح کو معاف کرنے کی درخواست کریں گے، مذہبی رہنماؤں نے گورنر پنجاب کو گستاخ رسول قرار دیا تھا، سلمان تاثیر نے جیل میں آسیہ مسیح سے ملاقات کے بعد میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ "آسیہ مسیح غریب اور اقلیتی برادری سے تعلق رکھتی ہے، اُس کی سزا معاف کر دینی چاہئے، اُن کا کہنا تھا کہ آسیہ مسیح نے اِس بات سے انکار کیا ہے کہ اُس نے اسلام یا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی ہے، بلکہ انہوں نے الزام لگایا کہ دیہاتیوں نے آسیہ کے ساتھ زیادتی کرنے اور اُسے گلیوں میں گھسیٹنے کیلئے گھر تک اُس کا پیچھا بھی کیا ہے، سلمان تاثیر کا کہنا تھا کہ وہ عدالتی کاروائی میں مداخلت نہیں کرنا چاہتے، تاہم وہ ہر ممکن کوشش کریں گے کہ آسیہ کو اِس جرم میں سزا نہ

ملے جو اُس نے کیا ہی نہیں۔
اِس گفتگو کے دو دن بعد ایک نجی ٹی وی چینل کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ پاکستان کا توہین رسالت قانون انسان کا بنایا ہوا ہے،خدا کی طرف سے نہیں ہے،انہوں نے الزام لگایا کہ اُن کی آسیہ مسیح کے ساتھ ملاقات کو مذہبی رہنماؤں کی جانب سے سیاسی رنگ دیا جارہا ہے تاکہ عوام کو اُن کے خلاف کیا جاسکے،اُن کیلئے یہ ایشو اِس حوالے سے اہم ہے کہ توہین رسالت قانون پر نظرثانی کی جائے،انہوں نے کہا کہ میں نے جامع تحقیقات کرائی ہیں،جس سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ آسیہ کے خلاف اِس قانون کا غلط استعمال کیا گیا ہے،یہ بات بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ سلمان تاثیر نے توہین رسالت کی مرتکب آسیہ مسیح کے حق میں ایک سے زیادہ بیانات جاری کیے،اُن کے اِس طرز عمل پر عوام اور دینی حلقوں میں شدید غم وغصے کی کیفیت پائی جاتی تھی،اسی وجہ سے وہ دینی اور مذہبی حلقوں میں متنازعہ شخصیت بن کر ابھرے تھے۔
گورنر سلمان تاثیر کے اسلام اور اسلامی تعلیمات کے خلاف انہی متنازعہ اور دل آزار خیالات اور آسیہ مسیح سے ملاقات کے بعد مذہبی رہنماؤں نے انہیں شدید تنقید کا نشانہ بنایا اور کہا کہ اگر صدر نے توہین رسالت کی ملزمہ کو معافی دی تو اُن کے خلاف ملک بھر میں شدید احتجاج کیا جائے گا،توہین رسالت

قانون کی حامی مذہبی جماعتوں کے اتحاد "تحریک ناموس رسالت" نے تو صدر زرداری سے توہین رسالت قانون کے خلاف سخت بیانات دینے پر گورنر پنجاب کو برطرف کرنے کا مطالبہ بھی کیا اور 31 دسمبر 2010ء کی تاریخی ملک ہڑتال کرکے ثابت کردیا کہ مسلمانان پاکستان کیا چاہتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ حضور ختمی المرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و ناموس پوری کائنات کا سرمایہ حیات ہے،اِس قیمتی متاع کا تحفظ ہر مسلمان اپنی جان سے زیادہ ضروری سمجھتا ہے،دنیا بھر کے مسلمان بلا تفریق رنگ و نسل اور زبان و علاقہ اِس معاملہ میں بنیان مرصوص کی طرح ہیں، کیونکہ یہی اُن کے ایمان کا تقاضہ ہے،یہی وجہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ والہانہ عشق کے تقاضے کے حوالے سے وہ ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے مسئلے میں انتہائی جذباتی نظر آتے ہیں،اور آخر کیوں نہ ہوں کہ ایک پکا اور سچا مسلمان اِس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کر ہی نہیں سکتا،ایک مسلمان اپنے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم کے نام و ناموس پر مرمٹنے اور اُس کی خاطر دنیا کی ہر چیز قربان کرنے کو اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتا ہے،ہماری اِس بات پر تاریخ کی کسی جرح سے نہ ٹوٹنے والی ایسی شہادتیں موجود ہیں جو ایک مسلمہ حقیقت کی بن چکی ہیں،تاریخ گواہ ہے کہ جہاں بھی مسلمانوں کو اقتدار حاصل رہا،وہاں کی عدالتیں شاتمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سزائے موت کا فیصلہ سناتی رہیں، لیکن اِس کے برعکس جب کبھی یا جہاں کہیں اُن کے پاس حکومت نہیں

رہی، وہاں جانثارانِ تحفظ ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلم حکومت کے رائج قوانین کی پرواہ کیے بغیر گستاخان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کیفر کردار تک پہنچایا اور خود ہنستے ہوئے تختہ دار پر چڑھ گئے۔

یہی وہ حقائق ہیں جس کی وجہ سے اسلام کے نام پر معرض وجود میں آنے والے پاکستان کے مسلمان ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بہت حساس واقع ہوئے ہیں اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ادنی سے ادنی گستاخی کو بھی ہرگز برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں، ایک مسلمان اِس حوالے سے کس قدر جذباتی ہوتا ہے، اِس کا اندازہ اِس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جرمنی میں جب ایک شخص نے خاکوں کی صورت توہین رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی جسارت کی، تو وہاں زیر تعلیم راولپنڈی سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان عامر چیمہ نے اُس پر قاتلانہ حملہ کیا، لیکن وہ بال بال بچ گیا، جس کے بعد عامر چیمہ کو پر اسرار انداز میں دوران حراست شہید کر دیا گیا، جب عامر چیمہ کی لاش پاکستان پہنچی تو اُس کی شہادت پر ہزاروں لوگوں نے اُس کے گھر پہنچ کر عامر چیمہ کے والد کو بیٹے کی شہادت پر نہ صرف مبارکباد دی، بلکہ جس محلے میں عامر چیمہ شہید کی رہائش تھی، اُس کے قریب واقع چوک کا نام" عامر چیمہ شہید چوک" رکھ دیا، لوگ آج بھی اِس نوجوان سے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کرتے ہیں اور اُسے شہید ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم قرار دیتے ہیں۔

قارئین محترم،برصغیر پاک و ہند میں توہین رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارتکاب کرنیوالوں کے محاسبے کا سلسلہ بہت پرانا ہے، تقسیم ہند سے پہلے لاہور میں راج پال نام کے ایک ہندو نے توہین رسالت کا ارتکاب کیا تو لاکھوں مسلمان سڑکوں پر نکل آئے تھے، ایک انگریز مجسٹریٹ نے جب راج پال کو رہا کر دیا تو مسلمانوں کا غم و غصہ اپنے عروج پر پہنچ گیا، بہت سے لوگوں نے راج پال کو قتل کرنے کی نیت کی، لیکن یہ سعادت ایک ایسے نوجوان کے حصے میں آئی جو ایک بڑھئی کا بیٹا تھا، علم دین نام کے اِس نوجوان نے راج پال کو چھریوں کے پے در پے وار کرکے موت کے گھاٹ اتار دیا، بعد میں علم دین پر مقدمہ چلایا گیا، قائدا عظم محمد علی جناح نے علم دین کا مقدمہ لڑا، جبکہ مفکر پاکستان علامہ اقبال نے اُس کی رہائی کیلئے مہم چلائی، لیکن انگریز عدالت نے علم دین کو پھانسی کی سزا دی، جسے اُس بہادر سپوت نے خوشدلی سے قبول کیا اور تختہ دار پر جھول گیا، علم دین شہید زندگی کے آخری سانس تک اِس بات پر فخر محسوس کرتا رہا کہ اُس نے ایک گستاخ رسول کو واصل جہنم کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کیا ہے،آج بھی علم دین کو غازی علم دین شہید کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اقبال کے یہ خراج عقیدت " اسی تہ گلاں کردے رہے،ترکھاں دا منڈا بازی لے گیا۔" تاریخ کا حصہ ہے۔

خیال رہے کہ غازی علم دین شہید کے جسد خاکی لیجانے کیلئے اپنے گھر سے چارپائی دینے اور نوجوانی میں علامہ اقبال کے قدموں میں بیٹھنے والے انگریزی ادب میں.برصغیر کے پہلے پی ایچ ڈی کا اعزاز رکھنے والے ممتاز دانشور وادیب ڈاکٹر محمد دین تاثیر کے بیٹے سلمان تاثیر سے عوام کو یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اتنے اہم حساس اور نازک معاملے پر اس قدر غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کریں گے، سلمان تاثیر نے نہ صرف یہ کہ قانون توہین رسالت کو کالا قانون کہا اور بنا تحقیق آسیہ مسیح کو بے گناہ قرار دیا، بلکہ عدالتی فیصلے پر تنقید کرکے خود توہین عدالت کے بھی مرتکب ہوئے،انھوں نے اِس بات کی بھی پرواہ نہیں کہ اُن کے اِس دل آزار،افسوسناک طرز عمل سے ملک کے لاکھوں عوام جو ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم پر کٹ مرنے کا جذبہ رکھتے ہیں،کے دلوں پر کیا بیتے گی،افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ ببانگ دہل ایسے لوگوں کو جوتے کی نوک پر رکھنے کی بات بھی کرتے رہے، جب حکومت کا ایک ایسا ذمہ دار نمائندہ اور صوبے آئینی سربراہ جو کہ خود عدالتی فیصلوں پر عمل کرنے اور کرانے کا پابند ہو، اسلامیان پاکستان کے جذبات کو.برانگیختہ کرنے والے بیانات دے گا،دین ومذہب کی تعلیمات کے خلاف دل آزار باتیں کرے گا تو اسلام اور ذات رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق رکھنے والوں کا مشتعل ہونا اور بھڑکنا ایک فطری عمل ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ سابق فوجی آمر کے نامزد کردہ گورنر سلمان تاثیر
جنھیں صدر آصف زرداری نے اِس منصب پر برقرار رکھا، کی تبدیلی کا مطالبہ وزیراعلیٰ
پنجاب کی جانب سے کئی مرتبہ کیا گیا، لیکن ایوان صدر کی حمایت ہونے کی وجہ سے وہ
مرتے دم تک اپنے عہدے پر برقرار رہے، سلمان تاثیر کے بارے یہ بھی گمان بھی کیا
جاتا ہے کہ انہیں اس معاملے میں امریکہ کی سرپرستی حاصل تھی، یہ بات بھی نوٹ کرنے
والی ہے کہ امریکی حکام نے توہین رسالت قانون 295 سی، قادیانیوں کو غیر مسلم
اقلیت قرار دینے والی ترمیم اور امتناع قادیانیت آرڈیننس کو ختم کرانے کیلئے کئی بار
کوششیں کیں، کیونکہ یہ قوانین امریکہ، امریکی حواریوں اور قادیانی لابی کے سینوں میں
نیزے کی انی کی طرح کھٹکتے ہیں، امریکی صدر سے لے کر امریکی سفیر تک ہر ایک کی یہی
کوشش ہوتی ہے کہ یہ قوانین ختم کردیئے جائیں تاکہ دشمنان اسلام کو شان رسالت
مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں توہین و تحقیر کا کھلا لائسنس مل جائے، لیکن عوامی ردعمل
کو دیکھتے ہوئے کسی بھی حکومت کی یہ جرات نہ ہوسکی کہ اِن قوانین میں چھیڑ چھاڑ
کرسکے، یہ بات بھی ریکارڈ کا حصہ ہے کہ بعض حکومتی ذمہ دار، این جی اوز اور نام نہاد
سیکولر ذہن لوگ بڑے زور و شور سے مسلسل اِن قوانین کی مخالفت کرتے رہے
ہیں، جس کی وجہ سے مسلمانوں کے جذبات بھڑکتے رہے، جس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ جن
لوگوں کے ذمے سلمان تاثیر کی سیکورٹی تھی انہی

میں سے ایک شخص نے سلمان تاثیر کو گولیاں مار کر قتل کر دیا۔
آج مغربی میڈیا یہ پروپیگنڈہ کر رہا ہے کہ پاکستان میں مذہب کے نام پر اختلاف کی گنجائش ختم ہو چکی ہے، حکمراں جماعت کے لوگ یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے کہ سلمان تاثیر کا قتل مذہبی تشدد کا شاخسانہ اور بڑھتے ہوئے مذہبی جنون کی علامت ہے ہمارے خیال میں یہ پروپیگنڈہ قطعاً غلط ہے، ہم مانتے ہیں کہ ماورائے آئین اقدامات کی کسی طور حوصلہ افزائی اور حمایت نہیں کی جا سکتی، لیکن جب ریاست اپنے فرائض سے غفلت برتے اور ریاستی ذمہ داران موجود قانون اور اُس قانون کے تحت دیئے گئے عدالتی فیصلوں کا احترام اور پاسداری نہ کریں، قانون کا مذاق اڑائیں، مجرموں کی وکالت کریں، عوام کے مذہبی جذبات و احساسات سے کھیلیں اور اُس قانون کے خلاف اعلان جنگ کریں، جس کا مقصد ذات رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم،اور مقدس شخصیات کی تحریم و تکریم کے ساتھ ملک کا استحکام، معاشرے کی بقاء اور فرد کا تحفظ اور سلامتی ہو، تو پھر ملک میں غازی علم دین اور ممتاز حسین قادری جیسے لوگوں کو پیدا ہونے سے کون روک سکتا ہے،آج گورنر پنجاب کا قتل ناموس رسالت قانون کی ضرورت، اہمیت اور افادیت کو ثابت کرتا ہے، ریاست اور معاشرے کے استحکام اور بقاء کیلئے ضروری ہے کہ اُس کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت بالکل اُسی طرح کی جائے جس طرح جغرافیائی سر حدوں کی جاتی ہے،جمعیت علماء پاکستان کے صدر اور تحریک تحفظ

ناموس رسالت کے کنوینر ڈاکٹر ابوالخیر محمد زبیر کا یہ مطالبہ قابل توجہ ہے کہ عدالت اس معاملے کی تحقیقات کرے کہ گورنر پنجاب کا قتل کس جذبے کے تحت کیا گیا، لہٰذا اس واقعہ کے اصل محرکات کی طرف توجہ دینا ہوگی اور سوچنا ہوگا کہ وہ کیا عوامل تھے جو ایک ایسے نوجوان جس کی ایک سال قبل شادی ہوئی، جس کا دو ماہ کا بیٹا ہے، جو پانچ بہنوں کا بھائی اور جس کا باپ ایک معمولی معمولی راج مستری کا کام کرتا ہے، کو حالات اِس نہج پر لے گئے کہ اُس نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، حکومت کو چاہیے کہ وہ اِس معاملے کو سیاسی رنگ دینے کے بجائے اصل اسباب و محرکات پر توجہ دے اور آئندہ لوگوں کو اِس راہ پر چلنے سے بچانے کیلئے کسی بھی ایسی ترمیم سے گریز کرے جس کا مقصد توہین رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے مجرموں کو بچانا یا فائدہ پہنچانا ہو۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ ملک ممتاز حسین قادری کا اعترافی بیان اور میڈیا سے کی گئی گفتگو صاف ظاہر کرتی ہے کہ اُس کا عمل عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور جذبہ ایمانی کا مظہر ہے، جو کہ خالصتاً ایک مذہبی معاملہ ہے، جسے حکومت سیاسی رنگ دے کر اِس قانون میں ممکنہ ترمیم کے خلاف مذہبی جماعتوں کے اتحاد کے نتیجے میں بیدار ہونے والی تحریک کو سبوتاژ کرنا چاہتی ہے اور ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کیلئے کٹ مرنے کے اُس ایمانی جذبے کو سرد کرنا چاہتی ہے جو ممتاز حسین قادری کے عمل سے اسلامیان پاکستان کے دلوں میں ایک

بار پھر زندہ و جاوید ہوگیا ہے، حکومت چاہتی ہے کسی طرح اس قتل کو سیاسی رنگ دے کر سارا ملبہ پنجاب گورنمنٹ پر ڈال دیا جائے، مقاصد خواہ کچھ بھی ہوں، لیکن ہر پاکستانی عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ سلمان تاثیر کے قتل کا اصل محرک کیا ہے، ایک طرف جہاں عوامی رائے عامہ سمیت موبائل مسیجز، فیس بک اور نیٹ پر موجود مواد اِس بات کی گواہ ہیں، تو دوسری طرف علماء کا نماز جنازہ پڑھنے سے انکار، مختلف شہروں میں ممتاز حسین قادری کی رہائی کیلئے ہونے والے مظاہرے، خاندان کی کفالت اور دو کروڑ کے انعام کا اعلان، عدالت میں پیشی کے وقت عوام اور وکلاء کا ہار پھول اور عقیدتی بوسوں سے والہانہ استقبال، اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے اور متعدد تنظیموں سمیت سینکڑوں وکلاء کا ممتاز حسین قادری کا مقدمہ لڑنے کا اعلان اِس بات کا اظہار ہے کہ وہ مسلمانان پاکستان کی نظر میں کوئی مذہبی جنونی اور دہشت گرد مجرم نہیں بلکہ ایک ایسا مجاہد ہے جس نے اُن کے جذبہ ایمانی کو تازگی اور نئی حرارت بخشی ہے، اسلامیان پاکستان سمجھتے ہیں کہ ملک ممتاز حسین قادری آج کا "غازی علم دین" ہے، جس نے غازی مرید حسین، غازی عبدالرشید، غازی عبدالقیوم، غازی عبد اللہ، غازی منظور حسین، غازی محمد صدیق، غازی عبدالمنان، غازی میاں محمد، غازی احمد دین، غازی معراج الدین، غازی فاروق، غازی حاجی محمد مانک اور غازی عامر چیمہ جیسے مجاہدوں (جنھوں نے راجپال، سوامی شردھانند، نتھورام، چنچل سنگھ، کھیم چند، پالامل، بھیشو، چرن

داس، ویداسنگھ، ہردیال سنگھ، نعمت احمر قادیانی، عبدالحق قادیانی جیسے مرتدوں کو
واصل جہنم کیا) کی سنت کو زندہ کرکے ملت اسلامیہ کے جذبات کی ترجمانی کی اور یہ
ثابت کردیا کہ پاکستانی مسلمان بہت کچھ برداشت کر سکتے ہیں، لیکن شاتمان رسول صلی
اللہ علیہ وسلم اور اُن کے حمایتوں کو کسی طور بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

بتلا دو گستاخ نبی کو غیرت مسلم زندہ ہے
دین پر مرمٹنے کا جذبہ کل بھی تھا اور آج بھی ہے

غلام ریاست کے غلام۔۔۔۔

جب ذہن میں نفرت، بغض و عناد اور کینہ بھرا ہوا اور دل تعصب اور کدورت کی گندھ
سے آلودہ ہو تو زبان سے شر انگیز، منافقانہ کلمات کا ادا ہونا تعجب خیز بات
نہیں، قانون توہین رسالت 295 سی کے حوالے سے عیسائیوں کے روحانی پیشوا پوپ
بینڈیکٹ کا حالیہ بیان اِسی کیفیت کا عکاس ہے، موصوف فرماتے ہیں کہ "پاکستان کے
حکمران حوصلہ کریں، آگے بڑھیں اور ناموس رسالت کے قانون کو ختم کرکے آسیہ بی
بی کو فوراً رہا کریں۔" 10 جنوری کو سال نو کی روایتی تقریب میں 119 ممالک کے
سفراء سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے" مصر میں عیسائیوں کے خلاف زیادتیوں پر
احتجاج اور حکومتِ مصر سے اُن کے تحفظ کو یقینی بنانے کا مطالبہ کرتے ہوئے
حکومتِ پاکستان سے کہا کہ وہ قانونِ توہینِ رسالت کی تنسیخ آسیہ کی فوری رہائی اور
مسیحی برادری پر مبینہ تشدد کے خاتمے کیلئے اقدامات کرے، اُن کا کہنا تھا کہ پاکستان میں
ناموس رسالت قانون کے ذریعے مذہبی آزادی کا حق چھینا جارہا ہے اور یہ اقلیتوں کے
خلاف جبر کا ایک ہتھیار بن گیا ہے۔" پاپائے روم کے اِس سڑے تعفن انگیز بیان کے
بعد پاکستان کے عوام میں شدید غم و غصے کی لہر دوڑ گئی، لیکن پاکستان کے مغرب نواز
غلامانہ ذہنیت پسند حکمرانوں نے تادم تحریر نہ تو پاپائے روم کے اِس گستاخانہ بیان کی
مذمت کی اور نہ ہی مصر جس کے

حکمران حسنی مبارک کو ساری دنیا سامراج کا ایجنٹ قرار دیتی ہے، جتنی جرات کا مظاہرہ کر سکی کہ ویٹی کن کے سفیر کو ملک سے نکل جانے کا حکم دے دیتی۔

پوپ بینڈیکٹ دنیا میں عیسائیت کے مبلغ اعظم ہیں، لیکن المیہ یہ ہے کہ عیسائیت کے اِس روحانی پیشوا کے ذہن و فکر پر دین اسلام اور صاحب اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ کے حوالے سے بغض و عناد اور کدورت کے گھناؤنے مکروہ جالے تنے ہوئے ہیں اور دل پر نفرت اور تعصب کی گندھی میلی تہیں جمی ہوئی ہیں، جو اُن کے موجودہ بیان میں حرف حرف اٹھتے تعفن سے آرہی ہے، عالم کفر کی طرح یہ پاپائے روم کے پیٹ کا درد اور مروڑ ہی ہے جس نے پوپ کو اپنے فرائض منصبی بھلا کر پاکستان کے قانون ناموس رسالت پر دل آزار اور ناروا تبصرے پر آمادہ کیا،اسلام دشمنی میں وہ یہ اہم اور بنیادی بات بھی بھول گئے کہ دنیا کا ہر مذہب اپنے عقائد و نظریات اور برگزیدہ مذہبی ہستیوں کے حوالے سے عقیدت و احترام اور تقدس کا ایک ایسا مخصوص دائرہ کار رکھتا ہے، جسے اُس مذہب کے ماننے والے اپنی متاع حیات سمجھتے ہوئے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں، یہ وہ اصول ہے جو آپ کو دنیا کے ہر مذہب میں ملے گا، یہ حقیقت بھی سب جانتے ہیں کہ جس طرح عیسائیت کے بارے میں مسلم علماء کی کوئی رائے، کسی عیسائی کیلئے قابل قبول نہیں ہے، بالکل اُسی طرح کسی عیسائی یا اُس کے پیشوا کو یہ اجازت نہیں دی جا سکتی

کہ وہ اسلام یا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور مقدس شخصیات کے بارے میں تہذیب و اخلاق سے گری ہوئی غیر محتاط زبان استعمال کرے اور اُس ملک کے منتخب نمائندوں کا منظور کردہ کسی قانون یا اُس قانون کے تحت سزا یافتہ کسی مجرم کی رہائی کا مطالبہ کرے۔

اَمرِ واقعہ یہ ہے کہ ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم قانون اور اِس قانون کی زد میں آنیوالی ملعونہ آسیہ کی رہائی کے حوالے سے پوپ نے جس ہذیانی کیفیت کا مظاہرہ کیا ہے، وہ نہ صرف یہ کہ اُن کے منصب کے شایان شان نہیں بلکہ اُن کا یہ بیان کی کسی مذہب کے روحانی پیشوا کے بجائے ایک اسلام دشمن متعصب شخص کی دلی کیفیت کا مظہر نظر آتا ہے، جس کے ذریعہ پیغمبر آخرالزماں حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم کے دین حق اور انکی ذاتِ مبارکہ کے بارے میں مغلظات بکنے کی کھلی چھوٹ کی ترغیب دی گئی ہے، پوپ کا یہ بیان مذہبی رواداری کے بجائے اشتعال انگیز جنونیت کا ایسا راستہ دکھاتا ہے جس کا لازماً نتیجہ تہذیبوں کے ٹکراؤ پر منتج ہوگا، واضح رہے کہ پوپ بینڈیکٹ اِس سے قبل بھی متعدد مواقع پر نہ صرف دین اسلام کے حوالے سے متنازعہ بیانات دے چکے ہیں بلکہ مادر پدر آزاد مغربی میڈیا پر دیئے جانیوالے گستاخانہ خاکوں کی آزادی اظہار رائے کے جواز کے تحت تائید بھی کر چکے ہیں، دین اسلام کے بارے میں پوپ بینڈکٹ اور اِس قبیل کے دوسرے آزادی اظہار اور انسانی حقوق کے

تحفظ کے نام نہاد علمبرداروں کا تعصب اپنی جگہ، مگر کوئی مسلمان اپنے عقیدے اور ایمان کی بنیاد پر کسی بھی نبی اور پیغمبر کی شان میں گستاخی کا تصور تک نہیں کر سکتا، کیونکہ تمام مذاہب کی برگزیدہ ہستیوں بشمول حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا احترام ایک مسلمان اپنے ایمان کا لازمی حصہ سمجھتا ہے۔

جبکہ ناموس رسالت کا قانون صرف حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و ناموس کے تحفظ کا ہی تقاضہ نہیں بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کی عزت و تکریم کا تحفظ اِس قانون کے زمرے میں آتا ہے، لہذا اِس قانون سے صرف مسلمانوں کو ہی نہیں مسیحیوں کو بھی اتنا ہی فائدہ ہے جتنا کہ مسلمانوں کو، جبکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اِس قانون کی وجہ سے ہی گستاخانِ رسول قانون و انصاف کی عملداری کے دائرے میں آکر اپنے آپ کو عاشقان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تادیبی کاروائی سے بھی بچاتے ہیں،اِس تناظر میں تو ناموس رسالت کے قانون کے برقرار رہنے کے بارے میں کوئی دو رائے نہیں ہونی چاہیے، یہاں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ پوپ بینڈیکٹ نے توہین مسیحیت کے قانون کے خاتمہ کا کبھی تقاضہ نہیں کیا، حالانکہ اُس قانون کے تحت صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین پر ہی سزائے موت نہیں دی جاتی، بلکہ پادری کی توہین بھی اِسی قانون کے تحت اتنی ہی سزا ہے، پوپ کو بخوبی علم ہو گا کہ ملعون سلمان رشدی کیخلاف برطانیہ میں مسلمانوں کے مظاہروں کے دوران برطانوی پارلیمنٹ سے

مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ توہین مسیحیت کے قانون میں ترمیم کرکے دیگر انبیاء علیہم السلام کی توہین پر بھی اِس قانون کے اطلاق کی گنجائش نکالے، مگر یہ مطالبہ اِس جواز کے ساتھ مسترد کر دیا گیا کہ توہین مسیحیت کے قانون میں کسی قسم کی ترمیم ممکن نہیں ہے، یہ قانون صرف برطانیہ و آئیرلینڈ میں ہی نہیں، سارے یورپ میں لاگو ہے، چنانچہ اِس صورتحال میں ہمیں ناموس رسالت کے قانون میں ترمیم یا اسکے یکسر خاتمہ کے مطالبہ میں مسلمانوں اور دین اسلام سے نفرت اور تعصب کے سوا کسی اور جذبے کا عمل دخل نظر نہیں آتا۔

ہمارا کہنا ہے کہ عیسائیت کے پیشوائے اعظم کو اگر تہذیبوں کے مابین ہم آہنگی، مختلف معاشروں کے درمیان خیر سگالی اور امن عالم سے اتنی ہی دلچسپی ہے اور وہ خلوص دل سے تحمل، برداشت اور رواداری کے جذبوں کا فروغ چاہتے ہیں تو انہیں ایک نظر اُن ممالک پر بھی ڈال لینی چاہئے جہاں اُن کے پیروکاروں کی حکمرانی ہے، وہاں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا ہے، کیا پوپ کو خبر نہیں کہ بیسیوں ممالک پر محیط اُن کی مذہبی سلطنت میں مسلمانوں کے ساتھ کیا رویہ اپنایا جاتا ہے؟ کہیں وہ اپنی مساجد کو مساجد نہیں کہہ سکتے تو کہیں وہ مینار اور گنبد نہیں بنا سکتے، کہیں نقاب اور حجاب کو نشانہ عتاب بنایا جا رہا ہے تو کہیں داڑھی رکھنے کا تعلق دہشت گردی سے جوڑا جاتا ہے، کیا پوپ نہیں جانتے کہ آج امریکہ جو دنیا میں مذہبی آزادی، انسانی حقوق

اور اظہار رائے کا سب سے بڑا ٹھیکیدار ہے، میں مسلمان گراؤنڈ زیرو میں ایک ایسا کمیونٹی سینٹر نہیں بنا سکتے جس کے ایک کمرے میں نماز کی سہولت رکھی گئی ہو، کیا پوپ بینڈیکٹ نہیں جانتے کہ اُن کے مقلدین کھلے عام یہ کہتے پھرتے ہیں کہ "یہاں دہشت گردوں کو عبادت گاہ بنانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔" کیا پوپ نہیں جانتے کہ اُن کے شیدائی اور کروسیڈ کے علمبردار کوفہ و بغداد کے گلی کوچوں میں کیا کھیل کھیلتے رہے ہیں؟ کیا وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ اُن کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے افغانستان میں کیا کر رہے ہیں؟ کیا انہیں اِس وحشت و درندگی کی بھی خبر نہیں جس کا نشانہ فلسطین اور کشمیر کے بے گناہ مسلمان بنے ہوئے ہیں؟ کیا پوپ بینڈیکٹ نہیں جانتے کہ وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے برس ہا برس سے مسلم بیزاری اور اسلام دشمنی کو اپنی پالیسی کا بنیادی رکن بنا رکھا ہے؟ ہم پوپ اور اُن کے حواریوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا کبھی انہوں نے اِس طرف توجہ دی، دنیا بھر میں مسلمانوں کے خلاف ہونے والے درندگی کے مظاہروں کے خلاف بات کی، کیا کبھی کوئی آواز اٹھائی؟ اگر نہیں تو پھر انہیں یہ حق کس نے دیا کہ وہ آسیہ مسیح کے کیس میں دخل دیں اور پاکستان کے آئین و قانون میں کھلی مداخلت کریں۔

ساری دنیا جانتی ہے کہ پوپ نے اسقاط حمل کے قانون کی حمایت کی، جبکہ اسلام اِس کی مخالفت کرتا ہے، پوپ نے ہم جنس پرستی کے قانون کو جائز قرار دیا جو

کہ غیر فطری عمل ہے، لیکن مسلمان ممالک میں سے کوئی نہیں بولا، مسلمانوں نے کبھی یورپ، امریکہ اور برطانیہ کے کسی قوانین میں تبدیلی کا مطالبہ نہیں کیا،اِس لیے کہ تمہارے ملک ہیں، تمہارے قانون ہیں، جو چاہے کرتے پھرو، ہمیں اِس میں دخل اندازی کا اختیار حاصل نہیں، تو پھر پوپ بینڈیکٹ کس اصول اور ضابطے کے تحت قانون توہین رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کو واپس لینے کا مطالبہ کر رہے ہیں؟ درحقیقت مغرب کے اِسی رویے نے پاکستانی مسلمانوں کو مشتعل کر رکھا ہے اور وہ انتہا پسندی کی طرف مائل ہو رہے ہیں، مغرب سے جب بھی اِس طرح کا کوئی مطالبہ سامنے آیا تو پاکستان میں اِس کا شدید رد عمل ہوا اور عوام یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ امریکہ اور مغرب ہمیں کیوں اُس راستے پر چلانا چاہتے ہیں جو ہمارے دین، ہماری روایات، ہماری شناخت اور ہماری طرز معاشرت سے مطابقت نہیں رکھتا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ اِس حوالے سے سارا قصور ہمارے حکمرانوں کا ہے جو اقتدار کے لالچ میں امریکہ اور مغرب سے ایسے وعدے کر لیتے ہیں جنہیں پورا کرنا اُن کے بس میں نہیں ہوتا، آج ہم سے اچھا تو مصر ہے جس نے یہ کہہ کر ویٹی کن سے اپنے سفیر کو واپس بلا لیا کہ "ہم کسی کو اپنے ذاتی معاملات میں مداخلت کی اجازت نہیں دے سکتے۔" لیکن حیرت ہے کہ پوپ کے براہ راست حکم اور مداخلت کے باوجود آج ہمارے حکمرانوں اور دفتر خارجہ کا مہر بلب ہونا اِس بات کا غماز ہے کہ ہم ایک ایسی غلام ریاست بن چکے ہیں، جس کا کام صرف اپنے آقاؤں کے حکم کی پیروی کرنا رہ گیا ہے اور دنیا میں ایسی

ریاست کی اپنی کوئی عزت، کوئی وقار اور کوئی انا و خودی نہیں ہوتی۔

گھر کے دروازوں پہ دستک دے رہا ہے انقلاب

سترہ دسمبر 2010ء کا ابھرتا ہوا سورج براعظم افریقہ کے ملک تیونس پر اپنی کرنیں بکھیر رہا تھا، سورج کی سنہری کرنوں سے بحیرہ روم کی چمکتی ہوئی لہریں تیونس کے ساحلوں سے ٹکرا رہی تھیں، تیونس کے مشرقی ساحلی شہر سفکس سے لگ بھگ 75 کلومیٹر دور سیدی بوزید کے قصبے میں معمولاتِ زندگی کا آغاز ہو چکا تھا، لوگ اپنے اپنے کام کاج کیلئے گھروں سے نکل رہے تھے، محمد بوعزیزی نے بھی اپنا سبزیوں کا ٹھیلا اٹھایا اور روزی کی تلاش میں گھر سے روانہ ہوگیا، محمد بوعزیزی ایک 26 سالہ مخنتی گریجویٹ نوجوان تھا، جس نے نوکری کی تلاش میں ناکامی کے بعد اپنے دوستوں سے کچھ رقم ادھار لے کر سبزی کا ٹھیلا لگا لیا تھا، اُسے ابھی ٹھیلا لگائے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دو پولیس کانسٹیبل اُس کے پاس پہنچے اور ٹھیلا لگانے کا لائسنس طلب کیا، محمد بوعزیزی نے حیران ہو کر پولیس والوں سے پوچھا کہ کیا سبزی کا ٹھیلا لگانے کیلئے بھی لائسنس ہوتا ہے؟ پولیس والوں نے کہا ہاں، لیکن تمہارے پاس یہ لائسنس نہیں ہے، لہٰذا تمہارا ٹھیلا ضبط کیا جاتا ہے، محمد بوعزیزی نے اُن سے بہت منت سماجت اور فریاد کی، لیکن پولیس والوں نے اُس کی ایک نہ سنی اور بوعزیزی کا ٹھیلا ضبط کرلیا، ناچار وہ اپنی فریاد لے کر گورنر ہاؤس گیا۔

مگر گورنر ہاؤس میں بھی اُس کی فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا، وہ گورنر ہاؤس کے دروازے پر اعلیٰ حکام تک اپنی فریاد پہنچانے کیلئے اصرار کرنے لگا،اِس شور شرابے میں گورنر ہاؤس کی ایک خاتون اہلکار باہر آئی، محمد بو عزیزی نے خاتون کو دیکھ کر انصاف کی دہائی دی، وہ خاتون آگے بڑھی اور محمد بو عزیزی کے گال پر تھپڑ جڑ دیا، بو عزیزی سکتے میں آ گیا، خاتون اہلکار کے تحقیر آمیز سلوک نے بو عزیزی کو شدید احساس محرومی اور ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیا،اُس نے گورنر ہاؤس کے سامنے اپنے اوپر مٹی کا تیل چھڑکا اور خود کو شعلوں کے حوالے کر دیا، یہ خبر جنگل کی آگ بن کر تیونس کے گلی کوچوں میں پھیلتی چلی گئی، جگہ جگہ لوگ سڑکوں پر نکل آئے، سیدی بو عزیزی کا عوامی احتجاج ہنگاموں کی شکل اختیار کرتا چلا گیا، محمد بو عزیزی کے جھلسے جسم پر چپکے کپڑے تیونس کے عوام میں بغاوت کے علم بن چکے تھے، سبزی فروش نوجوان کے جسم کی ٹیسیں اُس صدر زین العابدین بن علی کا پیچھا کر رہی تھی جو 23 سال سے تیونس کے اقتدار پر بلا شرکت غیرے قابض تھا اور جس نے تیونس میں سیاست کو ممنوع قرار دے رکھا تھا۔ ابھی محمد بو عزیزی اسپتال میں ہی تھا کہ ایک اور 22 سالہ نوجوان نے بے روزگاری سے مجبور ہو کر خود کو بجلی کا کرنٹ لگا کر ہلاک کر لیا،اُسی روز

پولیس فائرنگ نے ایک نوجوان کی جان لے لی، ہنگامے بڑھتے جا رہے تھے، احتجاج پھیلتا جا رہا تھا، عوام صدر زین العابدین بن علی کی قربانی چاہتے تھے۔ محمد بو عزیزی نے تین ہفتے زندگی اور موت کی کشمکش میں گزارنے کے بعد دم توڑا، تو پورا تیونس سڑکوں پر آ چکا تھا، اِس المیے نے قوم کے ضمیر کو جھنجھوڑ ڈالا، لوگ کرفیو کی پابندیوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے، یہ وہ عوامی سیلاب تھا جس میں فرانس کا لوئی XVI، زارِ روس، چین کا چیانگ کائی شیک، شاہ ایران اور کرغیزستان کا قربان بیگ تک بہہ گئے، پھر بھلا زین العابدین کیسے ٹھیر سکتا تھا؟ 23 برس تک مسند اقتدار پر براجمان رہنے والے زین العابدین بن علی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تیونس کے صابر و شاکر عوام یوں اچانک آگ بگولہ بھی ہو سکتے ہیں، وہ تو بڑے بڑے منصوبے بنائے بیٹھا تھا، اس کا داماد شاکر الماتری، اگلے صدر کے طور پر قطار میں کھڑا تھا، اس کی بیوی لیلیٰ، کرپشن کی الف لیلائی داستانوں کا مرکزی کردار بنی ہوئی تھی، سرکاری بوئنگ جیٹ طیارہ اس کی تحویل میں تھا، وہ جب چاہتی شاپنگ کے لئے پیرس، جینوا اور یورپ کے دوسرے شہروں کو نکل جاتی، قومی وسائل کی بے دردانہ لوٹ مار جاری تھی، بڑے بڑے شاپنگ پلازا، درآمد و برآمد کرنے والی کمپنیاں، ٹاؤن پلانرز، پراپرٹی ڈیلرز، بینک، میڈیا کے ادارے، ٹیلی کمیونی کیشن، انٹرنیٹ پرووائڈرز، کسٹم ڈیوٹیز، سب کچھ "شاہی خانوادے" کی مٹھی میں تھا۔

یہ لوگ سرکاری اثاثے کوڑیوں کے مول خریدتے اور پھر بھاری قیمت پر بیچ دیتے، جو کاروبار اچھا دکھائی دیتا، یہ اُس میں زبردستی حصہ دار بن جاتے، سرکاری ٹھیکوں میں بھاری کمیشن لیتے، سیاسی مبصرین کے نزدیک یہ ٹھگوں کا ٹولہ تھا. لالچ اور نااہلی کا عفریت جو خوشحال تیونس کی رگوں کا لہو چوس رہا تھا اور لوگ مہنگائی اور بے روزگاری کی چکی میں پس رہے تھے، گوکہ وکی لیکس نے تیونس کے حکمرانوں کی بہت سی کہانیاں بیان کیں لیکن یہ کہانیاں تیونس میں وہ قیامت بپا نہ کر سکی، جو قیامت محمد بوعزیزی کی خود سوزی نے پیدا کردی، صدر زین العابدین نے بہت داؤ پیچ اور حربے آزمائے، تمام قیدیوں کی رہائی کا حکم دیا، وزیر داخلہ کو برطرف کردیا، پارلیمنٹ توڑ کر ساٹھ دنوں میں نئے انتخابات کا اعلان کیا، تیس لاکھ نئی ملازمتیں دینے کا وعدہ کیا، یہ بھی کہا کہ میں 2014ء میں صدارت سے الگ ہوجاؤں گا، لیکن اب بہت دیر ہوچکی تھی، اور وہ لمحہ آگیا تھا جب بدعنوان حکمراں کے لئے تیونس کی زمین تنگ ہو گئی، اس نے اپنے سب سے بڑے سرپرست فرانس سے رابطہ کیا، پیغام ملا "ہم آپ کو خوش آمدید نہیں کہہ سکتے" اور پھر 14 جنوری کو وہ مرحلہ بھی آگیا جو ایک نہ ایک دن ہر آمر کی زندگی میں آتا ہے، فوج نے زین العابدین بن علی کا ساتھ چھوڑتے ہوئے عوام پر گولی چلانے سے انکار کر دیا، بپھرے ہوئے عوام مقتلوں کو سجاتے اور قتل گاہوں سے پرچم چنتے ہوئے دارالحکومت تیونس کی طرف بڑھتے رہے، یوں ڈیڑھ کروڑ آبادی والے ملک تیونس کا آمر جنرل زین العابدین تین ہفتے

سے جاری عوامی شورش سے خائف ہو کر اپنے اہل خانہ کے ساتھ چوروں کی طرح صدارتی محل سے سعودی عرب فرار ہوگیا۔

آج تیونس اور الجزائر میں برپا عوامی شورش صرف انہی دو ممالک تک محدود نہیں ہے، بلکہ محمد بو عزیزی کی خود سوزی سے آمروں کے خلاف جنم لینے والی انقلابی تحریک کے شعلے اب مصر تک جا پہنچے ہیں اور اِس آگ کی تپش نے اردن، یمن اور تازہ ترین اطلاعات کے مطابق سوڈان کو بھی اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے،آج تیونس کی بازگشت لیبیا اور سعودی عرب میں بھی سنائی دے رہی ہے، عوامی انقلاب اِن ممالک کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے، تیونس کے موجودہ حالات اور اُس کے عرب دنیا پر اثرات کے بعد ایک بات تو واضح طور پر کہی جا سکتی ہے کہ اب عرب دنیا سے امریکی و سامراجی غلبہ ختم ہونے کے عمل کا آغاز ہو چکا ہے، تیونس میں جو کچھ ہوا اُس نے باقی عرب دنیا کے عوام کو بھی بیدار کر دیا ہے،اِس بیداری کا اثر ہمسایہ عرب ممالک پر صاف دیکھا جاسکتا ہے، تیونس میں حالیہ عوامی احتجاج کے بعد اردن اور یمن میں بھی عوامی احتجاج کی لہر ابھر آئی ہے،اردن میں بھی عوام اُسی طرح مشکلات کا شکار ہیں جس کا تیونس کے عوام کو سامنا تھا، یمن کے دارالحکومت صنعاء میں بھی ہزاروں کی تعداد میں طالب علموں نے جلوس نکالا، جس میں عرب دنیا کے سربراہوں کے خلاف اور انقلاب کے حق میں نعرے لگائے گئے، نوجوانوں کا کہنا تھا کہ عرب سربراہ دھوکے باز، بزدل اور

امریکہ کے غلام ہیں،اُن کو عرب عوام کے معاملات سے زیادہ امریکی مفاد کی فکر رہتی ہے۔

یہ پرجوش طالبعلم اپنے حکمرانوں کو انتباہ کررہے ہیں کہ اب تمہاری رخصتی کا وقت آگیا ہے،اگر خیریت چاہتے ہو تو شرافت سے رخصت ہوجاؤ، ورنہ ہم تمھیں نکال باہر کریں گے، مصر کے بعد اردن کا عوامی مظاہروں کی زد میں آجانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ عرب دنیا بیدار ہورہی ہے، عین ممکن ہے کہ اگلے چند روز میں عرب دنیا کے باقی ممالک بھی اِس لہر کی زد میں آجائیں اور پاکستان میں بھی اِس کے اثرات دیکھنے کو ملیں،اگر ہمارے موجودہ حکمرانوں میں تاریخ سے سبق سیکھنے کی کچھ بھی اہلیت ہوتی تو وہ دیکھ سکتے کہ تاریخ کے ورق ورق پر یہ گواہی ثبت ہے کہ ایسے حکمراں ہمیشہ اپنے عوام کے عتاب کا نشانہ بنتے ہیں جو عوام سے زیادہ اپنے بیرونی آقاؤں کے مفادات کی نگہبانی کرتے ہیں،آج تیونس اور مصر کے عوام کا طرز عمل اِس بات کا گواہ ہے کہ جہاں احتساب و توازن کا کوئی نظام نہیں ہوتا وہاں عوام سڑکوں پر نکل کر اِس کمی کو پورا کردیتے ہیں، فلپائن میں مارکوس،ایران میں رضا شاہ پہلوی اور نیپال میں بادشاہت کی رخصتی کے بعد پچھلے سال بدعنوانی، مہنگائی اور بیروزگاری سے تنگ آئے ہوئے کرغیزستانی عوام کی بغاوت اِس کی روشن مثالیں ہیں۔

آج تیونس سے شروع ہونے والا احتجاجی طوفان شمالی افریقہ اور مشرقِ وسطیٰ کے بہت سے ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ تیونس میں عوامی شورش اور زین العابدین بن علی کے فرار کے بعد احتجاجی مظاہروں کی شدت نے اِس وقت مصر کو اپنے لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ قاہرہ سمیت کئی شہر فوج کے حوالے کر دیے گئے ہیں، لیکن کرفیو کے باوجود عوامی مظاہرے جاری ہیں، عوام "گو مبارک گو" کے نعرے لگا رہے ہیں، صرف چند دنوں کے مظاہروں سے ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ مصر میں حکومت مخالف تحریک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو گئی ہے اور مصر کے ناقابل شکست آمر حسنی مبارک کے اقتدار کا عنقریب خاتمہ ہونے والا ہے۔ مصر میں بدلتے ہوئے حالات کو دیکھتے ہوئے امریکہ نے بھی اپنی روایت کے مطابق اپنے چیلے حسنی مبارک سے آنکھیں پھیر لی ہیں اور اُسے ہری جھنڈی دکھا دی ہے۔

دوسری طرف عرب دنیا میں تیزی سے بڑھتی ہوئی عوامی بیداری امریکہ کے غلام عرب حکمرانوں کے لئے دردِ سر بنی ہوئی ہے اور اس نے ان کی نیندیں حرام کر دی ہیں، تیونس سے چلنے والا یہ کارواں آنے والے دنوں میں مزید کن کن ممالک کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہے، یہ دیکھنا ابھی باقی ہے لیکن ایک بات طے ہے کہ اِس خطے میں سیاسی تبدیلیوں کا عمل شروع ہو چکا ہے اور آنے والے دنوں میں عوامی بیداری کا یہ سلسلہ عرب دنیا میں ایک ایسی نئی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہو

گا، جو عرب ممالک کی بادشاہتوں اور کئی عشروں سے قابض آمروں کے مستقبل کو سوالیہ نشان بنا دے گا، تیونس کے غیور عوام نے ظلم و جبر کیخلاف انقلاب برپا کرکے پوری دنیا کے جابر حکمرانوں کو واضح پیغام دیا ہے کہ کوئی بھی حاکم فوج اور مسلح اداروں کے بھروسے پر زیادہ دیر اپنی حکومت قائم نہیں رکھ سکتا، حکومتوں کی بقاء کیلئے انصاف کی فراہمی اور عوامی حقوق کی پاسداری لازمی امر ہے، دیکھا جائے تو تیونس کے عوام کی بیداری اور مزاحمت امریکہ نواز حکمرانوں کیلئے ایک کھلا پیغام ہے۔

یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ ہمیشہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہوتے ہیں، جمہوری نظام ہو یا بادشاہت، سب پر لازم ہے کہ وہ عوام کے مصائب و آلام کے تدارک کے لئے عملی اقدام کریں، اِس وقت مسلم دنیا ہی نہیں دوسرے ترقی پذیر ممالک بھی امریکہ بالادستی اور اُس کے توسیع پسندانہ عزائم کا شکار ہیں اور امریکہ بہادر ہر ملک میں اپنے اثر و رسوخ کو برقرار رکھنے اور اپنے مفادات کے حصول کے لئے اُن کے حکمرانوں کی اِس طرح سرپرستی کرتا ہے کہ حکمران یہ یقین کرنے لگتے ہیں جب امریکی سپرپاور اُن کے ساتھ ہے تو انہیں کس بات کا ڈر، امریکہ کے ہوتے ہوئے کون انہیں مسند اقتدار سے ہٹا سکتا ہے۔

اِس خوش فہمی میں وہ یہ اہم بات بھی بھول جاتے ہیں کہ جب کسی امریکہ نواز

حکمران کی کشتی ڈوبنے لگتی ہے تو سب سے پہلے اس کا مربی امریکہ نہ صرف اُس سے
آنکھیں پھیرتا ہے بلکہ اقتدار سے بے دخل ہونے کے بعد اُسے پناہ دینے سے بھی انکار
کردیتا ہے، تیونس اور مصر کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں، لہذا تیونس کا عوامی
انقلاب اور مصر، اردن، یمن، الجزائر اور سوڈان سمیت عرب دنیا کے بپھرے ہوئے
عوام،ترقی پذیر اور تیسری دنیا کے غلام حکمرانوں کی آنکھیں کھولنے کیلئے کافی ہیں، اگر اب
بھی ہمارے حکمرانوں نے اصلاح احوال کی کوئی موثر کوشش نہ کی، سیاسی کرتب بازی
اور الفاظوں کی شعبدہ گری نہ چھوڑی تو پاکستان کے دروازے پر دستک دیتا ہوا عوامی
انقلاب اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے جائے گا۔

ہندوؤں کے مکروفریب اور مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان

البلاغ تحریک خلافت کے دوران ہندوؤں کے مکروفریب اور مسلمانوں کے عروج و
زوال کی داستان

یہ 19 ویں صدی کے اواخر کی بات ہے،جب خلافت عثمانیہ بے حد کمزور ہو چکی
تھی،حکومت مقروض اور ترکی کی مالی حالت انتہائی خستہ تھی،اُس زمانے میں یہودیوں
کا ایک وفد جس کی قیادت ترک یہودی قرہ صوہ آفندی کر رہا تھا،ترکی کے سلطان
عبدالحمید کے پاس آیا اور اُس نے خلیفہ کو تمام قرضہ اتارنے کی پیش کش کرتے ہوئے
کہا کہ " اگر آپ بیت المقدس اور فلسطین ہمیں دے دیں تو ہم خلافت عثمانیہ کا سارا
قرضہ اتار دیں گے اور مزید کئی ٹن سونا بھی دیں گے۔"لیکن سلطان نے اُن کی بات
ماننے کے بجائے اُسے دینی غیرت و حمیت سے بھرپور جواب دیتے ہوئے اپنے پاؤں کی
انگلی سے زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا"اگر اپنی ساری دولت دے دو اور اُس
کے بدلے میں تم لوگ بیت المقدس کی ذرا سی مٹی بھی مانگو گے تو ہم نہیں دیں
گے۔"اِس واقعہ کے بعد خلافت عثمانیہ کے خلاف سازشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا،چناں
چہ چند برسوں بعد جو شخص مصطفیٰ کمال پاشا کی طرف سے خلافت عثمانیہ کے خاتمے کا
پروانہ لے کر خلیفہ عبدالحمید کے پاس گیا تھا،وہ کوئی اور نہیں بلکہ وہی ترک یہودی قرہ
صوہ آفندی ہی تھا،جس نے خلیفہ کو بیت

المقدس اور فلسطین کے بدلے قرض اتارنے کی پیشکش کی تھی، خود مصطفیٰ کمال پاشا بھی یہودی النسل تھا، اُس کی ماں یہودن تھی اور باپ ترک قبا ئلی مسلمان تھا، ساری دنیا نے دیکھا کہ خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد ترکی میں نوجوان ترکوں کا غلبہ شروع ہو گیا، یہیں سے Youngs Turks کی اصطلاح نکلی، جنہوں نے مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں اسلام پسندوں پر مظالم ڈھائے، علما کا قتل عام کیا، نماز کی ادائیگی اور تمام اسلامی رسومات پر پابندی لگا دی، عربی زبان میں خطبہ، اذان اور نماز بند کر دی گئی، مساجد کے اماموں کو پابند کیا گیا کہ وہ "ترک" زبان میں اذان دیں، نماز ادا کریں اور خطبہ پڑھیں، اسلامی لباس اتروا کر عوام کو یورپی کپڑے پہننے پر مجبور کیا گیا، مصطفیٰ کمال پاشا اور اُس کے ساتھی نوجوان ترکوں نے ترکی میں اسلام کو کچلنے کے لیے جتنی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا اور مسلمانوں کو جتنا نقصان پہنچایا، اس کی مثال روس اور دیگر کمیونسٹ ملکوں کے علاوہ شاید ہی کہیں ملے، یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب تک ترکی میں خلافت عثمانیہ قائم رہی، اُس وقت تک استعماری قوتوں کا فلسطین میں یہودی مملکت کے قیام کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا، لیکن 1923ء میں ترکی سے خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد 15 مئی 1948ء کو فلسطین میں یہودی مملکت اسرائیل کا قیام عمل میں آگیا، حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جس " خلیفہ " نے ہر طرح کی لالچ اور دھمکیوں کے باوجود یہودیوں کو فلسطین کی رتی بھر زمین دینے سے انکار کر دیا تھا، اُسی سلطان کا ترکی فلسطین میں

اسرائیلی ریاست کو تسلیم کرنے اور اُس کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے والا دنیا کا سب سے پہلا ملک تھا۔

پہلی عالمی جنگ 1914ء میں شروع ہوئی جس کا نتیجہ 1918ء میں ترکی اور جرمنی کی شکست پر منتج ہوا۔اِس جنگ میں ایک طرف برطانیہ اور اُس کے حواری تھے تو دوسری طرف جرمنی اور ترکی کے آخری خلیفہ سلطان عبدالحمید کی افواج تھی۔جنگ کا خاتمہ خلافت عثمانیہ کے خاتمے کی شکل میں برآمد ہوا،ترکی میں خلافت اسلامیہ کے خاتمے نے ملت اسلامیہ کی رہی سہی مرکزیت کو ختم کرکے رکھ دیا،یہی وجہ تھی کہ ہندوستان کے مسلمان خلافت عثمانیہ کے خاتمے پر تڑپ اٹھے،5 جولائی 1919ء کو خلافت کے مسئلے پر رائے عامہ کو منظم کرنے اور متفقہ لائحہ عمل تیار کرنے کے لئے بمبئی میں آل انڈیا خلافت کمیٹی قائم کی گئی اور محمد علی جوہر اور شوکت علی نے ترکی میں خلافت کی بحالی کیلئے تحریک خلافت شروع کی،جس کے بڑے مقاصد" خلافت کی برقراری،مقامات مقدسہ کا تحفظ اور حفاظت اور سلطنتِ ترکی کو تقسیم نہ کرنا تھے۔خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس نومبر 1919ء میں دہلی میں منعقد ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ مسلمان انگریز کے جشن فتح میں شریک نہیں ہوں گے اور اگراُن کے مطالبات منظور نہ ہوئے تو وہ حکومت سے عدم تعاون کریں گے۔اِس اجلاس میں ہندوؤں سے تعاون کی اپیل کی گئی۔اُس زمانے میں کانگریس نے پہلے ہی رولٹ ایکٹ کے خلاف ملک گیر مہم شروع

کر رکھی تھی، دسمبر 1919ء میں کانگریس مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے اجلاس امرتسر میں منعقد ہوئے، جہاں گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا، 1920ء میں مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں ایک وفد انگلستان، اٹلی اور فرانس کے دورے پر روانہ ہوا تاکہ وزیراعظم برطانیہ اور اتحادیوں کو اُن کے وعدے یاد دلائے جائیں، وفد نے برطانوی وزیراعظم لائیڈ جارج سے ملاقات کی اور اٹلی اور فرانس کا بھی دورہ کیا مگر اُس کی کہیں بھی شنوائی نہ ہوئی، وفد کی ناکامی اور معاہدہ سیورے کی ذلت آمیز شرائط کے خلاف خلافت کمیٹی نے 1920ء میں تحریک ترک موالات کا فیصلہ کیا اور گاندھی کو اِس تحریک کا رہنما مقرر کیا گیا، بھلا گاندھی جیسے انتہائی درجے کے متعصب ہندو لیڈر کو خلافت اسلامیہ سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی، وہ اپنے اِس منافقانہ عمل سے سیاسی فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اور میثاق لکھنو کے سیاسی تاثر کو زائل کرنا چاہتا تھا، گاندھی تحریک خلافت میں شامل ہو کر ہندوستان کے سادہ دل مسلمانوں کو اِس غلط فہمی میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ وہ اور کانگریس مسلمانوں کے مفادات اور حقوق کے محافظ ہیں، اِس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ لیڈر کی حیثیت سے گاندھی کا سیاسی قد کاٹھ اتنا بڑھ گیا کہ وہ ہندوستان کی سیاست پر چھا گیا۔

اِس سیاسی چال سے اُس نے مسلمانوں کے علیحدہ تشخص کے ابھرنے کے ایک نادر موقع کو مسلمانوں سے چھین لیا بلکہ مسلمانوں کی قیادت بھی مسلمان لیڈروں سے

چھین لی،اِس طرح گاندھی متحدہ قومیت کے تاثر کو فروغ دینے میں کامیاب ہوگیا، یہی نہیں بلکہ اُس نے اپنی چالاکی سے تحریک خلافت کو ایسے راستے پر ڈال دیا جو مسلمانوں کو ہندوستان سے باہر لے جانے والے راستہ تھا،بات تحریک خلافت سے ترک موالات اور تحریک ہجرت تک جا پہنچی،اِسی دوران کچھ کانگریس نواز علماء نے بر عظیم کو دارالحرب قرار دے کر یہاں سے ہجرت کرنے کا فتویٰ دیا،جس پر ہزاروں مسلمانوں نے اپنے گھربار چھوڑ کر افغانستان کی راہ لی، جس میں مسلمانوں کو کافی جانی و مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑا، ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتحاد سطحی، جذباتی اور وقتی تھا، دونوں قوموں کو حکومت کے خلاف نفرت نے عارضی طور پر اکٹھا کر دیا تھا،لیکن شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں نے جلد ہی اِس اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا اور تحریک خلافت کمزور ہونا شروع ہو گئی، مسلمانوں کی تحریک خلافت سیاسی فائدے کے بجائے مذہبی جوش و خروش پر مبنی تھی، جبکہ ہندوؤں اِس میں سیاسی فائدہ تلاش کر رہے تھے جو تحریک خلافت کی کامیابی سے ملنا مشکل تھا، چنانچہ گاندھی نے اُس وقت اچانک تحریک ختم کرنے کا اعلان کرکے مسلمانوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا، جب مسلمانوں کے تمام رہنما جیل میں تھے اور تحریک کی قیادت سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا،گاندھی کے اِس عمل سے تحریک بھی ختم ہو کر رہ گئی اور مسلمانوں کا اپنے قائدین سے بھی اعتماد اٹھ گیا،یوں گاندھی ہندوؤں کے مہاتما بن گئے اور مولانا محمد علی جوہر گوشہ گم نامی میں چلے گئے، تحریک خلافت سے مسلمانان

ہند کو جو نقصان پہنچا وہ 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی سے آنے والی تباہی و بربادی کے بعد سب سے بڑا نقصان تھا۔اِس تحریک کے زمانے میں ترک موالات کے دوران مسلمانوں کو اِس بات پر بھی اکسایا گیا کہ وہ احتجاجاً تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کر دیں، یہاں بھی ہجرت کی طرح صرف مسلمان طلباء نے ہی اپنے تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کیا، ہندو طلبا نے اپنی تعلیمی سرگرمیاں برابر جاری رکھیں، مسلمان پہلے ہی تعلیم کے میدان میں ہندوؤں سے بہت پیچھے تھے،اُن میں جو تھوڑا بہت تعلیم کا عمل جاری تھا وہ بھی رک گیا، مارچ 1924ء میں مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی کے علاقے آزاد کرا کے جمہوریہ کے قیام اور اپنی صدارت کا اعلان کر دیا اور ترکی میں خلافت کا خاتمہ ہوگیا، پہلی جنگ عظیم کے دوران میں برطانوی حکومت نے اعلان بالفور کی رو سے فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی سازش کی، جبکہ شریف مکہ نے سازش کرکے سعودی عرب کو ترکی سلطنت سے الگ کر لیا اور شاہ عبدالعزیز نے سعودی عرب کے نام سے الگ مملکت کے قیام کا اعلان کر دیا، جس سے تحریک خلافت ماند پڑ گئی۔

تحریک خلافت جیسی عوامی تحریک کی مثال برصغیر کی تاریخ میں نہیں ملتی،اِس میں شک نہیں کہ یہ تحریک اپنے مقاصد کے حصول میں ناکام رہی، لیکن اِس نے ہندوستان کی سیاست اور مسلمانوں کی تاریخ پر گہرے نقوش مرتب کئے، یہاں اِس بات کو بھی ریکارڈ پر لانا ضروری ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں فاضل

بریلوی اور آپ کے رفقاء نے دینی فراست اور مومنانہ بصیرت سے پہلے ہی تحریک خلافت کے مسلمان قائدین اور برصغیر کی عوام پر واضح کر دیا تھا کہ تحریک خلافت سے مسلمانوں کو سوائے سخت نقصان کے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔امام احمد رضا اور آپ کے رفقاء کا تحریک کی ابتداء سے نقطہ نظر بالکل واضح اور غیر مبہم تھا۔آپ کا نفس تحریک خلافت سے قطعاً کوئی اختلاف نہیں تھا۔البتہ اِس تحریک کے طریقہ کار اور اِس مذہبی، ملی، دینی اور اسلامی مسئلہ میں ہندوؤں سے اخوت و دوستی اور گاندھی جیسے اسلام دشمن شخص کی قیادت و سیادت سے آپ کو سخت اختلاف تھا۔آپ نہ صرف خود اِس سے الگ تھلگ رہے بلکہ آپ اور آپ کے خلفاء نے تحریک خلافت کے لیڈروں کو سمجھانے کی بھی کوشش بھی کی، مگر وہ اُس قدر جوش و خروش اور غیض و غضب میں آئے ہوئے تھے کہ انہوں نے آپ کی ایک نہ سنی، بلکہ قائد اعظم محمد علی جناح کی طرح آپ پر بھی انگریز دوستی کے الزامات لگائے گئے۔اِس کیفیت کو ممتاز مورخ رئیس احمد جعفری "قائد اعظم محمد علی جناح اور اُن کا عہد صفحہ 150 "پر یوں بیان کرتے ہیں" تحریک خلافت ایک ہولناک طوفان کی طرح ہندوستان کے سیاسی مطلع پر نمودار ہوئی، مسلمانوں کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ وہ سر سے کفن باندھ کر میدان جہاد میں اتر چکے تھے، جیل جانا ایک کھیل بن گیا تھا، سینے پر گولیاں کھانا روزمرہ کا واقعہ تھا۔۔۔۔اِس طوفان کا رخ جس نے موڑنا چاہا، اُس کی پگڑی سلامت نہ رہ سکی، یہ مسئلہ مسلمانوں کی موت وزیست کا مسئلہ بن گیا تھا۔انہوں نے طے

کرلیا تھا کہ جو اُن کے ساتھ ہے، اُن کا دوست ہے اور جو اُن کے ساتھ نہیں ہے وہ دشمن کے سوا کچھ نہیں ہے، جسے انہوں نے اپنا مخالف سمجھا اُس کا سیاسی وجود ختم کردیا گیا، محمد علی جناح کو انہوں نے گوشہ نشینی پر مجبور کردیا.... اکابر علماء صلحاء اخیار ابرار میں سے جس نے بھی اِس تحریک کی مخالفت کی اُسے مسلمانوں کے قومی پلیٹ فارم سے ہٹ جانا پڑا.... مسلمان آزادی ہند کے نشے میں، ہندو مسلم اتحاد کے جوش میں اتنے بے خود ہوئے تھے کہ انہوں نے واقعات سے آنکھیں بند کرلی تھیں، حقائق سے منہ موڑ لیا تھا "کہ کہیں ہندو مسلم اتحاد کا آبگینہ پاش پاش نہ ہوجائے۔

درحقیقت تحریک کیا تھی ایک طوفان تھی جس نے اپنے پرائے کا امتیاز ختم کردیا تھا، طوفانوں کا رخ موڑنے والے جرات مند لوگ کانگریس اور گاندھی کے دام فریب میں جکڑے ہوئے تھے لیکن ایسے میں امام احمد رضا اور آپ کے رفقاء "علامہ حامد رضاخان، مولانا مختار الحق صدیقی، مولانا نعیم الدین مرادآبادی، مولانا امجد علی، مولانا ظفرالدین بہاری، مولانا ابوالبرکات اور علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر سید سلیمان اشرف جیسے مومنانہ بصیرت رکھنے والے لوگ ایسے بھی تھے جو قرآن و سنت کی روشنی میں مسلمانوں کو اِس خود کش اقدام سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے، جید عالم دین پروفیسر سید سلیمان اشرف کی کتاب "البلاغ" دراصل تحریک خلافت کے دوران مسلمانوں کی اِسی بد نظمی، بے عملی، ملی انحطاط، ہندوؤں

کی سازشوں اور خلافت عثمانیہ کے تاریخی واقعات کی ایک جامع دستاویز ہے، تقریباً 90 سال قبل لکھی جانے والی یہ کتاب، اُس دور کے اسلامیان ہند کے اضطراب، درپیش ملکی مسائل، خلافت عثمانیہ اور مقامات مقدسہ کی حفاظت کے حوالے سے درپیش چیلنجز اور عالم اسلام پر مصائب وآلام کے چھائے بادل کا مکمل احاطہ کئے ہوئے ہے، سید سلیمان اشرف کی یہ تصنیف نہ صرف سلطنت عثمانیہ کے زیر وبم سے ہمیں آگاہ کرتی ہے بلکہ اُس کے عروج وزوال کی داستان بھی سناتی ہے اور اسلام اور خلافت کے باب میں اسلام کا تصور خلافت بھی بیان کرتی ہے،آج اِس کتاب کا گہرا مطالعہ ماضی کی روشنی میں مستقبل کا حل فراہم کرتا ہے،اِس اہم اور نادر تاریخی دستاویز کی دوبارہ اشاعت کا سہرا "ادارہ پاکستان شناسی" کے روح رواں" جناب ظہور الدین امرتسری" کو جاتا ہے،جنھوں نے پیرانہ سالی میں بھی تحریک پاکستان اور مسلم اُمہ کا درد رکھنے والے علماء کی تحریروں کو دوبارہ شائع کرنے اور نئی نسل کو اپنے اسلاف کے کارناموں سے روشناس کرانے کا بیڑا اٹھایا ہوا ہے، یہ کتاب "ادارہ پاکستان شناشی 24/2 سوڈھیوال کالونی، ملتان روڈ لاہور 54500۔ یا فون نمبر 03224005952 سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

جب جرم کیلئے لوگ اجازت طلب کرنے لگیں۔۔۔۔

بائیس سالہ ریاض ملتان کا رہنے والا ہے جو اِس امید پر اپنے گھر سے ہزاروں میل دور کراچی آیا کہ یہاں محنت مزدوری کرکے اپنے بوڑھے والدین اور چھوٹے بہن بھائیوں کی کفالت کا انتظام بہتر کرسکے گا، لیکن اُس کے یہ خواب خواب ہی رہ گئے۔ کراچی جیسے شہر میں چھ ہزار روپے ماہانہ کی نوکری میں کرائے پر رہنا اور پیٹ کی آگ بجھانا بہت مشکل کام ہے، بھلا بوڑھے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی کفالت کیسے ہوسکتی ہے، دن رات محنت مشقت کرنے کے بعد بالآخر ریاض کو اندازہ ہوگیا ہے کہ اُس کی تمام تر کوشش کے باوجود اُس کے اور اہل خانہ کے حالات میں کوئی تبدیلی آتی دکھائی نہیں دیتی۔

یہی حال 55 سالہ بزرگ مزدور زین شاہ ہے، جو سائٹ کی ایک دوا ساز کمپنی میں کام کرتے ہیں اور سلطان آباد میں رہتے ہیں، بڑھتی ہوئی مہنگائی نے اُن کی زندگی عذاب بنادی ہے، بچے اپنی تعلیم کو خیرآباد کہہ کر مختلف فیکٹریوں میں کام کررہے ہیں، لیکن اِس کے باوجود گھر کے اخراجات پورے ہونے کا نام نہیں لیتے۔

کرائے کے مکان میں رہنے والے سات بچوں کے باپ لعل زادہ کا کہنا ہے کہ وہ طویل عرصے سے سائٹ میں واقع ایک میڈیسن کمپنی میں 9 ہزار ماہوار پر کام کررہا ہے، گزشتہ دس برسوں کے دوران اُس کی تنخواہ میں صرف 4 ہزار روپے کا اضافہ ہوا ہے جبکہ اِس کے مقابلے میں اخراجات میں کئی گنا بڑھ چکے ہیں، لعل زادہ کے نزدیک اِن حالات میں بچوں کی کفالت اور تعلیم و تربیت کے اخراجات پورے کرنا ناممکن ہوگیا ہے ۔

نوجوان نذر کا تعلق مالاکنڈ ڈویژن کے ضلع دیر سے ہے، ابھی وہ میٹرک کا طالبعلم تھا کہ عسکریت پسندوں نے اُس کے والد کو زخمی کردیا، جس سے وہ محنت مزدوری کے قابل نہ رہے، تعلیم ادھوری چھوڑ کر ڈیڑھ سال قبل نذر سات افراد پر مشتمل کنبے کی کفالت کی ذمہ داری اٹھائے کراچی آگیا، لیکن آج تک اُسے کوئی مستقل روزگار نہیں مل سکا، بلکہ اکثر اوقات مزدوری نہ ملنے کی وجہ سے اُسے بھوکا ہی سونا پڑتا ہے، ایسی صورت میں وہ اپنے گھر والوں کیلئے کیا بھیجے ۔

قارئین محترم یہ اُن دو ہزار لوگوں میں سے چند لوگوں کی زندگی کی مختصراً کہانیاں ہیں، جو حالات سے تنگ آکر گزشتہ دنوں ایک معروف دینی درسگاہ میں علمائے دین اور مفتیان کرام کے پاس یہ درخواست لے کر پہنچے کہ انہیں شریعت مطہرہ کی روشنی میں حرام اور ناجائز طریقے سے پیسہ کمانے کی اجازت دی جائے

کیونکہ وہ اب اپنے اہل خانہ کو مزید صعوبتیں برداشت کرتا نہیں دیکھنا چاہتے۔اِن لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر انہیں اجازت نہیں ملی تو وہ خود کشی کرنے پر مجبور ہو جائیں یا پھر بھوک سے موت اُن کا مقدر ہو گی۔

یہ ملک کے اُن لاکھوں کروڑوں لوگوں میں شامل وہ چند لوگ ہیں، جو خط غربت سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں، جو اشیاء خورد ونوش اور روزمرہ استعمال کی دیگر بنیادی اشیاء میں روز بروز اضافے سے تنگ آ چکے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو مکان کا کرایہ، بجلی کا بل اور پانی کا بل ادا کرتے ہیں تو کھانے کو کچھ نہیں بچتا، یہ وہ لوگ ہیں جو ڈیوٹی پر آنے جانے کیلئے چار پانچ کلومیٹر پیدل سفر کرکے کرایہ بچاتے ہیں لیکن اِس کے باوجود اِن کے بچوں کو دو وقت کی روٹی میسر نہیں ہوتی۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کی ماہانہ تنخواہ یا روزانہ اجرت اِس قدر قلیل ہے کہ مہنگائی کے طوفان کا مقابلہ کرنا اِن کے بس سے باہر ہوگیا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جن کے گھروں میں فاقے ہو رہے اور علاج معالجے کی سہولیات نہ ہونے کی وجہ سے اہل خانہ اِن کی آنکھوں کے سامنے سسک سسک کر دم توڑ رہے ہیں،اِن سائلین کا کہنا ہے کہ جب اسلام بھوک کی موت مرنے سے بچنے کیلئے سُور کا گوشت کھا کر زندگی بچانے کی اجازت دیتا ہے اور خود کشی کو حرام قرار دیتا ہے، تو کیا وہ

اِس دلیل کو سامنے رکھتے ہوئے چوری، ڈکیتی یا دیگر ناجائز ذرائع سے حاصل کردہ مال حرام سے اپنے اور اہل خانہ کے پیٹ کی آگ بجھا سکتے ہیں۔
فتویٰ کی درخواست لے کر آنے والے اِن سائلین کا کہنا ہے کہ وہ سیاسی تنظیموں، نام نہاد اشرافیہ اور سرمایہ دار طبقے کو اپنے دکھڑے سنا سنا کر تھک چکے ہیں اور اب مجبور ہو کر علماء کرام کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں کہ ایسی صورت میں اسلام انہیں اِس بات کی اجازت دیتا ہے یا نہیں؟ اور اگر اِن میں سے کوئی حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایسے کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو اُس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟
ایک طرف جہاں اِن سائلین کے سوال نے علمائے کرام اور مفتیان دین کو مشکل امتحان میں ڈال دیا ہے وہیں عوام کا علماء سے جرائم کیلئے اجازت کا طلب کرنا حکومت وقت کیلئے کسی انتباہ اور طمانچے سے کم نہیں، بنیادی طور پر عوامی حقوق کی حفاظت اور انہیں بنیادی سہولیات کی فراہمی حکومت وقت کی ذمہ داری ہوتی ہے جس میں ہماری حکومت قطعی طور پر ناکام دکھائی دیتی ہے۔
ایک طرف غربت، بھوک اور بیروزگاری کے باعث لوگوں کا زندگی گزارنا مشکل ہوگیا ہے تو دوسری جانب حکمرانوں کی سرپرستی میں سرکاری وسائل کو بے دریغ

لوٹا جارہا ہے، حکمرانوں کی عیاشیاں اور شاہ خرچیاں ہیں کہ ختم ہونے میں نہیں آرہی، ہر روز دو ارب روپے کے نوٹ چھاپے جارہے ہیں جس سے افراط زر میں اضافہ اور مہنگائی آسمان کو چھونے لگی ہے۔

اِن حالات میں اگر جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کیلئے حلال روزی کمانے والے افراد جرم کی اجازت طلب کرنے لگیں تو یقیناً یہ حکمرانوں کیلئے باعث شرم اور ڈوب مرنے کا مقام ہے،اِس المناک صورتحال کے ذمہ دار ہمارے ارباب اختیار ہیں جو حالات کو اِس نہج پر لے آئے ہیں،اگر اب بھی یہ اپنے رویوں میں تبدیلی نہیں لاتے اور اپنی روش نہیں بدلتے تو وہ دن دور نہیں جب جرائم کی آگ پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

آج مہنگائی کے ہاتھوں مجبور افراد کا علماء سے ناجائز کاموں کی اجازت کا طلب کرنا، ارباب اقتدار،ملک کی تمام سیاسی جماعتوں اور فلاحی و رفاعی تنظیموں کیلئے لمحہ فکریہ ہے،ہماری نظر میں جرم کیلئے شرعی اجازت کا طلب کرنا ارباب اقتدار،سیاسی جماعتوں اور طبقہ اشرافیہ سے عوام کی بڑھتی ہوئی مایوسی کا عکاس اور انہیں متنبہ کررہا ہے کہ ملک کے غریب اور مفلوک الحال طبقے کی بہتری کیلئے فوری اقدامات کیے جائیں۔

وگرنہ یہی مزدور مختلف جرائم کا سہارا لے کر اپنے خاندان کی کفالت کو جائز سمجھنے لگیں
گے اور پھر اس آگ میں جلنے سے ملک کا کوئی طبقہ بچ نہیں پائے گا۔یاد رکھیں جب
معاشرے میں لوگ جرم کرنے کیلیے مذہبی حوالے سے اجازت طلب کرنے لگیں تو سمجھ
لیجئے کہ تباہی و بربادی آپ کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔

عالم اسلام کے خلاف نیا امریکی گریٹ گیم-----

مغربی استعمار کی سرپرستی میں سوڈان کی تقسیم

جنوبی سوڈان عنقریب دنیا کا ایک آزاد اور خود مختار ملک بننے جارہا ہے، جس کا اب صرف رسمی اعلان باقی رہ گیاہے،9 جنوری سے 15 جنوری 2011ء تک ہونے والے استصواب رائے میں جنوبی سوڈان کی عیسائی آبادی کی 99 فیصد اکثریت نے شمالی سوڈان سے علیحدگی کے حق میں ووٹ ڈالے، سرکاری ریفرنڈم بیورو کے مطابق علیحدگی کی مخالفت میں صرف سولہ ہزار ایک سوانیس ووٹ پڑے،امریکی قیادت میں مغربی استعمار کے زیر اثر ہونے والے ریفرنڈیم کے نتائج کے بعد براعظم افریقہ کی سب سے بڑی اسلامی مملکت سوڈان کے دولخت ہونے کی اب صرف رسمی کاروائی ہی باقی رہ گئی ہے، جو 9 جولائی 2011ء کو ایک الگ ملک کے باقاعدہ اعلان کے بعد پوری ہوجائے گی،اِس کاروائی کے بعد دنیا کے نقشے پر سوڈان کے جنوب میں انڈونیشیا کی طرح مشرقی تیمور کی طرز پر ایک اور عیسائی ریاست وجود میں آجائے گی، جو دنیا کی ایک سو تیرانوے (193) اور براعظم افریقہ کا چونواں (54) ملک ہوگا۔

سوڈان نے یکم جنوری 1956ء کو مصر سے آزادی حاصل کی، متحدہ سوڈان میں ستر فی صد مسلمان، 5 فیصد عیسائی اور باقی 25 فی صد بت پرست آباد ہیں، جبکہ عیسائیوں کی اکثریت جنوبی حصے اور عرب مسلمانوں کی اکثریت شمالی حصے میں آباد ہے، 1972ء میں جنوبی صوبے میں عیسائیوں کی خانہ جنگی اور بغاوت کی وجہ اسے داخلی خودمختاری دے کر پہلی بار سوڈان کو غیر مستحکم کیا گیا،امریکہ اس وقت سے جنوب کے سوڈانی عیسائیوں کی پشت پناہی کر رہا ہے، 1980 کی دہائی میں جنوب میں دوبارہ خانہ جنگی اور بغاوت پھوٹ پڑی، 1989ء میں جنرل عمر البشیر کی فوجی حکومت نے متعدد بار جنوب کے باغیوں کو معافی اور امن کی پیشکش کی اور خانہ جنگی کے خاتمے کے لئے اقدامات کئے، مگر امریکی ڈالر کے ساتھ اسلحہ و بارود کی فراوانی و فراہمی اور مغربی و صہیونی پشت پناہی کے باعث جنوب میں امن قائم نہیں ہو سکا۔

دو دہائیوں سے زیادہ عرصہ جاری رہنے والی اِس خانہ جنگی میں 20 لاکھ سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے، دراصل امریکہ یہی چاہتا تھا کہ جنوب میں عیسائی باغیوں کی بغاوت کی آگ بجھنے نہ پائے، امریکہ کی اِس ناپاک اور مذموم کاروائی کے پس پردہ دو بڑے اور اہم مقاصد ہیں، اوّل، امریکہ کی ناپاک نظریں سوڈان کے قدرتی اور معدنی ذخائر آئل، گیس اور سونا چاندی، سلیکون، کاپر اور جپسم جیسی معدنیات پر لگی ہیں، دوسرے یہ کہ سوڈان نے چین کے تعاون سے اپنے

قدرتی وسائل کو ترقی دے کر ملک میں ترقی اور خوشحالی کے جو نئے امکانات پیدا کئے ہیں، وہ امریکہ اور اسرائیل کے اسٹریٹیجک مفادات کے خلاف ہیں،اِس لیے ضروری تھا کہ وہ افریقہ بالخصوص سوڈان میں اپنے قدم جمائے اور دیگر بیرونی طاقتوں کو سوڈان میں آنے سے روکے تاکہ بلا شرکت غیرے سوڈان کے وسائل خود ہڑپ کر سکے۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ 1898ء میں سوویت یونین کی افغانستان میں شکست اور وسط ایشیاء سے پسپائی کے بعد امریکہ کو گریٹ گیم کیلئے کھلا میدان مل گیا،لیکن یہ گریٹ گیم صرف افغانستان میں نہیں ہورہا بلکہ امریکہ یہ کھیل دنیا کے کئی ممالک میں کھیل رہا ہے اوراِس کھیل کے زیادہ تر میدان مسلم اکثریتی علاقے چنے گئے ہیں،ایسا ہی ایک کھیل افریقہ کے سب سے بڑے مسلم ملک سوڈان میں برسوں سے کھیلا جارہا ہے،جس کے اب بدترین نتائج سامنے آنے والے ہیں،سوڈان کی تقسیم کا فیصلہ تو بہت پہلے ہوچکا تھا،اب آخری کیلیں ٹھونکنے کی تیاری کی جارہی ہیں،بظاہراِس کھیل کی تکمیل کیلئے امریکہ اور اُس کے حواریوں نے استصواب رائے کا حربہ استعمال کیا،لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرار دادوں کے باوجود یہ استصواب رائے کا حق آج تک کشمیر میں کشمیریوں کو نہیں دیا گیا،آج سوڈان کی تقسیم میں صلیبی وصہیونی سازشیں کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اسرائیل کے ایماء پر امریکہ اور اُس کے صلیبی حواری جنوبی سوڈان میں عیسائیوں کی جو علیحدہ ریاست بنوانے جارہے ہیں، وہاں عیسائیوں کو اکثریت حاصل نہیں ہے، جنوبی سوڈان سات لاکھ مربع کلومیٹر پر محیط اور اِس کی آبادی 80 لاکھ ہے جس میں 18 فیصد مسلمان اور صرف 17 فیصد عیسائی ہیں، باقی بت پرست ہیں، یعنی وہاں مسلمانوں کی تعداد عیسائیوں سے زیادہ ہے، لیکن صلیبی طاقتوں کو صرف سوڈان کی تقسیم سے غرض ہے، جس کی اصل وجہ جنوبی سوڈان میں تیل ومعدنیات کی بیش قیمت دولت ہے۔

یہاں یہ جغرافیائی حقیقت بھی قابل ذکر ہے کہ جنوبی سوڈان کے پڑوسی افریقی ممالک ایتھوپیا (حبشہ) کینیا، یوگنڈا، ڈیموکریٹک ری پبلک آف کانگواور سنٹرل افریقی جمہوریہ عیسائی ممالک ہیں، صرف اُس کے شمالی اور مغربی پڑوسی مصر، لیبیااور چاڈ مسلم ملک ہیں،اِن عیسائی ملکوں نے امریکہ، برطانیہ اور اسرائیل کی مدد سے سوڈان کے عیسائیوں کو بغاوت پر اکسایااور مسلح بغاوت کے لئے اُن کی مالی اور فوجی امداد بھی کی،امریکہ اور اسرائیل، جنوبی سوڈان کے پڑوسی عیسائی ملکوں کے ذریعے ہمیشہ عیسائی باغیوں کی مدد کرتے رہے اورانہیں جدید اسلحے اور گولہ بارود سے لیس کرتے رہے، طرفہ تماشہ دیکھئے کہ اِن مغربی ممالک نے جنوبی سوڈان کے علیحدگی پسندوں اور باغیوں کو دہشت گرد اور باغی

کہنے کے بجائے انہیں اپنی آزادی کی جائز جدوجہد کرنے والا قرار دیا، جبکہ مسلمانوں کی طرف سے یہی جدوجہد کشمیر، فلسطین، چیچنیا اور داغستان وغیرہ میں بغاوت اور دہشت گردی شمار کی جاتی ہے۔

یہاں بھی مغرب نے اپنی اُس روایت کو زندہ رکھا جو مسلمان اور عیسائیوں کیلئے علیحدہ علیحدہ معیار، پیمانے اور اصول رکھتی ہے انہوں نے مسلم اکثریتی ملک انڈونیشیا کے عیسائی باغیوں کے ساتھ جو دوستانہ سلوک کیا، وہی رویہ مسلم سوڈان کے عیسائی باغیوں کے ساتھ اپنایا، جس طرح برسوں کی مسلح بغاوت کے بعد 20 مئی 2002 کو ریفرنڈم کے ذریعے مشرقی تیمور ایک آزاد عیسائی ملک بن گیا، بالکل اُسی طرح 9 جولائی 2011 کو قدرتی وسائل سے مالامال جنوبی سوڈان دنیا کا ایک نیا اور آزاد عیسائی ملک بننے جارہا ہے۔

آج اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ 1990 سے 2011 کے درمیان کے اکیس برسوں میں دنیا کے نقشے پر 33 نئے ممالک وجود میں آئے جن میں سے 24 عیسائی اور صرف 9 مسلم ریاستیں ہیں، خیال رہے کہ یہ سب کے سب شمالی ایشیاء اور مشرقی یورپ کے کمیونسٹ بلاک سوویت یونین اور یوگوسلاویہ کے ٹوٹنے کہ وجہ سے وجود میں آئے تھے، اِس میں بھی بوسنیا کے مسلمانوں کو مکمل آزادی نہیں دی گئی، بلکہ اقلیتی سربوں کو بھی اقتدار میں شامل کردیا گیا، مشرقی تیمور اور جنوبی

سوڈان کی طرح ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی مسلم اکثریتی اور جغرافیائی خطے کو ان کی مسلح جدوجہد آزادی یا بغاوت کے نتیجے میں آزادی یا خودمختاری نصیب ہوئی ہو، لیکن خود مسلم اکثریتی ممالک کو توڑنے اور اُس کے حصے بخرے کرنے کا عمل ہمیشہ جاری رہا، عراق اور سوڈان کی تقسیم اِس کا بین ثبوت ہے۔

عراق کے شمالی حصے کو کسی ریفرنڈم کے بغیر ہی عملاً ایک آزاد کردستان میں تبدیل کردیا گیا، لیکن چیچنیا اور داغستان (روس) مغربی میانمار، جنوبی تھائی لینڈ، جنوب مغربی چین (سینکیانگ) اور دیگر خطوں میں اقوام متحدہ میں وعدوں کے باوجود نہ صرف یہ کہ کبھی مشرقی تیمور اور جنوبی سوڈان کی طرح ریفرنڈم کے لئے راستہ ہموار نہیں کیا گیا بلکہ متذکرہ خطوں کی آزادی کی جدوجہد کرنے والوں پر علیحدگی پسندوں اور دہشت گردوں کا لیبل بھی لگا دیا گیا، اگر ریفرنڈم ہی تمام مسائل کا حل ہے تو آخر یہ علاقے اقوام متحدہ کی اِس حکمت عملی سے کیوں محروم ہیں؟ ہمارے اس سوال کا سب سے بہتر جواب اسرائیل کے وزیر برائے امور سلامتی "AVIDICHTER" کے اُس بیان سے ملتا ہے جو اُس نے 4 ستمبر 2008ء کو ایک اسرائیلی یونیورسٹی میں لیکچر دیتے ہوئے دیا تھا، کہ "ہمارا مقصد سوڈان کے حصے بخرے کرنا اور وہاں خانہ جنگی کی آگ بھڑکائے رکھنا ہے کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو یہ علاقہ اپنی وسیع و عریض سرزمین بے تحاشہ قدرتی معدنی اور زرعی وسائل اور اپنی بڑی آبادی کے ذریعے ایک طاقتور

علاقائی طاقت سکتی بن سکتا ہے۔
اِس لیے کہ اگر سوڈان میں استحکام رہا تو اپنے وسائل کے ذریعے ایسی قوت بن جائے گا جس کا مقابلہ ممکن نہیں رہے گا، لہٰذا سوڈان سے یہ صلاحیت چھین لینا اسرائیل کی قومی سلامتی کے لئے ناگزیر ہے، ہم نے سوڈان میں عدم استحکام پیدا کرنے کے لئے اُس کی پڑوسی ریاستوں ایتھوپیا، یوگنڈا، کینیا اور زائر میں سوڈان مخالفت کے بڑے مراکز قائم کیے اور اُن کو فعال رکھا تاکہ سوڈان عالم عرب اور افریقہ میں کوئی فعال کردار ادا نہ کر سکے۔"
یہی اسرائیلی وزیر برائے داخلی سلامتی امور مزید کہتے ہیں کہ "1968ء سے 1970ء کے درمیان میں جب مصر اور اسرائیل حالت جنگ میں تھے تو سوڈان نے مصری فضائیہ کی اصل قوت اور بری افواج کے تربیتی مراکز کے لئے اپنی سرزمین فراہم کی تھی، اِس صورتحال کے اعادہ سے بچنے کے لیے اسرائیلی ذمہ داران کا فرض تھا کہ وہ سوڈان کے لیے ایسی مشکلات کھڑی کریں جن سے نکلنا ممکن نہ رہے اور سوڈان عالم افریقہ میں کوئی مرکزی حیثیت حاصل نہ کر سکے، دارفر میں ہماری موجودگی ناگزیر تھی اِس کی تجویز وزیر اعظم ایریل شیرون نے دی کہ وہاں بحران کھڑا کیا جائے، اِس پر عمل کیا گیا اور عالمی برادری خاص طور پر امریکہ اور یورپ نے ساتھ دیا اور دارفر کے بارے میں ہمارے طے شدہ اہداف و مقاصد اب

" تکمیل کے آخری مراحل میں ہیں۔
قارئین محترم کیا یہ کھلا اعتراف اِس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ امریکہ اور اُس کے حواری کس کے لئے کام کر رہے ہیں، صاف ظاہر ہے کہ یہ سب صرف اسرائیل کے تحفظ کے لیے کیا جارہا ہے، کیونکہ امریکہ نہیں چاہتا کہ اُس کے لے پالک کے لئے خطے میں کوئی خطرہ موجود رہے، یہ ہے وہ ناپاک صہیونی و صلیبی منصوبہ جس کو امریکہ اپنے حواریوں کے ساتھ مل کر پایہ تکمیل تک پہنچا رہا ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ سوڈان کی تقسیم اور جنوب میں عیسائی ریاست کا قیام امریکی نوآبادیاتی منصوبے کا تسلسل اور مسلم ممالک کی طاقت کو پاش پاش کرنا ہے، ہماری نظر میں سوڈان کی تقسیم مسلم ممالک کی سیاسی تاریخ میں ایک اور سیاہ باب کا اضافہ ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ سوڈان کے بعد کس اسلامی ملک کی باری آتی ہے؟ چاڈ کے صدر ادریس دیبی کی یہ تنبیہ کہ " سوڈان کی علیحدگی کا نتیجہ بہت خطرناک نکلے گا اور اِس کا اثر پورے افریقہ تک پہنچے گا۔ " دیگر افریقی ممالک اور مسلم حکمرانوں کی آنکھیں کھولنے کیلئے کافی ہے

۔

جب تک مسلم ممالک کے حکمران اپنے پڑوسی اسلامی ممالک کی مذہبی، لسانی اور نسلی بنیادوں پر تقسیم پر خاموش تماشائی بنے رہیں گے، امریکہ اُس کے حواری

اِسی طرح مسلم ممالک کی تقسیم در تقسیم کا کھیل کھیلتے رہیں گے، واضح رہے کہ امریکی نوآبادیاتی سازشی منصوبہ کم و بیش تمام مسلم ممالک میں مختلف طریقوں سے جاری ہے، عراق، افغانستان، یمن، سعودی عرب اور پاکستان میں آزاد بلوچستان بھی اِسی سازشی منصوبے کا حصہ ہیں، حقیقت یہ ہے کہ فوجی جرنیلوں، خاندانی بادشاہتوں، شخصی آمریتوں اور ایجنٹ امریکی حکمرانوں نے مسلم ممالک کی آزادی اور وسائل کو امریکہ اور مغربی استعمار کی چراگاہ بنا دیا ہے۔

لیبیا۔۔۔سامراجی سازشوں کے نرغے میں

لیبیا.....اک نئے دور غلامی کی طرف گامزن

لیبیا کو اب تک انقلابی رہنما کرنل معمر قذافی کے نام سے پہچانا جاتا ہے، چار دہائیوں سے لیبیا کا داخلی استحکام، تیل کی آمدنی کا انتظام اور انتظامی تقسیم کار صدر معمر قذافی کے ہاتھوں میں ہے۔لیبیا تیل کی پیداوار کے حوالے سے دنیا میں 17 ویں نمبر پر آتا ہے اور تیل کی فروخت سے حاصل ہونے والی آمدنی لیبیا کی معیشت میں مرکزی کردار ادا کرتی ہے، جو کہ اِس ملک کی چھ ملین سے زائد کی آبادی کی ضروریات زندگی کے لئے کافی سے بہت زیادہ ہے۔لیبیا شمالی افریقہ کا سب سے امیر ملک ہے، جس میں دس بڑے قبائل آباد ہیں جن کی کئی ذیلی شاخیں پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں۔لیبیا کے صدر کرنل معمر قذافی کا تعلق بھی ایک ایسے ہی قبیلے قذافہ سے ہے۔

معمر قذافی 1942ء میں سِرت کے نزدیک ایک صحرائی علاقے میں پیدا ہوئے۔اوائل جوانی میں وہ مصری رہنما جمال عبدالناصر کے شیدائی تھے۔وہ 1956ء کے نہر سوئز کے بحران کے دوران مغرب اور اسرائیل کے خلاف ہونے والے مظاہروں میں بھی پیش پیش رہے۔1969ء فوجی بغاوت کے بعد وہ لیبیا کے رہنما بن کر ابھرے، کرنل

قذافی 70 کی دہائی میں عرب قوم پرستی کے علمبردار رہے،انہوں نے لیبیا کو اُس وقت کے مصری، شامی اور اردنی رہنماؤں کے ساتھ کئی معاہدوں میں بھی منسلک کیا، لیکن 90 کی دہائی میں عرب دنیا کو اپنی قیادت میں متحد کرنے کی کوشش میں ناکام رہنے کے بعد انہوں نے اپنی ساری توجہ براعظم افریقہ پر مرکوز کردی اور افریقی ملکوں کے لئے ایک ریاست ہائے متحدہ کا تصور بھی پیش کیا۔

کرنل معمر قذافی دنیا بھر میں مختلف آزادی پسند تنظیموں کے بھی پشت پناہ اور مددگار رہے ہیں، جن میں تنظیم آزادی فلسطین یا پی ایل او قابل ذکر ہے، عرب قیادت کے حوالے سے کرنل قذافی کے اکثر دیگر عرب رہنماؤں سے اختلافات بھی رہے ہیں، چند برس پہلے قاہرہ میں عرب لیگ کے سربراہ اجلاس کے دوران تو اُن کی سعودی بادشاہ عبداللہ سے سرعام تو تو میں میں بھی ہوئی تھی،انہوں نے لیبیا کو ایٹمی قوت بنانے کی بھی کوشش کی لیکن اپنوں کی غداری نے اُن کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہونے دیا۔

اُن کے 42 سالہ دورِ اقتدار میں لیبیا نے بہت تیزی سے معاشرتی اور معاشی ترقی کی، عالمی بینک کے اعداد و شمار کے مطابق لیبیا کی فی کس آمدنی تقریباً بارہ ہزار ڈالر ہے، ناخواندگی تقریباً ختم ہو چکی ہے اور ہر فرد کے پاس اپنا گھر ہے، کرنل معمر قذافی کے اقتدار سنبھالنے سے پہلے ایسا نہیں تھا،حکومت

ملازمت کے حصول اور دوسرے سرکاری کاموں میں مدد کرتی ہے۔دیگر عرب ممالک کے مقابلے میں لیبیا میں عورتیں آزاد ہیں، وہ جو چاہے پہنیں اور جہاں چاہے نوکری کریں، بلاشبہ اپنے دور اقتدار میں معمر قذافی نے لیبیا اور عوام کی ترقی و خوشحالی کیلئے اچھے کام کیے، مگر تیونس اور مصر کے حالیہ واقعات کو دیکھنے کے بعد اب لیبیا کے عوام یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ اُن کی اکثریت بنیادی سہولتوں سے محروم ہے۔

معمر قذافی عرب دنیا کے وہ واحد حکمران ہیں جو بادشاہ، سلطان یا خلیفہ کہلانے کے بجائے صدر کہلانا پسند کرتے ہیں،انہوں نے ملک کا آئین بھی خود ہی تصنیف کیا ہے جو گرین بک یا سبز کتاب کہلاتا ہے،اپنے بیالیس سالہ دور اقتدار کے دوران معمر قذافی نے لیبیا کو عرب سمیت دنیا بھر میں ایک خاص مقام دلوانے میں بہت اہم کردار ادا کیا، لیکن آج یہی لیبیا تیونس اور مصر کے بعد شدید ہنگاموں اور عوامی مخالفت کی زد میں ہے اور عرب ریاستوں کی بادشاہتوں اور آمریتوں کیخلاف تبدیلی کی جو لہر تیونس میں شروع ہوئی تھی، وہ مصر سے ہوتی ہوئی اب لیبیا کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ پچھلے دو ماہ میں مشرق وسطی میں عوامی احتجاج کی لہر نے خطے کا سیاسی منظر نامہ ہی تبدیل کر دیا ہے، یمن، بحرین، اردن، الجزائر، مراکش،

تیونس اور مصر سمیت دیگر عرب ممالک میں پھیلی ہوئی اِس احتجاجی لہر میں سب سے زیادہ تیزی لیبیا میں دیکھنے میں آ رہی ہے، جہاں مظاہرین اور ریاستی اداروں کے درمیان تصادم جاری ہے،اس صورتحال نے عرب ممالک کے حکمرانوں کو پریشان اور خائف کردیا ہے اور انہیں اپنے پیروں کے نیچے سے اقتدار کا قالین کھسکتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ چنانچہ انھوں نے عوام کو مراعات اور سہولتیں دینے کے اعلانات شروع کر دیئے ہیں، جس کی تازہ مثال سعودی عرب کے شاہ عبداللہ کی ہے جو گزشتہ تین ماہ سے بغرض علاج ملک سے باہر تھے، لیکن حالات کی سنگینی اور خطے کی تیزی سے بدلتی ہوئی صورتحال کو دیکھتے ہوئے انھوں نے وطن واپس آ کر پیش بندی کے طور پر عوام کو اصلاحات دینے اور سہولیات زندگی فراہم کرنے کیلئے 35 ارب ڈالر کے پیکیج کا اعلان کیا اور حکام کو سختی نہ کرنے کی ہدایات جاری کیں، سرکاری ٹیلی ویژن کے مطابق شاہ نے سوشل سیکیورٹی، رہائشی منصوبوں اور بیرون ملک تعلیم کے حصول کے لئے اضافی رقم دینے کا بھی اعلان کیا ہے۔

دوسری طرف یمن کے صدر علی عبداللہ صالح ملک میں بے روزگاری اور غربت کے نام پر حکومت کیخلاف ہونیوالے مظاہروں کو بیرونی اشاروں پر ملک کو غیر مستحکم کرنے کی سازش قرار دیتے ہیں، یہی باتیں بن علی نے تیونس میں کی تھیں، اردن کے

شاہ عبداللہ کو ہنگاموں کے پیچھے القاعدہ اور اخوان المسلمین کا ہاتھ دکھائی دیتا ہے، بحرینی حکام کو شیعہ ابھار کے پیچھے حزب اللہ کا ہاتھ نظر آتا ہے، جبکہ حسنی مبارک کی طرح معمر قذافی بھی یہی اشارے دے رہے ہیں کہ موجودہ شورش کے پیچھے امریکہ کا ہاتھ ہے۔

یہ ناممکن بھی نہیں، کیونکہ امریکہ ترقی پذیر ممالک میں شورش برپا کرانے اور حکومتوں کے تختے الٹانے کا کھیل کھیلتا رہتا ہے، حافظے کی کمزوری کے باوجود دنیا ابھی تک نہیں بھولی کہ انڈونیشیاء کے صدر سوئیکارنو سے نجات حاصل کرنے کیلئے کس نے کم و بیش پانچ لاکھ انڈونیشی قتل کروا ڈالے، عراق میں دودھ اور خوراک سے بلکتے بچوں کے پیچھے کس کی قاہری کام کر رہی ہے، کون ہے جس نے جھوٹ اور منافقت کا سہارا لے کر صدام حسین کی حکومت کا خاتمہ کیا، کس نے لبنان کی گلی کوچوں کو خون سے نہلایا، کس نے معمر قذافی کی اقامت گاہ کو بمباری کا نشانہ بنا کر اُس کی منہ بولی بیٹی کی جان لی، کون ہے جس نے اپنے پروردہ شاہ ایران کے تحفظ کیلئے ایران میں لاکھوں انسانوں کی گردنیں کٹوا ڈالیں، ویتنام، کمبوڈیا اور لاؤس کی دیواروں پر کس کے سیاہ خونی کارنامے رقم ہیں، کون ہے جو صومالیہ میں خون کی ہولی کھلتا رہا، کون ہے جس نے الجزائر کی منتخب حکومت کا تختہ الٹ کر اپنے چہیتوں کو تخت پر بیٹھایا اور وہ کون ہے جو آج بھی افغانستان اور پاکستان کے قبائلی علاقوں میں رقص ابلیس کر رہا ہے

۔

لہذااِس تاریخی تناظر میں عرب ریاستوں میں شروع ہونیوالے پرتشدد مظاہروں میں بیرونی ہاتھ کے ملوث ہونے کے امکان کو یکسر مسترد نہیں کیا جا سکتا، خاص طوپر لیبیا میں، یہ درست ہے کہ معمر قذافی گزشتہ بیالیس سال سے لیبیا پر حکمران ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ عرب دنیاکے دیگر حکمرانوں کی طرح انہوں نے بھی اپنے اقتدار کو طول دینے کیلئے ظلم و جبر کے آمرانہ ہتھکنڈے اپنائے ہوں، لیکن اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ لیبیاکے حالات تیونس اور مصر کے حالات سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتے۔

کیونکہ لیبیا کی حکومت نے عوام کی فلاح و بہبود اور لیبیا کی ترقی و خوشحالی کیلئے دیگر عرب ممالک کے مقابلے میں بہت زیادہ کام کیا ہے، وہاں غربت، بھوک و افلاس اور بے روزگاری نہیں ہے، نہ ہی وہاں جہالت، لاقانونیت اور بدامنی کا دور دورہ ہے، خود عالمی بینک کے اعدادوشمار اِس بات کے گواہ ہیں، لیکن اِس کے باوجود اِس وقت لیبیا میں موجود بے چینی کا فائدہ اٹھاکر جو فضا بنائی جارہی ہے، وہ قذافی حکومت کیلئے تیونس اور مصر سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔

ہماری نظر میں اِس کی اصل وجہ خود لیبیا کے صدر کرنل معمر قذافی ہیں جو آج بھی دنیا
میں استعمار کے خلاف نفرت اور مزاحمت کی علامت سمجھے جاتے ہیں،انھوں نے ہمیشہ
سامراجی اور استعماری قوتوں کو ٹف ٹائم دیا،وہ عرب دنیا کو متحد کرنے میں ناکامی کے
بعد افریقی یونین بنانے کیلئے سرگرم رہے،2000ء میں عراق میں صدام حکومت کے
خاتمے تک انھوں مزاحمت جاری رکھی،لیکن عرب ممالک کی بے وفائی اور عالمی تنہائی
نے انہیں مجبور کردیا کہ وہ کسی حد تک حالات سے سمجھوتہ کرلیں۔

مگراس کے باوجود انھوں نے لیبیا کو امریکی مفادات کی چراہ گاہ نہیں بننے دیا،آج لیبیا کو
ایٹمی قوت بنانا،اسرائیل کے خلاف فلسطین اور دیگر حریت پسند تنظیموں کی مدد
کرنا،اتحاد امت کی خواہش اور کوشش کرنا،صلیبی وصہیونی قوتوں کی آنکھوں میں
آنکھیں ڈالنا اور اُن کے خلاف بھرپور مزاحمت وجدوجہد کرنا،معمر قذافی کے وہ ناقابل
معافی جرائم ہیں جن کی سزا دینے کیلئے یہ قوتیں لیبیا میں تبدیلی کی خواہاں اور اس مقصد
کیلئے وہ لیبیا میں شورش کو بڑھاوا اور عوامی بغاوت کو فروغ دے رہی ہیں۔

یہ وہی قوتیں ہیں جو کبھی فلسطین اور کشمیر کے مسئلہ پر کوئی فیصلہ کن قدم نہیں اٹھاتیں،جو
گزشتہ دنوں سلامتی کونسل میں مقبوضہ فلسطینی علاقوں میں

اسرائیلی بستیوں کی تعمیر کے خلاف قرارداد مذمت 14 کے مقابلے میں صرف ایک ووٹ
سے مسترد کردیتی ہیں، انہیں بھارت کے زیر اثر مقبوضہ کشمیر سمیت دنیا بھر میں اور کہیں
بھی حقوق انسانی کی خلاف ورزی نظر نہیں آتی ،ظاہر ہے "دیدہ کور کو کیا آئے نظر کیا
دیکھے" والی بات ہے۔
اب جبکہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے ادارے نے لیبیا کی رکنیت معطل کرنے اور
تشدد کی عالمی تحقیقات کی سفارش کی ہے،امریکہ پہلے ہی اپنے نام نہاد عالمی اصولوں اور
خود ساختہ شائستگی کی مروجہ اقدار کی پاسداری میں لیبیا پر پابندیاں عائد کرچکا
ہے، دوسری طرف امریکہ، برطانیہ، فرانس اور جرمنی کی حمایت سے اقوام متحدہ کی
سلامتی کونسل لیبیا کے رہنما معمر قذافی، اُن رفقاء اور خاندان کے اثاثے منجمد
کرنے، بین الاقوامی سفر اور لیبیا کے اسلحہ خریدنے پر پابندیاں عائد کرنے اور اُس کا کیس
جرائم کی عالمی عدالت کے سپرد کرنے کا فیصلہ کرچکی ہے۔
سامراجی قوتوں کے اِن سب اقدامات کا مقصد لیبیا کے گرد گھیرا تنگ کرکے معمر قذافی کو
اقتدار سے بے دخل کرنا اور امریکہ نواز ایجنٹوں کا برسر اقتدار لانا ہے، تاکہ عراق کی
طرح لیبیا کے بھی تیل کے وسائل پر قبضہ کیا جاسکے،امر واقعہ یہ ہے کہ عوامی احتجاج کے
نتیجے میں تیونس اور مصر میں آنے

والی تبدیلیوں کو پہلے ہی سامراجی قوتیں ہائی جیک کر چکی ہیں اور امریکہ تیونس اور مصر میں انقلاب کو سبوتاژ کرکے کٹھ پتلی حکومت لانے میں کامیاب ہو چکا ہے۔

اس وقت اِن ممالک کی متبادل قیادت امریکی حمایت یافتہ فوجی جرنیلوں، کرپٹ بیوروکریٹس ،نااہل سیاستدانوں، پاکٹ اپوزیشن اور اقوام متحدہ میں اِن کے ایجنٹوں پر مشتمل ہے، بظاہر ان ممالک میں جو تبدیلی آئی ہے، وہ حقیقی نہیں بلکہ وہ مصنوعی تبدیلی ہے جس میں نظام نہیں صرف چہرے بدلتے ہیں، جبکہ کھیل، کھلاڑی اور شطرنج کی بساط وہی رہتی ہے، جس طرح تیونس اور مصر میں فوج نے اقتدار سنبھال کر حقیقی انقلاب کا راستہ روک دیا، کیا وہی کچھ لیبیا میں ہونے جارہا ہے، یہ دیکھنا ابھی باقی ہے۔

لیکن ایک بات طے ہے کہ امریکہ لیبیا میں ایسی حکومت چاہتا ہے جو امریکہ کی وفادار اور حلیف بن کر کام کرسکے، اگر خدانا خواستہ سامراجی قوتیں اپنے مذموم عزائم میں کامیاب ہو جاتی ہیں اور معمر قذافی کو اپنے اقتدار کا بوریا بستر لپیٹنا پڑتا ہے تو قذافی کے بعد لیبیا کا مستقبل کیسا ہوگا، کیا لیبیا اپنی گروہی اور قبائلی عصبیت سے دامن بچاکر اپنی وحدت اور سالمیت کو قائم رکھ سکے گا اور کیا لیبیا دیگر عرب ممالک کی طرح امریکی کالونی نہیں بنے گا، یہ

وہ سوالات ہیں جو اُن لیبیائی عوام کیلئے لمحہ فکریہ ہیں، جن کا احتجاج لیبیا کو ایک نئے دور غلامی کی طرف لے جانے کیلئے متحرک ہے۔

کہانی آپ الجھی ہے کہ الجھائی گئی
یہ عقدہ تب کھلے گا جب تماشہ ختم ہوگا

مفاہمت کے دائروں میں الجھی عوامی خواہشات

معمہ تو معمہ ہی ہوتا ہے، جس کے معنی ہی پیچیدہ بات، مبہم چیز اور پہیلی کے ہوتے ہیں، اگر سمجھ میں آ گئی تو ٹھیک، وگرنہ ذہن کے نہاں خانوں کی دیواروں سے ٹکراتی رہتی ہے اور قلب و روح کو زخمی کرتی رہتی ہے، بدقسمتی سے ہمارے ملک کی سیاست بھی کسی سمجھ میں نہ آنے والے معمہ سے کم نہیں ہے، حالات کب کون سا رخ اور رنگ اختیار کرلیں اور کب سیاسی بساط پر مہرے تبدیل ہوجائیں اور کب جیتی ہوئی بازی ہار میں تبدیل ہوجائے، یہ کوئی نہیں جانتا اور کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ کب ہونی انہونی اور انہونی ہونی بن جائے۔

ہمارے ملک کی سیاست کا ابتداء ہی سے یہ المیہ رہا ہے کہ جب بھی جمہوری قوتوں کی جانب سے سیاسی استحکام کے اسباب فراہم کئے جاتے ہیں، بے چینی، بے یقینی اور عدم استحکام کے سائے مزید گہرے سے گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں، جیسے جیسے اقتدار کے تحفظ کیلئے حکمران محل کی فصیلیں بلند کرتے اور دیواریں مضبوط بناتے ہیں، فصیلوں پر کمندیں ڈالنے والوں کے ارادے اور بھی مضبوط اور پختہ تر ہوتے چلے جاتے ہیں، جس قدر اقتدار کے دوام کیلئے نئی قلعہ بندیاں کی جاتی ہیں، اسی قدر سیاسی ماحول میں گھٹن اور کشیدگی بھی بڑھتی جاتی

ہے، ہمارے خیال میں اِس کی سب سے بڑی بنیادی وجہ جمہوری اصولوں سے رو
گردانی، آئینی اور قانونی تقاضوں سے انحراف اور اتفاق رائے کے بغیر قومی معاملات میں
فرد واحد کی مرضی و منشاء کا عمل دخل ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ فرد واحد خواہ کتنا ہی
مخلص، محب وطن، صاحب بصیرت اور دانا و بینا ہی کیوں نہ ہو، کبھی بھی آئین اور
دستوری اداروں کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔

ہماری 64 سالہ تاریخ میں ہر طالع آزما نے آئین کو ملبوس سمجھ کر اپنے قدو قامت کے
مطابق غیر آئینی اقدامات کے بل پر اپنے تئیں ملک و قوم کے مفاد میں دور رس
اصلاحات کا بیڑہ اٹھایا، لیکن جہاں اُس کی اپنی ذات کا بنیادی پتھر سرکا، وہیں اس کا اپنا تعمیر
کردہ بلند و بالا سیاسی قلعہ اور تحفظ دینے والے وزراء و مشیروں کی مضبوط دیواریں
ریت کے گارے کی طرح زمین پر آگریں اور پلک جھپکتے ہی تمام انقلابات کے
دروازے، اصلاحات کی کھڑکیاں، آئینی ترامیم کے دریچے اور ڈیمو کریسی کی محرابیں ملبے
کا ڈھیر بن گئیں۔

درحقیقت یہی وہ دیرینہ بیماری ہے جو پچھلے 64 سالوں سے اقتدار کے سنگھاسن پر بیٹھنے
والے ہر حکمران کے رگ و پے میں سرایت کرجاتی ہے، اس وقت بھی یہی دیرینہ بیماری
ہمارے حکمرانوں کے دلوں کے دروازے پر دستک دے رہی ہے، انہیں یہ یقین دلا رہی
ہے کہ "پاکستان بچانے" کے نعرے کی وجہ سے ملک کی تقدیر

سنبھالنے کا فریضہ قدرت نے انہیں سونپ دیا ہے اوراب صاف ستھری
جمہوریت، اقتصادی انقلاب، ترقی و خوشحالی کے تمام راستے اور عوامی فلاح و بہبود کے
تمام چشمے صرف انہی کی ذات سے پھوٹیں گے۔ ملک و قوم کا مستقبل اور قوم کی ترقی و
خوشحالی کی ضمانت اور بقاء اب اُن کی ذات سے مشروط ہے۔
یہی وہ خام خیالی اور خود فریبی ہے، جس نے پیپلز پارٹی اور دیگر حکومتی حلیف جماعتوں
کے درمیان مفاہمت کے پُر امن ماحول میں دراڑیں ڈال کر اُن کے راستے جدا جدا
کر دیئے ہیں، جس کی وجہ سے مستقبل میں قومی یکجہتی اور باہمی مفاہمت کے امکانات
معدوم ہو گئے۔
18 فروری 2008ء کے اُس عظیم عوامی مینڈیٹ جس کے نتیجے میں قومی سیاست میں
مفاہمت اور مصالحت کی فضا اور جیو اور جینے دو کے جس جذبے اور ولولے نے نمو پائی
تھی، سندھ کے وزیر داخلہ کے تند و تیز بیانات سے ہواؤں میں تحلیل ہو گئی ہے، جو
دونوں بڑی جماعتوں کے درمیان افہام و تفہیم اور باہمی رواداری کی بنیاد پر پیدا ہوئی
تھی اور بالآخر وہی ہونے جارہا ہے جس کا اندیشہ سیاسی مبصرین ظاہر کر رہے تھے۔
سیاسی کشیدگی اب مفاہمت کے دائروں سے نکل کر سیاسی مصلحتوں، ٹکراؤ اور ایک

دوسرے کو نیچا دکھانے کا چلن بن گئی ہے، یوں لگتا ہے کہ 1990ء والا محاذ آرائی کا دور پھر سے شروع ہونے جارہا ہے، اگر ایسا ہوا تو ہماری بہت بڑی بدقسمتی ہوگی، یہ کتنی عجیب صورتحال ہے کہ تین سال قبل جب عوام ایک آمر مطلق کے ساتھیوں اور پالیسی کو مسترد کرکے جمہوری قوتوں کو ووٹ دے رہے تھے تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ عوام کی عزت و تکریم، ملکی وقار اور حقیقی جمہورت سمیت کچھ بھی بحال نہیں ہوگا، بلکہ الٹا شرمناک حقیقتیں اور ملکی سلامتی کے حوالے سے خوفناک نتائج بے نقاب ہونگے اور عوام کا قائدین سے سیاسی اعتبار ہی اٹھ جائے گا۔

یہ کتنی شرمناک حقیقت ہے کہ ریمنڈ ڈیوس جیسے نہ جانے کتنے امریکی جاسوس ہماری سرزمین پر دندناتے پھر رہے ہیں، امریکی جاسوس طیاروں کیلئے ہماری ہی سرزمین استعمال ہو رہی ہے، یہ صرف چند مثالیں ہیں جبکہ اس طرح کی کتنی وہ تلخ حقیقتیں ہیں جو آج بھی پاکستان کی بھولی عوام سے پوشیدہ ہیں اور ارباب اقتدار عوام کی آنکھوں میں دھول جھونک کر بیرونی قوتوں کی کاسہ لیسی میں مصروف ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ایک منتخب سیاسی عوامی حکومت کا انتخاب عوام نے اپنی محرومی اور ان جمہوری حقوق کی بازیابی کیلئے کیا تھا جو ایک آمر مطلق نے آٹھ سال سے سلب کر رکھے تھے، عوام آئین میں نقب لگانے والے اور بیرونی طاقتوں کے ہاتھوں ملک کے قومی مفادات کا سودا کرنے والوں کا احتساب چاہتے

تھے۔
لیکن پاکستان کی بھولی عوام کی یہ آرزو اور خواہش برسر اقتدار آنے والوں کے ایجنڈے کے خلاف تھی، جس کی وجہ سے آئین کو دوبار توڑنے اور عدلیہ و عوام کو بے توقیر کرنے والوں کو مکمل تحفظ دیکر فوجی اعزار کے ساتھ رخصت کیا گیا اور اس دن کے بعد سے تاحال عوام اور اہل اقتدار کی ترجیحات ایک دوسرے کے خلاف اور متصادم ہیں۔
یہ حقیقت ہے کہ پاکستان اس وقت اپنی تاریخ کے انتہائی نازک دور سے گزر رہا ہے، موجودہ ریاستی نظام اپنی اصل جمہوری شکل و صورت کھو چکا ہے، جب تک ہمارے حکمران ملک و قوم کی مرضی و منشاء کے خلاف بیرونی دباؤ اور مصلحت کے تحت فیصلے کرنے ختم نہیں کر دیتے اُس وقت تک عوامی وتائید وحمایت یافتہ ایک جمہوری حکومت کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا، یاد رکھیں کوئی بھی جماعت اور حکومت پس پردہ قوتوں کی بدولت حکومت تو کر سکتی ہے لیکن عوامی امنگوں اور قومی وقار کے منافی طرز عمل کی وجہ سے عوامی جذبات کی ترجمان نہیں بن سکتی۔
ایسی حکومت جلد یابدیر اپنے انجام سے دوچار ہو جاتی ہے، اللہٰذا ہم ارباب

اقتدار سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ جمہوری اصولوں سے رو گردانی، آئینی اور قانونی تقاضوں سے انحراف اور اتفاق رائے کے بغیر قومی معاملات چلانے کیلئے اپنی مرضی و منشاء کا عمل دخل اور طاقت و عقل کل کی خود فریبی کی دیرینہ بیماری کے سحر سے باہر نکلیں اور تمام جمہوری سیاسی قوتوں کو ساتھ لے کر چلنے کا عزم کریں، ابھی کچھ نہیں بگڑا، ابھی بھی سنبھلنے کا وقت ہے، یاد رکھیئے فہم و فراست اور سیاسی سوج بوجھ کا عملی مظاہرہ ہی پاکستان میں جمہوریت کو دوام اور ملک کے جمہوری مستقبل کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔

آئی ایس آئی کے دفاتر پر حملہ ایک سوچی سمجھی منظم سازش۔۔۔

آئی ایس آئی سامراجی عزائم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ۔۔۔۔

خفیہ ایجنسیاں یا سراغ رساں ادارے کسی بھی ملک کی ایسی آنکھ،کان اور دماغ شمار کیئے جاتے ہیں جس کے بغیر اُس ملک کی سلامتی کی محافظ افواج اندھی اور بہری تصور کی جاتی ہے، کیونکہ اِن اداروں کے بغیر نہ تو ملک کی سالمیت کے خلاف ہونے والی سازشوں کا سراغ لگایا جاسکتا ہے اور نہ ہی ملکی مفادات کا تحفظ کیا جاسکتا ہے، جس وقت لوگ ملکی سلامتی کو لاحق خطرات سے بے خبر اپنے روز مرہ کے معمولات میں مصروف ہوتے ہیں،اُس وقت بھی یہ خفیہ ادارے حالت جنگ میں ہوتے ہیں اور اپنے ملک کی سلامتی کو لاحق خطرات کا مقابلہ کرنے کیلئے حکمت عملی (کاؤنٹر انٹیلی جنس آپریشن) وضع کر رہے ہوتے ہیں، ملکی سلامتی کے محافظ اداروں یا خفیہ ایجنسیوں کا یہ عمل ہر وقت جاری رہتا ہے۔

آج دنیا کے ہر ملک میں یہ ادارے نہ صرف موجود ہیں بلکہ اپنے اپنے ممالک کے مفادات کے تحفظ میں سرگرم عمل بھی ہیں، جیسے آسٹریلیا کی ASIS،انڈیا کی RAW ،فرانس کی DGSE،روس کی FSB (جو پہلے KGB کے نام سے کام کرہی تھی)، چین

MOSSAD اور اسرائیل کی M16 ،برطانیہ کی CIA، امریکہ کی MSS، کی

آئی بی، ایم آئی، ISI، وغیرہ، پاکستان کی بھی مایہ ناز انٹیلی جنس ایجنسی اور ہراول دستہ

این آئی اور اے آئی کے تعاون سے دشمن کی خفیہ چالوں، ملک دشمن،

سرگرمیوں، تخریبی کاروائیوں اور اندرونی سازشوں سے پاکستان کو محفوظ رکھنے کیلئے کام

کررہی ہے، آج اسے دنیا کی موثر اور کامیاب ترین انٹیلی جنس اداروں میں شمار کیا جاتا

ہے جو انتہائی کم بجٹ میں قابل فخر سٹریٹجک کامیابیاں حاصل کرچکا ہے۔

آئی ایس آئی (انٹر سرسز انٹیلی جنس) خالص عسکری نوعیت کی ایجنسی ہے، پاکستان کی

دیگر خفیہ ایجنسیاں ایم آئی، این آئی، اے آئی اور آئی بی اپنے اپنے اداروں کے لئے خفیہ

معلومات حاصل کرتی ہیں، لیکن آئی ایس آئی اِن چاروں سروسز سے متعلق معلومات

اکٹھی ہی نہیں کرتی بلکہ اُس کے ماہرین اِن معلومات کا بغور جائزہ لے کر نتائج اخذ کرتے

ہیں اور دشمن کی نیت تک کا اندازہ لگا کر آرمی چیف، ائر چیف اور نیول چیف کو آگاہ بھی

کرتے ہیں، یہ ادارہ عسکری نوعیت کے باعث براہِ راست وزیر اعظم کے ماتحت ہوتا ہے

۔

واضح رہے کہ آئی ایس آئی کی بنیاد 1948ء میں برٹش آرمی آفیسر میجر جنرل (ر)

کیوتھوم نے رکھی تھی اور 1950ء میں اسے قانونی طور پر پاکستان کے تحفظ کا ذمہ دار

ٹھہرا دیا گیا، آئی ایس آئی کا عملہ ایک حاضر سروس لیفٹیننٹ جنرل کے

زیر نگرانی ملک و قوم کے مفادات کے تحفظ کے لئے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر کام کرتا ہے۔ لیفٹننٹ جنرل جو کہ آئی ایس آئی میں بطور ڈائریکٹر جنرل کام کرتے ہیں، اُن کے نیچے تین ڈپٹی ڈائریکٹر جنرلز، ڈی ڈی جی پولیٹیکل، ڈی ڈی جی جنرل اور ڈی ڈی جی ایکسٹرنل ہوتے ہیں، جبکہ یہ ادارہ چھ سے آٹھ ڈویژنوں میں کام کرتا ہے، جس میں جوائنٹ انٹیلی (JCIB) جوائنٹ کاؤنٹر انٹیلی جنس بیورو (JIB) جوائینٹ انٹیلی جنس بیورو جوائنٹ سگنل انٹیلی جنس بیورو (JIM) جوائنٹ انٹیلی جنس مسلیینیئیس (JIN) جنس نارتھ اور جوائنٹ انٹیلی جنس ٹیکنکل ڈویژن شامل (JIT) جوائنٹ انٹیلی جنس ٹیکنکل (JSIB) ہیں۔

آئی ایس آئی نے پاکستان کے تحفظ کی خاطر ہمیشہ کلیدی کردار ادا کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ کا وجود دشمن کی آنکھ میں بری طرح کھٹکتا ہے اور وہ اِس کے خلاف بھرپور منفی ISI پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں، بھارت اور افغانستان کے بعد اب امریکہ نے بھی آئی ایس آئی پر الزامات لگانے شروع کر دیئے ہیں، حالانکہ یہ بات امریکہ ہی نہیں بلکہ پوری دنیا جانتی ہے کہ آئی ایس آئی نے افغانستان میں روس کی عبرت ناک شکست، دہشت گردی، طالبان کے خاتمے سمیت پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے تحفظ کے لئے بھی اہم کردار ادا کیا ہے اور امریکہ کی نام نہاد دہشت گردی کی جنگ میں نہ صرف آئی ایس آئی بلکہ پورے پاکستان نے امریکہ کا ساتھ دیتے ہوئے بے شمار قربانیاں دی ہیں، لیکن اِن خدمات کے باوجود آئی ایس

آئی ہدف تنقید اور معطون ٹھہرائی جاتی ہے، کبھی اِس پر بھارت میں دہشت گردی کے
الزام لگائے جاتے ہیں، تو کبھی اس کو کشمیر کے جہاد میں مجاہدین بھیجنے اور طالبان کو
ٹریننگ دینے کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے۔
گزشتہ دنوں وکی لیکس اور مغربی میڈیا کے ذریعے بھی آئی ایس آئی کو بدنام کرنے کی
پوری کوشش کی گئی، حالانکہ وکی لیکس کی رپورٹوں میں نیٹو اتحاد کی
ناکامیوں، نااہلیوں، بے گناہ لوگوں کے قتل، وار کرائمز اور جیلوں میں قیدیوں سے
زیادتیوں کے عناصر کی واضح نشاندہی موجود ہے، جبکہ وکی لیکس پر آئی ایس آئی کے
خلاف جتنی بھی خبریں دی گئیں، اُن کا کوئی ذریعہ نہیں لکھا گیا، بلکہ اُن کے ساتھ نامعلوم
اور ہر حوالے کے ساتھ ناقابلِ اعتبار کا لفظ لکھا گیا ہے۔
مگر اِس حقیقت کے باوجود آج امریکہ، برطانیہ، بھارت اور اسرائیل کو دنیا کے ہر کونے
اور افغانستان، کشمیر، بھارت، نیویارک اور لندن کے ہر پتھر کے نیچے آئی ایس آئی کا
کا پاکستان کی سالمیت، دفاع اور تحفظ کیلئے وہ قابل ISI وجود نظر آجاتا ہے، جس کی وجہ
فخر کردار ہے، جو دشمن کے مذموم عزائم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، آج
دشمن کی چالوں، خفیہ سازشوں، ملک کو درپیش خطرات کے حوالے سے افواج پاکستان و
دیگر متعلقہ فورسز اور سول قیادت کو

آگاہ کرنے اور وطن عزیز کو دشمنوں کی چالوں سے بچا کر محفوظ و مستحکم رکھنے میں
مصروف عمل یہ ادارہ امریکی، بھارتی اور اسرائیلی مذموم مقاصد کی راہ میں سیسہ پلائی
ہوئی دیوار کا کردار ادا کر رہا ہے۔اس لئے دشمنان پاکستان "سی آئی اے""را" اور
موساد" کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہود و ہنود امریکہ کی مدد"
سے پاکستان کی سلامتی کے ضامن اِس ادارے کے خاتمے یا اِس کی سرگرمیوں کو مفلوج
کرنے ہمیشہ سے سرگرم عمل رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آئی ایس آئی دیگر ملکوں کے خفیہ اداروں کی طرح پاکستان کے لئے
ناک،آنکھ،کان اور دماغ کا درجہ رکھتی ہے اور پاکستان کے خلاف چلائی جانے والی ہر
گولی کو اپنے سینے پر روکتی ہے۔آج اگر امریکہ کے لئے سی آئی اے،اسرائیل کے لئے
موساد،روس کے لئے ایف ایس بی،برطانیہ کیلئے ایم آئی فائیو،بھارت کے لئے را اور
افغانستان کیلئے خاد غلط نہیں ہیں تو پاکستان کی سلامتی کے تحفظ میں مصروف آئی ایس
آئی کا ادارہ کیسے غلط ہو سکتا ہے۔آج اگر پاکستانی قوم چین کی نیند سوتی ہے تو اِس کا سہرا
بھی اس ادارے کی چوکسی کے سر جاتا ہے۔

درحقیقت یہی وہ گناہ عظیم ہے جو پاکستان کے دشمنوں کے نزدیک نا قابل معافی
ہے،گزشتہ دنوں فیصل آباد میں آئی ایس آئی کے دفتر کے قریب ہونے والا حملہ

بھی اسی سلسلے کی ایک سوچی سمجھی اور منظم سازش ہے، جس کا مقصد کالعدم تحریک طالبان پاکستان کے بیان کے مطابق " آئی ایس آئی کو انتقام کا نشانہ بنانے " سے واضح ہے،اس قبل بھی ملک کے مختلف شہروں میں آئی ایس آئی کے دفاتر کو نشانہ بنایا جاچکا ہے، یہ حملے اس ادارے کیلئے کسی امتحان سے کم نہیں ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ امریکہ،اسرائیل اور بھارت ایک ایٹمی اسلامی مملکت پاکستان کا وجود مٹا کر اُس کے حصے بخرے کرنا چاہتے ہیں تاکہ دنیائے اسلام میں کوئی بھی اُن کی سامراجیت کے خلاف آواز اٹھانے والا باقی نہ بچے، مگر وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب تک مسلح افواج کے شانہ بشانہ آئی ایس آئی جیسا محب وطن ادارہ موجود ہے اور پاکستان کی حفاظت کی ذمہ داریاں سرانجام دے رہا ہے، وہ پاکستان کو نقصان پہنچانے کے مقاصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے،اسی وجہ سے اِن تینوں سامراجی ممالک نے کثیرالمقاصد منصوبے کے تحت آئی ایس آئی کے خلاف ایک عالمی سازش ترتیب دی ہے۔

جس میں آئی ایس آئی کے ذیلی دفاتر کو نشانہ بنا کر اُس کی توجہ دشمن کے پاکستان دشمن خطرناک عزائم سے ہٹانا ہے، واضح رہے کہ اسی سازش کے تحت ماضی میں امریکہ نے پاکستان کی بقاء کی ضامن آئی ایس آئی کو دوسرے ممالک کے لئے خطرہ قرار دیتے ہوئے سول حکومت کے ماتحت کرنے کا مطالبہ بھی کیا تھا، لیکن

ہمارا ماننا ہے کہ آئی ایس آئی اور پاک افواج کی موجودگی میں کوئی بھی ملک دشمن
قوت اپنے مزموم مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی، حقیقت یہ ہے پاکستان اور پاکستانی
عوام کے نزدیک آئی ایس آئی ایک قابل فخر ادارہ ہے اور پوری قوم،افواج پاکستان اور
آئی ایس آئی کی جذبہ حب الوطنی کو اپنے ایمان کا حصہ تصور کرتی ہے اور انہیں یقین ہے
کہ پاک افواج اور آئی ایس آئی کے ہوتے ہوئے پاکستان توڑنے کے خواب کبھی بھی
شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتے۔

خوں بہا طلب کرنا، وارثوں پہ واجب تھا۔۔۔۔

سوچتے ہیں کیا لکھیں اور کیا نہ لکھیں، کہاں سے شروع کریں اور کیسے شروع کریں، ذہن ماؤف اور عقل حیران و ششدر ہے، رہ رہ کر افتخار عارف کی نظم "خوں بہا" شدت سے یاد آ رہی ہے، "اپنے شہسواروں کو.... قتل کرنے والوں سے.... خوں بہا طلب کرنا.... وارثوں پہ واجب تھا.... قاتلوں پہ واجب تھا.... خوں بہا ادا کرنا.... واجبات کی تکمیل.... منصفوں پہ واجب تھی.... منصفوں کی نگرانی.... قدسیوں پہ واجب تھی.... وقت کی عدالت میں.... ایک سمت مسند تھی.... ایک سمت خنجر تھا.... تاج زر نگار اک سمت.... ایک سمت لشکر تھا.... اک طرف مقدر تھا.... طائفے پکار اٹھے.... "تاج و تخت زندہ باد!.... ساز و رخت زندہ باد".... خلق ہم سے کہتی ہے، سارا ماجرا لکھیں.... کس نے کس طرح پایا، اپنا خوں بہا لکھیں.... چشم نم سے شرمندہ.... ہم قلم سے شرمندہ، سوچتے ہیں کیا لکھیں...."۔

الجھی ہوئی سوچ اور گڈمڈ خیالات کا المیہ یہی ہوتا ہے کہ وہ فکری انتشار پیدا کر کے طبیعت میں ہیجان برپا کر دیتی ہے اور ذہن کو یکسو نہیں ہونے دیتی، کئی دنوں سے طبیعت کا یہی ہیجان قلب و روح میں کچوکے لگا رہا ہے کہ دو بے گناہ پاکستانی سپوتوں کا قاتل ریمنڈ ڈیوس فہیم کی بیوہ شمائلہ کے بستر

مرگ پر ادا کئے گئے الفاظ "مجھے انصاف چاہیے ....انصاف .... خون کا بدلہ خون" کی گونج چھوڑ کر چلا گیا،الفاظوں کے یہ نشتر پوری قوم سمیت ہماری بھی رگ و پے میں چبھ رہے ہیں،زخم لگ رہے ہیں،خون بہہ رہا ہے،لیکن سوائے کف افسوس ملنے کے اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے،ریمنڈ ڈیوس کی اچانک رہائی کی خبر قوم کے اعصاب پر بجلی بن کر گری ہے،ریمنڈ ڈیوس تو چلا گیا،اب تک وہ امریکہ بھی پہنچ چکا ہوگا،مگر ریمنڈ ڈیوس کی رہائی اپنے پیچھے بہت سی تلخ اور نا قابل تردید حقیقتیں چھوڑ گئی ہے،ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ ہمارے ارباب اقتدار امریکی خوف کے آسیب کا شکار ہیں،اُن کے دل ایمان و یقین کی دولت سے خالی اور پیر آج بھی بلا سوچے سمجھیں دلدار کے اشاروں پر رقص کرنے کیلئے بے تاب ہیں،وہ اپنے آقا امریکہ بہادر کی کلغی اونچی کرنے کیلئے اپنے اصول،اپنے نظریات،اپنی شناخت اور اپنی خودی کو کچلتے ہیں،اپنی قومی غیرت کا سودا کرتے ہیں اور اپنے آقاؤں کیلئے وہ سب کچھ کر سکتے ہیں جس کا ہم اور آپ تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ واقعی غلامی کا خوف آدمی کو کسی کام کا نہیں چھوڑتا،آج ثابت ہو گیا کہ بزدلی،بے حمیتی اور طوق غلامی قبول کرنے کا جرم صرف سابق فوجی آمر نے ہی نہیں کیا تھا بلکہ اِس جرم میں موجودہ حکمران اور پاکستان کے تمام ریاستی ادارے و عناصر بھی شامل ہیں،آج یقین ہو گیا کہ مسند اقتدار پر چاہے مشرف

.براجمان ہو یا صدر آصف علی زرداری، کچھ بھی نہیں بدلا،جب قاعدے اور ضابطے حکمرانوں کی جنبش ابرو کے تابع ہوں اور وہ آئین و دستور اور عوامی خواہشات و احساسات سے زیادہ اپنے بیرونی آقاؤں کی خوشنودی چاہیں،اُن کے سامنے جوابدہ ہوں،تو بدل بھی کیسے سکتا ہے،جہاں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ہمارے حکمرانوں کی نظر میں اپنے عوام کی جانوں کی کیا قدر و قیمت ہے،وہیں یہ حقیقت بھی سامنے آچکی ہے کہ ملک اور قوم سے زیادہ اپنے مفادات کا تحفظ کرنے والے حکمرانوں میں اتنا دم خم نہیں کہ وہ 45 دن سے زیادہ امریکی قاتل کو قید رکھ سکیں،نہ ہی ہمارے مدعیان اتنے حوصلہ مند ہیں کہ اداروں کا دباؤ برداشت کر سکیں اور نہ صاحبان استغاثہ،نہ ہی ہمارا نظام انصاف اتنا طاقتور اور توانا ہے کہ مجرم خوف کھائیں اور نہ ہی ہمارے قانون کے دست و بازو اتنے قوی ہیں کہ وہ امریکی قاتل کو ملکی قانون کے مطابق سزا دے سکیں۔

قوم لاکھ یکسو اور یک زبان سہی لیکن امریکی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے حکمرانوں کی ترجیحات عوامی خواہشات سے مختلف اور جدا ہیں،حکمرانوں نے جس غلامانہ اطاعت کا مظاہرہ کیا اُس نے پوری قوم کو دل گرفتہ کر دیا ہے،عدالتی فیصلے کا سہارا لے کر جس سرعت سے ریمنڈ ڈیوس کو نکالا گیا،اُس نے حکمرانوں کے سارے خدوخال اپنی پوری جزیات کے ساتھ قوم کے سامنے عیاں کر دیئے ہیں،جو روشنی اور تاریکی میں امتیاز کرنے کیلئے کافی ہیں،اس ڈرامے نے ملک کی

آزادی، خودمختاری، قومی غیرت و حمیت، آئین و قانون کی حکمرانی اور انصاف کے بول بالا ہونے سے متعلق بھی کئی سوالات اٹھائے ہیں جن کے جوابات اگر سامنے آئے تو بہت سے مقدس چہرے بے نقاب اور کئی پس پردہ کردار منظر عام پر آ سکتے ہیں۔

ریمنڈ ڈیوس کا کیس بلاشبہ ملک کی خودمختاری اور انصاف کی عملداری کے حوالے سے ایک ٹیسٹ کیس تھا جس نے قوم کا اپنے قائدین، حکمرانوں اور آئینی اداروں پر قائم بھرم ہی نہیں توڑا بلکہ غلاظت کے جوہڑ میں آج سب ننگے نظر آ رہے ہیں، وفاقی حکومت تو شروع دن سے ہی ریمنڈ کو سفارتی استثنٰی دلوا کر بچانے کی کوششوں میں مصروف تھی لیکن ریمنڈ ڈیوس کیخلاف پہلے دن سے ہی سامنے آنیوالے سخت عوامی ردعمل نے وفاقی حکمرانوں کے ہاتھ باندھ دیئے تھے اور وہ بظاہر یہی تاثر دیتے رہے کہ استثنٰی سمیت ریمنڈ سے متعلق ہر ایشو کا فیصلہ عدالت کریگی، گزشتہ روز ریمنڈ کی رہائی کے بعد بھی وفاقی حکومت کی جانب سے وزیر اطلاعات اور صدارتی ترجمان نے بھی یہی بیان دیا کہ ریمنڈ کی رہائی سے وفاقی حکومت کا کوئی تعلق نہیں ہے، مگر کیا اس حقیقت سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ ریمنڈ کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ سے نکالنے سمیت اسکی امریکہ حوالگی کے تمام معاملات متعلقہ وفاقی اداروں ہی نے طے نہیں کئے تھے، اگر وفاقی حکومت سامنے آنیوالے حقائق و شواہد کی بنیاد پر ریمنڈ کو مملکت کا ملزم سمجھتی

اور اسکے خلاف جاسوسی کے الزام میں آفیشل سیکرٹ ایکٹ کے تحت بھی مقدمہ درج ہوتا تو کیا وہ سزا سے بچ سکتا تھا۔

یہاں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ ریمنڈ کے معاملہ میں پنجاب حکومت کا کردار بھی قابل ستائش نہیں، جبکہ صوبائی تفتیشی ایجنسیوں نے ریمنڈ کیخلاف دہشت گردی کا مقدمہ درج کرنے کی بجائے محض تعزیرات پاکستان کے تحت قتل کا مقدمہ درج کرنے پر اکتفا کیا، اگر اسکے خلاف دہشت گردی کا مقدمہ درج ہوتا اور اسکا چالان عام عدالت کے بجائے انسداد دہشت گردی کی عدالت میں پیش ہوتا تو اسکی سزا کا تعین بھی انسداد دہشت گردی ایکٹ کی متعلقہ دفعات کے تحت ہوتا جس میں قانونِ شریعت کے مطابق دیت کی رعائت حاصل ہونے کے باوجود جرم کی نوعیت کا جائزہ لیکر ملزم کو دیت کی رعائت دینے یا نہ دینے کا فیصلہ ٹرائل کورٹ نے کرنا ہوتا ہے، اسی طرح ملزم کو جیل میں حاصل سہولتیں، امریکی حکام سے روزانہ ملاقاتیں، فیصلہ سے ایک روز قبل وزیراعلیٰ پنجاب کی لندن روانگی، وزیر اعظم کا ملک سے باہر ہونا، صدر مملکت کا کراچی جانا، مدعیان کا غائب ہو جانا، ایک ہی دن میں کیس کا فیصلہ، رہائی اور خفیہ روانگی اور اس عمل میں حساس اداروں کا کردار جیسے معاملات پر عوام کی جانب سے پنجاب اور مرکزی حکومت پر انگلی اٹھانا ایک فطری امر ہے۔

ان سب عوامل میں بطور قوم ہماری جگ ہنسائی کا سامان موجود ہے اور بطور آزاد و خود مختار مملکت ہماری ذلت و ہزیمتوں کے تذکرے کھل کر سامنے آئے ہیں، عدالتی کاروائی کی آڑ میں جس طرح ایک دہشت گرد اور قاتل کی رہائی کے لئے پورے حکومتی اور ریاستی نظام نے حصہ لیا ہے اور اس کا ملبہ مقتولوں کے وارثوں پر ڈالا گیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، قوم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہے کہ حکومت نے بے گناہ پاکستانیوں کے لہو کا ہی سودا نہیں کیا بلکہ قانون دیت کا سہارا لے کر شعائر اسلامی کا مذاق اڑایا اور ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث جاسوس کو رہائی دیکر ملکی تحفظ اور سالمیت کو بھی داؤ پر لگا دیا ہے۔

ریمنڈ ڈیوس کے معاملے نے آئین و قانون کی حکمرانی اور انصاف کے بول بالا ہونے پر بھی بہت بڑا سوالیہ نشان لگا دیا ہے،آج ایک عام آدمی کی حصولِ انصاف کیلئے ایڑیاں رگڑتے عمر گزر جاتی ہے اور وہ انصاف کی امید لئے قبر میں جا اترتا ہے لیکن اسے انصاف نہیں ملتا، مگر امریکہ کے ایک سفاک قاتل کو ایک ہی دن میں تمام قانونی، عدالتی اور انتظامی مراحل سے گزار کر نام نہاد انصاف فراہم کر دیا جاتا ہے اور اسے ملزم سے معزز بنا کر امریکہ کے حوالے کر دیا گیا جبکہ ٹرائل کورٹ کے فیصلے کیخلاف ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ میں اپیل دائر کرنے کے قانونی تقاضے بھی پورے نہیں ہوتے، حقیقت یہ ہے کہ ریمنڈ ڈیوس کیس نے جہاں حکمرانوں کے دہرے کردار کو بے نقاب کیا ہے، وہیں اُس نظام

عدل کو بھی مشکوک بنا دیا ہے، جس کی آزادی کیلئے قوم نے صبر آزما تحریک چلائی تھی، ریمنڈ ڈیوس کی رہائی پاکستان کی تاریخ کا ہولناک جرم ہے، اس عاجلانہ فیصلے نے ملک کی آزادی اور خود مختاری پر ہی بدنما داغ نہیں لگائے بلکہ پوری قوم کے سر بھی شرم سے جھکا دیئے ہیں۔

آج وفاقی حکومت اور صوبائی حکومت نے وہی کیا جو ایک امریکی وکیل نے پاکستانیوں کے بارے میں کہا تھا کہ پاکستانی وہ قوم ہے جو چند ڈالر کے عوض اپنی ماں کو بھی بیچ دیتے ہیں، آج ہمیں اپنے پاکستانی ہونے پر شرم آ رہی ہے، حکومت نے ہماری خودداری غیرت انا حب الوطنی اور خود مختاری کا جنازہ نکال کر ثابت کر دیا کہ ہم ایک خود مختار اور آزاد قوم نہیں ہیں، سابقہ فوجی آمر نے تو ہماری خود مختاری گروی رکھی تھی مگر موجودہ حکمرانوں نے تو اُسے بیچ بھی دیا ہے، آج جذبہ حب الوطنی، آئین و قانون کی پاسداری، جمہوریت اور آزاد عدلیہ کے لبادوں میں لپٹے سب چہرے بے نقاب ہو چکے ہیں، دو پاکستانی سپوتوں کا قاتل ہمارے قومی وقار، عزت و ناموس کو اپنے پاؤں تلے روند کر واپس جاتے ہوئے یہ ثابت کر گیا ہے کہ دنیا میں انسان اور شرف انسانیت پر سرفراز رہنے کا حق صرف امریکیوں کو حاصل ہے، آج ہم اس تلخ حقیقت سے کیسے دامن چھڑا سکتے ہیں کہ ریمنڈ ڈیوس کی رہائی کے لئے امریکہ کامیاب ہوا اور پاکستان کے اٹھارہ کروڑ عوام اپنے غلام حکمرانوں کی وجہ سے ناکام و نامراد اور اپنے آپ سے شرمسار و

شرمندہ، حقیقت ہے جب ظلم و جبر کی قوتوں کے ہاتھ گریبانوں تک پہنچ جائیں تو اُس وقت صرف ایک ہی سند کام آتی ہے، شمائلہ جیسی عزت و وقار کی موت، شمائلہ ہم اپنی بے بسی پر شرمندہ ہیں، تیرے آخری الفاظوں کی گونج زندگی بھر ہمارا پیچھا کرتی رہے گی

۔

تعبیر سے محروم اک سفر-----

یوم قرارداد پاکستان کے حوالے سے خصوصی مضمون

انیس سو اکتالیس کی بات ہے جب قائدِ اعظم محمد علی جناح مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ مدراس میں شرکت کرکے واپس جاتے ہوئے ایک قصبے سے گزر رہے تھے، قصبے کے لوگ اپنے ہر دل عزیز قائد کے استقبال میں سڑک کی دونوں جانب جمع تھے اور والہانہ انداز میں "پاکستان زندہ باد، قائدِ اعظم زندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے اِس استقبالی ہجوم میں ایک آٹھ نو برس کا بچہ بھی شامل تھا جس نے اپنے جسم پر صرف ایک لنگی پہن رکھی تھی،فرط مسرت اور جوش سے اُس کا چہرہ تمتا رہا تھا اور وہ بھی لوگوں کے ساتھ زور زور سے "پاکستان زندہ باد،پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگا رہا تھا، قائدِ اعظم محمد علی جناح نے بچے کے جوش و جذبے کو محسوس کرتے ہوئے گاڑی روکنے کا حکم دیا اور بچے کو اپنے پاس بلوایا، یہ صورتحال دیکھ کر بچہ گھبرا گیا قائدِ اعظم نے بچے کو پیار کیا اور اسے حوصلہ دیا جس سے بچے کی گھبراہٹ میں کمی واقع ہوئی،آپ نے بچے سے پوچھا "تم پاکستان کا مطلب کیا سمجھتے ہو؟ لڑکے نے قائدِ اعظم کو جواب دیا "پاکستان کا مطلب تو آپ بہتر جانتے ہیں ہم تو صرف اتنا سمجھتے ہیں

کہ جہاں مسلمانوں کی حکومت وہ "پاکستان" اور جہاں ہندوؤں کی حکومت وہ "ہندوستان۔"

اُس وقت قائدِاعظم کے ساتھ صحافیوں کا قافلہ بھی سفر کر رہا تھا آپ نے فوراً صحافیوں کو مخاطب کرکے کہا کہ "جاؤ مسٹر گاندھی (جو 23 مارچ 1940ء کو لاہور میں قرار داد پاکستان کی منظوری کے بعد سے مسلسل کہہ رہے تھے کہ وہ پاکستان کا مطلب نہیں سمجھ سکے) کو بتادو کہ مسلمانوں کا آٹھ برس کا بچہ بھی پاکستان کا مطلب سمجھتا ہے اگر وہ اب بھی نہیں سمجھے تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سمجھتے خوب ہیں لیکن اعتراف کرنا نہیں چاہتے" قرارداد پاکستان نے بچے بچے کے دل و دماغ میں ایک ہی بات نقش کردی تھی کہ ہم ایک الگ قوم ہیں، ایک ایسی قوم جس کا رہن سہن، تہذیب و تمدن، معاشی اور معاشرتی ضروریات عبادات اور عبادت گاہیں غرضیکہ زندگی کے تمام معاملات نہ صرف ہندوؤں سے الگ ہیں بلکہ اُن کے رسم و رواج اور روایات کے بھی یکسر خلاف ہیں۔

تئیس مارچ 1940ء کو لاہور کے منٹو پارک (مینار پاکستان) میں آل انڈیا مسلم لیگ کے 27 ویں سالانہ اجلاس جس میں لاکھوں کی تعداد میں مسلمانانِ ہند شریک تھے، شیر بنگال مولوی فضل حق نے قرار داد لاہور (جو بعد میں قرار داد پاکستان کے نام سے موسوم ہوئی) پیش کی تھی اور جسے تمام حاضرین جلسہ نے اتفاق رائے سے منظور کیا تھا اِس قرار داد میں کہا گیا تھا کہ "ہندوستان کے مسلمان صرف

اُس دستوری ڈھانچے کو اِس ملک میں قابل عمل سمجھیں گے جسے مرتب کرتے ہوئے ذیل کے اصول اور اُمور کو پیش نظر رکھا جائے گا۔ جغرافیائی طور پر متصلہ وحدتوں کے صوبے اِس طرح وضع کئے جائیں کہ جو ضروری علاقائی ردّو بدل کے ساتھ جن میں بلحاظ تعداد زیادہ ہیں جیسے کہ شمال مغربی زون ہیں انہیں باہم ملاکر ہندوستان کے اندر خود مختار آزاد مملکتیں بنادی جائیں، جن میں یہ بنائے گئے یونٹ آزاد اور خود مختار ہوں۔
"

اِس اجلاس میں قرار داد لاہور کی منظوری کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر اور مسلمانان برصغیر کے متفقہ قائد قائد اعظم محمد علی جناح نے تاریخ ساز خطبہ صدارت پیش کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ "لفظ قوم کی تعریف کی رو سے مسلمان ایک قوم ہیں اور اس لحاظ سے ان کا اپنا علیحدہ وطن، اپنا علاقہ اور اپنی مملکت ہونی
چاہئے...... میں کہتا ہوں کہ جب تک آپ اپنے نصب العین کو اپنے خون میں رچا بسا نہیں لیتے جب تک اپنی تمام آسائشات ترک کرنے کیلئے تیار نہ ہوں گے، جب تک اپنا سب کچھ قربان کرنے کیلئے آمادہ نہ ہوں گے، جب تک اپنے لوگوں کیلئے بے
غرضانہ، مخلصانہ اور صدق دلانہ کام کرنے کیلئے مستعد نہ ہوں گے اُس وقت تک آپ کو کبھی احساس نہ ہوگا، نہ آپ اپنے نصب العین کو پہچان سکیں گے، دوستوں ! اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ پہلے آپ قطعی طور پر ارادہ کرلیجئے پھر تدبیریں سوچئے، اپنے لوگ بیدار ہوچکے ہیں انہیں صرف آپ کی

رہنمائی کی ضرورت ہے، اسلام کے جانثاروں کی طرح آگے نکل بڑھیئے، مجھے یقین ہے کہ آپ ایک ایسی قوت بن جائیں گے جسے دوسروں کے لئے قبول کرنے کے سوا چارہ نہ ہوگا۔"

قائدِاعظم محمد علی جناح کا یہ تاریخی خطاب اور مولوی فضل حق کی پیش کردہ قرار داد لاہور مسلمانان برصغیر کی منزل کیلئے نشان راہ ثابت ہوئی، مسلم لیگ نے اِس اجلاس کے دوران مسلمانوں کیلئے جو نصب العین متعین کیا پوری قوم اُس کے حصول کیلئے سرگرم عمل ہو گئی، پاکستان کے نعرے نے مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونک دی اور وہ مسلم لیگ کے جھنڈے تلے متحد و منظم ہو کر قائدِاعظم محمد علی جناح کی قیادت میں 14اگست 1947ء کی صبح آزادی تک آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے اور پھر دنیا نے دیکھا کہ برصغیر کے مسلمانوں نے قائدِاعظم محمد علی جناح کی ولولہ انگیز قیادت میں صرف سات سال کے مختصر عرصے میں اپنے دونوں دشمنوں انگریزوں اور ہندوؤں کی غلامی سے آزادی حاصل کر لی اور 14اگست 1947ء کو تاریخ عالم میں دنیا کی سب سے پہلی اسلامی نظریاتی مملکت پاکستان کے نام سے معرضِ وجود میں آ گئی۔

انیس سو ستاون کی جنگ آزادی سے لے کر تخلیق پاکستان تک مسلمان برصغیر نے کئی ادوار دیکھے تھے مگر 23مارچ 1940ء کا دن اُن کے تصورات و خوابوں کی

تعبیر کا پیغام لے کر آیا، قائدِ اعظم محمد علی جناح نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا تھا کہ "پاکستان اسلامی اقدار کی تجربہ گاہ بننے والا ہے" قائدِ اعظم کے نزدیک پاکستان کا یہ تصور دراصل وہی "نظریہ اسلام" تھا جس کی بنیاد اور اساس چودہ سو سال پہلے ریاست مدینہ قائم کرکے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی تھی۔23مارچ 1940ء کی قرار داد پاکستان نے ایک آزاد و خود مختار سرزمین کے حصول کی جدو جہد اور مستقبل کی اسلامی ریاست کے نظام حکومت کے خد وخال واضح کرتے ہوئے چار اہم بنیادی اصول و محرکات بھی متعین کئے تھے۔

اِن میں سب سے پہلا اہم ترین محرک اسلامی حکومت کا قیام تھا،ایک ایسی اسلامی حکومت جہاں اسلام ہر شعبہ زندگی میں قوت محرکہ کے طور پر نافذ و غالب ہو،جہاں ظلم کی بیخ کنی ہو اور عدل کی حکمرانی کا قانون بلاامتیاز رنگ و نسل جاری و ساری ہو،اورجہاں شورائی جمہوریت کا نظام نافذ ہو اور ایوان نمائندگان کا چناؤ اُن کی صلاحیت کارکردگی اور تقویٰ کی بنیاد پر کیا جائے، قرار داد پاکستان کی دوسری بنیادی اساس ایسی اسلامی قومیت تھی جس کی شناخت نہ وطن تھی اور نہ ہی رنگ و نسل اور زبان و علاقہ،بقول اقبال "بازو تیرا توحید کی قوت سے قوی ہے۔۔۔۔اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے۔" یہی دینی وحدت رنگ و نسل،زبان وعلاقہ کے تفرقات سے بالاتر ہو کر مسلمانوں کو متحد رکھنے کی سب سے بڑی وجہ تھی،قرار داد پاکستان کا تیسرا اہم محرک اسلام

کا وہ تابناک سیاسی، سماجی اور ثقافتی نظام تھا جو چودہ سو سال سے انسانیت کے دامن میں فیوض وبرکات کے ثمرات ڈال رہا تھا۔ایسا شاندار اور تابناک تاریخی ورثہ رکھنے والی قوم کی شناخت ناچ گانا، بھنگڑا اور غیر اسلامی رسومات نہیں ہوا کرتی۔اور نہ ہی ایسی قوم کی ہیرو طبلے کی تھاپ پر ناچنے گانے والے ہو سکتے ہیں۔ہماری تاریخ تو خالد بن ولید،طارق بن زیاد، سلطان صلاح الدین ایوبی اور شیر میسور ٹیپو سلطان جیسے ہزاروں سپوتوں سے بھری ہوئی ہے۔ہمارا سرمایہ افتخار وہ اسوہء حسنہ ہے جس نے ہمیشہ تاریک ظلمتوں میں نور کا اجالا پھیلایا۔قرار داد پاکستان کا چوتھا اور اہم محرک پرُامن بقائے باہمی کا ایسا ماحول تھا جس میں نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم بھی اپنے سیاسی، سماجی اور معاشرتی اقدار کے مطابق آزاد و خود مختار زندگی بسر کر سکیں۔ہر طرف امن و سکون کا دور دورہ ہو اور ہر کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ ہو۔

آج پاکستان کے قیام کے 64 سال بعد بھی ہمیں اپنی قومی زندگی میں یہ چاروں محرکات دور دور تک نظر نہیں آتے۔ہر طرف لوٹ مار، افراتفری اور سیاسی انارکی ہے۔ملک و قوم کے درد سے عاری عناصر پاکستان کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں اور ان سب سے بڑھ کر سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ جس پاکستان کیلئے مسلمانان برصغیر نے اپنی جان ومال اور عزت وآبرو کی قربانی دی تھی۔آج اُسی پاکستان کے وجود کو یہ کہہ کر متنازعہ بنایا جارہا ہے کہ قیام پاکستان کا

جذبہ محرکہ ایک اسلامی فلاحی مملکت کا قیام نہیں بلکہ ایک ویسٹرن لبرل اسٹیٹ تھا۔آج پاکستان کی جو دینی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی حیثیت ہے وہ کسی طور بھی علامہ اقبال کے خواب کی تعبیر، قرارداد پاکستان اور قائدا عظم محمد علی جناح کے افکار و نظریات اور مسلمانان برصغیر کی قربانیوں کی تصویر نہیں ہو سکتی۔

پاکستان کو اسلامیان ہند اور تمام مسلم دنیا کیلئے ایک ٹھوس تشخص فراہم کرنا تھا لیکن آج پاکستان خود اپنے تشخص سے محروم نظر آتا ہے،اِن تلخ حقائق کے باوجود اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ علامہ اقبال نے ایک ایسے پاکستان کا خواب دیکھا تھا، قائدا عظم نے ایک ایسے پاکستان کی تحریک برپا کی تھی اور مسلمانان برصغیر نے ایک ایسے پاکستان کیلئے اپنا سب کچھ نذر کیا تھا جس میں کسی نواب، چودھری، رئیس، زمیندار، صدر، یا وزیر اعظم کا قانون نہیں بلکہ اللہ اور اُس کے رسول کا وہ قانون نافذ ہوگا جو ہر ایک کو عزت نفس، مساوات اور انصاف کی ضمانت فراہم کرے گا، جس پاکستان میں چند خاندانوں کی سیاسی اور معاشی اجارہ داری نہیں ہوگی اور جس پاکستان میں ایسی تفریق اور ایسے امتیاز کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی کہ حکمرانوں کی اولاد ہمیشہ حاکم رہے گی اور مزدور کا بیٹا مزدور اور ہاری کا بیٹا ہمیشہ ہاری رہے، جس پاکستان میں افراد نہیں بلکہ ادارے مضبوط ہوں گے اور جس پاکستان میں اقتدار

اعلیٰ اُس کے عوام کے پاس ہوگا اور حکمران عوام کے خادم نظر آئیں گے۔
یہی وہ پاکستان تھا جس کا خواب علامہ اقبال نے دیکھا، جسے قائدِ اعظم نے حاصل کرنا چاہا اور جس کے کیلئے لاکھوں مسلمان آگ و خون کے دریا سے گزرے۔1857ء کی جنگ آزادی سے لے کر 14 اگست 1947ء کی صبح آزادی تک تشکیل پاکستان کا سفر تھا، 64 سال گزرنے کے بعد بھی پاکستان کا خواب ابھی تشنہ تعبیر تکمیل کا متقاضی ہے، حصول زمین کے ساتھ تشکیل پاکستان کا ایک مرحلہ تو مکمل ہوگیا لیکن تکمیل پاکستان کا مرحلہ اب بھی باقی ہے، 23 مارچ کا دن ہمارے لیے قدر و منزلت کا باعث اور روشنی کی علامت ہے یہ دن ہمیں احساس دلاتا ہے کہ جس طرح برصغیر کے مسلمان ذات پات، رنگ و نسل کی برتری کے احساس کو مٹا کر ایک سبز ہلالی پرچم تلے اکھٹے ہو گئے تھے بالکل اُسی طرح آج ایک بار پھر ہمیں تمام باطل امتیازات کو مٹانا ہوگا اور باہم متحد و منظم ہو کر اُس وقت جدوجہد جاری رکھنا ہوگی جب تک کہ تکمیل پاکستان کی منزل نہیں آجاتی۔

نجات و دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

لیبیا نیا صلیبی میدان جنگ-----

امریکہ کی خود سری کوئی نئی بات نہیں، روس کی شکست و ریخت کے بعد دنیا کی واحد سپر پاور ہونے کی وجہ سے اُس نے خود ہی یہ استحقاق حاصل کرلیا ہے کہ وہ دنیا کے 190 سے زائد ممالک میں جہاں چاہے اور جب چاہے اپنی مرضی ومنشا اور پسند کی حکومتیں تخلیق کرسکتا ہے۔امریکہ دنیا میں جمہوریت کا سب سے بڑا علمبردار اور عوام کے بنیادی حقوق کا چیمپئن بنتا ہے۔ایک روشن خیال عالمی طاقت ہونے کیلئے وہ دنیا کو یہ تاثر بھی دیتا ہے کہ دنیا کے ممالک میں جمہوری نظام کارفرما ہو، عوامی حقوق کی پاسداری ہو اور عوام خود اپنی آزادانہ رائے سے اپنے حکمرانوں کا انتخاب کریں۔
لیکن دوسری طرف نظریہ ضرورت کے تحت وہ کسی بھی طرح کی حکومت کو سند جواز عطا کرنے کا حق بھی محفوظ رکھتا ہے۔اپنے تئیں حاصل اِس استحقاق کی وجہ سے اُس کی گڈ لسٹ میں جمہوری، فوجی، شاہی، موروثی اور آمرانہ ہر قسم کی حکومتیں شامل ہیں، کسی بھی ملک کیلئے امریکہ کے سیاسی حرم میں جگہ پانے کی واحد شرط یہ ہے کہ وہ امریکہ کی کاسہ لیس ہو،اُس کی عظمت کے قصیداں خواں ہو،اُس کے سامراجی عزائم کے پاسباں ہو اور اپنے ملک کے عوام کے جذبہ واحساس کو کچل کر امریکی حکمرانوں کی ہدایات پر عمل کرنے والی ہو،جو حکومتیں اِس شرط پر

پوری نہیں اترتی وہ جمہوریت دشمن، دہشت گردوں کی سرپرست، امن عالم کیلئے خطرہ اور امریکی دربار میں معتوب قرار پاتی ہیں۔
جنھیں امریکہ حرف غلط کی طرح مٹانے کے درپے ہوجاتا ہے، سچ ہے جب رعونت اپنی انتہا پر پہنچ جائے تو خوں آشام طاقتیں الفاظ کے معنی و مفہوم ہی بدل دیتی ہیں، آج امریکہ نے جس چیز کو دہشت گردی کا نام دے رکھا ہے اور وہ جس آزادی، جمہوریت اور انسانیت کا علمبردار ہے اُس کے خونی نقوش سے چین، کوریا، گوئٹے مالا، کیوبا، کانگو، پیرو، لاؤس، ویتنام، کمبوڈیا، گرینیڈا، نکاراگوا، پنامہ، یوگوسلاویہ، انڈونیشیا، لبنان، ایران، الجزائر، سوڈان سے لے کر عراق اور افغانستان کے درودیوار رنگین ہیں۔
جمہوریت، آزادی اور انسانی اقدار کے خلاف اکیسویں صدی کی پہلی عالمی جنگ شروع کرنے والے امریکہ نے گزشتہ 136 سالوں میں ایک کے سوا کوئی بھی جنگ اپنی سرزمین پر نہیں لڑی، ہمیشہ اُس نے اپنی لامحدود عسکری طاقت اور جدید ترین ٹیکنالوجی کی بنیاد پر کمزور ملکوں کو اپنی جارحیت کا نشانہ بنایا، آج امریکہ لیبیا کی تباہی و بربادی کے درپے ہے، لیبیا پر حالیہ بمباری اور تباہ کاری کا واحد مقصد یہ ہے کہ وہاں کرنل معمر قذافی کی حکومت کا خاتمہ کرکے عراق اور افغانستان کی طرح ایک ایسی کٹ پتلی حکومت قائم کی جائے جو امریکی

مفادات کی نگہبان اور اُس کے اشاروں پر ناچنے والی ہو۔

آج امریکہ کا نظریہ ضرورت پھر حرکت میں ہے،امریکہ اور اُس کے مغربی اتحادیوں کی لیبیا میں قذافی فورسز پر چڑھائی جاری ہے،لیبیا پر آتش و آہن کی بارش ہو رہی ہے اور یہ سب کچھ امریکہ کی رکھیل اقوام متحدہ کی چھتری تلے کیا جارہا ہے،اقوام متحدہ امریکہ اور اُس کے اتحادی یورپی ممالک کے تابعدار ادارے کا کردار ادا کر رہی ہے، یہ سب کچھ امریکہ کے نام نہاد امن اور عافیت کے اعلیٰ اصولوں کی کارفرمائی کیلئے ہو رہا ہے ،انسانی حقوق کی سربلندی اور دہشت گردوں کی سرکوبی کیلئے مصروف جہاد امریکہ کی عسکری قوت سے اٹھنے والے شعلے ابھی سرد نہیں ہوئے ۔

حالانکہ دنیا کے مختلف خطوں اور ممالک میں بھی حکمرانوں اور اُن کے مخالفوں کے درمیان تصادم جاری ہے، لیکن ہدف صرف لیبیا بنا ہوا ہے،اصل مسئلہ یہ ہے کہ امریکہ صرف اُن حکومتوں اور حکمرانوں کو اپنی جارحیت کا نشانہ بناتا ہے جو اُس کے مخالفین ہوتے ہیں اور جن کے دل و دماغ میں غیرت، عزت نفس، قومی آزادی اور خود مختاری کا سودا سمایا ہوتا ہے ۔

ء کے بعد لیبیا عرب دنیا کا دوسرا ملک ہے جس پر امریکہ اور اُس کے 2003

اتحادی آگ اور بارود برسا رہے ہیں، آج لیبیا کے خلاف اِس سامراجی جارحیت کا اصل میں لیبیا کو نو فلائی زون قرار دینے کی قرار دادUNO محرک عرب لیگ ہے، جس نے پیش کی تھی، مگر لیبیا پر حملوں کے بعد عرب لیگ نے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہوئے حملوں کی مذمت کرنا شروع کردی، عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل اَمر موسیٰ نے" من انم کہ من دا من "کے مصداق کہا کہ لیگ نے حملوں کی بجائے نو فلائی زون قائم کرنے کی قرارداد پیش کی تھی۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ جس طرح اقوام متحدہ سامراجی طاقتوں کی رکھیل بنی ہوئی ہے بالکل اُسی طرح او آئی سی اور عرب لیگ بھی ایک طوائف کا روپ دھار چکی ہے، مگر رکھیل اور طوائف میں فرق یہ ہوتا ہے کہ رکھیل عمر بھر اپنے عاشق کے ساتھ وفاداری نبھاتی ہے، جبکہ طوائف پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا کیونکہ طوائف نوٹوں کی جھنکار پر روزانہ اپنے عاشق بدلتی رہتی ہے۔

بد قسمتی سے 56 مسلم ممالک کی نمائندہ تنظیم او آئی سی اور عرب لیگ نے اُن طاغوتی طاقتوں کے آلہ کار بن کر میر جعفر میر صادق کا کردار ادا کیا ہے، جن کا مقصد ہی مسلم ممالک کے معدنی وسائل پر قبضہ کرنا ہے، اِس سے بڑی بے حمیتی اور کیا کوئی ہو سکتی ہے کہ ایک عرب ریاست لیبیا پر امریکہ اور اُس کے اتحادیوں کے فضائی اور بحری حملوں میں عرب لیگ سے وابستہ ممالک شریک اور

ایک مسلم ریاست کو اپنے ہاتھوں سے مارنے اور دفن کرنے کا سامان کر رہے ہیں۔
دوسری طرف امریکہ، برطانیہ، فرانس اور کینیڈا کے ساتھ اب اِس لڑائی میں اٹلی بھی شامل ہوگیا ہے، لیبیا پر اتحادی افواج کے حملوں کے بعد عالمی طاقتیں بھی تقسیم ہو گئی ہیں جبکہ چین اور روس سمیت کئی ممالک نے امریکہ، برطانیہ اور فرانس سے حملے بند کر نے کا مطالبہ کیا ہے، اقوام متحدہ کے پانچ میں سے تین رکن ممالک ایک طرف ہیں اور دو نے لیبیا میں کھلے عام بیرونی فوجی مداخلت کی شدید مذمت کی ہے۔
دوسری طرف بھارت ایران، وینز ویلا اور کیوبا بھی امریکہ، برطانیہ اور فرانس پر حملے بند کرنے کیلئے زور دے رہے ہیں، جبکہ افریقی یونین سمیت دنیا کے کئی ممالک امریکہ کی سرپرستی میں قذافی فورسز کے خلاف کاروائی کی مخالفت کر رہے ہیں، ایران کا کہنا ہے کہ وہ لیبیا میں انقلاب کا حامی ہے لیکن بیرونی فوجی مداخلت کا قائل نہیں، آج افغانستان اور عراق پر امریکی فوجی قبضے کے بعد شمالی افریقہ کا تیل برآمد کرنے والا سب سے اہم ملک لیبیا سامراجی انتقام کا مرکز بنا ہوا ہے۔

سلامتی کونسل نے لیبیا پر فضائی حملوں کیلئے جو بھونڈا جواز تراشا ہے اُس کے مطابق "کرنل قذافی اپنی ہی قوم کے اوپر حملہ آور ہیں اِس لیے عالمی قوتوں کو عام شہریوں کی حفاظت کے نام پر مداخلت کا حق حاصل ہے" لیکن یہ وہ جرم ہے جس میں خود امریکہ سمیت تمام عالمی قوتیں ملوث ہیں،اِس تناظر میں لیبیا کے خلاف سلامتی کونسل کی قرارداد لیبیا کے عوام کی ہمدردی میں نہیں ہے بلکہ یہ عالمی سیاست کے گندے کھیل کا حصہ معلوم ہوتی ہے،اِسی وجہ سے روسی وزیراعظم ولادی میرپیوٹن قرار داد کو نقائص سے پُر اور اِسے صلیبی جنگوں کے مترادف قرار دیتے ہیں۔

یہاں اَمر بھی قابل توجہ ہے کہ امریکہ، فرانس اور برطانیہ پہلے ہی اشارہ دے چکے تھے کہ وہ لیبیا پر فوج کشی کا ارادہ رکھتے ہیں، لیکن جب تیونس سے شروع ہونے والی عوامی احتجاج کی لہر لیبیا پہنچ کر معمر قذافی کے خلاف مسلح بغاوت کی شکل اختیار کر گئی تو امریکہ اور اُس کے حواریوں کو اقوام متحدہ کے ساتھ مل کر اپنا کھیل کھیلنے کا موقع مل گیا، حالانکہ اِس وقت لیبیا کے علاوہ شام، بحرین اور یمن سمیت کئی ملکوں میں حکومت اور مخالفین کے درمیان تصادم جاری ہے، لیکن لیبیا کو ہدف بنا کر امریکہ نے ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی ہے کہ وہ کسی بھی ملک میں حزب اختلاف کی سرپرستی، بچاؤ اور برسر اقتدار لانے کیلئے فوجی طاقت استعمال کرنے کا حق بھی رکھتا ہے اور انصاف کی پاکی

بحری بیڑوں، جنگی طیاروں اور تباہ کن بموں پر لادھ کر امریکی باغیوں تک پہنچنا امریکہ کیلئے بڑی بات نہیں ہے۔

آج ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ پوری اسلامی دنیا میں ایک بھی ایسا رہنما موجود نہیں جو اقوام متحدہ اور سامراجی طاقتوں کے دوہرے معیار کو سامنے رکھتے ہوئے اُن سے یہ سوال کرسکے کہ اگر آپ اپنے اصول اور قراردادوں کی حرمت کا اتنا ہی خیال ہے تو مسئلہ کشمیر پر اقوام متحدہ کی پاس کردہ قراردادیں ردی کا ڈھیر کیوں بنی ہوئی ہیں، اقوام متحدہ اور عالمی برادری کو لیبیا میں تو عوام پر ظلم نظر آرہا ہے لیکن برسوں سے جو ظلم بھارت کشمیر میں کر رہا ہے کیا وہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کی خلاف ورزی نہیں ہے؟ کیا اسرائیل فلسطینی عوام پر جو ظلم وستم کر رہا ہے اُس پر عالمی برادری اور اقوام متحدہ کا فرض نہیں بنتا کہ وہ اسرائیل کے خلاف بھی ایسی ہی کاروائی کریں اور مظلوم فلسطینیوں کو اسرائیل کے مظالم سے نجات دلائیں، ہم پوچھتے ہیں کہ کیا صرف عراق افغانستان اور لیبیا ہی میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں ہورہی ہیں، اسرائیل اور بھارت جو کچھ کر رہے ہیں کیا وہ اقوام متحدہ کی لغت میں انسانی حقوق کی پاسداری اور خدمت ہے؟

اقوام متحدہ اور مغربی دنیا کے اِسی دوہرے معیار اور کردار نے دنیا کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا ہے، لہذا یہ کہنا قطعاً غلط نہ ہوگا کہ اقوام متحدہ کا مقصد دنیا میں امن قائم کرنا نہیں بلکہ امریکہ اور اُس کے اتحادیوں کے مفادات کا تحفظ کرنا اور مسلم دنیا کے خلاف ننگی جارحیت کیلئے قانونی جواز فراہم کرنا ہے۔

اِس امر میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اقوام متحدہ کی چھتری تلے امریکہ اور اُس اتحادیوں نے عراق اور افغانستان کے بعد لیبیا پر حملہ کرکے پوری مسلم دنیا کو یہ واضح پیغام دیا ہے کہ وہ ایک ایک کرکے ہر مسلمان ملک کے خلاف کسی نہ کسی بہانے جارحیت کا ارتکاب کریں گے، سب سے شرمناک بات یہ ہے کہ مسلم دنیا کے حکمران صرف اپنے اقتدار کو بچانے کیلئے مغرب اور اقوام متحدہ کے اس دوہرے کردار پر خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔

آج اُمت مسلمہ کی ہر اکائی اپنی بقاء کی فکر میں ہے، جبکہ اپنے لامحدود مفادات کے ایجنڈے پر عمل پیرا امریکہ ایک ایسے ملک پر چڑھ دوڑا ہے جس نے اُس کا کچھ نہیں بگاڑا ہے، وہ اکثریت کی نمائندگی کے باوجود معمر قذافی کو لیبیا پر حکمرانی کا حق دینے کیلئے اِس لیے تیار نہیں کہ قذافی نے دنیا کے سب سے بڑے امریکی خرکار کیمپ کا حصہ بننے سے انکار کیا ہے۔

اسی وجہ سے امریکہ لیبیا میں لکیریں ڈال کر اپنے طویل المعیاد مقاصد کی راہ ہموار کر رہا ہے، ہماری رائے میں معمر قذافی کو ہٹانے کا مطلب لیبیا کی مرکزیت اور اُس کی یکجہتی پر ضرب لگانا ہے، یہ درست ہے کہ امریکہ اور اُس کے اتحادیوں کے اہداف کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، مصلحتوں اور مجبوریوں کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی مسلم حکومتوں میں اتنی توانائی نہیں کہ وہ امریکہ کی حکم عدولی کر سکیں اور اُس کے خلاف جا سکیں۔

لیکن لیبیا کی تباہی و بربادی کے ذمہ دار مسلم ممالک کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ بھی ایک دشت بے اماں میں کھڑے اُس جنگلی بھینسے سے خیر کی توقع کر رہے ہیں جس کے خونخوار سینگوں کو رخ کسی وقت بھی خود اُن کی اپنی طرف ہو سکتا ہے، ہمارا ماننا ہے کہ افغانستان اور عراق اکیسویں صدی کے امریکی چنگیزی لشکر کے ابتدائی پڑاؤ تھے، لیبیا بھی منزل نہیں، اصل منزل کیا ہے، اِس کا ابھی سامنے آنا باقی ہے، لیکن ایک بات طے ہے کہ اکیسویں صدی کے اس خونی عفریت نے ابھی بہت سی شہہ رگوں کا خون پینا ہے اور بہت سی مسلم مملکتوں کو تباہ و برباد کرنا ہے۔

زلفی سے قائد عوام تک۔۔۔۔

ذوالفقار علی بھٹو کی برسی کے موقع پر خصوصی تحریر

یہ اپریل 1945ء کی بات ہے جب تحریک پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کی ولولہ انگیز قیادت میں اپنے بام عروج پر تھی اور برصغیر مسلمانان ہند کے نعرے "لے کے رہیں گے پاکستان، بٹ کر رہے گا ھندوستان " سے گونج رہا تھا، بچے، بوڑھے، جوان سب کا ایک ہی مطالبہ تھا ایک آزاد و خود مختار سرزمین کا حصول، جس میں وہ اپنی زندگی اپنی معاشرتی روایات اور مذہبی اقدار کے مطابق بسر کرسکیں، گویا حصول پاکستان مسلمانان برصغیر کا خواب ہی نہیں انکی جدوجہد کی تعبیر بھی تھا،اُس زمانے میں ایک طالبعلم نے اپنے محبوب لیڈر قائد اعظم محمد علی جناح کو ایک خط لکھا۔

جس میں اُس نے لکھا"ڈیئر سر....... صوبہ سرحد میں جو سیاسی صورتحال پیدا ہوئی ہے،اُس نے مجھے اتنا جذباتی اور برانگیختہ کردیا ہے کہ میں اپنے قائد کو اِس کے متعلق لکھنے کی جرات کررہا ہوں،ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج مسلمانوں کو یہ محسوس کرلینا چاہیے کہ ہندو بنیئے ہمارے ساتھ کبھی مخلص

و متحد نہیں ہو سکتے، وہ ہمارے قرآن اور ہمارے پیغمبر کے شدید ترین دشمن ہیں، یہ بھی اچھی طرح جان لینا چاہیئے کہ آپ ہی ہمارے قائد اور رہنما ہیں، جناب آپ نے ہمیں ایک پلیٹ فارم اور ایک جھنڈے تلے اکٹھا کیا ہے اور ہر مسلمان کا یہی نعرہ ہے کہ پاکستان کی طرف بڑھو، ہماری قسمت پاکستان ہے۔ "ہماری منزل و مقصد پاکستان" ہے، ہمیں آپ کی ذات میں ایک قابل رہنما مل گیا ہے، اب ہمیں کوئی بھی منزل مقصود کی طرف جانے سے نہیں روک سکتا۔

میں حیران ہوں کہ شیخ محمد عبداللہ اور اُن جیسے ڈاکٹر خان صاحب وغیرہ اپنے آپ کو مسلمان کیسے کہتے ہیں جب کہ انہوں نے کانگریس کی پالیسیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں، میرا دل ڈوبنے لگتا ہے جب میں مسلم لیگ کے خلاف اُن کی بیہودہ تقریریں پڑھتا ہوں، کیا وہ اتنے ہی بے خبر ہیں یا اُن کی حبّ الوطنی کا یہی تقاضہ ہے؟ ہزاروں لاکھوں عبداللہ بھی مل کر ہم کو یقین نہیں دلا سکتے کہ ہم غلطی پر ہیں، اپنا ایڑھی چوٹی کا زور لگا کر بھی وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے، کیونکہ انہیں یہ احساس ہی نہیں ہے کہ ہم آپ سے کس قدر متاثر ہیں اور ہمیں آپ پر کتنا فخر ہے، ایک طالبعلم کی حیثیت سے میں ابھی اِس قابل تو نہیں ہوں کہ مادر وطن قائم کرنے کیلئے (آپ کی) کوئی مدد کر سکوں، لیکن ایک وقت ایسا آئے گا، جب میں پاکستان کیلئے اپنی جان قربان کروں گا۔"

بیس اپریل 1945ء کو سولہ سال کی عمر میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کو خط لکھنے والے نوجوان طالبعلم کوئی اور نہیں زلفی (ذوالفقار علی بھٹو) تھے، جو بعد میں قائد عوام، فخرِ ایشیاء ذوالفقار علی بھٹو کے نام سے جانے گئے، کسے معلوم تھا کہ اتنی کم عمری میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کو خط لکھ کر اپنی وفاداری اور ملک کیلئے جان دینے کے عزم کا اظہار کرنے والا طالبعلم ایک دن پاکستان کا وزیر اعظم بنے گا اور 4 اپریل 1979ء کو ایک فوجی آمر جنرل ضیاء الحق کے ہاتھوں تختہ دار پر لٹک کر اپنے دورِ طالبعلمی کے عہد پر ایفا کی مہر ثبت کرے گا۔

قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو 5 جنوری 1928ء کو لاڑکانہ میں سر شاہنواز بھٹو کی دوسری بیوی خورشید بیگم کے یہاں پیدا ہوئے، جو ایک معمولی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، وہ بچپن ہی سے طبقاتی اونچ نیچ، معاشرتی ناہمواریوں اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف تھے، بھٹو اپنی آخری کتاب "اگر مجھے قتل کردیا گیا" میں اپنے بچپن کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ" 1935ء میں جب میری عمر سات سال تھی، میرے والد اُس وقت بمبئی کی حکومت میں وزیر تھے ایک دن بمبئی کے گورنر لارڈ برابورن نے میرے والد کو تینوں بیٹوں کے ہمراہ چائے کی دعوت پر بلایا، جب میرے بڑے بھائی امداد علی جن کی عمر 21 سال تھی کا تعارف

ہو چکا تو گورنر نے بھائی کے بارے میں کہا "کتنا خوبصورت اور جوان آدمی ہے، امداد علی نے ایک تربیت یافتہ ارسٹو کریٹ ہوتے ہوئے جواب دیا "میں اپنے آپ کو بہت مسرور اور مغرور سمجھتا ہوں کیونکہ میری تعریف ہمارے خوبصورت گورنر نے کی ہے۔ جب میری باری آئی تو میں نے باریک آواز میں کہا "ہزایکسی لینسی گورنر اس لئے خوبصورت ہیں کیونکہ وہ ہمارے خوبصورت ملک کے خون پر پلتے ہیں، لارڈ برابورن میرے اِس جواب پر ششدر رہ گیا ایک لمحے تک وہ حیرت زدہ میری طرف دیکھتا رہا اور پھر میرے والد سے کہنے لگا "شاہنواز اِس میں تمہیں ایک شاعر اور انقلابی ملا ہے۔" بھٹو صاحب لکھتے ہیں "یہی سب کچھ ہے جو میں اِن سارے برسوں میں رہا ہوں، ایک شاعر اور ایک انقلابی اور جب تک میرے جسم میں سے آخری سانس نہیں نکل جاتی ہیں یہی رہوں گا۔

ذوالفقار علی بھٹو کا شمار بیسویں صدی میں جنوبی ایشیاء کے عظیم انقلابی رہنماؤں میں ہوتا ہے، وہ ایک ایسے رہنما تھے جو ناصرف پاکستان بلکہ دنیا بھر کے کروڑوں عوام میں بے حد مقبول تھے اور دنیا بھر بالخصوص مسلم دنیا کے سربراہ مملکت اُنہیں خاص محبت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو بے انتہا ذہانت، اعلیٰ سیاسی بصیرت، لاجواب تدبر اور دو

طرفہ تعلقات کے امور کے ماہر تھے، وہ ابتدا ہی سے ایشیائی امور میں مغرب کی مداخلت کے کڑے مخالفوں میں سے ایک تھے، بھٹو "سامراج" کے خاتمے،اقتصادی آزادی اور خود کفالت کے حامی اور زندگی بھر اس موقف کے زبردست داعی رہے کہ کسی ملک کے اندرونی معاملے میں مداخلت نہ کی جائے۔

بھٹو کہتے تھے "نوآبادیاتی دور ختم ہورہا ہے،اب ایشیاء اور افریقہ میں نئی طاقتیں ابھر چکی ہیں،افریشائی قیادت کے سامنے بنیادی مسئلہ اُن کی خود مختاری کے چیلنج کا ہے، مغرب میں ایشیائی قیادت کو جس دن برابری اور مساوات کی بنیاد پر تسلیم کرلیا گیا اُس دن عالمی امن کے تقاضے پورے ہوجائیں گے۔" اپنی اسی انقلابی فکر کی وجہ سے وہ زندگی بھر سامراجی حلقوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے رہے،جب 6 ستمبر 1965ء کو رات کے اندھیرے میں بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو اُس وقت ذوالفقار علی بھٹو نے بین الاقوامی محاذ پر پاکستان کی جنگ لڑی اور چین،انڈونیشیا، سعودی
عرب،ایران،ترکی، عراق، مصر، اردن، الجزائر، شام،
سوڈان، یمن، مراکش،لیبیا، کویت کی حکومتوں کو پاکستان کی اخلاقی اور مالی امداد پر رضامند کیا۔

ذوالفقار علی بھٹو نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں پاکستان کا مقدمہ لڑتے ہوئے تاریخی تقریر کی،جس کے ایک ایک لفظ سے زندگی حرارت اور جذبوں کی

سچائی عیاں تھی، بھٹو نے اقوام عالم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "ہم ہزار سال تک جنگ لڑیں گے" اُن کا یہ جملہ پاکستان کے عوام کے دلوں کی دھڑکن اور جذبوں کا امین تھا، مگر افسوس کہ میدان جنگ کی جیتی ہوئی باری فوجی حکمران نے تاشقند میں مزاکرات کی میز پر ہار دی۔

ذوالفقار علی بھٹو نے سقوط ڈھاکہ کے بعد 20 دسمبر 1971ء کو باقی ماندہ پاکستان کی باگ دوڑ سبنھالی، وہ پاکستان کی پہلی شخصیت تھے جس کی سوچ اور فکر کے منفرد،انقلابی اور تخلیقی انداز نے ایشیائی سیاست میں انقلاب آفریں تبدیلیاں پیدا کیں، افریشائی اتحاد،پاک بھارت تعلقات اور پاک چین دوستی کے متعلق بھٹو صاحب کا انداز فکر و عمل عالمی سامراج کے مقاصد کیلئے زہر قاتل ثابت ہوا،جس کی وجہ سے اُسے جنوب مشرقی ایشیاء میں اپنی پالیسیوں کے تسلسل میں ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا،اِسی وجہ سے بھٹو صاحب کو کئی بار خریدنے کی بھی کوشش کی گئی لیکن لالچ،دھونس،دھاندلی اور دھمکیوں کے باوجود بھٹو نے پاکستان کی سالمیت،استحکام،ترقی اور عوام کی خدمت کا پُر خار راستہ منتخب کیا،اُن کے دور حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ 7 ستمبر 1974ء کو قومی اسمبلی و سینٹ سے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینا اور 10اپریل 1973ء کو متفقہ آئین کی منظوری تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو ایٹمی پاکستان کے اولین معمار اور بانی اور اسلام کی نشاط ثانیہ کے سب سے بڑے علمبردار تھے،پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کی سعی کرنا ذوالفقار علی بھٹو کا سب سے بڑا جرم تھا،جو امریکہ کی نظر میں نا قابل معافی تھا اور امریکہ نہیں چاہتا تھا کہ پاکستان ایٹمی ٹیکنالوجی حاصل کرے اور مسلم ممالک کو متحد و منظم کرے چنانچہ امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے بھٹو کو دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ "اگر تم نے ایٹمی پروگرام ترک نہیں کیا اور اس منصوبے سے باز نہیں آئے تو تمہارا انجام عبرت ناک ہوگا۔"

اس دھمکی کو سن کر جناب بھٹو نے نہایت بہادری سے جرات مندانہ جواب دیتے ہوئے کہا تھا "مسٹر ہنری کسنجر یہ پاکستانی قوم کا حق ہے اور پاکستانی قوم اپنے حق سے دستبرار نہیں ہوسکتی، میں یہ پسند کروں گا کہ چند جرنیل میری لاش کو سڑکوں پر کھینچتے پھریں، لیکن قوم سے غداری کرکے میں تاریخ کا مجرم نہیں بنوں گا۔" بھٹو اپنے اسی ناکردہ جرم کی پاداش میں امریکی ایماء پر ایک فوجی آمر کے ہاتھوں 4 اپریل 1979ء کو تختہ دار پر لٹکا دیئے گئے، بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو سے اپنی آخری ملاقات میں بھٹو نے مسکراتے ہوئے کہا تھا کہ "میں اپنے اجداد کی زمینوں کی طرف واپس جارہا ہوں، تاکہ اِس سرزمین کا اِس کی خوشبو اور اِس کی فضا کا حصہ بن جاؤں، خلق خدا میرے بارے میں گیت گائے گی، میں اُن کی کہانیوں کا جاوداں حصہ بن جاؤں گا۔"

آج قائدِ عوام، فخرِ ایشیاء ذوالفقار علی بھٹو کو ہم سے جدا ہوئے 32 برس گزر چکے ہیں، لیکن قوم کے دل و دماغ اُن کی یادوں سے آج بھی معطر اور ترو تازہ ہیں، وہ تاریخِ پاکستان کا ایک ایسا زندہ و لازوال کردار ہیں، جس کے عزم و حوصلے، جرات و بہادری، بے مثال تدبر اور فہم و فراست سقوطِ پاکستان کے بعد باقی ماندہ پاکستان کی تشکیلِ نو کا باعث بنی۔

ایک قوم،ایک ملت مگر۔۔۔۔۔

اس جذبے کو سرد نہ ہونے دیجئے۔۔۔۔۔
ہاکی ہو یا کرکٹ، کھیل کے میدان میں اترنے والی ٹیموں میں سے کسی ایک کو ہار کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مگر وہ کھیل جس میں مقابلہ کسی اور کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے روایتی حریف اور ازلی دشمن کے ساتھ ہو تو اُس کھیل میں ہار اور جیت کے معنی و مفہوم ہی بدل جاتے ہیں، فتح قومی عزت ووقار اور فخر و سربلندی تصور کی جاتی ہے، جبکہ شکست کو ذلت وہزیمت اور ندامت و شرمندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔یوں کھیل کھیل نہیں رہتا بلکہ ایک جنگ کی سی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ایک ایسی نفسیاتی جنگ جس میں قوم کا ہر فرد اپنے تمام اختلافات پریشانیوں اور تکالیف کو بھلا کر باہم متحد و منظم ہو کر اپنی ٹیم سے صرف اور صرف جیت کی توقع رکھتا ہے۔ہار کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اور اگر بدقسمتی سے ہار کا سامنا کرنا پڑے تو یہ قوم کیلئے کسی سانحے سے کم نہیں ہوتا، دشمن ملک کی ٹیم سے اپنی شکست کا دکھ اور تکلیف اُسے گم سم اور بے چین کردیتا ہے۔

آج پوری قوم سیمی فائنل میں بھارت کے ہاتھوں شکست کے بعد اسی کیفیت سے دوچار ہے،اپنے آپ کو تسلی دینا مشکل ہو رہا ہے، ہمت، جوش اور جیت کے جذبوں سے عاری، ناقص اور مایوس کن کارکردگی کے باوجود ہار کی زہرناکی برداشت نہیں ہو رہی، یقیناً شکست کا زخم بہت گہرا اور افسوسناک ہے، ہار کی تلخی اور جیت کی سرشاری سے محرومی کا دکھ دیر تک رہے گا، لیکن ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ موہالی میں اچھی کارکردگی کی حامل ٹیم جیت گئی اور ناقص کارکردگی دکھانے والے ٹیم شکست کھا گئی، کیونکہ ایک کو بہرحال جیتنا اور دوسرے کو ہارنا ہی تھا، یہی اصول ہے، یہی قاعدہ ہے ۔
مگر ایک بات توجہ طلب ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ بھارت کے ساتھ پاکستان کا کرکٹ میچ ہو تو پوری قوم ایک ہو جاتی ہے، اُس کے سوچنے کا سمجھنے کا اور بولنے کا انداز ایک، ایک ہی جذبہ، ایک ہی لگن، ایک ہی خواہش، صرف جیت پر نظر، ساری قوم ٹی وی سکرینوں کے سامنے جم کر بیٹھ جاتی ہے، حال یہ ہوتا ہے کہ روزانہ کی دیہاڑی کرنے والا مزدور بھی اُس روز کام پر نہیں جاتا، مارکیٹیں ویران ہو جاتی ہیں تو سڑکیں سنسان، سارا کاروبار زندگی تھم سا جاتا ہے، ہر ایک پر بس ایک ہی دھن اور ایک ہی لگن سوار ہوتی ہے کہ ٹیم جیت جائے، دراصل اِس سارے عمل کا محرک وہ دو قومی نظریہ ہے جو قیام پاکستان کا باعث ہے، جو پاکستان اور بھارت کے درمیان ایسے ہر معرکے کے بعد مزید گہرا اور مضبوط

ہو جاتا ہے، یہی وہ جذبہ ہے جو ہمیں دشمن سے ہار پر شرمندگی اور ذلت کا احساس دلاتا ہے اور اسی جذبے کے باعث ہم بھارت سے شکست کو برداشت نہیں کرپاتے۔

یہی وہ جذبہ تھا جس نے سیمی فائنل میچ کے دوران پوری قوم کو ایک لڑی میں پرو دیا، پورے ملک کی فضاء پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونجتی رہی، مساجد کامیابی کی دعاؤں سے معمور رہی، کئی علاقوں میں پاکستان ٹیم کی کامیابی کے لئے قران خوانی کا اہتمام کیا گیا، گھروں میں خواتین قومی ٹیم کی فتح کے لئے دعائیں کرتی رہیں، جوں جوں میچ کا وقت قریب آتا گیا سڑکیں ویران، مارکیٹیں خالی اور بازار بے رونق ہوتے گئے، کاروباری مراکز میں صبح سے ہی چھٹی کا سماں رہا، بازاروں میں گاہک نہ ہونے کے برابر تھے جبکہ دکاندار دوکانوں میں ٹی وی لگا کر میچ دیکھنے میں مگن رہے، جگہ جگہ بڑی بڑی سکرینیں لگا کر میچ دکھانے کا اہتمام کیا گیا، میچ دیکھنے والوں کی تواضع طرح طرح کے کھانوں مشروبات اور چائے سے کی گئی اور اس دوران عوام کا جذبہ حب وطنی پورے عروج پر رہا، نوجوان موٹر سائیکل پر سوار ہو کر اور ہاتھوں میں قومی پرچم تھامے نعرے لگاتے سڑکوں گلیوں میں گھومتے رہے جبکہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے اپنے جسموں کے مختلف حصوں پر قومی پرچم بنوائے، پوری قوم میچ کے دوران ہر بال پر اپنی ٹیم کو داد دیتی رہی۔

جب انڈیا کا کوئی کھلاڑی آؤٹ ہو جاتا تو لوگ پاکستان کے حق میں نعرے بلند کرتے ہوائی فائرنگ کرتے۔ میچ کے دوران ہر پاکستانی کے لب پر یہی دعا تھی کہ پاک بھارت کرکٹ جنگ میں پاکستان کی ٹیم کامیاب ہو جائے۔ ملک کی عوام میں پاک بھارت جنگ جیسا جذبہ تھا، جنگی اور قومی ترانوں سے وطن عزیز کا چپہ چپہ گونج رہا تھا، نوجوان اپنا قومی پرچم اٹھائے اپنے ٹیم کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، ورلڈکپ کے موقع پر اس قومی جذبے کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ جیسے آج یہ کسی سیاسی سماجی اور مذہبی جماعتوں کے فرد نہیں ہیں، نہ ہی اِن کا تعلق سندھ، پنجاب، بلوچستان اور خیبر پختونخواہ کے مختلف رنگ و نسل اور علاقوں سے ہے، بلکہ یہ سب پاکستانی ہیں جو ایک قوم ایک ایسی ملت کے فرد ہیں جو اپنے ملک و قوم سے محبت کرتے ہیں اور اُن کے دل صرف اور صرف پاکستان کیلئے دھڑکتے ہیں۔

لیکن پاکستان کی ہار کے ساتھ ہی یہ قومی تفاخر کا احساس بخار کی طرح اتر جاتا ہے وہ جذبہ جنوں جو انہیں تمام اختلافات بھلا کر باہم متحد و منظم کرتا ہے غائب ہو جاتا ہے، قوم بکھر کر ایک ایسے منتشر ریوڑ میں تبدیل ہو جاتی ہے، جس کی کوئی منزل نہیں، جسے وقت کے تھپیڑے جہاں چاہیں ہانک دیں، افسوس کہ یہ جذبہ اُس وقت ناپید ہو جاتا ہے جب ملک کو استعمار کے چنگل سے نجات دلانے اور عزت و خودداری کے ساتھ جینے کی بات کی جاتی ہے، شاید پوری دنیا میں ہم

وہ واحد قوم ہیں جو کرکٹ کے لئے ایک ہو جاتے ہیں، لیکن اسلام اور پاکستان کے لئے ایک نہیں ہوتے۔

افسوس کہ یہ جذبہ ہمیں اُس وقت متحد نہیں کرتا جب کافر ہمارے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے اسلام اور ہمارے قرآن پر حرف زنی کرتے ہیں، صد افسوس کہ یہ جذبہ ہمیں اِن اہم معاملات پر اِس طرح متحد نہیں کرتا جس طرح ہم کرکٹ پر متحد ہو جاتے ہیں،،سردارن ملت ذرا سوچئے آخر کیا وجہ ہے وہ کیا عوامل ہیں جس کی وجہ سے آج ہم ذلیل و رسوا ہو رہے ہیں، کیوں ہم اصل معاملات سے صرف نظر کئے ہوئے ہیں،آج پاکستان کی سالمیت اور خودمختاری داؤ پر لگی ہوئی ہے حکمرانوں نے ہماری قومی غیرت و حمیت کا جنازہ نکال دیا ہے،یہ جذبہ اُس وقت کہاں چلا جاتا ہے جب اغیار ہماری توہین وتذلیل کرتے ہیں، کیوں ہماری غیرت نہیں جاگتی، کیوں ہمیں احساس نہیں ہوتا۔ آج حکمرانوں نے جمہوریت کے نام پر ہماری مٹی پلید کرکے رکھ دی ہے مگر ہم خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں، سوال یہ ہے کہ آخر ہم کس قسم کی قوم ہیں جسے سوائے کرکٹ کے اور کوئی بخار نہیں چڑھتا،خدارا اپنی قومی ذمہ داریوں کا احساس کیجئے، کرکٹ ضرور کھیلئے، میچ بھی دیکھئے، جوشیلے نعرے بھی لگایئے، لیکن اِس جذبے کو کبھی سرد نہ ہونے دیجئے جس کی وجہ سے ہم ایک قوم ایک ملت کے

فرد ہیں، جس نے ہمیں مختلف رنگ و نسل، زبان و علاقے کا ہونے کے باوجود ایک لڑی میں پرویا ہوا ہے۔یاد رکھیئے کہ یہی جذبہ ہماری اصل اساس، ہماری بنیاد اور ہماری بقاء کا ضامن ہے۔آج اگر ہم اِس جذبے کو اپنے قومی کردار کا حصہ بنالیں اور اسے سیاست، معیشت اور معاشرت سمیت زندگی کے تمام شعبوں میں بروئے کار لانے کا فیصلہ کرلیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اغیار کی غلامی کی زنجیریں توڑ کر دنیا میں ایک عزت دار باوقار اور خودمختار قوم کا مقام حاصل نہ کرلیں۔

تعلیم نہ کھپے۔۔۔۔۔۔ تعلیم نہ کھپے۔۔۔۔

ایچ ایس سی کی تحلیل، حکومت کا ایک انتقامی فیصلہ

اسلام تعلیم اور تعلّم سے وابستہ افراد کو معاشرے کا سب سے اہم فرد قرار دیتا ہے، حضور سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ "علم حاصل کرو، چاہے اُس کیلئے تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔" یہ قانون فطرت ہے کہ علم قوموں کی ترقی کی بنیاد اور اساس ہوا کرتا ہے، قوموں کے عروج وزوال میں تعلیم کا کردار ہمیشہ سے غیر معمولی اہمیت کا حامل رہا ہے، دنیا میں وہی قومیں اور ممالک مرجع خلائق رہے جنھوں نے تعلیمی میدان ترقی کی ،ایک وقت تھا جب تعلیم کی وجہ سے مسلمانوں کو دنیا کی امامت کا مرتبہ حاصل تھا، یہ وہ دور تھا جب مغرب اپنے تاریک ترین دور سے گزر رہا تھا، لیکن اُس وقت اسلام کی روشنی دنیا کو منور کر رہی تھی اور قرطبہ کی جامعات دنیا بھر میں علم وفن کا مرکز تھیں، لیکن جب تعلیم و تعلّم اور شمشیر و سناں کی جگہ طاؤس و رباب نے لے لی تو ہماری تنزلی کا دور شروع ہو گیا، تعلیمی ترقی نہ ہونے کی وجہ سے وہ جو کبھی اقوام عالم کے سردار تھے ،اغیار کے غلام اور محکوم ہو گئے، آج دنیا کی بہترین تعلیمی ادارے اغیار کے پاس ہیں اور پوری دنیا سے اعلیٰ

تعلیم کے حصول کے لئے لوگ اُن کی طرف رجوع کرتے ہیں، جبکہ ہماری تعلیمی ترقی کا حال یہ ہے کہ دنیا کی بڑی جامعات کی لسٹ میں دور دور تک ہماری کسی جامعہ کا نام تک نہیں آتا،اس کی بنیادی وجہ تعلیمی میدان میں حکومتوں کی عدم دلچسپی ہے، ہمارے یہاں بجٹ میں صرف 2 فیصد بجٹ حصہ تعلیم کے لئے مختص کیا جاتا ہے جس سے بہتری کی توقع تو کجا موجودہ سیٹ اپ کو چلانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں تعلیم کا شعبہ روز اوّل سے ہی عدم توجہی کا شکار رہا ہے،ہر حکومت نے تعلیمی کمیشن تشکیل بنائے، نت نئ تعلیمی پالیسیاں تشکیل دیں، تعلیمی فروغ کیلئے کاغذی ادارے بنائے، مگر ہمارا نظام تعلیم جوں کا توں ہی رہا، جبکہ دنیا کا دستور یہ ہے کہ قومیں اپنی ترقی اور کامیابی کیلئے ادارے تعمیر کرتی ہیں،اُن کی مسلسل پرورش کرتی ہیں،پروان چڑھاتی ہیں اور انہیں بہتر سے بہتر بناتی رہتی ہیں،تب جاکر نتائج حاصل کرتی ہیں، کیونکہ ادارے ہی قوموں کا اثاثہ اور میراث ہوتے ہیں جو ثمربار اور گھنے درختوں کی مانند انکی کئ نسلوں کو پھل مہیا کرتے ہیں، سایہ فراہم کرتے ہیں،اس کے عکس ہم نے اپنی چونسٹھ سالہ تارخ میں سب سے زیادہ زور ادارے بنانے کی بجائے انہیں کمزور کرنے اور توڑنے پر دیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر شعبے میں ہم پیچھے رہ گئے،ہمارے حکمرانوں کا یہ شغل اب بھی جاری ہے،اگر

اتفاق سے کوئی ادارہ وجود میں آ بھی گیا تو اِس کے درپے ہونا ہمارے حکمران اپنے فرض منصبی شمار کرتے ہیں، خوش قسمتی سے پچھلے آٹھ دس سالوں میں ادارہ سازی کے میدان کے اندر ہم سے ایک قابل تعریف کام سرزد ہو گیا جو ہائر ایجو کیشن کمیشن کا قیام تھا، لیکن اب ہمارے حکمران اسے تحلیل کرنے کے منصوبے بنارہے ہیں۔

پہلے ہی پاکستان میں تعلیم کا حال دگرگوں تھا، رہی سہی کسر حکومت نے ایچ ای سی کو ختم کرنے کا فیصلہ کرکے پوری کر دی ہے، تازہ ترین اطلاعات کے مطابق ہائر ایجو کیشن کمیشن کو ٹکڑے کرکے صوبوں میں بانٹ دیا جائے گا اور اِس کی مرکزی حیثیت ختم ہو جائے گی، حکومت کا دعویٰ ہے کہ یہ اقدام اٹھارویں ترمیم کے مطابق اٹھایا گیا ہے جبکہ 18 ویں ترمیم کمیٹی کے ایک رکن مسلم لیگ (ن) کے رہنما احسن اقبال کا کہنا ہے کہ ایسی کوئی آئینی مجبوری نہیں کہ ایچ ایس سی کو لازماً صوبوں کے حوالے کیا جائے، اُن کے خیال میں یہ انتقامی کاروائی ہے کیونکہ جعلی ڈگریوں کے معاملہ پر کمیشن نے حکومت کا دباؤ قبول نہیں کیا تھا، یہی رائے ملک کی دیگر سیاسی جماعتوں اور قائدین کی ہے، دوسری طرف تعلیمی اداروں کے وائس چانسلر سمیت طلبہ تنظیمیں بھی حکومت کے اِس فیصلے کے خلاف صف آراء ہو چکے ہیں، ہماری نظر میں ہائر ایجو کیشن کمیشن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے صوبوں کے سپرد کرنا اعلیٰ تعلیم کے مستقبل پر ڈاکہ ڈالنے کے مترادف

ہے،اس بات میں کوئی دو رائے نہیں کہ ہائر ایجوکیشن کمیشن کو چلانا صوبوں کے بس کا روگ نہیں اور نہ ہی یہ ادارہ اپنی نوعیت اور آئینی حیثیت کے سبب صوبوں کے سپرد کیا جانا چاہئے۔

اِس سے قطع نظر کہ ہائر ایجوکیشن کمیشن کے ٹکڑے کرنے کی آئینی حیثیت کیا ہے، یہ حقیقت کسی طور بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ تعلیمی کے میدان میں ہائر ایجوکیشن کمیشن کی کارکردگی انتہائی متاثر کن اور شاندار رہی ہے،ہائر ایجوکیشن کے قیام سے پہلے دنیا بھر کی بہترین جامعات میں پاکستان کی کوئی یونیورسٹی شامل نہیں تھی لیکن اب دنیا کی بہترین جامعات میں پاکستان کی دو یونیورسٹیاں شامل ہیں، یہ بھی حقیقت ہے کہ ہائر ایجوکیشن کے قیام کے بعد ریسرچ کے شعبے میں بہت ترقی ہوئی اور ہمارے اسکالر نے قابل قدر کام کیا،آج ایچ ایس سی کے تعاون سے سینکڑوں پاکستانی اسکالر پی ایچ ڈی اور اِس لیول کی تعلیم مکمل کرچکے، جبکہ سات ہزار سے زائد طلباء دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں سے ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں، جن سے یہ امید کی جارہی تھی کہ جب یہ اسکالرز اور پروفیسرز مختلف مضامین میں پی ایچ ڈی کرکے وطن واپس آئیں گے تو پاکستان کا علمی و تعلیمی معیار بہتر ہوگا اور اعلیٰ تعلیم کے میدان میں نمایاں بہتری آئے گی۔

لیکن حکومت کے اِس تعلیم دشمن اقدام سے ہم نہ صرف ہم عالمی بینک اور امریکہ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے کروڑوں ڈالر کی امداد سے محروم ہوجائیں گے بلکہ پاکستانی یونیورسٹیوں کو عالمی ریکنگ میں لانے اور پی ایچ ڈی پروفیسرز کی تعداد میں نمایاں اضافے اور ریسرچ کے ذریعے ترقی کے خواب بھی چکنا چور ہوجائیں گے۔ساتھ ہی وہ طلباء جنھیں ایچ ایس ی نے 50 ارب روپے خرچ کرکے اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک بھجوایا تھا،وطن واپس آنے سے گریز کریں گے۔جس نہ صرف تعلیمی معیار خراب ہوگا بلکہ قومی خزانے کو نقصان کے ساتھ ہماری ترقی کی رفتار بھی متاثر ہوگی اور اِس ادارے کے خاتمے سے پاکستان سمیت دنیا بھر میں پاکستان کی ڈگریاں بھی مشکوک قرار پائیں گی۔

لہذا ہماری ارباب اقتدار سے گزارش ہے کہ انہیں اپنے فیصلے کے حسن و قبح پر ضرور غور کرنا چاہیے تھا،ہماری نظر میں تعلیم کے شعبے کو صوبوں کے حوالے کرنا ایک خطرناک اور ایسا ملک دشمن قدم ہے،جس پر عمل سے چھوٹے صوبوں کے ٹیچرز اور پروفیسر اعلیٰ تعلیم کے مواقع سے محروم ہوجائیں گے۔اِس ادارے کی آزادانہ حیثیت ختم کرنے سے اِس کا سب سے زیادہ نقصان اُن چھوٹے صوبوں کو ہوگا جن کے وسائل پہلے ہی بہت کم ہیں،حکومت کے اِس عمل سے صوبوں کے درمیان غلط فہمیاں بھی پیدا ہوں گی کیونکہ تمام صوبوں اور کشمیر میں معیار تعلیم ایک جیسا نہیں ہے،دوسری جانب ایک ایسا ادارہ جو پاکستان کیلئے دنیا میں

قابلِ فخر کردار ادا کر رہا ہے،کے خاتمے سے ہمارا تعلیمی معیار گرے گا اور بیرونی ممالک میں موجود ہزاروں ذہین پاکستانی طلبہ کا مستقبل بھی تاریک ہو جائے گا۔

جہاں تک ایچ ای سی کا تعلق ہے تو ممکن ہے کہ اِس میں کچھ خامیاں ہوں لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں کہ اِس ادارے کو زندہ در گور کر دیا جائے،بلکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ وہ خامیاں دور کی جاتیں اور اِس کی کارکردگی کو بہتر بنایا جاتا،مگر افسوس کہ اِس طرف توجہ دینے کے بجائے اِس ادارے کے خاتمے کا فیصلہ کیا گیا جس سے اِس اعتراض میں وزن محسوس ہوتا ہے کہ ارکان پارلیمنٹ کی ڈگریوں کی چھان بین روکنے کے لئے حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے،ہم اپنے اربابِ اقتدار کو یاد دلانا چاہتے کہ قوموں کا روشن مستقبل اعلیٰ تعلیم سے وابستہ ہوتا ہے،آج کوئی معاشرہ تعلیم کی تجدید سے بے نیاز ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا،اچھی اور معیاری تعلیم سماج کے زندگی بخش نظریات سے چشم پوشی نہیں کر سکتی،دونوں کا ربط ایسی افادیت پیدا کر سکتا ہے جو قومی استحکام اور سماجی فلاح کی ضمانت ہے،ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ،جدید اور فلاحی معاشرہ ہی استحکام پاکستان کی کلید ہے،اربابِ اختیار،دانشوروں،ماہرینِ تعلیم،میڈیا اور اصحاب الرائے کی یہ اجتماعی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ پاکستان کے روشن مستقبل کے لئے حکومت کے اِس تعلیم کش (تعلیم نہ کھپے) کے اقدام کے خلاف متحد ہو کر

واضح لائحہ عمل اختیار کریں، وگرنہ اعلیٰ تعلیم کے میدان میں پیچھے رہ جانا ہمارا مقدر ہے

۔

قومی ہیروز کی خدمات کا اعتراف ایک نئی روایت کا آغاز

نیشنل ہیرو فاؤنڈیشن، نئی سوچ نئے جذبوں کی امین

ہر قوم کا مرکز و محور اُس کے قومی ہیرو ہوتے ہیں۔دنیا کی ہر قوم،اقوام عالم میں اپنے قومی ہیروز کے باعث پہچانی جاتی ہے اور اُس شناخت کا سہرا ایسے لوگوں کو ہی جاتا ہے جو تن من دھن کی بازی لگا کر دنیا میں نہ صرف اپنی علیحدہ شناخت پیدا کرتے ہیں بلکہ اپنی قوم کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔اِن قومی ہیروز کو رہتی نسلوں تک اسلیئے یاد رکھا جاتا ہے کیونکہ اِن کے قوم پر احسانات کا بدلہ ممکن نہیں ہوتا۔یہ قومی ہیروز زندگی کے مختلف شعبوں میں ملک و قوم کی خدمت کرکے نام پیدا کرتے ہیں، عزت کماتے ہیں اور تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں۔لوگ ان کی وفات کے بعد بھی ان کو یاد کرتے، دعائیں کرتے ہیں اور ان کی یادگاروں پر پھول سجاتے ہیں۔ان کے عظمت و کردار کی وجہ سے ان کی آئندہ نسلیں بھی معاشرے میں قابل احترام شخصیات کا درجہ پاتیں ہیں اور اپنے حسب نسب پر فخر محسوس کرتی ہیں۔زندہ قومیں اپنے قومی ہیروز کے نام اور کام کو آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے کیلیئے ہمیشہ سرگرم عمل رہتی ہیں۔وہ ان کے کارناموں کو کبھی بھی فراموش نہیں کرتیں، کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ

جو قومیں اپنے ہیروز کو بھلا دیتی ہیں، دنیا بھی انہیں نظر انداز کر دیتی ہے۔
تاریخ گواہ ہے کہ کسی ملک کے ہیروز اُس ملک کا سرمایہ افتخار ہوتے ہیں، زندہ قومیں اپنے اِن ہیروز کی اُن کی زندگی میں ہی قدر کرتی ہیں، اُن کے کارناموں کا اعتراف کرتی ہیں، اُسے سراہتی اور مشعل راہ بناتی ہیں، لیکن بد قسمتی سے اپنے قومی ہیروز کی قدر کرنے کے حوالے سے پاکستان کا ریکارڈ کچھ اچھا نہیں ہے، ہم زندگی میں انہیں وہ مقام اور اہمیت نہیں دیتے جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں، جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں بڑے بڑے نجی ادارے اپنی سماجی ذمہ داریوں کو بخوبی ادا کرتے ہیں اور ان اداروں کے زیر سایہ بہت سے فلاحی منصوبے پروان چڑھتے رہتے ہیں، مگر افسوس کہ پاکستان میں تمام فلاحی اور سماجی کاموں کا ذمہ دار ہم حکومت وقت کو ٹھہراتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر نجی کاروباری ادارے اپنی سماجی ذمہ داریوں سے واقف نہیں ہیں دوسرے یہ کہ ہمارے یہاں ان اداروں میں اس طرح کی سرگرمیوں کا کوئی رواج نہیں ہے۔
ہمارے ملک کے بڑے بڑے نجی ادارے جن میں بینک اور دوسری نجی کمپنیاں وغیرہ شامل ہیں اپنی بیلنس شیٹس میں ہر سال ایک کثیر رقم سماجی شعبوں میں ظاہر کرتے ہیں، تاکہ ٹیکس سے بچا جاسکے، مگر کچھ ایسے ادارے بھی ہیں جو اپنی آمدنی کا زیادہ تر حصہ فلاحی کاموں کیلئے وقف کرتے ہیں۔

نیشنل ہیر و فاؤنڈیشن بھی ایک ایسا ہی نجی ادارہ ہے جس کے قیام کا مقصد پاکستانی عوام بالخصوص نوجوان نسل کو اپنے اُن قومی ہیروز جنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں نیوکلیئر سائنس، انفارمیشن ٹیکنالوجی، میڈیکل، انجینئرنگ، کھیل، علم و ادب، فنون لطیفہ اور سیاسی و سماجی بہبود وغیرہ کے شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دی ہوں، کے کردار و عمل اور اُن کارناموں سے قوم کو روشناس کرانا اور قومی سطح پر اِن عظیم شخصیات کے عزت و وقار کو بحال کرانا ہے۔اس ادارے کو حکومت پاکستان نے بطور ایک غیر منافع بخش پبلک کمپنی ملکی سطح پر ہیروز ازم کے جذبے کے فروغ، قومی ہیروز کو خراج تحسین پیش کرنے اور اُن کی فلاح و بہبود کیلئے کام کرنے کی باقاعدہ اجازت دی ہے اور کمپنیز آرڈیننس 1984 کے سیکشن 42 کے تحت لائسنس بھی جاری کیا ہے۔اس ادارے کے کے (Celebrity) بنیادی اغراض و مقاصد میں "قومی ہیروز اور مشہور شخصیات درمیان فرق سے آگاہی، ملک میں ہیروز ازم کا فروغ، اُن کے کھوئے ہوئے تشخص کی بحالی، عوام الناس اور بالخصوص نوجوان نسل کو اُن کی خدمات و کارناموں سے روشناسی، گرانقدر خدمات پر خراج تحسین پیش کرنا، اُن کی سنہری کارناموں کو محفوظ کرنا، اُن کے اہل خانہ کی دلجوئی کے ساتھ مالی معاونت کیلئے مختلف فلاحی منصوبے تشکیل دینا، بینیفٹ پروگرام منعقد کرنا اور قومی سطح پر ہر سال نیشنل ہیروز ڈے منانے کا اہتمام کرنا" شامل ہیں، یہ ادارہ

2005ء سے شیخ راشد عالم بانی و سربراہ نیشنل ہیرو فاؤنڈیشن کی زیر نگرانی اپنی اس جدوجہد میں مصروف ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ایسے اَن گنت قومی ہیروز موجود ہیں، جو ملک اور قوم کیلئے گرانقدر خدمات انجام دینے کے باوجود گوشہ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں، معاشرے میں نہ توانہیں وہ عزت و مقام حاصل ہے جس کے وہ مستحق ہیں اور نہ ہی اُن کا کوئی پرسان حال ہے،اس تناظر میں نیشنل ہیرو فاؤنڈیشن کے قیام کا مقصد قومی سطح پر ایک ایسے پلیٹ فارم کی فراہمی ہے جس کے ذریعے قومی ہیروز کے کارہائے نمایاں اجاگر کرکے انہیں اُن کا جائز مقام دلوایا جائے اور آنے والی نسل کو اُن کے نقش قدم پر چلنے کی ترغیب دی جائے، نیشنل ہیرو فاؤنڈیشن نے اس سلسلے میں مختلف منصوبے ترتیب دیئے ہیں،اسی حوالے سے 20مارچ 2011ء کو ہوٹل پرل کانٹی نینٹل میں نیشنل ہیرو فاؤنڈیشن نے وفاقی وزیر خزانہ عبدالحفیظ شیخ کی زیر صدارت پہلی ونڈروومن ایوارڈ تقریب منعقد کرکے پاکستان میں ایک نئی روایت کی بنیاد رکھی ہے۔

اس تقریب کا مقصد وطن عزیز کی ترقی واستحکام کیلئے زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں اور قابل فخر کردار ادا کرنے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوا کر اپنی موجودگی کا احساس دلانے والی خواتین کو خراج تحسین پیش کرنا

تھا، بد قسمتی سے ہمارے ملک میں اِس قسم کی کوئی روایت موجود نہیں کہ وہ خواتین جو ہمارے معاشرے کا اہم حصہ ہیں اور جنھوں نے اپنے اپنے شعبوں میں شاندار خدمات انجام دی ہیں، اُن کی خدمات کو سراہا جائے، انہیں اہمیت دی جائے، اُن کے جائز مقام کو مانا جائے اور اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے کہ ملک کی ترقی و خوشحالی میں خواتین کا بھی اہم حصہ ہے، یہ اعزاز بھی نیشنل ہیرو فاؤنڈیشن کا جاتا ہے کہ اُس نے وزارت خزانہ کے اشتراک سے قومی سطح پر "ونڈر وومن آف دی ایئر ایوارڈ" کا اجراء کرکے ایسی خواتین کے عملی کردار کو نہ صرف بہترین خراج تحسین پیش کیا ہے بلکہ ایک قابل تقلید مثال بھی قائم کی ہے۔

اسی سلسلے میں نیشنل ہیرو فاؤنڈیشن نے گزشتہ دنوں پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دینے پر 18 خواتین کو ایوارڈ دیئے، اس پروقار تقریب میں سب سے پہلا "ونڈر وومن ایوارڈ آف دی ایئر" دختر مشرق شہید جمہوریت محترمہ بے نظیر بھٹو کو دیا گیا جسے ڈپٹی اسپیکر سندھ اسمبلی شہلا رضا نے وصول کیا، جبکہ میڈیم نورجہاں کا ایوارڈ اُن کی صاحبزادی ظل ہما نے وصول کیا، ان کے علاوہ محترمہ نسرین جلیل، بلقیس ایدھی، ڈاکٹر ملیحہ لودھی، جسٹس (ر) ناصرہ اقبال جاوید، سلطانہ صدیقی، امینہ سید، یاسمین لاری، کیپٹن عائشہ رابیہ نوید، پروفیسر انیتا غلام علی، اکرم

خاتون، کترینا حسین، حسینہ معین، محمودہ کاظمی، شفقت سلطانہ، عاصمہ منیر، رضیہ فرید، مس راحت کو بھی اپنے اپنے شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دینے پر ایوارڈز سے نوازا گیا۔اس موقع پر اپنے صدارتی خطاب میں وفاقی وزیر خزانہ عبدالحفیظ شیخ نے کہا کہ یہ وہ قابل فخر خواتین ہیں جنھوں نے جہاز اڑانے سے لے کر سماجی خدمات تک اور سیاست سے لے کر کھیل کے میدانوں سمیت ہر شعبہ زندگی میں اپنی خداداد صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے اور اُسے منوایا ہے۔انہوں نے نیشنل ہیرو فاؤنڈیشن کے بانی و چیئرمین شیخ راشد عالم کو اس منفرد تقریب کے انعقاد پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے پاکستان میں نیشنل ہیرو فاؤنڈیشن قائم کرکے نجی شعبے میں ایک نئی تاریخ رقم کی ہے۔

بلاشبہ نیشنل ہیرو فاؤنڈیشن کے زیر انتظام پہلی ونڈر وومن ایوارڈ کی تقریب ایک منفرد تقریب تھی جس کا اہتمام نیشنل ہیرو فاؤنڈیشن نے شاندار طریقے سے کیا تھا۔اس بات میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں کہ نیشنل ہیرو فاؤنڈیشن ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جہاں قومی ہیروز کی عظمت و کردار کے زبانی تذکرے ہی نہیں کیے جاتے بلکہ اُن کی خدمات کو سراہا بھی جاتا ہے اور اُن کی مالی معاونت بھی کی جاتی ہے۔درحقیقت نیشنل ہیرو فاؤنڈیشن ایک نئی سوچ اور نئے جذبوں کے حامل افراد کا پلیٹ فارم ہے۔ایسے افراد کا پلیٹ فارم جو اپنی قوم کی توجہ اُن قومی ہیروز کی جانب مبذول کرنا چاہتا ہے جنھیں بھلا کر گمنامی کے

اندھیروں میں دھکیل دیا گیا ہے، آج وطن عزیز کے اہل علم وہنر وخدمت کیلئے یہ بات
یقیناً خوشی کا باعث ہوگی کہ نیشنل ہیرو فاؤنڈیشن کے قیام سے اُن کی خدمات کے
اعتراف کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے، موجودہ حالات میں نیشنل ہیرو فاؤنڈیشن کی جانب
سے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں نمایاں خدمات انجام دینے پر ایوارڈ کا اجراء ایک مثبت
اور قابل تقلید مثال ہے، جس کو سامنے رکھتے ہوئے دوسرے اداروں کو بھی چاہیے کہ
وہ بھی اپنے قومی ہیروز کی حوصلہ افزائی کریں تاکہ ہماری نوجوان نسل اُن کے نقش قدم
پر چلتے ہوئے پاکستان کی تعمیر وترقی میں ساتھ اپنا مثبت کردار ادا کر سکے۔

دعوؤں کا نمک اور عوام کے زخم

عزم وارادے کی قوت سے محروم حکومتی دعوے

حقیقت یہ ہے کہ حکمرانوں کی طرف سے دعوؤں کی ست رنگی برسات ہر دور میں برستی رہی، ہر حکومت نے وعدؤں اور دعوؤں کے لولی پاپ سے عوام کو بہلانے اور سبز باغ دکھانے کی کوشش کی، حقائق خواہ کچھ بھی ہوں مگر دعویٰ یہی کیا جاتا رہا کہ حالات بہتر ہیں، عوام خوشحال ہیں، معیشت ترقی کر رہی ہے، لوگوں کی شرح آمدنی میں اضافہ ہوا ہے، حکومت نے نئے روزگار کے مواقع پیدا کیے ہیں، وغیرہ وغیرہ، موجودہ حکومت نے بھی سابقہ روایات کو برقرار رکھا اور سوائے بلند بانگ دعوؤں کے عوام کو کچھ نہ دیا، گزشتہ دنوں صدر محترم نے حیرت انگیز انکشاف کیا کہ حکومت نے تین برسوں میں معیشت کو مستحکم کردیا ہے، اب یہ بھلا کیسے ممکن ہے کہ صدر صاحب بولیں اور وزیر اعظم صاحب خاموش رہیں، اگلے ہی دن وزیراعظم صاحب نے بھی دعویٰ کردیا کہ ہم نے 70 فیصد دیہی آبادی کو خوشحال کردیا ہے، باقی مسائل بھی حل کردیں گے، کسی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اپنے قائدین کی دیکھا دیکھی وزیر خزانہ صاحب بھی ترنگ میں کہہ گئے کہ غربت میں 14 فیصد کمی واقع ہوئی ہے۔

مگر حکومتی ذمہ داران کے اِن دعوؤں کو سن کر ہمیں حیرت ہوتی ہے، نہ جانے یہ لوگ کون سی دنیا میں رہتے ہیں اور کس دنیا کی باتیں کرتے ہیں، جبکہ زمینی حقائق اور اسٹیٹ بینک سمیت عالمی مالیاتی اداروں کی رپوٹیں کچھ اور ہی نقشہ پیش کررہی ہیں، جو معیشت کے استحکام، عوامی ترقی و خوشحالی اور غربت میں کمی کے دعوؤں کے خلاف چیخ چیخ کر معیشت کی تباہی و بربادی کی نشاندہی کررہی ہیں، گورنر سٹیٹ بینک کہتے ہیں کہ معاشی صورتحال کے جلد ٹھیک ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے، افراط زر میں اضافے، ترقی کی رفتار میں سست روی، پیداوار میں کمی اور ملازمتوں کے نئے مواقع نہ ملنے کی وجہ سے عوام سخت دباؤ کا شکار ہیں، اگراِس کا فوری سدباب نہ کیا گیا تو نوجوانوں کے پاس سوائے اِس کے اور کوئی راستہ نہیں بچے گا کہ وہ چوریاں کریں، ڈاکے ڈالیں یا سٹریٹ کرائمز کا ارتکاب کریں، اسٹیٹ بنک آف پاکستان حکومت کو خبردار کرتا ہے کہ پٹرولیم مصنوعات اور بجلی کی قیمتوں میں اضافے سے مہنگائی کی شرح 15 فیصد تک بڑھنے کا خطرہ ہے، جس سے سماجی اور سیاسی سطح پر بے چینی پیدا ہونے کا خدشہ ہے، گورنر اسٹیٹ بینک کا یہ بھی کہنا ہے کہ گرانی کے حوالے سے صورت حال حوصلہ افزا نہیں، ملک میں سرمایہ کاری کا فقدان اور بدامنی مزید بگاڑ پیدا کرسکتی ہے، جبکہ ملک میں ترسیلات زر کی آمد میں کمی اور سرمائے کا فرار تیز تر ہوگیا ہے۔

کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار گورنر اسٹیٹ بینک سے قبل ایشیائی ترقیاتی بینک اور اقوام متحدہ کے ورلڈ فوڈ پروگرام بھی کر چکے ہیں۔منیلا سے جاری ہونے والی ایشیائی ترقیاتی بینک کی 2011ء کیلئے "آؤٹ لک" رپورٹ کا کہنا ہے کہ پاکستانی معیشت کو اہم چیلنجز کا سامنا ہے۔حکومت کی طرف سے آمدنی بڑھانے کے اقدامات میں تاخیر سے مالی خسارہ بڑھ رہا ہے۔پاکستان کی معیشت کا تذکرہ کرتے ہوئے رپورٹ کہتی ہے کہ دیگر ممالک کی نسبت پاکستان غیر ملکی سرمایہ کاری کیلئے پسندیدہ جگہ نہیں اور امن وامان کی خراب صورتحال کے باعث پاکستان غیر ملکی سرمایہ کاروں کی توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہا ہے۔رپورٹ میں رواں مالی سال کے دوران پاکستان میں مہنگائی میں مزید 16 فیصد اضافے کا عندیہ بھی دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ بجلی کے نرخوں میں اضافے سے مہنگائی بڑھے گی جبکہ ناقص منصوبہ بندی کے باعث سبسڈیز کا حجم 200 ارب روپے ہو جائے گا۔

رپورٹ میں پاکستانی معیشت کی مشکلات کا تذکرہ کرتے ہوئے گزشتہ سال کے سیلاب کی تباہ کاریوں کا بھی حوالہ دیا گیا ہے اور افراطِ زر کو معیشت کی ترقی کا دشمن قرار دیا گیا ہے۔وفاقی سیکرٹری شماریات آصف باجوہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ رواں مالی سال کے 9 ماہ کے دوران مہنگائی کی شرح 14.20 فیصد ہو گئی

ہے،دوسری طرف اقوام متحدہ کے ورلڈ فوڈ پروگرام کی رپورٹ کہتی ہے کہ پاکستان میں تین سال پہلے کے مقابلے میں اشیائے ضروریہ کی قیمتی دگنی ہو گئی ہیں،حکومت نے خوراک انتہائی مہنگی کر دی ہے،حالت یہ ہوچکی ہے کہ سیلاب زدہ علاقوں کے مکین روٹی کے لئے بھی قرض لینے پر مجبور ہوگئے ہیں اور اِس قرض کا 70 فیصد روٹی پر خرچ کررہے ہیں،ورلڈ فوڈ پروگرام نے اِس بات پر بھی افسوس کا اظہار کیا ہے کہ ملک خوراک سے بھرا ہوا ہے مگر غریب اِس کے حصول سے محروم ہیں۔

قارئین محترم یہ ہیں وہ تلخ زمینی حقائق جو ہماری قومی معیشت کے حقیقی خدوخال پیش کررہے ہیں،اِن حقائق کی تصدیق اسٹیٹ بینک اور بین الاقوامی مالیاتی اداروں کی رپورٹیں بھی کررہی ہیں،یہ رپورٹیں جو کچھ لکھ رہی ہیں وہ حرف بحرف درست ہے،کیا اِس حقیقت سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ ایک ایسا ملک جس میں آئے روز خودکش دھماکے ہو رہے ہوں،جس میں سیاستدان جلسے جلوسوں کے انعقاد سے ڈر رہے ہوں،جہاں عوام اور خواص میں سے کوئی بھی محفوظ نہ ہو،جہاں بچوں کے اسکولوں سے لے کر ہر اہم عمارت کے سامنے کنکریٹ کے بڑے بڑے بلاکس رکھے ہوں،جہاں بدامنی،افراتفری،لوٹ مار اور مس منیجمنٹ کا راج ہو،وہاں کون آکر سرمایہ کاری کرے گا،وہاں ترقی و خوشحالی کے دعوئے جھوٹے سیاسی بیانات تو ہو سکتے ہیں مگر حقیقت نہیں،اَمر واقعہ یہ ہے کہ ملک بدترین مالی

بحران کا شکار ہے، جبکہ عوام کی اکثریت کے حالات زندگی اتنے اجیرن ہو چکے ہیں کہ اُن کیلئے جسم وجاں کا رشتہ برقرار رکھنا دشوار ہو چکا ہے، وہ پل پل جیتے اور مرتے ہیں، غریب اور متوسط طبقات کیلئے بچوں کی اعلیٰ تعلیم تو در کنار، بنیادی اور عام تعلیم بھی ایک خواب بن کر رہ گئی ہے۔
بھوک کے ہاتھوں مجبور لوگ اجتماعی خودکشیاں کر رہے ہیں، بے بس والدین اپنی اولاد کے گلے میں برائے فروخت کا بورڈ لگا کر انہیں سر بازار لئے پھرتے ہیں، چند روز قبل لاہور کی ایک خاتون جب اپنے چھ سالہ بچے کو روٹی کا نوالہ کھلانے سے قاصر رہی، تو اُس کا گلا دبا دیا، اب تو ایسے آدم خور خاندان کا بھی انکشاف ہوا ہے جو انسانی مردار اور کتے تک کھاتا رہا ہے، غربت، بھوک اور مہنگائی کے باعث ایسے کربناک واقعات کا وقوع پذیر ہونا انسانی المیہ اور حکومت کیلئے شرمناک ہے، اس پر مستزاد یہ کہ بدامنی، لاقانونیت اور پرائی جنگ میں کودنے کے نتیجہ میں پھیلنے والی دہشت گردی نے سرمایہ کاری کا عمل روک کر قومی معیشت کا جوڑ جوڑ ہلا دیا ہے، آج پاکستان کے بدترین مالی بحران کی سب سے بڑی وجہ مبینہ دہشت گردی کیخلاف امریکی مفادات کی جنگ، اعلیٰ سطح پر کرپشن اور ہر شعبے میں مس مینجمنٹ ہے، جس کا خمیازہ غریب، متوسط اور سفید پوش طبقہ مہنگائی، بے روزگاری، غربت اور بھوک کی شکل میں بھگت رہا ہے، یہ ہماری تباہی و بربادی کی وہ اصل وجوہات ہیں جو حکمرانوں کی ناعاقبت اندیشی نے ہم

پر مسلط کردی ہیں۔
چنانچہ اِن حالات میں ارباب اقتدار کی جانب معیشت کے استحکام، 70 فیصد دیہی خوشحالی اور 14 فیصد غربت میں کمی کے پر فریب دعوئے ایک مذاق ہی معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ معیشت کا استحکام اسٹیٹ بینک اور عالمی اداروں کی رپورٹوں سے منکشف ہے، جبکہ 70 فیصد دیہی خوشحالی کا حال یہ ہے کہ خود وزیر اعظم کے آبائی شہر ملتان میں اُن کے گھر کے باہر وہ افراد مظاہرہ کررہے ہیں جو 10 ماہ پہلے آنے والے سیلاب سے متاثر ہوئے اور اُن کی اب تک کوئی خبر گیری نہیں کی گئی، باقی رہا 14 فیصد غربت میں کمی کا معاملہ تو وہ اقوام متحدہ کے ورلڈ فوڈ پروگرام کی رپورٹ سے عریاں ہوجاتا ہے، جبکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ پاکستان کی اقتصادیات کبھی کمزور نہیں رہی، نہ ہی ملک میں وسائل اور ٹیلنٹ کی کمی ہے، مگر اِس کے باوجود ملک غربت، مہنگائی، بے روزگاری اور دہشت گردی کی بھٹی میں جل رہا ہے، ہماری رائے میں یہ سب سابق فوجی آمر سے ورثے میں ملی ہوئی پالیسیوں کا تسلسل ہے، جب تک یہ پالیسیاں جاری رہیں گی اور جب تک ہم آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی ہدایات پر عمل کرتے رہیں گے ملک کی سیاست اور معیشت دونوں ہی برباد اور تباہ حال رہے گی اور عوام اِس کی سزا بھگتے رہیں گے۔
حقیقت یہ ہے کہ کبھی بھی معاشی ترقی و استحکام، غربت میں کمی اور خوشحالی

کے حکومتی دعوئے پرجوش بیانات اور خوشنما رنگین اشتہارات کے محتاج نہیں ہوتے اور نہ ہی انہیں کہنے، بتانے اور گنوانے کی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ اِس کی گواہی عوام کے پر سکون وطمینان بخش اور ہنستے مسکراتے چہروں سے ملتی ہے، جن پر آج فکروتردد اور معاشی پریشانیوں نے تجریدی آرٹ کی آڑی ٹیڑھی لکیریں کھینچی ہوئی ہیں، لہذا ارباب اقتدار کو چاہیے کہ وہ" ڈنگ ٹپاؤ پالیسی پر عمل پیرا ہونے کے بجائے عوام کے اصل مسائل کا ادراک کریں، یاد رکھیں دنیا کی کوئی قوم اُس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ اپنے محروم طبقات کو مراعات یافتہ طبقوں پر فوقیت نہیں دیتی، وہ حکمران جو اپنے وعدوں کا پاس نہیں رکھتے اور عوام کے بارے میں سوچنے کے بجائے اپنے بارے میں سوچتے ہیں وہ کبھی آنے والے کل میں زندہ نہیں رہتے، اچھے حکمران وہی ہوتے ہیں جو وعدوں اور دعوؤں کے بجائے عملی اقدامات کو ترجیح دیتے ہیں، ہماری اپنے ارباب اقتدار سے صرف اتنی گزارش ہے کہ وہ خدارا پاکستان کے بھوکے، ننگے عوام کے زخموں پر مزید نمک نہ چھڑکیں، انہیں دعوؤں اور وعدوں کے لولی پاپ سے نہ بہلائیں، جھوٹے خواب نہ دکھائیں، کیونکہ لایعنی وعدے اور عملی اقدامات سے محروم دعوئے عوام کیلئے اُن کے موجودہ مسائل سے زیادہ تکلیف دہ اور الفاظوں کا ایسا گورکھ دھندا ہیں جو عزم، حوصلے اور ارادے کی قوت سے محروم ہیں۔

قومی حکومت یا حکومت بچاؤ منصوبہ

قومی حکومت اپنی سلامتی اور خوشحالی کا نیا ایجنڈا

سچ فرمایا وزیر اعظم صاحب نے کہ "سیاست روزمرہ کا کام ہے اور یہ لمحہ بہ لمحہ بدلتی رہتی ہے،اِس میں کوئی حتمی بات نہیں ہوتی۔" ہماری سیاست کا یہ وہ رنگ ہے جس سے ہم اور آپ بخوبی واقف ہیں،جب مفادات مشترکہ ہوں تو کل کے دشمنوں کو آج کے دوست بنتے دیر نہیں لگتی، حیرت زدہ مت ہویئے کہ کل جو لوگ دشمن اور قاتل قرار دیئے گئے تھے آج وہی لوگ دوست بننے جارہے ہیں اور پیپلز پارٹی کی کشتی میں سواری کی تیاری کر رہے ہیں، سنا ہے کہ ق لیگ وفاقی کابینہ میں شامل ہونے پر راضی ہو گئی ہے اور کیوں نہ راضی ہوتی کہ پیپلز پارٹی نے بھی ق لیگ کو کابینہ میں شمولیت کیلئے 4 وفاقی وزراء، 6 وزراء مملکت اور اقوام متحدہ میں سفیر سمیت سینئر وزیر (جسے نائب وزیر اعظم کہا جاسکتا ہے) کی شاندار پیشکش جو کی ہے، سیاسی تجزیہ نگاروں کے مطابق ق لیگ کی حکومت میں شمولیت کا مقصد چودھری پرویز الٰہی کے بیٹے مونس الٰہی کا معاملہ ہے جن پر نیشنل انشورنس کمپنی لمیٹڈ میں گھپلے کا مقدمہ چل رہا ہے، جبکہ پیپلز پارٹی کا مفاد یہ ہے کہ حکومت میں ق لیگ کی شمولیت سے بجٹ منظور کرانے میں آسانی

ہو جائے گی، بصورت دیگر بجٹ کا سادہ اکثریت سے منظور کرانا مشکل ہوگا اور اگر ایسا
ہوا تو پی پی حکومت کو گھر جانا پڑے گا،اس اتحاد سے پیپلز پارٹی کو مزید یہ فائدہ ہوگا کہ
اسے اپنے اُن اتحادیوں کی بلیک میلنگ سے بھی نجات مل جائے گی جو علیحدگی دھمکیاں
دے کر مسلسل حکومت کیلئے خطرے کی گھنٹیاں بجا رہے ہیں۔
یوں معیشت کی بحالی، امن و امان، توانائی، مہنگائی کے چار نکاتی قومی ایجنڈے سمیت دیگر
سنگین چیلنجز سے نمٹنے کیلئے اہم سیاسی جماعتوں پر مشتمل قومی حکومت کیلئے کوششیں آخری
مرحلے میں داخل ہو گئی ہیں اور توقع کی جا رہی ہے کہ قومی حکومت کی تشکیل آئندہ چند
روز میں مکمل ہو جائے گی، مسلم لیگ ق کی شراکت اقتدار میں رضامندی کے بعد متحدہ
قومی موومنٹ نے بھی اقتدار میں شرکت پر مشروط آمادگی ظاہر کر دی ہے جبکہ جمعیت
علماء اسلام (ف) کو منانے کی حکومتی کوششیں بھی جاری ہیں، ذرائع کے مطابق مسلم
لیگ ن، جماعت اسلامی، تحریک انصاف سے بھی حکومتی سطح پر رابطے ہو رہے ہیں تاکہ
قومی مسائل کے کم سے کم نکات پر پارلیمنٹ کے اندر اور باہر تمام جماعتوں کو
سیاسی، جمہوری اور مشاورتی عمل کا حصہ بنایا جا سکے، دوسری طرف سیاسی جماعتوں کی
جانب سے قومی مفاہمتی ایجنڈے کے بنیادی خدوخال پر عمومی اتفاق رائے کا اظہار کیا گیا
ہے تاکہ ملک میں سیاسی محاذ آرائی کو ختم کیا جائے اور سیاسی جماعتیں ملک کو درپیش

بحرانوں سے نجات دلانے کیلئے متحد ہو کر آگے بڑھ سکیں۔
سیاسی ذرائع کا کہنا ہے کہ فارمولے کے تحت سیاسی ہم آہنگی کو قومی سطح پر وسعت دی جائے گی اور چاروں صوبوں میں سیاسی جماعتوں کے کردار کی اہمیت کو تسلیم کیا جائیگا، مسلم لیگ ق اور حکمران پی پی پی کے درمیان اسی نظریے کے تحت اس بات پر بھی اتفاق ہو گیا ہے کہ اگلے سال مارچ میں سینیٹ کے انتخابات اور 2013 کے عام انتخابات کیلئے سیٹ ایڈجسٹمنٹ کی بنیاد پر بات چیت کو جلد حتمی شکل دیدی جائیگی اور ایم کیو ایم کو پنجاب میں کام کرنے کیلئے خاطر خواہ مواقع فراہم کئے جائیں گے، جبکہ سندھ، بلوچستان اور خیبر پختونخوا کی صوبائی حکومتوں میں مسلم لیگ ق سے ایک ایک مشیر کو شامل کرنے کی تجویز بھی زیر غور ہے، یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ نئی قومی حکومت سے پارلیمنٹ میں اکثریت کی بنیاد پر آئین میں نئے صوبوں کے قیام سے متعلق ایک نئی ترمیم منظور کرانے کی تجویز بھی زیر غور ہے اور سرائیکی صوبہ اور ہزارہ صوبہ کے ساتھ بہاولپور کو صوبہ بنانے کی تجویز کا بھی جائزہ لیا جارہا ہے،اسی طرح اس بات کا بھی جائزہ لیا جارہا ہے کہ ڈپٹی وزیراعظم بنانے کیلئے آئین میں ترمیم کی ضرورت ہوگی یا ایگزیکٹو آرڈر سے ایسا ممکن ہوگا۔
قارئین محترم بجٹ سمیت آنے والے دنوں میں پیش آنے والے مسائل کے تناظر میں

دیکھا جائے تو مذکورہ نوعیت کی کسی پیشرفت کو بعید از قیاس قرار نہیں دیا جاسکتا، وزیر اعظم گیلانی صاحب کا یہ کہنا درست کہ سیاست میں کوئی حتمی بات نہیں ہوتی، یا یہ کہ سیاست میں کوئی چیز حرف آخر نہیں ہوتی، ایسا اکثر جمہوری ملکوں میں ہوتا رہتا ہے، لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ پرانے اتحاد توڑ کر نئے اتحاد کیوں بنائے جارہے ہیں اور نئے دوستوں کی تلاش کا پس پردہ مقصد کیا ہے، گو ہماری سیاست لاکھ لمحہ بہ لمحہ بدلنے والا کھیل سہی لیکن اسے منفی اور معمولی مفادات اور مقاصد کے حصول کیلئے بدلتے رہنا کوئی قابل ستائش عمل نہیں، اگر یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا تو اس سے قومی مقاصد اور ملکی مفادات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا، حکمران جب بھی اپنے اقتدار کے سنگھاسن کو ڈولتا ہوا محسوس کریں گے وہ نئے اتحادیوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں اور یقیناً نئے اتحادی حکومتی کمزوری اور موقع کا فائدہ اٹھا کر اپنے تعاون کی منہ مانگی قیمت مانگیں جو انہیں ادا کرنا پڑے گی، خواہ وہ ملک اور قومی مفادات کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

ہم مانتے ہیں کہ ہماری موجودہ سیاست میں کوئی چیز حرف آخر نہیں ہوتی اور نہ ہی کل کے دشمن آج کے دشمن ہوتے ہیں، کل تک جو لوگ ایک دوسرے کو قاتل، چور اور ڈاکو قرار دیتے تھے آج وہی لوگ ہم پیالہ و ہم نوالہ ہونے جارہے ہیں، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ جب سیاسی قوتیں اپنی نااہلی اور ناکامی کو چھپانے اور

اُس پر پردہ ڈالنے کے لئے "قومی حکومت" کا فارمولا ایک مجرب نسخے کے طور پر استعمال کرتی ہیں تو اس کا مقصد سوائے اپنی حکمرانی کو طول دینے، ریاستی وسائل واختیار کے بے جا استعمال اور ملک و قوم کے مفادات کے نام پر اپنے سیاسی اور گروہی مفادات کو تحفظ فراہم کرنے اور کچھ نہیں ہوتا، جبکہ حب الوطنی اور قومی ذمہ داری کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے موقع پر حکومت کی سابقہ کارکردگی اور عوامی مسائل کے حل کیلئے کی گئی کوششوں کا سنجیدگی سے جائزہ لے کر حکومت میں شمولیت کا کوئی فیصلہ کیا جائے، لہذا حکومت میں شامل ہونے والی جماعتوں کو چاہیے کہ حکومت میں شامل ہونے سے پہلے وہ حکومت کی سابقہ کارکردگی کو مد نظر رکھیں اور سوچیں کہ کیا حکومت کی موجودہ
کارکردگی، معیشت کی زبوں حالی، بڑھتی ہوئی مہنگائی، دہشت گردی و لاقانونیت اور بے انتہا کرپشن انہیں حکومت میں شامل ہونے اور اُس کے دست بازو و سہارا بننے کی اجازت دیتے ہیں، اگر نہیں تو انہیں قومی حکومت کے نام پر حکومت بچاؤ مجرب نسخے سے دور ہی رہنا چاہیے، کیونکہ یہ قومی سلامتی اور خوشحالی کی آڑ میں اپنی سلامتی اور خوشحالی کے ایجنڈا کے اور کچھ نہیں۔

تصوف اسلام کامدار زندگی

تصوف سر چشمہ علوم نبوت کی ایک شاخ

مشکوۃ،کتاب العلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت بیان ہوتی ہے کہ " میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم کے دو برتن حفاظت میں لیے،ایک کو لوگوں میں پھیلا دیا اور دوسرا اگر پھیلاؤں تو یہ گردن کاٹ دی جائے" یہ حدیث مبارکہ بتاتی ہے کہ حضرت ابوہریرہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو علوم سیکھے،ایک علمِ قال اور دوسرا علمِ حال،حضرت علی کرم اللہ وجہہ ارشاد فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے علم کے ستر ابواب بتا رکھے ہیں اور میرے سوا یہ علم کسی اور کو نہیں بتایا۔" (کتاب اللمع، ص،54)ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی سے پوچھا"اے حارث! صبح کیسے کی؟ حارث نے جواب دیا، اے اللہ کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں نے اللہ پر سچے ایمان کی حالت میں صبح کی۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "دیکھ تو کیا کہہ رہا ہے؟اے حارث! بے شک ہر ایک شے کی کوئی نہ کوئی حقیقت ہوتی ہے، تیرے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟"تو حارث نے جواب دیا، میں نے اپنے نفس سے علیحدگی اختیار کی اور اسے دنیا سے پھیر دیا، جس کے

نتیجہ میں میری نظر میں اِس دنیا کے پتھر، مٹی، سونا اور چاندی برابر ہو گئے ہیں، میں رات کو جاگتا ہوں اور دن میں پیاسا رہتا ہوں، میری یہ کیفیت ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے عرش کو اپنے سامنے ظاہر دیکھ رہا ہوں اور گویا میں جنت میں ایک دوسرے سے ملتے ہوئے اور اہل جہنم کو چلاتے ہوئے دیکھ رہا ہوں،اس پر نبی علیہ السلام نے فرمایا عرفت فالزم" (تو جان گیا ہے اور اسی پر جما رہ)۔"

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بارے میں اُن کی اہلیہ سے منقول ہے کہ "ابو بکر رضی اللہ عنہ کو لوگوں پر فضیلت نماز اور روزہ کی کثرت کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ دل کے یقین (معرفت) کی وجہ سے تھی۔" اسی یقین و معرفت کا نام علم حال (تصوف) ہے، جو کتابوں کے پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ خواہشات نفسانی کے ترک کرنے سے حاصل ہوتا ہے، حضرت حسن بصری فرمایا کرتے تھے" ہم نے تصوف کا علم قیل و قال کے ذریعے سے حاصل نہیں کیا، بلکہ دنیا اور اُس کی لذتوں کے ترک کرنے سے حاصل کیا ہے۔"حضرت مجدد الف ثانی اپنے ایک مکتوب میں ملا حاجی محمد لاہوری کو تحریر کرتے ہیں" شریعت کے تین حصے ہیں، علم، عمل، اخلاص،جب تک یہ تینوں اجزاء متحقق نہ ہوں شریعت متحقق نہیں ہوتی،جب شریعت متحقق ہو جاتی ہے تو حق تعالیٰ کی رضا حاصل ہو جاتی ہے،جو کہ تمام دنیاوی اور اُخروی سعادتوں سے بالاتر ہے، طریقت وحقیقت جس سے کہ صوفیاء ممتاز ہوئے

ہیں، دونوں شریعت کے تیسرے حصے (یعنی اخلاص) کی تکمیل میں شریعت کے خادم ہیں، پس اُن کی تحصیل صرف شریعت کی تکمیل کیلئے کی جاتی ہے۔احوال و مواجید اور علوم ومعارف جو اثنائے راہ میں حاصل ہوتی ہیں وہ مقاصد میں سے نہیں۔ان سب سے گزر کر مقام رضاتک پہنچنا چاہیے، جو کہ سلوک کا آخری مقام ہے۔اس لیے طریقت وحقیقت کی منزلوں کو طے کرنے کا مقصد تحصیلِ اخلاص (احسان) کے سوا کچھ نہیں ہے۔" (جلد اوّل، مکتوب سہ و ششم)

حقیقت یہ ہے کہ علم قال اور علم حال کی ندیاں سرچشمہ علوم نبوت ہی سے نکلی ہیں، شیخ ابوطالب مکی قوت القلوب میں لکھتے ہیں" دونوں علوم اصلی ہیں، جو ایک دوسرے سے مستغنی نہیں ہیں، بمنزلہ اسلام اور ایمان کے، ہر ایک دوسرے کے ساتھ بندھا ہوا ہے، جیسے جسم اور قلب کہ اُن میں سے ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتا، صوفیاء کے نزدیک تصوف، اپنے نفس کو ریاضت و مجاہدہ کے ذریعہ اخلاق رذیلہ سے پھیرنے اور اخلاق حمیدہ یعنی زہد و علم صبر واخلاص اور صدق و صفا جیسے خصائل حسنہ پر آمادہ کرنے کا نام ہے، جس سے دنیا و آخرت میں کامرانی نصیب ہو، تصوف کا لفظ "صوف" سے بنا ہے جس کے معنی اُون کے ہیں،اِس سے مراد یہ ہے کہ وہ درویش اور بندگانِ خدا جو دنیا کی لذتوں اور نعمتوں سے کنارہ کش ہو کر یادِ اللہ میں مصروف ہو جاتے ہیں، موٹا چھوٹا پہنتے ہیں اور جیسا بھی کھانے کو مل جائے اُس سے اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں، اہلِ تصوف نے تصوف کی بنیاد

جن ستونوں پر قائم کی ہے وہ صدق و صفا، اخلاص و محبت، احسان، عبادت، خشوع و خضوع، فقر، توکل، صبر و رضا اور شکر وغیرہ ہیں، اُنھوں نے تصوف کی بنیاد کے لئے اقوال رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سرچشمہ ہدایت بنایا ہے اور یہ بھی اَمر واقع ہے کہ آئمہ تصوف نے اپنے اعمال اور احوال و مقامات کے لیے سنت نبوی سے استناد و دلائل فراہم کرنے کی کامیاب کوشش فرمائی ہے۔

لیکن دورِ حاضر میں تصوف کو ایک متنازعہ موضوع بنا کر عوام اور خواص کے قلوب و اذہان کو پراگندہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، جس میں جاوید احمد غامدی جیسے غیر مقلد متعصبین پیش پیش ہیں، جو سادہ لوح عوام کو اپنی چرب زبانی سے ذہنی خلجان میں بتلا کر رہے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے خیال میں شریعتِ مطہرہ کو آلودگیوں سے پاک کرنے کی آڑ میں اُس شہ رگ کو کاٹ رہے ہیں جس پر مدار زندگی ہے، صاحبزادہ عمر بیر بلوی لکھتے ہیں کہ "حیرت ہے اِن لوگوں پر کہ وہ مذہب کیلئے شور مچاتے ہیں اور اعمال مذہب کو پیش کرتے ہیں، لیکن روح مذہب کو مکمل کرنے کیلئے کچھ نہیں کرتے، بلکہ جو لوگ کچھ کر رہے ہیں یعنی صوفیاء، اُن کو بھی بے کار جماعتِ اسلام خیال کرتے ہیں اور اُن کے اعمال مجاہدہ کو جو سراسر پختگی یقین کیلئے تجویز کیے گئے تھے، بیکار خیال کرتے ہوئے اُن سے عوام کو برگشتہ کیا جاتا ہے اور غیر مذہب خیال کیا جاتا ہے، نتیجہ وہی پیدا ہو رہا ہے کہ ان ظاہری اعمال کے اندر کوئی ثمرہ ظاہری اور آخری پیدا نہیں

"ہوتا، بلکہ لوگ مذہب سے بیزار ہو رہے ہیں۔
آج پہلے ہی دنیا بے چینی اور بے سکونی کا شکار ہے، مادہ پرستی نے ذہنی سکون اور قلبی اطمینان لوٹ لیا ہے، لوگ طمانیتِ قلب اور حصولِ آسودگی کیلئے مصنوعی سہارے تلاش کرکے اپنی دنیا و عاقبت برباد کر رہے ہیں، چنانچہ اِن حالات میں ضرورت اِس اَمر کی ہے کہ صوفیاء کرام کی تعلیمات کو عام کیا جائے اور اُس خانقاہی نظام کو بحال کیا جائے جو برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی ترویج و اشاعت کا باعث بنا ہے، ممتاز دینی اسکالر و ماہر علوم جدیدہ پروفیسر قاری مشتاق احمد نے "تصوف روحِ اسلام" ترتیب دے کر وقت کی اِس اہم ضرورت کو نہ صرف پورا کیا ہے بلکہ اُن تشکیک زدہ ذہنوں کے شبہات کو بھی دور کیا ہے، جو صاحب علم و دانش کہلوانے کے باوجود تصوف پر خامہ فرسائی کرتے ہیں اور اسے اسلام کے اوامر ونواحی سے بے نیازی کا راستہ قرار دیتے ہیں۔
کتابِ ھٰذا قرآن و سنت اور سلف صالحین کی تعلیمات سے اخذ کردہ دلائل اور تصوف کے اساسی مباحث پر مبنی ہے، جس کا مطالعہ قاری کو تصوف کے اصل حقائق سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ اُس پر اِس حقیقت کو بھی واضح کرتا ہے کہ آج کے مادی دور میں انسان کے قلبی سکون اور فلاح و نجات کا واحد راستہ یہی ہے کہ وہ شریعتِ مطہرہ پر چلتے ہوئے سلوک کی راہ اختیار کرے، یہ کتاب اُن

اوامر و نواہی کی بھی واضح نشاندہی کرتی ہے جن پر عمل کر کے ہم تصوف کی اصل روح
سے آشنا ہو سکتے ہیں، یہ کہنا قطعاً غلط نہ ہوگا کہ تصوف کی امہاتِ کتب کی روشنی میں
پروفیسر مشتاق احمد صاحب کی یہ کتاب دراصل تصوف کی اصل حقیقت، عناصر ترکیبی
اور آج کے دور کی ضرورت کے حوالے سے ایک بہت ہی عمدہ کوشش ہے، جس پر
صاحب مولف اور شیر ربانی اسلامک سینٹر، چوک شیر ربانی، 21 ایکڑ سکیم نیامزنگ سمن
آباد، لاہور کے جملہ اراکین مبارکباد کے مستحق ہیں۔

واہ، امریکہ واہ، دیکھ لیا تیرا انصاف

صرف ایک ڈالر کی سزا۔۔۔۔

واہ، امریکہ واہ، دیکھ لیا تیرا انصاف ایک طرف چھیاسی سال اور دوسری طرف صرف اور صرف ایک ڈالر کی سزا، دنیا میں امن وامان، حقوق انسانی اور انصاف و قانون کے پھریرے لہرانے والے امریکہ، جس نے اپنے من پسند حق و انصاف اور انسانی حقوق کی بالادستی کیلئے پوری دنیا کا امن تاراج کیا ہوا ہے، آج اُسی حقوق انسانی کے عالمی چیمپین امریکہ کی عدالت انصاف پاکستانی ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو 86 سال کی سزا سناتی ہے، جس کا جرم مبہم اور سوالیہ نشان ہے، جبکہ دوسری طرف وہی امریکی عدالت انصاف ملعون امریکی پادری ٹیری جونز جس نے قرآن مجید کی بے حرمتی اور اُسے نذر آتش کرنے جیسے گھناؤنے اور سنگین جرم کا ارتکاب کیا اور دنیا بھر کے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کیا، کو مشی گن میں واقع ایک مسجد (اسلامک سینٹر آف امریکہ) کے باہر مظاہرہ کرنے کے منصوبے اور نقص امن کے خدشے کے پیش نظر صرف ایک ڈالر جرمانے کی سزا سناتی ہے۔

یہ ہے وہ امریکی عالمگیر انصاف جس کے ڈنڈورے پیٹے جاتے ہیں، دعوئے کیے جاتے

ہیں اور مثالیں دی جاتی ہیں، واہ، امریکہ واہ، دیکھ لیا تیرا انصاف.... ایک طرف کمزور اور بے گناہ پاکستانی خاتون کیلئے چھیاسی سال کی سزا.... تو دوسری طرف اپنے متعصب اور ملعون صلیبی شہری پر صرف ایک ڈالر جرمانہ..... یہ ہے امریکی حقوق انسانی کا وہ اصل روپ جس کا امریکہ علمبردار بنتا ہے، یہ ہے امریکی آزاد عدلیہ کی وہ حقیقی تصویر جس کی آزادی، بلند کرداری اور انصاف کے دنیا بھر میں دعوئے کیے جاتے ہیں، ایک مسلمان اور بے گناہ پاکستانی کی سزا 86 سال، جبکہ ایک عیسائی امریکی مجرم کی سزا صرف ایک ڈالر، سچ کہتے ہیں کہ جب رعونت اور نا قابل تسخیر طاقت ہونے کا زعم اپنی انتہا پر پہنچ جائے تو خوں آشام طاقتیں الفاظوں کے معنی و مفہوم ہی بدل دیتی ہیں اور اپنی ایجاد کردہ ڈکشنری میں امن و امان، عدل و انصاف، بلند انسانی اقدار، روشن خیالی، آزادی اظہار، دہشت گردی اور جمہوریت کو منافقت اور دوغلے پن کے لبادے میں لپیٹ کر نئے نئے مفہوم تخلیق کرتی ہیں، نائن الیون کے بعد امریکہ نے بھی ڈکشنری میں لفظوں کے معنی و مفہوم بدل دیئے ہیں، آج عدل و انصاف، روشن خیالی، آزادی اظہار اور بلند انسانی اقدار وہی ہے جسے امریکہ پسند کرتا ہے اور جو امریکی مفادات و خواہشات کے عین مطابق ہے۔

چنانچہ امریکی انصاف کی نظر میں ملعون پادری ٹیری جونز اور وین سیپ جس نے فلوریڈا کے چرچ میں قرآن پاک کے نسخے پر (نعوذ باللہ) مقدمہ چلایا، اپنے تئیں

فردجرم" عائد کرتے ہوئے (نعوذباللہ) "پھانسی" کی سزا سنائی، پھر مٹی کی تیل میں" ڈبو کر اُسے (نعوذ باللہ) نذر آتش کرتے ہوئے سزا دینے کا اعلان کیا اور جلتے ہوئے قرآن کے ساتھ تصویریں بنوائیں، کوئی جرم نہیں، نہ ہی وہ امریکی قانون کی نظر میں مجرم ہے، اسی وجہ سے امریکی ذرائع ابلاغ نے آزادی بیان اور انسانی حقوق کی حمایت کے دعوؤں کے باوجود ٹیری جونز کے اِس گھناؤنے جرم پر خاموشی اختیار کی اور اس خبر کو نشر کرنے سے گریز کیا اور امریکی سفیر کیمرون منٹر اسے انفرادی واقعہ قرار دے کر اپنی، اپنے ملک، اپنے معاشرے اور ایک سپرپاور کی عالمی ذمہ داریوں سے دست کش ہو گئے، جبکہ دوسری طرف 23 ستمبر 2010ء کو ڈاکٹر عافیہ صدیقی جیسی نحیف وکمزور پاکستانی خاتون کو امریکی عدالت نے سات مختلف مقدمات میں مجموعی طور پر 86 سال کی سزا سنائی، جو انسانی تاریخ میں کسی بھی خاتون کو طویل ترین سزا ہے، جبکہ استغاثہ جرم ثابت کرنے میں بری طرح ناکام رہا، دوران سماعت اُس نے خود اِس بات کو تسلیم کیا کہ ڈاکٹر عافیہ صدیقی نے جس رائفل سے امریکی اہلکاروں پر حملہ کیا، اُس رائفل کے چلے ہوئے کارتوسوں کے خول نہیں ملے، نہ ہی رائفل پر ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے انگلیوں کے نشانات مل سکے، استغاثہ نے یہ بھی قبول کیا کہ یہ رائفل واردات کے بعد نشانات کے معائنے کیلئے محفوظ نہیں کی گئی بلکہ افغان جنگ میں استعمال ہوئی۔

لیکن مندرجہ بالا حقائق کے باوجود امریکی عدالت انصاف نے ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو مجرم قرار دے کر دنیا میں امریکی عدل وانصاف کا بول بالا کرکے اپنا اصل چہرہ بے نقاب کردیا،ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو ایک ایسے مقدمے میں سزا سنائی گئی،جس کا کوئی وجود نہیں تھا،نہ رائفل پر انگلیوں کے نشانات تھے،نہ جائے واردات پر گولی چلنے کے آثار،نہ کوئی شہادت اور نہ ہی کوئی گواہی،مگر امریکی گواہی،شہادت اور انصاف نے ثابت کردیا کہ،وہی قاتل،وہی شاہد،وہی منصف ٹھہرے....ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو سنائی جانے والی سزا کتنی منصفانہ تھی،اس کا اندازہ اِس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ سزا سنائے جانے کے بعد عدالت میں ایک امریکی خاتون نے عدالتی فیصلے کے خلاف شیم شیم کے نعرے لگائے،مظاہرے کی قیادت کی جبکہ بہت سے امریکی دانشوروں اور عوام نے اسے ظالمانہ قرار دیا،اسی طرح ایک امریکی شہری فیصل شہزاد نیویارک میں پکڑا گیا،پاکستان کو پیغام ملا کہ اگر اُس کا منصوبہ کامیاب ہو جاتا تو اسلام آباد ہی نہیں پورے پاکستان کی اینٹ سے اینٹ بجادی جاتی،کیوں؟ صرف اِسلئے کہ فیصل شہزاد ایک آدھ بار پاکستان آیا تھا اور یہ کوئی معمولی جرم نہیں تھا۔

اصل معاملہ یہ ہے کہ ڈنمارک کا کوئی ملعون کارٹونسٹ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا قابل اعتراض خاکہ بنائے یا امریکہ کا کوئی پادری قرآن مجید کی

بے حرمتی کرے، امریکہ و یورپ کا رد عمل یہی ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں ہر شخص کو آزادی حاصل ہے اور ہم کسی کی آزادی کو محدود نہیں کر سکتے، لیکن اِس کے برخلاف کوئی مسلمان جب اپنے ملک یا کسی دوسرے ملک میں اپنی آزادی پر اصرار کرتا ہے، خواہ وہ آزادی اظہار ہو یا عقیدہ و عمل کی آزادی تو امریکہ و یورپ کی اقدار و روایات خطرے میں پڑ جاتی ہیں، پوپ کو ادیان کے درمیان تصادم کا خدشہ محسوس ہونے لگتا ہے اور اقلیتوں کے حقوق ستانے لگتے ہیں گویا مسلمان اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں نہ تو اُن کے مذہبی حقوق ہیں اور نہ وہ اپنے عقیدے اور اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے میں آزاد ہیں، کسی ایک مسلمان اور پاکستانی کا انفرادی فعل بھی اسلام، مسلمانوں اور پاکستان کا اجتماعی جرم قرار دے دیا جاتا ہے اور پھر وہ طوفان بد تمیزی برپا ہوتا ہے کہ الامان والحفیظ۔

آج ملعون ٹیری جونز کا یہ انسانیت سوز اقدام اِسلئے انفرادی فعل ہے کہ وہ امریکی شہری اور مسیحی پادری ہے، حالانکہ مذکورہ ملعون پادری نے اپنے بونے قد کو اونچا کرنے اور سستی شہرت کے حصول کے لئے لعنت کا طوق اپنے گلے میں ڈالا، اُس کا یہ عمل انسانی تاریخ کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے، ٹیری جونز آج کے گلوبل ویلج کا وحشی قابیل ہے، جس نے فساد فی الارض کا فتنہ برپا کیا، لیکن نہ تو وہ مجرم ہے اور نہ ہی وہ انتہا پسندی کی انتہائی خطرناک

طرز کا موجد اور بانی، اُس کے اِس عمل کو انتہا پسندی تصور نہیں کیا گیا، دنیائے عیسائیت کے سربراہ پوپ بینی ڈکٹ کی زبان اب تک گنگ ہے، حالانکہ ملعونہ آسیہ مسیح کے معاملے میں وہ بیخ پا تھے۔ حیرت کی بات ہے کہ نہ ہی ویٹی کن سٹی نے کوئی بیان جاری کیا اور نہ ہی شیخوپورہ کی ایک عدالت کے فیصلے پر انگاروں پر لوٹنے والے پوپ کو کسی قسم کی تشویش لاحق ہوئی، نہ تو ویٹی کن سٹی اور امریکی انتظامیہ نے اُسے ایک نفسیاتی مریض اور غیر متوازن، متعصب اور امن دشمن شخص قرار دے کر کوئی تعرض کیا اور نہ ہی اُسے پادری کے عظیم روحانی منصب سے معزول اور چرچ سے بے دخل کر کے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کی ضرورت محسوس کی، کیوں اسلئے کہ سب کے دل ملعون صلیبی ٹیری جونز کے ساتھ ہی دھڑکتے ہیں۔

بلوچستان کا آتش فشاں۔۔۔۔

بلوچستان سے فوج کی واپسی، خوش آئند مگر مسائل کا حل نہیں۔۔۔۔

محرومی، ناانصافی اور ظلم وزیادتی کے بطن سے ہمیشہ جرم، نفرت اور بغاوت کی زہر آلود کونپلیں پھوٹتی ہیں اور انتشار، لاقانونیت اور بے چینی ہی جنم لیتی ہے، جو کسی بھی ملک، قوم اور معاشرے کیلئے تباہی و بربادی کا باعث بنتی ہے، آج نفرت، بغاوت اور احساس محرومی کی آگ میں جلتا ہوا بلوچستان ایک ایسے ہی آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہے، جس سے اُگلنے والا لاوانہ صرف قومی وحدت کیلئے نقصان دہ ہے بلکہ قومی سلامتی اور ملکی استحکام کیلئے بھی مضر ہے، جبکہ اَمر واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کی بقاء استحکام اور سالمیت کیلئے ملک کی موجودہ اکائیوں کا برقرار رہنا بہت ضروری ہے، جو آج ہمارے سابقہ اور موجودہ حکمرانوں کی پالیسیوں کی وجہ سے شدید خطرات میں گھری ہوئی ہیں، مگر افسوس کہ اس نازک صورتحال میں بھی ارباب اقتدار کا طرز عمل یہ ہے کہ وہ اِسے زبان، رنگ و نسل اور علاقہ کے نام پر مزید بڑھاوا دے رہے ہیں، بھانت بھانت کے راگ الاپ رہے ہیں اور اصل مسائل کے حل کی طرف توجہ دینے کے بجائے جغرافیائی اور لسانی تقسیم کی باتیں کر رہے ہیں، المیہ یہ ہے کہ وہ پاکستان جو ایک

قومی وحدت اور اسلامی نظریئے کی بنیاد پر معرض وجود میں آیا تھا،اُسے حکمرانوں کی غلط پالیسیوں اور معاشی بے انصافیوں نے چھوٹے چھوٹے ٹکروں میں تقسیم کرکے ایک دوسرے کے مد مقابل کھڑا کردیا ہے،ایک طرف مجبور،بے بس اور لاچار لوگ ہیں،تو دوسری طرف بالادست،بااختیار اور تمام وسائل کے مالک ارباب اقتدار،یہی وہ معاشرتی ناہمواری ہے جس نے وفاق اور صوبوں کے درمیان فاصلہ بڑھا دیا ہے،آج رقبے کے لحاظ سے ملک کا سب سے بڑا اور قدرتی و معدنی دولت سے مال صوبہ بلوچستان اِسی آگ میں جل رہا ہے اور خانہ جنگی کے باعث وہ ایک بار پھر اُس مقام پر کھڑا ہے جہاں ایک چنگاری زبردست دھماکے کا سبب بن سکتی ہے ۔

آج بلوچستان کے حالات اسقدر تشویشناک ہیں کہ ہر محب وطن شہری فکر مند ہے،روم جل رہا ہے مگر ہمارے حکمران چین کی بانسری بجارہے اور بندوق کی نوک پر مسائل کے حل کی اُسی پالیسی پر عمل پیرا ہیں جس نے سابقہ فوجی آمر کے دور میں بگاڑ کی بنیاد رکھی،غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کو جنم دیا اور قومی یکجہتی کو پارہ پارہ کیا،ہماری اسی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر بھارت نے اپنی خفیہ ایجنسی "را" کے ذریعے بلوچستان کے انتہا پسند عناصر کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کی اور انہیں علیحدگی کی تحریک کی جانب راغب کیا،اگر مشرف دور میں فوجی آپریشن کے دوران بزرگ بلوچ رہنما نواب اکبر بگٹی کی ہلاکت کا

سانحہ رونما نہ ہوتا تو ملک کی سالمیت کو نقصان پہنچانے کیلئے موقع کی تاک میں بیٹھے عناصر کو اپنی مذموم کاروائیوں کیلئے موقعہ نہ ملتا اور آج یہ حالات نہ ہوتے، بدقسمتی سے اس سانحہ نے نفرت و منافرت کی گرہیں اتنی پیچیدہ کردی کہ اب کھولے نہیں کھل رہی،اِس تناظر میں بلوچستان کے حالات کے پیش نظر آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی کی تشویش نظرانداز نہیں کی جاسکتی، بالخصوص قومی یکجہتی کی خاطر بلوچستان میں اعتماد کی فضا کی بحالی، محرومیوں کا ازالہ اور اُس کے حقوق کی سیاست کرنے والے قوم پرست لیڈروں کو قومی دھارے میں لانا بہت ضروری ہوگیا ہے، جس کیلئے ہمیں لسانی اور علاقائی عصبیت کے دائرے سے باہر نکل کر خود کو ایک قوم ایک ملت کی شکل میں ڈھالنا ہوگا،ترجیحی بنیادوں پر بلوچستان کے مسائل کے حل کیلئے عملی پیش رفت کرنا ہوگی اور فوجی حکمرانی کے دور میں بلوچستان کے عوام اور قوم پرست لیڈروں کے دلوں میں پیدا ہونیوالی غلط فہمیوں کو دور کرنا ہوگا ہے۔

اِس حوالے سے گزشتہ دنوں آرمی چیف نے آئندہ بلوچستان میں افواج پاکستان کو کسی آپریشن میں شریک نہ کرنے کا اعلان اور پانچ ہزار بلوچ نوجوانوں کو پاک فوج میں شامل ہونے کی دعوت دیکر فوجی حکمرانی کے دوران بلوچ قوم میں افواج پاکستان کے بارے میں پیدا ہونیوالی غلط فہمیاں دور کرنے کی مثبت کوشش کی ہے،اُمید ہے کہ اِس کے دوررس نتائج برآمد ہونگے،تاہم افواج پاکستان کو

اندرونی خطرات کی نوبت لانے والے بیرونی محرکات کا بھی سدباب کرنا چاہیے جو دفاع وطن کا بنیادی تقاضہ ہے۔ اگر قومی یکجہتی کی خاطر بلوچستان میں افواج پاکستان کو عوام کیخلاف آپریشن سے دور کرنا ضروری ہے تو اسی جذبے کے تحت قبائلی علاقوں میں جاری آپریشن سے افواج پاکستان کو باہر نکال لیا جانا بھی لازمی ہے کیونکہ یہ آپریشن بھی ردعمل میں خودکش حملوں کا باعث بن کر قومی اتحاد و یکجہتی اور افواج پاکستان کے ساتھ عوام کے اعتماد و بھروسے کے رشتے کو کمزور کر رہا ہے۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ بلوچستان سے فوج کی واپسی ایک مستحسن فیصلہ ہے مگر یہ بلوچستان کے مسائل کا پائیدار اور مستقل حل نہیں ہے۔ گو کہ پاکستان آرمی نے بلوچستان کے احساس محرومی کو کم کرنے کے لئے جہاں اور بہت سے منصوبوں پر کام جاری رکھا ہوا ہے وہیں آرمی چیف کی طرف سے کوئٹہ میں آرمی میڈیکل کالج کے قیام کا فیصلہ بھی انتہائی مفید اور سود مند ہے۔ اِس فیصلے سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان آرمی کو بلوچستان بھی اتنا ہی عزیز ہے جتنا کوئی اور صوبہ اور یہ کسی ایک صوبے کی نہیں بلکہ پورے پاکستان کی فوج ہے۔

بلاشبہ بلوچستان ایک حساس صوبہ ہے، یہاں ایک زمانے سے ایسے عناصر موجود ہیں جو اسلام آباد اور پنجاب کے بارے میں منفی تاثر پھیلا کر بلوچ نوجوانوں کو اکساتے رہے ہیں کہ وہ ہتھیار اٹھا کر اپنے حقوق حاصل کریں، خصوصاً پچھلے دس

سالوں میں سرحد پار سے ملنے والی امداد کی وجہ سے ایسے عناصر کی سرگرمیوں میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔اَمر واقعہ یہ ہے کہ اس طرح کے عناصر کی بیخ کنی میں پاک فوج نے اہم کردار ادا کیا ہے اور سرکردہ بلوچ سرداروں کو قومی دھارے میں لا کر یہ ثابت کیا ہے کہ وہ لوگ بلوچستان کی قسمت کی مالک نہیں ہیں جو علیحدگی کی باتیں کرتے ہیں بلکہ اکثریت اُن سرداروں اور محب وطن لوگوں کی ہے جو پاکستان سے محبت کرتے ہیں اور علیحدگی پسندوں کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ سمجھے جاتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ وطن عزیز کواِس وقت بدترین اندرونی و بیرونی خطرات کا سامنا ہے جس سے عہدا برآں ہونے کے لئے قومی سطح پر اتحاد و یکجہتی کی شدید ضرورت ہے تاکہ دشمن کو ہماری کسی اندرونی کمزوری سے مزید فائدہ اٹھانے کا موقع نہ مل سکے، کیونکہ بھارت تو تشکیل پاکستان کے وقت سے ہی ہماری آزادی و خودمختاری اور سالمیت کے درپے ہے اور وہ ہمیں نقصان پہنچانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، جبکہ کروسیڈی عزائم رکھنے والی ہنود اور یہود و نصاریٰ پر مبنی عالمی طاغوتی قوتیں بھی پاکستان کو ایک ایٹمی قوت ہونے کے ناطے اپنے مذموم و مکروہ عزائم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتی ہیں،اِس شیطانی اتحادِثلاثہ کا اوّلین مقصد پاکستان کی وحدت کو پارہ پارہ کرنا ہے، چنانچہ ملک کی سالمیت کے خلاف دشمن کی گھناؤنی سازشوں سے نبرد آزما ہونے کیلئے ٹھوس، جامع اور با مقصد حکمت عملی وضع کرنے کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں حکومتی، سیاسی اور عسکری قیادتوں کو باہم سر جوڑ کر بیٹھنا ہوگا اور بلوچستان کے مستقبل کے حوالے سے باہمی افہام و تفہیم کے ذریعے متفقہ لائحہ عمل تلاش کرنا ہوگا، کیونکہ حالات کا تقاضہ یہ مطالبہ کررہا ہے کہ بلوچستان کے حوالے سے مزید چشم پوشی اختیار کرنے کے بجائے،اُس کے زخموں پر مرہم رکھا جائے،اُسے امداد نہیں جائز حق دیا جائے،اُسے مسائل نہیں وسائل فراہم کئے جائیں اور محض زبانی دعوؤں اور وعدوں کے بجائے عملی اقدامات کی طرف توجہ دی جائے،ہمارا ماننا ہے کہ اہل بلوچستان اسلام پسند اور محب وطن پاکستانی ہیں اور وہ بھی پاکستان سے اُتنی ہی محبت کرتے ہیں، جتنی کہ ہم اور آپ کرتے ہیں،آج اگر وہ ناراض ہیں تو حکمرانوں کے طرز عمل سے ناراض ہیں،پاکستان سے ناراض نہیں،اُن کے دل محبت،اخوت اور جذبہ ایثار سے ہی جیتے جاسکتے ہیں، صرف ایک یہی راستہ ایسا ہے جسے اپناکر بلوچستان سے بدامنی، نفرت اور بغاوت کی آگ کو ٹھنڈا کیا جاسکتا ہے،حکومتی اور سیاسی قائدین نے اگر اب بھی بلوچستان کے مسئلے پر فوری توجہ نہ دی تو یہ صوبہ بارود کے ڈھیر میں تبدیل ہوجائے گا اور پھر شاید کوئی دوا، کوئی مرہم اور کوئی پھایا اُس کے زخموں کو مندمل نہ کرسکے گا،لہٰذا ہماری ارباب اقتدار اور تمام سیاسی قائدین سے گزارش ہے کہ وہ ناراض بلوچوں کو منانے اور انہیں قومی دھارے میں لانے کیلئے عملی اقدامات کی طرف توجہ دیں،یاد رکھیں کہ صرف

محبت، ایثار، ہمدردی اور جذبہ حب الوطنی ہی بلوچستان کو بچا سکتا ہے اور قومی وحدت کو قائم رکھ سکتا ہے۔

اسامہ کی شہادت اور قومی سلامتی پر جنم لینے والے سوالات

پاکستان،امریکی چنگیزی لشکر کی اصل منزل۔۔۔۔
پاکستان امریکہ اصل ہدف اور مستقل پڑاؤ۔۔۔۔

قارئین محترم آپ کو یاد ہوگا کہ کچھ عرصہ قبل ہم اپنے ایک مضمون "نائین الیون بہانہ،افغانستان ٹھکانہ اور پاکستان نشانہ "میں اِس اَمر کی نشاندہی کر چکے ہیں کہ امریکہ کا اصل ہدف اور نشانہ پاکستان ہے،اسی طرح ہم اپنے پچھلے مضمون "لیبیا نیا صلیبی میدان جنگ"میں واضح کرچکے ہیں کہ " افغانستان اور عراق اکیسویں صدی کے امریکی چنگیزی لشکر کے ابتدائی پڑاؤ تھے،لیبیا بھی منزل نہیں،اصل منزل کچھ اور ہے، لیکن ایک بات طے ہے کہ اکیسویں صدی کے اِس خونی عفریت نے ابھی بہت سی شہہ رگوں کا خون پینا ہے اور بہت سی مسلم مملکتوں کو تباہ و برباد کرنا ہے۔"آج پاکستان کے علاقے ایبٹ آباد میں امریکہ کے ہائی ویلیو ٹارگیٹ اسامہ بن لادن کی شہادت کے بعد امریکہ چنگیزی لشکر کی اصل منزل نکھر کر سامنے آچکی ہے اور پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے ظاہر کیے گئے تمام خدشات حقیقت کا روپ دھار چکے ہیں۔

اب اِس بات میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہا کہ امریکہ کا اصل ہدف، نشانہ، منزل اور مستقل پڑاؤ پاکستان ہے، گزشتہ دنوں وہائٹ ہاؤس کی جنگی ٹیم میں سی آئی اے کے سربراہ جنرل ڈیوڈ پیٹریاس، سیکرٹری دفاع کے عہدے پر سی آئی کے سابق ڈائریکٹر لیون پیناٹا اور ریان سی کروکر کی افغانستان میں نئے امریکی سفیر کی حیثیت سے تعیناتی اِس حقیقت کو مزید منکشف کرنے کیلئے کافی ہے، یہ تبدیلیاں ظاہر کرتی ہے کہ امریکی حکمت عملی یہی ہے کہ امریکہ افغانستان جنگ کو پاکستان منتقل کرنے اور پاکستان کا نیا امریکی میدان جنگ بنانے کی تیاری کرچکا ہے۔

خود اِس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے امریکی حکومت کے ترجمان اخبار واشنگٹن پوسٹ لکھتا ہے کہ " جنرل ڈیوڈ پیٹریاس سی آئی اے کے سربراہ بن گئے تو نائن الیون کے بعد دو جنگیں لڑنے والا یہ جنرل اپنی تیسری جنگ پاکستان میں لڑے گا اور خطے میں سی آئی اے کو زیادہ سے زیادہ مسلح کرنا پیٹریاس کی اولین ترجیح ہوگی۔"امریکی اخبار نیویارک ٹائمز بھی کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ " پیٹریاس اپنی تیسری جنگ پاکستان میں لڑیں گے اور پیٹریاس براہ راست ڈرون آپریشنز کو کنٹرول کریں گے۔" خیال رہے کہ جنرل پیٹریاس ڈرون حملوں کے بڑے حامی ہیں اور ان حملوں میں تیزی کی بڑی وجہ بھی

جنرل پیٹریاس ہی ہیں، دونوں امریکی اخبار یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ پیٹریاس کی بطور
سی آئی اے نامزدگی سے پاکستان میں اُن کے ہم منصب خوش نہیں ہیں اور پاکستان کے
آرمی چیف جنرل پیٹریاس کو سیاسی جرنیل کہتے ہیں، خیال رہے کہ یہ وہی جنرل
پیٹریاس ہیں جو آئی ایس آئی پر کئی بار سنگین الزامات لگا چکے ہیں اور جنھیں امریکی صدر
بارک اوباما امریکی قوم کا نمایاں "اسٹراٹیجک مفکر" قرار دیتے ہیں۔

اسی طرح لیون پیناٹا کے نئے وزیر دفاع نامزد ہونے کے بعد امریکی محکمہ خارجہ نے اپنی
ایک رپورٹ اِس الزام کا پھر اعادہ کیا ہے کہ افغان طالبان کو پاکستان میں محفوظ
ٹھکانوں سے جو مدد مل رہی ہے وہ اتحادی افواج کی کاروائیوں کیلئے نقصان دہ ثابت
ہو رہی ہے، چنانچہ اِس تناظر میں ہمارے ارباب اقتدار کو اِس قسم کی کسی غلط فہمی میں
نہیں رہنا چاہیے کہ جنرل پیٹریاس اور لیون پیناٹا کی نامزدگی معمول کی بات ہے، کیونکہ
جن حالات میں پیٹریاس اور لیون پیناٹا کو نامزد کیا گیا ہے وہ سب کے سامنے ہیں، اگر
امریکہ کی نیت دونوں ممالک میں بڑھتی ہوئی سرد مہری کو ختم کرنا اور پاک امریکہ
تعلقات میں بہتری لانا ہوتی تو سی آئی اے کا سربراہ کسی ایسی شخصیت کو نہ بنایا جاتا جو نہ
صرف ڈرون حملوں کا زبردست حامی ہے بلکہ پاکستان کے بارے میں بھی اچھے خیالات
نہیں رکھتا، لہٰذا جنرل پیٹریاس، لیون پیناٹا اور ریان سی کروکر کی

تعیناتی پاکستان کے حوالے سے نئی امریکی پالیسی کی عکاس اور اُس کے مذموم عزائم کا واضح اظہار ہے۔

چنانچہ اِن حالات میں اسامہ بن لادن کی پاکستان میں موجودگی اور ہلاکت جہاں پاکستان کے حوالے سے امریکی عزائم کیلئے آسانیاں فراہم کرتی ہے، وہیں اِس واقعہ نے پاکستان دشمن بھارت اور افغانستان کے کٹھ پتلی صدر حامد کرزئی کے اِس واویلے کو بھی تقویت دیتی کہ پاکستان دہشت گرد گروپوں کی آماجگاہ اور جنت ہے۔ایبٹ آباد کے نیم فوجی علاقے میں پیش آنے والے اِس واقعہ نے پاکستان کی سلامتی کے حوالے سے بھی بہت سے اہم سوالات کو جنم دیا ہے، عوام حیران و ششدر ہیں کہ امریکی فوجی آپریشن پاکستان کی فوج،ایجنسیوں اور حکومت کی لاعلمی اور رضا مندی کے بغیر کیسے ممکن ہو ا،کیسے امریکی فوجی ہیلی کاپٹر وں اِس حساس علاقے میں داخل ہوئے جہاں سے کاکول کی فوجی اکیڈمی بمشکل ڈیڑھ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے اور جہاں کئی فوجی تنصیبات سمیت فرنٹیر فورس رجمنٹ کا صدر دفتر بھی واقع ہے، کیوں ایبٹ آباد جیسے نیم فوجی علاقے میں امریکی فوجی ہیلی کاپٹر وں کی پرواز کا نوٹس نہیں لیا گیا؟حیرت کی بات ہے کہ ایک ایسے علاقے میں اسامہ بن لادن کئی سال سے ایک بڑے کمپاؤنڈ میں مقیم تھا اور پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی،ابتدائی اطلاعات یہ بھی ظاہر کر رہی ہیں کہ اسامہ بن لادن اور اُن کے ساتھیوں کے خلاف آپریشن سو

فیصد امریکی میرینز نے کیا، جس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ امریکی فوج جب چاہیں، جہاں چاہیں پاکستان کے کسی بھی علاقے میں داخل ہو سکتے ہیں اور باآسانی اپنے ٹارگیٹ کو نشانہ بنا کر واپس جا سکتے ہیں۔

محب وطن حلقے یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ کیا امریکی انتظامیہ اور فوج نے اِس آپریشن کے حوالے پاکستان میں کسی کو اعتماد میں لیا تھا اور اگر نہیں تو پاکستان کی فوج، آئی ایس آئی، سول انتظامیہ کیا کر رہی تھی، اگر کل کو ایسا ہی آپریشن ہماری ایٹمی تنصیبات کے خلاف کیا جاتا ہے تو پاکستان کے دفاعی ذمہ داران کیا حکمت عملی اختیار کریں گے، کیا وزیراعظم صاحب یہ کہیں گے کہ اُن کے پاس معلومات نہیں تھیں، دفتر خارجہ کی ترجمان فرمائیں گی کہ آپریشن میں پاکستان کا کوئی کردار نہیں تھا جبکہ فوج کے تعلقات عامہ کا ادارہ آئی ایس پی آر کسی وضاحت سے گریزاں نظر آئے گا، کیا یہ سب لاعلمی افسوسناک اور شرمناک نہیں ہے، کیا یہ تمام سول انتظامیہ، دفاعی اداروں اور سیکورٹی ایجنسیوں کی مجرمانہ غفلت کی نشان دہی نہیں کرتی اور کیا اُسامہ کی پاکستان میں موجودگی وہلاکت حکومت اور اُن تمام انٹیلی جنس کے اداروں کے کارکردگی پر سوالیہ نشان نہیں کھڑے کرتی جو یہ کہتے تھے نہیں تھکتے تھے کہ اُسامہ بن لادن پاکستان میں نہیں ہیں، کیا اب پاکستان کی اِس بات پر کوئی اعتبار کرے گا کہ القاعدہ یا افغان طالبان شوریٰ کی قیادت پاکستان میں موجود نہیں ہے۔

شاید قوم کو اِن سوالوں کے جواب کبھی نہ مل پائیں مگر پاکستان کی سلامتی کے حوالے سے جنم لینے والے یہ تمام سوالات آنے والے طوفان بلاخیز کی خبر دے رہے ہیں، اب جبکہ سی آئی اے کے نئے سربراہ کے حوالے سے یہ بات بھی سامنے آچکی ہے کہ وہ پاکستان میں اپنی تیسری جنگ لڑیں گے دوسری طرف امریکی صدر بھی واضح طور پر کہہ چکے ہیں کہ امریکہ سب کچھ کرسکتا ہے، یہ منظر نامہ امریکی خودسری اور من مانی کی لامتناہی حدوں کو ظاہر کررہا ہے، جس کا تعین کون کرے گا، قدموں کے نیچے سے زمین سرک رہی ہے، وقت ہاتھوں سے نکلا جارہا ہے، ارباب اقتدار کے خطرناک فیصلوں نے ملک اور قوم کو تباہی کے دھانے پر پہنچادیا ہے، لازمی ہوگیا ہے کہ امریکی مفادات کی جنگ میں پاکستان کے کردار اور 10 سالوں پر محیط یک طرفہ تعلقات کے رومانس پر نظر ثانی کی جائے، خوشی اور مبارکبادوں کے ڈونگرے برسانے کے بجائے اپنی بقاء کی فکر کی جائے اور اپنی صفیں درست کی جائیں، کیونکہ اب یہ جنگ ہماری سلامتی کی بجائے ہماری تباہی و بربادی کی جنگ بن گئی ہے۔

جس امریکہ کے خاطر ہماری مسلح افواج نے بے پناہ قربانیاں دیں اور ملک و قوم کا ناقابل تلافی نقصان ہوا، آج اسی " اکیسویں صدی کے ابراہہ " امریکہ کا صلیبی لشکر نہ صرف ہماری تباہی کے نئے نئے منصوبے بنا رہا ہے بلکہ پاکستان پر

حملہ آور ہونے کی تیاری بھی کر رہا ہے۔آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جنرل (ر) حمید گل اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ چکے ہیں کہ اسامہ بن لادن کی ہلاکت کا پاکستانی علاقے میں دعویٰ پاکستان کے لئے نیک شگون نہیں۔اب امریکہ پاکستان کو غیر مستحکم کرنے اور ایٹمی اثاثہ جات چھیننے کی کوششیں تیز کردے گا اور موجودہ صورت حال میں پاکستان کیلئے آئندہ آنے والے دن زیادہ مشکل ہوں گے، چنانچہ پاکستان کو بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

ہمارا ماننا ہے کہ وہ بھارتی وزیر داخلہ چدم برم کے شرانگیز بیانات ہوں یا کابل کے میئر حامد کرزئی کی ہرزہ سرائی یا پھر پاکستانی سرزمین پر اُسامہ بن لادن کا ڈرامہ، سب ایک ہی سلسلے کی ایک کڑیاں ہیں، جس کا مقصد امریکہ کے تیار کردہ خاکے میں رنگ بھر کے پاکستان کے گرد گھیرا تنگ کرنا اور پاکستان میں صلیبی میدان جنگ سجانا ہے،اَمر واقعہ یہ ہے کہ امریکہ ایک منظم منصوبہ بندی کے تحت پاکستان کے قدرتی وسائل، جغرافیائی حدود اور ایٹمی اثاثوں کی جانب بڑھ رہا ہے، افغانستان اور عراق میں ذلت آمیز پسپائی اور شدید جانی و مالی نقصان کے باوجود امریکی انتظامیہ کی نظریں پاکستان پر مرکوز ہیں،اسی وجہ سے امریکہ اپنی آخری بقاء کی جنگ پاکستان میں لڑنا چاہتا ہے اور اپنے مفادات کی قربان گاہ پر پاکستان کی آزادی، خودمختاری، سلامتی اور استحکام کو قربان کرنا چاہتا ہے، لہٰذا امریکی امداد اور قرض کے چند حقیر ٹکڑوں کے عوض

اپنی قومی خودمختاری، عزت وو قار اور آزادی کو گروی رکھنے کے بجائے اپنی بقاء اور
سلامتی کی فکر کیجئے کہ خاکم بدہن، تیری بربادیوں کے تذکرے ہیں آسمانوں میں ۔۔۔۔
۔

ڈاکٹر فضل الرحمن انصاری عالم اسلام کا ایک عظیم اسکالر

دامن رحمت میں جاکر سو گئے۔۔۔۔۔

چودہ اگست 1914ء میں محمد خلیل انصاری کے گھر پیدا ہونے والے علامہ مولانا ڈاکٹر فضل الرحمن انصاری کا سلسلہ نسب میزبان رسول سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، مولانا فضل الرحمن انصاری دنیائے اسلام کے مایہ ناز مبلغ اور بین الاقوامی شخصیت تھے،انھوں نے اپنی ساٹھ سالہ زندگی کا بیشتر حصہ تبلیغ اسلام میں صرف کیا اور پاکستان کے علاوہ افریقہ، امریکہ، ایشیاء اور یورپ کے مختلف ممالک میں تبلیغ اسلام کے سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دیں، جسے دنیائے اسلام میں قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، مولانا نے نوعمری میں قرآن پاک حفظ اور درس نظامی پر عبور حاصل کیا،آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے امتیازات ساتھ مختلف ڈگریاں حاصل کیں، جن میں علوم دینیہ میں بی،ٹی،ایچ (فاضل)،بی،ایس،سی اور فلسفہ جدید میں ایم اے کی ڈگری شامل ہے، فلسفے کے مضمون میں 98 فیصد نمبر حاصل کرکے آپ نے برصغیر میں ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔

دوران تعلیم اپنی قلبی واردات کے حوالے آپ خود تحریر فرماتے ہیں کہ "جامعہ علی گڑھ سے سائنس فیکلٹی سے انٹر پاس کرنے کے بعد اسلامی عقائد کے بارے میں عجیب و غریب شکوک و شبہات دل میں پیدا ہونے لگے تھے بلکہ ایک وقت تو دماغ انکار پر مائل ہوگیا تھا، لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا، عالم اسلام کے عظیم ترین مبلغ مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی سے ملاقات ہوئی اور اُن کی نگاہ کیمیا اثر نے دل و دماغ کی کایا پلٹ دی اور فکر و نظر کا دھارا صحیح سمت میں موڑا، جو دل انکار پر مائل تھا دین فطرت کی محبت اور عظمتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا گہوارہ بن گیا۔"

پروفیسر محمود حسین صدیقی لکھتے ہیں کہ "مولانا (شاہ عبدالعلیم صدیقی) کی ذات وہ مرکز تھی جہاں عشق و عقل آکر ملتے ہیں، سیاح عالم مولانا حافظ شاہ عبدالعلیم صدیقی کی چشم کرم نے فضل الرحمٰن صاحب کے قلب و دماغ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے نور سے منور کیا۔" جس کے بعد مولانا فضل الرحمٰن انصاری صاحب کے خیالات بدل گئے، وضع قطع میں بھی تبدیلی آگئی، مولانا نے فیکلٹی آف تھیوری میں داخلہ لے لیا، فلسفے میں مولانا ظفرالحسن اور دینیات میں خلیفہ اعلیٰ حضرت مولانا سیّد سلیمان اشرف کے ایسے شاگرد بنے کہ اساتذہ بھی آپ کر فخر کرنے لگے۔

آپ نے کراچی یونیورسٹی سے فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی،اپنے پیرومرشد مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی کے ساتھ دنیا بھر کے تبلیغی دورے کئے اور 22 سال آپ کی رفاقت میں گزارے،علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی نے آپ کو اپنی فرزندی کا شرف بھی بخشا،آپ مولانا کی سب سے بڑی صاحبزادی اَمۃ السبوح کے شوہر اور قائد ملتِ اسلامیہ حضرت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کے بہنوئی تھے، مولانا فضل الرحمٰن انصاری نے تحریک پاکستان میں بھی فعال کردارادا کیا،آپ بابائے قوم قائدا عظم محمد علی جناح کی قائم کردہ کل ہند مسلم لیگ ایجوکیشن کمیٹی کے رکن بھی رہے۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری کا شمار عصر حاضر کے عظیم اسلامی مفکروں اور فلسفیوں میں ہوتا ہے،آپ قدیم وجدید علوم و فنون کے ماہر اور کئی بین الاقوامی زبانوں پر عبور رکھتے تھے،آپ بلند پایہ انشاء پرداز اور شعلہ بیاں مقرر بھی تھے،آپ نے اپنی ساری زندگی خدمت اسلام میں بسر کی،آپ کو تحریر و تقریر دونوں میں یکساں کمال حاصل تھا،آپ نے اپنی سب سے پہلی کتاب The Beacon Light اٹھارہ سال کی عمر میں لکھی،جو ہانگ کانگ کے ایک پادری کے اسلام پر جھوٹے اعتراضات کا جواب تھی۔

آپ 25 کے قریب معرکۃ الآراء انگریزی کتابوں کے مصنف بھی ہیں،آپ کی دو جلدوں

پر مشتمل کتاب

کے بارے میں ممتاز " The Quranic Foundation and Structure "

قانون دان اے۔کے۔بروہی کہتے ہیں کہ "علامہ اقبال کے انگریزی خطبات " تشکیل جدید

الٰہیات "کے بعد اگر کوئی دوسری کتاب میری نظر میں آتی ہے تو وہ یہ ہے۔ڈاکٹر اشتیاق

حسین قریشی کہتے ہیں "مذہب اسلام کو سمجھنے کیلئے اب تک جو بہترین کوششیں کی گئی

ہیں، یہ اُن میں سے ایک ہے۔" مولانا کئی رسالوں کے مدیر بھی رہے۔

آپ نے تقسیم ہند سے قبل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور قیام پاکستان کے بعد سینٹ

پیٹرک کالج، سینٹ جوزف کالج، کالج آف ہوم اکنامکس اور کراچی یونیورسٹی میں لیکچرار

کی خدمات بھی انجام دیں، آپ کا سب سے بڑا کارنامہ 1958ء میں شمالی ناظم آباد میں

المرکز العالم الاسلامی (ورلڈ فیڈریشن آف اسلامک مشن) کا قیام ہے، جہاں سے فارغ

التحصیل ہونے والے طلباء دنیا بھر میں دین اسلام کی خدمت کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ عصر حاضر میں اُمت مسلمہ کیلئے مولانا نے فقید المثال خدمات انجام

دیں، یکم اپریل 1944ء کی اشاعت میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اخبار "مسلم یونیورسٹی

گزٹ" آپ کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتا

ہے" وہ ایک بے لوث ہمہ تن مصروف کار رہے اور اسلام کی سربلندی کیلئے ولولہ اور استقامت کے ساتھ علمی جہاد کرتے رہے جو اُن کے مومن صادق اور بلند پایہ مجاہد ہونے پر دلیل ہے، وہ عمل پیہم پر یقین رکھتے ہیں اور اسلام کی عملی خدمت میں انہوں نے کبھی دریغ نہیں کیا، لیکن اُن کا امتیاز اسی پر ختم نہیں ہوجاتا بلکہ وہ ایسے امتیازات کے حامل ہیں، جس میں اُن کی ہستی یکتا ہے اور ہمارے نوجوانوں کیلئے مشعل ہدایت ہے۔"

تین جون 1974ء کو عالم اسلام اِس عظیم مبلغ، تبحر عالم دین، محقق، مفکر اور فلسفی سے محروم ہوگیا، آپ کی آخری آرام گاہ آپ کی قائم کردہ درسگاہ المرکز اسلامی کراچی کے احاطے میں موجود ہے، جناب آرزو اکبرآبادی آپ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

دامنِ رحمت میں جاکر سوگئے
عبدِ حق فضلِ رحمان آرزو

ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم

ایٹم بم اور غوری میزائل رکھنے والے غلام۔۔۔۔

پوری قوم انگاروں پر لوٹ رہی ہے، ملک پر ایک قیامت گزر چکی ہے، لیکن بیانات اور تاویلات کی حاشیہ آرائیوں کے ساتھ اداروں اور افراد کے درمیان الزام تراشیوں کا سلسلہ جاری ہے، کوتاہی کس کی ہے اور غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کس نے کیا، کوئی اپنی غلطی تسلیم کرنے اور سچ بتانے کو تیار نہیں،آخر کسی کو تو یہ ذمہ داری قبول کرنی چاہئے، سچ بول کر قوم کو اصل حقائق سے آگاہ کرنا چاہئے،یقین جانیئے اگر یہ واقعہ کسی اور ملک میں پیش آتا تو حکومتیں مستعفی ہو جاتی ہیں،بڑے بڑے سول عہدیداروں کو انکوائری کمیشن کے سامنے پیش ہونا پڑ جاتا، فوجی عہدیداروں کا کورٹ مارشل ہو جاتا،اُن سے باز پُرس کی جاتی ہے، لیکن ہمارے یہاں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا، وطن عزیز کے محب وطن شہری چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ ہمیں 1971ء جیسے شرمناک واقعے سے ایک مرتبہ پھر دوچار ہونا پڑا ہے، لیکن حکمران اور متعلقہ ادارے صمم بکمم کی تصویر بنے بیٹھے ہیں اور متضاد بیانات جاری کر رہے ہیں، کوئی کھل کر سامنے آنے کو تیار نہیں۔

حال یہ ہے کہ صدر مملکت جو اپنے حکومتی اتحاد میں پڑنے والی چھوٹی سے چھوٹی دراڑ کو بھی دور کرنے کے لئے ملک کے کونے کونے میں پہنچ کر اجلاس طلب کرنے میں تاخیر نہیں کرتے، مگر صد افسوس کہ انہوں نے قومی سلامتی اور ملکی آزادی و خود مختاری کو پہنچنے والے اِس دھچکے پر ایک لفظ تک زبان پر لانا مناسب نہ سمجھا بلکہ پاکستان کی حاکمیت اعلیٰ کی سرعام بربادی پر غیر ملکی فوجی یلغار کے فوراً بعد واشنگٹن پوسٹ میں مضمون لکھ کر امریکہ بہادر کو مبارک باد دی، جبکہ وزیر اعظم صاحب اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ فرانس کے دورے پر روانہ ہو جاتے ہیں اور وہاں فرماتے ہیں اگر ہماری انٹیلی جنس ناکام ہوئی تو پوری دنیا کو بھی ذمہ داری قبول کرنی چاہیے،اِس واقعہ کی جملہ سنگین تفصیلات سامنے آنے کے بعد بھی انہوں نے اپنے دورے کو مختصر کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ وطن واپس آتے ہی سیاہ امریکی کارنامے کو "فتح عظیم" قرار دے ڈالا، فوج کے سربراہ کور کمانڈرز کے اجلاس میں ارشاد فرماتے ہیں کہ آئندہ ایسا واقعہ نہیں ہونا
چاہیے، لیکن اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیتا کہ 2 مئی کو امریکی اسپیشل فورسز نے تمام بین الاقوامی سفارتی آداب کی دھجیاں اڑا کر اپنے ہی ایک کلیدی اتحادی کی آزادی و خودمختاری کو کیوں روند ڈالا، کیوں دنیا کی نظروں میں پاکستان کی بے توقیری کی اور کیوں ذلت و رسوائی کے ساتھ بے غیرتی اور بے حمیتی ہمارا مقدر بنا دی گئی، کہاں گیا وہ ہمارا ناقابل

تسخیر دفاع، کہاں گئی وہ ہماری آزادی و خود مختاری کے دعوے اور کہاں گئے وہ ہمارے داخلی اور خارجی سلامتی کے بلند و بانگ بیانات، عجیب معمہ ہے کہ گھتیاں سلجائے نہیں سلجھ رہی ہیں۔

حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے اتحادی ہونے کے دعویدار نے ہم پر حملہ کیا،شب خون مارا اور صرف 40 منٹوں کی کاروائی کے بعد اپنے ہدف کو نشانہ بنا کر با حفاظت واپس بھی چلا گیا اور ہمارا پورے کا پورا دفاعی نظام ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بنا رہا،شاید برطانوی اخبار"گارجین "درست لکھتا ہے کہ یہ آپریشن دس سال پہلے اُس معاہدے میں دی گئی اجازت کے تحت کیا گیا جو سابق صدر و آرمی چیف پرویز مشرف اور سابق امریکی صدر بش نے 2001ء میں کیا تھا،جس کی توثیق 2008ء میں بھی کی گئی،اِس معاہدے کی رو سے امریکی فوج کو پاکستان میں آنے،آپریشن کرنے اور اسامہ بن لادن کی موت کیلئے ہر قسم کی کاروائی کرنے کی اجازت دی گئی تھی اور طے ہوا تھا کہ پاکستان امریکی کاروائی پر کسی قسم کی مزاحمت نہیں کرے گا،بلکہ اسامہ بن لادن کی موت پر صرف شدید احتجاج کرے گا،کیا آج ہماری جانب سے صرف تنبیہ اور آئندہ باز رہنے کے بیانات گارجین کی رپورٹ کو سچ ثابت کرنے کیلئے کافی نہیں،اصل بنیادی اور انتہائی تلخ حقیقت یہی ہے کہ سچ چھپایا جارہا ہے اور جھوٹ بولا جارہا ہے، جھوٹ فریب اور مکر و دجل کا یہ سلسلہ دس برسوں سے جاری ہے،نہ سول حکومت کچھ بتارہی ہے

نہ فوج اِس راز سے پردہ اٹھا رہی ہے کہ ہماری سلامتی کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے والی نام نہاد دہشت گردی کی بے ننگ و نام جنگ آخر کب تک ہمیں دشت بے اماں کی نذر کرتی رہے گی، کب تک ہماری تباہی و بربادی کا نوحہ صفحہ وقت پر لکھا جاتا رہے گا اور کب تک ذلت و رسوائی ہمارا مقدر بنی رہے گی۔

آج ایک ہفتے سے زائد ہو چلا ہے، لیکن ابھی تک پاکستانی قوم سمیت ساری دنیا کے سامنے تصویر کا وہی رخ ہے جسے امریکہ بہادر نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، اِس کہانی کو جھٹلانے والا کوئی نہیں، ہمارے سیاسی ذمہ داران جواز و تاویلات اور بہانے تلاش کر رہے ہیں اور عسکری قیادت مہر بہ لب ہے، دل اِس بات کو ماننے کیلئے تیار نہیں کہ انہیں اندازہ نہیں کہ پاکستان اپنی سلامتی کے حوالے سے کس قدر سنگین خطرات میں گھر چکا ہے، قوم سخت دل گرفتہ اور مایوسی کی شکار ہے، جبکہ اپوزیشن لیڈر چوہدری نثار علی خان ذمہ داران حکومت سے دوٹوک الفاظ میں مطالبہ کر رہے ہیں کہ وہ قوم کو سچ بتائیں یا استعفیٰ دیں، سابق وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی نے بھی وزیر اعظم سے واشگاف انداز میں مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا ہے جبکہ حکومت کے اتحادی صوبہ خیبر پختونخوا کے وزیر اعلیٰ نے بھی کہا کہ امریکہ نے یہ قدم اٹھا کر ہماری قربانیوں کی توہین کی ہے، لیکن اِس تمام گھمبیر صورتحال کے باوجود گزشتہ روز وزیر اعظم قومی اسمبلی میں ایبٹ آباد آپریشن کے حوالے کوئی خاطر خواہ تسلی بخش جواب نہیں

دے سکے، پارلیمنٹ سے خطاب میں انہوں نے فوج سے بریفنگ کیلئے 13 مئی کو پارلیمنٹ کو مشترکہ اِن کیمرا اجلاس طلب کرنے اور ایبٹ آباد آپریشن کی تحقیقات کیلئے لیفٹیننٹ جنرل جاوید اقبال کی سربراہی میں تحقیقاتی کمیٹی کے قیام کا اعلان تو کیا، لیکن عوام جن سوالات کے جوابات کے منتظر تھے اُن کا کوئی ذکر نہیں کیا، انہوں نے یہ بتانے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی کہ غلطی کہاں ہوئی ہے اور کوتاہی کا ذمہ دار کون ہے۔

اب 13 مئی کو پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس ہوگا، مگر وہ بھی بند کمرے میں، اس میں فوجی حکام بریفنگ دیں گے، جس کا صاف مطلب ہے کہ اصل بات عوام تک نہیں پہنچنے دی جائے گی، جبکہ بظاہر قومی اسمبلی سے وزیراعظم کے اِس خطاب کا بنیادی مقصد ایبٹ آباد میں القاعدہ کے سربراہ اسامہ بن لادن کی موجودگی، حکومت پاکستان اور اُس کی خفیہ ایجنسیوں کی اِس بارے میں بے خبری، پاکستان کی فضائی و زمینی حدود کی خلاف ورزی کرتے ہوئے امریکی اسپیشل فورسز کے یکطرفہ آپریشن، اُس سے پیدا ہونے والی

صورتحال اور اٹھنے والے سوالات پر قوم کو اعتماد میں لینا تھا، لیکن انہوں نے اِن بنیادی سوالات کا اپنی تقریر میں سرے سے ذکر ہی نہیں، حیرت کی بات ہے کہ پورے آٹھ روز بعد قوم کو اعتماد میں لینے کے لئے جو تقریر کی گئی وہ بھی انگریزی میں تھی، جس سے ایسا لگتا تھا کہ انہوں نے عوام سے زیادہ امریکہ کو اعتماد میں لینے کی کوشش کی، لہٰذا

قائد حزب اختلاف چودھری نثار علی خان کی اِس بات میں وزن معلوم ہوتا ہے کہ وزیراعظم کی تقریر غیر ملکی آقاؤں کے لئے تھی، عوام کے لئے نہیں،انہوں نے کہا کہ پاکستان کی گلیوں، محلوں میں جو باتیں ہو رہی ہیں اُن کا جواب وزیراعظم نے اپنی تقریر میں نہیں دیا، چودھری نثار علی خان کا کہنا تھا کہ وزیراعظم اعلان کریں کہ امریکی حملہ غیر قانونی اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کی خلاف ورزی ہے، اب اگر کوئی ڈرون جہاز، ہیلی کاپٹر آیا تو ہم اسے مار گرائیں گے،اگر حکومت نے ایسا نہ کیا تو یہ قومی مجرم ہوں گے،ہم سمجھتے ہیں کہ اپوزیشن لیڈر نے وزیراعظم کے خطاب پر اپنی تقریر میں بہت سے اہم سوالات اٹھائے ہیں جن پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وزیراعظم کا قومی اسمبلی سے خطاب اِک سعی لاحاصل کے سوا اور کچھ نہ تھا،اپنی اس تقریر میں انہوں نے امریکہ کو صاف لفظوں میں کوئی پیغام دینے کے بجائے صرف اتنا کہا کہ ہم شدید تحفظات رکھتے ہیں،اِن تحفظات سے امریکہ پر پہلے کوئی اثر پڑا ہے نہ اب پڑے گا،اُس نے تو کسی تکلف کے بغیر صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اسامہ کو مارنے کے لئے پاکستان کے اندر آپریشن ہمارا حق تھا،اِس پر ہم کسی سے معافی نہیں مانگیں گے اور آئندہ بھی کسی ہائی ویلیو ٹارگٹ کو پوچھے بغیر پاکستان میں نشانہ بناتے رہیں گے،پاکستان میں متعین امریکی سفیر نے ایک ٹی وی انٹرویو میں ملا عمر اور ایمن الظواہری کے

حوالے سے کہا ہے کہ یہ فیصلہ پاکستان نے کرنا ہے کہ انہیں ہم تنہا ماریں یا پاکستان بھی ہمارے ساتھ شریک ہوگا۔اِس امریکی رعونت آمیز طرز عمل سے اِس بات میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا کہ امریکہ کا ہمارے ساتھ طرزِ عمل آقا اور غلام والا ہے، جو غیرت مند پاکستانی قوم کو کسی طور بھی قابل قبول نہیں، لہذا ہمارے ارباب اقتدار کو چاہیے کہ وہ مزید کسی دباؤ میں آنے اور کسی بھی امریکی تقاضے پر معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے کے بجائے اُسے دوٹوک الفاظ میں یہ باور کرادیں کہ آئندہ ایبٹ آباد آپریشن جیسا کوئی واقعہ برداشت نہیں کیا جائیگا اگر ایسا ہوا تو ہماری جانب سے اُسے ویسا ہی جواب ملے گا، بے شک وہ ہماری امداد بند کردے یا اپنے صدر اور وزیر خارجہ کا دورہ منسوخ کردے، مگر ہم امریکہ کے ساتھ غلامانہ تعلقات برقرار رکھنے کی خاطر اپنے ملک وقوم کی سلامتی اور قومی مفادات کو داؤ پر نہیں لگا سکتے، یاد رکھیئے آزادی اور خودمختاری سے بڑی کوئی دولت نہیں، یہ وہ احساس تفاخر ہے جو کیوبا، وینزویلا اور ایران جیسے ملکوں کو دنیا میں سر اٹھا کر جینے کا حوصلہ عطا کرتا ہے، مگر جو قوم اپنی آزادی اور خودمختاری کو غیر ملکی امداد اور بھیک کے چند ٹکروں عوض گروی رکھ دیتی ہے وہ عملاً غلام ہو جاتی ہے، پھر چاہے اُس کے پاس ایٹم بم ہوں یا غوری میزائل، کچھ کام نہیں آتا، کیونکہ غلاموں کا کام صرف اپنے آقا کے حکم کی پیروی کرنا ہوتا ہے۔

تعلیمات اسلام اِک وسیع علمی شاہکار۔۔۔۔

اسلامی تعلیمات کا مکمل اور جامع احاطہ۔۔۔۔۔
انسائیکلو پیڈیا سے مراد ایسی ضخیم کتاب ہے جو ابجدی ترتیب سے دنیا بھر کی مختلف اشیاء اور علوم و فنون سے متعلق جامع معلومات ایک قاری کو بہم پہنچائے۔انسائیکلو پیڈیا ایک یونانی لفظ ہے،اردو میں اِسے مجمع العلوم یا قاموس العلوم بھی کہتے ہیں، انسائیکلو پیڈیا انگریزی کے بعد اب اردو میں بھی مقبول عام ہوچکا ہے، عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ انسائیکلو پیڈیا مرتب کرنے کی سب سے پہلی کوشش یونان میں ارسطو کے عہد میں کی گئی اور عربوں نے اسے عملی شکل دی، لیکن درست یہ ہے کہ دنیا کا سب سے پہلا انسائیکلو پیڈیا مسلمانوں نے عربی زبان میں مرتب کیا، جسے " مسالک الابصار فی مہالک الامصار" کے نام سے جانا جاتا ہے،اِسے ابن فضل العمری مصری نے ترتیب دیا تھا اور یہ اپنے وقت کا سب سے بڑا انسائیکلو پیڈیا کہلایا۔
انگریزی زبان کا مشہور انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا 1775ء میں تیس سال کی محنت کے بعد مکمل ہوا،اردو زبان میں بھی کئی مشہور و معروف انسائیکلو پیڈیا

شائع ہو چکے ہیں جن میں پاکستان کرانیکل (انسائیکلو پیڈیا)، عالمی انسائیکلو پیڈیا، انسائیکلو پیڈیا پاکستانیکا، اسلامی انسائیکلو پیڈیا اور اسلامی شخصیات کا انسائیکلو پیڈیا قابل ذکر ہیں، گیارہ سو صفحات پر مشتمل پاکستان کرانیکل (انسائیکلو پیڈیا) جو 14 اگست 1947ء سے اپریل 2010ء تک کے اہم تاریخی، سیاسی، سماجی، ثقافتی، تفریحی، علمی و ادبی واقعات اور اہم شخصیات کی پیدائش اور اموات کے احوال پر مشتمل ہے، کو معروف صحافی و ادیب عقیل عباس جعفری نے 20 برسوں کی محنت شاقہ کے بعد مکمل کیا، 2520 صفحات پر مشتمل عالمی انسائیکلو پیڈیا مصنف و مدیر یاسر جواد نے کم و بیش آٹھ برسوں کی محنت کے بعد ترتیب دیا، اسی طرح اسلامی شخصیات کا انسائیکلو پیڈیا بھی ایم ایس ناز نے کئی برسوں کی محنت کے بعد مکمل کیا.

لیکن مشہور ادیب سید قاسم محمود کا کام اس لحاظ سے منفرد ہے کہ انہوں نے وسائل کی کم مائیگی کے باوجود تن تنہا پانچ مختلف موضوعات "قرآن انسائیکلو پیڈیا"، "اِسلامی انسائیکلو پیڈیا"، "انسائیکلو پیڈیا احیائے اِسلام"، "پاکستانی بچوں کا انسائیکلو پیڈیا" اور "انسائیکلو پیڈیا پاکستانیکا" پر انسائیکلو پیڈیا ترتیب دے کر ایک محیرالعقل کارنامہ سرانجام دیا ہے، سید قاسم محمود کا ترتیب دیا ہوا ڈیڑھ ہزار صفحات پر مشتمل "انسائیکلو پیڈیا پاکستانیکا" کی خوبی یہ ہے کہ اِس میں الف سے لے کر "ی" تک

پاکستان کے حوالے سے تمام اشیاء، افراد، یادگار واقعات، تاریخی
حوادث، مذہب، مکاتیب، فلسفہ و معاشرت، جغرافیائی مقامات، شہر، سمندر، دریا غرض اُ
ن تمام چیزوں کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا گیا ہے جن کا جاننا ہر پاکستانی کیلئے شخص کے لئے
ضروری ہے۔
لیکن گورنمنٹ گورونانک ڈگری کالج ننکانہ صاحب کے پروفیسر اور گوشہ محققین ننکانہ
صاحب کے بانی و منتظم پروفیسر سید شبیر حسین شاہ زاہد کی کتاب "انسائیکلو پیڈیا تعلیمات
اسلام "اِس اعتبار سے منفرد ہے کہ اِس میں صرف اسلامی تعلیمات کا مکمل اور جامع احاطہ
کیا گیا ہے، پروفیسر صاحب ایک ماہر تعلیم ہی نہیں بلکہ ایک مصنف، مولف، مدرس، محقق
اور معروف علمی شخصیت بھی ہیں، یہ کتاب در حقیقت آپ کا بیش قیمت کارنامہ
ہے، موصوف اِس سے قبل بھی متعدد کتابیں تصنیف کر چکے ہیں اور قومی و بین الاقوامی
سطح پر اہل قلم اور صاحبان علم و دانش سے داد و تحسین کے حقدار قرار پا چکے ہیں، لیکن
زیر نظر کتاب اُن کی تحقیق اور عرق ریزی کی مظہر ہے، جس میں فاضل مولف نے
محض سنی سنائی باتوں پر اکتفا اور چربہ سازی سے کام لینے کے بجائے کتاب و سنت اور
تاریخ اسلام کے وسیع ذخیرے کو کھنگالنے اور اہم کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد منتخب گوہر
آبدار کو اہل ذوق و شوق کے سامنے پیش کیا ہے۔

انسائیکلو پیڈیا تعلیمات اسلام کی خوبی یہ ہے کہ اِس میں قرآن مجید اور احادیث مبارکہ کو اوّلیت دی گئی ہے اور متنازعہ سوال و جواب کو منتخب کرنے کے بجائے صرف مستند ماخذ سے استفادہ کیا گیا ہے، ہر جواب اپنے اندر بیش بہا معلومات سمیٹے ہوئے ہے، تمام گفتگو عام فہم، آسان اور روز مرہ زندگی میں درپیش عوامل و عادات کی اسلامی نکتہ نظر کے پس منظر میں کی گئی ہے اور ضروری مقامات پر قرآن پاک کی آیت، حدیث یا مستند کتب سے قول جواب کی تائید میں پیش کیے ہیں، کتاب کے ہر باب میں سوالات و جوابات شروع کرنے سے قبل وہ مناسب معلوماتی مواد جس کی بنیاد پر آگے آنے والے سوالات ترتیب دیئے گئے ہیں کو بھی یکجا کر دیا گیا ہے، یہ انداز ترتیب سوالات و جوابات پر مشتمل کتب سے بالکل جدا، الگ اور منفرد ہے۔

خواجہ نورالزماں اویسی لکھتے ہیں کہ "پروفیسر صاحب نے "انسائیکلو پیڈیا تعلیمات اسلام" میں اپنے علمی رشحات سوال و جواب کی شکل میں حوالہ قرطاس کر دیئے ہیں، یہ کہنے کو محض سوال و جواب ہیں لیکن اگر مطالعہ بہ نظر غائر کیا جائے تو یہ بات معلوم ہوگی کہ یہ دراصل سوال و جواب کے پردے میں علم و علمیت، معلومات و تحقیق اور وضاحت و تعلیمات کا ابلاغ ہے، جو محترم پروفیسر صاحب نے افادہ عام کیلئے پیش کر دیا ہے، ٹیبل فنگر ٹپس معلومات، مختصر آیات اور احادیث، دعائیں اور تعریفات و مفاہیم یہ سب اِس کتاب کے اجزا و خصائص

ہیں جن کے مطالعہ سے قاری بڑی دلچسپی کے ساتھ دین کی تعلیم باآسانی اخذ کرتا چلا
"جاتا ہے اور اسے بالکل پتہ بھی نہیں چلتا کہ اُس نے مطالعہ سعی و صعوبت سے کیا ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ "انسائیکلو پیڈیا تعلیمات اسلام " وسیع علمی شاہکار، عظیم جامع مجموعہ
اور خوبصورت بلند مرتبہ اسلامی سرمایہ ہے، یہ اپنی مثال آپ ایک ایسا عظیم علمی خزانہ
ہے جو آپ کو بہت سی ضخیم کتابوں کے مطالعے بے نیاز کرتا ہے ،اِس کتاب کا مطالعہ
جہاں قرآن مجید کی بنیادی تعلیمات،اسلام سے متعلق مکمل آگاہی اور اسلامی اقدار سے
روشناسی کا موجب ہے وہیں یہ کتاب توحید و رسالت، عقیدہ آخرت، نماز
روزہ، حج، ذکوۃ، حدیث و سنت،اسلامی تاریخ اور مذہب اسلام کے حوالے سے ایک
مسلمان کے ذہن میں جنم لینے والے سوالات اور اشکالات کا بھی تسلی بخش جواب فراہم
کرتی ہے، کوئی شبہ نہیں کہ "انسائیکلو پیڈیا تعلیمات اسلام "بہت کارآمد اور مفید
معلومات پر کتاب مبنی ہے جس سے ہر خاص و عام باآسانی استفادہ کرسکتا ہے اور دین
اسلام، سیرت النبی اور تاریخ اسلام سے متعلق بیش قیمت معلومات حاصل کرکے اپنی
دنیا اور عاقبت سنوار سکتا ہے، مکمل حوالوں سے مزین یہ کتاب طالبعلموں، نوجوانوں،
بزرگوں اور خواتین سب کیلئے یکساں مفید ہے، مقبول اکیڈمی، سرکلر روڈ چوک اردو بازار
لاہور کے زیر انتظام دیدہ زیب ٹائٹل اور آفسٹ پیپر پر طبع اس کتاب کی

موجودگی ہر مسلمان گھرانے میں بہت ضروری ہے۔

عمران خان پاگل ہے

عمران خان کا دیوانہ پن ۔۔۔۔۔
سیاست کے کوچہ ملامت میں ایک دفعہ نکل آنے کے بعد اصولوں اور پختگی کردار کا قائم رہنا بہت مشکل کام ہوتا ہے، ہم نے اس میدان کارزار میں بڑے بڑوں کو ٹھوکریں کھاتے، لڑکھڑاتے اور گرتے دیکھا ہے، اس راہ کے مسافروں میں قائداعظم محمد علی جناح جیسے صاحب کردار لوگ کم ہی ملتے ہیں جو اعلیٰ وارفع اصولوں، پختہ نظریات اور بے داغ کردار کو اپنی سیاست کا مرکز ومحور بنائیں اور زندگی کے کمزور لمحوں میں بھی اپنے اجلے دامن پر داغ نہ لگنے دیں، 15 سال قبل تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان بھی اس کوچہ ملامت میں تازہ ہوا کے ایک لطیف جھونکے کی طرح داخل ہوئے، مسلسل کرب وآزار میں مبتلا قوم کیلئے کچھ کر گزرنے کی تڑپ اور جنون انہیں اس وادی خارزار میں لے آیا، ملک کی تقدیر

بدلنے کا خواب اپنی آنکھوں میں سجائے، جذبہ حب الوطنی سے سرشار اِس پر عزم شخص نے براہ راست نوجوانوں کے دلوں پر دستک دی اور سیاست کے کوچہ وبازار میں رنگ ونور کا میلہ لگ گیا۔

انیس سو ستانوے (1997ء) کے الیکشن میں تحریک انصاف نے 132امیدوار کھڑے کئے، خود عمران خان نے 8 حلقوں سے الیکشن لڑا، لیکن وہ ایک بھی حلقے سے کامیاب نہ ہوسکے اور تحریک انصاف کے 132امیدواروں میں کوئی بھی اسمبلی میں نہ پہنچ سکا، پھر اپنے حریف کی کمزوریوں پر نظر رکھنے والا یہ جارحیت پسند کرکٹر یکایک اپنی باوقار چال بھول جاتا ہے اور تمام تر جذبہ صداقت اور نیک عزائم کے باوجود جنرل پرویز مشرف کے صدارتی ریفرنڈیم کی حمایت کرکے مصلحتوں اور مفاہمتوں کا شارٹ کٹ اختیار کرتا ہے، چاہنے والے حیران و ششدر رہ جاتے ہیں، لیکن جلد ہی اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوجاتا ہے،وہ خود تسلیم کرتا ہے کہ "وہ میری سب سے بڑی غلطی تھی، لیکن اِس میں میرے کسی مفاد، بدنیتی یا اصول شکنی کا دخل نہ تھا، مجھے باور کرایا گیا تھا کہ جنرل پرویز مشرف ریفرنڈیم کے ذریعے عوامی مینڈیٹ لے کر کرپٹ عناصر کے خلاف فیصلہ کن کاروائی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، میں کرپشن کو سیاست کا ناسور سمجھتا ہوں اور اسی خوش گمانی میں ریفرنڈیم کی حمایت کی کہ صدر مشرف کرپٹ لوگوں کا محاسبہ کریں گے..... لیکن غلطی ہوچکی تھی جس پر میں شرمندہ ہوں۔"

یہی احساس ندامت آج عمران خان کے بڑے پن کی علامت ہے، مگر کیا کریں کہ سیاست کے کوچہ ملامت میں ایک غلطی انسان کو اپنی منزل سے کوسوں دور لے جاتی ہے، عمران خان آج بھی اُس ایک غلطی کے تدارک کیلئے سرگرداں ہے، پاکستان کو 1992 کے کرکٹ ورلڈ کپ میں فتح یاب کروانے اور شوکت خانم کینسر اسپتال بنانے سے پاکستان کی نوجوان نسل میں مقبولیت حاصل کرنے والے عمران خان سیاست کے میدان میں کامیاب ہو سکیں گے یا نہیں، اس کا فیصلہ تو وقت ہی کرے گا تاہم ایک بات طے ہے کہ عمران خان نوجوانوں کیلئے ایک رول ماڈل کی حیثیت رکھتے ہیں، کرکٹ کے دنوں سے لے کر آج تک وہ اسی طرح لاکھوں کروڑوں پاکستانیوں کی دلوں کے دھڑکن ہیں، کرکٹ میں جس طرح انھوں نے بہت مشکل حالات میں بہترین قائدانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے پاکستان کو ورلڈ چیمپیئن بنوانے میں بنیادی کردار ادا کرکے اَن مٹ نقوش چھوڑے۔

بالکل اسی طرح شوکت خانم کینسر ہسپتال جیسے اداروں کی تکمیل سے ملک میں کینسر جیسے موزی مرض سے بچاؤ اور غریب عوام کو علاج معالجے کی سہولیات کی فراہمی بھی اُن کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے، صحت کے شعبے میں گراں قدر خدمات کے ساتھ تعلیمی شعبے میں بھی انھوں نے نمل نالج سٹی اور نمل یونیورسٹی کا افتتاح کرکے ملک کے ذہین اور مستحق طلباء کیلئے سکالرشپ پروگرام سے

تعلیمی میدان میں انقلاب لانے کے خواب کو عملی تعبیر دی۔آج عمران خان اور ملک کے دوسرے سیاستدانوں اور بڑی سیاسی جماعتوں کے کرتا دھرتاؤں میں یہی بنیادی فرق ہے کہ عمران خان کا جرات مند سیاسی ماضی سب کے سامنے ہے۔انھوں نے عملی طور پر جو کچھ ہو سکا،سب سے پہلے کرکے دکھایا،بعد میں عوام کی عدالت میں گئے۔

اُن کی سیاست کرنے کا انداز کچھ لوگوں کو اِس لئے نہیں بھاتا کہ وہ روایتی سیاست دانوں سے ہٹ کر صاف دلی کے ساتھ جو کچھ دل میں ہوتا ہے،وہی بولتے ہیں،معاشرتی برائیوں رشوت ستانی کرپشن،سفارش،میرٹ اور ملک میں عدل وانصاف اور طبقات کے مطابق وسائل کی تقسیم اور ملک سے لوٹی گئی رقوم کی واپسی کی بات کرتے ہیں،وہ کسی بینک کے نادہندہ اور نیب زدہ نہیں ہیں اور انھیں کبھی خود کو ضمیر کی عدالت میں پیش کرتے شرمندگی محسوس نہیں ہوتی۔ایک عالمی شخصیت ہونے کے ناطے امریکہ سے لے کر دنیا کے ہر ملک کا حکمران انھیں نہ صرف جانتا ہے بلکہ انکی ذات سے بھی بخوبی واقف ہے۔آج عمران خان ہی وہ واحد لیڈر ہیں جو سر میدان کھڑے ہو کر حکمرانوں کو ملکی عزت و وقار کو داؤ پر لگانے اور محض اقتدار سے چمٹے رہنے کیلئے اغیار کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر آڑے ہاتھوں لیتا ہے۔

جبکہ اس کے پاس کوئی عددی برتری نہیں ہے، نہ اُسے میدان سیاست میں عوام کیلئے کچھ کر دکھانے کا موقع ملا ہے، مگر کوئی ایسی بات ضرور ہے کہ تحریک انصاف کا کوئی جلسہ ہو یا کوئی کال ہو، عوام کی اکثریت اُس میں موجود ہوتی ہے، بچے بوڑھے، جوان اور ہر عمر کے افراد متحرک نظر آتے ہیں، جو بات تمام سیاسی جماعتوں کے مقابلے میں منفرد نظر آتی ہے وہ ہے نوجوانوں اور طالب علموں کا تحریک انصاف کی پالیسیوں، نظریات اور منشور سے والہانہ محبت، نوجوان اپنے قائد عمران خان کی ایک کال پر لبیک کہتے ہوئے اپنی خدمات پیش کرنے میں ذرا برابر بھی تعامل نہیں کرتے، یہی وجہ ہے کہ اُن کی تحریک لوگوں اور خصوصاً نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن بنتی چلی جارہی ہے۔

عمران خان نے اپنے 15 سالہ سیاسی سفر میں ہمیشہ قومی مفاد کو مقدم رکھا ہے، اُس نے ملک کی سلامتی اور خود مختاری کی جنگ بڑی جرات کے ساتھ لڑی، آزاد عدلیہ اور آزاد میڈیا کی جدوجہد میں تحریک انصاف نے ہراول دستے کا کردار ادا کیا، اُس کا کہنا ہے تحریک انصاف کا بنیادی مقصد اِس ملک کو قائد اور اقبال کے خوابوں کو تعبیر دینا ہے، اُن کا اصل ہدف ایک آزاد و خود مختار پاکستان کا احیاء ہے، جس میں تمام اکائیوں کو برابری کی سطح پر حقوق حاصل ہوں، آج 15 سال کی جدوجہد کے بعد تحریک انصاف پاکستانی عوام کی ایک توانا آواز بن چکی ہے، اور کیوں نہ بنے کہ عمران خان کا دل پاکستان کے لئے دھڑکتا

ہے،اُس کا جینا مرنا پاکستان کے لئے ہے۔

انہوں نے لندن کا گھر فروخت کرکے اسلام آباد پاکستان میں مستقل ڈیرہ ڈال لیاتاکہ اپنی شناخت پاکستان کو پاکستان دشمنوں کے خلاف مضبوط مورچہ اور مچان بناڈالے،اِسی وجہ ہے اُس نے تمام تر سیکورٹی رسک اور ورانگ کے باوجود پشاور جیسے شہر میں امریکی ڈرون حملوں کی شکل میں ریاستی دہشت گردی کے خلاف دو روزہ دھرنا دینے کانہ صرف اعلان کیا بلکہ کامیابی سے کر بھی دکھایا،جبکہ عمران خان اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ پشاور اور کراچی میں دھرنوں کے ذریعے ڈرون حملوں کو نہیں روکا جاسکتا،مگر پھر بھی اُسے امید ہے کہ یہ دھرنے عوامی شعور کی بیداری اور امریکی ڈرون غنڈہ گردی کو ختم کرنے کی جانب پہلا قدم ضرور ثابت ہوں گے۔

وہ پاکستان کے شہروں میں خوف وہراس کی فضا ختم کرنا چاہتا تھا اور لوگوں کو امید دینا چاہتا تھا کہ کوئی تو ہے جو ان کیساتھ بلٹ پروف گاڑی اور بلٹ پروف جیکٹ کے بغیر تمام رات سڑک پر بیٹھنے کیلئے تیار ہے،وہ چاہتا ہے کہ پاکستان کی سلامتی اور تحفظ کے لیے منافقت اور مصالحت کی چادر اتار کر پھینک دی جائے اور باعزت جینے کا راستہ اختیار کیا جائے،درحقیقت عمران خان پاکستان پر ہونے والے ڈرون حملوں کے غم میں پاگل ہو چکا ہے،دیوانہ وار

پاکستان کو بچانے کے لئے جان ہتھیلی پر رکھ کر سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہے، یہ وہی دیوانہ پن ہے جس نے پاکستان بنایا تھا،آج پاکستان بچانے کیلئے ایک بار پھر اُسی جنون، جذبے اور دیوانے پن کی ضرورت ہے،اب دیکھنا یہ ہے کہ کب قوم اس دیوانے کا ساتھ دے کراِس کی ہمرکاب ہوتی ہے۔

فرد جرم تیار ہو چکی ہے

مہران نیول بیس پر حملہ امریکی آپریشن تھا۔۔۔۔

نائن الیون کے بعد امریکی صدر جارج ڈبلیو بش (سینئر) نے کہا تھا کہ "دہشت گردی کے خلاف ہماری جنگ کا آغاز القاعدہ سے ہوتا ہے لیکن یہ وہاں پر ختم نہیں ہو جائے گی ..... یہ ایک طویل مہم ہے جو پہلے کسی نے نہیں دیکھی،اِس میں ٹی وی پر دکھائی دینے والے ڈرامائی حملے بھی شامل ہیں اور ایسے خفیہ آپریشن بھی، جن کی کامیابی کو صیغہ راز میں رکھا جائے گا، دنیا کے ہر گوشے میں موجود ہر ملک کو ایک فیصلہ کرنا ہوگا، یا وہ ہمارا ساتھی ہے یا دہشت گردوں کا۔" امریکی صدر کی عقل وخرد سے عاری اِس اشتعال انگیز تقریر نے اکیسویں صدی کا وہ خونی دیباچہ لکھا جس کے لہو رنگ صفحات آج وطن عزیز کے چپے چپے میں بکھرے ہوئے ہیں،اُس وقت ہمارے ارباب اقتدار کا خیال تھا کہ ہم نے امریکہ کا دست وبازو بننے کا فیصلہ اپنے ایٹمی پروگرام کو بچانے اور کشمیر پر اپنے مفادات کے تحفظ کیلئے کیا ہے،امریکی عزائم کی وسعتوں اور گہرائی کا اندازہ لگائے بغیر سابق فوجی آمر نے خود سپردگی کے عمل میں احتیاط اور تدبر سے کام لینے کے بجائے والہانہ پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے دلیل تراشی کہ" اِس وقت کسی مہم

جوئی کا راستہ ہمیں پتھر کے زمانے میں لے جائے گا۔" جبر، دباؤ اور معذوری کے تحت کیے گئے فیصلے میں اِس حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیا گیا کہ نیو ورلڈ آرڈر کا اوّلین تقاضہ یہ ہے کہ امریکہ ہر اُس قوت کا دم خم نکال دے گا جو کسی بھی وقت اُس کے اور اُس کے حواریوں کیلئے خطرہ بن سکتی ہے۔ ہمارے خوفزدہ دانشوروں اور تجزیہ نگاروں نے دہشت گردی کے خلاف امریکی مہم جوئی میں امریکی دست و بازو بننے کے حوالے سے جو دلکش و رنگین مناظر تخلیق کیے اور زبان و بیان کی جو حاشیہ آرائیاں تراشیں، آج اِس نام نہاد جنگ کے تمام نقوش نمایاں ہو کر سامنے آچکے ہیں، اب نوشتہ دیوار اُن لوگوں کو بھی صاف نظر آرہا ہے جو کل تک خوش گمانیوں کے رنگین غباروں سے دل بہلا رہے تھے، امریکی دوستی کے دعوے کرتے ہوئے زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے تھے اور ڈالروں کی بارش کے ساتھ ترقی و خوشحالی کے مژدے سنا رہے تھے، حقیقت ہے کہ جب کسی ملک کی قیادت خوف اور دباؤ میں مبتلا ہو جائے، اُس قوم کے دانشور حقیقت پسندی کے نام پر قومی غیرت و حمیت کا مذاق اڑانے لگیں اور فیصلوں پر اختیار رکھنے والے قائدین ہر قیمت پر تصادم سے گریز کی پالیسی پر چل نکلیں تو توانا جذبوں اور ناقابل عزائم کی مالک قوم بھی اندیشوں، واہموں اور خوف کے آسیب میں مبتلا ہو کر بھوسے کا ڈھیر بن جاتی ہے، اپنے وجود کی بقاء کا خوف اُس کے اعصاب سے ساری قوت و توانائی چھین کر اُسے نامہربان موسموں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے، آج ہماری پوری قوم ایسے ہی نامہرباں موسم کی زد میں ہے، بے یقینی کے موسم

نے حساس اور محب وطن افراد کی آنکھوں سے نیند کا خمار اڑا دیا ہے، دلوں میں اندیشوں اور وسوسوں کا خار دار جنگل اور بھی گھنا ہوگیا ہے اور چہرے پر شگفتگی و شادابی کی جگہ اللہ اِس ملک کی حفاظت کرے" کی فکر و دعا نے لے لی ہے، اَمر واقعہ یہ ہے کہ ملک" میں مسلسل اور پے در پے دہشت گردی کے ہونے والے واقعات کسی بڑے طوفان کی آمد کی خبر دے رہے ہیں، حالات کے تیور بتا رہے ہیں کہ امریکہ اور اُس حواری بتدریج اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کی طرف بڑھ رہے ہیں، بلاشبہ ہم اِس وقت قومی تاریخ کے سنگین ترین دور سے گزر رہے ہیں۔

بائیس "22" مئی کو مہران ائر بیس پر حملہ جو کہ راولپنڈی جی ایچ کیو کے بعد پاکستان کے کسی عسکری ادارے پر یہ دوسرا بڑا حملہ ہے اور جس میں انتہائی تربیت یافتہ لوگوں کو استعمال کیا گیا، اپنے پیچھے کئی سوالات چھوڑ گیا ہے، مگر فوری ضرورت یہ معلوم کرنے کی ہے کہ کوتاہی کہاں ہوئی، کس سے ہوئی اور آئندہ کیا کرنا ہے، لیکن پاک بحریہ کے سربراہ ایڈمرل نعمان بشیر صاحب فرماتے ہیں کہ مہران ائر بیس پر حملہ سیکورٹی کی ناکامی نہیں، دہشت گرد ماہر تربیت یافتہ اور شارپ شوٹر تھے، وہ جتنے تجربہ کار تھے اُس کے مقابلہ میں نقصان کم ہوا، یہ بھی کہا جارہا ہے کہ سانحہ ایبٹ آباد اور مہران ائر بیس پر حملے چونکہ رات کی تاریکی میں ہوئے اِس لیے کامیاب رہے، یعنی اگر دن میں ہوتے تو نمٹ لیا جاتا، حیرت ہوتی ہے اِن بیانات کو دیکھ کر، ہماری اطلاعات کے مطابق

مہران بیس اور اطراف کی سیکورٹی پر 11 سو افراد متعین ہیں، مگراس کے باوجود بحریہ
کے سربراہ اپنی اور اپنے ادارے کی ناکامی تسلیم کرنے کے بجائے دہشت گردوں کو خراج
تحسین پیش کررہے ہیں کہ وہ بڑے ماہر اور تربیت یافتہ تھے جن کے سامنے سب بے بس
ہوگئے،اس پر بھی فخر کیا جارہا ہے کہ حملہ آور جتنے تجربہ کار تھے اس کے مقابلے میں تو
نقصان بہت ہی کم ہوا ہے، گویا درجن بھر قیمتی جانوں کا زیاں، متعدد کا زخمی ہونا، 2
انتہائی قیمتی پی تھری سی اورین طیاروں کی تباہی، تیسرے کا نقصان کوئی نقصان ہی نہیں
ہے،اس پر مستزاد یہ کہ بحریہ اور بری فوج کے کمانڈرز، رینجرز اور پولیس کی بھاری
نفری کی موجودگی میں 2 دہشت گرد اتنی آسانی سے فرار بھی ہوگئے جس آسانی سے
اندر آئے تھے، یہ سب سیکورٹی کی ناکامی اور نااہلی نہیں تو اور کیا ہے؟ گو کہ پی این ایس
مہران کی سیکیورٹی کے حوالے سے عسکری ذمہ داران کا دعویٰ ہے کہ سیکورٹی میں کوئی
کمی نہیں تھی لیکن پھر بھی وہ اس سوال کا جواب دیں نہ دے سکے کہ یہ کیسے ممکن ہوا، حملہ
آور کس طرح اندر پہنچے، کیوں کسی کو اُس وقت تک خبر نہیں ہوئی جب تک ہینگر میں
کھڑے ہوئے طیاروں کو راکٹوں سے نشانہ نہیں بنایا گیا، حملہ آوروں کی تعداد کے
بارے میں بھی متضاد اطلاعات سامنے آتی رہیں، کبھی ان کی تعداد 15 اور کبھی 20
بتائی گئی، یہ بھی کہا گیا کہ کچھ مارے گئے اور کچھ زندہ پکڑ لیے گئے، لیکن بعد میں کہا گیا کہ
حملہ آور چھ تھے جن میں سے چار مار دیے گئے اور دو فرار ہونے میں کامیاب
ہوگئے،ان چھ افراد نے

فوجی کمانڈوز، بحریہ کے جوانوں اور رینجرز کو 18 گھنٹے تک مصروف رکھا اور بحریہ و رینجرز کے درجن بھر جوانوں کو شہید کردیا، سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ کئی دن گزرنے کے بعد بھی یہ طے نہیں ہو سکا کہ حملہ آور کتنے تھے اور وہ کیسے داخل ہوئے، ایک شبہ یہ بھی ظاہر کیا جارہا ہے کہ حملہ آوروں کو اندر سے بھی مدد فراہم کی گئی، عام خیال یہ ہے کہ حملہ آور پچھلی طرف سے 5 فٹ اونچی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوئے جہاں سیکورٹی کا کوئی بندوبست نہیں تھا اور وہاں کی نگرانی نہیں کی جاتی تھی، کیمرے اگر لگے ہوئے تھے تو یا تو وہ فعال نہیں تھے یا جھاڑیوں کی وجہ سے بے فائدہ تھے، حملہ آور بھاری اسلحہ اٹھا کر دو، ڈھائی کلو میٹر پیدل چل کر اندر داخل ہوئے اور انہیں کسی نے چیک نہیں کیا، تعجب کی بات ہے کہ ان دہشت گردوں نے 18 گھنٹے تک بحریہ اور بری افواج کے کمانڈوز اور رینجرز کا مقابلہ کیا، جدید ہتھیاروں، راکٹوں اور بموں سے لیس ان حملہ آوروں کا اصل نشانہ بحریہ کے پی تھری سی اورین طیارے تھے جو 120 ناٹیکل میل تک کام کرنے والے ریڈار اور دیگر تباہ کن صلاحیتوں کا حامل اور پاک بحریہ کی ریڑھ کی ہڈی اور بحری آنکھ سمجھے جاتے ہیں، جنھیں دہشت گردوں نے باآسانی ہدف بنا کر دینا کو یہ پیغام دیا کہ اب پاکستان کی سمندری حدود اور زیر آب وسائل بھی محفوظ رہے، یقیناً اس کاروائی کے پیچھے وہی ہاتھ کارفرما ہے جو ہماری تباہی و بربادی چاہتا ہے، اب آپ ہی بتایئے کہ یہ سیکورٹی کی ناکامی نہیں اور تو ناکامی کسے کہتے ہیں، مگر پھر بھی اگر یہ

اصرار کیا جائے کہ یہ سیکورٹی کی ناکامی نہیں تھی، دشمن ہی طاقت ور تھا، تو اس صورتحال میں آئندہ کسی اصلاح احوال کی توقع نہیں کی جاسکتی ہے۔؟

اَمر واقعہ یہ ہے کہ پی این ایس مہران پر حملہ غیر متوقع نہیں تھا، نائن الیون کے بعد سے اب تک مسلح افواج پر کم و بیش چالیس سے زائد حملے ہو چکے ہیں، 19 ماہ قبل جی ایچ کیو پر بھی اسی طرح کا حملہ ہوچکا ہے، حال ہی میں کراچی میں نیوی کی دو بسیں بھی دہشت گردوں کا نشانہ بن چکی ہیں، پی این ایس مہران پاک نیوی کا ملک بھر میں واحد ہوائی اڈہ ہے، جہاں سمندروں کی نگرانی کرنے اور دشمن کے عزائم پر کاری ضرب لگانے والے گراں قدر قیمتی طیارے کھڑے تھے، راولپنڈی میں جی ایچ کیو کے نشانہ بننے کے بعد یہ واضح تھا کہ مسلح افواج کی کوئی بھی عمارت، کوئی بھی اڈہ اور کوئی بھی تنصیب دہشت گردوں کا ہدف بن سکتی ہے، جبکہ اس سے قبل ایبٹ آباد کے واقعہ نے واضح کردیا تھا کہ ہم اس نوع کے بیرونی حملے کو روکنے کی سکت نہیں رکھتے، لیکن پی این ایس مہران کے واقعہ نے ثابت کردیا کہ ہماری انتہائی حساس تنصیبات بھی پانچ چھ دہشت گردوں کے داخلی حملے سے محفوظ نہیں ہیں، اس کے باوجود لاکھ تاویلات کے دفتر کھولے جائیں اور بھونڈے جواز تراشے جائیں مگر حقیقت یہی ہے کہ مہران بیس پر دہشتگردی کی کارروائی نے ہمارے دفاعی اور سیکورٹی نظام کی قلعی کھول دی ہے اور ناقص حفاظتی اقدامات اور حملہ آوروں کی کامیابی سے امریکہ کو یہ راگ

الاپنے کا ایک اور موقع فراہم کر دیا ہے کہ پاکستان اپنی ایٹمی تنصیبات کی حفاظت کا اہل نہیں ہے، پاکستان میں ریاست کی اتھارٹی مفلوج ہو چکی ہے اور دہشت گرد اتنے مضبوط اور توانا ہو چکے ہیں کہ ان کے ہاتھ کسی بھی وقت پاکستان کے ایٹمی اثاثوں تک پہنچ سکتے ہیں، اسی وجہ سے امریکی اخبار وال اسٹریٹ جرنل نے کھل کر لکھا کہ کراچی میں مہران نیول ایئر بیس پر عسکریت پسندوں کی کاروائی ایٹمی ہتھیاروں سے لیس پاکستان کی ناکامی کو بے نقاب کرتی ہے کہ سب سے زیادہ سخت حفاظتی علاقے بھی دہشت گردی کے حملوں سے محفوظ نہیں ہیں، یہ حملہ پاکستان کے جوہری ہتھیاروں میں اضافے اور اُن کی حفاظت پر امریکہ کی تشویش اور خدشات کو مزید گہرا کرتا ہے، امریکی اخبار نے یہ بھی انکشاف کیا کہ مہران بیس سے صرف پچیس کلومیٹر دور مسرور ایئر بیس پر ایٹمی ہتھیاروں کا بڑا ذخیرہ بھی موجود ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب سب سے زیادہ سخت حفاظتی علاقے بھی دہشت گردوں سے محفوظ نہیں ہیں تو کیا بعید امریکہ ایسا ہی کوئی حملہ کہوٹہ یا ہماری ایٹمی تنصیبات پر نہیں کر سکتا، ماہرین کا خیال ہے کہ حالیہ حملہ سیکیورٹی فورسز کی بڑی ناکامی ہے اور اس سے فوج اور سیکیورٹی اداروں کے حوالے سے عوام میں موجود امیج کو شدید دھچکہ لگا ہے، کیونکہ عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ دہشت گردوں کے لئے کسی فوجی تنصیبات کو نشانہ بنانا آسان ہدف نہیں

ہوتا، مگر ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادن کی موجودگی، امریکی دستوں کا ایبٹ آباد میں آپریشن اور اب فوج کی ایک اہم تنصیب پر حملہ، ماہرین کے مطابق سیکیورٹی اور حساس اداروں کی پیشہ وارانہ قابلیت اور صلاحیت کے بارے میں کئی سوال اٹھاتا ہے، اس واردات کے بعد پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کی حفاظت کا معاملہ ایک بار پھر اٹھایا جا رہا ہے کہ جو افواج اپنی بیس کی ہی حفاظت نہیں کر سکتی وہ ایٹمی اثاثوں کی حفاظت کیسے کر سکتی ہیں؟ پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کو غیر محفوظ ظاہر کرکے ان کی آڑ میں پاکستان میں امریکہ اور نیٹو کو فوجی کاروائی کا موقع فراہم کرنے میں طالبان کا فائدہ ہے یا امریکہ اور بھارت کا؟ اگر سوچیں گے اور غور کریں گے تو بہت سی باتیں سمجھ میں آئیں گی، حقیقت یہ ہے کہ وہ دہشت گرد جو خود کو امریکہ کا دشمن قرار دیتے ہیں، اُن کی اِن کاروائیوں سے سب سے زیادہ فائدہ امریکہ اور اُس کے حواریوں کو ہی پہنچ رہا ہے، چنانچہ اس تناظر میں آئی ایس آئی کے سابق سربراہ حمید گل کی بات سو فیصد درست لگتی ہے کہ پی این ایس مہران پر دہشت گردوں کا حملہ امریکی آپریشن تھا، اُن کا کہنا تھا کہ امریکہ پاکستان کو عدم استحکام کا شکار کرنا چاہتا ہے اور وہ خطے میں اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کیلئے ہمارے جوہری اثاثوں کو مشترکہ تحویل میں لینے کا خواہاں ہے، جبکہ نیٹو کے سیکرٹری جنرل راسموسن اور امریکی سینٹر جان کیری کے ایسے بیانات بھی سامنے آچکے ہیں جن میں پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں کو محفوظ قرار دینے کے ساتھ ساتھ اُن کے حوالے سے تشویش بھی ظاہر

کی گئی ہے، مغربی میڈیا کئی بار واشنگٹن کے ایسے منصوبوں کی طرف اشارہ کر چکا ہے جن کا مقصد پاکستان کے جوہری اثاثوں یا جوہری مواد کو محفوظ مقام پر منتقل کرنا بتایا جاتا ہے،ایسی قانون سازی کی باتیں بھی سننے میں آرہی ہیں کہ اگر کوئی ملک اپنے جوہری اثاثوں کی حفاظت نہیں کرسکتا ہو تو امریکہ اُن اثاثوں کو اپنی تحویل میں لے سکتا ہے، بعض بیرونی حلقے تو باقاعدہ یہ تجویز بھی پیش کرچکے ہیں کہ پاکستان کے ایٹمی ہتھیار دہشت گردوں کے ہاتھوں میں چلے جانے کا خطرہ ہے اس لئے اقوام متحدہ کی زیر نگرانی ایک مشترکہ کمان بنا دینی چاہئے جو ان کا کنٹرول سنبھال لے،ایک طرف یہ سازشیں پنپ رہی ہیں تو دوسری طرف پاکستان میں غیر ملکیوں کی آزادانہ آمدورفت جاری ہے،ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو یہاں آکر حساس نوعیت کی سرگرمیوں میں مصروف ہوجاتے ہیں اور ریمنڈ ڈیوس کی طرح سفارتی تحفظ کے ساتھ پورے ملک میں دندناتے پھرتے ہیں،ایسے لوگوں کو پوچھ گچھ کے کسی عمل سے گزرنا پڑتا ہے نہ انہیں ویزوں کے حصول یا اندرون ملک نقل و حرکت میں کوئی رکاوٹ پیش آتی ہے،امریکی خفیہ ادارے سی آئی اے کے حوالے سے عالمی پریس میں یہ خبریں بھی چھپ چکی ہیں کہ اس نے پاکستان میں اپنا الگ نیٹ ورک قائم کرلیا ہے،اس لئے اب اُسے آئی ایس آئی کی مدد یا تعاون کی بھی ضرورت نہیں رہی،اس کے کارندے بلاخوف وخطر اپنے مقاصد کے لئے جو چاہیں کرتے پھریں، کوئی انہیں روکنے والا نہیں، یہ لوگ ہماری سلامتی اور ہمارے حساس اداروں کے لئے بہت بڑا خطرہ ہیں، قارئین محترم حقائق

بیحد سنگین ہیں اور حکومت اور قومی اداروں سے ہمہ وقت بیداری اور مستعدی کا تقاضا کرتے ہیں، حالات بتارہے ہیں کہ وطن عزیز کو کئی جہتوں سے خطرات کا سامنا ہے، ایک دشمن تو ہمارے سامنے ہے مگر کچھ عناصر ایسے بھی ہیں جو ہمارے درمیان رہ کر دشمن کے مذموم عزائم کو تقویت پہنچارہے، لہٰذا ہمیں اِن سب سے چوکنا رہتے ہوئے ملک کی سلامتی اور بقاء کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے اور اس وقت سب سے پہلا کام قومی سلامتی کے ذمہ دار اداروں کی اپنی سیکورٹی کے حوالے سے پیدا ہونے والے سوالات کے جواب تلاش کرنا ہے۔

اب جبکہ مہران نیول ایئر بیس پر حملے کا خونی ڈراپ سین اپنے پیچھے ملکی سلامتی اور قیمتی اثاثوں کے حوالے سے کئی سوالات چھوڑ گیا ہے، مبصرین اور تجزیہ نگار حملے کے مقاصد کا تعین کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ پاک آرمی، ایئر فورس اور نیوی تینوں ایسے ادارے ہیں جو ملک کی بیرونی سرحدوں اور ملک کے استحکام اور سالمیت کے امین ہیں، ان کو ٹارگٹ کرنے کا مقصد محض دہشت گردی کی کارروائی نہیں بلکہ دشمن نے ان تینوں اداروں کے خلاف دہشت گرد کاروائیوں کے ذریعے نفسیاتی طور پر عوام کو یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ اگر یہ دفاعی ادارے اپنا تحفظ نہیں کر سکتے تو پھر وطن اور عوام کا تحفظ کیسے کر سکیں گے، چنانچہ وقت کا تقاضہ ہے کہ پاکستان کے حکمران اور مسلح افواج کے سربراہان صرف یہ بیان دینے کہ "ہمارا دفاع مضبوط ہاتھوں میں

ہے، کوئی ہمیں میلی نظر سے نہیں دیکھ سکتا" کے بجائے عملی طور پر دفاع وطن کے تقاضوں کو پورا کریں، کیونکہ دنیا کی کوئی بھی فوج خواہ کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہو وہ اس وقت تک وطن کا دفاع نہیں کر سکتی جب تک اُس ملک کے عوام اسکے ساتھ نہ ہوں، اگر پاکستان کے معروضی حالات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ کہنا مشکل نہیں کہ بدقسمتی سے اس وقت پاکستانی عوام کا اعتماد تقریباً سبھی اداروں خواہ وہ سول ہوں یا عسکری متزلزل ہو چکا ہے، دہشت گردی کی اس واردات سے افواج پاکستان کا مورال ڈاؤن کرنے کی ناکام و ناپاک کوشش کی گئی ہے، آج تمام اہل وطن یہ بات سوچ رہے ہیں کہ یہ حملے، یہ کاروائیاں، کب رکیں گی؟ یہ سلسلہ کب تھمے گا؟ ملک میں دہشت گردی، بم دھماکے، فورسز پر حملے آخر کب ختم ہونگے؟؟ ہماری ناقص رائے میں اِن تمام سوالات کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم امریکہ کی اِس نام نہاد جنگ سے باہر نکل آئیں، امریکہ کی کاسہ لیسی اور غلامی چھوڑ دیں اور پوری دیانت داری کے ساتھ دہشت گردی کے اصل عوامل کا تعین کریں، وقت کا تقاضا ہے کہ ہماری سیاسی ومذہبی جماعتیں اختلافات اور وقتی فائدوں کے حصار سے نکل کر ملکی سلامتی وبقاء کے یک نکاتی ایجنڈے پر مل جل کر کام کریں، یاد رکھیں قوم کے اتحاد اور یکجہتی کے ذریعے ہی دشمنوں کی سازشوں کو ناکام بنایا جاسکتا ہے، آج جبکہ یہ حقیقت پوری طرح نکھر کر سامنے آچکی ہے کہ امریکی کولیشن کا ہراول دستہ بن جانے کے باوجود ہمیں لاحاصلی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا، تازہ نوشتہ دیوار یہ ہے کہ امریکی جنگ لڑنے اور

اپنا سب کچھ نذر کرنے کے باوجود آج ہم عالمی کٹھرے میں مجرم کی طرح تنہا کھڑے ہیں، دشمن ہمارے خلاف فردِ جرم تیار کرچکا ہے، شواہد موجود ہیں، گواہیاں آنے والی ہیں اور حاکم بدہن وہ دن دور نہیں جب مخدوش حالات کا بہانہ بنا کر پاکستان سے ایٹمی اثاثے امریکہ اور اُس کے حواریوں کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا جائے۔ نائن الیون کو جارج ڈبلیو بش کی تقریر سے آغاز ہونے والی امریکی خونی تصنیف کا آخری باب اپنی تمام ترجزیات کے ساتھ ہمارے سامنے آچکا ہے، کیا ہمیں کچھ اندازہ ہے کہ کون سی قیامت ہمارے سروں پر منڈلا رہی ہے۔؟

وفاقی بجٹ، کتے بلیوں کیلئے ریلیف مگر عوام کیلئے نہیں

غریب دوست بجٹ، عوام کے ساتھ سنگین اور بھیانک مذاق۔۔۔۔۔
حزب اختلاف کے شدید احتجاج اور شور کے باوجود وزیر خزانہ نے قومی اسمبلی میں
آئندہ مالی سال 2011-12 کے لئے 27 کھرب 67 ارب روپے کا چوتھا بجٹ جس
کا سارا تانا بانا سچ کو چھپانے اور سچ کے سوا ہر شے کو زیب داستان بنانے کی فنکارانہ
چابکدستی سے بُنا گیا تھا، پیش کر دیا، وفاقی وزیر خزانہ کے پیش کردہ بجٹ پر بہتر رائے
تو ماہرین اقتصادیات ہی دے سکتے ہیں، ہمیں بجٹ کی غریب پروری اور عوام دوستی پر
بھی کسی قسم کا شک وشبہ نہیں، مگر زمینی حقائق کہتے ہیں کہ یہ بجٹ اعداد وشمار کا پر
فریب کھیل ہے، جسے ایسے ہنر مند مداریوں کے ہاتھوں نے تیار کیا ہے جو اپنی ذہانت کی
دھاک بیٹھانے اور اپنی حسنِ کارکردگی کا سکہ جمانے کیلئے اعداد وشمار کے گوشوارے
تراشنے اور ہندسوں کے ہیر پھیر سے خوشحالی کے سبز باغ دکھانے میں طاق ہوتے
ہیں، یہ وہی صاحبان کمال لوگ ہیں جو تھوڑی دیر کیلئے غربت بھوک اور افلاس کے بے
آب وگیاہ ریگستان میں کھڑے آدمی کو بھی اِس وہم میں مبتلا کر دیتے ہیں کہ
مسائلِ گراں بار کا طوفان گزر چکا ہے اب جلد ہی ترقی وخوشحالی کی بارش اُس کی بے
رنگ زندگی میں

خوشیوں کے رنگ بھر دے گی اور اُس کے وجود کو آسانیوں سے ہمکنار کر دے گی، مگر جب اعداد و شمار کا گورکھ دھندہ کھلتا ہے تو سامنے آنے والی حقیقت اُس کے مسائل کو دوچند اور زندگی کو مزید تلخ بنا دیتی ہے۔

موجودہ بجٹ بھی اعداد و شمار کا ایسا ہی گورکھ دھندہ ہے، جسے حکومت کے اقتصادی جادوگروں نے نہایت ہی چابکدستی سے سجایا ہے، جس میں اربوں کھربوں کی قصے کہانیاں شامل ہیں مگراس کے باوجود بمشکل چند ہزار روپے کمانے والے ایک عام آدمی کی زندگی محرومی، محتاجی اور بے بسی کے گرداب میں پریشان گھوم رہی ہے، اُس کیلئے اربوں کھربوں کے ہندسے اُسی طرح اجنبی ہیں جیسے اُس کی زندگی میں
خوشی، آسودگی، اطمینان اور سکون، اُسے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ حکومت نے ترقیاتی پروگراموں، اٹامک انرجی، پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ، دفاع، ہاؤسنگ اینڈ ورکس، کابینہ ڈویژن، سائنس و ٹیکنالوجی، قانون و انصاف تعلیم و صحت، صنعت و پیداوار وغیرہ کیلئے کتنی رقم مختص کی ہے، وہ تو صرف یہ جاننا چاہتا ہے کہ بجٹ سے اُس کی روزمرہ کی زندگی کیلئے کتنی آسانی پیدا ہوئی، کتنی سہولتیں میسر آئیں، حکومتی دعوے کے مطابق تو عوام دوست بجٹ پیش کیا گیا ہے اور عوام دوستی کا اِس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ آنے والے دنوں میں بجلی، چینی اور روزمرہ کی کھانے پینے کی اشیاء مزید مہنگی ہو جائیں گی، آمدورفت اور بار برداری کیلئے ٹرانسپورٹ کے کرائے بڑھ جائیں گے، مہنگائی کی نئی لہر زندگی کے

ہر شعبے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی اور یوں پہلے سے پسے ہوئے طبقات کیلئے زندگی کا عذاب اور بھی گھمبیر ہو جائے گا۔

جبکہ بجٹ میں حکومت نے عوام دوستی کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے ایمبولینس کی درآمد پر 5 فیصد ڈیوٹی کے ساتھ سیلز ٹیکس بھی عائد کر دیا گیا ہے، عوام کو دی جانے والی سبسڈیز میں 229 ارب 353 کروڑ اور یوٹیلیٹی اسٹوز میں موجود سامان پر دی گئی سبسڈی میں 2 ارب 20 کروڑ روپے کی کمی کی گئی ہے، اسی طرح چینی پر 3 ارب 50 کروڑ روپے کی رعایت ختم کرکے چینی کی درآمد اور مقامی سطح پر فراہمی پر عائد سیلز ٹیکس ختم کرکے 8 فیصد کے حساب سے فیڈرل ایکسائز ڈیوٹی عائد کرنے کی تجویز دی گئی ہے، جبکہ کھاد پر رواں مالی سال کے دوران دی جانے والی ہر قسم کی سبسڈی آئندہ مالی سال میں ختم کرنے کی تجویز ہے، حکومت نے عوام دوستی کے ساتھ ساتھ حیوان دوستی کا بھی بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے کتے بلیوں کی درآمدی خوراک 20 فیصد سستی کر دی ہے تاکہ وہ عام لوگ جن کے پاس اپنے کھانے کو روٹی نہیں ہے، کتے بلیوں کی نگہداشت اور افزائش نسل میں دلچسپی لے سکیں، جس ملک کی آدھے سے زیادہ آبادی خط غربت سے نیچے زندگی بسر کر رہی ہے، اُس ملک کے حکمرانوں کے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ دیکھئے، عوام بنیادی ضروریات سے محروم ہیں لیکن حکمران مغل بادشاہوں کی طرح قومی دولت پانی کی طرح اپنے عیش وعشرت اور بیرونی دوروں پر بہا رہے ہیں۔

حال یہ ہے کہ موجودہ بجٹ میں ایوان صدر کے کیلئے 2 کروڑ اضافے کے ساتھ 48 کروڑ مختص کئے گئے ہیں اسی طرح وزیر اعظم کے غیر ملکی دوروں کیلئے 577 کروڑ سے زیادہ کی رقم رکھی گئی ہے، جبکہ صدر کے غیر ملکی دوروں کیلئے 34 کروڑ روپے رکھے گئے ہیں، وزیر اعظم کی سرکاری آمدورفت اور موٹر کاروں کیلئے اس غریب قوم کو آئندہ مالی سال میں 2 کروڑ 46 لاکھ روپے ادا کرنے ہونگے، صرف وزیر اعظم ہاؤس کے باغات کی تزئین وآرائش کیلئے ایک کروڑ 2 لاکھ روپے مختص کئے گئے ہیں، وزیر اعظم کے ساتھ خدمات انجام دینے والے ملازمین کی تنخواہوں کیلئے 54 کروڑ 60 لاکھ روپے رکھے گئے ہیں، جبکہ ایوان صدر کے ملازمین کیلئے 11 کروڑ روپے رکھے گئے ہیں، جو ایوان صدر کے ملازمین کی تنخواہوں کیلئے مختص کئے گئے فنڈ 3 کروڑ 90 لاکھ روپے کے علاوہ ہیں، اسی طرح ایوان صدر کے باغات کی تزئین وآرائش کیلئے ایک کروڑ 50 لاکھ روپے رکھے گئے ہیں،اِس کے علاوہ 2 کروڑ 77 لاکھ روپے صدر کی سرکاری آمدورفت اور ایوان صدر کی موٹرکاروں کیلئے رکھے گئے ہیں، جبکہ صحت اور تعلیم کے لئے مختص رقوم سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ حکمرانوں کو زندگی کے اِن دو اہم ترین شعبوں سے کوئی دلچسپی نہیں، یہ غریب دوستی ہی ہے کہ حکومت نے امیروں پر اثرانداز ہونے والی تجاویز بجٹ میں شامل نہیں کیں، اسی وجہ سے عالمی میڈیا اور ڈونرز نے پاکستان کے بجٹ پر شدید تنقید کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی حکومت نئے مالی

سال کیلئے بجٹ میں زرعی ٹیکس لگانے اور امیروں سے ٹیکس وصولی کیلئے اقدامات متعارف کرانے میں ناکام رہی اور اس نے خسارے میں کمی کیلئے اقدامات نہیں کیے۔ حقیقت یہ ہے کہ بجٹ سے عوام کو کوئی ریلیف نہیں مل سکے بلکہ اُن کی مشکلات میں اضافہ ہی ہوگا، کیونکہ حکومت نے اخراجات پورے کرنے کیلئے مزید 287ارب روپے کے غیر ملکی قرضے لینے کا عندیہ دیا ہے، جبکہ پہلے سے لیے گئے قرضوں کے سود کی ادائیگی کیلئے 790 ارب سے زائد کی رقم بجٹ میں رکھی گئی ہے،اس ایک پہلو سے واضح اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہمارے وسائل کا بڑا حصہ غیر ملکی قرضوں اور سود کی ادائیگی کی نذر ہو جانے کے بعد عوام کی فلاح و بہبود کیلئے پیسہ کہاں بچے گا،اس کے باوجود ہمارے معاشی بقراطیوں کی خود فریبی اور خوش فہمی دیکھئے کہ غیر ملکی ملنے والی امداد اور کیری لوگر بل سے ملنے والی متوقع رقم بھی انھوں نے پہلے سے آمدنی کے کھاتے میں ڈال دی ہے اگر یہ امداد اور رقم نہیں ملتی ہے تو ظاہر ہے اِس کا بھگتان بھی عوام مزید نئے ٹیکس کی صورت میں ادا کریں گے،دوسری طرف حکومت نے بجٹ میں 975ارب روپے کا جو خسارہ ظاہر کیا ہے، اِس خسارے کو بھی پورا کرنے کیلئے نت نئے ٹیکس لگائے جائیں گے، جس سے غریبوں کی زندگی میں مزید غریبی ہی آئے گی،امر واقعہ یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے اکثر شعبوں سے سبسڈی کے خاتمے کے فیصلے نے صورتحال کو غیر یقینی بنا

دیا ہے۔
چنانچہ اس تاثر کو مزید تقویت مل رہی ہے کہ بجٹ آئی ایم ایف کے مفادات کو مد نظر رکھ کر اور عوام کے مسائل اور مشکلات کو فراموش کرکے تیار کیا گیا ہے،حکومت کی ان ہی پالیسیوں کے نتیجے میں قومی معیشت کا ہر پہلو ادبار و انحطاط کا شکار ہے،نہ صرف سرمایہ کاری رک گئی ہے بلکہ ملک سے سرمائے کے فرار کا عمل بھی تیز تر ہوتا جا رہا ہے،افسوسناک امر یہ ہے کہ سرکاری اداروں کی نجکاری کے حوالے سے حکومت کی پالیسی میں سنگین بدعنوانیاں بھی سامنے آئیں، یہاں تک کہ سپریم کورٹ آف پاکستان نے بھی سختی سے ان بدعنوانیوں کا نوٹس لیا ہے، جبکہ حکومت کی ناقص مالیاتی پالیسیوں، سرکاری وسائل کی لوٹ مار، سنگین بدعنوانیوں، سرکاری اخراجات میں بلاجواز اضافے اور خاص طور پر گیس و بجلی کی قیمتوں میں مسلسل اضافے نے حکومت کی ناکامی کے تاثر کو تقویت دی ہے،اس پس منظر میں عوام وفاقی بجٹ سے کوئی خوش آئند توقع اور امید رکھنے کی بجائے مایوسی کا اظہار کر رہے ہیں اور ماہرین اقتصادیات کی طرف سے غیر یقینی کیفیت کا اظہار اُن کی مایوسی میں اضافہ اور حکومت پر اُن کے رہے سہے اعتماد کو بھی ختم کر رہا ہے۔
حیران کن بات یہ ہے کہ روٹی، کپڑا اور مکان کی فراہمی کا نعرہ لگانے والی

حکومت نے ایک ایسا بجٹ پیش کیا ہے جس میں ملک کے غریب عوام کے لیے غذا، لباس اور رہائش کی فراہمی کی کوئی ضمانت موجود نہیں ہے، حسب روایت آمدنی واخراجات کا سالانہ میزانیہ پیش کرنے سے قبل حکومت نے سال گزشتہ کا اقتصادی جائزہ جاری کیا ہے، جس میں اس بات کا اعتراف کیا گیا کہ ملک کی معیشت کی صورت حال خراب رہی ہے، اندرونی اور بیرونی قرضے بڑھ گئے ہیں، مہنگائی میں اضافہ ہوا ہے، رواں مالی سال کے بیشتر اہداف حاصل نہیں ہو سکے، وفاقی وزیر خزانہ اور وزارت خزانہ نے کے معاشی منتظمین نے ملک کی اقتصادی ابتری کے حقیقی اسباب بیان کرنے کے بجائے عذر لنگ پیش کیا ہے، جس میں عالمی منڈی میں تیل کی قیمتوں میں اضافہ، سیلاب اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کے باعث ملکی معیشت پر دباو شامل ہیں، یہ درست ہے کہ ملکی معیشت پر منفی اثرات ڈالنے میں مذکورہ عوامل کا ہاتھ ہے، لیکن یہ حقیقی سبب نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ تین برسوں میں پاکستان کی معیشت کی تباہی میں تیزی آئی ہے، یہ اقتصادی تباہی سابقہ حکومت کی پالیسیوں کا تسلسل ہے، گزشتہ دس برسوں میں آمدنی اور اخراجات کا خسارہ چار ہزار ارب روپے تک پہنچ گیا ہے، بجٹ خسارے کو پورا کرنے کے لیے حکومت اندرونی اور بیرونی قرضے حاصل کرتی ہے، موجودہ حکومت نے گزشتہ تین برسوں میں جتنے قرضے حاصل کیے ہیں پاکستان کی تاریخ میں اُس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

اِس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ ملکی معیشت کی موجودہ صورتحال اس سے بھی

کہیں زیادہ خراب ہے جتنی موجودہ حکومت کو مارچ 2008ء میں ورثے میں ملی تھی۔آپ کو یاد ہوگا کہ صدر آصف علی زرداری نے کچھ عرصہ قبل پارلیمان کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے دعویٰ کیا تھا کہ انہوں نے ملکی معیشت کو پٹڑی پر ڈال دیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حکومت کی گزشتہ تین برسوں کی کارکردگی پاکستان کی تاریخ کی بدترین کارکردگی ہے، غیر ملکی قرضوں کا حجم 15 سو ارب روپے سے بڑھ کر سو ارب روپے سے زائد ہوچکا ہے اور یہ قرض اصلاً پاکستان کے 18 کروڑ عوام کو 46 ادا کرنا ہے،پاکستان کی معیشت کی تباہی میں سب سے بڑا کردار دہشت گردی کے خاتمے کی نام نہاد امریکی جنگ بھی ہے جس کی وجہ سے اب تک پاکستان کو 56 ارب ڈالر کا نقصان ہوچکا ہے جبکہ اس جنگ نے پاکستان کی سلامتی کو بھی خطرے میں ڈال دیا ہے اور آج اسی جنگ کی وجہ سے ہماری سیاسی اور عسکری قیادت ملزموں کے کٹہرے میں کھڑی ہوئی ہے، جبکہ قرضوں اور سود کی معیشت نے پاکستان کی آدھے سے زیاد آبادی کو غربت کی لکیر سے نیچے دھکیل دیا ہے، جس سے ملک میں بندہ مزدور سے لے کر متوسط طبقے کے افراد بھی چیخ اٹھے ہیں، اس کے باوجود حکومت کے معاشی منتظمین کی نظر میں اصل ہدف صرف یہ ہے کہ عوام سے زیادہ سے زیادہ ٹیکس کیسے وصول کیا جائے، وزارت خزانہ کو اس بات کی کوئی فکر نہیں ہے کہ لوگوں کی آمدنی میں اضافہ اور اخراجات میں کمی کیسے ہو، ایسا لگتا ہے کہ حکومت کے معاشی منتظمین تباہ شدہ معیشت کو سنبھالا دینے کے اقدامات سے دانستہ اجتناب کر رہے ہیں تاکہ ملک کی معیشت امریکا آئی ایم

ایف اور عالمی اداروں کے شکنجے میں جکڑی رہے، کیونکہ امریکہ نہیں چاہتا کہ بیرونی وسائل پر پاکستان کا انحصار کم ہو، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ قرضوں کے شیطانی چکر سے نکلے بغیر ملک سے غربت، مہنگائی اور بے روزگاری کا خاتمہ ممکن نہیں ہے۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ محض دعووں کے سہانے خواب دکھا کر اور اعداد و شمار کی جادوگری کا مظاہرہ کرکے پسے ہوئے پسماندہ عوام اور محروم طبقات کی حالت نہیں بدلی جاسکتی، جس بجٹ میں اعداد و شمار کے گورکھ دھندے کے تحت قوم کو سب اچھا کی تصویر دکھائی جائے مگر اس میں اخراجات 27 کھرب روپے کے مقابلے میں وسائل 24 کھرب روپے کے ظاہر کئے جائیں، اس بجٹ سے پسماندہ طبقات کی بہتری اور قوم کی فلاح و بہبود کی کیا توقع رکھی جاسکتی ہے، کیونکہ جب وسائل، آمدن اور اخراجات کا تناسب ہی حوصلہ شکن ہو تو عوام کو ریلیف دینے کا تصور بھی ایک سراب بن کر رہ جاتا ہے، دوسری طرف طرفہ تماشہ دیکھئے کہ کیری لوگر بل کے تحت منظور شدہ جو امداد ابھی امریکہ سے وصول بھی نہیں ہوئی، اسے بھی بجٹ کی متوقع آمدنی میں شمار کیا گیا ہے جو ترقیاتی بجٹ کے حوالے سے قوم کی آنکھوں میں سراسر دھول جھونکنے کے مترادف ہے، لہٰذا بجٹ میں پیش کئے جانے والے اعداد و شمار محض لفظوں کا ایسا گورکھ دھندہ ہیں جو عوام کو ریلیف فراہم کرنے کے سارے دعووں کی قلعی کھولتے ہیں، چنانچہ اِن حالات میں

موجودہ بجٹ کو وزیراعظم کی جانب سے "غریب دوست بجٹ" قرار دینا عوام کے ساتھ ایک سنگین اور بھیانک مذاق کے سوا اور کچھ نہیں۔

فتنہ قادیانیت کے خلاف مستند عکسی و دستاویزی ثبوت

" ثبوت حاضر ہیں جلد 3 "

''ثبوت حاضر ہیں جلد 3" نوجوان اسکالر و محقق محمد متین خالد کی قادیانیوں کی اسلام کے خلاف ہرزہ سرائیوں، مضحکہ خیزیوں اور کفریہ عقائد و عزائم کے مستند عکسی و دستاویزی ثبوت پر مبنی "ثبوت حاضر ہے" سلسلے کی تیسری اور تازہ تالیف ہے،اس کتاب کی " تقریظ " میں علامہ جمیل احمد نعیمی (استاذ الحدیث وناظم تعلیمات دارالعلوم نعیمیہ کراچی) لکھتے ہیں کہ "عقیدہ ختم نبوت اسلام کا وہ بنیادی اور مرکزی عقیدہ ہے جس میں معمولی سا شبہ بھی کفر ہے،امام اعظم امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ "جو شخص کسی جھوٹے مدعی نبوت (نبوت کا دعویٰ کرنے والا) سے دلیل طلب کرے وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔"کیونکہ دلیل طلب کرکے اُس نے اجرائے نبوت کے امکان کا عقیدہ رکھااور یہی کفر ہے، عقیدہ ختم نبوت اسلام کی بنیادو اساس ہے جس پر مکمل ایمان رکھے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا،قرآن مجید کی 100 کے قریب آیات اور 200 سے زائد احادیث مبارکہ سے ثابت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی اور رسول ہیں،آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی قسم کا کوئی نیا نبی نہیں، تمام صحابہ کرام،تابعین عظام، تبع

تابعین، ائمہ مجتہدین اور چودہ صدیوں کے مفسرین، محدثین، متکلمین، علماء اور صوفیاء سمیت پوری اُمت مسلمہ کا اِس بات پر اجماع رہا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ساتھ ہی نبوت و رسالت کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بند ہوگیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نئے نبی کے آنے کی ضرورت باقی نہیں رہی، لہذا اب اگر کوئی شخص کسی بھی معنوں میں دعوے نبوت کرتا ہے تو وہ بالاتفاق اُمت کافر و مرتد، کذّاب و دجّال اور دائرہ اسلام سے خارج قرار پاتا ہے..... قرآن و حدیث میں اِس اَمر کی تصریح فرمادی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی اور رسول ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت آخری امت، آپ کا قبلہ آخری قبلہ، آپ پر نازل شدہ کتاب آخری آسمانی کتاب ہے، یہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ کے ساتھ منصب ختم نبوت کے اختصاص کے تقاضے ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے پورے کر دیئے..... چنانچہ اِن تصریحات، تشریحات اور دلائل و اقوال سے یہ بات ثابت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں اور آپ کے بعد قیامت تک نبوت و رسالت کا سلسلہ بند ہوچکا ہے، اِس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو شخص بھی نبوت و رسالت کا دعویٰ کرے اور پھر اس دعوے کے بارے میں کتنی ہی تاویلیں کیوں نہ کرے، اپنی نبوت کو ظلّی، بروزی، تشریعی، غیر تشریعی، یا لغوی ثابت کرنے کیلئے لاکھ جتن کرے، لیکن

اسے کافر، مرتد اور زندیق ہی قرار دیا جائے گا اور اُمت کو خبردار کر دیا گیا کہ وہ ایسے عیار و مکار جھوٹے مدعیان نبوت اور اُن کے ماننے والوں سے دور رہیں۔

بیسویں صدی میں فرنگی سرپرستی میں قادیان کے ایک ضمیر فروش مرزائے قادیانی نے جس نبوتِ کاذبہ کا دعویٰ کیا، اُس کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا تھا کہ جو بھی شخص مرزا کی نبوت پر ایمان نہ لائے وہ کافر قرار دیا جائے، چنانچہ قادیانیوں نے بھی یہی کیا، انہوں نے اُن تمام مسلمانوں کو اپنی تحریر و تقریر میں اعلانیہ کافر قرار دیا، جنھوں نے مرزا قادیانی کو نبی نہیں مانا، قادیانیوں کا مسلمانوں سے اختلاف صرف مرزا کی نبوت کے معاملے میں ہی نہیں تھا، بلکہ خود قادیانیوں نے اپنا خدا، اپنا اسلام، اپنا قرآن، اپنی نماز، اپنا روزہ، غرض کہ اپنی ہر چیز مسلمانوں سے الگ قرار دیا جس کا منطقی نتیجہ ظاہر ہے کہ اُن کے غیر مسلم اقلیت ہونے کی شکل میں نکلا، مرزا قادیانی نے اسلام کو نا قابل تلافی نقصان پہنچایا، برصغیر میں مرزا کی عجمی نبوت کا مقصد انگریزی اقتدار کی مضبوطی کیلئے مسلمانوں کی فکری وحدت کو پارہ پارہ کرنا اور جذبہ جہاد کا خاتمہ تھا، مرزا کی ساری زندگی انگریز کی حاشیہ برداری میں گزری، اُس نے اپنی زندگی کا اِک اِک لمحہ حکومت برطانیہ کی مدح سرائی اور جاسوسی میں صرف کیا، انگریز کا دور حکومت مرزا کے بقول سایہ رحمت اور"

"ایسے امن واستحکام کا باعث تھا، جو اُسے مکہ و مدینہ میں بھی نہیں مل سکتا۔
ایسی صورت میں مرزا کے متبعین یہ کب گوارہ کرتے کہ انگریز اِس سرزمین سے چلے جائیں، چنانچہ مرزا کی جماعت نے برصغیر میں انگریز کے قیام کو طول دینے کیلئے اُسے ہر ممکن مدد و معاونت ہی فراہم نہ کی بلکہ قصر نبوت میں نقب لگانے کی کوشش کرنے والے مرزا کی ذریت نے "اکھنڈ بھارت" کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کیلئے تحریک پاکستان کی بھرپور مخالفت بھی کی اور انھوں نے قیام پاکستان کے بعد بھارت و اسرائیلی گٹھ جوڑ سے عالمی سطح پر پاکستان کے خلاف سازشیں کرکے "وجود پاکستان" کو نقصان پہنچانے میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔
یہاں یہ تاریخی حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ قادیانیت کے خلاف تحریک تحفظ ختم نبوت کی رہبری و قیادت میں علماء و مشائخ اہلسنّت ہمیشہ پیش پیش رہے، علمائے اہلسنّت و جماعت کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ سب سے پہلے مومنانہ فراست سے کام لیتے ہوئے مرزا کے کفر و نفاق اور اُس کے مزموم عقائد کا پردہ چاک کرکے اُس کا اُس وقت زبردست ردّ کیا، جس وقت کچھ لوگ مرزائے قادیانی کو" مرد صالح "اور اُس کی کتاب" براہین احمدیہ" کو صدی کا شاہکار قرار دے رہے تھے، عین

اُسی وقت علمائے حق اہلسنّت و جماعت کے نمائندے عارف کامل "علامہ غلام دستگیر قصوری" مرزا قادیانی کی کتاب "براہین احمدیہ" میں کئے گئے مرزا کے دعوؤں کا بطلان اپنی کتاب "رجم الشیاطین براغلوطات البراہین" میں پیش کرکے اُس کے کفر و گمراہی کا پردہ چاک کررہے تھے،علامہ غلام دستگیر قصوری برصغیر کے سب سے پہلے عالم دین تھے جنھوں نے مرزا کی کتاب "براہین احمدیہ" کے ابتدائی حصے پڑھ کر اُس کے کفرگمراہی کو بھانپ لیا تھا اور انھوں نے بروقت اِس فتنے کا ردّ کرکے برصغیر کے مسلمانوں کو مرزا کے ناپاک عزائم سے آگاہ کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ تعاقب فتنہ قادیانیت کے سب سے پہلے سرخیل علامہ غلام دستگیر ہاشمی قصوری سے لے کر پیر سیدنا مہر علی شاہ صاحب،اعلیٰ حضرت امام احمد رضاخاں فاضل بریلوی، حجۃ الاسلام علامہ حامد رضاخان،امیر ملت پیر جماعت علی شاہ صاحب، مبلغ اسلام علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی،پروفیسر محمد الیاس برنی، قاضی فضل احمد
لدھیانوی،تاج العلماء مولانا مفتی عمر نعیمی، مفتی مظفر احمد دہلوی، قائد تحریک ختم نبوت ء علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری، مجاہد ملت حضرت علامہ عبدالستار خان 1953 نیازی، غازی تحریک ختم نبوت 1953ء سید خلیل احمد قادری، حضرت شیخ الاسلام خواجہ قمرالدین سیالوی، مفتی ظفر علی نعمانی، صوفی محمد ایاز خان نیازی اور علامہ عبدالمصطفیٰ الازہری تک

ہزاروں علماء و مشائخ اہلسنّت شامل ہیں، لیکن عصر حاضر میں جس کے نام پر قادر مطلق نے تحریک ارتداد قادیانیت کا سہرا مقدر فرمایا وہ شخصیت حضرت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کی ہے،تاریخ اسلام میں ریاست و مملکت کی سطح پر فتنہ انکار ختم نبوت کو کفرو ارتداد قرار دینے اور اُس کے خلاف سب سے پہلے علم جہاد بلند کرنے کا اعزاز جانشین رسول خلیفہ اوّل سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا اور اُن کے بعد یہ اعزاز ”اُنہی کی اولاد امجاد میں علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کو نصیب ہوا۔

علماء اسلام کی گرفت اور پارلیمنٹ کے متفقہ فیصلے کے بعد قادیانی جماعت نے اپنے لٹریچر کو چھپانے کی منظم کوشش کی اور اپنے اسلام دشمن عقائد پر تقیہ کا پردہ ڈال کر اہل اسلام میں نقب زنی کا عمل جاری رکھا،ایسے میں ضرورت اس اَمر کی تھی کے قادیانیت کے کفروارتداد کو مستند شہادتوں کے ساتھ عوام کے سامنے لایا جائے،لیکن مجبوری یہ تھی کہ قادیانی لٹریچر تک عوام تو کجا خواص کی بھی رسائی آسان نہیں اور اگر خوش قسمتی سے قادیانی کتب و رسائل دستیاب ہو بھی جائیں تو قادیانی اپنے لٹریچر کے ہر نئے ایڈیشن میں تحریف کا فریضہ باقاعدگی سے سرانجام دیتے رہتے ہیں،پھر دور جدید میں عوام کے پاس وقت کی بڑی قلت ہے کہ مرزائی لٹریچر کی ورق گردانی کرکے اُس میں سے حقائق تلاش کریں،جہاں تک قادیانی لٹریچر کے مطالعہ کا اتفاق ہوا،ہمیں اِن میں

اجراء نبوت و وفات مسیح کی کج بحثیوں، جھوٹے الہامات، نہ پوری ہونے والی پیشین گو
ئیوں، علماء و مشائخ کے خلاف دشنام طرازیوں، سیدنا مسیح علیہ السلام پر توہین آمیز
تبرّے، پادری عبداللہ آتھم سے ہونے والے مناظرے اور محمدی بیگم کی مناکحت کی
جھوٹی تاویلات کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آتا، علم و حکمت ہو بھی تو کیونکر، کہ خدا جب
ایمان لیتا ہے تو عقل و حکمت چھین لیتا ہے۔

مرزا کے ساتھ بھی یہی ہوا، آج مرزا اور اُس کے متبعین دین و دنیا دونوں میں ذلیل و
خوار اور راندہ درگاہ ہیں، مرزا کے رنگ برنگے ماضی، اُس کے جھوٹے
دعوؤں، تحریروں، جھوٹی وحی و الہامات اور پیشین گوئیوں کا تجزیہ ہمیں یہ نتیجہ اخذ
کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ وہ ایک باخبر کذّاب تھا اور وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی
دھوکہ دے رہا تھا، اُس نے خدا کے نام اور جعلی نبوت کو سامراجی مقاصد کی تکمیل میں
استعمال کیا اور اُس کے اِس تمام کاروبار کا مقصد ذاتی عظمت اور مذہب کے نام پر دولت
و شہرت اکٹھی کرنا تھا، قادیانیوں کی انجیل "تذکرہ" میں وہ لغویات اور احمقانہ پن ہے
جو کسی اہم شخص کی سوانح عمری اور تاریخ میں ہرگز نہیں ملتا، مرزا قادیانی کی جھوٹی
وحی عربی، اردو، فارسی، انگریزی، عبرانی، ہندی اور پنجابی زبان میں ہے، زبان گھٹیا،
مبہم، عامیانہ، گندی اور غلط ہے، حقیقت میں اُس کا بڑا حصہ لغو اور بے معنی فقرات پر
مشتمل ہے، جس کے کوئی واضح معانی نہیں ہیں، پھر بھی قادیانی ذریت

اُس کے بیانات کی مختلف تاویلات پیش کرکے مرزا کی جھوٹی نبوت ثابت کرنے اور امت مسلمہ کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے، چنانچہ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ قادیانیوں کی اسلام دشمن سرگرمیوں اور ان کے اسلام کی خلاف ہرزہ سرائیوں، مضحکہ خیزیوں اور کفریہ عقائد و عزائم کا بھرپور محاصرہ کیا جائے، قادیانیت کی حقیقی گھناونی تصویر اوراسلام دشمن شرمناک کردار لوگوں کے سامنے رکھا جائے اور اُن کیلئے راہ فرار کے تمام دروازے بند کردیئے جائیں۔

جناب محمد متین خالد کی زیر نظر کتاب "ثبوت حاضر ہیں ! جلد 3" قادیانیت کی انہی اسلام اور پاکستان دشمن شرمناک تصاویر پر مبنی ہے، جو صاحب مولف کی 10 سالہ شبانہ روز انتھک محنت کا نتیجہ ہے، یہ عالم اسلام کی اپنی نوعیت کی منفرد اور شاہکار کتاب ہے جس میں قادیانیوں کی اسلام کے خلاف ہرزہ سرائیوں، مضحکہ خیزیوں اور کفریہ عقائد و عزائم کو مستند عکسی و دستاویزی شہادتوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، نو ابواب پر مشتمل اس کتاب میں قادیانی اخلاق، کذب و بہتان، لعنت بازی، تضاد بیانیاں، قادیانی تحریفات اور اوٹ پٹانگ پیشین گوئیاں کا پردہ چاک کیا گیا ہے، کتاب قادیانیوں کے متعلق نادر معلومات، حیرت انگیز اکتشفات، ہوش ربا انکشافات، سنسنی خیز واقعات، نا قابل تردید حقائق اور مذموم سرگرمیوں کے خفیہ گوشے لیے ہوئے ہے، اِس کتاب میں تمام قادیانی کتب اور اخبارات و رسائل کے ہزاروں صفحات کھنگالنے کے بعد

قادیانیوں کے مذموم عقائد و عزائم کے عکسی ثبوت یکجا کردیے گئے ہیں۔
جن کی موجودگی میں قادیانیوں کی طرف سے کسی قسم کا انکار،تاویل یا بہانہ ناممکن ہے،ہماری نظر میں آج قادیانیت کی اصل حقیقت کو سمجھنے کے لیے اِس سے بہتر کتاب کوئی نہیں،یہ کتاب اِس لحاظ سے بھی بہت اہم ہے کہ اِس کا مطالعہ
علما،خطباء،وکلاء،اساتذہ اور طلبہ کو فتنہ قادیانیت کے خلاف مضبوط دلائل اور ٹھوس معلومات کا ذخیرہ فراہم کرتا ہے اور قادیانیت کے خلاف ہر عدالتی مقدمہ،بحث اور مناظرہ میں مستند حوالے کی حیثیت سے پیش کیا جاسکتا ہے،کتاب کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر ہر مسلمان کے لیے اِس کا مطالعہ ناگزیر ہے،کتاب علم و عرفان پبلیشرز،الحمد مارکیٹ،40،اردو بازار،لاہور سے حاصل کی جاسکتی ہے

اسلام پسندوں کی کامیابی، ترکی میں بیداری کی نئی لہر

ترکی میں اسلام پسندوں کی کامیابی

گزشتہ دنوں ترکی میں ہونے والے عام انتخابات میں حکمراں جماعت جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی 59.11 فیصد ووٹ لے کر تیسری بار حکومت کرنے کیلئے منتخب ہو گئی۔ابتدائی اطلاعات کے مطابق جسٹس پارٹی نے 550 کے ایوان میں 326 نشستیں حاصل کرکے تاریخ ساز کامیابی حاصل کی اور 81 میں سے 66 صوبوں پر اپنی برتری قائم کردی۔انتخابات کے غیر سرکاری نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر دوسرے شخص نے ترک وزیراعظم رجب طیب اردگان کے حق میں ووٹ دیا اور عوام نے فوجی دباؤ کو یکسر مسترد کردیا، جس کے بعد ملک میں نئے سول آئین تیار کرنے کی راہ ہموار ہو گئی ہے۔حزب اختلاف کی جماعت ری پبلیکن پیپلز پارٹی نے 135 نشستیں حاصل کیں اور 25 فیصد ووٹوں کے ساتھ صرف 8 صوبوں تک ہی محدود رہی۔دیگر جماعتوں میں نیشنلسٹ ایکشن پارٹی نے 54 جبکہ آزاد امیدواروں نے 35 نشستیں حاصل کیں،ترکی کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کی طیب اردگان نے مسلسل تیسری بار کامیابی حاصل کی ہے اور انہوں نے ہر بار پہلے سے زیادہ ووٹ حاصل کیے ہیں، قارئین کی معلومات کیلئے عرض ہے کہ 2002ء کے انتخابات میں اِس جماعت نے 34 فیصد ووٹ ملے تھے اور 2007ء انتخابات میں اِس جماعت نے 47 فیصد ووٹ حاصل

کیے تھے جبکہ جون 2011ء کے الیکشن میں اِس جماعت نے 59.11 فیصد ووٹ حاصل کئے ہیں، جو کہ حکمراں جماعت جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی کی روز بروز بڑھتی ہوئی مقبولیت کی بین دلیل ہے۔

قارئین محترم، یہ وہی ترکی ہے جو ایک عرصے تک خلافت عثمانیہ کا مرکز رہا اور جسے عالم اسلام میں مرکزی حیثیت حاصل رہی، مگر ایک عالمی سازش کے تحت ترکی سے خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد یہ ملک عالم اسلام میں اپنی حیثیت کھو بیٹھا، جدید ترکی کے بانی مصطفیٰ کمال اتاترک نے خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد ملک کا نظم و نسق چلانے کیلئے سیکولرازم کا سہارا لیا اور یوں صدیوں تک دنیائے اسلام کی قیادت کرنے والی ریاست اپنی مسلم شناخت سے یک لخت محروم ہو گئی، مصطفیٰ کمال پاشا نے مذہب سے نفرت کو سیکولرازم کی تعریف قرار دیا اور اسے ہر شعبہ ہائے زندگی سے خارج کر دیا، اُس نے ملک کو مغربی ممالک کے ہم پلہ بنانے کے لئے سب سے پہلے اسلام کو زد پر رکھا، مدارس کو بند کر دیا گیا، قرآن کریم کا پڑھنا اور تعلیم دینا جرم بن گیا، بے ضرر صوفی سلسلوں پر بھی پابندی لگائی گئی، عورتوں کے لئے پردہ موقوف کر دیا گیا، مرد و خواتین کو جبراً مغربی لباس پہننے پر مجبور کیا گیا، ترکی ٹوپی ممنوع قرار دے دی گئی، نام اختیار کرنے کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج بیشتر ترک باشندوں کے نام عثمانی عہد کے ناموں سے یکسر مختلف ہیں، جن سے

کبھی مسلمان ہونے کی بو آتی تھی، اسلامی کلینڈر کا بھی خاتمہ کر دیا گیا، اسلام کے عائلی قوانین کا خاتمہ کرکے اُس کی جگہ سوئس قوانین کو آئین کا حصہ بنایا گیا۔

نتیجتاً کثرت ازدواج بھی ممنوع ہو گئی اور یہ حال ہوگیا کہ 98 فیصد مسلمانوں کے حامل ملک میں ایک سے زائد شادی کرنے والے افراد دوسری بیوی کو اپنی گرل فرینڈ قرار دیتے تو اُن سے کوئی باز پرس نہ کی جاتی، البتہ دو بیویاں رکھنے پر دھر لیا جاتا، عربی رسم الخط کو کالعدم قرار دے کر لاطینی رسم الخط اختیار کیا گیا، چن چن کر عربی اور فارسی الفاظ کو زبان سے نکال دیا گیا، مساجد میں عربی زبان میں اذان دینے اور حج کی ادائیگی پر بھی پابندیاں لگا دی گئی، پانچ صدیوں تک مرکزی حیثیت رکھنے والے شہر استنبول کی جگہ دارالحکومت کو انقرہ منتقل کر دیا گیا، فتح قسطنطنیہ کی سب سے اہم نشانی "ایا صوفیہ" کو مسجد سے عجائب گھر بنا دیا گیا، کمال اتاترک نے بہت سے رہنماؤں کو زندانوں میں ڈلوا دیا، یا سزائے موت دے دی، محمد عاکف جیسے عظیم شاعر اور مشہور مصنفہ خالدہ ادیب خانم نے اپنے شوہر کے ساتھ جلا وطنی کو غنیمت جانا، غرضیکہ اتاترک نے پوری کوشش کی کہ اسلام اور مسلمانوں سے تعلق کی ہر نشانی کو مٹا کر ترکی کو مشرق سے کاٹ کر مغرب کا حصہ بنا دیا جائے، اُس نے اسلام کا حلیہ بگاڑ کر ترک مسلمانوں کو ان کے صدیوں پر محیط عظیم علمی

ادبی و ثقافتی ہر اُس ورثے سے محروم کر دیا جو فکر اسلامی کا عکاس تھا۔
حال یہ تھا کہ 1960ء تک ترکی میں اسلام کا نام لینا بھی ایک جرم تھا، یہ وہی سال تھا جس میں وزیر اعظم عدنان میندریس کو اسلامی رجحان رکھنے کے جرم میں پھانسی دی گئی تھی، مگر انہی حالات میں ڈیزل میکانکس کے کامیاب سائنسدان کی حیثیت سے شہرت حاصل کرنے والا ایک 34 سالہ نوجوان "نجم الدین اربکان" ترکی میں اسلام کے نام پر ایک تحریک بپا کرتا ہے، اپنی جدوجہد کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے کیلئے نجم الدین اربکان کو پانچ مرتبہ نئی پارٹیاں قائم کرنی پڑی، انتخابات جیتنے کے بعد بھی اُن کی پارٹی پر پابندی لگائی جاتی رہی، اثاثہ جات ضبط کئے جاتے ہیں، پابند سلاسل کیا جاتا ہے، لیکن یہ اربکان ہی کا حوصلہ وہمت تھی کہ بار بار کی پابندیوں، اثاثوں کی ضبطی اور قید و بند کے باوجود صبر کا پہاڑ بنے رہے، آشیانہ بار بار جلتا رہا مگر وہ ہر بار نئے حوصلہ کے ساتھ تنکا تنکا جمع کرکے نیا آشیانہ تعمیر کرتے رہے، وہ ترک فوج جو ملک کی سیکولر پہچان کی نگہبان سمجھی جاتی ہے اور جس نے ملک میں اسلامی طرز زندگی بدلنے میں اہم ترین کردار ادا کیا، نجم الدین اربکان کی ذات اُس کے سامنے پہلی چٹان کے روپ میں سامنے آئی، انھوں نے جمہوری طریقے سے انتخابات میں حصہ لے کر کامیابی حاصل کی اور حکومت بنائی، لیکن جب جرنیلوں کو اپنا اقتدار خطرے میں نظر آنے لگا، تو پہلے تو اُن پر بے جا قسم کی پابندیاں عائد

کی گئیں پھر نجم الدین اربکان کی حکومت توڑ دی گئی، رفاہ پارٹی پر پابندی لگا دی گئی، لیکن نجم الدین اربکان نے جو راستہ کھول دیا تھا وہ فوج سے بند نہ ہو سکا، رفاہ پارٹی فضیلت پارٹی کے روپ میں سامنے آئی اور آج جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی کے نام سے اقتدار میں ہے۔

ترکی کے موجودہ وزیراعظم رجب طیب اردگان نجم الدین اربکان کے تربیت یافتہ اور دینی مدرسے سے فارغ التحصیل ہیں، آج فوج کے تمام ترجبر واستبداد کے باوجود ترک عوام کی اسلام سے محبت بڑھتی چلی جارہی ہے، خیال رہے کہ گزشتہ انتخابات کے موقع پر سیکولر عناصر نے فوج کی شہ پر بڑے بڑے احتجاجی جلوس نکالے لیکن سب بے اثر رہے، عوام نے جسٹس پارٹی کے حق میں اپنا فیصلہ دیا، عوامی تائید کی وجہ سے فی الوقت فوج بھی کسی مہم جوئی کی پوزیشن میں نہیں ہے، کچھ عرصہ قبل حکومت کا تختہ الٹنے کے الزام میں کئی فوجی افسر گرفتار کیے جاچکے ہیں، حال ہی میں دو حاضر سروس جنرل بھی پکڑے گئے ہیں، یہ عوامل ظاہر کرتے ہیں کہ اسلام پسندوں کی بڑھتی ہوئی قوت کے سامنے فوج بے بس ہوتی جارہی ہے، لیکن فوجی بغاوت کا ظہور کسی وقت بھی ممکن ہے، ہر چند کہ فوج بزعم خود اُس سیکولرازم کی محافظ ہے جو ترکی میں دم توڑ رہا ہے، لیکن عالمی دہشت گرد امریکہ کسی بھی مسلم ملک میں امن وامان نہیں دیکھنا چاہتا اور اسلام پسندوں کا عروج تو اُسے کسی بھی حالت میں قبول نہیں ہے، چنانچہ سی آئی

اسے ترکی میں اسی طرح کی بغاوت کروا سکتی ہے جس طرح اُس نے الجزائر میں اسلامک فرنٹ کے خلاف کرائی تھی، آپ کو یاد ہوگا کہ الجزائر میں عباسی مدنی کی قیادت میں اسلام پسندوں نے انتخابات میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی لیکن وہاں بھی امریکہ اور اُس کے صلیبی حواریوں نے فوج کی مدد سے انہیں اقتدار سے دور رکھا اور عباسی مدنی کو ایوان اقتدار کے بجائے جیل بھیج دیا گیا، ترکی میں بھی یہی کوشش دہرائی جا سکتی ہے۔ کیونکہ موجودہ الیکشن میں ترک عوام نے سیکولرازم کو ہی مسترد نہیں کیا ہے بلکہ عوام کی اکثریت نے سیکولرازم اور فوجی آئین کے خلاف اپنا فیصلہ بھی دے دیا ہے، آج ترکی میں صورتحال بدل چکی ہے، جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی عوام کی تائید و حمایت سے آگے بڑھ رہی ہے، وزیر اعظم رجب طیب اردگان اور صدر عبداللہ گل کی قیادت میں سیکولر ترکی نے ایک نئی انگڑائی لینی شروع کی ہے، اب یورپی یونین میں شرکت کے لیے بھیک مانگتا ترکی ایک نئے روپ میں سامنے آرہا ہے، وزیر اعظم طیب اردگان اور صدر عبداللہ گل کی اسلام پسند پارٹی ترکی کی سیاست پر حاوی نظر آتی ہے، فوج کی جانب سے تشویش کے باوجود عوام میں اسلامی تشخص مقبولیت اختیار کرتا جا رہا ہے، اسلام کا یہ سابق گڑھ اب اپنا جھکاؤ اسلامی ممالک کی جانب بڑھا رہا ہے، ماضی میں ترکی کو اسرائیل اور امریکہ کا بہترین حمایتی سمجھا جاتا رہا ہے لیکن آج ترکی اسرائیل کی مخالفت

میں کسی بھی اسلامی ملک سے زیادہ سرگرم نظر آتا ہے،آپ کو یاد ہوگا کہ ترک صدر عبداللہ گل نے سوئٹزرلینڈ میں انٹرنیشنل کانفرنس کے دوران غزہ میں اسرائیلی قتل عام کے خلاف آواز بلند کی تھی،یہ بات بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ جب اسرائیلی صدر ایہود اولمرٹ کی بات کا جواب دینے کے لیے ترک صدر کو مناسب وقت نہ دیا گیا توانہوں نے اجلاس سے احتجاجاً بائیکاٹ کر دیا تھا،جسے بعض حلقوں نے ترک صدر کا جذباتی فیصلہ قرار دیامگر یہ بات غلط ثابت ہوئی اور ترکی نے مسلسل اسرائیل کی پرزور مخالفت کرکے غزہ پر حملوں کے مسئلے پر آواز بلند کی،اسی طرح ترکی نے اپنے ہاں ہونیوالی فوجی مشقوں سے بھی اسرائیل کو بے دخل کر دیا،ترک وزیر اعظم نے واضح طور پر اعلان کیا کہ یہ اقدام غزہ میں اسرائیلی جارحیت کے جواب میں کیا گیا ہے،جس پر امریکہ اور کئی دوسرے مغربی ممالک کی جانب سے تشویش کا اظہار بھی کیا۔

تاہم ترکی نے اِن سب اعتراضات کو مسترد کر دیا،دوسری طرف ترکی نے امریکہ،اٹلی اور اسرائیل کی شراکت سے ہونیوالی فوجی مشقیں کو منسوخ کرتے ہوئے شام کے ساتھ مل کر فوجی مشقیں کرکے مغربی دنیا کو ایک نیا پیغام بھی دیا،ترکی کے سرکاری ٹی وی نے غزہ میں ہونیوالی بربریت کے خلاف ایک ڈرامہ بھی تیار کیا جس میں اسرائیلی فوجیوں کو قتل عام کرتے اور معصوم لوگوں کو ظلم کا نشانہ بناتے ہوئے دیکھایا گیا،جس پر اسرائیلی وزیر خارجہ اور وزیر

اعظم نے اِس ڈرامے کو اشتعال انگیز قرار دے کر روکنے کا مطالبہ کیا، لیکن ترکی نے سیپیرشن نامی اِس ڈرامے کو روکنے سے انکار کر دیا،ترک وزیر اعظم نے اپنے حالیہ دورہ پاکستان میں تمام مسائل کو مشترکہ جدوجہد سے حل کرنے کا اعلان کرتے ہوئے مسئلہ کشمیر کو جلد از جلد اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق حل کرنے کا مطالبہ بھی کیا، جوکہ یہود و ہنود اور صلیبی قوتوں کیلئے ایک واضح پیغام تھا،انھوں نے ایران پر کسی قسم کے حملے کو پاگل پن قرار دیتے ہوئے ایران کی بھرپور حمایت کا اعلان بھی کیا،ترک وزیر اعظم کے یہ سارے اقدامات اِس بات کے عکاس ہیں کہ ترکی اِس بار عالمی سامراج کے ایجنٹ کے طور پر نہیں بلکہ اسلامی جذبات کی حامل قیادت کے تحت ہم مذہب ممالک سے تعلقات کی بہتری کی کوششوں کے لئے خلوص دل سے کوشاں ہے، حقیقت یہ ہے کہ جب سے ترکی نے یورپی یونین میں شمولیت کی بھیک مانگنے کی بجائے اسلامی ممالک کے ساتھ تعلقات کی بہتری کا فیصلہ کیا ہے، عالم اسلام میں اُس کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے، خلاف عثمانیہ کے دور میں اسلام کا یہ مرکز ایک پھر اسلامی قوت کا گڑھ بن کر ابھر رہا ہے، جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی کی تیسری بار کامیابی اِس بات کی علامت ہے کہ ترکی کے عوام اپنی اسلامی اقدار اور شناخت کا دوبارہ احیاء چاہتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ جسٹس پارٹی کی حالیہ شاندار کامیابی نے ترکی سے سیکولر آئین کے چھٹکارے کی راہ ہموار کر دی ہے،یقینا اسلام پسندوں کی یہ کامیابی اسلام اور عالم اسلام کیلئے اِک اُمید نو کی مظہر ثابت ہو گی۔

دنیا کرے گی یاد مجھے زندگی کے بعد۔۔۔۔

آہ.... نور احمد میرٹھی بھی رخصت ہوئے

کوئی دو سال پہلے کی بات ہے جب جناب نور احمد میرٹھی صاحب سے ہمیں پہلی دفعہ
ملاقات کا موقع ملا، یہ ملاقات جہاں خوشگوار حیرت کا باعث تھی وہیں تکلیف اور دکھ کا
بھی سبب بنی،آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ دونوں کیفیتیں ایک ساتھ کیسے
،تو عرض ہے کہ خوشگوار حیرت اس لیے کہ ہم جناب میرٹھی صاحب کو بچپن سے کسی
اور حیثیت سے جانتے تھے،ہمیں نہیں معلوم تھا کہ بچپن میں جس ڈاکٹر کے کلینک سے
ہم دوا لیتے رہے وہاں پر ڈاکٹر صاحب کے اسٹینٹ کے فرائض انجام دینے والے کوئی
عام آدمی نہیں بلند پایہ ادیب اور محقق بھی ہیں،اگر جناب ندیم صدیقی صاحب
روزنامہ اردو ٹائمز ممبئی نیٹ پر ہماری توجہ اس جانب مبذول نہ کراتے تو شاید یہ راز
ہم پر کبھی نہ کھلتا کہ جنھیں ہم بچپن سے کسی اور حیثیت سے جانتے تھے،وہی دراصل
دنیائے ادب کی عظیم شخصیت نور احمد میرٹھی ہیں،ندیم صدیقی صاحب سے ہمارا تعلق
دراصل ہماری کتاب " تحریک تحفظ ختم نبوت سیدنا صدیق اکبر تا علامہ شاہ احمد نورانی
صدیقی "کے حوالے سے محبت کے درجے میں داخل ہوا تو نیٹ پر باتوں باتوں میں
ایک دن انہوں نے ہمیں کراچی کے

علاقے کورنگی زمان ٹاؤن میں رہائش پذیر اپنے دوست جناب نور احمد میرٹھی صاحب کا فون نمبر دے کر اُن کی خیریت سے آگاہی اور سلام پہنچانے کی استدعا کی۔
چنانچہ ہم نے ندیم صدیقی صاحب کی معرفت جناب نور احمد میرٹھی صاحب کو فون کرکے اُن کی خیریت معلوم کی اور انہیں ندیم صدیقی صاحب کا سلام پہنچایا، یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلتا رہا، آخر ایک دن جناب نور احمد میرٹھی صاحب نے فرمایا، احمد صاحب آپ اکثر فون کرکے خیریت معلوم کرتے ہیں، کسی دن تشریف لاکر شرف ملاقات بخشیں، چنانچہ ہم جناب نور احمد میرٹھی صاحب کے آشیانے پر پہنچے، چہرہ شناسا سا لگا، بات چیت اور مکمل تعارف میں یہ عقدہ کھلا کہ موصوف ہمارے علاقے میں جاوید کلینک پر ڈاکٹر جاوید کی معاونت کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں، یہ ملاقات جہاں خوشگوار حیرت کا باعث تھی وہیں یہ دیکھ کر تکلیف ہوئی کہ نور احمد میرٹھی صاحب سات ماہ سے ریڑھ کی ہڈی میں ٹی بی کی وجہ چلنے پھرنے سے معذور ہیں، بستر پر ہونے کے باوجود وہ نہایت ہی محبت اور خنداں پیشانی سے پیش آئے اور چلتے وقت اپنی دس بیش قیمت تحقیقی کتابیں دوبارہ آنے کی تاکید کے ساتھ ہماری نذر کیں، یوں نور احمد میرٹھی صاحب سے وقتاً فوقتاً ملاقاتوں کا ایک سلسلہ چل نکلا، ہم جب بھی جاتے وہ نہایت محبت و شفقت سے پیش آتے اور مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ چھوڑتے، اکثر ملاقات

کیلئے آنے والوں سے ہمارا تعارف کراتے ہوئے کہتے "احمد صاحب ہمارے حلقہ احباب میں خوبصورت اضافہ ہیں" نور احمد میرٹھی صاحب خوددار، پرعزم اور حوصلہ مند انسان تھے، انہوں نے اپنی ہمت اور قوت ارادی کے بل پر اپنی بیماری کو شکست دینا شروع کردی تھی، ہم ان سے اپنی آخری ملاقات جو کہ برادرم معروف کالم نگار اعظم عظیم اعظم کے ہمراہ ہوئی شاید کبھی بھول نہ پائیں، اس ملاقات میں ہم نے انہیں بغیر سہارے کے چلتے ہوئے پایا، انہوں نے اپنے کچن میں خود ہمارے لیے چائے بنا کر پیش کی، دیر تک خوبصورت باتیں کرتے رہے، چلتے وقت فرمایا "احمد صاحب جلدی آیئے گا زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے" واقعی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، 18 جون 2011ء کو ان کی رحلت کی دلگداز خبر سننے کو ملی، دنیائے علم وادب یہ آفتاب اپنی محبت بھری یادیں چھوڑ کر ہمیشہ کیلئے غروب ہوگیا۔

میرٹھ کی سرزمین ہمیشہ سے باکمال لوگوں کا گہوارہ رہی ہے جہاں علم و دانش کے کئی شگوفے پھوٹ کر قدآور درخت بنے، فکرو فہم اور علم و دانش کے اِن گلوں نے مہک کر برصغیر کی فضا کو معطر اور دیدہ ودل کو منور کیا، اِسی گدازپارہ صفت مٹی سے نور احمد میرٹھی کا وجود بھی نموپایا، نور احمد میرٹھی کے والد سید محمد احمد کا تعلق دہلی اور والدہ کا میرٹھ سے تھا، نور احمد میرٹھی نے 17 جنوری 1948ء کو دہلی میں آنکھ کھولی اور اپنے نانا سید نورالہی کے زیر

سایہ میرٹھ میں پرورش پائی، فیض عام انٹر کالج میرٹھ سے تعلیم حاصل کی، موصوف
کے نانا کا حلقہ احباب وسیع اور ماحول خالص مشرقی تھا،اسی لیے علم و تہذیب کی چھاؤں
جو سونے کو کندن بنادے، میں اُن کا فکر و شعور پروان چڑھا،وہ اپنے نانا سے بہت متاثر
اور عملی ادبی کام میں اشرف علی زبیری کے ممنون تھے، جنوری 1962ء میں پاکستان
منتقل ہوئے اور بقیہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد سماجی،ادبی اور صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔
برصغیرپاک و ہند میں غیر مسلموں کی حمدیہ، نعتیہ اور رثائی شاعری کے حوالے سے
تحقیقی کام کرنے نور احمد میرٹھی پہلے آدمی تھے،اُن کی ادبی خدمات کو مشاہیر اور دانشور
طبقہ نے سراہااور وہ آج دنیائے علم و ادب کی ایک جانی پہچانی شخصیت تھے،اُن کی ادبی
خدمات پر انہیں قائدِ اعظم ادبی ایوارڈ اور پاکستان نعت اکیڈمی کا سلور جوبلی ایوارڈ بھی
ملا، نور احمد میرٹھی کی دوررس متلاشی نگاہیں ہمیشہ عجیب عجیب نکتے تلاش کرکے اپنی بو
قلمی کے نادر شاہکار تراشتی ہیں اور جدید و منفرد انداز اُن کے محور فکر پر رقصاں
رہی، جس کا عملی اظہار ان کی وہ تصنیفات ہیں جو موجودہ اور آنے والی نسلوں کیلئے
سرمایہ افتخار ہیں، حقیقت یہ ہے کہ نور احمد میرٹھی ایک مکمل سوچ، مجسم فکر، سراپا
خلوص اور بے پایاں محبت کی وہ شبنم تھے جو ذہنوں کو طمانیت اور زندگی کو حرارت
بخشتی ہے۔

جن لوگوں نے علم وادب کو مقصد حیات بنا کر مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی نظم "پن چکی" کی طرح دُھن اور لگن سے کام کیا،اُن میں نوراحمد میرٹھی کا نام نمایاں و ممتاز مقام رکھتا ہے،اُن کی درجن بھر چھوٹی،بڑی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں اذکار وافکار، نورسخن، گلبانگ وحدت، بوستان عقیدت، انتخاب، اشاریہ، صابر براری کی" تخلیقات،تذکرہ شعرائے میرٹھ، مشاہیر میرٹھ، شخصیات میرٹھ اور بہرزماں بہرزباں جیسی نادر ونایاب اور اچھوتی کتابیں شامل ہیں،اس کے علاوہ مہرو ماہ،فراز خودی،جام طہور، چشم شوق،تاریخ رفتگاں،پانی پہ نقوش، ہوا چراغ آئینہ، خواب سے بیداری تک، دکھ موسم اور خواب، اعتبار کا موسم اور کتابوں پر تاریخی قطعات بھی آپ کی مرتبہ کتب میں شامل ہیں،جناب نوراحمد میرٹھی کی تمام کتابیں بین الاقوامی ادبی معیار کے مطابق چھاپی گئی ہیں۔

آپ 26،27 سال اسی کام میں لگے رہے کہ میرٹھ کے لوگوں نے علم وادب اور زندگی کے مختلف شعبوں میں علمی و تخلیقی سطح پر جو خدمات انجام دی ہیں،انہیں بصورت تذکرہ یکجا و مرتب کرکے دنیا کے سامنے پیش کیا جائے، میرٹھ سے تعلق رکھنے والی قومی و ملی تاریخ کی اِن عظیم شخصیات کے ذکر کے بغیر ہماری تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی،اِن سب شخصیات کو سمیٹ کر تذکرے کی صورت میں یکجا کرنا کوئی

آسان کام نہیں تھا،اِن کاموں کیلیئے ادارے بنائے جاتے ہیں،جہاں بہت سے لوگ مل کر کام کرتے ہیں اور پھر کوئی نتیجہ برآمد ہوتا ہے،لیکن نوراحمد میرٹھی نے یہ کام تن تنہا کرکے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا جس پر نہ صرف نوراحمد میرٹھی بلکہ ہم سب بجا طور پر فخر کرسکتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی سچ کہتے ہیں کہ "نوراحمد میرٹھی صاحب صاحب دل انسان ہیں،خلوص و محبت کا پیکر ہیں،دھن کے پورے،کام کے پکے.... علم و ادب اُن کا اوڑھنا بچھونا،دن رات اِسی کام میں لگے رہے اور گذشتہ پندرہ بیس سال کے عرصے میں کئی کتابیں مرتب کرکے شائع کرچکے ہیں جو سب کی سب اپنے موضوع پر اچھوتی اور اُن کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہیں،آپ لکھتے ہیں" بہر زمان بہر زبان کو ملا کر اُن کا یہ کام "تذکرہ شعرائے میرٹھ"، "مشاہیر میرٹھ، شخصیات میرٹھ"اتنا اہم ہوجاتا ہے کہ کسی بھی یونیورسٹی کو "انہیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دینی چاہیے۔

نوراحمد میرٹھی ادارہ فکر نو کراچی کے بانی،بزم اتحاد ادب،بزم شعر و سخن،ادارہ فوق الادب سے وابستہ اور آرٹس کونسل کراچی کے رکن بھی تھے،بیماری کی حالت میں بھی آپ تصنیف وتالیف کے کام میں تندہی سے مصروف رہے،اپنے انتقال سے قبل 1991 ء سے 2010ء تک چھپنے والے شعری مجموعوں اور نعتیہ کلام پر

انتخاب" کے عنوان سے جبکہ "گلستان عقیدت" کے نام سے غیر مسلموں کی منقبتی شاعری،تذکرہ شعرائے طنزومزاح، شعرائے طنزومزاح کی نعتیہ شاعری اور تذکرہ شاعرات پاکستان "پرکام کررہے تھے۔نوراحمد امیر ٹھی کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف بہت سے اہل علم و دانشوروں نے کیا ہے۔علامہ شاہ احمد نورانی فرماتے تھے "وہ کام جو مختلف حضرات مل کر کرتے انہوں نے تنہا کردکھایا۔"

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کہتے ہیں "نوراحمد میرٹھی کی نگاہ جستجو اور اشہب خیال نے بے بحر ظلمات میں غواصی کا فریضہ ادا کیا،اُن موتیوں کو تہہ آب سے باہر نکلااور نئی آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر لے آئے کہ عاشقان رسول کے دیدہ ودل منور ہوگئے۔"ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کہتے ہیں "جناب نوراحمد میرٹھی نے انتخاب اور ترتیب و تدوین کے فن کی تمام نزاکتوں کو خوب سمجھا اور بڑے سلیقے سے اپنے ادبی کاموں میں اِن کا اظہار کیا،یہ تذکرے اپنے حسن ترتیب اور حسن صورت کی بناء پر ہماری ادبی تاریخ میں یاد رکھے جائیں گے۔"محترم ضیاءالحق قاسمی کہتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ اُن کی خدمت کو شرف قبولیت بخشے۔"جناب زیڈ اے نظامی کہتے ہیں کہ "قدرت نے نوراحمد میرٹھی کو اِس خدمت کیلئے منتخب کرلیا،اُن کی تگ و دو اِس امر کی عکاسی کرتی ہے کہ وہ پورے انہماک اور خداداد صلاحتیوں کے ساتھ محو سفر ہیں.... کہ اُن کی یہ کاوشیں تاریخ ادب کا حصہ بنیں گی۔"

پروفیسر معین الدین عقیل کہتے ہیں کہ "ہمارا ادب اُن کے اِن کارناموں کو کبھی فراموش اور نظر انداز نہیں کر سکے گا۔" جناب حکیم محمد سعید مرحوم لکھتے ہیں کہ "محنت اور لگن سے قطع نظر نعتیہ کلام کے انتخاب میں بھی اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ صرف ایسا کلام منتخب کیا جائے جس میں جذبہ کی صداقت اور نئی خوبی کا پہلو ضرور ہو۔" ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کہتے ہیں "ز عشق مصطفےٰ دل ریش دارم ... رفاقت باخدائے خویش دارم ... آپ کو یہ رفاقت حاصل ہو۔"

حقیقت یہ ہے کہ جناب نور احمد میرٹھی کی زندگی محنت اور ایمانداری سے عبارت ہے، خود داری، قناعت اور غنا اُن کی زندگی کا خاصہ اور وجہ شناخت ہے، انہوں نے زندگی بھر اپنے رب پر توکل کے ساتھ بہادری سے حالات کا مقابلہ کیا اور ہمیشہ اپنی سفید پوشی کا بھرم قائم رکھا، کبھی حرف سوال زبان پر نہ لائے اور کبھی ایسی مدد کے طلبگار نہیں ہوئے، جو اُن کی طبیعت، مزاج اور زندگی بھر کے اثاثہ خود داری کے خلاف ہو، آج وہ ہم میں نہیں مگر اُن کی تحریریں ہمیشہ ہمیں اُن کی یاد اور اُن کے وجود کا احساس دلاتی رہیں گی۔

میرے حروف روشنی بانٹیں گے حشر تک
دنیا کرے گی یاد مجھے زندگی کے بعد

مسئلہ کشمیر پر عالمی ضمیر کی بیداری

تحریک آزادی کشمیر کا فیصلہ کن موڑ

مسلمانان کشمیر پر مظالم کی تاریخ تو کافی پرانی ہے، لیکن اِس کا باقاعدہ آغاز 16 مارچ 1846ء کو اُس معاہدہ امرتسر سے ہوا، جس کے ذریعے دنیا میں پہلی مرتبہ ایک نام نہاد مہذب قوم نے کشمیری مسلمانوں کو اُن کے وطن سمیت ہندو ڈوگرہ گلاب سنگھ کے ہاتھ صرف 75 ہزار روپے میں فروخت کر دیا، اُس دن سے کشمیریوں پر مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹنا شروع ہوئے اور اِن انسانیت سوز شرمناک مظالم کا سلسلہ آج بھی جاری ہے، جبکہ مظلوم کشمیریوں پر ہونے والے مظالم کو حقوق انسانی کی تنظیمیں اور میڈیا وقتاً فوقتاً دنیا کے سامنے لاکر عالمی ضمیر جگانے کی کوشش کرتا رہا ہے، گزشتہ دنوں بے جے پی کے رکن راجیہ سبھا اور سابق وزیر رام جیٹھ ملانی کی سربراہی میں مقبوضہ کشمیر کا دورہ کرنے والی غیر سرکاری کشمیر کمیٹی کی مرتب کردہ رپورٹ بھی اِس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے، بھارتی اخبار ٹائمز آف انڈیا کے مطابق رام جیٹھ ملانی نے اپنے دورے کے دوران کشمیری باشندوں پر توڑے جانیوالے بھارتی فوج کے مظالم پر سخت ذہنی کرب کا اظہار کیا اور کہا کہ مقبوضہ کشمیر میں لوگوں کے ساتھ نازی طرز کا ظلم ہو رہا ہے، اگر انکے ساتھ ناانصافیوں کا سلسلہ جاری رہا تو لوگ انصاف

کے حصول کیلئے متبادل راستے تلاش کرنے پر مجبور ہو جائینگے۔انہوں نے کہا کہ کٹھ پتلی
حکومت لوگوں کے ساتھ ناانصافیاں کر رہی ہے اور مقبوضہ جموں و کشمیر میں
غیر ضروری طور پر احتیاطی گرفتاری کے قوانین نافذ ہیں جن کا ناجائز استعمال کیا جا رہا
ہے۔انہوں نے مقبوضہ کشمیر کی کٹھ پتلی حکومت پر زور دیا کہ وہ گزشتہ چند سال میں
سرکاری کاروائیوں کے دوران شہید ہونیوالے نوجوانوں کے لواحقین سے معافی مانگے
اور انہیں بھرپور معاوضہ فراہم کرے۔
دوسری طرف انسانی حقوق کی عالمی تنظیم ہیومن رائٹس واچ نے بھارت پر زور دیا ہے
کہ اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کمیٹی کا رکن بننے کے بعد وہ اپنے وعدے پورے کرے اور
مقبوضہ کشمیر میں سیکورٹی قوانین پر نظرثانی کرے، جبکہ یورپی پارلیمنٹ نے بھی بھارت
کے ساتھ آزادانہ تجارت کے سمجھوتے کو مسئلہ کشمیر سے مشروط کر دیا ہے اور اس
معاہدے کو موخر کرتے ہوئے بھارت پر زور دیا ہے کہ وہ پاکستان کے ساتھ تعلقات کو
فروغ دیکر مضبوط بنائے۔اس سلسلہ میں یورپی پارلیمنٹ کی طرف سے گزشتہ ماہ 11
مئی کو باضابطہ طور پر ایک قرارداد بھی منظور کی گئی جس میں بھارت کو باور کرایا گیا
کہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں، جمہوریت اور سیکورٹی یورپی یونین اور بھارت کے
مابین تعلقات کے بنیادی اجزاء ہیں۔اس تناظر میں بھارت سے کہا گیا ہے کہ وہ کشمیر کے
دیرینہ تنازعہ سمیت تمام تصفیہ طلب مسائل کے حل کیلئے پاکستان کے ساتھ مذاکراتی

عمل میں تیزی لائے۔ واضح رہے کہ یورپی پارلیمنٹ نے یہ اقدام فروری میں کشمیری رہنماؤں کی جانب سے دی گئی حقائق پر مبنی معلومات کی بنا پر کیا ہے۔ دیکھا جائے تو عوامی جمہوریہ چین کی طرف سے کشمیری باشندوں کو الگ ویزہ جاری کرنے کے فیصلے کے بعد یہ دوسرا بڑا واقعہ ہے جس میں ایک اہم بین الاقوامی فورم سے بھارت کو مسئلہ کشمیر حل کرنے کے لئے ہی نہیں کہا گیا بلکہ آزاد تجارت کو بھی انسانی حقوق کی پامالیاں روکنے سے مشروط کیا گیا ہے۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ مسئلہ کشمیر کے حل کے حوالے سے ہم سے بہت سی کوتاہیاں ہوئیں ہیں اور ہم بھارت کا اصل گھناؤنا چہرہ دنیا کے سامنے نہ لا سکے۔ جبکہ بھارت نے کشمیر میں اسرائیل سے بھی بڑھ کر انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں کیں، لیکن اِس کے باوجود ہم دنیا کو کشمیر کی طرف متوجہ نہ کرسکے۔ ہمارے اِس رویئے کی وجہ سے بین الاقوامی فورم پر نہ صرف کشمیر کا مقدمہ کمزور ہوا بلکہ بھارتی فوجی درندوں کو ہزاروں کشمیری مسلمانوں کو شہید کرنے کا بھی موقع ملا۔ دنیا کی آنکھوں میں جس طرح دھول جھونک کر ہندو بنیئے نے ایک آزاد ریاست پر قبضہ کیا وہ بذات خود تاریخ کا ایک بدترین باب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس بت پرست قوم کا نہ تو کوئی مخصوص مذہبی ضابطہ ہے اور نہ ہی کوئی اخلاقی و معاشرتی معیار ہے۔ گاؤ ماتا کے یہ پجاری ہندوستان کی سرزمین پر توحید و رسالت کی دعوت لے کر آنے والوں کو اُسی طرح بلاشرکت غیرے اپنی

ملکیت سمجھتے رہے جس طرح یہودی ارض فلسطین پر قبضے کو اپنا پیدائشی حق تصور کرتے ہیں، جبکہ ہر دو مقامات پر خون مسلم ارزاں بھی رہا اور نا قابل شکست بھی، اس کے باوجود پاکستان اور بالخصوص عالم اسلام آج تک دنیا کے اِن مظلوم مسلمانوں کیلئے کوئی متفقہ لائحہ عمل اختیار نہیں کر سکا۔ جس طرح امریکہ کی ناجائز اولاد اسرائیل فلسطینی بستیوں کو تاخت وتاراج کرکے قتل عام کی پالیسی پر عمل کر رہا ہے، ہندو بنیاء بھی مقبوضہ کشمیر میں اُسی پالیسی پر عمل پیرا ہے، دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے دعویدار ملک کی سات لاکھ سے زائد فوج وادی کشمیر میں قتل و غارت گری کا عمل جاری رکھے ہوئے ہے۔

جبکہ کشمیری قافلہ حریت کے وکیل پاکستان میں نائین الیون کے بعد برسر اقتدار آنے والی حکومتوں نے بھی کشمیریوں کی قسمت سے کھیلنے کے شرمناک عمل کو جاری رکھا، ایک طرف جہاں اِس کی وجوہات عالمی حالات میں وقوع پزیر ہونے والی تبدیلیاں تھیں وہیں ایک اہم وجہ جذبہ ایمانی کا فقدان بھی رہی، ہماری اِس مجرمانہ غفلت کا بھارت نے بھرپور فائدہ اٹھایا، کشمیری حریت پسندوں کی تحریک کو کچلنے کیلئے بھارت نے بیرونی مداخلت کا راگ الاپا، خود کو مظلوم اور حق بجانب ثابت کرنے کیلئے جھوٹے پروپیگنڈے کا سہارا لیا، مگر جھوٹ، جھوٹ ہی ہوتا ہے، پروپیگنڈے کا غازہ زیادہ دیر تک سچائی کو نہیں چھپا سکتا، آج بھارتی جھوٹ کا ملمع اتر رہا ہے، حقیقت منکشف ہو رہی ہے اور سچائی دنیا کے

سامنے آرہی ہے، ساری دنیا جانتی ہے کہ ہندو بنیاء مقبوضہ کشمیر میں گزشتہ چھ دہائیوں سے جاری اپنے مظالم کی چاہے جتنی بھی پردہ پوشی کرتا رہے، امن کا راگ الاپتا رہے، زمینی حقائق کو چھپانا اسکے بس کی بات نہیں، آج اِن زمینی حقائق سے پوری دنیا آگاہ ہو چکی ہے کہ شاطر ہندو بنیئے نے گزشتہ 63 برسوں سے مقبوضہ کشمیر پر بزور طاقت اپنا تسلط جمایا ہوا ہے، جسے کشمیری عوام نے شروع دن سے قبول نہیں کیا اور وہ اپنے حق خود اختیاری کے حصول اور ہندو بنیئے کے تسلط سے آزادی کیلئے بھارتی فوج کے مظالم سہتے اور جان و مال کی بیش بہا قربانیاں دیتے ہوئے آزادی کی تحریک جاری رکھے ہوئے ہیں اور اپنی آزادی سے کم پر بھارت کی کوئی پیشکش قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔

دوسری طرف کشمیریوں کی آزادی غصب کرنے والوں کو بھی اِس بات کا احساس ہو چکا ہے کہ کشمیر ایک نہ ایک دن انکے ہاتھ سے نکل جائے گا، اسی لیے بھارتی حکمرانوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ آزادی کے جذبے سے معمور کشمیری عوام کی آواز کو دبائے رکھا جائے، چنانچہ ظلم و جبر کا ایسا کوئی ہتھکنڈہ نہیں جو کشمیری عوام پر آزمایا نہ گیا ہو، مگر حریت پسند کشمیری عوام ہر ہتھکنڈے کا سامنا اور مقابلہ کرتے رہے، لاٹھیاں کھاتے رہے اور اپنے سینے بھارتی سیکورٹی فورسز کی فائرنگ سے چھلنی کراتے ہوئے عزم و ہمت کے ساتھ آزادی کی منزل کی جانب گامزن ہیں، نتیجتاً خود بھارتی لیڈروں کو بھی اس بات کا احساس ہو چکا

ہے کہ کشمیریوں کی تحریک آزادی کو روکنا اب اُن کے بس کی بات نہیں رہی، یہی وجہ
ہے کہ گزشتہ سال بھارتی وزیراعظم منموہن سنگھ کو مقبوضہ کشمیر کے کا دورے کے
دوران بھارتی سیکورٹی فورسز کے مظالم کا اعتراف بھی کرنا پڑا، اسی طرح بھارتی وزیر
داخلہ چدم.برم نے بھی مقبوضہ کشمیر کے دورے کے بعد کشمیر کے سیاسی حل کی ضرورت
پر زور دیا جبکہ بھارتی آرمی چیف نے تو کشمیری حریت پسندوں کی مسلسل مزاحمت سے
زچ ہو کر بھارتی حکومت کو مقبوضہ کشمیر سے اپنی فوجیں نکالنے کی تجویز پیش کرکے اپنے
حکمرانوں کو باور کرادیا کہ کشمیری باشندوں کی مزاحمت کو روکنا اب بھارتی فوج کے
بس کا روگ نہیں رہا، دوسری جانب بھارتی رائے عامہ کی جانب سے بھی مسئلہ کشمیر کے
حل کیلئے اپنے حکمرانوں پر دباو بڑھتا جارہا ہے، معروف بھارتی خاتون دانشور ارون دھتی
رائے نے بھارتی حکمرانوں کو آئینہ دکھاتے ہوئے کہا کہ کشمیر کبھی بھارت کا حصہ نہیں
رہا، چنانچہ آج بھارتی رائے عامہ کے شعور کی بیداری کے نتیجہ میں صورتحال یہاں تک
پہنچ گئی ہے کہ بھارتی انتہا پسند ہندو جماعت بی جے پی کے رکن پارلیمنٹ رام جیٹھ ملانی
بھی مقبوضہ کشمیر میں بھارتی مظالم کیخلاف دہائی دیتے ہوئے مسئلہ کشمیر کے حل کو اپنی
زندگی کا اہم مشن قرار دے رہے ہیں۔
حقیقت یہ ہے کہ بھارتی لابی کے زہریلے پروپیگنڈے کے باوجود انسانی حقوق کی

عالمی تنظیم ہیومن رائٹس واچ، سابق وزیر رام جیٹھ ملانی کی غیر سرکاری رپورٹ اور یورپی پارلیمنٹ کی قرارداد مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے بلاشبہ انتہائی اہم اور مثبت پیش رفت ہیں، جو کشمیر کو اٹوٹ انگ قرار دینے والی بھارتی ہٹ دھرمی کی اصل حقیقت دنیا کے سامنے عریاں کررہی ہے، ہمیں امید ہے کہ مختلف عالمی فورمز پر مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے اٹھنے والی یہ آوازیں تحریک آزادی کشمیر کیلئے اک اہم اور فیصلہ کن موثر ثابت ہونگی، جبکہ دوسری جانب خود بھارت کے اندر بھی نہتے اور بے گناہ کشمیریوں پر بھارتی سیکورٹی فورسز کے مظالم کیخلاف سخت ردعمل سامنے آرہا ہے اور بھارت کے مختلف سیاسی و سماجی حلقوں میں اب کشمیر کی آزادی کیلئے آوازیں سنائی دے رہی ہیں، اس صورتحال میں بھارتی حکمرانوں کو مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے اندورنی دباؤ کے ساتھ اب بیرونی دباؤ کا بھی پہلے سے زیادہ سامنا ہے، لہذا ایسے وقت میں جبکہ کشمیر کی آزادی کیلئے خود بھارتی رائے عامہ بھی متحرک ہوچکی ہے اور کئی بین الاقوامی فورمز پر مسئلہ کشمیر کے حل کی بات کی جارہی ہے، ہمارے موجودہ حکمرانوں کی یہ لازمی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اقوام متحدہ کی قراردوں کے مطابق مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے اپنا متحرک کردار ادا کریں اور آزادی کی منزل کی جانب گامزن کشمیری مسلمانوں کا ہر ممکن ساتھ دیں، یاد رہے کہ تحریک آزادی کشمیر کے اس نازک موڑ پر اگر کشمیری عوام ہمارے حکمرانوں کی دہری پالیسیوں کی وجہ سے ایک بار پھر مایوس ہوگئے تو الحاق کشمیر کی صورت میں

تکمیل پاکستان کا خواب کبھی بھی شرمندہ تعبیر نہ ہو پائے گا۔

خداکیلئے اب توسچ بولیئے

بس بہت ہوچکا۔۔۔۔۔۔

جب حکومتی ذمہ داران کی طرف سے اِس قسم کے بیانات سامنے آئیں کہ "پاکستان میں کوئی ایئر بیس کسی کو نہیں دیا گیا"، "شمسی ایئر بیس خالی کروانے کا کہہ دیا ہے"، "شمسی ایئر بیس خالی کروالیا گیا ہے" ، " موجودہ حکومت نے امریکہ کو ڈرون حملوں کے لئے کبھی بھی شمسی ایئر بیس استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی"،" شمسی ایئر بیس سے امریکی انخلاکے باعث یہ اب آپریشنل نہیں ہے"،"شمسی ایئر بیس خالی کرنے کی کوئی بات نہیں ہوئی اِس حوالے سے وزیر دفاع کا بیان مشکوک ہے"،"ہم شمسی ایئر بیس کسی قیمت پر نہیں چھوڑیں گے "تو حقائق کا ادراک مشکل ہوجاتا ہے،آپ تمیز نہیں کرسکتے کہ کون سچ بول رہا اور کون جھوٹ،لگتا ہے کہ ہماری قومی زندگی میں جھوٹ ناگزیر ہوچکا ہے اور ہمارے حکمران جھوٹ کا استعمال ضرورت سے زیادہ کرنے لگے ہیں،حال یہ ہوگیا ہے کہ اربابِ اقتدار مسلسل جھوٹ بول کر حقائق کو چھپاتے اور عوام کو بے وقوف بناتے ہیں،جبکہ اَمر واقعہ یہ ہے کہ سچائی جلد یا بدیر آشکارہ ہوہی جاتی ہے،جیسا کہ بلوچستان کے قصبے دالبندین سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر قائم سمشی ایئر بیس کے حوالے سے ہوا،ہمارے حکومتی ذمہ داران کے بیانات کی سچائی امریکی

ذرائع ابلاغ کچھ یوں بیان کر رہا ہے کہ شمسی ایئر بیس کے حوالے سے وزیر دفاع کا بیان امریکی ذمہ داروں کے نزدیک امریکہ مخالف عوامی جذبات کو ٹھنڈا کی کوشش ہے، ہیرالڈ کی رپورٹ کے مطابق امریکی حکام کیلئے یہ بات حیران کن ہے کہ پاکستانی عہدیدار اپنے عوام میں غلط معلومات کیوں دیتے ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ شمسی ایئر بیس تاحال امریکہ کے زیر استعمال ہے، اب رہا امریکی میڈیا کی جانب سے اٹھایا گیا یہ سوال کہ پاکستانی حکام اپنے عوام کو غلط معلومات کیوں دیتے ہیں، تو اس کی صحیح وضاحت سرکاری حلقے ہی کر سکتے ہیں، مگر عوام اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے ارباب اقتدار جھوٹ کے اسیر اور جھوٹ اُن کی زندگی کا خاصہ ہے، وہ قومی زندگی کے ہر موڑ پر جھوٹ بول کر عوام کو دھوکہ دیتے اور بے وقوف بناتے ہیں، انہوں نے کبھی حقیقت حال عوام کو بتا کر اعتماد میں لینے کی کوشش نہیں کی۔

آج بھی یہی ہو رہا ہے ایک طرف وزیر دفاع فرماتے ہیں کہ امریکہ کو شمسی ائیر بیس خالی کروانے کا کہہ دیا ہے تو دوسری طرف حکومت کی وزیر اطلاعات دور کی کوڑی لاتے ہوئے فرماتی ہیں کہ شمسی ایئر بیس خالی کرنے کی کوئی بات نہیں ہوئی، اس حوالے سے وزیر دفاع کا بیان مشکوک ہے، دوسری جانب امریکہ بانگ دہل پاکستانی حکام کا مطالبہ مسترد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ ایئر بیس عسکریت پسندوں پر ڈرون حملوں کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے، اسے نہ تو خالی کیا گیا

ہے، نہ کرینگے، باالفاظ دیگر شمسی ایئر بیس تو ہمارے پاس آپکی غلامی کی علامت اور ثبوت ہے، یہ ثبوت ہم آپکے حوالے کر دینگے۔۔۔! بھول جاؤ، اسی میں تمہاری بہتری اور بھلائی ہے، رہا وزیر اطلاعات کی جانب سے وزیر دفاع کے بیان کو مشکوک قرار دینے کا معاملہ، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر دفاعی امور کے بارے میں متعلقہ وزیر ہی کا بیان مشکوک ہے تو پھر کس کا بیان قابل اعتماد ہو سکتا ہے، لہذا اس صورتحال میں یہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں رہتی کہ کوئی دوسری قوت حکومت کو ڈس کریڈٹ کر رہی ہے، ہماری نظر میں حکومت کا پرابلم یہی ہے کہ خود حکومتی شعبوں کی کارکردگی ہی اُس کے ڈس کریڈٹ ہونے پر دلالت کرتی ہے، اس مسئلے کا دوسرا اور توجہ طلب پہلو یہ بھی ہے کہ پاکستانی عوام کی اکثریت یہ محسوس کرتی ہے کہ امریکہ کی ناراضگی ہمارے بڑے بڑے لوگوں کے بیانات کو مشکوک بنا دیتی ہے، عموماً دیکھا گیا ہے کہ دنیا میں ایک آزاد اور خود مختار ریاست کے حکمرانوں اور ذمہ دار افراد کی بات کو قابل اعتبار اور قابل اعتماد سمجھا جاتا ہے، لیکن ہمارے حکومتی ذمہ داروں کے حالیہ بیانات نے اس شرمناک حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے کہ ایک ادنی امریکی عہدیدار کے سامنے ہمارے حکمرانوں اور ذمہ داران کی بات کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، جو امریکہ بہادر نے کہہ دیا بس وہی بات ہمارے ارباب اقتدار کے نزدیک وقعت و اہمیت رکھتی ہے۔

آج ہماری اس بے وقعتی کی اصل وجہ امریکی کاسہ لیسی اور غلامی ہے۔اگر ہمارے حکمرانوں نے ابتداء سے قومی غیرت اور ملکی مفادات کے مطابق آبرومندانہ پالیسیاں اختیار کی ہوتی اور بیرونی جارحانہ عزائم کو نکیل ڈالی ہوتی،دفاع وطن کے تقاضے نبھاتے ہوئے سخت رد عمل ظاہر کرکے دوٹوک جواب دیا ہوتا تو آج یہ نوبت نہ آتی،نہ امریکہ اور اسکے اتحادی ہمیں اپنی چراگاہ بناتے اور نہ ہی وہ ہمیں ترنوالہ سمجھنے کی جرات کرتے،مگر افسوس کہ ہمارے سابقہ اور موجودہ حکمران تو امریکہ کو یہ یقین دلا چکے ہیں کہ ہماری پالیسیاں اس غیرت کے تابع قطعاً تشکیل نہیں پائیں گی جس سے آپ اور آپکے ساتھی ہنود و یہود و نصاریٰ خوفزدہ ہیں، بلکہ آپ یقین رکھیں کہ ہماری پالیسیاں اور ہمارا مفاد آپکے ساتھ وابستہ ہے۔اس صورت میں ظاہر ہے کہ یہی نتیجہ سامنے آئے گا کہ غلامی کا پٹہ خوشی سے اپنے گلے میں ڈال کر اور ہاتھ میں کشکول گدائی پکڑ ایجاب و قبول کرنیوالے حکمرانوں کی معمولی سی سرکشی بھی آقا کو برداشت نہیں ہوگی، جیسا کہ موجودہ امریکی در عمل سے ظاہر ہو رہا ہے۔

دوسری طرف امریکہ دہشت گردی کیخلاف نئی حکمت عملی کا اعلان کرتے ہوئے ہمیں یہ بھی باور کرارہا ہے کہ مستقبل میں امریکہ عراق اور افغانستان جیسی مہنگی جنگوں کے بجائے مزید ڈرون حملوں اور خصوصی فورسز کی چھاپہ مار کاروائیوں میں اضافہ کرے گا، یہ کسی اور کیلیئے نہیں، صرف ہمارے لئے اس بدمست ہاتھی کا

پیغام ہے جس نے ڈرون حملوں کا ہماری دھرتی کو ہدف بنایا ہوا ہے جو ایبٹ آباد اپریشن
کی صورت میں اپنی سپیشل فورسز کی چھاپہ مار کاروائیوں کا بھی ہم پر تجربہ کر چکا
ہے،امریکہ کی یہ تمام کاروائیاں حکمرانوں کی قومی غیرت سے عاری پالیسیوں کا نتیجہ
ہیں،آج اگر امریکی گیدڑ بھبکی کے رد عمل میں ہمارے حکمران سر جھکائے اپنی صفائیاں
پیش کرتے نظر آتے ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہے ابھی قوم کو مزید عذاب سہنے اور
مزید بربادی کیلئے تیار رہنا چاہیے،ظاہر ہے جب آپ ملکی سلامتی کے خلاف امریکی
ڈرون حملوں اور ایبٹ آباد آپریشن جیسے اقدمات کو بخوشی قبول کرتے نظر آئیں گے
اور اپنے بے گناہ شہریوں کے سفاک قاتل ریمنڈ ڈیوس کو اپنے ملکی قوانین اور عدالتی
عملداری کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے مکمل پروٹوکول کے ساتھ امریکہ کے حوالے کر دیں
گے تو وہ ہماری بات حقارت کے ساتھ ہی ٹھکرائے گا، ویسے بھی یہ ایک مسلمہ حقیقت
ہے کہ جب اونٹ کو خیمے میں گردن گھسانے کی اجازت دے دی جائے تو وہ پورے کا
پورا خیمے میں گھسنا اپنا حق ہی سمجھے گا۔
بدقسمتی سے جب سے پاکستان دہشت گردی کے خلاف نام نہاد امریکی جنگ میں شریک
ہوا ہے،اس کے بدترین نتائج نے آج پاکستان کی ساکھ شکوک و شبہات کا شکار بنادی
ہے،پاکستان کی سلامتی کے ذمہ داران بھی آج اس اَمر پر تشویش میں مبتلا نظر آتے
ہیں کہ امریکہ اب باقاعدہ طور پر پاکستان کی سلامتی و خود

مختاری کی حدود کو پامال کر رہا ہے۔اسامہ بن لادین آپریشن کے بعد سے پاکستان سے انتہائی توہین و تحقیر آمیز انداز میں بات کی جارہی ہے۔یہ پاکستان کی بدقسمتی ہی کہی جاسکتی ہے کہ پاکستان نے دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ کی سمت اور اہداف کا تعین کیے بغیر ہی اپنے چار ائیر بیس (شہباز ائیر بیس، مہران ائیر بیس، سمشی ایئر بیس اور وفاقی دارالحکومت سے کچھ دور تربیلا)امریکہ کے حوالے کر دیئے۔جہاں تک شمسی ائیر بیس کا تعلق ہے تو اس بارے میں دستیاب معلومات یہ بتاتی ہیں کہ امریکہ اس اڈے کو کبھی خالی نہیں کرے گا۔اس لیے کہ یہ سی آئی اے آپریشنز کا بڑا مرکز بن چکا ہے۔دفاعی تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ امریکہ جس طرح افغانستان سے انخلاء کے باوجود افغانستان میں بالخصوص وسطی افغانستان میں اپنے اڈے برقرار رکھے گا۔اسی طرح وہ شمسی ائیر بیس کو بھی خطے میں اپنے اہداف کے حصول کا ذریعہ بنائے رکھنا چاہتا ہے۔جبکہ پاکستان کی مشکل یہ ہے کہ وہ اپنی غیر معمولی جغرافیائی پوزیشن کی وجہ سے مکمل طور پر امریکی مفادات کی سرزمین بن گیا ہے۔اسی لیے امریکہ نے اولین پیش رفت کے طور پر پاکستان میں فیصلہ وپالیسی سازی کے عمل کو اتنا کمزور کر دیا ہے کہ فوج، پارلیمنٹ اور عوام شدید خواہش کے باوجود ڈرون حملے نہیں رکوا سکے۔2 مئی کے واقعے کے بعد تو امریکہ کی خودسری دیدنی ہے۔ہر آنے والے دن کے ساتھ امریکی رعونت میں اضافہ ہو رہا ہے۔

چنانچہ اس تناظر میں اگر ہمارے حکمرانوں نے قومی غیرت و مفادات کے منافی پالیسیاں برقرار رکھیں تو خدانہ کرے کل ہماری ایٹمی ٹیکنالوجی بھی امریکی دسترس میں ہو اور ہمیں ہماری سلامتی کی بھی کوئی ضمانت نہ مل سکے۔لہذا عافیت اور دانشمندی کا تقاضہ یہ ہے کہ امریکہ کو "بس بہت ہوچکا" کا احساس دلا کر نہ صرف شمسی ایئر بیس خالی کرایا جائے بلکہ پاکستان میں موجود تمام امریکی جاسوسی کے نیٹ ورک کو بند کرنے کے ساتھ نیٹو کی سپلائی لائن بھی منقطع کردی جائے اورامریکہ پر باور کردیا جائے کہ آئندہ کوئی بھی ڈرون حملہ برداشت نہیں کیا جائے،خلاف ورزی کی صورت میں پاک فضائیہ کی صلاحیتوں اور ٹیکنالوجی کو بروئے کار لا کر پاکستان کی فضائی حدود میں داخل ہونیوالے ہر ڈرون کو مار گرایا جائے،اب وقت آگیا ہے کہ قوم کو واضح طور پر آگاہ کیا جائے کہ وطن عزیز کی خودمختاری کی سرحدیں کہاں سے شروع ہوتی ہیں اور کہاں جاکر ختم ہوتی ہیں،ہم سمجھتے ہیں کہ یہی وقت ہے قومی غیرت و حمیت کا مظاہرہ کرنے کا،قوم کو اعتماد میں لینے اور سچ بولنے کا،بہت جھوٹ بول چکے،خدا کیلئے اب تو سچ بولیئے،یاد رکھیئے،حکومتیں آتی جاتی رہتی ہیں لیکن ملک وقوم کی سلامتی اور بقاءکے ذمہ دار قومی اداروں سے اگر قوم کا اعتبار اٹھ جائے تو پھر کچھ باقی نہیں بچتا۔

اِک بھیڑ سی لگی ہے کفن کی دکان پر۔۔۔۔

واویلا اسپتال سائٹ کا وہ منظر بڑا ہی دلخراش تھا، میاں گل اپنی پانچ سالہ اکلوتی بیٹی لائبہ کی لاش گود میں اٹھائے ہوئے مسلسل آنسو بہا رہا تھا،جب بچی کا کوئی عزیز خون آلود کپڑوں میں ملبوس بچی کی لاش کو لینے کیلئے ہاتھ آگے بڑھاتا تو وہ دیوانہ وار اُس کا ہاتھ جھٹک دیتا، دہشت گردوں کی اندھی گولی نے شادی کے سات سال بعد منتوں اور مرادوں سے پیدا ہونے والی ننھی منی لائبہ کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے موت کی نیند سلادیا تھا، میاں گل کی دنیا لٹ چکی تھی، بچی کے موت کے صدمے نے اُسے دیوانہ کردیا تھا،ماں صدمے سے نڈھال سکتے کی حالت میں ایک کونے میں بے سدھ بیٹھی تھی، میاں گل کی آہ و بکا اور دل ہلادینے والی چیخوں نے اسپتال میں موجود لوگ اور اسٹاف کو افسردگی میں مبتلا کردیا تھا،ہر دل دکھی اور ہر آنکھ اشکبار تھی۔

میاں گل قصبہ کالونی مسلم آباد میں پہاڑی پر قائم آبادی کے ایک مکان میں رہائش پذیر ہے،اُس کا گھرانہ تین افراد پر مشتمل تھا، بارہ برس قبل اُس کی شادی ہوئی تھی، میاں گل کو اولاد کی شدید خواہش تھی مگر شادی کے ابتدائی سات سالوں میں اُس کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی،اُس نے بہت علاج کروایا،بزرگوں

کے مزارات پر حاضریاں دیں، نیازیں اور مرادیں مانگیں، منتیں رکھیں، بالآخر شادی کے سات سالوں کے بعد لائبہ کی شکل میں اُس کی مراد پوری ہوئی۔ لائبہ کے وجود نے میاں گل کے گھر کو خوشیوں اور قہقہوں سے بھر دیا۔ لائبہ میاں گل اور اُس کی اہلیہ کی ہی نہیں پورے خاندان کی آنکھ کا تارا تھی۔ اپنی اکلوتی بیٹی کی ہر خواہش پوری کرنے کیلئے میاں گل دن رات محنت مزدوری کرتا، بچی جب بڑی ہوئی تو میاں گل نے اُسے اسکول کے علاوہ دینی تعلیم کیلئے گھر سے قریب ایک مدرسے میں بھی داخل کروادیا۔

جہاں لائبہ اسکول سے فارغ ہونے کے بعد روزانہ جایا کرتی تھی، 7 جولائی کو لائبہ مدرسے سے پڑھنے کے بعد اپنی سہلیوں کے ساتھ سپارہ اٹھائے ہنستی مسکراتی گھر آرہی تھی، جب وہ اپنے گھر کے دروازے کے قریب پہنچی تو دہشت گردوں کی جانب سے چلائی گئی گولیاں اُس کے سینے اور بازو میں پیوست ہوگئیں، اُسے چیخنے کا بھی موقع نہ مل سکا، خون کا فوارہ بہہ نکلا، گولیوں کے جھٹکے سے ننھی منی لائبہ دیوار سے ٹکرا کر زمین پر آگری، ہاتھ میں تھاما ہوا سپارہ چھوٹ کر دور جاگرا، یہ منظر دیکھ کر قریب میں موجود افراد نے اُس کے والد میاں گل کو اطلاع دی، اُس پر تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی، میاں بیوی بچی کو لے کر فوری طور پر قریب میں واقع ولیکا اسپتال پہنچے، مگر دیر ہوچکی تھی اور ننھی لائبہ بھی چار دنوں میں دہشت گردوں کی گولیوں سے ہلاک ہونے والے سو سے

زائدافراد میں شامل ہوچکی تھی۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ 5 جولائی سے 8 جولائی تک کراچی میں لسانی بنیادوں پر جاری پر تشدد واقعات میں اکثریت ایسے لوگوں کی نشانہ بنی جن کا متعلقہ فریقین سے کوئی تعلق نہیں تھا، متحدہ قومی موومنٹ اور عوامی نیشنل پارٹی کے درمیان اردو یونیورسٹی گلشن اقبال میں مسلح تصادم سے جنم لینے والی دہشت گردی کی لہر کراچی کے مختلف علاقوں پرانی سبزی منڈی، عیسیٰ نگری، اورنگی ٹاؤن، قصبہ کالونی، کٹی پہاڑی اور سرجانی تک پھیل گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اورنگی ٹاؤن سے پھوٹنے والے پر تشدد ہنگاموں نے کراچی غربی کے علاوہ شہر کے کئی علاقوں سمیت علی گڑھ کالونی، اسلامیہ کالونی، ہریانہ کالونی، مومن آباد، بنارس، نارتھ ناظم آباد، ناظم آباد، بلدیہ ٹاؤن، اولڈ سٹی ایریا، کھارادر، بھیم پورہ، سائٹ، حسن اسکوائر، نیو کراچی، سولجر بازار، ماڈل کالونی، شیر شاہ اور دیگر آبادیاں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا، یہ سلسلہ 8 جولائی کی شب تک جاری رہا، قانون نافذ کرنے والے اداروں کو وسیع اختیارات دینے اور بڑی تعداد میں تعیناتی کے باوجود دہشت گرد پورے شہر میں دندناتے رہے، وہ مسافر بسوں اور ویگنوں پر فائرنگ کرتے رہے، گھروں کو آگ لگاتے رہے، مخالف آبادیوں کو راکٹوں اور دستی بموں سے بھی نشانہ بناتے رہے، شہر سنسان رہا، کاروباری مراکز بند رہے، پبلک ٹرانسپورٹ غائب رہی، لوگ جان بچانے

کیلئے نقل مکانی کرتے رہے۔
لیکن حسب معمول قانون نافذ کرنے والے ادارے اور امن و امان قائم کرنے کے ذمہ دار سیکورٹی اہلکار یا تو غائب تھے یا پھر بے بسی کی تصویر بنے قتل و غارت گری کے اِن واقعات پر خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتے رہے، کہیں بھی حکومت اور انتظامیہ کی رِٹ نظر ہی نہیں آئی، بے گناہ انسانوں کے خون سے شہر کے در و دیوار رنگین تھے، فضا سوگوار اور خوف و ہراس میں لپٹی ہوئی تھی، کراچی کا کوئی علاقہ ایسا نہیں تھا جو بدامنی اور انتشار پسند عناصر کی سفاکی کی لپیٹ میں نہ آیا ہو، لوگ اپنے پیاروں کی سلامتی کے لئے دعا گو اور فکرمند تھے مگر سیاسی قیادتوں کا حال یہ تھا کہ ایک دوسرے پر الزام دھرنے کے سوا انہیں کوئی کام نہیں تھا۔
منگل کی شام سے لاقانونیت، قتل و غارت گری، ٹارگٹ کلنگ اور معصوم و بے گناہ شہریوں کی زندگیوں سے کھیلنے کا شروع ہونے والا سلسلہ جمعہ کی شب تک جاری رہا، اِن پر تشدد واقعات میں 100 سے زائد افراد جاں بحق اور 200 سے زائد زخمی ہوئے، جن میں خواتین، بچے، بوڑھے اور نوجوان سبھی شامل تھے، آج ملک کے سب سے بڑے معاشی شہر کراچی کا حال یہ ہے کہ کوئی بھی شہری خود کو محفوظ تصور نہیں کرتا، دفاتر اور گھروں میں بھی کسی کی زندگی کے تحفظ کی ضمانت نہیں دی

جاسکتی، جبکہ سڑکوں اور بازاروں میں تو وحشت و بربریت رقص کرتی نظر آتی ہے، کوئی بھی انسان راہ چلتے اندھی گولی کا نشانہ بن سکتا ہے، لوگوں کا گھروں سے نکل کر بازاروں، دفاتر، تعلیمی اداروں اور دوسرے پبلک مقامات پر جانا خطرے سے خالی نہیں رہا، بدامنی اورانارکی کے باعث حکومت اور قانون نافذ کرنیوالے اداروں سے عوام کا اعتماد اٹھتا جا رہا ہے، مایوسی اور بے بسی اپنی انتہاء کو پہنچ چکی ہے، نہ صرف انسانی جانیں ضائع ہو رہی ہیں بلکہ نجی اور سرکاری املاک بھی شرپسند عناصر کی جنونی کاروائیوں کی بھینٹ چڑھ رہی ہے، لوگوں کا کاروبار تباہ ہو رہا ہے، سرمایہ کار تیزی سے اپنا سرمایہ سمیٹ رہا ہے اور کراچی کی بدامنی کے اثرات ملک کی معیشت پر بھی مرتب ہو رہے ہیں ۔

کراچی جل رہا ہے، یہاں سے اٹھنے والے آگ کے شعلے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لیتے نظر آئے، مگر ہمارے صوبائی و وفاقی حکمران چین کی بانسری بجاتے رہے، وزیر داخلہ صاحب دعویٰ کرتے رہے کہ اُن کے پاس سٹیلائٹ سے حاصل کی ہوئی تصویریں موجود ہیں جو اِس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ قاتلوں کے گروہوں کو سرکاری سرپرستی حاصل ہے، مگر افسوس کہ وہی ڈھاک کے تین پات، نہ قاتل پکڑے گئے اور نہ ہی اُن کے سرکاری سرپرست عوام کے سامنے لائے گئے، سینکڑوں بے گناہ بچے، بوڑھے اور جوان دہشت گردوں کی گولیوں کا نشانہ بنتے رہے، جبکہ سیاسی

جماعتیں ایکدوسرے پر الزامات لگاتی رہیں،ایکدوسرے کو لتاڑتی رہیں اور خونریزی کا
ذمہ دار ٹھہراتی رہیں،اصل قصوروار کون ہے اور قتل و غارت گری کے پیچھے پس پردہ
قوتیں کونسی ہیں، کون ہے جو کراچی کے امن کو تباہ کرکے پاکستان کی معیشت کو برباد
کرنے کے بین الاقوامی ایجنڈے پر کام کررہا ہے۔

انہیں بے نقاب کرنا تو حکومت کی ذمہ داری ہے، کراچی سمیت ملک کے تمام شہریوں کے
جان و مال کے تحفظ اور قیام امن کی ذمہ داری وفاقی اور صوبائی حکومتوں پر عائد ہوتی
ہے، مگر حکومت یہ ذمہ داری پوری کرنے میں نہ صرف ناکام ثابت ہوئی ہے،نہ ہی آج
تک ہماری وزارت داخلہ کو یہ کہنے کی زحمت ہوئی کہ وہ کراچی میں امن و امان قائم
کرنے میں ناکام رہی ہے،نہ کسی کے ماتھے پر احساس ندامت ہے،نہ چہرے پر آثار
شرمندگی، معافی مانگنا اور استعفیٰ دینا تو بہت دور کی بات ہے،بلکہ حکومت نے تو کراچی
کے بے بس شہریوں کو موت برسانے والے عفریتوں کے رحم و کرم پر چھوڑدیا ہے، شہر
انسانی مقتل گاہ بن چکا ہے،آج کراچی کے شہریوں کو سیاسی اختلافات اور قومی و لسانی
،تعصبات کی وہ قیمت چکانی پڑی کہ سینکڑوں گھر ماتم کدہ بن چکے ہیں

اِک بھیڑ سی لگی ہے کفن کی دکان پر
وحشتوں کے شہر میں ہے خون ارزاں بہت

قارئین محترم ۔۔۔! ایسا پہلی یا آخری بار تو نہیں ہوا، نہ جانے یہ سلسلہ کب تک چلے گا، کب تک بے رحم قاتل بے گناہ انسانوں کے خون سے ہولی کھیلتے رہیں، کب تک کراچی کے بے گناہ شہری لہو کا خراج ادا کرتے رہیں، موت کی بھینٹ چڑھتے رہیں گے، کب تک میاں گل جیسے باپ لائبہ جیسے اپنے اکلوتے بچوں کا جنازہ اٹھاتے رہیں گے اور کب تک ہم خون آدم کو اِس قدر بے قدری سے بہانے والوں کے ہاتھ کاٹنے کا اختیار رکھنے کے باوجود خاموش تماشائی بنے رہیں ۔۔۔

ہمیں ایسی امداد نہیں چاہیے-----

امریکی امداد اور ہمارا قومی مفاد

شاید ہماری آبرو مندی کا لمحہ سعید ابھی نہیں آیا،امریکی فوجی امداد کی معطلی سے تھوڑی
دیر کو یہ خوش گمانی ضرور پیدا ہوئی کہ ہماری سیاسی اور فوجی قیادت نے پاکستان کی
رگوں سے خون چوسنے والی اُس دیرینہ بیماری کا پتہ چلالیا ہے جس نے نائن الیون کے
بعد ہمارے ملک کے چپے چپے میں خوف و وحشت اور ویرانی کا رنگ بھر دیا ہے، تھوڑی
دیر کو ایسا لگا کہ ہمارے ارباب اختیار نے پاکستان کو لاحق اصل Core Issue کا
سراغ لگالیا ہے اور وہ امریکی امداد کی آکسیجن پر زندہ رہنے کے بجائے اپنے وسائل اور
خودانحصاری سے اُس مرض کے علاج پر متفق ہوگئے ہیں جس نے ایک غیرت مند قوم
کو کھائے ہوئے بھوسے کا ڈھیر بنادیا ہے، مگر افسوس کہ یہ خوش رنگ منظر بہت جلد
دھندلا گیا، جنرل پاشا کے دورہ امریکہ نے خودانحصاری کی ساری خوش فہمی خاک میں
ملادی، معالجینِ قوم کا فیصلہ ہے کہ ابھی ہمیں امریکی امداد کی آکسیجن پر مزید زندہ رہنا
ہے اور قوم کو امریکی امداد کی زہر آلود شوگر کوٹیڈ گولیاں اور کھانی ہیں۔

حقیقت یہی ہے کہ امریکی امداد کا زہر ہمارے جسدِ قومی میں اِس حد تک سرائیت

کر چکا ہے کہ اِس سے گلو خلاصی آسان نہیں ہے، مگر چھٹکارا حاصل کرنے کی تمنا اور کوشش تو کی جاسکتی ہے، جبکہ قوم پہلے ہی تیار ہے بلکہ بارہا بیزاری کا اظہار بھی کر چکی ہے، پھر یہ بات کون نہیں جانتا کہ پاکستانی فوج اور قوم کے لئے امریکی امداد ایک ایسا زہر ہے جسے امریکہ شوگر کوٹیڈ گولیوں کی شکل میں پیش کرتا ہے،اِس امداد کا فائدہ نہ تو پاکستانی فوج کو ہے اور نہ ہی ملک کی عوام کو، کیونکہ اِس کے ساتھ امریکی مفادات اور مطالبات کی ایک طویل فہرست نتھی ہوتی ہے،ظاہر ہے جب امداد وصول کی جائے گی تو اُن مطالبات کو بھی تسلیم کرنا ضروری ہوگا جو امریکہ امداد کے عیوض ہم سے چاہتا ہے، گذشتہ دنوں پاک فوج کو ملنے والی 80 کروڑ ڈالر کی امریکی امداد کی معطلی اور پھر بحالی بھی دراصل اسی پالیسی کا شاخسانہ ہے،امریکی مطالبہ تھا کہ انسداد دہشت گردی، عسکریت اور انٹیلی جنس کے شعبوں میں مزید کچھ کیا جائے، جبکہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکی پارٹنر بننے سے پاکستان ایک عشرے سے بدترین دہشت گردی کے لپیٹ میں ہے، جو روز بروز بڑھتی جارہی ہے،اب تک ہم اِس جنگ میں پانچ ہزار فوجیوں اور تیس ہزار سے زائد بے گناہ شہریوں کی جانیں قربان کر چکے ہیں، ستم یہ ہے امریکہ ابھی تک ہمارے جذبہ بے اختیاری شوق پر یقین نہیں کررہا، کبھی اُس کا میڈیا دور کی کوڑی لاتا ہے، تو کبھی ہمارے ایٹمی پروگرام کو غیر محفوظ قرار دیا جاتا ہے، کبھی فوج اور آئی ایس آئی پر انگلیاں اٹھائی جاتی ہیں، تو کبھی کہا جاتا ہے کہ ہم نے درست معلومات فراہم

نہیں کیں، غرض کہ ہر طرح کی قربانی کے باوجود ہماری خدمات اور وفا شعاری مشکوک قرار پاتی ہے۔

وفا شعاری کے اِن مظاہر اور قومی سطح پر انتہائی بھاری قیمت چکانے کے بعد آج ہم کہاں کھڑے ہیں، ہمارے ایٹمی اثاثے سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں، ملک دہشت گردی اور انارکی کی آگ میں جل رہا ہے، کشمیر کاز مٹھی میں بند ریت کے ذرّوں کی مانند ہمارے ہاتھوں سے پھسل چکا ہے اور ہماری معیشت ابھی تک امداد کے آکسیجن ٹینٹ میں موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اِس کے باوجود امریکی وزیر خارجہ اور دوسرے ذمہ داران کی جانب سے مسلسل کہا جارہا ہے کہ ہم نے اتنا کچھ نہیں کیا جتنا کرنا چاہئے تھا، حیرت کی بات ہے کہ اتنا کچھ کرنے کے باوجود امریکہ کی طرف سے ڈو مور کے تقاضے ہیں کہ ختم ہونے میں نہیں آتے۔ امریکی امداد کے لئے آئے دن نت نئی شرائط عائد کی جاتی ہیں اور پاکستان پر مسلسل دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ دہشت گردی کے خاتمے کے لئے جو کام امریکہ اور اُس کے اتحادی نہیں کرپائے وہ پاکستان کر دکھائے۔ اگر اِس جنگ میں پاکستان کے کردار اور اِس کے نتیجے میں جانی و مالی نقصان کو دیکھا جائے تو یہ امریکی امداد جس کا چرچا پوری دنیا میں ہے اور جو ہمارے سالانہ قومی بجٹ کا ڈیڑھ فیصد سے بھی کم ہے، درحقیقت اونٹ کے منہ میں زیرے کا بگھار کے مترادف ہے۔ اِس حقیر رقم کے عوض ہم نے اپنی قومی وقار اور ملکی سلامتی کو جو ٹھیس

پہنچائی ہے وہ ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔
اَمر واقعہ یہ ہے کہ اِس بھاری نقصان کے عوض ہمیں جتنی امریکی امداد ملی ہے، وہ درحقیقت نیٹو کو سپلائی لائن کی سہولت دینے کا کرایہ بھی نہیں ہے، جبکہ پاکستان سے گزرنے والا نیٹو کا یہ سپلائی روٹ ہمارے ملک میں جنگ زدہ ماحول کی ایک علامت بن گیا ہے، یہ ہمارے حریص حکمران ہیں جو امریکی امداد کو اپنے لیے بہت کچھ سمجھتے ہوئے قومی مفاد کی آڑ میں اسے قبول کرتے ہیں وگرنہ پاکستان بیش بہا تعاون کے تناظر میں یہ امداد امریکی احسانات کے پہاڑ میں دفن شدہ وہ چوہا ہے جس کے تعفن سے پوری قوم ذہنی مریض بن چکی ہے، دوسری طرف اتنی عظیم قربانی کے بعد پاکستانی عوام اتنے امریکہ تعاون کے بھی مستحق قرار نہیں پائے کہ اُن کا سپر وار پارٹنر انرجی کی قومی ضروریات پوری کرنے میں جنگ زدہ قوم کی مدد کرتا، جبکہ اُس نے بھارت کو ایٹمی توانائی کی ٹیکنالوجی سے نوازا، پاکستان، ایران اور بھارت تیل پائپ لائن منصوبے پر بھارت پر سفارتی دباؤ ڈال کر اِس لیے ثبوتاژ کیا کہ یہ منصوبہ پاکستان کے مفاد میں تھا، اسی طرح اُس نے پاکستان میں مسئلہ کشمیر کے تناظر میں قائم ہونے والے جہادی گروپس کی معاونت کو دہشت گردی قرار دیا اور مسئلہ کشمیر کے پرامن حل کے لئے بھی کوئی سفارتی تعاون فراہم نہیں کیا، یہ بھی حقیقت ہے کہ امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں بھارت کا ایک مصنوعی

کردار گھڑ کر اُسے افغانستان میں ہماری سرحدوں کے ساتھ بیٹھا کر ہمارے دفاع کے لئے ایک اور چیلنج پیدا کردیا۔

یہ نائن الیون کے تناظر میں پاک۔امریکہ تعلقات میں امریکی رویے پر مشتمل ایک مختصر پس منظر ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ اور سابق سویت یونین کے درمیان عالمی سرد جنگ میں سیٹو، سینٹو کے عسکری معاہدوں میں عملاً اہم ترین رکن ہونے سے لے کر افغانستان میں روسی جارحیت کے خاتمے کا بیس کیمپ بننے تک، امریکہ کے ساتھ پاکستان کی بے مثال پارٹنرشپ اور سرد جنگ کی تاریخ میں ہمارے نتیجہ خیز تعاون کی داستانیں بکھری پڑی ہیں، دونوں ملکوں کی اِس پارٹنرشپ میں کون کتنے فائدے میں رہا ہے، آپ پیش کردہ حقائق سے بہتر اندازہ لگا سکتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ امریکہ کو حاصل ہونے والے فوائد ہمارے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں، امریکہ نے پاکستان کے تعاون سے جتنے وسیع تر مفادات حاصل کیے ہیں، اُس کا اشرا شیر بھی پاکستان کو نہیں ملا، لیکن اِس کے باوجود امریکی ڈو مور کے مطالبے میں کمی نہیں آتی، یہ حقیقت اظہرا لمنش ہے کہ امریکہ نے کبھی بھی باہمی تعلقات میں پاکستان کے والہانہ پن کے جواب میں خلوص کا مظاہرہ نہیں کیا، جبکہ دوسری طرف ہمارے ارباب اقتدار امریکہ کی اصل نیت کو بھانپنے میں جانتے بوجھتے ناکام رہے، بدقسمتی سے یہ ہمارے حکمرانوں کی غلط پالیسیوں کا نتیجہ ہے کہ امریکہ ہمیں اپنے مقاصد کیلئے بے دریغ استعمال

کرتا رہا، جبکہ ہم اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ جب بھی ہم پر کوئی مشکل وقت آیا تو امریکہ نے صرف زبانی جمع خرچ کے سوا کچھ نہیں کیا، ایسا ایک بار نہیں بارہا ہوا، امریکہ نے ہر مشکل وقت میں پاکستان کی فوجی امداد روکی، 1965 اور 1971 کی جنگوں سمیت امریکہ نے سات بار فوجی اور اقتصادی امداد روک کر پاکستان کو جھکانے کی کوشش کی، دراصل امریکہ چاہتا ہے کہ پاکستان اپنے مفادات کی بات نہ کرے، صرف امریکی احکامات پر آنکھیں بند کرکے عمل کرتا رہے، خواہ اس پیروی اُسے کتنی ہی بڑی قیمت کیوں نہ چکانی پڑے۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ اُس نے ہمیں پانچ سات ارب ڈالر کا لالچ دے کر سو ارب ڈالر سے زیادہ کا نقصان کرایا اور اب مزید نقصانات اٹھانے کیلئے پاکستان پر دباؤ ڈال رہا ہے، جبکہ پہلے ہی پاکستان نام نہاد امریکی دہشت گردی کی جنگ کی وجہ سے بے انتہا نقصانات اور مشکلات سے دوچار ہے، مگر پھر بھی امریکہ ہمارے کردار سے مطمئن نہیں، آج ہمارے سابقہ اور موجودہ حکمرانوں کی جانب سے امریکی فرنٹ لائن اتحادی کا کردار قبول کرنے کی پالیسیوں نے ہی ہماری سلامتی کو سنگین خطرات سے دوچار کردیاہے، پہلے ہماری سیکورٹی فورسز کو امریکی ایماء پر قبائلی علاقوں میں اپنے ہی شہریوں کیخلاف صف آراء کیا گیا، جس کے ردعمل میں ہمیں خودکش حملوں اور دہشت گردی کی دوسری وارداتوں کے باعث سخت جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا، اب اُس کی حکمت عملی یہ ہے کہ افغانستان سے امریکی

افواج کے انخلاء کے بعد دہشت گردی کے خاتمہ کی آڑ میں افغان باشندوں کو تہس نہس کرنے کا کام پاکستان کی سیکورٹی فورسز کے سر تھوپ دیا جائے۔امریکہ چاہتا ہے کہ پاکستان کی سیکورٹی فورسز امریکی مفادات کی تکمیل کی خاطر قبائلی علاقوں میں اپنے ہی شہریوں کیخلاف۔برسرپیکار رہیں اور پاک افغان بارڈر پر افغان باشندوں کیخلاف نیٹو فورسز والا کردار ادا کریں اور دوسری طرف وہ بھارت کو اُس کا نگران بنا کر خود دور بیٹھا تماشا دیکھتا رہے،یہ سنگین صورتحال کسی طور بھی پاکستان کے مفاد میں نہیں،اس میں نہ صرف ملک کی سلامتی داؤپر لگے گی بلکہ افغان باشندوں کی مزاحمت کے کے ساتھ ساتھ ملک کی سالمیت کو مغربی سرحدوں پر مکار دشمن بھارت کے ہاتھوں سخت خطرات کا بھی سامنا رہے گا،جو ہماری افواج کو قبائلی علاقوں اور پاک افغان سرحد پر مصروف پا کر پاکستان کی سالمیت کے خلاف کوئی بھی قدم اٹھا سکتا ہے۔

لہٰذا امریکہ کی جانب سے جس جارحانہ انداز میں پاکستان کی بقاء سلامتی اور آزادی و خودمختاری کے منافی پالیسیاں اختیار کرکے اُن پر عملدرآمد کیا جا رہا ہے،اسکے پیش نظر ہمیں کسی بھی قسم کی امداد پر تکیہ کرنے کے بجائے ملکی وسائل اور خودانحصاری کے متبادل ذرائع اختیار کرنے چاہیں،اب یہ حقیقت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ امریکہ عالمی طاغوتی طاقتوں کے نمائندے کی حیثیت سے ہمارے ساتھ بدترین دشمنی کا مرتکب ہو رہا ہے،امریکی مفادات کی جنگ میں

ہمارے حکمران چاہے اپنے ملک و قوم کے مفادات کو نظرانداز کرکے اسکے احکامات کی تعمیل میں کتنے ہی مصروف کیوں نہ رہیں، امریکہ کبھی بھی اُن پر اعتماد نہیں کرے گا اور نہ ہی وہ اپنی اسلام اور پاکستان دشمن پالیسیاں ترک کرے گا، جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پاکستان کو اپنے توسیع پسندانہ عزائم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتا ہے، چنانچہ ہم سمجھتے ہیں کہ امریکی مفادات کی جنگ میں اپنی دفاعی قوت جھونکنے کی غلطی کرنے کے بجائے امریکی امداد کی آکسیجن پر زندہ رہنے سے گلوخلاصی حاصل کی جائے، ہمارے ارباب اختیار کو چاہیے کہ وہ امریکی دباؤ کے آگے مزید جھکنے کے بجائے قومی غیرت و حمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے آبرومندانہ فیصلے کریں اور امریکہ پر واضح کردیں کہ پاکستان اب مزید اُس کیلئے طفیلی ریاست کا کردار ادا کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا، خدا کے فضل و کرم سے پاکستان ایک باوسائل ملک ہے جو امریکی امداد کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے، یاد رکھیں پاکستان کی بقاء سلامتی اور استحکام و سالمیت کا راز امریکی غلامی سے نجات اور خودانحصاری میں پوشیدہ ہے، ایٹمی پاکستان کے بانی قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے کہا تھا کہ "ہمیں ایسی امداد نہیں چاہیے جو ہمیں قومی مفادات سے بے خبر بنادے۔"

وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان۔۔۔۔

حضرت مجدد الف ثانی (971 ھ 1034 ھ) دسویں صدی ہجری کے نہایت ہی
مشہور عالم و صوفی بزرگ تھے،آپ کا اسم گرامی شیخ احمد سرہندی تھا اور آپ کا سلسلہ
نسب 31 واسطوں سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے،آپ
سرہند، ہندوستان میں پیدا ہوئے، والد گرامی شیخ عبد الاحد ایک ممتاز عالم دین اور
صوفی تھے، صغر سنی میں ہی قرآن پاک حفظ کرکے اپنے والد سے علوم متداولہ کی تعلیم
حاصل کی، پھر سیالکوٹ جاکر مولانا کمال الدین کشمیری سے معقولات کی تکمیل کی اور
اکابر محدثین سے فن حدیث حاصل کیا، آپ سترہ سال کی عمر میں تمام مراحل تعلیم
سے فارغ ہو کر درس و تدریس میں مشغول ہوگئے، تصوف میں سلسلہ چشتیہ کی تعلیم
اپنے والد سے پائی اور سلسلہ نقشبندیہ کی تعلیم دہلی جاکر خواجہ باقی باللہ سے حاصل کی،
آپ کے علم و بزرگی کی شہرت اِس قدر پھیلی کہ روم، شام، ماوراء النہر اور افغانستان
وغیرہ تمام عالم اسلام کے مشائخ علماء اور ارادت مند آکر آپ سے مستفیذ ہونے
لگے،آپ طریقت کے ساتھ شریعت کے بھی سخت پابند تھے،آپ نے ہندوستان میں
تصوف کا نقشبندی سلسلہ متعارف کرایا۔

حضرت مجدد الف ثانی مطلقاً تصوف کے مخالف نہیں تھے، ہاں آپ نے ایسے تصوف کی

مخالفت ضرور کی جو شریعت کے تابع نہ تھا، قرآن و سنت کی پیروی اور ارکان اسلام پر
عمل ہی آپ کے نزدیک کامیابی کا واحد راستہ ہے، مغل بادشاہ اکبر کے دور میں بہت سی
ہندوانہ رسوم و رواج اور عقائد اسلام میں شامل ہو گئے، بادشاہ نے ہندوستان میں
آزادی مذہب کی آڑ میں اسلام کے روشن اصولوں کو چاک کر ڈالا اور ایک نیا دین "دین
الٰہی" ایجاد کیا، تو آپ نے اپنے مکتوبات میں اِن بدعات کی شدید مخالفت کی جس کی
وجہ سے آپ کو دور ابتلاء سے بھی گزرنا پڑا، آپ نے سلاطین وقت کی خلاف شرع
حرکات کی کھلم کھلا مخالفت کی اور افضل جہاد کا فریضہ سرانجام دیا، قید و بند کی صعوبتیں
بھی برداشت کیں مگر حق بات کہنے سے گریز نہ کیا۔ علامہ اقبال نے حضرت مجدد الف
ثانی کی انہی خدمات کا ذکر اپنے اِن اشعار میں کیا ہے۔

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمی احرار
وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

حضرت مجدد الف ثانی نے اسلام کی حفاظت اور تقویت کا انقلاب آفریں کارنامہ

سر انجام دیا جو رہتی دنیا تک کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے، حضرت مجدد الف ثانی مسلکاً حنفی اور مشرباً نقشبندی تھے، آپ 27 صفر 1034ھ میں انتقال کر گئے اور سر ہند میں طلوع ہونے والا علم و عرفاں کا یہ سورج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

زیر نظر کتاب "ارمغان امام ربانی جلد سوم "حضرت مجدد الف ثانی کی حیات و خدمات کے حوالے سے" 33ویں قومی امام ربانی مجدد الف ثانی کانفرنس "منعقدہ" سماع ہال داتا دربار لاہور" میں پیش کردہ علمی و تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے، جسے ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس صاحب نے مرتب کیا ہے، کتاب میں ممتاز ماہر تعلیم اور اہل علم و دانش ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی، پروفیسر قاری مشتاق احمد، پروفیسر محمد اقبال مجددی، ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس، ڈاکٹر حافظ محمد سجاد، ڈاکٹر حافظ محمد افتخار احمد، ڈاکٹر محمد اکرم ورک، پروفیسر راغب الیاس شاہ ہاشمی، پروفیسر محمد عظیم فاروقی کے بعنوان "علوم شرعیہ کی ترویج میں حضرت مجدد الف ثانی کی کوششیں اور ثمرات، تصوف روح اسلام، عوارف المعارف مکتوبات امام ربانی کی روشنی میں، لطائف المدینہ، عمدۃ الاسلام، اصلاح باطن و تزکیہ نفس مکتوبات امام ربانی کی روشنی میں، اثبات النبوۃ کے ادبی محاسن، تعلیم و تربیت اور اصلاح احوال حضرت مجدد الف ثانی کا منہج و اسلوب، حضرت مجدد الف ثانی کا طریق تربیت، ایصال ثواب مکتوبات کے

آئینے میں" جیسے علمی اور فکر انگیز مقالے شامل ہیں۔
کتاب میں محمد ناظم بشیر نقشبندی کا سابقہ کانفرنسز میں پیش کیے جانے والے مقالات کے عنوانات پر ایک معلوماتی مضمون بھی شامل ہے،اس کے علاوہ مجموعے میں مکاتیب کے عنوان سے مسعود ملت پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد کے ماہر نیازیات مورخ و محقق میاں محمد صادق قصوری اور صاحبزادہ بدر الاسلام صدیقی کے نام لکھے گئے وہ 39 مکتوبات بھی شامل ہیں جو حضرت مجدد الف ثانی کے احوال و آثار پر ہونے والے کام اور نئی جہتوں کو ظاہر کرتے ہیں، یہ مکتوبات ظاہر کرتے ہیں کہ امام ربانی پر لکھا گیا لٹریچر دنیا کے کن کن ممالک تک پہنچ چکا ہے، حقیقت یہ ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی کے افکار و نظریات کو سمجھنے کیلئے اہل قلم نے جتنا لٹریچر آپ کی زندگی پر لکھا صوفیانہ ادب میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔
یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے، جس میں ماہر رضویات ڈاکٹر مسعود احمد جیسے ممتاز اہل قلم اور حضرت صوفی غلام سرور نقشبندی مجددی کے قائم کردہ ادارے " مجدد الف ثانی سوسائٹی لاہور و شیر ربانی اسلامک سینٹر سمن آباد" سر فہرست ہیں، صوفی صاحب نے سال قبل امام ربانی کے پیغام اور مجددی انقلاب کو عام کرنے کیلئے اس ادارے کی 33 بنیاد رکھی تھی جسے اُن کے صاحبزادگان غلام مصطفےٰ

سرور، جنید سرور اور مرید باصفا ناظم بشیر نقشبندی نے آج بھی جاری رکھا ہوا ہے۔اس ادارے کے تحت "ارمغان امام ربانی جلد سوم" کی خوبصورت اشاعت حضرت مجدد الف ثانی کے مشن اور افکارو نظریات کو عام کرنے کی ایک قابل ستائش کوشش ہے، جس کیلئے صاحب مولف اور جملہ اراکین مبارکباد کے مستحق ہیں،کتاب شیر ربانی اسلامک سینٹر، شیر ربانی روڈ، چوک شیر ربانی، 21 ایکڑ سکیم نیامزنگ سمن آباد، لاہور فون نمبر 3004299321 سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

اپنی ہی آگ میں جلتا ہوا مغرب-----

صلیبی انقلاب کیلئے دس لاکھ افراد کو قتل کرنے کا خوفناک منصوبہ

سنہری بالوں والا آندرے بیرنگ بریوک اوسلو (ناروے) میں پیدا ہوا،اُس نے اوسلو اسکول آف مینجمنٹ سے بزنس ایڈمنسٹریشن کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی، وہ ایک کسان بھی ہے اور تاجر بھی،اُس نے ایک زرعی کمپنی بھی قائم کی،جہاں وہ سبزیاں اور تربوز کاشت کرتا تھا، وہ پچیس سے تیس سال کی عمر کے درمیان دائیں بازو کی شدت پسندی کی طرف مائل ہوا،آج وہ اپنے آپ کو شدت پسند اور کٹر عیسائی کہتا ہے، وہ یورپ کے دیگر لوگوں کی طرح مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی اکثریت سے خوفزدہ ہے، ناروے کے اخبار وردن گینگ کے مطابق آندرے بیرنگ آن لائن فورم میں حصہ لیتا تھا،جہاں وہ شدید قوم پرستانہ خیالات کا اظہار کرتا تھا، آندرے بیرنگ بریوک نے بظاہر عام قومی سروس کے علاوہ کوئی فوجی تربیت حاصل نہیں کی اور نہ ہی پولیس کے پاس اُس کے جرائم کا کوئی ریکارڈ موجود ہے، فیس بک پر آندرے بیرنگ بریوک کے نام سے منسوب صفحے (جسے اب ہٹادیا گیا ہے) پر وہ اپنے آپ کو قدامت پسند عیسائی بتاتا ہے،اسی طرح یو ٹیوب پر اُس سے منسوب ایک وڈیو جس میں اُس نے اسلام،مارکسزم اور کثیر الثقافتی معاشرے کے خلاف

غصے کا اظہار کیا تھا ہٹادی گئی ہے۔
ناروے ذرائع ابلاغ کے مطابق یہ وڈیو بریوک نے بنائی تھی،انٹرنیٹ پر شائع ہونے والے اُس کے پیغامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسلمان مخالف جذبات رکھتا ہے،نارویجن پولیس کے مطابق جمعہ 22 جولائی کو حملوں سے قبل آندرے بریوک نے انٹرنیٹ پر پندرہ سو صفحات پر مشتمل ایک مسودہ بھی شائع کیا تھا جس میں اُس نے اپنے عزائم کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ یورپ میں کثیر الثقافتی رجحان نے قومی حمیت کو کمزور کیا ہے،ٹوئٹر پر آندرے بیرنگ بریوک سے منسوب ایک پیغام میں وہ فلسفی جان سٹیورٹ مل کا یہ قول دہراتا ہے کہ "ایک صاحب ایمان شخص ایک لاکھ مفاد پرستوں کے برابر طاقت رکھتا ہے۔" ناروے پولیس کے مطابق اوسلو میں بم دھماکہ اور جزیرہ یٹویا کے یوتھ کیمپ پر فائرنگ کرکے 90 سے زائد افراد کی جان لینے کا ملزم آندرے بیرنگ بریوک انتہائی دائیں بازو کے شدت پسند خیالات کا حامی ہے،پولیس سربراہ کے مطابق 32 سالہ آندرے بیرنگ بریوک کے انٹرنیٹ پر شائع ہونے والے پیغامات سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ وہ دائیں بازو اور مسلمان مخالف خیالات کا حامی ہے۔
دوسری طرف ناروے میں قتل عام کرنے والے عیسائی دہشت گرد کی منظر عام پر آنے والی تازہ وڈیو میں اُس کا یہ انکشاف بھی موجود ہے کہ وہ بنیاد پرست

عیسائیوں کی قدیم ترین خفیہ تنظیم "نائٹ ٹیمپلرز" کا ملکی سطح پر کمانڈر ہے۔اُس نے حملے سے قبل ایک باقاعدہ وڈیو بھی ریکارڈ کرائی جسے مشن پر روانہ ہونے سے چھ گھنٹے قبل انٹرنیٹ پر اَپ لوڈ کیا گیا۔اُس کے بعد نائٹ ٹیمپلرز کے کمانڈر نے حملے کیلئے روانگی سے قبل فیس بک پر اپنے اکاؤنٹ پر ایک تحریری پیغام بھی چھوڑا جس میں اُس نے لکھا "مجھے یقین ہے کہ یہ میرا آخری پیغام ہوگا۔آج جمعے کا دن ہے،22 جولائی اور 12 بجکر 51 منٹ ہو رہے ہیں (فقط اندرے۔بریویک،نائٹ کمانڈر،نائٹ ٹیمپلرز برائے ناروے) یہاں یہ اَمر بھی قابل توجہ ہے کہ آندرے۔بریویک نے حملے سے 6 گھنٹے 12 منٹ قبل جو وڈیو یو ٹیوب پر اَپ لوڈ کی تھی،اُس میں وہ اُسی لباس میں ہے جو اُس نے حملے میں استعمال کیا۔اِس وڈیو میں وہ واضح طور پر کہہ رہا ہے کہ "بہت سوچ و بچار کے بعد تیار کیے گئے پلان کے مطابق اب سے چھ گھنٹے بعد وہ اپنے خود کش مشن پر روانہ ہو رہا ہے۔اُس کا مشن بارش کا پہلا قطرہ ہے اور یورپ میں ایک عیسائی انقلاب لانے کیلئے اُس کے ساتھی اپنی کوشش جاری رکھیں گے۔"

اُس نے اپنے منصوبے کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ سب سے پہلے وہ کھاد اور آئل سے تیار کردہ کار بم اوسلو کے مرکزی علاقے میں پھاڑے گا،اُس کے بعد وہ کشتی کے ذریعے جزیرے یوٹویا میں پہنچے گا،جہاں وہ اُس وقت تک لوگوں کو قتل کرتا رہے گا جب تک اُسے بھی قتل نہیں کر دیا جاتا۔اِس وڈیو میں اُس کا کہنا ہے کہ

وہ پولیس وردی اِس لیے استعمال کر رہا ہے تاکہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ جھٹکہ لگے،اُس کا کہنا ہے کہ عیسائی انقلاب لانے کیلیئے وہ کم از کم دس لاکھ افراد کو قتل کرنے کا منصوبہ رکھتا ہے،اِس وڈیو میں اپنے حملے کا پورا منصوبہ جزیات کے ساتھ بتانے کے بعد اُس نے ماضی قریب کے کچھ کلپس بھی وڈیو میں شامل کیے ہیں،ان کلپس میں وہ کھاد اور آئل سے بم بنانے کا تجربہ کر رہا ہے، حفاظتی لباس میں موجود نائٹ ٹیمپلرز کمانڈر کے لباس پر نائٹ ٹیمپلرز کا سرخ نشان واضح ہے،وہ اپنا نمبر بتاتے ہوئے کہتا ہے کہ نائٹ ٹیمپلرز میں اُس کا خفیہ کوڈ2083 ہے،اِس وڈیو میں وہ یہ بھی کہتا ہے کہ نائٹ ٹیمپلرز ختم نہیں ہوئے اور انہوں نے تیاری کے بعد ایک مرتبہ پھر مسلح جدوجہد شروع کردی ہے،اُس کا کہنا ہے کہ نو سال کی محنت اور تین لاکھ یورو کی لاگت سے اُس نے ایک لائحہ عمل تیار کیا ہے جس پر آنے والے عمل کرتے رہیں گے، عیسائی دہشت گرد کا مزید کہنا ہے کہ مسلح جدوجہد کا آغاز ناروے سے کرنا ایک سوچا سمجھا منصوبہ ہے اور یہ غیر قانونی نہیں ہے وہ اور اُس کے ساتھی یورپ میں ایک خالص عیسائی حکومت قائم کرنے کی جدوجہد کرتے رہیں گے، جہاں کوئی مسلمان یا سیکولر شخص موجود نہ ہو،اِس سلسلے میں وہ خون کا پہلا قطرہ بہانے جا رہا ہے۔

عیسائی دہشت گرد کا مزید کہنا ہے کہ وہ یورپ میں جس جنگ کا آغاز کر رہے ہیں

وہ مہینوں، برسوں یا شائد کئی دہائیوں تک چلے۔اِس میں بہنے والا سچے عیسائیوں کا خون نئی خالص عیسائی ریاست کیلئے بیج کا کام کرے گا اور بے ایمانوں کا خون کھاد کا کام کرے گا۔اپنی سفاکیت کے حوالے سے اُس کا کہنا تھا کہ اِس قدر بڑے پیمانے پر لوگوں کو اچانک قتل کرنا یقینا سفاکی ہے مگر جو لوگ عرصے سے سوئے ہوئے ہیں انہیں نیند سے جگانے کیلئے ایک بڑے جھٹکے کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اِس قتل عام کے ذریعے یورپ کو بڑا جھٹکہ دینا چاہتا ہے۔بارہ منٹ طویل وڈیو اور فیس بک پر اپنے انتہائی خطرناک پیغامات کے حوالے سے ناروے پولیس کے سربراہ کا کہنا تھا کہ انہیں وڈیو اور فیس بک پر موجود قاتل کے پیغامات مل گئے ہیں۔ناروے پولیس سربراہ نے کسی تبصرہ سے گریز کرتے ہوئے یہ تسلیم کیا کہ یو ٹیوب کا ریکارڈ یہ ظاہر کرتا ہے کہ حملہ آور کی وڈیو کو حملے سے قبل سینکڑوں افراد نے دیکھا۔انھوں نے اِس سوال کا جواب دینے سے گریز کیا کہ جب قاتل نے اپنا منصوبہ انٹرنیٹ پر جاری کر دیا تھا تو پھر کیوں پولیس اُسے روکنے میں ناکام رہی۔برطانوی اخبار ڈیلی میل اور اسکائی نیوز ٹی وی نے اپنی رپورٹس میں دعویٰ کیا ہے کہ نائٹ ٹیمپلرز کمانڈر برائے ناروے آندرے بیرنگ بریوک کے ساتھ انٹرنیٹ پر سات ہزار افراد یورپ بھر سے رابطے میں تھے اور اکثر اِس بات پر مباحثہ کرتے تھے کہ کس طرح یورپ سے مسلمانوں اور سیکولر افراد کا خاتمہ کیا جائے۔آندرے بریوک نے انٹرنیٹ پر جاری اپنے ایک لیکچر میں یہ بات بار بار دہرائی ہے کہ جب بھی حملہ

کرو، انتہائی بڑا حملہ کرو جس میں بہت زیادہ لوگ مارے جائیں اور ہمیشہ ایسا حملہ کرو جس میں صرف ایک یا دو افراد ہی شامل ہوں۔

الجزیرہ ٹی وی کی رپورٹ کے مطابق قاتل کے فلیٹ کی تلاشی کے دوران پولیس کو ایسی دستاویزات بھی ملی ہیں جس نے پولیس کو دہلادیا ہے،ان دستاویزات میں 17 صفحات پر مشتمل وہ منصوبہ بھی شامل ہے جس پر قاتل نے عمل کرتے ہوئے اوسلو میں دھماکہ کیا اور قریبی جزیرے پر جاکر قتل عام کیا، یہ منصوبہ کسی پیشہ ور فوجی کمانڈر کی طرف سے تیار کردہ لگتا ہے اور اِس میں حملے کی ہر جزیات طے کی گئیں ہیں، رپورٹ مزید کہتی ہے کہ شاید قاتل اور اُس کے ساتھی یہی چاہتے تھے کہ یہ سب چیزیں پولیس اور پریس کے ہاتھ لگیں تاکہ ان کے حملے کے محرکات دنیا کے سامنے آئیں، فلیٹ کی تلاشی کے دوران قاتل کا ایک تحریری بیان بھی ملا ہے جس میں اُس نے لکھا ہے کہ وہ نا تو پاگل ہے اور نہ ہی جنونی قاتل، بلکہ وہ گزشتہ دس برسوں سے نائٹ ٹیمپلرز کا کمانڈر ہے، جدید جنگی حکمت عملی کا مطالعہ کرنا اُس کا مشغلہ ہے اور وہ جدید نظریات، فلسفے اور علم مذہب پر عبور رکھتا ہے، جنگی تیاری کیلئے وہ گزشتہ دس برسوں سے باڈی بلڈنگ اور تیراکی بھی کرتا رہا ہے، ناروے پولیس کے مطابق قاتل نے پولیس کے سامنے قتل عام کا اعتراف کرلیا ہے، آندرے بیرنگ بریوک کے وکیل کا کہنا کہا ہے کہ ُان کے موکل نے جمعہ کو ہونے والے حملوں کی ذمہ داری قبول کر لی ہے اور اپنی

حرکت کو "وحشیانہ" مگر "ضروری" قرار دیا ہے،آندرے کا کہنا ہے کہ یہ حملے ناروے کے عوام کے لیے "شاک سگنل" ہیں،اُس نے پیر کے روز اوسلو کی عدالت میں پیش ہو کر دونوں حملوں کا اعتراف بھی کیا،مگر اپنے اوپر عائد الزامات کو قبول کرنے سے انکار کردیا،جس پر عدالت نے ہشتگردی اور عوام میں خوف وہراس پھیلانے کے الزامات کے تحت فرد جرم عائد کرتے ہوئے اُسے آٹھ ہفتوں کے ریمانڈ پر پولیس کے حوالے کر دیا گیا،32 سالہ آندرے بیرنگ.بریوک کو ناروے کے موجودہ قانون کے تحت زیادہ سے زیادہ 21 سال کی قید کی سزادی جا سکتی ہے۔

قارئین محترم !ناروے میں پیش آنے والے متذکرہ واقعہ کا پس منظر چاہے جو بھی ہو لیکن آندرے بیرنگ.بریوک کے اِس وحشیانہ قتل عام سے ایک بات واضح ہو گئی ہے کہ آندرے بھی اُسی خوف کا نمائندہ ہے جس نے یورپ کی بنیاد پرست صلیبی آبادی کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں کہ دن بدن مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی ایک دن یورپ سے اُس کی صلیبی شناخت چھین لے گی،اُس کا طرز عمل اِس بات کا عکاس ہے کہ دوسرے مذاہب بالخصوص ہندؤوں اور مسیحیوں میں بھی ایسے شدت پسند موجود ہیں جو اپنے مذہبی مقاصد کی خاطر عالمی اور علاقائی امن تہہ بالا کرنے میں قطعاً حجاب محسوس نہیں کرتے،آج مسلمانوں کے بارے میں مغرب،یورپ بالخصوص امریکہ میں جو نفرت انگیز تعصب پایا جاتا ہے،اسکے مظاہر انسانیت کے نام نہاد علمبردار مہذب معاشروں کے چہروں پر عیاں ہیں،اِس کے باوجود دنیا

کے کسی کونے میں ہونے والے دہشت گردی کے ہر واقعے کے تانے بانے اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ جوڑے جاتے ہیں، مغربی میڈیا پروپیگنڈہ کرتا ہے کہ

"All Muslims are not terrorists but all terrorists are Muslims"

یعنی سارے مسلمان تو دہشت گرد نہیں ہیں لیکن سارے دہشت گرد ضرور مسلمان ہیں۔ جبکہ اِس سے بڑا کوئی اور جھوٹ ہو ہی نہیں سکتا،تاریخ کے طالب علم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ دہشت گردی کبھی بھی مسلمانوں کا شیوہ نہیں رہا،اسلام نے ہمیشہ امن اور بھائی چارے کا درس دیا،تاریخ گواہ ہے کہ دنیاکے زیادہ تر دہشت گردی کے واقعات میں غیر مسلم ہی ملوث رہے ہیں،انیسویں صدی عیسوی میں شاید ہی کوئی ایسی دہشت گردی کی واردات ہوئی ہو جس میں کوئی مسلمان ملوث پایا گیا ہو،اگر حقائق کو سامنے رکھا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کرنے میں دیر نہیں لگتی کہ انفرادی اور ریاستی سطح پر دہشت گردی پوری دنیا میں ہوتی رہی ہے،اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی، حقائق بتاتے ہیں کہ اِس میں ہر طبقہ فکر کے لوگ ملوث تھے، ہیں اور رہیں گے، لیکن اس کے باوجود عالمی میڈیانے دہشت گردی کواِس طرح ہوّا بنا رکھا ہے جیسے یہ صرف اسلام اور مسلمانوں کی پیدا کردہ چیز ہے، جبکہ سچائی یہ ہے کہ دہشت گردی کی ابتداء یہود، ہنود اور یعنی صلیبی جنگ Crusade war صلیبی حکمرانوں سے ہوتی ہے، خود بش کے منہ سے کے الفاظ

اِس بات کے گواہ ہیں، شرمناک بات یہ ہے کہ وہ افغانستان میں روس کی بربریت ہو یاامریکہ کی ویتنام پر فوج کشی، وہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم برسانا ہو یا عراق اور افغانستان کی تباہی وبربادی، آج تک اِن انسانیت سوز واقعات کو کسی نے دہشت گردی قرار نہیں دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ نائن الیون سے پہلے دنیا بھر میں اِس قسم کے واقعات رونما ہوئے مگر کسی نے بھی انہیں دہشت گردی کا نام نہیں دیا، لیکن نائن الیون کے بعد عالمی تھانیدار امریکہ نے الفاظ کے معنی و مفہوم بدل کر ایک نئی لغت ایجاد کی اور اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کیلئے دہشت گردی کے سارے تانے بانے اسلام اور مسلمانوں سے جوڑ دیئے، جب سچائی پر پردہ ڈالنے اور ایک حقیقت کو دو مختلف نظریوں سے دیکھا جائے تو کبھی بھی دہشت گردی کو جڑ سے ختم نہیں کیا جاسکتا، آج مغرب اور یورپ انتہا پسندی اور بنیاد پرستی کا جو الزام مسلمانوں پر لگا رہے ہیں دراصل وہ خود اُسی انتہا پسندی اور بنیاد پرستی کا شکار ہیں، مغربی حکومتیں اور وہاں کی عوام خود اسی تعصب اور انتہا پسندی کا شکار ہے، آندرے بیرنگ کا عمل بھی اسی کا شاخشانہ ہے اور اُس نے یہ عمل اپنے حکمرانوں اور میڈیا کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر کیا ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ پہلے امریکی میڈیا کے زیر اثر یورپی میڈیا نے دہشت گردی

کا رشتہ اسلام سے جوڑا، جس کے نتیجہ میں پورے یورپ اور امریکہ میں خوفزدگی کی نفسیات نے جنم لیا اور اسی خوف نے آندرے بیرنگ کے ذہن میں یہ کام کر ڈالنے کا بھوت سوار کر دیا، اُس نے اپنے منشور میں بھی یہی کہا تھا کہ جو کام تم سمجھتے ہو کہ وہ ہو جانا چاہیے وہ خود کر جاو، اُس نے اپنے مشورے پر عمل کے لئے لوگوں کو اکسایا اور ابتدائی تفتیش میں اُس نے پولیس کو بھی یہی بتایا کہ اُس کے مزید دو تین گروپس ہیں، اُس نے اپنے پہلے بیان میں یہ اعتراف بھی کیا کہ اُس کا اِس قسم کی ایک تحریک سے تعلق ہے اور برطانیہ کے لوگوں سے اُس کا رابطہ ہے، لیکن اِس کے باوجود اسے تنہا ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، ناروے پولیس چیف مصر ہیں کہ وہ تنہا تھا اور اُس کا کسی گروپ سے کوئی تعلق نہیں ہے، دوسری طرف پورا میڈیا، ناروے کے وزراء اور حکومت آندرے کو ذہنی مریض قرار دینے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، ہو سکتا ہے کہ آنے والے دنوں میں ناروے حکومت اور مغربی میڈیا یہ ثابت کر ڈالے کہ آندرے بیرنگ تنہا اِس واردات کا ذمہ دار اور ذہنی مریض ہے اور عین ممکن ہے آندرے کو ذہنی مریض قرار دے کر اُس کی سزا جیل کے اسپتال میں گزارنے اور جلد رہائی کا موقع بھی پیدا کر دیا جائے، جبکہ اِس کے برخلاف اگر اِس واقعہ میں کوئی مسلمان ملوث ہوتا ہے تو مغربی میڈیا اور حکومتیں فوراً اُس کا تعلق القاعدہ سے جوڑ دیتے ہے۔

ایک سوئیڈش ادارے ٹائم کی ریسرچ کے مطابق آندرے بیرنگ کا منشور القاعدہ کے منشور کی نقل ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ القاعدہ کا منشور تیار کرنے والوں اور آندرے بیرنگ کا منشور تیار کرنے والوں کی ذہنی ساخت ایک ہی ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ اِس واقعہ کا اصل محرک امریکی قیادت میں گزشتہ دس سال سے جاری اسلام مخالف مہم ہے، جہاں اِس مہم نے یورپ میں ایک طرف مسلمانوں کے خلاف نفرتیں پھیلائی ہیں، وہیں بار بار یورپ کو القاعدہ کے حملوں سے ڈراوے اور دنیا بھر مسلمانوں کو مشتبہ قرار دینے کے عمل نے خوف کی نفسیات کو پروان چڑھایا ہے، جس کے نتیجے میں یورپ میں مسلمانوں کے خلاف تعصب اور نفرت میں اضافہ ہو اور آندرے بیرنگ نے اسی خوف کا شکار ہو کر اپنے ہی ملک میں دہشت گردی کا ارتکاب کیا، شاید وہ یہ بھول گئے کہ خوفزدہ انسان نہ صرف خود کو ہلاکت میں ڈالتا ہے بلکہ دوسروں کیلئے بھی ہلاکت کا سبب بنتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج مغرب اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تعصب، نفرت اور بغض و عناد کی اپنی ہی لگائی ہوئی آگ میں جل رہا ہے، آج ناروے کے افسوسناک واقعات مذہبی تفاخر و تعصبات میں لپٹے ہوئے نام نہاد مہذب مغربی معاشروں کیلئے لمحہ فکریہ ہیں، اگر مغرب واقعی دنیا سے دہشت گردی کا خاتمہ چاہتا ہے تو اُسے دنیا کے تمام لوگوں کو ایک ہی نگاہ سے دیکھنا ہوگا اور فتنہ پھیلانے والے افراد کو بلا امتیاز مذہب و ملت دہشت گرد قرار دے کر ایک ہی ترازو میں تولنا ہوگا، تب ہی جا کر دنیا سے دہشت گردی کا خاتمہ ممکن ہے۔

اے عباد الرحمٰن آگے بڑھو۔۔۔۔۔

رحمت حق بہانہ می جوید۔۔۔۔۔
ماہ رمضان المبارک ایک مرتبہ پھر ہم پر سایہ فگن ہے،اِس ماہ مبارکہ میں ربّ کریم کی رحمتوں کی بارش ہماری زندگیوں کو سیراب کرنے کیلئے برس رہی ہے،اِس ماہ کا ہر روز،روز سعید ہے،ہر شب،شب مبارک ہے،دن روشن ہوتا ہے تو اِن گنت بندوں کو یہ سعادت نصیب ہوتی ہے کہ وہ اپنے ربّ کی اطاعت اور رضا جوئی کی خاطر اپنے جسم کی جائز خواہشات اور ضروری مطالبات تک ترک کرکے گواہی دیں کہ اللہ ہی اُن کا ربّ اور مقصود و مطلوب ہے،اُس کی اطاعت و بندگی کی طلب ہی زندگی کی اصل بھوک پیاس ہے اور اُس کی خوشنودی ہی میں دلوں کیلئے سیری اور رگوں کیلئے تری کا سامان موجود ہے،جب رات کا اندھیرا چھاتا ہے تو بے شمار بندے اللہ کریم کے حضور قیام کرتے ہیں،اُس سے کلام کرتے ہیں اور اُس کے ذکر کی لذت و برکت سے مالامال ہوتے ہیں۔
اِس ماہ کی ہر گھڑی میں فیوض و برکات کا اتنا خزانہ پوشیدہ ہے کہ نفل اعمال صالحہ،فرض اعمال صالحہ کے درجے کو پہنچ جاتے ہیں اور فرائض ستر گناہ وزنی

اور بلند ہوجاتے ہیں، (بیہقی) رمضان آتا ہے تو آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، رحمتوں کی بارش ہوتی ہے اور نیکی راستوں پر چلنے کی سہولت اور توفیق عام ہوجاتی ہے، جہنم کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں اور روزہ بدی کے راستوں کی رکاوٹ بن جاتا ہے، شیطانوں کو زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے اور برائی پھیلانے کے مواقع کم سے کم ہوجاتے ہیں۔ (بخاری، مسلم) یہی وہ ماہ مبارکہ جس کیلئے جنت سال بھر سجائی جاتی ہے، معزز مہمانوں کے استقبال کی تیاریاں ہوتی ہیں،جنت کے دوازے کھول دیئے جاتے ہیں اور فرشتے پکار پکار کے کہتے ہیں،آوازیں لگاتے ہیں کہ "اے خیر کے طالب آگے بڑھ اور برائی کے طالب رک جا۔" (ترمذی۔ابن ماجہ)

ربّ کریم اِس خاص ماہ کی ہر صبح اور ہر رات فرشتوں کو مقرر فرماتا ہے جو آواز لگاتے ہیں "اے خیر کی تلاش کرنے والے متوجہ ہو اور آگے بڑھ،اے برائی کے طالب رک جا۔اُس کے بعد فرشتہ کہتا ہے" ہے کوئی اُس کی مغفرت چاہنے والا کہ اُس کی مغفرت کی جائی، ہے کوئی توبہ کرنے والا کہ اُس کی توبہ قبول کی جائی،ہے کوئی دعا کرنے والا کہ اُس کی دعا قبول کی جائے،ہے کوئی سائل کہ اس کا سوال پورا کیا جائے۔"

اللہ اللہ ! کیا دن ہیں کہ رحمت، مغفرت اور جہنم سے خلاصی کی سیل لگی ہوئی

ہے، لوگوں کو آوازیں دے دے کر بلایا جا رہا ہے، نیکیوں کے راستے پر چلنے کی سہولت
اور توفیق عام دی جا رہی ہے، گناہوں کی معافی کے مژدے سنائے جا رہے ہیں، کہا جا رہا
ہے، اے خطا کاروں... اے گناہ گاروں... اے عاصیوں آؤ... اپنے اپنے گناہوں
معافی حاصل کرلو... ربّ کا دریائے رحمت جوش میں ہے... بخشش اور مغفرت کے
پروانے تقسیم کیے جا رہے ہیں... تمہارا ربّ بہت ہی مہربان ہے... تم جو مانگو گے، وہ
تمہیں عطا کرے گا... بس آگے بڑھ کے تو دیکھو... اُس کے دامنِ رحمت و محبت کو تھام
کر تو دیکھو... ایک مرتبہ، صرف ایک مرتبہ، اُس سے مانگ کر تو دیکھو... ذرا اپنے
دامن پھیلا کر تو دیکھو... اُس کی بارگاہ میں سر جھکا کر تو دیکھو... آج اُس نے ہر چیز
سستی کر دی ہے... بس وہ منتظر ہے کہ اُس کے غلام... اُس کے بندے، عباد
الرحمٰن... اُس کی طرف رخ کریں... اُس کی طرف متوجہ ہوں... اور وہ انہیں معاف
کردے... بخش دے اور مغفرت کر دے اور جہنم سے خلاصی کی دولت سے نواز
دے... اللہ اللہ! آج اُس کی رحمت تو برسنے کے بہانے ڈھونڈ رہی ہے۔
دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ رحمتیں اور برکتیں ہر اُس شخص کے حصے میں آتی ہیں جس نے یہ
مہینہ پایا، یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے جب بارش ہوتی ہے تو ندی
نالوں، کھیتوں، کھلیانوں، چٹیل میدانوں اور سنگلاخ چٹانوں پر یکساں برستی ہے، ندی
نالے اور تالاب اپنی اپنی وسعت و گہرائی کے مطابق ہی بارش کے پانی

سے فیضیاب ہوتے ہیں، اسی طرح زمین کے مختلف ٹکڑے بھی اپنی استعداد کے مطابق ہی فصل دیتے ہیں، جبکہ بارش سب پر یکساں برستی ہے، مگر ایک چھوٹے سے گڑھے کے حصے میں اتنا وافر پانی نہیں آتا، جتنا ایک لمبے چوڑے تالاب کے حصے میں آتا ہے، اسی طرح بنجر اور سنگلاخ چٹانیں اور چٹیل میدان بھی بارش کے پانی کو اپنے اندر جذب نہیں کرپاتے، جبکہ زرخیز زمین لہلہا اٹھتی ہے، یہی حال انسانوں کی فطرت اور اُس کے نصیب کا ہے۔

رمضان کے خزانے تو بٹ رہے ہیں، ان خزانوں میں سے کس کا کیا ملنا ہے، یہ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے، اگر زرخیز زمین کی طرح آپ دل بھی نرم و گداز ہونگے، ایمان و یقین کی دولت سے مالا مال ہونگے اور آپ صبر واستقامت کے ساتھ مستقل مزاجی سے اپنا سفر جاری رکھیں گے تو یقینا ایمان صالحہ کے پھل، پھول اور بیل بوٹے آپ کے نصیب میں ہونگے، لیکن اگر دل پتھر کی طرح سخت ہونگے اور آپ ایک غافل کسان کی طرح سوتے پڑے رہیں گے تو رحمت، بخشش اور مغفرت کی یہ برسات گزر جائے گی اور دل کی بنجر زمین، بنجر ہی رہ جائے گی، یہ سب ربّ کریم کی عطا کردہ توفیق ہے اور توفیق الٰہی کے بغیر کسی کو کچھ نہیں ملتا، لیکن یاد رہے کہ توفیق بھی اُسی کو ملتی ہے جو اس کی کوشش کرتا ہے۔

چنانچہ توفیق الٰہی کے حصول کیلئے کوشش کیجئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ رمضان کا

ماہ مبارک گزر جائے، رب کی رحمتوں اور برکتوں کے ڈول کے ڈول انڈلے جاتے رہیں اور ہم اتنے بد نصیب ہوں کہ ہمارے حصے میں کچھ بھی نہ آئے، ہماری جھولی خالی کی خالی رہ جائے، کیا معلوم اگلا رمضان ہمیں ملے یا نہ ملے، لہذا میرے دوستو! توفیق الٰہی کے حصول کیلئے محنت کیجئے، اپنے حصے کی برکتیں اور رحمتیں لوٹنے کیلئے کمر کس لیجئے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اِس تنبیہہ کو یاد رکھئے کہ "کتنے روزہ دار ہیں جن کو اپنے روزوں سے بھوک پیاس کے سوا کچھ نہیں ملتا اور کتنے راتوں کو نماز پڑھنے والے ہیں جن کو اپنی نمازوں سے رات کی جگائی کے سوا کچھ حاصل نہیں

(ہوتا۔" (الدامی۔ابوہریرہ

(بد نصیب ہے وہ شخص جو اِس مہینے میں اُس کی رحمت سے محروم رہ جائے۔" (طبرانی "

مفادات کی میز پر اقتدار کی بندر بانٹ۔۔۔۔

رُوٹھنے منانے کے کھیل میں جان سے جانے والے۔۔۔۔۔

قومی اور اجتماعی مفادات کو پس پشت ڈال کر محض اپنی سیاسی بالادستی اور اقتدار کی بندر بانٹ کیلئے کیے جانے والے فیصلے کبھی بھی ملک و قوم کی خیر و فلاح کا باعث نہیں بن سکتے، مصلحت، دباؤ اور خوف کے تحت کیے جانے والے ایسے فیصلوں کو آپ لاکھ ایثار، قربانی، وسیع تر قومی مفاد اور مفاہمت کام نام دیں مگر حقیقت یہی ہے کہ نیک نیتی اور جذبہ اخلاص سے عاری خوبصورت الفاظ کے لبادے میں لپٹے ایسے فیصلوں کے بطن سے ترقی واستحکام اور امن و خوشحالی کی خوشنما کونپلیں نہیں پھوٹتی ہیں اور نہ ہی ایسے فیصلے دیرپا نتائج اور دوررس اثرات کے حامل ہوتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اپنے اپنے مفادات کے حصول کی خواہش فریقین کو اُس وقت تک آپس میں جوڑے رکھتی ہے جب تک کہ اُن کے مفادات پر ضرب نہیں پڑتی، مگر جہاں اُن کے مفادات متاثر ہوتے ہیں، تمام جذبہ ایثار، قربانی، وسیع تر قومی مفاد اور مفاہمت کے تار و پود اِس طرح بکھر جاتے ہیں، جیسے خزاں رسیدہ شجر کی بے جان پیتاں، زرا سا موسم کیا بدلتا ہے زبانیں زہر اگلنے لگتی ہیں، الزامات در الزامات کے بم اور گولے برسنے لگتے ہیں اور

دیکھتے ہی دیکھتے شہر کے درودیوار نفرت، بغض و عناد اور علاقائی اور لسانی تعصب کی آگ میں جل کر بے گناہ انسانوں کے خون سے رنگین ہونے لگتے ہیں۔

لیکن متحارب فریقین کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آتا، پھر روٹھنے منانے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور تمام تر اختلافات کے باوجود خود ساختہ وسیع تر قومی مفاد کا تقاضہ انہیں ایک بار پھر مفادات کی میز پر لے آتا ہے، ہوس اقتدار اور خواہش حکمرانی انہیں باہم یکجا کردیتی ہے، مگر انتشار سے اتفاق تک جو سینکڑوں لوگ قربانی کی بھینٹ چڑجاتے ہیں، جو لاتعداد گاڑیاں اور نجی و قومی املاک نذرِآتش کردی جاتی ہے،اُس کا کسی کو افسوس نہیں ہوتا، کسی کے ماتھے پر شکن نہیں آتی، کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا ہے، بے گناہ لوگ حکومت اور حکومتی حلیفوں کے ناعاقبت اندیش فیصلوں کی بھینٹ چڑھتے رہتے ہیں، روم جلتا رہتا ہے اور نیرو چین کی بانسری بجاتا ہے،اَمر واقعہ یہ ہے کہ موجودہ حکومت کے پانچ سالہ دور اقتدار کے دوتہائی عرصے میں یہی کچھ ہوا ہے، ہر شعبہ زندگی ابتری کا شکار ہے، مہنگائی، بے روزگاری، بدامنی و خوں ریزی، غربت، بھوک وافلاس، مالی بدعنوانیاں، گیس، بجلی اورپانی کا بحران، قومی اداروں کی تباہی، معاشی عدم استحکام، قومی یکجہتی کے فقدان کی بیماریوں نے آکاس بیل کی طرح پورے ملک و قوم کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے، ہر طرف مایوس کن اور حوصلہ شکن حالت نظر آتی ہے، یہی حال پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی کا ہے جہاں بدامنی نے مستقل

ڈیرے ڈال رکھے ہیں، دس بارہ بے گناہ شہریوں کا قتل روز کا معمول بن چکا ہے۔
عجب تماشا ہے کہ حکومت کی آئے دن کی یقین دہانیوں، صدر اور وزیر اعظم کی طفل تسلیوں اور وفاقی وزیر داخلہ کے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود معاملات بے قابو ہوتے چلے جاتے ہیں، شہر کی لسانی اور علاقائی بنیادوں پر تقسیم اور جتھہ بند تصادم نے پہلے ہی شہر کے امن و سکون کو تباہ کرکے رکھدیا ہے،اُس پر مستزاد صوبائی اور وفاقی حکومت کے ابن الوقتی کے مظہر انتظامی فیصلے،جو صاف ظاہر کرتے ہیں کہ یہ فیصلے محض سیاسی مفادات اور سودے بازیوں کیلئے کئے جارہے ہیں اور جن کا مقصد شہر پر اپنے کنٹرول کو برقرار رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے،ایسا ہی ایک فیصلہ آزاد کشمیر میں انتخابات کے موقع پر متحدہ اور پیپلز پارٹی کے درمیان اختلافات کے نتیجے میں متحدہ کی حکومت سے علیحدگی کے بعد انتہائی عجلت میں صوبہ سندھ میں سابقہ فوجی آمر کا متعارف کردہ ضلعی حکومتی نظام کے خاتمے اور انگریز کے عطا کردہ کمشنری نظام کی بحالی، پھر مزاکرات کے بعد کراچی وحیدرآباد میں ضلعی حکومتی نظام کی ازسر نو بحالی اور باقی سندھ میں کمشنری نظام کا اطلاق، مگر سندھ کی قوم پرست جماعتوں کی برہمی، شدید احتجاج اور ہڑتالوں کے اعلان کے بعد حکومت کی الٹے پیروں واپسی اور دوبارہ پورے سندھ میں لوکل گورنمنٹ آرڈیننس 2001ء کی بحالی ہے،دونوں میں سے کونسا نظام بہتر ہے یہ ایک الگ بحث ہے، مگر ایک نظام کی معطلی، دوسرے کے بحالی، پھر

دوسرے کی معطلی پہلے کی جزوی اور بعد میں مکمل بحالی کے فیصلے جس انداز سے کیے گئے اُس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ فیصلے عوام کے مفاد کیلئے نہیں بلکہ سیاسی مفادات اور جوڑ توڑ کیلئے کیے گئے ہیں۔

ایک ایسے وقت میں جبکہ ملک مسائل کے گرداب بلا میں پھنسا ہوا ہے اور مسائل کا انبوہ کثیر خوفناک اژدھے کی صورت منہ کھولے ہمیں نگلنے کیلئے تیار کھڑا ہے، حکمرانوں کا اِس قسم کا غیر سنجیدہ طرز عمل اور آرڈیننس پر آرڈیننس کا اجراء اس بات کا عکاس ہے کہ یہ معاملہ انتظامی نہیں بلکہ اِس فیصلے کا پس منظر سیاسی طاقت کا حصول ہے، دوسری طرف حکومتی طرز عمل سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ حکومت نے آئین و قانون کو موم کی ناک بنا رکھا ہے، جب چاہا اور جیسے چاہا موڑ لیا، آج نظام کی خرابی اور مملکت کو اقتدار کی مصلحتوں کے تابع رکھ کر چلانے کی روش ہمیں اِس مقام پر لے آئی ہے جہاں ہم ملک کے مختلف حصوں میں مختلف طرز حکمرانی لے کر چل رہے ہیں، جس صوبے میں حکومت مرکز کے موافق نہیں وہاں صوبائی تقسیم کے تصور کو ترقی و انقلاب کا نقیب اور عہد آفریں تصور بنا کر پیش کیا جارہا ہے اور جہاں ریاست کا کوئی کنٹرول نہیں، آئے دن حکومت کی عملداری چیلنج ہوتی رہتی ہے، اُن علاقوں میں ہم ابھی تک کوئی ایسا مربوط سلسلہ قائم نہیں کرپائے کہ قومی زندگی محفوظ و مامون بنا سکیں، جبکہ ہمارا تو حال یہ ہے کہ ہم آگہی کے باوجود امن و سلامتی کے

دشمنوں کو اِس لیے بے نقاب اور عبرتناک انجام سے دوچار نہیں کرپاتے کہ سیاسی ضرورتیں اور اقتدار کی مصلحتیں ہماری راہ کی رکاوٹ بن جاتیں ہیں،آج اقتدار کی انہی مصلحتوں نے کثیرالنسل اور کثیراللسان عروس البلاد شہر کراچی کے امن وسکون کو یرغمال بنایا ہوا ہے۔

عین ممکن ہے کہ حالیہ اقدامات وقتی طور پر شاید اہل اقتدار کا سہارا بن جائیں اور شہر میں جاری قتل و غارت گری رک جائے،مگر حقیقت یہی ہے کہ یہ امن وسکون چند روزہ ہے،ہم سمجھتے ہیں جب تک ذاتی پسند و ناپسند اور اقتدار کی ضرورتوں اور مصلحتوں کے دائرے سے باہر نکل کر قومی اور ملکی مفاد میں جرات مندانہ فیصلے نہیں کیے جاتے،اُس وقت تک صورتحال میں تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے،مگر موجودہ حکومت سے یہ توقع کارعبث ہے،کیونکہ نہ تواِن کے پاس استقامت ہے اور نہ ہی کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اُس پر سوچ،بچار اور فیصلے کے عوامل و عواقب پر غور کرنے کی صلاحیت ہے،یوں بھی حکومت اپنے ساڑھے تین سالہ دور اقتدار میں فیصلے کرکے واپس لینے کے کئی ریکارڈ قائم کرچکی ہے،اِس بار بھی اُس نے اپنے سابقہ ٹریک ریکارڈ کو برقرار رکھا ہے،ایسا لگتا ہے کہ کسی فیصلے کے اطلاق سے پہلے حکومت اُس کے اثرات و نتائج کا فہم و ادراک ہی نہیں رکھتی،بس نادر شاہی حکم جاری کردیا جاتا ہے مگر جب منفی ردعمل سامنے آتا ہے تو فیصلہ بدل جاتا ہے پھرایک بساط لپیٹ کر دوسری بساط بچھانے کی تیاری شروع

ہو جاتی ہے، ممکن ہے حکومت کی اِس حکمت عملی کا مقصد عوام کی توجہ اُن کو درپیش اصل مسائل سے ہٹا کر کسی اور طرف لگانا ہو مگر آرڈیننسوں کی معطلی اور بحالی کے اِس کھیل میں بے گناہ شہریوں کے قتل عام، قومی و نجی املاک کی تباہی، قومی یکجہتی اور ملکی معیشت کو پہنچنے والے نا قابل تلافی نقصان کی ذمہ دار مرکزی اور صوبائی حکومت کی ابن الوقتی کی مظہر غیر دانشمندانہ حکمت عملی ہیں۔

آج حکومت کے انہی غیر دانشمندانہ اقدامات کی بدولت نہ صرف سندھ کی قوم پرست جماعتیں برہم ہیں بلکہ خود حکومت کی حلیف اور اتحادی جماعت اے این پی بھی ناراض اور کہہ رہی ہے کہ پیپلزپارٹی کی حکومت ہر معاملہ پر جوتے کھاتی ہے، مرکز، صوبہ پختونخواہ اور سندھ میں پیپلزپارٹی کی اتحادی جماعت ہونے کے ناطے اے این پی کا شکوہ اپنی جگہ بالکل بجا ہے، دوسری طرف وزیر بلدیات آغا سراج درانی کا یہ یقین کہ عید سے پہلے متحدہ حکومت میں واپس آجائے گی اور دونوں ایک ساتھ مل کر عید کی نماز ادا کریں گے غلط نہیں ہے، موجودہ حالات کے تناظر میں متحدہ کی حکومت میں واپسی حیرت انگیز عمل نہیں ہوگا، کیونکہ متحدہ کا آنا جانا ایک معمول کی کاروائی ہے، رہی بات پیپلز پارٹی کی مقبولیت اور ساکھ کی تو حکومت کے اختیار کردہ طریقہ کار نے اُس کی بچی کھچی ساکھ کو ضرور نقصان پہنچایا اور ثابت کر دیا ہے کہ ارباب اقتدار میں اتنی بھی ہمت و جرات

نہیں کہ وہ اپنے فیصلوں پر قائم رہ سکیں، سچ کہا ہے کسی نے کہ " دنیا میں سمجھوتے کرنے، ڈرنے، گھبرانے اور ڈیل کرنے والوں کی عمر اُن کی زندگی سے بھی مختصر ہوتی ہے۔"

اللہ کی رضا پاکستان۔۔۔۔۔

یوم آزادی پر خصوصی تحریر

باقی ہے جسم وجاں ابھی قرض آزادی۔۔۔۔۔

تاریخ گواہ ہے کہ غلامی کی لعنت حساس افراد اور زندہ قوموں کیلئے ہمیشہ ذہنی اذیت، روحانی بے چینی اور قلبی درد و کرب کا باعث رہی ہے، جبکہ احساس غلامی اور محرومیت نے ہمیشہ محکوم اور غیور انسانوں اور غیور قوموں کے لہو کو گرم رکھا اور نتیجتاً حکمران قوموں کی ظاہری شفقت و مہربانی اور آئین پسندی کے باوجود محکوم قوموں نے غلامی کی زنجیروں کو توڑ ڈالا، یہ بھی حقیقت ہے کہ غلامی کی زنجیریں ٹوٹنے کا عمل کبھی خاموش نہیں ہوتا،غلامی کی زنجیروں پر موت کے رقص ہوتے ہیں،آزادی کے متوالے سولیوں پر چڑھتے ہیں، سروں کے نذرانے پیش کرتے ہیں، جانوں کی قربانی دی جاتی ہے اور شہداء کے بہتے ہوئے خون سے دریا سرخ ہوجاتے ہیں،گاؤں دیہات لٹتے ہیں، شہر جلائے جاتے ہیں لیکن آزادی کے متوالے آگ و خون کے دریاؤں سے گزر کر آزادی کی منزل تک پہنچ ہی جاتے ہیں،آگ و خون کے دریاؤں سے گزرنے کا احساس اور تجربہ برصغیر کے مسلمانوں سے زیادہ کسی اور قوم کو نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ غلامی کا طوق گلے

سے اتارنے کیلئے ہمیشہ سینہ سپر رہے،انہوں نے ہندو قوم کی طرح عزت و آزادی کے سودے نہیں کئے،پلاسی کے میدان سے لے کر سرنگا پٹم کی سرزمین تک 1857ء کی جنگ آزادی سے لے کر تحریک خلافت، تحریک ہجرت اور تحریک عدم تعاون اور جلیانوالہ باغ کے المیہ سے لے کر واقعہ کانپور مچھلی بازار، سانحہ مسجد شہید گنج اور حادثہ قصہ خوانی بازار تک ایسے تمام مواقع پر مسلمانانِ ہند جرات و بہادری کے ساتھ بڑھ چڑھ کر مردانگی کا مظاہرہ کرتے اور اپنے خون سے آزادی کے چراغ روشن کرتے رہے۔

مسلمانان برصغیر کی جدوجہدِ آزادی بلاشبہ انتہائی کٹھن اور صبر آزما کام تھی انہیں کئی محاذوں پر برسرپیکار رہنا پڑا،ایک طرف انگریز کی غلامی سے نجات کا مرحلہ درپیش تھا تو دوسری طرف ہندو بنیے کے متوقع رام راج کے برسراقتدار آنے کے خطرات لاحق تھے،انگریزوں اور ہندوؤں دونوں کی غلامی کے طوق انہیں اپنی گرفت میں لینے کیلئے بے چین تھے، کیونکہ دونوں ہی مسلمانوں کے ازلی دشمن تھے،انگریزوں کے ذہن سے صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کبھی محو نہیں ہو سکی اسی طرح ہندو برصغیر کے میدانوں میں سلطان محمود غزنوی، سلطان محمد غوری، ظہیر الدین محمد بابر، احمد شاہ ابدالی جیسے مایہ ناز سورماؤں اور جری جرنیلوں کے ہاتھوں اپنی ذلت آمیز شکستوں کے واقعات نہیں بھولے تھے،یہی وجہ تھی جب آزادی کی گھڑیاں قریب آئیں تو دونوں

قوموں نے اپنے سینوں میں چھپائی ہوئی برسوں کی دشمنی، نفرت اور بغض کا برملا اظہار کیا، انگریز نے حالات و واقعات سے مجبور ہو کر مسلمانان برصغیر کا مطالبہ تو منظور کرلیا لیکن پاکستان کے وجود کو گہری اور خطرناک ضربیں لگانے سے باز نہیں آئے، پاکستان میں شامل ہونے والے دو بڑے صوبے بنگال اور پنجاب کو تقسیم کر دیا گیا، باونڈری کمیشن سے تمام بے اصولیاں کرائیں گئیں، الغرض پاکستان کو لولا لنگڑا بنانے کیلئے انہوں نے تمام ممکنہ کوششیں روا رکھیں، دوسری طرف ہندوؤں اور سکھوں نے بھی اگرچہ پاکستان کے قیام پر بظاہر رضامندی ظاہر کر دی تھی لیکن اندرونی طور پر وہ پاکستان کے وجود کو چند ساعتوں یا چند مہینوں زیادہ دیکھنے کے متحمل نہیں تھے، وہ برصغیر کے مسلمانو ں کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتے تھے اور خاص کر انہوں نے بھارت میں شامل ہونے والے علاقوں کے مسلمانوں پر لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا، مسلمانوں کے محلے قصبے، شہر اور دیہات لوٹے انہیں آگ لگائی، ہزاروں لاکھوں بے گناہ بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کو تہہ تیغ کیا نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کو اغوا کیا، نواکھلی سے لے کر لاہور تک کشمیر سے لے کر راس کماری تک غریب مسلمانوں پر ایک قیامت گزر گئی، پورا مسلم ہندوستان جل رہا تھا، بہار سے لے کر مشرقی پنجاب تک آگ لگی ہوئی تھی لیکن انگریزوں کا "نیرو" لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور ہندوؤں کا "نیرو" مہاراجہ پٹیالہ جو پنجاب کا رنجیت سنگھ بننا چاہتا تھا چین سے بیٹھے بانسری بجا رہے تھے، مسلمانوں کی

دنیا لٹتی رہی اور مسلمانوں کے ازلی دشمن 14 اگست 1947ء کی صبح آزادی تک بانسری بجاتے رہے۔

چودہ اگست 1947ء کو دنیا کے نقشے پر ایک آزاد اسلامی جمہوری مملکت پاکستان بن کر ابھری، جس کے قیام کیلئے مسلمانان ہند نے بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں ایک طویل جنگ لڑی، یہ وہ سیاسی اور جمہوری حقوق کی بازیابی کی جنگ تھی جس کیلئے مسلمانانِ ہند نے قید و بند کی صعوبتیں تو ایک طرف ہزاروں ماؤں نے اپنے جگر گوشوں کی شہادت سے، ہزاروں بہنوں نے اپنی عزتوں اور عفتوں کے نذرانے دے کر اور ہزاروں معصوموں نے بوڑھوں نے اپنی جانوں کی بازی ہار کر ظالم و متعصب انگریزوں اور ہندوؤں سے اپنے پاک وطن کی آزادی حاصل کی، یہ حصول پاکستان کی طویل جدو جہد پر مبنی تاریخی واقعات زندہ اور باغیرت قوم کی تاریخ ہیں جو آج ہمارے لئے قابل رشک اور قابل زکر ہیں، یہ اُن نیک جذبوں اور پاکیزہ آرزوؤں کی تاریخ ہے جس کی قوت اور اثر سے ہندوستان کی تین سو سالہ شب ظلمت کا سینہ چیر کر آزادی کا سورج طلوع ہوا مگر اِن پاکیزہ فولادی جذبوں کی تاریخ کا آخری باب 11 ستمبر 1948ء کو بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناح کی وفات کے ساتھ ہی ختم اور مکمل ہوگیا اور اُس کے بعد جس تاریخ کا آغاز ہوا اُس کے صفحات پر کارناموں کی جگہ المیے رقم ہوئے، بابائے قوم اور شہید ملت لیاقت علی خان کی وفات کے بعد سے تا حال

ہماری قومی تاریخ المیوں در المیوں کی تاریخ جس کے صفحات کا ایک سرا مقبوضہ کشمیر کی
لہو رنگ وادی، سری نگر کے خوں آلود پہاڑوں سے لے کر ڈھاکہ اور چٹاگانگ کی خون
آلود گلیوں تک پھیلا ہوا ہے تو دوسرا صوبہ بلوچستان و پختونخواہ کے کوہساروں سے
لے کر کراچی کی سڑکوں تک سسکتی ہوئی مظلوم انسانیت اور بے بسی و لاچارگی کی تاریخ
بیان کرتا ہے۔ان المیوں نے ہمیں ایک متحد و منظم قوم سے چھوٹے چھوٹے انسانی
گروہوں اور بکھرے ہوئے بھیڑوں کے ریوڑ میں تبدیل کر دیا۔انگریزوں اور ہندو بنیے
سے لڑ کر پاکستان حاصل کرنے والی قوم جغرافیائی، لسانی اور نسلی تضادات میں الجھ کر
بکھر گئی۔اقتدار مافیا نے کبھی جمہوریت، کبھی اسلام،اور کبھی غریب پروری کے لبادوں
میں روپ بدل بدل کر جمہوریت کی دھجیاں اڑائیں،اسلام کے ساتھ کھلا مذاق کیا اور
سیاست کا وہ کھیل کھیلا جس کے احوال دیکھ کر شاید گورستانوں کے گل فروش بھی
شرمندہ ہوتے ہوں، سیاستدانوں کی باہمی چپقلش، سیاسی مفادات کی کالی آندھی نے
تحریک پاکستان کے مقاصد کے ساتھ قرارداد مقاصد کو بھی نہ صرف دھندلا کر رکھ دیا
بلکہ بانیان پاکستان اور تحریک پاکستان کے گمنام شہیدوں کی ارواح کو بھی زخم لگائے
جنھوں نے اپنا سب کچھ اس مملکت عظیم کے قیام کیلئے قربان کیا تھا۔
قوم گذشتہ 64برس سے اپنی ناکام تمناؤں اور حسرتوں کے لاشے اٹھائے امید بر

آس رہی جبکہ حکمرانوں نے ہر مرتبہ وطن عزیز پاکستان کے جواز کی توہین کی اور قیام پاکستان کے بنیادی مقصد کو فراموش کردیا، ہر مرتبہ وعدہ خلافی کی گئی، حکمرانوں نے پاکستان کو اپنے باپ کہ جاگیر سمجھ کر اس بری طرح لوٹا کہ آج پوری قوم کاسہ گدائی لئے ورلڈ بینک، آئی ایم ایف جیسے اسلام اور پاکستان دشمن اداروں کے سامنے کھڑی ہے جو اپنی مرضی سے ہمارا بجٹ بنواتے ہیں ہم پر ٹیکس لگواتے ہیں، بخدا یہ سریحاً توہین ہے اُن جذبوں کی جو قیام پاکستان کیلئے دی جانے والی قربانیوں کے پیچھے کارفرما تھے، یہ توہین ہے اُس خون کی جو پاکستان کیلئے شہدا کے بدن سے بہا، یہ توہین ہے اُس نظریئے کی جس کی بنیاد پر تحریک پاکستان چلائی گئی اور یہ توہین ہے اُس تاریخ کی جس کی پیشانی پر اسلام کی 12 سو سالہ حکمرانی کا تاج سجا رہا اور جس نے دنیا کو رہنے، سہنے اور جینے کے ڈھنگ اور قرینے سکھائے۔ آج اسی قوم کی تباہی و بربادی پر باطل ہنس رہا ہے، قوم بانیان پاکستان کی قربانیوں اور مقاصد کو بھول کر مفادات میں الجھ گئی ہے ہر کوئی کہیں بھی ہو اپنی مفاداتی جنگ سے باہر نہیں آرہاہے۔ اس وقت قوم جس دور آشوب سے گزر رہی ہے وہ انتہائی خطرناک اور بھیانک منظر کی عکاسی کر رہا ہے، وہ جنگ جو امریکہ کل تک افغانستان اور عراق میں لڑ رہا تھا آج کمال مہارت سے اُس نے وہ جنگ پاکستان کے اندر شروع کرا رکھی ہے جس سے ہمارا اسلامی تشخص اور مقام ہی متاثر نہیں ہو رہا بلکہ اس کا براہ راست اثر ہماری آزادی اور خود مختاری پر پڑ رہا ہے اور دشمن چاروں طرف سے

منہ کھولے ہمیں نگلنے کیلئے تیار کھڑا ہے۔ للہذا اس نازک وقت میں ہمیں اسلام کی درخشاں تاریخ کی روشنی میں اپنے گھوڑے ہر لمحے تیار رکھنے چاہیے، دشمن نے پاکستان کو کبھی معاف نہیں کیا اُس کا تو مقصد ہی یہی تھا کہ پاکستان چند ماہ میں ختم ہو جائے لیکن وہ بابائے قوم قائدِاعظم محمد علی جناح کے اِس قول اور حقیقت کو بھول گیا کہ "پاکستان خدا کی مرضی ہے اور یہ مرضی پوری ہو کر رہے گی پاکستان قیامت تک زندہ رہے گا۔"
انشاءاللہ پاکستان قیامت تک زندہ وآباد اور قائم و دائم رہے گا، دشمن کی کوئی چال کوئی حربہ پاک سرزمین کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا، ہم کل بھی آزاد تھے، آج بھی آزاد ہیں اور اپنے ربّ کی عطا سے کل بھی آزاد ہونگے، آج ہم اس پاک سرزمین کے
مرغزاروں، ریگزاروں، اور آباد قصبوں اور شہروں میں اپنی آزاد فضاوں کے ساتھ محو رقص ہیں، یہاں کی سرسبز و شاداب وادیاں ہمیں زندگی کے جبر سے بے خبر کئے ہوئے ہیں، جبکہ اس کے دامن میں جاری دریا اور اس کی تہوں میں چھپے خزانے ہماری توانائیوں کے جواب میں اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے کیلئے تیار ہیں، یہاں کے پہاڑوں کی بلندیاں اور سمندر کی وسعتیں ہماری ہمتوں کی آزمائش کیلئے محوِ انتظار ہیں، قدرت کی اَن گنت عطیات اس خطہ ارضی کے دامن میں پوشیدہ ہیں، لیکن افسوس کہ ہماری تمام توانائیاں سہل انگاری کی نظر ہو گئیں، ہماری خوابیدہ صلاحتیں کسی معجزہ کے ظہور کا انتظار کر رہی ہیں، اب

وقت آگیا ہے کہ ہم سہل انگاری کے فریب اور معجزوں کے انتظار کے سحر سے باہر نکلیں اور سوچیں کہ وہ کون سے دشمن ہیں جنہوں نے ہمیں 64 برس تک قیام کے پاکستان کی اصل منزل سے دور رکھا ہوا ہے۔پاکستان ہمارے پاس اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت ہے، یہ امانت ہے اُن شہداء کی جنہوں نے اس کی بنیادیں اپنے گرم لہو سے اٹھائیں، یہ امانت ہے ہماری آئندہ نسلوں کی جنہیں کل اس کا پاسبان بننا ہے۔یاد رکھیں کہ پاکستان ایک حقیقت ہے یہ عطیہ خداوندی ہے اس نعمت سے فیضیابی کیلئے ہمیں اپنے آپ کو پورے خلوص اور عزم صمیم کے ساتھ تیار کرنا ہوگا جس طرح ہمارے آباء واجداد نے اپنی انتھک محنت اور کامل جذبہ ایمان سے اسلام کے پیغام حق کو جزیرہ ہائے عرب کے ریگزاروں سے نکال کر دنیائے عالم کے گوشہ گوشہ تک پہنچایا تھا،آج ہمیں اُسی جذبہ اور ایمان کے ساتھ رخت سفر باندھنا ہوگا۔آیئے ہم سب مل کر اپنے بزرگوں کی اِس امانت کی حفاظت کریں، پاکستان کی نامکمل عمارت کی تعمیر کریں اور اُس تصور پاکستان کی تکمیل کریں جس کی تخریب ہمارے دشمنوں کا مقصد ومدعا ہے۔آج تکمیل پاکستان کیلئے ہمیں اسی جذبے، اسی ولولے اور وہی قربانیاں دینا ہونگی جس کا نظارہ تشکیل پاکستان کے وقت ہمارے آباؤاجداد نے پیش کیا تھا۔دوستو! سفر ابھی ادھورا ہے، تکمیل پاکستان کی منزل ابھی باقی ہے۔آیئے آج کے دن پاکستان کو حقیقی منزل تک پہنچانے کیلئے اپنا قومی و ملی کردار ادا کرنے کا عہد کریں "کہ باقی ہے جسم وجاں ابھی قرض آزادی۔"

غزوہ بدر جریدہ عالم پر نقش دوام۔۔۔۔

یوم بدر کے حوالے سے خصوصی تحریر

قانون فطرت ہے کہ جس چیز کو جتنا دبایا جاتا ہے وہ اتنا ہی ابھر کر سامنے آتی ہے، یعنی عمل جتنا شدید ہوتا ہے، رد عمل بھی اتنا ہی شدید واقع ہوتا ہے، یہ ایک بھی طے شدہ اصول ہے کہ ہر عمل اپنے اندر چند اسباب و محرکات رکھتا ہے، جو اپنے ظاہری اور خفیہ پہلوؤں پر محیط ہوتے ہیں، جنگ ہی کو لیجیے اِس کے کچھ اسباب فوری نوعیت کے ہوتے ہیں اور کچھ کا دورانیہ ایک طویل عرصے پر محیط ہوتا ہے، فوری وجہ تو صرف بہانہ بنتی ہے، لیکن اُس کے پس پردہ بہت سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں، غزوہ بدر بھی کسی فوری اور اضطراری سوچ کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ حق و باطل کے اِس معرکے کی وجوہات پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت سے ہجرت مدینہ تک اَن گنت واقعات کے دامن میں پھیلی ہوئی ہیں، اگرچہ چند ایک واقعات کو اِس معرکہ کی فوری وجوہات میں شمار کیا جاسکتا ہے، لیکن درحقیقت یہ تصادم تو اُسی روز ناگزیر ہوگیا تھا، جس دن پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم نے کفر و شرک کے طاغوتی ماحول میں اعلائے کلمۃ الحق کا پرچم بلند کیا تھا، جس روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین مکہ کو پتھر کے جھوٹے خداؤں کی پرستش ترک کرکے خدا وحدہ لاشریک کی بارگاہ

میں سجدہ ریز ہونے کی دعوت دی تھی، حقیقت یہ ہے کہ فاران کی چوٹیوں سے آفتاب ہدایت کے طلوع ہونے کے ساتھ ہی کفر کے اندھیروں نے اپنی بقاء کی جنگ کیلئے صف بندی کا آغاز کردیا تھا،اسلام اور پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سازشوں اور شرانگیزیوں کا سلسلہ اصل میں غزوہ بدر کا دیباچہ تھا،ہجرت مدینہ کے بعد مسلمانوں کے منظم ہونے سے اُن کی مظلومیت کا دور ختم ہوچکا تھا اور کفار مکہ کو یہ خدشہ کہ "اگر مسلمان ایک منظم قوت بن کر ابھرے تو صرف اُن کا باطل اقتدار ہی نہیں بلکہ اُن کا صدیوں کا قائم باطل نظام بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔"حقیقت میں تبدیل ہونے لگا تھا ۔

وہ جس قوت کو کمزور اور ختم کرنا چاہتے تھے،وہ قوت مدینہ منورہ میں بڑی تیزی سے عوامی پذیرائی حاصل کررہی تھی،کفار مکہ نے مسلمانوں کو مٹانے کیلئے ظلم وستم کے پہاڑ توڑے،قدم قدم پر جبر و تشدد کا نشانہ بنایا،اُن پر زمین کی وسعتیں تنگ کر دی گئیں،لیکن مسافرانِ راہ حق جادہ حق پر رواں دواں ہی رہے،نہ انکے ارادے متزلزل ہوئے اور نہ ہی اُن کے پائے استقلال میں لغزش آئی ،زباں پر احد احد کا نغمہ ہی گونجتا رہا،ہجرتِ مدینہ کے بعد تو کفار کی اسلام دشمنی، نفرت اور انتقام کی خواہشیں تمام حدوں سے تجاوز کر گئی،کفر کے علمبرداروں کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اپنے صدیوں سے قائم باطل نظام کو بچانے کیلئے کچھ بھی کر گزریں گے اور اِس دشمنی میں وہ تمام اصول وضابطوں

کو روند کر درندگی کی آخری حدوں کو بھی پھلانگنے سے گریز نہیں کریں گے۔ادھر پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے باطل ارادوں سے پوری طرح واقف تھے،آپ نے مہاجرین اور انصارِمدینہ کو جمع فرمایا اور ان سے ارشاد فرمایا کہ "ایک طرف تجارتی قافلہ ہے اور دوسری طرف کفار کا لشکر،اللہ کا وعدہ ہے کہ اِن دونوں میں سے کوئی ایک تمہیں مل جائے۔ "حضرت مقدار بن عمرو رضی اللہ عنہ اٹھ کر کہتے ہیں"یا رسول اللہ جدھر آپ کا ربّ آپ کو حکم دے رہاہے، اُس طرف چلیئے، ہم آپ کے ساتھ ہیں، بخدا ہم آپ کو وہ جواب نہ دیں گے جو بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کو دیا تھا کہ آپ اور آپ کا ربّ جائیں اور اُن سے جنگ کریں ہم تو یہاں بیٹھے ہیں.... اُس ذات پاک کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے اگر آپ ہمیں برک الغماد تک بھی لے چلیں تو ہم آپ کے ساتھ ہیں اور آپ کی معیت میں دشمن کے ساتھ جنگ کرتے جائیں گے۔"انصار میں سے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے نعرہ حق بلند کرتے ہوئے فرمایا"یا رسول اللہ اگر آپ ہمیں سمندر میں گرنے کا حکم دیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ سمندر میں چھلانگ لگادیں گے اور ہم میں سے ایک بھی شخص پیچھے نہ رہے گا۔"

فضا تیار تھی اور وقت آگیا تھا کہ کفار مکہ کی بڑھتی ہوئی خود سری، سرکشی اور رعونت کا جواب بے نیام شمشیروں سے دیا جائے اور اُن کے جنگی جنون کو

میدان جہاد میں ہی ٹھنڈا کیا جائے، چنانچہ خود پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم سمیت تمام صحابہ کرام اعلائے کلمتہ الحق کی بلندی اور باطل کی سرکوبی کیلئے اذن جہاد کے منتظر تھے، پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم اِس اَمر سے بخوبی آگاہ تھے کہ راہ انقلاب میں سربکف چلنے والے قافلے ہتھیلیوں پر اپنے سروں کے چراغ جلا کر ہی منزل انقلاب سے ہمکنار ہوتے ہیں، خلعت شہادت زیب تن کئے بغیر نہ تو کلمہ حق کی بلندی کا فریضہ سرانجام دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی باطل استحصالی قوتوں کے مکمل خاتمے کی توقع کی جاسکتی ہے، پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نئی حکمت عملی کے تحت باطل پر کاری ضرب لگانے کیلئے فیصلہ کن مرحلے کے منتظر تھے کہ رب تعالی کی طرف سے حکم ملتا ہے، "اجازت دی گئی اُن لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً اُن کی مدد پر قادر ہے یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے صرف اِس قصور پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔" (سورہ الحج 40-39)

سترہ رمضان المبارک 2 ہجری کی پر نور ساعتوں میں مجاہدین اسلام اپنے عظیم قائد امام المجاہدین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں توحید کا پرچم لہراتے ہوئے میدان بدر میں صف آراء ہوتے ہیں، جہاں حق باطل کا پہلا معرکہ گرم ہونے والا ہے، جہاں اِس عقدہ کی گرہ کشائی ہونے والی ہے کہ

جینے کا حق کس کو حاصل ہے اور موت کس کا مقدر ہے، جہاں اِس دعوئے کی تصدیق ہونے والی ہے کہ فداکاری کے میدان میں کون کون جانوں کا نذرانہ پیش کرتا ہے اور کون موت سے ہم آغوش ہونے سے جی چراتا ہے اور جہاں اِس حقیقت کا بھی انکشاف ہونے والا ہے کہ باطل کو زیروزبر کرنے والے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر نثار ہونے والے جریدہ عالم پر اپنا نقش دوام کس طرح ثبت کرتے ہیں، بدر کی فضا الجہاد الجہاد کے نعروں سے گونج رہی ہے، چشم فلک حیران و ششدر، جاں نثاران مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمتماتے ہوئے چہروں اور چمکتی ہوئی آنکھوں میں اسلام کا روشن مستقبل دیکھ رہی ہے، داستان حریت کا ایک نیا باب رقم ہونے جارہا ہے اور بے سروسامانی کے عالم میں دنیا وآخرت میں سرخروئی کا سامان فراہم کیا جارہا ہے، آج بدر کا میدان جنگ اُن کے دعوائے ایمان کا پہلا مظہر ہے، تاریخ عالم یہ منظر حیرت سے دیکھ رہی ہے کہ ایک طرف کفار مکہ کا ایک ہزار کا لشکر جرار تو دوسری طرف تین سو تیرہ فداکار دوجہاں، رسول انس وجاں صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں باطل سے نبرد آزما ہونے کیلئے نشہ شہادت سے سرشار، ایک طرف ہتھیاروں کی فراوانی دوسری طرف تن عریانی، ایک طرف سامان حرب پر بھروسہ، دوسری جانب ربّ کریم پر تکیہ، آج اُن کی سخت آزمائش اور امتحان کا وقت ہے کیونکہ سامان حرب اور افرادی قوت سے قطع نظر اُن کے مقابلے پر اُن کے قریبی اعزاء واقرباء ہیں، باپ کے مقابلے پر بیٹا، بھائی کے مقابلے پر بھائی، مگر اسلام کی عظمت و سربلندی اور خدا اور

اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت آج تمام رشتوں سے بالاتر ہے، بدر کا میدان بتا رہا ہے کہ کمند اسلام سے رشتہ جوڑنے والوں کو سب غیر اسلامی رشتے توڑنے پڑتے ہیں، اسلام کی راہ میں اگر خونی رشتے بھی حائل ہوں تو اُن کے حلقوم پر چھری چلانا پڑتی ہے، باپ کو بیٹے سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے، بھائی بھائی کا گلا کاٹتا ہے۔

ہوئی حائل نہ راہ حق میں ندی شیر مادر کی
کہ بڑھ کر کاٹ لی گردن برادر نے برادر کی

مجاہدین اسلام تاریخ میں اپنے رخ کو متعین کرنے کیلئے بے قرار ہیں، انھوں نے تمام دنیاوی عیش و عشرت اور لذتوں سے منہ موڑ لیا ہے اور اب وہ خدا اور اُس رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ جوڑ کر دونوں جہاں میں کامیابی سے ہمکنار ہونا چاہتے ہیں، مجاہدین آرزو شہادت میں پرجوش ہیں اور پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم ربّ کریم کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہیں، ردائے مبارک بار بار شانوں سے سرک جاتی ہے، فضائے بدر اب مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکلی ہوئی دعا سے معمور ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں "اے اللہ تو اپنا وعدہ پورا فرما، خدایا یہ سامان غرور کے ساتھ آئے ہوئے قریش تیرے رسول کو جھوٹا ثابت کرنا چاہتے ہیں، اے خدا اگر آج یہ مٹھی بھر جماعت ہلاک ہوگئی تو قیامت تک روئے زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔" بارگاہ ایزدی میں گریہ

واداری کی یہ کیفیت دیکھ کر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ عرض کرتے ہیں، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ اللہ کے سچے رسول ہیں، اللہ ضرور اپنا وعدہ پورا فرمائے گا اور فتح مسلمانوں کو نصیب ہوگی۔ نماز فجر کے بعد پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم جاں نثاران مصطفیٰ کی صف بندی فرماتے ہیں، آپ صفوں کو آراستہ کرتے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ سرداران قریش کی موت کی پیشین گوئی کرتے جاتے ہیں، ارشاد مبارک ہو رہا ہوتا ہے، ابوجہل یہاں مارا جائے گا، عتبہ یہاں قتل ہوگا، اُمیہ یہاں خاک نشین ہوگا، دنیا دیکھتی ہے کہ جنگ کے خاتمے کے بعد سرداران قریش ٹھیک اُن ہی مقامات پر ڈھیر تھے جن کی پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم نے نشاندہی فرمائی تھی، قلت تائید ایزدی سے کثرت پر غالب آتی ہے، باطل شکست کھا کر الٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہوتا ہے اور غازیان اسلام کو فتح مبین حاصل ہوتی ہے، معرکہ بدر اسلام کیلئے نقطہ عروج ثابت ہوتا ہے اور اِس معرکے کے مذہبی اور ملکی حالات پر دور رس نتائج مرتب ہوتے ہیں، دیکھا جائے تو بعثت نبوی کے بعد حقیقتاً یہ اسلام کی ترویج و اشاعت اور سربلندی کی جانب پہلا قدم تھا، جس نے کفر کی قوت کو ختم اور اُن کے باطل زعم کو حرف غلط کی طرح مٹادیا تھا، نصرت خداوندی نے مٹھی بھر مسلمانوں کو فتح و نصرت سے سرفراز فرمایا اور مجاہدین اسلام نے ثابت کردیا کہ راہ حق میں اعداد و شمار اور عددی برتری کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

اِس غزوے کے بعد مسلمان ایک قوت قاہرہ بن کر ابھرے اور آزادی وحریت کے گیت گاتے ہوئے ابر کرم بن کر دنیا پر سایہ فگن ہوگئے۔اِس غزوے نے مسلمانوں کی بہادری وجرات کی دھاک سارے عرب پر بیٹھادی،اِس معرکے نے ایک نئی تہذیب کو جنم دیا،بتانِ شعوب کی گردن کاٹی گئی،غرور،حسب و نسب کو خاک میں ملادیا گیا اور اِس غزوے کے بعد نصف صدی کے اندر اندر مسلمانوں نے ساری دنیا کا نقشہ بدل کر رکھدیا،اونٹوں اور بکریوں کے چرواہے اور صحراؤں کے بدوں نے پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں قیصر وکسریٰ کی قباؤں کو چاک کر ڈالا اور انھوں نے ثابت کردیا کہ دنیا کے بڑے سے بڑی طاقت انہیں جادہ حق سے ہٹا نہیں سکتی،کیونکہ وہ فتح و شکست سے بے نیاز ہو کر صرف اور صرف رضائے الٰہی کے حصول کیلئے لڑتے ہیں،دوستوں!.....یوم بدر غلبہ دین حق اور ابطال باطل کا دن ہے،اِس دن کفر کے مقدر میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ذلت آمیز شکست لکھ دی گئی اور اِس دن مطلع انسانیت پر ایک ایسی روشن صبح طلوع ہوئی جس سے کفر کے ایوانوں پر قیامت تک کیلئے لرزہ طاری ہوگیا،معرکہ بدر اسلام سے تجدید عہد وفا کا دن ہے،یہ دن اِس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ رزم حق و باطل میں میدان جنگ میں نکلنا اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ملانا نہایت ضروری ہے،صحابہ کرام جہاد کی تمنا میں جیتے تھے اور شہادت کے آرزو مند رہا کرتے تھے،اُن کے پیش نظر ہمیشہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہوا کرتا تھا"جس شخص کے (دل میں جہاد کی آرزو نہیں وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔"" میری)

اُمت میں جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔" آج اُمت مسلمہ ذلت و رسوائی اور محکومی و
غلامی کے گڑھے میں گری ہوئی ہے، جس کی اصل وجہ اپنے ماضی سے قطع تعلق اور
دوری ہے، اُمت مسلمہ کو دوبارہ بام ثریا تک پہنچانے اور وقت کی یزیدی قوتوں کے
خاتمے کیلئے فضائے بدر کا پیدا کیا جانا بہت ضروری ہے، آج ایک بار پھر ہمیں اُسوہ
مجاہدین بدر کو حرز جاں بنا کر وقت کی ابوجہلی قوتوں کے خاتمے، اسلام کے روشن مستقبل
اور غلبہ دین حق کیلئے میدان جہاد کی جانب چلنے کی تیاری کرنا ہوگی۔

دیکھ کر فہرست اعزازات کی آیا خیال۔۔۔۔

قومی اعزازات کی" لوٹ سیل

یہ 1956ء کی بات جب حکومت پاکستان نے اعلیٰ ترین کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والی شخصیات کو سول ایوارڈز دینے کا فیصلہ کیا، چنانچہ پہلی بار 19 مارچ 1957ء سے پاکستان کے سب سے بڑے سول اعزاز نشان پاکستان کا اجراء ہوا،یوں ہر سال یوم آزادی کے موقع پر ان ایوارڈز کیلئے نامزدگیوں کا باقاعدہ اعلان کیا جانے لگا اور نامزد افراد کو یہ اعزازات اگلے سال 23 مارچ کو دیئے جانے لگے قارئین محترم ! پاکستان کے یہ اعلیٰ ترین سول ایوارڈز پانچ اقسام کے ہیں،ایوارڈ کی ہر قسم کو چار درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے، نشان پاکستان کے بھی چار درجے ہیں،یعنی نشان پاکستان،ہلال پاکستان، ستارہ پاکستان اور تمغہ پاکستان،اسی طرح نشان شجاعت،نشان امتیاز،نشان قائدا عظم اور نشان خدمت کے بھی چار چار درجے ہیں،جو بالترتیب نشان،ہلال، ستارہ اور تمغہ کہلاتے ہیں،نشان پاکستان پاکستان کے سب سے اعلیٰ ترین سول اعزاز ہونے کی بنا پر خاصی تحقیق اور جانچ پڑتال کے بعد زندگی کے مختلف شعبوں اور ملک و قوم کیلئے اعلیٰ ترین خدمات انجام دینے پر دیا جاتا ہے،آئین کی شق 259(2) کے تحت ہر ایسے پاکستانی شہری کو جس نے جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے قومی خدمت سر

انجام دی ہو، فنون لطیفہ، لٹریچر، سائنس، کھیل اور نرسنگ کے شعبے میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہوں، کو اِن کو اعزازات کیلئے نامزد کیا جاتا ہے، جنھیں مختلف سطحوں پر قائم کمیٹیاں سفارشات اور کارکردگی کا جائزہ لینے کے بعد فائنل کرتی ہیں، پھر سمری کی شکل میں کابینہ ڈویژن اِن کو منظوری کیلئے مجاز اتھارٹی وزیر اعظم اور صدر کو بھیجتی ہے۔اہم اور دلچسپ بات یہ ہے کہ آئین پاکستان کے تحت اِن قومی اعزازات کو دینے کیلئے اصول و قاعدے بھی وضع کیے گئے ہیں اور ایوارڈ دینے کیلئے آئینی تقاضے۔اُس کے دائرہ کار (Scope) سمیت طریقہ کار بھی طے کر دیئے گئے ہیں۔

ریاستی سطح پر دیئے جانے والے اِن اعزازات کا تقاضہ یہ ہے کہ اِن کی حرمت و تقدیس اور عزت و تکریم کے ساتھ تعظیم کا بھی خیال رکھا جائے اور انہیں سیاسی وابستگیوں اور اقرباء پروری سے بچایا جائے۔شاید اسی وجہ سے ماضی میں محترمہ بے نظیر بھٹو کے دور میں جب اُس وقت کے وزیر بہبود آبادی جے سالک کو اقلیتوں کی خدمات کے حوالے سے ہلال امتیاز دینے کی سفارش کی گئی تو محترمہ نے اُس سمری کو یہ کہہ کر رد کردیا تھا کہ "پالیسی کے تحت کسی بھی وزیر کو کسی تمغے سے نہیں نوازا جاسکتا۔" دراصل محترمہ بے نظیر بھٹو نے آئین و قانون اور اِن اعزازات کی حرمت و تقدیس کی روشنی میں یہ اصول طے کر دیئے تھے کہ سرکاری ملازم اپنے فرائض منصبی کے حوالے سے کسی اعزاز کیلئے زیر تجویز نہیں

آ سکتے اور نہ ہی سیاسی عہدوں پر فائز شخصیات کو اِس بنیاد پر اِن اعزازات کا حقدار قرار دیا جاسکتا، ماضی کی حکومتوں نے سیاسی وابستگیوں اور تمام تر اقرباء پروری کے باوجود بڑی حد تک اِن اصول و قوائد کا خیال رکھا، مگر افسوس کہ موجودہ حکومت نے سیاسی وابستگیوں، اقرباء پروری اور قومی وسائل کی بندر بانٹ کے تحت اِس سال قومی اعزازات کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا، یوم آزادی کے موقع پر صدر مملکت نے جن 185 شخصیات کیلئے قومی اعزازات کا اعلان کیا، اُن میں سے بیشتر کا تعلق نہ صرف خود اُن کی اپنی جماعت سے ہے بلکہ اُن میں سے کئی ایک اہم حکومتی عہدوں پر بھی فائز ہیں، اِس لحاظ سے دیکھا جائے تو حکومت نے قومی اعزازات کو " اندھے کی ریوڑیوں" کی طرح اپنوں میں بانٹ کر اِن اعزازات کیلئے طے شدہ اصول و قواعد اور میرٹ کی دھجیاں اڑا دی ہیں۔

کیونکہ حکومت کی جانب سے نشان امتیاز سے نوازے جانے والوں میں فاروق نائیک چیئرمین سینٹ ہیں، سینٹر منتخب ہونے سے قبل وہ جناب آصف علی زرداری کے وکیل کے طور پر فرائض انجام دیتے رہے ہیں، فہمیدہ مرزا اسپیکر قومی اسمبلی ہیں اور پیپلز پارٹی سے اُن کی اور اُن کے شوہر کی وابستگی کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، رحمٰن ملک وزیر داخلہ ہیں، ملک و قوم کے لئے اُن کی کیا خدمات ہیں، سب اچھی طرح جانتے ہیں، اسی طرح سلمان فاروقی صدر مملکت کے پرنسپل سیکرٹری اور ایوانِ صدر ہی میں براجمان ہیں، ہلالِ امتیاز سے نوازے جانے والوں میں صدر

زرداری کے معتمد خاص فرحت اللہ بابر، امریکہ میں پاکستان کے سفیر حسین حقانی، بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کی انچارج فرزانہ راجہ جنہیں وفاقی وزیر کا درجہ بھی حاصل ہے اور صدر زرداری کے ایک اور رفیقِ کار بیت المال کے چیئرمین زمرد خان بھی شامل ہیں، مالِ مفت، دل بے رحم کی اِس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہوگی۔ ستارہ امتیاز اپنے ماتھے پر سجانے والوں میں پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن کے ڈائریکٹر جنرل مرتضٰی سولنگی، صدر مملکت کی بہت قریبی شخصیت اور کابینہ ڈویژن کی سیکرٹری نرگس سیٹھی جو خود اِن اعزازات کو پروسیس کرنے کی ذمہ دار ہیں) صدر کے پرنسپل سیکرٹری) سلمان فاروقی کی بھتیجی شرمیلا فاروقی، متحدہ کی رکن قومی اسمبلی خوش بخت شجاعت، مبشر لقمان (جو مشرف دورِ حکومت میں پنجاب کے نگراں وزیر رہ چکے ہیں اور دیگر اینکر پرسنز کے مقابلے میں حکومت کی طرف زیادہ جھکاؤ رکھتے ہیں) اور قاسم ضیاء بھی شامل ہیں، جو پیپلزپارٹی پنجاب کے صدر رہ چکے ہیں اور آجکل ہاکی فیڈریشن کے بھی صدر ہیں ۔

حیرت کی بات ہے کہ اعزازات کی اِس بندر بانٹ میں خود صدر مملکت نے اپنے لیے کوئی اعزاز نہیں رکھا، نہ ہی انہوں نے وزیراعظم کے لئے کسی تمغے کا اعلان کیا، کیا ہی اچھا ہوتا کہ ایک ایوارڈ بلاول بھٹو زرداری کے لئے بھی رکھ دیا جاتا، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جب متحدہ قومی موومنٹ کی خوش بخت شجاعت کے لئے

ستارہ امتیاز کا اعلان کیا تھا تو حکومت کی دوسری اتحادی جماعتوں کے عہدیداروں کیلئے بھی کسی نہ کسی ایوارڈ کا اعلان کر دیا جاتا، کم از کم غلام احمد بلور کو ریلوے کا بیڑا غرق کرنے پر تو ضرور کسی نہ کسی اعزاز کا مستحق قرار دیا جانا چاہیے تھا،اسی طرح مفاہمتی سیاست کے بادشاہ اور بیک وقت حلیف اور حریف کا ڈبل کردار ادا کرنے کے ماہر مولانا فضل الرحمن کو بھی اِس کیٹگری میں شامل کر لیا جاتا تو کیا بات تھی کہ ہمیشہ جنابِ شیخ کا قدم،اِدھر بھی ہوتا ہے اور اُدھر بھی،ارے اگر ایوارڈ ہی دینا تھا تو وزیر اعلیٰ بلوچستان سے زیادہ اور کون اعزاز کا مستحق ہو سکتا تھا کہ جن کی گفتگو سمجھنے کے لئے مترجم کی ضرورت پڑتی ہے اور جن کے بارے میں لطیفہ مشہور ہے کہ انہوں نے ظہر کی اذان کے وقت روزہ افطار کر لیا، سیکرٹری نے ڈرتے ڈرتے بتایا تو شان بے نیازی سے بولے "اذان اذان ہوتی ہے، چاہے ظہر کی ہو یا مغرب کی۔"مگر صد افسوس کہ صدر مملکت کے نے اِن اہم افراد کو نظر انداز کرکے قومی اعزازات جانچنے کے طریقہ کار پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے،شاید مسلم لیگ ن اور دیگر سیاسی جماعتیں اسی وجہ سے احتجاج کر رہی ہیں، خیر یہ تو چند جملہ معترضہ تھے،اصل معاملہ یہ ہے کہ حکومت نے زیادہ تر قومی اعزازات اپنے ذاتی مداحوں،پارٹی کارکنوں، سٹاف ممبروں اور خوشامدیوں میں بانٹ کر ان قومی اعزازات کے مرتبے و مقام کی توہین کی ہے،یہی وجہ ہے کہ قائد حزب اختلاف چوہدری نثار علی خان اِس اعلان کو قوم کے ساتھ مذاق سے تشبیہہ دے رہے

ہیں، جبکہ دوسری جانب ممتاز آئینی و قانونی ماہرین قومی اعزازات کی جیالوں میں تقسیم
پر ناراض ہیں اور رحمٰن ملک کو نشان امتیاز دینے کے فیصلے کو آئین کی خلاف ورزی
قرار دیتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ صدارتی معافی نامے کے باوجود جرم برقرار رہتا ہے
اور کسی سزایافتہ شخص کو قومی ایوارڈ نہیں دیا جاسکتا، کیا ایسے اشخاص جو کہ ذمہ دار
سرکاری اور حکومتی عہدوں پر فائز ہیں اور جن کی کارکردگی قوم کیلئے غیر تسلی بخش ہے
مگراِس کے باوجود یہ لوگ اپنی ذمہ داریوں اور فرائض منصبی سے زیادہ قومی خزانے
سے مراعات اور سہولیات وصول کررہے ہیں، کواِن قومی اعزازات کا مستحق قرار دیا
جاسکتاہے۔؟حیرت ناک اَمر یہ ہے کہ وہ لوگ جو کہ اپنی ذمہ داریوں کے اہل بھی
ثابت نہیں ہورہے آخر انھوں نے ایسی کونسی قومی و ملی خدمت اور کارنامہ سرانجام دیا
ہے جس کی بنیاد انہیں اِن اہم اعزازات کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔؟

قومی حلقے کی جانب سے اٹھائے گئے یہ سوالات اپنی جگہ توجہ طلب ہیں، ویسے بھی سول
اعزازات کی فہرست نے شہریوں کو حیران وششدر کردیا ہے کہ ایوارڈز سے نوازے
جانے والوں میں زیادہ تر پیپلز پارٹی کے اہم ارکان، صدر کے قریبی ساتھی اور
بیوروکریٹس شامل ہیں، ملک بھر میں اِن اعزازات کی تقسیم پر شدید تنقید ہورہی
ہے، کیا ہی اچھا ہوتا کہ جن لوگوں کو قومی اعزازات دینے کیلئے

منتخب کیا گیا ہے، میڈیا کو اُن کی خدمات کی وہ فہرست بھی جاری کر دی جاتی جن کے باعث انہیں اعزازات کا مستحق سمجھا گیا، خاص طور پر فاروق نائیک، فہمیدہ مرزا، رحمٰن ملک، سلمان فاروقی، فرحت اللہ بابر، مرتضٰی سولنگی، صوبہ سندھ کی مشیر شرمیلا فاروقی، موجودہ کیبنٹ سیکرٹری اور وزیر اعظم کی سابق پرنسپل سیکرٹری نرگس سیٹھی، امریکہ میں پاکستان کے سفیر حسین حقانی، بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کی سربراہ فرزانہ راجہ، پاکستان بیت المال کے چیئرمین زمرد خان اور متحدہ کی رکن اسمبلی خوش بخت شجاعت کی غیر معمولی خدمات جاننے کے لئے قوم تو ویسے بھی بیتاب ہے، پہلی بار قومی تاریخ میں اتنی بڑی تعداد میں ایک ہی سیاسی جماعت کے افراد کو اس طرح اعلیٰ ترین قومی اعزازات کیلئے منتخب کرنا یقینی طور پر اقربا پروری اور بندر بانٹ کے زمرے میں آتا ہے، اگر غیر جانبدارانہ جائزہ لیا جائے تو ان صاحبان کا ایسا کوئی خاص کارنامہ جس کی بنیاد پر انہیں اعلیٰ ترین اعزازات کیلئے منتخب کیا جا سکتا ہے، ثابت کرنا بہت مشکل ہے، جبکہ یہ اعزازات اُن افراد کو دیئے جاتے ہیں جنھوں نے ایسی کوئی قومی خدمت سر انجام دی ہو جس کی نظیر ملنا مشکل ہو یا ملک و قوم کی بہتری کیلئے ایسا کارنامہ انجام دیا ہو جس سے قوم کا سر فخر سے بلند ہو جائے، اَمر واقعہ یہ ہے کہ اِس سال حکومت نے سول اعزازات کی جو بے توقیری کی ہے، ماضی میں اِس کی کوئی مثال نہیں ملتی، جس طرح ریوڑیوں کی مانند یہ اعزازات اپنوں میں بانٹے گئے ہیں اور ایسے ایسے لوگوں کو نوازا گیا ہے جن

کی قومی و ملی خدمات خوردبین سے تلاش کرنے پر بھی نظر نہیں آتیں، سچ کہتے ہیں صفدر ہمدانی صاحب کہ

دیکھ کر فہرست اعزازات کی آیا خیال
کوئی تو چمچہ ہے اسمیں اور کوئی کفگیر ہے
قائدِ اعظم کی روح بھی بالیقیں بے چین ہے
ہائے کیا اقبال تیرے خواب کی تعبیر ہے

تحریک تحفظ ختم نبوت اور علامہ شاہ احمد نورانی

سات ستمبر یوم ختم نبوت کے حوالے سے خصوصی تحریر

عقیدہ ختم نبوت اسلام کی اساس اور وہ بنیاد ہے جس پر دین اسلام کی پوری عمارت کھڑی ہے، یہی وہ عقیدہ ہے جو جسد اسلام کی روح ہے، یہی وجہ ہے کہ اس عقیدہ کی اہمیت اور نزاکت کے پیش نظر مسلمان ہر دور میں تحفظ ختم نبوت کیلئے بڑے حساس اور چوکس رہے ہیں، تاریخ اسلام شاہد ہے کہ جب بھی کسی کمینہ خصلت نے قصر نبوت پر ڈاکہ زنی کی ناپاک جسارت کی، غیور مسلمانوں کی تلواریں اللہ کا انتقام بن کر اس کی طرف لپکیں اور اس جہنم واصل کر دیا، مسلمانوں کی تاریخ اس عقیدے کے تحفظ کیلئے قربانیاں دینے والوں سے بھری ہوئی ہے، ختم نبوت اتنا اہم مسئلہ ہے کہ قرآن مجید میں سو سے زائد مقامات پر اس کا واضح الفاظ میں ذکر موجود ہے جبکہ خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے کم و بیش دو سے زائد احادیث مبارکہ میں اس امر کی وضاحت مختلف پیرائے میں کی کہ پوری امت ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم نبوت کے مسئلہ پر یکسو اور متحد ہو گئی اور یہ پوری امت کا متفقہ عقیدہ قرار پایا، حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ سے لے کر آج تک ہر دور میں دنیا کے حریص اور طالع آزماؤں نے

جھوٹ، فریب، مکر و دجل اور شعبدے بازیوں سے قصر نبوت میں نقب لگانے کی جسارت کی، مگر امت مسلمہ اس جعلسازی کا مقابلہ کرنے کیلئے ہمیشہ مستعد رہی، مسیلمہ کذاب، طلیحہ بن خویلد، اسود عنسی سے لے کر مرزا قادیانی تک امت مسلمہ نے ہر دور میں ان نقب زنوں کا کامیاب تعاقب کیا، 1901ء میں جب سے مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے خود ساختہ نبی ہونے کا اعلان کیا، تو علماء و مشائخ نے اس فتنے کے سدباب اور ہر میدان میں قادیانیت کا محاسبہ جاری رکھا۔

بیسویں صدی کا آغاز امت مسلمہ کیلئے جن بدترین حالات میں ہوا، اس کا آج تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس تاریک دور میں اللہ ربّ العزت نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے امت کو ایسے افراد سے نوازا جنھوں نے کفر و طاغوت اور ظلم و استحصالی نظام کے خلاف ہر محاذ پر چومکھی لڑائی لڑی، اُن نفوس قدسیہ میں حضرت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کو ایک ممتاز اور منفرد مقام حاصل ہے، علامہ شاہ احمد نورانی کی زندگی اسلام کے عملی نفاذ، دینی قوتوں اور جمہوری اداروں کی فروغ وبقاء، پاکستان کے استحکام و سا لمیت، مسلم وحدت کی مسلسل جدوجہد، احیائے اسلام اور کفر کے خلاف عالم اسلام کی بیداری سے عبارت ہے، یکم اپریل 1926ء میں مبلغ اسلام سفیر پاکستان حضرت علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی رحمتہ اللہ علیہ کے گھر پیدا ہونے والے اس فرزند ارجمند نے زندگی بھر اپنے ایمان، ضمیر اور نسبی تقاضوں کو سامنے رکھ کر احقاق حق اور ابطال باطل

شمع روشن رکھی، علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کی زندگی کا واحد مشن ملک خداداد پاکستان میں نظام مصطفیٰ کا نفاذ اور مقام مصطفیٰ کا تحفظ تھا، قیام پاکستان کے بعد علماء و مشائخ نے 1953ء میں قادیانیوں کے خلاف تحریک چلائی لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکی، اس کے باوجود علمائے حق نئی حکمت عملی سے اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے سرانجام دیتے رہے اور ہر محاذ پر قادیانیوں کے سامنے سینہ سپر رہے، وہ علماء جنھوں نے حق کی آواز کو تحریک ختم نبوت 1953ء کی ناکامی کے بعد دوبارہ بلند کیا، ان میں روشن وتابندہ نام مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی کا ہے، جنھوں نے عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کیلئے بھرپور طریقے سے عملی جدوجہد جاری رکھی، قادیانیوں کے خلاف تحریک چلائی اور ان کی ہر موڑ پر مخالفت کرتے رہے، مولانا کو قادیانیوں کی مخالفت کرنا ورثے میں ملی تھی، ان کے والد مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی قادیانیوں کے اہم مخالفین میں سے تھے، انہوں نے افریقہ، یورپ، سیلون، انڈونیشیا، ملائیشیا، برما، اور عرب ریاستوں میں قادیانیت کے خلاف مہم چلائی اور ان کے رد میں انگریزی میں "The Mirror" اور اردو میں "مرزائی حقیقت کا اظہار" نامی کتاب لکھی، جب اس کتاب کا ملائیشیا کی زبان میں ترجمہ شائع ہوا تو وہاں قادیانیوں کے خلاف زبردست تحریک چلی، جس کے بعد ملائیشیا میں قادیانیوں کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا، چنانچہ مولانا نورانی نے اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے قادیانیوں کی مخالفت کی اور ہمیشہ ان کے آگے آہنی چٹان کی مانند کھڑے رہے۔

علامہ نورانی 1970 میں پہلی بار جمعیت علماء پاکستان کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، 15اپریل 1972ء کو قومی اسمبلی کا سہ روزہ افتتاحی اجلاس شروع ہواتوعلامہ نورانی نے اجلاس کے پہلے ہی روز جمعیت علماء پاکستان کے پارلیمانی قائد کی حیثیت سے عبوری آئین کے حوالے سے عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کو اپنا موضوع گفتگو بنایا، یہ پاکستان کی تاریخ میں قومی اسمبلی کے فلور پر عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ میں بلند ہونے والی سب سے پہلی آواز تھی، قومی اسمبلی میں اپنے اوّلین خطاب میں علامہ نورانی نے آئین کے اندر مسلمان کی تعریف شامل کرنے کا پرزور مطالبہ کیااور کہا کہ " جو لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی نہیں مانتے ہم ان کو مسلمان ہی نہیں سمجھتے۔"آپ کے اس مطالبے کا مقصد پاکستان کے اس اعلیٰ ترین انتظامی عہدوں پر عقیدہ ختم نبوت کے مخالف قادیانیوں اور غیر مسلموں کے فائز ہونے کے امکانات کا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خاتمہ تھا، دراصل علامہ نورانی کا آئین میں مسلمان کی تعریف شامل کرنے کا مطالبہ قادیانیوں کو کافراور غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی تحریک کا نقطہ آغاز اور 1974ء کی تحریک ختم نبوت کی بنیادی اساس تھا، اس اجلاس میں مولانا نورانی نے مسلمان کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ "مسلمان وہ ہے کہ جو کتاب وسنت اور ضرویات دین پر یقین رکھتا ہو اور قرآن کو ان تشریحات کے مطابق مانتا ہو جو سلف صالحین نے کی ہیں، نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو

آخری نبی تسلیم کرتا ہو۔اگر اسلامی آئین میں مسلمان کی یہ تعریف شامل نہ کی گئی تو ہم "ایسے آئین کو اسلامی آئین نہیں کہیں گے۔

چنانچہ 17 اپریل 1972ء کو جمعیت علماء پاکستان اور متحدہ اپوزیشن کی جانب سے مسلمان کی جامع تعریف کو پہلی بار اسمبلی میں پیش کی گئی۔جسے بعد میں 1973ء کے آئین میں شامل کرلیا گیا،علامہ نورانی کی کوششوں کی بدولت مسلمان کی تعریف پاکستان کے آئین کا حصہ بن چکی تھی۔دراصل آئین میں اس تعریف کی شمولیت نے قادیانیوں کو ایک ایسی غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا تھا،جس کا مستقبل میں صرف اعلان ہونا ہی باقی رہ گیا تھا،اس تعریف کی شمولیت سے قادیانیوں کو بھی یقین ہو چلا تھا کہ وہ ایک غیر اعلانیہ غیر مسلم اقلیت قرار پاچکے ہیں،علامہ شاہ احمد نورانی پاکستان کی پارلیمانی اورآئینی تاریخ میں پہلے سیاستدان تھے،جنہوں نے سب سے پہلے آئین میں مسلمان کی تعریف شامل کرنے کا مطالبہ کیا اورآپ نے آئین سازی کیلئے قائم کمیٹی میں سب سے پہلی ترمیم مسلمان کی تعریف اور اسلام کو ریاست کا سرکاری مذہب قرار دینے سے متعلق پیش کی،مولانا نورانی کو منکرین ختم نبوت قادیانیوں اور قادیانیت سے شدید نفرت تھی اوراسی نفرت نے انہیں زندگی بھر قادیانیت کے خلاف مصروف جہاد رکھا،قیام پاکستان کے بعد اُمت مسلمہ کو امید تھی کہ ایک اسلامی نظریاتی ملک ہونے کی وجہ سے حکومت وقت عوام کے مذہبی جذبات واحساسات کا خیال کرتے

ہوئے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے گی. لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوااور وقت کے ساتھ ساتھ قادیانیوں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا. یہاں تک قادیانیوں کی اسلام اور ملک دشمن سرگرمیوں کی وجہ سے اُمت مسلمہ کی نفرت نے 1953ء کی تحریک ختم نبوت کو جنم دیا. جسے حکومت نے طاقت کے بل پر وقتی طور پر دبالیا. لیکن قادیانی ذریت سے یہ نفرت اُمت مسلمہ کے دلوں میں سلگتی رہی. علامہ نورانی جو کہ نوجوانی میں تحریک ختم نبوت 1953ء میں جیدا کابر علماء کے ساتھ "علماء بورڈ کے ممبر اور مجلس عمل تحفظ ختم نبوت سندھ کے جنرل سیکرٹیری" کی حیثیت سے مرکزی کردار ادا کرچکے تھے. اس تحریک کی ناکامی کے اسباب و عوامل سے پوری طرح واقف تھے. چنانچہ آپ نے تحفظ ختم نبوت اور عظمت مصطفیٰ کو مملکت کا قانون بنانے اور آئینی تحفظ دینے کیلئے کام کرنا شروع کردیا. اس سفر کی کامیاب ابتداء آئین میں مسلمان کی تعریف کی شمولیت. ریاست کا سرکاری مذہب اسلام. دیگر اسلامی دفعات کو آئینی تحفظ دینے کے علاوہ عائلی قوانین کی تنسیخ. تینوں مسلح افواج کے سربراہوں کیلئے مسلمان ہونے کی شرط. فتنہ ارتداد کو روکنے کی ضمانت حاصل کرنے اور پاکستان کے دستور کو دو قومی نظریے سے ہم آہنگ کرنے کی کوششوں سے ہوچکی تھی اور آپ اپنے اہداف پر نظر رکھے ہوئے مرحلہ وار اس منزل کی جانب رواں دواں تھے

۔

دوسری طرف مرزائی آئین میں مسلمان کی تعریف کی شمولیت سے پہلے ہی سخت پریشان تھے کہ آزاد کشمیر اسمبلی میں قادیانیوں کے خلاف قرارداد کی منظوری نے ان کے تمام خدشات کو یقین میں بدل دیااور انہیں محسوس ہونے لگا کہ عنقریب اب پاکستان کی قومی اسمبلی میں موجود علماء ان کے مستقبل کے بارے میں قرار داد پیش کرکے ان کیلئے رہے سہے راستے بھی بند کردیں گے۔اس صورتحال نے مرزاناصر کو اس قدر سیخ پا کردیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف ہذیان بکنے لگا۔اتفاق سے اسی دوران سانحہ ربوہ پیش آگیا،جس نے قادیانیوں کے خلاف عوامی نفرت کو مزید گہرا کردیا،بعد میں یہی سانحہ تحریک ختم نبوت 1974ء کی اصل بنیاد بنا۔علامہ شاہ احمد نورانی جو کہ تمام حالات کا نہایت ہی باریک بینی سے جائزہ لے رہے تھے،نے محسوس کیا کہ اب قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوانے کیلئے آئینی اور قانونی جنگ لڑنا انتہائی ضروری ہوگیا ہے،چنانچہ 30 جون 1974ء کو آپ نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کیلئے تاریخ ساز قرارداد قومی اسمبلی میں پیش کی،جسے ایوان نے متفقہ طور پر منظور کرلیا،رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین مفتی منیب الرحمٰن کہتے ہیں کہ "علماء اُس سے پہلے بھی اسمبلی ہیں موجود تھے......مگر یہ سعادت ماضی میں کسی کے حصے میں بھی نہیں آئی،تاریخ پاکستان میں پہلی بار ایک مرد حق،پیکر صدق و صفا،کوہ استقامت اور حاصل جرات و شجاعت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی اسمبلی میں پہنچے اور فتنہ انکار ختم نبوت یعنی قادیانیت کو کفر وارتداد قرار دینے کی بابت قرارداد

قومی اسمبلی میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی،تاریخ اسلام میں ریاست و مملکت کی سطح پر فتنہ ٔ انکار ختم نبوت کو کفروارتداد قرار دینے اور ان کے خلاف علم جہاد بلند کرنے کا اعزاز جانشین رسول خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوااور ان کے بعد یہ اعزاز انہی کی اولاد امجاد میں علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کو نصیب ہوا۔"

علامہ نورانی کی قرارداد پیش ہونے کے بعد قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی جو کہ پورے ایوان پر مشتمل تھی نے دو ماہ میں قادیانی مسئلے پر غور خوض کیلئے 28 اجلاس اور 96 نشتیں منعقد کیں،اس دوران قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی کے روبرو قادیانی گروکے سرخیل مرزا ناصر،لاہوری گروپ کے امیر صدرالدین اور انجمن اشاعت اسلام لاہور کے عبدالمنان اور مسعود بیگ پر ان کے عقائد و نظریات،ملک دشمنی اور یہودی و سامراجی گٹھ جوڑ کے حوالے سے جرح ہوئی،علامہ نورانی فرماتے ہیں کہ "مسلسل گیارہ روزتک مرزا ناصر پر جرح ہوتی رہی،اور سوال اور جوابی سوال کیا جاتا رہا،مرزا کو صفائی پیش کرتے کرتے پسینہ چھوٹ جاتااور آخر تنگ آ کر کہہ دیتا کہ بس اب میں تھک گیا ہوں،اسے گمان نہیں تھا کہ اس طرح عدالتی کٹہرے میں بٹھا کر اس پر جرح کی جائے گی۔۔۔۔۔ وہ اپنا عقیدہ خود اراکین اسمبلی کے سامنے بیان کرگیا اور اس بات کا اعلان کرگیا کہ مرزا (غلام احمد قادیانی) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسیح موعود اور

امتی نبی ہے، جن اراکین اسمبلی کو قادیانیوں کے متعلق حقائق معلوم نہیں تھے،انہیں بھی معلوم ہوگیااور انہیں اس بات کا یقین ہوگیا کہ مولانا نورانی جنہیں اقلیت قرار دلوانے کی سعی کررہے ہیں وہ لوگ واقعی کافر، مرتداور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔" قادیانی مسئلے پر فیصلہ کرنے کیلئے قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی نے قادیانی مسئلہ کو جانچنے اور پرکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں چھوڑا، کمیٹی کی کارکردگی اور اس کی کاروائیوں پر حزب اختلاف کے لیڈروں نے بھی پورے اطمینان کا اظہار کیا،اس طویل جمہوری وپارلیمانی کاروائی کے بعد قومی اسمبلی نے پورے تدبر سے کام لیتے ہوئے 7 ستمبر 1974ء کو وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی موجودگی میں آئین کی دوسری اور وہ، واحد ترمیم منظور کی جس کی مخالفت میں ایک بھی ووٹ نہیں ڈالا گیا اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا تاریخ ساز فیصلہ کرتے ہوئے کہا کہ "جو شخص خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حتمی اور غیر مشروط ختم نبوت میں یقین نہیں رکھتا یا نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، کسی بھی لفظ یا بیان کے ذریعے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک ایسے دعویدار کو نبی تسلیم کرتا ہے،یا کہ مذہبی مصلح جانتا ہے، وہ آئین یا قانون کی رو سے مسلمان نہیں ہے۔"یوں جہاں علامہ شاہ احمد نورانی کی پیش کردہ قرارداد کی منظوری نے ختم نبوت کے ہر منکر کو خارج اسلام قرار دے دیا، وہاں اس قرارداد کی منظوری نے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے عہد حکومت کوایک منفرد اعزاز

سے مشرف کردیا،1973ء کا آئین ملک کا پہلا آئین تھا، جس میں پاکستان کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان، مملکت کا مذہب اسلام ،جس کی حفاظت کی ذمہ دار مملکت، مسلمان کی تعریف کی شمولیت اور قرآن و سنّت کے منافی کوئی قانون نہ بنانے کی شقوں کی وجہ سے 1956ء،1962ء کے آئین سے قدرے ممتاز تھا، لیکن قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے والی آئینی ترمیم نے اس آئین کو دنیا کے تمام اور بالخصوص اسلامی ممالک کے دساتیر میں ایک منفرد اور انوکھا اعزاز بخشا،وہ اعزاز یہ تھا کہ اس آئینی ترمیم کے زریعے اسلام کے ایک بنیادی عقیدے عقیدہ ختم نبوت جس پر اسلام کی بنیاد قائم ہے اور جس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں علمائے کرام قرآن و سنّت کی رو سے اس کے غیر مسلم ہونے کا اعلان کرتے تھے کو آئینی اور قانونی تحفظ دے کر اسے مملکت پاکستان کا ایک ایسا قانون بنادیا گیا تھا جس کی رُو سے عقیدہ ختم نبوت پر یقین نہ رکھنے والا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی اور شخص کی نبوت کو ماننے والا کافر و مرتد، خارج اسلام اور غیر مسلم اقلیت قرار پایا،اس لحاظ سے 1973ء کا دستور دنیا کے تمام دساتیر میں منفرد حیثیت اور ممتاز مقام رکھتا ہے،علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی برصغیر پاک و ہند میں تحریک ختم نبوت کے قائدِ آخر ہیں،آپ کے ہاتھوں پاکستان کی قومی اسمبلی کے ذریعے اس نوے سالہ فتنے کا اختتام ہوااور تحریک ختم نبوت اپنے منطقی انجام تک پہنچی۔

ترکی کمال اَتا ترک سے طیب اردگان تک۔۔۔۔

وہ ترکی جو 623 برس تک خلافت عثمانیہ کا مرکز رہا اور جسے چھ صدیوں تک عالم اسلام میں مرکزی حیثیت حاصل رہی، یکم نومبر 1922ء کو اپنی مرکزی حیثیت کھو بیٹھا، جدید ترکی کے بانی مصطفیٰ کمال اتاترک نے خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد ملک کا نظم و نسق چلانے کیلئے سیکولر ازم کا سہارا لیا، جس کی وجہ سے صدیوں تک دنیائے اسلام کی قیادت کرنے والی ریاست اپنی مسلم شناخت اور تشخص سے یک لخت محروم ہو گئی، مصطفیٰ کمال پاشا نے مغرب کی تقلید اور تائید و حمایت کیلئے مذہب سے نفرت کو سیکولر ازم کی تعریف قرار دیا اور اسے ہر شعبہ ہائے زندگی سے خارج کر دیا، اُس نے ترکی کو مغربی ممالک کے ہم پلہ بنانے کے لئے سب سے پہلے اسلام کو زد پر رکھا، مدارس کو بند کر دیا گیا، قرآن کریم کا پڑھنا اور تعلیم دینا جرم قرار پایا، مساجد میں عربی زبان میں اذان دینے اور حج کی ادائیگی پر بھی پابندیاں لگادی گئی، عورتوں کے لئے پردہ موقوف کر دیا گیا، مرد و خواتین کو جبراً مغربی لباس پہننے پر مجبور کیا گیا، ترکی ٹوپی ممنوع قرار دے دی گئی، نام اختیار کرنے کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا اور وہ نام رکھے جانے لگے جن سے کبھی مسلمان ہونے کی بو نہ آئے، اسلامی کلینڈر کا خاتمہ کر دیا گیا، اسلام کے عائلی قوانین ختم کرکے اُس کی جگہ سوئس قوانین کو آئین کا

حصہ بنایا گیا، نتیجتاً کثرت ازدواج بھی ممنوع ہو گئی اور حال یہ ہوگیا کہ 98 فیصد مسلمانوں کے حامل ملک میں ایک سے زائد شادی کرنے والے افراد دوسری بیوی کو اپنی گرل فرینڈ قرار دیتے تو اُن سے کوئی باز پرس نہ کی جاتی، البتہ دو بیویاں رکھنے پر دھر لیا جاتا، عربی رسم الخط کو کالعدم قرار دے کر لاطینی رسم الخط اختیار کیا گیا، چن چن کر عربی اور فارسی الفاظ کو ترکی زبان سے نکال دیا گیا، چھ صدیوں تک مرکزی حیثیت رکھنے والے شہر استنبول کی جگہ دارالحکومت کو انقرہ منتقل کر دیا گیا، فتح قسطنطنیہ کی سب سے اہم نشانی "ایاصوفیہ" کو مسجد سے عجائب گھر بنا دیا گیا، کمال اتاترک نے بہت سے رہنماؤں کو زندانوں میں ڈلوادیا، جلا وطنی پر مجبور کیا یا انہیں سزائے موت دے دی، غرضیکہ اتاترک نے پوری کوشش کی کہ اسلام اور مسلمانوں سے تعلق کی ہر نشانی کو مٹا کر ترکی کو مشرق سے کاٹ کر مغرب کا حصہ بنا دیا جائے، اُس نے آئین بنا کر فوج کے سیاسی کردار کو دستوری تحفظ اور آئین کا محافظ قرار دیا اور پوری کوشش کی کہ اسلام کا حلیہ بگاڑ کر ترک مسلمانوں کو ان کے صدیوں پر محیط عظیم علمی ادبی، ثقافتی اور ہر اُس دینی ورثے سے محروم کر دیا جو فکر اسلامی کا عکاس و آئینہ دار تھا، یوں 29 اکتوبر 1923ء کو ترکی باضابطہ سرکاری طور پر ریپبلک آف ترکی کی شکل میں ایک نئی اور جدید سیکولر ریاست کی شکل میں دنیا کے سامنے آیا۔

انیس سو ساٹھ تک یہ وہی ترکی تھا جس میں اسلام کا نام لینا بھی جرم تھا، یہ وہی سال تھا جس میں وزیر اعظم عدنان میندریس کو اسلامی رجحان رکھنے کے جرم میں پھانسی دی گئی، وہ ترک فوج جو ملک کی سیکولر پہچان کی نگہبان سمجھی جاتی ہے اور جس نے ملک میں اسلامی طرز زندگی بدلنے میں اہم ترین کردار ادا کیا، کے سامنے نجم الدین اربکان کی ذات پہلی بار ایک چٹان کے روپ میں سامنے آئی، ترک جرنیلوں کو اپنا اقتدار خطرے میں نظر آنے لگا، چنانچہ بار بار نجم الدین اربکان اور اُن کی جماعت پر پابندیاں عائد کی گئیں، لیکن نجم الدین اربکان نے جو راستہ کھول دیا تھا، وہ فوج سے بند نہ ہو سکا، رفاہ سے فضیلت اور فضیلت سے جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی تک کا سفر اسلام پسندوں کی پرامن سیاسی جدوجہد کا آئینہ دار ہے، ترکی کے موجودہ وزیر اعظم رجب طیب اردگان نجم الدین اربکان کے تربیت یافتہ اور سیاسی وارث ہیں، گذشتہ الیکشن میں جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی کی تاریخ ساز کامیابی اِس اَمر پر دلالت کرتی ہے کہ عوام کی اکثریت نے ترکی میں سیکولرازم اور فوجی آئین کے خلاف اپنا فیصلہ دے دیا ہے، آج ترکی میں صورتحال بدل چکی ہے، اسلام پسندوں کی بڑھتی ہوئی قوت کے سامنے فوج بے بس نظر آتی ہے، وزیر اعظم رجب طیب اردگان اور صدر عبداللہ گل کی قیادت میں سیکولر ترکی نے ایک نئی انگڑائی لینی شروع کی ہے، فوج کی تمام تر کوشش کے باوجود عوام میں اسلامی تشخص مقبولیت حاصل کر رہا ہے، اب یورپی یونین میں شرکت کے لئے بھیک مانگتا ترکی ایک نئے روپ میں دنیا کے سامنے آ

رہا ہے۔اسلام کا یہ سابق گڑھ اپنے مرکز کی طرف لوٹ رہا ہے اور اپنا جھکاؤ اسلامی ممالک کی جانب بڑھا رہا ہے۔آج ترکی احیائے خلافت کی منزل کی طرف گامزن ہے اور اِس ساری جدوجہد کا سہرا نجم الدین اربکان اور اُن کے سیاسی وارث رجب طیب اردگان کو جاتا ہے۔

درحقیقت طیب اردگان ایک ایسی مقناطیسی شخصیت کے مالک ہیں جس نے ترکی کے سیاسی نظام کی سمت کو ہی بدل کر رکھ دیا ہے،انھوں نے ترکی کے سیاسی کلچر کو ایک تعمیری اور نئی جہت عطا کی ہے،انھوں نے اپنے عزم ،ہمت ،حوصلے، دانشمندی اور حکمت عملی کی بناپر ترکی کو متحد،مستحکم اور عالمی برادری میں ممتاز مقام ہی نہیں دلایا بلکہ وہ ایک ہیرو اور عالم اسلام کے مسلم رہنماکے طور پر بھی ابھر کر سامنے آئے ہیں اور اُن کے اسرائیل کے خلاف دلیرانہ وجراتمندانہ موقف نے اُن کی شخصیت کو ترکی سے اٹھا کر عالمی سطح پر لاکھڑا کیاہے،قارئین محترم ! آپ کو یاد ہوگا کہ ترکی وہ واحد اسلامی ملک تھا جس کے اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات تھے،مگر 31 مئی 2010ء کو اسرائیل کی جانب سے غزہ کے مظلوم مسلمانوں کیلئے امداد لے کر جانے والے جہاز فریڈم فلوٹیلاپر حملے اور ترکی کے 9 رضاکاروں سمیت 19 افراد کی شہادت کے بعد ترکی کے تعلقات اسرائیل سے کشیدہ ہوگئے تھے،ترک وزیر اعظم رجب طیب اردگان نے اسرائیلی ظلم وبربریت کو تاریخ کا ایک نیا موڑ قرار دیتے ہوئے اِسے انسانی ضمیر پر حملے

سے تعبیر کیا تھا اور اسرائیل کے وحشیانہ اقدام کے خلاف سخت موقف اختیار کرتے ہوئے نہ صرف فریڈم فلوٹیلا پر اسرائیلی حملے کی شدید مذمت کی بلکہ نہایت پرامن اور مہذب طریقہ اختیار کرتے ہوئے اسرائیلی جارحیت کو بے نقاب کرتے ہوئے اسرائیل سے اپنے سفیر کو واپس بلالیا تھا اور اسرائیلی فوج کے ساتھ ترک افواج کی ہونے والی مشترکہ مشقیں بھی منسوخ کردی تھیں، ساتھ ہی اسرائیلی طیاروں کو اپنی فضائی حدود سے گزرنے کی اجازت دینے سے بھی انکار کر دیا تھا،آج اُسی ترکی نے فریڈم فوٹیلا کے حوالے سے اقوام متحدہ کی 56 صفحات پر مشتمل رپورٹ شدید رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے اُسے تسلیم کرنے سے انکار کردیا ہے اور ترک باشندوں کی ہلاکت سمیت غزہ کے محاصرے کے معاملے کو عالمی عدالت انصاف میں اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے،اُس نے اسرائیلی سفیر کو ملک سے نکل جانے کا حکم دیتے ہوئے فوجی تعاون کے خاتمے کا اعلان کیا اور اپنی بحریہ کو الرٹ کرتے ہوئے بحیرہ روم میں اپنا فوجی گشت بھی بڑھادیا ہے،ترکی کا مطالبہ ہے کہ اسرائیل اپنے اِس سفاکانہ عمل پر ترکی سے معافی مانگے اور زرتلافی ادا کرے،جس سے اسرائیل انکاری ہے،ترک وزیر خارجہ کا کہنا ہے کہ اسرائیل کو اِس واقعہ کی بڑی قیمت چکانی پڑے گی،جبکہ ترک صدر عبداللہ گل اور وزیر اعظم طیب اردگان نے اقوام متحدہ کی رپورٹ کو اپنے ملک کیلئے بے معنی قرار دیتے ہیں،دوسری طرف طیب اردگان 18 ستمبر کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں غزہ کی ناکا بندی ختم کرانے کیلئے رائے شماری کی غرض

سے ایک بل بھی پیش کرنا چاہتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ آنے والے دنوں میں اپنے
دورہ مصر کے دوران وہ اہل غزہ سے اظہار یکجہتی کیلئے غزہ کا دورہ بھی کریں، اگر انہیں
اِس دورے کی اجازت مل گئی تو وہ پہلے غیر ملکی وزیر اعظم ہونگے، جنہیں غزہ جانے کا
موقع ملے گا،اِس سارے قضیئے میں سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ وہ ترکی جو
کل تک اسرائیل کا دوست اور حمایتی سمجھا جاتا تھا،آج وہی ترکی اسرائیل کی مخالفت میں
تمام اسلامی ممالک میں سب سے زیادہ سرگرم اور متحرک نظر آتا ہے اور اسرائیل کی
وحشت و درندگی کے خلاف ڈٹا ہوا اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر للکار رہا ہے، جبکہ
اسرائیل کو تسلیم نہ کرنے والا عالم اسلام مصلحتوں کی منافقانہ چادر اوڑھے خاموش
تماشائی بنا ہوا ہے۔

یہاں یہ اَمر بھی قابل توجہ ہے کہ ترک وزیر اعظم طیب اردگان نے اسرائیل کے خلاف
یہ اقدام پہلی بار نہیں کیا بلکہ اِس سے قبل بھی سوئٹزرلینڈ کے شہر ڈیوس میں ہونے
والے ورلڈ اکنامک فورم کے اجلاس کے دوران ترکی کے وزیر اعظم طیب اردگان اُس
وقت احتجاجاً واک آؤٹ کر گئے تھے جب اسرائیل کے صدر شمعون پیرز نے اپنی 25
منٹ کی تقریر میں غزہ میں ہونے والے قتل عام کو جائز قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ
اسرائیل کو اپنے کئے پر کوئی شرمندگی نہیں اور اگر ضرورت پڑی تو مستقبل میں بھی وہ
اِس طرح کے اقدام سے گریز نہیں کرے

گا،اسرائیلی صدر کی تقریر کے بعد ترک وزیراعظم نے اِن کے الزامات کے جواب دینے
کے لئے وقت مانگا تو منتظمین نے انکار کردیا جس پر ترک وزیراعظم اجلاس سے یہ کہتے
ہوئے واک آؤٹ کرگئے کہ وہ اِس اجلاس میں آئندہ کبھی شرکت نہیں کریں
گے، کیونکہ منتظمین کا رویہ جانبدارانہ ہے،اُن کے جرات مندانہ اقدام کی وجہ سے نہ
صرف ترک عوام بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں نے اُن کو ایک ہیرو کے طور پر سراہا تھا اور
آج پھر انہیں حالیہ جرات مندانہ موقف پر عالم اسلام میں زبردست خراج تحسین پیش
کیا جارہا ہے،اُن کی بھرپور تائید وحمایت کی جارہی ہے، ہوسکتا ہے کہ ترکی کی حالیہ مہم
متعین اہداف حاصل نہ کرسکے مگراِس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ترکی کی اِس مہم نے
عالمی سیاست میں ایک ایسا ارتعاش پیدا کردیا ہے جس کی گمک عالمی ضمیر اور عالم اسلام
کے خوابیدہ حکمرانوں کو جھنجھوڑتی رہی گی،آج اسرائیلی جارحیت کے خلاف ترکی نے جو
آواز بلند کی ہے وہ محض جذبات کا اظہار نہیں ہے بلکہ غیرت ایمانی کا مظہر اور عالم اسلام
کے اُن بے حمیت حکمرانوں کے منہ پر طمانچہ ہے جنھوں نے محض بھیک کے چند ٹکوں کے
عیوض اپنی آزادی اور خودی کو گروی رکھدیا ہے،ترکی کے موجودہ کردار نے عرب
مہالک میں امریکہ کے حامی حکمرانوں کو پریشان کردیا ہے اور عرب عوام کا اپنے
حکمرانوں پر دباؤ بڑھتا جارہا ہے کہ وہ اسرائیل کے خلاف عملی اقدامات اٹھائیں اور
اسرائیل پر دباؤ ڈالیں کہ وہ غزہ کا محاصرہ ختم کرے،دوسری طرف ترکی جیسے ماڈریٹ
اور اعتدال پسند اسلامی ملک میں فلسطینیوں

کی اِس قدر بڑے پیمانے پر حمایت کا ابھرنا مغرب کے لئے لمحہ فکریہ بنا ہوا ہے۔اسرائیل کے اقدام کے باعث ترکی کے اسرائیل مخالف رویئے نے امریکہ کے لئے بہت سی پریشانیاں پیدا کردی ہیں جبکہ اسرائیل کی اندھا دھند حمایت نے ترکی کو امریکہ سے دور کردیا ہے۔اَمر واقعہ یہ ہے کہ ایک طویل عرصے سے عالم اسلام کسی غیرت مند ولولہ انگیز قیادت کا منتظر تھا،اُسے ایک اعتدال پسند،اسلامی اقدار پر یقین رکھنے والی بالغ نظر قیادت کی ضرورت ہے اور رجب طیب اردگان میں یہ صلاحیت موجود ہے۔اسی وجہ سے عالم اسلام کی قیادت کیلئے دنیا کی واحد اسلامی ایٹمی ریاست پاکستان کی طرف دیکھنے والے دنیا بھر کے مسلمان ہمارے غلام حکمرانوں کے کردار سے مایوس ہو کر ترک قیادت کی طرف دیکھ رہے ہیں اور اُنہیں اپنا مسیحا سمجھ رہے ہیں، جبکہ رجب طیب اردگان اسرائیل اور مغرب کے خلاف جرات مندانہ اقدامات کے سبب دنیا بھر کے مسلمانوں کی اُمیدوں کا مرکز بنے ہوئے ہیں،آج عالم اسلام کے مسلمان دعاگو ہیں کہ طیب اردگان کی قیادت میں ترکی اپنا کھویا ہوا تشخص حاصل کرکے اپنے روشن ماضی کی طرف لوٹے اور ایک بار پھر عالم اسلام کی قیادت کا فریضہ سرانجام دے۔

اتحادِ اُمت کے نقیب، مسلم قومیت کے علمبردار مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی

مولانا شاہ احمد نورانی کی 18 ستمبر 2011ء کو آٹھویں برسی کے حوالے سے خصوصی تحریر

جن کی قیادت میں اکٹھا ہونا ہر مکتبہ فکر اور مختلف سیاسی جماعتوں کیلئے باعث اعزاز تھا
سیاست کے میدان کارزار میں اُترنے کے بعد اپنے دامن کو جھوٹ، فریب، مکرو دجل
اور منافقت سے پاک رکھنا اور اُسے آلودہ نہ ہونے دینا ایک مشکل کام ہے، ایسی
صورت میں تو یہ کام اور بھی ناممکن ہو جاتا ہے جب یہ عوامل ایک سیاستدان کی کامیابی
کیلئے لازمی اوصاف شمار ہونے لگیں، یعنی جو جتنا بڑا جھوٹا، مکار، مطلبی اور دغا باز ہو وہ
اُتنا ہی بڑا سیاستدان مانا جائے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں نہ تو سیاست
مثالی ہے اور نہ ہی سیاستدانوں کا کردار قابل رشک ہے، یہی وجہ ہے کہ جس کی طبیعت
زرا مچلتی ہے اُس کا ہاتھ سیدھا سیاستدانوں کے گریبان تک پہنچ جاتا ہے، جب کسی کو
اپنی زبان کا ذائقہ بدلنا ہوتا ہے تو وہ سیاستدانوں کو دو چار صلواتیں سنا لیتا ہے، جس کسی
کو اپنے قلم کی جولانی اور حق گوئی کی دھاک بیٹھانی ہوتی ہے وہ سیاستدانوں کو

تختہ مشق بنالیتا ہے، مگر جھوٹ، فریب اور مکرو دجل کے اِس تعفن زدہ ماحول میں ایک
سیاستدان ایسا بھی ہے جس کی سیاست اور کردار ہی مثالی اور قابل رشک نہیں بلکہ آج
تک کسی کا ہاتھ اُس کے گریبان تک نہیں پہنچ سکا، صلواتیں سنانا اور برا بھلا کہنا تو دور
کی بات ہے، قلم کی جولانی دکھانے والے ہزار تلاش و جستجو کے باوجود آج تک اُس کے
کردار و عمل میں کوئی کمزور لمحہ تلاش نہ کرسکے، جھوٹ، فریب اور منافقت سے آراستہ
سیاسی بازی گری کے اِس میدان میں علامہ شاہ احمد نورانی وہ واحد قومی سیاستدان تھے
جنھوں نے کبھی اِن اوصاف رزیلہ سے اپنے اُجلے اور شفاف دامن کو آلودہ نہ ہونے
دیا، ہمیشہ صاف ستھری اور بے داغ سیاست کے علمبردار رہے، کبھی بھی اصولوں پر
سمجھوتہ نہیں کیا اور نہ ہی کبھی چور دروازے سے اقتدار میں آنے کی کوشش کی، یہی وجہ
ہے کہ آج اُن کے شدید ترین مخالف بھی اُن کا نام عزت و احترام سے لیتے ہیں۔
علامہ شاہ احمد نورانی نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز 1970ء کے انتخابات سے کیا، آپ کی
سالہ ہنگامہ خیز سیاسی زندگی 11 دسمبر 2003ء بروز جمعرات کو اختتام پذیر ہوئی، 33
سالہ مولانا نورانی ایک تجربہ کار سیاستدان، مذہبی رہنما اور مبلغ اسلام تھے، اُن کا 78
ہنستا مسکراتا چہرہ، پان کے سرخ رنگ سے رنگے ہونٹ اور خوش لباسی، خوش گفتاری اور
اصول پسندی اُن کی شخصیت کا خاصہ اور پہچان تھی، یکم اپریل 1926ء کو میرٹھ میں
مبلغ اسلام، سفیر پاکستان ” شاہ“

عبدالعلیم صدیقی کے گھر پیدا ہونے والے مولانا نورانی نے صرف آٹھ برس کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا، وہ مذہبی علوم پر مہارت رکھنے کے ساتھ الہ آباد یونیورسٹی کے گریجویٹ بھی تھے، بطور طالب علم انہوں نے نہ صرف تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا اور میرٹھ کے نوجوانوں کو منظم کیا بلکہ تقسیم ہند سے قبل متحدہ ہندوستان میں سنی کانفرنسوں کے انعقاد میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے، علامہ نورانی اردو، عربی، فارسی کے علاوہ انگریزی، سواحلی، فرانسیسی سمیت متعدد زبانیں بول سکتے تھے، انھوں نے اپنے بزرگوں کی طرح طریقت کے راستے کو اختیار کیا، سادہ زندگی گزاری اور وفات سے چند سال قبل تک "الفقر فخری" پر نازاں کراچی کے گنجان آباد علاقے صدر میں واقع کچھی میمن مسجد سے ملحقہ بوسیدہ فلیٹ میں رہتے رہے جس میں ہندوستان سے ہجرت کرکے آنے کے بعد سے مقیم تھے۔

علامہ شاہ احمد نورانی شاہی مسجد میرٹھ کے خطیب مولانا عبدالحکیم جوش میرٹھی کے پوتے تھے، جن کے بھائی اسماعیل میرٹھی اردو کے بلند پایہ شاعر اور نعت گو مانے جاتے ہیں، مولانا نورانی کے خاندان کا قریبی تعلق قائداعظم سے رہا، اس لیے وہ اُن مذہبی پیشواؤں میں تھے جو تحریک پاکستان کے زبردست حامی سمجھے جاتے تھے، آپ کے تایا نذیر احمد خجندی صدیقی (جنھوں نے قائداعظم اور رتن بائی کا نکاح پڑھایا) بمبئی میں مسجد کے خطیب تھے، اُن کے قائداعظم محمد

علی جناح سے ذاتی مراسم تھے،اسی طرح آپ کے دوسرے تایا مختار احمد صدیقی اور والد عبدالعلیم صدیقی بھی قائد اعظم کے ساتھیوں میں شمار کیے جاتے ہیں،پاکستان بننے کے بعد قائد اعظم نے پہلی نماز عید مولانا نورانی کے والد شاہ عبدالعلیم صدیقی کی امامت میں 18 اگست 1947ء کو کراچی میں ادا کی،اپنے والد شاہ عبدالعلیم صدیقی کی وفات کے بعد مولانا شاہ احمد نورانی نے 1953ء میں سرگرم عملی زندگی کا آغاز کیا اور دنیا بھر کے مختلف ممالک میں تبلیغی مشن پر جاتے رہے،ایک مبلغ کے طور پر آپ کا کام عملی سیاست میں آنے کے بعد تادم آخر بین الاقوامی تبلیغی ادارے ورلڈ اسلامک مشن کے پلیٹ فارم سے جاری رہا۔

مولانا نورانی کو گستاخان رسول اور منکرین ختم نبوت سے سخت نفرت تھی،1953ء کی تحریک تحفظ ختم نبوت کے دوران آپ قادیانی کے خلاف ایک متحرک رہنماء کے طور پر سامنے آئے اور قومی اسمبلی اور سینٹ سے لے کر عوامی جلسہ عام تک ہر میدان میں اسلام اور پاکستان دشمن قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا،1969ء میں پاکستان آنے کے بعد آپ نے قادیانیوں کے خلاف سب سے پہلا اور سخت بیان جاری کیا جس میں قوم کو اِس فرقہ کے خلاف لائحہ عمل مرتب کرنے کی دعوت دی،1972ء میں دستور سازی کے موقع پر جن ارکان اسمبلی نے آئین کو بھٹو کے سوشلزم اور صدارتی نظام سے محفوظ رکھنے اور اسے اسلامی، وفاقی اور

پارلیمانی رنگ دینے کیلیئے قائدانہ کردار ادا کیا،اُن میں علامہ شاہ احمد نورانی سرفہرست تھے،آپ ہی نے سب سے پہلے 1972 کے عبوری آئین میں مسلمان کی تعریف کا تعین کروایا، جس میں مسلمان ہونے کے لئے خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم پر بطور آخری رسول ایمان رکھنا شرط قرار اوّل قرار پایا،1973ء کے آئین کی تیاری میں علامہ نورانی کا کردار اُس وقت خاص اہمیت کا حامل رہا جب آپ نے اسلام پسند قوتوں، سوشلزم اور جمہوریت کی علمبردار سیاسی جماعتوں کے درمیان کامیاب سمجھوتے کو ممکن بنانے میں مدد دی اور آپ کی کوششوں کی بدولت 1973ء کے آئین میں اسلامی دفعات شامل ہوسکیں،آپ ہی نے 30 جون 1974ء کو قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے لئے قومی اسمبلی میں قرارداد پیش کی جس کے تحت 7 ستمبر 1974ء کو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں نے متفقہ طور پر پاکستان میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا۔

جب 1970ء کے عام انتخابات میں جمعیت علماء پاکستان نے 7 نشستیں جیت کر علامہ شاہ احمد نورانی کو پارلیمانی لیڈر مقرر کیا تو عام خیال یہی تھا کہ علماء و مشائخ کی یہ جماعت اپنی سابقہ روایات کے مطابق یحیٰی خان کیلیئے پرو اسٹیبلشمنٹ پالیسی وضع کریگی اور فوجی حکومت کے ہراَول دستے کا کردار ادا کرے گی، مگر یہ اعزاز مولانا نورانی کو جاتاہے کہ انھوں نے تحریک پاکستان میں مسلم لیگ کے شانہ بشانہ فعال کردار ادا کرنے والے علمائے اہلسنّت کی

سیاسی جماعت جمعیت علماء پاکستان کو حکمرانوں کے حرم سے نکال کر عوامی اور جمہوری جدوجہد کی راہ پر ڈالا اور ہر حاکم وقت کو امام ضامن باندھنے اور اُس کے اقتدار وسلامتی کا وظیفہ پڑھنے والے علماء و مشائخ کو سرکاری کانفرنسوں اور کمیٹیوں سے نکال کر یحییٰ خان، ذوالفقار علی بھٹو اور ضیاء الحق کی سول و فوجی آمریت کے سامنے صف آراء کردیا تاکہ سیدالشہداء امام حسین، امام اعظم، امام احمد بن حنبل اور مجدد الف ثانی کی درخشاں روایات کو زندہ رکھا جاسکے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں مولانا نورانی حزب مخالف کے رہنما بن کر ابھرے اور 1977ء میں سیاسی محاذ پاکستان قومی اتحاد کے روح رواں بن گئے، آپ نے اپنی فہم وفراست سے 1977ء کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی کی مبینہ دھاندلیوں کے خلاف چلنے والی عوامی تحریک کو تحریک نظام مصطفیٰ میں تبدیل کردیا، اِس تحریک کے دوران آپ گرفتار ہوئے اور پاکستان کے گرم ترین مقام گڑھی خیرو میں اسیر بھی رہے۔

علامہ شاہ احمد نورانی پاکستان میں بائیں بازو کی سیکولر اور لبرل سیاست کے مقابلے میں دائیں بازو کی اسلامی سیاست کے علمبردار تھے، آپ نے قادیانیت کے خلاف تحریک چلا کر 1973ء کے آئین میں اسلامی دفعات شامل کروائیں اور قومی اتحاد کی سیاست کو نظام مصطفیٰ کے رنگ میں ڈھال کر جس مذہبی رجحان کی تعمیر کی وہ بعد میں فوجی آمر حکمران جنرل ضیاء الحق کی سیاست کی بنیاد بنا، جنرل

ضیاء نے اُسی رجحان کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام کو اپنے سیاسی جواز کے لئے استعمال کیا اور
بہت سی مذہبی وسیاسی جماعتوں اور اُن کے وابستگان کو اپنے دام فریب میں
پھنسالیا، مگر بھٹو کے سخت ترین مخالف ہونے کے باوجود مولانا نورانی نے جنرل ضیاء الحق
کے مارشل لاء کی برملا مذمت کی اور ضیاء کابینہ میں اپنے ارکان نامزد کرنے کے بجائے
قومی اتحاد ہی چھوڑ دیا، جس کا فائدہ انہیں یہ ہوا کہ انہیں بعد میں کبھی جنرل ضیاء کی
حمایت پر افسوس اور شرمندگی کا اظہار نہیں کرنا پڑا، حالانکہ 1981ء میں جمعیت کی
تیسرے درجے کی قیادت جن میں حاجی حنیف طیب، ظہور الحسن بھوپالی، حافظ تقی، احد
یوسف اور الحاج شمیم الدین وغیرہ شامل تھے، مولانا نورانی کو چھوڑ کر اسلام آباد جانے
والی آمریت کی ٹرین میں سوار ہوگئے، 1988ء میں مولانا نورانی کو دوسرا دھچکہ اُس
وقت لگا جب اُن کے دیرینہ رفیق مجاہد ملت علامہ عبدالستار خان نیازی حلقہ 99 کے
ضمنی انتخابات کے موقع پر اُن سے الگ ہوگئے اور نواز شریف کی مسلم لیگ کے اتحادی
بن گئے، مجاہد ملت کے اِس فیصلے نے جمعیت علماء پاکستان کی سیاسی طاقت کو شدید نقصان
پہنچایا، تاہم ملتان کے معروف عالم دین غزالی دوراں حضرت علامہ مولانا سید احمد سعید
کاظمی کی حمایت ہمیشہ مولانا نورانی کے ساتھ رہی۔

یہ حقیقت ہے کہ تحریک پاکستان ہو یا تحریک ختم نبوت، تحریک نظام مصطفیٰ ہو یا

تحریک بحالی جمہوریت یا آئینی و پارلیمانی بالادستی کی تحریک، علامہ شاہ احمد نورانی جدو جہد کے کسی مرحلے میں کبھی پیچھے نہیں رہے،جب بھی ملک و قوم کو اُن کی ضرورت محسوس ہوئی، مولانا نورانی کو صف اوّل میں پایا،آپ نے کبھی کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا، کئی بار اصولوں کی خاطر اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالا،اپنے دیرینہ رفیقوں کی قربانی دی مگر پیچھے ہٹنا گوارہ نہیں کیا،علامہ شاہ احمد نورانی کے پیش نظر ہمیشہ عالم اسلام کا مجموعی مفاد، ملک میں نظام مصطفیٰ کا نفاذ، مقام مصطفیٰ کا تحفظ اور وطن عزیز پاکستان کی سلامتی و استحکام رہا،اِس مقصد کے حصول کیلئے آپ نے مختلف مکاتب فکر کے علماء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا، لیکن کبھی بھی اپنے عقائد و نظریات کا سودا نہیں کیا،مذہبی جماعتوں کے اندر موجود ہزار ہا اختلافات کے باوجود ملی یکجہتی کونسل کے ایک پلیٹ فارم پر متحد رکھنا مولانا نورانی کا ہی کارنامہ تھا،آپ ہی کی قیادت میں ایم ایم اے نے 2002ء کے عام انتخابات میں صوبہ خیبر پختونخواہ اور بلوچستان میں حیران کن کامیابی حاصل کی، یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ پاکستان کے مختلف فرقوں کی سیاسی جماعتیں جب بھی ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہونا چاہتیں تو قیادت کے لئے صرف ایک ہی شخص سب کے لیے قابل قبول ہوتا اور وہ تھے علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی ۔

درحقیقت علامہ شاہ احمد نورانی ایک سچے عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور

صحیح العقیدہ مسلمان تھے،آپ کی ذات، عظمت و کردار، سیر چشمی وحق گوئی، سیاسی
بصیرت اور عہدہ واقتدار سے بے نیازی کا اعتراف آپ کے سیاسی و مذہبی مخالفین بھی
کرتے نظر آتے ہیں، مولانا نورانی اُن معدودے چند علما و سیاستدانوں میں سے تھے جن
کے دامن پر نہ تو سول و فوجی آمروں سے سمجھوتے کا کوئی داغ تھا اور نہ ہی حکمرانوں کی
مراعات اور ایجنسیوں کی نوازشات کی کوئی چھینٹ تھی، اُن کی زندگی کا زیادہ تر حصہ
پاکستان اور بالخصوص دنیا بھر میں احیائے اسلام اور تحفظ ناموس رسالت صلی اللہ علیہ
وسلم کی جدوجہد میں گزرا،وہ مسلم قومیت اور اتحاد بین المسلمین کے علمبردار اور ملک
میں نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نفاذ کے داعی تھے،آج اُن کی
سادگی، متانت، خوش مزاجی، خوش گفتاری اور اصول پرستی یاد رہ جانے والی باتیں بن
گئیں ہیں،اُن کی وفات پاکستانی سیاست کو ایک تجربہ کار منجھے ہوئے پارلیمینٹیرین اور قد
آور بین الاقوامی مذہبی و سیاسی شخصیت سے ہی نہیں بلکہ مجلس عمل کو "مجلس بے عمل"
اور جمیعت علماء پاکستان کو بے داغ،اصولی اور کبھی نہ جھکنے اور بکنے والی بے مثال
قیادت سے بھی محروم کر گئی۔

محترم سوال وجود کی بقاء کا ہے۔۔۔۔

نام نہاد دہشت گردی جنگ سے لاتعلقی جرات اظہار چاہتی ہے۔۔۔۔
نائین الیون کے بعد امریکی دہشت گردی کی نام نہاد جنگ کے آغاز پر ہمارے ارباب اقتدار دانشوروں اور امریکی برتری سے متاثر تجزیہ نگاروں نے جو حاشیہ آرائیاں کیں،امریکی دست وبازو بننے کے حوالے سے جو خوبصورت مناظر تراشے،آج اُس کے تمام دلکش نقوش پھیکے اور ماند پڑ چکے ہیں،دعوؤں کی قلعی اتر چکی ہے اور اِس سپردگی کی حقیقت اپنی تمام تر سچائی کے ساتھ عریاں ہو کر سامنے آچکی ہے،اِس وقت حال یہ ہے کہ امریکی طوفان بلاخیزی کے سامنے ہماری ملکی قومی سلامتی اور پاکستان کا وجود سوالیہ نشان بنا ہوا ہے جبکہ ہماری بے پناہ قربانیاں اور نقصان کے باوجود امریکی جارحیت کا منہ زور طوفان ہمیں نگلنے کیلئے بہانے اور جواز تلاش کر رہا ہے،بار بار امریکی عہدیداروں کی طرف سے متنبہ کیا جا رہا ہے اور کھلم کھلا دھمکیاں دی جارہی ہیں،
امریکی نائب صدر جوزف بائیڈن کے بعد وزیر دفاع لیون پینٹا اور امریکی سفیر کیمرون منٹر کی طرف سے دھمکیاں بھی اسی سلسلے کی تازہ کڑیاں ہیں۔

گذشتہ دنوں امریکی وزیر دفاع نے کابل میں اتحادی افواج کے دفاتر اور امریکی سفارت خانے پر حملے کا حقانی نیٹ ورک کو ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے پاکستان پر الزام عائد کیا کہ پاکستان حقانی نیٹ ورک کیخلاف کاروائی میں ناکام ہو گیا ہے،اب امریکہ خود پاکستان" میں حقانی نیٹ ورک کیخلاف کاروائی کرے گا،اُن کا کہنا تھا کہ ہم اپنی افواج پر پاکستان میں موجود طالبان کو حملوں کی اجازت ہر گز نہیں دے سکتے،امریکہ اپنے مفادات کیخلاف پاکستان سے ہونیوالے حملوں کو روکنے کیلئے ہر ممکن اقدام کرے گا۔" لیون پینٹا نے پاکستان کو دھمکی نما پیغام دیتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ہم افغانستان میں تعینات اپنی افواج کے دفاع کیلئے ہر ممکن قدم اٹھا سکتے ہیں۔

اپنے پیش رو کی پیروی میں پاکستان میں تعینات امریکی سفیر کیمرون منٹر نے بھی تمام سفارتی آداب اور تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سر عام امریکی الزام کا اعادہ کیا اور کہا کہ امریکہ کے پاس شواہد موجود ہیں کہ حکومت پاکستان کے افغانستان میں دہشت گردانہ حملوں میں ملوث حقانی گروپ کے ساتھ تعلقات ہیں،ریڈیو پاکستان کو انٹرویو دیتے ہوئے امریکی سفیر کا کہنا تھا کہ اسلام آباد دہشت گردوں کی محفوظ پناگاہ نہ بنے،ہم دہشت گردوں کے خلاف کہیں بھی کاروائی کا حق محفوظ رکھتے ہیں اور القاعدہ جہاں بھی ہو گی اُسے نشانہ بنائیں گے۔"امریکی عہدیداروں کی رعونیت آمیز ان دھمکیوں پر پاک فوج کے

اعلیٰ عہدیدار کا کہنا تھا کہ پاکستان دہشت گردی کے خلاف تمام تر وسائل بروئے کار لا رہا ہے اور اگر دہشت گرد حملوں کیلئے افغانستان میں داخل ہوتے ہیں تو یہ اتحادی فوج کی ذمہ داری ہے کہ وہ اِن کےخلاف کاروائی کرے۔

اسپین میں ناٹو کی افواج کے سربراہی کانفرنس کے دوران اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے بری فوج کے سربراہ جنرل اشفاق پرویز کیانی نے امریکی دھمکی کا جراۓت مندانہ جواب دیتے ہوئے واضح کیا کہ پاکستان دہشت گردی کے خلاف جنگ میں آزاد اور خود مختار ملک ہونے کی حیثیت سے آزادانہ فیصلے کرے گا، ہم سمجھتے ہیں کہ اصولی طور پر تو اِس الزام کا جواب حکومتی ذمہ داران کی جانب سے دیا جانا چاہیے تھا، کیونکہ پاکستان میں جمہوریت، منتخب حکومت اور پارلیمنٹ موجود ہے، ملک کی خارجہ پالیسی کی تشکیل کا اختیار منتخب جمہوری حکومت کی ذمہ داری ہے جبکہ افواج پاکستان اور اُس کی قیادت کا فریضہ اُس پالیسی پر عمل کرنا ہے، لیکن افسوس کہ جمہوریت کی بالادستی کے دعوؤں اور منتخب حکومت کی موجودگی کے باوجود ہمارے دفتر خارجہ نے امریکی وزیر دفاع اور نائب صدر جوزف بائیڈن کے مخالفانہ بیانات پر احتجاج سے گریز کرتے ہوئے نہایت ہی بھونڈا اور پھسپھسا موقف اختیار کرتے ہوئے صرف اتنا کہنا گوارہ کیا یہ بیانات پاکستان امریکہ تعاون کے منافی ہیں، ہم انہیں مسترد کرتے ہیں اور پاکستان اِن مخالفانہ بیانات پر احتجاج نہیں کرے گا۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ جیسے جیسے امریکی افواج کی افغانستان سے واپسی کی ڈیڈ لائن قریب آرہی ہے، بے سروساماں حیرت پسند افغان مجاہدین کے ہاتھوں شکست کا خوف امریکی انتظامیہ اور اسکی دفاعی قیادت کی مایوسی اور اضطراب میں اضافہ کررہا ہے، دراصل امریکہ کو افغانستان میں جنگی ہزیمت اور پسپائی کا سامنا ہے وہ اپنی جنگی شکست کو تسلیم کرنے کے بجائے الزامات کی نئی بوچھاڑ شروع کر دیتا ہے، جو امریکی انتظامیہ کے ہذیان آمیز، غیر مہذبانہ اور ترش بیانات سے صاف عیاں ہے،امریکہ اِس طرح کا رویہ اختیار کرکے اپنی ناکامی اور شکست کا ملبہ پاکستان پر ڈالنے کی کوشش کررہا ہے، یہی وجہ ہے کہ اُس نے ایک بار پھر کابل میں طالبان کی طرف سے اتحادی فوجی ہیڈکوارٹر امریکی سفارتخانے پر کئے گئے حملوں کا الزام بالواسطہ طور پر پاکستان پر عائد کیا ہے، جو ہماری نظر میں کسی اعلانِ جنگ سے کم نہیں، جہاں تک حقانی نیٹ ورک کے حملوں کا تعلق ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ناممکنات میں سے ہے اور سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔

کیونکہ پاک افغان سرحد پر ایک طرف پاکستان کے 60 ہزار سے زائد فوجی تعینات ہیں تو دوسری جانب امریکہ اور نیٹوافواج کے علاوہ افغان فوج اور پولیس سمیت پاکستان سے تین گنا زیادہ اہلکار تعینات ہیں،اِس کے علاوہ خفیہ ایجنسیاں

اور جاسوسی سیٹلائٹ نظام علیحدہ کام کر رہا ہے،اِس تناظر میں بعید از عقل ہے کہ اتنے کڑے پہرے میں شدت پسند سرحد عبور کرکے جائیں اور اپنا مشن مکمل کرکے باحفاظت واپس لوٹ آئیں اور بالفرض محال ایسا ہوا بھی ہے تو سوال یہ ہے کہ چپے چپے پر موجود اتحادی افواج جب کابل میں اپنے ہائی ویلیو ٹارگٹس کی بھی حفاظت نہیں کر سکتیں تو امریکہ یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ وہ بیرونی جارحیت کو کسی صورت بھی قبول نہ کرنے کا اعزاز رکھنے والے غیرت مند، غیور نہتے افغانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا،دوسری طرف امریکہ کا پاکستان پر مذکورہ الزام عائد کرنے کا پس پردہ مقصد پاکستان کو شمالی وزیرستان میں نام نہاد حقانی شوریٰ کیخلاف آپریشن کیلئے مجبور کرنا ہے۔

اس تناظر میں سوال یہ ہے کہ آخر کب تک ہم امریکی آقاؤں کی مرضی اور خواہش پر سر تسلیم خم کرتے رہیں گے اور کب تک ہم جانتے بوجھتے اپنی تباہی وبربادی کا سامان کرتے رہیں گے، جبکہ دہشت گردی کی نام نہاد امریکی جنگ کیلئے ہم نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے اور سوائے لاحاصلی کے ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوا،آج 35ہزار جانوں،68 ارب ڈالر کے نقصان اور ملکی معیشت وثقافت کی بیش بہا قربانیوں کے باوجود بھی امریکہ ہمیں اِس کا صلہ دینے اور ہم پر بھروسہ کرنے کو تیار نہیں ہے،اُس نے ہمارے خلاف سازشوں کے جال بننا شروع کر دیئے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ امریکہ نے ہم سے ہر بار دھوکہ کیا،اُس نے ہم سے قربانی

لے کر ہمیشہ ہمارے ازلی دشمن بھارت کو نوازا،آج بھی وہ یہی کھیل کھیل رہا ہے،وہ بھارت کے ساتھ مل کر بلوچستان سمیت پاکستان کے دیگر علاقوں میں دہشت گردی کے ذریعے پاکستان کی سلامتی کو نقصان پہنچارہا ہے،لیکن اس حقیقت کے ادراک کے باوجود ہمارے ارباب اقتدار امریکی غلامی اور کاسہ لیسی میں پیش پیش ہیں،ہماری اس بڑی بدقسمتی اور کیا ہوگی کہ ہمارے صدر محترم اور وزیر اعظم صاحب امریکی خوشنودی کیلئے امریکہ اور نیٹو افواج کو افغانستان میں اپنے قیام بڑھانے کا مشورہ دیتے ہیں،جبکہ ملک کے عوام سمیت حزب اختلاف کی اکثر سیاسی جماعتیں،محب وطن اسلام پسند تنظیمیں،سول سوسائٹی اور قومی میڈیا حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا ہے کہ یہ ہماری جنگ نہیں،اب ہمیں اِس دلدل سے باہر نکلنے کی کوشش کرنا چاہیے،لیکن سابقہ فوجی آمر کے پیروکار،سلطانی جمہور کے دعویدار ڈالروں کے لالچ میں قومی خودمختاری،وقار اور غیرت وحمیت کا سوداجاری رکھے ہوئے ہیں۔

آج ہم میں اتنی بھی جرات اظہار نہیں کہ امریکہ کو دوٹوک الفاظ میں اُس کے جارحانہ الزامات کا جواب دے سکیں،ہم سمجھتے ہیں کہ آج ضرورت اس اَمر کی ہے کہ ہمیں عزت ووقار سے جینے کیلئے دہشت گردی کی نام نہاد امریکی جنگ سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہیے،موجودہ حالات کا تقاضہ یہی ہے کہ امریکہ کو اپنی ناکامیوں کا ملبہ پاکستان پر ڈالنے اور پاکستان کی سلامتی اور

خودمختاری کو پامال کرنے کے بہانے فراہم نہ کیے جائیں، ہم سمجھتے ہیں کہ بے چارگی کے زخم چاٹنے اور رنگارنگ خوشنما مگر بے اثر تاویلوں کے ذریعے اپنے آپ کو بہلا کر فریب دینے کے بجائے شکست خوردہ جوزف بائیدن، لیون پینٹا، کیمرون منٹر اور ہیری کلنٹن جیسے بدحواسوں کو لگام دی جائے۔ اگر اب بھی ایسا نہیں کیا گیا تو خاکم بدہن پاکستان کو بیرونی مداخلت کا اکھاڑہ بننے سے کوئی نہیں روک سکے گا، یاد رکھئے کہ یہ پاکستان کے وجود کی بقاء کا سوال ہے، ایک ایسے وجود کا، جو اپنے اساسی نظریات، اکابرین ملت کی بے لوث قربانیوں، قائداعظم کے افکار کی عظمت اور اٹھارہ کروڑ عوام کی قوت کا مظہر ہے، جسے جرات و بہادری سے سر اٹھا کر ہی قائم رکھا جاسکتا ہے، ہم اپنے ارباب اقتدار اور عسکری قیادت کو یاد دلانا چاہتے ہیں کہ جھک جانے والے سر کبھی گنتی میں نہیں آتے، ہمیشہ باطل و طاغوت کے سامنے اکڑے اور تنے ہوئے سروں کی ہی قیمت لگتی ہے اور یہی وہ سر ہوتے جو کٹتے کٹتے بھی ظلم کی تلواروں کی دھار موڑ کر حالات کا دھارا بدل دیتے ہیں۔

امریکی کروسیڈی عزائم اور پاکستان

غلامی سے بدتر ہے بے یقینی ۔۔۔۔۔

عراق میں صدام حسین حکومت کی معزولی، افغانستان میں طالبان اقتدار کے خاتمے، اُسامہ بن لادین کی شہادت، پاکستان کے قبائلی علاقوں پر ڈرون حملے اور لیبیا میں قذافی دور زوال کے بعد بھی امریکی خون آشام بھیڑیا نئے اور تازہ خون کا متلاشی ہے، اُس کی جارحیت اور سفاکی کی شعلے ابھی سرد نہیں ہوئے، اب اُس کے ظلم و بربریت کا سفر اُس فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہونے جا رہا ہے جس کا اظہار محب وطن حلقے، اہل علم و دانشور اور وطن پرست میڈیا و صحافی عرصہ دراز سے کرتے چلے آرہے ہیں اور آج اُن کے وہ خدشات کہ "نائن الیون بہانہ، افغانستان ٹھکانہ اور پاکستان اصل نشانہ" حقیقت کا روپ دھارتا نظر آرہا ہے، رفتہ رفتہ اُس کے لہجے میں وہ ہی انداز آتا جارہا ہے جو اُس نے صدام حسین کے خلاف جارحیت سے پہلے اپنایا تھا، آپ کو یاد ہوگا کہ صدام حسین پہلے امریکہ کا حلیف اور ایران کے خلاف اُس کا فرنٹ لائن اتحادی تھا، لیکن جب امریکی مقاصد پورے ہوگئے تو صدام کے روابط اور سرگرمیاں مشکوک ہوگئیں، پھر اچانک امریکہ پر انکشاف ہوا کہ صدام کے پاس دنیا اور خصوصاً

امریکہ کو وسیع پیمانے پر نقصان اور تباہی پہنچانے والے جوہری و کیمیائی ہتھیار موجود ہیں پھر دیکھتے ہی دیکھتے امریکہ کا لہجہ نہایت درشت سے درشت تر ہوگیا اور نتیجہ صدام کی معزولی اور پھانسی پر منتج ہوا، لیکن وہ تباہی پھیلانے کیمیائی ہتھیار آج تک دنیا کے سامنے نہ آسکے۔

اب ذرا موجودہ حالات پر غور کیجئے تو ہمیں بعینہٖ وہی صورت نظر آتی ہے جو کل عراق کے ساتھ تھی، پاکستان امریکہ کا فرنٹ لائن اتحادی ہے، لیکن امریکہ کا رویہ پاکستان کے ساتھ بالکل ویسا ہی ہے جیسا کل عراق کے ساتھ تھا، امریکہ پاک فوج کو دباؤ میں رکھنے کے لئے مسلسل ایسے الزامات لگا رہا ہے جیسے کہ پاکستان، افغانستان اور امریکہ میں دہشت گردی کا اصل سبب ہے، امریکی انتظامیہ کے تازہ فرمودات اُسی نفسیات کا مظاہرہ کر رہے ہیں جو اُنھوں نے ماضی میں عراق کے ساتھ اپنائی تھی، آج امریکی عہدیداروں کے بیانات یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ پاکستان ہی دراصل ساری دہشت گردی کروا رہا ہے، وہ کہتے ہیں کہ آئی ایس آئی کی اصل قوت حقانی نیٹ ورک ہے، جس نے آئی ایس آئی کی مدد سے کابل میں امریکی سفارت خانے اور ہوٹل پر حملے کیے، اِن بیانات میں پاکستان کے حوالے سے سب سے زیادہ خطرناک بات یہ بھی کہی گئی کہ پاکستان نے تشدد برآمد کرکے اپنی داخلی سلامتی خطرے میں ڈال لی ہے، گویا اِن بیانات کے ذریعے دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ دنیا کی بدمعاش ترین اور تخریب کار قوت

القائدہ یا طالبان نہیں بلکہ آئی ایس آئی ہے جو اِن قوتوں کی مدد سے دنیا بھر میں دہشت گردی کر رہی ہے۔
حالانکہ خود امریکیوں کی تحقیق کے مطابق دنیا بھر میں جتنی بھی عسکریت پسند اور دہشت گرد تنظیمیں ہیں، وہ سب سی آئی اے نیٹ ورک سے تعلق رکھتی ہیں، تحقیق کرنے والے تو یہاں تک لکھ چکے ہیں کہ امریکی خفیہ اداروں کا اُسامہ بن لادین، صدام حسین، القائدہ، طالبان اور لیبیا کے سابق صدر قذافی تک سے رابطہ تھا اور یہی ادارے دنیا بھر میں امریکی مفادات کیلئے دہشت گردی کو فروغ دیتے رہے ہیں، سب جانتے ہیں کہ دنیا میں گذشتہ کئی عشروں سے صرف امریکی خفیہ ادارے ہی دہشت گردی کو فروغ دے رہے ہیں، جبکہ یہ بات بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ بلیک واٹر جیسی بدنام زمانہ دہشت گرد تنظیم بھی امریکی سی آئی اے کے ماتحت ہی پاکستان سمیت مختلف ممالک میں تخریبی کاروئیاں کر رہی ہے، لیکن اِن ناقابل تردیک حقائق کے باوجود جس کی لاٹھی اُس کی بھینس والا معاملہ ہے، انسداد دہشت گردی اور امریکہ کو محفوظ بنانے کے جھوٹے پروپیگنڈے کی آڑ لے کر امریکہ دنیا بھر اسلام پسند قوتوں کے خلاف دندتا پھر رہا ہے۔
ویسے بھی امریکہ کی یہ روایت رہی ہے کہ جب تک اُس کے احکامات کی پابندی اور جائز اور ناجائز اور خواہشات کا احترام کیا جاتا ہے، امریکہ دوستی کا دم

بھرتا ہے، لیکن جونہی کوئی ملک اپنے قومی مفاد کی بات کرتا تو امریکہ الزامات، دھمکیوں اور ننگی جارحیت پر اتر آتا ہے، جیسا کہ اُس کے موجودہ طرز عمل سے عیاں ہے۔اِس تناظر میں پاکستانی فوج اور خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی کے اوپر امریکی فوجی اور سیاسی قیادت کے الزامات اور پاکستان کے داخلی حالات کی سنگینی نے ملک کی سلامتی کو شدید خطرے میں ڈال دیا ہے اور بظاہر پاکستان پر امریکی جارحیت کے سائے منڈلا رہے ہیں، دوسری طرف ہماری سیاسی قیادت کا حال یہ ہے کہ وہ قوم کو اعتماد میں لینے اور حقائق سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتی، بلکہ الٹا یہ سمجھتی ہے کہ امریکہ افغانستان کی جنگ پاکستان کے بغیر نہیں جیت سکتا اور ہم اُس کی لازمی ضرورت ہیں، دراصل یہی خام خیالی اور اور خود فریبی امریکی شہ کا باعث ہے امریکہ اچھی طرح جانتا ہے کہ پاکستان کے حکمران صرف ایک حد تک ہی مزاحمت کرتے ہیں اور بالآخر ہتھیار ڈال دیتے ہیں، یہی خطرہ ہمیں سابقہ آمری روایات کے امین موجودہ حکمرانوں سے بھی ہے۔
جبکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ افغان جنگ میں ناکامی کی وجہ سے امریکی فوجی اور سیاسی قیادت کو احتساب کا سامنا ہے، کیونکہ دس سال کی مارا ماری اور امریکی ٹیکس دہندگان کے کھربوں ڈالر جنگ کی بھٹی میں پھونک دینے کے باوجود امریکہ کو افغانستان میں سوائے ہزیمت کے کچھ حاصل نہیں ہوا، دوسری طرف امریکہ کو

تاریخ کی بدترین کساد بازاری اور بے روزگاری کے خوفناک آتش فشاں کا بھی سامنا ہے۔اِس صورتحال میں امریکی ڈیموکریٹ کے ذمہ داران یہ سمجھتے ہیں کہ اگر 2012 ءکے انتخابی سال میں یہ زہریلا مواد پھٹ پڑا تواُن کی پارٹی کی کامیابی کے سارے خواب بھسم ہوکر رہ جائیں گے،چنانچہ اپنے ملک کی رائے عامہ کی توجہ ہٹانے اور آئندہ صدارتی انتخابات میں ڈیموکریٹ امیدوار کی کامیابی کو زیادہ مستحکم بنانے کیلئے افغانستان شکست کا ملبہ پاکستان پر ڈال کر پاکستان کو قربانی کا بکرا بنایا جارہا ہے۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ افغانستان میں تعینات امریکی فوج کے کمانڈر جنرل میک کرسٹل اور جنرل ڈیوڈ پیٹریاس کے بعد اب ایڈمرل مائیک مولن بھی (جو 30 ستمبر کو ریٹائرڈ ہونے والے ہیں) امریکہ کو افغان جنگ جیت کر نہیں دے سکے اور اب یہ شکست خوردہ سورما اور دنیا کی سب سے بڑے جنگجو اپنی شرمناک شکست کو تسلیم کرنے کے بجائے اُس کی ذمہ داری پاکستانی فوج اور آئی ایس آئی پر ڈالنا چاہتے ہیں،دراصل امریکہ ناٹو ہیڈ کوارٹر اور امریکی و مغربی ممالک کے سفارت خانوں پر طالبان حملوں سے بوکھلا گیا ہے اور اپنی شکست ماننے کو تیار نہیں،اِس لیے وہ پاکستان اور حقانی حریت پسندوں پر بہتان تراشی کرکے اپنی ہزیمت کی خفت مٹانا چاہتا ہے،اِس تناظر میں امریکی انتظامیہ کے حالیہ بیانات اِس خدشہ کو ہوا دے رہے ہیں کہ وہ شمالی وزیرستان پر کوئی بڑا حملہ

کرنے والا ہے، بالکل ویسے ہی جیسے اُس نے ویتنام سے فرار ہوتے ہوئے لاؤس اور کمبوڈیا پر ویتنام چھاپہ ماروں کو محفوظ پناہ گاہ فراہم کرنے کا الزام لگا کر اُن کی شہری آبادیوں پر اندھا دھند بمباری کی تھی اور دونوں ریاستوں کے دس لاکھ باشندوں کو ہلاک کر دیا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکی شہنشاہ معظم اور دنیا کی واحد سپر پاور کے سربراہ اوبامہ 70 سالہ حریت پسند کمانڈر سراج الدین حقانی سے خائف ہیں اور طالبان کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونے کے بعد ہزیمت سے بچنے کیلئے پاکستان کو کمبوڈیا بنانے پر تلے ہوئے ہیں، اس صورتحال کا صاف مطلب یہ ہے کہ افغانستان میں شکست نے امریکی فوجی، سیاسی اور خفیہ ایجنسیوں کی قیادت کو پاگل کر دیا ہے اور اُن کے پاس ایک ہی حربہ باقی رہ گیا ہے کہ وہ اپنی خفیہ کاروائیاں پاکستان میں کریں، جس کا پس پردہ مقصد یہ ہے کہ پاکستان میں انتشار اور عدم استحکام پیدا ہو اور امریکہ اپنے اہداف باآسانی حاصل کر سکے، دوسرے یہ کہ امریکہ ایبٹ آباد طرز کی فوجی کاروائی کے ذریعے پاکستان کی جوہری صلاحیت کو تباہ کر کے بھارت کو علاقے کا چوہدری بنا دے، لیکن طالبان حریت پسندوں کی چھاپہ مار کاروائیوں نے امریکہ ہلا کر رکھ دیا ہے اور وہ پاکستان میں حقانی نیٹ ورک کی موجودگی کی فرضی داستان گھڑ کے پاکستان کو افغانستان میں نیٹو افواج والے کردار کی ادائیگی پر مجبور کر رہا ہے، بصورت دیگر

پاکستانی علاقوں پر خود حملے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔
اَمر واقعہ یہ ہے کہ امریکی مفادات کی جنگ میں اُس کے فرنٹ لائن اتحادی کا کردار ادا کرتے کرتے ہم پہلے ہی نا قابل تلافی نقصان اٹھا چکے ہیں، ہماری ملکی معیشت تباہی کے دہانے پر پہنچ چکی ہے، امن و امان تہہ و بالا ہو چکا ہے اور ملک کے کسی بھی حصے میں شہری زندگی محفوظ نہیں ہے، ہماری سیکورٹی فورسز کے ارکان اور تنصیبات دہشت گردوں اور خود کش حملہ آوروں کی ہی نہیں، پاکستان دشمن طاقتوں کے بھی نشانے پر ہیں، اس صورتحال میں غور طلب بات یہ ہے کہ امریکی فرنٹ لائن اتحادی کا کردار برقرار رکھ کر کیا ہم مزید ملک و قوم کے جانی اور مالی نقصان کے متحمل ہو سکتے ہیں۔؟ اب جبکہ امریکی طرز عمل سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آچکی ہے کہ ہماری حکومتی اور عسکری قیادتیں چاہے جتنے بھی امریکی ناز نخرے اٹھائیں، اُس کی چاپلوسی اور کاسہ لیسی کریں، لیکن کبھی بھی امریکہ نہ ہمارے کردار پر اعتبار کرے گا اور نہ ہی وہ ہماری کارکردگی سے مطمئن ہو گا، کیونکہ اِس خطے میں شروع کی گئی امریکی مفادات کی جنگ کا بنیادی ایجنڈہ ہی پاکستان کو غیر مستحکم اور ایٹمی قوت سے محروم کرنا ہے، یہی وجہ ہے کہ اُسے نہ ہمارے سسٹم سے کوئی غرض اور نہ ہی ہمارے نقصانات سے کوئی سروکار ہے، نہ ہی وہ ہماری ترقی و خوشحالی اور امن و سلامتی کے لئے فکر مند ہے، اُس کی اپنی کروسیڈی پالیسیاں اور ایجنڈہ ہے جس پر کاربند رہنا ہر امریکی

انتظامیہ کی بنیادی ذمہ داری ہے۔اپنی اِن ہی پالیسیوں کے تابع رہ کر امریکہ کبھی ہمارے ساتھ دوستی کا دعویدار ہوتا ہے۔ تو کبھی ہمیں اپنا فرنٹ لائن اتحادی بناتا ہے، کبھی ہمیں براہ راست دھمکیاں دیتا ہے اور کبھی ہماری خود مختاری و سالمیت پر خود حملہ آور ہونے سے بھی گریز نہیں کرتا۔اِس کے باوجود بھی ہم اُسے اپنا دوست اور ہمدرد سمجھتے ہیں، کیا یہ پرلے درجے کی بے وقوفی نہیں ہے۔؟

ہمارا ماننا ہے کہ زمینی حقائق اور بین الاقوامی اُمور سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص اِس بات سے اختلاف نہیں کرے گا کہ دنیا کی سب سے بڑی سپر پاور امریکہ کے ساتھ براہ راست تصادم کا راستہ اختیار کرنا کسی بھی ملک کا پسندیدہ آپشن نہیں ہو سکتا، خاص طور پر پاکستان کیلئے، کیوں کہ ہمارا معاشی، سیاسی اور عسکری اسٹرکچر گذشتہ کئی دہائیوں سے امریکہ کے ساتھ منسلک ہے، مگر یہ بھی تاریخ کی ایک بہت بڑی سچائی ہے کہ قوموں کی زندگی میں ایسے موڑ آتے ہیں جب پسندیدہ آپشن اختیار کرنے کا راستہ اُن کو بند گلی میں لے جاتا ہے اور وہ مجبور ہو کر ایسے آپشن تلاش کرتی ہیں جو پسندیدہ اگر نہ بھی ہو تو بھی قابل عمل اور زمینی حقائق سے مطابقت رکھتا ہو اور قومی مفادات کے تحفظ، بقاء اور استحکام کا ضامن ہو۔آج وطن عزیز پاکستان کو ایک ایسے ہی موڑ کا سامنا ہے،امریکہ نے ہمیں ایک ایسی بند گلی میں لا کھڑا کیا ہے، جہاں ہم نے

اپنے وسیع تر قومی مفادات، اپنی آزادی اور ملکی سالمیت و استحکام کیلئے جرات مندانہ فیصلے کرنے ہونگے، کیا اب بھی ”ہو رزم حق و باطل تو فولاد ہے مومن“ والا لمحہ نہیں آیا۔ یہ درست ہے کہ ہم امریکہ سے تصادم نہیں چاہتے، لیکن امریکہ کے احکامات مان کر اجتماعی خودکشی کرنا بھی ہمیں منظور نہیں، ہمیں افغانیوں سے خودداری، عزت و ناموس اور غیرت و حمیت کے ساتھ ایمان کی سربلندی اور پختہ یقین کے ساتھ جہاد کرنے کا سبق سیکھنا چاہیے، آج ہمارے بہت سے امریکہ نواز دانشوروں کا خیال ہے کہ اگر امریکہ نے اپنا دست کرم ہمارے سروں سے ہٹا لیا تو ہم زندہ نہیں رہ سکیں گے، لیکن وہ ہمیں امریکی طاقت سے ڈرانے کی کوشش کرتے وقت یہ بات بھول جاتے ہیں کہ سر اونچا کرکے چلنے اور اپنی انا اور خودی کا سودا نہ کرنے والے نان جویں کو ضرور ترستے ہیں لیکن بڑی ہی آبرومندانہ موت مرتے ہیں۔

یقیں مثل خلیل آتش نشینی
یقیں اللہ مستی، خود گزینی
سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار
غلامی سے بدتر ہے بے یقینی

رب کعبہ کی قسم وہ کامیاب ہوگیا۔۔۔۔

تحریک ناموس رسالت کا ایک اور غازی۔۔۔۔

فزت بِرَبِ الکَعبہَ "رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا۔" عبدالرحمٰن ابن ملجم خارجی کی زہر آلود تلوار سے گھائل ہو کر شہید ہونے والے آخری خلیفہ راشد سیدنا علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کی زبان مبارک سے نکلا ہوا یہ جملہ آج بھی تاریخ کا انمٹ نقش ہے، یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو کہے کہ" میں موت سے نہیں ڈرتا چاہے میں موت پر جا پڑوں یا موت مجھ پر آن پڑے" جو اپنے قاتل کو بھی شربت کا گلاس پیش کرے اور اُس کے ساتھ بھی انصاف کی آرزو رکھے، کوئی مانے یا نہ مانے لیکن صرف اور صرف وہی اپنے آخری وقت میں یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ آج میں کامیاب ہوگیا۔۔۔۔ ربّ کعبہ کی قسم ! آج راولپنڈی کی انسداد دہشتگردی کی خصوصی عدالت سے سزائے موت سن کر غازی ملک ممتاز حسین قادری بھی اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا، اُس نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ "میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم میری قربانی قبول فرمائیں، مجھے کوئی افسوس نہیں ہے، بلکہ میں بہت خوش ہوں کہ اب گستاخان رسول کافی عرصہ اپنے مذموم عزائم سے باز رہیں گے، میری نظر میں

سلمان تاثیر گستاخ رسول اور واجب القتل تھا، کیونکہ اُس نے ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون کو کالا قانون کہا اور گستاخ رسول آسیہ مسیح کی حمایت و معاونت کی، چنانچہ میں نے گورنر سلمان تاثیر کو واجب القتل مانتے ہوئے قتل کا ارادہ کیا اور قتل سے قبل اپنے پرس میں ایک چٹ ڈالی جس پر لکھا تھا کہ "گستاخ رسول کی سزا موت ہے" موت تو ایک دن آنی ہے تو پھر ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم پر جان قربان "ہو جائے تو کیا کہنا۔

رب کعبہ کی قسم! کیا کہنے ،یقیناوہ کامیاب ہوگیا اور کامیاب کیوں نہ ہو کہ" یہ وہ شہیدان عشق و وفا ہیں جو اپنے ہاتھوں میں حق و صداقت کی مشعلیں اٹھائے ،اپنے سینوں میں عشق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شمعیں جلائے ،اپنے دماغوں میں شہادت کی آرزو سمائے اور نظروں میں تصور مدینہ سجائے اپنے لیے موت کا انتخاب خود کرتے ہیں ،اسی لیے تو موت اِن سے دہشت زدہ رہتی ہے، کیونکہ اِن کی روحیں مرحلہ دار و رسن کی طالب ہوتی ہیں، کسی شخص کو جتنی محبت زندگی سے ہوتی ہے ،اُس سے کئی ہزار گنا انہیں موت سے پیار ہوتا ہے ،بلاشبہ دین اسلام کی عزت وآبرو انہی کے دم قدم سے ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ شہیدان ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم نے گورے اور کالے انگریز کی عدالت میں عزیمت واستقامت کا وہ مظاہرہ کیا کہ ہر مسلمان عش عش

کراٹھا اور کفر انگشت بدنداں ہو کر رہ گیا، وکلاء کے دلائل اور بے پناہ دباؤ کے باوجود انہوں نے عدالت میں شان و شوکت کے ساتھ اپنے جرم کا بار بار اعتراف کیا، عدالتی تاریخ میں اِس کی کوئی مثال نہیں ملتی، پھانسی کی سزا سنتے ہی اپنی مرادوں کے بر آنے پر وہ وجد میں آکر خوشی سے رقص کرتے ہیں، اپنی قسمت پر رشک کرتے ہیں، حلیف و حریف حیران رہ جاتے ہیں کہ موت کی سزا کے منتظر ان جانثاران مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا وزن جیل کی کال کوٹھریوں میں کیسے بڑھ جاتا ہے، وہ کیسے خوش و خرم رہتے ہیں، خوشی خوشی تختہ دار کو چومتے ہیں۔

کوئی لہجہ، کوئی طرز بیان، کوئی لغت، کوئی پیرایہ اظہار اتنی تاب نہیں رکھتا کہ وہ ان مجاہدین کی جرات بے مثل کا قصیدہ کہہ سکے، خراج تحسین پیش کر کے ان کی جرات و عظمت کو سلام پیش کر سکے، یہی وجہ ہے کہ شہیدان ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم ہماری آنکھوں میں بستے ہیں، دلوں میں رہتے ہیں اور سانسوں میں مہکتے ہیں، یہ ہماری کل جمع پونجی ہیں، یہ ہمارا اثاثہ ہیں، ہمارا سرمایہ افتخار ہیں، یہ اِس گم کردہ راہ قوم کے رہنماء اور برگشتہ بخت ملت کے محسن ہیں۔

یہ وہ مجاہدین اسلام ہیں جنھوں نے عظمت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و

حرمت کی خاطر اپنے خون کا نذرانہ پیش کرکے اسلام کی عظمت میں چار چار چاند لگائے۔اپنے مقدس لہو سے چمن اسلام کی آبیاری کرنے والے یہ وہ خوش نصیب ہیں جن پر روح فطرت ناز کرتی ہے،یہ وہ روشن کردار ہیں جن پر ہماری تاریخ غرور کرتی ہے،یہ تاریخ کے ماتھے کا جھومر اوراسلام کے درخشاں ستارے ہیں،یہ وہ مجاہدین اسلام ہیں جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہی وہ جدوجہد ہے جو زندگی کا حاصل ہے،اسی میں دائمی بقاء ہے اور یہی وہ رہگزر ہستی ہے جو شفاعت مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لے جاتی ہے،یہ وہ مجاہدین اسلام ہیں جن کی رفعت پر پوری ملت اسلامیہ رشک کرتی ہے،فردوس بریں بازو پھیلائے محبوب کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اِن عاشقوں کا استقبال کرتی ہے اور حور و غلمان ایسے ہی قدسیوں کی راہ تکتے ہیں،فرشتے جبرئیل امین کی قیادت میں اپنے ہاتھوں میں تاج عظمت لیے انہیں خوش آمدید کہتے ہیں،اللہ کی رضا پر راضی ہوجانے اور محبوب خدا کی آبرو پر فدا ہوجانے والے اِن خوش بختوں کو رب تعالیٰ اپنے دیدار سے مشرف فرماتا ہے۔"

اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ کے حاشیے ایسے ہی جانثاروں کے لہو سے گلرنگ ہیں جو اشارتاً اور کنایتاً بھی اپنے پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں معمولی سی توہین و تنقیص اک لمحے کیلئے بھی برداشت نہیں کرتے،اِن کا غیرت وحمیت سے سرشار خون کھول اٹھتا ہے،رگ و پے میں شرارے دوڑنے لگتے ہیں

اور وجود غیظ و غضب کی کڑکتی بجلیوں کا روپ دھار کر اُس وقت تک قرار نہیں پاتا جب تک کہ شاتم رسول کے ناپاک اور غلیظ وجود سے دھرتی کو پاک کرکے خود مرحلہ دارورسن طے نہیں کرلیتے، محافظان ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قافلہ شوق شہادت کل بھی جاری تھا اور آج بھی جاری وساری ہے۔

غازی ممتاز حسین قادری بھی اسی قافلہ شوق شہادت کا ایک مسافر ہے، جو مرحلہ دارورسن طے کرکے اپنا نام غازی مرید حسین، غازی عبدالرشید، غازی عبدالقیوم، غازی عبداللہ، غازی منظور حسین، غازی محمد صدیق، غازی عبدالمنان، غازی میاں محمد، غازی احمد دین، غازی معراج الدین، غازی فاروق احمد، غازی محمد اسحاق، غازی زاہد حسین، غازی عبدالرحمان، غازی حاجی محمد مانک اور غازی عامر چیمہ جیسے مجاہدوں کی فہرست میں لکھوانا چاہتا ہے، جنھوں نے راجپال، سوامی شردھانند، نتھورام، چنچل سنگھ، کھیم چند، پالامل، بھیشو، چرن داس، ویداسنگھ، ہردیال سنگھ، نعمت احمر قادیانی، عبدالحق قادیانی جیسے گستاخوں اور مرتدوں کو واصل جہنم کرکے اپنا نام شہیدان ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی تابناک فہرست میں درج کروایا، غازی ملک ممتاز حسین قادری نے اپنے قول وفعل سے یہ ثابت کردیا ہے کہ پاکستانی مسلمان بہت کچھ برداشت کرسکتے ہیں، لیکن کسی شاتمان رسول اور اُس کے حمایتوں کو کسی طور بھی برداشت نہیں کرسکتے۔

کیونکہ اُن کے نزدیک حضور ختمی المرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و ناموس پوری کائنات کا سرمایہ حیات ہے اور اِس قیمتی متاع کا تحفظ ہر مسلمان اپنی جان سے زیادہ ضروری سمجھتا ہے، دنیا بھر کے مسلمان بلا تفریق رنگ و نسل اور زبان و علاقہ اِس معاملہ میں بنیان مرصوص کی طرح ہیں، اُن کے ایمان کا تقاضہ اور دین اسلام کی یہی شرط اوّل ہے، یہی وجہ ہے کہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ والہانہ عشق کے تقاضے کے حوالے سے وہ ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے مسئلے میں انتہائی جذباتی نظر آتے ہیں اور آخر کیوں نہ ہوں، جب قانون نافذ کرنے والے ادارے اور حکومت اپنی ذمہ داری پوری نہ کریں، جمہوریت، آزادی اظہار اور اسلام دشمنوں کی خوشنودی کیلئے گستاخان رسول اور اُن کے سرپرستوں کی طرف داری کریں، انہیں کھلی چھوٹ دے دیں کہ وہ اپنی ناپاک اور گندی زبان سے شان اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں ہذیان بکتے پھریں تو پھر ایک سچا اور پکا مسلمان جو اپنے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم کے حرمت و ناموس پر مرمٹنے اور اُس کی خاطر دنیا کی ہر چیز قربان کرنے کو اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتا ہے، اُس کے پاس اِس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں بچتا کہ وہ خود ہی ایسے موذیوں کے ناپاک وجود سے دھرتی کو پاک کرے۔

غازی ممتاز قادری نے بھی یہی کیا، آج عدالت کہتی ہے کہ "کسی فرد واحد کو

اختیار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ کون مرتد اور غیر مسلم ہے اور نہ ہی کسی فرد کو یہ اجازت دی جا سکتی ہے کہ وہ لوگوں کو سزا دے کیونکہ اِس سے معاشرے میں انار کی کا راستہ ہموار ہوگا۔" لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عدالت، قانون اور ارباب اقتدار نے اپنی ذمہ داریاں پوری کیں، کیا پاکستان جیسے نظریاتی اور اسلامی ملک میں قانون تحفظ ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم 295 سی (جس کے تحت نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی پر سزائے موت دی جائے گی) کے مطابق گستاخان رسول کو قرار واقعی سزا دی، انہیں نشان عبرت بنایا، اگر نہیں تو پھر ظاہر ہے کہ غازی ممتاز قادری جیسے مجاہدوں اور عاشق رسولوں کو ہی یہ ذمہ ادا کرنی پڑے گی، یقیناً غازی ممتاز قادری نے وہی کیا جو ایک عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کرنا چاہیے تھا، ربّ کعبہ کی قسم ! کاتب وقت نے اُس کی روشن پیشانی پر لکھ دیا ہے کہ وہ اِس دنیا اور اُس دنیا دونوں میں کامیاب و کامران ہوا۔

اے یادگار عزتِ ناموس مصطفیٰ

کیا خوب انتخاب ہے تیری حیات کا

بدلہ لیا ہے دشمن احمد کا تو نے خوب

منظور کر چکا ہے شہادت تیری خدا

☆☆☆☆☆

نوٹ :اس مضمون کی تیاری میں متین خالد کی کتاب" شہیدان ناموس رسالت، ناموس رسالت کے خلاف امریکی سازشیں" اور ظفر جبار چشتی کی کتاب "پروانہ شمع رسالت" (سے مدد لی گئی ہے

گستاخانِ رسول آزاد مگر عاشقِ رسول کیلئے سزائے موت

بلآخر تقریباً آٹھ ماہ کی سماعت کے بعد یکم اکتوبر 2011ء کو راولپنڈی کی انسداد دہشتگردی کی خصوصی عدالت کے جج پرویز علی شاہ نے اڈیالہ جیل میں محافظ ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم غازی ملک ممتاز حسین قادری کو سابق گورنر پنجاب سلمان تاثیر کے مقدمہ قتل میں سزائے موت سناتے ہوئے کہا کہ " کہ کسی فرد واحد کو اختیار نہیں دیا جاسکتا کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ کون مرتد اور غیر مسلم ہے اور نہ ہی کسی فرد کو یہ اجازت دی جاسکتی ہے کہ وہ لوگوں کو سزا دے کیونکہ اِس سے معاشرے میں انارکی کا راستہ ہموار ہوگا، عدالت نے اپنے فیصلے میں یہ بھی کہا کہ ملزم کے اقدام نے عام لوگوں میں خوف وہراس پیدا کیا جو دہشتگردی کے زمرے میں آتا ہے اِس لیے ملزم کو انسداد دہشتگردی ایکٹ کی دفعہ 7 اور تعزیرات پاکستان کی دفعہ 302 کے تحت دوبار سزائے موت دی جاتی ہے، عدالت نے اپنے فیصلے میں کہا کہ انہیں دو لاکھ روپے بطور معاوضہ مقتول کے ورثاء کو ادا کرنا ہونگے، معاوضہ کی عدم ادائیگی کی صورت میں ممتاز قادری کو چھ ماہ قید بامشقت بھی کاٹنا ہوگی، عدالت نے اپنے فیصلے میں تسلیم کیا کہ گستاخ رسول کی سزا موت ہے، لیکن اِس کیلئے ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کا قانون موجود ہے، عدالت نے غازی ممتاز قادری کو سات یوم کے اندر سزائے موت کے خلاف اپیل کی اجازت بھی دی۔

سزائے موت کا فیصلہ سن کر غازی ممتاز حسین قادری نے خوشی سے نعرہ تکبیر بلند کیا اور مسکراتے ہوئے" الحمد اللہ رب العالمین " کے الفاظ ادا کئے، جبکہ ممتاز قادری کی اہلیہ نے اِس فیصلے کو انتہائی تحمل سے سنا اور کہا کہ میرے شوہر نے ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے جو قدم اٹھایا اُس پر میں فخر کرتی ہوں،اِس کے لئے ضرورت ہو تو میں اپنا دس ماہ کا بیٹا محمد علی بھی قربان کرنے کو تیار ہوں، ممتاز قادری کے والد نے فیصلہ سنتے ہی اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور کہا کہ میں ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اپنی ساری اولاد قربان کرنے کو تیار ہوں، غازی ممتاز قادری نے سزائے موت کے خلاف ہائیکورٹ میں اپیل دائر نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے، جبکہ غازی ممتاز قادری کے وکلاء اور علمائے کرام اپیل کا حق استعمال کرنے پر اصرار کر رہے ہیں، غازی ممتاز قادری کے وکیل ملک رفیق کا موقف ہے کہ ایک واقعہ میں کسی بھی ملزم کو دو مرتبہ سزائے موت نہیں دی جاسکتی،اُن کا کہنا ہے کہ اگرچہ عدالت نے غازی ممتاز قادری کے بیان کی بنیاد پر مقدمے کا فیصلہ سنایا ہے اور اُسے قتل کے الزام میں سزائے موت دی ہے،تاہم اِس کیس میں دہشت گردی کی دفعہ کے تحت کوئی ثبوت سامنے نہیں لائے گئے، غازی ممتاز قادری کے وکیل کا کہنا ہے کہ اِس مقدمے کی گزشتہ سماعت کے دوران یہ طے ہوا تھا کہ استغاثہ کے وکیل سیف الملوک کی جانب سے جمع کروائے گئے تحریری جواب پر وہ جواب الجواب

دلائل دیں گے لیکن ایسا نہیں کیا گیا، ملک رفیق کا یہ بھی کہنا ہے کہ پتہ نہیں متعلقہ عدالت کے جج پر کونسا دباؤ تھا جس کی بنا پر وہ ہفتے کے روز صبح آٹھ بجے ہی عدالت میں چلے گئے اور انہوں نے فوری فیصلہ بھی سنا دیا، انہوں نے عدالتی فیصلے کو جانبدارانہ قرار دیا، دوسری طرف غازی ممتاز قادری کے خاندان والوں نے انسداد دہشت گردی کی عدالت سے عجلت میں سنائی جانے والی سزا پر تحفظات کا اظہار کیا ہے، ممتاز قادری کے بھائی دلپذیر اعوان کا کہنا ہے کہ وہ انسداد دہشت گردی کی عدالت کے فیصلے کے خلاف کوئی اپیل نہیں کریں گے کیونکہ اُن کا بھائی اِس فیصلے سے بہت خوش ہے۔

واضح رہے کہ غازی ملک ممتاز حسین قادری کی سزائے موت کی بنیاد وہ بیان ہے جو اُس نے اسلام آباد کے ایک جوڈیشل مجسٹریٹ کے سامنے دیا تھا، جس میں انہوں نے سلمان تاثیر کو قتل کرنے کے اعتراف کرتے ہوئے اِسے اپنا ذاتی فعل قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ " میں نے 31 دسمبر 2010ء کو مسلم ٹاون میں ہونے والی ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کانفرنس سے متاثر ہو کر گورنر سلمان تاثیر کو واجب القتل مانتے ہوئے قتل کا ارادہ کیا، میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم میری قربانی قبول فرمائیں، مجھے کوئی افسوس نہیں ہے، بلکہ میں بہت خوش ہوں کہ اب گستاخان رسول کافی عرصہ اپنے مذموم عزائم سے باز رہیں گے، میری نظر میں سلمان تاثیر گستاخ رسول اور واجب القتل

تھا، کیونکہ اُس نے ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون کو کالا قانون کہا اور گستاخ رسول آسیہ مسیح کی حمایت ومعاونت کی، چنانچہ میں نے گورنر سلمان تاثیر کو واجب القتل مانتے ہوئے قتل کا ارادہ کیا اور قتل سے قبل اپنے پرس میں ایک چٹ ڈالی جس پر لکھا تھا کہ "گستاخ رسول کی سزا موت ہے" موت تو ایک دن آنی ہے تو پھر ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم پر جان قربان ہو جائے تو کیا کہنا۔" اِس میں شک نہیں کہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ 302 کے تحت قتل کی سزا، سزائے موت ہے اور قانون چونکہ لوگوں کے مذہبی جذبات کو اہمیت نہیں دیتا اِس لئے غازی ممتاز قادری کے لئے سزائے موت کا فیصلہ سنایا گیا، کیونکہ انہوں نے بڑی دلیری کے ساتھ عدالت کے روبرو اقرار کیا تھا کہ انہوں نے سلمان تاثیر کو قتل کرکے اپنا دینی فریضہ پورا کیا ہے۔

قارئین محترم ! غازی ممتاز قادری کے خلاف فیصلے نے عوام کے جذبات کو شدید ٹھیس پہنچائی ہے اور ملک بھر کے عوام اپنے جذبات کا بھرپور اظہار کر رہے ہیں، یہ بالکل ویسا ہی منظر نامہ ہے جیسے تقسیم سے پہلے گستاخ رسول راج پال کے زمانے میں تھا، جب غازی علم دین شہید کو ملنے والی سزا کی توثیق ایک انگریز جج نے کی تو متحدہ ہندوستان کے ہر شہر، قصبے، گاؤں اور کوچے کے لوگ سڑکوں پر آگئے تھے، آج وہی منظر نامہ اسلام کے نام پر حاصل کی گئی سرزمین پاکستان میں نظر آ رہا ہے، عدالتی فیصلہ آنے کے بعد غازی ممتاز قادری کے

ہزاروں حامیوں نے اڈیالہ جیل کے باہر جمع ہو کر عدالت اور حکومت کے خلاف زبردست نعرے بازی کی، فیصلہ آتے ہی ملک بھر میں مذہبی اور دینی جماعتوں کی جانب سے بھی احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے، تحریک ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے سربراہ اور جمعیت علماء پاکستان کے صدر صاحبزادہ ابو الخیر محمد زبیر نے لاہور میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اِس فیصلے کی مذمت کی، اُن کا کہنا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ناموس کے تحفظ کے لئے ہم کسی دنیاوی قانون کے پابند نہیں ہیں اور ہم اِس فیصلے کو شریعت کے منافی تصور کرتے ہیں، انہوں کہا کہ پوری قوم توقع کر رہی تھی کہ عدالت ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کو کالا قانون کہنے والے کے قتل پر اسلامی اصولوں کو مد نظر رکھ کر فیصلہ کرے گی، لیکن ایسا نہیں کیا گیا، اِس غیر شرعی فیصلے نے پورے پاکستان میں دین اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے والوں کو شدید صدمے سے دوچار کر دیا ہے، انہوں نے کہا کہ غازی ممتاز قادری کے دفاع کیلئے تحریک ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کا اجلاس طلب کیا جا رہا ہے، جس میں غازی ممتاز قادری کی سزائے موت کے خلاف ملک گیر تحریک چلانے کا فیصلہ کیا جائے گا، اسی طرح دیگر علماء، سیاسی و مذہبی جماعتوں اور تنظیموں کی جانب سے بھی اِس فیصلے خلاف 7 اکتوبر کو ملک بھر میں "یوم احتجاج" اور ملک گیر ہڑتال کا اعلان کیا گیا ہے۔

اُمر واقعہ یہ ہے کہ اِس فیصلے نے پاکستان میں نام نہاد مسلم حکمرانوں کے حقیقی چہروں کو بے نقاب کردیا ہے، ہمارے حکمرانوں میں اتنی بھی جرات نہیں تھی کہ وہ اِس مقدمے کی سماعت کھلی عدالت میں کرواتے، حالانکہ ممتاز حسین قادری نے سلمان تاثیر کو قتل کرنے کے بعد اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کردیا تھا،اِس مقدمے کی سماعت نہ صرف بند کمرے میں ہوئی بلکہ اِس کے لئے اڈیالہ جیل کا انتخاب کیا گیا، مقدمے کی سماعت کے طریقہ کار اور فیصلے پر اسی لیے تنقید اور تحفظات کا اظہار کیا گیا ہے کہ جتنی تیزی کے ساتھ سماعت کرکے فیصلہ سنایا گیا ہے،اُس کی مثال ہماری عدالتی تاریخ میں کم ہی ملتی ہے، یہاں یہ اُمر بھی قابل ذکر ہے کہ گورنر پنجاب سلمان تاثیر کے بارے میں انسداد دہشت گردی کی عدالت نے تسلیم کیا ہے کہ گستاخ رسول کی سزا موت ہے اور وہ واجب القتل ہے، لیکن عدالت نے اعتراف جرم کے باوجود غازی ممتاز حسین قادری کو دہشت گردی کا مجرم بھی قرار دیا، حالانکہ پورے ملک میں دہشت گردوں نے آگ لگائی ہوئی ہے، لیکن آج تک ایک بھی دہشت گردی کے مجرم کو سزا نہیں دی گئی، اسی طرح 900 کے قریب توہین رسالت کے کیس رجسٹرڈ ہونے کے باوجود آج تک کسی گستاخ رسول کو تختہ دار پر نہیں چڑھایا گیا، جبکہ ایمان اورحب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تقاضا پورا کرنے والے پاکستانی مسلمانوں کے ہیرو غازی ممتاز قادری کو انتہائی جلد بازی میں سزا سنادی گئی، درحقیقت انسداد دہشت گردی کی عدالت کا یہ فیصلہ اُس انگریزی عدالت سے بھی بدتر فیصلہ ہے جس نے

غازی علم دین کو سزائے موت دی تھی۔ویسے بھی پاکستان کی عدالتی اور قانونی تاریخ میں خصوصی عدالتوں اور انسداد دہشت گردی کی عدالت کے فیصلوں کو کبھی بھی اعتبار نہیں مل سکا،خود پیپلزپارٹی کی حکومت اور سابق وزیراعظم بے نظیر بھٹو اپنے خلاف انہی عدالتوں کے فیصلوں کو "کنگرو کورٹس" کے فیصلے قرار دے چکی ہیں۔

مگر آج سب سے زیادہ افسوس اِس بات کا ہے کہ ایسے مشتبہ اور حالات واقعات کے حقیقی تناظر کو نظرانداز کرکے دیئے جانے والے فیصلوں پر تبصرہ کرنے سے پیپلزپارٹی سمیت اکثر روشن خیال مغرب اور امریکہ نواز عناصر خاموش ہیں،اگر پیپلزپارٹی کی موجودہ حکومت امریکہ اور ویٹیکن کے دباؤ میں آکر قانون توہین رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتمے کے لیے متحرک نہ ہوتی تو یہ سانحہ پیش نہ آتا،اس لیے عدالت کے فاضل جج کا یہ تبصرہ ادھورا ہے کہ گستاخ رسول کی سزا موت ہے،وہ واجب القتل ہے،لیکن کسی بھی فرد کو خود سزا دینے کا اختیار نہیں،شاید فاضل جج یہ بھول گئے کہ جب اِس قانون کے خاتمے کے لیے تحریک چل رہی تھی اور سابق گورنر پنجاب اِس قانون کو سیاہ قانون قرار دے رہے تھے تو اُس وقت علمائے کرام اِس قانون کے حق میں یہی دلیل دے رہے تھے کہ اگر حکومت اِس قانون کو ختم کردے گی تو لوگ خود فیصلہ کریں گے،فاضل جج اِس اہم بات کو بھی نظرانداز کرگئے کہ ایمان و عقیدے سے تعلق رکھنے والے اُمور ہر چیز سے

بالاتر ہوتے ہیں، ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے اپنی جان تو کیا لوگ اپنے جگر گوشوں بھی قربان کردیتے ہیں، مگر پاکستان میں مغرب زدہ سیکولر اقلیت اور ذہنی غلام قیادت اِس بات کو سمجھنے سے قاصر ہے، حالانکہ حکمرانوں کو تو اسی وقت عبرت پکڑنی چاہیے تھی جب انہیں لاہور جیسے بڑے شہر میں سلمان تاثیر کی نماز جنازہ پڑھانے والا اور پڑھنے والا نہیں ملا، اب انھوں نے جلد بازی میں غازی ممتاز قادری کو سزائے موت دینے کا فیصلہ کیا ہے، مگر اُس نے تو پہلے ہی ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اپنی جان قربان کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے، تم اُسے تختہ دار پر لٹکا کر ختم کرنے نہیں بلکہ ہمیشہ کیلئے اَمر کرنے جارہے ہو۔

یقیناآنے والا کل شہیدانِ ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ میں ایک اور غازی کے اضافے پر نازاں ہوگا، کیونکہ غازی ممتاز قادری ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے تحفظ کے لئے غازی علم دین، غازی عبدالرشید اور غازی عبدالقیوم کا راہ اختیار کرکے اپنی منزل مراد کی جانب گامزن ہوچکا ہے، اب وہ زندہ رہے یا شہید ہوجائے، اُس نے عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مظاہرہ کرکے دنیا وآخرت دونوں جگہ سرخروئی حاصل کرلی ہے، آج غازی ممتاز قادری اِس اعزاز پر جہاں مسرور ونازاں ہے، وہیں فدائیان ختم نبوت اِس فیصلے سے سخت مضطرب اور دل گرفتہ ہیں اور اِسے مسترد کرتے ہوئے حکومت وقت اور عدالت

عالیہ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا شاتم رسول کی حمایت اور اُسے سزا سے معافی دلانے کا جرم زیادہ سنگین ہے یا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت کی خاطر اشتعال میں آ کر قتل جیسی واردات کا ارتکاب ؟ اپنے فیصلے میں فاضل جج نے بالواسطہ طور پر یہ تو تسلیم کیا کہ سلمان تاثیر توہین رسالت کے مرتکب ہوئے تھے۔مگر کیا فاضل عدالت اور ارباب اختیار نے اِس حوالے سے اپنی ذمہ داریاں ادا کیں ؟ کیا پاکستان جیسے نظریاتی اور اسلامی ملک میں قانون تحفظ ناموس رسالت 295 C کے مطابق کبھی کسی گستاخ رسول کو قرار واقعی سزا دی گئی۔اُسے نشان عبرت بنایا گیا؟ اگر نہیں تو پھر غازی ممتاز قادری جس نے مذہبی جذبات سے مغلوب ہو کر یہ ذمہ داری ادا کی۔تو کونسا جرم کیا؟ کیا اسلامی ملک کی عدالت تحفظ ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے دینی فریضہ کی ادائیگی پر ایک عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سزائے موت سناتی ہے؟ جب ریمنڈ ڈیوس جیسے تین بے گناہ پاکستانیوں کے قاتل اور مملکت کے دشمن کو ملک کے عمومی قانون کے ہوتے ہوئے اسلامی قانون دیت کا سہارا لے کر رہا کیا جا سکتا ہے تو پھر ممتاز قادری کے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟ اُسے کیوں قانون توہین رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کے باوجود۔برطانوی قانون کے مطابق سزا سنائی جاتی ہے؟ فدایان ختم نبوت سمجھتے ہیں کہ اگر ایسے ہی فیصلے کیے جاتے رہے تو ملک انار کی شکار ہو جائے گا۔کیونکہ مسلمان سب کچھ۔برداشت کر سکتے ہیں لیکن کسی کو گستاخ رسول یا اُس کے حمایتی کو اِس بات کی

اجازت نہیں دے سکتے کہ اُس کے ناپاک اور غلیظ ہاتھ عفت اور حرمت رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچیں۔

کسی ڈرے ہوئے ملک کی سہمی ہوئی آواز۔۔۔۔۔

آل پارٹیز کانفرنس ایک بے جان پیغام۔۔۔۔۔

دنیاکے امن کے ظاہری ٹھیکیدار امریکہ بہادر نے پوری دنیاکے امن کو کسی نہ کسی انداز میں خود ہی براہ راست یا بالراست تہہ وبالا کیا ہواہے، کہیں وہ خود ممالک پر غاصبانہ قبضہ کئے بیٹھا ہے تو کہیں اُس کے حواری اور غلام کٹھ پتلی حکمران عوام پر ظلم ڈھارہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ امریکہ کے خلاف مسلم دنیا، بالخصوص پاکستان اور ایران کی عوام میں شدید نفرت اور بے چینی پائی جاتی ہے، حالیہ دنوں میں امریکی مسلح افواج کے سربراہ مائیک مولن اور دیگر امریکی عہدیداروں کی جانب سے پاکستان پر لگائے جانے والے الزامات نے پاکستانی عوام کی نفرت میں مزیداضافہ کردیاہے، جس کے باعث وزیراعظم یوسف رضاگیلانی نے 29 ستمبر کو ملک بھر کی سیاسی جماعتوں سے مشاورت کے بعد اسلام آباد میں کل جماعتی کانفرنس کاانعقادکیا، اور وزیراعظم کی دعوت پر منعقد ہونے والی کل جماعتی قومی کانفرنس ایک متفقہ قرارداد کی منظوری کے بعد مکمل ہوگئی، گیارہ گھنٹے طوالت پر مبنی یہ کانفرنس اِس لحاظ سے کامیاب رہی کہ میزبان مختلف الخیال سیاسی جماعتوں کے قائدین سے ایک متفقہ قرار

داد منظور کرانے میں کامیاب ہوگئے، لیکن اِس کامیابی کا اعزاز بھی سیاسی جماعتوں کے قائدین کو ہی جاتا ہے جو بہت سے اُمور پر اختلاف رائے رکھنے کے باوجود اِس بات پر ہمیشہ متفق اور یکجا رہے کہ جب بھی پاکستان کو سلامتی کے حوالے سے کوئی نازک معاملہ درپیش ہوا تو یہ سیاسی قائدین اور جماعتوں نے ہمیشہ متفقہ موقف اختیار کیا، سوائے اِس ایک بات کے ہمیں وزیراعظم کی آل پارٹیز کانفرنس میں اور کوئی نئی بات نہیں نظر آئی، ہاں یہ کہنا کہ "پاکستان پر دہشت گردی ایکسپورٹ کے الزام کو غلط ہے، ہم غیر ملکی فوجی آپریشن کی اجازت نہیں دیں گے، یا پاکستان کی خودمختاری اور علاقائی سالمیت کا دفاع کیا جائے گا۔" یہ باتیں تو حکومت ہمیشہ ہی کہتی رہی ہے، جبکہ حکومت سے باہر سیاسی جماعتیں یہ مطالبہ بھی کرتی رہی ہیں کہ حکومت اکتوبر 2008ء سمیت پارلیمنٹ کی متفقہ قراردادوں پر عمل کرے، مگر حکومت نے اِس مطالبے کو ہمیشہ صرف نظر کیا، اب وزیراعظم کی زیر سربراہی اے، پی، سی میں ایک بار پھر یہی باتیں دہرائی گئی ہیں۔

طرفہ تماشا یہ ہے کہ اے، پی، سی کے متفقہ موقف کے باوجود امریکہ کی رَٹ اب بھی وہی ہے، گذشتہ دنوں سی آئی اے کے سربراہ نے بریفنگ دیتے ہوئے ایک بار پھر کہا کہ امریکہ کو کسی علاقے میں آپریشن کیلئے ڈکٹیشن کی ضرورت نہیں ہے، اصل سوال تو یہی ہے کہ امریکی ایماء پر پاکستان کے مختلف علاقوں میں

آپریشن کیوں کیا جارہا تھا اور مزید آپریشن کیلئے زور کیوں دیا جارہا ہے، ہمارے وزیراعظم صاحب فرماتے ہیں کہ پاکستان پر ڈو مور کیلئے دباؤ نہیں ڈالا جاسکتا، مگر امریکی انتظامیہ کے بیانات کچھ اور ہی کہانی بیان کرتے ہیں، میاں نواز شریف نے دال میں کچھ کالا کہہ کر اِس میں مزید معنی خیزی پیدا کردی ہے، حیرت ہے کہ اِس کے باوجود اے، پی، سی کے اعلامیے میں یہ درخواست کی گئی ہے کہ پاکستان کے قومی مفادات کا احترام کیا جائے، جبکہ قوم کے سامنے اصل معاملے یعنی "حقانی نیٹ ورک اور دہشت گردی ایکسپورٹ کے حوالے سے ہونی والی کوئی بات سامنے نہیں آئی، ایسا لگتا ہے کہ اِس حوالے سے کوئی بات ہوئی ہی نہیں، یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ ڈو مور کے یہ سارے مطالبات کس وجہ سے ہو رہے ہیں، حقائق جو بھی ہوں، بہر حال اصل معاملہ امریکی دہشت گردی کی نام نہاد جنگ ہے، نائین الیون کے بعد جب سے پاکستان اِس جنگ کا حصہ بنا ہے، اُس وقت سے یہ ساری مصیبتیں پاکستان پر نازل ہو رہی ہیں، بلاشبہ امریکہ کے ساتھ دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ کی حمایت کرکے پاکستان کچھ بھی حاصل نہ کرسکا، آج پاکستان کی معیشت روبہ زوال ہے، توانائی کا قحط پڑگیا ہے، عوام بھوکوں مر رہے ہیں، غربت وافلاس، بے روزگاری اور بدامنی نے ہمارا گھر دیکھ لیا ہے، تخریب کاری اور دہشت گردی روز مرہ کا معمول بن گئی ہے اور ہمارا معاشرتی ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کا شکار ہے۔

دوسری طرف ملکی خودمختاری، آزادی اور استحکام کو بھی شدید خطرات لاحق ہوگئے ہیں، ہر سطح پر شدید عدم تحفظ برپا ہوگیا ہے اور پوری قوم بے یقینی اور ناامیدی کی دلدل میں جاگری ہے، ہمارے اِن تمام تر حالات کی بنیادی وجہ خطے میں بین الاقوامی طاقتوں کی مداخلت، امریکی اور نیٹو افواج کے فوجی اڈوں کا قیام، طاقت کا غلط استعمال اور وہ خوفناک پالیسیاں ہیں، جن کی بناء پر خطے میں عدم استحکام پیدا ہوا، دس سال کا طویل عرصہ گزرنے کے باوجود امریکہ جنگ کے مطلوبہ اہداف تک رسائی میں ناکام ہے تو اِس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ جنگ کسی مقصد کے بغیر مسلط کی گئی، اگر اسامہ بن لادن سمیت چند ہزار افراد کی گرفتاری یا قتل اِس جنگ کا مقصد تھا تو بھی امریکہ کو کامیاب قرار نہیں دیا جاسکتا، اِس لیے امریکہ کی پریشانی میں بظاہر کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، دس سال کے دوران پوری قوت استعمال کرنے کے باوجود امریکہ افغان حریت پسندوں کے خاتمے سے عاجز آگیا اور اُسے مذاکرات کا دروازہ کھولنا ہی پڑا، یہ وہ حقیقت ہے جو پاکستان کا بچہ بچہ جانتا ہے، پھر بھی کہ آل پارٹیز کانفرنس میں اِس اہم مسئلہ کو نہیں چھیڑا گیا، نہ ہی اِس حوالے سے کوئی خبر جاری گی گئی، جو اعلامیہ جاری کیا گیا وہ نہایت ہی نرم، مبہم اور حکومت کی خواہشات کا عکاس معلوم ہوتا ہے، تعجب خیز اَمر ہے کہ وہ جماعتیں جو اِس حوالے سے مختلف موقف رکھتی ہیں اور ہر موقع پر یہ مطالبہ کرتی رہی ہیں کہ پاکستان امریکی جنگ سے الگ ہوجائے اور امریکی مداخلت ختم کی جائے، مگر کانفرنس کے اعلامیے کو دیکھتے

ہوئے تو یہی لگتا ہے کہ اِن جماعتوں نے یا تو خاموشی اختیار کی یا پھر اپنا موقف ہی تبدیل کرلیا ہے، حالانکہ موجودہ حالات میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آل پارٹیز کانفرنس کا واحد اور فیصلہ کن مطالبہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ سب سے پہلے پاکستان امریکی جنگ سے الگ ہونے کا اعلان کرے اور امریکی ایجنسیوں افواج اور حلیفوں کو ملک سے نکالا جائے، مگر افسوس ایسا نہیں کیا گیا، حالانکہ اِس حقیقت سے سب آشنا ہیں کہ عسکریت پسند افغانستان سے پاکستان منتقل نہیں ہورہے بلکہ امریکی عسکریت پسند افغانستان میں شکست کے بعد نیا ٹھکانہ ڈھونڈ رہے ہیں اور وہ حقانی نیٹ ورک کی آڑ میں پاکستان منتقل ہونا چاہتے ہیں، دوسری طرف جس حقانی نیٹ ورک کے نام پاکستان سے تعلقات خراب کیے جارہے ہیں، پاکستانی فوج اور آئی ایس آئی کو بدمعاش ثابت کیا جارہا ہے، امریکہ نے اب تک اُس کو دہشت گرد قرار نہیں دیا، صرف امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن کے اتنا کہہ دینے سے کہ "ہم حقانی نیٹ ورک کو دہشت گرد قرار دینے کے فیصلے کے قریب پہنچ چکے ہیں" معاملہ اِس لیے صاف نہیں ہوتا، کہ اگر حقانی نیٹ ورک دہشت گرد نہیں ہے تو پھر اُس کی خاطر پاکستان کو دھمکیاں کیوں دی جارہی ہے، کیوں پاکستان کے خلاف بھانت بھانت کے الزامات لگائے جارہے ہیں، لہٰذا اِس تناظر میں اے، پی، سی کا اعلامیہ بے معنی اور غیر اہم معلوم ہوتا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ آل پارٹیز کانفرنس کے ایجنڈا کو مختلف حلقے حالات کی

نزاکت کے مطابق عوامی جذبات اور خواہشات کا عکاس اور ملکی بقاء کے عین مطابق قرار نہیں دے رہے،اِس کانفرنس میں وزیراعظم سید یوسف رضا گیلانی اور آئی ایس آئی کے چیف احمد شجاع پاشا دونوں کے بیانات میں واضح یکسانیت نظر آتی تھی، چیف آف آرمی سٹاف جنرل اشفاق پرویز کیانی نے کانفرنس میں کہا کہ امریکی دھمکیوں سے نمٹنے کیلئے سیاسی جماعتوں کی حمایت کی ضرورت تھی، جو میسر آ گئی لیکن دوسری طرف سیاسی مبصرین حیران ہیں کہ سیاسی جماعتوں نے کئی گھنٹے تک جاری رہنے والی کانفرنس میں سفارت کارانہ زبان استعمال کی حالانکہ آل پارٹیز کانفرنس قومی جذبات اور قومی تقاضوں کو پورا کرنے کے اعلامیہ کی متقاضی تھی، گو متفقہ اعلامیہ میں کہا گیا ہے کہ ملکی خود مختاری پر سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا، وزیراعظم گیلانی نے بھی کہا ہے کہ مزید "ڈو مور" نہیں چلے گی، جارحیت کا منہ توڑ جواب دیا جائے گا، قوم سیسہ پلائی دیوار ثابت ہوگی، لیکن جو حکمران اپنی قرارداد میں امریکہ کا نام لے کر اُس کے جارحانہ عزائم کی مذمت نہیں کر سکتے وہ اِن دعووں کو کس قدر عملی جامہ پہنا سکتے ہیں، عوام خوب واقف ہیں، دراصل محترم وزیراعظم صاحب کی یہ باتیں وہی ہیں جو ہمارے حکمران ایک عرصے سے کرتے چلے آئے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ عزم حوصلے اور عملی اظہار سے محروم یہ دعوئے صرف اُن کے جذبات کو تسلی دینے کیلئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرارداد میں کہی گئی بات کہ "حقانی گروپ افغانستان میں متحرک ہے پاکستان میں نہیں" کے جواب میں ہلیری نے مزید دھمکی دی کہ پاکستان

سے مضبوط بنیادوں پر تعلقات میں بہتری چاہتے ہیں، مگر دہشت گردوں کی محفوظ پناہ گاہیں پاکستان ختم کرے، دہشت گردی کے خلاف جنگ سمیت ہمارے کئی معاملات پر مفادات مشترکہ ہیں، خیال رہے کہ اِس سے قبل مائیک مولن بھی واضح کر چکے ہیں کہ پاکستان اور امریکہ کے تعلقات کم ترین سطح پر پہنچ چکے ہیں جن میں بہتری کی توقع نہیں، مگر کانفرنس میں سیاسی لیڈروں نے اعلامیہ کی صورت میں جو زبان استعمال کی، وہ اِس لحاظ سے زیادہ خوش آئند نہیں کہ اِس میں وہ جذبہ دکھائی نہیں دیا جو وزیراعظم کے افتتاحی خطاب اور آئی ایس آئی چیف کی بریفنگ میں تھا، یوں لگتا ہے کہ اعلامیہ خدا سے زیادہ امریکی طاقت سے خوفردہ کسی ڈرے ہوئے ملک کی سہمی ہوئی آواز ہے، اِسی وجہ سے تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ اے، پی، سی نشتند، گفتند، برخاستند سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے، رہی بات "امن کو موقع دو" کے رہنما پالیسی اصول کی، جس کا مشترکہ اعلامیہ میں اعلان کیا گیا، یقیناً اچھی بات ہے، مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یک طرفہ امن کی خواہش کبھی بھی پروان نہیں چڑھائی جاسکتی، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ دبی دبی زبان میں ڈومور تسلیم کرنے کی گنجائش رکھ ابھی پرانی تنخواہ پر امریکی نوکری جاری رہے گی۔

آج تبصرہ نگاری اردو ادب و زبان میں ایک مستقل صنف اور فن کی شکل اختیار کر چکی ہے۔امر واقعہ یہ ہے کہ جب سے اردو رسائل و جرائد کا آغاز ہوا،اُس وقت سے نئی مطبوعات اور قدیم کتابوں پر تبصرہ و تعارف کی روایت بھی قائم ہوئی۔جسے اردو کے ہر معتبر رسالے اور مجلّہ نے آج تک برقرار رکھا ہوا ہے۔اِن رسائل و جرائد میں تعارف و تبصرے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قارئین کو مفید معلوماتی اور نئے نئے موضوعات پر چھپنے والی کتب و رسائل کا تعارف پہنچایا جائے۔اردو میں تبصرہ نگاری کا ایک اہم جزو یہ ہے کہ کتاب کے موضوع، مندرجات اور خوبیوں کے ساتھ ساتھ کمزوریوں کی بھی وضاحت کی جائے اور روشن پہلوؤں کے ساتھ تاریک خانوں کی بھی نشاندہی کی جائے۔اردو ادب میں تبصرہ نگاری کے میدان میں بابائے اردو مولوی عبدالحق، مولانا ابوالکلام آزاد،علامہ نیاز فتح پوری، ماہر القادری، سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریا آبادی، مولانا ابوالجلال اور شاہ معین الدین کے نام سرفہرست ہیں۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کہتے ہیں کہ "کسی کتاب پر تحریری شکل میں مختصر یا طویل اظہار رائے کا نام تبصرہ نگاری ہے۔دوسرے الفاظ میں کسی کتاب کے

مندرجات، اُس کی علمی وادبی نوعیت، افادیت واہمیت، مشمولات کی صحت یا عدم صحت، اُس کا علمی وادبی معیار اور اُس کی مجموعی قدر و قیمت کا ایک مضمون کی شکل میں تعین اُس کتاب پر تبصرہ کہلاتا ہے، جسے ریویو Review کرنا بھی کہتے ہیں، تبصرہ نگاری تنقید اور مضمون نویسی ہی کی ایک شکل ہے،اِس اعتبار سے یہ کوئی الگ صنف نثر نہیں ہے، تاہم دور حاضر میں تبصرہ نگاری کو بڑی اہمیت حاصل ہے، کسی کتاب کی مقبولیت میں اُس پر چھپنے والے تبصرے کو خاصا دخل حاصل ہوتا ہے، تبصرہ مصنف کو حوصلہ بخشتا ہے اور اُسے سوچ کے نئے زاویئے عطا کرتا ہے اور اُسے اپنی تخلیق پر نظرثانی کا مشورہ بھی دیتا ہے، تبصرہ نگاری کی اسی اہمیت کے پیش نظر ہر قابل ذکر علمی، تحقیقی اور ادبی رسالہ اپنے چند صفحات تبصروں کیلئے مخصوص کرتا ہے اور اہم کتابوں پر معروف اہل قلم سے تبصرے لکھوا کر شائع کرتا ہے۔"

مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ "ریویو کوئی آسان چیز نہیں،کامیاب تبصرہ نگاری کیلئے ضروری ہے کہ تبصرہ نگار کا مطالعہ وسیع ہو، خصوصاً وہ زیر تبصرہ کتاب کے موضوع سے ہمہ پہلو واقفت رکھنے کے ساتھ تنقیدی بصیرت بھی رکھتا ہو اور کامل غیر جانب داری کے ساتھ معروضی نقطہ نظر سے کتاب کے متعلق اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کرے،اچھے مبصر بعض اوقات کتاب کے ساتھ کتاب کے مندرجات کا اجمالی تعارف کراتے ہیں، مصنف کے پیش کردہ نکات کی نشاندہی بھی کرتے ہیں

اور بتاتے ہیں کہ زیر تبصرہ کتاب اسی موضوع پر موجود دیگر کتابوں میں کس اعتبار سے "خوشگوار اضافے کی حیثیت رکھتی ہے، یا محض اُس میں گھسی پٹی باتوں کا اعادہ ہے۔

پروفیسر سید شبیر حسین شاہ زاہد کی تبصرہ نگاری ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی بیان کردہ تعریف اور مولانا شبلی نعمانی کے وضع کردہ اصول و قوائد پر سو فیصدی پورا اترتی ہے، پروفیسر صاحب علم دوست اور قلم قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں، موصوف گورنمنٹ کالج ننکانہ صاحب میں اسلامی تعلیمات کے استاد اور عربی و تاریخ میں ڈگری ہولڈر ہیں، اُن کی عربی اور اسلامیات کے علاوہ اردو اور فارسی زبان و ادب پر بھی گہری ہے، شاہ صاحب نہ صرف ایک استاد بلکہ مذہبی اسکالر، خطیب، ادیب و محقق اور غضب کے مبصر بھی ہیں، علم و ادب آپ کا اوڑھنا بچھونا ہے، اب تک آپ کی "عقیدہ ختم نبوت اور حضرت مجدد الف ثانی"، "تجلیات سیرت النبی"، "انسائیکلو پیڈیا تعلیمات اسلام"، "مطالعہ تعلیمات اسلام" سمیت مختلف موضوعات پر 13 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

زیر نظر کتاب "تعارف و تبصرہ کارہائے قلم" آپ کے خطوط، مضامین، کتب و رسائل پر تبصروں اور تحقیقی و تنقیدی آراء کا ایسا مجموعہ ہے جو وسیع معلومات اور حیرت انگیز قوت حافظہ کا مظہر ہے، جس طرح ایک سائنسدان اپنے کام کو

تجربات، مشاہدات اور نتائج میں تقسیم کرتا ہے، بالکل اُسی طرح شاہ صاحب نے یہ تبصرے جدید سائنسی انداز میں سپرد قلم کیے ہیں، شاہ صاحب اپنے کام کو تین مرحلوں میں تقسیم کرتے ہیں، اوّل: مطالعہ و تعارف، دوم: مشاہدات و محاسن اور سوم: نقطہ نظر اور تجاویز، کسی کتاب یا رسالے پر تبصرے سے قبل شاہ صاحب پہلے عمیق مطالعہ کرتے ہیں، پھر اُسے تجزیاتی میز پر سجا کر نتیجہ اخذ کرتے ہیں اور نہایت دیانتداری سے صفحہ قرطاس کی زینت بنا کر قارئین کے سامنے پیش کر دیتے ہیں، آپ کے یہ تبصرے بے لاگ، غیر متعصبانہ، متوازن اور علمی استدلال کا ایسا رنگ لیے ہوئے ہیں جن کا مطالعہ ایک قاری کو علمی اور فکری دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔

شاہ صاحب نے زیر نظر کتاب "تعارف و تبصرہ کارہائے قلم" میں اسی اصول کو زاد راہ بنایا ہے، آپ کے تمام تعارف و تبصرے تحسینی، تنقیدی، اصلاحی اور تسامحات و فرو گزاشتوں کی صدق دل سے نشاندہی کرتے ہیں اور واقعتاً غیر جانبداری کے مظہر ہیں، شاہ صاحب نے اپنے تبصروں میں اِس بات کا خاص اہتمام کیا ہے کہ کسی فرد، ادارے، مسلک اور انجمن کو ہدف تنقید نہ بنایا جائے اور ساری گفتگو علمی، تحقیقی، حوالہ جاتی، دینی وادبی اور اخلاقی پہلوؤ_ں کو مد نظر رکھ کر کی جائے، اِس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ کی کتاب "تعارف و تبصرہ کارہائے قلم" محض تعارف و تبصرہ ہی نہیں بلکہ ایک مکمل اور بھرپور علمی و تحقیقی

جائزہ بھی ہے،اس جائزے میں آپ تعریف و توصیف، تنقید و آراء کے ساتھ ایسے فنی
مشورے بھی دیتے ہیں، جن پر عمل کرکے کتاب کے آئندہ آنے والے ایڈیشن کو مزید
بہتر اور خوبصورت بنایا جاسکتا،زیر نظر کتاب "تعارف و تبصرہ کارہائے قلم" اردو اور
پنجابی میں 73 مختلف کتب و رسائل پرپُر مغز تبصروں سے مزین ہے، جبکہ کتاب کے آخر
میں شامل 3 انگلش تبصرے شاہ صاحب کی انگریزی زبان و قواعد پر دسترس کے آئینہ
دار ہیں، عمدہ جلد اور خوبصورت ٹائٹل سے مزین یہ کتاب اپنے علمی،ادبی اور بے حد
معلوماتی تعارف تبصروں کی وجہ سے ایک قاری کے قلب و نظر اور علم و دانش کو جلا
بخشتی ہے،نو سو چورانوے صفحات کی یہ کتاب گوشہ_ محققین، ننکانہ صاحب سے فون نمبر
پر رابطہ کرکے حاصل کی جاسکتی ہے۔ 3014360919

عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے لرزتے ستون

اب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ ۔۔۔۔۔

وکی پیڈیا کے مطابق ”سرمایہ دارانہ نظام یا کیپٹل ازم سے مراد ایک معاشی و معاشرتی نظام ہے جس میں سرمایہ بطور عاملِ پیدائش نجی شعبہ کے اختیار میں ہوتا ہے۔اشتراکی نظام کے برعکس سرمایہ دارانہ نظام میں نجی شعبہ کی ترقی معکوس نہیں ہوتی بلکہ سرمایہ داروں کی ملکیت میں سرمایہ کا ارتکاز ہوتا ہے۔اِس نظام میں امیر امیر تر ہوتا چلا جاتا ہے۔“ اگرچہ سرمایہ دارانہ نظام نظریاتی طور پر ایک آزاد منڈی کا تصور پیش کرتا ہے مگر حقیقتاً منڈی کبھی بھی مکمل طور پر آزاد نہیں ہوتی۔اِسی طرح جملہ حقوق، منافع خوری اور نجی ملکیت اِس نظام کی وہ خصوصیات ہیں جس سے سرمایہ دارانہ نظام کے مخالفین کے مطابق غریبوں کا خون چوسا جاتا ہے۔آج جدید دانشوروں کا خیال ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہا ہے اور ایک متبادل نظام کی آوازیں شدت سے اٹھنا شروع ہو گئیں ہیں۔اِس کی تازہ مثال 17 ستمبر سے شروع ہونے والی وال اسٹریٹ پر قبضہ کرو تحریک ہے۔ایک ماہ قبل نیویارک میں معیشت کے مرکز وال اسٹریٹ سے شروع ہونے والا احتجاج آج دنیا کے پانچ براعظموں تک پھیل چکا

ہے، جبکہ امریکہ کے 90 شہر اِس احتجاجی تحریک کی لپیٹ میں ہیں، دوسری جانب برطانیہ، جرمنی، یونان، سپین، پرتگال، آئرلینڈ، اٹلی، جاپان، جنوبی کوریا، ہانگ کانگ، ملائیشیا، تائیوان، نیوزی لینڈ، آسٹریلیا اور کینیڈا سمیت دنیا کے 82 ممالک کے 951 شہروں میں لاکھوں افراد "ہم عالمی تبدیلی چاہتے ہیں" کے نعرے لگاتے ہوئے ریلیوں، دھرنوں اور مظاہروں کی صورت میں سڑکوں پر احتجاج کرتے نظر آ رہے ہیں، لوگ سرمایہ دارانہ نظام، غربت، عدم مساوات، نسلی امتیاز، جوہری توانائی سمیت دیگر سماجی خرابیوں کے خلاف سڑکوں پر مورچہ زن ہیں۔

مظاہرین کا کہنا ہے کہ امیر، غریب اور متوسط طبقے کے درمیان فرق بڑھتا جا رہا ہے، جبکہ سڈنی، میکسیکو، چلی، ارجنٹینا، ایتھنز، برلن، ٹوکیو اور ہانگ کانگ میں بھی ہزاروں افراد نے مظاہروں میں حصہ لیا، عالمی امن اور حقوق انسانی کے نام نہاد ٹھیکدار امریکہ میں یہ تحریک اب پرتشدد مظاہروں کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے اور حکومتی کریک ڈاؤن اور سینکڑوں افراد کی گرفتاریوں کے باوجود اِس تحریک کے بھڑکتے شعلے وائٹ ہاوس کی جانب لپکتے نظر آ رہے ہیں، جبکہ اٹلی کے دارالحکومت روم میں احتجاج نے ہنگاموں کی شکل اختیار کر لی ہے، روم کی گلیاں میدان جنگ کا منظر پیش کر رہی ہیں، دوسری جانب اعظم ایشیا، یورپ، شمالی امریکہ، افریقہ اور آسٹریلیا میں لاکھوں افراد نے سڑکوں پر آ کر معاشی ناہمواریوں، عدم مساوات اور جنگ و جدل پر مبنی امریکی پالیسی کے

خلاف آواز بلند کرتے ہوئے وال اسٹریٹ تحریک کے شرکاء کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کررہے ہیں، کینیڈاکے مختلف شہروں میں بھی کارپوریٹس کے خلاف یکجہتی کا مظاہرہ کیا گیا،ملائیشیاکے لوگ بھی سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف اکٹھے ہوگئے ہیں، جبکہ پرتگال کے دارالحکومت لزبن میں 50 ہزار سے زائد افراد آئی ایم ایف اور یورپی یونین کے بچت پروگرام کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے، یہ لوگ اپنی اِس تحریک کو انٹرنیٹ پر ٹوئٹر اور فیس بک سمیت سماجی رابطوں کی دیگر سائٹس کے ذریعے بھی منظم کررہے ہیں، تحریک کے منتظمین نے ایک ویب سائٹ پر جاری پیغام جاری میں کہاہے کہ ہمارے احتجاج کا مقصد اِس عالمگیر تبدیلی کی بنیاد رکھنا ہے جو ہم چاہتے ہیں۔

آج دنیا بھر میں جاری اِن احتجاجی مظاہروں سے سامراجی استحصالی نظام اور یہودیت کے زیر اثر امریکی جنگی جنونی پالیسیوں کے خلاف ایک ایسا عالمی انقلاب ابھرتا ہوا نظر آرہا ہے جو سرمایہ داری کی بنیاد پر استوار کیے گئے اِس نظام اوراِس کے پیروکاروں سمیت اقتصادی اور سماجی ناہمواریوں کا باعث بننے والی ہر چیز کو خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے جانے کیلئے بے تاب ہے، طوفانی بگولے کی شکل اختیار کرتی تحریک کا ابھرتا ہوا منظر نامہ عرب ممالک میں امریکی سرپرستی میں پروان چڑھنے والی تحریکوں کو بھی مات دیتا نظر آرہاہے،اَمر واقعہ یہ ہے کہ عالمی کساد بازاری کی حالیہ لہرکے نتیجے

میں لاکھوں افراد کے بے روزگار ہونے کے بعد متبادل عالمی مالیاتی نظام کے لئے آوازیں
اِس بار جتنی شدت سے اٹھنا شروع ہوئی ہیں، اُس کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی۔
اِس بار یہ آوازیں کسی مسلم یا سوشلسٹ معاشرے سے نہیں بلکہ سرمایہ داری اور مغربی
تہذیبی مراکز سے ابھر رہی ہیں اور یہ ابھرتی ہوئی آوازیں لفظ عالمگیریت کے حجاب کو
استعمال کرنے کے بجائے براہ راست صورتحال کا ذمہ دار عالمی سرمایہ دارانہ نظام کو
قرار دیتے ہوئے اِس کے خاتمے کا مطالبہ کررہی ہیں، حتیٰ کہ مین ہٹن، نیویارک کی "وال
اسٹریٹ" جہاں سے بوڑروا طبقے نے دنیا کو عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے شکنجے میں کسنے کا
آغاز کیا تھا، میں بھی سینکڑوں افراد نے کساد بازی کی لہر اور امریکہ میں لاکھوں افراد کی
بے روزگاری کا ذمہ دار سرمایہ دارانہ نظام میں مضمر خرابیوں کو قرار دیا ہے، اِن سب
کی زبان پر ایک ہی شکایت ہے کہ حکومت نے بینکوں کو بھرپور منافع کمانے کا موقع دیا
جس سے بے روزگاری بڑھی، روز بروز بڑھتے ہوئے مظاہروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ
امریکہ میں طبقاتی کشمکش نے اتنی شدت اختیار کرلی ہے کہ اِس سے خانہ جنگی کے
خدشات بڑھ گئے ہیں۔

اِس صورتحال کو دیکھتے ہوئے سابق امریکی صدر جمی کارٹر کہتے ہیں کہ "مجھے بہت زیادہ
تشویش اِس بات کی ہے کہ امریکہ کس سمت جا رہا ہے، وہ کہتے ہیں کہ موجودہ دور
امریکہ کا تاریخ میں انتہائی خراب دور ہے کہ عراق اور

افغانستان میں اتنی زیادہ رقم خرچ کی گئی جس سے امریکیوں کا معیار زندگی مسلسل گرتا جارہا ہے، جمی کارٹر کہتے ہیں کہ امریکہ ایران سے تو یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ وہ ایٹمی ہتھیار بنا رہا ہے، لیکن اِس کے بر عکس خود امریکہ کے پاس 70 ہزار ہتھیار ہیں، جمی کارٹر کا خیال ہے کہ امریکہ نے سفارت کاری کی جگہ تشدد بندوق اور گولی کا راستہ اختیار کیا ہوا ہے۔"امریکہ میں آج معاشی ناہمواری کا یہ عالم ہے کہ ملک کی 40 فیصد دولت ایک فیصد آبادی والے طبقے کے ہاتھ میں مرکوز ہو کر رہ گئی ہے، طرفہ تماشہ دیکھئے کہ غربت کے باعث انتہا پسندی کے جنم لینے کی پھبتی کسنے والا امریکہ آج خود اِسی مرض میں مبتلا نظر آرہا ہے، حالانکہ اُس نے اپنے معاشرے میں طبقاتی استحصال سے عوام کی توجہ ہٹانے کیلئے بیسویں صدی کے چار عشروں تک اُن کے سامنے سوویت یونین کا ہوا کھڑا کئے رکھا اور سوویت یونین کے خاتمے کے بعد اسلامی بنیاد پرستی، عسکریت پسندی اور انتہا پسندی کو مغربی تہذیب کیلئے خطرہ قرار دے کر انہیں جنگی جنون میں مبتلا کر دیا، مگر یہودی ساہوکاروں کی سودی رقم پر پلنے والے صلیبی قزاقوں اور لٹیروں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ انھوں نے افغانستان کے قدرتی وسائل کی لوٹ کھسوٹ سے جتنی دولت کمانے کا منصوبہ بنایا تھا اُس سے کہیں زیادہ رقم انہیں اِس لاحاصل جنگ پر صرف کرنا پڑے گی اور وہ خسارے میں رہیں گے۔

آج بین اقوامی تعلقات عامہ اور سیاسیات کے ماہرین امریکہ کی نام نہاد دہشت گردی اور انتہا پسندی کی جنگ کی بہت ساری وجوہات بیان کرتے ہیں جس میں مغربی ممالک کی مسلم دشمنی، اسلام اور سوشلزم سے خائف ہونا، غربت، وسطی ایشیائی ریاستوں کے 5 کھرب ڈالر کے قدرتی وسائل کو لوٹنے کی کوشش اور روس کے زوال کے بعد امریکہ کا پورے علاقے کا داداگیر بننا شامل ہے۔ مگر اِس کے علاوہ بھی بعض وجوہات ایسی ہیں جس کی وجہ سے امریکہ دہشت گردی اور انتہاپسندی کی جنگ کی طرف مائل ہے۔ جس میں دنیا کے مختلف علاقوں میں کشیدگی اور جنگی کیفیت پیدا کرکے اسلحہ بیچنا اور انحطاط و زوال پذیر سرمایہ دارانہ نظام کا تحفظ کرنا بھی شامل ہے۔ آج کل پوری دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام زوال پذیر ہے امریکہ اور اُس کے اتحادی مغربی ممالک اور دنیا کی 600 ملٹی نیشنل کمپنیوں کے پاس دنیا کی 60 فیصد اقتصادیات ہے۔ اُن کی پوری کوشش ہے کہ دولت کی غیر مساویانہ تقسیم پر مبنی اِس سامراجی نظام کو ہر حالت میں بچایا جائے۔ امریکہ اور اُس کے اتحادی یورپی ممالک چاہتے ہیں کہ اس آمرانہ سرمایہ دارانہ نظام کو ریاستوں اور ممالک کو آپس میں الجھا کر اور لڑا کر زندہ رکھا جائے۔ اگر ان تمام عوامل کو مد نظر رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام، سوشلزم اور کمیونزم کے خلاف دہشت گردی اور انتہا پسندی کی نام نہاد جنگ کی شکل میں برسرپیکار ہے، مگر امریکی مالیاتی بحران کے زلزلے نے پوری دنیا کے سرمایہ دارانہ نظام کی چولیں

ہلا

دی ہیں اور مالیاتی بحران کے بعد سرمایہ دارانہ نظام کے ستون لرزنے لگے ہیں، حال یہ ہے کہ دنیا کی مالیاتی مارکیٹوں سے 30 ہزار ارب ڈالر کے مساوی اثاثے تحلیل ہوکررہ گئے ہیں، بڑے بڑے مالیاتی ادارے اور بینک زمین بوس ہوگئے، یورپ، امریکہ اور جاپان میں بے روزگاری کی شرح 5 سے 9 فیصد تک جا پہنچی، عالمی سرمایہ دارانہ نظام کا ایک اہم ستون جرمنی دوسری جنگ عظیم کے بعد شدید ترین مالیاتی بحران، بے روزگاری اور کساد بازاری کا شکار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے سورج کو سودی گہن لگ چکا ہے اور اِس کی چکاچوند ماند پڑ چکی ہے، عالمی سرمایہ دارانہ نظام کا معاشی بلبلہ پھٹنے سے دنیا بھر میں غربت، بے روزگاری، بدامنی، بھوک و افلاس کی تاریکی بڑھ رہی ہے، دنیا کو عراق اور افغانستان جنگ کا تحفہ دینے والا امریکہ اب خود اُس کے شعلوں میں جھلس رہا ہے اور بادی النظر میں یہی محسوس ہو رہا ہے کہ امریکی یہودیوں کی غالب اکثریت کے زیر تسلط آنے والی نیویارک کی وال سٹریٹ پر قبضے کی یہ تحریک جس تلخ پس منظر میں شروع ہوئی ہے، امریکی سامراج کے لئے اُس کا نتیجہ اس سے زیادہ تلخ ہی نہیں بلکہ مسلم اُمہ کو تہس نہس کرکے پوری دنیا پر تسلط اور قبضے کے خواب دیکھنے والی عالمی صہیونی قوتوں کی بساط لپیٹنے کے لئے کافی ہو سکتا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ امریکہ نے اپنی بے پناہ طاقت، جدید ایٹمی ٹیکنالوجی اور ہتھیاروں کے بل بوتے پر توسیع پسندانہ عزائم کو آگے

بڑھاتے ہوئے جس طرح عالمی امن و سلامتی کو تاراج کیا اور مسلم ممالک پر اپنا تسلط جمایا ہے، اُس کا جلد یا بدیر یہی نتیجہ سامنے آنا تھا، جو آج پوری دنیا میں پھیلتی ہوئی "وال اسٹریٹ پر قبضہ کرو" تحریک کی صورت میں استحصالی سرمایہ دارانہ نظام کے پیروکاروں کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ آج اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ موجودہ عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے بحران نے سرمایہ داری کو اپنے ہی خالق نظریات سے متصادم کردیا ہے، عالمی سطح پر امریکہ اور اسرائیل کے سرمایہ دارانہ نظام کا مشاہدہ اِس نظام کی مکمل شکست و ناکامی کا غماز ہے، موجودہ عوامی ردعمل ثابت کرتا ہے کہ یہ تجربہ قطعی طور پر ناکام ہوگیا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ بہت جلد امریکہ اور اُس کے مفاد پرست حواریوں کے سرمایہ دارانہ بت پاش پاش ہوجانے والے ہیں، کیونکہ مردان خدا مست برسوں پہلے یہ پیشنگوئی کرچکے ہیں کہ "ایک وقت آئے گا جب کمیونزم خود ماسکو میں اپنے بچاؤ کیلئے پریشان ہوگا، سرمایہ دارانہ ڈیموکریسی خود واشنگٹن اور نیویارک میں اپنے تحفظ کے لئے لرزہ براندام ہوگی، مادہ پرستانہ الحاد خود لندن اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں جگہ پانے سے عاجز ہوگا، نسل پرستی اور قوم پرستی خود برہمنوں اور جرمنوں میں اپنے معتقد نہ پاسکے گی۔" آج وہ وقت آچکا ہے، کمیونزم ماسکو میں دفن ہوکر قصہ پارینہ بن چکا ہے، مادہ پرست الحاد لندن اور پیرس کی

سڑکوں پر ذلیل و رسوا ہو رہا ہے، نسل اور قوم پرستی برہمنوں اور جرمنوں میں اپنے معتقد ڈھونڈتی پھر رہی ہے، جبکہ سرمایہ دارانہ ڈیموکریسی اپنی بقاء کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے، چنانچہ اِس تناظر میں ابھرنے والا منظر نامہ ہمارے اُن ارباب اقتدار اور دولت پرست طبقوں کیلئے لمحہ فکریہ ہونا چاہیے جو اپنے اُس امریکی سرپرست جس کے اپنے ہاتھ سے اقتدار کی باگیں خشک اور بھربھری ریت کی مانند آہستہ آہستہ پھسلتی جارہی ہے، پر تکیہ کئے پاکستان کی مظلوم عوام کا استحصال کر رہے ہیں، شاید وہ یہ حقیقت بھول رہے ہیں کہ ہر وہ نظام جو غریب عوام کو لوٹنے، کچلنے اور استحصال کرنے پر مبنی ہوتا ہے کبھی بھی دیرپا اور پائیدار ثابت نہیں ہوتا۔

وہ حکمت ناز تھا جس پہ خرد مندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجہ خونیں میں تیغ کارزاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

ہیروز یا قومی مجرم-----

کیا ہم بدعنوان اور بے ایمان قوم ہیں-----

جب بدعنوانی،لوٹ مار اور کرپشن کا ناسور کسی معاشرے کی رگ و پے میں سرایت کر جائے تو قومیں اپنی اخلاقی ساخت شناخت اور مرتبہ و مقام کھو بیٹھتی ہیں اور تباہی و بربادی اُن کا مقدر ہوجاتی ہیں،بد قسمتی سے آج ہماری پوری قوم کو اسی تباہی وبربادی کا سامنا ہے،کرپشن کے سرطان نے پوری قوم کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے اور ہماری وہ اسلامی روایات،اخلاقی قدریں اور قومی تشخص جو کبھی ہماری وجہ شناخت و افتخار ہوتا تھا اور جس نے ہمیں دنیا میں عزت و وقار سے سر اٹھا کر جینے کا حوصلہ دیا تھا،آج ندارد ہے،حال یہ ہے کہ اِس بیماری نے ہماری اخلاقی قدروں اور معاشرتی روایات کو ہی بدل ڈالا ہے،دیانت و ایمانداری کی جگہ بے ایمانی اور بدعنوانی نے لے لی،آج جو جتنا بڑا بے ایمان،چور،ڈاکو اور لیٹرا ہے وہ معاشرے میں اتنا ہی صاحب عزت وحیثیت ہے،جبکہ محنت وایمانداری اور دیانت داری کے ساتھ زندگی گزارنا مشکل ہے،یہی وجہ ہے کہ ہر طرف کرپشن،لوٹ،مار اور بدعنوانی کا دور دورہ ہے،اوپر سے لے کر نیچے تک ہر آدمی اِس بیماری میں مبتلا اور اپنی اپنی حیثیت کے مطابق برابر کا

شریک ہے،اسی وجہ سے آج دنیا ہمیں ایک بدعنوان، بے ایمان اور نا قابل اعتبار قوم کے نام سے جانتی ہے۔

جب قومی زندگی میں اِس قسم کی صورتحال پیدا ہوجائے اور ارباب اقتدار سے لے کر ہر ادارے کے ذمہ داران بشمول قوم اِس موذی مرض میں مبتلا ہوجائے تو کھیل اور تفریح جیسے صحت مند شعبے کیونکراِس سے اپنے دامن کو پاک و صاف رکھ سکتے ہیں، لہٰذا اِس تناظر میں پاکستانی ٹیسٹ کپتان سلمان بٹ، فاسٹ بولر محمد آصف اور محمد عامر کو برطانوی عدالت سے دھوکہ دہی اور بدعنوانی کے جرم میں ملنے والی سزائیں بہت معمولی سی بات نظر آتی ہے،اِس مقدمے میں وسطی لندن کی سدک کراؤن کورٹ کے جسٹس جیریمی کک نے فیصلہ سناتے ہوئے سلمان بٹ کو ڈھائی سال، محمد آصف کو ایک سال اور محمد عامر کو 6 ماہ قید کی سزا سنائی اور بالترتیب 30 ہزار ہزار 120 اور 9 ہزار 389 پونڈ جرمانہ بھی عائد کیا،برطانوی جج کا کہنا تھا کہ 937،8 آپ لوگوں نے کرکٹ کے کھیل کے وقار کو نقصان پہنچایا،آپ کے اعمال کی وجہ سے کرکٹ بدنام ہوئی اور کرکٹ پر سے لوگوں کا اعتماد اٹھا، جج نے سلمان بٹ کو مخاطب کرتے ہوئے کہاکہ تمہاری سزا میں نرمی کی درخواست مسترد کی جاتی ہے، تمہارا کیریئر اب ختم ہو چکا ہے، تم بطور کپتان سب کے لئے مثال تھے، تمہارا جرم بڑا ہے، جج نے سلمان بٹ کو پی سی بی اور پاکستان کے وقار کو نقصان پہنچانے اور محمد عامر کو کرپٹ کرنے کے ساتھ مظہر مجید کے ساتھ میچ

فکسنگ کا منصوبہ ساز بھی قرار دیا، جج نے محمد آصف کو بھی جرم میں برابر کا شریک قرار دیا۔

جبکہ محمد عامر کی جانب سے غلطی کے اعتراف کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اُسے بہادری کے مظاہرے سے تشبیہ دی اور خوش آئند قرار دیا، عدالت نے کھلاڑیوں کے ایجنٹ مظہر مجید کو بھی 2 سال 8 ماہ قید کی سزا سنائی اور اُسے ہر سطح پر کرپشن میں ملوث ہونے اور سپاٹ فکسنگ کا سب سے بڑا مجرم قرار دیا اور تینوں کھلاڑیوں کو مقدمہ پر ہونے والے اخراجات ادا کرنے کا بھی حکم دیا، برطانوی عدالت کے 9 صفحاتی فیصلے میں پی سی بی کے کردار پر کڑی تنقید کے ساتھ اُسے مسخروں کی ٹیم بھی قرار دیا گیا، یہ درست ہے کہ کھیل کے مختلف شعبوں میں جواریوں کی مداخلت کوئی نئی بات نہیں ہے، یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا کی تقریباً ہر کرکٹ ٹیم کے کھلاڑی جوئے میں ملوث رہے ہیں، البتہ پہلی بار تین پاکستانی کھلاڑیوں اور ایک ایجنٹ کو قید اور جرمانے کی سخت سزائیں سنائی گئی ہیں، اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِن کھلاڑیوں پر جرم ثابت ہوگیا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ کرکٹ سمیت کئی کھیل کے کھلاڑی مختلف قسم کی بدعنوانیوں میں ملوث رہے ہیں۔

قارئین محترم ! کھلاڑی ملک کے سفیر ہوتے ہیں، اُن کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ

بیرون ملک اپنے بہترین کھیل اور اچھے کردار کا مظاہرہ کرکے اپنے ملک کی عزت و وقار کا تحفظ کریں، لیکن پاکستان کے اِن تینوں کرکٹرز کی کرپشن کی وجہ سے پوری قوم کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔برطانوی عدالت کی جانب سے پاکستانی کھلاڑیوں کے خلاف فیصلے نے قوم کو شدید صدمے سے دوچار کردیا ہے۔برطانوی عدالت کے جج کے بقول اِن کھلاڑیوں نے کرکٹ کے وقار کو ہی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ کرکٹ کو بھی بدنام کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی کھلاڑیوں کے اِس عمل سے صرف کرکٹ ہی نہیں، دنیا بھر میں پاکستان اور پاکستانی قوم کی عزت و وقار کو بھی شرمناک دھبہ لگایا ہے، وہ کھیل اور کھلاڑی جس نے ماضی میں مختلف مرحلوں پر اعزازات حاصل کرکے قوم کا سر فخر سے بلند کیا تھا،آج اِس واقعے کی وجہ سے شرمسار ہے، بلاشبہ 3 نومبر کا دن پاکستان کرکٹ کی تاریخ کا سیاہ ترین دن ہے اور سلمان بٹ، محمد آصف اور محمد عامر اِس سزا کے مستحق اور پوری قوم کے مجرم ہیں، جنھوں نے صرف چند ٹکوں کے عیوض ملک و قوم کے وقار کا سودا کیا،اب اِن کا اعتراف جرم، قوم سے معافی اور ندامت کے چند آنسو کیا اِس شرمناک عمل کا تدارک کرسکتے ہیں؟

اَمر واقعہ یہ ہے کہ پاکستان پہلے ہی دنیا میں کرپشن کے ریکارڈ قائم کررہا ہے،اہل اقتدار کے ہاتھوں قومی خزانے کی لوٹ مار، وسائل کی بندر بانٹ اور ملکی اداروں کی تباہی پر نوحہ کناں قوم کیلئے کرکٹ ٹیم کے کھلاڑیوں کا یہ

شرمناک طرز عمل کسی تازیانے سے کم نہیں، وطن عزیز اہل اقتدار اور بعض سیاستدانوں کی کرپشن کی وجہ سے عالمی سطح پر پہلے ہی بدنام تھا، رہی سہی کسر قومی کرکٹ ٹیم کے کھلاڑیوں نے پوری کر دی، یہی وجہ ہے کہ ملک بھر کے عوامی حلقوں کی طرف سے اِن کھلاڑیوں کی بھرپور مذمت کی جا رہی ہے، لیکن ہمارے نزدیک اصل مسئلہ سزا کا نہیں بلکہ اِس بات کا ہے کہ پاکستان کرکٹ کے صرف کھلاڑی ہی جوئے میں ملوث نہیں ہوئے بلکہ جہاں پاکستان کرکٹ بورڈ بالواسطہ طور پر مذکورہ کھلاڑیوں کے جرائم میں برابر کا شریک ہے، وہیں ہماری حکومت بھی پاکستان کی حرمت اور عزت بچانے کے لئے غفلت کی مرتکب ہوئی ہے، ویسے بھی یہ بات زبان زد عام ہے کہ ملک کا اقتدار اعلیٰ اقرباء پروری، لوٹ مار اور بدعنوانی میں ملوث ہے،اِس پس منظر میں قومی کرکٹ ٹیم کے کھلاڑیوں نے بھی وہی کام کیا ہے جو ارباب اقتدار کی ٹیم کر رہی ہے، بس فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے بددیانتی کے مرتکب ہوئے تو دوسرے وطن عزیز کی بدنامی کا باعث بنے،اِس لیے ہماری رائے میں جس طرح حکومت نے اپنے دور اقتدار میں کرپٹ اور نااہل افراد کو قومی اعزازات سے نوازا ہے، بالکل اُسی طرح قومی عزت ووقار کیلئے ذلت ورسوائی کا باعث بننے والے اِن تینوں کھلاڑیوں کیلئے بھی کسی نہ کسی اعزاز کا اعلان کرے۔

رہی بات یہ کہ پاکستان کرکٹ بورڈ مسخروں کی ٹیم ہے، تو بلاشبہ اس بات میں

کوئی شک و شبہ نہیں کہ سابق چیئرمین کا دور کرکٹ بورڈ میں مسخرے پن کا دور تھا، موجودہ صورتحال میں یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ کرکٹ بورڈ سمیت ہر ادارے میں سیاسی بنیادوں پر مخصوص افراد کو نوازنے کے لئے تقرریاں نہیں ہونی چاہیں، بلکہ تمام فیصلے میرٹ پر ہونے چاہیں، سابق چیئرمین اعجاز بٹ کی تقرری سیاسی بنیادوں پر کی گئی تھی، جس کا خمیازہ آج کرکٹ ٹیم کے انتشار اور میچ فکسنگ کی صورت میں سامنے آیا ہے، اگر اُن کی جگہ میرٹ پر آنے والی کوئی شخصیت موجود ہوتی تو بورڈ میں ڈسپلن ہوتا اور کھلاڑیوں کی سختی سے مانیٹرنگ بھی ہوتی، اس لیے ہمارا مطالبہ ہے کہ اصل انکوائری پاکستانی کرکٹ بورڈ اور ٹیم کے اُن آفیشلز کے خلاف بھی ہونی چاہیے جو اُس وقت ٹیم سے منسلک تھے، کیونکہ ٹیم منیجمنٹ کو یہ بات اچھی طرح سے معلوم تھی کہ اُس کی کرکٹرز کو دی گئی وارننگ کے باوجود مظہر مجید کرکٹرز سے ملتا رہا، جبکہ کرکٹ بورڈ خود یہ اعتراف کرتا رہا کہ ایجنٹ کے روپ میں مشکوک لوگوں سے دور رہنے کے لئے کرکٹرز کو متنبہ کیا گیا، لیکن اِس کے باوجود اُن کے رابطے برقرار رہے۔
تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ٹیم منیجمنٹ کیا کرتی رہی؟ سیکورٹی پر مامور افراد کہاں تھے؟ کیوں اُس وقت کوئی موثر قدم نہیں اٹھایا گیا؟ جبکہ جسٹس قیوم کمیشن کی سفارشات میں پاکستان کرکٹ بورڈ سے کہا گیا تھا کہ وہ کرکٹرز کے اثاثوں پر نظر رکھے مگر کبھی اِن سفارشات پر کوئی توجہ نہیں دی گئی، بلکہ

ڈسپلن کی خلاف ورزی کرنے والے کرکٹرز چہیتے بن کر کھیلتے رہے اور کرکٹ بورڈ سب اچھا ہے کی پالیسی پر چلتا اپنی کرسیاں بچاتا رہا، یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ کرکٹ بورڈ پہلے تو اِن کرکٹرز کی کھل کر حمایت کرتا رہا مگر بعد میں پیچھے ہٹ گیا، اگر سابق چیئرمین اعجاز بٹ اِن کھلاڑیوں کے خلاف کارروائی کرتے اور انہیں سزا دے دی جاتی تو عالمی سطح پر اس طرح پاکستان کی جگ ہنسائی نہ ہوتی اور یقیناً آج صورتحال مختلف ہوتی، مگر سابق چیئرمین نے اِن کرکٹرز کے خلاف خود فوری کارروائی نہ کرنے کا اعلان کر کے اِن قومی مجرموں کی سرپرستی کی، اِس تناظر میں خود کرکٹ بورڈ اور مینیجمنٹ کے ہوتے ہوئے سپاٹ فکسنگ کے اسکینڈل کا سامنے آنا پاکستان کرکٹ بورڈ کی مکمل ناکامی کا منہ بولتا ثبوت ہے، لہذا پاکستان کرکٹ بورڈ کے چیئرمین اور دیگر عہدیداروں کے کردار اور کارکردگی کا عدالتی جائزہ لینا اور بھی زیادہ ضروری ہوگیا ہے۔

دوسری طرف برطانوی عدالت کی سزا نے محب وطن حلقوں کو پاکستانی قوم کے اخلاقی بحران کے بارے میں ایک بار پھر تشویش میں مبتلا کر دیا ہے، اِس صدمہ انگیز سانحے نے ہمارے سیاسی، سماجی اور اخلاقی نظام کے بارے میں نئے سوالات پیدا کر دیے ہیں، راتوں رات دولت مند بننے کی دوڑ نے حلال و حرام کی تمیز ختم کر دی ہے اور معاشرے میں یہ تصور پختہ تر ہوگیا ہے کہ جب تک کوئی شخص کسی بدعنوانی اور جرم میں پکڑا نہ جائے تو وہ باعزت قرار نہیں پاتا، جب لوگوں

میں اپنے ضمیر کو جوابدہی اور رب کی پکڑ کا احساس ختم ہو جاتا ہے تو قوم اخلاقی زوال اور معاشرتی برائیوں میں مبتلا ہو کر تباہ ہو جاتی ہے۔آج ہمیں کچھ اسی قسم کی صورتحال کا سامنا ہے، بدعنوانی اور بے ایمانی کو جائز اور اپنا حق سمجھنے کے تصور سے کرپشن کا ناسور ہمارے معاشرے میں سرایت کرچکا ہے، یہ ناسور ہماری اخلاقی قدروں اور معاشرتی و سماجی ڈھانچے کو کھوکھلا کرکے ہمیں دنیا کے سامنے ایک بدعنوان اور بے ایمان قوم کے طور پر پیش کر رہا ہے، لہذا ضرورت اِس اَمر کی ہے کہ ملک سے کرپشن نما کلچر کے فوری خاتمے ،اِس کے پس پردہ ہونے والے نقصانات اور آئندہ آنے والی نئ نسلوں پر پڑنے والے برے اثرات کے تدارک کے لئے دیرپا اور پائیدار لائحہ عمل ترتیب دیا جائے، لیکن یہ تب تک ممکن نہیں جب تک کہ ہم اپنے معاشرے میں خیر و شر کے اصل معیار کو زندہ کرکے اُس کا ہر شعبہ زندگی میں اطلاق نہیں کرتے ۔

پاکستان کیا ہے اور کیسے بنے گا" ایک تاریخی دستاویز۔۔۔

فنافی الپاکستان مولانا عبدالستار خان نیازی

مجاہد ملت مولانا عبدالستار خان نیازی یکم اکتوبر 1915ء کو ضلع میانوالی کے گاؤں "اٹک پٹیالہ" میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد ذوالفقار خان ایک نیک سیرت اور پاکباز انسان تھے۔دینی گھرانہ ہونے کی وجہ سے مولانا نیازی کو بچپن ہی سے مذہبی ماحول میسر آیا۔1933ء میں مولانا عبدالستار خان نیازی نے میٹرک پاس کیا اور حصول تعلیم کیلئے لاہور تشریف لے آئے۔لاہور میں آپ نے انجمن حمایت اسلام کے زیر انتظام" اشاعت اسلام کالج" میں داخلہ لے لیا اور 1936ء میں "ماہر تبلیغ" کی حیثیت سے کالج میں ٹاپ کیا۔اسی دوران مولانا عبدالستار خان نیازی کی ملاقات حکیم الامت علامہ اقبال سے ہوئی۔اسرار خودی کے مطالعے نے فارسی پڑھنے کے شوق کو اِس قدر ابھارا کہ مولانا نیازی نے چھ ماہ میں منشی فاضل کا امتحان بھی پاس کرلیا۔اسی سال آپ نے ایف اے کا امتحان دیا اور اسلامیہ کالج لاہور میں بی اے میں داخلہ لے لیا۔یہ وہ زمانہ تھا جب برصغیر پاک وہند میں کانگریس اور مسلم لیگ کا بڑا چرچا تھا۔نیشنلسٹ طلباء کی تنظیم "نیشنل اسٹوڈینس فیڈریشن "تعلیمی اداروں میں چھائی ہوئی تھی۔چنانچہ 1936ء میں مولانا نیازی، مولانا ابراہیم علی چشتی، میاں محمد شفیع (م۔ش) مشہور صحافی حمید نظامی

اور عبدالسلام خورشید نے علامہ اقبال کی قیام گاہ پر اُن کے مشورے سے طلباء کی تنظیم دی مسلم اسٹوڈینس فیڈریشن "کی بنیاد رکھی، جس کا مقصد مسلم طلباء کو نیشنلسٹوں کے" اثر سے بچانا اور سیاسی شعور اجاگر کرکے قیام پاکستان کی راہ ہموار کرنا تھا، مولانا نیازی 1938ء میں اِس تنظیم کے صدر منتخب ہوئے، صدر منتخب ہونے کے بعد آپ نے "مسلم اسٹوڈینس فیڈریشن "کے منشور میں پہلی تبدیلی یہ کی کہ "مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل ایک الگ خطہ زمین جس میں مسلمانوں کی حکومت ہو" کو خلافت پاکستان "کا نام دیا، 1939 میں میں مولانا نیازی نے مسلم اسٹوڈینس فیڈریشن کی جانب سے "خلافت پاکستان اسکیم "نامی پمفلٹ شائع بھی کیا، جس کی ایک کاپی قائدِ اعظم محمد علی جناح کو بھی بھجوائی گئی، جسے قائدِ اعظم نے مولانا نیازی سے ملاقات میں ایک گرم اسکیم قرار دیا۔

مولانا عبدالستار خان نیازی نے 1938ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں ایم اے عربی میں داخلہ لے لیا اورایم اے کرنے کے بعد 1942ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں ڈین آف اسلامک اسٹیڈیز کی حیثیت سے خدمات بھی انجام دیں، 23 مارچ 1940ء کو جب قرار داد لاہور پیش ہوئی، اُس وقت مولانا نیازی ایم اے فائنل ایئر میں زیر تعلیم تھے، اِس اجلاس میں شرکت کرنے والے تمام مقررین کا مدعا اگرچہ پاکستان کا قیام ہی تھا مگر کسی نے اپنی تقریر میں پاکستان کا نام نہیں

لیا، یہ اعزاز صرف مولانا عبدالستار خان نیازی کو جاتا ہے کہ آپ نے پہلی بار اِس اجتماع میں "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ لگایا، جو مسلمانوں کے کسی عظیم اجتماع میں پاکستان کیلئے لگایا گیا پہلا نعرہ تھا۔ مولانا نیازی نے میانوالی ڈسٹرکٹ میں مسلم لیگ کو دوبارہ منظم کرنے کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ ضلع میانوالی کے صدر سمیت مسلم لیگ کے کئی اعلیٰ عہدوں پر خدمات انجام دیں۔ 1945ء میں قائد اعظم نے آپ کو ضلع میانوالی سے پروننشل اسمبلی کا ٹکٹ دیا جس پر آپ نے یونینسٹ پارٹی کے امیدوار کو شکست دے کر کامیابی حاصل کی۔ مولانا نیازی قیام پاکستان کے بعد 1951ء تک مسلم لیگ سے وابستہ رہے، مگر جب مسلم لیگ کو عملاً ایک لمیٹیڈ کمپنی بنادیا گیا تو آپ نے مسلم لیگ سے علیحدگی اختیار کرکے اپنے آپ کو خلافت پاکستان، جس کا مقصد ملکی قوانین کو شریعت کے مطابق بنانا اور اسلامی نظام کا مکمل نفاذ تھا، کیلئے وقف کردیا۔ مولانا نیازی عمر بھر ایک سربکف مجاہد کا کردار ادا کرتے رہے اور قیام پاکستان کے بعد اپنی وفات 2 مئی 2001ء تک اپنے مشن کی تکمیل، مقصد کے حصول اور ریاست کی فوز وفلاح کیلئے کمربستہ رہے۔ آپ کی ساری زندگی جبر واستبداد، ظلم واستحصال اور ناانصافی کے خلاف جہاد کرتے ہوئے، غلبہ دین، آزادی جمہوریت اور آمر وقت کے خلاف نعرہ حق بلند کرتے ہوئے گزری، مولانا نیازی اپنی زندگی میں کئی بار قید وبند کی صعوبتوں سے گزرے، قاتلانہ حملوں کی زد میں آئے، تختہ دار تک پہنچے، مگر کوئی قید، کوئی حملہ، کوئی سزا اور تختہ دار

کی اذیتیں مولانا نیازی کے عزم، حوصلے اور ارادوں کو متزلزل نہ کر سکی۔

تحریک پاکستان میں مولانا عبدالستار خان نیازی کا کردار روز روشن کی طرح عیاں ہے، یہ مولانا ہی تھے جنھوں نے پنجاب میں قائداعظم کی تائید وحمایت میں پہلی اور موثر آواز بلند کی، سر سکندر حیات کی سازشوں کا مردانہ وار مقابلہ کرکے مسلم لیگ کے قیام واستحکام کی راہ ہموار کی اور مسلم لیگ کو اہل پنجاب کے دلوں کی ڈھرکن بنادیا،

مولانا پاکستان بنانے والوں میں سے ایک تھے،اُن کا اوڑھنا بچھونا سب ہی کچھ پاکستان اور نفاذ اسلام کیلئے تھا،وہ فنافی الپاکستان تھے،وہ پاکستان کو دنیا کے سامنے خلافت راشدہ کی طرز پر ایک جدید فلاحی ریاست کی طور پر دیکھنا چاہتے تھے، مولانا نے اِس مقصد کیلئے متعدد کتابچے اور کتابیں بھی لکھیں جن میں "خلافت پاکستان، مسودہ آئین پاکستان، منشور خلافت،اتحاد بین المسلمین وغیرہ شامل ہیں،زیر نظر کتاب "پاکستان کیا ہے اور کیسے بنے گا؟" بھی اسی سلسلے کی ایک اہم تاریخی کڑی ہے، جسے 1945ء میں مولانا نیازی نے اپنے تحریکی ساتھی میاں محمد شفیع (م ش) کے ساتھ مل کر مکمل کیا،آج پاکستان کے بارے میں بڑے زور وشور کے ساتھ یہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ قیام پاکستان کا مقصد کسی مذہبی ریاست کا قیام نہیں تھا،نہ ہی قائداعظم پاکستان کو ایک اسلامی فلاحی ریاست بنانا چاہتے تھے، سیکولر ذہن لوگ اپنی بات کی تائید میں قائداعظم کا ایک آدھ بیان بھی

سیاق و سباق سے ہٹ کر پیش کرتے ہیں، حالانکہ قائدِ اعظم محمد علی جناح کے سینکڑوں بیانات ریکارڈ پر موجود ہیں جن میں پاکستان کے اسلامی خدوخال اور قرآن مجید کا بطور دستور نمایاں تذکرہ موجود ہے۔ قیامِ پاکستان کا مطالبہ کیوں کیا گیا، اِس کے اسباب و محرکات کیا تھے، کیوں اِس مطالبے کو اِس قدر پذیرائی ملی اور پاکستان میں کونسا نظام نافذ ہوگا۔؟ ہمارا ماننا ہے کہ اِن سوالوں کے صحیح جواباب وہی لوگ دے سکتے ہیں، جنھوں نے پاکستان بنانے کی جدوجہد میں فعال کردار ادا کیا یا جنھوں نے پاکستان بنایا، وہی لوگ بہتر طور پر بتا سکتے ہیں کہ پاکستان کیوں اور کس لیے بنایا گیا تھا، مجاہد ملت کی کتاب "پاکستان کیا ہے اور کیسے بنے گا" آج بھی اِن تمام سوالوں کے اطمینان بخش جوابات فراہم کرتی ہے۔

قیامِ پاکستان سے دو سال قبل لکھی گئی اِس کتاب میں مولانا عبدالستار خان نیازی نے برصغیر کی تاریخ، قیامِ پاکستان کے حالات و عوامل، پاکستان کیسے بنے گا، پاکستان کیا ہوگا اور نئی مملکت کے نظام و قانون سمیت اقتصادیات، علوم و تعلیم اور سلطنت و سیاست پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے، مولانا نیازی اِس کتاب میں شریعت فروش مولویوں، نوابوں، برہمنوں، بنیوں، انگریزوں اور پڑھے لکھے طبقے" بابوں" کو زوال کی علامت اور نفاذ اسلام کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیتے ہیں، شریعت فروش مولویوں کو مارآستین نمبر ایک قرار دیتے ہوئے

مولانا نیازی لکھتے ہیں کہ "یہی وہ حضرات ہیں جو کبھی انگلستان کا بادشاہ مرجائے تو اُس کیلئے مسجدوں میں مغفرت کی دعائیں کراتے ہیں، کبھی سود حلال قرار پاتا ہے، کبھی جہاد حرام ہو جاتا ہے، کبھی شہدائے کرام حرام موت مرنے والے قرار پاتے، کبھی فاسق و فاجر مسلمانوں کی مذمت کرتے کرتے کافروں کی بیعت کر لیتے ہیں، کبھی دین پر وطن کو غالب قرار دیتے ہیں اور کبھی پرانے اسلام کی جگہ نیا اسلام جاری کرنے کو درس قرآن اور حلقہ تلقین کا ڈھونگ رچایا جاتا ہے، انہی لوگوں کے آباؤاجداد نے جزیہ اور گاؤکشی ہندوستان میں حرام قرار دیئے تھے، یہی ٹیپو سلطان اور افغان مجاہدین کے خلاف سکھوں اور مرہٹوں کے حق میں فتوے دیتے تھے۔" نواب مولانا کے نزدیک "ہوس و حرص کا غلام، قوم کا غدار اور دین سے بے پرواہ طبقہ ہے، مولانا لکھتے ہیں کہ "فرنگی اور مرہٹوں سے اِن نوابوں نے سازش کرکے انہیں ملک میں داخل کیا، میر جعفر سے لے کر میر صادق تک سب نواب ہی تھے، آج سر فضل حسین اور سر سکندر حیات بھی نوابوں ہی کی فہرست میں داخل ہیں، جو ہمارے ہی لٹے ہوئے دستر خوان سے چند ریزے ہمارے سامنے ڈال کر ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ دیکھو ہم تمہارے لیے کیا کیا خوان نعمت لائے ہیں۔" وہ برہمنوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ "یہی برہمن مرہٹوں کا پیشوا بن انہیں مسلمانوں کے خلاف لایا، کیونکہ اسلامی مساوات برہمن کے اقتدار کے منافی تھی، یہی تھا جو اُمی چند بن کر سراج الدولہ کی تباہی کا باعث بنا، یہی ٹیپو سلطان کا غدار مشیر مال تھا، اسی نے 1857ء کے انقلاب میں جاٹ مل بن کر

جاسوسی کی، اسی نے شیواجی کو گرو بن کر سوراجیہ کا سبق پڑھایا اور یہی مہاتما بن کر عدم تشدد اور چرخے کی آڑ میں اسلامی علیحدگی ختم کرنا چاہتا ہے۔" وہ لکھتے ہیں کہ بنیا مسلمان کے خون کا پیاسا ہے، یہ برہمن جتنا ذہین تو نہیں، لیکن حریص بلا کا ہے، ہیمو بقال سے لے کر آج تک اُس کی ہر کوشش اسلامی اقتدار کی تخریب پر ہی مذکور رہی۔" وہ کہتے ہیں کہ فرنگی کا نسخہ حکومت سادہ بھی ہے اور آسان بھی، پہلے جسم کی طاقت اور دماغ کی چال سے کھانے پینے کا سامان سب چھین لو، پھر بھوک کے ماروں کو بقدر ضرورت وہی سامان دے کر اُن سے جو چاہو کرواتے رہو، اُن کے اخلاق، دین حتیٰکہ فطرت تک بدل ڈالو، نوکری اُن کا مزاج بن جائے، موت کا ڈر اور حاجت کا خوف انہیں جیتے جی مار ڈالے اور سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ محتاج رہیں۔" بابو کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں کہ " کبھی انہیں آزادی کا بخار ہوتا ہے، کبھی جمہوریت کے دورے پڑتے ہیں، کبھی مزدور کی ہمدردی کی قے آنے لگتی ہے، کبھی اصلاح معیشت و تمدن کے دست لگ جاتے ہیں، ان کے استدلال میں ممالک غیر کی تاریخ سے اکثر مثالیں نقل ہوتی ہیں، گو اپنے جد امجد کا نام بھی یاد نہیں ہوتا۔"

مولانا تعبیر پاکستان کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " ہماری تعبیر پاکستان اگر کچھ ہے تو وہ ایک فلسفہ زندگی اور ضابطہ حیات ہے، یہ فلسفہ زندگی اور ضابطہ حیات اپنی تصنیف کے اعتبار سے کچھ نیا نہیں بلکہ وہی اسلام

اور شریعت کے تیرہ سو سال پرانے اصول ہیں، ہم نے صرف اِن اصولوں کو موجودہ حالات پر عائد کرکے اِس سے جو نتیجے برآمد ہوئے وہ آپ کے سامنے پیش کیے ہیں۔" مولانا لکھتے ہیں کہ " پاکستان کے معنی ہیں ایک ایسا تمدن، ایک ایسی سلطنت، ایک ایسی اُمت، جس کی بناء محض توحید و ایمان پر ہو، گویا ہم ہندوستان میں اسلام کا ایک دینی، تمدنی، سیاسی اور جنگی مرکز قائم کرنا چاہتے ہیں، جہاں روحانی، اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی، فوجی، نفسیاتی غرض کہ ہر قسم کی قوت نفاذ کے مالک ہم اور صرف ہم ہونگے .... اور .... خلافت پاکستان کی اسلامی حکومت کا قانون دیوانی اور فوجداری معنوں میں شریعت اسلامی پر ہوگا۔" قارئین محترم ! یہ تھا وہ تصور پاکستان جس کیلئے ہمارے اسلاف نے بے پناہ قربانیاں دیں اور قیام پاکستان کو ممکن بنایا، ہمارے اسلاف صرف نمازیں پڑھوانے اور روزے رکھوانے کیلئے پاکستان نہیں بنوانا چاہتے تھے بلکہ اُن کے پیش نظر ایک ایسی فلاحی ریاست کا تصور تھا جہاں وسائل رزق سب کیلئے، عدل وانصاف ہر شخص کیلئے، علاج معالجے اور جان ومال، عزت وآبرو کا تحفظ ہر شہری کیلئے ریاست کی ذمہ داری تھی، جہاں وجہ عزت سرمایہ داری وجاگیرداری نہیں بلکہ اعلیٰ اخلاقی اوصاف، دیانت، امانت، تقویٰ اور خداترسی ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامیان ہند نے اسلامی تصور قومیت ہی کی بنیاد پر ہندوؤں سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا اور تحریک پاکستان اپنے ارفع مقاصد کے اعتبار سے

تحریک احیاءِ اُمت تھی، مگر افسوس کہ آج تک ہم اُسی جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں بلکہ ترقی معکوس کی بدولت آدھا پاکستان گنوا چکے ہیں، قیام پاکستان کے بعد ہمارے غلام حکمرانوں اور ابن الوقت سیاسی لیڈروں نے پاکستان کا جو حشر کیا، وہ سب کے سامنے ہے،اِن لوگوں نے پاکستان کو نہ صرف اُس کی حقیقی منزل سے دور کیا بلکہ خود منزل کو ژولیدہ فکری کے ذریعے خواب پریشاں کرنے میں اب تک مصروف ہیں، چنانچہ اِن حالات میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نئی نسل کو اِس فکری گمراہی سے بچایا جائے اور انہیں اپنے اسلاف کے سیرت و کردار اور اُن حالات و عوامل سے روشناس کرایا جائے جو قیام پاکستان کی اساس و بنیاد ہیں۔"پاکستان کیا ہے اور کیسے بنے گا۔؟"اسی سلسلے کے ایک اہم نادر تاریخی دستاویز ہے، مجاہد ملت مولانا عبدالستار خان نیازی تحریک پاکستان کے روح رواں تھے،زیر نظر کتاب میں مولانا عبدالستار خان نیازی نے قیام پاکستان کے تاریخی حالات و عوامل کے ذکر کے ساتھ مملکت پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد اُسے کامیابی وکامرانی سے چلا کر دنیا کے سامنے ایک ماڈل ریاست کے طور پر پیش کرنے کا مکمل لائحہ عمل بھی پیش کیا ہے، صاحب مصنف نے اِس کتاب میں مملکت کے مختلف شعبوں اقتصادیات، دفاع، خارجہ پالیسی، قانون، تعلیم وغیرہ پر بھی اسلامی نکتہ نظر سے سیر حاصل گفتگو کی ہے،کتاب کی ابتداء میں صاحب بصیرت حضرت بابا بلند کوہی زابلستانی کے وہ فکر انگیز ایمانی ملفوظ بھی شامل کئے گئے ہیں، جو16اور 17 مئی 1945 ء کو روزنامہ نوائے وقت کی زینت بنے

تھے۔اِن ملفوظ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ قیام پاکستان اَمر الٰہی اور مشیعت ایزدی
تھا،ہمارا ماننا ہے کہ زیر نظر کتاب مطالعہ پاکستان،تاریخ اور سیاسیات کے طلباء کیلئے بہت
سود مند ثابت ہو سکتی ہے کیونکہ کتاب کا مطالعہ نئی نسل کو ماضی کا آئینہ ہی نہیں دکھاتا
بلکہ مستقبل کے خطوط بھی متعین کرتا ہے۔ہمیں امید ہے کہ تحریک پاکستان کے نامور
قائد اور مجاہد مولانا عبدالستار خان نیازی کی تحریر کردہ اِس نادر قیمتی اثاثے کی 66 سال
بعد دوبارہ اشاعت قیام پاکستان کی وجوہات پر پڑنے والی گرد کو صاف کرنے میں اہم
کردار ادا کرے گی۔ہم اِس کامیاب کوشش وکاوش پر ماہر نیازیات جناب صادق قصوری
اور مجاہد ملت فاونڈیشن کے جملہ رفقاء کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔کتاب مجاہد ملت
فاونڈیشن۔برج کلاں ضلع قصور (پاکستان)پوسٹ کوڈ 55051 سے چالیس روپے کے
ڈاک ٹکٹ بھیج کر حاصل کی جاسکتی ہے۔

عمران خان زرا احتیاط سے۔۔۔۔۔ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے

قومی مفادات اور کشمیر کاز سے انحراف کامیابی کی منزل تک نہیں لے جاسکتا۔۔۔۔

کیا مسئلہ کشمیر ایک بار پھر حکمرانوں کی سیاسی منافقت کا شکار ہونے جارہا ہے۔؟کیا مستقبل قریب میں اُبھرتی ہوئی تیسری سیاسی قوت تحریک انصاف کے قائد عمران خان، جنھیں سیاسی تجزیہ نگارایک متبادل قیادت اور نئے متوقع حکمران کے روپ میں پیش کررہے ہیں، کشمیر پر اُسی سابقہ موقف کا اعادہ کریں گے، جس کی وجہ سے یہ مسئلہ آج تک لٹکا ہوا ہے۔؟اور کیا جس طرح پاکستانی حکمرانوں نے 63 سال تک مسئلہ کشمیر کو الجھا کر اپنے سیاسی مقاصد کیلئے استعمال کیا،آئندہ آنے والی قیادت بھی کشمیر کاز کیلئے وہی دوغلی پالیسی جاری رکھ کر مزید 63 سالوں تک اِس مسئلے کو الجھائے رکھے گی۔؟ اِن سوالوں کے جوابات سے قبل ہم کچھ دیر کیلئے ماضی سے حال تک کا سفر کرتے ہیں، مسئلہ کشمیر گذشتہ 63 سالوں سے ہمارے سیاسی اور فوجی حکمرانوں کی عدم توجہی، سیاسی بازی گری اور لفظی جمع خرچی کا شکار رہا ہے، حکمرانوں نے بار بار کشمیر کے معاملے پر ہمالیہ پہاڑ سے بڑی غلطیاں کیں، جس کی سزا آج کشمیری عوام سمیت پوری پاکستانی قوم بھگت رہی ہے، یہ وہی جنت نظیر وادی کشمیر ہے جس کی سیاسی اور

جغرافیائی اہمیت کے پیشِ نظر قائدِ اعظم محمد علی جناح نے فرمایا تھا کہ "کشمیر ہماری شہ رگ ہے۔" اِس شہ رگ کے حصول کیلئے قائدِ اعظم نے جنرل گریسی کو بھارتی فوج کے خلاف کاروائی کا حکم بھی دیا تھا، لیکن جنرل گریسی نے اِس حکم کو دانستہ نظرانداز کرکے بھارت کو فائدہ پہنچایا، اگر 1948 میں سیز فائر نہ ہوتا تو کشمیر آزاد ہو کر کب کا پاکستان میں شامل ہوچکا ہوتا، لیکن سازشی ہندو بنیا اقوام متحدہ کی مدد سے فائر بندی کرانے میں کامیاب ہوگیا اور یوں اُسے اپنی مکارانہ چالیں چلنے اور کشمیر کو اپنا اُٹوٹ انگ قرار دینے کیلئے وقت مل گیا، 1962ء میں ہمیں کشمیر آزاد کرانے کا سب سے اہم موقعہ چین بھارت جنگ کے دوران ملا، جب چین نے ہم سے کہا تھا کہ کشمیر پر قبضہ کرلو، لیکن اُس وقت کی فوجی آمر جنرل ایوب خان نے کشمیر پر قبضے کا آسان موقع گنوادیا، اگر اُس روز جنرل ایوب بہادرانہ فیصلہ کرلیتے تو ہماری تاریخ کا دھارا ایک نیا رخ اختیار کرچکا ہوتا،اس شرمناک واقعہ کی تفصل جنرل ایوب کے سیکرٹری قدرت اللہ شہاب کی کتاب شہاب نامہ "میں دیکھی جاسکتی ہے۔"

یوں1989ء میں لبریشن فرنٹ کے نوجوانوں کی عسکری تحریک کے آغاز سے قبل تک مسئلہ کشمیر پاکستانی حکمرانوں کی سیاسی بازی گری کا شکار رہا،1994ء میں محترمہ بے نظیر بھٹو مسئلہ کشمیر کو OIC میں لے گئیں اور انھوں نے OIC میں

حریت کانفرنس کو مبصر کی حیثیت دلوائی۔1999ء میں میاں نواز شریف نے بھارت کے ساتھ مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا۔جس کے نتیجے میں بھارتی وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی پاکستان آئے۔اس دورے سے کچھ امکانات پیدا ہوئے کہ شاید مسئلہ کشمیر کا کوئی پرامن حل نکل آئے۔لیکن واقعہ کارگل سے یہ معاملہ ایک بار پھر سرد مہری کا شکار ہوگیا۔ 12 اکتوبر 1999ء کو جنرل پرویز مشرف میاں نواز شریف کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قابض ہوگئے۔جس کے بعد دونوں ممالک کے درمیان ایک بار پھر مذاکراتی عمل شروع ہوا۔جولائی 2001ء میں پرویز مشرف سربراہی کانفرنس میں شرکت کیلئے آگرہ گئے۔مگر یہ کانفرنس کامیاب نہ ہوسکی۔اسی دوران سانحہ نائن الیون سے دنیا کے نقشے پر ایک ایسا نیا منظر نامہ ابھرا۔جس نے جدوجہد آزادی اور دہشت گردی کے فرق کو مٹادیا۔ امریکہ اور اُس کے حواریوں نے اقوام متحدہ کی چھتری تلے ایک نئی لغت ایجاد کی اور انہوں نے مسلمانوں کے جذبہ جہاد اور آزادی کی جدوجہد کو دہشت گردی کا خود ساختہ نیا مفہوم ہی نہیں پہنایا بلکہ وہ مسلم ممالک اور حریت پسند تنظیمیں جو دنیا بھر میں مظلوم اور محکوم مسلمانوں کے حقوق کی علامت اور عالم کفر کیلئے چیلنج بنی ہوئی تھیں کو دہشت گرد قرار دے کر اُن پر چڑھ دوڑے۔آج اِس ظلم و بربریت اور سفاکی کی داستانیں افغانستان، عراق ،لیبیا،پاکستان کے قبائلی علاقوں اور آپ کو اب شام تک بکھری نظر آئیں گی۔

جنوری 2004ء میں پاک بھارت مزاکراتی عمل ایک بار پھر شروع ہوا،اٹل بہاری واجپائی دوسری بار پاکستان آئے، لیکن اِن مزاکرات کا بھی کوئی فوری حل نہ نکل سکا،اِس دوران پرویز مشرف نے کشمیر پر چار نکاتی فارمولا بھی پیش کیا،مگر بھارت کی طرف سے اِس کا بھی کوئی مثبت جواب نہیں آیا،27دسمبر 2007ء کو بے نظیر بھٹو کی ناگہانی شہادت نے پیپلز پارٹی کو چوتھی بار اقتدار کے سنگھاسن پر پہنچادیا،صدر آصف علی زرداری صدارتی عہدہ سنبھالنے سے پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ" پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات کومستحکم کرنے میں مسئلہ کشمیر کو آڑے نہیں آنے دیا جائے گااور اگر اِس معاملے کو حل کرنے کی ذمہ داری اگلی نسلوں پر چھوڑ دی جائے تو بہتر ہے۔"بعد میں انہوں نے یہ بھی کہاکہ" کشمیر کو سائیڈ لائن پر رکھ کر بھارت سے باہمی روابط مضبوط بنائے جا سکتے ہیں۔"یہ دراصل وہ امریکی زبان تھی جو وہ صدر صاحب بول رہے تھے،جب ملک کی سیاسی جماعتوں کی طرف سے اُن کے بیان پر کڑی تنقید ہوئی تو انہوں نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہاکہ "کشمیر پر پاکستان کے دیرینہ موقف میں تبدیلی نہیں آئی ہے۔" مگراِس کا عملی ثبوت اُس وقت عیاں ہو کر سامنے آگیاجب نیویارک سے شائع ہونے والے اخبار" وال اسٹریٹ جرنل"کو دیئے گئے انٹرویو میں صدر زرداری نے کہاکہ کشمیر کے اندر جو لوگ مسلح جدوجہد میں سرگرم ہیں وہ اصل میں دہشت گرد ہیں،بھارت پاکستان کیلئے خطرہ نہیں ہے اور نہ ہی اُس کے بڑھتے ہوئے "اثرورسوخ سے پاکستان کو ڈر ہو سکتا ہے۔

صدر کے بیان سے یہ بات صاف محسوس کی جا سکتی تھی کہ کشمیر کے بارے میں اُن کی سوچ اور خیالات میں ہی نہیں بلکہ حکمت عملی میں بھی لچک اور تبدیلی پائی جاتی ہے اور اِس کا عملی اظہار گذشتہ دنوں موجودہ حکمران جماعت بھارت کو پسندیدہ ملک قرار دے کر کر بھی چکی ہے، حال ہی میں مالدیپ میں ہونے والی سارک سربراہ کانفرنس کے موقع پر وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے بھارتی وزیر اعظم منموہن سنگھ سے ملاقات میں یہ دعویٰ بھی کیا کہ کشمیر سمیت تمام تنازعات با مقصد مذاکرات کے ذریعے طے ہونگے اور اگلے سال مئی کے بعد برصغیر کے عوام کو خوشخبری سنا دی جائے گی، مگر بھارتی وزیر اعظم نے بھارت پہنچتے ہی بھارت ساتھ کے تجارت کو فروغ دینے کے خواہش مند اور پسندیدہ ملک قرار دینے والے ہمارے خوش فہم وزیراعظم کو دو ٹوک الفاظ میں باور کرادیا کہ پاکستان کی جانب سے دہشت گردی کیخلاف موثر اقدامات تک وہ پاکستان کا دورہ نہیں کرینگے، یعنی بالفاظ دیگر وہ یہ کہہ رہے تھے کہ حکومت پاکستان کی جہاد کشمیر میں مصروف کشمیری عوام اور حریت پسند تنظیموں کے خلاف کارروائی ہی مسئلہ کشمیر کو کسی ممکنہ حل کی طرف لے جا سکتی ہے، دراصل بھارت آزادی کشمیر کی تحریک کو پاکستان کی اخلاقی و سیاسی حمایت سے محروم کرکے باآسانی کچلنا چاہتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا وزیراعظم پاکستان نے ایسے ہی اقدامات کے تحت مسئلہ کشمیر کے حل کی قوم کو نوید سنائی ہے، اگر خدانخواستہ ایسا ہے تو اِس کا مطلب اِس کے سوا

اور کیا ہو سکتا ہے کہ پاکستان خود کشمیر کو پلیٹ میں رکھ کر بھارت کے حوالے کر دے۔
حقیقت یہ ہے کہ ہماری حکومت کو کشمیر کے حل سے کوئی دلچسپی نہیں اور نہ ہی اِس حوالے سے وہ کوئی واضح حکمت عملی اور ایجنڈا رکھتی ہے، ویسے بھی تاریخ گواہ ہے کہ مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے حکومتوں کی پالیسیاں کبھی بھی عوامی جذبات کی نمائندہ نہیں رہیں، ہماری کسی بھی حکومت نے مسئلہ کشمیر کو مثبت انداز میں حل کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی، جس کی وجہ سے کشمیر کاز کو ہر دور میں نقصان ہوا ہے، حکمرانوں نے 63 سال جذباتی کارروائیوں، غیر حقیقت پسندانہ سیاسی پالیسیوں اور غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل کی بھینٹ چڑھا دیئے، اگر یہی روش آئندہ بھی جاری رہی تو اگلے تریسٹھ برسوں میں بھی یہ مسئلہ حل طلب ہی رہے گا، یہی وجہ ہے کہ کشمیری بھائی پاکستانی حکمرانوں کی دوغلی اور منافقانہ پالیسی سے سخت نالاں ہیں، انہیں پاکستان سے گلہ ہے کہ وہ کئی عشروں سے جاری تحریک آزادی کشمیر کی اخلاقی پشت بانی بھی نہیں کر رہا ہے، جبکہ وہ 1989ء سے اب تک بھارتی تسلط سے آزادی کیلئے ایک لاکھ جانوں اور ہزاروں بہنوں کی عصمتوں کی قربانی دے چکے ہیں اور آج بھی 8 لاکھ درندہ صفت بھارتی افواج کے سامنے ڈٹے ہوئے ہیں، اِن حالات میں میڈیا کا پروجیکٹ کردہ اور مستقبل کا متوقع حکمران ہونے کے دعویدار عمران خان بھی اگر وہی راگ

الاپیں، اُسی پالیسی کو جاری رکھنے کا اعادہ کریں اور دونوں ملکوں کے درمیان اعتماد سازی
اور تعلقات کی بحالی کا وہی فارمولا کہ" پاکستان اور بھارت کے درمیان باہمی دوستی
اور رشتوں کو قائم اور استوار رکھنے کیلئے مسئلہ کشمیر کو مستقبل میں حل کرنے کیلئے
چھوڑدیا جانا چاہیے" پیش کریں جسے صدر زرداری نے پیش کیا تھا اور جسے میاں نواز
شریف نے یہ کہہ کر آگے بڑھایا تھا کہ" دونوں ممالک کو مسئلہ کشمیر پر اپنے 60 سالہ
موقف سے باہر نکل آنا چاہیے"تو اِس کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ عمران خان بھی
نواز شریف اور آصف علی زرداری کی طرح کشمیری حریت پسندوں اور عوام کی
قربانیوں کے طویل سفر کو غلط ثابت کرکے اُن کی آزادی کی تحریک کو ایک ایسے مرحلے
پر سبوتاژ کرنا چاہتے ہیں، جب مقبوضہ کشمیر کے چپے چپے سے حق خودارادیت کیلئے
آوازیں بلند ہو رہی ہیں اور پوری دنیا کے میڈیا میں یہ مسئلہ ایک کرنٹ ایشو بن چکا
ہے، خود کشمیری عوام اپنی جدوجہد کے اِس نازک مرحلے پر کھڑے اپنے خون سے
تحریک آزادی کشمیر کی آبیاری کرکے یہ ثابت کررہے ہیں کہ وہ بھارت کے ظالمانہ شکنجے
سے آزادی حاصل کیے بغیر کسی قیمت پر راضی نہیں ہونگے۔

یقیناً عمران خان کے بیانات سے یقیناً بھارت بہت خوش ہوا ہوگا، جس نے 1948ء
سے اِس مسئلہ کو آئندہ کی نسلوں کے لیے اٹھا رکھا ہے اور کشمیریوں کی نسل کشی میں
مصروف ہے، مگر ہمارا ماننا ہے کہ عمران خان نے نہ صرف کشمیریوں کے جذبات

مجروح کیے ہیں بلکہ بے شمار پاکستانیوں کو بھی شدید مایوس کیا ہے، بھارت تو یہی چاہتا ہے کہ پاکستان مسئلہ کشمیر کو بھول کر باہم تجارت کو فروغ دے، عمران خان نے مسئلہ کشمیر کو مستقبل کیلئے علیحدہ رکھ چھوڑنے کی بات کرکے بھارت کے موقف ہی کی تائید کی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ آئندہ نسلوں اور مستقبل کے لئے وقت کا تعین کون کرے گا؟ کشمیر میں اب تک تین نسلیں شہید ہوچکی ہیں اور کتنی نسلوں کے لہو تک انہیں اِس مسئلہ کے حل کا انتظار کرنا ہوگا؟ حیرت کی بات ہے کہ تحریک انصاف کے قائد عمران خان نے کشمیر میں بھارتی فوج کی درندگی، غارت گری اور کشمیری بہنوں کی عصمت دری کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا، انہوں نے یہ تو کہا کہ مسئلہ کشمیر کا جو بھی حل ہو اُس میں بندوق کا استعمال نہیں کیا جانا چاہیے، لیکن کیا اُن کے علم نہیں کہ بندوق کون استعمال کررہا ہے؟ کیا وہ نہیں جانتے کہ 1989ء سے قبل کشمیریوں نے مسلح جدوجہد کا راستہ اختیار نہیں کیا تھا؟ اسی طرح انہوں نے گورنر پنجاب سلمان تاثیر کے حوالے سے بھی کہا ہے کہ اُس کا قاتل ہیرو بن گیا، مگر شاید وہ یہ بھول گئے کہ گورنر پنجاب توہین رسالت کی مرتکب سزایافتہ مجرمہ آسیہ مسیح کی کھلے عام سرپرستی میں مصروف تھے، انہوں نے توہین رسالت کے قانون کو کالا قانون بھی کہا، اُن کا یہ عمل اسلام اور مملکت کے قانون کے خلاف اور لاکھوں عاشقان مصطفیٰؐ کے مذہبی جذبات کو مجروع کرنے کا سبب بنا، یہی وہ بنیادی وجہ تھی کہ آج اُس کا قاتل مسلمانوں کا ہیرو بنا ہوا ہے، بالکل اُسی طرح جس طرح

غازی عبدالقیوم اور علم الدین شہید عاشقان مصطفیٰ کے ہیرو ہیں۔
بلاشبہ عمران خان پاکستان کی گندی سیاست میں ایک قابل قدر اضافہ ہیں،انھوں پندرہ سال کی مسلسل محنت اور جدوجہد کے بعد اپنا مقام پیدا کیا ہے،لوگ انہیں امریکی غلامی اور ملک میں مسلط جاگیردارانہ نظام کے خلاف ایک نجات دہندہ کے روپ میں دیکھ رہے ہیں،ہزاروں لوگوں نے اُن سے روشن مستقبل کی اُمیدیں وابستہ کی ہوئی ہیں،مگرایسے میں اِس قسم کے دل آزار بیانات اُن کی مستقبل کی سیاست پر کئی سوالیہ نشان لگارہے ہیں،کیا انہیں نہیں معلوم کہ بھارت کے ساتھ یکطرفہ دوستی و باہمی اعتماد سازی کے نام پر آلو پیاز کی تجارت اور بس سروس چلانے کی کوشش مظلوم کشمیریوں کے خون کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے،وہ نہیں جانتے کہ کشمیر کاز کو سائیڈ لائن کرکے تجارت کو فروغ دینے کا مطلب بھارت کو فائدہ پہنچا کر اُس کی علاقائی تھانیداری پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے سوااور کچھ نہیں ہے،کیا وہ نہیں جانتے کہ کشمیر کو نظر انداز کرکے قومی مفادات کا سودا کرنیوالی قیادت کبھی بھی پاکستانی عوام کیلئے قابل قبول نہیں ہوسکتی اور نہ ہی مسئلہ کشمیر حل کئے بغیرپاک بھارت تعلقات بہتر ہوسکتے،کیا وہ اِس حقیقت سے بھی آگاہ نہیں کہ محض اقتدار کے حصول کیلئے بھارت اور امریکی خوشنودی کی خاطر کشمیری عوام کی امنگوں کیخلاف جانا اور عاشق رسول ممتاز قادری کو اپنا ہیرو قرار دینے پر ناپسندیدگی کا

اظہار کرنا کروڑوں مسلمانوں کے مذہبی جذبات اور دینی جذبوں کی توہین ہے، لہٰذا ہمارا
عمران خان کو مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ اپنی طرز فکر اور موجودہ موقف پر نظر ثانی
کریں، کہیں ایسا نہ ہو کہ بھارت کی خوشامد اور امریکی چاپلوسی میں اُن کی شخصیت کا پورا
مجسمہ ہی مین بوس ہو جائے، کیونکہ مسئلہ کشمیر محض چند ہزار میل پر مشتمل قطعہ زمین کی
بندر بانٹ کا معاملہ نہیں بلکہ یہ ڈیڑھ کروڑ کشمیریوں کے مستقبل کا ایسا سوال ہے، جس
سے پاکستان کی ترقی و خوشحالی کے ساتھ سلامتی و استحکام بھی وابستہ ہے اور کیوں نہ ہو
کہ "کشمیر پاکستان کی شہہ رگ ہے" اور شہہ رگ کے بغیر نہ تو کوئی انسان زندہ رہ سکتا
ہے اور نہ ہی کوئی ملک۔

صرف احتجاج اور بائیکاٹ کافی نہیں۔۔۔۔

قومی عزت و وقار سے بالاتر کوئی چیز نہیں۔۔۔۔۔

وطن عزیز پاکستان اِس وقت شدید بحرانی کیفیت سے دوچار ہے، ہر آنے والے دن کے ساتھ ملک کے حالات سنگین سے سنگین تر ہوتے جارہے ہیں، جس کی وجہ سے ہر محب وطن شہری جو کئی عشروں سے حکمرانوں کی بوئی ہوئی بھوک، مہنگائی، بے روزگاری، دہشت گردی اور کرپشن کی فصل کاٹ رہا ہے، بے یقینی اور مایوسی کا شکار ہے، ہر کوئی جانتا ہے کہ کاروبار مملکت خوش اسلوبی سے نہیں چل رہا، حال یہ ہے کہ مایوسی اور بے یقینی نے تمام قومی اداروں پر منفی اثرات مرتب کر رکھے ہیں، مگر اِن تمام تلخ حقائق سے بے نیاز ہمارے حکمران اپنی معیاد حکومت پوری کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہیں، پیر پگارا نے کہا تھا کہ نومبر کا مہینہ حکومت کے لئے بھاری ہے، واقعی ماہ نومبر حکومت کیلئے بہت بھاری رہا،اِس ماہ میں میمو اسکینڈل، حسین حقانی کا استعفیٰ، شیریں رحمٰن کی بطور سفیر تقرری، سپریم کورٹ میں حکومت کی این آر او نظرثانی اپیل کا مسترد ہونا، شاہ محمود قریشی کی تحریک انصاف میں شمولیت سمیت صدر زرداری پر سنگین الزامات جیسے پے درپے واقعات نے ملکی سیاست میں ہلچل مچادی، مگر 26 نومبر کو نیٹو کا

پاکستانی چوکیوں پر فضائی حملے نے اِن اہم واقعات کو نہ صرف پس پشت ڈال دیا بلکہ قوم کے دل و دماغ کی چولیں بھی ہلا کر رکھ دیں۔

بد قسمتی سے امریکی دہشت گردی کی نام نہاد جنگ میں کرائے کا سپاہی بننے سے ملک کے مقتدر طبقے میں ایک ایسے گروہ نے جنم لے لیا جس کی وفاداری پاکستان سے زیادہ امریکی مفادات کے تحفظ سے مشروط ہے اور اِس طبقے کے نزدیک دنیاوی مفادات ملک کے قومی، ملی اور دینی مفادات سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، یہی وہ طرز عمل ہے جس نے مقتدر اعلیٰ کے جذبہ حب الوطنی کو عوام کی نظر میں مشکوک بنادیا ہے، مائیک مولن میمو اور حسین حقانی کے استعفے سے پیدا ہونے والے اِس سوال سے ابھی قوم سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ نیٹو کی پاکستانی چوکی پر حملے جس میں پاک فوج کے ایک میجر ایک کیپٹن سمیت جوانوں کی شہادت اور متعدد زخمیوں کی خبر نے اُن کے ہوش اڑا دیئے، نیٹو کی اِس 26 جارحیت پر آج پوری قوم سراپا احتجاج ہے، اس حملے پر اٹھنے والا شور ایک فطری عمل ہے، مگر اِس شور میں سپریم کورٹ کے فیصلے اور میمو اسکینڈل کی بازگشت گم ہو گئی ہے، جو یقیناً میمو کے اصل مصنفوں کیلئے باعث سکون ہوگی۔

دوسری جانب پاکستان کے حکومتی اور عسکری حلقوں نے اُسی روایتی رد عمل کا مظاہرہ کیا جس کا وہ ماضی میں کرتے رہے ہیں، کابینہ کی کمیٹی برائے دفاع کے

ہنگامی اجلاس میں قوم کے غم وغصے کو کم کرنے کیلئے کچھ فیصلے بھی کئے گئے، جن میں نیٹو افواج کی سپلائی بند کردینے کا اعلان اور شمسی ایئر بیس کو پندرہ روز کے اندر اندر امریکی فوج سے خالی کرانے کا کہا گیا اور آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی نے اِس طرح کی جارحانہ کارروائیوں کو نا قابل قبول قرار دیتے ہوئے مستقبل میں ایسی کسی کاروائی کا جواب دینے کے لئے تیار رہنے کی ضرورت پر زور دیا، اب یہ بھی کہا جارہا ہے کہ پاکستان مذکورہ واقعے پر احتجاج ریکارڈ کرانے کے لئے بون کانفرنس میں شرکت نہیں کرے گا، وزیر اطلاعات اِس حکومتی فیصلے کو ٹرننگ پوائنٹ قرار دی دے رہی ہیں، سفارتی سطح پر بھی اسلام آباد، برسلز اور واشنگٹن میں روایتی احتجاجی مراسلے متعلقہ حکام کو دیئے گئے ہیں، دوسری جانب امریکی حکومت اور نیٹو کی اعلیٰ کمان کی جانب سے بھی مذکورہ واقعے پر روایتی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے پاکستان کے ساتھ مل کر مشترکہ تحقیقات کی پیشکش کی گئی اور واقعے کی فوری وجوہات معلوم کرکے ذمہ داری کا تعین کرنے کی یقین دہانی کرائی گئی ہے، مگر تحقیقات کے نتائج سامنے آئے بغیر پاکستان سے معافی مانگنے سے صاف انکار کردیا ہے۔

لیکن اَمر واقعہ یہ ہے کہ اِس تمام رد عمل میں کوئی ایک بھی چیز ایسی نہیں ہے، جس کی بنیاد پر یہ ضمانت مل سکے کہ ہماری سرزمین پر آئندہ اِس قسم کا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوگا، پاکستانی عوام کو اصل تشویش ہی اِس بات پر ہے

کہ حکمرانوں کے بقول ہم نیٹو اور امریکہ کے حلیف اور اتحادی ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ امریکی اور نیٹو فورسز بار بار ہماری سرزمین پر ایسی کارروائیاں کرتی ہیں۔؟ کیوں ہماری سلامتی اور خودمختاری کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں۔؟ ہمارے حکمران کیوں اِن اشتعال انگیز کاروائیوں پر خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں۔؟اور کیوں ہماری سرحدوں کے محافظ کوئی جوابی کاروائی نہیں کرتے۔؟ جبکہ ملکی سلامتی اور خودمختاری کے خلاف اِس قسم کے خطرناک اور اشتعال انگیز رویے کی اکثر و بیشتر مثالیں سامنے آتی رہتی ہیں، مگر پھر بھی ہم امریکی نام نہاد دہشت گردی کی جنگ کے فرنٹ لائن اتحادی ہیں اور اب تک اِس جنگ میں 35 ہزار جانوں کی قربانی کے ساتھ 40 ارب ڈالر سے زائد کا مالی نقصان اٹھاچکے ہیں،اِس کے باوجود اعلیٰ امریکی قیادت ہم پر دہشت گردوں کی موجودگی کے الزامات لگاتی ہے،ذرائع ابلاغ کے ذریعے پاکستان پر " دہرا کھیل " کھیلنے کا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے،براہِ راست پہلے آئی ایس آئی اور پھر پاک فوج پر " دہشت گردوں "کی سرپرستی کے الزام لگائے جاتے ہیں اور بابانگ دہل اعلان کیا جاتا ہے کہ امریکہ اور اُس کے حواری پاکستانی سرحدوں کے اندر موجود اِن دہشت گردوں کے خلاف ہر قسم کی کارروائی کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔

مگر حقیقت حال یہ ہے کہ جیسے جیسے امریکی نام نہاد دہشت گردی کی جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہورہی ہے،پاکستان اور امریکی مفادات کا تصادم بڑھتا

جارہا ہے،اب تک پاکستانی حکمرانوں کا موقف یہ تھا کہ دونوں ممالک مشترکہ دشمنوں کے خلاف جنگ لڑرہے ہیں، لیکن جب کوئی بھی قومی و ملکی سلامتی کا حساس اور نازک مرحلہ سامنے آتا ہے، ہماری فوجی اور سیاسی قیادت اپنا سابقہ موقف تبدیل کرلیتی ہے، یہ طرز عمل ثابت کرتا ہے کہ ہماری سابق اور موجودہ قیادت صرف قوم کو فریب دینے کیلئے صرف رسمی احتجاج تک محدود ہے،آج یہ مرحلہ تیسری بار سامنے آیا ہے،جب پاکستانی فوجی اور سیاسی قیادت نے سخت ردِ عمل کا مظاہرہ کیا ہے،آپ کو یاد ہوگا کہ امریکی جاسوس ریمنڈ ڈیوس کی گرفتاری اور ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادین کے ٹھکانے پر امریکی کمانڈو کا حملہ بھی ایک ایسا ہی مرحلہ تھا، جبکہ اِس سے قبل بھی امریکی فوجی پاکستان کی سرحدوں کی خلاف ورزی کرتے اور پاکستانی فوجیوں کو نشانہ بناتے رہے ہیں اور ہماری فوجی قیادت سخت ردِ عمل کا اظہار کرتی رہی، مگر اَمر واقعہ یہ ہے کہ پاکستانی سرحدوں کی خلاف ورزی کوئی نئی بات نہیں، ہر بار پاکستانی حکومت کی فدویانہ چیخ و پکار اور قوم کو دی جانے والی طفل تسلیوں کے باوجود دوسری جانب سے اِس جارحانہ رویئے پر کسی قسم کی معذرت اور معافی کا اظہار نہیں کیا جاتا، بلکہ سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ ہماری سرزمین پر اِس قسم کی زیادہ تر کارروائیوں کے بارے میں امریکہ اور اُس کے اتحادیوں کی جانب سے علی الاعلان کہا جاتا ہے کہ یہ کارروائیاں حکومت پاکستان کی مرضی سے کی جارہی ہیں، جن کیلئے شمسی اور شہباز ایئر بیس جیسے متعدد پاکستانی ہوائی اڈے استعمال

ہو رہے ہیں، اب ایک بار پھر شمسی ایئر بیس کو پندرہ دن میں خالی کرانے کی بات کی جارہی ہے، حالانکہ اِس اڈے کے بارے میں پہلے کہا گیا تھا کہ امریکن فوج یہ ہوائی اڈا خالی کرچکی ہے۔

اب دوبارہ اِسی بات کو دہرانے کا مطلب جہاں عوامی غم وغصے کو ٹھنڈا کرنے کے حربے کے سوا اور کچھ نہیں، وہیں یہ بات یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ ہمارے حکمران بے شمار معاملات قوم سے پوشیدہ رکھے ہوئے ہیں، جن پر امریکہ اور اُن کے درمیان خاموش مفاہمت موجود ہے، یہ صورتحال یقیناً ملکی و قومی سلامتی کے حوالے سے بے حد تشویشناک ہے، کیونکہ کوئی بھی محب پاکستانی یہ سوچ ہی نہیں سکتا کہ قومی و ملکی خود مختاری کے خلاف اِس قسم کے واقعات کی اجازت دی جاسکتی ہے، لہٰذا اب ہماری سول اور عسکری قیادت کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ دہشت گردی کے نام پر لڑی جانے والی اِس جنگ میں آج کے بعد ہمارا کردار کیا ہونا چاہیے، اب ہمیں امریکہ اور نیٹو کمان کو یہ صاف اور واضح پیغام دینا ہوگا کہ ہماری برداشت کی حد ختم ہوچکی ہے اور آئندہ اِس قسم کی جارحیت کا منہ توڑ جواب دیا جائے گا، محض بون کانفرنس میں شرکت نہ کرنے، نیٹو کی سپلائی روک دینے یا ایک آدھ ایئر پورٹ خالی کرانے کے اقدامات کافی نہیں اور نہ ہی اسے پاک امریکہ تعلقات میں ٹرننگ پوائنٹ قرار دیا جاسکتا ہے، کیونکہ نیٹو کا پاکستانی سیکورٹی فورسز پر حملہ ملکی سالمیت پر حملے کے مترادف ہے۔

لہذا ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ نیٹو حملوں کے رد عمل کے طور پر حکومت نیٹو ممالک سے اپنے سفیروں کو واپس بلالیتی اور افغانستان میں امریکہ و صلیبی حواریوں کی دہشت گردی میں مزید تعاون سے انکار کردیتی، مگر افسوس کہ ایسا نہیں کیا گیا، حالانکہ امریکی جارحیت کے خلاف پارلیمان اور پارلیمان سے باہر تمام جماعتیں متفقہ موقف اختیار کرچکی ہیں، کل جماعتی کانفرنس کے بعد کابینہ کی دفاعی کمیٹی کے اجلاس کے فیصلے اِس بات کا تقاضہ کرتے ہیں کہ دہشت گردی کے خلاف نام نہاد امریکی جنگ میں مزید شرکت سے معذوری اختیار کرلی جائے، کیونکہ یہ مسئلہ چند فوجیوں کی جانوں کا نہیں بلکہ ملک و قوم کی سلامتی کا ہے، ہماری نظر میں نیٹو کا یہ حملہ پاکستان کی خود مختاری پر حملے کے مترادف ہے، اِس لیے ناگزیر ہے کہ ہماری عسکری و سیاسی قیادت محض بیان بازی اور رسمی قراردادوں پر ہی اکتفا کرنے کے بجائے ملک اور قوم کے مفادات سے ہم آہنگ اور وہ جرات مندانہ فیصلے کرے، جس میں ہماری بقاء، آزادی، خود مختاری اور پرامن و خوشحال مستقبل کی ضمانت موجود ہو اور جو ہمارے قومی عزت و وقار کے مطابق ہوں، یاد رکھیں کہ دنیا میں سر اٹھا کر جینے کیلئے قومی عزت و وقار سے بالاتر کوئی چیز نہیں ہوتی۔

یوم سقوط ڈھاکہ کا سبق۔۔۔۔

سولہ دسمبر یوم سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے خصوصی تحریر
میجر خلیل احمد مرزا لکھتے ہیں کہ "شام سات بجے کے قریب یونٹ کی طرف سے حکم ملا
کہ تمام کمپنیاں پیچھے آ جائیں، لڑائی ختم ہو گئی ہے، جنرل نیازی نے ہتھیار ڈالنا منظور
کر لیا ہے، چنانچہ پنجاب رجمنٹ کے کمپنی کمانڈر اور میں نے مل کر فیصلہ کیا کہ اپنے
ہتھیار دشمن کے حوالے نہیں کریں گے، ہم نے اپنی رائفلیں اور ایمونیشن ایک بوری
میں لپیٹ کر ایک بڑے درخت کے نیچے گڑھا کھود کر دبا دیا، اس وقت میری آنکھوں
سے آنسو جاری تھے۔۔۔۔۔آہ۔۔۔۔۔ہمیں یہ ذلت بھی دیکھنا تھی، دل و دماغ میں
ایک طوفان سا اٹھ رہا تھا کہ یہ کیا ہو گیا۔۔۔۔۔ہماری آئندہ نسلیں ہمارے متعلق کیا
خیال کریں گی، پاکستان کا ایک حصہ دشمن نے ہم سے علیحدہ کر دیا۔۔۔۔۔۔تاریخ میں
ہندوستان کی کامیابی اور ہماری ناکامی کا ذکر ہو گا" قارئین محترم ! سولہ دسمبر 1971
ء کو آج 40 برس ہونے کو آئے ہیں لیکن محب وطن پاکستانیوں کے دلوں میں میجر
خلیل احمد مرزا کی طرح سقوط ڈھاکہ کے زخم آج بھی تازہ ہیں، سانحہ مشرقی پاکستان
ہماری قومی زندگی کا ایک ایسا المیہ ہے، جسے 40 سال گزرنے کے بعد بھی پاکستان کے
غیور اور باشعور

عوام اپنے ذہنوں سے بھلا نہیں پائے، ان کے سینوں میں اپنے مشرقی بازو کی علیحدگی کا غم ایک لاوے کی طرح دہک رہا ہے۔

سولہ دسمبر 1971ء کا دن اپنے پیچھے ایک ایسی لمبی داستان رکھتا ہے، جس میں اپنوں اور بیگانوں کی سالوں کی پلاننگ اور وہ سازشیں پوشیدہ ہیں، جنھوں نے مشرقی پاکستان کے مسلمانوں میں تعصب، محرومی اور احساس کمتری کو اِس حد تک پروان چڑھایا کہ اُس کے نتائج سقوط ڈھاکہ پر منتج ہوئے۔ گو کہ اِس المیے کے کئی تکلیف دہ پہلو ہیں، لیکن دو پہلو سب سے زیادہ کربناک تھے، ایک تو یہ کہ ہمیں ہندو بنیے کے ہاتھوں ایک ایسی فوجی شکست (جس میں ہماری 90ہزار فوج کو ہتھیار ڈالنا پڑے) کا سامنا کرنا پڑا، جس کی مثال دوسری جنگ عظیم کے بعد نہیں ملتی اور دوسرے پاکستان کی نصف سے زیادہ آبادی والا حصہ ہم سے علیحدہ ہوگیا، یوں پاکستان اپنے قیام کے 24 سال بعد ہی دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا، تاریخ اسلام میں ایسا پہلی مرتبہ نہیں ہوا تھا کہ ایک سلطنت ٹوٹ کر دو علیحدہ علیحدہ مملکتوں میں تقسیم ہوئی ہو۔

لیکن وطن عزیز پاکستان کی دو حصوں میں تقسیم اِس لئے ناقابل فہم اور تکلیف دہ اَمر تھی کہ یہ سرزمین دنیا میں ریاست مدینہ کے بعد اسلام کے نام پر وجود میں آنے والی پہلی سرزمین تھی جو مسلمانان برصغیر کی طویل، صبر آزما

کٹھن جدوجہد اور بے پناہ قربانیوں کے بعد حاصل کی گئی تھی اور جس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی، قیام پاکستان کی کہانی ایک ایسی لہو لہو دستاویز ہے جس کا ہر صفحہ غیرت مند بوڑھوں، حریت سند نوجوانوں، معصوم بچوں اور عفت مآب ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کے خون سے رنگین ہے،گنگا، جمنا، گھومتی، گھاگرا، نربدا، ستلج، بیاس، راوی، چناب سے لے کر جہلم تک وہ کون سا دریا تھا جو مسلمانوں کے خون سے لہو رنگ نہیں تھا،ہر طرف آگ تھی، شور تھا،آہ بکا اور چیخ و پکار تھی، چشم فلک آج بھی گواہ ہے کہ کس طرح لاکھوں مسلمان چھوٹے۔بڑے ڈیروں میں حفاظت اور سلامتی کے خاطر سکڑے سمٹے بیٹھے تھے،یا پر آشوب راستوں پر خاک و خون میں لتھڑے ہوئے اپنی نئی منزل پاکستان کی جانب اُس وقت بھی گامزن تھے،جب ہندو اور سکھ بلوائی چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ "جو مانگے گا پاکستان ،اس کو ملے گا قبرستان"لیکن پھر بھی یہ قافلہ آگ و خون کے دریا عبور کرکے 14 اگست 1947ء کو قائد اعظم محمد علی جناح کی ولولہ انگیز قیادت میں اپنی منزل مراد پاکستان تک پہنچ ہی گیا۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ تخلیق پاکستان کو ہندووں اور مسلمانوں نے اپنے اپنے مخصوص نظریئے سے دیکھا، مسلمانوں کے نزدیک پاکستان کا قیام ایک عظیم کامیابی کی حیثیت رکھتا تھا، جبکہ اِس موقعہ پر ہندووں کا ردعمل ذلت و شکست اور توہین و اہانت کے احساسات سے مملو تھا، ہندووں کی یہی کوشش تھی کہ ہندوستان

تقسیم نہ ہو اور سارے خطے پر ان کی حکمرانی ہو، جبکہ مسلمانوں کے دل احساس تشکر اور طمانیت کے جذبوں سے سرشار تھے کہ ان کی جدوجہد بار آور ثابت ہوئی، مگر ہندو تاریخ کے اِس فیصلے کو کسی طور بھی قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے، وہ اِس نقصان کا ازالہ کرنے کا تہیہ کرچکے تھے، چونکہ پاکستان جغرافیائی لحاظ سے ایک وحدت نہیں تھا، یہ دنیا کا واحد منفرد ملک تھا جس کے دونوں بازوں کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ تھا، درمیان میں دشمن کا علاقہ واقع تھا اور سوائے مذہب اور مشترکہ جدوجہد آزادی کے دونوں کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں تھی، صرف ایک دین اسلام ہی تھا جو دونوں بازوں کو ایک وحدت، ایک لڑی اور ایک زنجیر میں باندھ سکتا تھا اور پاکستانی قوم کو یک جہتی و استحکام دے سکتا تھا، ہمارا دشمن اچھی طرح جانتا تھا کہ جب تک یہ تعلق یہ رشتہ مضبوط ہے پاکستان توانا و مضبوط اور متحد و مستحکم رہے گا، جہاں یہ رشتہ کمزور ہوا پاکستان کمزور ہوجائے گا، چنانچہ پاکستان دشمنوں نے قیام پاکستان کے بعد سے مشرقی پاکستان میں نسلی، لسانی اور صوبائی و علاقائی نفرت و عصبیت کو پروان چڑھانا شروع کردیا، رہی سہی کسر ہمارے حکمرانوں کی ناعاقبت اندیش پالیسیوں نے پوری کردی، بقول زیڈ اے سلہری "ان (حکمرانوں) کی پالیسیوں نے ملک کو افسوسناک طور پر تقسیم کردیا" جس کا منطقی نتیجہ متحدہ پاکستان کے خاتمے کی شکل میں ہمارے سامنے آیا۔

یہ حقیقت ہے کہ " جو قوم اپنی تاریخ کو فراموش کردیتی ہے،اس کا جغرافیہ اسے
فراموش کردیاہے "زندہ قومیں اپنے ماضی اور حال پر تنقید کرکے مستقبل کو روشن کو
کرتی ہیں، کسی قوم کے ذہنی طور پر بالغ ہونے کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ خود اپنے
آپ کو اپنے ماضی اور حال کو تنقید کا موضوع بنائے اور اگر خود میں کوئی خامی نظر آئے
تو اس کی ذمہ داری دوسرے افراد یا کسی دوسری قوم پر ڈالنے کے بجائے یہ معلوم
کرنے کوشش کرے کہ اِس شکست و ریخت میں خود اُس کا اور اُس کی قوم کے دیگر افراد
کا کیا کردار ہے،زندہ قومیں اِس قسم کے تجزیئے اور تنقید سے اہم نتائج اخذ کرتی ہے اور
ماضی و حال کی خامیوں اور غلطیوں سے آگاہ ہوکر اپنے مستقبل کیلئے صحیح راستے تلاش
کرتی ہیں، وہ کوشش کرتی ہیں کہ اگر تاریخی عوامل نے انہیں شکست و زوال کی منزل پر
کھڑا کر بھی دیا ہے تو مزید تباہی و بربادی کا راستہ اختیار نہ کیا جائے بلکہ قومی سلامتی و
بقاء کی نئی راہیں تلاش کی جائیں،تاریخ گواہ ہے کہ سمجھدار قومیں اپنی ناکامیوں کو حرز
جان نہیں بناتیں بلکہ ان کے اسباب و علل کو ہمیشہ سامنے رکھتی ہیں اور ا ن سے سبق
سیکھتے رہنے کا داعیہ ان میں کبھی بھی ختم نہیں ہوتا۔
یہی ایک زندہ اور توانا قوم کی شناخت و علامت ہے،آج 40 برس گزر جانے کے بعد اِس
بحث سے قطع نظر کہ ہم نے اپنی ناکامی کے اسباب سے کتنا سبق سیکھا

ہے، کٹتا نہیں، ہم اِس حقیقت کبریٰ کے اصولی و عملی تقاضوں کو ہر گز ہر گز فراموش نہیں کر سکتے کہ پاکستان اسلام کے نام پر اور اسلام کی خاطر حاصل کیا گیا تھا، یہ مملکت خدا داد خالصتاً جمہوری جدوجہد کے بعد اِس مقصد کیلئے حاصل کی گئی تھی کہ یہاں مسلمان دین اسلام کے عملی تقاضوں کی روشنی میں اپنی زندگی بسر کریں گے اور اقتصادی و معاشی ترقی و خوشحالی کی منزلیں طے کریں گے، یہی وہ واضح اور بنیادی فرق تھا، جس کی اساس تاریخ جغرافیے اور معدنی وسائل کی تقسیم پر نہیں بلکہ دو قومی نظریئے کے منفرد نظریاتی، تشخص پر رکھی گئی تھی، جسے ہمارے ارباب اختیار آج پھولوں کے ہاروں سے مٹانے کی یک طرفہ سعی ناکام کر رہے ہیں، وہ بھول رہے ہیں کہ قائدِ اعظم محمد علی جناح نے 1948ء میں اسلامیہ کالج پشاور کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے قیام پاکستان کے اصل محرک کو واضح کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کیلئے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے، جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو نافذ کر سکیں۔"

مقصد واضح تھا تحریک پاکستان کے رہنماؤں اور مفکروں کے ذہن و فکر میں کوئی الجھن نہ تھی، ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کے دل و دماغ میں کوئی ابہام نہیں تھا، لیکن آج 64 برسوں کے بعد بھی ہم پاکستان کو اسلامی نظام کی تجربہ گاہ اور قرآن و سنت کی روشن تعلیمات کی آماجگاہ نہیں بنا سکے، منطقی نتیجہ

سقوط ڈھاکہ کے دلدوز سانحے کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے،ہماری اسی کمزوری
کا فائدہ آج دشمن ایک بار پھر اُٹھانا چاہتا ہے، وہ بلوچستان، سرحداور آزاد قبائلی علاقوں
میں قومی، لسانی اور علاقائی عصبیت کو فروغ دے کر پاکستان کی وحدت اور سالمیت کو
نقصان پہنچانے کے درپے ہے،وہ بلوچستان میں وہی کھیل کھیل رہا ہے جو بنگلہ دیش بننے
کا محرک بنا تھا،اِس وقت ملک کی مجموعی صورتحال یہ ہے کہ ہم نوع بہ نوع مسائل میں
گھرے ہوئے ہیں،نائین الیون کے بعد امریکہ کا ساتھ دینے کے باعث قوم مایوس، شکستہ
دلی اور مردنی کا شکار ہے،ایٹمی طاقت اور بہترین جغرافیائی محل وقوع رکھتے ہوئے بھی
ہمارا حال یہ ہے کہ ہمارے اناج پر زندہ رہنے والا افغانستان جیسا ملک ہم پر در اندازی
کے الزامات لگاتا اور ہم پر حملے کی دھمکیاں دیتا ہے،پورا ملک امریکی کالونی بنا ہوا
ہے،امریکی عمال حکمرانوں کیلئے احکامات وہدایت نامے لیے دندناتے پھرتے ہیں،بات
بات پر بھارت ہمیں آنکھیں دکھاتا ہے،کھلے عام ہماری سرحدوں کی خلاف ورزی کی
جارہی ہے،امریکہ،اسرائیل اور اُس کے حواریوں کی سرپرستی میں بھارتی قیادت کے
جارحانہ بیانات،اُس کی جنگی تیاریاں،اُس کے خطرناک عزائم کی نشاندہی کررہے ہیں۔
لیکن ہمارے حکمراں ہیں کہ بھارت جیسے ازلی دشمن سے محبت کی پینگیں بڑھارہے
ہیں،دوستی اور پسندیدہ ملک قرار دینے کے راگ الاپ رہے ہیں اور ملک کو قوم

کو دھوکہ دینے کیلئے "بھارت سے کوئی خطرہ نہیں، ملک کا دفاع مضبوط ہاتھوں میں ہے، بیرونی جارحیت کا منہ توڑ جواب دیاگا۔" جیسے زبانی بیانات کے گولے داغ رہے ہیں، دوسری طرف ہمارے مدارس، مذہبی تنظیمیں، دینی شخصیات اور ہمارا مذہبی تشخص ہر سنگ اور تیر دشنام کا نشانہ بنا ہوا ہے، مغربی تہذیب و اقدار کو سرکاری سرپرستی دی جارہی ہے اور استعماری دباؤ پر مدارس، رفاعی اور فلاحی اداروں پر پابندی لگائی جارہی ہے، حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا یہ منظر نامہ کسی طور پر بھی خوش آئند نہیں، آج وہ پاکستان گہری دھند میں لپٹتا جارہا ہے، جس کے خدوخال 64 سال پہلے قربانیوں کی لازوال تاریخ رقم کرنے والوں کی آنکھوں کو لو دیتے تھے، لیکن اہل ایمان مایوس نہیں ہیں، پاکستان پر اللہ کریم کا خصوصی فضل و کرم تھا، ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ رہے گا، پاکستان ہمیشہ قائم و دائم رہے گا، صرف ضرورت اِس اَمر کی ہے کہ ہمارے رہنما، سیاسی قائدین، پالیسی ساز ادارے اور حکمران اِس حقیقت کا احساس کرلیں کہ اسلام کے نام پر قائم ہونے والی ریاست کو اپنی سلامتی و بقاء اور استحکام کیلئے اسلامی نظام کی کارفرمائی درکار ہے، یہی وہ حقیقت ہے جس کا ادراک ارضِ پاک کیلئے اپنا سب کچھ قربان کرنے والے مجاہدوں اور مسلمانان برصغیر کی تمناؤں کے چراغ کو روشن رکھ کر موجودہ پاکستان کو مزید تقسیم سے بچاسکتا ہے، ہمیشہ قائم و دائم رکھ سکتا ہے اور دشمنانِ دین وملت کے ناپاک مذموم عزائم کو خاک میں ملا سکتا ہے۔

ایوان صدر کا کچن زندہ باد۔۔۔۔

ایسی جمہوریت سے آمریت بہتر ہے۔۔۔۔۔
آج پاکستان کی معیشت کس سطح پر پہنچ چکی ہے اِس کا اندازہ اِس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ملک میں زر مبادلہ کے ذخائر کم ہو رہے ہیں، پاکستانی کرنسی ہر گزرتے دن کے ساتھ اپنی قدر کھو رہی ہے، فیکٹریوں، ملوں اور کارخانوں کے پاس آرڈرز ہیں لیکن پروڈکشن دینے کیلئے بجلی اور گیس نہیں ہے، جس کی وجہ سے ایکسپورٹس نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے، سابقہ آمرانہ دور میں ڈالر 60 روپے کا تھا مگر آج 90 روپے تک پہنچ چکاہے، پٹرول کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں، ایل پی جی کی قیمتوں میں بھی سلسل اضافہ ہو رہاہے، مہنگائی بے لگام گھوڑے کی طرح غریب عوام کو روند رہی ہے، گیس نہ ہونے کی وجہ سے گھریلو صارفین مٹی کے تیل اور لکڑی سے اپنے چولہے چلا رہے ہیں، اندرونی اور بیرونی قرضوں کا حجم خوفناک حد تک بڑھ چکا ہے، جبکہ حکومت نئے نوٹ چھاپ کر ایک ریکارڈ قائم کر رہی ہے، روزانہ اربوں اور کھربوں کرپشن کی داستانیں منظر عام پر آ رہی ہیں، پی آئی اے، پاکستان اسٹیل، واپڈا اور ریلوے جیسا وطن عزیز کا ہر ادارہ کھوکھلا، مقروض اور دیوالیہ ہو چکا ہے، ملک کے

اندرونی حالات، بدامنی، دہشت گردی اور بیڈ گورنس کی وجہ سے بیرونی سرمایہ کاری رک چکی ہے،ایک ایسے ملک میں جہاں سرمایہ دار کیلئے گیس، بجلی اور دیگر سہولیات میسر نہ ہوں،جہاں خام مال کی یہ حالت ہو کہ ہاتھ لگاتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہو اور جہاں سرمایہ غیر محفوظ ہو،وہاں کون سرمایہ کاری کرے گا،حال یہ ہے کہ ہر گزرتا لمحہ پاکستانی معیشت کو تباہی کی طرف لے جارہا ہے لیکن حکمرانوں کا حال یہ ہے کہ اُن کے عیش و عشرت اور اللوں تللوں میں کوئی فرق نہیں پڑ رہا۔

عقل حیران اور ذہن ماؤف ہوجاتا ہے یہ دیکھ کر کہ اِس قدر سنگین معاشی بحران کے باوجود بھی ایوان صدر کے باورچی خانے کی از سرنو تعمیر اور آرائش کیلئے 26 کروڑ 16 لاکھ 85 ہزار روپے کا پی سی ون پلاننگ کمیشن کو منظوری کیلئے پیش کیا گیا ہے،اطلاعات کے مطابق کیپیٹل ڈیولپمنٹ اتھارٹی نے ایوان صدر کے باورچی خانے میں متعلقہ آلات کی تنصیب کیلئے نو کروڑ اٹھاون لاکھ پچھتّر ہزار روپے اور موجودہ اسٹرکچر کو منہدم کرکے نئے ڈیزائن کے آرائش، پلمبرنگ اور فائر فائیٹنگ سمیت دیگر آلات کی تنصیب کیلئے دو کروڑ اسی لاکھ بیس ہزار روپے تجویز کئے ہیں،اسی طرح الیکٹرک ورک،ڈیپارٹمنٹل چارجز،پروجیکٹ ڈائریکٹر کی فیس اور ٹرانسپورٹ کے اخراجات کی مد میں تیرہ کروڑ ستتر لاکھ روپے کی منظوری طلب کی گئی ہے،یہ بھی اطلاعات ہیں کہ پروجیکٹ کا پی سی ون

ڈائریکٹر مینٹیننس ایوان صدر، سی ڈی اے اور پریذیڈنٹ سیکرٹیریٹ کی مشاورت سے رواں سال 27 جون کو منظور کیا گیا تھا، جسے پلاننگ کمیشن پبلک سیکٹر ڈیولپمنٹ پروگرام کے تحت فنانس کرے گا، خیال رہے کہ ایوان صدر میں نئے باورچی خانے کی 2011 تعمیر کے بعد بیک وقت چھ سو وی آئی پی شخصیات کے طعام کا انتظام ممکن ہوگا۔

ایک طرف حال یہ ہے کہ غریب عوام کے چولہے ٹھنڈے پڑے ہیں، لوگ فاقوں سے مر رہے ہیں مگر دوسری جانب ایوان صدر کے باورچی خانے کی تعمیر نو اور بیک وقت چھ سو غریب اور ضرورت مند افراد کے طعام کے انتظامات ہو رہے، قومی دولت اور ملکی وسائل کی اس سے بڑی بے قدری اور کیا ہوگی، یہ ہماری بد قسمتی ہی ہے کہ پاکستانی حکمرانوں کی شخصیت ہمیشہ سے تضادات کا مجموعہ رہی ہے، اقتدار میں آنے سے قبل انہوں نے قوم کو بہت سے دلکش سیاسی نعرے دیئے، لیکن کبھی اِس سچائی کا اظہار نہیں کیا کہ جب تک ہم اپنی معیشت کو نہیں سنواریں گے، اُس وقت تک نہ تو خود عیش و آرام سے رہیں گے اور نہ ہی وہ سہولیات استعمال کریں گے جس سے ملک کے غریب عوام محروم ہیں، اِس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اقتدار میں آنے والے تمام حکمرانوں کا تعلق اُس بالائی طبقے سے رہا جو نعروں کے ذریعے قومی جذبات کو ہوا دیتے ہیں، سنہرے مستقبل کے خواب دکھاتے ہیں اور وعدوں کے جھوٹے لولی پاپ سے قوم کو بہلانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر جب اقتدار میں آجاتے

ہیں تو اپنے تمام دعوئے اور وعدے بھول جاتے ہیں، زیادہ پرانی بات نہیں صدر محترم جب پہلی مرتبہ ایوان صدر میں داخل ہوئے تھے تو قومی میڈیا میں اِس خبر کا بہت چرچا تھا کہ صدر صاحب نے ایوان صدر کی تمام امپورٹیڈ کراکری پیک کرنے اور لوکل کراکری استعمال کرنے کے احکامات جاری کیے۔ابتداء میں اُن کے نجی دوروں کے اخراجات ذاتی جیب سے ادا کرنے کی خبریں بھی میڈیا کی زینت بنی،یاد رہے کہ یہ وہی ہمارے صدر محترم ہیں جنھوں نے اپنے ابتدائی ایام میں کہا تھا کہ پاکستان کوئی لمیٹیڈ کمپنی نہیں جو دیوالیہ ہوجائے،انھوں نے بڑے زور و شور کے ساتھ ملکی معیشت سنوارنے کے دعوئے کیے گئے،ایک کے بعد ایک معاشی ماہرین کی ٹیم منتخب کی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حکومت نے اپنے پونے چار سالہ دور اقتدار میں ملکی معیشت کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کی کوئی عملی کوشش نہیں کی۔

اِس وقت بھی جبکہ ملکی معیشت تباہی کے دہانے پر پہنچ چکی ہے،حکومت کے پاس معیشت کو درست کرنے کا نہ تو کوئی فارمولا ہے اور نہ ہی اُسے اس بات سے کوئی سروکار ہے کہ معاشی اعتبار سے ملک کس طرف جارہا ہے،ہر طرف لوٹ مار اور کرپشن کا بازار گرم ہے،منظور نظر افراد اِس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہے ہیں،خزانہ خالی ہے لیکن ارباب اقتدار مفاہمت کی سیاست کی آڑ میں خود بھی کھاؤ اور ہمیں بھی کھانے دو کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں،آج ملک کا نظام جس

طرح چلایا جارہا ہے اُسے دیکھ کر ہمیں بچہ سقہ اور محمد شاہ رنگیلا کا دور یاد آتا ہے، تاریخ بتاتی ہے کہ جب بچہ سقہ کو ایک دن کا اقتدار ملا تو اُس نے اپنے ایک روزہ دور حکومت میں وہ سب کچھ کرنا چاہا جو برسوں کا متقاضی تھا، جبکہ محمد شاہ رنگیلے میں اپنی رنگین مزاجی اور عیاشی کی بدولت تخت وتاج تو گنوایا ہی، ساتھ ہی ملکی معیشت کا بیڑا غرق کرکے عوام کو الگ نچوڑا اور بدحال کیا، یہی حال ہمارے حکمرانوں کا ہے، آج ملک کے تمام معاشی، سیاسی اور اقتصادی تجزیہ نگار اِس بات پر متفق ہیں کہ پیپلزپارٹی کا موجودہ دور پاکستان کی تاریخ کا وہ بدترین دور حکومت ہے جس میں حکومتی بیڈ گورنس اور ملک و قوم کی تباہی و بربادی کی کہانی مملکت کے ہر درودیوار پر لکھی نظر آتی ہے، ہر شاخ پر الو بیٹھا ہے، مہنگائی میں کئی سو گنا اضافہ ہوچکا ہے، بجلی کی جگہ موم بتی اور تیل کے چراغ جل رہے ہیں، گاڑیوں کی جگہ تانگے اور سائیکل استعمال ہورہی ہیں، گھروں میں گیس کے بجائے لکڑیوں پر کھانا بن رہا ہے، ہر طرف غربت، بھوک اور افلاس کا راج ہے، لوگ خودکشیاں کرنے پر مجبور ہیں، مگر حکومت اپنے پانچ سال پورے کرنے کے سوا کوئی ایجنڈا نہیں رکھتی۔

پاکستانی عوام کی اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہوگی کہ انہیں جو بھی جمہوری یا آمر حکمران ملا اُس نے ہمیشہ عوام کی کھال ادھیڑی، جو بھی نئی حکومت آتی ہے کہ وہ خزانہ خالی ہونے اور عوام سے قربانی مانگتی نظر آئی، لیکن اب عوام

یکث طرفہ قربانیاں دے دے کر تھک چکے ہے، ہوش ربا مہنگائی اور معاشی مسائل نے
انہیں ذہنی مریض بنادیا ہے، دوسری طرف ارباب اقتدار طبقے کا حال یہ ہے کہ اُن کی
طرز زندگی اور بود وباش میں کوئی فرق نہیں آرہا، نہ ہی فضول خرچیاں بند ہورہی ہیں
اور نہ ہی یہ لوگ اپنی بیرون ملک بنکوں میں پڑی دولت واپس پاکستان لانے کو تیار
نہیں ہیں، یہ وہ حالات ہیں جو ہر محب وطن پاکستانی کو دہلا رہے ہیں، معاشی موت
ہمارے سروں پر منڈلا رہی ہے مگر ہمارے صدر مملکت محترم ، معزز وزیراعظم اور سیاسی
قیادت اِس حقیقت کے ادراک سے محروم ہے، قوم کو صبر اور کفایت شعاری کا درس
دینے والوں کواِس بات کا احساس بھی نہیں کہ جن وسائل کے بل بوتے پر وہ عیش
وعشرت کی زندگی گزار رہے ہیں وہ اُن کے پاس ملک و قوم کی امانت ہے، انہیں تو
صرف جمہوریت بچانے اور اپنی مدت پوری کرنے کی فکر لاحق ہے، خواہ ملک میں قحط
جیسی ہی صورتحال کیوں نہ پیدا ہوجائے، خدارا ملک و قوم پر رحم کیجئے، ستم رسیدہ قوم پر
اتنا ظلم مت کیجئے کہ قوم کا سیاسی قیادت اور موجودہ طرز جمہوریت سے اعتماد و یقین ہی
اٹھ جائے اور وہ یہ کہنے پر مجبور نہ ہوجائیں کہ ایسی جمہوریت سے آمریت بہتر ہے ۔

قومی تعمیر وترقی میں کتاب کلچر کا کردار۔۔۔۔

کتاب کلچر کے فروغ میں قومی و ملّی ذمہ داری

عالمی کتب میلہ کتب بینی کے فروغ میں اہم کردار ادا کریگا

یہ حقیقت ہے کہ کوئی درسگاہ اور تعلیم یافتہ معاشرہ کتاب کی ضرورت سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، اسی طرح تعلیم اور کتب خانے بھی ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں، تعلیمی اداروں میں نصابی ضرورت محض نصابی کتابوں سے پوری نہیں ہو سکتیں، لہذا تحقیقی ضروریات کیلئے اضافی کتابوں کا ہونا بہت ضروری ہے، جنہیں منظم اشاعتی اداروں اور کتب خانوں کی مدد سے پورا کیا جا سکتا ہے، خیال رہے کہ معاشرتی ترقی کا انحصار اِس بات پر ہے کہ عوام مروجہ علوم اور زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں، اُن کی علمی سطح جتنی بلند ہو گی ملک بھی اتنی ہی ترقی کرے گا، آج کے جدید دور میں علم کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ ہمارے سکول، کالج اور یونیورسٹیاں ہیں، مگراِن میں صرف نصابی تعلیم دی جاتی ہے، یہ تعلیمی ادارے علم کی انتہاء نہیں ہیں، بلکہ یہاں سے لوگ اپنے راستے سے آگاہ ہوتے ہیں اور عملی زندگی کے راستوں پر مسلسل گامزن رہتے

کیلئے کتابیں اور کتب خانے تلاش کرتے ہیں۔اِس لحاظ سے کتابوں کی اہمیت اِس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ صحیح معنوں میں حصول علم کا ذریعہ ہیں۔ لہذا یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ جو راستہ تعلیمی اداروں سے نکلتا ہے وہ کتاب اور مکتبوں پر آ کر ختم ہو جاتا ہے کہ یہاں پر ہر قسم کا علم بغیر کسی پابندی اور رکاوٹ باآسانی مل جاتا ہے۔
کہتے ہیں کتاب کا انسان سے تعلق بڑا پرانا ہے اور کتاب نہ صرف انسان کی بہترین دوست ہے، بلکہ یہ انسان کے علم و ہنر اور ذہنی استعداد میں بھی بے پناہ اضافہ کرتی ہے اور خود آگاہی اور اپنے ارد گرد کے حالات و واقعات کا ادراک پیدا کرتی ہیں، یہ بات کچھ غلط بھی نہیں، دنیا میں کتب میلے منعقد کرنے کا مقصد لوگوں میں کتاب کی ضرورت و اہمیت کو اجاگر کرنا ہوتا ہے۔اِس حوالے سے پاکستان میں ناصرف معلوماتی سیمینارز اور کتب میلے منعقد کروانے کی اشد ضرورت ہے، بلکہ اس موقع پر حکومتی اور نجی سطح پر عوام میں شعور بیدار کرنے کے لئے معلوماتی پروگرامز شروع کرنے کی بھی شدید ضرورت ہے، کیونکہ پاکستان میں ایک تو شرح خواندگی بہت کم ہے، دوسرے مہنگائی کی وجہ سے کتاب دوستی میں بھی بہت کمی واقع ہوئی ہے۔اِس رجحان میں کمی کی دیگر وجوہات میں معلومات کے جدید ذرائع کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور موبائل فون بھی شامل ہیں، جب سے لوگوں میں اِن جدید ذرائع کے استعمال کی شرح بڑھی ہے، کتاب دوستی اور اُس کی

اہمیت میں کمی واقع ہوئی ہے، اسی وجہ سے ہمارے نوجوانوں میں ذوق مطالعہ کی کمی
ہے، جس کا سہرا کسی حد تک کمپیوٹر اور موبائل فونز پر جاتا ہے، جہاں اِن کے بے شمار
فوائد ہیں، وہیں یہ نوجوان نسل کو گمراہ کرنے میں بھی اپنا کردار ادا کر رہے ہیں ۔
آج ہماری نوجوان نسل کے پاس کتاب پڑھنے کا وقت نہیں، لیکن دن رات انٹرنیٹ
چیٹنگ اور فضول و عشقیہ ایس ایم ایس کرنے میں انہیں کمال حاصل ہے، جس کی وجہ
سے مطالعہ کی عادت ختم ہوتی جارہی ہے، لیکن آئی ٹی کے اِس دور میں جبکہ انٹرنیٹ پر
موجود مواد اور ای بک یعنی برقی کتابوں کی موجودگی کے باوجود بھی کتابوں کی اہمیت اور
افادیت کسی طور کم نہیں ہوئی، آج بھی پاکستانی معاشرے کے 70 فیصد افراد کیلئے کتاب
معلومات اور حصول علم کا اہم اور بنیادی ذریعہ ہے، جبکہ علم و ادب کے شائقین بھی
کتب بینی میں بھرپور دلچسپی لیتے ہیں، اسی رجحان کو فروغ دینے اور برقرار رکھنے کیلئے
نیشنل بک فاؤنڈیشن اور وزارت تعلیم کے زیر انتظام پاکستان کے سب سے بڑے شہر
کراچی کے ایکسپو سینٹر میں ساتویں پانچ روزہ عالمی کتب میلہ کا آغاز ہو چکا ہے، اِس کتاب
میلے کو برطانوی سفارتخانے اور آکسفورڈ پریس کی طرف سے بھی اسپانسر کیا گیا ہے، جو
16 دسمبر سے 20 دسمبر تک جاری رہے گا، کراچی میں منعقد اِس نمائش کے انعقاد کا
مقصد نہ صرف پاکستانی مصنفین کی کتابوں کی اہمیت واضح کرنا ہے

بلکہ عوام میں کتابیں خریدنے اور مطالعے کے شوق کو بھی اجاگر کرنا ہے، کراچی کے
ایکسپو سینٹر میں جاری اِس نمائش میں مشہور پاکستانی مصنف احمد رشید جن کی لکھی ہوئی '
طالبان'' نامی کتاب امریکہ میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں میں شمار کی '
جاتی ہے، سمیت سو سے زائد مصنف اور ادیب حصہ لے رہے ہیں، جبکہ
.برطانیہ،امریکہ،فرانس ،جرمنی اور بھارت سے تعلق رکھنے والے تین مصنف بھی اِس
کتب میلے میں شریک ہیں ۔
کراچی میں جاری کتب میلے میں پاکستان کی مقامی زبانوں کے علاوہ کئی پبلشرز کا تعلق
.برطانیہ، عرب ممالک، بھارت ،ایران ، سنگاپور، تھائی لینڈ،یونان ،ترکی ،ملائیشیا اور
.برطانیہ وغیرہ سے ہے،واضح رہے کہ کراچی میں گذشتہ سال عالمی کتب میلے میں پونے
تین لاکھ کے قریب لوگ کتابیں خریدنے کیلیۓ آئے تھے، نمائش کے منتظمین اِس سال پہلے
سے زائد افراد کی شرکت کی توقع رکھتے ہیں،رواں سال کتب میلے میں مختلف کتابوں پر
سے 45 فیصد تک رعایت رکھی گئی ہے، یہ کتب میلہ روزانہ صبح دس سے رات نو 15
بجے تک جاری ہے، جس میں ملک اور بیرون ملک کے سو سے زائد پبلشرز کتب میلے کا
حصہ بنے ہوئے ہیں، جو اپنے ساتھ مختلف زبانوں میں بہترین کتابوں کا انتخاب لے کر
آئے ہیں، کتب میلے میں 250 کے قریب ملکی وغیر ملکی بک اسٹالز لگائے ہیں، جن پر دنیا
کے ہر موضوع پر کتابیں موجود ہیں،ان اسٹالز پر پاکستان کی مقامی

زبانوں کے علاوہ عربی، انگریزی، فارسی، ترکی سمیت کئی دیگر زبانوں کی کتب شامل ہیں،اِن کتابوں کو دیکھنے اور خریدنے کیلئے مقامی لوگوں کی جوق در جوق آمد کا سلسلہ جاری ہے،خاص طور پر قاری الیاس صاحب کی "بولتی کتابوں"کا منفرد اسٹال بچوں اور خواتین کی خصوصی توجہ کا مرکز ہے،ساتویں عالمی کتب میلے کے دوران ایکسپو سینٹر میں مختلف ادبی سرگرمیوں کا اہتمام بھی کیا گیا ہے،جن میں مختلف ٹاک شوز کے علاوہ سیمینارز اور پبلشرز کی نئی کتابوں کی تقریب رونمائی بھی شامل ہے،کتابوں کے غیر ملکی اسٹالز کے علاوہ میلے میں مقامی اور علاقائی زبانوں کی کتابوں کو بھی اہمیت دی گئی ہے،جن میں سندھی،پشتو،سرائیکی میں کتابوں کے اسٹالز بھی شامل ہیں۔

قارئین کی معلومات کیلئے یہ بتانا ضروری ہے کہ کراچی کے ایکسپو سینٹر میں پہلا عالمی کتب میلہ 2005ء میں منعقد کیا گیا تھا،اُس کے بعد سے یہ سلسلہ کامیابی سے جاری ہے،کتب میلے کے منتظم اور پاکستان پبلشرز اور بک سیلرز ایسوسی ایشن کے چیئرمین خالد عزیز کا کہنا ہے کہ پاکستان میں تعلیم کو عام کرنا اُن کے ادارے کا بنیادی مقصد ہے،وہ کہتے ہیں کہ کتاب کے بغیر تعلیم ممکن نہیں،اُن کا خیال ہے کہ نجی شعبے میں رہتے ہوئے اِس طرح کے میلوں کو منعقد کرکے ہم یہ کوشش کر سکتے ہیں کہ اپنے بچوں اور نوجوانوں میں کتابوں سے دوستی کے رجحان کو فروغ دیں اور والدین کو کتابوں کی اہمیت کا احساس

دلائیں، کیونکہ جب بچے اچھی کتابیں پڑھیں گے تو تربیت اچھی ہو گی اور اچھی تعلیم و تربیت کے نتیجے میں ہمیں اچھی قیادت میسر آئے گی، جس سے ملک ترقی کرے گا اور معاشرے سے لاقانونیت، بدامنی، بے روزگاری، بدانتظامی اور لسانی و صوبائی تعصب سمیت بہت سے مسائل میں کمی آئے گی. کراچی میں جاری ساتویں عالمی کتب میلے کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے مہمانِ خصوصی صوبائی وزیر تعلیم پیر مظہر الحق کا کہنا تھا کہ ہر سال کتب میلہ کا کامیابی سے انعقاد اِس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ لوگوں میں کتب بینی کا شوق موجود ہے اور وقت کے ساتھ پروان چڑھ رہا ہے۔

واضح رہے کہ گذشتہ سال ایک لاکھ نوے ہزار کے قریب خاندانوں نے ایکسپو سینٹر کا رخ کیا تھا، جن میں خواتین اور بچوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی، چونکہ اس سال گذشتہ سال کی نسبت زیادہ تعداد میں پبلشرز عالمی کتب میلے کا حصہ ہیں، اِس لیے منتظمین کو سال گذشتہ سے زیادہ شائقین کتب کی شرکت کی امید ہے، انہیں امید ہے کہ اِس سال بھی اہلیانِ کراچی بڑی تعداد میں ایکسپو سینٹر آئیں گے اور بقیہ دنوں میں یہاں لوگوں بہت زیادہ رش ہوگا، یقیناً کثیر تعداد میں شائقین کتب کی شرکت منتظمین کیلئے جہاں حوصلہ افزاء بات ہوگی، وہیں یہ عمل یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ پاکستان میں کتب بینی کا شوق فروغ پا رہا ہے، لیکن کم آمدنی والا طبقہ اپنے محدود وسائل کی وجہ سے اِس قسم کی نمائش

سے کوسوں دور ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ "بچہ ہی مستقبل کا باپ ہے" آج کے والدین کل بچے تھے اور آج کے بچے ہی کل کے اچھے اور ذمہ داری شہری ہونگے. الہذا اُن کی تربیت اِس انداز سے کی جائے کہ اُن میں فروغ مطالعہ کی عادت پختہ ہو اور وہ تمام عمر حصول علم میں مگن رہ سکیں، چنانچہ ضرورت اِس اَمر کی ہے کہ حکومت کتاب کلچر کو فروغ دینے کیلئے کتابوں کی قیمتوں کو کنٹرول کرے اور عام آدمی کیلئے سستی و معیاری کتابوں کا حصول آسان بنائے تاکہ غریب عوام اور خاص طور پر نوجوان نسل میں مطالعہ کی اہمیت اور عادت کو پختہ کیا جاسکے۔

اور جنگ ختم ہوگئی۔۔۔۔۔

عراقی جنگ کا حاصل ذلت آمیز شکست اور شرمناک رسوائی۔۔۔۔

جمعرات 15 دسمبر 2011ء کو عراق کے دارالحکومت بغداد میں امریکی پرچم اتار لیا گیا اور بالآخر عراق میں نو سالہ امریکی فوجی آپریشن کا خاتمہ ہوگیا، یوں اتوار 18 دسمبر کی صبح عراق میں تعینات آخری امریکی فوجی دستہ بھی سیکورٹی معاملات عراقی حکام کے سپرد کرکے وہاں سے روانہ ہوگیا، جمعرات کو عراقی دارالحکومت بغداد میں امریکی فوجی انخلا کی ایک باضابطہ تقریب منعقد ہوئی جو نو برس کے قریب جاری رہنے والی اِس جنگ کے اختتام کی علامت تھی،اِس اختتامی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے امریکی وزیر دفاع لیون پنیٹا کا کہنا تھا کہ نو سال جاری رہنے والی اِس جنگ میں امریکی فوجیوں کی قربانیاں قابل تحسین ہیں، لیون پنیٹا کا کہنا تھا کہ ایک آزاد اور خودمختار عراق کو وجود میں لانے کیلئے امریکہ اور عراق نے اِس جنگ کی بڑی قیمت ادا کی ہے، اِس تقریب سے ایک روز قبل 14 دسمبر کو شمالی کیرولائنا میں صدر باراک اوباما نے وطن واپس لوٹنے والے فوجیوں کا استقبال کرتے ہوئے عراق جنگ کو امریکی فوج کی ایک بڑی کامیابی قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ ”عراق سے نکلتے ہوئے امریکی

فوج کے سر بلند ہیں، عراق جنگ جلد ہی تاریخ کا حصہ بن جائے گی اور آپ کی خدمات
کو صدیوں تک یاد رکھا جائے گا، بارک اوباما کا کہنا تھا کہ اب عراق کی تقدیر اُس کے
عوام کے ہاتھوں میں ہے، انہوں نے کہا کہ عراق کی صورت حال کو مثالی تو قرار نہیں
دیا جا سکتا، لیکن امریکی فوج اپنے پیچھے ایک آزاد اور مستحکم ملک چھوڑ کر جا رہے
ہیں، پورے خطے کے عوام عراق کو ایک ایسے ملک کے طور پر دیکھیں گے جو اپنی قسمت کا
خود تعین کرے گا، انہوں نے کہا کہ عراقی عوام یہ بات جان لیں کہ وہ تنہا نہیں ہیں، وہ
امریکہ کے مضبوط اور دیرپا شراکت دار ہیں، امریکہ اپنی افواج کی واپسی کے بعد بھی عراق
کے ساتھ مضبوط تعلق قائم رکھے گا۔"

گو کہ عراق میں تعینات امریکی فوج کے انخلا کے بعد عراق میں امریکہ کا نو سالہ فوجی
مشن سرکاری طور پر اپنے انجام کو پہنچ گیا، لیکن عراق پر امریکی حملے کا پس منظر اور پیش
منظر بہت سے سوالات کو جنم دیتا ہے، بظاہر ابتداء میں بش انتظامیہ کا موقف تھا کہ
سابق عراقی صدر صدام حسین بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار اپنے ملک
میں چھپائے ہوئے ہیں اور وہ القاعدہ کے عسکریت پسندوں کی حمایت کرتے ہیں، اس
لیے امریکہ عراق کی ایک جمہوری ملک کے طور پر تعمیر نو کرے گا، جو باقی مشرقِ وسطیٰ پر
گہرے اثرات مرتب کرے گی، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ عراق پر امریکی حملے اور وہاں
مستقل فوجی موجودگی

کی تہہ میں کارِ فرما اصل پس پردہ مقاصد عراقی تیل کے ذخائر میں امریکہ کی گہری دلچسپی، عراق پر قبضے کی آڑ میں معدنی دولت سے مالا مال دوسرے عرب ممالک میں اثر ورسوخ و قبضہ، اسرائیل کے لئے بقاء کی ضمانت، اُس کے تحفظ کو یقینی بنانا اور دریائے نیل سے دریائے فرات تک اسرائیل کی رسائی اور عرب ممالک میں اسلامی بیداری کی لہر کا قلع قمع کرنا تھا، اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا امریکہ اور اُس کے اتحادیوں کو وہ مطلوبہ نتائج حاصل ہوئے، جو عراق پر حملے کی ظاہری و خفیہ وجوہات تھے، ساتھ ہی اِس بات کا بھی جائزہ لینے کی بھی اَشد ضرورت ہے کہ کیا واقعی امریکہ عراق کو ایک آزاد اور مستحکم ملک کے طور پر چھوڑ کر جا رہا ہے۔؟

جہاں تک اِس بات کا تعلق ہے کہ امریکہ عراق کی ایک جمہوری ملک کے طور پر تعمیر نو کرے گا، جو کہ باقی مشرقِ وسطیٰ پر گہرے اثرات مرتب کرے گی، تو عراق پر حملے کے مابعد اثرات کو دیکھ کر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ مقصد کبھی بھی حاصل نہیں کیا جاسکتا، ہاں البتہ یہ ضرور ہوا کہ مالکی حکومت جو کہ امریکہ کی ہمدرد حکومت ہے، کی موجودگی میں خطے میں امریکہ کے بنیادی مفادات کو کبھی نقصان نہیں پہنچے گا، رہی یہ بات کہ عراق کو وسیع پیانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کو تیار کرنے کی صلاحیت سے محروم کردیا جائے، تو اب یہ بات سب کے علم میں ہے کہ عراق کے پاس کبھی ایسی کوئی صلاحیت تھی ہی

نہیں، بلکہ یہ تو عراق پر حملے کا محض ایک ظاہری بہانہ تھا، خود اِس کا اعتراف سابق برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر کے اُس بیان سے ہوتا ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ "اگر عراق کے پاس وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار نہ بھی ہوتے تو بھی وہ عراق پر حملہ ضرور کرتے کیونکہ اُن کے خیال میں صدام کی آمرانہ حکومت اِس بات کا اخلاقی جواز فراہم کرنے کے لیے کافی تھی کہ مغربی ممالک طاقت استعمال کریں اور وہاں کی حکومت کو تبدیل کردیں۔" رہی عراقی تیل کے ذخائر میں امریکی دلچسپی کی بات، تو اِس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ امریکہ عراقی تیل کے ذخائر میں گہری دلچسپی رکھتا ہے،اِس کی بنیاد عراقی تیل کے اثاثوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے 2007ء کا وہ معاہدہ ہے جس میں اِس بات پر اتفاق کیا گیا کہ امریکی کمپنیوں کو ترجیحی بنیادوں پر مواقع فراہم کیے جائیں گے۔اِس معاہدے کو دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ امریکہ اپنے اِس مقصد میں کامیاب رہا،باقی رہا اسلامی ممالک میں اثر ورسوخ،اسرائیل کے تحفظ و بقاء کی ضمانت اور نیل سے فرات تک رسائی کے ساتھ عرب ممالک میں اسلامی بیداری کا قلع قمع کرنا،تو یہ وہ مقاصد ہیں جس کے حصول میں امریکہ اور اُس کے حواری زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوئے۔

مگر اس تمام ترجزوی کامیابی کے باوجود اس حقیقت کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ امریکہ کواِن مقاصد کے حصول کیلئے بہت بڑی اور بھاری قیمت

چکاناپڑی ہے،اعدادوشمار بتاتے ہیں کہ اب تک امریکہ جنگ کی مد میں 8 کھرب ڈالر سے زائد کا نقصان اٹھاچکاہے،جبکہ امریکی کانگریس کی بجٹ رپورٹ کے مطابق عراق جنگ پر اب تک 7 کھرب 8 ارب ڈالراور افغانستان کی جنگ پر3کھرب 45 ارب ڈالر خرچ ہوچکے ہیں،یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ سابق صدر بش نے جنگ کے نام پر جو خطیر رقم کانگریس سے منظور کروائی تھی وہ چین،روس،برطانیہ اور بھارت کے مجموعی فوجی بجٹ سے بھی زیادہ تھی،آج اِس قدر زیادہ مالی نقصان کو دیکھ کر بہت سے امریکی پالیسی ساز اِس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ یہ جنگ لڑی ہی نہیں جانی چاہیے تھی،جبکہ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ 2003ء میں عراق پر حملے کے بعد سے وہاں 15 لاکھ امریکی فوجیوں نے خدمات انجام دیں،جس میں لقمہ اجل بننے والے امریکی فوجی اہلکار بھی شامل ہیں،یہ تعداد عراق جنگ میں ہلاک ہونے والے 4394 امریکی شہری،141 صحافی اور 450 نمایاں شخصیات کے علاوہ ہے،جبکہ عام 1471 عراقی شہریوں کی ہلاکتوں کا صحیح تخمینہ لگانا مشکل ہے پینٹاگان کے اعداد و شمار عراق میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد 10 لاکھ70 ظاہر کرتے ہیں،حقیقت یہ ہے کہ اب تک عراق وافغانستان جنگ پر امریکہ 10 کھرب ڈالرز سے زائد خرچ چکا ہے،جس نے اُس کی معیشت کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے،اُس کا مالیاتی بحران پانچ ٹریلین ڈالرتک پہنچ چکا ہے،جسے پورا کرنے کیلئے اُس نے بڑے حصے کو اپنے اتحادیوں کی گردن پر ڈال دیا ہے، یعنی امریکہ اب عراق اور افغان جنگ کے اخراجات دنیاکے دیگر ملکوں کی

جیبوں سے پورا کر رہا ہے اور یوں موجودہ دنیا بالخصوص امریکہ اور اُس کے اتحادی ممالک عراق اور افغانستان میں بش کی جنونی جنگ کی بھاری قیمت ادا کر رہے ہیں، مبصرین کا کہنا ہے کہ امریکہ کی اقتصادی کمر اِس حد تک ٹوٹ چکی ہے کہ اب وہ دوسرے ملکوں پر شرطیں عائد کرنے کے بجائے اُن کی شرطیں ماننے پر تیار ہے،اِس کی وجہ گذشتہ کئی برسوں سے دس ٹریلین ڈالر کے بجٹ خسارے میں چلتی امریکی معیشت ہے، دوسری طرف عراق اور افغانستان کی جنونی جنگ نے طاقت کے نشے میں بدمست امریکہ کو سپرپاور کی کرسی سے بھی نیچے اٹھا پھینکا ہے۔

اِس تناظر میں دیکھا جائے تو عراق و افغانستان جنگ نے اپنے پیچھے مایوسی اور غیر یقینی کا ترکہ چھوڑا ہے، دراصل اِس جنگ نے پورے سرمایہ دارانہ نظام کی چولیں ہلا دی ہیں، تیل اور اسلحے کے سوداگروں کی تجوریاں تو بھر گئی ہیں لیکن عوام کی بے روزگاری میں اضافہ ہوا،امریکہ اور مغربی یورپ کے اہم ممالک کے سینکڑوں بینک دیوالیہ ہو گئے ہیں،بینکنگ سسٹم کو بچانے کے لیے جو داخلی قرضے لیے گئے اُس نے مقروض معیشتوں کے اگلے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیئے، یہاں تک کہ امریکی معیشت کو دیوالیہ ہونے سے بچانے کے لیے نئی قانون سازی کا سہارا لینا پڑا،تاکہ حکومت مزید داخلی قرضے لے سکے، بے رحم سرمایہ داروں نے اپنے اموال میں تو اضافہ کیا ہے، مگر حکومت اور عوام کو مزید کمزور کر دیا، دوسری طرف اس جنگ کے دوران عراق میں جو تباہی آئی ہے اُسے الفاظ میں

بیان نہیں کیا جاسکتا، امریکہ کی نظر تو فقط اپنے پانچ ہزار فوجیوں کی لاشوں پر ہے، لیکن عراقیوں کی لاشیں تو گنی بھی نہیں جاسکتیں، آج امریکی اِس بات پر تو غور کر رہے ہیں کہ اتنی بھاری قیمت اور اتنی انسانی جانوں کی قربانی دینے کے بعد انہیں کیا حاصل ہوا، مگر وہ یہ نہیں سوچتے کہ عراق پر قبضے صدام حسین کی بے دخلی اور 30 دسمبر 2006 کو اُن کی پھانسی کے باوجود عراق میں وسیع پیمانے کی تباہی مچانے والے ہتھیار نہ ملنے کی وجہ سے اِس جنگ کا اصلی جواز تو پہلے ہی غلط ثابت ہوگیا ہے، ہمارا ماننا ہے کہ عراق پر قبضے کے امریکی استعماری مقاصد کی مجموعی طور پر جس انداز اور جس پیمانے پر شکست ہوئی ہے، وہ امریکہ کیلئے شرمناک اور ذلت آمیز ہے، حقیقت یہ ہے کہ امریکی افواج ظلم و بربریت اور اپنی شکست و رسوا کن ناکامی کا داغ لے کر عراق سے نکلی ہے، آج آزادی، انسانی حقوق اور جمہوریت کے نام نہاد عالمی چیمپئن عراق کو تباہی و بربادی کے ساتھ عصبیت، لسانیت اورفرقہ واریت کے تحفے دے کر عراق سے رخصت ہوچکے ہیں، دوسری طرف آج عراق حالت جنگ میں نہیں مگر وہ پر امن بھی نہیں ہے، عراق کا مستقبل غیر یقینی ہے، ملک کا ایک وسیع علاقہ برباد ہو چکاہے، بنیادی انفراسٹریکچر تباہ ہو کر رہ گیا ہے، ہزاروں عراقی یتیم بچوں اور بیواؤں کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے، ملک نسلی اور فرقہ ورانہ بنیادوں پر الگ تقسیم ہو کر رہ گیا ہے اور آج اپنے مستقبل کے حوالے سے ہر عراقی بے یقینی اور مایوسی کی کیفیت میں مبتلا ہیں، چنانچہ اِس تناظر میں

امریکہ کا یہ دعویٰ کہ وہ ایک آزاد اور مستحکم عراق چھوڑ کر جارہا ہے، قطعاً غلط اور سراسر جھوٹ ہے، گو بظاہر عراق میں امریکی جنگ ختم ہو گئی ہے، لیکن آج بھی عراق میں ایسے کوئی آثار نظر نہیں آتے جس کی بنیاد پر یہ کہا جائے کہ عراق میں امریکی مفادات کی جنگ ختم ہو گئی ہے، نوری المالکی کی امریکہ نواز بغل بچہ حکومت کی وجہ سے عراقی یہ سمجھتے ہیں کی اُن کا ملک ابھی تک امریکی گرفت سے آزاد نہیں ہوا اور ابھی عراق کا امریکی مفادات کی باجگزار جمہوریت سے ایک آزاد و خودمختار ریاست بننے کا مرحلہ باقی ہے، دوسری جانب مشرق وسطیٰ میں طلوع ہوتی ہوئی بیداری کی لہر اور التحریر اسکوائر سے جنم لیتی ہوئی حریت پسندوں کی انقلابی سوچ نے امریکہ کی ناجائز اولاد اسرائیل کو اپنے مستقبل کے بارے میں پہلے سے بھی زیادہ فکر مند کر دیا ہے۔

میرا قائد۔۔۔ محمد علی جناح

"جس روز قائدِ اعظم نے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کیا، میں اُس روز کراچی
میں تھا۔ افتتاحی تقریب کے بعد اُن کی واپسی سے کچھ پہلے میں وائی، ایم، اے بلڈنگ
کے پیچھے جاکر ایوان صدر کے بڑے گیٹ
کے سامنے کھڑا ہوگیا، اُس جگہ بھیڑ نہیں تھی، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میرے قریب
ایک شخص بھی نہیں تھا، تھوڑی دیر کے بعد دور سے قائدِ اعظم کی کھلی گاڑی آتی دکھائی
دی،آہستہ آہستہ یہ گاڑی عین میرے سامنے آ گئی، میں نے اپنے قائد کو جی بھر کے
دیکھا، سفید شیروانی اور اپنی مخصوص ٹوپی پہنے وہ بالکل سیدھے بیٹھے تھے، اُن کے ساتھ
اُن کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح تھیں۔
گاڑی ابھی صدر دروازے کی طرف مڑنے ہی والی تھی کہ قائدِ اعظم نے آہستہ سے اپنی
گردن بائیں طرف گھمائی اور اُن کی نظریں سیدھی میرے چہرے پر پڑیں، بے ساختگی
میں میرا داہنا ہاتھ ماتھے کی طرف اٹھا.... اور.... پھر.... اور.... پھر.... وہ وہیں
جم کر رہ گیا.... یااللہ....! میرے ہاتھ کے ساتھ ہی میرے قائد کا ہاتھ بھی ماتھے
کی طرف اٹھا، میرے قائد نے میرے سلام کا جواب دیا.... میرے قائد نے ایک واحد
ہاتھ کا سلام قبول کیا.... میرے قائد نے ایک گمنام شخص کا سلام

" قبول کیا.... میرا قائد اسلامی روایات کا پابند ہے.... میرا قائد مکمل مسلمان ہے۔
قائد اعظم محمد علی جناح کے بارے سید اشفاق نقوی کے یہ جذبات مسلمانان برصغیر کی دلی کیفیت کے آئینہ دار ہیں، رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں کہ " قائد اعظم کے ساتھ سب سے بڑی بے انصافی یہ ہوتی چلی آرہی ہے کہ اُن پر لکھنے والوں میں سے کسی نے بھی آپ کو مومنانہ صفات، مذہبی جذبات، دینی تاثرات، اسلامی رجحانات کے آئینہ میں پیش نہیں کیا، جیسے دین و مذہب سے آپ کا کوئی واسطہ ہی نہ ہو، حالانکہ آپ کا ہر ارشاد، ہر بیان، ہر تقریر اسلام کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوتی تھی، گو آپ منافقین کی طرح اسلام، اسلام کی رٹ نہیں لگاتے تھے، بلکہ اٹھتے بیٹھتے اسلام ہی کو اپنے مخصوص رنگ اور عصری تقاضوں کے مطابق پیش کرتے تھے، اگر آپ کی ہر تقریر اور ارشاد کا دیانت دارانہ جائزہ لیا جائے تو وہ اسلام کی کسوٹی پر پورا اترے گا۔ "
آج قائد اعظم محمد جناح کے یوم پیدائش کے موقع پر ہم ان کی زندگی کے وہ چند واقعات آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں جو قائد کی زندگی کے دینی، مذہبی اور اسلامی پہلوؤں کو بھرپور طریقے سے اجاگر کرتے ہیں، اگرچہ قائد اعظم بظاہر معنوی اعتبار سے مذہبی رہنما نہیں تھے لیکن یہ واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ

برصغیر کے مسلمانوں کو ایک آزاد وطن کی منزل سے روشناس کرنے والے قائد کا خدا،
رسول اور اپنے دین و مذہب پر کتنا کامل یقین تھا اور وہ کتنے پختہ اصولوں کے مالک
تھے، شاید اسی وجہ سے جناب مجید نظامی نے کہا کہ "اُن کی شخصیت کا خمیر سنہرے
اصولوں کی روشن مٹی سے اٹھا تھا اور ان کی پوری زندگی ایک زندہ کرامت تھی۔"
خواجہ اشرف احمد بیان کرتے ہیں کہ "3مارچ 1941ء کو لاہور ریلوے اسٹیشن کے
سامنے آسٹریلیا مسجد میں نماز عصر ادا کرنا تھی،جب قائد تشریف لائے تو مرزا عبدالحمید
تقریر کر رہے تھے، مسجد کھچا کچ بھری ہوئی تھی، قائد موٹر کار سے برآمد ہوئے تو انہوں
نے اچکن، چوڑی دار پاجامہ اور بٹلر شوز پہن رکھے تھے، اُن کی آمد پر لوگوں میں ہلچل
پیدا ہوئی، لیکن وہ فوراً سنبھل گئے کہ قائد اعظم نظم و ضبط کے انسان تھے، وہ مسجد کے
بغلی دروازے میں داخل ہوئے، اگلی صف تک راستہ بن گیا، لیکن قائد نے یہ کہتے ہوئے
اگلی صف میں جانے سے انکار کر دیا "میں آخر میں آیا ہوں اسلئے یہیں بیٹھوں گا"
سیاست میں آگے جانے والا خانہ خدا میں سب سے پیچھے بیٹھا، نماز سے فارغ ہونے کے پر
قائد نے جو کام فوراً کیا وہ یہ کہ اپنے جوتے اٹھالیے، ہر کسی کی خواہش تھی کہ وہ قائد کے
جوتے اٹھانے کی سعادت حاصل کرے، لیکن ہر کسی کی حسرت ہی رہی، لوگ بعد میں
اُن کے ہاتھ سے جوتے چھیننے کی کوشش ہی کرتے رہے، لیکن قائد کی گرفت آہنی

تھی، وہ ہجوم میں اپنی ریشمی جرابوں سمیت کوئی تیس قدم بغیر جوتوں کے چلے اور اصرار اور کوشش کے باوجود کسی شخص کو اپنا جوتا نہیں پکڑایا۔

مولانا حسرت موہانی بیان کرتے ہیں کہ "ایک روز میں جناح صاحب کی کوٹھی پر صبح ہی صبح نہایت ضروری کام سے پہنچا اور ملازم کو اطلاع کرنے کو کہا۔ ملازم نے کہا اس وقت ہم کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ آپ تشریف رکھیں، تھوڑی دیر میں جناح صاحب خود تشریف لے آئیں گے۔ چونکہ مجھے ضروری کام تھا۔ اس لیے مجھے ملازم پر غصہ آیا اور میں خود کمرے میں چلا گیا۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پھر تیسرے کمرے میں پہنچا تو برابر والے کمرے سے مجھے کسی کے بلک بلک کر رونے اور کچھ کہنے کی آواز آئی، یہ جناح صاحب کی آواز تھی، میں گھبرا گیا اور آہستہ سے پردہ اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قائد اعظم سجدے میں پڑے ہیں اور بہت ہی بیقراری کے ساتھ دعا مانگ رہے ہیں، میں دبے پاؤں وہیں سے واپس آگیا اور اب تو بھائی جب جاتا ہوں اور ملازم کہتا ہے کہ صاحب اندر ہیں تو یہی سمجھتا ہوں کہ وہ سجدے میں پڑے دعا کر رہے ہیں، میرے تصور میں ہر وقت وہی تصویر اور وہی آواز رہتی ہے۔"

جناب مختار زمن کہتے ہیں کہ "میرے والد آگرہ میں جج تھے، انہوں نے بتایا کہ ایک دفعہ قائد اعظم کسی کیس کے سلسلے میں آگرہ تشریف لائے، اس موقع پر مسلم

لیگ نے جلسہ کرنا چاہا، لیکن قائد اعظم نے اس میں شرکت سے انکار کر دیا اور کہا، میں اپنے موکل کی طرف سے پیش ہونے آیا ہوں، جس کی وہ فیس ادا کر چکا ہے، میں خیانت کیسے کروں، آپ جلسہ کرنا چاہتے ہیں تو بعد میں بلا لیں، میں اپنے خرچ پر آؤں گا۔" نواب صدیق علی خان کہتے ہیں کہ "جارج ششم شاہ انگلستان کے زمانے میں ہندوستان کیلئے مزید اصلاحات کے سلسلے میں قائد اعظم لندن تشریف لے گئے،

مذاکرات جاری تھے کہ قصر بکنگھم سے ظہرانے کی دعوت موصول ہوئی، اُس زمانے میں قصر بکنگھم کی دعوت ایک اعزاز ہی نہیں بلکہ یادگار موقع ہوتا تھا لیکن قائد اعظم نے یہ کہہ کر اس دعوت میں شرکت کرنے سے معذرت کر لی کہ "آجکل رمضان المبارک کا مقدس مہینہ ہے اور اس میں مسلمان روزے رکھتے ہیں۔"

تحریک پاکستان کے آخری مرحلے میں قائد اعظم نے مسلم عوام سے چاندی کی گولیوں کی اپیل کی، اس پر عام مسلمان مردوں ہی نے نہیں عورتوں نے بھی لبیک کہا اور اپنا زیور تک لیگ فنڈ میں دینا شروع کر دیا، لیکن قائد اعظم نے اس چندے کو قبول نہیں کیا،

ایک روز بیگم شائستہ اکرام اللہ نے قائد اعظم سے پوچھا، سر یہ مسلمان خانہ دار عورتیں اتنے شوق سے اپنے ہاتھوں کے کنگن اور بالیاں اتار اتار کر مسلم لیگ کو دیتی ہیں اور آپ انہیں قبول نہیں کرتے، واپس کر دیتے ہیں، عجیب سا لگتا ہے، کیا یہ ایک قابل قدر جذبے کی توہین نہیں ہے،

قائداعظم نے کہانہیں یہ بات نہیں، کوئی اور لیڈر ہوتو شاید اسے اپنی بڑی کامیابی سمجھے، لیکن میں سیاست میں جذباتیت کو پسند نہیں کرتا، ان خواتین کو چاہیے کہ وہ زیورات کا عطیہ کرنے سے پہلے اپنے اپنے شوہروں سے پوچھیں، اُن سے اجازت لیں اور پھر دیں۔
"

دہلی مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا جلسہ امپیریل ہوٹل میں ہورہا تھا، خاکساروں نے گڑبڑ کی، سارا ہنگامہ قائداعظم کے خلاف تھا، لیکن سارے ہنگامے میں جو شخص سب سے پرسکون رہا، وہ خود قائداعظم تھے، جب میٹنگ انتشار کا شکار ہوکر ختم ہوگئی تو وہ بڑے اطمینان سے تنہا باہر جانے لگے، یہ دیکھ کر پیر آف مانکی شریف نے آپ سے کہا، آپ اس طرح باہر نہ جایئے، کہیں آپ کو کچھ نہ ہوجائے، ہم آپ کے ساتھ چلتے ہیں، قائد اعظم نے کہانہیں، اس کی ضرورت نہیں اور آسمان کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا، کیا وہ (خدا) وہاں نہیں؟۔ اسی طرح 1946ء میں جب قائداعظم شملہ تشریف لے گئے تو بعض لیگی کارکنوں نے محسوس کیا کہ قائداعظم کیلئے خصوصی حفاظتی اقدامات کی
ضرورت ہے، ایک کارکن نے آپ سے کہا جناب ہمیں معلوم ہے کہ دشمن آپ کی جان کے درپے ہیں، اس لیے اجازت دیجئے کہ ضروری حفاظتی اقدامات کئے جائیں، جس پر قائداعظم نے فرمایا مجھے اللہ کی ذات پر بھروسہ ہے، خدا ہی سب سے بڑا محافظ اور چارہ ساز ہے، آپ فکر مند نہ ہوں۔

اپریل 1945ء میں قائداعظم خان آف قلات کی دعوت پر بلوچستان تشریف لے گئے اس موقع پر خان آف قلات نے ان سے بچوں کے ایک اسکول کے معائنہ کی درخواست کی، قائداعظم ننھے منے بچوں سے مل کر بہت خوش ہوئے اور اُن سے گھل مل گئے، قائداعظم نے ایک بچے سے خان آف قلات کی جانب اشارہ کرکے پوچھا یہ کون ہیں، بچے نے جواب دیا یہ ہمارے بادشاہ ہیں، قائداعظم نے بچے سے پوچھا، میں کون ہوں، بچہ بولا، آپ ہمارے بادشاہ کے مہمان ہیں، قائد نے پھر بچے سے پوچھا، تم کون ہو، بچہ بولا، میں بلوچ ہوں، قائداعظم نے خان آف قلات سے کہا، اب آپ ان کو پہلا سبق یہ پڑھایئے کہ میں مسلمان ہوں اور بچوں سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا، بچو....! تم پہلے مسلمان ہو، پھر بلوچ یا کچھ اور ہو۔

پاکستان کے سابق اٹارنی جنرل جناب یحییٰ بختیار نے ایک موقع پر جب قائداعظم کوئٹہ میں قیام پزیر تھے، ان کی کچھ ایسی تصویریں دکھائیں جو انہوں نے کھینچی تھیں، قائداعظم نے اُن سے اپنی مزید تصویریں کھینچنے کی فرمائش کی، یحییٰ بختیار نے عذر پیش کیا، لیکن قائداعظم نے اُن کا عذر مسترد کردیا، دوسرے دن جناب یحییٰ بختیار اپنا کیمرہ اور فلیش لے کر قائداعظم کی رہائش گاہ پہنچے، اُس وقت قائداعظم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر مشتمل ایک کتاب جس کا ٹائیٹل "الحدیث" تھا مطالعہ فرمارہے تھے، یحییٰ

بختیار چاہتے تھے کہ وہ قائداعظم کی تصویر ایسے زاویہ سے لیں کہ کتاب کا ٹائیٹل بھی فوکس میں آ سکے۔ لیکن قائداعظم نے تصویر کھنچوانے سے پہلے کتاب علیحدہ رکھدی اور یحیٰی بختیار سے فرمایا "میں ایک مقدس کتاب کو اس قسم کی پبلسٹی کا موضوع بنانا پسند نہیں کرتا۔"

قائداعظم کے معالج ٹی بی اسپیشلسٹ ڈاکٹر ریاض علی شاہ لکھتے ہیں کہ "ایک بار دوا کے اثرات دیکھنے کیلئے ہم ان کے پاس بیٹھے تھے، میں نے دیکھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں، لیکن ہم نے اُن کو بات چیت سے منع کر رکھا تھا، اس لیے الفاظ لبوں پر آ کر رک جاتے تھے، اسی ذہنی کشمکش سے نجات دلانے کیلئے ہم نے خود انہیں بولنے کی دعوت دی، تو وہ بولے، "تم جانتے ہو، جب مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ پاکستان بن چکا ہے تو میری روح کو کس قدر اطمینان ہوتا ہے، یہ مشکل کام تھا اور میں اکیلا اسے کبھی نہیں کر سکتا تھا، میرا ایمان ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا روحانی فیض ہے کہ پاکستان وجود میں آیا، اب یہ پاکستانیوں کا فرض ہے کہ وہ اسے خلافت راشدہ کا نمونہ بنائیں، تاکہ خدا اپنا وعدہ پورا کرے اور مسلمانوں کو زمین کی بادشاہت دے، پاکستان میں سب کچھ ہے، اس کی پہاڑیوں، ریگستانوں اور میدانوں میں نباتات بھی ہیں اور معدنیات بھی، انہیں تسخیر کرنا پاکستانی قوم کا فرض ہے، قومیں نیک نیتی، دیانت داری، اچھے اعمال اور نظم و ضبط سے بنتی ہیں اور اخلاقی برائیوں،

"منافقت، زرپرستی اور خود پسندی سے تباہ ہو جاتی ہیں۔

نوٹ:۔اس مضمون کی تیاری میں جناب متین خالد کی کتاب "اسلام کا سفیر" سے مدد
لی گئی ہے)

مجلس عمل سے مجلس بے عمل تک-----

گذشتہ کچھ عرصے سے مولانا فضل الرحمٰن متحدہ مجلس عمل (ایم ایم اے) کی بحالی کیلئے ایک بار پھر متحرک ہیں،انہیں اچانک ایم ایم اے کی بحالی کے لئے فعال کردار ادا کرنے کی فکر لاحق ہو گئی ہے اور ذاتی طور پر مذہبی و سیاسی جماعتوں کے غیر فعال اتحاد کی بحالی میں خصوصی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے،جس کی وجہ سے دینی جماعتوں کے اتحاد میں شامل جماعتوں کے سربراہان کا اجلاس بلانے کیلئے کوششیں آخری مرحلے میں داخل ہوگئیں ہیں،اس حوالے سے جے یو آئی (ف) کے مرکزی رہنما حافظ حسین احمد ایم ایم اے کی بحالی کے سلسلے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں،اطلاعات کے مطابق گذشتہ دنوں لاہور میں ایم ایم اے میں شامل اہم جماعتوں کے ذمہ داران جمعیت علمائے اسلام (ف) کے امیر مولانا فضل الرحمٰن ،جماعت اسلامی کے سیکرٹری جنرل لیاقت بلوچ اور جمعیت علمائے پاکستان کے سیکرٹری جنرل پیر اعجاز ہاشمی کے درمیان اہم ملاقاتیں ہوئیں،جس میں متحدہ مجلس عمل کی بحالی اور ملک کی مجموعی سیاسی صورتحال پر غور اورایم ایم اے کی بحالی کیلئے کوششیں تیز کرنے،ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھنے اوردوسری جماعتوں سے بھی رابطہ کرنے پر اتفاق کیا ہے۔

قارئین محترم !آپ کو یاد ہوگا کہ جولائی 2001 میں پاکستان کی چھ بڑی دینی جماعتوں نے ایک نئے اتحاد "متحدہ مجلس عمل" کے قیام کی منظوری دی تھی، جس کا مقصد ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کیلئے اسلامی نظام کے قیام اور لادینی عناصر کی یلغار کا مقابلہ کرنا تھا، قاضی حسین احمد کی رہائش گاہ پر ہونے والے اِس اجلاس میں جمعیت علماءپاکستان کے سربراہ علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی، جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد، جمعیت علمائے اسلام (ف) کے مولانا فضل الرحمٰن، تحریک جعفریہ کے علامہ ساجد نقوی، جمعیت اہلحدیث کے علامہ ساجد میر اور جے یو آئی (س) کے مولانا سمیع الحق شامل تھے، بعد ازاں علامہ شاہ احمد نورانی کو متحدہ مجلس عمل کا چیئرمین منتخب کیا گیا، ابتداء میں متحدہ مجلس عمل میں شامل جماعتوں نے بڑی سرگرمی کا ثبوت دیا اور ایسے تمام خدشات کو در کردیا کہ یہ اتحاد بیرونی طاقتوں یا ملکی ایجنسیوں کی سرپرستی میں بنایا گیا ہے، چنانچہ 2002 کے الیکشن میں متحدہ مجلس عمل نے قومی اسمبلی کی 68 اور بعد میں سینٹ میں 20 نشستیں جیت کر بھاری کامیابی حاصل کی، سرحد اور بلوچستان میں بھی ایم ایم اے کی حمایت یافتہ حکومتیں قائم ہوئیں، یوں مرکز میں ایک مضبوط حزب اختلاف وجود میں آئی، علامہ نورانی کی قیادت میں مجلس عمل نے جمہوری اداروں کی سلامتی اور بقاء کیلئے بھرپور تعمیری کردار ادا کیا، لیکن اِس کے ساتھ ہی مجلس عمل نے لیگل فریم ورک آرڈر، 58 ٹوبی، نیشنل سیکورٹی کونسل اور باوردی صدر کو مسترد کرتے ہوئے 1973 کے آئین کو اصل شکل

میں بحالی کے ساتھ اعلیٰ عدلیہ کے ججوں سے آئین کے تحت دوبارہ حلف لینے کا بھی مطالبہ کیا، ساتھ ہی متحدہ مجلس عمل کانے یہ بھی فیصلہ کیاکہ صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں میں امریکیوں کو آپریشن کرنے اجازت نہیں دی جائے گی، یہ صورتحال ظفراللہ جمالی کی حکومت کیلئے پریشانی کا باعث تھی۔

مولانا نورانی کے دوٹوک موقف نے حکومت کی نیندیں حرام کردیں، حکومت کی کوشش تھی کی پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے قبل متحدہ مجلس عمل کو قائل کرلیا جائے، چنانچہ مزاکرات کے دور شروع ہوئے،اس دوران حکومت اور متحدہ مجلس عمل کے درمیان 7 میں 6 نکات پر زبانی اتفاق رائے بھی ہوا، لیکن صدر کی وردی کا معاملہ ابھی تک لٹکا ہوا تھا، جسے منوانے کیلئے مجلس عمل مسلسل دباو بڑھاتی رہی، امریکہ کے دورے سے واپسی پر وزیر اعظم ظفراللہ جمالی نے ایم ایم اے کوایک بار پھر ایل ایف او کے تین متنازعہ امور پر مزاکرات کی دعوت دی، جسے مجلس عمل کے قائد علامہ شاہ احمد نورانی نے رد کرتے ہوئے عوامی رابطہ مہم شروع کرنے کا عندیہ دیا اور مطالبات کی منظوری کیلئے 17 دسمبر 2003 کی ڈیڈ لائین دی، جس کے اگلے دن حکومت مخالف تحریک شروع ہونا تھی، لیکن شومئی قسمت کہ کسی بھی احتجاجی تحریک کی نوبت نہ آسکی،اس دوران پاکستانی سیاست اور مجلس عمل 11 دسمبر 2003 کو مولانا شاہ احمد نورانی کی اصولی قیادت سے محروم ہونے کی وجہ سے ایک ایسے عظیم سانحہ سے دوچار ہوئی، جس نے ایم ایم اے کی کمر

توڑ کر رکھ دی،اُس کے بعد پاکستان کی سیاسی تاریخ نے وہ موڑ لیا کہ ایم ایم اے بطور سیاسی جماعت اور تحریک اپنے اصولی مقاصد سے دور ہٹتی چلی گئی اور پھر کبھی سنبھل نہ سکی بلکہ مولانا نورانی کے بعد ایم ایم اے پاکستانی سیاست میں "ملا ملٹری الائنس" کے نام سے پہچانا جانے لگا۔

دراصل مولانا نورانی مجلس عمل کیلئے جہاں اتحاد کی علامت تھے،وہاں اُن کی بے باکی اور حق گوئی نے ایم ایم اے کو حکومت کے ساتھ کسی بھی شرمناک معاہدے سے بھی محفوظ ومامون رکھا ہوا تھا،یہ بات بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ جب تک مولانا نورانی کی نہ بکنے اور نہ جھکنے والی قیادت مجلس عمل کی صدارت پر فائز رہی،حکومت اپنے مطلوبہ مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہی،اِس کی وجہ یہ تھی کہ مولانا نورانی کی سیاسی ترجحات میں حصول اقتدار آخری نمبر پر آتا تھا،وہ خود فرماتے تھے کہ "اگر ممبری چلی گئی تو کیا ہوگا،منبری تو ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔" مولانا زندگی بھر اپنے انہی اصولوں پر کامیابی سے گامزن رہے،مگر مولانا نورانی کی وفات کے بعد مجلس عمل بڑے کرّوفر کے ساتھ میدان عمل میں اتری،اُس نے مولانا نورانی کے مشن کو جاری رکھنے اور اُس پر چلنے کا اعلان بھی کیا،لیکن افسوس کہ ابھی مولانا کا کفن بھی میلا نہیں ہوا کہ مجلس عمل نے اُن کی وفات کے دو ہفتوں کے اندر اندر یعنی 19دسمبر 2003 کو حکومت سے تمام معاملات طے کرکے سودے بازی کرلی،اِس طرح متحدہ مجلس عمل

مولانا نورانی کی وفات کے بعد " مجلس بے عمل " بن گئی، اُس کے اِس طرز عمل کو دیکھ کر ایسا لگا کہ حکومت اور مجلس عمل کے درمیان معاہدے کی راہ میں مولانا نورانی آخری کانٹا تھے، جس کے نکل جانے سے فریقین کو حد درجہ اطمینان ہوا تھا، یوں محض پانچ دنوں کے اندر اندر مجلس عمل نے وہ شرمناک سمجھوتہ کرلیا جسے مولانا نورانی اپنی زندگی میں ہمیشہ مسترد کرتے رہے اور 28 دسمبر 2003 کو قاضی حسین، مولانا فضل الرحمٰن و دیگر قائدین کی موجودگی میں مجلس عمل نے آئین میں 17 ویں آئینی ترمیم کا بل منظور کرکے پرویز مشرف کی حکمرانی کو آئینی و قانونی جواز فراہم کردیا۔

قارئین محترم ! یہ وہی مجلس عمل تھی جو مولانا نورانی کی زندگی میں ایل ایف او پر کسی سمجھوتے کی روادار نہ تھی، لیکن مولانا نورانی کی اصولی اور بے باک قیادت کی آنکھیں بند ہوتے ہی مجلس عمل جھاگ کی طرح بیٹھ گئی، جس مجلس عمل کو مولانا نورانی نے اپنی سچائی، اصول پرستی اور بے داغ قیادت کے خون سے سینچا تھا، بعد میں اُسی مجلس عمل کے قائدین بالخصوص مولانا فضل الرحمٰن نے اپنے سیاسی و ذاتی مقاصد کیلئے بھرپور استعمال کیا اور ایل ایف او کی منظوری و حقوق نسواں بل سمیت کیا کیا شرمناک معاہدے کئے، آپ بخوبی واقف ہیں، آج ایک بار پھر مولانا فضل الرحمٰن کے پیٹ میں مجلس عمل کی بحالی کی مروڑ اُٹھ رہی اور وہ بحالی کیلئے بہت مضطرب اور بے چین ہیں، آخر کیوں ؟

اِس

کی کیا وجہ ہے؟ وہ کیا مقاصد ہیں جو مولانا فضل الرحمٰن مجلس عمل کے پلیٹ فارم سے پھر حاصل کرنا چاہتے ہیں،سب جانتے ہیں کہ مولانا فضل الرحمٰن مجلس عمل کی بحالی کی آڑ میں اپنا سیاسی وزن بڑھا کر حکومت کو بلیک میل کرتے ہیں اور مراعات حاصل کرتے ہیں،علامہ نورانی کی وفات کے بعد مولانا فضل الرحمٰن نے مجلس عمل کو وزن بڑھانے کی مشین بنادیا ہے،جب انہیں حکومت سے کچھ حاصل کرنا ہوتا ہے،وہ ایم ایم اے کی بحالی کا شوشہ چھوڑ دیتے ہیں،خود اُن کا ماضی کا طرز عمل اِس بات کا گواہ ہے،کیا یہ درست نہیں کہ مولانا کی کشمیر کمیٹی کی چیئرمینی سے لے کر محمد خان شیرانی کی اسلامی نظریاتی کونسل میں تقرری تک کی ساری منازل مولانا فضل الرحمٰن نے ایم ایم اے کی بحالی کی دھمکی سے حاصل کیں،دراصل مولانا لمحہ موجود سے انجوائے کرنے اور فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے،اُن کی یہی سیاسی بصیرت،حکمت عملی اور صلاحیت انہیں دیگر دینی جماعتوں کے قائدین سے جدا کرتی ہے۔

بقول جناب عرفان صدیقی مولانا فضل الرحمٰن کبھی بھی دینی تقاضوں اور سیاسی اہداف میں ٹکراؤ پیدا نہیں ہونے دیتے،وہ ہمیشہ سیاسی اہداف کو ترجیح دیتے ہیں اور دینی تقاضوں کو مصلحت کی پوٹلی میں باندھ کرایک طرف رکھ دیتے ہیں،یہ بھی مولانا کی خوبی ہے کہ وہ سیاسی ہدف کی اہمیت اور افادیت کے لئے ایسے ایمان پرور دلائل کا انبار لگا دیتے ہیں کہ ان کا ہر اقدام تقاضائے

دین دکھائی دینے لگتا ہے اور ہم جیسے عامیوں کو بھی یہ یقین ہو جاتا ہے کہ مولانا فضل الرحمٰن اگراس وقت سیاسی کروٹ نہ لیتے تو دین کی فوز و فلاح کا ایک بڑا موقع ضائع ہو جاتا، پرویز مشرف کی سترہویں ترمیم کے حق میں ووٹ دیتے وقت بھی مولانا نے ایسا سماں باندھا تھا کہ بہت سے لوگ اسے دنیوی اور اخروی نجات کا ذریعہ سمجھنے لگے تھے، بہت سو کو تو اِس کے کار خیر اور تقاضائے اسلام ہونے کا ایسا یقین ہو گیا تھا کہ شاید روز محشر اللہ تعالٰی سب سے پہلا سوال ہی یہی پوچھے گا کہ "تم نے سترہویں ترمیم کے حق میں ووٹ دیا یا نہیں؟" قوم کو ایسی ہی روحانی کیفیت کا تجربہ 1993 میں اُس وقت بھی ہوا تھا، جب مولانا نے محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت سے تعاون کو توشہ دین و ایمان بنا دیا تھا، مولانا فضل الرحمٰن کی قیادت میں ایم ایم اے پانچ برس تک سرحد پر بلاشرکت غیرے حکومت کرتی رہی، دوران اقتدار اُس نے اسلام کے چہرے کو کتنا نکھارا؟ معاشرے میں اسلامی تعلیمات کے نفوذ و عروج کے لئے کیا کچھ کیا؟ لوگوں کی زندگیوں میں کتنی تبدیلی لائی۔؟

زیر اقتدار صوبے کے خدوخال باقی تین صوبوں سے کس قدر مختلف تھے؟اور کس اعتبار سے ایم ایم اے کے عہد حکمرانی کو دوسروں سے جدا تھا، قوم اچھی طرح جانتی ہے،اِس دوران پانچ سال تک صوبہ سرحد اور قبائلی علاقہ امریکی کروسیڈی جنگ کے میدان کا رزار بنے رہے، لیکن ایم ایم اے کی حکومت کہیں مزاحم نہ

ہوئی، کبھی حدوں سے تجاوز نہ کیا اور کبھی امریکہ کی اطاعت گزار مشرف حکومت کیلئے کوئی مسئلہ کھڑا نہ کیا، یہاں تک کہ رسوائے زمانہ سترہویں ترمیم بھی وارثان منبر و محراب اور صاحبان جبہ و دستار نے قبول کرلی اور پرویز مشرف کے 12 اکتوبر 1999 کے ماورائے آئین اقدام کو جامہ تقدس بھی پہنا دیا، سب سے افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ خیبر پختون خواہ پر علمائے کرام کی بلاشرکت غیرے حکمرانی، وہاں کے عوام کے لئے کوئی نیا، اچھوتا اور ثمر آور تجربہ ثابت نہ ہوئی، یہ ویسی ہی حکمرانی تھی جیسی دینی تعلیمات و اسناد سے بے بہرہ دنیاداروں کی ہوتی ہے، کرپشن کی داستانیں بھی چلتی رہیں، ووٹ خریدے اور بیچے جاتے رہے، اقربا پروری عروج پر رہی اور اسلام پہاڑوں سے اتر کر بستیوں تک نہ آسکا، اس سارے عرصے میں ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی جسے ایم ایم اے کا امتیاز قرار دیا جاسکے۔

کل تک مولانا پرویز مشرف کے ہمراہ لیلائے اقتدار سے لطف اندوز ہو رہے تھے، آج صدر آصف زرداری کے ہم رکاب اور مرکز میں پیپلز پارٹی سے ہاتھ ملایا ہوا ہے، اپنے حصے سے زیادہ وزارتیں اور چیئرمینیاں حاصل کی ہوئیں ہیں، دراصل وہ تمام سیاسی راستے کھلے رکھنا چاہتے ہیں تاکہ بوقت ضرورت کسی بھی طرف جاسکیں، عجیب بات ہے کہ آج وہ ایم ایم اے (جسے توڑنے میں ان کا سب سے بڑا حصہ ہے) کو بحال بھی کرنا چاہتے ہیں اور لیلیٰ اقتدار کی غلام گردش سے نکلنا بھی

نہیں چاہتے ہیں، یعنی ایک ہی وقت میں دو مختلف چاہتیں، حیرت کی بات ہے، دراصل مولانا انتہائی زیرک اور معاملہ فہم سیاستدان ہیں، وہ جانتے ہیں کہ انتخابات نزدیک آرہے ہیں، جس میں کامیابی مذہبی جماعتوں کے اتحاد کے بغیر مشکل ہے، اکثر سیاسی تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ مولانا ایک بار پھر مجلس عمل کی فعالیت کی آڑ میں جمعیت علمائے پاکستان اور دیگر مذہبی جماعتوں کو بطور چارہ استعمال کرنا چاہتے ہیں، یہی ان کا طریقہ واردات ہے، انہیں تو بس اقتدار کی کرسی ملنی چاہیے، اسی وجہ سے مولانا آج پھر وہیں آگئے ہیں جہاں وہ ہمیشہ آیا کرتے تھے، اُن کے دل و دماغ میں بہار کے انہی روٹھے ہوئے دنوں کی یاد انگڑائی لے رہی ہے جو 2002 میں سرحد اور بلوچستان تو اُن کے پاوں تلے تھے اور گئے دنوں کو آواز دینے اور سہانے موسموں کی بساط بچھانے کے لئے ضروری ہے کہ پھر سے ایک ایم ایم اے کو بحال کیا جائے، پھر سے وہی کھیل کھیلا جائے ۔

باخبر ذرائع یہ بھی بتاتے ہیں کہ مولانا نے جوڑ توڑ شروع کردیا ہے، اس سلسلے میں انہوں نے 10 دسمبر کو جماعت اسلامی کے ساتھ ایک خفیہ ملاقات میں سرحد اور بلوچستان میں انتخابی ایڈجسمنٹ کرلی ہے، مجلس عمل کی بحالی اجلاس سے پہلے مولانا کا یہ اقدام صریحاً بددیانتی ہے، شاید اسی وجہ سے 13 دسمبر کو مجلس عمل کی بحالی کیلئے ہونے والا اجلاس منعقد نہ ہوسکا، اس تناظر میں ہماری دیگر جماعتوں کے قائدین اور بالخصوص جمعیت علماء پاکستان کے اکابرین

سے گزارش ہے کہ وہ مولانا کی چالبازیوں اور اُن کے مفاد پرستانہ طرز عمل کو سامنے رکھتے ہوئے مجلس عمل سے دور ہی رہیں، ویسے بھی مجلس عمل اِس وقت مولانا نورانی جیسی قدآور اور اصولی قیادت سے محروم ہے، دوسرے مولانا نورانی کے لگائے ہوئے اور JUP،اِس درخت کے پھل فضل الرحمٰن اور جماعت اسلامی نے ہی کھائے ہیں دیگر جماعتوں کے حصے میں بدنامی اور جگ ہنسائی کے سوا اور کچھ نہ آیا،اِس لحاظ سے مجلس عمل میں اِن جماعتوں کی شمولیت کا فیصلہ فضل الرحمٰن اور جماعت اسلامی کیلئے تو سیاسی فائدے کا سبب بن سکتا ہے، مگر خود اِن جماعتوں کیلئے نہیں، پھر مولانا کی سیاسی بازیگری اور جوڑ توڑ کی وجہ سے ایم ایم اے پہلے ہی اِس قدر بدنام ہو چکی ہے کہ اب قوم اِس پر اعتبار کرنے کو اِس لیے تیار نہیں کہ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ مولانا فضل الرحمٰن کی ڈوریں کہیں اور سے ہلائی جاتی ہیں اور وہ ہمیشہ بادشاہ گروں کی خواہشات پر ہی متحرک ہوتے ہیں۔

پھر وہی راگ درباری، وہی سرکاری قوالی

امیر شہر کو اُونچا سنائی دیتا ہے۔۔۔۔۔
تاریخ بتاتی ہے کہ سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دور حکومت 22 لاکھ مربع میل کے وسیع و عریض علاقے پر مشتمل تھا، جس میں کچھ ایسے علاقے بھی شامل تھے جن کے مکمل حالات جاننے میں آپ کو کافی دشواری پیش آتی تھی، چنانچہ آپ تمام صوبوں کی جانب قاصد روانہ کرکے وہاں کے حالات معلوم کرتے رہتے تھے، سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اِس بات کا اتنا احساس تھا کہ اُن کی رعایا میں ایک چھوٹی سی بستی بھی ایسی نہ رہ جائے جہاں عدل و انصاف مہیا نہ کرسکیں، مبادا کوئی قوم ظلم و جبر کی چکی کے نیچے پستی رہے اور عمر اُس سے بے خبر ہو، طبری کے بیان کردہ ایک واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافت کے آخری سالوں میں آپ کا یہ احساس اتنا شدید ہوگیا تھا کہ آپ نے پورے ملک کے سرکاری دورے کا وسیع پروگرام بھی بنایا، مگر شہادت نے اِس پروگرام پر عمل پیرا نہ ہونے دیا، سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے ماتحت حکام کو بھی لوگوں کی ضروریات کا احساس دلاتے رہتے تھے، ایک مرتبہ بصرہ کے گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو فرمایا "لوگوں کے گھروں میں اُن کی فراخی کا سامان پیدا

کرو اور اُن کے متعلقین کو راحت دینے کا انتظام کرو۔" قحط کے دنوں میں فیصلہ کیا کہ اُس وقت تک گوشت اور گھی کو ہاتھ نہ لگائیں گے جب تک لوگ قحط میں مبتلا ہیں، چنانچہ آپ نے کثرت سے فاقے کرنے شروع کر دیئے، یہاں تک کہ لوگوں نے آپ کی حالت دیکھ کر کہنا شروع کر دیا کہ "اگر اللہ عام الرمادہ کا قحط دور نہ فرماتا تو ہمارا خیال تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے غم میں جان دے دیتے۔" آپ خود فرمایا کرتے تھے "مجھے لوگوں کی تکلیف کا احساس کیونکر پیدا ہو سکتا ہے جب تک کہ میں خود اُن کی مصیبت میں شریک نہ ہوں۔" ہماری اسلامی تاریخ میں خلفائے راشدین اور بہت سے فرمار وائے سلطنت کے دور رعایا پروری کی ایسی بے شمار مثالوں سے مزین ہیں۔

مگر افسوس کہ آج کے دور میں خلفائے راشدین اور دیگر مسلم حکمرانوں کے عہد خوش جمال کے صرف خواب ہی دیکھے جا سکتے ہیں، اُس دور کے یہ واقعات بیان تو کیے جا سکتے ہیں لیکن ہمارے صاحبان اقتدار کے نزدیک قابل عمل اور قابل اقتداء نہیں ہیں، کیونکہ عوام کے ووٹوں سے مسند اقتدار تک رسائی حاصل کرنے والوں کے نزدیک اِن واقعات کی کوئی حیثیت واہمیت نہیں، لہٰذا اُن سے اِس کی توقع کار عبث ہے، کاش ایسا ہوتا تخت و تاج والوں کو عوام کے دکھ درد کی خبر ہوتی، انہیں معلوم ہوتا کہ مہنگائی کے عفریت نے کیا اودھم مچا رکھا ہے، یومیہ اجرت اور کم آمدنی والے افراد کس زبوں حالی کا شکار ہیں، کاش وہ

جانتے کہ مارکیٹ میں آٹے دال کا بھاؤ کیا ہے، گیس، بجلی، پٹرول، مٹی کے تیل اور ڈیزل کی قیمتیں بڑھا دینے سے عام آدمی کی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، اگر مہنگائی، غربت اور بے روزگاری جیسے عذابوں یہ آگاہ ہوتے تو آج عوام کی یہ حالت زار نہ ہوتی، اِس وقت صورتحال یہ ہے کہ ملک کا ہر ادارہ تباہی و بربادی کا شکار ہے، اُس کے باوجود صدر محترم کمال سادگی سے فرماتے ہیں کہ ادارے کمزور ہوئے ہیں تباہ تو نہیں ہوئے، وزیر اعظم صاحب دعویٰ کرتے ہیں کہ ملک میں سب سے زیادہ ترقیاتی کام اُن کے دور میں ہو رہے ہیں اور پورے ملک میں ترقیاتی منصوبوں کا جال بچھا دیا گیا ہے، اپنی اِس بے مثال کارکردگی جس نے غریب عوام سے روٹی کپڑا اور مکان کی چھت تک چھین لی ہے، کی بنیاد پر صدر صاحب فرماتے ہیں کہ وہ آئندہ الیکشن بھی اِسی نعرے پر جیتیں گے، جبکہ وزیر اعظم صاحب اِس عزم کا اظہار کرتے ہیں وہ سیاسی یتیموں اور ٹسٹ ٹیوب بے بیز کے شور شرابے پر ایوان اقتدار سے رخصت نہیں ہوں گے، کسی کو صدر یا میری شکل پسند نہیں تو مواخذے کا شوق پورا کرلے یا تحریک عدم اعتماد لے آئے، مگر ملک میں سیاسی تبدیلی کیلئے کوئی غیر آئینی اقدام ہرگز برداشت نہیں کیا جائے گا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ صدر مملکت اور محترم وزیر اعظم صاحب کے اِن تمام دعوؤں کے برعکس ملک کی حقیقی صورت حال بے حد تشویشناک ہے، زمینی حقائق کہتے ہیں کہ

موجودہ حکومت عوامی توقعات پوری کرنے میں بری طرح ناکام رہی ہے، اس کے باوجود وزیر اعظم صاحب فرماتے ہیں کہ اُن کی حکومت نے شہید بینظیر بھٹو کے منشور جس میں عوام کو روٹی کپڑے اور مکان کی ضمانت دی گئی تھی، پر کافی حد تک عمل کر دیا ہے، جبکہ عام آدمی آج اِن تینوں سہولتوں کیلئے مارا مارا پھر رہا ہے، بین الاقوامی سروے رپورٹوں کے مطابق جب سابق آمر پرویز مشرف نے اقتدار چھوڑا تو ملک میں خط غربت سے نیچے زندگی گزارنے والوں کی تعداد چار کروڑ سے کم تھی، آج انہی رپورٹوں کے مطابق اِن لوگوں کی تعداد جن کے گھروں میں صرف ایک وقت کھانا پکتا ہے، سات کروڑ سے اوپر نکل گئی ہے جو موجودہ حکومت کی طرف سے غریبوں کی دل لگا کر "خدمت" کرنے کا منہ بولتا ثبوت ہے، کرپشن، مہنگائی، بے روزگاری اور بجلی کے بحران تو ایک طرف، اب تو گیس کی کمی کی وجہ سے کروڑوں گھروں کے چولہے بھی ٹھنڈے ہو رہے ہیں، پنجاب اور سرحد کے بعد اب سندھ اور بلوچستان بھی گیس کی کمیابی کا شکار ہے، حقیقت یہ ہے کہ بجلی کے سالوں پرانے بحران کے بعد گیس کی عدم دستیابی نے صنعتوں کو مکمل تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے، دوسری طرف عوام کے زخموں پر مزید نمک پاشی بجلی، گیس، سی این جی، ایل پی جی اور پٹرول وغیرہ کی قیمتوں میں مسلسل اضافے کی صورت میں کی جا رہی ہے، حال یہ ہے کہ ہر طرف قیامت کا شور ہے، اِک حشر برپا ہے، مگر اِس کے باوجود صدر محترم اور وزیر اعظم صاحب ملک کو درپیش سنگین مسائل پر توجہ دینے کے بجائے اپنی حکومتی کارکردگی کے لایعنی دعوے

کر رہے ہیں، عجب طرفہ تماشا ہے کہ ایک طرف ارباب اقتدار کہتے ہیں کہ وہ کسی کی تنقید سے جانے والے نہیں، کیونکہ اُن کے ساتھ 18 کروڑ عوام ہیں، لیکن اُس 18 کروڑ عوام کی اکثریت کی حالت یہ ہے کہ اُس کے پاس کھانے کو روٹی، پہننے کو کپڑا اور سر چھپانے کو چھت تک نہیں ہے۔ بے روزگاری، بھوک، غربت اور افلاس نے لوگوں کو خود سوزی، خودکشی اور اپنے بچوں کے قتل تک پر مجبور کر دیا ہے، مگر ججوں کی بحالی کیلئے نہیں بلکہ عوام سے روٹی، کپڑا اور مکان کے لئے ووٹ حاصل کرنے کے دعویدار غریبوں کی جماعت اور حکومت کے صدر کو اُن کی کوئی فکر نہیں ہے۔

عجیب رسم ہے چارہ گروں کی محفل میں
لگا کے زخم نمک سے مساج کرتے ہیں
غریب شہر ترستا ہے اک نوالے کو
امیر شہر کے کتے بھی راج کرتے ہیں

صد افسوس کہ یہاں تو دور دور تک عوام کے ساتھ شرکت غم کے بھی کوئی آثار نظر تک نہیں آتے، عوام دانے دانے کو ترس رہے ہیں اور ارباب اقتدار کا حال یہ ہے کہ اُن کے شاہانہ اخراجات دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ شاید یہ پاکستان جیسے غریب ملک کے حکمران نہیں بلکہ کسی ایسے ملک کے حکمران ہیں جہاں کے عوام اِس

قدرآسودہ اور خوشحال ہیں کہ انہیں اِس سے غرض ہی نہیں کہ ہمارے حکمران سیاستدان اور بیوروکریٹ قومی خزانے سے کتنا کچھ خرچ کر رہے ہیں، ایک طرف عوام بدحالی اور بے روزگاری سے دوچار ہیں تو دوسری طرف ہمارے حکمرانوں کے شاہانہ اخراجات ہیں کہ بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں، وہ عالی شان محلوں، کروڑوں روپے کی بلٹ پروف گاڑیوں دولت کی ریل پیل اور اربوں کے اخراجات سے غیر ملکی دورے کرنے میں امریکہ، برطانیہ جرمنی جاپان آسٹریلیا اور کینیڈا جیسے ملکوں کے لیڈروں پر سبقت لے جانے کی دوڑ میں مصروف ہیں، ہر طرف کرپشن کا دریا بہہ رہا ہے، ایمنسٹی انٹرنیشنل کہہ رہی ہے کہ گزشتہ برس کم و بیش پانچ سو ارب روپے کرپشن کی نذر ہو ئے، ریاستی کھونٹے سے بندھے، پاکستان اسٹیل، ریلوے، واپڈا اور پی آئی اے جیسے کوئی درجن بھر سفید ہاتھی ہر سال تین سو ارب روپے ہڑپ کر رہے ہیں، لیکن حکومت کو اِن کی اصلاح احوال کی کوئی فکر نہیں، اُسے رعایا سے کچھ غرض نہیں کہ مفلوک الحال اہل وطن کے سروں پہ کیسی بجلیاں کڑک رہی ہیں، وہ کس قدر سفاک مہنگائی کی صلیب پر لٹکے ہوئے ہیں، بس بارگاہ اقتدار میں سیاسی گویوں اور قوالوں نے ایک ہی راگ، ایک ہی قوالی الاپ رکھی ہے کہ "ہم سیاسی نجومیوں کی پیش گوئیوں سے آئے ہیں نہ جائیں گے، ہم نے ملک کے چار بجٹ پیش کئے پانچواں بھی کریں گے، ہم نے محترمہ بینظیر بھٹو کے منشور اور میثاق جمہوریت پر 80 فیصد عمل کر دیا ہے، ہمارے خلاف واویلا کرنے والے سیاسی مخالفین کی یہ بھول ہے کہ انتخابات مقررہ وقت سے پہلے ہو جائیں

گے۔حکومت اپنی مدت اقتدار کے باقی ڈیڑھ سال میں بجلی کی کمی پوری کر دے گی،ہم نے دہشت گردی اور مہنگائی کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے،وغیرہ وغیرہ۔"کاش۔۔۔۔۔!
ہمارے ارباب اقتدار کو ملک کے بھوکے ننگے عوام کی فکر ہوتی،عوام کے ووٹوں سے مسند اقتدار تک رسائی حاصل کرنے والے صاحبان اقتدار کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا اور کاش۔۔۔۔! وہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالی عنہ کی طرح غریب عوام کی بے بسی،کرب اور اذیت آمیز شب و روز کی تلخی کو محسوس کر سکتے،مگر اِس دور فسوں کار میں ایسا ممکن نہیں کہ نابینا امیر شہر سنائی بھی اُونچا دیتا ہے۔

میمو گیٹ اسکینڈل آخر ماجرا کیا ہے-----

منصور اعجاز کی آمد اور حکومت کی گھبراہٹ

بالآخر حکومت اپنے منصوبے میں بظاہر کامیاب ٹھہری، وہ چاہتی بھی یہی تھی کہ منصور اعجاز کسی بھی طرح میمو کمیشن کے سامنے پیش نہ ہو سکے، چنانچہ اُس نے اِس منصوبہ بندی پر جس توجہ اور سرعت سے عمل کیا، اُس کے الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا گواہ ہیں، اگر 16 جنوری سے اب تک کا ریکارڈ اٹھا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کوئی حربہ نہیں جسے حکومت اور حکومتی ذمہ داران نے منصور اعجاز کی آمد میں رکاوٹ ڈالنے کیلئے استعمال نہ کیا ہو، محترم وزیر اعظم ،وزیر داخلہ اور سابق سینئر وزیر پنجاب سے لے کر پیپلز پارٹی کے عام کارکن تک کھل کر اِس عدالتی معاملے پر اثر انداز ہوتے رہے، وزیر اعظم صاحب نے تو صاف کہہ دیا کہ "منصور اعجاز کوئی وائسرائے یا امریکی صدر سے بڑی شخصیت تو نہیں، جس کیلئے اربوں روپے خرچ کیے جائیں یا فوج کی سیکورٹی مہیا کی جائے، میمو لکھنے والے کو فوج کا پروٹوکول دینا درست نہیں، حکومت آئین اور قانون کے تحت ایسا نہیں کر سکتی، منصور اعجاز کی سیکورٹی کی ذمہ دار صرف وزارت داخلہ ہے، ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی فرمادیا کہ منصور اعجاز پاکستان سے

کبھی بھی مخلص نہیں رہا، ہمیشہ اسٹیبلشمنٹ، حکومتوں اور پاکستان کے خلاف زہر اگلتا رہا، اُسے کمیشن اور پارلیمانی کمیٹی کے سامنے پیش ہونا چاہیے۔" مگر کیسے اِس کا جواب نہیں دیا گیا، وزیر داخلہ صاحب فرماتے ہیں کہ اگر پارلیمانی کمیٹی نے کہا تو منصور اعجاز کا نام ای سی ایل میں ڈالا جا سکتا ہے، اُسے بے نظیر حکومت گرانے کے الزام میں گرفتار بھی کیا جا سکتا ہے، اب وزیر داخلہ صاحب کہتے ہیں کہ منصور اعجاز ایکسپوز ہو گیا ہے، اُس کی عوام کو بے وقوف بنانے کی کوشش ناکام ہو گئی اور جھوٹ پر مبنی ڈرامے کا ڈراپ سین ہو گیا ہے، سابق وزیر قانون اور حکومتی وکیل کہتے ہیں کہ منصور اعجاز کا نام ای سی ایل میں ڈال دیا گیا ہے، اُس کی شرائط صریحاً بلیک میلنگ ہے اور اُس کی افسانہ نگاری کا ایک اور باب بند ہو گیا، انہوں نے کہا کہ اگر منصور اعجاز سچا ہوتا تو پاکستان آتا، ساتھ ہی انہوں نے یہ دھمکی بھی دی کہ دفعہ 182 کے تحت جھوٹا الزام لگانے والے شخص کو گرفتار بھی کیا جا سکتا ہے۔

چت بھی میری اور پٹ بھی میری، حکومت کا یہ وہ طرز عمل ہے جو صاف ظاہر کرتا ہے کہ اُس کے عزائم اور ارادے کیا ہیں اور وہ کیا چاہتی ہے، اِن دھمکی آمیز بیانات کو منصور اعجاز کی وکالت سے ہٹ کر ایک غیر جانبدارانہ تناظر میں دیکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ منصور اعجاز نے پاکستان آ کر کمیشن کا سامنے پیش ہونے سے کیوں انکار کیا۔؟ جس طرح سے حکومتی ذمہ داران کی طرف سے

منصور اعجاز کو خوفزدہ کیا جاتا رہا، کیا ایسی صورت میں کوئی بھی شخص پاکستان آکر خود کو سیاسی دباؤ کے زیر اثر رہنے والی پاکستانی پولیس اور سیکورٹی حکام کے رحم و کرم پر چھوڑ سکتا ہے۔؟یقیناً کوئی بھی شخص اتنا کم عقل ہر گز نہیں ہو سکتا کہ جان بوجھ کر اپنی زندگی خطرے میں ڈالے، چنانچہ منصور اعجاز نے بھی وہی کیا جو حالات و واقعات کا تقاضہ تھا،اب اُسے جھوٹا قرار دینا اور یہ کہنا کہ منصور اعجاز ایکسپوز ہو گیا، سوائے اپنے منہ میاں مٹھو بننے کے اور کچھ نہیں، کیونکہ جس طرح حکومتی ذمہ داران نے منصور اعجاز کو ڈرانے، دھمکانے اور اُس کے آنے کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے کیلئے جو کچھ کیا اُس سے کون ایکسپوز ہوا اور کون جھوٹا ثابت ہوا، یہ کہنے کی ضرورت نہیں،اِس تمام قضیئے میں سب زیادہ تعجب خیز اَمر یہ ہے کہ ایک امریکی شہری کا نام ای سی ایل لسٹ میں ڈالنے کی دھمکی وہ حکومت دے رہی ہے جس نے خود تین بے گناہ پاکستانیوں کے قاتل امریکی جاسوس ریمنڈ ڈیوس کو بڑے اہتمام کے ساتھ امریکہ کے حوالے کیا تھا،آج وزیر اعظم صاحب منصور اعجاز کو کسی وائسرائے سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اب وائسرائے کا دور تو ختم ہو گیا، لیکن وہ کیا یہ نہیں جانتے کہ اُن کی حکومت کے نزدیک امریکہ کا ایک معمولی ایلچی بھی کسی وائسرائے سے کم نہیں ہے،اپنی سیکورٹی پر اربوں روپے خرچ کرنے والے وزیر اعظم صاحب آج منصور اعجاز کی سیکورٹی پر رقم خرچ کرنے کو اِس لیے تیار نہیں کہ اِس سے اُن کے مفادات پر ضرب پڑتی ہے۔

لیکن کیاانہیں معلوم نہیں کہ منصور اعجاز سپریم کورٹ کے حکم کے تحت اپنا جواب داخل کرانے کیلئے اسلام آباد آرہا تھا، دوسرے یہ کہ حکومت میمو کو کاغذ کا ایک ٹکڑا سمجھتی ہے تو پھراس معاملے کواِس قدر غیر معمولی اہمیت دینا کیا معنی رکھتا ہے، اگر منصور اعجاز کو خطرہ نہیں تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حسین حقانی کو کیاخطرات لاحق ہیں جو انہیں وزیر اعظم ہاؤس کے اندر خصوصی سکیورٹی میں رکھاگیا ہے، کیوں اُن کی آزادانہ نقل و حرکت محدود کی گئی ہے اور کیوں وہ اپنی سلامتی کے خدشات کا بار بار ذکر کرتے ہیں، کیا یہ عدالتی کام میں مداخلت نہیں کہ جو شخص کمیشن کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار ہو اور جس کی گواہی کے بغیر تحقیقات آگے نہ بڑھ سکیں اُسے گرفتاری اور واپس نہ جانے کی دھمکیاں دی جائیں، جس وزیر داخلہ نے دھمکی آمیز بیانات کے ذریعے منصور اعجاز کو پاکستان آنے سے روکنے کی شعوری کوشش کی، حکومت نے جان بوجھ کر منصور اعجاز کی سیکورٹی کی ذمہ داری اُسی کی وزارت داخلہ کے حوالے کردی، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محترمہ بینظیر بھٹو کی حکومت گرانے کے ایک کردار کو ٹارگٹ بنائے بیٹھے وزیر داخلہ کیا یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ نواز شریف کی دو حکومتیں گرانے میں کس کس نے سازش کی تھی ؟کیا وزیر داخلہ صاحب قومی میڈیا میں بار بار اٹھائے جانے والے اِس سوال کا جواب دینا پسند کریں گے کہ جس وقت محترمہ پر لیاقت باغ میں جان لیوا حملہ ہوا تھا تو

دھماکے کے بعد اُن کی گاڑی نے کہاں جاکر بریک لگائے تھے ؟ ہم سمجھتے ہیں کہ منصور اعجاز اگر جھوٹا ہے تو اُسے ضرور بے نقاب ہونے دینا چاہیے، چنانچہ اِس تناظر میں منصور اعجاز کا یہ عذر معقول ہے کہ اسے وزارت داخلہ کی سیکورٹی پر اعتماد نہیں ہے۔

جہاں تک میمو اسکینڈل کی حقیقت کا تعلق ہے، تو ایک بات بالکل واضح ہے کہ منصور اعجاز اِس میمو کا ایک اہم کردار ہے اور میمو گیٹ اسکینڈل کے ثبوت کا سب سے بڑا انحصار اُس کی گواہی پر ہے، اُس کے پاس کیا اور کیسے ثبوت ہیں اِس کا علم تو اُسی وقت ہوگا، جب یہ ثبوت سامنے آئیں گے، لیکن ایک بات طے ہے کہ منصور اعجاز بیان دینے اور تحقیقات میں معاونت و ثبوت فراہم کرنے سے اب بھی انکاری نہیں ہے، دوسری طرف اِس میمو کی زد میں صدر کے قریبی ساتھی اور حکومت کے سابق سفیر حسین حقانی ہیں، اِس میمو کی ایک مدعی عسکری قیادت بھی ہے، چونکہ اب یہ معاملہ عدالت عظمی میں ہے، ایسے میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ حکومت پاکستان حقائق کی تلاش اور الزامات کی جانچ پڑتال، صحیح اور غلط کے تعین کیلئے خود منصور اعجاز کو نہ صرف طلب کرتی بلکہ اُس کو ہر قسم کی سہولت فراہم کرنے کا اعلان کرتی، چونکہ الزامات کا کھرا صرف حسین حقانی تک ہی نہیں بلکہ بہت آگے تک جاتا ہے، اِس لیے کوشش یہ ہونی چاہیے تھی کہ اِس سازش تک پہنچا جاتا جو ملک کی سلامتی اور مسلح افواج کے خلاف کی جارہی تھی

اور جس کے تحت فوجی خود مختاری کو داؤ پر لگانے کے وعدے وعید کئے جا رہے تھے، تاکہ سچ اور جھوٹ کا تعین ہو سکتا اور یہ معلوم ہو سکتا کہ اِس سازش کے پیچھے کون کون سے عناصر شامل ہیں، سپریم کورٹ میں دائر درخواستوں کا بھی یہی مقصد تھا، مگر حیرت انگیز اَمر یہ ہے کہ حکومت کو اِن درخواستوں کا دائر ہونا بھی پسند نہیں، وہ اِس حوالے سے ہونے والی تحقیقات سے بھی برہم ہے، حکومتی بے چینی اور اضطراب ظاہر کرتا ہے کہ وہ کسی طور یہ نہیں چاہتی کہ یہ تحقیقات آگے بڑھے اور منصور اعجاز پاکستان آئے، جبکہ مناسب تو یہ تھا کہ اِس معاملے میں اگر حکومت کے ہاتھ صاف ہیں، تو اُسے منصور اعجاز کی آمد کی پر خوشدلی کا اظہار کرتے ہوئے فول پروف سکیورٹی کے انتظامات کرنے چاہئے تھے، تاکہ اصل حقائق قوم کے سامنے آ سکتے اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جاتا۔

مگر حکومتی ارکان کا طرز، بے چینی اور حد درجے بڑھا ہوا اضطراب ظاہر کرتا ہے کہ دال میں کچھ کالا نہیں، بہت کچھ کالا ہے، جبکہ یہ بات بھی ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ میمو کیس میں شروع دن سے ہی حکومتی طرز عمل نے بہت سے سوالات کھڑے کر دیئے ہیں اور اُس کے گرد شکوک و شبہات کا دائرہ بنا دیا ہے، رہی سہی کسر اِس معاملے میں حکومتی ذمہ داران کے بیانات اور روڑے اٹکانے کے طرز عمل نے پوری کر دی ہے، سوال یہ ہے کہ آخر اُسے یہ خوف کیوں لاحق ہے کہ یہ سب کچھ اُس

کے خلاف ہو رہا ہے، منصور اعجاز نے جو کچھ کہا اگر وہ اُس کا ثبوت دینے کیلئے پاکستان آ کر میمو کمیشن میں بیان دینا چاہتا ہے تو اُس سے حکومت اتنی خائف کیوں ہے، کیوں نہیں چاہتی کہ منصور اعجاز پاکستان آئے اور اپنا بیان اور ثبوت کمیشن کے سامنے پیش کرے، کیوں بار بار وزیر داخلہ یہ دھمکی آمیز بیان دہراتے رہے کہ ہم اُس سے پوچھیں گے کہ بینظیر حکومت کس کے کہنے پر گرائی تھی، چنانچہ منصور اعجاز کے وکیل کی توجہ دلانے پر اس صورتحال کا نوٹس لیتے ہوئے میمو کمشن کے سربراہ جسٹس فائز عیسیٰ نے اٹارنی جنرل انوار الحق سے کہا ہے کہ آپ بیان حلفی دے چکے ہیں کہ منصور اعجاز کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی، پھر وزیر اعظم اور وزیر داخلہ کیوں بیانات دے رہے ہیں، انہوں نے وفاقی وزیر داخلہ رحمٰن ملک کو طلب کرکے وضاحت بھی مانگی، اس موقع پر جسٹس فائز عیسیٰ نے کہا کہ آپ کمیشن کے لئے مشکلات پیدا کر رہے ہیں اور دھمکی آمیز بیانات دے رہے ہیں، جس پر وفاقی وزیر داخلہ نے کہا کہ منصور اعجاز کا نام ای سی ایل پر نہیں ڈالا جائے گا اور انہیں فول پروف سکیورٹی مہیا کی جائے گی، وفاقی وزیر داخلہ نے منصور اعجاز کو گرفتار نہ کرنے سے متعلق بیان حلفی بھی کمیشن میں جمع کرا دیا ہے، چنانچہ میمو کمیشن نے منصور اعجاز کو 9 فروری کو پیش ہونے کے لئے آخری مہلت دیتے ہوئے اپنے حکم میں کہا ہے کہ حکومت پاکستان منصور اعجاز کی پاکستان آمد، قیام خفیہ رکھنے اور اُن کی بحفاظت واپسی یقینی بنائے، حکم میں مزید کہا گیا ہے کہ سیکرٹری کمیشن

منصور اعجاز کے آنے کی صورت میں اُن کے طیارے تک جائیں، انہیں مسلسل اسکارٹ کر کے کمیشن تک لائیں اور ضروری دستاویز طیارے سے ہی اپنی حفاظت میں لے لیں۔اِس حوالے سے کمیشن نے ایف آئی اے، سی اے اے اور دیگر متعلقہ اداروں کو بھی ہدایات جاری کر دی ہیں، کمیشن نے یہ حکم بھی جاری کیا ہے کہ میمو کمیشن میں پیش ہونے والے وکلا اخبار نویسوں سے بات چیت نہ کریں، کمیشن کا کہنا ہے کہ منصور اعجاز براہ راست کمیشن کے سامنے پیش ہو سکتے ہیں، ہوٹل میں بیان ریکارڈ کرا سکتے ہیں، چاہیں تو نجی سکیورٹی حاصل کر سکتے ہیں جس سے حکومت کا کوئی تعلق نہ ہو۔اب دیکھنا یہ ہے کہ میمو کمیشن کے اقدامات اور حکومتی یقین دہانیوں کے بعد منصور اعجاز کیا پاکستان آ کر کمیشن کے سامنے اپنا بیان قلمبند کراتے ہیں اور کس طرح قومی سلامتی سے وابستہ یہ اہم معاملہ اپنے منطقی انجام تک پہنچتا ہے۔ ہمارا ماننا ہے کہ اگر میمو کاغذ کا ٹکڑا اور اتنا ہی غیر اہم ہے کہ اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے، تو اِس کا تعین خود کرنے کے بجائے عدالتی کمیشن اور عدالت عظمیٰ کو کرنے دیا جائے، فیصلے سے قبل اِس معاملے پر کسی کو جھوٹا اور ایکسپوز قرار دینا قطعاً درست نہیں ہے۔

یومِ میلاد تجدید عہدِ وفا اور انقلاب کا دن

ماہ ربیع الاوّل اور اِس ماہ مبارکہ میں 12، ربیع الاوّل کے دن کا ہر لمحہ اور ہر گھڑی اہل ایمان کیلئے بہارِ جاودانی کا پیغام لے کر آتی ہے۔ کائناتِ ہست و بود کو ہمیشہ تاریخ کے اِن مقدس لمحات پر ناز رہے گا جو 12، ربیع الاوّل کی صبح سعادت کے دامن میں سمٹ آئے اور اِن مقدس لمحات نے اِس دن کو پوری تاریخِ انسانی میں دیگر تمام ایام سے ایسا جدا اور ممتاز کر دیا کہ اب اِس دن کے بعد قیامت تک کوئی بھی دن اِس دن سے زیادہ معزز، مکرّم، افضل اور مقدس نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ دن "وجہ وجودِ کائنات" کے عالمِ دنیا میں ظہور کا دن ہے۔

بارہ ربیع الاوّل کا دن صرف تاریخِ انسانی کا ہی نہیں پوری کائناتِ عالم کا وہ عظیم ترین دن ہے۔ جس کے انتظار میں گردش شام و سحر نے ماہ و سال کی لاکھوں کروٹیں بدلی تھیں۔ اِس دن فضائے عالم مسرتوں کے دلآویز نغموں سے گونج اٹھی اور اِس صبح نور کے پاکیزہ اُجالے نے شمس و قمر کو روشنی اور ستاروں کو ضو فشانی بخشی۔ اِس دن کی صبح انقلاب کی اثر آفرینی نے تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ وہ تاریخ جس کا ورق ورق درماندگی اور انسان دشمنی کی گواہی دے رہا تھا۔ وہ تاریخ جس کا دامن ظلم و بربریت سے تار تار تھا۔

وہ تاریخ جس میں قیصر و کسریٰ کا جبر و استبداد لوگوں کا مقدر بن چکا تھا۔ لیکن ظہور قدسی کے اِن مبارک لمحات نے تہذیب انسانی کو وقار، ثقافت کو تقدس، علم کو وسعت، فکر کو ندرت، عمل کو طہارت اور جذبوں کو پاکیزگی بخشی اور نفرتوں اور عداوتوں کے خارزار لامتناہی صحرا میں محبت واُخوت اور مروت و خلوص کے گلستان آباد کئے۔ یہی وہ دن جس کیلئے قدرت نے شعور انسانی کو تمام ارتقائی منازل سے گزار کر بلوغت کے اُس مقام پر پہنچادیا تھا جہاں اب اُسے ہدایت و رہنمائی کیلئے پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم جیسی نمونہ کمال اور جامع الصفات ہستی کی شدت سے ضرورت تھی۔

بارہ ربیع الاوّل کا دن توحید باری تعالیٰ کی پرچم کشائی اور ظلم و ستم میں جکڑی ہوئی اقوام اور سسکتی ہوئی انسانیت کی رہائی کا دن ہے۔ یہ دن صداقتوں کا امین اور سعادتوں کا پیامبر ہے۔اِس دن طلوع ہونے والے سورج کی روشنی نے انسانیت کو افراط و تفریط کی دلدل سے نکال کر توازن واعتدال کی راہ پر گامزن کردیا۔اِس دن نے تمام نسلی، لسانی، طبقاتی اور جغرافیائی بتوں کو توڑ کر صفحہ ہستی پر ایک ایسے خدائی نظام کو جنم دیا جس نے روئے زمین پر امن و محبت، اتحاد و یگانگت کی فضا قائم کرکے تمام جھوٹے باطل امتیازات کا خاتمہ کردیا اور بھٹکی ہوئی مخلوق کو خالق حقیقی کی دہلیز پر لاکر سجدہ ریز کردیا

یوم میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم نجات ہے شرک سے، جہالت سے، ظلم سے، غلامی کی زنجیروں سے، شیطان اور طاغوت کے ہتھکنڈوں سے اور جھوٹے خداؤں کی خدائی سے، یوم میلاد دراصل اُس انقلاب کی صبحِ نو کی نوید ہے جس نے انسانیت کے دامن سے ظلم و درندگی کے بدنما دھبوں کو صاف کرکے اُسے رحمت و رافت کے خوشبودار اور صدا بہار پھولوں سے بھر دیا اوراِس انقلاب نے عرب کے صحرا نوردوں کو خضرِ راہ بنادیا۔چرواہوں کو قافلہ سالاری عطا کی اور غلاموں کو وہ ہمت و حوصلہ اور مرتبہ و مقام دیا کہ حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ سیّدنا بلال (میرے آقا بلال رضی اللہ عنہ) کہلائے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے یتیموں، بے کسوں اور مفلسوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوئے جس کے حقداراِس انقلاب سے قبل صاحبِ جاہ و حشمت وثروت ہوا کرتے تھے۔ گویایوم میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم عظمت انسانی کا محافظ وپاسباں قرار پایاجس کی بدولت انسانیت کو عظمت و شرف کی معراج عطا ہوئی۔میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم دراصل پوری کائنات کیلئے ربّ کائنات کے اُس نظام کا اجراء ہے جس کی حکمرانی تمام قومی، لسانی اور جغرافیائی بتوں کو پامال کرکے برابری کے حقوق عطا کرتی ہے۔

میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم خالق کائنات کا وہ آخری ورلڈ آرڈر ہے جس کے بعد دنیا کو کسی نئے ورلڈ آرڈر کی ضرورت نہیں رہتی۔لاکھوں درود و سلام اُس ذات اقدس پر جس کے سر انور پر ربّ کائنات نے خاتمُ النبیین، رحمتہُ اللعالمین اور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا تاج سجا کر پوری کائنات کیلئے ہدایت و رہنمائی کا سر چشمہ بنادیا۔ابتدائے آفرنیش سے لے کرتا قیامت اور مابعد قیامت جس کو جو کچھ بھی ملایا ملے گا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضانِ کرم کا تصدق ہے۔کائنات میں پھیلی ہوئی ہر چیز کا وجود اور اِن اشیاء میں موجود رنگ و نور اور حسن و رعنائی کا ظہور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی وجود کی برکت ہے۔

پیغمبر انقلاب، سپہ سالار اعظم،امام المجاہدین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کا ہر ہر گوشہ اور ہر ہر پہلو ہمہ گیر، جامع اور کامل نمونہ ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ بنی نوع انساں کیلئے روحانی، اخلاقی، معاشی، سیاسی اور سماجی تمام مسائل کا حل پیش کرتی ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت و تبلیغ کے ذریعے اسلامی ریاست" مدینہ "کی بنیاد رکھی اور جہاد کے زریعے اس کی حدود کو وسیع کیا۔اس لیئے کہ دین حق کو شرق سے غرب تک غالب کردینے کی جدوجہد "وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور

دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اِسے تمام ادیان باطلہ پر غالب کر دے، خواہ مشرکین کو (کتنا ہی ناگوار گزرے" (الصف: 9

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی کا حصہ تھی اور اسی مقصد کے حصول کیلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم زندگی بھر باطل قوتوں سے نبرد آزما رہتے ہیں۔ چشمِ زمانہ دیکھتی ہے کہ کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہر مکہ کی گلی کوچوں میں لوگوں کو راہ حق کی طرف بلاتے دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی دعوتِ حق کی پاداش میں طائف کے بازاروں میں پتھروں سے لہولہان ہوتے ہیں۔ شعب ابی طالب کی گھاٹی میں معاشی و معاشرتی بائیکاٹ برداشت کرتے ہیں۔ دشمنوں کی برہنہ تلواریں درِ دولت کا محاصرہ کرتی ہیں۔ ہجرت مدینہ ہوتی ہے۔ کبھی معرکہ بدر میں صحابہ کرام کو صف آراء کرتے دکھائی دیتے ہیں تو کبھی انہیں اُحد کے مورچوں پر متعین کرتے نظر آتے ہیں۔ کبھی دندان مبارک کی شہادت، کبھی چہرہ انور کا زخمی ہونا، کبھی شکم مبارک پر پتھر باندھ کر اسلام کے دفاع کیلئے خندقیں کھودنا اور کبھی خیبر، کبھی حُنین، کبھی قریضہ کی جنگیں۔ غرض کہ پے درپے مہمات و غزوات۔ دس سالہ مدنی زندگی میں کم و بیش 27 غزوات میں بنفسِ نفیس شرکت اور 56 سرایا میں دشمن اسلام کی جانب لشکر کی روانگی۔ اِن تمام غزوات و سرایا اور مصائب و آلام کو برداشت کرنے

کا بنیادی مقصد دین حق کو دنیا میں غالب کر دینے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اس لیئے کہ پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک دین صرف عبادات و ریاضات کی ادائیگی اور تکمیل کا نام نہیں تھا۔

آج عام آدمی سے لے کر قومی اور بین الاقوامی سطح تک اُمت مسلمہ کے افراد مایوسی و بے بسی اور اپنے مقصد سے عدم آشنائی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ باطل طاغوتی اور سامراجی طاقتیں اِسے صفحہ ہستی سے مٹانے کے درپے ہیں۔ کشمیر، فلسطین، عراق، افغانستان، بوسنیا، چیچینیا، مراکش، الجزائر اور برما سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں کے بادل اُمت مسلمہ کیلیئے لمحہ فکریہ بنے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کے خون سے زمین کا دامن سرخ ہو رہا ہے اور وقت کے چنگیز و ہلاکو انسانی کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کر رہے ہیں۔

اُن کی آتش انتقام بجھنے نہیں پا رہی۔ دنیا بھر میں مظلوم مسلمان یہود و نصاریٰ کے پنجہ استبداد میں جکڑے ہوئے سسکیاں لے رہے ہیں۔ لیکن جینوا کے کسی معاہدے، اقوام متحدہ کے کسی چارٹرڈ اور سلامتی کونسل کی کسی قرارداد سے اُن کی دادرسی نہیں ہو رہی ہے۔ طاغوتی اور سامراجی طاقتیں اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کیلیئے جو چاہتی ہیں کر گزرتی ہیں۔ عراق پر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی وحشیانہ جنگی کاروائیاں، فلسطین میں صہیونیت کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل

عام،آئے دن مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی، بوسینیا کے مظلوم مسلمانوں کی نسل کشی،اور اجتماعی قبروں میں تدفین، چیچینیا میں سرخ سامراج کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل عام اور جذبہ آزادی کا کچلا جانا۔

بھارت میں قوم پرست ہندوؤں کے ہاتھوں ہزاروں مسلمانوں کا قتل عام اور بابری مسجد کی شہادت، کشمیر میں بھارتی فوجی درندوں کے ہاتھوں مظلوم کشمیری مسلمانوں کا قتل، دختران کشمیر کی بے حرمتی اور افغانستان میں بے گناہ مسلمانوں کے خون سے ہولی جیسے واقعات جہاں آج عالمی ضمیر کے دوہرے معیار کی شرمناک علامتیں ہیں۔وہاں دنیا میں پانڈوں اور آبی و جنگلی حیات کا تحفظ کرنے والی این،جی اوز اور امنِ عالم کے نام نہاد علمبرداروں اور ٹھکیداروں کی اِن واقعات پر پراسرار خاموشی بھی اُن کے مسلمانوں کے خلاف اندرونی جذبہ نفرت کی آئینہ دار ہے۔

آج اُمت مسلمہ کے افراد، حکمران اور ادارے جن مقتدر افراد اور اداروں سے اپنے بنیادی حقوق کی بھیک مانگتے پھر رہے ہیں وہ خود مسلمانوں کے سب سے بڑے قاتل اور انسانی حقوق کی پامالی کے سب سے بڑے مجرم ہیں۔آج پوری دنیا میں اُمت مسلمہ کیلئے موجودہ صوتحال دراصل اُن صلیبی جنگوں کا تسلسل ہے۔جن میں اہل صلیب نے مسلمانوں کے ہاتھوں ذلت آمیز عبرت ناک شکست کھائی تھی۔آج وہ

عالم اسلام کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھا کر مسلمانوں سے اپنی اُسی ذلت آمیز شکست کا بدلہ لے رہے ہیں۔

اُسی انتقام کی آگ نے آج اُمت مسلمہ کو دنیا بھر میں لہو رنگ کر رکھا ہے۔بد قسمتی سے اہلِ صلیب کو مسلمانوں کے خون سے آتش انتقام بجھانے کا موقع خود اُمت نے دیا ہے۔وہ لمحہ غفلت جس نے ہماری نظروں سے ہماری منزل او جھل کردی اور اُمت کو غلامی کی دلدل میں دھکیل دیا،اب ہمیں اس لمحہ غفلت سے آزادی حاصل کرنا ہوگی۔عالم اسلام کو اپنی مجرمانہ خاموشی کو ترک کرنا ہوگا۔اور اپنے جذبہ حریت کو بیدار کرکے میدان کارزار کا راستہ اختیار کرنا ہوگا اور یہ اُسی وقت ممکن ہوگا جب ہم انفرادی، قومی اور بین الاقوامی زندگی میں ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے قربت پیدا کرکے مقصد بعثت نبوی کو سمجھنے کی کوشش کریں گے اور دین مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو غالب کردینے کیلئے " انقلاب نظامِ مصطفیٰ " کا راستہ اختیار کریں گے ۔

یہ بار امانت اٹھانے کیلئے ہمیں اُس سفر انقلاب کا مسافر بننا پڑے گا۔جس کے قافلہ سالار پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ماہ ربیع الاوّل ہمیں پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و محبت کا پیغام دیتا ہے۔آج اِس عشق و محبت کو اَمر کرنے اور دائمی بقاء کے حصول کیلئے مقصد بعثت نبوی سے

بھی عشق و محبت کی شدید ضرورت ہے ۔اِس مرتبہ ہمیں جشن میلاد مناتے ہوئے اپنی انفرادی، قومی اور عالمی حیثیت پر بھی ضرور غور کرنا چاہیے اورجہاں تک بھی ممکن ہو اُنہیں نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں رنگنے کی اُمنگ پیدا کرنا چاہیے۔

اپنے وجود کی بقاء اوراپنی سلامتی کی ضمانت کیلئے ہمیں اپنے اندر وحدت اور دینی عصبیت پیدا کرنا ہوگی۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ہم پر حملہ آور قوتیں متحد ہورہی ہیں۔اُن کے صدیوں کے باہمی اختلافات ختم ہو رہے ہیں اور وہ اپنے انفرادی مفادات پر اپنے قومی مفادات کوترجیح دیتے ہوئے عالم اسلام کے گرد گھیرا تنگ کر رہے ہیں۔دوسری طرف ہم ایک خدا،ایک رسول،ایک دین اور ایک کعبہ کو ماننے والے باہم منتشراور متفرق ایک بکھرے ہوئے ریوڑ کی طرح خونخوار بھیڑیوں کی زد میں ہیں۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ اُمت اپنے محسن آقا پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے وابستہ ہونے کے بجائے اغیارکے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی ہے۔

آج ملتِ اسلامیہ کو درپیش داخلی،خارجی، نظریاتی اور جغرافیائی چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کیلئے دامن مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے عملی وابستگی اختیار کرنا ہوگی۔اپنے اسلاف کے طریقوں کو اپنانا ہوگا۔باہم متحدو منظم ہو کر تمام

استحصالی قوتوں کے خلاف سینہ سپر ہونا ہوگا اور اپنی عظمت رفتہ کے حصول کیلئے مصائب و آلام اور قربانیوں کی تاریخ دہرا کر یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وطن عزیز پاکستان پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم کے سرفروشوں، جانثاروں اور غلاموں کا ملک ہے اور یہ زمین انقلابِ نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے روح پرور جذبوں کی امین ہونے کے ساتھ ساتھ اِس کی اساس و بنیاد اسلام کی اولین ریاست، ریاست مدینہ کا ایسا عکس ہے۔
جس کا نصب العین ہی غلبہ دین کی جدوجہد کیلئے نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا عملی نفاذ ہے۔یوم میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صبح سعادت سے لے کر آج تک ہر سال پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا اِس صبح سعید کا شایان شان طریقے سے استقبال کرتے ہیں۔درود و سلام کے نذرانے پیش کرتے ہیں۔بیان و نعت کی محفلیں سجاتے ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و مناقب پر تقاریر ہوتی ہیں۔جلسے اور جلوسوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔گلی محلوں اور شہروں کو سجایا جاتا ہے۔چراغاں کیا جاتا ہے۔
اس لیئے کہ یہ دن اُمتِ مسلمہ کیلئے افضل ترین دن ہے اور اِس دن کو جشن عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طور پر منانا اہل ایمان کیلئے باعث ذریعہ نجات ہے۔یہ سب درحقیقت تحدیث نعمت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات

مبارکہ کے ساتھ اپنے تعلق کے اظہار اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پیغام ہدایت کی تبلیغ واشاعت کا ذریعہ ہے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حقیقی تعلق کے اظہار کا حق تب ہی ادا ہوسکتا ہے۔ جب ہم متذکرہ بالا امور کے ساتھ ساتھ انفرادی اور اجتماعی سطح پر ہر شعبہ زندگی کو مکمل طور پر پیغمبر انقلاب آقائے نامدار سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور سنت مطہرہ کے سانچے میں ڈھال لیں۔

سیرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی آفاقی تعلیمات سے اپنے ظاہر و باطن کو انقلاب آشنا کریں اور جشن میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یوم تجدید عہد اور یوم انقلاب کے طور پر منائیں۔ جشن میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم منانے والے خوش بخت مسلمانوں۔۔۔۔ ۔یہ جشن ۔۔۔۔۔ یہ مسرت و شادانی تمہیں مبارک ہو۔ لیکن یاد رہے کہ اِس دن کا ایک تقاضہ یہ بھی ہے کہ مقصد بعثت نبوی کو سمجھا جائے اور اس مقصد کو سمجھ کر تجدید عہد کیا جائے کہ ہم پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو دنیا میں غالب کر دینے کی جدوجہد میں تن من اور دھن کی بازی لگادیں گے۔ کیونکہ یہی مقصد بعثت نبوی کی تکمیل اور یوم میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل پیغام ہے۔ جس پر عمل کے بغیر نہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا حق ادا ہوسکتا ہے اور نہ ہی یوم میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی تقاضے پورے ہوسکتے ہیں۔

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

جادو نگری کے جادو گر اور زیاں کاری کا المیہ۔۔

جناب صدر، آگہی عمل مانگتی ہے۔۔۔۔۔!

پاکستان ایک جادو نگری ہے، جس کے حکمران وہ جادو گر ہیں جو بیانات کے منتروں سے قوم کی تقدیر بدلنا چاہتے ہیں، من پسند گوشوارے تراش کر سوانیزے سورج کے نیچے کھڑی قطرہ قطرہ پگھلتی قوم کو ترقی و خوشحالی کے سبز باغ دکھانا چاہتے ہیں اور پرفریب اعداد و شمار کے گورکھ دھندے سے اپنی حسن کارکردگی کی دھاک بیٹھانا چاہتے ہیں، جب تلخ حقیقتوں کو نظر انداز کرکے حکمران اپنی پسند کے منظر تراشنے کے مرض میں مبتلا ہوجائیں تو زمینی حقیقتیں اپنا وجود کھو بیٹھتی ہیں، مرض کی شدت بہار اور خزاں رتوں کی تمیز مٹا دیتی ہے، حکمرانوں کا ذوق نظر ہر منظر کو بہار جاودانی کے خوبصورت لبادے میں لپیٹ کر اِس طرح پیش کرتا ہے، جس میں نہ رتوں کی پہچان باقی رہتی ہے اور نہ ہی موسموں کا سراغ ملتا ہے، جب قوموں کی صورت گری کرنے والے رہنما اِس بیماری میں مبتلا ہوجائیں تو قافلے بھٹک جاتے ہیں اور قومیں اپنا نشان منزل کھو بیٹھتی ہیں۔

بدقسمتی سے پاکستانی قوم بھی ایک ایسے ہی بھٹکے ہوئے کارواں کی مانند ہے جو

اپنا نشان منزل کھو چکی ہے، 64 سال سے ہمارے حکمران اپنے بیانات کے جادو سے قوم کی تقدیر بدلنے کے دعویدار ہیں، مگر حالات ہر آنے والے دن کے ساتھ پہلے سے بھی ناگفتہ بہ ہیں،اِس کے باوجود بھی ہمارے موجودہ حکمرانوں کا دعویٰ ہے کہ اگر انہیں پانچ سال پورے کرنے دیئے گئے تو وہ ملک کی تقدیر بدل دیں گے،اُن کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے بینظیر انکم سپورٹ پروگرام کے ذریعے معیشت کو مستحکم کیا ہے، مگر زمینی حقائق کہتے ہیں کہ گذشتہ چار برسوں کے دوران موجودہ حکومت کی کارکردگی اور پالیسی ایسی نہیں رہی ، جس کی بنیاد پر اِس دعوے کو تسلیم کیا جاسکے، وہ منصوبہ جس کے ذریعے حکمران معیشت کے مستحکم کرنے کے دعویدار ہیں، وہ خود بدعنوانی کے پھیلتے ہوئے ناسور کی وجہ سے مختلف قسم کے اسکینڈلز کی زد میں ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ جس روز صدر صاحب نے یہ دعویٰ کیا ، عین اُسی روز مرکزی بینک کی سہ ماہی رپورٹ نے اُس کی یہ کہہ کر تردید کردی کہ ملکی معیشت کمزور ہے اور سال 2012ء کے دوران جی ڈی پی کا 4.2 فیصد کا ہدف حاصل کرنا مشکل ہے،اسٹیٹ بینک کا کہنا تھا کہ ترقی کا ہدف حاصل کرنا مشکل ہے، حکومتی قرضے دگنے ہوگئے ہیں، مہنگائی بڑھے گی،اخراجات میں اضافہ ہوگیا ہے،اِس لیے بجٹ خسارے کا بوجھ بینکوں پر آگیا ہے، اسٹیٹ بینک کی رپورٹیں مسلسل پاکستان کی بدترین اقتصادی صورتحال کی نشاندہی کررہی ہیں، گزشتہ دو سال سے جاری

ہونیوالی سٹیٹ بینک کی ہر سہ ماہی رپورٹ حکومتی بے ضابطگیوں کا رونا روتی نظر آتی ہے، جبکہ حکمرانوں نے بینکوں سے قرضے لیکر روزمرہ کے معاملات چلانے کا آسان راستہ اختیار کرکے ملک اور عوام کو مزید مشکلات میں ڈال رکھا ہے۔اسٹیٹ بینک کی رپورٹ میں گیس کی قلت، تیل کی بلند قیمتوں اور زرعی اجناس کی عالمی قیمتوں میں کمی کے عوامل کو قومی پیداوار کے مقررہ ہدف کے حصول میں دشواری کا سبب ٹھہرایا گیا ہے،رپورٹ میں اِس بات کا بھی اعتراف کیا گیا ہے کہ بیرونی وسائل سے رقم نہ آنے کے سبب بجٹ خسارہ پورا کرنے کا بوجھ بینکاری نظام پر آگیا ہے، جس کی وجہ سے نجی شعبے کے لئے اپنا کردار ادا کرنے کی گنجائش ختم ہو گئی ہے، اسٹیٹ بینک کی یہ رپورٹ ملک کی معاشی ابتری کی بڑی حدتک عکاسی کرتی ہے۔

رپورٹ سے یہ حقیقت بھی پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ مہنگائی اور بے روزگاری کی چکی میں پستے کروڑں پاکستانیوں کے لئے مزید مشکل وقت آرہا ہے، چنانچہ اِس رپورٹ کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مستقبل قریب میں مہنگائی کو لگام دیئے جانے کا کوئی امکان نہیں ہے، طرفہ تماشہ یہ ہے کہ گزشتہ دو سال کے دوران اسٹیٹ بینک کے چار گورنر حکومت کی ناقابل اصلاح مالی پالیسیوں سے اختلاف کرتے ہوئے مستعفی ہوچکے ہیں، مگر من مانیوں کی راہ اختیار کرنیوالے حکمرانوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی ،نہ ہی حکمرانوں نے اپنے اللے

تعلقوں میں کوئی کمی آنے دی، نہ ہی ملک اور قوم کی بہتری کیلئے قابل ذکر پالیسیاں بنائی گئیں ، نتیجتاً قوم، بے روزگاری ، غربت ، بھوک و افلاس اور کمر توڑ مہنگائی کے عذاب میں مبتلا ہے، دوسری طرف خود حکومت نے ملکی معیشت کو "فرینڈز آف پاکستان"، کیری لوگر بل اور آئی ایم ایف کے شکنجے میں بری طرح جکڑ دیا ہے ۔
آج حال یہ ہے کہ بے روزگاری اور غربت و افلاس کا گراف بلند ترین سطح پر ہے ، توانائی کے بحران نے قومی معیشت کو متزلزل کرکے رکھ دیا ہے، ہزاروں کارخانے، فیکٹریاں اور صنعتی ادارے بند ہو چکے ہیں ، لاکھوں مزدور بیروزگار ہو گئے ہیں، بجلی ، گیس اور پیٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافے نے مصنوعات کی پیداواری لاگت میں اضافہ کرکے گرانی کے ایک نئے طوفان کو جنم دیا ہے، ملکی برآمدات میں زبردست کمی سے نہ صرف کئی غیر ملکی منڈیاں پاکستان کے ہاتھ سے نکل گئی ہیں بلکہ تجارتی خسارے میں بھی مسلسل اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے، ملک میں امن وامان کی صورتحال انتہائی خراب ہے جس نے سرمایہ کاری کو بری طرح متاثر کیا ہے اور غیر ملکی سرمائے کا فرار تیز تر ہوتا جارہا ہے، بہت سی صنعتیں بیرون ملک منتقل ہو گئیں ہیں، یہاں تک کہ پاکستانی رمایہ کاروں نے بھی اپنا سرمایہ ملائیشیا، سری لنکا اور بنگلہ دیش منتقل کردیا ہے،اس تناظر میں اہم سوال یہ ہے کہ پاکستان کے معاشی حالات جس تباہی کے

دہانے پر پہنچ چکے ہیں کیا اُس کا ازالہ ایک بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کے ذریعے لوگوں کو بھکاری بنا کر کیا جاسکتا ہے۔

ہمارا ماننا ہے ایسا ہرگز ممکن نہیں، حقیقت یہ ہے کہ حکمرانوں کی غلط پالیسیوں اور عیاشیوں نے ملک کو اُس دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے،جہاں بینک بھی اب حکومت کو قرضے دینے سے ہچکچا رہے ہیں،اِس وقت مسئلہ صرف معیشت کے استحکام کا ہی نہیں رہا، بلکہ معاشی بحران نے ملک میں سماجی، اخلاقی اور نفسیاتی مسائل بھی پیدا کر دیے ہیں، کرپشن اور بدعنوانی سکہ رائج الوقت بن چکا ہے،جس کی گندگی میں اب پوری قوم لتھڑی ہوئی نظر آتی ہے، بدعنوانی اور نااہل انداز حکمرانی نے اہم اداروں کو تباہ کر دیا ہے،

وزیر اعظم صاحب نے قومی اسمبلی میں اپنی پہلی تقریر میں عوام کے لئے ایک ریلیف پیکیج دینے کا اعلان کیا تھا،اِس بات کو آج چار سال بیت چکے ہیں، عوام انتظار کی سولی پر لٹکے رہے مگر دور دور تک انہیں ایسا کوئی ریلیف پیکیج نظر نہیں آیا،جس سے عوامی مصائب وآلام میں کمی کے آثار نظر آتے، ستم بالائے ستم یہ کہ حکمرانوں نے اپنے انتخابی منشور میں عوام سے جو وعدے کئے تھے اور عوام نے اُن سے جو توقعات وابستہ کی تھیں،آج وہ سب حکومت کی ناکام پالیسیوں کے باعث نقش برآب بن کر رہ گئے ہیں، سوال یہ ہے کہ حکومت عوام کی مشکلات و مصائب کا ازالہ کیوں نہ کرپائی اور عوام سے کئے گئے وعدوں اور یقین دہانیوں کی تار پود کیوں

بکھر کر رہ گئے۔

اِس ابتری کے حقیقی اسباب کیا ہیں؟ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے، کرپشن کا کینسر ہمارے قومی وسائل کو جس طرح تباہ کر رہا ہے، اُس کی تفصیلات آئے دن منظر عام پر آرہی ہیں، حکمرانوں نے چار سال تک اپنی کرپشن کی دولت کو بچانے، عدالتی احکامات کو ٹالنے اور تسلسل اقتدار کی راہیں تلاش کرنے کے سوا کسی طرف توجہ نہیں دی، اگر عوامی مسائل اور توانائی کے بحران کو حل کرنے پر توجہ دی جاتی تو آج ہماری صنعتوں کا پہیہ ٹھپ نہ ہوتا، کارخانے پیداوار دے رہے ہوتے، نئی صنعتوں کے قیام سے روزگار کے نئے مواقع پیدا ہو رہے ہوتے، لیکن افسوس کہ اِس عرصے کے دوران کوئی بھی مثبت نہ ہوسکا، یہ چار برس صرف زیاں کاری کا وہ المیہ ہیں جس میں ہم نے اپنے قومی وقار، آئین و قانون کی بالادستی، عوامی فلاح و بہبود، گڈ گورننس اور اپنی مثبت اقدار و روایات تک کو کھودیا، چار سال تک معیشت کو بہتری کے بجائے ہولناک ابتری میں مبتلا کرنے والے حکمراں آج یہ مضحکہ خیز دعویٰ کر رہے ہیں کہ انہیں پانچ سال پورے کر لینے دیے جائیں تو وہ ملک کی تقدیر بدل دیں گے۔

حیرت ہوتی ہے ہمیں اپنے حکمرانوں کی اِس مفلسانہ انداز فکر پر، جو کام وہ چار سال میں نہ کرپائے، ایک سال میں کرنے کا دعویٰ کر رہے ہیں، سب جانتے ہیں

کہ حقیقی تبدیلی اِن کھوکھلے بیانات اور سطحی سوچ سے ممکن نہیں ہے، محض روٹی، کپڑا اور مکان کا دل خوش کن نعرہ لگانے، کشکول توڑنے اور اسلامی فلاحی ریاست کی خوب صورت اصطلاحیں استعمال کرنے سے تبدیلی نہیں آسکتی، نہ ہی عوام کو زیادہ دیر اِن پر فریب نعروں سے بہلایا جاسکتا ہے، یاد رکھیں جنون بادیہ پیمائی کے بغیر لمبی اور سیاہ رات کا کٹھن سفر کبھی بھی تمام نہیں ہوتا، شعور منزل جدوجہد کا متقاضی ہے، آگہی عمل مانگتی ہے اور عمل قربانی کا خراج لیتا ہے، اگر ہمارے حکمران ملکی معیشت اور عوام کی حالت زار بہتر بنانا چاہتے ہیں انہیں اپنے دل میں چھپی آرزوں اور تمناؤں کے دریچے بند کرنا ہونگے، صرف بیانات کے منتر اور اعلانات کے جادو سے ملک و قوم کی تقدیر بدلنے کے بجائے ٹھوس عملی اقدامات کرنا ہونگے اور زمینی حقائق کو اپنی ذوق نگاہ کے سانچے میں ڈھال کر دیکھنے کے بجائے حقائق کے آئینے میں اِن کا درست تناظر میں جائزہ لینا ہوگا۔

بلوچستان عالمی سامراج کی نئی شکارگاہ۔۔۔۔

بلوچستان عالمی سامراج کے شکنجے میں۔۔۔۔

کہتے ہیں عمومی تاثر اصل حقائق سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے،جب ایک تاثر عوام کے دل و دماغ میں راسخ ہوجائے اور دل میں شکوک و شبہات کی آکاس بیل پھیلادے تو محض زبانی لفاظی اور لایعنی دعوؤں سے یہ تاثر زائل نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی صورت میں گوشواروں اور حقائق ناموں کا کھیل ایک مضحکہ خیز تماشا بن کر رہ جاتا ہے۔ بلوچستان گزشتہ کئی عشروں سے ایسے ہی تاثر کا شکار ہے۔ عمومی تاثر اور ارباب اقتدار کے حقائق ناموں میں بہت فرق ہے۔ ہمارے ارباب اقتدار کا خیال ہے کہ بلوچستان کی فضاء بغاوت اور غداری کے جراثیموں کیلئے بہت سازگار ہے۔ مگر بلوچستان کے رہنے والے اِس سے متفق نہیں،اُن کا کہنا ہے کہ جب ہم اپنی محرومیوں کا تذکرہ کرتے ہیں،اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا رونا روتے ہیں اور آئین میں دیئے گئے حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں تو ہم پر بغاوت اور غداری کا الزام لگادیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بلوچستان کا احساس محرومی محض تخیلاتی نہیں، یہ احساس محرومی اپنے اندر ٹھوس وجوہات رکھتا ہے۔اہلیان بلوچستان کے پاس اپنی محرومیوں کی ایک طویل فہرست ہے،جب وہ وکالت

پر آتے ہیں تو کسی کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ پاکستانی عوام کی اکثریت بلوچستان کے اِس دکھ کو سمجھتی ہے۔ مگر طاقت آزمائی کو کمال فن سمجھنے والے ہمارے ارباب اقتدار نہیں سمجھتے۔ وہ ہر منظر کو جرم بغاوت اور شورش کی عینک سے دیکھتے ہیں۔
آج بلوچستان میں جو کچھ ہو رہا ہے اُس کی تاریخ برسوں پرانی ہے۔ بلوچستان کئی عشروں سے سلگ رہا ہے۔ مری، مینگل اور بگٹی قبائل کے خلاف کئی آپریشن ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر شازیہ کے واقعے اور نواب اکبر بگٹی کے قتل کے بعد بلوچستان کے حالات بگڑتے چلے گئے اور احساس محرومی کی برسوں سے سلگتی آگ، شعلوں سے قومی و لسانی عصبیت اور مملکت سے بغاوت کے خوفناک الاؤ میں تبدیل ہو گئی۔ جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اب امریکہ نے بھی بلوچستان کی آگ بھڑکانے کے لئے باقاعدہ کاروائی شروع کر دی ہے۔ مقبوضہ کشمیر اور فلسطین کو بھارت اور اسرائیل کا اندورنی معاملہ قرار دینے والے امریکہ کو بھی اب بلوچستان کی فکر لاحق ہو گئی اور بلوچستان کے بارے میں امریکی پالیسی کا از سر نو جائزہ لیا جا رہا ہے۔ نئی حکمت عملی کے تحت امریکی وزارت خارجہ اور سی آئی اے کے پاکستان ونگ میں "بلوچستان واچ ڈیسک" قائم کر دیا گیا ہے۔ دوسری طرف امریکی ایوان نمائندگان کی خارجہ امور کی کمیٹی عوامی سماعت کے ذریعے کہہ رہی ہے کہ بلوچستان ایک ایسا شورش زدہ علاقہ ہے، جس میں پاک فوج، نیم فوجی اور خفیہ

ادارے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے سرخیل ہیں، آٹھ فروری کو اوور سائٹ اینڈ انویسٹیگیشن کے لئے ذیلی کمیٹی کے تحت ہونے والی سماعت کے دوران پانچ ماہرین نے اپنے بیانات کمیٹی کو جمع کرائے، جن میں واشنگٹن ڈی سی کی جارج ٹاؤن یونیورسٹی کی اسسٹنٹ پروفیسر کرسٹین فیئر، امریکی فوجی تجزیہ نگار اور مصنف رالف پیٹرز (جو جون 2006ء میں آرمڈ فورسز جرنل میں ایسا نقشہ شائع کر چکے ہیں جس میں ایران اور پاکستانی بلوچستان کو افغانستان کے مخصوص علاقے پر مشتمل گریٹر یا آزاد بلوچستان دکھایا گیا تھا) اور انسانی حقوق کی تنظیم ہیومن رائٹس واچ کے پاکستان کے لئے ڈائریکٹر علی دایان حسن بھی شامل تھے، علی دایان حسن کی تجویز تھی کہ اغواء ماورائے عدالت قتل اور غیر قانونی گرفتاریاں روکنے کیلئے حکومت پاکستان پر دباؤ ڈالا جائے، جبکہ اِس موقع پر امریکی ماہرین اور حکام نے فوج، آئی ایس آئی، آئی بی اور ایف سی پر پابندیاں لگانے اور تعلقات ختم کرنے کی تجاویز دی اور مطالبہ کیا کہ بلوچستان میں حالات معمول پر لانے کے لئے امریکہ پاکستان پر دباؤ ڈالے اور پاکستان سے پوچھے کہ بلوچوں کو آزادی کا حق کیوں نہیں دیا جا سکتا۔؟

جب امریکی ایوان نمائندگان کی خارجہ امور کی کمیٹی میں بلوچستان کے مسئلے پر عوامی بحث و مباحثہ کا تذکرہ امریکی محکمہ خارجہ کی خاتون ترجمان وکٹوریہ نولینڈ کی پریس بریفنگ میں زیر بحث آیا، تو انھوں نے خارجہ امور کی

کمیٹی کی سماعت کو امریکی حکومت کا موقف تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ کانگریس بہت سے خارجی امور پر سماعت کا اہتمام کرتی رہتی ہے۔ایسی سماعتوں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ امریکی حکومت کسی ایک موقف کی حامی ہے یا اُس کی توثیق کرتی ہے۔اِس سوال کے جواب میں کہ کیا اِس سے یہ سمجھا جائے کہ امریکہ بلوچستان کی آزادی کے مطالبے کا حمایتی نہیں ہے۔امریکی محکمہ خارجہ کی ترجمان کا کہنا تھا کہ اِس معاملے پر ہمارا موقف تبدیل نہیں ہوا ہے۔امریکہ بلوچستان کی آزادی و خود مختاری کا حامی نہیں۔امریکی حکومت بلوچستان کی تمام جماعتوں پر زور دیتی ہے کہ اپنے اختلافات کا پرامن اور قابل قبول سیاسی حل نکالیں۔جبکہ امریکی دفتر خارجہ کے معتبر ذرائع کہتے ہیں کہ امریکی حکومت بلوچستان کی موجودہ صورت حال کو گہری تشویش کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ بلوچستان کے مسئلے پر امریکی طرز عمل کے بعض پہلوؤں پر پاکستان نے قومی اور ملکی مفادات سے آہنگ موقف اختیار کرتے ہوئے کہا ہے کہ بلوچستان پاکستان کا اندرونی معاملہ ہے۔امریکہ سمیت کسی کو اپنے اندرونی معاملات میں مداخلت کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔امریکی کانگریس کمیٹی میں بلوچستان کے معاملات پر امریکی ارکان کی بحث پر شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے دفتر خارجہ کے ترجمان عبدالباسط کا کہنا تھا کہ کسی ملک کو پاکستان کے اندرونی معاملات اور قومی خود مختاری میں مداخلت کی اجازت نہیں دیں گے۔پاکستان نے اپنی تشویش سے واشنگٹن کو آگاہ کردیا ہے۔دوسری طرف ارکان سینٹ کا کہنا تھا

کہ امریکی کمیٹی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ بلوچستان کے مسئلے کو عالمی سطح پر اجاگر کرنے کی کوشش کرے، امریکی مداخلت کسی صورت برداشت نہیں کی جائے گی، پاکستان اپنے معاملات خود نمٹانے کی صلاحیت رکھتا ہے، حکومتی اور اپوزیشن ارکان کی طرف سے حکومت پر زور دیا گیا کہ وہ اِس مسئلے کو امریکہ کے سامنے اٹھائے، حکومت پاکستان اور سینٹ کی طرف سے اِس حوالے سے ایک سخت پیغام دیا جائے کہ ہم کسی بیرونی مداخلت کو ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔

قابل تشویش بات یہ ہے کہ امریکی کانگریس کمیٹی نے اپنی سماعت کے دوران بلوچستان کی آزادی و خودمختاری کے مسئلے کو ایک عالمی مسئلہ بنانے کا اہتمام کیا ہے جبکہ امریکی ذرائع ابلاغ، تحقیقی ادارے، جامعات اور حکومتی اداروں نے بلوچستان کے مسئلے کو عالمی مسئلہ بنانے کی کوششیں شروع کردی ہے، جس سے بلوچستان کے حوالے سے امریکی پالیسی کھل کر سامنے آگئی ہے، ایک طرف امریکی حکام یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ پاکستان کو مستحکم دیکھنا چاہتے ہیں، جبکہ دوسری طرف پاکستان کو غیر مستحکم کرنے کے حوالے سے امریکی کردار کسی سے پوشیدہ نہیں، آج امریکہ کو پاکستان کے حالات پر بہت تشویش ہے، وہ آزاد بلوچستان کی بات کر رہا ہے، امریکی دفاعی ماہر کہتے ہیں کہ بلوچوں کو آزادی کا حق کیوں نہیں دیا جاتا، لیکن ہم اُن سے سوال کرتے ہیں کشمیر اور فلسطین کے عوام برسوں سے حق خودارادی اور آزادی کے متلاشی ہیں، کیا انھوں نے کبھی

بھارت اور اسرائیل سے پوچھا کہ اُس نے فلسطین اور کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کو آزادی
کا حق کیوں نہیں دیتا، ہم سمجھتے ہیں کہ امریکی کانگریس کمیٹی میں باضابطہ طور پر بلوچستان
کی آزادی پر غور وخوض انتہائی اشتعال انگیز اقدام ہے، جس پر وزارت خارجہ اور ارباب
اقتدار کی جانب سے شدید رد عمل آنا چاہیئے تھا، مگر صد افسوس کہ ایک قرارداد
مذمت کی منظوری قومی سلامتی سے جڑے اِس اہم مسئلے کا حل سمجھی گئی، دوسری طرف
امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی جانب سے یہ وضاحت کہ امریکی کانگریس کمیٹی کو امریکی
انتظامیہ کی تائید اور حمایت حاصل نہیں اور امریکہ بلوچستان کو پاکستان کا حصہ دیکھنا چاہتا
ہے، عالمی رائے عامہ کو بے وقوف بنانے کے مترادف اور منافقت پر مبنی پالیسی کا حصہ
ہے، اصل معاملہ یہ ہے کہ امریکہ کو بلوچوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے، وہ بلوچستان
کارڈ کو افغانستان کے بارے میں پاکستان پر دباؤ ڈالنے کیلئے استعمال کر رہا ہے، خود بڑی
فوج کے سربراہ اِس حقیقت کا اظہار کر چکے ہیں کہ وسطی ایشیائی ریاستوں اور افغانستان
تک رسائی بلوچستان کی بندرگاہوں کے ذریعے ہی ممکن ہے، جنرل کیانی نے امریکی
کانگریس میں بلوچستان کے مسئلے پر بحث کو درست تناظر میں جوڑا ہے۔
اَمر واقعہ یہ ہے کہ بلوچستان میں امریکی دلچسپی بے سبب نہیں، محل وقوع کے اعتبار سے
بلوچستان دنیا کا اہم ترین علاقہ ہے جو ایران، مڈل ایسٹ، جنوب مغربی

ایشیاء اور سینٹرل ایشیاء سے جڑا ہوا اور گوادر کی بندرگاہ سمیت تیل گیس اور معدنیاتی ذخائر کے ساتھ ساتھ بلوچستان کا اسٹریٹیجک محل وقوع عالمی قوتوں کے لئے اپنے اندر خصوصی کشش رکھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بلوچستان ایک طویل عرصے سے سی آئی اے، خاد، اور را کی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا ہے، امریکہ کی سونے چاندی و دیگر معدنی وسائل سے مالا مال اور جغرافیائی نکتہ نظر سے بے انتہا اہمیت کے حامل پاکستان کے سب سے بڑے صوبے بلوچستان کو اپنا خصوصی ہدف بنانے اور جدید ترین سہولتوں سے آراستہ گوادر پورٹ کے ذریعے _دوبئی سے زیادہ سستی اور کم فاصلہ بندرگاہ کے حصول کی خواہش عریاں ہو کر سامنے آچکی ہے، اسی وجہ سے اُس نے براہ راست بلوچستان میں انارکی اور قومی شاونزم کی لڑائی سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا ہے، جس کی وجہ سے آج پاکستان کا یہ اہم اور حساس صوبہ عالمی طاقتوں کی آماجگاہ بن چکا ہے اور بلوچستان کے حالات بہت تیزی سے بگاڑے جارہے ہیں، حکومت کی جانب سے بلوچ عوام کی جائز شکایات کے ازالے میں کوتاہی کے نتیجے میں صورت حال ہر لحہ ابتر ہوتی جارہی ہے، جس کی وجہ سے بیرونی سازشی طاقتوں کو اپنا مذموم کھل کھیلنے کے موقع مل رہا ہے، اس صورتحال سے ہر محب وطن پاکستانی سخت اضطراب میں بتلا ہے، مگر ہمارے ارباب اختیار خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں، حکومتی پالیسیوں نے بلوچستان کو ایک ایسی دلدل بنا دیا گیا ہے جس میں ریاست دھنستی جارہی ہے، اس وقت جبکہ علیحدگی کی تحریک زوروں پر ہے اور امریکہ کی نظریں بلوچستان کے ذخائر اور

گوادر جیسی اہم پورٹ پر جمی ہوئی ہیں، دوسری طرف بھارت جیسا ہمارا ازلی دشمن بلوچستان میں تخریب کاری کے جال بچھانے میں نہ صرف کامیاب ہوچکا ہے بلکہ بلوچستان کے پسے ہوئے اور مفلوک الحال عوام میں انتشار کا باعث بھی بن رہا ہے، ایسے میں ہر طبقہ فکر بالخصوص سیاسی رہنماؤں اور حکومت وقت کی ذمہ داریاں بہت اہمیت اختیار کر جاتی ہیں۔

لیکن المیہ یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے چارہ گری اور ناراض بلوچوں کے زخموں پر مرہم کی کوئی سنجیدہ کوشش سامنے نہیں آرہی، ہمارے حکمرانوں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ بلوچستان کے لوگوں کا ایک بڑا حصہ راکٹوں، لشکروں اور مارٹر گولوں کے خلاف ہونے کے باوجود، وہاں ریلوے لائینیں کیوں اکھاڑ دی جاتی ہیں، تیل کی پائپ لائینیں کیوں اڑادی جاتی ہیں، کیوں ریاستی اداروں کے ساتھ پنجہ آزمائی کی جاتی ہے، کیوں قومی انفرااسٹریکچر کو نقصان پہنچایا جاتا ہے، حکومت کے ہوتے ہوئے کیوں متوازی حکومت قائم کی جاتی ہے، وہ کیا وجوہات تھیں جس نے مری، مینگل اور بگٹی قبائل کو سرکشی کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا، کیوں لوگ گھروں، بستیوں اور محلوں کو چھوڑ پر غاروں اور پہاڑوں کی طرف نکل گئے ہیں، آج بلوچ نئی نسل اسقدر برہم کیوں ہے، کیوں یونیورسٹیوں اور کالجز کے طلباء آتشِ جوالہ بنے ہوئے اپنے دوسرے پاکستانی بھائیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں، یہ سب کچھ کیوں ہوا، یقینا بلوچستان میں وقفے

وقفے سے بھڑکنے والے آتش فشاں اپنے اندر کچھ محرکات رکھتے ہیں، جس کی طرف کبھی بھی ہمارے ارباب اقتدار نے توجہ نہیں دی، پنجہ آزمائی اور طاقت کو ہر مسئلے کا حل سمجھنے والوں نے اصل مرض کے علاج سے پہلو تہی کرتے ہوئے بلوچستان کے دکھ کی دوا اور علاج سڑکوں، پلوں، ترقیاتی منصوبوں اور این ایف سی ایوارڈ وآغازِ بلوچستان پیکیج تجویز کئے، جبکہ مسئلہ سڑکوں، پلوں اور ترقیاتی کاموں سے کہیں زیادہ باہمی اعتماد اور عزت نفس کی بحالی کے ساتھ بلوچ عوام قائم اس تاثر کو زائل کرنے کا جس نے حالات اس نہج پر پہنچا دیئے ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ بلوچستان کے حالات طاقت سے نہیں، محبت، ہمدردی، رواداری اور انصاف کے قیام سے ہی درست کیے جا سکتے ہیں، لہٰذا ملک کی تمام سیاسی قیادت کو بلوچستان کے لوگوں کے ساتھ بے انصافی کے خاتمے کیلئے اپنا کردار ادا کرنا چاہیے اور ارباب اختیار کو سیاسی فہم تدبر سے کام لیکر بلوچستان کے حالات کو اِس نہج پر جانے سے روکنے کی تدبیر کرنی چاہئے جو سقوط ڈھاکہ جیسے کسی دوسرے سانحہ پر منتج ہو سکتے ہیں، اِس نازک موقع پر ہم امریکی حمایت پر اطمینان کا اظہار کرنے والے اپنے اُن ناراض بلوچ بھائیوں سے بھی استدعا کرتے ہیں کہ وہ بزرگ بلوچ سیاستدان سردار عطاء اللہ مینگل کی اِس بات پر ضرور غور کریں کہ اگر بلوچ پاکستان سے آزادی حاصل کرلیں گے تو وہ عالمی سامراج کے شکنجے میں پھنس جائیں گے

ذکر خیر الوریٰ روشنی روشنی۔۔۔۔

اُن کی ہر اِک ادا روشنی روشنی

پیغمبر انقلاب حضرت محمد مصطفیٰ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدحت، تعریف و توصیف، شمائل و خصائص کے نظمی اندازِ بیاں کو نعت یا نعت گوئی کہا جاتا ہے، یہ سہ حرفی لفظ نعت (ن ع ت) عربی زبان کا مصدر ہے، جس کے لغوی معنی حمد و ثنا اور تعریف و توصیف بیان کرنا ہے۔اردو شاعری میں نظم کی اصناف سخن میں نعت وہ صنف سخن ہے جس کے اشعار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف بیان کی جاتی ہے۔اردو میں شاید ہی ایسی کوئی صنف سخن ہو جس میں نعتیں نہ کہی گئی ہوں۔اِس لیے اِس کے اسالیب طے شدہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ اِس کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے۔کہتے ہیں نعت گوئی پل صراط پر چلنے جیسا عمل ہے۔ذرا سی لغزش سے ایمان کی سرحدیں ٹوٹ جاتی ہیں اور عقیدے کا زاویہ تبدیل ہو جاتا ہے۔اِس پل صراط کو عبور کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں، یہ وہ بارگاہ اقدس ہے جہاں بڑے بڑے قدسیوں کے پاؤں لرز جاتے ہیں اور مقام الوہیت و رسالت کے درمیان توازن قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے، صرف وہی لوگ محفوظ رہتے ہیں جو قرآن و حدیث کو مشعل راہ بناتے ہیں، چونکہ یہ بڑا نازک اور کٹھن کام ہے، اِس لیے نعت لکھتے ہوئے بہت ہی احتیاط اور اعتدال کی ضرورت ہوتی ہے۔

شاہ معین الدین ندوی کہتے ہیں نعت گوئی کیلئے شاعر کا صاحبِ بصارت اور صاحب بصیرت ہونا اوّلین شرط ہے، کیوں کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس، نبوت اور عبدیت کے کمال پر خالق بھی نازاں ہے، خود ربّ تعالیٰ نے مدح رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلیٰ وارفع قرار دیا، قرآن کہتا ہے، ورفعنا لک ذکرک (اور ہم نے تمہارے ذکر کو بلند کیا)،اِس لحاظ سے نعت گوئی کا محرک اور نعت کا پہلا مجموعہ کلام قرآن مجید قرار پاتا ہے، جب خالق خود اپنی تخلیق پر نازاں ہو اور مدح سرائی فرمائے تو اُس ذات مبارکہ جس کو وجہ وجود کائنات ہونے کا شرف حاصل ہے، کی ثنا خوانی انسان سے کہاں ممکن، ضعیف البیان انسان کی کیا بساط، جو اب کشائی کرے،اِس لیے الفاظ پر کتنی ہی دسترس اور قدرت کیوں نہ حاصل ہو، شاعر اپنے آپ کو بیان وصف سے عاجز ہی پاتا ہے، لیکن اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی مداحی کرنے سے خود کو روک بھی نہیں سکتا، چنانچہ نعت کا ورودِ مسعود ہوتا ہے اور آسمان سے زمینیں تراشنے کے باوجود شعراء یہ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ " بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" نعت گوئی کا تعلق قادر الکلامی سے زیادہ توفیق الٰہی پر منحصر ہے، یہ وصف وہبی ہے، نعت وہی کہتا ہے جس کو نعت کہنے کی توفیق عطا ہوتی ہے، جبکہ نعت کا حق بھی وہی ادا کر سکتا ہے، جس کا دل جذبہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سرشار ہو، عشق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر نعت

کی تخلیق ممکن نہیں، یعنی محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم جب شعر و نظم کے پیکر میں ڈھلتی ہے، تب ہی نعت وارد ہوتی ہے، بظاہر نعت کہنا اور زبانِ شاعری میں ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی عامیانہ توصیف کر دینا بہت آسان ہے، لیکن اِس کے پورے لوازم و شرائط سے عہدہ برآ ہونا بہت مشکل کام ہے، جس کیلئے حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کمالات نبوت و رسالت، اسلام کی اصل روح، عہد رسالت کے واقعات اور قرآن و احادیث سے روشنی لازمی ہے،اِس کے بغیر نعت گوئی ممکن نہیں، یہ وصف بہت کم شعراء میں پایا جاتاہے، عاشق رسول اور امام نعت نگاری اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی فرماتے ہیں

قرآں سے میں نے نعت گوئی سیکھی
یعنی رہے احکام شریعت ملحوظ

حضور سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ثناء خوانی کرنے والے ہر دور میں آتے رہے، شاعر صحابہ کرام میں سے کوئی ایسا نہیں ملتا، جس نے مدح رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اشعار نہ کہے ہوں، حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ پہلے نعت گو شاعر اور نعت خواں تھے، جنہیں شاعرِ دربارِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہا جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ عرب شعرا نے اِس فن کو بام عروج تک پہنچایا، مگر ہندوستان کے شعرا بھی پیچھے نہیں رہے، ہماری اردو شاعری میں کچھ نام ایسے بھی ہیں جنہوں نے اِس فن اور ہنر کے طفیل ابدی شہرت حاصل کی،اِن میں

امام احمد رضا خان، حسن رضا خان، علامہ اقبال، امیر مینائی، صائم چشتی، ادیب رائے پوری، خواجہ بیدم وارثی، محمد علی ظہوری قصوری، بہزاد لکھنوی، عبدالستار نیازی، قمر الدین انجم، پروفیسر اقبال عظیم ، صباء اکبر آبادی، خالد محمود نقشبندی اور علیم الدین علیم وغیرہ قابل ذکر ہیں، مگر دور حاضر میں نابغہ روزگار الحاج پروفیسر حفیظ تائب کا نامِ نامی نعت گوئی کا اہم ترین حوالہ ہے۔انہوں نے اردو اور پنجابی میں نعت گوئی کو اِس با کمال اور شائستہ طریقے سے ادا کیا کہ انھیں ان کی زندگی میں ہی نعت کے حوالے سے اعلیٰ وکلاسیک درجہ حاصل ہوگیا۔انھوں نے خود کو مدحت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے وقف رکھا،نہ صرف خود نعتیں کہیں، بلکہ معاصر شعراء کرام کو بھی نعت گوئی کی طرف راغب کیا، محترم منظور عباس ازہر بھی اُن میں سے ایک ہیں۔جنھوں نے کم و بیش اٹھارہ سال غزل کے میدان میں کمالات فن کے جوہر دکھائے، پھر جناب حفیظ تائب کے تحرک پر نعتیہ میدان میں قدم رکھتے ہوئے کہا

محو ثنائے احمد مختار ہوگیا

دل آج میرا آپ ہی شہکار ہوگیا

ازہر وہ خوش نصیب ہے جس کا جہان میں

نعتِ رسول شیوہِ گفتار ہوگیا

ذکر خیرالوریٰ روشنی "منظور عباس ازہر کی شاخ عقیدت پر نمو پانے والا پہلا" مجموعہ نعت ہے۔ڈاکٹر شبیر احمد قادری کہتے ہیں "منظور عباس ازہر نے عمر بھر خود کو سر رشتہ لفظ و معنی سے منسلک کئے رکھا، خاص طور پر غزل کے میدان میں انہوں نے جو کمالات فن دکھائے، ایک عہد اُس کا معترف ہے۔افکار گہر نثار کو جامہ حرف پہناتے ہیں تو گویا ارضِ قرطاس خود پر نازاں ہوتی ہے۔ لیکن انہوں نے غزلوں کے مجموعے پر نعتیہ کلام کی اشاعت کو فوقیت دی،اُن کا نعتیہ مجموعہ کلام حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ترجمان ہے اور اِس میں شامل نعتیں فکر و نظر کے اعتبار سے شاعر کو رتبہ اعتبار سے سرفراز کرنے کا موجب ہیں، یہ نعتیں ہُم و غم کے موسموں میں فرحت اور سکون عطا کرنے کا وسیلہ ہیں۔""ذکر خیرالوریٰ روشنی" کی خوبی یہ ہے کہ اِس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی "محمد" کی حرفی تعداد کی مناسبت سے 92 نعتیں شامل ہیں، جس میں بے ساختگی، والہانہ پن اور جذب و مستی کا تصور انتہائی بلندیوں کو چھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

وہ میری زیست مری جان کا حوالہ ہیں
متاعِ دین ہیں ایمان کا حوالہ ہیں
اندھیری رات میں روشن چراغ کی صورت
شکوکِ کفر میں ایقان کا حوالہ ہیں

جناب منظور عباس ازہر اعلیٰ تعلیم یافتہ بزرگ اور صاحب فکر و نظر شاعر ہیں،آپ 1982 تک شعبہ تدریس سے وابستہ رہے ہیں،اس وقت جمعیت علمائے پاکستان جڑانوالہ کے صدر اور 1978 سے مجلس ادب جڑانوالہ کے معتمد عمومی ہیں، موصوف نعتیہ شاعری میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں،علامہ اقبال اور حفیظ تائب سے بہت متاثر ہیں،یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں اِن اکابرین کی جھلک نظر آتی ہے،انھوں نے نعت کو نیا رنگ و آہنگ ہی نہیں دیا بلکہ نئی لفظیات سے آراستہ بھی کیا ہے۔

ذکر خیرالوریٰ روشنی روشنی

اُن کی ہر اِک ادا روشنی روشنی

جناب منظور عباس ازہر کے یہ گلہائے رنگ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی محبت کا اظہار اور نعتیہ ادب کا قابل قدر سرمایہ ہے،" ذکر خیرالوریٰ روشنی روشنی"کا اِک اِک لفظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و ستائش کا مظہر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف کریمہ کا بیان موصوف کی شادابی ایمان کی علامت ہے۔

بیسویں آئینی ترمیم کی منظوری کیلئے 36 کروڑ 61 لاکھ کا ٹکٹ مکا

پیر20فروری کو سینٹ میں بیسویں آئینی ترمیم کی منظوری کیلئے جو شرمناک ڈرامہ کھیلا گیا اور جس طرح حکومت نے 36 کروڑ 61 لاکھ روپے کی "سیاسی رشوت" متروک فنڈ بحالی کے نام پر سینیٹروں میں تقسیم کرکے دو بار موخر ہونے والی یہ ترمیم منظور کرائی،اُس سے یہ ثابت ہوگیا کہ ننگی، بہری اور بے شرم کرپشن ہمارے سیاسی نظام کی نہ صرف وجہ شناخت اور طرہ امتیاز بن چکی ہے،بلکہ یہ ہمارے معاشرے میں اِس بری طرح رچ بس گئی ہے کہ اِس سے چھٹکارا پانے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا،سچ کہتے ہیں مچھلی ہمیشہ سر کی جانب سے سڑتی ہے،جب حکمران طبقہ اور معزز ارکانِ پارلیمان ایمان داری،اعلیٰ کردار نگاری اور اصول پرستی کی مثال قائم کرنے کے بجائے بے ایمانی اور بے اصولی کو اپنا حق اور استحقاق سمجھنے لگیں تو پھر عوام الناس سے کسی بہتری اور اچھائی کی توقع رکھنا کارِ عبث ہے،یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں ہر سطح پر لوٹ مار،بدعنوانی اور کرپشن کی گنگا بہہ رہی ہے،ہر طرف لوٹ کھسوٹ اور خرید وفروخت کا بازار گرم ہے اور لوگ بکاؤ مال بنے بے ایمانی اور ضمیر فروشی کی

بدترین مثالیں قائم کر رہے ہیں۔

اِس ترمیم کی منظوری میں سب زیادہ تکلیف دہ اَمر یہ رہا کہ منتخب ایوانوں میں عوام کی نمائندگی کرنے والے اِن اراکین کی عوامی مسائل کے حل میں دلچسپی کا اندازہ اِس اَمر سے لگایا جاسکتا ہے کہ حکومتی اتحاد ہی نہیں، بارگیننگ کی پوزیشن پر آنیوالے اپوزیشن جماعتوں کے اراکین بھی 20ویں آئینی ترمیم کو عوام کے روٹی، روزگار اور مہنگائی جیسے گھمبیر مسائل اور توانائی کے درپیش سنگین بحران کے حل کے ساتھ مشروط کرانے کے بجائے صرف اپنے ترقیاتی فنڈز کے اجراء میں دلچسپی لیتے نظر آئے۔ بدقسمتی سے اِس عمل میں اسلامی انقلاب اور صالح و دین دار قیادت کی دعویدار جماعت اسلامی کے وہ دوارکان بھی شامل تھے، جنھوں نے بظاہر تو ترمیم کی مخالفت میں ووٹ دیا، مگر متروک ترقیاتی فنڈ کے اجراء کو اپنا استحقاق سمجھا اور جواز یہ پیش کیا کہ حکومت نے یہ فنڈز کافی عرصے سے روک رکھے تھے، جو اب 20ویں آئینی ترمیم کے موقع پر جاری ہوئے ہیں، لیکن جب بعد میں میڈیا کی طرف سے سوالات اٹھائے جانے لگے تو جماعت اسلامی کے سینٹر پروفیسر خورشید احمد فرمانے لگے کہ جماعت اسلامی کے سینٹر اپنے حصے کے ترقیاتی فنڈز وصول نہیں کرینگے، سوال یہ ہے کہ کیا اب فنڈ وصول نہ کرنے سے وہ داغ دھل جائے گا جو لگ چکا ہے اور کیا اِس وضاحت سے حقیقت تبدیل ہوجائے گی۔؟ حد تو یہ ہے کہ اِن صاحب کردار اراکین میں

ملک کی متبادل قیادت سمجھی جانیوالی مسلم لیگ (ن) کے ارکان بھی شامل تھے، جنھوں نے قومی اسمبلی میں بھی حکومت کو اِس ترمیم پر اتفاق رائے والے "مک مکا" کی سہولت فراہم کی اور کسی نے بھی عوامی مسائل اور ملکی ابتری کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں کی، محض اپنے ترقیاتی فنڈز کے اجراء کی خاطر اپنی بارگیننگ پوزیشن مضبوط بنانے کیلیئے دو روز تک 20ویں آئینی ترمیم موخر کراتے رہے،اِس تمام قضیئے میں مزید طرفہ تماشا یہ ہوا کہ سینٹ کے وہ 20 اراکین جن کی رکنیت آئندہ چند روز میں ختم ہونے جارہی ہے، وہ بھی قومی خزانے کی اِس لوٹ مار اور بندر بانٹ میں اپنا حصہ بقدرِ جثہ وصول کرتے نظر آئے، یوں عوام کی فلاح و بہبود کے نام پر اراکین سینٹ کی فلاح و بہبود کا یہ کارِ ثواب عین اُس وقت انجام پایا، جب ملک کے مفلوک الحال عوام 12 سے 18 گھنٹے روزانہ کی اذیت ناک لوڈشیڈنگ کے ساتھ غربت، بے روزگاری اور مہنگائی کے عذابوں کے ساتھ انتظامیہ کی لاٹھیاں اور آنسو گیس کے شیل بھی برداشت کررہے ہیں۔

لیکن چونکہ مفادات مشترکہ تھے،اِس لیے وزیر اعظم کے حکم پر 60 اراکین سینٹ کو ترقیاتی فنڈز کے نام پر قومی خزانے سے خطیر رقم جاری کرکے ایک نیا ریکارڈ قائم کردیا گیا اور 20ویں آئینی ترمیم منظور کرلی گئی، حالانکہ یہ وہی آئینی ترمیم تھی، جس پر سینٹ میں حکومتی اتحاد کی بعض جماعتوں نے شدید

اعتراضات اٹھاتے ہوئے کہا تھا کہ وزیر اعظم اور قائد حزب اختلاف کے بعد اسپیکر کی قائم کردہ کمیٹی کی ناکامی کی صورت میں نگران وزیر اعظم کے تقرر کا اختیار پارلیمنٹ کے بجائے الیکشن کمیشن کو کیوں دیا گیا ہے؟ یہ اختیار الیکشن کمیشن کو نہیں ملنا چاہیے۔اِن اراکین کی جانب سے دوسرا اعتراض یہ بھی اٹھایا گیا تھا کہ " اگر وزیر اعظم یا وزیر اعلیٰ اسمبلی توڑ دیتے ہیں تو اسمبلی باقی نہیں رہے گی۔ایسی صورت میں اسپیکر کیسے کمیٹی بنائے گا؟ "یہاں یہ اَمر بھی قابل ذکر ہے کہ حکومتی اتحاد کی پارلیمانی پارٹی کے اجلاس میں اٹھائے جانے والے اعتراضات پر ارکان کو مطمئن نہیں کیا جاسکا۔چنانچہ قائد ایوان کی تجویز پر چیئرمین کو آئینی ترمیمی بل پر غور موخر کرنا پڑا۔صورتحال کا یہ دلچسپ پہلو بھی سامنے رہے کہ جو دو بڑے اعتراضات اٹھائے گئے، وہ سرکاری بینچوں کے بعض اراکین کی طرف سے پیش کئے گئے تھے، جس سے واضح ہوتا تھا کہ قومی اسمبلی کی متعلقہ کمیٹی نے عجلت میں بعض ابہام چھوڑ دیئے اور اِس کے تمام پہلوؤں پر غور نہیں کیا۔اب اگر ایوان بالا قومی اسمبلی کے منظور کردہ اِس ترمیمی بل کے سقم کو دور کرنے کیلئے مزید کوئی ترمیم کرتا ہے تو اسے دوبارہ منظوری کے لئے پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں پیش کرنا ہوتا، یہ صورتحال اِس اَمر کی غمازی کر رہی تھی کہ سینٹ سے بل کی متفقہ منظوری بہت مشکل ہے، مگر 36 کروڑ 61 لاکھ روپے کے متروک فنڈز کے اجراء نے حکومت کی یہ مشکل حل کر دی اور محض پانچ گھنٹوں کے اندر اندر 20 ویں آئینی ترمیم دو تہائی

اکثریت سے منظور کرلی گئی۔
لیکن 20 ویں آئینی ترمیم کے اِس موقع پر حکومت کی جانب سے متروک فنڈز کا اجراء شکوک و شبہات کے ساتھ کئی سوالات کو بھی جنم دیتا ہے، کیا یہ فنڈز پہلے جاری نہیں ہو سکتے تھے، یہ بھی ہو سکتا تھا کہ آئینی ترمیم کی منظوری کے چند دن بعد جاری کر دیئے جاتے، ایسی کوئی ہنگامی صورتحال تو نہ تھی، جب گذشتہ تین سال سے پیپلز ورکس پروگرام کی مد میں یہ ترقیاتی اسکیمیں متروک تھیں تو اب اچانک اِن متروک ترقیاتی اسکیموں کی منظوری کس بنیاد پر دی گئی، اگر یہ منصوبے عوامی فلاح و بہبود کے تھے تو کیوں تین سال تک عوام کو اِن منصوبوں سے محروم رکھا گیا، کیوں اِس فنڈ کو عین 20 آئینی ترمیم کے موقع پر جاری کیا گیا، کیوں اُن سینیٹرز کو بھی اِس فنڈز کا حصے دار بنایا گیا جن کی رکنیت آئندہ چند روز میں ختم ہونے والی ہے، ایسے میں ریٹائر ہونے والے سینیٹرز کے ترقیاتی فنڈز کے استعمال کی نگرانی کون کرے گا؟ اور اِس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ فنڈز عوامی فلاح و بہبود کے منصوبوں پر ہی خرچ ہونگے۔؟ یقیناً یہ سارا عمل شکوک و شبہات سے بالاتر نہیں، خود سینیٹر طاہر مشہدی فنڈز کے اجراء پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے تصدیق کرتے ہیں کہ کچھ سینیٹروں نے فنڈز کے اجراء کو بیسویں ترمیم کی منظوری سے مشروط کیا تھا، سینیٹر مشاہد اللہ کہتے ہیں کہ کچھ سیاسی جماعتوں نے فنڈز جاری کرنے کا مطالبہ کیا تھا، وہ خود بھی اِس فنڈ کو

اپنا حق قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ حکومت کو اختیار ہے کہ وہ "لیپس" ہوجانے والے فنڈز دوبارہ جاری کر سکتی ہے،اِس تناظر میں سینئر مسلم لیگی رہنما کبیر علی واسطی کی جانب سے اٹھایا گیا سوال نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ سینٹروں نے ایسا کون سا کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ اُن کو یہ انعام دیا گیا؟ کبیر علی واسطی تو سارے عمل کو قبل از وقت انتخابی دھاندلی قرار دیتے ہوئے عدالت عظمیٰ سے نوٹس لینے کا مطالبہ بھی کرتے ہیں،انھوں نے یہ پیش گوئی بھی کی ہے کہ پیپلزپارٹی انتخابات سے قبل دھاندلی کے حوالے سے ایسے کئی اعلانات کرے گی جس سے آنے والی حکومت کیلئے مسائل میں اضافہ ہوگا۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ وزیر اعظم صاحب لاکھ دعویٰ کریں کہ 20 ویں آئینی ترمیم کی منظوری سے جمہوریت مضبوط ہوئی ہے اور آئندہ انتخابات صاف و شفاف ہوں گے،وزیر اعظم اور قائد حزب اختلاف اپنی "داڑھی" کسی اور کے ہاتھ میں نہیں دیں گے،اب کسی پر دھاندلی کا الزام نہیں آئے گا،لیکن حقیقت یہ ہے کہ اِس ترمیم کے ذریعے ایک آزاد اور طاقتور الیکشن کمیشن کے قیام اور غیر جانبدار نگران حکومت سے زیادہ اُن 28 ارکان پارلیمان کی بحالی ممکن ہوئی ہے جنھیں سپریم کورٹ نے غیر آئینی قرار دے کر معطل کر دیا تھا اور اُن کی بحالی آئینی ترمیم سے مشروط کر دی تھی،ہم سمجھتے ہیں کہ اِس ترمیم کی منظوری کے دوران حکومت نے ارکان کی حمایت حاصل کرنے کے لئے جو طریقہ اختیار کیا یا ارکان نے

جس طرح اپنے مطالبات منظور کروائے، اسے کسی طور بھی جمہوری اور شفاف نہیں قرار دیا جاسکتا، یقیناً یہ ایسا افسوسناک عمل ہے جسے ارکان کی حمایت خریدنے یا ارکان کی جانب سے بلیک میلنگ کے سوا اور کوئی نام نہیں دیا جاسکتا، جب جمہوریت کی مضبوطی، صاف و شفاف انتخابات کا انعقاد اور دھاندلی کے الزامات سے بچاؤ کی بنیاد سینٹ اور اسمبلیوں میں موجود ارکان کو کروڑوں روپے کے فنڈز جاری کرکے رکھی جائے اور پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں موجود حکومتی اور اپوزیشن جماعتیں آئندہ انتخابات میں بھی اپنے اپنے حصے کی بندر بانٹ پر متحد و متفق ہوں تو ایسی صورت میں اِن انتخابات کے منصفانہ ہونے کی بھلا کیسے توقع کی جا سکتی ہے۔؟

ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا اِس سے سیاست کو کاروبار بنانے کا تصور پختہ نہیں ہوتا، جب خود حکمران طبقات قومی دولت و وسائل کی لوٹ مار کے کلچر کو فروغ دینے کا سبب بنیں تو کسی صورت اِس کلچر کے سدباب کی صورت نہیں نکل سکتی اور نہ ہی آئندہ میرٹ پر عوام کے حقیقی نمائندوں کے انتخاب کی توقع کی جا سکتی ہے، کیونکہ مذکورہ آئینی ترمیم میں ایسا کوئی جادو پوشیدہ نہیں جس کی بنیاد پر آئندہ صاف اور شفاف الیکشن ہو سکیں اور کسی پر دھاندلی کا الزام بھی نہ لگے، حقیقت یہ ہے کہ 20 ویں آئینی ترمیم کے ذریعے جو" مک مکا" ہوا ہے وہ عوام کے نام پر باہمی مفادات کی رکھوالی ہے، سب نے قومی خزانے کی لوٹ مار میں نہ

صرف اپنا اپنا حصہ وصول کیا بلکہ عوامی مسائل کے حل کے لئے آواز اٹھانے والوں کو
جمہوریت کیخلاف سازشیں کرنیوالے عناصر کا لیبل لگا کر اُن پر ایوان اقتدار کے
دروازے بھی بند کر دیئے ہیں۔ایسی صورت میں عوام اِس باہمی مفاداتی کلچر کے ماتحت
اپنے حالات میں کیونکر تبدیلی کی توقع کر سکتے ہیں جبکہ عوام کے اِن منتخب نمائندوں نے
ملک اور قوم کو درپیش گھمبیر مسائل کے حل کیلئے کبھی بھی اتفاق رائے کا مظاہرہ نہ کیا
ہو۔اَمر واقعہ یہ ہے کہ سلطانی جمہور کا کلمہ پڑھنے والوں نے ہمیشہ عوام کو کیڑے مکوڑے
سمجھ کر نظرانداز کیا ہے۔ہمیشہ اپنے مفادات کے خاطر باہم متحد و منظم اور شیر وشکر رہے
ہیں اور کبھی بھی اِس معاملے میں اُن کے درمیان نظریاتی اور سیاسی اختلاف آڑے نہیں
آیا ہے۔لہذااِس تناظر میں اٹھارویں آئینی ترمیم ہو یا انیسویں، بیسویں ترمیم ہو یا آنے
والی 21ویں ترمیم،اِن تمام ترامیم سے صرف حکمران طبقات کے باہمی مفادات کو تحفظ
دینے والا نظام تو مضبوط ہو سکتا ہے، مگر ملک و قوم کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔

صیاد کے دن تھوڑے ہیں۔۔۔

انجام کی سنائی دیتی دستک۔۔۔۔
جب طاقت کا بے دریغ استعمال، ظلم و بربریت اور انتہاؤں کو چھوتی ہوئی رعونت دستورِ عمل بن جائے، عدل و انصاف، امن و عافیت کا پرچم لہرانے اور انسانی حقوق کے گن گانے والی خود ساختہ مہذب دنیا اِسی اصول کو زندگی کا ضابطہ قرار دے ڈالے تو پھر وحشت و درندگی کو لگام دینا ممکن نہیں رہتا، پھر وہی کچھ ہوتا ہے جو اتوار 11 مارچ کو افغانستان کے صوبے قندھار کے ضلع پنجوائی میں ہوا، جس میں نشے میں دھت امریکی فوجیوں نے چار گھروں میں گھس کر نو بچوں اور تین خواتین سمیت 16 بے گناہ افغان شہریوں پر وحشیانہ فائرنگ کرکے نہ صرف شہید کرڈالا بلکہ اطلاعات کے مطابق اِن جنونی قاتلوں نے کیمیائی مادہ چھڑک کر لاشیں بھی جلادیں، یہ درحقیقت اُسی ہارر فلم کا ایک دہشت ناک منظر تھا جو گذشتہ ایک عشرے سے امریکی ڈائریکشن میں افغانستان کی سرزمین پر فلمائی جارہی ہے، جس میں ہر طرف بے ڈھب، مڑی تڑی بے گور و کفن لاشیں، دور تک بکھرے انسانی اعضاء اور اُن کے بیچوں بیچ اپنے صلیبی حواریوں کے ساتھ کھڑا امریکی فلم ڈائریکٹر اپنے چہرے پر سفاکانہ مسکراہٹ سجائے ہدایات جاری کررہا ہے۔

اُمتِ مسلمہ کے لہو رنگ مناظر سے فلمائی ہوئی وحشت ناک مناظر سے بھرپور اِس فلم کی عکس بندی گذشتہ کئی عشروں سے دنیا کے مختلف مسلم ممالک میں جاری ہے، جس میں امریکی خونخوار درندے بے گناہ مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں، بھوکے بھیڑیئے پاگل کتوں کی مانند انسانی جسموں کو بھنبھوڑ رہے ہیں، مظلوم مسلمانوں کی نعشوں پر رقص ابلیس کر رہے ہیں اور قصر ابیض کا مکین فلم ڈائریکٹر اپنے چیلوں کے ساتھ گہرے رنج و غم کا اظہار اور واقعہ میں ملوث افراد کو انصاف کے کٹہرے میں لانے کا اعلان کرکے طفل تسلیاں دے رہے ہیں، دس سال سے یہی کچھ ہو رہا ہے، امریکی قاتل اپنے صلیبی حواریوں کے ساتھ مل کر قتل و غارت گری کا کھیل کھیل رہے ہیں، 7 اکتوبر 2001ء سے اب تک لاکھوں افغان شہری اِس درندگی کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں، مگر اِن کے قاتلوں کو دنیا کی کوئی عدالت انصاف کے کٹہرے میں لانے کی جرات نہ کر سکی، اگر کسی کو انصاف کے کٹہرے تک لایا بھی گیا تو اُس کو قرار واقعی سزا نہ مل سکی، دنیا جانتی ہے امریکی انصاف کا دوہرا معیار ہے، جس میں ایک مسلمان عدم ثبوت و گواہ کے باوجود کڑی سے کڑی سزا کا مستحق ٹھہرایا جاتا ہے مگر امریکی شہری ثبوت اور گواہوں کے باوجود بھی معمولی سزا کا حقدار قرار نہیں پاتا۔

لہذا اِس معاملے میں بھی حسب سابق وہی کچھ ہوگا جیسا پہلے ہوتا رہا ہے، لیکن ایک بات بالکل واضح ہے کہ جس بے دردی سے

پاکستان، عراق، لیبیا، شام، افغانستان اور مسلم دنیا کے مختلف ممالک میں مسلمانوں کا قتل عام کیا جارہا ہے۔اُس سے ثابت ہوتا ہے امریکہ اور اُس کے صلیبی حواریوں کا مقصد اِس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں کے وجود کو مٹادیا جائے یا پھر انہیں اِس قدر کچل دیا جائے کہ وہ کبھی سر اٹھانے کے قابل نہ ہو سکیں،یہی کام فلسطین میں امریکہ کا لے پالک اسرائیل اور مقبوضہ کشمیر میں ہندو بنیاء کررہا ہے،سب کا مقصد ایک ہے۔اُمت مرحوم کا خاتمہ،یہی وجہ ہے کہ وہ انسانوں کو اِس طرح شکار کرتے ہیں جیسے وہ کوئی جنگلی جانور ہیں،یہ وہی فکر بیمار ہے جس کا اظہار کرتے ہوئے عراق اور افغانستان میں خدمات انجام دینے والے سابق جنرل جیمز میٹس نے کہا تھا کہ "اِن لوگوں کو قتل کرنے سے بڑا مزا ملتا ہے۔" جنرل جیمز کے ریمارکس کی روشنی میں اِس بات کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے کہ صابرہ، شتیلہ، فلوجہ، رملہ، قلعہ جنگی، دشت لیلیٰ، بلگرام اور قندھار جیسے انسانیت سوز واقعات کیوں پیش آتے ہیں، کیوں ہاتھ پاؤں بندھے قیدیوں کے سینوں کو چھلنی کردیا جاتا ہے، کیوں مردہ انسانوں کی لاشوں کی بے حرمتی کی جاتی ہے،اُن کے جسموں پر پیشاب کیا جاتا ہے،صاف ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ تسکین طبع اور لطف اندوزی کیلئے کیا جارہا ہے اور کیوں نہ کیا جائے کہ امریکہ کی پوری تاریخ برہنہ جارحیت،توسیع پسندانہ عزائم،کمزوروں پر لشکر کشی اور ظلم و جبر کے خونی ابواب سے مزین ہے،جس میں مسلمان کی جان ومال، عزت وآبرو کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

قندھار میں وقوع پزیر ہونے والا المناک واقعہ اِس بات کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ افغانستان میں تعینات امریکی افواج شدید بوکھلاہٹ کا شکار ہے اور اب اِس جنگ سے راہ فرار چاہتی ہے،امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں کیا پایا؟ یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا لیکن اِس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ امریکہ اِس جنگ میں اب تک بہت کچھ گنوا چکا ہے،اخلاقی انحطاط، معاشرتی زوال اور فوج میں بڑھتے ہوئے نفسیاتی امراض کے ساتھ اُس کی معیشت کو بھی گھن لگ چکا ہے،آج خوف کی صلیب پر لٹکی ہوئی امریکی حکومت اور عوام کے اعصاب مفلوج ہیں،ربّ کی مدد و نصرت اور میدانِ بدر کو فسانہ سمجھنے والے طاقت کے پجاریوں اور اسلحہ و بارود پر بھروسہ کرنے والوں کی زندگی میں یہ دن بھی آنا تھا کہ مٹھی بھر طالبان ناقابل تسخیر سپر پاور کا گھمنڈ خاک میں ملادیں گے،ناقابل شکست سامراجی یلغار کا رخ موڑ دیں گے،لاکھوں ڈالر پھونک کر اور ہزاروں جانیں لے کر بھی امریکہ اِس قبیلے کا کچھ نہ بگاڑ سکا،گذشتہ دس برسوں میں افغان سرزمین پر کتنا بارود برسا، کتنی بستیاں پیوند خاک ہوئیں،آگ و بارود کے اِس کھیل نے کتنے انسانوں کو بھسم کیا، کتنی عورتیں بیوہ،بچے یتیم اور بزرگ بے سہارا ہوئے،کتنے لوگ زندگی بھر کیلئے اپاہج ہوئے، کسی کے پاس کوئی اعداد وشمار نہیں، کسی کے پاس اِن سوختہ جانوں پر گزرنے والی قیامت اور تباہ کاریوں کی کوئی تفصیل نہیں،نہ کابل کے چغہ پوش میئر کے پاس،نہ سات

سمندر پار سے آئے ہوئے لشکر چنگیز کے پاس اور نہ ہی دنیا میں حقوق انسانی کا راگ الاپنے والی این جی اوز کے پاس اِن دس برسوں میں امریکہ اور اُس کے حواریوں نے کیا کچھ نہیں کیا، اُس نے کسی تہذیبی قرینے، احترام آدمیت، جنگی قوانین اور جمہوری روایات کا پاس نہیں رکھا، بے دست وپا افغانیوں پر کون سا حربہ نہیں آزمایا، لیکن گرد و پیش سے بے خبر اور سود زیاں سے بے نیاز یہ قافلہ سخت جاں زیر نہ ہو سکا، وہ افغان تحریک مزاحمت کو نہ کچل سکا، اِس حریت کیش گروہ کی کلغی نہ جھکا سکا، وہ آج بھی زندہ اور پہلے سے زیادہ سرکشیدہ، سربلند اور کمالِ استقامت سے معرکہ آراء ہیں، اُن کی صفوں میں کوئی خوف وہراس کی لہر نہیں۔

سات سمندر پار سے افغانستان کو راکھ ڈھیر بنانے کا عزم لے کر آنے والے بھول گئے کہ طالبان کسی قبیلے اور گروہ کی نہیں ایک فلسفہ حیات کی جنگ لڑ رہے ہیں، وقت کی منہ زور قوتوں کے خلاف حق و صداقت کی جنگ، جس کے زمانے، مقام اور میدان بدلتے رہتے ہیں، لیکن کشمکش کبھی ختم نہیں ہوتی، اِس جنگ کا جاری رہنا ہی اِس کی اصل فتح ہے، یہ لوگ اُسی اُمت مرحوم سے نسبت و حوالہ رکھتے ہیں جس کے دامن میں ابھی تک چنگاریاں سلگ رہی ہیں، جس کی اُمیدوں کی راکھ کبھی سرد نہیں ہوتی، جس کے افراد اشکِ سحر گاہی سے وضو کرتے اور رضائے اِلٰہی کی خاطر جانوں کے نذرانے پیش کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے ہیں، وہ یہ بھی

بھول گئے کہ ربّ کی ذات پر بھروسہ کرنے والے یہ وہ مرد مومن ہیں جنھوں نے اپنا جینا مرنا اپنے ربّ کیلئے وقف کردیا ہے اور جن کیلئے قادر مطلق "دشمنوں کی تدبیروں کو ایسے ہی اُن کے منہ پر الٹ دیتا ہے۔" مقابلے میں لاکھ تباہی و بربادی کے علمبردار اپنی تمام عسکری طاقت و وسائل بروئے کار کیوں نہ لائیں، پروپیگنڈے اور جھوٹ کے سہارے اپنی شکست خوردہ اور حواس باختہ سپاہ کو حوصلہ دینے کی کوشش کیوں نہ کرتے رہیں، مگر ڈائپر استعمال کرنے والی بزدل افواج کبھی بھی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے والے فاقہ کش مجاہدین کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ افغانستان کو جنگی تجربہ گاہ بنانے والا گھمنڈی امریکہ آج شکست خوردگی اور ذلت و رسوائی کے بھنور میں گرفتار ہے، گرداب بلا اُس کی گردن تک آ پہنچا ہے، آنے والا وقت اُس کی رعونت پر خاک ڈالنے والا ہے، صدیوں سے افغانستان کے کوہساروں پر کندہ تاریخ کہہ رہی کہ سلطنتوں کے قبرستان "افغانستان" میں اُس کی قبر تیار ہوچکی ہے اور فلم کا آخری منظران فاقہ کش مجاہدین کے ہاتھوں عکس بند ہونے جارہا ہے، بے شک میرا ربّ ایمان والوں کے ایک چھوٹے گروہ کو بے ایمانوں کے بڑے گروہ پر غالب آنے کی بشارت پورا کرنے والا ہے ۔

گلوبل مارچ ٹویروشلم دنیا بھر کے حریت پسندوں کا مارچ

گلوبل مارچ ٹویروشلم فلسطین کی آزادی اور بیداری اُمت کا نیا سنگ میل
"ہم وہ صبح دیکھنے جارہے ہیں کہ جب دنیا کے آزاد انسان فلسطینی پرچم تھامے
اردن، مصر، لبنان، تیونس اور طرابلس میں نمودار ہوں گے۔" پہلے گلوبل مارچ ٹو
یروشلم کے موقع پر کہا گیا فلسطینی رہنماء اسماعیل حانیہ کا یہ تاریخی جملہ وقت کے بدلتے
دھارے کی نشاندہی کررہا ہے، واقعی حالات بدل رہے ہیں، مظلوم فلسطینیوں کی
قربانیاں رنگ لارہی ہیں، اسرائیلی جارحیت کے خلاف عالمی ضمیر بیدار ہورہا ہے
اورآج دنیا کے کونے کونے سے فلسطینیوں کے حق میں بلند ہوتی ہوئی آوازیں اُن کی
تاریخ ساز جدوجہد کا اعتراف کررہی ہیں۔

فلسطینی ہر سال 30 مارچ کو یوم الارض مناتے ہیں، وہ 30 مارچ 1976ء کو ڈھائے
جانے والے اُس قیامت خیز واقعہ کی یاد تازہ کرتے ہیں جس میں اسرائیلی فوجی درندوں
نے پرامن مظاہرین پر حملہ کرکے سینکڑوں افراد کو زخمی و شہید، ہزاروں کو پابند
سلاسل اوربے شمار فلسطینیوں کو اُن کی آبائی سرزمین سے زبردستی بے دخل کردیا
تھا، اُس روح فرسا واقعے کی یاد تازہ کرنے کیلئے فلسطینی چاہے وہ

غزہ کے باسی ہوں یا مغربی کنارے کے رہائشی، لبنان کے مہاجر ہوں یا شام میں بسنے والے، ہر سال آزادی کے اِن شہداء کی یاد کو تازہ کرنے اور اسرائیلی ظلم وبربریت سے پردہ اٹھانے کے لئے یروشلم اور القدس کی سرحدوں پر جمع ہوتے ہیں اور اسرائیلی جارح افواج کے مظالم پر صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں، لیکن گزشتہ سال سے اِس احتجاج میں اب عالمی برادری بھی شامل ہو رہی ہے۔ گلوبل مارچ ٹو یروشلم اِسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

گزشتہ سال جب اِس مارچ کا تصور پیش کیا گیا تو اِس نظریئے کو دنیا بھر میں اِس قدر پذیرائی حاصل ہوئی کہ آج یہ نظریہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر چکا ہے اور دنیا کے متعدد ممالک سے تعلق رکھنے والے مختلف اقوام و مذہب کے لوگ اِس کاروان میں جوق در جوق شامل ہو رہے ہیں، درحقیقت اِس مارچ کا اصل مقصد بھی یہی ہے کہ دنیا بھر کے باضمیر مسلمانوں، عیسائیوں، یہودیوں اور دیگر مذاہب کے لوگوں کو مجتمع کرکے عالمی ضمیر کو جگایا جائے اور اُسے یہ باور کرایا جائے کہ کہ نسل پرست صہیونی ریاست کی یروشلم اور اُس کے باسیوں کے خلاف اقدامات اور پالیسیاں فلسطینیوں کے ساتھ ساتھ انسانیت کے خلاف بھی سنگین جرائم ہیں، اِس لیے دنیا اسرائیل کی جانب سے یروشلم اور دیگر فلسطینی علاقوں پر قبضے اور عالمی قوانین کی پامالی کے خاتمے کی کوششوں میں فلسطینیوں کا ساتھ دے، دراصل گلوبل مارچ ٹو یروشلم کے منتظمین اِس مارچ کے

ذریعے فلسطینی تحریک مزاحمت کو ایک نیا رخ دینا چاہتے ہیں جس میں دنیا بھر کے لاکھوں مظاہرین بلاامتیاز رنگ و نسل اور مذہب ایک ایسی فلسطینی ریاست کے قیام کا مطالبہ کرتے نظر آئیں جس کا دارالحکومت یروشلم ہو۔

چنانچہ اِس مقصد کیلئے ہر سال 30 مارچ کو فلسطین میں احتجاجی ریلیاں اور مارچ منعقد کئے جاتے ہیں تاکہ مسئلہ ارض فلسطین کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے اور اِس دیرینہ مسئلے کا پائیدار حل تلاش کیا جاسکے۔ 30 مارچ کو ہونے والے گلوبل مارچ ٹو یروشلم کا مقصد بھی یہی ہے کہ فلسطینی بھائیوں کو صہیونی ظلم و ستم سے نجات دلانے کیلئے پرامن احتجاج کیا جائے ، چنانچہ اِس سال پوری دنیا نے اِس مسئلے کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے، مظلوم فلسطینیوں کے ساتھ اظہار یکجہتی اور ظالم و غاصب صیہونی ریاست اسرائیل کے مظالم کا پردہ فاش کرنے کے لئے دنیا بھر میں ریلیاں نکالنے اور مارچ کرنے کا فیصلہ کیا ہے،اِس مقصد کیلئے عالمی مارچ برائے آزادی القدس میں دنیا بھر سے مختلف رنگ و نسل اور زبان ومذہب کے تقریباً10 لاکھ افراد فلسطین کی آزادی کیلئے 30 مارچ کو مقبوضہ فلسطین کی چار سرحدوں مصر، لبنان، شام اور اردن کی جانب سے بیت المقدس کی جانب پرامن احتجاجی مارچ کریں گے،اِسی روز دنیا بھر میں امریکی و اسرائیلی سفارتخانوں کے سامنے بھی پرامن احتجاجی مظاہرے کئے جائیں گے۔

اِس مقصد کیلئے 15 ایشیائی ممالک کا پہلا قافلہ جس میں پاکستان، انڈیا، ایران، بحرین، ملائشیا، انڈونیشیا، بنگلہ دیش، تاجکستان، ازبکستان، ترکی، سعودی عرب، جاپان اور آسٹریلیا کی اہم سیاسی، سماجی اور مذہبی شخصیات شامل ہیں، بھارت سے روانہ ہو کر براستہ پاکستان، ایران، ترکی، اردن اور لبنان کی جانب روانہ ہوچکا، جبکہ دوسرا قافلہ جس میں مختلف ممالک بشمول امریکہ اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کے لوگوں کے نمائندہ وفود شامل ہیں، افریقہ سے اپنے سفر کا آغاز کرچکا ہے،اِسی قسم کے قافلے دیگر چار براعظموں سے یروشلم کی جانب رواں دواں ہیں،اِس مارچ کو امریکہ، برطانیہ، جرمنی، اٹلی کے علاوہ دیگر مغربی ممالک میں بھی خاصی پذیرائی ملی ہے، اطلاعات یہ بھی ہیں کہ یورپی ممالک سے ایک بہت بڑا قافلہ اردن کی جانب روانہ ہونے والا ہے، دوسری طرف برطانیہ کی انسانی حقوق کی تنظیم نے 30 مارچ کو اسرائیلی سفارت خانے کے سامنے مظاہرے کا اعلان بھی کیا ہے، جبکہ تنظیم آزادی فلسطین کے تحت قافلوں کے شرکاء کا فلسطین پہنچنے پر شاندار خیر مقدم کیا جائے گا۔

دوسری طرف اسرائیل اِس پر امن قافلے کو روکنے کی کوشش میں مصروف ہے،اُس نے بیت المقدس میں انفرادی حیثیت میں آنے کی ممانعت کرتے ہوئے 50 افراد کے وفد پر پابندی عائد کر رکھی ہے، صیہونی حکومت اِس مارچ سے اِس قدر خوفزدہ ہے کہ

اُس نے مارچ کے خلاف باقاعدہ کئی محاذ قائم کر دیئے ہیں، جس میں سائبر وار سب سے اہم ہے، اسرائیلیوں نے مارچ ٹویروشلم کے نام سے کئی ویب سائٹس بنائی ہیں جس کے ذریعے وہ دنیا کی گلوبل مارچ ٹویروشلم سے بڑھتی ہوئی ہمدردی کو کم اوراِس سے متنفر کرنا چاہتا ہے، لیکن تمام تر اسرائیلی مخالفتوں اور اقدامات کے باوجود اِس وقت پاکستان سے روانہ ہونے والا گلوبل مارچ ٹویروشلم کا پہلا قافلہ ایران کے شہر قم پہنچ چکا، جہاں سے اُس کی اگلی منزل ترکی، اردن اور لبنان ہوگی، خیال رہے کہ گلوبل مارچ ٹویروشلم میں شرکت کیلئے سب سے پہلا قافلہ 10 مارچ کو انڈیا سے روانہ ہوا تھا، جس میں بھارت کے علاوہ انڈونیشیا، ملائیشیا اور فلپائن کے سینکڑوں مندوبین شامل ہیں، یہ قافلہ واہگہ باڈر کے راستے لاہور سے ملتان ، سکھر اور حیدرآباد ہوتا ہوا کراچی پہنچا تو اِس کا شاندار استقبال کیا گیا، اِس موقع پر پاکستان کی معروف سیاسی و مذہبی جماعتوں کے قائدین سمیت فلسطین سفیر ڈاکٹر ہازم ابو شاب بھی انہیں خوش آمدید کہنے والوں میں شامل تھے، کراچی سے اِس قافلے کے میں مختلف سیاسی، سماجی اور مذہبی جماعتوں کے وفود کے ساتھ جمعیت علمائے پاکستان کا بھی ایک آٹھ رکنی وفد علامہ سید عقیل انجم، قاضی احمد نورانی، حسنات احمد قادری اور طارق مغل کی قیادت میں 14 مارچ کو مزار قائد پر حاضری دینے کے بعد ایران روانہ ہو چکا ہے۔

ایران روانگی سے قبل فلسطین فاؤنڈیشن پاکستان کی دعوت پر پاکستان میں فلسطینی سفیر ڈاکٹر ہازم ابو شاباب نے ایشیائی ممالک کے مندوبین برائے گلوبل مارچ ٹو یروشلم کے شرکاء سے خصوصی ملاقات کی،اِس موقع پر اُن کا کہنا تھا کہ میرے خاندان کی چار نسلیں فلسطین سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئی ہیں ، ہم آج تک بے وطن ہیں ، لیکن ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے اپنے وطن میں رہ پائیں نہ کہ مہاجرین کی زندگی گزاریں،اُن کا کہنا تھا کہ گلوبل مارچ ٹو یروشلم کی کوشش ایک ایسی نوبل تحریک ہے جس کے بعد اُمید ہے کہ فلسطین بہت جلد غاصب صیہونی ریاست اسرائیل کے قبضے سے آزاد ہو جائے گا،انھوں نے اِس عزم کا بھی اعادہ کیا کہ فلسطینی کسی صورت اسرائیل جیسی غیر قانونی اور غاصب ریاست کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کریں گے،اِس موقع پر انھوں نے فلسطین فاؤنڈیشن پاکستان کی جانب سے فلسطینی عوام سے اظہار یکجہتی کے لئے کی جانے والی کوششوں کو بھی زبردست خراج تحسین پیش کیا۔

قارئین محترم !آپ جانتے ہیں کہ فلسطینی سرزمین 1948ء سے اسرائیلی قبضہ میں ہے جبکہ بیت المقدس 1967 ء سے اسرائیلی شکنجہ جکڑا ہوا ہے، جبکہ عالمی استعمار امریکہ اسرائیل کی پشت پناہی میں مصروف ہے ،جب بھی یہ معاملہ اقوام متحدہ میں اٹھایا جاتا ہے ،اسرائیلی سرپرست امریکہ ویٹو کرکے دبا دیتا ہے،امریکی حمایت نے فلسطینیوں کا خون، زمین، عزت و آبرو اور مستقبل صیہونی

بھیڑیوں کے لئے حلال قرار دی ہے، جس کی وجہ سے آئے روز انسانی تذلیل کا تماشہ
لبنان، اردن اور فلسطین میں صابرہ، شتیلہ اور غزہ کی صورت میں دہرایا جاتا ہے
اسرائیلی فوج اور انتظامیہ کھلے عام بین الاقوامی قوانین کو پامالی کرتی ہے، مگر کوئی اُسے،
لگام دینے والا نہیں تھا، کوئی اُس کے ہاتھ روکنے والا نہیں، لہٰذا ضرورت اِس امر کی ہے
کہ دنیا بھر کے تمام مذہبی، سیاسی، ثقافتی اور انسانی حقوق کے ماننے والے متحد ہو کر
مشترکہ جد وجہد کرتے ہوئے بیت المقدس کی آزادی کے لئے کام کریں اور گلوبل مارچ
ٹویروشلم کے ذریعے پوری دنیا کو بیدار کریں تاکہ بیت المقدس صیہونی غاصبانہ تسلط سے
نجات حاصل کر سکے۔

اِس تناظر میں گلوبل مارچ ٹویروشلم اُمید کی روشن کرن ہے، جس کے ذریعے پوری
دنیا میں بیداری کا عمل شروع ہوچکا ہے۔آج اسماعیل حانیہ کی کہی ہوئی بات سچ ثابت
ہورہی ہے،اب امریکہ اور اسرائیل سمیت دنیا کی کوئی ظالم وجابرطاقت زیادہ دیر
فلسطینیوں کے آواز کو دبا نہیں سکتی۔آج دنیا بھر کے آزاد حریت پسند فلسطینی پرچم تھامے
اُن کے ساتھ ہم آواز ہیں اور وہ دن دور نہیں جب گلوبل مارچ ٹویروشلم مسئلہ فلسطین
کو اجاگر کرنے اور فلسطین کی آزادی اور اُمت مسلمہ کی بیداری کا نیا سنگ میل ثابت ہو
گا، 30 مارچ 2012ء کو فلسطین کی چاروں سرحدوں پر ہونے والا یہ عظیم گلوبل مارچ
ٹویروشلم کسی ایک

خطہ کا نہیں بلکہ دنیا بھر کے اُن حریت پسندوں مارچ ہے، جو فلسطینیوں کے 36 ویں یوم الارض کے موقع پر دنیا کے سامنے مسئلہ فلسطین کی اہمیت اجاگر کرنے اور ایک غاصب صیہونی ریاست کے انسانیت سوز مظالم کو عریاں کرنے کیلئے گلوبل مارچ کا یہ ترانہ گاتے ہوئے گامزن ہونگے۔

قدس ہمیں اپنی آنکھوں میں موجود دلفریب مسکراہٹ سے پکار رہا ہے۔ اُس نے اپنے" ہاتھ دنیا بھر کے آزاد انسانوں کی جانب بڑھا دیئے ہیں اور ہمارے قلوب کو اخلاص سے پرُ کر دیا ہے۔ اے قدس! دنیا بھر سے حریت پسند انسان تیری جانب بڑھ رہے ہیں اور تیری آنکھوں کی حسین مسکراہٹ نے انہیں نتائج سے بے پرواہ کر دیا ہے۔ اے قدس! ہم تیری سرحدوں پر جمع ہو رہے ہیں۔ اے قدس! وہ لوگ جنہوں نے تیری توہین کی کبھی بھی امن سے نہ رہیں۔ تیری جانب عظیم سفر کے ذریعے ۔ تمام ادیان نے ہم کو متحد کر دیا، تیرے حسن نے ہمیں آزاد عزم اور ایمان کے ساتھ تیری سرحدوں پر جمع ہونے پر مجبور کر دیا۔ اے سنہری ریت والی سرزمین.... ہم تیری قید اور تکلیفوں کو نہیں بھولے۔ تیری محبت کتنے ہی دلوں میں بستی ہے جو سینکڑوں میل کا سفر کرکے تیری جانب آئے ہیں تاکہ تجھ سے قریب ہو سکیں اور ان کو اِس اَمر کے محال ہونے کی کوئی پرواہ نہیں۔"

شفیق بریلوی، جہان نعت کا روشن ستارہ ڈوب گیا۔۔۔۔

کائناتِ انسانی پر ربّ کریم کا سب سے بڑا انعام عطائے ذاتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے،اِس عظیم ترین انعام کا شکر بجا لانے کیلئے اللہ کے برگزیدہ اور مقبول بندوں نے ہر دور میں اُس کے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی ثناء خوانی کی،یوں نعت لکھنے کا عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی شروع ہوگیا،شاعر رسول حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ پہلے نعت خواں اور گو شاعر تھے، جنہیں شاعرِ دربارِ رسالت بھی کہا جاتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کے ادوار میں عربی زبان میں نعتیں لکھی جانے لگی، پھر جوں جوں عربوں کی فتوحات بڑھتی گئیں دوسری زبانوں میں بھی نعت لکھنے کا رواج عام ہوتا گیا، عربی اور فارسی کے بعد برصغیر کی کئی زبانوں میں نعت لکھی گئی اور یوں یہ سلسلہ ہندوستان میں رواج پا گیا،کہتے ہیں فنی طور پر اردو میں محسن کاکوروی جن کا تعلق لکھنو سے تھا،نے نعت کو رواج دیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ برصغیر میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی نے فنِ نعت کو بام عروج تک پہنچایا اور عشق و محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈوب کر کمال نعتیں لکھیں، ہماری اردو شاعری میں کچھ نام ایسے بھی ہیں جنھوں نے اِس فن اور ہنر کے طفیل ابدی شہرت حاصل کی،اِن میں مولانا حسن رضا خان، علامہ اقبال، امیر

مینائی، صائم چشتی، ادیب رائے پوری، خواجہ بیدم وارثی، محمد علی ظہوری قصوری، بہزاد لکھنوی، عبدالستار نیازی، قمر الدین انجم، پروفیسر اقبال عظیم، صباء اکبر آبادی، خالد محمود نقشبندی، علیم الدین علیم اور پروفیسر حفیظ تائب وغیرہ کے نام نامی نعت گوئی کا اہم ترین حوالہ ہیں۔

کہتے ہیں نعت گوئی پل صراط پر چلنے جیسا عمل ہے، ذرا سی لغزش سے ایمان کی سرحدیں ٹوٹ جاتی ہیں اور عقیدے کا زاویہ بدل ہو جاتا ہے، اِس پل صراط کو عبور کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں، یہ وہ بارگاہ اقدس ہے جہاں بڑے بڑے قدسیوں کے پاؤں لرز جاتے ہیں اور مقام الوہیت و رسالت کے درمیان توازن قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے، صرف وہی لوگ محفوظ رہتے ہیں جو قرآن و حدیث کو مشعل راہ بناتے ہیں، چونکہ یہ بڑا نازک اور کٹھن کام ہے، اِس لیے نعت لکھتے ہوئے بہت ہی احتیاط اور اعتدال کی ضرورت ہوتی ہے، بظاہر نعت کا موضوع بڑا آسان، عام فہم اور سادہ سا لگتا ہے، لیکن در حقیقت ایسا نہیں، اِس میں ذرہ بھر بھی کوتاہی اور لغزش کی گنجائش نہیں، کیونکہ ذرا لغزش سے نعت گو کے سارے اعمال ہی اکارت ہی نہیں ہوتے بلکہ ضلالت و گمراہی کے عمیق گڑھا بھی اُس کا مقدر بن جاتا ہے، اس صنف میں احتیاط کا یہ عالم ہے کہ عرفی جیسا خود پسند اور متکبر شاعر بھی جب اِس میدان میں آتا ہے تو کانپ کر کہہ اٹھتا ہے۔

عرفی مشتاب این رہِ نعت است نہ صحر است

آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را

اُس کے نزدیک نعت گوئی تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔امام نعت گویاں مولانا احمد رضا خان بریلوی کے نزدیک نعت گوئی انتہائی مشکل کام ہے۔ ذرا سا آگے بڑھے تو مقام الوہیت کی حدود میں داخل ہو گئے اور ذرہ برابر بھی کمی کی تو توہین و تنقیص شروع ہو گئی۔ گویا نعت شریف میں دونوں جانب حدود و قیود کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے، کیونکہ ذرا سا شاعرانہ غلو کفر و ضلالت کے زمرے میں پہنچا سکتا ہے یا پھر ذرا سا عجز بیان اہانت کا باعث بن سکتا ہے۔اس لیے الفاظ پر کتنی ہی دسترس اور قدرت کیوں نہ حاصل ہو، شاعر اپنے آپ کو بیان وصف سے عاجز ہی پاتا ہے، لیکن اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی مداحی کرنے سے خود کو روک بھی نہیں سکتا۔چنانچہ نعت کا ورودِ مسعود ہوتا ہے اور آسمان سے زمینیں تراشنے کے باوجود شعراء یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" ۔بظاہر نعت کہنا اور زبانِ شاعری میں ذات رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی عامیانہ توصیف کر دینا بہت آسان ہے، لیکن اِس کے پورے لوازم و شرائط سے عہدہ برآ ہونا بہت مشکل کام ہے، جس کیلئے حب رسول کے ساتھ ساتھ کمالات نبوت و رسالت، اسلام کی اصل روح، عہد رسالت کے واقعات اور قرآن و احادیث سے روشنی لازمی ہے، جس کے بغیر نعت گوئی ممکن نہیں، یہ وصف بہت کم شعراء میں پایا جاتا ہے۔بقول ڈاکٹر ریاض مجید "نعت میں وزن

و بحر، قافیہ و ردیف کی حد بندی میں موزونیت الفاظ، سلاست کے بعد جو چیز اِسے نعت کا
درجہ دیتی ہے وہ ہے، عشق رسول کی نغمہ سنجی، چونکہ یہ نبی کی ترانہ سرائی ہے اِس لیے
اِس میں صداقت مضمون، واقعیت مفہوم اور حسن محاکات کے سوا رنگینی خیال اور
ندرت تخیل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔"کامیاب نعت گوئی کیلئے جہاں سوز و
گداز، تڑپ، عشق اور سرشاری کی ضرورت ہے وہاں حد درجہ احتیاط، حفظِ مراتب اور
شریعت کی پاسداری کی بھی ضرورت ہے۔

ادب گاہیست زیرِ آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید این جا

حقیقت یہ ہے کہ نعت گوئی کا تعلق قادر الکلامی سے زیادہ توفیق الٰہی پر منحصر ہے، یہ
وصف وہبی ہے، نعت وہی کہتا ہے جس کو نعت کہنے کی توفیق عطا ہوتی ہے، جبکہ نعت کا
حق بھی وہی ادا کر سکتا ہے، جس کا دل جذبہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سرشار
ہو، کیونکہ عشق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر نعت کی تخلیق ممکن نہیں، یعنی محبت رسول
جب شعر و نظم کے پیکر میں ڈھلتی ہے، تب ہی نعت وارد ہوتی ہے۔بزرگ شاعر شفیق
احمد شفیق بریلوی کا شمار بھی ایسی ہی وہبی نعت گو شعراء میں ہوتا ہے جن کو توفیق ایزدی
اِس میدان میں لے آئی، حضرت شفیق بریلوی 1920ء میں بریلی کے ایک متوسط
گھرانے میں پیدا ہوئے، یہ وہی شہر ہے جہاں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان اور شاہ نیاز
جیسی قابل قدر ہستیوں نے

جنم لیا، شفیق بریلوی کا گھریلوں ماحول مذہبی تھا، والد محترم ایک علمی و روحانی شخصیت
اور عربی و فارسی پر عبور رکھتے تھے، وہ تصوف کے روحانی سلسلہ چشتیہ صابریہ سے وابستہ
اور صوفیانہ طرز زندگی بسر کرتے تھے، باقاعدگی سے اُن کے گھر میں محافل میلاد و
عرس بزرگان دین کا اہتمام ہوتا تھا، شفیق بریلوی بچپن سے ہی اِن محافل میں حصہ لیا
کرتے تھے، گھر کے ماحول، والد کی تربیت اور بزرگوں کی صحبت نے شفیق بریلوی کے دل
کو محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی لازوال دولت سے سرشار کردیا، قلب و نظر میں
عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سیل رواں جاری ہوگیا اور شفیق بریلوی کی زندگی کا ظاہر
و باطن محبت و مروت کے سانچے میں ڈھل کر پاکیزگی و طہارت سے مرقع و مصفّا
ہوگیا، آپ اِس کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

آگیا حق کی قسم آغوش رحمت میں وہی
جس کی جانب اُنکی نظروں کا اشارہ ہوگیا

جناب شفیق بریلوی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی اور 1938ء میں
اٹھارہ سال کی عمر میں باقاعدہ شاعری کا آغاز کیا، ابتداء میں طبیعت غزل گوئی کی جانب
مائل رہی لیکن گھریلو ماحول اور والدین کا رنگ تصوف انہیں نعت گوئی کی طرف ایسا لایا
کہ نعتیہ شاعری ہی مقصد حیات ٹھہری۔

تمام عمر رہوں عشق بتلائے رسول

زباں پہ ہو مرے اللہ بس ثنائے رسول

یوں شفیق بریلوی نے نعت گوئی کو اپنی زندگی کا مقصد و مدعا بنالیا،یقیناً یہ بہت بڑی سعادت تھی کہ اُن کے جذبے نے اظہار کیلئے شعر کا جو روپ دھارا، وہ محض لذت گفتار اور وصفِ لب و رخسار سے متشکل نہیں تھا،بلکہ جذبے کی شدت، فکر کی سچائی اور احساس کی شگفتگی سے عبارت ہے، شفیق بریلوی نے اپنے فنی سفر کیلئے سعادت ابدی کی اُس راہ کا انتخاب کیا، جس پر چلنے والا مسافر کبھی بھی گم کردہ راہِ منزل نہیں قرار پا سکتا،آپ نعت گوئی میں سب سے زیادہ امام احمد رضا خان بریلوی سے متاثر تھے، قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی تشریف لے آئے اور کراچی کی مضافاتی بستی لانڈھی کو اپنا مستقل مسکن بنالیا، یہاں آپ نے کئی ادبی انجمنوں کی بنیاد ڈالی،اُن کے روح رواں رہے اور ہزاروں شاگردوں کی تربیت کی،مگر 1980 میں شاگردوں کے اصرار پر بننے والی ادبی انجمن "بزم شفیق ادب" سے تادم زیست وابستہ رہے۔

شفیق بریلوی نے جو کچھ کہا فی البدی کہا، کبھی شاعری میں کسی نے اصلاح نہیں لی، اللہ تعالٰی نے نعت گوئی میں جو اب و لہجہ شفیق بریلوی کو عطا فرمایا، وہ دوسروں سے بہت مختلف، جدا اور متاثر کن ہے،آپ سچے عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور پابند شریعت تھے، فکر کی بلند خیالی اور نیک اعمالی نے آپ کے کلام

کو جلاء بخشی اور آپ نے اپنے نعتیہ کلام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہی اوصاف حمیدہ بیان کیے جو قرآن و حدیث اور سیرت طیبہ سے ثابت ہیں، نعتیہ شاعری کے ساتھ ساتھ شفیق بریلوی نے اہل بیت اطہار، خلفائے راشدین اور آئمہ و اولیائے عظام کی شان میں مناقب بھی لکھے، جو بہت مشہور ہوئے، شفیق بریلوی درویش منش، سادہ طبیعت اور دھیمے لب و لہجے میں بات کرنے والے انسان تھے،انہوں نے نعت کے پھولوں کو خیال و فکر، عقیدت و محبت، عشق و شیفتگی اور ادب و احترام کے دل کش رنگوں سے مزین کرنے کے ساتھ ساتھ فنی و تیکنیکی محاسن سے بھی آراستہ کرنے پر توجہ دی ہے، مگر پھر بھی اِس انتخاب نعت کا قاری اگر کہیں زبان و بیان،اسلوب اور فنی نکتہ نگاہ سے تشنگی یا عدم سیرابی محسوس کرتا ہے تو یہ سیرابی ممکن ہی نہیں کیونکہ "لفظوں کے مقدر میں کہاں اتنی رسائی" لفظ تو درماندہ و عاجز ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح سرائی اندازہ حرف و خیال سے ماورا.

البتہ بہتری کی گنجائش تو ہر جگہ موجود رہتی ہے، یہاں بھی ہے،تاریخ میرٹھ اور بہر زباں بہر مکان کے مصنف مشہور مورخ جناب نور احمد میرٹھی آپ کی نعتیہ شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آپ کی شاعری میں "جذبات کی فراوانی اور عقیدت و احترام کی جلوہ سامانی ہے، محترم شفیق بریلوی نے اکثر نعتوں میں محاسن و شمائل نبوی کے ساتھ ساتھ اپنے اشعار میں تبلیغ کا فریضہ

بھی ادا کیا ہے، موصوف نے دعویٰ عشق محمد صلی اللہ علیہ وسلم رکھنے والوں کی توجہ بصد اخلاص اِس جانب بھی دلائی ہے کہ اُن کی زندگی کے شب و روز پیغام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق بھی گزرے ہیں یا نہیں؟ عقیدت و محبت کے جوش میں یہ ہوش کی باتیں اِس اَمر پر دلالت کرتی ہیں کہ شفیق بریلوی صاحب ایک صالح طبیعت انسان ہیں۔ ”منظر و حمد و نعت، ضیائے مدینہ، گلشن نعت، بہار ذکر حسین، حب اہل بیت، تحفہ معرفت، مدحت باب فخر اُمم، بہار گنبد خضرا، نگاہ ناز اور شوخی غزل آپ کی مشہور تصانیف ہیں، افسوس کہ جہان نعت کا یہ روشن ستارہ 5 اپریل 2012ء بروز جمعرات، کراچی میں 92 سال کی عمر میں ڈوب گیا اور گلشن علم وادب ایک عظیم علمی، روحانی اور قد آور شخصیت سے ہمیشہ کیلئے محروم ہو گیا۔

جان نکلے مری یارب شہہ ابرار کے پاس
جس کا میں ہوں مجھے پہنچا اُسی سرکار کے پاس
میں سمجھوں گا ملی دولتِ کونین مجھے
موت آئے جو درِ احمد مختار کے پاس

اصولی سیاست سے وصولی سیاست تک۔۔۔۔

جناب ایسا پہلی بار تو نہیں ہوا۔۔۔۔۔۔
جنرل حمید گل کے نزدیک مولانا فضل الرحمٰن کا یوٹرن افسوسناک ہے، وہ مولانا کے امریکی سفیر اور صدر سے ملاقات کے بعد موقف کی تبدیلی پر بھی حیران ہیں اور کہتے ہیں کوئی مجبوری نہ ہونے کے باوجود مولانا کا فیصلہ سمجھ سے بالاتر ہے، عمران خان کہتے ہیں کہ نیٹو سپلائی کی بحالی پر زرداری، نواز اور مولانا ڈیزل کا مک مکا ہوگیا ہے، زرداری اور نواز شریف بھائی ہیں جبکہ فضل الرحمٰن اُن کے پارٹنر ہیں، امیر جماعت اسلامی سید منور حسن کہتے ہیں کہ ن لیگ اور جے یو آئی کا حکومت کا اتحادی بن کر امریکی کیمپ میں جانا المیہ ہے، انہیں مولانا فضل الرحمٰن سے گلہ ہے کہ مولانا کل تک طالبان سے ہمدردی کر رہے تھے لیکن منسٹر اور صدر سے ایک ہی ملاقات کے بعد وہ اپنا موقف تبدل کرکے انجمن غلامان امریکہ کے ہمنوا بن گئے، اُن کا یہ بھی کہنا ہے کہ پارلیمنٹ میں بیٹھے لوگ قومی مفادات پر امریکی مفادات کو ترجیح دینے اور امریکی غلامی میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوششوں میں مصروف ہیں، کچھ اسی قسم کے خیالات دیگر سیاسی رہنماؤں کے بھی ہیں، لیکن ہمارا ماننا ہے اِس میں حیرانی

اور اچنبھے کی کوئی بات نہیں، نہ ہی ایسا پہلی بار ہوا ہے، دنیا جانتی ہے کہ میدان سیاست میں مولانا کا کردار کبھی بھی مثالی نہیں رہا، اُن کے طرز عمل نے ہمیشہ اُن کے بلند بانگ دعوؤں کی نفی کی ہے، جبکہ مولانا کی معاملہ فہمی، دور اندیشی، موقعہ شناسی اور ابن الوقتی سے ایک زمانہ واقف ہے، حال ہی میں مولانا نے خود فرمایا کہ " وہ صدر کی بات نہیں مانتے بلکہ اپنی ہر بات منواتے ہیں، اُن پر امریکی سفیر کیمرون منٹر سمیت کسی کا بھی منتر نہیں چلتا بلکہ اُن کا منتر دوسروں پر چل جاتا ہے۔" اب اِس اعتراف حقیقت کے بعد بھی کیا کچھ سمجھنے اور سمجھانے کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

کیا جنرل حمید گل، عمران خان، منور حسین، قاضی حسین احمد، صاحبزادہ زبیر اور دفاع پاکستان کونسل کے دیگر سیاسی رہنما اِس حقیقت سے واقف نہیں ہیں، کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ مولانا حزب اختلاف میں رہ کر اقتدار کی سیاست کرتے ہیں، وہ ہمیشہ اقتدار کے مزے لوٹتے ہیں اور اکثر یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ انہیں " اقتدار عزیز نہیں، جمہوری اصولوں کی پاسداری چاہتے ہیں " مگر جمہوری اصولوں کی پاسداری اور اقتدار سے دوری کیلئے وہ ہمیشہ اُس کولیشن کا حصہ ہوتے ہیں جو مسند اقتدار پر متمکن ہوتی ہے، وہ ہمیشہ حکومت اور حکومتی کارکردگی کو کڑی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں، لیکن درپردہ حکومت اور حکومتی اقدامات کی تائید و حمایت جاری رکھ کر کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتے، کیا یہ

لوگ یہ بھی نہیں جانتے کہ سیاسی حوالے سے مولانا کی گفتگو ہمیشہ تحفظات اور خدشات کے گرد گھومتی نظر آتی ہے، مگر درحقیقت یہ تحفظات اور خدشات اپنے مفادات کے تحفظ اور بقاء کیلئے ہوتے ہیں، کیا یہ لوگ اِس حقیقت سے بھی آشنا نہیں کہ مولانا فضل لرحمٰن نے ہر دور میں اقتدار کے مزے لوٹے اور مراعات یافتہ عہدوں کا حصول مولانا کا محبوب مشغلہ رہا ہے، وہ بے نظیر بھٹو کے دوسرے دور حکومت میں خارجہ امور کی کمیٹی کے چیئرمین رہے، پرویز مشرف کی مارشل لاء کے تحت وجود میں آنے والی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف رہے، جنرل مشرف کے دور حکومت کو آئینی تحفظ فراہم کرنے والی سترہویں آئینی ترمیم کو منظور کرانے میں اہم کردار ادا کرنے والے مولانا فضل الرحمٰن آج کشمیر کمیٹی کے چیئرمین ہیں، حالانکہ اُن کے اکابرین کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کو جہاد کے بجائے اپنے ملک (بھارت) سے بغاوت کے مترادف قرار دیتے تھے۔

جمہوریت، پارلیمنٹ کی بالادستی اور آئین و قانون کے راگ الاپنے والے یہ وہی مولانا فضل الرحمٰن ہیں جو 9 مارچ 2007ء کو چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کی معطلی کے غیر آئینی اقدام پر شاہراہ دستور پر شرمندہ شرمندہ نظر آئے، مگر 3 نومبر 2007ء کے غیر آئینی آمرانہ اقدام پر معزز عدلیہ کے ججز کے خلاف دل کا غبار نکالتے دکھائی دیئے۔

اپنی مدت پوری کرتی اسمبلیوں سے جنرل پرویز مشرف کے غیر آئینی اور غیر

قانونی صدارتی انتخاب کے موقع پر متحدہ مجلس عمل کے متفقہ فیصلے کے مطابق قومی و صوبائی اسمبلیوں سے بیک وقت استعفیٰ دینے کے حوالے سے بھی مولانا کا دورخی کردار کسی ڈھکا چھپا نہیں، آئینی اور قانونی موشگافیوں، تحفظات اور خدشات کا تذکرہ کرکے حکومتوں کو بلیک میل کرنے والے مولانا فضل الرحمٰن کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ جائز و ناجائز کسی بھی طریقے سے اعلیٰ حکومتی عہدوں کو حاصل کیا جائے۔ الہٰذا اِس میں حیرانی اور شکوئے کی قطعاً کوئی بات نہیں، کیونکہ ایسا پہلی بار تو نہیں ہوا، مولانا موصوف تو یہ عمل بارہا دہرا چکے ہیں، وہ ہر حکومت میں اسی وجہ سے شامل رہتے ہیں کہ اُن کے پیش نظر جمہوری نظام کی بقاء اور نظریاتی ترجیحات ہوتی ہیں، اب وہ نظریاتی ترجیحات مالی منفعت، جاہ و منصب اور ذاتی مراعات کے گرد گھومتی ہوں یا جمہوری نظام کسی فوجی آمریت کی کوکھ سے جنم لیتا ہو، مولانا ہمیشہ اپنی نظریاتی ترجیحات کیلئے اُس جمہوری نظام کو بچانے کی تگ و دو ضرور کرتے ہیں، ہاں یہ الگ بات ہے کہ اُس جمہوری نظام کو بچاتے بچاتے مولانا کو کچھ نہ کچھ فوائد، مراعات اور مفادات حاصل ہوجاتے ہیں، نیٹو سپلائی بحالی معاملے پر بھی یقینا مولانا نے کوئی نہ کوئی قیمت ضرور وصول کی ہوگی، سب جانتے ہیں کہ مولانا کارزار سیاست کے ایک ایسے شہسوار ہیں، جنھوں نے اپنے اسی انداز سیاست کی بدولت ملک کے سادہ لوح عوام کے ساتھ دیندار طبقے کو بھی حیران و ششدر کررکھا ہے، آج اُن کی اعلیٰ ترین سیاسی بصیرت اور جوڑ توڑ کا اِس سے بڑا ثبوت اور کیا

ہو سکتا ہے کہ عوام تو عوام خود ماہر سیاستدان بھی اُن کی اِس طرز سیاست پر حیران و پریشان اور یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ مولانا کی سیاست کے رنگ ڈھنگ اتنے انوکھے، نرالے اور عقل و خرد میں نہ آنے والے کیوں ہیں۔؟

اِس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ مولانا وطن عزیز کے ایک ایسے سیاست دان ہیں جن کا سیاسی اونٹ کبھی بھی، کہیں بھی، کسی بھی کروٹ بیٹھ سکتا ہے،آپ وثوق سے نہیں کہہ سکتے، وہ کب کس کے ساتھ ہیں اور کب کس کے خلاف،ایک بین الاقوامی نشریاتی ادارے نے مولانا کے اِس طرز عمل کی خوبصورت تصویر کشی کرتے ہوئے لکھا تھا کہ مولانا فضل الرحمٰن سیاست کے مے خانے میں "رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت بھی نہ گئ"وہ آئیڈیل ازم اور عملی سیاسی تقاضوں کو نہ صرف خلط ملط نہیں ہونے دیتے بلکہ بے وقت کی راگنی پر بھی اپنا وقت ضائع نہیں کرتے، مولانا طالبان کے ہیرو بھی ہیں اور اینٹی طالبان لابی کے بھی آئیڈیل، وہ جب چاہیں امریکہ کے خلاف آگ لگادیں اور جب چاہیں اِس آگ پر ٹھنڈی بالٹی انڈیل سکتے ہیں..... فضل الرحمٰن جمعیت علمائے اسلام (ف) کے جمگھٹے میں ہوں تو ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ سے کم پر راضی نہیں ہوتے، باہر ہوں تو جنرل پرویز مشرف (اوراب آصف علی زرداری) کی اقتدار پسندی اور روشن خیالی کو بھی حرام نہیں کہتے، بس مکروہ سمجھتے ہیں،وہ فوجی سیٹ اپ کے یکسر مخالف بھی ہیں اور موجودہ سیٹ اپ (جنرل پرویز مشرف) میں وزیر اعظم بننے کے خواہشمند

بھی، مولانا فضل الرحمٰن واحد سیاستدان ہیں جو ایک ہی وقت میں پانچ مختلف رنگوں کی گیندیں ہوا میں اچھالنے کے ماہر ہیں اور اُن میں سے کسی کو بھی زمین پر گرنے نہیں دیتے۔"

مولانا کا یہ بھی کمال ہے کہ وہ حکومت میں رہ کر اپوزیشن میں ہوتے ہیں اور کبھی اپوزیشن بینچوں پر بیٹھ کر وزارتوں کے مزے لوٹتے ہیں، اپنے اِس فن میں طاق ہونے کی وجہ سے آج وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں، شاید اسی وجہ سے لوگ انہیں چکری ساستدان کہتے ہیں، جو دوسروں کو چکر دے کر اپنا مقصد حاصل کر لیتے ہیں، انہوں نے جنرل مشرف کیساتھ آٹھ سالہ دور میں اقتدار اور حزب اختلاف دونوں کے مزے ایک ساتھ لینے کا نیا ریکارڈ قائم کیا، یہ کریڈٹ بھی صرف مولانا ہی کو جاتا ہے کہ انہوں نے ایل ایف او کو آئین کا حصہ بنانے کیلئے ایم ایم اے کو جنرل مشرف کی مدد کیلئے راضی کیا اوراس کے بدلے سرحد کی پوری اور بلوچستان کی آدھی حکومت حاصل کی اور خود قائد حزب اختلاف کی کرسی پر جا بیٹھے، یہ بھی انہی کا اعجاز ہے کہ اے پی ڈی ایم کے اجتماعی استعفوں کے باوجود مولانا نے سرحد اسمبلی نہیں ٹوٹنے دی اور انتخابی کالج برقرار رکھ کر مشرف کو صدر منتخب ہونے کا پورا پورا موقع فراہم کیا، جبکہ اُن کے ساتھی قاضی حسین احمد سمیت جے یو پی، مسلم لیگ (ن) کے قائدین لکیر پیٹتے ہی رہ گئے۔

دراصل مولانا سیاست کے کوچہ ملامت کے وہ مسافر ہیں جن کا قول و فعل، کردار و عمل اور شخصیت ہمیشہ متنازعہ اور ابن الوقتی کی مظہر رہی ہے، سیاست کے اِس کوچہ ملامت میں مولانا کے قدم اگر ایک بار پھر لڑکھڑا گئے تو اِس میں حیران ہونے کی کونسی بات ہے، اِس کوچے میں تو بڑے بڑے صاحب کردار لوگوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں، ویسے ویسے بھی سیاستدان تو سیاستدان ہی ہوتا ہے، کبھی بھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتا، مولانا فضل الرحمٰن تو سیاستدانوں کے اُس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جو ہار کر بھی جیت جانے اور فائدہ اٹھانے کا گُر خوب جانتے ہیں، اِس مقام پر ہم اِن حیران و ششدر سیاسی رہنماوں کو وہ لمحہ یاد دلانا چاہتے ہیں جب مولانا فضل الرحمٰن نے امریکہ کو یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ پاکستان کی وزارت عظمٰی کے وہی سب سے اہم اور اہل امیدوار ہیں، گو یہ بیل منڈھے نہیں چڑھی لیکن اُس وقت ہی یہ بات کھل کر سامنے آ گئی تھی کہ مولانا فضل الرحمٰن اپنے اقتدار اور مفادات کیلئے کچھ بھی کر سکتے ہیں، کہیں بھی جا سکتے ہیں اور کسی سے بھی مدد کے خواہاں ہو سکتے ہیں، ہم جنرل حمید گل، صاحبزادہ زبیر، منور حسن اور قاضی حسین احمد وغیرہ کو یہ بھی یاد دلانا چاہتے ہیں کہ مشرف دور کے یہ وہی درباری مولوی ہیں جو آج موجودہ حکومت کی جھولی میں بیٹھے اُس کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں، کل کسی اور کے ہاتھ مضبوط کرتے نظر آئیں گے، بدقسمتی سے یہی ہماری سیاست کا معیار ہے کہ اپنے موقف میں بنیادی تبدیلی کرنے کے باوجود بانگ دہل کہا جائے کہ ہم فلاں فلاں معاملے

میں تواب بھی اپنے اصولی موقف پر قائم ہیں، یہی وہ شرمناک طرز عمل اور کردار
وعمل کی دورخی ہے جس نے عوام کا سیاستدانوں پر سے اعتماد اٹھایا دیا ہے اور آج لوگ
کسی بھی سیاسی لیڈر پر بھروسہ کرنے کو تیار نہیں۔ لہذا اِس تناظر میں ضرورت اِس اَمر
کی ہے کہ مولانا کے طرز عمل پر حیرت و استعجاب کا اظہار کرنے اور کف افسوس ملنے کے
بجائے ایسی حکمت عملی مرتب کی جائے، جس میں کسی بھی ابن الوقت، کاسہ لیس اور
مفاد عاجلہ کے رسیا سیاسی کردار کو فائدہ اٹھانے کا موقع نہ ملے، ہم یہاں یہ بات بھی
واضح کرتے چلیں کہ اِن تمام باتوں کو دہرانے کا مقصد کسی کی توہین و تنقیص یا کیچڑ
اچھالنا نہیں، بلکہ دفاع پاکستان کونسل اور بالخصوص جے یو پی کے قائدین کو وہ جھلک
دکھانا مقصود ہے جس کی روشنی میں مستقبل کی صورت گری آسان ہو سکے۔

دنیا" میڈیا قبضہ گروپ مافیا کے نرغے میں۔۔۔۔

بلوچستان میں گفتار پہ قدغن اور اظہار پہ تالے

کہتے ہیں سچ بات کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ بہت زیادہ کڑوی ہوتی ہے۔انسان کبھی بھی اِس کی تاثیر کو آسانی سے ہضم نہیں کرپاتا، جبکہ فاسشٹ کی شناخت یہ ہوتی ہے کہ وہ کبھی بھی سچ کو قبول نہیں کرتا بلکہ ہر حربے سے اُسے دبانے، کچلنے اور صدق کی بنیاد پر اُگنے والے والے پودے کو مسلنے اور سچ کو نیست و نابود کرنے پر اپنا سارا زور لگا دیتا ہے، وہ ہر اُس آئینے کو توڑ دیتا ہے جس میں اُسے اپنا کریہہ چہرہ دکھائی دیتا ہے اور وہ اپنی ساری طاقت آئینہ کو برا بھلا کہنے میں گزارتا ہے۔ فاشزم کی پوری تاریخ ایسے واقعات سے عبارت ہے۔دنیا میں یہ چیزیں وہاں ہوتی تھیں جہاں جمہوریت نہیں ہوتی،آئین و قانون کی حکمرانی نہیں ہوتی۔ لیکن ایک جمہوریت کے دعویدار ملک میں اگر ایسا ہو کہ ریاست کے اہم ستون کو عضو معطل بنادیا جائے تو اِسے آپ کیا کہیں گے۔ ہماری قومی تاریخ گواہ ہے کہ پاکستان میں الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا ہمیشہ حکومتِ وقت کا غلام اور ترجمان رہا ہے،اُس نے حکومت وقت کی چاپلوسی اور

کاسہ لیسی میں کیا کچھ نہیں کیا، لیکن اِس فیلڈ میں ایک طبقہ ایسا بھی موجود رہا جس نے کبھی بھی آمر وقت کی غلامی قبول نہیں کی۔ہمیشہ حق و سچ کا آئینہ دکھایا، حکمرانوں کی لوٹ مار، کرپشن اور بدعنوانیوں کو بے نقاب کیا اور عوامی و معاشرتی مسائل کو اجاگر کیا۔اِس جرم کی پاداش میں اِس طبقے کو بہت بڑی قیمت چکانی پڑی، حق گو صحافیوں کے خلاف مقدمات بنے، پابند سلاسل ہوئے، حکومت کے خلاف بولنے والی زبانوں پر قفل لگے۔انہیں ڈرایا دھمکایا گیا، مالکان پر دباؤ ڈال کر انہیں صحافیوں کو نوکریوں سے نکلوایا گیا اور اخبارات کو دباؤ میں لانے کیلئے سرکاری اشتہارات بند کرکے اِن اداروں اوران سے وابستہ افراد کو معاشی ابتلاء میں مبتلا کرنے کی کوششیں کی گئیں،آج اِس شرمناک فاشزم کی زندہ مثال کوئٹہ سے تعلق رکھنے والے دنیا گروپ آف نیوز پیپرز کی ہے، جو گذشتہ 15 سالوں سے مسلسل صوبائی، قومی اور بین الاقوامی مسائل کی موثر نمائندگی کررہا ہے اور بلوچستان کا ایک موقر اخبار شمار ہوتا ہے، لیکن آج دنیا گروپ آف نیوزپیپرز سرکاری اہلکاروں کی ملی بھگت سے انتقامی کاروائی کا شکار ہے۔

اِس تمام قضیئے کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اپنے حق پر ڈاکہ ڈالنے کےخلاف اِس ادارے نے 6 مارچ کومعزز عدلیہ سے رجوع کرتے ہوئے بلوچستان ہائیکورٹ میں دو آئینی رٹ پٹیشنز بھی دائر کررکھی ہیں جو ابھی زیر سماعت ہیں، مگر عدالتی

کاروائی سے قبل ہی (پنجاب سے تعلق رکھنے والے ایک نجی ٹی وی کے مالک جو روزنامہ دنیا"کی غیر قانونی این او سیز اور ڈیکلریشنز حاصل کرچکا ہے) نے مقامی انتظامیہ کی" ملی بھگت سے دنیا گروپ آف نیوزپیپرز کو انتقامی کاروائی کا نشانہ بنانا شروع کردیا ہے اور سرکاری اشتہارات میں کمی و بندش جیسے غیر جمہوری و فسطائی ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کردیئے ہیں،اِس ملی بھگت میں بالادست و بااثر لابی کے ساتھ محکمہ تعلقات عامہ بلوچستان کے قائم مقام ڈائریکٹر اور افسران بھی شامل ہیں، قارئین محترم !دنیا گروپ آف نیوز پیپرز کے خلاف اِس ظالمانہ کاروائی کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہِ اس ادارے کو معاشی نقصان پہنچا کر اپنے حقوق کیلئے دائر آئینی درخواست کو واپس لینے پر مجبور کیا جاسکے، جبکہ سرکاری اشتہارات جاری کرنے کی غیر منصفانہ پالیسی کے باعث متعدد اخبارات بالخصوص بلوچستان کے بہت سے اخبارات پہلے ہی بند ہونے کے قریب پہنچ چکے ہیں، جس کی وجہ سے پرنٹ میڈیا کی مالی مشکلات میں اضافہ ہو رہا ہے اور سینکڑوں صحافی اور اخباری کارکنان کے بیروزگار ہونے کے خدشات پیدا ہو رہے ہیں، لیکن آج ایک بار پھر اِن بالادست طاقتوں نے وہی اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرکے کوئٹہ سے شائع ہونے والے اخبار روزنامہ دنیا پر قبضہ جمانے کی کوششیں شروع کردی ہے،اِن بااثر افراد کی خواہش ہے کہ جس طرح اُنھوں نے بلوچستان کے مظلوم عوام کی آواز کو دبایا ہوا ہے، بالکل اُسی طرح یہاں سے شائع ہونے والے ہر اُس اخبار کو بند کروا دیا جائے جو حق و سچ کا

علمبردار اور سچائی کا آئینہ دکھاتا ہے۔
قارئین محترم ! ہم سمجھتے ہیں کہ کسی بھی معاشرے میں میڈیا کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ جس معاشرے میں آزادی صحافت پر پابندیاں لگائی جاتی ہے، حق و سچ کا گلا گھونٹا جاتا ہے اور جھوٹ کو پروان چڑھایا جاتا ہے، وہ معاشرہ کبھی بھی ترقی و خوشحالی کی منازل طے نہیں کرپاتا،اس تناظر میں الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا ایک ایسے شفاف آئینے کی مانند ہے جس میں حکمران وقت اور بیوروکریسی اپنے کارکردگی کا جائزہ لے سکتی ہے اور اُسے بہتر بناکر قومی و ملی خدمت انجام دے سکتی ہے،دوسری طرف آج کے دور جدید میں ساری دنیااِس بات کی قائل ہے کہ میڈیا کی آزادی کے بغیر قومی ترقی اور سماجی انصاف کی فراہمی کا خواب کبھی بھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا،لیکن ہماری اِس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہوگی کہ پاکستان میں آزادی اظہار کے تحفظ کے دعویدار ہی بااثر افراد کے ساتھ مل کر آزاد میڈیا کی راہ میں رکاوٹیں کھڑے کریں اور "میڈیا قبضہ گروپ مافیا" کے ساتھ مل کر عوام کی آواز کو دبانے کی سازشوں میں مصروف نظر آئیں، درحقیقت یہ وہ قوتیں ہیں جو اسٹیبلیشمنٹ کی چھتری تلے اپنے غلط، ناجائز اور نا مناسب عمل کو طاقت اور پیسے کے بل بوتے پر جائز رنگ دینا چاہتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ روزنامہ دنیا کوئٹہ گزشتہ پندرہ سالوں سے باقاعدگی سے کوئٹہ سے شائع ہونے والا ایک کثیر الاشاعت اخبار ہے، جس سے نہ صرف کوئٹہ بلکہ کراچی، اسلام آباد، لاہور، پشاور میں بھی سینکڑوں کارکن صحافی حضرات وابستہ اور اپنی روزی روٹی کمارہے ہیں اور یہ اخبار این او سی، ڈیکلریشن سمیت پریس آرڈیننس کے تمام قانونی تقاضے پورے کرتا ہے، دوسری طرف پریس آرڈیننس کے مطابق محکمہ اطلاعات اِس بات کا پابند ہے کہ وہ پہلے سے رجسٹرڈ مذکورہ نام یا اِس سے ملتے جلتے ناموں سے کسی فرد یا ادارے کو این او سی جاری نہیں کر سکتا، لیکن اِس کے باجود "دنیا" کے نام سے پنجاب کے نجی چینل کو این او سی جاری کر دیا گیا، جس کے خلاف "دنیا گروپ آف نیوز پیپرز" کی انتظامیہ بلوچستان ہائیکورٹ سے رجوع کر چکی ہے اور دائر کردہ پٹیشن ابھی زیر سماعت ہے، لیکن اِس کے باوجود نام نہاد میڈیا کے آزادی کے دعویداروں کی جانب سے صوبہ بلوچستان کی موثر و توانا آواز کو دبانے کی بھرپور کوششیں کی جارہی ہیں، یہ سازشی عناصر چاہتے ہیں کہ روزنامہ "دنیا" کو ملنے والے سرکاری اشتہارات بند کرکے ادارے کو معاشی مشکلات اور تباہی سے دوچار کر دیا جائے اور اُسے اِس حد تک مجبور و بے دست وپا کر دیا جائے کہ وہ ہائیکورٹ میں دائر اپنی پٹیشن سے دستبردار ہوجائے، ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا گروپ آف نیوز پیپرز کا کیس عدالت میں زیر سماعت ہونے کی وجہ سے محکمہ تعلقات عامہ کی جانب سے اشتہارات میں کمی، بندش اور دیگر انتقامی کاروائیاں توہین عدالت کے زمرے میں آتی ہیں اور

تاثر کی تصدیق کرتی ہیں کہ ان عناصر نے عدالتی فیصلوں، آئین و قانون کو نہ ماننے کی قسم کھائی ہوئی ہے۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ بلوچستان کے عوام، صحافی اور اخبارات پہلے سے ہی ارباب اقتدار کی جانب سے بری طرح نظر انداز کئے گئے ہیں اور اب استعماری قوتیں بلوچستان کی زبان بھی کاٹنے کی تیاری کر رہی ہیں، وہ چاہتی ہیں کہ بلوچستان میں جمہوریت کے چوتھے ستون پریس کی آزادی کا گلا گھونٹ دیا جائے۔اس تناظر میں روزنامہ دنیا پر قبضہ گیری اور اس کی انتظامیہ کو مشکلات سے دوچار کرنے کی پالیسی بلوچستان کے مظلوم عوام کے ساتھ نہ صرف کھلی دشمنی، بلکہ کسی اخبار کے مقررہ اشتہار کو کم کرنا یا اُس پر پابندی لگانا اُس ادارے کے معاشی قتل اور بنیادی حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کے بھی مترادف ہے، لہٰذا ہم جناب چیف جسٹس بلوچستان ہائیکورٹ، گورنر بلوچستان، وزیر اعلیٰ اور چیف سیکرٹری بلوچستان سے پر زور اپیل کرتے ہیں کہ وہ اِس ناانصافی کا نوٹس لیتے ہوئے اِس ادارے کے معاشی قتل کی سازش میں ملوث افراد کیخلاف کارروائی کا حکم دیکر "دنیا گروپ آف نیوز پیپرز" کی انتظامیہ اور ملازمین کو فوری انصاف مہیا کریں۔

ہماری وفاقی حکومت اور وفاقی وزیر اطلاعات سے بھی گزارش ہے کہ وہ اس بات کا

سنجیدگی سے نوٹس لیں اور آزادی صحافت کے اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے اِس راہ میں حائل رکاوٹوں کو فوری دور کرنے کے احکامات جاری کریں، ہم چیف جسٹس سپریم کورٹ سے بھی اپیل کرتے ہیں کہ وہ اِس معاملے کا فوری نوٹس لیتے ہوئے پریس آرڈیننس کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف سخت کاروائی کی ہدایات جاری کریں، مذکورہ چینل کے مالک کی جانب سے اثر رسوخ استعمال کرکے این او سی حاصل کرنے کی مکمل تحقیقات کا حکم دیں اور آزادی صحافت کے دشمن اِس قبیح عمل میں ملوث افراد کے خلاف سخت تادیبی کاروائی کا حکم جاری کریں، ساتھ ہی ہم متعلقہ اداروں سے بھی گزارش کرتے ہیں کہ چونکہ "دنیا گروپ آف نیوز پیپرز" کی انتظامیہ کی جانب سے پٹیشن بلوچستان ہائیکورٹ میں زیر سماعت ہے، لہٰذا تاحکم ثانی پنجاب کے نجی چینل کے مالک کو اثر ورسوخ استعمال کرنے اور صوبائی انتظامیہ کی ملی بھگت سے مذکورہ ادارے کو مالی مشکلات کا شکار کرکے انصاف کا گلاگھونٹنے جیسے عمل سے باز رکھا جائے ہم سمجھتے ہیں یہ اقدام نہ صرف تمام جمہوری اصولوں کے منافی بلکہ آزادی صحافت، حکمران اتحاد کے منشور اور میثاقِ جمہوریت کے بھی منافی ہے ہماری نظر میں پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا کو دباؤ میں لانا جمہوریت کو کمزور کرنے کے مترادف ہے، لہٰذا ہماری ملک کی تمام صحافتی تنظیموں اور انجمنوں سے گزارش ہے کہ وہ "دنیا گروپ آف نیوز پیپرز" کا اِس مشکل وقت میں ساتھ دیں اور صحافت دشمن عناصر کی منفی سرگرمیوں کو بے نقاب کرنے میں اپنا مثبت کردار ادا کریں تاکہ روزنامہ دنیا کوئٹہ کے خلاف

ہونے والے ظلم کا سدباب ہو سکے۔

وہ جنگ جو آج بھی جاری ہے۔۔۔

ہم آپ کو 1169ء کی کہانی سنا رہے ہیں، یہ وہ وقت تھا جب عیسائی بادشاہ آگسٹس سلطان نور الدین زنگی کے ہاتھوں ذلت ناک شکست کھا کر تمام مفتوحہ علاقے واپس کر چکا تھا،اُس نے نور الدین زنگی کو تاوان بھی دیا اور جنگ نہ کرنے کے معاہدے پر دستخط کرکے جزیہ بھی ادا کیا، لیکن اِس شکست کے بعد اُس نے کرک کے قلعے میں اسلام کی بیخ کنی کے منصوبے بنانے شروع کردیئے،اُس کے اسلام دشمن خبطی رویئے اور خفیہ چالوں کی وجہ سے اُس کے بعض حواری صلیبی حکمران اور جرنیل اُسے شک و شبے کی نگاہ سے دیکھتے تھے،یہی وجہ تھی کہ اُس کے اپنے ساتھیوں نے اُس پر یہ الزام بھی عائد کیا کہ وہ اندر سے مسلمانوں کا دوست ہے اور اُن کے ساتھ سودے بازی کررہا ہے،یورپی مورخ اندرے آزون لکھتا ہے کہ ایسے ہی ایک موقع پر آگسٹس نے الزام کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا"ایک مسلمان حکمران کو پھانسنے کیلئے میں اپنی کنواری بیٹیوں کو بھی اُس کے حوالے کرنے سے گریز نہیں کروں گا،تم مسلمانوں کے ساتھ صلح نامے اور دوستی کے معاہدے کرنے سے گھبراتے ہو کیونکہ اُس میں تم اپنی توہین کا پہلو دیکھتے ہو،لیکن تم یہ نہیں سوچتے کہ مسلمان کو میدان جنگ کی نسبت صلح کے میدان میں مارنا زیادہ آسان ہے، میرا نظریہ یہ ہے کہ ضرورت پڑنے پر اُن کے آگے ہتھیار ڈال کر صلح نامہ کرو،معاہدہ کرو اور

گھرآ کر معاہدے اور صلح نامے کے الٹ عمل کرو۔کیا میں ایسا نہیں کر رہا؟ کیا تم نہیں جانتے کہ میرے خون کے رشتے کی دو لڑکیاں دمشق کے شیخ کے حرم میں ہیں، کیا اُس شیخ سے تم لڑے بغیر بہت سارا علاقہ نہیں لے چکے ؟ وہ مجھے اپنا دوست سمجھتا ہے اور میں اُس کا جانی دشمن ہوں، میں ہر ایک غیر مسلم سے کہوں گا کہ مسلمانوں کے ساتھ معاہدے کرو اور انہیں دھوکہ دے کر مارو۔"

مورخین نے یہاں تک لکھا کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ بعض صلیبی حکمرانوں نے میدان جنگ کو اہمیت دینا چھوڑ دی اور وہ اِس نظریئے کی قائل ہوگئے کہ جنگ اِس طریقے سے لڑو کہ مسلمانوں کی جنگی طاقت زائل ہوتی رہے۔اُن کے نزدیک عقلمندی کا تقاضہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے مذہبی عقائد پر زور دار حملہ کرو۔اُن کے دلوں میں ایسے وہم پیدا کر دو جو مسلمان قوم اور فوج کے درمیان بداعتمادی، نفرت اور حقارت کو جنم دیں، فلپس آگسٹس اِس مکتبہ فکر کے مفکروں میں سرفہرست تھا، جو اسلام دشمنی کو اپنے مذہب کا بنیادی اصول سمجھتا تھا اور کہا کرتا تھا ہماری جنگ صلاح الدین ایوبی اور نور الدین زنگی سے نہیں، یہ صلیب اور اسلام کی جنگ ہے جو ہماری زندگی میں نہیں تو کسی نہ کسی وقت ضرور کامیاب ہوگی۔بس اِس کیلئے ضروری ہے مسلمانوں کی اٹھتی ہوئی نسل کے ذہن میں مذہب کے بجائے جنسیت بھر دو اور انہیں ذہنی عیاشی میں مبتلا کر دو۔

ہمیں تاریخ کا وہ منظر بھی یاد آرہا ہے، جب جولائی 1187ء کو حطین کے میدان میں سات صلیبی حکمرانوں کی متحدہ فوج کو جو مکہ اور مدینے پر قبضہ کرنے آئی تھی، ایوبی سپاہ نے عبرتناک شکست دے کر مکہ اور مدینہ کی جانب بری نظر سے دیکھنے کا انتقام لے لیا تھا اور اب وہ حطین سے پچیس میل دور عکرہ پر حملہ آور تھا، سلطان نے یہ فیصلہ اِس لیے کیا تھا کہ عکرہ صلیبیوں کا مکہ تھا، سلطان اُسے تہہ تیغ کرکے مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی کا انتقام لینا چاہتا تھا، دوسرے بیت المقدس سے پہلے سلطان عکرہ پر اِس لیے بھی قبضہ چاہتا تھا کہ صلیبیوں کے حوصلے پست ہوجائیں گے اور وہ جلد ہتھیار ڈال دیں، چنانچہ اُس نے مضبوط دفاع کے باوجود عکرہ پر حملہ کردیا اور 8 جولائی 1187ء کو عکرہ ایوبی افواج کے قبضے میں تھا، اِس معرکے میں صلیبی انٹیلیجنس کا سربراہ ہرمن بھی گرفتار ہوا، جسے فرار ہوتے ہوئے ایک کماندار نے گرفتار کیا تھا، گرفتاری کے وقت ہرمن نے کماندار کو خوبصورت لڑکیوں اور بہت سے سونا دے کر فرار کرانے پیش کش کی تھی، مگر کماندار نے اُسے رد کردیا، ہرمن کو جب سلطان صلاح الدین ایوبی کے سامنے پیش کیا گیا تو اُس نے گرفتار کرنے والے کماندار کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے سلطان سے کہا" سلطان معظم ! اگر آپ کے تمام کماندار اِس کردار کے ہیں جو مجھے پکڑ کر لایا ہے تو میں آپ کو یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ آپ کو بڑی سے بڑی فوج بھی یہاں سے نہیں نکال سکتی، اُس نے کہا، میری نظر انسانی فطرت کی کمزوریوں پر رہتی ہے، میں نے آپ کے خلاف یہی ہتھیار استعمال

کیا، میرا ماننا ہے کہ جب یہ کمزوریاں کسی جرنیل میں پیدا ہو جاتی ہیں یا پیدا کر دی جاتی ہیں تو شکست اُس کے ماتھے پر لکھ دی جاتی ہے ۔ میں نے آپ کے یہاں جتنے بھی غدار پیدا کیے، اُن میں سب سے پہلے یہی کمزوریاں پیدا کیں، حکومت کرنے کا نشہ انسانوں کو لے ڈوبتا ہے، سلطان معظم !آپ کے جاسوسی کا نظام نہایت ہی کار گر ہے ،آپ صحیح وقت اور صحیح مقام پر ضرب لگاتے ہیں، مگر میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ صرف آپ کی زندگی تک ہے، ہم نے آپ کے یہاں جو بیج بو دیا ہے ، وہ ضائع نہیں ہوگا،آپ چونکہ ایمان والے ہیں اِس لیے آپ نے بے دین عناصر کو دبا لیا، لیکن ہم نے آپ کے امراء کے دلوں میں حکومت، دولت ، لذت اور عورت کا نشہ بھر دیا ہے،آپ کے جانشین اِس نشے کو اتار نہیں سکیں گے اور میرے جانشین اِس نشے کو تیز کرتے رہیں گے۔

سلطان معظم ! یہ جنگ جو ہم لڑ رہے ہیں ، یہ میری اور آپ کی ،یا ہمارے بادشاہوں کی اور آپ کی جنگ نہیں، یہ کلیسا اور کعبہ کی جنگ ہے، جو ہمارے مرنے کے بعد بھی جاری رہے گی،اب ہم میدان جنگ میں نہیں لڑیں گے،ہم کوئی ملک فتح نہیں کریں گے، ہم مسلمانوں کے دل و دماغ کو فتح کریں گے، ہم مسلمانوں کے مذہبی عقائد کا محاصرہ کریں گے، ہماری لڑکیاں، ہماری دولت، ہماری تہذیب کی کشش جسے آپ بے حیائی کہتے ہیں،اسلام کی دیواروں میں شگاف ڈالے گی، پھر مسلمان اپنی تہذیب سے نفرت اور یورپ کے طور طریقوں سے محبت کریں گے، سلطان معظم ! وہ

”وقت آپ نہیں دیکھیں گے ، میں نہیں دیکھوں گا، ہماری روحیں دیکھیں گی۔

سلطان صلاح الدین ایوبی، جرمن نژاد ہرمن کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا، ہرمن کہہ رہا تھا، ”سلطان معظم !آپ کو معلوم ہے کہ ہم نے عرب کو کیوں میدان جنگ بنایا ؟ صرف اِس لیے کہ ساری دنیا کے مسلمان اِس خطے کی طرف منہ کرکے عبادت کرتے ہیں اور یہاں مسلمانوں کا کعبہ ہے، ہم مسلمانوں کے اِس مرکز کو ختم کر رہے ہیں، آپ آج بیت المقدس کو ہمارے قبضے سے چھڑالیں گے ، لیکن جب آپ دنیا سے اٹھ جائیں گے، مسجد اقصیٰ پھر ہماری عبادت گاہ بن جائے گی، میں جو پیشین گوئی کررہا ہوں یہ اپنی اور آپ کی قوم کی فطرت کو بڑی غور سے دیکھ کر کررہا ہوں، ہم آپ کی قوم کو، ریاستوں اور ملکوں میں تقسیم کرکے انہیں ایک دوسرے کا دشمن بنادیں گے اور فلسطین کا نام ونشان نہیں رہے گا، یہودیوں نے آپ کی قوم کے لڑکوں اور لڑکیوں میں لذت پرستی کا بیج بونا شروع کردیا ہے،اِن میں سے اب کوئی نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی پیدا نہیں ہوگا۔“

قارئین محترم ! یہ تھی وہ صلیبی ذہنیت جو کل بھی ملت اسلامیہ کی جڑوں کو چاٹ رہی تھی اور آج بھی یہ دیمک ہماری اساس وبنیاد کو کھوکھلا کررہی ہے، یہ دونوں تاریخی واقعات ہمارے ماضی، حال اور آنے والے مستقبل کے بہترین عکاس

اور کسی تبصرے کے محتاج نہیں، کیونکہ اِس میں ہماری موجودہ شکست و ریخت اور ذلت و رسوائی کے تمام اسباب و عوامل کی واضح نشاندہی موجود ہے، تقریباً ساڑھے آٹھ سو سال قبل فلپس آگسٹس اور عیسائی جاسوس ہرمن نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنے جن مذموم عزائم کا اظہار کیا تھا،آج ملت اسلامیہ اُس میں بری طرح گھری نظر آتی ہے، کلیسا اور کعبہ کی جنگ آج بھی جاری ہے، فرق صرف یہ ہے کہ جنگ کا لیبل اور ہتھیار بدل گئے ہیں، جس طرح کل پورا عالم کفر صلاح الدین ایوبی کے خلاف صف آراء تھا، بالکل اُسی طرح یہ آج پاکستان اور عالم اسلام کے خلاف متحد و منظم ہیں، یہ صلیبی جنگوں کی وہ کہانی ہے جو کہ مرحلہ در مرحلہ اب بھی جاری ہے، صلیبی حکمران عسکری سالار، سپاہی اور کلیسا کسی مرحلے پر اِس جنگ کو نہیں بھولے، مگر افسوس ہم، بھول گئے اور آج اسی بھول نے ہمیں تباہی و بربادی کے دہانے پر پہنچادیا ہے، سچ کہا ہے کسی نے کہ بد بختی کا مقابلہ تو کیا جاسکتا ہے لیکن اپنی کوتاہیوں اور غلط کاریوں کا نہیں۔

☆☆☆☆☆

نوٹ :۔اس مضمون کی تیاری میں مشہور کتاب "داستان ایمان فروشوں کی" سے مدد لی گئی ہے

! یہی تو لائق تعزیز جرم ہے ــــــ

عذاب الٰہی سے ڈرانے کے مجرم۔۔۔۔۔

سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور حکومت کی بات ہے کہ ایک رات
مدینہ منورہ ایک تاریک گلی میں دو دوست آپس میں باتیں کرتے ہوئے جارہے
تھے۔ایک نے دوسرے سے کہا، میں سمجھتا ہوں، خلیفۃ المسلمین نے خالد بن ولید کو
سپہ سالاری سے معزول کرکے اچھا نہیں کیا۔ دوسرے دوست نے پہلے کی رائے سے
اتفاق کرتے ہوئے جواب دیا ، ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔انہیں معلوم نہیں تھا کہ اِن
کے پیچھے سیدنا عمر فاروق بھی آرہے ہیں، آپ نے دونوں دوستوں کی باتیں سن لیں
اور آواز بدل کر اُن سے پوچھا، تو پھر تمہارے خیال میں اب عمر کے ساتھ کیا سلوک
کرنا چاہیے۔؟دونوں دوستوں نے بلا کسی توقف جواب دیا، عمر سے کیا سلوک کرنا؟
کیا مطلب ؟ ارے بھائی ! وہ امیرالمومنین ہیں، ہم بات تو انہی کی مانیں گے، یہ تو ہماری
زاتی رائے ہے، یہ سن کر سیدنا عمر فاروق آگے بڑھے، اپنا تعارف کروایا اور اُن سے
کہا، میں اللہ ربّ العزت کا شکرادا کرتا ہوں، جس نے مجھے تم جیسے ساتھی عطا
کیے، آپ نے فرمایا" جب تک تم جیسے لوگ موجود ہیں مسلمان شکست نہیں کھا سکتے۔"

تاریخ بتاتی ہے کہ سیدنا عمر فاروق نے حضرت خالد بن ولید کو رومیوں سے جنگ کے موقع پر عین اُس وقت فوج کی سپہ سالاری سے معزول کر دیا تھا جب آپ میدان جنگ میں دشمنان اسلام سے برسرپیکار تھے اوراُس وقت آپ کی شہرت بام عروج پر تھی،آپ ہر معرکے میں کامیابی وکامرانی کے جھنڈے گاڑتے چلے جارہے تھے،اُن کی اِس کامیابی کو دیکھ کر عوام الناس میں یہ تاثر قوی ہوتا جارہا تھا کہ ہر معرکے میں مسلمانوں کو کامیابی حضرت خالد بن ولید کی وجہ سے حاصل ہورہی ہے،چنانچہ اِس خیال کو رد اور اِس تاثر کا زائل کرنے اور اِس بات کو ثابت کرنے کیلئے کہ کامیابی وکامرانی عطا کرنے والی ذات صرف اور صرف اللہ ربّ العزت کی ہے،اُسی کی مدد و نصرت فتح وکامیابی کا موجب بنتی ہے،سیدنا عمر فاروق نے حضرت خالد بن ولید کو فوج کی سپہ سالاری سے معزول کرکے لشکر اسلام کی قیادت حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کو سونپ دی اور حضرت خالد بن ولید کو ان کا نائب بنادیا تھا،جس کی وجہ سے آپ کے اِس فیصلے پر عوام میں اختلاف رائے پایا گیا،مگراِس کے باوجود نہ صرف لوگوں نے بلکہ خود حضرت خالد بن ولید نے فیصلے پر عمل کرکے ثابت کردیا کہ نیک و صالح حکمرانوں کے فیصلے اختلاف رائے رکھنے کے باوجود قابل عمل ہوتے ہیں اور اُن میں مملکت اور قوم کی بہتری کا راز پوشیدہ ہوتا ہے۔

یہ واقعہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ مومنانہ بصیرت رکھنے والے حکمران اِس اختلاف رائے پر برا نہیں مانتے اور نہ اِسے اپنی عزت نفس، اَنا اور استحقاق کو مسئلہ بناتے ہیں، بلکہ مثبت اختلاف رائے پر تعریف و تحسین فرماتے ہیں اور اللہ کریم کا شکرادا کرتے ہیں کہ اُس نے اُن کی قوم میں ایسے جرات مند اور بہادر لوگ پیدا کیے جو حاکم وقت کے سامنے کلمہ حق کہنے اور اُسے احتساب کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کی ہمت رکھتے تھے۔ ہماری تاریخ ایسے بے شمار واقعات سے مزین ہے، درحقیقت یہ اختلاف رائے کی وہ مثبت اور صحت مند صورت تھی جو معاشرے کو درست راہ پر گامزن رکھنے میں ایک اہم کردار ادا کرتی تھی اور حکمران ہمہ وقت وقت کو اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی اور عوامی گرفت و احتساب کا احساس دلاتی رہتی تھی، مگر افسوس کہ آج اِس اسلامی وصف سے ہمارے حکمران عاری ہیں، حقیقت اور سچائی کے آئینے میں انہیں اپنا آپ اچھا نہیں لگتا، وہ اِس بات پر ناراض ہوجاتے ہیں کہ آپ کیوں اُن کی پالیسیوں پر حرف تنقید بلند کرتے ہیں، کیوں سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسائل سامنے لاتے ہیں، کیوں حکمران وقت کو اُن کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہیں اور کیوں اصلاح احوال کے مشورے دیتے ہیں، یہ باتیں مزاج شاہی پر بہت ناگوار گزرتی ہیں، چنانچہ اِس کی روک تھام ہمارے سرکاری اداروں کی اوّلین ذمہ داری قرار پاتی ہے۔

ایسے میں نواب شاہ سے تعلق رکھنے والے مولانا عبدالقدیر ڈیپر، عبدالوہاب بروہی اور عزیز احمد بھٹی کی ہمت تو دیکھئے کہ انہوں نے جناب صدر کو خدا کے عذاب سے ڈرنے کی دھمکی دے ڈالی ،اُن کا یہ جرم یقینا لائق تعزیر ہے ، وہ یہ بھول بیٹھے کہ وہ کسی خلفاء راشد کے نہیں بلکہ زرداری دور میں جی رہے ہیں،جہاں ہر طرف مال و دولت کی فراوانی ہے، عیش و عشرت کی حکمرانی ہے،امن و سکون اور سلامتی و خوشحالی کا دور دورہ ہے، دور دور تک بھوک ، غربت ،افلاس اور بے روزگاری کا نام و نشان نہیں اور شیر بکری ایک گھاٹ پانی پی رہے ہے، بھلا ایسے تاریخ ساز سنہری دور میں ایک مولوی اور اُس کے چند ساتھیوں کی یہ جرات اور اتنی ہمت کہ وہ جناب صدر کو خدا کے عذاب سے ڈرنے جیسی سنگین دھمکی دے ڈالے، یہ تو جرم عظیم ہے ، لہٰذا اِن حضرات کو ایوان صدر کی شکایت پر نوابشاہ ایئر پورٹ پولیس نے اصلاحی خط بھیجنے کے الزام میں مقدمہ درج کرکے جیل بھیج دیا، گرفتار ملزمان کا کہنا ہے کہ انہوں نے دھمکی آمیز خط نہیں لکھا بلکہ اصلاحی خط لکھا تھا جس میں صدر کو نصیحت کی گئی تھی، ہمارا ماننا ہے کہ کسی نظام یا سسٹم سے وابستہ رہتے ہوئے اُس سے اختلاف رکھنا، یا اختلاف رکھتے ہوئے بھی اُس سے وابستہ رہنا اور اُس کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کرتے رہنا، یقینا ایک ایسی خوبصورت روایت ہے جو اسلامی معاشرے کا لازمی جزو رہی ہے، جبکہ کسی سسٹم سے اختلاف کی اجازت نہ دینا یا اختلاف رائے رکھنے کو قابل تعزیر جرم سمجھنا فرعونیت اور چنگیزیت کی علامت ہیں، جن

قوموں، معاشروں اوراداروں میں یہ بات رواج پا جائے، وہاں بدترین قسم کی منافقت جنم لیتی ہے جو غیبت اور چغلی سے ہوتی ہوئی حسد، کینے اور بغض و عناد کے رذیل درجے تک پہنچ کر ایسی سازشوں کو جنم دیتی ہے جس سے نہ صرف افراد کے کردار و عمل داغدار ہوتے ہیں بلکہ ادارے، معاشرے اور قومیں بھی روبہ زوال ہو کر انحطاط کا شکار ہوجاتی ہیں۔

یہی وہ نقصان تھا جس سے معاشرے اور افراد کو بچانے کیلئے پیغمبر انقلاب خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اختلاف رائے کی اجازت دی بلکہ متعدد موقعوں پر بہ نفس نفیس خود اِس کی حوصلہ افزائی بھی فرمائی۔ تجربہ کہتا ہے کہ جس معاشرے میں عقل و رائے پر پہرے بٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے وہاں تعمیر کے بجائے تخریب جنم لیتی ہے ۔اگر اظہار رائے کے مثبت راستے بند کر دیئے جائیں گے تو پھر یہ منفی راہیں تلاش کرتی ہے۔اِس لیے جو معاشرے، ادارے اور قومیں ترقی کے خواہاں ہوتی ہیں وہ ہمیشہ اختلاف رائے کی نہ صرف قدر کرتی ہیں بلکہ اِس کو پروان چڑھانے کی سعی بھی کرتی ہیں۔اسلام میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے بعد صرف اور صرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ ایسی ذات ہے جس کی غیر مشروط اطاعت کا حکم ملتا ہے۔اب پیغمبر اسلام کے حکم کے منشاء کے سمجھنے میں تو اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی اطاعت میں کسی اختلاف وتاویل کی قطعاً کوئی

گنجائش نہیں ہے، یہاں خیال رہے کہ عزت، قدر و منزلت اور اطاعت و محبت کے
حوالے سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ مسلم معاشرے میں ایک ایسا
منفرد مقام رکھتی ہے کہ جس کا تقابل کسی بھی زمانے کے سیاسی قائد، لیڈر اور حکمران
سے نہیں کیا جاسکتا، مگر اِس اعلیٰ رتبہ و مقام کے باوجود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم
نے نہ صرف لوگوں سے رائے طلب کی بلکہ بعض مواقع پر اپنی رائے کے برخلاف اُن
کی رائے پر عمل بھی کیا اور بعض تہذیبی اور نجی معاملات میں لوگوں کو یہ آزادی بھی
دی کہ وہ چاہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورے پر عمل کریں اور چاہیں تو نہ
کریں۔

یہی وہ بنیادی وجہ تھی کہ اسلامی معاشرے میں یہ بات کبھی مسئلہ نہیں بنی تھی کہ حدود
اور آداب کی رعایت کرتے ہوئے اولاد، والدین سے اختلاف کرسکتی ہے یا دلیل کی
بنیاد پر شاگرد استاد سے اختلاف کرسکتا ہے یا مرید پیر سے اور رعایا حاکم سے اختلاف
کرسکتی ہے، ہماری تاریخ میں اِس بات پر تو تنقید یا بحث مل جاتی ہے کہ اختلاف کرتے
ہوئے آداب کا خیال نہیں رکھا گیا یا حفظ مراتب کو نظرانداز کردیا گیا، لیکن یہ کبھی
نہیں کہا گیا کہ اختلاف رائے کیوں کیا گیا، اسلامی تہذیب میں جس طرح حفظ مراتب کو
ایک بنیادی قدر کی حیثیت حاصل ہے اسی طرح اختلاف رائے اور اظہار رائے کی
آزادی کو بھی اہم حیثیت کی حامل رہی ہے، رہا سوال یہ کہ اختلاف رائے کیوں کیا گیا،
مسلمان

معاشروں میں بہت بعد کی پیداوار ہے۔ اِس کا نہ اللہ اور رسول کے حکم سے کوئی تعلق ہے اور نہ اہل علم کی روایات سے۔ بدقسمتی سے آج یہ روش روش ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی اور ہم نے ذات، مرتبہ و مقام اور اعلیٰ سوسائٹی کے بت تراش کر اُن کو اتنا مقدس بنا لیا کہ اُن سے اختلاف کی گنجائش کو ہی ختم کر ڈالا۔

لہٰذا اِس رویے نے اسلامی تہذیب و تمدن اور معاشرے میں انسانوں کو عقل کل اور دیوتا بنانے کی رسمِ قبیح کو پروان چڑھایا۔ بدقسمتی سے اب یہ صورت حالات ہو گئی ہے کہ مسلم معاشروں میں جگہ جگہ قائم مذہبی، سیاسی، معاشی، علمی اور عملی دیوتاؤں کو اپنا مفاد اسی میں نظر آتا ہے کہ اختلاف رائے کو ادب، محبت اور عشق کے نام پر غیر اسلامی باور کرایا جائے تاکہ اُن کی دیوتائی حیثیت بھی قائم رہے اور کاروبار گلشن بھی چلتا رہے۔ اِن حالات میں ہر وہ مسلمان جو اللہ کی رضا کا طالب، آخرت کی کامیابی اور مسلم معاشروں اور اداروں کی ترقی کا خواہاں ہو، اُس پر لازم ہے کہ وہ جہاں بھی ہو، اپنی حیثیت و بساط کے مطابق اِس بات کو عام کرے کہ آداب کی رعایت کرتے ہوئے اپنا اپنا فریضہ سرانجام دیتا رہے، کیونکہ اختلاف رائے نہ صرف اسلامی تہذیب کے ماتھے کا جھومر بلکہ اللہ اور اُس کے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ بس اتنا خیال رہے کہ اِس پیغام کو عام کرنے میں تہذیب و شا

لسنگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔

ایٹمی پاکستان سامراجی خطرات کی زد میں۔۔۔

یوم تکبیر 28 مئی کے حوالے سے خصوصی تحریر

ایٹمی پروگرام قومی افتخار اور ملکی بقاء کی ضمانت ہے۔۔۔۔

حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی زندگی میں بعض لمحات اتنے منفرد،اہم اور تاریخی ہوتے ہیں کہ اُن لمحوں کی اہمیت اور حیثیت کا مقابلہ کئی صدیاں بھی مل کر نہیں کرسکتیں، یہ منفرد و قیمتی لمحات دراصل تاریخ کا وہ حساس موڑ ہوتے ہیں،جہاں کوئی قوم اپنے لیے عزت و وقار اور غرور و تمکنت یا ذلت و رسوائی اور غلامی و محکومی میں سے کسی ایک کا ایک راستے کا انتخاب کرتی ہے۔بزدل، ڈرپوک،ابن الوقت اور غلام ذہنیت کے لوگ اِن تاریخ ساز لمحات کی قدر و قیمت نہیں جانتے اور نہ ہی اُن کے دل و دماغ کسی چیلنج کو قبول کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں، نتیجتاً ایسی اقوام شاہراہ حیات پر دوسری اقوام سے پیچھے رہ جاتی ہیں اور پھراِن اقوام کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب یہ قومیں ماضی کی گرد میں کھو کر قصہ پارینہ بن کر تاریخ کی بوسیدہ کتابوں کا حصہ بن جاتی ہیں، لیکن اِس کے برعکس جرات مند اور بہادر لوگ تاریخ کے ان نازک لمحات میں ہوش مندی اور دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے ایسے تاریخی فیصلے

کرتے ہیں، جو قومی زندگی کی بقاء، سلامتی واستحکام اور تحفظ کیلئے لازم وملزوم ہوتے ہیں، 14 اگست 1947ء کی یوم آزادی کے بعد 28 مئی 1998ء کا دن اور سہ پہر 3:20 منٹ کا وقت پاکستان کی تاریخ کا وہ تاریخ ساز لمحہ ہے، جس کے احساس تفاخر نے پوری قوم اور عالم اسلام کے مسلمانوں کا سر غرور و سر فخر اور خوشی و استنباط سے بلند کر دیا، 28 مئی" یوم تکبیر" پاکستان کی تاریخ کا وہ دن ہے، جس دن پاکستان نے بلوچستان کے مقام" چاغی" کے پہاڑی سلسلے "راس کوہ" میں زیر زمین پانچ ایٹمی دھماکے کرکے عالم اسلام کی پہلی اور دنیا کی ساتویں ایٹمی قوت ہونے کا اعزاز حاصل کیا اور 11 مئی 1998 کو پوکھران میں 3 اور 13 مئی کو 2 ایٹمی دھماکوں کے بھارتی ایٹمی ایڈونچر کا دندان شکن جواب دے کر جنوب مشرقی ایشیاء میں ہندو بنیئے کے توسیع پسندانہ عزائم اور خطے میں جوہری بالادستی کے بھارتی منصوبے کو بھی خاک میں ملا دیا، اِس تاریخ ساز موقع پر اُس وقت کے وزیر اعظم میاں نواز شریف نے عوامی جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے قوم سے اپنے خطاب میں کہا کہ " الحمدللہ ہم نے گزشتہ دنوں کے بھارتی ایٹمی دھماکوں کا حساب 6 کامیاب ایٹمی دھماکوں سے چکا دیا ہے، اب ہم پر کوئی دشمن شب خون مارنے کی جرات نہیں کرسکے گا، کامیاب ایٹمی دھماکوں سے پاکستان کو دنیا کی ساتویں اور عالم اسلام کی پہلی ایٹمی قوت بننے کا اعزاز حاصل ہوگیا اور ایٹمی تجربات نے ملت اسلامیہ پر پانچ صدیوں سے طاری جمود توڑ کر اُس کو خواب خرگوش سے بیدار کردیا، انہوں نے کہا کہ پاکستان کا ایٹم بم ملت

اسلامیہ کی نہ صرف بلکہ اُس کے اتحاد کی علامت بھی ہے جو عہد رفتہ کی عظمت کو واپس لانے کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔"

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ 1947ء سے ہی پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد بھارت پاکستان کا دشمن بن گیا اور وہ ہر قیمت پر پاکستان کو ختم کرنے کے درپے رہا، دراصل یہود و ہنود یہ قطعاً نہیں چاہتے کہ کہ دنیا کے نقشے پر واقع ایک چھوٹا سا اسلامی ملک پاکستان دنیا میں عزت و وقار کے ساتھ زندہ رہے اور عالم اسلام کی قیادت کا فریضہ انجام دے، چنانچہ وہ ہمیشہ ہی مختلف حیلوں اور بہانوں سے پاکستان کے خلاف سازشوں میں مصروف رہے، بھارت کا ایٹمی پروگرام، امریکہ، روس اور دیگر ایٹمی طاقتوں سے جوہری معاہدے، جدید لڑاکا طیاروں اور، فوجی ساز و سامان کا حصول اور اسلحہ کے انبار، سب اسی سلسلے کی کڑی ہیں، 1960ء کے عشرے میں جب یہ خبریں آنی شروع ہوئیں کہ بھارت بڑی تیزی سے جوہری تجربات کی سمت بڑھ رہا ہے، اُس وقت کی ہماری سیاسی قیادت جوہری اسلحہ کے میدان میں قدم رکھنے کے حوالے سے مخمصے کا شکار تھی لیکن اُس وقت بھی ایوب کابینہ کے نوجوان وزیر ذوالفقار علی بھٹو کی دور اندیش نگاہوں سے بھارت کا ایٹمی پروگرام اور مستقبل کے جارحانہ عزائم پوشیدہ نہیں تھے، بھٹو بھارت کو مستقبل کی نیوکلیئر طاقت کے روپ میں دیکھ کر پاکستان کیلئے خطرہ محسوس کر رہے تھے اور اُن کی خواہش تھی کہ طاقت کے توازن

کو برابر کرنے کیلئے پاکستان کو بھی اپنا جوہری پروگرام شروع کرنا چاہیے، یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ اس مقصد کیلئے انہوں نے کابینہ میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ پاکستان کو جوہری اسلحہ کی تیاری کا پروگرام شروع کرنا چاہئے، لیکن ایوب خان اور اُن کے امریکہ نواز وزیر خزانہ محمد شعیب اور دیگر وزیروں نے بھٹو کی اِس تجویز یکسر مسترد کرتے ہوئے جوہری صلاحیت کے عدم حصول کا فیصلہ کیا۔1963ء میں جب صدر ایوب خان فرانس کے دورے پر گئے تو وہاں فرانسیسی صدر چارلس ڈی گال نے پاکستان میں جوہری ری پراسسنگ پلانٹ کی تعمیر کی پیش کش کی لیکن ایوب خان نے فرانس کی یہ پیشکش اُس وقت کے چیف آف آرمی اسٹاف جنرل یحیٰی خان، سائنسی مشیر ڈاکٹر عبدالسلام (قادیانی) اور منصوبہ بندی کمیشن کے نائب چیئرمین مرزا مظفر احمد قادیانی المعروف ایم ایم احمد (جو کہ کسی طور بھی پاکستان کو ایک مسلم ایٹمی طاقت کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتے تھے) کے مشورے پر ٹھکرا دی، لیکن یہ قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو ہی تھے جنھوں نے 1971ء میں پاکستان کے دولخت ہونے کے بعد باقی ماندہ پاکستان کا اقتدار سنبھالا اور پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کے لئے 1973ء میں جوہری صلاحیت کے حصول کا باقاعدہ پروگرام شروع کیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کا عزم تھا کہ "ہم گھاس کھالیں گے لیکن ایٹم بم ضرور بنائیں گے" یہ ذوالفقار علی بھٹو ہی کا کارنامہ تھا کہ جہاں ایک طرف انہوں

نے فرانسیسی حکومت کو جوہری ری پراسسنگ پلانٹ کی تعمیر کی پرانی پیشکش کی تجدید پر آمادہ کیا، وہیں انہوں نے پاکستان کے جوہری پروگرام کو درست سمت میں گامزن کرنے کیلئے جوہری توانائی کمیشن کے سربراہ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ سائنسی مشیر ڈاکٹر عبدالسلام (قادیانی) کو بھی برطرف کر دیا اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان جو کہ اُس وقت ہالینڈ میں مقیم تھے کو پاکستان بلواکر پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کی ذمہ داریاں سونپیں، بھٹو جس تیزی سے پاکستان کا جوہری پروگرام بڑھا رہے تھے وہ امریکہ اور صہیونی لابی کے نزدیک کسی طور بھی قابل قبول اور قابل معافی جرم نہ تھا، چنانچہ 1976ء میں امریکی وزیر خارجہ ہنری کیسنجر نے پاکستان کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو دھمکی دی کہ اگر تم نے ایٹمی ری پراسسنگ اور ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کے منصوبہ پر کام جاری رکھا تو ہم تمہیں مثال عبرت بنا دیں گے۔ لیکن قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو نے کیسنجر کی اس دھمکی کے باوجود پاکستان کا ایٹمی پروگرام جاری رکھا کیونکہ بھٹو کے نزدیک اُن کی جان سے زیادہ ملک و قوم کی سلامتی اور بقاء زیادہ اہمیت کی حامل تھی جو پہلے ہی بھارتی ایٹمی پروگرام کی وجہ سے شدید خطرے میں تھی، دوسری طرف بھٹو صاحب کے حکم پر عالمی شہرت یافتہ مایہ ناز ایٹمی سائنسدان اور پاکستان کی ایٹمی ٹیکنالوجی کے بانی و معمار ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے انتہائی ناسازگار حالات میں پاکستان کے جوہری پروگرام کا آغاز کیا، مشکل ترین حالات میں جوہری پروگرام کی تشکیل، تعمیر اور تکمیل کی

یہ داستان بھی اللہ تعالیٰ اور اُس کے حبیب کریم ﷺ ہی کے بے پایاں فضل و کرم کا ثمر ہے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی زیر نگرانی 1976ء میں پاکستان کے سائنس دانوں نے کہوٹہ لیباٹری میں یورینیم کی افزودگی کا کام شروع کیا اور 1982ء تک پاکستانی سائنسدان 90 فیصد افزودگی کی صلاحیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے ۔ بالآخر وہ دن بھی آیا جب قومی و ملی جذبوں سے سرشار ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور اُن کی پوری ٹیم کی اپنی انتھک محنت نے 28 مئی 1998ء کو بھارت کے پانچ ایٹمی دھماکوں کے جواب میں چھ کامیاب ایٹمی دھماکے کرکے نہ صرف وطن عزیز کو ناقابل تسخیر قلعہ بنادیا بلکہ وہ قوم اور مسلح افواج کے مورال کو بھی آسمان کی بلندیوں پر لے گئے اور پوری قوم کے اعصاب سے ہندو بنیئے کے خوف کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم کردیا۔ڈاکٹر عبدالقدیر اور اُن کی ٹیم کے اِس عظیم کارنامے کی بدولت آج 28 مئی 1998ء کا دن پاکستان کی تاریخ میں "تحفظ نظریہ پاکستان اور تکمیل دفاع پاکستان کی تاریخ کا دن" اور" یوم تکبیر" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

آج پاکستان کا جوہری پروگرام اور ایٹم بم جو کہ پورے عالم اسلام کا جوہری پروگرام اور ایٹم بم ہے کے خلاف بھارت ،اسرائیل ، امریکہ اور اس کے حواری سازشوں میں میں مصروف ہیں اور وہ پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کے گرد گھیرا تنگ کررہے ہیں،ان کی خواہش ہے کہ کسی طرح پاکستان کو جوہری صلاحیت سے محروم

کردیا جائے، آئے دن کوئی نہ کوئی فتنہ ساماں کہانی مغربی پریس کی زینت بنتی رہتی ہے، بے سروپا شوشے اڑائے جاتے ہیں کہ پاکستان ایک غیر ذمہ دار ملک ہے اور اس کے ایٹمی اثاثے کسی بھی وقت القاعدہ اور دوسرے انتہا پسند عناصر کے ہاتھ لگ سکتے ہیں،سب سے زیادہ ستم ظریفی کی بات ہے کہ جو ممالک پاکستان کے ایٹم بم پر "اسلامی بم" کی پھبتی کستے ہیں ،اِن کے نزدیک امریکہ،برطانیہ اور فرانس کے ایٹم بم "عیسائی بم" نہیں ہیں ،چین اور روس کے بم "کمیونسٹ بم" نہیں ہیں، بھارت کا ایٹم بم "ہندو بم نہیں ہے اور نہ ہی اسرائیل کا ایٹم بم "یہودی بم" ہے ،اس کھلے تضاد اور دو عملی کی" اصل وجہ یہ ہے کہ پاکستان کی ایٹمی صلاحیت روز اول سے بھارت جیسے دشمنوں اور امریکہ جیسے نام نہاد دوستوں کیلئے سوہان روح بنی رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ پاکستان بار بار امریکی پابندیوں اور مخالفانہ پروپیگنڈے کا شکار ہوا،جبکہ پاکستان کو دہشت گردوں کی نرسری اور ناکام ریاست قرار دینے کے امریکی بیانات بھی اسی سلسلے کی کڑی تھے تاکہ انتہا پسندوں کے قبضے کا شور مچا کر پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں پر کنٹرول حاصل کیا جاسکے،ماضی میں ڈاکٹر عبدالقدیر کے خلاف الزام تراشی بھی اسی حکمت عملی کا نتیجہ تھی اور اسلام آباد پر طالبان کی چڑھائی کا شور بھی اسی لئے مچایا گیا،دنیا کو یہ بھی تاثر دیا گیا کہ طالبان کی نظریں ہمارے ایٹمی اثاثوں پر ہے،جبکہ حال ہی میں امریکی حکومت نے ایک خصوصی فورس کی تشکیل اور پاک افغان سرحد پر اُس کی تعیناتی بھی صرف اس مقصد کیلئے

کی ہے کہ وقت ضرورت پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں کا کنٹرول حاصل کیا جاسکے، امریکہ اپنے علاقائی مفادات، اسلام مخالف عالمی ایجنڈے اور بھارت و اسرائیل کیلئے خطرہ تصور کرتے ہوئے پاکستان اورایران سمیت کسی بھی اسلامی ریاست کو ایٹمی صلاحیت کا حامل دیکھنا نہیں چاہتا، اس لئے وہ مختلف حیلوں بہانوں سے ہمارے ایٹمی پروگرام کو کیپ یا ختم کرنے کے درپے ہے، لہٰذااس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے، جبکہ دوسری طرف پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے خلاف امریکی پراپیگنڈے سے متاثر بعض نام نہاد دانشور جو یہ راگ الاپ رہے ہیں کہ پاکستان کو 1998ء میں ایٹمی تجربات کی ضرورت نہیں تھی، امریکی مرعوبیت اور بھارت نوازی پر مبنی سوچ کے حامل یہ افراد بھول رہے ہیں کہ اگر خدانخواستہ پاکستان ایٹمی قوت نہ ہوتا تو ممبئی دھماکوں کے بعد بھارت پاکستان پر حملہ کرنے میں ایک دن کی تاخیر نہ کرتا، حقیقت یہ ہے کہ ہمارا میزائل اور ایٹمی پروگرام جو قومی افتخار اور ملکی بقاء کی علامت بھی ہے،ہی پاکستان کے دفاع استحکام اور سلامتی کا ضامن اور دشمن کے ناپاک و مذموم عزائم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے،جس کی حفاظت اتحاد و یگانگت اور قومی یکجہتی سے ہی ممکن ہے۔

تجلیاتِ ختمِ نبوت " نئے گوشوں کی نقاب کشائی

مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں، اللہ کریم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر بعثت انبیاء کا سلسلہ ختم فرما دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا،آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اِس صفت خاتمیت کا ذکر قرآن و حدیث میں نہایت ہی جامع انداز میں صراحت کے ساتھ کیا گیا ہے، لہذا اب قیامت تک کسی قوم یا زمانہ کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی اور نبی یا رسول کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی اور دروازہ نبوت ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو کوئی بھی نبوت کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ملعون اور ابلیس کے ناپاک عزائم کا ترجمان ہوگا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کے جھوٹے دعویداروں کی نہ صرف نشاندہی فرمائی حدیث مبارکہ میں اُن کی تعداد بھی بیان فرما دی، حضرت ثوبان سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" میری اُمت میں تیس (30) کذاب ہوں گے، اُن میں سے ہر ایک کذاب کو گمان ہوگا کہ وہ نبی ہے، حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔" اب اگر کوئی شخص حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت یا رسالت کا دعویٰ کرے (خواہ کسی معنی میں ہو) وہ کافر، کاذب، مرتد اور خارج از اسلام

ہے، نیز جو شخص اُس کے کفر و ارتداد میں شک کرے یا اسے مومن، مجتہد یا مجدد وغیرہ مانے وہ بھی کافر و مرتد اور جہنمی ہے۔

قرآن و حدیث کی روشنی میں ختم نبوت کا انکار محال ہے اور یہ ایسا متفق علیہ عقیدہ ہے کہ خود عہد رسالت میں مسیلمہ کذاب نے جب نبوت کا دعوی کیا، حالانکہ اُس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق بھی کی، تو بھی اُس کے جھوٹا ہونے میں ذرا بھی تامل نہ کیا گیا اور صدیق اکبر کے عہد خلافت میں صحابہ کرام نے جنگ کرکے اُسے کیفر کردار تک پہنچایا، اِس کے بعد بھی جب اور جہاں کسی نے نبوت کا دعوی کیا، اُمت مسلمہ نے متفقہ طور پر اُسے جھوٹا اور خارج از اسلام قرار دیا اور اُس کے قلع قمع کی ہر ممکن کوشش کی۔ 20 ویں صدی میں جب مرزا قادیانی کی جھوٹی نبوت کی فرنگی کارخانے میں تشکیل ہوئی تو سب سے پہلے مرزا کا محاسبہ کرنے والے عارف کامل علامہ غلام دستگیر قصوری تھے جنھوں نے مرزا کی کتاب "براہین احمدیہ" میں کئے گئے مرزا کے دعووٗں کا بطلان "رجم الشیاطین براغلوطات البراہین" میں کیا، آپ مرزا کی کتاب "براہین احمدیہ" پڑھ کر اسکی گمراہی اور فتنے سے برصغیرپاک و ہند میں واقف ہونے والے پہلے فرد ہیں، خیال رہے کہ اُس وقت تک مرزا نے کھلا دعویٰ نبوت نہیں کیا تھا اور اُس کے الہامات کی بناء پر بہت سے علماء اُسے "مرد صالح "اور" اسلام کا عظیم مبلغ" قرار دے رہے تھے، مگر یہ علماء اہلسنّت کا نور ایمان تھا

جس کی فراست نے مرزا کو قبل از دعوئ نبوت ہی پہچان لیا تھا،آپ کے بعد علمائے اہلسنّت کی طویل فہرست میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی،علامہ حامد رضا خان،نواب الدین رمداسی،مولانا غلام قادر بھیروی،پیر جماعت علی شاہ صاحب،سیدنا مہر علی شاہ صاحب اور بہت سے نام ملتے ہیں۔

یہ اعزاز بھی فاتح سرحد مولانا عبد الحامد بدایونی کو جاتا ہے جنھوں نے سب سے پہلے قادیانیوں کو مسلم لیگ کی رکنیت حاصل کرنے سے روکنے کی قرارداد 30 جولائی 1944ء کو لاہور میں مسلم لیگ کے ایک اجلاس میں پیش کی،اسی طرح تحفظ ختم نبوت کی قانونی جنگ کے مجاہد اوّل علامہ سید سعید احمد کاظمی نے سب سے پہلے 1952 میں مسلم لیگ صوبائی کونسل کے اجلاس میں یہ مسئلہ اٹھایا اور قادیانیوں کو کافر قرار دینے اور انہیں کلیدی عہدوں سے ہٹانے کی قرارداد منظور کروائی،1953 میں غازی کشمیر علامہ سید ابوالحسنات قادری کی زیر قیادت تحریک ختم نبوت چلی،جس میں تمام مکاتب فکر کے علماء نے حصہ لیا،اِس تحریک کے دوران علامہ ابوالحسنات قادری گرفتار ہوئے،جبکہ آپ کے صاحبزادے سید خلیل احمد قادری اور مجاہد ملت علامہ عبدالستار نیازی کو سزائے موت سنائی گئی،30جون 1974 کو قائد ملت اسلامیہ علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی نے پاکستان کی قومی اسمبلی میں قادیانوں کے خلاف قرارداد پیش کرنے کا اعزاز حاصل کیا،جسے 7 ستمبر 1974 کو پاکستان کے دونوں ایوان نے متفقہ طور پر منظور

کر کے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا،اِس دوران علماء اور اکابرین اہلسنّت نے اسمبلی فلور سے پاکستان کے قریہ قریہ،چپہ چپہ کامیاب تحریک چلائی اور یوں نوے سالہ مسئلہ اپنے منطقی انجام کو پہنچا۔

اِس تحریک کے مختلف محاذوں پر بہت سے اکابر اور علماء اہلسنّت نے گراں قدر خدمات انجام دیں،زیر نظر کتاب "تجلیات ختم نبوت"اِن میں سے چند بزرگوں علامہ اقبال،سفیر اسلام علامہ عبد العلیم صدیقی،علامہ سید سعید احمد کاظمی،صاحبزادہ افتخار الحسن آلو مہاروی،پیرزادہ اقبال احمد فاروقی،چوہدری غلام عباس اور خطیب پاکستان علامہ شفیع اوکاڑوی کے تذکروں پر مشتمل ہے،اِس کتاب کو ممتاز محقق،ادیب اور کالم نگار صلاح الدین سعیدی نے مرتب کیاہے،مولف کے یہ وہ مضامین ہیں جو پاکستان کے مختلف اخبارات اور جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں،صلاح الدین سعیدی صاحب دسمبر 1965 میں لاہور میں پیدا ہوئے،1979 سے 1995 تک کراچی میں مقیم رہے اور 1995 سے دوبارہ لاہور میں سکونت اختیار کی،تب سے اب تک موصوف کے قلم سے"باتوں سے خوشبو آئے،نظام مصطفےٰ میں جہیز کا تصور،بزرگان دین کا نعتیہ کلام اوّل تا سوم،رسائل میلاد اوّل تا چہارم،شخصیات اسلام،صدیق اکبر کے تاریخ ساز فیصلے،فاروق اعظم کے تاریخ ساز فیصلے،عثمان غنی کے تاریخ ساز فیصلے اور علی المرتضیٰ کے تاریخ ساز فیصلے"جیسی گرانقدر کتابیں سامنے آچکی ہیں۔

تجلیات ختم نبوت آپ کی مندرجہ بالا کتابوں میں اِس لحاظ سے منفرد ہے کہ اِس میں تحریک ختم نبوت میں نمایاں کردار ادا کرنے والی شخصیات کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے اور اُن کے حوالے بہت سے نئے گوشے اور نئے پہلو سامنے لائے گئے ہیں، جیسے علامہ سید سعید احمد کاظمی کے حوالے سے کم لوگ جانتے ہیں کہ آپ پنجاب مسلم لیگ مجلس عاملہ کے رکن تھے اور آپ نے مسلم لیگ کے صوبائی اجلاس میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کیلئے سب سے پہلے قرار داد پاس کروائی،اسی طرح مبلغ اسلام علامہ عبدالعلیم صدیقی کی قادیانیت کے خلاف بین الاقوامی سرگرمیاں، مناظرے اور تحریری خدمات بھی عام افراد کے علم میں نہیں ہیں، قادیانی گھرانے میں جنم لینے والے آزاد کشمیر اسمبلی کے قائد اور مسلم کانفرنس کے رہنماء چودھری غلام عباس کی زندگی کا یہ پہلو خاص توجہ طلب ہے کہ آپ امیر ملت پیر جماعت علی شاہ صاحب کے مرید اور خلیفہ مجاز تھے، منیر انکوائری رپورٹ کے مطابق "پورے شہر میں تقریر کے ذریعے آگ لگانے والے" صاحبزادہ فیض الحسن کی خود نوشت "زندگی" کے منتخب حصوں کا انتخاب قارئین کیلئے نئی معلومات کا باعث ہے،اسی طرح 1953 کی تحریک ختم نبوت کے دوران" صوبہ بدر خطیب" کا لقب پانے والے پیرزادہ اقبال احمد فاروقی کی زندگی کے بہت سے نئے گوشے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

آج بہت سے لوگ یہ بات تو جانتے ہیں کہ 1965 کی جنگ کے دوران ملی نغمے گا کر
میڈم نورجہاں نے فوجی جوانوں کا حوصلہ بڑھایا مگر یہ بات شاید ہی کم لوگوں کے علم
میں ہو کہ اِس جنگ کے دوران محاذ جنگ پر جا کر پاک افواج کا مورال بلند کرنے کیلئے پر
جوش تقریر کرنے اور پاک فوج کے جوانوں کا جذبہ بڑھانے والے کوئی اور نہیں علامہ
شفیع اوکاڑوی تھے۔ غرض کہ اِس قسم کی بہت سی اہم اور نئی معلومات کتاب کا حصہ
ہیں،کتاب کے آخر میں مرزا اور مرزائی ذریت کے حوالے سے مشاہیر ملت کے تاثرات
اور ختم نبوت کے حوالے سے منظوم حصہ بے انتہا اہمیت کے حامل ہیں،ابتداء میں میاں
محمد سلیم حماد ہجویری کا پر مغز معلوماتی دقیق مقالہ کتاب کے حسن میں چار چار چاند لگاتا
ہے، عمدہ پیپر اور خوبصورت ٹائٹل سے مزین یہ کتاب دارالکتابت، شیخ ہندی،
سٹریٹ، دربار مارکیٹ، لاہور یا فون 03334330982 سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

خود آپ اپنے دام میں صیاد آگیا۔۔۔

طوفان ابھی ٹلا نہیں ہے۔۔۔۔

جس سماج میں جھوٹ، فریب، منافقت اور لاقانونیت کی حکمرانی ہو، کرپشن، بے انصافی، لوٹ مار اور اقرباء پروری کا راج ہو، اُس سماج کے لوگوں کا جھوٹی قسمیں کھانا اور قرآن مجید کو اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کیلئے استعمال کرنا غلط نہیں سمجھا جاتا، غلط تو وہ سمجھتے ہیں اور ڈرتے تو وہ ہیں جنہیں اپنے ربّ کی گرفت کا احساس ہوتا ہے، جنہیں اِس بات کا خوف ہوتا ہے کہ اگر جھوٹی قسم یا جھوٹا قرآن اٹھایا تو وہ اللہ کی پکڑ سے نہیں بچ پائیں، مگر جب انسان کے دل و دماغ سے سزا وجزاء کا یقین نکل جائے اور اپنے اعمال کے حساب وکتاب کا ڈر جاتا رہے تو وہ بے خوف ہو جاتا ہے، پھر اُسے اپنے موقف کو سچ ثابت کرنے کیلئے کچھ بھی کر گزرنے سے ڈر نہیں لگتا، ملک ریاض کے ساتھ بھی یہی ہوا، عدالتی بیان پر اکتفا کرنے کے بجائے اُس نے عوام کی نظروں میں اپنا مقدمہ مضبوط بنانے کیلئے قرآن اٹھا کر چیف جسٹس پر الزامات لگائے، ارسلان افتخار کو ڈان قرار دیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اُس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے، ماہرین قانون کے نزدیک تو ملک ریاض صرف توہین عدالت کے مرتکب ہوئے، مگر وہ عوام کی نظروں میں ذلیل و رسوا ہونے کے ساتھ ربّ کی پکڑ اور قرآن کی بے

حرمتی کے سزاوار بھی ٹھہرے، شاید یہ رب کے کلام کی بے توقیری کی سزا ہے کہ انہوں نے اپنی دنیاوی نیک نامی کو خود اپنے ہی ہاتھوں خاک میں ملا دیا، حالانکہ اصول و قاعدہ یہ تھا کہ اگر ملک ریاض کے ساتھ کوئی دھوکہ یا فریب ہوا تھا تو وہ قانونی راستہ اختیار کرکے ارسلان افتخار کے خلاف ایف آئی آر درج کرا سکتے تھے۔ قانونی کاروائی کر سکتے تھے، یہ کام اُن کیلئے کوئی مشکل نہ تھا کہ صدر اور وزیراعظم اُن کے قریبی دوست ہیں، مگر ملک ریاض نے مقتدر حلقوں کی تائید سے جس سازشی ڈرامے کا سکرپٹ تیار کیا تھا، اُس کا مرکزی خیال چیف جسٹس پاکستان کو عوام کی نظروں میں گرانا، انہیں بدنام کرنا اور دباؤ ڈال کر مستعفی ہونے پر مجبور کرنا تھا یا پھر اُن کے خلاف حکومت کو صدارتی ریفرنس کیلئے مواد کی فراہمی تھا۔

اگر اُن کے اِس اقدام کا مقصد اُس 34 کروڑ کی رقم کی واپسی تھا جو اُن کے بقول انہوں نے ارسلان افتخار کو دی تو پھر ملک ریاض نے عدالت کے اندر اور باہر اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کیوں نہیں کیا؟ نہ ہی انہوں نے اُس کیلئے کوئی قانونی راستہ اختیار کیا، بلکہ دونوں مقامات پر اُن کا طرز عمل اِس بات کی چغلی کھاتا ہے کہ وہ چیف جسٹس اور اُن کے خاندان کو بلیک میل کرنے کی کوشش کرتے رہے، حقائق بتاتے ہیں کہ ملک ریاض نے سپریم کورٹ میں اپنے خلاف مقدموں میں ریلیف لینے کیلئے نہ صرف چیف جسٹس پاکستان کے قریبی وکلاء اعتزاز

احسن اور حامد خان کی خدمات بھاری فیسوں پر حاصل کیں بلکہ اپنی کامیاب پالیسی فائلوں کو پہیئے لگانے" کے مطابق ارسلان افتخار کو بھی استعمال کیا، لیکن جب اُن کی" یہ تمام کوششیں رائیگاں ثابت ہوئیں اور انہیں سپریم کورٹ سے مقدمات میں ریلیف نہ ملا تو انہوں نے چیف جسٹس پاکستان کے خلاف یہ ڈرامہ کھیلا اور انہیں بلیک میل کرکے خوف زدہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اَمرِ ربّی ہے کہ حق اور سچ کبھی مغلوب نہیں ہوتا، نہ ہی زیادہ دیر چھپایا جاسکتا ہے۔ ہاں وقتی طور پر جھوٹ کے تانے بانے سچائی کو گدلا ضرور دیتے ہیں، لیکن بہت جلد حقیقت طشت ازبام ہو جاتی ہے اور حق اپنی تمام تر سچائی کے ساتھ نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔

کہتے ہیں سازش کبھی چھپائے نہیں چھپتی اور سازشی کردار اپنے لب و لہجہ، حرکات و سکنات سے سازش کے تانے بانے خود ہی بے نقاب کر دیتا ہے۔ اِس کیس میں بھی یہی ہوا، وہ ملک ریاض جس کے بارے میں عام تاثر یہی تھا کہ وہ ایسی کرشمہ ساز شخصیت ہے، جس نے زیرو سے ہیرو تک کا سفر کامیابی سے طے کیا اور اپنے راستے میں آنے والے ہر ممکنہ شخص کو ہٹانے کے بجائے اپنی طاقت کے بل پر اپنے حلقہ احباب میں شامل کرلیا، خود اپنے ہی جال میں پھنس گیا اور اپنے ہی کھودے ہوئے گڑھے میں گرگیا۔ وہ انٹرویو جو اُس نے اور اُس کے حواریوں نے منظم منصوبہ بندی کے تحت چیف جسٹس کے خلاف تیار کیا تھا، اُس انٹرویو کے ابتدائی

اور وقفے کے درمیان ملک ریاض اور اینکرز کے درمیان ہونے والی آف دی ریکارڈ گفتگو کی وڈیو سامنے آتے ہی اِس سازش کے سارے کردار عریاں ہو کر قوم کے سامنے آ گئے۔اِس وڈیو کو دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حکمران جماعت کس طرح ملک ریاض کے ساتھ نہ صرف شامل ہے بلکہ مقتدر طبقے کی جانب سے ٹی وی چینلز مالکان اور اینکرز پرسنز کو پیسے کے زور پر خرید کر اپنی مرضی کے پروگرام پیش کرکے عوام کو کیسے گمراہ کرتے ہیں۔اب ملک ریاض کے خود ساختہ انٹرویو اور ٹی وی مالکان اور اینکر پرسنز کی منافقانہ روش منظر عام پر آنے کے بعد پرائیویٹ چینل کی جانب سے مسلسل یہ پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے کہ ملک ریاض انٹرویو کی لیک ہونے والی فوٹیج دراصل ملک کے ایک مشہور و معروف ٹی وی چینل کی جانب سے اُن کے خلاف کی جانے والی سازش کا نتیجہ ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ اپنی خفت مٹانے اور چینل مالکان و اینکر پرسنز کی جانب سے اختیار کئے جانے والے منافقانہ رویئے پر پردہ ڈالنے کی کوشش ہے۔اِس کا ثبوت ڈائریکٹر کرنٹ افیئرز کا استعفٰی ہے، جو ظاہر کرتا ہے کہ اِس ادارے کے خلاف کوئی سازش نہیں ہوئی، بلکہ ادارے کے مالکان خود اِس منافقانہ روش میں شامل تھے۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ جس طرح ملک ریاض نے ڈاکٹر ارسلان افتخار کے حوالے سے ریکارڈ محفوظ کیا اور ہوٹلوں، کلبوں، شاپنگ سینٹروں کی تصاویر بنائیں، یہ

تمام عمل منظم سازش کی چغلی کھاتے ہیں، جبکہ دوسری جانب ریلیف نہ ملنے کے باوجود ڈاکٹر ارسلان پر سرمایہ کاری کا جاری رہنا، سازش کو منطقی انجام تک پہنچانے کا اہم ثبوت ہے ۔ اگر ملک ریاض بے گناہ ہوتا تو وہ آغاز میں ہی براہ راست یا بالواسطہ چیف جسٹس کو ڈاکٹر ارسلان کی بلیک میلنگ سے آگاہ کرسکتا تھا، مگراُس نے خفیہ ایجنڈے کے تحت آبرو مندانہ راستہ اختیار کرنے کی بجائے شاطرانہ راستہ اختیار کیا اور صحافیوں اور وکلاء کی ہمدردیاں حاصل کرنے کیلئے انہیں مبینہ دستاویزات دکھاتا رہا،چونکہ ملک ریاض کا مقصد اپنے مقدمات میں ریلیف حاصل کرنا اور ریلیف نہ ملنے کی صورت میں چیف جسٹس کو بدنام کرنا تھا،اِس لیے اُس نے ذرائع ابلاغ کے بعض عناصر کی مدد سے یہ ہنگامہ مچایاتاکہ چیف جسٹس کو اپنے منصب سے علیحدہ ہونے پر مجبور کردیاجائے یا پھر انہیں حساس مقدمات کی سماعت سے روک دیاجائے،اِس عمل میں وہ یہ بھول گیاکہ حق اور باطل کی جنگ میں ہمیشہ حق کی فتح لازم ہے، یہ درست ہے کہ ماضی میں ہماری عدالیہ کے کردار پر سوالیہ نشان لگتے رہے، لیکن چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس افتخار محمد چودھری کے 2007ء میں مشرف کے سامنے انکار اور 2009ء میں اُن کی بحالی کے بعد عوام کی نظروں میں عدلیہ کا وقار بلند ہوا ہے اور اُن کی نظریں عدلیہ پر ہی لگی ہوئی ہیں،یہی وجہ ہے کہ اب عدلیہ کو نشانے پر لیا جارہا ہے، جبکہ یہ اَمر بھی کسی سے مخفی نہیں کہ موجودہ حکمرانوں کی کرپشن کی داستانیں روز اوّل سے زبان زدِ عام ہیں اور عدالتی

فیصلوں اور ناقابل تردید ثبوتوں کے باوجود صدر، وزیراعظم، وزراء اور پیپلز پارٹی کی قیادت" میں نہ مانوں" کی پالیسی پر گامزن ہے، گذشتہ دنوں عدالتی احکامات نہ ماننے کی وجہ سے وزیراعظم نہ صرف مجرم ٹھرائے گئے اور مستقبل میں انھیں نااہلی کا بھی سامنا ہے۔

اگر گزشتہ چار سالوں کی حکومتی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے تو حکمرانوں کے سامنے عوام، فوج، سمیت تمام ادارے اور قوتیں بے بس نظر آتی ہیں، دوسری جانب بالادستی کی دعویدار پارلیمنٹ ربڑاسٹمپ کا کردار ادا کرتی دکھائی دیتی ہے، مگر اِس ناگفتہ بہ حالت میں بھی ایک فرد ایسا ہے جو پاکستان کے بے بس اور لاچار عوام کیلئے اُمید اور روشنی کی آخری کرن ثابت ہوا ہے اور وہ فرد چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس افتخار محمد چودہری صاحب ہیں، جنھوں نے اپنے کردار و عمل سے سپریم کورٹ آف پاکستان کو عوام کی نظروں میں عزت و باوقار بخشا اور عوام کا کھویا ہوا اعتماد بحال کروایا ہے، اسی لیے ہمارے حکمران انہیں اپنی راہ کی رکاوٹ سمجھتے ہوئے ہٹانے کیلئے اِس قسم کے اوچھے حربے استعمال کررہے ہیں، آج پاکستانی عوام یہ بات بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر ارسلان اور ملک ریاض اسکینڈل منظر عام پر لانے کا بنیادی مقصد بھی یہی ہے، سازش تیار کرنے والے شاید اِس خوش گمانی میں مبتلا تھے کہ چیف جسٹس صاحب انصاف کے مقابلے میں شفقت پدری کو ترجیح دیں گے اور بلیک میل ہونے یا سودے باری کرنے

پر مجبور ہو جائیں گے، مگر چیف جسٹس کے ازخود نوٹس نے اُن کے سارے حربے ناکام
بنادیئے اور ارسلان کیس کی ابتدائی سماعت میں ہی واضح کر دیا کہ انصاف اندھا ہوتا ہے
اور وہ یہ نہیں دیکھتا کہ ملزم باپ، بیٹا یا بھائی یا پھر کوئی اور رشتہ دار ہے، کیا آج
پاکستان کی موجودہ تاریخ میں دور نبوی اور سنت فاروقی جیسی کوئی اور ایک ایسی مثال
پیش کی جاسکتی ہے۔؟اب جبکہ چیف جسٹس اور عدلیہ کے خلاف تمام سازش بے نقاب
ہو چکی ہے اور یہ حقیقت بھی سامنے آچکی ہے کہ اِس مبینہ سازش کا شر خود چیف جسٹس
صاحب کیلئے خیر کا باعث اور ملک ریاض کیلئے برے دنوں کا نقطہ آغاز بن چکا
ہے، ضرورت اِس اَمر کی ہے کہ ارسلان افتخار اور ملک ریاض کے ہمراہ وہ اصلی چہرے
بھی بے نقاب کیے جائیں جو اُس سازش کے پیچھے کارفرما ہیں۔

قارئین محترم ! آج اِس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری
کی جانب سے طاقتور قوتوں کے مقابلے پر "حرف انکار" نے پاکستان کی سیاست کا رخ بدل
دیا ہے، جنرل مشرف سے معزولی اور عوامی تحریک کے نتیجے میں چیف جسٹس
افتخار محمد چودھری کی بحالی کے باوجود آزاد عدلیہ کے پر کاٹنے کی سازشیں ابھی ختم نہیں
ہوئیں، طوفان ابھی ٹلا نہیں ہے، بے لاگ تحقیقات کے عدالتی حکم کی آڑ میں فتنہ وفساد
سے بھرپور ناٹک رچانے کا موقع ابھی بھی حکومت کے ہاتھ میں ہے،اسی وجہ سے ملک
ریاض کے بے سروپا الزامات نے

قوم کو ایک بار پھر یکسو کر دیا ہے اور عدلیہ کی حفاظت کرنے والی قوتیں دوبارہ منظم ہو رہی ہیں، اِن حالات میں پاکستان کی سیول سوسائٹی اور خاموش اکثریت پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اِن کرپٹ مافیا کے خلاف آخری جنگ لڑنے کیلئے میدان عمل میں آنے کی تیاری کرلیں، کیونکہ اب وقت آگیا ہے کہ حق اور باطل، سچے اور جھوٹے، کھرے اور کھوٹے میں تمیز پیدا کی جائے اور اُن قوتوں کا ساتھ دیا جائے جو حق کی علامت، سچائی کی علمبردار اور ظالم و استحصالی قوتوں کے خلاف عدل و انصاف کا نشان ہیں، آج چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کی ذات تبدیل شدہ، آزاد عدلیہ میں انصاف کی ضمانت و بنیاد ہے، ہمارا ماننا ہے کہ ایک ایسے شخص کو اُس کے عاقل و بالغ بیٹے کے گناہوں اور کوتاہیوں کی سزا ہرگز نہیں دی جاسکتی جو کرپٹ مافیا کے خلاف جہاد کر رہا ہے، جو بے لگام اداروں کو آئین و قانون کے تابع لانے کیلئے دن رات کام کر رہا ہے اور جس کا عمل و کردار عوام سمیت پوری دنیا کے سامنے کھلی کتاب کی مانند ہو، لہٰذا یہ جدوجہد صرف چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے تحفظ اور استقرار کی نہیں بلکہ اُس آزاد عدلیہ کے عزت وقار اور بقاء و سلامتی کی ہے جو 66 سال سے غلام و محکوم اور مجبور و بے بس قوم کیلئے آج اُمید کی آخری کرن ہے۔

پیپلز پارٹی کو ایک اور شہید مل گیا۔۔۔

زندہ شہید

اور گیلانی فارغ ہو گئے۔۔۔۔

نااہلی کی خبر کیا آئی خبروں کی برسات چل نکلی، ہر نیوز چینل، ہر ویب سائٹ پر ایک ہی بریکینگ نیوز تھی "سپریم کورٹ نے یوسف رضا گیلانی کو نااہل قرار دے دیا، وزیر اعظم کی چھٹی ہو گئی، پیپلز پارٹی کو ایک اور سیاسی شہید مل گیا۔" پاکستان کا ہر شہر، ہر محلہ، ہر بازار، ہر گلی، ہر کوچہ اس خبر کی برسات سے جل تھل تھا، فیصلے کی خوشی میں جہاں بہت سے لوگ ڈھول پیٹ رہے تھے، بھنگڑے ڈال رہے تھے اور ایک دوسرے کو مٹھائیاں کھلا رہے تھے، وہیں کچھ مقامات پر جیالے احتجاج بھی ہو رہا ہے، اِس منظر نامے کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اپنے طویل المدت وزیر اعظم رہنے کے اعزاز پر مسرور وشاداں نظر آنے والے وزیر اعظم اِس اعزاز سے ہی محروم نہیں ہوئے، بلکہ عدالتی فیصلے نے انہیں پاکستان کے پہلے نااہل اور سزا یافتہ وزیر اعظم کے منصب سے بھی سرفراز کر کے سیاسی تاریخ کو ایک اور نیا کردار دے دیا، ویسے بھی نواب اسلم رئیسانی کے فلسفے کی روشنی میں دیکھا جائے تو "اعزاز تو اعزاز ہی ہوتا ہے"

طویل المدتی وزیر اعظم

نہ سہی، پاکستان کے پہلے نااہل وزیر اعظم ہی سہی۔

انیس جون 2012 کو چیف جسٹس پاکستان مسٹر جسٹس افتخار محمد چودھری کی سربراہی میں عدالت عظمی کے تین رکنی بینچ نے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کی اہلیت سے متعلق اسپیکر قومی اسمبلی کی رولنگ کے خلاف مسلم لیگ (ن) تحریک انصاف اور دیگر افراد کی جانب سے دائر کی گئی 8 آئینی درخواستیں نمٹاتے ہوئے سپریم کورٹ کے سات رکنی بینچ کے 26 اپریل کے فیصلہ کو برقرار رکھتے ہوئے وزیراعظم کو قومی اسمبلی کی رکنیت سے نااہل قرار دیدیا، فاضل عدالت نے اِن درخواستوں کی سماعت مکمل کرکے شام ساڑھے تین بجے اپنا مختصر فیصلہ سناتے ہوئے کہاکہ سپریم کورٹ کے سات رکنی بینچ نے 26 اپریل کو وزیراعظم کو توہین عدالت کے جرم میں تابرخواست عدالت قید کی سزا دی تھی، جس کی بنیاد پر آئین کی دفعہ 63 ون جی کے تحت وہ 26 اپریل سے ہی نااہل قرار دیئے جاچکے ہیں، سپریم کورٹ نے اپنے مختصر فیصلے میں کہاکہ اسپیکر کی رولنگ کو پارلیمانی تحفظ حاصل نہیں اور وزیر اعظم 26اپریل سے نااہل ہیں، اب وہ پارلیمنٹ کے ممبر نہیں رہے،الیکشن کمیشن وزیراعظم کی نااہلی کا نوٹیفکیشن جاری کرے، عدالت نے اپنے فیصلے میں کہاکہ صدر جمہوری عمل کو جاری رکھتے ہوئے اقدامات کریں، دوران سماعت چیف جسٹس آف پاکستان نے کہاکہ پارلیمنٹ کااحترام کرتے ہیں لیکن آئین اور قانون کو بھی دیکھناہے ، سات ججوں کا فیصلہ صرف اپیل میں ہی تبدیل

ہوسکتا ہے۔

عدالت کا کہنا تھاکہ وزیراعظم اگر اپیل کردیتے تو انہیں مزید مہلت مل سکتی تھی ، جسٹس خلجی عارف نے کہاکہ جج اپنے ضمیر کو جانتے ہیں اور اللہ کو جواب دہ ہیں،اِس موقع پر جسٹس جواد ایس خواجہ نے کہاکہ آئین اہم اور مقدم ہے ،جج ہو یا وزیراعظم ، سب عوام کے ملازم ہیں،دوران سماعت فاضل چیف جسٹس کے یہ ریمارکس بھی معنی خیز تھے کہ کیا اسپیکر قومی اسمبلی سپریم کورٹ کے سات رکنی بینچ کے فیصلہ کی سکروٹنی کر سکتی ہیں، اگراِس بات کی اجازت دے دی گئی تو عدلیہ کی آزادی کہاں جائیگی اور عدلیہ کہاں کھڑی ہوگی؟ جبکہ کسی عدالتی فیصلے کو مجاز اپیلٹ کورٹ کے سوا کوئی دوسری اتھارٹی ختم نہیں کر سکتی،فاضل بینچ نے دوران سماعت یہ بھی باور کرادیا کہ چونکہ وزیراعظم نے اپنی سزا کیخلاف مقررہ میعاد کے اندر اپیل دائر نہیں کی اِس لئے اُن کی سزا کے بارے میں سپریم کورٹ کے سات رکنی بینچ کا فیصلہ حتمی ہو چکا ہے اورا سپیکر کو سپریم کورٹ کے فیصلہ پر اپنا فیصلہ دینے کا قطعاً اختیار نہیں ہے۔

قارئین محترم ! حقیقت یہ ہے کہ اِس نااہلی کی طرف واضح اشارہ تو 26 اپریل کے فیصلے میں موجود تھا اور امید کی جارہی تھی کہ اسپیکر خود ہی وزیراعظم کی نااہلی کا سوال اٹھائیں گی، اگر سید یوسف رضا گیلانی اور حکمران پیپلز

پارٹی کی طرف سے 26 اپریل کو ہی سپریم کورٹ کے سات رکنی بینچ کے فیصلہ کو تسلیم کرلیا جاتا اور اُس کی روشنی میں کسی نئے وزیراعظم کا انتخاب ہوجاتا تو آج پیپلز پارٹی پر آئین اور عدالتی فیصلوں سے روگردانی کا کوئی دھبہ نہ لگتا، مگر پیپلز پارٹی اور اُس کی حکومت نے وزیراعظم کی نااہلیت سے متعلق سپریم کورٹ کے فیصلہ پر بھی اپنی من مرضی کی تاویلیں پیش کرنا شروع کر دیں اور پارلیمنٹ کی برتری خطرے میں ہونے کا ڈھنڈورا پیٹا جانے لگا، جبکہ اِس عمل میں حکمران پیپلز پارٹی نے اسپیکر کے منصب کو بھی متنازعہ بنا دیا، اَمر واقعہ یہ ہے کہ سپریم کورٹ کے اِس فیصلہ کے بعد جہاں اِس بارے میں کوئی آئینی اور قانونی ابہام نہیں رہا کہ سید یوسف رضا گیلانی 26 اپریل سے ہی اپنی اسمبلی کی رکنیت سے نااہل ہو چکے ہیں، وہیں یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ اب پاکستان میں کوئی بھی شخص انصاف سے بالاتر نہیں ہے اور ہر شخص چاہے وہ کتنے بھی بڑے عہدے پر کیوں نہ فائز ہو قابل احتساب اور قابل سزا ہے، اُمید ہے کہ اسپیکر رولنگ کے خلاف سپریم کورٹ کا فیصلہ دورس اثرات کا حامل ہوگا۔

اب جبکہ اسپیکر رولنگ کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے بعد سید یوسف رضا گیلانی کیلئے دادرسی کے تمام دروازے بند ہو چکے ہیں، مگر یہ سوال اب بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ 26 اپریل کے بعد یوسف رضا گیلانی کے بطور وزیراعظم کئے گئے فیصلوں اور اقدامات کی قانونی اور آئینی حیثیت کیا ہوگی اور یہ کہ جب

وزیراعظم کی نااہلیت کے ساتھ اُن کی کابینہ کا وجود باقی نہیں رہا تو اب تک کابینہ کے نام پر ہونیوالے فیصلوں کی کیا حیثیت ہے؟ لہٰذا ضرورت اِس امر کی ہے کہ فوری قومی اسمبلی کا اجلاس بلا کر نئے وزیراعظم کا انتخاب عمل میں لایا جائے اور قومی اسمبلی سے سید یوسف رضا گیلانی اور اُن کی کابینہ کے 26 اپریل سے 19 جون تک کے فیصلوں اور قومی اسمبلی میں منظور کئے گئے وفاقی بجٹ کو آئینی تحفظ دیا جائے تاکہ ملک و مملکت کو کسی ممکنہ آئینی خلاء سے بچایا جاسکے ،اس وقت حکمران جماعت اور اُس کے اتحادیوں کیلئے سسٹم بچانے کا یہی واحد راستہ ہے، سنا ہے یوسف رضا گیلانی سپریم کورٹ کا فیصلہ تسلیم کرچکے ہیں اور وہ وزیراعظم ہاؤس سے بغیر جھنڈے والی گاڑی میں گھر روانہ ہو چکے ، اگر یہی کام وہ 26 اپریل کو کرلیتے تو آج پارلیمانی جمہوری نظام کی عملداری میں اُن کا بول بالا ہوتا، مگر افسوس کہ یہ سعادت اُن کے نصیب میں نہیں تھی،انہوں نے سوا چار سال تک جس انداز سے حکومت چلائی اُس کا خمیازہ پیپلز پارٹی سے زیادہ ملک کے غریب عوام بھگت رہے ہیں۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ سپریم کورٹ کا فیصلہ ایک ایسے وقت سامنے آیا ہے جب کئی مشکل سیاسی چیلنجوں سے کامیابی سے گزرنے کے بعد یہ خیال کیا جارہا تھا کہ اب وزیراعظم اپنی پانچ سالہ مدت بھی مکمل کرلیں گے لیکن ایسا نہ ہوسکا، وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی ،بلاشبہ طویل عرصے تک وزیر اعظم رہے ہیں

لیکن اُن کے حوالے سے عوامی تاثر بہت ہی منفی ہے ،یہی وجہ ہے کہ اُن کی نااہلی پر لوگوں نے خوشیاں منائیں جبکہ اُن کے حق میں کلمہ خیر کہنے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے ،ماسوائے سیاسی اتحادیوں کے پاکستان کا عام شہری اُن کے دور حکومت سے قطعاً مطمئن دکھائی نہیں دیتا، کیونکہ اُنھوں نے اپنے دور حکومت سوائے دعووں اور وعدوں کے عوام کو کچھ نہیں دیا، بعض مبصرین کے نزدیک آئینی اصلاحات، آغاز بلوچستان پیکج اور صوبہ سرحد کو نئی شناخت دینا چند اہم پیش رفت ضرور ہیں، لیکن اِن سے زمینی حقائق میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہیں آئی ہے، نا اہل قرار دیئے جانے والے وزیر اعظم اور اُن کی معاشی ٹیم نے اقتصادی میدان میں کوئی جھنڈے نہیں گاڑے،اُن کے دور حکومت میں مہنگائی، لوڈشیڈنگ، خسارے اور روپے کی بے قدری نے عوام کو پریشان حال رکھا،نااہل وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کا دور اقتدار میں پانچ بار وزیر خزانہ اور چھ بار سیکریٹری خزانہ تبدیل ہوئے، 2008 میں پاکستانی معیشت پر مجموعی قرضہ اور واجبات 64 کھرب کے لگ بھگ تھا جو اب 121 کھرب روپے کی خطرناک حدوں کو چھو رہا ہے، مہنگائی کے طوفان کی وجہ سے عوام کو کئی مشکل معاشی فیصلے بھگتنا پڑے، حکومتی اداروں نے چار سال میں 50 فی صد مہنگائی کا اعتراف کیا لیکن حقیقت حکومتی اعداد و شمار سے کہیں زیادہ ہے،اِن چار سالوں میں بجلی 96 فی صد مہنگی ہوئی، جبکہ ہر مہینے تیل سے بجلی بنانے کے نرخ اِس کے علاوہ ہیں، سی این جی 37 روپے سے بڑھ کر81 روپے تک پہنچی،اُن کے آنے سے

پہلے پٹرول 58 روپے تھا، جسے عوام نے سنچری کراس کرتے ہوئے بھی دیکھا۔
ابتدا میں مالی خسارہ جو 7 کھرب کے لگ بھگ تھا جو اب 13 کھرب تک پہنچ چکا ہے،
میں معاشی ترقی کی شرح 7 فی صد تھی جو اب ڈھائی فی صد پر لڑکھڑا رہی 2008
ہے۔لوڈشیڈنگ سے قومی معیشت کو ہر سال 2 ارب ڈالر کا نقصان پہنچا اور ہر سال 4
لاکھ افراد روزگار سے محروم ہوئے ۔آج یہ حال ہے کہ مزدور کے ہاتھ میں اوزار کے
بجائے ڈنڈے ہیں جنھیں وہ لوڈشیڈنگ کے خلاف مظاہروں میں استعمال کر رہے ہیں، یہ
اعزاز بھی یوسف رضا گیلانی کے دور حکومت کو حاصل ہے کہ اُن کے دور میں
لوڈشیڈنگ کے خاتمے کی تاریخ ایک مذاق بن کر رہ گئی۔بدعنوانی کے معاملے میں بھی حج
اور ایفیڈرین سمیت لاتعداد سکینڈل سامنے آئے،۔قومی اسمبلی میں اکثریت نہ ہونے
کی وجہ سے یوسف رضا گیلانی کا زیادہ تر وقت عوامی مسائل پر توجہ دینے کے بجائے اپنے
حلیفوں کو منانے اور اپنا اقتدار قائم رکھنے میں گزرا۔اپنے پورے دور حکومت یں گیلانی
حکومت نے امریکہ اور فوج کو ناراض نہ کرنے کی پالیسی اپنائے رکھی،جس کا نتیجہ یہ
نکلا کہ امریکی ڈرون حملے نہ صرف زیادہ ہوئے بلکہ امریکیوں نے پہلی بار پاکستان میں
گھس کر ایبٹ آباد میں کارروائی بھی کی۔اِن حقائق کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو یوسف
رضا گیلانی کوئی قابل فخر کارنامہ انجام نہ دے سکے اور اُن کی حکومت پاکستان کی ناکام
ترین حکومت رہی، یہ تماشا بھی انہی کے

دور میں ہوا کہ توہین عدالت کے مرتکب ہونے کے باوجود وزیر اعظم صاحب نے
اخلاقی طور پر اپنے عہدے سے علیحدہ ہونا پسند نہیں کیا چنانچہ یہ ناخوشگوار ذمہ داری بھی
عدالت عظمیٰ کو سرانجام دینا پڑی اور یوں اُن کا 34 سالہ سیاسی سفر اپنے اختتام کو پہنچا۔
قارئین محترم ! صدیوں پہلے سقراط نے کہا تھا"اسمبلیاں ،ذہنی معذوروں، بے وقوفوں،
ترکھانوں، لوہاروں، موچیوں، دکانداروں اور منافع خوروں کی آماجگاہ ہوتی، کوئی شخص
صرف اِس بنیاد پر کہ اُسے عوام نے چنا ہے حکمران کہلانے کا حقدار نہیں۔" صدیوں پہلے
کہا گیا یہ قول آج ہمارے ارکان اسمبلی اور حکمرانوں پر کتنا صادق آتا ہے،آپ سمجھ سکتے
ہیں، محض اقتدار کی کرسی پر بیٹھ جانے سے کوئی شخص عوام کا حکمران نہیں بن جاتا، بلند
ایوانوں کے در و بام پر اترنے والی خوشحالی کی چاندنی اگر غریب بستیوں کے کچے
گھروندوں اور شکستہ در و بام تک نہ پہنچ پائے تو ایسی حکمرانی کا کیا فائدہ، عوامی حکمران بننے
کیلئے عوام کے دکھ درد اور غموں کا مداوا بھی ضروری ہے،جس میں ہمارے ارباب
اقتدار بری طرح ناکام ثابت ہوئے، اپنی اِس ناکامی کے اعتراف کرتے ہوئے وزیر اعظم
صاحب کو تو بہت پہلے ہی عوامی نمائندگی اور اقتدار سے الگ ہو جانا چاہیے تھا، مگر ایسا
نہیں ہوا، پھر 26 اپریل کو عدالت نے انہیں باعزت واپسی کا راستہ فراہم کیا۔

افسوس کہ سعادت و افتخار کا لمحہ اُن کی زندگی میں نہیں تھا،اگر محترم وزیر اعظم اُس
وقت عدالتی حکم کی پیروی کرتے ہوئے از خود اقتدار سے الگ ہوجاتے توآج اُن کی
عزت و توقیر میں اضافہ ہی ہوتا، مگر افسوس کہ باعزت واپسی کا وہ لمحہ انہوں نے کھودیا
ویسے بھی یہ ہماری تاریخی سچائی ہے کہ پاکستان میں جمہوریت کو کبھی بھی سازگار موسم،
اور خوشگوار آب وہوا میسر نہیں آئی، کبھی فوجی آمروں نے حکمرانوں کو اٹھاکر ایوان
اقتدار سے باہر پھینک دیا تو کبھی خود جمہوری حکمرانوں کی خودسری، آمرانہ رویئے اور
ماورائے آئین اقدامات انہیں ایوان اقتدار سے باہر لے گئے ،یوسف رضا گیلانی کے
ساتھ بھی یہی ہوا، وہ اِس لحاظ سے پاکستان کے پہلے منفرد وزیر اعظم ٹہرے کہ انہیں
پاکستان کی سپریم کورٹ نے توہین عدالت کا مجرم قرار دے کر وزارت عظمٰی کے منصب
کیلئے نااہل قرار دیا،یوں وزیر اعظم کی نااہلی سے پیپلز پارٹی جو شہیدوں کے نام پر
سیاست میں مشہور ہے ، کو ایک اور سیاسی شہید مل گیا، بس فرق صرف اتنا ہے کہ یہ
شہید زندہ ہے، جسے پیپلز پارٹی آئندہ الیکشن ہیں ایک ترپ کارڈ کے طور پر استعمال میں
لائے گی ۔

مصر میں حسن البناء کا خواب شرمندہ تعبیر ہوگا

اخوان کامیابی مصر میں اسلامی انقلاب کی پہلی کرن۔۔۔۔۔

مکافات عمل ایک اٹل حقیقت ہے۔ازل سے قدرت کا یہی دستور چلا آرہا ہے کہ ہر انسان کو اپنے کیے کا بدلہ ضرور چکانا ہے، تین عشروں تک مصر پر حکمرانی کرنے والے اور مصریوں کی قسمت کے مالک بنے رہنے والے حسنی مبارک کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ ایک دن اُسے صدراتی محل چھوڑ کر عدالتوں کا سامنا کرنے پڑے گا اور اپنی بقیہ زندگی جیل یا ایام حراست میں بستر مرگ پر گزارنی پڑے گے۔اسی طرح بارہا جیل جانے والے اور زنداں کی سلاخوں کے پیچھے اپنی آزادی کے خواب دیکھنے والے محمد مرسی کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ ایک دن جیل سے نکل کر وہ ملک کے اعلیٰ ترین منصب صدارت پر فائز ہو جائیں گے۔یہی مکافات عمل ہے، سچ کہتے ہیں وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا، سیاہ رات کے بعد روشنی کی کرن کا پھوٹنا ایک طے شدہ اَمر ہے۔

آج مصر میں انقلاب نو کی پہلی کرن طلوع ہو چکی ہے،60 سال کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ ایک غیر فوجی اور مذہبی شخصیت 51.7 فیصد ووٹ لے کر منصب صدارت پر

فائز ہوچکی ہے، جس وقت محمد مرسی کی کامیابی کا اعلان ہوا،اُن کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو رواں اور جبیں بارگاہ لم‌یزلی میں سجدہ ریز تھی ، مصر کے بازار وقت سے پہلے بند ہوچکے تھے، تحریر اسکوائر اللہ اکبر کے نعروں سے گونج رہا تھا اور مصر کی سڑکیں،چوک، میدان و مساجد محمد مرسی کی کامیابی پر مصریوں کے سجدہ ہٕ شکر کے مناظر پیش کررہی تھیں کہ قدرت نے انہیں پہلی بار اپنی مرضی سے اپنا لیڈر منتخب کرنے کا موقع عطا فرمایا تھا،بلاشبہ محمد مرسی مصر کی تاریخ کے پہلے صدر ہیں جنھیں مصر کے عوام نے خود منتخب کیا،اُن کا تعلق اُس اخوان المسلمون سے ہے جو 9 عشروں سے مسلسل مصری حکمرانوں کے ظلم ،جبر اور عتاب کا شکار رہی ہے،یہ وہی اخوان المسلمون ہے جسے دنیائے عرب کی سب سے بڑی اسلامی تحریک کا اعزاز بھی حاصل ہے،جسے 1928 میں حسن البناء نے قائم کیا تھا اور جنھیں 12 فروری 1949ء کو شاہ فاروق کے حکم پر رات کی تاریکی شہید کردیا گیا تھا۔

جب رات کے پچھلے پہر حسن البناء کی شہادت کی خبر اُن کے بوڑھے والد شیخ احمد عبد الرحمٰن البناء تک پہنچائی گئی تو انھوں نے بے ساختہ کہا "سبحانک وعدالتک یاربی لقد قتلوا ولدی" (اے اللہ تو ہر عیب سے پاک ہے، تیرا عدل برحق ہے، اے میرے رب ظالموں نے میرے بیٹے کو قتل کردیا ہے)، صبح طلوع آفتاب کے بعد حسن البناء کا جسد خاکی مسلح پہرے اُن کے گھر لایا گیا، لوگوں کو جنازے میں

شرکت اور تعزیت سے روک دیا گیا، چنانچہ حسن البناء کا جنازہ اُن کے بینائی سے محروم سالہ بوڑھے والد، اہلیہ بہن اور 18 سالہ بیٹی نے اٹھایا، اہل خانہ نے سنگینوں کے 90 سائے میں جامع مسجد قیسوم میں نماز جنازہ ادا کی اور امام شافعی کے قبرستان میں حسن البناء کو سپرد خاک کردیا، بے بسی کے اِس عالم میں شہید کی روح کو مخاطب کرتے ہوئے جواں سال بیٹی کے کہے ہوئے تاریخی جملے "باباجان آپ کے جنازے کے ساتھ لوگوں کا ہجوم نہیں ہے، زمین والوں کو روک دیا گیا ہے، مگر آسمان والوں کو کون روک سکتا ہے، آپ کے جنازے کے ساتھ شہداء کی روحوں کا قافلہ چلا آرہا ہے، آپ اطمینان کے ساتھ اپنے ربّ اعلیٰ کے پاس جایئے، آپ نے جو پیغام ہمیں دیا ہے، وہ زندہ رہے گا، جو جھنڈا ہمیں تھمایا ہے، وہ سربلند رہے گا۔" آج حقیقت بن کر دنیا کے سامنے آچکے ہیں۔

گو کہ حسن البناء کی شہادت کے بعد حکمرانوں نے شہید کے رشتہ داروں کو پابند سلاسل کردیا، اخوان پر پابندی عائد کردی، جماعت سے تعلق رکھنے والے باغی اور معتوب قرار دیئے گئے، شیخ عبدالقادر عودہ، شیخ محمد فرغلی، یوسف طلعت، ابراہیم الطیب، ہنداوی دویر اور سید قطب شہید سمیت بہت سے افراد تختہ دار پر لٹکائے گئے، حسن اسماعیل الھضیبی کو پہلے سزائے موت سزا سنائی پھر اُسے عمر قید میں تبدیل کردیا گیا، اسماعیل الھضیبی، محمد قطب، استاذ صالح ابورفیق، محمد فرید عبدالخالق، سیدہ زینب الغزالی، حسن الھضیبی کی اہلیہ

،

صاحبزادی، سید قطب کی بہن اور ہزاروں مرد و خواتین کو جیلوں میں ڈال دیا گیا،اخوان سے تعلق کے جرم میں لوگوں کو اذیتیں دی گئیں، کوڑے مارے گئے، املاک وجائیدادیں ضبط کی گئیں ،جلاوطن کیا گیا،اخوان المسلمون پر زندگی تنگ کردی گئی ، بظاہر جماعت کا وجود ختم کردیا گیا،مگر ذہن و قلب سے حسن البناء کا پیغام محو نہ ہو سکا،

آمریت، ظلم استبداد اور سازش کا کوئی وار اخوان کو اپنے نظریئے، مقصد اور نصب العین سے پیچھے نہ ہٹا سکا اور ابتلاء و آزمائش کے مشکل ،کٹھن اور طویل دور میں بھی یہ قافلہ سخت جاں آگے بڑھتا رہا۔

یہاں تک کہ 24 جون 2012ء کو امید و روشنی کی پہلی کرن پھوٹی، قید وبند شہادتوں اور مصیبتوں کے بعد اخوان کو محمد مرسی کے حلف اٹھانے اور اقتدار سنبھالنے کی صورت یں پہلی فتح نصیب ہوئی،اس وقت مصر کی حکمران فوجی کونسل کے سربراہ فیلڈ مارشل محمد طنطاوی باضابطہ طور پر اقتدار صدر مرسی کے سپرد کرچکے ہیں ،مگر اسلامی انقلاب کی حقیقی منزل ابھی بہت دور ہے،راہ_ں پیچیدہ و دشوار سہی مگر نو منتخب صدر پر عزم ہیں،حلف برداری کے بعد قاہرہ یونیورسٹی میں خطاب کرتے ہوئے انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اُس پارلیمان کو (جسے فوج نے تحلیل کردیا تھا) بحال کریں گے جو ایک منصفانہ اور شفاف انتخابات کے نتیجے میں وجود میں آئی اور جس پر ایک نئے جمہوری آئین کی تیاری کیلئے اعتماد کیا

گیا تھا،اُن کا کہنا تھا کہ فوج کو لازماً عوامی رائے کا احترام کرنا چاہیے اور وہ اپنے اصل کام ملک کے عوام اور اُس کی سرحدوں کی نگہبانی سنبھالے،اِس موقع پرانہوں نے آئین پر عملدرآمد، اداروں کے احترام اور شہریوں کے تمام حقوق کے تحفظ کا بھی اعادہ کیا۔
سرکاری تقریب حلف۔برداری سے قبل محمد مرسی نے قاہرہ کے تحریراسکوائر میں ہزاروں کے مجمع کے سامنے اپنے منصب کا غیر رسمی حلف بھی اٹھایا اور مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ عوام کی طاقت سے۔بڑی طاقت کوئی نہیں،اب مصر میں اقتدار اور حاکمیت کا منبع عوام ہیں، تحریر اسکوائر میں جمع عوام کو محمد مرسی نے یقین دلایا کہ وہ صدر کے کسی بھی اختیار سے دستبردار نہیں ہوں گے، محمد مرسی نے مصری عوام سے وعدہ کیا کہ فوج کی طرف سے حراست میں لیے گئے تمام شہریوں کو رہا کیا جائے گا اور اُن تمام لوگوں کے لواحقین کو انصاف فراہم کیا جائے گا جو حسنی مبارک کے خلاف احتجاج میں جاں بحق ہو گئے تھے،انہوں نے مصری مسلمانوں اور عیسائیوں کو خراج عقیدت پیش کیا،اِس وقت محمد مرسی مصری معاشرے کے تمام طبقات سے مشاورت کر رہے ہیں،جس کے بعد وہ وزیراعظم اور زیادہ ترٹیکنوکریٹس پر مشتمل کابینہ تشکیل دیں گے۔
قارئین محترم ! آپ کے علم میں ہوگا کہ 1952 میں مصر میں جمال عبدالناصر کی

بغاوت کے بعد سے انورالسادت اور حسنی مبارک تک فوج ہی اقتدار پر قابض رہی ہے، سال کے بعد یہ پہلا موقع ہے جب ایک غیر فوجی شخصیت کے عہدہ صدارت پر فائز 60 ہونے سے مصر میں ایک طویل دور آمریت کا خاتمہ ہوا ہے، دیکھا جائے تو مصر میں اِس طویل دور آمریت کے خاتمے کی کڑیاں تیونس کی عوامی جدوجہد سے ملتی ہیں،

اگر تیونس سے اٹھنے والے عوامی تحریک مصر کو اپنی گرفت میں نہ لیتی اوراہل تیونس یہ نعرہ نہ لگاتے کہ "مصریو،اب تمہاری باری ہے۔" تو شاید مصری عوام سڑکوں پر نہ نکلتے اگر وہ ہر چوک کو میدان التحریر (آزادی چوک) نہ بناتے تو مصر کی صورتحال آج تبدیل نہ ہوتی، گو حسنی مبارک نے عوامی جدوجہد کو کچلنے اورآخری وقت تک قدم جمانے کی ہر ممکن کوشش کی، مگر جب ملک کی عوام سڑکوں پر نکل آئے تو پھر کوئی طاقت اِس سیلاب کا مقابلہ نہیں کرسکتی، حسنی مبارک کے پیچھے فوج کا ہاتھ ہونے کے باوجود بھی وہ عوامی سیلاب کے سامنے نہ ٹھہر سکی ،اُس نے عوامی جذبات ٹھنڈا کرنے اور اقتدار اپنی مٹھی میں رکھنے کیلئے فروری 2011 ءہیں حسنی مبارک کی برطرفی کے بعد فیلڈ مارشل کی قیادت میں ایک فوجی کونسل بنادی۔

شاید فوجی کونسل یہ سمجھتی تھی کہ اِس طرح عوام کا غصہ ٹھنڈا ہوجائے گا اور وہ اپنی من مانی جاری رکھے گی ،مگر ایسا نہ ہوسکا اور عوامی مطالبات کے حق میں اُسے انتخابات کرانے پڑے جس میں اخوان المسلمون کو تاریخ ساز کامیابی

حاصل ہوئی۔ فوجی کونسل اِس کامیابی کو ہضم نہ کر سکی اور پارلیمنٹ کے آدھے سے زیادہ
ارکان کو فارغ کردیا گیا۔ دوسری طرف 16 اور 17 جون کو ہونے والے صدارتی
انتخابات میں رسی نے واضح اکثریت حاصل کی مگر دانستہ اُن کی کامیابی کے اعلان میں
تاخیر کی گئی۔ آخر کار عوام کو ایک بار پھر سڑکوں پر آنا پڑا۔ التحریر اسکوائر پھر آباد ہوا
اور بپھرے ہوئے عوامی طوفان کے آگے فوجی کونسل کو گھٹنے ٹیکنے پڑے، چنانچہ بااَمر
مجبوری 24 جون کو محمد مرسی کی کامیابی کا اعلان کیا گیا۔اِس طرح عالم عرب کے سب سے
زیادہ آبادی والے مصر میں پہلی بار ایک دیندار مسلمان ایوان صدر میں داخل ہوا۔
یوں کم و بیش 85 سال بعد مصر میں لادینیت کو شکست اور اسلام پسندوں کو پہلی کامیابی
نصیب ہوئی۔

آج مغربی دنیا اور صہیونی و صلیبی حواری مصر میں اخوان المسلمون کی اِس کامیابی پر
بوکھلائے اٹھے ہیں، وہ ایک دیندار مسلمان کی کامیابی کو "قومی تقسیم "کا نیا رنگ دے کر
اسلام پسندوں کی کامیابی کو مصر کیلئے خطرہ قرار دے رہے ہیں، دوسری طرف فوجی
حمایت یافتہ ہارنے والے امیدوار احمد شفیق اور اُن کے حامیوں کے نزدیک یہ مصر کیلئے
ایک افسوسناک دن ہے کہ اِس ملک کی نمائندگی محمد مرسی اور اُن کا گروپ کرے گا۔
اخوان المسلمون کو بدنام کرنے کیلئے اسلام دشمن قوتیں ابھی سے یہ پروپیگنڈا بھی کر رہی
ہیں کہ اخوان شخصی

آزادی پر قدغن لگادے گی اور سیاست میں مذہب کا دخل ہو جائے ،ہمیں حسنی مبارک کی شخصی آزادی سے کوسوں دور اور مذہب کو سیاست سے ہی نہیں بلکہ معاشرت سے بھی بیدخل کرنے والی آمریت کو قبول کرنے والوں کے اِس طرز فکر پر قطعاً کوئی حیرت نہیں ہے۔

در حقیقت یہ وہی عناصر ہیں جنھوں نے حسنی مبارک کے اپنے عوام اور خاص کر اسلام پسندوں کے ساتھ کیے گئے سلوک پر کبھی کوئی آواز نہیں اٹھائی، کیونکہ اُن کے نزدیک اسلامی تعلیمات کا مذاق اڑانا، اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر زبان طعن دراز کرنا، اپنی ترقی کا خاکہ عہد فراعنہ کی تہذیب سے منسلک کرنا، سابقہ حکمرانوں کی جانب سے اہل مصر کو تحتموت اور رعمسیس کے فرزند قرار دینا، فرعونی تہذیب کے احیاء کی کوششیں کرنا، مصری کرنسی اور ڈاک ٹکٹوں پر فرعونی عہد کے نشان "عقاب" اور فرعون کی تصویریں چھاپنا، سڑکوں، پارکوں، گاڑیوں اور عمارتوں کے نام فرعون کے نام پر رکھنا، لادینیت ،بے حیائی، فحاشی ، عریانی، شراب نوشی اور جسم فروشی کی سرپرستی اور فروغ دینا کوئی جرم نہیں تھا،اِن نام نہاد سیکولر ، حقوق انسانی اور اظہار رائے کی آزادی کے علمبردار عناصر نے لادین مصری حکمرانوں کے خلاف کبھی آواز نہ اٹھائی۔ مگر آج ایک دیندار شخص کے مصری صدر منتخب ہونے پر اُن کے پیٹ میں اِس لیے

درد ہو رہا ہے کہ محمد مرسی کا تعلق اخوان المسلمون سے ہے جو مصر میں اسلامی نظام کی داعی اور مصری نظام و قانون کو شریعت اسلامیہ کی بنیادوں پر استوار کرکے قرآن و سنت کی حکمرانی قائم کرنا چاہتی ہے ،آج یہ تحریک مصر کی سرحدوں سے نکل کر سوڈان اردن،شام، عراق اور سعودی عرب سمیت کئی عرب ممالک میں پھیل چکی ہے،

اور عرب ممالک کے حکمران اخوان المسلمون کے مذہبی ایکٹوزم سے خوفزدہ اور ڈرر ہے ہیں کہ کہیں مصر میں آنے والے تبدیلی کی لہراُن کے ممالک کو بھی اپنی لپیٹ میں نہ لے لے،یہی خوف انہیں آمادہ مخالفت کیے ہوئے ہے، دوسری طرف تاریخ ساز کامیابی کے باوجود نو منتخب صدر کو ابھی کئی اہم چیلنجز کا سامنا ہے، جس میں سب سے اہم معاملہ اُن ایک تہائی ارکان جو پارٹی وابستگی کی بنیاد پر منتخب ہوئے کی بحالی اور نئے اسلامی آئین کی تیاری کے ساتھ اُس آرڈیننس کی منسوخی ہے جسے کے ذریعے فوجی سپریم کونسل نے صدر کے اختیارات کو محدود کرکے بجٹ اور قانون سازی سے متعلق بعض اہم اختیارات اپنے دائرہ اختیار میں کرلیے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی بہت اہمیت کی حامل ہے کہ محمد مرسی کی کامیابی کے باوجود اُن کے مدمقابل کمزور نہیں ہیں، گو صدارتی انتخاب میں حصہ لینے والے ڈھائی کروڑ ووٹروں میں سے ایک کروڑ بتیس لاکھ نے اخوان کے امیدوار کے حق میں رائے دی ہے مگر اُن کے مدمقابل امیدوار نے بھی ایک کروڑ تئیس لاکھ ووٹ حاصل کیے

ہیں، دیکھا جائے تو مجموعی فرق صرف نو لاکھ ووٹوں کا ہے جو بہت زیادہ اہمیت نہیں
رکھتا، یہ نتائج اِس جانب بھی اشارہ کرتے ہیں کہ اگر لبرل اور سابق صدر کے حامی
عناصر عدم تعاون پر کمر باندھ لیں تو اخوان کیلئے کامیابی سے حکومت چلانا اور اپنے
مقاصد کو حاصل کرنا آسان کام نہیں، اخوان قیادت کو بھی اِس حقیقت کا ادراک
ہے، یہی وجہ ہے کہ نو منتخب صدر نے صرف اخوان کے بجائے قومی حکومت تشکیل دینے
کا فیصلہ کیا ہے، انہوں نے حلف برداری سے قبل ہی اخوان المسلمون سے اپنی وابستگی
ختم کرلی ہے اور اخوان کی سیاسی جماعت عدل و تعمیر پارٹی کی صدارت سے بھی علیحدگی
اختیار کرکے سب کو ساتھ لے کر چلنے کے عزم کا اظہار کیا ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ ان
چیلنجز سے کس طرح عہدہ برآں ہوتے ہیں اور کیونکہ سیکولر و لادین عناصر کیلئے قابل
قبول بننے کی کوشش میں دین و شریعت پر کسی سمجھوتے سے باز رہتے ہیں۔
یقیناً چیلنجز سخت کٹھن اور دشوار ہونے کے باوجود صدر مرسی کے پیش نظر یہ حقیقت
بھی ہوگی کہ اخوان المسلمون کی کئی عشروں پر مشتمل جدوجہد کسی سیکولر یا مغربی
جمہوری نظام کیلئے نہیں ہے، دیکھنا یہ ہے کہ صدر مرسی اخوان المسلمون کے نصب العین،
مقاصد اور اہداف کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں، قارئین
محترم !اِن تمام خدشات کے باوجود اِس حقیقت کو صرف نظر نہیں کیا جاسکتا کہ آج 84
سال بعد مصر میں اخوان کی بے مثال

کامیابی ایک ایسی اسلامی فلاحی جمہوری انقلاب کی علامت کے طور پر سامنے آئی ہے جسے تجزیہ نگار مصری عوام کی عظیم فتح اور طاغوتی قوتوں کی شکست سے تعبیر کرتے ہوئے پرأمید ہیں کہ اسلام کو تمام مسائل کا حل قرار دینے والی احیائے اسلام کی یہ تحریک مومنانہ فراست سے بہت جلد اِن داخلی اور خارجی مسائل پر قابو پالے گی، اُمید ہے کہ اخوان کی یہ میابی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی ضمانت ثابت ہونے کے ساتھ عالم اسلام کی اُن تمام اسلام پسند قوتوں کیلئے اُمید اور حوصلے کا باعث بنے گی جوظالم و جابر اور آمر حکمرانوں کے خلاف اپنے اپنے ممالک میں التحریر اسکوائر سجانے کیلئے بے چین ہیں۔

محمد متین خالد مجاہد تحریک تحفظ ختم نبوت

محمد متین خالد وہ جسے چن لیا گیا۔۔۔۔

محمد متین خالد عصر حاضر کا پروفیسر الیاس برنی

کہتے ہیں کچھ سعادتیں، کچھ فضیلتیں، کچھ رفعتیں اور کچھ عظمتیں ایسی ہیں جو ہر ایک کے نصیب میں نہیں ہوتیں، اس کے فیصلے لوح محفوظ پر رقم ہو چکے ہوتے ہیں، ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اسباب و محرکات کیا ہیں؟ وجوہات کیا کہتی ہیں؟ یہ کوئی نہیں جانتا، نہ ہی کوئی توضیح یا وضاحت پیش کی جا سکتی ہے، بس زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ رتبہ بلند اُنہی کو ملتا ہے، جنھیں ربّ کائنات چن لیتا ہے، بڑے بڑے مفکر، مفسر، محدث، علماء، عشاق اور مجاہد اس لمحے کی آرزو میں زندگی گزار دیتے ہیں، لیکن سعادت کا ہُما بیٹھتا ہے تو ترکھان کے بیٹے غازی علم دین، کوچوان غازی عبدالقیوم، نمبر دار کے بیٹے غازی مرید حسین، صوبیدار کے بیٹے غازی میاں محمد شہید، خوش نویس قاضی عبدالرشید، کپڑا بننے والے جولاہے صوفی عبداللہ، شیخ برادری سے تعلق رکھنے والے غازی محمد صدیق، صرف نحو کے طالبعلم غازی عبدالمنان، پروفیسر نذیر چیمہ کے بیٹے عامر

عبدالرحمٰن چیمہ اور راج مزدور کے بیٹے غازی ممتاز قادری کے سر پر،اور حضرت اقبال جیسے عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کف افسوس ملتے اور یہ کہتے رہ جاتے ہیں"اسی

"گلاں کردے رہے تے ترکھاں دا منڈا بازی لے گیا۔

درحقیقت یہ وہ منتخب سعادت ہے جسے کاتبِ تقدیر نے اِن افراد کیلئے مقدر فرمادیا ہے اور انہیں اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ کی عزت و توقیر اور حرمت و وقار کے تحفظ کیلئے چن لیا ہے،یہ وہ مجاہدین تحریک تحفظ ختم نبوت ہیں جن کا انتخاب نظر رحمت نے فرمایا،جنھیں حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم نے اذنِ پسندیدگی بخشا اور اپنی ذات مبارکہ کے تحفظ ودفاع کا مقدس فریضہ عطا کرکے کبھی غازی اور کبھی شہید کے مقام پر سرفراز فرمایا،"یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا۔" برادرم متین خالد کا تعلق بھی مجاہدین کے اِسی قبیلے سے ہے،جن کی زندگی کا مقصد عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث ملت اسلامیہ کے جوانوں میں منتقل کرنا ہے اور انہیں جنتی قافلے کی راہ دکھلاکر منکرین ختم نبوت کا محاسبہ و ردّ اور گستاخ رسالت کی رگ جاں کاٹ کر فنا فی النار کرنا ہے۔

مفتی محمد امین قادری مرحوم برادرم متین خالد کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ"محمد متین خالد عصر حاضر کے پروفیسر محمد الیاس برنی

ہیں۔" مرحوم کا یہ جملہ قطعاً مبالغہ آرائی پر مبنی نہیں، متین خالد واقعی عصر حاضر کے پروفیسر الیاس.برنی ہیں،19 اپریل 1890 کو ضلع بلند شہر،یوپی بھارت کی تحصیل خورجہ میں پیدا ہونے والے پروفیسر الیاس.برنی تحریک ختم نبوت کے پہلے قلمی مجاہد تھے،وہ اُن قابل قدر سپوتوں میں سے تھے جن پر کوئی قوم بجا طور پر فخر کرسکتی ہے،آپ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ سے والہانہ عشق و محبت رکھتے تھے،منکرین ختم نبوت سے اظہار نفرت اور اُن کا محاسبہ الیاس.برنی کی زندگی کا مقصد اوّل تھا،شاہ بلیغ الدین کے مطابق" پروفیسر محمد الیاس.برنی نے قادیانیت کے خلاف تنہا بہت.بڑا جہاد کیا اور قادیانیت کے خلاف سب سے پہلے جامع کتابیں لکھیں،پروفیسر الیاس.برنی قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کی تجویز دینے والے ابتدائی لوگوں میں تھے۔" آپ بہت سی شہرہ آفاق کتب کے مصنف تھے،لیکن آپ کی کتاب" قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ" (وہ پہلی کتاب تھی جس میں سب سے پہلے قادیانی مذہب اور عقائد واعمال کی گھناونی تفصیل خود قادیانی کتابوں کے حوالے سے پیش کی گئی) کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی،یہ کتاب آج بھی قادیانی قاموس کا درجہ رکھتی ہے،پروفیسر الیاس.برنی نے اپنی ساری زندگی مرزا قادیانی اور اُس کی ذرّیت کے محاسبےاور علمی تعاقب میں گزاری اور یکم فروری 1959 کواِس جہان فانی سے رخصت ہوئے۔

عصر حاضر میں پروفیسر الیاس برنی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے محمد متین خالد نے بھی انگریزی گماشتے اور جھوٹے مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی کے مکروفریب کو بے نقاب کرنے اور اُس کی ذریعۃ البغایا کے محاسبے کو اپنی زندگی کا مشن بنایا، تحفظ عقیدہ ختم نبوت کی خاطر اپنی جان قربان کرنے کا عزم صمیم رکھنے والے محمد متین خالد 5 اکتوبر 1960 کو بمقام پپلاں ضلع منڈی بہاؤالدین میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد، غلام محمد صاحب پاک آرمی میں تھے،انہوں نے 1965 اور 1971 کی پاک بھارت جنگ میں مجاہدانہ کردار ادا کیا اور ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ عرصہ محکمہ مال میں بھی ملازمت کی،آپ کی والدہ محترمہ فاطمہ بی بی میانوالی سے تعلق رکھتی تھیں،شادی کے بعد والد صاحب پہلے گجرات پھر ننکانہ شفٹ ہوگئے،1973 میں متین خالد ابھی ساتویں جماعت کے طالبعلم تھے کہ والد محترم کا سایہ سر سے اُٹھ گیا،1993 میں عقیدہ ختم نبوت اور فتنہ قادیانیت کی سرکوبی کے محاذ پر سب سے زیادہ حوصلہ افزائی اور جرات عطا کرنے والی والدہ محترمہ بھی انہیں داغ مفارقت دے گئیں۔

محمد متین خالد نے مولانا احسان الحق سے قرآن ناظرہ پڑھا اور ننکانہ سے ابتدائی تعلیم کے ساتھ گریجویشن مکمل کیا،1981 میں پنجاب یونیورسٹی میں ایل،ایل،بی میں داخلہ لیا،لاء کالج میں آپ کو جناب محمد اقبال موکل،پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری اور جسٹس میاں نذیر اختر جیسے قابل قدر اساتذہ کی صحبت

سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا، ابھی ایل ایل بی کا پہلا ہی سال مکمل ہوا تھا کہ ملازمت اختیار کرنا پڑی اور یوں ایل ایل بی مکمل کرنے کا خواب ادھورا رہ گیا، 1985 میں متین خالد نے پنجاب یونیورسٹی سے پرائیویٹ اسلامیات میں ایم، اے کیا، آپ پانچ بھائیوں میں تیسرے نمبر پر ہیں، ویسے تو آپ کے تمام گھر والے تحفظ ختم نبوت کی دولت سے مالا مال ہیں لیکن خاص طور پر بڑے بھائی محمد شاہین پرواز، متین خالد کے تمام تحریری، تحقیقی اور اشاعتی اُمور کی نگرانی کے ساتھ تحریک تحفظ ختم نبوت کے تبلیغی اُمور میں بھی ہاتھ بٹاتے اور انتظامی ذمہ داریاں ادا کرتے ہیں، 2007 میں حج بیت اللہ کی سعادت سے بہرہ مند ہونے والے متین خالد اردو، پنجابی اور انگریزی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں، آپ ضیائے اُمت مفسر قرآن حضرت جسٹس پیر کرم شاہ الازھری سے بیعت ہیں اور حضرت عبدالحفیظ شاہ صاحب (کجو سندھ) کی شخصیت سے بہت متاثر ہیں، متین خالد اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی اور قائد ملت اسلامیہ حضرت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی سمیت اُن تمام علماء و مشائخ اور بزرگان دین سے محبت و عقیدت رکھتے ہیں جن کی زندگی کا مقصد تحفظ ختم نبوت و ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم ہے، آپ کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں، آپ نے اپنے دونوں بیٹے محمد بن متین اور احمد بن متین کو تحفظ ختم نبوت کیلئے وقف کر دیا ہے، آپ کے دونوں بیٹے، بیٹیاں اور اہلیہ ہمیشہ آپ کے تصنیفی و تحقیقی کاموں میں معاون و مددگار ہوتے ہیں، قادیانیوں سے مناظرہ محمد متین خالد کا پسندیدہ مشغلہ ہے

اور اپنی معاشی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے بعد تحفظ ختم نبوت آپ کی دلچسپی کا واحد مرکز و محور ہے۔

محمد متین خالد نے زندگی کا بیشتر حصہ ننکانہ میں گزارا، مگر آج کل داتا کی نگری لاہور آپ کا مستقل ٹھکانہ ہے۔ملازمت سے عملی زندگی کا آغاز کرنے والے متین خالد کی زندگی 1983 تک ایک سیدھے سادھے عام مسلمان کی طرح تھی، کوئی نہیں جانتا تھا کہ آنے والے وقت میں ردّ قادیانیت اور تحفظ ختم نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے محمد متین خالد کا نام ایک سند اور ایک مستند حوالہ قرار پائے گا، مگر مشیعت ایزدی محمد متین خالد کو اُن چنیدہ افراد میں شامل کرچکی تھی جن کے ماتھے دفاع ختم نبوت کا اعزاز لکھا جاچکا ہے، کہتے ہیں رحمت حق بہانہ می جوید، 1983 کا سال محمد متین خالد کی زندگی میں اُس وقت تبدیلی کا سال ثابت ہوا، جب آپ کے ایک قریبی دوست نے انہیں ایک ایسا قادیانی پمفلٹ پڑھنے کو دیا جس میں حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سمیت اہلبیتِ عظام خصوصاً حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کی شان میں گستاخی اور دریدہ دہنی موجود تھی، اِس گستاخانہ تحریر نے محمد متین خالد کے دل و دماغ میں ہلچل مچادی اور اُن کی زندگی کے دھارے کو تبدیل کردیا، دو سال آپ نے مطالعہ، تحقیق اور جستجو میں گزارے اور 1985 میں اپنی والدہ، بھائی، اہل خانہ اور کچھ مخلص دوستوں کے تعاون سے قادیانیت کے خلاف عملی جدوجہد میں حصہ

لینے کا فیصلہ کرتے ہوئے ننکانہ کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا، چنانچہ آپ کی کوششوں کی بدولت ننکانہ میں بین الاقوامی ختم نبوت کانفرنسز کا سلسلہ شروع ہوا، آپ نے قادیانیت کے خلاف عوامی شعور کی بیداری اور اپنے مذہب و عقیدے کی پختگی کیلئے انٹرنیشنل گولڈ میڈل تحریری مقالے اور کوئز پروگرامات کا بھی انعقاد کیا اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

ہمارے دوست صادق علی زاہد کہتے ہیں کہ "متین خالد صاحب کی کوششوں کی بدولت ننکانہ اور اُس کے گرد نواح میں جانثاران ختم نبوت کی کئی منظم ٹیمیں تشکیل پاچکی ہیں، جنھوں نے اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے قادیانیوں کا ناطقہ بند کر رکھا ہے، اہلیانِ ننکانہ کے معاشی بائیکاٹ کی وجہ سے قادیانیوں کی اکثریت ننکانہ چھوڑ کر فرار ہوچکی ہے، آج ننکانہ میں کوئی قادیانی شعائر اسلام استعمال کرنے کی جرات نہیں کرسکتا۔

دوسری طرف متین خالد کا نام اپنے تحقیقی کام اور ردّ قادیانیت کے حوالے بین الاقوامی دنیا میں ایک مستند حوالے کا درجہ اختیار کرچکا ہے، آج 1983 سے شروع ہونے والا محمد متین خالد کی زندگی کا نیا سفر بہت سی منازل طے کرچکا ہے، تحفظ ختم نبوت کے ایمان افروز راستے پر چلتے ہوئے محمد متین خالد کو تقریباً 28 سال ہوچکے ہیں، اِس دوران عقیدہ ختم نبوت اور فتنہ قادیانیت، قادیانی عقائد، قادیانیوں سے متعلق عدالتی" فیصلے، قادیانیت سے متعلق آئین و قانون کیا کہتا ہے، احمدی دوستو! تمہیں

اسلام بلاتا ہے، مرزا قادیانی کی علمی حیثیت، حضرت مہر علی شاہ گولڑوی اور فتنہ قادیانیت، پاکستان کے خلاف قادیانی سازشیں، پارلیمنٹ میں قادیانی شکست، قادیانیت انگریز کا خود کاشتہ پودا، شہیدانِ ناموس رسالت، ناموسِ رسالت کے خلاف امریکی سازشیں، اف یہ پادری، حقوق انسانی کی آڑ میں، علامہ اقبال اور فتنہ قادیانیت اور اسلام کا سفیر جیسی 50 کے قریب معرکۃ الآراء کتابیں آپ کے قلم سے نکل کر دنیا بھر میں آپ کی پہچان و شناخت بن چکے ہیں، جبکہ ردّ قادیانیت پر 32 سے زائد کتابچے اِس کے علاوہ ہیں، مگراِن سب تصانیف وتالیف میں "ثبوت حاضر ہیں" جلد اوّل تا چہارم کا مقام ہی الگ، جدا اور ممتاز ہے، جس طرح اہل علم پروفیسر الیاس برنی کی کتاب "قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ" کو قادیانی قاموس قرار دیتے ہیں، بالکل اُسی طرح علمی مجالیس میں متین خالد کی کتاب "ثبوت حاضر ہیں" قادیانی ڈائریکٹری اور انسائیکلوپیڈیا کا درجہ رکھتی ہے، اِس کتاب کی ہر جلد 50 ہزار سے زائد قادیانی کتب و رسائل اور اخبارات کے صفحات کھنگالنے کے بعد تیار کی گئی ہے، جو قادیانیت کا اصل چہرہ بے نقاب کرکے دنیا بھر میں قادیانیوں اور اُن کے سرپرستوں کو ذلیل و رسوا کر رہی ہے۔

آج محمد متین خالد ایک ایسا نام ہے جو قادیانیت کے رگ و پے سے واقفیت اور آگاہی رکھتا ہے، قادیانی حلقوں میں متین خالد کا نام آتے ہیں سانپ سونگھ

جاتا ہے، آج تک اُن کا دیا گیا کوئی حوالہ غلط ثابت نہیں کیا جاسکا، یہ سب اُن پر اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فضل و کرم ہے۔ متین خالد نے عملی کام کے ساتھ تحریر و تقریر کے شعبے کو بھی نظر انداز نہیں کیا، دور جدید میں انٹرنیٹ گمراہ کن قادیانی پروپیگنڈے کا سب سے موثر ہتھیار بن چکا ہے۔ قادیانی انٹرنیٹ کے ذریعے بھولے بھالے مسلمانوں کو بے وقوف بنا کر اُن کے دین و ایمان کو خراب کر رہے ہیں، مگر اِس محاذ پر بھی متین خالد قادیانی سازشوں کو ڈٹ کر مردانہ وار مقابلہ کر رہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ فتنہ قادیانیت کے خلاف برصغیر پاک و ہند میں بہت جامع اور گرانقدر کام ہوا، مگر اِس کے باوجود وہ اب بھی بہت سے علمی و تحقیقی کام کی گنجائش محسوس کرتے ہیں، آپ فتنہ قادیانیت کی سرکوبی کیلئے بہت زیادہ منظم اور سائنٹیفک انداز میں اجتماعی کام وقت کی ضرورت قرار دیتے ہیں۔ متین خالد قادیانیت کی طرح فتنہ گوہر شاہی اور فتنہ غامدیہ کو بھی اسلام کا چھپا ہوا دشمن قرار دیتے ہیں۔ قارئین محترم ! اس قدر عظیم، گرانقدر اور تاریخ ساز کام کے باوجود محمد متین خالد کسی سرکاری یا غیر سرکاری ادارے سے انعام و اکرام یا اعزار و تعریفی سند کے متمنی نہیں ہیں، اُن کی صرف اتنی سی آرزو ہے کہ ربّ کریم اور اُس کے پیارے رؤف رحیم حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم دفاع ختم نبوت کے حوالے سے اُن کی اِس ٹوٹی پھوٹی کوشش وکاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول و منظور فرما کر توشہ آخرت بنالیں، یقینا محمد متین خالد قابل رشک اور مبارکباد

ہیں کہ اللہ کریم نے انہیں اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ کے تحفظ ودفاع کے مقدس مشن کیلئے منتخب فرمایا ہے، بے شک حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار کی عزت وناموس اور عظمت کا تحفظ محمد متین خالد کا وہ منفرد اعزاز ہے جس نے انہیں مجاہدین ختم نبوت کے قافلے کا سپاہی بنا کر حیات جاوداں سے ہمکنار کردیا ہے، یہ قدرت کے فیصلے ہیں کہ کس سے کیا کام لینا ہے، بے شک یہ رتبہ بلند ہر کسی کے نصیب میں نہیں۔

دہد حق ، عشق احمد، بندگان چیدہ خود را

بہ خاصاں می دہد شہ، بادہ نوشیدہ خود را

☆☆☆☆☆

گلشن اسلام '' آج کی نصابی ضرورت۔۔۔۔۔''

حضرت مولانا فتح محمد صاحب 1907 میں وادی سون سکیسر تحصیل نوشہرہ ضلع
خوشاب کی ایک ڈھوک "گل محمد والی" میں ملک علی محمد کے گھر پیدا ہوئے، بچپن ہی
میں والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا،ابتدائی تعلیم و تربیت ماموں ملک شیر بہار کی زیر نگرانی
ہوئی جو خود بھی ایک عالم باعمل تھے، پھر طلب علم کی جستجو آپ کو بندیال شریف لے
گئی جہاں استاذ العلماء حضرت مولانا یار محمد نے نوجوان فتح محمد اپنی خصوصی توجہ
وعنایات کا حقدار ٹھہرایا، بعد میں استاذ العلماء کی اجازت سے جامعہ عباسیہ بھاولپور
میں داخلہ لے لیا اور شیخ الجامعہ مولانا غلام محمد گھوٹوی کی شاگردی اختیار کی، 1933
میں جامعہ اسلامیہ بھاولپور سے "علامہ" کے منصب پر سرفراز ہوئے، آپ نے 1935
میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل (Honours in Arabic) کا ڈپلومہ حاصل
کیا، عملی زندگی کا ابتدائی ایک سال دارالعلوم عزیزیہ بھیرہ میں تدریس کے فرائض
سرانجام دیتے ہوئے گزارا، اپنے پیرو مرشد حضرت سیدنا مہر علی شاہ گولڑوی کے
صاحبزادے پیر غلام محی الدین شاہ المعروف بابو جی کی خواہش پر تین سال دیوان غلام
قطب الدین سجادہ نشین درگاہ بابا فرید الدین گنج شکر کے مذہبی اتالیق رہے، بابو جی کی
ہی خواہش پر 15 سال پیر سید نصیر الدین نصیر کی تعلیم و تربیت کا فریضہ بھی سرانجام

دیا، مولانا فتح محمد نے اعلیٰ تعلیم کے خواہشمند نوجوانوں کیلئے راولپنڈی میں منشی فاضل کلاسز کا بھی اجراء کیا، مسلسل لگن، محنت اور کام مولانا فتح محمد کی زندگی طرہ امتیاز رہا اور زندگی کے آخری لمحات تک دین کی ترویج واشاعت میں مصروف رہے، 26 دسمبر 1969 کو مولانا فتح محمد نے اس دار فانی سے کوچ فرمایا اور آپ کی تدفین حضرت بابو جی زیر نگرانی گولڑہ شریف کے "خاصانِ درگاہ" قبرستان میں ہوئی۔

مولانا فتح محمد نے کچھ عرصہ دارالعلوم انجمن نعمانیہ لاہور میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے، بعد میں اسلامیہ ہائی اسکول مری روڈ راولپنڈی میں اسلامیات اور فارسی کے استاد مقرر ہوئے، یہ وہ زمانہ تھا جب تحریک پاکستان اپنے عروج پر تھی اور مسلمان طالبعلموں کو اسلامی عقائد و تعلیمات سے آراستہ کرنا کسی جہاد سے کم نہ تھا، چنانچہ وقت و حالات کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے مولانا فتح محمد صاحب نے ماسٹر محمد فاضل جیسے مخلص دوستوں کے تعاون و مشورے سے ایک ایسی کتاب کی تالیف شروع کی جس کا مقصد آنے والی نسل کو دین سے آگاہی فراہم کرکے ملک و قوم کی تعمیر نو کیلئے تیار کرنا تھا، یہ کتاب قیام پاکستان تک "گلشن اسلام" کے نام سے چار حصوں میں چھپ کر تیار ہوئی، اُس زمانے میں کتاب کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر ہائی اسکول انتظامیہ نے "گلشن اسلام" کو اپنے نصاب میں شامل کیا اور اس کی تعلیم

طلباء کیلئے لازمی قرار دی، قیام پاکستان کے وقت 3 سے 4 حصوں میں لکھی گئی یہ کتاب
اب تقریباً 64 سال کے بعد دوبارہ نئی تزئین و آرائش کے ساتھ ایک خوبصورت مجلد
شکل میں سامنے آئی ہے، جس کا سہرا صاحب مولف کے صاحبزادے عبدالستار اعوان کے
سر جاتا ہے، 64 سال بعد "گلشن اسلام" کی دوبارہ اشاعت کے جذبہ محرکہ کی وضاحت
کرتے عبدالستار اعوان کہتے ہیں کہ "عصر حاضر میں بنیادی اسلامی عقائد، احکام اور اعمال
سے آگہی کی جتنی ضرورت آج ہے شاید اِس سے پہلے کبھی نہ ہوئی ہو۔"
یقیناً عبدالستار اعوان صاحب کی رائے سے کوئی صاحبِ ایمان اختلاف نہیں کرسکتا، آج
بڑھتی ہوئی بے راہ روی، عریانی و فحاشی اور مادر پدر آزاد معاشرے میں اسلامی
تعلیمات و اقتدار کے احیاء کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی ہے، "گلشن اسلام"
درحقیقت اُن اسلامی عقائد و اعمال اور احکام پر مشتمل ایک ایسی کتاب ہے، جس کا مقصد
عقائد و اعمال کی اصلاح کرکے نئی نسل کو دنیا و آخرت میں کامیابی و کامرانی کا راستہ دکھانا
ہے، خیال رہے کہ عقیدہ "عقد" سے ماخوذ ہے، عقیدہ اُس اعتقاد کو بھی کہا جاتا ہے جو
انسان رکھتا ہے، عقیدہ درحقیقت دل کے عمل یعنی دل کے کسی بات پر ایمان رکھنے
اور اُس کی تصدیق کرنے کا نام ہے، جیسے اللہ تعالیٰ پر، اُس کے فرشتوں پر، اُس کی کتابوں
پر، اُس کے رسولوں پر، یومِ آخرت اور اچھی، بری تقدیر پر ایمان رکھنا، انہیں ارکانِ

ایمان بھی کہا جاتا ہے۔ عقیدہ ایک ایسی بنیاد ہے جس پر دین کی عمارت قائم ہے۔ایمان کی مضبوطی اور استحکام کیلئے عقائد کی درستگی جزو لاینفک ہے۔ کلمہ کے اقرار کے بعد اگر عقیدہ کی لغزش واقع ہو جائے تو اللہ کے ہاں اُس کوئی معافی نہیں۔ جبکہ عملی کوتاہی پر اللہ جسے چاہے معاف فرمادے۔ عموماً احکام شریعت کو دو اقسام میں تقسیم کیا جاتا۔ایک عقائد اور دوسرے اعمال۔

عقائد کا تعلق کیفیتِ عمل سے نہیں ہے۔ جبکہ اعمال کا تعلق کیفیتِ عمل سے ہے۔ مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوۃ اور جہاد اور دیگر عملی احکامات پر عمل کرنا۔یہ "فروع" (شاخیں) بھی کہلاتے ہیں۔ لہذا صحیح عقیدہ ہی وہ بنیاد ہے جس پر دین قائم ہوتا ہے اور اِس کی درستگی پر ہی اعمال کی صحت کا دارومدار ہے۔ اسلام نے ایمان کے بعد عقائد کی درستگی پر بہت زور دیا ہے۔ علماء کرام نے اصلاح عقائد پر جو محنت فرمائی ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر کوئی شخص ساری زندگی اچھے اعمال کرتا رہے، لیکن اُس کے عقائد یا اُن میں سے کوئی ایک عقیدہ بھی درست نہ ہو تو روزِ قیامت اُس کے سارے اعمال غارت ہو جائیں گے۔اِسی وجہ سے علمائے کرام نے کوشش کی کہ اُمت مسلمہ کو صحیح عقائد سے روشناس کرایا جائے۔زیر نظر کتاب " گلشن اسلام " بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ جس کو صاحب مولف نے نوجوان طلباء کی ضرورت کو مد نظر رکھ کر نہایت ہی آسان سادہ اور عام فہم زبان میں ترتیب دیا ہے۔کتاب کو تین حصوں

اور چار ابواب میں تقسیم کیا ہے، حصہ اوّل" پنجم اور ششم "حصہ دوم" ہفتم اور ہشتم"
حصہ سوم "نہم و دہم جماعت کے طلباء کیلئے ہے، کتاب کے پہلے باب میں عقائد کو بیان کیا
گیاہے، دوسرا باب اُن احکام فقہی کے حوالے سے ہے جن کی روز مرہ زندگی میں زیادہ
ضرورت پیش آتی ہے، تیسرا باب حیات طیبہ کے حوالے سے اور چوتھے باب میں صحابہ
کرام و صلحائے اُمت کے مختصر حالات و فضائل بیان کیے گئے ہیں۔
طلباء کی آسانی کیلئے اِس کتاب کو سوالاً جواباً مرتب کرکے دریا کو کوزے میں بند کردیا
گیا ہے، اہم مقامات پر موجود ضروری وضاحت و معلومات کتاب کی افادیت میں چار
چاند لگاتی ہے، ہماری نظر میں یہ کتاب اسکولوں کے طلباء و طالبات کے ساتھ ساتھ ہر
مسلم گھرانے کی لازمی ضرورت ہے، چنانچہ کتاب کی افادیت کے پیش نظر ہماری وزارت
تعلیم سے اپیل ہے کہ اِس اہم اور جامع کتاب کو پنجم تا دہم جماعت کے طلباء کے نصاب کا
حصہ بنایا جائے، ہم تنظیم المدارس پاکستان کے سربراہ جناب مفتی منیب الرحمٰن صاحب
سے بھی اپیل کرتے ہیں کہ اس اہم کتاب کو تنظیم المدارس پاکستان کے زیر انتظام چلنے
والے تمام مدارس کے نصاب میں بھی شامل کیا جائے، قارئین محترم ! "گلشن
اسلام "ایک بہت ہی مفید اور جامع کتاب ہے، جس کا مطالعہ طلباء و طالبات کے ساتھ
ایک عام قاری کیلئے بھی دینی معلومات میں اضافے کا سبب بن سکتا ہے، 64 سال بعد
اِس کتاب کی

دوبارہ اشاعت پر ہم جناب عبدالستار اعوان کو مبارکباد پیش کرتے ہیں،کتاب یونیک کیسٹ مہر بلڈنگ چوہدری ظفرالحق روڈ۔راولپنڈی سے فون نمبر 03005130067 پر رابطہ قائم کرکے حاصل کی جاسکتی ہے۔

شاہ احمد نورانی زمانہ ساز مدبر اور دیدہ ور رہنماء۔۔۔۔

دو ستمبر 2012 .بروز اتوار مولانا نورانی کی 9 ویں.برسی پر خصوصی تحریر

تاریخ انسانی گواہ ہے کہ ہمیشہ اہل حق، کفرو منافقت اور باطل قوتوں کے خلاف نہ صرف سینہ سپر رہے ہیں انھوں نے طاغوتی قوتوں کا ڈٹ کر مردانہ وار مقابلہ کیااوراسلام کے پرچم کو کبھی بھی کسی یزیدی دربار میں سرنگوں نہیں ہونے دیا،اُن اہل حق کی نگاہیں ہمیشہ منزل مقصود پر رہی،کارواں میں کون شامل ہوااور کون چلاگیا، کس نے کس موڑ پر مجبوریوں کا بہانہ بنایا اور کس نے مصائب وآلام سے گھبرا کریا خار دار راہوں میں تھک کرساتھ چھوڑ دیا،نادان دوستوں کی مخالفت، دانا دشمنوں کی تباہ کن سازشیں یا جماعت کی آستینوں میں بت، وہ اِن تمام باتوں اور اندیشوں سے بے نیاز ہوتے ہیں اور الزامات کے خارزاروں، مخالفت کی پر خطر گھاٹیوں اور بغض اور حسد کے کانٹوں کی پرواہ کیے بغیر عازم سفر رہتے ہیں،انھیں وقت کی کوئی بھی رکاوٹ،اذیت ناک ماحول، حوادث اور ناخوشگوار واقعات، لمحے بھر کیلئے بھی بے چین نہیں کر سکتے، وہ خنداں پیشانی کے ساتھ مسکراہٹیں تقسیم کرتے ہوئے دلوں کو فتح کرتے ہیں اور دنیا کے نقشے بدلتے چلے جاتے ہیں،ایسے مردان حق روز روز پیدا نہیں ہوتے

مفکر اسلام علامہ اقبال ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہتے ہیں

تجھے معلوم بھی ہے کچھ کہ صدیوں کے تفکر سے

کلیجہ پھونک کر کرتی ہے فطرت اک بشر پیدا

حقیقت بھی یہی ہے کہ صدیوں کے الٹ پھیر اور افلاک کی ہزاروں گردشوں کے بطن سے ایک ایسا دانائے راز پیدا ہوتا ہے جس کی جہد مسلسل سے ریگستانوں کو سیراب کرنے والے ہزاروں چشمے پھوٹتے ہیں، اُس کے نفس شعلہ بار سے سحر نو کا پیغام لے کر لاکھوں آفتاب طلوع ہوتے ہیں۔

بیسویں صدی کا آغاز اُمت مسلمہ کیلئے جن بدترین حالات میں ہوا، اُس کا آج تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، لیکن اِس تاریک دور میں اللہ ربّ العزت نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے ایسے منتخب افراد سے اُمت کو نوازا جنھوں نے ہر میدان میں چومکھی لڑائی لڑی اور ظلم و استحصالی نظام کا سینہ چیر کر شمع رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی کو اِس طرح سے پھیلایا کہ غفلت، غلامی اور ناامیدی کے سائے چھٹ گئے اور احیائے اسلام اور اُمت مسلمہ کی اجتماعی وحدت و عالمگیر قوت کی حیثیت سے ابھرنے کے آثار نو پیدا ہونے لگے، موجودہ صدی میں جن نفوسِ قدسیہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ کام لیا، اُن میں حضرت علامہ شاہ احمد نورانی

صدیقی کو ایک ممتاز حیثیت اور منفرد مقام حاصل ہے،یکم اپریل 1926 کو مبلغ اسلام علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی صاحب کے گھر پیدا ہونے والے اِس فرزندِ ارجمند نے اپنے ایمان، ضمیر اور نسبی تقاضوں کو سامنے رکھ کر احقاق حق اور ابطالِ باطل کی جو شمع روشن کی وہ احیائے اُمت کی عالمی تحریک بن کے مشرق و مغرب کے دور دراز گوشوں تک پھیل چکی ہے۔

مولانا نورانی کا خاندان قومی اور ملّی حوالوں سے نمایاں خدمات کی شاندار روایات کا امین ہے،آپ کے آباؤ اجداد عرب سے آکر میرٹھ میں آباد ہوئے، یہ وہی میرٹھ شہر ہے،جہاں کے حریت پسند غیور مسلمانوں نے انگریز کے خلاف 1857 میں جنگ آزادی کا آغاز کرکے تحریک پاکستان کی بنیاد رکھی اوراس تحریک آزادی کی آبیاری میں مولانا نورانی کے خاندان کا بھی حصہ رہا، مولانا نورانی کے خاندان کا شمار میرٹھ کے مشہور علمی اور صوفی گھرانوں میں ہوتا تھا،آپ کے دادا شاہ عبدالحکیم میرٹھ کی شاہی مسجد کے خطیب تھے،برصغیر کے مشہور ادیب و شاعر مولانا اسمٰعیل میرٹھی آپکے دادا کے سگے بھائی تھے، مشہور عالم دین مولانا مختار احمد صدیقی، مولانا بشیر احمد صدیقی اور مولانا نذیر احمد خجندی،آپ کے والد مولانا عبدالعلیم صدیقی کے سگے بھائی تھے، مولانا نورانی کے تایا مولانا نذیر احمد خجندی صدیقی بمبئی کی جامع مسجد کے خطیب تھے، جن کے دست اقدس پر قائدِ اعظم کی ہونے والی بیوی رتن بائی نے اسلام قبول اور آپ نے

قائد اعظم کا نکاح پڑھایا، مولانا ندید خجندی نے تحریک خلافت میں فعال کردار ادا کیا اور گرفتار بھی ہوئے۔آپ کے والد علامہ عبد العلیم صدیقی جن کی تدفین جنت البقیع میں اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے قدموں میں ہوئی۔نامور عالم دین، خطیب اور مبلغ اسلام تھے۔آپ کی تبلیغ مساعی کے نتیجے میں ساٹھ ہزار سے زائد غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا۔

مولانا شاہ احمد نورانی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی۔آٹھ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا، تجوید وقرات کی تعلیم مدینہ منورہ میں مشہور قاری الشیخ حسن الشاعر سے حاصل کی۔1944 میں اٹھارہ سال کی عمر میں درس نظامی کی تکمیل کی۔آپ کی دستار بندی مفتی اعظم ہند فرزند اعلیٰ حضرت مولانا شاہ مصطفیٰ رضا
خاں، صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی، والد گرامی مبلغ اسلام مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی اور آپ کے استاد محترم مولانا غلام جیلانی میرٹھی علیہم الرحمہ نے کی۔ میں 19 سال کی عمر میں آپ نے الہ آباد یونیورسٹی سے گریجویشن مکمل 1945
کرتے ہی سیاست میں عملاً حصہ لینا شروع کر دیا۔1946 میں آپ نے مسلم نوجوانوں کی تنظیم " نیشنل گارڈ "کی بنیاد رکھی اور انتخابات میں مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کی کامیابی کیلئے بھرپور جد وجہد کا آغاز کیا۔1947 میں پہلی مرتبہ سیاست میں حصہ لینے پر ڈیفنس انڈیا رولز کے تحت گرفتار ہوئے اور دو ہفتے کیلئے جیل

گئے، علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی 1948 میں والد ماجد کے ہمراہ پاکستان تشریف لائے اور 1953 میں قادیانیوں کے خلاف تحریک ختم نبوت میں بھرپور حصہ لے کر پاکستان میں اپنی مذہبی وسیاسی زندگی کا آغاز کیا۔

بارہ سے زائد زبانیں جاننے اور خالی ہاتھ باعزت وباوقار زندگی گزارنے والے مولانا شاہ احمد نورانی پرکشش وباکمال شخصیت کے مالک تھے، آپ بزرگوں اور اسلاف کے کمالات سے مزین، نجابت و شرافت کا نمونہ، وقار و تمکنت کا خزینہ، ظاہری و باطنی لطافت و نظافت کا مجسمہ، حسن و جمال و فضل و کمال کے عظیم پیکر اور عاجزی و انکساری کی اعلیٰ مثال تھے، مولانا نورانی اپنی ذات کے بارے میں انتہائی کم گو اور منکسر المزاج تھے، آپ کی ساری زندگی اعلائے کلمتہ الحق کی جدوجہد میں گزری، اتحاد اُمت کی تڑپ اور بلاد کفر میں اشاعت اسلام اور عقیدہ ختم نبوت کا تحفظ آپ کی زندگی کے بنیادی نصب العین رہے، آج مولانا نورانی کی ذات مبارکہ صرف پاکستان ہی کیلئے نہیں بلکہ اُمت مسلمہ اور پوری دنیا کے مسلمانوں کیلئے سرمایہ افتخار ہے، آپ ایک نادر روزگار مفکر، بے باک قائد، زمانہ ساز مدبر، ایک حیات آفریں شخصیت کے مالک، انقلاب نظام مصطفیٰ کے نقیب اور سب سے بڑھ کر تسلیم و رضا کے پیکر اور سچے عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے، آپکی 78 سالہ زندگی دین اسلام کے عملی نفاذ، دینی قوتوں اور جمہوری اداروں کی فروغ وبقاء، پاکستان کے استحکام و سالمیت، مسلم

وحدت کی جہد مسلسل اور احیائے اسلام و کفر کے خلاف عالم اسلام کی بیداری سے عبارت ہے۔

مولانا نورانی ایسے ہی منتخب مجاہدین میں سے ہیں، جنھوں نے عصر حاضر میں علمی فکری اور روحانی و مذہبی محاذ پر بھرپور جہاد کیا،آپ زوال آشنا ملت اسلامیہ کی نشاطِ ثانیہ کی علامت اور عصرِ حاضر میں قوت و اقتدار کے بدلتے ہوئے معیاروں کو سامنے رکھتے ہوئے زندگی بھر اسلام کے عادلانہ سیاسی، سماجی، ثقافتی اور اقتصادی نظام کے قیام کیلئے مصروف جہاد رہے،آپ کی تکبیرِ مسلسل دشت وصحرا، شہر اور بیابانوں میں زندگی بھر صدائے حق بلند کرتی رہی،آپ کی ساری زندگی طاغوتی نظام کے علمبرداروں کے خلاف ایک چیلنج، بھٹکے ہوئے کارواں کی نقیب، بھولے ہوئے نغموں کی ایک صدا،ملت کے درد کا درماں، بے قرار دلوں کی دھڑکن اور صدیوں کی حرماں نصیبی کے بعد ایک اُمید کی کرن کی مانند رہی،آپ نے تشکیک و اضطراب کے اِس پر فتن دور میں لاکھوں قلوب و اذہان کو ایمان اور یقین کی لازوال دولت سے سرفراز کیا،عصر حاضر میں آپ نظامِ مصطفیٰ کی اصطلاح کے نہ صرف خالق بلکہ قافلہ انقلابِ نظامِ مصطفیٰ کے میر کارواں بھی رہے،آپ اُمت کو ماسکو اور واشنگٹن کے بجائے گنبدِ خضراء کا راستہ دکھانے والے تھے،آپ فرمایا کرتے تھے "ہماری منزل اسلام آباد نہیں بلکہ اسلام ہے،ہمارے سفر کی منتہائے معراج لندن، پیرس اور واشنگٹن نہیں بلکہ مکّہ

مکرمہ اور مدینہ منورہ ہے۔" اس لیے آپ نے اقتدار کے بجائے ہمیشہ حزبِ اختلاف کی سیاست کی، تحریک ختم نبوت 1953 سے لیکر 11، دسمبر 2003 تک، حزبِ اختلاف کی سیاست کا اتنا طویل، حوصلہ شکن اور صبر آزما سفر کوئی مرد قلندر صاحبِ عزیمت واستقامت ہی طے کر سکتا ہے۔

تاریخ نے لیلائے اقتدار کی بھول بھلیوں میں جہاں وقت کے نامی گرامی افراد کو گم ہوتے، اسلام کو اپنی منزل قرار دینے والوں کو اسلام آباد کے اسٹیشن پر اُترتے اور فوجی آمروں کی آغوش میں وزارتوں کے مزے لوٹتے دیکھا ہے، وہیں تاریخ اِس بات کی بھی گواہ ہے کہ مولانا نورانی وہ واحد دیدہ ور، حق پسند و حق آگاہ اور صاحبِ بصیرت رہنما تھے، جنھوں نے جنرل ایوب خان، جنرل آغا محمد یحییٰ خان، ذوالفقار علی بھٹو، جنرل محمد ضیاء الحق، نواز شریف اور جنرل پرویز مشرف تک ہر آمر وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کلمہ حق بلند کیا، آپ قومی اسمبلی، سینٹ اور عوامی فلور ہر مقام پر بہادر نڈر، بیباک، حق وصداقت اور نہ جھکنے اور نہ بکنے والی قیادت کی علامت تھے، مولانا نورانی زندگی بھر اپنے ہدف اور مشن پر ڈٹے رہے، پائے استقامت میں معمولی سی لغزش بھی آپ کو گوارہ نہ تھی، لیلائے اقتدار کی غلام گردشیں، بھول بھلیاں اور کشش کبھی اِس غلامِ مصطفیٰ کو اپنے دامِ فریب میں نہ الجھا سکی اور وہ دیوانہ مصطفیٰ اسوہ شبیری کی پیروی کرتا ہوا وقت کے ہر آمر کے سامنے کلمہء حق بلند کرتا دکھائی

دیا، مولانا نورانی اُن معدودے چند علماو سیاستدانوں میں سے تھے جن کے دامن پر نہ تو سول و فوجی آمروں سے سمجھوتے کا کوئی داغ تھا اور نہ ہی حکمرانوں کی مراعات اور ایجنسیوں کی نوازشات کی کوئی چھینٹ تھی۔جس طرح ایک سچے عاشق رسول کی زندگی کا ہرپل اور ہر لمحہ اپنے محبوب کی اتباع اور پیروی میں گزرتا ہے۔بالکل اُسی طرح مولانا نورانی کی زندگی کازیادہ تر حصہ پاکستان اور بالخصوص دنیا بھر میں احیائے اسلام اور تحفظ ناموس رسالت کی جدوجہد میں گزرا۔

مولانا نورانی مسلم قومیت اور اتحاد بین المسلمین کے علمبردار اور ملک میں نظام مصطفیٰ کے نفاذکے داعی تھے۔اپنی عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد سے لے کر اپنے وصال تک مولانا نورانی کی زندگی کااِک اِک پل نظام مصطفیٰ کے نفاذ،مقام مصطفیٰ کے تحفظ،عالم اسلام کی یکجہتی اور دین اسلام کے غلبہ و سربلندی کی جدوجہد میں گزرا،مولانا نورانی ایک دیدہ ور، صاحبِ نظروبصیرت،زہد و تقویٰ،مظہر صدق و صفا،مردِ حق آگاہ،نابغہ روزگار،عالم با عمل،قائدِ بے مثال،عالمی مبلغ و داعی اور امام اُمت تھے۔آپ نے فکرو عمل کے جوچراغ روشن کیے وہ صدیوں تک تاریک راہوں پر مسافرانِ حق کیلئے علم و عمل کی روشنی بکھیرتے رہیں گے۔آج آپ کی سادگی،متانت،خوش مزاجی،خوش گفتاری اور اصول پرستی یاد رہ جانے والی باتیں بن کر رہ گئیں ہیں اور آپ کی وفات سے

پاکستانی سیاست ایک تجربہ کار منجھے ہوئے پارلیمنٹیرین اور قدآور بین الاقوامی مذہبی و سیاسی شخصیت سے محروم ہو گئی ہے۔

تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت اور مولانا شاہ احمد نورانی۔۔۔

سات ستمبر یوم تحفظ ختم نبوت کے حوالے سے خصوصی تحریر

عقیدہ ختم نبوت اسلام کی اساس اور وہ بنیاد ہے جس پر دین اسلام کی پوری عمارت کھڑی ہے، یہی وہ عقیدہ ہے جو جسد اسلام کی روح ہے، یہی وجہ ہے کہ اس عقیدہ کی اہمیت اور نزاکت کے پیش نظر مسلمان ہر دور میں تحفظ ختم نبوت کیلئے بڑے حساس اور چوکس رہے ہیں، تاریخ اسلام شاہد ہے کہ جب بھی کسی کمینہ خصلت نے قصر نبوت پر ڈاکہ زنی کی ناپاک جسارت کی تو غیور مسلمانوں کی تلواریں اللہ کا انتقام بن کر اس کی طرف لپکیں اور اس جہنم واصل کر دیا، مسلمانوں کی تاریخ اس عقیدے کے تحفظ کیلئے قربانیاں دینے والوں سے بھری ہوئی ہے، ختم نبوت اتنا اہم مسئلہ ہے کہ قرآن مجید میں سو سے زائد مقامات پر اس کا واضح الفاظ میں ذکر موجود ہے جبکہ خود رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے کم وبیش دو سے زائد احادیث مبارکہ میں اس امر کی وضاحت مختلف پیرائے میں کی کہ پوری امت ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم نبوت کے مسئلہ پر یکسو اور متحد ہو گئی اور یہ پوری امت کا متفقہ عقیدہ قرار پایا، حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ سے لے کر آج تک ہر دور میں دنیا کے حریص اور طالع

آزماؤں نے جھوٹ، فریب، مکر و دجل اور شعبدے بازیوں سے قصر نبوت میں نقب لگانے کی جسارت کی، مگر امت مسلمہ اس جعلسازی کا مقابلہ کرنے کیلئے ہمیشہ مستعد رہی، مسیلمہ کذاب، طلیحہ بن خویلد، اسود عنسی سے لے کر مرزا قادیانی تک امت مسلمہ نے ہر دور میں ان نقب زنوں کا کامیاب تعاقب کیا، 1901 میں جب سے مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے خود ساختہ نبی ہونے کا اعلان کیا، تو علماء و مشائخ نے اس فتنے کے سد باب اور ہر میدان میں قادیانیت کا محاسبہ جاری رکھا۔

بیسویں صدی کا آغاز امت مسلمہ کیلئے جن بدترین حالات میں ہوا، اس کا آج تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس تاریک دور میں اللہ ربّ العزّت نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے امت کو ایسے افراد سے نوازا جنھوں نے کفر و طاغوت اور ظلم و استحصالی نظام کے خلاف ہر محاذ پر چومکھی لڑائی لڑی، اُن نفوس قدسیہ میں حضرت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کو ایک ممتاز اور منفرد مقام حاصل ہے، علامہ شاہ احمد نورانی کی زندگی اسلام کے عملی نفاذ، دینی قوتوں اور جمہوری اداروں کی فروغ وبقاء، پاکستان کے استحکام و سا لمیت، مسلم وحدت کی مسلسل جدوجہد، احیائے اسلام اور کفر کے خلاف عالم اسلام کی بیداری سے عبارت ہے، یکم اپریل 1926 میں مبلغ اسلام سفیر پاکستان حضرت علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی رحمتہ اللہ علیہ کے گھر پیدا ہونے والے اس فرزند ارجمند نے زندگی بھر اپنے ایمان، ضمیر اور نسبی تقاضوں کو سامنے رکھ کر احقاق حق اور ابطالِ باطل

کی شمع روشن رکھی اور اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہمیشہ اسلام اور پاکستان دشمن قوتوں کے آگے آہنی چٹان کی مانند کھڑے رہے۔ مولانا شاہ احمد نورانی کی زندگی کا واحد مشن ملک خداداد پاکستان میں نظام مصطفیٰ کا نفاذ اور مقام مصطفیٰ کا تحفظ تھا۔آپ پہلی بار1971 میں جمعیت علماءپاکستان کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور اپریل 1972 کو قومی اسمبلی کا سہ روزہ افتتاحی اجلاس کے پہلے ہی روز ہی جمعیت 15 علماءپاکستان کے پارلیمانی قائد کی حیثیت سے عبوری آئین کے حوالے سے عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کو اپنا موضوع گفتگو بنایا، یہ پاکستان کی تاریخ میں قومی اسمبلی کے فلور پر عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ میں بلند ہونے والی سب سے پہلی آواز تھی۔ قومی اسمبلی میں اپنے اوّلین خطاب میں علامہ نورانی نے آئین کے اندر مسلمان کی تعریف شامل کرنے کا پر زور مطالبہ کیا اور کہا کہ "جو لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی نہیں مانتے ہم ان کو مسلمان ہی نہیں سمجھتے۔"آپ کے اس مطالبے کا مقصد پاکستان کے اس اعلیٰ ترین انتظامی عہدوں پر عقیدہ ختم نبوت کے مخالف قادیانیوں اور غیر مسلموں کے فائز ہونے کے امکانات کا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خاتمہ تھا۔

دراصل علامہ نورانی کا آئین میں مسلمان کی تعریف شامل کرنے کا مطالبہ قادیانیوں کو کافراور غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی تحریک کا نقطہ آغاز اور

کی تحریک ختم نبوت کی بنیادی اساس تھا،اس اجلاس میں مولانا نورانی نے 1974 مسلمان کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ "مسلمان وہ ہے کہ جو کتاب وسنت اور ضرویات دین پر یقین رکھتا ہو اور قرآن کو ان تشریحات کے مطابق مانتا ہو جو سلف صالحین نے کی ہیں، نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی تسلیم کرتا ہو،اگر اسلامی آئین میں مسلمان کی یہ تعریف شامل نہ کی گئی تو ہم ایسے آئین کو اسلامی آئین نہیں کہیں گے۔"چنانچہ 17 اپریل 1972 کو جمعیت علماءپاکستان اور متحدہ اپوزیشن کی جانب سے مسلمان کی جامع تعریف کو پہلی بار اسمبلی میں پیش کی گئی،جسے بعد میں 1973 کے آئین میں شامل کرلیا گیا،علامہ نورانی کی کوششوں کی بدولت مسلمان کی تعریف پاکستان کے آئین کا حصہ بن چکی تھی اور آئین میں اس تعریف کی شمولیت نے قادیانیوں کو ایک ایسی غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا تھا،جس کا مستقبل میں صرف اعلان ہونا ہی باقی رہ گیا تھا،دوسری طرف اس تعریف کی شمولیت سے قادیانیوں کو بھی یقین ہو چلا تھا کہ وہ ایک غیر اعلانیہ غیر مسلم اقلیت قرار پا چکے ہیں،علامہ شاہ احمد نورانی پاکستان کی پارلیمانی اور آئینی تاریخ میں پہلے سیاستدان تھے،جنھوں نے سب سے پہلے آئین میں مسلمان کی تعریف شامل کرنے کا مطالبہ کیا اور آپ نے آئین سازی کیلئے قائم کمیٹی میں سب سے پہلی ترمیم مسلمان کی تعریف اور اسلام کو ریاست کا سرکاری مذہب قرار دینے سے متعلق پیش کی۔

مولانا نورانی کو منکرین ختم نبوت قادیانیوں اور قادیانیت سے شدید نفرت تھی اور اسی نفرت نے انہیں زندگی بھر فتنہ قادیانیت کے خلاف مصروف جہاد رکھا، قیام پاکستان کے بعد اُمت مسلمہ کو امید تھی کہ ایک اسلامی نظریاتی ملک ہونے کی وجہ سے حکومت وقت عوام کے مذہبی جذبات واحساسات کا خیال کرتے ہوئے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے گی، لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا اور وقت کے ساتھ ساتھ قادیانیوں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا، یہاں تک قادیانیوں کی اسلام اور ملک دشمن سرگرمیوں کی وجہ سے اُمت مسلمہ کی نفرت نے 1953 کی تحریک ختم نبوت کو جنم دیا، جسے حکومت نے طاقت کے بل پر وقتی طور پر دبالیا، لیکن قادیانی ذرّیت سے یہ نفرت اُمت مسلمہ کے دلوں میں سلگتی رہی، علامہ نورانی جو کہ نوجوانی میں تحریک ختم نبوت 1953 میں جید اکابر علماء کے ساتھ "علماء بورڈ کے ممبر اور مجلس عمل تحفظ ختم نبوت سندھ کے جنرل سیکر ٹیری" کی حیثیت سے مرکزی کردار ادا کرچکے تھے، اس تحریک کی ناکامی کے اسباب و عوامل سے پوری طرح واقف تھے، چنانچہ آپ نے تحفظ ختم نبوت اور عظمت مصطفیٰ کو مملکت کا قانون بنانے اور آئینی تحفظ دینے کیلئے کام کرنا شروع کردیا، اس سفر کی کامیاب ابتداء آئین میں مسلمان کی تعریف کی شمولیت، ریاست کا سرکاری مذہب اسلام ،دیگر اسلامی دفعات کو آئینی تحفظ دینے کے علاوہ عائلی قوانین کی تنسیخ، تینوں مسلح افواج کے سربراہوں کیلئے مسلمان ہونے کی شرط، فتنہ ارتداد کو روکنے کی ضمانت حاصل کرنے اور پاکستان کے دستور

کو دو قومی نظریے سے ہم آہنگ کرنے کی کوششوں سے ہو چکی تھی اور آپ اپنے اہداف پر نظر رکھے ہوئے مرحلہ وار اس منزل کی جانب رواں دواں تھے۔
دوسری جانب مرزائی آئین میں مسلمان کی تعریف کی شمولیت سے پہلے ہی سخت پریشان تھے کہ 29 اپریل 1973 کو آزاد کشمیر اسمبلی میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی قرار داد کی منظوری نے ان کے تمام خدشات کو یقین میں بدل دیا اور انہیں محسوس ہونے لگا کہ عنقریب اب پاکستان کی قومی اسمبلی میں موجود علماء ان کے مستقبل کے بارے میں قرار داد پیش کر کے ان کیلئے رہے سہے راستے بھی بند کر دیں گے۔اس صورتحال نے مرزا ناصر کو اس قدر سیخ پا کر دیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف ہذیان بکنے لگا۔اتفاق سے اسی دوران سانحہ ربوہ پیش آگیا،جس نے قادیانیوں کے خلاف عوامی نفرت کو مزید گہرا کر دیا،بعد میں یہی سانحہ تحریک ختم نبوت 1974 کی اصل بنیاد بنا۔علامہ شاہ احمد نورانی جو کہ تمام حالات کا نہایت ہی باریک بینی سے جائزہ لے رہے تھے،نے محسوس کیا کہ اب قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوانے کیلئے آئینی اور قانونی جنگ لڑنا انتہائی ضروری ہوگیا ہے،چنانچہ آپ نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی تاریخ ساز قرار داد تیار کر کے 30،جون 1974 کو متفقہ اپوزیشن کی جانب سے قومی اسمبلی میں پیش کی،جسے ایوان نے متفقہ طور پر منظور کرلیا اور مزید کاروائی کیلئے قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی جو کہ پورے ایوان پر

مشتمل تھی، تشکیل دے دی۔

اس کمیٹی نے دو ماہ میں قادیانی مسئلے پر غور خوص کیلئے 28 اجلاس اور 96 نشستیں منعقد کئے،اس دوران قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی کے روبرو قادیانی گروہ کے سرخیل مرزا ناصر،لاہوری گروپ کے امیر صدرالدین اور انجمن اشاعت اسلام لاہور کے عبدالمنان اور مسعود بیگ پر ان کے عقائد و نظریات،ملک دشمنی اور یہودی و سامراجی گٹھ جوڑ کے حوالے سے جرح ہوئی،علامہ نورانی فرماتے ہیں کہ "مسلسل گیارہ روز تک مرزا ناصر پر جرح ہوتی رہی،اور سوال اور جوابی سوال کیا جاتا رہا،مرزا کو صفائی پیش کرتے کرتے پسینہ چھوٹ جاتا اور آخر تنگ آ کر کہہ دیتا کہ بس اب میں تھک گیا ہوں،اسے گمان نہیں تھا کہ اس طرح عدالتی کٹہرے میں بٹھا کر اس پر جرح کی جائے گی۔۔۔۔۔ وہ اپنا عقیدہ خود اراکین اسمبلی کے سامنے بیان کرگیا اور اس بات کا اعلان کرگیا کہ مرزا (غلام احمد قادیانی) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسیح موعود اور امتی نبی ہے،جن اراکین اسمبلی کو قادیانیوں کے متعلق حقائق معلوم نہیں تھے،انہیں بھی معلوم ہوگیا اور انہیں اس بات کا یقین ہوگیا کہ مولانا نورانی جنہیں اقلیت قرار دلوانے کی سعی کررہے ہیں وہ لوگ واقعی کافر،مرتد اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔"قادیانی مسئلے پر فیصلہ کرنے کیلئے قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی نے قادیانی مسئلہ کو جانچنے اور پرکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں

چھوڑا، کمیٹی کی کارکردگی اور اس کی کاروائیوں پر حزب اختلاف کے لیڈروں نے بھی پورے اطمینان کا اظہار کیا،اس طویل جمہوری وپارلیمانی کاروائی کے بعد قومی اسمبلی نے پورے تدبر سے کام لیتے ہوئے 7، ستمبر 1974 کو وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی موجودگی میں آئین کی وہ واحد دوسری ترمیم منظور کی جس کی مخالفت میں ایک بھی ووٹ نہیں ڈالا گیا اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا تاریخ ساز فیصلہ کرتے ہوئے کہا کہ "جو شخص خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حتمی اور غیر مشروط ختم نبوت میں یقین نہیں رکھتا یا نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، کسی بھی لفظ یا بیان کے ذریعے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک ایسے دعویدار کو نبی تسلیم کرتا ہے،یا کہ مذہبی مصلح جانتا ہے،وہ آئین یا قانون کی رو سے مسلمان نہیں ہے۔" یوں مولانا شاہ احمد نورانی کی پیش کردہ قرار داد کی منظوری نے ختم نبوت کے ہر منکر کو خارج اسلام قرار دے دیا،آپ کے ہاتھوں پاکستان کی قومی اسمبلی کے ذریعے اس نوے سالہ فتنے کا اختتام ہوااور تحریک ختم نبوت اپنے منطقی انجام تک پہنچی، پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن چیئرمین رویت ہلال کمیٹی لکھتے ہیں کہ " علماء اُس سے پہلے بھی موجود تھے...... مگر یہ سعادت ماضی میں کسی کے حصے میں بھی نہیں آئی،تاریخ پاکستان میں پہلی بار ایک مرد حق،پیکر صدق و صفا،کوہ استقامت اور حاصل جرات و شجاعت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی اسمبلی

میں پہنچے اور فتنہ انکار ختم نبوت یعنی قادیانیت کو کفر و ارتداد قرار دینے کی بابت قرار داد قومی اسمبلی میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔تاریخ اسلام میں ریاست و مملکت کی سطح پر فتنہ انکار ختم نبوت کو کفر و ارتداد قرار دینے اور ان کے خلاف علم جہاد بلند کرنے کا اعزاز جانشین رسول خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا اور اُن کے بعد یہ اعزاز انہی کی اولاد امجاد میں علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کو نصیب ہوا۔"بے شک علامہ شاہ احمد نورانی عصر حاضر میں عاشقان مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سردار ہیں،آپ نے مقام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے تحفظ کیلئے بے پناہ خدمات سرانجام دیں اور اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر زندگی کے آخری لمحے تک اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔

تحفظِ ختمِ نبوت، اکابرین ملت اور ہماری ذمہ داریاں۔۔۔

سات ستمبر یوم ختم نبوت کے حوالے خصوصی تحریر
عقیدہ ختم نبوت اسلام کی بنیاد و اساس ہے جس پر مکمل ایمان رکھے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا، قرآن مجید کی 100 کے قریب آیات مبارکہ اور 200 سے زائد احادیث سے ثابت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالی کے آخری نبی اور رسول ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی قسم کا کوئی نیا نبی نہیں، تمام صحابہ کرام، تابعین عظام، تبع تابعین، ائمہ مجتہدین اور چودہ صدیوں کے
مفسرین، محدثین، متکلمین، علماء اور صوفیاء سمیت پوری اُمت مسلمہ کا اِس بات پر اجماع رہا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ساتھ ہی نبوت و رسالت کا دروازہ ہمیشہ کیلئے بند ہوگیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نئے نبی کے آنے کی ضرورت باقی نہیں رہی، لہٰذا اب اگر کوئی شخص کسی بھی معنوں میں دعوائے نبوت کرتا ہے تو وہ بالاتفاق اُمت کافر و مرتد، کذاب و دجّال اور دائرہ اسلام سے خارج قرار پاتا ہے، حضور خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سلسلہ نبوت کی آخری کڑی ہیں، آپ کے بعد کسی شخص کو اِس منصب پر فائز نہیں کیا جائے

گا،جس طرح قرآن کریم کی نصوص قطعیہ سے عقیدہ ختم نبوت ثابت ہے، بالکل اسی طرح احادیث متواترہ سے بھی یہ بات ثابت ہے،آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں" میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں۔" (ابوداود جلد2،ص: 228)" رسالت ونبوت ختم ہوچکی ہے پس میرے بعد نہ کوئی رسول ہے اور نہ نبی۔" (ترمذی، جلد2، ص51)" میں آخری نبی ہوں اور تم آخری امت ہو۔" (ابن ماجہ: 297)

اِن ارشاداتِ نبوی میں اِس اَمر کی تصریح فرمادی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی اور رسول ہیں اور آپ کی اُمت آخری امت،آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ آخری قبلہ،آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ کتاب آخری آسمانی کتاب ہے، یہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ کے ساتھ منصب ختم نبوت کے اختصاص کے تقاضے ہیں، جو اللہ تعالٰی نے پورے کر دیے، امام اہلسنّت الشاہ احمد رضا فاضل بریلوی کے مطابق "حضور پر نور خاتم النبیین سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم یعنی بعثت میں آخر جمیع انبیاء و مرسلین بلا تاویل و بلا تخصیص ہونا ضروریات دین سے ہے، جو اِس کا منکر ہو یا اِس میں ادنی شک وشبہ کو بھی راہ دے،کافر مرتد ملعون ہے۔" (فتاوٰی رضویہ جلد 6 ۔ص 57) اِن تصریحات، تشریحات اور دلائل واقوال سے یہ بات ثابت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں،آپ کے بعد قیامت تک نبوت و

رسالت کا سلسلہ بند ہوچکا ہے،اِس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کرم کے بعد جو شخص
بھی نبوت و رسالت کا دعویٰ کرے اور پھر اس دعوے کے بارے میں کتنی ہی تاویلیں
کیوں نہ کرے،اپنی نبوت کو ظلّی، بروزی، تشریعی، غیر تشریعی، یا لغوی ثابت کرنے کیلئے
لاکھ جتن کرے، لیکن اسے کافر، مرتد اور زندیق ہی قرار دیا جائے گا۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے انبیاء علیہم السلام تشریف لائے،اُن میں سے ہر
نبی نے اپنے بعد آنے والے نبی کی بشارت دی اور گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی تصدیق
کی، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی تصدیق تو فرمائی لیکن
کسی نئے آنے والے نبی کی بشارت نہیں دی، بلکہ فرمایا" قیامت اُس وقت تک قائم نہیں
ہوگی جب تک کہ 30 کے قریب دجال اور کذاب پیدا نہ ہوں، جن میں سے ہر ایک یہ
دعویٰ کرے گا کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔" ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا" قریب ہے کہ
میری امت میں 30 جھوٹے پیدا ہوں، ہر ایک یہی کہے گا کہ میں نبی ہوں، حالانکہ میں
خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں۔" اِن ارشادات میں حضرت محمد مصطفیٰ
صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے "مدعیان نبوت " کے لئے دجال اور کذاب کا لفظ استعمال
فرمایا، جس کا معنی ہے کہ" وہ لوگ شدید دھوکے باز اور بہت زیادہ جھوٹ بولنے
والے ہوں گے،اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرکے مسلمانوں کو اپنے دامن فریب میں
پھنسائیں گے۔"

لہٰذا اُمت کو خبردار کر دیا گیا کہ وہ ایسے عیار و مکار جھوٹے مدعیان نبوت اور اُن کے ماننے والوں سے دور رہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اِس پیشنگوئی کے مطابق عہد رسالتمآب سے لے کر آج تک سینکڑوں کذاب اور دجال مدعیان نبوت پیدا ہوئے، جن کا حشر تاریخ اسلام سے واقفیت رکھنے والے خوب جانتے ہیں۔

لیکن بیسویں صدی میں فرنگی سرپرستی میں قادیان کے ایک ضمیر فروش مرزا غلام احمد قادیانی نے جس نبوتِ کاذبہ کا دعویٰ کیا، اُس کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا تھا کہ جو بھی شخص مرزا کی نبوت پر ایمان نہ لائے وہ کافر قرار دیا جائے، چنانچہ قادیانیوں نے بھی یہی کیا، انہوں نے اُن تمام مسلمانوں کو اپنی تحریر و تقریر میں اعلانیہ کافر قرار دیا، جنھوں نے مرزا قادیانی کو نبی نہیں مانا، قادیانیوں کا مسلمانوں سے اختلاف صرف مرزا کی نبوت کے معاملے میں ہی نہیں تھا، بلکہ خود قادیانیوں نے اپنا خدا، اپنا اسلام، اپنا قرآن، اپنی نماز، اپنا روزہ، غرض کہ اپنی ہر چیز مسلمانوں سے الگ قرار دی، جس کا منطقی نتیجہ ظاہر ہے کہ اُن کے غیر مسلم اقلیت ہونے کی شکل میں نکلا، مرزا قادیانی نے اسلام کو نا قابل تلافی نقصان پہنچایا، برصغیر میں مرزا کی عجمی نبوت کا مقصد انگریزی اقتدار کی مضبوطی کیلئے مسلمانوں کی فکری وحدت کو پارہ پارہ کرنا اور جذبہ جہاد کا خاتمہ تھا، مرزا کی ساری زندگی انگریز کی حاشیہ برداری میں گزری، اُس نے اپنی زندگی کا اِک اِک لمحہ حکومت برطانیہ کی مدح سرائی

اور جاسوسی میں صرف کیا، انگریز کا دور حکومت مرزا کے نزدیک "سایہ رحمت اور ایسے امن و استحکام کا باعث تھا، جو اُسے مکہ و مدینہ میں بھی نہیں مل سکتا۔" ایسی صورت میں مرزا کے متبعین یہ کب گوارہ کرتے کہ انگریز اِس سرزمین سے چلے جائیں، چنانچہ مرزا کی جماعت نے برصغیر میں انگریز کے قیام کو طول دینے کیلئے اُسے ہر ممکن مدد و معاونت فراہم کی، حقیقت یہ ہے کہ قصر نبوت میں نقب لگانے کی کوشش کرنے والے مرزا کی ذریت نے "اکھنڈ بھارت" کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کیلئے تحریک پاکستان کی ہی مخالفت نہیں کی بلکہ انھوں نے قیام پاکستان کے بعد بھارت و اسرائیلی گٹھ جوڑ سے عالمی سطح پر پاکستان کے خلاف سازشیں کرکے وجود پاکستان کو نقصان پہنچانے میں بھی کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔

یہاں یہ تاریخی حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ قادیانیت کے خلاف تحریک تحفظ ختم نبوت کی رہبری و قیادت میں علماء و مشائخ اہلسنّت ہمیشہ پیش پیش رہے، علمائے اہلسنّت و جماعت کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ سب سے پہلے مومنانہ فراست سے کام لیتے ہوئے مرزا کے کفر و نفاق اور اُس کے مزموم عقائد کا پردہ چاک کرکے اُس کا اُس وقت زبردست ردّ کیا، جس وقت کچھ لوگ مرزائے قادیانی کو" مرد صالح "اور اُس کی کتاب "براہین احمدیہ" کو صدی کا شاہکار قرار دے رہے تھے، عین اُسی وقت علمائے حق اہلسنّت و جماعت کے نمائندے عارف کامل" علامہ غلام

دستگیر قصوری رحمتہ اللہ علیہ " مرزا قادیانی کی کتاب "براہین احمدیہ" میں کئے گئے مرزا کے دعووں کا بطلان اپنی کتاب "رجم الشیاطین براغلوطات البراہین" میں پیش کرکے اُس کے کفر و گمراہی کا پردہ چاک کیا،علامہ غلام دستگیر قصوری رحمتہ اللہ علیہ برصغیر کے سب سے پہلے عالم دین تھے جنھوں نے مرزا کی کتاب "براہین احمدیہ" کے ابتدائی حصے پڑھ کر اُس کے کفرگمراہی کو بھانپ لیا تھا اور انہوں نے بروقت اِس فتنے کا ردّ کرکے برصغیر کے مسلمانوں کو مرزا کے ناپاک عزائم سے آگاہ کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ تعاقب فتنہ قادیانیت کے سب سے پہلے سرخیل علامہ غلام دستگیر ہاشمی قصوری سے لے کر پیر سیدنا مہر علی شاہ صاحب،اعلیٰ حضرت امام احمد رضاخاں فاضل بریلوی، حجۃ الاسلام علامہ حامد رضاخان،امیر ملت پیر جماعت علی شاہ صاحب، مبلغ اسلام علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی،پروفیسر محمد الیاس برنی، قاضی فضل احمد لدھیانوی،تاج العلماء مولانا مفتی عمر نعیمی، مفتی مظفر احمد دہلوی، قائد تحریک ختم نبوت علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری، مجاہد ملت حضرت علامہ عبدالستار خان 1953 نیازی، غازی تحریک ختم نبوت 1953 سید خلیل احمد قادری، حضرت شیخ الاسلام خواجہ قمرالدین سیالوی، مفتی ظفر علی نعمانی، صوفی محمد ایاز خان نیازی اور علامہ عبدالمصطفیٰ الازہری، رحمھم اللہ تعالیٰ اجمعین تک ہزاروں علماء و مشائخ اہلسنّت شامل ہیں، لیکن عصر حاضر میں

جس کے نام پر قادر مطلق نے تحریک ارتداد قادیانیت کا سہرا مقدر فرمایا وہ شخصیت حضرت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی رحمتہ اللہ علیہ کی ہے،تاریخ اسلام میں ریاست و مملکت کی سطح پر فتنہ انکار ختم نبوت کو کفر وارتداد قرار دینے اور اُس کے خلاف سب سے پہلے علم جہاد بلند کرنے کا اعزاز جانشین رسول خلیفہ اوّل سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوااور اُن کے بعد یہ اعزاز اُنہی کی اولاد امجاد میں علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کو نصیب ہوا۔

علامہ شاہ احمد نورانی نے 30جون 1974 کو قومی اسمبلی میں قادیانیت کے خلاف قرار داد پیش کرنے سے لے کراُس کی منظوری تک نہایت ہی محنت و جانفشانی سے کام کیا،اِس دوران آپ نے قومی اسمبلی کے اجلاسوں میں باقاعدگی سے شرکت کے ساتھ،اراکین اسمبلی کواعتماد میں لینے،انہیں مسئلہ ختم نبوت کی اہمیت و حیثیت سے روشناس کرانے،رات گئےتک اٹارنی جنرل یحیٰی بختیار کے ساتھ قادیانیوں سے پوچھے جانے والے سوالات کی تیاری کے ساتھ،مرزا ناصر اور صدرالدین لاہوری کے محضر نامے کے جواب میں 75 سوالات پر مشتمل سوالنامہ کی تیاری میں بھی بھرپور حصہ لیا،آپ نے قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی اور رہبر کمیٹی کے رکن ہونے کے باوجود عوامی رائے عامہ ہموار کرنے کیلئے ملک بھر کے طوفانی دوروں میں چالیس ہزار میل کا سفر طے کیا اور ڈیڑھ سو سے زائد شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں عوامی جلسوں سے خطاب کرکے مسلمانوں کو

قادیانیوں کے گمراہ کن عقائد، فتنہ پردازیوں اور شرانگیزیوں سے آگاہ کیا،پاکستان کی تاریخ میں اسمبلی فلور پر عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کیلئے سب سے پہلے مسلمان کی تعریف کو آئین کا حصہ بنانے کا مطالبہ کرنے والے علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کی پیش کردہ قرار کے نتیجے میں 7 ستمبر 1974 کو ملک کی منتخب پارلیمنٹ نے متفقہ طور پر قادیانیوں کو اُن کے کفریہ عقائد کی بناء پر غیر مسلم اقلیت قرار دیا اور یوں نوے سالہ فتنہ اپنے منطقی انجام کو پہنچا۔

قارئین محترم ! علماءاسلام کی گرفت اور پارلیمنٹ کے متفقہ فیصلے کے بعد قادیانی جماعت نے اپنے لٹریچر کو چھپانے کی منظم کوشش کی اور اپنے اسلام دشمن عقائد پر تقیہ کا پردہ ڈال کر اہل اسلام میں نقب زنی کا عمل جاری رکھا ہوا ہے،ایسے میں ضرورت اس اَمر کی ہے کہ قادیانیت کے کفر وارتداد کو مستند شہادتوں کے ساتھ عوام کے سامنے لایا جائے اور قادیانیوں کی اسلام دشمن سرگرمیوں،اسلام کے خلاف ہرزہ سرائیوں، مضحکہ خیزیوں اور کفریہ عقائد و عزائم کا بھرپور محاصرہ کیا جائے اور اُن کے راہ فرار کے تمام دروازے بند کردیئے جائیں،اس کام کیلئے ہم سب کو اپنا بھرپور، فعال اور متحرک کردار ادا کرنا ہوگا،دعا ہے کہ اللہ کریم فتنہ قادیانیت کی سرکوبی اور بیخ کنی کیلئے ہمیں بھی اپنے اسلاف کی طرح سرفروشانہ کردار ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(آمین بحرمۃ خاتم النبیین سید المرسلین وعلی وآلہ واصحابہ اجمعین)

تعمیر ملت کیلئے تاریخ ساز جدوجہد، قومی و ملّی تاریخ کا انمٹ باب

JUP کی دینی، سیاسی اور قومی و ملّی خدمات کی امین ضخیم تاریخی دستاویز

"پاکستان اُسی دن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا..... جب پہلا فرد مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہیں رہا، وہ ایک جداگانہ قوم کا فرد ہوگیا۔" قائدِاعظم محمد علی جناح کا یہ قول برعظیم میں ملتِ اسلامیہ کی مبداء واساس اور جداگانہ مسلم مملکت کے وجود کی جانب اشارہ کرتا ہے۔برصغیر میں مسلم مملکت کے بانی محمد بن قاسم سے لے کر مغلیہ خاندان کے آخری حکمران بہادر شاہ ظفر تک، مسلمانوں کی حکومت رہی۔اس دوران علماء و مشائخ عقائد و اعمال اور تزکیہ نفس کی اصلاح کا فریضہ سرانجام دیتے رہے، مگر انگریز کی آمد اور برعظیم پر مکمل قبضے کے بعد وقت کے تقاضے علماء و مشائخ کو مسند دعوت وارشاد سے اٹھا کر رسم شبیری ادا کرنے کیلئے میدان عمل میں لے آئے، 1857 کے معرکہ کارزار میں علامہ فضل الحق خیرآبادی، مولانا سیّد کفایت علی کافی، مفتی صدرالدین آزردہ، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولانا فضل رسول بدایونی، مفتی لطف اللہ علی گڑھی، مولانا شاہ احمد اللہ مدراسی، مولانا عبدالجلیل شہید گڑھی، مولانا فیض احمد بدایونی، منشی رسول بخش کاکوری، مولانا

رضا علی خان اور مولانا نقی علی خان وغیرہ نے آزادی حریت کی شمع روشن کی، جبکہ 1857 کے بعد مولانا احمد رضا خان فاضل بریلوی نے اِس قافلہ حریت کی فکری آبیاری فرمائی اور دو قومی نظریئے کا شعور دیا۔
آپ کے بعد آپ کے خلفاء اور علمائے اہلسنّت حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا خان، صدرالافاضل مولانا نعیم الدین مرادآبادی، مبلغ اسلام علامہ عبدلعلیم صدیقی، سیّد محمد محدث کچھوچھوی، مولانا امجد علی خان، ابوالحسنات سید محمد احمد قادری، ابوالبرکات سید احمد قادری، علامہ عبدالحامد بدایونی، امیر ملت پیر جماعت علی شاہ، خواجہ قمرالدین سیالوی، مولانا سید احمد سعید کاظمی، مولانا عبدالستار خان نیازی، مولانا عبدالغفور ہزاروی، مولانا ابراہیم علی چشتی، مولانا غلام محمد ترنم، مفتی سرحد مفتی شائستہ گل، پیر عبدالرحیم پیر آف بھرچونڈی شریف، پیر آف مانکی شریف اور پیر آف زکوڑی شریف وغیرہ نے برصغیر کے مسلمانوں میں سیاسی شعور کی بیداری میں بہت اہم کردار ادا کیا اور تحریکِ پاکستان میں ہراوّل دستے کا کردار ادا کرتے ہوئے آل انڈیا مسلم لیگ اور قائدِ اعظم محمد علی جناح کے شانہ بشانہ کام کیا۔ان اکابرین اہلسنّت کی یہ تاریخی جدوجہد جماعت رضائے مصطفٰی، شدھی و سنگھٹن تحریکیں، تحریک خلافت، موالات و ہجرت اور آل انڈیا سنی کانفرنس کے قیام 1925 سے لے کر بنارس سنی کانفرنس 1946 کے تاریخ ساز اجلاس اور 14 اگست 1947 کو قیام پاکستان تک

پھیلی ہوئی ہے۔

بے شک قیام پاکستان علماء و مشائخ اور عوام اہلسنّت کی لازوال جدوجہد اور قربانیوں کا ثمر ہے، کوئی غیر جانبدار مورخ اِس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ تحریک پاکستان کے سفر میں تکمیل پاکستان تک کوئی ایک موڑ بھی ایسا نہیں تھا، جہاں حضرات علماء و مشائخ اہلسنّت قوم کی رہبری و رہنمائی کیلئے موجود نہ تھے، مگر بدقسمتی سے قیام پاکستان کے بعد اقتدار کی غلام گردشوں میں کھیلے جانے والے کھیل نے پاکستان کو اُس کے حقیقی نصب العین سے دور کردیا اوراِس دوران ایک ایساطبقہ ابھر کر سامنے آیا، جس کے وابستگان نے تحریک پاکستان میں کہیں بھی کوئی سرگرمی نہ دکھائی، یہ وہی لوگ تھے، جنھوں نے علی الاعلان تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کی مخالفت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں چھوڑا، پاکستان کو پلیدستان قرار دیا، اُن کے نزدیک مسلمانوں کے محبوب قائد قائداعظم کافراعظم " تھے، قیام پاکستان کے بعد یہ طبقہ نوزائدہ مملکت کے اقتدار میں حصہ دار " بن گیا، اِن حالات کو سنی علماء کیلئے نظر انداز کرنا آسان نہ تھا اور وہ نئے سیاسی ڈھانچے میں اپنے مقام کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے پر مائل ہوئے، چنانچہ علامہ سید احمد سعید کاظمی نے آل انڈیا سنی کانفرنس کے احیاء کا بیڑا اٹھایا اورابوالحسنات سیّد محمد احمد قادری کی توجہ ایک خط کے ذریعے اس صورتحال کی جانب مبذول کراتے ہوئے اہلسنّت کو ایک

امیر کی قیادت میں منظم اور مجتمع ہونے کی دعوت دی تاکہ مملکت خداداد پاکستان کو شریعت کے نفاذ کے ذریعے صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بنایا جاسکے۔
یوں 28، مارچ 1948 کو ملتان میں اہلسنّت و جماعت کی نمائندہ تنظیم "جمعیت علماء پاکستان" کی بنیاد رکھی گئی۔ جمعیت علماء پاکستان، پاکستان کی پہلی مذہبی سیاسی جماعت تھی جو قیام پاکستان کے بعد قائم کی گئی۔ جمعیت علماء پاکستان نے قیام پاکستان کے وقت پیش آنے والے مسائل کے ساتھ ساتھ قیام پاکستان کے اصل مقصد کو کبھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا، یہ اعزاز بھی جمعیت کو جاتا ہے کہ اُس نے سب سے پہلے ملک میں نظام مصطفیٰ کے نفاذ کا مطالبہ کیا اور 7، مئی 1948 کو یوم شریعت کے عنوان سے پورے ملک میں تحریک شروع کی۔ 1948 میں جمعیت علماء پاکستان نے جہاد کشمیر میں بھرپور حصہ لیتے ہوئے مجاہدین کیلئے عملی تعاون اور مالی امداد فراہم کی۔ جمعیت نے 1949 میں قرارداد مقاصد کی منظوری، 1951 میں علامہ عبدالعلیم صدیقی، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا ابوالحسنات قادری وغیرہ کی قیادت میں مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام کے ساتھ مل کر بائیس (22) نکات کی تیاری، 1953 کی تحریک ختم نبوت اور 1956 میں پاکستان کے آئین کی تدوین اور فقہ حنفی کو پبلک لاء بنانے کیلئے تاریخ ساز خدمات انجام دیں اور اِس جدوجہد کے دوران جمعیت کے رہنماؤں نے قید و بند کی

صعوبتیں برداشت کرکے دارورسن کی روایت کو زندہ رکھا۔

اِس دوران جمعیت علماءپاکستان انتخابی سیاست سے دور رہ کر مذہبی و سماجی میدانوں میں مصروف عمل رہی، جمعیت 1948 سے 1970 تک کئی نشیب وفراز سے گزری، مگر 1970 میں جمعیت مولانا شاہ احمد نورانی کی قیادت میں پہلی بار سیاسی میدان میں اتری اور ملک میں نظام مصطفیٰ کے نفاذ اور مقام مصطفیٰ کے تحفظ کی جدوجہد آغاز کیا، مولانا نورانی کی قیادت میں جمعیت کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ اُس نے صرف چار (4) ممبران اسمبلی کی مدد سے دو تہائی کی اکثریت رکھنے والے وزیر اعظم کو آئین میں اسلامی دفعات کی شمولیت پر نہ صرف رضا مند کیا بلکہ اسمبلی فلور پر اسلامی دفعات کو آئینی تحفظ دلانے اور عائلی قوانین کی تنسیخ، تینوں مسلح افواج کے سربراہوں کیلئے مسلمان ہونے کی شرط، صدر اور وزیر اعظم، گورنرز، چیف جسٹس ارکان سینٹ و قومی و صوبائی اسمبلی کے حلف ناموں کی منظوری اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوانے کا اعزاز بھی حاصل کیا، جمعیت نے مولانا نورانی کی سربراہی میں پاکستان کے دستور کو دو قومی نظریئے سے ہم آہنگ کرنے کیلئے بھرپور پارلیمانی جدوجہد کی، یہ اعزاز بھی جمعیت کے سربراہ مولانا نورانی کو جاتا ہے کہ انہوں نے تحریک پاکستان میں مسلم لیگ کے شانہ بشانہ شاندار کردار ادا کرنے والے علماء و مشائخ کی جماعت، جمعیت علماءپاکستان کو حکمرانوں کے حرم سے نکال کر

عوامی اور جمہوری جدوجہد کی راہ پر ڈالا اور سول و فوجی آمروں کے سامنے کلمہ حق بلند
کرکے ہمیشہ شبیری روایت کو زندہ رکھا۔اس جماعت کے قائد نے ملکی مسائل کے ساتھ
قومی وملی مسائل بھی اپنی توجہ مرتکز رکھی۔اسلام اور شعائر اسلامی کے خلاف دشمنانان
اسلام کی سازشوں کو بے نقاب کیا،ہمیشہ عالم اسلام کے تحفظ و بقاء اور دنیا بھر کے مظلوم
مسلمانوں کے حق خودارادیت کی جنگ لڑی اور وہ تاریخ ساز کردار ادا کیا جو ہماری قومی
وملی تاریخ کا انمٹ باب ہے۔

کہتے ہیں"تاریخ قوم کا حافظہ ہوتی ہے اور جو قوم اپنی تاریخ بھلادیتی ہے گویا وہ اپنے
حافظے سے محروم ہوجاتی ہے۔"ویسے بھی دیگر اقوام کی نسبت ہماری قوم کیلئے تاریخ کا
شعور جغرافیائی احساس پر اِس لیے بھی فوقیت رکھتا ہے کہ ہمارا جغرافیہ ہماری تاریخ کا
نتیجہ اور ہماری وحدت کی اصل بنیاد ہے،یہ درحقیقت وہ تاریخی تسلسل ہے جو ہمارے
سیاسی جغرافیئے کیلئے وجہ تخلیق کی حیثیت رکھتا ہے،جب تک ہم اِس تسلسل کے معنی نہیں
سمجھتے اُس وقت تک اپنی تاریخ اور جغرافیئے سے ہمارا وہ تعلق قائم نہیں ہوسکتا،جو صحیح
معنوں میں ایک قومی وحدت کیلئے لازم وملزوم ہے،تعمیر ملت کیلئے جمیعت علماءپاکستان
کی سیاسی جدوجہد قوم کے اِسی دھندلائے ہوئے حافظے کو تازہ کرنے کی ایک پُرخلوص
کوشش ہے،ہماری نظر میں سہ ماہی انوار رضا جوہر آباد کی زیر نظر اشاعت

خاص "تعمیر ملت کیلئے جمعیت علماء پاکستان کی سیاسی جدوجہد "جمعیت کی اسی دینی، سیاسی اور قومی و ملی خدمات کی امین ضخیم تاریخی دستاویز ہے، یہ وہ تاریخی نوادرات ہیں جو ہمارے اسلاف کا قابل فخر سرمایہ ہیں اور جسے ملک کے ممتاز صحافی و ادیب ملک محبوب الرسول قادری نے ترتیب دیا ہے، ملک محبوب الرسول نے جمعیت علماء پاکستان کے مختلف ادوار میں بکھرے ہوئے اُن تاریخی حوالوں کو یکجا کرنے کا کارنامہ انجام دیا ہے جو قوم کی آگہی اور رہنمائی کے ساتھ آنے والی نسلوں کو اپنی تاریخ اور جمعیت علماء پاکستان کی بلند پایہ سیاسی و مذہبی جدوجہد سے آشنا کرنے کا سبب بن سکتے ہیں۔

ملک محبوب الرسول کی یہ کوشش ایک قومی جماعت کی تاریخ کو محفوظ کرنے کے ساتھ وابستگانِ جمعیت کو دعوت فکر و عمل دیتی ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے شاندار ماضی کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے حال کو بہتر بنائیں اور مستقبل کا روشن لائحہ عمل ترتیب دیں، سہ ماہی انوار رضا کے اِس مجلے میں قریباً ڈیڑھ سو موضوعات پر شامل مضامین، تاریخی انٹرویوز، اہم دستاویز، عکسی نقول اور تاثرات و تاریخی واقعات صاحب مولف کی محنت و عرق ریزی کے مظہر ہیں، تاریخ کے اِن منتشر اوراق کی یکجائی کیلئے صاحب مولف کی کوشش و محنت نے "تعمیر ملت کیلئے جمعیت علماء پاکستان کی سیاسی جدوجہد" کو اہم تاریخی و صحافتی دستاویز کا درجہ دیا ہے، علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کے 9 ویں عرس کے موقع پر اس

تاریخی دستاویز کی اشاعت تاریخ پاکستان اور بالخصوص مولانا نورانی سے محبت رکھنے والوں کیلئے کسی نایاب تحفہ سے کم نہیں، اپنی تاریخ کو تروتازہ اور زندہ رکھنے کی اِس شاندار کوشش پر ملک محبوب الرسول قادری یقیناً ہدیہ تبریک اور مبارکباد کے مستحق ہیں، کتاب انٹرنیشنل غوثیہ فورم، انوار رضا لائبریری 4/198، جوہر آباد، پنجاب سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

توہین رسالت، مغرب کی قلمی، فکری اور ثقافتی دہشت گردی

ابھی غیرتِ مسلم زندہ ہے۔۔۔۔۔

توہین رسالت، مغرب کی قلمی، فکری اور ثقافتی دہشت گردی۔۔۔۔

گستاخانہ فلم، مغرب کا منافقت انگیز مکروہ چہرہ بے نقاب

اِس سے زیادہ سفلہ پن، ذہنی پسماندگی، کمینگی اور ڈھٹائی کیا ہوگی کہ ایک ایسا معاشرے کا فرد، جس کی نوجوان لڑکیاں شادی سے پہلے جنسی تعلقات کو برا نہ سمجھیں، جس کے بچے اپنے باپ کا نام نہ جانتے ہوں، جس کے والدین کو اولاد اور اولاد کو والدین کی خبر نہ ہو، جس کے بوڑھے بے کارو ناکارہ سمجھ کر اولڈ ہوم میں پھینک دیئے جائیں اور جس کے مادر پدر آزاد ماحول میں انسان انسان کو نہ پہچانے، اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں زبان طعن دراز کرے، دامن مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیچڑ اچھالنے کی ناپاک جسارت کرے، دنیا بھر کے کڑوڑوں مسلمانوں کی دل آزاری کا مرتکب ہو اور وہاں کے حکمران وانتظامیہ دوسرے مذاہب بالخصوص اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ

علیہ وسلم کی بے ادبی کی کوششوں کو آزادی اظہار کا نام دے کر چپ سادھ لے تو اِسے اسلام دشمنوں کو خباثت و کمینگی اور ذلالت کی تمام حدوں کو پار کرنے کا موقع فراہم کرنے کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے، شاید بے شرمی، بے حیائی، بے حمیتی اور منافقت کی کوئی آخری حد نہیں ہوتی، دوسری طرف عالم اسلام کے غلام حکمرانوں کا شرمناک اور بزدلانہ طرز عمل کہ اپنے آقا انکل سام کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے یہ بھی بھول جائیں کہ کسی کے مذہبی عقائد کو نشانہ بنا کر اُسے مشتعل کرنا بھی اتنا ہی قابل مذمت اور قابل گرفت فعل ہے جتنا کہ تشدد کا ارتکاب کرنا۔

آج لیبیا کے شہر بن غازی میں امریکی قونصل خانے کے سامنے احتجاج کے دوران عمارت پر مسلح افراد کے حملے کو کئی زاویوں سے دیکھا جاسکتا ہے، مگر اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اِس دل آزار فلم میں پائے جانے والے شر انگیز مواد کے باعث دنیا بھر کے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے ہیں اور امریکی سفارت کاروں کے قتل کا مذکورہ واقعہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی پر مبنی اسی فلم کے خلاف احتجاج کے دوران پیش آیا ہے، جس کی تشہیر گستاخ امریکی پادری ٹیری جونز کی جانب سے کی گئی، یہ وہی پادری ہے جو ماضی میں بھی قرآن پاک کو نذر آتش کرنے اور نیویارک میں گراؤنڈ زیرو کے قریب مسجد کی تعمیر کی مخالفت کر کے ایسی اشتعال انگیز فضا

پیدا کر چکا ہے، جس کے باعث دنیا بھر کے مسلمان پہلے بھی سراپا احتجاج بنے رہے، مگر
اِس بار اُس نے یو ٹیوب پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی پر مبنی
ویڈیو کلپ چلا کر اور بعض مقامات پر اِس فلم کے کچھ حصوں کی نمائش کرکے ایک بار
پھر دنیا بھر کے مسلمانوں کے جذبات کو مشتعل کرکے ایسی فضا پیدا کر دی، جس کا رد عمل
لیبیا، سوڈان، مصر، تیونس اور یمن میں امریکی سفارت خانوں کے باہر مظاہروں کی
صورت میں سامنے آیا ہے، مصر، لیبیا، تیونس، عراق ،
پاکستان، ایران، افغانستان، بھارت اور بنگلہ دیش سمیت دنیا کے ہر کونے میں بسنے
والے مسلمان اِس ہرزہ سرائی کے خلاف غیض وغضب کی تصویر بنے، یا
اللہ..... یا رسول صلی اللہ علیہ وسلم "کے نعرے لگاتے امریکی سفارتخانوں پر چڑھ
دوڑے ہیں، اُن کا صرف ایک ہی مطالبہ ہے کہ گستاخ رسول کی ایک سزا.... سر تن سے
جدا، سر تن سے جدا، آج پوری اسلامی دنیا میں توہین رسالت صلی اللہ علیہ وسلم پر مبنی
اِس مبینہ فلم کی تیاری پر جس شدید رد عمل کا اظہار کیا جا رہا ہے اُس نے عالم کفر کو لرزہ
براندام کر دیا ہے۔
یقینا یہ عالم اسلام کے جذبات کو دانستہ مشتعل کرنے کی ایک سوچی سمجھی سازش
ہے، یہی وجہ ہے کہ جامع الازہر اسے مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنے اور فرقہ واریت
پھیلانے کی سازش قرار دیتے ہوئے فلم پر پابندی کا مطالبہ کرتا ہے، مصر کے مفتی اعظم
کے مطابق " محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ٹرائل

کا عالمی دن، کے نام سے تیار کی گئی یہ فلم کینہ پرور اور بیمار ذہنیت کے لوگوں کی اسلام دشمنی اور تعصب کا ایک واضح ثبوت ہے، آزادی اظہارِ رائے کی آڑ میں اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی برداشت نہیں کی جاسکتی، نہ اِس کی اجازت دی سکتی ہے، انہوں نے اپنے بیان میں نائن الیون کی برسی کے موقع پر امریکی قبطیوں کی جانب سے گستاخانہ فلم ریلیز کرنے کی شدید مذمت کی اور کہاکہ اسلام دشمن عناصر اِس قسم کے اوچھے ہتھکنڈوں سے کروڑوں مسلمانوں کے جذبات سے کھیل رہے ہیں، اُن کا کہنا تھاکہ آزادی اظہار ایک الگ چیز ہے اور مقدس ہستیوں کی توہین الگ معاملہ ہے، اسلام سمیت دنیا کا کوئی مذہب مخالف مذہب کی شخصیات کی توہین کی اجازت نہیں دیتا، نہ ہی کوئی مذہب ایسی شرمناک حرکات کو آزادی اظہار تسلیم کرتا ہے، یہ عالمی حقوق کی سنگین پامالی ہے، مٹھی بھر شرپسند عناصر کروڑوں مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کررہے ہیں، مفتی اعظم نے انسانی حقوق کی عالمی تنظیموں اور آزادی کے عالمی مبلغین سے مطالبہ کیا کہ وہ شرپسندوں کے ہاتھوں اسلام اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی شان میں کی جانے والی گستاخیوں کا سلسلہ بند کروائیں اور اخلاق باختہ گستاخانہ فلم کے تمام کرداروں کے خلاف عالمی قوانین کے تحت کارروائی کریں۔

مگر دنیا بھر کے مسلمانوں کے شدید احتجاج کے باوجود امریکی صدر اور امریکی

وزیر خارجہ نے امریکی سفارتخانوں پر حملوں کی مذمت تو کی، لیکن اِس گستاخانہ فلم پر پابندی کے حوالے سے معنی خیز خاموشی اختیار کی، امریکہ کا قاہرہ میں اپنے سفارتخانے پر حملے کا حوالہ دیتے ہوئے یہ کہنا تھا کہ واشنگٹن کسی بھی مذہب بالخصوص دین اسلام کو گزند پہنچانے کی کسی بھی کوشش کی شدید مذمت کرتا ہے، ایسا کرنے والے امریکی پالیسیوں کی ترجمانی نہیں کرتے اور وہ امریکہ میں اظہار رائے کی آزادی کا فائدہ اٹھاکر ایسے اقدامات اٹھاتے ہیں، لیکن امریکہ اُن کے خلاف قانونی کارروائی کرکے انہیں سزا نہیں دلوا سکتا، درحقیقت اِس قسم کی مکروہ حرکات کی حوصلہ افزائی اور اجازت دینے کے مترادف اور اس سوال کو جنم دیتا ہے کہ جس اقدام کو واشنگٹن قابل مذمت قرار دیتا ہے، وہ خود اُس کے خلاف کارروائی کے معاملے میں سنجیدہ کیوں نہیں ہے؟ اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ امریکی پالیسی میں اِس قسم کی گستاخانہ فلم کی اجازت ہے تو بھی کسی ایک شخص یا چند اشخاص کو یہ حق کیسے دیا جاسکتا ہے کہ وہ دوسروں کے مذہب یا اُن کی برگزیدہ شخصیات کی توہین و تنقیص کریں، جبکہ خود امریکی معاشرے میں ہتک عزت کے قوانین موجود ہیں جس کے مطابق کوئی شخص اظہار رائے کی آزادی کی آڑ میں کسی دوسرے کی کردار کشی نہیں کرسکتا، مگر اسلام کی برگزیدہ شخصیات کی گستاخیوں کے خلاف امریکی حکام کے پاس کوئی قانون موجود نہیں، جس کا صاف مطلب اسلام اور مسلمانوں کی مقدس شخصیات کے خلاف گستاخانہ حرکات کی سرپرستی اور لائسنس دینا ہی سمجھا جائے

گا، چنانچہ اِس تناظر میں امریکی حکومت کواس قسم کے مکروہ اقدامات سے بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

آج نائن الیون سمیت جن واقعات کے ذمہ دار مسلمان قرار دیئے جاتے ہیں، وہ درحقیقت بالواسطہ یا بلاواسطہ بڑی حد تک تہذیبوں میں تصادم کے نظریئے کا ہی شاخسانہ محسوس ہوتے ہیں، خود مغربی ملکوں کو جو مسلم دنیا کو انتہا پسندی سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں، کواِس بات کا جائزہ لینے کی شدید ضرورت ہے کہ ٹیری جونز جیسے خبیث اور بیمار ذہنیت کے لوگ جس طبقہ فکر کی نمائندگی کرتے ہیں، کیا ایسے لوگوں کو محض آزادیِ اظہار رائے کے نام پر دوسرے مذاہب بالخصوص مسلمانوں کے جذبات کو پامال کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے ؟اظہار رائے کی آزادی کے علمبرداروں کو یہ بھی سوچنا ہوگا کہ آزادی اظہار کے نام پر ایسی قبیح سرگرمیوں کی اجازت دینا کتنا درست ہے جو صراحتاً قلمی، فکری اور ثقافتی دہشت گردی کے زمرے میں آتی ہوں اور جس سے دنیاکے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے جذبات کو تکلیف و ٹھیس پہنچے، چنانچہ مصر کے مفتی اعظم کے بیان کی روشنی میں آزادی اظہار اور مقدس ہستیوں کی توہین دو الگ الگ معاملے ہیں جنھیں یکجا کرکے نہیں دیکھا جاسکتا، لہٰذا اسلام دشمنوں کی جانب سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے بنائی گئی گستاخانہ فلم ایک ایسی ناپاک جسارت قرار پاتی ہے جو مغرب کی منافقت اور نفرت انگیز مکروہ چہرہ سامنے

لاتی ہے اور اُس کی خباثت و خیانت کا پردہ چاک کرتے ہوئے ظاہر کرتی ہے کہ اسلام دشمنی میں یہود و نصاریٰ آپس میں متحد اور معاون و مددگار ہیں، لاکھ اُس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے طور طریقے، قدار و رویئے اور معاشرت و معیشت سب ہی کچھ کیوں نہ بدل چکا ہو، مگر اُس کے انداز فکر اور اسلام دشمنی میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا ہے، وہ کل بھی اسلام اور مسلمانوں کا دشمن تھا اور آج بھی ہے، چنانچہ اِس تناظر میں مسلم رہنماؤں اور دانشوروں کا یہ موقف مبنی بر حقیقت ہے کہ فلم بنانے اور یو ٹیوب پر ریلیز کرنے کا مقصد مسلمانوں کو مشتعل کرکے اُن کے جذبات کو بھڑکانا ہے تاکہ رد عمل کے طور پر مسلمانوں کو دہشت گرد اور انتہا پسند قرار دینے کا بہانہ ہاتھ آسکے اور مغربی طاقتیں اِس کی آڑ میں اُمت مسلمہ کے خلاف صلیبی جنگ کے نئے محاذ کھول کر اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کر سکیں۔

یقینا یہ ایک سوچی سمجھی سازش اور اسلام کے خلاف مغرب کی اُس بین الاقوامی مہم کا حصہ ہے جس کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کا کرۂ ارض سے صفایا کرنا ہے، سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر مسلمانوں کے خلاف ہی ایسی مذموم حرکات کا ارتکاب کیوں کیا جاتا ہے؟ کیوں توہین آمیز خاکوں، شعائر اسلامی کی توہین اور اسلام اور پیغمبر اسلام کی شان میں گستاخی کے ذریعے بار بار مسلمانوں کی غیرت کو للکارا جاتا ہے؟ کیوں یورپی ممالک میں مسلمان کو دہشت گرد اور مسلم

خواتین کے اسکارف پہنے پر پابندی عائد کی جاتی ہے۔؟اِس کا سیدھا سادہ جواب ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان دیگر الہامی کتب (توریت،زبور،انجیل) اور تمام انبیاء ومرسلین پر ایمان رکھنے کے ساتھ اسلام، شعائر اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت وحرمت حوالے بڑے حساس واقع ہوئے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و ناموس کا تحفظ اور شعائر اسلامی کی حفاظت اسلام کی بنیاد و اساس ہے، جس کیلئے ہر مسلمان خواہ وہ دنیا کے کسی بھی خطے اورزبان و نسل سے تعلق رکھتا ہو، اسلام اور صاحب اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و ناموس کا تحفظ اپنی جان سے بھی زیادہ ضروری سمجھتا ہے، جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ عشق و محبت کا تقاضہ مختلف رنگ و نسل اور زبان وعلاقوں میں تقسیم اُمت مسلمہ کو ہمیشہ اہل کفر کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنادیتا ہے، یہی وہ جذبہ ہے جو عالم کفر کی آنکھ میں کانٹے کی طرح چبھتا ہے اور جس کے خاتمے کیلئے وہ وقتاً فوقتاًاِس قسم کی شرانگیز مذموم کوششیں کرتا رہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عالم کفر مسلمانوں سے نہیں بلکہ اُن کے ایمان کی راکھ میں چھپی محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اُس چنگاری سے ڈر و خوف اور خطرہ محسوس کرتا ہے، جو کسی بھی وقت شعلہ جوالہ بن کر اُس کے طاغوتی نظام کے درودیوار زمین بوس کر سکتی ہے، لیکن ہر بار وہ اسلام دشمنی میں یہ بات بھول

جاتا ہے کہ مسلمان خواہ کتنا ہی بد عمل اور دین سے دور کیوں نہ ہو، ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے تحفظ کیلئے جان دینا یا لینا ایک اعزاز اور سعادت سمجھتا ہے، اُسے اپنی جان مال اور عزت و آبروؤ سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و حرمت عزیز ہے، جس کی حفاظت کیلئے وہ ہر لمحہ کٹ مرنے کو تیار ہے، لہذا شعائر اسلامی کا مذاق اڑانے اور توہین رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی ناپاک جسارت کرکے صلیبی جنگ بھڑکانے والوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ زندگی سے زیادہ موت سے محبت کرنے والے مسلمانوں کی غیرت کو نہ للکاریں، اگر یہ اٹھ کھڑے ہوئے تو پھر تمہیں دنیا کے کسی کونے میں بھی پناہ نہیں ملے گی۔

کمزور ہیں ہم لوگ مگر اتنا بتا دیں

میراث ہے دار پہ انکار نہ کرنا

آزادی رائے کا احساس ہے لیکن

تم ذات محمد کبھی وار نہ کرنا

طلاق کی بڑھتی ہوئی شرح اسباب و محرکات اور تدارک

زیادہ عرصے پرانی بات نہیں اگر ہم دو تین عشرے پیچھے کی طرف جائیں تو ہمارے معاشرے میں لفظ "طلاق "ایک گالی سمجھا جاتا تھا، مگر اب یہ بات قصہ پارینہ بن چکی ہے، پچھلی ایک دہائی سے پاکستان میں طلاق کی شرح میں ناقابلِ یقین حد تک اضافہ ہوا ہے، صرف پچھلے چار برسوں کے دوران کراچی شہر کی 11 فیملی کورٹس میں طلاق اور خلع کے کم و بیش 75 ہزار کیسیز رجسٹرڈ ہوئے،ایک مقامی روزنامے سے حاصل شدہ اعداد و شمار کہتے ہیں کہ اِس وقت کراچی میں قائم فیملی کورٹس میں طلاق اور خلع کے یومیہ 45 کیس درج ہوتے ہیں، جبکہ جنوری 2005 سے جنوری 2008 کے دوران فیملی کورٹس میں طلاق و خلع کے 64 ہزار 800 کیس درج ہوئے تھے، مگر 2008 کے بعد اِس تعداد میں نمایاں اضافہ دیکھنے میں آیا اور کراچی کی فیملی کورٹس میں جنوری 2008 سے لے کر رواں برس 2012 کے دوران طلاق و خلع کے 72 ہزار 900 کیس درج ہوئے،اِن میں سب سے زیادہ شرح کراچی کے ضلع شرقی میں رہی،اسی طرح شہری حکومت کے ماتحت کراچی کے 18 ٹاؤنز کی مصالحتی کمیٹیوں میں 2008 سے اگست 2012 کے دوران طلاق و خلع کے 2 ہزار 154 کیسیز رجسٹرڈ ہوئے، جس میں گلشن اقبال ٹاؤن سرفہرست رہا،اس طرح کراچی کی تمام فیملی کورٹس اور شہری حکومت کی مصالحتی کمیٹیوں میں طلاق و خلع کے رجسٹرڈ ہونے والے کیسیز کا مجموعہ

ہزار 54 بنتا ہے، جس کی سالانہ اوسط 18764 نکلتی ہے، جبکہ اِس میں 20 فیصد 75 کیسیز ایسے ہیں جو رجسٹرڈ ہی نہیں ہوتے اور معاملہ دو خاندانوں کے درمیان ہی رہتا ہے، واضح رہے کہ یہ اعداد و شمار صرف پاکستان کے شہر کراچی کے ہیں، جس سے آپ پورے ملک کی مجموعی صورتحال کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ سابقہ اور موجودہ حکومتوں کی آزادی نسواں اور روشن خیالی مہم نے بھی اِس شرح میں اضافہ کیا ہے، عورتوں کی آزادی اور اُن کیلئے انصاف کی فوری فراہمی کے خلاف کوئی ذی شعور نہیں ہو سکتا، بشرطیکہ یہ اسلامی حدود اور شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے ہو، مگر یہ مہم پاکستان کے مسلم معاشرہ کے مشترکہ خاندانی نظام کو تباہ کرنے کی خوفناک سازش ہے تاکہ مغرب کی طرح یہاں بھی مادر پدر آزاد معاشرہ قائم ہو جائے اور عورت چراغ خانہ کی بجائے شمع محفل اور بازار کی جنس بن جائے یہی وجہ ہے کہ اِس وقت ہمارے ملک میں محبت کی شادیوں کے حق میں فضا ہموار کی جارہی ہے، مشترکہ خاندانی نظام تباہ کرنے کیلئے فیملی کورٹس ایکٹ اکتوبر 2005 دفعہ سیکشن 10 کے تحت طلاق کا عمل آسان تر کر دیا گیا ہے، اس کے برخلاف انسانی (4) اور خاندانی معاملات سے تعلق رکھنے والے قوانین اتنے پیچیدہ ہیں کہ اُن میں فوری انصاف کا حصول مشکل ترین نہیں تو مشکل تر ضرور ہے، جبکہ طلاق کے معاملات کو روشن خیالی کے دور میں انتہائی آسان بنا دیا گیا ہے اور عائلی قوانین میں اِن تبدیلیوں کو عورتوں

کی آزادی اور فوری انصاف قرار دیا گیا ہے، چنانچہ آزادی اور فوری انصاف کی مہم کا نتیجہ یہ ہے کہ روزانہ سینکڑوں خواتین ازدواجی زندگی کے بندھن سے آزاد ہو رہی ہیں اور طلاق جیسا ناپسندیدہ عمل اب ہمارے ہاں آسان ترین کام بنتا جارہا ہے، خواتین اسے حق سمجھ کر استعمال کررہی ہیں، یہ بھی سابقہ آمرانہ دور میں کی جانے والی ترامیم کا نتیجہ ہے کہ عدالتیں خلع اور طلاق کی ڈگریاں ریوڑیوں کی طرح بانٹ رہی ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ میاں بیوی کا رشتہ اعتماد اور بھروسے کی بنیاد پر قائم رہتا ہے جب کبھی دونوں میں اعتماد اور بھروسے کی بنیادیں ہلتی ہیں تو اِس رشتے کی بنیادیں بھی کمزور ہو جاتی ہےاور یہ رشتہ ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے، اگر دونوں میں اعتماد اور بھروسے کی بنیادیں مضبوط رہیں گی تو یہ رشتہ بھی مضبوط تر ہوتا جائے گا اور کبھی زوال پذیر نہیں ہوگا، عدم برداشت بھی طلاق کا ایک اہم سبب ہے اگر دونوں فریق آپس میں برداشت اور تحمل سے کام لیں اور ایک دوسرے کی غلطیوں سے درگزر کریں تو اِس مقدس رشتے کو قائم رکھنا آسان رہتا ہے، چونکہ ہماری معاشرتی اقدار میں شادی ایک سمجھوتہ ہے، جو لوگ اپنے شریک حیات سے سمجھوتہ کرلیتے ہیں اور گھریلو وزندگی کے دیگر اُمور میں باہمی مشاورت اور رضامندی سے کام لیتے ہیں، ایک دوسرے کی معمولی غلطیوں سے درگزر کرتے ہیں، اُن کی شادی قائم رہتی ہے اور جو لوگ سمجھوتہ نہیں کرپاتے اُن کا یہ مقدس رشتہ

ٹوٹ جاتا ہے، اگر ہم پاکستان میں طلاق کے اِس بڑھتے ہوئے رجحان کی وجوہات کا ذکر کریں تو ہر ہونے والی طلاق کے پیچھے ایک الگ وجہ اور الگ کہانی ملے گی، مگر طلاق و خلع کے کیسیز کا جائزہ یہ بتاتا ہے کہ دو شادی شدہ افراد میں علیحدگی کا سبب بننے والی بنیادی وجوہات میں گھریلو ناچاقی سرفہرست ہے، جبکہ قربانی دینے کے عزم میں کمی، زبردستی شادی، مشترکہ خاندانی نظام سے بغاوت، سماجی اسٹیٹس، حرص و ہوس، بیوی یا شوہر کا شکی مزاج ہونا، دوسری یا جلد بازی میں محبت کی شادی، انڈین ٹی وی ڈراموں اور فلموں کے اثرات، معاشی مسائل، شوہر کا نشہ کرنا، وٹہ سٹہ یا خاندان سے باہر شادی کرنا اور نام نہاد این جی اوز کی جانب سے خواتین کی آگاہی (جسے بغاوت پر اُکسانا قرار دینا زیادہ مناسب ہے) کیلئے چلائے جانے والے پروگرام بھی طلاق و خلع کی شرح میں تیزی سے اضافے کا سبب بن رہے ہیں۔

طلاق خانگی زندگی کی تباہی کے ساتھ سب سے زیادہ اولاد کو متاثر کرتی ہے اور طلاق کی آگ کی لپیٹ میں دو خاندان بری طرح جلتے اور جھلستے رہتے ہیں، طلاق جیسا انتہائی قدم اٹھانے والے لمحے بھر کو بھی اِس نکتے پر غور نہیں کرتے، نتیجتاً اُن کے بچوں کی زندگی تباہ ہوجاتی ہے اور وہ کبھی نہ ختم ہونے والی احساس کمتری اور نفسیاتی عوارض کا شکار ہوجاتے ہیں، نفسیاتی اور دماغی امراض کے ہسپتالوں میں کئے گئے سروے کے مطابق اِن بیماریوں میں مبتلا ہونے

والے مریضوں میں بڑی تعداد ایسے افراد کی ہوتی ہے جو طلاق کی وجہ سے بچپن میں والدین کی شفقت سے محروم ہو جاتے ہیں، یہ محرومی بچوں کو جرائم کی طرف راغب کرنے کا سبب بنتی ہے، اکثر اوقات طلاق خودکشی اور قتل کا سبب بھی بن جاتی ہے، جن والدین کے درمیان طلاق واقع ہو جاتی ہے، اُن کے بچے معمول کی زندگی گزارنے کے قابل نہیں رہتے، وہ عدم توازن اور عدم تحفظ کا شکار ہو جاتے ہیں، اُن کی تعلیمی اور معاشرتی کارکردگی متاثر ہوتی ہے اور اُن میں اعتماد اور خودداری کا فقدان رہتا ہے جو معاشرے کو ایک مفید اور کارآمد شہری سے محروم کر دیتا ہے۔

چونکہ ایک مسلم خاندان کی ابتداء ''نکاح'' سے ہوتی ہے، اِس لیے اسلام میں نکاح ایک ایسا سماجی معاہدہ ہے، جسے اسلام نے تقدیس عطا کرکے عبادت کا درجہ دیا ہے اور اسلام یہ چاہتا ہے کہ یہ رشتہ تاحیات برقرار رہے، جس کیلئے اسلام نے ایسے اقدامات تجویز کئے ہیں جو اِس مقدس رشتے کی بقاء کی ضمانت دیتے ہیں اور اسے دوام بخشتے ہیں، یہ رشتہ اِس قدر عظیم ہے کہ اِس میں منسلک ہونے کے بعد ایک جوڑا جس میں اِس سے پہلے کوئی شناسائی نہیں ہوتی، ایک دوسرے سے بے پناہ پیار و محبت کا اظہار کرتا اور ہر خوشی و غمی میں زندگی بھر کا ساتھی بن جاتا ہے، اِن کا باہمی تعلق اِس قدر لطیف ہے کہ قرآن مجید نے دونوں کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے، تاہم بعض اوقات یہ عظیم رشتہ مکدر ہو جاتا ہے اور

اِس میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں، اگر بشری کمزوریوں اور سماجی حالات کی وجہ سے اِس رشتے کو برقرار رکھنا مشکل ہو جائے تو شریعت مطہرہ نے طلاق کو انتہائی ناپسندہ عمل قرار دیتے ہوئے ایکدوسرے سے جدا ہونے کا راستہ رکھا ہے، اسلام اجازت دیتا ہے کہ "طلاق" کے ایک متعین طریقہ کار پر عمل کرتے ہوئے وہ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں کہ شاید کہ اِس جدائی کے بعد اللہ کریم اُن کیلئے خوشگوار زندگی کا کوئی اور سبب بنادے، اِس کا مطلب یہ ہے کہ "طلاق" نہایت ہی مجبوری کی حالت میں دی جا سکتی ہے، لیکن آج جب ہم اپنے معاشرے میں "طلاق" کے بڑھتے ہوئے واقعات دیکھتے ہیں اور اِن کے اعداد وشمار کا جائزہ لیتے ہیں تو ایک خطرناک تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔

بد قسمتی سے مغربی تہذیب کے اثرات اور مادر پدر آزاد معاشرے کی اندھی تقلید کی وجہ سے ہمارے ہاں ماضی کے مقابلے میں طلاق کی شرح خطرناک حدتک پہنچ کر ایک سماجی مسئلہ بن چکی ہے جو ہمارے اسلامی معاشرے میں موجود آئیڈیل خاندانی نظام کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہی ہے، لہٰذا ضرورت اِس اَمر کی ہے کہ اسلام کے قانونِ طلاق کو قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح کرنے کی سعی کی ہے تاکہ اِس کا ناجائز استعمال روکا جاسکے اور فرد، خاندان اور معاشرے کو بہت سے سماجی مسائل اور الجھنوں سے بچایا
جاسکے،اِس کام کیلئے معاشرے کے حساس اور ذمہ دار طبقات اور علماء کو خصوصی توجہ
دینے اوراِس کے اسباب وعلل کا

جائزہ لے کر تدارک کرنے کی شدید ضرورت ہے،یاد رکھیں طلاق ایک ناپسندیدہ فعل ہے جس معاشرے میں طلاق کی کثرت ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ معاشرہ اپنی فطری زندگی کے راستے سے بھٹک گیا ہے۔

متحدہ مجلس عمل کی بحالی.....امکانات وخدشات

ایم ایم اے کا ماضی حال اور مستقبل۔۔۔۔۔

یہ 12 اکتوبر 1999 کے بعد کی بات ہے جب جنرل پرویز مشرف کو اقتدار سنبھالے چند ہی ماہ کا عرصہ گزرا تھا، جنرل مشرف کے اقتدار پر قبضہ نے امریکی عزائم کی راہ میں آسانیاں پیدا کردیں، خود جنرل مشرف نے امریکی مطالبات کے آگے سر نگوں کردیا اور پاکستانی ہوائی اڈے امریکہ کو پیش کر دیئے، جو بعد میں افغنستان پر امریکی حملوں اور امریکی و عالمی فوج کے خطے میں براجمان ہونے کی صورت میں سامنے آئے، یہ وہ وقت تھا جب اسٹیبلشمنٹ کی تیار کردہ سیاسی جماعتیں ناکام ثابت ہوئیں، دور دور تک کوئی سیاسی خلاء کو پورا کرنے والا کوئی نہ تھا،اِن حالات میں ضرورت اِس امر کی تھی کہ دینی جماعتیں میدان عمل میں اتر کر سیاسی خلاء کو پر کریں، چنانچہ اِن حالات میں جید علمائے کرام نے دینی اتحاد کی ضرورت کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور جمعیت علماء پاکستان کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی نے اُس وقت کے امیر جماعت اسلامی پاکستان قاضی حسین احمد کے ساتھ مل کر تاریخی کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا، مولانا نورانی نے تمام مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والی دینی جماعتوں کو ایک پلیٹ

فارم پر اکٹھا کیا اور جولائی 2001 میں جمعیت علماء پاکستان، جماعت اسلامی، جمعیت علمائے
اسلام (ف) جمعیت علمائے اسلام (س)، تحریک جعفریہ اور جمعیت اہلحدیث پر مشتمل ملک
قائم کی، جسے 19 MMA کی چھ بڑی دینی جماعتوں کے اتحاد" متحدہ مجلس عمل" یعنی
مارچ 2002 کو باقاعدہ اتحاد میں تبدیل کر دیا گیا اور یوں مولانا شاہ احمد نورانی کی
سربراہی میں اِن جماعتوں نے پاکستان کی آزادی، سلامتی، خود مختاری، استحکام اور اسلامی
تشخص کی بحالی کیلئے مشترکہ جدوجہد کا آغاز کر دیا۔

ملک کے آئندہ انتخابات کے پیش نظر ان چھ دینی جماعتوں نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ مستقبل
کے خطرات سے نبرد آزما ہونے اور سیکولر قوتوں کا راستہ روکنے کیلئے انتخابات کے
نے اپنے انتخابی منشور میں اعلان کرتے MMA، حوالے سے مشترکہ جدوجہد کی جائے گی
ہوئے کہا کہ متحدہ مجلس عمل برسر اقتدار آ کر ملک میں نظام مصطفیٰ نافذ کرے گی، یہ
کی تحریک نظام مصطفیٰ کے بعد دوسرا موقع تھا جب مختلف مکاتیب فکر کے علماء کرام 1977
نے مولانا شاہ احمد نورانی پر اظہار اعتماد کرتے ہوئے نظام مصطفیٰ کے نفاذ کو اپنے منشور کا
مرکزی نقطہ قرار دیا اور 23 جولائی 2002 سے اپنی انتخابی مہم چلانے کا اعلان
لادین عناصر کو MMA کر دیا، مولانا شاہ احمد نورانی پُر عزم تھے کہ عام انتخابات میں
شکست فاش دے کر کامیابی حاصل کرے گی، اُن کا ماننا تھا کہ صرف دینی جماعتیں ہی ملک
کو بحران

سے نکال سکتی ہیں۔10 اکتوبر 2002 کو مولانا نورانی کی توقعات حقیقت کا روپ دھار
ے قوم کے سامنے تھیں، کسی کے وہم وگمان میں نہ تھا کہ دینی جماعتوں کے اِس اتحاد کو
عوام اِس طرح پذیرائی بخشے گی کہ وہ حکومت کی سرپرستی میں قائم شدہ جماعت مسلم لیگ
ق) کے بعد دوسری بڑی قوت بن کر ابھرے گی، متحدہ مجلس عمل کی کامیابی نے سیاسی)
پنڈتوں اور ملکی پالیسی سازوں کو حیران وپریشان کردیا، یہ ملکی تاریخ میں ابھرنے والی
پہلی اتنی بڑی تبدیلی تھی، اگراَن دیکھی طاقتیں پاکستان پیپلزپارٹی پیٹریاٹ تشکیل دینے
کے حق میں ہوتی، لیکن عالمی طاقتیںMMA میں کامیاب نہ ہوتیں تو صورتحال یقیناً
نہیں چاہتی تھیں کہ پاکستان میں اسلام پسندوں کو آگے بڑھنے کا موقع ملے۔اگرچہ متحدہ
مجلس عمل کی کامیابی کو عوامی سطح پر بہت پذیرائی حاصل ہوئی، لیکن عالمی سطح پر اِس
کامیابی کو رجعت پسند عناصر کا غلبہ قرار دیا گیا،تاہم متحدہ مجلس عمل نے حالات کی
نزاکت محسوس کرتے ہوئے قومی سطح پر مفاہمت کی پالیسی جاری رکھی، کیونکہ مجلس عمل
ملک میں انارکی اور نئی مخاصمت کے دروازے کھول کراُن لوگوں کو مایوس کرنا نہیں
چاہتی تھی جنھوں نے انتخابات میں متحدہ مجلس عمل پر اعتماد کا اظہار کیا تھا، ساتھ ہی
مجلس عمل حکومت کو وقت بھی دینا چاہتی تھی، چنانچہ جمہوری عمل کو کسی تعطل سے
بچانے کیلئے مجلس عمل نے حکومت کے سامنے مندرجہ ذیل شرائط رکھیں، صدر مشرف
وردی اتاریں،58ٹوبی اور نیشنل سیکورٹی کونسل کے خاتمے کا اعلان کریں،1973کا غیر

متازعہ دستور بحال کیا جائے اور لیگل فریم ورک آرڈر منسوخ کیا جائے۔
دوہزار تین کا سال سیاسی سرگرمیوں کے عروج کا سال تھا،اس سال مولانا شاہ احمد نورانی جنھوں نے متحدہ مجلس عمل کی انتخابی کامیابی کیلئے عام انتخابات میں حصہ نہیں لیا تھا، اتحاد میں شامل جماعتوں کے قائدین کے اصرار پر 24فروری 2003 کو سینٹ کا الیکشن لڑا اور کامیابی حاصل کی ، سینٹ کے اِن انتخابات میں مجلس عمل نے 18 نشستیں کے سربراہیMMA حاصل کیں، حالات کی نزاکت کے پیش نظر 9اپریل 2003 کو اجلاس میں حکومت کی خارجہ پالیسی اور ایل ایف او پر حکومتی موقف کو مسترد کردیا گیا، صدر کی وردی کے مسئلے پر مولانا نورانی مشرف کو کوئی رعایت دینے پر تیار نہیں تھے،چنانچہ مجلس عمل اور حکومتی مزاکرات کے کئی دور بے نتیجہ رہے اور کوئی اتفاق رائے پیدا نہ ہوسکا،جس کی اصل وجہ خود حکومت کا غیر سنجیدہ رویہ تھا،وہ روز اوّل سے کی بدقسمتی یہMMA اپوزیشن کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیل رہی تھی،دوسری طرف تھی کہ وہ مولانا فضل الرحمٰن کی ڈیڑھ صوبے کی حکومت کے کے چکریں بری طرح پھنس چکی تھی، مولانا فضل الرحمٰن کو اپنے ڈیڑھ صوبائی اقتدار کی اِس قدر فکر تھی کہ وہ اپنے موقف پر حکومتی چھاپ لگانے کیلئے ہر وقت تیار رہتے تھے، یہ بات ایم ایم اے کیلئے نقصان دہ تھی، مولانا نورانی اِس ساری صورتحال کا بغور جائزہ لے رہے تھے،دوسری طرف 7 میں سے 6 نکات پر اتفاق رائے ہونے کے باوجود

صدر کی وردی کے مسئلہ ہنوز اٹکا ہوا تھا، مولانا نورانی نے حکومت کی جانب سے پیش کردہ آئینی پیکج متنازعہ امور پر وضاحت نہ ملنے کے سبب مسترد کردیا تھا اور 17 دسمبر 2003 کی حتمی ڈیڈ لائن دے دی، جس کے اگلے دن متحدہ مجلس عمل نے حکومت مخالف احتجاجی تحریک کا آغاز کرنا تھا مگر اس سے قبل کہ حکومت کے خلاف کوئی احتجاجی تحریک شروع ہوتی پاکستان کی قومی سیاست اور MMA کو اُس وقت اِس عظیم سانحے سے دوچار ہونا پڑا جب 11 دسمبر 2003 کو مجلس عمل کے قائد مولانا شاہ احمد نورانی اسلام آباد میں ایک اہم پریس کانفرنس سے خطاب کرنے سے قبل حرکت قلب بند ہونے کے سبب خالق حقیقی سے جا ملے۔

مولانا شاہ احمد نورانی کی وفات کے بعد مجلس عمل جھاگ کی طرح بیٹھ گئی، 25 دسمبر 2003 کو مولانا کی وفات کے محض دو ہفتوں کے بعد مجلس عمل نے حکومت سے تمام معاملات طے کرکے یہ ظاہر کردیا کہ مولانا شاہ احمد نورانی اِس معاہدے کی راہ میں آخری کانٹا تھے، مولانا نورانی کے انتقال کے بعد مجلس عمل کے قائدین کی طرف سے ہوس اقتدار میں پے درپے سمجھوتوں اور مجلس عمل کی صوبائی حکومت کے دعوؤں کے باوجود عوامی فلاح کے اسلامی تصور سے میلوں دوری نے مجلس عمل کی افادیت کیساتھ اُس کے وجود کو بھی سوالیہ نشان بناڈالا، رہی سہی کسر حضرت مولانا فضل الرحمٰن کے دن رات بدلتے طرز عمل نے پوری کردی، انہوں نے اپنے مفادات کی خاطر جنرل مشرف کے اقتدار کو دوام بخشنے، سترھویں ترمیم

کو قوم پر مسلط کرنے، وردی سمیت اُسے دوبارہ اقتدار میں لانے، حدود آرڈیننس کی منظوری اور صوبے میں بلا شرکت غیرے جبکہ وفاق میں حصہ بقدر جُسہ کے اصول کے تحت ابن الوقتی اور کاسہ لیسی کا گھناؤنا کھیل کھیلا ہے۔ یوں مجلس عمل نے مولانا شاہ احمد نورانی کے دوٹوک موقف کی ہی نفی نہیں کی بلکہ انتخابی مہم کے دوران ایل ایف او کے خلاف نعرہ کی بنیاد پر حاصل شدہ کامیابی کے ثمرات کو ضائع کرکے عوامی اعتماد کو بھی دھوکہ دیا، یوں کئی شرمناک سمجھوتے مجلس عمل کے حصے میں آئے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مولانا نورانی جب تک مجلس عمل کے سربراہ رہے حکومت اپنے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں ناکام رہی، لیکن مولانا نورانی کی آنکھیں بند ہوتے جبہ ودستار کے امینوں نے اصولوں پر سودے بازی کرکے مجلس عمل کے ساتھ جمہوریت کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچایا، یہی وجہ تھی کہ بعد میں سیاسی شکست اور ناکامی متحدہ مجلس عمل کا مقدر بن گئی اور ایم ایم اے بطور سیاسی جماعت اور تحریک اپنے مقاصد سے دور ہٹ کر دم توڑ کر گئی۔

یہ ہے متحدہ مجلس عمل کہانی اور اِس مضمون کی لمبی تمہید، اتنی لمبی تمہید باندھنے کیلئے معذرت چاہتا ہوں، مگر اِس لمبی تمہید کا مقصد آپ کو متحدہ مجلس عمل کے اُس اصولی اور تاریخ ساز کردار سے آگاہ کرنا ہے جو مجلس عمل نے مولانا شاہ احمد نورانی کی قیادت میں ادا کیا، مگر بعد کے آنے والے

لوگوں نے مجلس عمل کو حکمران وقت کے قدموں کی جوتی بنادیا، مولانا شاہ احمد نورانی کے بعد مجلس عمل کے قائدین نے جو کچھ کیا ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں، آج ایک بار پھر جمعیت علماء پاکستان کے موجودہ سربراہ ڈاکٹر ابوالخیر محمد زبیر صاحب، سینئر نائب صدر صاحبزادہ شاہ اویس نورانی اور جمعیت علماء اسلام (س) کے قائد مولانا فضل الرحمٰن متحدہ مجلس عمل کی بحالی کے خواہاں ہیں اور متحدہ مجلس عمل کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ اِس سلسلے میں 18 اکتوبر کو اسلام آباد میں مذہبی جماعتوں کا ایک اہم اجلاس JUP کی میزبانی میں ہوا، جس میں مولانا فضل الرحمٰن نے ایم ایم اے کی فعالی کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ ایم ایم اے کو فعال کرنے پر اصولی اتفاق ہوگیا ہے، مگر مکمل بحالی کا فیصلہ عید کے بعد میں کیا جائے گا، اس موقع پر مولانا فضل الرحمٰن نے مزید کہا کہ آج کے اجلاس میں جماعت اسلامی کے معاملے پر بات نہیں ہوئی اگر جماعت اسلامی کے رہنماؤں نے رابطہ کیا تو اُس پر غور کیا جائے گا، واضح رہے کہ متحدہ مجلس عمل کی بحالی کے سلسلے میں ہونے والے اجلاس میں جے یو پی، جمعیت علماء اسلام (ف)، جمعیت اہلحدیث اور تحریک اسلامی کے صاحبزادہ زبیر، مولانا فضل الرحمٰن، پروفیسر ساجد میر اور علامہ ساجد نقوی کے ہمراہ پیر عبدالرحیم نقشبندی، پیر اعجاز ہاشمی، صاحبزادہ اویس نورانی، قاری زوار بہادر، عبدالغفور حیدری اور مولانا امجد خان نے شرکت کی، باوثوق ذرائع کہتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے باہر ہونے کی وجہ سے مجلس عمل کی بحالی کا باضابطہ

اعلان نہیں کیا گیا، جب تک یہ باضابطہ اعلان نہیں ہو جاتا مولانا فضل الرحمٰن مجلس عمل کے عبوری سربراہ ہونگے۔

قارئین محترم ! گذشتہ الیکشن میں مذہبی جماعتوں کی ناکامی کے بعد متحدہ مجلس عمل کی بحالی کے حوالے سے کئی بار کوششیں کی گئیں، اِس حوالے سے وقتاً فوقتاً خبریں بھی میڈیا کی زینت بنتی رہیں، جن میں متعدد بار مجلس عمل بحال اور بے حال ہوئی، مگر اَمر واقعہ یہ ہے کہ کوئی خاص پیش رفت قوم کے سامنے نہ آسکی، بلکہ بارہا اِس احیاء کو سیاسی مقاصد جوڑ توڑ اور سودے بازی کیلئے استعمال کیا گیا، شاید یہی وجہ ہے کہ سابقہ مجلس عمل کی ، دو اتحادی جماعتیں جماعت اسلامی اور جمعیت علماء اسلام (س) آج اس احیاء سے کنارہ کش اور دیگر جماعتوں کی قیادت کو اپنے JUP نظر آتی ہیں، ہم نے بارہا اس حوالے سے خدشات ،اتحاد میں شامل ہونے کے نقصانات اور مستقبل میں اِس کے مضمرات سے آگاہ کرنے کی پوری کوشش کی، مقصد و مدعا مولانا شاہ احمد نورانی کے بعد متحدہ مجلس عمل کا وہ کردار تھا جس نے مولانا نورانی کے کرے کرائے پر جھاڑو پھیر دی اور مجلس عمل کو طالع آزماوئں کے در کی لونڈی بنادیا، یقینا وہ خدشات آج بھی بدستور اپنی جگہ موجود ہیں ،بلکہ موجودہ احیاء میں جماعت اسلامی اور جمعیت علماء اسلام (س) کی عدم شمولیت نے اسے مزید تقویت دے دی ہے، یہ سوال اب بھی سر اٹھائے کھڑا ہے کہ اگر متحدہ مجلس عمل مولانا نورانی کے بعد اپنے طے شدہ

مقاصد سے بھٹک سکتی ہے تو کیا موجودہ حالات اور دو اہم جماعتوں کی عدم موجودگی میں اپنے مقاصد حاصل کرپائے گی۔ ہمیں اِس اَمر میں بھی کوئی شک و شبہ نہیں کہ متحدہ مجلس عمل آئندہ الیکشن میں 2002 جیسی کامیابی حاصل نہیں کر سکتی۔ بلکہ ان دونوں جماعتوں کی عدم موجودگی مذہبی ووٹ بینک تقسیم کرنے کا بھی سبب بنے گی۔ جس کا زیادہ تر فائدہ سیکولر قوتوں اور پیپلزپارٹی کو ہوگا۔ بالفرض محال اگر مجلس عمل کامیابی حاصل کر بھی لیتی ہے تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ آئندہ سیاسی جوڑ توڑ اور سودے بازی میں ملوث نہیں ہوگی اور وہی عمل دوبارہ نہیں دہرایا جائے گا جو ماضی میں دہرایا گیا تھا۔

یہی وہ تحفظات ہیں جو جماعت اسلامی اور جمعیت علماء اسلام (س) کے مجلس عمل میں دوبارہ شرکت کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ جماعت اسلامی چاہتی ہے کہ اُسے اس بات کی یقین دہانی کرائی جائے اور مولانا فضل الرحمٰن اِس نکتے پر یکسوئی اختیار کرلیں کہ وہ آئندہ پیپلزپارٹی اور زرداری سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔ جماعت اسلامی کا کہنا ہے کہ 2002 کی طرح سیٹوں کا فارمولا طے ہوجائے اور ماضی میں جن اسباب کے سبب MMA غیر فعال ہوئی تھی اُس کا تجزیہ کرکے آئندہ اُن سے بچنے کا لائحہ عمل طے کرلیا جائے۔ جماعت اسلامی کے امیر منور حسن نے بارہا اس مطالبے کو دہرایا کہ MMA بحال کرنے سے پہلے اس اَمر کا جائزہ لیاجائے کہ اِس کو بے حال کس نے کیا؟ وہ یہ بھی کہتے ہیں یہ

کسی کے جیب کی گھڑی نہیں ہے کہ جب چاہے باہر نکال لی جائے اور جب چاہے واپس
جیب میں رکھ لی جائے،ماضی کے طرز عمل کو دیکھتے ہوئے یقینا جماعت اسلامی کے
تحفظات بے بنیاد نہیں، یہی تذبذب جمیعت علماء اسلام (س) کیلئے بھی رکاوٹ بنا ہوا ہے جو
کی بحالی کو فراڈ اور پاکستانی عوام کو آئندہ عام انتخابات میں گمراہ کرنے کی MMA
کے نام پر اقتدار کے MMA منصوبہ بندی سمجھتے ہوئے اسے اقتدار پرست ٹولے کا پھر
مزے لوٹنے کا کھیل قرار دیتی ہے، دوسری جانب جماعت اسلامی اور جمیعت علماء اسلام
س) کے خدشات کو دور کرنے کے بجائے مولانا فضل الرحمٰن ایک ایسا بیان داغ (
دیا، جس کی کسی کو توقع نہیں تھی، خود مولانا کو بھی اِس طرح کا بیان دینا زیب نہیں
میں جماعت اسلامی کو شامل کرنا "الکوحل" ملانے کے MMA دیتا تھا، مولانا نے فرمایا
مترادف ہوگا،ایک ایسے وقت میں جب صاحبزادہ زبیر اور پروفیسر ساجد میر وغیرہ ایم
ایم اے میں جماعت اسلامی کی شمولیت کیلئے کوشاں ہیں مولانا فضل الرحمٰن کا بیان اُن کی
میں جماعت اسلامی مائنس فارمولے کو ہی ظاہر MMA کوششوں کو سبوتاژ کرنے اور
نہیں کرتا بلکہ سیاسی تجزیہ نگاروں کی اُس رائے کہ" مولانا فضل الرحمٰن نے اپنی
مخصوص حکمت عملی کے تحت جماعت اسلامی کو متحدہ مجلس عمل سے باہر رکھ کر عبوری
سربراہی اسی لیے حاصل کی ہے کہ وہ باآسانی مستقبل میں مجلس عمل کے سربراہ بن
سکیں۔"کی توثیق کرتا بھی دکھائی دیتا ہے۔

جبکہ دوسری طرف جماعت اسلامی سے وابستہ اخبارات و رسائل متحدہ مجلس عمل کی
بحالی کو مردہ گھوڑے سے تشبیہہ دے رہے ہیں، یوں متحدہ مجلس عمل کی بحالی کے
حوالے سے جماعت اسلامی، جے یو آئی اور مولانا فضل الرحمٰن کے درمیان تنقید و تنقیص
کی جو گولہ باری ہو رہی اُس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مجلس عمل کے قائدین
کس حد تک متحدہ مجلس عمل کی بحالی کی کوششوں میں سنجیدہ ہیں، یہاں حیرت انگیز اَمر
یہ بھی ہے کہ ماضی میں دونوں فریقین نے MMA کے پلیٹ فارم سے خیبر بختونخواہ کے
مکمل اور بلوچستان کے آدھے حکمران ہونے کے ناطے بھرپور فائدے اٹھائے ہیں، لیکن
اب دونوں ایک دوسرے کو آڑے ہاتھوں لے رہے ہیں، جماعت اسلامی کو یہ بھی رنج
ہے کہ مولانا فضل الرحمٰن اپوزیشن کا ڈھول بھی پیٹتے ہیں اور اندورن خانہ حکومت کی
محبت و شفقت سے مستفید بھی ہوتے ہیں، یقینا مولانا کی یہ دوہری اور متضاد پالیسی ایم
ایم اے کے مستقبل کیلئے زہر قاتل کا درجہ رکھتی ہے، چنانچہ اس تناظر میں متحدہ مجلس
عمل میں شامل جماعتوں کے قائدین کیلئے یہ پہلو بھی توجہ طلب ہے کہ کیا اتحاد میں
شامل کسی شخص یا جماعت کو اِس بات کی اجازت دی جاسکتی ہے وہ اِس اتحاد کو خالصتاً
اپنے ذاتی و گروہی مقاصد کے حصول کیلئے استعمال کرتا پھرے، جبکہ اِس حقیقت سے بھی
سب واقف ہیں کہ مولانا فضل الرحمٰن دین کے نام پر سیاست کرتے ہیں، سیاسی
قلابازیاں مولانا کا وطیرہ ہیں جسے لوگ منافقت کا نام دیتے ہیں، مولانا نے ہمیشہ اقتدار
کو پہلی ترجیح دی، انہوں نے ہر دور میں اقتدار کے

مزے لوٹے، شمالی علاقہ جات میں ڈرون حملے ہوتے رہے، امریکی مداخلت بڑھتی رہی
اور مولانا فضل الرحمٰن وفاق میں بیٹھ کر محض خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتے ہوئے
اقتدار کی موج مستیوں میں مصروف رہے، مشرف دور میں جب لال مسجد آپریشن کیا گیا
تو مولانا فضل الرحمٰن نے ایک مرتبہ پھر سیاسی چال بازیوں کو ہتھیار بنایا،انہوں نے
اِس ایشو کی نہ حمایت کی اور نہ ہی مخالفت، جس سے ایم ایم اے کی ساکھ عوامی سطح پر
بری طرح متاثر ہوئی،جب پیپلزپارٹی کی حکومت قائم ہوئی تو مولانا نے MMA میں
شامل تمام دینی جماعتوں کی طرف سے MMA کو ایک مرتبہ پھر تشکیل دینے کے
حوالے سے کوششوں کو سبوتاژ کرتے ہوئے صرف اور صرف اقتدار کو مقدم رکھا اور
اب جبکہ انتخابات کا طبل بجنے کو ہے تو مولانا ایم ایم اے کو قائم کرنے کی باتیں کر رہے
ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ صوبہ خیبر پی کے اور شمالی علاقہ جات کے حوالے سے اپنی سیاسی ساکھ
کو بحال رکھنا چاہتے ہیں،اُن کا مقصد صرف اتنا ہے کہ آئندہ عام انتخابات کے دوران
جس کی بھی حکومت قائم ہو اور مولانا وفاق میں بیٹھ کر حکومت کے کاندھوں پر چڑھ
سکیں اور اقتدار کے مزے لوٹتے رہیں،یہی مولانا کا مطمع نظر، مقصد و مدعا ہے، یہ
درست ہے کہ عوام ملک میں دینی جماعتوں اور مذہبی حلقوں کے اقتدار کی خواہش مند
ہے مگر مولانا فضل الرحمٰن نے سابق آمر پرویز مشرف کے دور اقتدار کے دوران تشکیل
پانے والی MMA کے ساتھ جو کچھ کیا

سمیت اتحاد میں شامل تمام مذہبی جماعتیں آج تک بھگت رہی JUPاس کا خمیازہ
ہیں، مولانا کے طرز عمل کی وجہ سے لوگ مذہبی جماعتوں پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں
کی بحالی کی باتیں ہوتی ہیں تو عوام انہیں مشکوک نظروں سے MMA ہے،جب بھی
دیگر جماعتوں کے قائدین ایک JUPدیکھنے لگتے ہیں، مگراِس حقیقت کے ادراک کے باوجود
بار پھر مجلس عمل کی اجڑی ہوئی مانگ میں نیا سندور بھرنے کے خواہشمند ہیں، محترم
قائدین کی خواہشات کے صد احترام کے باوجود ذہن میں ابھرتے چند سوالات ہنوز غور
طلب ہیں،آخر مجلس عمل کے احیاء کی ضرورت کیوں محسوس کی جارہی ہے؟وہ کیا مقاصد
ہیں جنھیں مولانا فضل حکومتی حلیف اور شریک اقتدار ہونے کے باوجود مجلس عمل کو
فعال کرکے حاصل کرنا چاہتے؟اگر کسی طور یہ اتحاد دوبارہ فعال ہو بھی گیا تو کیا مولانا
شاہ احمد نورانی کی اُس اصولی روایات کو زندہ کرپائے گا جو مولانا نورانی کے دور میں
مجلس عمل کا خاصہ ، شناخت اور پہچان تھیں؟کیا مجلس عمل 2002 ء کی طرح کامیابی سے
ہمکنار ہوپائے گی ؟اور عوام مجلس عمل کی سابقہ مایوس کن کارکردگی کو دیکھتے ہوئے
ایک بار پھر اُسے سند قبولیت عطا کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔؟جبکہ مجلس عمل کی سابقہ
مایوس کن کارکردگی دیکھتے ہوئے ہمیں یہ کہنے میں کوئی قطعاً کوئی عار نہیں کہ مجلس عمل کا
وجود شاید کچھ مذہبی جماعتوں کے مفادات کی تکمیل کیلئے ایک بار پھر وقت کی ضرورت
ہو، مگر عوام اور بالخصوص عوام اہلسنّت کااِس اتحاد میں دلچسپی لیناأمر محال محسوس ہوتا
ہے، یہ بات جمعیت

علماءِ پاکستان کیلئے لمحہ فکریہ ہے، آج اِس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اپنی سابقہ کارگزاری کے سبب متحدہ مجلس عمل عوام میں اپنی ساکھ اور وقار کھو چکی ہے اور مولانا فضل الرحمٰن کے مسلسل حکومت میں شامل رہنے کی وجہ سے عوام اُن پر کسی طور اعتماد کرنے کو تیار نہیں ،چنانچہ اِن حالات میں متحدہ مجلس عمل کے پلیٹ فارم کے ذریعے اپنے وجود، اپنی شناخت اور اپنی حیثیت کی قربانی کے بعد حصول اقتدار کی کوشش کے قائدین کیلئے سوچنا JUP کس قدر کامیابی سے ہمکنار ہو سکتی ہے یہ ہم سے زیادہ ضروری ہے۔

کے قائدین کو یہ حقیقت بھی اپنے پیش نظر رکھنا ہوگی کہ وہ JUP اس کے ساتھ ساتھ جس مکتبہ فکر کی نمائندہ ہے کیا اُس مکتبہ فکر کے لوگ اب اِس قسم کے اتحاد میں رہنے کیلئے مزید انتشار JUP کو پسند بھی کرتے یا نہیں، اگر نہیں تو کیا اِس قسم کی سیاسی غلطی کے سیاسی کیرئیر کیلئے خود کشی سے کم JUP وافتراق کا سبب نہیں بنے گی اور یہ طرز عمل نہ ہوگا، لہٰذا اِن عوامل ، ماضی کے تلخ تجربات اور مولانا فضل الرحمٰن کی ہر قیمت پر حصول اقتدار کی سیاست کے تناظر میں آنے والے حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمارا قائدین جمعیت کو مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ جمعیت کو اِن ابن الوقت افراد کی بیساکھی بننے سے بچائیں، ہماری نظریں متحدہ مجلس عمل میں دوبارہ شامل ہونے سے کہیں بہتر ہے کہ جمعیت علماءِ پاکستان، اتحاد اہلسنّت کیلئے جمعیت کے دیگر دھڑوں، سنی

تنظیموں اور تحریکوں کو باہم متحد و منظم کرنے کی مخلصانہ کوشش کرے کیونکہ اسی میں
جمعیت کے نظریاتی تشخص، تنظیمی بقاء اور مستقبل کی بااثر سیاسی قوت ہونے کا راز مضمر
ہے، قائدین JUP یاد رکھیں کہ جمعیت علماء پاکستان اُن علماء و مشائخ اور عوام اہلسنّت کی
وارث اور امین ہے جنھوں نے تحریک پاکستان میں ہراول دستے کا کردار ادا کرتے
ہوئے قربانیوں کی لازوال تاریخ رقم کی اور جن نسلیں آج بھی اس مملکت کی
بقاء استحکام اور سالمیت کیلئے مصروف جہاد ہیں، الہٰذا اس تناظر میں متحدہ مجلس عمل کے
پلیٹ فارم کے ذریعے اپنے وجود، اپنی شناخت اور اپنی حیثیت کی قربانی کے بعد حصول
اقتدار کی کوششیں کس حد تک جمعیت علماء پاکستان اور اہلسنّت وجماعت کیلئے فوز وفلاح کا
باعث بن سکتی ہیں ،اِس کا جواب قائدین جمعیت علماء پاکستان پر قرض ہے، ہمارا ماننا ہے
کہ حالات کے تناظر میں JUP کی ایم ایم اے میں دوبارہ شمولیت اُس کے مذہبی اور
مسلکی تشخص اور رہے سہے بقیہ وجود کیلئے سیاسی خود کشی سے کم نہیں۔

سچائی کا سرٹیفکیٹ یا حکومت کا امتحان۔۔۔۔

گیند حکومت کی کورٹ میں ہے۔۔۔۔۔

گذشتہ دنوں سپریم کورٹ نے قومی تاریخ کے 16 سالہ پرانے ایک اہم ترین مقدمے کا فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ 1990ء میں ایوان صدر، آرمی چیف اور آئی ایس آئی کے اس وقت کے سربراہ کی ملی بھگت سے عوام کے مینڈیٹ کو چرانے اور حقیقی عوامی نمائندوں کو اقتدار میں آنے سے روکنے کی واردات کی گئی، اگرچہ مختلف ادوار میں بعض سیاسی شخصیات کے بیانات کے ذریعے اس واردات کے بہت سے پہلو قوم کے سامنے آئے مگراِن باتوں کی کوئی قانونی حیثیت نہ تھی، اب سپریم کورٹ کے چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کی سربراہی میں قائم تین رکنی بنچ نے اِن کرداروں کے چہروں سے نقاب الٹ کراُن کے خلاف کارروائی کا حکم دیا ہے، سپریم کورٹ نے اپنے مختصر فیصلے میں کہا ہے کہ 1990 کے الیکشن میں ایوان صدر کے ذریعے الیکشن میں دھاندلی کرکے سیاسی عمل کو آلودہ کیا گیا، سابق صدر غلام اسحاق نے آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایوان صدر میں الیکشن کمیشن قائم کرکے انتخابی نتائج پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی، عدالت نے انتخابات میں دھاندلی اور سیاسی عمل کو آلودہ کرنے پر سابق آرمی چیف جنرل اسلم بیگ اور سابق ڈی جی آئی ایس آئی جنرل اسد درانی کے خلاف وفاقی حکومت کو قانونی

کارروائی کا حکم دیتے ہوئے اصغر خان کیس کو قابل سماعت قرار دے دیا۔

عدالت نے قرار دیا کہ یہ عوامی نوعیت کا کیس ہے، اگر ایوان صدر میں اِس وقت کوئی سیاسی سیل ہے تو اُسے فوری ختم کیا جائے، عدالت نے اپنے فیصلے میں ملک کے لئے فوج کی قربانیوں کو سراتے ہوئے قرار دیا کہ فوج سیاست میں حصہ نہیں لے سکتی، آئی ایس آئی اور ایم آئی کا سیاسی عدم استحکام میں کردار نہیں ہو سکتا، سابق آرمی چیف اور ڈی جی آئی ایس آئی نے انفرادی حیثیت میں کام کیا، یہ اُن کا انفرادی فعل تھا اداروں کا نہیں تھا، یہ دونوں غیر آئینی اور غیر قانونی سرگرمیوں میں شریک ہوئے اور انھوں نے ایوان صدر میں قائم غیر قانونی الیکشن سیل کے تحت ہونے والی سرگرمیوں میں حصہ لیا جو فوج کے لئے بدنامی کا باعث بنا، ایف آئی اے رقوم کی تقسیم کی تحقیقات کرکے منافع سمیت وصول کرے، یونس حبیب کے خلاف بھی کارروائی کی جائے، فیصلے میں کہا گیا ہے کہ صدر پوری جمہوریہ کا نمائندہ ہوتا ہے اور اگر وہ اپنے حلف سے وفا نہ کرے تو آئین کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے، عدالت نے جن سیاستدانوں پر رقم کی وصولی کا الزام ہے اُن کے بارے میں اپنے فیصلے میں کہا کہ اُن کے خلاف مکمل تحقیقات کئے بغیر کوئی حکم نہیں دیا جا سکتا، تاہم عدالت نے ایف آئی اے کو حکم دیا کہ وہ اس بارے میں تحقیقات کرے اور ثابت ہونے پر سیاستدانوں سے رقوم منافع سمیت وصول کرے، مقدمے کا فیصلہ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے

تحریر کیا ہے، جس میں بڑی فوج کے سابق سربراہ جنرل (ر) اسلم بیگ اور آئی ایس آئی کے سابق ڈائرکٹر جنرل اسد درانی کو انفرادی طور پر اس عمل کا ذمہ دار قرار دیاگیااور بہ حیثیت ادارہ فوج کو سیاست میں مداخلت اور انتخابی دھاندلی کے الزام سے بری کردیا ہے،اس مقدمے کی سماعت کے دوران میں کئی امور زیر بحث آئے ہیں، لیکن اُن کے بارے میں کوئی بات نہیں کہی گئی ہے، ہوسکتا ہے کہ تفصیلی فیصلے میں اُن تمام امور کا بھی احاطہ کیا جائے،اصغر خان کیس کے فیصلے کے نتیجے میں صرف یہ بات سامنے آئی ہے کہ دو افراد نے انفرادی طور پر اپنے دائرہ کار سے تجاوز کیا،انھوں نے ناجائز طور پر سیاست دانوں میں رقوم تقسیم کیں اِس لیے عدالت عظمیٰ نے اِن دو افراد کے خلاف کارروائی کی ہدایت کی ہے۔

سپریم کورٹ کے موجودہ فیصلے پر مدعی جناب ایئر مارشل اصغر خان نے اطمینان کا اظہار کیا اور کہا ہے کہ یہ ایک اچھا فیصلہ ہے، یہ فیصلہ اِس تناظر میں بھی اہمیت رکھتا ہے کہ حکومت کی شکایت یہ ہے کہ عدالتی فعالیت کی پشت پر اسٹیبلشمنٹ کی اصل طاقت فوج ہے،اس فیصلے نے یہ بات بھی ظاہر کردی ہے کہ ایوان صدر کو سیاست کا مرکز نہیں ہونا چاہیے اِس لیے کہ صدر وفاق کا نمائندہ ہوتا ہے جبکہ وزیر اعظم حکومت یا انتظامیہ کا نمائندہ ہے اور سیاست اس کا حق ہے ایوان صدر کو تمام سیاسی جماعتوں کے درمیان غیر جانبدار ہونا

چاہیے، جبکہ سپریم کورٹ کے مذکورہ فیصلے پر وزیراعظم راجہ پرویز اشرف نے اپنے
رد عمل میں کہا کہ 1990 کے انتخابات چرانے والے قومی مجرم ہیں اور اُن کے خلاف
آئین و قانون کے تحت کارروائی ہوگی اور قوم کی ایک ایک پائی وصول کی جائے گی، وزیر
اعظم کا یہ بھی کہنا تھا کہ تاریخ نے سچ اگل دیا ہے، انھوں نے یہ وضاحت بھی کی کہ
اِس وقت ایوان صدر میں کوئی سیاسی سیل کام نہیں کررہا، سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد
حکومت اور پی پی پی کی قیادت کا رد عمل یہ ظاہر کررہا ہے کہ جیسے اُسے کوئی سنہری موقع
مل گیا ہو، لیکن وہ یہ بھول رہے ہیں کہ سپریم کورٹ فیصلے کے بعد جب یہ مقدمہ
عدالتوں میں چلے گا تو الزامات فریم ہوں گے، جنہیں ثابت کرنے کیلئے نہ صرف طویل
عرصہ بلکہ شواہد بھی درکار ہونگے، خود پی پی پی بھی اس مقدمے میں سرگرم نہیں رہے
گی کیونکہ جو کچھ مسلم لیگی قیادت نے 1990 میں PPP کے ساتھ کیا، وہی PPP
قیادت نے 1993 میں مسلم لیگ کے ساتھ کیا، دوسری بات یہ کہ جس ادارے سے
انکوائری کرانے کی بات کی جارہی ہے، وہ بذات خود کرپٹ ترین ادارہ ہے، کتنے ہی
گنت مقدمات کی انکوائری کے دوران خود سپریم کورٹ ایف آئی اے کے خلاف نااہلی
یکطرفہ کارروائی اور بدنیتی کی چارج شیٹ جاری کرچکی ہے، لہٰذا اس تناظر میں مجرموں
کو سزائیں دلوانا آسان کام نظر نہیں آتا، ہاں یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ حکومت اِس
موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے مخالفوں کی کردار کشی اور اسے بطور ہتھیار اگلے الیکشن میں
استعمال کرسکتی ہے۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ اِس فیصلے سے یہ تو واضح ہو گیا کہ 1988ء میں آئی جے آئی کی تشکیل میں فوجی سربراہ اور اُس وقت کے صدر نے مداخلت کی، لیکن یہ تاریخ کا آدھا اور نامکمل سچ ہے، اصل حقائق سے قوم کب باخبر ہوسکے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ بہرحال پھر بھی قوم اصغر خان کیس کو زیر بحث لانے اور بہت سارے حقائق کو منظر عام پر لانے پر سپریم کورٹ کی ممنون ہے۔ بس اتنی گزارش ہے کہ حقائق محض منظر ہی عام پر نہ لائے جائیں بلکہ اصلاح احوال کی بھی کوشش ہونی چاہئے، جس کی سردست کوئی امید نظر نہیں آتی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ سپریم کورٹ کے فیصلے میں اُن فوجی و سیاسی کرداروں کا ذکر تو آیا جنھوں نے قومی خزانے سے چوری کرکے رقمیں سیاسی جماعتوں میں تقسیم کیں، لیکن وہ کردار جنھوں نے انتخابی عمل کو متاثر کیا اور بقول وزیر اعظم "انتخابی نتائج چرائے" ابھی بھی صیغہ راز میں ہیں، اگر رقم تقسیم کرنا سازش تھی تو انتخابی عمل پر اثر انداز ہونا اور اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرنا بھی اسی سازش کا اگلا حصہ ہے، اگر سیاست کی خفیہ کہانیاں منظر عام پر لانی ہیں تو اسٹیبلشمنٹ کے اُن کرداروں کو بھی سامنے لانا ہوگا جو اسلام آباد میں بیٹھے چالیں چلتے ہیں اور حکومت بنانے اور گرانے میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں، یہ درست ہے کہ اصغر خان کیس کے تاریخی فیصلے نے جمہوریت کے استحکام کی راہ ضرور دکھائی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی سیاسی تاریخ ایسے شرمناک اقدامات و واقعات سے

بھری پڑی ہے جس میں عوامی مینڈیٹ پر ڈاکہ ڈالتے ہوئے من پسند افراد یا پارٹی کو اکثریت دلانے کے لئے غیر قانونی اور غیر آئینی ہتھکنڈے استعمال کئے جاتے رہے، جس کے نتیجے میں ملک میں نہ صرف سیاسی بحران پیدا ہوا بلکہ اقتصادی اور معاشی میدان میں بھی ملک پیچھے چلا گیا، کرپشن اور رشوت کی پیداوار حکومتوں نے نہ صرف جمہوریت کو بدنام کیا بلکہ ملک میں بے ایمانی اور دھوکہ دہی کا ایسا کلچر پیدا کیا کہ اوپر سے نیچے تک سب مل کر وسائل کی لوٹ کھسوٹ میں لگ گئے، فرائض کی ادائیگی کا احساس دھندلانے لگا اور عوامی خدمت کا بنیادی فرض پس پشت چلا گیا، نوے کی دہائی اور اُس کے بعد کے واقعات اِن تمام باتوں کی تصدیق کرتے دکھائی دیتے ہیں، آج کوئی فوجی قیادتوں کو موردالزام ٹھہراتا ہے تو کوئی سیاسی قیادتوں کی نااہلی کا رونا روتا ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سب نے مل کر آئین اور قانون کی دھجیاں اڑائیں ہیں۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ اصغر خان کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلے کو پورے ملک نے سراہا گیا، اب حکومت وقت کی اوّلین ذمہ داری ہے کہ سپریم کورٹ کے احکامات کی روشنی میں ٹھوس اقدامات کرکے اِس معاملے کو منطقی انجام تک پہنچائے، محترم چیف جسٹس صاحب نے درست فرمایا کہ آئین کی پامالی اور قانون سے انحراف نے قوم کو بھٹکا دیا، بلاشبہ اِس کی تمام تر ذمہ داری ماضی قریب کی سیاسی اور فوجی قیادتوں پر عائد ہوتی ہے، مگر سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے نے ایک بار

پھر امید کی کرن پیدا کی ہے کہ عوامی قیادت کے دعویدار صرف اور صرف آئین کی پاسداری اور عوامی قوت پر ہی یقین رکھیں اور اقتدار میں آنے کے لئے چور راستے تلاش کرنے کے بجائے صرف آئینی اور قانونی راستے کو ہی اپنائیں، بلاشبہ یہ ہماری سیاسی تاریخ کا ایسا اہم موڑ ہے جس میں جراتمندانہ اقدامات اور فیصلے وقت کا تقاضہ ہیں، ہمارا ماننا ہے کہ ایسے لوگوں سے قانون کے مطابق نمٹا جائے جن کے نام سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں دیئے ہیں، ساتھ ہی ایسے تمام سیاست دانوں کو تاحیات نااہل قرار دیا جائے جنھوں نے پیسے وصول کئے اور ایسی قانون سازی کی جائے کہ آئندہ کسی کو انتخابات اور اُن کے نتائج پر اثر انداز ہونے کا موقع نہ مل سکے،اِس حوالے سے تمام محب وطن سیاسی جماعتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوامی شعور کی بیداری کی مہم چلائیں تاکہ عوام انتخابات میں بلاخوف اور دباؤ اپنے ضمیر کے مطابق اپنے نمائندوں کا انتخاب کرسکیں،اِس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ سپریم کورٹ کے جراتمندانہ فیصلوں کے نتیجے میں تبدیلی کے آثار نمایاں ہورہے ہیں، لوٹ مار، کرپشن، بددیانتی اور قومی و ملی امور کو نقصان پہنچانے والے بے نقاب اور قوم کے سامنے عریاں ہو رہے ہیں، لہٰذا فیصلے پر فوری اور بلاتاخیر عمل کیا جانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے،اب جبکہ سپریم کورٹ نے اپنا تاریخی فرض ادا کرتے ہوئے گیند اُس پارٹی کی حکومت کی کورٹ میں پھینک دی ہے جس کے خلاف سازش کی گئی تھی، دیکھنا یہ ہے کہ عدالت عظمیٰ نے جن افراد کی نشاندہی کی ہے حکومت اُن کے خلاف کیا

کارروائی کرتی ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ عدلیہ نے ایک تاریخ ساز فیصلہ دیکر راستہ متعین کردیا ہے۔اب اِس فیصلے پر عمل درآمد اور متعلقہ کرداروں کو کیفر کردار تک پہنچانا اُسی حکومت کی اوّلین ذمہ داری ہے جواِس فیصلے پر بغلیں بجاتے ہوئے راگ الاپ رہی ہے کہ 16 برس بعد تاریخ نے سچ اگل کر پی پی کی سچائی کا سرٹیفکیٹ دے دیا ہے۔

ناموسِ رسالت اور مغرب کی شر انگیزیاں۔۔۔۔

متین خالد ایک استعمار دشمن مجاہد۔۔۔۔
متین خالد سامراجی و یہودی گماشتوں کیلئے اک شعلہ جوالہ۔۔۔۔
یہ حقیقت ہے کہ انتہا پسندی اور دہشت گردی کے حوالے سے مغرب کے اپنے
معیارات، اپنے پیمانے اور اپنے خودساختہ معنی و مفہوم ہیں، نوایجاد شدہ مغربی لغت کسی
غیر مسلم کے غلط کام کو جرم قرار دیتی ہے مگر کسی مسلمان سے اگر وہی کام سرزد
ہو جائے تو وہ دہشت گرد قرار پاتا ہے، اسی طرح مغربی دنیا میں ایک یہودی کا ڈارھی
رکھنا اُس کے مذہب کا حصہ مانا جاتا ہے مگر ایک مسلمان کی ڈارھی اُسے انتہا پسند اور
دہشت گرد گردانتی ہے، اگر ایک عیسائی راہبہ " نن " اپنے سر کو کپڑے سے ڈھانپے تو
کہا جاتا ہے اُس نے اپنے آپ کو خداوند مسیح کیلئے وقف کر دیا ہے، لیکن ایک مسلمان
عورت اگر اسکارف اوڑھے تو مغرب اُسے نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتا
ہے، مغرب کو چرچ کی گھنٹیوں کا بجنا درست لگتا ہے مگر مساجد سے اذانوں کا بلند ہونا
سماعتوں پر بوجھ اور نیند کُش محسوس ہوتا ہے، الغرض مغرب اپنے ہر فعل ہر عمل کیلئے
آزاد و خود مختار

مگر مسلمان اپنے فعل و عمل کیلئے قابل نفرت و معتوب قرار پاتے ہیں، یہ ترقی یافتہ، رواداری اور حقوق انسانی کے عالمی چیمپیئن اور اپنے آپ کو انسانی آزادی اور آزادی اظہار کے دعویدار کہلانے والے مغرب کا وہ منافقانہ دوہرا معیار ہے، جس کی ہزاروں مثالیں دی جاسکتی ہیں، مگر ہم نے یہاں صرف چند پر اکتفا کیا ہے۔

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ مغرب توہین اسلام اور گستاخی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تو آزادی اظہار سے تعبیر کرتا ہے مگر کسی فرد کو اِس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ ہولوکاسٹ کے خلاف کچھ کہہ سکے، جبکہ اِس تناظر میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہولوکاسٹ کا یہ قانون آزادی اظہار پر قدغن نہیں ؟کیا ہولوکاسٹ کیلئے علیحدہ سے قانون سازی کرنا اور مسلمانوں کے مذہبی شعار کیلئے قانون بنانے سے گریز کرنا متضاد رویئے کی عکاسی نہیں کرتا اور کیا ہولوکاسٹ کے منکرین کیلئے قانون کی موجودگی اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بھی ایسے ہی کسی قانون کے نفاذ کا جواز فراہم نہیں کرتا۔ ؟مغرب کے پاس اِن سوالوں کا کوئی جواب نہیں، نہ ہی وہ اِن سوالوں کے جواب تلاش کرنا اور دینا چاہتا ہے، دراصل مغرب کا یہ طرز عمل اُس کے اُس ذہنی خناس کو ظاہر کرتا ہے جس کے مظاہرے اکثر و بیشتر توہین آمیز خاکے، متنازعہ کتب ورسائل اور گستاخانہ فلموں کی شکل میں سامنے آتے رہتے ہیں

اور مغرب کا خبث باطن اُسے بغض و کینہ اور نفرت پن پر ابھارتا رہتا ہے، یہ اَمر مغرب کے اُس نفسیاتی روگ اور دلی مرض کی جانب اشارہ کرتا ہے، جس کا راز اُس ذلت آمیز ہزیمت اور شرمناک شکست میں پوشیدہ ہے جو اُس نے صلیبی جنگوں میں مسلمانوں سے کھائی تھی، اسلام اور عالم اسلام کے خلاف مغربی دنیا کا یہ بغض اب پوری طرح عریاں ہوچکا ہے، ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ہنگٹن نے تہذیبوں کے تصادم کا جو نظریہ پیش کیا تھا وہ اب کھل کر عملی شکل اختیار کرچکا ہے، یہ شیطنت کا وہ پہلو ہے جس کا اظہار صدیوں سے ہورہا ہے اور جسے مغرب آزادی اظہار کے لبادے میں چھپانا اور تحفظ چاہتا ہے۔

ناموس رسالت کے خلاف مغرب کی شرانگیزیاں" دراصل مغرب کے اِسی بغض" وعناد بھرے مکروہ چہرے کی نقاب کشائی ہے، جسے عصر حاضر کے نوجوان محقق محمد متین خالد نے ترتیب دیا ہے، آپ جانتے ہیں کہ ردِ فتنہ مرزائیت اور تحفظ ختم نبوت و ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم محمد متین خالد کا پسندیدہ موضوع ہے، اب تک اِس موضوع پر اُن کے قلم سے نکلی ہوئی 60 سے زائد کتب دنیا بھر میں قبولیت عامہ کا درجہ حاصل کرکے متین خالد کی پہچان وشناخت بن چکی ہیں، دفاعتحفظ ختم نبوت اور تحفظ ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان افروز راستے پر چلتے ہوئے متین خالد کو تقریباً تین عشرے گزر چکے ہیں، اِس دوران "عقیدہ ختم نبوت اور فتنہ قادیانیت، قادیانی عقائد، قادیانیوں سے متعلق عدالتی

فیصلے، قادیانیت سے متعلق آئین و قانون کیا کہتا ہے،احمدی دوستو تمھیں اسلام بلاتا ہے، مرزا قادیانی کی علمی حیثیت، حضرت مہر علی شاہ گولڑوی اور فتنہ قادیانیت،پاکستان کے خلاف قادیانی سازشیں،پارلیمنٹ میں قادیانی شکست، قادیانیت انگریز کا خود کاشتہ پودا، شہیدانِ ناموس رسالت، ناموسِ رسالت کے خلاف امریکی سازشیں،اُف یہ پادری، حقوق انسانی کی آڑ میں،علامہ اقبال اور فتنہ قادیانیت،اسلام کا سفیر اور ثبوت حاضر ہیں'' جیسی مشہور و معروف اور معرکۃ الآراء کتابیں اُن کے قلم سے نکل کر باطل کے ایوانوں میں زلزلہ برپا کرچکی ہیں، جبکہ لاتعداد مقالات وکتابچے اِس کے علاوہ ہیں۔ آج محمد متین خالد کا نام پاکستان اور بیرونی دنیا کے علمی ادبی اور دینی حلقوں میں ایک معتبر حوالہ اور موقر استعارہ بن چکا ہے، متین خالد سامراجی و یہودی گماشتوں اور قادیانیت کے خرمن باطل کیلئے شعلہ جوالہ اور برق بے اماں کی حیثیت رکھتے ہیں،وہ ادبی حلقہ میں استعمار و دشمن مجاہد کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں،اُن کی تمام تر قلمی ترکتازیوں کا ہدف اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن وہ نقاب پوش گماشتے ہیں جو دین کے نام پر اسلام کے قلعے اور عقائد کی فصیلوں پر شب خون مارنا چاہتے ہیں، متین خالد نے استعمار کے اِن پٹھوؤں کو اسلام کے پیرہن میں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ضرار بنانے کیلئے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتے پھر رہے تھے،اپنے قلم کٹہرے میں

لا کھڑا کیا ہے اور انہیں اِس طرح بے لباس و بے نقاب کر دیا ہے کہ اِن بھگوڑوں کیلئے اب جائے ماندن ہے نہ پائے رفتن۔

عصر حاضر میں قادیانیت عالم اسلام کی شہ رگ پر سرطان کے پھوڑے کی مانند ہے،اِس پھوڑے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کیلئے جس قسم کی تیز دھار نشتر کی ضرورت ہے وہ متین خالد کی تحریروں میں بدرجہ اَتم موجود ہے، وہ اِس میدان میں قرون اولی کی خالدی شمشیر لیے ڈٹے ہوئے ہیں،یقیناردِ قادیانیت اور تحفظ ختم نبوت و ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر محمد متین خالد کی تحقیقی و تصنیفی اور تالیفی و تجزیاتی کاوشوں کی اصابت و وقعت ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے،اُن کی یہ کاوشیں گزشتہ تین عشرے سے تواتر و تسلسل کے ساتھ ارباب نقد و نظر سے خراج و ستائش وصول کر رہی ہیں، بیگانہ و خویش ہر حلقہ، محبوب و معتوب ہر انجمن اور حلیف و حریف ہر محاذ اُن کی سنجیدہ فکر اور ثقاہت کا معترف ہے، غیر جانبدار اور حقائق شعار اصحاب دانش تسلیم کر چکے ہیں کہ اِس نوجوان محقق کی تالیفات و تصنیفات کا مابہ الامتیاز وصف دیانت صداقت متانت اور جرات ہے،اُن کی تازہ کتاب "ناموس رسالت کے خلاف مغرب کی شرانگیزیاں" بھی انہی خوبیوں کا نادر مرقع ہے۔

جس میں ملک کے ممتاز اہل قلم،دانشور اور مذہبی اسکالرز جن میں ڈاکٹر عامر

لیاقت حسین، اوریا مقبول جان، انور غازی، پروفیسر محمد اکرم رضا، محمد اسماعیل قریشی، شاہ بلیغ الدین، مفتی تقی عثمانی، ڈاکٹر اسرار احمد، عرفان صدیقی، حامد میر، ارشاد احمد حقانی، یاسر محمد خان، جنرل حمید گل، اسلم شیخوپوری، ڈاکٹر طاہر القادری، اشتیاق بیگ، بشریٰ رحمٰن، خاور چوہدری، جسٹس سجاد علی شاہ، جاوید چوہدری، فرحت عباس شاہ وغیرہ شامل ہیں، کے 126 کے قریب پر مغز، مدلل اور معلوماتی مضامین ومقالات ایمان کو نئی تازگی اور جلاء بخشتے ہیں۔ برادرم محمد متین خالد نے عشق و محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے لبریز اِن ایمان افروز تحریروں کو یکجا کرکے جہاں ایک گرانقدر علمی تحفہ دیا ہے، وہیں انہوں نے مغرب کی منافقت، اسلام دشمنی اور مسلمانوں سے معاندانہ رویہ کو بھی بے نقاب کردیا ہے۔ انہوں نے اِس تحقیقی دستاویز میں حقائق کا وہ آئینہ دکھایا ہے جس میں مغرب اپنے تمام تر انسانی حقوق، مساوات اور رواداری کے بلند بانگ دعووں کے باجود جھوٹا، مکار اور فریبی نظر آتا ہے اور اُس کا خبث باطن پوری طرح عریاں ہوکر دنیا کے سامنے آجاتا ہے۔

کراچی لاشوں اور جنازوں کا شہر۔۔۔۔

گرتے لاشے اٹھتے جنازے پر غمال شہر مگر قاتل آزاد۔۔۔۔۔
گذشتہ ماہ عدالت عظمٰی میں "کراچی امن وامان مقدمے "کی سماعت کے دوران پیش آنے والا وہ منظر نا قابل یقین اور حیرت انگیز تھا،جب جسٹس سرمد جلال عثمانی نے ایڈوکیٹ جنرل سندھ سے سوال کیا کہ آج مرنے والوں کی تعداد کیا ہے؟جواب میں ایڈوکیٹ جنرل نے فرمایا،جناب آج کا اسکور چھ ہے،جس پر جسٹس سرمد جلال عثمانی کا کہنا تھا کہ کیا لوگوں کا مرنا میچ اسکورنگ ہے،کیا یہاں چوکے چھکے لگ رہے ہیں؟قارئین محترم ! جسٹس سرمد جلال عثمانی اور ایڈوکیٹ جنرل سندھ کے درمیان پیش آنے والا یہ مکالمہ ہے ہمارے ارباب اقتدار اور اُن کے حواریوں کی بے حسی،لاتعلقی اور شکاوت کلبی کا آئینہ دار ہے،کراچی میں بے گناہ لوگ مارے جارہے ہیں،روزانہ دس سے بیس افراد کا قتل معمول بن چکا ہے،نامعلوم قاتل شہر میں دندناتے پھر رہے ہیں،کوئی انہیں روکنے والا نہیں،شہر یرغمال مگر قاتل درندے آزاد،میرا عروس البلاد اجڑ رہا ہے مگر حکمران گونگے بہرے اور اندھے تماشائی بنے ہوئے ہیں اور حکومتی نمائندے بے گناہ افراد کے قتل کو کسی میچ اسکور کی طرح بیان کررہے ہیں،یہ میرے شہر میں

بدامنی اور قتل وغارت گری کا وہ نوحہ ہے، جسے لکھتے لکھتے عرصہ بیت گیا، زبانیں تھک گئیں ،ذہن ماؤف ہوگئے، لیکن نہ قاتلوں کے ہاتھ تھکے اور نہ خون سے رنگین شہر کے درودیوار خشک ہوئے،ہر روز میرے شہر کی زمین انسانی خون سے رنگین ہوتی ہے، بچے یتیم ہوتے ہیں، سہاگنیں بیوہ ہوجاتی ہیں اور بوڑھے ماں باپ اپنے مستقبل کے سہاروں سے محروم ہوجاتے ہیں، لیکن حاکم وقت فرمارہے ہیں کراچی میں حکومت ناکام نہیں ہوئی۔

دعوے ہیں کہ رکتے ہی نہیں،ارباب اقتدار جھوٹ پر جھوٹ بولتے ہیں مگر شرمندہ نہیں ہوتے، ہمیں اٹھتے بیٹھتے اُس آہنی ہاتھ کا سبق پڑھاجاتا ہے جو کہیں نظر نہیں آتا، روزانہ نت نئے جواز تراشے جاتے ہیں، کبھی طالبان کوذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے تو کبھی کسی مافیا اور کسی گروہ کو، مگر ذمہ داروں کو روکنا، پکڑنا اور کیفر کردار تک پہنچانے میں مجبورو بے بس نظر آتے ہیں، طرفہ تماشا یہ کہ کہا جاتا ہے حالات خراب ضرور ہیں مگر ایسے بھی نہیں جیسا میڈیا پیش کررہا ہے،یقینا یہ ڈھٹائی اور بے شرمی کی انتہا ہے کہ شہر میں ہرطرف خوف وہراس کا عالم ہے، کاروباری سرگرمیاں ماندپڑ چکی ہیں، صرف ماہ نومبر کے 10 دنوں میں 100 سے زائد افراد قتل ہوچکے ہیں،ایک میڈیا رپورٹ کے مطابق کراچی میں بدامنی کے خاتمے کیلئے جامع احکامات پر مبنی سپریم کورٹ کا فیصلہ آنے کے باوجود اکتوبر2011 سے 10نومبر 2012 تک شہر میں 2250 افراد دہشت گردی کا

نشانہ بن کر اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے، جبکہ 2012 کے آغاز سے اب تک سیاسی کارکنوں سمیت 1800 سے زائد انسانوں کا خون بہایا جا چکا ہے، یہ وہ اعداد و شمار ہیں جن کا مختلف پولیس اسٹیشنوں میں باقاعدہ اندراج کیا گیا ہے لیکن شہریوں کا کہنا ہے کہ مارے جانے والوں کی اصل تعداد اِس سے بھی کہیں زیادہ ہے۔

دوسری طرف مرنے والوں میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن کے لواحقین قانون نافذ کرنے والے اداروں سے انصاف کی توقع ختم ہونے کے باعث اُن سے رجوع ہی نہیں کرتے، بہت سے لوگ لاپتہ ہیں جن کے زندہ ہونے کی امیدیں دم توڑ چکی ہیں، آپ کو یاد ہوگا کہ سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں حکم دیا تھا کہ شہر میں تمام غیر قانونی اسلحہ ضبط کیا جائے، پولیس کو سیاسی اثر سے پاک کیا جائے، لینڈ مافیا کے خلاف کارروائی کیلئے قانون سازی کی جائے، اسلحہ لائسنس نادرا کے ذریعے جاری کئے جائیں اور شہر کے مختلف علاقوں سے نو گو ایریاز ختم کئے جائیں، مگر بدقسمتی سے اِن احکامات پر کلی تو کیا جزوی عملدرآمد بھی نہیں ہوا، جس کی وجہ سے دو کروڑ نفوس پر مشتمل گنجان آباد میرا عروس البلاد ایک عرصہ سے بدترین سیاسی، لسانی، نسلی اور فرقہ وارانہ دہشت گردی کا نشانہ بنا ہوا ہے، روزانہ درجنوں افراد ناحق قتل ہو رہے ہیں، کروڑوں روپے کی قیمتی املاک کا نقصان اس کے علاوہ ہے، مگر افسوسناک بات یہ ہے کہ ملک کے اس سب سے بڑے اور غریب پرور شہر میں حکومتی رٹ کہیں نظر نہیں آتی، ٹارگٹ کلرز، بھتہ

خور اور فرقہ پرست بلا روک ٹوک دندناتے پھرتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں آگ اور خون کا بازار گرم کرتے ہیں اور ایسے غائب ہو جاتے ہیں جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہیں تھا، پورا شہر پیشہ ور قاتلوں کے رحم و کرم پر ہے، مگر اس صورت حال کی ذمہ داری حکومت قبول کر رہی ہے نہ سیاسی پارٹیاں اور نہ ہی سکیورٹی ایجنسیاں اور قانون نافذ کرنے والے ادارے، یہ اُس شہر کا حال ہے جہاں تین سرکردہ پارٹیوں اور اُن کے شراکت داروں کی حکومت ہے، مگر ہر روز لاشے گرتے ہیں، نوحے گونجتے ہیں اور جنازے اٹھتے ہیں، بھتہ خوری، اغواء برائے تاوان، ٹارگیٹ کلنگ اور جلاؤ گھیراؤ جہاں کلچر بنا دیا گیا ہے، گینگ وار نے شہر کا امن و چین غارت کر رکھا ہے، اب تو تخریبی عناصر کے حوصلے اس قدر بڑھ چکے ہیں کہ پولیس اور رینجرز کی چوکیوں اور گشت پر مامور اہلکاروں کے علاوہ حساس تنصیبات کو بھی حملوں کا نشانہ بنا ریا جا رہا ہے۔

گذشتہ دنوں اس صورتحال پر صدر مملکت نے وزیراعلیٰ سندھ سے فون پر برہمی کا اظہار کیا، وزیراعلیٰ پولیس افسران پر برہم ہوئے اور آئی جی سندھ نے تین ڈی آئی جیز پر اپنا غصہ نکالا، مگر حالات جوں کے توں ہی رہے، عجب معاملہ ہے کہ صدر مملکت، وزیراعظم، وزیر داخلہ، صوبائی گورنر اور وزیراعلیٰ وقتاً فوقتاً امن و امان کو معمول پر لانے کے لئے ہدایات تو جاری کرتے ہیں، مگر حکومتی اقدامات کے مثبت نتائج نظر برآمد نہیں ہوتے، حال یہ ہے کہ پہلے شہر کے

مخصوص علاقوں میں مار دھاڑ ہوتی تھی مگر اب پورا شہر قتل و غارت گری کی لپیٹ میں ہے، وارداتوں میں کمی کی بجائے اضافہ ہو رہا ہے، جتنے لوگ پکڑے جاتے ہیں، اُن سے زیادہ نئے میدان میں آ جاتے ہیں، آج تک شاید ہی کسی مجرم کو کوئی سزا ملی ہو، صوبائی وزیر اطلاعات اِس کی وجہ یہ بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عدالتیں ملزموں کو رہا کر دیتی ہیں، جبکہ عدالتوں اور قانون کے شعبے سے تعلق رکھنے والے حلقوں کی جانب سے بار بار اس اَمر کی نشاندہی کی جاتی رہی ہے کہ تفتیشی شعبے کو زیادہ سرگرم، مستعد اور موثر ہونا چاہیے، کیونکہ جب تک مقدمات ٹھوس شواہد اور ثبوتوں کے ساتھ عدالتوں میں نہیں جائیں گے، موجودہ قوانین کے تحت ملزموں کو سزا ملنے کے امکانات معدوم ہی رہیں گے۔

ہمارا ماننا ہے کہ جب تک مجرموں کو ایک آنکھ سے دیکھا نہیں جائے گا، جب تک سزا پر عملدآمد نہیں ہوگا، مجرموں کی پیرول پر رہائی بند نہیں ہوگی اور جب تک قانون شہادت میں ترمیم اور گواہوں کو تحفظ فراہم نہیں کیا جائے گا، حالات کے سدھار کی صورت نہیں نکلے گی، یہ اَمر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ کراچی کے عوام کی جان و مال سے کھیلنے والے کون ہیں، یہ بات بھی مخفی نہیں کہ اِن جرائم پیشہ افراد کی ڈوریں کہاں سے ہلائی جاتی ہیں کون ان کی سرپرستی کرتے ہیں، مگر اصل مسئلہ یہ ہے کہ پکڑنے والے خود اُن پر ہاتھ ڈالنے سے ڈرتے ہیں، یہی وہ عوامل ہیں جس نے اِس عروس البلاد کو اجاڑ نا شروع

کردیا ہے، میرا رنگ و روشنیوں کا شہر، شہروں کی دلہن ایک بیوہ کی سونی کلائی بنتا جارہا ہے، لہٰذا ضرورت اِس اَمر کی ہے کہ وفاقی و صوبائی حکومت، سیکورٹی ایجنسیاں، تمام سیاسی پارٹیاں، دینی تنظیمیں اور علمائے کرام کراچی میں قیام امن کیلئے اپنا اپنا کردار ادا کریں اور شہر کو قتل وغارت کے عفریت سے بچائیں، ہم ارباب اقتدار اور ملک کی تمام سیاسی ومذہبی جماعتوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو موردالزام ٹھہرانے کی بجائے بدامنی پر قابو پانے کیلئے ایک ایسا مشترکہ اور متفقہ لائحہ عمل مرتب کریں جس کو بلاتفریق پوری قوت سے عملی جامہ پہنایا جاسکے، ویسے بھی خطے میں جاری عالمی آویزشوں کے تناظر میں کوئی بھی محب وطن لمحہ بھر کیلئے اپنے گھر کی فکر سے لاتعلق نہیں رہ سکتا، آج پاکستان کے 19 کروڑ عوام اپنے حکمرانوں اور فیصلہ سازوں کی طرف دیکھ رہے ہیں اور اُن سے فوری، موثر اور ایسے درست اقدامات کے متمنی ہیں جس کے نتیجے میں ملک کا معاشی مرکز ایک بار پھر سے امن کا گہوارہ بن جائے، یاد رکھیں کراچی میں امن و سکون ایک شہر کے لوگوں کا نہیں بلکہ پوری قوم کا مسئلہ ہے اور اِس کے سود وزیاں میں ملک کے ہر صوبے، ہر علاقے اور ہر قوم کے لوگ برابر کے شریک ہیں، لہٰذا حکومت سمیت سب کی ذمہ داری ہے کہ اس شہر کو مزید تباہی و بربادی سے بچائیں۔

غزہ پر حملہ، اسرائیل نے کیا کھویا کیا پایا۔۔۔۔

غزہ پر اسرائیلی جارحیت اور امن معاہدہ۔۔۔۔۔

اِس وقت بظاہر اسرائیل اور حماس کے درمیان جنگ بندی کے معاہدے پر عمل درامد شروع ہو چکا ہے، جس کے تحت اسرائیل تمام عسکری کارروائیاں روکنے اور ٹارگٹ کلنگ ختم کرنے کیلئے اِس شرط پر رضامند ہوگیا کہ حماس اسرائیل میں اور سرحدی علاقوں پر اپنے حملے روک دے گا،اِس معاہدے میں کہا گیا ہے کہ تمام فلسطینی دھڑے غزہ سے اسرائیل اور سرحدی علاقوں پر راکٹ اور دوسرے حملے روک دیں گے،اسرائیلی وزیر اعظم بنیامن نیتن یاہو کے دفتر سے جاری ایک بیان میں کہا گیا کہ وزیراعظم اُس امریکی تجویز پر رضامند ہوئے ہیں کہ طاقت کے استعمال سے پہلے وہ مصر کی طرف سے جنگ بندی کے منصوبے کو ایک موقع دیں اور حالات کو قابو میں لانے کیلئے امن کی طرف قدم اٹھائیں، مصر کے وزیر خارجہ کامل امر نے قاہرہ میں اپنی امریکی ہم منصب ہیلری کلنٹن کے ساتھ ایک نیوز کانفرس میں جنگ بندی کا اعلان کیا، بعد میں اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل نے بھی ایک اجلاس میں اسرائیل اور حماس پر زور دیا کہ وہ جنگ بندی پر سنجیدگی سے عمل درآمد کریں اور بین الاقوامی برادری سے مطالبہ کیا کہ غزہ کیلئے ایمرجنسی

امداد فراہم کریں، امریکی صدر بارک اوباما نے معاہدے کو تسلیم کرنے پر اسرائیلی رہنماؤں کی تعریف کی اور کہا کہ وہ اسرائیلی دفاعی نظام کو اور بہتر بنانے کے لیے مزید رقم فراہم کرنے کی کوشش کریں گے۔اُدھر جنگ بندی کے معاہدے کے اعلان کے بعد فلسطینیوں نے جشن مناتے ہوئے ہوئی فائرنگ کی۔ایک بین الاقوامی نیوز ایجنسی کے مطابق راتوں رات شہر کا نقشہ ہی بدل گیا اور وہ لوگ جنھوں نے ہوائی حملوں سے بچنے کیلئے پناہ لے رکھی تھی، سڑکوں پر نکل آئے۔لوگوں نے اپنی مدد آپ کے تحت حملوں میں تباہ ہونے والی عمارتوں کی مرمت اور صفائی کا کام بھی شروع کر دیا گیا ہے جبکہ حماس نے اپنی فتح کا جشن منانے کیلئے جمعرات کو عام تعطیل کا اعلان بھی کیا۔

دوسری طرف جنگ بندی کے معاہدے کے بعد اسرائیل کے وزیرِ دفاع ایہود باراک کا اسرائیلی ریڈیو پر دھمکی آمیز بیان بھی نشر کیا گیا جس میں کہا گیا کہ "یہ کوئی باضابطہ معاہدہ نہیں بلکہ چند سمجھوتے ہیں، جو نو دن یا نو ہفتے قائم رہ سکتا ہے، لیکن اگر یہ قائم نہ رہا تو ہم جانتے کہ پھر ہم کیا کریں گے۔اگر کوئی فائرنگ ہوئی تو ہم اپنی کارروائی دوبارہ شروع کر دیں گے۔" جبکہ حماس کے سیاسی رہنما خالد مشعل کا کہنا ہے کہ اسرائیل کی جارحیت ناکام ہو گئی ہے،جلاوطن فلسطینی رہنما خالد مشعل نے قاہرہ میں ایک اخباری کانفرنس میں واضح کیا کہ "اگر اسرائیل پاسداری کرے گا تو ہم بھی پاسداری کریں گے،اگر وہ

خلاف ورزی کرے گا تو پھر ہمارے ہاتھ لبلبی پر ہوں گے۔" اُن کا کہنا تھا کہ معاہدے میں حماس کے مطالبات مان لیے گئے ہیں، خالد مشعل نے مزید کہا کہ غزہ کے تمام راستے کھول دیے جائیں گے جس میں مصر کی طرف کا راستہ بھی شامل ہے، انھوں نے ثالثی کے کردار کیلئے مصر کا شکریہ بھی ادا کیا، واضح رہے کہ جنگ بندی پر رضامند ہونے کا اعلان ایک ایسے وقت کیا گیا ہے جب اسرائیل کے شہر تل ابیب میں ایک بس پر بم حملے میں 21 کے قریب افراد زخمی ہوئے، اسرائیل اور حماس کے درمیان ایک ہفتے سے جاری پر تشدد تصادم میں 160 کے قریب فلسطینی شہید، 1500 سے زیادہ زخمی ہوئے، جبکہ املاک کی تباہی و بربادی کا نقصان علیحدہ ہے، اسرائیلی ذرائع ابلاغ میں شائع ایک رپورٹ کے مطابق 14 تا 21 نومبر تک جاری رہنے والی غزہ پر آٹھ روزہ اسرائیلی بمباری کے جواب میں فلسطینی مزاحمت کاروں نے متعدد اسرائیلی شہروں کو راکٹ حملوں کا نشانہ بنایا، جس سے کل 1143 اسرائیلی تعمیرات کو نقصان پہنچا، عبرانی زبان کے کثیر الاشاعت روزنامے "یدیعوت احرونوت" کے مطابق فلسطینی مجاہدین نے تل ابیب کے ایک علاقے "ریشون لیٹسیون" پر بھرپور راکٹ حملے کرکے صرف اِس ٹاؤن میں 172 رہائشی یونٹس کو شدید نقصان پہنچایا، اِن اعداد و شمار سے اسرائیلی وزارت داخلہ کے اُن دعووں کی نفی ہوتی ہے جس میں تل ابیب میں انتہائی کم نقصانات کا اعلان کیا گیا تھا۔

قابل غور بات یہ ہے کہ صہیونی دہشت گردوں نے ایک بار پھر فلسطین کی تحریک آزادی، حماس کے مجاہدین کو وحشیانہ دہشت گردی کا نشانہ کیوں بنایا؟ اور کیوں غزہ سمیت مختلف علاقوں پر اسرائیلی جنگی طیاروں کے حملوں میں بے گناہ فلسطینیوں کو شہید کیا، جن میں حماس کے فوجی سربراہ احمد الجباری بھی شامل ہیں، تجزیہ نگاروں کے نزدیک ویسے تو غزہ پر اسرائیل کے حملوں کا فوری محرک فلسطینی انتظامیہ کی اقوام متحدہ میں مبصر کی حیثیت سے درخواست پر اعتراض بتایا جاتا ہے، لیکن اصل محرک حماس کی تحریک مزاحمت ہے جس نے اسرائیل کو عالمی برادری میں بالکل تنہا کردیا ہے، خطے میں بدلتی صورتحال بالخصوص مصر میں اخوان کی کامیابی نے اسرائیل کے گرد گھیرا تنگ کردیا ہے، لبنان کی حزب اللہ نے بھی ایران کے تعاون سے اسرائیل کو محصور کردیا ہے،تاہم نیا حملہ اِس حوالے سے بہت اہم ہے کہ فلسطینی شہر غزہ کی پٹی میں اسرائیلی فوج کی جارحیت کو وزیراعظم بنجمن نیتن یاہو اپنی انتخابی فتح کا ایک زینہ بنانا چاہتے تھے، لیکن حماس کے جوابی حملوں نے اسرائیل کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا اور اُس کے پاس امن معاہدے کی علاوہ باعزت واپسی کا کوئی راستہ نہیں بچا، یوں یہ جنگ صہیونی وزیراعظم کی پیش آئندپارلیمانی انتخابات میں شکست کی نوشتہ دیوار دکھائی دیتی ہے، مرکزاطلاعات فلسطین کا کہنا ہے کہ نیتن یاہو حکومت نے اپنے ووٹروں کو یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ غزہ کی پٹی میں حماس کو ختم کرکے دم لے گی، لیکن موجودہ جنگی ہزیمت نے نیتن یاہو کے ووٹروں

کو سخت مایوس کیا اور یہ جنگ صہیونی وزیراعظم کے گلے کا ہار بننے کے بجائے شکست کی صورت میں ماتھے کا شرمناک داغ بن چکی ہے، بعض مبصرین کے نزدیک اِن حملوں کی ایک وجہ یہ تھی کہ اسرائیلی وزیراعظم نیتن یاہو حماس کو اشتعال دلانے کے لئے بے چین و مضطرب تھے تاکہ وہ اپنے ووٹروں کو یقین دلا سکیں کہ اُن کی حکومت اسرائیلی شہریوں کی حفاظت کے لئے ہر حریف کا مقابلہ کرنے کی اہلیت رکھتی ہے،اسرائیل میں عوامی مقبولیت کے حوالے سے کیے گئے تازہ ترین سروے میں نیتن یاہو کی مقبولیت صفر ہو کر رہ گئی ہے اور صہیونی عوامی حلقے حماس کے ساتھ فائر بندی کے معاہدے کو وزیراعظم اور حکمراں جماعت لیکوڈ پارٹی کی شکست فاش سے تعبیر کر رہے ہیں۔
اَمر واقعہ یہ ہے کہ حالیہ اسرائیلی جارحیت "آپریشن پلر آف ڈیفنس"کا مقصد گذشتہ اسرائیلی آپریشن "کاسٹ لیڈ" سے مختلف نہیں جو دسمبر 2008 سے جنوری 2009تک جاری رہا، تین ہفتوں پر محیط اِس آپریشن میں اسرائیل نے فلسطینی سرزمین پر عسکری دھاوا بول دیا،نہ صرف املاک بلکہ شہریوں پر بھی گولہ باری کی اور ایسے حربے استعمال کیے جنھیں اقوام متحدہ بھی جنگی مظالم قرار دیتی ہے،لیکن طاقت کے بھرپور استعمال کے باوجود اسرائیل اپنے اہداف کو حاصل کرنے میں ناکام رہا اور اب تین سال بعد دوبارہ جنگی کارروائی میں ذلت و ہزیمت اسرائیل کا مقدر بنی ہے،جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیل غزہ اور لبنان کی

جنگوں میں ناکامی کو باوجود اُن سے سبق سیکھنے میں ناکام رہا ہے، جبکہ اسرائیلی درندوں کو بہت پہلے ہی یہ سبق سیکھ لینا چاہئے تھا کہ وہ لوگوں کو قتل کر سکتے ہیں، شہروں کو تباہ و برباد کر سکتے ہیں، لیکن کسی نظریے کا خاتمہ نہیں کر سکتے۔حماس ایک نظریئے ایک تحریک کا نام ہے، جس سے وابستہ ہر فلسطینی اپنی ریاست کے قیام اور قومی خودمختاری کے جذبات سے سرشار ہے، لہٰذا غزہ کے حریت پسندوں کی جدوجہد اور اُن کے خلاف اسرائیل کی سفاکانہ کارروائیوں کو حقائق کی روشنی میں دیکھا جانا چاہیے، کیونکہ یہ محض دو یکساں اخلاقی پوزیشن رکھنے والے فریقوں کا تنازع نہیں، نہ ہی یہ دو ملکوں کا کوئی سرحدی اختلاف ہے،آپ اِسے کسی غلط فہمی کے سبب شروع ہوجانے والا جھگڑا بھی نہیں کہہ سکتے، حقیقت یہ ہے کہ اِس میں ایک طرف ثابت شدہ غاصب،ڈاکو، قاتل اور منصوبہ بندی کے ساتھ ارتکاب جرم کرنے والے مجرم اور اُس کے پشت پناہ ہیں، تو دوسری طرف وہ مظلوم لوگ ہیں جو یقینی طور پر اِن درندوں کے ہاتھوں قتل و غارت گری کا نشانہ بنتے چلے آرہے ہیں،آج غزہ میں کھیلی جانے والی خون کی ہولی اِسی سفاکانہ کھیل کا حصہ ہے، دنیا جانتی ہے کہ یہ وقتی جنگ بندی اِس مسئلے کا حل نہیں،آگ اور خون کے کھیل میں یہ محض ایک عارضی وقفہ ہے،اسرائیلی وزیر دفاع کے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ یہ خونی کھیل کسی وقت بھی دوبارہ دہرایا جاسکتا ہے، چنانچہ عالمی ٹھیکداروں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اِس تنازع کو مستقل طور پر حل کرنے کیلئے غاصب کو غاصب اور مظلوم کو مظلوم

تسلیم کریں اور ظالم سے مظلوم کو اُس کا حق دلوائیں۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ فلسطین کی موجودہ صورتحال نئی نہیں ہے، اپنے قیام کے آغاز سے اسرائیلی فوج نے فلسطینیوں کا جو قتل عام شروع کیا تھا، اُس میں وقفے ضرور آتے رہے، لیکن اگراِن وقفوں کو نکال دیا جائے تو معلوم ہوتا ہے یہ وہ قتل عام ہے جو 1948ء کواسرائیل کے قیام سے تاحال جاری ہے، اسرائیل دنیا کا انوکھا ملک ہے جو دوسروں کی سرزمین پر انھیں بے دخل کرکے آباد کیا گیا اور اِن آبادیوں کو اسرائیل کا نام دیا گیا، وقت کے ساتھ ساتھ یہودی مزید زمینوں پر قابض ہوتے گئے اور فلسطینی اپنی زمینوں سے بے دخل، صرف اتنا ہی نہیں، اُن کی بہت بڑی آبادی کو فلسطین سے نکال دیا گیا جو آج بھی لبنان، اردن، شام اور دوسرے ممالک میں بے گھر فلسطینیوں کے مہاجر کیمپ میں بے چارگی کی زندگی بسر کررہے ہیں، دوسری طرف غزہ کی پٹی پر کنٹرول رکھنے والی اسلامی تنظیم حماس امریکی و مغربی حکام کی مصالحت کی ہر کوشش کو فلسطینی عوام کو بے وقوف بنانے کی کوشش" سے تعبیر کرتی ہے، اسرائیل کی حالیہ 6" برسوں میں متعدد جارحانہ کارروائیوں کے باعث وہ ایسا سوچنے میں حق بجانب ہیں، اصولی طور پر حریت پسندوں کا یہ موقف درست ہے کہ جارح اور غاصب اسرائیل سے اُس وقت تک مذاکرات نہیں ہوسکتے جب تک اسرائیل ارضِ فلسطین پر غیر فلسطینی یہودی آبادکاروں کی بستیوں کی تعمیر کا سلسلہ بند نہیں

کرتا، دنیا جانتی ہے کہ جائیداد کے اصل مالک جائیداد پر ناجائز قابض عناصر کے ساتھ
کبھی مذاکرات نہیں کیا کرتے۔ارض فلسطین پر اسی ناجائز قبضے کے خلاف فلسطینی 65
برس سے برسرپیکار ہیں،1948 سے اب تک اسرائیل کے غاصبانہ قبضہ کی وجہ سے
مشرق وسطیٰ کا امن تہ و بالا ہے اور فلسطینی اپنی ہی دھرتی کی جیل نما ایک پٹی میں محصور
ہیں، جبکہ امریکہ ، یورپ اور روسی یہودیوں نے ان کی دھرتی پر عالمی اداروں اور
طاقتوں کی مدد سے قابض ہونے کے بعد فلسطین کے اصل باسیوں کو وہاں سے نکالنے کا
سفاکانہ عمل شروع کر رکھا ہے۔

لہٰذا اس تناظر میں مشرق وسطیٰ میں قیام امن کی کوئی کوشش اُس وقت تک کامیاب
نہیں ہو سکتی جب تک معاہدوں کے مطابق اسرائیل کے متوازی فلسطینی ریاست قائم نہیں
ہوجاتی اور یہ تب ہی ممکن ہے جب اسرائیل کے سرپرست امریکہ اور اُس کی پروردہ
ریاست اسرائیل فلسطینی عوام کے حق رائے دہی کا احترام کرے اور عالمی عدالت انصاف
کے فیصلے جس میں اسرائیل کو غیر قانونی دیوار مسمار کرنے کا حکم دیا گیا ہے پر عمل کرتے
ہوئے غزہ کی پٹی میں محصور فلسطینیوں کا محاصرہ ختم کرنے کے اقدامات کرے، ساتھ وہ
کیمپ ڈیوڈ، اوسلو اور شرم الشیخ معاہدوں کے تحت جس آزاد اور خود مختار فلسطینی
ریاست کے قیام کے اعلامیہ کاری کیا گیا تھا،اُس پر دیانتداری سے عمل کرے، حماس
رہنماؤں کا یہ بھی مطالبہ ہے،جب تک یہ مطالبات پورے نہیں ہوتے فلسطینی اپنی
جدوجہد جاری

رکھنے کیلئے پر عزم رہیں گے، حقیقت یہ ہے کہ غزہ اور اسرائیل کا عسکری لحاظ سے کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے،ایک مختصر سی آبادی جو غزہ میں ہر طرف سے محصور ہے، لیکن اس کے باوجود حماس کے وابستگان اور فلسطینی مجاہدین اسرائیل اور اُس کے پشت پناہ امریکہ کے سامنے اپنی جرات ایمانی کی بدولت ڈٹے ہوئے ہیں، فلسطینی گزشتہ 65 برس سے حالت جنگ میں ہیں، تمام تر بے سروسامانی کے باوجود اُن حوصلے بلند، عزم جوان اور ادارے غیر متزلزل ہیں اور وہ زندگی کی آخری سانس تک فلسطین کے تحفظ وبقاء کی جنگ لڑنے کیلئے صہیونی غاصبوں سے معرکہ آرائی میں مصروف ہیں۔

کرپشن کے حمام میں ۔۔۔۔

ایک مشہور کہاوت ہے کہ "مچھلی ہمیشہ سر کی جانب سے سڑتی ہے۔" ہماری قومی اور اجتماعی زندگی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے، یعنی کسی بھی قوم کے سڑنے یا تباہ ہونے کا آغاز اُس کے سر یا اوپری سطح کی جانب سے ہی ہوا کرتا ہے، مطلب یہ ہے کہ برائی سب سے پہلے قوم کے ارباب اقتدار اور اہلِ فکرو دانش میں پیدا ہوتی ہے، پھر اُس کا پھیلاؤ دوسری سمتیں تلاش کرتا ہے، جو مشہور عربی ضرب المثل "الناس علیٰ دین ملوکھم" کہ لوگ اپنے حکمرانوں کے دین پر (پیروکار) ہوتے ہیں۔" کو سچ ثابت کرتا ہے، یعنی جیسے حکمران ہوتے ہیں، ویسی ہی اُس کی رعایا ہوتی ہے، ہماری قومی زندگی اِس کہاوت اور عربی ضرب المثل کی مکمل آئینہ دار ہے، آج ارباب اختیار اور قومی اداروں کے ہر شعبے سے لے کر عوامی سطح تک برائی ایک کینسر کی طرح قومی زندگی کے رگ و پے میں سرائیت کر چکی ہے، کام چوری قوم کی عادت ثانیہ بن چکی ہے، ڈسپلن کو توڑنا ایک مشغلہ اور قانون شکنی ایک روایت کی شکل اختیار کر گئی ہے، اپنے دائرہ کار اور اختیارات سے تجاوز روز مرہ کا معمول اور عدم برداشت اور تشدد ایک فیشن کا روپ دھار چکا ہے، قوم میں اِن ساری خرابیوں کی تخلیق اور پرورش کسی اور نے نہیں کی ہے بلکہ اِن قومی بیماریوں اور خرابیوں کا اصل سبب نااہل قیادت کے ذمہ جاتا ہے، اِس کا ثبوت خود قیادت کا اپنا وہ

طرز عمل ہے جو لوٹ مار، کرپشن، بدعنوانی اور قومی وسائل کی بندر بانٹ تک پھیلا ہوا ہے، مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ جو اِس عمل کے ذمہ دار ہیں وہی اِس کے بے نقاب ہونے پر سب سے زیادہ شور و غوغا اور واویلا مچاتے ہیں۔

کچھ ایسا ہی گذشتہ دنوں اُس وقت ہوا جب سینٹر فار پیس اینڈ ڈویلپمنٹ انیشیٹیوز کی رپورٹ میڈیا کی زینت بنی، جس کے مطابق سال 2011 میں صدر مملکت سمیت پارلیمنٹ کے 67 فیصد ارکان نے اپنے ذمہ واجب الادا ٹیکس جمع نہیں کرایا، ٹیکس ادانہ کرنیوالوں میں 63 فیصد سینیٹرز جبکہ 69 فیصدارکان قومی اسمبلی شامل ہیں،اسلام آباد میں سنٹر فار انوسٹی گیشو رپورٹنگ اور سینٹر فار پیس اینڈ ڈویلپمنٹ انیشیوٹیوز کی طرف سے تیار کردہ رپورٹ میں کہاگیاہے کہ ٹیکس ریٹرن فائل نہ کرنیوالوں میں صدر مملکت، سابق وزیراعظم، نائب وزیراعظم، وزیر داخلہ، وزیر ریلوے، ڈپٹی چیئرمین سینٹ اور چیئرمین پبلک اکاونٹس کمیٹی کے چیئرمین سمیت چودھری وجاہت حسین، نذر حسین گوندل، مخدوم امین فہیم اور فرزانہ راجہ بھی شامل ہیں، جبکہ ٹیکس جمع نہ کرانیوالی پارٹی سربراہوں میں عوامی نیشنل پارٹی کی اسفندیار ولی، جے یو آئی (ف) کے مولانا فضل الرحمان، پیپلز پارٹی (شیرپاؤ) کے آفتاب احمد خان شیرپاؤ، فنکشنل لیگ کے پیر صدرالدین راشدی اور بی این پی عوامی کے یعقوب بزنجو بھی شامل ہیں، سینٹر فار پیس اینڈ ڈویلپمنٹ انیشیٹیوز کی رپورٹ میں دعویٰ کیا گیا کہ قومی

اسمبلی اور سینٹ کے مجموعی 446 ارکان میں سے صرف 126 ارکان نے ٹیکس ادا کیا، جن میں حکمران پیپلز پارٹی کے صرف 52 ارکان شامل ہیں، جبکہ حکمراں جماعت کے 107 ارکان نے ٹیکس کی ادائیگی نہیں کی،اِسی طرح مسلم لیگ (ن) کے صرف 32 ارکانِ پارلیمنٹ نے ٹیکس جمع کرایا اور 71 ارکان نے ٹیکس جمع ہی نہیں کرایا، رپورٹ یہ بھی بتاتی ہے کہ سینٹ کے 104 میں سے صرف 38 ارکان نے ٹیکس جمع کرایا جبکہ قومی اسمبلی کے 342 میں سے صرف 90 ارکان ٹیکس ادا کرنے والوں میں شامل ہیں، رپورٹ میں ٹیکس ادا کرنیوالے ارکان کی ادا شدہ رقوم کی تفصیلات بھی فراہم کی گئی ہیں جن کے جائزہ سے اکثر ارکان کے انتہائی غریب ہونے کا احساس نمایاں ہوتا ہے
۔

غالب گمان یہی ہے کہ سینٹر فار پیس اینڈ ڈویلپمنٹ انیشیٹیوز نے اپنی رپورٹ ایف بی آر کے مرتب کردہ اعداد و شمار کی روشنی میں مرتب کی ہوگی، جس میں عین ممکن ہے کسی حد تک مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہو، لیکن اِس رپورٹ سے آپ ہمارے ملک میں ٹیکس نا دہندہ حکمران اور طبقہ اشرافیہ کی چوری اور سینہ زوری کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں، خود وفاقی وزیر خزانہ حکمران طبقات اور اسمبلیوں و سینٹ کے ارکان کی ٹیکس چوری کا بھانڈہ پھوڑتے ہوئے گزشتہ سال کی بجٹ تقریر میں اِس بات کا اعتراف کرچکے ہیں کہ "پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے مجموعی ساڑھے گیارہ سو ارکان میں سے 8 سو ارکان سرے سے ٹیکس

ادا ہی نہیں کرتے۔" ایف بی آر کے ریکارڈ کے مطابق اِس وقت 87 لاکھ کے قریب شہری ٹیکس نیٹ میں شامل ہیں جن میں سے صرف تنخواہ دار طبقہ پابندی کے ساتھ ٹیکس ادا کرتا ہے جن کی تنخواہوں کی ادائیگی سے پہلے ہی ٹیکس کٹوتی کر لی جاتی ہے، جبکہ بڑے ٹیکس گزاروں میں شامل صنعت کار، تاجر، زمیندار اور دیگر شعبہ ہائے زندگی کے بیشتر لوگ ہر حکومت کا حصہ ہونے یا اقتدار کے ایوانوں میں اثر و رسوخ رکھنے کے باعث ٹیکس چوری یا عدم ادائیگی کو اپنا استحقاق سمجھتے ہیں، رہی سہی کسر آمدنی گوشواروں میں آمدنی کی تشخیص سے ٹیکس چوری کے راستے نکال کر پوری کر لی جاتی ہے، جس کی وجہ سے بڑے ٹیکس گزاروں کی اکثریت یا تو ٹیکس ادا ہی نہیں کرتی یا اُن کی جانب سے ٹیکس کی ادائیگی نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے، جس سسٹم میں ٹیکس کلچر کو فروغ دینے اور ٹیکس چوری روکنے کے ذمہ دار افراد ہی ٹیکس چوری اور قومی خزانے کی لوٹ مار کے عمل میں برابر کے شریک ہوں، جس سسٹم میں ارباب اقتدار اور طبقہ اشرافیہ کو اربوں کروڑوں روپے کے قرضے لے کر معاف کرانے اور جعل سازی کی بنیاد پر ٹیکسوں کی ادائیگی سے انکار کی عادت پڑی ہو، جس سسٹم میں صدر مملکت، وزیراعظم، وفاقی وزراء اور صوبائی کابینہ کے ارکان تک ٹیکس ادا نہ کرنے والوں میں شامل ہوں، اُس سسٹم میں ٹیکس چوروں سے قانون کی عملداری کون کرائے گا۔؟ یہ سوال پوری قوم کیلئے لمحہ فکریہ ہے۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں جب کسی طاقتور اور اعلیٰ شخصیت کا بدعنوان ہونا ثابت ہو جاتا ہے تو اُسے قانون کے کٹھہرے میں لاکر قرار واقعی سزا دینے اور نشانِ عبرت بنانے میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہیں کی جاتی، مگر ہمارے یہاں گنگا الٹی بہہ رہی ہے، چیئرمین نیب نے کرپشن کی جس نہر کا ذکر کیا ہے، اگر اُس نہر میں احتسابی جال پھینکا جاتا ہے تو یقیناً بڑے بڑے مگرمچھ قابو میں آتے، مگر افسوس اِس پر عمل درآمد کرنے کے بجائے 12 دسمبر کو کابینہ کے اجلاس میں وزراء کی اکثریت نے سینٹر فار پیس اینڈ ڈویلپمنٹ انیشیٹیوز، ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ اور چیئرمین نیب کے بیان کو مسترد کر دیا، جبکہ 13 دسمبر کو چیئرمین نیب کی پریس کانفرنس کے بعد یہ تاثر ابھرا کہ انہیں اپنے بیان کی ثقاہت پر پورا یقین ہے مگر اربابِ حکومت اِسے چیئرمین کی سرکشی تصور کر رہے ہیں، ہمارا ماننا ہے کہ اگر اربابِ اقتدار یہ سمجھتے ہیں کہ چیئرمین نیب نے مبالغے سے کام لیا ہے تو وہ ٹھوس حقائق و شواہد اور اعداد وشمار کی روشنی میں اپنی حکومت کی پونے پانچ سالہ دیانتدارانہ کارکردگی کا ریکارڈ پیش کرکے اُن کے مبالغہ کی قلعی کھول سکتے ہیں اور اِس معاملے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر سکتے ہیں کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹس، گورنر سٹیٹ بینک آف پاکستان، آڈیٹر جنرل آف

پاکستان، چیئرمین ایف بی آر اور چیئرمین نیب کے بیانات میں پیش کردہ اعداد وشمار میں فرق کیوں نہیں ہے؟ گو وفاقی وزراء نے چیئرمین نیب اور ایمنسٹی کی رپورٹ کو تو مسترد کیا

لیکن کسی معزز وفاقی وزیر کو یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ اُن کے پونے پانچ سالہ دور حکومت میں کسی بھی سطح پر کوئی کرپشن نہیں ہوئی یا کرپشن کی سرکوبی اور انسداد کیلئے اُن کی حکومت نے فلاں فلاں آہنی اقدامات کئے، تعجب خیز بات یہ ہے کہ اصل موضوع پر بات کرنے کے بجائے ایک وفاقی وزیر نے کرپشن کو سندِ جواز فراہم کرتے ہوئے فرمایا کہ دنیا کے کس ملک میں کرپشن نہیں ہوتی۔

یہ درست ہے کہ دنیا کے بیشتر ممالک بدعنوانی اور کرپشن کی لپیٹ میں ہیں، لیکن کیا اِس کا مطلب یہ ہے کہ ہم بھی کرپشن کریں اور دوسروں کے غلط کام سے اپنی کرپشن اور بدعنوانی کیلئے سند جواز حاصل کریں، دنیا میں ایسے بھی بہت سے ممالک اور مثالیں موجود ہیں، جہاں کرپشن کو جرم مانا جاتا ہے اور ٹیکس چوری سب سے بڑا جرم گردانا جاتا ہے، جہاں کرپٹ افراد کو احتساب کے کٹھرے میں لاکر قرار واقعی سزا دی جاتی ہے، کیا ہم اُنہیں سند جواز نہیں بنا سکتے، مگر افسوس ہم نے ہمیشہ منفی مثالوں ہی کو اپنے سامنے رکھا، اِس منفی روش کے فروغ کا نتیجہ آج ایک بھیانک شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے، ٹیکس چوری ہمارے معاشرے میں جرم کے بجائے فیشن کی شکل اختیار کر چکی ہے اور بدعنوانی اور کرپشن کے سنگین ترین جرائم میں ملوث ملزمان عدالت عظمیٰ کے واضح احکامات کے باوجود آزاد گھوم رہے ہیں، جب حکمران طبقات ہی اپنے ذمہ

واجب الادا ٹیکس ادا نہیں کرینگے تو عام ٹیکس گزاروں سے ٹیکس ادائیگی کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے، جس قوم کے حکمران اور طبقہ اشرافیہ ہی ٹیکس چوری کے مرض میں مبتلا ہوں، سرکاری پرستی میں لوٹ میں ملوث ہوں تو پھر کیا دیگر اداروں اور عام طبقے کو اس کی ترغیب نہیں ملے گی، جب اعلیٰ ترین مناصب پر فائز افراد ہی بدعنوان ہو جائیں تو وہ نچلی سطح کے لوگوں کو بدعنوانی سے کیسے روکا جا سکتا ہے، ایسی صورت میں قوم کی ترقی کا خواب کیسے شرمندہ تعبیر ہو سکتا ہے، کس طرح اصلاح احوال کی توقع کی جا سکتی ہے، آج ہمارے ارکان پارلیمنٹ ایمنسٹی انٹرنیشنل اور چیئرمین نیب کی کرپشن کے حوالے سے رپورٹس اور بیانات پر مشتعل اور برافروختہ ہیں، غم و غصہ کی حالت میں وہ اِن رپورٹس اور بیانات کو مسترد کر رہے ہیں، مگر حقیقت یہی ہے کہ کرپشن کے معاملے پر کابینہ کا غم و غصہ حقائق کے برخلاف ہے اور کرپشن کی اِن رپورٹس کو مسترد کرنے سے زمینی حقائق تبدیل نہیں ہو سکتے، کیونکہ ایک ایمنسٹی انٹرنیشنل ہی نہیں خود حکومت کی بدعنوانیوں کے حوالے اُس کا اپنا ادارہ نیب بھی انگشت نمائی کر رہا ہے، آج ہماری قومی زندگی کا کوئی شعبہ رشوت خوری، کمیشن اور بدعنوانی سے پاک نہیں ہے، حال یہ ہے کہ سرکاری اداروں میں اب ایماندار افراد ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے، کرپشن اور بدعنوانی نے زندگی کے تمام شعبوں کو کھوکھلا کر دیا ہے، کرپشن، بدعنوانی، لوٹ مار اور قومی وسائل کی بندر بانٹ ارباب اقتدار اور طبقہ اشرافیہ کا نشان امتیاز بن کر رہ گئی ہے، آج کرپشن

اور بدعنوانی پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ بن چکا ہے۔ذرائع ابلاغ میں کوئی دن ایسا نہیں ہوتا کہ بدعنوانی کے بارے میں کوئی خبر شائع نہ ہوتی ہو۔

جبکہ دنیا بھر کے مہذب اور ترقی یافتہ معاشروں میں جمہوریت کے تسلسل اور معاشی ترقی کیلئے بدعنوانی سے پاک حکومت کا وجود اتنا ہی ناگزیر ہے جتنا انسانی زندگی کی بقاء کیلئے آکسیجن کی موجودگی ضروری ہے، مگر جہاں حکمران اور طبقہ اشرافیہ کیلئے خود احتسابی اور جواب دہی کا تصور آئین و قانون سے بالاتر ہو، وہاں مملکت کے ہر شعبے میں ایسا تنزل اور انحطاط طاری ہوجاتا ہے جو ایک عام آدمی کی زندگی اجیرن بنا دیتا ہے، یہ صورت حال ملک کے طول و عرض میں باآسانی دیکھی جاسکتی ہے،آج ہمارے اربابِ اقتدار کی عاقبت نا اندیشی، حسن کارکردگی اور عوامی خدمت کی روشن مثالیں پاکستان کے ہر درودیوار پر رقم ہیں، روٹی کپڑا اور مکان دینے کے دعویداروں اہل پاکستان سے جس طرح کا سلوک روا رکھا ہوا ہے، وہ یقینا بے حسی اور حقارت کے رشتے کا عملی ثبوت ہے، یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ حکمران اگر اصول پسند اور قانون و ضابطے کے پابند ہوں تو عوام بھی آئین و قانون کا احترام کرتے ہیں، حکمران اگر سادگی کو اپنا شعار بناتے ہیں تو عوام بھی اپنا طرز زندگی سادہ اور آسان کرلیتے ہیں، حکمران اگر مسائل کے حل میں سنجیدہ ہوں تو عوام کے مزاج میں بھی سکون اور ٹھہراؤ آجاتا ہے، مگر حکمران اگر تصنع، بناوٹ اور نمائش پسندی کے

دلدادہ ہوں تو عوام اُن سے پہلے عیش و آسائش پر فریفتہ دکھائی دیتے ہیں، حکمران اگر بدعنوان اور کرپشن میں مبتلا ہوں تو عوام بھی اِس بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جب ارباب اقتدار صاحب کردار، صادق و امین اور قانون پسند نہ ہوں تو قوم میں محنت و دیانت، قناعت و ایمانداری اور فرض شناسی و قانون پسندی کے جذبات کیونکر پیدا ہو سکتے ہیں، کسی دانشور نے درست کہا ہے کہ "معاشرے میں پیدا ہونے والی خرابی کسی ایک شعبے یا ادارے تک محدود نہیں رہتی۔" چنانچہ آج ملک کا ہر قابل احترام عہدہ کرپشن اور بدعنوانی کے الزامات کی زد میں ہے، جس کے خاتمے کیلئے

عدلیہ، پارلیمنٹ، ارباب اختیار اور معاشرے کے ہر فرد کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا، ہم سمجھتے ہیں جس دن وطن عزیز کا ہر فرد انفرادی طور پر بدعنوانی سے اجتناب کا طرز عمل اختیار کرلے گا کرپشن سے پاک معاشرے کا خواب اُسی دن شرمندہ تعبیر ہو جائے گا۔

شیخ الاسلام کا تضادات سے بھرپور استدلالی خطاب۔۔۔

عجب ہے تیری سیاست ، عجب ہے تیرا نظام ۔۔۔۔ حسین سے بھی مراسم ،،یزید کو بھی سلام

انتخابات کا التوا یا کسی دیرینہ خواہش کی تکمیل ۔۔۔۔۔ ایجنڈا کیا ہے

تیئس دسمبر کو حضرت شیخ الاسلام کینیڈا کے برف زاروں سے لاہور کے مرغزاروں میں تشریف لا کر جلسہ عام کر چکے ہیں، خود شیخ الاسلام اور منہاجین کے دعوؤں کے مطابق شرکاء جلسہ کی تعداد بیس لاکھ تھی، جبکہ الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا سمیت خفیہ ایجنسیوں کی رپورٹ کچھ اور ہی کہانی سنا رہی ہے،میڈیا نے شرکاء کی تعداد ایک لاکھ سے دو لاکھ اور خفیہ ایجنسی کی رپورٹ کے مطابق یہ تعداد پچاس سے ساٹھ ہزار تھی، بہرحال اِس میں کچھ شک نہیں کہ میڈیا پر اربوں روپے کی اشتہاری مہم، تعارفی کالمز، پے درپے پلانٹڈ انٹرویوز اور شاہراہوں، گلی کوچوں میں آویزاں لاتعداد بینرز کے بعد شرکاء جلسہ کی تعداد زیادہ تھی، مگر اتنی بھی نہیں کہ اُسے بیس لاکھ قرار دیا جاسکے،اِس حوالے سے ہم فیس بک کی ایک دلچسپ پوسٹ جسے "طاہر القادری کی کرامت سے تشبیہہ دی گئی ہے" کا تذکرہ ضرور کرنا چاہیں گے، پوسٹ کے مطابق میدان عرفات اور منیٰ کے بالترتیب چودہ

اشارعہ اور ساڑھے پندرہ کلومیٹر ایریا کے اندر حج کے دوران 35 لاکھ حجاج سما سکتے ہیں لیکن مینار پاکستان کے تین کلومیٹر ایریا میں بیس لاکھ منہاجی سما گئے۔" یہ حضرت شیخ الاسلام کی کرامت نہیں تو اور کیا ہے۔

ہمارے ایک دوست کہتے ہیں کہ " پیر خود نہیں اڑتا بلکہ مرید اڑاتے ہیں۔" لہذا اِس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں، شیخ الاسلام کی بزرگی سے ایسا ممکن ہے، قارئین محترم ! یہ تو چند جملہ معترضہ تھے، اصل بات یہ ہے کہ محترم طاہر القادری صاحب طویل عرصے سے کینیڈا میں مقیم ہیں، وہ قوم کو بے یار ومددگار چھوڑ کر نہ صرف پاکستان سے چلے گئے بلکہ وہاں کی شہریت بھی لے لی، ملکہ برطانیہ سے وفاداری کا حلف بھی اٹھا لیا،اِس وقت موصوف پاکستانی نہیں کینیڈین شہری ہیں،اب جبکہ الیکشن سر پر کھڑے ہیں تو شیخ الاسلام کو اچانک وطن کی یاد ستائی، تشریف لائے اور حکم دیا" نا ہنجارو تین ہفتوں میں سب ٹھیک کر دو، ورنہ میں اپنے لشکریوں کے ساتھ آ رہا ہوں۔"اور ہماری کم نصیبی دیکھئے کہ کینیڈا کا ایک شہری ہمیں تین ہفتوں کا الٹی میٹم دے رہا ہے کہ" انسان بن جاؤ ورنہ میں اپنی ایک عدد بغل بچہ مجلس مشاورت کو پارلیمنٹ کا نام دے کر تمہاری تقدیر کے فیصلے کروں گا۔" باالفاظ دیگر ایک اور غیر ملکی پاکستان کی سیاست اور معاملات میں دخل دے رہا ہے، حضرت سے قبل ایک برطانوی شہری بھی 20 سال سے یہی کام کر رہے ہیں، لیکن طاہر القادری نے یہ منصب ابھی نیا نیا

سنبھالا ہے،آپ کو یاد ہوگا، بات بھی زیادہ پرانی نہیں جب 12 اکتوبر1999 میں
پرویز مشرف نامی ' 'مرد حق " نے انقلاب نو کا پرچم لہرا کر جمہوریت پر کاری وار کیا تھا
اور ایک نیک و پاکباز "سیاست " کی بنیاد ڈالی تھی تو حضرت شیخ الاسلام پر وجد کی سی
کیفیت طاری ہو گئی تھی،اُس وقت محترم نے قوم کو بتایا تھا کہ وہ جس مسیحا کی راہ دیکھ
رہی ہے، وہ مسیحا" پرویز مشرف "کی شکل میں آچکا ہے اور جب ہماری تاریخ کے سب سے
شرمناک ریفرنڈم کا ڈنکا بجا تو موصوف اِس والہانہ پن کے ساتھ دوڑ میں شامل ہوئے
کہ باقی سب منہ دیکھتے ہی رہ گئے اور جناب مشرف کے سایہ ِ شفقت تلے 2002 کے
انتخابات میں قومی اسمبلی جا پہنچے،نا جانے یہ کس سرگوشی کا اثر تھا یا کسی خواب کی
بشارت یا پھر کوئی غیبی اشارہ تھا کہ حضرت کے دل میں وزارت عظمٰی کا چراغ جگمگانے
لگا،مگر کیا کریں کہ مسلم لیگ (ق) پیا کو بھا گئی،یوں آرزوِ دیرینہ کی ناکامی اور وزارت
عظمٰی کے خواب بکھرنے سے دل برداشتہ ہو کر حضرت اپنے مرد حق اور نجات دہندہ
سے ہی نہیں اسمبلی سے بھی بیزار ہو گئے اور دو سال بعد ایک ضخیم مسودے کی صورت
میں "سیاست پر لاکھ لعنت " بھیج کر استعفٰی دے کر پاکستان کی سیاست و معاملات سے
دست بردار ہو گئے۔

اور حضرت اہل پاکستان سے لاتعلق ہو کر کینیڈا کے گوشہ عافیت میں جا بیٹھے،اِس دوران
انہوں نے یہاں کی سیاست، نظام حکومت اور مسائل کی چکی میں

پستی عوام کے مسائل کے حوالے سے مکمل لاتعلقی اختیار کیے رکھی، اب اچانک انہیں احساس ہوا کہ ریاست کا وجود خطرے میں ہے، ظالمانہ نظام نے عوام کی زندگی اجیرن بنادی ہے، تبدیلی کا وقت آن پہنچا ہے، چنانچہ وہ "سیاست نہیں ریاست بچاؤ" کا نعرہ لگاتے ہوئے 21 دسمبر کو پاکستان تشریف لے آئے، عین ممکن ہے کہ زور شور سے موصوف کی اچانک آمد کے پس پردہ کسی خواب، بشارت یا کسی غیبی اشارے کا ہاتھ کارفرما ہو، مگریوں اُن کی اچانک واپسی مادی فکر رکھنے والوں کے ذہن میں شکوک وشبہات پیدا کر رہی ہے جو کہ بلا جواز بھی نہیں ہے۔23 دسمبر کو جلسہ عام سے پہلے موصوف نے اپنے متعدد انٹرویوز اور اخباری بیانات میں دعویٰ کیا تھا کہ وہ 23 دسمبر کو مینار پاکستان کے جلسہ عام میں ملک بچانے کے لائحہ عمل کا اعلان کریں گے اور ریاست بچانے کیلئے سیاست کو طویل عرصے کیلئے کسی گہری قبر میں دفن کر دیں گے، مگر افسوس ایسا نہ ہوسکا، اپنی پونے دو گھنٹے کی تقریر (جس میں شرکاء جلسہ کی عصر اور مغرب کی نمازیں ضائع ہوئیں اور بقول شیخ الاسلام انہوں نے عصر کی نماز جلسہ گاہ میں آنے سے قبل گھر پر ادا کی، جبکہ تین بجکر پانچ منٹ پر جب انہوں اپنی تقریر کا آغاز کیا تو لاہور میں عصر کا وقت شروع بھی نہیں ہوا تھا) میں انہوں جو باتیں کیں، اُس میں ایسے کسی لائحہ عمل کا اعلان شامل نہیں تھا، عوام کیلئے اُن کی باتیں نہ تو نئی تھیں اور نہ ہی چونکا دینے والی، سب زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ زندگی بھر "مصطفوی انقلاب" کا پیغام دینے والے اِس داعی نے اپنی پوری

تقریر میں اُس انقلاب کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی۔
کہتے ہیں کہ جناب طاہر القادری شیخ الاسلام ہی نہیں،علامہ،
ڈاکٹر،پروفیسر،مدبر، مفکر، فقیہ اور صاحبِ کشف و کرامات بزرگ بھی ہیں، لہٰذا یقیناً
انہیں علم ہوگا کہ قومی اصلاح کا عمل ارتقائی ہوتا ہے، جو طویل، کٹھن اور صبر آزما
جدوجہد کے بعد ہی وقوع پذیر ہوتا ہے، مگر انہوں نے اِس عمل کیلئے حکومت کو صرف
تین ہفتوں کی مہلت دی جو کہ ناممکن اَمر ہے، لہٰذا اِس ساری واردات کا حاصل یہی
سوال ٹھہرتا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام کا اصل ایجنڈا کیا ہے۔؟ وہ کیا چاہتے ہیں اور کیوں
عرصہ دراز کے بعد پاکستانی سیاست میں بھونچال پیدا کرنے کیلئے ہاتھ پیر مار رہے
ہیں۔؟اِن سوالات کا جائزہ لینے سے پہلے یہ بتاتے چلیں کہ شیخ الاسلام کا جلسہ بلاشبہ غیر
معمولی تھا لیکن کیا جلسوں کی بنیاد پر امور ریاست طے پاتے ہیں۔؟ جلسہ کتنا ہی کامیاب
کیوں نہ ہو جائے لیکن کیا وہ انتخابات کا متبادل بن سکتا ہے؟ کیا مریدین اور وابستگان کے
ہجوم کو پارلیمنٹ کا نام دیا جا سکتا ہے؟ اگر شیخ الاسلام کو مقبولیت کا اتنا ہی خمار ہے تو
انتخابات میں آئیں، الیکشن لڑیں، جیتیں، حکومت بنائیں اور اپنے چالیس لاکھ ووٹرز کی
مدد سے نظام حکومت بدل ڈالیں، یقین جانیے ملک میں اُسی روز انقلاب آ جائے گا، مگر
شیخ الاسلام کے انداز و اطوار بتاتے ہیں وہ بہت جلدی میں ہیں، شاید انہیں خوش فہمی
ہو گئی ہے کہ جب وہ اسلام

آباد کا رخ کریں گے تو حکومت اُن کے قدموں میں ڈال دی جائے گی۔؟ جبکہ ہمارا ماننا ہے کہ ایک جلسے کی بنیاد پر ملک کا سیاسی نظام تہہ و بالا کر دینے کی خواہش اتنی پر اسرار تو ہے کہ شیخ الاسلام جیسی معتبر شخصیت کو بھی جلسے میں اپنی گفتگو سے پہلے خدا کی قسم اٹھانا پڑی کہ اُن کے پیچھے کسی ایجنسی کا ہاتھ نہیں، کسی بیرونی ایجنڈے کے تحت وہ پاکستان نہیں آئے اور نہ ہی کسی نے انہیں فنڈنگ کی ہے۔

بلاشبہ محترم طاہر القادری ایک اچھے اور قادر الکلام مقرر ہیں، مگر مثالیت پسندی میں وہ بہت دور نکل جاتے ہیں، فرماتے ہیں کہ قطعی شفاف انتخابات کا ماحول پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے کو سرمایہ داری کی لعنتوں سے پاک کیا جائے، ہر آدمی کو انصاف میسر ہو، کرپشن کی جڑ کاٹ دی جائے وغیرہ وغیرہ۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی معاشرہ برائیوں سے پاک ہو جائے اور اُس میں ہر طرف نیکیوں کا چلن ہو تو پھر اُس نظام کی ضرورت ہی کیا رہ جائے گی جو انتخابات کی صورت میں وجود میں آتا ہے، کیا وہ معاشرہ خود اپنے لیے ایک موزوں سیاسی نظام وضع نہیں کر سکتا۔؟ جناب شیخ الاسلام صاحب سے یہ بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ جب موجودہ حکومت آپ کے نزدیک قابل اعتماد نہیں اور اپوزیشن بھی اِس قابل نہیں کہ زمام اقتدار اُس کے ہاتھ میں دی جا سکے تو عبوری نگران حکومت کتنی غیر معینہ مدت کے لیے ہمارے سروں پر مسلط رہے گی.....

اس

سے بھی زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ اُس کا مینڈیٹ کون دے گا، محترم شیخ الاسلام کے اس مطالبے کہ فوج اور عدلیہ کو بھی نگران حکومت میں شامل کیا جائے، بہت سے شکوک و شبہات پیدا کرتا ہے، کیا اُس سے "نجات دہندگی" کا وہ دور ایک بار پھر لوٹ نہیں آئے گا جس کا طوق گردن سے اتارنے کے لیے قوم مسلسل جدوجہد کرتی چلی آ رہی ہے، جناب شیخ الاسلام صاحب نے مناظرانہ انداز میں بار بار دستور پاکستان کے اوراق سے مختلف شقوں کے حوالے دیئے مگر یہ بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ نگران عبوری حکومت کے تقرر کے اختیار میں فوج، عدلیہ اور نمائندگی سے محروم سیاسی جماعتوں کو کس آئینی شق کے تحت شامل کیا جائے؟ کیا اُن کا یہ مطالبہ جمہوریت اور دستوریت کے سراسر منافی نہیں ہے۔؟

محترم شیخ الاسلام نے آئین کی رو سے ثابت کیا ہے کہ ایک حکومت کی مدت ختم ہونے کے بعد 90 دن کے اندر نئے انتخابات کرانا ضروری نہیں، انتخابی عمل کو آئینی بنانے کے لیے خواہ جتنے وقت کی ضرورت ہو لیا جائے، یعنی یہ وقت برسوں پر بھی محیط ہو سکتا ہے، کیونکہ انتخابی عمل کو آئینی بنانے کے لیے انہوں نے جو شرائط پیش کی ہیں، وہ چند سالوں میں شاید ہی پوری ہو سکیں، محترم شیخ الاسلام کی تقریر سے محسوس ہوتا ہے کہ اُن کا ایجنڈا" انتخابات منسوخ یا ملتوی "کرانا ہے، تاہم انہوں نے اپنے اصل عزائم کی پردہ پوشی کرتے ہوئے یہ بات کسی اور ڈھنگ سے کہی، لیکن مطلب صاف، واضح اور عیاں تھا کہ اِسے انتخابات

ملتوی کرانے کا ایجنڈا ہی کہا اور کیا سمجھا جائے گا،مزید فرماتے ہیں " جب تک ملک میں آئین کے تحت نظام قائم نہیں ہوتا،انتخابات بھی آئینی نہیں ہو سکتے، لیکن اگراِس کے باوجود انتخابات کرائے جائیں تو یہ انتخابات غیر آئینی ہوں گے اور ہم اُس کو کسی صورت تسلیم نہیں کریں گے۔" انہوں نے کہا کہ انتخابات شفاف ہونے چاہئیں، آئین کی شق 63,62 پر عمل کیا جائے اور حکومت انتخابات سے قبل اپنا نظام درست کرے، جس کیلئے انہوں نے حکومت کو صرف 10 جنوری تک کی مہلت دی، 18 دن میں اُن کا مطلوبہ نظام نافذ نہ ہوا تو شیخ الاسلام نے اسلام آباد کے محاصرے کی دھمکی دیدی،اُن کا کہنا ہے کہ 14 جنوری کو 40 لاکھ عوام اسلام آباد میں جمع ہوں گے جسے انہوں نے عوام کی پارلیمنٹ کا نام دیا، ہمارا ماننا ہے کہ ان کے مطالبات خواہ کتنے ہی اہم اور ضروری کیوں نہ ہوں لیکن صرف 18 دن میں جو مطلوبہ تبدیلی وہ چاہتے ہیں نہیں آسکتی۔

ایسی صورت میں کیا پارلیمان کا گھیراؤ کیا جائے گا۔؟ ارکان اسمبلی بقول شیخ الاسلام لٹیروں کو پارلیمان میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا،پرامن رہتے ہوئے یہ سب کچھ کیسے ممکن ہے، صحیح جواب تو شیخ الاسلام ہی دے سکتے ہیں، مگر گمان یہی کیا جا رہا ہے کہ اچانک ایسی مہم چلانا بغیر کسی بیرونی طاقت کی پشت پناہی کے ممکن نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ محترم شیخ الاسلام کے خطاب میں کئی تضادات تھے اور اُن کا استدلالی انداز بہت سے داخلی تضادات کا آئینہ دار

ہے، وہ انتخابات کے لیے مثالی اصلاحات اور کڑی شرائط عائد کرتے ہیں مگر خود اِن شرائط پر پورا نہیں اترتے۔اسی طرح سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اگر وہ انتخابی عمل میں خود کو شامل ہی نہیں کرنا چاہتے تو پھر وہ جیسی بھی اصطلاحات لے آئیں، اپنی قیادت سے عوام کو کس طرح فیض یاب کر سکیں گے۔؟ دراصل شیخ الاسلام جو راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں، وہ ایک ایسا خواب ہے، جس کی تعبیر موجودہ نظام کی تباہی اور اُس فوجی آمریت کی شکل میں نظر آتی ہے، جس کے کاندھوں پر سواری کرکے حضرت شیخ الاسلام وزارت عظمٰی کی دیرینہ منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں، حیرت انگیز بات ہے کہ شیخ الاسلام نے ایک ایسے وقت میں انتخابی نظام کی تبدیلی کا راگ الاپا ہے جبکہ پہلے ہی بہت کچھ بدل چکا ہے، ملک میں ایک آزاد اور خود مختار الیکشن کمیشن موجود ہے، جس کی پشت پر آزاد عدلیہ کھڑی ہے، ووٹر لسٹیں صاف شفاف بنائی جارہی ہیں، جہاں حلقہ بندیوں میں دھاندلی کی شکایات تھیں، انہیں ٹھیک کرنے کا حکم جاری ہوچکا ہے، فوج اِس وقت بالکل غیر جانب دار ہے، لہذا انتخابات میں عوام کی بھرپور شرکت تبدیلی کی بنیاد بن سکتی ہے، ایسے حالات میں شیخ الاسلام اور کیا چاہتے ہیں؟ سمجھ میں نا آنے والی کوئی بات نہیں۔

اِس وقت پاکستان کا سیاسی منظر نامہ یہ ہے کہ تمام سیاسی جماعتیں اور قابل ذکر سیاسی قائدین اس بات پر متفق ہیں کہ بروقت انتخابات کے سوا کوئی چارہ

کار نہیں، یہی آئین اور پاکستان کے وسیع تر مفادات کا تقاضا ہے، کیا اِس قومی اتفاق رائے میں شیخ الاسلام اور اُن کی حمایت کنندگان کو رخنہ ڈالنے کی اجازت دی جا سکتی۔؟ ہمارا ماننا ہے کہ یہ وقت اِس قسم کے مسائل میں اُلجھنے اور نئے پنڈورا بکس کھولنے کا نہیں ہے، وطن عزیز کو سیاسی بے یقینی، بدامنی اور معاشی انحطاط نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے، لہٰذا پاکستان کی وحدت و سالمیت کا تقاضا یہ ہے کہ آئندہ عام انتخابات کی راہ میں منفی تعبیرات و توجیہات کے کانٹے بچھانے کے بجائے لوگوں کے دلوں میں امید کی شمع روشن کی جائے۔انہیں یہ احساس دلایا جائے کہ وہی اِس ملک کے اصل مالک ہیں اور اپنے ووٹ کی طاقت اور درست استعمال سے ملک کی تقدیر بدل سکتے ہیں، لہٰذا عوام کے اِس بڑھتے ہوئے سیاسی شعور کے راستے میں اب کسی رکاوٹ کی کوئی گنجائش نہیں ہے، وہ دن دور نہیں جب عوامی شعور اور تبدیلی کی خواہش کا یہ سیلاب بہت کچھ بہالے جائے گا، لیکن اِس کے لئے اگر کسی غیر جمہوری اور ماروائے آئین حل کی راہ دکھائی گئی تو ملک ایک بار پھر کسی طالع آزماء کی آمریت کا شکار ہو کر جمہوری عمل سے دور جا سکتا ہے۔

جھوٹے خوابوں کے سوداگر۔۔۔۔

پا شکستہ سر بریدہ خواب، خواب لے لو، خواب ۔۔۔۔۔
ن،م راشد نے کہا تھا، خواب لے لو، خواب۔۔۔۔۔ صبح ہوتے ہی چوک میں جا کر لگاتا ہوں صدا۔۔۔۔۔ خواب لے لو، خواب۔۔۔۔۔ خواب اصلی ہیں کہ نقلی۔۔۔۔۔ خواب لے لو خواب۔۔۔۔۔ 66 سال سے ہمارے حکمران اور سیاسی قائدین قوم کو خواب ہی تو دکھا رہے ہیں، جان، مال اور آبرو کے تحفظ کے خواب، روٹی، کپڑے، مکان کے خواب، بیمار کیلئے دوا اور علاج و معالجہ کے خواب، پاکستان کے سنہری مستقبل کے خواب، حصول انصاف کے خواب، کرپشن، رشوت، چور بازاری، سینہ زوری کے خاتمے کے خواب، تعلیم یافتہ پاکستان کے خواب، ملک میں ایک ہی تعلیمی نظام کے نفاذ کے خواب، فرقہ واریت تشدد اور نفرتوں کے خاتمے کے خواب، بے گھروں کو گھر بنا کر دینے کے خواب، غریب کی بیٹیوں کی شادی کے خواب، سرداروں، وڈیروں اور جاگیرداروں کے جبر مسلسل کے خاتمے کے خواب، بے زمین کسانوں کو زمین دینے کے خواب، مذہبی طبقے کی نفرتوں کے خاتمے کے خواب، پولیس اور طاقت ور ایجنسیوں کے ظلم کے خاتمے کے خواب، بچھڑے ہوؤں کو ملانے کے خواب، جنگ تشدد بم دھماکے، قتل و غارتگری کے رک جانے کے خواب، امن و سکون سلامتی کے خواب، ہر سطح پر میرٹ کی

بالادستی کے خواب، علم و شرافت کو عزت ملنے کے خواب، معاشرے میں عزت کے پیمانے بدلنے کے خواب، سکون کی نیند سونے کے خواب، ڈیموں کے بننے کے خواب، انڈسٹری کے پھلنے پھولنے کے خواب، زراعت کی خوشحالی کے خواب، لوڈ شیڈنگ کے خاتمے کے خواب اور بجلی، پانی، گیس اور سستے آٹے کے دستیاب ہونے کے خواب۔۔۔۔۔ خواب۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ بس خواب۔

ہمارے ہر آنے والے حکمران نے اِن خوابوں کو اپنی حکومت کا مرکزی نقطہ قرار دیا، ہر سیاسی جماعت نے اِن خوابوں کو اپنی الیکشن مہم کا منشور بنا کر عوام کو اپنی جانب متوجہ کیا، مگر برسر اقتدار آنے کے بعد وہ سارے وعدے بھول گئے، یوں آج تک یہ خواب اپنی عملی تعبیر سے محروم رہے، حکمرانوں اور سیاستدانوں نے اِسے صرف ایوان اقتدار تک پہنچنے ذریعہ بنایا، اب جبکہ الیکشن قریب ہیں حکمران اور سیاسی جماعتیں ایک بار پھر ان خوابوں کو بڑھاوا دے رہی ہیں، نئی امیدیں، نئے سپنوں کی جوت جگا رہی ہیں، چاہتی ہیں کہ عوام ایک بار پھر اُن پر اعتماد کرکے انہیں ایوان اقتدار تک پہنچائیں، چنانچہ بھانت بھانت کی بولیاں بولی جارہی ہیں، روز نت نئے نعرے وجود میں آرہے ہیں، کوئی سیاست نہیں ریاست بچانے کی بات کررہا ہے، تو کوئی کرپٹ اور بدعنوان سیاستدانوں کو ایوان اقتدار سے اٹھا کر باہر پھینکنے جارہا ہے، دعووں اور وعدوں کو جمعہ بازار لگا ہوا ہے، بس کسی نہ کسی طرح عوام کی ہمدردی حاصل ہوجائے اور کام بن

جائے،دوسری طرف اپنی آئینی مدت پوری کرتی حکمران جماعت بھی یہی خواہش ہے کہ
اُسے ایک موقع اور دیا جائے، صدر صاحب پر اُمید ہیں کہ آئندہ بھی برسر اقتدار آکر
عوام کی ترقی اور ملک کی خدمت کا سفر جاری رکھیں گے ۔
مگر موجودہ حکمرانوں کے پورے عرصہ اقتدار کا جائزہ لیا جائے تو اُس کے کھاتے میں
عوام کی فلاح و بہبود سے متعلق ایسا کوئی کریڈٹ نظر نہیں آتا جس کی بنیاد پر آئندہ
انتخابات میں اُس کے دوبارہ برسر اقتدار آنے کی راہ_ ہموار ہو سکتی ہو، حکمران جماعت
نے عوام کے مسائل کے حل کے معاملہ میں صرف بے نیازی کا مظاہرہ ہی نہیں کیا بلکہ اپنی
من مانیوں، اللے تللوں، اقربا پروری، میرٹ کے قتل عام، کرپشن کلچر کے فروغ، آئین
و قانون سے سرکشی اور اپنی بیڈ گورنس سے عوام کو منتخب جمہوری نظام سے بھی متنفر
کردیا ہے،دوسری طرف عوام کا حال یہ ہے کہ ایک عام آدمی کیلئے دو وقت کی آبرو
مندانہ روٹی کا حصول بھی مشکل تر ہو گیا ہے،اشیائے خورونوش کے نرخوں میں اضافے
کے روز افزوں رجحان کے باعث عام شہری کیلئے زندگی جبر مسلسل بن چکی ہے،امن
وسکون، راحت وآسودگی کے سارے خواب بکھر چکے ہیں اور ساری خوش گمانیاں کافور
ہوچکی ہے ،آج حال یہ ہے آٹا جیسی بنیادی ضرورت کی چیز بھی 5 سے 8 روپے
اضافے کے ساتھ 38 سے 40 روپے کلو بک رہی ہے، روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ
لگانے والوں نے عوام کیلئے آٹا خریدنا بھی مشکل تر بنا دیا ہے، عوام صرف

بجلی اور گیس کی لوڈشیڈنگ کے عذاب سے ہی نہیں گزر رہے بلکہ جان لیوا مہنگائی سے مرتب ہونیوالے منفی اثرات بھی بھگت رہے ہیں، جبکہ توانائی کے بحران سے کارخانے اور فیکٹریاں بند ہونے سے بے روزگاری کا سیلاب امڈ آیا ہے،دوسری طرف ملک میں موجود بدامنی کی وجہ سے جان و مال کا تحفظ شہریوں کیلئے پہلے ہی پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سازگار جمہوری فضاکے باوجود ارباب اقتدار نے عوام کے روزمرہ مسائل کے حل کی جانب کوئی توجہ نہیں دی،اگراِس منظر نامے کو سامنے رکھا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ ریاست نہ تو شہریوں کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کی آئینی ذمہ داری پوری کر سکی،نہ ہی وہ عوام کو جان و مال کے تحفظ کی ضمانت دے سکی،یوں لگتا ہے کہ حکمرانوں نے عوام کو ہاتھ پاؤں باندھ کر زورآور استحصالی طبقات کے آگے پھینک دیا گیا ہے، جبکہ مہذب معاشروں میں ارباب اقتدار کی اوّلین ترجیح عوام کی زندگی کو مطمئن اور آسودہ بنانا ہوتی ہے، مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ ہے،ارباب اقتدار کواِس سے کوئی غرض نہیں کہ عوام کس حال میں ہیں،اُن پر کیابیت رہی ہے،انہیں تو بس اپنی عیش وعشرت کی پڑی ہے،اِس سے زیادہ لاپروائی، بے حسی اور سنگدلی اور کیا ہوگی کہ عوام بھوک، غربت، مہنگائی اور بے روزگاری کے عذاب میں بتىلا ہیں، مگر وزیراعظم صاحب جن کا عرصہ اقتدار 15 مارچ کو ختم ہو رہا ہے کیلئے پر تعیش بلٹ

پروف گاڑیاں (اسپورٹس یوٹیلٹی وہیکل ،ایس یو وی) خریدی جارہی ہیں جن کی قیمت صرف سوا دس کروڑ ہے، حیرت ہے جس ملک کا بال بال قرضوں میں جکڑا ہو، جہاں کے عوام دو وقت کی روٹی کو ترس رہے ہوں، اُن کے چولہے بجھ رہے ہوں، بے روزگاری اور تنگدستی انہیں خود کشی پر مجبور کررہی ہو، اُس ملک کے حکمران کروڑوں روپے کی گاڑیاں خریدتے ہوئے ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کررہے، ظاہر ہے جب ارباب اقتدار کے اِس قسم کے معاملات ہونگے تو باہر سے آئے ہوئے مداریوں کو اپنی دکان چمکانے اور مجمع لگانے کا موقع تو ملے گا۔

ارباب اقتدار کی انہی شاہ خرچیوں اور عوامی مسائل سے عدم دلچسپی کو دیکھتے ہوئے پاکستان اکانومی واچ نے انتباہ کیا ہے کہ اگر موجودہ حکمران پھر جیت کر آ گئے تو ملک میں توانائی نام کی کوئی چیز نہیں رہے گی، عوام کو سفر کیلئے صرف سائیکل میسر ہوگی اور بار برداری کے لیے گدھا گاڑیوں سے کام لیا جائے گا، اکانومی واچ کے مطابق ہڈیوں کے ڈاکٹر جیسے مشیروں کی موجودگی پاکستان کو پتھر کے دور میں دھکیل دے گی اور تمام شہر آثار قدیمہ کا منظر پیش کریں گے، اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو پھر یہاں قانون کی حکمرانی کا نہیں، ظلم وجبر اور وحشت و بربریت کا راج ہوگا، پاکستان اکانومی واچ کا یہ تجزیہ ایسا نوشتہ دیوار ہے جو عوام کی آنکھیں کھولنے اور انہیں خوش فہمیوں اور خوش گمانیوں سے باہر نکالنے کیلئے کافی ہے، اَمر واقعہ یہ ہے کہ وطن

عزیز میں آنے والی ہر حکومت نے عوام کو صرف خواب ہی دکھائے، خوابوں سے ہی انہیں بہلایا اور پھر خواب ہی خواب میں خود قصہ پارینہ ہوگئے، مگر عوام کے مسائل جوں کے توں ہی رہے،آج پھر سیاسی بازی گری عروج پر ہے، جھوٹے خوابوں کے سوداگر اپنی سیاسی پٹاریوں سے عوام کو دھوکہ دینے کیلئے لایعنی دعووں اور وعدوں کے لولی پاپ نکل رہے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ عوام ایک بار وہی غلطی دہراتی ہے یا مزید دھوکہ نہ کھانے کا عہد کرکے اپنی تقدیر بدلنے کا فیصلہ کرتی ہے۔

اسیر وسوسہ کیوں ہو۔۔۔۔وطن کے روز وشب سے۔۔۔۔ کس لیے بیزار ہوا تتے۔۔۔۔ تمہاری آنکھ میں کیوں۔۔۔۔بے یقینی رقص کرتی ہے۔۔۔۔

رگوں میں آخرش۔۔۔۔کیوں خوف کا عالم ہے اِس درجہ۔۔۔۔ابھی تو اپنی مٹی میں۔۔۔۔نمو کا وصف زندہ ہے۔۔۔۔ابھی دریا میں پانی ہے۔۔۔۔

اسلام آباد کے میدان کربلا میں۔۔۔۔

حسینیت کے علمبردار اور یزید کی بیعت۔۔۔۔۔

بالآخر 17 جنوری کو حکومتی ٹیم سے مذاکرات کے بعد حضرت شیخ الاسلام کے 14 جنوری سے شروع ہونے والے انقلابی دھرنے کا نہ صرف ڈراپ سین ہوگیا بلکہ انقلابی غبارے سے ہوا بھی نکل گئی، حیرت ہے اِس شرمناک ناکامی کے باوجود امام انقلاب نے مبارکبادیں اور دھرنے کے شرکاء نے جشن منایا، بھنگڑے ڈالے، قارئین محترم !اِس ڈراپ سین پر کسی اظہار خیال سے پہلے عوامی حلقوں کی جانب سے اٹھائے گئے کچھ سوالات بہت اہمیت کے حامل ہیں، جناب طاہر القادری اور زرداری حکومت سے معاہدے پر عوام میں کیا تبصرہ کیاگیا،آیئے دیکھتے ہیں، عوامی حلقوں میں یہ سوال شدت سے گردش کرتا رہا کہ کیا امام حسین نے یزیدیوں سے سمجھوتہ کیا تھا؟ کیا یہ یزدیوں سے حسینیوں کا سمجھوتہ ہوسکتا ہے؟ واضح رہے کہ طاہر القادری 10 جنوری سے 17 جنوری کی رات تک اپنے ہر خطاب میں صدر اور وزیر اعظم راجا پرویز اشرف کی حکومت کو یزیدی، فرعون، بدبخت اور ڈاکو کہتے رہے،انہوں نے کہا کہ کربلا میں حضرت حسین پر پانی بند کردیا گیا تھا،اس دور کے یزیدیوں نے کیبل بند کردیئے ، بجلی بند کردی،طاہر القادری

اپنے لانگ مارچ کو حسینی قافلہ اور خود کو حضرت امام حسین کی جدوجہد کا نمونہ قرار دیتے رہے۔انہوں نے بار بار دعویٰ کیا کہ حکومت کا خاتمہ کیے بغیر دھرنا ختم نہیں ہوگا،انہوں نے 14 جنوری کو اپنے پہلے خطاب میں صدر، وزیر اعظم،اسمبلیوں اور تمام وزرا کو برطرف کر دیا تھا،لیکن پھر اسی یزیدی لشکر سے حسینیت کے علمبردار نے معاہدہ کرلیا، حسین کا پیروکار مسلسل بم پروف اور بلٹ پروف بنکر میں ہر طرح کی سہولتوں سے محظوظ ہوتا رہااور اُس کے پیروکار سخت سردی اور بارش میں کھلے آسمان تلے پڑے رہے، کیا یہی حسینیت ہے۔؟جبکہ اسلام آباد میں داخلے سے قبل انہوں نے یہاں تک کہا تھا کہ وہ اب کسی سے مذاکرات کرنے نہیں جارہے، بلکہ فیصلہ کریں گے، سنائیں گے اور عمل کرکے دکھائیں گے۔جناب طاہر القادری اپنے حامیوں سے مخاطب ہوکر یہ دعویٰ بھی کرتے رہے کہ حکومت آج یا کل میں ختم ہونے والی ہے۔اس ضمن میں دلچسپ بات یہ ہے کہ جب سپریم کورٹ نے راجہ پرویز اشرف سمیت کئی لوگوں کے گرفتاری کے احکامات جاری کیے تو انہوں نے دوران خطاب اپنے حامیوں کو مبارکباد دی اور کہا کہ آدھا کام ہوگیا ہے ،آدھا کل ہوجائے گا،مگر چوتھے روز اچانک امام انقلاب نے اُس حکومت سے معاہدہ کرلیا جسے وہ مسلسل یزیدی لشکر قرار دیتے رہے۔

واقفان حال بتاتے ہیں کہ جمعرات کو اسلام آباد میں موسم کے بدلتے ہوئے تیور

طاہر القادری اور حکومت دونوں کے لئے پریشانی و فکر مندی کا باعث بنے رہے۔
طاہر القادری کو یہ فکر کھائے جارہی تھی کہ بارش شروع ہو گئی تو مارچ میں شریک افراد کیلئے مزید ٹھہرنا محال ہو جائے گا، لوگ بکھر جائیں گے اور اصلاحات کے حوالے سے رسمی مذاکرات اور لیپاپوتی کا بھی موقع نہیں ملے گا، جبکہ حکومت کو یہ پریشانی لاحق تھی کہ اگر اور کچھ نہ بھی ہو تو صرف سخت سردی کا موسم ہی ہلاکتوں کا سبب بن سکتا ہے، جمعہ کے روز یہ راز بھی منکشف ہوا کہ ڈاکٹر صاحب پر مزید دباؤ کینیڈا کی حکومت کی طرف سے آرہا تھا، کینیڈا کی حکومت نے انہیں اس اَمر کی جواب دہی کے لئے طلب کر لیا تھا کہ وہ ایک ایسے ملک میں کیوں گئے ہیں جہاں وہ سمجھتے ہیں کہ اُن کی جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے، مزید انکشاف یہ بھی ہوا کہ وہ اپنے بیٹوں اور اہل و عیال کے ہمراہ 27 جنوری کی پرواز کیلئے ٹکٹ بھی حاصل کر چکے تھے،اس صورتِ حال میں حالات سے فرار اور مذاکرات کا انعقاد ہی اُن کے نقطہ نظر سے ایک بڑی کامیابی تھی،دوسری جانب حکومت کے لئے بھی پریشان کن مسئلہ یہ تھا کہ چالیس سے پچاس ہزار لوگوں کا چار دن سے دارالحکومت میں کھلے آسمان تلے احتجاجی دھرنا اُس کے اعصاب پر بوجھ بنتا جارہا تھا، لہٰذا اپنے اپنے مفادات کے تحفظ کیلئے فریقین مذاکرات پر تیار ہو گئے۔
اور یوں ڈی چوک اسلام آباد میں دس رکنی حکومتی مذاکراتی ٹیم اور تحریک منہاج

القرآن کے قائدکے مابین لانگ مارچ ڈیکلریشن کے تحت 16 مارچ سے قبل اسمبلیاں تحلیل کرنے، انتخابی امیدواروں کی آئین کی دفعات ،62,63 کے تحت مکمل جانچ پڑتال کرنے کے بعد انہیں بطور امیدوار انتخابی مہم شروع کرنے کی اجازت دینے اور نگران وزیراعظم کیلئے حکومت کی جانب سے بھجوائے جانیوالے دو ناموں پر ڈاکٹر طاہرالقادری سے رضامندی کرنے پر اتفاق ہو گیا اور اِس ڈیکلریشن کی بنیاد پر ڈاکٹر طاہرالقادری نے ڈی چوک اسلام آباد میں چار روز سے جاری دھرنا ختم کرنے کا اعلان کر دیا اور اِس معاہدے کو جمہوریت کی فتح قرار دیکر ایک دوسرے کو گلے مل کر مبارکبادیں دی گئیں۔

ساتھ ہی ایک دوسرے کیخلاف کسی قسم کی الزام تراشی اور انتقامی کارروائیوں سے گریز کا عہد بھی کیا، تعجب خیز بات یہ کہ تمام تر ناکامی کے باوجود ڈاکٹر طاہرالقادری اِس معاہدے کو اپنے مشن کی کامیابی قرار دے رہے ہیں، حقیقت یہی ہے کہ متذکرہ "معاہدہ لانگ مارچ" کے تحت وہ اپنے ایجنڈے کے چاروں میں سے ایک نکتہ بھی تسلیم کرانے میں کامیاب نہیں ہوپائے اور دھرنا مذاکرات کے باوجود اپنے اعلانیہ مقاصد کے حصول میں قطعی ناکام ثابت ہوا، ساتھ ہی انہیں سسٹم کی تبدیلی کے حوالے سے بھی کوئی ریلیف نہیں ملا اور انہیں حکمرانوں کے لالی پاپ پر ہی خوش ہو کر اپنے دھرنے کے خاتمے کا اعلان کرنا پڑا، جس سے بادی النظر میں یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ دھرنا ختم کرنے کیلئے کسی جواز کی

تلاش میں تھے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر طاہر القادری اسمبلیوں اور حکومت کے فوری خاتمے کا تقاضا پورا کرا پائے، نہ الیکشن کمیشن کی از سر نو تشکیل سے متعلق اُن کا مطالبہ فوری طور پر تسلیم ہوا، البتہ انہیں یہ فائدہ ضرور ہوا ہے کہ انہوں نے اِس معاہدے کے تحت اپنی مستقبل کی سیاست کی راہ ضرور نکال لی ۔جبکہ انہیں حاصل ہونیوالا یہی فائدہ حکمران طبقات کیلئے غور و فکر کا متقاضی ہے کہ لانگ مارچ اور دھرنوں کے ذریعے اپنی حیثیت اور مطالبات بزور طاقت تسلیم کرانے کی اِس روایت سے مستقبل میں انتہائی سنگین نتائج مرتب ہو سکتے ہیں اور کل کوئی بھی شخص یا گروہ مذہبی اور لسانی بنیادوں پر یا کوئی اور ایشو کھڑا کر کے لانگ مارچ اور دھرنے کی صورت میں اقتدار کے ایوانوں کا گھیراؤ کر کے حکمرانوں سے کوئی بھی بات منوالے کھڑا ہو سکتا ہے۔آج اگر ڈاکٹر طاہر القادری سادہ لوح عوام اور جذباتی خواتین و بچوں کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں تو کل کو کوئی متشدد گروپ بھی یہی راستہ اختیار کر کے اقتدار کے ایوانوں سے جو چاہے گا، تسلیم کراتا پھرے گا۔

یہ درست ہے کہ سسٹم میں تبدیلی اور موروثی سیاسی انتخابی نظام سے نجات یقیناً ملک کے ہر باشندے کی خواہش ہے اور اِس میں کوئی دو رائے نہیں کہ

عوام اپنے حقیقی نمائندے منتخب ایوانوں میں پہنچانے کے متمنی ہیں، جبکہ موجودہ انتخابی نظام انکی حقیقی نمائندگی کی خواہش کی راہ_ میں رکاوٹ ہے۔اِس تناظر میں ڈاکٹر طاہرالقادری کو تبدیلی اور انتخابی نظام کی اصلاح کا نعرہ لگانے پر عوامی پذیرائی حاصل ہوئی، لیکن اُن سے تبدیلی کی توقعات وابستہ کرنیوالے لوگوں کو سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ وہ جن کیخلاف تبدیلی لانے کے دلپذیر نعرے بلند کر رہے تھے،انہی کے ساتھ معاہدہ کرکے انہوں نے موجودہ سسٹم ہی کے ماتحت انتخابات کا انعقاد قبول کرلیا ہے،اب دیکھنا یہ ہے کہ دھرنا پارٹی اور اُس کے محترم قائد عام انتخابات میں کیا تیر مارتے ہیں، مگراِس سے قبل انہیں ایک مصلح اور دینی اسکالر کا لبادہ اتار کر.براہ_ِ راست سیاسی انتخابی میدان میں آنا ہوگا اور وہ تمام قانونی اور آئینی تقاضے پورے کرنا ہونگے۔جس کا مطالبہ وہ حکمرانوں اور دوسری سیاسی قیادتوں سے کرتے رہے ہیں،اُس کے بعد ہی وہ جس نظام کی تبدیلی کا جو ایجنڈہ رکھتے ہیں، انتخابات کے ذریعے منتخب ایوانوں میں پہنچ کراُس کیلئے موثر کردار ادا کرنے قابل ہو سکیں گے۔

قابل غور بات یہ ہے کہِ اس سارے کھیل میں ملک وقوم کے ہاتھ کیا آیا؟ جبکہ اِس مہم نے طرح طرح کی قیاس آرائیوں کو بھی جنم دیا اوراِس دوران میں مسلسل ماورائے آئین مداخلت کا خدشہ بھی محسوس کیا جاتا رہا، جبکہ خود موصوف

نے ماورائے آئین مطالبات پیش کئے اور فوج اور عدلیہ کو بھی سیاست میں گھسیٹنے کی
کوشش کی، جبکہ لانگ مارچ اور دھرنے میں شریک لوگوں میں سے اکثریت کو اصل
سیاسی صورتحال کا علم نہ تھا، وہ مہنگائی، غربت، بے روزگاری، بجلی اور گیس کی
لوڈشیڈنگ اور امن وامان کی بگڑتی صورتحال کے ستائے ہوئے تھے اور اِس لیے
دھرنے میں شریک ہوئے کہ شاید اِس طرح اُن کے دکھوں اور پریشانیوں کا مداوا ہو
سکے گا، مگر دھرنے کا اختتام اُن کے مسائل کے حل کے بجائے طاہر القادری کے سیاسی
مطالبات کی قبولیت پر ہوا اور دھرنے کے شرکاء خالی ہاتھ ہی گھروں کو لوٹ گئے۔
یوں دھرنے میں شریک مسائل زدہ عوام جو امیدیں لے کر آئے تھے وہ کامیاب نہ ہو
سکیں اور حکومت کا تختہ الٹنے کیلئے آنے والے انقلابیوں نے اسلام آباد کے میدان کربلا
میں " حسینیوں کی یزید کے ہاتھ بیعت "کی ایک نئی تاریخ رقم کرڈالی۔

تعلیمی نسل کشی کا نیا بل۔۔۔۔۔

ایچ ای سی ترمیمی بل ایک انتقامی فیصلہ۔۔۔۔۔

کہتے ہیں تعلیم ترقی کی شاہ کلید ہے اور علم قوموں کی ترقی کی بنیاد و اساس ہوا کرتا ہے، یہ حقیقت ہے کہ قوموں کے عروج و زوال میں تعلیم کا کردار ہمیشہ سے غیر معمولی اہمیت کا حامل رہا ہے، دنیا میں وہی قومیں اور ممالک باوقار مقام کے حامل ٹھہرے جنھوں نے اِس گوہر کمیاب کے حصول کیلئے حکمت عملی وضع کی، لیکن اِس کے برعکس جن قوموں نے تساہل سے کام لیا اور لاپروائی برتی وہ قومیں جغرافیائی آزادی کے باوجود ذہنی غلامی سے نہ نکل سکیں، یہ قومی ترقی کے پرکھنے کا رائج الوقت پیمانہ ہے،اِس اصول کی روشنی میں وطن عزیز کا جائزہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ہمارے یہاں تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کے مطابق مطلوبہ حکمت عملی کبھی وضع ہی نہیں کی جا سکی، نتیجتاً ہمارا شمار اُن قوموں میں ہونے لگا جن کا وجود ہی سوالیہ نشان ہے، سردست اِس تشویشناک صورتحال، اسباب و محرکات اور پس پردہ عوامل کا جائزہ ہمارا مقصود نظر نہیں، لیکن ایک بات طے ہے کہ نصف صدی سے زیادہ سفر طے کرنے کے باوجود اگر ہم تعلیمی میدان میں کوئی قابل قدر ترقی نہ کرسکے تو اِس کی سب سے بڑی وجہ

ارباب اقتدار کی عدم دلچسپی اور شعبہ سے پہلو تہی ہے، حالانکہ ایک وقت وہ بھی تھا جب تعلیمی ترقی کی وجہ سے مسلمان دنیا کی امامت کے مرتبے پر فائز تھے، یہ وہ دور تھا جب مغرب اپنے تاریک ترین دور سے گزر رہا تھا، مگر قرطبہ کی جامعات دنیا بھر میں علم وفن کی روشنی پھیلا رہی تھیں، لیکن جب تعلیم و تعلّم اور شمشیر و سناں کی جگہ طاؤس و رباب نے لے لی تو ہماری تنزلی کا دور شروع ہو گیا، تعلیمی ترقی نہ ہونے کی وجہ سے وہ جو کبھی اقوام عالم کے سردار تھے، اغیار کے غلام اور محکوم ہوگئے، آج حال یہ ہے کہ دنیا کے بہترین تعلیمی ادارے اغیار کے پاس ہیں اور پوری دنیا سے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے لوگ اُن کی طرف رخ کرتے ہیں، دوسری طرف ہماری تعلیمی ترقی کا حال یہ ہے کہ دنیا کی بڑی جامعات کی فہرست میں دور دور تک ہماری کسی یونیورسٹی کا نام نظر نہیں آتا۔

ہمارے ملک میں تعلیم کا شعبہ روز اوّل سے ہی عدم توجہی کا شکار رہا ہے، ہر حکومت نے تعلیمی کمیشن تشکیل دیئے، نت نئی تعلیمی پالیسیاں بنائیں، تعلیمی فروغ کیلئے کاغذی ادارے قائم کئے، مگر ہمارا نظام تعلیم جوں کا توں ہی رہا، جبکہ دنیا کا دستور یہ ہے کہ قومیں اپنی ترقی اور کامیابی کیلئے ادارے تعمیر کرتی ہیں، اُن کی مسلسل پرورش کرتی ہیں، پروان چڑھاتی ہیں اور انہیں بہتر سے بہتر بناتی رہتی ہیں، تب جا کر کہیں برسوں بعد نتائج حاصل ہوتے

ہیں، وہ اِس حقیقت سے واقف ہیں کہ ادارے ہی قوموں کا اثاثہ اور میراث ہوتے ہیں جو ثمربار اور گھنے درختوں کی مانند آنے والی نسلوں کو نہ صرف سایہ فراہم کرتے ہیں بلکہ ترقی و خوشحالی کا پھل بھی مہیا کرتے ہیں، مگر اِس کے برعکس ہم نے اپنی 65 سالہ تاریخ میں سب سے زیادہ توجہ ادارے بنانے کی بجائے انہیں کمزور کرنے اور توڑنے پر صرف کی ،جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر شعبے میں ہم پیچھے رہ گئے، بد قسمتی سے ہمارے حکمرانوں کا یہ شغل آج بھی جاری ہے، اگر اتفاق سے کسی دور حکومت میں کوئی ادارہ وجود میں آ بھی گیا تو اِس کے درپے ہونا، آنے والے حکمرانوں نے اپنا فرض منصبی سمجھا، خوش قسمتی سے سابقہ دور آمریت میں ادارہ سازی کے میدان ایک قابل تعریف کام سرزد ہوا، جو ہائر ایجوکیشن کمیشن کا قیام تھا، لیکن موجودہ حکومت برسر اقتدار آنے کے بعد سے مسلسل اِس کوشش میں مصروف رہی کہ کسی طرح اِس ادارے کو اپنے قابو میں لایا جائے،اِس مقصد کیلئے اُس نے مختلف حربے استعمال کئے، مگر ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا،اب ایک بار پھر اِس ادارے کی خود مختاری کے خاتمے اور چیئرمین کے عہدے کی معیاد کم کرنے کیلئے حکومتی جماعت کے چند ارکان نے” پرائیویٹ ممبرز ہائیر ایجوکیشن کمیشن ترمیمی بل” پیش کیا، جسے 23 جنوری کو قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی نے منظور کرلیا۔

اِس بل کا ایک پس پردہ مقصد یہ بھی ہے کہ اُن 393 ارکان پارلیمنٹ کو متوقع

نااہلی سے بچایا جائے، جن کی ڈگریوں کی تصدیق 2010 میں سپریم کورٹ کی دی گئی ہدایات کے باوجود حکومت کے عدم تعاون کی وجہ سے اب تک نہیں ہو سکی اور اِن ارکان پارلیمنٹ کی اسناد کو مشکوک یا جعلی سمجھا جارہا ہے اورجب تک اِن ارکان پارلیمنٹ کی ڈگریوں کی تصدیق نہیں ہوجاتی اِن افراد کو اگلا الیکشن لڑنے کی اجازت نہیں ملے گی،اَمر واقعہ یہ ہے کہ ہائر ایجوکیشن کمیشن ملک کا ایک موقر ادارہ ہے،جس نے اعلیٰ تعلیم کے فروغ کیلئے بہت کم وقت میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں،اعلیٰ تعلیم کی پالیسی، معیار کی نگرانی، اُس پر عمل درآمد کو یقینی بنانا،اسناد کی توثیق،نئے اعلیٰ تعلیمی اداروں کا قیام اور پہلے سے موجود اداروں میں تعلیم وتدریس کے انتظامات کی بہتری،اِس ادارے کے فرائض میں شامل ہے، یہ کمیشن 2002 میں جنرل مشرف کے دور حکومت میں معرضِ وجود میں آیا،ڈاکٹر عطاالرحمٰن 2002 سے 2008 تک اِس ادارے کے سربراہ رہے،جنھوں نے ملک میں اعلیٰ تعلیم کے فروغ اوراِس کے معیار کو بہتر بنانے کیلئے قابل ستائش انقلابی اقدامات کیے، کئی ہزار اساتذہ کو ڈاکٹریٹ کیلئے دنیا کے ممتاز تعلیمی اداروں میں بھیجا،ملک کے اندر اعلیٰ تعلیمی اداروں میں اساتذہ کیلئے اہلیت کے معیار کو بلند کیا، ملک کی جامعات میں متعدد تحقیقی منصوبے شروع کیے اوراِن مقاصد کے حصول کیلئے تعلیمی بجٹ میں حتی الامکان اضافہ کروایا۔

مگر موجودہ حکومت کے برسراقتدار آنے کے بعد یہ شعبہ بری طرح نظر انداز کیا گیا، جس کے نتیجے میں ملک کی جامعات شدید مالی مسائل کا شکار ہوئیں، بیرون ملک سرکاری وظائف پر پی ایچ ڈی کیلئے جانے والے ہزاروں افراد کے وظائف بھی بند ہوگئے۔تاہم مشکلات کے باوجود ہائر ایجوکیشن کمیشن کے موجودہ سربراہ ڈاکٹر جاوید لغاری نے اپنی ذمے داریاں احسن طریقے سے ادا کیں، چونکہ 2008 کے الیکشن میں ارکان پارلیمنٹ کیلئے گریجویشن کی شرط لازمی تھی،اِس لیے انتخابات کے بعد بعض ارکان کی ڈگریوں کو عدالت میں چیلنج کیا گیا، جن میں سے متعدد ڈگریاں جعلی نکلیں تو عدالت نے ہائر ایجوکیشن کمیشن سے تمام ارکان پارلیمنٹ کی ڈگریوں کی توثیق ضروری قرار دی، جس کے بعد سے کمیشن اور اُس کے سربراہ کیلئے آزمائشوں کا دور شروع ہوگیا، قومی روزنامے کی رپورٹ کے مطابق جب کمیشن کے چیئرمین ڈاکٹر جاوید لغاری نے جعلی ڈگریوں کو اصلی قرار دلوانے یا اِس کام میں زیادہ سے زیادہ تاخیر کرنے کے حکومتی مطالبے کو ماننے سے انکار کیا تو اُن پر مستعفی ہونے کیلئے دباؤ ڈالا گیا،جب وہ جھکنے کو تیار نہیں ہوئے تو اُن کے بھائی کو یکے بعد دیگر مقدمات میں ملوث کیا گیا، اُن کے آبائی فارم ہاؤس پر چھاپہ مار کر وہاں کام کرنے والے کسانوں کو گرفتار کیا گیا، لیکن کمیشن کے چیئرمین اِن تمام ہتھکنڈوں کے باوجود اپنے جائز موقف پر ڈٹے رہے تو 18 ترمیم کے ذریعے ہائر ایجوکیشن کمیشن کو تحلیل کرنے کی کوشش کی گئی، مگر سپریم کورٹ کی مداخلت کے باعث یہ حربہ بھی ناکام ہوگیا، جس کے بعد

حکومت نے کمیشن کے فنڈز میں چالیس فی صد کمی کر دی،جب فیکلٹی ارکان، عملے، طلبہ
اور دیگر ملازمین نے ملک گیر ہڑتال کی تو اُسے 20 فیصد فنڈز فراہم کر دیئے گئے۔
بعد ازاں ایچ ای سی کا انتظامی اور مالی کنٹرول وزارت تعلیم کے ماتحت کرنے کی کوشش
کی گئی، مگر اِس نوٹیفکیشن کو سندھ ہائی کورٹ نے منسوخ کر دیا، جس پر حکومت نے ایچ
ای سی کو اپنے ہاتھ میں لینے کیلئے ایک اور قدم اٹھایا اور ایگزیکٹیو ڈائریکٹر کی پوزیشن کا
فائدہ اٹھاتے ہوئے وزیر اعظم نے سیکرٹری تعلیم کو ہدایت کی کہ وہ قائم مقام ایگزیکٹیو
ڈائریکٹر کا عہدہ سنبھال لیں، حالانکہ اِس اسامی جس کی تقرری کمیشن کا اختیار ہے ،ایچ ای
سی پہلے ہی اشتہار دے چکی تھی، چنانچہ چیئرمین ایچ ای سی نے اِس صورتحال کو قبول
کرنے سے انکار کر دیا، جس کے بعد ایچ ای سی اور حکومت کے درمیان ایک نئی جنگ
چھڑ گئی جو ایک بار پھر سپریم کورٹ جا پہنچی، عدالت عظمٰی نے حکومت کا حکم معطل کرتے
ہوئے ایچ ای سی کو ایگزیکٹیو ڈائریکٹر کی تقرری کا حکم دیا،اِس طرح ایک اور شکست
حکومت کے حصے میں آئی اور وہ ایک بار پھر اِس ادارے کے سربراہ کو زیر نہ
کر سکی، چنانچہ حکومت نے کمیشن کو بے دست وپا بنانے کیلئے ہائر ایجوکیشن کمیشن کے
قانون میں ترمیم کا اعلان کر دیا، جس کا مقصد کمیشن کی خودمختاری کے خاتمے اور چیئرمین
کے عہدے کی میعاد کو کم کرنا ہے تاکہ موجودہ سربراہ سے

نجات حاصل کرکے کسی ایسے شخص کو کمیشن کا چیئرمین بنایا جائے جو حکومت کے ناجائز مطالبات کو پورا کرنے میں لیت و لعل سے کام نہ لے اور اُن 393 ارکان قومی و صوبائی اسمبلی اور سینیٹ کواِس بل کی منظوری کے ذریعے نااہلی کی تلوار سے بچایا جاسکے۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ ابھی یہ بل قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی نے منظور کیا ہے،اگر یہ بل اگلے مراحل طے کرکے باقاعدہ قانون بن جاتا ہے تواِس سے نہ صرف جعلی ڈگری ہولڈرز جعلسازوں کی حکمرانی کی راہ ہموار ہوجائے گی بلکہ پاکستان میں اعلیٰ تعلیم کا مستقبل تاریک اور بیرون دنیا میں ہمارے تعلیمی معیار کی رہی سہی ساکھ بھی ختم ہوکر رہ جائے گی، تعلیمی تباہی و بربادی کا یہ منظر نامہ نقش دیوار ہے، یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ایچ ای سی کی کارکردگی سے متاثر ہوکر ترکی، سری لنکا اور بنگلہ دیش سمیت متعدد ممالک اِس طرز کا ادارہ قائم کرنے کیلئے کوشاں ہیں، جبکہ بھارت اِس سے ایک قدم آگے سپر ایچ ای سی قائم کرنے جارہا ہے تاکہ تعلیمی میدان میں بلاشرکت غیرے قیادت کا تاج اپنے سر سجا سکے،دوسری جانب ورلڈ اکنامک فورم کے اعداد و شمار اعلیٰ تعلیم وتربیت ، ٹیکنالوجی اورجدت کے حوالے سے پاکستان میں گزشتہ تین سال کے دوران دیگر ممالک کے مقابلے میں بہتری دکھارہے ہیں، جواِس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اعلیٰ تعلیم میں اصلاحات کے فوائد حاصل ہورہے ہیں، مگر افسوس ہماری حکومت ایک قابل

قدر ادارے کو اپنی ذاتی عناد اور انتقام کا نشانہ بنا کر تباہ و برباد کرنے پر تلی ہوئی ہے، یہی وجہ ہے کہ ملک بھر کی جامعات کے وائس چانسلرز اور ماہرین تعلیم کی بڑی تعداد نے اِس مجوزہ ترمیمی بل پر اپنے شدید تحفظات کا اظہار کیا ہے۔

اُن ماہرین کا موقف ہے کہ ایچ ای سی کا قیام 2001 میں قائم کردہ اسٹیئرنگ کمیٹی اور ٹاسک فورس کے 18 ماہ پر محیط مشاورت سے عمل میں لایا گیا تھا، لیکن مجوزہ ترمیمی بل میں کسی بھی اسٹیک ہولڈر سے کوئی مشاورت نہیں کی گئی، نہ ہی حکومت نے ملک کی یونیورسٹیوں اور ایک لاکھ سے زائد فیکلٹی سمیت کسی فرد یا ادارے سے مشورے 140 کو اہم جانا، چنانچہ اِس تناظر میں اِس بل کی منظوری سے اعلیٰ تعلیم کے شعبے

کو شدید خطرات لاحق ہوگئے ہیں، یقیناً ملک بھر کے ماہرین تعلیم اور جامعات کے وائس چانسلرز کے خدشات بجا ہیں، حکومت 393 جعلی ڈگری ہولڈر کو بچانا اور کمیشن کو اپنے کنٹرول میں لا کر ایک ایسے ادارے کو عضو معطل بنانا چاہتی ہے جس کی کارکردگی کا اعتراف اندرون اور بیرون ملک بھی کیا جارہا ہے، قارئین محترم ! ہائر ایجوکیشن کمیشن پر پے درپے حکومتی حملوں سے اُس کے عزائم واضح ہیں، آج ایک بار پھر ایچ ای سی پر خطرات کے گہرے اور مہیب سائے منڈلا رہے ہیں، یہ خطرات ہمہ پہلو سنگین اور علم دوست طبقات کیلئے باعث تشویش ہیں، جن سے مقابلے کیلئے مشترکہ اور منظم جدوجہد وقت کی اہم

ضرورت ہے، لہذا تمام سیاسی جماعتوں، سماجی حلقوں اور سول سوسائٹی کی اجتماعی ذمہ داری ہے کہ وہ حکومت کی اِس تعلیم دشمن پالیسی اور فیصلے کے خلاف متحد ہوکر واضح لائحہ عمل اختیار کریں اور اِس ادارے کی آزادی و خودمختاری کو قائم رکھنے اور اپنی نسلوں کو فکری و نظریاتی بربادی سے بچانے کیلئے آگے آئیں، ساتھ ہی ہماری سپریم کورٹ سے بھی گزارش ہے کہ وہ حکومت کے اِس تعلیم کش پالیسی بل کے خلاف از خود نوٹس لے کر وطن عزیز کے نوجوانوں کے مستقبل کو تاریک اور جہالت کے اندھے گڑھوں میں گرنے سے بچائے۔

الجامعة العلیمیۃ الاسلامیۃ میں سالانہ جلسہ دستار بندی و تقسیم اسناد

جامعہ علیمیہ دینی و عصری تعلیم کا امتزاج ہے

الوفاق العالمی للدعوۃ الاسلامیۃ یعنی ورلڈ فیڈریشن آف اسلامک مشن کا قیام حضرت علامہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری صاحب کی کوششوں کی بدولت 28 اگست 1958 میں عمل میں آیا، 1965 میں جامعہ علیمیہ کی موجودہ عمارت مکمل ہوئی، 29اگست 1971 کو اس ادارے کی پہلی تقریب تقسیم اسناد منعقد ہوئی، جس سے اس ادارے نے ایک بین الاقوامی تعلیمی ادارے کی شکل اختیار کرلی ،آج یہ ادارہ مبلغ اسلام علامہ عبدالعلیم صدیقی کی عظیم القدر تبلیغی اور دینی وملی خدمات کے اعتراف کے طور پر "جامعہ علیمیہ" بھی کہلاتا ہے۔

اس ادارے کے قیام کا مقصد دنیا بھر کی اسلامی سرگرمیوں کو ایک رابطے میں منسلک کرنا، دوردراز کے ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کی دینی وروحانی تربیت، اندرون و بیرون ملک علمائے دین کے تبلیغی و اصلاحی دوروں کا اہتمام، مروجہ لادینی نظام تعلیم اور غیر فکر کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا، مسلم ممالک کے نوجوانوں کے درمیان اسلامی تعلیمات اور فکر کی ترویج اور دور جدید

کے مسائل کے مطابق اسلامی تعلیمات کی تشریح اور عملی زندگی میں اطلاق ہے۔
اس ادارے کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اس ادارے کی ابتدائی پہلی جماعت کے طلباء کا تعلق پاکستان کے علاوہ مشرقی افریقہ، جنوبی امریکہ، غرب الہند اور جنوبی افریقہ سے آئے ہوئے طلباء پر مشتمل تھا، بعد میں بتدریج فیجی، آسٹریلیا،
فلپائن، انڈونیشیا، کوریا، تھائی لینڈ، سنگاپور، سیلون، ماریشش، موزنبیق، گھانا، جرمنی اور کناڈا وغیرہ کے طلباء نے بھی اس ادارے میں تعلیم حاصل کی، آج بھی بہت سے ممالک کے طلباء اس ادارے میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔
جامعہ علیمیہ کا نصب العین ایسے جامع علمائے دین پیدا کرنا ہے جو عربی زبان وادب علوم شرعیہ اور افکار جدیدہ پر مبنی اپنی تعلیم و تربیت کے باعث عصر حاضر کے انسانوں، کی صحیح رہبری و رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے سکیں، اس لحاظ سے دینی و عصری علوم سے مزین علماء کی تیاری میں جامعہ علیمیہ کا منصوبہ جلیل القدر مقاصد کا حامل ہے اور آج اس ادارے سے فارغ التحصیل طلباء شیخ الجامعہ جناب سرفراز صابری صاحب اور قابل اساتذہ کی سرپرستی میں اندورن و بیرون ملک گرانقدر دینی و ملی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

جامعہ علیمیہ کراچی پاکستان محض ایک دینی درسگاہ نہیں، بلکہ یہ انگریزی نظام تعلیم کی پیدا کردہ دینی ودنیاوی تفریق کو دور کرنے کی ایک سعی بلیغ اور جامع انقلابی تعلیمی منصوبہ ہے، جس میں داخلہ کے وقت طلبا کا اولیول یا میٹرک پاس ہونا لازمی ہے، جامعہ علیمیہ کراچی یونیورسٹی سے ایفیلیٹڈ بھی ہے، اس ادارے میں دینی و عصری علوم کے حسین امتزاج سے ایسی متوازی تعلیم وتربیت کا انتظام ہے جو اسلام کی حقانیت، اسلامی نظریہ حیات کی عظمت اور اسلامی طرز معاشرت کی برتری کا طلباء میں احساس پیدا کرکے انہیں معاشرے میں متحرک و فعال کردار ادا کرنے کا جذبہ بھی عطا کرتا ہے اور اُن کے کردار و عمل میں وہی جھلک نظر آتی ہے جس کا دین متین ایک مبلغ سے تقاضہ کرتا ہے۔

اس مقصد کے حصول کیلئے جامعہ علیمیہ نے اپنا ایک علیحدہ تعلیمی نصاب مرتب کیا ہے، جس کی خصوصیت یہ ہے کہ طلباء کی تعلیم واساس علوم دینیہ پر رکھتے ہوئے اُن میں علوم وفنون کا حسن امتزاج پیدا کیا جاسکے ،جامعہ علیمیہ میں عربی زبان وادب، تفسیر واصول تفسیر، حدیث واصول حدیث، فقہ واصول فقہ، علم کلام وافتاء، سیرت طیبہ وتاریخ اسلام کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان وادب، منطق، قدیم وجدید فلسفہ، نفسیات وتاریخ، معاشیات، سیاسیات، عمرانیات، تقابل ادیان وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے، یہاں کی خاص بات یہ ہے کہ علوم دینیہ کی تعلیم عربی زبان اور دیگر عصری علوم کی تعلیم انگریزی زبان

میں ہوتی ہے تاکہ طلباء اصل ماخذات سے پوری طرح مستفید ہو سکیں، نصابی کتب کے انتخاب میں اس اَمر کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ طلبہ عربی استعداد بڑھا سکیں اور اعلیٰ معیار پر علوم دینیہ کی ٹھوس قابلیت اور بصیرت حاصل کر سکیں۔

اس مقصد کیلئے جامعہ علیمیہ کے نصاب کو تین مراحل میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلا مرحلہ درجہ اعدادی و اعلیٰ ثانوی اور درجہ عالیہ پر مشتمل ہے۔ درجہ اعدادی و اعلیٰ ثانوی، تین سال پر مشتمل ہے، جس میں ابتدائی عربی، صرف و نحو، عقائد و عبادات، تجوید و قرات اور قرآن مجید کی صورتوں کے ترجمے و تشریح اور تقابل ادیان کے ساتھ انٹر میڈیٹ سال اوّل اور دوم کے نصاب کے مطابق انگریزی، معاشیات، تاریخ اسلام منطق و اسلامک اسٹڈیز کی تعلیم دی جاتی ہے۔

جبکہ درجہ عالیہ، دو سال کے نصاب پر مشتمل ہے، جس میں عربی زبان وادب، انشاء و بلاغت، تفسیر حدیث و فقہ، علم الکلام اور تقابل ادیان کے ساتھ ساتھ بی، اے سال اوّل و دوم کے نصاب کے مطابق معاشیات، سیاسیات، فلسفہ، تاریخ اسلام، تقابل ادیان اور اسلامک اسٹڈیز کی تعلیم دی جاتی ہے۔ دوسرا مرحلہ درجہ کامل کہلاتا ہے جو کہ دو سال پر مشتمل ہے، اس مرحلے میں درجۃ الاجازۃ

العالیہ کی سند حاصل کرنے والے طلباء کو داخلہ دیا جاتا ہے اور انہیں جامعہ علیمیہ کے نصاب کے ساتھ عربی، معارف اسلامی، معاشیات، سیاسیات اور فلسفہ وغیرہ میں کراچی یونیورسٹی سے ایم۔اے کا پاس کرنا ضروری ہے،اس مرحلے میں کامیاب طلباء کو درجۃ الکامل کی سند ملتی ہے۔ جبکہ تیسرا مرحلہ درجۃ اختصاص تین سال پر مشتمل ہے، جس میں کامل سند حاصل کرنے والے طلباء کو داخلہ دیا جاتا ہے، یہ درجہ تحقیقی نوعیت ہے جس میں کامیاب طلباء درجۃ التخصص کی سند حاصل کرتے ہیں ،اس منزل پر طلباء کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لے کر اپنے ایم۔اے کے مضامین کے مطابق پی ایچ ڈی کی تکمیل کر سکتے ہیں۔

جامعہ علیمیہ میں طلباء کی رہائش کیلئے ضروری سہولتوں سے آراستہ ہاسٹل کا بھی انتظام ہے، جامعہ یں طلباء کی سہولت کیلئے ایک اعلیٰ درجے کی لائبریری بھی موجود ہے، جس میں علوم دینیہ سے متعلق عربی،اردو اور انگریزی میں کتابوں کا بیش قیمت ذخیرہ موجود ہے، یہ بات بہت اہم ہے کہ جامعہ طلباء کو نصابی کتب اور رہائش مفت فراہم کرتی ہے، جبکہ طلباء کے تزکیہ نفس اور تعمیر سیرت کیلئے جامعہ کے احاطے میں ایک عالیشان مسجد اور دارالتربیت بھی موجود ہے۔

ہفتہ 9 فروری 2013ء کو جامعہ علیمیہ کے شیخ الجامعہ جناب سرفراز صابری صاحب

نے 44 ویں سالانہ جلسہ دستار بندی و تقسیم اسناد کا نعقاد کیا، جس میں ملک کے ممتاز علماء کرام، دانشور، سیاسی و سماجی شخصیتوں کے علاوہ طلباء اور لوگوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی، اس مقصد کیلئے جامعہ کی مسجد کے صحن یں خوبصورت تقریب کا اہتمام کیا گیا، اس پر وقار تقریب تقسیم اسناد کی صدارت صاحبزادہ مصطفےٰ فاضل انصاری سرپرست ورلڈ فیڈریشن آف اسلامک مشن نے کی، جبکہ تقریب کے مہمان خصوصی سجادہ نشین ابومکرم ڈاکٹر سید محمد اشرف الجیلانی دامت ابرکاتہم العالیہ تھے، دیگر مہمانان گرامی میں ممتاز قانون داں بیرسٹر فروغ نسیم، علامہ حیات نور صاحب پرنسپل علیمیہ اسلامک سینٹر ماریشش، مفتی عبدالحلیم ہزاروی، علامہ خلیل الرحمٰن چشتی، علامہ زاہد الحق، جہانگیر صدیقی، شیخ عمران الحق، حامد علی علیمی، محمد طارق خان، مولانا یحیٰی صاحب، مولانا عابد علی مسکین، مولانا محمد نعمان، قاری ظفر اور حافظ محمد شفیق صاحب وغیرہ شامل تھے۔ اس تقریب تقسیم اسناد کی نظامت علامہ مولانا عبداللہ نورانی اور علامہ عمیر محمود صدیقی صاحب نے کی، تقریب کا آغاز قاری رضاالمصطفیٰ صاحب نے تلاوت قرآن مجید سے کیا، جبکہ بارگاہ رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم میں حافظ محمودالحسین اشرفی اور سہیل مصطفیٰ قادری نے ہدیہ نعت پیش کیا۔

ورلڈ اسلامک مشن کے تحت ماریشش میں قائم علیمیہ اسلامک سینٹر کے پرنسپل ڈاکٹر حیات نور صاحب نے "20 ویں صدی میں اسلام کے احیاء" کے موضوع پر گفتگو

کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر آج حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و صورت کو
اپنالیا جائے تو مسائل ومشکلات سے بھری یہ دنیا چین و امن کا گہوارہ بن سکتی
ہے،انھوں نے کہا کہ ہم اسلام کی حیات نو کے منتظر ہیں مگر اسلام ہماری حیات نو کا منتظر
ہے،اس موقع پر انھوں مشہور انگریز ادیب جارج برنارڈ شاہ کا قول دہراتے ہوئے کہا
کہ جارج برنارڈ شاہ نے کہا تھا کہ میں نے اسلام کو ہمیشہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے
،اس لیے کہ اسلام میں زندہ رہنے کی طاقت موجود ہے
یہ دنیا کا واحد مذہب ہے جو دنیا کے بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت رکھنے کی صلاحیت
رکھتا ہے،اگر کسی مذہب میں یہ صلاحیت موجود نہ ہو تو مذہب کو بدلنا پڑے گا یہ پھر
وہ مذہب ختم ہو جائے گا،جارج برنارڈ شاہ نے تسلیم کیا کہ اسلام زندہ مذہب ہے اور
ہمیشہ زندہ رہے گا،ڈاکٹر حیات نور صاحب کا کہنا تھا کہ لیکن ہم قومی اعتبار سے مردہ پڑے
ہوئے ہیں،جس دن یہ تحریک پیدا ہو گئی بس اُسی دن سے تبدیلی کا آغاز ہو جائے
گا،انھوں نے فارغ التحصیل طلباء کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہوئے اسلام کی
بقاء اور احیاء کیلئے فعال کردار ادا کرنے بھی تلقین کی۔
اسلامی قوانین اور عدالتی نظام ، نفاذ و امکانات کے موضوع پر گفتگو کرتے "

ہوئے ممتاز قانون داں بیرسٹر فروغ نسیم کا کہنا تھا کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور اسلام نے انسانی زندگی کے ہر شعبے میں رہبری ورہنمائی کے جامع اصول مرتب کئے ہیں،انہوں نے کہا کہ ہمارا موجودہ عدالتی نظام اگر مکمل طور پر اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھال دیا جائے تو معاشرے سے جرائم کا باآسانی خاتمہ ہوسکتا ہے اور معاشرہ چین و امن کا گہوارہ بن سکتا ہے۔

صدر مجلس صاحبزادہ مصطفےٰ فاضل انصاری نے اپنے صدارتی میں فارغ التحصیل طلباء کو مستقبل میں درپیش چیلنجز سے آگاہ کیا اور انہیں آنے والی مشکلات و دشواریوں سے نبرد آزماء ہونے کا لائحہ عمل دیتے ہوئے کہا کہ ہمیشہ ہمت، استقامت اور ثابت قدمی سے حالات کا مقابلہ کیا جائے،انہوں نے فارغ التحصیل طلباء میں اسناد وانعامات بھی تقسیم کئے،آخر میں صلوٰۃ و سلام کے بعد علامہ ڈاکٹر سید محمد اشرف الجیلانی کی دعائے خیر پر یہ تقریب سعید اختتام پذیر ہوئی۔

بولتا جہل ہے بدنام دین ہوتا ہے۔۔۔۔۔

پٹے ہوئے مہرے اور ناکام مداری کی حالت کچھ ایسی ہی ہوتی ہے، ہار کا دکھ اور تماشے کی ناکامی کسی پہلو چین نہیں لینے دیتی ،اپنی علمیت ،بڑائی اور خود نمائی کی شکست تمام اصول قاعدے اور اخلاقی ضابطے بھی بھلادیتی ہے،انسان اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے اور ہذیان بکنے لگتا ہے،ایسا ہی کچھ حضرت شیخ الاسلام کے ساتھ ہوا،پیٹیشن کیا خارج ہوئی حضرت سب کچھ بھول کر جاہ و جلال کی ایسی تصویر بن گئے،جس کی توقع بہت ہی کم تھی، کل تک آئین اور قانون کی دانشمندی کے قصیدے پڑھنے ، سپریم کورٹ زندہ بادکے نعرے لگوانے اور اُس کے ہر فیصلے کو تسلیم کرنے کا دعویٰ کرنے والے آج عدالت عظمیٰ،چیف جسٹس اور معزز ججز پر انگلیاں اٹھارہے ہیں،زبان شرارے اُگل رہی تو چہرہ غیض وغضب کی آڑی ترچھی کہانیاں سنارہا ہے،شعلہ بیانیاں ہیں کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی،دوسری طرف حضرت شیخ الاسلام کے حواریوں کا حال بھی کچھ مختلف نہیں، محترم چیف جسٹس صاحب کے خلاف شوشل میڈیا پر جس قسم کے غیر اخلاقی رویئے کا مظاہرہ کیا جارہاہے،وہ یہ سوال کھڑا کررہا ہے کہ کیا مصطفوی انقلاب کے دعویداروں اور حسینیت کی مالا جپنے والوں کا کردار ایسا ہوتا ہے۔؟

محترم شیخ الاسلام صاحب جس طرح پٹیشن کے خارج ہونے پر پریس کانفرنس میں شعلہ فشاں نظر آئے۔اُسے دیکھ کر فیصل رضا عابدی کا منہ سے آگ نکالنا یاد آ گیا، حیرت ہوتی ہے عقیدت مندوں کے اِس جملے پر کہ "حق کے راستے میں رکاوٹیں آتی ہیں۔" بے شک حق کا راستہ مشکل اور کٹھن ہے مگر مسافرانِ حق عزم اور حوصلے کا مظاہرہ کرتے ہیں، جس طرح چیف جسٹس صاحب دو سال مصائب میں رہے، لیکن کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائے، صبر واستقامت سے حالات کا مقابلہ کیا، حق پر تھے تو دنیا نے دیکھا کہ حق کیسے غالب آیا، مگر آپ کو تو ابھی میدان کارزار میں اُترے دو ماہ کا عرصہ بھی نہیں گزرا،ابھی تو ابتدائی معرکہ کا آغاز بھی نہیں ہوا،کامل انقلاب کی منزل تو کوسوں دور ہے، اتنی جلدی صبر رضا کا دامن چھوڑ دیا اور مذہب واخلاقیات کے سارے اصول بھول گئے، عدالتی فیصلے سے اختلاف کا یہ طریقہ تو نہیں کہ چیف جسٹس صاحب کی ذات کو ہدف تنقید بنایا جائے،گڑھے مردے اکھاڑے جائیں اور عدالت میں پرانی تصویر کو دکھاکے گلا پھاڑ کے کہا جائے کہ ملکہ الزبتھ اور مشرف کی وفاداری میں کوئی فرق نہیں، آپ نے بھی تو پرویز مشرف کے پی سی او کے تحت حلف اٹھایا تھا۔

جناب شیخ الاسلام صاحب یقیناً آپ سے بہتر کون جانتا ہوگا کہ اگر حال کلمہ پڑھ لے تو ماضی کا کفر کالعدم قرار پاتا ہے، غلطی کا ادراک اور دور رہنے کا طرز عمل ماضی کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے، بیرسٹر اعتزاز احسن نے بڑی

متوازن بات کہی کہ "پی سی او کے تحت حلف اُٹھانا اتنا ہی غلط ہے جس قدر دہری شہریت کا حامل ہونا ہے، لیکن اسی چیف جسٹس نے بعد ازاں ڈکٹیٹر کے سامنے حرف انکار بھی بلند کیا اور پی سی او حلف کے گناہ کا کفارہ بھی ادا کر دیا، اب چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چودھری کو پی سی او جج نہیں کہہ سکتے۔" حقیقت بھی یہی ہے قوم چیف جسٹس صاحب کو پی سی او جج نہیں سمجھتی، چیف صاحب نے اُس لغزش کا جو کفارہ ادا کیا ہے ،اُس کی نظیر ہماری عدالتی تاریخ میں شاید ہی کوئی اور ملے، چیف صاحب کے ایک حرف انکار نے عدلیہ کو نظریہ ضرورت کی دلدل سے نکال کر آئین و قانون کی پاسداری کا وہ حوصلہ عطا کیا ہے، جس پر تاریخ ہمیشہ فخر کرے گی، جناب شیخ الاسلام صاحب آپ اگر چاہتے ہیں کہ آپ کی نیک نیتی پر شک نہ کیا جائے تو آپ کو کینیڈین شہریت ختم کرکے ملکہ کے حلفِ وفاداری پر تین حرف بھیجنا ہونگے ،یقین جانیئے آپ کو بھی عزت مل جائے گی، لیکن اگر آپ کا یہی طرز عمل رہا کہ جن کو یزید، ڈاکو اور لٹیرا کہہ کر سابق حکمران قرار دیا، پھر انہی سے مذاکرات و عہد وپیاں کیے تو آپ کی صداقت و وفاداری پر سوال تو اٹھیں گے، اِس پر اتنا چراغ پا ہونا کہ تہذیب و شائستگی کا دامن ہی چھوٹ جائے آپ اور آپ کے معتقدین کو زیب نہیں دیتا۔

حالات و قرائین تو یہی ظاہر کرتے ہیں کہ حضرت شیخ الاسلام صاحب یہ سوچ کر

پاکستان آئے تھے کہ " جب اِس ملک میں اپنا حلقہ انتخاب نہ رکھنے والا دو حلقوں سے منتخب ہو جاتا ہے، متنازعہ شہریت رکھنے کے باوجود وزیر اعظم اور مالی امور کا نگران بن کر ملک و قوم کی تقدیر کے فیصلے کرتا ہے، ملک کو دو لخت کرنے والا فوجی آمر اپنی بقیہ زندگی آرام اور چین سے بسر کرتا ہے،دوسرا فوجی آمر جمہوری حکومت کا تختہ الٹتا ہے اور کمزور عدالتی فیصلے کے باوجود ایک منتخب وزیر اعظم کو تختہ دار پر چڑھا دیتا ہے، تیسرا فوجی ڈکٹیٹر ایک وزیر اعظم کو ملک بدر کر دیتا ہے، عدلیہ پر شب خوں مارتا ہے ،دو مرتبہ آئین توڑتا ہے اور گارڈ آف آنر کے سائے میں رخصت ہو کر لندن میں آرام و سکون کی زندگی گزارتا ہے ، موجودہ صدر ،وزیر اعظم اور وزراء پر بے لگام کرپشن کے الزامات لگتے ہیں لیکن کسی میں اتنی جرات نہیں ہوتی کہ احتساب کی بات کریں،اسمبلی کے 70 فیصد اراکین ٹیکس نہیں دیتے مگر آئین میں اپنی پسند کی ترامیم کرا لیتے ہیں، کراچی جیسے شہر میں پولیس اور رینجرز کے ہوتے ہوئے روزانہ درجنوں بے گناہ افراد مارے جاتے ہیں اور قاتل چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتے ہیں، کوئی نہیں پوچھتا کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہو رہا ہے،مزید طرفہ تماشا یہ کہ قبروں میں دفن لیڈر زندوں پر حکومت کرتے ہیں" جیسے انہونے اور حیرتناک واقعات ہو سکتے ہیں۔

تو اِن حالات میں وہ بھی اگر ڈگڈگی بجا کر ایک نیا تماشا دکھا دیں تو کوئی

نئی بات نہ ہوگی،جہاں قوم کو بے وقوف بنانے کے اتنے سرکس چل رہے، وہاں ایک نئے سرکس میں کیا مضائقہ ہے، لیکن اِس خوش فہمی میں شیخ محترم یہ بات بھول گئے کہ افتخار محمد چودہری صاحب کے حرف انکار سے جنم لینے والی سپریم کورٹ ملک کے اُن چند اداروں میں سے ایک ہے جس نے پاکستان میں ہونے والی تبدیلیوں میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، سپریم کورٹ کے جج صاحبان کسی کی فصاحت و بلاغت اور چرب زبانی سے متاثر نہیں ہوتے ،نہ ہی سڑکوں پر کیا جانے والا احتجاج،بڑے سے بڑا جلسہ اور لانگ مارچ اُن پر اثر انداز ہوتا ہے،وہ تو صرف آئین و قانون کی کو دیکھتے ہیں، دلیل و اصول کی زبان سمجھتے ہیں،اسی لیے عدالت عظمٰی اُن کی درخواست کو بدنیتی پر مبنی قرار دے کر واضح کردیا کہ بیرون ملک مقیم دوہری شہریت کے حامل پاکستانیوں کو ووٹ کا حق تو ہے لیکن ایسی سیاست کا نہیں جس سے سارے ملک کا نظام اُلٹ پلٹ ہوجائے،یوں عدالت عالیہ نے شیخ الاسلام کو پنڈورا بکس کھولنے کی اجازت نہیں دی اور 23 دسمبر سے چائے کی پیالی میں اٹھایا گیا طوفان خس وخاشاک کی طرح بیٹھ گیا،ویسے بھی پچھلے چند سالوں کے دوران عدالتوں نے ایسے بہت سے حالات دیکھ لیے ہیں ،جن کی روشنی میں حضرت شیخ الاسلام کا ایجنڈا سمجھنا کوئی مشکل کام نہ تھا،باالفاظ دیگر حضرت نے سرکس لگانے کیلئے غلط جگہ کا انتخاب کیا ہے، اگر وہ 23 دسمبر کے جلسہ عام اور 14 جنوری کے لانگ مارچ کی خود ساختہ کامیابی پر ہی اکتفاء کرلیتے اور اتنا زیادہ اونچا اُڑنے کی کوشش نہ کرتے تو آج انہیں

اِس خفت آمیز شرمندگی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

کہتے ہیں علم کی زیادتی انسان کو عقل کُل ہونے کے زعم میں مبتلا کر دیتی ہے، یہ غرور وتکبر بڑے بڑے عابدوں اور زاہدوں کو راندہ درگاہ بنادیتا ہے، حضرت بزعم خود کتنے ہی بڑے شیخ الاسلام ، پروفیسر،ڈاکٹر ، قانون دان اور علامہ کیوں نہ ہوں، لیکن سپریم کورٹ میں اپنے مقدمے کے دوران جس طرح اُن کی قانونی مہارت کی پول کھلی اُس نے اُن کے بقیہ دعووں میں بھی کلام کی گنجائش پیدا کر دی ہے، ضروری نہیں کہ عوام کے مجمع میں گرجنے برسنے اور خوابوں وتاویلات کے سہارے لوگوں کو بے وقوف بنا لینے والا ہر آدمی دنیاکے تمام علوم وفنون میں ماہر ویکتا ہو، عدالت عظمیٰ میں جس طرح شیخ الاسلام نے اپنے جوہر دکھائے اُس کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اُن پر توہین عدالت کا مقدمہ چلایا جاتا، مگر عدالت نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے درگذر سے کام لیا، شیخ الاسلام کو تو عدالت کی اِس مہربانی پر شکر گزار ہونا چاہیے، مگر افسوس جس دانش کم وحشت کا عملی مظاہرہ انہوں نے پٹیشن کے خارج ہونے پر پریس کانفرنس میں کیا،اُس نے اُن کی شخصیت اور قول و فعل کی بہت سے جہتیں کھول کرظاہر کردیا کہ حسینیت کا درس دینے والے اور لوگوں کو صبر واستقامت کی تلقین کرنے والے کس قدر جلد تہذیب وشائستگی کے تمام ضابطے بھول جاتے ہیں، المیہ یہی ہے کہ نماز باجماعت کی تلقین کرنے والے اور نیکی وپرہیزگاری کا درس

دینے والے اکثر شعبدہ_ گر خود نمازوں کے اوقات اور نیکی و تقویٰ پر عمل بھول جاتے ہیں۔

شعبدہ گر بھی پہنتے ہیں علماء کا لباس...... بولتا جہل ہے بدنام دین ہوتا ہے

جب تک جذبوں کی صداقت کا بھرم قائم ہے۔۔۔۔

مکتوباتِ ڈاکٹر مختار الدین احمد۔۔۔۔

کہتے ہیں مکاتیب دراصل مکتوب نگار کی شخصیت کے سربستہ رازوں کی کلید ہوتے ہیں اور شخصیت کی تمام گتھیاں سلجھانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، یہ مکاتیب ہی ہیں جو کسی شخصیت کی زندگی کے پنہاں پہلو سامنے لانے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں، لہذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مکتوب نگار اپنی زندگی کے تمام نشیب و فراز، جذباتی میلانات، مستقبل کے اندیشہ ہائے دور دراز اور اِس جہاں کے کار دراز کے متعلق مکتوب کی سطور کے ذریعے جو کچھ پیغام ارسال کرتا ہے، وہ نوائے سروش کی صورت میں مکتوب الیہ تک پہنچ جاتا ہے، مکتوب نگاری ایک ایسا فن ہے جو زندگی کی کلیت پر محیط ہے، حیات و کائنات کے تمام پہلو مکاتیب کا موضوع بن سکتے ہیں اور یہی اُن کی مقبولیت کا راز ہے، یہ ایک مسلمہ صداقت ہے کہ مکاتیب زندگی کی حرکت و حرارت کے آئینہ دار ہوتے ہیں، مکاتیب کا زندگی کے حقائق سے گہرا تعلق ہے، ڈاکٹر خورشید الاسلام نے لکھا ہے" زندگی اپنی راہیں خود بنا لیتی ہے، خط اپنی باتیں خود پیدا کر لیتا ہے.... زندہ رہنے کیلئے اور خط لکھنے کیلئے زندگی کا احترام ضروری ہے۔"

یہ حقیقت ہے کہ انسانی زندگی میں مدوجزر کی کیفیت ہمیشہ برقرار رہتی ہے،ایک تخلیق کار کا رویہ بھی خوب ہوتا ہے کبھی سوز و ساز رومی تو کبھی پیچ وتاب رازی،زندگی میں ایسے متعدد عوامل ہوتے ہیں جو تخلیق کار کا اوڑھنا بچھونا بن کر اُسے ہمہ وقت اپنی گرفت میں لیے رکھتے ہیں، جبکہ یوں بھی ہوتا ہے کہ تمام حقیقتیں خیال و خواب بن جاتی ہیں، جنہیں ہم دیکھ کر جیتے ہیں وہی لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں صداقتوں پر سراب کا گمان گزرتا ہے اور یہ سب سیل زماں کے تھپیڑوں کی زد میں آ کر پس منظر میں چلا جاتا ہے اور ہمارے اجتماعی لا شعور کا حصہ بن جاتا ہے، لیکن اجتماعی لا شعور کا حصہ بن جانے کے باوجود پس منظر میں چلی جانے والی صداقتیں ایک لمحے کیلئے بھی غائب نہیں ہوتیں، بلکہ ہمیشہ اپنے وجود کا احساس دلاتی رہتی ہیں، مکاتیب بھی اِس کی ایک صورت پیش کرتے ہیں،اُن کی اساسی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اگرچہ اُن کا تعلق ایک فرد کی نجی زندگی سے ہوتا ہے لیکن یہ اِس انداز سے زندگی کی کلیت اور جامعیت کی عکاسی کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو اِن میں اپنی زندگی کے تمام موسم اترتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں، سچ ہے دل سے نکلی بات کی اثر آفرینی بہر حال مسلمہ ہے۔
مکتوب نگار کی تاب سخن کے اعجاز سے فکر و نظر کے متعدد نئے دریچے وا ہوتے

چلے جاتے ہیں اور قلب و روح کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلنے والے پر خلوص جذبات کا یہ سیل رواں آلام روزگار کو خس وخاشاک کے مانند بہالے جاتا ہے،پر خلوص جذبات سے مزین مکاتیب کی صدا پوری انسانیت کے مسائل کی ترجمانی پر قادر ہے، مکتوب نگار اپنے شعوری غور وفکر کو اپنے اسلوب کی اساس بناتا ہے، بادی النظر میں مکتوب نگاری کی حدیں جذبہ انسانیت نوازی سے ملتی ہیں،ان دونوں میں مقاصد کی ہم آہنگی فکر و نظر کے متعدد نئے دریچے وا کرتی چلی جاتی ہے، مکتوب نگار جہاں اپنی داخلی کیفیات کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرتا ہے، وہاں زندگی کے تلخ حقائق کو بھی منصہ شہود پر لاتا ہے، یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ مکتوب نگار تخلیق ادب کے حوالے سے زندگی کی حرکت و حرارت کی عکاسی کرنے والے جملہ پہلو سامنے لاتا ہے اور اس طرح زندگی کی جدلیاتی حرکت کے بارے میں کوئی ابہام نہیں رہتا، وہ جانتا ہے کہ خزاں بہار کے آنے جانے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ فرد کی زندگی اور قلب و روح پر اترنے والے تمام موسم دل کے کھلنے اور مر جھانے سے عبارت ہیں، کہتے ہیں مکتوب نگاری ذوق سلیم کی مظہر ہے اور ایک زیرک اور با شعور مکتوب نگار اپنے اسلوب کے ذریعے دلوں کو مسخر کر لیتا ہے۔

مکتوبات ڈاکٹر مختارالدین احمد بنام پیرزادہ اقبال احمد فاروقی "بھی ایسے ہی جذبوں کی امین ہے، جو اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے شاگرد عزیز ملک

العلماء مولانا ظفرالدین قادری رضوی کے فرزند ارجمند پروفیسر ڈاکٹر مختار الدین احمد رئیس شعبہ عربی علی گڑھ یونیورسٹی کے محترم اقبال احمد فاروقی کے نام اُن خطوط کا مجموعہ ہے، جس کا دورانیہ فروری 1992 تا جولائی 2009 پر محیط ہے، داستان ترتیب میں صاحب مولف محمد عالم مختار حق لکھتے ہیں کہ " ڈاکٹر مختار الدین احمد اور فاروقی صاحب میں مراسلت کا آغاز دسمبر 1964 میں ہوا، درمیانی مدت کے مکاتیب جن کا درمیانی عرصہ 28 سال پر محیط ہے، بس اُن (اقبال فاروقی صاحب) کے لااُبالی پن کی نذر ہوئے، فاروقی صاحب کے پاس اپنی نگارشات کا کوئی ریکارڈ نہیں۔" لیکن اِس کے باوجود انہوں نے 227 مکتوبات کا گرانقدر تحفہ اہل علم کی خدمت پیش کرکے علمی کارنامہ سرانجام دیا ہے، ڈاکٹر مختار الدین احمد کے یہ خطوط مختصر و طویل نویسی اور خاکہ کشی کے ساتھ خوبصورت منظر کشی کے بھی مظہر ہیں، ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی مکاتیب کے جائزے میں لکھتے ہیں کہ "پروفیسر صاحب کے مکتوب الیہم کا دائرہ نہ صرف برصغیر ایشیاء، افریقہ اور مغربی ممالک کے علمائ، ادباء، مصنفین، محققین، ناشرین، مدیران رسائل وجرائد اور ماہرین تعلیم تک پھیلا ہوا ہے، خود اُن کے بقول انہوں نے اب تک پچاس ساٹھ ہزار خطوط تو ضرور لکھے ہونگے .....آپ کے خطوط محض رسمی نہیں ہوتے بلکہ علمی، ادبی، دینی اور تحقیقی اُمور ہی سے متعلق ہوتے، اِس سلسلے میں آپ کی ذات تن تنہا ایک ادارہ ہے، اگر آپ کے تمام مکاتیب کا مجموعہ چھپ جائے تو بلاشبہ اُس کی حیثیت ایک انسائیکلو پیڈیا سے کسی طور

کم نہیں ہوگی اور یہ نہ صرف مستقبل کے ریسرچ اسکالروں بلکہ عصر موجودہ کے مصنفین و محققین اور صاحبان علم و قلم کیلئے ایک قیمتی ذخیرہ اور رہنماء ثابت ہوگا۔"

مکتوبات میں شامل ڈاکٹر مختار الدین احمد کے خطوط کی خاص بات یہ ہے کہ اِن میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی کتابوں، اُن کے مکاتیب، ملک العلماء کی تصانیف وغیرہ کی تدوین واشاعت اور جلد از جلد منظر عام پر آجانے کی بے کلی آپ کی اعلیٰ حضرت سے بے پناہ محبت وعقیدت اور فروغ رضویات کیلئے مساعی وتڑپ کا احساس دلاتی ہے، مکتوبات میں شامل خطوط کو سادگی و سلاست، خلوص و دردمندی اور انسانی ہمدردی کا امتیازی وصف قرار دیا جاسکتا ہے، ڈاکٹر صاحب کی مکتوب نگاری میں تکلف، تصنع، مافوق الفطرت عناصر، ریاکاری اور موقع پرستی کی کہیں کوئی گنجائش نظر نہیں آتی، خطوط کے مندرجات اور موضوعات کا تعلق براہ راست زندگی سے ہے، جس طرح زندگی کے تلخ حقائق سے چشم پوشی ممکن نہیں، اُسی طرح مکاتیب کی اثر آفرینی سے شپرانہ چشم پوشی آسان کام نہیں، ڈاکٹر صاحب اپنی ذات کو پس منظر میں رکھتے ہوئے حالات کی اِس مسحور کن انداز میں عکاسی کرتے ہیں کہ قاری پر تمام حقائق خود بہ خود منکشف ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اِن خطوط کے مطالعے سے احساس، ادراک، وجدان اور عرفان کو متاع بے بہا نصیب

ہوتی ہے۔ڈاکٹر صاحب کے یہ مکاتیب نہ صرف شگفتگی، شائستگی، صداقت،
خلوص، دردمندی اور انسانی ہمدردی اور اُس کے موثر ابلاغ کو یقینی بنانے والے عناصر
سے مزین ہیں بلکہ ہماری تاریخ، تہذیب، ثقافت، درخشاں اقدار و روایات کے امین اور
تاثراتی و بیانیہ نثر کے اعلیٰ نمونہ بھی ہیں۔ یہ درست ہے کہ عصر حاضر کی ترقی نے اقدار و
روایات کے معائر بدل ڈالے اور وقت کی طنابیں کھینچ کر دنیا کو ایک گلوبل ویلیج میں
تبدیل کردیا، مگر مکاتیب کی دلکشی اور دل پذیری کا معیار ہر دور میں مسلمہ رہا، محبتوں،
چاہتوں، قربتوں اور عہد و پیماں کے امین خطوط کی اہمیت ہر دور میں موجود تھی اور ر
ہے گی اور خطوط کی ترسیل کا سلسلہ اُس وقت تک جاری رہے گا جب تک جذبوں کی
صداقت کا بھرم قائم ہے۔

نوادراتِ رضا میں منفرد اضافہ۔۔۔۔۔

امام احمد رضا فاضل بریلوی (1856-1921) ایک عظیم فقیہ، محدث، دانشور اور دور اندیش عظیم مسلم رہنماء تھے،آپ کی ذات سیاسی بصیرت اور مومنانہ فراست کا بہترین نمونہ تھی،آپ اُمتِ مسلمہ کے داخلی اور خارجی مسائل و مشکلات پر حساس نظر رکھتے تھے اور مسلمانوں کی حالتِ زار اور اُن کی فلاح و نجات کیلئے تدبیریں بھی پیش فرماتے تھے،زندگی بھر مولانا احمد رضا کی فکر و نظر کا محور یہی رہا کہ اسلامی تہذیب دنیا کی ہر تہذیب پر غالب اور مسلمان بلند و بالادست رہیں،آپ دین و مذہب، سیاست و صحافت، معیشت و معاشرت، تعلیم و تجارت، غرضیکہ ہر میدان میں مسلمانوں کو سرخ رو اور پیش رو دیکھنا چاہتے تھے،اِس مقصد کیلئے آپ نے مسلسل جد و جہد فرمائی، بار بار اُمت مسلمہ کو جھنجھوڑا، علما اور قائدین کو فرائض منصبی کا احساس دلایا، کوتاہیوں پر زجر و توبیخ فرمائی اور آزادی و خودداری کی راہ عمل متعین کی۔

گو آپ نے عملاً سیاست میں حصہ نہیں لیا، لیکن سیاست دانوں کی رہنمائی کا فریضہ بخوبی سرانجام دیا، جس وقت مسلم زعماء نے گنگا جمنا تہذیب کو اپنا مرکز بنایا، پیشانی پر تلک کا نشان سجایا اور ہندوؤں کو مساجد کے منبروں پر بیٹھایا، اُس وقت مولانا احمد رضا خاں نے انہیں نہ صرف متنبہ کیا بلکہ کفار کی دوستی اور شعار کو اپنانے سے بھی روکا اور قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح فرمایا کہ کفار ومشرکین کبھی بھی مسلمانوں کے بہی خواہ نہیں ہو سکتے، اُس دور پر آشوب میں مولانا احمد رضا خاں وہ واحد مذہبی رہنما تھے جنھوں نے ہر اُس فتنے کے خلاف ابلاغ حق کا فریضہ بلا خوف لامتہ لائم ادا کیا جس نے عامۃ المسلمین کے مفاد کے خلاف کام کیا، اِس معرکے میں آپ کے خلفاء وتلامذہ نے بھی اہم کردار ادا کیا اور اعتدال و سنجیدگی کے ساتھ شریعت مطہرہ کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھا، عالم اسلام کا یہ آفتاب 25 صفر 1340ھ مطابق 1921ء کو نمازِ جمعہ کے وقت بریلی میں غروب ہوگیا۔

مولانا احمد رضا فاضل بریلوی ایک کثیر التصانیف عالم دین تھے، دنیائے اسلام میں آپ کی تصنیف وتالیف کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے، ایک اندازے کے مطابق آپکی تصانیف 50 علوم وفنون میں ایک ہزار سے زائد ہیں، اِس قدر تصانیف کے علاوہ آپ نے مختلف علوم وفنون کی تقریباً 80 کتابوں پر تعلیقات وحاشیے بھی تحریر کئے ہیں، اِس علمی سرمایہ کے علاوہ آپ کے دو علمی وفقہی شاہکار

خاص طور پر قابل ذکر اور لائق ستائش ہیں، ایک 12 ضخیم جلدوں پر مشتمل فتاویٰ رضویہ جس کا پورا نام "العطایا النبویہ فی الفتاویٰ الرضویہ" جبکہ دوسرا علمی شاہکار قرآن مجید کا اردو ترجمہ "کنزالایمان فی ترجمۃ القرآن" ہے۔

کتاب "تقاریظ امام احمد رضا" عالم اسلام کے اِس عظیم مفکر، مدبر، عالم اور فقیہ کی اُن تقاریظ کا مجموعہ ہے، جسے آپ نے مختلف کتب ورسائل اور فتاویٰ جات کے ضمن میں اردو، عربی اور فارسی زبانوں میں تحریر فرمایا، یہاں یہ بات واضح رہے کہ کسی تصنیف کی خصوصیت پر تحریری اظہار رائے نثری ادب میں تقریظ کہلاتا ہے، تقریظ ہمیشہ کتاب کے شروع میں بطور افتتاحیہ درج ہوتی ہے، یہ وہ کلمات ہوتے ہیں جو ایک قاری کو مطالعے سے قبل کتاب، صاحب کتاب، اسلوبِ تحریر، طرز نگارش اور اصل موضوع سے روشناس کراتے ہیں، اردو زبان میں "دیباچہ، پیش لفظ، مقدمہ اور تمہیدی کلمات" جیسے الفاظ بھی تقریظ کے متبادل کے طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں، اعلیٰ حضرت کی تحریر کردہ اِن تقاریظ کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ اعلیحضرت کو اِن تینوں زبانوں میں مکمل عبور اور کامل دسترس حاصل تھی، آپ کی یہ تقاریظ فصاحت وبلاغت اور زبان وبیان کی خوبیوں اور موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے منفرد مقام وشان کی حامل ہیں، امام احمد رضا کا تبحر علمی محققانہ شان اور زبان وادب میں مہارت کا مظہر ہے، اَمر واقعہ یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت زبان وبیان اور تحریر میں حد درجہ احتیاط

ودیانت کے قائل تھے،آپ کو اگر کسی کتاب کی تحریر میں کوئی شرعی، علمی یا ادبی خامی نظر آتی تو آپ اُس کتاب پر تقریظ لکھنے سے انکار فرمادیتے،اِس لحاظ سے کسی کتاب پر آپ کی تقریظ کی موجودگی اُس کے معتبر و مستند ہونے کی اوّلین دلیل ہے۔

یہ درست ہے کہ ایک معیاری تقریظ لکھنا مشکل کام ہے، لیکن کسی مصنف کی تقریظات کو یکجا کرنا اِس سے بھی زیادہ دشوار عمل ہے اور وہ بھی اعلیٰ حضرت جیسی شخصیت، جن کی بیشتر کتابیں آج بھی تاریکی کے دبیز پردوں میں چھپی ہوئی ہیں،اِس تناظر میں یقینا یہ ایک مشکل کام تھا، مگر محترم صابر حسین شاہ بخاری نے اِس مشکل کام کا بیڑا اٹھایا اور 25 سال کی محنت وشاقہ اور مسلسل تلاش و جستجو کے نتیجے میں 50 تقاریظ "تقاریظ امام احمد رضا" کے نام سے یکجا کرکے نوادرات رضا میں ایک منفرد اضافہ فرمایاہے، قابل ذکر بات یہ ہے کہ اِن تقاریظ کی ترتیب وتدوین موصوف نے ضلع اٹک کے ایک دور افتادہ علاقے برہان شریف میں مکمل کی،اِس مقصد کیلئے صاحب مولف نے نہ جانے کتنے احباب سے رابطہ کیا ہوگا، کتنی کتابوں پر نظر دوڑائی ہوگی اور کتنے کتب خانوں و مدارس کی خاک چھانی ہوگی؟۔مگر جب ارادے اٹل، عزم جواں اور حوصلے بلند ہوں تو کامیابی کا حصول ناممکن نہیں، صابر حسین شاہ بخاری امام احمد رضا کے علوم وفنون کے بحر بیکراں سے "تقاریظ امام احمد رضا" کی شکل میں جو چند موتی چن کر لائے

ہیں،اُس پر وہ ہدیہ تبریک کے مستحق ہیں،اُن کی یہ کوشش جہاں تحقیق و مطالعہ رضویات کے حوالے سے نئے گوشے اور نئے زاویئے متعارف کرانے کی بہترین کوشش ہے،وہیں ماہر رضویات پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد مظہری کے پندوہ جلدوں پر مشتمل سوانح اعلیٰ حضرت کے جامع منصوبہ "دائرہ معارف امام احمد رضا" کے ایک عنوان کے تکمیل کی ترجمان بھی ہے۔اب یہ اہل علم اور قارئین کی ذمہ داری بنتی ہے کہ شاہ صاحب کی تحقیق و جستجو اور محنت کی قدر کرتے ہوئے کتاب کو محبانِ اعلیٰ حضرت تک پہنچانے کی سعی بلیغ کریں۔

حریصِ منصب حریصِ زر تھے

بالآخر 16 مارچ 2013 کو 18 فروری 2008ء کے انتخابات کے تحت وجود میں آنے والی پاکستان کی 13 ویں قومی اسمبلی اپنی آئینی مینڈیٹ پورا ہونے پر تحلیل ہو گئی۔اِس سے قبل 2002 کے مشرف دور آمریت میں تشکیل پانے والی قومی اسمبلی نے بھی اپنی پانچ سالہ میعاد پوری کی تھی، جبکہ اپنی میعاد پوری کرنیوالی موجودہ اسمبلی کے انتخابات بھی جنرل مشرف کے ماتحت قائم سسٹم کے تحت ہی منعقد ہوئے تھے،تاہم موجودہ اسمبلی مشرف کی جرنیلی آمریت کے خاتمہ کا باعث بنی اور سلطانی جمہور سے وابستہ ہونے کی دعویدار رہی ،اس لئے اِس منتخب جمہوری اسمبلی کی آئینی میعاد کی تکمیل قومی سیاسی تاریخ کا ایک منفرد واقعہ قرار دیا جا سکتا ہے، مگران پانچ برسوں میں پیپلز پارٹی کی حکومت نے قوم سے کیا چھینااور کیا دیا، اِن پانچ برسوں میں قوم پر کیا بیتی، اُس نے کیسے زندگی گزاری، کس طرح حالات سے سمجھوتہ کیا، ہمارے حکمرانوں نے اِس سے کوئی غرض وغایت نہیں رکھی، وہ تو قومی خزانہ لوٹنے اور ملکی دولت پر ہاتھ صاف کرنے میں مصروف رہے ،حکومتی ارکان نے کوئی موقع اور کوئی لمحہ اِس کار خیر سے دور رہنا پسند نہ کیا ،بلکہ اقتدار کے ڈوبتے سورج کی آخری کرن تک لوٹ مار اور بھاگتے چور کی لنگوٹی پر بھی ہاتھ صاف کرنے کی ہوش رُبا داستانیں منظر عام پر آتی رہیں۔

اِس معاملے میں جمعہ 15 مارچ کو سندھ حکومت نے تو انتہا ہی کر دی اور منتخب ارکان اسمبلی نے اپنے لیے تاحیات مراعات بھی منظور کرالیں، یوں مدت ختم ہونے سے ایک دن پہلے اپنے لیے تنخواہ میں 60 فیصد تک اضافے کی خود ہی منظوری دے ڈالی ، سندھ کے وزیر اعلیٰ سندھ قائم علی شاہ کے اس اقدام نے ہمارے سر فخر و غرور سے بلند کر دیئے موصوف جاتے جاتے اپنے، اسپیکر اور ڈپٹی اسپیکر کیلئے زندگی بھر تنخواہ اور الاؤ نسز کی، مد کا 70 فیصد الاونئس کی منظوری دے گئے ،ساتھ ہی وزیر اعلیٰ صاحب اپنے لیے گریڈ 17 کا سیکرٹری، کلرک، ڈرائیور، مالی، باورچی اور ایک بھنگی رکھ سکیں گے، جن کی تنخواہ کا بوجھ عوام پر ہی ہوگا، بات یہاں پر نہیں رکی ، موصوف 10 ہزار روپے ماہانہ فون اور موبائیل الاؤنس کے ساتھ پولیس سیکورٹی کے بھی حقدار ٹھہرے ۔برسر اقتدار پارٹی نے جاتے جاتے ایسی لوٹ سیل لگائی ، جس کی ہمیں ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی،اوپر سے ڈھٹائی کی انتہا یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے عوام کی خدمت کی ہے، سندھ اسمبلی نے آخری لمحہ تک مفادات سمیٹنے اور لوٹ مار کرنے کے لیے ہفتہ کے دن کی تعطیل بھی منسوخ کر دی، یہی نہیں بلکہ اسٹیٹ بینک سمیت تمام بینک بھی کھلوائے گئے تاکہ آخری دن پیسے کا لین دین مکمل ہوجائے، دوسری طرف وزارت خزانہ میں فنڈز کے اجراء کیلئے لوٹ سیل لگی رہی اور بلوں پر دھڑا دھڑ سائن ہوتے رہے ، طرفہ تماشا یہ کہ حکومت سندھ نے آخری دنوں میں ایک اور

کارنامہ یہ بھی انجام دیا کہ من پسند لوگوں کو نوکریاں بانٹی گئیں ، ہزاروں عارضی ملازمین کو مستقل کیا، یہ سب عوام کی محبت میں اور اپنے منشور روٹی، کپڑا اور مکان کے دعوے پر عمل درآمد کیلئے نہیں ہوا بلکہ آنے والے الیکشن میں اپنے ووٹرز کی تعداد بڑھانے کے لیے کیا گیا۔

لوٹ مار اور بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے میں وفاقی حکومت بھی کسی سے پیچھے نہیں رہی ، ملک بھر میں نئے سی این جی اسٹیشنز پر پابندی کے باوجود وزیراعظم صاحب نے اپنے منظور نظر افراد کو 400 لائسنس جاری کر دیئے اور نیشنل بینک میں 3 ہزار ملازمین کی بھرتی کے احکامات کے ساتھ 100 افسران کو پلاٹ اور وفادار افسروں کو ترقی بھی د ی، دوسری طرف قومی اسمبلی کی اسپیکر کی جانب سے دفتر چھوڑنے سے دو دن قبل خود اپنی زیر صدارت ہونے والے قومی اسمبلی کی فنانس کمیٹی کے آخری اجلاس میں تاحیات بھاری مراعات کی منظوری کا نوٹیفکیشن جاری کروایا، جس کے تحت فہمیدہ مرزا سمیت 6 سابق اسپیکرز صاحبزادہ فاروق علی خان، فخر امام، الٰہی بخش سومرو، حامد ناصر چٹھہ، چوہدری امیر حسین اور یوسف رضا گیلانی بھی اِن مراعات سے مستفید ہوسکیں گے۔اس عرصہ اقتدار کے دوران انتہائی مقروض قوم کے شاہ خرچ حکمرانوں کی شاہ خرچیاں بھی عروج پر رہیں، حکومت نے صرف 6 ماہ میں 20 کھرب روپے قرض لے کر پھونک ڈالے اور اپنی آمدنی سے 6 کھرب 25 ارب روپے زیادہ خرچ کر دیئے، سبکدوش ہونے والی

پیپلزپارٹی کی حکومت کے دوریں ملک کا بجٹ خسارہ 13 اعشاریہ 69 کھرب کی بلند ترین سطح پر پہنچ گیا، وزارت خزانہ کی دستاویزات کے مطابق صرف 8 ماہ میں 880 ارب روپے تک مالی خسارہ جا پہنچا جو جون تک 14 کھرب ہو سکتا ہے۔ارکان اسمبلی کی طرف سے قومی وسائل کی لوٹ مار کا ایک شرمناک پہلو یہ بھی سامنے آیا کہ 2008ء کے الیکشن میں خالی ہاتھ آنے والے وزراء جاتے وقت سرکاری رہائش گاہوں سے اپنے ساتھ قیمتی فرنیچر، کراکری، قالین، ڈیکوریشن کا سامان، پنکھے، فریج، جنریٹر حتیٰ کہ انرجی سیور تک ٹرکوں میں لاد کے لے گئے۔اِس کے باوجود وزیر اعظم راجہ پرویز اشرف نے کابینہ سے خطاب کرتے ہوئے جمہوری حکومت کی مدت کی تکمیل پر مبارکباد پیش کی اور کہا کہ یہ پاکستان کا ایک تاریخ ساز دن ہے، اُن کا دعویٰ تھا حکومت نے کئی کامیابیاں حاصل کیں اور وہ اپنی کوششوں میں بڑی حد تک کامیاب رہے، مگر حکومتی کامیابی اور کارکردگی کا جیتا جاگتا نمونہ یہ تھا کہ جس وقت وزیر اعظم صاحب قوم سے اپنا پہلا اور آخری الوداعی خطاب فرمارہے تھے بجلی کی لوڈشیڈنگ کے باعث ملک کی آدھی سے زیادہ آبادی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ پیپلزپارٹی کا پانچ سالہ دورحکومت میں خامیوں کا پلڑا بہت بھاری نظر آتا ہے،اس پورے دور میں ملکی معیشت میں ریکارڈ تنزلی آئی، قومی قرضے جو پیپلز پارٹی کے اقتدار میں آنے سے پہلے تقریباً چھ ہزار ارب

روپے تھے وہ بڑھ کر تیرہ ہزار ارب روپے تک جا پہنچے ہیں، پیٹرول، ڈیزل، سی این جی اور عام استعمال کی غذائی اشیاء کی قیمتوں میں سینکڑوں گنا اضافہ ہو، افراط زر کی شرح بڑھی، قومی پیداوار میں میں کمی واقعے ہوئی، پاکستان روپے کی قدر شرمناک حد تک گر گئی، مالیاتی انتظام انتہائی خراب رہا، بلکہ فی الحقیقت قومی خزانے اور حکومتی اداروں کو بے دردی سے لوٹا گیا، کرپشن اور بدترین گورننس نے ملکی معیشت کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا، پانچ سالوں کے دوران پانچ وزرائے خزانہ، پانچ سیکرٹری خزانہ اور سٹیٹ بینک کے چار گورنرز تبدیل کیے گئے، قومی اداروں میں قوائد و ضوابط کے خلاف بھرتی اور ترقیاں دے کر اپنے من پسند افراد کو اہم عہدوں پر لگا گیا، جس سے ان اداروں کی بنیادیں ہل کر رہ گئیں، پی آئی اے، ریلوے، سٹیل ملزان کی زندہ مثالیں ہیں، توانائی کے بحران نے عوام کی کمر توڑ کر رکھ دی، عام آدمی کی عزت نفس کو بھی مجروح کیا گیا اور حیرت انگیز بات یہ کہ اپنی کارکردگی پر اترانے والی حکومت نے پارلیمنٹ کو اپنی پانچ سالہ کارکردگی کے بارے میں اعتماد میں لینے یا اس حوالے سے قوم کو آگاہ کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں اور وزیر اعظم نے اپنی حکومت کی پانچ سالہ کارکردگی پر مفصل خطاب سے گریز کیا۔ ملکی تاریخ میں پہلی بار صدر اور وزیر اعظم اور کابینہ کے ارکان پر کھل کر کرپشن کے الزامات لگے، پیپلزپارٹی کے ممبران اور حکومتی ارکان نے قومی خزانے کے اربوں روپے کو غیر قانونی طور پر اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا اور حکومت

نے قومی تقاضے پورے کرنے کی بجائے ذاتی اور پارٹی مفادات کو مقدم جانا، اس عرصے میں حکومت نے امن و امان اور عوام کی جان و مال کے تحفظ کو ترجیح نہ دی، دہشت گردی، ٹارگٹ کلنگ اور انتہا پسندی کو فروغ ملا، عوام کی جان ومال، عزت وآبرو بھی داؤ پر لگی رہی، مزید طرفہ تماشا یہ کہ موجودہ حکومت کے دور میں 300 فیصد سے زائد مہنگائی کا شکار رہنے والی عوام کیلئے جمہوریت کے آخری 48 گھنٹے انتہائی بھاری رہے اور اپنی مدت ختم کرنے سے چند گھنٹے قبل اسمبلی اپنے لئے انتہائی بھاری مراعات کی ایسی حالت میں متفقہ طور پر منظور دیتی رہی، جبکہ بیرونی قرضوں کے نتیجے میں ہر پاکستانی 88 ہزار روپے سے زائد کا مقروض اور حکومتی اقدامات کے نتیجے میں 1 کروڑ 90 لاکھ پاکستانی بیروزگار ہیں۔

اُدھر خیبر پختونخوا کی حکومت نے اپنے آخری دن انتہائی انوکھا فیصلہ کرتے ہوئے ملاکنڈ تعلیمی وبورڈ کے کنٹرولر کو ہٹا کر باچا خان اسکول کے مبینہ سفارشی پرنسپل کو یہ نشست سونپ دی، مرکز میں نئے منتخب کردہ وزیر خزانہ سلیم مانڈوی والا نے خصوصی چابکدستی دکھائی اور اپنی وزارت کے 20 روز میں 5 ارب روپے کے معاشی فیصلے کر ڈالے، جس میں 16 ارب روپے کی متنازعہ ٹیکس ایمنسٹی اسکیم بھی ہے، یوں حکومت نے اسمگل شدہ گاڑیوں کی رجسٹریشن کی اجازت دے کر قانونی طریقے سے کاروبار کرنے والوں کے معاشی قتل فیصلہ کیا، یہ قوم کی بدقسمتی ہی تھی کہ امن وامان کے حوالے سے موجودہ حکومت کا دور ایک ڈراونا خواب ہی

رہا، دستیاب اعداد و شمار کے مطابق 9900 خواتین و بچوں سمیت 50 ہزار سے زائد شہری دہشت گردی کی بھینٹ چڑھے اور شہری و دیہی علاقوں میں عبادت گاہوں سمیت 15 ہزار گھر، اسکولز، مساجد و امام بارگاہیں اور دکانیں بم دھماکوں کے نتیجے میں تباہ ہوئیں، پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں قبائلی علاقوں میں 230 ڈرونز حملے کئے گئے، جن میں آزاد ذرائع کے مطابق 12 ہزار سے زائد لوگ مارے گئے، اس دور حکومت میں سلالہ چیک پوسٹ پر حملہ بھی پاکستان کی تاریخ کا ایک سیاہ ترین باب ہے، ایبٹ آباد آپریشن، جی ایچ کیو، مہران بیس پر حملہ اور آئے روز خود کش دھماکوں کی وجہ سے ملکی سالمیت پر کاری ضربیں لگیں، مگر حکومت کی طرف سے کوئی بھی سنجیدہ اقدام دیکھنے میں نہ آیا، اور ریمنڈ ڈیوس کا پاکستان سے فرار بھی پیپلز پارٹی حکومت کا ایک کارنامہ ہے جس سے عالمی سطح پر پاکستان کے امیج کو کاری ضرب لگی، خارجہ پالیسی میں بھی پیپلز پارٹی کو سخت ناکامی کا سامنا رہا اور امریکہ سمیت بھارتی جارحیت کے خلاف کوئی بھی موثر حکمت عملی وضع نہ کی جا سکی۔

حقیقت یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کا یہ دور حکومت پاکستان کی تاریخ کا سیاہ ترین دور حکومت تھا، جس میں مہنگائی میں ہوشربا اضافہ ہوا، جس میں غریب، غریب تر ہو گئے اور امیر امیر تر ہوتے چلے گئے، ایک طرف غریب مرتے رہے تو دوسری جانب وزیر تیس تیس گاڑیوں کے کارواں کے ساتھ پروٹوکول کے مزے لیتے

رہے، اس دور حکومت میں کرپشن ، لوٹ مار اور اقرباپروری کی داستانیاں کسی سے
ڈھکی چھپی نہیں، سینکڑوں ایسے سکینڈل ہیں جن میں اربوں روپوں کی کرپشن کی گئی اور
ملکی خزانے کو زبردست نقصان پہنچایا گیا، دنیا بھر میں پاکستان کی جگ ہنسائی ہوئی،
معیشت تباہی کے دھانے پر پہنچی، حیرت کی بات یہ ہے کہ گزشتہ 5 سال میں جو لوٹ
مار کی گئی اس پر حکومت اور ارباب اقتدار زرہ برابر بھی شرمندہ نہیں بلکہ پر عزم ہیں
کہ عوام انہیں دوبارہ اقتدار کے سنگھاسن پر بیٹھائیں گے۔

حریصِ منصب حریصِ زر تھے
فروغِ شر تھے جو مقتدر تھے

لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا عوام اس بار بھی ان لٹیروں کو پہچاننے میں غلطی کریں، یا
پھر سیاسی شعور کا مظاہرہ کرتے ہوئے ووٹ کے ذریعے تبدیلی کو یقینی بنائیں گے ،یقینا
آنے والے انتخابات عوام کی اِسی بالغ نظری کا امتحان ہیں، اس مرتبہ عوام نے اگر اپنے
ووٹ کے حق کو ضائع کر دیا تو پھر ایسی ہی بے فیض وبے عمل قیادتیں ہی ملک پر مسلط
ہوں گی جس کے نتائج اِس سے بہت زیادہ سنگین ہو سکتے ہیں، اگر عوام کو اپنی تقدیر بدلنی
ہے تو خود کو بھی بدلنا ہوگا اور اپنے ووٹ کے درست استعمال سے ایک مخلص ، صالح اور
ایماندار قیادت

کو برسراقتدار لانا ہوگا، سوچیئے اور درست فیصلہ کیجئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کا غلط فیصلہ ایک بار پھر کسی ایسی ہی پارلیمینٹ کو وجود میں لانے کا سبب بن جائے جسے ملک وقوم کے پانچ سال ضائع کرنے کا ذرہ برابر بھی افسوس نہ ہو۔

خدا کرے کہ مری ارض پاک پر اترے
وہ فصل گل جسے اندیشہ زوال نہ ہو

صاف وشفاف الیکشن اصل امتحان۔۔۔۔۔

نگران حکومت اور الیکشن کمیشن کا اصل امتحان۔۔۔۔۔

چوبیس مارچ 2013ء کو چیف الیکشن کمشنر نے جسٹس ریٹائرڈ میر ہزار خان کھوسو کو ملک کا نگران وزیراعظم مقرر کر دیا، مسلم لیگ نواز یہ سمجھ رہی تھی کہ یہ معاملہ الیکشن کمیشن میں جانے کی صورت میں جسٹس ریٹائرڈ ناصر اسلم زاہد کے حق میں فیصلہ آئے گا، جبکہ پیپلز پارٹی کا خیال تھا کہ ڈاکٹر عشرت حسین کو منتخب کیا جائے گا، شاید یہی وجہ تھی کہ دونوں جماعتوں نے یہ معاملہ پارلیمانی کمیٹی کی سطح پر طے نہیں کیا، مگر الیکشن کمیشن نے غیر متوقع طور پر میر ہزار خان کھوسو کو نگران وزیر اعظم منتخب کر کے حکومت اور اپوزیشن دونوں کو سرپرائز دے دیا اور خوش اسلوبی سے پہلے معرکے میں کامیابی حاصل کر لی، پاکستان کے موجودہ نگران وزیر اعظم میر ہزار خان کھوسو کا تعلق بلوچستان کے ضلع جعفر آباد سے ہے جو سندھ اور بلوچستان کے سنگم پر واقع ہے، اُمید ہے کہ اُن کے انتخاب سے شورش زدہ بلوچستان کے احساس محرومی میں کمی واقع ہو گی، میر ہزار خان کھوسو 3 ستمبر 1929ء کو ضلع جعفر آباد کے گاؤں اعظم خان میں پیدا ہوئے، انہوں نے 1954ء میں سندھ یونیورسٹی سے گریجویشن کے

بعد 1956ء میں کراچی یونیورسٹی سے قانون کی سند حاصل کی، میر ہزار خان کھوسو 20 جون 1977ء کو بھٹو حکومت کے آخری ایام میں بلوچستان ہائی کورٹ کے عارضی جج بنے، بعد میں ضیاء الحق نے انہیں مستقل کر دیا، وہ بطور چیف جسٹس 29 ستمبر 1991ء کو ریٹائر ہوئے، ریٹائرمنٹ کے بعد میر ہزار خان کھوسو کو وفاقی شرعی عدالت کا جج بنایا گیا اور 17 نومبر 1992ء کو میاں نواز شریف کے دور میں میر ہزار خان کھوسو وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس بنے۔

ٹھنڈے اور دھیمے مزاج کے میر ہزار خان کھوسو کا خاندان پیپلز پارٹی سے تعلق رکھتا ہے، لیکن مقامی سیاست میں میر ہزار خان کھوسو ہمیشہ ظہور خان کھوسو کے حامی رہے ہیں، جو پہلے تو جمہوری وطن پارٹی سے وابستہ تھے مگر اب مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر انتخاب لڑ رہے ہیں، شاید یہی وجہ ہے کہ مسلم لیگ (ن) نے میر ہزار خان کھوسو کی نامزدگی پر اعتراض نہیں کیا اور کھلے دل سے الیکشن کمیشن کے اِس فیصلے کو قبول کر لیا، 84 سالہ نگراں وزیر اعظم میر ہزار خان کھوسو سندھی، اردو، بلوچی، انگریزی روانی سے بولتے ہیں، اُنھوں نے خود کو ہمیشہ سیاست سے دور رکھا، وہ ایک تجربہ کار اور دیانت دار شخصیت کے مالک ہیں ،اِس وقت نگران حکومت کیلئے سب سے بڑا چیلنج پرامن اور غیر جانبدارانہ الیکشن کا انعقاد ہے اور آئینی طور پر نگران حکومت کی سب سے بڑی ذمہ داری غیر جانبدارانہ اور شفاف انتخابات کرانے میں الیکشن کمیشن کی مدد اور اہم

ریاستی امورانجام دینا ہے، یہ درست ہے کہ وفاقی کابینہ کی تشکیل نگران وزیراعظم میر ہزار خان کھوسو کی اپنی صوابدید ہے، مگروہ کسی ایسے شخص کو وزیریا مشیر نہیں بنا سکیں گے جو کسی سیاسی جماعت سے تعلق رکھتا ہویا انتخابات میں قومی یا صوبائی اسمبلی کاامیدوار ہو۔انہیں وفاقی کابینہ کے انتخاب میں آئین کے آرٹیکل 62-63 کا بھی خیال رکھنا ہوگا، جس کا مطالبہ ملک کی مختلف سیاسی جماعتوں کی جانب سے کیا جارہا ہے۔
گوپاکستان میں آزاد اور بااختیار الیکشن کمیشن کے حوالے سے کوئی قابل فخر ریکارڈ دستیاب نہیں، ماضی میں فوج ہی نگران وزرائے اعظم لاتی رہی، ملک معراج خالد، معین قریشی ، سردار بلخ شیر مزاری اور محمد میاں سومرو تک نگران حکومتوں کے اقدامات کے حوالے سے یہی تاثر ملتاہے کہ اُس کے پیچھے فوجی ایجنڈہ موجود رہا، یہی وجہ تھی کہ الیکشن کے دوران مخصوص سیاسی پارٹیوں کی کردار کشی کیلئے پرانے مقدمات کو زندہ کرنا نگران حکومتوں کا دستور رہا، اسی طرح ماضی میں نگران حکومتوں کی اقتصادی اصلاحات نے پاکستان کے سیاسی افق پر بہت ہلچل مچائی ، کرپشن ،اقتصادی بحران، سیاستدانوں کاقرضے لے کرواپس نہ کرنا، زرعی ٹیکس کا نفاذ یہ سب ایسے معاملات ہیں جوہمیشہ عام انتخابات کے موقع پر موضوع بحث بنے، عموماً کچھ حلقوں کی جانب سے یہ مطالبہ بھی کیا جاتا رہاکہ قوم کا اربوں روپیہ ہڑپ کرنیوالوں کوالیکشن میں حصہ لینے کی اجازت نہ

دی جائے۔ماضی میں نگران حکومتوں نے کرپشن کے خاتمے اور قرضوں کی وصولی کیلئے
کچھ اقدامات کیے، لیکن یہ اقدامات اور قانون سازی اِن کرپٹ افراد کیلئے ریت کی دیوار
ثابت ہوئی اور ملک وقوم کا اربوں روپیہ ہڑپ کرنیوالے اسمبلیوں میں پہنچنے میں
کامیاب ہوہی گئے۔اِسی طرح معین قریشی کے دور میں ڈیفالٹرز افراد کی ایک لسٹ بھی
اخبارات میں شائع کرائی گئی مگر معاملہ جوں کا توں ہی رہااور انتخاب سے پہلے احتساب کا
نعرہ ایکدوسرے کا راستہ روکنے کیلئے استعمال کیا گیا۔

یہاں یہ اَمر دلچسپی سے خالی نہیں کہ نگران حکومتوں نے انتخابی اصلاحات کیلئے کچھ
تجربے بھی کئے، جن میں 1997ء کے الیکشن سے قبل انتخابی اصلاحات کے تحت اقلیتوں
کو دوہرے ووٹ کا حق دیا جانا بھی شامل ہے۔اِن انتخابی اصلاحات کے تحت الیکشن میں
شناختی کارڈ کی پابندی کا بھی خاتمہ کردیاگیا، ضروری محسوس ہونے پر کوئی بھی دوسری
شناخت دیکھائی جاسکتی تھی۔اِس مخلوط طریقہ انتخاب پر کڑی تنقید ہوئی، جے یو پی،جماعت
اسلامی اور مسلم لیگ (ن) سمیت کئی دینی جماعتوں نے جداگانہ طریقہ انتخاب کی شدید
مخالفت کی اور اسے پاکستان کو سیکولر اسٹیٹ بنانے کا حربہ قرار دیا، اُس وقت جمعیت
علماءپاکستان کے سربرہ مولانا شاہ احمد نورانی نے حکومت سے یہ مطالبہ کیا تھاکہ ملک
میں متناسب نمائندگی کا طریقہ انتخاب رائج کیا جائے اور ووٹوں کے تناسب سے سیٹیں

مختص کی جائیں، خیال رہے کہ جداگانہ طریقہ انتخاب ضیاء الحق نے 1985ء کے
غیر جماعت انتخابات میں بھی متعارف کروایا تھا۔اُن کے نزدیک اِن انتخابی اصلاحات
کا مقصد اقلیتوں کے احساس محرومی ختم کو کم کرنا اور انہیں قومی دھارے میں لانا
تھا۔لیکن دینی جماعتوں کی مخالفت کی وجہ سے بعد میں یہ مخلوط طریقہ انتخاب ختم
کردیاگیا۔مگر جنرل مشرف نے 2002ء کے الیکشن میں بحال کرکے اقلیتوں کو ایک بار
پھر دوہرے ووٹ کا حق دے دیا۔یوں 2007ء کے الیکشن بھی اسی مخلوط طریقہ انتخاب
کے مطابق ہوئے اور مئی 2013ء کے الیکشن میں بھی یہی طریقہ انتخاب رائج رہے گا۔
یہ درست ہے کہ اِس وقت موجودہ الیکشن کمیشن کسی حد تک ایک آزاد ادارہ ہے۔مگر
ابھی اتنا بااختیار نہیں ہے جتنا کہ بھارت اور دیگر مغربی ممالک میں ہے۔اِن ممالک میں
نگران حکومت کی ضرورت اِس لیے محسوس نہیں ہوتی کہ ریاست کے دوسرے ادارے
بالخصوص الیکشن کرانے والے ادارے آزاد اور بااختیار ہوتے ہیں۔اگر امریکہ میں کوئی
امیدوار قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے تو پہلے تو الیکشن کمیشن اُس کی گرفت کرتا ہے اُس
کے بعد عدالتیں گھیرا تنگ کردیتی ہیں۔ بھارت میں تو الیکشن کمیشن اتنا بااختیار ہے کہ
کلیدی عہدوں پر لوگوں کے تبادلے کرسکتا ہے۔ کسی بھی ادارے کو مخصوص حکم یا
طرزِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کرسکتا ہے۔وہ پارٹیوں اور امیدواروں کے اخراجات کی
مسلسل جانچ پڑتال

کرتا ہے اور خلاف ورزی کی صورت میں اُسے سزا بھی دیتا ہے۔اِن حقائق مد نظر رکھتے ہوئے ضرورت اِس اَمر کی ہے کہ الیکشن کمیشن کو دیگر ممالک کی طرح ایک مکمل آزاد اور بااختیار ادارہ بنایا جائے۔اگر ایسا ہوگیا تو یہ عمل پاکستانی جمہوریت کے ارتقاء کیلئے ایک بڑا اور اہم سنگ میل ثابت ہوسکتا ہے۔

مگر افسوس جب سے الیکشن کمیشن کو کسی حد تک ایک آزاد ادارہ بنا دیا گیا ہے، نگراں حکومتوں کی تشکیل میں ہر سیاسی جماعت کی یہ خواہش رہی کہ اُس کی پسند کا نگراں سیٹ اپ قائم ہو۔سیاسی جماعتوں کا یہ عمل اِس بات کا عکاس ہے کہ دونوں بڑی جماعتیں عوامی مقبولیت اور ووٹ حاصل کرنے کی اہلیت رکھنے کے باوجود حکومتی سرپرستی سے محروم ہونا پسند نہیں کرتیں اور اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرنا چاہتی ہیں۔اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا الیکشن کمیشن سپریم کورٹ کی طرح ایک آزاد اور بااختیار ادارے کا کردار ادا کرسکتا ہے ؟اور نگران حکومت اُسے یہ کردار ادا کرنے میں کس حد تک دو معاونت فراہم کرتی ہے۔ابھی بھی بعض حلقوں کی جانب سے عام انتخابات کے انعقاد پر شکوک وشبہات کا اظہار کرتے ہوئے کہا جارہا ہے کہ الیکشن ملتوی ہوجائیں گے اور موجودہ نگران سیٹ اپ دو سال تک چلے گا۔پہلے احتساب ہوگا پھر انتخاب۔

خود نگراں وزیر اعظم میر ہزار خان کھوسو نے حلف اٹھانے کے بعد اپنے خطاب میں

کہا تھا کہ اگر انتخابات ملتوی ہوئے تو وہ اپنے منصب سے مستعفی ہو جائیں گے،اس کا مطلب یہ ہے کہ نگراں وزیراعظم کے تقرر اور انتخابات کے نظام الاوقات کا اعلان ہونے کے باوجود انتخابات کے انعقاد کے یقینی ہونے کے بارے میں شکوک و شبہات ختم نہیں ہونے پائے اور،بروقت انعقاد کے ساتھ منصفانہ، شفاف اور آزادانہ انتخابات کا سوال اپنی جگہ بدستور موجود ہے، جبکہ نگراں وزیراعظم کے حوالے سے بھی کچھ جماعتوں کے تحفظات ہیں،اسی طرح سندھ کے نگراں وزیراعلیٰ پر تو حزب اختلاف کی تمام جماعتوں نے تحفظات کا اظہار کیا ہے، گو پیپلز پارٹی وفاق، سندھ اور پنجاب میں اپنی مرضی کی نگراں حکومتیں قائم کرنے میں کامیاب ہوچکی ہے جو نگراں حکومتوں کے غیر جانبداری کے تصور کو مشکوک کررہی ہے،یہی وجہ تھی کہ ماضی میں جانبدار عبوری حکومتوں کے تحت شفاف اور آزادانہ انتخابات پر اعتبار نہیں کیا گیا اور آئینی ترمیم کے ذریعے غیر جانبدار نگراں حکومت کا تصور متعارف کرایا گیا،چنانچہ 18 ویں آئینی ترمیم کے ذریعے ایک نیا تجربہ سامنے آیا ہے،الہٰذا الیکشن کمیشن اِس حوالے سے اپنا آئینی کردار ادا نہ کرے اور نگراں حکومت اپنی غیر جانبداری ثابت کرتے ہوئے صاف، شفاف اور غیر جانبدارانہ انتخابات کے انعقاد کو یقینی بنا کر اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کو منتقل کرے،یہی دونوں کا اصل امتحان و آزمائش ہے۔

پاکستان کا مطلب کیا۔۔۔۔

یہ 1941ء کی بات ہے جب قائدِ اعظم محمد علی جناح مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (منعقدہ مدراس) میں شرکت کرکے واپس جاتے ہوئے ایک قصبے سے گزر رہے تھے ، قصبے کے لوگ اپنے ہر دل عزیز قائد کے استقبال کیلئے سڑک کی دونوں جانب جمع تھے اور والہانہ انداز میں "پاکستان زندہ باد، قائدِ اعظم زندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے اِس استقبالی ہجوم میں ایک آٹھ نو برس کا بچہ بھی شامل تھا، جس کے جسم پر صرف ایک لنگی تھی ، فرطِ مسرت اور جوش وجذبات سے اُس کا چہرہ تمتا رہا تھا اور وہ بھی لوگوں کے ساتھ زور زور سے "پاکستان زندہ باد، پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگا رہا تھا، قائدِ اعظم محمد علی جناح نے بچے کے جوش وجذبے کو محسوس کرتے ہوئے گاڑی روکنے کا حکم دیا اور بچے کو اپنے پاس بلوایا، بچہ یہ صورتحال دیکھ کر گھبرا گیا، قائدِ اعظم نے بچے کو پیار کیا اور اُسے حوصلہ دیا، جب بچے کی گھبراہٹ میں کمی واقع ہوئی تو آپ نے بچے سے پوچھا "تم پاکستان کا مطلب کیا سمجھتے ہو؟ بچے نے قائدِ اعظم کو جواب دیتے ہوئے کہا "پاکستان کا مطلب تو آپ بہتر جانتے ہیں، ہم تو صرف اتنا سمجھتے ہیں کہ جہاں مسلمانوں کی حکومت وہ "پاکستان" اور جہاں ہندوؤں کی حکومت وہ "ہندوستان"، اُس وقت قائدِ اعظم کے ساتھ صحافیوں کا بھی ایک قافلہ سفر کر رہا تھا، آپ نے فوراً صحافیوں کو مخاطب

کرتے ہوئے فرمایا "جاؤ مسٹر گاندھی (جو 23 مارچ 1940ء کو لاہور میں قرار داد پاکستان کی منظوری کے بعد سے مسلسل کہہ رہے تھے کہ وہ پاکستان کا مطلب نہیں سمجھ سکے) کو بتادو کہ مسلمانوں کا آٹھ برس کا بچہ بھی پاکستان کا مطلب سمجھتا ہے ،اگر وہ اب بھی نہیں سمجھے تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سمجھتے خوب ہیں، لیکن اعتراف کرنا نہیں چاہتے۔"

حقیقت یہ ہے کہ متحدہ ہندوستان کا ایک دیہاتی بچہ ہی نہیں، پوری مسلمان اُمت پاکستان کا مطلب بہت اچھی طرح سمجھتی تھی، تحریک پاکستان نے برصغیر کے بچے بچے کے دل و دماغ میں ایک ہی بات نقش کردی تھی کہ ہم ایک الگ قوم ہیں، ایک ایسی قوم جس کا رہن سہن، تہذیب و تمدن، معاشی اور معاشرتی ضروریات عبادات اور عبادت گاہیں غرضیکہ زندگی کے تمام معاملات نہ صرف ہندوو ںں سے الگ ہیں، بلکہ اُن کے رسم و رواج اور روایات کے بھی یکسر خلاف ہیں، یہی وجہ تھی کہ برصغیر کے مسلمانوں کی زبان پر صرف ایک ہی نعرہ تھا "پاکستان کا مطلب کیا.... لاالہ الا اللہ، قانون ریاست کیا ہوگا.... محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"

گو 1857ء کی جنگ آزادی سے لے کر تخلیق پاکستان تک مسلمانان برصغیر نے کئی ادوار دیکھے تھے، مگر 14 اگست 1947ء کا دن اُن کے تصورات و خوابوں کی تعبیر کا پیغام لے کر آیا، قائد اعظم محمد علی جناح نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا تھا

کہ "Pakistan is going to be a laboratory for experimentry
Islamic values"" قائداعظم کے "پاکستان اسلامی اقدار کی تجربہ گاہ بننے والا ہے۔"
نزدیک پاکستان کا یہ تصور دراصل وہی "نظریہ اسلام" تھا، جس کی بنیاد اور اساس چودہ
سو سال پہلے ریاست مدینہ قائم کرکے پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی تھی۔
در حقیقت قیام پاکستان ایک ایسی آزادو خود مختار اسلامی ریاست کے حصول کی جدوجہد
تھی، جس کے چار اہم بنیادی اصول و محرکات 23مارچ 1940ء کی قرار داد پاکستان نے
متعین کرتے ہوئے مستقبل کی اسلامی حکومت کے نظام کو واضح کردیا تھا، جس کا سب سے
پہلا اہم ترین محرک اسلامی حکومت کا قیام تھا،ایک ایسی اسلامی حکومت جہاں اسلام ہر
شعبہ زندگی میں قوت محرکہ کے طور پر نافذ و غالب ہو، جہاں ظلم کی بیخ کنی ہو اور عدل
کی حکمرانی کا قانون بلاامتیاز رنگ و نسل جاری و ساری ہو،اور جہاں شورائی جمہوریت کا
نظام نافذ ہو اور ایوان نمائندگان کا چناؤ اُن کی صلاحیت کارکردگی اور تقویٰ کی بنیاد
پر کیا جائے، قرار داد پاکستان کی دوسری بنیادی اساس ایسی اسلامی قومیت تھی، جس کی
شناخت نہ وطن تھی اور نہ ہی رنگ و نسل اور زبان و علاقہ ،بقول اقبال "بازو تیرا
توحید کی قوت سے قوی ہے۔اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے۔"

یہی دینی وحدت رنگ و نسل، زبان و علاقہ کے تفرقات سے بالاتر ہو کر مسلمانوں کو متحد رکھنے کی سب سے بڑی وجہ تھی۔ قرار داد پاکستان کا تیسرا اہم محرک اسلام کا وہ تابناک سیاسی، سماجی اور ثقافتی نظام تھا، جو چودہ سو سال سے انسانیت کے دامن میں فیوض و برکات کے ثمرات ڈال رہا تھا۔ ایسا شاندار اور تابناک تاریخی ورثہ رکھنے والی قوم کی شناخت ناچ گانا، بھنگڑا اور غیر اسلامی رسومات نہیں ہوا کرتی اور نہ ہی ایسی قوم کی ہیر و طبلے کی تھاپ پر ناچنے گانے والے ہو سکتے ہیں، ہماری تاریخ تو خالد بن ولید، طارق بن زیاد، سلطان صلاح الدین ایوبی اور شیر میسور ٹیپو سلطان جیسے ہزاروں سپوتوں سے بھری ہوئی ہے،

ایسا شاندار اور تابناک تاریخی ورثہ رکھنے والی قوم کی شناخت ناچ گانا، بھنگڑا اور غیر اسلامی رسومات نہیں ہوا کرتی اور نہ ہی ایسی قوم کی ہیر و طبلے کی تھاپ پر ناچنے گانے والے ہو سکتے ہیں، ہماری تاریخ تو خالد بن ولید، طارق بن زیاد، سلطان صلاح الدین ایوبی اور شیر میسور ٹیپو سلطان جیسے ہزاروں سپوتوں سے بھری ہوئی ہے ہمارا سرمایہ افتخار وہ اسوہ حسنہ ہے جس نے ہمیشہ تاریک ظلمتوں میں نور کا اجالا پھیلایا۔ قرار داد پاکستان کا چوتھا اور اہم محرک پُرامن بقائے باہمی کا ایسا ماحول تھا جس میں نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم بھی اپنے سیاسی، سماجی اور معاشرتی اقدار کے مطابق آزاد و خود مختار زندگی بسر کر سکیں، ہر طرف امن و سکون کا دور دورہ ہو اور ہر کسی

کی جان و مال اور عزت وآبرو محفوظ ہو۔

مگر آج بد قسمتی سے ہمیں اپنی قومی زندگی میں یہ چاروں محرکات دور دور تک نظر نہیں آتے ،ہر طرف لوٹ مار،افراتفری اور سیاسی انارکی ہے،ملک و قوم کے درد سے عاری عناصر پاکستان کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں اور سب سے بڑی ستم ظریفی یہ کہ جس پاکستان کیلئے مسلمانان برصغیر نے اپنی جان ومال اور عزت وآبرو کی قربانی دی،آج اُسی پاکستان کے وجود کو یہ کہہ کر متنازعہ بنایا جارہا ہے کہ قیام پاکستان کا جذبہ محرکہ ایک اسلامی فلاحی مملکت کا قیام نہیں بلکہ ایک ویسٹرن لبرل اسٹیٹ تھا، قائد اعظم پاکستان کو ایک سیکولر اسٹیٹ بنانا چاہتے تھے،یوں نام نہاد دانشوراور بیرونی چندے پر چلنے والی این،جی اوز ونشریاتی ادارے پاکستان کے معنی و مطلب کو بدلنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کررہے،ایک معروف پرائیویٹ چینل کی جانب سے تو باقاعدہ مہم کے ذریعے پاکستان کا مطلب یوں بیان جارہا ہے کہ "پاکستان کا مطلب

۔پڑھنے لکھنے کے A,B,C,D.... کیا ....ا،ب،پ،ت۔پاکستان کا مطلب کیا

سوا،پاکستان کا مطلب کیا۔" اِس طرح کے اشتہارات کے ذریعے اسلام اورپاکستان دشمن عناصر ہماری نظریاتی اساس کو بدلنے کی ایک منظم سازش کر رہے ہیں،کچھ لوگ تو ببانگ دہل یہ ثابت کر رہے ہیں کہ پاکستان کا وجود ایک تاریخی غلطی ہے،لہٰذاان حالات میں ضرورت اِس اَمر کی ہے کہ اہل علم و دانش اور محبان

پاکستان دشمن کی اِس ناپاک سازش کو ناکام بنانے کیلئے اپنا تعمیری کردار ادا کریں اور اپنی نوجوان بالخصوص آنے والی نسلوں کو قیام پاکستان اصل غرض وغایت سے آگاہ کرنے کیلئے منظم جدوجہد کریں۔

المقصود کا زیر نظر مجلّہ "پاکستان کا مطلب کیا.....؟" دراصل اسی کوشش کی ایک بہترین کڑی ہے، جسے نوجوان محقق، اسکالر اور عالم دین مفتی عمیر محمود صدیقی نے مرتب کیا ہے اور تحفظ نظریہ پاکستان کی اِس نظریاتی کشمکش میں ماقبل و مابعد تحریک پاکستان کے تاریخی خزانے سے ناقابل تردید شواہد و حقائق سامنے لاکر متذکرہ بالا سوچ و فکر کے حامل افراد کے منفی پروپیگنڈے کے تاروپود بکھیر دیئے ہیں، عمیر محمود صدیقی صاحب نے جدید تحقیقی اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے دیانت کے ساتھ تحریک پاکستان کے بہت سے مخفی گوشوں کو اجاگر کیا ہے اور بتایا ہے کہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح، علامہ اقبال، لیاقت علی خان، مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح، سردار عبدالرب نشتر، مولانا نعیم الدین مرادآبادی، سید محمد محدث کچھوچھوی، علامہ عبدالعلیم صدیقی، مولانا حسرت موہانی، سید امین الحسنات پیر آف مانکی شریف، امیر ملت جماعت علی شاہ صاحب، علامہ عبدالحامد بدایونی، مولانا عبدالستار نیازی اور دیگر اکابرین ملت کیسا پاکستان چاہتے تھے اور کیوں چاہتے تھے۔

ہمارا ماننا ہے کہ موجودہ نظریاتی کشمکش میں یہ تاریخی دستاویز ایسا قیمتی و علمی سرمایہ ہے جس میں صاحب مولف نے قیام پاکستان کا پس منظر و پیش منظر، مقاصد و ضرورت اور قائدین تحریک پاکستان کے قول و فعل اور کردار و عمل کی روشنی سے واضح کیا ہے کہ قیام پاکستان کا مطلب کرّہ ارض پر ایک ایسی اسلامی مملکت کا قیام ہے جو مدینہ ثانی ہو، جہاں مسلمان اپنی زندگی قرآن و سنت کے مطابق گزار کرسکیں۔ قائداعظم نے قیام پاکستان کے مقصد کو واضح کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "پاکستان کا مطلب محض آزادی نہیں بلکہ اسلامک آئیڈیالوجی یعنی اسلامی نظریہ ہے، جس کی حفاظت کرنی ہے، جو ہم تک ایک قیمتی اثاثے کے طور پر پہنچی ہے، جس کے بارے میں ہم امید کرتے ہیں کہ دوسرے ہمارے ساتھ اِس میں حصہ دار بنیں گے۔" چنانچہ قائداعظم کے اِس قول کو آج عملی جامہ پہنانے کیلئے ضرورت اِس اَمر کی ہے کہ اِس کتاب کو پاکستان کے تمام دفاعی، آئینی و قانونی، تعلیمی اور پالیسی ساز اداروں کے ساتھ ساتھ ریڈیو ٹی وی اینکرز، سیاستدانوں، صحافیوں، علماو مشائخ عظام، اساتذہ و پروفیسرز تک پہنچایا جائے، تاکہ نظریہ پاکستان کے خلاف اِس ناپاک جسارت کا منہ توڑ جواب دیا جاسکے اور اُس پاکستان بنانے کی عملی جدوجہد میں حصہ لیا جائے جس کا خواب علامہ اقبال نے دیکھا، جس کیلئے قائداعظم نے تحریک برپا کی اور مسلمانانِ برصغیر نے جسے قائم کرنے کیلئے اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کردیا۔

نجات دہندہ کا انتخاب قومی تدبر کا امتحان۔۔۔۔۔

قائدِ اعظم جیسا تو ہو۔۔۔۔۔

جولائی 1942 میں دوسری جنگ عظیم کے دوران جب برطانوی افواج نے " الامین "کے مقام پر نازی فوج کی پیش قدمی کو روک دیا، تواِس کامیابی کے باوجود برطانوی وزیرِ اعظم چرچل نے مشرق وسطیٰ میں اپنے عسکری کمانڈروں کو تبدیل کر دیا اور جنرل سر ہیرالڈ ایلیگزانڈر کو مشرق وسطیٰ میں برطانوی افواج کا کمانڈر انچیف جبکہ لیفٹننٹ جنرل سر برنارڈ ایل منٹگمری کو آٹھویں فوج کا کمانڈر مقرر کر دیا، جنرل منٹگمری نے اِس جنگ میں اتحادی افواج کے سپریم کمانڈر کی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے 23 اکتوبر 1942 کو جرمن افواج کے کمانڈر جنرل ایروِن رومل کی فوج کو شکست فاش دی اور نازیوں کے بڑھتے ہوئے قدم اکھیڑ دیئے ،اُس نے جرمنی اور جاپان جیسی طاقتوں کو برطانوی سپاہیوں کے آگے سرنگوں ہونے پر مجبور کر دیا، جنرل منٹگمری کی جنگی حکمت عملی آج بھی دنیا بھر میں عسکری نصاب کا حصہ ہے،اُس نے یہ جنگیں اپنے درست فیصلوں، بہترین جنگی چالوں اور اعلیٰ قائدانہ صلاحیت کی بنیاد پر جیتیں ، قوم نے اُسے اِن اعلیٰ خدمات پر فیلڈ مارشل کے خطاب سے نوازا۔

فیلڈ مارشل منٹگمری نے ساری زندگی سادگی سے گزاری، وہ شراب اور سگریٹ کو ہاتھ تک نہ لگاتا تھا، بڑی بڑی آرام دہ کاروں کی بجائے ہمیشہ فوجی جیپ میں سفر کرتا، اُس کے پاس اپنا ذاتی گھر تک نہیں تھا، ریٹائرمنٹ کے بعد اُس نے اپنی بقیہ زندگی کرائے کے مکان بدلتے گزاری، کبھی اِس جگہ اور کبھی اُس جگہ، جب بار بار کی نقل مکانی سے تنگ آگیا تو ایک دن برطانوی وزیر اعظم کی خدمت میں حاضر ہوا، وزیر اعظم نے ٹین ڈاوننگ اسٹریٹ کے صدر دروازے پر قوم کے اِس عظیم ہیرو کا استقبال کیا، عزت واحترام سے اپنے دفتر میں بیٹھایا اور آنے کی وجہ دریافت کی، فیلڈ مارشل منٹگمری نے اپنا بریف کیس کھولا، ایک درخواست نکالی اور وزیر اعظم کو پیش کردی، وزیر اعظم نے درخواست پڑھنا شروع کی، جس میں منٹگمری نے اپنے کارنامے گنوانے کے بعد حکومت سے درخواست کی تھی کہ "میں بہت بوڑھا ہوچکا ہوں، میرے پاس رہنے کیلئے گھر نہیں ہے، کرائے کے مکان میں رہتا ہوں، بار بار گھر بدلنا مشکل ہوگیا ہے، مہنگائی بھی بہت زیادہ ہے، کرایہ نہیں دے سکتا، لہذا مہربانی فرما کر مجھے ایک فلیٹ یا کوئی زرعی زمین کا ٹکڑا الاٹ کردیا جائے، تاکہ میری بقیہ زندگی باآسانی گزر سکے۔

وزیر اعظم نے درخواست پڑھنے کے بعد فیلڈ مارشل منٹگمری سے عرض کی، جناب بے شک آپ ہمارے قومی ہیرو ہیں، دوسری جنگ عظیم میں آپ کی عسکری خدمات برطانیہ سمیت پوری دنیا کیلئے قابل احترام ہیں، اِس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ دنیا میں آپ کے پائے کا کوئی جنرل نہیں، لیکن" سر "زندگی بھر آپ اپنی خدمات کا معاوضہ لیتے رہے ہیں، حکومت

برطانیہ نے آپ کی خدمات کا معقول معاوضہ پیش کیاہے، کبھی آپ کی تنخواہ لیٹ نہیں کی،اِن سب باتوں کو بھی اگر نظرانداز کردیا جائے،تب بھی جناب ایک برطانوی پرائم منسٹر کے پاس ایسا کوئی اختیار نہیں ،جس کے ذریعے وہ آپ کو فلیٹ یازمین الاٹ کرسکے، مجھے بہت حدافسوس ہے، میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں، یہ کہہ وزیراعظم نے بوڑھے فیلڈ مارشل کواُس کی درخواست واپس کردی۔" یہ مسلمہ اصول ہے کہ آئین وقانون کی حکمرانی ،اصول قاعدے اور ضابطوں کا پابند بناتی ہے، طریقہ کار متعین کرتی ہے اور معاشرے کے ہر دفرد کو اپنے اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کا احساس دلاتی ہے، دنیا میں گریٹ برٹن کے نام سے پہچانے والے ملک کے وزیراعظم کے پاس ایسے کوئی صوابدیدی اختیار حاصل نہیں تھے، جسے استعمال کرکے وہ اپنے قومی ہیرواور سابق فیلڈ مارشل کو فلیٹ یازمین کا ٹکڑا الاٹ کرسکتا۔

گزشتہ دنوں انتقال کرجانے والی سابق وزیراعظم اور برطانوی "آئرن لیڈی" مارگریٹ تھیچر اپنی خود نوشت "دی ڈاوننگ ایئرز" میں لکھتی ہیں کہ وزارت عظمی کے دوران اُن کا اسٹاف 70افراد پر مشتمل تھا، ٹین ڈاوننگ اسٹریٹ آفس کم اور گھر زیادہ تھا، جہاں ہم 70افراد ایک خاندان کی طرح رہتے تھے،اِن 70افراد پر برطانیہ کا نظام چلانے کے ساتھ ساتھ دنیا بھر میں برطانوی امیج کی حفاظت اور تھرڈ ورلڈ کی ترقی کا خیال رکھنے کی ذمہ داری بھی عائد تھی، مارگریٹ تھیچر کے الفاظ ہیں کہ "عملہ بہت کم اور کام بہت تھکا دینے والا تھا، لہٰذاہم لوگ دن رات مصروف رہتے تھے، مجھے کبھی کبھی وائٹ ہاوس اور

جرمن چانسلری پر بڑا رشک آتا تھا، جہاں بالترتیب 400 اور 500 افراد یہی کام کرتے تھے، لیکن ہم نے تو اپنی چادر دیکھ کر ہی پاؤں پھیلانے تھے، سو اس مختصر عملے سے ہی کام چلانا پڑا، جو ہم نے چلایا۔ اپنی خود نوشت میں مارگریٹ تھیچر نے مزید لکھا کہ "میری مصروفیات اتنی زیادہ تھیں کہ مجھے نہیں یاد کہ میں کبھی 4 گھنٹے سے زیادہ سوئی ہوں، میرے آفس کے اوپر وزیر اعظم کیلئے ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا، اُس تک پہنچنے کیلئے کوئی لفٹ نہیں تھی، لہٰذا مجھے سیڑھیوں کے ذریعے ہی آنا جانا پڑتا تھا، تھیچر کہتی ہیں میں اور میرا خاوند اُس فلیٹ میں اکیلے رہتے تھے، نوکر ہمارے پاس نہیں تھا، لہٰذا سارا کام خود کرنا پڑتا تھا۔

دوپہر کو جب بھوک سے بری نڈھال ہو جاتی تو بھاگتی ہوئی اوپر فلیٹ میں جاتی، لینچ تیار کرتی اور فٹافٹ کھا کر نیچے آجاتی، رات کو گیارہ بجے جب تمام ساتھی اپنے گھروں کو لوٹ جاتے تو میں تھکاوٹ سے چور سیڑھیوں کی ریلنگ پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ اوپر فلیٹ تک آتی، جہاں میرا شوہر منتظر ہوتا، پھر ہم لوگ کچن میں مصروف ہو جاتے، کھانا تیار کرتے، کھاتے اور میں پھر سے تازہ دم ہو کر دوبارہ فائلوں میں کھو جاتی۔ تھیچر کہتی ہیں "مجھے ہر ہفتے 4 سے 7 ہزار خطوط موصول ہوتے، ان میں سے ایک بھی خط ایسا نہیں ہوتا تھا، جسے میں ردی کی ٹوکری میں پھینکنے کی جرات کر سکتی، چنانچہ خطوط کو پڑھنا، اُن میں دیئے گئے نکات پر غور کرنا اور اُن پر حکم جاری کرنے سے قبل برطانوی آئین و قانون کے تقاضوں کو مد نظر رکھنا بڑا کڑا مرحلہ ہوتا

تھا۔ ” تھیچر کی لائف ہسٹری بتاتی ہے کہ وزارت عظمیٰ کے دوران اُن کی فلڈ اسٹریٹ میں مقیم اپنے خاندان سے سال میں ایک آدھ بار ہی ملاقات ہوتی، جب پچھلی رات کے سناٹے میں انہیں چند میل کے فاصلے پر مقیم اپنے پیاروں کی یاد آتی تو اُن کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ۔ لیکن وہ انہیں فوراً پونچھ دیتیں، کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ برطانوی شہری کمزور لیڈروں سے محبت نہیں کرتے۔

قارئین محترم ! ہم جب اِن واقعات کو پڑھتے ہیں اور اِس آئینے میں وطن عزیز کے حکمرانوں کے قول وفعل اور طرز عمل کی تصویر دیکھتے ہیں تو حیران و ششدر رہ جاتے ہیں، عقل ماؤف ہوجاتی ، ذہن ودل یہ سمجھنے اور قبول کرنے سے قاصر رہتاہے کہ ایک ایسا ملک جو مقروض ہو، جس کا بال بال اندورنی اور بیرونی قرضوں میں جکڑا ہو، جس کی معیشت غیروں کے ہاتھ گروی رکھی ہوئی ہو، جس کے غریب عوام بے بسی و لاچارگی کی زندگی بسر کررہے ہوں اور زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم ہوں جہاں کھانے کو روٹی اور پینے کو صاف پانی میسر نہ ہو، بھوک ، غربت ، بے۔
روزگاری، بدامنی اور لاقانونیت کا راج ہو، اُس ملک کا ایوان صدر، وزیر اعظم ہاوس گورنر ہاوس ، وزیر اعلیٰ ہاوس اور سیکرٹریٹ سینکڑوں ایکڑ پر پھیلی ہوئی عظیم الشان، عمارتوں پر مشتمل اور قوم کے اربوں روپے ہضم کرجاتا ہو، جس میں متعین ہزاروں افراد پر کا عملہ دن رات حکمرانوں کی جنبش ابرو پر کورنش بجالاتا ہو ، ایسی طرز زندگی اختیار کرنے والے حکمرانوں کی قوم مقروض و مفلس ہو سکتی ہے اور کیا ایک مقروض و مفلس قوم کے حکمرانوں ایسی بود وباش جائز ہے۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ ہمارے حکمرانوں نے شاہانہ کروفر میں مغل حکمرانوں کو بھی مات دے دی، سابقہ حکومت کے پانچ سالہ دور اقتدار میں قومی خزانے کی لوٹ مار کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا گیا اور تو اور جاتے جاتے تاحیات مراعاتی پیکیج کے نام پر قومی خزانے کی لوٹ مار کیلئے جو نادر طریقہ اختیار کیا گیا اُس کی مثال تو پاکستان کی تاریخ میں نہیں ملتی، خود اپنے لیے تاحیات پُر تعش مراعات کا پیکیج منظور کرتے ہوئے انہیں ذرا بھی شرم نہ آئی ،بے شرمی اور ڈھٹائی کی انتہا دیکھئے کہ یہ بھی نہیں سوچا کہ اپنے دور اقتدار میں ملک و قوم کا دیا کیا ہے، عوامی فلاح و بہبود کا کونسا ایسا کام کیا ہے، جس کی بنیاد پر تاحیات مراعات حق قرار پائیں،کیا ملک و قوم کے مخلص حکمران اور عوام کے حقیقی نمائندے ایسا کرتے ہیں، مہذب دنیا کی تاریخ میں ہمیں کوئی ایسی دوسری مثال نظر نہیں آتی کہ برسراقتدار جماعت سے وابستہ اراکین نے خود اپنے لیے مراعاتی پیکیج منظور کیا ہو،البتہ ایسی ہزاروں مثالیں موجود ہیں،جس میں برسراقتدار طبقے سے وابستہ افراد نے اپنے ملک اور قوم کے حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے اُن مراعات میں بھی کٹوتی یا مکمل دست برداری اختیار کرنے کو ترجیح دی جو ملک کے آئین و قانون کے تحت انہیں حاصل اور اُن کا حق تھیں، ایسی بھی مثالیں موجود ہیں جس میں محب وطن حکمرانوں نے بے لوث خدمت کو اپنا شعار بنا کر اپنے ملک اور قوم کو ترقی کی معراج پر پہنچایا، مگر افسوس کہ ہم نے اپنی قومی تاریخ میں نہ تو خود کوئی ایسی مثال قائم کی اور نہ ہی کبھی کسی اور کی مثال کو قابل تقلید جانا، صد افسوس کہ ہم تو

بابائے قوم قائدا عظم محمد علی جناح کا بحیثیت گورنر جنرل ایک روپیہ تنخواہ کا عملی پیکج
بھی بھول گئے۔ سچ کہتے ہیں جب بے شرمی، ڈھٹائی اور بے ضمیری قلب و روح پر غالب
آجائے تو صحیح و غلط کی تمیز مٹ جاتی ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جب ملک کا منتظم اعلیٰ اپنے امراء و مصاحب اور درباریوں کے ناجائز و
غلط کاموں پر صرف نظر کرتے ہوئے خاموش رہ کر منظوری کی سند جواز عطا کرنے لگے
توآئین و قانون کی بالادستی مفقود اور انصاف ناپید ہوجاتا ہے، گذشتہ پانچ برسوں کے
دوران سابقہ حکومت کا اسلوب حکمرانی اِس بات کا مظہر ہے کہ اُسے ملک و قوم کی تعمیر
وترقی اور فلاح و بہبود سے کتنی ہمدردی تھی، چنانچہ اقتدار کے آخری دنوں میں سابقہ
ارباب اقتدار کی ابھر کر سامنے آنی والی تصویر کا تقاضہ ہے کہ 11 مئی کو قوم جمہوری
آمروں کے بجائے نیک، صالح اور ایسے محب وطن نجات دہندہ کا انتخاب کرے، جس
کی جڑیں ایمان، اتحاد، تنظیم اور یقین محکم سے جڑی ہوں، جو قناعت و کفایت کا نمونہ
آئین و قانون کا پابند، اپنے عمل کا جوابدہ اور عوام کے حقیقی مسائل کا فہم وادارک،
رکھتا ہو، جو خود اگر قائدا عظم نہ ہو تو کم از کم قائدا عظم جیسا تو ہو۔

الیکشن کے التوا کی سازش۔۔۔۔

بم دھماکے ،ٹارگیٹ کلنگ احتجاج اور ہڑتالیں

سیاسی اکھاڑا تیار ہورہاہے،دنگل سجنے والا ہے،انتخابات کا بگل بج چکا ہے اورپاکستان کی سیاسی جماعتیں پرفریب وعدوں اور لایعنی دعوؤں پر مبنی اپنے اپنے منشور کا اعلان کرکے عوامی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کررہی ہیں،یوں 11 مئی کوپاکستانی تاریخ کے دسویں دلچسپ اور منفرد انتخابات ہونے جارہے ہیں،جو ابھی تک غیر یقینی کیفیت اور ابہام کا شکار ہیں، رائے عامہ کے جائزے کے مطابق 11 مئی کو ہونے والے الیکشن میں مسلم لیگ (ن)، پی پی پی اور تحریک انصاف کے درمیان کانٹے کا مقابلہ ہوگا جو اِن جماعتوں کے مستقبل کا تعین کرے گا،اب جبکہ قوم ایک بار پھر انتخابی تجربے سے گزرنے اور اپنے آنے والے حکمرانوں کے انتخاب کا فیصلہ کرنے جارہی ہے،دیکھنا یہ ہے کہ کیاانتخابی نتائج ملک و قوم کی تقدیر بدل سکیں گے؟ قومی مصائب وآلام کو کم کرسکیں گے؟اور عوام کوپرامن وآسودہ حال زندگی دےسکیں گے۔؟ گوان تمام سوالوں کے جواب توالیکشن کے بعد ہی ملیں گے،مگرایک بات طے ہے کہ اِس دوران دنیا بھر میں بہت سی انقلابی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں لیکن پاکستان دنیا بھر میں ہونے

والی تبدیلیوں کا اصل مرکز ہے جو افغانستان پر امریکی قبضے کے بعد سے مسلسل حالت جنگ میں ہے، امریکہ بظاہر تو افغانستان پر قابض ہے، لیکن پوری دنیا پر امریکی قبضے اور انسانیت دشمن سامراجی نظام کے تسلط کیلئے پاکستان کے نظام سیاست وحکومت پر بھی اپنا قبضہ چاہتا ہے۔

لیکن اِس دوران امریکہ اور عالمی سامراجیت کے خلاف پاکستانی عوام کا شعور پختہ ہوا ہے اور پاکستانی عوام اِس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ ہمارے قومی وملی مسائل کا حل اور اخروی نجات کا ذریعہ صرف اور صرف دین اسلام سے وابستگی میں ہے، گذشتہ دنوں ایک بین الاقوامی نشریاتی ادارے پر شائع ہونے والی رپورٹ بھی اِس بات کی گواہ ہے کہ پاکستانی نوجوان اپنے قومی وملی مسائل کا حل نفاذ اسلام کو سمجھتے ہیں، اَمر واقعہ یہ ہے کہ پاکستانی عوام امریکہ اور اُس کے آلہ کار حکمران اور بدعنوان سیاستدانوں کو موجودہ مصائب وآلام کا ذمہ دار سمجھتے ہیں، یہی وجہ ہے جنرل پرویز مشرف اور اُن کے سیاسی جانشین عوام میں سب سے زیادہ غیر مقبول ہیں، چنانچہ اِن حالات میں نائین الیون کے بعد ملک میں تیسرے اہم انتخابات کا اصل موضوع ہی یہ ہے کہ کیا انتخابات کے نتائج قوم کے اصل جذبات، آرزوؤں اور تمناوں کی نمائندگی کر سکیں گے؟ اگر انتخابات کے ذریعے پاکستان کے عوام کی حقیقی آواز ایوانوں میں پہنچ گئی تو کیا امریکی عزائم ناکام ہوجائیں گے، یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں متوقع

انتخابی نتائج کی اصل فکر امریکہ اور امریکہ نواز قوتوں کو بہت زیادہ ہے، دوسری جانب ایک عام پاکستانی مہنگائی، بیروزگاری اور کرپشن سے نجات چاہتا ہے، مگراِن سب تبدیلیوں کا تعلق آئین کی حکمرانی اور قانون کی بالادستی سے ہے، جو ملک میں سیاسی و معاشی استحکام کا بنیادی سبب ہے۔ لیکن ہماری سیاسی جماعتوں کے قائدین میں اِس فہم ادراک کا فقدان ہے۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا انتخاب ہے جو آج بھی امیدوں، وسوسوں، اندیشوں اور خطرات کے درمیان گھرا ہوا ہے، ملک کے تین صوبوں میں امن و عامہ کی صورتحال تشویشناک حدتک خراب ہے، اب جبکہ عام انتخابات میں صرف چند دن باقی رہ گئے ہیں، لیکن انتخابی گھما گھی اور جوش کا فقدان ہے، بے یقینی کے بادل چھٹنے کا نام نہیں لے رہے، ہر زبان پر ایک ہی سوال ہے کیا الیکشن ہوجائیں گے ؟ یہ شک اُس وقت اور بھی بڑھ جاتا ہے جب نگران حکومت یہ کہتی ہے کہ " عوام افواہوں پرکان نہ دھریں الیکشن وقت پر ہوں گے "تولوگ سوچتے ہیں کہ کیا الیکشن وقت پر نہ ہونے کا امکان باقی ہے، دوسری جانب دہشت گردی کی کارروائیاں اِن خدشات میں مزید اضافے کا باعث بن رہی ہیں، کوئٹہ، پشاور، سوات، ڈی آئی خان، جیکب آباد اور کراچی میں متحدہ واے این پی کے الیکشن دفاترپر ہونیوالے بم دھماکے خطرے کا سگنل ہیں، جس سے الیکشن کے التواکے خدشات بڑھتے جارہے ہیں،ان واقعات پر غیر معمولی ردعمل سے محسوس ہو رہا

ہے کہ انتخابات کو سبوتاژ کرنے کیلئے شرانگیز کارروائیوں کا دائرہ وسیع کیا جارہا ہے، یہ بھی خیال کیا جارہا ہے کہ پے درپے اِس قسم کے واقعات کا مقصد الیکشن کے التوا کا جواز فراہم کرنا ہے، یہ صورتحال اور بھی غیر یقینی کی کیفیت کو جنم دے رہی ہے۔
اب جبکہ انتخابات میں صرف چند دن باقی رہ گئے ہیں، حال یہ ہے کہ ملک کے تین صوبوں میں کوئی بھی سیاسی جماعت ابھی تک جلسے جلوسوں کی سیاست شروع نہیں کر سکی ہے، صرف پنجاب میں ایسا لگتا ہے کہ الیکشن ہونے جارہے ہیں، جہاں سب سے زیادہ پرجوش نواز شریف اورعمران خان نظر آ رہے ہیں، جن کی انتخابی سرگرمیاں جلسے جلوسوں کے علاوہ میڈیا میں اشتہارات کی صورت میں بھی عروج پر ہیں، پنجاب کا انتخابی منظر نامہ بتارہا ہے اِس بار پیپلزپارٹی اور مسلم لیگ (ن) کے درمیان نہیں بلکہ مسلم لیگ (ن) اور تحریک انصاف اصل مقابلہ ہوگا، جبکہ پنجاب کے مقابلے میں ملک کے دیگر صوبوں میں انتخابی مہم میں وہ گہما گہمی نظر نہیں آرہی، پشاور میں اے این پی کے رہنما غلام احمد بلور پر خودکش حملے کے بعد سے ماحول پر اب بھی خوف اور جمود کی فضا طاری ہے اور سیاسی گہما گہمی مفقود ہے، ایک طرف بڑی سیاسی جماعتیں دہشت گردوں کے حملے کے باعث جمود کا شکار ہیں تو دوسری جانب پاکستان تحریک انصاف کے چیئرمین عمران خان کے خیبر پختونخواکے مختلف اضلاع کے طوفانی دورہ کرچکے ہیں اوران کے دوروں نے جمعیت علمائے

اسلام، مسلم لیگ ن اور پیپلزپارٹی کیلئے خطرے کی گھنٹی بجادی ہے، جبکہ پیپلزپارٹی اور اُس کی اتحادی جماعتوں کی انتخابی مہم بھی پھیکی نظر آتی ہے، وہ سکیورٹی کے خطرات کے پیش نظر بڑے جلسوں پر مبنی انتخابی مہم سے گریز کر رہے ہیں۔
دوسری طرف نواز شریف انتخابی سیاست میں زیادہ مضبوط نظر آتے ہیں ، سیاسی تجزیہ نگار بھی نواز شریف کو بہت زیادہ اہمیت دے رہے ہیں ،اُن کے خیال میں نواز شریف اگلی حکومت بنانے کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں،امریکی اسٹیبلشمنٹ کے بعض خفیہ سروے میں یہ امکان بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ انتخابی نتائج میں کوئی بھی جماعت واضح اکثریت نہیں حاصل کر سکے گی، جماعت اسلامی جس کا نواز شریف اور عمران خان دونوں سے اتحاد نہیں ہو سکا،اب وہ تنہا میدان میں ہے، جبکہ نواز شریف کی بے وفائی کی وجہ سے جمعیت علماءپاکستان کا بھی یہی حال ہے، جس کے امیدواروں نے ابھی تک اپنی انتخابی مہم بھی شروع نہیں کی ، ویسے بھی اِن جماعتوں کے کامیابی کے امکانات بہت ہی معدوم ہیں، سندھ میں پیپلزپارٹی اور متحدہ کے امیدواروں کا مقابلہ کرنے کیلئے پیر پگارہ کی قیادت میں 10 جماعتی اتحاد قائم کیا گیا ہے، جس میں مسلم لیگ فنکشنل، مسلم لیگ ن،، جمعیت علماءپاکستان ، جماعت اسلامی، جمعیت علماء اسلام ف، نیشنل پیپلزپارٹی، سنی تحریک اور قوم پرست جماعتیں شامل ہیں، سندھ کے دیہی صورتحال کے

برعکس کراچی اور حیدرآباد میں دس جماعتی اتحاد شدید اختلافات کا شکار ہے، پھر بھی توقع ہے کہ یہ دس جماعتی اتحاد پیپلزپارٹی اور متحدہ کو ٹف ٹائم دے گا۔دوسری طرف کراچی میں متحدہ کے الیکشن دفاتر پر حملوں نے انتخابات میں متحدہ کی شرکت کے حوالے ابہام پیدا کردیا ہے، غالب امکان یہی ہے کہ یوم سوگ اور ہڑتالیں متحدہ کو انتخابی بائیکاٹ کی طرف لے جاسکتی ہیں، ویسے بھی اِس وقت متحدہ کو کراچی اور حیدرآباد کی سیاست میں اپنی قوت برقرار رکھنے میں خاصی مشکلات کا سامنا ہے، دوسری طرف مجلس وحدت المسلمین بھی انتخابی میدان میں موجود ہے جبکہ مہاجر قومی موومنٹ کے چیئرمین آفاق احمد بھی انتخابی میدان میں اتر چکے ہیں اور اُن کی پوری کوشش ہے کہ وہ کراچی سے کوئی نشست جیت لیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انتخابی مہم کی شدت میں کمی کی وجوہات میں سیکورٹی اور دہشت گردی کا معاملہ سرفہرست ہے،اِس میں کچھ شک نہیں کہ ملک میں سیکورٹی کا معاملہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے جو کہ ذمہ داری حکومت کی ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں بم دھماکوں کے پیچھے وہی قوتیں کارفرما ہیں جو انتخابات کو ملتوی کرانا چاہتی ہیں، کیونکہ سیاسی بعض قوتوں پہلے ہی دہشت گردی کی بنیاد پر انتخابات سے فرار کا عندیہ ظاہر کرچکی ہیں اور دہشت گردی کا مزید کوئی بڑا واقعہ انہیں باآسانی فرار کا راستے پر لے جاسکتا ہے، دوسری

جانب نگراں حکومت کے وزیر داخلہ ملک حبیب پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ اگر دہشت گردی کا کوئی واقعہ سامنے آیا تو پرامن انتخابات کی ضمانت نہیں دے سکیں گے، یہی وجہ ہے کہ بروقت انتخابات کے انعقاد پر مکمل اتفاق رائے رکھنے کے باوجود سیاسی جماعتیں آزادانہ بنیاد پر انتخابی مہم چلانے سے قاصر نظر آتی ہیں،اس حوالے سے سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ پنجاب کے نگران وزیر اعلیٰ نجم سیٹھی نے بھی انتخابات کی صحت پر سوال اٹھاتے ہوئے کہا ہے کہ اگر صدر زرداری، نواز شریف اور عمران خان انتخابات کی تاریخ میں توسیع چاہتے ہیں تو اِس پر غور کیا جاسکتا ہے۔

جبکہ صدر زرداری کے قریبی ساتھی فیصل رضا عابدی پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ ملک میں فوری انتخابات ہوتے دکھائی نہیں دے رہے ،پاکستان کے انتخابی ابہام میں ایک سوال طاہر القادری اور جنرل (ر) پرویز مشرف کے گرد بھی گھوم رہا ہے کہ وہ کس ایجنڈے کے تحت انتخابات سے قبل پاکستان آئے ہیں اور اُن کے پیچھے کون لوگ ہیں ؟اِن دونوں حضرات کی آمد کے عمل نے انتخابی عمل انعقاد کے حوالے سے مزید شکوک و شبہات پیدا کردیے ہیں،اَمر واقعہ یہ ہے پاکستان اِس وقت جن بڑے بحرانوں میں گھرا ہوا ہے اُس میں ایک مضبوط سیاسی مینڈیٹ کی ضرورت ہے، لیکن موجودہ حالات میں اِس کے امکان بہت ہی کم ہے کہ کوئی جماعت تنہا حکومت بناسکے،جس کی وجہ سے ایک غیر یقینی کیفیت سامنے کھڑی ہے، یہ پاکستان کا وہ

منظر نامہ یہ ہے جو انتخابات سے پہلے سجایا گیا ہے، جبکہ دوسرا منظر نامہ وہ ہوگا جو انتخابات کے بعد قوم کے سامنے آئے گا اور اصل کھیل الیکشن کے بعد شروع ہوگا۔

مولانا عبدالستار نیازی حریتِ فکر کا مجاہد۔۔۔۔

دو مئی کو مجاہد ملت مولانا عبدالستار خان نیازی کی برسی کے موقع پر خصوصی تحریر

مولانا عبدالستار نیازی حریتِ فکر کا مجاہد۔۔۔۔۔

مولانا محمد عبدالستار خان نیازی، قلندرانہ ادائیں، سکندرانہ جلال، میانوالی کا شعلہ صفت پٹھان، جس کے جنون نے کبھی فارغ بیٹھنا سیکھا نہیں، نے تحریک پاکستان میں شاندار کردار ادا کیا، مجاہد ملت مولانا عبدالستار خان نیازی یکم اکتوبر 1915ء کو ضلع میانوالی کے گاؤں "اٹک پٹیالہ" میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد ذوالفقار خان ایک نیک سیرت اور پاکباز انسان تھے۔دینی گھرانہ ہونے کی وجہ سے مولانا نیازی کو بچپن ہی سے مذہبی ماحول میسر آیا۔1933ء میں مولانا عبدالستار خان نیازی نے میٹرک پاس کیا اور حصول تعلیم کیلئے لاہور تشریف لے آئے۔لاہور میں آپ نے انجمن حمایت اسلام کے زیر انتظام" اشاعت اسلام کالج" میں داخلہ لیا اور 1936ء میں "ماہر تبلیغ"کی حیثیت سے کالج میں ٹاپ کیا، اسی دوران مولانا نیازی کی ملاقات حکیم الامت علامہ اقبال سے ہوئی، اسرار خودی

کے مطالعے نے فارسی پڑھنے کے شوق کو اِس قدر ابھارا کہ مولانا نیازی نے چھ ماہ میں منشی فاضل کا امتحان بھی پاس کر لیا، اِسی سال آپ نے ایف اے کا امتحان دیا اور اسلامیہ کالج لاہور میں بی اے میں داخلہ لے لیا، یہ وہ زمانہ تھا جب برصغیر پاک و ہند میں کانگریس اور مسلم لیگ کا بڑا چرچا تھا، نیشنلسٹ طلباء کی تنظیم "نیشنل اسٹوڈینس فیڈریشن" تعلیمی اداروں میں چھائی ہوئی تھی۔

چنانچہ 1936ء میں مولانا نیازی، مولانا ابراہیم علی چشتی، میاں محمد شفیع (م، ش) مشہور صحافی حمید نظامی اور عبدالسلام خورشید نے علامہ اقبال کی قیام گاہ پر اُن کے مشورے سے طلباء کی تنظیم "دی مسلم اسٹوڈینس فیڈریشن" کی بنیاد رکھی، جس کا مقصد مسلم طلباء کو نیشنلسٹوں کے اثر سے بچانا اور سیاسی شعور اجاگر کرکے قیام پاکستان کی راہ ہموار کرنا تھا، مولانا نیازی 1938ء میں اِس تنظیم کے صدر منتخب ہوئے، صدر منتخب ہونے کے بعد آپ نے "مسلم اسٹوڈینس فیڈریشن" کے منشور میں پہلی تبدیلی یہ کی کہ "مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل ایک الگ خطہ زمین جس میں مسلمانوں کی حکومت ہو" کو خلافت پاکستان" کا نام دیا، 1939 میں میں مولانا نیازی نے مسلم اسٹوڈینس فیڈریشن کی جانب سے "خلافت پاکستان اسکیم" نامی پمفلٹ شائع بھی کیا، جس کی ایک کاپی قائداعظم محمد علی جناح کو بھجوائی گئی، جسے قائد اعظم نے مولانا نیازی سے ملاقات میں ایک گرم اسکیم قرار دیا۔

مولانا عبدالستار خان نیازی نے 1938ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں ایم اے عربی میں داخلہ لے لیا اور ایم اے کرنے کے بعد 1942ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں ڈین آف اسلامک اسٹیڈیز کی حیثیت سے خدمات بھی انجام دیں، مولانا نے خضر وزارت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لیا، سر سکندر حیات کے خلاف مورچہ لگایا، 23 مارچ 1940ء کو جب قرار داد لاہور پیش ہوئی ،اس وقت مولانا نیازی ایم اے فائنل ایئر میں زیر تعلیم تھے،اِس اجلاس میں شرکت کرنے والے تمام مقررین کا مدعا اگرچہ پاکستان کا قیام ہی تھا مگر کسی نے اپنی تقریر میں پاکستان کا نام نہیں لیا، یہ اعزاز صرف مولانا عبدالستار خان نیازی کو جاتا ہے کہ آپ نے پہلی باراِس اجتماع میں "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ لگایا، جو مسلمانوں کے کسی عظیم اجتماع میں پاکستان کیلئے لگایا گیا پہلا نعرہ تھا، مولانا نیازی نے میانوالی ڈسٹرکٹ میں مسلم لیگ کو دوبارہ منظم کرنے کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ ضلع میانوالی کے صدر سمیت مسلم لیگ کے کئی اعلیٰ عہدوں بھی پر خدمات انجام دیں، 1945ء میں قائدِاعظم نے آپ کو ضلع میانوالی سے پروننشل اسمبلی کا ٹکٹ دیا جس پر آپ نے یونینسٹ پارٹی کے امیدوار کو شکست دے کر کامیابی حاصل کی، 1946ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر میانوالی سے ایم این اے منتخب ہوئے، مولانا نیازی نے قائدِاعظم سے کئی ملاقاتیں کیں اور طویل خط وکتابت ہوئی، مولانا تشکیل پاکستان کے بعد بھی ہر

لمحہ متحرک رہے اور عوامی لیگ سے ہوتے ہوئے جمعیت علماء پاکستان میں پہنچے، تادم مرگ جے یو پی میں صوبائی صدر، مرکزی سیکرٹری جنرل اور مرکزی صدر کی ذمہ داریاں بنھاتے رہے۔

ناموس ارض وطن کے پاسبان مولانا نیازی نے تحریک پاکستان کے علاوہ تحریک ختم نبوت، تحریک نظام مصطفیٰ، تحریک بحالی جمہوریت، تحریک تحفظ ناموس رسالت میں قائدانہ جرات مندانہ اور دلیرانہ کردار ادا کیا جو تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ جگمگاتا رہے گا، 1953ء کی تاریخی تحریک ختم نبوت کے دوران مولانا نیازی کو سزائے موت سنائی گئی تھی اور شمع رسالت کا یہ پروانہ تختہ دار کو چوم کر زندگی کی طرف پلٹا تھا، مولانا نیازی قیام پاکستان کے بعد 1951ء تک مسلم لیگ سے وابستہ رہے، مگر جب مسلم لیگ کو عملاً ایک لمیٹیڈ کمپنی بنادیا گیا تو آپ نے مسلم لیگ سے علیحدگی اختیار کرکے اپنے آپ کو خلافت پاکستان، جس کا مقصد ملکی قوانین کو شریعت کے مطابق بنانا اور اسلامی نظام کا مکمل نفاذ تھا، کیلئے وقف کردیا، مولانا نیازی عمر بھر ایک سربکف مجاہد کا کردار ادا کرتے رہے اور قیام پاکستان کے زندگی کے آخری لمحے تک اپنے مشن کی تکمیل، مقصد کے حصول اور ریاست کی فوزوفلاح کیلئے کمربستہ رہے۔

مولانا نیازی کی ساری زندگی جبرواستبداد، ظلم واستحصال اور ناانصافی کے خلاف

جہاد کرتے ہوئے، غلبہ دین،آزادی جمہوریت اورآمر وقت کے خلاف نعرہ حق بلند
کرتے ہوئے گزری، مولانا نیازی اپنی زندگی میں کئی بار قید وبند کی صعوبتوں سے
گزرے، قاتلانہ حملوں کی زد میں آئے، تختہ دارتک پہنچے، مگر کوئی قید، کوئی حملہ، کوئی
سزااور تختہ دار کی اذیتیں مولانا نیازی کے عزم، حوصلے اور ارادوں کو متزلزل نہ
کرسکی، یہ حقیقت ہے کہ تحریک پاکستان ییں مولانا عبدالستار خان نیازی کا کردار روز
روشن کی طرح عیاں ہے، یہ مولاناہی تھے جنھوں نے پنجاب میں قائداعظم کی
تائیدوحمایت میں پہلی اور موثرآواز بلند کی، سرسکندر حیات کی سازشوں کا مردانہ وار
مقابلہ کرکے مسلم لیگ کے قیام واستحکام کی راہ ہموار کی اور مسلم لیگ کو اہل پنجاب کے
دلوں کی ڈھرکن بنادیا، مولاناپاکستان بنانے والوں میں سے ایک تھے،ان کا اوڑنا بچھونا
سب ہی کچھ پاکستان اور نفاذ اسلام کیلئے تھا،وہ فنافی الپاکستان تھے،وہ پاکستان کو دنیاکے
سامنے خلافت راشدہ کی طرز پر ایک جدید فلاحی ریاست کی طورپر دیکھنا چاہتے تھے،
مولانا نے اِس مقصد کیلئے متعدد کتابچے اورکتابیں بھی لکھیں جن میں"خلافت
پاکستان، مسودہ آئین پاکستان، منشور خلافت،اتحاد بین المسلمین وغیرہ شامل ہیں۔
مولانا نیازی بلند قامت ہی نہیں، بلند کردار بھی تھے، قدآور شخصیتوں میں بھی نمایاں
، نظرآتے، اپنی کلاہ کے ساتھ اور بھی ممتاز و منفرد دکھائی دیتے

یہ کلاہ کج کلاہوں کی نظر میں بری طرح کھٹکتی رہی، لیکن جبر و استبداد اور اختیار و اقتدار کا کوئی وار اس مرد مجاہد کو زیر نہ کر سکا، اپنے سچے خدا کے حضور جھکنے والا سر دنیاوی خداؤں کے سامنے ہمیشہ سربلند رہا، اقبال کا فکر و فلسفہ اور قائداعظم کے نظریات نوجوان نیازی کی رگوں میں لہو بن کر دوڑتے۔ اقبال اُن میں اپنے شاہین کا عکس پاتے،
قائداعظم انہیں ستاروں پر کمند ڈالنے والے اُن نوجوانوں میں شمار کرتے جن سے اقبال کو محبت تھی۔ ایک موقع پر قائد نے مولانا نیازی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا نیازی جیسے نوجوان میرے ساتھ ہیں تو پاکستان کا قیام دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔" انہوں نے تحریک پاکستان کے دوران جیل بھی کاٹی اور قیام پاکستان کے بعد جرنیلوں، جاگیرداروں اور بیوروکریٹوں نے نوزائیدہ مملکت خداداد کو اپنی شکارگاہ بنایا تو نیازی نے انہیں روکنے ٹوکنے میں بھی کوئی کوتاہی نہ کی، حق پرستوں کے قافلہ سالار نے فیلڈ مارشل ایوب خان کی آمریت، نواب آف کالا باغ کی چنگیزیت، جنرل ضیاء الحق کی فسطائیت کو مسلسل للکارتے رہے اور بار بار زندانوں کو رونق بخشتے رہے۔
مادرِ ملت فاطمہ جناح ایوب خان کے خلاف صدارتی انتخاب میں اتریں تو نیازی کاروانِ جمہوریت کے ہراول دستے میں تھے۔ میانوالی میں انتخابی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا "ہم اُس شخص (گورنر کالاباغ) کو جوتے کی نوک

پر بھی نہیں رکھتے۔" مولانا نیازی کو راستے سے ہٹانے کیلئے اُن پر قاتلانہ حملے بھی کرائے گئے، لیکن قدرت نے نیازی سے بھٹو دور کی تحریک ختم نبوت (1974) اور 1977 ء کی تحریک نظام مصطفٰی میں بھی کام لینا تھا، سو وہ زندہ رہے، اسمبلی اور سینٹ کے رکن کی حیثیت سے مولانا نیازی کی فکر انگیز اور تاریخ ساز تقریریں آج بھی ہماری پارلیمانی تاریخ کا ایک روشن باب ہے، مولانا نیازی کا ہمارے ملک کے اُن چند لیڈروں میں شمار ہوتا ہے، جن کے ضمیر کو کوئی خرید سکا نہ ہی دبا سکا، اسلام اور پاکستان اُن کی سیاست کے مرکز و محور رہے، عمر کے آخری حصے میں بھی اُن کے لہجے میں جوانوں کی توانائی اور فرعون صفت حکمرانوں کو چیلنج کرنے والے مجاہدوں کا آہنگ صاف دکھائی دیتا تھا، شورش کاشمیری نے جراتوں کے اس عظیم پیکر کو یوں خراج تحسین پیش کیا۔

جیتا ہے نگہبانی اسلام کی خاطر

ہر دور کے شداد تیرے پاؤں کے نیچے

فاسق ہیں تری تلخ نوائی سے گلہ مند

ساتھی ہیں تیرے دین پیمبر کے جگر بند

دنیا میں 84 سال گزار کر اپنے پروردگار کے پاس چلے جانے والے بطل جلیل مولانا عبدالستار خان نیازی کی ساری زندگی روایت شکنی اور روایت سازی میں

گزری، وہ قابل بھی تھے اور مقبول بھی، وہ فقرِ غیور اور عشق خود آگاہ کے نقیب تھے،اُن کے من میں اجالوں کا ایک دریا بہتا تھا،اپنے لہجے میں جرات اور صداقت کی گھن گرج رکھنے والے مولانا نیازی نے اپنے ہم عصر مذہبی سیاستدانوں کی طرح کبھی بھی اقتدار کے بازار میں دستار نہیں بیچی،اُن کے سینے میں ہزاروں ولولوں کی کائنات بسی ہوئی تھی، وہ پاکستان کو نظام مصطفیٰ کا گہوارہ بنانے کے شوق میں جنون کی حد تک مبتلا تھے، وہ پاکستان کو ایک ایسی جدید اسلامی فلاحی ریاست کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے، جہاں وسائل رزق اور عدل وانصاف ہر شخص کیلئے ہو، جہاں علاج معالجے، جان ومال اور عزت وآبرو کا تحفظ ریاست کی ذمہ داری ہو، جہاں وجہ عزت سرمایہ داری وجاگیرداری نہیں بلکہ اعلیٰ اخلاقی اوصاف ، دیانت، امانت، تقویٰ اور خداترسی ہو۔
مولانا نیازی حریت فکر کے مجاہد تھے، مولانا عبدالستار خان نیازی اُن لوگوں میں سے ایک تھے جو اِس دنیا میں آتے ضرور ہیں، مگر جاتے کبھی نہیں، اُن کی راہ سیاست کا قدم قدم یادگار ہے اور اُن کا گلشن حیات رنگا رنگ پھولوں سے بھرا ہوا ہے، زمانہ طالب علمی میں اقبال کا شاہین اور عملی زندگی میں اقبال کا مردِ مومن اور قائد کا یہ جانباز سپاہی، مئی 2001ء کو اپنے ربّ کے حضور حاضر ہوگیا۔2
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

کرسی اقتدار اور تبدیلی کی امید۔۔۔ میاں صاحب کا نیا امتحان

یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ جمہوریت کی بنیادی روح صاف وشفاف الیکشن کا انعقاد ہے،آج دنیا میں جہاں بھی مثالی جمہوریت موجود ہے،اُس کے پیچھے یہی اصول کارفرما ہے،اِس کی وجہ یہ ہے کہ بروقت اور صاف وشفاف الیکشن کا انعقاد نہ صرف جمہوریت کو مضبوط وتوانا کرتا ہے بلکہ تیسری قوت کو جمہوری اداروں پر شب خوں مارنے سے بھی روکتا ہے۔وطن عزیز پاکستان ایک اسلامی فلاحی ریاست کے طور پر معرض وجود میں آیا،برصغیر کے مسلمانوں نے قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں ڈاکٹر محمد اقبال کے جس تصور پاکستان کو عملی شکل دینے کی جدوجہد میں تن من دھن کی بازی لگائی ،اُس کا مقصد ایک ایسے خطہ زمین کا حصول تھا جہاں مسلمان اپنی زندگی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جمہوری اقدار کے مطابق بسر کرسکیں۔خود بانی پاکستان بھی وطن عزیز میں جمہوری طرز حکومت چاہتے تھے،لیکن بدقسمتی سے قیام پاکستان کے بعد ملک میں جمہوری عمل کا تسلسل رک گیا،مارشل لائی آمریت نے نہ صرف جمہوری عمل کے راستے میں روڑے اٹکائے بلکہ اِس عمل میں ابن الوقت سیاستدانوں نے بھی بنیادیں مضبوط کیں،مزید طرفہ تماشہ یہ ہوا کہ کچھ سیاسی جماعتوں کو خاندانی جاگیر و وراثت بنادیا گیا جس کا نتیجہ عوام کا جمہوری عمل سے متنفر ہونے کی

صورت میں سامنے آیا۔

دوہزارآٹھ (2008ء) میں طویل پرویزی آمریت کے بعد پیپلز پارٹی اور دیگر جماعتوں کے اتحاد سے قائم ہونے والی حکومت اِس لحاظ سے پہلی حکومت تھی کہ اُس نے اپنی آئینی مدت پوری کی، جس کا کریڈٹ تمام اسٹیک ہولڈر کو جاتا ہے،یوں ہماری سیاسی تاریخ میں پہلی بار ایک منتخب سیاسی حکومت کی آئینی مدت کی تکمیل کے بعد دوسری منتخب ہونے والی جماعت کو پرامن اقتدار کی منتقلی کے خوش آئند آثار پیدا ہوئے،یقینا یہ عمل ملک میں جمہوریت کی مضبوطی اور جمہوری قوتوں کی بالغ نظری کے ساتھ عوام کے سیاسی شعور کی بیداری کی بھی علامت ہے،11 مئی کے انتخابات کے بعد مسلم لیگ ن) وفاق میں سب سے بڑی سیاسی جماعت بن کر ابھری، جبکہ پنجاب کی صوبائی) حکومت کی تشکیل کیلئے بھی اُسے بھاری اکثریت حاصل ہو گئی،دوسری جانب تحریک انصاف بھی ایک بڑی سیاسی قوت کے طور پر سامنے آئی، جس نے ملک پر چار بار حکومت کرنے والی پیپلز پارٹی کو پیچھے دھکیل دیا ہے،البتہ سندھ میں پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کی مخلوط حکومت بننے کے زیادہ امکانات ہیں، جبکہ خیبر پختون خواہ میں تحریک انصاف بڑی جماعت کی حیثیت سے صوبے کا نظم ونسق سنبھالنے کا حق رکھتی ہے،اگر تحریک انصاف خیبر پختونخواہ میں ایک مثالی حکومت کا نمونہ پیش کرتی ہے تو یہ نہ صرف ملک کے دیگر صوبوں کیلئے روشن مثال ہوگا بلکہ اُس کے آئندہ برسر اقتدار

آنے یا نہ آنے کی بھی راہ ہموار کریگا، سردست تحریک انصاف قومی اسمبلی میں حقیقی اپوزیشن کا کردار ادا کرکے حکومت کی اصلاح اور عوام کے بنیادی حقوق کے دفاع کا فریضہ انجام دے سکتی ہے، جبکہ بلوچستان میں مسلم لیگ ن، قوم پرست جماعتوں کے اتحاد کے ساتھ حکومت بنا سکتی ہے۔

قارئین محترم ! حالیہ انتخابات کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ نعروں، پروپیگنڈے اور ذات،برادری کی بنیاد پر ووٹ دینے کا رجحان اگرچہ ختم نہیں ہوا مگر کم ضرور ہوا ہے اور لوگوں نے کارکردگی کی بنیاد پر کسی جماعت کے حق یا مخالفت میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، جواِس نظام پر ایک گہری ضرب سے کم نہیں،یقیناً یہ ایک مثبت تبدیلی کی علامت ہے جبکہ دوسری،بڑی تبدیلی ووٹنگ کے اعداد وشمار ظاہر کرتے ہیں،اِس مرتبہ ووٹنگ کی شرح گزشتہ انتخابات کے مقابلے میں خاصی زیادہ تھی، ملک بھر کے پولنگ سٹیشنوں کے باہر ووٹروں کی طویل قطاریں لگی ہوئی تھیں، عوام کا جوش وخروش ظاہر کر رہا تھا کہ اُن کا سیاسی شعور بیداری کی جانب گامزن ہے اور وہ،بڑی حد تک یہ بات جان چکے ہیں کہ حکمرانی عوام کا استحقاق اور تمام ملکی اثاثے اور وسائل قوم کی ملکیت ہیں، یہی وہ شعور ہے جس کی بدولت عوام اپنا ووٹ ڈالنے کیلئے جوق در جوق گھروں سے نکلے، حیرت ناک بات یہ ہے کہ یہ جوش وخروش اُن پوش علاقوں میں بھی نظر آیا، جہاں گیس بجلی مہنگائی اور بے روزگاری جیسی چیزوں کا دور کا بھی واسطہ

نہیں ہے۔

آج 11 مئی کے عام انتخابات ماضی کا حصہ بن چکے ہیں، تبدیلی کیلئے دیا گیا ووٹ ہی تبدیل ہوگیا، انتخابات میں جو کچھ ہوا وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے، متعدد جماعتوں کی جانب سے دھاندلی کے الزامات کے باجود اگر جذبات اور خواہشات سے ہٹ کر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حالیہ الیکشن کے نتائج گذشتہ الیکشن نتائج سے مختلف نہیں ہیں، گذشتہ الیکشن میں عوام نے ایک آمر وقت اور اُس کی کاسہ لیس جماعت کے خلاف اپنا حق رائے دہی استعمال کرتے ہوئے پیپلز پارٹی پر اعتماد کا اظہار کیا تھا، لیکن حالیہ الیکشن میں پی پی اور اُس کے اتحادیوں کی عوامی مسائل سے لاپروائی، بے انتہا کرپشن، لوٹ مار، مہنگائی، بے روزگاری اور ناقص پالیسیوں کی وجہ قوم نے اُسے مسترد کرتے ہوئے مسلم لیگ ن کو اعتماد کا ووٹ دیا، اب مسلم لیگ ن عوامی اعتماد پر کس حد تک پورا اترتی ہے، یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا، لیکن ایک بات طے ہے کہ پچھلے پانچ سالوں تک حکومتی اتحاد کا حصہ رہنے والی پیپلز پارٹی، اے این پی اور قاف لیگ کی غیر معمولی شکست وہزیمت عوامی غم غصے اور ناراضگی کا بین ثبوت ہے اور اِس بات کا اظہار ہے کہ پی پی کے قائدین نے جو کچھ بویا، وہی کاٹا، صدر محترم نے سیاسی جوڑ توڑ اور مفاہمتی مکروفریب سے کام لے کر پانچ سال تو مکمل کر لیے مگر وہ عوامی عدالت میں سرخرو نہ ہوسکے، دوسری

جانب تحریک انصاف حسب توقع نہ سہی مگر خاطر خواہ حد تک ووٹوں کے اعتبار سے دوسری بڑی اور موثر سیاسی قوت کے طور پر سامنے آئی ہے، جس کا کریڈٹ عمران خان اور نوجوانوں کو جاتا ہے، 11 مئی کے الیکشن میں عوام کی بھرپور شرکت اور نوجوانوں کے جوش وجذبے نے ثابت کردیا ہے کہ پاکستانی قوم دہشت گردوں اور انتہاپسندوں کے مذموم عزائم کو ناکام بنانے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے، سیاسی مبصرین کے مطابق حالیہ انتخابات میں پہلی بار طبقہ اشرافیہ نے بھی عام عوام کی طرح اپنا ووٹ کاسٹ کرکے تبدیلی کے عمل میں اپنا حصہ ملایا ہے۔

اِس وقت ملک سیاسی منظر نامہ یہ ہے کہ اب آئندہ پانچ سال تک مسلم لیگ (ن) کے سربراہ میاں محمد نواز شریف کو بحیثیت وزیر اعظم ملک وقوم کی قیادت کرنی ہے، میاں صاحب کی خواہش ہے کہ اُن کی جماعت کو کسی دوسری پارٹی کی مدد کے بغیر حکومت سازی کا موقع ملے تاکہ ملک میں ایک مضبوط حکومت قائم ہو اور وہ ملک کے مسائل کے حل اور قومی تعمیر وترقی کیلئے بہتر اقدامات کرسکیں، نئے منظر نامے میں میاں صاحب کی خواہش پوری ہونے کے زیادہ روشن امکانات موجود ہیں، ویسے بھی جب سابقہ حکومت اپنی خراب اور ناقص کارکردگی کے باوجود آئینی مدت مکمل کرسکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ میاں صاحب کو یہ موقع نہ ملے، دیکھنا صرف یہ ہے کہ اِس بار میاں صاحب کس حد تک فہم وتدبر اور تحمل مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہیں، ویسے نئے چیف آف آرمی کی تقرری سے اُن کے یہ وصف

بہت جلد قوم کے سامنے آنے والے ہیں، جو اُن کی آئینی مدت پورا کرنے یا نہ کرنے کا تعین کریں گے۔ سر دست میاں صاحب کے گذشتہ ٹریک ریکارڈ کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ کہنا ابھی قبل از وقت ہوگا، ہاں عمومی اصول و قاعدہ کہ " انسان اپنی غلطیوں سے سیکھتا اور آئندہ بچنے کو کوشش کرتا ہے "کے مطابق یہی اُمید کی جاسکتی ہے کہ میاں صاحب ماضی کے تلخ تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے اِس بار محاذ آرائی سے گریز کریں گے۔

یہ درست ہے کہ موجودہ حالات میں اقتدار میاں صاحب کیلئے پھولوں کی سیج ثابت نہیں ہوگا، انہیں اور اُن کی جماعت کو اپنی ساری توانائیاں قومی مسائل کے حل کیلئے وقف کرنا ہونگی، اِس وقت ملک کو داخلی اور بیرونی سطحوں پر سنگین چیلنجوں کا سامنا ہے، دہشت گردی کے عفریت نے پاکستان کو عضو ناکارہ بنادیا ہے، معاشی بحران انتہائی پیچیدہ ہوچکا ہے، دوسری جانب، گیس، بجلی، مہنگائی اور بے روزگاری جیسے مسائل سے نجات کیلئے نتیجہ خیز اقدامات کی ضرورت ہے جو قومی اتفاق رائے کے بغیر ممکن نہیں، چنانچہ قوم کو اِس دلدل سے نکالنے کیلئے میاں صاحب کو متانت، بردباری اور سیاسی سمجھ بوجھ سے کام لینا ہوگا، اِس تناظر میں ہماری میاں صاحب سے گزارش ہے کہ وہ عوامی مینڈیٹ کو محاذ آرائی کے بجائے قومی تعمیر وترقی کیلئے استعمال کریں، میرٹ پر فیصلے کریں، ملک وقوم کو ایک اچھی اور مثالی حکومت دیں اور ثابت کریں کہ عوام نے جس تبدیلی

کی اُمید کیلئے انہیں منتخب کیا ہے وہ اُس پر پورا اترتے ہیں۔

ویل ڈن عائشہ فاروق، ویل ڈن۔۔۔۔۔

عائشہ فاروق پاکستان کی پہلی خاتون فائٹر پائلٹ۔۔۔۔۔
یہ 21اپریل 2006ء کی بات ہے،جب پاک فوج کے ترجمان میجر جنرل شوکت سلطان نے اسلام آباد کے مقامی صحافیوں کی پریس کانفرنس میں یہ اعلان کیا کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار بری فوج میں طبّی شعبے کے علاوہ کسی دوسرے شعبے میں 30 خواتین کو بھرتی کیا جائے گا اور انہیں سگنلز، تعلقات عامہ، کمپیوٹر سیکشن، تعلیمی اور قانونی شعبوں میں بحیثیت کپتان اور میجر مقرر کیا جائے گا۔اُس وقت کے فوجی ترجمان کا یہ بھی کہنا تھا کہ فوج میں خواتین کی تعیناتی کا عمل بتدریج بڑھایا جائے گا۔اِس سے قبل پاک فوج میں خواتین کی بھرتی کا عمل صرف طبّی شعبے تک ہی محدود تھا، جس میں تقریبا 650 خواتین بحیثیت ڈاکٹرز اور 2300 خواتین بطور نرسز کام کر رہی تھیں، جن میں ایک میجر جنرل ، 13 برگیڈئر، 26 کرنل اور 38 لیفٹیننٹ کرنل کے عہدوں پر تعینات تھیں۔اِس پریس کانفرنس میں انھوں یہ انکشاف بھی کیا کہ گزشتہ ماہ پاک فضائیہ میں چار خواتین کو تربیت کے بعد بحیثیت لڑاکا پائلٹ بھرتی کیا گیا ہے،لڑاکا فورس میں یہ پہلی خواتین تھیں جنھوں نے ائیر فورس میں شمولیت اختیار کی تھی۔میجر

جنرل شوکت سلطان کا کہنا تھا کہ اگر اِن خواتین کی کارکردگی تسلی بخش رہی تو آئندہ فوج میں خواتین کو بحیثیت لڑاکا فوجی افسر بھی تعینات کیا جاسکتا ہے۔

تیس مارچ 2006ء کو افواج پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار چار خواتین نے اپنی تربیت مکمل کرکے فائٹر پائلٹ ہونے کا اعزاز حاصل کیا، فلائنگ بیجز حاصل کرنے والی اِن خواتین میں صبا خان، نادیہ گل، مریم خلیل اور سائرہ بتول شامل تھیں، جنھوں نے 32 مرد کیڈٹس کے ساتھ ایک سو سولہواں جنرل ڈیوٹی پائلٹ کورس مکمل کرکے فضائی فورس میں شمولیت اختیار کی تھی، سب سے اہم بات یہ تھی کہ اِن چار فائٹر خواتین پائلٹ میں سے دو کا تعلق پاکستان کے سب سے زیادہ پسماندہ صوبے بلوچستان کے شہر کوئٹہ سے تھا، جبکہ ایک کا تعلق مذہبی اعتبار سے سخت گیر خیالات رکھنے والے صوبہ سرحد اور ایک کا صوبہ پنجاب کے شہر بہاولپور سے تھا، رسالپور اکیڈمی (جو کہ پاکستان میں فائٹر پائلٹ کا کورس کرانے والی سب سے اہم اور بڑی اکیڈمی میں شمار ہوتی ہے، 1910ء میں انگریزوں نے قائم کی تھی، یہاں پہلی جنگِ عظیم کے وقت فلائنگ کلب قائم کیا گیا، قیام پاکستان کے بعد 1948ء میں قائدِ اعظم محمد علی جناح نے رسالپور فلائنگ سکول کو کالج کا درجہ دیا، بعد میں جنرل ایوب خان نے 1967ء میں اِسے اکیڈمی میں تبدیل کردیا تھا۔) میں پاسنگ آؤٹ پریڈ کے موقع پر ان چاروں خواتین کی کامیابی پر

اُس وقت کے نائب آرمی چیف جنرل احسن سلیم حیات نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ہوئے کہا تھا کہ کامیاب پائلٹ خواتین نے مردوں کی طرح مشکل ترین تربیتی مراحل میں خود کو ثابت قدم رکھا۔

تیرہ جون 2013ء کو عائشہ فاروق نے پاک فضائیہ کی پہلی خاتون جنگجو فائٹر پائلٹ ہونے کا اعزاز حاصل کیا، یہ اعزاز انہوں نے فائٹر پائلٹ کا آخری امتحان پاس کرکے حاصل کیا، وہ اِس وقت پاک فضائیہ میں موجود پانچ خواتین لڑاکا پائلٹس میں واحد لڑاکا جیٹ اڑانے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور F-7PG خاتون پائلٹ ہیں جو چینی ساختہ پاک فضائیہ میں موجود دیگر مرد فائٹر پائلٹ کے شانہ بشانہ ملک کی فضائی سرحدوں کے تحفظ کا فریضہ سرانجام دینے کیلئے ہر گھڑی تیار ہیں، سر پر اسکارف اور پاک فضائیہ کے پروقار سبز یونیفارم میں ملبوس دکھائی دینے والی 26 سالہ عائشہ فاروق ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں، وہ اُن 19 پاکستانی خواتین میں سے ایک ہیں جنھوں نے گزشتہ دس سالوں میں پاکستان ایئر فورس سے تربیت حاصل کی، نازک جسامت عائشہ فاروق کے والد فاروق کا تعلق صوبہ پنجاب کے تاریخی شہر بہاولپور سے ہے، جن کے سات سال قبل انتقال کے بعد انہوں نے پاکستان ایئر فورس جوائن کرنے کا فیصلہ کیا، عائشہ فاروق کا کہنا ہے کہ "ہمارے معاشرے کی خواتین یہ سوچ بھی نہیں سکتیں کہ وہ جہاز جیسی چیز اڑائیں گی، خاندانی دباؤ عورتوں کو مسلح افواج

میں کام کرنے سے روکتا ہے کہ یہ مردوں کے کام ہیں،اِس قسم کی باتیں خواتین کو جنگی پائلٹ کی طرف بڑھنے سے روک دیتی ہیں، چنانچہ ابتداء میں انہیں بھی اپنی بیوہ اور غیر تعلیم یافتہ والدہ کی جانب سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا،تاہم انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور باالآخر پاکستان ائیر فورس میں شمولیت اختیار کر ہی لی، جہاں انہیں اپنی محنت اور صلاحیتوں کی بنیاد پر آگے بڑھنے کا مواقع ملا، خوش قسمتی سے انہیں کسی بھی مرحلے پر صنف نازک ہونے کے ناطے امتیازی سلوک کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

نرم گفتار عائشہ فاروق اِس وقت پاکستان کے گرم ترین علاقہ سرگودھا کی" مصحف ائیر بیس"جہاں ٹیمپریچر 50 ڈگری تک چلاجاتا ہے، میں تعینات ہیں، واحد خاتون جنگجو پائلٹ ہونے کے ناطے اپنے مرد ساتھیوں کے بارے میں عائشہ فاروق کا کہنا ہے کہ" انہیں کچھ مختلف نہیں محسوس ہوتا، ہماری سرگرمیاں ایک سی ہیں، دشمن پر بمباری کرنا ہمارا پیشہ ہے، وہ کہتی ہیں کہ اپنے ملک کے جغرافیائی محل وقوع اور دہشت گردی کی وجہ سے یہ بہت اہم ہے کہ ہر وقت تیار رہا جائے۔"عائشہ فاروق گزشتہ دہائیوں کے دوران پاکستان ایر فورس کی 19 ویں خاتون پائلٹ ہیں،اُن کے ساتھ پانچ خواتین اور بھی ہیں، تاہم ابھی انہیں جنگ میں شریک ہونے کے لئے فائنل ٹیسٹ کے مرحلے سے گزرنا ہے، قارئین محترم ! حقیقت یہ ہے کہ حالیہ برسوں میں خواتین کا یہ بدلا ہوا رویہ اِس بات کا عکاس ہے

کہ خواتین کا پاکستانی دفاعی افواج میں شمولیت کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے، سکواڈرن
کے ونگ کمانڈر نسیم کہتے ہیں کہ اب زیادہ تر خواتین فوج میں شمولیت اختیار کر رہی 20
ہیں، خود انھوں نے 25 خواتین پائلٹ تیار کی ہیں، جن میں عائشہ فاروق بھی شامل
اڑا سکتی ہیں۔ ونگ کمانڈر نسیم کہتے ہیں F-7PG ہیں، یہ پائلٹس بہ آسانی چینی جنگجو جہاز
کہ اگرچہ گزشتہ دہائیوں کے دوران عورتوں نے پاکستانی ہوائی سرحدوں کی خلاف
ورزی اور باغیوں کے حملوں کے حفاظتی کاموں میں پیش رفت کی ہے، مگر بہت کم
خواتین ''ایلیٹ انسداد دہشت گردی فورس'' کا حصہ بنی ہیں۔

ویسے تو پاکستان کی تینوں افواج میں طبی اور دیگر شعبوں میں خواتین کام کرتی ہیں، مگر
لڑاکا فورسز میں پاک فضائیہ نے بری اور بحری افواج پر سبقت حاصل کرتے ہوئے
خواتین کو بھرتی کیا، اِس وقت 316 خواتین پاک فضائیہ کا حصہ ہیں، جبکہ 5 سال قبل
یہ تعداد صرف 100 تھی، اسی طرح 4000 سے زائد خواتین بری فوج کے دیگر
شعبوں میں فرائض انجام دے رہی ہیں، حالانکہ پاکستانی خواتین پر میدان جنگ میں
لڑنے کیلئے اب بھی پابندی عائد ہے، مگر حالیہ برسوں میں پاکستان کی دفاعی فورسز میں
خواتین کی بڑھتی ہوئی تعداد اِس بات کا ثبوت ہے کہ خواتین کے رویوں میں تبدیلی
آرہی ہے اور وہ دفاع وطن کیلئے مردوں کے شانہ بشانہ اپنی قومی وملی خدمات ادا کرنے
کیلئے آگے آکر ایک نئی روایت کی

بنیاد رکھ رہی ہیں، جس میں عائشہ فاروق اور اُن کی ساتھی پائلٹس صبا خان، نادیہ گل، مریم خلیل اور سائرہ بتول سر فہرست ہیں، ہم اِن تمام قوم کی قابل فخر خواتین پائلٹس کے جوش وجذبے اور عزم و ہمت کو سلام کرتے ہیں، جنھوں نے اِس میدان میں اپنی قابلیت اور اہلیت ثابت کرکے آنے والی خواتین کیلئے نئے دروازے کھولے ہیں، ویل ڈن عائشہ فاروق، ویل ڈن.... ویل ڈن، صبا خان، نادیہ گل، مریم خلیل اور سائرہ بتول، ویل ڈن۔

یہ درست ہے کہ عورت اگرچہ صنف نازک ہے مگر اپنی صلاحیت، ذہانت اور سمجھ بوجھ میں صنف قوی سے کسی طور پر بھی کم نہیں ہے، تاریخ انسانی اِس بات کی گواہ ہے کہ ملک و قوم کو جب بھی کسی مہم جوئی کا سامنا کرنا پڑا تو خواتین نے مردوں کے شانہ بشانہ رہ کر ملک و قوم کی ترقی میں بھرپور کردار ادا کیا، ہماری تاریخ میں مسلمان خواتین کے مجاہدانہ کردار اور بہادری کے بے شمار واقعات موجود ہیں، قیام پاکستان کی تحریک میں سامراجی قوتوں کے خلاف محترمہ فاطمہ جناح، بیگم رعنا لیاقت علی خان اور بی اماں جیسی تاریخ ساز شخصیات نے اہم کردار ادا کیا اور بے شمار خواتین نے جانوں کی پرواہ کئے بغیر حیرت انگیز کارنامے سرانجام دے کر یہ ثابت کردیا کہ اُن کے کردار کے بغیر پاکستان کا وجود میں آنا بہت حد تک ناممکن سی بات تھی، تاریخ میں وہ منظر آج بھی محفوظ ہے جب پنجاب سول سیکرٹریٹ کی عمارت کے گرد سخت حفاظتی اقدامات کے باوجود

فاطمہ صغریٰ نامی سولہ سالہ لڑکی نے انگریز سامراج کا جھنڈا اتار کر پاکستان مسلم لیگ کا جھنڈا لہرایا تھا اور بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح بھی مسلم خواتین کے جوش و جذبے اور عزم و عمل سے متاثر ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ "بہنو اور بیٹیو! اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ میرا مشن کامیاب ہوگا،اس لیے کہ اب ہندوستان کی مسلمان عورت نے بھی آزادی کے مفہوم کو سمجھ لیا ہے...... مجھے فخر ہے کہ اب میری قوم کے مردوں کے شانہ بشانہ عورتیں بھی جنگ آزادی میں شریک ہوں گی۔" مسلمان خواتین نے جس طرح پاکستان کے حصول میں مثالی کردار ادا کیا، وقت کا تقاضا ہے کہ اب خواتین پاکستان کی سالمیت اور ملکی سرحدوں کے تحفظ و دفاع کیلئے بھی اپنا بھرپور انقلابی کردار ادا کریں، یہ مسلمہ اصول ہے کہ عورت اگر اپنے اندر انقلابی سوچ پیدا کرلے تو قوموں کی تقدیر بدلتے دیر نہیں لگتی۔

ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی ایک مدبر خاتون اور دینی اسکالر

آپ کی عملی زندگی اور مذہبی جدوجہد پاکستانی خواتین کیلئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے

جمعیت علماءپاکستان شعبہ خواتین کی صدر، سابق ممبر قومی اسمبلی اور اسلامی نظریاتی کونسل کی رکن، عظیم مذہبی سکالر ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی 7اگست 2013ء بمطابق 28 رمضان المبارک کو76 سال کی عمر میں کراچی میں انتقال کر گئی.ڈاکٹر فریدہ احمد طویل عرصے سے علیل اور ایک مقامی اسپتال میں زیر علاج تھیں، بدھ کو علی الصباح اُن کی طبیعت اچانک بگڑ گئی اور وہ اپنے خالق حقیقی سے جاملیں.اُن کے سوگواروں میں شریک حیات و ماہر معاشیات پروفیسر محمد احمد صدیقی ، دو صاحبزادے ڈاکٹر طلحہ صدیقی اورڈاکٹر جنید صدیقی کے علاوہ ایک صاحبزادی سمعیہ صدیقی شامل ہیں۔

ڈاکٹر فریدہ28 جون1935ء کو بھارت کے شہر میرٹھ میں پیدا ہوئیں، انھوں نے 1958 میں پوسٹ گریجویٹ کیا،آپ اعلیٰ فاضل بریلوی حضرت شاہ احمد رضا بریلوی کے خلیفہ خاص مبلغ اسلام حضرت علامہ شاہ عبد العلیم صدیقی کی بیٹی اور قائد

ملت اسلامیہ حضرت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کی ہمشیرہ تھیں، انہوں نے ایم اے کرنے کے بعد اپنے والد کی خواہش پر عالمہ کا کورس مکمل کیا اور بعد میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ،آپ نے متعدد کتابیں بھی تصنیف کیں،آپ ویمن اسلامک مشن کی سربراہ کے علاوہ مختلف اسلامی اور تعلیمی اداروں سے وابستگی کے ساتھ جامعہ کراچی سنڈیکیٹ کی رکن بھی تھیں،آپ کی نماز جنازہ جمعرات 8اگست کو بعد نماز ظہر حضرت عبداللہ شاہ غازی کے مزار کے احاطے میں جمعیت علمائے پاکستان کی سپریم کونسل کے رکن حضرت علامہ مفتی مولانا جمیل احمد نعیمی صاحب کی اقتداء میں ادا کی گئی،جس میں چیئرمین مرکزی رویت ہلال کمیٹی مفتی منیب الرحمٰن اورعلامہ جمیل احمد نعیمی سمت شہر کی مشہور و معروف سماجی و سیاسی شخصیات کے علاوہ عوام کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی بعد میں انہیں ڈیفنس گزری کے قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا۔

ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی قائد ملت اسلامیہ علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کے قائم کردہ ادارے ورلڈ اسلامک مشن کے زیر انتظام کراچی میں ایک ویمن اسلامک مشنری یونیورسٹی کی چانسلر بھی تھیں، جہاں خواتین کو جدید عصری علوم کے ساتھ ساتھ دینی علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں،ڈاکٹر فریدہ احمد نے پہلی کلاس سے لے کر پانچویں کلاس تک نصاب تعلیم بھی تیار کیا تھا جو متعدد سکولوں میں پڑھایا جاتا ہے۔آپ نے براعظم یورپ اور افریقہ سمیت دنیا کے بہت سے ممالک کا

تبلیغی دورہ بھی کیا،آپ 1970 ء میں عملی سیاست میں شامل ہوئیں اور تاحیات ملک
میں نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے متحرک رہیں اوراس سلسلے میں آپ نے
خواتین میں سیاسی شعور بیدار کرنے کے لئے ملک بھر کے مختلف علاقوں میں خواتین کے
ہزاروں اجتماعات سے خطاب بھی کیا،ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی نے تحریک ختم نبوت صلی
اللہ علیہ وسل اور تحریک نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوران بڑھ چڑھ کر حصہ
بھی لیا۔

ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی 2002 کے انتخابات میں ایم ایم اے کے پلیٹ فارم سے
خواتین کی مخصوص نشست پر ممبر قومی اسمبلی بنی اور اسمبلی میں انہوں نے نومبر 2006
ء میں حکومت کی طرف سے پیش کردہ حقوق نسواں بل کی شدید مخالفت کرتے ہوئے
اسے " فحاشی پھیلاؤ بل "قرار دیا اور احتجاجاً سب سے پہلے اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ
دیتے ہوئے کہا تھا کہ " تحفظ حقوق نسواں بل غیر آئینی اور قرآن و سنت کے منافی ہے
اور آئین کے مطابق اسمبلی قرآن و سنت کے منافی قانون سازی نہیں کر سکتی۔"انہوں
اسلامی تعلیمات کے منافی اِس بل کے خلاف متعدد کتابچے بھی تحریر کرکے شائع کرائے۔
ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی نے بھرپور عملی زندگی گزاری، جس کے دوران انہوں نے مختلف
ممالک کے دورے کیے اور رکن قومی اسمبلی بھی منتخب ہوئیں، اسلامک

یونیورسٹی انٹرنیشنل کی چانسلر ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی 2002 کے عام انتخابات میں مجلس عمل کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں،آپ اسلامی نظریاتی کونسل کی رکن بھی تھیں اور ویمن اسلامک مشن نامی تنظیم کی روح رواں تھیں، آپ سندھ زکوۃ کونسل کے ساتھ جنرل مشرف کے دور میں حدود آرڈیننس کے تنازع کے حل کیلئے قائم کی گئی کمیٹی کی رکن بھی رہیں،ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی فلاحی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کا حصہ لیتی تھیں اور ہر سال درجنوں اجتماعی شادیوں کا اہتمام کرتی تھیں،آپ نے کشمیر میں زلزلے اور سیلاب کے دوران متاثرین کی امداد میں اہم کردار ادا کیا، ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی انتہائی متقی، مہمان نواز اور با اخلاق خاتون تھیں اور فارغ اوقات میں قرآن پاک کی تلاوت کے علاوہ دینی کتابوں کا مطالعہ پسند کرتی تھیں۔

کہتے ہیں کہ ایک کامیاب مرد کی فتوحات کے پیچھے ایک خاتون کا ہاتھ ہوتا ہے، یہ خاتون کبھی بیوی کی شکل میں ہوتی ہے اور کبھی ہمشیرہ کی صورت میں۔ اس کی ایک بڑی مثال بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح علیہ الرحمہ کے ساتھ ہر قدم پر ان کی عظیم ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح کی ہے، جن کے بھرپور تعاون سے قائداعظم علیہ الرحمہ پاکستان بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ دوسری بڑی اور نا قابل فراموش مثال عزت مآب محترمہ ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی کی ہے جن کی ثابت قدمی نے مولانا شاہ احمد نورانی علیہ الرحمہ کی لیڈر شپ کو چار چاند

لگادیئے، 1977ء کی تحریک نظام مصطفیٰ کے دوران جب اس وقت کی حکومت نے تحریک کے ہیرو اور قائد مولانا شاہ احمد نورانی علیہ الرحمہ کو ان کی عوامی مقبولیت سے خوفزدہ ہوکر جیل میں بند کردیا تو یہ ڈاکٹر فریدہ ہی تھیں جو جون، جولائی کی شدید گرمی میں قومی اتحاد کے جلسوں سے خطاب کرتے ہوئے اسلام دشمن عالمی سامراج اور نظام مصطفیٰ کے دشمنوں کو للکارتی رہیں، انہوں نے نشترپارک کراچی کے لاکھوں افراد کے جلسہ میں تاریخی جملہ کہا کہ " حکمرانو! ڈرواُس وقت سے جب میرا بھائی جیل سے باہر آیا تو انقلاب آجائے گا۔" یہی ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی تھیں جنھوں نے پاکستانی خواتین کی رہنمائی کرتے ہوئے تعلیم، انسان دوستی اور سماجی خدمت کے شعبوں میں گراں قدر خدمات انجام دیں، بے شک ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی کی عملی زندگی اور مذہبی جدوجہد پاکستانی خواتین کیلئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے اور آپ کی دینی اور قومی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی، ڈاکٹر فریدہ کی وفات سے ملک ایک مدبر خاتون اور مخلص دینی سکالر سے محروم ہوگیا ہے۔

اسلامی نظام تجارت و معیشت اور دور جدید کی معاشیات

زندگی میں تجارت اور معیشت کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔اچھی و منافع بخش تجارت مضبوط اور مستحکم معیشت کو جنم دے کر ملک و قوم کی ترقی کا باعث بنتی ہے۔اسلام دینِ کامل ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں رہبری و رہنمائی کیلئے جامع اصول و قواعد فراہم کرتا ہے۔ تجارت و معیشت پر شارح اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی شرح وبسیط کے ساتھ روشنی ڈالی،تاکہ اِس شعبے کو جھوٹ، دھوکہ دہی،ملاوٹ، جھوٹی قسمیں کھانے اور ذخیرہ اندوزی و منافع خوری جیسی تجارتی خرابیوں سے دور کیا جاسکے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں"جو شخص (تاجر) خرید تا اور بیچتا ہے اُسے پانچ خصلتوں یعنی" سوداور قسم کھانا، مال کا عیب چھپانا، بیچتے وقت تعریف کرنااور خریدتے وقت عیب نکالنے " سے دوری اختیار کرنا چاہئے،ورنہ نہ وہ ہرگز خریدے اور نہ بیچے۔"اسلامی تعلیمات کی رُو سے جو شخص مسلمانوں کے بازار میں تجارتی کاروبار کرتا ہے اُس میں کچھ مشخص صفات و خصوصیات کا ہونا بہت ضروری ہے،یعنی اُس میں خرید وفروخت کی عقل موجود ہو اور وہ (صاحبِ تفقہ) خرید و فروخت کے احکام کا علم رکھتا ہو۔اسلام معیشت کے بارے میں یہ بنیادی تصورات فراہم کرتا ہے کہ کسب وصَرف یعنی مال کا حاصل کرنا اور اُس کا خرچ کرنا اِس طور پر

ہو کہ وہ افراد اور سماج کیلئے نفع بخش ہو، نقصان دہ نہ ہو، اسلام نے ایسی چیزوں کی
تجارت سے منع کیا جو لوگوں کیلئے نقصان دہ ہو، جیسے نشہ آور منشیات وغیرہ۔اسلام
تجارت میں احتکار سے منع کرتا ہے،اسی طرح خرچ کرنے میں بھی فرد اور سماج کے نفع
و نقصان کو ملحوظ رکھا گیا ہے، فضول خرچی کی ممانعت اِس لیے کی گئی کہ اِس سے قومیں
معاشی پسماندگی میں مبتلا ہوتی ہیں اور تعلیم و صحت اور دیگر معاشرتی مفید کاموں میں
خرچ نہیں کرپاتی، جبکہ اسلام نے اِس بات کو بڑی اہمیت دی کہ دولت کا ارتکاز چند
ہاتھوں تک محدود نہ رہے، بلکہ وہ زیادہ سے زیادہ تقسیم ہو کر گردش میں رہے۔
دین اسلام میں نفع کا بھی ایک جائز فطری تصور موجود ہے اور نفع خوری کی مد میں سود
کو حرام قرار دیا گیا ہے، کیونکہ یہ ایک غیر فطری چیز ہے، خود پیسوں سے پیسے پیدا نہیں
ہو سکتے، جبکہ سود خور یہ فرض کرکے نفع یعنی سود وصول کرتا ہے کہ اُس کے پیسوں سے
لامحالہ پیسوں میں اضافہ ہوگا،اسی طرح اسلام میں انسانی محنت کو بڑی اہمیت دی گئی
ہے، فطری اصول یہ ہے کہ جب تک مال کے ساتھ انسانی محنت کی شمولیت نہ ہو، وہ
منافع بخش نہیں ہوتا،اسی اصول پر اسلام میں استثمار کے طریقوں میں مضاربت اور
مزارعت شامل ہے، مضاربت میں ایک شخص کا سرمایہ ہوتا ہے اور دوسرے کی محنت
اورمزارعت میں ایک شخص کی زمین ہوتی ہے اور دوسرے کی محنت، دونوں صورتوں
میں یہ ضروری ہے کہ فریقین کی رضامندی ہو

اور کہ محنت کار کے نفع کا تناسب زیادہ رکھا جائے۔ اسلام کے پورے نظام حیات میں اِس بات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے کہ کوئی ایسا عمل نہیں ہونا چاہئے، جو فطرت سے بغاوت پر مبنی ہو، اِسی لیے تلقی جلب، بیع حاضر للبادی، تناجش اور احتکار وغیرہ کو منع کیا گیا، کیوں کہ اِن تمام صورتوں میں قیمتوں میں غیر فطری اتار چڑھاؤ پیدا کیا جاتا ہے، آج کل تشہیری وسائل اور ترغیبی اشتہارات کے ذریعہ مصنوعی طور پر چیزوں کی طلب بڑھائی جاتی ہے، یہ بھی اسلام کی نظر میں پسندیدہ عمل نہیں ہے، چنانچہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت میں جھوٹ بولنے اور دھوکہ دینے سے منع فرمایا ہے اور کسی چیز کے فائدہ کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرنا اور اُس کے نقصانات کے پہلو پر پردہ ڈالنا بھی جھوٹ میں داخل ہے، جس کا زبردست مظاہرہ موجودہ دور کے اشتہارات میں ہمیں نظر آتا ہے۔

دنیا میں اسلام کے نظام معیشت کے مقابلے میں دو بڑے معاشی نظام وجود میں آئے، ایک اشتریکیت دوسرا سرمایہ دارآنہ نظام۔ اشتراکیت نے ستر سالہ تجربہ کے بعد اپنی ہی جائے پیدائش میں دم توڑدیا اور اگر آج کہیں باقی بھی ہے تو وہاں اُس نے اپنے بعض بنیادی تصورات سے ہی سبکدوشی قبول کرلی ہے، اشتراکیت کے مقابلے میں اسلام کا تصور یہ ہے کہ بنیادی ضرورتیں سب کو مہیا ہوں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ معاشی معیار بھی سب کا ایک جیسا ہی ہو، اسی طرح اسلام انفرادی ملکیت کا قائل ہے، لیکن افراد پر اِس بات کو واجب قرار دیتا ہے کہ

وہ اپنے مال میں سماج کا حق محسوس کریں اور مفلس و نادار طبقے کی مدد کریں۔زکوۃ اور صدقات و خیرات اسی کی مختلف اشکال ہیں، ساتھ ہی شریعت اسلامی میں زیادہ تر قدرتی وسائل کو حکومت کی ملکیت قرار دیا گیا ہے،تاکہ اُس کا نفع زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام بھی اِس وقت موت وزیست کی کیفیت میں بتلا ہے۔اِس نظام نے افراد کو ایسا بے لگام بنادیا کہ اُن کیلئے کوئی اخلاقی سرحد نہیں رہی، سرمایہ دارانہ نظام کی سب سے بڑی خرابی سود اور قمار کی اجازت ہے، جو نفع حاصل کرنے کے غیر فطری طریقے ہیں۔اِس میں مال کو مبالغہ آمیز اہمیت دی جاتی ہے اور مزدوروں کی محنت کو کوئی خاص درجہ مقرر نہیں، یہ نظام ذخیرہ اندوزی کی اجازت دیتا ہے، جو معاشرے کے غریب لوگوں کے ساتھ ظلم ہے ۔اِس میں مصنوعی طور پر صارفیت کو بڑھایا جاتا ہے اور اشتہارات اور بے جا ترغیبات کے ذریعہ معاشرے کا مزاج بنایا جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ضروریات پر قانع نہ رکھے، بلکہ خواہشات کا غلام بن جائے اور اپنی صلاحیت سے زیادہ خرچ کرے، تاکہ سرمایہ داروں کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچے،اب چاہے غریب و نادار طبقے کے لوگ قرض اور فضول خرچی کے بوجھ کے نیچے دب کر ہی کیوں نہ مر جائیں۔

جبکہ اسلام کے معاشی نظام انسانیت کی حقیقی فلاح و بہبود اور معاشی اعتبار سے عدل کے قیام کا مظہر ہے،اسلام نے مثبت طور پر رزق کی جد وجہد کی ترغیب

دی اور اسے ہر مسلمان پر فرض کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا"جب تم فجر کی نماز پڑھ لو تو اپنی روزی کی تلاش سے غافل ہو کر سوتے نہ رہو"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا"جو شخص دنیا کو جائز طریقے سے حاصل کرتا ہے کہ سوال سے بچے اور اہل وعیال کی کفالت کرے اور ہمسایہ کی مدد کرے تو قیامت کے دن جب وہ اُٹھے گا تو اُس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح روشن ہوگا۔"اسلامی معاشیات کا ایک اساسی اصول یہ ہے کہ تمام انسانوں کیلئے معاشی سہولتیں فراہم کی جائیں، قدرت کے ودیعت کردہ وسائل کو ترقی دی جائے، رزق کے مخزنوں کو چند ہاتھوں میں اِس طرح مرکوز نہ ہونے دیا جائے کہ دوسروں پر اُس کے دروازے بند ہوجائیں،اسلام کے معاشی نظام کے مثبت معاشی مقاصد میں غربت کا انسداد اور تمام انسانوں کو معاشی جد وجہد کے مساوی مواقع فراہم کرنا بڑی اہمیت کا حامل ہے،اسلام سب کو حصول رزق کے مواقع عطا کرنے اور مثبت طور پر ایسی حکمت عملیاں بنانے کی تاکید کرتا ہے،جس سے غربت وافلاس ختم ہو اور انسانوں کو اُن کی بنیادی ضروریات لازماً حاصل ہوں اور اُن تمام ذرائع کو ممنوع قرار دیا ہے جو ظلم وزیادتی اور دوسروں کی حق تلفی پر مبنی ہوں، اسلام محض افلاس، غربت، معیار زندگی کے گرنے کے خطرات اور قلت وسائل کے غوغا ء سے انسان کشی اور نسل کشی کی پالیسی کی اجازت نہیں دیتا،قرآن واضح تنبیہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ " تم اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم ہی اُن کو رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی،اُن کا مارنا

بڑی خطاہے۔" درحقیقت اسلام کا مزاج مغرب کی تمام معاشی تحریکات سے منفرد اور جداگانہ ہے، وہ ہر فرد اور پوری اُمت کی توجہ کو معاشی وسائل کی ترقی اور پیداواری امکانات سے پورا پورا فائدہ اٹھانے میں مرکوز کرتا ہے، معاشرت میں انصاف اور آزادی کے قیام کے ساتھ ساتھ غربت وافلاس کا انسداد کرکے بہتر معاشی زندگی کا قیام ممکن بناتا ہے، قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں رزق حلال کی جتنی اہمیت بیان کی گئی ہے، وہ اِس اَمر پر دلالت کرتی ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں صرف جائز اور حلال رزق کے فروغ کے مساعی ہوں گی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں" کسی نے بھی اپنے ہاتھ کے کمائے ہوئے عمل سے زیادہ بہتر طعام نہیں کھایا، اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتے تھے۔" اسلام نے معاشی جد وجہد کو حلال وحرام کا پابند کیا ہے، یہ ایک ایسا اصول ہے جس سے دور جدید کی معاشیات قطعاً ناآشنا ہے، اسلامی معیشت میں صرف کی تکثیر کی جگہ اس کے انسب سطح کا حصول پیش نظر رہتا ہے اور ایک حقیقی فلاحی معیشت ظہور میں آتی ہے، اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ایک حرمت ربوا ہے جو معاشی ظلم کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اسلام میں سود کو اس کی ہر شکل میں حرام قرار دیا ہے اور اس کے لینے والے کو اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اعلان جنگ قرار دیا ہے، درحقیقت اسلام نے تجارتی اخلاقیات کا ایک ضابطہ پیش کیا ہے، اسلام تجارتی لین دین

میں دیانت داری اور خدا ترسی کے جذبات کو فروغ دیتا ہے اور اُن تمام ذرائع کو ممنوع قرار دیا ہے جو ظلم وزیادتی اور دوسروں کی حق تلفی پر مبنی ہوں، اسلام تجارت کے سلسلے میں باہمی آمراد رضامندی کی تلقین کرتا ہے، تجارت کی بنیاد تعاون باہمی پر ہے،اس کے ساتھ ساتھ دیانت، جائز اور مباح کی تجارت، ذخیرہ اندوزی کی ممانعت،اسراف کی بندش بھی عائد کرتے ہوئے کہتا ہے، "کلوا واشربوا ولا تسرفوا" کھاؤ اور پیو مگر اسراف نہ کرو۔اسلام دولت کے ارتکاز کو پسند نہیں کرتا اوراس بات کا نصرام کرتاہے کہ مختلف معاشرتی،ادارتی، قانونی اور اخلاقی تدابیر سے دولت کی تقسیم زیادہ سے زیادہ منصفانہ ہو اور پورے معاشرہ میں گردش کرے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں" اللہ تعالی کی کتاب کے مطابق اپنا مال اُن لوگوں میں تقسیم کرو جن کا حق مقرر کیا گیا ہے۔

درحقیقت اسلام جہاں معاشی ترقی کا خواہاں ہے، وہاں دینی، روحانی اور اخلاقی ہدایات کا معلم بھی ہے،اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی کرکے فلاحی نظامِ معیشت کا قیام ممکن نہیں ہے،اسی لیے اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ انسان حصولِ مال کی خاطر شتر بے مہار بن جائے اور حلال و حرام کا امتیاز ہی ختم کرڈالے،آج اسلامی تعلیمات سے ناآشنا بعض حلقے یہ پراپیگنڈہ کرتے ہیں کہ معیشت و تجارت کے بارے میں اسلامی احکام پر عمل کرنے سے ہمارا اسار

اکاروبار ٹھپ ہو جائے گا اور ہم معاشی اعتبار سے بہت پیچھے رہ جائیں گے، مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ حقیقی اور دیرپا ترقی کیلئے تجارتی سرگرمیوں کو مناسب اصول و ضوابط کے دائرہ میں رکھنا انتہائی ضروری ہے، اقتصادی ماہرین کے نزدیک ہمارے موجودہ معاشی و اقتصادی بحران کا بنیادی سبب معاشی سرگرمیوں کا اخلاقی قیود اور پابندیوں سے مستثنیٰ ہونا ہے اگر یہ ناقدین اسلام کے تجارتی احکام کا حقیقت پسندی سے جائزہ لیں تو خود گواہی دیں گے کہ اسلامی طریقہ تجارت میں شتر بے مہار آزادی، ہوس، مفاد پرستی اور خود غرضی کو کنٹرول کرنے کا شاندار نظام اور طریقہ کار موجود ہے جو معاشرے کے اجتماعی مفادات کا تحفظ کرتا ہے اور معاشی بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں کو روکتا ہے، آج بھی ہم اپنی تجارت و معیشت کو اسلام کے ان جامع اصولوں کی روشنی میں صحت مند بنیادوں پر استوار کر ایک مضبوط و مستحکم معیشت کی بنیاد رکھ سکتے ہیں، یاد رکھیں جب تک کسی معاشرہ کے معاشی اور مالی معاملات مناسب اصول و ضوابط کے پابند نہ ہوں، اُس وقت تک اس معاشرہ کی منصفانہ تشکیل ممکن نہیں ہو سکتی۔

قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوانے والی قرار داد........ تاریخی حقائق کیا کہتے ہیں؟

سات ستمبر یوم تحفظ ختم نبوت کے حوالے سے خصوصی تحریر
ایک تحقیقی وتاریخی مطالعہ
قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوانے والی قرارداد........ تاریخی حقائق کیا کہتے ہیں؟

"ایک جھوٹ کو اتنی بار دہراؤ کہ لوگ اُسے سچ سمجھنے لگیں۔"ہٹلر کے وزیراطلاعات جوزف گوئبلز کا یہ مقولہ آج ایک ایسے مستقل شیطانی حربے کی شکل اختیار کرچکا ہے جس کا دائرہ کار اب سیاسی کارکنان، قائدین اور ارباب اقتدار تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ مخصوص مذہبی و دینی شخصیات، صاحب علم و دانش اور کچھ نام نہاد محققین بھی اِس کی لپیٹ میں آچکے ہیں، المیہ یہ ہے کہ اِس "جھوٹ" کی شرانگیزی میں اُس وقت مزید اضافہ ہو جاتا ہے جب جھوٹ بولنے والا دینی عالم وفاضل، شیخ الحدیث اور منصب افتاء پر فائز ہو اور اچھی طرح جانتا ہو کہ ایک مومن دیگر اخلاقی کمزوریوں اور خرابیوں میں مبتلا ہونے کے باوجود کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا ہے، دین اسلام جھوٹ، غیبت اور منافقانہ طرز عمل

کی سختی سے ممانعت کرتا ہے، مگر ہمارے یہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو سچائی کو چھپانے کیلئے جھوٹ پر جھوٹ بولتے ہیں، حقیقت کو جھٹلاتے ہیں، تاریخ کو مسخ کرتے ہیں اور لغو و من گھڑنت تاریخ سازی کرکے اپنی کوتاہیوں، بداعمالیوں اور قومی و ملی جرائم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں، اِس طبقہ فکر میں خاص طور پر وہ لوگ بھی شامل ہیں جنھوں نے 1857ء کی جنگِ آزادی سے لے کر 1947ء میں قیام پاکستان تک، انگریز اور ہندو بنیئے کی خدمت و کاسہ لیسی کی، اسلامی تعلیمات کی نت نئی توضیح و تشریح پیش کی، اسلامی نظریہ قومیت (مسلم قومیت) کے مقابلے میں " اوطان" کو قومیت کا ماخذ قرار دیا، متحدہ قومیت کا راگ الاپا، ہندو مسلم بھائی بھائی کے نعرے لگائے، اُنہیں مساجد کے منبروں پر بیٹھایا، اُن کی خوشنودی کیلئے مسلمانوں کو شعائر اسلامی سے روکنے کے فتوے دیئے، علیٰ الاعلان کانگریس کا ساتھ دیا، نظریہ پاکستان اور تحریک پاکستان کی بھرپور مخالفت کی اور نہ صرف مسلمانان برصغیر کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کیں بلکہ پاکستان کو "پلیدستان" اور قائداعظم محمد علی جناح کو "کافراعظم" تک قرار دیا، کہنے والوں نے یہاں تک کہا کہ "کسی ماں نے ایسا بچہ نہیں جنا جو پاکستان کی "پ" بناسکے۔

اِن لوگوں کی بداعمالیاں کسی سے مخفی نہیں، تاریخ کے صفحات اِن کے سیاہ کارناموں سے بھرے پڑے ہیں، مگر جب 14 اگست 1947ء کو قیام پاکستان نے اُن کے

تمام مذموم عزائم اور ناپاک ارادوں کو خاک میں ملادیا، تواُن کے پاس اِس کے سوا کوئی راستہ نہیں بچاکہ اپنے اکابرین کے شرمناک کردار وعمل کو چھپایا جائے۔اُن کے منفی کردار وعمل پر پردہ ڈالا جائے، چنانچہ انہوں نے منظم انداز یں‌تاریخ کو نئے سانچے میں ڈھالنے کے کام شروع کردیااور اپنی شرمندگی، خجالت اور قومی جرائم کو چھپانے کیلئے حقائق کو مسخ کرکے نئی تاریخ سازی کی ابتداء کی جوآج بھی باقاعدہ منظم منصوبہ بندی کے تحت جاری ہے۔ حال یہ ہے کہ آج ہمارے تعلیمی نصاب میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوچکی ہیں، تعلیمی نصاب کی شکل بگاڑی دی گئی، نتیجہ ہماری نئی نسل اپنی ہی حقیقی تاریخ سے بے بہرہ ہے،آج ہمارا تعلیمی نظام اِس حد تک منقسم ہے کے آپ اگر منظور شدہ تاریخ سے روح گردانی کے مرتکب ہوئے تواُس کی سزاامتحان میں صفراور نتائج میں ناکامی کے مترادف ہے،المیہ یہ ہے کہ ہم نے سوال کو جرم قرار دے دیا ہے اور یہ فرض کر لیا ہے کے اِس ترکیب کے ذریعے شاید ہم سچ کو دبا پائیں، لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کے وہ عمارت جس کی بنیاد ہی جھوٹ پر ہو وہ کب تک قائم رہ سکتی ہے، کیا جھوٹ کبھی بھی سچ کا متبادل ہو سکتا ہے۔؟کیا حقیقت ہمیشہ جھوٹ کے پردوں میں دبی رہ سکتی ہے۔؟، ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ اگر سچ کبھی افشاں ہوگا تواُس کا نتیجہ کیا نکلے گااور کیا یہ درست نہیں کہ یہ لوگ اِس بات کی پرورش نہیں کررہے کہ "جھوٹ سچ سے بہتر ہے"۔

آج یہ مخصوص مکتبہ فکر اپنے فائدے کیلئے تاریخ کے ساتھ جو علمی بددیانتی کر رہا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے، مگر تاریخ کو دھوکہ دینا اتنا آسان نہیں ہے، چاہے تاریخ فاتح ہی کیوں نہ لکھے، آج تاریخ میں تیمور فاتح اعظم ہو کر بھی کس لقب سے مقبول ہے سب جانتے ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ تاریخ" فاتح" لکھتا ہے۔"مگر وہ اِس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ فاتح جو تاریخ لکھتا ہے وہ فتح ایک قوم یا ایک علاقے پر پاتا ہے ، تاریخ پر نہیں۔ جبکہ سچ اپنا راستہ خود ڈھونڈ لیتا ہے، لیکن جھوٹ کو قائم رکھنے کیلئے مزید جھوٹ بولنے پڑتے ہیں، بدقسمتی سے پاکستان میں پائے جانے والے کچھ لوگوں نے سچ کو جھوٹ کے کمبل میں لپیٹ رکھا ہے، مگر تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ حق و باطل کے معرکے میں آخری فتح سچ کا مقدر بنتی ہے، سچ کو شکست دینا، دبا دینا یا روک دینا کسی بھی قوت کیلئے ممکن نہیں ہوتا، سچ دھرتی کا سینہ چیر کر نمودار ہو جاتا ہے اور اپنے ہونے کی خود ہی گواہی بن جاتا ہے۔

قارئین محترم !آج ہم کچھ ایسی تاریخی حقیقتیں آپ کے سامنے لا رہے ہیں جس کے بارے میں اِس مخصوص مکتبہ فکر نے علمی بددیانتی سے کام لیتے ہوئے حقائق کو بدلنے کی کوشش کی اور اِس کا سہرا اپنے اکابرین کے سر باندھنا چاہا، مگر بالآخر سچ سامنے آ ہی گیا اور اپنے ہونے کی خود ہی گواہی بن گیا۔آیئے دیکھتے ہیں کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے والی تاریخ ساز قرارداد کے

حوالے سے اصل حقائق کیا کہتے ہیں۔

سات ستمبر کا دن مسلمانان پاکستان کیلئے خصوصی طور پر اور عالم اسلام میں بسنے والے مسلمانوں کیلئے عمومی طور پر ایک یادگار اور تاریخی دن کی حیثیت رکھتا ہے، یہ دن جب ہر سال لوٹ کر آتا ہے تو ہمیں اُس تاریخ ساز فیصلے کی یاد دلاتا ہے جو پاکستان کی قومی اسمبلی نے عقیدہ ختم نبوت کی حقانیت کا برملا اور متفقہ اعلان کرتے ہوئے جاری کیا تھا اوراِس عظیم اور تاریخ ساز فیصلے کی رُو سے مرزا غلام احمد قادیانی اور اُس کو ماننے والی تمام ذریت (احمدی اور لاہوری گروپ) کو کافر قرار دے کر دائرہ اسلام سے خارج قرار دے دیا گیا۔اَمر واقعہ یہ ہے کہ 7 ستمبر 1974ء کو پاکستان کی قومی اسمبلی کے اِس متفقہ فیصلے کا اصل محرک علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کی تیار کردہ وہ قرار داد تھی، جو آپ نے 30 جون 1974ء کو قومی اسمبلی میں پیش کی،چونکہ قرار داد پیش ہونے سے لے کر 7 ستمبر 1974ء کو قرار داد کی منظوری تک ہونے والے اسمبلی کے "اِن کیمرہ" اجلاس تھے اوراُن کی نشرواشاعت پر پابندی تھی،اِس وجہ سے عرصہ دراز تک اصل حقیقت پس پردہ رہی اوراِس مخصوص مکتبہ فکر نے اِس صورتحال کا بھرپور فائدہ اٹھا کر حقائق کو مسخ کرنے کی پوری کوشش کی،انہوں نے اِس حوالے سے کئی کتابیں شائع کیں، جن میں قرار داد کے اصل محرک اور قرار داد پر دستخط کرنے والوں کی ترتیب میں ردوبدل کرکے تاریخی حقیقت پر نہ صرف پردہ

ڈالا، بلکہ اپنے لوگوں کو ہیرو بنا کر بھی پیش کیا گیا، جبکہ اصل حقیقت اِس کے برخلاف تھی، چنانچہ ہم ذیل میں پاکستان قومی اسمبلی کے ریکارڈ کی روشنی میں آج اسی حقیقت سے پردہ اٹھا رہے ہیں، مگر اِس سے قبل آپ کے سامنے اِس مخصوص مکتبہ فکر کی چند حوالہ جات جو کہ سراسر جھوٹ، فریب اور دروغ گوئی پر مبنی ہیں، کو پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

آیئے پہلا حوالہ دیکھتے ہیں، مولوی اللہ وسایا اپنی کتاب "تحریک ختم نبوت "جلد سوم شائع کردہ عالمی مجلس ختم نبوت حضوری باغ ملتان جون 1995ء کے صفحہ 467 پر اپوزیشن کی قرارداد"کا عنوان قائم کرکے لکھتے ہیں"قومی اسمبلی میں آج صبح قادیانیوں" کے مسئلہ سے متعلق حزب اختلاف کی طرف سے مولانا شاہ احمد نورانی نے جو قرارداد پیش کی اور جسے ایوان نے متفقہ طور پر منظور کرلیا،اُس پر اپوزیشن کے 23 حاضر اور سرکاری پارٹی کے 3 ارکان کے دستخط ہیں،اُن کے نام یہ ہیں، مولانا مفتی محمود، مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا عبدالمصطفیٰ الازہری، پروفیسر غفور احمد، مولانا سید محمد علی رضوی، مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک، چودھری ظہور الٰہی، سردار شیر باز مزاری، مولانا ظفر علی انصاری، مخدوم نور محمد ہاشمی، صاحبزادہ احمد رضا قصوری، محمود اعظم فاروقی، مسٹر غلام فاروق، عبدالحمید جتوئی، حاجی مولا بخش سومرو، مولانا صدر الشہید، سردار شوکت حیات خان، مولانا نعمت اللہ، عمرا خان، راؤ خورشید علی

خان، میر علی احمد تالپور.... ماضی میں حکومت کا ساتھ دینے والے اپوزیشن کے اِن ارکان نے بھی دستخط کئے، مسلم لیگ کے نواب ذاکر قریشی، کرم بخش اعوان، غلام حیدر ڈھانڈلہ، جمعیت علماءپاکستان کے غلام حیدر بھروانہ اور صاحبزادہ نذر سلطان۔اِس جماعت کے غلام ابراہیم برق نے ساتھیوں کے زور دینے کے باوجود قرار داد پر دستخط نہیں کیے۔
"

قارئین محترم! مندرجہ بالا اقتباس آپ کے سامنے ہے، جس میں کئی غلط بیانیاں موجود ہیں،پہلی غلط بیانی یہ ہے کہ اللہ وسایا صاحب مولانا مفتی محمود کا نام سب سے پہلے لکھ رہے ہیں، جبکہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے بلکہ سر فہرست مولانا شاہ احمد نورانی کا نام ہے،اپنی بات کا ثبوت ہم آگے آپ کے سامنے پیش کررہے ہیں،دوسری غلط بیانی یہ کہ اللہ وسایا صاحب قرار داد پر دستخط کرنے والے 23 اپوزیشن اور 3 سرکاری ارکان سمیت کل 26 اراکین کا ذکر کررہے ہیں، جبکہ پاکستان قومی اسمبلی ریکارڈ (جو کہ آگے پیش ہے) یہ بتاتا ہے کہ قرار داد پر 22 ارکان نے دستخط کئے تھے،جناب رئیس عطا محمد خان مری بھی اُن اراکین پارلیمنٹ میں شامل تھے جنھوں نے سب سے پہلے اِس قرار داد پر دستخط 22 کئے، مگر مولوی اللہ وسایا کی فہرست میں رئیس عطا محمد خان مری کا نام شامل نہیں ہے، جو اچنبے کی بات ہے، جبکہ 15 ارکان اسمبلی جن کے بارے میں معتبر روایات موجود ہیں، کہا جاتا ہے کہ اُنھوں نے بعد میں قرار داد پر دستخط کئے

تھے۔اِس طرح قرار داد پر دستخط کرنے والوں کی کل تعداد 37 ہو جاتی ہے، 26 نہیں۔ یہاں یہ واضح رہے کہ "نواب ذاکر قریشی، کرم بخش اعوان، غلام حیدر ڈھانڈلہ، غلام حیدر بھروانہ اور صاحبزادہ نذر سلطان" کا تعلق اُن 15 ارکان سے ہے جنھوں نے بعد میں قرار داد پر دستخط کئے تھے۔اِس قتباس میں تیسری اور چوتھی غلط بیانی جو کہ حقیقتاً سراسر جھوٹ ،فریب اور منافقت پر مبنی ہے ،وہ یہ کہ مولوی اللہ وسایا لکھتے ہیں کہ "اِس جماعت (یعنی جمعیت علماءپاکستان) کے غلام ابراہیم برق نے ساتھیوں کے زور دینے کے باوجود قرار داد پر دستخط نہیں کیے۔"

مولوی اللہ وسایا کی یہ بات خود اُن کی اپنی کتاب "پارلیمنٹ میں قادیانی شکست" (جو کہ پہلے "تاریخی قومی دستاویز 1974" کے نام سے چھپ چکی ہے) سے ہی غلط ثابت ہوجاتی ہے، جس کے صفحہ 30 پر قرار داد پر دستخط کرنے والوں کی فہرست کی ترتیب 28 پر مولانا موصوف خود لکھتے ہیں کہ "میاں محمد ابراہیم برق "نے بعد میں قرار داد پر دستخط کئے تھے۔اِس مقام پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولوی اللہ وسایا صاحب ایک طرف میاں محمد ابراہیم برق کی آڑلے کر جمعیت علماء اسلام کے مولوی غلام غوث ہزاروی اور مولوی عبدالحکیم کے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے والی قرار داد پر دستخط نہ کرنے کے شرمناک عمل پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں، جنھوں نے اپنے ساتھیوں کے اصرار کے باوجود آخرتک

قرار داد پر دستخط نہیں کئے تھے۔اُن کے اِس طرز عمل کا اظہار مولانا شاہ احمد نورانی اپنے انٹرویو میں کرتے ہوئے کہتے ہیں "ہزاروی اور اُن کے ساتھی مولانا عبدالحکیم نے تو 30 جون والی قرار داد پر دستخط تک نہیں کیے۔" (ماہنامہ ضیائے حرم، ختم نبوت نمبر دسمبر 1974ء) اور" جمعیت علماء اسلام کے مولوی غلام غوث ہزاروی اور مولوی عبدالحکیم بار بار کہنے کے باوجود یہ سعادت حاصل نہ کرسکے۔" (ماہنامہ ضیائے حرم، ختم نبوت نمبر دسمبر 1974ء) دوسری طرف وہ میاں محمد ابراہیم برق کو جمعیت علماء پاکستان کا ممبر اسمبلی قرار دے کر جمعیت علماء پاکستان پر الزام تراشی کے بھی مرتکب ہورہے ہیں،یہ درست ہے کہ غلام ابراہیم برق نے جمعیت علماء پاکستان کے ٹکٹ پر الیکشن لڑا،مگر ممبر اسمبلی بننے کے بعد اُنھوں نے بھی غلام حیدر بھروانہ اور صاحبزادہ نذر سلطان کی طرح اپنی ہمدردیاں حکومتی جماعت سے وابستہ کرلیں،جس کی وجہ سے جمعیت علماء پاکستان نے اُن کی بنیادی رکنیت معطل کردی تھی،اِس کے بعد بھی اللہ وسایا کا یہ لکھنا کہ اِس جماعت (جمعیت علماء پاکستان) کے غلام ابراہیم برق نے ساتھیوں کے زور دینے کے باوجود قرار داد پر دستخط نہیں کیے۔"سراسر جھوٹ پر مبنی ہے اور اُن کے دلی بغض اور مسلکی تعصب کا آئینہ دار ہے،جبکہ حقائق اور دیانت داری کا تقاضہ تو یہ تھا کہ وہ اپنے ہم مسلک مولوی غلام غوث ہزاروی اور مولوی عبدالحکیم کے بارے میں سچائی سے کام لیتے ہوئے یہ لکھتے کہ "جمعیت علماء اسلام کے مولوی غلام غوث

ہزاروی اور مولوی عبدالحکیم نے اِس قرار داد پر دستخط نہیں کیے۔" مگر افسوس اُنہوں نے اِس حقیقت کا اظہار کرنے کے بجائے ایک نئی کہانی گھڑی اور اصل حقائق کو چھپانے اور تاریخ کو بدلنے کی کوشش کی۔

اِسی طرح مولوی اللہ وسایا اپنی کتاب "پارلیمنٹ میں قادیانی شکست" کے صفحہ 10 پر مولانا شاہ احمد نورانی کی پیش کردہ قرارداد کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "قائد اہل سنت مولانا شاہ احمد نورانی نے پرائیویٹ بل اسمبلی میں پیش کیا۔"مگر اسی کتاب کے صفحہ 29 پر "حزب اختلاف کی تاریخی قرارداد" کی سرخی قائم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ’’30 جون 1974ء کو قومی اسمبلی میں اپوزیشن نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے والی قرارجو پیش کی تھی،اُس کا متن درج ذیل ہے۔"ایک ہی کتاب میں دو مختلف باتیں۔۔۔۔۔! پہلے مقام پر قائدِ اہلسنّت مولانا شاہ احمد نورانی قرار داد پیش کرنے والے ،جبکہ دوسرے مقام پر وہی قرار داد اپوزیشن کی قرار داد قرار پاتی ہے، عجب مخمصہ پیدا ہوتا ہے کہ قرارداد کس نے پیش کی، مولانا شاہ احمد نورانی نے یا اپوزیشن نے۔؟یا یہ کہ مولانا نورانی نے اپوزیشن کی جانب سے قرار داد پیش کی۔؟ہمارا سوال یہ ہے کہ اگر قرار داد مولانا نورانی کی تیار کردہ نہیں تھی بلکہ حزب اختلاف کی جانب سے پیش کی گئی تھی تو پھر اِس قرار داد کو اپوزیشن کی جانب سے خان عبدالولی خان کو پیش کرنا چاہیے تھا، مولانا نورانی کو نہیں، کیونکہ ولی خان

اُس وقت قائدِ حزبِ اختلاف تھے، مگر مولانا شاہ احمد نورانی کا اسمبلی میں اِس قرار داد کو پیش کرنا ظاہر کرتا ہے کہ مولانا نورانی ہی قرار داد کے اصل خالق اور محرک ہیں،آپ نے خود قرار داد تیار کی ،اُس پر ہم خیال اراکین اسمبلی کے دستخط لیے اور 30 جون 1974ء کو اِس "تاریخ ساز قرارداد" کو اسمبلی اجلاس میں پیش کردیا۔

اِس مقام پر ہم مولانا شاہ احمد نورانی کا "ماہنامہ ضیائے حرم لاہور'' کو دیا گیا ایک انٹرویو دیکھتے ہیں، جس میں مولانا نورانی فرماتے ہیں"اِس سال اپریل میں، میں ورلڈ اسلامک کانفرنس میں شرکت کیلئے لندن گیا،اُن دنوں مکہ معظّمہ میں رابطہ عالم اسلامی کا اجلاس ہورہا تھا، ورلڈ اسلامک مشن کانفرنس کی وجہ سے میں اُس وقت مکہ معظّمہ نہیں جاسکا،لندن سے فارغ ہوکر میں مکہ معظّمہ حاضر ہوا، حاضری کا ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ وہاں سے رابطہ عالم اسلامی کی وہ قرار داد حاصل کروں جو انھوں نے قادیانیوں کے بارے میں متفقہ طور پر منظور کی تھی،26 مئی کو یہ قرار داد لے کر پاکستان پہنچا تو قادیانیوں کا مسئلہ شروع ہوچکا تھا،ہم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ رابطہ عالم اسلامی کی قرارداد کی روشنی میں قومی اسمبلی کیلئے اپنی قرار داد مرتب کی،جس میں حزب اختلاف کی تمام جماعتوں کا مشورہ شامل تھا،یہی قرار داد ہم نے 30 جون کو اسمبلی میں پیش کی،جس پر 37 ارکان کے دستخط تھے۔" (ماہنامہ ضیائے

حرم لاہور، ختم نبوت نمبر، دسمبر 1974) مولانا نورانی کا 7 دسمبر 1974ء کو قرار داد کی منظوری کے تقریباً دو ماہ بعد ماہنامہ ضیائے حرم لاہور کو دیا گیا انٹرویو واضح کر رہا ہے کہ یہ قرار داد صرف اور صرف مولانا شاہ احمد نورانی کی کوشش اور محنت شاقہ کا نتیجہ تھی،آپ ہی اِس قرار داد کے بنانے والے اور اصل محرک ہیں،آپ ہی نے قرار داد کی تیاری کے بعد اُس پر حزب اختلاف کی جماعتوں کے ہم خیال اراکین سے مشورہ کیا،دستخط لیے اور 30 جون 1974ء کو اسمبلی اجلاس میں پیش کر دیا۔لیکن مولوی اللہ وسایا نے علمی بددیانتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ کریڈٹ مولانا نورانی کو دینا پسند نہیں کیا بلکہ اپوزیشن کی قرار داد کا لفظ استعمال کرکے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ قرار داد اپوزیشن کی جانب سے پیش کی گئی تھی۔

اِس مقام پر یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ "محرک" کے معنی تحریک دینے والے،اُبھارنے والے یا اُکسانے والے کے ہوتے ہیں،یعنی کسی کام کا تحرک پیدا کرنے یا تحریک دینے والے اور اُس کام کیلئے ابھارنے اور اُکسانے والے کو "محرک" کہتے ہیں، مشاہدہ شاہد ہے کہ کسی کام کیلئے تحرک پیدا کرنے والا، تحریک دینے والا اور ابھارنے یا اُکسانے والا ایک ہی فرد ہوتا ہے،باقی لوگ جو اُس کی حمائت کرتے ہیں تائید کرنے والے کہلاتے ہیں،اِس لحاظ سے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے والی قرار داد کے اصل محرک مولانا

شاہ احمد نورانی ہیں، باقی قرارداد پر دستخط کرکے مولانا نورانی کے موقف کی حمایت کرنے والے "مویدین" یعنی تائید کرنے والے، مددگار و معاون ہیں، چنانچہ اصولی طور پر انہیں محرکینِ قرار داد قرار دینا درست نہیں ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اِس مخصوص مکتبہ فکر کے تمام نام نہاد محقق اور اہل قلم اِس اہم اور بنیادی نکتہ کو دانستاً گول کر جاتے ہیں کہ قرار داد کا اصل محرک کون ہے، آپ کو اس موضوع پر شائع شدہ کسی بھی کتاب میں اِس سوال کا جواب نہیں ملے گا، نہ ہی یہ لوگ قرار داد پیش کرنے والوں کے ناموں کی درست ترتیب سامنے لاتے ہیں، آپ کو تحریک ختم نبوت، جلد سوم "صفحہ 467 سے لے کر "پارلیمنٹ میں قادیانی شکست "صفحہ 30"، "قادیانی فتنہ اور ملت اسلامیہ کا موقف "مرتبہ مفتی محمد تقی عثمانی و مولانا سمیع الحق، ادارہ المعارف کراچی، صفحہ 29 اور تاریخی دستاویز" مرتبہ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی کے صفحہ 538 تک ایک ہی ترتیب ملے گی، سب نے اصل فہرست میں ردوبدل کرکے مولانا مفتی محمود کا نام سرفہرست یعنی پہلے نمبر اور مولانا شاہ احمد نورانی کا نام تیسرے نمبر پر لکھا ہے، سب کے سب 22 ارکان کو قرار داد کا محرک قرار دیتے ہیں اور مولانا شاہ احمد نورانی جو کہ قرار داد کو تیار کرنے والے اور اصل محرک ہیں، کو ترتیب میں تیسرے نمبر پر رکھتے ہیں، جبکہ قومی اسمبلی ریکارڈ کے مطابق مولانا شاہ احمد نورانی کا نام پہلے نمبر اور

مولانا مفتی محمود کا نام تیسرے نمبر پر ہے۔

اِس ریکارڈ کے مطابق 30 جون 1974ء بروز اتوار، اسٹیٹ بینک بلڈنگ اسلام آباد میں قومی اسمبلی کا اجلاس وقفے کے بعد اسپیکر صاحبزادہ فاروق علی خان کی زیر صدارت شروع ہوتا ہے۔ جس میں اسپیکر قومی اسمبلی مولانا نورانی کو قرار داد پیش کرنے کیلئے کہتے ہیں، مولانا شاہ احمد نورانی اسپیکر کی اجازت سے قرار داد اسمبلی میں پیش کرتے ہیں، جسے متفقہ طور پر منظور کرلیا جاتا ہے۔ اُس قرار داد پر 22 اسمبلی ممبران کے دستخط مندرجہ ذیل ترتیب سے ہیں۔1۔ مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی، 2۔ مولوی مفتی محمود، 3۔ مولانا عبدالمصطفیٰ الازہری، 4۔ پروفیسر غفور احمد، 5۔ مولانا سید محمد علی رضوی، 6۔ مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک، 7۔ چوہدری ظہور الٰہی، 8۔ سردار شیر باز مزاری، 9۔ مولانا ظفر احمد انصاری، 10۔ مولانا صدر الشہید، 11۔ صاحبزادہ احمد رضا قصوری، 12۔ جناب محمود اعظم فاروقی، 13۔ مولانا نعمت اللہ صاحب، 14۔ جناب عمرا خان، 15۔ جناب غلام فاروق، 16۔ سردار مولا بخش سومرو، 17۔ جناب رئیس عطا محمد مری، 18۔ مخدوم نور محمد ہاشمی، 19۔ سردار شوکت حیات خان، 20۔ جناب علی احمد تالپور، 21۔ جناب عبدالحمید جتوئی، 22۔ راؤ خورشید علی خان۔ ذیل میں ہم ثبوت کے طور پر قومی اسمبلی ریکارڈ سے مولانا شاہ احمد نورانی کی 30 جون 1974ء کی اسمبلی میں پیش کردہ قرار داد اور قرار داد پر دستخط کرنے والوں کے ناموں

(کی فہرست پیش کر رہے ہیں (دیکھئے

The National Assembly Of Pakistan Debates(Third Session of 1974)Vol.IV Contains Nos.14 to 26 Sunday The 30th June 1974

جس سے واضح ہو رہا ہے کہ یہ لوگ اصل حقائق کو مسخ کرتے ہیں اور اپنے مکتبہ فکر کے افراد کو اِس قرار داد کا سرخیل بنا کر پیش کرتے ہیں، ہماری بات کی تائید مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی کی مرتب کردہ کتاب "تاریخی دستاویز" کے اِس اقتباس سے ہوتی ہے، جس میں بڑی خوبصورتی سے حقائق کو توڑ مروڑ کرکے پیش کیا گیا ہے، مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی لکھتے ہیں "اللہ رب العزت کا فضل واحسان کے بموجب 1970 ء میں جمعیت علمائے اسلام کی مثالی جدوجہد سے مفکر اسلام مولانا مفتی محمود، شیر اسلام مولانا غلام غوث ہزاروی، شیخ الحدیث مولانا عبدالحق، مولانا عبدالحکیم، مولانا صدر الشہید اور دیگر حضرات قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم برسر اقتدار آئے، قادیانیوں نے 1970ء میں پیپلز پارٹی کی دامے، درمے اور افرادی مدد کی، قادیانیوں نے پھر پَر پرزے نکالے، 29 مئی 1974 ء کو چناب نگر ربوہ ریلوے اسٹیشن پر نشتر میڈیکل کالج ملتان کے طلباء پر قاتلانہ حملہ کیا، اِس کے نتیجے میں تحریک چلی، اسلامیان پاکستان ایک پلیٹ فارم مجلس عمل تحفظ ختم نبوت پاکستان پر جمع ہوئے، جس کی قیادت دیوبند کے مردِ جلیل محدثِ کبیر مولانا سید محمد یوسف بنوری نے

فرمائی اور قومی اسمبلی میں اُمتِ مسلمہ کی نمائندگی کا شرف حق تعالٰی نے دیوبند کے عظیم سپوت مفکرِ اسلام مولانا مفتی محمود کو بخشا۔یوں قادیانی قانونی طور پر اپنے منطقی انجام کو پہنچے اور اُن کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا گیا۔"

تاریخی دستاویز، مرتبہ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی، ص 501)

اِس اقتباس میں مولوی غلام غوث ہزاروی اور مولانا عبدالحکیم جنھوں نے قرار داد کی تائید کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا، کی شان میں زمین وآسمان کے قلابے ملائے جارہے ہیں،اور کس ڈھٹائی سے حقائق کو مسخ کرتے ہوئے مولانا مفتی محمود کو قومی اسمبلی میں اُمتِ مسلمہ کی نمائندگی کا اعزاز بخشا جارہا ہے، قارئین محترم !اِس مکتبہ فکر کیلئے یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے،اِن کی تو ساری تاریخ ہی اِس قسم کے جھوٹ اور فریب سے بھری پڑی ہے،اِس طرح کا طرز عمل آپ کو اِن کے یہاں جابجا نظرآئے گا،آج یہ لوگ تحریک ختم نبوت 1974ء کی عظیم الشان کامیابی کا تمام تر کریڈٹ اور سہرا مولانا یوسف بنوری، مفتی محمود اور مولانا شاہ احمد نورانی کی مرتب کردہ قرار داد پر دستخط نہ کرنے والے مولانا غلام غوث ہزاروی، "جو 7 ستمبر 1974ء کو قرارداد کی منظوری کے بعد اِس فیصلے کا کریڈٹ بھٹو حکومت کو دیتے ہیں"

(The National Assembly Of Pakistan Debates Saturday.7th September,1974

اپنی اِس کوشش میں یہ نام نہاد محققین.بڑی دور کی کوڑیاں لاتے ہیں،اخبارات کے
پورے کے پورے صفحات سیاہ کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ تحریک ختم
نبوت 1974 ء کی کامیابی اِن متذکرہ افراد کی کوششوں اور کاوشوں کی مرہون منت
ہے، لیکن حقیقت اِس کے.برعکس ہے،اِس میں کوئی شک نہیں مولانا یوسف
بنوری، مولانا مفتی محمود، مولانا عبدالحق وغیرہ بھی تحریک ختم نبوت 1974 ء میں
شامل تھے اور انھوں نے دیگر مکتبہ فکر کے ساتھ مل کر اِس تحریک میں حصہ لیا، لیکن
اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تحریک ختم نبوت 1974 ء کو اُس کے منطقی انجام
تک پہنچانے میں اصل کردار علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی نے ہی ادا کیا،آپ نے جس
فہم و فراست اور حسن تدبر سے اِس تحریک کو پارلیمنٹ کے اندر اور باہر عوامی سطح
پر منظم کیا اور پیپلز پارٹی کے اراکین اسمبلی سمیت تمام اراکین قومی اسمبلی اور ملک کے
وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کو قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے والی قرار
داد کے حق میں قائل کیا،وہ صرف اور صرف آپ کا ہی کارنامہ ہے۔
مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین مفتی منیب الرحمٰن صاحب اِس کارنامے کا اعتراف
کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ " علماء اُس سے پہلے بھی اسمبلیوں میں موجود

تھے۔مثلاً شیخ شبیر احمد عثمانی، مفتی محمود اور غلام غوث ہزاروی وغیرہما، مگر یہ سعادت ماضی میں کسی کے حصے میں بھی نہیں آئی،تاریخ پاکستان میں پہلی بار ایک مرد حق پیکر صدق و صفا، کوہ استقامت اور حاصل جرا_ت و شجاعت علامہ شاہ احمد نورانی، صدیقی اسمبلی میں پہنچے اور فتنہ_ انکار ختم نبوت یعنی قادیانیت کو کفر و ارتداد قرار دینے کی بابت قرار داد قومی اسمبلی میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ،تاریخ اسلام میں ریاست و مملکت کی سطح پر فتنہ_ انکار ختم نبوت کو کفروارتداد قرار دینے اور اُن کے خلاف علم جہاد بلند کرنے کا اعزاز جانشین رسول خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا اور اُن کے بعد یہ اعزاز انہی کی اولاد امجاد میں علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کو نصیب ہوا۔" (ماہنامہ کاروان قمر کراچی امام نورانی نمبر نومبر دسمبر 2004ء ص 20)اصل حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ اعزاز مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی کو حاصل ہے، قومی اسمبلی کا ریکارڈ شاہد ہے کہ تحریک ارتداد قادیانیت کے محرک صرف اور صرف مولانا شاہ احمد نورانی ہیں، مولانا نورانی عصر حاضر میں عاشقان مصطفیٰ کے سردار اور تحریک ختم نبوت کے سرگرم مجاہد و قافلہ سالار ہیں اور رب کریم نے عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کیلئے آپ کو منتخب فرمایا۔ قارئین محترم ! یہ وہ تاریخی سچائی ہے جسے مخالفین نے خضاب لگا کر جھوٹ کے پردوں میں چھپانے کی پوری کوشش کی اور اس، کا سہرا اپنے لوگوں کے سر باندھا، چنانچہ اِس تناظر آج ضرورت اِس اَمر کی ہے کہ مخالفین کی

جانب سے ڈالے گئے جھوٹ اور مکر و فریب کے دبیز پردوں ہٹا کر تاریخی حقیقت کو
سامنے لایا جائے اور نئی نسل کے اذہان میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کو دور
کر کے انہیں بتایا جائے کہ سچ وہ نہیں جو بیان کیا گیا بلکہ وہ ہے جو چھپایا جا رہا ہے۔

ہوشیار ہو جاؤ.... آپریشن ہونے والا ہے

کراچی میں ٹارگٹڈ آپریشن،امکانات و خدشات.....

اَمر واقعہ یہ ہے کہ کراچی کی بدامنی کی طویل تاریخ اور پس منظر ہے،جو سر دست اِس وقت موضوع گفتگو نہیں،لیکن اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ماضی میں پیپلزپارٹی کی حکومت نے کراچی کی سیاست میں بڑے فیصلے کرنے کی بجائے ایسے فیصلے کیے جو محض اقتدار بچانے کے لیے ضروری تھے،اُس نے سپریم کورٹ کی جانب سے کراچی بدامنی کیس کے فیصلہ پر بھی خاموشی اختیار کرکے ایک طرح سے مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کیا تھا،جس کی وجہ سے عدالت عظمٰی نئی حکومت کے بارے میں بھی یہ تبصرہ کرنے پر مجبور ہو گئی ہے کہ گزشتہ دو برس سے جاری بدامنی کی ذمہ داری وفاقی اور صوبائی دونوں حکومتوں پر عائد ہوتی ہے، جبکہ نئی حکومت اپنے گزشتہ تین ماہ کے طرز عمل سے یہ جواز پیش کرنے میں ناکام رہی کہ وہ کراچی کی بدامنی کی ذمے دار نہیں ہے،اب کراچی کی صورتحال پر موجودہ جمہوری حکومت کچھ سنجیدگی سے اقدامات کرتی نظر آتی ہے،وزیر عظم نواز شریف باہمی مشاورت سے کچھ اہم فیصلے کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں،یہی وجہ تھی کہ کابینہ کا خصوصی اجلاس کراچی طلب کیا گیا،اِس سے قبل وزیراعظم نے کراچی

میں مختلف جماعتوں کے سیاسی رہنماؤں کو کراچی میں ہونے والے ممکنہ اقدامات پر بھی اعتماد میں لیا،اِس خصوصی کابینہ کے اجلاس میں متحدہ کی نمائندگی کیلئے ڈاکٹر فاروق ستار کو بھی بلایا کیا گیا تھا، لیکن حکومت کو یہ فیصلہ اِس لیے واپس لیناپڑا کہ متحدہ کو کابینہ کے خصوصی اجلاس میں دعوت کے بعد باقی تمام جماعتوں نے اُس کی شرکت پر شدید تحفظات کا اظہار کیا تھا، اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومت نے کراچی میں ٹارگیٹڈ آپریشن کے حوالے سے جو فیصلہ کیا ہے اُس کے کیا نتائج نکلتے ہیں۔

جبکہ معاملہ یہ ہے کہ کراچی کے عوام کئی عشروں سے مشکلات اور عذاب میں گھرے ہوئے کسی معجزے کی امید لگائے بیٹھے ہیں، حالات کس کروٹ بیٹھتے ہیں، کسی کو کچھ اندازہ نہیں، البتہ پورے ملک اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے پاکستانی یہ خواہش ضرور رکھتے ہیں کہ ملک کا سب سے بڑا شہر امن کا گہوارہ بن جائے،اِس میں تو کوئی شک نہیں کہ وزارت داخلہ اور حکومت سندھ نے مل کر ٹارگیٹڈ آپریشن کے لئے ایک لائحہ عمل تو مرتب کیا ہے ، مگراِس لائحہ عمل میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے کیا منصوبہ بندی کی گئی ہے؟اوراِسے کیسے عملی جامعہ پہنایا جائے گا؟ یہ نکتہ قابل غور ہے،اِس حوالے سے سب سے پہلا سوال ذہن میں جو ابھرتا ہے وہ یہ کہ کیا واقعی آپریشن کی تیاری مکمل کرلی گئی ہے اور کیا حکومت کا یہ آپریشن اِس صورت میں کامیابی سے ہمکنار ہوسکے گا جبکہ پہلے سے

ہی یہ شور مچایا دیا گیا ہے کہ "ہوشیار ہو جاؤ...... کراچی میں آپریشن ہونے والا ہے۔" اگر اِس کے باوجود یہ آپریشن کامیاب ہو جاتا ہے تو شاید یہ دنیا کا پہلا آپریشن ہوگا...... ! جس میں پیشگی اطلاع کے بعد کامیابی نصیب ہوگی۔ جبکہ زمینی حقائق کہتے ہیں کہ اِس آپریشن کو کامیاب بنانے کے لئے مملکت کے تمام اداروں کو چومکھی لڑائی لڑنا ہوگی، آپ کو یاد ہوگا کہ گذشتہ دنوں متحدہ نے کراچی میں فوج کو طلب کرنے کا مطالبہ کیا تھا، لیکن اُس کے اِس مطالبہ پر ایک عمومی اتفاق رائے یہ سامنے آیا ہے کہ کراچی میں فوج کو طلب کرنے کی بجائے حکومت کو ٹارگیٹڈ آپریشن کی طرف توجہ دینی چاہیے جو کہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔

سپریم کورٹ پہلے ہی کہہ چکی ہے کہ کراچی کی بیشتر سیاسی جماعتیں مجرموں کی سرپرستی کرتی ہیں اور اُن کی مدد کے بغیر کراچی کا بحران حل نہیں ہوسکے گا، گو موجودہ وزیر اعظم ابتداء ہی سے کراچی کے مسئلہ کو اہم قرار دے کر اُس کے حل پر زور دیتے رہے ہیں، مگر یہ بات واضح رہے کہ یہ مسئلہ وفاقی حکومت اکیلے حل نہیں کر سکتی، اِس کیلئے اُسے پیپلزپارٹی کی صوبائی حکومت سمیت کراچی کے دیگر اہم سیاسی فریقین کی حمایت کی شدید ضرورت ہے اور صوبے کی اہم جماعتیں متحدہ، اے این پی، جماعت اسلامی، فنکشنل لیگ اور سنی تحریک وغیرہ کس حد تک حکومت کا ساتھ دیتی ہیں، دوسری جانب متحدہ کو خدشہ ہے کہ کراچی میں

متوقع ٹارگٹڈ آپریشن کا مقصد اُسے دیوار سے لگانا ہے، چناچہ اِس تناظر میں وفاقی حکومت کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ متحدہ کے تحفظات دور کرے اور اُسے اپنے عمل سے ثابت کرنا ہوگا کہ وہ ایک غیر جانبدار آپریشن کی حامی اور آپریشن بغیر کسی سیاسی تفریق کے کیا جائے گا۔ واضح رہے کہ وزیر اعظم نے آپریشن کی نگرانی کے لیے کل جماعتی کمیٹی قائم کرنے کا بھی اعلان کیا ہے، اِس کمیٹی کے قیام سے بھی سیاسی جماعتوں میں یہ تاثر ختم ہوگا کہ اُن کے خلاف کوئی سازش تیار ہو رہی ہے، لیکن وفاقی حکومت کا یہ قدم سوالیہ نشان ہے کہ اُس نے آپریشن کی ساری ذمہ داری صوبائی حکومت پر ڈال دی ہے، جس کی وجہ سے آپریشن کی کامیابی اور ناکامی میں صوبائی حکومت کا کردار اہمیت اختیار کرگیا ہے، اب یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ صوبائی حکومت ماضی کے برخلاف کس طرز عمل کا مظاہرہ کرتی ہے اور کراچی کو دہشت گردوں سے پاک کرنے میں کتنی سنجیدہ ہے ۔یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ آپریشن کے حوالے سے ایک فہرست بھی تیار ہوئی ہے جو 700 سے زائد اُن لوگوں پر مشتمل ہے، جن پر سنگین نوعیت کے الزامات ہیں۔
ہمارا ماننا ہے کہ حکومت اور بالخصوص وزیر اعظم صاحب کیلئے کراچی کے مسئلہ کا حل اُن کی اپنی صلاحیتوں کا کڑاامتحان ہوگا، کیونکہ اگر پیپلزپارٹی کی طرح کراچی کے مسئلہ پر مسلم لیگ (ن) بھی ناکام ہوتی ہے تو اِس سے کراچی کا بحران اور زیادہ سنگین صورتحال اختیار کر جائے گا، اگر یہ ٹارگٹڈ آپریشن

ناکام ہو جاتا ہے تو اُس کے بعد اِس کے حل کیلئے فوجی ایکشن کا مطالبہ زور پکڑے گا جو کسی فوج کی عزت و وقار کے کیلئے نقصان دہ ثابت ہوگا، چنانچہ گیند اب وفاقی اور صوبائی حکومت سمیت سندھ کی سیاسی جماعتوں کی کورٹ میں ہے کہ وہ کراچی کے مسائل کا کیاپائیدار حل تلاش کرتی ہیں۔ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ کچھ حلقوں کی جانب سے یہ بھی کہا یہ جارہا ہے کہ وفاقی حکومت کوئی الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتی، جس کی وجہ اُس نے آپریشن سندھ کے وزیراعلیٰ کی زیر نگرانی کرانے کا فیصلہ کیا ہے، جبکہ کراچی حالات کے تناظر میں اِس آپریشن یں غلطی اور کمزوری کی کوئی گنجائش نہیں ہے،آپریشن کی کامیابی تب ہی ممکن ہے جب تک مصمم ارادے کے ساتھ بلا تفریق دہشت گردوں اور سماج دشمن عناصر پر ہاتھ نہیں ڈالا جاتا، اِس وقت تک کراچی کے حالات کو بہتر بنایا اور آپریشن کی کامیابی ممکن نہیں، الہٰذا کراچی میں امن کی دعویدار ہر سیاسی جماعت کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ کراچی کے حالات کو سدھارنے اور اُسے بھتہ خوروں ،ٹارگٹ کلرز، دہشت گردوں اور گینگ وار کے سرپرستوں سے پاک کرنے کے لئے حکومتی فیصلوں کی تائید کریں، وزیراعظم نواز شریف نے جس طرح آرمی چیف ،ڈی جی آئی ایس آئی اور دیگر اعلیٰ حکام کو اعتماد میں لے کر آپریشن کا فیصلہ کیا ہے،اُس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں رہ گئی ہے کہ یہ آپریشن پوری سچائی، دلجمعی اور غیر جانبداری سے کیا جائے گا،اگر یہ ناکام ہوگیا تواِس سے نہ صرف حکومت اور اداروں کی ساخ خراب ہوگی بلکہ کراچی بھی ہمیشہ ہمیشہ

کے لئے لاقانونیت کا گڑھ بن جائے گا۔

لہٰذا اس تناظر میں کراچی آپریشن جمہوری قوتوں کے لئے ایک بڑا امتحان ہے، یہ سوال اب کسی سے ڈھکا چھپا نہیں کہ ماضی کی حکومت کیوں کراچی میں امن بحال نہیں کر سکی؟ آج سیاسی مصلحتوں نے کراچی شہر کو اُس دہانے پر پہنچا دیا ہے کہ ایک مرتبہ پھر حکومتی سطح پر سب کچھ چھوڑ کر کراچی کو مسئلہ نمبرون قرار دیا جا رہا ہے، سپریم کورٹ پہلے ہی کہہ چکی ہے، جبکہ میڈیا سمیت تمام انٹیلی جنس اداروں کی بھی یہی رائے ہے کہ کراچی کو سیاسی جماعتوں کے مسلح ونگز نے یرغمال بنا رکھا ہے، اِن جماعتوں کی آستینوں میں چھپے ہوئے دہشت گرد کراچی کے امن کے دشمن ہیں، جس کی وجہ سے ہزاروں شہری اندھی گولیوں کا نشانہ بن کر زندگی ہار چکے ہیں، لہٰذا ضروری ہے کہ حکومت اِس پہلو پر خصوصی توجہ دے کہ کراچی کو اسلحہ سے کیسے پاک کیا جائے۔ٹارگٹڈ آپریشن میں جہاں دہشت گردوں، مجرموں اور قاتلوں کا قلع قمع ضروری ہے، وہیں ناجائز اسلحہ کی ضبطی بھی ایک ناگزیر عمل ہے،کیا اس بارے میں کوئی تیاری کی گئ ہے کیونکہ دہشت گردی میں اضافہ اسلحہ اور بارود کے بغیر ممکن نہیں اور جدید اسلحہ کی فراوانی کے باعث قانون شکن پولیس اور رینجرز پر غالب آجاتے ہیں، یہ درست ہے کہ کراچی آپریشن اگرچہ فوج کی نگرانی میں نہیں ہو رہا، تاہم وزیر اعظم نواز شریف نے آپریشن شروع کرنے سے پہلے ایک واضح پیغام دیا ہے کہ فوج اِس آپریشن کے

مقاصد اور اہداف سے پوری طرح متفق ہے، جوایک خوش آئند بات ہے۔
ویسے تواِس سے قبل بھی کراچی میں اعلیٰ سطح کے اجلاس ہوتے رہے ہیں، محترم آصف علی زرداری اپنے سابق وزرائے اعظم سید یوسف رضا گیلانی اور راجہ پرویزاشرف کے ہمراہ کراچی میں بیٹھ کر کئی بار سندھ حکومت کو امن وامان کے قیام کے لئے ہدایات کرتے رہے ہیں، مگر ان میں اخلاص اور جرات کی حد درجہ کمی تھی، جس کی وجہ سے یہ احکامات سود مند ثابت نہ ہوسکے۔ وزیر اعظم محمد نواز شریف نے انتخابی مہم میں سندھ کے عوام کو یقین دلایا تھا کہ کراچی کو اُس کی روشنیاں اور امن لوٹائیں گے، یہ اُن کے لئے یہ بہت دیرینہ اور سنجیدہ معاملہ ہے، اس بار اُن طرز عمل سے یہ معاملہ منطقی انجام تک پہنچتا محسوس ہورہا ہے۔ لیکن اِس کے باوجود عوام کے ذہنوں میں اب بھی بے یقینی اور خدشات کے سائے موجود ہیں، شائداِس لئے کہ وہ کئی عشروں سے کراچی میں قتل و غارت گری کو برپا ہوئے دیکھتے آئے ہیں۔ اللہ کرے اِس بار کراچی کی عوام کی امیدیں اور خواب پورے ہو جائیں اور کراچی کی رونقیں اور امن وامان جو قومی سلامتی کیلئے لازمی ہے، دوبارہ بحال ہوجائے تاکہ لوگ سکھ، چین اور امن کی زندگی
گزار سکیں، اگرایسا ہوگیا تو یہ یقیناً حکومت کی ایک ایسی کامیابی تصور ہوگی جواُس کی اب تک کی تمام ناکامیوں پر پردہ ڈال دے گی۔

اوباما بش کے نقش قدم پر۔۔۔۔

شام پر امریکی حملے کے مضمرات۔۔۔۔

تحریر:۔ محمد احمد ترازی

امریکی صدر بارک اوباما کانگریس کی منظوری سے قبل یہ بات واضح کرچکے تھے کہ اُن کی حکومت شام پر حملے کا فیصلہ کرچکی ہے اور شام کے خلاف فوجی کارروائی کسی بھی وقت شروع ہوسکتی ہے،انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ امریکہ اِس اقدام کے لئے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی منظوری بھی ضروری نہیں سمجھتا،اُس وقت انھوں نے اپنی حکومت کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا تھا کہ امریکہ کو جنگ کے خطرات کا اندازہ ہے تاہم شام میں 21 اگست کو ہونے والا کیمیائی حملہ انسانیت پر حملے کے مترادف تھا،جس سے خود امریکہ کی قومی سلامتی کو بھی سنگین خطرات لاحق ہوگئے ہیں،امریکی صدر کے بیان نے اِس بات کی تصدیق کردی تھی کہ شام پر حملے کا سبب شام کے عوام کو ایک جابر اور مسترد حکومت سے نجات دلانا نہیں بلکہ اسرائیل اور اپنے عالمی سامراجی مفادات کا تحفظ ہے،لیکن عراق اور افغانستان کی جنگ کی جو قیمت امریکا کو داخلی طور پر دینی

پڑی ہے،اُس کی وجہ سے امریکی رائے عامہ اور سیاست دانوں کی ایک بڑی تعداد جنگ کے کسی نئے محاذ کو کھولنے کی اجازت دینے کو تیار نہیں ہے،امریکی رائے عامہ کسی بھی صورت میں امریکی سپاہیوں کو کسی نئے محاذ جنگ کا ایندھن بنانے کو تیار نہیں،یہی وجہ ہے کہ امریکی صدر اہداف کو نشانہ بنانے کی بات کر رہے ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ ماضی میں عراق پر حملے کے لئے مہلک ہتھیاروں کا جو جواز تراشا گیا تھا،وہ اقوام متحدہ کے معائنہ کاروں کی رپورٹوں سے واضح ہوگیا تھا کہ اُس کا کوئی ثبوت نہیں ملا، لیکن اِس کے باوجود بش حکومت نے عراق پر حملہ کیا جس کے نتیجے میں لاکھوں جانوں کا زیاں ہوااور کم و بیش نصف کروڑ افراد نقل مکانی پر مجبور ہوگئے جبکہ عراق میں بدامنی اور خوں ریزی کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔اُس وقت امریکہ کی اِس کارروائی میں دنیاکے بہت سے ملک اُس کے ساتھ تھے،امریکہ نے صدام حسین کے عراق پر یلغار کرتے وقت بھی یہ وجہ بیان کی تھی کہ عراق کے پاس ہمہ گیر تباہی کے (WMD) ہتھیار موجود ہیں جن کی تلفی "ہماری ذمہ داری" ہے،اب اوباما بھی شام پر (Sarin) وہی الزام لگا رہے ہیں کہ اُس نے اپنی ہی آبادی پر کیمیاوی گیس استعمال کی ہے،جس کے نتیجے میں 1429 بے گناہ اور معصوم شہری مارے گئے ہیں۔!اِس وقت امریکہ نے اپنے چار تباہ کن "ڈسٹرائٹر" طیارہ بردار جہاز شام کی بندرگاہوں کے سامنے

لا کر لنگر انداز کر دے ہیں جو شام میں کسی بھی ٹارگٹ کو نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں، سوال یہ ہے کہ اِس امریکی حملے کی صورت میں جو بے گناہ لوگ مارے جائیں گے وہ شام کے گیس اٹیک سے مارے گئے 1429 سے کئی گنا زیادہ ہو سکتے ہیں اوراُن کی بے گناہ موت کا ذمہ دار کون ہوگا۔؟یہی سوال روس کے صدر ولادی میر پوٹن نے اٹھایا ہے کہ امریکہ فوجی کارروائی سے قبل اِس پہلو پر غور کرے کہ آیااِس عمل سے شام میں تشدد کا خاتمہ ہو جائے گا اور سویلینز کی ہلاکتیں نہیں ہوں گی؟روس پہلے ہی خبردار کر چکا ہے کہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کو نظرانداز کرکے کسی قسم کی یکطرفہ فوجی کارروائی بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی ہوگی۔

لیکن اِس کے باوجود شام کے حوالے صدر اوباما جو کچھ کرنے جارہے ہیں،اُس میں اُن کا ساتھ دینے والے بہت کم ہیں، جبکہ اِس اقدام کے مخالف بہت ہیں،روسی صدر نے تو شام پر حملے کی صورت میں امریکہ کے حامی ایک عرب ملک پر حملے کی دھمکی تک دے دی ہے،اگر کسی بھی درجے میں ایسا ہوا تو عالمی اور علاقائی امن کس طرح تہ و بالا ہوگا،اِس کا تصور بھی ہولناک ہے، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ شام میں جمہوریت کے قیام کی تحریک کی حمایت کی جانی چاہیے اوراُسے کامیاب بنانے کے لئے پرامن سفارتی، تجارتی اور اقتصادی اقدامات عمل میں لائے جانے چاہئے تھے،امریکی کانگریس کو چاہیے تھا کہ وہ صدر اوباما کو وہ غلطی دہرانے

سے روکے جو امریکہ افغانستان اور عراق پر حملے کی صورت میں کرچکا ہے، مگر افسوس کانگریس نے ایک ایسے وقت میں جبکہ شام کے خلاف صدر اوباماکا موقف عالمی حمایت سے محروم ہے، حملے کی اجازت دے کر عالمی امن ہی داؤ پر لگادیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ دنیاکے بہت سے ممالک اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل کی منظوری کے بغیر شام کے خلاف اقدام کی مخالفت کررہے ہیں روس نے تو سلامتی کونسل کی منظوری کے بغیر شام پر فوجی کارروائی کو بین الاقوامی قانون کے تابوت میں آخری کیل قرار دیا ہے، جبکہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے موثر ہونے اور اُس کی افادیت پر بھی سوالات اٹھنا شروع ہوگئے ہیں،اَمر واقعہ یہ ہے کہ اِس وقت سلامتی کونسل کے مستقل ارکان میں سے روس اور چین شام کے خلاف فوجی کارروائی کے کھلے مخالف ہیں،یہی وجہ ہے امریکہ سلامتی کونسل میں جانے سے گریز کررہا ہے کہیں ان ممالک کی جانب سے ویٹو کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

شام پر حملہ کس درجے کی عاقبت نا اندیشی ہوگی،اِس کا اندازہ برطانوی پارلیمنٹ کے رویے سے بھی لگایا جاسکتا ہے،جس نے اپنی حکومت کو شام پر حملے میں شرکت کی اجازت نہیں دی اور برطانوی پارلیمان نے 75 فیصد اکثریت کے ساتھ حکومت کی اِس درخواست کو مسترد کردیاکہ شام پر حملے میں امریکہ کا ساتھ دیا جائے،اِس شرمناک ناکامی کے باوجود امریکہ نے کیمرون کی پیٹھ تھپکی ہے اور اُسے دِلاسا دیا ہے کہ کوئی بات نہیں، آپ کی حکومت تو ہمارے ساتھ

ہے، جبکہ پاکستان سمیت تیسرے دنیا کے بہت سے ممالک کی جانب سے بھی اِس حملے کی مخالفت کی گئی ہے۔ دوسری طرف روسی وزیر خارجہ نے امریکہ کو یہ وارننگ بھی دی ہے کہ وہ عراق والی غلطی کا اعادہ نہ کرے وگرنہ اُس کا انجام "نیک" نہیں ہوگا، نیٹو کے سربراہ آندرے فوگ راسموسن نے بھی دوٹوک الفاظ میں اعلان کیا ہے کہ شام پر حملے میں نیٹو کا کوئی کردار نہیں ہوگا، فرانس کے صدر فرانسوا اولاند نے کہا ہے کہ وہ شام کے حوالے سے کسی بھی فوجی کارروائی سے قبل اپنے ملک کی پارلیمنٹ کو بھی اعتماد میں لیں گے، فرانس کے وزیر داخلہ مانویل والس کا کہنا ہے کہ اُن کا ملک شام کے خلاف اکیلے کوئی کارروائی نہیں کرے گا، اٹلی کے وزیر اعظم ایزیکو لیٹا کا کہنا ہے کہ امریکا اور فرانس یقینی طور پر شام پر حملے کا سوچ رہے ہیں، لیکن اُن کا ملک اقوام متحدہ کی منظوری کے بغیر اِس عمل میں شریک نہیں ہوگا، جبکہ ایران کی پارلیمنٹ کی قومی سلامتی کمیٹی کے سربراہ علیم الدین بروجری کے مطابق شام پر حملہ صرف شامی سرحدوں تک محدود نہیں رہے گا بلکہ اُس کے منفی اثرات سارے خطے پر مرتب ہوں گے، مشرق وسطیٰ میں ایک اور امریکی اتحادی ملک اردن کے وزیر اطلاعات محمد مومنی کا کہنا ہے کہ انہیں یقین ہے کہ تمام سفارتی ذرائع کے استعمال کے بعد ہی امریکا کسی فوجی ایکشن کے آپشن کو استعمال کرے گا، دوسری طرف اردن سمیت بہت سے اسلامی ممالک میں شام پر ممکنہ امریکی حملے کے تناظر میں عوامی مظاہروں کا سلسلہ جاری ہے۔

قارئین محترم ! عالمی رائے عامہ کے تازہ ترین جائزے بھی اِس بات کی علامت ہیں کہ امریکہ سمیت دنیا بھر کی بھاری اکثریت شام پر حملے کی مخالف ہے۔اِن حالات میں امریکی حکومت اگر شام کے خلاف یکطرفہ کارروائی کرتی ہے تو اُس کی عالمی تنہائی مزید بڑھ جائے گی، لیکن اس کے باوجود امریکی صدر شام کے خلاف کارروائی کے لئے جتنی عجلت میں نظر آتے ہیں،اُس نے افغانستان اور عراق پر حملے کے وقت سابق امریکی صدر جارج بش کی یاد تازہ کردی ہے، جبکہ یہ دونوں کارروائیاں کسی مثبت نتیجے کا سبب نہیں بن سکیں اور اُن کا فیصلہ نہ صرف یہ کہ بہت بڑے پیمانے پر انسانی تباہی کا سبب بنا بلکہ امریکہ کی معیشت کے لئے بھی سخت نقصان دہ ثابت ہوا،اب امریکی افواج ا ِن مقاصد کو حاصل کیے بغیر افغانستان سے واپس جانے کی تیاری کررہی ہے، لیکن ماضی کی اِس شرمناک شکست وہزیمت کے باوجود بھی صدر اوباما بش کے نقش قدم پر گامزن ہیں اور اپنے پیشرو کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شام میں قتل وغارت گری کی نئی تاریخ لکھنے جارہے ہیں۔

اسلامی مضاربت کے نام پر نیا فراڈ

اسلامی مضاربت کے نام پر نیا فراڈ

پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا مالیاتی اسکینڈل

لباسِ خضر میں ملبوس نوسربازوں نے عوام کے 500ارب روپے لوٹ لیے۔

تازہ ترین خبر کے مطابق پانچ سو ارب سے زائد کے مضاربہ اسکینڈل کے مرکزی ملزم
مفتی احسان سے نیب نے تفتیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور تحقیقات کا اختیار ملنے کے بعد
نیب نے ملزم مفتی احسان کے خلاف ریفرنس داخل کرنے کی تیاری شروع کر دی
ہے، واضح رہے کہ مفتی احسان نے سود سے پاک مضاربہ اسکیم کے نام پر سادہ لوح
افراد سے 220 ارب سے زائد رقم بٹوری تھی، خبر کے مطابق 25 ستمبر کو نیب کے
ایگزیکٹو بورڈ کے ایک اہم اجلاس کے بعد ڈی جی نیب راولپنڈی کرنل (ر) صبح صادق
نے مفتی احسان سے تحقیقات کرنے کا فیصلہ کیا۔ کرنل (ر) صبح صادق نے کا کہنا ہے کہ
ملزم کی طرف سے متاثرین کو رضاکارانہ طور پر رقم کی واپسی ممکن نظر نہیں آ رہی، لہٰذا
ملزم کی طرف سے مایوسی کے بعد اُس کے

خلاف آرڈیننس 1999 کے تحت مقدمے کی کارروائی شروع کر رہے ہیں، انکوائری کا
کے تحت یہ NAO 25 1999 (A) اختیار ملنے سے قبل ڈی جی کو نیب کے قانون
اختیار تھا کہ وہ ملزم کی طرف سے رقم کی رضاکارانہ طور پر واپسی کی صورت میں اُسے
رہا کر سکتے تھے، چنانچہ 18 جون کو ڈی جی نیب نے ملزم کے ساتھ 546 ملین روپے کی
رضاکارانہ واپسی کا معاہدہ کرکے اُسے رہا کر دیا گیا تھا، تاہم مفتی احسان کو ماہانہ 10
کروڑ روپے حسب وعدہ ادا نہ کرنے پر دوبارہ گرفتار کر لیا گیا ہے۔
ڈی جی نیب راولپنڈی کے مطابق مفتی احسان کے خلاف نیب کو دوبارہ 3700
درخواستیں موصول ہوئیں جن میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ مفتی احسان نے مضاربہ فراڈ کے
ذریعے اُن سے 4 ارب روپے ہتھیا لئے ہیں ، خیال رہے کہ مفتی احسان اکیلا شخص
ہے جو مضاربہ متاثرین کے 220 ارب روپے لوٹ کر چلتا بنا، جبکہ اِس اسکینڈل میں
شامل چند دوسرے گروپوں نے بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے اور متاثرین سے سود
سے پاک جعلی منافع بخش سکیم کے نام پر 500 ارب سے زائد رقم لوٹی ہے۔ دوسری
جانب نیب کو دیگر مضاربہ گروپوں الیگزر، میزان اور البراکہ کے خلاف ابتدائی تحقیقات
سے معلوم ہوا ہے کہ اِن گروپوں نے ایک افغان ہیروں کے اسمگلر کے ساتھ مشترکہ
کاروبار پر تمام پیسہ لگا رکھا ہے، ہیروں کے اِس افغان سمگلر کا ایک ساتھی تھائی لینڈ کا
رہنے والا ہے، جسے نیب نے دیگر 13

ایجنٹوں کے ہمراہ تحقیقات کیلئے 24 ستمبر کو نوٹس بھیجا تھا، مگر اُس نے نیب کے سامنے پیش ہونے سے انکار کر دیا، ڈی جی نیب نے بتایا کہ انہوں نے مضاربہ اسکینڈل میں ملوث کچھ طاقتور شخصیات کی بھی نشاندہی کی ہے، جنھیں چیئرمین نیپ کی تقرری کے بعد شامل تفتیش کیا جائے گا۔باخبر ذرائع کا یہ بھی کہنا ہے کہ نیب نے اربوں روپے کے مضاربہ اسکینڈل کی تحقیقات کا دائرہ وسیع کر دیا گیا ہے اور وسیع پیمانے پر تحقیقات کیلئے ڈی جی راولپنڈی کرنل (ر) صبح صادق کی سربراہی میں پانچ رکنی ٹیم تشکیل دے دی ہے، جو عنقریب مضاربہ گروپ کے چیئرمین مولانا ایوبی کی گرفتاری کیلئے دبئی روانہ ہوگی، ساتھ ہی الیگزر گروپ کے ایک اور اہم کردار مفتی ابراہیم جو اِس وقت ایف آئی اے کی تحویل میں ہے، سے نیب تحقیقات میں مصروف ہے۔

قارئین محترم ! دین کے نام پر غریب و سادہ لوح عوام کو لوٹنے کا یہ طریقہ واردات نیا نہیں ہے، ماضی میں بھی ایک مخصوص مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے افراداِس قسم کی دھوکہ دہی،فراڈ اور لوٹ مار میں ملوث رہے ہیں،الائنس گروپ اور ٹی جے ابراہیم اینڈ کمپنی وغیرہ کے نام آج بھی آپ کی یادداشت ہیں محفوظ ہونگے، مگراس مرتبہ پاکستانی تاریخ کے سب سے بڑے مضاربہ اسکینڈل کے مرکزی کردار مفتی احسان کے ساتھ وابستہ بعض بڑی بڑی شخصیات اورمفیان کرام کے نام بھی سامنے آرہے ہیں، جس میں خاص طور پر جامعہ بنوریہ کراچی کے

رئیس مفتی نعیم، اُن کے بیٹوں، بھائی اور مفتی عبداللہ شوکت کے ساتھ کئی مشہور
علماء کرام شامل ہیں، گو مفتی نعیم اور جامعہ بنوریہ اخبارات میں اشتہارات وغیرہ کے
ذریعے اِس اسکینڈل سے اپنی برات کا اعلان کر چکے ہیں، جبکہ کچھ مدرسوں اور
دارالعلوم کی جانب سے بھی وضاحتیں سامنے آئی ہیں، تاہم اِس کے باوجود بعض افراد کا
دعویٰ ہے کہ اُن کے پاس اِن مفتیان کرام کی جانب سے دیئے گئے فتوے اور اُن سے
ہونے والی گفتگو کی ویڈیو موجود ہے، چنانچہ اِس تناظر میں ضرورت اِس اَمر کی ہے کہ
اِس حوالے سے شفاف اور غیر جانبدارانہ تحقیقات کی جائے تاکہ اصل حقائق قوم کے
سامنے آ سکیں۔

اِس تمام قضیئے میں سب سے زیادہ قابل افسوس پہلو یہ ہے کہ اِس مخصوص مکتبہ فکر سے
وابستہ مفتی اور علماء کے گروپ نے مختلف جعلی کمپنیوں (البرکہ مارکیٹنگ، الیگزر گروپ
وغیرہ) کا سہارا لے کر مضاربہ اور مشارکہ کے نام پر ہزاروں شہریوں سے کھربوں
روپے ہڑپ کر لیے ہیں، اِن جعلی کمپنیوں نے ملک اور ملک سے باہر مبینہ طور پر ایسے
منصوبوں میں کھربوں روپے کی سرمایہ کاری ظاہر کی ہے، جن کا زمین پر کوئی وجود ہی
نہیں ہے، صرف ایک الیگزر نامی کمپنی نے نصف درجن کے قریب منصوبوں میں 7
ارب سے 26 ارب کی سرمایہ کاری کا دعویٰ کیا ہے، جس میں موٹر سائیکل تیار کرنے
والی فیکٹری کے منصوبے پر ایک کھرب 30ارب روپے دکھائے گئے ہیں، اِس مقصد
کیلئے لاہور کے قریب 45 ایکڑ زمین کی

خریدی ظاہر کی گئی ہے، لیکن فیکٹری کہاں ہے کسی کو نہیں معلوم۔اسی طرح ایگزر نے فضائی کمپنی کا منصوبہ بھی شروع کیا جس پر41ارب لگانے اور کمپنی کے فلیٹ میں بوئنگ 737شامل کرنے کا دعوی کیا گیا، مگر یہ بوئنگ کس ایئر پورٹ سے اڑتا ہے، کہاں جاتا ہے اور کون لوگ اِس میں سفر کرتے ہیں، کوئی نہیں جانتا۔ایگزر کا دعویٰ ہے اُس نے فاسٹ موونگ کنزیومر گڈز پر ایک سو کروڑ امریکی ڈالر یعنی 95 ارب روپے سے زائد کی سرمایہ کاری کی، جبکہ حصص کی مالیت 3 کھرب 80 ارب روپے ہے، لیکن زمین پر یہ منصوبہ ہنوز لاپتہ ہے۔

اِس کے علاوہ ایگزر گروپ، ایگزر جوسز، ایگزر منرل واٹر، ایگزر انرجی مشروبات، ایگزر چائے وغیرہ بنانے کا بھی دعویٰ کرتا ہے مگر یہ تمام چیزیں آپ کو کسی مارکیٹ میں نظر نہیں آئیں گی، ساتھ ہی اِس گروپ کی جانب سے ایگزر الیکٹرونکس، ایگزر انرجی سیور اور گھریلوں استعمال کی اشیاء فریج، ٹی وی وغیرہ بنانے کا بھی دعویٰ موجود ہے، لیکن تحقیقاتی رپورٹ کہتی ہیں کہ اِن تمام کمپنیوں کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔اِسی طرح ایگزر نے "سکون سٹی " کے نام سے رہائشی منصوبے لاہور، اسلام آباد اور راولپنڈی میں شروع کرنے کیلئے 2500ایکڑ اراضی حاصل کرنے کا بھی دعویٰ کیا ہے، مگر یہ زمین کہاں ہے ،ایگزر کے لاہور آفس کو بھی نہیں معلوم۔ساتھ ہی اِس گروپ کا کہنا ہے کہ اُس نے بھاری سرمایہ کاری سے ایتھوپیا میں ایک لاکھ ایکڑ اراضی کی خرید

اری کی ہے،اِس گروپ نے ایک چننگ اور سپننگ فیکٹری بھی خریداری میں ظاہر کی ہے، جس کی پیداوار تاحال صفر ہے، حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کمپنی نے اِن منصوبوں پر خرچ کی گئی رقم ظاہر نہیں کی ہے،البتہ بعض دیگر منصوبوں پر کھربوں روپے کی سرمایہ کاری دکھائی گئی ہے، قابل ذکر بات یہ ہے کہ اِن کمپنیوں میں کیپ لہبل ایشیا الیگزر،آصف جاوید ٹریڈ کمپنی، حبیب کارپوریشن، میزان، سپیڈکس،ایم ایم قریشی پرائیوٹ لمیٹیڈ،الغفار ایسوسی ایشن، شفیق کیبل مرچنٹ، گرین کارپوریشن،المسلم ٹریڈنگ کمپنی، الحاشر مضاربہ کمپنی،البرکہ مضاربہ کمپنی اور مسیحا انٹرپرائزز وغیرہ بھی شامل ہیں، جنھیں سیکورٹی ایکسچینج کمیشن آف پاکستان سے مضاربت کی اجازت نہیں ہے اور نہ ہی اِن کمپنیوں نے خود کو درست طریقے سے رجسٹرڈ کروایاہے، مگراِس کے باوجود اسلامی مضاربت اور شراکت کے نام پر اِن کمپنیوں نے عوام سے کھربوں روپے ہتھیالیے ہیں۔

اِس حوالے سے قومی روزنامے میں شائع ہونے والی رپورٹ کہتی ہے کہ " 850 افراد نے قومی احتساب بیورو (نیب) سے رجوع کرتے ہوئے دعویٰ کیاہے کہ اُن کے ساتھ 500 ملین روپے کافراڈ کیاگیا، رپورٹ مزید بتاتی ہے کہ اِس کیس میں مفتیوں کی صرف ایک کمپنی ملوث ہے جو مضاربہ اور مشارکہ کے نام سے کاروبار کر رہی ہے،اِس بات کی بھی اطلاعات ہیں کہ مفتیوں کے مختلف گروپ

مختلف کمپنیوں کیلئے کام کرتے ہیں، لیکن، چیئرمین نیب کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے
ادارے نے فی الحال صرف ایک گروپ کے خلاف تحقیقات کی ہیں، رپورٹ کے مطابق
سود سے پاک اسلامی سرمایہ کاری کے نام پر مفتیوں کے ایک گروپ نے ماہانہ 6 سے 8
فیصد منافع پر مضاربہ اسکیم میں پیسے لگانے کا لالچ دے کر مبینہ طور پر شہریوں کی ایک
بڑی تعداد کا استحصال کیا ہے۔ان مفتیوں پر بھروسہ کرکے بہت سی خواتین نے اپنے
زیورات اور لوگوں نے جائیدادیں اور کاروبار بیچ کر مضاربہ کمپنی میں سرمایہ کاری کی
اور اپنی جمع پونجی اِس امید پر اِن حضرات کے حوالے کردی کہ سود سے پاک اچھا منافع
کما سکیں گے۔

جبکہ نیب ذرائع کے مطابق اُسے مفتی احسان الحق اور اُن کے گروپ کے خلاف شکایت
موصول ہوئی جو نفع نقصان کی بنیاد پر عوام کے پیسوں پر کاروبار کرتے تھے۔اِس گروپ
کو عوام نے مضاربہ کے نام پر پیسے دیئے، جس کے پاس کوئی اتھارٹی یا اجازت نامہ نہیں
تھا اور یہ بطور مضاربہ کمپنی سیکیورٹی ایکسچینج کمیشن آف پاکستان (ایس ای سی پی) کے
پاس رجسٹر بھی نہیں تھی، اِس شکایت کی وجہ سے نیب نے باقاعدہ تحقیقات شروع
کردیں اور عوام کی آگاہی کیلئے نیپ نے ایک اشتہار بھی شایع کروایا کہ عوام مذکورہ کمپنی
میں سرمایہ کاری نہ کریں اور جن لوگوں کو پہلے ہی ٹھگ لیا گیا ہے، وہ اپنے دعوے نیب
کے پاس درج کروائیں، چنانچہ گزشتہ ماہ کے وسط تک 856 افراد نے نیپ سے رابطہ

کرکے اپنے دعوے درج کرائے، جبکہ بہت سے متاثرین ایسے بھی ہیں، جنہوں نے اِن کمپنیوں میں لاکھوں کروڑوں میں سرمایہ کاری کی ہے، وہ اپنی شکایات نیب میں درج کرانے سے اِس لیے ہچکچا رہے ہیں کہ انہیں ڈر ہے کہ ادارہ اُن لاکھوں کروڑوں روپے کے ذرائع آمدنی سے متعلق اُن کے خلاف بھی تحقیقات شروع نہ کردے جو انہوں نے ”فراڈ مضاربہ اسکیم میں منافع کیلئے لگائے تھے۔

ابتدائی تحقیقات کے بعد نیب کو یہ بھی معلوم ہوا کہ مفتیوں کے اِس گروپ نے بدنیتی کے تحت عوام سے بطور مضاربہ کمپنی اپنی رجسٹریشن کا معاملہ بھی چھپایا اور عوام سے بھاری رقوم وصول کیں اور انہیں میسرز فیاضی گوجرانوالہ انڈسٹریز پرائیویٹ لمیٹڈ (جو کہ پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنی کے طور پر رجسٹرڈ ہے اور اِس کے پاس مضاربہ کمپنی چلانے کا اختیار نہیں ہے) کے نام سے رسیدیں جاری کیں، چنانچہ عوامی شکایات پر نیب نے مفتی احسان کو گرفتار کرلیا، جہاں ملزم نے اپنے گناہ کا اعتراف کرتے ہوئے نیب آرڈیننس 1999ء کی شق 25 اے کے تحت رضاکارانہ طور پر رقم واپس کرنے پر آمادگی ظاہر کی، چنانچہ کی درخواست قبول کرلی اور اِس حوالے سے VR 55 جون کو نیب نے ملزم کی 18 کروڑ 20 لاکھ روپے کی مجموعی رقم میں سے ملزم نے 44 لاکھ 60 لاکھ روپے کے 20 پے آرڈر جمع کرادیئے اور ملزم کی درخواست پر باقی رقم ایک ماہ بعد ادا کرنے کی اجازت دی گئی، جبکہ ملزم کی 6 غیر منقولہ جائیدادوں کے کاغذات بھی نیب نے اپنے پاس

بطور ضمانت رکھ کر اُسے رہا کر دیا تھا۔ باخبر ذرائع یہ بھی کہتے ہیں کہ مفتی احسان کی کمپنی
کے علاوہ بھی دیگر دو کمپنیاں اسی طرح کے غیر قانونی دھندے میں ملوث ہیں، اِس
حوالے سے ایک متاثرہ شخص کا کہنا ہے کہ اُس نے مفتی عثمان نامی شخص کی کمپنی میں 2
کروڑ روپے لگائے جو مفتی عثمان نے ربا فری (سود سے پاک) کاروبار کے نام پر حاصل
کئے تھے، اِس متاثرہ شخص کے مطابق کئی اعلیٰ علماء اور مذہبی گروپس کا نام بھی اِس کاروبار
میں لیا جاتا ہے۔

باخبر ذرائع یہ بھی بتاتے ہیں اِس اسکینڈل کے نمایاں کرداروں میں مفتی احسان الحق
280 ارب سے زائد، زید شاہان صدیقی المعروف سیٹھ میمن ڈیفنس والا 125 ارب،
شفیق الرحمٰن 80 ارب سے زائد اور مفتی اسامہ ضیاء 20 ارب سے زائد کے فراڈ میں
ملوث ہیں، اسی طرح مختلف چھوٹے گروپ بھی ہیں، جن کا فراڈ کروڑوں میں بتایا
جاتا ہے، جبکہ مفتی اسامہ ضیاء کا فراڈ چند ماہ قبل ہی راولپنڈی میں منظر عام پر
آیا ہے، جس کے بعد یہ شخص مفرور اور ایک اطلاع کے مطابق پاکستان سے فرار
ہو چکا ہے، ذرائع یہ بھی بتاتے ہیں کہ مفتی احسان الحق اور مفتی اسامہ ضیاء 10 سے 20
فی صد تک منافع اپنے ایجنٹوں کو دیتے اور وہ ایجنٹ 5 سے 15 فی صد تک عوام کو منافع
کی مد میں ادا کرتے تھے، یوں یہ منافع عام بینکوں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ تھا، اعتماد
و بھروسہ حاصل کرنے کیلئے فراڈ کرنے والوں نے ابتدائی طور پر لوگوں کو بروقت
ادائیگیاں بھی کیں، جس سے لوگوں کا

اعتماد بڑھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے طول و عرض میں یہ وبا پھیل گئی، اگرچہ فراڈ میں ملوث افراد اور ادارے رقوم کے لین دین کیلئے بینکوں کو ذریعہ بناتے تھے، لیکن یہ کسی ادارے کی بجائے انفرادی ناموں کو استعمال کرتے تھے ، جبکہ ایجنٹ رقوم کے حصول کے لیے بینکوں یا دیگر ذرائع پر انحصار کرنے کے بجائے نقد رقم پر توجہ دیتے اور متاثرین کو کوئی مصدقہ ثبوت فراہم کرنے کی بجائے اپنے نام نہاد اداروں کی پرنٹ شدہ رسیدیں دیتے، جبکہ بعض تو کوئی ثبوت بھی نہیں دیتے اور اگر کوئی مطالبہ کرتا تو کہا جاتا اگر آپ کو اعتماد نہیں تو اِس کاروبار میں شرکت نہ کریں، یہ وہ طریقہ واردات تھا جس نے عوام کو مزید گمراہ کیا، یہی وجہ ہے کہ متاثرین کی ایک بڑی تعداد ایسی بھی ہے، جن کے پاس اپنی انویسمینٹ کے حوالے سے کوئی ثبوت ہی موجود نہیں ہے، جس کی وجہ سے وہ نہ کسی جگہ اپنی رقم کی وصولیابی کا دعویٰ کر سکتے اور نہ ہی قانونی طور پر اُن کی داد رسی آسان ہے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ ساری مشکوک سرگرمیاں دیوبندی مکتبہ فکر اور اِس مکتبہ فکر کی " تبلیغی جماعت " کا نام استعمال کرکے کی گئیں اور ان لوگوں نے مضاربت کے نام پر پاکستان کے بڑے بڑے مدارس سے فتاوی بھی لیے ، جنھیں دکھا کر یہ لوگ باآسانی لوگوں کو اپنے جال میں پھنسا لیتے تھے، مگر قابل غور پہلو یہ ہے کہ جس وقت یہ کام عروج پر تھا اُس وقت تبلیغی جماعت سمیت تمام ذمہ

داران خاموش تھے ، لیکن اب بھانڈہ پھوٹنے کے بعد یہ لوگ اِس کاروبار سے لاتعلّقی کا اظہار کر رہے ہیں،اِس کے ساتھ یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اِن جعلی مضاربہ کمپنیوں کے فرنٹ مین کے طور پر جو لوگ سامنے آئے اُن کا تعلق بھی اِس مخصوص مکتبہ فکر اور تبلیغی جماعت سے ہے،مثال کے طور پر تبلیغی جماعت کے ایک دیرینہ ساتھی مفتی ضیاء الحسن جن کا تعلق راولپنڈی کے مشہور و معروف تبلیغی مرکز "ذکریہ" مسجد سے ہے اور جو الیگزر گروپ کی تخلیق کار، روح رواں اور ابتدائی طور پر مضاربہ کار کے طور پر سامنے آنے والے مفتی اسامہ ضیاء اور مفتی احسان ضیاء کے والد ہیں، جبکہ ناصر لالیکا مفتی اسامہ ضیاء اور مفتی احسان ضیاء کا برادر نسبتی ہے،اِن حضرت نے اسلام آباد، راولپنڈی کے علماء اور مدارس پر توجہ مرکوز کی اور دیکھتے ہی دیکھتے مفتی اسامہ ضیاء نے اپنے ہم مسلک نوعمر مفتیوں،مدارس کے اساتذہ اور خطباء کو مڈل مین بنا کر اُن لوگوں تک رسائی حاصل کرلی یہ جو اپنا سرمایہ سودی کاموں میں تو نہیں لگانا چاہتے تھے مگر اپنے سرمائے سے غیر معمولی منافع حاصل کرنے میں خصوصی دلچپی رکھتے تھے۔

ایسے لوگوں تک رسائی کیلئے مفتی اسامہ اور اُن جیسے لوگوں نے دینی طبقے سے وابستہ حلقہ اثر رکھنے والوں لوگوں کو بطور ایجنٹ استعمال کیا،اِن میں اسلام آباد راولپنڈی کے علاوہ دوسرے شہروں کے بیسیوں خطیب،آئمہ مساجد اور

مدارس کے اساتذہ بھی شامل ہیں،اس طرح یہ لوگ محض چند برسوں کے دوران کھربوں روپے اکٹھا کرنے میں کامیاب ہوگئے اور لوگوں نے اِن کے جھانسے اور پر کشش منافع کے لالچ میں اپنی زمینیں، زیورات، رہائشی مکانات، مال مویشی فروخت کر کے تمام جمع پونجی اِن مفتیوں کے حوالے کردی، اسی طرح ہزارہ ڈویژن کے چھ اضلاع میں فراڈ اور نوسربازی میں ملوث مفتیوں اور قاریوں کا تعلق بھی اسی مکتبہ فکر ہے،اس کے علاوہ پاکستان کے مختلف علاقوں خصوصاً پنجاب اور سرحد کے بڑے شہروں میں جعلی مضاربہ کاروبار کرنے والی کمپنی کیپ ٹیبل ایشیا کے کرتا دھرتاوں میں بھی اِس جماعت سے وابستہ اہم لوگوں کے نام سامنے آئے ہیں، یوں ضلع اٹک کی 5 تحصیلوں سے 200 ارب روپے اکٹھے کرنے والے مفتی بشیر، مفتی عبدالرافع، مفتی عبدالخالق، مفتی اسامہ، مفتی احسان ضیاء اور ناصر لاایکا سمیت اِس کاروبار سے منسلک 95 فی صد افراد کا تعلق اسی مکتبہ فکر سے ہے، جبکہ ضلع دیر لوئر کی عوام بھی تبلیغی جماعت سے وابستہ کچھ افراد کے ملوث ہونے کی وجہ سے اپنی تمام جمع پونجی اِس اَن دیکھے کاروبار میں جھونک کر اپنی زندگی برباد کرچکے ہیں۔

قارئین محترم ! اَمر واقعہ یہ ہے کہ مجموعی طور پر کاروباری مشارکت اور مضاربت کا یہ عمل اسلام کے وضع کردہ اصولوں پر نہیں بلکہ فراڈ اور دجل وفریب کی بنیاد پر شروع کیا گیا تھا، جس کی وجہ سے حالیہ مضاربہ اسکینڈل ملکی

کی تاریخ کا سب سے بڑا مالیاتی اسکینڈل بن کر سامنے آیا ہے،اِس اسکینڈل کے تمام مرکزی کردار دینی حال، حلیہ، حوالہ اور تعلق رکھنے کی وجہ سے سادہ لوح عوام کو بے وقوف بناکر کھربوں روپے لوٹ چکے ہیں، لباس خضر میں ملبوس اِن نوسرباز مفتیوں اور قاریوں کے اِس شرمناک طرز عمل کی وجہ سے نا صرف اسلام اور اسلامی اسلامی تعلیمات کو نقصان پہنچا ہے بلکہ اِن کے اس غیر دینی طرز عمل سے اُن مکتبہ فکر جو اِس قسم کے مضاربتی اور مشارکتی معاملات سے قطعی لا تعلق ہیں، کی نیک نامی اور شہرت کو بھی شدید نقصان پہنچا ہے، دوسری جانب اِس فراڈ، لوٹ مار، دھوکہ دہی اور جعل سازی کی وجہ سے عوام کا اُن پر سے اعتماد و بھروسہ بھی مجروح ہوا ہے، لہٰذا حکومت وقت، ارباب اختیار قومی احتساب بیورو اور دیگر تحقیقاتی ایجنسیوں کی اوّلین ذمہ داری بنتی ہے کہ دین کی آڑ میں اِس سنگین فراڈ میں ملوث تمام خفیہ اور ظاہری کرداروں کو بے نقاب کرکے قوم کے سامنے لایا جائے، ساتھ ہی متاثرین اسکینڈل کی ڈوبی ہوئی رقوم کی واپسی کے انتظامات کیے جائیں اور اِس فراڈ میں ملوث تمام غاصبوں کو کڑی سے کڑی سزا دے کر نشان عبرت بنایا جائے تاکہ آئندہ کسی مذہبی حال، حلیئے اور حوالہ رکھنے والے شخص کو یہ جرات نہ ہوسکے کہ وہ اسلام کے نام پر سادہ لوح عوام کے جذبات سے کھیل سکے اور اُن کے اعتماد و بھروسے کا خون کرسکے۔

☆☆☆☆☆

قادیانی طلسم ہوش رُبا کی نقاب کشائی۔۔۔۔

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ مرزاغلام احمد قادیانی کی بودو باش۔برطانوی سامراج کی عنایت اور سرپرستی کا نتیجہ تھی ،انگریز نے اُسے جھوٹی پیغمبری کا لبادہ پہنا کرأمت مسلمہ میں برگ حشیش کی مانند کاشت کیا۔ قادیانیت استعماری سیاست کا وہ خود کاشتہ پودا ہے ،جسے انگریز نے اپنے نظریہ ضرورت کے تحت پروان چڑھایا اوراس کی حفاظت و آبیاری اور دین مرزائیت کے فروغ و حفاظت کیلئے بڑے اہتمام سے کام لیا۔چنانچہ جھوٹ اور مکروفریب کی گود میں جنم لینے والے اِس ناجائز بچے نے اپنے سرپرستوں کی ایماء پر اُمت مسلمہ کو اندر سے کھوکھلا کرنے کی بہت کوششیں کیں اور مسلمانوں کو جذبہ جہاد سے برگشتہ کرنے اور اُن میں سے روح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتمے کیلئے ہر حربہ استعمال کیا۔ مولانا مرتضیٰ احمد خان مکیش اپنی کتاب "پاکستان میں مرزائیت" میں لکھتے ہیں کہ " 1919ء تحریک خلافت کے دوران مرزائی جماعت نے اُس دور کے وائسرائے کے سامنے سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے سرکار انگریزی کو یقین دلایا کہ مسلمانوں کے اِس جہاد آزادی کا مقابلہ کرنے کیلئے آپ کے خادم موجود ہیں، جو سرکار انگریز کی وفاداری کو مذہبی عقیدہ کے رو سے اپنا فرض سمجھتے ہیں۔" دراصل مرزا قادیانی برطانوی سامراج کا پروردہ ایسا جھوٹا مدعی نبوت تھا جس کی ساری زندگی اپنے

یہودی وعیسائی آقاؤں کی خوشنودی اور مداح سرائی میں گزری۔

نبوت ورسالت کے اِس جھوٹے دعویدار کا خود کہنا ہے کہ "میں ایک ایسے خاندان سے ہوں کہ جو اِس گورنمنٹ کا پکا خیر خواہ ہے۔" "اور گورنمنٹ پر پوشیدہ نہیں کہ ہم قدیم سے اُس کی خدمت کرنے والے اور اُس کے ناصح اور خیر خواہوں میں سے ہیں اور ہر ایک وقت پر دلی عزم سے ہم حاضر ہوتے رہے ہیں۔" "کیا گورنمنٹ اتنا غور نہیں کرتی کہ ہم انہی بزرگوں کی اولاد ہیں جنھوں نے اپنی عمریں حکومت برطانیہ کی خدمت میں صرف کردیں۔" اور آج "ہم اپنی معزز گورنمنٹ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم اسی طرح مخلص اور خیر خواہ ہیں جس طرح ہمارے بزرگ تھے۔" "میں بذات خود سترہ برس سے سرکار انگریزی کی ایک ایسی خدمت میں مشغول ہوں کہ درحقیقت وہ ایک ایسی خیر خواہی گورنمنٹ عالیہ کی مجھ سے ظہور میں آئی ہے کہ میرے بزرگوں سے زیادہ ہے اور وہ یہ کہ بیسیوں کتابیں عربی اور فارسی اور اردو میں اس غرض سے تالیف کی ہیں کہ اِس گورنمنٹ محسنہ سے ہرگز جہاد درست نہیں، بلکہ سچے دل سے اطاعت کرنا ہر ایک مسلمان پر فرض ہے۔" سب جانتے ہیں کہ "میری عمر کا اکثر حصہ اس سلطنت انگریزی کی تائید اور حمایت میں گزرا ہے اور میں نے ممانیت جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اِس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کیے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں اُن سے بھر سکتی ہیں۔ میں نے ایسی کتابیں تمام کو

ممالک عرب اور مصر اور شام اور کابل اور روم تک پہنچادیا ہے ۔ میری ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان اِس سلطنت کے سچے خیر خواہ ہو جائیں اور مہدی خونی اور مسیح خونی کی بے اصل روایتیں اور جہاد کے جوش والے مسائل جو احمقوں کے دلوں کو خراب کرتے ،اُن کے دلوں سے معدوم ہو جائیں۔" درحقیقت مرزا اور مرزائی جماعت کی ساری تگ ودو اِس مقصد کیلئے ہے کہ مسلمانوں کو محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور جذبہ جہاد سے دور کرکے انہیں سرکار انگریز کی اطاعت و وفاداری کے راستے پر گامزن کیا جائے، مرزا کی کتب ورسائل ، اشتہارات اور فرمودات اِس بات کا بین ثبوت ہیں جبکہ درج بالا چند اقتباسات مرزا کے سامراجی مقاصد کی واضح عکاسی کرتے ہیں۔

نئی آنے والی کتاب " قادیانیت برطانوی سامراج کا خودکاشتہ پودا" قادیانی مذہب کے ایسے ہی عقائد و عزائم ، سامراجی حمایت اور جہاد کی ممانیت پر مبنی نا قابل تردید اور ہوش ربا عکسی شہادتوں کا مجموعہ ہے، جسے عصر حاضر کے " الیاس برنی" جناب محمد متین خالد صاحب نے بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے ترتیب دیا ہے۔ یہ ایسی انگشت بدنداں کردینے والی کتاب ہے جس میں مرزا قادیانی کی اپنی ہی تحریروں اور فرمودات سے ثابت کیا گیا ہے کہ قادیانیت انگریز کا بویا ہوا ایسا فتنہ ہے جس کا مذہب اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جناب محمد متین خالد نے کتاب کو کسی ابہام اور شک و شبہ سے بچانے کیلئے مرزا قادیانی کے شرمناک

اور ندامت آمیز اعترافات کے عکسی ثبوت بھی شامل کتاب کر دیئے ہیں، جنھیں جھٹلانا اور انکار کرنا کسی قادیانی اور اُس کے حواری کے بس کی بات نہیں۔ یہ اعترافات مرزا کی خانہ ساز نبوت کے تمام راز طشت از بام کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ یہ قادیانی ٹولہ سامراج کا ٹاؤٹ، ایجنٹ اور خوشامدیوں اور لادین درباریوں کا ایسا گروہ ہے جس کی کڑیاں اسود عنسی اور مسلمہ کذاب سے جا ملتی ہیں۔

قارئین محترم! تین عشروں سے زائد دین وایمان کی سرحدوں پر پہرہ دینے والے برادرم محمد متین خالد کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور تحفظ ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی دولت سے مالامال محمد متین خالد برسوں سے قادیانیت کے خلاف قلمی جہاد میں مصروف ہیں، اب تک رد قادیانیت پر اُن کی سو سے زائد کتب ورسائل شائع ہو چکی ہیں۔ ”قادیانیت برطانوی سامراج کا خودکاشتہ پودا“ اِس موضوع پر اُن کی نئی کتاب ہے، جس میں قادیانی مکر ودجل اور استعماری چاپلوسی کو توہین وتضحیک کے بجائے مدلل دلائل وبراہین سے آسان وسلیس انداز میں نقاب کشائی کی گئی ہے اور قادیانی طلسم ہوش ربا کے اندر جاکر حمامِ باد گرد کے پردے اٹھائے گئے ہیں۔ بقول جناب شفیق مرزا ”محمد متین خالد نے تنِ تنہا اِس تحقیقی کتاب میں اتنا کچھ اکٹھا کر دیا ہے جو اداروں اور جماعتوں کا کام تھا۔“ بے شک کتاب بڑی عرق ریزی اور

محنت شاقہ سے تیار کی گئی ہے، جس میں شامل ناقابل تردید دلائل، چشم کشا انکشافات، حیرت انگیز حوالہ جات اور عبرت آموز حقائق نے اِس کتاب کو اپنی نوعیت کی پہلی منفرد اور اپنی مثال آپ کتاب بنادیا ہے۔ فخر قوم ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب، محترم جبار مرزا، جناب راجہ ظفرالحق اور محترم شفیق مرزا جیسی قومی شخصیات کے پر مغز تبصرے کتاب کی اہمیت وافادیت کو اور بھی دوچند کرتے ہیں۔

ایران جوہری معاہدہ اور پاکستان پر منڈلاتے خطرات۔۔۔

ابھی ہمارے کانوں میں "مرگ بر امریکہ، مرگ بر اسرائیل اور مرگ بر ضدِ ولایت فقیہ" کے نعروں کی گونج باقی ہے، ابھی ہماری سماعتیں "Axis of Evil" کو یادوں کی بھول بھلیوں سے محو بھی نہیں کرپائی تھیں کہ 24 نومبر کو امریکہ کو "شیطان بزرگ" اور ایران کو" برائی کا محور "قرار دینے والوں کے درمیان جوہری معاہدہ کا طے پاجانا شدید حیرت و استعجاب کا باعث تھا۔ اتوار کے روز اُس وقت ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب یہ خبر سنی کہ جنیوا میں ایران اور 6 عالمی طاقتوں امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، روس اور چین کے درمیان چار روز سے جاری رہنے والے مذاکرات کے بعد ایران کے ایٹمی پروگرام کے بارے معاہدہ طے پا گیا ہے، جس کے تحت ایران اپنا جوہری پروگرام محدود کر دے گا، معاہدہ کے تحت ایران یورینیم کی افزودگی کم سے کم سطح پر رول بیک کرے گا اور ذخائر میں کمی کرتے ہوئے اپنی جوہری تنصیبات کو ہر وقت عالمی معائنہ کے لئے کھلا رکھے گا۔ اِس معاہدہ کے تحت ایران نے اِس بات پر بھی رضا مندی ظاہر کی کہ وہ 6 ماہ تک یورینیم کو 5 فیصد سے زیادہ حد تک افزودہ نہیں کرے گا اور ایران ایٹمی توانائی کے عالمی ادارے (IAEA) کے انسپکٹرز کو اپنے نیوکلیئر پلانٹس کے روزانہ معائنہ کی اجازت دے گا۔ ایران نئے سینٹری فیوجز نہیں

لگائے گا اور عالمی معائنہ کاروں کو " آراک " کی جوہری تنصیبات تک رسائی بھی دے گا۔اِس کے عوض امریکہ سمیت عالمی۔برادری ایران کو 7 ارب ڈالر کے حصول میں مدد دیں گے اور آئندہ 6 ماہ تک ایران پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جائے گی، تیل کی درآمد کی اجازت موجودہ حد تک۔برقرار رہے گی۔ ایران پر قیمتی دھاتوں اور فضائی کمپنیوں کے سلسلے میں پہلے سے عائد چند پابندیاں معطل کر دی جائیں گی اور ایرانی تیل کے منجمد اثاثے جو تقریباً 4 ارب بیس کروڑ ڈالر ہیں جاری کر دیئے جائیں گے۔

مذکورہ معاہدے کے حوالے سے ایران کو۔برائی کا محور قرار دینے والے امریکہ کے صدر اوباما کا کہنا ہے کہ یہ معاہدہ دنیا کو محفوظ بنانے اور جوہری تنازعہ کے جامع حل کی جانب اہم قدم ہے،اوباما کہتے ہیں کہ ہم ایران کے جوہری پروگرام کی صلاحیت کو محدود کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ہمارا مقصد مسئلہ کا پرامن حل تھا تا ہم معاہدہ کی خلاف ورزی پر ایران سے ریلیف واپس لے لیا جائے گا۔ایران کا جوہری پروگرام پرامن مقاصد کے لئے ہونا چاہیے۔پرامن جوہری توانائی کا حصول ہر ملک کا حق ہے، ماضی میں کانگریس نے ایران پر پابندیاں عائد کیں لیکن یہ وقت ایران پر مزید پابندیاں عائد کرنے کا نہیں، ایران کو چاہیے کہ وہ معاہدہ پر عملدرآمد کرے۔ ایران کو دوبارہ عالمی۔برادری کا حصہ بننے پر فائدہ ہو گا۔ امریکی صدر کا کہنا تھا کہ ہم اقتدار

میں آنے کے بعد ایران مسئلہ کا پر امن حل چاہتے تھے اور یہ معاہدہ ساری دنیا کے لئے ایک نیا آغاز ہو گا۔ معاہدے سے ایران کو تجارتی معاہدے جاری رکھنے کا موقع ملے گا۔ انہوں نے کہا کہ معاہدے کے تحت ایران نئے سینٹری فیوجز نصب نہیں کرے گا، ایران ایٹمی توانائی کے اہل کاروں کو اپنی ایٹمی تنصیبات تک رسائی دے گا،ایران کو چاہیے کہ وہ معاہدہ پر عملدرآمد کو یقینی بنائے، معاہدہ کے نتیجہ میں ایران کی جانب سے جوہری ہتھیاروں کی تیاری نا ممکن ہو جائے گی۔

جبکہ ایرانی صدر حسن روحانی نے معاہدے پر دستخط کے بعد اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مذاکرات کی کامیابی کیلئے مذاکرات کاروں نے اہم کردار ادا کیا، معاہدے کے بعد نئے دور کا آغاز ہو گا۔ ایرانی صدر کا کہنا تھا کہ معاہدہ روشن خیال ایرانی عوام کی وجہ سے طے پایا، انہوں نے معاہدہ پر خوشی کا اظہار کیا۔ ایرانی وزیر خارجہ جواد ظریف نے جنیوا میں پریس کانفرنس سے خطاب میں کہا کہ جوہری معاہدہ مسائل کے حل کی چابی ہے، ایران جوہری پروگرام کی پاسداری کرے گا، ان کا کہنا تھا کہ معاہدہ اہم پیش رفت ہے۔ دوسری طرف چین، امریکہ، برطانیہ، فرانس، روس اور جرمنی نے مذاکرات کے بعد اعلان کیا ہے کہ ایران کے ساتھ تاریخی جوہری معاہدہ طے پا گیا ہے، یورپی یونین ایرانی وزیر خارجہ اور فرانس نے اس معاہدہ کی تصدیق کی، برطانوی وزیر اعظم سے

ملاقات کے بعد پریس کانفرنس سے خطاب میں امریکی وزیر خارجہ جان کیری نے کہا کہ معاہدہ کے بعد خطہ میں اسرائیل سمیت ہمارے اتحادی محفوظ ہو گئے ہیں۔ان کا کہنا تھا کہ ہمارا مقصد ایران کو ایٹمی ہتھیار بنانے سے روکنا تھا۔عالمی برادری کئی مرتبہ اپنے تحفظات کا اظہار کر چکی تھی۔جان کیری نے بتایا کہ ایران کے پاس اب 19 ہزار سینٹری فیوجز ہیں،اگرایران سے ایٹمی معاہدہ نہ ہوتا تو اس کا ایٹمی پروگرام مزید آگے بڑھ جاتا،امریکی وزیر خارجہ جان کیری نے میڈیا کے نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ایران اور عالمی طاقتوں کے درمیان طے پانے والے معاہدے سے اسرائیل کو محفوظ بنانے میں مدد ملے گی اور ایرانی جوہری پروگرام رول بیک ہو جائے گا۔اُن کا یہ بھی کہنا تھا اس مسئلے کے بارے میں اسرائیل اور امریکہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں "فیصلے" اور "اندازے" کا معاملہ ہے۔

اُدھر روس اور چین نے بھی ایران اور عالمی طاقتوں کے درمیان اس کے جوہری پروگرام کے حوالے سے سمجھوتے کا خیر مقدم کیا اور دنیا بھر نے اس تاریخی معاہدے کا خیر مقدم کرتے ہوئے اسے خوش آئند قرار دیا ہے،البتہ سعودی عرب نے خبردار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایران سے عالمی معاہدہ کی ناکامی کی صورت میں ریاض خاموش نہیں رہے گااور ناکامی کی مضمرات کی ذمہ داری مغرب بالخصوص امریکہ اور برطانیہ پر عائد ہو گی،دوسری طرف اسرائیل نے معاہدے پر

ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے مسترد کر دیا ہے، اسرائیل کا کہنا ہے یہ معاہدہ تاریخی غلطی اور ایرانی فتح ہے ہم اسے ماننے کے پابند نہیں۔اسرائیلی وزیراعظم نیتن یاہو اس معاہدے پر سخت برافروختہ ہیں اور کہتے ہیں کہ اسرائیلی ریاست، دنیا میں قوم یہود کی واحد ریاست ہے،اس لئے اس کے تحفظ کا "مقدس فریضہ" ہماری ذمہ داری ہے۔اسرائیلی وزیراعظم کا کہنا ہے کہ حسن روحانی بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا ہیں!
۔حالانکہ یہ بات ساری دنیا جانتی ہے کہ اسرائیل خود ایک غیر اعلانیہ جوہری ریاست ہے، جس کے جوہری ترکش میں جوہری وار ہیڈز کی تعداد چین کے وار ہیڈز سے بھی زیادہ ہیں۔اَمر واقعہ یہ ہے کہ اسرائیل کو پاکستان، ایران اور اسلامی دنیا کی ایٹمی سرگرمیاں خار کی طرح چبھتی رہی ہیں، یہ بات بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ اسرائیل نے بارہا بھارت اور امریکی قیادت کواِن دو ممالک پر حملے کیلئے بھی اکسایا۔ شواہد بتاتے ہیں کہ جن دنوں امریکہ نے عراق اور بعد ازاں افغانستان کو اپنی جارحیت کا نشانہ بنایا تھا اُن دنوں بھی اسرائیل نے امریکہ پر دباو ڈالا تھا کہ پاکستان اور ایرانی جوہری، پروگرام سے بھی نبٹ لیا جائے، لیکن امریکہ اسرائیلی دباؤکے باوجود اس اقدام سے اس لیے باز رہا کہ یہ ممالک اُس کیلئے تر نوالہ ثابت نہیں ہوتے۔
ماضی یں اسرائیل نے بڑی شدومد کے ساتھ اس پروپیگنڈے سے مغربی دنیا کو

خوفزدہ بھی کیا کہ ایران ایٹم بم بنانے کے لئے قریب پہنچ گیا ہے، اس پر مستزاد سابق ایرانی صدر محمود احمدی نژاد کے بیانات تھے جن سے اسرائیل لرزہ براندام رہتا تھا کیونکہ وہ نہ تو اسرائیل کے وجود کو تسلیم کرنے کے لئے تیار تھے اور نہ ہالوکاسٹ کے افسانوں کو درست مانتے تھے،اسی لئے خوفزدہ مغربی دنیا یہ سمجھتی تھی کہ جونہی ایران کے پاس ایٹمی ہتھیار آئے گا، وہ اسرائیل کو نیست و نابود کرنے کی راہ پر چل پڑے گا، جبکہ اس کے برخلاف اسرائیل نے ایک زمانے میں بغداد پر فضائی حملہ کرکے عراق کا ایٹمی ری ایکٹر تباہ کر دیا تھا، وہ ایسا ہی سلوک ایرانی ایٹمی پروگرام کے ساتھ بھی چاہتا تھا، لیکن جب اُسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی تو اُس نے معاہدے کو مسترد کر کے اپنی راہ پر چلنے کا اعلان کر دیا ہے۔ گو اس وقت ایران اور مغربی طاقتوں کے درمیان نئے جوہری معاہدے کے حوالے سے ماہرین پر امید ہیں کہ اِس سے جلد ہی خطے میں اقتصادی سرگرمیوں کا ایک نیا دور شروع ہوگا اور علاقائی تجارتی سرگرمیاں فروغ پائیں گی، کشیدگی کم ہوگی اور سفارتی سرگرمیوں کے نئے دور کا آغاز ہوگا جو خطے کو خوشحالی سے ہمکنار کرے گا، دوسری طرف ایران نے بھی اپنے حالیہ رویئے سے ثابت کیا ہے کہ کشیدگی تدبر کے ذریعے کم کی جاسکتی ہے۔ ایران نے محمود احمدی نژاد کا دور بھی دیکھا مغربی دنیا اُن کی کھری باتوں سے بدکتی تھی اور وہ خود بھی دنیا کو خوفزدہ کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے تھے، آج ایران حسن روحانی کا دور دیکھ رہا

ہے جو ماضی کی قیادتوں اور بالخصوص ایرانی انقلاب کے بانی آیت اللہ خمینی کے افکار و نظریات سے یکسر مختلف ہے۔ کل تک ایک دوسرے کو "شیطان بزرگ" اور "برائی کا محور" قرار دینے والے آج ایک ہی کشتی میں سوار ایک دوسرے کے دوست ہیں، حالیہ ایرانی طرز عمل سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُس نے اپنے نعرے کے پہلے حصے "مرگ بر امریکہ" کو پس پشت ڈال دیا ہے۔

یہ درست ہے کہ حالیہ جوہری معاہدے کے تناظر میں جہاں ایک دہائی سے جاری ایران امریکہ کشمکش کا خاتمہ ہوا ہے اور ایران اور ایرانی قوم کیلئے عالمی برادری سے ثمرات سمیٹنے کا موقع ملا ہے، وہیں اِس جوہری معاہدے سے پاکستان کیلئے نئے خطرات نے بھی جنم لیا ہے، اِس معاہدے نے پاکستان کیلئے خطرے کی ایسی گھنٹی بجادی ہے جو آنے والے دنوں میں پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے خاتمے کیلئے امریکہ اور اُس کے اتحادی ممالک کا دباؤ بڑھانے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ کچھ تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ اس معاہدے سے پاکستان اور ایران گیس پائپ لائن کے منصوبے پر عملدرآمد کی راہ ہموار ہوئی ہے، لیکن تصویر کا دوسرا رخ یہ کہتا ہے کہ اس معاہدے کے بعد پاکستان پر ایٹمی تنصیبات کے عالمی معائنے کیلئے دباؤ بڑھ جائے گا اور ایران کے بعد پاکستان سے بھی اس بات کا تقاضا کیا جائے گا، چنانچہ اس معاہدے کے اثرات کو وسیع تناظر میں دیکھنا ہوگا اور اگلے چھ ماہ اِس وجہ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں کہ پاکستان

کا پر امن ایٹمی پروگرام ہنود و یہود اور اسرائیل کے سینے میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔

ڈرون حملے، حکومتی دعوے اور قومی لائحہ عمل۔۔۔

گذشتہ دنوں اُمور خارجہ کے مشیر سرتاج عزیز نے ڈرون حملے نہ ہونے کی یقین دہانی کرائی تھی، لیکن ابھی اُن کے بیان کی سیاہی بھی خشک ہونے نہ پائی تھی کہ امریکہ نے ہنگو کی تحصیل ٹل کے علاقے ٹنڈر میں واقع ایک مدرسے پر ڈرون میزائل داغ دیئے، گزشتہ دنوں مشیر خارجہ نے سینیٹ کی قائمہ کمیٹی برائے امور خارجہ کو بتایا تھا کہ امریکہ نے اس بات کی واضح یقین دہانی کرادی ہے کہ وہ طالبان کے ساتھ مذاکرات کے دوران ڈرون حملے نہیں کرے گا، مگر افسوس کہ مشیر خارجہ کے بیان کو ابھی 24 گھنٹے بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ امریکہ نے ڈرون حملوں کا دائرہ خیبر پختونخوا تک بڑھا دیا، جسے بعض تجزیہ نگار وفاقی حکومت کی کمزور خارجہ پالیسی سے تعبیر کررہے ہیں، قدرتی طور پر اس حملے سے عدم تحفظ کا احساس عام ہوا اور اس نے امریکی عزائم کے بارے میں شکوک و شبہات کو جہاں مزید مزید گہرا کردیا ہے، وہیں اِس بات کو بھی واضح کردیا ہے کہ ہمارا حکمران طبقہ مسلسل جھوٹ پر جھوٹ بول کر نہ صرف قوم کو بے وقوف بنارہاہے بلکہ اہم قومی اُمور سے پارلیمان کو بھی بے خبر رکھے ہوئے ہے۔اَمر واقعہ یہ ہے کہ حکومتی دعووں کے باوجود ڈرون حملوں کا سلسلہ نہ تو رُک سکا اور نہ ہی اِس میں کوئی کمی واقع ہوئی ہے۔

بلکہ ڈرون حملے بند کرنے کے مطالبے کے باوجود امریکہ نے پاکستان کے اس مطالبے کو درخور اعتنا نہ سمجھتے ہوئے ڈرون حملوں کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے اور مستقبل میں بھی ایسے کوئی آثار نظر نہیں آرہے کہ وہ یہ حملے کرنا بند کردے گا، دوسری طرف جمعیت علماء پاکستان کے سربراہ صاحبزادہ ابوالخیر محمد زبیر سمیت متعدد سیاسی رہنماوں نے ہنگو میں ڈرون حملے کو ملکی سالمیت اور خود مختاری پر براہ راست حملہ قرار دیا ہے، جبکہ ہنگو میں امریکی ڈرون حملے پر وفاقی وزیر داخلہ چوہدری نثار کا کہنا ہے کہ اب کسی امریکی یقین دہانی پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا، امریکہ کو اب کوئی کیسے اپنا "دوست" کہہ سکتا ہے، قوم کو ہنگو ڈرون حملے کے بعد امریکی ڈالروں اور" عزت نفس" میں سے کسی ایک کا چناؤ کرنا ہوگا۔ چوہدری نثار کا کہنا تھا کہ امریکہ نے پاکستان کی جانب سے ڈرون حملوں کی بندش کے پرزور مطالبے اور وزیر اعظم نواز شریف کی جانب سے دورہ امریکہ میں ان حملوں کی بھرپور مخالفت کے باوجود حملے جاری رکھنے کے اقدام سے ثابت ہوگیا کہ امریکہ پاکستان کے اندر امن قائم ہونے دینا چاہتا ہے اور نہ ہی امن کیلئے مذاکرات کا عمل آگے بڑھنے دینا چاہتا ہے۔

جبکہ خود وزیر اعظم صاحب اظہار بے بسی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ڈرون حملے

غیر مناسب،تکلیف دہ اور کسی صورت قابل قبول نہیں، امریکی ڈرون حملے کی وجہ سے
طالبان سے مذاکرات کی تیاری دھری کی دھری رہ گئی۔ قارئین محترم ! دفتر خارجہ
وزیر داخلہ اور وزیر اعظم میاں نواز شریف کے ان ظاہری ردعمل کے باوجود اس،
حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مسلم لیگ ن ڈرون حملوں کی بندش کے حوالے سے منقسم
نظر آتی ہے، چوہدری نثار، عمران خان کی طرح امریکہ کے خلاف سخت موقف اختیار
کرنے کے حامی ہیں، جبکہ وزیر اعظم نواز شریف امریکہ کی ناراضی سے بچنا چاہتے ہیں، گو
ہنگو میں امریکی حملے کی وجہ سے نواز شریف کے گرد گھیرا کیے ہوئے حلقے کسی حد تک
کمزور پڑ گئے ہیں،تاہم اب بھی چوہدری نثار کیلئے یہ مشکل بات ہوگی وہ نواز شریف کو
پاک امریکہ تعلقات اور تعاون کی موجودہ سطح میں بڑی تبدیلی لانے پر راضی کر سکیں،
محترم وزیر داخلہ اس وجہ سے بھی امریکہ سے خائف ہیں کہ واشنگٹن نے حکیم اللہ محسود
کو ڈرون حملے میں ہلاک کرکے امن عمل کیلئے کی جانے والی اُن کی کوششیں
سبوتاژ کردیں، چوہدری نثار سمجھتے ہیں کہ امریکہ جان بوجھ کر پاکستان میں دہشت گردی
کو ہوا دے رہا ہے اور وہ یہاں امن کی کسی کوشش کو کامیاب ہونے نہیں دے رہا۔
دوسری طرف ہنگو حملے کے بعد تحریک انصاف کے چیئرمین عمران خان نے ایک پریس
کانفرنس سے خطاب میں کہا کہ سرتاج عزیز کے ڈرون حملے نہ کرنے کی امریکی

یقین دہانی کے بعد ہنگو میں ہونے والے حملے سے ثابت ہو گیا کہ امریکہ پاکستانی حکمرانوں کو جوتے کی نوک پر رکھتا ہے، تحریک انصاف نے ڈرون حملوں کی بندش تک نیٹو سپلائی کے خلاف دھرنوں کا بھی اعلان کیا ہے، عمران خان نے ڈرون حملوں کے خلاف مہم شروع کرتے ہوئے کہا کہ جب تک امریکہ ڈرون حملے بند کرنے کی یقین دہانی نہیں کراتا، ہم نیٹو سپلائیز کو مکمل طور پر بند رکھیں گے اور نیٹو کنٹینرز کو افغانستان جانے نہیں دیا جائے گا۔ گو عمران خان کا ڈرون حملوں کے خلاف بیان اور نیٹو سپلائی کی معطلی کا اقدام قومی جذبات کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے، مگر مسلم لیگ ن کی قیادت اور حکومت تحریک انصاف کے اس اقدام کا مذاق اڑا رہی ہے، جبکہ اس پہلو سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا کہ ماضی میں مسلم لیگ ن خود پیپلزپارٹی کے دور حکومت میں اس مہم میں سرگرم رہی اور امریکی ڈرونز کو مار گرانے کا مطالبہ بھی کرتی رہی ہے اور خود مسلم لیگ ن کے سربراہ اور موجودہ وزیر اعظم نواز شریف ڈرون حملوں کو رکوانے کیلئے نیٹو سپلائی کی بندش کے خیال کی حمایت کرتے رہے ہیں۔

آپ کو یاد ہو گا کہ ماضی میں نواز شریف نے نیٹو سپلائی بند کروانے کے حوالے سے اُس شق کا سہرہ بھی اپنے سر لیا تھا جو کہ گزشتہ برس پارلیمنٹ کی متفقہ قرارداد میں شامل تھی، حیرت کی بات ہے کہ وہ مسلم لیگ ن جو کہ آج تحریک انصاف کی جانب سے نیٹو سپلائی بند کرنے کے اقدام کی مخالفت کر رہی ہے اور اس اقدام

کو پاکستان کو عالمی سطح پر تنہا کیے جانے کے مترادف قرار دے رہی ہے، اسی مسلم لیگ ن کا پارلیمنٹ کی متفقہ قرارداد میں امریکی ڈرونز کو مار گرانے کی شق ڈلوانے میں کلیدی کردار تھا۔ 27 دسمبر 2011 کو نواز شریف نے کہا تھا کہ "یہ ن لیگ ہی تھی جس نے ڈروں حملے نہ رکنے کی صورت میں نیٹو سپلائی بند کروانے کی شق شامل کروائی تھی۔" 30 مارچ 2012 کو نواز شریف نے اس وقت کے امریکی سفیر کیمران منٹر کو بتایا تھا کہ ڈرون حملوں کا تسلسل پاک امریکہ تعلقات کو سنگین نقصان پہنچائیگا۔اس وقت میاں صاحب کا موقف تھا کہ ڈرون حملے پاکستان اور امریکا کے تعلقات معمول کی سطح پر واپس لانے میں بنیادی رکاوٹ ہیں۔

اُن دنوں مسلم لیگ ن اس وقت کی پیپلزپارٹی کی حکومت کی جانب سے پارلیمانی قرارداد نظرانداز کیے جانے پر تنقید کرتی رہی اور اس نے پیپلزپارٹی کی حکومت کی جانب سے نیٹو سپلائی کھولنے پر بھی احتجاج کیا تھا۔ یہی مسلم لیگ ن پارلیمنٹ میں نعرہ لگایا کرتی تھی کہ ''بدعنوان حکومت نامنظور"، "امریکا سے ڈکٹیشن لینا بند کیا جائے"، "آئی ایم ایف کا بجٹ نامنظور" اور ''ڈرون حملے بند کیے جائیں۔" 14 مئی 2011 کو میڈیا پریس کانفرنس کرتے ہوئے نواز شریف نے کہا تھا کہ "ہم نے قرارداد کے ذریعے حکومت سے امریکہ کو انتباہ کروایا ہے کہ اگر ڈرون حملے فوری طور پر نہیں رکتے تو نیٹو سپلائی بند کردی

جائیگی۔" انھوں نے مزید کہا تھا کہ ڈرون حملے بند نہ ہونے کی صورت میں نیٹو سپلائی
کی بندش کا نکتہ مسلم لیگ ن نے شامل کروایا ہے۔ مگر افسوس کہ آج اقتدار میں آنے
کے بعد نواز شریف کی حکومت وہی کر رہی ہے جس کیلئے مسلم لیگ ن، پیپلزپارٹی پر تنقید
کرتی تھی، یہی وہ تضاد ہے جس کی وجہ سے عوام حکمرانوں پر اعتبار کرنے کو تیار
نہیں۔آج نواز شریف کی حکومت اپنے ترجمان کے ذریعے نا صرف تحریک انصاف اور
اسکے قائد عمران خان کا مذاق اڑا رہی ہے بلکہ اس نے ڈرون حملے بند کروانے کے حوالے
سے پشاور ہائیکورٹ کے 9 مئی 2013ء کے فیصلے کو بھی نظرانداز کر دیا ہے جس میں
پشاور ہائیکورٹ نے "ڈرونز کے خلاف اقوام متحدہ میں قرارداد پیش کرنا، نیٹو سپلائی بند
کرنا، واشنگٹن سے قطع تعلق کرنا، ڈرون حملوں میں جاں بحق ہونیوالے عام شہریوں کو
بطور مداوا معاوضے کی ادائیگی اور امریکی جارحیت سے معصوم شہریوں کی جانوں کو مزید
نقصان سے بچانے کیلئے ڈرون مار گرانے" کی ہدایات جاری کی تھیں۔
اقتدار میں آنے کے بعد مسلم لیگ ن اپنے اُس موقف کی یکسر نفی کر رہی ہے جس کا
اظہار وہ اپوزیشن میں ہوتے ہوئے کرتی رہی ہے،اَمر واقعہ یہ ہے کہ ڈرون حملے ملکی
خودمختاری اور سلامتی کی خلاف ورزی ہیں اور ان سے شدت پسندی کے خلاف جنگ پر
منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں، امریکہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ ہر ڈرون حملہ
کے خلاف انتقامی کارروائی کا سامنا پاکستان کے عام شہریوں کو

کرنا پڑتا ہے، حالیہ ڈرون حملے اس پہلو سے اور بھی زیادہ قابل مذمت ہیں کہ ان کی
مدد سے حکومت اور طالبان کے درمیان مذاکرات اور مفاہمت کی کوششوں کو ناکام
بنایا گیا ہے۔آج پاکستانی عوام یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ امریکی حکومت پاکستان میں
دہشت گردی کے مسئلے کے حل میں عملی تعاون کیلئے ڈرون حملے بند کرکے اس آگ کو
بجھانے میں مدد دینے کے بجائے ان کا استعمال اس انداز میں کیوں کرنے پر تلی ہوئی ہے
جس سے کھلی دراندازی کا دائرہ پاکستان کے دیگر علاقوں تک بڑھتا محسوس ہو رہا ہے
اورامریکی انتظامیہ کے اس رویے سے پاکستان میں دہشت گردی کے خلاف جنگ میں
امریکہ سے تعاون ختم کرنے کے حق میں بڑے پیمانے پر رائے عامہ ہموار ہو رہی ہے۔
حتیٰ کہ وفاقی وزیر داخلہ تک پکار اٹھے ہیں کہ ہمیں امریکی ڈالروں یا عزت نفس میں
سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا، قومی مذہبی جماعتوں کی طرف سے نیٹو سپلائی روکنے کی
کارروائی کا اعلان فی الحقیقت پاکستان کی آبادی کے بہت بڑے حصے کے جذبات کی
ترجمانی ہے، پاکستانی عوام یہ سمجھتی ہے کہ ماضی کی حکومتوں نے پاکستان کو پرائی آگ
میں جھونک دیا ہے، جس سے اب اسے جلد از جلد باہر آ جانا چاہئے۔ لہٰذا اس تناظر میں
سیاسی جماعتوں کو چاہیے کہ وہ مشاورت جاری رکھیں اور امریکہ کو پاکستان کی علاقائی
حدود کے احترام پر مجبور کرنے کے لیے مشترکہ حکمت عملی بروئے کار لائیں۔ ہم سمجھتے
ہیں کہ اب وقت آ گیا

ہے کہ پاکستانی حکومت قوم کو مزید دھوکہ دینے کے بجائے ڈرون حملوں اور دہشت
گردی کی جنگ کے حوالے سے اپنی واضح پالیسی کا اعلان کرے۔ ہمارا ماننا ہے کہ حکومت
کا ایک دلیرانہ فیصلہ پاکستان کو دہشت گردی کے اُس عذاب سے نجات دلا سکتا ہے، جس
میں ہزاروں بے گناہ پاکستانیوں کا خون بہہ چکا ہے اور بھاری مالی نقصانات نے
پاکستان کو معاشی بحران سے دوچار کر دیا ہے۔

جہانِ رضویت کا یہ روشن ستارہ ڈوب گیا۔۔۔۔

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی بھی رخصت ہوئے۔۔۔۔۔

یہ 1986ء کی بات ہے جب پہلی مرتبہ ہمیں لاہور جانے کا موقع ملا، حضرت داتا گنج بخش کے مزارپُر انوار پر حاضری کے بعد گنج بخش روڈ پر مختلف مکتبوں کے دورے کے دوران ایک چھوٹی سی دکان میں واقع "مکتبہ نبویہ" بھی دیکھا، اُس وقت معلوم ہوا کہ اِس مکتبہ کے روح رواں اہلسنّت کے عظیم عالم اور متعدد کتابوں کے مصنف" صاحبزادہ اقبال احمد فاروقی صاحب" ہیں، فاروقی اُس وقت مکتبہ پر موجود نہیں تھے ،اِس لیے ملاقات نہ ہوسکی۔ بعد میں کئی مرتبہ لاہور جانا ہوا، آخری بار جنوری 2006ء میں لاہور گئے، لاہور کا یہ دورہ خالصتاً مطالعاتی دورہ تھا، جس کا مقصد اکابر علماء سے ملاقات کرکے اپنی کتاب" تحریک تحفظ ختم نبوت سیدنا صدیق اکبر تا علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی" کیلئے رہنمائی و مواد کی دستیابی تھا، چنانچہ جناب اقبال احمد فاروقی صاحب سے بھی ملاقات کیلئے برادرم السیّد عقیل انجم کے ہمراہ مکتبہ نبویہ پہنچے، مگر فاروقی صاحب مکتبہ پر موجود نہیں تھے۔

ہمارا دورہ چونکہ طویل تھا اور وقت کم تھا، ہمیں ننکانہ و فیصل آباد بھی جانا تھا، لیکن اِس کے باوجود ہم نے کئی گھنٹے فاروقی صاحب کا انتظار کیا، مگر کسی مصروفیت کی وجہ سے آپ تشریف نہ لائے، یوں ہماری کم نصیبی کہ اِس مرتبہ بھی فاروقی صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی اور ہم علامہ اقبال احمد فاروقی صاحب کی زیارت سے محروم رہے۔ دورے سے واپسی پر ہم نے جناب اقبال احمد فاروقی صاحب کو خط لکھا اور اپنی حاضری کا مقصد و مدعا بیان کیا، 25 فروری 2006ء کو حضرت کا جوابی محبت نامہ موصول ہوا، جس میں حضرت نے ہماری کوششوں کو سراہتے ہوئے کامیابی کی دعا فرمائی اور اپنی مفید تجاویز و آراء سے بھی نوازا۔ فاروقی صاحب کا وہ خط آج بھی ہمارے پاس بطور یادگار محفوظ ہے، 19 دسمبر 2013ء کو بھائی توفیق جوناگڑھی سے یہ افسوسناک خبر سننے کو ملی کہ پیرزادہ اقبال احمد فاروقی صاحب انتقال فرماگئے ہیں۔

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی صاحب 4 جنوری 1928ء کو گجرات سے چودہ میل دور ایک چھوٹے سے گاؤں "شہاب دیوال" میں مولانا انور پیر فاروقی کے گھر پیدا ہوئے، ابتدائی دینی تعلیم اپنے والد اور تایا مولانا نور پیر فاروقی سے حاصل کی، پرائمری تعلیم قریبی گاؤں گھوڑی (ونا سنگھ) سے حاصل کی اور مڈل قریبی قصبے دولت نگر سے پاس کیا۔ آپ کے گھر کا ماحول دینی تھا اور والد محترم چونکہ گاؤں کی مسجد و مدرسے وابستہ تھے ،اُن کے اکابر علماء سے خصوصی تعلقات تھے،

جس کی وجہ سے علاقے میں علماء کی آمدورفت رہتی تھی۔ گھرانے کے دینی ماحول اور روحانی تعلیمات کے فیضان نے پیرزادہ اقبال احمد فاروقی صاحب کی طبیعت گہرا اثر ڈالا، جوزندگی کے آخری لمحات تک قائم رہا۔

انیس سو سینتس (1937ء) میں اقبال احمد فاروقی اپنے والد کے ہمراہ لاہور آئے اور صاحب تفسیر نبوی مولانا محمد نبی بخش حلوائی نقشبندی کے حلقہ تلمیذ میں شامل ہوگئے لاہور میں اقبال احمد فاروقی صاحب کو دارالعلوم حزب الاحناف میں درس نظامی کے، اساتذہ سے استفادے کا بھی موقع ملا، 1939ء ضلع بہاولنگر میں واقع مدرسہ تعلیم الاسلام (جس کے بانی حافظ غلام حسین صاحب تھے) کی شہرت انہیں وہاں لے گئی، یہاں حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی حلقوں میں بھی آپ متعارف ہوئے۔اقبال احمد فاروقی بعد میں منشی فاضل کے امتحان کیلئے لاہور واپس آگئے، 1944ء میں آپ نے فاضل فارسی کا امتحان پاس کیا، یہ وہ زمانہ تھا جب علامہ نبی بخش حلوائی کے نامور شاگرد، مرید اور جانشین مولانا باغ علی نسیم اپنے استاد کی مسجد اور مدرسہ کی نگرانی کررہے تھے،انہوں نے اقبال احمد فاروقی کی حوصلہ افزائی کی اور تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے میں بہت تعاون کیا، چنانچہ فاضل فارسی کے امتحان میں کامیابی کے بعد آپ نے 1948ء میں میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا،آپ نے 1950ء میں انٹر کیا اور 1952ء میں گریجویشن بھی مکمل کرلیا۔اس دوران کچھ عرصہ کیلئے آپ نے مایہ نازخطاط

مولانا عبدالرشید عادل گڑھی سے فن کتابت بھی سیکھی۔

اقبال احمد فاروقی صاحب کا زمانہ طالب علمی لاہور کی سیاسی زندگی کے عروج کا زمانہ تھا، جگہ جگہ جلسے، جلوس اور اجتماعات ہوتے تھے، جس میں وقت کے مشہور خطیب اور سیاستداں شریک ہوتے۔ایک طرف کانگریس اور اُس کی حمایت میں سرگرم مجلس احرار جمعیت علماء ہند اور مکتبہ دیوبند کے علماء تھے تو دوسری جانب مسلم لیگ اور قائدِاعظم محمد علی جناح کی حمایت میں پیر جماعت علی شاہ صاحب، پیر آف مانکی شریف، پیر صاحب زکوڑی شریف، تونسہ، سیال اور بیربل شریف کے روحانی خانوادے سمیت دیگر علماء و مشائخ اہلسنّت مطالبہ پاکستان کی پرزور حمایت میں اپنے شاگرد، مریدین اور عوام اہلسنّت کے ہمراہ میدان عمل میں موجود تھے۔فاروقی صاحب کو اِن جلسوں میں شرکت کا موقع ملا، دیگر نوجوان طبقے اور طلباء کی طرح اقبال احمد فاروقی بھی مولانا محمد بخش مسلم بی اے کی علمی وادبی شخصیت اور شعلہ بیانی سے بہت متاثر تھے۔

قیام پاکستان کے بعد لاہور کی علمی وادبی دنیا میں زبردست تبدیلی رونما ہوئی، ہندوستان کے مختلف شہروں سے علماء کرام، شعراء اور ادیبوں نے لاہور کو اپنا مسکن بنایا، جس کی وجہ سے اقبال احمد فاروقی صاحب کے حلقہ احباب میں نئے نئے اہلِ علم افراد شامل ہوئے اور آپ نے اِن اہل علم کی رفاقت میں اپنا

تعلیمی سفر جاری رکھا، درسِ نظامی کے ساتھ ساتھ آپ نے فاضل عربی، ایم اے فارسی اور ایل ایل بی کی اسناد بھی حاصل کیں، آپ نے کچھ عرصے تدریسی خدمات بھی انجام دیں مگر فکر معاش اقبال احمد فاروقی کو مدارس دینیہ کی نورانی فضاوں سے نکال کر سرکاری ملازمت کی طرف لے گئی اور آپ سرکاری نوکری سے وابستہ ہوگئے، آپ کا یہ سرکاری سفر پنجاب کے محکمہ صنعت لیبر ویلفیئر کے 19 گریڈ آفیسر کی حیثیت سے 1988ء میں اختتام پذیر ہوا، لیکن اپنی سرکاری زندگی کے دوران بھی فاروقی صاحب کا علمائے کرام، مشائخِ عظام اور اہلِ علم سے قریبی تعلق برقرار رہا اور انہیں علماء و مشائخ کے قریب بیٹھنے اور اُن کی نگاہِ التفات سے فائدہ اٹھانے کا سنہری موقع ملا۔

انیس سو اڑتالیس (1948ء) میں جب اکابرینِ اہلسنّت نے ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کیلئے جمعیت علماء پاکستان قائم کی تو اقبال احمد فاروقی صاحب نے جمعیت کے پروگراموں کو کامیاب بنانے میں بھرپور کردار ادا کیا، اُنھوں نے جمعیت کے تحت منعقدہ شریعت کانفرنس کی تیاری میں دن رات ایک کر دیا، 1953ء کی تحریک ختم نبوت میں آپ نے سرکاری ملازمت کے باوجود تحریک میں فعال کردار ادا کیا اور تحریک میں حصہ لینے اور قابل اعتراض تقریر کی پاداش میں کوئٹہ بدری کی سزا بھی پائی، مگر آپ نے ہمت و استقامت اور پامردی سے حالات کا مقابلہ جاری رکھا، اقبال احمد فاروقی صاحب نے تبلیغی خدمات کے ساتھ ساتھ اخبارات و رسائل میں

قلمی ناموں سے مضامین بھی لکھے اور مفتی محمد حسین نعیمی کی زیرادارت جاری ہونے والے رسالے "عرفات" میں نائب مدیر اعلیٰ کی خدمات بھی انجام دیں۔
اقبال احمد فاروقی صاحب نے 1968ء اپنے مخلص ساتھی مولانا باغ علی نسیم کے ساتھ مل کر" مکتبہ نبویہ" کی توسیع کے کام کا آغاز کیا اور اہلسنت کی کتب کو نئے انداز سے طبع کرانا شروع کیا، جسے اہل ذوق نے تحسین کی نگاہ سے دیکھا اور بہت پسند کیا، اِس علمی جدوجہد میں جناب محمد عالم مختار حق اور اور جناب بشیر ناظم ایم اے نے آپ کا بھرپور ساتھ دیا، بہت جلد اقبال احمد فاروقی صاحب کی کوششوں کی بدولت" مکتبہ نبویہ" نے علم وادب کے ایک ایسے مرکز کی حیثیت حاصل کرلی، جہاں ہر وقت ارباب علم ودانش کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔اپنی بے بضاعتی کے باوجود پیرزادہ اقبال احمد فاروقی گذشتہ 25 سالوں سے ماہنامہ "جہاں رضا" کی اشاعت میں سرگرم رہے، آج اِس رسالے کے قارئین کا حلقہ پاکستان سے نکل کر ہندوستان، امریکہ، جنوبی افریقہ، کینیڈا، عرب امارات اور یورپ کے بسنے والوں تک پہنچ چکا ہے، یہاں یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ ماہنامہ "جہاں رضا" وہ رسالہ ہے جو اپنے آغاز سے ہی اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے افکار و نظریات کا ترجمان رہا، اِس رسالے میں فاضل بریلوی کی علمی بصیرت اور سیرت و کردار پر چالیس ہزار سے زیادہ مقالات شائع ہوچکے ہیں، جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔

یہ اقبال احمد فاروقی ہی تھے جنھوں نے مولانا محمد شریف نوری، مولانا انوار الاسلام اور پیر کرم شاہ صاحب الازہری کو گنج بخش روڈ پر مکتبہ اسلامیہ، مکتبہ حامدیہ اور، ماہنامہ" ضیائے حرم" کا دفتر قائم کرنے پر آمادہ کیا۔اِس طرح گنج بخش روڈ بازار علم ودانش بن گیا جہاں ہر وقت علماء وطلباء کتابوں کی تلاش میں رکتے اور اپنی علمی تشنگی مٹاتے۔1967ء میں اقبال احمد فاروقی صاحب نے حکیم محمد موسیٰ امر تسری، مولانا محمد شفیع رضوی، محمد عارف ضیائی اور مولانا باغ علی نسیم کے ہمراہ" مرکزی مجلس رضا" کے قیام میں کلیدی کردار ادا کیا۔اِس مجلس نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی کی شخصیت کے علمی گوشوں کو مقبول و متعارف کرانے کیلئے جلسے جلوس اور سیمینار ترتیب دیئے، اہلِ علم سے مقالات و مضامین لکھوائے اور بے شمار کتابیں و پمفلٹ ہزاروں کی تعداد میں شائع کرکے مفت تقسیم کرائیں۔اِس میں کچھ شک نہیں کہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی افکار و نظریات کو عوام الناس میں متعارف کرنے میں "مرکزی مجلس رضا نے جو کردار ادا کیا اُس کی مثال نہیں ملتی، یہ "مرکزی مجلس رضا" ہی تھی جس کی" بدولت آج پاکستان ہی میں کیا پورے عالم اسلام میں" نغمات رضا "کی گونج سنائی دے رہی ہے۔

اقبال احمد فاروقی صاحب کو اپنی زندگی میں کتابیں لکھنے اور تراجم کرنے کی

سعادت بھی حاصل ہوئی،اُن کی 60 ساٹھ سے زائد تالیفات و تصنیفات اہل علم کے مطالعہ میں آئیں ، جنہیں نے حد پسند کیا گیا،انہوں نے مکتبہ نبویہ کے زیر انتظام تفسیر نبوی (پنجابی) کا اردو ترجمہ،تذکرہ علمائے اہلسنت،الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین،نزھۃ الخواتر، تکمیل الایمان، مرج البحرین،زبدۃ الآثار، مقامات صوفیاء، قصر عرفان، خزینۃ الاصفیاء، الدولۃ المکیۃ، کشف المحجوب، مجالس علماء، فکر فاروقی، نسیم بطحا، باتوں سے خوش بو آئے... جیسی کتابیں یادگار شائع کیں۔

پیر زادہ اقبال احمد فاروقی صاحب کو اہل علم و دانش کے ساتھ ساتھ میر علی احمد خان تالپور جیسے معروف سیاستدانوں کے ساتھ بھی اٹھنے بیٹھنے کا بھی موقع ملا، حقیقت یہ ہے کہ فاروقی صاحب بلند پایہ ادیب، باکمال خطیب ،نباض وقت اور ایک درمند انسان تھے انہیں عربی، فارسی، اردو اور پنجابی میں کمال دسترس حاصل تھی، وہ جمعیت، علماء پاکستان کے رکن ، مرکزی مجلس رضا لاہور کے سربراہ اور ماہ نامہ " جہانِ رضا" کے مدیر اعلی بھی رہے،اللہ کریم نے انہیں بے شمار انعام واکرام سے نوازا، یہ اُن کی دینی خدمات کی برکت تھی کہ ربّ کریم نے اپنے بندوں کے دلوں میں اِس فقیر بے نوا کی محبت ڈال دی، وہ جہاں بھی گئے عزت و احترام سے سرفراز ہوئے، لوگوں نے انہیں دل و جان سے چاہا۔آج علم وادب اور جہانِ رضویت کا یہ رخشندہ ستارہ میانی صاحب کے قبرستان میں

غازی علم دین شہید کے قریب آسودہ خاک ہے۔
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

آزادی اظہار کے نام پر۔۔۔۔۔

آزادی اظہار مغرب کا مکروہ طریقہ واردات

انیس سو پچانوئے "1995ء" کی بات ہے جب امریکہ کی ریاست اوکلاہاما میں دہشت گردی کی ایک بڑی واردات ہوئی، ابھی یہ واردات جاری ہی تھی کہ امریکی ٹیلی ویژن چینلز نے ایک بارلیش نوجوان کی نشاندہی کرتے ہوئے واردات میں مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دے کر ملوث ہونے کی خبریں نشر کرنا شروع کردیں، مگر چند گھنٹوں بعد معلوم ہوا کہ واردات میں ایک امریکی عیسائی نوجوان ٹموتھی میک ویہہ ملوث ہے۔ کچھ اسی طرح کی صورتحال ناروے کے دارالحکومت اوسلو میں بھی پیش آئی، جب دہشت گردی کی واردات جاری تھی کہ ناروے، امریکہ اور یورپ کے ریڈیو اورٹی وی چینلز چیخ چیخ کر یہ پروپیگنڈہ کر رہے تھے کہ واردات میں القاعدہ کا ہاتھ ہے، اُس وقت بعض مبصرین نے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ اِس واردات کی وجہ ناروے کے اخبار میں شائع ہونے والے توہین رسالت پر مبنی نازیبا کارٹون ہیں، کسی نے دلیل دی کہ اِس کی وجہ یہ ہے کہ ناروے کے فوجی افغانستان میں لڑرہے ہیں، لیکن چند گھنٹوں بعد جب معلوم ہوا کہ واردات میں ناروے کا بنیاد پرست عیسائی شہری آندرے بہرویک ملوث ہے، جس نے 90 سے زیادہ

بے گناہ لوگوں کو مار ڈالا۔ آندرے بہرویک نے حراست میں لیے جانے کے بعد نہ صرف اپنے جرم کا اعتراف کیا بلکہ اُس پر فخر کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اُس نے یہ قدم مغربی دنیا کو اسلام اور مسلمانوں سے محفوظ بنانے کیلئے اٹھایا ہے،اُس نے اپنے اِس اقدام کے جواز میں انٹرنیٹ پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت پر مبنی 15 سو صفحات پر مشتمل دستاویز بھی چھوڑی۔

یہاں یہ پہلو بھی قابل توجہ ہے کہ جیسے ہی سانحہ اوسلو کے ذمہ دار آندرے بہرویک کا نام دنیا کے سامنے آیا، ناروے حکومت اور ذرائع ابلاغ نے اپنا پینترہ بدل لیا اور یہ ثابت کرنے کی کوششیں شروع کردی کہ آندرے "پاگل" ہے،اُس کا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔ مغرب کی اِن کوششوں کا مطلب یہ تھا کہ وہ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ آندرے محض ایک "فرد" ہے،ناروے یا مغرب کا نمائندہ نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کوئی پاگل آندرے کی طرح کھیتی باڑی اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف 15 سو صفحات پر مشتمل دستاویزات تخلیق کرتا ہے۔؟ اگر مغربی دنیا آندرے بہرویک کو ایک فرد قرار دے کر اجتماع سے الگ کرسکتی ہے تو پھر یہی اصول مسلم دنیا کیلئے کیوں استعمال میں نہیں لایا جاتا۔؟اِس سوال کا جواب کسی مغربی مفکر اور دانشور کے پاس نہیں ہے۔

قارئین محترم !درج بالا واقعات سے مغربی دنیا کی اجتماعی سوچ کے کئی اہم

پہلو نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں، مگراِس کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ مغربی دنیا نے اسلام ، صاحب اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف جھوٹ، فریب اور قیاس آرائی کو اپنی پالیسی کا بنیادی نقطہ بنایا ہوا ہے۔آج مغربی ذرائع ابلاغ معروضیت کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے پیشے میں اِسے ایمان کا درجہ دیتے ہیں مگر وہ عملی مثال پیش کرنے سے قاصر ہیں، حالانکہ پیشہ ورانہ دیانت اور اخلاقیات کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر آپ کی نشر کردہ خبر کسی وجہ سے غلط ثابت ہو جائے تو اُس پر متعلقہ فرد، افراد یا ادارے سے فوری معذرت طلب کی جائے اور آئندہ اِس قسم کی لغو اور بے بنیاد خبر کے نشر ہونے سے بچنے کی تدابیر اختیار کی جائیں، مگر عملاً ایسا نہیں کیا جارہا، آج بھی مغربی دنیا کے ذرائع ابلاغ جھوٹی اور بے بنیاد قیاس آرائیوں کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں اور اسلام صاحب اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور اُمت محمدیہ کو دہشت گرد ظاہر کرکے دنیا میں، بدنام کر رہے ہیں، جبکہ مغربی میڈیا کے کسی نمائندے کو یہ توفیق نہیں ہو رہی کہ وہ اپنی جھوٹی خبروں اور بے بنیاد قیاس آرائیوں پر شرم وندامت کا اظہار کرتے ہوئے عالم اسلام سے معذرت طلب کرے۔

درحقیقت مغرب کا یہ طرز عمل علم، انصاف، توازن، تہذیب اور دلیل سے خالی ہے، دنیا میں آزادی اظہار رائے، حقوق انسانی اور مساوات کا ڈھنڈورا پیٹنے والا مغرب اسلام اور ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف دوہرا معیار

اپنائے ہوئے ہے، وہ اپنی منافقت اور تعصب کو آزادی اظہار کے لبادے میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے، یہ کتنی عجیب بات ہے کہ مغرب جو آزادی رائے، حقوق انسانی، روشن خیالی، وسعت نظر، عدم تشدد، مذہبی رواداری، شہری آزادی، جمہوریت اور آزادی نسواں کے چیمپین ہونے کا دعویدار ہے، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز متعصبانہ رویہ رکھتا ہے، آج مغرب میں آزادی اظہار رائے کا مطلب پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے اسلام، صاحب اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور مقدس اسلامی شخصیات کی توہین و تمسخر اڑانا لیا جاتا ہے، جو پورے مغربی معاشرے کی اجتماعی سوچ کا مظہر ہے، معاملہ یہ ہے کہ مغرب پہلے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اسلام کی مقدس شخصیات کی توہین و تنقیص کرتا ہے اور جب ردعمل میں کہیں کوئی انفرادی واقعہ رونما ہوجاتا ہے تو وہ اُسے جواز بنا کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز منفی پروپیگنڈے میں مصروف ہوجاتا ہے اور ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اسلام تشدد پسند دین اور اِس کے ماننے والے متشدد لوگ ہیں، یہی مغرب کا طریقہ واردات اور اصل نفسیات ہے، پہلے وہ مد مقابل سے اپنے مقائیس اور فکری کسوٹیاں منواتا ہے اور پھر چابکدستی سے اُس عمل پیرا ہوجاتا ہے۔

آج مغربی دنیا کا طرز عمل یہ ہے کہ وہ گاہے گاہے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور مقدس شخصیات کی شان میں گستاخی کی جسارت کرکے عالم اسلام کی

دل آزاری کرتا ہے اور پھر اپنے فعل قبیح کو آزادی اظہار کا نام دے کر جاری رکھنے پر بضد بھی رہتا ہے جبکہ آزادی اور کسی کی دل آزاری میں زمین آسمان کا فرق ہے، دنیا کے کسی معاشرے میں رائے کے اظہار کی ایسی آزادی نہیں دی گئی کہ جب چاہے، جو چاہے کسی کی بھی عزت خاک میں ملا دے،آج دنیا کے ہر معاشرے میں اپنے اپنے حالات و عوامل کے مطابق اظہار رائے کی حدود مقرر ہیں، حقائق کو بیان کرنے کیلئے بھی کچھ ضابطے اور قرینے مقرر کیے گئے ہیں جیسے یورپ و امریکہ جہاں فحاشی و عریانی عروج پر ہے مگر بچوں میں جنسی ہیجان پیدا کرنے والی فحش نگاری اور مذہبی و نسلی منافرت پھیلانے والی تحاریر و تقاریر پر پابندی ہے، آسٹریا، بیلجیئم، چیک ری
پبلکن، فرانس، جرمنی، اسرائیل، ایتھوپیا، پولینڈ، رومانیہ، چیکو سلواکیہ، سوئٹزرلینڈ وغیرہ میں عالمی جنگوں کی تباہی کے انکار کو فوجداری جرم قرار دیا گیا ہے، یورپ کے اکثر ممالک میں ہولوکاسٹ کے انکار بلکہ اُس کے بارے میں یہ تک کہنے کی اجازت نہیں کے اُس میں ہلاک شدہ یہودیوں کی تعداد مبالغہ آمیز ہے۔
خود آزادی اظہار رائے کی بات کرنے والے مغرب کی اپنی حالت یہ ہے کے وہاں بھی کوئی کھل کر اُن کے دستور، اقتدار اعلیٰ یا پالیسیوں پر بات نہیں کر سکتا، صرف یورپ و امریکہ کیا، پوری دنیا میں ہتک عزت اور توہین عدالت کے

قوانین موجود ہیں، دنیا کے ہر ملک میں وہاں کے دستور یا اقتدار اعلیٰ سے بغاوت
یا باغیانہ اظہار رائے کو سنگین جرم قرار دیا گیا ہے اور مجرموں کیلئے موت تک کی سزا
موجود ہے،اسی طرح مقدس ہستیوں، مقدس مقامات ،اور مقدس اشیاء کی توہین پر بھی
سزا کا قانون زیادہ تر ممالک میں موجود ہے،مگر جب معاملہ اسلام،صاحب اسلام صلی اللہ
علیہ وسلم اور قابل تعظیم اسلامی شخصیات کا آتا ہے تو یہ تمام اصول و قاعدے اور ضابطے
و قانون معطل و بے اثر ہو جاتے ہیں اور ایسے فعل قبیح کی جسارت کرنے والے کو نام
نہاد آزادی اظہار کا تحفظ فراہم کر دیا جاتا ہے۔

مغرب کے اسی اسلام دشمن کردار اور دوہرے منافقانہ معیار کو دور حاضر کے نوجوان
اسکالر محمد متین خالد نے اپنی نئی کتاب "آزادی اظہار کے نام پر" میں بے نقاب کیا
ہے،انھوں نے اِس کتاب میں بے لگام آزادی اظہار کے خبط میں مبتلا مغرب کے مکروہ
چہرے کی نقاب کشائی کرتے ہوئے دلائل و براہان سے ثابت کیا ہے کہ اخلاق،
مساوات، رواداری،انسانی آزادی اور آزادی اظہار کے نام نہاد علمبرداروں کا اصل
کردار کیا ہے اور وہ کس طرح رعونت، عدم برداشت اور دشنام طرازیوں کے شرمناک
عملی نمونے پیش کرتے ہیں،کتاب میں نامور ادیب ودانشور اور مشہور کالم نویس محمد
صلاح الدین،ڈاکٹر محمد امین،شاہنواز فاروقی،پروفیسر عبدالجبار شاکر،پروفیسر
خورشید احمد، عطاالرحمٰن،اوریا

مقبول جان، ڈاکٹر انیس احمد، محمد اسماعیل قریشی، سابق وزیر خارجہ آغا شاہی، ڈاکٹر سرفراز نعیمی شہید، اسرار کسانہ، سید عاصم محمود، محمد عامر خاکوانی، پروفیسر شمیم اختر، اشتیاق بیگ، ڈاکٹر مجاہد منصوری، حافظ شفیق الرحمٰن، ڈاکٹر عامر لیاقت حسین، ارشاد احمد حقانی، حامد میر، عرفان صدیقی، انور غازی، انصار عباسی، ڈاکٹر محمود احمد غازی، عطا اللہ صدیقی اور رابرٹ فسک وغیرہ کے تقریباً 100 کے قریب تحقیقی مضامین ومقالات شامل ہیں۔

جو دین اسلام میں شخصی آزادی کی حدود وقیود واضح کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ دین اسلام آزادی رائے کی اجازت دینے کے باوجود اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کسی کے بنیادی عقائد اور اقدار پر تیشہ زنی یا کیچڑ اچھالی جائے، یا کسی کو ایسی شخصی آزادی حاصل ہو جو فرد اور معاشرے کیلئے فتنہ وفساد کا سبب بن جائے، بلاشبہ یہ تحقیقی کتاب صاحبِ مولف کی عرق ریزی کی مظہر اور اعجاز قلم کا منفرد شہکار ہے، جس کا مطالعہ مغرب کی اسلام دشمنی کا پردہ چاک کرتا ہے، صاحبِ مطالعہ کے ایمان کو نئی جلا بخشتا ہے اور قلب وروح کو طمانیت وآسودگی عطا کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

پھر مذاکرات کا راگ

یہ مذاکرات ایک بہانہ ہیں

یوں لگتا ہے کہ وطن عزیز کے رہنے والوں کیلئے جائے اماں کم ہوتی جارہی ہے، کسی کی زندگی محفوظ نہیں، ملک کا کوئی گوشہ دہشت گردوں کی پہنچ سے دور نہیں، ہر گزرنے والی ساعت اپنے ساتھ ہلاکت اور خونریزی کی اِک نئی خبر لاتی ہے، مٹھی بھر عناصر کے ہاتھوں پورا ملک دہشت اور بربریت سے لرز رہا ہے، بنوں، راولپنڈی، لاہور، کراچی، مستونگ، فیصل آباد، گوجرانوالہ، کبیر والا، مانسہرہ، پشاور اور پنجگور ملک دشمن عناصر اور تخریب کاروں کے نشانے پر ہے، صرف ایک ماہ کے دوران سو سے زیادہ بے گناہ شہری، پولیس اور عسکری اہل کار شہید ہو چکے ہیں،اس بے گناہ ہلاکتوں میں راہ گیر، انسداد پولیو مہم کی رضاکار خواتین اور مرد، بہادر اور جانباز محافظ اور طالب علم سبھی شامل ہیں۔ محب وطن حلقے اس صورتحال پر دل گرفتہ اور بے چین ہیں، جبکہ سیاسی اور سماجی حلقے اپنی برہمی کا اظہار کرتے رہے ہیں، دہشت گردی کا پھنکارتا ہوا بے لگام عفریت ملک و قوم کی بنیادیں ہلا رہا ہے مگر ہمارے ارباب اقتدار سوچ وبچار کی کیفیت سے باہر ہی نہیں آرہے ہیں، گذشتہ دنوں کابینہ کے اجلاس کے حوالے سے یہ اطلاع بھی سامنے آئی ہے کہ حکومت درپیش حالات میں ایک اور اے

پی سی بلانے کا منصوبہ بنا رہی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ پچھلے سال 9 ستمبر کو ہونے والی اے پی سی کے فیصلوں پر آج تک کوئی سنجیدہ پیش رفت کیوں نہیں کی گئی،جب پچھلی اے پی سی بے مقصد رہی تو پھر ایک اور اے پی سی بلانے کا فائدہ۔؟

امر واقعہ یہ ہے کہ بہت ہو چکی ہے ، تباہی و بربادی نے ہماری معیشت و معاشرت کا بیڑہ غرق کرکے رکھ دیا ہے،ایک عشرے سے زائد عرصے پر محیط دہشتگردی نے ہمیں بحیثیت مجموعی مسائل و مصائب کی ایک اذیت ناک صورتحال سے دوچار کر رکھا ہے، جس کا تقاضہ ہے کہ جلد از جلد اس عذاب سے باہر نکلا جائے ،دوسری طرف طالبان یا دہشتگرد عناصر اپنی حکمت عملی میں بہت واضح دکھائی دیتے ہیں، انہوں نے پہل قدمی کا آپشن اپنا رکھا ہے جس کے نتیجے میں وہ جب، جہاں اور جیسے چاہتے ہیں دہشتگردی کی وارداتوں کو عملی جامہ پہنا دیتے ہیں، بنوں میں ہمارے بہادر سپاہیوں کے کانوائے پر حملہ سے لے کر، راولپنڈی میں جی ایچ کیو کے قرب میں آر اے بازار میں خودکش واردات اور چاروں صوبوں میں انسداد پولیو مہم کے رضاکاروں پر قاتلانہ حملے سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں جو حکومت سے جوابی حکمت عملی اختیار کرنے کی متقاضی ہیں، اب تو رائے عامہ کا ایک بڑا حلقہ مطالبہ کرتا نظر آتا ہے کہ حکومت جرات کا مظاہرہ کرکے اِن ملک دشمن عناصر کا قلع قمع کرے اور آمادہ پیکار عناصر کو پوری ریاستی طاقت کے ساتھ کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔

لیکن شدید عوامی دباؤکے باجود حکومت نے ایک بار پھر مذاکرات کا راستہ اپنایا ہے اور وزیراعظم نے 4 ارکنی مذاکراتی کمیٹی جس میں عرفان صدیقی، رحیم اللہ یوسف ذئی، میجر ریٹائرڈ عامر اور سابق سفیر رستم خان مہمند شامل ہیں، جبکہ طالبان کی مذاکراتی کمیٹی جو کہ جماعت اسلامی کے پروفیسر ابراہیم، جمعیت علمائے اسلام (س) کے سربراہ مولانا سمیع الحق، جمعیت علمائے اسلام (ف) کے مفتی کفایت اللہ، لال مسجد کے خطیب مولانا عبدالعزیز اور عمران خان پر مشتمل ہے، میں ان کا اپنا کوئی نمائندہ شامل نہیں ہے۔بظاہر کمیٹی کے قیام اوراپوزیشن جماعتوں کواعتماد میں لئے جانے کے اقدام پر قومی اسمبلی میں وزیراعظم کو غیر معمولی پذیرائی ملی اور طالبان کے حوالے سے صورتحال نے ایک نیا موڑ لیا ہے، وزیراعظم کی جانب سے طالبان کو مذاکرات کی پیش کش نے بظاہر منظرنامہ بدل کر رکھ دیا ہے اور امن کو ایک بار پھر موقعہ دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے، وزیراعظم نے قومی اسمبلی سے اپنے خطاب میں اس عزم کا بھی اظہار کیا کہ قوم کو دہشت گردوں کے ہاتھوں یرغمال نہیں بننے دیں گے اور دہشت گردی اور قتل وغارت مزید برداشت نہیں کی جائے گی۔

واضح رہے کہ وزیراعظم کے خطاب سے دو دن پہلے تک کچھ اس قسم کے اشارے مل رہے تھے کہ حکومت طالبان کے خلاف فوجی آپریشن کرنے کا ارادہ رکھتی ہے، پچھلے

کچھ عرصے سے جس انداز میں دہشت گردی کے واقعات رونما ہوئے ،اس نے نفسیاتی طور پر لوگوں میں آپریشن کی حمایت بڑھادی تھی اور اس بات کا اعتراف خود وزیر اعظم نے پارلیمانی پارٹی کے اجلاس میں کیا تھا، وزیر اعظم نے اس وقت دو ٹوک انداز میں کہاکہ مذاکرات صرف انہی قوتوں سے ہونگے جو ریاست کی رٹ قبول کریں گے جبکہ وہ عناصر جو ریاست کی رٹ قبول کرنے کی بجائے جنگ چاہتے ہیں ان سے اب کھلی جنگ ہوگی، یہ منظر نامہ ظاہر کرتا ہے کہ حکومتی سطح پر کہیں نہ کہیں آپریشن کی حمایت کرنے کا فیصلہ ہوچکا تھا، تاہم اس دباؤ کے باوجود امن کو ایک بار پھر موقعہ دیا گیا ہے اورحکومت نے طالبان کو مذاکرات کی دعوت دے کر گیند طالبان کی کورٹ میں پھینک دی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ مذاکرات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے،ماضی کے تلخ تجربات اور کئی بار ہونے والے مذاکرات کی روشنی میں بہت سے حلقے بے یقینی کا شکار ہیں ، انہیں مذاکرات کی کامیابی کا یقین نہیں، یہی صورتحال قوم کی بھی ہے ،لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال گردش کررہا ہے کہ پہلے مذاکرات کون سا دیرپا اور حوصلہ افزا ثابت ہوئے جو ایک بار پھر مذاکرات کا راگ الاپا جارہا ہے، یہ درست ہے کہ جنگیں مسائل کا حل نہیں ، معاملات بات چیت سے ہی حل ہوتے ہیں، لیکن یہ اُسی صورت میں ممکن ہے جب دونوں جانب سے معاہدوں کی پاسداری کی جائے، مگر دیکھا یہ گیاکہ ماضی کے معاہدوں سے فریق مخالف نے نہ صرف فائدہ

اٹھایا بلکہ معاہدوں کی بھی خلاف ورزی کرتے ہوئے حکومتی رٹ کو چیلنج بھی کیا،اسی طرح اُن قوتوں کا کردار بھی شک و شبے سے بالاتر نہیں جو دہشت گردوں کے خلاف سرجیکل آپریشن کا سن کر بات چیت اور امن معاہدوں کیلئے متحرک ہوجاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انہیں تادیبی کاروائی سے بچایا جائے،اس بار بھی یہی قوتیں متحرک ہیں اور حکومت کو باور کروارہی ہیں کہ وہ فوجی آپریشن کی غلطی نہ کرے وگرنہ یہ جنگ قبائلی علاقوں سے نکل کر ملک کے شہری علاقوں میں داخل ہوجائے جو حکومت کیلئے نئی مصیبت کھڑی کرسکتی ہے، سوال یہ ہے کہ اس وقت کونسا سا ملک کے شہری علاقے ان دہشت گردوں کی کاروائیوں سے محفوظ ہیں۔

بہرحال حقیقت یہ ہے کہ اصل امتحان حکومت وقت کا ہے،دیکھنا یہ ہے کہ وزیراعظم صاحب آنے والے دنوں میں پوری قوم اور بالخصوص سیاسی قیادت کو کیسے ساتھ لے کر چلتے ہیں،اگر مذاکرات ناکام ہوتے ہیں،تب یقینا سرجیکل آپریشن ہی آخری آپشن رہ جاتا ہے،جس کی حمایت میں رائے عامہ کو تیار کرنا مشکل نہیں،عوام پہلے ہی آئے روز کی دہشت گردانہ سرگرمیوں سے عاجز اور پریشان ہیں اور چاہتے ہیں کہ ملک کے گلی محلوں کو بے گناہ انسانی خون سے نہلانے والے ان عناصر کا قلع قمع کیا جائے،اب جبکہ دوبارہ سے مذاکراتی عمل شروع ہونے جارہا ہے تو اسے بڑی احتیاط اور دانش سے آگے بڑھنا ہوگا،دیکھنا یہ ہے کہ

وزیر اعظم کی جانب سے امن مذاکرات کیلئے ڈالا گیا ڈول دہشت گردی کے خوفناک
کنویں سے امن کا پانی نکال سکتا ہے اور ملک و قوم کو عافیت و سلامتی کی راہ پر ڈال سکتا
ہے یا نہیں، ہمارا ماننا ہے کہ امن کو آخری موقع دینے کے خواہاں وزیر اعظم صاحب کا
اصل امتحان اب شروع ہونے جا رہا ہے اور آنے والا وقت بتائے گا کہ وہ اپنی کوششوں
میں کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں -

دریائے جہلم کے کنارے واقع "بھیرہ "ضلع سرگودھا کا ایک تاریخی قصبہ ہے، جس کا شمار پنجاب کے اُن علاقوں میں ہوتا ہے جو قدیم زمانے سے۔برصغیر پر حملہ آوروں کی گزر گاہ اور قیام گاہ رہے ہیں،تاریخ بتاتی ہے کہ 326 ق م میں یونان کے ظالم فاتح سکندر اعظم کا اُس وقت کے حکمران راجہ پورو (یونانی تلفظ پورس) سے فیصلہ کن معرکہ اسی قصبے کے قرب و جوار میں ہوا تھا۔ مشہور چینی سیاح ہیون سانگ نے اپنے سفر نامے میں بھیرہ کا تذکرہ "علم و فنون " کے مرکز کی حیثیت سے کیا ہے۔جب سلطان محمود غزنوی ہندوستان پر حملہ آور ہونے کیلئے آیا تو اُس نے بھیرہ میں بھی قیام کیا، مغلوں نے جب ہندوستان پر قسمت آزمائی شروع کی تو اُس کی گزرگاہ میں بھی بھیرہ ایک اہم قیام گاہ تھا،1540ء میں ایک فوجی مہم کے دوران شیر شاہ سوری بھی کچھ عرصے کیلئے بھیرہ میں مقیم رہا،اِس قیام کے دوران شیر شاہ سوری یا اُس کے کسی جانشین نے یہاں ایک عالی شان مسجد تعمیر کی جو اپنی وسعت، خوب صورتی اور عمارتی شکوہ کے لحاظ سے مسلمانوں کی شان و شوکت کا شان دار مظہر تھی۔

جب مغلوں کے زوال کے بعد پنجاب پر سکھوں کی حکومت قائم ہوئی تو بادشاہی

مسجد لاہور کی طرح یہ مسجد بھی سکھا شاہی سے محفوظ نہ رہ سکی اور سکھوں نے مسجد کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔1857ء کی جنگ آزادی کے بعد جب ہندوستان کی حکومت کا نظم و نسق حکومت برطانیہ نے اپنے ہاتھوں میں لیا تو مقامی لوگوں سے بہتر تعلقات استوار کرنے کا فیصلہ کیا گیا، جس کے نتیجے میں مقبوضہ مساجد کو واگزار کیا جانے لگا، چنانچہ 1860ء کے لگ بھگ بھیرہ کی اِس تاریخی مسجد کی دوبارہ تعمیر ہوئی، جس کا سہرا اُس دور کے ممتاز اور جید عالم دین علامہ احمد الدین بگوی کے سر جاتا ہے،انھوں نے یہ کارنامہ کسی حکومتی سرپرستی کے بغیر مسلمانوں کی مدد سے سرانجام دیا، خیال رہے کہ علامہ احمد الدین بگوی وہی عالم دین ہیں جو بادشاہی مسجد لاہور کی واگزاری کے بعد اُس کے پہلے امام و خطیب مقرر ہوئے۔

بھیرہ سے تعلق رکھنے والے خاندان بگویہ کا شمار اُن قدیم علمی گھرانوں میں ہوتا ہے، جن کی خدمات کا سلسلہ ساڑھے تین صدیوں پر محیط ہے،ان میں حضرت مولانا قاضی احمد الدین بگوی (جنھوں نے حضرت شاہ ولی اللہ کی درس گاہ سے استفادہ کیا اور شاہ اسحاق دہلوی سے سند حدیث حاصل کی)، مولانا ظہور احمد بگوی، مولانا افتخار احمد بگوی،علامہ برکات احمد بگوی اور مولانا ابرار احمد بگوی جیسے نامور لوگ شامل ہیں، یعنی اِس خاندان کے علماء وفضلاء کئی سو سالوں سے دین ومذہب اور علم وادب کی خدمت کررہے ہیں، ڈاکٹر انوار احمد بگوی صاحب کا

بھی تعلق اسی خانوادے سے ہے، پنجاب کے مردم خیز قصبے بھیرہ میں پیدا ہونے والے ڈاکٹر انوار احمد بگوی نے اپنے تعلیمی مدارج اعلیٰ نمبروں سے طے کیے، کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے ایم بی بی ایس کیا، بعد ازاں پنجاب کے محکمہ صحت سے منسلک ہو گئے، دوران ملازمت اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے اور بہترین کارکردگی پر وزیر اعلیٰ پنجاب سے طلائی تمغہ اور سند سے نوازے گئے، دفتر میں قومی زبان اردو کو رائج کرنے کی جدوجہد پر بابائے اردو ڈاکٹر سید عبداللہ سے نشان سپاس پایا، اپنی خاندانی روایات کے مطابق ڈاکٹر انوار احمد بگوی کو بچپن ہی سے علم وادب سے دلچسپی رہی، آپ دوران تعلیم کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے سالنامے "کیمکول" کے مدیر بھی رہے۔
ڈاکٹر انوار احمد بگوی کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، جس میں " خمینی وفردوسی کی سرزمین"، "تقریرات مسلم"، "بھیرہ تاریخ و تمدن اوردی ہسٹری آف سرگودھا"، "انڈکس ماہنامہ شمس الاسلام بھیرہ"، "مخطوطات بگویہ کتب خانہ بھیرہ " وغیرہ شامل ہیں، ڈاکٹر صاحب اسلام، سیاست، عمرانیات، طب، تنقید اور سیر وسیاحت جیسے موضوعات پر بھی متعدد مقالات بھی لکھ چکے ہیں، لیکن آپ کا سب سے بڑا اور بلند پایہ کارنامہ خاندان بگویہ کے علماو مشائخ کے علمی، ملی اور سماجی خدمات کے تذکرے پر مبنی ساڑھے تین سو سالہ تاریخ "تذکار بگویہ" کی تین ضخیم جلدوں کی تدوین ہے، تذکار بگویہ کی جلد اول خاندان بگویہ کے مورث اعلیٰ

مولانا حافظ نور حیات بگوی سے مولانا ظہور احمد بگوی (1650ءتا1945ء) تک کے علما و مشائخ کے کارناموں کے تذکرے پر مبنی ہے، جبکہ جلد دوم (1945ءتا 1975ء) میں مولانا افتخار احمد بگوی، مولانا حکیم برکات احمد بگوی، مجلس مرکزیہ حزب الانصار، شعبہ تصنیف وتالیف ومکتبہ، تحریک پاکستان اور حزب الانصار، اہم قرار دادیں، قیام پاکستان، تحریک ختم نبوت 1953ء اور مجلس عمل تحریک ختم نبوت بھیرہ اور آثار بگویہ وغیرہ کے حالات وواقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔اِن دونوں کتابوں کے مطالعے سے قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے وہ اِن ادوار میں اکابر علماء کی جدوجہد کے مختلف مراحل اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

زیر نظر کتاب "تذکار بگویہ جلد سوم" خطوط ومراسلات، حالات اور خدمات (1883ءتا 2010ء) بھی دراصل اِسی سلسلے کی تیسری کڑی ہے، جس میں برصغیر کے مشاہیر علماء، مبلغین، اساتذہ اور مشائخ کے چنیدہ خطوط ومراسلات شامل کتاب کیے گئے ہیں، یہ خطوط اپنے دامن میں تاریخ کا سرمایہ سمیٹے ہوئے ہیں اور اپنے عہد کے پر آشوب المیوں اور تلخ وشیریں حالات وحوادث ومسائل کی نشاندہی کرتے ہوئے اُس دور کی سیاسی الجھنوں، سماجی روایات، اخلاقی قدروں، ذہنی رجحانات اور نفسانی رویوں کی بھی عکاسی کرتے ہیں اور لکھنے والوں کے مزاج وطبیعت سے آگاہی فراہم کرتے ہیں، جس سے ہمیں اِن شخصیات کے بارے میں جاننے کا موقع

ملتا ہے، درحقیقت یہ تحریریں اپنے اندر برصغیر کی تہذیب و ثقافت کے تمام خدوخال سمیٹے ہوئے ہیں اور اِن کے مطالعے سے اہل علم کے فکری اختلافات اور باہمی تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے۔

قارئین محترم ! مکاتیب دراصل مکتوب نگار کی شخصیت کے سربستہ رازوں کی کلید ہوتے ہیں اور شخصیت کی تمام گتھیاں سلجھانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، یہ مکاتیب ہی ہیں جو کسی شخصیت کی زندگی کے پنہاں پہلو سامنے لانے میں مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں، لہذا یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ مکتوب نگار اپنی زندگی کے تمام نشیب و فراز، جذباتی میلانات، مستقبل کے اندیشہ ہائے دور دراز اور اِس جہاں کے کار دراز کے متعلق مکتوب کی سطور کے ذریعے جو کچھ پیغام ارسال کرتا ہے، وہ نوائے سروش کی صورت میں مکتوب الیہ تک پہنچ جاتا ہے، ڈاکٹر خورشید الاسلام نے لکھا ہے کہ " زندگی اپنی راہیں خود بنا لیتی ہے، خط اپنی باتیں خود پیدا کرلیتا ہے۔۔۔۔ زندہ رہنے کیلئے اور خط لکھنے کیلئے زندگی کا احترام ضروری ہے۔" یہ مسلمہ صداقت ہے کہ مکاتیب زندگی کی حرکت و حرارت کے آئینہ دار ہوتے ہیں اور مکاتیب کا زندگی کے حقائق سے گہرا تعلق ہوتا ہے، مکاتیب کی اساسی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اگرچہ اُن کا تعلق ایک فرد کی نجی زندگی سے ہوتا ہے لیکن یہ اِس انداز سے زندگی کی کلیت اور جامعیت کی عکاسی کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو اِن میں اپنی زندگی کے تمام موسم اترتے ہوئے

محسوس ہوتے ہیں،تذکار بگویہ کی جلد سوم قاری کواِس احساس سے نکلنے نہیں دیتی ہے۔
تذکار بگویہ کی جلد سوم پانچ ابواب پر محیط ہے اور باب اوّل چار جز پر پھیلا ہوا ہے جس میں مولانا ظہور احمد بگوی، مولانا افتخار احمد بگوی، مولانا ابرار احمد بگوی اور صاحبزادہ انوار احمد بگوی کے نام ہندوستان بھر کے جید علما و مشائخ اور ہندو مسلم رہنماؤں کے ساتھ اُن کے 680 خطوط کا منتخب ریکارڈ شامل کیا گیا ہے۔باب دوم مکتوب نگاروں کے حالات زندگی پر مشتمل ہے۔باب سوم میں تحریک خلافت و موالات کے دوران پیش آنے والے حالات و عوامل کے تذکرہ ہے۔باب چہارم تاثر اور خدمات کے حوالے سے ہے جبکہ باب پنجم تقریباً 300 کے لگ بھگ اسکین شدہ دستاویزات پر مشتمل ہے۔جس نے کتاب میں معنویت اور وسعت پیدا کرکے اسے ایک مستند تاریخی اور قیمتی دستاویز بنادیا ہے۔صاحب مولف کا طرز تحریر اِس قدر دلچسپ اور تاریخی دستاویزاور تحریروں کے انتخاب کا ذوق اِس قدر ہمہ جہت ہے کہ قاری اِس ضخیم کتاب کو جہاں سے بھی پڑھنا شروع کرتا ہے،اِس کے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے۔یہ درست ہے کہ تذکار بگویہ کی تینوں ضخیم جلدیں اگرچہ خاندان بگویہ کے صاحب علم و عزیمت اسلاف کی دینی، روحانی، سماجی اور سیاسی خدمات کا احاطہ کرتی ہے۔لیکن اِس کے مولف ڈاکٹر انوار احمد بگوی نے اِس قدر محنت،ذہانت اور دیانت سے کام لیا ہے کہ

یہ ایک خانوادے کی نہیں، بلکہ برصغیر پاک و ہند میں علما و مشائخ کی تاریخ کا ایک ایسا مستند باب بن گئی ہیں جو تاریخ کے شعبے سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔اِس اعلیٰ ، علمی اور تاریخی دستاویز مرتب کرنے پر ڈاکٹر انوار احمد بگوی اور جملہ معاون بھیرہ یقینا مبارک باد کے مستحق ہیں۔

شہیدِ بغداد" اُسید الحق قادری بدایونی۔۔۔کیا خوب شہادت پائی ہے"

جانے والے تجھے روئے گا زمانہ برسوں۔۔۔۔

محترم السلام علیکم ! کیا آپ وہی ترازی صاحب ہیں جن کی کتاب" تحریک ختم نبوت" سیدنا صدیق اکبر تا علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی"ہے۔؟یہ کتاب میری نظر سے گزری ہے،خانوادہ علیمیہ پر بہت خوب کاوش ہے، میں نے حال ہی میں ایک طویل مضمون قلم بند کیا ہے،آپ کی کتاب کا حوالہ بھی دیا ہے۔" 24 اپریل 2012ء کو شوشل میڈیا کی مشہور ویب سائٹ فیس بک پر محترم اُسید الحق محمد عاصم قادری شہید کا ہمارے نام یہ پہلا پیغام تھا جو آگے چل کر مزید رابطے کا سبب بنا۔شہید سے دوسرا رابطہ 29 مئی 2012ء کو اُس وقت ہوا جب ہم نے اپنے فیس پیج پر علامہ عبدالحامد بدایونی اور مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی کے جون 1957 کے دورہ روس سے متعلق تصاویر شیئر کیں تو علامہ اسید الحق صاحب نے پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا،جناب ترازی صاحب "تاثرات روس" ہمارے کتب خانے میں موجود ہے، لیکن مجھے ایک کتاب کی تلاش ہے ، ممکن ہے آپ کے پاس ہو، علامہ بدایونی اور مولانا عبدالعلیم صدیقی کے 1946ء میں حجاز کا سفر نامہ حامد بھائی نے لکھا تھا"وفد حجاز کی رپورٹ " کے نام سے یہ کتاب اگر دستیاب

"ہو جائے تو میں بہت ممنون ہو نگا۔

اِس کے بعد 20 مارچ 2013ء کو شہید کا برقی پیغام ملا جس میں آپ نے لکھا "السلام علیکم ! ایک ضرورت کیلئے تکلیف دے رہا ہوں، ثاقب بھائی سے بھی کہہ چکا ہوں، مجھے جے یو پی کی 1952ء تا 1957ء کے درمیان کی سالانہ رپورٹ درکار ہے، یہ غالباً ایک ساتھ شائع ہوئی ہے، دراصل اِن سالوں میں جے یو پی کا ایک وفد حجاز گیا تھا اور اُس نے شاہ سعود سے ملاقات کرکے گنبد خضراء شریف کے تحفظ کا مطالبہ کیا تھا، میں مولانا عبدالحامد بدایونی کا رسالہ " الجواب المشکور" شائع کر رہا ہوں، اُس کے مقدمے کے سلسلے میں مجھے معلومات درکار ہیں، اگر فرصت ہو تو اِس جانب توجہ فرمائیں۔" حسن اتفاق کہ مولانا اُسید الحق قادری صاحب کی مطلوبہ دستاویزات اور 1952ء میں جے یو پی کے وفد کی رپورٹ "تحفظ مسجد نبوی اور آثار مبارکہ "عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ہمارے ریکارڈ میں موجود تھی، جو ہم نے انہیں ارسال کر دیں، آپ نے بے پناہ اظہار تشکر فرمایا اور اِن دستاویزات کو بطور حوالہ استعمال کرنے کی اجازت طلب کی۔

اکتوبر 2013ء میں ہم نے اپنے فیس بک پر "فتاویٰ علماء طہران بجواز بناء الانبیاء والائمۃ وزیار تھم علیھم السلام" سن اشاعت رجب 1381ھ اور مبلغ

اسلام علامہ عبدالعلیم صدیقی کا تقریباً 70 سال قبل 1366ھ میں شائع ہونے والا ایک نادر عربی رسالہ جس پر اخوان المسلمین کے بانی شیخ حسن البناء کی تقریظ موجود ہے " الفتوی النصوص فی بیان الضرائن والمکوس" کے ٹائٹل پیج پر لگائے تو شہید نے اِن دونوں اہم رسالوں کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار فرمایا، ہم نے دونوں رسالے انہیں ارسال فرماتے ہوئے گزارش کی کہ وہ ہمارے لیے " الفتوی النصوص فی بیان الضرائن والمکوس "کے اردو ترجمہ کا اہتمام فرمادیں، ہم اِس ترجمے کو افادہ عام کیلئے پاکستان میں شائع کرنا چاہتے ہیں، حضرت نے بہت جلد ترجمہ مکمل کرکے ارسال کرنے کا وعدہ فرمایا، لیکن زندگی نے انہیں وعدہ وفا کرنے کی مہلت نہیں دی۔ 9 نومبر 2013ء کو جناب اُسید الحق کی جانب سے ملنے والا پیغام "ہمارے ایک دوست مبلغ اسلام پر پی ایچ ڈی کررہے ہیں، میں نے آپ کا حوالہ دیا ہے، اگر ممکن ہو تو کچھ تعاون فرمادیں ہمارے نام حضرت کا آخری برقی مراسلہ ثابت ہوا، اور ملت اسلامیہ کا یہ نابغہ روزگار" نوجوان خانوادہ بدایونی کا چشم وچراغ اور عظیم اسلامی اسکالر 4 مارچ کو عراق میں دہشت گردی کا نشانہ بن کر ہمیں حیران وغمگین چھوڑ گیا۔

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ...... عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کرگیا وہ

قارئین محترم !اپریل 2013ء سے قبل ہمارا علامہ اسید الحق عاصم قادری سے غائبانہ تعارف تھا، جس کی بنیاد ماہنامہ" جام نور" میں شائع ہونے والے آپ کے علمی و تحقیقی مضامین اور مجاہد آزادی علامہ فضل الحق خیر آبادی پر پاکستان میں شائع ہونے والی کتاب "خیر آبادیات" تھی، گو پاک بھارت سرحدی دیوار نے ہمیں کبھی علامہ اسید الحق قادری سے شرفِ ملاقات کا موقع نہیں دیا، لیکن انٹرنیٹ کی دنیا سرحدی حدود وقیود کی پابند نہیں،آپ کہیں بھی کسی سے بھی رابطہ قائم کر سکتے ہیں،یوں نیٹ کے ذریعے علامہ اسید الحق قادری سے قائم ہونے والا یہ مختصر سا تعلق ہمارے لیے کسی اعزاز سے کم نہ تھا،ہم نے ہمیشہ اِس تعلق کو اپنے لیے باعث فخر و مسرت جانا اور مجلسِ احباب میں ذکر کرتے ہوئے نازاں وشاداں رہے۔

علامہ اسید الحق قادری خانوادہ قادریہ بدایوں کی علمی، تہذیبی اور روحانی وراثتوں کے امین تھے،آپ حضرت مولانا شاہ فضل رسول قادری بدایونی،تاج الفحول مولانا عبدالقادر بدایونی، مولانا عبدالقدیر بدایونی اور شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری کے علوم وفضل کے حقیقی وارث تھے،6 مئی 1975ء کو بدایوں میں جنم لینے والے اِس علم وفن کے آفتاب نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد کے زیر سرپرستی مدرسہ قادریہ میں حاصل کی ، خواجہ علم وفن علامہ مظفر حسین رضوی صاحب قبلہ کی بارگاہ میں زانوے تلمذ طے کرکے فاضل درس نظامی ہوئے،الہ آباد

بورڈ اترپردیش سے فاضل دینیات اور فاضل ادب عربی کیا، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے
ایم، اے علوم اسلامیہ مکمل کیا اور فن تفسیر وعلوم قرآن میں تخصص کیلئے جامعہ ازہر
تشریف لے گئے، وہیں آپ نے دارالافتاء المصریۃ سے تخصص فی الافتاء بھی کیا، علامہ
اسید الحق قادری 2004ء میں ہندوستان واپس تشریف لائے اور تخلیقی و تصنیفی میدان
میں قدم رکھا۔

اور صرف دس سال کے مختصر عرصے میں ساٹھ سے زائد کتابوں کی تخریج و تصحیح،
تصنیف وتالیف اور تحقیق وتدوین کا حیرت انگیز اور فقید المثال کارنامہ انجام دے
ڈالا، یوں صرف 38 سال کی عمر قلیل میں بزرگوں جیسے کام کرنے والے اسید الحق
قادری نوجوان محقق اور ندرت فکر رکھنے والے عظیم اسلامی اسکالر کے روپ میں ملت
اسلامیہ میں ممتاز مقام حاصل کرچکے تھے، انہوں نے اپنے خانوادے کی علمی و تصنیفی
خدمات کو ایک نئے رنگ و آہنگ سے مزین کیا اور تاج الفحول اکیڈمی کے زیر نگرانی
اپنے بزرگوں کی سو سے زائد تصانیف اپنی تخریج و تحشیہ اور تقدیم کے ساتھ شائع
کرنے اور بعض کتابوں کو ہندی، گجراتی اور انگریزی زبانوں میں منتقل کرنے کا بھی
اہتمام کیا، اُن کی تصنیف وتالیف میں "قرآن کی سائنسی تفسیر، خامہ
تلاشی، خیرآبادیات، عربی محاورات، حدیث افتراق امت اور منتخب التواریخ" کی تقدیم
جدید علمی وادبی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھیں گئیں۔

گذشتہ سال اُن کی پندرہ کتابیں منظر عام پر آئیں، جن میں خانوادہ بدایوں کی مفصل تاریخ "اکمل التاریخ"مصنفہ مولانا ضیاء القادری، خانوادہ مارہرہ شریف کی مکمل تاریخ تذکرہ نوری"مصنفہ قاضی غلام شبر نوری، ترجمہ و شرح قصیدتان رائعتان "، "الجواب المشکور"مصنفہ مولانا عبدالحامد بدایونی اور حضرت شمس مارہرہ آل احمد اچھے میاں کے جشن دو صد سالہ کی مناسبت سے تین اہم اور وقیع کتابیں قابل ذکر ہیں، آپ کا سب سے بڑا کارنامہ اپنے خاندان کی تاریخ کی از سر نو اشاعت اور اپنے پیر خانے خانقاہ برکاتیہ مارہرہ شریف کی تاریخ اور اکابر مارہرہ کی حیات وخدمات پر مبنی کتب کی اشاعت جدید ہے، علامہ اسید الحق نے مختلف علوم وفنون پر بھی قلم اٹھایا اور سیکڑوں تحقیقی مضامین سپرد قلم کیے، جو ماہنامہ "جام نور" کے صفحات کی زینت بن کر اُس کے علمی معیار میں اضافے کا سبب بنے۔

علامہ اسید الحق قادری کا شمار قرآن وحدیث پر گہری نظر رکھنے والے نوجوان علماء میں ہوتا تھا، آپ علوم عقلیہ ونقلیہ پر کامل عبور رکھتے تھے، اسید الحق قادری برصغیر پاک وہند میں نوجوان علماء کے سرخیل اور نئی نسل میں علم وادب کی ایک معتبر شخصیت تھے، آپ صحیح معنوں میں عالم دین اور اپنے آباؤ اجداد کی وراثتوں کے امین اور اُن کے نقش قدم پر چلنے والے تھے، علامہ محمد افروز

چڑیا کوٹی فرماتے ہیں" انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایسے وقت میں کیا جب فیض و تحقیق کی جنس گراں مایہ بازار علم سے تقریباً اٹھ چکی تھی، فکر و نظر کے زوایئے دھندلا سے گئے تھے، تعلیمی و تنظیمی امور بری طرح انحطاط و تعطل کے شکار تھے، تحقیقی مزاج مفلوج اور اپنی ذات سے اوپر اٹھ کر دوسروں کیلئے کچھ سوچنے کا شعور قریباً اپاہج ہو چکا تھا اور جماعت تحقیق و تخلیص سے آنکھیں موند کر محض چند رسمی معمولات میں الجھ کر رہ گئی تھی، ایسے خشمگیں حالات میں چمن اہلسنت کی حنا بندی اور علم و تحقیق کی گرتی ہوئی قدروں کو سنبھالا دینے کیلئے علامہ میدان میں اترے اور انتھک کوششوں اور اپنے "مدبرانہ خیالات سے وہ انقلاب بپا کرتے ہیں کہ زمانہ عش عش کر اٹھتا ہے۔

حضرت علامہ اسید الحق قادری کی زندگی" کم وقت میں زیادہ کام" سے عبارت ہے، یہی وجہ ہے کہ کم عمری میں انہوں نے علمی میدان میں گرانقدر خدمات انجام دیں، علمی وادبی حلقوں کو اُن سے بڑی توقعات وابستہ تھیں، زندگی اگر وفا کرتی تو وہ اور بھی محیر العقول اور تاریخ ساز کارنامے انجام دیتے، مگر کاتب تقدیر کی دی ہوئی مہلت ہی اتنی تھی، منگل 4 مارچ 2014ء کو وہ اُس وقت ہمیں افسردہ و سوگوار چھوڑ کر عازم جنت ہوئے جب ایک 25 رکنی زیارتی وفد جس میں اُن کے والد محترم مولانا عبدالحمید محمد سالم قادری اور چھوٹے بھائی

مولانا محمد عبدالغنی عطیف میاں قادری بھی شامل تھے، کے ہمراہ بغداد شریف کی زیارت سے فارغ ہوکر "اربل" جاتے ہوئے شاہراہ سلیمانیہ پر ایک دہشت گردانہ حملے میں شہید کردیئے گئے، یوں ہمیشہ علم وادب کی آبیاری کرنے والی سرزمینِ دجلہ وفرات ایک عالم بے دبدل کے خون سے رنگین ہوگئی۔انہیں جمعرات 6 مارچ 2014 ء کوواپس ہندوستان روانہ ہونا تھا، مگر مشیت ایزدی یہی تھی کہ اِس دن اُن کے جسد خاکی کو بغداد کے الگیلانیہ میں احاطہ درگاہ غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی میں سپرد خاک کیا جائے، پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔
زندگی میں ایک بار انھوں نے اِس تمنا کا اظہار فرمایا تھا کہ "جینے کیلئے مدینہ اور مرنے کیلئے بغداد پسند کرتا ہوں" ، " فُزتُ وَرَبِّ الکَعبہ" رب کعبہ کی قسم وہ کامیاب ہوگئے، اللہ کریم نے اپنے محبوب بندے کی خواہش کو رتبہ شہادت سے اِس طرح بدلا کہ ملتِ اسلامیہ انہیں ہمیشہ "شہیدِ بغداد" کے نام سے یاد رکھے گی،آج دنیائے علم و تحقیق کے اِس ابھرتے ہوئے مفکر ومدبر، ممتاز محقق، متبحر عالم دین، محدث و فقیہ، قادرالکلام شاعر اور متحرک وفعال علم دوست شخصیت سے وابستہ چند متذکرہ یادیں ہمارا سرمایہ افتخار ہیں، بلاشبہ شہید اسید الحق قادری ایک عبقری شخصیت تھے،انھوں نے تلاش وجستجو کو ایک نیا رنگ دیا اور عصری تقاضوں کے مطابق تحقیق و تنقید کے نئے زوایئے متعین کرکے میدان علم وادب پر اپنے اَنمٹ نقوش چھوڑے،اُن کے چلے

جانے سے ملّتِ اسلامیہ کا جو عظیم نقصان ہوا، یقیناً اُس کی تلافی کئی دہائیوں تک ممکن نہیں ہے۔ شاعر مشرق اقبال نے ایسے ہی لوگوں کیلئے کہا تھا۔

تجھے معلوم بھی کچھ کہ صدیوں کے تفکر سے
کلیجہ پھونک کر کرتی ہے فطرت اِک بشر پیدا

اسلام دشمن طاقتوں کا نیا مہرہ

نو"9" اکتوبر 2012ء کو وادی سوات میں ایک مبینہ نامعلوم حملہ آور کی فائرنگ سے زخمی ہونے والی سولہ سالہ ملالہ یوسفذئی اسلام دشمن طاقتوں کے نئے مہرے کے طور پر سامنے آئی،ابتداء میں ملالہ پر حملے سے ہر شخص پُر ملال تھا اور اِس کے ذہن میں پہلا سوال یہی ابھرا کہ آخر اِس بچی کا کیا قصور ہے۔؟ جبکہ حملہ آوروں کی جانب سے جاری ہونے والی چارج شیٹ میں کہا گیا کہ وہ امریکن ایجنٹ ہے،حالانکہ وطن عزیز کے موجودہ حالات میں یہ کوئی ایسا بڑا جرم نہیں ہے،بلکہ حقیتاً پاکستان میں تو اِسے جرم تصور ہی نہیں کیا جاتا،کیونکہ یہاں ایک ملالہ ہی کیا ہزاروں امریکی ایجنٹ دندناتے پھرتے اور ہمارے آئین و قانون کی دھجیاں اڑاتے ہیں اور وطن دشمن عناصر کی سرپرستی کرتے نظر آتے ہیں،سوئے اتفاق اگر کبھی کوئی قانونی گرفت میں آ بھی جائے تو ہمارے ارباب اختیار غلامی کا حق ادا کرتے ہوئے اُسے عزت و احترام سے باحفاظت امریکہ بہادر کے حوالے کر دیتے ہیں۔

دوسری طرف ملالہ پر حملے کی خبر کے ساتھ ہی پورا پاکستانی اور بین الاقوامی میڈیا ملالہ پر مرکوز ہوگیا،جس نے ملالہ یوسف زئی کو قومی و بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں قوم کی بہادر بیٹی کے طور پر پیش کیا،اِس حوالے سے خصوصی

رپورٹس اور بلیٹن نشر کیے گئے، ٹریگر چلائے گئے، اِن چینلوں سے وابستہ احباب بتاتے ہیں کہ اِس کی ہدایات بہت اوپر سے آئی تھی، یہی وجہ تھی کہ اِس مسئلے پر تمام چینل ہم آواز و ہم رکاب تھے، جبکہ یہی حال بین الاقوامی میڈیا میں بھی نظر آیا۔ سوشل میڈیا بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا، ملالہ کو خراجِ تحسین پیش کرنے کیلئے بہت سوں نے اپنی پروفائل پکچر کی جگہ ملالہ کی تصویر ڈسپلے کر دی، شاعروں نے نظمیں اور ادیبوں نے مذمتی قرار دادیں اپنے اسٹیٹس پر آویزاں کیں، بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ملالہ کو باقاعدہ "قوم کی بیٹی" کے خطاب سے نوازا جائے، جبکہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ملالہ پر حملے کو ایک نئے زاویے سے دیکھتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ آخر اِس تمام کاروائی کے پس پردہ مقاصد کیا ہیں۔

زیر نظر کتاب "ملالہ یوسفذئی اسلام دشمن طاقتوں کا نیا مہرہ" دراصل ایسی ہی مضامین کا نیا مجموعہ ہے، جسے عصر حاضر کے مایہ ناز محقق اور مجاہد ختم نبوت محمد متین خالد نے ترتیب دیا ہے، متین خالد صاحب ایک مدت سے عقیدہِ ختم نبوت کے تحفظ کیلئے کام کرتے چلے آرہے ہیں، عصر حاضر میں متین خالد وسیع مطالعہ کے مالک اور اِس موضوع پر ایک سند کی حیثیت رکھتے ہیں، اب تک آپ کی متعدد کتابیں بالخصوص "ثبوت حاضر ہیں، قادیانیت سے اسلام تک، تحفظ ختم نبوت اہمیت وفضیلت، شہیدان ناموس رسالت، اسلام کا سفیر، علامہ اقبال اور فتنہ

قادیانیت، وغیرہ عالمی شہرت حاصل کرچکی ہیں ۔جب ملالہ یوسف زئی کے معالے کا چرچا
ہوااور اُس کی متنازعہ کتاب
"I am Malala"
منظر عام پر آئی، جس میں شاتم رسول سلمان رشدی اور اسلام وپاکستان دشمن
قادیانیوں کی کھلے عام وکالت کی گئ اور شعائر اسلامی و پاک افواج کا مذاق اڑایا گیا، تو محمد
متین خالد کی حساس قلب و روح بے چین ہو گئ اورآپ نے اِس موضوع پر پاکستان کے
ممتاز دانشور ومحب وطن اہل قلم کے مضامین کا انتخاب مندرجہ بالا عنوان سے مرتب
کرکے پس پردہ سازش کو بے نقاب
کرنے کا عزم صمیم کرلیا۔
ملالہ یوسفذئی اسلام دشمن طاقتوں کا نیا مہرہ" میں وطن عزیزکے ممتاز اہل قلم "اوریا
مقبول جان، حافظ شفیق الرحمٰن، انصار عباسی، طلعت حسین، عبداللہ طارق سہیل، ارشاد
احمد عارف، ڈاکٹر عامر لیاقت حسین، اشتیاق بیگ، عامر خاکوانی، پروفیسر خباب احمد، حفیظ
اللہ نیازی، آصف محمود، سین صحرائی، طیبہ ضیاء، ڈاکٹر سمیحہ راحیل قاضی، پروفیسر رفعت
مظہراور شیریں حیدر وغیرہ کے 48 مضامین کا انتخاب ہے۔ کتاب کا مطالعہ جہاں اِس
حقیقت کو منکشف کرتا ہے کہ کتاب کی وجہ تصنیف کیا ہے، برطانوی وزیر اعظم گولڈن
براؤن نے کیوں کتاب کی اشاعت میں مالی معاونت کی، کرسٹینا لیب نے اصل
مسودے میں کیا ردوبدل

کیا، ملالہ کیسے بغیر سفری دستاویزات کے برطانیہ پہنچی، مرزا مسرور قادیانی کی ملالہ کے والد سے ملاقات میں کیا معاملات طے ہوئے اور ملالہ کی نوبل انعام سمیت متعدد عالمی اعزات کیلئے نامزدی کے پس پردہ مقاصد کیا ہیں، وہیں یہ بھی بتاتا ہے کہ ملالہ یوسفذئی دراصل اسلام اور پاکستان دشمن طاقتوں کی بچھائی اُس بساط کا نیا مہرہ ہے، جس کا اصل مقصد "ملالہ" کو رول ماڈل کے طور پر پیش کرتے ہوئے ہماری نوجوان نسل خصوصاً پاکستانی بچیوں کو شعائر اسلامی کا مذاق اڑانے اور آزادی ِ اظہار کے نام پر ذات رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم پر تنقید کی جسارت پیدا کرنے کے ساتھ، قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے والے متفقہ قانون کو غلط قرار دینے اور مسلح افواج و قومی سیکورٹی اداروں کو متنازعہ بنا کر اُن پر عدم اعتماد کے اظہار کیلئے تیار کرنا ہے۔

یہ دراصل وہ بھیانک سازش ہے جس کا مقصد خاکم بدہن پاکستان کے استحکام و سالمیت کو نقصان پہنچا کر اُسے دنیا کے نقشے سے حرف غلط کی طرح مٹانا ہے۔کتاب کے مضامین مغرب کی اِس خفیہ سازش کو بے نقاب کرتے ہیں، جس کی کڑیاں سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین سے جا ملتی ہیں،کتاب دہلا دینے والے ہوشربا انکشافات کا مجموعہ ہے، جسے مرتب نے بڑی محنت، عرق ریزی اور سلیقے سے ترتیب دیا ہے،کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اِس میں دعوے کی دلیل کے طور پر ملالہ کی کتاب کی

عکسی شہادت بھی موجود ہے۔ ہمارا ماننا ہے کہ اسلام اور پاکستان دشمن عناصر کو پہچاننا اور اُن کے مذموم عزائم کو ناکام بنانا ہر محب وطن پاکستانی کا فرض ہے اور اس فرض تکمیل کیلئے "ملالہ یوسفذئی اسلام دشمن طاقتوں کا نیا مہرہ" نامی کتاب بہترین مددگار و معاون دستاویز ہے۔

رَواں دَواں ہے قافلہ۔۔۔۔رُکا نہیں۔۔۔۔بکا نہیں۔۔۔۔

اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی سے لے کر 14، اگست 1947ء تک علماء و مشائخ اور عوام اہلسنّت کی لازوال قربانیوں کا ثمر پاکستان دنیاکے نقشے پر دو قومی نظریئے کی بنیاد پر وجود میں آیا،اِس دوران اکابرین اہلسنّت نے ،جماعت رضائے مصطفیٰ، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، آل انڈیا سنی کانفرنس اور قیام پاکستان کی تحریک میں ہراوّل دستے کا کردار ادا کرتے ہوئے اِس جدوجہد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے شانہ بشانہ کام کیا، دیانت دار مورخ اِس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ تحریک پاکستان کے سفر میں کوئی ایسا موڑ نہیں آیا، جہاں پر یہ حضرات علماء و مشائخ رہبری و رہنمائی کرنے کیلئے موجود نہ رہے ہوں۔

قیام پاکستان کے بعد علماء اہلسنّت نے پاکستان کو دو قومی نظریئے کے سانچے میں ڈھالنے کی توقعات پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ سے وابستہ رکھیں،انہیں یہ امید تھی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی قیادت تحریک پاکستان کے دوران کیئے گئے اپنے وعدے کے مطابق نوزائیدہ مملکت میں اسلامی نظام نافذ کرے گی،لیکن قائداعظم محمد علی جناح کے انتقال اور پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد اقتدار کی غلام گردشوں میں کھیلے جانے والے

کھیل نے پاکستان کو اُس کے حقیقی نصب العین سے دور کردیا اور آل انڈیا مسلم لیگ کی قیادت اپنے وعدے سے منحرف ہو گئی۔اِس دوران ایک ایسا طبقہ بھی ابھر کر سامنے آگیا، جس کے وابستگان نے تحریک پاکستان میں کہیں بھی کوئی سرگرمی نہیں دکھائی تھی، بلکہ علی الاعلان تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کی مخالفت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں چھوڑا، لیکن پاکستان بننے کے بعد یہ لوگ اقتدار کے مزے لوٹ رہے تھے۔

چنانچہ سنّی علماء نے مسلم لیگ اور جمعیت علماء اسلام کے درمیان بڑھتے ہوئے قریبی تعلق کو اِس وقت شدت سے محسوس کیا، جب جمعیت علماء اسلام کے صدر مولانا شبیر احمد عثمانی کو سی، اے، پی Constituent Assembly of Pakistan کا ممبر منتخب کیا گیا، جو مسلم لیگ کے حلقے میں شیخ الاسلام کے نام سے جانے جاتے تھے، سرکاری توثیق کے بغیر اُن کی تقرری کو علماء اہلسنّت کیلئے نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا، اِس عمل نے سنّی علماء کو نئے سیاسی سیٹ اپ میں اپنے مقام کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے پر مائل کیا اور 4، مارچ 1948ء کو مولانا سیّد احمد سعید کاظمی نے مولانا ابوالحسنات سیّد محمد احمد قادری کی توجہ ایک خط کے ذریعے دوسرے فرقوں کے اتحاد اور پاکستان میں اہلسنّت کی تقسیم کی طرف مبذول کراتے ہوئے لکھا، کہ "دنیا کے گوشے گوشے میں بیداری کی لہر دوڑ گئی ہے، مگر ہم خواب غفلت میں مدہوش ہیں، اِس کے بر عکس اغیار نے ہمیشہ موقع شناسی

سے کام لیا، حالات کا گہری نظر سے جائزہ لیا اور جو قدم اٹھایا، بر محل اور مقتضائے حال کے مطابق اٹھایا، چنانچہ ان کی مشہور شخصیتیں اور جماعتیں جواب سے قریباً دو سال تک نظریہ پاکستان اور اِس کے قیام کی شدید ترین مخالفت کرتی رہیں۔۔۔۔جب انہیں قیام پاکستان کا یقین ہو چلا تو انھوں نے حیرت انگیز طور پر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی اور کچھ ایسا رسوخ پیدا کیا کہ اُن کا ایک فرد ایک ہی جست میں منصب دستور سازی پر فائز ہو کر پاکستان کی اسمبلی پر چھا گیا۔

دوسری جانب یہ حقیقت ہے کہ ہم نے ہمیشہ مسلم لیگ کی حمایت کی اُس کا ساتھ دیا اور قیام پاکستان کے سلسلہ میں اپنی تمام کوششیں صرف کر دیں، جانی و مالی قربانی میں کوئی دریغ نہیں کیا اور اللہ کے کرم سے اپنے اور بیگانوں کی شدید مخالفتوں کے باوجود پاکستان قائم ہو گیا، مگر ہماری عدم تنظیم نے ہمیں یہ وقت دکھایا کہ آج اِس حکومت پاکستان میں جس کا قیام ہماری قربانیوں کا نتیجہ ہے، ہمیں کوئی امتیاز و وقار حاصل نہیں، نہ ہماری خدمات کا کوئی نتیجہ ہے، ہمارا مستقبل شدید خطرات میں گھرا ہے، مستقبل قریب میں جو طوفانی انقلاب رونما ہوتا نظر آ رہا ہے، اُس کی تہہ میں ہمارے مخالفین کی طاغوتی طاقتیں ہمیں کچلنے اور حرف غلط کی طرح مٹا دینے کے درپے نظر آتی ہیں، ہم اِس طرح غیر، منظم و منتشر رہے تو اِس کا انجام ظاہر ہے۔۔۔۔اگر ہم عزت و وقار کے

ساتھ رہنے اور اپنے صحیح مذہب و مسلک کی بقاء کے خواہش مند ہیں تو ہمیں فی الفور ایک مرکز پر ایسی وسیع اور مستحکم تنظیم کے ساتھ منظم ہونا پڑے گا کہ ہمارا ایک فرد بھی ہم سے جدا نہ رہے۔۔۔۔۔ہم تو اہلسنّت کی تسبیح کے بکھرے ہوئے دانوں کو وسیع تنظیم کے مضبوط رشتے میں پرونا اور ایک امیر اہلسنّت کی قیادت میں منظم اور مجتمع کرکے یہ چاہتے ہیں کہ مملکت خداداد پاکستان کی ایسی صحیح دینی اور ملی خدمت کریں کہ "وہ آئین شریعت کے مکمل نفاذ کے ساتھ صحیح معنوں میں اسلامی سلطنت بن جائے۔

علامہ کاظمی کا مطمع نظر سنّی عوام کا اتحاد اور ایک امیر اہلسنّت کی قیادت میں پاکستان کو اسلامی مملکت بنانا تھا،انھوں نے علماء اہلسنّت کو وقت کے تقاضوں کا احساس دلایا تاکہ اِس نوزائیدہ مملکت کو اُس کی حقیقی منزل تک پہنچایا جاسکے،چنانچہ آپ کے تحرک پر 27،28، اور 29،مارچ 1948ء کو ملتان میں اہلسنّت و جماعت کی نمائندہ تنظیم "جمعیت علماء پاکستان" کی بنیاد رکھی گئی،جس کے سب سے پہلے صدر غازی کشمیر علامہ ابو الحسنات سیّد محمد احمد قادری،ناظم اعلیٰ علامہ سیّد احمد سعید کاظمی،نائب ناظم اعلیٰ مولانا غلام محمد ترنم اور ناظم اطلاعات مولانا محمد بخش مسلم قرار پائے،قیام پاکستان کے بعد ملک میں "جمعیت علماء پاکستان" پہلی مذہبی سیاسی جماعت تھی جو قائم کی گئی،جمعیت کے ابتدائی منشور میں "پاکستان کو اسلامی مملکت بنانے،معاشرے کو

تمام معاشرتی و سماجی برائیوں سے پاک کرنے، مسلمانوں کے درمیان اسلامی طریقہ کار کو پھیلانے، انہیں عملی مسلمان بنانے، اُن کے درمیان روح جہاد بیدار کرنے، اُن کی توجہ مغربی تہذیب کے بجائے اسلامی تہذیب کی جانب مبذول کرانے، حکومت کی رہنمائی کیلئے سنّی علماء کو صوبائی اور قومی اسمبلی میں حق نمائندگی دینے، مساجد اور خانقاہوں کی اعانت، تعلیمی اداروں کی نصابی کتابوں کی نظرثانی اور طلباء کیلئے تفسیر، حدیث، فقہ اور اسلامی تاریخ کو لازمی قرار دینے، مسلح افواج کو منظم کرکے اُن میں روح جہاد بیدار کرنے، پاکستان کی استحکام اور سلامتی کیلئے کسی قربانی سے دریغ نہ کرنے، پاکستان اور مسلم امّہ اور اسلام کی سربلندی اور امن کے قیام کیلئے کام کرنے پاکستان بھر میں جمعیت علماء پاکستان کی شاخوں کا قیام اور سیاسی سرگرمیوں سے، اجتناب، وغیرہ شامل تھے، اُس وقت جمعیت علماء پاکستان کی رکنیت صرف سنّی علماء، خطیب اور مذہبی ذہن رکھنے والے افراد کیلئے مخصوص تھی۔

جمعیت علماء پاکستان نے مذہبی جماعت کی حیثیت سے ملک میں نظام مصطفٰی کے نفاذ اور مقام مصطفٰی کے تحفظ کیلئے اپنی جدوجہد کی ابتداء کی، جمعیت کے قیام سے قبل مہاجرین کی آبادکاری ایک بہت بڑا مسئلہ تھا، جمعیت علماء پاکستان نے آبادکاری کے ساتھ ساتھ پاکستان کے اصل مقصد کو کبھی بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا، یہ اعزاز بھی جمعیت کو جاتا ہے کہ اُس نے سب سے پہلے ملک میں

نظام مصطفیاکے نفاذ کا مطالبہ کیا اور 7، مئی 1948ء کو یوم شریعت کے عنوان سے پورے ملک میں تحریک شروع کی،1948ء میں جمعیت علماءپاکستان نے جہاد کشمیر میں بھرپور حصہ لیتے ہوئے مجاہدین کیلئے عملی تعاون اور مالی امداد فراہم کی،جمعیت علماء پاکستان نے 1949ء میں قرارداد مقاصد کی منظوری،1951ء میں علامہ عبدالحامد بدایونی کی قیادت میں مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام کے ساتھ مل کر بائیس (22) نکات کی تیاری، 1953ء کی تحریک ختم نبوت اور 1956ء میں پاکستان کے آئین کی تدوین اور فقہ حنفی کو پبلک لاء بنانے کیلئے تاریخ ساز خدمات انجام دیں اوراس جدوجہد کے دوران جمعیت علماءپاکستان کے رہنماؤں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرکے دارورسن کی روایت کو بھی رکھا۔

جمعیت کے پہلے صدرعلامہ ابوالحسنات سید محمداحمد قادری کے انتقال کے بعد جمعیت کئی نشیب وفراز سے گزری، بعض علماء و مشائخ نے عملی میدان میں کام کرنے کے بجائے اپنے خانقاہی نظام میں مصروف رہنا بہتر خیال کیا، جبکہ کچھ نے اپنے اپنے علیحدہ گروپ بنالیے، جن میں صاحبزادہ فیض الحسن،علامہ عبدالغفور ہزاروی، مولانا خلیل احمد قادری، مولانا سید محمود شاہ گجراتی اورعلامہ محمود احمد رضوی گروپ قابل ذکر ہیں،لیکن اِس مشکل دور میں بھی جمعیت علامہ عبدالحامد بدایونی کی قیادت میں انتخابی سیاست سے دور مذہبی و سماجی میدانوں میں مصروف عمل رہی،جمعیت کے اکابرین کا خیال تھا کہ بطور پاکستان

کی خالق جماعت ہونے کے، مسلم لیگ کو ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کا کام کرنا چاہیے، اس لیے انہوں نے سیاسی سطح پر کئی بار مسلم لیگ کے ہاتھ مضبوط کئے، لیکن ہر بار اقتدار کی غلام گردشوں اور بھول بھلیوں میں کھو جانے والے حکمرانوں نے نفاذ اسلام کے خواب کو جب شرمندہ تعبیر نہ ہونے دیا، اس صورتحال میں جمعیت علماء پاکستان کا سیاسی میدان اترنا ایک منطقی عمل تھا، لیکن اس کیلئے ضرورت اِس امر کی تھی کہ پہلے تمام گروپوں کو متحد و منظم کرکے ایک لڑی میں پرویا جائے، چنانچہ مفتی اعظم پاکستان حضرت علامہ ابوالبرکات سید محمد احمد قادری جو اہلسنّت کو متحد و منظم دیکھنے کے خواہاں تھے، نے 4، اپریل 1970ء دارالعلوم حزب الاحناف لاہور میں تمام گروپوں کے رہنماؤں کا ایک مشترکہ اجلاس طلب کیا۔

اس اجلاس میں تمام گروپوں کے رہنماؤں نے شرکت کی، جبکہ علامہ عبد الحامد بدایونی اپنی نجی مصروفیات کی وجہ سے اِس اہم اجلاس میں شریک نہ ہوسکے، مگر آپ نے حضرت مفتی اعظم پاکستان کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا اور ساتھ ہی آپ نے اِس اجلاس میں کئے گئے فیصلوں کو بھی تسلیم کرنے اظہار بھی کیا تھا، حضرت مفتی اعظم پاکستان کے حکم پر اِس اجلاس کی صدارت قائد ملت اسلامیہ علامہ شاہ احمد نورانی نے کی، جید علماء و مشائخ کی موجودگی میں آپ نے اِس اہم و تاریخی اجلاس کی صدارت کی اور اِس حسنِ خوبی سے اجلاس کی کاروائی

چلائی کہ آپس میں ہزاروں اختلافات رکھنے والے رہنماؤں نے آپ کی ذات پر اظہار اعتماد کرتے ہوئے جمعیت علماء پاکستان کے تمام گروپوں کو توڑنے اور باہم مدغم کرنے کا اعلان کرتے ہوئے اپنی اپنی صدارت سے استعفیٰ دے کر ملک میں لادینیت اور کمیونسٹ نظام کے علمبرداروں کا راستہ روکنے کیلئے ایک مربوط و منظم حکمت عملی کا اعلان کیا۔

یوں جمعیت علماء پاکستان میں 13، جون 1970ء کو ہونے والے نئے انتخابات جس میں شیخ الاسلام حضرت خواجہ قمرالدین سیالوی صدر، علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی سینئر نائب صدر، پیر کرم شاہ صاحب الازہری نائب صدر اور علامہ محمود احمد رضوی سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے اپنے دور نو کا آغاز کیا۔ جمعیت ایک نئے اور انقلابی روپ میں عوام کے سامنے آئی اور اُس نے دسمبر میں ہونے والے عام انتخابات میں بھرپور حصہ لینے کا اعلان کرکے اِس عہد کا بھی اعادہ کیا کہ وہ اب ملک کی نظریاتی اساس کو تحفظ دینے کیلئے قومی سیاست میں براہ راست اپنا کردار ادا کرے گی۔ مولانا شاہ احمد نورانی جمعیت علماء پاکستان کو عوامی اور جمہوری جدوجہد کی راہ پر ڈال دیا، خواجہ قمرالاسلام سیالوی صاحب کی تائید وحمایت سے جمعیت کے نائب صدر مولانا نورانی نے جمعیت کو نئے خطوط پر منظم کرنا شروع کیا اور جلد ہی آپ کی حکمت عملی اور پالیسیوں کی بدولت سیاسی میدان میں نووارد جمعیت علماء پاکستان دسمبر 1970ء کے عام انتخابات میں

حیرت انگیز کامیابی حاصل کرکے ایک ملک کی ایک بڑی سیاسی جماعت کے بن کر سیاسی افق پر نمودار ہوئی۔

اس تاریخ ساز کامیابی کے کچھ عرصے بعد دسمبر 1972ء کو شیخ الاسلام خواجہ قمرالدین سیالوی صاحب اپنی پیرانہ سالی اور علالت کی وجہ سے جمعیت کی صدارت سے مستعفی ہوگئے اور مئی 1973ء میں صدرات کا تاج مولانا نورانی کے سر پر سجادیا گیا، 1970ء کے الیکشن کے بعد جمعیت جو مولانا نورانی کی قیادت میں پنجاب (دیہی) اور سندھ شہری) کی مدد سے یہ ایک اہم سیاسی جماعت بن کر ابھری تھی،نے قومی اسمبلی اور) سندھ اسمبلی میں آئین سازی کیلئے نہ صرف اہم خدمات انجام دیں بلکہ پاکستان کے دستور کو اسلامی بنانے میں بھی مرکزی کردار ادا کیا،جمعیت نے آئین میں مسلمان کی تعریف سے لے کر قادیانیوں کی غیر مسلم اقلیت قرار دلوانے میں کوئی دقیقہ فرگزاشت نہ چھوڑا، مولانا نورانی کی قیادت میں جمعیت نے ملکی سیاست میں" حصول اقتدار کے بغیر سیاست " کی ایک نئی اور منفرد روش متعارف کروائی،آپ اصولوں کی خاطر وقت کے ہر جابر سلطان کے سامنے ڈٹ گئے اور علماء ومشائخ کو مساجد وخانقاہوں سے نکال کر میدان عمل میں لا کھڑا کیا۔

لیکن ضیائی مارشل لاء نے جمعیت کو اُس وقت اندرونی اختلاف اور خلفشار سے

دوچار کردیا جب جمعیت سے وابستہ کچھ علماء ومشائخ (علامہ عبدالمصطفیٰ الازہری، محمود احمد رضوی، مفتی محمد حسین قادری، سید شاہ شاہ تراب الحق وغیرہ)اور تیسرے درجے کی قیادت (ظہور الحسن بھوپالی، حاجی حنیف طیب، حافظ تقی، عثمان خان نوری وغیرہ) مارشل لاء کی گود میں جا بیٹھی، انتشار وافتراق کا یہ لمحہ جمعیت کیلئے بہت مشکل اور کٹھن تھا، لیکن مولانا عبدالستار خان نیازی، پروفیسر سید شاہ فرید الحق اور دیگر اکابرین نے جمعیت کو سرکاری تسخیری سے بچاتے ہوئے مولانا نورانی کا ساتھ دے کر اصولی سیاست کا سفر جاری رکھا۔

1990ء میں یہ سفر اُس وقت ایک بار پھر باہمی اختلاف کا شکار ہوا، جب حلقہ 99 کے ضمنی الیکشن کے موقع پر کچھ ناعاقبت اندیش لوگوں کی سازشوں نے جمعیت کے جنرل سیکرٹری مجاہد ملت عبدالستار خان نیازی اور قائد جمعیت مولانا شاہ احمد نورانی کے درمیان دوریاں پیدا کردیں، مولانا نورانی کے بعد مجاہد ملت جمعیت کی سب سے جرا_ت مند، بااصول اور باوقار قیادت میں شامل تھے، اُن کی علیحدگی جمعیت علماء پاکستان کیلئے کسی دھچکے سے کم نہ تھی، مگر ان حالات میں بھی جمعیت نے اپنا سفر پوری استقامت کے ساتھ جاری رکھا اور یہی کوشش کی کہ مجاہد ملت جمعیت میں واپس میں آجائیں۔

باالآخر دس سال بعد اکتوبر 2000ء میں یہ کوششیں اُس وقت بار آور ثابت ہوئیں

جب مجاہد ملت جمعیت میں واپس آئے اور نئے سیٹ اپ میں جمعیت علماء پاکستان کے صدر بنے۔اِس نئے سیٹ اپ میں سید امیر شاہ گیلانی سینئر نائب صدر، پروفیسر شاہ فرید الحق جنرل سیکرٹری جبکہ مولانا شاہ احمد نورانی چیئرمین سپریم کونسل تھے۔ مجاہد ملت کی واپسی کے بعد جمعیت ایک بار پھر نئے عزم اور ولولے کے ساتھ اپنے مشن پر رواں دواں ہو گئی۔ مگر2002ء میں مجاہد ملت کی رحلت اور 2003ء میں مولانا شاہ احمد نورانی کی جدائی سے قیادت کا بار گراں کچھ عرصے کیلئے پروفیسر سید شاہ فرید الحق صاحب کے بوڑھے کاندھوں پر منتقل ہوگیا، بعد میں یہ ذمہ داری صاحبزادہ شاہ انس نورانی صاحب کے حصے میں آئی، مگر2008ء کے الیکشن میں ناکامی کے بعد صاحبزادہ انس نورانی نے جمعیت کی صدارت سے استعفیٰ دیدیا، جس کے بعد ڈاکٹر ابوالخیر محمد زبیر فکر نورانی کے محافظ و امین بن کر سامنے آئے۔اُن کی قائد ملت اسلامیہ کے ساتھ 30 سالہ رفاقت رہی اور اُن کا شمار مولانا شاہ احمد نورانی کے بااعتماد، جانثار اور وفادار ساتھیوں میں ہوتا ہے، صاحبزادہ زبیر نے اپنے دور صدارت میں جمعیت علماءپاکستان کو مولانا ابوالحسنات، علامہ کاظمی اور مولانا نورانی کے متعین کردہ خطوط پر گامزن کیا، متحرک و فعال رکھا اور عروج پر پہنچایا۔

ابھی یہ سفر جاری ہی تھا کہ 7، دسمبر 2013 ء کو کچھ احباب نے پیر اعجاز ہاشمی چیئرمین سپریم کونسل کی صدرات کی میں مجلس شوریٰ و عاملہ کا ایک ایسا

غیر آئینی اور غیر دستوری اجلاس بلایا، جس کی صدرات جمیعت کے دستور کی روشنی میں صرف صدر جمیعت ہی کرسکتا ہے، یوں صدر جمیعت کو نظر انداز کرکے اس اجلاس کو منعقد کرنا اور اس میں مولانا نورانی کے وفادار ساتھیوں شبیر ابوطالب، قاضی احمد نورانی، سید عقیل انجم، مولانا بشیر القادری، یونس دانش اور طاہر رشید تنولی کو جمیعت سے خارج کرنے کا فیصلہ کرنا ایک بار پھر جمیعت علماء پاکستان میں نفاق کا سبب بنا، جمیعت کے صدر صاحبزادہ ابوالخیر محمد زبیر نے اس اجلاس اور اس میں کئے گئے فیصلوں کو غیر دستوری قرار دیا اور جمیعت کو متحد و منظم رکھنے کی کوششیں جاری رکھیں، انہوں نے 22 دسمبر کو لاہور میں منعقدہ شوریٰ و عاملہ کے اجلاس میں ایک اعلیٰ مزاکراتی کمیٹی بھی تشکیل دی، جس کا کام قائدین سے ملاقات کرکے جماعتی امور پر اتفاق رائے پیدا کرنا تھا، مگر 7 دسمبر کے غیر دستوری اجلاس منعقد کرنے والوں نے صاحبزادہ صاحب کی اِن تمام کوششوں کو سبوتاژ کرتے ہوئے 28 دسمبر کو لاہور میں ایک اور غیر دستوری اجلاس منعقد کیا، جس میں جمیعت علماء پاکستان کی تمام صوبائی اور مرکزی تنظیموں کو توڑنے اور 16 فروری کو صوبائی جبکہ 2 مارچ کو مرکزی انتخابات کرانے کا نہ صرف غیر آئینی اعلان کیا، بلکہ الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا پر توہین آمیز بیانات بھی جاری کئے گئے۔

ظاہر ہے یہ صورتحال کسی طور بھی خوش آئند نہ تھی، مگراس کے باوجود ڈاکٹر

ابوالخیر محمد زبیر نے مفاہمتی کوششیں جاری رکھی اور جمعیت کو انتشار سے بچانے کیلئے خود صاحبزادہ اویس نورانی سے ملنے اُن گھر تشریف لے گئے،اِس موقع پر پیر عبدالخالق بھرچونڈی شریف اور مفتی ابراہیم صاحب بھی موجود تھے،مگر صاحبزادہ زبیر کی یہ ملاقات بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی اور باہمی مفاہمت کی تمام کوششیں ایک بار پھر ناکام ہو گئیں ہیں،چنانچہ 22 دسمبر کے شوریٰ وعاملہ کے اجلاس کے فیصلے کے مطابق جمعیت علماء پاکستان کے صوبائی اور مرکزی الیکشن منعقد ہوئے،جس میں ڈاکٹر ابوالخیر محمد زبیر تیسری مرتبہ بلا مقابلہ جمعیت علماء پاکستان کے صدر منتخب ہوگئے،اپنے انتخاب پر انہوں نے کہاکہ وہ مولانا شاہ احمد نورانی کی حیات میں اُن کے شانہ بشانہ رہے ہیں اور انہی سے سیاسی تربیت حاصل کی ہے،انہوں نے اِس عزم کا بھی اعادہ کیاکہ وہ مشن نورانی سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹیں گے اور انہی کے نقش قدم پر چلیں گے۔

آج جمعیت علماءپاکستان ایک بار پھر اپنی نو منتخب قیادت کے زیر سرپرستی اکابرین اہلسنّت کے نقش قدم پر گامزن ہے،جبکہ دوسری جانب وہ لوگ ہیں جو جمعیت علماء پاکستان کو اپنی موروثی جاگیر سمجھتے ہیں اوراس حقیقت کو بھول بیٹھے ہیں کہ جمعیت علماء پاکستان ایک ایسی سیاسی مذہبی جماعت ہے جس کی بنیاد علامہ سید احمد سعید کاظمی نے رکھی،جس کی آبیاری مولانا

ابوالحسنات محمد احمد قادری، مولانا عبدالحامد بدایونی، خواجہ قمرالدین سیالوی، مولانا شاہ احمد نورانی، مجاہد ملت مولانا عبدالستار خان نیازی، مردِ حق پروفیسر شاہ فرید الحق، حضرت علامہ مفتی جمیل احمد نعیمی اور دیگر علماء ومشائخ اور اکابرین اہلسنّت نے کی، یہ ہمارے بزرگوں کا ایسا سرمایہ ہے، جس کے وارث صرف اور صرف عوام اہلسنّت ہیں۔ قارئین محترم ! آج جمعیت علماء پاکستان اتحاد اہلسنّت کیلئے کوشاں ہے، اُس کی اِنہی کوششوں کا بدولت 6 مختلف الخیال دھڑے جمعیت علماء پاکستان میں شامل ہوچکے ہیں، مارچ کو جمعیت علماء پاکستان نے کراچی کے خالقدینا ھال میں فقیدالمثال نورانی ، 2 ورکرز کنونشن کا انعقاد کرکے اپنے اُس سفر نو کا آغاز کردیا ہے، جس کی آخری منزل ملک میں نظام مصطفیٰ کا نفاذ اور مقام مصطفیٰ کا تحفظ ہوگی۔ (انشاءاللہ)

مرزا قادیانی کا طبّی محاسبہ

ایک نئی، انوکھی اور منفرد کتاب

رائے محمد کمال لکھتے ہیں کہ "اگر قادیانیت کے فکری پس منظر پر غور کیا جائے تو بادی النظر میں یہی تاثر ابھرتا ہے کہ اِس خطہ ارض پر ابتداً تحریک وہابیہ نے جنم لیااور اِس کے اثرات یوں پھیلے کہ متاثرہ افراد کے دلوں سے دانائے راز ختم الرسول مولائے کل صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ سے والہانہ محبت اور جذباتی تعلق کمزور ہوگیا، حسن عقیدت کی جلوہ باری اور بادہ عشق و مستی کی کیفیت موجود نہ رہی، ہزار بار مشک و گلاب سے منہ دھوکر اپنے آقا و مولا کا نام لینے اور پھر بھی بے ادبی خیال کرنے کا رنگ اُن کے دلوں سے نکل گیا۔ یہ سوال آج بھی جواب طلب ہے کہ قادیانی تحریک احمدیہ، علمائے دیوبند کی صدائے بازگشت تھی یا دیوبندی مسلک وہابیوں کے خمیر سے اٹھا، لیکن یہ اَمر مسلمہ حقیقت ہے کہ جماعت اسلامی، نیچریت، چکڑالویت، پرویزیت اور دہریت وغیرہ اِن ہی کا ثمر ہے۔"

مگرایک بات طے ہے کہ قادیانیت انیسویں صدی کے ہندوستان کا ایک عظیم فتنہ ارتداد ہے، جس کی نشوونما اور آبیاری "عہد تسلط برطانیہ" میں ہوئی، مرزا غلام

احمد قادیانی اِس کا بانی مبانی تھا، جس نے انگریز سرکار کے اشارے پر عامۃ المسلمین سے علیحدگی کی روش اختیار کرتے ہوئے قادیانیت کی بنیاد رکھی اور فتنہ ارتداد کی ایک نئی روش متعارف کروائی۔اِس تحریک کا تاریخی پس منظر واضح کرتا ہے کہ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد برٹش گورنمنٹ کی ایماء پر پادریوں کی جانب سے مرتب کی گئی رپورٹ کو مد نظر رکھتے ہوئے مناسب اور موزوں آدمی کی تلاش کا کام شروع ہوا، حالانکہ اِس سے قبل مولوی اسماعیل دہلوی کے ذریعے برصغیر میں فرقہ وارِیت کی بنیاد رکھی جاچکی تھی اور تقویۃ الایمان اور تحذیر الناس جیسی کتابوں نے " امکان کذب "اور" ظلّی نبوت " کے دروازے تو پہلے ہی کھول دیئے تھے،اب صرف انگریز سرکار کو تلاش تھی تو کسی ایسے فرد کی جو برطانوی عملداری کے تحفظات میں کشف والہام کا ڈھونگ رچاکے اور خفیہ رپورٹ میں بیان کئے گئے مقاصد کو بااحسن خوبی پورا کرے، چنانچہ اِس کام کیلئے انگریز کی نگاہ نے انتخاب مرزاغلام احمد قادیانی پر ٹھہری۔

مرزا کے بیٹے مرزا بشیر احمد کے بقول مرزاغلام احمد قادیانی نے 1880ء میں " ملہم من اللہ" ہونے کا اعلان کیا اور اپنے " مجدد" ہونے کا ناد پھونکا، 1888ء میں اعلان کیا کہ اللہ نے اُسے بیعت لینے کا حکم فرمایا ہے، اُس نے 1891ء میں اپنے " مسیح موعود" ہونے کی خبر دی اور " ظلّی نبوت " کا دعویٰ کیا، پھر 1901ء میں " نبوت " کا اعلان "کر دیا اور نومبر 1904ء میں خود ہی "کرشن

کے مقام پر فائز ہوگیا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کی زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مرزا ذہنی طور پر غیر متوازن ہونے کے باوجود ایک چالاک فریب کار اور عمداً مکار شخص تھا۔ مگر اپنے سیاسی مقاصد میں بالکل واضح موقف رکھتا تھا اور شروع سے آخر تک اُس کا سیاسی موقف ایک ہی رہا۔ مرزا کی تمام تحریروں کا بین السطور لب لباب تاج برطانیہ سے وفاداری، جہاد کی منسوخی و مذمت، اسلامی دنیا کو سامراجی تسلط کے تحت رکھنے کی خواہش اور ہندوستان میں سامراج کے استحکام کیلئے خدمات سرانجام دینا تھی۔ مرزا غلام احمد قادیانی کی گندی زندگی پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ مرزا کئی روحانی اور نفسیاتی عوارض کے ساتھ مختلف اقسام کی جسمانی بیماریوں کا بھی شکار تھا، جس میں خصوصاً اعصابی تناؤ، ذیابیطس، درد شقیقہ، قولنج، تپ دق، خفقان، مردانہ کمزوری اور شدید و مستقل پیچش میں بھی بتلا رہنا قابل ذکر ہے، خود اُس کی اپنی اور مرزائی پیروکاروں کی تحریروں میں اِن بیماریوں کا تذکرہ جابجا ملتا ہے۔

زیر نظر کتاب "مرزا قادیانی کا طبّی محاسبہ" دراصل مرزا قادیانی کی اِن ہی جسمانی بیماریوں کے تذکرے پر مبنی ہے، جسے مجاہد ختم نبوت جناب صادق علی زاہد (ننکانہ صاحب) نے ترتیب دیا ہے، محترم صادق علی زاہد اِس سے قبل "علماء حق اور ردِ فتنہ مرزائیت، تذکرہ مجاہدین ختم نبوت، عقیدہ ختم نبوت اور فتنہ مرزائیت، عقیدہ ختم نبوت اور ردِ فتنہ مرزائیت سوالاً جواباً اور عقیدہ

ختم نبوت اور فتنہ قادیانیت سوالاً جواباً" جیسی معرکۃ العراء کتابیں مرتب کر چکے ہیں اور تحفظ عقیدہ ختم نبوت اور ردِ فتنہ مرزائیت کے حوالے سے آج علمی و تحقیقی حلقوں میں اُن کا نام ایک مستند و معتبر حوالہ رکھتا ہے۔ ہمیں ذاتی طور پر جناب صادق علی زاہد صاحب سے خصوصی تعلق کا اعزاز حاصل ہے ،انھوں نے ہماری کتاب " تحریک تحفظ ختم نبوت سیدنا صدیق اکبر تا علامہ شاہ احمد نورانی" کے سلسلے میں نہ صرف ہم سے قلمی تعاون فرمایا بلکہ اپنے دولت خانے پر مہمان نوازی کا شرف بھی بخشا،آپ ایک مخلص و ملنسار دوست اور محبت کرنے والے ساتھی ہیں،ایک حادثے میں دائیں ہاتھ کی کلائی سے محروم ہونے کے باوجود اُن کے عزم و حوصلے بہت بلند اور قابل ستائش ہیں، عقیدہ ختم نبوت کا تحفظ اور منکرین ختم نبوت کی سرکوبی اُن کی زندگی کا مشن اور اِس مشن کی تکمیل انہیں ہمہ وقت متحرک و فعال رکھتی ہے۔

متذکرہ کتاب بھی اُن کے انہی عزائم کی آئینہ دار ہے،اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ ایک نئی،انوکھی اور منفرد کتاب ہے جس میں مرزا قادیانی کو لاحق 269 جسمانی بیماریوں کا تذکرہ بمعہ حوالاجات موجود ہے، مرزا کے جسمانی وجود پر ان بیماریوں کی موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ مرزا کاذب و ملعون تھا، کیونکہ اللہ کا سچا نبی حسن وجمال کا پیکر، نفاست و صفائی سے آراستہ اور قابل رشک جسمانی صحت واعضاء کا مالک ہوتا ہے، قانون فطرت تو یہ ہے کہ اُس کے جسم پر تو

مکھی تک نہیں بیٹھتی۔ لیکن یہ کیسا مدعی نبوت تھا جس کا جسم "نامردی، دماغی کمزوری، ضعف قلب، ذیابیطس، دردسر، تشنج، خارش، جزام، رعشہ، فالج، مراق، اعصابی کمزوری، مالیخولیا، دق، سل، کثرت دست اور کثرت بول وغیرہ" جیسی خبیث اور قابل شرم و نفرت بیماریوں کی آماجگاہ تھا، یقیناً یہ تازیانہ عبرت 269 اورعذاب الٰہی تھا جس نے ہر لمحہ مرزا کو کسی نہ کسی جان لیوا بیماری میں جکڑے رکھا، حتیٰکہ اُس کی موت بھی مرضِ ہیضہ کے سبب ہوئی۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ قادیانی لٹریچر سے اخذ کردہ مرزا قادیانی کی موذی بیماریاں اُس کے جھوٹے الہامات "ہم نے تیری صحت کا ٹھیکہ لیا ہے۔" یا "اُس نے مجھے براہین احمدیہ میں بشارت دی کہ ہر ایک خبیث عارضہ سے تجھ کو محفوظ رکھوں گا اور اپنی نعمت تجھ پر پوری کردونگا۔" کی بین دلیل اور مرزا کے پیروکاروں کیلئے دعوت غور و فکر ہے، جناب صادق علی زاہد نے بڑی عرق ریزی سے قادیانی لٹریچر کا مطالعہ کرکے 269 بیماریوں کی طویل فہرست جدید انداز تحقیق کے ساتھ ایک نئے اسلوب سے قارئین کے سامنے پیش کی ہے، جو اِس موضوع پر فاضل مولف کے وسیع تجربے، عمیق تجزیئے اور ماہرانہ قلمکاری کا عملی ثبوت ہے، محترم جبار مرزا درست فرماتے ہیں کہ "اگر ذوق و جنوں زندہ ہو تو کوئی کام مشکل نہیں ہوتا۔" فاضل مولف نے ننکانہ جیسے دور افتادہ علاقے میں رہتے ہوئے جس محنت شاقہ سے مطالعہ و تحقیق کا یہ مشکل مرحلہ طے کیا ہے، وہ یقیناً قابل

ستائش ہے۔ ہماری دعا ہے کہ ربّ کریم انہیں مزید کامیابیاں و کامرانی اور سعادتِ دارین
عطا فرمائے۔ آمین

محققِ لاہور، محمد عالم مختار حق مرحوم

لاہور ایک عالم و فاضل، ادیب شہیر اور ایک فردِ عظیم سے محروم ہو گیا
چھ مارچ 2014ء کو داتا کی نگری" لاہور" پیرزادہ اقبال احمد فاروقی صاحب کے بعد
اُن کے دیرینہ ساتھی اور ایک اور علم دوست شخصیت سے بھی محروم ہو گئی، یہ عالم بے
بدل، فاضل بے مثال اور کتاب دوست و کتاب شناس محمد عالم مختار حق صاحب تھے،
جنہیں حضرت پیر غلام دستگیر نامی نے" مختار حق" کا تاریخی نام دیا تھا، اُن کا آستانہ
فیض بند روڈ پر جھگیاں شہاب الدین میں واقع تھا، جو اب "شہاب ٹاؤن" کے نام
سے موسوم ہو چکا ہے۔ یہ قصبہ نما محلّہ جناب محمد عالم مختارِ حق کی باطنی روشنیوں سے
منور تھا، وہ اِس محلے کی جامع مسجد میں امامت فرماتے اور خطبہ جمعہ میں قرآن کریم
کے احکامات، نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور ائمہ کرام کے فیوضِ
روحانی سالکانِ راہِ حق تک پہنچاتے تھے،سب سے اہم بات یہ ہے کہ اللہ کریم نے تعلیم
کے ابتدائی درجوں میں ہی اُن کے دل میں کتاب کی محبت پیدا کر دی اور پھر کتابوں کی
جمع آوری، اُن کی حفاظت اور مطالعہ عشق کا درجہ اختیار کر گیا، جو اُن کی زندگی

کے آخری لمحات تک قائم رہا۔

محمد عالم مختار حق صاحب کو مطالعے اور کتابیں جمع کرنے کا شوق پروان چڑھنے کی وجہ کاغذ کا وہ ٹکڑا تھا، جو بچپن میں اسکول جاتے ہوئے تیز ہوا سے اڑتا ہوا آیا اور اُن کے سینے سے چمٹ گیا،آپ نے دیکھا تو وہ کسی اخبار کا ورق تھا، جس پر قرآنی آیات اور اُس کا ترجمہ جلی حروف میں چھپا ہوا تھا، س وقت آپ کی عمر زیادہ نہیں تھی، لیکن اتنی بات سمجھ میں آ گئی کہ یہ قرآنی آیات کی بے حرمتی ہے،چنانچہ آپ نے ورق کو اپنے ہاتھوں سے صاف کیا،بوسہ دیا، آنکھوں سے لگایا اور تہہ کرکے اپنے بستے میں رکھ لیا، مشیعت ایزدی میں بس قبولیت کا وہی لمحہ تھا جب ربّ کریم نے کم عمر محمد عالم مختار حق کے دل میں اوراقِ مقدسہ، لکھے اور چھپے ہوئے ہی نہیں، بلکہ دستیاب ہر مطبوعہ ورق کو محفوظ کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا۔

محمد عالم مختار حق جھگیاں شہاب الدین (جو بند روڈ سے چوک یتیم خانہ کی طرف آنے والی سڑک کے دائیں طرف آباد ہے) میں 4 مارچ 1931ء کو پیدا ہوئے، اُس زمانے میں فصیل سے گھرے ہوئے شہر لاہور کی یہ ایک دور افتادہ بستی شمار ہوتی تھی، جس کے چاروں طرف کھیت تھے، ابتدائی تعلیم اپنے والد گرامی سے حاصل کی لیکن پرائمری کا امتحان ایم سی اسکول ڈھوان دال سے، مڈل کا امتحان

اسلامیہ اسکول ملتان روڈ سے اور میٹرک اسلامیہ ہائی اسکول بھاٹی گیٹ لاہور سے 1949ء میں پاس کیا، اِس دوران دینی، علمی اور ادبی کتابوں کے مطالعے اور اپنی لائبریری بنانے کا شوق پیدا ہوچکا تھا، اِس شوق کے تحت ہی انہوں نے دارالعلوم السنہ شرقیہ سے فاضلِ فارسی کی سند حاصل کی۔ لیکن اِس سے قبل وہ محکمہ ڈاک میں ملازمت اختیار کرچکے تھے اور یہ فیصلہ بھی کرلیا تھا کہ کوئی کتاب مانگ کر نہیں بلکہ خرید کر پڑھیں گے۔ آپ سرکاری تنخواہ سے گھر چلاتے اور کتابیں خریدنے کے لیے کتابت شدہ مسودوں کی پروف ریڈنگ کرتے، جسے کتاب کی نظرثانی کا درجہ بھی حاصل تھا، یعنی پروف ریڈنگ کے دوران مصنف کی غلطیوں کی اصلاح بھی کردیتے تھے۔

جناب محمد عالم مختار جامع مسجد شہاب نگر کے پیش امام بھی تھے، عموماً دیکھا گیا ہے کہ لکھنے پڑھنے والے افراد دینی فرائض کے معاملے میں قدرے سست واقع ہوتے ہیں، لیکن محمد عالم مختار حق دینی فرائض پر بڑی سختی اور سنجیدگی سے عمل کرتے تھے، وہ محلے کی مسجد میں اعزازی طور پر امامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے، انہوں نے نصف صدی تک نہ اس مسجد کو چھوڑا اور نہ مسجد نے انہیں چھوڑا۔ خوبی قسمت دیکھئے کہ انہیں انتقال کے بعد بھی آخری آرام گاہ اُسی مسجد سے متصل ملی۔ محمد عالم مختار حق اُن خاصانِ خدا میں تھے جو دین میں اخلاق کی اہمیت کو سمجھتے اور زندگی کے ہر پہلو پر اخلاقی رویئے کو کبھی

ترک نہیں کرتے تھے، وہ نہ تو کبھی اپنی دین داری اور عبادات کا تذکرہ کرتے اور نہ ہی دوسروں کو بد عملی کی وجہ سے تحقیر کی نظر سے دیکھتے تھے، اُن کی شخصیت میں غرور نام کو بھی نہیں تھا،، وہ ایک روشن خیال دانشور تھے، جن کا مطالعہ ادب وسیع تھا۔ محمد عالم مختار حق صاحب کیلئے مسجد میں امامت، دینِ اسلام کی تبلیغ کا وسیلہ تھا، انہوں نے اپنے خاندان کی کفالت کیلئے ڈاک کے سرکاری محکمے میں ملازمت اختیار کی اور 6 جون 1992 ء کو ڈائریکٹر اکاؤنٹس کے دفتر سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنی پنشن پر گزر اوقات کرنے لگے۔

کتابوں کی خریداری کا سلسلہ زندگی کے آخری دور تک جاری رہا،اس وقت اُن کی لائبریری میں چودہ ہزار سے زائد قیمتی کتب موجود ہیں۔ دیگر رسائل اور انگریزی کتب اِس کے علاوہ ہیں، خطاطی کے نادر نمونے بھی انہوں نے سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں،اُن کے گھر کے تین کمرے ہر موضوع کی الگ الگ الماریوں سے بھرے پڑے ہیں۔ دور دور سے علم کے پیاسے آتے ہیں اور اُن کے نادر کتب خانے سے استفادہ کرتے ہیں۔ بلا مبالغہ آج تحقیقی کام کیلئے جو نادر و نایاب کتابیں اُن کے کتب خانے میں موجود ہیں وہ لاہور کی سرکاری لائبریری میں بھی دستیاب نہیں ہوں گی۔ محمد عالم مختار حق صاحب کی لائبریری میں موضوعاتی اعتبار سے قرآنیات کا ذخیرہ سب سے گراں قدر ہے، دو صد سے زائد قرآن کریم کے نسخے، تراجم اور تفاسیر موجود ہیں، ایک پوسٹر پر پورا قرآن مجید لکھا ہوا دیکھنے

کی سعادت آپ کو یہاں میسر آسکتی ہے۔ لائبریری میں موجود "الفی" قرآن کا ہر ورق الف سے شروع ہوتا ہے، یہاں ایک ایسا قرآن پاک بھی موجود ہے جس کا ایک پارہ صرف دو صفحات یعنی ایک ورق میں لکھا ہوا ہے۔ غالب اور علامہ اقبال پر لکھی ہوئی کتابیں اور اُن کے دیوان بھی اِس لائبریری میں موجود ہیں۔

اِس لائبریری میں ہندوستان سے ضیاء الدین ندوی، ایران سے علی بیات، مصر سے ڈاکٹر حازم محمد احمد، جاپان سے ٹیسٹویو کوچی، امریکہ سے مسٹر بیوکر اور علی گڑھ سے ڈاکٹر عطا خورشید تشریف لا چکے ہیں۔

جبکہ پاکستان کے جن ممتاز ادیبوں نے اِس لائبریری اور اُس کے منتظم کی سنہری لفظوں میں تحسین کی اُن میں جناب مشفق خواجہ، محمد طفیل (مدیر نقوش)، ڈاکٹر معین الدین عقیل، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر انور محمود خالد، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر وحید قریشی جنھوں نے محمد عالم مختار حق کو "محقق لاہور" کا خطاب بھی دیا تھا) جیسے بے شمار) لوگ شامل ہیں۔ درحقیقت محمد عالم صاحب نے اپنی ذاتی محنت اور کوشش سے اپنے گھر میں بڑا نادر اور بے مثل کتب خانہ بنایا ہے، یہ کتب خانہ کیا ہے گویا علم کی ایک ایسی سبیل ہے جس سے وہ گزشتہ نصف صدی سے تشنگانِ علم کو سیراب کرتے رہے۔ ویسے تو ذاتی کتب خانے تو اور بھی ہوں گے لیکن اِس کتب خانے کی خاص بات یہ ہے کہ اِس سے فیض اٹھانے

والوں کو کبھی محمد عالم مختار حق صاحب نے انکار نہیں کیا، بلکہ اُن کی فیاضی اور علم دوستی کی یہ نادر مثال ہے کہ وہ خود اِس کتب خانے کی نادر کتابیں، رسائل، نوادر خطاطی و دیگر چیزیں یہاں آنے والوں کو بخوشی دکھاتے بھی تھے اور اگر ضرورت ہو تو اُس کے عکس بھی فراہم کرتے تھے۔

ہم خود اِس بات کے شاہد ہیں کہ جب ہم نے پیرزادہ اقبال احمد فاروقی صاحب کی وساطت سے اپنی کتاب "تحریک تحفظ ختم نبوت سیدنا صدیق اکبر تا علامہ شاہ احمد نورانی" کے سلسلے میں محمد عالم مختار حق صاحب سے رابطہ کیا تو حضرت نہ صرف ہم سے عملی تعاون فرمایا بلکہ مزید کوشش و جستجو کیلئے "کھوکر لائبریری" کا راستہ بتایا، اِس حوالے سے ہمارے نام حضرت کا ایک خط آج بھی ہمارے پاس محفوظ ہے۔ لوگ جب اُن سے پوچھتے کہ آپ کے بعد اِس کتب خانے کا کیا ہوگا۔؟ تو فرماتے کہ آخر لوگ انتقال کرکے دنیا سے جاتے ہی رہتے ہیں، لیکن اُن کی زندگی میں کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ آپ کے بعد آپ کے بنگلے کا کیا ہوگا، کوٹھی کا کیا ہوگا، کار اور دیگر چیزوں کا کیا ہوگا۔؟ یہ بات کتابوں کے بارے میں ہی کیوں پوچھی جاتی ہے۔؟ محمد عالم مختار حق صاحب کا کتابوں سے محبت کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ سید منور علی شاہ صاحب (امریکہ) سے فرمایا" شاہ "صاحب اگر ممکن ہوتا تو یہ کتابیں میں اپنے ساتھ قبر میں لے جاتا۔

کہتے ہیں مولانا غلام رسول مہر جب زندہ تھے تو محمد عالم مختار حق کو روزانہ ایک خط لکھتے تھے، اُن کے خطوط کے دو مجموعے محمد عالم مختار حق نے اپنے گراں قیمت حواشی سے چھاپے۔ "مشفق نامے" کے عنوان سے مشفق خواجہ کے خطوط کا سب سے پہلا مجموعہ بھی محمد عالم مختار حق نے ہی شائع کیا تھا، اب تک اُن کی 26 تالیفات منظر عام پر آ چکی ہیں۔جب محمد طفیل مدیر "نقوش" نے "رسول نمبر" چھاپنے کا منصوبہ بنایا تو آپ کے مشوروں سے خوب استفادہ کیا اور جب "نقوش کا رسول نمبر" چھپا تو اُس دور کے صدرِ پاکستان جنرل ضیاءالحق نے مختار حق صاحب کی اِس نمبر کی ترتیب و تدوین اور الفاظ خوانی کی خدمات کے اعتراف میں سعادت حج پر روانہ کیا۔ جبکہ محمد عالم مختار حق کی خطاطی پر حکومت پنجاب نے انہیں 2008ء میں گولڈ میڈل بھی دیا تھا۔

محمد عالم مختار حق صاحب کا دورِ آخر کا اہم کارنامہ عالم اسلام کے نامور محقق اور عالم ڈاکٹر محمد حمیداللہ مرحوم کی منتشر تحریروں کی "نگارشات ڈاکٹر محمد حمیداللہ" کے عنوان سے تین جلدوں میں ترتیب و تدوین ہے، وہ ہمیشہ ڈاکٹر محمد حمیداللہ مرحوم کی تحریروں کے حصول کیلئے کوشاں رہتے تھے اور اُن کی دیرینہ خواہش تھی کہ اِس سلسلے کی چوتھی جلد بھی ترتیب پا جائے۔ اُن کے علمی اور تحقیقی کارناموں کی تفصیل قدرے طویل ہے، البتہ اُن کی

مطبوعہ کتب کی مختصر فہرست میں "خطوطِ مہر، اقبالیاتِ مہر، گنجینہ مہر (2 جلدیں)، مشفق من خواجہ من، مشفق نامے، فکرِ فاروقی، مکتوبات ڈاکٹر مختار الدین احمد بنام پیرزادہ اقبال احمد فاروقی، نگارشاتِ ڈاکٹر محمد حمیداللہ (3 جلدیں) شامل ہیں۔

قارئین محترم ! جناب محمد عالم مختار حق کی علمی، ادبی اور دینی خدمات کا یہ ایک مختصر اجمالی جائزہ ہے، وہ 83 برس کی عمر میں بھی دین حق کی خدمت میں مصروف تھے اور ادبی کام پوری لگن سے مصروف تھے کہ 6 مارچ کی شب باتیں کرتے کرتے سو گئے، نصف شب چھاتی میں گھٹن محسوس ہوئی اور ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی محمد عالم مختار حق خالقِ حقیقی سے جا ملے ۔ یوں لاہور ایک عالم و فاضل، ادیب شہیر اور ایک فردِ عظیم سے محروم ہو گیا تھا۔ آج محمد عالم مختار حق صاحب اِس دنیا میں نہیں، مگر امید ہے کہ اُن کے لائق فرزند اور بڑے صاحبزادے محبوب عالم صاحب جو گزشتہ چالیس برسوں سے اُن کے مشیر و معاونِ علمی بھی رہے ہیں، اپنے والد محترم کی دیرینہ خواہش کی تکمیل کا سامان کریں گے۔

جائے ولادت کی مسماری کا شرمناک منصوبہ۔۔۔

قومیں اپنے اسلاف اور اکابرین سے وابستہ نشانیوں کی حفاظت کرتی ہیں اوران تاریخی نوادرات اور ورثوں کو حوادث زمانہ سے محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کرتی ہیں،آج دنیا میں بے شمارتاریخی عمارات،نوادرات و کھنڈرات اور انبیاء و صلحاء سے منسوب مقابر جو مصر، عراق، فلسطین، شام اوراردن وغیرہ میں زیارت گاہ عام بنے ہوئے ہیں،اِس کی عملی مثال ہیں،مگر افسوس کہ سرزمین نجد وحجاز پر قبضے کے بعد سعودی حکومت نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم،امہات المومنین اور صحابہ کرام سے منسوب اُن تمام تاریخی مقابر اور عمارات کے نام ونشان تک مٹادیئے،جن سے مسلمانوں کو اپنے قلب میں ایمان کی ڈھرکنیں سنائی دیتی تھیں،جبکہ اِن تاریخی مقامات کی حفاظت اور نئے سرے سے تزئین وآرائش کرکے محفوظ بنانے کیلئے سلطنت عثمانیہ نے بڑی محنت کی تھی۔تاریخ بتاتی ہے کہ ترکوں نے اپنے دور حکومت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے وابستہ ہر جسمانی،روحانی،تاریخی اور جمالیاتی کیفیت کو آئندہ نسلوں تک پہنچانے کی بھرپور کوشش کی،حالانکہ یہ کام غیر شعوری طور پر عہد نبوی سے جاری تھا،مگر ترکوں نے اِس کام کو شعوری رنگ دے کر عملی شکل دی،انہوں نے یہ کام جنون کی حدتک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور انسانی حواس کی حدود تک

نفاست اور قلبی و ایمانی سچائی سے انجام دیا۔
اُن کو علم تھا کہ جس خطہ زمین پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نزول ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا قدم پڑا، جس کی آب و ہوا کا پہلا سانس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر جذب ہوا، جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لہجے کا گداز پہلی بار برداشت کیا اور سمجھا کہ یہ قدآور گوشے، خوشبو سے معطر لمحے اور کفر کو لرزہ براندام کرنے والی صدا کے نقش اوّل محض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے نہیں بلکہ رہتی دنیا تک ہر کلمہ گو مسلمان کیلئے ازلی اور آبائی نشان ہیں، ترکوں کو اِس بات کا مکمل ادراک تھا، سو انہوں نے اِس کام کا آغاز مدینہ منورہ میں اُس میدان کے تعین سے کیا، جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد محترم حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ حالات بخار میں اپنے گھر سے دور اپنی اہلیہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کو حالت حمل میں بے سہارا چھوڑ کر ملک عدم کا سفر اختیار کیا تھا۔ ترکوں نے ایک پہاڑ کی کوکھ میں اُس چھوٹے سے گھر اور اُس میں واقع اُس شمالی کمرے کا بھی تعین کیا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنم لیا، انہوں نے اُس پگڈنڈی کو بھی متعین کیا، جو بیت اللہ کی جانب جاتی تھی، جس پر چل کر آپ کے دادا حضرت عبدالمطلب نے نوزائیدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھا کر یہ دعا کی تھی کہ "اے خالق کائنات اِس بچے پر رحم فرما، اِس واسطے کہ یہ بے

آسرا اور یتیم ہے۔" ترکوں نے اِس شالی کمرے، پگڈنڈی اور اِس دعا کے مقام کا بھی تعین کرکے نشان چھوڑا۔ ترکوں نے اُس مقام کا بھی تعین کرکے محفوظ کیا، جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ سال کی عمر میں اپنی والدہ ماجدہ کے ہمراہ اپنے والد ماجد کی قبر مبارک سے واپسی پر ایک رات قیام فرمایا اور جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم والدہ ماجدہ کے سائے سے ہمیشہ کیلئے محروم ہوئے، ترکوں نے اُس راستے کا بھی تعین کیا جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی والدہ کے وصال کے تین سال بعد اپنے دادا کے جسد خاکی کے ہمراہ رنجیدہ حالت میں سفر فرمایا تھا۔

غرض کہ ترکوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے ولادت سے لے کر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے گھر، بنوارقم کی بیٹھک، ورقہ بن نوفل کی دہلیز، حضرت اُم ہانی کے آنگن اور مکہ ومدینہ میں واقع اُس قبرستان جس میں خانوادہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بیشتر افراد اور صحابہ کرام مدفن تھے، سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے گھر، مسجد قبا، مسجد نبوی اور بنو نجار کی کچی بستی سے لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال ظاہری تک تمام منسوب مقامات مقدسہ کو آنے والی نسلوں کیلئے محفوظ بنانے کا فریضہ بہ احسن وخوبی انجام دیا۔ اِس تمام کاروائی میں ترکوں کا طریقہ بہت ہی موثر اور جداگانہ تھا، جس کی ایک مثال خانہ کعبہ کے سامنے پہاڑ پر واقع اُس چھوٹی سی مسجد بلال کی ہے، جو زمانہ کی

غفلت کی وجہ سے مٹی اور پتھر کا ڈھیر بن چکی تھی،اِس چھوٹی سی مسجد کو اُس کے اصلی خطوط پر دوبارہ تعمیر کرنے کیلئے ترکوں نے پہلے تمام مٹی، چونے اور اصلی پتھروں کو الگ کیا،اُس کے بعد مٹی اور چونے کو باریک چھلنیوں سے چھانا،بچے ہوئے چونے کا کیمیائی تجزیہ کرکے اُس کے اجزاء معلوم کیے،پھر اِن اجزاء کے اصلی ماخذ دریافت کرکے نئے اور پرانے چونے کو چنائی کیلئے استعمال کیا،اسی طرح پتھروں کو بھی اُس کی تراش،خراش اور ساخت کے مطابق اُسی جگہ نصب کیا گیا جیسا پہلی مرتبہ عہد نبوی میں تھا،اِس طرح وہی مٹی، وہی گارا، وہی چونا اور وہی پتھر بالکل اُسی طرح استعمال ہوا جیسا کہ مسجد کی تعمیر اوّل کے وقت تھا،یوں مسجد نئی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی اصلی خدوخال اور اوّل خطوط پر قائم ہوگئی۔

اِس کام کیلئے ترکوں نے پورے عالم اسلام سے عمارت سازی کے سینکڑوں ماہرین جو اعلیٰ معمار،بہترین نقشہ نویس، منفرد سنگ تراش،ماہر خطاط، تجربہ کار کیمیا گر،انوکھے شیشہ گر اور یگانہ روزگار رنگ سازوں کو جمع کیا،یہ لوگ صرف دو باتوں یعنی ایک تعمیر کے لمحہ اوّل سے لے کر تکمیل تک باوضو رہنے اور دوسرے اِس دوران ہر لمحہ تلاوت قرآن کرتے رہیں گے،کے پابند تھے، سلطنت عثمانیہ کی زیر نگرانی اِن ماہرین فن نے کئی عشروں کی محنت کے بعد یہ کام مکمل کیا،درحقیقت مقامات مقدسہ کی تزئین وآرائش اور انہیں محفوظ بنانے کیلئے

ترکوں کی یہ کوشش عالم اسلام پر سب سے بڑا احسان تھی۔مگر1918ء میں پہلی جنگ عظیم ہیں انگریز، فرانسیسی اور اطالوی طاقتوں کے ہاتھوں ترک جرمن اتحاد کی شکست نے جرمنی کے دو ٹکڑے کرنے کے ساتھ ساتھ سلطنت عثمانیہ کی وسیع و عریض حدود کو بھی بکھیر کر رکھدیا اور1921ء میں نجد کے قبیلہ سعود نے فاتح طاقتوں کی ایماء پر نجد میں اپنی عملداری کا اعلان کر دیا، یہ عملداری 1926ء تک مکہ،مدینہ اور جدے پر قبضے کے بعد نجد وحجاز کی بادشاہت میں تبدیل ہو گئی۔

حجاز پر قبضے کے بعد سعودیوں نے حسب سابق سب سے پہلا کام یہ کیا کہ خانہ کعبہ، مسجد نبوی اور جہاں جہاں جس جس عمارت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کندہ نظر آیا، اُس کو نہایت بھونڈے طریقے سے مٹادیا، کہیں خطاطی اور فنون لطیفہ کے اِن نادر نمونوں پر تار کول اور پلستر تھوپ کر چھپادیا گیا،یا پھر چھینی اور ہتھوڑے کا استعمال کرکے اکھیڑنے کی جسارت کی گئی،اس شرمناک گستاخی کے نشانات آج بھی حجاز کے طول وعرض اور خاص کر خانہ کعبہ کی پرانی مسجد اور مسجد نبوی کے درودیوار پر نظر آتے ہیں، سعودیوں نے صرف اِسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہر تاریخی، روحانی اور معاشرتی علامت کو اپنے خود ساختہ عقیدہ توحید کا ہدف بنایا۔جنت الاولی اور جنت البقیع کے تاریخی قبرستانوں جن میں حضرت عبدالمطلب،ابوطالب، ورقہ بن نوفل، حضرت خدیجہ ، خاتون جنت، حضرت

عباس، حضرت حلیمہ سعدیہ، کئی امہات المومنین، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے اور صاحبزادیاں اور خانوادہ رسول کے دیگر اصحاب آرام فرما تھے، پر بلڈوزر چلاکر چٹیل میدان میں تبدیل کر دیا، جنت البقیع کے سامنے قائم شہداء کے مزارات سڑک کی نذر کر دیئے، خاتون جنت سے منسوب مسجد فاطمہ مسمار کر دی گئی، یوں نہ ابوطالب کا محلّہ رہا، نہ ورقہ بن نوفل کی دہلیز، نہ اُم ہانی کا آنگن رہا اور نہ ہی بنوارقم کی بیٹھک۔ آج ابوطالب کے محلے پر جدید عمارت کھڑی ہے، ورقہ بن نوفل کا مکان کپڑے کے بازار کی لپیٹ میں آچکا ہے، دارلارقم موٹر گاڑیوں کا اڈا بنا ہوا ہے، اُم ہانی کا گھر توسیع حرم کی نذر ہوچکا ہے، ہجرت کے راستے کا نام ونشان مٹ چکا ہے، مسجد قبا کا قدیم کنواں پتھر کی سل سے بند کیا جاچکا ہے، مسجد فاطمہ آل سعود سے منسوب پارک میں تبدیل ہوچکی ہے اور آپصلی اللہ علیہ وسلم کی جائے ولادت کے آثار پر ایک لائبریری قائم ہوچکی ہے، جس کے حوالے سے سعودی حکام کہتے ہیں کہ یہ جگہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے ولادت نہیں ہے، اسی وجہ سے انھوں نے دو سال قبل اِس لائبریری کو عوام الناس کیلئے بند کردیا اور وہاں ایسے بورڈ آویزاں کر دیئے ہیں جن پر زائرین کو وہاں جانے سے منع کیا جاتا ہے۔

آج یہ جائے ولادت بھی جس پر لائبریری قائم ہے مکہ میں تعمیراتی منصوبوں کے باعث تباہی کے خطرے سے دوچار ہے، ایک برطانوی اخبار انڈیپینڈنٹ نے اپنی

حالیہ اشاعت میں خبر دی ہے کہ مکہ میں تعمیر نو کے نئے منصوبوں کے تحت ممکن ہے کہ
پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے ولادت پر نئی عمارتیں بنادی جائیں، تعمیراتی
منصوبے کی انچارج سعودی کمپنی بن لادن گروپ نے بھی حکومت کو یہی تجویز دی ہے
کہ اونچی بنیاد پر قائم لائبریری اور اُس کے نیچے واقع عمارت کو مسمار کرکے امامِ کعبہ کی
رہائش گاہ اور ساتھ واقع شاہی محل کیلئے راستہ نکالا جائے۔اسی طرح ایک سعودی ماہر
آثار قدیمہ ڈاکٹر عرفان العلاوی نے انکشاف کیا ہے کہ سعودی حکومت مسجد الحرام کے
ساتھ واقع اِس مقام مولد پر قائم لائبریری کو بھی ختم کرنا چاہتی ہے، وہ سعودی حکومت
کے اِس موقف کہ " یہ جگہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے ولادت نہیں ہے"
کی نفی کرتے ہوئے دعویٰ کرتے ہیں کہ صدیوں پرانے نقشے اور دستاویزات اِس بات
کی تصدیق کرتے ہیں کہ یہی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے پیدائش ہے۔
قارئین محترم ! ہر صاحب ایمان کے نزدیک پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات
مبارکہ سے نسبت اور حوالہ محبت واحترام کا درجہ رکھتا ہے اور تقاضہ کرتا ہے اِس مقام
مولد کی پوری پوری حفاظت کی جائے اور اُسے قائم رکھا جائے، مگر افسوس کہ گیارھویں
صدی کی آغوش میں پرورش پانے والی نجدیت جب بارھویں صدی میں قدم رکھتی ہے
تو ایک ایسے عقیدے کو جنم دیتی ہے جس میں

فتنہ وفساد اور فسق وفجور کے علاوہ اور کچھ نہیں،انھوں نے مسلمانوں کے ادب واحترام اور عقیدت و محبت کو ختم کرنے اور مٹانے کیلئے کفر و شرک کے فتووں کا سہارا لیا،چنانچہ کسی کو کعبہ یا جالی مبارک کا بوسہ دیتے دیکھا تو مشرک ہونے کا فتویٰ داغ دیا ،انبیاء علیہ السلام اور اولیائے و صالحین کے مقابر کو تعمیروآباد اور پر ہجوم دیکھا تو شرک قرار دے دیا یا انہیں زمین بوس کردیا،آل سعود کے ہاتھوں نجد و حجاز میں اسلامی ورثہ اور شعائر اللہ کی پامالی اور انہدام سے شروع ہونے والا سلسلہ آج دنیا کے بہت سے اسلامی ممالک تک پھیل چکا ہے،آج پاکستان میں بھی مزارات اولیاء اور بزرگان دین کے مقابر پر ہونے والے بم دھماکے اسی تکفیری فکر کا شاخسانہ ہیں اور تکفیری دہشت گردی نے مساجد و امام بارگاہوں کے ساتھ ساتھ کوچہ و بازار کو بھی اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے،یہ لوگ طاقت کے زور پر اپنا نجدی فکر وفلسفہ منوانا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دنیا سے یہ مراکز محبت وعقیدت ختم کرکے مسلمانوں کے دلوں سے ادب واحترام اور محبت نکال دیا جائے ،یہی وجہ ہے کہ مقامات مقدسہ،مزارات اولیاء اور قدیم مساجد و مقامات جیسے اسلامی ورثوں کے انہدام کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

جبکہ دوسری جانب سعودی حکومت اپنے آباؤ اجداداور بادشاہوں کے آثار کو محفوظ بنانے کیلئے کروڑوں ریال خرچ کررہی ہے،یہ کتنی عجیب بات ہے کہ آل سعود کے

آباؤاجداد اور مطلق العنان حکمرانوں کی آثار کو محفوظ بنانے کیلئے کروڑوں ریال کا خرچ کرنا جائز اور عین اسلام قرار پاتا ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اہلِ بیت رسول، صحابہ کرام اور اسلام کی محترم شخصیات سے نسبت و حوالہ رکھنے والے متبرک و مقدس مقامات کی حفاظت کفر و شرک کے دائرے میں لی جاتی ہے، اَمر واقعہ یہ ہے کہ جائے ولادت کی مسماری کا مجوزہ منصوبہ ایک شریعت سوز کاروائی ہونے کے ساتھ، عالم اسلام کی غیرت و حمیت پر حملہ اور اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کھلی دشمنی کا مظہر ہے، چنانچہ اِس دل ہلا دینے والے انکشاف سے پورے عالم اسلام میں بے چینی اور اضطراب کی لہرے دوڑ گئی ہے اور یہ خبر ہر باضمیر عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بجلی بن کر گری کہ آل سعود جس کے ہاتھ پہلے ہی خانوادہ نبوت، امہات المومنین اور صحابہ کبار کے مزارات کے انہدام سے آلودہ ہیں، مکہ مکرمہ میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے ولادت کو مسمار کرنے کا ارادہ رکھتی ہے، جو اہل محبت کیلئے نہایت دردناک اور قابل تشویش بات ہے۔

اِس لیے دنیا بھر کے خوش عقیدہ اور باضمیر مسلمانوں کا فرض منصبی بنتا ہے کہ وہ استعماری ایجنٹ اور حجاز مقدس کو اپنی ذاتی جاگیر سمجھنے والے نفس کے غلام اُن حکمرانوں اسلام کی نشانیوں کو ویران و تاراج کرکے اپنے محلات میں سونے چاندی کے ظروف و فانوس سے تزئین و آرائش کرتے ہیں) کے خلاف آواز بلند

کرکے اِس اسلامی ورثہ کی حفاظت کیلئے اپنا دینی فریضہ ادا کریں، ہم اُن تمام این جی اوز اور سماجی تنظیموں جو افغانستان میں چند بتوں کی مسماری پر سراپا احتجاج تھیں ، سے بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ مولود رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی متوقع انہدام کے خلاف لب کشائی کرتے ہوئے میدان عمل میں آئیں، ساتھ ہی ہمارا تمام مسلم ممالک کی حکومتوں سے بھی مطالبہ ہے کہ وہ اُمت مسلمہ کا احتجاج سعودی ایوانوں تک پہنچائے اور تمام مقامات مقدسہ بالخصوص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے ولادت کے تحفظ اوراُس عزت وحرمت کو یقینی بنانے کیلئے سعودی حکومت پر بھرپور دباؤڈالیں، تاکہ وہ اسلام کا مقدس نام لے کر مزید شعائر اسلامی کے انہدام سے اجتناب کرے۔

اَے حرم قرطبہ ! ہم تجھ سے شرمندہ ہیں....!

میری آواز

اَے حرم قرطبہ ! ہم تجھ سے شرمندہ ہیں....!

مسلم تاریخی ورثہ جامع مسجد قرطبہ کے خلاف مبینہ سازش.....!

اُندلس (اسپین) میں اسلامی سلطنت کا دور صدیوں پر محیط ہے، جس وقت دنیا جہالت کے اندھیروں میں غرق تھی، یورپ کیچڑ اور گندگی کا ڈھیر اور علم وحکمت سے بے بہرہ تھا، اُس وقت اسلامی اُندلیس میں فقہ و حدیث، طب و جراحت، ریاضی و کیمیا اور آج کی جدید سائنسی علوم وفنون کی بنیاد ڈالی جاچکی تھی، وہاں علم وحکمت اور صنعت وحرفت کے نئے باب کھل رہے تھے، اُندلس کے سینکڑوں کتب خانے لاکھوں علمی وتحقیقی کتابوں سے مزین تھے، اُس زمانے میں اندلیسی مسلمان دنیا کی سب سے زیادہ تعلیم اور ترقی یافتہ قوم شمار ہوتے تھے اور یہ خطہ دنیا کا سب سے زیادہ زرخیز خطہ مانا جاتا تھا، جہاں سے دنیا جہاں کے تشنگانِ علم اپنی پیاس بجھاتے تھے، اسلامی اُندلیس علم وفن، تہذیب وتمدن، سیاست ومعاشرت اور اخلاق وشائستگی کا ایک ایسا گہوارہ تھا جس نے انسانی تاریخ پر اپنے اَنمٹ نقوش ثبت کیے، اُس دور میں اُندلس مختلف تہذیبوں اور

قوموں کا سنگم تھا، جہاں باشندوں کو مذہبی، معاشرتی، ثقافتی اور فکری آزادی حاصل تھی۔

اُندلس کی اسلامی حکومت نے آٹھ سو سال میں کئی عروج زوال دیکھے، مگر1236ء میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب اندلسی مسلمان ” شمشیر وسناں کو ترک کرکے طاؤس و رباب“ میں گم ہوگئے اور اُن کی باہمی نااتفاقی وچپقلش ،مذہبی منافرت اور لسانی و قومی تعصب کا فائدہ اٹھاکر فرڈنیارڈ نے اُندلس میں اسلامی اقتدار کا خاتمہ کردیا، وہ اُندلس جسے مسلم سپہ سالار طارق بن زیاد کی قیادت میں اسلامی لشکر نے فتح کیا تھا، جہاں آٹھ سو سال مسلمانوں نے حکومت کرکے اُسے بے پناہ ترقی دی اور علم وحکمت ، تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کا ایسا مرکز بنایا، جس کی کرنوں نے یورپ سمیت موجودہ دنیا کے تمام خطوں کو منور کیا، وہاں سے اسلامی تہذیب وتمدن کے آثار اور مسلمانوں کے وجود کو ایسے مٹادیا گیا جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔ حسن ودلکشی، علم وادب، مروت وروداری کے وصف سے آراستہ اُندلس پر جب اخلاق باختہ ،اُجڈ، تہذیب ناآشنا، کم ظرف اور تنگ نظر متعصب صلیبیوں نے قبضہ کیا تو بے شمار مسلمانوں کا خون بہایا گیا، بچوں کا غلام بنایا گیا، مسلمان خواتین اور بچیوں کی حرمتیں، عزتیں اور عصمتیں پامال ہوئیں، لائبریریوں کو نیست ونابود اور لاکھوں کتابوں کو جلا کر خاکستر کیا گیا، مساجد اور خانقاہیں کلیساؤں میں تبدیل کردی

گئیں، جبکہ لاکھوں مسلمانوں کو ہجرت پر مجبور کر دیا گیا، جو بچ رہے انہیں جبراً عیسائیت اختیار کرنے، خنزیر کا گوشت کھانے اور گلے میں صلیب لٹکانے پر مجبور کر دیا گیا، یہ طرز عمل مغربی تہذیب کے ظلم و استبداد، متعصب رویئے، عدم برداشت پر مبنی انتہا پسندانہ طرز فکر اور اسلام دشمن فکر کا عکاس اور اُندلس کی مسلم تاریخ کا سب المناک اور خونچکاں پہلو ہے۔

قارئین محترم! اُندلس کی تاریخ کا مطالعہ جہاں ہمارے اسلاف کے قابل فخر ماضی کے عروج کا اظہار ہے، وہیں یہ ہمارے حال کی بدحالی کا نوحہ اور مستقبل میں بے مستقبل ہونے کا سامان عبرت بھی ہے،آج اُندلس میں اسلامی فن تعمیر کے چند ہی نادر شاہکار بچے ہیں، جنھیں دیکھ کر اغیار بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ جو قوم آج بدحالی بے یقینی اور جمود و خزاں کا شکار ہو کر بکھرے ہوئے ریوڑ کی مانند ہے،اُس کا ماضی کتنا، روشن اور شاندار تھا،''قرطبہ کی جامعہ مسجد'' لے کر غرناطہ میں آخری اسلامی حصار'' الحمراء'' کے محلات تک آج اسپین جانے والے انہیں دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ یہ کیسی قوم تھی'' جہاں سے بھی گزری اپنی تہذیب و تمدن کے اَنمٹ نقوش چھوڑ گئی۔''تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ وہی جامع مسجد ہے جس کی تعمیر عبد الرحمان اوّل الداخل نے آٹھویں صدی کے اواخر میں میں شروع کی، یہ مسجد وادی الکبیر میں دریا کے پل پر اُس جگہ تعمیر کی گئی جہاں سینٹ

ونسنٹ کا گرجا موجود تھا، جس کا کچھ حصہ مسلمان پہلے ہی بطور مسجد استعمال کر رہے تھے، چنانچہ عبدالرحمان اوّل الداخل نے بہت بھاری قیمت ادا کرکے باقی گرجا بھی عیسائیوں سے خرید لیا اور 754ء میں مسجد کی تعمیر کا کام شروع ہوا، یہ شاندار مسجد صرف دو سال کی قلیل مدت میں تیار ہوئی اور اِس کی تعمیر پر 80 ہزار دینار خرچ ہوئے ، یہ مسجد دنیا میں ''مسجد قرطبہ'' کے نام سے مشہور ہوئی ، یوں عبدالرحمٰن اوّل الداخل نے اُندلیس میں اسلامی فن تعمیر کے نادر شاہکار جامع مسجد قرطبہ کی بنیاد رکھی، جس کی چوڑائی ایک سو پچاس اور لمبائی دو سو بیس میٹر کے قریب تھی،اِس مسجد میں چودہ سو سے زائد ستون تھے، مسجد اتنی بڑی تھی کہ اگر کوئی دور سے دیکھتا تو اُس کی آخری حد نظر نہیں آتی تھی، مسجد کی صفائی ستھرائی کیلئے تین سو خادم مامور تھے،آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ اُس زمانے کے تعمیراتی ماہرین نے مٹی کے بنے پائپوں کے ذریعۂ مسجد تک پانی پہنچانے کیلئے باقاعدہ پائپ لائین بچھائی تھی، یہ پانی مسجد کے اطراف میں پہاڑی چشموں سے نکلتا تھا، مسجد کے صحن میں بہت ہی خوبصورت فوارے نصب تھے۔

جامع مسجد قرطبہ کی دیواریں اِس قدر بلند تھیں کہ دور سے شہر کی فصیل کا گماں ہوتا تھا، مسجد کی چھت تیں فٹ کی بلندی پر تعمیر کی گئی تھی، جس سے ہوا اور روشنی کا بہتر نکاس ممکن ہوا، چھت کو سہارا دینے کیلئے کئی ستون تعمیر

کئے گئے، اِن ستونوں کی کثرت سے مسجد میں خود بخود راستے بن گئے، ہر ستون پر دوہری نعلی محرابیں نصب کی گئیں جو بعد میں اُندلس کے فنِ تعمیر کا حصہ قرار پائی، ہر دوسری محراب کو پہلی محراب کے اوپر ایسے نصب کیا گیا کہ وہ چھت سے جا ملی، چھت میں دو سو اسی ستارے نصب کئے گئے، وہ ستارے جو اندرونی دالان میں نصب تھے، خالص چاندی کے بنے ہوئے تھے، مسجد کے مرکزی ہال میں ایک بہت بڑا فانوس نصب کیا گیا، جس میں بیک وقت ایک ہزار چراغ روشن ہوتے تھے، مسجد میں روشنی کیلئے استعمال ہونے والے چراغوں کی درست تعداد تو نہیں ملتی مگر ایک روایت بتاتی ہے کہ اِن کی تعداد ساڑھے سات ہزار سے زائد تھی، مسجد میں روشنی کا انتظام اِس قدر بہتر تھا کہ رات کے وقت بھی دن کا گماں ہوتا تھا۔

مسجد قرطبہ میں نصب ستون زیادہ تر اشبیلیہ، اربونہ اور قرطاجنہ سے منگوائے گئے تھے لیکن تعداد کم ہونے کی وجہ سے امیر عبد الرحمان اوّل الداخل نے بعد میں اندلسی سنگِ مرمر ترشوا کر ایسے ستون تیار کروائے، جنھیں سونے اور جواہرات سے مزین کیا گیا،اِن ستونوں نے مسجد کی تزئین و آرائش میں مزید اضافہ کر دیا، یہ سارا کام نہایت نفاست اور ماہرانہ فنکاری کے ساتھ انجام دیا گیا، ابتداء میں مسجد میں نو دروازے نصب کئے گئے ،بعد میں اِن کی تعداد اکیس تک جا پہنچی،اِن میں سے تین دروازے شمال اور نو نو دروازے مشرق اور

مغرب کی جانب تھے، مشرق اور مغرب کی جانب نصب دروازوں میں ایک ،ایک دروازہ صرف خواتین کیلئے مخصوص تھا، مسجد کے تمام درودیوار اور فرش کو خوبصورت پتھروں سے مزین کیا گیا تھا، جبکہ چھت نقش ونگار اور مختلف چوبی پٹیوں سے آراستہ تھی، خاص دالان کے دروازہ پر سونے کا کام کیا گیا،اسی طرح مسجد قرطبہ کی محراب جس سنگ مرمر سے تیار کی گئی وہ دودھ سے زیادہ سفید اور چمکیلا تھا، صناعوں نے اِسے ہفت پہلو کمرے کی شکل دے دی تھی ،جس کے اندر کی جانب سنگ تراشی کے ذریعےَ خوبصورت گل کاری کا کام کیا گیا،اُس کے سامنے کی طرف قوس کی شکل میں جو آرچ بنائی گئی تھی اُسے دونوں طرف سے دو ستونوں نے سہارا دے رکھا ہے،اِس محراب پر خوبصورت اور رنگین نقش ونگار بنائے گئے، جس کے گرد کوفی رسم الخط میں قرآنی آیات لکھی گئیں، مسجد کا منبر خوشبو دار قیمتی لکڑی کے 36 ہزار ٹکڑوں سے بنایا گیا تھا، جنھیں جوڑنے کیلئے سونے اور چاندی کے کیلیں استعمال ہوئیں ، جبکہ مسجد کی دیواروں اور چھت پر خوبصورت خطاطی سے مزین قرآن مجید کی آیات مبارکہ کندہ کی گئیں۔

اِس مسجد کی تعمیر آٹھویں صدی عیسوی میں شروع ہوئی اور آٹھ صدیوں تک ہر آنے والے مسلم حکمران نے مسجد کی تزئین و آرائش میں اپنا حصہ ڈالا تھا، غرضیکہ مسجد ایک خوبصورت شاہکار تھی، اِس کی خوبصورتی کا اندازہ اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہاں عیسائیوں کی اکثریت کے باوجود کبھی کلیسا بنانے کی حمایت

نہیں کی گئی، عیسائی خود کہتے تھے کہ اگر یہاں کلیسا بنایا گیا تو مسجد کا حسن خراب ہو جائے گا، لیکن بعد میں آرچ بشپ نے اِس فیصلے کی مخالفت کرتے ہوئے مسجد کے وسط میں کلیسا کی تعمیر کا حکم دیا، تعمیر مکمل ہونے کے بعد اُس نے جب مسجد کو دیکھا تو تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا" اگر مجھے معلوم ہوتا کہ مسجد اتنی حسین ہے تو میں یہاں کبھی کلیسا کی تعمیر کی اجازت نہ دیتا۔"اِس پر شکوہ مسجد کے نقوش آج بھی مسلم فن تعمیر کے اعلیٰ ذوق کی علامت اور اسپین میں مسلمانوں کی شاندار حکمرانی کا زندہَ وجاوید حوالہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی میں تعمیر ہونے والی قرطبہ کی جامع مسجد اسلامی فنِ تعمیر کا ایک نادر شاہکار ہے، یہ دنیا کی قدیم ترین مساجد میں سے ایک ہے، جسے اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو نے عالمی ثقافتی ورثہ قرار دیا ہے ،اِس مسجد کو دیکھنے کیلئے دنیا بھر سے ہر سال 14 لاکھ سے زائد سیاح اسپین آتے ہیں۔

مگر سب سے بڑی بد قسمتی یہ ہے کہ اب صدیوں سے یہ مسجد اپنے امام اور اُن مقتدیوں کی منتظر جو طاؤس رباب میں کھوگئے ہیں، مسجد کے بلند وبالا مینار صدیوں سے موذّن کی اذان کو ترس رہے ہیں،اُندلس میں مسلمانوں کے زوال کے بعد دوسری مساجد کی طرح مسجد قرطبہ بھی عیسائی راہبوں کے تسلط میں آگئی، پندرھویں صدی میں مسجد کے وسط میں ایک کیتھولیک گرجا قائم کردیا گیا جہاں

عیسائیوں کو عبادت کی اجازت ہے، لیکن مسلمانوں کیلئے مسجد میں اذان دینے اور نماز کی ادائیگی پر آج بھی پابندی عائد ہے۔1931 میں شاعر مشرق علامہ اقبالؒ وہ پہلے فرد تھے جنھوں نے آٹھ سو سال بعد قرطبہ کی جامع مسجد میں پابندی کے باوجود اذان دی، نماز ادا کی اور مسجد قرطبہ کے عنوان سے ایک خوبصورت نظم بھی کہی، مگر اُن کے بعد مسجد پر پھر اُسی خاموشی کا راج ہے، دسمبر 2006ء میں اسپین کے مسلمانوں نے پوپ بینڈکٹ سے اپیل کی تھی کہ انہیں جامع مسجد قرطبہ میں عبادت کی اجازت دی جائے، مگر اُن کی درخواست مسترد کردی گئی۔

اِس وقت مسجد کی تاریخی عمارت ریاست کی ملکیت ہے لیکن اِس کا انتظام وانصرام مسجد کے وسط میں قائم گرجے کے ہاتھ میں ہے،المیہ یہ ہے کہ مسلم تاریخ کی اِس یادگار نشانی کو حکومت نے صرف 30یورو (یعنی 4ہزار315روپے) میں کلیسا ہاتھ فروخت کردیا ہے، ملکی قانون کے تحت اب اِس مسجد کو گرجے کی ملکیت قرار دیا جارہا ہے اور آئندہ دو برسوں میں یہ مسجد مکمل طور پر چرچ کی ملکیت بن جائے گی،جو اسپین میں اِس عظیم مسلم تاریخی ورثہ کے خلاف ایک مبینہ سازش ہے، مسجد کو مکمل طور پر گرجے میں تبدیل کرنے کے فیصلے نے دنیا بھر کے مسلمانوں میں بے چینی کی لہر دوڑادی ہے، خود اسپین میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد اِس متنازع فیصلے کے خلاف احتجاج کررہے ہیں ،انٹر

نیٹ پر ساڑھے تین لاکھ سے زائد افراد نے ایک آن لائین پٹینشن داخل کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ قرطبہ کی جامع مسجد اسپین کی تاریخ کی علامت ہے،لہٰذا اِسے سابقہ حیثیت میں برقرار رکھا جائے اور کیتھولک چرچ کی ملکیت نہ بنایا جائے ،اُن کا موقف ہے کہ ملک کا کیتھولک چرچ اِس مسجد کی اسلامی حیثیت پر عیسائیت کو غالب کرنا چاہتا ہے،اِس وقت اسپین میں مسجد کے تاریخی تشخص کو بچانے کیلئے تحریک زور پکڑتی جارہی ہے، جبکہ یورپ سمیت دنیا بھر کی مسلم تنظیموں نے بھی یونیسکو سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اسپین کی حکومت کے اِس اقدام کو رکوانے میں اپنا کردار ادا کرے، دوسری جانب دنیاکے نقشے پر موجود پچاس سے زائد اسلامی ممالک اور اُن کے سربراہان مملکت کا حال یہ ہے وہ مسلم تاریخ کے اِس عظیم ورثے کی پامالی پر خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں،آج اندلس میں مسلم تاریخ کا یہ عظیم ورثہ دنیاکے ڈیڑھ ارب سے زائد مسلمانوں کے خوابیدہ ٔ ضمیر کو جھنجھوڑ رہاہے،اُن کی قومی وملی غیرت اور دینی حمیت کو للکار رہاہے اور سوال کررہا ہے کہ کیا اُمت مسلمہ میں اتنا بھی دم خم نہیں کہ وہ اپنے تاریخی ورثے اور شعائر اسلامی کے تحفظ کو یقینی بناسکے اور اِسے صلیبی دستبرد سے محفوظ رکھ سکیں۔

☆☆☆☆☆

نوٹ:۔اس مضمون کی تیاری میں وکی پیڈیا اور دیگر ویب سائٹ پر موجود مواد اور کتاب ”مسلمانان اندلس کی تاریخ“ترجمہ ظفر اقبال کلیار سے ستفادہ کیا

(گیا ہے۔

!.... تعلیمی زبوں حالی کا دلخراش منظر اور حکومتی ذمہ داری

اِس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ قیام پاکستان سے لے کر آج تک ہمارا شعبہ تعلیم حکومتوں کی عدم توجہی کا شکار رہا، جس کی وجہ سے عام آدمی کیلئے تعلیمی سہولتوں کا فقدان ایک سنگین صورت اختیار کرگیا، حالانکہ 5 سے 16 سال تک کے ہر بچے کو مفت اور معیاری تعلیم کی فراہمی آئین کی شق 25A کے تحت حکومت وقت کی ذمہ داری میں آتی ہے، لیکن جہاں ہماری حکومتیں دیگر شعبوں میں ٹھوس اور عملی اقدامات سے محروم رہی، وہیں تعلیم جیسے اہم شعبے میں بھی اپنی آئینی ذمہ داری پوری کرنے میں ناکام نظرآئیں۔اَمر واقعہ یہ ہے کہ دنیاکے ترقی یافتہ ممالک کی ترقی کا رازاُن کی تعلیمی پالیسوں میں پوشیدہ ہے، یعنی کسی بھی ملک کی ترقی وخوشحالی کا انحصار اُس کی تعلیمی پالیسی پر ہوتا ہے،آج برطانیہ، چین، جاپان اور سنگاپور سمیت دنیاکے بہت سے ممالک کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں، دوسری جنگ عظیم کاشکست خوردہ جاپان آج ساری دنیا کو تعلیمی میدان میں پیچھے چھوڑچکا ہے، وہاں شرح خواندگی 99% ہے جو کہ پوری دنیامیں سب سے زیادہ ہے۔

جبکہ دنیا کی ساتویں ایٹمی قوت پاکستان کی تعلیمی کارکردگی کا جائزہ بتاتا ہے کہ ہماری شرح
خواندگی جنوبی ایشیا کی کم ترین شرح خواندگی میں شمار ہوتی ہے،افسوسناک پہلو یہ ہے کہ
خطے کے آٹھ ممالک بنگلہ دیش، بھوٹان، بھارت، ایران، مالدیپ نیپال اور سری لنکا
میں پاکستان نیپال کے بعد پسماندگی کی انتہائی آخری صف میں کھڑا ہے، جہاں خواندگی کی
شرح 74 فیصد ہے، جبکہ نیپال میں شرح خواندگی 65 فیصد، سری لنکا میں 94 فیصد،
بھارت میں 92 فیصد، مالدیپ میں 96 فیصد، بنگلہ دیش میں 85 فیصد، بھوٹان میں
فیصد اور ایران میں 93 فیصد ہے۔پاکستان میں حکومتیں تعلیم پر کتنا خرچ کرتی رہی 88
ہیں اِس کا اندازہ یونیسکو کے جاری کردہ اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے
کہ ہمارے حکمران تعلیم کو کتنی ترجیح دیتے ہیں، جبکہ اقوام متحدہ نے مجموعی قومی پیداوار کا
کم سے کم 4 فیصد تعلیم کیلئے مختص کرنے کا عالمی معیار مقرر کر رکھا ہے لیکن پاکستان کی
زبوں حال تعلیمی تصویر یہ دلخراش منظر پیش کرتی ہے کہ 13 برس قبل بھی اور آج بھی
ہم اپنے مجموعی بجٹ کا صرف 2 فیصد تعلیم کو دیتے ہیں۔
کے ایجوکیشن انڈکس میں پاکستان کا 173 ممالک میں UNO آج ہمارا حال یہ ہے کہ
واں نمبر ہے اور ہمارے اسکولوں میں بچوں کی تعداد ہر سال کم سے کم ہوتی جارہی 166
ہی ہے، ایک رپورٹ کے مطابق 100 میں سے صرف 25 بچے اسکول جاتے ہیں

اور اِن 25 میں سے 6 بچے ہی ہائی اسکول کی سطح تک پہنچ پاتے ہیں،اِس وقت ہمارے ا سکولوں میں اساتذہ کی شدید قلت ہے اور ہر 60 بچوں کیلئے صرف ایک استاد موجود ہے جو کہ دنیا کا کم ترین تناسب ہے، جبکہ ہمارے بہت سے اسکولوں کی حالت ایسی ہے کہ وہ ''اسکول'' کہلائے جانے کے قابل ہی نہیں ہیں،اُن میں پڑھائی نہ ہونے کے برابر ہے اور اکثر اسکول پانی و بجلی اور دیگر بنیادی سہولیات سے محروم ہیں،اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو کے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں 5 کروڑ 70 لاکھ بچے زیور تعلیم سے محروم ہیں، جبکہ 67 لاکھ پاکستانی بچے تو ایسے ہیں جو بنیادی ابتدائی تعلیم سے بھی نابلد ہیں،پلڈاٹ کی ایک حالیہ رپورٹ کہتی ہے کہ اگر ہمارے ہاں شعبہ تعلیم کی یہی رفتار رہی تو ہمارا پرائمری تعلیم کا ہدف اگلے 30 سالوں میں ہی پورا ہوسکے گا۔

جبکہ ایجوکیشن ٹاسک فورس کی طرف سے ''پاکستان کی تعلیمی ایمر جنسی'' کے عنوان سے جاری کردہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ پاکستان کی اِس تباہ کن ایمرجنسی کے اثرات انسانی، سماجی اور معاشی سطح پر موجود ہیں اور اِس بحران سے ملک کی سالمیت کو شدید خطرہ لاحق ہے،رپورٹ کے مطابق پاکستان تعلیم کے حوالے سے اپنی بین الاقوامی ذمہ داریاں نبھانے میں اب تک ناکام رہا ہے،پاکستان کے تقریباً ستر لاکھ بچے پرائمری تعلیم سے محروم ہیں، یہ تعداد

لاہور شہر کی پوری آبادی کے برابر ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دنیا میں جتنے بچے اِس وقت پرائمری تعلیم سے محروم ہیں اُن کی تقریباً دس فیصد تعداد پاکستان میں ہے۔ اِس طرح تعلیم سے محروم بچوں کی تعداد کے حوالے سے پاکستان دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے۔ پاکستان کے ہائی اسکولوں میں داخلے کی شرح محض 23 فیصد ہونے کی وجہ سے پاکستان بین الاقوامی اور اپنی آئینی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں اور بھی پیچھے ہے۔ گو پاکستان میں تعلیمی مواقع کم نہیں لیکن اِس کی ناہموار تقسیم سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ملک کے بیس فیصد امیر ترین شہری غریب ترین شہریوں کے مقابلے میں سات سال زیادہ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ دوسری جانب تیس فیصد پاکستانی انتہائی تعلیمی غربت میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور وہ بمشکل دو سال تک سکول جا پاتے ہیں۔

گذشتہ دنوں قومی روزنامے میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق پارلیمنٹ ہاؤس میں میلینم ڈویلپمنٹ اہداف سے متعلق اسپیکر کے قائم کردہ خصوصی پارلیمانی کمیٹی کے اجلاس میں تعلیمی اعداد و شمار کے ضمن میں جب حقائق پیش کئے گئے تو شرکاء اجلاس پر شرمندگی کا احساس غالب تھا اور شرح خواندگی سے متعلق ماضی کی حکومتوں کی ساری کارکردگی کا جادو سر پر چڑھ کر بول رہا تھا۔ مگر اِس تعلیمی زبوں حالی کے باوجود وفاقی حکومت نے تعلیمی بجٹ میں معمولی اضافہ کرتے ہوئے آئندہ مالی سال کیلئے محض 64 ارب روپے مختص کئے ہیں، جو کہ

خود ن لیگ کے انتخابی وعدے اور منشور " تعلیم پر جی ڈی پی کا کم از کم 4 فیصد خرچ کرنے "کی بھی صریحاً خلاف ورزی ہے، گو پنجاب صوبائی حکومت کی جانب سے یونیورسٹی طلباء میں لیپ ٹاپس تقسیم ایک قابل تعریف عمل ہے، لیکن اِس تلخ حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آج بھی قوم کے بچے پلوں کے نیچے اور قبرستانوں میں بیٹھ کر تعلیم حاصل کرنے پر مجبور ہیں، چنانچہ اِس تناظر میں آنے والی نسل کو جاہل رکھنا اور اُن کی تعلیم وتربیت پر توجہ نہ دینا حکومت کی سب سے بڑی نااہلی اور جرم قرار پاتا ہے، کیونکہ جہالت کے اندھیرے سے علم کی روشنی کی طرف لے جانا حکومت وقت کی اہم ،بنیادی اور آئینی ذمہ داری بنتی ہے۔

یاد رکھیئے ترقی اور تعلیم کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور قوموں کا عروج تعلیم کے ذریعے ہی ممکن ہوتا ہے، تعلیم کسی بھی قوم اور ملک کی مستقبل سازی کیلئے ناگزیر ہے، تعلیم کا عمل جتنا بامقصد، موثر اور وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوگا، اتنا ہی قوم اور ملک کا مستقبل شاندار اور تابناک ہوگا، مملکت خداداد پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے، ہم اِس بات پر مکمل طور پر یکسو ہیں کہ اِس ملک کی بقاء وسلامتی اور استحکام اِس کے بنیادی نظریہ پر عمل پیرا ہونے میں ہے، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ نظام تعلیم اور تعلیمی عمل ،اِس طرح استوار کیا جاتا کہ ہماری آنے والی نسلیں اپنے ملک و قوم کے

اجتماعی شعور اور نظریاتی اساس سے پوری طرح ہم آہنگ ہو جاتیں اور اُس کے عملی
تقاضوں کی تکمیل کی صلاحیتیں لے کر پروان چڑھتیں، اس سلسلے میں یہ بھی ضروری تھا
کہ ہماری تعلیمی پالیسیاں، نصابات کی تشکیل، تربیت اساتذہ، طریقہ تعلیم، ذریعہ تعلیم،
نظام کار اور نظام امتحانات کو ملکی اور قومی ترجیحات کے مطابق استوار کیا جاتا، لیکن
بد قسمتی سے ایسا نہ ہو سکا اور ہر دور میں آنے والی حکومتوں میں جو چیزیں مشترک رہی
وہ نااہلی، خود غرضی، کم ظرفی، کوتاہ بینی، ذاتی مفادات اور استعمار سے وفاداری کے
رویئے تھے ،یہی وہ وجوہات ہیں جن کی بناء پر تعلیمی پالیسیاں تو بنی مگر نتیجہ وہی ڈھاک
کے تین پات ہی رہے۔

لہذا ہمارا تعلیمی شعبہ ہنگامی اقدامات اور بھرپور توجہ کا متقاضی ہے، جس کیلئے سرکاری سطح
پر نیک نیتی، جذبہ صادق اور عزم صمیم ضروری ہے اور یہ تب ہی ممکن ہے جب ہمارے
ارباب اقتدار تعلیمی بجٹ میں خاطر خواہ اضافہ اور اخراجات کی صحیح ترجیحات کا تعین،
اقراء سرچارج کی مد میں حاصل ہونے والی ایک کھرب سے زائد رقم کو تعلیمی شعبے کی
ترقی کیلئے استعمال، مخصوص طبقاتی نظام کے خاتمے اور پوش طبقہ کیلئے قائم تعلیمی اداروں
کی سرکاری سرپرستی میں کمی اور اُن وسائل کو عوامی تعلیم کیلئے صرف کرنے جیسے عملی
اقدامات کے ساتھ نئی نسل کو بہتر مسلمان اور اچھا پاکستانی بنانے کیلئے یکساں قومی

نصاب کی تشکیل اور اردو زبان کو اُس کا جائز مقام دیتے ہوئے ذریعہ تعلیم بنانے اور انگریزی کی بین الاقوامی حیثیت کے پیش نظر اُس کی بہتر تدریس کے انتظامات پر خصوصی توجہ نہیں دیتے۔

آج نالج بیسڈ معاشی دور میں معاشی ترقی کیلئے تعلیم کی اہمیت اِس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ دنیا ایک گلوبل ویلج کی صورت اختیار کر چکی ہے، سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں سے لے کے مینجمنٹ اور سوشل سائنسز تک انتہائی تیز رفتاری سے ترقی ہو رہی ہیں، کمیونیکیشن اور معاشی مسائل کے صحیح ادراک اور فہم کیلئے تعلیم ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، تعلیمی بجٹ کو خاطر خواہ بڑھانے سے ہی اِس شعبے میں ترقی اور انقلاب لایا جاسکتا ہے، لہذا ضرورت اِس امر کی ہے کہ ملک میں تعلیمی ایمرجنسی کا نفاذ کرکے ایسی تعلیمی اصلاحات لائی جائیں جو ہمیں دیگر ممالک کی طرح تعلیمی میدان میں آگے لے جاسکیں، اگر ہم ترقی یافتہ ممالک کی فہرست میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو ہمیں تعلیمی میدان میں انقلابی اقدامات کرنا ہونگے ،تاریخ گواہ ہے کہ جن قوموں نے تعلیم کا اپنا نصب العین بنایا وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہوئے اور جنھوں نے تعلیم سے کنارہ کشی اختیار کی وہ ذلت و پستی میں گر کر دوسری قوموں کی غلامی پر مجبور ہوگئے۔

بجٹ اعداد و شمار کا گورکھ دھندہ اور زمینی حقائق

عوام دوست بجٹ اور 12 ہزار تنخواہ......!

جب معمولاتِ زندگی آرام و آسائش اور وسائل کی فراوانی میں بسر ہوں، دور دور تک زندگی میں مسائل و پریشانیوں کا گزر نہ ہو، آدمی کو روزی روزگار اور ضروریات زندگی کی عدم دستیابی کا مسئلہ بھی درپیش نہ ہو تو ایسی حالت میں غیر متوقع صورتحال جس کا انسان کو فہم و ادراک ہی نہ ہو، نہ ہی اُسے کبھی زندگی میں ایسے حالات سے واسطہ پڑا ہو، اُس کا سٹپٹا جانا ایک قدرتی اَمر ہے، گذشتہ دنوں ہمارے وزیر خزانہ جناب اسحاق ڈار کو بھی کچھ ایسی ہی صورتحال کا اُس وقت سامنا کرنا پڑا، جب پوسٹ بجٹ پریس کانفرنس کے دوران ایک صحافی نے اُن سے یہ سوال کرلیا کہ " آپ نے کم سے کم تنخواہیں 12 ہزار روپے ماہانہ مقرر کرنے کا اعلان کیا ہے، آپ اِس تنخواہ میں ایک گھر کا بجٹ بنا کر دکھائیں۔" ظاہر ہے مصائب و آلام میں مبتلا ایک عام پاکستانی کے حالات زندگی کی نمائندگی کرتا یہ چھبتا ہوا سوال، وزیر موصوف کیلئے قطعی غیر متوقع تھا، لہٰذا پہلے تو انہوں نے جارحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہہ دیا کہ " عوام کو مصیبتیں ہم نے تو نہیں دیں، نہ یہ ہماری وجہ سے آئی ہیں۔" تاہم

فوراً ہی انہیں اپنے رویئے کا احساس ہوگیا اور اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے گویا ہوئے ”درحقیقت یہ مصیبتیں ماضی کی حکومتوں کی دی ہوئی ہیں ،اِن کو حل کرتے کرتے وقت لگے گا۔“

اب کتنا وقت لگے، عوام کی مصیبتیں کب ختم ہونگی ،کب انہیں سکون و آسودگی کا لمحہ میسر آئے گا،اِس حوالے سے کچھ نہیں کہا جاسکتا ،اَمر واقعہ یہ ہے ہر آنے والی حکومت نے مشکلات و پریشانیوں کا رونا رویا اور عوام کے مصائب و آلام کا ذمہ دار پچھلی حکومتوں کو ٹھہرایا، محترم وزیر خزانہ نے بھی وہی کیا، اپنی حکومتی کارکردگی کو بہتر بنانے اور کچھ کر دکھانے کے بجائے سارا کا سارا ملبہ گذشتہ حکومت پر ڈال دیا، ساتھ ہی مسائل کے حل کیلئے وہی پرانا راگ بھی الاپ دیا کہ ” وقت لگے گا۔“مگر شاید وہ اِس حقیقت سے واقف نہیں کہ کچھ حقیقتیں ایسی ہوتیں ہیں جو معلومات کے اِن گنت ذرائع اور لامحدود وسائل رکھنے کے باوجود ارباب اقتدار کی عالی نسب بارگاہوں پر منکشف نہیں ہوپاتیں، لیکن گلی کوچوں میں حشرات الارض کی طرح رینگتے عوام الناس کم فہم ہونے کے باوجود اِن زمینی حقیقتوں کا پالیتے ہیں، جس طرح ساحل پر کھڑے ہوکر دریا کی طغیانی کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، بالکل اُسی طرح گلی کوچوں کی دکانوں پر جائے، تپتی دھوپ میں یوٹیلیٹی اسٹور کے باہر لمبی قطار میں گھنٹوں کھڑے ہوئے،اور دھول مٹی میں اَٹے اتوار بازاروں کی خاک چھانے

بغیراس حقیقت کا ادراک کرنا محال ہے کہ مہنگائی کا عفریت کتنا خونخوار ہو چلا ہے اور ایک آدمی کے شب و روز کس کرب و اذیت میں گزر رہے ہیں۔

محترم وزیر خزانہ کا پیش کردہ وفاقی بجٹ ''اعداد و شمار کا ہیر پھیر'' ہے جس کا نتیجہ سود وزیاں'' کے سوا اور کچھ نہیں، بجٹ غربت، مہنگائی، بیروزگاری کے گرداب میں'' پھنسے عوام، تنخواہ دار طبقات، مزدوروں، خانہ دار خواتین اور دیگر طبقات زندگی کیلئے مایوسی و نامرادی کا پیغام دیتا نظر آرہا ہے، اِس تناظر میں عوام میں غصے اور اضطراب کی کیفیت کا پیدا ہونا فطری عمل ہے، حالیہ بجٹ میں حکومت نے کم از کم تنخواہ 12 ہزار روپے مقرر کرنے کا اعلان کیا ہے، لیکن مزدور طبقات اِس اضافے پر خوش نظر نہیں آرہے، اوّل تو اِس معمولی اضافے سے اُن کی معاشی حالت میں کچھ سدھار آنے والا نہیں، دوسرے یہ کہ اصل مسئلہ اِن قوانین پر عملدرآمد کا ہے، ابھی تک ایسے بہت سے ادارے موجود ہیں، جہاں گذشتہ سال بڑھائی گئی تنخواہ کا بھی اطلاق نہیں ہوسکا، یہ وہ ادارے ہیں جو عوام کو حکومت کی طے کردہ کم از کم اجرت کسی طور بھی دینے کو تیار نہیں ہیں، اِس صورتحال میں بعض مزدور تنظیمیں بجٹ کے اعداد و شمار کے ہیر پھیر کا جائزہ لے کر مزدور طبقات کا مہنگائی کے بوجھ تلے دبنے کا عندیہ دے رہی ہیں، بجٹ کے حوالے سے پرچون فروشوں کی جانب سے بھی اضطراب کا اظہار کیا جا رہا ہے، جن کے بقول اب گلی محلے کے دکاندار بھی ٹیکس کے جال میں

پھنس گئے ہیں اور اُن پر ''سپیشل پروسیجر رولز فار ریٹیلرز'' کے نام پر 17 فیصد سیلز ٹیکس عائد ہو گیا ہے، جبکہ خواتین خانہ سر پکڑے بیٹھی ہیں کہ اُن کے گھر کا بجٹ تو پہلے ہی مہنگائی کے سونامی کے باعث قابو میں نہیں آرہا تھا، اب کینولا، سن فلاور کلکنگ آئل مہنگا ہونے اور پرچون فروشوں پر عائد ہونیوالے 17 فیصد سیلز ٹیکس کی بنیاد پر اشیائے خوردنی کی دوسری تمام اشیاء کے نرخ بھی آسمان تک جا پہنچنے سے وہ گھریلو اخراجات کیسے پورے کرپائیں گی۔

دوسری طرف طرفہ تماشا یہ ہے کہ بجٹ کی منظوری اور اطلاق یکم جولائی سے ہوگا مگر مہنگائی کا طوفان بجٹ کے اعلان کے ساتھ ہی برپا ہو گیا ہے، جہاں منافع خور تاجروں نے مصنوعات ذخیرہ کرکے انہیں مہنگے داموں مارکیٹ میں لانے کیلئے اپنی چھریاں کانٹے تیز کرلیے ہیں، وہیں ریٹیلرز اور خوانچہ فروشوں تک نے اشیائے خوردنی، دالوں، سبزیوں، مٹن، بیف، چکن، مشروبات کے نرخ ابھی سے بڑھا دیئے ہیں، اِس صورتحال میں بجٹ میں وزیر خزانہ کے اعلان کردہ مہنگائی کو کنٹرول کرنے کے منصوبے کی ابھی سے بھیانک تصویر نظر آرہی ہے، جبکہ آئندہ ماہ بجٹ کے اطلاق کے وقت ماہ رمضان المبارک کا بھی آغاز ہو چکا ہوگا، جس کے دوران مہنگائی عوام کی کیا درگت بنائے گی، یہ تصور کرکے اُن کے ابھی سے پسینے چھوٹ رہے ہیں، جبکہ بجٹ میں تجویز کیے گئے ٹیکس نظام کی بنیاد پر عام

آدمی کے استعمال کی اشیاء واشنگ مشین، جوسر، جنریٹر، پنکھے سیلز ٹیکس کی زد میں آکر مہنگے
ہو رہے ہیں اور سیمنٹ اور سریا مہنگا کرکے عام آدمی کے اپنے گھر کی تعمیر کے خواب بھی
چکناچور کئے جا رہے ہیں،اس کے برعکس 18 سو سی سی سے بڑی گاڑیوں کو ٹیکسوں کی
چھوٹ دے کر سستا کیا جا رہا ہے تواِس سے اپوزیشن کے اِن الزامات کو ہی تقویت ملے
گی کہ اِس بجٹ کے ذریعے عام آدمی کے بجائے مراعات یافتہ اشرافیہ طبقات کے
مفادات کا تحفظ کیا گیا ہے،یوں بھی کسی حکومت کا بجٹ جہاں اگلے مالی سال کے حوالے
سے تفصیلی پلان کو ظاہر کرتا ہے ،وہاں اِس سے حکومتی معاشی پالیسیوں کی سمت اور
موڈ بھی ظاہر ہوتا ہے، بجٹ کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے سے حکومتی مالیاتی ماہرین
کے مائنڈ سیٹ کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی کہ اُن میں طاقتور طبقات پر ٹیکس لگانے
کی کس قدر جرات ہے۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ ہر دو چار ہفتوں بعد مہنگائی کا بم عوام پر گرتا اور اُن کی کمر توڑ دیتا
ہے، پٹرول کے ساتھ بجلی کی قیمتوں میں بھی ماہانہ بنیادوں پر تبدیلی جاری ہے، تبدیلی کا
مطلب ویسے صرف مہنگا ہونا ہی ہے، سستی تو بجلی کبھی نہیں ہوتی، اعداد وشمار کی
جادوگری ہمارے بجٹ میں سب سے زیادہ پریشان کن بات ہے، چیزوں کوایسے پرکشش
طریقے سے پیش کیا جاتا ہے، جیسے ملک میں دودھ اور شہد کی نہریں بہہ رہی ہوں، جبکہ
عملی طور پراِس کے برعکس

ہی ہوتا ہے، مثال کے طور پر ہمارے وزیر خزانہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ معاشی ترقی کی شرح 4.1 رہی، دلچسپ بات ہے کہ عالمی سطح کے اقتصادی ادارے اِس بات کو بالکل ہی نہیں مانتے، اُن کے خیال میں یہ شرح 3.3 کے قریب ہے، یہی صورتحال دیگر اعداد و شمار کی ہے، وزیر خزانہ کے بقول فی کس آمدنی کی شرح سنتالیس ڈالر بڑھ گئی اور اب یہ 1386 ڈالر ہو گئی، لیکن اِس بات کی کوئی ٹھوس وضاحت نہیں کی گئی کہ یہ انقلاب کیسے رونما ہوا۔ ؟ ہمارے اقتصادی ماہرین ایسی دل خوش کن تصویر پیش کرتے ہیں کہ لگتا ہے سب انڈیکیٹر ٹھیک ہیں اور کارکردگی بہترین رہی، بعض اوقات تو آدمی حیرت سے سوچتا ہے کہ یہ کس ملک کا نقشہ کھینچا جا رہا ہے اور میں کہاں رہ رہا ہوں۔ ؟ یہی وہ بات ہے، جس کی وجہ سے بجٹ کے اعداد و شمار پر لوگوں کا اعتماد اٹھ گیا ہے۔

ہمارا ماننا ہے کہ عوام الناس کیلئے بجٹ ایک ایسی بلائے ناگہانی ہے جو قوم پر عذاب کی صورت میں ہر سال نازل ہوتی ہے اور پورا سال منی بجٹ کے بچے جنتی ہے، کبھی بجلی، پٹرول، گیس اور سی این جی کے نرخوں میں اضافے کی صورت میں اور کبھی حکمرانوں کی چہیتے ذخیرہ اندوز، گراں فروش اور مارکیٹ فورس کی من مانی کارروائی کے نتیجے میں۔ یہی وجہ ہے کہ چند برسوں سے بجٹ ایک رسمی کارروائی بن کے رہ گیا ہے اور دیکھا یہ گیا کہ عوام بجٹ سے بڑی حد تک لاتعلق ہو گئی ہے، عام آدمی کو اکانومی کے پیچیدہ گورکھ دھندوں کی پہلے ہی

سمجھ نہیں آتی تھی، اب پڑھی لکھی مڈل کلاس بھی بیزار ہو چکی ہے، جس کی مختلف وجوہات ہیں، دراصل ایک حقیقی بجٹ کیلئے چند چیزیں لازمی ہوتی ہیں، اُن کے بغیر اس کے اثرات مرتب نہیں ہو سکتے، مشاہدہ یہ ہے کہ ہر سال بجٹ سے پہلے اخبارات اور ٹی وی چینلز مختلف شعبہ زندگی کے عام آدمیوں سے گفتگو کرتے اور مختلف نوعیت کے سروے کراتے ہیں، اِن تمام میں ایک بات مشترک نظر آتی ہے کہ ملک کا غریب آدمی بجٹ سے بالکل لاتعلق ہو چکا ہے، اُس کی یہ کیفیت کم علمی یا ان پڑھ ہونے کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ اُسے یہ یقین ہو چلا ہے کہ بجٹ خواہ کسی بھی حکومت کا ہو، اُس کیلئے اِس میں کچھ نہیں ہوگا، اُسے پتہ ہے کہ اُس پر تو بوجھ ہی پڑنا ہے اور دو وقت کی روٹی کمانے کیلئے جتنی جدوجہد وہ آج کر رہا ہے، اگلے سال اِس سے بھی زیادہ کرنی پڑے گی، یہ وہ ہولناک حقیقت ہے جس کا ہمارے ارباب اقتدار، اقتصادی ماہرین اور بجٹ سازوں کو ادراک کرنا ہوگا۔

داعش عراق میں تحریکِ طالبان کا نیا رُوپ-----

شدت پسند تکفیری گروہ جو عراق کو خارجی اسٹیٹ بنانا چاہتا ہے

رواں سال جنوری میں اچانک عالمی میڈیا کی توجہ کا مرکز بننے والے شدت پسند سلفی تکفیری گروہ "داعش" (ISIS) نے گذشتہ دنوں عراق و شام کے مفتوحہ علاقوں میں اپنی خلافت کا اعلان کرتے ہوئے ابو بکرالبغدادی کو 'ابراہیم" کے لقب سے خلیفہ نامز کردیا، داعش وہ شدت پسند تنظیم ہے جو پچھلے دس برسوں سے القاعدہ کے زیر سایہ کام کرنے والی دیگر تنظیموں میں شامل رہی ہے، مگر یہ قدرے غیر معروف تنظیم رہی، جس کی وجہ سے بہت کم لوگ اِس کے بارے میں جانتے تھے، لیکن رواں برس جنوری میں یہ تنظیم اُس وقت عالمی میڈیا کی توجہ کا مرکز بنی جب یکے بعد دیگرے کئی اہم عراقی علاقے "داعش" کے جنگجوؤں کے قبضے میں آ گئے اور داعش بغداد کے دہانے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی، آج جس تیزی سے یہ خارجی عقائد پر مبنی تکفیری گروہ عراق میں پیشقدمی کر رہا ہے، اُس نے عراق کے ہمسایہ ممالک میں بھی خطرے کی گھنٹیاں بجادی ہیں ، سعودی عرب، قطر، کویت اوراردن کے حکمران پریشان ہیں کہ مبادا یہ طوفان کہیں اُن کی سرحدوں کا رخ نہ کرلے۔

جہاں داعش کی پیش قدمی اور برق رفتاری سے اہم عراقی علاقوں اور تنصیبات پر کنٹرول نے عراق اور اُس کے ہمسایہ ممالک کو سب سے بڑے خطرے سے دوچار کردیا
ہے، وہیں اِس کی بڑھتی ہوئی سرگرمیاں اور طاقت کئی اہم سوالات کو بھی جنم دیتی ہے، جیسے کہ داعش کا اصل تعارف کیا ہے۔؟اِس گروہ میں شامل لوگ کون ہیں ۔؟اِس کے اصل اہداف کیا ہیں ۔؟آخراِس شدت پسند تکفیری گروپ کے پاس ایسی کون سی طلسماتی چھڑی ہے جس نے بلک جھپکتے عراق کا ایک چوتھائی حصہ پکے ہوئے پھل کی مانند اِس کی جھولی میں ڈال دیا ہے۔؟کیا واقعی یہ گروہ مادی اور دفاعی اعتبار سے اِس قدر طاقتور ہے کہ شام اور عراق کی فوجیں بھی اِسے شکست نہیں دے سکتیں ۔؟اِن سوالات کے ساتھ سب سے اہم سوال یہ بھی ہے کہ ایک ایسا خارجی گروہ جو اپنے مخالفین کو کافرومشرک قرار دے کر اُن کا خون مباح جانتا ہے کا وسیع پیمانے پر جدید فوجی ہتھیاروں اور سازوسامان سے لیس ہو کر ایک خطرناک ترین دہشت گرد گروہ میں تبدیل ہونا، کن خفیہ طاقتوں کی پشت پناہی کا مرہون منت ہے۔؟ بالفاظ دیگر داعش ایک خود رو نظریاتی تنظیم ہے یا پھر اِس کے پس پردہ کوئی خفیہ طاقت موجود ہے۔؟
آیئے زیر نظر گفتگو میں داعش کا تعارف، حدود اربعہ واہداف اور مندرجہ بالا سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔خارجی دہشت گرد تنظیم "داعش"

چار حروف کا مرکب ہے، جو "دولت اسلامیہ عراق وشام" کا اختصار ہے، انگریزی میں
اِسے "Iraq Syria Islamic State" یعنی مختصراً ISIS کے نام سے جانا جاتا ہے،
اس کی بنیادالقاعدہ کی فکر سے متاثر کچھ شدت پسندوں نے 15 اکتوبر 2006ء کو بغداد
میں رکھی اور ابو عمر البغدادی اِس تنظیم کا پہلا سربراہ مقرر ہوا۔اُس وقت "داعش" کے
قیام کا بنیادی مقصد عراق اور شام کے کچھ علاقوں پر مشتمل خارجی عقائد پر مبنی ایک نام
نہاد خارجی ریاست کا قیام تھا، تنظیم کے کرتا دھرتاؤں کے نزدیک عراق اور شام کی
1932ء میں قائم کردہ حدود بے معنی تھیں اور وہ دونوں ممالک کو ایک ریاست میں
ضم کرنے کیلئے کوشاں تھے۔آغاز میں تنظیم کا ڈھانچا، وسائل اور افرادی قوت صرف
عراق کے چند علاقوں تک محدود تھی۔

مگر 19 اپریل 2010ء کو جب داعش کا سربراہ ابو عمر البغدادی ایک میزائل حملے میں
مارا گیا، تو ابو بکر البغدادی کو تنظیم کا نیا سربراہ مقرر کیا گیا، جس کا اصل نام "ابراہیم
عواد ابراہیم علی البدر" ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابو بکر البغدادی کے ابو عمر البغدادی کے
ساتھ بہت قریبی تعلقات تھے، جس کی وجہ سے ابو عمر بغدادی نے مرنے سے پہلے
وصیت کی تھی کہ اُس کا جانشین ابو بکر البغدادی ہی ہوگا، چنانچہ 16 مئی 2010ء کو
ابو بکر البغدادی" الدولۃ الاسلامیۃ فی العراق" کا امیر منتخب ہوا۔ابو بکر البغدادی 1971
ء میں شہر سامرا

کے ایک ایسے ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوا کہ جو سلفی تکفیری عقیدے کا حامل ہے۔اُس نے بغداد اسلامی یونیورسٹی سے بیچلرز، ماسٹرز اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ابو بکر البغدادی نے اپنی سرگرمیوں کی ابتداء تبلیغ اور لوگوں کو پڑھانے لکھانے سے شروع کی، مگر کچھ ہی عرصے بعد وہ جہاد کے میدان میں اتر گیا اور جہادی سلفیوں کے اہم ترین ارکان میں شمار ہونے لگا۔اُس نے اپنی سب سے پہلی سرگرمی مسجد امام احمد بن حنبل سے شروع کی جہاں اُس نے ایک چھوٹا سا جہادی گروپ بنایا۔اِس گروپ نے کئی دہشتگرادنہ کارروائیاں بھی انجام دی ہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ 2003ء میں عراق پر امریکی حملے کے بعد ابو بکر البغدادی نے فلوجہ میں امریکی افواج کے خلاف حملے میں شرکت کی جہاں اُس کی صدام کے پرانے ساتھیوں اور عہدیداروں سے آشنائی اور ملاقات ہوئی۔ اسی دوران وہ امریکی فوجیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا اور پھر جیل بھیج دیا گیا، جہاں اُس کے مذہبی جنونیوں اور شدت پسندوں کے تعلقات استوار ہوئے اور وہ اُن سے مزید متاثر ہوا۔ ابو بکر البغدادی نے جیل سے آزاد ہونے والے تمام انتہاپسندوں کو اپنے حلقے میں شامل کرلیا،اِن میں کچھ ایسے بھی افراد تھے جو بم بنانے اور دھماکہ کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔اِس طرح بغدادی کی تنظیم "الدولۃ الاسلامیہ فی العراق" ایک شدت پسند تنظیم میں تبدیل ہو گئی اور

دیگر ممالک سے سینکڑوں افراد اِس تنظیم سے جڑ گئے اور عراق میں داعش تحریک طالبان پاکستان کے جدید ایڈیشن کے طور پر سامنے آئی۔
داعش کی زمام کار ابو بکر البغدادی کے ہاتھ میں آتے ہی تنظیم کی کارکردگی میں ایک ڈرامائی تبدیلی نظر آئی ۔دیکھتے ہی دیکھتے داعش نے عراق کے طول و عرض میں دھماکے شروع کر دیئے ۔ عراقی حکومت کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ القاعدہ نے اچانک اتنی طاقت کیسے پکڑ لی اور امریکہ جس القاعدہ کی کمر توڑنے کے مسلسل دعوے کر رہا تھا،وہ پورے قد کے ساتھ سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔جب مارچ 2011ء میں شام میں صدر بشارالاسد کے خلاف علم بغاوت بلند ہوا تو پہلی بار "داعش" کی موجودگی کی خبریں دنیا کے سامنے آئیں یہ بات بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ جس وقت امریکہ اور اُس کے حواری شام میں بشار الاسد کیخلاف برسرپیکار جنگجوؤں کے ہاتھ مضبوط کر رہے تھے اُس وقت داعش بھی اُن پروردہ گروپوں میں شامل تھی۔جن کی پشت پناہی امریکہ اور اُس کے ISIS حواری کر رہے تھے ۔ حالانکہ دنیا کو دکھانے کیلئے اُسی سال ابو بکر البغدادی کا نام امریکہ کی بلیک لسٹ میں شامل کیا گیا تھا اور اُس پر دس ملین ڈالر کا انعام رکھا گیا۔
بہرحال داعش نے اپنے نئے قائد البغدادی کی قیادت میں جلد ہی شام میں بھی

الرقہ، حلب، اللاذقیہ، دمشق، دیرالزور، حمص، حسکہ اور ادلب میں اپنے پنجے مضبوط کرلیے، اِس تنظیم کی جنگی طاقت کا اندازہ اِس اَمر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اِس کے جنگجوؤں نے ایک طرف شامی فوج کا مقابلہ کیا اور دوسری طرف شام کے حقیقی سنی گروپوں کے خلاف بھی بھرپور جنگ جاری رکھی۔ داعش نے ابوبکرالبغدادی کے آنے کے عراق میں کئی دہشتگردانہ کارروائیاں انجام دی ہیں جن کی وجہ سے سیکڑوں بےگناہ عراقیوں کا خون بہایا گیا،اِس گروہ نے سب سے اہم کارروائی مسجد اُم القریٰ پر حملہ کرکے انجام دی کہ جس میں عراقی پارلیمنٹ کے نمائندے خالد فہداوی مارے گئے، اِسی طرح اسامہ بن لادن کے خون کا بھی بدلہ لینے کے لیے متعدد کارروائیاں انجام دی گئیں کہ جن میں سینکڑوں فوجیوں، پولیس اہلکاروں اور عوام کا خون بہایا گیا، عراقی القاعدہ سے وابستہ انٹرنیٹ ویب سائٹ نے بن لادن کا بدلہ لینے کے لیے سو سے زیادہ خودکش حملوں کی ذمہ داری قبول کی،اِس کے بعد اِس گروہ نے کچھ خاص آپریشنز بھی انجام دیئے کہ جن میں مرکزی بینک، وزارت انصاف، ابوغریب اور حوت کی جیلوں پر حملہ شامل ہے،جون کے اوائل میں تنظیم نے عراق کے اندر گوریلا کارروائیوں کے بجائے باقاعدہ شہروں کو فتح کرنے کی پالیسی اپنائی اور صرف دو ہفتوں کے دوران سات ہزار مربع میل کے علاقے پر قبضہ کرکے یہ ثابت کردیا کہ داعش چند دنوں میں پورے عراق کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے، شام کے کئی شہروں کے بعد اب عراق میں موصل، تکریت، صوبہ الانبار مرکزی شہر فلوجہ تلعفر اور جبل

المنصوریہ پر قبضہ کرتے ہوئے اُس نے بغداد پر دستک دینا شروع کردی ہے، تادم تحریر داعش کے جنگجو بغداد سے محض چند گھنٹوں کی مسافت پر ہیں، اگر فضائی بمباری کے ذریعے ان کی پیش قدمی نہ روکی گئی تو دنیا ایک مرتبہ پھر سقوط بغداد کا ایک نیا سانحہ دیکھے گی۔

اگرچہ ابوبکرالبغدادی کی قیادت میں عقیدتی اعتبار سے داعش اور القاعدہ سلفی شمار کئے جاتے ہیں، مگر عسکری اعتبار سے داعش قدرے مختلف ثابت ہوئی ،اسی وجہ سے داعش جلد ہی القاعدہ سے جدا ہوگئے، داعش، القاعدہ کی مانند نہیں ہے کہ جو صرف جنگ پر ہی اکتفا کرلے بلکہ زمینوں کو فتح کرنا اور اُن پر قبضہ کرنا اِس کے اہم جنگی اہداف و مبانی میں سے ہے۔ میڈیا رپورٹ کے مطابق ابوبکرالبغدادی جب کسی شہر کو فتح کرنا چاہتا ہے تو پہلے اپنے اہلکاروں کو وہاں کے مقامی لباس میں بھیجتا ہے جو وہاں جاکر گھروں میں پرامن طریقے سے زندگی گزارنے لگتے ہیں اور اگلے حکم کا انتظار کرتے ہیں، اِس کے بعد وہ لوگ بیعت کے لیے قبیلوں کے سرداروں سے مذاکرہ کرتے ہیں اگر اِن سرداروں نے بیعت قبول کرلی تو داعش کے چند قابل اعتماد افراد اُن کے پاس رہ جاتے ہیں اور قبیلے کی راہنمائی کرتے ہیں اور شہر کے گورنر کو انہیں کے درمیان میں سے انتخاب کرتے ہیں، لیکن اگر کسی سردار نے اُن کی بیعت قبول نہیں کی تو وہ خفیہ آپریشنز کے ذریعے اُس پر دباؤ بناتے ہیں اور اگر پھر بھی کامیابی حاصل

نہ ہو تو اُس علاقے کو تباہ و برباد کردیتے ہیں ، جس کی حالیہ مثال اطاعت نہ کرنے پر
دریائے دجلہ کے کنارے پر واقع سنی اکثریتی قصبے زوویا کو بموں سے اڑا دینے والی
کاروائی ہے ۔اِس گاؤں کی تباہی کی تصاویر داعش خود نیٹ پر جاری کیں ہیں جس میں پورا
گاؤں ملبے کا ڈھیر نظر آرہا ہے، ساتھ ہی داعش نے یہ پیغام بھی جاری کیا ہے کہ اُس کا
حکم نہ ماننے والوں کا ایسا ہی انجام ہوتا ہے۔
داعش ایسے علاقوں کے فتح کرنے کو ترجیح دیتا ہے جو قدرتی ذخائر سے مالامال ہوں کہ
جن میں سب سے پہلی ترجیح تیل کی دولت سے مالامال علاقے ہیں، یہ حربہ داعش کو
مالی طور مضبوط بنانے کے علاوہ اُس کے حریفوں کو ناتواں بنانے میں کافی مدد دیتا ہے۔
شام اور عراق کے مختلف شہروں پر قبضے کے بعد داعش نے "مال غنیمت" کے نام پر
بڑے پیانے پر لوٹ مار اور قتل وغارت گری کی ہے، جس کے بعد اب اُس کے اثاثے
چار ارب ڈالر سے تجاوز کرچکے ہیں، یہ تمام رقم اسلحہ کے حصول اور جنگجوؤں کی تیاری
صرف کی جارہی ہے، یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ سعودی عرب، کویت اور قطر کے
پرائیویٹ ڈونرز داعش کی مالی مدد کرتے ہیں، تاہم چونکہ ایک بڑے رقبہ پر اُس کا قبضہ
ہے اِس لئے یہاں کی ساری سرکاری مشینری اور وسائل داش کے پاس آگئے
ہیں، جو اُس کی آمدن کا ایک بڑا ذریعہ ہے، علاوہ ازیں مسلح تصادم کے وقت انہوں نے
کئی بینکوں سے اربوں ڈالرز اپنے

قبضے میں لے لئے تھے، صرف موصل کے بینک سے 400 ملین ڈالرز کیش ملا، مقامی
بزنس پر اُس کا کنٹرول ہے، ٹیکسوں کا نظام بھی ہے، تیل سے بھی آمدن ہو رہی ہے،
شمالی شام میں یہ تیل اور بجلی کی فروخت سے آمدن حاصل کرتا ہے، شمالی عراق میں
سرکاری فوجوں سے بھاری مقدار یں ٹینک، آرٹلری، چھوٹے ہتھیار مال غنیمت کے
طور پر حاصل کئے گئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آج لوٹ مار کے نتیجے میں حاصل کردہ
دولت کی بنیاد پر داعش کو دنیا کا امیر ترین جنگجو گروپ قرار دیا جارہا ہے اور داعش کے
اثاثے صومالیہ، الجزائر، افغانستان اور دنیا کے دیگر خطوں میں موجود شدت پسندوں
کے کل اثاثوں سے تجاوز کر گئے ہیں، چونکہ داعش نے طاقت کے ذریعے عراق اور شام
کے درمیان اپنا نیٹ ورک مضبوط کرلیا ہے، جس کی وجہ سے دنیا کے دیگر خطوں سے
تعلق رکھنے والے عسکریت پسند اِسے ایک محفوظ ٹھکانے کے طور پر دیکھ رہے ہیں اور ان
کا رخ اب انہی علاقوں کی طرف ہو رہا ہے۔
گو مغربی میڈیا داعش کو سنی عسکریت پسند تنظیم کا نام دیتا ہے مگر حقیقت میں داعش
خارجی عقائد پر مبنی سلفی انتہا پسند دہشت گرد تنظیم ہے، جس کی آبیاری امریکہ اور اُس کے
حواریوں نے کی ہے، امریکی خفیہ ادارے سی آئی اے کے باغی سابق اہلکار ایڈورڈ
اسنوڈن کا کہنا ہے کہ دولت اسلامی شام و عراق کے سربراہ ابو بکر البغدادی امریکہ اور
اسرائیل کا ایجنٹ ہے اور سی آئی اے اور

برطانیہ کے انٹیلی جنس ادارے نے بدنام زمانہ اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد کے ساتھ مل کر ایک دہشت گرد تنظیم بنائی جو کہ دنیا بھر کے شدت پسندوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے اور اس پالیسی کو " دی ہارنیٹز نیسٹ " کا نام دیا گیا۔ایڈ ورڈ اسنوڈن کہتا ہے کہ اس پالیسی کا مقصد تمام دنیا کیلئے بڑے خطرات کو ایک جگہ اکٹھا کرنا تھا تاکہ انھیں ایک جگہ سے کنٹرول کیا جاسکے اور عرب ممالک میں انتشار پھیلایا جاسکے۔ اسنوڈن کہتا ہے کہ ابو بکر البغدادی کو اسرائیل کی خفیہ ایجنسی موساد کے ذریعے سے انتہائی سخت فوجی تربیت دلوائی گئی اور اِس کے ساتھ ساتھ بولنے میں مہارت کی تربیت بھی دی گئی تاکہ وہ دنیا بھر کے دہشت گردوں کو اپنے بیان سے متاثر کرسکے، اسنوڈن کا یہ بھی کہنا تھا کہ تینوں ممالک کے نزدیک صیہونی ریاست کی حفاظت کیلئے اسرائیل کی سرحدوں کے قریب ایک دہشت گرد تنظیم ضروری ہے۔

کینیڈین تھنک ٹینک گلوبل ریسرچ اپنی رپورٹ میں دعویٰ کرتی ہے کہ داعش کو امریکہ نے اپنے مقاصد کیلئے کھڑا کیا ہے اور اِس کے جنگجوؤں کو سب سے پہلے امریکہ نے ہی اردن کے میدانوں میں گوریلا جنگ کی تربیت دلوائی تھی،علاوہ ازیں برطانوی حکومت منی ٹرکس شام میں باغیوں کو Toyota کے x4 نے خصوصی طور پر برطانیہ سے جو 4 بھیجے تھے وہ بھی داعش کے جنگجوؤں کے استعمال میں ہیں، رپورٹ کے مطابق ایک خاص حکمت عملی کے تحت داعش کے جنگجوؤں کیلئے موصل

تکریت، باقوبہ، فلوجہ، الانبار اور ملحق علاقوں پر قبضے کی راہ ہموار کی اور عراقی فوج باقاعدہ حکمت عملی کے تحت پسپائی کی ہدایت کی گئی تاکہ داعش جنگجوؤں کو سرکاری فوج کے زیر استعمال انتہائی جدید امریکی اسلحہ، میزائل، راکٹس اور بکتر بند گاڑیاں ہاتھ لگیں۔ جبکہ وائس آف رشیا کی رپورٹ داعش کو CIA کی پیداوار قرار دیتے ہوئے سوال اٹھاتی ہے کہ داعش کی کاروائیوں پر امریکی افواج ایکشن کیوں نہیں لیتی ہے۔؟ ایک آن لائن امریکی جریدے Living Like Country اپنے تجزیئے میں انکشاف کرتا ہے کہ داعش کے خود ساختہ خلیفہ ابوبکر البغدادی CIA کی دعوت پر امریکہ جاچکا ہے، امریکی تجزیہ نگار برنی زیبارٹ لکھتا ہے کہ 2005ء میں ابوبکر البغدادی کو یوایس اسپیشل فورسز نے عراق سے گرفتار کرکے نامعلوم مقام منتقل کیا تھا اور 2009ء تک امریکی تحویل میں رہا، لیکن اس بات کی قوی شہادتیں موجود ہیں اس دوران ابوبکر البغدادی کو عراق کے بجائے نیویارک میں آزادانہ نقل وحرکت کرتے ہوئے دیکھا گیا، جس کا صاف مطلب تھا کہ بغدادی پر ہاتھ رکھدیا گیا ہے۔ ایک عرب تجزیہ نگار ڈاکٹر نفیس احمد کی رائے میں امریکی سرپرستی میں داعش کی تشکیل کا کام 2005ء میں شروع ہوا، جب عراق میں فرقہ واریت کو پنپنے کا موقع دیا گیا، اِس مقصد کیلئے عراق اور ملحق خطے میں ایسا ماحول قائم کرنا تھا مسالک باہمی لڑائیوں کے ذریعے مشرق وسطٰی اور بالخصوص عراق کی سرحدوں

کو تبدیل کرکے تیل کی سپلائی کو مستقل اور آسان بنایا جائے۔اسی امریکی پلان کے مطابق آزاد کردستان ریاست کی راہ ہموار کی جاچکی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ داعش ہو، تحریک طالبان پاکستان یا کوئی اور خارجی عقائد پر مبنی انتہا پسند گروہ، سب کا مقصد ایک ہی ہے کہ طاقت اور قبضے کے زور پر اپنے عقائد باطلہ کو نافذ کیا جائے اور اہلسنّت وجماعت سمیت دیگر مکتبہ فکر کے لوگوں کو اپنے زیر نگیں لایا جائے یا پھر اُن کا خاتمہ کردیا جائے۔اس بات کی تائید گذشتہ دنوں داعش کی جانب سے جاری ہونے والے اُس 10 نکاتی ایجنڈے سے بھی ہوتی ہے جو اُس نے عراق میں اپنے زیر کنٹرول علاقوں کیلئے جاری کیا ہے، یہ 10 نکاتی لائحہ عمل داعش کی شدت پسندی، مذموم اہداف ومقاصد اور مستقبل کے لائحہ عمل کی واضح نشان دہی کرتا ہے۔دوسری جانب داعش نے اپنے پانچ سالہ منصوبے کے طور پر ایک نقشہ بھی جاری کیا ہے جس کے مطابق اگلے پانچ برسوں کے دوران نقشے میں سیاہ رنگ میں دکھائے گئے دنیا کے مختلف علاقے مسلم خلافت کے زیر کنٹرول ہوں گے۔اِس منصوبے کے مطابق پاکستان، ایران، مشرق وسطیٰ کے عرب ممالک، افریقہ کے عرب ممالک حتیٰ کہ بعض یورپی ممالک بھی اسلامی خلافت میں شامل ہوں گے۔ عراق میں اسلامی ریاست کے قیام کے اعلان میں کہا گیا ہے کہ ابوبکر البغدادی تمام دنیا کے مسلمانوں کے حکمران ہیں۔ابوبکر البغدادی کی سربراہی میں داعش نے اپنے جس مذموم ایجنڈے کا اعلان

کیا ہے اُس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ داعش تمام مقامات مقدسہ کو مسمار کر دے گی، علاوہ ازیں داعش نے سعودی عرب کے حوالے سے اپنے خوفناک عزائم کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے وہ سعودی عرب پر قبضے کے بعد خانہ کعبہ کو بھی (نعوذ باللہ) مسمار کر دیں گے۔

قارئین محترم! تکفیری دہشتگردوں کے ظلم کی داستانیں نئی نہیں ہیں، پاکستان سے لے کر شام اور نائجیریا اور افریقہ تک اِن خارجی حیوانوں کے انسانیت سوز مظالم کی داستانیں گردش کر رہی ہیں، لوگوں کو ذبح کرکے اُن کا کلیجہ چبانا، گلے کاٹ کر سروں سے فٹبال کھیلنا، خواتین کی عصمت دری کرنا وغیرہ اِس خارجی تکفیری گروہ کی شناختی علامات ہیں، عراق میں بھی اِس خارجی تکفیری گروہ نے یہی کچھ کیا ہے ،ایک برطانوی اخبار ڈیلی میل کے مطابق اِس تکفیری خارجی دہشتگرد گروہ نے عراق میں اپنے زیر تسلط علاقوں کے عوام سے یہ مطالبہ کیا ہے اِن علاقوں میں رہنے والے عوام اپنی لڑکیاں مجاہدین کی جنسی تسکین کیلئے پیش کریں، حکم نہ ماننے والوں کو سنگین نتائج کی دھمکی دی گئی ہے، جبکہ اِس سے پہلے شام میں بھی اِس خارجی گروہ نے اسی خباثت، درندگی اور بے شرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لاتعداد سنی مسلمان بچیوں کی عزت لوٹ لی تھی، اِس بے غیرتی کا نام اُن لوگوں نے "نکاح الجہاد" رکھا ہے، شروع میں اِس تکفیری خارجی گروہ کے ہمدردوں نے اِن خبروں کو جھٹلانے کی کوشش کی تھی لیکن

اب یہ خبریں تمام ذرائع ابلاغ میں شائع ہو کر دنیا کے سامنے آچکیں ہیں یہاں تک کہ سعودی میڈیا نے بھی تسلیم کر لیا ہے کہ شدت پسند وہابی علماء "نکاح الجہاد" کی اجازت دے رہے ہیں اور اِس چکر میں بے غیرت اور بے حیا ماں باپ اپنی لڑکیوں کو زبردستی تکفیری دہشتگردوں کے آگے پیش کر رہے ہیں۔

دوسری طرف حال ہی میں دہشت گرد گروہ داعش نے انٹرنٹ پر تصاویر شائع کی ہیں جن میں عراق اور شام کے مختلف علاقوں میں حضرت یونس علیہ السلام اور حضرت شیت علیہ السلام کے مزارات کی شہادت اور صحابہ کرام حضرت عمار یاسر، حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہم اور اولیا اللہ کے مزارات کو تباہ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے اور متعدد سنی صوفی اور شیعہ مساجد اور گرجا گھروں کو منہدم کر دیا گیا ہے۔اِن سنی صوفی مزارات اور مساجد و گرجا گھروں کی تباہی سے اِس تاثر کو مزید تقویت ملی ہے کہ عراق اور شام میں ہونے والی تکفیری خارجی دہشت گردی جس میں سلفی اور دیوبندی انتہا پسند شامل ہیں کو امن پسند سنی مسلمانوں سے نہیں جوڑا جا سکتا، یہ عالم اسلام اور اہلسنّت کے خلاف ایک منظم عالمی استعماری سازش ہے۔ گو اِس دہشت گرد گروہ داعش کی حمایت کرنے والے قائدین یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اِس گروہ کی تشکیل کا مقصد اسلامی ممالک بالخصوص شام اور عراق میں شریعت خلافت اسلامیہ کے دور کو دوبارہ لوٹانا ہے مگر اِن کے قول و عمل میں مکمل تضاد پایا جاتا ہے اور اِن کے وحشیانہ اعمال

کا نتیجہ یہ ہوا کہ امن اور صلح پسند دین کا چہرہ دنیا کی نظروں میں مخدوش ہو کر رہ گیا ہے، جسے بہانہ بنا کر اسلام مخالف اور صیہونی عناصر اسلام کو بدنام کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ عالم اسلام کے معروف عالم دین ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے ابو بکر بغدادی الشلفی کی خلافت کو باطل قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ " ایک دہشت گرد گروہ داعش " کی جانب سے اسلامی خلافت کا اعلان دین اسلام کے اہداف سے سازگار نہیں ہے۔" داعش " دہشت گردوں کی خلافت ہے جو شرعی لحاظ سے باطل ہے،اُن کا کہنا تھا کہ عراق میں آئی ایس یا داعش کی خلافت شرعی طور پر باطل ہے اور داعش گروہ کے وحشیانہ اور بھیانک اقدامات عراق اور شام کے مسلمانوں خاص طور پر اہلسنت پر منفی اور خطرناک اثرات مرتب کریں گے۔" واضح رہے کہ داعش نے عراق کے شہر موصل پر قبضہ کرنے کے بعد ابو بکر البغدادی الشلفی کی خلافت کا اعلان کیا تھا اور تمام مسلمانوں کو اِس کی خلافت قبول کرنے کا حکم دیا، لیکن عراق کے سنی مسلمانوں نے تکفیری وہابی و دیوبندی دہشت گردوں کے نام نہاد خلیفہ کو پہلے ہی رد کر دیا تھا اور وہ عراقی فوج اور دیگر مسلمانوں کے ساتھ ملکر تکفیری خوارج دہشت گردوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے ہیں۔

اُمر واقعہ یہ ہے کہ امریکی سامراج نے ایک بار پھر عراق کو آگ میں جھونک دیا ہے اور عراق میں پر تشدد سیاست اور مرکزیت کے پارہ پارہ ہونے کی الم ناک داستان ایک نئے انسانی المیے کی طرف بڑھتی نظر آتی ہے۔ماضی میں اقوام متحدہ اور عالمی توانائی ایجنسی "آئی اے۔ ای اے" کے معائنہ کاروں کی تردید کے باوجود 2003ء میں امریکہ بہادر کا کیمیائی، حیاتیاتی اور وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی موجودگی کو جواز بنا کر عراق پر حملہ کے تین مقصد یعنی "وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی تباہی، صدام حسین کی آمریت کی جگہ سلطانی جمہور کے نظام کا قیام اور ملک کو امن وامان کا گہوارہ بناتے ہوئے دنیا کو عراق سے لاحق خطرات سے محفوظ رکھنا۔" بیان کیے گئے تھے۔ یہ تین بنیادی مقاصد اُس وقت کے عراق کیلئے امریکی ناظم الامور مسٹر پال بریمر نے نیویارک میں ایک نیوز کانفرنس میں بیان کیے تھے، کم وبیش یہی اعلانات اور دعوے اُس وقت کے امریکی صدر جارج ڈبلیو بش جونیئر کے بھی تھے، عراق میں وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار تو تھے ہی نہیں، اِس لیے اُن کا قصہ ہی ختم، تاہم صدام حسین کا قصہ تمام کردیا گیا۔ مگر جمہوریت۔؟ آج گیارہ سال بعد کا عراق صدام حسین کے پر امن اور متحدہ عراق سے کہیں زیادہ خوفناک، پرخطر، تباہ کن اور دہشت گردی کا مرکز بن چکا ہے۔ ہوسکتا ہے امریکہ کی نظر میں صدام حسین کی آمرانہ حکومت کا کوئی جواز نہیں ہو، مگر وہ نوری المالکی اور حامد کرزئی کی طرح کٹھ پتلی نہیں تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ امریکہ کسی بھی صورت میں متحدہ عراق کا خواہاں نہیں ہے اور عراق
کی تقسیم خود امریکہ کی سازش ہے، امریکی تجزیہ نگار بھی یہ بات تسلیم کرنے لگے ہیں کہ
عراق کو تقسیم سے دوچار کرنے کے لیے حالات کی سازگاری میں واشنگٹن کا کلیدی کردار
ہے، البتہ خطے کے بعض ممالک اپنی غلط پالیسیوں اور اپنے اپنے مفادات کے باعث جلتی
پر تیل ڈال رہے ہیں، دوسری جانب اِس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ پانچ لاکھ سے
زائد عراقیوں کا خون بہانے میں جتنا ہاتھ امریکیوں کا ہے اتنا ہی اُس کے پروردہ دہشت
گرد خارجی گروپوں کا بھی ہاتھ ہے، موجودہ تناظر میں عراق کے موجودہ بحران سے
باخبر لوگ نہایت خطرناک پیشن گوئیاں کررہے ہیں اور داعش نے عراق کے بہت
بڑے علاقے پر کنٹرول حاصل کرنے کے بعد وہاں ایک نام نہاد خارجی فکر پر مبنی خلافت
کا اعلان کردیا ہے، جو عراقی اکثریت کیلئے کسی طور قابل قبول نہ ہوگا، چنانچہ اِس صورت
حال میں عراق کی تقسیم کا امکان نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

غزہ زندہ رہے گا۔۔۔۔۔۔

صہیونی درندگی اور حماس کی تاریخ ساز مزاحمت
اسرائیل نے حماس کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔۔۔۔۔
عجب کشمکش میں مبتلا ہوں کہ غزہ میں اسرائیل نے جو کچھ کیا، اُسے کیا نام دیا جائے، صہیونی ظلم و بربریت کہا جائے، محصور فلسطینیوں کی نسل کشی قرار دیا جائے، حقوق انسانی کی توہین وتذلیل کہا جائے، بین الاقوامی اصولوں کی خلاف ورزی کہا جائے، مہذب دنیا کی بے حسی، چشم پوشی یا سنگدلی مانا جائے، عالم اسلام کی کمزوری کہا جائے یا پھر اُمت مسلمہ کی بے بسی سے تعبیر کیا جائے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ اِس المناک سانحے کی بے شمار جہتیں اور لاتعداد زوایئے ہونے کے باوجود یہودی بغض وعداوت، نفرت وعناداور دین اسلام سے رنجش و کدورت کے جذبے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ دوہرے معیار اور دوغلے کردار کے کریہہ اور مکروہ جال میں جکڑی ہوئی پوری غیر مسلم دنیا اور منافقانہ وغلامانہ کردار کی حامل مسلم قیادتوں کی خاموش رضا مندی میں امریکی آشیرباد اور اقوام متحدہ کی معاونت کے ساتھ صلیبیوں کی ناجائز اولاد اسرائیل غزہ میں خوں آشام کھیل کھیلنے میں مصروف رہا، غزہ میں 8 جولائی سے جاری اسرائیلی

حملوں میں کم وپیش 2500 سے زائد فلسطینی شہید اور نو ہزار سے زائد زخمی ہوئے، شہید ہونے والوں میں زیادہ تعداد کم عمر بچوں کی تھی۔ اسرائیلی حملوں نے غزہ کی آبادی کو راکھ کا ڈھیر بنادیا، مساجد، ہسپتال، اسکولز، پولیس اسٹیشن، سرکاری دفاتر، صنعتی ادارے، ہوٹل اور مارکیٹیں اسرائیلی بمباری سے تباہی وبربادی کا منظر پیش کر رہے ہیں، ایک تہائی غزہ کھنڈر میں تبدیل ہوچکا ہے، اِس جنگ کے دوران غزہ میں ایک قیامتِ صغریٰ برپا رہی، گلیاں اور بازار لاشوں سے اَٹے نظر آئے اور تدفین کیلئے قبرستان تنگ پڑگئے۔

مگر ڈیڑھ ماہ سے زائد عرصے پر محیط اِس جنگ میں اسرائیل دنیا کی سب سے بڑی اوپن جیل غزہ کے محصور باشندوں کی ہمت وحوصلے اور جذبہ ایمانی کو فتح کرنے اور حماس کو قابل ذکر نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہوسکا اور بالآخر قاہرہ میں اسرائیل اور حماس کے درمیان طے پانے والے طویل المدتی معاہدے "غزہ میں آمدورفت کے راستے کھولنے، فشنگ زون غزہ کے ساحل تک بڑھانے، مصر اور غزہ کے درمیان سرحد کھولنے اور غزہ کی تعمیر نو سمیت دیگر تصفیہ طلب معاملات مزاکرات سے حل کرنے" پر آمادگی ظاہر کرتے ہوئے اُس نے حماس کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔ مرکز اطلاعات فلسطین کے مطابق اسلامی تحریک مزاحمت حماس نے اسرائیل کے ساتھ مستقل جنگ بندی معاہدے کی توثیق کرتے ہوئے کہا کہ یہ معاہدہ فلسطینی قوم کی امنگوں اور شرائط کے عین مطابق کیا گیا ہے، جنگ بندی

کا معاہدہ فلسطینی قوم کی فتح اور نصرت کی علامت ہے، حماس کے ترجمان کا کہنا تھا کہ ہم نے غزہ کی پٹی میں حملہ آور دشمن فوج کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا اور جنگ بندی معاہدے کی کامیابی فقط غزہ کی راہ_داریوں کے کھولنے جانے تک محدود نہیں بلکہ یہ جنگ بندی بیت القدس اور ارض فلسطین کی آزادی کی بھی راہ ہموار کرے گی،ترجمان نے کہا کہ ہم نے اسرائیلی جارحیت کا جواب بھی طاقت سے دیا اور پوری قوت کے ساتھ جنگ بندی معاہدے میں اپنی شرائط بھی تسلیم کرائی ہیں،اِس معاہدے کے بعد ہم بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کے زیادہ قریب ہوگئے ہیں۔حماس کے سیاسی رہنماء موسیٰ ابو مرزوق نے معاہدے کو مزاحمت کی فتح قرار دیا جبکہ اِس شرمناک ہزیمت پر اسرائیل کی جانب سے تاحال کوئی بیان سامنے نہیں آیا۔

دوسری جانب اسرائیلی فوجی ترجمان نے ایک ٹویٹ میں دعویٰ کیا کہ انھوں نے اپنے مطلوبہ اہداف حاصل کر لیے، لیکن حماس کے ترجمان کہتے ہیں کہ اسرائیل غزہ میں 100 فیصد ناکام رہا ہے۔حماس کے دعوئے کی تصدیق اسرائیلی وزیر انصاف زیپی لیونی کے اُس اعترافی بیان سے ہوتی ہے جس میں دوران جارحیت اعتراف کیا گیا کہ اسرائیل کو سنگین حالات اور بڑے پیمانے پر جانی اور مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑا،اسی طرح اسرائیلی وزیر سیاحت عوزی لانڈو کہتے ہیں کہ اسرائیلی فوج اپنے مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے اور ہم غزہ کی پٹی میں ایک

اسٹریٹیجک معرکہ میں ہار چکے ہیں۔اَمر واقعہ یہ ہے کہ اسرائیلی فوج نے غزہ پر زمینی، فضائی اور بحری حملے کئے لیکن وہ حماس کا زور توڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکا، بلکہ اِس جارحیت میں اُس کو بھاری بھر کم جنگی اخراجات اور معاشی نقصان بھی اٹھانا پڑا۔رہا جنگی کامیابی کا معاملہ تو اِس حوالے سے خود اسرائیلی فوج کے ایک اعلی عہدیدار نے اعتراف کیا کہ اگر اُن کی پیادہ اور آرمڈ انفنٹری کو اسرائیلی فضائیہ کے ایف سولہ، ایف پندرہ طیاروں سمیت ہیل فائر میزائلوں سے لیس جاسوسی طیاروں کا کور حاصل نہ ہوتا تو وہ غزہ میں ایک ملی میٹر بھی اندر جانے کی جرات نہ کرتے۔ایک اور فوجی عہدیدار کے بقول اگر ہمیں فضائی مدد حاصل نہ ہوتی تو غزہ سے ہمارا ایک بھی فوجی زندہ سلامت واپس نہ آتا۔اسرائیل کی مشہور متعدد ویب" پورٹلز" نے اسرائیلی فوجی افسر کا یہ بیان جلی سرخیوں میں شائع کیا کہ پیادہ اسرائیلی فوج کے غزہ میں داخلے سے پہلے ایف سولہ اور ایف پندرہ طیاروں نے ڈھائی سو کلو گرام سے لے کر ایک اور ڈیڑھ ٹن وزنی بم برسا کر غزہ کی عمارتیں تباہ کیں، یہ عمارتیں اسرائیل اور غزہ سرحد پر واقع تھیں۔اخباری رپورٹ کے مطابق غزہ پر 20 ہزار ٹن بارود کی بارش کی گئی مگر اتنے بڑے پیمانے پر بمباری کے بعد بھی پیدل فوج کے سورماؤں نے اِس خوف سے غزہ کے علاقے میں پیش قدمی نہیں کی کہ کسی زیر زمین سرنگ سے" القسام بریگیڈ "کا کوئی مجاہد نکل کر انہیں ہلاک نہ کر دے، انہیں مسلح فلسطینی مزاحمت کاروں کی جانب سے بچھائی جانے والی سرنگوں کی موجودگی کا

اِس قدر خوف تھا کہ اسرائیلی ٹینک تین میٹر کا فاصلہ تین تین گھنٹوں میں طے کرتے تھے۔

دوسری جانب اسرائیلی میڈیا نے بھی غزہ میں فوجی ناکامی کو آڑے ہاتھوں لیااور سوال اٹھایا کہ آخر اسرائیلی انٹیلی جنس حماس جنگجوو_ں کے الاقصیٰ اور عزالقسام بریگیڈ کی عسکری مہارت اور جنگی حکمت عملی کا درست اندازہ لگانے میں کیوں ناکام رہی؟ ٹائمز آف اسرائیل کے عسکری نامہ نگار ایوی شاو_ل کا کہنا تھا کہ اسرائیلی فوج اور انٹیلی جنس جنگی حکمت عملی بنانے میں ناکام رہیں اور اُن کا مرکزی ہدف عوامی مار کیٹیں، گھر، مساجد اور تعلیمی ادارے تھے، جہاں حماس کے جنگجوو_ں کے بجائے عام فلسطینی نشانہ بنے۔اسرائیلی جریدے یروشلم پوسٹ کے مطابق حماس کے اعلیٰ کمانڈرز اور رہنماو_ں کو قتل کرنے کیلئے بنائی جانے والی ٹاسک فورس ایک بھی حماس رکن یا کمانڈر کو گرفتار یا ہلاک کرنے میں ناکام رہی۔ صہیونی دفاعی تجزیہ نگار پروفیسر اوری یار یوسف نے حماس کے مقابلے میں اپنے ملک کی جنگی صلاحیت پر شبہات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہمیں ڈر تھا کہ غزہ میں آپریشن میں حماس کے ہاتھوں صہیونی فوج کو بدترین شکست کا سامنا نہ کرنا پڑے، کیونکہ فوج زمینی کارروائی کی متحمل نہیں تھی۔اسرائیلی اخبار یدیعوت احرونوت میں شائع ہونے والے تجزیہ میں بتایاگیاکہ غزہ جنگ کے بعد اسرائیلی فوج کی دفاعی صلاحیت بری طرح متاثر

ہوئی اور فوج کا رعب کم ہوا ہے، ہماری فوج نہ صرف حماس کو شکست دینے میں ناکام
رہی ہے بلکہ ہمیں تو یہ خوف تھا کہ حماس کے خلاف جنگ میں ہماری فوج تباہی سے
دوچار نہ ہو جائے۔
اسی طرح دفاعی تجزیہ نگار ولنے جہاں اسرائیلی فوج کی جنگی صلاحیت میں کمزوری کا
اعتراف کیا، وہیں فلسطینی تنظیموں بالخصوص حماس کی عسکری صلاحیت کو بھی تسلیم کرتے
ہوئے کہا کہ ہمیں اِس طویل جنگ کے بعد یہ بات مان لینی چاہیے کہ ہماری فوج حماس
کے مقابلے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور اِس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ
ہماری دفاعی اور فوجی صلاحیت کے بارے میں جو خیالات اِس سے پہلے ظاہر کیے جاتے
رہے ہیں وہ سب غلط تھے۔ حماس کے مقابلے میں اسرائیلی فوج کی ناکامی کا اندازہ اِس اَمر
سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ حماس نے اپنے معمولی ہتھیاروں کی مدد سے ہمارے تمام
شہروں کو ہلا کر رکھ دیا اور ہمارے فوجی اور عام شہریوں کو راکٹ حملوں کے ذریعے
کامیابی سے نشانہ بنایا۔ حماس کی یہ بھی بڑی کامیابی ہے کہ اُس نے مقامی سطح پر ایسے
راکٹ تیار کر لیے ہیں جو اسرائیل کے تمام شہروں تک مار کرنے کی صلاحیت رکھتے
ہیں۔ حالیہ آپریشن میں اسرائیل کی جانب سے یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ حماس کی
آپریشنل صلاحیتوں کو نقصان پہنچایا گیا، کمانڈ سنٹرز کو تباہ کیا گیا، حماس نے اسرائیل میں
حملے کرنے کیلئے جو سرنگیں بنائی گئی

تھیں، انھیں تباہ کردیا گیا اور حماس کے سینکڑوں جنگجوؤں کو ہلاک کردیا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ حماس کا راکٹوں کا ذخیرہ بھی ختم کردیا گیا ہے۔

لیکن غزہ کی پٹی سے ایک مرتبہ پھر راکٹ حملوں نے یہ ثابت کردیا کہ اسرائیل کی ڈیڑھ ماہ کی مسلسل بمباری کے باوجود فلسطینی مزاحمت کار پر عزم رہے اور مزاحمت کاروں کا انفراسٹرکچر تباہ کرنے اور اُن کی کمر توڑنے کے اسرائیلی دعوے بے بنیاد ثابت ہوئے۔ اسرائیل سمیت دنیا بھر کیلئے یہ اَمر بھی باعث حیرت رہا کہ فلسطینی مزاحمت کاروں کو اسرائیلی فوج کے حملوں کا ذرا بھر خوف نہیں تھا، وہ پوری آزادی اور بے باکی کے ساتھ اسرائیلی کالونیوں پر راکٹ حملے کرکے یہ ثابت کرتے رہے کہ فلسطینی مزاحمتی طاقت اب بھی مضبوط ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے واشنگٹن پوسٹ نے لکھا کہ حماس کو غیر مسلح کرنا ابھی بہت دور کی بات ہے اور فی الحال اسرائیل کے عقابوں کو مصالحت کی ضرورت کو تسلیم کرنا ہوگا۔ ہفنگٹن پوسٹ کا بھی ماننا تھا کہ اسرائیل غزہ میں لڑائی ہار گیا ہے، اخبار کے مطابق یہ شکست اُسی وقت ہو گئی تھی جب اسرائیل کے پہلے میزائل یا گولے نے ایک گھر کو تباہ کیا اور بہت سی خواتین اور بچوں کو ہلاک کردیا، ایک اسرائیلی صحافی عامرہ ہاس کہتی ہے کہ "اسرائیل کی اخلاقی شکست برسوں تک اُس کا پیچھا کرتی رہے گی۔"

دوسری جانب وقت غزہ پر ہونے والی وحشیانہ جارحیت کے مستقبل کے حوالے سے
اسرائیلی فوج اور حکومت میں بھی واضح تقسیم نظر آ رہی ہے، اسرائیلی وزیراعظم بنیامن
نیتن یاھو کی انتہا پسند کابینہ کی خواہش تھی کہ غزہ کی پٹی پر مستقل قبضہ کر لیا جائے اور
علاقے کے تمام اہم مقامات پر فوج تعینات کر دی جائے، لیکن فوج نے کابینہ کو بتایا کہ
غزہ کی پٹی پر مستقل قبضہ اتنا آسان نہیں جتنا حکومت نے سوچ رکھا ہے، رپورٹ کے
مطابق محکمہ دفاع، فوج اور دیگر سیکیورٹی اداروں کی جانب سے غزہ پر مستقل قبضے کے
مضمرات کے حوالے حکومت کو بتایا گیا کہ غزہ کی پٹی پر ایک مرتبہ پھر سے قبضہ نہایت
مشکل اور اسرائیل کیلئے تباہ کن ثابت ہوگا، کیونکہ غزہ کے تمام مقامات تک فوج کا
کنٹرول قائم کرنے کیلئے پانچ سال کا عرصہ لگے گا،اِس عرصے میں اسرائیلی فوج کو کم سے
کم 20 ہزار فلسطینی گوریلا جنگجوؤں کو ختم کرنا ہوگا اور نتیجے میں اسرائیل کو اپنے
ہزاروں فوجیوں اور سویلینز کی قربانی بھی دینا ہوگی۔
اِن رپورٹس میں یہ بھی بتایا گیا کہ سینکڑوں اسرائیلی فوجی بھی اغواء کیے جا سکتے
ہیں، ساتھ ہی فلسطینی شہریوں کی ہلاکتوں میں غیر معمولی اضافہ اسرائیل کو عالمی برادری
میں مزید تنہا کردے گا، صرف یہی نہیں بلکہ اسرائیل کو غزہ کی پٹی میں دھماکہ خیز مواد
تلف کرنے اور بارودی سرنگوں اور زمین دوز بنکروں کے خاتمے میں بھی بھاری قیمت
چکانا ہوگی اور اگر فلسطینیوں نے اسرائیل کے

خلاف مسلح بغاوت شروع کردی تو اُس کے نتیجے میں فلسطین کے چپے چپے پر آباد کیے گئے یہودی آباد کاروں کی جانیں خطرے میں پڑ جائیں گی،اس لیے حکومت غزہ کی پٹی کے تمام علاقوں میں فوج داخل کرنا اور مستقل قبضہ چاہتی ہے تو اُسے یہ تمام حالات سامنے رکھنا ہوں گے۔ ذرائع یہ بھی بتاتے ہیں کہ سیکیورٹی اداروں کی حقائق پر مبنی رپورٹس کے بعد صہیونی کابینہ خوف کا شکار ہو کراس مخمصے میں مبتلا رہی کہ آیا وہ غزہ کی پٹی کے مستقبل کے حوالے سے کیا فیصلہ کرے اور یوں کابینہ میں دیکھا جانے والا مستقل قبضہ ایک ڈراؤنا خواب بن کر رہ گیا،اَمر واقعہ یہ ہے کہ جنگ کے دوران دنیا نے غزہ کی تباہی کی جو تصویر دیکھی، وہ اسرائیلی فوجی شکست اور بہادر فلسطینی مزاحمت کاروں کی کامیابی کے ساتھ غزہ کے زندہ ہونے کا بین ثبوت ہے۔

بھارتی آبی جارحیت اور ہماری ناقص حکمت عملی۔۔۔۔

تقریباً ساڑھے تین سو سال قبل مسیح کی بات ہے جب کوٹلیہ چانکیہ نے ہندوستان کے بادشاہوں کو حکومتی اسرار رموز سکھانے کیلئے ایک کتاب "ارتھ شاستر" لکھی، یہ کتاب جھوٹ، مکر وفریب، منافقت، دھوکہ دہی، دغا اور چالبازی کے گُروں پر مبنی ہے، منافقت، مکروفریب اور دغابازی کے اصولوں پر مبنی یہ کتاب صدیاں گزرنے کے بعد آج بھی بھارتی سیاست کا مزکر و محور ہے، بھارت کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے لے کر موجودہ وزیر اعظم نریندر مودی تک ہر بھارتی حکمران ہمیں چانکیائی سیاست پر پوری طرح عمل پیرا نظر آتا ہے۔چانکیہ کی کتاب ارتھ شاستر کا ایک اصول ہے کہ "دشمن کو کبھی اعتماد میں نہ آنے دو، کہو کچھ، کرو کچھ، جب دباؤ آئے، تو وعدہ کرلو، جب دباؤ ہٹے، تو مکر جاؤ۔" چانکیہ کا یہ منافقانہ گر بھارت کی سیاسی اور خارجہ پالیسی کی اصل بنیاد واساس ہے، قیام پاکستان سے لے کر آج تک ایسے بے شمار مواقع آئے جب بھارت کے بڑے بڑے لیڈروں نے پاکستان کے ساتھ مسائل کے حل کے اعلانات اور وعدے کئے، لیکن بعد میں اپنی کمٹمنٹ سے مکر گئے،اَمر واقعہ یہ ہے کہ بھارت جو اعلان کرتا ہے، ا_±س سے بھاگ جاتا ہے، جو وعدہ کرتا ہے، اس سے مکر جاتا ہے اور جو معاہدے کرتا ہے، اسے خود ہی توڑ دیتا ہے، 67 سالہ

تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات ہیں جو بھارت کی دوغلی پالیسی کے آئینہ دار ہیں۔
سر دست ہم 1961-61 کے سندھ طاس معاہدے کی بات کرتے ہیں جس کے تحت بھارت اِس اَمر کا پابند ہے کہ پاکستان کو ممکنہ سیلابی خطرے سے پیشگی آگاہ کرے، مگر ماضی کی طرح ایک بار پھر بھارت نے پاک بھارت دوستی کی بحالی کے بلند بانگ دعوؤں اور اعتماد سازی کی یقین دہانیوں کے باوجود انتہائی منفی کردار ادا کرتے ہوئے دریائے چناب اور ستلج میں پیشگی اطلاع دیئے بغیر سیلابی ریلا چھوڑ کر ہمارے ارباب اقتدار کی یک طرفہ محبت کی پینگوں کا برہمنیانہ انداز میں جواب دیا۔ بھارت کی جانب سے چھوڑے گئے سیلابی ریلوں کی وجہ سے سیکڑوں پاکستانی دیہات وقصبے زیر آب آئے اور اربوں کی املاک ، اراضی اور مویشیوں کا نقصان الگ ہوا ہے، جبکہ سندھ طاس معاہدے کے تحت بھارت کا فرض تھا کہ وہ اپنے اِس اقدام کی پیشگی اطلاع دیتا لیکن اُس نے ماضی طرح اس بار بھی ایسا نہ کیا، لہٰذا اس تناظر میں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ بھارتی حکمران پاکستانیوں سے " آستیں میں دشنہ پنہاں اور ہاتھ میں خنجر کھلا " قسم کی "دوستانہ ڈپلومیسی " بروئے کار لاتے ہیں۔
اَمر واقعہ یہ ہے کہ بھارت کی جانب سے دریاؤں میں پانی چھوڑنے اور بارشوں

کے سبب سیلابوں کا آنا ہر سال کا معمول بنتا جارہا ہے،اس کی بڑی وجہ پاکستانی دریاوں پر متنازعہ بھارتی ڈیموں کی تعمیر اور پاکستان میں کالاباغ ڈیم جیسے سود مند منصوبوں پر عمل درآمد کا نہ ہونا ہے، جب سے بھارت نے سندھ طاس معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ڈیموں کی تعمیر شروع کی ،اُس وقت سے محب وطن حلقوں حکومت کو آگاہ کرتے رہے کہ بھارتی آبی جارحیت کو فوری روکا جائے وگرنہ بھارت جب چاہے گا پانی روک کر پاکستان میں خشک سالی کی کیفیت اور جب چاہے گا دریاوں میں یکدم پانی چھوڑ کر سیلاب کی صورتحال پیدا کر دے گا، مگر صد افسوس کہ اس جانب کوئی توجہ نہیں دی گئی۔نائن الیون کے بعد بھارت نے اسرائیلی ماہرین اور بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے تعاون سے جنگی بنیادوں پر ڈیموں کی تعمیر مکمل کرنا شروع کی، مگر پرویز مشرف اور بعد میں آنے والی حکومتیں خاموش تماشائی بنی رہیں بلکہ متنازعہ ڈیموں کی تعمیر کے مقدمات بھی عالمی ثالثی عدالت میں صحیح معنوں میں نہیں لڑے گئے اور بھارت سے یکطرفہ دوستی پروان چڑھانے کیلئے پاکستان کے اصل موقف کو عالمی ثالثی عدالت میں پیش ہی نہیں کیا گیا، جس کا نقصان یہ ہوا کہ بھارت ڈیموں پر ڈیم تعمیر کر کے پانی ذخیرہ کرنے اور روکنے کی صلاحیت بڑھاتا رہا۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ جب پاکستان میں پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو فصلوں کو پانی نہیں ملتا اور جب ضرورت نہیں ہوتی تو بھارت یکدم پانی چھوڑ کر ملک میں سیلاب کی صورتحال پیدا کر دیتا ہے۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کے وجود کو تسلیم نہ کرنے والا ازلی دشمن بھارت 2020ء تک تمام دریاؤں کے پانیوں کو اپنی حدود میں ذخیرہ کرنے کے منصوبہ پر عمل پیرا ہے جس کی تصدیق بھارتی انسٹی ٹیوشن آف انجینئرز نے نیپال کانفرنس2011ء میں کرچکے ہیں، جبکہ عالمی ماہرین کی جائزہ رپورٹ کہتی ہے کہ1922ء سے 1961ء تک تقریباًچالیس سال میں دریائے سندھ میں 93 ملین ایکڑ فٹ پانی، دریائے جہلم میں 23 ملین ایکڑ فٹ اور دریائے چناب میں 26 ملین ایکڑ فٹ پانی رہ گیا،اس ناقابل تردید جائزہ رپورٹ کے مطابق بھارت نے پاکستان کے حصہ میں آنے والے مغربی دریاؤں چناب، جہلم اور سندھ کا56ملین ایکڑفٹ یعنی کہ 5 کروڑ60لاکھ ایکڑ فٹ پانی ہڑپ کر لیاہے،حالانکہ سندھ طاس معاہدے کے آرٹیکل 3 شق نمبر 1 کے تحت پاکستان کو بغیر کسی پابندی کے مغربی دریاؤں کے پانیوں کو استعمال کرنے کا حق حاصل ہے، اسی طرح آرٹیکل 3 شق نمبر 2 میں بھی تاکید کی گئی ہے کہ بھارت پر لازم ہے کہ وہ مغربی دریاؤں کو بہنے دے اور اس حوالہ سے بھارت کو کسی قسم کی مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں ہوگا اور وہ ان پر سٹوریج ڈیم ہرگز نہیں بناسکتا اور نہ ہی کسی دریا اور نالے کا رخ موڑ سکتاہے، لیکن بھارت کے جو دل میں آتا ہے وہ کر رہاہے کوئی اسے پوچھنے والا نہیں ہے۔

یہی وہ حکومتی کمزوریاں ہیں جس سے غاصب بھارت کے حوصلے بڑھ رہے ہیں، بھارت نے پن بجلی کی آڑ میں پاکستان کی جانب بہنے والے دریاؤں کے 56 ملین ایکڑ فٹ پانی کا رخ شمال سے جنوب کی طرف موڑنے کی مکمل صلاحیت حاصل کرلی ہے، یوں 1961ء کے مقابلہ میں پاکستانی دریاؤں میں دو تہائی پانی کم ہو چکا ہے، بھارت نے سندھ طاس معاہدہ کی آڑ میں پہلے ہی پاکستان کی طرف بہنے والے مشرقی دریاؤں ستلج، بیاس اور راوی کا 33 ملین ایکڑ فٹ پانی روکا اور 12 بڑی نہریں نکال کر راجھستان کا غیر آباد بنجر علاقہ آباد کیا، 9 ملین ایکڑ فٹ پانی مشرقی دریاؤں کی زندگی، آبی حیات، جنگلی جانوروں، چرند پرند اور ان دریاؤں کے کناروں پر عہد قدم سے آباد کروڑوں انسانوں کے پینے و دیگر گھریلو استعمال کے لئے مختص تھا، بھارت نے اُسے بھی روک لیا ہے حالانکہ یونیورسل ڈیکلریشن 1948ء کے آرٹیکل 3 کے تحت یہ پانی بھارت کسی معاہدے اور قانون کے تحت ہرگز نہیں روک سکتا، مگر کھلی جارحیت اور ہٹ دھرمی کے باوجود پاکستانی حکمرانوں نے اس مسئلہ پر مجرمانہ خاموشی اور غفلت کا مظاہرہ کیا اور ہماری کرپٹ بیوروکریسی اور نااہل حکومتوں کی وجہ سے بھارت کو دریاؤں پر غیر قانونی ڈیموں کی تعمیر کا موقع ملا اور وہ ابھی تک پاکستانی دریاؤں کے علاوہ مقبوضہ کشمیر سے پاکستان کی جانب بہنے والے ندی نالوں پر بھی ڈیم تعمیر کر رہا ہے تاکہ پاکستانی پانی ایک ایک بوند کو ترسیں اور وہ بغیر جنگ لڑے اپنے مذموم مقاصد حاصل کر سکے، ایک طرف بھارتی آبی دہشت گردی پورے زور

وشور سے جاری ہے تو دوسری جانب ہمارے حکمران بھارت سے یک طرفہ محبت و دوستی کی پینگیں بڑھانے کیلئے انہیں آموں کی پیٹیاں بھیج کر ہندو بنیئے کی کاسہ لیسی میں لگے ہوئے ہیں۔

اس وقت حال یہ ہے کہ بھارت کی جانب مزید پانی چھوڑے جانے کی وجہ سے پاکستانی دریاوں میں سیلاب بڑھ رہا ہے ، دریائے چناب میں ہیڈ خانکی اور قادر آباد کے مقام پر انتہائی اونچے درجے کا سیلاب ہے، جہاں سینکڑوں دیہات زیر آب آ گئے اور ہزاروں لوگ بے گھر ہوگئے ہیں،اسی طرح دریائے جہلم میں منگلا اور رسول کے مقام پر اونچے درجے کا سیلاب سے پانی درجنوں دیہات میں داخل ہو گیا ہے، جبکہ 5 لاکھ کیوسک سے زائد کا ریلا جہلم شہر میں داخل ہو گیا، ادھر سیالکوٹ کا پسماندہ دیہاتی علاقہ بجوات کا سیالکوٹ سے زمینی رابطہ منقطع ہو گیا ہے، دریائے جہلم کی قریبی تحصیل ملک وال کے 30 سے زائد دیہات پانی میں گھر گئے اور زمینی رابطہ منقطع ہو گیا۔ نیشنل ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی کے مطابق سیلاب سے صوبے پنجاب میں کم از کم دس لاکھ سے زائد افراد متاثر ہوئے ہیں،پاکستان کے زیر انتظام کشمیر میں سیلاب سے متاثرہ افراد کی تعداد ہزاروں میں بتائی جاتی ہے، جبکہ سیلابی ریلے میں سینکڑوں مکانات منہدم، سڑکیں،اور ہزاروں ایکڑ رقبے پر مشتمل کھڑی فصلیں الگ تباہ ہو گئی ہیں، موجودہ سیلاب نے دو ہزار دس کے سیلاب کی یاد تازہ کر دی جو ملک کی

تاریخ کا بدترین سیلاب تھا، جس میں 1,700 سے زائد افراد ہلاک اور 18 ملین متاثر ہوئے تھے۔

قارئین محترم ! یہ درست ہے کہ آبی تنازعہ پاکستان اور بھارت کا بنیادی مسئلہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہماری ہر حکومت نے اس سلسلے میں اپنا فریضہ ادا کرنے میں غفلت کا مظاہرہ کیا ہے، ذرائع ابلاغ اور سیاسی قیادت ایک طویل عرصے سے بھارت کی آبی دہشت گردی پر آگاہ کرتے رہے ہیں، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ارباب اقتدار کے پاس اس مسئلہ کے حل کیلئے کوئی فوری اور طویل المیعاد منصوبہ بندی موجود نہیں ہے، جبکہ بھارت کی جانب سے آبی جارحیت کا سلسلہ روز بروز طول پکڑتا جا رہا ہے، وہ ایک طرف پاکستانی دریاوں پر غیر قانونی ڈیم بنا کر اپنی بنجر زمینوں کو سیراب اور ہمارے ہی دریاوں سے بجلی پیدا کرکے ہمیں فروخت کرنے کے منصوبے بنا رہا ہے، ساتھ ہی بارشوں کے دوران ڈیموں میں ذخیرہ کیا گیا زائد پانی چھوڑ کر ہمارے لہلہاتے ہوئے کھیتوں اور کھلیانوں کو برباد بھی کر رہا ہے، یہ امر قابل ذکر ہے کہ پاکستان کو ہر تیسرے چوتھے برس سیلابوں کی تباہ کاریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ہر برس آنے والے چھوٹے بڑے سیلابوں کے طوفانی ریلے ملکی معیشت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچاتے ہیں، مگر اس کے باوجود مقامِ حیرت ہے کہ فلڈ کمیشن کی سفارشات پر عملدرآمد کو حکومت نے سرد خانے کی نذر کر رکھا ہے۔

دوسری طرف ہماری حفاظتی تدابیر کے فقدان کا عالم یہ ہے کہ پاکستان میں سیلاب کی ہنگامی اطلاع دینے والے صرف 7 ریڈار ہیں، محض بڑا ڈیم نہ ہونے کی وجہ سے پاکستان میں اب تک کروڑوں ایکڑ فٹ پانی ضائع ہو چکا ہے، جبکہ بارانی پانی کو محفوظ کرنے کیلئے وسیع پیمانے پر منصوبہ بندی کی ضرورت ہے، اگر ملک میں چھوٹے اور بڑے ڈیموں کا نیٹ ورک موجود ہوتا تو کروڑوں ایکڑ فٹ قیمتی پانی کے ضیاع کو روکا جا سکتا ہے، امر واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کا اقتصادی، زرعی، صنعتی، دفاعی اور ریاستی استحکام ڈیموں کی تعمیر سے مشروط ہے، چنانچہ ہم اپنے ارباب اقتدار کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ بڑے ڈیموں کے ساتھ چھوٹے ڈیموں کی تعمیر بھی ناگزیر ہے اور اسے ہمیں اپنی قومی ترجیحات میں سرفہرست رکھنا چاہیے اور یہ کہ موجودہ صورتحال پر ہمارے حکمرانوں کو کسی صورت خاموش نہیں رہنا چاہیے، بلکہ بھارتی آبی جارحیت روکنے کے لئے بھرپور کردار بھی ادا کرنا چاہیے، یاد رکھئے بھارت کے تعمیر کردہ متنازعہ ڈیم وطن عزیز پاکستان کے دفاع کیلئے سخت نقصان دہ ہیں، اس لئے حکومت کو بھارتی آبی دہشت گردی کے مسئلہ پر سنجیدگی سے سوچنا ہوگا اور اس کے تدارک کیلئے عملی اقدامات کرنے ہونگے۔

انجمن طلباء اسلام دائیں بازو کی پہلی نظریاتی طلبہ تنظیم

انجمن طلباء اسلام، نظریات، جدوجہد اور اثرات کا ایک جائزہ
جس نے طلباء کے دلوں کو خوفِ خدا اور محبت و عشقِ رسول کے جذبے سے سرشار
کرکے اُن کا رخ مکینِ گنبدِ خضراء کی جانب موڑا۔

طلبہ سیاست کا مطالعہ بتاتا ہے کہ برصغیر میں اِس کا باقاعدہ آغاز 1905ء میں تقسیم
بنگال کے موقع پر برطانوی راج کی مخالفت کے باوجود شروع ہوا،اِس تحریک میں
پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کے پہلے اسپیکر مولوی تمیز الدین خان نے بطور طالب علم
حصہ لیا۔اِسی سال پنجاب میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے طلبہ نے ہندوستانی طلبہ
سے امتیازی سلوک کے خلاف احتجاجی تحریک کانگریس کے مستقبل کے رہنماؤں کی
قیادت میں شروع ہوئی۔کچھ سال بعد1920 اور1921ء میں شروع ہونے والی
تحریک خلافت و ہجرت میں بھی بہت سے مسلمان طلبہ نے حصہ لیا،لیکن 1936ء میں
لکھنو میں پہلی طلبہ تنظیم ''آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن'' قائم کی گئی۔چونکہ اِس تنظیم
میں مسلم طلباء کے مقابلے میں ہندوؤں کی اکثریت تھی،اِس لیے مسلم طلباء کو ایک
علیحدہ طلباء تنظیم کی ضرورت محسوس

ہوئی۔ چنانچہ 17 جنوری 1937ء میں " آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن " قائم کی گئی، جس کا پہلا اجلاس دسمبر 1937ء کو کلکتہ میں قائد اعظم محمد علی جناح کی زیر صدارت میں منعقد ہوا۔ یہی صورتحال پنجاب میں پیش آئی، جہاں 1936ء میں نیشنلسٹ طلباء کی تنظیم " نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن " پنجاب کے تعلیمی اداروں پر چھائی ہوئی تھی۔ چنانچہ مجاہد ملت مولانا عبدالستار خان نیازی، مولانا ابراہیم علی چشتی، میاں محمد شفیع، عبدالسلام خورشید اور حمید نظامی مرحوم نے علامہ اقبال سے مشورے کے بعد نومبر، دسمبر 1936ء میں " دی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن " کی بنیاد رکھی، جس نے مسلم لیگ کا دست وبازو بن کر تحریک پاکستان میں ہراوّل دستے کا کردار ادا کیا۔

تشکیل پاکستان کے بعد طلبہ تحریک کا از سر نو آغاز مشرقی پاکستان اور صوبہ سندھ سے ہوا۔ پاکستان بنتے ہی پنجابی اور مہاجروں کی اجارہ داری کے خلاف طلبہ نے علم احتجاج بلند کیا، مغربی پاکستان کے اقلیتی صوبوں کے راہنماؤں کے برعکس بنگال کے عوام کا مسئلہ اردو زبان، قومی تشخص اور معاشی غلبے سے نجات پانا تھا۔اس مطالبے اور زبان کے مسئلے کو بنیاد بنا کر مشرقی پاکستان میں " مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن " قائم کی گئی، جس کے عہدے داروں میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے طالبعلم شیخ مجیب الرحمٰن بھی شامل تھے۔

1949ء میں راولپنڈی میں کمیونسٹ پارٹی کے زیر اثر ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس فیڈریشن (DSF) کی بنیاد رکھی

نے طلباء اور تعلیمی DSF، گئی۔اِس کی ایک شاخ 1952ء میں سندھ میں بھی قائم ہوئی اداروں کی حالت زار کی بہتری کے منشور پر کام کرکے واضح مقبولیت حاصل کی۔ تنظیم نے مختلف تعلیمی اداروں کی غیر مناسب فیسوں کے مسئلے پر بھی احتجاج کیا مگر انتظامیہ کی ہٹ دھرمی کے باعث بات ہنگاموں اور گرفتاریوں تک جا پہنچی اور 1954ء میں اِس تنظیم پر سرکاری پابندی عائد کر دی گئی۔ 1956ء میں طلبہ تنظیموں کی کمی کو پورا کرنے کیلئے" نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن (NSF) بنائی گئی۔جس کی صفوں میں جلد ہی سابقہ DSF کے کارکنان نے برتری حاصل کر لی، مگر ایوب مارشل لاء لگنے کے بعد طلبہ تنظیموں کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ لیکن پابندی کے باوجود طلبہ کسی نہ کسی طور حکومت کے خلاف برسرپیکار رہے۔چنانچہ طلبہ کو نکیل ڈالنے کی خاطر "شریف کمیشن" قائم کیا گیا، طلبہ کو ملکی سیاست سے دور رکھنے کیلئے اِس کمیشن کی پیش کردہ کئی سفارشات صدر ایوب نے منظور کرلیں، لیکن اِن سفارشات کے خلاف ملک بھر میں طلبہ نے احتجاج کیا، جس کی محترمہ فاطمہ جناح نے بھی حمایت کی۔

معاہدہ تاشقند کے بعد ایوب کابینہ چھوڑنے والے نوجوان وزیر ذوالفقار علی بھٹو نے طلبہ کو ایوب مخالف تحریک میں موثر طور پر استعمال کیا اور ایوب حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ 1967ء میں بلوچ طلبہ کی تنظیم" بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن" کراچی میں قائم ہوئی، جس کا بنیادی مطالبہ ون یونٹ

اور بلوچ سرداری نظام کا خاتمے کے ساتھ بلوچ طلبہ میں قومی تشخص اجاگر کرنا تھا۔اِس تنظیم نے ایوب مخالف تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔ بعد میں بھٹو دور میں بلوچستان میں کے دونوں دھڑوں متحرک رہے۔ بھٹو دور BSF ہونے والی گوریلا کاروائیوں میں بھی قائم ہوئی۔اِس تنظیم (PSF) میں ہی پیپلز پارٹی کی طلبہ تنظیم پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن میں زیادہ تر بائیں بازو (یعنی ایسے ترقی پسند جو کمیونسٹ، سوشلسٹ اور مذہب مخالف فلسفے کے علمبردار تھے) سے تعلق رکھنے والے طلباء شامل تھے،جو" سرخ ہے، سرخ ہے ایشیاء سرخ ہے"کے نعرے لگاتے تھے۔یہ وہ دور تھا جب پاکستان سمیت دنیا بھر کے بہت، سے طلبہ بائیں بازو کی احتجاجی تحریکوں میں فعال تھے۔اُس زمانے میں پاکستان میں دائیں بازو کی طلبہ تنظیموں کا وجود نہ ہونے کے.برابر تھا۔

حالانکہ مخصوص مکتبہ فکر کی ترجمان جماعت اسلامی کے زیر اثر طلبہ تنظیم "اسلامی جمعیت طلبہ" کی ابتداء قیام پاکستان کے چند ماہ بعد ہوچکی تھی،مگرِاس تنظیم نے طلبہ سیاست میں باقاعدگی سے حصہ 1953ء میں لینا شروع کیا اور پہلا جلوس 1968ء میں نکالا۔ یہ تنظیم دراصل بائیں بازو کی جماعتوں کی مقبولیت سے گھبرا کر میدان میں اتری تھی،مگر رفتہ رفتہ اِس تنظیم نے فاشسٹ رویہ اختیار کر لیا۔بقول پروفیسر عزیزالدین خان ”جماعت اسلامی کی طرح اسلامی جمعیت طلبہ نے بھی اپنے آپ کو ہمیشہ عوام سے بلند اور خدا کی طرف سے

منتخب کئے گئے صالحین کا ایک گروہ تصور کیا ہے، جن کا کام اُن تمام باتوں کو، جنہیں وہ خدائی احکامات تصور کرتی ہے، طلبہ تک پہنچانا اور انہیں تسلیم کرنے سے انکار کرنے والوں پر جبراً نافذ کرنا ہے۔۔۔۔۔جمعیت کی نظر میں غیر اسلامی تصورات رکھنے والے جن میں سوشلسٹ اور مغربی کلچر کے دلدادہ سبھی شامل ہیں) ،برداشت نہیں کیے جا سکتے تھے۔"

اِن حالات میں دائیں بازو کی نمائندگی کرنے والی ایک ایسی طلبہ تنظیم کی ضرورت تھی جو نوجوانوں کے دلوں کو محبت اور عشق مصطفیٰ کے جذبے سے سرشار کرکے اُن کی عقیدتوں کا رخ مکینِ گنبدِ خضراء کی جانب موڑ سکے اور وطن عزیز کے خلاف ہونے والی سازشوں کا مقابلہ کر سکے۔چنانچہ وقت کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے "انجمن محبان اسلام" (قائم شدہ 1962ء) کے بانی و سرپرست حضرت علامہ جمیل احمد نعیمی اور جمیت طلباء اہلسنّت وجماعت" (قائم شدہ 1966ء) کے بانی محمد یعقوب قادری (شہید" یکم اگست 2013ء) نے 20 جنوری 1968ء کو کراچی میں رفقاء کے مشورے اور دونوں تنظیموں کے ادغام سے پاکستان کی پہلی نظریاتی طلبہ تنظیم "انجمن طلبہ اسلام (ATI) " کی بنیاد رکھی۔علامہ جمیل احمد نعیمی سرپرست اعلیٰ مقرر ہوئے اور آپ کی سرپرستی کی بدولت انجمن طلباء اسلام کو اکابر علماء ومشائخ کی تائید وحمایت اور توجہ واعتبار حاصل ہوا، جبکہ حاجی محمد حنیف طیب انجمن کے پہلے مرکزی صدر اور محمد یعقوب قادری ناظم اعلیٰ

بنے۔

انجمن طلبہ اسلام وطن عزیز میں دائیں بازو کی نمائندگی کرنے والی سب سے پہلی طلباء تنظیم تھی جس کا بنیادی نصب العین طلباء کے قلوب میں "عشق مصطفیٰ کی شمع فروزاں کرکے اُن میں صحیح اسلامی روح بیدار کرنا" تھا۔پاکستان کی طلبہ تنظیموں کو یہ اعزاز بھی حاصل ہوا کہ اُس نے تعلیمی اداروں میں (ATI) ہیں۔انجمن طلباء اسلام سب سے پہلے ذاتِ مصطفیٰ کو مرکز و منبع مان کر "ہم عظمتِ رسول کے پاسباں ہیں،پاسباں" اور" غلامی رسول میں موت بھی قبول ہے،نہ ہو جو عشق مصطفیٰ تو زندگی فضول ہے" کے سرفرشانہ نعرے بلند کیے۔ انجمن نے طلباء میں حقیقی اسلامی روح کی بیداری، مقام مصطفیٰ کا تحفظ اور نظام مصطفیٰ کے نفاذ کیلئے ملک گیر سطح پر بے نظیر جدو جہد کا آغاز کیا اور کمیونسٹوں، سوشلسٹوں اور مذہب مخالفوں کے پروپیگنڈے کا پردہ چاک کرتے ہوئے وطن عزیز کو ایسے تحریکی کارکن مہیا کیے، جو ملک کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کے محافظ اور تحریک نظام مصطفیٰ کا ہراوّل دستہ ثابت ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انجمن کی شاخیں سندھ، پنجاب، بلوچستان اور پنجاب کے تعلیمی اداروں میں پھیل گئیں اورجذبہ عشق رسول سے سرشار ہزاروں نوجوان طلباء انجمن کے دامن سے وابستہ ہوتے چلے گئے۔

انجمن طلبہ اسلام نے تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم طلباء کو دین کی دعوت کے ساتھ ساتھ خوفِ خدا اور عشق رسول کے راستے پر گامزن کیا اور اُن میں محبت و عشق رسول کی شمع روشن کرکے انہیں حصول پاکستان کے مقاصد کی تکمیل کیلئے عازم سفر کیا۔ انجمن طلبہ اسلام قومی، علاقائی اور لسانی تعصّبات سے پاک ایسے محب وطن طلبہ کا یوتھ ونگ بنی، جو وطن عزیز کی ترقی واستحکام اور سماجی انصاف پر مبنی معاشرے کے قیام کیلئے ملک میں نظام مصطفیٰ کا عملی نفاذ دیکھنا چاہتا تھے۔ چنانچہ اِن مقاصد کے حصول کیلئے انجمن ہمیشہ برسرپیکار رہی۔ بلاشبہ اپنے 46 سالہ سفر میں انجمن کے ذمہ داران، کارکنان اور معاونین نے پرعزم جذبوں، بلند حوصلوں اور قابل فخر سعادتوں پر مبنی تاریخ ساز جدوجہد کی، جو بلند جذبوں، حوصلوں اور ایثار وقربانیوں کی بے شمار داستانیں اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔

انجمن طلباء اسلام کے اسی تابناک ماضی کو جناب معین الدین نوری نے اپنی حالیہ کاوش انجمن طلباء اسلام، نظریات، جدوجہد، اثرات "میں سمیٹنے کی سعی کی ہے۔ حال ہی میں" شائع ہونے والی اُن کی نئی کتاب انجمن کے اِسی ولولہ انگیز سفر کی ضخیم روداد ہے، جسے معین الدین نوری نے برسوں کی محنت اور لاتعداد کتب ورسال، اخبارات وکتابچوں اور غیر مطبوعہ مواد کی ورق گردانی، مکتبوں اور لائبریوں کی خاک آرائی اور مدرسوں اور آستانوں کی حاضری کے بعد بڑی عرق

رہنری اور جانفشانی سے ترتیب دیا ہے۔876 صفحات پر محیط مواداُن کی بلند ہمت اور ذوقِ جنوں کا آئینہ دار ہے،بلا مبالغہ انجمن کی 46 سالہ تاریخ کو جمع کرنا،ترتیب دینا اور کتابی شکل میں یکجا کرنا معین الدین نوری کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

یہ کتاب انجمن طلبہ اسلام کے تاریخی پس منظر، فکری زاویے،تگ وتاز، تنظیمی خدوخال،میڈیا ومطبوعات،انجمن اور طلبہ سیاست، قومی وملی تحریکوں میں کردار،انجمن کے اثرات جیسے عنوانات میں منقسم ہے۔کتاب کے آخر میں انجمن کی تصویری تاریخ میں اُس کی نصابی وغیر نصابی سرگرمیوں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔کتاب کے ذیلی عنوانات قومی وملی خدمات کے ساتھ ساتھ تحریک ختم نبوت وناموس رسالت، تحریک آزادی کشمیر،جہاد افغانستان میں انجمن کے کردار اور انجمن کی سیاسی، سماجی،رفاحی وفلاحی خدمات کے علاوہ تعلیمی اداروں میں نصابی وغیر نصابی سرگرمیوں کا بھی احاطہ کرتے ہیں۔مباحث کے سرسری جائزے سے ہی کام کی دقّت نظری اور گہرائی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

قارئین محترم ! کتاب انجمن طلباء اسلام کے کارکنان کی عزیمت واستقامت،جرأت وہمت، حکمت ودانش اور بہادری وشجاعت کی داستان رکھنے کے باوجود اپنے اندر انجمن کی تاریخ کے کچھ ایسے تلخ حقائق بھی سموئے ہوئے ہے،جس نے اہلسنّت کی

سیاسی مستقبل پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہوئے اُسے سوالیہ نشان بنادیااور آج ہم
چاہتے ہوئے بھی اِسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔اِن تلخ حقائق میں سے ایک قابل ذکر
ATI کا پہلو23اکتوبر1987ء کوڈاکٹر ظفر اقبال نوری کی قیادت میں جنم لینے والا
گروپ ہے،جس کے قیام نے انجمن کو عملاً دو دھڑوں میں منقسم کردیا۔انجمن کا ایک
کا طلبہ ونگ رہا،اُس نے اہلسنّت کی واحد مذہبی وسیاسی نمائندہ تنظیمJUP گروپ جو
جمعیت علماءپاکستان اور قائد جمعیت مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی سے تعلق اور نسبت و
حوالے کو اپنے لیے باعث افتخار جانا،جبکہ دوسرا گروپ جسے ڈاکٹر ظفر اقبال نوری کی
کا طلبہ ونگ بننے سے انکار کرتے ہوئے آزاد روش اختیار کرنے کاJUP قیادت میں
JUPدعویٰ تھا،کی سرپرستی اور تائید وحمایت فروری1985ءکے غیر جماعتی الیکشن میں
شوریٰ کے بائیکاٹ کے فیصلے سے بغاوت کرکے الیکشن لڑنے اور "نظام مصطفیٰ" گروپ
تشکیل دینے والے اُس وقت کے ممبر اسمبلی،حکومتی وزیر اور سابق صدر انجمن حاجی محمد
حنیف طیب صاحب کررہے تھے۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ جس طرح اہلسنّت کی واحد نمائندہ تنظیم" جمعیت
ATI بھی علماءپاکستان "اکابرین کی میراث ہے،بالکل اُسی طرح تقسیم سے قبل
میں جنم لینے والےATI طلباءاہلسنّت کی واحد نمائندہ طلبہ تنظیم رہی،مگر1987ء میں
اختلافات نے انجمن کے ساتھ ساتھ اہلسنّت کی پوری نظریاتی تحریک

سے فارغ ہونے والے بعض سابقین نے مرکزی ATI کو بھی شدید نقصان پہنچایا۔
جماعت سے وابستہ ہو کر اُسے تقویت پہنچانے کے بجائے اپنی ایک نئی جماعت بنانے کو
ترجیح دی، 26جولائی 1991ء کو "مصطفائی تحریک" اور 17 ستمبر 2009ء کو نئی سیاسی
قیام اِسی گروپنگ کا شاخسانہ تھے۔اِسی طرح گلی PFP جماعت" پاکستان فلاح پارٹی" یعنی
گلی، محلے محلے "انجمن عاشقان رسول،غلامان رسول، محبان رسول، فدایان رسول اور
خادمان رسول" جیسے ناموں کی لاتعداد چھوٹی وقتی اور غیر موثر تنظیمیں بھی
وجود میں آئیں، جس سے انتشار میں مزید اضافہ ہوااور لا مرکزیت کو فروغ ملا۔یوں
اِس گروپنگ نے نہ صرف اہلسنّت کو رسوا و بے آبرو کیا، بلکہ تقسیم کے ثمرات اہلسنّت
کی مذہبی وسیاسی بے وزنی، بے توقیری اور بے وقعتی کی صورت میں بھی ظاہر ہوئے۔
مزید المیہ یہ ہوا کہ اِن اختلافات نے ایسے دانشوروں اور نقادوں کو بھی جنم دیا، جو
اپنی عقل وخرد کے پیمانوں پر جماعتی پالیسی کو پرکھنے اور مرکزی قیادت کے فیصلوں پر
جرح وتعدیل کرنے لگے ۔اِس خطرناک رجحان نے ایسے پالیسی ساز بھی متعارف
کروائے جو جماعتی شوریٰ اور مرکزی قیادت کے فیصلوں پر عمل درآمد کرنے کے بجائے
قائدین اور جماعت کو اپنی لائین آف ایکشن پر چلتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے، جبکہ تنظیمی اور
تحریکی تقاضہ تھا کہ شوریٰ اور مرکزی قیادت کے فیصلوں پر بلا چون چرا عمل کیا جاتا۔اِس
طرز عمل نے

تنظیمی ڈھانچہ کمزور کردیا، نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری مذہبی و سیاسی قوت کا شیرازہ بکھر گیا، جگ ہنسائی، سیاسی شکست و ہزیمت اور ذلت و سوائی ہمارا مقدر بن گئی۔آج وقت کا تقاضہ ہمیں اتحاد اہلسنّت کی دعوت دے رہا ہے، لیکن یہ تب ہی ممکن ہوگا جب ماضی کے اختلافات کو بھلا کر ایک دوسرے کو تسلیم کیا جائے۔آپسی رنجشوں اور کدورتوں کو مٹا کر ایک جھنڈے ،ایک قیادت اور ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوا جائے اور منظم و مربوط حکمت عملی کے تحت اپنی کھوئی ہوئی عزت و وقار کے حصول اور مذہبی و سیاسی تشخص کی بحالی کیلئے بے لوث ہو کر جدوجہد کی جائے۔ واضح رہے کہ اِسی میں ملت کا وسیع تر مفاد کامیابی اور بقاء کا راز مضمر ہے۔

قارئین محترم ! چونکہ صاحبِ مو_لف جناب معین الدین نوری کا عملی تعلق، وابستگی اور جھکاؤ انجمن طلبہ اسلام" نوری گروپ " کی جانب رہا،اِس لیے کتاب میں شامل 1987ء کے بعد کی تمام تر تنظیمی سرگرمیاں اِسی گروپ کی کارکردگی کا احاطہ کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ انجمن طلبہ اسلام کا وہ طلبہ ونگ جو اپنی مادر تنظیم یعنی جمعیت علماءپاکستان اور علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی سے وابستہ ہے، کتاب کو جانبدارانہ تاریخ قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ صاحب مولف نے انجمن کی تاریخ کو اپنے خاص نقطہ نظر سے دیکھا، لکھا اور واقعات کا بیان اپنی پسند وناپسند کی بنیاد پر کیا ہے، جبکہ ایک غیر جانبدار

مورخ کا کام تمام حقائق کو سامنے لانا اور فیصلہ قارئین پر چھوڑنا ہوتا ہے۔ چنانچہ معترضین اِس کتاب کو ڈاکٹر ظفر اقبال نوری گروپ کی تاریخ قرار دیتے ہوئے موقف اختیار کرتے ہیں کہ صاحبِ مولف نے تحقیقی تقاضے پورے نہیں کیے اور اُن کا کام اصل تاریخی حقائق اور تحقیقی تقاضوں کے منافی ہے۔

اِسی طرح بانی انجمن کا معاملہ بھی اختلافی اور مزید تحقیق طلب ہے، یہی وجہ ہے کہ بہت سے احباب کتاب کے بعض مندرجات پر شدید اعتراضات اور تحفظات رکھتے ہیں۔ چنانچہ اِس تناظر میں کتاب کے مندرجات سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے، مگر اِس بات میں کوئی شک نہیں کہ مولف نے انجمن طلبہ اسلام کے قیام کے پس منظر سے لے کر اِس کی ارتقائی جدوجہد، کارہائے نمایاں اور توسیعی سرگرمیوں کو بہترین انداز میں اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد تحفظات رکھنے کے باوجود بانی انجمن علامہ جمیل احمد نعیمی وسعت قلبی اور اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں" مجھے ذاتی طور پر اِس کتاب کے مندرجات پر کچھ تحفظات ہو سکتے ہیں، مگر اِس کے باوجود مجھے یہ بات کہنے میں کوئی عار نہیں کہ عزیزم معین الدین نوری نے جو کام کر دکھایا ہے، وہ انجمن طلبہ اسلام اور اِس کی فکر سے وابستہ افراد و تنظیموں کیلئے مشعل راہ ہے اور کتاب انجمن کی تاریخ ہی نہیں بلکہ یہ قاری کی فکری تشکیل، ذہنی تربیت اور اہم معلومات میں اضافے کا بھی باعث بنے گی۔

کتاب کا ایک امتیازی پہلو یہ بھی ہے کہ مولف نے جہاں انجمن طلبہ اسلام کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کی ہے، وہیں دیگر طلبہ تنظیموں کے تعارف اور طلبہ سیاست میں اُن کے کردار و عمل پر بھی مفصل روشنی ڈالی ہے، ساتھ ہی مولف انجمن طلبہ اسلام کی طلبہ سیاست میں مثبت جذبوں کو پروان چڑھانے والی منفرد اور تاریخی جدوجہد کا وہ پہلو بھی سامنے لائے ہیں جو اکثر لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہا ہے۔کتاب میں شامل ڈاکٹر مجیب احمد کا پر مغز ابتدائیہ اور محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان،علامہ جمیل احمد نعیمی،پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن،ڈاکٹر شاہد حسن رضوی،ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی، جسٹس (ر) میاں نذیر اختر،ڈاکٹر نور احمد شاہتاز، سینئر صحافی جناب جبار مرزا، جنرل (ر) حمید گل،ڈاکٹر نذر حسین سکندری اور ڈاکٹر محمد احمد قادری کے تبصرے اُس کی اہمیت وافادیت میں اضافے کا باعث ہیں۔

بلاشبہ تمام تر اعتراضات و تحفظات کے باوجود معین الدین نوری صاحب کی کتاب ایک قابل ستائش وپُر تحسین کاوش ہے،انھوں نے انجمن کے عظیم سپوتوں،پر عزم رہنماؤں اور ہمہ وقت متحرک و فعال انجمن کے اُن کارکنان ومعاونین کو بہترین خراج عقیدت پیش کیا ہے،جنھوں نے تعلیمی اداروں کو ایک باوقار انجمن عطا کی،دانش گاہوں کے تقدس کا نعرہ بلند کیااور جن کی متاع حیات اسلام کا بول

بالا کرنے کیلئے وقف رہی۔کتاب ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور نے خوبصورت سرورق سے مزین و مجلد شائع کی ہے۔اُمید ہے کہ انجمن کی یہ داستانِ عزیمت مذہبی و نظریاتی سیاست سے دلچسپی رکھنے والوں کے ساتھ ساتھ پر عزم طلباء اور نوجوانوں کیلئے مشعل راہ کا کام دے گی۔

پاکستان ماضی کا ترکی یا حالیہ سعودی عرب.....!

اکیسویں ترمیم اصل اہداف پر نظر رکھیئے......

ترکی میں سلطنت عثمانیہ کا قیام 1299ء میں عمل میں آیا، لیکن خلافت کے قیام کا باقاعدہ اعلان 1453ء میں سلطان محمد دوم نے قسطنطنیہ کی فتح کے بعد کیا، قسطنطنیہ کی فتح نے خلافت عثمانیہ کی سرحدیں براعظم ایشیاء سے نکال کر یورپ تک پھیلادیں، بعد میں باقی ماندہ علاقے بھی بتدریج خلافت عثمانیہ کی عملداری میں آ گئے اور 1517ء میں سلطان سلیم کے دور میں مصر کی فتح نے خلافت عثمانیہ کی سرحدیں افریقہ تک پھیلادیں۔ مورخین کے مطابق 1683ء میں یورپ کے شہر ویانا کے محاصرے نے سلطنت عثمانیہ کے زوال کی بنیاد رکھی ، وہ علاقے جو عثمانی ترکوں نے ساڑھے تین سو سال کے عرصے میں فتح کئے تھے ، ایک ایک کرکے اگلے دو سو سالوں میں اُن سے چھن لیے گئے اور کم وبیش پونے چھ سو سال قائم رہنے والی سلطنت عثمانیہ کا مکمل خاتمہ 1923ء میں مصطفیٰ کمال پاشا نے جدید ترکی کی بنیاد رکھ کر کردیا۔

مصطفیٰ کمال پاشا ایک سیکولر خیالات کا حامل فرد تھا،اُس نے ترکی کو سیکولر

ملک بنانے کیلئے 3 مارچ 1923ء کو ایک بل اسمبلی میں پیش کیا، جس کا مقصد ترکی میں سیکولر ازم ، ترک قومیت اور مغربی جمہوریت کی ترویج واشاعت کے ساتھ خلافت عثمانیہ کا خاتمہ و بے دخلی اور عثمانی دور کے مذہبی اثرات کو زائل کرکے مذہبی تعلیم اور تمام مذہبی سرگرمیوں کو حکومتی کنٹرول میں لانا تھا،اِس بل کی منظوری نے ریاست اور مذہب کو جدا کرکے سیکولر ترکی کی بنیاد رکھی ۔اِس بل کے اثرات نے سیاست، ثقافت اور تعلیم سمیت زندگی کے تمام شعبہ جات میں مذہب اور مذہبی شخصیات کے اثر کو زائل کرنا شروع کردیا اور یکساں نظام تعلیم کے نام پر ملک بھر میں قائم دینی مدارس پر مکمل پابندی عائد کردی گئی، قالَ قالَ رسول اللہ ﷺ کی صدائیں بلند کرنے والے دینی ادارے اور مدارس گھوڑوں کے اصطبل اور مارکیٹوں میں تبدیل کردیئے گئے، صوفیوں اور درویشوں کے آستانے بند کردیئے گئے، جبکہ ہجری کیلنڈر اور شرعی عدالتیں بھی کالعدم قرار دے دی گئیں۔

1928ء میں عربی رسم الخط کی جگہ ترکی میں لاطینی رسم الخط اختیار کیا گیا اور 1932ء میں عربی میں قرآن کی اشاعت پر بھی پابندی عائد کرکے ترک عوام کو مجبور کیا گیا کہ وہ مقامی یعنی ترکی زبان میں لکھا گیا قرآن پڑھیں،اسی سال مساجد سے عربی زبان میں اذان دینے پر بھی پابندی لگادی گئی اور موذن حضرات کو ترکی زبان میں اذان دینے کے احکامات جاری کیے گئے، مصطفیٰ کمال نے

درویشوں کے پہننے والے چغے اور ترکی ٹوپی کا استعمال بھی ممنوع قرار دے دیا،اُسے اسلامی تہذیب و ثقافت سے اِس قدر نفرت تھی کہ اُس نے اسلامی ثقافت سے جڑی ہر نشانی کو مٹانے یا اُس پر پابندی لگانے کی کوشش کی ،اُس کی نفرت اور کدروت کا اندازہ لگانے کیلئے یہ حکم ہی کافی ہے کہ آئندہ ترک مسلمان خالقِ کائنات کو عربی نام ''اللہ'' کی بجائے ترکی زبان میں ''تانڑی'' نام سے پکاریں گے ۔

لیکن ترکی میں مصطفیٰ کمال پاشا اور اُس کے پیروکاروں کی اسلامی تہذیب وتمدن کے آثار مٹانے اور ترکی کو مکمل طور پر یورپ کے سانچے میں ڈھالنے کی تمام تر کوششوں کے باوجود اہلیان ترکی کے دلوں میں اسلام اور اسلامی تعلیمات زندہ رہیں، حالانکہ ترک سیکولر فوج اور حکمرانوں نے تمام تر جبری ہتھکنڈوں کے باوجود ترکی سے اسلام اور اسلام کے نام لیواؤں کو مٹانے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی ،1960ء میں عربی میں اذان دینے کی اجازت دینے کے جرم میں ترک رہنماء عدنان مندریس کی پھانسی سے لے نجم الدین اربکان ،سابق صدر عبداللہ گل اور موجودہ صدر طیب اردگان تک ترکی میں اسلام پسندوں کی صبر آزما جدوجہد کی ایک طویل داستان ہے۔آج وہی ترکی موجودہ صدر رجب طیب اردگان کی قیادت میں نہ صرف اپنے ماضی کی طرف لوٹ رہا ہے بلکہ مستقبل میں عالم اسلام کی رہنمائی کا فریضہ ادا کرنے کی بھی تیاری ہے۔

جبکہ دنیا کا وہ واحد خطہ زمین ''مملکت خداد داد پاکستان'' جو قائم ہی اسلام کے نام پر ہوا آج اپنی اساس وبنیاد سے نہ صرف کوسوں دور ہے، بلکہ رہی سہی کسر ہمارے حکمران، وقت پوری کر رہے ہیں جو اپنی کمزوریوں اور ناکامیوں کی پردہ دری کرتے ہوئے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ پاکستان کے اندر تمام مسائل کا اصل منبع ومرکز مذہب اور مذہبی تعلیمات سے منسلک ہے، حالانکہ اس بات کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں کہ اسلام کے نام پر قائم ہونے والی مملکت کے موجودہ مسائل کا اصل سبب اسلام اور اسلامی تعلیمات ہیں۔

دہشت گردی کی لہر کے خلاف 6 جنوری 2015ء کو پہلے قومی اسمبلی، بعد ازاں سینٹ سے منظور ہونے والے اکیسویں آئینی ترمیمی بل اور آرمی ایکٹ 1952ء میں کی گئی ترامیم بھی اسی سلسلے کی کڑی ہیں، بظاہر ان قدامات سے حکومت کو ایسا لگتا ہے کہ ریاست کے خلاف ہتھیار اٹھانے والوں کے کڑے احتساب کی راہ ہموار ہو گئی ہے، لیکن اَمر واقعہ یہ ہے کہ ان ترامیم کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال نے تشویشناک شکل اختیار کر لی ہے، اندورن سندھ اور خصوصاً صوبہ پنجاب میں حکومت نے اذان، خطبے اور صلوٰۃ وسلام کیلئے لاؤڈ اسپیکر پر پابندی عائد کرتے ہوئے ہزاروں علماء ومشائخ اور عوام اہلسنّت کے خلاف مقدمات قائم کرتے ہوئے انہیں گرفتار کیا ہے، جبکہ متعدد ایسی مذہبی کتابوں کی اشاعت پر بھی پابندی عائد

کردی گئی ہے جن کا تعلق کسی طور بھی دہشت گردی اور فرقہ واریت کے فروغ سے نہیں ہے، اردو بازار لاہور کے تقریباً سات سو کتب فروشوں پر مقدمات درج ہو چکے ہیں، پولیس جس کتاب کو مشکوک پاتی ہے اٹھا کر لے جاتی ہے، میڈیا رپورٹ کے مطابق سیدنا عبدالقادر جیلانی کی کتاب "غنیۃ الطالبین" کے علاوہ سیدنا مہر علی شاہ صاحب کی کتاب اور مفتی احمد یار نعیمی کی کتابوں پر بھی پابندی عائد کی جا چکی ہے اور تو اور مجاہد اسلام صلاح الدین ایوبی کی سوانح عمری بھی پنجاب حکومت کی پابندی کی زد میں ہے دوسری جانب زندگی بھر دین متین کی خدمت اور ساری عمر تحفظ ناموس رسالت ﷺ، کی حفاظت و پاسداری میں گزارنے والے مجاہدین آج اپنی ضمانتیں قبل از گرفتاری کرائے بیٹھے ہیں۔

ابھی اکیسویں آئینی ترمیم کے تحت ہونے والے اقدامات کی گرد بھی نہیں بیٹھنے پائی تھی کہ مرکزی حکومت نظام صلوٰۃ نافذ کر کے ایک اور نیا پنڈورا بکس کھولنے جا رہی ہے، جہاں تک اذان اور نماز کے اوقات کا تعلق ہے تو یہ ملک بھر میں یکساں نہیں ہو سکتے کیونکہ سورج کے طلوع اور غروب کا وقت اور مختلف مسالک میں اذان اور نماز کے اوقات مختلف ہیں، عیدین کے حوالے سے بھی ہر سال کچھ لوگوں کی جانب سے یہ تجویز سامنے آتی ہے کہ عید سعودی عرب کے مطابق تمام عالم اسلام میں ایک ہی دن منائی جائے، لیکن فقہی اور جغرافیائی حالات کو سمجھنے والے جانتے ہیں کہ یہ ایک غیر ضروری اور ناقابل عمل تجویز

ہے،ایسا ہی رمضان کے چاند اور سحر وافطار کا معاملہ ہے،جس کا اطلاق پورے پاکستان میں نہیں کیا جاسکتا، تمام عالم اسلام تو دور کی بات ہے،اس پس منظر میں ایک خطرناک تجویز یہ بھی سامنے آئی ہے کہ تمام مساجد میں عیدین اور جمعہ کا خطبہ یکساں ہو،جس کا واضح مطلب یہ ہے آئمہ مساجد اُس خطبے کے پابند ہونگے جو حکومت جاری کرے گی،یقینا یہ آئمہ مساجد کا گلہ گھوٹنے اور انہیں سرکاری ملازم بنانے کی سازش ہے اور سعودی طرز فکر کی نقالی ہے،جس کا اطلاق پاکستان جیسے ملک میں ممکن نہیں۔

حالیہ حکومتی اقدامات سے یوں لگتا ہے کہ پاکستان کے سارے مسائل ختم ہوگئے ہیں اور قوم نچنت ہوگئی ہے،شاید اسی لیے حکمران طبقہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے مسائل اٹھاتا اور بحث ومباحثہ کو دعوت دیتا ہے جس کا کوئی تعلق ملک و قوم کے درپیش مسائل سے نہیں ہوتا، اسی وجہ سے تنظیم المدارس اہلسنّت پاکستان کے سربراہ مفتی منیب الرحمٰن نے حکومت کو متنبہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ ہوش و دانشمندی سے کام لے اور اصل ایجنڈے پر اپنی توجہ مرکوز رکھے،مدارس و مساجد میں بلاسبب خوف وہراس کی فضا پیدا کرنے سے جو ردعمل جنم لے گا جو انتشار کا سبب بنے گا اور دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑنے کے بنیادی مقصد کیلئے نقصان دہ ثابت ہوگا،دوسری طرف JUPکے سربراہ صاحبزادہ ابوالخیر زبیر کا کہنا تھا کہ اہلسنّت کو دیوار سے لگانے کی کوشش برداشت نہیں کی جائے گی، اگر حکومت

نے ہمارے مطالبات پر توجہ نہیں دی اور اپنی روش نہ بدلی تو جمعیت عملی اقدامات کرنے پر مجبور ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ دہشت گردی کے سدباب اور اُس کو جڑ سے اکھاڑنے پھینکنے کے حوالے سے کوئی دو رائے نہیں، لیکن غور طلب پہلو یہ ہے کہ اِس ناسور کا اصل محرک کون ہے، فنڈنگ کون کرتا ہے اور اِس کی آبیاری وپرورش کس مکتبہ فکر اور مدرسوں میں کی جاتی ہے، لہٰذا شاخوں کو کاٹنے کے بجائے جڑوں کی صفائی پر توجہ دی جائے، دنیا جانتی ہے کہ بے گناہ افراد کو خاک وخون میں نہلانے اور قومی وملی املاک کو نقصان پہنچانے والے دہشت گرد عناصر کے سوتے کہاں سے پھوٹتے ہیں، گزشتہ دنوں پھانسی کی سزا پانے والے دہشت گردوں کے مذہبی اور تنظیمی تعلق حقیقت حال کو عیاں کرنے کیلئے کافی ہیں، مگر افسوس کہ اصل اسباب و محرکات پر توجہ دینے کے بجائے ملک کے اُس مکتبہ فکر کو نشانہ بنایا جارہا ہے جس کے ماننے والوں نے قیام پاکستان کی جدوجہد میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا اور جس کے اکابرین نے قائدِ اعظم محمد علی جناح اور مسلم کی تائید وحمایت میں کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا، دوسری جانب خود اِس مکتبہ فکر کے متعدد عالم دین جن میں ڈاکٹر سرفراز نعیمی، مولانا افتخار احمد حبیبی، مولانا قاسم ساسولی مولانا عبدالعظیم قادری، مولانا نورالدین قادری، علامہ امیر حسین شیرازی، مفتی، محمود شاہ رضوی، پیر سمیع اللہ چشتی اور

شہدائے نشتر پارک اِنہی خارجی فکر رکھنے والے دہشت گردوں کی مذموم کاروائیوں کا نشانہ بنے۔اِن دہشت گردوں نے محبت واخوت کا درس دینے والی خانقاہوں اور صدیوں سے مرجع خلائق بزرگان دین اور اولیائے کرام کے مزارات کو بھی نہ بخشا۔ چنانچہ اکیسویں آئینی ترمیم کے تناظر میں دہشت گردی کے اصل عوامل واسباب کو نظر انداز کرکے صرف اُس مکتبہ فکر جس کا دہشت گردی اور قومی سلامتی کے منافی کسی سرگرمیوں سے کبھی بھی کوئی تعلق نہیں رہا،کے مدارس ،مساجد ،مذہب و مسلک اور کتب پر قدغن ملکی حالات کو مزید تباہی کی طرف لے جاسکتے ہیں،ہماری ارباب اقتدار سے گزارش ہے کہ وہ ہوش سے کام لے اور وطن عزیز کو ماضی کا ترکی یا حالیہ سعودی عرب بنانے سے گریز کرے، ہر محب وطن جانتا ہے کہ پاکستان کے موجودہ مسائل اور بڑھتی ہوئی دہشت گردانہ سرگرمیوں کی اصل وجوہات کیا ہے ،لہذا اصل اسباب پر توجہ دی جائے اور نان ایشو کو ایشو بنانے سے گریز کیا جائے ،بصورت دیگر نہ صرف اصل مسائل سے توجہ ہٹ سکتی ہے بلکہ اس قسم کے اقدامات کے خلاف آنے والا ردِ عمل دہشت گردی کو جڑ سے اُکھاڑنے کے بنیادی مقصد کیلئے ہی نہیں قومی وملی یکجہتی کیلئے بھی نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔

ہماری نجات صرف ایک عوامی مفاہمت۔۔۔۔۔

اِسے مفاہمت کی پالیسی کا اعجاز کہیئے یا پھر مولانا فضل الرحمٰن کی سیاسی چال بازیوں اور جوڑ توڑ کا ہنر کمال کہ جمعیت علمائے اسلام نے سینٹ میں صرف پانچ سیٹیں رکھنے کے باوجود اپنی جماعت کے سینئر مولانا عبدالغفور حیدری کو ڈپٹی چیئرمین سینیٹ منتخب کروالیا، جبکہ پیپلز پارٹی کے سینئر رضا ربانی بھی اسی پالیسی کے تحت بلا مقابلہ چیئرمین سینٹ منتخب ہوگئے، محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد "مفاہمت کی سیاست" کا نعرہ ایسا ابھرا کہ اِسے بعد میں ملک کے ہر سیاسی قائد نے اپنایا، آج مفاہمت کی سیاست تمام سیاستدانوں کے پسندیدہ الفاظ ہیں اور ہزار اختلاف رائے رکھنے کے باوجود یہ لوگ جنگ کے بجائے مفاہمت سے اپنے مسائل سلجھانے کو ترجیح دیتے ہیں۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ ماضی میں جو بھی حکومت برسر اقتدار آئی اُسے ایسی حزب اختلاف کا سامنا کرنا پڑا جو حکومت گرانے کو اپنی اہم ترجیح قرار دیتی تھی، چنانچہ اِس باہمی چپقلش کا انجام حکومتِ وقت کی رخصتی یا سیاسی نظام کی بساط لپیٹنے کی صورت میں سامنے آتا رہا، مگر 2008ء کے بعد وطن عزیز میں مفاہمت اور مصلحت پسندی کو بنیادی فوقیت دی گئی اور سیاستدانوں نے مفاہمت

کی سیاست کا راستہ اختیار کیا، یوں ملک میں شروع ہونے والے نئے سیاسی دور "مفاہمتی سیاست" نے "شجر سیاست" کو لالچ، خود غرضی، مفاد پرستی اور منافقت کی دیمک لگادی، وہ سیاست جو کبھی اصولوں اور نظریات کی پابند تھی، آج تمام اصول وقیود سے ماورا اپنے اپنے مفادات کے تحفظ کا نام بن گئی، یوں سیاسی نظام میں حزب اختلاف کا اصل کردار یعنی قانون سازی میں متبادل تجاویز کا دینا، عوامی مسائل کے حل اور تحفظ کو یقینی بنانا اور حکومتی کاموں کی نگرانی کرنا عملاً مفقود ہوگیا اور ہر دو فریق اپنے اپنے مفاد کے تحفظ کیلئے منافقانہ مفاہمت پر آمادہ ہوگئے۔

آج مفاہمت اور مصلحت پسندی کی سیاست اِس قدر آگے بڑھ گئی ہے کہ حزب اختلاف نے جمہوری نظام کو سہارا دینا اپنی لازمی ضرورت بنالیا، یوں مفاہمتی سیاست کے نام پر ملک میں قائم ہونے والا جمہوری نظام اقتدار کی بندر بانٹ بن کر رہ گیا، "خود بھی کھاؤ اور ہمیں بھی کھانے دو" کی پالیسی نے جمہوری اقتدار اور روایات کو تباہ کرکے رکھ دیا، جس کی وجہ سے بلوچستان، سندھ اور بالخصوص کراچی کے داخلی مسائل ہنوز حل طلب اور جرا_ت مندانہ فیصلوں کے متقاضی ہیں، لیکن مصلحت پسندی اور سیاسی سمجھوتوں کے شکار موجودہ جمہوری نظام میں اِس بات کا امکان آٹے میں نمک کے برابر ہے۔

یہ درست ہے کہ قومی و ملی مفادات کے تحفظ کے پیش نظر بعض اوقات سیاسی سمجھوتے اور مصلحت پسندی کی راہ اختیار کی جاتی ہے ، یہ کوئی بری بات بھی نہیں، مگر جب مفاہمت اور مصلحت پسندی کی حکمت عملی قومی و ملی مسائل میں اتفاق رائے کے بجائے محض اقتدار کو طول دینے یا قومی وسائل کی بندر بانٹ کیلئے اختیار کی جائے تو نتیجہ قومی اداروں کی کمزوری کے ساتھ نت نئے مسائل کو بھی جنم دینے کا باعث بنتا ہے، ہمارا موجودہ قومی منظر نامہ اسی پالیسی کا آئینہ دار ہے۔

چنانچہ اِس تناظر میں یہ امید کرنا کہ مسائل حل ہوجائیں گے اور ملک کے ایک عام آدمی کے مفاد کو مد نظر رکھا جائے گا، سوائے خام خیالی کے اور کچھ نہیں، مفادات اور سیاسی مصلحتوں کا شکار سیاسی جماعتوں میں اشتراک عمل کے ثمرات سماج کے اُن طبقات تک کسی طور پہنچ پائیں گے جن کیلئے جسم وجان کا رشتہ برقرار رکھنا بھی مشکل ہوچکا ہے، زرداری جمہوریت سے لے کر نواز جمہوریت تک کا سفر ہمارے سامنے ہے، حقیقت یہ ہے کہ مفاہمتی سیاست کے نام پر وجود میں آنے والا سیاسی نظام مفاد پرست سیاستدانوں اور طبقہ اشرافیہ کیلئے آئیڈیل ثابت ہوا، کیونکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہیں اور اِسے قومی مفاد میں مفاہمت کا نام دیتے ہیں، جبکہ حقیقت میں یہ مفاہمت نہیں بلکہ عوام کے خلاف ایک ایسا گٹھ جوڑ ہے جو انہیں ہر قیمت پر

غلام رکھنے کے اصول پر مبنی ہے۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ پاکستان میں عام آدمی کا دم بھرنے والی سیاسی جماعتوں نے ہمیشہ اپنے مفادات کی سیاست کی اور اپنے اِس رویئے کو قومی مفاہمت کے لبادے میں لپیٹ کر اپنے فائدے کیلئے استعمال کیا،اِن جماعتوں نے ہمیشہ ایک دوسرے کے مفادات کا تحفظ کیا اور اپنی بارگیننگ پوزیشن مضبوط کرنے کیلئے تمام اصولوں و قواعد کو بالائے طاق رکھ کر اپنے طرز عمل کو" عظیم تر قومی مفاد" کا نام دیا، یہی حال کچھ اُن جماعتوں کا بھی رہا جو ملک میں مذہبی سیاست کی علمبردار ہیں، یہ جماعتیں بھی ملکی مفاد پر اپنے جماعتی اور ذاتی مفادات کو ترجیح دیتی نظر آتی ہیں، ٹکٹوں کی تقسیم، عہدوں کی بندربانٹ، انتخابات سے پہلے گروہ بندی، میرٹ کو نظرانداز کرکے اپنی من پسند تقرریاں اور ذاتی مفادات کو مقدم جاننا، آج ہمارے سیاسی کلچر کا بنیادی حصہ بن چکا ہے اوراِس صورت حال میں ہماری سیاست ایک کارٹیل بن کر رہ گئی ہے، جو صرف اپنے مفاد کو تحفظ دینے کیلئے تمام اصولوں اور قومی مفادات کو بالائے طاق رکھ کر فیصلہ سازی میں مصروف ہے۔

آج ہماری سیاسی جماعتیں عوامی مسائل سے بے خبر جوڑ توڑ کی سیاست میں مصروف ہیں ،اور ملک میں جاری دہشت گردی، فرقہ واریت، امن وامان کی ابتر صورت حال

بجلی اور گیس کی لوڈ شیڈنگ، کرپشن ، اقربا پروری اور بڑھتی ہوئی بے روزگاری جیسے خوفناک مسائل اِن کی نظروں سے اوجھل ہیں،انہیں عوام اور عوامی مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ،اگرانہیں دلچسپی ہے تو اپنی اپنی باری سے ،چنانچہ اِس تناظر میں سوشل میڈیا پر گردش کرتی وہ تصویر اور اُس کا کیپشن پوری قوم کیلئے لمحہ فکریہ ہے، جس میں تمام سیاسی جماعتوں کے قائدین کی باچھیں کھلی ہوئی ہیں،جو پاکستانی عوام کے بے بسی سے زیادہ اُن کی بے حسی پر ہنس رہے ہیں ،جواِس بات پر قہقہے لگارہے ہیں کہ یہ کتنی بے وقوف قوم ہے جو سب کچھ جاننے کے باوجود انہیں بار بار منتخب کرتی ہے اور انہیں دونوں ہاتھوں سے قومی دولت لوٹنے ، باہر منتقل کرنے اور نوچ کھانے کا موقع فراہم کرتی ہے، درحقیقت یہ ہماری سیاسی جماعتوں کا وہ مکروہ طرز عمل ہے جو گزشتہ کئی برسوں سے جاری ہے۔

قارئین محترم ! ہمارا ماننا ہے کہ جو مفاہمت عہدوں کی بندر بانٹ، وسائل کی تقسیم، کرپشن کی حفاظت ،ایک دوسرے کے مفادات کے تحفظ اور استحصالی نظام کی بقاء کیلئے اپنائی جائے ،وہ کبھی بھی عوام کیلئے سود مند ثابت نہیں ہو سکتی اور نہ ہی عوام کو کوئی ریلیف دے سکتی ہے،یاد رکھیئے ملک میں حقیقی جمہوریت کا ظہوراور عوامی مسائل کے حل کے ساتھ قومی وملی وسائل کے تحفظ کیلئے صاحب کردار نیک و صالح اور خوف خدا رکھنے والے نمائندوں کی پارلیمان میں موجودگی

ضروری ہے، جس کیلئے ایک مفاہمت ملک کے بیس کروڑ عوام کو بھی کرنا ہوگی، یقین جانیئے یہی عوامی مفاہمت وطن عزیز کو ان ابن الوقت، موقع پرست اور منافقانہ طرز عمل اختیار کرنے والے سیاستدانوں سے نجات دلا سکتی ہے۔

یہ موج خوں کب رکے گی۔۔۔۔

سانحہ کراچی،اسباب و محرکات اور عملی تقاضے۔۔۔۔۔۔

جمعرات کو کراچی میں اسماعیلی برادری کے قتل عام پر یوم سوگ منایا گیا اور سخت سیکورٹی میں جاں بحق ہونے والے مرد و خواتین کی نماز ادا کی گئی،اس موقع پر سیکورٹی کے سخت انتظامات دیکھنے میں آئے، سانحہ پشاور کے بعد کراچی کے اِس سانحہ نے پوری پاکستانی قوم کو غم واندوہ کی کیفیت میں ہی مبتلا نہیں کیا بلکہ ہر شہری کی آنکھ بھی نمناک کردی، یہ سانحہ اپنی المناکی، سوگواری اور دلخراشی کے لحاظ سے سانحہ 12 مئی 2007ء اور سانحہ 16 دسمبر 2014ء سے کسی بھی طرح کم نہیں، گو سانحہ پشاور کے بعد ایک تاثر یہ ملا تھا کہ شاید اب مستقبل میں اِس طرح کا وسیع پیمانے پر کشت وخون کا کوئی اور واقعہ رونما نہیں ہوگا، مگر چند مہینوں میں ہی درجنوں نہتے پاکستانیوں کے منظم انداز میں قتل عام نے ملک بھر میں بالعموم اور کراچی میں بالخصوص سیکورٹی صورت حال پر متعدد سنجیدہ سوالات کو جنم دیا ہے،دوسری جانب اسماعیلی برادری کے روحانی پیشوا آغا خان نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ پرامن جماعت پر حملہ عقل سے عاری تشدد کی عکاسی کرتا ہے اور اِس حملہ کے محرکات

سیاسی یا فرقہ وارانہ ہو سکتے ہیں، وزیر اعظم میاں نواز شریف نے بھی اِس واقعہ کے خلاف ملک بھر میں جمعرات کو یوم سوگ منانے کا اعلان کیا، دیگر شہروں کے برعکس کراچی میں گذشتہ روز کے قتل عام کے بعد وسیع پیانے پر سوگ منایا گیا اور حادثہ کے روز ہی کراچی کی تاجر برداری نے اعلان کر دیا کہ وہ جمعرات کو پر امن ہڑتال کریں گے، الہذا شہر قائد میں کاروباری سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر رہیں۔
ادھر کراچی میں اسماعیلی برادری کی بس پر دہشت گردی کے حملے کے تناظر میں کور ہیڈ کوارٹرز میں ایپکس کمیٹی کا اجلاس ہوا، جس میں گورنر سندھ، ڈی جی ملٹری آپریشنز، ڈی جی ملٹری انٹیلی جنس، ڈی جی آئی ایس پی آر اور آئی جی سندھ نے شرکت کی، بدھ کی رات وزیر اعظم نے کراچی کے گورنر ہاؤس میں بھی اعلیٰ سطحی اجلاس کی صدارت کی، جس میں انہیں ڈی جی رینجرز اور آئی جی نے بس حملے کے حوالے سے ابتدائی تحقیقات سے آگاہ کیا، اِس اعلیٰ سطحی اجلاس میں پاک افواج کے سربراہ جنرل راحیل شریف جو کراچی کی نازک صورتحال کے پیش نظر سری لنکا کا دورہ منسوخ کرکے اجلاس میں شرکت ہوئے کے علاوہ وزیر اعلیٰ سید قائم علی شاہ، ڈی جی رینجرز اور کور کمانڈر سابق صدر آصف علی زرداری اور متحدہ قومی موومنٹ کے رہنما ڈاکٹر فاروق ستار نے، بھی موجود تھے، وزیر اعظم نے حسب روایت پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو ہدایت کی کہ بس پر حملے

میں ملوث ملزمان کو گرفتار کرنے کیلئے تمام وسائل بروئے کار لائے جائیں، سرکاری نشریاتی ادارے کے مطابق وزیر اعظم کا کہنا تھا کہ بربریت کے واقعات انسداد دہشت گردی کے خلاف حکومت کے عزم کو متزلزل نہیں کر سکتے انہوں نے اِس عزم کا بھی اظہار کیا کہ معصوم لوگوں کے قاتلوں کا مکمل صفایا کیا جائے گا۔

یہاں یہ اُمر پیش نظر رہے کہ سانحہ صفورا جیسے دلدوز واقعات کراچی میں معمول بن چکے ہیں، ٹارگٹڈ آپریشن کے باوجود 6 سے زائد ٹارگٹ کلرز کا موٹرسائیکلوں پر کھلے عام ایس ایم جی، نائن ایم ایم پستولوں سمیت دندناتے پھرنا، بس کا محاصرہ کرکے اُس میں سوار ہونا اور 4 سے 5 منٹ تک فائرنگ کرکے بے گناہ، نہتے شہریوں کا قتل عام کرنا ملک کے باسیوں کے اذہان و قلوب میں بہت سے سوالات کو جنم دے رہا ہے، مزید حیران کن بات یہ ہے کہ فائرنگ کے وقت جائے وقوعہ کے قریب واقع پولیس چوکی میں ایک بھی اہلکار موجود نہ تھا، یہ بھی میڈیا پر آیا کہ ٹارگٹ کلرز ہولناک فائرنگ کے بعد داعش کے پمفلٹس پھینک کر فرار ہو گئے، حکومت سندھ اور اپیکس کمیٹی کی ناک کے نیچے ہونے والا دہشت گردی کا یہ واقعہ ہماری قومی تاریخ کا بدترین واقعہ ہے، جو ایک جانب صوبائی حکومت کی کارکردگی پر سوالیہ نشان لگاتا ہے تو دوسری جانب یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ حزب اقتدار ہوں یا حزب اختلاف دونوں ہی دہشت گردی کے

خاتمہ میں اپنی سنجیدگی دکھانے میں ناکام رہے ہیں۔

انتہاپسندی کا عفریت سالوں سے وطن عزیز کے باسیوں کیلئے بڑے چیلنج کی شکل میں موجود ہے مگر سیاسی اشرافیہ معاملہ پر درکار توجہ دینے میں ناکام رہی ہے، اگر مگر کے باوجود یہ یقین سے کہنا مشکل ہے کہ سانحہ کراچی کے بعد اِس سرزمین پر کشت وخون کا کوئی اور سانحہ رونما نہیں ہوگا، حیران کن بات یہ ہے کہ وفاقی اور صوبائی حکومت کی جانب سے پولیس جیسے اہم محکمہ میں اصلاحات لانے پر بھی توجہ نہیں دی جارہی اور دہشت گردی کے خلاف جاری جنگ میں فوج کو فرنٹ لائن پر استعمال کیا جارہا ہے جو مستقل حل نہیں ہے، دوسری جانب پی پی پی کے وزیر اعلیٰ اور صوبے کے انتظامی سربراہ مسلسل اپنی افادیت ثابت کرنے میں ناکام رہے ہیں، یہی معاملہ صوبے کی انتظامیہ اور پولیس کا ہے جو ان تخریبی عناصر اور مافیاز پر قابو پانے میں ناکام دکھائی دیتی، چنانچہ ضرورت اِس امر کی ہے کہ پولیس اور انتظامیہ کے محاسبے اور مواخذے کے لئے عملِ تطہیر کو بروئے کار لاتے ہوئے آہنی اقدامات کئے جائیں اور ایسی پولیس فورس تشکیل دی جائے جو سیاسی وابستگی سے بالاتر ہونے کے ساتھ جدید عصری تقاضوں سے بھی بہرہ ور ہو۔

یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ جب تک سیاسی جماعتوں اور حکومتی ترجیحات درست نہیں ہوگی اور فیصلے قومی مفاد میں نہیں کیے جائیں گے اُس وقت تک پاکستان

میں قیام امن کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا، ہمارا ماننا ہے کہ یہ سانحہ بالخصوص صوبائی حکومت اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی کارکردگی پر سوالیہ نشان ہے اور وفاقی اور صوبائی حکومتوں کو اس سوال کا تسلی بخش جواب دینا ہوگا کہ کراچی میں جاری ٹارگٹیڈ آپریشن کے دوران دہشت گرد کیوں اور کیسے اتنی بھیانک کارروائی کرنے میں کامیاب ہوئے، ساتھ ہی وطن عزیز کا باشعور طبقہ وزیراعظم صاحب سے یہ بھی پوچھنا چاہتا ہے کہ سانحہ پشاور کے بعد جو قومی ایکشن پلان منظور کیا گیا تھا اُس پر عمل درآمد ہونا کیونکر تاحال ممکن نہیں بنایا جاسکا۔

دوسری جانب وطن عزیز میں لسانی، سیاسی اور مذہبی دہشت گردی کی کارروائیوں میں پڑوسی ملک کے ملوث ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا، بھارت کا معاملہ یہ ہے کہ اُس کی سیاست اور صحافت میں ایسے عناصر بہت طاقتور ہیں جو پاکستان سمیت خطے کے دیگر ممالک سے برابری کی بنیاد پر تعلقات قائم کرنے کے مخالف ہیں، اسلام اور پاکستان دشمنی اُن میں اِس انداز میں رچ بس چکی کہ وہ اِس رجحان سے کسی طور پر دور ہونے کو تیار نہیں، جبکہ بھارتیہ جنتا پارٹی کی سرکار بھی کسی طور انتہا پسندانہ پالیسوں سے تائب ہونے کو تیار نظر نہیں آتی، آئے دن کنٹرول لائن پر گولہ باری، بلوچستان میں علیحدگی پسندوں کو بھرپور تعاون فراہم کرنا اور پاکستان کے معاشی حب کراچی میں انارکی پھیلانے کا

سلسلہ بدستور جاری ہے، یہی وجہ ہے کہ گزشتہ کور کمانڈرز اجلاس میں بھارتی خفیہ ادارے" را" کی جانب سے ملک میں دہشت گردی کے واقعات کو مبینہ طور پر شہ دینے کا سختی سے نوٹس لیا گیا، دفتر خارجہ نے بھی اپنے حالیہ ہفتہ واری بیان میں بھارت کو پاکستان کے داخلی معاملات میں مداخلت سے گریز کا مشورہ دیا ہے، سیاسی مبصرین کے نزدیک وزارت خارجہ کا بیان دراصل اُن اطلاعات کی تصدیق کرنے کے مترادف ہے کہ "را" پاکستان میں دہشت گردی کو شہ دے رہی ہے۔

یہ امر لائق توجہ ہے کہ 11 مارچ 2015ء کو عزیز آباد آپریشن کے بعد کراچی میں ٹارگٹ کلنگ کے واقعات میں واضح کمی دکھائی دی تھی لیکن شومی قسمت کہ اپریل کے آخری عشرے سے ٹارگٹ کلنگ کی لہر میں دوبارہ واضح شدت ریکارڈ پر آئی، اس دوران 2 ڈی ایس پی، سماجی کارکن سبین محمود اور استاد صحافی پروفیسر وحیدالرحمٰن شہید ہوئے، جبکہ ایس ایس پی راؤ انوار کے کانوائے پر حملہ کیا گیا اور 13 مئی کو اسماعیلی کمیونٹی کی بس کو نشانہ بنایا گیا، جس میں 46 افراد مارے گئے، یوں کراچی میں بے گناہ انسانوں کے خون سے مسلسل ہولی کھیلی جا رہی ہے جبکہ فرقہ وارانہ جماعتیں اُسے مخصوص کمیونٹی کے خلاف منظم دہشت گردانہ واردات قرار دے کر متاثرہ کمیونٹی کی ہمدردی کی آڑ میں جہاں اُن کے زخموں پر نمک پاشی کر رہی ہیں، وہیں بین السطور وہ ایسے بیانات بھی داغتی ہیں

جن کا مقصد فرقہ واریت کے شعلوں کو ہوا دے کر حالات کو مزید ابتر بنانا ہوتا ہے،ایسے میں صدر مملکت،وزیراعظم، وزیر داخلہ، صوبہ سندھ کے وزیراعلیٰ،آئی جی سندھ،ڈی جی رینجرز کی جانب سے واقعہ کی مذمت اور متوفیان کے ورثاء کیلئے فی کس پانچ لاکھ روپے کا اعلان کے ساتھ کسی صوبائی وزیر کی جانب سے پورے وثوق کے ساتھ یہ یقین دلانا کہ پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو متحرک کر دیا گیا ہے کسی طور بھی اِن سانحات کا مداوا نہیں کر سکتا۔

یہ بات بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ سابق ڈی جی رینجرز (موجودہ ڈی جی آئی ایس آئی) پہلے ہی کراچی بدامنی کیس میں عدالت عظمیٰ کو بتا چکے ہیں کہ کراچی میں امن وامان کی صورت حال اور بدامنی کے ذمہ دار سیاسی جماعتوں کے مسلح ونگز ہیں، سپریم کورٹ کی وہ آبزرویشن جو 20 کروڑ پاکستانیوں کے محسوسات،جذبات اور خیالات کی مظہر ہے، آج بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ کراچی میں آپریشن کلین اَپ کے سوا چارہ نہیں،الہٰذا دہشت گردی، تخریب کاری اور ٹارگٹ کلنگ کے ڈسے عوام کو سیاستدانوں، حکمرانوں اور مقتدر طبقات کے محض اعلانات اور خالی خولی بیانات سے مطمئن نہیں کیا جاسکتا بلکہ صرف اور صرف عملی اقدامات ہی ان کے زخموں کا مرہم،درد کا درماں اور دکھوں کا مداوا بن سکتے ہیں،الہٰذا حقائق کے تناظر میں کراچی کے شہریوں کو اعلانات اور بیانات کی طفل تسلی نہیں بلکہ موءثر ترین عملی اقدامات کی ضرورت ہے،واضح رہے کہ کراچی کے موجودہ حالات

پر ہر محب وطن شہری مضطرب ہے اور وہ اصلاح احوال چاہتا ہے، کراچی شہر کی سیاست کے سٹیک ہولڈرز اور اجارہ داروں کو بھی اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ 1981ء تک امن وسکون کا گھوارہ تصور کیا جانے والا شہر بتدریج مافیاز اور ٹارگٹ کلرز کی تربیت اور پناہ گاہ کیسے بنا؟اسے نسلی اور مذہبی منافرتوں کی پرورش گاہ کن دیدہ و نادیدہ عناصر نے بنایا ہے ؟۔

یہاں یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ شہر قائد اب بھی وطن دشمن اور امن دشمن عناصر کی جولانگاہ بنا ہوا ہے۔ اِن عناصر کا صفایا کرنا ریاستی مشینری کا اولین فرض ہے، جب تک کراچی میں ٹارگٹ کلنگ، دہشت گردی، تخریب کاری، قبضہ گردی اور منشیات فروشی میں ملوث مافیا اور انتہاپسند لسانی اور فرقہ وارانہ تنظیموں کے مسلح دستوں کے خلاف یکسو ہو کر بلاامتیاز اور بلا توقف آپریشن نہیں کیا جاتااور شہر قائد ایسے مافیاز کے نرغے سے آزاد نہیں کرایا جاتا۔اِس قسم کے دلدوز سانحات وقوع پذیر ہو کر مقتدر طبقات اور ریاست کی رٹ کو چیلنج کرتے رہیں گے۔لہذا آرمی چیف کی ہدایات کے مطابق کراچی ٹارگٹڈ آپریشن کو بلاامتیاز و بلا تفریق آگے بڑھایا جائے تاکہ شہر قائد کی رونقیں بحال ہو سکیں۔

سانحہ منیٰ ایران سعودی مخاصمت یا کچھ اور

حج کے مبارک موقع پر سانحہ منیٰ نے قیامت صغریٰ کے مناظر پیش کر دیئے، اتنے مقدس اور عظیم اجتماع پر اس قدر بڑے پیانے پر اجتماعی جانی نقصان شاید ہماری تاریخ میں پہلے کبھی نہیں ہوا،تاحال شہداء کی اصل تعداد اور اس سانحہ میں زخمیوں ہونے والے کی شناخت سامنے نہیں آپائی جبکہ الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا پر تکرار کے ساتھ گمشدہ افراد کی اصطلاح نے ہزاروں گھرانوں کو رنج والم کی تصویر بنایا ہوا ہے ،لوگ اپنے پیاروں کی خیریت کیلئے فکر مند اور پریشان ہیں۔

ایک معروف پاکستانی نیوز چینل کے مطابق سانحہ منیٰ میں شہید پاکستانی حجاج کی تعداد 36 ہو گئی ہے، جس کی تصدیق کرتے ہوئے وزارت مذہبی امور نے اپنی ویب سائٹ پر شہداء کے نام بھی جاری کر دیئے، وزیر مذہبی امور کے مطابق منیٰ میں شہید ہونے والے پاکستانی حجاج کی تعداد 35 ہے جب کہ 85 حاجی ایسے ہیں جو ہنوز لاپتہ ہیں ،وفاقی وزیر کے مطابق منیٰ میں زخمی ہونے والے حجاج کرام کو سعودی حکام نے دیگر شہروں میں منتقل کردیا ہے،دوسری جانب برطانوی اخبار دی گارجین نے دعویٰ کیا ہے کہ سانحہ منیٰ میں سب سے زیادہ شہادتیں پاکستانیوں کی ہوئی ہیں جو کہ 236 ہیں ،جبکہ اس سانحہ میں 131 ایرانی اور 87 مراکشی

حجاج کرام بھی شہید ہوئے ہیں،تاہم پاکستانی وزارت مذہبی امور برطانوی اخبار کی خبر کی تردید کرتی ہے۔ واضح رہے کہ حج کے موقع پر بھگڈر مچنے سے ہلاکتوں کا یہ پہلا واقعہ نہیں بلکہ اس سے قبل بھی کئی مواقع پر اس طرح کے واقعات رونما ہو چکے ہیں، اس طرح کا آخری سب سے بڑا واقعہ جنوری 2006 میں رونما ہوا تھا جب رمی کے دوران بھگڈر مچنے سے 364 حاجی جاں بحق ہو گئے تھے جبکہ 1990 میں اس طرز کا سب سے بدترین واقعہ رونما ہوا جب ایک سرنگ میں بھگڈر مچنے سے 1426 عازمین جان گنوا بیٹھے تھے جن میں سے اکثریت ایشیائی باشندوں کی تھی۔

منیٰ میں شہید ہونے والے پاکستانی حجاج کی اصل تعداد تو بہت جلد سامنے آجائیں گی لیکن سردست توجہ طلب مسئلہ یہ ہے کہ اس المناک سانحے کی اصل وجوہات اور عوامل کیا ہیں، الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا میں یں اس حادثے کی بہت ساری وجوہات بیان کی جارہی ہیں ، لیکن شوشل میڈیا پر موجود عرب شہزادے کی گاڑی سے شیطان کو کنکریاں مارنے کی مبینہ وڈیوز اور عرب دنیا کے اخبارات میں شائع ہونے والی خبریں اس سانحے کے جس پہلو کی نشاندہی کر رہے ہیں اُسے ایران اور سعودی عرب مخاصمت کا شاخشانہ قرار دے کر صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

ایرانی ذرائع ابلاغ میں سعودی حکام کی بد انتظامی اور لالچ کو اس سانحہ کی اصل وجہ قرار دیتے ہوئے تنقید کا سلسلہ جاری ہے۔ایرانی حکومت عالمی سطح پر منیٰ میں پیش آنے والے واقعہ پر سعودی حکومت سے تحقیقات کروانے کا مطالبہ کر رہی ہے۔ ایرانی پراسیکیوٹر جنرل کہتے ہیں کہ ایران کوشش کرے گا کہ سعودی شاہی خاندان کے جرائم کے خلاف بین الاقوامی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔ جبکہ ملک کے سپریم لیڈر آیت اللہ خامنہ ای کا کہتے ہیں کہ الزام تراشیاں کرنے کے بجائے سعودی حکومت سے اس واقعہ کی ذمہ داری قبول کرکے متاثرہ خاندانوں سے معافی مانگے۔ سعودی عرب کے وزیرِ خارجہ عادل الجبیر کا کہنا ہے کہ ایران ایک حادثے پر سیاست کر رہا ہے۔ان کا یہ بھی کہنا تھا میں امید کرتا ہوں کہ ایرانی قیادت ہلاک ہونے والوں کی خاطر عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوے تحقیقات کے نتائج آنے کا انتظار کرے گی۔ دوسری جانب سعودی حکام نے اس حادثے کی ذمہ داری عازمین حج کی بد نظمی پر ڈال کر اپنی جان چھڑانے کی کوشش کی ہے۔ ایک سعودی وزیر نے ایرانی عازمین کو اس حادثے کا ذمے دار قرار دیتے ہوئے کہا کہ انہوں نے حج کے قوانین پر عمل درآمد نہیں کیا۔

امر واقعہ یہ ہے کہ ایکدوسرے پر الزامات کی بھرمار سعودی عرب اور اہل ایران کی ناراضگی کی وجہ سے قابل فہم ہے۔ مگر اس حادثے کی اصل اور بنیادی پہلو سے جان بوجھ کر اعتراض برتا جارہا ہے۔ جبکہ مقدس شہر مکہ میں حج کے موقع پر

شیطان کو کنکریاں مارنے کے دوران منیٰ میں پیش آنے والے حادثے کے متعلق نہایت افسوسناک حقائق سامنے آ رہے ہیں، بین الاقوامی میڈیا کے مطابق عینی شاہدین نے واقعہ کا ذمے دار سعودی حکام کو قرار دے دیا ہے اور عینی شاہدین کی جانب سے بتائی گئی تفصیلات سعودی موقف سے یکسر مختلف ہیں، لیبیا کے 45 سالہ احمد ابو بکر کا کہنا ہے وہاں بہت ہجوم تھا، پولیس نے عازمین کیلئے تمام داخلی اور خارجی راستے بند کر دیے تھے، حادثے کے بعد ہم نے پولیس کی مدد سے متاثرین کو ہٹایا لیکن اس موقع پر موجود پولیس واضح طور پر ناتجربہ کار محسوس ہوئی۔

مقدس مقامات کی از سر نو تعمیرات کے ایک بڑے ناقد کا کہنا ہے کہ بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود پولیس کی صحیح طریقے سے تربیت نہیں کی گئی اور زبان پر مہارت نہ ہونے کے سبب انہیں بڑی تعداد میں غیر ملکی عازمین سے رابطے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جبکہ مکہ کی اسلامی ورثہ ریسرچ فاو_نڈیشن کے شریک بانی عرفان ال الاوی نے بتایا کہ انہیں یہ تک نہیں معلوم کے لوگوں سے بات کیسے کرنی ہے، یہ عوام کو قابو نہیں کر پا رہے تھے، موجودہ واقعہ کے متعلق بعض مقامی شہریوں کا کہنا ہے کہ رواں برس سے قبل سکیورٹی اور حاجیوں کی رہنمائی کے لیے تعینات زیادہ تر عملہ یمنی ہوتا تھا لیکن اس برس بوجوہ انہیں سبکدوش کر دیا گیا اور ان کی جگہ ہنگامی طور پر بعض افریقی ممالک سے

آئے افراد کو نہایت مختصر اور نامکمل تربیت کے بعد تعینات کر دیا گیا، یہ ناتجربہ کار عملہ پہلی آزمائش ہی میں ناکام ہوگیا اور اس قدر بھیانک حادثے کا سبب بنا۔

بہرحال جو بھی کچھ ہوا نہایت ہی افسوسناک ہے لیکن اس سے بھی زیادہ المناک بات سعودی حکام کی شہدائے منیٰ کی لاشوں کے ساتھ انسانیت سوز سلوک اور بے حرمت ہے ایسا تو انسان جانوروں کے ساتھ بھی نہیں کرتا، دوسری طرف سعودی مفتی اعظم کا یہ کہنا کر کہ ایسا حادثہ روکنا انسانی اختیار سے باہر تھا، اس اندوہناک سانحہ پر حکومتی لاپروائی اور کوتاہی کو چھپانے کی کوشش ہے ۔ہمارے خیال میں اس عظیم سانحہ کے ذمہ داروں کو مشیت ایزدی کے پردے میں چھپانے کی کوشش دراصل جرم پر پردہ ڈالنے کے مترادف ہوگی، یہ درست ہے کہ اس سانحہ میں جان سے گزرنے والے وہ خوش نصیب تھے جنھوں نے چند ہی ساعتوں میں رتبہ شہادت حاصل کرلیا اور لبیک اللھم لبیک کی صدائیں بلند کرتے ہوئے اپنے رب کی بارگاہ میں حاضر ہوگئے لیکن اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ کہ ایسے المناک حادثات کی روک تھام کیلئے موثر عملی انتظامات نہ کیئے جائیں اور اسے مشیت ایزدی قرار دے کر صرف نظر کردیا جائے، کیونکہ منشائے الٰہی یہی ہے کہ اپنی زندگی کی حفاظت میں کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہ چھوڑا جائے ،لہٰذا بہت ضروری ہے کہ سانحہ منیٰ کی غیر جانبدارنہ تحقیقات کرائی جائیں تاکہ مستقبل میں اس قسم

کے واقعات کا سدباب کیا جاسکے اور آئندہ ناحق انسانی جانیں ضائع ہونے سے بچ سکیں۔